صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کا پیغام

نقوش کے ۱۰۰ویں [illegible] اشاعت پر میں ادارے اور اس کے مدیر کو مبارکباد دیتا [illegible] اور مسلسل کاوش سے نقوش کو اس معیار پر لا کھڑا کیا ہے [illegible] ادبی شخصیتوں کی خود نوشت سوانح پیش کر رہا ہے ۔

میں سرکاری مصروفیتوں کی وجہ سے میں اس ادبی اجتماع میں شریک نہیں ہو سکتا، [illegible] ادبی جشن میں شریک ہوں ۔ میں پاکستان کے ادیبوں اور فنکاروں کا [illegible] سے ہماری بہت سی قومی امیدیں وابستہ ہیں ۔ ادیب اور فنکار قوم [illegible] مجھے خوشی ہے کہ پاکستان کے ادیبوں نے آج تک ہم سے تعاون [illegible] میری رہنمائی ہے ۔

[illegible] وں کا ایک نمائندہ جریدہ ہے جو صالح اور تعمیری [illegible] اس [illegible] ہے پیش کرنے والے جریدوں کی تعداد ہمارے ہاں کم ہے ۔ اسی وجہ سے ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے ۔ میری تو خواہش ہے کہ ایسے [illegible] پڑھیں اور ملک میں باذوق قاری پیدا کریں ۔

محمد ایوب خان فیلڈ مارشل

۱۰۰ واں شمارہ

فہرس

طلوع — محمد طفیل
تصریحات — محمد طفیل

مکتوبات منجانب:

۱ — فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں
۲ — سر ونسٹن چرچل
۳ — جنرل آئزن ہاور
۴ — ہیرلڈ میکملن
۵ — برٹرینڈ رسل
۶ — ایلیا اہرن برگ
۷ — پنڈت جواہر لعل نہرو
۸ — ٹی - ایس - ایلیٹ
۹ — ایزرا پاؤنڈ
۱۰ — لارڈ ڈگلس ہیوم
۱۱ — ہر مجسٹی فرح دیبا پہلوی
۱۲ — ہز ہائنس آغا خاں
۱۳ — ڈاکٹر رادھا کرشنن
۱۴ — ڈاکٹر ذاکر حسین
۱۵ — رابرٹ فراسٹ
۱۶ — جیمز تھربر
۱۷ — ڈبلیو - ایس ماہم
۱۸ — الڈس ہکسلے
۱۹ — اے - ای سٹیونسن
۲۰ — سمرسٹ ماہم
۲۱ — فیض احمد فیض
۲۲ — وان ریگ بروکس
۲۳ — محمد معین
۲۴ — والڈیشے میرڈوکرو
۲۵ — چینی سفیر
۲۶ — انفرمیشن منسٹر الٰہی
۲۷ — امریکی سفیر
۲۸ — انڈونیشی سفیر
۲۹ — سفیر متحدہ عرب جمہوریہ
۳۰ — سفیر سعودی عرب
۳۱ — ترکی سفیر
۳۲ — لبنانی سفیر
۳۳ — سوڈانی سفیر
۳۴ — برازیلی سفیر
۳۵ — سفیر یوگوسلاویہ
۳۶ — برطانوی ڈی کمشنر
۳۷ — سفیر فلپائن
۳۸ — ہائی کمشنر کینیڈا
۳۹ — سفیر بلجیم
۴۰ — ہائی کمشنر آسٹریلیا
۴۱ — سفیر سوئٹزرلینڈ
۴۲ — ہائی کمشنر ملیشیا

مضامین

۱ — آپ بیتیوں کی اہمیت — مولانا غلام رسول مہر، ۳۶
۲ — آپ بیتیوں کے چند نمایاں پہلو — مولانا علم الدین سالک، ۴۰
۳ — آپ بیتی — ڈاکٹر سید عبداللہ، ۶۰
۴ — آپ بیتی کی مختلف صورتیں — یوسف جمال انصاری، ۶۸
۵ — آپ بیتی کیا ہے؟ — ریحانہ خانم، ۶۴

سربراہِ مملکت

۱ — قائد اعظمؒ — ۲
۲ — فیلڈ مارشل محمد ایوب خان — ۱۵

---

۳ — تیمور گورگانی — ۸۵۳
۴ — ظہیر الدین بابر — ۳۳۱

۵ — گلبدن بیگم ۳۸۵
۶ — نورالدین محمد جہانگیر ۸۶۱
۷ — جہاں آرا بیگم ۹۳۲
۸ — اورنگ زیب عالمگیر ۹۴۶
۹ — واجد علی شاہ ۳۳۹
۱۰ — امیر عبدالرحمٰن ۹۳۶
۱۱ — شوارژنگی ۱۶۰۰
۱۲ — اڈولف ہٹلر ۹۰۸
۱۳ — مسولینی ۵۳۹

---

۱۴ — ڈیوک آف ونڈسر ۸۸۸
۱۵ — جمال عبدالناصر ۸۸۰
۱۶ — رضا شاہ پہلوی ۸۷۱
۱۷ — فرح دیبا پہلوی ۸۷۷
۱۸ — ملکہ ایلزبتھ دوم ۸۵۰
۱۹ — ونسٹن چرچل ۱۷۵۵
۲۰ — آئزن ہاور ۸۴۱
۲۱ — لنڈن بی جانسن ۸۴۵
۲۲ — جواہر لال نہرو ۹۶۳
۲۳ — رادھا کرشنن ۹۵۶
۲۴ — پرنس آغا خاں (چہارم) ۱۸۱۲

اولیاء، صوفیاء

۲۵ — مخدوم علی ہجویریؒ ۱۵۳۱
۲۶ — سعدی شیرازیؒ ۱۵۵۳
۲۷ — امیر خسروؒ ۱۵۵۶
۲۸ — مجدد الف ثانیؒ ۳۲۴
۲۹ — شاہ محمد غوثؒ ۱۵۰۸
۳۰ — میرزا مظہر جان جاناں ۲۸۹
۳۱ — سید غوث علی شاہ قلندرؒ ۹۱
۳۲ — مولانا اشرف علی تھانوی ۱۸۰۶
۳۳ — شاہ محمد حسین الہ آبادیؒ ۶۹۳
۳۴ — شاہ محمد سلیمان پھلواری ۱۵۱۵
۳۵ — خواجہ حسن نظامی ۱۵۳۸

علماء

۳۶ — شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۱۵۶۱

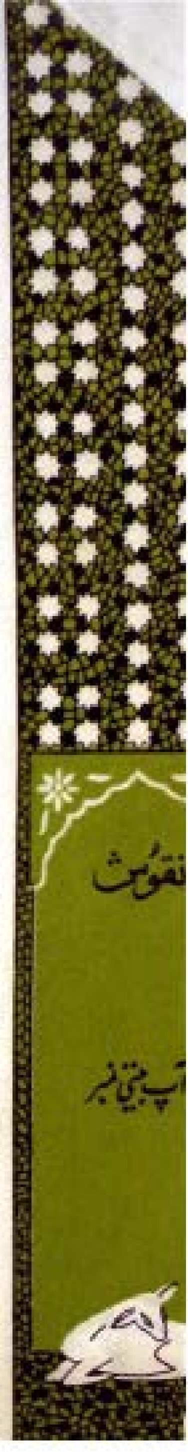

۳۷ — میر غلام علی آزاد بلگرامی ۲۹۳
۳۸ — مولوی محمد جعفر تھانیسری ۱۷۶
۳۹ — مولانا عبید اللہ سندھی ۱۳۲۰
۴۰ — نواب حبیب الرحمٰن شروانی ۱۶۳۸
۴۱ — مولانا حسین احمد مدنی ۳۶۳
۴۲ — سید سلیمان ندوی ۳۷۷
۴۳ — اسلم جیراجپوری ۱۳۰۹
۴۴ — مولوی محمد شفیع ۱۳۵۸
۴۵ — عبدالماجد دریابادی ۱۰۶۷
۴۶ — ابوالاعلیٰ مودودی ۱۳۸۵

مؤرخ

۴۷ — ملا عبدالقادر بدایونی ۳۰۳
۴۸ — ابوالفضل ۱۶۷۱
۴۹ — مولوی رحمٰن علی ۱۳۷۳
۵۰ — حکیم سید عبدالحی ۱۳۷۶
۵۱ — فقیر محمد جہلمی ۱۳۸۰
۵۲ — جسٹس امیر علی ۳۲۹
۵۳ — منشی ذکاء اللہ دہلوی ۴۳۳
۵۴ — مولوی کریم الدین ۴۵۲
۵۵ — لالہ سری رام ۵۵۷
۵۶ — عبدالرزاق کانپوری ۴۲۵
۵۷ — محمد دین فوق ۶۷۰

مصلحین، سیاسین

۵۸ — میرزا ابوطالب اصفہانی ۶۱۳
۵۹ — مسیح الدین خاں سفیر اودھ ۳۷۰
۶۰ — محمد عنایت حسین خاں ۱۷۷۵
۶۱ — سر سید احمد خاں ۱۱۱، ۴۲۵
۶۲ — دادا بھائی نوروجی ۲۱۲
۶۳ — نواب محسن الملک ۴۳۲
۶۴ — نواب وقار الملک ۴۳۳
۶۵ — جسٹس محمود ۶۳۸
۶۶ — گاندھی ۳۴۶
۶۷ — مولانا محمد علی جوہر ۷۷۸
۶۸ — ڈاکٹر محمد اقبال ۲
۶۹ — مولانا ظفر علی خاں ۷۳۱

۷۰ — شیخ عبدالقادر ۷۲۰
۷۱ — ابوالکلام آزاد ۱۸۳۵
۷۲ — چودھری افضل حق ۵۸۰
۷۳ — عطاء اللہ شاہ بخاری ۷۱۵
۷۴ — سر راس مسعود ۴۳۹
۷۵ — سر سید رضا علی ۳۱۰
۷۶ — نواب آغا مرزا دہلوی ۶۲۳
۷۷ — سید ہمایوں مرزا ۱۷۸۹
۷۸ — سر اسمٰعیل مرزا ۷۶۳
۷۹ — راجہ غضنفر علی ۱۸۱۳
۸۰ — سر ظفر اللہ خاں ۹۶۲
۸۱ — شیخ محمد عبداللہ ۹۰۳
۸۲ — ڈاکٹر اشرف ۱۵۸۲
۸۳ — خلیق الزماں ۱۷۳۳
۸۴ — میر لائق علی ۱۷۱۲
۸۵ — شورش کاشمیری ۱۲۱۱
۸۶ — بیج ناتھ جج ۵۷۰

غیر ملکی ادیب

۸۷ — روسو ۱۵۷۵
۸۸ — جان کیٹس ۹۷۳
۸۹ — دوستووسکی ۱۶۲۲
۹۰ — گورکی ۸۱۲
۹۱ — چیخوف ۷۸۳
۹۲ — آسکر وائلڈ ۹۱۹
۹۳ — برنارڈ شا ۱۸۳۱
۹۴ — رابندر ناتھ ٹیگور ۱۶۷۶
۹۵ — ڈاکٹر طٰہٰ حسین ۲۳۹
۹۶ — ایرسکین کالڈول ۹۶۹
۹۷ — جان اپڈائیک ۹۸۲
۹۸ — ہرمن ووک ۹۳۷
۹۹ — ونگ ہے ۹۸۵
۱۰۰ — یوانگ آنگ ۹۸۷
۱۰۱ — من متھ ناتھ گپت ۱۵۹۱
۱۰۲ — بشیدا گجراتی ۶۷۷
۱۰۳ — سید حسین ناصر ۹۸۸
۱۰۴ — رادین چائیم مناہم ۹۹۰

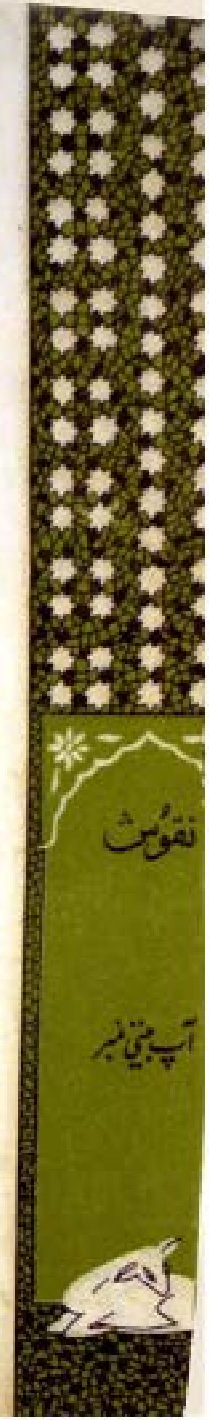

۱۰۵ — پال جون جینیس ۹۹۱
۱۰۶ — فریڈی وریدی توخش ۹۹۲
۱۰۷ — فنڈی کوغلو ۹۹۳
۱۰۸ — پیونیر برشیں ۱۳۸۲
۱۰۹ — محمد یمین ۱۸۵۱

— ادباء، شعراء

۱۱۰ — میر تقی میر ۱۸
۱۱۱ — میراثر ۲۸۷
۱۱۲ — عبدالقادر بیدل ۴۴۱
۱۱۳ — رجب علی بیگ سرور ۴۱
۱۱۴ — حیدر بخش حیدری ۱۴۸۷
۱۱۵ — کاظم علی جوان ۱۴۸۹
۱۱۶ — نہال چند لاہوری ۱۴۸۴
۱۱۷ — بہادر علی حسینی ۱۴۸۲
۱۱۸ — شیخ حفیظ الدین ۱۴۸۳
۱۱۹ — مرزا علی لطف ۱۴۸۵
۱۲۰ — میر شیر علی افسوس ۱۴۹۳
۱۲۱ — سید مظفر علی اسیر لکھنوی ۱۴۹۶
۱۲۲ — خواجہ قمرالدین خاں راقم ۱۴۹۱
۱۲۳ — سراج الدین علی خاں آرزو ۴۴۹
۱۲۴ — اسداللہ خاں غالب ۴۵۶
۱۲۵ — مومن خاں مومن ۴۹۷
۱۲۶ — ظہیر دہلوی ۵۰۲
۱۲۷ — مظفر علی سندیلوی ۴۹۷
۱۲۸ — منیر شکوہ آبادی ۳۰۳
۱۲۹ — مولوی غلام قادر نگین رامپوری ۷۰
۱۳۰ — عبدالغفور نساخ ۵۲۳
۱۳۱ — حقیر بلگرامی ۱۵۰۰
۱۳۲ — سید غلام حسین بلگرامی ۱۵۰۴
۱۳۳ — میر حسن دہلوی ۱۵۶۷
۱۳۴ — جلال لکھنوی ۱۵۰۶
۱۳۵ — تسلیم لکھنوی ۱۵۰۳
۱۳۶ — مصطفےٰ خاں شیفتہ ۱۶۶۲
۱۳۷ — غلام ہمدانی مصحفی ۱۳۸۶
۱۳۸ — سعادت یار خاں رنگین ۱۳۸۳
۱۳۹ — محمد حسین آزاد ۱۸۲۰

۱۴۰ — ڈپٹی نذیر احمد ۴۲
۱۴۱ — داغ دہلوی ۱۶۸۳، ۴۳۰
۱۴۲ — امیر مینائیؒ ۱۳۹۳
۱۴۳ — مولانا حالی ۲۸۱، ۴۴۴
۱۴۴ — مولانا شبلی ۴۲۶، ۴۶۳
۱۴۵ — مولوی عبدالحق ۱۳۵
۱۴۶ — ریاض خیرآبادی ۱۵۵
۱۴۷ — نظم طباطبائیؒ ۲۰۹، ۵۷۳
۱۴۸ — وحیدالدین سلیم ۴۳۷
۱۴۹ — عبدالحلیم شرر ۴۳۶، ۵۶۴
۱۵۰ — اکبر الٰہ آبادی ۴۲۸
۱۵۱ — منشی رحمت اللہ رعد ۴۳۶
۱۵۲ — میر ناصر علی ۴۳۷
۱۵۳ — ہوش بلگرامی ۲۱۶
۱۵۴ — عزیز مرزا ۵۶۵
۱۵۵ — احمد علی شوق قدوائیؒ ۵۶۶
۱۵۶ — مرزا رسوا لکھنوی ۵۶۷
۱۵۷ — پیارے لال آشوب ۵۶۹
۱۵۸ — ٹھاکر برت لال ورمن ۵۷۱
۱۵۹ — امداد امام اثر ۵۷۲
۱۶۰ — مرزا سلطان احمد ۵۷۶
۱۶۱ — مولوی محبوب عالم ۵۷۹
۱۶۲ — مرزا فرحت اللہ بیگ ۵۸۶
۱۶۳ — شاد عظیم آبادی ۶۰۵
۱۶۴ — جگر بسوانی ۶۸۵
۱۶۵ — اطہر ہاپڑوی ۶۹۰
۱۶۶ — خواجہ غلام الحسنین ۷۴۴
۱۶۷ — ناطق لکھنوی ۷۴۹
۱۶۸ — جالب دہلوی ۷۵۶
۱۶۹ — مولوی مہیش پرشاد ۷۶۰
۱۷۰ — امجد حیدرآبادی ۷۹۹
۱۷۱ — عنایت اللہ دہلوی ۱۳۹۶
۱۷۲ — احسن مارہروی ۱۴۰۶
۱۷۳ — دیا نرائن نگم ۱۴۳۰
۱۷۴ — پریم چند ۱۸۳
۱۷۵ — آسی الدنی ۱۴۳۲
۱۷۶ — دل شاہجہانپوری ۱۴۳۵

نقوش
آپ بیتی نمبر

۱۷۷ — عبدالمجید سالک ۷۰۳
۱۷۸ — اختر شیرانی ۱۴۲۸
۱۷۹ — یگانہ چنگیزی ۱۴۳۸
۱۸۰ — ہادی مچھلی شہری ۱۴۴۰
۱۸۱ — سیماب اکبر آبادی ۱۴۴۳
۱۸۲ — علی اختر، اختر ۱۴۴۵
۱۸۳ — رضا علی وحشت ۱۴۴۶
۱۸۴ — آزاد انصاری ۱۴۴۷
۱۸۵ — نوح ناروی ۱۴۴۸
۱۸۶ — فانی بدایونی ۱۴۴۹
۱۸۷ — تاجور نجیب آبادی ۱۴۵۰
۱۸۸ — جلیل مانک پوری ۱۴۶۱
۱۸۹ — آغا حشر ۱۴۶۲
۱۹۰ — صفی لکھنوی ۱۴۶۳
۱۹۱ — ثاقب لکھنوی ۱۴۷۱
۱۹۲ — حسرت موہانی ۱۶۳۸
۱۹۳ — جگر مرادآبادی ۱۷۰۲
۱۹۴ — سعادت حسن منٹو ۱۴۹۰
۱۹۵ — مجید لاہوری ۱۴۵۵
۱۹۶ — ماسٹر جگت سنگھ ۱۴۵۶
۱۹۷ — شوکت تھانوی ۱۷۴۳
۱۹۸ — چودھری محمد علی ردولوی ۹۹۳

۱۹۹ — نیاز فتحپوری ۱۰۰۱
۲۰۰ — رشید احمد صدیقی ۱۰۰۷
۲۰۱ — جوش ملیح آبادی ۱۰۵۹
۲۰۲ — حفیظ جالندھری ۱۰۸۰
۲۰۳ — فراق گورکھپوری ۱۳۶۳
۲۰۴ — مجنوں گورکھپوری ۱۰۲۲
۲۰۵ — قاضی عبدالودود ۱۰۱۵
۲۰۶ — لطیف الدین احمد ۱۱۶۲
۲۰۷ — مسعود حسن رضوی ۱۱۶۶
۲۰۸ — اثر لکھنوی ۱۳۷۲
۲۰۹ — حکیم احمد شجاع ۱۳۵۵
۲۱۰ — عبدالقادر سروری ۱۱۳۹
۲۱۱ — ڈاکٹر اعجاز حسین ۱۲۱۸
۲۱۲ — ڈاکٹر سید عبداللہ ۱۱۰۲

۲۱۳ — جوش ملسیانی ۱۱۳۳
۲۱۴ — تلوک چند محروم ۱۱۰۸
۲۱۵ — اختر اورینوی ۱۰۹۷
۲۱۶ — ڈاکٹر عندلیب شادانی ۱۲۶۶
۲۱۷ — آنند نرائن ملا ۱۲۸۲
۲۱۸ — شوکت سبزواری ۱۱۵۰
۲۱۹ — نصیرالدین ہاشمی ۱۳۳۴
۲۲۰ — میکش اکبرآبادی ۱۱۹۰
۲۲۱ — دیوان سنگھ مفتون ۱۱۹۸
۲۲۲ — شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ۱۷۸۳
۲۲۳ — صوفی غلام مصطفےٰ تبسم ۱۰۹۳

---

۲۲۴ — کرشن چندر ۱۰۳۳
۲۲۵ — عصمت چغتائی ۱۰۲۷
۲۲۶ — راجندر سنگھ بیدی ۱۷۶۷
۲۲۷ — قرۃ العین حیدر ۱۷۴۱
۲۲۸ — خواجہ احمد عباس ۱۰۴۶
۲۲۹ — ممتاز مفتی ۱۱۴۱
۲۳۰ — ہاجرہ مسرور ۱۰۴۷
۲۳۱ — کنہیا لال کپور ۱۱۴۶
۲۳۲ — خدیجہ مستور ۱۱۰۵
۲۳۳ — شاہد احمد دہلوی ۱۱۱۳
۲۳۴ — منظور الٰہی ۱۳۴۵
۲۳۵ — نثار احمد فاروقی ۱۳۷۶
۲۳۶ — میرزا ادیب ۱۱۷۶
۲۳۷ — اختر انصاری دہلوی ۱۲۹۳
۲۳۸ — گوپی چند نارنگ ۱۲۰۷
۲۳۹ — ڈاکٹر گیان چند ۱۱۷۰
۲۴۰ — ڈاکٹر محمد حسن ۱۱۳۷
۲۴۱ — تقی محمد خاں خورجوی ۱۳۰۳
۲۴۲ — ڈاکٹر غلام جیلانی برق ۱۲۶۹
۲۴۳ — شکیلہ اختر ۱۳۵۲
۲۴۴ — جیلانی بانو ۱۲۵۸

محمد طفیل ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر
ادارہ فروغ اردو، ایبک روڈ (انارکلی) لاہور سے شائع کیا

نقوش
آپ بیتی نمبر

ترتیب (حصہ اوّل)

۱ — طلوع   محمد طفیل
۲ — تشریحات   محمد طفیل

---

۳ — قائد اعظم، ۱
۴ — فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، ۱۵
۵ — مکاتیب، ۱۷

---

۶ — آپ بیتیوں کی اہمیت   غلام رسول مہر، ۳۶
۷ — آپ بیتیوں کے چند نمایاں پہلو   علاء الدین سالک، ۴۰
۸ — آپ بیتی   ڈاکٹر سید عبداللہ، ۶۰
۹ — آپ بیتی اور اس کی مختلف ترکیبیں   یوسف جمال انصاری، ۶۸
۱۰ — آپ بیتی کیا ہے؟   ریحانہ حسن خانم، ۸۴

---

۱۱ — ڈاکٹر محمد اقبال، ۲۰
۱۲ — میر تقی میر، ۱۸
رجب علی بیگ سرور، ۴۲
۱۳ — ڈپٹی نذیر احمد، ۴۳
۱۴ — عبدالقادر نگین رامپوری، ۷۰
۱۵ — سید غوث علی شاہ قلندر، ۹۱
۱۶ — سر سید احمد خان، ۱۱۱، ۴۲۵
۱۷ — مولوی عبدالحق، ۱۳۵
۱۸ — ریاض خیرآبادی، ۱۵۵
۱۹ — مولوی محمد جعفر تھانیسری، ۱۷۶
۲۰ — پریم چند، ۱۸۳ ✓
۲۱ — علی حیدر نظم طباطبائی، ۲۰۹، ۵۷۳
۲۲ — دادا بھائی نوروجی، ۲۱۲
۲۳ — ہوش بلگرامی، ۲۱۶
۲۴ — واجد علی شاہ، ۲۲۹

۲۵ — ڈاکٹر طٰہٰ حسین، ۲۴۹
۲۶ — مولانا حسین احمد مدنی، ۲۶۴
۲۷ — سید سلیمان ندوی، ۲۷۷
۲۸ — حالی، ۲۸۱، ۴۳۳
۲۹ — میر امن دہلوی، ۲۸۷ ✓
۳۰ — میرزا مظہر جان جاناں، ۲۸۹
۳۱ — میر غلام علی آزاد بلگرامی، ۲۹۳
۳۲ — سید مظہر علی سندیلوی، ۲۹۷
۳۳ — میر شکوہ آبادی، ۳۰۳
۳۴ — سر سید رضا علی، ۳۱۰
۳۵ — مجدد الف ثانیؒ ۳۲۴
۳۶ — ظہیر الدین محمد بابر، ۳۳۱
۳۷ — گاندھی، ۳۴۶
۳۸ — مسیح الدین خان، ۳۷۰
۳۹ — گلبدن بیگم، ۳۸۵
۴۰ — مُلّا عبدالقادر بدایونی، ۴۰۴
۴۱ — محمد عبدالرزاق کانپوری، ۴۲۵
۴۲ — شبلی نعمانی، ۴۲۶، ۵۶۳
۴۳ — اکبر الٰہ آبادی، ۴۲۸
۴۴ — سید امیر علی، ۴۲۹
۴۵ — داغ دہلوی، ۴۳۰
۴۶ — نواب محسن الملک، ۴۳۲
۴۷ — منشی ذکاء اللہ، ۴۳۳
۴۸ — مولوی محمد حسین آزاد، ۴۳۳
۴۹ — مولوی نذیر احمد دہلوی، ۴۳۴ ✓
۵۰ — نواب وقار الملک، ۴۳۵ ✓

۵۱ — منشی رحمت اللہ رعد، ۴۲۶
۵۲ — مولوی عبدالحلیم شرر، ۵۶۲
۵۳ — وحید الدین سلیم پانی پتی، ۴۳۷
۵۴ — میر ناصر علی، ۴۳۷
۵۵ — سید محمود، ۴۳۸
۵۶ — سر سید راس مسعود، ۴۳۹
۵۷ — عبدالقادر بیدل، ۴۴۱
۵۸ — سراج الدین علی خاں آرزو، ۴۴۹
۵۹ — مولوی کریم الدین، ۴۵۲
۶۰ — مرزا اسد اللہ خاں غالب، ۴۵۶
۶۱ — مومن، ۴۹۷
۶۲ — ظہیر دہلوی، ۵۰۲
۶۳ — عبدالغفور نساخ، ۵۲۳
۶۴ — مسولینی، ۵۳۹
۶۵ — لالہ سری رام دہلوی، ۵۵۷
۶۶ — عزیز مرزا۔ ۵۶۵
۶۷ — شوق قدوائی، ۵۶۶
۶۸ — مرزا محمد ہادی رسوا، ۵۶۷
۶۹ — پیارے لال آشوب، ۵۶۹
۷۰ — بیچ ناقدیچ، ۵۷۰
۷۱ — شیو برت لال ورمن، ۵۷۱
۷۲ — امداد امام اثر، ۵۷۲
۷۳ — مرزا سلطان احمد، ۵۷۶
۷۴ — مولوی محبوب عالم، ۵۷۹
۷۵ — چودھری افضل حق، ۵۸۰
۷۶ — مرزا فرحت اللہ بیگ، ۵۸۶
۷۷ — شاد عظیم آبادی، ۶۰۵
۷۸ — میرزا ابو طالب خاں اصفہانی، ۶۱۳
۷۹ — نواب آغا مرزا دہلوی، ۶۲۳
۸۰ — محمد دین فوق، ۶۷۰
۸۱ — شیدا گجراتی، ۶۷۷
۸۲ — جگر بسوانی، ۶۸۵
۸۳ — اطہر ہاپوڑی، ۶۹۰
۸۴ — شاہ محمد حسین الہ آبادی، ۶۹۳
۸۵ — عبدالمجید سالک، ۷۰۳
۸۶ — سید عطاء اللہ شاہ بخاری، ۷۱۵
۸۷ — سر شیخ عبدالقادر، ۷۲۰
۸۸ — ظفر علی خاں، ۷۳۱
۸۹ — خواجہ غلام الحسنین، ۷۴۴
۹۰ — ناطق لکھنوی، ۷۴۹
۹۱ — جالب دہلوی، ۷۵۹
۹۲ — مولوی مہیش پرشاد، ۷۶۰
۹۳ — سر مرزا اسمٰعیل، ۷۶۳
۹۴ — محمد علی جوہر، ۷۷۸
۹۵ — جیجونت، ۷۸۳
۹۶ — امجد حیدر آبادی، ۷۹۹
۹۷ — گورکی، ۸۱۲

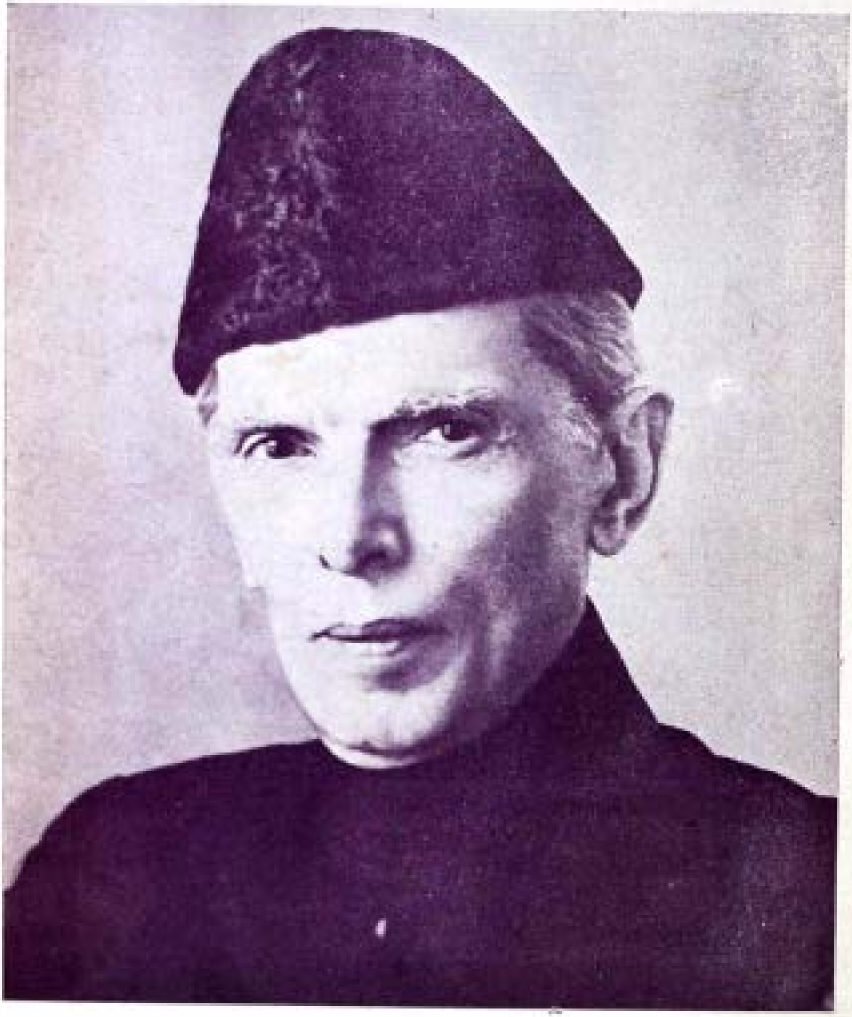

قائداعظم

پاکستان

PRESIDENT'S CAMP
(PAKISTAN)

اب ملک میں جمہوریت کا دور شروع ہو چکا
ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا ہوں کہ وہ
اپنے فضل و کرم سے پاکستان کو ایک خوشحال
اور ترقی یافتہ ملک بنائے اور اسلامی معاشرہ
قائم کرنے میں ہماری مدد کرے۔ آمین۔

محمد ایوب خان۔ فیلڈ مارشل۔

محمد ایوب خان

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

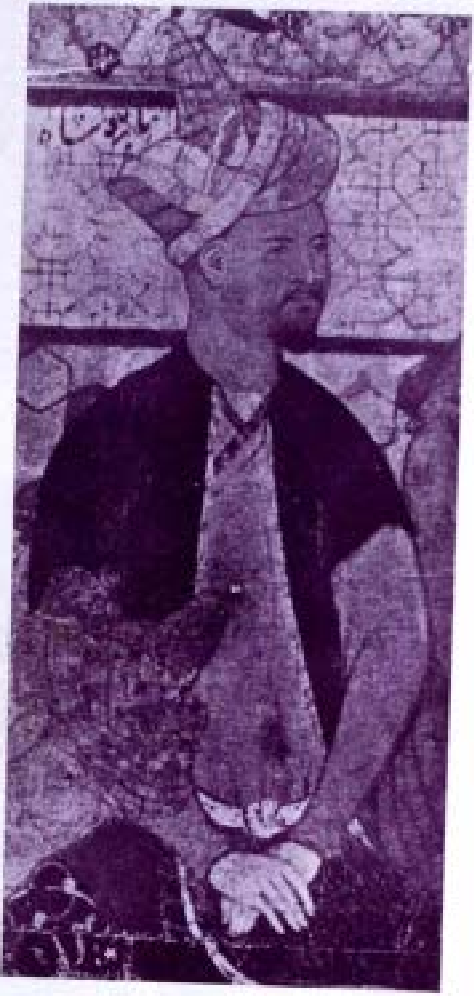

ظہیرالدین بابر

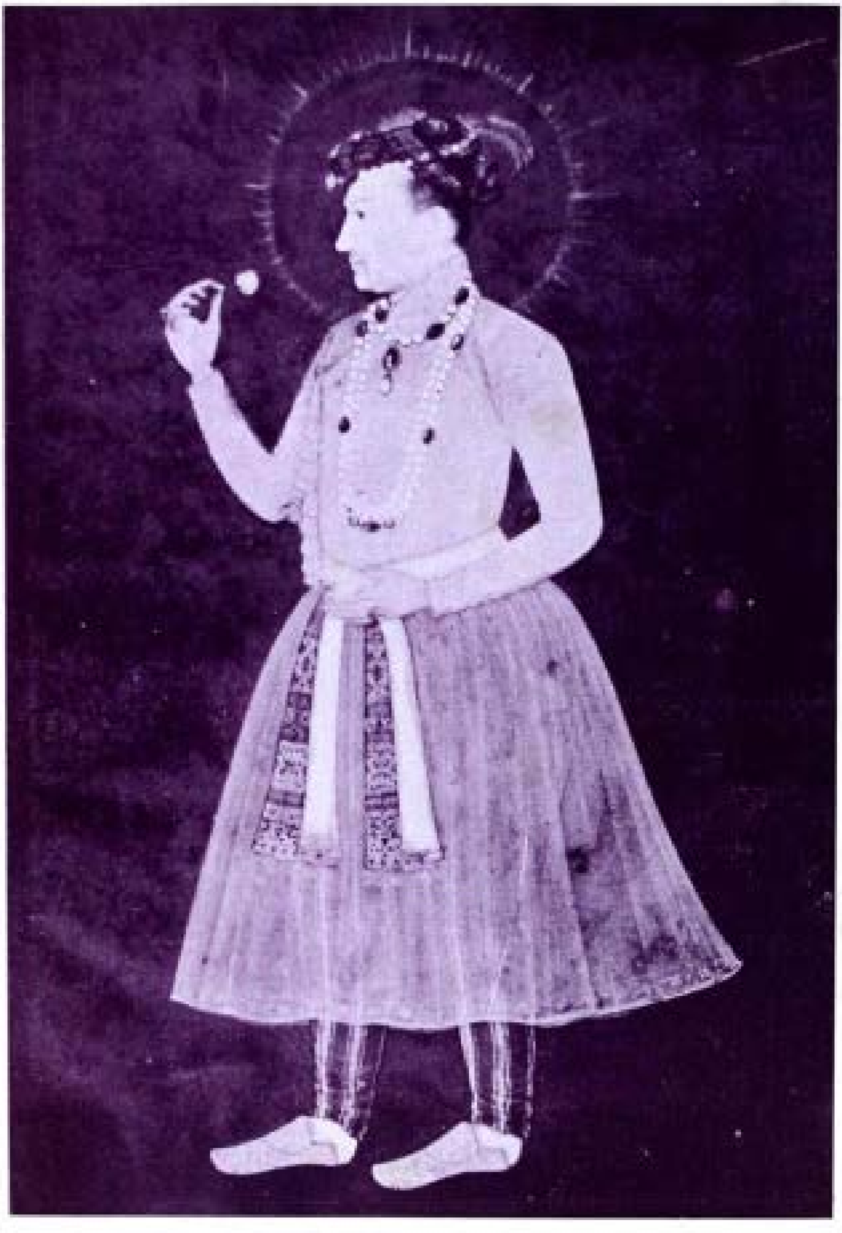

نورالدین محمد جہانگیر

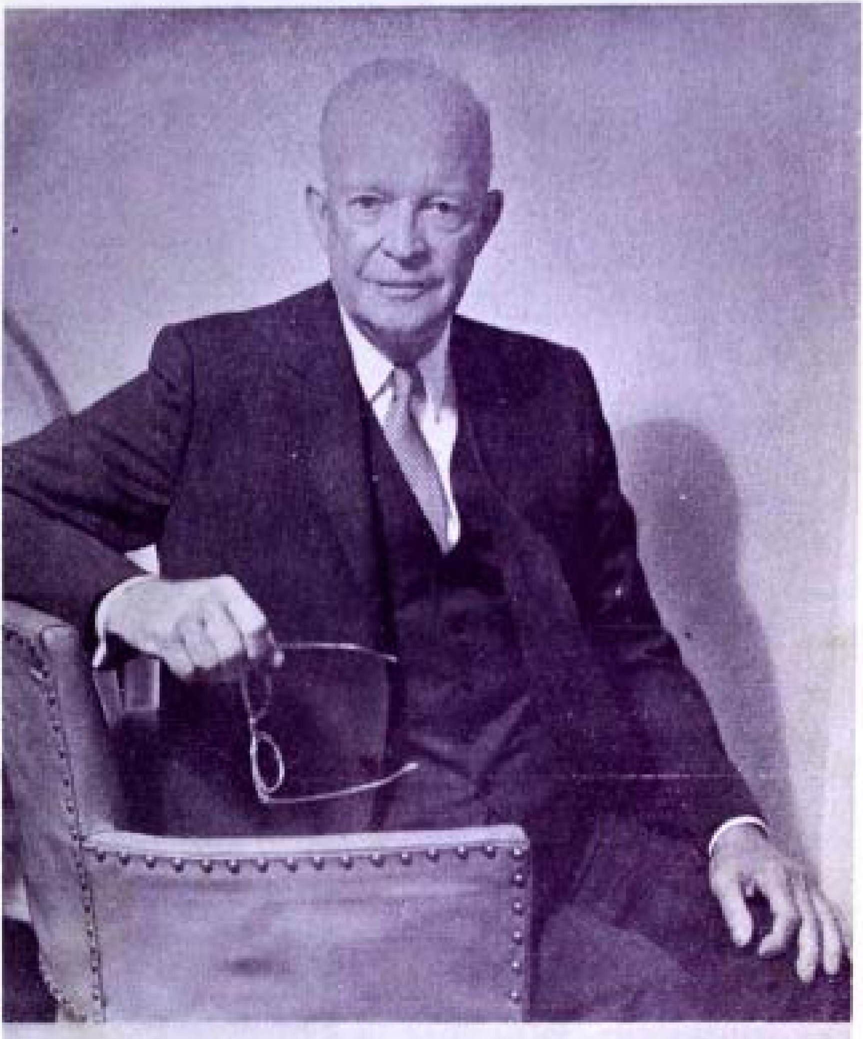

For:

NUQOOSH Magazine on the occasion of their centurial issue

Dwight D. Eisenhower

آئزن ہاور

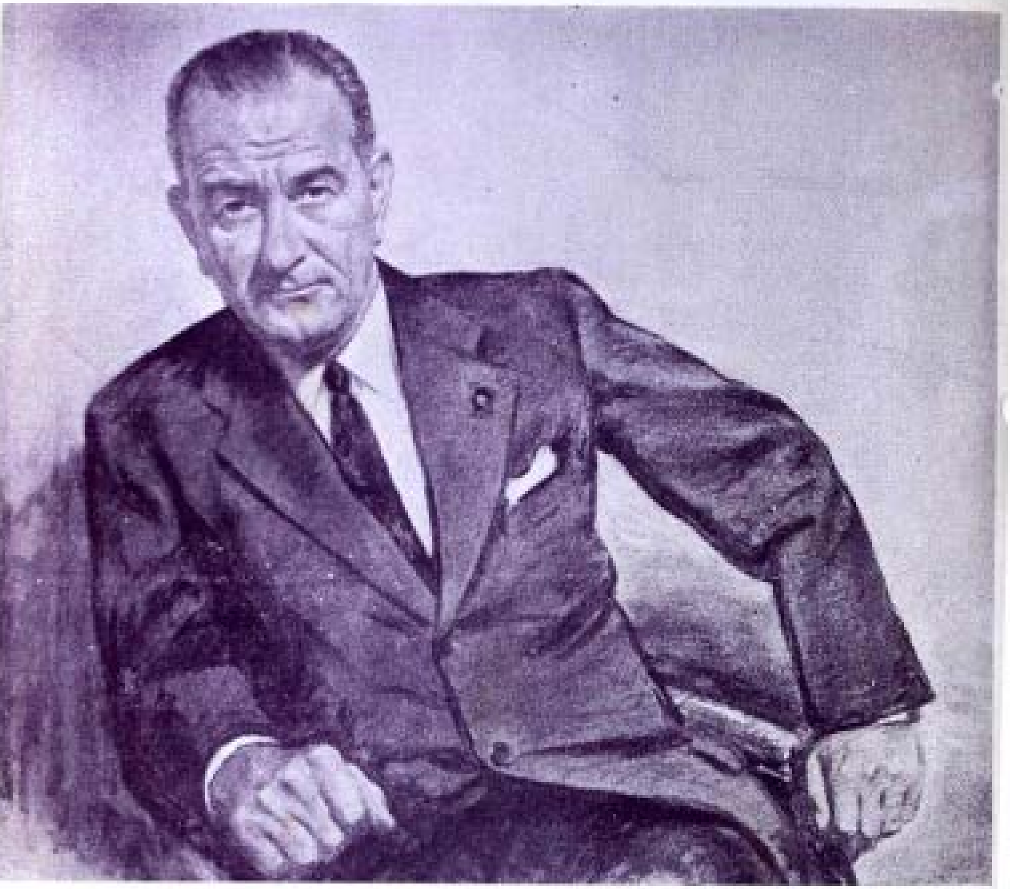

لنڈن - بی - جانسن

شهنشاه ایران ، فرح دیبا پهلوی

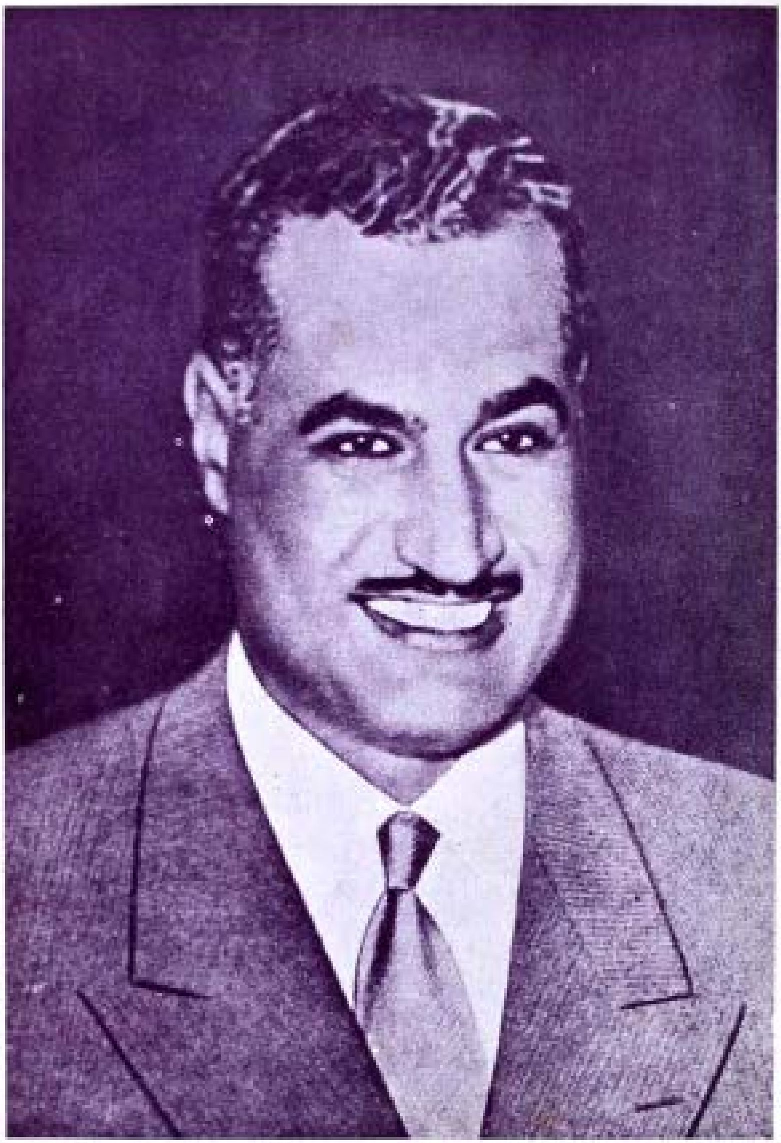

جمال عبد الناصر

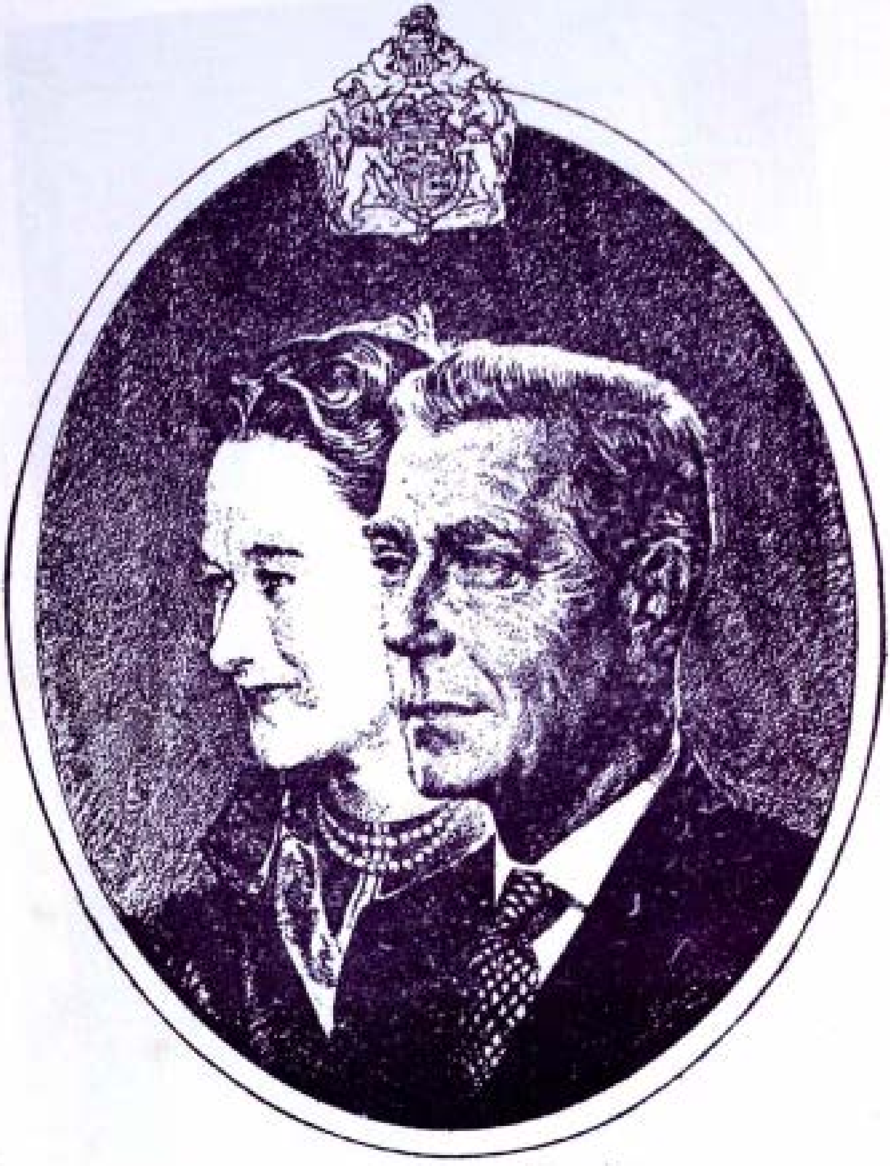

ایڈورڈ ہشتم اور سمسن

ملکه ایلزبث دوم

سر ونسٹن چرچل

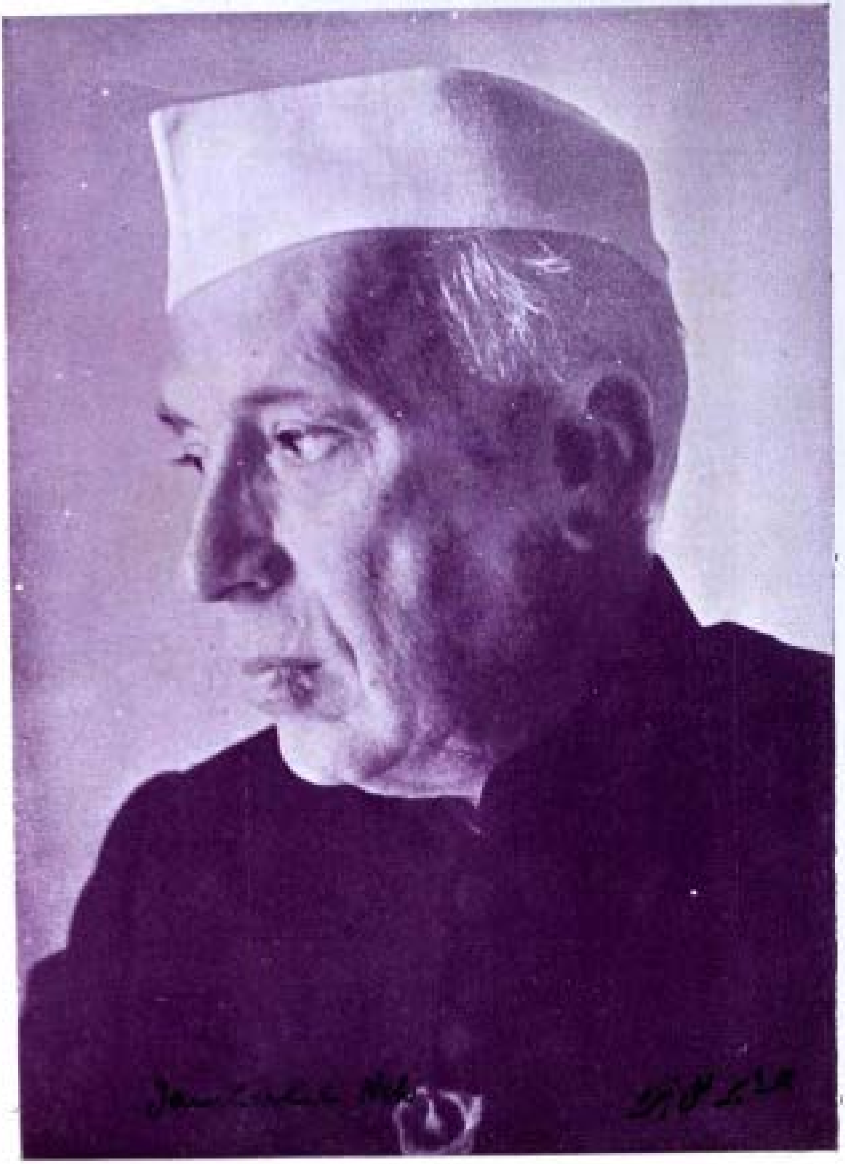

جواہر لال نہرو

ایس رادھا کرشنن

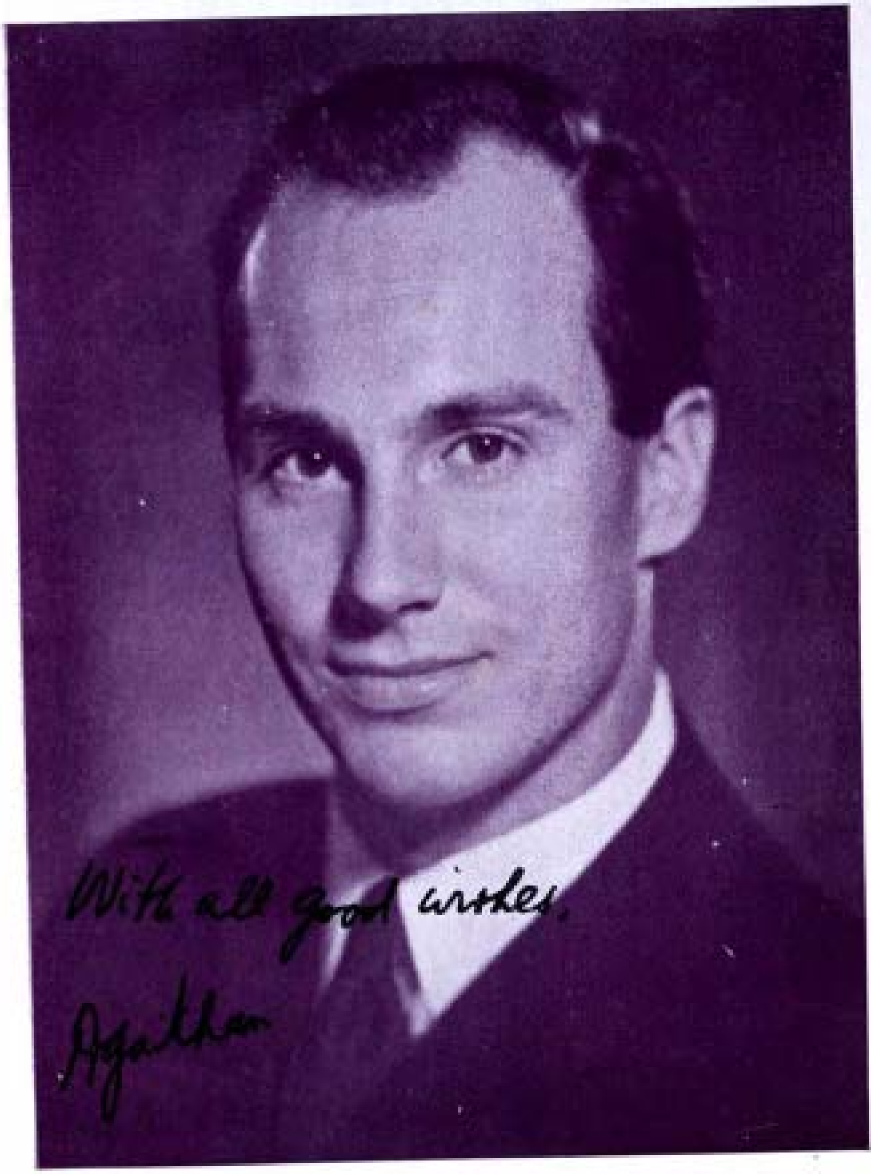
With all good wishes.
Aga Khan

آغا خان (چہارم)

شیخ محمد عبداللہ
۱۹۶۳

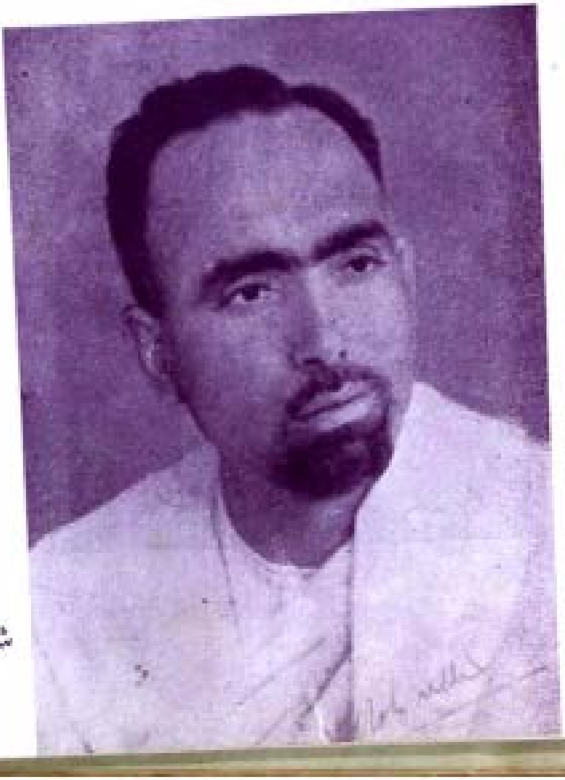

شیخ محمد عبداللہ
۱۹۳۲

Zafrulla Khan

سر ظفراللہ خان

راجہ غضنفر علی خان

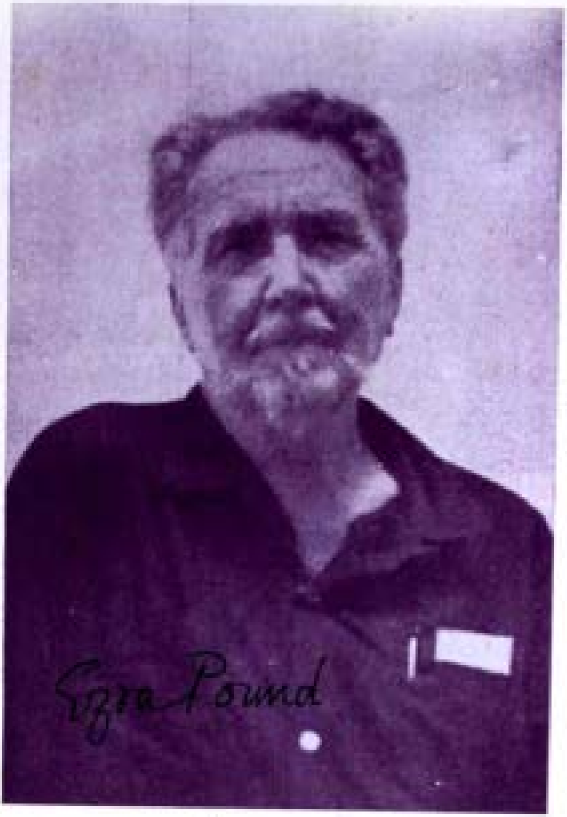

ایزرا پاؤنڈ

John Updike

جان اپڈائیک

Handwriting

I was born in 1932, in the town
of Shillington, Pennsylvania, a
suburb of the city of Reading.

ہیرمن ووک

To Nuqoosh:

It gives me deep pleasure to think that the great public who read the Urdu language will become acquainted with my life story through your distinguished pages.

Sincerely

ونگ جے

我喜爱农村，经常住在农村里，并且有志于写作反映中国农村新生活、新面貌、新气象、新人物的作品。虽然我已写作了二十多年，但万里长征我只迈出了第一步。艺术创作的高峰永远在前，我会努力地向前走去。

闻捷（Wen Chieh）

1963.9.8于拉合尔[illegible]

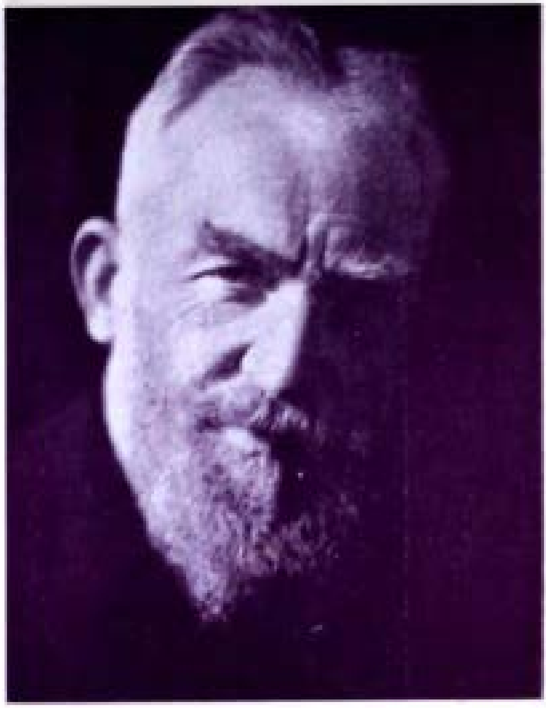

برنارد شا

دوستو وسکی

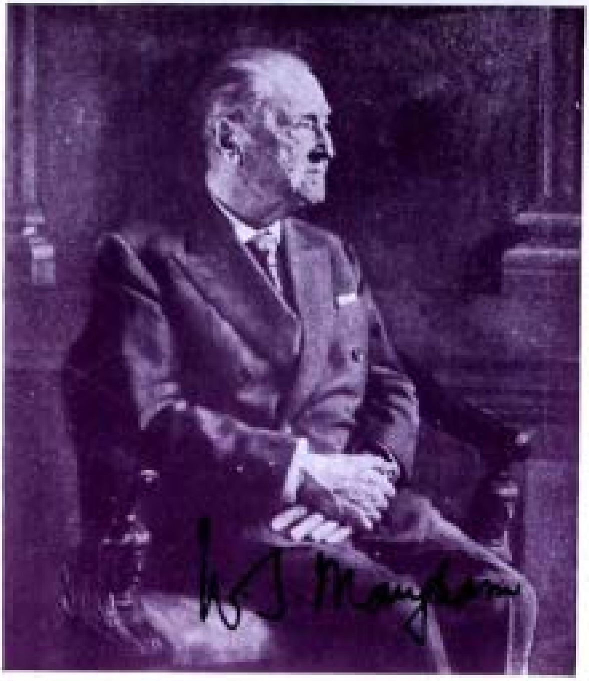

ڈبلیو، ایس، ماہم

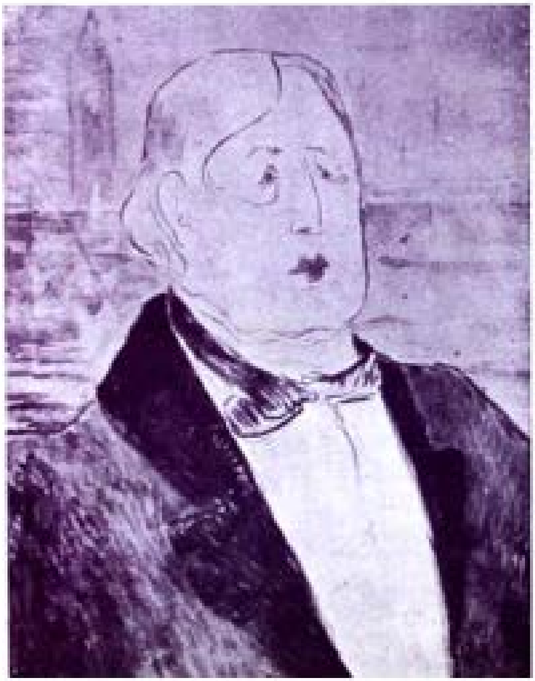

آسکر وائلڈ

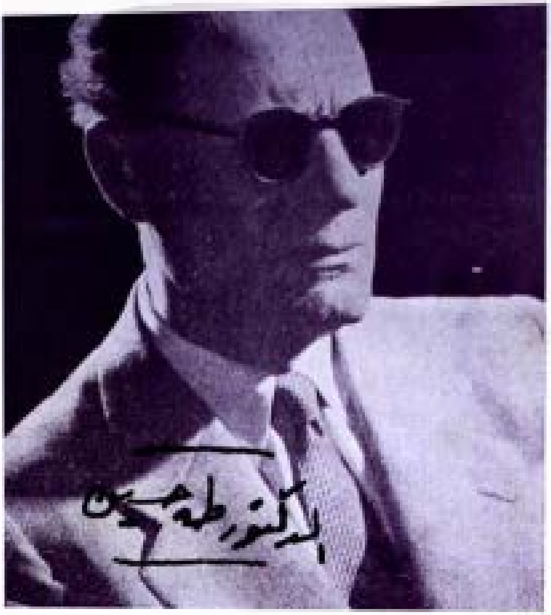
الدکتور طہ حسین

ڈاکٹر طہٰ حسین

صلاح الدین الاسیر

سید حسین نصر

محمد معین

Best wishes to NUQOOSH
Leonard Bernstein

لیونیر برسٹن

to
[illegible]
Zulfikar Ali Bhutto

ذوالفقار علی بھٹو

MINISTER FOR EXTERNAL AFFAIR
RAWALPINDI

مورخہ ۲ جون ۱۹۶۲ء

نقوش کے سوویں شمارہ کی اشاعت کے موقعہ پر پیغام بھیجتے ہوئے ان شاندار خدمات کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہوگی جو اس جریدے نے اس ملک کے ادبی ارتقا کے سلسلہ میں انجام دی ہیں۔

ایک ایسے دور میں جبکہ قیام پاکستان نے فرسودہ روایات اور پرانے رجحانات میں تبدیلی کی ضرورت پیدا کر دی تھی اس جریدے نے ادبی ماحول میں خوشگوار۔ صحتمند اور بروقت تبدیلی پیدا کرنے اور ادب کو نئے زاویے عطا کرنے میں بہت گرانقدر کام کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے ادب دوست حضرات کے ذوق کو صحتمند دھارے میں موڑنے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ خدمات ہماری ادبی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

نقوش کے اس "آپ بیتی" نمبر کی اشاعت پر میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ یہ نقوش کی زندگی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو
(ذوالفقار علی بھٹو)
وزیر خارجہ پاکستان

طلوع

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرا پاگل پن، کبھی مجھے اس حد تک بھی "رسوا" کرائے گا کہ جھونپڑی میں بیٹھ کر محلوں کے خواب دیکھوں گا۔

خاکسار، جو ادب کی خدمت کا مدعی ہے۔ ادب کے بادشاہوں کے حضور جا پہنچا۔

وہی بات ہوئی۔ کہاں راجہ بھوج، کہاں گنگو تیلی!

یقین کیجیے آپ کے اس گنگو تیلی کو دیو جانس کلبی کی وہ بات پسند ہے کہ جب اس سے سکندرِ اعظم نے پوچھا تھا کہ —

"بتا تو کیا چاہتا ہے؟"

تو اُس نے جواب میں کہا تھا — وہ دھوپ مجھ تک پہنچنے دیجیے۔ جو آپ نے روک رکھی ہے۔"

چلو چھوڑیں اس بات کو، میں تو کہنے یہ چلا تھا کہ اس گنہگارِ ادب نے ادب کے بڑے ادیبوں کے ساتھ بڑے لوگوں سے بھی قلمی مدد چاہی۔ یہ کوئی انہونی بات تو نہیں کہ ادبی بادشاہوں کے ساتھ دنیاوی بادشاہوں سے بھی ملاقات کر لی جائے — بادشاہ تو بادشاہ، میں تو اس نمبر کے لیے اللہ میاں سے بھی مضمون لکھوانے کا ارادہ کرتا۔ بشرطیکہ اس پر قدرت رکھتا۔

ایک طفلانہ سی بات یاد آئی

آپ نے سُنا ہی ہوگا کہ ایک معصوم سے یتیم بچے نے اپنی ماں سے پوچھا تھا "امّاں میرے ابا کہاں ہیں؟"

"اللہ میاں کے پاس!"

چنانچہ اس بچے نے اپنے ابا کو خط اللہ میاں کی معرفت بھیجا تھا۔ ایمان سے کہتا ہوں کہ میرا بھی دل چاہتا تھا کہ اس نمبر کے سلسلے میں اُس یتیم بچے والی معصومیت کو شعوری صورت دے دیتا — لوگ نادان ہی تو کہتے۔

اب جب کہ یہ نمبر آپ کے ملاحظہ میں آ رہا ہے۔ میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں:

"کیا اس نمبر کی تکمیل کے سلسلے میں، اللہ میاں نے میری کوئی مدد نہیں کی؟

پتہ نہیں آپ کا جواب کیا ہے۔ مگر میں بارگاہِ ربّ العزت میں اپنا سر جھکا دینا چاہتا ہوں۔

محمد طفیل

تصریحات

میں نے چیونٹیوں کو دیکھا کہ وہ ایک قطار میں ایک دوسرے کے پیچھے چلی جا رہی ہیں اور چلی ہی جا رہی ہیں۔ یوں قطار میں چلنے والی چیونٹیوں سے مجھے کبھی بھی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ اُن اِکّا دُکّا چیونٹیوں سے دلچسپی رہی۔ جو قطار سے الگ مخالف سمت چلی جا رہی ہوں۔

میں نے اپنی ادارتی ذمہ داریوں کے باب میں قطار میں چلنے والی چیونٹیوں کا ساتھ نہیں دیا۔ بلکہ اُن اِکّا دُکّا، اُداس، پریشان اور حالات سے نبرد آزما ہونے والی چیونٹیوں کا ساتھ دیا۔ جو انجام سے بے خبر ہوں تو ہوں۔ مگر اس بات سے بے خبر نہیں کہ نئی منزلوں کا سراغ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ نامعلوم وادیوں کا رُخ کیا جائے۔

ذہن کی اسی غلط سوچ نے میرے لیے سو مسائل پیدا کر رکھے ہیں۔ مگر میں آپ کو غیر ضروری باتوں میں اُلجھانا نہیں چاہتا۔

آئیے پہلے معاملے کی بات کریں۔

مجھے آپ سے ہمدردی ہے کہ آپ کو اتنا کچھ پڑھنا پڑے گا۔ مگر میری نادانی دیکھیے کہ سر نیوڑھائے جگر لخت لخت کو جمع کرتا ہی چلا گیا اور اتنا کچھ کرنے پر بھی کچھ اور کرنے کی حسرت رہ گئی۔ فکر کوئی بھی ہو۔ رُسوا ضرور کرائے گی۔ سرمایۂ ناز نہ سہی، پُر صفحات سہی!

میں آپ کے حوصلے کا امتحان لینا نہیں چاہتا کہ آپ کو تقریباً دو ہزار صفحات پڑھنے کے ساتھ، اس بات پر بھی مجبور کروں کہ جناب میرا لکھا ہوا بھی پڑھیے۔

پہلے پہل تو میرا خیال تھا بھی کہ کچھ اور نہ سہی، مگر اس نمبر کی آپ بیتی ضرور لکھوں گا۔ شروع بھی کی۔ مگر جب دیکھا کہ وہ کوئی ساٹھ صفحات کالے کر ڈالے گی تو دل اس کی اشاعت پر راضی نہ ہوا۔ سب لکھے لکھائے کو یہ سمجھ کر ایک طرف ڈال دیا کہ کچھ لکھا ہی نہ تھا۔

پھر اپنوں نے یہ بھی سمجھایا کہ میاں اس نمبر میں اپنی آپ بیتی ضرور شامل کر لینا۔ زندۂ جاوید ہو جاؤ گے۔ میرا جواب یہ رہا کہ اگر یہ نمبر زندۂ جاوید نہیں بنا سکتا تو میری آپ بیتی بھی مجھے زندگی بخش نہ سکے گی۔ پھر میری آپ بیتی نقوش کے سوا ہے بھی کیا۔ جس دن یہ چراغ بجھ جائے گا۔ اُس دن سے اپنی زندگی پر سے یہ جینے کی تہمت بھی ختم ہو جائے گی۔

میرے نزدیک کسی کا مرنا اور جینا، اُس کے مقاصد اور اس کے کام پر منحصر ہوتا ہے۔ جتنے لوگ چل پھر رہے ہیں۔ مجھے اُنھیں زندہ سمجھنے میں تامّل ہے اور جتنے لوگ مرے ہوئے ہیں۔ مجھے اُنھیں مُردہ سمجھنے کا کوئی حق نہیں۔

زندگی تو اپنا ایک دستور العمل لے کر آتی ہے اور گزر جاتی ہے۔ جو لوگ گزرتے ہوئے لمحات کو پڑھنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ ان کی نہ تو زندگی کوئی زندگی ہے اور نہ مستقبل کوئی مستقبل! ویسے اِس دنیا کے رہنے والے بڑی دلچسپ چیز ہیں۔ "ان کے نزدیک اچھا آدمی وہ ہے جو مر چکا ہو یا وہ جو ابھی پیدا ہی نہ ہوا ہو۔"

آپ بیتی کے موضوع پر بھی کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس لیے کہ اس نمبر میں مجھ سے معتبر قسم کے دوستوں نے اس ضرورت کو بہ حسن پورا کر دیا ہے۔

مختصر لفظوں میں آپ بیتی سے کسی انسان کی زندگی کے تجربات، مشاہدات، محسوسات، نظریات اور عقاید کی ایک مربوط داستان ہوتی ہے۔ جو خود اس نے بے کم و کاست اور راست راست قلم بند کر دی ہو۔ جسے پڑھ کر اس کی زندگی کے نشیب و فراز معلوم ہوں۔ اس کے نہاں خانوں کے پردے اُٹھ جائیں اور ہم اس کی خارجی زندگی کے سوا اس کی داخلی کیفیات کے حجرے میں بھی جھانک کر دیکھ سکیں۔

اُفوہ! — میں بھی کیا فضول قسم کی باتوں کو لے بیٹھا۔ مجھے تو یہ چاہیے کہ اس نمبر کی ترتیب کے سلسلے میں چند ضروری باتوں کی وضاحت

سیدھے سے انداز میں کر کے چھٹی چاہتا ہوں ۔

ہاں تو صاحب سنیے!

(۱) اس نمبر کی ترتیب یہ ہے کہ کوئی ترتیب نہیں ـــ جیسے جیسے مضمون ملتے گئے ۔ ہم انھیں چھاپتے رہے ۔ اگر اس امر کا انتظار کرتے کہ ہر مضمون اپنی جگہ پر آئے تو اس کے لیے ابھی اور کئی مہینے انتظار کرنا پڑتا ۔ چونکہ معاملہ انتظار اور صبر کی حدود پھلانگ چکا تھا ۔ اس لیے مجبوراً ایسا کرنا پڑا ۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر اہم مضمون آخر میں چھپے گئے ـــ اب تو ترتیب صرف فہرست میں ملے گی ۔

(۲) اس نمبر کے سلسلے میں اُردو کے علاوہ دیگر ۲۱ زبانوں کے ادیبوں نے بھی حصہ لیا ہے ۔ جس میں بنگالی ، فارسی ، عربی ، گجراتی ، انگریزی ، فرانسیسی ، روسی ، چینی ، ترکی ، ہیبریو اور انڈونیزی زبانوں کے ادیب ہیں ۔

(۳) اس نمبر کے سلسلے میں جن ملکوں نے دلچسپی لی ۔ اُن کے نام یہ ہیں ـــ چین ، ہندوستان ، امریکہ ، برطانیہ ، اٹلی ، روس ، جرمنی ، ملیشیا ، متحدہ عرب جمہوریہ ، ایران ، لبنان ، سعودی عرب ، ترکی ، انڈونیشیا ، کینیڈا ، برازیل ، فلپائن ، سوئٹزرلینڈ ، پولینڈ ، فن لینڈ ، یوگوسلاویہ ، سپین ، کیوبا ، جاپان ، سوڈان ، بلجیم ، فرانس ، سویڈن ۔

بیرونِ ملک سے آئی ہوئی اتنی ساری چیزوں کو پیش کرنا میرے لیے مشکل ہو گیا ۔ اگر توفیق ہوئی تو اس نمبر کا دوسرا حصہ بھی چھاپیں گے ۔ فی الحال تو اپنے وسائل کی نارسائیوں پر شرمندہ ہوں ۔ خدا کرے کہ کبھی اس کا موقع نکلے کہ میں باہر سے آئے ہوئے سارے مضمون چھاپ سکوں اور اس کے ساتھ اُن ادیبوں اور شاعروں کے مضامین بھی پیش کر سکوں ۔ جو اس نمبر میں نہیں آ سکے ۔ کچھ میری نالائقی سے کچھ ادیبوں کے تساہل سے ۔

(۴) اس نمبر کے سلسلے میں ہمیں سب سے زیادہ دقت ترجموں کے سلسلے میں پیش آئی ۔ انگریزی ، فارسی اور عربی زبانوں کے ترجمے کرانا تو مشکل نہ تھا ۔ مشکل تھی تو چینی ، روسی ، ترکی اور فرنچ کی ـــ ایک مضمون جو ہمیں روسی زبان میں ملا تھا ۔ اس کے ترجمے کے لیے انتھک کوشش کی مگر ہم اس کا ترجمہ کرا نہ سکے ۔ ابھی تک تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ مضمون ہے کس کا ، ویسے ادارہ نقوش کی طرف سے خط ایلیا اہرن برگ کو لکھا گیا تھا ۔ اس لیے ہم وہ مضمون انہی کا سمجھتے ہیں ۔ اس نمبر میں ان کی تصویر اور ان کے مضمون کی آخری چند سطریں چھاپ رہے ہیں ۔ اگر اس مضمون کا ترجمہ کرا سکے تو آئندہ کسی پرچے میں چھاپ دیں گے ۔

(۵) اُردو ادب میں جتنی بھی آپ بیتیاں موجود ہیں ۔ اُن سب کے لیے کوشش کی گئی کہ وہ اس نمبر میں آ جائیں ۔ بڑی آپ بیتیوں کی تلخیص کی گئی اور چھوٹے مضامین کو من و عن پیش کر دیا اور جن شخصیتوں نے اس نوع کا کوئی مربوط سرمایہ نہیں چھوڑا تھا ۔ ان کے خود نوشت حالات ، خطوط ، ملفوظات ، سفرناموں اور تذکروں سے مرتب کر کے پیش کیے جا رہے ہیں ۔ یوں سطر سطر جوڑنا اور اسے مضمون کی صورت دینا ایک مسئلہ تھا ۔ ایک مہم تھی ۔

بہرحال اس نمبر میں جو کچھ درج ہے ۔ وہ سب کچھ مصنف کا اپنا ہے ۔ ہم کہیں کہیں ضمنی عنوان دینے کے گنہگار ضرور ہیں ۔ وہ بھی اس لیے تاکہ بے ربطی پیدا نہ ہو اور اگر کہیں دو لفظ لکھنے پر مجبور بھی ہوئے تو وہ بریکٹ میں لکھ دیے تاکہ الگ ہو جائیں ۔ یہ التزام سارے مضامین میں ہے ۔ سوائے عبدالغفور نساخ والے مضمون کے ۔

(۶) اس نمبر میں چند مضمون سوانحی بھی ہیں ۔ مگر یہ ایک مجبوری تھی ۔ اس لیے کہ بڑے لوگوں نے کہہ دیا کہ ہم خود سے کچھ نہ لکھیں گے ـــ یہ ہمارا اصول ہے ۔ شامل اس لیے کیا گیا کہ وہ ہمیں براہِ راست متعلقہ شخصیتوں نے بھیجے تھے اور تصویروں پر دستخط کر کے ہمیں نوازا تھا اس لیے ان کے لیے گنجائش نکالنی پڑی ۔ ورنہ بداخلاقی کا مظاہرہ ہوتا ۔

(۷) نقوش میں اُردو کے بڑے ادیبوں کی تصویریں متعدد بار چھپ چکی ہیں ۔ اس لیے ہم نے اس سلسلے میں زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں سمجھی ۔ وہی ہمارے گنے چنے ادیب ہیں ۔ وہی ان کی تصویریں ہیں ۔ مگر اس مرتبہ غیر ملکی ادیبوں اور چند سربراہوں کی تصویریں نمایاں طور پر چھاپی جا رہی ہیں ۔

ایک ادبی پرچے میں مہمان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کا اہتمام لازمی ہی تھا۔

ان میں ایک تصویر لبنانی ادیب صلاح الدین المنیر کی بھی ہے۔ جو مجھے آخر وقت تک یہ کہتے رہے کہ میں نہ صرف اپنا مضمون بھیجوں گا بلکہ وہاں کے دوسرے ادیبوں سے بھی مضمون بھجواؤں گا۔ امیر صاحب عربی زبان بولتے تھے۔ میں عربی جانتا نہ تھا۔ ترجمان میری ہر بات کے جواب میں ان کی طرف سے وعدے کا اقرار کرتے تھے۔ خود امیر صاحب کا ایک لفظ جو میرے ہر سوال کے جواب میں میری سمجھ میں بھی آتا تھا وہ تھا "حاضر"۔ میں تو اس کا مطلب ان کی طرف سے یہی سمجھتا رہا کہ میں اس کام کے لیے حاضر ہوں۔ ممکن ہے یہ لفظ بھی حیدرآباد دکن کی زبان میں "حاضر ہوتا ہوں" کے مترادف ہو جس کا مطلب وہاں یہ ہے "جا رہا ہوں۔ واپس نہیں آؤں گا"۔

ایزرا پاؤنڈ کی تصویر صرف اس لیے چھاپی جا رہی ہے تاکہ مجھ جیسے لوگ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ یہ کوئی خاتون ہیں۔ پھر یہ تصویر ایزرا پاؤنڈ کی بیوی نے مجھے اس لیے بھجوائی تھی کہ چھاپی جائے۔ لہٰذا اس تحفے کی بھی اشاعت مناسب تھی۔

(۸) بیرونِ ملک سے آئے ہوئے بہت سے خطوط ہم نے نہیں چھاپے صرف وہ چند خطوط چھاپ رہے ہیں۔ جن میں کوئی نہ کوئی "اطلاع" ہے۔ اگر ان خطوط میں سے یہ پتہ چلتا ہو کہ میں نے اپنی آپ بیتی لکھ تو رکھی ہے۔ مگر چھپے گی موت کے بعد ۔۔ یا ۔۔ کسی ادیب کی بیوی لکھیں کہ میرے خاوند کا انتقال ہو چکا ہے ۔۔ تو یہ اطلاعیں بھی کسی نہ کسی حد تک سوانحی معلومات کا درجہ رکھتی ہیں۔

(۹) یہ پرچہ دو جلدوں میں ہے۔ ان کی اپنی جگہ الگ الگ کوئی حیثیت نہیں۔ صرف ضخامت کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے تاکہ بقول رشید احمد صدیقی لیٹ کر پڑھنے میں پسلیوں کے ٹوٹنے کا خطرہ نہ رہے۔

(۱۰) ہو سکتا ہے کہ یہ پرچہ جسے میں نے انتہائی محنت اور حد درجہ کی ذہنی اذیتوں کے بعد مکمل کیا ہے۔ آپ کے لیے پوری ذہنی تشفی کا باعث نہ ہو۔ مجھے بھی اس نمبر کی سب کوتاہیاں اور سب خامیاں معلوم ہیں۔ مگر کوتاہیوں کو دور کرنا میرے اختیار میں نہ تھا اور خوبیوں کا کیا ہے۔ وہ آپ کے نزدیک محل نظر بھی ہو سکتی ہیں۔

(۱۱) یہ سطریں لکھنا ابھی باقی تھیں کہ پنڈت جواہر لعل نہرو کے انتقال کی خبر آئی۔ سخت صدمہ ہوا۔ مجھے ان سے زندگی میں دو بار ملنے کا اتفاق ہوا۔ دونوں ہی بار دل و دماغ نے خوشگوار قسم کا اثر محسوس کیا۔ اس نمبر کے لیے بھی انھوں نے اپنی آپ بیتی اور اپنی فوٹو اپنے دستخطوں کے ساتھ بھجوائی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک مدبر، ایک بڑا آدمی اٹھ گیا ۔۔ میں کہتا ہوں ایک بڑا ادیب چل بسا ۔۔ ساری دنیا کہہ رہی ہے کہ پنڈت جی بڑے آدمی تھے۔ اگر آپ بھی اس کو قطعی تسلیم کرتے ہوں تو آپ سے عرض کر دوں کہ مرنے کے بعد بھی بڑے آدمی کے وجودِ معنوی کی چاندنی چاروں طرف پھیلی رہتی ہے"۔

(۱۲) اب میں اپنے ملک کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اپنی انتہائی مصروفیات کے باوجود میری درخواست کی آبرو رکھی اور یوں عملی تعاون فرما کر اس نمبر کی قدر و قیمت بڑھائی۔ یہ فخر بھی شاید کسی رسالے کو حاصل نہیں ہوا کہ خود انھوں نے کسی (رسالے) کو اپنا کوئی مضمون مرحمت فرمایا ہو۔ اہلِ قلم کے ساتھ جو ان کا واسطہ ہے وہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔

پچھلے دنوں جب میں یو۔ اے۔ آر کے دفتر گیا تو اس کے سربراہ نے جمال عبدالناصر کے بارے میں کہا تھا کہ ہمارے صدر تکلفات سے بہت دور ہیں۔ عوامی آدمی ہیں۔ صد درجہ مخلص ہیں ۔۔ تو مجھے یوں لگا تھا کہ جیسے وہ اپنے صدر کی نہیں۔ ہمارے صدر کی باتیں کر رہے ہوں۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا:

میں نے اپنی ادارتی ذمہ داریوں کے باب میں قطاروں میں چلنے والی چیونٹیوں کا ساتھ نہیں دیا۔ بلکہ اُن اِکا دُکا اداس پریشان مگر حالات سے نبرد آزما چلنے والی چیونٹیوں کا ساتھ دیا۔ جو انجام سے بے خبر ہوتی ہیں۔ مگر اس بات سے بے خبر نہیں کہ نئی منزلوں کا سراغ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ نامعلوم وادیوں کا رخ کیا جائے۔

آخر میں ایک بات اور سن لیں:

"سمندر کی لہریں اور ہوا کی قوت اس ملاح کے ساتھ ہوتی ہے۔ جو ہر خطرے کو اپنی منزل کا ایک حصہ سمجھتا ہو"

محمد طفیل

نقوش

کے سابقہ نمبر

			صفحات
۱ -	غزل نمبر	اُردو غزل کی پونے دو سو سالہ تاریخ	۷۵۲
۲ -	افسانہ نمبر	اُردو افسانے کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ	۱۰۹۰
۳ -	مکاتیب نمبر	اُردو خطوط کی سو سالہ تاریخ	۱۰۴۸
۴ -	شخصیات نمبر	مشاہیرِ ادب کی سو سالہ شخصی تاریخ	۱۵۱۴
۵ -	طنز و مزاح نمبر	طنزیہ و مزاحیہ ادب کی سوا سو سالہ تاریخ	۹۲۸
۶ -	لاہور نمبر	لاہور کی نو سو سالہ مستند مگر جامع تاریخ	۱۲۰۴
۷ -	ادبِ عالیہ نمبر	نقوش کی دس سالہ تخلیقات کا انتخاب	۱۲۷۲
۸ -	آپ بیتی نمبر[1]	خود نوشت حالات، چار سو سالہ شخصی تاریخ	۱۹۶۴

۹ -	پطرس نمبر	: پطرس کے سارے ہی مضامین کے ساتھ فن اور شخصیت پر مکمل کام	۶۴۰
۱۰ -	منٹو نمبر	: منٹو کے منتخب افسانوں کے ساتھ فن اور شخصیت پر بھرپور کام	۳۸۴
۱۱ -	شوکت نمبر	: شوکت کی اہم مزاحیہ تخلیقات کے ساتھ فن اور شخصیت پر دلچسپ کام	۶۲۴

اور ان کے علاوہ :-

آزادی نمبر ناولٹ نمبر پنج سالہ نمبر
دس سالہ نمبر خاص نمبر اور سالنامے

[1] موجودہ نمبر

قائدِ اعظم محمد علی جناح

گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

"میں پنجابی مسلم راجپوت ہوں۔ کئی پشتیں گزریں، میرے ایک جد کاٹھیاواڑ چلے گئے تھے۔ وہاں انھوں نے ایک خواجہ کی لڑکی سے شادی کر لی اور انھی کے خاندان میں مل گئے۔ اس وقت سے ہم لوگ خوجوں میں شمار ہونے لگے۔ میرے وہ جد جو کاٹھیاواڑ چلے گئے تھے، ضلع منٹگمری کے رہنے والے تھے[1]"

[ولادت ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو بمقام کراچی ہوئی۔ تعلیم کا آغاز ۱۸۸۱ء میں مکتب سے ہوا۔ بعدازاں گوکل داس پرائمری اسکول بمبئی اور چند سال بعد مدرسہ ہائی اسکول کراچی میں پڑھا جس کے صدر دروازے پر یہ کتبہ لکھا ہوا تھا: "ENTER TO LEARN GO FORTH TO SERVE" یعنی علم حاصل کرنے کے لیے آؤ اور خدمت کرنے کے لیے جاؤ۔]

محنت کی عادت

"میں زیادہ اس لیے پڑھتا ہوں کہ مجھ کو ایک دن بڑا آدمی بننا ہے۔ کیا آپ پسند نہیں کرتے کہ میں بڑا آدمی بنوں؟"

[۱۸۹۲ء میں مشن اسکول کراچی سے ۱۶ سال کی عمر میں میٹریکولیشن کیا۔ والد جناح پونجا کے ایک انگریز دوست مسٹر فریڈرک کرافٹ کے مشورے سے بیرسٹری کے لیے انگلستان روانہ ہوئے۔ لندن پہنچ کر "لنکن ان" میں داخلہ لیا۔ ۳۵ رسل روڈ کنگسٹن کے ایک معمولی مکان میں قیام کیا]

لندن کا پہلا تاثر

"انگلستان میرے لیے ایک عجیب ملک تھا اور وہاں کے باشندے میرے لیے غیر مانوس۔ میرا وہاں کوئی واقف نہ تھا۔"

---

[1] یہ بات قائداعظم کے منہ سے اس وقت نکلی جب نواب صاحب باغپت نے کہا کہ آپ کا خاندان تو تجارت پیشہ ہے پھر آپ میں یہ گھن گرج کہاں سے آئی؟ راوی اس کے صفیر احمد عباسی پرائیویٹ سیکرٹری نواب صاحب چھتاری ہیں جو اس وقت مجلس میں موجود تھے۔ (محمد عبداللہ قریشی) (قائداعظم میری نظر میں۔ ص ۲۳۸-۲۳۹)

کی گرد و غبار اور سخت موسم سرما نے مجھے بے حد پریشان کیا۔ لیکن بہت جلد میرا دل لگ گیا اور میں خوش و خرم رہنے لگا۔"

برل ازم کا کیف و سرور

"انگلستان میں مجھے برل ازم مکتب خیال کے بہت سے ممتاز راہنماؤں سے ملنے کے مواقع ملے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اس نظریے کو سمجھنے لگا۔ اس وقت انگلستان میں لارڈ مورلے کے برل ازم کا سکہ چلتا تھا۔ میں نے انہی کے افکار و نظریات کو اپنایا اور یہ برل ازم میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ جس نے مجھے عجب خوشی اور مسرت کی کیفیت بخشی۔"

لندن کی شرارتیں

جب میں وہاں پڑھا کرتا تھا تو ایک دفعہ مجھے لندن میں پولیس سے بھی سابقہ پڑا۔ واقعہ یوں ہوا کہ ایک رات ہم کشتی رانی کے میلے گئے ہوئے تھے۔ راستے میں ایک چھکڑا مل گیا۔ ہم سب دوست باری باری ایک دوسرے کو چھکڑے پر کھینچ رہے تھے کہ راستے میں پولیس آگئی اور سب کو پولیس اسٹیشن لے گئی۔ لیکن انھوں نے ہمیں کچھ نہ کہا اور بغیر کسی شرط کے گھر جانے کی اجازت دے دی۔"[1]

[یہیں دادا بھائی نوروجی کے الیکشن کے ہنگاموں میں سرگرم حصہ لیا۔ انیس سال کی عمر میں بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے کراچی واپس آئے۔ کچھ عرصہ کراچی میں اور پھر ۱۸۹۶ء میں بمبئی میں پریکٹس شروع کی۔ ۱۹۰۰ء میں پریسیڈنسی مجسٹریٹ بمبئی مقرر ہوئے۔ دادا بھائی نوروجی کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے کانگرس میں شرکت کی اور پھر ملازمت چھوڑ کر بمبئی ہائیکورٹ میں ایڈووکیٹ کی حیثیت سے کام شروع کر دیا]

وکالت میں کامیابی

بمبئی کے محکمہ جوڈیشل کے انچارج سر چارلس اولیونٹ کی پندرہ سو روپیہ ماہوار گریڈ کی مستقل ملازمت کی پیشکش ٹھکرا دینے کے دو سال بعد جب سر چارلس انگلستان سے واپس آئے جہاں وہ پنشن پا کر جا چکے تھے تو اورینٹ کلب کے ایک جلسہ میں اتفاقاً میری ملاقات ان سے ہوئی۔ خود اٹھ کر میرے پاس آئے اور پوچھا۔ کیسے گزرتی ہے؟ میں نے کہا۔ خدا کا شکر ہے؟ پوچھا۔ آمدنی کا کیا حال ہے؟ میں نے کہا۔ دو ہزار روپیہ سے زیادہ کما لیتا ہوں۔ یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے "شاباش! مجھے مسرت ہے کہ تم نے میری پیشکش ٹھکرا دی۔"

[۱۹۰۹ء میں سپریم امپیریل کونسل کے بلا مقابلہ ممبر منتخب ہوئے۔ انڈیا کونسل کی ہیئت ترکیبی پر سخت نکتہ چینی کی۔ وقف علی الاولاد کا مسودہ قانون پیش کیا جو منظور ہوا۔ ۱۹۱۳ء میں کانگرس کے ایک وفد میں شریک ہو کر مسٹر گوکھلے کے ساتھ لندن گئے تاکہ آنے والے اصلاحات کے سلسلے میں ممبران پارلیمنٹ سے تبادلۂ خیالات کریں]

---

[1] یہ بات قائد اعظم نے اس وقت کہی جب سیاسی لیڈر دھڑا دھڑ قید ہو رہے تھے اور آپ سے کسی نے پوچھا کہ آپ بھی کبھی گرفتار ہوئے یا نہیں؟

ٹائمز (لندن) کو طویل انٹرویو

"برٹش امپائر کا ہندوستان وہ تنہا ممبر ہے جو حکومت کے نظام میں نمائندگی سے محروم ہے اور دنیا میں ہندوستان وہ تنہا ملک ہے جہاں نمائندہ اور ذمہ دار حکومت کا وجود ہی نہیں۔"

[مسلم لیگ اور کانگریس میں اتحاد کی کوشش (۱۹۱۵ء) آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ کی صدارت (۱۹۱۶ء) میثاق لکھنؤ کانگریس میں ہردلعزیزی اور سر ڈینشا پٹیٹ کی صاحبزادی مس رتی پٹیٹ کو مشرف با اسلام کر کے نکاح (۱۹۱۸ء) رولٹ ایکٹ پر بطور احتجاج امپیریل کونسل سے استعفیٰ۔ (۱۹۱۹ء)]

رولٹ بل کی مخالفت

"مجرمانہ سیاسی سازش کا مسئلہ رولٹ کمیٹی نے اس طرح اٹھایا ہے جیسے کچھ جرائم پیشہ قبائل ہم میں دفعتاً نمودار ہو گئے ہیں اور اب ضروری ہے کہ ایک قانون بنا کر ان کا صفایا اور قلع قمع کر دیا جائے۔ لیکن قانون بنانا مرض کا علاج نہیں بلکہ (حکومت کو) اپنی پالیسی تبدیل کرنی چاہیے۔ یہ مجرمانہ سازشیں خود بخود دور ہو جائیں گی۔ اس کمیٹی نے (جو سر سڈنی رولٹ کی زیر صدارت تشکیل کی گئی تھی) ایسی سفارشات پیش کی ہیں جنھیں کوئی مہذب حکومت قبول نہیں کر سکتی۔ ان کا تصور بھی نہیں کر سکتی — اگر اسے قانون کی شکل دے دی گئی تو سارے ملک میں اس سرے سے لے کر اس سرے تک ایک آگ لگ جائے گی۔"

امپیریل کونسل سے استعفیٰ

رولٹ ایکٹ کی منظوری اور اس پر آپ (وائسرائے) کی مہر تصدیق نے عوام کو برطانوی انصاف سے برگشتہ کر دیا ہے۔ انصاف اور عدالت کے بنیادی اصولوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا گیا ہے اور قوم کے دستوری اور آئینی حق کو سوخت کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا میں اس فیصلہ اور حکومت کی اس روش کے خلاف احتجاج اور اظہار برہمی کے طور پر امپیریل کونسل کی ممبری سے استعفا دیتا ہوں۔ ان حالات میں کوئی خوددار آدمی حکومت سے تعاون نہیں کر سکتا۔ ایسی حکومت سے جو ایوان آئین سازی میں قوم کے منتخب شدہ نمائندوں کی آواز ٹھکرا دیتی ہو۔"[1]

سکوت مرگ آسا

"میرے بہت سے دوستوں اور رفیقوں نے پوچھا ہے کہ میں سیاسیات کے اس نازک ترین دور میں خاموش کیوں ہوں یا الگ تھلگ کیوں ہوں؟ بلاشبہ صورت حال دشواریوں اور خطروں سے لبریز ہے۔ ایک طرف حکومت کا وہ خود سرانہ اور سفاکانہ طرز عمل ہے جس نے

---

[1] یہ مکتوب مالابار ہل بمبئی سے ۲۸ مارچ ۱۹۱۹ء کو وائسرائے ہند کے نام بھیجا گیا۔

وقارِ قومی کو مجروح کر رکھا ہے جس شخص میں ذرا بھی سیاسی بصیرت ہوگی وہ حکومت کو اس طرزِ عمل پر ملامت کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ جنگِ عظیم جو ابھی ابھی ختم ہوئی ہے۔ اس میں ہندوستان نے اپنا خون بہایا۔ مال و زر سے حکومت کی مدد کی۔ لیکن صلہ کیا ملا؟ رولٹ ایکٹ — لیکن دوسری طرف یہ کہنے سے بھی باز نہیں رہ سکتا کہ گاندھی جی نے جن کی میں عزت کرتا ہوں، جو پروگرام اختیار کیا ہے وہ قوم کو غلط راستے پر لیے جا رہا ہے۔ (آوازیں نہیں نہیں) میں جانتا ہوں۔ آپ یہی کہیں گے لیکن میں آپ سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ اگر یہ پروگرام قوم کو غلط راستے پر نہ لیے جا رہا ہوتا اور اگر مجھے یقین ہوتا کہ یہ صحیح پروگرام ہے تو میں پہلا شخص ہوتا جو اس کی عملی تائید کرتا۔ میں گاندھی جی اور ان کے رفقاء کی عزت کرتا ہوں۔ ان کے جذبۂ قربانی کا معترف ہوں لیکن میں پھر کہوں گا کہ ان کا پروگرام قوم کو صراطِ مستقیم کے بجائے ایک گڑھے کی طرف لیے جا رہا ہے۔ (آوازیں، نہیں نہیں) میری رائے میں صحیح راستہ یہ تھا کہ کونسل میں جا کر دو بدو بیوروکریسی کا مقابلہ کیا جاتا۔ یہاں تک کہ حکومت کونسل کو توڑ دینے پر مجبور ہو جاتی۔ زارِ روس نے ڈوما قائم کی۔ وہاں کے وطن پرستوں نے یہی کیا اور بالآخر زارِ روس نے مجبور ہو کر ڈوما توڑ دیا۔ یہی ہمارے لیڈر یہاں بھی کر سکتے تھے۔

اب گاندھی جی کے پروگرام کی دوسری شق کو لیجیے۔ یہ ہے سکولوں کا مقاطعہ۔ میں پوچھتا ہوں۔ آخر ترکِ تعلیم کا مقصد کیا ہے؟ صرف چرخہ کاتنا؟ اگر یہی بات ہے اور گاندھی جی کہتے ہیں یہی بات ہے تو میں کہوں گا کہ یہ تحریک سیاسی تحریک بہر حال نہیں۔

گاندھی جی کے پروگرام کی تیسری شق ہے کھادی کا عام رواج۔ اس پر خود کانگرس کے ڈیلی گیٹ بھی عامل نہیں۔ اس طرح کامیابی نہیں ہو سکتی۔ یہ سیاسی پروگرام نہیں ہے۔ جذباتی پروگرام ہے۔ اس کے بجائے اگر یہ ہوتا کہ ملوں پر ملیں قائم کی جاتیں اور پھر برطانوی مال کا مقاطعہ کیا جاتا تو ایک بات بھی تھی۔ اس طرح سکول اور کالج جا بجا قائم کیے جاتے پھر طلباء سے باہر آنے کو کہا جاتا تو کون تائید نہ کرتا؟[1]

[ہندو مسلم اتحاد کے لیے ایک نیا فارمولا پیش کیا (۱۹۲۷ء) اجلاس مسلم لیگ کلکتہ کی صدارت اور زبردست جدوجہد کا آغاز (۱۹۲۸ء) سائمن کمیشن کا بائیکاٹ۔ نہرو رپورٹ کی مخالفت۔ موتی لعل نہرو سے جھڑپ (۱۹۲۹ء) پہلی گول میز کانفرنس کے لیے لندن کو روانگی (۱۹۳۰ء) ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۴ء تک ہندوستان کی سیاست سے عارضی کنارہ کشی اور لندن میں قیام۔ ۱۱ فروری ۱۹۳۴ء کو مرکزی اسمبلی کے لیے مسلمانانِ بمبئی کی طرف سے کاغذاتِ نامزدگی، جناح راجندر پرشاد فارمولا (۱۹۳۵ء) علی گڑھ یونیورسٹی یونین میں ۵ فروری ۱۹۳۵ء کو اپنے قیامِ لندن کے اسباب اور جناح راجندر گفت و شنید پر روشنی۔]

اتحاد کے امکان کا خاتمہ

"میں حیران ہوں کہ میری قوتِ خود داری اور وقار کو کیا ہو گیا تھا کہ میں کانگرس سے صلح و مفاہمت کی بھیک مانگا کرتا تھا میں نے اس مسئلہ کے حل کے لیے اتنی مسلسل اور غیر منقطع مساعی کیں کہ ایک انگریزی اخبار نے لکھا: مسٹر جناح ہندو مسلم اتحاد کے مسئلے سے کبھی نہیں تھکتے۔" لیکن گول میز کانفرنس کے زمانہ میں مجھے اپنی زندگی میں سب سے بڑا صدمہ پہنچا۔ جیسے ہی خطرہ کے آثار نمایاں ہوئے۔ ہندو ذہنیت ——

---

[1] یہ تقریر گوکھلے کی برسی کے موقعہ پر بمبئی میں کی گئی اور فروری ۱۹۲۱ء کے بمبئی کرانیکل میں شائع ہوئی۔

دل و دماغ کے اعتبار سے — اس طرح نمایاں ہوئی کہ اتحاد کا امکان ہی ختم ہو گیا۔

اب میں مایوس ہو چکا تھا۔ مسلمان بے سہارا اور ڈانواں ڈول ہو رہے تھے۔ کبھی حکومت کے یار وفاداران کی رہنمائی کے لیے میدان میں آموجود ہوتے تھے، کبھی کانگرس کے نیاز مندانِ خصوصی ان کی قیادت کا فرض ادا کرنے لگتے تھے۔ مجھے اب ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں ہندوستان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ نہ ہندو ذہنیت میں کوئی خوشگوار تبدیلی لا سکتا ہوں۔ نہ مسلمانوں کی آنکھیں کھول سکتا ہوں۔ آخر میں نے لندن ہی میں بود و باش کا فیصلہ کر لیا، پھر بھی ہندوستان سے میں نے تعلق قائم رکھا اور چار سال کے قیام کے بعد میں نے دیکھا کہ مسلمان خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔ آخر میں نے رختِ سفر باندھا اور ہندوستان پہنچ گیا۔

یہاں آنے کے بعد ۱۹۳۶ء میں میں نے صوبائی انتخاب کے سلسلہ میں کانگرس سے مفاہمت و مصالحت کی گفت و شنید کی اور ایک فارمولا ہم دونوں نے مرتب کیا، لیکن ہندوؤں نے اسے منظور نہیں کیا اور معاملہ ختم ہو گیا۔"

ناکامی کے اسباب

میں نے ہندو اور مسلمان کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے اپنی بہترین کوششیں صرف کیں۔ میری ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ بدنصیب ہندوستان کے یہ دو فرزند ایک دوسرے کو پہچانیں، سمجھیں اور باہمی رواداری کے اور محبت کے رشتے میں منسلک ہو جائیں لیکن میں نے محسوس کیا کہ ابنائے وطن کے قلوب میں مسلمان کے لیے عزت و احترام اور مساوات و رواداری کے جذبات موجود نہیں اور ابنائے وطن نہیں چاہتے کہ مسلمان بھی ترقی کے میدان میں ان کے دوش بدوش آگے بڑھ سکیں۔ میری قوم پرورانہ کوششوں کو ابنائے وطن نے اپنی ریشہ دوانیوں اور سازشوں سے ناکام بنانے کی مسلسل اور پیہم سعی کی — آزادی جسے کانگرس نے اپنا سیاسی نصب العین قرار دے رکھا ہے، ابنائے وطن کی متعصبانہ سرگرمیوں سے ثابت ہوا کہ یہ ایک حسین فریب ہے اور اس آزادی کا مفہوم ایک قوم کی آزادی ہے بلکہ میں اس سے بھی ایک قدم آگے جاتا ہوں کہ کانگرس کی آزادی کا مطلب اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی آزادی ہے اور اس آزادی سے وہ دوسرے فرقوں اور قوموں کو محروم رکھنا چاہتے ہیں۔

الگ الگ تنظیمیں

"ہندو کا تعصب اور کانگرس کی سنگدلی مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی بجائے روز بروز ایک دوسرے سے دور ہوتے جانے کا باعث ہوئی۔ ہندو اور مسلمان کے مابین ایک ناقابلِ عبور خلیج حائل ہو گئی اور دونوں قومیں اپنے احیا و بقا کے لیے دو الگ الگ نظریات کے ماتحت منظم ہونے لگیں۔ اس کی ذمہ داری کسی ایک جماعت یا فرد پر نہیں ڈالی جا سکتی بلکہ اس کا ذمہ دار وہ تعصب ہے جس کا مظاہرہ ابنائے وطن موقع . موقع کرتے رہتے ہیں۔"

مسلم لیگ کا احیاء

یہی وہ واقعات و حالات تھے جنھوں نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں بکھری ہوئی اور منتشر مسلم قوم کو آنے والے

خطرات سے باخبر اور ہوشیار کروں اور انھیں ایک مرکز پر لا کر ایک منظم قوم کی صورت دے دوں — یہی وہ جذبہ تھا جس نے مجھے مجبور کیا کہ میں مسلم لیگ کے تن مردہ میں زندگی کی ایک نئی روح پھونکوں، مسلمانوں کی خفتہ قوتوں کو بیدار کروں، ان کے جمود و کسل کو حرکت میں تبدیل کر دوں۔ یہ ایک بڑا کام تھا لیکن خدا نے میرے بوڑھے جسم میں جوانی کا خون دوڑا دیا۔ میرے کمزور بازوؤں میں خدائی طاقت آگئی۔ میں اس بوجھ کو اپنے کمزور شانوں پر اٹھانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کونسی ساعت تھی جب میں نے اپنی منتشر قوم کو پکارا اور آنے والے خطرات کا خاکہ اس کے سامنے پیش کیا۔ میری نحیف آواز پر سوئی ہوئی قوم نے کروٹ لی اور مجھے محسوس ہوا کہ راکھ کے اس وسیع انبار میں زندگی کی چنگاریاں موجود ہیں۔ میری آواز صور اسرافیل ثابت ہوئی۔ سویا ہوا شیر ایک جماہی لے کر اٹھا اور اس کی گرج سے ہندوستان کی فضا میں ایک گونج پیدا ہو گئی۔ آج میری گردن بارگاہ رب العزت میں جھکی ہے۔ قومی بیداری کا دھارا ایک عظیم سیلاب کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ بکھرے ہوئے اور منتشر اجزائے ملت کی شیرازہ بندی ہو چکی ہے اور آج ملت کے روبرو ایک نصب العین ہے۔ ایک لائحہ عمل ہے اور اس کی قومی آواز ہندوستان کی چار دیواری سے نکل کر بلاد مغرب اور سواد مشرق میں ہر طرف پھیل گئی ہے۔[1]

[مسلم لیگ کے اجلاس بمبئی کی صدارت۔ مسلم لیگ کے مستقل صدر کی حیثیت سے انتخاب۔ نئی جد وجہد کا آغاز۔ ہندوستان بھر میں طوفانی دورہ۔ مسلم لیگ کی نئی انتخابی پالیسی کا اعلان (۱۹۳۶ء) مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ۔ مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ کی صدارت (اکتوبر ۱۹۳۷ء)]

خطبۂ صدارت

"... میں چاہتا ہوں کہ مسلمان اپنے اوپر اعتماد کرنا اور اپنی تقدیر اپنے ہاتھ میں لینا سیکھیں۔ ہمیں ایسے راسخ العقیدہ اہل ہمت اور صاحب عزم کی ضرورت ہے جو اپنے معتقدات کی حفاظت کے لیے تمام دنیا کے مقابلے میں تن تنہا ڈٹ جانے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں۔ ہمیں طاقت و عزم پیدا کرنا چاہیے اور یہ طاقت و عزم عام مسلمانوں کے باہمی انضباط، اتحاد اور وحدت کے بغیر حاصل نہ ہو سکے گا۔"

قرارداد پاکستان

"ہمیں جنوری ۱۹۳۹ء سے آغاز جنگ تک بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ناگپور میں ودیا مندر سکیم اور ہندوستان کے تمام حصوں میں واردھا سکیم کے مسئلہ پر ہماری توجہ مرکوز رہی۔ کانگرسی حکومتوں کے صوبوں میں ہمیں ستایا اور دبایا جا رہا تھا۔ ریاست جے پور اور بھاؤنگر میں مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک ہو رہا تھا اس نے ہماری توجہ اپنی طرف جذب رکھی۔ راجکوٹ کی مختصر سی ریاست میں ایک اہم مسئلہ پیدا ہو گیا تھا اور ہمیں اس سے عہدہ برآ ہونا تھا۔ راجکوٹ کے معاملہ کو کانگرس نے ایک آزمائشی مسئلہ بنا لیا تھا جو ایک ثلث ہندوستان پر اثر انداز ہوتا۔

اسی طرح مسلم لیگ جنوری ۱۹۳۹ء سے جنگ کے آغاز تک بہت اہم مسائل سے دوچار رہی۔ جنگ کے آغاز سے پہلے ہندوستان کو سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ مرکزی حکومت میں فیڈرل اسکیم نافذ کر دی جائے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس معاملے میں کیا ریشہ دوانیاں ہو رہی تھیں لیکن مسلما

---

[1] قائد اعظم از محمد اشرف خاں عطا۔ ص ۱۳-۱۴

ہر طرح سختی سے اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ مرکزی فیڈرل حکومت کی خطرناک سکیم جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں درج ہے ہرگز منظور نہیں کرنی چاہیے۔ برطانوی حکومت کو مرکزی فیڈرل حکومت کی سکیم سے دست برداری کی ترغیب میں ہم نے کچھ کم حصہ نہیں لیا۔ اس امر کو برطانوی حکومت کے ذہن نشین کرانے میں مسلم لیگ کا حصہ بھی کچھ کم نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ انگریز ضدی، قدامت پسند اور چالاک ہونے کے باوجود دیر فہم ہیں۔ جنگ چھڑ جانے کے بعد وائسرائے نے مسلم لیگ سے مدد کی درخواست کی۔ اور اسی وقت اسے معلوم ہوا کہ مسلم لیگ ایک طاقت ہے۔ آپ نے کہ جنگ چھڑنے سے پہلے تک وائسرائے نے مجھے کبھی یاد نہیں کیا بلکہ گاندھی اور صرف گاندھی کو یہ شرف حاصل ہوتا رہا۔ میں مقننہ میں کافی عرصے تک ایک اہم پارٹی کا لیڈر رہ چکا ہوں جو موجودہ پارٹی سے (جس کی قیادت کی عزت مجھے اب حاصل ہے) بھی بڑی تھی یعنی مرکزی اسمبلی مسلم لیگ پارٹی لیکن اس کے باوجود وائسرائے نے اس سے پہلے مجھے کبھی یاد نہیں فرمایا جس وقت جناب گاندھی کے ساتھ مجھے وائسرائے کا دعوت نامہ ملا ہوا تو میں حیران رہ گیا۔ یکایک یہ ترقی مجھے بخش دی گئی؟ پھر سوچا کہ یہ سب کچھ مسلم لیگ کی وجہ سے ہے جس کا صدر حسنِ اتفاق سے میں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے کانگرس ہائی کمان کو سخت صدمہ پہنچا ہے اور کیوں نہ پہنچتا۔ میرا بلایا جانا ہندوستان کی واحد نمائندگی کے حق کے متعلق کانگرس کے دعوے کو ایک چیلنج تھا۔

جنگ چھڑ جانے کے بعد ہماری حالت یہ تھی کہ ایک طرف کنواں تھا اور دوسری طرف کھائی۔ میں نہیں سمجھتا کہ جنگ کے ساتھ ہی یہ حالت بھی ختم ہو جائے گی۔ بہرحال ہم نہایت واضح طور پر ہندوستان کی آزادی کے طالب ہیں لیکن یہ آزادی تمام ہندوستان کی آزادی ہونی چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ ایک جماعت یا بدتر صورت میں کانگرس کو آزادی مل جائے اور مسلمان اور دیگر اقلیتیں غلام بنی رہیں۔"

"قومیت کی تعریف چاہے جس طرح کی جائے، مسلمان اس تعریف کی رُو سے ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس لیے اس بات کے مستحق ہیں کہ ملک میں ان کا اپنا ارضِ وطن، ان کی اپنی الگ مملکت اور اپنی جداگانہ خود مختار ریاست ہو۔ ہم مسلمان چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے اندر ہم ایک آزاد قوم بن کر اپنے ہمسایوں کے ساتھ ہم آہنگی اور امن و امان سے زندگی بسر کریں۔ ہماری تمنا ہے کہ ہماری قوم اپنی روحانی، اخلاقی، ثقافتی، اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کو کامل ترین نشوونما بخشے اور اس کام کے لیے وہ طریقِ عمل اختیار کرے جو اس کے نزدیک بہترین ہو اور ہماری رائے میں ہمارے قدرتی عملیات اور نصب العین سے ہم آہنگ ہو۔"

(لاہور۔ ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء)

ہم نہ ہوں گے تو ہمیں یاد کرے گی دُنیا

آج ہندو مجھے کوستے ہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب ہندوستانی اور ان کی نسلیں رہتی دُنیا تک مجھے اچھے الفاظ میں یاد کریں گی اور مجھے دعا دیں گی۔ گو اس وقت میں دُنیا میں موجود نہیں ہوں گا۔ اس وقت تو میں ایک بہت ہی غلط سمجھا ہوا انسان ہوں۔

دہلی میں جناح فٹ بال ٹورنامنٹ کا افتتاح

"یہ میری زندگی میں پہلا موقع ہے کہ میں نے فٹ بال کو اپنے پاؤں سے ٹھوکر لگائی۔"

زندگی میں پاکستان دیکھنے کی خواہش

ہم منزل کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں لیکن میری روح آپ کی طرح جوان ہے۔ میری زندگی کی یہ انتہائی تمنا ہے کہ مسلمانانِ ہند جو عدیم النظیر روایات کے حامل ہیں جن کا ماضی درخشندہ ہے۔ میں ان کا مستقبل درخشندہ دیکھ سکوں۔ میرا دل چاہتا ہے۔ میری خدا سے دعا ہے کہ میں اپنی زندگی میں قیام پاکستان دیکھ سکوں۔ میری آنکھیں مسلمانوں کو ہندوستان میں ایک قوم کی طرح سے سربلند ظفریاب اور کامیاب دیکھ سکیں۔ اس کے بعد اگر مجھے موت بھی آ جائے تو میں خوشی خوشی اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دوں گا۔ میری روح کو تسکین اور اطمینان ہو گا۔

ناکامی کوئی لفظ نہیں

اخلاقی قوت، دلیری، محنت اور استقلال وہ چار ستون ہیں جن پر انسانی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے اور ناکامی وہ لفظ ہے جسے میں جانتا ہی نہیں۔

ہمارا قومی شاعر

”آج میں اپنے قومی شاعر اقبال کی مقدس یاد میں اپنا ہدیۂ عقیدت پیش کرتا ہوں۔ آج ہم اس شخص کی یاد منا رہے ہیں جو ایک بہت بڑا شاعر، نکتہ شناس، درویش، فلسفی اور مفکر تھا۔ میں خدا تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ مرحوم کی روح ابدی سکون سے ہمکنار ہو۔

آج اقبال ہم میں موجود نہیں لیکن ان کے شعر جو غیر فانی حیثیت اختیار کر چکے ہیں ہماری رہنمائی اور ہمارے دلوں میں جوشِ عمل پیدا کرنے کے لیے ہم میں ہمیشہ موجود رہیں گے۔ ان کے اشعار اپنی ہیئت کی دل آویزی اور زبان کی شیرینی کے علاوہ اس عظیم المرتبت شاعر کے دل و دماغ کی صحیح معنوں میں عکاسی بھی کرتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری یہ محبوب شخصیت اسلام کی تعلیمات کی کس قدر گرویدہ تھی۔ اقبال حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سچے اور مخلص پیرو تھے۔ وہ اول و آخر مسلمان تھے۔ وہ اسلام کے ترجمان اور اس کی آواز تھے۔

اقبال محض ایک پیغامبر و فلسفی نہ تھے۔ انھوں نے ہمت و جرأت، عمل و سعی پیہم، خود اعتمادی اور سب سے بڑھ کر ایمان باللہ اور عقیدت اسلام کی بھی دعوت دی۔ ان کی ذات گرامی حامل تھی۔ ایک طرف شاعر کی مثال پسندی اور دوسری طرف ایک ایسے آدمی کی حقیقت پسندی کی جو گرد و پیش کی چیزوں کو عملی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا عادی ہو۔ خدا تعالیٰ پر یقین محکم اور مسلسل اور پیہم جد و جہد ـــ مختصراً یہ کہ اقبال کے پیغام کی یہی خصوصیت اقبال کو ایک سچے مسلمان کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کرتی ہے

اقبال کو اسلام کے اصولوں پر غیر متزلزل یقین تھا۔ اس کے نزدیک فرد کی زندگی میں کامیابی کے معنی یہ تھے کہ اس کی ذات کی تکمیل ہو جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کا اقبال کی نظر میں صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا تعلیمات اسلام کی پیروی۔ اقبال نے انسانیت کو بھی پیہم عمل اور تکمیل ذات ہی کے ذریعے اپنی فلاح و بہبود حاصل کرنے کی دعوت دی۔

بے شک اقبال ایک عظیم شاعر اور فلسفی تھے۔ لیکن ایک عملی سیاست دان کے لحاظ سے بھی وہ کچھ کم حیثیت کے مالک نہیں تھے۔ دین اسلام کے نصب العین اور اس کے شاندار مستقبل پر یقین واثق رکھنے کی وجہ سے اقبال ان معدودے چند افراد میں سے ایک تھے جنھوں نے سب سے پہلے اس امکان پر سوچ بچار کیا کہ برعظیم ہند کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں کو جو ہندوستان میں مسلمانوں کا تاریخی وطن ہے اس سے الگ کر کے ایک اسلامی ریاست بنا دیا جائے۔

میں آپ لوگوں کے ساتھ یوم اقبال منانے میں خلوص دل سے شریک ہوتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ ہمیں اس امر کی توفیق دے کہ ہمارے قومی شاعر نے جن اصولوں کی ہمیں دعوت دی تھی۔ ہم اپنی زندگیاں ان کے مطابق ڈھالیں تاکہ پاکستان کا مقصد ہمیں حاصل ہو اور اس میں جب کہ وہ قائم ہو جائے ہم ان اصولوں کو جن کی اقبال نے تعلیم دی تھی عملی جامہ پہنا سکیں۔” (یوم اقبال ۱۹۴۴ء)

جذبۂ سرفروشی

ہم پر الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم نے اپنے مقصد کے لیے قربانیاں نہیں کیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس قسم کی قربانیاں کرنے سے قاصر ہیں جن کی کانگرس کو عادت ہے۔ حصول قیادت کے لیے پہلے بھیڑ بکری کی طرح لاٹھی چارج کے نیچے بیٹھ جانا۔ اس کے بعد جیل جانا۔ پھر دو دن میں کسی کے بہانے جیل سے رہائی حاصل کرنا۔ میں اس قسم کی جدوجہد میں بالکل یقین نہیں رکھتا۔ لیکن اگر قربانیاں دینے کا وقت آیا تو میں پہلا شخص ہوں گا جو اپنے سینے پر گولی کھاؤں گا۔“

میں کوئٹہ میں ڈاکٹروں کے مشورے سے بحالی صحت کے لیے آیا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ لوگ میری تقریر سننا چاہتے ہیں۔ مجھے ان کا مطالبہ تسلیم کرنا پڑا کیونکہ میری تمام زندگی قوم کے لیے وقف ہے۔” (کوئٹہ۔ ۱۰ ؍ اکتوبر ۱۹۴۵ء)

سب کچھ غریبوں کے لیے

میں بوڑھا آدمی ہوں۔ مجھے خدا نے وہ سب کچھ دے رکھا ہے جس سے میں اپنی بقیہ زندگی آرام و سکون سے بسر کر سکتا ہوں۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ میں اپنا خون پسینہ ایک کر رہا ہوں۔ دن رات کا آرام اپنے اوپر حرام کر رکھا ہے۔ میں یہ سب کچھ سرمایہ داروں کے لیے نہیں، آپ لوگوں کے لیے کر رہا ہوں۔

حقیقی مسرت

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں ایک بہت بڑے سیٹھ کے ہاں مہمان تھا۔ صبح کو رخصت کے وقت میں نے حسب دستور اس کے ملازم کو روپوں کی ایک معقول رقم دینا چاہی۔ بوڑھے ملازم نے واپس کر دی۔ میں نے اس خیال سے کہ بہت بڑے آدمی کا ملازم ہے۔ شاید رقم کو اپنی پوزیشن سے کم سمجھتا ہے۔ رقم کو دوگنا کر دیا۔ ملازم نے پھر واپس کر دی۔ تین چار مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ میں ہر دفعہ اضافہ کرتا اور وہ واپس کر دیتا۔ میں حیران تھا کہ کہاں تک بڑھاتا جاؤں۔ آخر میں نے رد و انکار کی وجہ پوچھی تو بوڑھے ملازم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

میں نے رونے کا سبب پوچھا تو اُس نے نہایت مؤثر اور رقت انگیز لہجے میں کہا:

"قائداعظم! آپ مجھے روپے دے کر خوش کرنا چاہتے ہیں۔ میرا بال بال آپ کی ان محنتوں اور جانکاہیوں پر خوش ہے جو آپ قوم کے لیے کر رہے ہیں۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ میری باقی عمر آپ کو بخش دے تاکہ جو کام آپ نے اپنے ذمہ لیا ہے اسے پورا کر سکیں۔ یہ رقم جو آپ مجھے دیتے ہیں اسی کام میں صرف فرمائیں۔"

بڑے بڑے سرمایہ دار یا نواب جو میری تعریف کرتے ہیں، مجھے اس سے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کی نیتوں اور عملوں سے میں خوب واقف ہوں۔ میری حقیقی مسرت غریبوں کے اخلاص میں ہے۔

کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

میں ۱۹۳۶ء میں پشاور آیا تھا اور دس دن ٹھہرا تھا۔ اب پورے نو سال بعد دوبارہ یہاں آیا ہوں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ۱۹۳۶ء اور آج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کچھ چیز نہیں تھی لیکن مسلسل محنت اور قربانی سے آج یہ حالت ہے... کہ کروڑوں مسلمان مسلم لیگ کے ساتھ ہیں۔ مسلمان کا خدا ایک ہے۔ مسلمان کی کتاب قرآن ایک ہے۔ مسلمان کا پیغمبر ایک ہے۔ مسلم لیگ نے یہ کوشش کی ہے کہ مسلمان بھی ایک ہو جائیں۔ ہمارا مقصد اور نصب العین یہ ہے کہ جہاں مسلمان کی اکثریت ہے وہاں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو۔ یہ بات اب اتنی عام ہو چکی ہے کہ محتاج وضاحت نہیں رہی۔ یہ حقیقت بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ مسلمانوں کا کوئی دوست نہیں، نہ انگریز نہ ہندو۔ اب ہمیں انگریز اور ہندو کی متحدہ طاقت سے لڑنا ہے۔ یہ بھی جنگ ہے وہ بھی جنگ۔ اسلام ہمیں غیر اللہ سے ڈرنا نہیں سکھاتا۔ ہم ڈٹ کر مقابلہ کریں گے اور انشاء اللہ کامیاب ہوں گے۔

"سب سے خراب مسلمان میں ہوں۔ میرا گناہ یہ ہے کہ مسلمان کو ایک جھنڈے تلے اور ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا ہے۔"

۱۹۲۴ء میں آپ کے صوبے کے لیے اصلاحات کے لیے ہم لڑ رہے تھے۔ میں اس کے لیے ہر طرح کوشاں تھا۔

جب تک مجھ میں جان ہے میں ایک مسلمان کے خون کا قطرہ ضائع نہیں ہونے دوں گا۔ اب یہ سوال سیدھا ہے۔ آپ کو سمجھنا چاہیے قربانی کس وقت کرنی ہے کس موقع پر کرنی ہے۔ یہ آپ کے جرنیل کا کام ہے جو اپنے فرض کو اچھی طرح جانتا ہے۔ یقین کرو کہ جب وقت آیا تو میں سب سے پیش پیش ہوں گا۔ تمہیں بھی ساتھ لے کر نکلوں گا اور پھر میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ لیکن یہ نہیں چاہتا کہ صرف اس لیے جیل جاؤں کہ باہر آ کر لوگوں سے کہوں۔ میں جیل میں گیا تھا۔ میں اب جیل سے آیا ہوں۔ میں نے قربانی کی ہے۔ وغیرہ وغیرہ... ہم چاہتے ہیں کہ جب آگے بڑھیں تو شکست نہ ہو اور اگر شکست ہو تو آبرومندانہ ہو۔ ہم بے عزتی نہیں کروائیں گے۔ قوم کو ذلیل نہیں کریں گے۔

(پشاور، ۲۶ نومبر ۱۹۳۶ء)

قیام پاکستان کے بعد زندگی کا نیا دور

میں دہلی کے باشندوں کو الوداع کہتا ہوں جہاں ہر فرقے سے تعلق رکھنے والے میرے بہت سے دوست ہیں۔ اب ہمیں ماضی کو دفن کر دینا چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ ہندوستان اور پاکستان دو آزاد حکومتوں کی طرح اپنی زندگی کا نیا دور شروع کریں۔ (دہلی، ۷ اگست ۱۹۴۷ء)

پاکستان کا پہلا میزانیہ

ہمارے دشمن کہتے تھے کہ پاکستان دیوالیہ ہو گا۔ وہ پیدا ہوتے ہی ختم ہو جائے گا۔ لیکن پاکستان کے میزانیہ نے دشمنوں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اللہ پر توکل نے دشمن کی ہر چال کو ناکام بنا دیا۔ دشمن نے پاکستان کو ختم کرنے کے لیے جو عنکبوتی جال تیار کیا تھا وہ خود اس میں پھنس گیا ہے۔ مسلمان نوجوانو! مسلمانو! میرا پیغام تمھارے لیے صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ایک زندہ اور غیور قوم کی طرح قدم بڑھائے چلو اور میرے ان الفاظ کو اپنی زندگی کا موٹو بنا لو۔ ضبط و نظم، قربانی و ایثار اور خلوص و دیانت۔ انشاء اللہ پاکستان بہت جلد دنیا کا ایک عظیم ملک بن جائے گا۔ ہر مسلمان عورت، مرد، جوان، بوڑھے اور بچے کو اپنے خدا کے حضور میں کھڑے ہو کر صدق و صفا کے ساتھ اس امر کا عہد کرنا چاہیے کہ وہ جب تک پاکستان کو ناقابلِ تسخیر اور عظیم ملک نہ بنا دیں گے۔ آرام اور چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ اللہ ہماری مدد کرے۔

پاکستان کی ترقی کے امکانات

خدا نے پاکستان کو ہر چیز دے رکھی ہے۔ اس کے لیے ترقی کے امکانات بڑے روشن ہیں۔ پاکستان میں ہر وہ شے موجود ہے جو صنعتی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ ضرورت صرف محنت، خلوص اور دیانتداری کی ہے۔ میری قوم میں یہ اوصاف پیدا ہو جائیں تو یہ دنیا کی بہت بڑی قوم بن سکتی ہے۔ ہمیں مشکلات و مصائب سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ خدا ہمیشہ ان قوموں کو آزمائش میں ڈالتا ہے جنھیں وہ زمین کی خلافت سونپنا چاہتا ہے۔

قومی روایات اور تمدنی خصوصیات

قیام پاکستان جس کے حصول کے لیے ہم گزشتہ دس سال سے جد و جہد کر رہے تھے خدا کے فضل سے آج وہ حقیقت بن کر سامنے آگیا ہے۔ اپنے لیے ایک وسیع مملکت حاصل کرنا ہمارا نصب العین نہیں تھا بلکہ یہ نصب العین کے حصول کا ایک ذریعہ تھا۔ مقصد یہ ہے کہ ہم ایک ایسی مملکت کے مالک ہوں جہاں ہم اپنی روایات اور تمدنی خصوصیات کے مطابق ترقی کر سکیں۔

تجارت

کسی ملک کی خوشحالی اور فارغ البالی کا انحصار اس ملک کے تاجر طبقہ پر ہے۔ مسلمان تجارت کے میدان میں بہت پس ماندہ ہیں۔ اب انھیں پورا موقع مل گیا ہے کہ وہ اس میدان میں قدم بڑھائیں اور تجارت میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ لگائیں۔

تاجروں کو لوٹ کھسوٹ، ناجائز منافع بازی، بددیانتی اور کم تولنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ کیونکہ اسلام اور اخلاق دونوں اس کی اجازت نہیں دیتے۔

کشمیر کا جھگڑا

کشمیر کا مسئلہ نہایت نازک مسئلہ ہے لیکن اس حقیقت کو کوئی انصاف پسند قوم اور ملک نظر انداز نہیں کر سکتا کہ کشمیر

تمدنی، ثقافتی، مذہبی، جغرافیائی، معاشرتی اور سیاسی طور پر پاکستان کا ایک حصّہ ہے جب بھی اور جس نقطۂ نظر سے بھی نقشے پر نظر ڈالی جائے گی یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ کشمیر سیاسی اور جنگی حیثیت سے پاکستان کی شہ رگ ہے۔ کوئی ملک اور قوم اسے برداشت نہیں کر سکتی کہ اپنی شہ رگ کو دشمن کی تلوار کے نیچے دے دے۔ کشمیر پاکستان کا حصّہ ہے۔ ایک ایسا حصّہ ہے جسے پاکستان سے الگ نہیں کیا جا سکتا مجھے کہنے دیجئے قطعاً ہچکچاہٹ نہیں کہ ریڈ کلف ایوارڈ میں مسلمانوں کے ساتھ فراڈ کیا گیا۔ گورداسپور کے ایک ایسے حصّے کو جو آبادی کے لحاظ سے مسلم اکثریت کا علاقہ تھا محض اس لیے ہندوستان کے حوالے کر دیا گیا کہ ہندوستان کو کشمیر کے معاملات میں مداخلت کی آزادی مل سکے پاکستان نے ریڈ کلف ایوارڈ کو دیانتداری سے تسلیم کیا تھا لیکن ہندوستان کی نیت میں شروع سے فتور تھا۔ اس فتور کا مظہر کشمیر کا جھگڑا ہے۔

مہاجرین کا مسئلہ

”قیام پاکستان کے بعد مہاجرین کے مسئلے نے مجھے بہت پریشان کیا۔ مجھے اس کا خیال ضرور تھا کہ ہندوستان اور پاکستان میں آبادی کا تبادلہ ہوگا اور یہ تبادلہ آہستہ آہستہ عمل میں آئے گا لیکن ہندوستان میں طے شدہ پروگرام اور سازش کے تحت مسلمانوں کا قتل عام شروع کیا گیا۔ یہ قتل عام اس قدر وسیع پیمانے پر ہوا کہ کسی مذہب، قوم اور ملک کے تصور میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی کہ دنیا کے کسی گوشہ اور خطہ میں اس قدر درندگی اور بربریت کا مظاہرہ کیا جا سکتا ہے۔ قتل عام کے بعد ہمارے دشمنوں نے ہمیں ختم کرنے کے لیے ستر لاکھ مسلمانوں کو ان کی ہر چیز چھین کر پاکستان کی طرف دھکیل دیا۔ میں پورے یقین اور دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس سیلاب کے سامنے مضبوط سے مضبوط اور مستحکم سے مستحکم حکومت کی بنیادیں بھی متزلزل ہو جاتیں اور ایوان حکومت دھڑام سے زمین پر آ رہتا۔ ہماری مملکت تو ابھی نوزائیدہ ایسی مملکت جسے نہ ابھی فوج پر اختیار رہا تھا، نہ وہ پورے طور پر نظم و نسق سنبھال سکی تھی۔ خزانہ خالی تھا، اسلحہ دشمن کے قبضہ میں تھا لیکن اللہ نے ہماری مدد کی، مسلمانوں نے جس عزم و ایثار، قربانی اور جوش کا اظہار اس موقع پر کیا ہے اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہوا اس سے مجھے روحانی اذیت پہنچی۔ میرے قلب پر ایک ایسی چوٹ لگی کہ جس کا درد میں زندگی کے آخری سانس تک بھی محسوس کرتا رہوں گا۔ مسلمانوں کی تباہی پر میرا دل رات دن خون کے آنسو روتا ہے۔“

ہماری قومی زبان

پاکستان کی مشترکہ قومی زبان جو مملکت کے مختلف صوبوں کے درمیان افہام و تفہیم کا واحد ذریعہ ہو سکتی ہے، وہ اُردو ہے۔ اُردو کے سوا کوئی اور زبان نہیں۔

ملک کی سرکاری زبان بھی اُردو ہی ہونی چاہیے۔ یہ وہ زبان ہے جسے برصغیر کے لاکھوں مسلمانوں نے پرورش کیا ہے اور اسے پاکستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سمجھا جا سکتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اُردو میں دوسری صوبائی زبانوں سے کہیں زیادہ اسلامی تہذیب و ثقافت کا بہترین سرمایہ موجود ہے اور اُردو ہی دوسرے اسلامی ممالک کی زبانوں سے زیادہ قریب ہے۔

دستور ساز اسمبلی

دستور ساز اسمبلی کے بارے میں میرا نظریہ ہے کہ اس میں عوام کے نمائندے ہوں گے اور ان کا انتخاب محدود حق رائے دہندگی پر نہ ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ جمہوریت ہمارے خون میں بسی ہوئی ہے۔ جمہوریت ہمارے گوشت پوست میں ہے۔ امتداد زمانہ سے وہ ہمارے خون میں منجمد ہو گئی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب پھر خون میں روانی پیدا ہو چلی ہے۔

شہری آزادی

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کسی جابرانہ کارروائی یا جرائم کی ہمت افزائی کرتے ہیں لیکن میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے آئین و ضوابط کا بغور مطالعہ کیا ہے اور یہ محسوس کیا ہے کہ ہر آئین میں سب سے زیادہ اہم شے شہری آزادی ہے۔ میرا اس بات پر پختہ ایمان ہے کہ حکومت بغیر مقدمہ چلائے اور بغیر جرم ثابت کیے ایک منٹ کے لیے بھی کسی انسان کی آزادی ضبط نہیں کر سکتی۔

حقوقِ نسواں

دنیا میں کوئی بھی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ گامزن نہ ہوں۔ ہم بہت سی رسوم کا شکار ہیں۔ عورتوں کو گھروں کی چار دیواری میں بند کر کے رکھنا انسانیت کے خلاف ایک جرم ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم مغرب کی برائیوں کی تقلید کریں بلکہ اسلام کے معیار کے مطابق عورتوں کی پوزیشن کو سماج میں بلند کرنا چاہیے۔ آج جس حالت میں عورتیں زندگی بسر کر رہی ہیں، وہ اسلامی قانون کے منافی ہے۔ آپ اپنی عورتوں کو زندگی کے تمام شعبوں میں اپنا ساتھی بنائیں اور ساتھ ساتھ مغرب کی برائیوں سے بچنے کی کوشش کریں۔

مرض الموت میں اپنے معالج سے

"میں نے آج تک کبھی اپنی صحت کی پروا نہیں کی اور نہ آئندہ کے لیے خیال کرنے کو تیار ہوں۔ موت اور زندگی سب خدا کی طرف سے ہے۔ موت وقتِ معین سے پہلے نہیں آ سکتی۔ یہ میرا ایمان ہے۔ میں خداوند قدوس کی ذات کے سوا اس دنیا میں کسی طاقت سے نہیں ڈرتا۔ موت کا خوف مجھ پر طاری نہیں۔ جب موت کو آنا ہے اور ضرور آنا ہے تو پھر موت سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔"

یہ تو تم جانتے ہی ہو جب سازِ حیات کے تار ڈھیلے پڑ جائیں اور ایک ایک کر کے ساتھ چھوڑ دیں تو پھر ان کا جوڑنا ذرا وقت طلب کام ہوتا ہے۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ مجھے میری بیماری کے متعلق تمام صورتِ حال سے آگاہ کر دیں کہ مجھے کیا بیماری ہے، کس حد تک بڑھ چکی ہے۔ میں یہ اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ ہر مریض کو اپنے معالج سے یہ دریافت کرنے کا حق ہوتا ہے۔ بیماری کی نوعیت معلوم ہونے کے بعد میں آپ سے زیادہ سے زیادہ تعاون کر سکوں گا اور علاج میں آپ کو آسانی ہو گی۔ لیکن اگر طبی اصول صورتِ حال بیان کرنے میں مانع ہوں تو پھر میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا۔"

میرا کام ختم ہو گیا

میں اپنا کام ختم کر چکا۔ اب مجھے مرنے کا افسوس نہ ہوگا۔ چند سال قبل یقیناً میری آرزو تھی کہ میں زندہ رہوں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے دنیا کی تمنا تھی یا میں موت سے خوف کھاتا تھا بلکہ اس لیے کہ قوم نے جو کام میرے سپرد کیا تھا اور قدرت نے جس خدمت کے لیے مجھے چنا تھا میں اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا سکوں۔ وہ کام پورا ہو گیا ہے۔ میں اپنا فرض ادا کر چکا ہوں۔ پاکستان بن گیا ہے۔ اس کی بنیادیں مضبوط ہیں۔ اب چند ماہ سے مجھے ایسے خیالات آتے رہتے ہیں کہ میں اپنا فرض ادا کر چکا ہوں۔ قوم کو جس چیز کی ضرورت تھی وہ اسے مل گئی۔ اب یہ قوم کا کام ہے کہ وہ اس کی تعمیر کرے۔ اسے ناقابلِ تسخیر اور ترقی یافتہ ملک بنائے۔ حکومت کا نظم و نسق دیانت داری اور محنت سے چلائے۔ میں طویل سفر کے بعد تھک گیا ہوں۔ آٹھ سال تک مجھے قوم کے اعتماد و تعاون کے بل پر تنہا دو عیار اور مضبوط دشمنوں سے لڑنا پڑا ہے۔ میں نے خدا کے بھروسہ پر ان تھک کوشش کی ہے اور اپنے جسم کے خون کا آخری قطرہ تک حصولِ پاکستان کے لیے صرف کر دیا ہے۔ میں تھک گیا ہوں۔ آرام چاہتا ہوں۔ اب مجھے زندگی سے زیادہ دلچسپی نہیں۔"

"حالات کے مطابق قدرت کوئی نہ کوئی آدمی ضرور پیدا کر دیتی ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ خدا کی ذات پر کامل بھروسہ رکھو اور اپنے ذاتی مفادات کو قومی اور ملکی مفادات پر ترجیح نہ دو۔ خدا تمہیں مجھ سے بھی زیادہ کوئی لائق رہنما عطا کر دے گا۔"

"گو میں آپ کے درمیان موجود نہیں ہوں گا لیکن آپ دیکھیں گے کہ اگر مسلمانوں نے خلوص، دیانت داری اور نظم و ضبط سے کام لیا تو چند ہی سال میں پاکستان دنیا کے عظیم ترین ملکوں میں شمار ہو گا۔ اس کی ترقی اور طاقت دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی اور کرۂ ارض کی ہر قوم اس کی دوستی کی خواہاں ہو گی۔"

آخری دُعا

(پُرنم آنکھوں سے اپنا منہ کمبل سے ڈھانپ کر بھرّائی ہوئی آواز میں)

"اے خدا! تو نے ہی مسلمانوں کو یہ نعمت عطا کی ہے۔ تو ہی اس کی حفاظت کرنے والا ہے۔ میری قوم کمزور ہے اور ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔ ابھی تو اس کی کمی بھی دور نہیں ہوئی۔ تو ہی اس کا حامی و ناصر ہو۔"

[وفات : ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء ۔ شب ۱۰ بجکر ۲۵ منٹ بمقام کراچی)

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں

میں جب اپنی زندگی کے ورق اُلٹتا ہوں تو جس تاثر کو بے حد نمایاں پاتا ہوں وہ میری والدہ ماجدہ (خُدا ان کا سایہ تادیر مجھ پر رکھے) کی تربیت ہے۔ میری والدہ پُرانی وضع کی پابند صوم و صلوٰۃ خاتون ہیں۔ اپنے بچوں کی تربیت میں اُنھوں نے دو امور کا خاص خیال رکھا۔ ایک مذہب سے لگاؤ۔ دوسرے لوگوں سے برابر کا سلوک اور محبت۔ یہ دو جذبے میری زندگی میں جاری و ساری رہے ہیں۔

اپنے والد (خُدا اُنھیں جنت نصیب کرے) سے مجھے ضبط و تحمل کی تعلیم ملی۔ اُنھوں نے مجھے انتہائی تکلیف دہ حالات کا ضبط و تحمل سے مقابلہ کرنے کا عادی بنایا۔

یہ باتیں آج شاید عجیب معلوم ہوں لیکن آج سے پچاس ساٹھ سال قبل مسلمانوں کی قصباتی تہذیب میں بچوں کی تعلیم و تربیت ماں باپ کی نظر سے شروع ہوتی تھی جس میں بزرگوں کا ادب، چھوٹوں سے شفقت اور آس پاس کے رہنے والوں کی خدمت پر خاص طور سے توجہ دی جاتی تھی۔

آگے چل کر ملک و ملت کی جو خدمت مجھ سے بن آئی اس میں میری حقیر کوشش سے کہیں زیادہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور میرے ماں باپ کی تربیت کا حصہ ہے۔

مغربی پاکستان کے شمال مغربی کونے میں ضلع ہزارہ واقع ہے جو اپنے مناظرِ قدرت کی وجہ سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اسی ضلع کے ایک گاؤں ریحانہ میں ۱۹۰۷ء میں میں نے ایک پٹھان گھرانے میں آنکھ کھولی۔ بچپن میں چاروں طرف پھیلی ہوئی غربت کو دیکھ کر میں سوچا کرتا تھا کہ اِسے دُور کرنے کے لیے ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔ مل جُل کر کچھ کرنا چاہیے۔ سوچنے کی یہ عادت زندگی کا معمول بن گئی۔

میرے والد محترم متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اُنھوں نے حوصلے اور دُور اندیشی سے کام لے کر اپنے بچوں کو تحصیل علم کے لیے نہ صرف ضلع بلکہ صوبے سے باہر بھیجا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مسلمانانِ ہندوستان کی سب سے بڑی اور مرکزی درس گاہ تھی جہاں نہ صرف تہذیب و ثقافت و ادب فن کی تشکیل ہو رہی تھی بلکہ اس مایۂ ناز درس گاہ سے ایسے طالب علم تربیت پا کر نکلے جنھوں نے مسلمانانِ ہند کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی میں فیصلہ کن حصہ لیا۔ یہ میری انتہائی خوش قسمتی تھی کہ مجھے اس سرچشمۂ علم سے فیضان کا موقع ملا۔ یہیں علی گڑھ میں مجھے مسلمانوں کی یکجا جدوجہد کا قریب سے مطالعہ کرنے کا بھی موقع ملا۔ جب مجھے کالج یونین کا عہدہ دار بنایا گیا اور تنظیم کا کام میرے سپرد ہوا تو مسلمانوں کی تنظیم سے گویا میرا پہلا رشتہ قائم ہوا۔

دورانِ تعلیم ہی مجھے فوج میں کمشنڈ آفیسری کی ٹریننگ کے لیے منتخب کر لیا گیا اور مشہور ملٹری کالج سینڈہرسٹ بھیج دیا گیا۔ جہاں ۱۹۲۸ء میں مجھے کمیشن مل گیا۔ یہاں سے میری زندگی کا نیا باب شروع ہوا جو افواجِ پاکستان کی تنظیم پر ختم ہوا۔

پاکستان کے قیام کے بعد مجھے سرحدی علاقوں سے فوج کے انخلا کا کام سپرد ہوا اور بعد میں مشرقی پاکستان میں فوج کی کمان دی گئی۔ یہ ایک بڑی ذمہ داری تھی۔ پاکستان تو بن چکا تھا لیکن مصیبتوں میں گھرا ہوا تھا۔ ہمارے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ نہ وسائل تھے نہ روپیہ تھا۔ نہ سامان تھا نہ ہتھیار تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ پرانی تنظیم ٹوٹ چکی تھی۔ نئی عمل میں نہیں آئی تھی۔ لے دے کر ہمارے پاس ایک چیز تھی۔ وہ تھی عوام کا بے پناہ جذبۂ عمل۔ میں نے اسی جذبۂ عمل کو اُبھار کر مشرقی پاکستان کا فوجی دفاع تیار کیا اور اللہ کا شکر ہے کہ مشکلات پر قابو پا لیا۔

۱۹۵۱ء میں میری ذمہ داری اور بڑھ گئی چونکہ مجھے پاکستانی فوج کا کمانڈر انچیف بنا دیا گیا اور میں فوج کی ازسرِ نو تنظیم میں منہمک ہو گیا۔ میں اس کام کو اپنی زندگی کا سب سے عظیم کام سمجھتا ہوں۔ آج جب میں دیکھتا ہوں کہ پاکستانی فوج دنیا کی بہترین افواج میں سے ہے تو میرا سر خدا کے شکر میں جھک جاتا ہے۔

قدرتی بات ہے کہ ہر نئے ملک کے قیام کے بعد ایک عبوری دور آتا ہے۔ پاکستان میں بھی عبوری دور آیا۔ سیاست غلط راستے پر چل نکلی۔ پاکستان میں حالات کا یہ رخ دیکھ کر مجھے تکلیف تو ہوتی تھی لیکن ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ دو ایک مرتبہ مجھے سیاسی عہدے کی پیشکش ہوئی لیکن سپاہی کے لیے سیاسی دھندوں میں پڑنا خوش کن بات نہیں ہوتی۔ اس لیے دل نہ مانا۔

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں حالات نے ناگہاں پلٹا کھایا اور مجھے پاکستان کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینا پڑی۔ یہ ایک ایسی ذمہ داری کا سنبھالنا تھا جس سے عہدہ برآ ہونا آسان نہ تھا۔ خدا کی مہربانی اور اپنے جذبۂ خدمت کے بھروسہ پر آگے بڑھا۔ یہ تو کوئی مورخ ہی بتا سکتا ہے کہ میری محنت ٹھکانے لگی یا نہیں۔ اپنی طرف سے میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنی بساط سے بڑھ کر کام کیا ہے۔

مجھے اس بات کا احساس تھا کہ مارشل لاء ایک عبوری چیز ہے اور عوام کے نمائندوں کا حکومت کے کام میں ہاتھ بٹانا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بغیر کوئی ملک پھل پھول نہیں سکتا۔ حالات کے مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ مغربی پارلیمانی طرز کی جمہوریت یہاں نہیں چل سکتی۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے بنیادی جمہوریت کی شکل قائم کی۔ جس میں وہی نمائندے اُوپر آ سکتے ہیں جو عوام کے سچے خادم ہوں اور ان کے اعتماد کے اہل ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ کچھ ملک اسے اپنا رہے ہیں۔

اب ملک میں جمہوریت کا دوسرا دور شروع ہو چکا ہے اور میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ اپنے فضل و کرم سے پاکستان کو ایک خوشحال اور ترقی یافتہ ملک بنانے اور اسلامی معاشرہ قائم کرنے میں ہماری مدد کرے۔

PRESIDENT'S HOUSE
Rawalpindi

No. D. 24127-Press/63 December 7, 1963.

Dear Sir,

As desired in your letters of 9th September and 25th October 1963, I am directed to send herewith the following material for inclusion in the Centurial issue of your journal entitled. آپ بیتی

(i) a brief biographical sketch of the President,
(ii) a copy of the President's autographed photograph, and
(iii) a few words in President's own hand-writing.

2. The delay is regretted.

Yours truly,

(A. Waheed)
Deputy Secretary to the President.

Dear Mr. Tufail,

I write on behalf of Sir Winston Churchill to thank you for your letter. Sir Winston is complimented by your thought of him, but he regrets that he cannot assist you, as he has now entirely ceased his literary activities.

I hope that you may be able to obtain the details you want from WHO'S WHO and from some of Sir Winston's books, perhaps My EARLY LIFE, THE WORLD CRISIS, and THE WAR MEMOIRS.

Yours sincerely,
Private Secretary.

Dear Mr. Tufail :

General Eisenhower has asked me to forward the enclosed photograph and biography which you requested in your letter of September 17th, to be included in the centurial issue of NUQOOSH Magazine along with other personalities of the world.

With his best wishes.

Sincerely,
ROBERT L. SCHULZ
Brig. Gen., U. S. A. (Ret)
Executive Assistant.

House of Commons,
London.

Dear Mr. Tufail,

Mr. Macmillan has asked me to write on his behalf to thank you for your letter of November 5.

Mr. Macmillan was very interested to hear about "Nuqoosh", but very much regrets that he is unable to send you an autobiography of himself. He gets so many requests of this kind that he has had to make it a rule to refuse them unless the circumstances are exceptional. He is sorry about this, but very much hopes you will understand the position.

Yours sincerely,
Assistant Personal
Secretary.

Dear Mr. Tufail,

Thank you very much for your letter. I must confine myself to antinuclear work.

I enclose some literature concerning the recently formed Peace Foundations. It is our hope that we shall be able to secure very widespread financial support in the form of covenants of a set amount for a set period of time. This will be sought simultaneously with our accumulation of large sums. In this way, I am confident that we shall advance quickly towards the achievement of our more ambitious aims. I hope you can assist this and contribute. If you are able to suggest other people who might be willing to support the Foundations financially we shall be pleased to send them brochures.

With good wishes,

Yours sincerly,
Bertrand Russell.

MOSCOU,

CHER CONFRERE,

JE VOUS PRIE DE M'EXCUSER MON SILENCE J'ETAIS LONGTEMPS ABSENT. JE VOUS ENVOIE LE TEXTE AUTOBIO-GRAPHIQUE QUE J'AI ECRIT POUR UN RECUEIL SUR LES ECRIVAINS CONTEMPORAINS, PARU CHEZ NOUS IL Y A QUELQUES ANNEES. JE VOUS ENVOIE DE MEME UNE PHOTO RECENTE.

JE VOUS PRIE DE CROIRE A MES MEILLEURS SENTIMENTS.

(For Ilya Ehrenburg)

Prime Minister's Secretariat,
NEW DELHI - 11

نمبر ۹ (۲) ۶۳ — ایچ

مکرمی -

آپ کا خط مورخہ ۲۸ - ستمبر ۱۹۶۳ء وزیراعظم صاحب کو ملا -

آپ کی خواہش کے مطابق وزیراعظم صاحب کی سوانح عمری اور ایک دستخط شدہ فوٹو آپ کو بھیجی جا رہی ہیں -

آپکا
پران ناتھ ساھنی
پرائیویٹ سیکرٹری

FABER AND FABER LTD ;
Publishers,
24-Russell Square London, WCI

Dear Mohammad Tufail,

As Mr. Eliot is at present abroad, I am writing to acknowledge your letter of January 4th.

I very much regret that it is not possible to send you Mr. Eliot's autobiography as he has not written one at all ; neither is it possible to send you a photograph of Mr. Eliot as there are none available for circulation.

Yours sincerely,
Secretary to Mr. Eliot.

Dear Mr. Editor, "NUQOOSH"

Your letter to my husband reached me here yesterday. My husband has been very ill, now improving, but is in a clinic in Switzerland, and I cannot trouble him at present with your request - Later on, I will give him your communication. He has still difficulty in concentration, and I have had to refuse several request.

Yours sincerely,
(Mrs. Ezra Pound) D. Pound.

May I add a word of admiration for your lovely letter-heading.

I have found a copy of photo, for you.

HOUSE OF LORDS,
S. W. I.

Dear Sir,

The Lord Chancellor has asked me to thank you for your letter of 5th November. I regret that it has remained unanswered for so long.

I understand that you have already received from the British Information Services in Lahore biographical notes and a photograph of Lord Dilhorne which I hope will meet your requirements. If you require further assistance I am sure the Regional Information Officer in Lahore will be very happy to assist you.

Yours faithfully,

دربار شاهنشاهی

Cher Monsieur Tufail,

La lettre que vous avez presentee a Sa Majesti Pahlavi, l'Imperatrice de l'Iran, est bien parvenue a sa Haute Destination.

Mon Auguste Souveranie Apprecie votre aimable pensee et vous souhaite bonheur et bien etre.

Viuillez agreer, l'assurance de ma consideration la meilleure.

Fazollah Nabil

Maitre de la Cour de sa Majeste
Farah Pahlavi, l'Imperatrice
de l'Iran.

P. S. Comme les regles protocolaires interdisent l'octroi de la photographie autographiee, je vous envoie ci-joint une photographie non signee de mon Auguste Souveraine ainsi que les renseignements que vous avez sollicites.

Dear Sir,

With reference to your letter dated 1st November, 1963 addressed to H. H. The Aga Khan, I am enclosing herewith a short autobiography for your centurial issue of "NUQOOSH" together with a photograph duly signed by His Highness.

Yours truly,
G. Beguel
Private Secretary.

PRESIDENT's SECRETARIAT.
Rashtrapati Bhavan,
NEW DELHI-4

Dear Sir,

Kindly refer to your letter of October 21. I am herewith sending "My Search for Truth" which is a brief autobiographical sketch by the President. I am sure you will find this book usefull. You may quote from it any manner you like. A brief life sketch and an autographed picture of the President are also enclosed.

Please excuse me for the delay in complying with your request.

With best wishes.

Yours faithfully,
(A. M. ABDUL HAMID)
Public Relations Officer.

مجمع اللغة العربية

السيد الاستاذ محمد طفيل

عضو اللجنة التنفيذية لمجلة "نقوش" لاهور باكستان اقدم الى سيادتكم احسن التحية .

وبعد ، فقد تلقى الدكتور طه حسين رئيس المجمع رسالتكم البهية في شان مجلة نقوش ، واعتزامكم طبع جزء يتضمن تراجم شخصية ، ورغبتكم في الحصول على تاريخ لحياته وصورة له .

ويسرني أن أبلغكم شكر الدكتور طه حسين لكم ، وأطيب تمنياته لمجلتكم ،

وقد أشار بالاستجابة لما رغبتم فيه ، ومع كتابي هذا الكلمة أعدتها ادارة المجمع ، فيها اجمال للمراحل المختلفة والأعمال العلمية والأدبية التي قام بها سيادته ،

ومعه أيضا صورة له .

وأنتهز هذه الفرصة لأقدم اليكم وافر الاحترام .

المدير العام

DARTMOUTH COLLEGE.

Dear Sir :

Your letter of the seventh instant, addressed to Mr. Robert Frost, has been referred to my attention for reply, Mr. Frost having died just a year ago.

I am sure that RF's estate would wish me to express regret that it was not possible for him to comply with your request that he prepare an autobiographical statement for your publication, **Nuqoosh**. It was gracious of you to have extended such an invitation.

With good wishes for the success of your forthcoming issue, please know me to be

Very truly yours,
Acting College Librarian

West Cornwall
Connecticut

Dear Mr. Tufail,

I am sorry to have to tell you that James Thurber died in November 1961, and for that reason I cannot send you any autobiographical material, autographed photographs, or facsimile writing.

My husband would have been very glad to do this, I am sure. I regret very much that I cannot help you.

Sincerely yours,
Helen Thurber.

15th January, 1964.

Dear Sir,

Thank you for your letter of January 3rd. You are mistaken in thinking that I have written an autobiography for publication. Such material as I have put together will not be published until after my death.

Yours sincerely,
W. S. MAHGHAM

I enclose a reproduction of a portrait recently painted of me by my old friend, Sir Gerald Kelly, K.C.V.O., P.P.R.A.

6233 Mulholland Highway
Los Angeles 28, California
U. S. A.

Dear Mr, Tufail :

I regret to tell you that my husband is not well at this time, and therefore cannot accept your kind invitation.

Sincerely yours,
Laura Huxley.

UNITED STATES REPRESENTATIVE
TO THE UNITED NATIONS.

SEAL
790 United Nations Plaza
New York 17, N.Y.
——— —
YUkon 6-2424

October 11, 1963.

Dear Sir :

I appreciate greatly your kind invitation for me to contribute a statement to your magazine. I regret very much, however, that I am unable to do so because of the extremely heavy pressure of business in the United Nations General Assembly.

I wish for you the best of everything, however, and send you my good wishes and sincere regards.

Cordially yours,
Adlai E. Stevenson.

Enc. Bio & photo

VILLA MAURESQUE,
St. Jean. Cap Ferrat.

Dear Mr. Tufail,

I am acknowledging your letter to Mr. Maugham because Mr. Maugham is ill and unable to attend to his correspondence.

I am sorry, therefore, that your request cannot be complied with.

Yours very truly,
Miss Seark
Secretary

Dear Mr. Tufail,

In answer to your letter to my husband, Van Wrek Brooks requesting his autobiography, signature, etc., I must tell you that my husband, Mr. Brooks, died on May **2nd** 1963.

With many regrets.

Sincerely yours
glodgs Brooks
(Mr. Van Wrek)

دانش گاہ تہران

Sir,

I have received your letter of November 1, 1963, for which I thank you.

I send you herewith a short autobiography together with a copy of my photograph signed. I hope you will succeed in finishing your Nuqoosh.

With best wishes

Sincerely yours,
Mohammad Moin.

Sir,

My husband, Vladimir Nabokov, asks me to thank you for your letter of October 13.

He would have gladly sent you the material you want but unfortunately the heavy load of work does not allow him to find the necessary time. He suggests that you can find the information you need in the Who's Who or on the jackets of his publications.

Yours truly,
(Mrs. Vladimir Nabokov)

Embassy of the People's Republic of China
in Pakistan

Dear Sir,

I presume you have received the original copy of autobiography of Mr. Wen Chieh and Mr. Yuan Ying which I sent to you on Jan. 7, 1964. I take pleasure now in sending you the biographies of Mr. Kuo Mo-jo, Mr. Hsia Yen, Mr. Chao Shu-li, Madam Hsieh Ping-hsin, Mr. Chou Yang, Mr. Li Chi, Mr. Mao Tun and Mr. Tien Han together with a copy each of their autographed photos. Pleas acknowledge receipt.

I shall be much appreciated if you could kindly let me know about the use of these materials. If possible, please send us two copies of "AAP BEETI" which comprise these materials.

With kind regards,

Yours sincerely,
(Hsu Ying-chieh).

ROMA,

Presidenza
del Consiglidei Ministri
Servizi Informazioni E. Proprieta
Letteraria Artistica E. Scientifica

In relazione alla lettera in data 21-10-1963, con la quale la S. V. chiedeva l'invio di fotografie di personalita della scienza e della letteratura italiane, si rimettono, con pacco a parte, n. 10 foto.

Si prega di inviare una copia dei giornali sui quali le fotografie saranno state utilizzate, al seguente indirizzo:

PRESIDENZA DEL CONSIGLIO DEI MINISTRI
SERVIZIO INFORMAZIONI
DIVISIONE VII - Via Po, 14 - ROMA

Si ringrazia e si resta in attesa di un corte se cenno di riscontro.

IL DIRETTORE GENERALE

THE FOREIGN SERVICE
OF THE
UNITED STATES OF AMERICA

Dear Mr. Tufail :

As the Ambassador is out of the city, I have been instructed to reply to your letter.

I have noticed that you have addressed a similar letter to the American Consul General and the Public Affairs Officer in Lahore with a request similar to that contained in your letter to the Ambassador.

In order to avoid duplication, please let me know if Lahore has been able to meet your request.

I am sure Lahore has the material that you have requested with the exception of autographed photos of President and Mrs. Kennedy. The latter are not obtainable at this time, but we do have excellent portraits of the President and First Lady available in Lahore as well as in Karachi.

Your centurial project sounds extremely interesting an dI wish you success.

Yours sincerely,
Clyde G. Hess
Chief Information Officer

Kedutaan Besar
REFUBLIK INDONESIA

Dear Mr. Tufail,

On behalf of H. E. the Indonesian Ambassador I have to thank you for your letter of 2nd October. Your idea of including short autobiographies of the Heads of State has been much appreciated.

However, your request has been duly forwarded to Djakarta to the relevant authorities and as soon as I receive reply from them I will contact you once again regarding this matter.

Yours sincerely,
(Drs. Soenardi)
First Secretary
Press & Public Relations.

5, Cornwall
Avenue
London 3

۲- اکتوبر،

مکرمی طفیل صاحب۔ تسلیم،

میں لندن سے غیر حاضر تھا۔ اسلئے آپکے خطوط کے جواب میں تاخیر ہوئی، معذرت خواہ ہوں۔

مجھے دوستوں کی خوشنودی خاطر کا پاس بہت ہے لیکن بد قسمتی سے اب کے آپ نے ایسی فرمائش کی ہے جسکی تعمیل نہ ہو سکے گی، اسے خودی کی پستی سمجھئے یا کچھ اور لیکن مجھ سے اپنے بارے میں کچھ لکھا نہیں جاتا بلکہ میں تو حتی الامکان شعر میں بھی واحد متکلم کا صیغہ استعمال نہیں کرتا۔ یہ کوئی اصولی بات نہیں محض اپنی طبع کا تقاضا ہے چنانچہ اس بار آپکی محفل میں شرکت نہ کرسکونگا۔ یہ نمبر آپ میرے بغیر پورا کر لیجئے، بعد کے کسی شمارے کے لئے کچھ لکھ بھیجونگا، فقط

مخلص

فیض

EMBASSY OF THE
UNITED ARAB REPUBLIC

Dear Sir,

In reply to your letter of the 10th instant, we would advise you to contact the undermentioned address, for your requirements.

The Information Department,
Soliman Pasha Street,
Cairo. (United Arab Republic).

We regret we are unable to supply the autobiographies required by you, as they are not readily available at the Embassy, and in order to save time, we are advising you to contact the authorities in Cairo, directly.

Yours faithfully,
(Mahmoud Osman)
Third Secretary.

Ministry of Foreign Affairs
THE ROYAL EMBASSY OF
SAUDI ARABIA

Dear Sir,

With reference to your letter dated 10th October, 1963, we are sending under seperate cover the desired information accompanied by pamphlets and photographs.

Yours truly,
Secretary.

TURKISH TOURISM AND INFORMATION OFFICE

Dear Sir :

Please refer to your letter dated October 9, 1963.

We have today written to Ankara for biographies and photographs of Turkish statesmen. For the biographies of other prominent personalities of Turkey, we would suggest that you write directly to NEBIOGLU YAYINEVI, Istanbul; they are publishers of the biographies of importatn people.

We hope to get quick response to our request, for your magazine is already known as a veneral le literary periodical, and your achievements in the last few years have been amply evident. We wish your magazine even more success in the future.

We shall communicate with you as soon as we receive a reply from Ankara.

With best regards,

Yours sincerely,
Afsin Oktay
Director.

EMBASSY OF THE REPUBLIC OF LEBANON IN PAKISTAN

Dear Sir,

With reference to your letter of October 3rd, 1963, please find enclosed herewith a photograph for General Fouad Chehab President of the Republic of Lebanon and another, for the Prime Minister Mr. Rashid Karame. In addition you'll also find brief life sketches and a magazine which contains some useful articles.

Yours faithfully,
George Dib
Secretary

EMBASSY OF THE REPUBLIC OF THE SUDAN KARACHI.

Dear Sir,

With reference to your letter of 13th October, 1963 addressed to H.E. the Ambassador of the Sudan. I am directed to send you herewith a photograph of H.E. the President of the Republic of the Sudan together with his biography.

Yours faitfully,
Fiyaz Ahmad.
for Ambassador of the Republic of
the Sudan.

EMBASSY OF THE U. S. OF BRAZIL

Dear Sir,

We have for acknowledgement your letter dated the 30th September, 1963.

As requested, enclosed please find the autobiography of His Excellency Mr. Joao Blechior Goulart, President, of the United States of Brazil together with his phtoaorgph.

Yours truly,
Carmo Faria
Secretary.

EMBASSY
OF THE S.F.R. OF YUGOSLAVIA
PAKISTAN

Dear Sir,

Acknowledging the receipt of your letter dated 7th October 1963, addressed to His Excellency Mr. Nikola Milicevic concerning the autobiographies of Head of State and other important personalities of S.F.R. of Yugoslavia, I have pleasure to send you herewith the following biographies together with their photos:

1. **JOSIP BROZ TITO** - President of SFR of Yugoslavia
2. **JOVANKA BROZ TITO** - Wife of the President of SFR of Yugoslavia
3. **ALEKSANDAR RANKOVIC** - Yugoslav Statesman - Vice President of SFR of Yugoslavia
4. **EDVARD KARDELJ** - President of the Federal Assembly of SFR of Yugoslavia
5. **PETAR STAMBOLIC**-President of the Federal Executive Council of SFR of Yugoslavia
6. **KOCA POPOVIC** - State Secretary for Foreign Affairs of the SFR of Yugoslavia.

At the same time also enclosed you will find two books : "Josip Broz Tito" and "Tito Strategist of the Revolution and Founder of the People's Army".

Unfortunately, we are unable to send you autobiographies of the dignataries because some of them are at present absent from Yugoslavia (President Tito, his wife and Koca Popovic are on a state visit to some Latin American countries, President of the Federal Assembly Edvard Kardelj is paying a visit to Austria). Other dignitaries are occupied with their work.

We hope that the biographies and photos of Yugoslav dignitaries will meet with your approval and you will print them in your issue of "APP BEETI" and we would be grateful to you if you could kindly send us two copies of your issue when printed.

Yours sincerely,
(Florijan Kovac).

BRITISH INFORMATION SERVICES
Office of the High Commissioner for the United Kingdom.

Dear Tufail,

I am directed by the Acting High Commissioner to thank you for your letter of 27th September and for the interesting information about 'Nuqoosh' and your plans for the hundredth issue.

In response to your request, I enclose biographies and photographs of Her Majesty Queen Elizabeth II and H.R.H. The Prince Philip, Duke of Edinburgh. I regret that it is not possible to let you have the signed photographs or the personal notes for which you ask. As I am sure you realise, Her Majesty and Prince Philip receive so many requests of this kind that they have to make a general rule not to accede to them.

We shall be glad to help with biographical material on outstanding men and women in Britain and you may care to discuss your requirements in detail with our Lahore office at Racecourse Road. You would be very welcome. In the meantime, I enclose biographies and photographs of Sir Winston Churchil, Mr. Harold Macmillan, Lord Home, Mr. Harold Wilson, Sir John Cockcroft, Sir Malcolm Sargent, Benjamin Britten, Aldous Huxley, Earl Russell, Lord Dilhorne, Somerset Maugham and Lord Rootes.

Please accept our best wishes for the success of your issue.

Yours sincerely
(E. BAILEY)

Philippine Embassy
G.P.O. Box No. 225
Karachi, Pakistan.

Sir,

I wish to acknowledge the receipt of your letter of November 10, 1963, and to inform you that your request has been referred by this Embassy to its Government for the desired materials,

As a leading writer of Pakistan, you might be interested in reading the enclosed copies of **News from the Philippines** (back number), containing worthwhile articles about the Philippines.

Very truly yours,
R. S. BUSUEGO
Ambassador

Office of the
HIGH COMMISSIONER FOR CANADA
Metropole Hotel
Victoria Road,
Karachi, 17

November 5, 1963.

Dear Sir,

With reference to your letter to us of September, 30, 1963, we are pleased to enclose for you photographs and biographies of the following Canadian public figures :

H. E. Major-General Georges P. Vanier - **Governor General of Canada.**

Rt. Hon. Lester B. Pearson - **Prime Minister of Canada.**

The Hon. P. J. J. Martin - **Secretary of State for External Affairs.**

The Hon. W. L. Gordon - **Minister of Finance and Receiver General.**

The Hon. J. V. Lamarsh - **Minister of National Health and Welfare.**

The Hon. C. M. Drury - **Minister of Industry.**

The Hon. H. W. Hays - **Minister of Agriculture.**

Rt. Hon. J. G. Diefenbaker - **Leader of the Opposition.**

Mr. T. C. Douglas, MP.

Mr. R. N. Thompson, MP

Yours truly,

Richard G. Seaborn.

Dear Sir,

I would like to thank you for your letter of September 30th 1963, concerning the special issue of your magazine NUQOOSH.

The matter is under consideration, but I should be grateful if you would add to the valuable information you have already given the Embassy the approximate publication date of your centurial issue. It would also be greatly appreciated if you could send the Embassy one of the past number of your magazine.

Hoping to hear from you very soon, I remain.

Yours sincerely,

J. C. SALMON
Ambassador of Belgium.

AUSTRALIAN HIGH COMMISSION.
9 Kutchery Road,
KARACHI.

Dear Mr Tufail,

I would like to acknowledge and thank you for your recent letter regarding material for the Centurial issue of "NUQOOSH"

Whilst it is regretted that it is not possible to provide you with a personal message and autographed-photograph from the Prime Minister of Australia, Sir Robert Menzies, I am pleased to enclose some biographical notes on the Prime Minister together with a photograph which I hope will be suitable for publication in your special issue of "NUQOOSH"

Yours sincerely
(D.W. McNiol)
High Commissioner

EMBASSY OF SWITZERLAND
in Pakistan.

Dear Sirs,

I acknowledge receipt of your letter of October 7, 1963, requesting me to supply you with material about the Swiss personalities. I have requested my home authorities to make such material available and will revert to the matter upon receipt of reply.

Yours faithfully,
C. H. Bruggmonn
Swiss Charge d'Affaires a.

Office of the High Commissioner
for Malaysia in Pakistan.

Dear Sir,

Further to our letter in this series dated 21st November, 1963 we have pleasure to forward herewith a copy each of the photographs of His Majesty the Yang di-Pertuan Agong (Supreme Head of State of Malaysia) and the Hon'ble Prime Minister of Malaysia, along with their brief biographies for publication in your special issue entitled "Autobiographies"

Please acknowledge receipt.

Yours faithfully,
(Noordin bin Ariffin)
Third Secretary

شیریں تر از حکایتِ ما نیست قصۂ
تاریخ روزگار سراپا نوشتہ ایم

غلام رسول مہر

آپ بیتیوں کی اہمیت

شیریں تر از حکایتِ ما نیست قصہ
تاریخِ روزگار سراپا نوشتہ ایم

شیخ علی حزیں نے خود نوشت سوانح حیات "تاریخ احوال بتذکرۂ حال" کے آغاز میں فرمایا ہے کہ کارگاہِ آفرینش میں انسان کے لیے تحصیلِ عبرت سے بڑھ کر قیمتی سرمایہ کوئی نہیں۔ یہی سبب ہے کہ دانشمندوں اور وقت کی قدر و قیمت پہچاننے والوں میں سے ایک گروہ نے کتب تاریخ کی تدوین اور احوال نیک و بد کی تحریر و تسوید میں اوقاتِ حیات صرف کیے۔ خود میں نے اپنی سرگزشت پر نظرِ بازگشت ڈالی تو اسے فائدۂ عبرت سے خالی نہ پایا لہٰذا جو کچھ یاد رہ گیا اسے اجمالاً معرضِ نگارش میں لاتا ہوں:-

"در نقلِ احوالِ دیگراں بسا باشد کہ ناقل را بہ بسا سبب تخلیط و اشتباہ
افتد و اما در شرحِ احوالِ خویش مجالِ آں نیست۔"

مطلب یہ کہ انسان کے لیے دوسروں کے حالات سے براہِ راست اس طرح آگاہی ممکن ہی نہیں جس طرح وہ اپنے حالات سے آگاہ ہوتا ہے۔ دوسروں کے حالات لکھے تو گوناگوں اسباب کی بنا پر مختلف واقعات کے متعلق اسے شبہات پیدا ہوں گے۔ ایسی روایتیں سامنے آئیں گی جن میں تناقض یا کم و بیش اختلاف موجود ہوگا اور وہ قرائن ہی کے مطابق ایک رائے اختیار کرے گا۔ ممکن ہے اس طرح صحیح حالات میں نادانستہ غلط باتوں کی آمیزش ہو جائے مگر اپنے حالات میں تخلیط یا شبہ کا کوئی امکان ہی نہیں۔

بنیادی حقیقت

خود نوشت سوانح کی ترجیح و برتری کے متعلق یہ ایک بنیادی حقیقت ہے جو شیخ حزیں نے سادہ سے الفاظ میں بیان فرما دی۔ میں سمجھتا ہوں کہ سورۂ قیامت کی مشہور آیت "بل الانسان علیٰ نفسہٖ بصیرۃ و لو القیٰ معاذیرہ" میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور نظیری کا جو شعر اس تحریر کا طرۂ عنوان ہے اس میں بھی یہی بنیادی بات کہی گئی ہے اگرچہ اس کا انداز و اسلوب مختلف ہے اور اس میں ایک ایسا پہلو بھی درج کر دیا گیا ہے جس کی توضیح ایک مفصل تحریر کی متقاضی ہے۔

بہرحال کسی وجود کے احوال و کوائف کو خود اس سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا اور اس کی حرکات و سکنات کے محرکات کا صحیح تر اندازہ خود اس کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ کیا یہ معلوم نہیں کہ جب تاریخوں یا انفرادی سرگزشتوں میں کسی بیان کی توثیق خود متعلقہ افراد کے اقوال و ملفوظات سے کر دی جاتی ہے تو اسے درست تسلیم کر لینے میں کسی کے لیے بھی تامل کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ جب تمام سوانح خود صاحبِ سوانح کے قلم سے

ہوں گے تو انہیں اہم و اقدم ماننے میں اختلاف کی کون سی وجہ ہو سکتی ہے؟

ایک اعتراض

البتہ ایک اعتراض ہو سکتا ہے اور اعتراض کے بجائے اس پر مفصل بحث ہونی چاہیے تاکہ حقیقت واضح ہو جائے یعنی جو شخص آپ بیتی لکھے گا اس کی انتہائی کوشش طبعاً یہ ہوگی کہ اپنی زندگی کے صرف وہی پہلو منظر عام پر لائے جو اس کے نزدیک شایان و زیبا ہوں۔ ان کی نمایش و آرائش اور تزئین و تحسین میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گا بلکہ مختلف برائیوں کے چہرے پر بھی حسن و خوبی کا رنگ روغن اس طرح چڑھا دے گا کہ وہ نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو جائیں۔

بلا شبہ ایسا امکان موجود ہے مگر آپ غور فرمائیں گے تو معلوم ہوگا کہ اس معاملے کے بھی دو پہلو ہیں۔ اول یہ کہ آپ جن چیزوں کو برائیاں سمجھتے ہیں حقیقتاً وہ برائیاں نہ ہوں۔ آپ نے بلا تحقیق سمجھ لیا کہ وہ برائیاں ہیں۔ اگر حقیقت یہی ہے تو آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ آپ غلط فہمی سے محفوظ ہو گئے اور ایک شخصیت کے بارے میں بے انصافی کے ارتکاب سے بچ گئے۔ دوم یہ کہ صاحب تحریر نے تکلف یا تحریف سے کام لیا۔ وہ کذب و دروغ کی افسانہ بافی میں مصروف ہو گیا تاکہ جھوٹ کو سچ اور باطل کو حق کا لباس پہنا دے۔

حقیقتِ حال

اس کا مطلب صاف الفاظ میں یہ ہوا کہ اس فرد میں کذب و دروغ کا جوہر موجود تھا۔ اگر حقیقت یہی ہے تو اسے صرف خود نوشتہ سوانح تک کیوں محدود سمجھا جائے؟ یہ جوہر اس فرد کے ہر بیان، ہر قول اور ہر تحریر میں نمایاں ہو سکتا ہے اور اس کی کوئی نمائش و نمود شبہات کے ایراد سے محفوظ نہ رہے گی مگر اس بنا پر "آپ بیتی" کے پورے انبار کو ناقابلِ اعتبار قرار دے دینا کیونکر قرینِ حق و انصاف قرار پا سکتا ہے؟ اگر کوئی شخص جھوٹ بولنے میں جری اور دلیر ہے تو اس کی آلائش سے محض آپ بیتی ہی کا دامن کیوں ملوث سمجھا جائے؟ اس کی باقی چیزوں کو اس لوث سے پاک سمجھنے کی کون سی وجہ ہوگی؟ نیز اس امر کی کیا دلیل کہ تاریخ و سوانح کے نام سے جو کچھ لکھا گیا یا لکھا جائے گا وہ بہر حال درست اور ہر شبہ سے پاک ہوگا؟

استدلالِ صحیح اور فکرِ سلیم

ہم مختلف اصحاب کے مکاتیب یا تحریرات و مصنفات کو نگارشِ احوال کا بہترین ماخذ کیوں قرار دیتے ہیں؟ محض اس لیے کہ انسان اپنے متعلق مکاتیب یا تحریرات و مصنفات میں جو کچھ لکھ جاتا ہے وہ زیادہ قابلِ اعتماد ہوتا ہے۔ یہ سب چیزیں لمبی مدت پر حاوی ہوتی ہیں اور بظاہر ایسا امکان کم ہے کہ انسان اتنی لمبی مدت تک بناوٹ کا سلسلہ قائم رکھے اور حقیقت کسی نہ کسی شکل میں بے نقاب نہ ہو جائے۔ لہٰذا آپ بیتی کو کیوں ناقابلِ اعتماد سمجھا جائے؟

پھر ہمارے لیے استدلالِ صحیح اور فکرِ سلیم سے کام لے کر ہر تحریر میں سے وضع و ساخت کا حصہ الگ کر لینا مشکل نہیں مگر صرف آپ بیتی پر یہ تحکم کیوں کیجیے؟ ہمارے سامنے صرف ایک آپ بیتی نہیں ہوتی۔ ایک ایک دور کے متعلق کئی آپ بیتیاں آ جاتی ہیں۔ تاریخی کتابیں لکھی جاتی ہیں اور ہمارے سامنے شہادتوں کے انبار لگ جاتے ہیں جن میں مختلف زاویہ ہائے نگاہ منعکس ہوتے ہیں اور ہم چھان بین کرتے ہوئے زیادہ بہتر اور مستحکم نتیجے

پر پہنچ سکتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ ایسا کوئی ذریعہ ہمارے پاس موجود نہ ہو تو ہم کیا کریں گے؟ کیا تاریکی میں قیاس آرائی کے تیر چلا کر صحیح رائے پر پہنچ جائیں گے؟

قلندرانہ شان کے لوگ

جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں انسانی آبادی دو گروہوں میں منقسم ہے۔ پہلا گروہ ان بلند مرتبت ہستیوں کا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ عظمت عطا کرتا ہے مگر وہ اس بنا پر اپنے گرد و پیش وضع و ساخت کی رنگ آرائیوں کے لیے کبھی آمادہ نہیں ہوتے۔ ان کی فطرت کو بناوٹ سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ وہ ہر بات بے تکلف کہہ دیتے ہیں جس طرح راست باز آدمیوں کا شیوہ ہوتا ہے۔ نظیریؔ نے ایک جگہ کہا ہے ؎

ہمہ را زشتی و زیبائی ما در نظر است
بخیہ بر طرفِ پردہ کارے نہ زدیم

یعنی ہماری زشتی و زیبائی، ہماری برائی اور اچھائی ہر شخص کی نظروں کے سامنے آشکارا ہے۔ ہم وہ لوگ ہیں کہ اپنے کسی کام کے پردے کے اطراف بخیے کی کوشش کبھی نہیں کرتے کہ جو کچھ اندر ہو رہا ہے وہ چھپا رہے اور دوسروں پر ظاہر نہ ہونے پائے۔ ہماری ہر چیز سب کے سامنے ہے۔

یہ اسی گروہ کا نقشہ ہے جس کا ذکر میں کر رہا ہوں۔ مرزا غالبؔ اس سلسلے کی ایک بہترین مثال ہیں۔ یا تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ان لوگوں کو اپنی عظمت کا اتنا پختہ یقین ہوتا ہے کہ کسی نازیبا فعل کے اعتراف کو وہ اس میں باعثِ خلل نہیں سمجھتے، یا وہ عظمت کے باب میں اس نقطۂ نگاہ ہی کے قائل نہیں کہ کسی نازیبا فعل کا صدور اس کا حلیہ بگاڑ سکتا ہے، یا انہیں اپنی عظمت کے متعلق تکلف اور بناوٹ سے کام لینا گوارا ہی نہیں، یا وہ قدرت کے اس بنیادی اصول پر کاربند ہوتے ہیں کہ جو شے خلقِ خدا کے لیے نفع بخش ہے وہ بہر حال قائم رہے گی اگرچہ اس کا وجود مٹا ڈالنے کی کوشش کی جائے یا نہ کی جائے۔ جو نفع بخش نہیں، اس کے لیے مٹ جانا لازم ہے خواہ اس کے گرد و پیش وضع و ساخت کی کتنی ہی بلند و مستحکم دیواریں اٹھا دی جائیں۔

آپ بیتی کی حقیقی حیثیت

دوسرا گروہ وہ ہے جو عظمت کی بلندیوں پر پہنچنے کے لیے برابر ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے۔ اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جہاں کہیں کوئی رخنہ نظر آئے اسے جلدی سے بند کر دے تاکہ کوئی شخص اندر جھانک کر حقیقت کا پتا نہ لگا لے۔ وضع و ساخت کی اس جلوہ گری اور ملمع آرائی کی بھی بیسیوں مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں اور ان کی حقیقی حیثیت معلوم کر لینا ہرگز مشکل نہیں۔ یہ لوگ آپ بیتی کے سلسلے میں جو کچھ کہیں گے اسے پوری چھان بین کیے بغیر قبول نہیں کیا جا سکتا۔

غرض آپ بیتی پر ہمہ گیر بے اعتباری کا خطِ بطلان کھینچنا مناسب نہیں۔ دنیا کے عام ذخیرۂ نگارش کی طرح آپ بیتی بھی نقد و نظر کی دسترس سے باہر نہیں۔ ہمارے لیے غور و فکر اور چھان بین کے ذریعے سے اس کے ہر جزو کے صحیح واقعات اخذ کر لینا مشکل نہیں لیکن نفسِ معلوماتِ سیرت کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو آپ بیتی کو ہر دوسرے ذخیرۂ تاریخی اور انبارِ سیرت پر ترجیح حاصل ہے اور اس کے اعتراف میں تامل کیوں کیا جائے۔

ایک خاص پہلو

آپ بیتی کا ایک خاص پہلو میرے نزدیک خصوصی توجہ کا محتاج ہے یعنی ذاتی حالات کے علاوہ وقت، عہد اور ماحول کی تصاویر کے مرقعے بھی

ہر بالغ نظر مصنف کی تحریر یقیناً مرتب ہوگی۔ یہ مرقعے کسی دوسری جگہ مل نہیں سکتے مثلاً مرزا غالب کے مکاتیب بھی اس غرض سے نہیں لکھے گئے تھے کہ ان میں ذاتی سوانح ہوں گے یا ان سے عہد غالب کے بارے میں نہایت دلچسپ معلومات مہیا ہو جائیں گی جن کا اور کوئی ذریعہ اور کوئی ماخذ نظر نہیں آتا۔ لیکن مرزا غالب کا کمال یہ ہے کہ انہی مکاتیب سے ان کے مکمل سوانح حیات تیار کیے جا سکتے ہیں اور سب نہیں تو اکثر وقائع حیات کی تفصیلات معلوم کی جا سکتی ہیں۔ انہی مکاتیب سے ہم وقت کے انتظامی، سیاسی، تمدنی اور معاشرتی نقشے کے ایک ایک خانے میں رنگ بھر سکتے ہیں۔ میرے سامنے اور مثالیں بھی ہیں لیکن یہاں ان پر بحث کا رشتۂ بیان کھل جائے تو اسے سمیٹنا مشکل ہو جائے گا اور تحریر بہت پھیل جائے گی۔

نقوش کا آپ بیتی نمبر

مجھے یہ سن کر انتہائی خوشی ہوئی کہ نقوش کے جدت طراز مدیر نے آپ بیتی کا خاص نمبر مرتب کیا اور اس کے لیے ذاتی سوانح کا بہت سا ذخیرہ اکٹھا کر لیا۔ میں نے وہ مرقع دیکھا نہیں اس لیے کہہ نہیں سکتا کہ اس میں کیا کچھ آ گیا ہے اور کیا کچھ باقی رہ گیا ہے لیکن یہ جانتا ہوں کہ آپ بیتی کا ذخیرہ یکجا کر دینا ایک نہایت ضروری کام تھا۔ دوسرے کاموں کی طرح اس کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے "نقوش" کو سبقت کے شرف سے مشرف کیا۔ خدا کرے "نقوش" کے دوسرے خاص نمبروں کی طرح یہ نمبر بھی اپنی مثال آپ بن جائے اور اہل ذوق کے لیے لذت طعام کے علاوہ شیخ علی حزیں کے قول کے مطابق عبرت و موعظت کا بہترین سرمایہ ثابت ہو۔ "ادب برائے ادب" کا کوئی مطلب میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا۔ "ادب برائے اصلاح فکر و نظر" "ادب برائے تزئین احوال" "ادب برائے سربلندی انسانیت" ایک شایاں نصب العین ہے، جس کے لیے ایک باہمت اور بلند حوصلہ انسان زندگی کے قیمتی اوقات بے دریغ قربان کر سکتا ہے۔ خدا کرے "نقوش" کا یہ خاص نمبر اس اہم فرض کی بجا آوری کا بھی ایک قابل قدر ذریعہ ثابت ہو۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

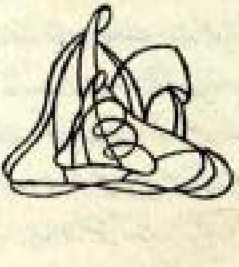

علم الدین سالک

آپ بیتیوں کے بعض نمایاں پہلو

سوانح نگاری ایک قسم کی تاریخ ہوتی ہے۔ تاریخ میں ایک قوم یا ایک ملک کے واقعات مربوط کر کے بیان کیے جاتے ہیں مگر سوانح نگاری میں انفرادیت کا پہلو غالب ہوتا ہے اور یہ ایک فردِ واحد کی زندگی کے کارناموں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ افسانے کا رنگ رکھتی ہے مگر افسانہ نہیں ہوتی۔ افسانہ خیال ہوتا ہے اور یہ حقیقت۔ اس میں صحتِ واقعات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ البتہ اس میں لکھنے والے کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اسے اس انداز سے لکھے کہ یہ آرٹ کا ایک دلکش مرقع بن جائے۔

بعض حالتوں میں سوانح نگار دوسروں کی بجائے اپنی ہی سرگزشت کو موضوعِ سخن بناتا ہے اور جن واقعات کو وہ اپنے نقطۂ نظر سے اہم اور ضروری سمجھتا ہے لکھتا ہے اور باقیوں کو خواہ وہ دوسروں کی نظر میں کتنی ہی اہمیت کیوں نہ رکھیں قلم زد کر دیتا ہے۔ بعض آپ بیتی لکھنے والے اپنی زندگی کے برے بھلے واقعات اور حادثات کو بیان کرنا آپ بیتی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔

آپ بیتی اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ انسان خود۔ اس کا آغاز انسان کے آغاز کے ساتھ ہوا۔ زمانے کی گردش نے آپ بیتیوں کے نام و نشان مٹا دیے تاہم بعض زبانوں میں آج سے ہزاروں سال پہلے کی لکھی ہوئی آپ بیتیاں موجود ہیں۔

فارسی زبان اور اردو زبان میں بڑا گہرا رشتہ ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ اُردو فارسی کے بغیر نمک بے کیف اور گل بے رنگ ہے تو بے جا نہ ہوگا مگر اُردو میں ابھی تک حسنِ بیان کے وہ شوخ نمونے کم ہی ہیں جو ہمیں فارسی ادب میں ملتے ہیں۔ اُردو زبان کی عمر بھی کتنی ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن۔ اس کے علاوہ فارسی زبان کو امراء، وزراء اور درباروں کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ اُردو کو جب شاہی درباروں کی سرپرستی نصیب ہوئی تو بادشاہیاں اور دربار ایک ایک کر کے مٹ گئے۔ تاہم اُردو میں وہ خوبیاں موجود ہیں جن کی بدولت وہ ہر قسم کی سرپرستیوں کے نہ ہونے کے باوجود اپنا مقام خود پیدا کر رہی ہے اور وہ وقت دور نہیں جب اس کے خزانے علم و ادب کے جواہر پاروں سے مالا مال ہو جائیں گے۔

فارسی ادبیات میں تاریخی ادب ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔ اس میں تاریخ عمومی اور مقامی تاریخ کی بے شمار کتابیں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ علماء، صوفیاء، امراء اور شعراء کے تذکرے بھی ہیں۔ تاریخ کی ان تمام اصناف میں ہر مصنف نے تاریخ اور تذکروں کے آخر میں آپ بیتی کے طور پر اپنے متعلق بہت سے حالات لکھ دیے ہیں۔ اگر انہیں یکجا کر لیا جائے تو آپ بیتیوں کا ایک بیش بہا مرقع تیار ہو سکتا ہے۔ ان کے علاوہ فارسی ادب میں مستقل آپ بیتیاں بھی لکھی گئی ہیں جن کے مصنف بادشاہ، وزیر اور ادیب ہیں۔ ان میں سے کچھ طبع ہو چکی ہیں۔ بعض ابھی تک مسودوں میں پڑی ہیں اور بعض گردشِ روزگار کا شکار ہو کر صفحۂ دنیا سے ناپید ہو چکی ہیں۔ ان آپ بیتیوں میں بعض بے حد دلچسپ ہیں۔ بعض میں حکمت اور موعظت کے موتی اچھلتے نظر آتے ہیں اور بعض اپنے زمانے کے تمدن، معاشرت اور ثقافت

کی منظر کشی کرتی ہیں۔ ان کتابوں کی مدد سے تاریخ کے خشک واقعات میں رنگ بھر کر دلکشی کے سامان پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ آج ہماری تاریخ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ واقعات کی کھتونی اور جنگ و جدل کا ایک مرقع ہے جس میں درباری رسوم اور جنگ و جدل کی مار دھاڑ کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ اگر ان کے ساتھ آپ بیتیوں کو ملا کر پڑھا جائے تو وہ چیز جسے عوام کی سرگرمیوں کی تاریخ کہا جا سکتا ہے اور جس پر اہلِ یورپ کو ناز ہے، بڑی آسانی کے ساتھ مرتب ہو سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ ہم نے ابھی تک انھیں درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور اپنی توجہ اس جانب مبذول نہیں کی۔

بابر کی تزک ہو یا فتوحاتِ فیروز شاہی، جہانگیر نامہ ہو یا رقعاتِ عالمگیری ہم زیادہ سے زیادہ ان کے بارے میں یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ واقعات دلکش، زبان سلیس اور اندازِ بیان شگفتہ ہے یا اس سے بڑھ کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ مصنف نے قدرتِ زبان کی بدولت فلاں واقعہ بیان کرتے ہوئے وہ سماں باندھا ہے کہ اس کا ہو بہو نقشہ سامنے آ گیا ہے۔ حالانکہ ان کتابوں کی قدر و منزلت ان باتوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔

ہر دور اپنی مخصوص تہذیب رکھتا ہے۔ اس کے بنیادی خدوخال تو صدیوں کے بعد تبدیل ہوتے ہیں مگر فروعی چیزیں ہر دور اور ہر زمانے میں بدلتی رہتی ہیں۔ ان کی نشاندہی عام تاریخی کتابیں نہیں کر سکتیں۔ ہمیں ان کے لیے آپ بیتیوں کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ کیونکہ ان کی مدد سے ہم ایک قوم، ایک ملت اور ایک ملک کی تہذیب کی ابتدا اور عہد بہ عہد ترقیوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو تاریخ کے طالب علم کے لیے بڑی ضروری اور بڑی اہم ہے۔

ہندو اور مسلم دور کے بعد جب برطانیہ کا زمانہ آیا تو بہت سے سپاہیوں، مدبروں اور حکمرانوں نے اپنے سوانحِ حیات مرتب کیے۔ یہ سب کتابیں سیاسی نقطۂ نظر سے تیار ہوئیں۔ ان میں جو آپ بیتیاں بڑے بڑے عہدیداروں نے لکھی ہیں ان میں بڑی عیاری اور پرکاری کے ساتھ جھوٹ اور سچ کو آپس میں اس طرح سمو دیا گیا ہے کہ ان کا ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ وہ اپنی خامیوں اور برائیوں کو ہنرمندی کا رنگ دیتے ہیں۔ شکستوں کو ایسے وجوہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو یقین ہو جاتا ہے کہ اگر وہ اس وقت پسپائی کا راستہ اختیار نہ کرتے تو تباہی اور بربادی کا شکار ہو جاتے۔ ان کے مظالم کی داستان اور ان کی بدعہدیوں کے افسانے یوں سامنے آتے ہیں کہ ہم خود اپنی نظروں میں ذلیل ہو جاتے ہیں اور بے اختیار پکار اٹھتے ہیں ـ

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا
میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

اسی بنا پر سر جان کیی نے اپنی مشہور کتاب "سپاہی وار" میں لکھا ہے کہ "ہم جب کسی دیسی حکمران کے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اس پر طرح طرح کے الزام لگا کر اسے بدنام کرتے ہیں، پھر اس کے ملک پر قبضہ کر لیتے ہیں۔" البتہ معمولی سپاہیوں اور چھوٹے چھوٹے افسروں کی آپ بیتیاں یا ڈائریاں ان سے مستثنیٰ ہیں۔ وہ تلبیس کاری کے بجائے صاف گوئی سے کام لیتے ہیں اور واقعات بلا کم و کاست بیان کر دیتے ہیں۔ ان سے نتیجہ نکالنا قاری کا اپنا کام ہے۔

بابر نامہ

فارسی اور اردو میں بے شمار آپ بیتیاں لکھی گئی ہیں۔ ان سب پر تبصرہ کرنا اور ان کی خوبیوں کو اجاگر کرنا دشوار ہے اس لیے

سر دست چند آپ بیتیوں کے بعض خاص خاص پہلو نمایاں کیے جاتے ہیں تاکہ تاریخ کے کچھ گوشے بے نقاب ہو جائیں اور لکھنے والے کی ہمہ گیر شخصیت کا کچھ اندازہ ہو جائے۔ سب سے پہلے بابر کی آپ بیتی یعنی بابر نامہ یا تزک بابری ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس کتاب کو جو اہمیت حاصل ہے اور بادشاہوں یا شہنشاہوں کی آپ بیتیوں میں اسے ایک منفرد حیثیت حاصل ہے۔ اس کے پڑھنے سے ایک بات بہت سامنے واضح طور پر آجاتی ہے کہ اس کا مصنف فطرتِ انسانی کا بہت بڑا نباض ہے اور اس کی نظر جزئیات تک جاتی ہے۔ اس نے اشیا کا اتنا گہرا مطالعہ کیا ہے کہ عام مورخ کی نگاہ وہاں نہیں پہنچتی وہ مقام اس کے سامنے پیش پا افتادہ ہے۔ وہ جس علاقے کا ذکر کرتا ہے اس کی آب و ہوا، وہاں کی پیداوار، زمین کی خصوصیات، انسانوں کے چلن یہاں تک کہ زبان کے جوڑ جوڑ کو الگ الگ کر کے اپنے قاری کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ ان چیزوں کو پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بابر نہ صرف انسانی فطرت کا راز دار ہے بلکہ وہ اس علاقے کے لوگوں کی سیرت اور کردار کو بھی خوب سمجھتا ہے۔ کہیں کہیں وہ نئے تجربات بھی کرتا ہے مثلاً ایک دفعہ اس نے یہ دیکھنا چاہا کہ شراب جو مردوں میں خرمستی پیدا کرتی ہے اس کا اثر عورت کی طبیعت پر کیا ہوتا ہے۔ عورت کی زندگی کے اس پہلو کا مطالعہ کرنے کے لیے ایک عورت جمیل آغا کو انتخاب کیا جاتا ہے۔ بابر ایک اوٹ میں چھپ جاتا ہے۔ اسے شراب پلائی جاتی ہے۔ نشہ کے ساتھ ساتھ اس کی جو حالت ہوتی ہے اور اس کی طبیعت میں جو تغیر و تبدل رونما ہوتا ہے بابر یہ کہہ کر بیان کرتا ہے کہ "عورت کی جنس اس فطرت شراب کے لیے موزوں نہیں۔" یہ فقرہ بہت بلیغ ہے۔ اس پر زیادہ لکھنا اس وقت کے معاشرے کے آئین کے خلاف تھا۔

اس زمانے میں عورت کو معاشرے میں جو مقام حاصل تھا اس کے بارے میں یقین یا تفصیل کے ساتھ کسی مورخ نے نہیں لکھا عام طور پر خیال یہی کیا جاتا ہے کہ عورت محلات کی زینت ہوتی تھی مگر بابر کی آپ بیتی پڑھنے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ عورت نہ صرف خود بڑے بڑے کارنامے انجام دے سکتی ہے بلکہ وہ اپنی اولاد کو بھی عظیم انسان بنا سکتی ہے۔ وہ بابر نامہ کی ابتدا میں کہتا ہے کہ میری زندگی کو بنانے والی دو عورتیں ہیں۔ ایک میری نانی 'ایسان دولت' اور دوسری میری ماں 'قتلق نگار خانم'۔ انہوں نے مصائب و آلام، بدبختی و بدنصیبی، خوش حالی اور فارغ البالی، فتح و شکست میں سایے کی طرح میرا ساتھ دیا۔ میں جو کچھ ہوں وہ ان کی وجہ سے ہوں۔ اس کے بعد وہ اپنی نانی کا ایک ایسا زریں کارنامہ بیان کرتا ہے جس سے اکثر خاندانوں کی تاریخ یکسر خالی ہے۔

بابر کا یہ بیان آلِ بابر کے لیے مشعلِ راہ کا کام دیتا رہا ہے اور اس کی بدولت اس خاندان نے جلیل القدر عورتیں پیدا کیں جن کی زندگی آج بھی ہزیمت خوردہ دلوں کو پیغامِ حیات بخش رہی ہے۔ تاریخ کے اوراق پر ایسی جلیل القدر ہستیوں کا ذکر آنا ہمارے معاشرے میں ایک ایسا خوشگوار تغیر پیدا کر سکتا ہے جو ملت کو ذہنی غلامی سے نجات دلا سکتا ہے۔

بابر ایک خوش نصیب سپاہی، رعایا نواز بادشاہ، فارسی اور ترکی کا زبردست ادیب اور یگانہ روزگار انسان تھا جس کا دامن طرح طرح کے کمالات سے لبریز تھا۔ وہ تیمور کی چھٹی پشت سے تھا اس لیے اسے ورثے میں تیمور کی علم نوازی اور ادب پروری ملی۔ اس کے ساتھ شجاعت، مستقل مزاجی، حوصلہ مندی سے بھی اسے حصۂ وافر ملا۔ اس نے اپنے واقعاتِ زندگی لکھے۔ اس میں کئی خامیاں ہیں مگر جو کچھ ہم تک پہنچا ہے وہ بڑا دلچسپ مرقع ہے جس میں قسم قسم کی تصویریں جلوہ آرائی کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے سامنے اس کا باپ عمر شیخ مرزا تھا۔ اس میں بھی تیموریوں کی تمام خصوصیات بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ بابر اس کی قلمی تصویر یوں پیش کرتا ہے:۔

> "ان کے اخلاق و اطوار ایسے تھے۔ وہ حنفی مذہب رکھتے تھے اور بڑے خوش اعتقاد انسان تھے پانچوں وقت کی نماز پڑھتے تھے۔ بیشتر قرآن شریف کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ وہ خواجہ عبیداللہ احرار کے مرید تھے۔ اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ حضرت خواجہ انہیں فرزند کہا کرتے تھے۔ میرے والد اچھے خاصے پڑھے لکھے انسان تھے خمسہ نظامی خمسہ امیر اور مثنوی مولانا روم اور تاریخ کی کتب اکثر ان کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ شاہنامہ بھی اکثر ان کے زیر مطالعہ رہتا تھا۔ وہ موزوں طبع تھے مگر شعر گوئی کی جانب توجہ نہ کی۔"
>
> (توزک بابری ص ۴۰)

بابر کا نانا منگولیا کا خان اعظم یونس خاں تھا جسے اس کے علمی تبحر کی وجہ سے استاد یونس خاں کہا کرتے تھے۔ یونس خاں نے اپنی بیٹیوں کو بھی زیورِ علم سے آراستہ کیا تھا۔ بابر کو علم کی دولت ماں اور باپ دونوں سے ملی۔ عمر شیخ نے اسے بلند پایہ اساتذہ سے تعلیم دلوائی۔ بابر اپنے ایک استاد شیخ مزید بیگ کی خوبیوں کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے:۔

> "وہ میرے پہلے اتالیق ہیں۔ ان کے قاعدے اور قرینے بہت اچھے تھے۔ وہ بابر میرزا ابن بایسنغر میرزا کی خدمت میں بھی رہے تھے۔ عمر شیخ میرزا کی سرکار میں ان سے بڑا کوئی امیر نہ تھا۔"

اپنے ایک اور استاد مولانا قاضی عبداللہ کے بارے میں بابر لکھتا ہے:۔

> "خواجہ مولانا قاضی کا نام عبداللہ اور عرف خواجہ مولانا تھا۔ باپ کی طرف سے ان کا نسب شیخ برہان الدین قلیج تک اور ماں کی جانب سے سلطان ایلیک تک پہنچتا ہے۔ فرغانہ کے علاقے میں اس خاندان کے افراد پیشوائی، شیخ الاسلامی اور قضاۃ کے عہدوں پر فائز رہے خواجہ مولانا حضرت خواجہ عبیداللہ احرار کے مرید تھے۔ ان ہی سے تربیت پائی۔ مجھے ان کے ولی ہونے میں کوئی شک نہیں۔ مولانا عجیب شخص تھے۔ ڈر اور خوف ان میں نام کو بھی نہ تھا۔ میں نے ایسا دلیر اور نڈر آدمی نہ کبھی دیکھا تھا نہ سنا۔ دنیادار کتنے ہی بہادر کیوں نہ ہوں مگر انہیں کچھ نہ کچھ دھڑکا لگا ہی رہتا ہے۔ خواجہ اس سے بالکل پاک اور مبرا تھے۔"

تزک کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بابر کو کلام پاک، سعدی کی گلستان اور بوستان، فردوسی کے شاہنامہ، خواجہ نظامی گنجوی کے خمسہ، حضرت امیر خسرو دہلوی کے خمسہ، مولانا شرف الدین علی یزدی کے ظفر نامہ اور مولانا منہاج الدین سراج جوزجانی کی طبقات ناصری سے ایک خاص رغبت تھی۔ وہ ان کا ذکر تزک میں جا بجا کرتا ہے۔ ترکی زبان اس کی مادری زبان تھی جس میں وہ شعر کہتا اور اپنا روزنامچہ لکھتا تھا جسے آج بابرنامہ یا توزک بابری کہا جاتا ہے۔

بابر کا زمانہ شعر و ادب کا زمانہ تھا۔ اکثر شعرا اس کے ہاں راہ و رسم رکھتے تھے۔ بابر نے توزک میں ان کے کلام پر تبصرہ

بھی کیا ہے جس سے اس کے صحیح ادبی مذاق کا پتہ چلتا ہے۔ اس نے جس شاعر کے متعلق جو رائے دی ہے وہ اتنی صحیح ہے کہ کوئی ماہر فن اس سے اچھی تنقید نہیں کر سکتا۔

میر علی شیر نوائی کے متعلق لکھتا ہے کہ وہ بے نظیر آدمی تھا۔ ترکی میں شعر کہتا تھا اور ایسا کہتا تھا کہ دوسرا ایک کہے گا۔ اس نے ترکی میں چھ مثنویاں لکھیں۔ پانچ خمسہ نظامی کے جواب میں اور ایک عطار کی منطق الطیر کے وزن پر لسان الطیر کے نام سے۔ اس نے غزلوں کے چار دیوان چھوڑے۔ ان کے علاوہ اس کی اور بھی تصانیف ہیں جو ان سے کمتر درجہ رکھتی ہیں۔ اس نے عروض پر ایک رسالہ بھی لکھا۔ اس کا ایک فارسی دیوان بھی ہے۔ فارسی میں وہ فانی تخلص کرتا تھا۔ اس کے بعض اشعار برے نہیں مگر اکثر گرے ہوئے ہیں۔ اس نے فن موسیقی میں بھی اچھی چیزیں لکھی ہیں۔ وہ اہل فضل و ہنر کا بہت قدردان اور مربی ہے۔ علی شیر نوائی جیسا دوسرا آدمی پیدا ہونا دشوار ہے۔

ایک شاعر شیخم بیگ سہیلی کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے:۔

> " اس نے سہیلی تخلص رکھا اس واسطے وہ شیخم سہیلی مشہور ہو گیا۔ وہ اس قسم کے شعر کہتا ہے جن میں ڈراؤنے الفاظ اور معانی ہوتے ہیں۔ اس کا ایک شعر یہ ہے ؎
>
> شب غم گرد باد آہم ز جائے برد گردوں را
> فرو برد اژدہائے سیل اشکم ربع مسکوں را
>
> کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اس نے یہی شعر مولانا عبدالرحمن جامی کے سامنے پڑھا۔ مولانا نے ہنس کر فرمایا کہ آپ شعر کہتے ہیں یا آدمی کو ڈراتے ہیں۔ اس نے دیوان بھی مرتب کیا ہے اور مثنویاں بھی لکھی ہیں:"

بابر کے معاصرین میں ایک شاعر آصفی بھی تھا۔ بابر کہتا ہے کہ "اس کے اشعار با معنی اور رنگین ہوتے ہیں مگر وہ عشق و حال دونوں سے خالی ہیں:"

ایک اور شاعر بنائی ہروی تھا۔ اس کا باپ استاد محمد بنا یعنی معمار تھا۔ اس کی غزلوں میں رنگ اور حال دونوں واقع ہیں۔ اس نے مثنویاں بھی لکھیں۔ ایک میوہ کے تعلق میں ہے۔ یہ بڑی لغو ہے۔

ایک شاعر صیفی بخاری تھا۔ اس کی شاعری بقول بابر "بڑی معمولی تھی"۔ ہاتفی بھی اسی دور کا شاعر ہے۔ اس نے خمسہ کے مقابلے میں مثنویاں لکھیں جن میں ایک تیمور نامہ بھی ہے جو ہفت پیکر کا جواب ہے مگر لیلیٰ مجنوں اس کی مشہور مثنوی ہے۔ یہ مثنوی جیسی شہرت رکھتی ہے ویسی نہیں۔

بابر نے اپنے معاصرین میں سے اور شاعروں پر بھی اسی طرح تنقید کی ہے مگر اس کا اپنا سب سے بڑا کارنامہ بابر نامہ ہے جس میں اس نے اپنی طبیعت کے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں اور اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاں پہنچا وہاں اس نے انسانوں اور حیوانوں کا بڑا گہرا مطالعہ کیا اور ان کے بارے میں اپنی جچی تلی رائے دی۔

جب بابر ہندوستان میں آیا تو اس نے اس ملک کے تمدن اور تہذیب کے بارے میں جو کچھ لکھا وہ آج بھی کم و بیش کہیں کہیں اسی صورت میں موجود ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ”اس کے آدمیوں میں نہ تو ظاہری حسن ہے اور نہ وہ اچھی طرح میل ملاپ کر سکتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں نہ تو ادراک و ادب ہے نہ کوئی مروّت۔“

آگے چل کر وہ کہتا ہے ”یہاں گھوڑا خوب نہیں۔ گوشت اچھا نہیں ملتا۔ انگور، خربوزہ اور اچھے میوے میسر نہیں آتے۔ برف اور ٹھنڈا پانی بھی نہیں۔ اس کے بازاروں میں عمدہ کھانا اور اچھی روٹی نہیں ملتی۔ یہاں حمام نہیں، مدرسے نہیں، شمع اور مشعل سے یہاں کے لوگ ناواقف ہیں۔ شمعدان نہیں۔ شمع کی جگہ مشعل سے کام لیتے ہیں۔ یہاں ڈیوٹ ہوتی ہے جو بہت میلی کچیلی ہوتی ہے۔ علاوہ اکثر لوگ اسے ہی استعمال کرتے ہیں۔ شمعدان بنانے کے لیے لوہے کو لکڑی میں گاڑ دیتے ہیں۔ ایک ہاتھ میں تونبی ہوتی ہے جس میں ایک تنگ سوراخ ہوتا ہے۔ یہاں سے تیل کی پتلی دھار شمعدان میں گرتی ہے۔ بادشاہوں اور امیروں کے ہاں اگر شمع کی ضرورت پڑے تو اسی گندی ڈیوٹ پر چراغ رکھ کر لاتے ہیں۔ باغ اچھے نہیں ہوتے۔ نہ ان میں عمارت ہوتی ہے نہ آب رواں کا بندوبست ہوتا ہے۔ ان کی عمارتوں میں صفائی اور ہوا کا گزر نہیں۔ لوگ ننگے پاؤں چلتے ہیں۔ لنگوٹ باندھتے ہیں۔ ان کی عورتیں دھوتی یا لنگی باندھتی ہیں۔ نصف سر کے اوپر لیتی ہیں اور نصف کمر کے گرد باندھتی ہیں۔ ہندوستان میں دستکار اور صنعت کار بکثرت ملتے ہیں۔ ہر کام کے لیے بیشمار پیشہ ور موجود ہیں۔ پیشہ باپ سے بیٹے کو ورثہ میں ملتا ہے۔ آگرہ میں سنگتراش بکثرت ہیں۔ آگرہ میں جو عمارات میں بنوا رہا ہوں ان میں روزانہ چھ سو اسی (۶۸۰) کے قریب آدمی کام کرتے ہیں۔ اسی طرح سیکری، بیانہ، دولت پور، گوالیار، کول (علی گڑھ) میں جو عمارتیں بنوا رہا ہوں ان میں روزانہ ایک ہزار چار سو چھیانوے (۱۴۹۶) سنگتراش کام کر رہے ہیں۔ اس سے دوسرے پیشوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔“

بابر جب پہلی مرتبہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور مار دھاڑ کرتا بھیرہ تک پہنچا تو واپسی پر اسے ایک مقام پر سنبل کا درخت نظر آیا۔ اس نے اب تک اس کا نام ہی سنا تھا۔ اب اسے اچھی طرح دیکھا اور بہت خوش ہوا۔ وہ تزک میں لکھتا ہے کہ ”سنبل کے درخت کی آرزو تھی۔ اس پہاڑ پر وہ درخت دیکھا گیا۔ اس پہاڑ کے دامن میں سنبل کے درخت کم ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں اکا دکا ایک آدھ درخت ہوتا ہے لیکن ہندوستان کے پہاڑوں کے دامن میں سنبل کا درخت کثیر تعداد میں ہوتا ہے اور رنگا رنگ ہیں۔“

(بابرنامہ ص ۷۴۱، بمبئی ایڈیشن)

گوالیار میں اس کا ایک مرتبہ پڑاؤ ہوا۔ معلوم ہوا کہ وہاں سے چھ کوس کے فاصلے پر جنوب مشرق کی جانب ایک خوبصورت آبشار ہے۔ وہ اسے دیکھنے کے لیے روانہ ہوا۔ جنگل میں آبنوس کے درخت نظر آئے۔ وہ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اپنے ہمراہیوں کو جنہوں نے ابھی تک یہ درخت نہیں دیکھا تھا بتایا کہ یہ آبنوس کا درخت ہے۔ چنانچہ بابرنامہ میں لکھتا ہے:۔

”درخت آبنوس را کہ اہل ہند تیندو گویند بمردمے کہ ندیدہ بودند نمودہ شد۔“ (ص ۳۳۶)

بابر کا قیام ہندوستان میں چھ برس تک رہا۔ اس عرصے میں اسے اطمینان کا سانس لینا نصیب نہ ہوا۔ زیادہ وقت فتوحات اور امن و امان کے قیام میں بسر ہوا تاہم اس نے یہاں کی زبان سے اچھی خاصی واقفیت حاصل کر لی۔ تزک میں وہ یہاں کے جنوبی

کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:-

"نام حاکم ایں ولایت نواب بچہ آب سروان ملک "بہت" بود۔ نام اصل اسد بود و ہندوستانیاں ایں چنیں حرکت را گاہے ساکن می خوانند چنانچہ نبتر را نبیری گویند۔ اسد را اسد گفتہ اند۔ رفتہ رفتہ بہت شد۔" (ص ۱۳۱)

وہ آم کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے:-

یکے انب است۔ اکثر مردم ہندوستان "ب" را بے حرکت تلفظ کنند۔"

پنجاب میں آم کو اب بھی انب ہی کہتے ہیں۔ انب ثمرے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ بعض اسے نغزک بولتے ہیں۔ بابر کے الفاظ ہیں:-

"چوں بد تلفظ می شود بعضے نغزک گفتہ اند، چنانچہ امیر خسرو گفتہ ؎

نغزک ما نغز کن بوستاں
نغز ترین میوۂ ہندوستاں"

آم کا نام سلطان شمس الدین التمش نے نغزک رکھا تھا۔ اس کی تائید سلطان الاولیاء حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات سے ہوتی ہے:-

"سلطان شمس الدین فرمود کہ او وقتے در بداؤوں آمد، نغزک چند پیش او آوردند۔ آں جا نغزک نیک شیریں باشد۔ چوں بخورد گفت ایں را چہ گویند؟ گفتند ایں را آم گویند اگر بزبان ترکی ام چیزے قبیح را گویند۔ سلطان فرمود ایں را نغزک باید گفت۔ چوں ایں نام بلفظ مبارک او رفت ہمیں نام شد۔" فوائد الفواد (ص ۲۲۵)

بابر کہتا ہے کہ اہلِ ہند "ش" کا تلفظ "س" کرتے ہیں۔ بعض اوقات الف کو گرا دیتے ہیں۔ مثلاً کالے ہرن کو ہندوستانی کل ہرن کہتے ہیں جو دراصل کالا ہرن ہے۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے بابر نامہ کی اہمیت خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔

جہانگیر نامہ

جہانگیر نامہ یعنی تزک جہانگیری بھی ایک اہم دستاویز ہے جسے شاہی آپ بیتیوں میں بڑا اونچا مقام حاصل ہے۔ یہ اپنی جگہ ایک ایسی کتاب ہے جس سے ہم جہانگیر کے مذاق کا نہایت صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس نے واقعات کا تسلسل قائم رکھنے کے بجائے فقط انھی واقعات کا ذکر کیا ہے جو اس کی طبیعت پر اثر انداز ہوئے۔ وہ جس واقعے کے بارے میں قلم اٹھاتا ہے اسے بلا کم و کاست بیان کرتا ہے۔ وہ نہ اپنی برائیوں پر پردہ ڈالتا ہے نہ اپنی خوبیوں کو اجاگر کرتے وقت حجاب محسوس کرتا ہے۔ وہ شراب پیتا ہے تو اس کا ذکر کرتا ہے اور اگر رات کے پچھلے پہر اللہ اللہ کرتا ہے تو اس کا حال بھی لکھتا ہے۔

جہانگیر درحقیقت ایک فن کار تھا۔ اگر وہ شاعری اور مصوری میں پڑتا تو آج اس کا مقام اتنا بلند ہوتا کہ اس کے فن پر کتابیں لکھی جاتیں۔ وہ حیوانات اور نباتات سے ایک خاص لگاؤ رکھتا ہے۔ وہ ان کا گہرا مطالعہ کرتا ہے۔ ان کے حسن اور خوبیوں سے متاثر ہوتا ہے اور بعض حیوانوں کی خاص خاص خوبیوں کو تزک میں بیان کرتا ہے۔ جو نتائج اس نے اخذ کئے ہیں آج بھی علم حیوانات و نباتات کی اتنی ترقی کے باوجود اس میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔ اگر وہ نیچرل سائنس کا پروفیسر ہوتا تو وہ بہت سے نئے نظریات آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑ جاتا مگر سلطنت کے جھمیلوں اور سیاست کے بکھیڑوں نے اسے کہیں کا نہ رکھا۔ تاہم شعر و ادب کا تذکرہ ہو یا خطاطی و مصوری کا، پہاڑوں اور جنگلوں کے حسین و جمیل مناظر ہوں یا بہتے ہوئے پانی کی مست خرامی اور آبشاروں کی ترنم ریزی، ان سب کا ذکر وہ ایک والہانہ انداز سے کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنا روزنامچہ لکھتے وقت ان سے محظوظ ہو رہا ہے۔

مصوری کے متعلق تو اس کا دعویٰ تھا کہ:۔

> "مرا ذوقِ تصویر و مہارتِ تمیزِ او بجائے رسید کہ از استادانِ گذشتہ و حال ہر کس بنظر درمی آمد
> بے آنکہ نامش مذکور شود بہ بدیہہ دریابم کہ کار فلان ست:"

اس سے بڑھ کر اسے یہ بھی دعویٰ ہے کہ اگر ایک تصویر جس میں چند چہرے ہوں اور ہر چہرہ الگ الگ استادوں نے بنایا ہو تو میں بتا سکتا ہوں کہ یہ چہرہ کس نے بنایا ہے اور اگر ایک صورت کو کئی استادوں نے مل کر بنایا ہو تو میں بتا سکتا ہوں کہ آنکھ کس نے بنائی ہے ابرو کس نے تیار کیے ہیں اور چہرہ کس کے موقلم کا نتیجہ ہے۔ اس کی تائید ایک واقعہ سے ہوتی ہے جس کا ذکر جہانگیر نے تزک میں تو نہیں کیا مگر بعض تذکرہ نگاروں نے اسے بیان کیا ہے۔ ان میں سرخوش اور والہ داغستانی کے ہاں اس واقعہ کی جزئیات میں کچھ ایسا زیادہ فرق نہیں ملتا۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک مصور ایک تصویر لے کر جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تصویر یوں تھی کہ ایک عورت نہا رہی ہے اور اس کی باندیاں اس کا سنگار کر رہی ہیں۔ جہانگیر نے تصویر دیکھتے ہی حکم دیا کہ اسے تین ہزار روپے دے دیے جائیں۔ مصور نے کہا کہ مجھے اس سے زیادہ اس تصویر کی قیمت مل رہی ہے مگر میں نے اسے فروخت نہیں کیا۔ میں جہاں پناہ سے اتنا دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ حضور کس بات کی قدر افزائی فرما رہے ہیں؟ جہانگیر نے کہا کہ نہانے کے بعد لونڈی بیگم کو جھانواں کر رہی ہے اس سے خفیف سی گدگدی پیدا ہوتی ہے اس کا اثر تم نے تصویر کے چہرے پر دکھایا ہے یہ اس کی قیمت ہے۔ مصور نے بڑھ کر قدم چوم لیے اور ہمیشہ کے لیے اس کا ہو رہا۔

جہانگیر کو مصوری سے اتنا لگاؤ تھا کہ وہ سفر و حضر میں اپنے ساتھ مصور رکھا کرتا تھا۔ اسے اگر کوئی منظر پسند آتا یا کوئی پھول اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لیتا یا کوئی جانور دوسروں سے قدرے مختلف ہوتا تو فوراً مصور کو حکم دیتا اور وہ اس کی تصویر بنا کے اس کے حضور میں پیش کر دیتا۔ تزک میں اس قسم کے واقعات بکثرت ملتے ہیں۔ وہ جب کشمیر گیا تو اس نے کشمیر کے جنگلی درختوں، خودرو پھولوں، سبزہ زاروں اور لالہ زاروں کی تصویریں تیار کرائیں۔ جہانگیر کے اس ذوق کی بدولت کتابی مصوری عالم وجود میں آئی۔ گو اس کی ابتدا اکبر نے کی تھی مگر جہانگیر کی سرپرستی میں آکر اس نے معراج کمال حاصل کیا۔ اس نے اپنے ذوق کی تسکین کے لیے بڑے بڑے اساتذہ کے شاہکار جمع کر کے مرقع جہانگیری تیار کیا جو آج بھی مشرق و مغرب کے مبصروں سے خراج تحسین حاصل کر رہا ہے۔

تصویر اس کے جمالیاتی ذوق کا ایک مظہر ہے۔ اس نے تصویر سے گزر کر ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اپنی مملکت میں جا بجا خوبصورت اور مسحور کن باغات لگوائے۔ کشمیر کا شالامار باغ اسی کی توجہ کا نتیجہ ہے۔ اس کی تختہ بندی قابلِ داد ہے۔ اس کا ایک ایک منظر اپنے اندر شاہانہ شوکت رکھتا ہے۔ آبشار ہوں یا پانی کے جھرنے، فوارے ہوں یا بہتی ہوئی نہریں ان میں سے ہر ایک کا کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست۔ اس کی بارہ دری جسے "نشیمن شاہ بیگم" کہتے ہیں اپنے اندر عجیب دلکشی کے سامان رکھتی ہے۔ اس کے گرداگرد حوض اور فوارے اس کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں۔

یہ تو جہانگیر کا وہ کارنامہ ہے جس کے ذریعے اس نے حسن کو نکھارا ہے۔ اس کے علاوہ وہ شعر و ادب کے حسن سے بھی بیگانہ نہ تھا اس نے ایک بیاض مرتب کی تھی جس میں وہ اساتذہ کے اچھے شعر جو اس کے دل پر اثر انداز ہوتے نقل کر لیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک ہندی شاعر نے ایک اچھوتے مضمون کی نظم اس کے حضور پیش کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر آفتاب کے کوئی بیٹا ہوتا تو کبھی رات نہ ہوتی کیونکہ جب آفتاب چھپ جاتا تو اس کا بیٹا اس کی بجائے عالم افروزی کرتا۔ خداوند تعالیٰ کا شکر ہے کہ آپ کے والد کو اس نے ایسا بیٹا دیا کہ لوگوں نے اس کے انتقال کو محسوس نہ کیا۔ آفتاب کو اس پر رشک ہے کہ آپ کے نصیب کی روشنی اور عدالت کے نور کی وجہ سے سلطنت میں کہیں رات نہیں ہوتی۔ جہانگیر کو یہ مضمون آفرینی بہت پسند آئی۔ چنانچہ اس نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "ایں تازگی مضمون از شعرائے ہند کم بگوش رسیدہ"۔ جہانگیر نے اسے ایک ہاتھی انعام میں دیا اور درباری شعراء کو حکم دیا کہ اس مضمون کو فارسی میں ترجمہ کریں۔ چنانچہ ایک شاعر نے اس کا ترجمہ یوں کیا۔

گر پسر داشتے جہاں افروز
شب نہ گشتے ہمیشہ بودے روز
زانکہ چوں او نہفتے افسر زر
بہ نمودے کلاہ گوشہ پسر
شکر کز بعد آں چناں پدرے
جانشیں گشت ایں چنیں پسرے
کہ ز شنکار گشتنی آں شاہ
کس بہ ماتم نہ کرد جامہ سیاہ

ملا محمد صوفی مازندرانی ایک صاحبِ دل بزرگ اور شاعر تھے۔ زہد و تقویٰ کے ساتھ ساتھ ذوقِ شعر گوئی بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے نہایت بلند پایہ ساقی نامہ بھی لکھا ہے اور "بت خانہ" کے نام سے ایک بیاض بھی مرتب کی ہے۔ وہ ہندوستان آئے اور گھوم پھر کر احمد آباد میں ڈیرے ڈال دیئے۔ گجرات کا گورنر سیف خاں ان کا بڑا معتقد تھا۔ جہانگیر بھی ان کی ملاقات کے لیے بے تاب تھا۔ اس نے سیف خاں کو لکھا۔ اس نے ملا محمد صوفی کو اکبر آباد کی طرف روانہ کیا مگر وہ راستے ہی میں فوت ہو گئے۔ انتقال کے وقت انہوں نے یہ رباعی لکھی اور بادشاہ کے پاس بھجوا دی۔

اے شاہ نہ تخت و نہ نگیں می ماند
از بہر تو دو گز زمیں می ماند
صندوق خود و کاسۂ درویشاں را
خالی کن و پر کن کہ ہمیں می ماند

جہانگیر نے یہ رباعی پڑھی اور اس پر رقت طاری ہو گئی۔

جہانگیر کے ذوقِ شعر و سخن کے بارے میں مولانا شبلی نے شعر العجم میں بہت کچھ لکھا ہے اور ان کے اس مضمون کا ماخذ تزکِ جہانگیری ہے۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی رعایا اور عوام کی بھلائی کے لیے "دوازدہ احکام" جاری کیے جن میں اس کی زنجیرِ عدل خاص طور پر شہرت رکھتی ہے۔ ان احکام پر اس نے عمل کرایا اور وقتاً فوقتاً وہ اصلاحِ معاشرہ کے لیے مزید احکام بھی جاری کرتا رہا۔ بنگال میں خواجہ سرا بنانے کی قبیح رسم پائی جاتی تھی، جہانگیر نے اس انسانیت سوز رسم کو بڑی سختی سے ختم کیا۔

فتوحاتِ فیروز شاہی

فتوحاتِ فیروز شاہی کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ میں اس میں سے چند اقتباسات یہاں درج کرتا ہوں جن پر اس زمانے کے اور بعد کے مورخوں نے بہت کم روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً فیروز شاہ نے شریعت کی پیروی کرتے ہوئے سلطنت کے ڈھانچے کو بدلنے کی کوشش کی۔ اپنے اس اقدام کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:۔

> "مجھ سے پہلے بیت المال میں نامشروع اور حرام مال جمع کیا جاتا تھا۔ مثلاً زرکاری کی منڈی، دلالوں کے بازار، قصاب، پھول بیچنے والے، تنبول، نقد فروش، ماہی فروش، نداف، صابون ساز، ریشم فروش، روغن گر، تہ بازاری، قمار بازی، کاہ چراغی وغیرہ وغیرہ پر محصول چنگی لیا جاتا تھا۔ ہم نے اہلِ دیوان کو ہدایت کر دی ہے کہ اس قسم کی تمام چنگیوں کو ختم کیا جائے اور جو اس کی خلاف ورزی کرے گا اسے سزا دی جائے گی۔ بیت المال میں جو مال آئے وہ شرعِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور کتبِ فقہ کے عین مطابق ہونا چاہیے اور وہ یہ ہیں: زمین کا خراج، عشر، زکوٰۃ، جزیہ، لاوارثوں کا مال، مالِ غنیمت، معدنیات کا خمس۔ جو مال کلام پاک کے حکم کے مطابق نہ ہو اسے بیت المال میں جمع نہ کیا جائے۔"

معاشرے کی اصلاح کے لیے اقدام کرتے ہوئے اس نے حکم دیا:

> "مسلمانوں کے ہاں ایک ایسا رواج ہو گیا تھا جسے اسلام جائز قرار نہیں دیتا۔ متبرک دنوں میں یہاں کی عورتیں پالکی، ڈولی، چھکڑے، ڈولے، گھوڑے اور اونٹ پر سوار ہو کر یا جوق در جوق پیادہ چل کر شہر کے باہر جاتیں۔ مزاروں پر حاضری دیتیں۔ شہر کے بدمعاش اور آوارہ مزاج

اپنی نفسانی خواہشات کی خاطر ان عورتوں کو چھیڑ کر فتنہ و فساد پیدا کرتے تھے۔ بلا عذر عورتوں کا گھروں سے باہر جانا شرعاً ممنوع ہے۔ ہم نے حکم دیا کہ کوئی عورت مزارات کی زیارت کو نہ جائے اور اگر کوئی ایسا کرے تو اسے سزا دی جائے۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے اب مستورات گھروں سے باہر نہیں آتیں، نہ وہ زیارت کو جاتی ہیں۔ اب یہ بدعت دور ہو گئی ہے۔"

"پہلے یہ دستور تھا کہ امیر لوگ سونے اور چاندی کے برتن دسترخوان پر استعمال کرتے تھے۔ تلواروں کے قبضے اور ترکش سونے سے مرصع کر لیا کرتے تھے۔ میں نے اس کے بارے میں حکمِ امتناع جاری کیا اور اس کی بجائے ہتھیاروں کو شکاری جانوروں کی ہڈیوں سے مرصع کیا، اور وہ برتن استعمال کرنے شروع کیے جو شریعت کی رُو سے جائز ہیں۔

کپڑے لوگ ایسے پہنتے تھے جن پر تصویریں بنی ہوتی تھیں۔ شاہی خلعت بھی اسی قسم کے کپڑوں سے تیار ہوتے تھے اور لوگوں کو پہنائے جاتے تھے۔ اسی طرح لگام، زین، سواری کے دوسرے سامان، پیالے، صراحی، لوٹا، خیمے، پردے، تخت اور کرسی کے تمام ساز و سامان تصویروں سے مزین ہوتے تھے۔ خدا کے احکام کی پیروی کرتے ہوئے اور لوگوں کی ہدایت کی خاطر میں نے حکم جاری کیا کہ ان تصویروں کو مٹا دیا جائے اور فقط وہی چیزیں استعمال کی جائیں جو شرعاً جائز ہیں۔ حویلیوں اور محلوں کی دیواروں پر بھی تصویریں نہ بنائی جائیں اور جو بنی ہوئی ہیں وہ مٹا دی جائیں۔ لوگوں کا لباس اکثر ریشمی اور زردوزی ہوتا تھا۔ مردوں کے لیے یہ جائز نہیں۔ میں نے اسے بھی روکا۔ زردوزی کے جھنڈے، زربفت کی ٹوپیاں جن کا عرض چار انگل سے زیادہ نہ ہو جائز قرار دی گئیں۔ اس طرح خلافِ شریعت لباس بھی ختم ہو گیا۔"

فیروز شاہ کی ان اصلاحات کا ہلکا سا خاکہ اگرچہ شمس سراج عفیف نے تاریخ فیروز شاہی میں بھی دیا ہے مگر تفصیلات صرف "فتوحاتِ فیروز شاہی" سے ہی مل سکتی ہیں جس کی وجہ سے اس کی بڑی اہمیت ہے اور زمانہ کا مورخ اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا۔

ملفوظات

آپ بیتی کی ایک صورت صوفیائے کرام کے ملفوظات بھی ہیں۔ صوفیاء جب ہندوستان آئے تو وہ اپنے ساتھ اسلام کی سادگی، اخوت اور مساوات بھی لائے۔ وہ جہاں بھی گئے ان کی صحبت میں ہندو، مسلمان اور اچھوت برابر حاضر ہوتے رہے۔ ان میں سے اکثر کے اخلاق اور کردار سے متاثر ہو کر ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔ وہاں ایک وقت ایسا آتا جب ایک عام مجلس منعقد ہوتی جس میں ہر شخص مذہب و ملت کے اختلاف کے باوجود شریک ہو سکتا تھا۔ یہاں زندگی کے اکثر پہلوؤں پر گفتگو ہوتی۔ کبھی کبھی حالات اور معاشرہ بھی زیر بحث آ جاتا۔ پیرِ طریقت ان موضوعات پر بڑی بے تکلفی سے گفتگو کرتا۔ اس کے بعض مرید جو تقرب کا درجہ رکھتے اشارات لکھتے جاتے۔ مگر

جا کر انہیں مرتب کرتے اور پھر جب جماعت خانے (خانقاہ) میں اپنے مرشد کے حضور میں باریابی حاصل کرتے تو اپنے لکھے ہوئے ملفوظات اپنے مرشد کو سناتے۔ اگر وہ کہہ دیتا کہ تم نے میرے مفہوم کو صحیح صحیح بیان کر دیا ہے تو اس کے دوسرے مرید اس کی نقول حاصل کر لیتے۔ اس طرح یہ حلقۂ خاص سے نکل کر عوام تک پہنچ جاتے۔

یہ ملفوظات عام طور پر تاریخ وار مرتب کیے جاتے تھے۔ ہندوپاکستان میں ان کے مرتب کرنے کا زمانہ شیخ نظام الدین اولیاؒ سے شروع ہوتا ہے، جنہوں نے بڑی احتیاط برتی ہے۔ اس سے پہلے جس قدر ملفوظات مرتب ہوئے ان کی حیثیت مشکوک ہے۔

ملفوظات میں جہاں ایک صاحب سجادہ کے روزمرہ مشاغل کا ذکر ملتا ہے وہاں اس وقت کی سیاست، معاشرت اور لوگوں کی اقتصادی حالت کا علم بھی ہو جاتا ہے۔ اس زمانے کی تعلیم و تربیت کے بارے میں سب سے زیادہ بیش بہا معلومات ہمیں فقط ان ہی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ ان کے پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے فاتح، کشورکشا اور شہنشاہ بھی اکثر مشکلات اور پریشانیوں کے وقت انہی بوریا نشینوں کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ چنانچہ التمش، بلبن، جلال الدین خلجی، علاؤالدین خلجی اور محمد بن تغلق شاہ اکثر ان جماعت خانوں میں حاضر ہو کر اپنی نذرِ عقیدت پیش کیا کرتے تھے۔

ہندوستان میں ہزارہا صوفی گزرے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کے حالات اور ملفوظات ہم تک پہنچے ہیں۔ ان کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ جس بزرگ نے دہلی کے اندر بیٹھ کر اسلام اور قرآنی تعلیمات کی اشاعت منظم طریقے پر کی وہ فقط حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ تھے۔ انہیں ہم آج مختلف ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ کوئی انہیں محبوب الٰہی اور کوئی سلطان الاولیاء کہتا ہے۔ ان کے پیرِ طریقت "بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ" نے ان کو خرقۂ خلافت عطا کرتے وقت یہ فرمایا تھا کہ میں تمہیں "سلطان الہند" بناتا ہوں۔ سلطان کے لیے تلوار لازمی چیز ہے۔ یہ لو قرآن پاک! یہی تمہاری تلوار ہے۔ جب تک اسے تھامے رہو گے اور اس پر عمل کرتے رہو گے تمہیں کامیابی ہی کامیابی نصیب ہوگی۔ انہوں نے اپنے مرشد کی ہدایت کے مطابق زندگی کے آخری لمحے تک قرآن پاک پر عمل کیا۔ آج وہ حقیقتاً "سلطان الہند" ہیں۔ آپ کے ملفوظات بہت سے لوگوں نے جمع کیے ہیں۔ ان میں امیر خسرو بھی ہیں جن کے بارے میں ان کے پیر بھائی حضرت نصیر الدین شاہ چراغ دہلوی نے ایک مجلس میں فرمایا تھا کہ حضرت محبوب الٰہی کے جماعت خانے میں ایک درویش آیا۔ اس نے عسرت اور تنگ دستی کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا کہ آج کی نذر و فتوح تمہاری ہے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اس دن فتوح میں ایک چیتل تک نہ آیا۔ آپ نے فرمایا اچھا کل سہی۔ دوسرے دن بھی ایسا ہی ہوا۔ اس کی پریشانی دیکھ کر آپ نے اپنی کفش اسے عطا کی۔ وہ اسے لے کر روانہ ہوا۔ حضرت امیر خسرو بادشاہ کے ساتھ شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر اس درویش سے ملاقات ہوئی۔ باتوں ہی باتوں میں امیر خسرو نے فرمایا کہ "مرا از تو بوئے پیرِ روشن ضمیر من می آید، شاید کہ از شیخ من نشانی نزدِ خود داری"۔ درویش نے آپ بیتی سنائی جسے سن کر امیر خسرو نے فرمایا: "اس نشانی کو کیا کرو گے؟ مجھے دے دو اور مجھ سے پانچ لاکھ چاندی کے ٹنکے لے لو"۔ درویش راضی ہو گیا۔ حضرت امیر خسرو نے کفش کا جوڑا لیا اور اسے سر پر رکھے اپنے پیرِ طریقت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہیں سارا ماجرا سنایا اور کہا: "درویش اتنی حقیر رقم پر راضی ہو گیا۔ اگر اس جوڑے کے بدلے وہ مجھ سے جان و مال طلب کرتا تو میں دریغ نہ کرتا"۔ یہ اس زمانے کے استاد و شاگرد اور پیر و مرید کے تعلقات کی ایک ہلکی سی جھلک ہے جو ہمیں تاریخ کے صفحات میں نہیں مل سکتی۔

اس زمانے میں مرشد یعنی خانقاہ نشین جید عالم باعمل ہوتا تھا۔ خانقاہ گویا اعلیٰ تعلیم و تربیت کا بہت بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ بعض اوقات مرید اپنے بچے کی تعلیم شروع کرتے وقت اس کی بسم اللہ خوانی اپنے مرشد سے کرایا کرتے تھے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے بھی ایک مرتبہ یہ رسم ادا کی۔ ہفتہ کا روز تھا۔ ۱۰/ محرم ۷۱۹ھ کو خواجہ حسن دہلوی اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ فوائد الفواد میں لکھتے ہیں: "میں اس روز اپنے عزیز کے ایک چھوٹے لڑکے کو ہمراہ لایا تاکہ حضور کی نظر کی برکت سے اللہ تعالیٰ اسے قرآن شریف پڑھنا نصیب کرے۔ آپ نے دعا کی پھر تختی پر دست مبارک سے یہ عبارت لکھی: بسم اللہ الرحمن الرحیم رَبِّ یَسِّرْ وَلَا تُعَسِّرْ ا ب ت ث ج" اور زبان مبارک سے یہ حروف بچے کو پڑھائے۔ اس کے بعد فرمایا: "حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کو جبراً کھینچ کر بہشت میں لایا جائے گا۔ اس حدیث کے متعلق تین قول مشہور ہیں، ایک یہ ہے کہ وہ لوگ یہ بچے ہوں گے جو جبراً مکتب کے پاس لائے جاتے ہیں اور جو بتدریج حروف سے معنی کو پہنچتے ہیں۔"

اپنی ابتدائی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ "بداؤں میں ایک شخص قرآن شریف ساتوں طرح کی قرأت سے پڑھ سکتا تھا۔ وہ نہایت صالح اور صاحب کرامت تھا۔ وہ پہلے ہندو تھا بعد میں مسلمان ہوا۔ اسے شادی مقری کہتے تھے۔ اس کی کرامت یہ تھی کہ جو شخص اس سے قرآن پاک کا ایک ورق پڑھ لیتا اللہ تعالیٰ اسے سارا قرآن کریم پڑھنے کی توفیق عطا کر دیتا۔ میں نے بھی اس سے ایک سیپارہ پڑھا۔ اس کی برکت سے مجھے قرآن شریف حفظ ہو گیا۔

اس کا آقا لاہور میں رہتا تھا جسے خواجگی مقری کہتے تھے۔ وہ بھی بہت ہی بزرگ تھا۔ ایک دفعہ کوئی شخص لہاور (لاہور) سے آیا۔ شادی نے پوچھا 'کیا میرا آقا راضی خوشی ہے؟' اس کا آقا فوت ہو چکا تھا لیکن اس شخص نے مناسب نہ سمجھا کہ اسے وفات کی خبر دے۔ اس نے کہا 'ہاں! وہ سلامت ہے۔' پھر لاہور کے حالات بیان کرنے شروع کیے۔ برسات بڑے زور کی آئی جس سے کئی گھر برباد ہو گئے۔ ایک مرتبہ آگ بھی لگی اس سے کئی گھر جل کر راکھ ہو گئے۔ جب وہ شخص اتنی باتیں بیان کر چکا تو شادی نے کہا 'شاید میرا آقا زندہ نہیں۔' اس شخص نے کہا 'ہاں!' شادی نے کہا 'اگر میرا آقا زندہ ہوتا تو شہر ان حادثات سے دوچار نہ ہوتا۔'"

شیخ نظام الدین اولیاء نے اپنے ایک مرید شیخ عثمان خیرآبادی کا ذکر کیا۔ وہ متقی تھا اور قرآن پاک کا مفسر بھی۔ آپ نے فرمایا "وہ بہت بزرگ آدمی تھا۔ اس نے ایک تفسیر بھی تیار کی۔ وہ شلغم اور چقندر وغیرہ کی سبزی پکایا کرتا اور اسے فروخت کیا کرتا۔ اگر کوئی شخص اسے کھوٹا پیسہ دے جاتا تو وہ دیدہ و دانستہ اسے رکھ لیتا۔ لوگ سمجھتے کہ اسے کھوٹے کھرے کی تمیز نہیں۔ بہت سے آدمی کھوٹے پیسے دے کر کھرے سے بدل لے جاتے۔ جب وہ فوت ہونے لگا تو آسمان کی طرف منہ کر کے اس نے کہا: 'اے پروردگار عالم! تو بھی خوب جانتا ہے کہ لوگ مجھے کھوٹے پیسے دے جایا کرتے تھے، میں انہیں قبول کرتا اور کبھی نہیں لوٹاتا تھا۔ اگر مجھ سے کوئی کھوٹی طاعت ہوئی ہے تو اپنے فضل و کرم سے رد نہ کرنا۔'"

حضرت نصیر الدین شاہ چراغ دہلوی شیخ نظام الدین اولیاء کے مرید تھے۔ ایک دن ان کی مجلس میں سلطان علاؤ الدین خلجی کا ذکر خیر ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے ملک افتخار قاضی حمید الدین نے ایک مرتبہ سنایا کہ ایک بار میں نے علاؤ الدین خلجی کو دیکھا کہ پلنگ پر برہنہ سر زمین پر پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا اور کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں اس کے سامنے گیا تو اسے بالکل خبر نہ ہوئی۔ میں باہر آیا اور رک گیا

سے کہا کہ آج میں نے بادشاہ کو عجیب حالت میں دیکھا ہے۔ تم بھی آؤ، میں تمھیں بھی دکھاتا ہوں۔ وہ میرے ساتھ اندر آ گیا۔ ہم نے بادشاہ کو اسی حالت میں دیکھا۔ ہم اس کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اسے باتوں میں لگانا چاہا۔ باتوں ہی باتوں میں میں نے عرض کیا۔ امیر المومنین! حکم ہو تو کچھ عرض کروں۔ بادشاہ نے اجازت دی۔ قاضی حمید الدین نے عرض کیا" میں اندر آیا تو دیکھا کہ حضور برہنہ سر پریشان حال و فکرمند ہیں۔ آپ کو کس بات کی فکر ہے؟" بادشاہ نے کہا: "سنو! مجھے چند روز سے یہ فکر دامن گیر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی مخلوق کا حاکم بنایا ہے۔ کوئی ایسا کام کرنا چاہیے جس سے تمام مخلوق کو نفع پہنچے۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ کیا کروں؟ اگر اپنا خزانہ تقسیم کردوں تو بھی مخلوق کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اب ایک بات یہ سمجھ میں آئی ہے کہ غلے کی ارزانی کی تدبیر کروں۔ اس سے اللہ کی مخلوق کو ضرور نفع پہنچے گا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ بنجاروں کے نائکوں کو حکم دوں کہ وہ حاضر ہوں۔ وہ جو غلہ اطرافِ ملک سے ہزاروں بیلوں پر لاتے ہیں اس کی قیمت اپنے خزانے سے ادا کروں اور ان کو ان کے ذاتی اور خانگی خرچ کے لیے علیحدہ روپے دوں تاکہ وہ بے فکر ہیں اور اطرافِ ملک سے غلہ لا کر میرے مقرر کردہ نرخوں پر فروخت کریں۔" قاضی حمید الدین نے یہ واقعہ بیان کرکے کہا۔ قصہ مختصر یہ کہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا۔ شاہی فرمان جاری ہوئے۔ خلعت، خرچ اور قیمت شاہی خزانے سے ادا کی گئی اور غلہ بکثرت منڈیوں میں آنے لگا۔ چند روز بعد گیہوں سات جیتل فی من بکنا شروع ہوا۔ گھی، شکر اور دوسری اجناس بھی ارزاں بکنے لگیں اور تمام لوگ آسودہ حال ہوگئے۔ یہ قصہ بیان کرنے کے بعد حضرت نصیر الدین شاہ چراغ دہلوی نے فرمایا کہ سلطان علاؤ الدین خلجی عجیب خدا ترس اور غریب پرور بادشاہ تھا۔ حاضرین مجلس میں سے ایک شخص نے کہا: "لوگ اس کی قبر کی زیارت کو جاتے ہیں۔ فاتحہ پڑھتے ہیں اور اپنی مراد کی ڈوری اس کے مزار پر باندھ آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی حاجتیں پوری کرتا ہے۔"

حضرت نصیر الدین شاہ چراغ دہلوی کے ملفوظات کو مرتب کرنے والے نے اپنا ایک ذاتی واقعہ بھی لکھا ہے: "ایک روز عید کی نماز پڑھنے کے بعد میں سلطان علاؤ الدین کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے لیے گیا۔ مجھے کوئی حاجت نہ تھی لیکن پھر بھی میں نے دستار سے ایک دھاگا نکال کر مزار سے باندھ دیا۔ رات کو خواب میں دیکھا، کوئی کہہ رہا ہے: تیری کیا حاجت ہے؟ میں نے کہا: کوئی حاجت نہیں۔"

(خیر المجالس مجلس ہفتاد و ہفتم)

ان چند اقتباسات سے جو میں نے ایک ہی دور کے صوفیائے کبار کے ملفوظات سے لیے ہیں اس دور کے معاشرے کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ یہ فقط ایک نمونہ ہے ورنہ یہ وہ بحر بے پایاں ہے جس کی شناوری کے لیے عمریں درکار ہیں۔

مکتوبات

مکتوبات کو پاک و ہند کے فارسی ادب میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ زبان سیکھنے، انشا پردازی پر قدرت حاصل کرنے اور علم و ادب سے مزاولت پیدا کرنے کے لیے ہمارے قدیم درس میں مکتوبات پڑھائے جاتے تھے۔ ان مکتوبات کے مصنف جب اپنے ذاتی امور کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو مکتوبات آپ بیتی کے حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے تاریخ کے بہت سے الجھاؤ دور ہوتے ہیں۔

تیموریوں کا دور مکتوباتی ادب کی بہار کا زمانہ ہے۔ اس دور میں مختلف موضوعات پر مکتوبات لکھے گئے۔ اکبر کے زمانے میں ان کا

اکثر موضوع بدعت اور گمراہی کے خلاف جہاد کرنا اور عوام کو اس سیلاب سے روکنے کے لیے صف آرا کرنا تھا۔ اس کے علاوہ ان تمام طاقتوں کے استیصال کے لیے جو اسلام کے خلاف یورش کر رہی تھیں، امرا کی جتھہ بندی کرنا اور عالموں کو دعوتِ عمل دینا تھا تاکہ وہ یکجا ہو کر کوئی پروگرام بنائیں اور اس پر عمل کریں۔ بعض مکتوبات نگار جو بے حد محتاط تھے اور جو پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہتے تھے انھوں نے فقط تقویٰ، طہارت، نیکی اور تصوف کو موضوعِ سخن قرار دیا اور اسی کی تلقین کی۔ علما اور صلحا جو خود نیک تھے مگر اپنی نیکی سے دوسروں کو متاثر نہیں کر سکتے تھے ان کو بھی جھنجھوڑ کر ان کا فریضہ یاد دلانا صاحبانِ مکاتیب نے اپنا فرض سمجھا۔ چنانچہ خواجہ باقی باللہؒ، امام ربانی مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ وغیرہم کے مکتوبات کا عام انداز یہی ہے۔ عالمگیر، ابوالفضل، فیضی، حکیم ابوالفتح گیلانی اور دوسرے بڑے بڑے انشا پردازوں کے مکتوبات میں سیاست اور معاشرت کا رنگ جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ اگر ان تمام مکتوبات کو سامنے رکھ کر ملک کی تاریخ مرتب کرنے میں مدد لی جاتی تو اس برِاعظم کی تاریخ کا رنگ ہی بدل جاتا اور غیر مسلموں کی پیدا کی ہوئی غلط بیانیاں دور ہو جاتیں۔

اُردو کا دامن

فارسی اور اُردو میں بڑا گہرا تعلق ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ فارسی اور اُردو ایک تصویر کے دو رُخ ہیں تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ اس لیے اُردو کا دامن آپ بیتیوں سے خالی نہیں رہ سکتا تھا۔ اس میں کچھ آپ بیتیاں ہیں، کچھ سفرنامے، کچھ ملفوظات و مکتوبات ہیں، کچھ ڈائریاں اور روزنامچے۔ بعض کا رنگ بڑا شوخ اور دلکش ہے اور بعض نہایت پھیکی اور خشک ہیں۔

اُردو میں یورپ کے اثر کی وجہ سے بہت سی مشہور آپ بیتیاں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ یہ سب کی سب انگریزی کے راستے ہم تک پہنچی ہیں کیونکہ انگریزی زبان ہمارے نصابِ تعلیم میں ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی رہی ہے اور اب تک ہے۔ اس طرح آپ بیتیوں کے سلسلے میں اُردو دیگر مشرقی زبانوں سے زیادہ مالا مال ہے۔

ہمارے یہاں آپ بیتیوں کا رواج ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد شروع ہوا۔ جس قدر ملک ترقی کرتا گیا اسی قدر زیادہ آپ بیتیاں لکھی جاتی رہیں۔ چنانچہ سب سے پہلی آپ بیتی جو اُردو زبان میں لکھی گئی وہ مولانا محمد جعفر کا "کالا پانی" ہے۔ اس میں مولانا محمد جعفر تھانیسری نے اپنی زندگی کے اس دور کا پورا پورا نقشہ کھینچا ہے جو انھیں جلاوطنی میں بسر کرنا پڑا۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری بہت بڑے مجاہد تھے۔ انھوں نے وطن اور آزادی کی محبت میں بڑی سے بڑی مصیبت کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ علما کے جس گروہ کی بدولت وقتاً فوقتاً ہندوستان میں آزادی کی تڑپ پیدا ہوتی رہی جس کا آخری مظاہرہ ۱۸۵۷ء میں ہوا، انھی مجاہد جب انگریز کے استبداد سے مجبور ہو کر دریائے شور کی سزا پا کر کالے پانی (انڈمان) پہنچے تو انھوں نے اس قید و بند کو بڑا معمولی واقعہ تصور کیا۔ وہاں ایک مرتبہ پھر علم کی شمع روشن کی جس کے گرد علم کے پروانے جمع ہوتے۔ کتابیں لکھی گئیں۔ بحث مباحثے ہوتے۔ جس شخص پر سختی اور کڑی نگرانی رہی اس نے کوئلے سے دیواروں پر اپنی زندگی کے کچھ واقعات لکھ دیے جو بعد میں ان کے لواحقین نے نقل کر کے چھپوا دیے۔ علامہ فضل حق خیرآبادی نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور اس کے پس منظر کو اسی طرح مرتب کیا۔ ان کے استقلال کی یہ حالت تھی کہ جب انگریز کے سامنے ان کا مقدمہ پیش ہوا وہ علامہ کا شاگرد تھا۔ وہ انھیں رہا کرنا چاہتا تھا۔ گواہوں نے بھی مجسٹریٹ کی مدد کی اور مولانا کو پہچاننے سے انکار کر دیا مگر آپ یہی فرماتے رہے کہ میں نے فتوے پر دستخط کیے ہیں۔

اور یہ میرے ہی ہیں اس لیے اس نے مجبور ہو کر آپ کو عمر قید کی سزا دی اور تاریخ کہتی ہے کہ ہمارے دورِ آخر کا یہ علامہ جو منقولات میں اپنی نظیر آپ تھا انڈمان پہنچ کر گھاس کا کام کیا کرتا تھا۔ جب ان کا بیٹا ان کی رہائی کا فرمان لے کر انڈمان پہنچا تو ان کا جنازہ قبرستان کی طرف دفن کرنے کے لیے لے جایا جا رہا تھا اور جب وہ مکان پر پہنچے تو دیواروں پر وہ کتاب لکھی ہوئی پائی گئی جسے بعد میں ثورۃ الہندیہ کے نام سے شائع کیا گیا ہے اور اس کا اُردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

دوسری قابلِ ذکر آپ بیتی جس کا تعلق اسی ہنگامے سے ہے ظہیر دہلوی کی "داستانِ غدر" ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے واقعات کے ساتھ ساتھ اس ہنگامے کی داستان بھی بڑی تفصیل سے لکھی ہے۔ اس کے مطالعہ سے لال قلعے کی زوال پذیر تہذیب اور معاشرت کے چند دھندلے سے نشانات ملتے ہیں۔ ظہیر نے ہر چیز اختصار کے ساتھ بیان کی ہے۔ انھوں نے ہر قدم پر احتیاط کا سہارا لیا ہے۔ وہ ایسا کیوں نہ کرتے حالات ہی ایسے تھے۔ بات بات پر زبان کٹتی تھی۔ غالب نے اس دور کے تمام لکھنے والوں کی معذرت پیش کرتے ہوئے ایک غزل میں یوں کہا تھا۔

ایں راز کہ در سینہ نہان ست نہ وعظ است
بر دار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

انھی ایام میں خان بہادر منشی محمد عنایت حسین نے "ایامِ غدر" لکھی۔ اس میں کوئی جدت اور ندرت نہیں۔ سیدھے سادے واقعات ہیں اور وہ بھی نکال کر صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیے گئے ہیں البتہ واقعاتِ اظفری اس سے بہتر تصنیف ہے جس میں زوال پذیر معاشرے کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

سیاسی آپ بیتیوں میں مولانا حسرت موہانی کی "قیدِ فرنگ" کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے بڑی بیباکی کے ساتھ جیل کی زندگی اور اس کی مصیبتوں کا حال لکھا ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ اس زمانے کی تصنیف ہے جس زمانے میں آزادی کا نام لینا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ جیل خانے کیا تھے؟ دوزخ کے طبقات تھے جہاں خاص طور پر سیاسی قیدیوں کو سخت عقوبت دی جاتی تھی۔ مولانا نے جیل کے ایام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مجھے جیل کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ اس نے میری زندگی میں سادگی، اعتدال، ضبطِ نفس، ریاضت، جفاکشی، استقلال اور سب سے بڑھ کر توکل و قناعت کے جوہر عطا کیے۔ میرے شعر میں اثر اسی کی بدولت پیدا ہوا۔ اس نے میری زندگی کی کایا پلٹ دی اور دل سے ماسوا اللہ کا خوف دور کر دیا۔

چودھری افضل حق نے بھی "میرا افسانہ" اور "دوزخ" لکھ کر اُردو ادب میں دو نہایت اہم آپ بیتیوں کا اضافہ کیا ہے۔ دوزخ ان کے ایامِ قید و بند کی داستان ہے۔ اس میں ایک چیز قابلِ ذکر ہے کہ حسرت موہانی والی جیل اور چودھری افضل حق والی جیل میں بڑا فرق نظر آتا ہے۔ وقت اور سیاست کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ جیل کے حالات بھی تبدیل ہوتے گئے۔ پھر بھی انھوں نے دوسرے قیدیوں کے ساتھ مل کر سیاسی قیدیوں کے لیے کچھ حقوق حاصل کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کی۔

"میرا افسانہ" ایک قابلِ قدر تصنیف ہے جس میں چودھری افضل حق نے اپنی آپ بیتی بڑی بے تکلفی سے بیان کر دی ہے۔ وہ پولیس میں تھانے دار تھے کہ خلافت کی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک سے ملتِ اسلامیہ کو کیا فائدہ پہنچا؟ اس کی تفصیل کو جانے دیجیے۔ فقط دو باتیں قابلِ ذکر ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں بیداری کے آثار پیدا ہوئے اور انھوں نے سیاسیات کے شجرِ ممنوعہ کو چھو لیا۔

دوسرے اس تحریک کی بدولت کم از کم اتنا ضرور ہوا کہ عوام کے دلوں سے انگریزوں کی ہیبت اٹھ گئی اور انہیں یقین ہوگیا کہ انگریز کا وعدہ شاعری کے روایتی معشوق کے وعدے کی طرح بے اعتبار ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ان کے دل انگریز کی نفرت سے لبریز ہوگئے۔

خواجہ حسن نظامی اُردو کے صاحب طرز انشاپرداز ہیں۔ ان کی کتابیں ہر فن پر ہیں۔ انہوں نے آپ بیتی بھی لکھی اور روزنامچہ بھی مرتب کیا اور سفر و سیاحت کے حالات بھی لکھتے رہے۔ اگر ان چیزوں کو یکجا کر کے قرینے سلیقے سے مرتب کیا جائے تو نہ صرف خواجہ حسن نظامی کی آپ بیتی بلکہ اس دور کی سیاسی، معاشرتی، ادبی اور رجال سرگرمیوں کی مفصل تاریخ تیار ہو سکتی ہے۔ کاش کہ ان کے مریدین میں سے کوئی اس کام کو اپنے ذمے لے۔ خواجہ حسن نظامی کا پہلا عملی اقدام خواہ اسے سیاسی کہیے یا مذہبی، کانپور کی مسجد کے قضیے سے شروع ہوتا ہے۔ یہ قضیہ مسلمانوں کی سیاسی بیداری کا پہلا دن تھا۔ انگریز کی مذہبی رواداری کا پردہ چاک ہوا اور ان کی ریاکاری نمایاں ہوئی۔ ہر شخص اس سے متاثر ہوا۔ مولانا شبلی نے ایک درد انگیز نظم لکھی جسے بحق سرکار ضبط کر لیا گیا۔ چند شعر یہ ہیں۔

مساجد کی حفاظت کو تو اب توپوں کی حاجت ہے
خدا کو آپ نے مشکور فرمایا حمایت ہے
پہنائی جا رہی ہیں عالمانِ دین کو زنجیریں
یہ سنت سید سجاد عالی کی امانت ہے
عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
یہ بچے ہیں انہیں تو جلد سو جانے کی عادت ہے

خواجہ حسن نظامی نے میرٹھ میں اس موقع پر بڑی دھواں دھار تقریر کی جس کا عنوان "کہو اللہ اکبر" تھا۔ اس تقریر کو ہندوستان کی کئی زبانوں میں ترجمہ کر کے شائع کیا گیا، یہاں تک کہ اس کا ترکی ترجمہ غازی انور پاشا کی خدمت میں بھی پیش کیا گیا۔ ان کے دوستوں کو گمان تھا کہ خواجہ حسن نظامی میرٹھ ہی میں گرفتار کر لیے جائیں گے مگر ایسا نہ ہوا البتہ تقریر ضبط کر لی گئی۔ خواجہ حسن نظامی نے اپنے سفر کاٹھیاواڑ اور بمبئی میں بہت سی دلچسپ تقریبوں میں حصہ لیا۔ ان میں سے ایک کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ بمبئی میں ان دنوں سر فیروز شاہ مہتہ بڑے با اثر لیڈر اور میونسپلٹی کے چیئرمین تھے۔ ایک خاص جلسے میں فنڈ جمع کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ کافی غور و خوض کے بعد انہوں نے گوہر جان کلکتے والی کو وہاں مدعو کیا اور اس کا گانا کرایا۔ گوہر جان خرچ کے علاوہ پانچ سو روپیہ یومیہ لیتی تھی۔ جتنے دن وہ وہاں رہی اس کے گانے پر معقول رقم جمع ہوئی۔ آخری تقریب پر اسے ایک سنہری تمغا اور فیس کی رقم پیش کی گئی۔ اس نے منتظمین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فیس کی رقم کے علاوہ اتنی ہی رقم اپنی جانب سے چندہ کے طور پر پیش کی۔ گوہر جان بڑی صاحب کمال مغنیہ تھی۔ اس کی ذات میں بہت سی خوبیاں جمع تھیں۔ وہ کئی زبانوں پر قدرت رکھتی تھی اور ان میں نہ صرف گا سکتی تھی بلکہ اپنا مافی الضمیر بھی ادا کر سکتی تھی۔ چنانچہ سر رضا علی نے "اعمالنامہ" میں الہ آباد کی نمائش کا ذکر کرتے ہوئے ان کمالات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

"الہ آباد کی نمائش میں اس کے لیے ایک بہت بڑا پنڈال بنایا گیا تھا جس میں پانچ چھ ہزار

آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ ایک طرف چھوٹا سا چبوترہ تھا جس کو خوب سجایا ہوا تھا۔ یہ چبوترہ اس کے بیٹھنے کی جگہ تھی، وہاں سے وہ گانا گاتی تھی۔ اس کی آواز میں جادو تھا۔ وہ ہندستان کی ہر زبان سے واقف تھی۔ ابھی وہ ہندی گانا گا رہی ہے:

"رام کرے کہیں نینا نہ اُلجھے
ان نینن کی بان بُری ہے
اُلجھے نیناں سُلجھائے نہ سُلجھے!
رام کرے کہیں نینا نہ اُلجھے"

لوگ مسحور ہیں اور مزے لوٹ رہے ہیں۔ ایک عجیب سماں بندھا ہوا ہے۔ گیت ختم ہوتے ہی اس نے غالب کا کلام شروع کر دیا۔ اس کی تانیں دل میں اُتری جاتی ہیں۔ لوگ عش عش کر رہے ہیں۔ بعض اشعار پر سر دھن رہے ہیں اور بعض گانے کا مزا لے رہے ہیں۔ غرض ساری محفل کی محفل پر اس نے جادو کر دیا ہے۔ کوئی جھومتا ہے کوئی آہ کر رہا ہے اور کوئی واہ۔ یہ ابھی ہو ہی رہا ہے کہ گوہر جان نے پنجابی گیت شروع کر دیا:

"کاہنوں مارنا ایں ہیرے عشقیں روڑے

چن توں چھپ ہیں وے"

ساتھ ہی ہیر رانجھے کے عشق و محبت کے بول شروع کر دیے۔ جب یہ ختم ہوا تو پیلو کا راگ چھیڑ دیا، اس کے بعد فارسی کی یہ غزل:

"از پنجۂ من چاک گریباں گلہ دارد"

اس کے بعد اس نے اپنی وہ نظم جو امیر حبیب اللہ کی مدح میں لکھی تھی سنانی شروع کی۔ آواز کا جادو ہے کہ لوگ جھوم رہے ہیں، سر ہل رہے ہیں۔ یکایک اس نے بنگالی راگ الاپنا شروع کیا۔ ہر طرف سے بنگالی میں چھپی چھپی کی صدائیں بلند ہوئیں۔ تمام محفل خاموش بیٹھی سن رہی ہے اور آواز کا لطف اٹھا رہی ہے۔ اس سے فارغ ہو کر مرہٹی گیت شروع کر دیا، پھر گجراتی۔ اتنے میں انگریزی میں گانا شروع کیا۔ غرض گانا ختم ہوا، ہر شخص اپنی جگہ مبہوت ہے۔ گھر جانے کو جی نہیں چاہتا، یہی خواہش ہے کہ یہ محفل اور چلے۔"

الہ آباد ہی میں وہ حضرت اکبر الہ آبادی کی خدمت میں حاضر ہوئی اور جب وہ آپ سے رخصت ہونے لگی تو آپ نے فرمایا یہ تحفہ میری طرف سے بھی لیتی جائیے۔

خوش نصیب آج بھلا کون ہے گوہر کے سوا　　سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

سر سید رضا علی کی آپ بیتی "اعمال نامہ" میں اس زمانے کی سیاسیات، ملکی حالات، اردو ہندی تنازع اور علی گڑھ کی سرگرمیوں کا ذکر اس انداز میں کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا ان حالات میں کھو جاتا ہے۔ بعض حضرات اعمال نامہ کے بارے میں یہ بھی کہتے ہیں کہ کتاب آپ بیتی کے معیار پر پوری نہیں اترتی اور بعضوں نے ناقدانہ بینی سے کام لیتے ہوئے اس کی خوبیوں کو نظرانداز کر کے فقط خامیوں کی نشاندہی کی ہے مگر جب اسے ایک مرتبہ شروع کر لیا جائے تو پھر ختم کیے بغیر دل نہیں مانتا۔ میں نے خود اس کتاب کو ایک رات میں ختم کیا تھا اور اس کے گہرے نقوش اب تک میرے دل پر نقش ہیں۔ اس لیے میری نگاہ میں یہ ایک بہت کامیاب آپ بیتی ہے جو معلومات اور فنی خوبیوں سے بھی مالا مال ہے۔

اب میں ایک اور آپ بیتی کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ حکیم احمد شجاع کی "خوں بہا" ہے جو ان کی زندگی کے پچاس سال کا مرقع ہے۔ اس میں اس زمانے کے بہت سے واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ کتاب کا انداز بیان نہایت شگفتہ ہے اور اس کی فنی خوبیاں بے شمار ہیں۔ مجھے اس میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی جس کا شکوہ بعض نقاد دبی زبان سے کرتے ہیں۔

"ناقابل فراموش" واقعی اسم بامسمی ہے۔ ہر واقعہ ایک تاریخ اور سبق ہے۔ دیوان سنگھ مفتون مدیر "ریاست" بہت بڑے اخبار نویس اور نڈر صحافی ہیں۔ منشی محبوب عالم مدیر "پیسہ اخبار" اور منشی محمد الدین فوق مدیر "اخبار کشمیری" کی طرح مفتون نے بھی فن صحافت میں نام پیدا کیا ہے اور بہت بڑے بڑے پہاڑوں سے ٹکر لی ہے۔ ان کی زندگی ایک ایسے انسان کی زندگی ہے جس نے نہایت پست مقام سے قابل رشک ترقی کی۔ "ناقابل فراموش" میں مفتون کی زندگی کے اتار چڑھاؤ، زمانے کے نشیب و فراز، ان کے ذاتی تجربات و مشاہدات ان کی اصول پرستی کی جھلکیاں جا بجا نظر آتی ہیں۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ پاک و ہند کا ہر نوجوان اسے پڑھے اور اپنے اندر وہ خوبیاں پیدا کرے جن سے انسان کامیابی کا معراج حاصل کرتا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ چند اور بھی آپ بیتیاں ہیں جو معیاری کہی جا سکتی ہیں۔ ان میں مولانا حسین احمد مدنی کی "نقش حیات" رشید احمد صدیقی کی "آشفتہ بیانی میری" عبدالمجید سالک کی "سرگزشت" ہمایوں مرزا کی "میری کہانی میری زبانی" مولانا عبدالرزاق کانپوری کی "یادِ ایام" شاد عظیم آبادی کی "شاد کی کہانی شاد کی زبانی" اور مرزا فرحت اللہ بیگ کی "یادِ ایام عشرت فانی" خاص طور پر مطالعہ کے قابل ہیں۔

میرے دوست منشی محمد الدین فوق مرحوم اپنے زمانے کے ایک قابل قدر انسان تھے۔ انہوں نے گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر اور شہرت کو لات مار کر اتنا کام کیا ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ وہ کامیاب صحافی، نغز گو شاعر، تاریخ کے جید عالم اور اصلاح معاشرہ کے بہت بڑے داعی تھے۔ انہوں نے کشمیریوں کو بیدار کرنے کے لیے پچاس برس کام کیا اور یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ ان کی زندگی ہی میں کشمیری نشہ حریت سے سرشار ہو کر اپنے بنیادی انسانی حقوق طلب کرنے کے لیے میدان عمل میں کود پڑے۔ "سرگزشت فوق" ابھی تک طباعت کے زیور سے آراستہ نہیں ہوئی۔ وہ مسودے کی صورت میں میرے دوست مولوی محمد عبداللہ قریشی کے پاس موجود ہے۔ اس کے سرسری مطالعہ سے چند ایسی باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں جو کسی اور سرگزشت میں نہیں ملتیں۔ منشی صاحب بہت بڑے سیاح تھے۔ انہوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں پنجاب، وسط ہند اور راجپوتانہ کی ریاستوں کی سیاحت کی۔ بنگال تک پہنچے اور اپنے تاثرات سرگزشت میں

درج کیے۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاستی دنیا برطانوی ہندوستان سے بالکل مختلف تھی۔ راجے نوابے ایسی ہستیاں تھیں جن کے بارے میں شیخ سعدی نے فرمایا تھا:۔

”گاہے بہ سلامے برنجند وگاہے بہ دشنامے خلعت می بخشند“

وہ رعایا کو بھیڑ بکریوں سے زیادہ حیثیت نہ دیتے تھے بلکہ انھیں اپنا زرخرید غلام سمجھتے تھے۔ پڑھنا پڑھانا ان کے نقطۂ نظر سے ایک فضول کوشش تھی اور یہ درد سر انھوں نے کبھی مول نہیں لیا۔ اخلاقی پستی حد سے گزر چکی تھی۔ انسانوں سے بیگار لی جاتی اور قسم قسم کے ٹیکس وصول کیے جاتے تھے۔ پھر سازشوں کا یہ حال تھا کہ چھوٹے سے بڑا عہدے دار بھی اپنے آپ کو اس سے الگ نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کی عزت اور اس کا عہدہ اسی وقت تک محفوظ تھا جب تک ریاست کا سربراہ اس سے خوش رہتا۔ ان چیزوں کے علاوہ فوق صاحب کی زندگی کے بعض دلچسپ واقعات بھی اس میں موجود ہیں۔ اس آپ بیتی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ فوق صاحب خود اس کا مرکزی کردار ہیں۔ وہ ایک منٹ کے لیے بھی اس بات کو فراموش نہیں کرتے کہ وہ اپنی سرگزشت لکھ رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جو شخص بھی ان سے ملا اس کا تذکرہ انھوں نے اس انداز سے کیا کہ اس کی خوبیاں نمایاں ہو جاتی ہیں اور وہ زندہ جاوید ہو جاتا ہے۔ ان کے بیان میں متانت اور سنجیدگی ہے۔ وہ مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیتے مگر حقیقت کو ایسے انداز میں بیان کرتے ہیں کہ اس میں افسانے کا مزا آتا ہے۔ ان کی زندگی میں حیرت انگیز انقلابات ہندوستان میں آئے۔ کئی تحریکیں ابھریں، جماعتیں بنیں اور بگڑیں، پرانی قدریں مٹیں اور نئی بستیاں آباد ہوئیں۔ ان سب کا ذکر اور اثر آپ کی زندگی کی ہر منزل میں نظر آتا ہے۔

اردو میں غیر ملکی مشاہیر کی آپ بیتیوں کے ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔ یہ بھی پڑھنے کے قابل ہیں اور ان سے وہ پس منظر تیار ہو سکتا ہے جس کے ذریعے اقوام عالم کی موجودہ کشمکش اور اعصابی جنگ کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

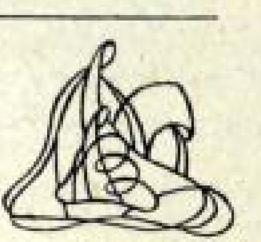

ڈاکٹر سید عبداللہ

آپ بیتی

کیا کوئی شخص مکمل اور باریکیوں کی حد تک صحیح آپ بیتی لکھ سکتا ہے؟ اس کا جواب اگر نفی میں نہیں تو تشکیک میں ضرور ہوگا۔ کسی فرد پر جو کچھ بیتی ہے اس کا صحیح بیان تبھی ممکن ہوگا جب دنیا کے وہ سارے باسی (جن کی نظر سے کسی کی آپ بیتی گزرے گی) یا تو فرشتے بن جائیں گے جو تسبیح و تہلیل کے لیے مخلوق ہوئے ہیں (جیسا کہ فرشتوں نے ازل کی امتحان گاہ اوّل میں اعلان کیا تھا) یا تب جب لکھنے والا اس چٹان کی طرح ہو جائے گا جس کے سینے سے بے ساختہ چشمے اُبل پڑتے ہیں اور وہ اپنی سنگ دلی کے باوجود بے بس ہو جاتا ہے، جو کچھ اس کے اندر ہوتا ہے اُگل دیتا ہے یا جب پڑھنے والا شاہ بلوط کی اس خشک ٹہنی کی مانند ہو جائے گا جس میں پانی کا رس پہنچ بھی جائے تو اسے محسوس بھی نہ ہو کہ کیا ہو رہا ہے۔ کسی شاعر نے بلاوجہ نہیں کہا تھا۔

مرا دردے است اندر دل اگر گویم زباں سوزد
وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

یہ محض شاعرانہ تعلّی نہ تھی بلکہ ایک ایسی حقیقت کا اعلان تھا جو مغز استخواں کی شہادت لے کر نکلا تھا اور حق یہ ہے کہ شاعر تو پھر بھی اتنا کچھ کہہ سکا کیونکہ اسے ایما و رمز کی رعایت حاصل ہے۔ کوئی دوسرا آدمی اگر مکمل آپ بیتی لکھنے کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ بہت بڑی بات کا اعلان کرتا ہے جو اس کی قدرت سے باہر ہے یا ٹالنے کا بہانہ کرتا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

رہی نگفتہ مرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

یہ شعر میر کا ہے جنہیں اپنے متعلق سب کچھ کہہ دینے کا بڑا شوق تھا۔ مثنویاں لکھیں، جوشِ عشق اور خواب و خیال لکھی، غزل کو لمبا کرتے کرتے "قصیدۂ طور" کر دیا۔ ایک غزل سے تسلی نہ ہوئی تو اسی زمین میں دو دو غزلیں لکھ ماریں۔ چھوٹی سی بات لکھنے بیٹھے کہانیاں بن گئیں۔

رقعہ لکھتے لکھے گئے دفتر
شوق نے بات کیا بڑھائی ہے

پھر بھی داستان نگفتہ رہی اور چھ دیوان اور کئی مثنویاں اور "ایک ذکرِ میر" لکھ کر بھی حالت یہی رہی کہ

تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے

اس کے باوجود دنیا میں لوگوں نے اپنی سوانح عمریاں لکھیں اور اب بھی لکھتے جا رہے ہیں۔ لیکن اس قسم کی سوانح عمریاں

کی کثرت اس بات کا ثبوت نہیں کہ "آپ بیتی" واقعی لکھی جا سکتی ہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ کسی دوسرے کی سوانح عمری لکھنا بھی مشکل کام ہے اور آپ بیتی تو از قبیل محالات ہے۔

مجھے یہ تسلیم ہے کہ اپنی ایک خاص قسم کی سوانح عمری (یعنی اپنے سوانح زندگی) لکھے جا سکتے ہیں مگر میں سوانح عمری اور آپ بیتی میں فرق کرتا ہوں اور وہ اس لیے کہ اپنی سوانح عمری لکھ کر بھی ضروری نہیں کہ کوئی شخص آپ بیتی لکھ سکے۔ اپنی سوانح عمری اس حد تک تو ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص اپنی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات لکھ دے یا زیادہ سے زیادہ تھوڑی دور ان کے باطنی محرکات کا بیان بھی کر دے۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص وہ سب کچھ لکھ دے جو اس پر اور اس کے دل پر گزری ہے۔ ایک لحاظ سے آپ بیتی یا خود نوشت سوانح عمری کی صنف دوسروں کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں کے مقابلے میں خاصی نارسا اور ناقص چیز ہوتی ہے۔ اس کے راستے میں دو بڑی رکاوٹیں ہوتی ہیں۔ دوسروں کا خوف اور اپنے آپ سے محبت۔ ایک اچھا سوانح نگار اپنے فن کی لاج رکھنے کے لیے بہت سی ایسی باتیں بھی بیان کر دیتا ہے جو خود نوشت نویس کے لیے ممکن نہیں ہوتیں۔ سوانح نگار اپنے ہیرو کے کردار کا جج بن سکتا ہے۔ اس کی کمزوریوں کا شمار بھی کر سکتا ہے۔ لیکن آپ بیتی میں اپنی محبت اور دوسروں کا خوف ہر وقت دامن گیر رہتا ہے۔ وہ نہ اپنے گناہوں کی صحیح فہرست پیش کر سکتا ہے نہ اپنا صحیح جج بن سکتا ہے۔ آپ بیتی میں "اگر گویم زباں سوزد" کی مصیبت ہر ہر گام پر پیش آ جاتی ہے۔ سچ کہنا یوں بھی مشکل ہے مگر اپنے متعلق سچ کہنا دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ واقعات کی خارجی روداد اپنے متعلق اور چشم دید تفصیل دوسروں کے متعلق بیان ہو سکتی ہے۔

روسو نے اپنے اعترافات ضرور لکھے مگر مجھے روسو کی روحانی شوریدگی کے پیش نظر پورا بھروسہ نہیں کہ اس نے جذباتیت سے بلند ہو کر لکھا ہو۔ اس نے اپنی زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتا کر بڑی جرأت کا ثبوت دیا ہے لیکن یہ بھلا دیا جاتا ہے کہ روسو کے عہد میں اس قسم کے ادب کی مانگ تھی اور اس قسم کی اشتہار بازی سے شہرت کا بازار گرم کیا جا سکتا تھا۔ اس دور میں مغرب میں یہ خیال ہو چلا تھا کہ ادیبوں اور دانشوروں کے لیے جنسی بے راہ روی کوئی عیب کی بات نہیں۔ ایسی کہانیوں میں لوگ دلچسپی لیتے تھے (اور بعض اوقات شاید ایسی باتوں کو ادیب کی بڑائی کی علامت سمجھتے تھے) ممکن ہے روسو نے اشتہار بازی کی ہو۔

روسو بہت بڑا آدمی تھا۔ مجھے اس کی نیت اور ارادے پر شبہ نہیں مگر میں روسو کے نفسیاتی توازن کا قائل نہیں۔ بہر حال میں یہ ساری گفتگو سچائی کے نقطۂ نظر سے کر رہا ہوں۔ میرا مقصد روسو کی تنقیص نہیں۔ میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر بے لاگ سچائی سوانح عمری اور آپ بیتی کی شرط اول ہے تو یہ مقصد آپ بیتی سے اچھی طرح پورا نہیں ہوتا۔ اس کے راستے میں بہت بڑے پہاڑ کھڑے ہیں یا بڑی خوفناک دلدلیں ہیں۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ براہ راست آپ بیتی ممکن نہیں۔ البتہ بالواسطہ کوششیں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اپنے احساسات کی سرگزشت لکھنے کا بہترین ذریعہ ناول ہے جس میں "سرِ دلبراں" کو "حدیثِ دیگراں" بنا کر پیش کرنا ممکن ہے۔ غمِ دل پردے میں بیاں ہو جاتا ہے اور بسا اوقات قاریوں کو معلوم بھی ہو جاتا ہے کہ ناول نگار دوسروں کی زبانی اپنی ہی کہانی بیان کر رہا ہے۔

آپ بیتی کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ اس میں مصنف یا تو سب کچھ چھپا جاتا ہے یا بہت بننے کی کوشش کرتا ہے اور جاننے سے

کام لیتا ہے۔ اسی لیے AUTOBIOGRAPHY کی مصنف (BURR) نے لکھا ہے کہ ارادے سے لکھی ہوئی آپ بیتی بڑی ناکام صنف ہے۔ اس میں جھوٹ زیادہ ہوتا ہے۔ انکسار کے نام سے اعتراف حال کیا جاتا ہے اور لوگوں کو یاد کرایا جاتا ہے کہ میں پہلے درجے کا صاف گو اور راست باز ہوں۔ اس صنف میں وہ روزنامچے بھی آ جاتے ہیں جن میں اصل ناموں کی جگہ ناموں کے حرف اول لکھ دیے جاتے ہیں مثلاً ق نے یہ کہا اور ج سے میری یوں بات ہوئی۔ ت نے یہ فرمایا اور ت نے یوں بات کاٹ دی۔ دراصل یہ سب کچھ اپنی یادداشت کی حد تک تو ٹھیک ہے اور کسی دوسرے سوانح نگار کے لیے اچھا مواد ہے مگر مستقلاً کوئی خاص چیز نہیں۔ ایسے روزنامچے اپنی ہی خلوت میں دہرانے کے لیے تو چل سکتے ہیں مگر دوسروں کے لیے اس قسم کی رموز بے معنی ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ آپ بیتی سو درجہ تاثراتی چیز ہوتی ہے۔ اگر یہ سوانح عمری ہے تو اس کو سائنٹیفک ہونا چاہیے۔ سچا سوانح نگار اپنے مواد سے سر مو تجاوز نہیں کر سکتا لیکن آپ بیتی میں مواد اپنی ذات کے اندر سے نکلتا ہے۔ خود کوزہ و خود کوزہ گر۔ خود ہی مجرم، خود ہی گواہ، خود ہی جج۔ اگر کوئی یہ کہے کہ آپ بیتی لکھنے والا شاعر کی مانند اپنے تاثر پر انحصار کرتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ شاعر نے کبھی واقعاتی صحت کا دعویٰ نہیں کیا۔ اس کا طریق کار تاثر، تخیل اور تفکر کو ملاتا ہے۔ اس میں صداقت عمومی مد نظر ہوتی ہے۔ آپ بیتی میں صداقت خصوصی کی جستجو لازمی ہے۔ اس کے علاوہ اسے جج بھی بننا ہے ــــ اور یوں جج بننے میں کوئی خاص وقت نہیں لیکن اپنا جج خود بننا ایک مشکل امر ہے خود اپنی اصلاح کرتے رہنا ممکن بلکہ اکثر ہوتا ہے مگر جج بن کر اپنے کو اشتہاری مجرم بتانے والے بہت کم دیکھے گئے ہیں۔ یہ قانون حفظ ذات کے خلاف ہے۔ ہاں ناول کے پردے میں سب کچھ بیان ہو سکتا ہے۔

آپ بیتی کے خلاف میں نے جو کچھ کہا اس کے باوجود آپ بیتیاں لکھی گئی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں اور ان کا جو سرمایہ دنیا میں موجود ہے اس کو مد نظر رکھ کر آپ بیتیوں کے کچھ اوصاف مرتب کیے جا سکتے ہیں۔ چلیے اس کے اصول روسو کے اعترافات ہی سے حاصل کر لیتے ہیں۔ روسو کے اعترافات کی افتتاحی عبارت یہ ہے:۔

> میں نے ایک ایسی مہم کا بیڑہ اٹھایا ہے جس کی کوئی نظیر نہیں اور شاید کوئی دوسرا آدمی اس
> کی تقلید (کی جرأت) بھی نہ کر سکے گا۔ میں کشتہ تقدیر مخلوق (بنی نوع) کے سامنے ایک انسان کی
> تصویر رکھ رہا ہوں ــــ اور یہ انسان کون ہے۔ میں خود ہوں۔
>
> میں اپنے دل کے بھید جانتا ہوں۔ میں نے دوسرے انسانوں کو بھی دیکھا ہے۔ میں ان میں سے
> کسی جیسا نہیں۔ ان سے بہتر ہونے کا دعویٰ تو نہیں کر سکتا پر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مجھ میں کچھ
> ندرت ضرور ہے۔ کیا قدرت نے مجھے جس سانچے میں ڈھالا ہے۔ اس کو خود ہی توڑ کر کوئی
> اچھا کام کیا۔ اس کا فیصلہ میری کتاب کو پڑھ کر ہی کیا جا سکے گا۔۔۔۔۔۔۔
>
> میں نے سچائی اور پوری آزادی کے ساتھ اپنے عیب و ہنر کو بیان کیا ہے۔ میں نے اپنا کوئی
> جرم نہیں چھپایا۔ میں نے اپنی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان نہیں کیا ــــ اور اگر کہیں کہیں
> میں نے زیب داستان کا ارتکاب کیا ہے تو محض اس وجہ سے کہ بعض بعض موقعوں پر میری

> یاد نے میرا ساتھ نہیں دیا لہٰذا مجھے وہ خلا پورے کرنے پڑے۔
>
> عین ممکن ہے کہ میں نے بعض ایسی باتوں کو حقیقی سمجھ لیا ہو جو خیالی تھیں لیکن میں نے جان بوجھ کر جھوٹ کو سچ نہیں کیا۔ میں جیسا بھی تھا ویسا ہی میں نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ کبھی برا اور قابلِ نفرت، کبھی نیک طینت، کشادہ دل اور رفیع۔ میرے ہم نوع میرے ان اعترافات کو سنیں میری پستی پر شرمائیں، میرے دکھ پر کانپ جائیں — اور اگر ان میں سے کسی کو جرأت ہو تو وہ اسی خلوص اور جرأت کے ساتھ اپنے دل کو ٹٹولے اور اگر کہہ سکتا ہے تو صاف کہہ دے کہ میں اس آدمی (روسو) سے برتر آدمی ہوں۔

روسو کی تحریر میں خلوص کے ساتھ ساتھ خوف بھی پایا جاتا ہے۔ پھر بھی روسو نے یہ بتایا کہ ایک اچھی آپ بیتی کے لیے ضروری ہے کہ وہ کچھ نہ چھپائے اور بیرونی ملامت و تحسین سے بے نیاز ہو کر ہر وہ بات کہہ دے جو اس کے کردار اور اس کی شخصیت کی ہو بہو نقل بن جائے۔ آپ بیتی سے سوانح عمری کے مقابلے میں ہماری توقعات کچھ زیادہ ہی ہوتی ہیں۔ سوانح نگار جن رموز و اسرار یا محرکات تک پہنچ سکتا یا جزوی ہی کوشش سے پہنچتا ہے اور طویل و مسلسل چھان بین کے بعد نتیجے اخذ کرتا ہے۔ آپ بیتی لکھنے والے کو اس تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ وہ جن افعال کا خالق یا مصدر ہے ان کے اسباب خارجی و داخلی سے باخبر بھی ہوتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ اپنے کردار اور شخصیت کی ہو بہو نقل کے معاملے میں آپ بیتی لکھنے والے کو جتنی آسانیاں میسر ہیں اتنی ہی مشکلات بھی ہیں۔ اظہارِ شخصیت کی ہوس اخفائے شخصیت کے دست بدست چلتی ہے اور بہت کم لوگ ایسے نکل سکتے ہیں جنہیں روسو کی سی اخلاقی یا فکری جرأت حاصل ہوتی ہے اس لیے آپ بیتی اکثر صورتوں میں کسی دوسرے کے ہاتھ سے لکھی ہوئی سوانح عمری کے مقابلے میں بے وزن ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اکثر آپ بیتیاں یا تو محض منہ پھٹ پردہ دری کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں یا چند چیدہ واقعات کے اردگرد گھومتی ہیں یا زندگی کا بیرونی خاکہ بن جاتی ہیں یا اپنا اشتہار بن کر تجارت کا ذریعہ بنتی ہیں۔

بایں ہمہ آپ بیتیاں سوانح نگاروں کے لیے نہایت مفید مواد مہیا کرتی ہیں۔ بڑے بڑے جرنیلوں، سیاست دانوں، شاعروں، مفکروں اور ادیبوں نے اپنے حالات جب بھی لکھے ان کے ضمن میں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ان کے فن، فکر اور کارناموں کے ارتقا کے اسباب پر مستند مواد فراہم ہوا۔ اہم واقعاتِ زندگی کی باریک جزئیات اور ان کے پس پردہ انسانی محرکات کا سلسلہ (ایک حد تک) خود بخود سامنے آ جاتا ہے۔ آپ بیتی لکھنے والے کا مواد ذہن میں پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے۔ اسے کتابوں کی ورق گردانی اور دستاویزوں کی چھان بین نہیں کرنی پڑتی۔ سب کچھ اس کے پاس محفوظ ہوتا ہے۔ آپ بیتی میں اپنی ملامت یا اپنی تحسین کی طرف بے توازن جھکاؤ بھی ہو تب بھی آپ بیتی دوسرے سوانح نگاروں کے لیے اولین اور مستند ترین ماخذ ثابت ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ بھی درست ہے کہ آپ بیتی کی پھیلائی ہوئی غلط فہمی کو دور کرنا سوانح نگار کے لیے تقریباً محال ہو جاتا ہے۔ سب سے اچھی آپ بیتی وہ ہوتی ہے جو کسی بڑے دعوے کے بغیر بے تکلف اور سادہ احوالِ زندگی پر مشتمل ہو۔

اس ضمن میں گوئٹے کی آپ بیتی پر نظر ڈالیے۔ گوئٹے کی شخصیت دلچسپ اور ہنگامہ خیز تھی اور اس کی آپ بیتی بھی دلچسپ اور

خیال افروز ہے۔ لیکن جب لوئیس نے گوئٹے کی زندگی لکھی تو اسے سب سے زیادہ اس کی خود نوشت سوانح عمری نے پریشان کیا۔ گوئٹے کا انداز بیان رومانی تھا۔ اس کی طبیعت میں گرم جوشی اور اس کے قلم کو حقیقتوں سے نکل کر تخیل کی دنیا میں گلگشت کرنے کی عادت تھی۔ وہ ذرا سی بات کو کچھ نہ کچھ بنا دیتا تھا۔ وہ اپنے یوم ولادت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:-

> "سن ۱۷۴۹ء میں ۲۸ اگست کا دن تھا کہ میں فرینکفرٹ میں ٹھیک نصف النہار میں عالم وجود میں آیا۔ میرا زائچہ طالع مسعود کا پتہ دیتا تھا۔ آفتاب برج سنبلہ میں اوج کے انتہائی نقطے پر تھا۔ زہرہ اور مشتری کے تصرفات اس دن کے لیے بہت سازگار رہے۔ عطارد کی جانب سے دشمنی کے آثار نہ تھے۔ زحل اور مشتری غیر جانبدار تھے البتہ چاند جو تقریباً پورا ہو چکا تھا ستیزہ رو تھا خصوصاً اس لیے کہ اس کی نحس حالت اس تکلیف کے ساتھ جو میری ولادت کے ساتھ وابستہ تھی ہم آہنگ ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے مملکت وجود میں آنے سے روکے رکھا تا آنکہ وہ نحس حالت ختم ہو گئی:"

ایک آپ بیتی کا یہ آغاز عجیب و غریب ہے۔ علم نجوم کی یہ ماہرانہ گفتگو گوئٹے کی یاد کا حصہ نہیں ہو سکتی بلکہ بہت بعد کی معلومات پر مبنی ہے۔ اس پر بجا طور پہ یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ آپ بیتی کا ہر لمحہ تجربے کی روشنی میں ریکارڈ ہونا چاہئے۔ یعنی ولادت کی ساعات اور ان کے تجربات کو اپنی زبان سے نہیں دوسروں کی زبانی بیان کرنا چاہیے۔ کیونکہ ان ساعتوں کا تجربہ مصنف کی یادداشتوں کا حصہ نہیں ہو سکتا۔ کم سے کم روسو نے اس بات کا خیال رکھا ہے اور ایسی باتوں کو روایتوں پر مبنی کیا ہے۔ روسو نے اپنی ولادت کے دوران اپنی ماں کے انتقال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:-

> "my birth cost my mother, her life, and was the first of my misfortune. I am ignorant how my father supported her loss at that time but I know he was ever after inconsolable.

گوئٹے نے اپنے گھر کے متعلق اپنے بچپن کے جو تاثرات لکھے ہیں وہ بھی کچھ ایسے ہیں جن کو تخیل کی پیداوار کہا جا سکتا ہے۔ ان میں تجربے کی سی حقیقت معلوم نہیں ہوتی۔ اگرچہ یہ بھی باور کیا جا سکتا ہے کہ ان کے تخیل کو لاشعور سے امداد ملی۔

مقصود گفتگو یہ ہے کہ آپ بیتی جہاں مفید اور (بعض امور میں) مستند صنف ہے وہاں اس کے خطرناک ہونے میں بھی کوئی کلام نہیں۔ BURR نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ آخر عمر میں لکھی ہوئی آپ بیتی کے مقابلے میں وہ مسلسل روزنامچے زیادہ مستند ہوتے ہیں جو خفیہ طور پر لکھے جاتے ہیں اور ان میں پیش آمدہ واقعات اپنے متعلقہ تاثرات کے ساتھ درج ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا انداز اگرچہ سوانح عمری یا آپ بیتی کی طرح بیانیہ نہیں ہوتا اور بعض واقعات کی وقتی جھلک دکھانا ان کا مقصد ہوتا ہے لیکن ان میں مصنف اکثر

کا لکھتا ہے۔ وہ ذات کا رازدار بن جاتا ہے اور دنیا کا خوف نہیں کھاتا۔ مگر یہ یاد رہے کہ ہر روزنامچہ نویس ضروری نہیں کہ اپنے قلم کو اپنا رازدار بنا سکے۔ بہت سے روزنامچے ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کے حالات و واقعات زیادہ اور اپنے کم لکھتے ہیں۔ دنیا کے بارے میں ذاتی تاثر دیانتداری سے ظاہر کرنا بھی اگرچہ مشکل امر ہے مگر اپنے قلم کو دیانتداری سے اپنا محرم و رازداں بنانا اور بھی مشکل ہے۔

وہ آپ بیتی لکھنے والے بڑے فائدے میں رہتے ہیں جو روسو کی تقلید نہیں کرتے۔ وہ اپنے کام کو محدود کر لیتے ہیں اور اپنے اہم واقعات یا کارناموں کی تفصیل اور محرکات و ماحول کا ایک بے تکلف، مخلصانہ، مستند تصور دلا دیتے ہیں۔ ہوگارتھ پریس (لندن) نے ایک سلسلہ "خود نوشت" شائع کیا۔ اس میں اہم مفکرین نے اپنے اپنے اہم کارنامۂ زندگی کو بیان کر کے اپنی زندگی کا ارتقا بھی دکھایا ہے۔ اسی سلسلے میں فرائڈ کی خود نوشت بھی ہے جس میں بڑی سادگی سے مصنف نے زندگی کے اہم واقعات کو اپنے مرکزی فکر کے حوالے سے بیانیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ آپ بیتی مکمل نہیں مگر مخلصانہ اور مفید ہے۔

بعض آپ بیتیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں مصنف مقفل صندوقوں میں محفوظ کر دیتے ہیں اور ورثا کو وصیت کر دیتے ہیں۔ "میری یہ کتاب میری زندگی کے بعد چھپے"۔ یہ آپ بیتیاں یا تو شدید خود پسندانہ اور شدید جذباتی رویے کی حامل ہوتی ہیں یا ان میں دوسروں کے خلاف بہت کچھ لکھا ہوتا ہے۔ ان کے بارے میں اس قسم کی وصیتیں خوف کے تحت کی جاتی ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی اہمیت بڑھانے کے لیے ہو کہ یہ بھی ترغیب کی ایک صورت ہے۔ با ایں ہمہ اگر یہ آپ بیتیاں ان توقعات کو پورا کر سکتی ہوں جن کا دلوں میں پیدا ہونا یقینی امر ہے تو اس میں کوئی خاص مضائقہ بھی نہیں۔ کیونکہ اپنے زمانے اور اپنے معاصرین کے بارے میں ذاتی تعصبات موت کے بعد ہی ظہور میں آئیں تو مناسب ہے کیونکہ اس فضا میں دوسروں کو بھی تعصبات کے عیب و صواب پرکھنے کا بہتر موقع مل سکتا ہے اور میرا ذاتی رجحان یہ ہے کہ اپنی آپ بیتی اپنی زندگی میں شائع کر دینے کے مقابلے میں بعد از وفات شائع ہونے میں سچائی کے اظہار کی گنجائش کم ہو جاتی ہے۔ سچائیوں کا اظہار بلا خوف اور جیتے جی کرنا چاہیے تاکہ دوسروں کو افہام و تفہیم کا موقع مل سکے اور اگر وہ کوئی ایسے راز ہیں جن کے اظہار میں حجابات حائل ہے تو ایسے رازوں کو سینے کے اندر ہی دفن رہنا چاہیے۔ غرض یہ ہے کہ آپ بیتی کو ذاتی جلوہ نمائی، نمود و نمائش اور چھپ کر حملہ کرنے کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔

اردو میں آپ بیتیاں کئی طرح کی ہیں:۔ (۱) مکمل حالات زندگی (۲) زندگی کے کسی حصے کی روداد یا ایسی سوانح عمری جس کی مدد سے اپنے اہم فن یا اہم کارنامے کی ارتقائی داستان مرتب کی ہو (۳) روزنامچے اور سفرنامے (۴) شخصی جھلکیاں یا شخصی خاکے (۵) کسی کی کہانی اس کی زبانی (۶) شخصی انشائیے۔

اس مختصر مضمون میں ان سب اقسام اور ہر قسم کی اہم کتابوں سے بحث دشوار ہے اس لیے میں ۲، ۳ اور ۴ کا تذکرہ نظرانداز کرتے ہوئے مکمل آپ بیتیوں کا ذکر کرتا ہوں۔

مکمل سے میری مراد وہ خود نوشت سوانح عمری ہے جو ابتدائے زندگی کے اس حصے تک جب تک قلم نے ساتھ دیا پہنچ چلی گئی ہو۔ میں مولانا جعفر تھانیسری کی کتاب "کالا پانی" کو مکمل نہیں کہہ سکتا کیونکہ یہ جزوی ہے۔ داستانِ غدر (ظہیر دہلوی) اگرچہ ابتدائے زندگی

سے شروع کی گئی ہے پھر بھی دراصل یہ داستانِ غدر ہے۔ چودھری افضل حق کی کتاب "میرا افسانہ" خواجہ حسن نظامی کی آپ بیتی "محمد امین زبیری کی نوروزشت" اور اس طرح کی دوسری کتابوں کو مکمل نہیں کہا جا سکتا۔

میری دانست میں سید ہمایوں مرزا کی کتاب "میری کہانی میری زبانی"، رضا علی کا "اعمال نامہ"، دیوان سنگھ مفتون کی کتاب "ناقابلِ فراموش"، عبدالمجید سالک کی "سرگزشت"، علی محمد خاں کی "فرزانہ" اور مولانا حسین احمد مدنی کی "نقشِ حیات" آپ بیتی کی صنف کے اوصاف کو کسی حد تک پورا کرنے والی کتابیں ہیں۔

ان مصنفوں میں سے ہر ایک کا ایک خاص نقطۂ نظر ہے جو ہر ایک کی تصنیف میں جھلک رہا ہے۔ ہمایوں مرزا اپنی شخصیت اور "اپنی بی بی" کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔ رضا علی ملک کی شائستگی کے زمانے کی حیثیت سے ملک کی ذوقی، ادبی، تعلیمی اور تھوڑے سیاسی حالات کو اپنی تصویر کے پس منظر میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مفتون سیاست کے ماحول اور جزئیات کے معاملے میں راز کشائی کے جذبے سے لکھ رہے ہیں۔ علی محمد خاں ایک حساس اور جزئیات پر نظر رکھنے والے آدمی ہیں۔ واقعاتِ زندگی کے ردِ عمل کے اچھے ترجمان ہیں۔ مولانا سالک حالات نگار ہیں۔ ان کا مقصد اپنے سے زیادہ دوسروں کے متعلق لکھنا ہے اور مولانا حسین احمد مدنی کا مقصد یہ ہے کہ "بطورِ تحدیثِ نعمتِ خداوندی، اللہ تعالیٰ کے اس فضل و کرم کا جو کہ مجھ پر اور میرے والدین اور خاندان پر سایہ گستر رہا ہے اور اب بھی سایہ فگن ہے، تذکرہ کروں اور اس کے شکریے کے گیت گا کر قلب و دماغ ناظرین کو معطر کروں۔" مولانا حسین احمد نے کوئی بڑا دعویٰ نہیں کیا۔ موصوف مؤرخ کے فرض سے پوری طرح باخبر ہونے کے باوجود اپنی سوانح عمری تذکیہ، اخلاق آموزی اور واقعاتِ سیاسی کی خارجی تفصیل کے مقصد سے مرتب کی ہے۔

اگر ہم میں سے کسی کو یہ جستجو ہو کہ اردو میں روسو کے اعترافات کی طرح کی کتنی چیزیں لکھی گئی ہیں تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ شاید ایک بھی نہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ اردو کا آپ بیتی نگار مشرق میں بیٹھا ہے جہاں اس کے لیے ممکن نہیں کہ سچائی یا اپنی تصویر کشی کی آڑ لے کر اپنی بداعمالیوں کی تشہیر کرتا پھرے اور حقیقت تو یہ ہے کہ بداعمالیوں کی تشہیر کی یہ حرکت خود مغرب کو بھی مہنگی پڑی ہے۔ بالآخر یہ ہوا کہ لغزش کو تقاضائے بشریت سمجھنے کی بجائے بشریت کا زیور بنا لیا گیا۔

ناول اور سوانح عمری میں حقیقت نگاری کی تحریک بہت مقبول ہونے کے باوجود اس بڑے نتیجے سے نہ بچ سکی کہ حقیقت نگار آخر انسانیت کے کیڑے نکال کر اپنی دکان چمکانے والا ثابت ہوا۔ حقیقت نگار مصوروں کا بھی آخر یہ حال ہوا کہ اچھے بھلے معقول آدمی ہونے کے باوجود گھناؤنے اور رذیلانہ (SORDID) موضوعات میں دلچسپی لینے لگے اور اب حقیقت نگاری، پستی اور فرومایگی کی ہم معنی اصطلاح محسوس ہو رہی ہے۔

مقصد یہ ہے کہ اردو میں سچائی کے نام سے بدی کی ترغیب کا کاروبار کچھ زیادہ چمکا نہیں کیونکہ یہاں بدی کو تقاضائے بشریت سمجھنے کے باوجود کوئی ایسی چیز نہیں سمجھا جاتا جس کی تشہیر کی جائے۔

یہ مضمون تذکرہ مولانا ابوالکلام کے تذکرے کے بغیر نامکمل رہے گا۔ "تذکرہ" کا مصنف ذہنی طور پر روسو، وکٹر ہیوگو اور انقلابِ فرانس لانے والے مصنفوں کے بہت قریب رہا ہے اور تذکرہ ہر چند کہ آپ بیتی نہیں پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ آپ بیتی نہ ہو کر بھی آپ بیتی کی سوانگ

کتاب ہے۔ اس کتاب نے یہ بتایا کہ آپ بیتی صرف اپنی ذات کے تجربات تک محدود نہیں بلکہ ذات کے پس پشت خاندان کے کئی صدیوں کے تجربات کا خلاصہ ہے جن کا ذکر کیے بغیر ایک معمولی لمحے کی سرگزشت (جس کا دوسرا نام کسی کی ذاتی زندگی ہے) بھی مکمل نہیں ہو سکتی —— ابوالکلام آزاد کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ بیتی لکھی ہی نہیں جا سکتی:

> "جتنی زندگی گزر چکی ہے مڑ کر دیکھتا ہوں تو ایک تودۂ غبار سے زیادہ نہیں —— اور جو کچھ سامنے ہے وہ بھی جلوۂ سراب سے زیادہ نظر نہیں آتا .... اپنی سرگزشت و شمارِ عمر لکھوں تو کیا لکھوں؟ ایک تودۂ غبار و جلوۂ سراب کی تاریخ حیات قلمبند ہو تو کیونکر ہو۔ دریا میں حباب تیرتے ہیں، ہوا میں غبار اڑتا ہے، طوفان نے درخت گرا دیے ہیں، سیلاب نے عمارتیں بہا دیں، عنکبوت نے اپنی پوری عمر تعمیر میں بسر کر دی، مرغ آشیاں پرست نے کونے کونے سے تنکے جمع کیے۔ خرمن و برق کا معاملہ، آتش و خس کا افسانہ ان سب کی سرگزشتیں لکھی جا سکتی ہیں تو لکھ لیجیے۔ میری پوری سوانح عمری بھی انھی میں مل جائے گی۔ نصف افسانۂ امید اور نصف ماتم یاس!"

اس تمہید کے بعد مولانا ابوالکلام نے ہمیں اگر کچھ بتایا بھی ہے تو وہ کچھ ایسا ہے کہ ہم اسے خرمن و برق کا استعارہ ہی سمجھنے پر مجبور ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں —— اور اگر غور کیجیے تو اس سے زیادہ کہا بھی کیا جا سکتا ہے۔ بالآخر آپ بیتی کے صحیح اظہار کے لیے استعارے ہی تو رہ جاتے ہیں۔ ان سے آگے بڑھنا چاہیں تو شاعری کیجیے اور اگر یہ لطیف پیرایہ بھی حسب حال نہ ہو تو ناول کے سفینے میں بیٹھ کر صفحۂ آب پر نقش کھینچتے جائیے۔ پانی کی ان گنت موجوں کی طرح اس کی وسعت بھی بے کراں ہے۔

یوسف جمال انصاری

آپ بیتی اور اُس کی مختلف صورتیں

ہماری ذات اور باہر کی دُنیا

علم کو ہم آسانی کے ساتھ دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک علم تو وہ ہے جس کا تعلق خارجی عالم سے ہے اور دوسرا خود اپنی ذات کا علم۔ بظاہر یہ معلوم ہوگا کہ خارجی عالم اپنی ذات کے مقابلے میں وسیع تر ہے۔ اپنی ذات سے باہر جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے وہ سب خارجی عالم ہے اور اس کے مقابلے میں خود ہماری ذات ایک حقیر سی چیز نظر آنے لگتی ہے۔ لیکن نگاہِ غور سے دیکھیں تو ہماری ذات میں اپنی جگہ ایک عالم ہے۔ ایک ایسا عالم جو ہمارے لیے خارجی عالم سے بھی زیادہ حقیقی اور ناقابلِ ادراک ہے۔ خارجی عالم کو جانچنے پرکھنے اور جاننے کے پیمانے موجود ہیں لیکن معرفتِ ذات کا کوئی پیمانہ موجود نہیں۔ معرفتِ ذات اسی لیے خارجی عالم کی واقفیت سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ اپنی روح کی گہرائیوں میں ڈوب کر اگر کوئی موتی ہم نکال بھی لائیں تو دُنیا کے بازار میں اس کی قدر و قیمت کا تعین آسان نہیں ہے۔

یہ کہنا بھی محض ایک دعویٰ ہے کہ علم کو حقیقی معنی میں یُوں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ دراصل باطن و خارج میں باہم ایک ایسا ربط ہے کہ خارجی عالم کو بھی اپنی ذات کی معرفت کے بغیر پرکھا نہیں جا سکتا اور یہی حال معرفتِ ذات کا ہے۔ اس کو جاننے کے لیے بھی خارجی عالم کا سہارا لینا پڑے گا۔ بات یہ ہے کہ علمِ ذات اور علمِ خوارج دونوں کے درمیان ایک ضد بھی ہے اور ایک ربط باہم بھی باہر کی دنیا جاننے کے لیے اپنی ذات کا سہارا لینا ناگزیر ہے اور اسی طرح اپنی ذات کی تشریح کرنے کے لیے کل پیمانوں کی مدد لینی پڑتی ہے جو باہر کی دُنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہماری ذات عالمِ خوارج کے ذریعے بھی ہماری سمجھ میں آتی ہے اور باہر کی دُنیا کو ہم اپنے آئینے میں دیکھ کر ہی پہچان سکتے ہیں وہ خواہ ہماری ذات ہو یا باہر کی دُنیا۔ یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ اُسے جاننے کے لیے ایسے اصول منضبط ہو سکتے ہیں، جن کا تعلق خود اپنے وجود سے ہو۔ مکمل معروضیت ناممکن ہے اور اسی طرح مکمل داخلیت بھی قرینِ قیاس نہیں۔ اس کے باوجود آسانی کی خاطر ہم نے علم کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ایک کا تعلق اپنی ذات سے اور دوسرے کا خارجی عالم سے ظاہر کیا ہے۔

معرفتِ ذات صرف صوفیوں کا مرکزِ نگاہ نہیں رہی۔ ابتدائے آفرینش ہی سے انسان یہ سوچتا چلا آیا ہے کہ میں کون ہوں؟ اور کیا ہوں؟ اور یہ گرد و پیش کی دنیا کیا ہے؟ اور میں یہاں کیوں آیا ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں اور مجھے کہاں جانا ہے؟ یہ اور اس قسم کے سوالات دراصل ہم خود اپنی ذات سے پوچھتے ہیں۔ ان سوالات کا جواب بھی اندر ہی سے آتا ہے۔ تصوف اور روحانیت کا تعلق اگرچہ ان سوالات سے گہرا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ صرف صوفیا ہی ان سوالات پر سوچتے آئے ہوں یا ان

جوابات دینے کے اہل ہوں۔ انسان میں ایک اجتماعی تجربہ بھی ہے اور ایک انفرادی تجربہ بھی۔ ان تجربوں کی روشنی میں اہل فکر اس قسم کے جواب تلاش کرتے آئے ہیں جب ہم ان سوالات کا جواب مرتب کریں تو وہ ایک تو خود ہمارا ذاتی جواب ہوگا، جس کا تعلق انفرادی تجربے سے ہوگا اور دوسرا عالم انسانیت کا مشترکہ اور اجتماعی جواب۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی سوانح حیات مرتب کرتا ہے تو دوسرے اشخاص ان کو دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں اور ان میں اپنی ذات کا عکس دیکھ کر ان سے تسکین حاصل کرتے ہیں۔ ورنہ پھر کیا وجہ ہے کہ ایک شخص کے حالات میں دوسرے شخص کو دلچسپی کا احساس ہوتا ہے۔

ہماری زندگی خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی۔ گوناگوں تجربات سے مرکب ہے۔ ہر سانس ایک تجربہ ہے اور ہر لمحہ ایک عالم ہے۔ یونہی زندگی کا سفر طے ہوتا رہتا ہے۔ وقت کی مثال ایک میدان کی سی ہے اور زندگی گویا ایک راہی ہے جو اُس میدان سے گزرے اور جب ہم اپنے سوانح حیات مرتب کرتے ہیں — تو گویا ہم ہر سانس کا محاسبہ کر رہے ہیں۔

ہمارا افسانوی ادب یوں شروع ہوا کہ ہم نے اپنے تجربات سے فائدہ اٹھا کر تخیلی انداز میں مختلف ناموں اور شخصیتوں کے سوانح حیات مرتب کرنے شروع کیے۔ افسانوی اشخاص دراصل ہماری ذات ہی کے حصے ہوتے ہیں۔ جو تجربات ہم ان کرداروں کے نام سے اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں۔ وہ خود ہمارے ہی تجربات ہوتے ہیں۔ افراط و تفریط سے قطع نظر ہم اپنے تجربات خواہ وہ سچ مچ پیش آتے ہوں یا ہم نے تخیل کی مدد سے قیاس کرلئے ہوں افسانوی رنگ میں پیش کردیتے ہیں اس طرح ہمارا افسانوی ادب دراصل سوانحی ادب ہے۔ جو واردات ہمارے افسانوی کرداروں کو پیش آتے ہیں۔ اگر وہ پیش نہ بھی آئے ہوں۔ تب بھی ان کی صداقت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ شاعرانہ صداقت اتنی تنگ اور سطحی نہیں ہوتی جتنی عام طور پر غیر شاعرانہ صداقت ہوتی ہے۔ شاعر کے دل پر وہ سب کچھ بیت جاتا ہے جو بظاہر پیش بھی نہ آیا ہو۔ پس ہم اپنے افسانوں میں جو کچھ دکھاتے ہیں۔ وہ ایک روحانی واردات ہوتی ہے جس کو شاعرانہ صداقت کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

سوانحی ادب افسانوی رنگ میں

افسانے اور سوانح میں ایک گہرا ربط ہے۔ بعض اوقات ہم فرضی ناموں سے اپنے تجربات پیش کرتے ہیں اور بعض اوقات اپنے نام سے دوسروں کے تجربات۔ ان دونوں صورتوں میں کوئی تناقض نہیں۔ ایک قاری کے لیے یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ وہ کسی فرضی کردار کے سوانح پڑھ رہا ہے یا کسی تاریخی شخصیت کی سوانح عمری۔ قاری کے لیے شخصی اور فرضی اشخاص میں تمیز کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اُسے تو اس قدر مشترک کو انسانیت یا انسانی تجربہ کہتے ہیں۔ ہمارے سامنے جلیل القدر بادشاہوں کے تزک اور مشہور ادیبوں کے خود نوشت تذکرے موجود ہیں۔ ہمیں اس سے کیا تعلق کہ جو کچھ امیر تیمور یا شہنشاہ بابر یا جہانگیر نے لکھا ہے۔ وہ صداقت پر مبنی ہے یا اس میں مبالغے کی رنگ آمیزی بھی شامل ہے۔ ہمیں تو اس سے تعلق ہے کہ جو کچھ ہم ان تذکروں میں پڑھتے ہیں۔ اس سے ہمیں کس حد تک دلچسپی ہوتی ہے۔ ان تذکروں میں اگر صداقت کی بجائے شاعرانہ صداقت اور حقیقت کی بجائے مبالغہ آمیزی بھی ہو تو ان کے ساتھ ہماری دلچسپی کم نہ ہوگی۔ اب اگر کوئی افسانوی رنگ میں

کسی فرضی بادشاہ کی سوانح حیات مرتب کرے اور اس میں ہمارے لیے دلچسپی کا پورا پورا سامان موجود ہو تو ہم ایسے افسانوی ادب کو اسی دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے جیسے ان تاریخی شخصیتوں کے سوانح کو۔ یہی حال ادبی تذکروں کا ہے۔ ضروری نہیں کہ ان تذکروں میں اس قسم کی صداقت تلاش کی جائے جو محض سطحی اور واقعاتی ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے شمس العلماء محمد حسین آزاد کی آبِ حیات پر یہ کہہ کر اعتراضات وارد کیے تھے کہ آبِ حیات میں جو روایات ملتی ہیں۔ ان میں سے بہت سی من گھڑت ہیں۔ یہ اعتراض کہ کوئی روایت من گھڑت ہے۔ اس لیے ناقابلِ قبول بھی ہوگی محض سطحی ہے۔ اگر کسی روایت میں خواہ وہ من گھڑت ہی کیوں نہ ہو، نفسیاتی اور شاعرانہ صداقت موجود ہے تو وہ روایت انتہائی قابلِ قدر ہے۔ یہی حال ان روایات کا ہے جو ہمیں آبِ حیات میں ملتی ہیں۔ یہ آزاد کا انتہائی کمال ہے کہ کسی شاعر کی تصنیفات سمجھانے کے لیے انھوں نے ایسی روایات تصنیف کیں جن سے اس شاعر کی تصنیفات کو سمجھنا ممکن ہو گیا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ حسنِ تخیل کے بل بوتے پر ان روایات کی تصنیف اعلیٰ قسم کی تخیلی شاعری کی حیثیت رکھتی ہے۔ غرض کہ سوانح اور افسانے میں ایک گہرا ربط ہے جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا بعض اوقات مصنف کو صیغہ واحد متکلم میں اپنے فرضی کردار کے سوانح حیات مرتب کرنا پڑتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی ادبی سوانح عمری کہلائی جاتی ہے۔ انگریزی ناول کے ابتدا میں یہ ایک عام دستور تھا کہ ہر ناول کو ایک سرگزشت کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ اٹھارویں بلکہ انیسویں صدی عیسوی میں بھی عام قارئین کا ادبی ذوق ناپختہ تھا۔ اگر کسی ناول پر یہ درج ہو کہ یہ محض فرضی کردار کا افسانہ نہیں ہے۔ سچ مچ کی سرگزشت ہے تو لوگ اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ ناول یا افسانے کو سوانح عمری یا سرگزشت کہہ کر پکارنا عام تھا۔ لوگ شاعرانہ صداقت کی قدر و قیمت سے پوری طرح آگاہ نہ تھے۔ اسی لیے مصنفین کو لازم آتا تھا کہ افسانے یا ناول کو سوانح یا سرگزشت یا شخصی تاریخ کہہ کر پکاریں۔ اس صورت میں دو قسم کے اسلوب اختیار کیے جاتے تھے۔ پہلا طریقہ یہ تھا کہ ہم نے کسی ہیرو کے حالات بیان کرنا شروع کر دیے یعنی مصنف اپنی ذات کو ظاہر کیے بغیر معروضی رنگ میں اصلی یا افسانوی کرداروں کے حالات پیش کرتا تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ ہیرو گویا خود اپنے حالات بیان کر رہا ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ اپنی خود نوشت سوانح حیات لکھ رہا ہے۔ خود نوشت سوانح حیات کو ہم آپ بیتی کہہ کر پکارتے ہیں۔ گویا یہ دوسری صورت افسانوی رنگ میں آپ بیتی لکھنے کے مترادف تھی۔ افسانے اور سوانح نگاری آپ بیتی اس طرح شاعرانہ تخیل کی تین صورتیں بن کر ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ افسانے کا سوانح یا آپ بیتی سے الگ کرنا ممکن نہیں۔ نگاری کے لیے اگر شاعرانہ صداقت موجود ہو تو افسانہ بھی سوانح حیات یا آپ بیتی سے مختلف نہیں اور اگر بنیادی انسانی قدریں مفقود ہوں تو سوانح حیات بھی بے جان اور بے معنی واقعات کا ایک تسلسل ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔

غرض کہ ناول کے ارتقا پر سرگزشت یا سوانح نگاری نے گہرا اثر ڈالا۔ سوانح نگاری کے دو اسلوب ممکن ہیں یعنی اعلیٰ افراد کے سوانح یا ادنیٰ کرداروں کے حالاتِ زندگی۔ ان دو صورتوں میں دو مختلف اسلوبِ نگارش کے نمونے سامنے آتے ہیں جب ہم کسی ہیرو یعنی اعلیٰ کردار کے لکھنے والے شخص کے اصلی یا فرضی سوانح لکھنے بیٹھیں تو اسلوبِ نگارش شاعرانہ نثر پیدا کرے گا۔ مبالغہ آرائی۔ توصیف اور شاعرانہ رنگ آمیزی کے بغیر اس قسم کے سوانح مرتب نہ ہو سکیں گے۔ اس کے برعکس ادنیٰ کرداروں اور جرائم پیشہ

اشخاص کے اصلی یا فرضی سوانح لکھتے وقت حقیقت پسندانہ نثر کے بغیر کام نہ چل سکے گا۔ ناول نگاری صرف اسی وقت ممکن ہے جب نثر اپنے ارتقا کی ایک خاص منزل تک پہنچ چکی ہو۔ اس نثر میں شاعرانہ اور حقیقت پسندانہ دونوں قسم کی کردار نگاری ممکن ہو۔ قاری کو اس سے غرض نہیں کہ یہ سوانح (علم اس سے کہ ان کا تعلق اعلیٰ کردار نگاری سے ہے یا ادنے' درجے کے افراد کا تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے) اصلی ہے یا فرضی۔ کم از کم ان سوانح کو اس طرح پیش کیا جائے کہ ان میں افسانوی صفات موجود ہو۔ سوانح کیونکہ دونوں قسم کے لکھے گئے ہیں۔ اس لیے نثر کے ارتقا میں اور خصوصیت کے ساتھ ناول نگاری کے ارتقا میں سوانحی ادب سے بڑا فائدہ پہنچا ہے۔ سچ پوچھئے تو ادنیٰ کرداروں اور جرائم پیشہ اشخاص کے سوانح ناول نگاری کے لیے زیادہ مفید اور ممد ثابت ہوئے ہیں۔ ان کی وجہ سے حقیقت پسندانہ اور سیدھی سچی نثر وجود میں آسکی۔ لیکن یہاں یہ بحث چنداں مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ اس لیے اسے ایک جملہ معترضہ کے طور پر لکھا جا رہا ہے۔ ناول نگاری پر بحث کرتے وقت شاید اس مبحث پر کچھ لکھنا واقعی مفید مطلب ہو سکتا تھا۔

سوانح نگاری اور انشائیہ

چھاپے کی ایجاد نثر کے لیے پیام رحمت بن کر آئی۔ اس کے ساتھ ہی نثر نگاری کے نئے نئے اسلوب وجود میں آنے لگے۔ افسانوی ادب تو پھر بھی معروضی اور داخلی طرز فکر کے بین بین ہے۔ انشائیہ ایک خالصتہً داخلی طرز نگارش ہے۔ چھاپے کی ایجاد کے بعد اول فرانس میں پھر انگلستان میں انشائیہ وجود میں آیا۔ یہ نثر کی ایک خاص قسم ہے جس میں لکھنے والا اپنے احساسات وخیالات کو قلم بند کرتا ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے مضامین ایک طرح کی آپ بیتی ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا بیٹھا سوچ رہا ہے یعنی وہ اپنے خیالات کو اپنے لیے لکھ رہا ہے۔ اس طرح انشائیہ میں ایک ذاتی صفت موجود ہوتی ہے اور انشائیہ کسی سوچنے اور لکھنے والے کے احساسات کا آئینہ ہوتا ہے۔ اردو نثر کا ارتقا یورپین زبانوں کے مقابلے میں دیر سے ہوا۔ یہاں چھاپے کی ایجاد بھی دیر ہی سے پہنچی تھی۔ پھر جس طرح ہر زبان کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔ اردو زبان میں بھی نظمیں اور غزلیں لکھی گئیں اور نثر بعد کو وجود میں آئی۔ اردو میں انشائیہ بھی انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں وجود میں آیا اور اس کو مناسب ترقی ہمارے زمانے میں ہوئی ہے۔ عبدالحلیم شرر، سجاد حیدر یلدرم، خواجہ حسن نظامی اور دوسرے اکابر نے اردو انشائیہ کو ترقی دے کر اسے دوسری زبانوں کے بہترین انشاپردازوں کے شاہکاروں کے دوش بدوش لا کھڑا کیا۔ سب سے قابل قدر شاید خواجہ حسن نظامی کے انشائیے ہیں۔ انشائیہ اور سوانح نگاری ایک دوسرے سے بے حد ملتے ہوئے ہیں۔ ان دونوں اصناف میں گہرا تعلق ہے۔ اس وقت میرے سامنے خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں کی ایک شاہکار کتاب "سی پارۂ دل" پڑی ہوئی ہے۔ میں اس کے اوراق پلٹتا ہوں تو جا بجا مجھے سوانح نگاری اور خود نوشت سوانح نگاری کے نمونے نظر آتے ہیں۔ "دیا سلائی" کے زیر عنوان لکھتے ہیں۔ آپ کون ہیں۔ ناچیز تنکا۔ اسم شریف دیا سلائی کہتے ہیں۔ "مگر ایک دھوبی کاغذی گھاٹ پر"۔ در اصل کپڑے دھونے والا دھوبی نہیں۔ روحوں کے داغ دھبے

دھونے والے صوفی کی سرگزشت ہے۔ "تنکے کا سلوک" یوں شروع ہوتا ہے۔ شیراز کے خلیق صوفی نے کہا۔ درخت کے ہر پتے پر کردگار کی معرفت منقوش ہے۔ اس چھوٹے سے مضمون میں قلم کے تنکے کا مختلف ادوار سے گزر کر کاغذ کی صورت میں رونما ہونا بیان کیا گیا ہے لیکن دراصل منازلِ تصوف کے ذریعے روح کا مصفا ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ "سوئی کی لن ترانی" میں کالے اور گورے دونوں کے تن ڈھانپنے کا قصہ ہے۔ کپڑا نہ ہو تو کیا انگریز اور کیا دیسی سب ننگے پھریں۔ غرضکہ ان انشائیوں میں خارج سے باطن کی طرف رجوع ہے۔ بظاہر لکھنے والے کا وہ ردِ عمل ظاہر کیا گیا ہے جس کا تعلق خارجی دنیا سے ہے لیکن گہری نظر سے دیکھا جائے تو باطنی اشارے ملتے ہیں اور منازلِ تصوف کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔ دراصل انشائیہ کسی مصنف کے ردِ عمل اور ذاتی احساسات وخیالات کا ذریعہ اظہار ہے۔ خود خواجہ حسن نظامی نے جو اس فن کے موجدوں میں سے تھے۔ انشائیہ اور سوانح اور خود نوشت سوانح میں تفریق نہیں برتی۔ کہیں وہ خارجی اشیا کے اندر حقیقت کا جلوہ دیکھنے کے لیے ایک سیر بین بن جاتے ہیں۔ چیزوں کو جانچتے پرکھتے اور بیان کرتے ہیں۔ یہ انداز سوانحی ہوتا ہے اور کہیں وہ خود مختلف اشیا کا روپ بھر لیتے ہیں اور مختلف حالات اپنے اوپر وارد کر لیتے ہیں۔ یہ صورت خود نوشت سوانح کی سی ہے جیسے کہ "میں کہ ایک دھوبی" "مچھر" اور "سوئی کی لن ترانی" میں انھوں نے اختیار کیا ہے۔

بعض لکھنے والوں نے انشائیہ میں اپنے احساسات کو بلا واسطہ پیش کیا ہے جیسے عبدالحلیم شرر اور سجاد حیدر یلدرم کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس قسم کے انشائیے بغیر کوئی روپ بھرے اور کوئی واسطہ تلاش کئے اپنے احساسات وخیالات میں ڈوب کر گوہر مقصود لاتے ہیں۔ اور پڑھنے والے کو احساس ہوتا ہے کہ جو کچھ لکھنے والے پر بیتی وہ خود اس پر بیت رہی ہے۔

اس کے برخلاف ایک طریقہ یہ ہے کہ دوسروں کے حالات یوں بیان کئے جائیں کہ قاری کو محسوس ہو جیسے وہ سب کچھ اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے۔ فرحت اللہ بیگ نے دلی کا ایک یادگار مشاعرہ لکھ کر اس طرزِ تحریر کو معراجِ کمال تک پہنچایا۔ آخری تاجدار دہلی بہادر شاہ ظفر کے دور کا ایک ایسا مرقع ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ جیسے ہم بھی اس دور میں سانس لے رہے ہیں۔ جن کرداروں کی سوانح نگاری کی گئی ہے۔ وہ جیتے جاگتے ہیں۔ گویا ہم سے ملاقات کر رہے ہیں۔ احوالِ غالب میں مالک رام نے ایک مختصر مضمون میں مرزا غالب کے رہن سہن کو اجاگر کیا ہے مگر ایسے جاندار طریقے سے کہ سارے حالات جیتی جاگتی تصویریں بن کر تخیل کے پردے پر ابھرتی ہیں۔ گویا ایک غالب کا پرستار آگرے سے چل کر دہلی پہنچتا ہے۔ اور دو مختلف موقعوں پر غالب سے ملاقات کرتا ہے۔ غالب کے رہنے سہنے کا طریقہ۔ غالب کے عادات و مزاج۔ غالب کے دوستوں کی تصویر کشی۔ غالب کے احباب کا غالب کے ساتھ تعلق خاطر۔ غرضکہ ایک پورا دور چند صفحات میں یوں پیش کیا گیا ہے کہ دریا کوزے میں بند ہو گیا ہے۔ سوانح نگاری کا یہ ایک انوکھا شاہکار ہے۔

مکتوبات کے ذریعہ سوانح نگاری

آپ بیتی کی ایک صورت مکاتیب نگاری ہے۔ خط و کتابت ایک فطری اور بے تکلف طریقۂ اظہار ہے جس کو

انسان اپنے حالات وخیالات کو سیدھے سچے طریقے سے ظاہر کرتا ہے۔ اُردو میں سب سے پُرلطف خط مرزا غالب نے لکھے ہیں۔ ان خطوط کو ایک خاص ترتیب سے پڑھا جائے تو یہ خطوط مرزا غالب کے حالات کے مختلف ابواب بن جاتے ہیں۔ مکتوبات ادب کا وہ شعبہ ہیں جنھیں صداقت پر مبنی خیال کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ناول نگاری کی داغ بیل پڑی تو لوگوں نے مکتوبات کے ذریعے ناول لکھے۔ یعنی پورا ناول مختلف خطوط پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس طرح لکھنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ افسانوں اور ناولوں کو اس زمانے کے قاری صداقت سے خالی سمجھتے تھے۔ اس کے برخلاف خطوط کو وہ صداقت پر مبنی خیال کرتے تھے۔ خط وکتابت خواہ وہ اصلی ہو یا فرضی، ناول نگاری کے ارتقا میں ایک اہم کڑی رہ چکی ہے۔ قباحت یہ ہے کہ پلاٹ کے تسلسل کو خط وکتابت کا پیرایۂ بیان غیر ضروری طور پر پھیلا دیتا ہے۔ ہیرو یا ہیروئن کا کچھ حال بیان کرنا ہو تو اس کے لیے ایک لمبا خط لکھا جانا ضروری ہے جس میں بہت سی غیر متعلق باتیں اس لیے بیان کی جائیں گی کہ وہ خط سچ کا خط معلوم ہو۔ . . . یہی وجہ ہے کہ آخر کار یہ اسلوب نگارش ناول نگاروں کو ترک کرنا پڑا۔ لیکن جہاں تک سوانح نگاری کا تعلق ہے، یہ ایک امر مسلّمہ ہے کہ خطوط خود نوشت سرگزشت ہوتے ہیں۔ آج بھی مشہور ادبی و سیاسی شخصیتوں کے خطوط ہمارے ادب کا ایک قابل قدر سرمایہ ہیں۔ (خطوط غالب، غبار خاطر از ابوالکلام آزاد۔ مکتوبات نیاز فتح پوری)

روزنامچے

آپ بیتی یا سرگزشت لکھنے کا ایک طریقہ روزنامچہ نویسی ہے۔ ڈائری یا روزنامچہ ادب کا ایک شعبہ ہے۔ بعض روزنامچے عالمگیر شہرت کے مالک ہیں۔ اٹلی اور انگلستان میں بعض نامور ادیبوں نے اپنے روزنامچے لکھے۔ ان روزنامچوں سے نہ صرف لکھنے والے کے سوانح معلوم ہوتے ہیں بلکہ اس کے دور پر روشنی پڑتی ہے۔ ہم ایک پورے دور کو ایک شخصیت کے روزنامچے میں جلوہ گر دیکھتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں خواجہ حسن نظامی کے روزنامچے بڑے مقبول ہوئے۔ یہ روزنامچے اولاً رسالہ درویش دہلی اور اس کے بعد رسالہ منادی دہلی میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو روزنامچے اشاعت کی غرض سے تحریر میں لائے جاتے ہیں۔ ان میں ایک پہلو نمائش کا ہو سکتا ہے اور دوسرا اخفائے حقیقت کا۔ یعنی لکھنے والا جس رنگ میں اپنے کو پیش کرنا چاہے اس رنگ میں پیش کرتا ہے۔ روزنامچے کی بہترین صورت وہ ہے جب لکھنے والا اپنی یادداشت کے لیے روزنامچہ لکھے۔ نہ کہ اشاعت کی غرض سے۔ خود نوشت سوانح نگاری میں روزنامچے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے کہ روزنامچے میں مصنف کے روز وشب کا ذکر خود اس کے قلم سے ہوتا ہے۔ روزنامچے کی ایک خاص ادبی صورت بھی ہے۔ جس طرح مرزا رسوا نے امراؤ جان ادا میں ایک طوائف کی سرگزشت لکھی۔ اسی طرح قاضی عبدالغفار نے لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری میں ایک طوائف اور ایک قلاش بین کے روز وشب کا حال قلم بند کیا ہے۔ یہ تینوں کتابیں ہمارے سوانحی ادب میں ایک خاص درجے کی مالک ہیں۔ امراؤ جان ادا دراصل کسی ایک طوائف کا افسانہ نہیں۔ یہ ہمارے معاشرے کی داستان ہے جس کی مرکزی کردار ایک زنِ بازاری ہے جو بالفاظ دیگر طوائفوں کی نمائندہ ہے۔ یہ کتاب کردار نگاری کے درجۂ کمال تک پہنچی ہے جس معاشرے کا

ذکر اس میں کیا گیا ہے۔ طوائف اُس معاشرے میں ایک خاص حیثیت کی مالک ہوا کرتی تھی۔ طوائف کا کوٹھا نوجوانوں کے لیے ایک تربیت گاہ سے کم نہ تھا۔ لیلیٰ کے خطوط میں بھی طوائف کی ذہنیت کا ایک نہایت کامیاب تجزیہ ملتا ہے۔ یہ طوائف بھی ایک بیچی جاتی عورت ہے لیکن نقطۂ نظر وہ نہیں جو مرزا رسوا کا تھا۔ یہاں طوائف حسنِ خوں آشام کے روپ میں بھی نظر آتی ہے اور پہلو میں ایک دھڑکتا ہوا دل رکھنے والی عورت کی صورت میں بھی۔ مگر اب طوائف کو وہ پہلا سا مقام حاصل نہیں۔ مجنوں کی ڈائری میں ایک تماش بین نوجوان کے سوانح ہیں۔ ان میں ان کو تماش بین طبقے پر ایک گہرا طنز ملتا ہے۔

مثنوی

ہمارے بیانیہ ادب کی ایک اہم شاخ مثنوی ہے۔ مثنوی کے ذریعے شاعر اپنا حال بھی قاری تک پہنچاتا ہے اور دوسروں کا حال بھی۔ یوں تو ہم مثنوی کو آپ بیتی سے کہیں بڑھ کر جگ بیتی قرار دے سکتے ہیں۔ اس لیے کہ مثنوی میں بعض اوقات تاریخی شخصیتوں اور بعض اوقات فرضی کرداروں کے قصے ہوتے ہیں۔ لیکن آپ بیتی کا پہلو بھی اکثر و بیشتر مثنویات میں موجود ہوتا ہے۔ ہماری شاعری میں مثنوی کو رزمیہ کا قائم مقام سمجھا جاتا ہے۔ رزمیہ شاعری میں ہیرو خواہ وہ افسانوی ہو یا تاریخی کارہائے نمایاں انجام دیتا ہے۔ دنیا کی عظیم ترین شاعری رزمیہ شاعری ہی کو تصور کیا گیا ہے۔ ہومر کی ایلیڈ، فردوسی کا شاہنامہ، ملٹن کا فردوسِ گم گشتہ۔ ہندوستانی ادب میں رامائن اور مہابھارت۔ غرضیکہ رزمیہ شاعری کے اعلیٰ ترین نمونے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں لیکن اعلیٰ کردار کے کارہائے نمایاں بیان کرنے کا فن ہر زبان میں پایا جاتا ہے۔ خواہ وہ خالصتاً رزمیہ کی حدود میں آتا ہو یا نہ آتا ہو۔ نظامی کا سکندر نامہ۔ جامی کی یوسف زلیخا، وارث شاہ کی ہیر، میر حسن کی بدر منیر اور دیا شنکر نسیم کی گلزارِ نسیم اور اسی طرح اگر گنتے چلے جائیں تو مشرقی ادب میں بیانیہ شاعری کے اعلیٰ نمونوں کا فقدان نہیں ہے جیسا کہ بیانیہ شاعری کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ ان مثنویوں میں جو پیرایۂ اظہار اختیار کیا گیا ہے وہ معروضی ہے۔ یعنی ہم ان مثنویوں کے ذریعے ایک تہذیب اور ایک دور سے پوری طرح واقف ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے مثنوی کو جگ بیتی کہہ کر پکارنا مناسب ہوگا۔ تاہم یہ بھی ایک قدیم دستور چلا آتا ہے کہ اصل قصہ بیان کرنے سے پہلے شاعر خود اپنے دور اور اپنے حالات مختصراً بیان کرے۔ اس حصے کو آپ بیتی کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ دونوں صورتوں میں مثنوی نظم کے پیرائے میں سوانحی ادب کی اہم ضروریات کو پورا کرتی چلی آئی ہے۔

تذکرے

مشرقی زبانوں میں تنقید اور تجزیے کی ابتدا دیر سے ہوئی۔ اس باب میں مغربی زبانوں کو اولیت کا شرف حاصل ہے لیکن مشرق میں تذکرہ نگاری کا دستور شروع ہی سے رہا ہے۔ ہمارے ہاں تاریخ ادب کے سلسلے میں بھی تذکرے ہی مرتب کیے جاتے تھے۔ میر تقی میر، میر حسن اور مصحفی کے دور سے لے کر آبِ حیات بلکہ خمخانۂ جاوید تک ہمیں شاعروں کے حالات لطائف، مشہور واقعات وغیرہ ہی ملتے ہیں۔ تنقید اس قسم کے تذکروں میں ہے بھی تو برائے نام۔ اس بہانے سے کم از کم اتنا

جو اگر اردو شاعری کی ابتدا سے موجودہ زمانے تک مشہور شعرا کے حالات ضرور مرتب ہو گئے۔ سوانحی ادب کو ان تذکروں سے بڑا فائدہ پہنچا۔ خود ہمارے دور میں اور ذرا اس سے کچھ پہلے تذکرہ نویسی میں مغربی اور خصوصیت کے ساتھ انگریز مصنفین کے زیر اثر ایک نئی شان پیدا ہو گئی۔ تذکرہ محض تذکرہ ہی نہیں رہا۔ اس میں صاحب مضمون پر اور اس کے اعمال و افعال پر تذکرہ نویس کی طرف سے تنقید بھی کی جانے لگی۔ مولوی عبدالحق کا تذکرہ "چند ہم عصر"، مرزا فرحت اللہ بیگ کی "نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی" رشید احمد صدیقی کی "گنج ہائے گراں مایہ" اور بعض اس قسم کی دوسری تصانیف تذکرہ نویسی کے ارتقا میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

بعض لکھنے والوں نے خود اپنا تذکرہ اپنے قلم سے کیا ہے۔ یہ سلسلہ یوں تو میر اور میر حسن اور مصحفی سے شروع ہوتا ہے اور حسرت موہانی تک چلا جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی عجیب بات ہے کہ مشرقی عجز و انکسار نے ان تذکرہ نویسوں کو کھل کر اپنی ذات کے متعلق لکھنے کی اجازت نہیں دی۔ دوسروں کے حالات میں تو انھوں نے پوری کی پوری کتابیں لکھ ڈالیں لیکن جب اپنی باری آئی تو اپنے متعلق چند سطروں ہی میں اشارہ کر کے رہ گئے۔ بہرحال ان اشارات کو مجتمع کر کے خود مصنف کے الفاظ کو اس طرح ترتیب دیا جا سکتا ہے کہ اس کے خود نوشت حالات یکجا ہو جائیں۔ اور ان تذکرہ نویسوں نے اپنا حال بھی کھل کر بیان کیا ہوتا تو ہمارے سوانحی ادب کو تذکرہ نگاری سے اور زیادہ فائدہ پہنچتا یعنی وہ اسرار و معارف ہم تک پہنچ سکتے جو مشرقی وضع عجز و انکسار کی نذر ہو گئے اور اب کوئی صورت معلومات کی باقی نہیں۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ایک فرد واحد کے علم میں موجود ہوتی ہیں لیکن کاغذ پر نہ آ سکنے کے باعث معدوم ہو جاتی ہیں اور دنیا ان سے محروم رہ جاتی ہے۔

شخصیت نگاری

شخصیت نگاری کا فن بھی ہم نے مغرب ہی سے سیکھا ہے۔ ناول سے پہلے مغربی ادب میں انشائیہ اور شخصیت نگاری موجود تھے بلکہ شخصیت نگاری تو انشائیہ سے بھی بہت پہلے سے ہوتی آئی ہے۔ شخصیت نگاری نہ ہوتی تو افسانوی ادب میں کردار نگاری کا ارتقا بھرپور طریقے پر نہ ہوا ہوتا۔ بات یہ ہے کہ شخصیت نگاری دراصل ایک طرح کی کردار نگاری ہی ہے۔ انداز تحریر عموماً ڈرامائی سا ہوتا ہے۔ کردار کے خد و خال یوں ابھارے جاتے ہیں کہ ذہن کے پردے پر کردار کی تصویر جیتی جاگتی سامنے آ جاتی ہے اور قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ سچ مچ کردار سے اس کی ملاقات ہو رہی ہے۔ ایک اور طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پیرایۂ اظہار ڈرامائی نہ ہو بلکہ بیانیہ ہو۔ اس صورت میں تاثر ذرا الفاظ کو پھیلا کر بیان کرنے سے پیدا ہوتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ پچھلے زمانے کی بات بیان کی جاتی ہے۔ سوانح نگاری کے ڈرامائی طرز میں ماضی کو اس طرح سامنے لایا جاتا ہے کہ وہ حال نظر آتا ہے۔ بہرحال انداز تحریر کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ مقصد ایک ہی پیش نظر رہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کردار کے حالات قاری تک پہنچائے جائیں۔

بعض متفرق صورتیں

بعض لوگوں نے اپنے خود نوشت سوانح ہم تک خطوط کے ذریعے پہنچائے ہیں۔ اس ضمن میں خطوط غالب اور غبار خاطر

کا نام اوپر آچکا ہے۔ بعض دفعہ یہ ہوا ہے کہ کسی مشہور شخصیت سے اس کے حالات پوچھے گئے تو اس نے مکتوب کے رنگ میں یہ حالات لکھ بھیجے۔ کبھی ایسا ہوا ہے کہ پوچھنے والے نے ان مکتوبات کی روشنی میں شخصیت کے حالات مرتب کر لیے۔ بسا اوقات یہ بھی ہوا ہے کہ اس نے پورے کا پورا خط یا اس کا ضروری اقتباس جوں کا توں لے لیا اور شخصیت کے ضمن میں درج کر لیا۔ اس صورت میں الفاظ گویا وہی رہے جو صاحب سوانح نے اپنے خط میں استعمال کیے۔ بعض اوقات شخصیت نگاری ایک ادبی روپ اختیار کرتی ہے۔ کوئی صاحب تصنیف اپنی کتاب کا پیش لفظ اپنے حالات سے مرتب کرتا ہے اور یوں اپنی پوری شخصیت کو اپنے نظریۂ فن کو اپنے الفاظ میں قلم بند کر دیتا ہے۔ ادب کو اس قسم کی تحریروں سے بڑا فائدہ پہنچا ہے۔ اس لیے کہ ان تحریروں میں قیاس اور مفروضات کی گنجائش نہیں رہتی۔ مصنف ہم کو اپنے ذہن کا آئینہ خود دکھا دیتا ہے۔ پرانی کتابوں میں یہ دستور عام تھا کہ اصل کتاب جہاں سے شروع ہو، اس سے پہلے مصنف عرض حال کرتا تھا۔ یہ ایک تمہید یا پیش لفظ کی صورت ہوتی یعنی یہ کتاب کیوں لکھی جا رہی ہے۔ یہ کتاب کس دور میں لکھی جا رہی ہے۔ اس کتاب کے لکھنے والا کون ہے؟ اور اس کے حالات زندگی کیا ہیں؟ یہ اور اسی قبیل کے سوالات کا جواب دیباچے کی صورت میں مصنف خود دے دیتا تھا۔

مشاہیر کا انٹرویو

موجودہ زمانے میں مشہور شخصیتوں کا انٹرویو کرنے اور ان سے زبانی ان کے حالات و خیالات معلوم کرنے کا طریقہ نکلا ہے اور ہمارا دور ایک صحافتی دور ہے۔ اس دور میں رسائل و اخبارات کے ایڈیٹر ملک کے مشہور ارباب فن کے پاس جاتے ہیں اور ان کی خدمت میں ایک سوال نامہ پیش کرتے ہیں جس کا جواب خواہ مختصر ہو خواہ طویل۔ ان مشاہیر کے حالات و خیالات کو اپنے حصر میں لے لیتا ہے

یہ طریقہ بھی قابل قدر ہے خصوصاً اس نفسیاتی زمانے میں جب سوال نامہ یوں مرتب کیا جاتا ہے کہ ساری ضروری باتیں پوچھی جا جواب مکمل اور شافی ہو۔

شخصیت نگاری کا فن دراصل مشاہیر کے سوانح لکھنے کا فن ہے۔ خود نوشت سوانح عمری اس کی زد میں نہیں آتی۔ ایک شخص دوسرے اشخاص کے متعلق اپنے تاثرات ضبطِ تحریر میں لاتا ہے۔ ہمارے دور میں شخصیت نگاری پر خاصا کام ہوا ہے۔ فرحت اللہ بیگ، مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، عبدالمجید سالک، دیوان سنگھ مفتون اور ان کے علاوہ بھی بعض نمایاں شخصیت نگاروں نے اس فن میں اضافہ کیا ہے۔ رسالہ نقوش کا شخصیات نمبر اس ضمن میں ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے۔ قاری کا لطف یہاں دوبالا ہو جاتا ہے۔ جہاں ایک مشہور لکھنے والا دوسرے مشہور لکھنے والے پر اظہار خیال کر رہا ہو۔ شخصیت نگاری ایک فن کے علاوہ ایک سائنس بھی ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے دور میں نفسیات اور تجزیہ نفس نے جو ترقی کی ہے۔ وہ پچھلے زمانے تک نہیں ہوئی تھی۔ اب شخصیت کو سمجھنے کے نئے نئے پیمانے وضع ہوئے ہیں اور نئے نئے اصول بنائے گئے ہیں۔

سفرنامے اور رپورتاژ

زندگی کو ایک سفر اور دنیا کو عالم مسافرت اور سرائے فانی وغیرہ کہہ کر پکارنا عام ہے۔ ان تشبیہات

کے پیچھے جو نفسیات کام کر رہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں سفر کرتا چلا آتا ہے۔ یوں تو ہر سانس ایک سفر ہے جو مختصر وقت میں اختیار کیا گیا ہو لیکن تشبیہات سے قطع نظر بھی دیکھا جائے تو ابتدا میں انسان ایک جگہ رہ کر متمدن زندگی بسر کرنے کے بجائے جگہ جگہ مارا مارا پھرتا تھا۔ یہ کیفیت ہزاروں بلکہ لاکھوں برس قائم رہی۔ اس نے ہماری نفسیات پر ایک گہرا اثر چھوڑا۔ آج ہم کو شہری زندگی اختیار کئے ہزاروں برس کا زمانہ گزرا۔ لیکن ہمارے تحت شعور میں پچھلے تجربات کا نقش موجود ہے اور یہ نقش غالباً مٹ نہیں سکتا۔ زندگی کو تو ہم سفر سے تشبیہ دیتے ہی آئے ہیں۔ موت بھی ہمارے لیے ایک سفر ہی ہے اور موت کے بعد بھی یہ تصور موجود ہے کہ سفر ابھی ختم نہیں ہوا۔ بقول میرؔ

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر بڑا شاعر اور مفکر کسی منزل کی طرف سفر میں مصروف و منہمک ہے جیسے وہ اپنی جنت یا جہنم تلاش کر رہا ہو۔ اگر طرزِ فکر نشاطیہ ہے تو زندگی کا سفر اس امید پر طے ہو رہا ہے کہ اس کی منزل کوئی خیالی جنت ہے۔ اگر شاعر اذیت پسند ہے تو گویا وہ دوزخ کی طرف کشاں کشاں جا رہا ہے۔ یہ احساس اتنا شدید ہوتا ہے کہ خود زندگی ہی میں جنت اور دوزخ ہر سانس میں ملتی ہے۔ غرض کہ کوئی لمحہ اہلِ فکر کا سفر سے خالی نہیں۔ یہاں ایک پہلو اور بھی قابلِ غور ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان فطرتاً تجسس پسند ہے۔ وہ خیال کی دنیا میں اور حقیقی دنیا میں تلاش و تجسس میں لگا رہتا ہے۔ گویا وہ ایک کولمبس ہے اور اس کا مقصود کوئی نئی دنیا دریافت کرنا ہے۔ اپنے وطن سے نکل کر جنگلوں جنگلوں مارے مارے پھرنا دریاؤں اور سمندروں میں طوفانوں کے مقابلے کرنا۔ طرح طرح کے مصائب سے دوچار ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان میں ایک ازلی خواہش سفر کرنے کی ہے اور نئی نئی جگہیں دریافت کرنے کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زبان کے ادب میں سفرناموں کی بہتات ہے۔ ان سفرناموں میں بعض اوقات بے سروپا باتیں بھی ہوتی ہیں۔ سفر کرنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہم بیان کریں گے۔ اس پر پڑھنے والے پورا یقین کریں گے۔ چنانچہ وہ جھوٹ اور سچ کو خلط ملط کرتے آئے ہیں۔ بہرحال مبالغہ آرائی سے قطع نظر بھی سفرناموں میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ ان میں دوسروں کے حالات بھی ہوتے ہیں اور اپنے تجربات بھی ان میں مشہور مقامات اور مشہور شخصیات کی تصویر کشی بھی ہوتی ہے۔ اس طرح جگ بیتی اور آپ بیتی کا سنگم اگر ملتا ہے تو سفرناموں میں۔ ان سفرناموں کے پڑھنے سے ہماری فطرت کا ایک بنیادی تقاضا تسکین پاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ سفرنامے اس قدر مقبول ہیں۔ اردو زبان میں بھی سفرناموں کی کوئی کمی نہیں۔ علامہ شبلی اور خواجہ حسن نظامی نے بلادِ اسلامیہ میں اپنے سفر کا حال ایسے منفرد انداز میں لکھا ہے کہ ان کے سفرنامے ہمارے ادب کا جزو بن کر رہ گئے ہیں۔

سفر کے تاثرات ظاہر کرنے کا ایک جدید طریقہ رپورتاژ ہے۔ بنیادی طور پر یہ رپورٹ کرنے کا ایک فن ہے یعنی جو کچھ دیکھا جائے وہ بیان کر دیا جائے لیکن فنی صورت یہ ہے کہ ایک طویل مقالے میں کسی سفر کے تاثرات کو ابھارا جائے اور رنگِ تحریر افسانوی ہو۔ یہ فن مغرب میں بھی ابھی جدید ہی سمجھا جاتا ہے اور خود ہماری زبان میں تو اس کو رائج ہوئے چند ہی سال کا عرصہ گزرا ہے۔ بعض اچھے رپورتاژ اردو میں وہ ہیں جو مشہور افسانہ نگار کرشن چندر نے لکھے۔ ان رپورتاژوں میں سفر کی سرگزشت اور لکھنے والے کے ذاتی تاثرات کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے اور ان کے پڑھنے میں سفرنامے اور افسانے دونوں کا مزہ آتا ہے۔ مناظر کی عکاسی کے ساتھ ساتھ

اپنے احساسات کی عکاسی بھی کی جاتی ہے اور یہ لحاظ بھی رکھا جاتا ہے کہ انفرادی طور پر جو کچھ لکھنے والے نے محسوس کیا، اجتماعی طور پر قارئین بھی وہی محسوس کر سکیں۔

آپ بیتی کا عنصر متفرق اصنافِ سخن میں

بظاہر مثنوی کے علاوہ دوسرے اصنافِ سخن میں اتنی گنجائش نہیں معلوم ہوتی کہ شاعر ان کے ذریعے اپنی آپ بیتی بیان کرے۔ لیکن غزل کی صنف ایسی رنگا رنگ ہے کہ اس میں سب کچھ کہا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ کہنے کا ڈھنگ آتا ہو۔ بات یہ ہے کہ غزل انفرادی تجربے کو عمومی رنگ میں پیش کرنے کا دعویٰ کرتی ہے۔ اگرچہ غزل کا ایک خاص اسلوب ہے اور کہا گیا ہے کہ غزل کے موضوعات بھی متعین ہیں لیکن غزل کا کمال یہی ہے کہ وہ بیک وقت عمومی بھی ہوتی ہے اور انفرادی بھی۔ غزل کا شاعر ایک مخصوص شخصیت بن کر ہی سامنے آتا ہے اور اگر وہ عظیم شاعر ہو تو خود غزل کو اپنے انفرادی تجربے کا ذریعۂ اظہار بھی بنا دیتا ہے۔ چنانچہ بڑے بڑے غزل گو وہی ہیں جنھوں نے غزل میں ایک انفرادی رنگ پیدا کیا ہے اور اپنے ذاتی حالات و تجربات غزل کے روپ میں پیش کئے۔ اس سلسلے میں میرؔ، غالبؔ، داغؔ، اقبالؔ اور جوشؔ کے نام پیش کئے جا سکتے ہیں۔ جن کی شخصیت کا ذریعۂ اظہار ان کی غزل ہے۔ مولانا حسرتؔ موہانی کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے جنھوں نے اپنے سیاسی تجربات قید و بند کے حالات آزادی کی تڑپ اور اسی قسم کے دوسرے خیالات کو غزل کا جامہ پہنایا ہے۔ قصیدے کے باب میں بھی یہی کچھ کہا جا سکتا ہے جو غزل کے ضمن میں کہا گیا ہے۔ ایرانی شعراء اور ان کے بعد پاک و ہند کے پارسی اور اردو قصیدہ نگار اپنے قصائد میں اپنے سوانح اور زمانے کے حالات کا تذکرہ کرتے چلے آئے ہیں۔ اس ضمن میں عرفیؔ اور فیضیؔ کے قصائد ایک خاص حیثیت کے مالک ہیں۔ ان شعراء کی آپ بیتی ان کے قصائد میں موجود ہے۔ یہی حال سوداؔ اور ذوقؔ کے قصیدوں کا ہے۔ سوداؔ نے خصوصیت کے ساتھ شکایاتِ زمانہ اور ذاتی حالات اپنے قصائد میں داخل کئے۔ ایک حد تک رباعیات میں بھی آپ بیتی کی جھلک ملتی ہے۔ ہر چند کہ رباعی کی صنف چار مصرعوں پر مشتمل ہے اور چار مصرعوں میں اپنے حال کو پورا طرح بیان کرنا چنداں آسان نہیں۔ شاعر کو اختصار اور گہرائی سے کام لینا پڑتا ہے یعنی اپنے حالات کی ایک جھلک دکھانے پر قناعت کرنی پڑتی ہے۔ غرضیکہ مثنوی کے علاوہ غزل، قصیدہ اور رباعی بھی اپنے حالات بیان کرنے میں شاعر کی مدد کرتی آئی ہے۔

سوانح عمری اور آپ بیتی

سوانح نگاری کے لیے چند شرائط ضروری ہیں۔ اوّل یہ کہ سوانح نگار اپنے فن سے پوری طرح واقف ہو۔ دوسری یہ کہ سوانح نگار زمانے کے بدلتے ہوئے مذاق کے مطابق شخصیت کے ان عناصر پر زور دے جو قارئین کی نگاہ میں اہمیت رکھتے ہوں۔ تیسری یہ کہ سوانح نگاری کے ذریعے شخصیت نگاری کا فن ترقی کر سکے۔ بظاہر یہ شرائط کچھ ایسی اہم نہیں معلوم ہوتیں۔ بعض لوگ تو بغیر کسی فنی آگاہی کے صرف اپنے جوہرِ قابل پر اعتماد کر کے سوانح نگاری کرتے آئے ہیں۔ لیکن ان کی کامیابی

کا راز یہ ہے کہ نادانستہ طور پر وہ ان اصولوں پر کاربند رہے ہیں۔ پہلی شرط کا تعلق ترک و اخذ سے ہے۔ یعنی ایک اصلی یا فرضی کے کون سے پہلو نمایاں کئے جائیں اور کون سے چھوڑ دیئے جائیں۔ کسی ہیرو کا حال بیان کرنے میں یہ لحاظ رکھا جاتا ہے کارہائے نمایاں پر زور دیا جائے۔ اس کی زندگی کے ان لمحات کا حال تفصیل کے ساتھ بیان کرنا لاحاصل ہوگا۔ جن میں وہ چھو باتوں میں لگا رہا ہو یا ایسے غیر ضروری کاموں میں مصروف رہا ہو۔ جن کے بیان سے قاری کو کوئی فائدہ نہ پہنچے جو لوگ خود اپنے حالات یا دوسروں کے سوانح ایک خاص نقطۂ نظر سے بیان کرتے ہیں اور اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر اپنی یا دوسروں کی شخصیت کے خدوخال نمایاں کرتے ہیں۔ وہ سوانح نگاری کے فن سے واقف ہوتے ہیں۔ سوانح نگاری ایک بڑی ذمہ دار صنفِ ادب ہے جن شخصیتوں کے سوانح ماڈل یا نمونہ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کئے جائیں۔ ان میں واقعی کوئی بات بھی ایسی ہونی چاہئے کہ پڑھنے والے کو احساس ہو کہ اس شخصیت کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہے۔ یہی شخصیتیں ہمارے سماج میں ہیرو بن کر ابھرتی ہیں۔ ان کا میدانِ عمل خواہ سیاسی ہو یا روحانی یا ادبی یہاں یہ بھی ضروری ہے کہ جن شخصیات کے سوانح پیش کئے جائیں۔ ان کی صرف مدح سرائی ہی نہ کی جائے۔ سوانح نگاری کوئی قصیدہ نگاری نہیں ہے۔ عام شخصیتوں کی غلطیاں اور کوتاہیاں سامانِ عبرت و بصیرت ہوتی ہیں۔ یہ کوتاہیاں اگر ظاہر نہ کی جائیں اور معروف شخصیتوں کو ہیرو بنا کر محض ان کی پوجا کی جائے تو یہ فنِ سوانح نگاری کے ساتھ انصاف کرنا نہ ہوگا۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ صاحبِ سوانح کی عظمت کو پوری طرح سمجھا جائے۔ کسی بڑے آدمی میں وہ کونسی خوبیاں تھیں۔ جس نے اس کو بڑا بنایا یہ جب تک یہ معلوم نہ ہو اور سوانح نگاری کے ذریعہ سے عام قارئین تک نہ پہنچایا جاسکے۔ قارئین کو پورا فائدہ نہ پہنچے گا۔ یہاں جگ بیتی اور آپ بیتی میں کوئی فرق نہیں۔ چاہے میں خود اپنا حال لکھوں۔ لیکن جب تک مجھے اپنی کوتاہیوں اور بلندیوں کا پورا احساس نہ ہو اور میں ان دونوں کو اپنے پڑھنے والوں تک نہ پہنچا سکوں۔ میری آپ بیتی دوسروں کے لیے فائدہ مند نہ ہوگی۔

مذاقِ زمانہ وقت کے ساتھ بدلتا رہا ہے وہ بدلتا رہے گا۔ شخصیت کے جن پہلوؤں پر پچھلے دور کے لوگ زور دیتے تھے۔ یہ ضروری نہیں کہ موجودہ نسل کے لوگ بھی انھیں کو پسند کرتے ہوں نہ یہ ضروری ہے کہ ایک قوم یا ملک کے رہنے والے جن شخصی خصوصیات کو پسند یا ناپسند کرتے آئے ہیں۔ دوسری قوم یا ملک کے لوگ بھی انھیں کو پسند یا ناپسند کریں گے۔ مختلف زمانوں اور مختلف مقامات میں سوچنے کا ڈھنگ مختلف رہا ہے۔ دنیا اتنی متنوع اور رنگارنگ ہے۔ سوچنے کے طریقے اور فیشن وقت کے ساتھ ساتھ اس طرح بدلتے چلے آئے ہیں کہ کل جو چیز خوبی کہلاتی تھی۔ ممکن ہے کہ آج برائی نظر آئے۔ سرمایہ داری کے دور میں جو قدریں قابلِ قدر تھیں۔ جمہوری زمانے میں ان میں سے اکثر ناپسندیدہ ہوگئی ہیں۔ سائنس کی ترقی۔ سیر و سفر کی آسانیاں۔ علوم کی اشاعت اور ایسے ہی بہت سے دوسرے وجوہ ہمارے معاشرتی زاویہ ہائے نگاہ کو بدل دینے کے لیے کافی ہیں۔ چنانچہ کامیاب سوانح نگار وہ ہے جو اپنے دور کے تقاضوں کو پوری طرح سمجھتا ہے اور یہ جانتا ہے کہ شخصیت کے کون سے پہلو اس کے دور میں نمایاں کرنے کے قابل ہیں۔

شخصیت نگاری جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے۔ اب ایک فن ہی نہیں ایک سائنس بھی ہے۔ ماحول اور وراثت کے بغیر شخصیت شخصیت نہیں بنتی۔ چنانچہ دورِ حاضر کا سوانح نگار اپنے یا دوسروں کے سوانح حیات اس طرح مرتب کرتا ہے کہ قارئین یہ سمجھ سکیں کہ صاحبِ سوانح کس حد تک وراثت کا منت پذیر رہا اور کس حد تک ماحول کا احسان مند۔ ماحول اور وراثت ایک حد تک ہم آہنگ بھی ہیں اور ایک حد تک

ایک دوسرے کی ضد بھی ہیں۔ سوانح نگاری کا ایک مدرسۂ فکر وراثت پر زور دیتا ہے اور دوسرا ماحول پر۔ اگرچہ دونوں یہ جانتے ہیں کہ ماحول اور وراثت دونوں ہی شخصیت کے لیے ضروری ہیں۔ ماحول اور وراثت کے علاوہ شخصیت میں ایک مخصوص عنصر انفرادی یا ذاتی ہوتا ہے جس کے بغیر شخصیت کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ یہ تیسرا عنصر دراصل نشانِ استفہام بن کر سوانح نگار کے سامنے آتا ہے یہ ایک بھول بھلیاں ہے مگر اس کا عبور کرنا انتہائی ضروری ہے۔ یہ ایک معمہ ہے۔ جسے سوانح نگار اگر حل نہ کر سکے تو وہ ناکامیاب ہے اور اگر ہو جائے تو صاحبِ کشف و کرامت ہے۔ اس تیسری صورت کو سمجھنے کے لیے نفسیات اور تجزیۂ نفس مدت سے سرگرداں ہیں۔ شعور، تحت شعور اور لاشعور کی منزلوں سے گزر کر علمِ ذات تک پہنچنا سوانح نگار کا کام ہے۔ جیسے جیسے نفسیات اور تجزیۂ نفس کو ترقی ہوگی شخصیت نگاری اپنے معراجِ کمال کی طرف پہنچے گی۔ ابھی یوں معلوم ہوتا ہے کہ سوانح نگاری اپنی ابتدائی منزل میں ہے۔

آپ بیتی اور اعترافات بقائے نسل کی خواہش کے علاوہ خود اپنی ذات کا اظہار ہے۔ ہماری جبلت میں داخل ہے۔ ہمارے تمام فنونِ لطیفہ فنکار کے اظہارِ ذات کے سوا کچھ نہیں۔ خواہ وہ تاج محل جیسی سنگین اور حسین عمارت ہو یا میرؔ و غالبؔ کی اثر آفرید شاعری۔ یہ انسانی خاصا ہے کہ وہ اپنی ذات کا کوئی نقش دنیا میں چھوڑ کر جانا چاہتا ہے۔ اس طرح فانی زندگی بقائے دوام حاصل کرتی ہے۔ آپ بیتی بھی اپنی ذات کا ایک نقش ہی ہے جسے صفحۂ عالم پر ثبت کرنا ہماری سرشت میں داخل ہے۔ یوں تو مشاہیر کے حالات لکھ کر بھی ایک تسکین حاصل ہوتی ہے لیکن اپنے حالات لکھنا اور بھی زیادہ روحانی تسکین دیتا ہے۔ آپ بیتی کا فن ابھی تک کوئی منضبط فن نہیں ہے۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ تعداد صفحات کی کوئی قید ہو۔ یا کوئی خاص طریقِ کار ہو جس پر لکھنے والے کے لیے عمل پیرا ہونا ضروری ہو۔ آپ بیتی خواہ چند سطروں پر مشتمل ہو خواہ سیکڑوں صفحات پر محیط، بہرحال آپ بیتی ہی ہوتی ہے۔ درانحالیکہ خود نوشت سوانح عمری جو معنوی طور پر آپ بیتی ہی کہلاتی ہے۔ عموماً ایک مفصل کتاب ہوتی ہے جس میں مختلف باب ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے اس کا پھیلاؤ خاصا ہوتا ہے۔ البتہ آپ بیتی عام طور پر اپنے حالات کا نثر میں لکھنا ہے یعنی بنیادی شرائط دو ہیں۔ اوّل یہ کہ مصنف اپنے حالات خود لکھے اور دوسرے یہ کہ وہ حالات نثر میں ہوں۔

آپ بیتی کو اعترافات کہنا بجا ہوگا۔ یہ لفظ مسیحی دینیات سے مستعار ہے۔ مسیحی کلیسا میں ہر شخص پر یہ لازم آتا ہے کہ پادری کے سامنے اپنے حالات کا اعتراف کرے۔ اپنی غلطیوں کے اعتراف سے جو ندامت ہوتی ہے۔ وہ گناہوں کو دھو دیتی ہے اور اعتراف کرنے والے کی روح پاکیزہ ہو جاتی ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو آپ بیتی انسان کی ندامت کا افسانہ ہے۔ اس لیے آپ بیتی میں ایک گہرا اعترافی رنگ ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ فطرتِ انسانی کا ایک خاصا یہ بھی ہے کہ انسان اپنی محبت میں آپ مبتلا ہے اسے اپنی کہانی بھی خوبصورت نظر آتی ہے۔ وہ اپنے کو اپنی نظر میں خوبصورت بنا کر اپنی پوجا خود کرتا ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو آپ بیتی میں اپنی ہی سرگزشت افسانوی رنگ میں ہوتی ہے۔ انسان اپنے عیوب پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے تاکہ وہ دوسروں کی نظر میں اور اس سے بھی بڑھ چڑھ کر خود اپنی نظر میں سرخرو ہو سکے۔ ان دونوں رنگوں کے امتزاج سے آپ بیتی میں حسن پیدا ہوتا ہے یعنی ایک طرف احساسِ ندامت اور دوسری طرف خود پرستی۔ دنیا کی مشہور آپ بیتیاں جن لوگوں نے لکھیں۔ ان میں سینٹ آگسٹائن۔ روسو، ٹالسٹائی

لینن۔ مہاتما گاندھی۔ خواجہ حسن نظامی۔ نہرو۔ جواہر لال نہرو کے نام شامل ہیں۔

ہمارا دور ایک تنقیدی دور ہے۔ اچھا سوانح نگار آج کل وہ کہلاتا ہے جو اپنے موضوع کے ساتھ نہ صرف انصاف کرے بلکہ ممکن ہو تو صاحب سوانح کو بالکل ننگا کر دے۔ ہر بڑے آدمی کے اندر ایک چھوٹا آدمی بھی ہوتا ہے۔ آج کا سوانح نگار صاحب سوانح سے مرعوب نہیں ہوتا۔ نہ وہ اس کی قصیدہ خوانی کرتا ہے۔ وہ تجزیے کی روشنی میں اپنے موضوع کو جانچتا پرکھتا ہے اور عموماً اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ مشاہیر کوتاہیوں اور خامیوں سے مبرا نہ تھے۔ ہمارا دور بت شکنی کا دور ہے نہ کہ ہیرو پرستی کا۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ آخر خود نوشت سوانح نگاری کو جانچنے پرکھنے کے ذرائع کون سے ہیں۔ ہم کسی دوسرے کے سوانح لکھیں تو یہ امر اختیاری ہے کہ ہم صاحب سوانح پر نکتہ چینی کریں یا اس کی مدح سرائی۔ عام طور پر ہمارے زمانے کا سوانح نگار یہ ثابت کرتا ہے کہ مشاہیر اکثر و بیشتر غیر ضروری طور پر مشہور ہو گئے۔ ایک بڑا فاتح جو اپنے کو بہادر جانتا تھا، آج اس کی نسبت یہ لکھا جا سکتا ہے کہ وہ بہادر نہ تھا ڈرپوک تھا۔ مگر حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے کہ وہ فاتح بن گیا۔ لیکن خود نوشت سوانح نگاری میں تنقید کے مواقع نہیں ہوتے۔ یہاں تو ہم اپنے کو جیسا تصور کرتے ہیں، ویسا یا اس سے بڑھ چڑھ کر ظاہر کرتے ہیں بلکہ ثابت کر دیتے ہیں۔ آپ بیتی پر ایمان لانا قارئین کے لیے ضروری نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشاہیر کی آپ بیتیوں پر بعد کے لوگوں نے اختلافی مضامین لکھے۔ یہ طریقہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو عام قارئین خود نوشت سوانح پڑھ کر صحیح نتیجے پر نہ پہنچ سکیں گے۔

آپ بیتی کی سہ گونہ حیثیت

سوانحی ادب کی عموماً اور آپ بیتی کی خصوصاً سہ گونہ حیثیت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا (۱) تاریخی حیثیت (۲) اخلاقی حیثیت (۳) یادگاری حیثیت۔ جہاں تک آخر الذکر کا تعلق ہے اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ بقائے نسل کی طرح اظہار ذات بھی انسانی جبلت میں شامل ہے۔ باقی دو قسم کے امتیازات جو سوانحی ادب کو حاصل ہیں وہ تاریخی اور اخلاقی ہیں۔ سوانح نگاری خواہ وہ حقیقت پر مبنی ہو اور جیتے جاگتے کرداروں کے سوانح پر مشتمل ہو اپنے دور کی تاریخ کو ضرور پیش نظر رکھتی چلی آئی ہے۔ چنانچہ ہم کسی دور کی تاریخ اس دور کی سوانح عمریوں سے مرتب کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں مشہور انگریز مفکر و سوانح نگار ٹامس کارلائل کا قول ہے کہ "تاریخ بڑے آدمیوں کے سوانح کا نام ہے" اس قول میں دو نظریات کا امتزاج ہے۔ اول یہ کہ بڑی شخصیتیں اپنے دور کی تاریخ بناتی ہیں۔ کارلائل کے لیے یہ کہنا اس واسطے درست تھا کہ اس نے ہیرو پرستی کے فلسفے کو رواج دیا ہے۔ دوسرا پہلو اس قول کا یہ بھی ہے کہ کسی بڑی شخصیت کا مطالعہ اس کے تاریخی دور سے الگ ہو کر نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ سوانح عمریوں میں کسی خاص شخصیت کے سوانح ہی نہیں ملتے بلکہ اس دور کی تاریخ کا عکس بھی ہوتا ہے۔ یہی بات خصوصی طور پر آپ بیتی کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ جب کوئی شخص اپنے سوانح حیات لکھتا ہے تو وہ اپنے دور کے حالات پر بھی تبصرہ کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ اپنے دور کی تاریخ پیش کرتا ہے۔ اب ہم سوانحی ادب کی دوسری حیثیت کی طرف آتے ہیں۔ پرانے زمانے سے اب تک بڑی شخصیتوں کے سوانح اخلاقی نقطۂ نظر سے لکھے جاتے رہے ہیں۔ اس طرح کسی شخص کے سوانح حیات ایک جانب نمونۂ عظمت ہوتے ہیں اور دوسری طرف مرقع عبرت۔ عظمت اور عبرت ہر سوانح حیات کا جوہر ہیں۔ جب تک یہ نہ دکھایا جائے کہ کسی اہم کردار نے

کارہائے نمایاں انجام دیے، کہاں کہاں دوسرے عام انسانوں سے بڑھ چڑھ کر زندگی کی بلندیوں تک رسائی حاصل کی اور اس کے ساتھ ہی کس کس طرح عام انسانوں کی طرح زندگی کے ہاتھوں شکست کھائی اور عام انسانی کمزوریوں سے بلند نہ ہو سکے اس وقت تک سوانح نگاری گویا اپنا فرض منصبی بجا نہیں لا سکتی۔ عبرت اور عظمت کو نمایاں کرنے سے سوانحی ادب میں اخلاقی شان پیدا ہوتی ہے۔ پھر جب کوئی اپنی آپ بیتی لکھے اور زندگی کے اتار چڑھاؤ یوں دکھائے کہ کس طرح اس نے ایک بڑا کام کیا اور کس طور پر چھوٹی چھوٹی غلطیوں اور معمولی انسانی کمزوریوں سے اپنی شخصیت کے دامن کو پاک نہ رکھ سکا تو اس کا یہ لکھنا ایک عجیب مزا دیتا ہے اور خود اس کی ہستی نمونۂ عظمت اور مرقع عبرت بن کر ہماری آنکھوں کے آگے ابھرتی ہے۔

نئی اور پرانی قدریں آپ بیتی میں

پچھلے زمانے میں اور ہمارے زمانے میں دو قسم کی مختلف قدریں رائج رہی ہیں۔ ایک دور تھا جب نفی ہستی، انکسار، فقر و درویشی کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ دور زندگی کو ریاضت و عبادت اور رضائے الٰہی کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ ایسے دور میں جو ادب پیدا ہوا اس میں ان اصل یا فرضی شخصیتوں کو انسانی زندگی کا مثالی نمونہ قرار دیا گیا جو مجاہدۂ نفس، ریاضت و عبادت، فقر و درویشی اور انکسار و تواضع کو انسانی اقدار میں سربلند تصور کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم اپنے بزرگوں کے حالات پڑھتے ہیں تو ان میں ہمیں دنیوی طمع و حرص، نام و نمود، خودستائی، غرور و نخوت اور اسی قبیل کے دوسرے جذبات نہیں ملتے بلکہ تمام تر زور دنیا سے الگ تھلگ رہنے پر اور اپنے آپ کو خدا کی خاطر یا دوسرے انسانوں کی بھلائی کے لیے فنا کر دینے پر ہوتا ہے۔ قدیم معاشرت میں خواہ وہ ہندو معاشرت ہو یا چینی یا اسلامی معاشرت یکساں طور پر انہی اقدار کی کارفرمائی تھی۔ چنانچہ جن لوگوں نے اپنے حالات لکھے ہیں یا دوسروں کے سوانح پیش کیے ہیں ان اقدار کو سراہا ہے لیکن جب دور بدلا اور یورپ و ایشیا میں نئی قدریں رائج ہوئیں تو سوانحی ادب کے سانچے بھی بدل گئے۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد جب صنعتی و جمہوری دور آیا تو نفس پرستی بڑھنے لگی۔ اپنی تعریف اپنے منہ کرنا قابل اعتراض نہ رہا۔ خود غرضی، خودستائی اور ہم چوں ما دیگرے نیست کا ڈنکا بجنے لگا۔ چنانچہ آج کل خود پرستی کا دور دورہ ہے۔ ان حالات میں ایک سوانح نگار کا فرض یہ ہے کہ شخصیت کو نئی قدروں کے پیمانے سے ناپے۔ مراد یہ ہے کہ کس طرح کوئی شخص غلط اور صحیح کی بحث میں پڑے بغیر چھوٹی حیثیت سے بڑی حیثیت پر پہنچ گیا، مال و دولت، عزت و شہرت اور جاہ و منصب اس کے قدم چومنے لگے۔ یہاں اس سے غرض نہیں کہ جو ذرائع اس شخص نے اختیار کیے وہ اخلاقی تھے یا غیر اخلاقی، دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کس قدر کامیاب یا ناکامیاب رہا۔ ایسے دور میں آپ بیتی بھی خودستائی کے سوا کچھ نہیں ہوتی بلکہ لکھنے والا فخر و نازش کے ساتھ لکھ سکتا ہے کہ اس نے کامیابی حاصل کرنے کی خاطر جائز و ناجائز میں کوئی امتیاز نہیں برتا۔ اس کے باوجود آپ بیتی کی اہمیت کم نہیں ہوتی اس لیے کہ آپ بیتی پر محاکمہ کرنے کا کام مستقبل کا ہے اور کسے معلوم کہ مستقبل میں کون سی قدریں جاری و ساری ہوں گی۔

آپ بیتی بطور اشتہار

ہمارا دور ایک اشتہاری دور ہے۔ اس معنی میں کہ آج کل اپنے منہ میاں مٹھو بننا قابل تعریف خیال کیا جاتا ہے۔ ایسے دور میں

آپ بیتی کے لیے بڑا خطرہ یہ ہو سکتا ہے کہ انسان اپنی کمزوریوں کو ضبطِ تحریر میں نہ لائے اور اخفائے حال سے کام لے کر مستقبل کے قارئین کو حقیقت سے باخبر نہ ہونے دے۔ جو آپ بیتیاں اس مقصد سے لکھی گئی ہوں کہ وہ چھپ کر شائع ہوں گی ان میں لکھنے والے بجا طور پر اخفائے حال سے کام لے سکتے ہیں لیکن جو شخص اپنی آپ بیتی اپنی خاطر لکھے اسے کوئی ضرورت نہیں کہ اخفائے حال سے کام لے۔ اوپر یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ آپ بیتی کی حیثیت اعترافات کی سی ہوتی ہے۔ ایسی آپ بیتی انسانیت کے لیے مفید خدمت انجام دے سکتی ہے۔ اس اشتہاری دور میں ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اپنے حالات بے کم و کاست لکھے جائیں۔ تاہم جو باتیں چھپانے کے قابل ہوں، وہاں زبان کو مخصوص علامتوں کا حامل بنا دیا جائے۔ اصل معاملہ صرف ان پر کھل سکے گا جو ان علامتوں کو سمجھیں گے اور اس پہیلی کو بوجھیں گے۔ ایسی آپ بیتی ماہرینِ نفسیات کے لیے خاص طور پر کارآمد ہو سکتی ہے۔ غرض کہ اس اشتہاری دور میں بھی آپ بیتی کی اہمیت کم نہیں ہوئی بلکہ کچھ بڑھ گئی ہے۔

آپ بیتی اور خود شناسی

کہتے ہیں کہ خود شناسی خدا شناسی ہے اور خود کو پہچاننے کے لیے محض فکر ہی کافی نہیں بلکہ ذکر بھی ضروری ہے۔ یعنی جب ہم خود اپنے دل میں ایک بات کو دہرا لیتے ہیں تو ہمارے خیالوں کی گتھی سلجھ جاتی ہے اور ہم اپنے افکار و اعمال کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے آپ بیتی لکھتے وقت گویا ہم اپنے اعمال و افکار کو دہرا رہے ہوتے ہیں اور اپنی ذات کے سمجھنے میں ہمیں آسانی ہو جاتی ہے۔ پھر جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ جو مسائل ہمارے ہیں یا اس سے ملتے جلتے مسائل اس جمہوری دور میں دوسروں کے بھی ہوں گے تو ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اپنے حالات و واردات کو احاطۂ تحریر میں لا کر نہ صرف یہ کہ ہم خود شناسی کی منزل تک پہنچ رہے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اسی منزل تک پہنچا رہے ہیں۔ وجود وقت کے نقطۂ نظر سے ہر ہستی الگ اور منفرد ہے۔ جو روحانی واردات مجھ پر گزرتی ہے مجھ کو صرف اسی کا علم ہو سکتا ہے لیکن جس طرح ہر ذرے میں نظامِ شمسی کار فرما ہے اسی طرح ہر ہستی کے جذبات و احساسات کا مد و جزر بھی یکساں ہوتا ہے۔ انسانیت کی قدرِ مشترک سب انسانوں میں موجود ہوتی ہے۔ آپ بیتی ہر شخص کو آئینہ دکھاتی ہے۔ مصنف کی طرف سے نظر ہٹا کر قارئین خود اپنی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ یہ ایک عارفانہ نزول ہے۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا .... (غالب)

اس طرح انسان اپنے پیدا کرنے والے کی ذات کی طرف اشارہ کر رہا ہوتا ہے۔ اگرچہ بظاہر اس کا مقصد اپنی روحانی واردات کو بیان کرنا ہوتا ہے۔

ریحانہ خانم

آپ بیتی کیا ہے؟

آپ بیتی ایک لحاظ سے سوانح عمری سے بہتر اور دلچسپ تر تصنیف ہوتی ہے۔ آپ بیتی میں شخصیت کے ایسے مظاہر ملتے ہیں جن سے مصنف سے زیادہ کوئی باخبر نہیں ہوتا۔ بلکہ زندگی کے حصے یا ایسے اسرار ہوتے ہیں جن سے بیرونی دنیا کا کوئی آدمی باخبر ہو سکتا ہی نہیں۔ آپ بیتی کے لیے بنیادی چیز سچائی ہے۔ یہ سچائی ہی ہے جو ایک فرد کی تصویر کو واضح صورت میں ہمارے سامنے لا سکتی ہے اور یہ تصویر جامد و ساکن نہیں ہوتی۔ بلکہ رواں دواں اور جیتی جاگتی تصویر ہوتی ہے۔ ایک فرد کی تصویر اس کی پوری دنیا۔ وہ دنیا میں گزرتے ہوئے شب و روز میں پیش آنے والے ہر طرح کے کوائف میں نفسیاتی الجھنیں اور کشمکشیں سوچنے کے انداز محسوس کرنے کے طریقے جذباتی نظام کے محرکات غرض ایک اچھی آپ بیتی میں سب کچھ نظر آ سکتا ہے۔ ایک جاندار آپ بیتی میں لکھنے والے کے ماتھے کی تیوریاں اس کا تبسم زیر لب بھی نمایاں ہو سکتا ہے اور اس کے ذہن کی وسیع دنیا میں سمائے ہوئے خیالات ہی اس کے علاوہ دل کی دھڑکنوں کی آواز بھی سنی جا سکتی ہے۔ یعنی کل خارجی و داخلی زندگی کی عکاسی زندگی میں دیکھی جا سکتی ہے مگر سب سے بڑی شرط وہی سچائی پھر خلوص اور بے باکی ہے مگر ایسا شاذ ہی ہوتا ہے کہ ہر طرح کی خصوصیات ایک آپ بیتی میں نظر آ سکیں۔ اس کام کی دشواری کا اندازہ تو اتنی بات سے ہو سکتا ہے کہ ہم کبھی یہ سوچیں کہ ہم اپنی زندگی کا تجزیہ سے مرتب کر رہے ہیں۔ اگر سوچا جائے تو ہم میں سے کتنے ہوں گے جو اس فرمان پر لبیک کہہ سکیں جس میں ہمیں اپنی زندگی کی کہانی من و عن بیان کرنے کے لیے کہا گیا۔ ہم قول، من عرف نفسہ فقد عرف ربہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اور یہ بلا وجہ نہیں، کون اپنے نفس کی تہوں تک پہنچ سکتا ہے۔ اور کون صحیح طور پر پہنچنے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ کس کی پرواز ان کے رب تک ہو سکتی ہے۔ یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا تو ظاہر ہے کہ اپنی دنیا من کی دنیا اور تن کی دنیا کو پہچان لیا۔ گویا کائنات کو جان لینے کے برابر ہوا۔ مگر صرف جان لینا اور بات ہے اور جان کر اس کو دوسروں کے علم میں لانا اور اس کی صحیح تصویر کھینچنا چیزے دیگر۔ اب آپ بیتی کہاں ہوئی تلوار کی دھار پر چل کر بلکہ ناچ کر دکھانا ہوا بہرحال یہ سچ ہے کہ بہت سے انسان ہو گزرے ہیں جنہوں نے آپ بیتیاں لکھیں اور اس مشکل فن کی مشکلات سے عہدہ برآ بھی ہو سکے آپ بیتی لکھنے والا خود ہی اپنا شاہد اور خود ہی اپنا ناقد بن کر کھڑا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کام مشکل خیال کیا گیا ہے۔ ورنہ اس فن سے متعلق بہت کوششیں ہوئی ہیں بعض بڑی کامیاب بعض کسی حد تک کامیاب اور بعض معمولی۔ آپ بیتی کے فن پر روشنی ڈالنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کوششوں پر اجمالی نظر ڈال لی جائے جن کے تحت ہر زمانے میں آپ بیتیاں ظہور پذیر ہوتی رہیں۔

آپ بیتی کے فن کا ارتقاء

عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ آٹو بائیوگرافی اپنی بہن بائیوگرافی سے پہلے صاف ستھری شکل میں بطور ادبی تصنیف کے ظہور پذیر ہوئی۔

خود نوشت سوانح عمری کی ابتداء کا ثبوت دینا کتنا دشوار ہے اور ویسے بھی اس فن کا عہد بہ عہد مطالعہ کرنا ناممکن سا ہے کیونکہ

اس فن کے ارتقا کی کوئی مرتب صورت نظر نہیں آتی یعنی کوئی تصنیف ایسی نظر نہیں آتی کم از کم ہمارے یہاں جس میں آپ بیتی کے فنی ارتقا کا عہد بعہد جائزہ لیا گیا ہو۔ اگرچہ آپ بیتی سے متعلقہ صورتیں بہت پہلے سے وجود میں آچکی تھیں مگر اصل میں یہ چیز نسبتاً جدید زمانے کی پیداوار ہے۔ مسلمانوں کے زمانے میں بھی آپ بیتی بے رواج نہیں رہی چنانچہ ابن خلدون نے اپنی خود نوشت لکھی تھی۔ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ قدرے بے ضابطہ صورت میں چلتا رہا۔

پہلے پہل خود نوشت اور تاریخ میں فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ ہیروڈوٹس اور زینوفن وغیرہ کے کارناموں میں تاریخ اور خود نوشت سوانح کا امتزاج ملتا ہے نفسیاتی اور اعترافی آپ بیتیاں رومن عہد سے لکھی جانی شروع ہوئیں۔ سینٹ آگسٹائن (۴۳۰-۳۵۴) کے روحانی تجربات کے نتیجے میں پہلی دفعہ نفسیاتی اور روحانی تجربات پر مبنی مگر مذہبی مقصد کے تحت لکھے ہوئے اعترافات ملتے ہیں سولہویں صدی عیسوی میں اٹلی کی دو خاص کتابیں قابل قدر ہیں جو سائنٹفک اور فنکارانہ طور پر ذاتی تجربے کا نمونہ ہیں۔ ایک جیروم کارڈن فرنیش کی تصنیف اور دوسری تصنیف BENEVENUTO CELLINE کی ہے انگریزی میں شروع شروع میں نظم میں آپ بیتیاں لکھی گئیں جیسے اس دور میں بعض مثنویاں۔ سترھویں صدی عیسوی میں انگریزی میں بہت زیادہ آپ بیتیاں لکھی گئیں مگر ۱۷۰۰ سے پہلے بہت کم شائع ہوئیں۔ مارگریٹ کیونڈش کی آپ بیتی اسی زمانے میں لکھی گئی پیورٹین مذہب کے روحانی محاسبے کے تحت بن یان اور فاکس کی مذہبی آپ بیتیاں ظہور میں آئیں گویا اس فن کی تہ میں مذہبی آبیاری کو بھی دخل ہے۔

اٹھارویں صدی میں ناول کے فن کے ساتھ بھی آپ بیتی کے فن کو ایک طرح سے ملا دیا گیا۔ پھر انیسویں صدی میں آپ بیتی سے متعلق صحیح قسم کا کام بھی ہوا۔ اس زمانے میں ہربرٹ سپنسر، ٹرولوپ، ہیڈن، ہیملس، امرسن، الفرڈ رسل، کارڈینل نیومین اور کارلائل وغیرہ آپ بیتیاں لکھنے والوں میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ ہر زمانے میں آپ بیتی کے ساتھ عجب قسم کا سلوک بھی ہوتا آیا ہے۔ جارج بورو نے آپ بیتی اور افسانے کے فن کی آمیزش کی۔ اس زمانے میں ایڈمنڈ گوس نے آٹو بائیوگرافی اور بائیوگرافی کو ملا دیا۔ اس کی تصنیف باپ بیٹا یعنی فادر اینڈ سن اسی امتزاج کا نمونہ ہے۔ اس زمانے میں جان سٹوارٹ مل کی آپ بیتی نہ صرف ذات کا بیان ہے بلکہ انیسویں صدی کے انگریزی خیالات کا مرقع بھی ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے اثر سے سپاہیوں نے خوب آپ بیتیاں لکھیں اور بیسویں صدی میں ان سپاہیوں کے بہت سے نام گنائے جا سکتے ہیں جنہوں نے آپ بیتیاں تصنیف کی تھیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی قسم کا بحران جس زمانے میں پایا جاتا ہے تو اس زمانے میں اپنی ذات کی طرف توجہ اور اپنی ذات کو بیان کرنے کا رجحان بڑھ جاتا ہے۔ ان کل سوانحی کوششوں کے علاوہ خطوط، اعترافات، ڈائریاں اور روزنامچے بھی قابل ذکر ہو سکتے ہیں۔ جن میں آپ بیتی کے بکھرے ہوئے عناصر پائے جاتے رہے ہیں۔ لیڈی فین شا کی لکھی ہوئی یادداشتیں جو ۱۶۷۶ء کی تصنیف ہے ذاتی تجربے کا بہترین نمونہ ہیں۔ اس میں لیڈی فین شا نے ہیرو بننے کی کوشش نہیں کی ہے اور یہی بڑی خوبی ہے انگریزی میں آپ بیتیاں لکھنے والوں میں ان ملیشٹ ۱۷۱۹-۱۶۳۹ ایڈمنڈ کالے اور راج نارتھ کی کوششیں بڑی حد تک سنجیدہ اور تجزیاتی ہیں۔ انہوں نے اپنے تجربات اور زندگی و شخصیت کو دکھانے کی بڑی بہتر کوشش کی ہیں۔ راج نارتھ نے چار جزئیات پر جو ذات کی وضاحت کرسکتی ہیں زیادہ زور دیا ہے۔ گبن کے MEMOIRE میں بھی ذات و نفسیات کو سمجھنے اور بیان کرنے کی کوشش عمدہ ہے۔ مارک رودر فورڈ (RUTHN FORD) کی خود نوشت سوانح عمری زیادہ تر حقائق پر مبنی ہے۔ جس میں اس کی مذہبی زندگی، توہمات اور آزاد خیالات

کی جھلکیاں دکھاتے ہیں۔ روسو کے اعترافات کی اس لحاظ سے اہمیت بھی گئی ہے کہ اسے آپ بیتی سے متعلق کام کرنے والوں کا شاہزادہ کہا گیا۔ اور بھی کئی کتب علم کے حقائق اور رازوں سے پردے اٹھاتے ہیں۔ ایسی تحریر ہر ایک سے نہیں لکھی جا سکتی ایسی ہمت ویسے ہی کسی شاہی نظر آتی ہے۔ مشرقی ادب میں مغربی انداز کی آزادانہ تحریریں اور اپنی ذات سے متعلق لکھی ہوئی تصانیف و تحریریں بہت کم ہیں۔ فارسی ادب میں اگر مغل بادشاہ اپنی توزکیں نہ لکھ جاتے تو شاید اب تک یہ ادب اس صنف ادب سے محروم ہی ہوتا۔

اگرچہ شہنشاہ بابر کی توزک بابری اصل میں ترکی زبان میں تھی مگر اکبر کے حکم سے اس کو فارسی میں منتقل کرایا گیا۔ بعد میں اس کے ترجمے انگریزی اور فرانسیسی زبان میں ہوئے۔ توزک بابری میں بادشاہ کی اپنی ذات کی جھلک، زندگی کے حالات اس کے کارناموں کے علاوہ جو تاریخی واقعات و حالات رہے بادشاہ کے کارناموں کے ضمن میں آنے ضروری تھے مل سکتے ہیں۔ شاید وہ اور کسی جگہ نہ مل سکیں۔ اگرچہ یہ ذات کا بیان بھی خاصا ہے مگر زیادہ تر خارجی بیانات کی طرف رجحان ہے۔

جس طرح بابر کو اپنی زندگی اور واقعات زندگی کو تحریر کرنے کا خیال آ گیا تھا۔ ویسے ہی جہانگیر بھی اس کام پر آمادہ ہوا۔ بادشاہ جہانگیر نے ذاتی مشاہدات اور ذاتی ذوق و شوق کی تفصیلات خوب دی ہیں۔

جہانگیر کے شوق و ذوق کے تحت شکار، پھولوں اور خوشبوؤں وغیرہ سے رغبت کا اظہار خوب ہوتا ہے۔ جہانگیر کی اپنے والد کے ساتھ عقیدت و روحانی فیض پھر اپنے ہی بیٹے کی بغاوت کی کہانیاں اور دل دکھ وغیرہ سب کچھ بیان ہوا۔ بادشاہ کا رجحان زیادہ تر حقائق کے بیان کی طرف ہی نظر آتا ہے۔ تخت نشینی کے پہلے جشن نوروز میں داد عیش اور مجلس و محفل کے لیے نفیس اشیاء اور عیش و عشرت کا بندوبست بھی دکھایا گیا ہے۔ مشاہدات اور واقعات کا ذکر سب سے زیادہ ہے۔ اس دور تک بادشاہوں کی کاوشیں ہر لحاظ سے قابل داد ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ تزوکات خاص اور ہر لحاظ سے کامیاب آپ بیتیاں نہیں خارجی واقعات و حالات کا بیان زیادہ ہے اور شاید وہ اس لیے کہ شاہی زندگی ان تمام باتوں کے حقائق پر مبنی تھی۔

امیر تیمور کے ملفوظات کا سراغ بھی ملتا ہے۔ یہ ترکی الاصل تھے۔ ابوطالب حسن نے ترجمہ کیا اور یہ یادداشتیں شاہجہان بادشاہ کو پیش کیں۔ ابوطالب کا بیان ہے کہ اس نے یمن کے بادشاہ جعفر کی لائبریری میں یہ ترکی کتاب پائی جس میں امیر تیمور نے اپنی عمر کے ساتویں سال سے لے کر سترھویں یا چوہترھویں سال تک کے حالات محفوظ کیے ہیں۔ اس کے بعض حصوں کا ترجمہ انگریزی میں بھی کیا گیا مگر ہو سکتا ہے کہ یہ سوانح عمری خود شہنشاہ تیمور نے نہ لکھی ہو بلکہ بعد میں کسی نے صیغہ واحد متکلم میں یہ اس طرح مرتب کی ہو جیسے بادشاہ کی خود لکھی ہوئی ظاہر کیا جا سکے۔ اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ برٹش میوزیم میں موجود جلد میں موت کی واردات اس طرح لکھی ہوئی ہے جیسے خود تیمور مرتے دم بلکہ بعد تک لکھتا رہا ہو۔ مرض الموت سے بڑھ کر موت تک کا ذکر یوں ہے کہ شعبان کے مہینے کی سترہ تاریخ کی شام کو اللہ اللہ کہتے ہوئے میں نے ہوش کھو دیئے اور یہ زندگی مستعار اس کے حوالے کر دی جس کی طرف سے یہ ودیعت ہوئی تھی۔!

ایسا ممکن ہو سکتا ہے کہ تیمور کی لکھی ہوئی تصنیف کو یا کسی نے اپنی طرف سے اس کی زندگی کے آخری لمحات تک کی باتیں جوڑ دی ہوں۔ بہر حال یہ تصنیف تزک تیموری کے نام سے برٹش میوزیم اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔

ان تزوکات کے علاوہ شیخ علی حزین کی آپ بیتی بھی ہے جس کا ترجمہ ایف۔ سی۔ بالفور نے انگریزی میں کر دیا ہے۔ دیباچہ

میں شیخ علی حزیں کہتے ہیں کہ وہ اپنے ساتھ بیتنے والے ہر طرح کے واقعات اور حالات کی تبدیلیاں جن کا اثر ان پر ہوا بیان کرنے کے خواہشمند ہیں۔ اس تصنیف میں علی حزیں نے اپنے جد امجد اور پھر باپ کے حالات کے ساتھ آپ بیتی کو شروع کیا ہے۔ اپنی پیدائش اور جائے پیدائش (اصفہان) وغیرہ کا خوب ذکر کیا ہے۔

ذہانت اور تعلیم کی جھلکیاں دکھائی ہیں۔ اس آپ بیتی کا رخ بھی ذات کی طرف زیادہ ہونے کی بجائے خارجیت کی طرف زیادہ ہے۔ مشہور تاجروں اور ان کے کارناموں کا ذکر مثلاً۔ ملا محمد رضا خاں نادر قلی کریم خان محمد شاہ وغیرہ کے بہت سے حالات اور واقعات بیان کرتے چلے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ شیخ علی حزیں کی زندگی کے بہت سے سفر صفحۂ تصنیف پر آگئے ہیں۔ ان سفروں کی تفاصیل اور ان کے تحت آنے والے حالات و واقعات کا بیان بہت کافی ہے۔ اس طرح شیخ علی حزیں کی زندگی کی کہانی کے ساتھ ساتھ تاریخی اور سیاسی واقعات بھی چلتے ہیں۔ ان سب سرگزشتوں کے بعد اردو کے بڑے اور نامور شاعر میر تقی میر کی آپ بیتی ذکر میر بھی فارسی زبان میں لکھی ہوئی موجود ہے۔ اس کا اردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس آپ بیتی میں ذاتی بیان ہی سب کچھ ہے۔ میر کا رجحان ہی دراصل ذاتی بیان اور اپنی ذات کی طرف تھا۔ شاعری میں ذاتی بیان پردوں میں بھی ہوا ہوگا مگر یہاں واردات قلبی و ذہنی کیفیتیں بھی نظر آجاتی ہیں۔ میر کی غم پسندی کی ساری وجہ اس آپ بیتی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ غم کے ساتھ نباہ اور اس غم کی وجوہ اور ان پر اثرات سب کچھ اور بہت سی چیزیں اس تصنیف میں نظر آتی ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ اگر یہ عظیم شاعر اپنی آپ بیتی ایسا شاہکار اپنے معتقدوں کے لیے نہ چھوڑ جاتے تو ان کے حالات زندگی سے بہت کم کسی کو واقفیت ہو سکتی۔ ابوالفضل نے بھی اپنی مختصر سی سرگذشت تحریر کی ہے۔ اس کے علاوہ شاہجہان کے زمانے کے شاعر منیر لاہوری نے اگرچہ کوئی باقاعدہ آپ بیتی نہیں لکھی مگر ایک خط میں اپنے بہت سے حالات اس طریقے سے لکھ دیئے ہیں کہ ملفوظات کے بیان کا امر تعین کر گیا ہے۔ پھر آنند رام مخلص کا تذکرہ و سفرنامہ بھی کچھ آپ بیتی سے متعلق ہے۔ حضرت داتا گنج بخش کی تصنیف کشف المحجوب میں بھی آپ بیتی ہی سے متعلق تحریریں ہیں۔ اردو میں پہلے پہل دکن کی مثنویاں ایسی ملتی ہیں جن سے بعض شاعروں نے اپنے حالات زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ اس کے بعد ایک طویل عرصہ تک اس کام کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی اور انیسویں صدی عیسوی سے پہلے اردو میں اپنی ذات کے بیان کا رواج رجحان کے طریقے پر نظر نہیں آتا۔

آپ بیتی، سوانح عمری کی حدود سے اتصال و تضاد آپ بیتی کیا ہے؟ اس پر بحث و گفتگو کرنے سے قبل اس فن کا فن سوانح عمری کے ساتھ مقابلہ و موازنہ ناگزیر نظر آتا ہے کیونکہ آٹو بائیوگرافی کو بائیوگرافی کی بہن کہا جاتا ہے۔

ایک شخص کے بارے میں کسی دوسرے شخص کی لکھی ہوئی سوانح عمری اور خود اپنی لکھی ہوئی سوانح عمری میں نمایاں اور پہلا فرق تو یہ ہے کہ سوانح عمری کا فن تقاضا کرتا ہے کہ اس کا ہیرو مہد سے لحد تک نظر آئے۔ سوانح نگار کا فرض ہے کہ پیدائش سے لے کر آخر زندگی تک کے کل حالات من و عن بیان کر دے۔ مگر آپ بیتی لکھنے والے سے مکمل زندگی لحد تک (پیش) کرنے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ لہٰذا کوئی آپ بیتی بھی مکمل نہیں ہوتی۔

یعنی یہ اس حیثیت سے لکھی ہی نہیں جاتی کہ زندگی کو پوری طرح دکھایا جائے۔ دوسرے یہ کہ بچپن کے حالات بیان کرنا جبکہ خود

وقت سوانح نگار کو خود کا شعور بھی نہ تھا اور کسی انسان کے لیے بھی بچپن کے معصوم زمانے کی باتوں کا یاد رہنا مشکل امر ہے۔ البتہ بعض کے سنائے واقعات بیان کیے جا سکتے ہیں اور کیے جاتے ہیں۔ پھر آپ بیتی لکھنے والا اس انتظار میں بھی بیٹھا نہیں رہتا کہ اس کی زندگی کا آخری سال ہو اور وہ اپنی زندگی کی تکمیل اپنی تصنیف میں دکھا دے۔ بلکہ عام طور سے بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ آپ بیتی لکھنے والا حد بندی کر لیتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ کچھ زندگی کے حالات دکھانے سے وہ قطعی طور پر قاصر ہے بلکہ وہ ایک حصہ عمر کو بیان کر دینا بھی کافی سمجھ لیتا ہے۔ اور عام طور پر اسی قسم کا بیان ملتا ہے کہ اس خاص حصے یا واقعے یا سال کے بعد آگے نہیں لکھ رہا یعنی عموماً موت سے بہت پہلے آپ بیتی کا کام ختم کر دیا جاتا ہے۔ ویسے بھی کسی کو کیا معلوم کہ زندگی کی انتہا کب تک ہوگی۔ کسی کی گواہی دینا آسان ہے مگر آپ اپنا گواہ بننا دشوار تر مرحلہ ہے۔ کسی کے مضحک پہلو اور نقائص گنوانے میں سوانح نگار کا کیا جاتا ہے مگر آپ اپنے مصائب اور کمزوریاں دکھاتے وقت جس طرح کا غور و خوض اور کانٹ چھانٹ ہوگی۔ وہ ظاہر ہے اس لیے یہاں بھی آپ بیتی اور کسی کی لکھی ہوئی سوانح عمری میں فرق ہو سکتا ہے۔ ایک اور فرق یہ کہ سوانح عمری پہلے سے تیاری کے بعد اور ارادتاً بعض طریقوں اور مقاصد کو لے کر لکھی جاتی ہے اس کے لیے اصول مرتب صورت میں سامنے رکھے جا سکتے ہیں مگر آپ بیتی کا لکھا جانا اتفاقی چیز ہے۔ اور وہ اپنی مرضی و طبیع کے تابع ہو کر یہ کام کیا جاتا ہے اور شاید یہ خیال بھی نہیں آتا کہ اگر ایسا ہی نہیں کیا جاتا کہ کوئی اصول سامنے رکھے جائیں اور حق تو یہ ہے کہ اگر آپ بیتی لکھنے والا بندھے ٹکے اصول سامنے رکھ کر اور پہلے سے یہ منصوبہ بنا کر چلے کہ اسے اس طرح لکھنا ہے اور اس طرح لکھنا ہے اور پھر یہ کام شروع کر دے تو وہ کم از کم تصنع اور بناوٹ سے بچ نہیں سکے گا اور اس طرح اصل مقصد یعنی انکشافات ذات جو خود بخود بہتر صورت میں ہو سکتا تھا وہ جاتا رہے گا۔ یہاں تو کچھ شاعری والا معاملہ ہے جس طرح اصل شاعری کرتے وقت کبھی یہ نہیں سوچا جاتا کہ فلاں طریقے سے فلاں بات کہی جائے گی۔ بلکہ لکھنے والے کی اپنی ذات اور اس میں بیتنے والی کیفیات۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں سے نکلنے والی بات خود بخود ایک حیثیت یا سانچہ اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح آپ بیتی لکھنے والے کا اپنی زندگی کا سچا افسانہ خود بخود ایک روپ اختیار کر لیتا ہے۔

آپ بیتی اور سوانح عمری میں ایک اور فرق بھی پایا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ آپ بیتی لکھنے والا اپنی ذہنی نفسیاتی کیفیات اور جذبات اور خواہشات سے بہت حد تک واقف ہے یا یوں کہ خود لکھنے والے پر اپنی داخلی زندگی بخوبی روشن ہے اگر خود لکھنے والا چاہے تو اس کی ذات سے متعلق ہر طرح کے انکشافات ہو سکتے ہیں۔ مگر سوانح نگار کا اپنے ہیرو کی اندرونی یا داخلی دنیا تک پہنچنا مشکل ہے۔ خود کو اپنے ذہن اور دل میں بسنے والی دنیا کا بخوبی علم ہوتا ہے اور آپ بیتی لکھنے والا اگر سچائی خلوص سے کام لے تو سب کچھ سامنے لا سکتا ہے مگر سوانح نگار کسی کے دماغ کی تہوں اور دل کے خانوں تک کیسے اور پھر کہاں تک پہنچ سکتا ہے۔

سوانح نگار کو ہر طرح کا مواد حاصل کرنے کے لیے بڑی جانچ پڑتال اور جستجو سے کام لینا پڑتا ہے۔ مگر خود لکھنے والا اپنے آپ سے ہر طرح سے واقف ہونے کا فائدہ رکھتا ہے۔ سوانح نگار کو کسی میں جان ڈال دینے کا کٹھن کام کرنا ہوتا ہے جب کہ آپ بیتی لکھنے والا خود اپنی شخصیت و انفرادیت سمیت اپنی تحریر میں آسانی سے جلوہ گر ہو سکتا ہے۔

اگرچہ بائیوگرافی اور آٹو بائیوگرافی کے طرز عمل میں کچھ فرق سامنے آجاتے ہیں مگر فنی مماثلتیں بھی کچھ کم نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ۔

> آٹو بائیوگرافی بائیوگرافی کی ایک قسم ہے جس میں مصنف اپنی زندگی کی کہانی بیان کرتا ہے۔

اگرچہ فنِ سوانح نگاری کی طرح آپ بیتی کے بارے میں بھی اصول معین نہیں کئے جا سکتے تاہم جو تین بڑے عناصر سوانح عمری میں ہونے چاہئیں وہ آپ بیتی کے بھی ناگزیر ہیں یعنی (۱) سچائی (ب) شخصیت (ج) فن

اپنی لکھی ہوئی سوانح عمری اور دوسرے کی لکھی ہوئی سوانح عمری میں سب سے پہلی اور مشترک چیز سچائی ہے اور یہی ان دونوں کی روح ہے جس کے بغیر نہ بایوگرافی، بایوگرافی ہے نہ آٹو بایوگرافی آٹو بایوگرافی۔

سچائی ہی سب سے بڑا وصف ہے جو شخصی تاریخ کے لیے نہایت ضروری و اولین چیز ہے۔ سچائی ہی وہ روح ہے جو انسانی زندگی کو دوبارہ مرتب کر کے اور متحرک و جاندار بنا کر سامنے لے آتی ہے چاہے یہ انسانی زندگی سوانحی ہیرو کی اور کسی کی مرتب کردہ ہو یا خود اپنی زندگی کی تصویر ہو۔ سوانح عمری لکھتے وقت لازم ہے کہ وہ تمام خصائص دکھائے جائیں جو انسانی زندگی کی تکمیل کر کے شخصیت کی وضاحت کر سکتے ہیں۔ آپ بیتی لکھنے والے کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی زندگی کی تمام وہ خصوصیات (خوبیاں بھی اور کمزوریاں بھی) دکھائے جو ایک فرد کی واضح صورت بنانے کے لیے اور زندگی کو سامنے لانے کے لیے ضروری ہیں۔ سوانح نگار اور اپنی زندگی مرتب کرنے والے دونوں کے لیے لازم ہے کہ انسانی زندگی کے تمام اوصاف و خصائل دکھائیں تاکہ شخصیت بھرپور انداز میں نظر آ سکے۔ فن کے نقطۂ نظر سے بھی آپ بیتی لکھنے والے اور کسی کی سوانح لکھنے والے سے ایک سی ہی بات مقصود ہے۔ واقعات کے جمع کرنے کے بعد اس طرح سے ترتیب و تدوین کی جائے کہ شخصی زندگی بالکل اسی طرح سامنے آئے جس طرح وہ اپنی حیات میں رہی۔ سب سے بہترین طریقہ تو یہی ہے کہ شروع سے آخر تک واقعات کی ترتیب کا وہی لحاظ رکھا جائے جو اصل زندگی میں تھا یعنی انسان کو جو کچھ پہلے درپیش ہوا وہ پہلے اور جو بعد میں ہوا وہ بعد میں دکھایا جائے ہر بات اور ہر واقعے کو مناسب اور زندگی کی ترتیب کے مطابق جگہ ملے۔ اس کے بعد وہ بڑا مشکل اندازہ جو دونوں کے لیے ضروری ہے کہ زندگی بھر کے چھوٹے بڑے واقعات اور حالات میں سے مناسب چیزیں تحریر کی جائیں۔ زندگی جتنی طویل ہے اگر ہر طرح کی باتیں اور اتنی ہی زیادہ ویسے کی ویسے دکھائی جائیں تو تصنیف بھی زندگی کی طرح طویل ہو جائے گی اور یہ طوالت بار کی حد تک جا پہنچے گی۔ اس کے لیے نہایت فنکاری اور ہوشمندی کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے مناسب ہے کہ وہ باتیں جن کا تعلق زندگی کے روزمرہ معمولات سے ہے اور جو عام طور پر ہر زندگی میں ہوا ہی کرتی ہیں نکال دی جائیں۔ اس قسم کی باتوں سے کسی شخصیت کو سمجھنے اور پرکھنے میں کوئی خاص مدد نہیں ملتی یا جو کسی خاص شخص کی شبیہ کو واضح بنانے میں کوئی وجہ نہیں رکھتی۔ اس کام میں یہ خیال رہنا بھی لازمی ہے کہ کوئی ایسی بات نہ رہ جائے جو انسانی زندگی کے کسی خاص پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہو اور اس کاٹ چھانٹ کے قاعدے میں لکھنے والا وہ کچھ تو بیان کر دے جو اس کی پسند اور مطلب کی خاص چیز ہے اور بنیادی باتیں رہ جائیں خصوصاً جب کہ خود لکھنے والا پہلے ہی سے اخفا کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ معمولی اور عام باتیں جو ہر انسان میں مشترک ہیں اور جن کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا وہ نکالی جا سکتی ہیں ورنہ بعض دفعہ نہایت معمولی اشارے اور بظاہر معمولی باتیں یا حرکات جن میں انسان کی زندگی کی بعض خصوصیات و بعض پہلوؤں کو واضح کرنے میں ہمیں مدد دیتی ہیں بعض باریک جذبات انسان کی بعض خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں۔ یہ وہ فنکاری اور دقتِ نظر کا کام ہے کہ تصنیف نہ تو قارئین کے لیے بار بن جائے اور نہ اس میں سے کوئی ضروری بات رہ جائے۔

آپ بیتی اور سوانح عمری میں زمانے کا مسئلہ بھی مشترک ہے یعنی کسی شخص کی کہانی لکھتے وقت بھی یہ دکھانا ضروری ہے کہ زندگی کا

ڈرامہ کس ہنج پر پھیلا گیا ہے۔ انسان زمانے اور ماحول ہی سے اٹھتا بڑھتا ہے یا زمانے ہی کی پیداوار ہے اس لیے زمانہ اور ماحول دکھانا ضروری ہے مگر یہ خیال رہے کہ کہیں ماحول کی تصویر اتنی گہری نہ ہو جائے کہ شخصیت کے نقوش مدھم پڑ جائیں پس منظر میں چلے جائیں، بلکہ زمانہ ماحول اور فضا تو شخصیت کی تصویر کا پس منظر ہے زمانی حالات و کوائف اتنے نہ ہوں کہ سوانحی تصنیف تاریخ کی حدود سے جا ملے

کسی کی لکھی ہوئی سوانح عمری بھی انسان کی کہانی ہے اور آپ بیتی بھی انسانی داستان ہے۔ دونوں کے مقاصد بڑی حد تک ملتے جلتے بھی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ باتیں آپ بیتی لکھنے والے سے رہ جاتی ہیں اور کچھ چیزیں سوانح نگار کے بس کی نہیں ہو سکتیں اس سے مدعا یہ ہے کہ کسی کی سوانح عمری لکھنے والا انسان کی دماغی اور دلی سطحوں اور گہرائیوں میں نہیں جھانک پاتا اور آپ بیتی لکھنے والے کو اپنی زندگی از ابتدا تا انتہا دکھانا مشکل ہے۔

سوانح عمری بیانیہ کی ایک ایسی قسم ہے جو بہت شوق سے پڑھی جاتی ہے۔ بالکل یہی بات آپ بیتی کے لیے کہی جا سکتی ہے۔ غرض کہ بہت سے مقامات پر آپ بیتی اور کسی کی لکھی ہوئی سوانح عمری کی حدود میں اتصال ہوتا ہے اور یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ بہت سے مقامات پر بڑا نمایاں فرق بھی ہے۔

آپ بیتی اور دیگر اصناف

سوانح عمری اور ناول میں جو فرق ہے وہی آپ بیتی اور ناول میں فرق ہے۔ ناول نگار کسی بھی کردار کی زندگی پیش کرتے وقت اس کو اپنے تصور اور تخیل کے مطابق جو چاہے بنا سکتا ہے۔ کسی سوانح نگار اور آپ بیتی لکھنے والے کے لیے تصور اور تخیل کے اس استعمال سے متعلق سوچنا بھی محال ہے۔ صیغہ واحد متکلم میں جو ناول لکھے جاتے ہیں اور آپ بیتی میں بھی یہی فرق ہے۔ اس ناول کی "میں" اور آپ بیتی کی "میں" میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ صیغہ واحد متکلم کسی کردار کے لیے ہوتا ہے۔ اور مبالغہ اور تخیل کی آسانیاں اس پر دوچند ہوتی ہیں اور آپ بیتی میں صیغہ "میں" سے مراد خالصتاً لکھنے والے کی ذات ہے اور اس میں میں پر تصور یا تخیل کا خول چڑھانا گویا آپ بیتی کے لیے زہر ہلاہل ہے۔ کم و بیش یہی حال افسانے اور آپ بیتی کا ہے۔

افسانے اور ناول کے ہیرو میں مثالیت کا شائبہ ضرور پیدا ہو جاتا ہے اور آپ بیتی میں ہیرو اگر مثالی بنتا نظر آئے تو اسے جھوٹی کہانی قرار دے دیا جائے کیونکہ وہ تو ہم سا انسان ہی ہے۔

آپ بیتی اور شاعری میں بھی حسن دلی کیفیات اور جذبات کا عالم کسی حد تک مشترک ہو سکتا ہے۔ شاعری میں سب سے عمدہ چیز تاثیر اور دوسرے کے جذبات کی اپیل ہے۔ آپ بیتی میں یہ عنصر بدرجہ اتم ہو سکتا ہے آپ بیتی کے سوا وہ شاعری ہی تو ہے اگرچہ تمام تر نہیں جس میں کوئی شخص اپنے دل کے گوشے باہر نکال کر رکھ دیتا ہے۔ خون جگر کے قطرے سے تصویریں بناتا ہے۔

شعروں میں زندگی کا ابھرا ہوا چہرا نظر آتا ہے۔ اپنے دل کی دھڑکنیں، اپنے اوپر بیتنے والی کیفیات دل و دماغ پر بیت جانے والی وارداتیں شاعری میں سمو جاتی ہیں۔ اگر نہایت غور و فکر کے ساتھ شاعری کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں سے لاتعداد ایسے عناصر نکالے جاتے ہیں جو سراسر آپ بیتی ہوتے ہیں کم از کم یہ تو ہو سکتا ہے کہ آپ بیتی کا کوئی نہ کوئی گوشہ شعر میں نظر آجاتا مگر شاعری اور آپ بیتی میں بڑے بڑے اور نمایاں فرق بھی ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ شاعرانہ سچائی اور سوانحی سچائی میں بڑا فرق ہے۔ شاعر کو ہر طرح کے مبالغے کی اجازت ہے

آپ بیتی لکھنے والے کو ذرہ برابر بھی نہیں۔ شاعر تخیل اور تصور کی مدد سے کوئی تصویر کیسی ہی بنائے آپ بیتی لکھنے والا صرف حقیقت بیان کر سکتا ہے۔ شاعر مجبور نہیں ہے اور ہونا چاہتا ہے اس کا نمونہ بھی پیش کر سکتا ہے۔ آپ بیتی لکھنے والا بغیر حقائق کے اور ثبوت کے ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ پھر یہ کہ شاعر طرز ابلاغ میں چاہے تصویر کو گہرے رنگ عطا کرے چاہے مدھم یا مبہم بھی بنا دے کہ مدعا بھی مخفی ہو جائے آپ بیتی لکھنے والے کو پہیلیاں بجھوانے کا حق حاصل نہیں اس کو تو صاف و سادہ اور بیان کر دینے والا انداز اختیار کرنا پڑتا ہے مطلب کو چھپانا اور اخفاء کے پردے ڈالنا آپ بیتی لکھنے والے کے لیے ایک بڑا عیب ہے۔ بہرحال آپ بیتی اپنی جگہ ایک صنف ہے جس کے مقاصد اور حدود سوائے سوانح عمری کے شاذ ہی کسی صنف ادب کے ساتھ ملتے ہیں۔

آپ بیتی میں دشواریاں، خامیاں اور ان سے نباہ کی صورت

ابن حنیف اپنی سرگزشت کی تمہید میں لکھتے ہیں کہ ایک زندگی کی کہانی لکھنا مشکل بات ہے اور جب کہ یہ کہانی کسی کی اپنی زندگی ہو تو بہت ہی مشکل ہے۔

یہاں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کوئی شخص کیوں اپنی زندگی کی کہانی سنانا چاہتا ہے اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ میں کتنا اعلیٰ ہوں۔

یعنی سب سے مشکل یہی ہے کہ انسان جو کچھ ہے وہ اس سے بڑھ کر اپنے لیے اندازہ کرتا ہے۔ کسی انسان کا اپنے متعلق بغیر خود پسندی کے بات کرنا دشوار سا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

"تصویر بنانے والا جانتا ہے کہ اس کے سامنے بیٹھنے والا کبھی بھی اپنی تصویر سے مطمئن نہیں ہوتا جب کہ اس سٹوڈیو میں جو تصویریں اسے نظر آ رہی ہیں وہ ان کی عمدگی سے متاثر ہوتا ہے۔

اس کی وجہ یہی ہے کہ انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ اپنے متعلق اصل سے بہت بڑھ کر اندازہ کرتا ہے۔ انسان اپنے آپ کو اونچا سمجھتا ہے۔ ڈونش اپنی آپ بیتی لکھتے ہوئے کہتا ہے: انسانی فطرت میں جو غرور ہے اور جو اپنی زندگی کے ساتھ محبت ہے اس کے لیے یہ بڑا دشوار ہے کہ وہ اپنی سرگزشت کا تجزیہ کرے اور اپنی غلطیوں اور خامیوں کو جمع کرے۔ ١

انسان کی طبیعت یہ ہے کہ شعوری یا لاشعوری طور پر اپنے آپ سے اسے محبت ہوتی ہے اور وہ یہ گوارا بھی نہیں کر سکتا کہ اس میں بھی عام انسانوں والے نقائص اور عام انسانوں جیسی خامیاں ہو سکتی ہیں۔ جہاں آپ بیتی لکھنے والا اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کا اعتراف کرنا چاہتا ہے۔ وہاں اسے اپنا قلم سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور دوسری طرف اس کے پڑھنے والے کو اس وقت پڑھنا ناگوار اور دشوار ہو جاتا ہے جب کہنے والا اپنے متعلق ذرا سی خوبی یا تعریف سے متعلق کوئی جملہ کہے ویسے یہ بات بھی صحیح ہے کہ آپ بیتی لکھنے والے کی اپنی دانست میں کڑی سے کڑی تنقید بھی عموماً اوروں کو خود پسندی نہیں تو کم سے کم فراخ دلی رعایت نظر اندازی اور بیجا نرمی کے مرادف نظر آتی ہے۔

جب کوئی شعوری طور پر اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہے کہ اس نے زندگی اچھائیوں کے ساتھ گزاری یا برائیوں

میں تو وہ اپنے آپ کو نہایت چکنی اور پھسلتی زمین پر پاتا ہے کوئی بھی ہو اس وقت ضرور رکتا ہے جب وہ یہ سوچ کر وہ اپنی تعریف کرے یا اپنے اوپر جو الزامات وارد ہو سکتے ہیں ان کا ذکر کرے یہ چیز انسانی فطرت بن گئی ہے کہ ہم اپنی اچھی باتیں تو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں اور خامیوں کو دوسروں سے چھپاتے ہیں۔

اس غرض کے لیے کہ انسان اپنے آپ کو ایک بلند سطح پر دیکھ سکے وہ اپنے آپ کو عام زندگی سے بلند کرنا چاہتا ہے اور اپنی زندگی کے معمولی واقعات اور عام عادات کے ذکر کو چھوڑ کر چونکا دینے والی کیفیات و حالات کا بیان کہیں زیادہ پسند کر لیتا ہے۔

اپنی خود پسندی کا اور اپنے متعلق غلط اندازے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ آپ بیتی لکھنے والا اس بات پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنے بیان ہی سے روزمرہ زندگی کی عام خصوصیات نکال دے اور اپنے آپ کو خاص خاص نمایاں واقعات و معاملات تک محدود رکھے انسان اپنی شخصیت کو دکھانے کے لیے ہر بات کو تحریک پیدا کرنے والی اور زوردار بنا دیتا ہے۔

آپ بیتی میں جو قدرتی کوشش ہوتی ہے اسے بسا اوقات یہ بات زائل کر دیتی ہے کہ مصنف اپنی زندگی کے واقعات بے کم و کاست بیان کرنے کی بجائے ذہنی برتری ثابت کرنے کے لیے کسی مصنوعی اور مثالی شخص کی زندگی بیان کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ اس طرح زندگی کے حقیقی گوشے بے نقاب ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ ایک کٹھ پتلی کی سرگزشت سامنے آجاتی ہے جو نہ دل کے لیے کشش رکھتی ہے نہ دماغ کے لیے۔ ایک اور چیز جو آپ بیتی کی کشش کو زائل کرتی ہے یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے واقعات بیان کرتے وقت حقیقی تاثرات کی بجائے خیالات قلمبند کرنے لگتا ہے جو مفروضوں کی چھلنی میں چھن کر نکلتے ہیں یعنی انسان حقیقی تاثرات کی بجائے بعض باتیں خیال کی مدد سے بناتا ہے اور بعض فرض بھی کر لیتا ہے۔ در اصل آپ بیتی لکھتے وقت سچائی اور اس کے تحت آنے والی جرأت و بے باکی و صاف گوئی ہی آپ بیتی لکھنے والے کا زبردست امتحان ہے آپ بیتی دلکش اور جاذب ہو ہی تب سکتی ہے اور اس کے صحیح ہونے کا یقین بھی تب ہو سکتا ہے کہ انسان خود اپنا ناقد بن کر اپنی زندگی کے تمام اچھے برے پہلو دکھا دے۔ اپنی طرف سے اگر کوئی اخفا سے کام لیتا ہے تو وہ اپنے ساتھ دھوکا کرتا ہے کیونکہ وہ یہ نہیں سمجھ پاتا کہ طرح طرح کی ان باتوں سے معرا کہانی جن باتوں کو چھپا کے رکھنا چاہتا ہے سپاٹ زندگی کا نمونہ پیش کرے گی۔ اور سپاٹ کہانی زندگی کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا اس پر لاکھ تصنع اور بناوٹ کے خول چڑھا دیے جائیں وہ کچھ بھی نہیں ہوگی ہر انسان بہرحال انسان ہے ہر انسان کی زندگی کے متنوع پہلو ہوتے ہیں۔ سوائے دنیا کے گنے چنے کچھ پاکیزہ لوگوں کے کون ہر طرح کی خامی و خلل سے پاک ہے اور جب کوئی آپ بیتی لکھنے والا اپنے آپ کو ہر طرح کی کمزوری سے معرا دکھانے کی کوشش کرتا ہے حقائق کی جستجو کرنے والے اور زندگی پر گہری نظر رکھنے والے کو اس کی نیت پر شبہ ہو جاتا ہے وہ ایسی تصنیف کو ذرا بھی اہمیت نہیں دیتا۔

اگر کوئی سچائی سے کام لے کر اپنی تصویر کا ہر گوشہ دکھانے کے لیے مستعد ہوتا بھی ہے تو جھجک اور حجاب اس کے قدم روکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لکھنے والوں کی آپ بیتیاں ان کی وفات کے بعد منظر عام پر آئی ہیں۔ اینڈریو کارنیگی ANDREW CARNEGIE نے اپنی آپ بیتی میں کہا ہے کہ وہ اپنی کہانی اس انداز میں بیان کر رہا ہے جیسے پرخلوص دوستوں اور اپنے قریبی لوگوں کے سامنے کہہ رہا ہو اس طرح نہیں جیسے کہ عوام کے سامنے بیان کی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کے سامنے اپنی زندگی کی سچی کہانی دہراتے وقت انسان گھبراتا ہے۔ یہاں مصنف کا یہ خیال بھی جھلک دکھاتا ہے کہ عوام کو پیش نظر رکھ کر وہ باتیں کہی جانے کے قابل نہیں جو وہ کہہ رہا

ہے۔ اس کے علاوہ لکھنے والا یہ بھی چاہتا ہے کہ سننے والے ہمدرد اور پرخلوص ہوں لکھنے والے جھجکتے ہیں کہ سننے والے عام طور پر ہمدرد نہیں ہوتے اور انہیں لطف ہوتا ہے کہ ان کے مصائب دکھاتا ہے تو وہ اپنا درجہ گراتا نہیں بلکہ بحیثیت حقائق نگار اس کا درجہ بلند ہو جاتا ہے جس نے اپنی ذات کے ساتھ انصاف سے کام لیا۔ اس سے بڑھ کر کون ایماندار ہوگا۔

جھجک اور ہچکچاہٹ کی ایک وجہ شائستگی بھی ہے کہ انسانی معاملات میں سے بعض اس نوعیت کے بھی ہوتے ہیں کہ کہنے والا کھل کر کہہ نہیں سکتا۔ زندگی کے بعض خاص واقعات اور پہلوؤں کا تعلق ان معاملات سے ہوتا ہے اس لیے ان کا بیان بھی ضروری ہو جاتا ہے جیسی گر لائل نے کہا ہے کہ اگر میں اپنی سوانح عمری شروع سے آخر تک بغیر کسی قسم کے اخفا کے اور بغیر کسی جھوٹے رنگ کے لکھوں تو کسی خامی کے بغیر یہ بھی میرے ملک کی عورتوں کے لیے ایک نایاب دستاویز ہوتی مگر شائستگی مانع ہے۔ نہ صرف بیان کرنا بلکہ انسانی زندگی کو سمجھنا بھی بڑا دشوار ہے۔ کئی بیان کرنے والے خود کہتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ وہ کس قسم کے ہیں ان کی زندگی کیا ہے اور کس طرح گزری ہے یعنی غور کرنا اور اپنے آپ کو سمجھ سکنا بھی بڑی بات ہے۔ انسانی زندگی سپاٹ اور سیدھی سادی نہیں بلکہ ساری زندگی ایک تجربہ ہے اور عجیب تجربہ ہے۔ اگر کوئی آدمی بیس سال کی عمر سے اپنی ذات کے لیے غور کرے اگر وہ حقائق جان سکے تو ستر سال کی عمر تک وہ یہ جان سکتا ہے کہ اس کی عمر کا ایک تہائی حصہ غلطیوں میں صرف ہو گیا۔ دوسرا تہائی حصہ ان غلطیوں کو دوسری خامیوں میں تبدیل کرنے میں اور آخری تہائی حصہ اس کوشش میں صرف ہو گیا کہ وہ مثالی زندگی کی خطاؤں کو واپس لیا جائے۔ یا اپنی کی ہوئی غلطیوں کو مٹایا جائے۔

انسان جب بڑا ہو جاتا ہے اور اپنی زندگی کے اختتام تک پہنچتا ہے تو اسے کچھ اندازہ ہو پاتا ہے کہ وہ کن راستوں سے چل کر اس منزل کے آخر تک پہنچا ہے۔ اس لیے زندگی کی تمام راہوں پر غور کرنا اور غور کر کے حقائق کو صحیح طریقے پر بیان کرنا ہی بڑا کٹھن کام ہے۔

انسان کا ذہن اگرچہ بڑا وسیع نظام رکھتا ہے۔ یاد رکھنے کی بڑی تفصیلیں انسان میں موجود ہیں۔ مگر گزری ہوئی زندگی اور زندگی سے متعلق ہر بات کا یاد رہنا بھی کچھ ناممکن سا ہے اگر سب کچھ یاد رہ بھی سکتا ہو تو انسانی فطرت کچھ ایسی ہے کہ انسان اپنے دماغ کو جھٹک کر بھی ایسے ناپسندیدہ واقعات اور ناخوشگوار باتیں نکال دینا چاہتا ہے جن کو یاد رکھنے میں اسے تکلیف اور الجھن محسوس ہوتی ہے۔ پھر انسان کو بچپن تو ضرور ہی بھول چکا ہوتا ہے۔ اس کی جگہ ماں باپ یا دیگر لوگوں سے سنے ہوئے حالات بیان کر دیئے جاتے ہیں۔ آپ بیتی لکھنے والے کو یہ بھی معلوم ہے کہ ذرا سا بھی غلط اشارہ اس کے لیے قابل گرفت ہو سکتا ہے۔

جہاں انسان بھول جانے کی فطرت رکھتا ہے وہاں اس سے متعلق ایک چیز اور بھی ہے کہ بھولے ہوئے واقعات کی جگہ ذہن کی تخلیقات کو دے دی جاتی ہے یا انسان ذہن کی مدد سے بھولی ہوئی تصویروں کی بجائے نئی نئی تصویریں بنا کر اپنی تصویر کو رنگین بنا دیتا ہے اس کے علاوہ دماغ دلیل و جواز، نیت و عمل سے کام لینے کی ترغیب بھی دے دیتا ہے۔ بعض دفعہ انسان زندگی کے تلخ حقائق سے فرار حاصل کرتا ہے اور تصوریہ تخیل کی آباد کردہ دنیا میں رہتا ہے اور اگر وہ آپ بیتی لکھے تو اس میں ایک مثالی کردار اور مثالی دنیا کا نقشہ سامنے آجائیگا۔

ان سب باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ روز بروز کی لکھی ہوئی ڈائری انسان کو آپ بیتی لکھنے کی ترغیب کے علاوہ اس کام کو بطریق احسن انجام دینے میں مدد دے سکتی ہے۔

لکھنے والا واقعات کو شعوری کوشش کے ساتھ زیادہ رنگین اور دلکش بنانے کی کوشش بھی کرتا ہے حالانکہ آپ بیتی میں بناوٹ

اور کسی بھی شعوری کاوش کی ضرورت نہیں، کیونکہ زندگی اور زندگی کی کہانی بذات خود دلچسپ و دلکش ہیں۔ تصور، تخیل کی مدد سے زندگی کی تصویر کے نقوش کو اور رنگ دینا یا کسی گوشے سے اسے ملفوف کر کے تصویر کو دھندلا یا شوخ بنا دیتا ہے اور یہ حقیقت سے لگا نہیں کھاتی۔

بعض لکھنے والے سبق سکھانے یا تلقین کرنے کا مقصد بھی اپنے سامنے رکھ بیٹھتے ہیں۔ کسی بھی کہانی سے اگر کوئی سبق خود بخود پیدا ہوتا ہو تو وہ اس کی قدر بڑھا جاتا ہے مگر جب سعی کر کے اور شعوری کاوش سے سبق نکال کر دکھایا جائے تو انسان خیر و شر، خوبی و برائی کے چکر اور نتائج میں الجھ کر حقائق سے دور چلا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اسباق سکھانا ہی مقصود ہو گا تو ہر ایسے واقعہ کے بیان سے گریز کیا جائے گا۔ جس میں کوئی بھی برائی کا پہلو نظر آ رہا ہو۔

آپ بیتی لکھنے والوں کے یہاں ایک اور رجحان عام نظر آتا ہے۔ وہ اپنی ذات کے بیان کے دوران میں کسی بھی ذکر کو شروع کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ادھر ادھر کو بہہ جاتے ہیں اور پیچھے ہی چلے جاتے ہیں۔ بڑی دور تک انجانے راہرو کے ساتھ چلنے کے بعد انہیں خیال آتا ہے کہ وہ تو اپنی ذات کا بیان کر رہے تھے اور ادھر ادھر کے بیانات ان کا مقصد نہیں ہے۔ کسی شخص کا ذکر آ جائے، کسی انسانی خصوصیت کا ذکر ہو، کسی مکانی و زمانی خصوصیت کا بیان ہو، مشاہدات کا ذکر ہو یا زندگی کے متعلقہ موضوعات کا، تو وہ اپنی ذات سے ہٹ کر اسی کے ساتھ منسلک ہو جاتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی مدرس یا ادب کا استاد اپنی آپ بیتی لکھنے لگے اور کہتے کہتے میر کا ذکر آ جائے تو اس کے ذکر سے صفحات سیاہ کرنے لگے یا ناسخ و آتش کا موازنہ و مقابلہ لے بیٹھے یا شبلی کی قابلیت کے بیان میں یہ بھول جائے کہ اسے تو اپنی ذات کا بیان کرنا ہے۔ یہاں ذات کے ذکر کے ساتھ اپنی پسند اور ذوق کے لیے تھوڑا بہت اس طرح کا اشارہ آ جائے تو کافی ہے، ورنہ یہ ایک بڑی خامی ہے اور یہ خامی ہے بھی اتنی ہی عام کہ شخصی بات کو اصل بنا کر اس پر توجہ کی جاتی ہے۔ تاریخی اور سیاسی زندگی سے واسطہ رکھنے والے لوگ اپنی ذات کے ذکر سے بڑھ کر تاریخی و سیاسی حالات کا جائزہ لینے لگتے ہیں یہاں تک کہ پس منظر پیش منظر میں آ جاتا ہے اور جس شخصیت کا ظہور مقصود ہے وہ پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ بعض لکھنے والے اپنے نسب اور اجداد کے ذکر میں سوانحی تصنیف کو تذکرہ بنا دیتے ہیں حالانکہ نسب کا ذکر ایک ضمیمے کی صورت میں ہونا چاہیے۔ بعض لکھنے والے اجتماعی معاملات اور زمانے کے حالات کے ذکر میں ہی آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیتے ہیں۔ ایسی کل سیاسی، تاریخی اور اجتماعی باتیں چاہے کتنی ہی پر لطف اور افادیت کی حامل ہوں۔ آپ بیتی ڈھونڈنے والے کو نہیں بھاتیں۔ وہ وہاں تمام عمل سیاسی اور تاریخی بحثوں میں الجھنے کی بجائے زندہ شخصیت اور کردار کو بمع اس کی زندگی کے شب و روز کے دیکھنا چاہتا ہے۔

ایسی ہی بے شمار خامیاں اکثر آپ بیتی لکھنے والوں کے ہاں پائی جاتی ہیں جو ایسی تصنیف کی قدر کو کم کر دیتی ہیں۔ یہ کہا تو جا سکتا ہے کہ لکھنے والے نے غلط بیانی سے کام لیا یا الفاظ کے اخفا سے فائدہ اٹھایا، لیکن یہ چیز چھپی نہیں رہتی بلکہ یہی لکھنے والے کی ذہنی کیفیت، اس کے معیار اور ذوق و شوق کا پتہ دیتی ہے یعنی لکھنے والے کی کاوش کیسی بھی ہو اس کی ذات اس کی شخصیت سے ضرور ابھرتی ہے۔ یہاں اگر کوئی شخص صحیح سوانح لکھ سکتا ہے تو وہ خود صاحب سوانح ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنی زندگی کے واقعات میں رنگ آمیزی نہ کرے اور یہ بات انسانی طبائع سے بالکل ناممکن ہے کیونکہ کوئی شخص فطرتاً اپنی تشہیر کرنا چاہتا ہے نہ اپنے معائب کا ڈھنڈورا پیٹنا چاہتا ہے۔ یعنی باوجود اس متوقع بات کے کہ خود لکھنے والا پوری طرح اظہار نہیں کر سکتا اس بات سے بھی

انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خود نوشت سوانح عمری ہی اصل سوانح عمری ہو سکتی ہے۔ اگر غور لکھنے والا مندرجہ بالا معائب جو آپ بیتی میں نظر آتے ہیں اپنے ذہن میں رکھے اور نہایت خلوص اور ایمانداری سے کام لے جھجکنے سے بچے اور جرأت کا ثبوت دے تو آپ بیتی لکھنا ایک بہت اعلیٰ کام ہے اور اس میں افادیت کے پہلو بھی ہیں بقول ایلی جینٹ ۔

" ہم سب کی ایک ہی سی پریشانیاں ہوتی ہیں ایک سے غم ایک سی اٹھنے والی امیدیں ایک سی خواہشات اس لیے یہ ایک بہتر صورت بن سکتی ہے کہ کسی کی کہانی سب کی مدد کرے۔"

ایک تو جہاں دیدہ اشخاص کے تجربے مدد کرتے ہیں دوسرے جب ہم سوچتے ہیں کہ ہماری زندگی میں بھی وہی گتھیاں ہیں جو دوسروں کے ہاں ہیں تو یہ بات ہمیں سکون دیتی ہے بعض وقت آپ بیتی لکھنے والا اپنے عقیدوں پر روشنی ڈالتے وقت اپنے آپ کو ناخوش بھی کرتا ہے مگر وہ ان مسائل سے متعلق بتاتا ہے جو دوسروں کے لیے سوہانِ روح بنے ہوتے ہیں۔ ایک آپ بیتی سے ہم ایک شخص کے ذاتی محسوسات جانتے ہیں اور اس کے علاوہ یہ کہ اس نے زندگی کیسے بسر کی، کیسی چیز کو پسند کیا اور کس کو ناپسند کیا۔ انسانی سرشت میں داخل ہے کہ انسان اپنے احوال و کیفیات بتانے کے لیے بے تاب ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ بتاتے وقت وہ مجمع نہیں چاہتا بلکہ پُرخلوص اور ہمدرد دوست یا قرابت دار یہاں تک لکھنے والے کو تکلیف بھی نہیں ہوگی کیونکہ وہ اپنے دل کو کھولتے اور اپنی بپتیاں بیان کرنے میں اطمینان محسوس کر رہا ہے مگر آپ بیتی میں باریک بینی اور ذاتی تجربے کی ضرورت ہے جب ہم اپنی تصویر دوسرے لوگوں کے لیے بنانے لگتے ہیں ہمیں اس بات کے لیے حیران نہیں ہونا چاہیے کہ اگر تصویر پسندیدگی کے ساتھ قبول نہ کی گئی تو !!!۔ آپ بیتی خود بخود جاذبیت رکھتی ہے اس کے بیان اور ابلاغ میں ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی ہچکچاہٹ اور جھجک مانع ہو اگر انسان یہ کہنے میں بیباک ہے کہ وہ کچھ باتیں بھول گیا ہے یا کچھ باتوں سے متعلق شکوک میں مبتلا ہے یا کسی بات کے ذکر میں اپنے آپ کو بے تکلف نہیں پاتا تو یوں ہی محسوس ہوتا ہے کہ اس نے کچھ کہہ دیا ہے اندازہ تو ہو جاتا ہے کہ کچھ کہنے کی بات اور بھی تھی اور وہ نہ کہہ سکنے پر قلق محسوس کر رہا ہے یہ چیز لکھنے والے کی فطرت کو ظاہر کر رہی ہے کہ وہ چھپانے اور بچا رکھنے کی عادت نہیں رکھتا۔ اپنی بعض باتیں جن کے خیال سے بھی انسان کو شرم محسوس ہوتی ہے بیان کرنے میں ذرا اعتدال سے کام لیا جائے تو مضائقہ نہیں مگر بالکل چھپا جانا اُن کے خلاف ہے۔ مشرقی حیاداری ایسی باتوں کے اظہار میں عموماً مانع ہوتی ہے ورنہ مغربی ادب میں ایسے نمونے بھی موجود ہیں جن کے کھلے کھلے انداز پر حیرت ہوتی ہے۔ انسان کی زندگی جس نہج کی رہی ہو وہ جس ڈگر پر چلتا رہا ہو طرزِ عمل زندگی میں جیسا بھی رہا ہو اس کے طریقے اور اصول سب اس کی داستانِ حیات پر اثر انداز ہوں گے۔ ان اثرات کا واضح ہو جانا ہی بہتر ہے لکھنے والا واقعات کی صورت مسخ نہ کرے ورنہ اس طرح آپ بیتی سچا اعمال نامہ ہونے کی بجائے افسانہ یا ناول بن جائے گی میانہ روی اس طرح کی ہو کہ نہ حد سے زیادہ انکساری سے کام لیا جائے نہ اخفا کا الزام عاید ہو۔ بعض دفعہ زیادہ انکساری سے واقعات کا خون ہوتا ہے فنی طریقے سے ہر واقعہ کو مناسب جگہ دی جائے نہ ہی کسی تصویر کا رنگ پھیکا پڑے نہ ہی ضرورت سے زیادہ گہرا ہو۔

شروع سے آخر تک اگر آپ بیتی پر غور کیا جائے تو اس میں بہت کچھ آ جاتا ہے اگر ہم انسانی زندگی کو اس طرح دیکھیں جیسے سمندر تک پہنچنے کے لیے میدانی علاقہ میں بہتا ہوا دریا۔ ہم اس کے رنگ اور صفائی ذائقہ اور چلبلاہٹ پر غور کریں گے پھر اس کی کنکریوں ریت اور کیچڑ پر جس پر کہ وہ بہتا رہا اور اس کے ساتھ اس کے ماحول کے رد عمل میں پھیلنے اور سکڑنے کے انداز کو کبھی طغیانی بھی آئی ہے

بھی دریا سوکھ بھی جاتا ہے۔ ان سب چیزوں سے بڑھ کر تجزیے کے طور پر دیکھیں گے کہ اس کے پانی میں کچھ نمک اور گیسوں کی ملاوٹ بھی ہے بعض وقت گیسیں اور نمک اور گرد کی فضا اور شعور کا نتیجہ ہو سکتے ہیں مگر ان کی اصل وہ سرچشمہ ہے جہاں سے دریا پھوٹتا تھا اس کی وضاحت یوں کی جائے گی کہ انسانی زندگی ظاہری باطنی رستے میں آنے والی رکاوٹیں اور وسائل ماحول اور فضا انسان کے خاص خصائص اور عادات ان سب کے علاوہ اس کے نسب پر تھوڑا سا اثر کہ خصائل میں سے کون سی وراثت میں ملی ہیں کون سی ماحول و فضا کی پیداوار ہیں اور کن خصائص خاص شخصیت کو ابھارنے والے ہیں ہر چیز کے بیان میں مناسبت کا لحاظ ضروری ہے۔ انسان کی داخلی اور خارجی زندگی کے ہر طرح کے کوائف سانحے، کاوش، تجربات، کیفیات، جذبات، محسوسات، سوچنے کے انداز اور طرزِ عمل اور طریقے سب کی وضاحت ہو۔ شخصیت کا کوئی گوشہ اوجھل نہ رہے تو بہتر ہے۔

آخر میں اس بات پر زور دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آپ بیتی میں سچائی بے باکی اور خلوص کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ سچائی اور پوری سچائی کی ضرورت ہے۔ شخصیت کے ابھرنے کے لیے تصنیف لکھی گئی ہے اور لازمی ہے کہ تصنیف شخصیت کو واضح صورت میں دکھائے۔ خوش ترتیب تسلسل مناسب انتخاب کی ضرورت ہے۔ اور فن کا تقاضا یہ بھی ہے کہ سادگی اور صفائی سے بیان ہو ابلاغ میں کسی قسم کا الٹ پھیر تصنع اور پیچیدگی نہ ہو۔

فنِ آپ بیتی کے اس جائزے کے بعد جب ہم اُردو میں آپ بیتی کی روایت پر نظر ڈالتے ہیں تو سوانح نگاری کی طرح آپ بیتی بھی جدید دور کی پیداوار معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کے دھندلے سے نقوش قدیم شاعری کے بعض نمونوں، تذکروں، فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی تالیفات کے دیباچوں وغیرہ میں بھی مل جاتے ہیں۔ تاہم آپ بیتی یا سرگزشت کی ادبی ترقی یافتہ صورت اُردو میں انیسویں صدی کے آخر سے ملتی ہے۔ بیسویں صدی میں بہت سی آپ بیتیاں لکھی گئیں جن میں بعض فنی اعتبار سے قابلِ قدر ہیں۔

ہے آج جو سرگزشت اپنی
کل اُس کی کہانیاں بنیں گی

ڈاکٹر محمد اقبال

ولادت — جمعہ ۳ ذیقعدہ ۱۲۹۴ھ (۹ نومبر ۱۸۷۷ء)

وفات — ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء — بمقام لاہور

میری زندگی

میری زندگی میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں جو اوروں کے لئے سبق آموز ہو سکے۔ ہاں خیالات کا تدریجی انقلاب البتہ سبق آموز ہو سکتا ہے۔ اگر کبھی فرصت ہو گئی، تو لکھوں گا۔ فی الحال اس کا وجود محض عزائم کی فہرست میں ہے۔

(اقبال نامہ، جلد اوّل، ص ۲۲۶)

میرے پہلو میں ایک چھوٹا سا بت خانہ ہے کہ ہر بت اس صنم کدے کا رشکِ صنعتِ آذری ہے۔ اس پرانے مکان کی کبھی سیر کی ہے؛ خدا کی قسم بنارس کا بازار فراموش کر جاؤ۔ (اقبال نامہ، حصہ دوم، ص ۳۵۶)

میرا سینہ یاس آفریں اور غم انگیز خیالات کا خزینہ ہے۔ یہ خیالات میری روح کی تاریک بامیوں سے سانپ کی طرح نکلے چلے آتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں ایک سپیرا بن جاؤں گا۔ گلیوں میں پھروں گا اور تماش بین لڑکوں کی ایک بھیڑ میرے پیچھے پیچھے ہو گی۔

اگر وہ خیالات جو میری روح کی گہرائیوں میں طوفان بپا کئے ہوئے ہیں، عوام پر ظاہر ہو جائیں تو پھر مجھے یقین واثق ہے کہ میری موت کے بعد میری پرستش ہو گی۔ دُنیا میرے گناہوں کی پردہ پوشی کرے گی اور مجھے اپنے آنسوؤں کا خراجِ عقیدت پیش کرے گی۔ (بنام عطیہ بیگم فیضی)

پس از من شعر من خوانند و دریابند و می گویند   جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

من دمیدم از زمینِ مردہ

میں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا   رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند
اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو   لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند
تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں   مرغانِ سحر خواں مری صحبت سے ہیں خورسند
لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

میرے آبا و اجداد اہلِ خطہ ہی سے ہیں —

تنم گلے ز خیابانِ جنتِ کشمیر　　دل از حریمِ حجاز و نوا ز شیراز است

کشمیر کا چمن جو مجھے دلپذیر ہے　　اس باغ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثے میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائداد　　جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دُور　　یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دُور
ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر　　بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دُور

میرے آباؤ اجداد

میرے آباؤ اجداد برہمن تھے۔ انہوں نے اپنی عمریں اس سوچ میں گزار دیں کہ خدا کیا ہے؟ میں اپنی عمر اس سوچ میں گزار رہا ہوں کہ انسان کیا ہے؟

میں اصل کا خاص سومناتی　　آبا میرے لاتی و مناتی

میر و مرزا بہ سیاست دل و دیں باختہ اند
جز برہمن پسرے محرمِ اسرار کجاست

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

بت پرستی کو مرے پیشِ نظر لاتی ہے　　یادِ ایامِ گزشتہ مجھے شرماتی ہے
ہے جو پیشانی پہ اسلام کا ٹیکا اقبال　　کوئی پنڈت مجھے کہتا ہے تو شرم آتی ہے

(کشمیر میں، ہمارے خاندان کی رہائش موضع چکو پرگنہ اڈون تحصیل کولگام، میں تھی وہاں سے ہجرت کر کے سیالکوٹ آئے)

ہماری گوت

مجھے معلوم نہیں لفظ سپرو کے معانی کشمیری زبان میں کیا ہیں۔ ممکن ہے اس کے معنی وہی ہوں جو ذوقی نے تحریر فرمائے ہیں یعنی وہ لڑکا جو چھوٹی عمر میں بڑوں کی سی ذہانت دکھائے۔ البتہ کشمیری برہمنوں کی یہ گوت سپرو ہے۔ اس کی اصل کے متعلق جو کچھ میں نے اپنے والد مرحوم (شیخ نور محمد) سے سنا تھا، وہ عرض کرتا ہوں۔

جب مسلمانوں کا کشمیر میں دور دورہ ہوا تو براہمہ کشمیر مسلمانوں کے علوم و زبان کی طرف بوجہ قدامت پرستی یا اور وجوہ کے توجہ نہ کرتے تھے۔ اس قوم میں سب سے پہلے جس گروہ نے فارسی وغیرہ کی طرف توجہ کی اور اس میں امتیاز حاصل

کرکے حکومتِ اسلامی کا اعتماد حاصل کیا وہ سپرو کہلایا۔ اس لفظ کے معنی ہیں وہ شخص جو سب سے پہلے پڑھنا شروع کرے یا جس نے سب سے پہلے پڑھنا شروع کیا، حق تقدم کے لئے کئی زبانوں میں آتا ہے اور پڑھ کا روٹ وہی ہے جو ہمارے مصدر پڑھنا کا ہے۔

والد مرحوم کہتے تھے کہ یہ نام کشمیر کے برہمنوں نے اپنے اُن بھائی بندوں کو ازراہ تعریض و تحقیر دیا تھا جنھوں نے قدیم رسوم و تعلقات قومی و مذہبی کو چھوڑ کر سب سے پہلے اسلامی زبان و علوم کو سیکھنا شروع کیا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ نام ایک مستقل گوت ہو کر مشہور ہو گیا۔

دیوان ٹیک چند ایم اے جو پنجاب میں کمشنر تھے، ان کو تحقیق لسان کا بڑا شوق تھا۔ ایک دفعہ انبالہ میں انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ لفظ سپرو کا تعلق ایران کے قدیم بادشاہ شاپور سے ہے اور سپرو حقیقت میں ایرانی ہیں جو اسلام سے بہت پہلے ایران کو چھوڑ کر کشمیر میں آباد ہوئے اور اپنی ذہانت و فطانت کی وجہ سے برہمنوں میں داخل ہو گئے۔ واللہ اعلم

پنجاب میں جہاں تک مجھے معلوم ہے، کوئی گھر مسلمان سپرو خاندان کا نہیں ہے۔ اعجاز کی شادی کے وقت اس امر کی جستجو کی گئی تھی مگر ناکامی ہوئی۔[1]

ولادت

میری ولادت (۹ نومبر ۱۸۷۷ء) سے چند روز قبل میرے والد نے ایک خواب دیکھا کہ ایک بڑا ہی عجیب و غریب پرندہ فضا میں زمین کے قریب اُڑ رہا ہے اور بڑی کثرت سے لوگوں کا ہجوم ہے۔ اس ہجوم میں میں بھی ہوں۔ وہ پرندہ کسی کی کوشش سے ہاتھ نہیں آتا لیکن خود بخود میرے دامن میں آ گرا اور میں نے اس کو پکڑ لیا۔ اس کے بعد میں پیدا ہوا تو انہوں نے اس خواب کی یہ تاویل کی کہ وہ با اقبال پرندہ میں ہی تھا۔ (اقبال کامل ص ۳)

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

افسوس کہ ہم اچھے زمانے میں پیدا نہ ہوئے۔ مسلمان امراء میں مذاقِ علمی مفقود ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے۔

تلاوتِ قرآن کی لذت

جب میں سیالکوٹ میں پڑھتا تھا تو صبح اُٹھ کر روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کرتا تھا۔ والد مرحوم اپنے اوراد و وظائف سے فرصت پا کر آتے اور مجھے دیکھ کر گزر جاتے۔ ایک دن صبح کو میرے پاس سے گزرے تو مسکرا کر فرمایا کہ کبھی فرصت ملی تو میں تم کو ایک بات بتاؤں گا۔ میں نے دو چار دفعہ بتانے کا تقاضا کیا تو فرمایا کہ جب امتحان دے لوگے تب۔ جب امتحان دے چکا اور لاہور سے مکان آیا تو فرمایا جب پاس ہو جاؤ گے تب۔ جب پاس ہو گیا اور پوچھا تو فرمایا بتاؤں گا۔ ایک صبح کو جب حسبِ دستور قرآن کی تلاوت کر رہا تھا تو وہ میرے پاس آ گئے اور فرمایا۔ "بیٹا! جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ یہ قرآن تم ہی پر اترا ہے یعنی اللہ تعالٰے خود تم سے ہم کلام ہے۔" ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

---

[1] اقبال کشمیری پنڈتوں کی سپرو گوت سے تعلق رکھتے تھے۔ شیخ اعجاز احمد ان کے بھتیجے یعنی شیخ عطا محمد کے فرزند ہیں۔ تفصیل کے لئے منشی محمد الدین فوق کی کتاب تاریخ اقوام کشمیر دیکھئے جس کی تصنیف کے وقت اقبال نے ۱۰ جنوری ۱۹۳۲ء کو یہ سطور لکھی تھیں۔

ان کا یہ فقرہ میرے دل میں اُتر گیا اور اس کی لذت دل میں اب تک محسوس کرتا ہوں۔

خدا ترسی کی تعلیم

ایک دفعہ ایک سائل سوال کرتا ہوا ہمارے دروازے پر آیا، اُس نے صدا دی اور بُری طرح اڑ گیا۔ میرے شباب کا زمانہ تھا۔ مجھے اس کی ضد پر غصہ آیا۔ میں نے اسے پیٹا اور اس کی جھولی زمین پر الٹ دی۔ باپ کا دل اس بے رحمی پر بھر آیا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ؎

گفت فردا اُمتِ خیر الرسل   جمع گردد پیشِ آں مولائے کل
غازیانِ ملتِ بیضائے او   حافظانِ حکمتِ رعنائے او
ہم شہیدانے کہ دیں را حجت اند   مثلِ انجم در فضائے ملت اند
زاہدان و عاشقانِ دل فگار   عالمان و عاصیانِ شرمسار
در میانِ انجمن گردد بلند   نالہ ہائے ایں گدائے دردمند
اے صراطت مشکل از بے مرکبی   من چہ گویم چوں مرا پرسد نبی

انہوں نے فرمایا کہ قیامت کے دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد تمام اُمت جمع ہوگی جس میں مجاہد، حکیم، شہید، زاہد، صوفی، عالم اور گنہگار ہر قسم کے لوگ ہوں گے اور اس مظلوم سائل کی فریاد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے دریافت فرمائیں گے کہ ہم نے ایک بندۂ مسلم کو تیری فرزندی اور نگرانی میں دیا، تو اسے بھی آدمی نہ بنا سکا، تو میں کیا جواب دوں گا ؎

اندکے اندیش و یاد آر اے پسر   اجتماعِ اُمتِ خیر البشر
باز ایں ریشِ سفیدِ من نگر   لرزہ بیم و امیدِ من نگر
بر پدر ایں جورِ نازیبا مکن   پیشِ مولا بندہ را رسوا مکن
غنچۂ از شاخسارِ مصطفےٰ   گل شو از بادِ بہارِ مصطفےٰ
از بہارش رنگ و بو باید گرفت   بہرۂ از خلقِ او باید گرفت
فطرتِ مسلم سراپا شفقت است   در جہاں دست و زبانش رحمت است
آنکہ مہتاب از سرِ انگشتش دو نیم   رحمتِ او عام و اخلاقش عظیم
از مقامِ او اگر دور ایستی   از میانِ معشرِ ما نیستی

یعنی اس مجمع کا خیال کر اور میری سفید داڑھی کو دیکھ۔ باپ پر اس قدر ظلم کرکے آقا کے سامنے اس کو ذلیل نہ کر۔ تو چمنِ محمدی کی ایک کلی ہے۔ اس چمن کی ہوا سے پھول بن کر کھل۔ اسی چمن کی بہار سے تجھ کو رنگ و بو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق سے ایک حصہ لینا چاہیئے۔ مسلمان کی فطرت سراپا شفقت اور اس کے ہاتھ اور زبان رحمت ہیں۔ جس نے ایک انگلی کے اشارے سے چاند کو دو ٹکڑے کر دیا۔ اس کی رحمت عام اور اس کے اخلاق نہایت بلند پایہ ہیں۔ اس لئے اگر تو اس کے مقام سے دور ہے تو ہماری جماعت سے الگ ہے۔ (رموزِ بیخودی)

اسلام کی خدمت کا عہد

ایک دن والد مرحوم نے مجھ سے کہا کہ میں نے تمہارے پڑھانے لکھانے میں جو محنت صرف کی ہے، میں تم سے اس کا معاوضہ چاہتا ہوں۔ میں نے بڑے شوق سے پوچھا کہ وہ کیا ہے۔ والد مرحوم نے کہا کسی موقع سے بتاؤں گا۔ چنانچہ انھوں نے ایک دفعہ کہا کہ ”بیٹا! میری محنت کا معاوضہ یہ ہے کہ تم اسلام کی خدمت کرنا۔“ بات ختم ہو گئی۔ اس کے بعد میں نے امتحان وغیرہ دے کر اور کامیاب ہو کر لاہور میں کام شروع کیا۔ ساتھ ہی میری شاعری کا چرچا پھیلا اور نوجوانوں نے اس کو اسلام کا ترانہ بنایا اور دوسری نظمیں لکھیں اور لوگوں نے ان کو ذوق و شوق سے پڑھا اور سنا، اور سامعین میں ولولہ پیدا ہونے لگا، تو ان ہی دنوں میرے والد مرض الموت میں بیمار ہوئے۔ میں ان کے دیکھنے کو لاہور سے آیا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ والد بزرگوار! آپ سے جو میں نے اسلام کی خدمت کا عہد کیا تھا، وہ پورا کیا یا نہیں؟ باپ نے بستر مرگ پر شہادت دی کہ جان من! تم نے میری محنت کا معاوضہ ادا کر دیا۔

والد کا انتقال

پدر و مرشد اقبال ازیں عالم رفت
ما ہمہ راہرواں، منزل ما ملک ابد
ہاتف از حضرت حق خواست چو تاریخ رحیل
آمد آواز ”اثر رحمت“ و ”آغوش لحد“
۱۳۴۹ھ ۱۳۴۹ھ

والدہ مرحومہ

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا
دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی
زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

لوح مزار پر سید اکبر الہ آبادی کا کہا ہوا قطعہ ذیل ثبت کرایا ؎

مادر مخدومہ اقبال رفت
سوئے جنت زیں جہان بے ثبات
گفت اکبر با دل پُر درد و غم
”رحلت مخدومہ“ تاریخ وفات
۱۳۳۳ھ

میرا بھائی

وہ میرا یوسف ثانی وہ شمع محفل عشق
ہوئی ہے جس کی اخوت قرار جاں مجھ کو
جلا کے جس کی محبت نے دفتر من و تو
ہوائے عیش میں پالا، کیا جواں مجھ کو

ریاضِ دہر میں مانندِ گل رہے خنداں
کہ ہے عزیز تر از جاں وہ جانِ جاں مجھکو

(۱۹۰۷ء میں) میرے بڑے بھائی جان (شیخ عطا محمد) پر جو بلوچستان کی سرحد پر سب ڈویژنل آفیسر ملٹری ورکس تھے ان کے مخالفین نے ایک خوفناک فوجداری مقدمہ بنا دیا ہے

ہوا اگر یوسف مرا زحمت کشِ چاہِ الم
چین آئے مصر آزادی میں پھر کیونکر مجھے

لیکن الحمدللہ کہ دشمنوں کے منہ میں خاک پڑی۔ بھائی صاحب بری ہوئے۔ اگرچہ روپیہ کثیر صرف ہوا، تاہم شکر ہے ہماری مصیبت کا خاتمہ ہوا۔ ہم باقی رہ گئے اور ہماری مصیبت دشمنوں کی تلاش میں پھر بلوچستان کی طرف عود کر گئی۔ بلوچستان ایجنسی والے تو ہمارے ساتھ ناانصافی کرنے پر آمادہ تھے مگر خدا بھلا کرے لارڈ کرزن کا کہ میرے لکھنے پر معاملہ دگرگوں ہو گیا۔ (۹ اگست ۱۹۰۷ء۔ اقبال نامہ ص ۱)

میں (اورنگ آباد) گیا اور عالمگیر علیہ الرحمۃ کے مزار پاک پر حاضر ہوا۔ میرے بڑے بھائی بھی ساتھ تھے۔ کہنے لگے میں قنات کے اندر نہ جاؤں گا کہ میری ڈاڑھی غیر مشروع ہے (۱۰ دسمبر ۱۹۱۲ء۔ اقبال نامہ حصہ دوم ص ۴۳)

میرے اُستاد

حضرت مولوی سید میر حسن صاحب پروفیسر عربی سکاچ مشن کالج سیالکوٹ..... بڑے بزرگ عالم اور شعر فہم ہیں۔ میں نے انہیں سے اکتسابِ فیض کیا ہے۔ (۲۹ اگست ۱۹۱۹ء اقبال نامہ حصہ دوم ص ۳۰۹)

وہ شمعِ بارگہِ خاندانِ مرتضوی
رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھکو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھکو

دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھکو

(۲۵ ستمبر ۱۹۲۹ء کو جب مولوی صاحب فوت ہوئے تو اقبال نے قرآن مجید کی اس آیت سے تاریخ نکال کر کتبہ ان کی قبر پر ثبت کرایا جو سیالکوٹ کی عیدگاہ کے پیچھے ایک قبرستان میں ہے) وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین

پروفیسر آرنلڈ کی یاد

ذرہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونے کو تھا
آئنہ ٹوٹا ہوا عالم نما ہونے کو تھا
نخل میری آرزوؤں کا ہرا ہونے کو تھا
آہ! کیا جانے کوئی میں کیا سے کیا ہونے کو تھا

ابرِ رحمت دامن از گلزارِ من برچید و رفت
اندکے بر غنچہ ہائے آرزو بارید و رفت

تو کہاں ہے اے کلیمِ ذروۂ سینائے علم
تھی تری موجِ نفس بادِ نشاط افزائے علم

اب کہاں وہ شوق رہ پیمائی صحرائے علم　　تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم
"شور لیلیٰ کو کہ باز آرائش سودا کند
خاک مجنوں را غبار خاطر صحرا کند"

تعلیمی سفر انگلستان (۱۹۰۵ء)

چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثل نکہت گل　　ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھ کو
چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے　　شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

ڈگریوں پہ ڈگریاں

جب میں ولایت گیا تو کچھ اپنا روپیہ میرے پاس موجود تھا لیکن زیادہ تر رقم میرے بھائی صاحب نے مہیا کر دی تھی۔ ولایت کے قیام کے دوران میں وقتاً فوقتاً مجھ کو روپے بھیجتے رہتے تھے۔ جب میں نے کیمبرج سے بی اے کر لیا تو انہوں نے لکھا کہ اب بیرسٹری کا کورس پورا کر کے واپس آجاؤ۔ لیکن میرا ارادہ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لینے کا تھا، اس لئے میں نے جواب دیا کہ کچھ رقم بھیجئے تاکہ جرمنی جاکر ڈاکٹری کی سند لے لوں۔ انہوں نے مجھ کو مطلوبہ رقم بھیج دی۔ انہی دنوں میں وہ ایک روز سیالکوٹ میں اپنے بے تکلف دوستوں کی صحبت میں بیٹھے تھے کہ کسی شخص نے پوچھا۔

"کیوں شیخ صاحب! سنا ہے اقبال نے ایک اور ڈگری لی ہے؟"

بھائی صاحب نے جواب دیا۔

"بھئی کیا بتلاؤں، ابھی تو وہ ڈگریوں پہ ڈگریاں لئے جارہا ہے۔ خدا جانے ان ڈگریوں کا انجام کب ہوگا؟"

(آثار اقبال۔ ص ۳۶)

ڈاکٹر آف فلاسفی

جرمنی کے متعلق میری معلومات اب (اگست ۱۹۳۲ء) کی پرانی ہو چکی ہیں۔ تیرہ برس گذرے ہیں میں اس ملک میں تھا، اس کے بعد اس ملک کو تاریخ عالم کی ایک عظیم ترین جنگ سے دوچار ہونا پڑا اور اس وقت وہ ملک دنیا کی معاشی تاریخ کے ایک عدیم المثال مالی بحران میں مبتلا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جرمنی کی درس گاہوں میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ میں تو صرف اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنا مقالہ (ایران میں فلسفہ الٰہیات کا ارتقاء) میونک یونیورسٹی میں پیش کیا تھا جس کے ارباب اختیار نے مجھے یونیورسٹی میں قیام کی شرط سے مستثنےٰ کر دیا اور مجھے اپنا مقالہ انگریزی میں لکھنے کی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔ جرمن یونیورسٹیاں بالعموم تین سال یا ڈیڑھ سال کے لئے لیکچروں میں حاضری پہ اصرار کرتی ہیں۔ حاضری کی مدت کا تعین امیدوار کی اہلیت پر ہوتا ہے اور عام طور پر مقالہ جرمنی زبان میں مرتب کرنے پر اصرار کیا جاتا ہے۔ مجھے اپنے کیمبرج کے استادوں کی سفارش کی بنا پر اس سے مستثنےٰ قرار دیا گیا۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کا امتحان زبانی جرمن زبان میں ہوا جو میں نے دوران قیام تھوڑی بہت سیکھ لی تھی۔

(اقبال نامہ۔ جلد اول۔ ص ۲۲۹ - ۲۲۸)

ذبیحہ کا خاص انتظام

میں نے ڈاکٹر آرنلڈ صاحب سے یہ خواہش ظاہر کی کہ میرے قیام کا انتظام کسی ایسے گھر میں کر دیا جائے جہاں ذبیحہ کا خاص انتظام ہو۔ یورپ میں صرف یہودی اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ وہ ذبیحہ کھائیں۔ چنانچہ ایک اچھے یہودی گھر میں میری رہائش کا انتظام کر دیا گیا۔ ان لوگوں میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ اپنی نماز باقاعدہ پڑھتے تھے۔ جب میں گھر میں ہوتا تھا تو میں بھی شریک ہو جاتا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ مسلم ہونے کی وجہ سے حضرت موسیٰ میرے لیے بھی پیغمبر ہیں اور میں ان کی روش پر چل سکتا ہوں۔ وغیرہ وغیرہ لیکن کچھ عرصے کے بعد میرا دل ان لوگوں کی طرف سے کھٹا ہو گیا۔ یہ لوگ ہر اس چیز میں جس کی مجھے ضرورت ہوتی تھی اور جس کو میں ان کے ذریعے منگاتا تھا، دکانداروں سے کمیشن لیا کرتے تھے۔ ان کی اس عادت نے ان کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیا۔

اسلامی طہارت

قیام انگلستان میں میرا لوٹا میرے ساتھ ہوتا تھا۔ چند روز اسی طرح گزرے۔ آخر میری میزبان یعنی مالکہ مکان (لینڈ لیڈی) سے نہ رہا گیا۔ (یہ خاتون پچاس سال کے لگ بھگ تھی اور میرے ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آتی تھی) مجھ سے پوچھنے لگی یہ چیز تم غسل خانے میں کیوں لے جاتے ہو؟ میں نے کہا کہ اسلامی طہارت کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ قضائے حاجت کے بعد صرف کاغذ یا مٹی کے ڈھیلے کا استعمال کافی نہیں بلکہ پانی سے استنجا کرنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ اس پر گفتگو شروع ہوئی۔ میں نے ان کے سامنے طہارت اور غسل کے اسلامی اصول بیان کیے۔ مثلاً غسل جنابت مسلمان مرد اور عورت پر اسی طرح فرض ہے جس طرح عورت پر طہر کا غسل۔ پھر میں نے کہا۔ بڑی بی! کسی خاص غسل کی آپ کو حاجت نہ ہوگی البتہ طہارت کا پانی ضرور استعمال کیا کیجیے۔ یہ باتیں سن کر بڑی بی بہت خوش ہوئی اور فرمانے لگی کہ میں ضرور ایسا کروں گی۔ مسلمانوں کے یہ قواعد نہایت پاکیزہ ہیں۔

بے داغ جوانی

میں نے یورپ کی آب و ہوا اور تہذیب و تمدن کا مطلق اثر قبول نہیں کیا ؎

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی

بندۂ روسیاہ کبھی کبھی تہجد کے لیے اٹھتا ہے اور بعض دفعہ تمام رات بیداری میں گزر جاتی ہے ..... اس وقت عبادت الٰہی میں لذت حاصل ہوتی ہے ؎

"نماز بے حضور از من نیاید"

شیطان کے پیغمبر

کیمبرج کے زمانہ میں چند معاصروں سے مذہب پر بحث چھڑ گئی۔ ایک صاحب پوچھنے لگے۔ مسٹر اقبال! یہ کیا بات ہے کہ جتنے بھی پیغمبر اور بانیان مذہب دنیا میں آئے وہ بلا استثنا ایشیا میں مبعوث ہوئے۔ یورپ میں ایک بھی پیدا نہیں ہوا۔ میں نے جواب دیا۔ بھئی شروع شروع میں اللہ میاں اور شیطان نے اپنا اپنا بخرا بانٹ لیا۔ اللہ میاں

نے ایشیا کو پسند کیا اور شیطان نے یورپ کو۔ اس لیے پیغمبر جو اللہ میاں کی طرف سے آئے ہیں، ایشیا میں مبعوث ہوئے۔ وہ صاحب بول اٹھے۔ تو پھر شیطان کے پیغمبر کیا ہوئے؟ میں نے جواب دیا: "یہ تمہارے میکیاولی اور مشہور اہلِ سیاست اس کے رسول ہیں۔" اس پر بحث ختم ہوا۔ (آثارِ اقبال ص ۵۹ ۔ ۶۰۔ اقبال کامل ص ۹۲۔ اقبال کے جواہر ریزے ص ۱۳۔۱۴)

تقریروں کا مشغلہ

انگلستان میں میں نے اسلامی مذہب و تمدن پر لیکچروں کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ ایک لیکچر ہو چکا ہے۔ دوسرا اسلامی تصوف پر فروری (۱۹۰۸ء) کے تیسرے ہفتہ میں ہوگا۔ باقی لیکچروں کے عنوان یہ ہوں گے، "مسلمانوں کا اثر تہذیبِ یورپ پر" - "اسلامی جمہوریت" - "اسلام اور عقلِ انسانی" وغیرہ۔ (۱۰؍ فروری ۱۹۰۸ء اقبال نامہ حصہ دوم ص ۳۵۸)

انگلستان میں طالبِ علمی کے زمانے میں میں بھی تقریروں کے مشغلہ میں کچھ عرصہ کے لیے منہمک رہا۔ لیکن بعد میں میں نے اسے بالکل ترک کر دیا ——— (انبیاء اور مصلحین اقوام کو چھوڑ کر جو لوگ بے ضرورت اٹھتے بیٹھتے تقریریں کرتے رہتے ہیں، ان میں روحانیت کا فقدان ہوتا ہے۔

ذاتی امتیازات

۱۵؍ اپریل ۱۹۱۰ء (کو اخبار) مخبرِ دکن سے معلوم ہوا کہ حیدر آباد ہائی کورٹ کی ججی کے لیے چند نام حضور نظام خلد اللہ ملکہ، کے سامنے پیش کیے گئے ہیں جن میں ایک نام خاکسار کا بھی ہے۔ اس خیال سے کہ میرا نام اور ناموں کے ساتھ پیش ہوا ہے اور یہ ایک قسم کا مقابلہ ہے چند امور آپ کے گوش گزار کرنا ضروری ہے ———

اس جگہ کے لیے فلسفہ دانی کی چنداں ضرورت نہیں۔ تاہم یہ کہنا ضروری ہے کہ اس فن میں، میں نے ہندوستان اور یورپ کے اعلیٰ ترین امتحان انگلستان (کیمبرج) جرمنی (میونک) یونیورسٹیوں کے پاس کیے ہیں۔ انگلستان سے واپس آنے پر لاہور گورنمنٹ کالج میں مجھے فلسفے کا اعلیٰ پروفیسر مقرر کیا گیا تھا۔ یہ کام میں نے ۱۸ ماہ تک کیا۔ اور یہاں اعلیٰ ترین جماعتوں کو اس فن کی تعلیم دی۔ گورنمنٹ نے بعد ازاں یہ جگہ مجھے آفر بھی کی مگر میں نے انکار کر دیا، میری ضرورت گورنمنٹ کو کس قدر تھی؛ اس کا اندازہ اس سے ہو جائے گا کہ پروفیسری کے تقرر کی وجہ سے میں ہیچ کچہری نہ جا سکتا تھا۔ جہاں ہائی کورٹ کو گورنمنٹ کی طرف سے ہدایت کی گئی کہ میرے تمام مقدمات دن کے پچھلے حصے میں پیش ہوا کریں۔ چنانچہ ۱۸ ماہ تک اسی پر عملدرآمد ہوتا رہا۔ مگر اس عہدے کے لیے جو حیدر آباد میں خالی ہوا ہے غالباً عربی دانی کی زیادہ ضرورت ہوگی۔ اس کے متعلق یہ امر سرکار کے گوش گزار کرتا ہے کہ عربی زبان کے امتحانات میں میں پنجاب میں اوّل رہا ہوں۔ انگلستان میں مجھ کو عارضی طور پر چھ ماہ کے لیے لندن یونیورسٹی کا عربی کا پروفیسر مقرر کیا گیا تھا۔ واپسی پر پنجاب اور الٰہ آباد کی یونیورسٹیوں میں عربی اور فلسفہ میں بی اے اور ایم اے کا ممتحن مقرر کیا گیا اور اب بھی ہوں۔ امسال الٰہ آباد یونیورسٹی کے ایم اے کے دو پرچے میرے پاس تھے۔ پنجاب میں بی اے کی فارسی کا ایک پرچہ اور ایم اے فلسفے کے دو پرچے میرے پاس ہیں۔ علاوہ ان مضامین کے میں نے پنجاب گورنمنٹ کالج میں علم اقتصادیات، تاریخ اور انگریزی بی اے اور ایم اے کی جماعتوں کو پڑھائی ہے اور حکام بالادست سے تحسین حاصل کی ہے۔

تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی ایک عرصے سے جاری ہے۔ علم الاقتصاد پر اردو میں سب سے پہلے مستند کتاب میں نے لکھی

انگریزی میں چھوٹی چھوٹی تصانیف کے علاوہ ایک مفصل رسالہ فلسفۂ ایران پر بھی لکھا ہے جو انگلستان میں شائع ہوا تھا۔ میرے پاس اس وقت یہ کتاب موجود نہیں۔ ورنہ ایصال خدمت کرتا۔

..... فقہ اسلام میں اس وقت ایک مفصل کتاب بزبان انگریزی زیر تصنیف ہے، جس کے لیے میں نے مصر و شام و عرب سے مسالہ جمع کیا ہے جو انشاء اللہ بشرط زندگی شائع ہوگی اور مجھے یقین ہے کہ اپنے فن میں ایک بے نظیر کتاب ہوگی۔ میرا ارادہ ہے کہ اس کتاب کو تفصیلِ مسائل کے اعتبار سے ایسا بناؤں جیسی کہ امام سرخسی کی مبسوط ہے جو ساٹھ جلدوں میں ہے۔ (شاد اقبال)

انجمن میں تنہا

لاہور ایک بڑا شہر ہے لیکن میں اس ہجوم میں تنہا ہوں۔ ایک فرد واحد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے ؎

طعنہ زن ہے ضبط اور لذت بڑی افشا میں ہے
ہے کوئی مشکل سی مشکل راز داں کے واسطے

لارڈ بیکن کہتے ہیں ”جتنا بڑا شہر ہو اتنی ہی بڑی تنہائی ہوتی ہے۔“ سو یہی حال میرا لاہور میں ہے۔ اس کے علاوہ گذشتہ ماہ بعض معاملات کی وجہ سے سخت پریشانی رہی اور مجھے بعض کام اپنی فطرت اور طبیعت کے خلاف کرنے پڑے اور ان کاموں میں طبع سلیم میرے لیے شکنجے کا کام دے گئی۔ کیا خوب کہہ گیا ہے عرفی ؎

دستم ز مدعی بہ قبول غلط و لے
در تابم از شکنجۂ طبع سلیم خویش (اقبال نامہ جلد ۲، ص ۳۵)

لاہور میں ضروریاتِ اسلامی سے ایک متنفس بھی آگاہ نہیں۔ یہاں انجمن اور کالج اور ڈاکٹر صاحب کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ پنجاب میں علما کا پیدا ہونا بند ہو گیا اور اگر خدا تعالیٰ نے کوئی خاص مدد نہ کی تو آئندہ بیس سال نہایت خطرناک نظر آتے ہیں۔ صوفیا کی دکانیں ہیں مگر وہاں سیرتِ اسلامی کی متاع نہیں بکتی۔

کئی صدیوں سے علماء اور صوفیا میں طاقت کے لیے جنگ رہی، جس میں آخر کار صوفیا غالب آ گئے۔ یہاں تک کہ اب برائے نام علماء جو باقی ہیں وہ بھی جب تک کسی خانوادے میں بیعت نہ لیتے ہوں ہر دلعزیز نہیں ہو سکتے۔ یہ روش گویا علماء کی طرف سے اپنی شکست کا اعتراف ہے۔ مجدد الف ثانی، عالمگیر اور مولانا اسمٰعیل شہید رحمتہ اللہ علیہم نے اسلامی سیرت کے احیاء کی کوشش کی مگر صوفیا کی کثرت اور صدیوں کی جمع شدہ قوت نے اس گروہ احرار کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ اب اسلامی جماعت کا محض خدا پر بھروسہ ہے۔ میں بھلا کیا کر سکتا ہوں۔ صرف ایک بے چینی اور مضطرب جان رکھتا ہوں۔ قوتِ عمل مفقود ہے۔ ہاں یہ آرزو رہتی ہے کہ کوئی قابل نوجوان جو ذوقِ خداداد کے ساتھ قوتِ عمل بھی رکھتا ہو مل جائے جس کے دل میں اپنا اضطراب منتقل کر دوں۔ (اقبال نامہ جلد ۲، ص ۴۹)

...... میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کو ابھی تک اس کا احساس نہیں کہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس ملک ہندوستان میں کیا ہو رہا ہے۔ اگر وقت پر موجودہ حالات کی اصلاح کی طرف توجہ نہ کی گئی تو مسلمانوں اور اسلام کا مستقبل اس ملک میں کیا ہو جائے گا۔ ہم تو اپنا زمانہ حقیقت میں ختم کر چکے۔ آیندہ نسلوں کی فکر کرنا ہمارا فرض ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی زندگی گونڈ اور بھیل اقوام کی طرح ہو جائے۔ اگر

ان مقاصد کی تکمیل کے لئے مجھے اپنے کام چھوڑنے پڑیں تو انشاءاللہ چھوڑ دوں گا اور اپنی زندگی کے باقی ایام اسی ایک مقصد جلیل کے لئے وقف کر دوں گا۔ . . . ہم لوگ قیامت کے روز خدا اور رسولؐ کے سامنے جوابدہ ہوں گے۔ (اقبال نامہ جلد دوم ص ۲۰۳)

میں شعر کیونکر کہتا ہوں؟

ایک مرتبہ فارمن کرسچن کالج لاہور کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس نے مجھے بھی اس میں دعوت شرکت دی۔ اجلاس کا پروگرام ختم ہونے کے بعد چائے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ہم لوگ چائے پینے بیٹھے تو ڈاکٹر لوکس میرے پاس آئے اور کہنے لگے "چائے پی کے چلے نہ جانا، مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" ہم چائے پی چکے تو ڈاکٹر لوکس آئے اور مجھے اپنے ساتھ ایک گوشے میں لے گئے اور کہنے لگے، "اقبال! مجھے بتاؤ کہ تمہارے پیغمبرؐ پر قرآن کا مفہوم نازل ہوا تھا اور چونکہ انہیں صرف عربی زبان آتی تھی، انہوں نے قرآن کریم عربی میں منتقل کر دیا یا یہ عبارت بھی اسی طرح اتری تھی؟" میں نے کہا، "یہ عبارت ہی اتری تھی۔" ڈاکٹر لوکس نے حیران ہو کر کہا، "اقبال! تم جیسا پڑھا لکھا آدمی بھی اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ یہ عبارت ہی اسی طرح اتری ہے؟" میں نے کہا، "ڈاکٹر لوکس! یقین! میرا تجربہ ہے! مجھ پر شعر پورا اترتا ہے تو پیغمبرؐ پر عبارت کیوں نہیں اتری ہوگی؟"

جب شعر کہنے کی کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے تو سمجھو کہ ایک ماہی گیر نے مچھلیاں پکڑنے کے لئے جال ڈالا ہے۔ مچھلیاں اس کثرت سے جال کی طرف کھنچی چلی آ رہی ہیں کہ ماہی گیر پریشان ہو گیا ہے۔ سوچتا ہے کہ اتنی مچھلیوں میں سے کسے پکڑوں اور کسے چھوڑ دوں؟

یہ کیفیت تو مجھ پر سال میں زیادہ سے زیادہ دو بار طاری ہوتی ہے لیکن فیضان کا یہ عالم کئی کئی گھنٹے رہتا ہے اور میں بے تکلفی سے شعر کہتا جاتا ہوں۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ جب طویل عرصے کے بعد یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو پہلی کیفیت میں کہا گیا آخری شعر دوسری کیفیت کے پہلے شعر سے مربوط ہوتا ہے گویا اس کیفیت میں ایک قسم کا تسلسل بھی ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ یہ فیضان کے لمحے، دراصل ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو میں ایک قسم کی تکان، عصبی اضمحلال اور پژمردگی سی محسوس کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ چھ سات سال تک مجھ پر کیفیت طاری نہ ہوئی تو میں یہ سمجھا کہ خدا تعالیٰ نے مجھ سے یہ نعمت چھین لی ہے چنانچہ اس زمانے میں میں نے نثر لکھنے کی طرف توجہ کی۔ یک بیک ایک روز پھر یہی کیفیت طاری ہو گئی۔ ان لمحوں میں میری طبیعت ایک عجیب لذت محسوس کر رہی تھی۔ بس ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اشعار کا ایک بحر مواج ہے کہ امڈا چلا آتا ہے۔ یہ کیفیت سرور و نشاط اتنی دیر تک قائم رہی کہ اس نے چھ سات سال کے جمود و تعطل (قبض) کی تلافی کر دی۔

مشہور جرمن شاعر گوئٹے کے متعلق ایک کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ جب اس نے جرمن زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ پڑھا تو اپنے بعض دوستوں سے کہا کہ میں یہ کتاب پڑھتا ہوں تو میری روح میرے جسم میں کانپنے لگتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شاعر کو بھی ایک قسم کا الہام ہوتا ہے اس لئے جب وہ کوئی کتاب پڑھتا ہے تو اپنی روح کو اس کی معنویت سے ہم آہنگ پاتا ہے اور اس کی طبیعت ایک خاص اہتزاز محسوس کرتی ہے یہ چیز دوسروں کو نصیب نہیں ہو سکتی۔ (روزگار فقیر ص ۳۸-۴۰)

مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور
عطا ہوا ہے مجھے ذکر و فکر و جذب و سرور

میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فن شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات و روایات کی رُو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ ورنہ ؎

نہ بینی خیر ازاں مرد فرو دست کہ بر من تہمت شعر و سخن بست (زبور عجم)

(اقبال نامہ حصہ اول ص ۱۹۵-۱۹۶)

فارسی میں لکھنے کی وجہ

میں اول اپنے کلام کو خاص لوگوں کے اندر محدود رکھنا چاہتا تھا اور اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ پہلے یہ سمجھ دار لوگ میرے پیغام کو دیکھیں اور غور کر کے صحیح طور پر سمجھیں۔ پھر اس کو عوام تک پہنچائیں کیونکہ میرے خیال میں جب باریک باتیں عوام کے سامنے بلا کسی واسطہ کے پیش ہوتی ہیں تو کچھ لوگ سمجھتے ہیں اور کچھ نہیں سمجھتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کہنے والے کا مطلب کچھ کا کچھ مان لیا جاتا ہے۔[1]

اُردو کا مستقبل

جب میں پہلے پہل لکھنؤ گیا تو وہاں کے مشہور شاعر پیارے صاحب رشید زندہ تھے۔ لکھنؤ کے بعض شاعری سے دلچسپی رکھنے والے دوستوں نے میری آمد پر شعر و سخن کی ایک مجلس منعقد کی جس میں پیارے صاحب رشید بھی تشریف لائے۔ حاضرین سے نام بنام ملانے کے بعد میر مجلس نے فرمائش کی کہ میں اپنا کلام سناؤں۔ چنانچہ ان کے ارشاد کی تعمیل میں میں نے اپنی چند نظمیں سنائیں۔ میں وہ منظر اب تک نہیں بھولا کہ میں اپنا کلام سُنا رہا تھا اور میرے ہر ہر شعر پر پیارے صاحب رشید کے چہرے سے حیرت اور کوفت کے ملے جلے جذبات کا اظہار ہو رہا تھا۔ کبھی ان کی بھنویں تنتی تھیں اور ڈھیلی پڑ جاتی تھیں، کبھی آنکھیں ایکا ایکی کھلتی تھیں، اور ایکا ایکی بند ہو جاتی تھیں۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ جب میں کلام سُنا چکا تو اُن کے پاس بیٹھ کر میں نے ادب سے پوچھا کہ آپ کے سامنے شعر پڑھنا ہے تو گستاخی، لیکن جو کچھ میں نے عرض کیا، آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ اُنھوں نے قدرے تامل سے جواب دیا۔ ہاں صاحب سُنا ہے لیکن سچ پوچھئے تو ایسی اردو نہ ہم نے آج تک پڑھی ہے نہ سُنی ہے، حیران ہوں کہ یہ فارسی ہے یا اردو ہے یا کوئی اور زبان ہے۔ پھر کسی قدر تبسم کے ساتھ، اب دِلّی اور لکھنؤ کے وہ لوگ رخصت ہوتے جا رہے ہیں جن کے دم سے اردو شاعری کے ان دو مرکزوں کی خصوصیتیں قائم تھیں، اور چند سال کی بات ہے کہ لکھنؤ، دلّی، لاہور اور حیدرآباد دکن ایک سطح پر آ جائیں گے۔

زبان کو میں ایک بُت تصور نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے بلکہ اظہار مطالب کا ایک انسانی ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جب اس میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مُردہ ہو جاتی ہے۔ ہاں تراکیب کے وضع کرنے میں مذاق سلیم کو ہاتھ سے نہ دینا چاہئے۔ (۹ اگست [illegible]۔ اقبال نامہ حصہ اول ص ۵۶)

زبانیں اپنی اندرونی قوتوں سے نشو و نما پاتی ہیں اور نئے نئے خیالات و جذبات کے ادا کر سکنے پر ان کے بقا کا انحصار ہے۔ (۹ ستمبر [illegible]۔ اقبال نامہ حصہ دوم ص ۵۵)

---

[1] ۱۹۳۱ء میں جب گول میز کانفرنس کے موقع پر لندن میں رہنے والے ہندوستانی طالب علموں نے ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں ایک اجتماع کیا جس میں انھوں نے اپنے مداحین کو بتایا کہ انھوں نے اسرار خودی اور رموز بیخودی فارسی میں کیوں لکھیں۔

اگرچہ میں اردو زبان کی بحیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا، تاہم میری لسانی عصبیت، دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں۔ (۱۰ ستمبر ۱۹۳۶ء اقبال نامہ حصہ دوم ص ۱۰۰-۹۹)

نظریۂ ملیت

میں سماجی اتحاد کے لئے وطن کو ایک بنیاد سمجھتا تھا۔ اس لئے خاکِ وطن کا ہر ذرہ مجھے دیوتا دکھائی دیتا تھا۔ اُس وقت میرے خیالات مادیت کی طرف مائل تھے۔ سوائے وطن کے مجھے انسانوں میں اتحاد کے لئے کوئی دُوسرا ذریعہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اب میں انسانوں کو صرف ازلی اور ابدی روحانی بنیادوں پر متحد کرنا چاہتا ہوں اور جب بھی میں اسلام کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو میری مراد اس سے یہی روحانی نظام ہے۔ اسلام اور مسلم میرے لئے خاص اصطلاحات ہیں جن کو میرے خیالات سمجھنے کے لئے اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔ (رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۹۳۹)

حق گوئی

قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضے میں میری جان اور آبرو ہے اور قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی جس کی وجہ سے مجھے خدا پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں، دُنیا کی کوئی قوت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ انشاءاللہ۔ اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں لیکن اس کا دل مومن ہے۔ (اقبال نامہ جلد اوّل ص ۲۰۶-۲۰۷)

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق   نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش   میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش   خاشاک کے تودے کو کہے کوہِ دماوند
ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش   میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند
پُرسوز و نظرباز و نکوبین و کم آزار   آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند
ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکرخند

عقیدہ

میرا عقیدہ ہے کہ غلو فی الزہد اور مسئلہ وجود مسلمانوں میں زیادہ تر بدھ (ذہنیت) مذہب کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ خواجہ نقشبندی اور مجدد سرہند کی میرے دل میں بڑی عزت ہے مگر افسوس ہے کہ آج یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے۔ یہی حال سلسلہ قادریہ کا ہے جس میں میں خود بیعت رکھتا ہوں حالانکہ حضرت محی الدین (عبدالقادر گیلانیؒ) کا مقصود اسلامی تصوف کو عجمیت سے پاک کرنا تھا۔ (۱۳ نومبر ۱۹۱۷ء بنام سید سلیمان ندوی)

ملازمت سے گریز

میں نے کچھ دنوں پروفیسری کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ہندوستانی کالجوں کی پروفیسری میں علمی کام تو ہوتا نہیں، البتہ ملازمت کی ذلتیں ضرور سہنی پڑتی ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ طالب علموں کی حاضری کے متعلق گورنمنٹ کالج کے پرنسپل سے کچھ جھگڑا ہو گیا اور پرنسپل نے مجھ سے کچھ اس طرح گفتگو کی جیسے کوئی کلرک سے باتیں کرتا ہے۔ اس دن سے طبیعت ملازمت سے ایسی کھٹی ہوئی کہ جی میں ٹھان لی کہ جہاں تک ہو سکے گا ملازمت سے گریز کروں گا۔ (آثارِ اقبال ص ۲۲-۲۳)

میں علی گڑھ کالج کی پروفیسری بھی نامنظور کرنے سے ہدفِ ملامت ہو رہا ہوں مگر ــ

شادم ز عمرِ خویش کہ در عرصاتِ باغِ عشق
شاخے کہ رست سنگ نمی رسدش آشیاں کنند

(اقبال نامہ حصہ دوم ص ۲۵۹)

جھوٹی شہرت سے نفرت

میں سیدھی سادی دیانتدارانہ زندگی بسر کرتا ہوں۔ میرا دل اور میری زبان ایک دوسرے کے ساتھ کلیتاً ہمنوا ہیں۔ لوگ ریاکاروں سے عقیدت رکھتے ہیں اور اسی کا احترام کرتے ہیں۔ میں ریاکاری اور منافقت سے کوسوں دور بھاگتا ہوں۔ اگر ریاکاری اور منافقت ہی میرے لئے وجہ حصول عزت و شہرت ہو سکتی ہے تو خدا کرے میں اس دنیا سے ایسا بے تعلق اور بیگانہ ہو جاؤں کہ میرے لئے ایک بھی آنکھ اشکبار اور ایک بھی زبان نوحہ خواں نہ ہو۔ پبلک کے بت سے پیروں والے عفریت کو اپنے احترام کا تحفہ دوسروں کو دینے دیجئے جو مذہب اور اخلاق کے بارے میں جھوٹے مطمح نظر کی مطابقت میں عمل کرتے ہوئے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ میں ان کے رسوم و رواج کا احترام کرنے کی غرض سے جو انسانی دماغ کی فطری آزادی کو دباتے ہیں، اپنے آپ کو جھکا نہیں سکتا۔ بائرن، گوئٹے اور شیلے کا ان کے زمانہ کے لوگوں نے مطلق احترام نہیں کیا اور اگرچہ میں شاعرانہ اعتبار سے ان سے کہیں کم ہوں، تاہم فخریہ کہہ سکتا ہوں کہ اس بارے میں مجھے ان کی رفاقت حاصل ہے۔ (اقبال از عطیہ بیگم)

دنیوی نقطۂ نگاہ سے خطاب بھی ایک عزت ہے مگر ہر عزت فقط اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔

جینا وہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے

حصولِ جاہ و منصب

ہوس بھی ہو تو نہیں مجھ میں ہمتِ تگ و تاز
حصولِ جاہ ہے وابستۂ مذاقِ تلاش
ہزار شکر طبیعت ہے ریزہ کار مری
ہزار شکر نہیں ہے دماغ فتنہ تراش
مرے سخن سے دلوں کی ہیں کھیتیاں سرسبز
جہاں میں ہوں میں مثالِ سحاب دریا پاش
یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں
کہ فیضِ عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش
ہوائے بزمِ سلاطین دلیلِ مردہ دلی
کیا ہے حافظِ رنگیں نوا نے راز یہ فاش

"گرت ہواست کہ با خضر ہمنشیں باشی
نہاں ز چشمِ سکندر چو آبِ حیواں باشی"

استغناء

میں ایک فقیر آدمی ہوں مجھے جو کچھ اعلیٰ حضرت (نواب صاحب بھوپال) دیتے ہیں، میری ضروریات کے لئے کافی ہے۔ (رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۱۰۴۱)

اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال کی پنشن قبول کرنے کے بعد کسی اور طرف نگاہ کرنا آئین جوانمردی نہیں ہے۔

(اقبال نامہ ص ۳۶۸)

امارت، عزت، آبرو، جاہ و حشم عام ہے مگر دل ایک ایسی چیز ہے کہ ہر امیر کے پہلو میں نہیں ہوتا۔

اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم میرے لئے مقرر فرمائی ہے وہ میرے لئے کافی ہے۔ اور کافی نہ بھی ہو تو میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا روپیہ کا لالچ ہے جو کسی طرح بھی کسی مسلمان کے شایان شان نہیں ہے۔ (اقبال نامہ ص ۲۴۲)

میں خود تو یہاں تک احتیاط کرتا ہوں کہ جو لوگ کتاب کو پڑھ نہیں سکتے وہ اسے خرید بھی کریں۔ کیونکہ ان کو خریداری کی ترغیب دینا ایک قسم کی ناانصافی ہے۔ باقی رہا میں، تو میری طرح امت مرحوم میں سیکڑوں آدمی آگے گزر گئے ہیں جنہوں نے رکاوٹوں کے ہوتے ہوئے کام کیا ہے۔ مجھ سے جہاں تک ہو سکے گا انہیں کی تقلید کروں گا۔ (۱۵ جون ۳۷ء بنام خان نیاز الدین خاں)

کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی
کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

زندگی کی تگ و تاز

ہر شاعر، ادیب اور آرٹسٹ کا فن اس وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک وہ زندگی کی تگ و دو میں شریک ہے۔ جو لوگ دنیا کے ہنگامے سے کٹ کر گوشۂ عافیت اختیار کر لیتے یا بغیر مشقت کے آرام و راحت کی زندگی بسر کرنا شروع کر دیتے ہیں وہ اس الہام سے محروم ہو جاتے ہیں جو صرف زندگی کے اتار چڑھاؤ میں براہ راست شریک ہونے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ ایک آرٹسٹ کا نقطۂ نگاہ اور نصب العین عوام کے نقطۂ نگاہ اور نصب العین سے مختلف ہوتا ہے۔ اس ندرت و ذوقِ نظر کے باعث فرد اور سوسائٹی میں تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے اور بعض اوقات اس تصادم سے ایسی چنگاریاں پھوٹتی ہیں جن سے آرٹسٹ کا فن حیات تازہ حاصل کر لیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میرے اوقات کا بیشتر حصہ فکر معاش اور دنیوی کدورات میں ضائع ہو جاتا ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ اگر میں زندگی کی کشمکش سے علیحدہ ہو جاؤں تو میری شاعری بھی اس تڑپ سے محروم ہو جائے گی جس کا سب سے بڑا منبع خود زندگی ہے۔[1]

یوم اقبال فنڈ

سر سکندر حیات خاں نے انٹر کالجیئیٹ مسلم برادرہڈ کے نام جو پیغام دیا ہے اس میں انہوں نے میرے متعلق بہت سے بلند جذبات کا اظہار فرمایا ہے۔ میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔

سر سکندر حیات نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ جو لوگ میرے کلام سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ سب مل کر مجھے ایک تھیلی پیش کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں ہماری قوم کی ضروریات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کے سامنے ایک شخص کی ضرورتیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ ہر چند کہ اس شخص کی شاعری نے ہزاروں لاکھوں انسانوں کی روح کو جلا اور تازگی بخشی ہو۔ فرد اور اس کی احتیاج بہر حال ختم ہو جانے والی چیز ہے لیکن قوم اور اس کی احتیاج ہمیشہ باقی رہے گی۔

آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اسلامی علوم کی تحقیق کے لئے لاہور کے اسلامیہ کالج میں ایک چیئر قائم کی جائے جہاں جدید طریقوں کے مطابق ریسرچ ہونی چاہئے۔ اسلامی تاریخ، فقہ، دینیات اور تصوف سے جس قدر جہالت پنجاب میں برتی جا رہی ہے اور اس جہالت سے جس قدر فائدہ غرض مند لوگوں نے پنجاب میں اٹھایا ہے اس کی مثال ہندوستان بھر میں کہیں نہیں ملتی۔

اب وقت آ گیا ہے کہ اسلامی فکر اور اسلامی طرز حیات کا بغور مطالعہ کر کے ہم عوام کو بتائیں کہ اسلام کا اصل مقصد کیا تھا اور اس

---

[1] رسالہ ادبی دنیا اگست ۱۹۳۲ء ص ۱۲۔ اقبال کامل ص ۱۰۱

مقصد اور پیغام کو کس طرح نثر و نظم پردوں میں چھپا دیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ ہندوستان کے اندر موجودہ اسلام کی روح کو کیونکر مسخ کیا گیا ہے۔ ان پردوں کو اب اٹھانا چاہیے تاکہ نئی نسل کے نوجوان اسلام کی حقیقی شکل و صورت سے آگاہ ہو سکیں۔

مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ غیر مسلموں کے لئے بھی یہ ادارہ بے حد مفید ثابت ہوگا۔ کیونکہ اسلام ایک طرف ایشیا کے باشندوں کی زندگی میں ایک زبردست عنصر کی حیثیت سے کارفرما ہے تو دوسری طرف اس نے نوع انسانی کے ذہنی اور مذہبی انقلاب میں بڑا نمایاں حصہ لیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری اس تجویز کو پنجاب کے وزیر اعظم پسند فرمائیں گے اور اپنے اثر و رسوخ سے اسے کامیاب بنانے کی کوشش بھی کریں گے۔ تاہم میں ایک سو (۱۰۰) روپے کی حقیر رقم اس مجوزہ فنڈ کی نذر کرتا ہوں۔" (سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور مورخہ ۱۱ دسمبر ۱۹۳۶ء)

بیماری کا حال (۲۱ جون ۱۹۳۶ء)

دو سال سے اوپر ہو گئے۔ جنوری کے مہینے میں عید کی نماز پڑھ کر واپس آیا۔ سویاں دہی کے ساتھ کھاتے ہی زکام ہوا۔ بہتیرا علاج کیے پر زکام بند ہوا تو گلا بیٹھ گیا۔ یہ کیفیت دو سال سے جاری ہے۔ بلند آواز سے بول نہیں سکتا۔ اسی وجہ سے مجھے بالآخر بیرسٹری کا کام چھوڑنا پڑا۔ انگریزی اور یونانی اطبا دونوں کا علاج کیا مگر کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ مجھے کسی قدر دمہ کی شکایت ہو گئی۔ حکیم نابینا صاحب نے فرمایا کہ تمہاری بیماری ایک ہلکا سا دمہ ہے۔ کھانسی اس شدت سے آتی تھی کہ میں بے ہوش ہو جاتا تھا۔ اب یہ کیفیت نہیں ہے۔ صبح بلغم نکلتی ہے۔ علی ہذا القیاس کھانا کھانے کے بعد بھی سفید بلغم نکلتی ہے جس کے نکلنے سے آواز نسبتاً بہتر ہو جاتی ہے۔ انگریزی اطباء کی تشخیص یہ ہے کہ ایک رگ جسے aorta کہتے ہیں اور جو قلب کے قریب ہے ایک مقام سے پھیل گئی ہے۔ اس کا دباؤ ووکل کارڈ پر پڑتا ہے جس کے سبب سے بولنے میں دقت ہوتی ہے۔ علی ہذا القیاس ان کی تشخیص یہ بھی ہے کہ طویل بیماری سے قلب کی رگیں کمزور ہو گئی ہیں۔ اس واسطے عام کمزوری ہو گئی ہے اور مجھے کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس میں EXCITEMENT پیدا ہو۔ ذرا سی محنت کرنے سے دم پھول جاتا ہے یہاں تک کہ غسل کرنے میں اپنے ہاتھوں سے اپنا بدن بھی اگر ملوں تو دم چڑھ جاتا ہے۔ عام کمزوری بھی ہے۔ یہ مختصر کیفیت میری بیماری کی ہے۔

۳، اپریل (۱۹۳۶ء) کی رات ۳ بجے کے قریب (جب اس شب بھوپال میں تھا) میں نے سرسید علیہ الرحمۃ کو خواب میں دیکھا۔ پوچھتے ہیں تم کب سے بیمار ہو۔ میں نے عرض کیا دو سال سے اوپر مدت گزر گئی۔ فرمایا حضور رسالت مآب کی خدمت میں عرض کرو۔ میری آنکھ اسی وقت کھل گئی اور اس عرضداشت کے چند شعر جو اب طویل ہو گئی ہے میری زبان پر جاری ہو گئے۔ انشاء اللہ ایک مثنوی فارسی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" نام کے ساتھ یہ عرضداشت شائع ہو گی۔ ۴، اپریل کی صبح سے میری آواز میں کچھ تبدیلی شروع ہوئی۔ اب پہلے کی نسبت آواز صاف تر ہے اور اس میں وہ رنگ (Ring) عود کر رہا ہے جو انسانی آواز کا خاصہ ہے۔ گو اس ترقی کی رفتار بہت سست ہے۔ جسم میں بھی عام کمزوری ہے (اقبال نامہ جلد اول ص ۲۱۲-۲۱۴)۔ بینائی میں فرق آ گیا ہے۔ اختلاج بہت بڑھ گیا ہے۔ پرہیز کا بھی قائل نہیں۔ معلوم ہو رہا ہے کہ امتحان کا وقت آ گیا۔ تقرب نصیب ہو رہا ہے۔ ہم آغوشی بھی مل جائے گی۔ انشاء اللہ! (۲۰ مئی ۱۹۳۷ء) (اقبال نامہ جلد اول ص ۲۹۰)

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید نسیمے از حجاز آید کہ ناید ؟
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید ؟

آخری آرام گاہ

زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی

(مرتبہ، محمد عبداللہ قریشی)

میر تقی میر

میرے بزرگ

میرے آبا و اجداد ملک حجاز کو خیرباد کہہ کر طرح طرح کی مشکلیں اور مصیبتیں جھیلتے ہوئے ہندوستان میں پہلے پہل دکنی ساحلوں کی طرف آئے تھے اور وہاں سے یہ پورا قبیلہ احمد آباد (گجرات) میں آکر بس گیا۔ پھر ان میں سے کچھ تو مستقل طور پر وہیں رہ پڑے اور کچھ نے آگے بڑھ کر تلاشِ روزگار کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ میرے جدِ اعلیٰ دارالخلافہ اکبرآباد (آگرہ) آگئے لیکن آب و ہوا کی یہ اچانک تبدیلی انھیں راس نہ آئی اور بیمار پڑ گئے۔ اسی بیماری میں ان کا انتقال ہوا۔ انھوں نے اپنی یادگار صرف ایک لڑکا چھوڑا تھا، جو میرے دادا تھے۔

میرے دادا بہت دنوں تک روزگار کی جستجو میں سرگرداں رہے، پایانِ کار انھیں اکبرآباد کے نواح کی فوجداری کا عہدہ مل گیا۔ وہ سادہ زندگی گزارتے تھے۔ اُن کی عمر پچاس سال ہوگی، کہ بیمار پڑ گئے۔ کچھ دنوں دوا دارو کی، مگر پوری طرح صحت یاب نہ ہوئے تھے کہ گوالیار کا سفر پیش آیا۔ زیادہ چلنے پھرنے اور بھاگ دوڑ کرنے سے مرض کا دوبارہ حملہ ہوا اور وہ گوالیار ہی میں انتقال کر گئے۔ ان کے دو لڑکے تھے ——— بڑے کے دماغ میں خلل تھا، یہ جوانی ہی میں مر گئے، انھوں نے اپنی کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ چھوٹے میرے والد تھے۔ انھوں نے فقر و درویشی اختیار کی اور مروجہ علوم ظاہری کی تحصیل کے لیے، جن کے بغیر عالمِ معنی تک پہنچنا دشوار ہے، حضرت شاہ کلیم اللہ اکبرآبادی کی خدمت میں پہنچے، جو ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ حضرت کی خدمت میں رہ کر میرے والد نے ترک و تجرید اختیار کی اور کڑی ریاضت کے بعد اپنے پیر و مرشد کی رہنمائی سے درویشی کی اعلیٰ منزلوں تک پہنچ گئے۔

پس از خرابیِ بسیار دل بدست افتاد!

والد کی سیرت

وہ صالح اور نیک سیرت جوان تھے، دل میں عشق کی گرمی رکھتے تھے اور علی متقی کے خطاب سے مشہور ہوئے۔

کہتے ہیں کہ ایک دن انھوں نے اپنے پیر و مُرشد سے عرض کیا کہ میں نے آپ کی خدمت میں رہ کر اپنے عقاید جیسا کچھ دُرست کر لیے ہیں وہ آپ پر واضح ہی ہے لیکن حاکم شام کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا: "کسی دن بتائیں گے!"

مدّت کے بعد ایک صبح، منہ اندھیرے، محرم خاں خواجہ سرائے شاہجہانی کی مسجد میں تشریف لائے، میرے والد کے ملازم ان کے وضو کے لیے پانی لانے کو دوڑے، مگر والد خود اُٹھے، لوٹا لیا اور شاہ صاحب کو وضو کرانے لگے۔ اُس وقت شاہ صاحب نے فرمایا: "میاں علی متقی! تمام عمر اس کا نام میری زبان پر نہیں آیا اس کے لیے میں خدا کا شکر کس طرح ادا کروں۔" والد کہتے تھے، خدا کا شکر ہے کہ اس کے بعد میں نے بھی کبھی اس کا نام نہیں لیا۔

علی متقی روز و شب خدا کی یاد میں محو رہتے تھے۔ کبھی استغراق کی کیفیت کم ہوتی تو فرماتے "بیٹا عشق کرو، عشق ہی اس کارخانۂ ہستی کا چلانے والا ہے، اگر عشق نہ ہوتا تو نظام عالم قائم ہی نہ ہو سکتا۔ بغیر عشق کے زندگی وبال ہے۔ عشق میں جی جان کی بازی لگا دینا ہی کمال ہے۔ عشق ہی بناتا ہے عشق ہی جلا کر کندن کر دیتا ہے، جو کچھ ہے وہ عشق ہی کا ظہور ہے، آگ میں سوزش عشق سے ہے اور پانی میں روانی عشق سے ہے۔ خاک میں عشق کا قرار ہے اور ہوا میں اس کا اضطرار ہے۔ موت عشق کی مستی اور زندگی اس کی ہشیاری ہے۔ دن عشق کی بیداری اور رات اس کی نیند ہے۔ مسلمان عشق کا جمال اور کافر اس کا جلال ہے۔ نیکی عشق کا قُرب اور گناہ اس سے دُوری ہے۔ جنت عشق کا شوق اور دوزخ اس کا ذوق ہے۔ عشق کا مقام و مرتبہ بندگی سے، زہد و عرفان سے، سچائی اور خلوص سے، اشتیاق اور وجدان سے بھی بہت بلند و بالاتر ہے۔ کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں، کہ آسمانوں کی یہ گردش بھی عشق ہی کے باعث ہے یعنی وہ اپنے محبوب تک پہنچنے کی دُھن میں برابر سرگرداں ہیں ؎

بے عشق نباید بود بے عشق نباید زیست
پیغمبر کنعانی عشق پیرے دارد

وہ دن بھر الحاح و زاری کرتے، راتوں کو جاگتے، اُن کی جبینِ نیاز ہر وقت بارگاہِ الٰہی میں جھکی رہتی، ہمیشہ شرابِ شوق سے سرشار رہتے، ان کا دامن تمام آلائشوں سے پاک تھا۔ ان کا نورانی چہرہ عابدوں کی محفل کا رونق افزا تھا، وہ آفتاب تھے لیکن خلوت پسند اتنے کہ اپنے سائے سے بھی گریزاں، جب کبھی اپنے آپ میں آتے فرماتے: "بیٹا۔ دنیا ایک ہنگامے سے زیادہ نہیں اپنے دامن کو دنیاداری اور معصیت کی آلائش سے پاک صاف رکھو۔ اللہ کی محبت کو اپنا مشغلہ بناؤ اور عاقبت کی فکر سے غافل نہ رہو۔ جو صاحب نظر ہیں وہ دنیا کو ایک دھوکا سمجھتے ہیں۔ زندگی ایک وہم ہے اور وہم کی بنیادوں پر امیدوں کے محل بنانا پانی کو رسّی سے باندھنے کی سعی لاحاصل کے مترادف ہے۔ طول امل سے چمٹے رہنا چاندنی کو گزوں سے ناپنا ہے۔ اے عزیز جو کہ تمھیں دنیا سے سفر کرنا ہے، زادِ راہ کی فکر کرو تاکہ نقصان نہ اٹھاؤ۔ اس ذات کی طرف متوجہ رہو۔ کائنات کو جس کا آئینہ کہتے ہیں اور اپنی ذات کو اسے سونپ دو جسے دل میں تلاش کرتے ہیں۔ مقصود کا ملنا یقینی ہے بشرطیکہ ذوق طلب سچا ہو، اگرچہ ہر چیز میں اسی کا جلوہ ہے تاہم ہمیں اس کے اظہار میں شرط ادب ضروری ہے۔

خدا کا تعلق بندوں کے ساتھ وہی ہے جو روح کا جسم کے ساتھ ہے کہ تمہارا وجود بغیر اس کے نہیں اور اس کی نمود بغیر تمہارے نہیں۔ یہ کائنات ظہور میں آنے سے پہلے عین ذات تھی اور نمود ظہوری کے بعد وہی ذات عین کائنات ہے۔

مشکل حکایتیست کہ ہر ذرہ عین اوست
اما نمی تواں کہ اشارت بدو کنند

وہ درویش اور درویش پرست تھے۔ شکستہ دل اور شکستگی کے مشتاق۔ متواضع، بھری مجلس میں تنہا۔ وسیع مشرب، فقیر کامل اور منکسر مزاج ——— کبھی پیار سے مجھے گود میں لے لیتے تو میرا رنگ دیکھ کر فرماتے: "اے سرمایۂ جاں! یہ کیسی آگ ہے جو تیرے دل میں سُلگ رہی ہے؟ یہ کیسی جلن ہے جو تیری جان کے ساتھ ہے" اس پر میں ہنستا اور وہ روتے جاتے۔ افسوس کہ میں نے زندگی میں اُن کا مقام نہ پہچانا۔ وہ ایسے انسان تھے کہ اپنے حال میں گم تھے، کبھی کسی کے لیے بارِ خاطر نہ بنے۔

ایک دن اشراق کی نماز کے بعد میری طرف توجہ فرمائی۔ میں اس وقت کھیل کود میں محو تھا، دیکھ کر فرمایا: "بیٹا! زمانہ سخت تیز رفتار ہے کسی کو مہلت نہیں دیتا۔ اپنی تربیت سے غافل نہ رہو۔ اس راستے میں بڑے نشیب و فراز ہیں، دیکھ بھال کر، پھونک پھونک کر قدم رکھو۔

نشانِ پائے تو فردِ حسابِ زندگی است
قدم شمردہ دریں کہنہ خاکداں بردار

یہ بھی کوئی کھیل ہے جو کھیلتے ہو۔ کیا نازیبا کام کرتے ہو، اس سے لَو لگاؤ جس کے خرامِ ناز پر کائنات نچھاور ہو، جس کی ایک ایک ادا پر ہزار دل اور جانیں قربان ہوں۔ اس شاہدِ گل پر بلبل بن کر فدا ہو جو سدا بہار ہے۔ آسمان کسی کے لیے اپنی چال نہیں بدلتا، جو کرنا ہے جلد کرلو، زندگی کی مہلت غنیمت سمجھو اور اپنی حقیقت کی تلاش کرو۔

اُن کی متبرک صورت باطن کا آئینہ تھی، وہ اس عالمِ اجسام میں ایسے بزرگ تھے جنھوں نے عنانِ اختیار کبھی ہاتھوں سے نہیں جانے دی۔ اتنے پرہیزگار کہ کسی نامحرم نے کبھی ان کے ہاتھ پاؤں نہیں دیکھے۔ اگر آپ انھیں دیکھتے تو کہتے کہ کوئی فرشتہ آدمی کے روپ میں آگیا ہے اور ایسی خوبی سے انھوں نے بھی استقامت کا ثبوت کم ہی دیا ہے۔ اخلاقِ حمیدہ، اوصافِ ستودہ، طبعِ مشکل پسند اور دلِ دردمند رکھتے تھے۔ آنکھیں نم اور ہر وقت ایک کیفیت سی طاری رہتی تھی۔

لاہور کا سفر

کہتے ہیں کہ ایک دن پریشان حال گھر میں داخل ہوئے، بوڑھی ماما بیٹھی ہوئی تھی۔ اس سے کہا کہ آج مجھے بڑے زوروں کی بھوک لگی ہے، اگر تھوڑی سی روٹی مل جائے تو جان میں جان آجائے۔ ماما نے کہا کہ گھر میں تو کچھ ہے نہیں۔ انھوں نے پھر کہا کہ بھوک بے حد ہے۔ ناچار ماما اٹھی، بنئے کی دکان سے آٹا اور گھی لائی تاکہ روٹی پکائے۔ اس اثنا میں انھوں نے پھر شدتِ گرسنگی کا اظہار کیا۔ ماما جھنجھلا اٹھی اور ترخ کر بولی: "صاحب یہ فقیری ہے اس زمانہ میں یہ ناز نخرے نہیں چلتے۔" والد صاحب نے کہا،

"اچھا تو دل ہی سے روٹی پکا۔ میں ایک فقیر سے ملنے لاہور جا رہا ہوں۔ اس سے مل کے واپس آجاؤں گا۔" یہ کہا اور اپنا رومال اُٹھا کر، جو گریۂ نیم شبی سے تربتر ہو رہا تھا، چل پڑے۔ ماں پریشان حال ان کے پیچھے دوڑی اور دامن پکڑ لیا۔ ہر چند خوشامد کی مگر اُن پر کوئی اثر نہ ہوا۔ آخرکار ہار کر بیٹھ رہی اور آئینے پر پانی ڈال کر شگون دیکھنے لگی۔ والد صاحب جہاں منزل کرتے وہ کریم مطلق اپنی شانِ رزاقی سے کھانے پینے کا سامان مہیا کر دیتا۔ کچھ ہی دنوں میں لاہور پہنچ گئے اور اس مکار درویش سے ملے جو دریائے راوی کے کنارے ایک بارہ دری میں رہتا تھا اور دُنیا بھر کو گمراہ کر رہا تھا۔ لوگوں میں وہ "منفشاں فرود" کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے فارسی کے کچھ فقرے یاد کر رکھے تھے، نا سمجھ لوگ جو اس کی ریاکاری کو پرکھ نہیں سکتے تھے اس کے سامنے ناک سے لکیریں کھینچتے تھے۔ وہ کہنے لگا کہ میں تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دینِ مبارک کی تائید و ترویج کر رہا ہوں اور جاہل مجھے گمراہ اور دھوکے باز سمجھتے ہیں۔ میرے والد کو یہ سُن کر غصہ آگیا اور فرمایا: "او کمینے ہمارے پیغمبر کا دین تجھ ایسوں کی تائید کا محتاج نہیں۔ ذرا سوچ کر بات کر، میرے اور تیرے درمیان تلوار رکھی ہے، ایسا نہ ہو کہ مارا جائے۔"

غرض کہ یہ پہلی ہی ملاقات بے مزہ ہو گئی۔ میرے والد بڑے ترش رُو ہو کر اُٹھے اور جا کے ایک فقیر کے تکیے میں رات بسر کی۔ جب صبح ہوئی، وہ ریاکار معذرت خواہی کے لیے آیا۔ میرے والد نے فرمایا کہ تیرا معافی مانگنا بے فائدہ ہے۔ کل کیا کھری کھری سنائی تھیں جو آج سناؤں گا، جب تیری روسیاہی کا پردہ چاک ہو گیا تو اب معذرت کیسی! جا کہیں اور اپنا منہ کالا کر، ایسا نہ ہو کہ ہر جگہ بدنام و رسوا ہو جائے۔ اس پر وہ شرم سے پانی پانی ہو گیا، مگر بڑی حد تک اس کی اصلاح بھی ہو گئی۔ یوں یہ صحبت بے مزہ ختم ہوئی۔

لاہور سے واپسی

یکایک والد صاحب کو لاہور سے واپسی کا خیال پیدا ہوا۔ اگرچہ کچھ زادِ راہ پاس نہیں تھا، تاہم محض اللہ کے بھروسے پر چل پڑے اور دس بارہ دن کی مسافت طے کر کے دہلی پہنچ گئے۔ یہاں شیخ عبدالعزیز عزت کے بیٹے قمر الدین خان کے مکان پر قیام کیا جو صوبے کے دیوان تھے اور جن سے کچھ قرابت کا تعلق بھی تھا۔ شہر کے لوگ جوق در جوق اُن سے نیاز حاصل کرنے کے لیے آئے اور بڑی تعظیم و تکریم کی۔ بہتوں نے اس درویش خدا مست کے ہاتھوں پر بیعت ارادت بھی کی۔ ان کی نگاہ کے اثر سے بہت لوگ فیض یاب ہوئے۔ اُن کے وضو کا پانی بطور تبرک لے جاتے اور مریضوں کو پلاتے، اللہ کے فضل سے بیمار صحت یاب بھی ہو جاتے۔

وہ اتنا روتے تھے کہ ہچکی بندھ جاتی۔ جو آہ اُن کے دل سے نکلتی، آسمانوں کا جگر چیر جاتی۔ شہر بھر میں غلغلہ مچ گیا کہ ایک درویش کامل یہاں آیا ہوا ہے۔ امراء نے بھی ملاقات کی آرزو ظاہر کی مگر انھوں نے قبول نہ کیا اور فرمایا کہ "میں فقیر ہوں، آپ امیر، میرا آپ کا کیا تعلق؟" امیر الامراء صمصام الدولہ نے سابقہ تعلقات کا واسطہ دے کر التجا کی کہ مجھے دولتِ دیدار سے محروم نہ فرمائیے، اجازت دیجیے کہ یہ رُوسیاہ حاضر ہو کر قدم بوس ہو۔ والد صاحب نے تبسم کیا اور کہا: "ملاقات کے لیے مناسبت

ضروری ہے۔ امید ہے کہ آپ مجھے معذور سمجھ کر میرے حال پر چھوڑ دیں گے۔" جب کثرت خلائق سے تنگ آ گئے تو ایک رات کو وسط شب میں اُٹھے اور تہجد کی نماز پڑھ کر شہر سے نکل گئے۔ لوگوں نے بہتیری تلاش کی مگر ان کی گردِ پا بھی نہ پا سکے ..... وہ تین دن میں اکبرآباد (آگرہ) سے تین منزل اس طرف، بیانہ میں وارد ہوئے جو سادات اور شرفا کی قدیم بستی ہے اور یہاں ایک مسجد میں قیام فرمایا۔

سید امان اللہ

بیانہ میں ایک نوجوان سید زادہ نہایت حسین اور خوشرو نظر سے گزرا۔ آپ نے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور جذب کامل سے کھینچ بلایا۔ اس پری وش کی حالت ایسی بدلی کہ دیوانہ وار بے ہوش ہو کر آپ کے قدموں میں گر پڑا۔ اس کے عزیز سمجھ گئے کہ لڑکے کی حالت درویش کی نظر کے اثر سے دگرگوں ہو گئی ہے۔ ان سے التجا کی کہ اس نوجوان کی حالت پر رحم فرمائیے۔ آپ نے تھوڑا سا پانی منگوایا اور کچھ دعا پڑھ کر اس پر دم کیا۔ جیسے ہی پانی حلق سے نیچے اُترا وہ لڑکا ہوش میں آ گیا اور نہایت ادب سے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا اور عرض کی: "اگر آپ کچھ دن میرے مہمان رہیں تو عین بندہ نوازی ہو گی ورنہ یہ تو میں جانتا ہوں کہ جس عالم میں آپ ہیں وہاں ناز کا گزر ہی نہیں، بے نیازی ہی بے نیازی ہے۔" والد صاحب نے فرمایا کہ دوستی کی راہ سے دعوت قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن میں پا برکاب ہوں، کل یہاں سے روانگی کا عزم ہے۔" حاضرین نے کہا: "ہم آپ کی مرضی کے تابع اصرار کرنا بے ادبی ہو گی، لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر آپ اس لڑکے کے گھر تشریف لے چلیں اور کچھ تناول فرمائیں تو آپ کی عنایت سے بعید نہ ہو گا۔"

چونکہ شہر کے عمائد و اکابر کی درخواست کا پاس تھا، فرمایا: "اچھا منظور ہے۔ لیکن فقیر کا دل کبھی شاد رہتا ہے کبھی ملول۔ کوئی ہمارے حال سے تعرض نہ کرے۔" لوگوں نے کہا: "ہماری کیا مجال ہے اور کسے یہ گوارا ہو گا کہ حضور کے خلافِ مزاج کوئی بات ظہور میں آئے اور یہ سعادت شقاوت میں بدل جائے۔" غرض والد صاحب ان لوگوں کے ساتھ اس لڑکے کے گھر تشریف لے گئے اور وہاں کچھ کھانا بھی تناول فرمایا۔

شادی کی مذمت

اتفاق سے اسی رات کو اس لڑکے کی شادی تھی۔ تھوڑی رات گئے وہ دولہا کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ: "حضور بھی قدم رنجہ فرما کر محفل شادی کی رونق افزائی کریں تو ہمارے لیے فخر کا مقام ہو گا۔" فرمایا: "مبارک ہو، مگر افسوس کہ شادی خدا پرستی کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے ..... آدمی اس معاملے میں مجبور ہے۔ میں بھی ابتدائے جوانی میں شراب عیش سے سرشار تھا۔ آخر کار سوائے خمار کے جو تکلیف دہ ہے اور کچھ نہ حاصل ہوا۔ جب خدائے بزرگ نے مجھے اس گرفتاری سے نجات دی تو پھر میں نے اپنے تئیں مضبوط و مستحکم بنایا اور شمع وار ایک پاؤں پر جلنے لگا۔ اب تو ایک راکھ کے ڈھیر سے زیادہ نہیں

ہوں، دل ہی نہیں رہا کہ ہوس پیدا ہو، نہ وہ دماغ کہ لہو و لعب کی طرف مائل ہو۔ جشنِ شادی کی ان مشغلوں سے جو تمھارے ساتھ ہیں خیال ہوتا ہے کہ تم کیسے غزالِ رعنا ہو۔ حیرت ہے کہ رم نہیں کرتے اور اس جال سے نکل نہیں جاتے۔ اگر عقلِ سلیم ہے تو اس نکتے کو سمجھو کہ اللہ بس باقی ہوس۔"

مختصر یہ کہ وہ لڑکا دلہن کے گھر گیا، اور یہ درویش بے نیاز اس شہر سے چلے آئے۔ ڈیڑھ دن کا راستہ طے کر کے اکبرآباد پہنچے اور اطمینان سے اپنے گھر میں قیام کیا۔ جب اس حسین نوجوان کو معلوم ہوا کہ درویش شہر چھوڑ کر جا چکے ہیں تو بیوی کو مکان پر چھوڑا، خورد پانی تک نہیں پیا اور اسی وقت گرتا پڑتا، آنسو بہاتا، ان کی تلاش میں جنگل کی طرف چل دیا۔ جو کوئی راستے میں ملتا اس سے درویش کا پتہ نشان پوچھتا، کبھی ادھر دوڑتا کبھی ادھر۔ مگر کوئی راہبر ان کا پتہ بتانے والا نہ ملا۔ مایوس ہو کر اس نے ایک آہِ جگرخراش بلند کی اور کہا "اے میرے خضر میں نادان پریشان و سرگرداں ہوں، آیئے اور میری رہنمائی فرمایئے۔ اگر اس مصیبت میں میری دستگیری فرمائیں تو میں سمجھوں کہ مجھے بڑا خزانہ مل گیا۔ وہ دامن جسے میں پھولوں سے بھرا کرتا تھا آج چاک چاک ہے، جو سر کبھی تکیۂ ناز پر رکھا ہوا تھا اب اسی پر خاک پڑی ہے، میرے اوپر رحم کیجیے کہ اب تو پاؤں بھی چلنے سے رہ گئے ہیں۔ کرم کیجیے کہ سوائے آوارگی کے اب اس ویرانے میں میرا کوئی ساتھی نہیں رہا۔ آپ خورشید ہیں اپنے اس حقیر ذرے پر بھی روشنی ڈالیے۔ آخر یہ کیا ہوا کہ آسودگی نے مجھ سے منہ موڑ لیا اور کیا ہوا کہ آوارگی اور سراسیمگی مجھ پر سوار ہے۔" کبھی کہتا: "بگولے کی طرح وحشت آمادہ ہوں، شاید آپ نے مجھے فراموش کر دیا ہے۔ ہر چند مجھے اپنی نارسائی کا یقین ہے، لیکن محض آپ کے کرم کی آس لگائے دشت و کہسار میں آوارہ پھر رہا ہوں، وہ رخسار جو گلِ تر سے مشابہ تھے دھوپ کی تمازت سے تونس گئے۔ اور آنکھیں جن سے ہرن شرماتے تھے اب سفید ہو گئی ہیں۔ آپ آفتاب ہیں اور میں سایۂ اُفتادہ۔ آپ سوار ہیں اور میں پیادہ۔ جس طرف سے بھی غبار اٹھتا ہے تو مجھے آپ کی آمد کا گمان ہوتا ہے، لیکن جب آپ نظر نہیں آتے تو رو رو کر اپنا گلا پھاڑتا ہوں۔ آپ تو تمام اعجاز کو محیط یعنی کامل ہیں پھر ہم غافلوں کے حال سے کیوں غافل ہیں؟" نوجوان اسی طرح روتا دھوتا چلا جاتا تھا، کبھی کھڑا ہو جاتا کبھی چلنے لگتا کہ اچانک ایک بزرگ نمودار ہوئے اور انھوں نے بڑے لطف اور نرمی سے فرمایا: "اے نوجوان کسے ڈھونڈتا ہے اور یہ کیا ہے جو تو کہہ رہا ہے؟ جا بے چینی اور اضطراب چھوڑ دے، حق تعالیٰ اکبرآباد میں ملیں گے۔" یہ مژدہ سن کر اس کے دلِ بے قرار کو قرار آیا۔ وہ دلجمعی سے چلنے لگا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ آدھی رات کے قریب شہر (اکبرآباد) میں داخل ہوا، راستے میں تلاش کرتا نام و نشان پوچھتا آیا اور والد صاحب کے قدموں میں گر پڑا۔ مارے خوشی کے رخساروں پر آنسو ڈھلک آئے۔ ناکامی کا سارا رنج کلفتِ حصولِ مراد سے، جو اس کے واہمہ و خیال میں بھی نہیں تھی، دُور ہوئی۔ والد صاحب نے اس کے حسن و جمال کی طرف ایک نظر کی اور اسی پاک نظر سے اُسے کامل بنا دیا۔ اتنی محبت سے پیش آئے کہ تحریر میں نہیں سما سکتی اور اس سے ایسی دلداری کی باتیں کیں کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ اس کا سر چھاتی سے لگایا اور بے حد محبت سے فرمایا: "اے میر امان اللہ تم نے بڑے مصائب جھیلے، زمانے کے سرد و گرم دیکھے مگر اب جدائی کا رنج نہیں اُٹھانا پڑے گا۔ اب میرا گھر تمھارا گھر ہے اور میرے لڑکے بالے سب تمھارے ہیں۔ خوش ہو کہ تم نے اپنی نہرِ حیات کا رشتہ ایک عجیب دریا سے جوڑ لیا ہے، مسرور ہو کہ سروِ سہی کے مانند تم نے اپنا دامن سب سے

جھاڑ دیا ہے۔ اب دلجمع ہو جاؤ اور دروازہ بند کر کے سب سے قطع تعلق کر لو۔ تھوڑے دن آپ میں گم رہو تاکہ خدا کو اپنی طرف کھینچ سکو۔"

غرض کہ وہ سیّد زادے والد ہی کے ساتھ رہنے لگے۔ میرے والد انھیں "برادر عزیز" کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ بھی صبح و شام درویش کی خدمت میں حاضر ہوتے اور کسبِ کمال کرتے۔ والد ایک لمحے کے لیے بھی ان کی دلجوئی سے غافل نہ رہتے، ہر روز عشق و درویشی کا ایک نیا باب ان پر کھول دیتے تھے۔ تھوڑی ہی مدت میں یہ درویش کامل ہو گئے، یہاں تک نوبت پہنچی کہ پلک جھپکاتے تو ہزاروں عجائب ظاہر ہوتے اور ذرا ارادہ کرتے تو کرامت نمایاں ہو جاتی۔ جب اُن کے دوست احباب تک یہ خبر پہنچی تو وہ وطن سے بڑے اشتیاق کے ساتھ آئے۔ اُن کی بیوی دق کے مرض میں گرفتار ہو گئیں اور کچھ دنوں بعد اس دنیا سے چل بسیں۔

القصہ ان کی درویشی کا چرچا ہوا اور عقیدت مندوں کا ہجوم رہنے لگا تو انھوں نے لوگوں سے ملاقات کرنے میں مصلحت نہ دیکھی اور گوشہ گیر ہو گئے۔ جب اسی حالت میں ایک سال بیت گیا تو والد صاحب نے کہلا بھیجا کہ اب دنیا والوں کے لیے اپنے فیض کا دروازہ کھول دینا چاہیے۔ ایک شام کو اپنے حجرے سے باہر نکلے، اس انداز سے کہ فرشتوں کو رشک آئے۔ درویش (میرے والد) کو سلام کیا اور قدموں پر گر گئے۔ والد صاحب نے فرمایا: "بڑے باہمت مرد ہو اور تم نے یہ بہت بڑا کام انجام دیا ہے، ہوس اور نفس دونوں انسان کے دشمن ہیں، ہوس انسان کو کتے کی طرح سرگرداں رکھتی ہے اور نفس اسے مغرور و سرکش بنا دیتا ہے، تم نے قناعت کا پتھر پیٹ سے باندھ کر نفس کو زیر کر لیا ہے:

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"

میں ان دنوں سات سال کا تھا، انھوں نے مجھے اپنے سے مانوس کر لیا اور گود لے لیا تھا، یعنی مجھے میرے ماں باپ کے ساتھ نہ چھوڑتے تھے اور اپنا فرزند بنا لیا تھا، ایک لمحے کے لیے بھی مجھے اپنے پاس سے جدا نہ کرتے اور بڑے لاڈ پیار سے میری پرورش کرتے تھے۔ چنانچہ میں دن رات ان کے ساتھ رہتا اور اُن سے قرآن شریف پڑھتا تھا۔

ایک دن وہ جمعہ بازار کی سیر کو گئے تھے وہاں ان کی نظر ایک روغن فروش کے لڑکے پر پڑی، جو ایک دولت مند جوان تھا، یہ اس کی محبت میں دل کھو بیٹھے اور بے قابو ہو گئے۔ جب اس لڑکے کی جانب سے التفات نہ پایا تو دل کی بے قراری اور بڑھی، ہر چند کوشش کرتے تھے مگر دل پر بس نہ چلتا تھا، لوگوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر زمین پر قدم رکھتے تھے تب کہیں راستہ چلتے تھے۔ اپنے دل سے کہتے: "اے عزیز، ایسا کھیل کوئی بھی کھیلتا ہے جو تو نے کھیل کر اپنے تئیں کوچہ و بازار میں رسوا کرایا؟ تو ضبط و استقامت کا وہ عالم تھا یا یہ بے اختیاری و بے قراری...... دل ایسی چیز تو نہ تھی کہ ایک بازاری لونڈے پر نچھاور کر دی جائے.... اب پیر و مرشد کی توجہ کے سوا چارہ نہیں، جو کچھ بھی ہو ان کی خدمت میں جا کر بیٹھتا ہوں۔"

چنانچہ اسی حال تباہ سے، آنکھوں میں اشک اور لبوں پر آہیں لیے ہوئے مغرب کی نماز کے قریب لوگوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر درویش کی خدمت میں آئے، حاضرین نے تعظیم کی، درویش نے اشارہ کیا، انھیں صدر میں جگہ دی گئی تو والد نے کہا: "اے علی! کہاں تھے؟ آج بڑی دیر میں صورت دکھائی۔" انھوں نے عرض کیا: "جمعہ بازار کی سیر کرنے گیا تھا۔" فرمایا: "تم نے شاید یہ نہیں سنا تھا

ستمِ عشق می داند کہ سودا می کند
دیدنِ طفلاں تہ بازار رسوا می کند

جاؤ اب اپنے حجرے سے آٹھ دن رات تک باہر نہ نکلنا اور اس داستان کا ہرگز اعادہ نہ کرنا۔ اللہ تعالےٰ کریم ہے، شاید اس لڑکے کو پہنچا دے اور تمھاری لاج رکھ لے۔"

اتفاق دیکھئے ابھی ایک ہفتہ بھی نہ ہوا تھا کہ شام کے وقت وہ چودھویں کا چاند اپنے گھر سے نکلا اور سراسیمہ و بے تاب سا دکان پر بیٹھ گیا۔ دکان کا دلال بھی وہیں کھڑا تھا۔ اس نے پوچھا: "کیا بات ہے، آج تمھارا رنگ ہی بدلا ہوا ہے اور بہت بے چین نظر آتے ہو۔" لڑکے نے کہا "کیا بتاؤں جو دل پر گزر رہی ہے زبان تک نہیں لا سکتا۔ مگر تجھے ہمدرد سمجھ کر بتا دینے میں مضائقہ نہیں، آج چھٹا دن ہے ایک درویش اس راستے سے گزرے تھے۔ ان کی نگاہ میری رعنائی پر پڑی، کچھ دیر وارفتگی کے عالم میں کھڑے رہے، میں نے غرور و تمکنت سے ان کی جانب التفات نہ کیا تو ناچار وہ جلے دل سے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر چلے گئے۔ وہ دن تھا اور آج کا دن ہے ان کی صورت میری نظروں کے سامنے سے جُدا نہیں ہوتی، نہ دل سے ان کا خیال جاتا ہے، سوتے جاگتے انھیں کا تصور اور انھیں کی یاد ہے، کیا کروں، دل کو کیسے بہلاؤں، ان کا نام کس سے پوچھوں، پتہ کہاں دریافت کروں، راستہ کیسے طے کروں، اپنا غم کس سے کہوں؟" دلال نے کہا: "وہ تو بہت مشہور بزرگ ہیں، نہایت منکسر مزاج، ایک خلق ان کے آستانے پر ماتھا ٹیکتی ہے ایک عالم اُن کا مرید ہے وہ سید علی متقی کے چھوٹے بھائی ہیں جو درویشی و بزرگی میں اس آسمان کے نیچے یکتہ و تنہا اور مشہور آفاق ہیں، ان کا آستانہ جس کی خاک تبرک کے طور پر لے جاتے ہیں، شہر پناہ سے باہر عید گاہ کے قریب ہے، تم میرے ساتھ آؤ اور غم سے چھٹکارا پاؤ۔" غرض وہ فرومایہ اس لڑکے کو میرے والد کی خدمت میں لایا، انھوں نے حقیقت حال سُن کر فرمایا: "آخر عشق کی بے نیازی نے تغافل کا انتقام لے ہی لیا!" ایک ملازم کو حکم دیا کہ جا کر برادر عزیز سے کہہ دے کہ: "آؤ تمھارا محبوب تمھیں ڈھونڈھتا ہے۔" جب یہ حکم، اس خوشخبری کے ساتھ اس جگر خستہ گوشہ نشین کو ملا تو کلبۂ احزاں سے دست افشاں و پاکوباں باہر آئے۔ پہلے پیرو مرشد کے قدموں میں سرِ نیاز پابوسی کے لیے جھکایا، پھر دستِ شوق لڑکے کی جانب بغل گیر ہونے کے لیے بڑھایا، یعنی دل کی خواہش کے مطابق اپنے سینے سے لگایا اور اپنی تمنا کے موافق اس نخلِ مراد کو دیکھا۔

والد نے دونوں کو اجازت دی کہ علیحدہ بیٹھ کر بات چیت کریں، جب باتیں چھڑیں تو درویش (میر امان اللہ) نے کہا: "اے جوانِ رعنا میں فقیر ہوں اور بے مدعا دل رکھتا ہوں، مجھے اپنی زلف اسیر نہ سمجھنا، خدا ہی جانتا ہے کہ یہ دل کہاں پھنسا ہوا ہے اور یہ سراپا خواہش جان کس کی آرزومند ہے۔ خبردار تو مغرور نہ ہونا اور ناز نخرے نہ کرنا ایسا نہ ہو کہ افسوس کرے۔ درویش لوگ اگرچہ دائرۂ آسمان سے باہر ہیں لیکن انھیں بھی ایک حال میں نہیں چھوڑا جاتا۔ اچھا اب جاؤ تم نے بہت رنج اٹھایا ہوگا۔"

لڑکے نے کہا: "میں نے رنج تو اٹھایا ہے، مگر گنج پا لیا ہے، اب میں اس آستانے کی جاروب کشی کو فخر سمجھتا ہوں، امید ہے آپ مجھے محروم نہ فرمائیں گے اور میرے حال پر عنایت کی نظر رکھیں گے۔ پھر وہ ہر روز صبح آکر بیٹھتا اور دل و جان سے خدمت کرتا تھا۔

درویش جگر ریش (میر امان اللہ) ہفتے میں ایک بار احسان اللہ نامی ایک فقیر سے جو ایک مرد آزاد تھا، ملاقات کرنے جایا کرتے تھے۔ آگرے میں عیدگاہ کے اس پار ایک محلہ "فقیر کا تکیہ" تھا وہاں ان کا صاف ستھرا، بلند چار دیواری کا مکان تھا، جس کے دروازے پر یہ شعر لکھا ہوا تھا: ؎

خاطر آسودہ خواہی راہ آمد شد بہ بند
چاک در پیراہن دیوار از دست در است

جو کوئی ان کا دروازہ کھٹکھٹاتا اور آواز دیتا تو خود آتے اور جواب دیتے "احسان اللہ گھر میں نہیں ہے۔ جلدی جاؤ، یہ گھر خالی ہے۔" ایک بار میرے چچا نے ان سے ملاقات کا ارادہ کیا تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ جب دروازے پر پہنچے تو وہی جواب ملا یعنی "احسان اللہ گھر میں نہیں ہے۔" چچا نے کہا "اگر احسان اللہ نہیں ہے تو امان اللہ ہے۔" ہنسے اور دروازہ کھول دیا۔ کیا دیکھتا ہوں ایک گٹھے ہوئے متناسب جسم کا جوان ہے، خورشید سوار۔ جس کی پیشانی سے ہیبت حق نمودار ہے۔ اگری چادر اوڑھے، لنگی باندھے اور نہایت پرُہیبت سُرخ آنکھیں۔ گویا شیر عشق الٰہی سے ان کے در پر سویا ہوا ہے۔ معانقہ ہوا اور پیلو کے سائے میں بیٹھ گئے۔ ایک دوسرے کی مزاج پرسی کی۔ فرمانے لگے: "اے میر امان اللہ، میں نے گوشہ نشینی اس لیے اختیار کی ہے کہ صحبت کے لائق انسان نہیں پائے۔ تمہیں دل بہت چاہتا ہے۔ جب تک تم نہیں آتے برابر خیال رہتا ہے۔ اور ہاں، یہ بچہ کس کا ہے؟" چچا نے کہا: "علی متقی کا لڑکا اور میرا گود پالا ہے۔" فرمایا: "یہ بچہ ابھی کم سِن ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے اگر اس کی تربیت ڈھنگ سے ہو گئی تو ایک ہی جست میں آسمان سے بھی پرے پہنچے گا۔ اس سے کہو درویشوں کی ملاقات کو اپنا معمول بنائے، فقیروں کی صحبت بڑی بابرکت ہوتی ہے۔" پھر پانی میں سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا بھگو کر کھانے کے لیے مجھے دیا۔ میں نے ایسی لذیذ غذا کبھی نہیں کھائی مجھے اب تک اس کا ذائقہ یاد ہے۔

احسان اللہ کے ملفوظات

فرمایا: اے یار عزیز دل اگر غمگین ہے تو مبارک ہے، غم اگر دلگداز ہے تو اچھا ہے، درویش دل محزوں تلاش کرتے ہیں نہ کہ شائستہ طرب۔ جان دردمند چاہتے ہیں نہ کہ درماں طلب۔ روئے نیاز اس کی طرف رکھو جو بے نیاز ہے، سب کام اسے سونپ دو جو کارساز ہے۔ گوشہ نشین ہو جاؤ اور توکل کرو، اپنے اندر کھو جاؤ اور غور و تامل کرو۔ اگر جان میں نیاز پیدا ہو جائے تو عنقا ہے، دل اگر گداز ہو جائے تو کیمیا ہے۔

اے یار عزیز وہ یکتا پیرہن معشوق جس رنگ میں چاہتا ہے نمودار ہو جاتا ہے، کبھی پھول ہے کبھی رنگ۔ کہیں لعل ہے کہیں سنگ۔ کچھ لوگ پھول سے جی خوش کر لیتے ہیں، بعض رنگ سے عشق کرتے ہیں۔ ایک جماعت لعل کو معتبر جانتی ہے تو دوسری پتھر کو خدا مانتی ہے۔ خبردار کہ یہ غور کرنے کا مقام ہے۔ ایسی آنکھ ہونی چاہیے جو ماسوا کی طرف نہ اُٹھے اور وہ دل درکار ہے جو اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ دشمن اور دوست سب اسی کے ہیں کیونکہ دونوں پر اس کا تصرف ہے، ہدایت اور گمراہی دونوں اسی کے مظہر ہیں

مست اور ہشیار سب اسی کو ڈھونڈتے ہیں، محراب اس کے ابرو سے پیدا ہوئی ہے، مے خانہ اس کی آنکھ سے ہویدا ہوا ہے۔ زہادِ مناجاتی عبادت و اطاعت کرتے ہیں، رندانِ خراباتی جام لنڈھاتے ہیں۔ محراب میں سر جھکانا چاہیے اور خرابات میں رندانہ وضع سے آنا چاہیے یعنی ہر موقع کی رعایت اور مرتبے کا لحاظ ضروری ہے……

یہاں تک بات پہنچی تھی کہ شہر کے صوبہ دار کا مصاحب آیا اور اس کی درخواست پیش کی کہ نصرت یار خاں قدم بوسی کے لیے حاضر ہو رہا ہے۔ درویش نے فرمایا: "خوش رہے، ہر چند وہ فقیروں سے ملاقات کا منہ نہیں رکھتا لیکن اب مجھے اس سے شرم آتی ہے، کئی بار ناکام لوٹ چکا ہے، اس بار بھی واپس ہو گیا تو خدا جانے پھر ملاقات ہو یا نہ ہو۔" جب صوبہ دار دروازے پر آیا، ہاتھی سے اترا اور دوڑ کر شرف پابوسی حاصل کیا اور پانچ اشرفیاں نذر کیں۔ احسان اللہ نے فرمایا: "خوب آئے اور اچھا لائے" صوبہ دار نے عرض کیا: "میری خوش بختی ہے کہ آپ کی خدمت میں حاضری کا شرف پایا اور زیارت سے فیض یاب ہوا، دل کی مراد پوری ہو گئی۔" درویش کی جانب سے التفات دیکھا تو یہ بھی درخواست کی کہ کبھی کبھی مجھ روسیاہ کو ایک نگاہ کرم سے نوازتے رہیے۔" احسان اللہ نے فرمایا: "دل قوی رکھو، کہ تم خدائے عزوجل کی طرف سے نوازے گئے ہو۔ یہاں سرخ رو ہو تو عجب ہے کہ قیامت میں بھی نوازے جاؤ، اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرو، محتاجوں کی مدد کرو۔ بے مروت اور تنگ دل نہ ہو، بے کسوں کو ذلیل نہ کرو، خدا سے ڈرو، غرور نہ کرو، غریبوں کی حاجت روائی میں حیلے حوالے نہ کرو، اور دادخواہ لوگوں سے ہرگز منہ نہ موڑنا، ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن ذلیل کیے جاؤ، اچھا اب جاؤ کیونکہ یہ یار عزیز (میر امان اللہ) بہت نازک مزاج اور بے دماغ ہیں میں ان کی پاسداری کے لیے مجبور ہوں۔ صوبہ دار نے نہایت اعتقاد سے اپنا ماتھا زمین سے لگایا، فقیر کے آستانے کو بوسہ دیا اور چلا گیا۔

اسی دوران میں گویتے کا ایک لڑکا، گھونگھریالے بال، کتابی چہرہ، عودی رنگ، کانوں میں سونے کے چھلے پہنے، اس طرف سے گزرا۔ فقیر کی نظر اس پر پڑی، بے اختیار ہو گئے۔ میرے چچا سے فرمایا "اس کو بلا کر یہاں بٹھاؤ" وہ لڑکا آکر بیٹھ گیا اور بھیروں میں یہ شعر گانا شروع کیا:

بیا کہ عمر عزیزم بجستجوئے تو رفت
ندل زرفتی و جانم در آرزوئے تو رفت

درویش کو وجد آگیا، بہت محظوظ ہوئے، اس سے فرمایا "اے عزیز، آج رات فقیر کے ساتھ بسر کرو اور جو چیزیں تمہیں یاد ہوں بطور خود سناؤ۔" لڑکے نے کہا: "بسر و چشم، یہ تو میرے لیے سعادت اور مجھ پر احسان ہے۔"

شام ہو چلی تھی، سب رخصت کر کے دروازہ بند کر لیا اور یاد الٰہی میں بیٹھ گئے۔ پھر سنا گیا کہ فقیر نے عشاء کی نماز پڑھنے کا ارادہ کیا اور اشرفیوں کو تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ اس سیاہ دل گویتے نے بھانپ لیا۔ تھوڑی دیر بعد بازار گیا اور وہاں سے دودھ کے پیالے میں زہر ملا کر لایا۔ بڑے اصرار اور مبالغے سے درویش کو پینے کے لیے دیا، دودھ کا پینا تھا کہ درویش کی حالت دگرگوں ہو گئی، انھوں نے ہاتھ پاؤں پھینکنے شروع کیے۔ یعنی وہ زہر اپنا کام کر گیا۔ وہ کم بخت ناہنجار اشرفیاں اٹھا کر چلتا بنا۔ آدھی رات کو درویش کی آہ نے ہمسایوں کی نیندیں اڑا دیں، گھبرا کر دوڑے تو درویش کو جاں بلب پایا۔ لوگوں نے اس عیار لڑکے کو بہت ڈھونڈا مگر وہ رات

کی تاریکی میں ایسا چھپ گیا کہ کہیں نظر نہ آیا۔ صبح ہوئی تو درویش نے جان آفریں کو جان سپرد کی۔ شہر کے سرگروہ لوگ انتہائی رنج و ملال کے ساتھ ان کے جنازے میں شریک ہوئے اور اُن کی وصیت کے مطابق "فقیر کے تکیے" میں دفن کر دیا۔ اب تک وہ جگہ زیارت گاہِ خلائق ہے۔

بایزید

میرے چچا کو درویشوں کی صحبت میں جانے اور اُن جگر فگاروں سے ملاقات کرنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک دن کسی سے سُنا کہ کوئی فقیر بایزید نام کے، سرائے گیلانی کے ایک حجرے میں آکر ٹھہرے ہیں۔ جب پتا لگا تو اشتیاق بڑھا اور سب طرف سے دل اچاٹ ہو گیا، مجھے چھوڑ کر جاگم جاگ ان کی خدمت میں گئے، دیکھا ایک جوان ہے بلند و بالا، نہایت مستغنی، گویا فرشتہ اس دُنیا میں آگیا ہے۔ نہیں نہیں جانِ آدم سے زیادہ عزیز۔ پتھر کا تکیہ، خاک کا بچھونا، ہر وقت ہلاک ہونے پر آمادہ، شکستہ دل، کشادہ رو، سوختہ جاں، دلدادہ، خاک افتادہ، متوکل اور مقصودِ دلی سے بہرہ مند ـــ اگر کوئی خوش چشم بھی ان کے سامنے جاتا تو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے۔ کسی سے ملاقات نہ کرتے، بے کسی سے بسر کر رہے تھے۔ اکثر اوقات آنکھیں بند رکھتے۔ دل کسی وقت خدا کی یاد سے غافل نہیں تھا۔ روٹی کو رغبت سے نہ دیکھتے، پانی بھی بمشکل حلق سے اتارتے، سخت کوش اور باریک بیں تھے۔ قلندرانہ وضع کا لباس زیبِ تن تھا۔ چچا سے پوچھا، "کیا نام ہے اور کہاں رہتے ہو؟ دردمند اور عاشق پیشہ معلوم ہوتے ہو۔" چچا نے کہا: "اسی شہر میں رہتا ہوں، میر امان اللہ میرا نام ہے۔" فرمایا: "بیٹھ جاؤ، تمھارے ساتھ وقت اچھا کٹے گا۔"

یہ پہلی ملاقات تھی، جلد ہی ختم ہو گئی، فقیر کو زیادہ زحمت دینا مناسب نہ سمجھا۔ چچا نے میرے والد کی خدمت میں آکر ان کا سارا احوال بیان کیا۔ والد نے کہا:

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

ہم مشرب درویش کہاں میسر آتے ہیں، انھیں دیکھنے کے لئے اکثر جایا کرو۔"

پھر ایک دن عصر کی نماز کے بعد اُن سے ملاقات کرنے گئے۔ اس بار مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ درویش نے بڑی عنایت اور شفقت سے استقبال کیا اور اپنے سامنے بٹھایا۔ میں تو کم سن تھا، چچا سے مخاطب ہوئے اور میرے بارے میں دریافت کیا۔ چچا نے بتایا:

"میر علی متقی کا فرزند ہے۔" فرمانے لگے: "اوہ ـــ پھر تم سے کیا پوچھنا۔ اس بچے کے والد تو بڑے واقفِ اسرار بزرگ ہیں۔ وہ آسمانِ درویشی کے خورشید، مشہورِ جہاں، بلکہ جانِ درویشی ہیں، ایسا دریا ہیں جس کی تہ سے قیمتی موتی نکلتے ہیں، ہم فقیر تو بے مایہ ہیں، ہم سے کیا بن پڑتا ہے۔ میاں لڑکے، میری طرف سے سلام نیاز کے بعد کہنا کہ یہ شوقِ بے پایاں کی کوتاہی نہیں جو اب تک حاضر نہ ہو سکا بلکہ شکستہ پائی اور بخت کی نایاوری ہے جو چاہتا ہے کہ میں اس خرابے سے قدم باہر نہ نکالوں۔ آپ بڑے بزرگ ہیں میں آپ کی نسبت چھوٹا ہوں، مجھ ایسے بے سروپا کے لیے کسی خاص وقت میں دعا فرمائیے۔"

انہی باتوں میں رات ہو گئی۔ ہم نے اجازت چاہی، فرمایا: "خدا حافظ"

وہاں سے آ کر ہم نے والد صاحب کی خدمت میں درویش کا سلام اور پیام پہنچایا، فرمایا: "اُن کی عنایت ہے۔ اب اپنے چچا کے ساتھ جاؤ تو میرا سلام بھی ضرور کہہ دینا۔"

ایک دن میرے والد نے کہا: "اے برادرِ عزیز، دماغ ختم ہو رہا ہے، یعنی روز بروز ضعیف ہوتا جاتا ہے۔ اگر اسے قرآن مجید حفظ کرنے میں لگایا جائے تو کیسا ہے؟" چچا نے کہا: "بہت اچھی بات آپ کے خیال میں آئی۔" چنانچہ ڈیڑھ سال کی مدت میں قرآن حفظ کر لیا۔

ایک دن دونوں بیٹھے (قرآن شریف کا) دورہ کر رہے تھے کہ اسد اللہ نامی ایک درویش نیلا لباس پہنے اور نمدی ٹوپی اوڑھے وارد ہوئے۔ جب والد کے سامنے آئے تو انھوں نے فرمایا:

"اے کیوو جامہ کے سیرابہ پز، تم نے اتنا دور دراز سفر کیوں اختیار کیا اور اس ویران راستے کے شدائد اپنے اوپر کیوں گوارا کیے؟" وہ عزیز سامنے آ کر قدموں پر جُھک گیا۔ والد نے ان کا سر چھاتی سے لگایا اور اپنے پاس جگہ دی۔ میرے چچا اس گرم جوشی پر حیران ہوئے اور پوچھا یہ کون بزرگ ہیں؟ والد نے کہا: "میرے پرانے دوست ہیں۔" چچا اور بھی حیرت زدہ ہوئے، اور کہا اتنی گہری دوستی کے لیے تو ملاقات کی کثرت شرط ہے، مگر میں نے ان بزرگ کو آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" والد نے فرمایا: "میں اور یہ ایک ہی پیر کے مرید ہیں، یہ دو سال میں ایک بار پیر کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ایک دن میں نے پیر و مرشد کی خدمت میں سوال کیا، کیا ہو جو موت کے آثار پہلے سے مجھ پر ظاہر ہو جائیں، تاکہ میں آخرت کی تیاری میں مشغول ہو جاؤں اور دوسری باتوں میں دل نہ لگاؤں۔ ارشاد ہوا، جب تم کیوو جامہ کے اس تاجر کو دیکھو تو جان لینا کہ اگلے سال تک زندہ نہ ہو گے۔" لہٰذا یقین کر لو کہ اب میری عمر بہت تھوڑی رہ گئی ہے۔

چچا یہ الفاظ سُن کر بہت رنجیدہ ہوئے اور کہنے لگے: "انشاء اللہ میں یہ واقعہ نہ دیکھوں گا یعنی اس منحوس دن تک دنیا ہی میں نہ رہوں گا اور یہ صدمہ نہ اٹھاؤں گا۔" جب تازہ وارد درویش سے بات چیت شروع ہوئی تو اس نے بیان کیا کہ کچھ دنوں سے میری دکان نہیں چل رہی تھی، مال کا کوئی گاہک ہی نہ تھا، رات کو مال تیار کرتا تھا، صبح کو ڈال دیتا تھا۔ جو کچھ جمع پونجی تھی سب کھانے میں چلی گئی۔ ناچار مایوس ہو گیا۔ ایک دن اسی رنج میں زمین پر لیٹا تھا کہ نیند کا جھونکا آیا اور سو گیا۔ دیکھا کہ پیر و مرشد میرے سرہانے کھڑے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اے اسد اللہ ہر چند سفر میں بڑی دشواریاں ہیں اور راستہ بھی لمبا ہے، لیکن ایک بار علی تقی سے تمھارا ملاقات کرنا ضروری ہے۔ میرے ان کے درمیان ایک اشارہ ہے، جیسے ہی تم پہنچو گے وہ سمجھ جائیں گے، تمھیں چاہیے کہ فوراً روانہ ہو جاؤ اور کساد بازاری کا غم نہ کرو، جب وہاں سے واپس آؤ گے تمھارا مال ایسا ہاتھوں ہاتھ بکے گا کہ تبرک ہو جائے گا۔" میں نے بیدار ہو کر دکان شاگرد کے سپرد کی اور زادِ راہ کے لیے آدھی سوکھی روٹی لے کر چل کھڑا ہوا۔ تھوڑی سی مدت میں ایک دنیا سے دوسری میں پہنچ گیا یعنی کیوو جامہ سے آگرے آیا اور اپنے دل اشتیاق کے مطابق تمھیں دیکھ لیا۔ اب میری واپسی تمھارے اختیار میں ہے، جب اجازت دو گے واپس چلا جاؤں گا۔" میرے والد مسکرائے اور کہا: "اے اسد اللہ ایسے کیوں ہوا کے گھوڑے پر

سوار ہو، تمہارا حال خراب تو نہیں ہو گا جو اتنی بے تابی دکھا رہے ہو۔ تم ایسے کٹھن سفر سے آئے ہو اور اتنی زحمت گوارا کی ہے، اگر ہم فقیروں کے اتنے مشتاق ہی ہو تو اپنے آرام ہی کے لیے کچھ دن رہو، جلدی کیا ہے؟ واپسی بھی ہو جائے گی۔" ایک ملازم کو حکم دیا کہ ان کا بستر بچا کے حجرے میں بچھا دے اور خوب خدمت کرے۔ والد ایک لمحے کے لیے ان سے جدا نہ ہوتے اور دلجوئی و مزاج گوئی میں انھیں لگائے رکھتے۔

القصہ ایک ہفتے کے بعد وہ درویش (اسداللہ) رخصت ہوئے۔

چچا کی وفات

عید کی صبح میرے چچا نئے کپڑے پہن کر نماز کے لیے گئے۔ جب واپس آئے تو ان کے سینے میں درد ہونے لگا اور ایسی شدت سے کہ چہرے کا رنگ اڑ گیا اور دل کا سکون جاتا رہا۔ میرے والد کو بلایا اور کہنے لگے: "میرے سینے میں نہایت شدید درد ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انجام بخیر نہیں۔ ایسی تکلیف ہے کہ دم گھٹا جا رہا ہے، غالباً اب جان ناتواں میں اتنی تاب نہیں۔ میری عبا بدن سے نوچ لو کہ اس سے وحشت ہوتی ہے، میری قبا اتار پھینکو یہ سر پر بوجھ بنی جا رہی ہے، جان میری ناتواں ہے، اور یہ بیماری شدید۔"

شام تک درد اور بھی بڑھ گیا اور ان کی آہ آہ کا شور بلند ہوا۔ وہ سراپا دل درد مند بن گئے۔ ضبط کرتے تو غنچہ کی طرح سمٹ جاتے اور درد سے آہ و فریاد کرتے تو پھول کی مانند پریشان نظر آتے۔ جب گھڑی بھر رات گزری تو ناطاقتی حد سے بڑھ گئی۔ پیرومرشد سے کہنے لگے: "آخر دل نے سختی اٹھائی اور آنکھیں شدت غم سے پتھرا گئیں۔ آپ خود اس مے خانے کے دانائے راز ہیں، اگر میری عمر کے پیمانے میں ابھی کچھ تلچھٹ رہ گئی ہو تو وہ کسی اور کو دے دیجیے کیونکہ اس شدت درد میں دُرد (تلچھٹ) پینے کے لیے بڑا کلیجہ چاہیے۔ میں موت کی تلخی کو اس جان شیریں کے مقابلے میں سو درجے گوارا سمجھتا ہوں۔ توجہ فرمائیے کہ اس مشکل سے نجات پاؤں اور رحم کیجیے تاکہ آرام مل جائے۔" رات گئے اپنی کلاہ شب پوش مجھے عنایت فرمائی اور غلبۂ ناتوانی سے آنکھیں بند کر لیں۔ جب رات آخر ہوئی یعنی سفیدۂ سحر نمودار ہوا تو ان کی المناک روح لبوں پر آ چلی تھی۔ ادھر مؤذن نے "اللہ اکبر" کہا، ادھر یہ شب زندہ دار بیدار ہو گیا یعنی دل پر ہاتھ رکھا اور جان جان آفریں کے سپرد کی۔

میرے والد نے عمامہ زمین پر پھینک دیا اور گریبان چاک کر لیا۔ اس جانکاہ صدمے سے چھاتی پیٹنے لگے۔ ان کے مریدوں نے سروں پہ خاک اور جگر پر داغ لیے۔ اسی رنجوری کے عالم میں میت کی رسمیں ادا کیں اور درد مند کا جنازہ تیار کیا۔

جب لوگ نماز جنازہ کے لیے کھڑے ہوئے تو بہت سے نڈھال ہو کر فرش پر گر گئے۔ میرے والد نے کہا: "اے ناواقف آداب آشنائی، دیر میں معلوم ہوا کہ تو بے وفا ہے، ایسا رخصت ہوا کہ میرا سینہ پھونک دیا۔ دوست ایسے تو نہیں جایا کرتے اور غم خوار ایسے بے مروت تو نہیں ہوا کرتے۔"

بزرگوں نے جنازے کو کندھا دیا، یعنی پوری عزت سے اٹھایا، پیرومرشد کی آہیں مردے کے علم کی طرح جنازے کے آگے آگے چل رہی تھیں۔ ان کے معتقد آٹھ آٹھ آنسو روتے ہوئے میت کو شہر سے باہر لے گئے وہاں ایک باغ کے گوشے میں سپرد خاک

لے کے پھول برسائے اور فاتحہ پڑھی۔ نہایت صدمہ اٹھایا اور سوائے صبر کے کوئی چارہ نہ پایا۔

تیجے کے دن جب شہر کے لوگ فاتحہ خوانی کے لیے آئے تو میرے والد نے کہا: "جس کا ایسا عزیز مر گیا ہو، اسے اگر "عزیز مردہ" کہیں تو بجا ہے۔ آج سے مجھے عزیز مردہ کہا جائے۔ چنانچہ وہ شہر میں اسی لقب سے مشہور ہو گئے۔ دن میں سو سو بار روتے تھے اور بُرے حال میں جیتے تھے۔ میں جو مرحوم چچا کا گودوں پالا تھا اور اپنی ساری ضرورتوں کو ان سے کہتا تھا، انھیں کے ساتھ سوتا اور رہتا تھا، اب دن بھر انھیں یاد کرتا اور رات بھر آنسو بہاتا۔ والد ہر طرح میری دلجوئی کرتے اور کبھی مجھے آزردہ نہ ہونے دیتے۔ کبھی کہتے کہ بیٹے میں تمھیں بہت چاہتا ہوں۔ مگر اس غم سے گھلا جاتا ہوں کہ میں بھی بر سرِ راہ ہوں۔" کبھی فرماتے کہ: "میرے چاند اب تم گود کے بچے تو نہیں ہو، خدا کا شکر ہے دس سال کے ہو گئے، کیوں جی کڑھاتے ہو، آخر درویش زادے ہو، دل مضبوط رکھو اپنے تئیں خدا کو سونپ دو، ہشاش بشاش رہو اور مجھے اپنا نازبردار جانو۔ میری جان کیا تم دودھ پیتے بچے ہو جو ہر وقت روتے رہتے ہو، اپنا غم کیوں کھاتے ہو، تمھارا وارث تو خدا ہے۔ جانے والے کبھی نہیں آتے، گزرنے والے منہ نہیں دکھاتے۔ بیٹے یہاں چل چلاؤ لگ رہا ہے جسے بھی دیکھتے ہو وہ آمادۂ سفر ہے یہ مت سمجھو کہ دنیا تمھارے رہنے کی جگہ ہے۔"

احمد بیگ

ایک دن رنج کے عالم میں چچا کی موت کا حلوہ تقسیم کر رہے تھے کہ ایک شکری رنگ، خوش وضع نوجوان جس کا نام احمد بیگ تھا، آیا اور ولایتی انگور کے کچھ دانے ہاتھ میں رکھ کر نذر گزرانے۔ اور کہا کہ ابھی ولایت سے آ رہا ہوں اور حج کے لیے جانے کا ارادہ ہے۔ اس شہر میں آیا تو آپ کی درویشی کا آوازہ سنا، مشتاقِ دیدار ہو کر خدمتِ سامی میں حاضر ہوا ہوں۔ والد نے فرمایا: "بیٹے خود کو پاؤ پھر کعبے جاؤ، کعبہ فقیروں کے دل ہائے سوختہ کا نام ہے اور مقصود ان جگر ریشوں کی قربت ہے، اگر فقیروں کے دل کو متوجہ کرو تو وہ بغیر سعی و کوشش کے کعبۂ مراد دکھا دیتے ہیں۔ تم جو کچھ کہتے ہو حرم کے محرم بھی وہی کہتے ہیں۔ جسے تم ڈھونڈتے ہو خود کعبہ بھی اسی کو ڈھونڈ رہا ہے۔ دلوں کا طواف کرو یہی کعبے کا طواف ہے، اپنے ہی جویا ہو تو اچھا، مقصود یہی ہے۔ غیر کا کوئی وجود نہیں اور کوئی شے مشہود و موجود نہیں۔

مجھے تمھاری جوانی پر رحم آتا ہے کہ رنج اٹھاؤ گے مگر مقصود پھر بھی نہ پاؤ گے۔ درویشوں کی بات پوری توجہ سے سنو، کچھ دن ٹھہرو اور یہاں سے نہ جاؤ۔ اس جوان نے جب درویش کو ملتفت پایا تو حکم سے سرتابی نہ کی یعنی ٹھہر گیا اور سخت ریاضت میں مشغول ہوا۔ ذہن سلیم رکھتا تھا، اکتساب کیا اور سات مہینے میں مرتبۂ کمال تک پہنچ گیا۔ اتفاقاً پیر و مرشد کے پاس کہیں سے کچھ روپیہ آیا، انھوں نے جوان سے فرمایا کہ اسے خرچ کرو اور حجاز کے سفر پہ جاؤ۔ صبح کی نماز کے بعد اسے زیرِ پیچ و دستار اور سجادۂ محرابی عنایت کیا اور رخصت کر دیا۔

والد کی وفات

ایک دن دھوپ چڑھے والد، میر امان اللہ کے بھانجے محمد باسط کی عیادت کے لیے، جو ایک عالم فاضل اور متصوف کامل تھے

محلہ عالم گنج گئے، جو آگرے کا مشہور محلہ ہے۔ شام ہونے لگی تو وہاں سے گھر کی جانب واپس ہوئے، مغرب اور عشاء کی نماز اپنی مسجد میں ادا کی، جب سونے کے لیے بستر پر گئے اور میں حاضر ہوا تو فرمایا: "بیٹے آج سورج کی حرارت میرے مزاج پر اثر انداز ہوئی ہے، سر میں درد ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے بخار چڑھے گا۔" رات کا کھانا نہیں کھایا اور سو گئے۔ صبح کو بیدار ہوئے تو بہت تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔ حکیم ابو الفتح جو اُن کے پرانے معالج تھے آئے اور ٹھنڈائی چلائی مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ درویش کو بخار ٹھہر گیا یعنی روز شام کو چڑھتا اور ساری رات رہتا۔ بخار توڑنے کی ان گنت ترکیبیں کر دیکھیں لیکن کسی سے یہ عقدہ حل نہ ہوا۔ ایک مہینے بعد تشخیص ہوئی کہ بخار نے تپ کو لپیٹ لیا ہے اور ہڈیوں میں بیٹھ گیا ہے یعنی یہ درویش نحیف جو محض جلد ہڈیوں سے زیادہ نہیں، دق میں مبتلا ہے۔

ایک دن مجھ سے کہنے لگے: "بیٹے، میری جان صرف نیاز ہے اور جسم گُھلا جاتا ہے۔ غذا سے مطلق رغبت نہیں، کھاتا ہوں تو گرانی کرتی ہے۔ طبیب جو دوا صبح دیتا ہے وہ معدے میں اگلی صبح تک ویسے ہی دھری رہتی ہے۔ چاہتا ہوں کہ اب موت آنے تک غذا چھوڑ دوں، بازار سے نرگس کے چار پانچ دستے لے آؤ تاکہ بقیۂ زندگی انھیں کبھی کبھی سونگھ لیا کروں۔" میں ارشاد کے بموجب لایا اور ان کے سامنے رکھ دیے۔ جب آنکھ کھلتے دستہ ہاتھ میں لے کر سونگھتے اور فرماتے: "خدا کا شکر ہے، سیر ہو گیا۔" جب انھوں نے غذا ترک کر دی تو ہم بے کسوں کو اپنی زندگی سے بالکل ہی مایوس کر دیا۔ ہاتھ پاؤں کی طاقت جواب دے گئی، ضعف حد سے بڑھ گیا، بات بہت کم کرتے اور نمازیں اشاروں سے پڑھتے تھے۔ اور شب کو حسب معمول حکیم ٹھنڈائی کا پیالہ لایا تو درویش نے ناک بھوں چڑھائی اور دوا پینے سے انکار کر دیا، پیالہ زمین پر پٹک کر بولے: "اے کم بخت دوا کا تاثیر کرنا تو مجھے اول دن سے معلوم تھا مگر تیرا لحاظ کر کے پی لیتا تھا۔ افسوس تو نے اتنی سی بات نہ سمجھی، جا اب مجھے میرے حال پر چھوڑ دے۔ ناقباحت فہمی وہ مرض ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔"

حافظ محمد حسن

اس وقت حافظ محمد حسن کو بلایا جو میرے بڑے اور علاتی بھائی تھے اور فرمایا کہ "میں فقیر ہوں، میرے پاس کچھ اثاثہ نہیں، بس تین سو کتابیں ہیں وہ میرے سامنے لاؤ اور بھائیوں میں تقسیم کر دو۔" وہ کہنے لگے: "میں طالب علم ہوں اور میرا کتابوں سے بیشتر واسطہ رہتا ہے یہ چھوٹے بھائی کتابوں سے کوئی ربط ہی نہیں رکھتے ان کے ورق پھاڑ ڈالیں گے، ایک پتنگ بنائے گا، دوسرا ناؤ بنا کر پانی میں بہا دے گا، اگر آپ یہ سب کتابیں مجھی کو سونپ دیں تو اچھا ہے، ورنہ آپ مختار ہیں۔" والد کو ان کی بدنیتی کا اندازہ تھا۔ انھیں ڈانٹ کر کہنے لگے: "اس سے کیا ہوتا ہے جو تو نے فقیروں کا بھیس بدل لیا ہے، تیری مکاری اور حیلہ سازی تو ابھی تک گئی نہیں، تو چاہتا ہے کہ ان بچوں سے دغا کرے اور میری آنکھیں بند ہونے کے بعد انھیں نقصان پہنچائے۔ یاد رکھ کہ اللہ تعالیٰ غیور ہے اور غیور کو پسند کرتا ہے۔ غالب ہے کہ میر محمد تقی تیرا دست نگر نہ ہوگا، اگر تو اس کے ساتھ دوسری طرح پیش آئے گا تو نیچا دیکھے گا اور تیری عزت کا نقش اس کے سامنے نہ بیٹھے گا۔ اگر تو اپنے منشا میں کامیاب ہو گیا تو ایک جلد کتاب کے بدلے تیری کھال کھینچ لے گا۔ کم ظرف انسان قابل اعتبار نہیں رہتا اور بخل و حسد ذلت و خواری کی علامت ہے۔ بہتر ہے یہ کتابیں تو ہی لے جا اور رکھ لے۔" اس کے بعد میری

طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: "بیٹے میں بازار کے بنیوں کا تین سو روپے کا مقروض ہوں۔ امید ہے جب تک وہ قرض ادا نہ کرو گے میرا جنازہ نہ اٹھاؤ گے، کیونکہ میں معاملے کا صاف رہا ہوں اور تمام عمر کسی کو دھوکا نہیں دیا۔" میں نے عرض کیا کہ سوائے ان کتابوں کے اور کوئی اثاثہ نظر نہیں آتا۔ وہ کتابیں بھی آپ نے بڑے بھائی کو سونپ دیں۔ اب میں قرض کہاں سے ادا کروں گا۔ والد کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور فرمانے لگے: "مایوس نہ ہونا چاہئے، خدا کریم ہے، ہنڈی راستے ہی میں ہے اور پہنچا چاہتی ہے، چاہتا تھا کہ روپیہ آنے تک زندہ رہوں، لیکن عمر کے چند ہی لمحے باقی رہ گئے ہیں۔ اب ٹھہرنا ممکن نہیں۔" پھر مجھے دعا دی اور خدا کے سپرد کیا۔ کچھ سانسیں اور آئیں اس کے بعد انتقال فرمایا۔

بھائی کی طوطا چشمی

درویش نے آنکھیں موندیں تو سارا عالم میری نظروں میں تاریک ہو گیا۔ بڑا حادثہ رونما ہوا، آسمان مجھ پر ٹوٹ پڑا، آٹھ آٹھ آنسو روتا تھا، صبر و شکیب جاتا رہا، دیواروں سے سر پھوڑتا تھا، خاک پر لوٹتا تھا، بڑا ہنگامہ بپا ہوا گویا قیامت نمودار ہو گئی۔ میرے بڑے بھائی نے انسانیت کو بالائے طاق رکھ کر طوطا چشمی اختیار کی۔ جب دیکھا کہ باپ مفلس مرا ہے اور قرض خواہ میرے دامن گیر ہوں گے تو پہلو بچا گئے اور کہنے لگے: "جو لاڈ پیار کے پالے پوسے ہیں وہ جانیں اور ان کا کام۔ میں تو باپ کی زندگی میں بھی دخیل کار نہ ہوا اور ترکے سے بھی درگزرا، ان کے سجادہ نشین سلامت رہیں جو سر پیٹ رہے ہیں اور منہ نوچ رہے ہیں وہ جو مناسب سمجھیں گے کریں گے۔"

میں نے بے کسی کا یہ تازہ صدمہ اٹھایا تھا۔ جب ان کی یہ مغروری اور کمینی باتیں سنیں تو غم و غصہ اور بھی زیادہ ہوا، مگر ان سے کوئی التجا نہ کی، ہمت کو مضبوط رکھا اور خدا پر بھروسہ کر کے بیٹھ گیا۔ بازار کے بنیے مزید دو سو روپے لائے اور بے حد خوشامد کی، مگر میں نے درویش کی وصیت کا پاس کیا اور وہ روپے قبول نہ کئے۔ صاف انکار بھی نہ کیا کہ شاید ملول ہوں، باتوں میں لگاتا رہا۔

اتنے میں سید گل خاں، جو میرے پدر بزرگوار کے مرید تھے، ان کا نوکر پانچ سو روپے کی ہنڈی لے کر آیا اور میرا شریک غم ہوا۔ میں نے تین سو روپے تو قرض خواہوں کو ادا کر کے فارغ خطی حاصل کی اور سو روپے سے فقیر کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ اور پیر و مرشد کے پہلو میں انھیں مدفون کیا۔

میری سرگذشت

والد کی موت کے بعد میں نے فلک کی بے مروتی دیکھی، زمانے کے ستم جھیلے۔ نہیں نہیں فلک یا زمانے کا کیا قصور، میرا ہی ستارہ منحوس تھا کہ ایسے آفتاب کا سایہ میرے سر سے اٹھ گیا۔ جو کچھ بھی کیا میری قسمت نے کیا، سوائے میرے اپنے ہاتھ کے اور کسی کا ہاتھ میرے سر پر نہ تھا، یعنی کوئی سرپرست نہ تھا مگر میں نے غیرت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور ہرگز کسی کے دروازے پر سائل بن کر نہ گیا، نہ میرے ہونٹ حرف مطلب سے آشنا ہوئے، نہ مجھے کسی چیز کی طمع پیدا ہوئی۔ کسی سے میں نے امداد طلب نہیں کی نہ کسی نے مجھے امداد دی میں

خدائے کریم نے مجھے کسی کا شرمندۂ احسان نہ کیا اور مجھے میرے بھائی کا، جو مجھ سے کینہ رکھتے تھے دست نگر نہ بنایا۔ میں رات دن درویش (والد) کا ماتم کرتا تھا اور تمام کام خدا کے آسرے پر چھوڑ دیے تھے۔ چھوٹے بھائی کو گھر بٹھا کر روزگار تلاش کرنے کے لیے سارے شہر میں گھومتا تھا۔ لیکن کوئی تدبیر برآمد نہ ہوا۔ یعنی وطن میں کوئی صورت نہ نکلی تو پردیس کا رُخ کیا، راستے کی صعوبتیں اپنے اوپر گوارا کیں اور سفر کے شدائد جھیل کر شاہجہاں آباد دہلی پہنچا۔ یہاں بھی بہت گھوما مگر کسی کو شفیق نہ پایا۔

خواجہ محمد باسط نے جو امیر الامرا صمصام الدولہ کے بھتیجے تھے میرے حال پر عنایت کی اور مجھے نواب کے سامنے لے گئے، نواب نے مجھے دیکھ کر پوچھا: "یہ کس کا لڑکا ہے؟" خواجہ محمد باسط نے کہا: "میر محمد علی کا!" فرمانے لگے کہ "اس کے یہاں آنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دنیا سے گزر چکے ہوں گے۔" پھر بہت افسوس ظاہر کرنے کے بعد کہنے لگے کہ "اُن کے مجھ پر بڑے حقوق ہیں، ایک روپیہ روز میری سرکار سے اس لڑکے کو دیا جائے۔" میں نے التماس کیا کہ "اگر اتنی مہربانی کریں کہ مجھے دستخط فرما کر دے دیں تو متصدیوں کے چوں وچرا کرنے کی گنجائش نہ رہے گی۔"

میں نے درخواست جیب سے نکالی، اچانک خواجہ مذکور کی زبان سے نکلا کہ یہ "قلمدان کا وقت نہیں ہے!" یہ سن کر میں نے ٹھٹھا مارا، نواب نے میرے منہ کو دیکھا اور ہنسی کا سبب پوچھا، میں نے عرض کیا کہ "آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی، اگر یہ فرماتے کہ قلمدان بردار حاضر نہیں، تو ایک بات بھی تھی، یا یہ کہتا ٹھیک تھا کہ یہ نواب کے دستخط کرنے کا وقت نہیں۔ "قلمدان کا وقت نہیں" کہنا تو نئی ترکیب ہے۔ قلمدان کا وجود ایک لکڑی سے زیادہ نہیں وہ وقت وغیر وقت نہیں جانتا۔ جس شخص کو بھی حکم دیا جائے اٹھا لائے گا۔" نواب ہنسنے لگے اور بولے کہ "معقول بات کہتا ہے۔" غرض میری بات کو رد نہ کیا، قلمدان منگوایا اور درخواست پر دستخط کر دیے۔ وہ بادشاہ کے دربار کا دن تھا، نواب تیار ہو کر چلنے لگے اور بڑی عنایت سے مجھے رخصت کیا۔

اس زمانے تک کہ نادر شاہ نے محمد شاہ پر چڑھائی کی اور نواب مذکور اس کے مقابلے میں مارے گئے، یہ روزینہ مجھے ملتا رہا، اسی سے نان ونمک کھا کر گزارا کر رہا تھا۔

اس انقلاب (حملۂ نادری) کے بعد پھر سنگدل زمانے نے مجھے ستایا، وہ لوگ جو درویش کی زندگی میں میری خاکِ پا بھی سرمے کی طرح آنکھوں سے لگاتے تھے، اب مجھ سے آنکھیں چرانے لگے۔ مجبور ہو کر دوسری بار دہلی پہنچا، اور اپنے بڑے بھائی کے ماموں، سراج الدین علی خاں آرزو کا احسان اٹھایا، یعنی کچھ دن ان کے ساتھ رہا، اور شہر کے لوگوں سے چند کتابیں پڑھیں، جب اس قابل ہو گیا کہ کسی کا مخاطب صحیح بن سکوں تو بھائی کا خط ماموں کے نام پہنچا، کہ "میر محمد تقی فتنۂ روزگار ہے، اس کی تربیت ہرگز نہ کرنی چاہیے بلکہ دوستی کے پردے میں کام تمام کر دینا چاہیے۔" وہ عزیز (آرزو) پکے دنیادار تھے اپنے بھانجے کی عداوت دیکھ کر برا چاہنے لگے، اگر میں سامنے پڑتا تو چنگھاڑنے لگتے، اور نگاہ بچا کر رہتا تو اول فول بکتے، ہر وقت ان کی نگاہیں میری نگرانی میں رہتیں اور دشمنوں کا سا برتاؤ کرتے۔ میں کیا بیان کروں کہ ان سے کیا سلوک دیکھا اور کس طرح لکھوں کہ کیا رنج اُٹھائے، میں ہرچند صبر وضبط کرتا اور لاکھ احتیاج ہو مگر ان سے ایک روپیہ بھی نہ مانگتا تھا، مگر وہ دشمنی سے باز نہ آتے تھے۔ اگر ان کی ایذادہی کا ماجرا تفصیل سے بیان کروں تو ایک علیحدہ دفتر درکار ہے، میرا دکھا ہوا دل اور بھی زخمی ہو گیا اور میں پاگل ہو گیا۔ مزاج میں وحشت پیدا

ہو گئی، جس کوٹھڑی میں رہتا تھا۔ اس کا دروازہ بند کر لیتا اور اس ہجوم افکار میں تنہا بیٹھ جاتا۔ چاند نکلتا تو میرے لیے قیامت ہوتی تھی، اگرچہ میں اس وقت سے چاند کو دیکھتا آیا تھا جب منہ دُھلاتے وقت دایہ "چاند چاند" کہتی اور میں آسمان کی سمت دیکھتا تھا، لیکن نہ اس طرح کہ دیوانگی تک نوبت پہنچ جائے اور وحشت اتنی بڑھ جائے کہ لوگ مجھ سے ڈر کر میری کوٹھڑی کا دروازہ بند کر دیں اور مجھ سے دُور بھاگنے لگیں۔

قمرالدین خاں کی بیوی نے جو میرے والد کی مرید بھی تھیں اور قریبی رشتہ بھی رکھتی تھیں، میرے علاج میں بہت روپیہ خرچ کیا۔ ملاؤں سیانوں نے جھاڑ پھونک کی اور طبیبوں نے فصد کھولی بارے طبیبوں کا تیر نشانے پر بیٹھا جب خریف کا موسم آیا اور بہار رخصت ہوئی تو جنون خود بخود گھٹ گیا۔ جلد ہی پوری طرح صحت یاب ہو گیا اور "مکتوبات" پڑھنے شروع کر دیے۔

ایک دن بازار میں ایک کتاب کے کچھ اجزا ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا کہ میر جعفر نامی ایک جوان ادھر سے گزرے، مجھے دیکھا تو میرے قریب آئے اور تھوڑی دیر توقف کر کے کہنے لگے: "اے عزیز! معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے کا تمہیں شوق ہے، میں بھی کتاب کا کیڑا ہوں، لیکن کوئی طالب نہیں ملتا۔ اگر تم چاہو تو کبھی کبھی آجایا کروں گا۔" میں نے کہا: "آپ کی خدمت کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا، اگر محض خدا واسطے آپ یہ زحمت گوارا کریں تو عین بندہ نوازی ہے۔" کہنے لگے: "اتنا ضرور ہے کہ تھوڑا سا ناشتہ مل جائے اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔" میں نے کہا: "یہ مشکل خدائے کریم آسان کر دے گا، اگرچہ میرے پاس بھی کچھ نہیں ہے۔" انھوں نے ان منتشر اوراق کو صفحوں کے مطابق کر کے مجھے دیا اور چلے گئے۔ اس کے بعد اکثر اس انسان نما فرشتے سے ملاقات ہوتی، نہایت مہربانی سے پیش آتے یعنی اپنا دماغ کھپا کر مجھے کچھ سکھاتے۔ میں بھی تا بمقدور ان کی خدمت کرتا یعنی جو کچھ میسر آتا اُن کے لیے خرچ کرتا۔ ناگاہ ان کے وطن عظیم آباد سے کوئی خط آیا اور وہ ادھر چلے گئے۔

کچھ دنوں کے بعد سعادت علی نام کے ایک سید سے میری ملاقات ہوئی جو امروہہ کے رہنے والے تھے اور انھوں نے مجھے ریختہ میں شعر کہنے کی ترغیب دی جو شعر فارسی کی طرح قلعہ شاہی کی زبان میں شاعری ہے۔ اور اس وقت بہت رواج پا رہی تھی۔ میں نے بھی بہت محنت کی اور اپنی مشق اتنی کر لی کہ شہر کے شاعروں میں مستند سمجھا جانے لگا۔ میرے اشعار گلی کوچوں میں پڑھے جانے لگے اور ادنیٰ و اعلیٰ کے کانوں تک پہنچ گئے۔

ایک دن ماموں نے مجھے کھانے پر بلایا اور پھٹکارنا شروع کر دیا۔ میں بہت کڑھا اور کھانے میں ہاتھ ڈالے بغیر اُٹھ گیا۔ جب ان سے سختی نہ دیکھی تو شام کو ان کے گھر سے نکلا اور جامع مسجد کا رستہ لیا۔ اتفاق سے راہ بھول گیا اور قاضی حوض پر آنکلا جو وزیرالممالک اعتمادالدولہ کی حویلی کے پاس ایک چھوٹی سی نہر ہے۔ یہاں میں نے پانی پیا۔ اس جگہ علیم اللہ نامی ایک شخص میرے پاس آیا اور بولا: "تم میر تقی میر ہو نا؟" میں نے کہا: "تم نے کیسے پہچانا؟" بولا: "تمھارا سودائیانہ تو مشہور ہے!" رعایت خاں نے جو عظیم اللہ خاں کا لڑکا اور اعتمادالدولہ قمرالدین خاں کا بھانجا ہے، جب سے تمھارے اشعار سنے ہیں تم سے ملاقات کرنے کا بہت ہی مشتاق ہے۔ اگر تم میرے ساتھ چل کر اس سے ملو تو میرے لیے بھی باریابی کا بہانہ ہو جائے گا۔ میں جا کر ملا۔ بڑی شرافت سے پیش آیا اور مجھے اپنا رفیق بنا لیا۔ اس کی ملازمت سے مجھے فائدہ پہنچا اور تنگدستی سے چھٹکارا مل گیا۔

ایک چاندنی رات میں خان کے سامنے ڈوم کا لڑکا چبوترے پر بیٹھا گا رہا تھا۔ خان نے مجھے دیکھا تو کہنے لگا: "میر صاحب نے اپنے دو تین شعر ریختہ کے یاد کرا دیجئے تو یہ اپنے ساز پر درست کر کے گائے گا۔" میں نے کہا: "یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔" کہنے لگا: "میری خاطر سے!" چونکہ ملازمت کا پاس تھا، طوعاً و کرہاً تعمیل کی اور پانچ شعر ریختہ کے اسے یاد کرا دیے۔ مگر یہ بات میری طبع نازک پر بہت گراں گزری۔ آخر دو تین دن کے بعد گھر بیٹھ رہا۔ اس نے ہر چند بلایا، نہیں گیا اور اس کی نوکری چھوڑ دی۔ مگر اس شخص کی مروت نے مجھے بے روزگار دیکھنا گوارا نہ کیا۔ میرے بھائی محمد رضی کو، میرے حقوق رفاقت کے پیش نظر، اپنے پاس سے گھوڑا عنایت کیا اور نوکر رکھ لیا۔ ایک مدت کے بعد جب میں جا کر ملا تو اس نے بہت عذر خواہی کی۔ میں نے کہا: "خیر۔ گذشتہ را صلوٰۃ"

جب اسی طرح کچھ دن گزر گئے تو میں نے نواب بہادر کے ہاں ملازمت تلاش کی۔ اسد یار خاں نے جو اس کی فوج کا بخشی تھا، میرا احوال اسے سنا کر، گھوڑے اور نوکری کی شرط معاف کرا دی۔ وہ (نواب بہادر) میرا لحاظ اور بعض امداد و اعانت کرتا تھا۔ خدا اسے جزائے خیر دے۔

ان دنوں محمد خاں بنگش کا لڑکا قائم خاں روہیلوں کی جنگ میں مارا گیا اور صفدر جنگ اس کے املاک کی ضبطی کے لیے روانہ ہوا۔ میں بھی ایک تقریب سے اسحاق خاں نجم الدولہ کے ساتھ اس طرف کی سیر کرنے گیا۔ قائم خاں کے چھوٹے بھائی احمد خاں سے بڑی بھاری جنگ ہوئی وزیر کی فوج نے منہ کی کھائی اور اسحٰق خاں بھی قتل ہوئے۔ میں اس ہارے ہوئے لشکر کے ساتھ بڑی زحمت اٹھا کر شہر دہلی واپس آ گیا۔

(جب انتظام الدولہ وزیر ہوا) انھیں دنوں میں زمانے کی نامساعدت سے تنگ آ کر میں نے ماموں (سراج الدین علی خاں آرزو) کی ہمسائیگی ترک کر دی، یہ سوچ کر کہ وہ مجھے بری نظر سے دیکھیں گے اور امیر خاں مرحوم کی حویلی میں سکونت اختیار کی۔ (جو محمد شاہی عہد کے بڑے امیر تھے اور سلطنت کی ڈھلتی ہوئی رگ اُن کے ہاتھ میں تھی نیز الہ آباد کی صوبہ داری بھی ان کے سپرد تھی۔ تخلص ان کا انجام ہے۔ اپنی خوش سلیقگی اور شیوا بیانی کے لیے ضرب المثل ہیں) ان کی حویلی میں منتقل ہو کر بڑی تنگی بسر کرتا رہا۔

اسی زمانے میں جب صفدر جنگ نے وفات پائی اور صوبے (اودھ) کی ریاست اس کے بیٹے شجاع الدولہ کو ملی، میرے ماموں خان آرزو لالچ کے مارے نکل پڑے، یعنی شجاع الدولہ کے لشکر میں اس توقع پر گئے کہ اسحاق خاں شہید کے بھائی وہاں ہیں وہ حقوق سابق کا خیال کر کے کچھ مراعات دیں گے، مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ قسمت نے دھکا دیا تھا، وہیں مر گئے۔ ان کی نعش وہاں سے لا کر انھیں کی حویلی میں سپرد خاک کر دی گئی۔

دو تین مہینے کے بعد راجا جگل کشور جو محمد شاہ کے زمانے میں وکیل بنگالہ تھے اور بڑی جاہ و حشمت کے ساتھ رہتے تھے، مجھے گھر سے بلا کر لے گئے اور اپنے اشعار پر اصلاح کی خدمت سپرد کی۔ مگر میں نے اصلاح کی قابلیت نہ دیکھی اور ان کی اکثر تصنیفات پر خط کھینچ دیا۔

ایک دن میں نے راجا جگل کشور کے سامنے روزگار کی شکایت کی۔ وہ عزیز شرم سے پیلا پڑ گیا۔ کہنے لگا: "میں خود مفلس ہوں، کچھ بھی ہوتا تو ہرگز تامل نہ کرتا۔" ایک دن سوار ہو کر راجا ناگرمل کے ہاں گیا اور میرا تعارف کرا کے بلا بھیجا۔ میں گیا اور

اس کے وسیلے سے ملاقات کی، بہت لطف و عنایت سے پیش آیا، کہنے لگا: "دعوتِ شیراز حاضر ہے۔ یعنی تمھارا حصہ میں تمھیں پہنچا دیے گا۔" مجھے اطمینان ہو گیا تو اُٹھ کر واپس آیا۔ دوسرے دن ملاقات میں جب شعر خوانی ہوئی تو کہنے لگا: "میر کا ہر شعر موتیوں کی لڑی ہے۔ مجھے اس شخص کا اسلوب بہت پسند ہے۔" ایسے ہی کبھی کبھار جاتا رہا، مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ چونکہ حال تو بڑی تنگی تک پہنچ گیا تھا، ایک دن صبح کی نماز کے بعد اس کے دروازے پر گیا، چوبداروں کا میر دہ جے سنگھ نامی میرے سامنے آیا اور کہنے لگا: "یہ دربار کا کون سا وقت ہے؟" میں نے کہا: "اضطرار کا عالم ہے!" بولا: "تم لوگوں کو درویش کہتے ہیں تم شاید یہ نہیں جانتے کہ خدا کے حکم کے بغیر ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کرتا۔ یہاں اپنی ریاست کے آگے تمھاری کیا قدر ہے۔ صابر و شاکر رہنا چاہیے ہر کام کا ایک وقت ہے یہاں تو تمھاری رسائی مشکل ہے البتہ ان کے بڑے لڑکے مل سکتے ہیں۔" میں نہایت شرمندہ ہوا اور واپس آ گیا۔

ایک دن اس دربان کے کہنے کے مطابق راجا کے لڑکے سے ملنے گیا۔ دربان نے روک دیا، بولا: "اس وقت ان سے ملاقات کرنا ممکن نہیں۔" مجبوراً واپس آ گیا۔ پھر عشاء کی نماز کے بعد گیا۔ دیکھا تو ڈیوڑھی پر دربان نہیں ہے۔ میں نے پوچھا: "دربان کہاں گیا؟" لوگوں نے کہا: "آج اس کے سر میں ایسا شدید درد تھا کہ بیٹھ نہیں سکتا تھا۔" میں نے سوچا کہ تائیدِ الٰہی شاملِ حال ہے دیوان خانے میں داخل ہوا اور ملاقات کی۔ شعر خوانی کا بھی اتفاق ہوا۔ خواجہ غالب نے جو ایک بااثر آدمی ہے اور مجھ سے واقف تھا، میرا احوال مفصل سنایا اور کچھ مقرر کرا دیا جو میں ایک سال تک پاتا رہا۔ ایک رات راجا کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے میری ایک سال کی تنخواہ دے کر فرمایا: "اکثر مجھ سے ملتے رہا کیجیے۔" اس دن سے عشاء کی نماز کے بعد ملازموں کے طریقے سے ان کے پائیں باغ میں جاتا اور دو گھڑی رات گئے تک رہتا تھا۔ اس خدمت کا پھل یہ تھا کہ چین سکھ سے گزر اوقات ہو رہی تھی۔

(ابدالیوں اور روہیلوں کے ہاتھوں دلی کی تباہی کے بعد) میں راجا کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ زمانے کے ہاتھوں سخت پریشان ہوں، چاہتا ہوں کہ شہر سے نکل جاؤں اور جہاں سینگ سمائیں چلا جاؤں، ممکن ہے اسی طرح کچھ آسودگی نصیب ہو جائے۔ انھوں نے میرے ساتھ رعایت کی اور مجھے رخصت کر دیا۔ میں بال بچوں کو لے کر پیادہ پا نکلا، کوئی منزل تو تھی نہیں، خدا پر بھروسا کر کے راستہ طے کرنا شروع کیا۔ دن بھر میں مشکل سے ۵ - ۶ کوس کی منزل ہو سکی۔ رات ایک سرائے میں درخت کے نیچے گزاری۔ اگلی صبح کو راجا جگل کشور کی بی بی ادھر سے گزریں۔ اور ہم مجبوروں کی دستگیری کی اپنے ساتھ برسانہ تک لے آئیں اور طرح طرح سے سلوک کر کے دلجوئی کی۔

ذی الحجہ کی آخری تاریخ کو وہ کاماں گئیں جو برسانہ سے تین کوس پر راجا جے سنگھ (والیِ جے پور) کی سرحد ہے۔ فقیر اپنے اہل و عیال کے ساتھ عشرۂ محرم یہیں وہیں (برسانہ) مقیم رہا اور عاشورے سے اگلے دن (۱۱ محرم) وہاں سے نکل کر کمہیر پہنچا۔

کمہیر

یہاں صفدر جنگ کے سابق خزانچی لالہ رادھا کشن کا بیٹا بہادر سنگھ جو ان دنوں راجا کے ساتھ مقیم تھا۔ ایک شام کو آیا اور مجھے اپنے ساتھ لے گیا اور میری امداد و اعانت کی۔ میں اس کا احسان مند ہوں کہ اس نے دوستی کا حق ادا کیا اور کچھ دن

ٹکڑوں ہی سے بسر ہو گئے۔

میں ایک دن کھانے پینے کا سامان نہ ہونے کے باعث پریشان بیٹھا تھا، جی میں آئی کہ اعظم خاں کلاں (جو فردوس آرامگاہ محمد شاہ کے عہد میں شش ہزاری امیر اور نہایت کریم النفس انسان تھا) کے لڑکے اعظم خاں سے ملا جائے تو شاید کچھ دن ٹکڑے گزر جائیں۔ چنانچہ گیا اور سورج مل کے حویلے میں اس سے ملا جو دلی کے خانہ خرابوں کی نئی جائے پناہ بنا ہوا تھا۔ اس عزیز نے، خدا بخشے، میری خیر و عافیت معلوم کی۔ میں نے اپنا دکھڑا سنایا تو سننے والے بہت متاثر ہوئے۔ جب قہوہ اور حقہ دیا گیا تو یہ شعر میری زبان پر آیا: ؎

امروز چو کار من عرفی ہم افتاد   باہم نگرستیم و گریستیم و برفتیم

ایسے ہی چند شعر میں نے پڑھے اور دو تین آنسو پلکوں سے گرائے۔ چند لمحوں کے بعد دیکھا کہ خان فکر مند ہے۔ میں نے کہا: "آپ کس سوچ میں پڑ گئے؟" بولا: "کچھ نہیں۔" میں نے کہا: "کچھ تو ہے؟" کہنے لگا: "جب تم شہر دلی میں آتے تھے تو ہم طرح طرح کی مٹھائیاں اور قسم قسم کے حلوے منگاتے اور دونوں کھاتے تھے۔ آج عجب اتفاق ہے کہ کچھ کھانڈ بھی میسر نہیں جو تمہارے لیے ایک پیالہ شربت بنا سکوں۔" میں نے کہا: "میں ان سب چیزوں کا ندیدہ نہیں ہوں۔ وہ بات بھی تفریحاً ہو جاتی تھی۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میں حریص اور لالچی نہیں۔ زمانہ بدلتا رہتا ہے۔ وہ شربت و شیرینی کا وقت تھا، یہ تلخیاں جھیلنے کا موسم ہے۔" یہی بات چیت ہو رہی تھی کہ ایک عورت سر پر خوان رکھے دروازے سے داخل ہوئی اور بولی: "سعید الدین خاں خانساماں کی بہن نے آپ کو دعا کہی ہے۔ کچھ حلوائے نزاکت اور شبینے کی نیاز کی شیرینی بھیجی ہے۔" خاں نے خوان پوش اٹھایا اور اس کی نظر حلوے پر پڑی تو باغ باغ ہو گیا۔ کہنے لگا: "میر روسیاہ تو اپنی قدر خوب جانتا ہے، ایک عرصے فاقہ کشی پر مدار ہے۔ حلوے اور شیرینی کا تو ذکر ہی کیا کہیں سے روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہیں آیا۔ تم میرے عزیز مہمان ہو، یہ سب تمہارا ہے۔ میرا حصہ مجھے دے کر باقی سب اپنے گھر بھیج دو۔" میں نے کہا: "یہ تو بہت ہے، میں اتنے سارے کا کیا کروں گا؟" کہنے لگا: "تمہارے لڑکے میر فیض علی کے کام آئے گا۔" غرض کہ اس بھلے مانس نے اصرار کرکے حلوے کی قاب اور مٹھائی کا خوان میرے گھر بھجوا دیا اور مجھے ہنسی خوشی رخصت کیا۔ دو دن تک اسی مٹھائی پر گزر ہوئی۔ تیسرے دن راجا کے چھوٹے لڑکے کشن سنگھ نے مجھے بلایا اور حالات دریافت کرنے کے بعد کہا کہ "راجا صاحب کے آنے تک میرے پاس رہو۔" میں نے کہا کہ کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں۔ بولا: "مطمئن رہو یہاں سب کچھ موجود ہے۔" خدا اسے خوش رکھے اس نے میری ضرورت کا سب سامان مہیا کر دیا۔

اسی دوران کمہیر میں راجا ناگر مل دوبارہ تشریف لائے۔ میں ان دنوں وہیں تھا، التماس کیا: "میں آپ کی تشریف آوری کا منتظر تھا اب مجھے اجازت دیجئے کہ کہیں نکل جاؤں۔ کیونکہ ناساز گار حالات کا مقابلہ کرنے کی سکت باقی نہیں رہی۔" راجا نے جو میرے حال پر بڑی عنایت فرماتے تھے کہا: "معلوم ہوتا ہے 'بیابان مرگ' ہونے کا ارادہ ہے۔ ہاں اگر میں چھوڑ دوں تو چلے جانا۔" اسی دن خرچ کے واسطے کچھ بھیجا اور میرا وظیفہ بدستور سابق دستخط کرکے عنایت کیا۔

دیر زمانے کے بعد دلی آیا، ایک دن ٹہلتا ہوا شہر کے تازہ ویرانوں سے گزرا، ہر قدم پر روتا اور عبرت حاصل کرتا تھا۔

جوں جوں آگے بڑھا حیرت بڑھتی گئی۔ مکانوں کو شناخت نہ کر سکا۔ آبادی کا پتہ تھا نہ عمارتوں کے آثار نہ اُن کے مکینوں کی خبر۔۔۔ گھر کے گھر مسمار تھے اور دیواریں شکستہ۔ خانقاہیں صوفیوں سے خالی خرابات رندوں سے۔ یہاں سے وہاں تک ایک ویرانہ تھا لق و دق۔ نہ وہ بازار تھے جن کا بیان کروں، نہ بازار کے وہ حسین لڑکے، اب حُسن کہاں جسے تلاش کروں۔ وہ یارانِ عاشق مزاج کدھر گئے، حسین جوان گزر گئے۔۔۔۔۔۔ ناگاہ اس محلے میں آنکلا جہاں میں رہتا تھا، جلسے کرتا تھا، شعر پڑھتا تھا، عاشقانہ زندگی گزارتا تھا، راتوں کو روتا، خوش قدوں سے عشق لڑاتا، ان کے حُسن کی تعریفیں کرتا اور لمبی لمبی زلفوں والے معشوقوں کے ساتھ رہتا تھا حسینوں کی پرستش کرتا اور ایک لمحے کے لیے بھی ان سے جدائی ہوتی تو بے قرار ہو جاتا تھا۔ اب کوئی ایسا مانوس چہرہ نظر نہ آیا جس سے دو باتیں کر لیتا، کوئی معقول انسان نہ پایا جس کے پاس جا بیٹھتا۔ اس وحشت انگیز گلی سے نکل کر ویران راستے پر آ کھڑا ہوا اور حیرت سے تباہی کے چھوڑے ہوئے نشانات دیکھتا رہا۔ بہت صدمہ اٹھایا اور یہ عہد کیا کہ اب ادھر نہ آؤں گا اور جب تک رہوں شہر کا قصد نہ کروں گا۔

سفرِ آگرہ

(اگلے سال) میں تیس سال کے بعد آگرے گیا اور اپنے والد اور چچا کے مزارات کی زیارت کی۔ وہاں کے شاعروں نے مجھے اس فن کا امام سمجھ کر اکثر ملاقات کی۔ میں صبح و شام دریا کے کنارے سیر و تماشا کرنے کے لیے جاتا تھا۔ میری معنی آفرینی کا شہرہ تو عالم گیر تھا۔ اکثر حسین، سیاہ پلکوں والے، اچھی کج دھج والے، جامہ زیب اور پاکیزہ صفت شاعر مجھے نہیں چھوڑتے تھے۔ دو تین بار سارے شہر میں گھوما۔ وہاں کے عالموں، فقیروں اور شاعروں سے ملا، لیکن کوئی ایسا مخاطب نہ پایا جس سے بات کر کے دل بے تاب کو تسلی ہو۔ شہر کو ایک وحشت ناک ویرانہ پایا اور نہایت صدمہ اٹھا کر لوٹ آیا۔ چار مہینے وطن مالوف میں گزارے رخصت ہوتے وقت آنکھیں بھر آئیں۔ سورج مل کے قلعوں میں واپس آگیا۔

لکھنؤ کا سفر

(نجف خاں کی بیماری کے زمانے میں) فقیر خانہ نشین تھا اور چاہتا تھا کہ شہر سے نکل جاؤں مگر اسباب و وسائل کا فقدان قدم نہیں نکالنے دیتا تھا۔ بارے نواب آصف الدولہ بہادر کو خیال آیا کہ میر میرے پاس نہیں آتا۔ نواب سالار جنگ نے ان پرانے روابط پر نظر کر کے جو میرے (سوتیلے) ماموں خان آرزو سے تھے، کہا: "اگر نواب صاحب ازراہ عنایت زادِ راہ کے لیے کچھ مرحمت فرما دیں تو میر ضرور آجائے گا۔" حکم ہوا کہ ایسا کیا جائے۔ انھوں نے سرکار سے زادِ راہ دے کر مجھے خط لکھا کہ "نواب والا جناب تمھیں طلب فرماتے ہیں، جس طرح بھی بن پڑے خود کو یہاں پہنچاؤ۔" میں تو دل برداشتہ بیٹھا ہی تھا، خط پاتے ہی لکھنؤ روانہ ہو گیا۔ فرخ آباد سے گزرا۔ مظفر جنگ نے جو وہاں کے رئیس تھے ہر چند چاہا کہ میں کچھ دن ان کے ہاں ٹھہر جاؤں مگر میرا دل نہیں مانا۔ ایک دن بعد روانہ ہو کر منزلِ مقصود پر پہنچ گیا۔ پہلے نواب سالار جنگ کے گھر گیا، انھوں نے میری بڑی عزت کی اور میرے لیے ضروری

چیزیں بندگانِ عالی سے کہہ کر بھجوا دیں۔

چار پانچ روز کے بعد اتفاقاً نواب عالی جناب مرغ لڑانے کے لیے تشریف لائے۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ حاضرِ خدمت ہوا، فراست سے تاڑ لیا اور فرمانے لگے: "میر محمد تقی ہو!" پھر بڑی عنایت سے بغل گیر ہوئے اور اپنے ساتھ اپنی نشست گاہ پر لے گئے اور مجھے مخاطب کر کے اپنے اشعار سنائے۔ میں نے کہا: "سبحان اللہ۔ بادشاہوں کا کلام، کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے۔" فرطِ مہربانی سے مجھے بھی شعر خوانی کا موقع دیا۔ اس روز میں نے غزل کے چند شعر کہے۔ جب نواب صاحب اُٹھ کر جانے لگے تو نواب سالار جنگ نے کہا: "میر حسب الطلب آئے ہیں اور اب بندگانِ عالی مختار ہیں، انھیں کوئی جگہ عنایت فرمائیں اور جب مرضیِ مبارک ہو خدمت میں بلوا بھیجیں۔" نواب صاحب نے فرمایا: "میں کچھ مقرر کر کے تمھارے پاس بھیج دوں گا۔" دو تین دن بعد یاد فرمایا تو میں حاضر ہوا اور مدح میں جو قصیدہ کہا تھا وہ سنایا۔ سماعت فرمایا اور بڑی عنایت سے اپنے ملازموں کی صف میں مجھے داخل کر لیا۔

خاتمہ

القصہ دنیا عجب حادثہ گاہ ہے۔ کیسے کیسے مکان خراب ہو گئے اور کیسے کیسے جوان مر گئے۔ کیسے باغ تھے کہ ویران ہو گئے اور کیا محفلیں تھیں جو افسانہ ہو گئیں۔ کیسے کیسے پھول کملا گئے۔ کیا کیا رنگ اُڑ گئے۔ کیسی کیسی مجلسیں اُٹھ گئیں۔ کیسے کیسے قافلے کوچ کر گئے۔ زمانے نے کیا کیا خرابیاں دیکھیں اور کیسے کیسے انسان جانوں کی بازی ہار گئے۔ ان عبرت بیں نگاہوں نے کیا کیا دیکھا اور ان سننے والے کانوں نے کیا کیا سن لیا۔

اس تھوڑی سی مدت میں اس ایک قطرۂ خون نے جسے دل کہتے ہیں طرح طرح کے ستم جھیلے اور تمام خون ہو گیا۔ میرا مزاج ناساز تھا۔ ہر شخص سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ اب بڑھاپا آ گیا ہے یعنی عمرِ عزیز ساٹھ سال کی ہو چکی ہے۔ اکثر اوقات بیمار رہتا ہوں۔ کچھ دن آنکھوں کی تکلیف میں مبتلا رہا۔ بینائی کمزور ہو گئی اور عینک کی ضرورت پڑی۔ دانتوں کے درد کی بات کیا کہوں، حیران تھا کہ کب تک علاج کروں، آخر مجبور ہو کر ایک ایک دانت جڑ سے اکھڑوا دیا۔

غرض کہ ضعفِ قویٰ، بے دماغی، ناتوانی، دل شکستگی اور آزردہ خاطری سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بہت دن نہ جیوں گا۔ زمانہ بھی زندہ رہنے کے لائق نہیں۔ اب اس سے دامن کھینچ لینا ہی اچھا ہے — خاتمہ بخیر ہو جائے۔ یہی آرزو ہے ورنہ اختیار تو اسی ذاتِ بے ہمتا کے ہاتھ ہے۔

تلخیص و ترجمہ:- نثار احمد فاروقی

رجب علی بیگ سرور

یہ پنبہ دہاں ہیچمداں محرر داستان منقول گذشتگاں سراپا نقص رجب علی بیگ متخلص بہ سرور متوطن حال خطۂ بے نظیر دل پذیر رشک گلشن جناں مسکن حور و غلماں جائے مردم تمیز، باشندے یہاں کے ذکی فہیم عقل کے تیز اگر دیدۂ انصاف نظر غور سے اس شہر کو دیکھے تو جہاں کی دید کی حسرت نہ رہے آنکھ بند کرے۔ شعر

سنا صفاہاں بھی جس کا خوشہ چیں ہے — وہ بے شک لکھنؤ کی سرزمیں ہے

سبحان اللہ و بحمدہ عجب شہر گلزار ہے ہر گلی دلکش ہر کوچہ دلچسپ باغ و بہار ہے ہر شخص اپنے طور پر با وضع قطعدار ہے وہ دوپہر کا بازار کس انداز کا ہے ہر دوکان میں جنس تازہ نیاز کا ہے۔ نان بائی خوش سلیقہ شیرمال کباب نان نہاری جہان کی نعمت اس آبداری کی جس کی بو باس سے دل طاقت پائے دماغ معطر ہو جائے فرشتہ گزرے تو سونگھ کے کیا ہی سیر ہو دانہ دانہ ریزہ ہو دیکھے سے بھوک لگ آئے وہ سرخ سرخ پیالے نہاری کا گھار سرخ لچکے شیرمال تنگوت کے رنگ کی خستہ بھربھری ایک بار کھائے ان نعمت کا مزہ پائے تمام عمر ہونٹ چاٹا جائے۔ ہر تنوری پر ان کی وہ سجی چیزیں آدمی رشک شیشہ و گلاب میں انواع و اقسام کے شربت قرینے سے چنے روز مرہ دیکھنے والے ان کے دیکھنے سے۔ کبھی کوئی پکارا کہ میاں ٹکے کو ڈھیر لگایا ہے کوئی موزوں طبیعت یہ فقرہ سناتا مزہ انگور کا ہے چھنگروں میں کسی طرف یہ صدا آتی ہے گنڈیریاں پونڈے کی ایک طرف تنبولی سرخروئی سے بیڑہ دو کا ایک کے بول بول میں جابجا چپا کر ہر دم بدم بھری انگلی کا منہ کالا ہو بگڑ کر لالا ہیں یہ کمال ہے کتھے چونے سے ادھر میں کھڑا لال ہے۔ مرزا تاش بینی کے واسطے یہ شہر خداداد ہے جہاں ہر ایک استاد ہے سیکڑوں لگا مرغ و گل کندہ تا تراش الوان در جواب سے عطر بیچنے والے عطر سے جی پھول پھلواری صرف ہو گئے۔ صبح و شام وہ بہار نظر آتی ہے کہ شام اودھ اور بنارس کی سحر بھول جاتی ہے شہر تفلیس میں بھی جس ہنر کا کمال یہاں حاصل ہے۔

بندہ کمترین تلامذہ اور خوشہ چین خرمن کمال جناب قبلہ استاد و شاگرد نواز معروف و ممتاز جمیع فضل و کمال نیک سیرت فرزند خصائل خرد آگاہ دانش آموز و یگانہ جناب میر سعادت علی خوش فکر زبان رشک انوری خاقانی نوازش حسین خاں صاحب عرف مرزا خانی متخلص نوازش کا ہے حقیقت حال یہ تمام ہے کہ طرز ریختہ اور روزمرہ محاورہ کا ان پر اختتام ہے۔

حسب اتفاق ایک روز مع چند دوست صادق یاران صفا کیش و موافق باہم بیٹھا تھا۔ مگر نیرنگی زمانہ ناہنجار و کج روی فلک سفلہ پرور و جفا شعار سے یاران حزیں و زار اور بہجوم اندوہ و یاس سے اور حرمان و افکار سے ہر دم بے حواس تھے دل گرفتہ بیٹھے ہوا اداس تھے انہوں نے کہا

جو ہم تم پاس بیٹھے ہیں یہ دم بھی غنیمت ہے — یہ جینا یوں بسر ہو جائے تو کیا کم غنیمت ہے

لیکن زمانے کی عادت یہی ہے کہ باوجود کثرت غم و شدت اندوہ و الم دو شخص کو باہم نہیں دیکھ سکتا۔ اس وقت کوئی قصہ کہانی شیریں بیانی ایسا بیان کر کہ رفع کدورت صحبت پریشانی طبیعت ہو اور غنچۂ فسردہ دل با تبسم از نسیم تکلم کھل جائے فرمانبردار نے بجز اقرار انکار مناسب وقت نہ جانا چند کلمے گوش گزار کئے اور کہا کہ اگر یہ بھی تمام اس قصہ کو انداز سے ادا کروں ... اور تحریر کرے تو زیبائش و طرز ... بھی ہو اور ... کام آئے ... تحریر کی ... یہ قصہ عجیب بے نظیر ہے ... تحریر سے نظم و نثر ... طبع کا خیال تھا شاعری کا احتمال نہ تھا۔ دوست کی خوشی سے کام رکھا، فسانۂ عجائب اس کا نام رکھا۔

ڈپٹی نذیر احمد

أبا هند فلا تعجل علينا   وأنظرنا نخبرك اليقينا

ابتدائی حالات

یہ شعر میری زندگی کا آئینہ ہے۔ ہم لوگ بہت غریب تھے۔ دکھانے کو روٹی نہ پہننے کو کپڑا، وہ بدبخت جس کے حق میں مصیبت صد رشتہ دار وہ تھے جو دست کاری سے اور مزدوری یا کاشتکاری سے اپنا پیٹ پالتے تھے۔ انیسویں صدی کے وسط میں باپ مولوی سعادت علی سے بڑے تاؤ سے پڑھنا شروع کیا۔ سب سے پہلے قرآن پڑھا، مگر وہی طوطے کی طرح۔ میں نے جو قرآن کے اس پڑھنے کو طوطے کی طرح کا پڑھنا کہا تو اس سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ میں اس طرح کے پڑھنے کو تضیع وقت سمجھتا ہوں۔ ایک مسلم بچہ جس نے تحصیل علم کے میدان میں پہلا قدم رکھا ہے اس سے زیادہ اور کیا کر ہی سکتا ہے۔ طوطے کی طرح کا پڑھنا بھی خاص کر مسلمانوں کے بچوں کے لیے ضرور مفید ہے۔ قرآن کے پڑھنے سے حروف عربی کے مخارج پر ان کی زبان رُستی ہے جو اردو دانی کی تکمیل کے لیے ضروری ہے۔ بہر کیف میں بڑے فخر اور بڑی مسرت کے ساتھ اس کا اعلان کرتا ہوں کہ میری تعلیم قرآن سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد میں نے فارسی کی متداول کتابیں اپنے والد سے پڑھیں۔ میں نے ٹھیک وہ دن کی تیز آتے ہی سمجھا کہ فارسی کتابوں کے اکثر مضامین عشق کی طبیعت میں بد اخلاقی کا بیج بوتے اور اس کو آوارگی سکھاتے ہیں۔ فارسی لٹریچر ایسا پیٹ بھر کر گندا ہے کہ جھوٹ اور مبالغہ اور حسن پرستی اور خوشامد اور ادعائی خیالات اور ریا اور نفاق وغیرہ اخلاق ذمیمہ کے اعتبار سے اس کو جیتی جاگتی کتاب کہنا ہرگز مبالغہ نہیں مگر میں نے اول تو فارسی ایسے صغر سنی میں پڑھی کہ مجھ کو بدی کا احساس ہی نہ تھا، دوسرے پڑھی تو اپنے والد سے پڑھی۔ ان کی تعلیم تریاق تھی فارسی لٹریچر کے زہر کا۔

پس از سی سال این معنی محقق شد بخاقانی   کہ ویرانی است آباد و جہان آباد ویرانی

اب اس قول اعتراف پر پہنچ کر مجھ کو اس کا کامل یقین ہوا کہ مخفی و قابل اطمینان آگہی میں اپنے کسی بزرگ کی تعلیم ہے۔ بشرطیکہ بزرگ ضابطہ کا اور مستند بننے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو ورنہ فزلتم اگر ہم نہ رہے" علی گڑھ یا انجمن حمایت اسلام لاہور۔

تعلیم

میرے والد مرحوم کا ارادہ مجھ کو دین دار مولوی بنانے کا تھا جس کے لیے ان کی حالت مساعد نہ تھی۔ مگر انھوں نے علمی مذاق میری طبیعت میں پیدا کر دیا تھا اور یقین کر لیا تھا کہ "من جد وجد ومن قلب قلب" اس مذاق کے ہوتے منزل تمام طے کرنے کے لیے اور کسی ساز و سامان کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے مجھ کو اپنی سرپرستی سے علیحدہ کر کے جناب مولوی نصر اللہ خاں صاحب مرحوم و مغفور کے سپرد کر دیا۔ یہ بزرگ حسن اتفاق سے ان دنوں بجنور میں ڈپٹی کلکٹر تھے جو میرا وطن نہیں، وطنی قرابت نہیں بلکہ وطن اصلی ہے۔ جاہ و حشمت، علو مرتبت، علم و فضل، میر جوش، علم و راسخ شریعت و طریقت، اتنی صفتیں میں نے ڈپٹی صاحب کے سوا کسی ایک شخص میں مجتمع نہیں دیکھیں اور اسی جامعیت کے اعتبار سے وہ فرید روزگار تھے۔ علم ظاہر و باطن کی تعلیم کے لیے طلباء کی ایک جماعت کثیر کو اپنے ساتھ لیے رہتے تھے۔ میرا چال چلن والد کے یہاں وثیقہ تھا تو ڈپٹی صاحب کے یہاں اس کی رجسٹری ہوئی۔ یہ ڈپٹی

صاحب کی خدا واسطے کی سچی محبت مجھ جیسے ناچیز کے ساتھ تھی کہ جب میں نحو صرف میں شرح ملا تک، منطق میں میر قطبی تک، فلسفہ میں میبذی تک پہنچا تو انھوں نے اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے والد کو یہ لکھ کر فرمایا کہ اب اس کو دہلی لے جاؤ۔ وہاں اس کا پڑھنا خوب ہو گا۔ یہاں مجھ کو والد نے پنجابی کٹڑہ کی مسجد میں چھوڑ دیا اب تو وہ محلے کا محلہ ریل میں آگیا ہے۔ مگر ۱۹۰۹ء۔ ۱۹۱۰ء میں جب کا یہ ذکر ہے پنجابی سوداگر اس میں آباد تھے۔ مسجد کا نام اورنگ آبادی تھا اور وہ ہر طرح سے نئی پوری مسجد کے قریب واقع تھی۔ اس میں مختلف مقامات کے پچاس ساٹھ طالب علم مسافر رہتے تھے۔ بعض نے کسی مسجد کی امامت یا پڑھانے کے ذریعے سے معاش کے ٹھکانے بنا رکھے تھے۔ مگر اکثر باری باری سے دونوں وقت پنجابیوں کے گھروں سے ٹکڑے مانگ لاتے اور آپس میں بانٹ کھاتے اور ان ہی میں سے ایک میں بھی تھا کم عمر لڑکے مولویوں کے زنان خانے میں جاتے تھے اور ان سے خدمت گاری کا کام لیا جاتا تھا۔ معاوضہ اس کا کہ مسجد میں رہتے ہیں۔ پس ان کے لیے مسجد بھٹیاری کی سرائے تھی اور اس کا کرایہ مولویوں اور مولونیوں کی خدمت۔ گو میری عمر بارہ سال کی تھی۔ مگر قد چھوٹا ہونے کی وجہ سے نو دس برس کا معلوم ہوتا تھا۔ پڑھنے کے علاوہ میرا کام روٹیاں سمیٹنا بھی تھا۔ صبح ہوئی اور میں چھوٹی سی ٹوکری ہاتھ میں لے گھر گھر روٹیاں جمع کرنے نکلا۔ کسی نے رات کی بچی ہوئی دال ہی دے دی۔ کسی نے قیمہ کی ٹکڑی ہی رکھ دی۔ کسی نے دو تین سوکھی روٹیوں پر ہی ٹرخایا۔ غرض رنگ برنگ کا کھانا جمع ہو جاتا۔ مسجد کے پاس ہی عبدالخالق صاحب کا مکان تھا۔ اچھے کھاتے پیتے آدمی تھے۔ انھیں کے بیٹے ڈپٹی عبدالحامد ہیں جو سامنے والے مکان میں رہتے ہیں۔ ان کے ہاں میرا قدم رکھنا مشکل تھا۔ ادھر میں نے دروازے میں قدم رکھا ادھر ان کی لڑکی نے ٹانگ لی۔ جب تک میرے دو پیسے معاوضہ مجھ سے نہ پیسہ لیتی، دو گھونسے نکلتے، دو روٹی کا ٹکڑا دیتی۔ خدا جانے کہاں سے مجھ جیسا معاملہ اٹھا لاتی تھی۔ پیٹتے پیٹتے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے۔ جہاں میں نے ہاتھ روکا اور اس نے جڑ انگلیوں پر مارا۔ میری جان سی نکل جاتی تھی۔ میں نے مولوی صاحب سے شکایت بھی کی۔ مگر انھوں نے ٹال دیا۔ خیر نہیں مجھ سے کیا دشمنی تھی۔ چلتے چلتے تاکید کر دیا کرتے تھے کہ عبدالخالق صاحب کے مکان میں ضرور جانا۔ بہرحال مار دھاڑ کی روز وہاں جانا پڑتا اور روز یہی مصیبت جھیلنی پڑتی۔ مجھ سے بھی کرید کر لڑتی تھی۔ یہ لڑکی وہ تھی جو بعد میں ہماری بیگم صاحبہ ہوئیں۔ جب سوچتا ہوں تو پچھلا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے اور بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ اکثر ہم دونوں پہلی باتوں کو یاد کرتے اور خوب ہنستے تھے۔ خدا مرحومہ پر رحمت کرے جیسی بچپن میں شریر تھیں ویسی ہی جوانی میں مہذب ہو گئیں۔ ان کے مرنے کے بعد ہماری تو زندگی کا مزا جاتا رہا۔

اورنگ آبادی مسجد مولویوں کے ایک خاندان کی تولیت میں تھی۔ ان میں اختلاف عقاید کی وجہ سے وہابی اور بدعتی دو گروہ تھے ایک دوسرے کے دشمن۔ مسجد کے طالب علم بھی ان دو گروہوں میں منقسم تھے۔ میں تھا کہ اپنا مذہب جدھر کچھ ملتا دکھتا تھا ادھر ہی کا ہو رہا۔ میں نصر اللہ خاں صاحب کی کتابیں دیکھے ہوئے تھا۔ ان لوگوں کی طرف سے میرے دل میں ایک طرح کی بدگمانی اور نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ یہ مسجد سے لگا کر جتنے طالب علم جس مولوی کی سرکار میں تھے، وہ مولوی ان کی تعلیم کا ذمہ دار تھا۔ جس طرح بعض مولوی نام کے مولوی تھے۔ اسی طرح بعض طالب علم نام کے طالب علم بھی تھے جنھوں نے پیٹ بھرنے کے لیے گداگری کی یہ شان اختیار کر رکھی تھی۔ کسی کا مقولہ ہے جس کو بچپن میں سنا کرتے تھے اور یوں سمجھتے تھے کہ علم حاصل ہونا بہت سی شرطوں پر موقوف ہے "سات سہاگنیں ہوں تو لاڈو لا اچھا ہے" یعنی یہ کہ شاگرد کو شوق ہو جی لگا کر پڑھے۔ استاد شفیق ہو دل لگا کر شاگرد کو پڑھائے۔ سمجھ سے تو دونوں کو ایک وقت فراغت مزاج خاطر ہو کر پڑھنے پڑھانے میں کسی طرح کا خلل نہ واقع ہو۔ جو کتاب درکار ہو فوراً ہاتھ بہم پہنچ جائے۔ ظاہر ہے کہ اتنی شرائط کا جمع ہونا ہر ایک کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ مجھ کو تو کسی مولوی نے نہ آپ پڑھایا اور نہ پڑھنے دیا۔ آپ نہیں پڑھایا تو ایک بات ہے۔ شکایت تو اس کی ہے کہ پڑھنے بھی نہیں دیا۔ بعض طالب علم دو تین برس کے اندر اندر مجھ سے ملے میں نے ان کو علم کی طرف

سے ایسا ہی کیا اور نقصان پایا جیسے وہ پہلے تھے۔ جس جس پہلو سے میں اُس وقت کو یاد کرتا ہوں جب کہ میں پنجابی کٹڑے کی مسجد میں تھا تو پاتا ہوں کہ میری ساری عمر میں وہ بدترین وقت تھا اور اگر اس کو چار پانچ برس کا بھی امتداد ہوتا تو میں تو دنیا اور دین دونوں طرف سے تباہ ہو گیا تھا۔

عمر گذری ہے مصیبت جھیلتے کیا جانیں ہم
لذت عیش و فراغ و راحت و آرام کو

دلی کالج

بارے ایک عجب اتفاق سے میں دلی کالج کی دوسری عربی جماعت میں داخل ہو گیا۔ فرصت کے وقت ہم دلی کی گلیوں کے چکر لگاتے کبھی کبھی کشمیری دروازے کی طرف بھی نکل جاتے۔ ایک روز کشمیری دروازے کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دلی کالج میں بڑا ہجوم ہے۔ کالج وہاں تھا جہاں اب گورنمنٹ اسکول ہے۔ میں بھی بھیڑ میں گھس گیا۔ معلوم ہوا کہ لڑکوں کا امتحان لینے مفتی صدر الدین صاحب آئے ہیں۔ ہم نے کہا چلو ہم بھی دیکھیں۔ برآمدے میں پہنچا۔ قد چھوٹا تھا۔ لوگوں کی ٹانگوں میں سے ہوتا ہوا گھس گھسا کر کمرے کے دروازے تک پہنچ گیا۔ دیکھا کہ کمرے کے بیچ میں میز بچھی ہے اس کے سامنے کرسی پر مفتی صاحب بیٹھے ہیں۔ ایک ایک لڑکا آتا ہے۔ اس سے سوال کرتے ہیں اور سامنے کاغذ پر کچھ لکھتے جاتے ہیں۔ میز کے دوسرے پہلو کی کرسی پر ایک انگریز بیٹھا ہے۔ یہ مدرسے کے پرنسپل صاحب تھے۔ ہم تماشے میں ہو رہے تھے کہ صاحب کسی کام کے لیے اٹھے تو چپراسیوں نے راستہ صاف کرنا شروع کیا۔ جو لوگ دروازے کے سامنے کھڑے تھے وہ کسی طرح پیچھے نہ ہٹتے تھے۔ چپراسی زبردستی دھکیل رہے تھے اسی دھکا پیل میں میرا توازن بگڑ گیا۔ دروازے کے سامنے سنگ مرمر کا فرش تھا اس پر میرا پاؤں رپٹا اور میں دھم سے گرا۔ اتنی دیر میں پرنسپل صاحب بھی دروازے تک آگئے تھے۔ انھوں نے جو مجھے گرتے دیکھا تو دوڑ کر میری طرف بڑھے۔ اٹھایا اور پوچھنے لگے کہیں چوٹ تو نہیں آئی۔ ان کی شفقت آمیز باتیں اب تک میرے دل پر کا نقش فی الحجر ہیں۔ باتوں باتوں میں پوچھا میاں صاحب زادے کیا پڑھتے ہو؟ میں نے کہا "معلقات" ان کو بڑا تعجب ہوا۔ پھر پوچھا میں نے وہی جواب دیا۔ میری عمر بھی پوچھی میں نے کہا مجھے کیا معلوم۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر بجائے اپنے کام کو جانے کے سیدھے مجھ کو مفتی صاحب کے پاس لے گئے اور کہنے لگے "مفتی صاحب یہ لڑکا کہتا ہے میں معلقات پڑھتا ہوں۔ ذرا دیکھیے تو سچ کہتا ہے یا یونہی باتیں بناتا ہے۔" مفتی صاحب نے کہا "کیا پڑھتا ہے؟" میں نے کہا "معلقات"۔ کہنے لگے "کہاں پڑھتا ہے؟" میں نے کہا پنجابیوں کے کٹڑے کی مسجد میں۔ پھر کہا "معلقات درس پڑھے گا۔" میں نے کہا "جی" انھوں نے میز پر سے کتاب اٹھائی اور میرے ہاتھ میں دے دی اور کہا "یہاں سے پڑھو۔" جس شعر پر انھوں نے انگلی رکھی تھی وہ یہی شعر تھا:

أَبَا هِنْدٍ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْنَا   وَأَنْظِرْنَا نُخَبِّرْكَ الْيَقِينَا

میں نے پڑھا، معنی بیان کیے۔ انھوں نے ترکیب پوچھی، وہ بیان کی۔ مفتی صاحب بہت چکرائے۔ پوچھنے لگے "تجھ کو کون پڑھاتا ہے؟" میں نے کہا مسجد کے مولوی صاحب۔ کہا "مدرسے میں پڑھے گا؟" میں نے جواب دیا "ضرور پڑھوں گا۔" مفتی صاحب نے قلم اٹھا کاغذ پر چند سطریں لکھیں اور پرنسپل صاحب کو دے کر کہا "اس کو سپرنٹنڈنٹ صاحب کے پاس بھیج دو۔" میں وہاں سے نکل کر گھر آیا۔ مولوی صاحب سے کچھ ذکر نہ کیا۔ کوئی سات آٹھ روز کے بعد کالج کا چپراسی مولوی صاحب کے پاس ایک کاغذ لے کر گیا۔ اس میں لکھا تھا کہ نذیر احمد کو کالج میں داخل کرنے کی اجازت ہو گئی ہے۔ کل سے آپ اس لڑکے کو کالج میں آنے کی ہدایت کر دیجیے۔ اس کا وظیفہ بھی ہو گیا ہے۔ چپراسی تو یہ حکم دے کر چلتا بنا اور مجھ کو خدا نے مسجد کی گدایانہ زندگی سے نجات دی۔ مجھ کو مولوی صاحب نے بلایا، خط دکھایا، پوچھا "یہ کیا معاملہ ہے؟" میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ جب زیادہ سختی کی تو تمام واقعہ بیان کیا۔ وہ بہت خوش ہوئے

اور دوسرے روز سے جا بیٹھا تھا پرنسپل کے ہاتھ میں دے دیا۔ کالج کی تعلیم کی ابتدا تھی کہ وطن میں والد کا انتقال ہو گیا۔ دو ڈھائی برس کی جدائی جھیلنی تھی سے دو متقارب العمر لڑکوں کے وظیفوں پر آٹھ دس آدمیوں کی خانہ داری کے بوجھ کا پڑ جانا حقیقت میں مصیبت کے پہاڑ کا ٹوٹ پڑنا تھا۔ والد کا قبل از وقت انتقال تحصیل علم کے لیے کاری تازیانے کا کام کر گیا۔ وطن سے پلٹ کر واپس آیا تو یہ خیال تھا کہ مجھ اکیلے کے نہیں بلکہ سارے خاندان کے ٹو بی آر ناٹ ٹو بی (To be or not to be) کا فیصلہ ہے۔ چنانچہ تحصیل علم کے میدان میں یا تو قدم بقدم چل رہا تھا یا اب لگا سرپٹ دوڑنے باوجودیکہ بجائے خود مدرسے کی پڑھائی کا ایک انبار تھا، میں نے اس وقت کے مشاہیر مدرسے کے علاوہ دو سبق اور شروع کر دیے میلاد دو دن پڑھتا پڑھاتا تھا بلکہ کتابوں کو چاٹتا تھا۔ دن کا تو کیا حساب، دن مجھے یاد نہیں کہ زمانہ طالب علمی میں کسی ایک رات نیند بھر کر سویا ہوں۔ میں اسکالرشپ کے پیچھے ایک چوکیدار کو چند پیسے مہینہ دیا کرتا تھا کہ مجھ کو رات کے دو بجے کتاب بینی کے لیے جگا دے۔ میں گرمیوں میں مکان کے صحن میں لالٹین رکھ کر اور جاڑوں میں باہر صحن میں بیٹھ کر کتاب دیکھتا تھا۔ شاعر سوز ہوں، مجھ کو کئی قسم کے کھیل اور بیچ معلوم تھے اور اگر میں سمجھتا کہ اس طرح کی طالب علمی طالب علموں کے حق میں مفید ہوگی تو کچھ جا نہیں ان لفظوں کے جتا دینے میں دریغ نہ کرتا۔ غرض مجھ کو کئی قسم کے کھیل اور بیچ معلوم تھے اور اب میں خیال کرتا ہوں کہ غالب اسی آل ورک اینڈ نو پلے (All work and no play) کا نتیجہ ہوا ہو تو تعجب نہیں کہ ساری عمر مجھے ریاضی سے ذاتی۔ ایک زمانے میں شطرنج کھیلو تو کھیلتا تھا تو ہمیشہ بازی کھاتا تھا اور برد بیٹھنا بڑی جیت سمجھتا تھا۔

سرکاری مدرسوں کی پڑھائی میں طلب الکل فوت الکل کا عیب شروع سے چلا آتا ہے۔ یعنی نہ تو متعلم کے رجحان طبیعت کو دیکھیں، نہ اس کی رغبت کو پہچانیں، تین تین چار چار درجن مختلف المذاق لڑکوں کی ایک جماعت بنائی اور سب کو ایک ہی لاٹھی ہانکے چلے پھر پڑھائی اتنی کہ لڑکے کے دماغ میں ہر حرف کی طرح اور بے تکے ٹھونسی جاتی ہے اور وہ علم نہیں ہوتی جس کا ضروری نتیجہ ہے کہ جس کو اصلی استعداد کہتے ہیں وہ کسی فن میں بھی حاصل نہیں ہوتی۔ جیک آف آل اینڈ ماسٹر آف نن JOCK OF ALL AND MASTEROF NONE

نہ محقق بود نہ دانشمند
چار پائے برو کتابے چند

اب تو انگریزی کا اس قدر رواج ہو گیا ہے کہ سرکاری مدارس کے طالب علموں میں اور بیرونی طالب علموں میں کسی طرح کا اشتراک باقی نہیں رہا کہ ایک کا دوسرے کے ساتھ مقابلہ کیا جائے مگر میری طالب علمی کے زمانے میں عربی ایسی کس مپرسی کی حالت میں نہ تھی۔ مدرسے اور شہر کے عربی خواں طالب علموں میں ایک طرح کی منافست قائم تھی اور کبھی کبھی دونوں گروہوں میں مٹھ بھیڑ بھی ہو جاتی تھی۔ شہری طالب علم استعداد کے اعتبار سے ہم لوگوں کو اپنا جوڑ نہیں سمجھتے تھے اور واقع میں بھی مدرسے والے شہریوں کی ٹکر کے نہ تھے۔ وجہ یہ کہ شہریوں کے پاس لے دے کر ایک عربی تھی اور وہ بھی اختیاری، جتنا چاہا پڑھا۔ یہ لوگ مطالعے کے بڑے دھنی تھے۔ حاشیے خواہ شرحیں جتنی تھیں جس کتاب کو لے کر بیٹھے اس کی سیاہی تک چاٹ گئے۔ برخلاف مدرسے والوں کے ان کا حال یک سر و ہزار سودا کا تھا۔

یک دل و خیل آرزو دل بکہ بکہ دہم — تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

میں مطالعہ کو بڑی ضروری چیز سمجھتا تھا یعنی اگلے سبق کو زور طبیعت سے آپ نکالتا تھا۔ اس میں ایسی محنت ہوتی تھی کہ جس نے مطالعے کیے ہیں بس اس کا دل جانتا ہے۔ گھنٹوں کتاب پر سر جھکائے جھکائے گردن شل ہو جاتی تھی اور دماغ پر جو زور پڑتا تھا۔ بس اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا

ہے تو اور گھٹنے لگے۔ اچھے زبردست معالجے کے بعد طبیعت اس قدر بحال ہو جاتی تھی کہ گویا بڑی بھاری منزل طے کر کے گئے ہیں۔ زحمت تو بڑی سخت تھی مگر ویسے ہی اس کے تماشے بھی تھے۔ کسی فن کی ایک کتاب بھی اس طرح پر تفرقے سے گزر گئی تو میں جانو کہ اس فن میں اچھا خاصا ماہر ہو گیا۔ استعداد جو از حد بڑھتی تھی۔ میرا یہ حال تھا کہ تاریخ اور ریاضی کے نام سے مجھ کو وحشت ہوتی تھی۔ مگر اسکالرشپ کے لیے چار و ناچار دیکھنا پڑتا تھا۔ ع

جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا

لیکن یہ دیکھنا پارے کا سا چبھتا تھا۔ مگر یہ بڑی خیریت تھی کہ نمبروں کے مجموعے پر پاس اور فیل کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ خدا عربی کا بھلا کرے کہ وہ ریاضی وغیرہ کی تلافی کرتی رہتی تھی اور یہ نہ ہوتا تو میں کسی طرح جماعت میں جم نہیں سکتا تھا۔ پس مجھے جو ایسا جو کچھ بھی آتا ہے میں اس کے لیے کالج سے بڑھ کر باہری پڑھائی کا شکر گزار ہوں۔ اگرچہ یہ شکریہ بھی کالج ہی کی طرف عود کرتا ہے۔ کیوں کہ کالج کا وظیفہ مجھے سپورٹ رہا، نہ کرتا تو میں کسی طرح پڑھنا جاری رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اگرچہ کالج نے عربی میں میری کافی مدد نہیں کی اور اگرچہ بے مناسبتی کی وجہ سے میں نے سائنس کو شوق سے نہیں پڑھا لیکن معلومات کی وسعت، رائے کی آزادی، [illegible]، گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی، اجتہاد کی وجہ، بصیرت، یہ چیزیں جو تعلیم کے عمدہ نتائج ہیں اور جو حقیقت میں شرط زندگی ہیں۔ ان کو میں نے کالج ہی میں سیکھا اور حاصل کیا۔ اگر میں نے کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو میں جاہل رہ جاتا، یا مولوی ہوتا تنگ خیال، متعصب، اکھل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے عیوب کا متجسس، بدخو، بدخلق۔

ترک دنیا بمردم آموزند خویشتن سیم و غلہ اندوزند

کا حال، مسلمانوں کا نادان دوست، تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا بہرا۔

اسی زمانے میں سید احمد خاں فارسی جماعت میں، منشی ذکاء اللہ صاحب کی جماعت میں، اور پیارے لال انگریزی کی جماعت میں پڑھتے تھے۔ میں عربی کی جماعت میں شریک ہوا۔ ایک تو شوق، دوسرے پڑھانے والے ہشیار، تیسرے ایک مضمون اور وہ بھی ایسا جس کا مجھے بچپن سے شوق تھا، تھوڑے ہی دنوں میں اپنی سب جماعت والوں کو دبا لیا۔

پرنسپل صاحب کے کمرے کے بازو میں جو چھوٹا کمرہ ہے اسی میں ہماری جماعت تھی۔ دوسرے پہلو میں جو کمرہ ہے اس میں [illegible] کی جماعت ہم پڑھتے تھے۔ آج کل کے طالب علموں کی طرح [illegible] نہیں لادتے تھے۔ ایک ہی مضمون کی تکمیل کرنا دشوار ہے۔ آج کل پڑھاتے نہیں لادتے ہیں۔ آج پڑھائی کا حال جیسے کچی تعمیر، ایسی دیوار ہے جس میں گارے کا بھی روڑا ہے۔ ٹھیکریاں بھی گھسیڑ دی گئی ہیں۔ مٹی بھی ہے، پتھر بھی ہے، کہیں چونا اور اینٹ بھی ہے۔ ایک دھکا دیا اور اڑاڑا دھم گری۔ ہم کو اس زمانے میں ایک مضمون پڑھاتے تھے، مگر اس میں کامل کر دیتے تھے۔ پڑھانے والے ایسے ویسے [illegible] نہیں ہوتے تھے۔ ایسے کو چھانٹا جاتا تھا جس کے سامنے آج کل کے عالم فاضل [illegible] آتے ہیں۔ یہ حال کا مشرقی اسکول نہیں بلکہ غدر کے پہلے کا کالج جس کو میں تمام ہندوستان کی تعلیم گاہوں میں [illegible]، خدا اس کو جنت نصیب کرے۔ تو بڑی محنت کرتے کرتے چاک ہو گیا اور میرے ساری عمر کی تحصیل میں ایک تمغہ نصیب ہوا وہ بھی کورس کی کتاب پر نہیں بلکہ جواب مضمون پر، تمغہ غدر میں لٹ گیا۔ اس کا اتنا یاد ہے۔ مضمون فراموش۔ شاید شمس العلماء خان بہادر ذکاء اللہ کو یاد ہو گا۔ ان کا حافظہ ماشاء اللہ قوی ہے۔ دوسرے ہم جماعت طالب علموں میں ایک طرح کا تحاسد قائم ہو جاتا ہے اور تحاسد محمود ہے جو شوق کو مشتعل اور محنت کو ہلکا کرتا رہتا ہے۔ تمغہ جیتے دیکھ کر انھوں نے مجھ کو ضرور بری طرح گھورا ہو گا۔

مجھ کو اپنے بچپن کی باتیں یاد آتی ہیں کہ ہمارے دہلی کالج میں بڑے مولوی صاحب یعنی عربی کے مدرس اوّل کو ہی کی شاگردی پر مجھے ناز ہے۔

سو روپیہ تنخواہ ملتی تھی۔ اور اس پر وہ اکثر عسرت کی شکایت کیا کرتے تھے اور ہم طالب علموں کے وظیفے چار روپیے سے گیارہ روپیہ تک تھے تو ہم لوگ آپس میں کہا کرتے تھے۔ کہ گرو مولوی صاحب خلاف واقع اپنی تنگ دستی ظاہر کرتے ہیں۔ کیا ہم لوگ ان کی تنخواہ چھڑانا چاہتے ہیں۔ اُس وقت ہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کوئی شخص سو روپیہ ماہوار کی آمدنی رکھ کر بھی تنگ دست رہ سکتا ہے۔ پھر ہم اُن کے تفصیلی مصارف پر نظر ڈالتے مثلاً کھانا ایک روپیہ تو دوسرا بڑی فیاضی کے ساتھ کتنا کر دیں نہیں نہیں بلکہ پچیس۔ اسی طرح ہر ہر بات اور ہر ہر رقم پر بحث ہوتی۔ اس پر اس سے بھی زیادہ سرگرمی کے ساتھ جو گورنر جنرل کی کونسل میں ہندوستان کے بجٹ پر ہوتی ہے بہر کیف مصارف کا مجموعہ پچاس ساٹھ سے متجاوز نہ ہوتا۔ غرض اس خصوص میں مولوی صاحب کی طرف سے ہم کو بدگمانی رہی۔ آخر وہ دن آیا اور آتا تھا کہ میں کانپور میں ڈپٹی انسپکٹر تھا اور جتنا کہ پہلی تنخواہ سو اسو سے بھی زیادہ مجھ کو ملتی اور اتفاق سے اس وقت وہ ناکافی بھی تھی مجھ کو فوراً مولوی صاحب یاد آئے۔

میں ذرا بھی اس بات کے کہنے میں باک نہیں کرتا کہ کالج کی طالب العلمی کا زمانہ مذہب کی رو سے مجھ پر بڑے ہی تذبذب کا گزرا ہے۔ یہ تو میرا حال تھا جس نے مدت العمر سائنس کا شوق نہیں کیا۔ لڑکے بہرحال ان کے جو سائنس میں جھک تھے اور اُن کا مبلغ العلم یہی سائنس تھا اور بس مجھ کو ساری عمر سائنس سے گریز رہا۔ اس کے دو سبب ہوئے اوّل یہ کہ سائنس کے بعض مضامین اقلیدس جبر و مقابلہ و امثالہا بہت سوچ بچار چاہتے ہیں۔ اس کا جو ہے تو اس سے عہدہ برآ ہو سکے اور اخبار پڑھائی کے ہوتے کسی ایک کا کیسے ہو رہے۔ پس بہت طالب علم ذرا چند کی ایک چیز لے لیتے ہیں اسی پر زیادہ توجہ کرتے اور اسی میں اچھے بھی رہتے ہیں میں نے عربی ادب لے لیا تھا اور سائنس کو بے دھڑک چھوڑتا تھا۔ ادب عربی ساری کی زندگی میں تو میرے بہت کام آیا نہیں مگر اتنا ضرور ہوا کہ عمر بھر کے لیے ایک دل خوش کن مشغلہ ہاتھ آگیا۔ دوسرا سبب سائنس کی طرف سے میری بے رغبتی کا یہ بھی ہوا کہ میری طبیعت واقع ہوئی ہے۔ کنسرویٹو CONSERVATIVE تھوڑا بہت کنسرویٹزم CONSERVATISM تو سبھی طبیعتوں میں ہوتا ہے۔ میری طبیعت میں اس کا عنصر کچھ زیادہ ہے۔ سائنس نے جو میرے مذہبی خیالات پر حملہ کرنا شروع کیا۔ سائنس میں تو مخل کرنے کو طبیعت نے گوارا نہ کیا مگر بے رغبتی کیا کام آئے سائنس کی صدائیں کالج کے در و دیوار میں بڑی گونج رہی تھیں۔ بلکہ ایک وقت تو ایسا آیا کہ گونجتے گونجتے ڈھول بجنے لگے یعنی سائنس کے پروفیسر جناب ماسٹر رام چندر صاحب جو ذات کے کائستھ تھے اور جنھوں نے کتاب میکسیما اینڈ مینیما MAXIMA AND MINIMA تصنیف کر کے تمام یورپ میں اپنی ریاضی دانی کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ اصطباغ لینے پر آمادہ ہوئے۔ دہلی سوسائٹی میں بڑے نامور آدمی تھے اور انھوں نے ڈنکے کی چوٹ عیسائی ہونا چاہا تو تمام شہر میں ڈھنڈورا سا پٹ گیا اور جا بجا مباحثے کی مجلسیں گرم ہو گئیں۔ عربی جماعتوں کے کمرہ میں اور طالب علموں کے ساتھ بھی آئے دن مڈبھیڑ ہوتی رہتی تھی لیکن میں دیکھتا تھا کہ مولوی چپ تو نہیں ہوتے تھے۔ کچھ نہ کچھ کہے ہی جاتے تھے مگر وہ کہنا سمجھنے والے کے نزدیک لاجواب ہونے کے برابر تھا اس لیے یہ لوگ عیسائی مذہب کے گھر کے بھید سے محض ناواقف تھے ان کو خبر ہی نہ تھی کہ عیسائیوں میں کہاں کہاں پانی مرتا ہے۔ ورنہ تو معاملہ پادری ماسٹر صاحب کو بند کرنے کے لیے بس کرتا تھا۔ غرض بات کو صاف سائنس کے زہر نے باوجودیکہ میں نے اس کو ذرا سا چکھا ہی تھا میرے ایمان کو تو ڈانواڈول کر دیا تھا۔

مجھ کو ماسٹر صاحب کے ساتھ ایک خصوصیت بھی تھی۔ اور اکثر ان کے مکان پر بھی جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ ماسٹر صاحب نے بھی مجھ کو گرانا چاہا مگر مجھ کو عربی کا شوق تھا اور قرآن کی عبارت پر طاق تھا۔ اسی تریاق نے مجھ کو اس زہر سے بچایا، یہاں تک کہ کالج سے اپنا ایمان سلامت لے کے نکل گیا گو کلیہ و متزلزل، متخلخل، ضعیف، مضمحل۔ پھر میں نے علم کلام کی کتابیں دیکھنی شروع کیں۔ موافق و مخالف دونوں ماسٹروں نے مجھ کو عیسائی بنانا چاہا

مرحوم [illegible] نے [illegible] سے [illegible] مذہب۔ مناظرے کا ایک انگریزی اور قاعدہ ہے۔ معارضہ بالمثل، جس کے معنی ہیں کہ ایک شخص، دوسرے سے کہے تمھاری آنکھ میں تنکا ہے، اور دوسرا کہے تمھاری آنکھ میں شہتیر۔ اس طریقے سے ممکن ہے کہ بعض صورتوں میں معترض بند ہو جائے۔ لیکن جو تحقیق حق چاہتا ہے دونوں سے بری ہو جاتا ہے۔ ہاں ہر جب سے میں قرآن کے سمجھنے پر قادر ہوا اس کے استحسان میں کبھی ایک لمحے کے لیے بھی کمی نہیں ہوئی اور اس نے مجھے وہ کام دیا جو صحابہ کرام [illegible] ہے۔ ایک [illegible] سے مرحمت ہو۔

انگریزی کے قریب میں کالج میں رہا اور برابر باہر کی پڑھائی کی بھی ڈیوڑھ لگائے رکھی، تو دو ہی کتابیں بھی نظر سے گزر گئیں اور میں نے اس اثنا میں پڑھانا بھی شروع کر دیا تھا۔ میں اپنے میں اتنی استعداد پاتا کہ درس کو جاری رکھتا تو رفتہ رفتہ نکالنے بھی لگتا۔ مگر مولویت کی دکان کا جتنا [illegible] بے طلب۔

اس زندگی میں مجھ کو بھی اتفاق نا ملائم پیش آئے۔ مگر جس قدر رنج مجھ کو ہوئے بیان نہیں کر سکتا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اس وقت کبھی کبھی مجھ کو خودکشی کا بھی خیال آیا ہے۔ لیکن سوچا ہے

بس ملا رہے ہیں ہم پر کرم ہائے روزگار
ایک بے رخی پر روٹھنا شرط وفا نہیں!

تیس روپے میں آدمی دال چپاتی ہی کھا سکتا ہے۔ سسرال کی بدولت الوان نعمت مجھ سے نہیں کھائے جاتے تھے۔ بیوی سے کہتا کہ اس طرح [illegible] مفت کے ٹکڑے توڑوں گا، جب تک خدا مجھے اپنے فضل و کرم سے فارغ البال کرے۔ تم اس کو میری ناخوشی اور ناراضمندی پر محمول نہ کرو۔ خدا اپنی قدرت سے مجھ کو فارغ البال کرے گا تو دیکھو گی کہ میں تم کو کیسا خوش رکھتا ہوں اور یہ تنگ دستی انشاءاللہ چند روزہ ہے تم کو بے دل نہ ہونا چاہیے۔

ملازمت اور سفر پنجاب

۱۸۵۴ء میں مسٹر رچرڈ ٹمپل جو آخر کار سر رچرڈ ٹمپل اور بمبئی کے گورنر ہو گئے تھے، ان دنوں ضلع گجرات شاہ دولہ کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ ہندوستان کے بعض اضلاع آگرہ، متھرا وغیرہ میں سررشتہ تعلیم جاری ہو چکا تھا۔ مسٹر ٹمپل نے اس کی مختصر نقل اپنے ضلع میں کرنی چاہی اور یوں تعلیم کے آفتاب کی پہلی کرن پنجاب میں ضلع گجرات پر پڑی۔ نہیں معلوم گجرات کے لوگوں نے اس قدم کا کچھ اثر لیا اور تعلیم کے اقبال سے وہ ضلع پنجاب کے دوسرے اضلاع سے بڑھ چڑھ کے ہیں یا نہیں۔ مسٹر ٹمپل نے دہلی کالج سے جس کا ان دنوں تعلیم کی دنیا میں ڈنکا بج رہا تھا، چھ مدرس طلب کیے۔ میں نے سوچا کہ لوگوں کو حقیقت مند بنانے کی تدبیری عمر نہیں۔ ضرورت مجھ کو مجبور کرتی تھی کہ میں پنجاب جانا قبول کروں۔ مگر یہی شرط کی کہ میرا جتنا چڑھا ہوا وظیفہ ہے مجھ کو مل جائے تاکہ وہ میرے زاد راہ کے کام آئے۔ جانے کو تو تھے چھ مدرس، تنخواہ پانچ مدرس اور ایک کمشنر [illegible] جب اس حالت میں کہ میں تازہ ولایت تھا، ایسی کالج سے اقبال ہو چلا آتا تھا اور جو کچھ پڑھا تھا سب مستحضر [illegible] تھا، میں کمشنر [illegible] تھا۔ تو اب [illegible] شناس کے میں اپنے تئیں کیا خیال کر سکتا ہوں۔ میں اس وقت کا لکھا پڑھا بے شک بہت کچھ بھول گیا۔ مگر پنجاب کے سفر کو نہیں بھولا اور بھولنے کی چیز بھی نہ تھی۔ غدر کو ہوئے ہوئے کچھ ایسی زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی بھری برسات تھی۔ ندی نالے دریا ہو رہے تھے۔ اور دریا سمندر۔ ٹرنک روڈ (شاہراہ) جاری تھی۔ مگر جا بجا پل نہیں بنے پائے تھے گویا کہ بند تھی۔ اور ان سب پر طرہ یہ کہ ناتجربہ کاری، ناداری، بے سروسامانی۔ غرض وہ جو کتابوں میں سفر کی مصیبتیں پڑھی تھیں ان کی تصدیق ہو گئی اور تئیں دن میں جیسے دلی سے گجرات پہنچا ہوں مجھ کو اس سفر کی صرف صعوبتیں یاد ہیں۔ چونکہ منزل منزل کا سفر تھا۔ میں نے آتے جاتے راہ کے سارے شہروں کو بھی دیکھا۔ ان

ہی سے ایک واہمہ ہی ہے۔ سو کل گنجاہ پہنچ کر میں نے مدرسے کی بنیاد ڈالی اور محنت و شوق سے چند بچے خوش ذہن لڑکے جمع کیے۔ مگر میں اپنی قسمت کو روتا تھا۔ کہ ابھی انٹرنس ہوا کہ ایسی حرف شناس منشی سے میری تقدیر بہکے تھے۔ لوگ سچ کہتے ہیں کہ مکتب کے ونشے میں جی کی عقل چرتی ہے میں میرا اجتہاد وقت گنجاہ میں صرف ہو اہل علم کے اقتباسے میں اس کو حسب تفریق سے تعبیر کرتا ہوں۔ یعنی جس وقت میں نے کالج چھوڑا وہاں کے علاوہ بھی بہت کچھ زبانی یاد تھے۔ یا پنجاب کے دو برس کے قیام میں شاید مشکل سے دو دو بھی یاد رہے ہوں گے باقی سب بھول گئے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ مطالعہ کی قوت دست برد نسیان سے محفوظ رہی ہے

نگیں آرزوئے دل کا کہ بڑی کاوش سے
اسم کو میں نے ترے کندہ کیا ہے اس میں

جب مدرسہ گنجاہ کرنل صاحب کے یہاں چلا گیا تو میں مدرسی میں ذرا خوشحال ہو چکا تھا۔ بہتر سے بہتر مکان رہنے کو ملا۔ کرنل صاحب کی خدمت میں گھوڑے کی سواری کو دونوں وقت عمدہ سے عمدہ کھانا راجہ صاحب کے سر۔ لیکن پنجاب کا قیام مجھ کو ناگوار تھا۔ چھ مہینے نہیں گزرنے پائے تھے کہ میں نے گنجاہ کی دوڑ مسجد سررشتہ تعلیم کے حکام کو عرضیاں درخواستیں شروع کیں تاکہ مجھ کو ان اطراف میں کہیں جگہ مل جائے۔ بارے ایک دم سے دو آفر (offers) ملے۔ اجمیر کالج کی ستر روپے کی عربی مدرسی اور کانپور کی ڈپٹی انسپکٹری۔ میں نے آئندہ کی توقعات کے لحاظ سے ڈپٹی انسپکٹری قبول کر لی۔ جس جائے جو کام دیں پڑے سو کام۔ گنجاہ کی مدرسی کا سا تو حال نہ تھا کہ مدتوں کو بیٹھے بیٹھے کہا۔ مگر یہاں بھی قریب قریب ہماں آتش و رکاسہ بیچے زکات سنتے پھرو۔ تنے میں تو

یاراں فراموش کردند عشق

غدر غدر کا وقت آیا یعنی ۱۸۵۷ء کا مشہور مفسدہ۔ کس کی نوکری اور کیا پڑھنا، جینے کے دے پڑ گئے۔ غدر کے دنوں میں جب باغیوں نے دلی کے سرکاری میگزین کو لوٹا اور لوٹ یا تو بازاری لوگوں میں کم کوئی بچا ہوگا جو کوئی نہ کوئی ہتھیار جاہل بندوق، طمنچہ، اٹھا کر نہ لے گیا ہو۔ جس محلے میں پنجابی کٹرے کی مشہور مسجد تھی۔ اس میں بہت سے مجاہدین آ ٹھہرے تھے۔ ان میں اکثر باہر کے گنوار تھے۔ سو ان غازی لشکر کے رجمنٹ سپاہیوں کا حال یہ تھا کہ نشانہ لگانا اور بندوق چلانا کیسا بیچاروں کو بھرنے کا طریقہ بھی معلوم نہ تھا۔ ان لوگوں کی بڑی بڑی جماعتیں دھاوا کرنے کو جاتیں۔ شام کو جب ہار کر پسپا ہو کے اور یہ واپس آتیں کو ان کی فتح ہوتی تھی۔ دو چار دس پانچ آدمی زخمی بھی ہو جاتے لوگ جانتے کہ لڑائی میں زخمی ہوئے ان کی بڑی قدر و منزلت ہوتی مگر وہ لڑائی کے زخمی نہیں ہوتے تھے وہ زخمی ہوتے تھے۔ اس طرح پر کہ بندوق بھرنی چاہیے تھی ایک انچ ڈیڑھ انچ انھوں نے ناواقفیت کی وجہ سے بھر دی ایک بالشت سوا بالشت۔ ادھر چاپ کرنے سے بندوق پھٹی ادھر پھٹی ہی تھی۔ اپنی ہی طرف کے دو چار دس پندرہ، جس کا وقت آ لگا رخصت ہو گئے اور بندوقیں اپنے فرض سے ادا ہوئیں یہ مجاہد انگریزوں کو گالیاں دیتے کہ ان ایسے تیسوں نے اسی دن کے لیے یہ دھوکے کی بندوقیں بنا بنا کر رکھی تھیں۔

اُن دنوں جب قلعہ پر توپیں چڑھائی گئیں تو شاہزادے جمع ہو کر حضور میں گئے اور عرض کیا کہ اگر توپیں چھوڑی جائیں گی تو خانہ زاد دہل کر مر جائیں گے۔ چنانچہ حضور نے ممانعت کر دی۔ یہ ان لوگوں کی بہادری تھی جنھوں نے انگریزوں کے مقابلے میں علم بغاوت بلند کیا تھا۔ میں اس زمانے کے بہادروں میں نہیں تو بزدلوں میں بھی نہیں۔ بہادری کا سٹینڈرڈ ہی گھٹ گیا ہو تو اس کا میں کیا کروں۔

بیچارا بہادر شاہ مجبور تھا۔ کسی اور پر بھی اگر یہی مصیبت نازل ہوتی تو وہ بھی اسی طرح ان بد معاش ٹھگوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح

پہنچا۔ یہ لوگ بادشاہ کو فائدہ پہنچانے تھوڑی آئے تھے۔ ان کا مقصد تو شہر کو لوٹنا تھا وہ پورا ہوا اور انھوں نے دلی کو کھوکھلا کر دیا۔ ایک روز میں دریبے میں سے جا رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک فوج تلنگوں کی آ رہی ہے۔ میں بھی دیکھ کر گلاب گنڈی کی دوکان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ آگے آگے جھنڈے والے تھے مگر وہ ایسا اندھا دھند دھوں دھڑنگ بنے ہوئے تھے کہ خدا کی پناہ۔ پیچھے کوئی پچاس ساٹھ سوار تھے مگر ان کی عجیب کیفیت تھی گھوڑے کیا تھے۔ دھوبی کے گدھے معلوم ہوتے تھے جن پر یہ سوار تھے۔ مگر گٹھڑیوں کی کثرت سے جسم کا کچھ تھوڑا ہی سا حصہ دکھائی دیتا تھا۔ یہ گٹھڑیاں کیا تھیں؟ دہلی کی لوٹ جس جیسے آدمی کو کھاتا پیتا دیکھا اس کے کپڑے تک اتروا لیے۔ جس روپے پیسے والوں کو دیکھا اس کے گھر پر جا کر دھمکی دی اور کہا چل ہمارے ساتھ قلعے کو تو انگریزوں سے ملا ہوا ہے۔ جب تک کچھ زر نہ رکھوا دیا۔ اس کا پنڈ نہ چھوڑا۔ اگر دہلی کے چاروں طرف انگریزی فوج کا محاصرہ نہ ہوتا تو شریف لوگ بھی کے دہلی سے نکل گئے ہوتے مگر خدائی فوجداروں کا یہ لشکر ٹل جاتا" دن دن کے تڑکے رات۔ میرے سامنے سے گذرا۔ اس ہجوم بے تمیز کے بیچوں بیچ دولھا میاں تھے یہ کون تھے۔ عالی جناب بہادر خاں صاحب سپہ سالار۔ لباس سے بجائے سپہ سالار کے دولھا معلوم ہوتے تھے۔ جڑاؤ زیور میں لدے ہوئے تھے۔ پہنتے وقت شاید یہ بھی معلوم کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی گئی تھی کہ کون سا مردانہ زیور ہے اور کون سا زنانہ۔ صافے پر بجائے طرے کے سرا سری لگائی تھی۔ جیسے خود زیور سے آراستہ تھے اسی طرح ان کا گھوڑا بھی زیور سے لدا ہوا تھا۔ شان کے آنے کی طرح اینٹھے جاتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ گویا بادشاہی خدائی اب ان کے ہاتھ آ گئی ہے۔ گلاب گنڈی نے جو ان لٹیروں کو آتے دیکھا پیچھے سے دوکان بند کر دی اور اندر دروازوں سے بیٹھا جھانکتا رہا۔ خدا معلوم کیا اتفاق ہوا کہ بہادر خاں کا گھوڑا عین اس کی دوکان کے سامنے آ کر رکا۔ بہادر خاں نے ادھر ادھر گردن پھیری پوچھا یہ کس کی دوکان ہے ان کے ہمرکاب نے عرض کی کہ گلاب گنڈی کی۔ فرمایا اس بدمعاش کو خبر نہیں تھی کہ ہم بدولت ادھر سے گزر رہے ہیں۔ دوکان بند کرنے کے کیا معنی ابھی کھلواؤ۔ خبر نہیں کہ اس حکم قضا شیم کا بیچارے لالہ جی پر کیا اثر ہوا۔ ہم نے تو یہ دیکھا کہ ایک سپاہی نے تلوار کا دستہ کواڑ پر مارا کہ دروازہ کھولو اور جس طرح سم سم کھل جا کے الفاظ سے علی بابا کے قصے میں چوروں کے خزانے کا دروازہ کھلتا تھا اسی طرح اس حکم سے گلاب گنڈی کی دوکان کھل گئی۔ عجب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تماشے کا پردہ اٹھ گیا۔ دروازے کے بیچوں بیچ لالہ جی دہلیز کے نیچے ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ کچھ بولنا چاہتے تھے۔ مگر زبان یاری نہ دیتی تھی۔ اس وقت بہادر خاں کچھ خوش خوش تھے۔ کسی مرغی آسامی کو ذبح کر آئے ہونگے۔ کہنے لگے تمہاری ہی دوکان سے بادشاہ کے ہاں عطر جاتا ہے۔ لالہ جی نے بڑے زور سے گردن کو ٹوٹی ہوئی گڑیا کی طرح جھٹکا دیا۔ حکم ہوا کہ جو عطر بہتر سے بہتر ہو وہ حاضر کرو۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے اندر گئے اور دو کنٹر عطر سے بھرے ہوئے حاضر کیے۔ معلوم نہیں بیس روپیہ تولہ کا عطر تھا یا تیس روپیہ تولہ کا۔ بہادر خاں نے دونوں کنٹر لیے کاگ نکالنے کی تکلیف کون گوارا کرتا ایک کی گردن دوسرے سے ٹکرا دی۔ دونوں گردنیں کھٹ سے ٹوٹ گئیں۔ عطر سونگھا، کچھ پسند آیا۔ ایک کنٹر گھوڑے کی ایال پر الٹ دیا اور دوسرا دُم پر کنٹر پھینک کر حکم دیا گیا "مارچ"۔ اس طرح بیچارے گلاب گنڈی کا سینکڑوں روپیہ کا نقصان کر کے یہ ہندوستان کو آزادی دلانے والے چل دیئے۔ ادھر اس خدائی فوجدار کا جانا اور ادھر ہم لونڈوں کا تالیاں بجانا۔ بیچارے لالہ جی نے غصے سے جھلا کر دوکان بند کر دی۔

غدر کے طوفان بدتمیزی میں نقصان تو جو ہوتا تھا وہ ہوا۔ مگر کالج کی دوربین توڑ کر جو نقصان اس بے سری فوج نے ملک کو پہنچایا اس کی تلافی ناممکن ہے۔ پرنسپل صاحب کہا کرتے تھے کہ یہ دوربین یورپ کے ایک بڑے دولت مند انگریز نے کالج کی نذر کی ہے۔ اس کے سامنے کا شیشہ بڑی دقت سے تیار ہوا تھا۔ اس انگریز کے خاندان والوں نے برسوں میں اسے گھس کر پتلا اور ایسا تیار کیا تھا کہ کاغذ سے بھی باریک ہو گیا تھا۔ یہ دوربین کالج کا سرمایۂ ناز تھی۔

ہماری تقدیر میں تو انگریزی علم و ادب کی برکات سے متمتع ہونا لکھا تھا۔ ہم مولویوں کے خاندان سے ایک بڑے دھڑے کی [illegible]

باغیوں نے انگریز پردہ نشین عیسائی بیبیوں کو جمع کر کے میگزین کے میدان میں بٹھا دی ان میں مسز لیسن MRS LEISON بھی تھیں یہ بھی زخمی ہو چکی تھیں۔ ان کو مولویوں نے اپنے یہاں رکھ کر ان کی مرہم پٹی کی۔ تو وہ تندرست ہو گئیں میں بھی اس کی جان بچانے میں شریک رہا۔ دہلی کی فتح سے پہلے ان کو انگریزی کیمپ میں پہنچا دیا۔ یہ خیر خواہی قطع نظر اس کے کہ ایسے نازک اور خطرناک وقت میں تھی

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

مولویوں کے خاندان سے ہوئی اور ایسی رازداری کے ساتھ کہ ایک طرف مسجد میں جہادی نعرے پڑے تھے اور دوسری طرف ان کے پڑوس میں تھی

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے

ایک لیڈی کی جان بچنے ٹھہری رہی اور اس کی جائے معجزہ کی یہ خیر خواہی فی نفسہٖ اس درجے کی تھی کہ گورنمنٹ اس کے صلے میں جو کچھ کرتی کم تھا مگر مولویوں کے باہمی اختلاف نے جو ان کی گھٹی میں پڑا ہے۔ اتنی بڑی خیر خواہی کو خاک میں ملا دیا جس کو کم اس خیر خواہی کی رازداری میں تو مولویوں کے خاندان کا بچہ بچہ شریک تھا۔ مگر اس وقت رئیس خاندان دو تھے مولوی نذیر حسین صاحب جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے اور میرے خسر مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم۔ اور خیر خواہی بھی ان ہی دو کا نام تھا۔ باوجودیکہ دونوں میں سالے بہنوئی کا رشتہ بھی تھا اس پر بھی دونوں میں اختلاف ہوا اور خیر خواہی کا انعام یہ ملا کہ جنرل بخت خاں باغی نے مولویوں سے زبردستی جہاد کے فتوے پر مہریں کرائی تھیں اگر یہ خیر خواہی نہ ہوتی تو ان کو پھانسی ملتی انھوں نے میم کی جان بچائی سرکار نے ان کی جان بخشی فرمائی۔ پھر دونوں نے اس اختلاف کا خمیازہ بھی بھگتا۔ میں نے جو یہ پھوٹ دیکھی بحالی کا حکم لے الٰہ آباد میں جا کر دم لیا۔ جان بچی لاکھوں پائے غدر کی وجہ سے گورنمنٹ کی مشینری کے سارے کل پرزے ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ خاص کر سررشتہ تعلیم ایسا چوپٹ ہوا کہ اس کو سنبھلتے سنبھلتے کئی برس لگے۔ میں نے غدر کی یہ حکایت اس لیے بیان کی کہ مجھ کو جتنا کچھ بھی اس خیر خواہی میں دخل یا اس سے تعلق تھا وہ کالج کی صحبت کا اثر تھا۔ غدر کے دو تین برس بعد سررشتہ تعلیم تو چل گیا مگر جس چیز کو میری آنکھیں ڈھونڈتی تھیں یعنی اس کا تذکرہ تک نہ تھا وہی ناپید رہی یعنی دہلی کالج۔ ہاں سعادت توفیق سے اب میری اپنی تعلیم نے ایک دوسری شان اختیار کی جس نے میری پچھلی تعلیم کی خاطر خواہ داد دی اور مجھ کو ایک ایسے شغل سے لگا دیا کہ وہ مجھے ساری عمر کے لیے بس کرتا ہے اور اب عمر کی طرف سے میری خاطر جمع ہے جیسے ایک پیاسا چشمۂ آب حیات پر بیٹھا ہے اور اس کا دل سیر ہے۔ جب چاہے گا پی لے گا۔ تشریح اس اجمال کی یہ ہے

انگریزی تعلیم

میں ایسے باپ کا بیٹا ہوں کہ دلی کالج کے پرنسپل نے ہر چند چاہا کہ میں انگریزی پڑھوں۔ والد مرحوم نے جو ایک غریب آدمی تھے مگر اپنے وقت کے بڑے دین دار، صاف کہہ دیا کہ مجھے اس کا مر جانا منظور اس کا بھیک مانگنا قبول مگر انگریزی پڑھنا گوارا نہیں اور خود میں بھی انگریزی کی طرف سے بدگمان ہی سا رہا۔ الٰہ آباد میں عبداللہ خاں مرحوم اہل عدالت نے مجھے مکان میں ٹھہرایا۔ بیٹھک میری ان کی مشترک تھی ساتھ کے اٹھنے بیٹھنے سے معلوم ہوا کہ انھوں نے اردو کی تحصیل کے علاوہ مشن اسکول میں انگریزی کی تعلیم بھی پائی ہے۔ یہ معلوم کر کے میں نے کسی قدر ٹٹول کر دیکھا تو ان کو پکا مسلمان پایا۔ علم کے ساتھ صوم و صلوٰۃ کے پابند باوجودیکہ انگریزی میں بھی لیاقت ہے مگر وضع ظاہر طرز ماند و بود اور گفتگو سے کوئی جان نہیں سکتا کہ ان کو انگریزی چھو بھی گئی ہے۔ عبداللہ خاں کی وہ ادا جس کو میں نے بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا یہ تھی کہ غدر کے فتنے نے جو آگ ملک میں لگائی تھی وہ ابھی بڑی سلگ رہی تھی۔ یعنی دار و گیر جاری تھی اور جو لوگ ناکردہ گناہ دشمنوں کی مخبری پر پا

محض احتساب پر مامور تھے ان کے عزیز و قریب ان کی رہائی کے لیے یہاں صدر الہ آباد میں آ کر پڑے ہوئے تھے۔ اور ان کو انگریزی درخواستیں اور اپیلیں لکھوانے کی ضرورت ہوتی تھی اور وکیلوں اور بیرسٹروں کی یہ کیفیت کہ کسی کو گھر بیچے اور کسی کو آگ تاپے۔ میں عبداللہ خاں کو دیکھتا تھا کہ راتوں کو بیٹھ کر مسلمانوں کی اپیلیں مفت لکھتے اور ان کی پیروی بھی کرتے سمجھتے کے ساتھ تھے اس وقت مسلمانوں کی امداد و خیر خواہی کا اس سے بڑھ کر کوئی پیرایہ نہیں تھا۔ پہلے شخص جنھوں نے انگریزی اور انگریزی دانوں کی طرف سے میری منافرت کو دور کیا وہ عبداللہ خاں تھے۔ عبداللہ خاں کو دیکھ کر میں نے جانا کہ اچھا انگریزی داں اسلامی خیالات والا بھی ہے۔ عبداللہ خاں عربی داں تو تھے ہی انگریزی سے قرآن کی آیتوں اور حدیثوں کے معنی پوچھتے رہتے تھے۔ تو میں مشکل الفاظ اس طرح سمجھاتا کہ وہ جلدی سے سمجھ لیتے اور عبارت سے استنباطِ مطلب پر قادر ہو جاتے تھے۔ یوں تو برابر عبداللہ خاں مجھ سے انگریزی پڑھنے کے لیے کہتے رہتے تھے۔ اب انھوں نے میری خوشامد اور کے صلے میں زیادہ اصرار کرنا شروع کیا اور کہا میں تم کو انگریزی سکھا دوں گا۔ غرض کہ میں نے انگریزی پڑھنی شروع کی مگر مشکل یہ تھی کہ میری نوکری تھی دورے کی تو میں کیا کرتا کہ سمال ٹاپ عربین نائٹس (SMALL TOP ARABIAN NIGHTS) لے دس دس پندرہ پندرہ صفحے عبداللہ خاں سے دیکھ لیتا اور دورے میں ان کو رٹا کرتا۔ شروع شروع میں تو انگریزی کے ہجوں سے ایک طرح کی وحشت ہوتی مگر جب ہزار دو ہزار لفظ ذہن نشین ہو گئے تو میں انگلش انٹو اردو ڈکشنری (ENGLISH INTO URDU DICTIONARY) کی مدد سے آسان آسان عبارتوں کا مطلب نکالنے لگا۔ غرض یہ ہے کہ میں اس طرح پر انگریزی سیکھنے میں مجھ کو یہ بات معلوم ہوئی کہ آدمی کوئی سی زبان بھی باقاعدہ سیکھے تو اس کی مدد سے دوسری زبان کا سیکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ میں نے انگریزی سبقاً سبقاً ترتیب سے نہیں پڑھی اور انگریزی کی گرامر مجھے اب تک نہیں آتی۔ مگر چونکہ عربی قواعد کو پڑھی تھی اس نے انگریزی کو میرے لیے ایسا آسان کر دیا کہ جو مدرسے کے لڑکے برسوں میں کرتے ہیں میں نے مہینوں میں کر لیا۔

میں ان دنوں مدارس الہ آباد کا ڈپٹی انسپکٹر تھا اور مجھ کو دورے کی ضرورت سے اکثر ریل پر سفر کرنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ چونکہ ریل نئی چیز تھی انتظام میں بھی بہت سے نقص تھے۔

ایک مرتبہ سفر میں مجھ سے لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ انگریزوں کی صنعت و ایجاد کا ذکر تھا، ریل کا نام آیا تو ایک صاحب بولے کہ ریل تو جانے کب مدتوں سے قسطنطنیہ میں حضرت سلطان روم کے اصطبل کی لید وغیرہ اٹھانے کے لیے کام میں لائی جاتی ہے۔ کسی انگریز کی نظر پڑ گئی اور وہ فوراً اڑا لایا۔ بات تو کچھ نہیں مگر ایسی ہی ایسی باتوں سے پتہ لگتا ہے کہ انگریزوں کی نسبت کیسے خیالات تھے۔

ترجمہ انکم ٹیکس

میرزا امر علی خاں ذوالقدر مرحوم نے جو الہ آباد میں اول درجے کے ڈپٹی کلکٹر تھے، اور میرے حال پر خاص عنایت فرماتے تھے میری انگریزی کو بے تکلف ذہانت پر محمول فرمایا اور چونکہ خود ذکاوت اور لیاقت کے قدر شناس تھے۔ مجھ کو عزیز رکھنے لگے اسی اثنا میں اول بار انکم ٹیکس ایکٹ جاری ہوا۔ سر ولیم میور نے جو ان دنوں ریونیو بورڈ کے سینئر ممبر تھے میرزا امر علی خاں سے اس کے اردو ترجمے کی فرمائش کی۔ انھوں نے عذر کیا کہ مجھ کو انگریزی نہیں آتی۔ ہاں ایک شخص میری نظر میں ہے میں اس کو حاضر کروں گا حضور اس کا امتحان لے لیں میرے نزدیک وہ کر سکے گا، اور اچھا کر سکے گا۔ وہاں تو ڈپٹی صاحب نے یہ کہا اور مجھ کو بلا کر فرمایا کہ میں تیرا نام لے آیا ہوں اور کل ہی تجھ کو میور صاحب کے پاس لے چلوں گا۔ یہ سن کر میرے تو ہوش اڑ گئے اور میں نے کہا کہ آپ نے یہ کیا غضب کیا۔ میں آج ہی رات کو دورے پر چلا جاتا ہوں۔ فرمایا کہ کہیں جاؤ۔ وہ جو تمھارے انسپکٹر ہیں بابو شیو پرشاد ان کے نام حکم جائے گا۔ اور وہ تم کو پکڑ کر بھیج دیں گے۔ میں دیر تک حجت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ڈپٹی صاحب ناخوش ہونے لگے اور میں نے سمجھا کہ واقعی میں انھوں نے ناحق کہ میرا نام لے دیا۔ گھر میں چلا آیا مجھ کو ساری رات نیند نہیں آئی

اسی خیال میں مستغرق رہا کہ "دے بندش" ہو گا اور پہنچتے ہی میور صاحب انگریزی بولیں گے تو میں کیا سمجھوں گا اور کیا جواب دوں گا۔ ایسے خیالات نے مجھے رات بھر بے چین رکھا۔ اگلے دن دس بجے تھے کہ اردلی دوڑا ہوا آیا کہ ڈپٹی صاحب بگھی لیے کھڑے ہیں۔ جا پہنچا۔ راستے بھر مارے جھجکنے کے میں نے ڈپٹی صاحب سے آنکھ تک نہیں ملائی۔ ڈپٹی صاحب مجھے باہر بٹھا آپ اندر چلے گئے۔ میں کوئی چار پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ میری طلبی آئی۔ قریب جا کر سلام کیا۔ دیکھا کہ سخت مدیم الفرصت ہیں۔ انگریزی کاغذات کے بہت سے بنڈل سامنے دھرے ہیں۔ سر جھکائے دیکھ دیکھ کر اپنی پنسل سے کچھ لکھا اور الگ رکھ دیا۔ مجھے سلام کرتے کو تو کیا دیکھا ہو گا، مگر میری آہٹ پا کر جھکے جھکے اردو میں پوچھا کہ علم کہاں حاصل کیا؟ عرض کیا دہلی کالج میں۔ اتنا میری زبان سے اور نکلا کہ جب حضور نے ضرورت سے پہلے کالج کا ملاحظہ فرمایا تو میں عربی کی اول جماعت میں تھا بلکہ حضور نے مجھ سے تاریخ یمنی کا ایک قصیدہ بھی پڑھوا کر سنا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ سر ولیم میور نے میری اس بات کو توجہ سے سنا یا نہیں۔ مگر سامنے گرٹ کی ہسٹری پڑی تھی اٹھا کر مجھے دی اور فرمایا کہیں سے اس کے ایک چیپٹر کا ترجمہ کر کے آج ہی کے دن اسی وقت مجھ کو دکھا جانا۔ اس کے بعد ڈپٹی صاحب اور میں دونوں رخصت ہوئے۔ رستے میں ڈپٹی صاحب نے مجھے خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ مکان پر پہنچنے کے ساتھ ہی میں تو ستو باندھ کر ترجمے کے پیچھے پڑا۔ چھوٹا سا چیپٹر CHEPTER منتخب کیا۔ الفاظ کو ڈکشنری میں دیکھا اور مطالعے کے زور سے مطلب سمجھا پھر ترجمہ کر ڈالا تھا۔ میعاد سے تین دن پہلے میں نے اصل و ترجمہ ڈپٹی صاحب کے پاس بھیج دیا کہ وہ بھی ایک نظر دیکھ لیں۔ یہ ایسے ہی موقع پر اسی وقت میور صاحب کے پاس لے گئے۔ انھوں نے دیکھ کر پسند کیا اور فرمایا کہ نذیر احمد ترجمہ کرے اور [illegible] صاحب سیکرٹری کو دکھاتا رہے۔ ڈپٹی صاحب نے کہا کہ وہ سر رشتہ تعلیم کا ملازم ہے اور اکثر دورے میں رہتا ہے۔ اس پر میور صاحب نے بابو شیو پرشاد صاحب کے نام ایک چٹ لکھ دی کہ نذیر احمد کو انکم ٹیکس ایکٹ کے ترجمے کے لیے اس کام سے سبکدوش کر دو۔ یہاں کا قصہ یہاں چھوڑا۔ یہاں سنو اب ذرا ترجمے کا بیان۔ میور صاحب نے جو دن مقرر فرمایا تھا میں نے ایک دن پہلے ڈپٹی صاحب سے جا کر کہا کہ اب کل مجھ کو لے چلیے گا۔ ڈپٹی صاحب نے دو تین چھینکے ہو کر فرمایا کہ مجھ سے جو نادانی ہوئی تھی۔ میں نے ان کو بتا دیا۔ اب تم جاؤ اور میور صاحب جانیں۔ میں نے بہتری ہی منت اور سماجت کی انھوں نے میور صاحب تک چلنے کی حامی ہی نہ بھری۔ یہاں تک کہ میعاد کے دن میں نے صبح سے جا کر دھرنا دیا پھر بھی وہ انکار ہی کرتے رہے۔ جب مجھے خوب زچ کر لیا اور میں رونکھا سا ہوا تو ایک لفافہ میرے آگے ڈال دیا۔ اس میں میور صاحب کی دستخطی چٹ بابو شیو پرشاد صاحب کے نام تھی کہ نذیر احمد کو انکم ٹیکس ایکٹ کے ترجمے کے لیے اس کام سے سبکدوش کر دو۔ میں اطمینان سے ترجمے کے کام میں مشغول ہو گیا۔ آدھا ترجمہ کر چکا تھا کہ بابو صاحب آ دھمکے اور میں ان کی پیش دستی میں ترجمہ کرنے لگا۔ اس سے مجھ کو بے دلی سی ہوئی مگر ڈپٹی صاحب نے سمجھایا کہ میور صاحب اور [illegible] صاحب تم کو جان چکے ہیں۔ ان کو اتنا جاننا تمھارے لیے بس کرتا ہے۔ ڈپٹی صاحب: تمھارے لکھے ہوئے میں بابو صاحب نے تو کچھ تصرف نہیں کیا؟ میں نے کہا ایک نقطے کا بھی نہیں۔ ڈپٹی صاحب: بس تو مال میں آنے کی تیاری کرو۔ یہ کہہ کر مجھے شفقت سے زیادہ پاس بٹھایا اور خوش ہو ہو کر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے جیسے اُن کو میری آئندہ ترقی کا اذعان تھا یہ ہے [illegible]۔ انکم ٹیکس ایکٹ کے ترجمے پر تو اس کے سوا کوئی قابل منفعت مرتب ہوئی نہیں کہ بابو شیو پرشاد صاحب [illegible] صاحب کے پاس میرا آنا جانا سن کر ذرا سیدھی طرح بات کرنے لگے اور ہاں میری انگریزی کو اس سے بہت فائدہ پہنچا۔ اسباب مجھ کو عربی کی تھوڑی یا انکم ٹیکس ایکٹ کے ترجمے کا کام سن کر میرے حواس باختہ ہو گئے تھے یا اب ایسا ہوا کہ میں نے [illegible] صاحب سے مانگ کر بورڈ کے کئی سرکلر ترجمے اور میں ایسا خیال کرتا ہوں کہ ترجمے کی جنتری میں سے نکل کر میری اردو کی تحریر بھی ٹھیک ہو گئی اور مجھ کو ان مثلوں اور قافیہ بندی اور مبالغہ اور استعارات

اور تشبیہات کے بدون سادہ سلیس شگفتہ عبارت میں ادائے مطلب کا ڈھنگ آ گیا۔ جس کو آگے چل کر لوگوں نے بہت پسند کیا ادھر تو میری طبیعت ترجمے کی سان پر چڑھی ہوئی تھی ادھر اسی کے مقارن سر جارج ایڈمنسٹن Sir George Edmonstone جو اپنی خاص نگرانی میں پینل کوڈ (Penal Code) کا اردو ترجمہ کرا رہے تھے۔

ترجمہ تعزیرات

اس طرح پر کہ ریبی کے منشی عظمت اللہ ترجمے کرتے پھر ریڈ Reade صاحب ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن کے میر منشی مولوی کریم بخش صاحب اس کو بناتے پھر ریڈ صاحب انگریزی سے مقابلہ کرتے۔ اس سب کے بعد وہ ترجمہ اصلاح خاتم کے لیے لفٹننٹ لاٹ صاحب کو سنایا جاتا۔ تب کہیں جا کر وہ ٹھکانے سے بیٹھتا۔ لاٹ صاحب حسب معمول سرمائی دورے کے لیے پہاڑ پر سے اترے الٰہ آباد پہنچے ہیں ابھی ہفتہ عشرے کی دیر ہے کہ ریڈ صاحب کی چٹھی میرے نام آئی کہ لاٹ صاحب صرف دو دن الٰہ آباد ٹھہر کر بنارس چلے جائیں گے عظمت اللہ، کریم بخش ان کے ساتھ مجھ سے آگے بڑھ جائیں گے۔ میں چند روز بنارس ہی صاحب کمشنر کے یہاں الٰہ آباد ٹھہروں گا۔ تم کچہری کے وقت میں عظمت اللہ کا ترجمہ مجھے سنا دیا کرنا چنانچہ لاٹ صاحب آئے بھی اور گئے بھی میں حکم کے مطابق ہر روز جاتا اور جس طرح حاکم کے سامنے رپورٹ خوانی ہوتی ہے منشی عظمت اللہ کا ترجمہ مولوی کریم بخش کا بنایا ہوا ریڈ صاحب کو سنا کر چلا آتا۔ ریڈ صاحب جگہ جگہ رکتے اور کبھی کبھی ناخوش بھی ہوتے۔ مجھ پر نہیں مترجموں پر۔ سو دو تین دفعات کہیں تین چار گھنٹے میں پاس ہوتیں۔ مجھے بڑا تاؤ آتا تھا کہ ترجمہ کے کوئی اور یہ باتیں سے کوئی غرض بھی یہ ضرور کہوں گا کہ وہ بھلا آدمی جو بات کہتا تھا یا دن تو پادری کی کہتا تھا۔ جو اعتراض کرتا تھا وہ ٹھکانے کا ہوتا تھا۔ یہاں پرانے زمانے کے انگریز صف کی اردو سمجھتے تھے گو اچھی اردو لکھ نہ سکیں مگر ترجمے کی غلطیاں نکالتے تھے اور دلی والوں کے کان پکڑوا دیں۔ میں نے بھی ترجمہ دیکھا تو واقعی کچھ اطراف اکثر اصلاح معلوم ہوتا۔ میں نے دل میں کہا کہ نذیر احمد تو بھی تم ٹھونک کر میدان میں کیوں نہیں آ جاتا۔ اردو جانتا ہے۔ فارسی جانتا ہے۔ عربی جانتا ہے۔ کچھ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی سمجھتا ہے۔ ان لوگوں سے اچھا نہیں تو کم سے کم ایسا ترجمہ تو کرے گا۔ میں تین چار دن تو ریڈ صاحب کا رنگ ڈھنگ دیکھتا رہا کہ کیا چاہتے ہیں اور کہاں اٹکتے ہیں۔ جب اس کی اٹکل مل گئی تو میں سوا دو روپے کی رائل ڈکشنری بازار سے خرید لایا۔ رات کو لیمپ جلا، کپڑے اتار، لنگوٹ باندھ، ترجمے پر پل پڑا۔ جن دفعات کا ترجمہ دوسرے دن پیش ہونے والا تھا ان کا ترجمہ خود کر ڈالا دوسرے روز ترجمہ جیب میں ڈال دفتر پہنچا۔ ڈائرکٹر صاحب آئے مجھے بلایا اور ان لوگوں کے ترجمہ کو سن کر وہی گڑبڑ شروع کی خدا خدا کر کے یہ مشکل آسان ہوئی۔ میں نے کہا کہ حضور میں بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔ کہا اچھا کہو۔ میں نے جیب سے کاغذ نکالا وہ سمجھے عرضی ہے لینے کو ہاتھ بڑھایا۔ میں نے کہا عرضی نہیں ہے آج کی دفعات کا ترجمہ میں نے کیا ہے۔ ڈائرکٹر صاحب یہ سن کر اچھل پڑے کہنے لگے "تم نے تم نے ترجمہ کیا ہے؟ تم تو انگریزی نہیں جانتے پھر ترجمہ کیسے کیا؟" میں نے کہا کہ رائل ڈکشنری سے۔ انھوں نے ہنس کر کہا تعزیرات کا ترجمہ رائل ڈکشنری سے نہیں ہوا کرتا۔ میں نے کہا سن تو لیجیے۔ کہا اچھا سناؤ۔ میں نے پڑھا تو صاحب بہادر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کہنے لگے یہ ترجمہ تم نے رائل ڈکشنری سے کیا ہے؟ میں نے کہا "ہاں"۔ کہنے لگے کل شروع کی چار دفعات کا ترجمہ کر کے لاؤ۔ میں دوسرے دن لے کر گیا۔ بہت پسند کیا اور کہا تم نے پہلے ہی کیوں نہ کہا کہ میں ترجمہ کر سکتا ہوں۔ جو میرا اتنا وقت ضائع کرایا۔ جاؤ تم بھی اس ترجمہ کرنے والوں میں شریک ہو جاؤ۔"

ریڈ صاحب نے ترجمہ مجھ سے لے لیا اور لاٹ صاحب کے نام کی ایک چٹھی میرے حوالے کی کہ آج ہی ڈاک میں بنارس پہنچ کر یہ چٹھی لاٹ صاحب کو دو وہ تم کو ترجمے میں شریک کر لیں گے اور میں بھی آج کے چوتھے دن لاٹ صاحب کے کیمپ میں ہوں گا۔ غرض کہ میں بنارس پہنچا

اور منشی عظمت اللہ اور مولوی کریم بخش کے ساتھ ثالث الثلاثہ بنا لیا گیا۔ میرا منصب کرٹیسائز (CRITICIZE) یعنی نکتہ چینی کا تھا۔ میں نے اسی میں واٹ صاحب اور ریڈ صاحب دونوں کی نظر میں اتنا اعتبار پیدا کر لیا کہ ترجمے کے ختم ہوتے ہی بجائے منشی عظمت اللہ اور مولوی کریم بخش کو دیا یعنی پانچ چھ سو کی جیب کی قیمتی گھڑی۔ جس کے ڈھکنے کے اندر نام اور عطیہ گورنمنٹ ولایت سے کندہ ہو کر آیا اور ڈپٹی کلکٹری کے لیے تینوں کو یکساں نام زد کر دیا۔ ہاں اس کو جو چاہو سمجھو کہ میں نے بلا اجازت لفٹنٹ گورنر و کمشنر کے یہاں ترجمہ بھیج دیا۔ میں نے انڈکس بنایا۔ میں نے دفعات کے خلاصے لکھے۔ میری اس کامیابی سے یوں تو جیسا قاعدہ ہے میرے دوست احباب بھی خوش ہوئے، لیکن اوروں کی خوشی خالی خوشی تھی ہاں لکھنؤ سے واپس آ کر جو میں ڈ صاحب کے سلام کو گیا۔ تو انھوں نے کہا کہ تم نے بڑی دیر لگائی کانپور میں ایک تحصیل داری خالی ہونے والی ہے۔ میں نے تمھارے انتظار میں اس کو روک رکھا ہے۔ ڈپٹی کلکٹری تو آپ لوگوں کو ملے گی ضرور ملے گی مگر میرے نزدیک پایہ بہ پایہ چڑھنا اچھا ہے۔ اور میں بھی عنقریب کلکٹری پر جانے والا ہوں میں نے سوچا کہ "نقد را بہ نسیہ گذاشتن کار خردمنداں نیست" جیسا آیا تھا ویسا ہی ڈ صاحب سے چٹھی لے کر کانپور کو لوٹ گیا۔

تحصیل داری

تحصیل دار ہوا تو "سائنس علم دریاؤ" میں تھا اس کوچے سے نابلد۔ عقلوں پر اپنا وقار قائم رکھ کر کام سے آگاہی پیدا کرنے کے لیے محکمہ قانون اور ہدایت نامہ اور سرکلر اور دستور العمل اور مثلوں کے دیکھنے میں طالب العلموں سے بہت کرنی پڑی اور شاید کارروائی کے لیے میں اتنی محنت بھی نہ کرتا تحصیل داروں کے امتحان میں تین چار مہینے باقی تھے اور میں جدید الخدمت ہونے کا عذر کر کے تو ضرور بچ جاتا۔ مگر میں نے کہا کہ برسوں تک کا کھٹکا دل میں رہے۔ میں نے جان توڑ کر ایسی محنت کی روزمرہ کے کام کو بھی پسماندہ نہ ہونے دیا اور ساتھ کے ساتھ امتحان کے لیے بھی تیاری کرتا رہا۔ اس محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساتھ کے امتحان دینے والوں میں سب سے اول رہا۔ اب یہ وقت آیا تھا کہ میں دن بھر کا ذہن کلانے بیٹھا حتیٰ یہ پایا کہ گو وہ جو کہتے ہیں کہ کام کرنے کو کام کی کمی نہیں۔ انھی دنوں ایکٹ ۲۵ سنہ ۱۸۶۱ عیسوی کا اردو ترجمہ ضابطہ فوجداری گورنمنٹ گزٹ میں شائع ہوا باوجودیکہ ضابطہ گویا قانون تعزیرات ہند کا ضمیمہ تھا جیسے تھا تعزیرات ہند بلکہ بے طرح ہم ہی لوگ ضابطہ کا ترجمہ کرتے مگر کسی کو اس کا خیال نہ آیا اور مسٹر ولسٹن (WILSTON) مترجم گورنمنٹ نے اپنے طور پر بلا لحاظ تعزیرات ہند ضابطہ کا ترجمہ کر کے سرکاری گزٹ میں چھپوا بھی دیا تو تعزیرات ہند اور ضابطہ میں اختلاف ہونا ہی چاہیے اور ہوا بھی۔ میں نے میرزا مرعلی خاں ذوالقدر کے ذریعے یہ بات گورنمنٹ کے کانوں تک پہنچائی۔ بات معقول تھی گورنمنٹ نے فرو گذاشت کو تسلیم کیا اور آخر مجھ کو ضابطہ کا ترجمہ درست کرنا پڑا۔ غرض تحصیل داری کا زمانہ جو دو برس سے متجاوز نہ تھا، کام سے آگاہی پیدا کرنے، یکجائی خدمت اور ضابطہ فوجداری کی اصلاح میں مشغول رہا۔

ڈپٹی کلکٹری

پھر میں ڈپٹی کلکٹر کر دیا گیا۔ دو مہینے کانپور میں کام کرنے پایا تھا کہ محنت جو میری قسمت میں لکھی تھی، گورکھپور لے گئی۔ دیکھا ضلع کیا ہے خود ولایت ہے جس کا ایک ایک پرگنہ آبادی اور مال گزاری اور وسعت رقبہ میں بڑے بڑے اضلاع کی ہمسری کرتا ہے اور مشہور ہے بقدر علم، جیسا ضلع بڑا ہے ویسا ہی مال۔ فوجداری کا معمولی کام بہت ہے اور بندوبست اس کے علاوہ کثرت کار دیکھ کر گھبرایا تو سہی مگر ہمت نہیں ہاری۔ رات دن محنت کر کے کام کو "امروز و بفردا مگذار" پر لا ڈالا مرتے کیا نہ کرتے۔ شاہ مدار کثرت کار کے علاوہ ایک پیچ ڈپٹی کلکٹری کے امتحان کی اور تھی لیکن محنت میں خدا نے برکت دی ہے۔ دن بھر کام کی اُدھیڑ بن میں رہا رات کو امتحان کے لیے کتابوں کی ورق گردانی کی۔ سارے تمام پراونس (PROVINCE) میں مال و فوجداری دونوں صیغوں میں اوّل رہا اور بقیہ امتحانوں سے چھٹی پائی۔ اس کے بعد میری تبدیلی ضلع جالون میں ہو گئی۔

بہرِ زمیں کہ رسیدیم آسماں پیداست

یہاں بھی وہی بندوبست۔ بندوبست میں رہ کر فرصت کی توقع ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص چیل کے گھونسلے میں ماس ڈھونڈتا پھرے۔ خاص کر میرے لیے کہ میں کارِ سرکار میں نفلوں کو بھی فرضوں کی طرح اپنے اوپر لازم کر لیا کرتا تھا۔ بندوبست کی کم فرصتی پر ایک حکایت یاد آئی۔ کہ میں ایک بار رمضان کے مہینے میں دورے پر تھا۔ اتفاق سے ایک دوست فضل اللہ صاحب دن کے وقت تشریف لائے اور مجھے حقہ پیتے دیکھ کر تعجب کیا اور پوچھا کہ کیا آپ کا روزہ نہیں؟ میں نے کہا کہ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے آپ دیکھتے ہی ہیں۔ فرمانے لگے خیر ہے کیا عذر ہے؟ میں نے کہا کہ سفر۔ دوست: دورے کو امام ابو حنیفہ نے سفر تسلیم نہیں کیا۔ میں: "کون امام ابو حنیفہ؟" دوست: "آپ کیسی جاہل مارواڑی کی سی باتیں کرتے ہیں۔ اجی وہ ہی امام ابو حنیفہ جن کے ہم سب حنفی مقلد ہیں۔" میں: "وہ کہیں بندوبست کے ڈپٹی کلکٹر بھی رہے تھے؟" دوست: "لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ ان کی شان اس سے ارفع و اعلیٰ تھی۔ انھوں نے خدمتِ قضا تو قبول کی ہی نہیں۔ ڈپٹی کلکٹری صنعت ہیچ کیا چیز ہے؟" میں: "امام ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ کتنے ہی نیاز مند ہوں، تو دورے کو سفر نہیں مانتے اور گورنمنٹ ہم کو روپیہ روز بھتہ دیتی ہے۔ از برائے خدا کہیں یہ مسئلہ کسی حاکم کے گوش گزار نہ کر دیجیے گا، ورنہ ہم بیچارے ڈپٹی کلکٹروں کا بھتہ مارا جائے گا۔"

تصنیف و تالیف

باوجود ایسی عدیم الفرصتی کے میں نے علمی مشغلے کو نہ چھوڑا۔ مگر وہاں اس کی شان بدل دی۔ یعنی اب میرے بچے، دو بیٹیاں، جن میں سے بڑی کے جوان مرگ مرنے کا میرے دل پر داغ ہے اور ایک بیٹا خدا اس کی عمر دراز کرے، اس قابل ہوئے کہ ان کو پڑھانا شروع کرایا جائے۔ بیٹے کے بارے میں تو وہ طفلِ رضیع ہی تھا تب ہی سے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جس طرح میں نے اپنے باپ سے پڑھنا شروع کیا تھا، میں آپ اس کو پڑھاؤں گا۔ رہیں بیٹیاں ان کے لیے قرآن، ترجمۂ قرآن اور چھوٹے چھوٹے مذہبی رسائل راہِ نجات وغیرہ کے سوائے کوئی کتاب ہی نہ تھی۔ اور بیٹے کے لیے، ابھی سرکاری سکولوں کی کتابیں تو خاصی تھیں مگر میں ان سے زیادہ شگفتہ کتابیں چاہتا تھا کہ اس کو پڑھنے سے وحشت نہ ہو۔ اس پر بھی ایک حکایت یاد آئی اور اکثر یاد آیا کرتی ہے کہ بشیر کوئی پانچ برس کا ہو گا۔ میری عادت تھی کہ کھانا کھانے سے فارغ ہو کر الحمد للہ الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمین و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔ مصرعہ:

شکرِ نعمت ہائے تو چنداں کہ نعمت ہائے تو

بالالتزام پڑھا کرتا تھا۔ تو ایک دن بشیر نے پوچھا کہ ابا جان آپ کھانے کے بعد یہ کیا پڑھا کرتے ہیں۔ میں نے کہا بیٹا خدا نے صورتِ آبرو کے ساتھ روزی دی ہے اس کا شکر کرتا ہوں۔ کہنے لگا مجھ کو بھی سکھا دیجیے۔ میں نے کہا کہ عربی تو تم کو مشکل سے یاد ہو گی میں اردو کی دعا بتا دوں گا، تم وہی پڑھ لیا کرنا۔ چنانچہ میں نے یہ شعر سکھا دیا ؎

یہ روزی طیب بے مشقت خدا کی قدرت کا دیکھو جلوا
کہ جانوروں کو ملی رسوئی کیا عنایت گدھوں کو حلوا

نے ابھی تھی جلدی سے یاد ہو گیا اور بشیر کو لاگ کہ وقت بے وقت پڑھتا پھرا۔ اگرچہ سمجھتا بوجھتا تو کچھ نہیں، گدھوں کو حلوا کی جگہ گدھوں کا حلوا زبان پر چڑھ گیا اور وہ اسی کو رٹتا۔ یہ بات تھی ہنسی کی، نہ میں نے روکا اور نہ ہی کسی کو روکنے دیا۔ اب تک بھی جب کبھی گدھوں کا حلوا یاد آ جاتا ہے تو ہم لوگ ہنسا کرتے ہیں۔ تو میں اپنے بچوں کے لیے ایسی کتابیں چاہتا تھا کہ وہ ان کو چاؤ

سے پڑھیں، ڈھونڈا تلاش کی۔ کہیں پتہ نہ لگا۔ ناچار میں نے ہر ایک کے مناسب حالات آپ کتابیں بنانی شروع کیں۔ بڑی لڑکی کے لیے مراۃ العروس، چھوٹی کے لیے منتخب الحکایات، بشیر کے لیے چند پند۔ یہ نہیں کیا کہ کتابیں سالم لکھ لیں تب پڑھانی شروع کیں۔ نہیں بلکہ ہر کتاب کے چار چار، پانچ پانچ صفحے لکھ کر ہر ایک کے حوالے کر دیتے۔ مگر وہ بچوں کو ایسی بھاتیں کہ جس کو پاؤ صفحے کے پڑھنے کی طاقت تھی وہ آدھے صفحے کے لیے اور جس کو ایک صفحے کی استعداد تھی دو ورق کے لیے مستعد تھا۔ جب دیکھو ایک نہ ایک متقاضی ہے کہ میرا سبق کم رہ گیا ہے۔ میں اسی وقت قلم برداشتہ لکھ دیتا۔ تقاضوں کتابوں کا پہلا گھان پورا ہوا۔ اتنے میں تو کیمپسن صاحب ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن دورہ کرتے کرتے ضلع کے ہیڈ کوارٹر اور ڈاک کے باغ میں فروکش ہوئے۔ شام کے وقت بنگلے کے باہر درختوں کے تلے ٹہل رہے تھے کہ بشیر ٹٹو پر سوار دو تین آدمی ساتھ لیے ادھر سے نکلا۔ صاحب کو دیکھ ٹٹو پر سے اتر سلام کیا۔ صاحب نے نام و نشان کے بعد پوچھا کیا پڑھتے ہو؟ بشیر: چند پند۔ صاحب: یہ نام تو ہم نے نہیں سنا۔ بشیر: بڑی اچھی اچھی نصیحت کی باتیں ہیں۔ صاحب: ہم کو وہ کتاب دکھا سکتے ہو۔ بشیر: میں ابھی جا کر گھر سے لے آتا ہوں۔ وہ نالے پار ہمارا ہی گھر دکھائی دیتا ہے۔ تھوڑی دور سے لوٹ کر: میں بڑی آپا اور چھوٹی آپا کی کتابیں بھی لیتا آؤں؟ وہ چند پند سے بھی اچھی ہیں۔ بڑے مزے کی باتیں ہیں۔ صاحب: ضرور سب لاؤ۔ بشیر نے بستے کا بستہ گھر سے لا صاحب کے حوالے کیا۔ شام کو میں کچہری سے گھر آیا تو بہن بھائی لڑ رہے تھے۔ بہنوں کو شکایت تھی کہ ہماری کتابیں کیوں دے آئے۔ میں نے سن کر کہا کیا مضائقہ ہے، میں تم کو ان سے بہتر کتابیں بنا دوں گا۔ اگلے دن جو میں کیمپسن صاحب سے ملا تو انھوں نے شاید ان کتابوں کو کچھ دیکھ بھال لیا ہوگا۔ فرمایا ان کی نقلیں مجھے پرسوں تک کاپی بھیج دو۔ یہاں میرے پاس خسرے کی صفائی میں بہت سے اچھے تھے۔ خوش خط اور کتابیں بھی چھوٹے چھوٹے رسالے۔ میں نے شیرازہ توڑ اوراق تقسیم کر دیئے۔ شاموں شام نقل ہو کر آ گئے۔ چھپی ہوئی جلدیں بندھوا کر صاحب تو پرسوں تک کوچ کر گئے تھے۔ میں نے اگلے ہی دن کتابیں پہنچا دیں۔ کوئی دو مہینے بعد نینی تال سے کیمپسن صاحب کی چٹھی آئی کہ مراۃ العروس کو پڑھ کر میں بہت ہی محظوظ ہوا۔ اپنے طرز قبول میں پہلی ہی کتاب ہے اور ہزار روپے کے انعام کی مستحق ہے اور اسی غرض سے میں اس کو گورنمنٹ میں پیش کروں گا۔ لفٹیننٹ گورنر تھے وہی سر ولیم میور جن کی فرمائش سے میں نے انکم ٹیکس کا ترجمہ کیا تھا۔ انھوں نے تو مراۃ العروس کو آسمان پر چڑھا دیا۔ ہزار روپیہ گورنمنٹ سے سر دربار انعام دیا۔ ایک قیمتی گھڑی میرا نام کندہ کرا کے جیب خاص سے کیمپسن صاحب نے اور اپنے ریویو کو گورنمنٹ گزٹ میں چھپوایا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ مزدور خوش دل کند کار بیش۔ میں نے بھی تصنیف کا دفتر کھول دیا۔ اور اب بھی کھلا ہی سا ہے۔ ہاتھ کے رعشے کی وجہ سے پٹ بھیڑ دیئے ہیں۔ بند نہیں کیے۔ مراۃ العروس کے بعد میں نے سینڈفورڈ کی طرح کا ایک ناول بنات النعش لڑکیوں کے لیے لکھا اور اس کو بھی بطمع انعام سرکار میں چلتا کیا۔ [illegible] پانسو روپیا اس پر بھی انعام ملا اور چونکہ بابو شیو پرشاد نے اتنے ہی کی سفارش کی۔ میں اس پانسو کو بھی کئی پانسو کے برابر سمجھتا ہوں۔ ضلع جب ان کا بندوبست ختم ہونے کو ہوا تو مجھ کو پھر گورکھپور بدل دیا گیا۔ بہتری ہیں تو گورکھپور کا نام سن کر ڈر گیا تھا مگر اس مرتبہ کام تھوڑا تھا اور تھوڑے دنوں کا بھی تھا۔ سوتوں سے سادہ رپورٹوں میں شکایت ملی جاری تھی کہ ضلع بندی کے وقت ضلع گورکھپور میں جنگل بہت تھا۔ اس کے بعد سے گرانٹ سسٹم پر جنگل کٹ کٹ کر کاشت ہو گئے۔ نیپال کی ترائی کے لوگوں نے کتنے گاؤں بسا لیے۔ حکام اور اعمال کی کثرت کار سے معاملہ کو صدر کی سرحد سے بہت تکلیف ہے اور اتنے لوگوں کی روک تھام بھی مشکل ہے۔ اس کار ضلع گورکھپور سے کچھ علاقہ کاٹ کر ضلع بستی قائم رکھا۔ میری تعیناتی اسی غرض سے تھی کہ ضلع بستی کے کاغذات بندوبست الگ کر دوں۔ جیسا کہ سرکاری کام تھوڑا تھا۔ ویسا ہی ایک

چھوٹا سا کام تصنیف و تالیف کا بھی مل گیا کہ میری چل اٹھی۔ ایک مہتمم بندوبست مسٹر لیوروڈن بھی تھے۔ ان کا میں ماتحت تو نہ تھا مگر وہ آدمی علم دوست دو چار ملاقاتوں میں مہربانی فرمانے لگے۔ انھوں نے قانون شہادت پر انگریزی میں ایک عالمانہ متن لکھا اور مجھ سے اس کے ترجمے کی فرمائش کی۔ رسالہ تو چھوٹا تھا مگر تھا بڑی اوق۔ ڈن صاحب نے ترجمہ پسند کیا اور منشی نولکشور کے مطبع میں اس کو چھپوا بھی دیا۔ مجھ کو نہیں معلوم کہ اس کا کیا حشر ہوا۔ میں تو اس کا ذکر بھی نہ کرتا۔ مگر آگے چل کر ان ہی لیوروڈن صاحب کے ایک فرمائشی ترجمے کا حال بیان کروں گا جس کی وجہ سے میرے حق میں ایک بڑا مفید نتیجہ مرتب ہوا۔ تعزیرات کا کام پورا ہو گیا تو مجھ کو اعظم گڑھ بھیج دیا۔ کتاب بینی اور تصنیف و تالیف کی لت فرصت ڈھونڈتی تھی۔

جی چاہتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

بندوبست ہے کہ پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں بار بار حکام سے درخواست کرتا کہ اب مجھ کو ضلع کا کام ملے۔ حکام وعدہ بھی فرماتے ہیں مگر عین وقت پر

اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی

یہی نظر مجھ پر پڑتی ہے۔ میں تو بندوبست سے اس قدر ملول ہو گیا تھا کہ جب سر ولیم میور نے آگرے کے مقام پر ڈیوک آف اڈنبرا کی موجودگی میں مجھ کو مراۃ العروس کی تصنیف کے صلے میں انعام دیا جس کا ذکر میں ابھی کر چکا ہوں۔ تو میں ان کی شان میں عربی کا مدحیہ قصیدہ لکھ لے گیا تھا۔

اعظم گڑھ میں

اعظم گڑھ کے قیام کا زمانہ تصنیف و تالیف کے اعتبار سے اچھا کامیاب زمانہ تھا۔ میں نے اعظم گڑھ میں ایک تو توبۃ النصوح لکھی۔ جو میری تصنیفات میں سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ وہ مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور لاٹ صاحب کو گورنمنٹ کی نیوٹرلٹی (. . . . .) کے لحاظ سے تامل تھا کہ وہ اس کو انعامی کتابوں کے شمول میں سے بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ مگر کتاب کا پلاٹ کچھ ایسا بن پڑا تھا۔ کہ لاٹ صاحب کو دیکھتے ہی بن آئی۔ وہ کتاب باوجودیکہ اسلام کے سانچے میں ڈھالی گئی تھی مگر اس میں کہیں بھی کوئی ایسی بات نہیں تھی جس کو کوئی دوسرے مذہب کا آدمی دیکھ کر برا مانے اس پر بھی گورنمنٹ نے ایک ہزار روپیہ اوّل درجہ کا انعام دیا اور انعام سے بڑھ کر یہ ہوا کہ سول سروس کے امتحان میں داخل کی گئی۔ میں جو کتابیں بناتا تھا تو صرف انعام کی طمع سے نہیں بلکہ اصل میں مجھ کو ان کتابوں کے ذریعے سے اپنے بچوں کی تعلیم منظور ہوتی تھی اور گورنمنٹ سے جو انعام مل جاتے تھے وہ رونگن ہیں۔

کانفرنس کے لکچرار ہونے کے علاوہ شہرت کا ایک ذریعہ تصنیف و تالیف ہے اور آپ صاحبوں کو معلوم ہے کہ میں اس شہرت

---

۱ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے لفٹیننٹ گورنر تھے۔ جو عربی کے بڑے ادیب اور فاضل اجل تھے۔ خدمت سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ اڈنبرا یونیورسٹی کے پرنسپل تھے۔ کیمپسن صاحب ایم اے ان کے دوست ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن تھے۔ انھوں نے مراۃ العروس اور توبۃ النصوح کا انگریزی ترجمہ کیا، اور توبۃ النصوح کی ایک مبسوط شرح بھی انگریزی میں لکھی۔

سے بھی بے نصیب نہیں رہا۔ گرچہ ایسی تصنیفات موجب فخر نہیں ہونی چاہییں۔ اور میں ان کو موجب فخر سمجھتا بھی نہیں۔ بلکہ سچ پوچھو تو جب کوئی شخص منہ پر میری کتابوں کی تعریف کرتا ہے تو میں اُلٹا جھینپتا ہوں۔ میں نے عربی کی صرف اور منطق سے تصنیف کا سلسلہ شروع بھی کیا تھا تو خاص اپنے لڑکے کے پڑھانے کے لیے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کوئی باپ اپنی اولاد کی خیر خواہی میں کمی نہیں کرتا۔ میں نے بھی ان کتابوں کے تیار کرنے میں کوئی کمی نہیں کی۔ دل تو چاہتا تھا کہ جو کچھ بھی مجھ کو آتا ہے بیٹے کو گھول کر پلا دوں۔ مگر وہ تو ایک آن ہونی بات تھی۔ تاہم میں نے برسوں کے سوچ بچار کے بعد بیٹے بیٹے کو جلدی زیادہ سے زیادہ برس سوا برس میں عربی عبارت کے پڑھنے پر قادر ہو جانے، منطق کے ابتدائی رسالے پر جس کا نام "مبادی الحکمۃ" ہے مجھ کو گورنمنٹ سے پانسو روپیہ کا انعام بھی ملا۔ وہ کتاب گورنمنٹ کی فرمائش سے لکھی گئی تھی اور اس کے ساتھ دوسرے مصنفوں کے گیارہ رسالے اور بھی پیش ہوئے تھے۔ مگر میں اس کا بھی شیخی خورا (competition) (مقابلہ) میں بازی لے گیا اور مبادی الحکمۃ کلکتہ یونیورسٹی کے کورس میں داخل ہو گئی۔ معلوم نہیں کہ اب بھی ہے یا نہیں۔ کچھ تو انعام کے لالچ اور زیادہ تر اس خیال سے کہ لڑکوں میں قوت ممیزہ ہے نہیں۔ میں نے صرف عربی کا رسالہ [illegible] فی الصرف بھی گورنمنٹ میں پیش کیا۔ بدقسمتی سے وہ رسالہ کسی مولوی صاحب کے [illegible] عقب کی [illegible] مجھ کو معلوم نہیں [illegible] میں نے وہ کتاب اپنے لڑکے کے لیے لکھی تھی۔ اور میں اس کتاب کو اس پر آزما بھی چکا تھا۔ وہ کتاب لفظوں میں پوری اتری تھی مگر کم بخت دل نے [illegible] اور جو دیکھا گورنمنٹ نے کتاب کو بیرنگ واپس کر دیا میں نے اپنے خرچ سے اس کو لڑکوں کے فائدے کے لیے چھپوایا۔ میں نے لڑکوں کو دیا چاہا مگر اور افسوس ہے کہ [illegible] آنکھیں بچھوئیں۔ اشتہار دیے، اخباروں میں چھپوایا۔ مصنف نے پرزہ خاست۔ آخر کار میں نے کتاب کے آخر میں ایک اعلان زیادہ کیا اور اس میں لکھا کہ کوئی علمی کتاب کے لکھنے کا حوصلہ کرے۔ جب کہ اس کی اتنی مصیبتیں جھیلنی پڑیں کہ آپ ہی مسودہ لکھے، آپ ہی کاپی اور آپ ہی تصحیح کا ذمہ دار ہو اور آخر کار آپ ہی بیٹھا پڑھا بھی کرے۔ وہ دن اور آج کا دن میں نے تو علمی کتاب کے لکھنے سے اپنا کان اینٹھا ہے

دل میں کتنے مسودے تھے ولے
ایک پیش اُن کے روبرو نہ گیا

گولمنز ہونز کا ترجمہ

تمام اعظم گڑھ کی برکات میں سے دی لاسٹ دونات دی لیسٹ The Last though not the Least یورپ کی مشہور کتاب گولمنز ہونز کا ترجمہ ہے یہ کتاب ایک فرانسیسی عالم نے علمی مضمون کو [illegible] کے پیرائے میں لکھا ہے کہ قصہ معلوم ہوتا ہے۔ پہلے وہ جرمنی میں ترجمہ ہوئی۔ جرمنی سے انگریزی میں۔ اب [illegible] صاحب کو خیال آیا کہ اس کو اردو کیا جائے گورنمنٹ میں ایک ہزار روپے کے انعام کا اشتہار دیا اور مجھ کو چٹھی لکھی کہ میں نے اشتہار تو دیا ہے مگر میری نگاہ تم پر ہے۔ میں نے عذر کیا کہ میں نے تعلیم نسواں کا سلسلہ رکھا ہے اور اس میں مجھ کو ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ جب تک [illegible] ہوں اس سے زیادہ فرصت نہیں پا سکتا۔ مگر بزرگ نے تو [illegible] کمشنر [illegible] کا دباؤ ڈلوایا۔ ناچار مجھے ترجمہ کرنا پڑا۔ سب ملا کر گیارہ ترجمے ہوئے ان میں [illegible] کے [illegible] نے ان کی کمیٹی بٹھائی۔ کمیٹی نے میرے ترجمے کو سب سے بہتر قرار دیا مگر ساتھ ہی یہ بھی لگا دی کہ اب ٹوڈنگ (with Remarks) نہیں ہزار میں سے چار سو کے قابل ہے۔ جی جل کر خاک ہی تو ہو گیا۔ میرا ان کمیٹی کے نام پوچھتا ہوں تو نام نہیں بتاتے۔ استعفا دریافت کرتا ہوں، استعفا ظاہر نہیں کرتے۔ وہ دن اور آج کا دن ہے میں فرمائشی شاعری سے [illegible] کے چپ ہو رہا۔ وہاں [illegible] صاحب اس فکر میں [illegible] اب اس کو آپ ٹوڈنگ کون کرے۔ یہ بات اُن کے کان میں پڑی ہوئی تھی کہ حیدرآباد دکن میں امیر کبیر سر سالار جنگ اوّل کے ساتھ کر [illegible]

Co-agent، بھی ہیں، علم ہیئات کے بڑے عالم ہیں۔ انھوں نے اس فن میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے اور وہ انگریزی میں ترجمہ بھی ہوا ہے امیر صاحب کے علو شان کے لائق ہے پھر وہی صاحب کریں ترجمات نہ ہوئی کرو۔ امیر صاحب کو لکھیں مگر انھوں نے سانڈرس صاحب ریذیڈنٹ کو لکھا اور میں نے مترجم کر دیا ہے۔ اور میں اس کو اپ ٹو ڈیٹ کرانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ امیر صاحب کی اس کی طرف متوجہ فرما سکیں تو میں آپ کا اور امیر صاحب کا بہت ہی ممنون ہوں گا۔ یوں وہ میرا ترجمہ صاحب ریذیڈنٹ حیدرآباد وہاں امیر کبیر سرسالار جنگ سے دست بدست مولوی سید حسین بلگرامی تک پہنچا اور مجھے کچھ خبر نہیں اور ان صاحبوں میں کسی سے جان پہچان۔ یہ تقریب میرے حیدرآباد جانے کی اور یہی وہ ترجمہ ہے جس کی نسبت میں نے تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ اس کی وجہ سے میرے حق میں بڑا مفید نتیجہ مرتب ہوا۔ ترجمہ مولوی سید حسین کے پاس ہے اور مجھے معلوم نہیں۔ یہاں تک کہ بات بھول بسری ہو گئی کرتے ہیں مولوی سید حسین کو خط آیا لکھا تھا کہ تمھارا ترجمہ مجھ کو سپرد ہوا ہے مجھ کو اس کی کیفیت کی رائے سے اتفاق نہیں۔ جس نے ترجمے کو اچھا نہیں بتایا۔ ترجمہ بہتر سے بہتر ہوا ہے۔ اور اس میں کچھ کسر ہے تو اسی قدر کہ تم ہی اس کی نظرثانی کرو اور جہاں ضرورت دیکھو اصلاح کرو اور میں رائے لکھ کر ترجمہ ڈن صاحب کے پاس بھیج رہا ہوں۔ خط کو آئے ایک ہفتہ نہیں گزرنے پایا تھا کہ ڈن صاحب کے مفاجاۃً انتقال فرمانے کی خبر انگریزی اخبار میں پڑھی۔ اناً فاناً سا گزر گیا اور سمجھا کہ ترجمہ بھی مر گیا۔ کس کو لکھوں کس سے پوچھوں ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

اسی عرصے میں ڈن صاحب کی بیوہ شوہر کو دفن کر کے ولایت چلی گئیں کوئی چھ مہینے بعد انھوں نے مجھ کو لکھا کہ اگر تمہارے ترجمے کا حال ڈن صاحب مرحوم کے بیان زبانی اور ان کے روزنامچے کے پڑھنے سے مجھ کو بخوبی معلوم ہے اور وہ ترجمہ میرے پاس ہے اور چھ سو روپیہ ترجمے کی قیمت کا بھی امانت ہے جو تم کو بھیجتی ہوں۔ حضرات ذرا دیکھیں ان لوگوں کے اخلاق ان لوگوں کی تہذیب، ان لوگوں کی مروت، ان لوگوں کی وفاداری، ان لوگوں کا پاس عہد میں نے تعزیت کے بعد لکھا کہ روپیہ تو مجھ کو چاہیے نہیں۔ ہاں ترجمہ واپس کر دیجیے تو میں ڈن صاحب کی نشانی اپنے پاس رکھوں گا۔ جب ترجمہ میرے پاس آگیا تو میں نے ترجمہ بہ ہیئت ساری مراسلت بھیج کر کے گورنمنٹ میں پیش کر دی۔ گورنمنٹ نے بڑی قدر دانی وہ چھ سو روپے جو کمیٹی نقاد ترجمہ نے منظور کرنے تھے اپنی گرہ سے بھر دیئے۔

القصہ اُدھر میں ریڈ صاحب نے مخالفت شروع کر دی تھی۔ جب اُدھر سے جواب ترکی بہ ترکی ملا تو شورش فرو ہو گئی۔ انھوں نے رپورٹ کر دی کہ کم از کم اب سے نذیر احمد کو دوسرے ضلع میں بھیجا جائے۔ یہاں اس کی ضرورت باقی نہیں اور سکندرپور کا کام ڈن صاحب کے سپرد ہوا۔ اس رپورٹ میں ڈن صاحب کی بڑی تعریف لکھی اور میری نسبت لکھا اس میں عقل بہت کم ہے اور کام کرنے کی طاقت بڑی۔ غالباً جس افسر کے ماتحت رہے گا اس کو رضامند کرے گا۔

حیدرآباد

اس کے بعد سرسالار جنگ نے مجھ کو حیدرآباد بلا لیا اور شروع ہی سے میری اتنی تنخواہ کر دی کہ اگر میں یہاں مر کر دوبارہ بھی جنم لیتا تو نصیب نہ ہوتی اور تنخواہ کے علاوہ لاکھوں تحفے ہوں کی ایک تنخواہ تو ان کی قدر دانی تھی۔ میں نے بھی ان کے کام کو لگے دن کو دن نہ سمجھا اور رات کو رات ع

کہ مزدور خوش دل کند کار بیش

عزت خدا کی مہربانی تھی کہ ایک تازہ وارد جو رسم و راہ ملک سے بے خبر زبان سے نا آشنا، دستور و رواج سے ناواقف ہو گئے

کے ساتھ معقول رائے دینے لگے۔ اس سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ یہاں فارسی دفتر ہے اور میں نے ساری عمر بھی فارسی نہیں لکھی مجھ کو تو فارسی کی تحریر ایک اجنبی بات معلوم ہوئی۔ لیکن چار و ناچار لکھنی پڑی۔ وہ خدا کے فضل سے کچھ ایسی بن پڑی کہ تمام حیدرآباد میں غل مچ گیا اور لوگ حیران ہو گئے۔

یہاں آسمان پر چڑھ جانا اور تحت الثریٰ میں گر جانا ایک بات ہے۔ جو لوگ کہ وزیر ہو گئے ہیں اُن میں سے کسی کو ذرا نہیں سمجھتا ہوں ایک ملک کے سیکڑوں ہزاروں بڑے بڑے والی برسوں سے پڑے جھک مارتے پھرتے ہیں کوئی پرسانِ حال نہیں اور چونکہ یہ ایک بہت بڑی ریاست ہے خلقِ خدا ہر چہار طرف سے ٹوٹ پڑی ہے پھر یہاں کل فرد لئے قیامت ہے۔ عہدہ اور علم کوئی چیز نہیں ہے میں نواب صاحب کی قدردانی اور مولوی مہدی علی صاحب کی مہربانی تھی اور فی الاصل مجھ پر احسان کرنا منظور تھا کہ میرے عزیزوں کو عہدوں پر نامزد کر دیا۔ ہمارے ہم وطن ہی ہمارے دشمن ہیں دیکھ کر جلتے اور پیچ کشی میں لگے رہتے ہیں۔

عمل داری میں اچھا انتظام نہیں اگر خدا نوکروں کو توفیق خیرخواہی دے تو یہ ملک یکتا ہے خود اودھ کا چوگنا ہے اور زمین بعض اطراف میں بلا مبالغہ تین سو روپیہ بیگہ بکتی ہے۔ نوکروں کی شوخ چشمی کی وجہ یہ ہے کہ موقوفی کا دستور نہیں، جرمانے کا کوئی قاعدہ نہیں۔

ذاتِ نظام کو اس ملک میں حضور یا بندگانِ عالی سے تعبیر کرتے ہیں اور لفظ حضور جو تعظیماً بولا جاتا ہے۔ اس کا مترادف مثلاً تقصیر ہے حضور کا سن شریف پندرہ برس کا ہے اور اس وقت تک حضور زمامِ سلطنت اپنے دستِ مبارک میں نہیں لیے۔ نواب مختار الملک سر سالار جنگ بہادر اور نواب شمس الامرا امیر کبیر بہادر ریجنٹ ہیں ان دونوں میں باہمی اختلاف ہے۔ انتظامِ سلطنت نواب مختار الملک کرتے ہیں۔ سب سے بڑے جاگیردار امیر کبیر ہیں۔ جن کے خاندان میں حضور کی صاحبزادیاں بیاہی جاتی ہیں۔ خدا اس سلطنت کو کہ مسلمانوں کا ذریعہ فخر ہے اور میرے جیسے تو رزق کی ڈوری ہے قیامِ دنیا تک قائم رکھے چونکہ ایک مشہور جگہ ہے یورپ کے سیاح اکثر وہاں تک جاتے رہتے ہیں۔ اور جب کوئی شہزادہ یا لارڈ یا مشاہیر میں سے کوئی اور شخص آتا ہے تو سرکارِ نظام کی طرف سے علی قدر مراتب بڑی سیر چشمی اور فیاضی سے اس کی مہمان نوازی ہوتی ہے۔ بلکہ کوئی سال ایسی دعوتوں سے خالی جاتا ہوگا۔ مجھ کو بھی ان دعوتوں میں بارہا شریک ہونے کا اتفاق ہوا ہے اب یاد نہیں کہ کون آیا تھا مگر تھا کوئی بڑا جلیل القدر انگریز۔ معمول کے مطابق اس کو ڈنر دیا گیا اور اس میں ریذیڈنسی اور چھاؤنی کے کل انگریز مرد و زن اور سرکارِ نظام کے تمام معززین مدعو تھے۔ ایوانِ وزارت میں دعوت تھی ترتیب کے ساتھ میزیں لگائی گئیں۔ البتہ نواب مختار الملک سر سالار جنگ اوّل صدر نشین تھے ان کے دائیں بائیں بڑے بڑے انگریز اور ان کی لیڈیاں۔ مجھ کو جس میز پر جگہ ملی وہ ایسے موقع پر واقع ہوئی تھی۔ کہ میری پشت کسی قدر سالار جنگ کی طرف کو ہوتی تھی۔ تو میں مارے ادب کے اور کسی قدر کیوریاسٹی curiosity (شوق) کی وجہ سے میں بار بار مڑ مڑ کر سر سالار جنگ کو دیکھتا جاتا تھا ڈنر کا سازوسامان کیا بیان کروں بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سر سالار جنگ گویا تختِ سلطنت پر اجلاس فرما رہے ہیں۔ گیس gas کی روشنی نے رات کو دن کر دیا ہے۔ سالڈ سلور solid silver (خالص چاندی) کی تشتریوں کا دور چل رہا ہے۔ چینی کی آوازوں کا گرگرا رہی ہے۔ ہنسی مذاق کی باتیں ہو رہی ہیں۔ کھانے کے بعد ہی کے پٹاخے چھوٹ رہے ہیں۔ پھر تھیٹر کا تماشا ہے۔ آتش بازی ہے۔ انگریزی ہندوستانی ناچ ہے۔ یہ سن کر سب کے دل تو خوش، مجھ بیچارے جو ہونگے۔ جس وقت میں مڑ مڑ کر سر سالار جنگ کو دیکھتا تھا نواب محسن الملک بہادر سے کہیں اور دونوں ایک ہی میز پر تھے کہتا جاتا تھا کہ اس وقت کوئی سرکار کے دل کو دیکھے مارے خوشی کے ڈبل سائز (دو چند مقدار کا) ہو گیا ہوگا۔ اللہ اللہ سالار جنگ مرحوم و مغفور کس بلا کے ذہین اور رسا تھے۔ اسی مجمع میں میرے بار بار دیکھنے کو دیکھا اور اگلے دن نواب محسن الملک سے پوچھا۔ انھوں نے بے کم و کاست عرض کر دیا تو فرمانے

گیا ہے جس میں آدمی دوسرے کی حالت کا اندازہ کرنے میں ہمیشہ غلطی کیا کرتا ہے اور میرا حال یہ ہے کہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں مجھے چوبیس منٹ بھی کبھی بے فکری نصیب نہیں ہوتی۔ یہ حال تھا اس شخص کا جو تھا تو وزیر مگر خود مختاری کے اعتبار سے اس کو بادشاہ کہا جا سکتا ہے۔

خانہ نشینی

یہاں مجھ کو جو شکایت تھی وہ سنئے کہ یہی کہا جاتا تھا کہ حیدرآباد ایسا نامعقول شہر ہے، اچھا شہر نہیں۔ حق نہیں دیکھا نہیں تعلق نہیں رکھی بے مروتی سے گزری۔ وہاں اگر میں تصنیف و تالیف کا خیال کرتا تو گویا کا مجرم ہوتا۔ غرض زمانہ قیام حیدرآباد میں تعلیم و تعلم سے بے تعلقی ہی سی رہی مگر ایک تو سر سالار جنگ کے حکم سے میں ایڈمنسٹریشن پر چند رسالے حضور پرنور کے ملاحظے کے لیے تصنیف کیے، دوسرا یہ کہ خود اور ایک بڑی بات ٹالا کیے ہے کہ بدون اس کے اور سرکاری کسی حق کا نتیجہ روا تھی جو چھ مہینے سترہ دن میں قرآن حفظ کر لیا۔ سر سالار جنگ کے انتقال کے بعد ان کے بھتیجوں اور دوستوں کے پائے ثبات تو اکھڑ ہی گئے اور جو سب سے پہلے بھاگ کھڑا ہوا وہ میں تھا۔ حیدرآباد کے سابقین نے نوکری کے پیشے کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہا کسی کی بھی ہو اور سرکار عالی نظام سے وظیفہ لے مزے سے گھر آ بیٹھا۔

فراغ و سبکدوشی و بے نوائی ۔۔ نہ دربان کی منت نہ احسان کسی کا

میں نے مدرسی، ڈپٹی انسپکٹری، تحصیلداری اور ڈپٹی کلکٹری اور بالآخر سرکار نظام میں صدر تعلقہ داری یعنی ایک ڈویژن کی کمشنری نہیں بلکہ گورنری کی ہے۔ اور ان سب خدمتوں میں تھوڑی بہت افسری حکومت تو تھی ہی مگر اب جو پچھلی زندگی کا کبھی خیال کرتا ہوں تو کسی شان میں نوکری کی یاد سے محظوظ نہیں رہا۔ ہاں ایک وقت تھا کہ تنزل اور جاہ سے ڈرتا تھا۔ پھر ایک وقت وہ ہوا کہ کمشنر اور بورڈ کے ممبر سے کم کی سمائی نہیں ہوتی تھی۔ غرض نوکری کو ہم کا پیشہ و معزز سمجھنا محض خیالی بات ہے۔ عزت اور ذلت پیشہ پر موقوف نہیں بلکہ عزت اور ذلت کا مدار انسان کا چال چلن ہے۔ ساری عمر کام اور محنت میں گزاری۔ مشغولی شرط زندگی ہو گئی تھی، میں نے پڑھنے لکھنے سے بے کاری کی تلافی کی اور یہ نہ کرتا تو اب تک کبھی کا مر بھی گیا ہوتا۔ پندرہ سولہ برس گھر بیٹھے ہو گئے پڑھنے لکھنے کی بدولت کبھی ایک منٹ کے لیے اگر لا صحبت کی تمنا کی اور نہ تنہائی سے تنگ دل ہوا ہوں۔

ہے آدمی بجائے خود ایک محشر خیال ۔۔ ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

اس خانہ نشینی کے زمانے میں ابن الوقت، محصنات، رویائے صادقہ تین تو ناول لکھے، وہ قانونوں کا سلسلہ ترجموں سے موقوف ہے جو ہندوستان کا جدید شرعی نصاب قرار دیا جا سکتا ہے کہ میری ساری کتابیں انعامی اور غیر انعامی جائز و ناجائز طور پر بار بار چھپتی ہی رہتی ہیں اور مراۃ العروس کو تو لوگوں نے ایسا سر چڑھایا ہے کہ انگریزی، بنگالی، گجراتی، بھاشا، پنجابی، کشمیری زبانوں میں میرے علم و اجازت سے ترجمے کیے ہیں اور مجھ سے بے پوچھے کسی نے ترجمہ کر لیا ہو تو وہ جانے۔ اس کا بیان۔ ناولوں کے علاوہ قوم ہماری جو بجز لکچروں کی بلا اپنے پیچھے لگا کر ہر سال کے سال میرا مقصد بروقت خرچ کرا دیتے ہیں۔

لکچر

لکچر دینا میرا پیشہ نہیں، لکچر سے مجھ کو کوئی مال منظور و نہیں۔ قوت بیانیہ سے کام مقصود ہو تو وعظ کہوں، تفسیر لکھوں، رہی شہرت، اس کی مجھ کو ضرورت نہیں اور خواہش بھی نہیں۔ نہ میں کسی انجمن یا سوسائٹی کا ممبر ہوں، نہ سیکرٹری، نہ کارپرداز، نہ کارکن، نہ مشیر۔ بعض لوگ جن کی خاطر مجھ کو ایسی ہی عزیز ہے، زبردستی لکچر دینے کے لیے پکڑے جاتے ہیں۔ اتنے ضعیف تعلق پر بھی مجھ کو قومی خدمت کا معقول بہت آ لیتا ہی رہتا ہے۔ انجمن حمایت الاسلام میں لکچر دینے کی بدولت اس کو ہزاروں روپے کی گرہ سے خرچ کیے تحت گری کی ایک بیتی انتہائیں مہینوں بیمار رہا۔ سید احمد خاں کے برسوں دن کے چند گھنٹے کی رفاقت کا نتیجہ ہے کہ اگر علمائے شہر سے فتویٰ لیا جائے تو مجھ کو مرتد نہیں تو کافر اور کافر

نہیں تو کافی منزل رہ جائیں گے۔

میں بہتر بہت بہتر مجمع کا لیکچرار ہوں یعنی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا بے شک۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں لوگوں کا اتنا ہجوم نہیں ہوتا لیکن کانفرنس کے ممبر اور وزیٹر شرافت لیاقت اور دنیاوی وجاہت کے اعتبار سے چیدہ اور برگزیدہ لوگ ہوتے ہیں اور کسی کانفرنس میں شریک ہونا ہی ان کی چیدگی اور برگزیدگی کی دلیل ہے۔ اتنے بڑے ہندوستان میں صرف تین جگہیں ہیں جہاں میں لیکچر دیتا ہوں۔ سب سے اوّل سرسید احمد خاں کانفرنس یا کوئی بھی مجلس جس میں وہ مجھے لیکچر دینے کی تکلیف دیں۔ میں نے آج تک ان کی کسی دعوت کو رد نہیں کیا، انشاء اللہ کروں گا بھی نہیں اور باوجود کہ میں ان سے بعض باتوں میں اختلاف کرتا ہوں تاہم میرے دل میں ان کی ایسی عظمت ہے کہ اگر میں ان کے تمام عقاید سے اتفاق رکھتا ہوتا اور مجھ کو پیری کی خواہش بھی ہوتی تو میں خود ان کے ہاتھ پر بیعت کر لیتا اور میرے انجمن حمایت اسلام لاہور میں جانے کی ابتدا بھی انھیں سے ہوئی ہے میں نے لیکچر دیا اور لاہور والے انجمن ان سے میرے گرویدہ ہوتے تیسرا انجمن اور سالانہ جلسوں اور لیکچر کا ڈول پڑا اگرچہ میں اپنے لیکچروں کی بابت نہیں مجھوڑنے دیا کہ لیکچروں کا کام بڑھتی رہا تا پڑا پھر دن لگتی کے چند مقامات ہیں جن میں چار و ناچار شریک ہونا پڑتا ہے۔

میری مثال اس زمانے کے ایک شاعر کی سی ہے کہ بیچارہ کوئی نیا مضمون نہیں پاتا، جس طرف ذہن کو دوڑاتا ہے دیکھتا ہے کہ وصل اور ہجر اور انتظار اور دل سوختگی اور سرد آہ اور بہار اور خزاں اور استغناے محبوب اور پرہیزگاری دین کے ساتھ تمسخر وغیرہ وغیرہ کوئی خیال نہیں جس میں اُردو کے اور اگلے سیکڑوں ہزاروں نے طبع آزمائی نہیں کی ناچار باوجود تعلّی کے بیچارا کو قناعت کرتا ہے۔ OVER AND OVER AGAIN ، وہ بھی ہر ایک کو نصیب نہیں جس طرح ایک کسان ہل جوتنے میں اپنے ہنکتے بیل کی کبھی دم مروڑتا ہے کبھی اس کو للکارتا ہے کبھی اس کے گد گدی کرتا اور کبھی سانٹا مارتا اور کبھی آر بھی چبھوتا ہے۔ اسی طرح وہ لوگ جو مسلمانوں کی ریفارم REFORM کے درپے ہیں، مسلمانوں کو کبھی ان کے بزرگوں کی شان و شوکت اور ان کی عظمت ان کے فتوحات ان کے ہر طرح کے کمالات یاد دلاتے ہیں کبھی مسلمانوں کی حالت موجودہ کی تباہی، ان کی مفلسی، اقوام معاصر کے مقابلے میں ان کی بے وقعتی کا مرثیہ ان کو سناتے اور کبھی ان کو کاہلی اور تعصب پر ملامت کرتے۔ اسی غرض سے کہ مسلمانوں کی غیرت کو تازیانہ ہو، میں بھی یہی کچھ کہتا ہوں اور اس کے سوا کر ہی کیا سکتا ہوں۔ میری بات کسی سے نہیں ملتی نہ اولڈ اسکول OLD SCHOOL (پرانے خیالات والوں) کی طرح میں ڈارک ویوز DARK VIEWS رکھتا ہوں، نہ نیچریوں کی سی بلند پروازی۔ جب سرسید نے پکار کر کہ مجھ کو مسلمانوں پر لیکچر دینا ہو گا۔ تو میں نے اپنے خیالات کی وجہ سے چاہا کہ عذر کروں پھر میں نے سمجھا کہ سرسید تو نہیں مگر شاید کسی کو ایسا گمان ہو کہ لاہور کی کانفرنس میں جو ذرا تعریف ہو گئی تھی تو شیخی میں آ گیا۔ جانتے ہیں کہ بڑے نخرے کرتا ہے۔ اس سوءظن کے دفع کرنے کو میں بے عذر چلا جاتا ہوں ورنہ مجھ کو مجامع عام میں شریک ہونے کی عادت نہیں اور شوق و رغبت بھی نہیں۔

سرسید احمد خاں

سرسید احمد خاں کی ایک طرح کی عظمت دل میں بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ بھی کچھ اس وجہ سے نہیں کہ انگریزی یا ڈاکٹر ہیں یا سرکار دربار میں ان کو مسلمانوں کا ایک گروہ ہیں جیش المذہب ریفارمر مانتا ہے۔ بلکہ اس وجہ سے اور صرف اسی وجہ سے کہ مسلمانوں کے سچے خیرخواہ ہیں اور اپنی سمجھ کے مطابق اور جس نے اپنی سمجھ کے موافق کیا تو اس نے سب کچھ کیا، غرض اپنی سمجھ کے مطابق جہاں تک ہو سکا اور ہو سکتا ہے اقدام و تعلیم سے وعظ و پند سے دینے سے دلانے ولایت علی الخیر سے مسلمانوں کی اصلاح حالت میں جان توڑ کر کوشش کرتے ہیں یوں سرسید احمد خاں کی ایک طرح کی عظمت دل میں بیٹھی ہوئی ہے اگر سرسید اپنا سارا منصوبہ ظاہر کر دیں تو شاید ہی نانوے یل جا پہنچ جائیں، ہر چند سرسید نے بہتیری ہی ہمدردی کی ٹٹوّ س دکھائی۔ اسی خیال سے میں نے شروع سے کندھا نہیں دیا، جانتا تھا کہ پیچھے پر ہاتھ دھرنے دیا اور انھوں نے شق جڑے۔ پس میں نے کیا پایا

شیرہ دکھا کر سرسید کو آتے دیکھا اور جھجک کے رہ ہو رہا بہر کیف جس کام کا بیڑا سرسید نے اٹھایا ہے وہ اتنا بڑا عظیم کام ہے کہ گنج قارون بھی اس کے سر انجام کو کافی نہیں ہو سکتا۔ میں بعض مذہبی عقاید میں سید احمد خاں سے اختلاف کرتا ہوں اور اس کو خفت سمجھو یا بے پروائی یا خود پسندی کہ میں کبھی سید احمد خاں کی تصنیفات کا سبسکرائبر (SUBSCRIBER) نہیں رہا یا اس وجہ سے کہ میں تو دل سے اس کا معتقد تھا کہ تہذیب الاخلاق مسلمانوں کی ریفارم کی دی اونلی (THE ONLY) آرگن ہے۔

سرسید کے مرنے کی وجہ سے میری طبیعت حاضر نہیں رہتی اور جیسے لیکچر کی توقع مجھ سے لوگ رکھتے ہیں، نہیں دے سکتا۔

کیا کہیں مشغلہ لیکچر کا ابھی چھوٹ گیا
جب سے اک یار چھٹا ایسا کہ جی چھوٹ گیا
صبر رخصت ہوا سنتے ہی ترا عزم سفر
تم تو کل جاؤ گے پر ہم سے ابھی چھوٹ گیا

میں کیا کروں میرا حال یہ ہو گیا کہ جب کبھی لیکچر یا پبلک اسپیچ کا خیال کرتا، سید احمد خاں کی صورت سامنے آ کھڑی ہوتی ان کا تصور بندھا اور طبیعت بے قابو ہوئی اور اس کا سبب یہ ہے کہ لیکچر اور پبلک اسپیچ وغیرہ کی گرتڈی ہم لوگوں میں اسی مرحوم نے پیدا کی تھی بس خود لیکچر دینے کھڑا ہوتا ہوں تب سید احمد خاں یاد آتے ہیں، کسی کو لیکچر دیتے دیکھتا ہوں تب سید احمد خاں یاد آتے ہیں۔ کوئی مسلمان انگریزی داں انگریزی خواں نظر پڑتا ہے تب سید احمد خاں یاد آتے ہیں کسی مسلمان لڑکے کو گورنمنٹ پر اجلاس کرتے دیکھتا ہوں تب سید احمد خاں یاد آتے ہیں کسی مسلمان کو انگریز کی کوٹھی پر جاتے اس سے بے تکلف باتیں کرتے دیکھتا ہوں، تب سید احمد خاں یاد آتے ہیں گاڑی گھوڑے سے سید احمد خاں یاد آتے ہیں کوٹ پتلون میز کرسی چھری کانٹے سے غرض ہر انگریزی وضع انگریزی ادا سے سید احمد خاں یاد آتے ہیں۔

کس قدر جلدی گزرتے ہیں جہاں میں ماہ و سال
کاش ہم کو بھول کر آتے کبھی اس کا خیال
حال سمجھے ہیں وہ ہو جائیں گے ماضی ایک دن
جتنے مستقبل ہیں ہو جائیں گے وہ اک روز حال

قدم قدم پر اُن کو ناکامی پیش آئی اور آتی ہی تھی مستقل و متواتر ناکامیوں سے اُن کا غصہ بڑھ گیا تھا وہ جل کر اپنوں کو بھی سخت بات کہہ بیٹھا کرتے تھے ایک دن اپنے خیال میں محو ٹہل رہے تھے میں جا نکلا تو بار بار ان کے منہ سے نکلا پاپی پاپی، میں نے کہا کیا مجھ کو ارشاد ہوتا ہے، ایک بار لال پیلی آنکھیں نکال کر کہا ہاں تم کو۔ مجھ کو نیچری کہنا عار تھا، مگر سید احمد خاں کی وجہ سے نیچریت کے وہ معنی نہیں جن کی وجہ سے میں نیچریت کو عار سمجھا کرتا تھا۔ سید احمد خاں کے مرنے پر میں نے چند بند مرثیہ کے طور پر کہے تھے۔

ہو سید پہ رحمت خدا کی
کہ اسلام کی شرطِ خدمت ادا کی
علی گڑھ میں آخر کو کالج بنایا
محبت سے روٹھے ہوؤں کو منایا

ترجمۃ القرآن

انگریزی اخبار کے مطالعے سے انگریزی کو بھی اپنے زعم میں نبھایا اور میں انگریزی اخبار کو اپنے لیے، بلکہ ہر ایک انگریزی داں کے لیے سب سے بہتر معلم اور اخبار کو سب سے بہتر سبق سمجھتا ہوں۔ عربی میں تو کچھ پڑھا نہیں بلکہ جگالی کی یعنی جو کچھ زمانہ طالب علمی میں پڑھ لکھ لیا تھا اسی کو دہرانا اسی میں غور کرتے رہنا کہ میں نے ادب اور دینیات میں سے بھی تفسیر اور حدیث اور سیر کو لے لیا کہ ان ہی چیزوں میں میرا جی لگتا ہے۔

کوئی ایسا انصاف اور حق ناشناس اور احمق ہو گا کہ مولوی شاہ رفیع الدین یا مولوی شاہ عبد القادر کے ترجموں یا تراجم قرآن پر معترض ہو مگر ہے کیا کہ ان بزرگوں نے فرطِ ادب سے لفظی تقدیم و تاخیر کو بھی گناہ سمجھا۔ مولوی شاہ رفیع الدین صاحب کی نسبت مولوی شاہ عبد القادر صاحب نے ذرا اس پیچ کو ڈھیلا کیا ہے اور محاورات اردو کو بہت نباہا ہے۔ مگر انصاف حق اُن کے ترجمے میں بھی ہے یہ سب کچھ ہے مگر اس کو کیا جائے کہ اس

وقت کے لوگ اس طرح کے ترجموں کو پسند نہیں کرتے اور اس کو پڑھ کر خوش نہیں ہوتے اور اصل مطلب فوت ہو رہا ہے کہ جو لوگ اردو کے پڑھنے پر قادر ہیں۔ اُن میں اکثر ان ترجموں سے الٹا الجھتے ہیں اور مطالب قرآن سے ایسے ہی بے خبر رہتے ہیں۔ جیسے اَن پڑھ۔ قرآن کے ترجمے کے بارے میں ایسے خیالات وقتاً فوقتاً میرے ذہن میں گزرا کرتے تھے۔ ایک جملہ معترضہ ادھر بھی سن لیجیے کہ جب سے مراۃ العروس کے ساتھ اس بات کی شہرت ہوئی کہ میں اردو بھی لکھتا ہوں تبھی سے چند دین دار دوستوں نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ اگر تم قرآن کا اردو ترجمہ کر دو تو بڑا کام کرو۔ میں بھی اس ضرورت کو سمجھتا تھا مگر کلام الٰہی کی عظمت کے لحاظ سے ترجمہ کے لیے قرآن کو چھوتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ اسی اثنا میں حدیث کی ایک کتاب دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کا نام ہے "تیسیر الوصول الیٰ جامع الاصول فی احادیث الرسول" صاحب کتاب نے صحاح ستہ کی احادیث کو ایک جگہ اس خوبی سے ترتیب وار درج کیا ہے کہ اس کا حجم ایک کتاب کے حجم سے بڑھنے نہیں پایا۔ مجھ کو وہ کتاب ایسی پسند آئی کہ میں نے بے تامل اس کا ترجمہ شروع کیا اور یہ سمجھا کہ اگر اس کتاب کا شگفتہ ترجمہ ہو جائے تو صحاح ستہ کے ترجموں کی کچھ ضرورت نہیں۔ چنانچہ اس کے ربع اول کا ترجمہ کیا۔ اسی ربع میں واقع ہوئی کتاب التفسیر اور اس میں واقع ہوئیں قرآن کی آیتیں اور چار و ناچار ان کا ترجمہ کرنا پڑا تو میں نے اُن آیات کا ویسا ہی با محاورہ سلیس مطلب خیز ترجمہ کیا جیسا ترجمہ لوگ چاہتے ہیں اور جیسا کہ ضرورت ہے۔ اب مجھ کو خیال آیا کہ وہی آیتیں قرآن میں ہیں تو میری طبیعت ترجمہ کرنے میں مضائقہ کرتی ہے تو میری وہی مثل ہوئی کہ گڑ کھائیں گلگلوں سے پرہیز۔ اس خیال نے اب آ کر دبایا کہ میں نے تیسیر کا ترجمہ تو کیا موقوف اور ایک دم سے قرآن مجید کا ترجمہ شروع کر دیا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وہ ترجمہ تمام ہوا۔ میں نے اس کو مطبع انصاری دہلی میں اپنے زیر نظر چھپوایا۔ بعض صاحبوں نے مجھ سے منہ پھوڑ کر فرمائش کی اور صلاح تو بہتوں نے دی کہ میں نمونے کے طور پر چند مقامات کا اپنا ترجمہ دوسرے ترجموں سے مقابلہ کر کے پبلک کے روبرو پیش کر دوں۔ مگر میں نے ایسا کیا نہیں اور کروں گا بھی نہیں۔ کیوں کہ اس میں دوسرے ترجموں کے ساتھ ایک طرح کا معارضہ ٹھہرتا ہے اور معارضہ نہ میری نیت ہے اور نہ میں اپنے اوپر تہمت لینی چاہتا ہوں۔ ہاں میں اپنا ترجمہ ہر ایک شخص کو دکھا سکتا ہوں اور دکھانے کے لیے اس کو چھپوایا ہے۔ اور دوسرے ترجموں سے مقابلہ کرنا میرا کام نہیں۔ جس ارادے سے وہ ترجمے کیے گئے اور جس زمانے میں کیے گئے وہ اب بھی لاجواب ہیں اور جو شخص شگفتہ عبارت میں قرآن کا مطلب آسانی سے سمجھنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے تو نہیں مگر اس مبتدی ادب عربی میں لفظ بلفظ کے ترجمے سے اپنی استعداد بڑھانا چاہتا ہے اس کے لیے بکار آمد ہیں اور بکار آمد رہیں گے۔ میں نے ترجمۃ القرآن کی نسبت بہت زیادہ گفتگو کی ہے تو کوئی صاحب ایسا خیال نہ فرمائیں کہ میں اپنے ترجمے کی خریداری کی ترغیب دیتا ہوں۔ میں تو اس شخص کا ہم خیال ہوں جس نے یہ شعر کہا ہے ؎

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است
رفتن بپائے مردیِ ہمسایہ در بہشت

اس زمانے میں جس طرح کے مصنفوں کی نسل چلی ہے۔ اُن میں سے ایک میں بھی ہوں۔ مگر میں نے کبھی اپنی کسی کتاب کی اشاعت کے لیے کسی طرح کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ میں نے اپنی کسی کتاب میں لکھا بھی ہے کہ میں کتابیں نہیں تصنیف کرتا بلکہ یوں سمجھو کہ ایک طرح کے کنکوے بناتا ہوں اگر ان میں پرواز کا مادہ ہے تو آپ سے اُڑیں گے۔ ورنہ میں کہاں اُن کے پیچھے دُم چھلے کی طرح لٹکا پھروں گا۔ اور یہی معاملہ میں اپنے قرآن کے ترجمے کی نسبت بھی کرنے والا ہوں اور میں قوم کی قدردانی کا بھی اندازہ لیے بیٹھا ہوں۔ میں تو ایک بیکار سا آدمی ہوں اور میری ساری عمر اپنے ہی نفس کی خدمت میں گذری ہے۔ لیکن جو قوم کے محسن اور ہمدرد اور خیر خواہ اور دلسوز اور فدائی ہیں۔ ان کو بھی جیسے جیسے خطاب اور جو جو انعام ملے ہیں مجھ کو ذرا ذرا معلوم ہیں۔ میں تو اپنے ترجمے کی نسبت فیصلہ کر چکا ہوں کہ میری زندگی میں تو کیا ہے سو [illegible] ہی سہی ہے مگر خوش ہوں کہ میں نے قرآن کا ترجمہ کیا تو کیا۔

حرمت منشورات مسلمانوں کا خیال اور دوسری طرف ان مسلمانوں کا جنھوں نے انگریزی تعلیم پائی ہے۔ جو آئندہ چار و ناچار انگریزی پڑھیں گے۔

ایل ایل ڈی

میری گون بڑی قیمتی ہے۔ ساڑھے چھ سو روپے میں وہ گون پڑی ہیں، اصلا کیا خریدتا۔ یہ میاں مشرف نے میرے سر منڈھ دیں۔ وہ ایڈنبرا میں پڑھتے تھے مجھے لکھا کہ اپنی تمام تصنیفات و تالیفات کی نہایت عمدہ جلدیں بندھوا کر بھجوا دیجیے۔ سر ولیم میور دیکھنا چاہتے ہیں۔ سر ولیم میور پہلے ممالک مغربی شمالی کے لفٹیننٹ گورنر تھے۔ مجھ پر بھی بہت مہربان تھے۔ میں نے مشرف کے لکھے کو سچ جانا۔ کتابوں کی جلدیں بندھوا ایڈنبرا روانہ کر دیں۔ ان کتابوں میں میرا کلام مجید کا ترجمہ تھا۔ وہ بہت پسند کیا گیا۔ سر ولیم میور نے یہ کتابیں ایڈنبرا یونیورسٹی میں پیش کر دیں اور ہمیں گھر بیٹھے ایل ایل ڈی کی ڈگری مل گئی۔ مگر اس ڈگری کی اطلاع میرے پاس بعد میں آئی پہلے ایک درزی کا خط وہاں آیا کہ مسٹر مشرف کی فرمائش کے بموجب ایل ایل ڈی کی ایک سیاہ اور ایک سرخ گون مع ٹوپی کے روانہ کی گئی ہے براہ کرم جس قدر جلد ممکن ہو ساڑھے چھ سو روپے روانہ فرمایئے۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ الٰہی کیا ماجرا ہے میاں مشرف دیوانہ ہو گیا ہے یا یہ درزی پاگل ہے کیا بیٹھے بٹھائے یہ روانہ کر دیا۔ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گون کا چھتا بھی آ گیا۔ غرض اسی کشمکش میں ایک ہفتہ گزر گیا۔ دوسری ڈاک سے ایل ایل ڈی کی ڈگری ملنے کا مراسلہ اور میاں مشرف کا خط ملا۔ قہر درویش بر جان درویش درزی صاحب کو رقم روانہ کی۔ مشرف کو بڑا لعن طعن لکھا کہ وہاں سے یہ تحفے بھجوا کر مجھے کیا ممنون کیا ہے۔ یہیں اپنے آپ کی گون بنوا لیتا۔ غرض ایک ملا کا بیٹا ڈاکٹر ڈپٹی شمس العلما، ایل ایل ڈی، ہو گیا ساتھ آسمانی کھیچ اسی دلی کے

مجھ را سا خطاب تو ہے مجھ کو اس سے نفور گو ہے خطاب کو میری نسبت سے عار و ننگ
کیوں کر کہیں کسی سے کہ ہم کون ہیں کیا ہیں ایک ذرہ ہیں اور نام کے شمس العلماء ہیں

شعر و شاعری

میری عمر کے اوائل میں اگرچہ وہ دلی کے انحطاط کا زمانہ تھا پھر بھی ہر فن کا فرد کامل دلی میں موجود تھا۔ لوگ نہ صرف دلی والوں کی زبان کا لوہا مانتے تھے بلکہ ان کی وضع کا، ان کی تہذیب کا، ان کی لیاقت کا، ان کی ذہانت کا، ان کے علم و ہنر کا، ان کے حرفت و صنعت کا یعنی ہر چیز کا جو دلی کی ہوا بھی کو چھو گئی ہو۔

دلی کے متاخرین شاعروں میں اسد اللہ خاں غالب سب سے سربرآوردہ تھے۔ اپنا اپنا مذاق ہے میں تو ان دو شاعروں کا معتقد ہوں متقدمین میں مرزا رفیع سودا اور متاخرین میں اسد اللہ خاں غالب کا۔ غالب کے مضامین الجھے اور خیالات جدت لیے ہوتے تھے۔ بندش مضبوط، مگر شوخی کے ساتھ ان میں اگر عیب تھا تو یہ کہ مشکل گو تھے لیکن اس عیب پر بھی وہ فارسی اور اردو دونوں کے استاد مسلم مانے جاتے ہیں۔ ان کے دیوان ریختہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو نظم میں ایک طرز جدید کا ڈول ڈالنا منظور تھا مگر چونکہ گردش ایام (COURSE OF TIME) یا رفتار زمانہ اس کے خلاف پڑ رہا تھا رواج دینا تو درکنار آخر میں خود غالب کو اسے چھوڑ دینا پڑا۔ میں شاعر نہیں ہوں مگر اتنی عقل مجھ کو بھی ہے کہ اگر کوئی شعر میرے روبرو پڑھا جائے۔ تو غالب ہے کہ اس کے قائل کے تعین میں غلطی نہ کروں۔ میں جانتا ہوں کہ میر صاحب کے مضامین حسرت آلود ہوتے ہیں اور زبان نہایت درجہ شستہ اور سلیس یہ بات خاص میر صاحب ہی میں دیکھی گئی کہ ضرورت شعری کی وجہ سے لفظ کاٹ کر نکالنا بھی جائز نہیں رکھتے۔ انشاء اللہ خاں چلبلے ہیں۔ بیان میں شوخی۔ سودا ہر قسم کے مضامین پر قادر ہیں۔ بندش بھی اس کی مضبوط ہوتی ہے۔ متاخرین میں مثلاً غالب اور ذوق میں تمیز کرنا کیا مشکل ہے۔ مجھکو خود ایسا اتفاق ہوا ہے کہ بہ ضرورت کسی اخبار میں کوئی مضمون دیا اپنے نام سے نہیں۔ مگر اڑانے والے تاڑ گئے تو مجھ کو بڑی حیرت بھی پیش آئی۔

ایک طرز ہمارے حالی صاحب نے اختیار کی اور وہ مقبول ہو گئی۔ اس واسطے کہ روز مرہ کے رنگ کے مطابق تھی۔ اس کی مقبولیت اس

دہلی کی تو یہ ہے کہ حالی کے اشعار ظفر کی غزلوں کی طرح ہر ایک گانے والے کے منہ پر ہیں انھوں نے ایک بڑی دُھوم کا مسدس لکھ کر ایسا غل مچایا کہ جہاں جہاں موزوں طبع تھے سب لگے اُن ہی کی نے میں گانے اور گنگنانے والوں میں یہ آپ کا نیاز مند بھی ہے۔ میں نے بھی اُسی طرز میں ایک مسدس لکھی خود حالی نے نظم کا رنگ بدل دیا اور شاعری اگلی گندگی اور بے ہودگی سے بہت کچھ پاک ہو گئی۔ لیکن افسوس جوانی اور شاعری کا مذاق گیا مگر اطمینان ہو سکتا تھا کہ اس عمر میں اس مذاق کا اوّل ابتدائی شاعری کے زہر آلود اثر سے محفوظ رہ سکے گا۔

شیخ ابراہیم ذوق کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے ؎

ہیں دہن غنچوں کے وا کیا جانے کیا کہنے کو ہیں
شاید اُس کو دیکھ کر صلِّ علیٰ کہنے کو ہیں

شاہجہان پور میں کانفرنس ہوا تو ایک صاحب نے جن کا نام اور تخلص دونوں مجھ کو بھول گئے ہیں۔ سید احمد خاں کے خیر مقدم کے طور پر اُسی دن میں ایک نظم پڑھی تھی اور نواب محسن الملک بہادر نے جو اس کانفرنس کے پریذیڈنٹ تھے اس نظم کی بڑی مدح کی تھی اور وہ مدح کی مستحق تھی بھی۔ مجھ کو خیال آیا کہ میں بھی اسی طرح طبع آزمائی کروں۔ بے شک میں ان جیسے شعر نہیں کہہ سکتا، اور میں نے ساری عمر شعر گوئی کو اپنا مشغلہ بھی نہیں بنایا یہاں تک کہ ہنوز میں نے اپنا کوئی تخلص بھی نہیں رکھا اور میری طبیعت کے موزوں ہونے کی وجہ سے کبھی کوئی شعر موزوں کر لیا تو اس کو میں نہیں کہتا۔ مگر اتنا کہنے سے میں شاعر نہیں ہو گیا اور نہ میں شاعر ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں اور شاعر نہیں اور شاعری کا دعویٰ نہیں تو مدح کی توقع کیوں ہو۔ مدح و ستائش نہ بھی ہو تاہم یہ فائدہ کیا کم ہے کہ مجھ جیسے اناڑی شاعر کی وجہ سے خواجہ الطاف حسین حالی جیسے کمالات کی حق قدردانی کی جائے گی۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے پہلے تک دلّی میں ایسے ایسے شاعر موجود تھے کہ ہر شخص اپنی طرز کا استاد تھا مگر بیچارے محتاج، مفلس، تنگ معاش کی وجہ سے پریشان اور جتنے نامی اور مستند شعرا، متقدمین و متاخرین ہندی اور عجمی ہو گزرے ہیں، سب ہی کے کلام سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ شاعروں کو گویا کسی فقیر کی بددعا ہے۔ کہ ہمیشہ تنگ دست رہیں، ہمارے ملک میں کلب علی خاں ایک شاعر تھے اُن کے شعر سے اس کی تصدیق ہوتی ہے وہ فرماتے ہیں ؎

لوگ کہتے ہیں کہ تو بھی شعر گوئی گھس ہے
شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر ہو گیا

میری زبان اُردو ہے اور میں اُردو ہی بولتا ہوں مگر اس میں یا تو عربی الفاظ ہوتے ہیں اس واسطے کہ میں مسلمان ہوں اور مجھ کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ باپ دادا جدِ موروثی مسلمان ہوں اور اپنے نسب نامے میں انقراضِ سلطنتِ دہلی تک جو نسل مشائخ اور مفتی اور علماء کے نام پاتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ سب میری طرح کے مسلمان ہوں اور کم سے کم اتنی عربی جانیں جتنی مجھ کو آتی ہے یا میرے بولنے میں انگریزی الفاظ ہوتے ہیں اس لیے کہ گورنمنٹ انگریزی کا نمک خوار ہوں، کسی خصوصیت کا امیدوار نہیں، تقربِ حکام کا اتنا خواستگار نہیں ؎

نہ بر اشترے سوارم نہ چو اشتر زیر بارم
نہ خداوند رعیت نہ غلام شہریارم

شکر کیا ہے کہ میں سرکار کا رضا مند، خوش دل اور شکر گزار رعیت ہوں اور چاہتا کہ سب مسلمان میری طرح رعیت ہوں اور کم سے کم اتنی انگریزی جانیں جتنی مجھ کو آتی ہے۔ یوں تو میری انگریزی دانی بہت کچھ بھی نہیں اور کچھ ہوتی تو کہاں سے ہوتی۔ جن دنوں طالب علمی کا اتفاق ہوا آج کل کا سا زمانہ نہ تھا کہ در و دیوار سے انگریزی کی لپک ہے۔ زمین و آسمان سے انگریزی کا تقاضا ہے۔ دنیا نے جان کھا رکھی ہے کہ میری طلب ہے تو انگریزی پڑھو، دو آنکھیں دکھا رہی ہے کہ مجھ کو سمجھنا چاہتے ہو تو انگریزی پڑھو۔ وہ تو ایسے وقت تھے کہ خود سید احمد خاں سے بھی پوچھا جاتا تو انگریزی پڑھنے کو کفر بتاتے تو اس کے گواہ ہیں، ہونے کے نتیجے پر ضرور غور کرتے تھے مگر میں کچھ نہ کچھ کہتے ہی گیا اور اب بھی کرتا ہوں، زیادہ نہیں ہو سکتا تو بالالتزام انگریزی اخبار پڑھتا ہوں۔ سو حق

میں نے انگریزی تو تھوڑی بہت پڑھی مگر از بس کہ انگریزی میں کاروبار کرنے کا موقع نہ ملا، میں اس کو اپ ([illegible]) نہ کر سکا۔ انگریزی کے ایکسپریس ([illegible]) کرنے کا ایک طریقہ اور تھا۔ انگلش وائف یا انگلش وائف سے اس کے لیے خدا نے مجھ کو پیدا نہیں کیا، نہ مزاج عشقی بازو صورت ایسی تھی۔ میں نے اپنی انگریزی لغت کو بیچ دیا ورنہ اس لغت پر بیچ پر بی اے والوں کے ساتھ پالا لینے کو موجود ہوں مگر بی۔ اے بھی مسلمان بی اے کیوں کہ معلوم ہے کہ انھوں نے [illegible] کی ہوگی اور جدہ بھی ہارا تو ہیں ہارا ہے۔

میں پولیٹیکل طور کا آدمی نہیں ہوں جس کے دل کو جتھے سے کسی طرح کا علاقہ ہوتا۔ جو لوگ نیشنل کانگریس کے بانی اور موجودہ محرک ہیں انھوں نے اپنے گروہ کا نام انڈین نیشنل کانگریس رکھا ہے۔ اپنے منہ میاں مٹھو۔ لیکن ایک عقل کی کتاب جس کو ہندوستان کے جغرافیے اور تاریخ سے کچھ بھی مناسبت ہے ہندوستان کے نام کے ساتھ لفظ نیشنل سن کر کان کھڑے کرے گا کہ کجا ہندوستان اور کجا نیشنلٹی۔

من چہ می سرایم و طنبورہ من چہ می سراید

تمام روئے زمین پر کوئی ایسا ملک نہیں کہ جس میں اس کثرت سے مختلف العقائد، مختلف المراسم، مختلف العادات اور مختلف الاغراض قومیں رہتی ہوں جیسے ہندوستان۔ پس ایسے ہجوم نے متضاد کو ایک جا کر کے ایک مجموعی مرکب قوم واحد قرار دینا صریح مغالطہ دہی ہے۔

میں نے اپنے لیے روپیہ کمانے کی کوشش کی۔ وہ بھی تمول کی نظر سے نہیں بلکہ فارغ البالی کی غرض سے۔ شخصی عزت کی طرف سے میرا دل کچھ ہمیشہ بجھا ہوا سا ہے۔ یہی شخصی ایک مجھے کے لیے بھی اس کا خیال نہیں کیا۔ کیوں کہ میں قومی عزت کے بدون شخصی عزت کو اصل عزت نہیں بلکہ عزت کا [illegible] سمجھتا ہوں۔ شخصی عزت تو در کنار ایک کوڑی روپیہ سے بھی وہ خوش نصیب نہیں جو ایک معزز قوم کے آدمی کو ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے۔ اس سے کیا متمتع ہو سکتا ہے۔ وہ بد بخت جس کے بعض مصیبت زدہ رشتہ دار دلی میں دست کاری سے اور مجبوری میں کاشتکاری سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ ان سب کی دستگیری کروں، اتنی توفیق نہیں، ان کی مصیبت کا متعلقاً احساس نہ ہو ایسا دل نہیں۔ میں تو ایک متوسط الحال آدمی ہوں جو لوگ بڑی بڑی شخصی عزتیں رکھتے ہیں میں تو ان کے عیش کو بھی ایسی کدورتوں سے صاف نہیں پاتا۔

تجارت کا شوق

میں دلی میں رہتا ہوں، میرے گھر کے قریب کھاری باؤلی کا مشہور بازار ہے۔ اس سرے سے اس سرے تک تمام غلہ فروشی میں خاندان میں وہ دکانیں اور مکانات کی قسم سے کچھ جائداد ہے۔ ہم لوگ ہمیشہ جائداد کو ترجیح دیتے ہیں کیوں کہ اس سے کرایہ آسانی سے اور بلا دقت وصول ہو جاتا ہے۔

میں سچ کہتا ہوں کہ تجارت کے شوق میں تین لاکھ روپیہ کھو بیٹھا ہوں۔ پھر بھی جو کچھ مجھے بعض تھوڑے دو کانداروں سے فائدہ پہنچا ہے، اس نے میرے نقصان کی تلافی ہی نہیں کر دی بلکہ نفع میں بھی پہنچا دیا ہے۔ میں لوگوں سے کہتا ہوں کہ تجارت کرو روپیہ میں دیتا ہوں، نوکری کی ٹھوکریں اٹھاؤ گے تو مزا معلوم ہوگا۔ جب مجھ پر [illegible] لگ چکا ہے تو اب مجھے ڈر ہی کیا رہا۔ سود میں کیا حرج ہے۔ میں نہ دوں گا تو کسی ساہوکار سے لو گے اس کو خوشی سے سود دو گے۔ اور سے بہتر مجھے کچھ فائدہ پہنچاؤ گے تو دین و دنیا دونوں میں بھلا ہوگا۔ اوروں سے روپیہ سیکڑہ لیتا ہوں تم سے چودہ آنے لوں گا۔

امیر حبیب اللہ سے ملاقات

مجھ میں ایک بڑا سخت عیب ہے کہ تسلسل حسن قائم نہیں رکھ سکتا۔ امیر حبیب اللہ خاں کے دربار میں تو شعر کے جال مصیبت میں پھنس گیا۔ شعر یہ خاص تھا کہ معلوم ہوا کسی نے نہ مجھے [illegible] دیا اس میں میرے شعر کا کوئی سر [illegible] جڑا ہینہ [illegible] میں شعر جو مجھے [illegible] ہو گئیں [illegible] کی گرفت سے نکلنے کی [illegible]

کوشش کر جنبش تک نہیں ہوتی۔ بارے خدا خدا کر کے گرفت ڈھیلی ہوئی تو میں ذرا علیحدہ ہوا ابھی پوری طرح سانس بھی نہ لینے پایا تھا کہ اس نے میرے گلے میں باہیں ڈال بوسے پر بوسے لینا شروع کیا بھلا مجھ بڈھے کو دیکھو اور امیر صاحب کی اس حرکت کو دیکھو کچھ تعریف کا یہ طریقہ افغانستان ہی میں اچھا معلوم ہوتا ہو گا مجھ کو تو مارے شرم کے پسینے چھوٹ گئے وہ اللہ کا بندہ ذرا دم لیتا اور ہمارا منہ تک کر پھر لپٹ جاتا۔ چپٹا اور پیشانی ہی پر بوسے پر بوسہ لینا شروع کرتا۔ بیچارے دوسرے بھلے آدمی بیٹھے ہوئے کیا کہتے ہوں گے۔ جب میں نے اس مصیبت سے رہائی پائی تو ناک سے پسینہ اس طرح بہہ رہا تھا جس طرح کسی ٹوٹی صراحی میں سے پانی رستا ہے۔

مجھ کو اکثر اتفاق ہوتا ہے کہ کسی دوست کی دوکان پر بیٹھا ہوتا ہوں اور آم وغیرہ کوئی چیز بکنے آئی اور میں نے بھی خریدی۔ اب اس پوٹلی کو ہاتھ میں لٹکا کر کبر نفس کی وجہ سے گھر تک لانا مجھ پر بار ہوتا ہے اور نہیں لا سکتا اور اگر آپ لوگ اپنے اپنے نفس کا احتساب کیجیے گا تو میں یقین جانتا ہوں کہ اکثر بڑے شہروں میں ایک خود دماغ نہیں ہوں میں جب شروع شروع میں ترک خدمت کر کے خانہ نشین ہوا تو دنوں میرا یہ حال رہا کہ بازار میں پیادہ پا نکلنے سے میری طبیعت منغض ہوتی تھی۔ اگر بازار میں مجھ سے کھڑے ہو کر کوئی بات کرتا تو میں اس کو بڑی بدتمیزی خیال کرتا تھا۔ خدمتگار مجھ کو اس طرح لازم تھا جیسے آدمی کو ہمزاد لیکن میں نے سوچا کہ جس شہر میں میں نے مسافرانہ طالب العلمی کی، اس وقت کے جاننے اور دیکھنے والے ہنوز موجود ہیں، صرف اتنی سی بات سے کہ میں نے اتفاق سے بڑی بڑی نوکریاں کیں، چار پیسے پلے ہو گئے میرا اس قدر اترانا ذلیل کم ظرفی ہے۔ چنانچہ میں نے اس رعونت کو کم کیا پہلے تو میں نے اس سبب سے گاڑی گھوڑا نہیں رکھا کہ سائیسوں سے ڈر لگتا تھا۔ ایک تو وہ گھاس چراتے ہیں، دوسرے گھوڑے کی مالش نہیں کرتے۔ تیسرے گاڑی کا آنچ بیچ تو زائل، وہ قدر دان بیٹھے بٹھائے اپنی بھلی چنگی جان کو عذاب لگانے اور دن رات کا فکر مول لے۔ رفتہ رفتہ پیدل چلنے پھرنے کی عادت ہو گئی۔ اب آخری عمر میں گاڑی کی ضرورت ہوئی تو گاڑی رکھتے ہوئے شرم آتی ہے لوگ کیا کہیں گے کہ تمام عمر تو مولوی صاحب جوتیاں چٹخاتے پھرے اب بڑھاپے میں گاڑی پر سوار ہو کر پھرتے ہیں مگر نفس میں ابھی اتنی خباثت باقی ہے کہ کوئی چیز لے کر چلتے ہوئے شرماتا ہوں۔

ان فضیحتی کے ملاقاتوں پر میرا دل بیٹھ جاتا ہے کیا کروں، ان ملاقاتوں سے عاجز آ گیا ہوں۔ اپنا بھی وقت ضائع کرتے ہیں اور میرا بھی۔ میں اپنی زندگی کے اخیر دن ایسے سکون میں بسر کرنے چاہتا ہوں کہ اپنے اختیار سے ایک گوشۂ عافیت میں چھپا ہوں۔

اپنے ہی ہاتھوں بگڑتے اور بنا کرتے ہیں لوگ
کوسنا بیجا ہے ناحق گردش ایام کو

(ترتیب: عظیم الشان صدیقی)

مولوی عبدالقادر غمگیںؔ رامپوری

میرے بزرگوں میں اسحاق نامی آذربائیجان میں ایک عافیت نشین شخص تھے۔ ان کے بیٹے احمد نے ہندوستان کا راستہ لیا۔ سیدھے دہلی پہنچے۔ کچھ عرصے تک کسی نے ان کو نہ پوچھا یہاں تک کہ جو کچھ سرمایہ پاس تھا خورد و نوش میں ختم ہوگیا۔ تب رحمت الٰہی جوش میں آئی اور مدرسہ غازی الدین میں امامت کی جگہ مل گئی۔ ایک برادری شخص کی لڑکی سے عقد ہوگیا۔ جس سے تین لڑکے محمد اعظم، محمد معظم اور محمد اسلم پیدا ہوئے۔ سب نے پیشہ سپہ گری اختیار کیا۔ محمد معظم عالم نوجوانی میں نظام الدین اولیا کے راستے میں گھوڑے سے گر کر جاں بحق تسلیم ہوا۔ محمد اعظم باپ کی اطلاع کے بغیر دکن کو روانہ ہوگیا پھر اس کی کوئی اطلاع نہ ملی۔ محمد اسلم باپ کے ساتھ زندگی بسر کرتا رہا۔ اس کا نکاح خواجہ محمد امین پسر خواجہ محمد اسحاق کی لڑکی کے ساتھ ہوگیا۔ جب شہر دہلی ایرانی مسلمانوں اور کافران دکن کے ہاتھوں تباہ ہوا تو محمد اسلم والدین کے حکم سے اپنی بیوی اور ہشت سالہ لڑکے محمد اکرم کو چھوڑ کر قائم علی خاں کے لشکر میں بنگال پہنچے۔ وہاں سے روانہ ہو کر مراد آباد پہنچے۔ چند ماہ زندہ رہے۔ آخر کار اس خاکدان کو چھوڑ دیا اور سید احمد کے احاطے کے متصل قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

محمد اسلم نے ایک ہشت سالہ لڑکا محمد اکرم چھوڑا جس کا سرپرست سوائے ماں کے کوئی نہ تھا۔ مادر مشفقہ اپنی بڑی بہن سے ملاقات کے لیے رامپور آئیں۔ انھوں نے کہا کہ نسبت مراد آباد کے تمہارا یہاں رہنا بہتر ہے۔ انھوں نے بھی منظور کر لیا۔

اسی عرصے میں میری نانی مراد آباد چھوڑ کر رامپور پہنچ گئیں۔ میری زبان کھلتے ہی سب سے پہلے لفظ اماں ابا سے آشنا ہوئی۔ . . . .

میری دادی میری والدہ کو بھی دہلی کی اردو سکھاتی تھیں اور ہمیشہ یہ دیکھتیں کہ جو بات مراد آباد کے محاورے کی، دہلی کے محاورے کے خلاف زبان پر آتی ان کو فوراً متنبہ کرتیں۔ جب میری زبان سے حرف نکلنے لگے تو مولانا (مفتی شرف الدین رامپوری) نے مجھے آیۂ کریمہ:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَکَبِّرْہُ تَکْبِیْرًا۔

بطریق رسم سکھائی۔ میرے والد جب مجھ کو مولانا کے سامنے لے جاتے تو وہ ہر کام اور ہر وقت کی مقررہ دعائیں مجھے تعلیم فرماتے۔ سات سال کی عمر میں قرآن شریف ختم ہوا۔ چودہ برس کی عمر تک گھر میں پرورش پاتا رہا۔ دادی نے پند نامہ سعدی، کریما، خالق باری پڑھائی۔

۱۲۱۰ھ (۱۷۹۵ء) میں راقم الحروف نے مولانا شرف الدین کی خدمت میں تعلیم حاصل کی۔ نحو، رسائل، منطق، فلسفہ، معانی و بیان اور کچھ اصول فقہ کی تحصیل کی۔

۱۲۱۴ھ (۱۷۹۹ء) میں مولوی ضیاء النبی نے اپنے رسالے کے سواروں میں اس کم سواد کا نام بھی لکھ لیا بغیر ادائے خدمت حق الخدمت مجھ کو رزق فرما دیتے۔ ان کا احسان اپنے اوپر زیادہ دیکھتا ہوں۔ ان مجلسوں میں اکثر کتب حدیث، تفسیر اور فقہ کی تصحیح اور مقابلہ

ہوتا تھا اور کبھی مناظر، اصطرلاب اور ہندسہ کا تذکرہ آجاتا تھا کبھی علم ہیئت سے بحث ہونے لگتی تھی۔ ان فنون سے بھی میں نے واقفیت حاصل کرلی لیکن ان علوم میں میرا کوئی اُستاد نہیں۔

کچھ عرصے کے بعد والد صاحب کی ملازمت کا سلسلہ نظام علی خاں کی سرکار سے منقطع ہوگیا چند روز قاسم علی خاں کے ساتھ گزارے اس کے بعد مجھ سمیت پھر نواب نصر اللہ خاں کے ساتھ رہے۔ نواب کی ملازمت کے وقت والد نے فرمایا کہ میرا اور تمہارا ایک جا رہنا مناسب نہیں (مولوی ضیاء الدین) کے مشورے سے عنایت اللہ خاں کے رسالے میں اپنا نام لکھایا۔ تنخواہ میں بھی اضافہ ہوگیا اس کے علاوہ جز اول گرداول اور شادی غمی میں اعانت کی رعایات تھیں۔ کھانا دسترخوان پر ساتھ ہوتا تھا اور مشغلہ کبھی شعر و شاعری کبھی تاریخ کبھی حدیث۔ کبھی پرگنے کی تحصیل و تشخیص کے متعلق مشورہ۔ جس وقت بخشی گری کفایت اللہ خاں سے متعلق ہوئی اور نواب فیض اللہ خاں کے پیش کار غلام حسین نائب ہو گئے تو عرضداشت (حاضری، دکھانے) کے لیے جانا ضروری ہوگیا۔ مجھے ان کے سامنے جانا ناگوار معلوم ہوا کیونکہ مولوی ضیاء الدین کے زمانے میں صرف میرا نام درج تھا اب عام لوگوں کی طرح اپنا حلیہ باپ دادا کا نام لکھوانے کو کم ہمتی کے خیال سے میں نہ گیا اور یہ جواب دیا مجھے نوکری منظور نہیں خیال ہے کہ مراد آباد چلا جانا چاہیے جو مصلحت ہوگی اس پر کاربند ہوجاؤں گا۔

چند روز شاہی مسجد مراد آباد میں جاکر بیٹھا کیونکہ وہاں ہر قسم کے لوگوں کا مجمع تھا جو کتاب لے آتے پڑھا دیتا تھا۔ لالہ ضیا رام نے جو ہمارا [illegible] کے عزیزوں میں سے ہے ایک مکان اپنے مکان کے پہلو میں میرے لیے کرائے پر لے لیا اور ضروریات میں بھی مدد کی۔

کہار کا عنایت کردہ

ایک دن نواب فتح اللہ خاں ولد دوندے خاں کے صاحبزادے نثار خاں، مرجی محمود پور کے رئیس کو اپنے ہمراہ لے کر ڈاکٹر ...... صاحب کی ملاقات کو گئے میں بھی ساتھ ہو لیا۔ صاحب میرے حال کی طرف متوجہ ہوئے۔ دوسرے بزرگوار دوبارہ نہ گئے البتہ میں بے سروسامان ایک مرتبہ پھر گیا۔ صاحب کے کہار نے جاکر اطلاع دی کہ ایک مولوی صاحب ملاقات کے لیے آئے ہیں صاحب نے بلایا اور مہربانی سے پیش آیا۔ ہفتہ عشرے کے بعد میں جاتا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا آتا۔ کبھی کبھی صاحب کو فارسی لکھوانے کی ضرورت پڑتی تو فرما دیتے میں اس کو پورا کر دیتا۔ ڈاکٹر صاحب وہاں کے صاحبوں کے سامنے میرا تذکرہ بہت تعریف کے ساتھ کرنے لگے یہاں تک کہ میں مولوی مشہور ہوگیا۔ یہ وہی خطاب ہے جو کہار کا عنایت کردہ ہے ڈاکٹر صاحب نے اس کی اشاعت کردی اب میں اس بے موقع لقب سے تنگ ہوں مگر دنیا کی زبان بند نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹر صاحب نے مسٹر صاحب سے میرے بارے میں کچھ کہہ دیا۔ انہوں نے رخصت کے وقت فرمایا کہ شنبہ کے دن جس وقت چاہو آجانا اور اگر ہمارے قبضہ کا کوئی کام اپنے مناسب سمجھو تو اس کی درخواست بھی دے دینا میں جاتا تو تھا لیکن کوئی کام اپنے مناسب نہ دیکھا۔ لیکن دل میں اس خیال پر جما ہوا تھا کہ اگر اپنی رائے سے کوئی کام تجویز فرمادیں گے تو اپنی صوابدید کے لحاظ سے اس کی نگرانی کی جانب سے چشم پوشی فرمائیں گے اور اگر کسی کام کا خود مدعی بنا جائے تو دیکھیے امتحان میں کامیابی کیونکر ہو۔ اس ڈھنگ پر میں نے کئی روز گزار دیے

اتفاقاً کمشنری بورڈ کے صاحبان تشریف لے آئے۔ صاحبزادہ عنایت اللہ خاں نے گفت و شنید کرنے کے لیے مجھے لشکر کے ساتھ کردیا میری جمعیت کی جانب روانگی ہوگئی اور ہم بریلی شہر جا پہنچے۔

دوسرے دن تمام عملہ کو وہیں چھوڑ کر ہم دیو کے راستے کی سیر کو چل دیئے۔ وہاں سے لگاتار کوچ کر کے لچھ گڑھ پہنچ گئے۔ علی گڑھ کے پڑاؤ پر لشکر کے قریب ایک فقیر گنگا تیر رہتا تھا، میں اس کے پاس چلا گیا۔ درویش نہ اخلاق سے پیش آیا، عمر بڑی رنگ میں بیٹھا ہوا اس کے سارے سر کے بھی بیس برس کے بھی نہ ہوں گے ناخن بڑھے ہوئے تھے ان کے چہرے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے دہکتا ہوا انگارہ، راکھ میں چمکتا ہے جو کوئی ایک بار دیکھ لیتا پھر نظر ہٹا ہی نہیں سکتا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ یہیں بیٹھا رہوں اور خداوند تعالیٰ کی اس عجیب روزگار صنعت کو دیکھتا ہی رہوں گرو جی سے میں نے پوچھا کہ مجھ کو بھی چیلوں کے حلقے میں داخل کر سکتے ہو؟ کہا: نہیں ــــ مسلمان قوم کی ہمارے مذہبی طریقے میں گنجائش نہیں۔ اپنے حال پر چار آنسو بہاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا:

اگر ننگ بودے مرا رسم و راہ
بہ اسلامیاں داشتم پائے گاہ
کنوں ننگ دارد ز من پیر دیر
کہ در من نہ بیند نشانے ز خیر

جہائے مُردہ

وہاں سے منزل بمنزل چل کر کاس گنج آئے اور کاس گنج سے مارہرہ۔ جہاں شاہ برکت اللہ بلگرامی کا مقام ہے۔ بہت سے لوگوں کی زبانی وہاں کے بزرگوں کی تعریف سن چکا تھا۔ وہاں دو بزرگوار ہیں ایک کو بڑی سرکار اور دوسرے کو چھوٹی سرکار کہتے ہیں اور ان دونوں کا اختلاف ہندو مسلم اختلاف سے بھی زیادہ ہے۔ چنانچہ میں گیا اور دونوں کی زیارت کی اور اس قدر برکتیں حاصل کیں کہ دوبارہ وہاں جانے کی حاجت نہ رہی۔

مشتاق شدم تا بدر شیخ رسیدم
آں یافتم اے شیخ کہ بہ میخانہ ندیدم

خانقاہ میں بہت سی کتابیں اور عمدہ نسخے ہیں۔ دوسری نادر چیزیں جو علما اور مشائخ کے یہاں بہت کم پائی جاتی ہیں بڑی سرکار میں موجود ہیں۔ من جملہ ان کے جہائے مردہ بھی ہے لیکن میں نے اس کو نہیں دیکھا اس کا دیکھنا اس لیے ممکن نہ ہو سکا کہ سال بھر میں مقررہ دنوں میں اس کو دکھاتے ہیں۔ اور مردہ پرستوں کی آنکھوں میں روشنی بڑھاتے ہیں۔

تھانہ ٹھاکردوارہ

اب میں مراد آباد گیا اور کارنی صاحب کے در دولت پر حاضر ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا خط صاحب کے ملازم خاص رحمن نامی کے ہاتھ بھجوا دیا۔ فرمایا کہ اس وقت میرے قبضے میں ٹھاکردوارے کی ایک پولیس چوکی ہے تنخواہ تیس روپے ہے لیکن مناسب ہو کہ منظور کر لو میری ترقی کے ساتھ تمہاری ترقی شامل ہے۔ میں نے منظور کر لی جس دن میں صاحب سے رخصت ہوا اور اگلے دن تھانے کو روانگی کا ارادہ کیا ایک شخص میرے پاس آیا اور کہا کہ میں ٹھاکردوارے کا جمعدار ہوں۔ میں نے کہا: کیا عدالت سے تمہاری طلبی کا کوئی حکم پہنچا ہے؟ اس نے کہا: نہیں، بلکہ پولیس کے مالک اور علاقے کے سررشتہ دار نے مجھے بلایا ہے۔ اس لیے آیا ہوں۔ میں نے اس شخص کی شوخ چشمی اور خود سری کو دیکھتے ہوئے دل میں خیال کیا کہ گربہ کشتن روز اول۔ و ”مشتے بعد از جنگ است“ پر عمل کرنا چاہیے چنانچہ میں نے اس کو اطلاع دی کہ میں کل وہاں پہنچ کر فرد حاضر و غیر حاضر مجسٹریٹ بہادر کے حضور روانہ کروں گا تمہاری غیر حاضری

کا سبب جو کچھ تم نے بیان کیا ہے وہی لکھ دوں یا کچھ اور، یہ سنتے ہی اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور کہنے لگا: اب تک کوئی افسر میرے سر پر عتاب تابع فرمان ہوں۔ رات ہی یہاں سے روانہ ہو کر آپ کے تشریف لانے سے پہلے پہنچ جاؤں گا۔

پہلی واردات ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء تک کی ہے۔

تھانہ امروہہ اسی زمانے میں میری دادی عالم جاوداں کو سدھاریں۔ مجھ کو یہیں مراد آباد رکھ دیا یہاں تک کہ آزول صاحب جج آ گئے اور کارن صاحب کے مکان پر قیام کیا۔ صاحب نے بندہ کو یاد فرمایا اور جج صاحب کے سامنے پیش کر دیا۔ صاحب جج نے علیحدہ مکان میں جا کر فرمایا کہ تم کو امروہہ بھیجا جاتا ہے، وہاں پر چالیس روپے کی تنخواہ ہے۔ چوری اور غارت گری کے ہنگامے بہت ہیں۔ بخت علی سے کچھ تدارک نہ ہو سکا، تمھارے واسطے بھیجتا ہوں۔ کب جا سکو گے؟ میں نے عرض کی اگر اسی وقت ارشاد ہو تو اسی وقت۔

صاحب کی توجہ بندے کے حال پر پڑنے لگی۔ ہفتہ بھر میں ایک دو مرتبہ یاد فرما لیتے۔ اور دوسرے تھانوں مثل حسن پور، بچھرایوں، اور سنگھ پور کے انتظام کے لیے بھیج دیتے اور پولیس کے محکمے میں جو کوئی ملازم ہوتا میرے ذریعے سے ہوتا۔ جب کیمبری صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس مقرر ہوئے تو مجھے معلوم ہوا کہ دونوں صاحبوں میں زبردست اختلافات رائے ہے اور دونوں جگہ جواب دہی کرنی پڑے گی لہٰذا میں مستعفی ہو گیا۔

کارن صاحب بہادر دیناج پور کے کلکٹر ہو گئے۔ ویلڈر صاحب ایک ایسے شخص کی تلاش کر رہے تھے جو یہاں کی زبان ان کو سکھا دے۔ مجھے یاد فرمایا۔ لوگوں نے کہا کہ صاحب کا مزاج بہت تیز ہے، کوئی ایک مہینے سے زیادہ نہیں رہ سکتا۔ میں نے کہا اب تو چند روز ایسے صاحب کی نوکری ضروری ہے تاکہ سخت اور تیز مزاج افسر کے ساتھ بسر اوقات کرنے کا طریقہ بھی سیکھ لوں۔ چنانچہ کرتپور کے مقام پر خدمت میں حاضر ہو گیا۔ آغا محمود پانچسو روپیہ سے کم تنخواہ پاتے تھے۔ تیس روپے میرے لیے مقرر کیے باربرداری اور سفر خرچ کا صرفہ بھی اپنے ہی ذمہ رکھا۔ میں نے قبول کر لیا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگوں نے لاٹ صاحب سے جا کر کہا صاحب فلاں شخص (عبدالقادر) کو کسی وقت بھی نہیں چھوڑتے۔

اسی عرصے میں میرے خسر کا انتقال ہو گیا۔ میں سنبھل سے ایک دن کی اجازت لے کر مراد آباد آیا اور ایک عرضی لکھی کہ جب تک حضور والا دوسرے عہدے پر ممتاز نہ ہوں مجھ کو رخصت عنایت ہو۔ تفصیلی وجوہ بیان کرنا نہیں چاہتا۔ یہ کہہ کر میں وطن چلا گیا۔ جہاں رامپور میں آکر ایک عجیب ہی انقلاب دیکھا۔ نواب نصراللہ خاں کی وفات ہو گئی۔ میں زمانے کی نیرنگیاں دیکھتا رہا۔ — اب کچھ مراد آباد کی کیفیت لکھتا ہوں۔ وہاں کے رئیس حافظ رحمت خاں کے چچا زاد بھائی دوندے خاں کی اولاد میں ہیں جو ایک عرصے تک وہاں کے مالک رہے۔ علی الدین خاں، حاجی رفیع الدین خاں کا بھتیجا ہے کہ عطا حسین کی چہار درویش میں منثور کلام سب اسی کا ہے۔ تواریخ سے باخبر ہے۔

حالات امروہہ اسی نواح میں امروہہ کا علاقہ ہے۔ شہر میں سادات، کمبوہ، کائستھ، کلال، تنبولی، کھتری، تگا اور شیخ زادے ہیں۔ مگر سردار، افسر، جاگیردار اور زمیندار حقیقت میں سادات ہیں۔ دوسروں نے جو کچھ حاصل کیا ہے ان ہی سے کیا ہے۔ دیہات میں میواتی، چوری، لوٹ مار، رہزنی اور پاسبانی خوب کرتے ہیں اور گوجر زیادہ تر رہزنی، مویشیوں کی چوری اور جاٹوں کے گاؤں کی بربادی کا کام کرتے ہیں اور جاٹ بھی رہزنی کرنے اور گوجروں سے مڈبھیڑ کے عادی ہیں۔ بنجارا چوہان بھی

کبھی کبھی غارت اور شب خون کر ڈالتے ہیں۔ یہ سب کے سب اسی زور طلب اور بد اطوار پرگنے کی رعایا ہیں۔ اس کا سبب جیسا کہ مجھے معلوم ہے ایک یہ ہے کہ یہ تمام قومیں قوی، مردم زادے ہیں اور دوسرے یہ کہ جاگیر داروں کی رعیت رہے ہیں۔ اسی حالت پر چند پشتیں گزر گئی ہیں۔ باریک اور خوبصورت مٹی کے برتن جیسے اس دیار کے کمال بناتے ہیں میں نے کہیں نہیں دیکھے۔ ایک فرشی حقہ بنایا جاتا ہے کہ جب دم لگاتے ہیں تو پانی اندر ہوتا ہے اور چھوڑتے ہی سارا پانی حقے کے نیچے تلے میں جمع ہو جاتا ہے اور حقہ میں سے نکل آتا ہے پھر دوبارہ تازہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

سفرِ بنگال

اسی زمانے میں ڈاکٹر صاحب نے یاد کر کے ارشاد فرمایا کہ سفر خرچ لو اور چلے جاؤ۔ میں مراد آباد جا کر [illegible] صاحب سے رخصت ہوا۔ بنگال کے ارادے سے میں پھر اپنے گھر آیا اور والد صاحب اور دوسرے بزرگوں سے اجازت حاصل کر کے بریلی آیا اور اور چھپرہ کے لیے ایک کشتی کرایہ پر لی۔ اتفاقاً کشتی لطف راستے پر چل کر مانکول موتی ہاری تک پہنچ گئی جو پورنیہ کے ضلع میں ایک قصبہ ہے۔ مانکول میں ایک مقام پر میں نے اپنا سامان رکھ دیا۔ لوگوں سے جانا یا تھا کہ یہ کاروان سرائے ہے۔ اور شام تک میں نے اپنے ایک ساتھی کو بھیجا تاکہ یہ کہہ کر پورنیہ تک سواری اور بار برداری کا کرایہ کر کے ہمارے ساتھ سفر کریں۔ وہاں ایک شخص آیا جس کی شکل و صورت نمایاں تھی کہنے لگا یہ مکان ہمارے بزرگوں کا ہے اور مہمانوں کے لیے بنایا تھا جو کچھ میسر ہو گا اس سے ٹھہرنے والوں کی مہمانی کرتے تھے۔ میں نے نام پوچھا، عبدالکریم۔ پھر وہ چلا گیا۔ شام کے وقت سامان خورد و نوش لایا اور کہا کہ اس معمولی کھانے کو قبول فرما کر احسان کیجئے۔ میں پہلے سے سن چکا تھا کہ وہ دس روپیہ سالانہ کی زمین ہے اور ڈیڑھ روپیہ ماہانہ کی تنخواہ پر گزر اوقات ہے۔ میں نے قبول کرنے سے عذر کیا اور کہا مہربان کے مکان پر ہم نے آرام پایا تھا یہی مہربانی کافی ہے۔ وہ رنجیدہ خاطر ہوئے کہ آپ جیسے بزرگوں سے میں یہ توقع نہیں رکھتا کہ میری عزت کی حیثیت پر مجھے کم حیثیت سمجھیں گے اور میری روکھی سوکھی روٹی سے بھی احتراز کریں گے۔ ناچار میں نے منظور کر لیا اور کوئی صورت ایسی ذہن میں آئی جس کے ذریعے میں "حساب دوستاں در دل" کا مضمون سمجھ لیتا۔ کیونکہ اس کا کوئی بچہ نہ تھا کہ مٹھائی کے بہانے ہی اسے کچھ دے دیتا۔ بہرحال جو کچھ تھا میں نے سب اس کے سامنے رکھ دیا کہ جو آپ کو پسند ہو لے لیجئے۔ اس نے کہا کہ میرے کام کی ایک بھی نہیں۔ میں نے کہا ارناج پور میں عہدۂ قضا جاری ہونے والا ہے اگر منظور ہو تو کوشش کر دی جائے۔ کہا کہ میری ماں بڑھیا ہے کوئی ان کی خبر گیری کرنے والا نہیں۔ میری بچے رکھتا نہیں جن کی وجہ سے فکر معاش میں کہیں جاتا۔ الغرض عمر میں ایسا تنگ دست اور دریا دل میں نے نہیں دیکھا۔

دھان پر انڈا

تین روز میں پورنیہ پہنچ گئے۔ پورنیہ میں جو امر بسر وبائی بازار میں جو شخص فیل پا، گلے پھوڑا اور کالا خصیہ نہ ہو مگر زرد رنگ اور بخار میں مبتلا ہو، تندرستوں میں شمار ہونے کے قابل ہے جو تھے روز روز زندہ ہوا اور ہنگری میں ایک بیٹے کی دکان میں رات گزاری۔ اگلے دن سویرے بھاگتا ناج پور پھر چوا پہنچا۔ وہاں ایک عجیب حکایت سنی کہ کسی کاشتکار نے خواب میں دیکھا کہ مرغی نے دھان کی شاخ پر انڈا دیا ہے اور دھان کہتا ہے کہ جب میری ذات اس درجے کو پہنچ گئی ہے تو میں اب بنگال سے جاتا ہوں۔ کاشتکار کی آنکھ کھلی تو اس نے لوگوں سے خواب کہہ دیا۔ سب گاؤں والوں نے یہی مناسب سمجھا کہ مرغیوں کو ایک دم مار ڈالا جائے تاکہ دھان پریشان ہو کر ہماری سرزمین نہ چھوڑ دے اور دنیا تکا سے زمر جائے۔ دوسرے دیہاتوں میں بھی خبر ہو گئی اور چند نا عاقبت اندیشوں کے سوا کہیں بھی مرغیوں کا نشان نہیں چھوڑا۔

بھاگ کر چندریا پہنچا اور اگلی صبح کو رنجاپور۔

ایک راجا رادھا ناتھ نامی بہت بڑا زمیندار تھا وہ مرا اور ایک نابالغ لڑکا چھوڑا جس کی عمر بہت کم تھی سرکار نے اس کی جائداد کو کورٹ آف وارڈس کے ماتحت کر دیا۔ میں مسکین نابالغ بچہ پیر کا منیجر کار کن ہو گیا۔

حسن بنگال

اب کچھ وہاں کی سرزمین کا حال لکھتا ہوں۔ عورتوں کا لباس ناف سے گھٹنے تک ریشمی، سینہ کھلا ہوا، کمر بالوں سے ڈھکی ہوئی، بھیڑیا آنکھوں والی جوانیت شوخ چشم ان کے شب دراز بال جو گورش کی سپیدی صبح کا مقابلہ کرکے شیر خوار بچے کو کام کے وقت ایک رسی میں کمر سے باندھ دیتیں تمام بدن چھپانا کپڑا موجود ہونے کی صورت میں بھی پسند نہ کرتیں۔ دور کے باشندے (مسافر) کی بے حد تعظیم کرتیں اور جو کچھ ان کے پاس ہوتا اس کے سامنے لا رکھتیں اگر وہ قبول کر لیتا تو اس کی خوبی شمار کرتیں اور اگر صرف خورد و نوش پر اکتفا کرتا تو اس کا بھی ان پر کوئی بار نہ تھا۔ بلکہ زندگی بھر اس کو چھوڑنا نہیں چاہتیں تھیں۔ رنگین ریشمی ساڑھی رنجاپور کے ضلع کی دور دور مشہور ہے اور بوریا بھی سیتل پاٹی کو شرماتا ہے۔

ڈھاکا

چنانچہ براہ نادانی یا غرور جوانی یا رسائی طبع کی روزی رسانی پر اعتماد کرکے بلا اجازت وہاں فرید پور سے بھاگ کر ڈھاکا پہنچا۔ میں نے دس روپے سے تین سو روپے تک کی ملازمت کی ہے مگر جہاں بھی رہا ہوں مجھ سے زیادہ تنخواہ اور عزت پانے والا دوسرا نہیں رہا۔ جس دن فرید پور سے چلا تو پانچ روپے کے سوا میرے پاس نقد کچھ نہ تھا۔ ڈھاکے میں کسی سے واقفیت نہ تھی۔ ناگاہ ایک شخص آیا اور دریا کے کنارے میرا نام لے کر پوچھا وہ کون سی کشتی میں ہے جو ڈھاکے آیا ہے۔ وہ میرے پاس آگیا میں نے پوچھا تمہارا کیا نام ہے اور کون ہو؟ اس نے جواب دیا میرا نام شیخ ہے اور نواب نصرت جنگ کے پیش کار سید محمد حسین خاں کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔ پالکی اور سامان لے جانے والے مزدور ساتھ ہیں۔ سید محمد حسین خاں نے سلام کہا ہے اور یہ کہا ہے کہ اگر ایک دو روز یہاں ٹھہریں تو احسان ہوگا میں نے پوچھا وہ مجھے کیا جانیں۔ کہا آغا میر فرزند خاں وہاں فرید پور والے آپ کا ذکر خیر کرتے تھے اس بنا پر وہ مشتاق ہو گئے۔ تین روز تک ان کا مہمان رہا۔ نواب نصرت جنگ نے بھی یاد فرمایا اور بے حد نوازشیں فرمائیں۔ ایک مہینہ اسی طریقے پر گزر گیا اس کے بعد روزانہ ایک چیز کوئی برتن یا کپڑا اپنے ملازم کو دیتا کہ دوستوں سے پوشیدہ فروخت کرکے کچھ کھانے کا بندوبست کرے۔ آخر یہ صورت بھی نہ رہی۔ اس دن مجھے فکر ہوئی کہ اب کیا کرنا چاہیے۔

ایک عورت دروازے میں داخل ہوئی اور میرا نام لے کر پوچھا وہ کہاں ہے؟ کہنے لگی میں مراد آباد کی رہنے والی ہوں میرا لڑکا نائک تھا جس کے متعلق دو کلمات خیر آپ نے صوبے دار سے فرما دیئے تھے تو حوالدار ہو گیا ہے مجھے اپنی باندی اور لڑکے کو باندی زادہ سمجھے یہاں کس امید پر پڑے ہو؟ میں نے کہا وطن جانے کا ارادہ ہے مگر سامان کی فکر ہے۔ اپنا زیور اتارا اور کہا یہ دو سو روپے کا مال ہے بیچئے اور سفر کی تدبیر کیجئے میں نے جواب دیا اگر ضرورت پڑی تو لے لوں گا اس وقت اپنے ہی پاس رکھو۔ جب وہ عورت چلی گئی تو ہرکارہ نے کلارن صاحب کا خط لا کر دیا۔ مضمون یہ تھا "میرا خط تین سو چھتیس روپے کی رسید کے ساتھ ایجنٹ صاحب کے پاس بھیج کر روپیہ وصول کر لیں اگر زاد راہ کافی نہ ہو تو دیر توقف کرکے مجھے لکھیں"۔ میں نے روپیہ وصول کرکے رسید مع عرضی کے ایجنٹ صاحب کے پاس بھیج دی۔ شام کے وقت اس عورت نے کھانا بھیجا۔

نواب میر اشرف علی صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ نواب شمس الدولہ نے تمہاری تنخواہ میرے ذمہ کر دی ہے۔ ستر روپے ہر مہینے باورچی خانے کا خرچ اور خدمت گاروں کی تنخواہ تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ جاڑے اور گرمیوں کے کپڑے میرے مصارف میں شامل ہیں۔ سواری بھی متعین ہو جائے گی۔ میں نے کہا نواب صاحب میرے مربی ہیں مجھے اپنے مہربان کی نوکری سے کیا عار ہے مگر کوئی کام فرما دیجیے جس کو میں انجام دوں۔ فرمایا میں تم کو واجب الاحترام سمجھتا ہوں یہی کام ہے کہ کچھ عرصے تک یہاں رہو اور اپنے سفر کے تذکرے سے میرا دل بہلاؤ۔ جب جی چاہے تمہیں دیکھوں۔ میں نے بہت اچھا کہہ کر منظور کر لیا۔ میں آرام سے میں وہاں رہا اب تک کسی دوسری جگہ وہ آرام مجھے نہیں ملا۔

بنگال سے واپسی

دو مہینے ڈھاکے میں ٹھہرا۔ ناگہاں والد صاحب کا خط پہنچا کہ تم کو تین سال ہو گئے میرا دل بہت پریشان ہے۔ اب تم زندگی بھر میرے پاس رہو کہیں باہر مت جاؤ۔ ان کی تحریر دیکھتے ہی میں ایسا پریشان ہوا کہ ایک کشتی جسے بجرا کہتے ہیں کلکتے کے لیے کرایہ کی۔ جس دن کلکتہ پہنچا ہوں شام کا وقت تھا چودھویں شب تھی۔ سمندر کے پانی میں جوار بھاٹا کا شور ہوا۔ میرے ہمراہی ڈرنے لگے تمام شب ان کی تسلی و دلاسے میں گزری۔

کلکتے سے چل کر مرشد آباد کے قریب پہنچا تھا کہ رات کے وقت کشتی میں چوری ہو گئی۔ صبح کو کشتی مرشد آباد پہنچ گئی۔ نقد ایک روپیہ بھی پاس نہ رہا۔ آخر کار دو سو روپے کا خریدا ہوا دو شالہ نوے روپے میں بیچ کر ہمراہیوں کی تنخواہ ادا کی اور جو باقی بچا روزمرہ کے خرچ میں آیا۔

یہ ۱۲۲۳ھ کی روداد تھی۔

مرشد آباد سے کشتی میں بیٹھ کر عظیم آباد پہنچا۔ ایک روز ٹھہر کر روانہ ہو گیا۔ چونکہ سفر خرچ پاس نہ رہا تھا بنارس میں اترنا پڑا۔ کچھ اسباب فروخت کیا اور بیس روز وہاں ٹھہرا۔ آخر یہاں سے پھر لکھنؤ کو روانہ ہو گیا۔

لکھنؤ میں ورود

مرزا کاظم شیرازی نے جو نواب سعادت علی خاں کے باورچی خانے میں ملازم تھا پھر علیحدہ ہو کر سوداگری کر رہا تھا مجھے لیا اور اس خیال سے کہ شاید ڈھاکے سے مال تجارت لایا ہوگا بے حد منت سماجت سے مجھے اپنے گھر لے گیا۔ یہ مکان نیا بنا ہوا تھا۔ یوں بہتر پایا کہ خاص بازار کے قریب تھا۔ یہ زمانہ نواب سعادت علی خاں کا آخری عہد تھا۔ جب میں نے سامان دھوپ میں بچھا دیا تب وہ سمجھا کہ مسافر ہے تاجر نہیں۔ اب اسے مروّت مانع ہوئی کہ مجھے گھر سے نکال دے۔

اسی روز میر ابراہیم کلاہ امیر خاں جو عبدالباقی کے رسالے میں نوکر تھا مجھ سے ملنے آیا۔ میرے عبدالعلی شہوانی جو بندر سے کے ہم سبق تھے شوق سے مجھ سے آ کر ملے۔ دوسرے روز میں میر عبدالعلی سے ملنے گیا وہ مکان پر نہ تھے ان کے بھائی سے معلوم ہوا کہ نفیسی شرح موجز حکیم مرزا محمد علی صاحب کے یہاں پڑھنے گئے ہیں۔ یہ سنتے ہی میں بھی پوچھتے پوچھتے مدرسہ پہنچا اور سلام کر کے بیٹھ گیا۔ کتاب میں بحث یہ تھی کہ معتدل حقیقی کا وجود اگر ہو بھی جائے تو کہاں ہو کیونکہ ہر مرکب اپنے غالب جز کے مکان میں ہوتا ہے اور معتدل میں کوئی جز غالب نہیں ہوتا لہٰذا اس کا وجود محال ہے۔ میں نے کہا جس جگہ ترکیب پائے وہیں رہ سکتا ہے کیونکہ وہاں دوسرے مکان میں منتقل ہونے کا کوئی سبب نہیں۔ یہ سن کر حکیم صاحب نے خیال کیا کہ شاید یہ ماہر ہے ان کو اس کی کیا خبر تھی کہ ہر دانشمند سے سن کر کچھ یاد کر لیا ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔ القصہ حکیم صاحب نے درس ختم کر دیا۔

اور مجھ سے پوچھا کہ یونانیوں کے مسئلہ الٰہیات میں وجود محض خیر ہے اور عدم محض خیر ہے اور عدم محض شر اس کا کیا مطلب ہے۔ خدا کی مدد تھی کہ اسی روز اس مسئلے کو ہدایۃ الحکمت کی شرح ملا صدرا میں دیکھ چکا تھا میں نے بیان کر دیا اور ایک رباعی بھی پڑھ دی جس میں اجمالاً یہ مسئلہ میں نے نظم کیا تھا:

نیکو نگر کہ ہست در ملک وجود
خیر کل ز شر جزئی موجود
بر چہرۂ زیب گر بود خال سیاہ
پیداست کہ حسن چہرہ را افزود

حکیم صاحب بے حد خوش ہوئے اور مجھ سے متعلق جو کچھ اُن کے دل میں آیا میر انشاء اللہ خاں سے کہہ دیا۔ حکیم صاحب، میر انشاء اللہ خاں اور میر محمد تقی تینوں مجھ سے ملنے آئے اور نوازش فرمائی۔

میر انشاء اللہ خاں

دوسرے روز میر انشاء اللہ خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اگرچہ وہ شعر و شاعری میں مشہور ہیں لیکن میری دانست میں علم مجلسی اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ اس کام میں وہ یکتائے زمانہ کہے جا سکتے تھے۔ اردو، فارسی، عربی، پنجابی، پوربی، مرہٹی، کشمیری، ترکی اور افغانی لوگوں سے ان کی ہی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ فارسی نثر بے تکلف اور خوب رواں لکھتے تھے۔ تیر اندازی اور گھوڑے کی سواری بھی جانتے تھے۔ وکالت کے ذریعے جو کچھ مناسب جمع رکھتے۔ رندوں میں پیر مغاں اور حلقۂ مشائخ میں شیخ صنعاں بنے ہوتے تھے۔

ایک دن مشاعرہ کی محفل میں جو ان دنوں مرزا جعفر کے مکان پر ہوتی تھی میں بھی چلا گیا۔ مرزا محمد حسین قتیل، مصحفی، میر نصیر دہلوی اس زمرے میں سرگروہ شمار ہوتے تھے اور شیخ امام بخش ناسخ کو ان دنوں اس فن میں دن دونی شہرت حاصل تھی۔

مصحفی

ایک روز میاں مصحفی کے مکان پر جانے کا اتفاق ہوا خوب تفصیلی ملاقات رہی کثرت سے لوگوں کو میر نجات کی گلکشتی پڑھاتے تھے اور اکثر لوگوں کے اشعار کی اصلاح بھی کرتے تھے۔ مگر بایں ہمہ نان شبینہ کے محتاج تھے۔ کہتے تھے کہ میری پیدائش [illegible] میں ہوئی جو شاہجہان آباد کے قریب ہے۔

جس دن میں اس شہر میں آیا تھا اسی دن مجھ سے اکبر آباد دیوان خانہ کے نائب داروغہ لالہ امرت لال نے کہا کہ فلاں شخص کو ہمارا سلام پہنچا کر کہو کہ مقام چاندا کے اخبار نویس کی تحریر سے نام، وطن، اور کلکتہ سے لکھنؤ آنا مجھے معلوم ہو گیا تھا۔ آج شہر کی خبروں سے معلوم ہوا کہ اس نام و نشان کا شخص [illegible] سے نو آباد شہر میں آیا ہے اور خاص بازار کے قریب کاظم شیرازی کے مکان میں ٹھہرا ہے۔ بعد مغرب میں امرت لال دروغہ گنج کے مکان پر رہتا ہوں اگر قدم رنجہ فرمائیں تو مفصل روداد اور حالات معلوم کر کے امیر کے حضور میں لکھ دوں۔ میں نے سوچا کہ اپنا لباس امراء کے دربار کے قابل نہیں نہ اتنا سرمایہ ہے کہ اس کو بیچ کر یہاں قیام اور سفر کا خرچ برداشت کر سکوں۔ اس کا انجام دشوار سمجھتے ہوئے بہت جلد سیر کر کے گھر (رامپور) کو چل دیا۔ بریلی کے راستے سے اپنے شہر پہنچ کر والد صاحب کے قدموں سے آنکھیں ملیں اور ان کی مغفرت کرے۔ مجھے دیکھ کر ان کے جسم میں تازہ جان آ گئی۔ بھائی بہن چاروں طرف سے جھپٹ پڑے۔ احباب مبارکباد

کے لیے آنے لگے۔ یہ کچھ تو اس سبب سے کہ والد صاحب کی خوش دلی کا سبب تھا، ورنہ میں اس وقت بالکل بے سرو سامان پہنچا تھا۔ والدہ صاحبہ کے انتقال کے بعد دوسری مرتبہ آسودگی اور مالداری کی حالت میں گیا مگر وہ لطف و سرور گھر میں نہ پایا۔

پھر مولانا جمال الدین، مولوی رستم علی اور مولوی شرف کی خدمت میں قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا۔ مولانا جمال الدین کی خدمت میں حاضری کے وقت میں حالات سفر بیان کر رہا تھا۔ ڈھاکے سے رخصت کے وقت احباب کے آبدیدہ ہو جانے سے اپنا آزردہ خاطر ہونا یاد آ گیا اور وہ بات جو آپ نے برسوں پہلے مولانا جمال الدین نے مثال کے طور پر بیان فرمائی تھی خیال میں آ گئی۔ کسی نے مولانا سے پوچھا کہ نیک لوگ کامیاب زندگی سے زیادہ عالم جاودانی کی آرزو رکھتے ہیں حتیٰ کہ اصحاب کتابوں کی مثال دی ہے کہ ایک شخص اپنے باپ کی اجازت سے بنگال پہنچا۔ کچھ عرصے وہاں قیام کیا اور وہاں کے باشندوں سے پیار اور دوستی کے تعلقات ہو گئے اس وقت اس کو اپنے والد کے دیکھنے کی آرزو ہوئی، باپ نے بھی حکم بھیجا کہ بہت جلد آ جاؤ۔ جدائی کے وقت دوستوں کو آبدیدہ دیکھ کر اس کا افسردہ اور غمزدہ ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں حالانکہ مقصد جدائی ہے اور کسی کا جبر نہیں۔

نازک مزاجی

حکیم غلام حسین خاں نے کسی کے ہاتھ یہ پیام بھیجا کہ مجھ کو دم بھر کی فرصت نہیں اگر بے تکلفی کا خیال کرتے ہوئے جب چاہیں مجھ سے ملنے چلے آئیں تو پرانی دوستی سے بعید نہیں۔ میں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ چلا گیا۔ میں اور حکیم صاحب ایک محلے کے رہنے والے اور ہم جماعت تھے وہاں وہ خوش نصیبی سے نواب احمد علی خاں کی نوازشوں کی بنا پر ریاست [illegible] کے مختار کل بنے تھے علاوہ کرتے تھے اپنی وضعداری میں بہت زیادہ تعظیم کی۔ مسند سے اٹھے، معانقہ کیا، مسند پر اپنے پہلو میں جگہ دی مگر اس شوریدہ سر کو بہت گراں گزرا۔ اول تو یہ کہ خود نہ آئے مجھے بلایا، دوسرے تکیہ اور مسند، تیسرے یہ کہ پہلے گفتگو میں حکیم صاحب کہا کرتے تھے اب خان صاحب کہنا پڑا۔ تاہم اس مجلس کو استراق کی دو مرتبہ آخر تک پہنچایا اور دوبارہ نہ گیا۔

دہلی کو روانگی

چند مہینے گزرے تھے کہ دہلی سے ولیم صاحب کا خط مع سفر خرچ پہنچا۔ یکم رمضان ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۵ء کو دریائے جمنا پر پہنچ گیا۔ جو نامی ولیم صاحب کا ملازم مجھے دریا کے کنارے لینے آ گیا۔ اپنے شہر میں ایک جگہ ٹھہرا دیا۔ تیسرے روز خود بدولت نے مجھے بلایا اور شاہ جہان آباد کو فوجداری کے انتظام کے لیے نیا عہدہ عدالت دورہ مقرر ہوا ہے۔ سررشتہ داری تمہارے نام کی جاتی ہوں میسرے دل میں پیدا ہو فرمایا۔ کچھ وقت لگا، اتفاقاً گارڈنر صاحب آ گئے فرمایا کہ میں پرسوں سے نریلہ جاؤں گا میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ بالآخر مقررہ دن ایک مختصر سا خیمہ خرید کر لشکر کے ساتھ ہو لیا اور نریلہ پہنچا۔ بارش اتنی شدت سے ہوئی کہ آگ جلانا اور روٹی پکانا دشوار تھا۔ دوسرے روز جو آیا اور موقوف ہوا پھر کوچ کرکے سونی پت پہنچ گئے یہ ایک پرانا شہر ہے۔ وہاں شدت کی بارش ہوئی تین روز رہنا پڑا۔ بھوکے تھے دن دھوپ کا منہ دیکھا ایک روز اور ٹھہرے تاکہ خیمے خشک ہو جائیں اس کے بعد گنہور پہنچے وہاں سے دوسرے روز چل کر پانی پت میں قیام کیا۔ پانی پت میں کچھ عرصے قیام کرکے برست کو روانہ ہوئے۔

ولیم فریزر

برست میں جمنا کنارے صاحب عدالت کا لشکر ٹھہرا تھا کہ فریزر صاحب کا خیمہ بھی پہنچ گیا اور چند روز کے بعد وہ پہاڑ کی جانب جہاں جنگ ہو رہی تھی چلا گیا۔ فریزر صاحب خوش خلق، دلیر، دریا دل، سیر چشم، رفیق پرور اور عقلمند ہے مگر غرور اور خود سر ہے۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک میں شروع سے ہی سرکاری قانون نہ تھے سب ریزیڈنٹ کی تجویز پر منحصر تھا اور فریزر نے

جو کام اپنی عقل سے انجام کو پہنچایا اس میں کوئی قباحت پیدا ہوئی۔ گارڈنر صاحب اور رشکان صاحب کے بندوبست کو توڑ کر اضافہ کر دیا۔ ملک آباد ہوا اور آب پاشی سے بے باقی ہو گئی۔ اس کے باوجود فریزر نے مناسب ترقی نہ پائی بلکہ کسی نے اس کو پوچھا بھی نہیں فارسی، اردو اور ہریانہ زبانیں وہ اہل زبان جیسی جانتا تھا۔ اور سب کام خود انجام کو پہنچاتا تھا اس کے سامنے کوئی کارکن راقم کے قلم یا حاکم کی لاٹھی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ سخت سے سخت کاموں کو ذاتی توجہ سے آسان سمجھ لیتا تھا۔ بندہ کا گمان ہے کہ وہ ایک مرتبہ ممالک محروسہ کی سیر کرے تو سرکاری روپیہ وصول کرنے کے موجودہ صورت سے بہتر طریقہ نکال سکتا ہے۔ جب تک کسی کی نیک نامی اور کارگزاری اس کے خیال میں نہ آجائے اپنے قول و فعل سے اس کے رتبے کا لحاظ نہیں کرتا تھا۔ اور ظاہرداری جو سفارت کے کاموں کے لیے ضروری ہے کی طبیعت کو پسند نہیں تھی۔

مزار ابو علی قلندر

کرنال پرانا شہر ہے۔ وہاں کی زبان اور رسم و رواج پنجاب سے ملتے جلتے ہیں۔ کرنال میں بھی بہت اونچے گنبد کا ایک مقبرہ ہے اس کو بھی ابو علی قلندر کی قبر کہتے ہیں۔ لوگ پانی پت والی قبر کو وہاں کے گورپنتھوں کا فریب سمجھتے ہیں اور اپنے قول کی سند یہ بیان کرتے ہیں کہ ابو علی قلندر کا قیام مرتے دم تک بڑھاکھیڑہ میں رہا متفق علیہ ہے وہ جگہ یہاں سے بیس کوس پر ہے قریب جگہ چھوڑ کر دور کیوں لے جاتے ہیں؟ پانی پت والے کہتے ہیں کہ ان کے محبوب مبارز خاں کی قبر پانی پت والے مقبرے میں ہے قرینہ یہ ہے کہ ان کو بھی حسب وصیت یہیں لے آئے ہیں۔ پانی پت میں وہ سامان زیادہ ہے جو نیکوں کی قبروں پر مردہ پرست لایا کرتے ہیں۔ یہ ہیچمدان مولف کرنال والوں کی دلیل کو قوی سمجھتا ہے۔ کیونکہ بے وقوف لوگ جن کا کام قبرستانوں کی آرائش ہے ہمیشہ عقل سے خارج باتوں پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔

پانی پت میں چند روز قیام کے بعد فریزر صاحب کا خط پہنچا کہ تنہا خود کو یہاں دہلی پہنچاؤ۔ میں روانہ ہو کر اسی روز صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

بیگم شمرو

فریزر کے دوسرے سفر میں شمرو بیگم میرے آقا کے خیمے میں آئی۔ مرتنش صاحب اس کے استقبال کو گئے اور میرے آقا کے ساتھ گورنر جنرل کے خیمے میں اس کو لے گئے۔ وہ پالکی میں تھی اور دونوں امیر اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے ابھی تک سرکار میں اس کا مرتبہ روز افزوں ہے۔ لارڈ کمبرمیر سپہ سالار نے والدہ کا خطاب اس کے لیے لکھا ہے اور کپتان بیکن بہادر نے ہمشیرہ لکھا ہے اور شاہ دہلی کے دربار میں بھی اس کا لقب فرزند عزیزہ ہے اگرچہ اب آفتاب لب بام ہے مگر چراغ سحری کی طرح گھر روشن کر رکھا ہے۔

یہ خاتون شمرو کے مرنے کے بعد نجف خاں کے زمانے میں سپاہ شمرو کی سربراہ ہو گئی تھی اور اپنے اس لڑکے کو جس نے خود سری اختیار کر لی تھی فراموش خانۂ نیستی میں بھیج دیا تھا۔ نجف خاں کے بعد نشیب و فراز میں سلامت روی سے اپنے مرتبے پر قائم رہی اور تخت نشین دہلی کی خانہ زادگی اور اطاعت کا دم بھرتی رہی۔ باوجودیکہ اس بیوہ کو بادشاہ کی طرف زر و زیور میسر ہوا۔ بخلاف دوسروں کے کہ کوئی ایران کی دورکا ناداری سے کوئی توران کی گدائی سے خانی اور نمک خواری کے مرتبے پر پہنچ کر اپنے گزشتہ زمانے کو فراموش کر بیٹھے حتیٰ کہ خاندان تیموریہ کی خانہ زادگی کو بھی اپنے لیے ناپسند کرنے لگے۔

شاہ جہان آباد میں ایک ایسا باغ لگایا ہے جو برسوں اس کی یادگار رہے گا۔ کہتے ہیں کہ اس نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس سے کچھ تعلق نہیں۔ اس کا مقصد کامیاب زندگی بسر کرنا ہے مسلمانوں میں قرآن خواں ہے اور عیسائیوں میں انجیل داں، یہودیوں کے سامنے ان دونوں سے انکار اور گروہ ہنود میں سب سے بیزار ہے۔

شاہ عبد العزیز دہلوی

بیگم شمرو جہاں سے اپنے ملک کو واپس ہو گئی اور لارڈ صاحب ہوڈل کو روانہ ہوئے ان کی خاتون سیٹن صاحب اور آقا بھی شاہ جہان آباد پہنچے۔ ان ایام میں آقا رحیم صاحب اور زوجہ گورنر جنرل کی بیگم کے ساتھ شہر کی عمارتیں دیکھنے کے لیے چلے جاتے اور چند و بزرگان شہر کی زیارت اور مولانا عبد العزیز کی مجلس وعظ میں جاتا۔

لارڈ صاحب (ماٹرا) کے شاہ جہان آباد تشریف نہ لانے کا سبب لوگ یہ ظاہر کرتے تھے کہ صاحب موصوف بادشاہ اکبر ثانی کی برابر کرسی پر بیٹھنا چاہتا ہے اور بادشاہ نہیں چاہتا۔

میری تصانیف

۱۔ شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں نے ۷ رمضان ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸۰۶ء بروز سہ شنبہ آخر شب میں ۴۰ سال چار ماہ چھ یوم سلطنت کرکے اس خاکدان کو چھوڑا اور خواجہ قطب الدین کے جوار میں ابدی آرام گاہ اختیار کی۔ اکبر ثانی بادشاہ دہلی کے تخت پر بیٹھے۔ عہد چنگیز کے زمانے سے شاہ عالم کی وفات تک ہر ایک بادشاہ کی مدت حکومت اور ہر ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں سلطنت کے منتقل ہونے کے حالات کو میں نے ایک ہشت ورقی رسالے میں لکھ دیا ہے۔

۲۔ تعلیقات بر جامع البرکات شیخ عبد الحق دہلوی۔

۳۔ شرح حکم مرتضوی در منافع امر و نہی مصطفوی۔

۴۔ سیر الکلام علمائے اعلام۔

۵۔ ترجمہ رسالہ حسن العقیدہ شاہ ولی اللہ دہلوی۔

۶۔ شرح رسالہ عقائد شاہ عبد العزیز دہلوی

۷۔ رسوم اسمائے معبودان ہند۔

۸۔ شرح میزان البلاغہ شاہ عبد العزیز دہلوی

۹۔ تعلیقات بر شمائل ترمذی

۱۰۔ کشف الحقیقت دعا و اجابت

۱۱۔ رسالہ قبلہ نما (اس رسالے سے صحیح مذہبی راستہ معلوم ہو سکتا ہے)

۱۲۔ رسالہ عروض (مختصر و مفید)

---

[1] یہ باغ چاندنی چوک دہلی میں اس جگہ تھا جہاں اب بھاگیرتھ پیلس ہے اور بیگم کا باغ مشہور تھا۔ ناصر علی سرہندی بھی اسی علاقے میں رہتے تھے۔

۱۳- قواعد زبان اردو (جو ولیم صاحب کے پاس رہ گئی)،

۱۴- حکایات بزرگان اردو (ہر طبقے کے محاورات کہانیوں کے انداز میں)،

۱۵- امثال ہندی و فارسی۔

۱۶- تاریخ احوال اجمیر و مارواڑ (اس کی نقل ولیم صاحب نے سرجان مالکم کے پاس بھیج دی)،

۱۷- رسالہ شطرنج (اس میں ہر قسم کے نمونے کھیل کی شکل میں بیان کیے ہیں)،

۱۸- رسالہ آداب نکاح۔

۱۹- رسالہ فوائد صوم

۲۰- برہان (جس میں رمل نجوم جفر شانہ بینی سرور افال قرعہ استخارہ وغیرہ کا ابطال نیک بختی و بدبختی کے متعلق عقلی و نقلی دلائل تسخیر اور ٹونے کا باطل ہونا اور جادو کی حقیقت صاف صاف بیان کر دی ہے)،

۲۱- رسالہ امکان خرق عادات

۲۲- تربیت و تعلیم علوم و تربیت اطفال،

۲۳- طریق انتظام ملک

۲۴- رسالہ طرز تحریر (ریاضی اور انگلش کی تحریر اور وہ طریقہ جس سے طویل مطلب کو مختصر اور مختصر کو ایسا طویل کرنا کہ گراں نہ گزرے)،

میرے بعد جس کے بھی ہاتھ یہ رسائل لگیں اگر اپنے ہی نام سے شائع کر دے تب بھی ہم خوش ہیں اگر کسی نالائق کے ہاتھ پڑ گئے تو وہ دوا فروشوں کے حوالے کر دے گا۔[1]

قلعہ معلی کی جھلکیاں

اس شہر دہلی میں شاہ جہاں کا بنوایا ہوا قلعہ ہے جس کا دروازہ وہی تیار ہا ہے کہ یہ بادشاہوں کے رہنے کی جگہ ہے۔ عمارات وہاں سے جداگانہ ہیں روزنہ بھی علیحدہ ہے۔ بادشاہ کسی کے سر پہ ہاتھ نہیں رکھتا اور حسب مراتب علاوہ دربار کے سوا کوئی بیٹھ نہیں سکتا۔ مگر عوام کو خدمت کی غرض سے اجازت ہے شاہی حجام کو خاص تراش، خدمت گار کو خواص، ناظر کو نواب دربار کو نواب ناظر، جتم جیب کو مرتبہ چابک سوار کو کمک پیرا فیلبان کو فوجدار۔ قیدیان کو جستہ، بیلدار کو منتظم غلاموں کو قلار، کھانے کو خاصہ، دو خوان جو کسی کو عطا ہو توش، مستعمل کپڑے کو ملبوس خاص، فرزندان شاہ کو صاحب عالم، جانشین شاہ کو ولی عہد، خاتون کو نواب صاحب محل، اور دوسری بیگمات کے لیے نواب مخصوص ہے۔ بادشاہ کی ماں نواب قدسیہ اور بادشاہ کے بھائی شہزادے کہلاتے ہیں تیموری اولاد نیز دوسرے رشتہ دار سلاطین کہلاتے ہیں، لونڈیوں کو ارباب نشاط انتقال کو [illegible]، بادشاہ کو زندہ کرامات کہتے ہیں۔

---

[1] بظاہر معلوم ہوتا ہے مولوی عبدالقادر کا یہ خدشہ صحیح نکلا ان کی آپ بیتی کے سوا کسی رسالے کا سراغ نہیں ملتا۔

جب کوئی شخص خوان یا تحفہ بادشاہ کے حضور سے لاوے تو لوگ کھڑے ہو کر سر پر ہاتھ رکھ کر شاہی آداب بجالاتے ہیں اور اسی کو انعام دیتے ہیں۔ اور اس سے کہتے ہیں آداب و کورنش بجا لاؤ۔ اسی طرح اگر دریافت حال کے لیے آوے تو بھی اسی انداز سے شاہی آداب بجالاتے ہیں۔ اگر فرمان یا عرضی خاص بادشاہ کے دستخط سے مزین ہو جو شقہ سے ہوتے تھے لاوے تو اس لانے والے کے ہاتھ سے کھڑے ہو کر لیتے ہیں اور پھر سر آنکھوں سے لگا کر کھولتے ہیں۔ اگر کوئی عرضی بادشاہ کے حضور میں بھیجیں تو سادہ کاغذ پر لکھتے ہیں اور لفافے پر سوائے لفظ "عرضی" کے کچھ نہیں ہوتا اور بادشاہ صرف عرضی کی پیشانی پر دستخط کر دیتا ہے۔ دوسرے لوگ عرضی کی پشت پر حکم لکھ دیتے ہیں۔ اور قلعہ مبارک میں بازاری دفتر میں عدالتی مہر کے لیے کاغذ نہیں بھیجتے بلکہ بندگان شاہی اپنی دستی مہر لگا دیتے ہیں جو پروانہ اور روبکار نہیں ہوتا بلکہ خط ہوتا ہے۔

آداب ملازمت

جب کبھی بادشاہ کی ملاقات کے لیے جاتے ہیں تو اس مقام سے جہاں لال پردہ ہے پاپیادہ ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ چھتری بھی نہیں لے جا سکتے۔ مقام تسلیم میں پہنچ کر جھکتے ہیں اور سر پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ چوبدار اس مجرائی کا نام اسی امتیاز سے لیتا ہے جس کی بادشاہ کے حضور سے اجازت حاصل ہو چکی ہے اور کہتا ہے: "جہاں پناہ! مہابلی سلامت!" اس کے بعد جیسا مرتبہ ہو روپیہ یا اشرفی (تین یا دو) رومال پر رکھ کر نذر پیش کرتے ہیں پھر اس کے علاوہ کچھ سونا چاندی بادشاہ کے سر پر رکھ کر بطور نچھاور گھما کر شاگرد پیشہ کو دے دیتے ہیں۔ قبولیت نذر کے بعد پیچھے ہٹ کر آداب بجالاتے ہیں۔ پھر حسب اشارہ علیحدہ جگہ پر چلے جاتے ہیں۔ وہاں خلعت پہنتے ہیں جس کے بہت سے مراتب ہیں یعنی تین، پانچ، سات، گیارہ اور اکیس کپڑے ہیں۔ خلعت پہن کر پھر بادشاہ کے حضور میں آتے ہیں۔ اس وقت خلعت کی نذر پیش کر کے آداب بجالاتے ہیں۔ اور کچھ دیر ٹھہر کر رخصت ہو جاتے ہیں۔

پھر ولی عہد کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ وہاں بھی مثل دستور حضور بادشاہ عمل میں لاتے ہیں۔ وہاں سے اسی لباس میں اپنے گھر تک آتے ہیں۔ شاہی خدام کو حسب معمول خلعت انعام دیتے ہیں اور دستور ہے کہ اگر گھوڑا مرحمت ہو تو زین پوش کندھے پر رکھتے ہیں اگر ہاتھی ہو تو انکس ہاتھ میں دیتے ہیں اور اگر نالکی یا پالکی ہو تو اس کا پایہ پکڑا جاتا ہے۔

نذر کی اشرفی یا روپے پر شاہ وقت کا سکہ ہونا چاہیے بلکہ اسی بادشاہ کا سکہ ہوتا ہے اور گفتگو میں بادشاہ کی ملاقات کو ملازمت کہتے ہیں بادشاہ کے سامنے کسی کے نام کے ساتھ لفظ "صاحب" نہیں کہتے بلکہ بہادر، خان یا جو خطاب حضور سے ملا ہو اس کے زبان پر لانے میں مضائقہ نہیں ہے۔ مثلاً مسٹر اگرچہ صاحب کے معنی میں ہے مگر بادشاہ اس سے واقف نہیں اس لیے اپنے قلم سے بھی انگریز صاحبوں کو لکھتا ہے اور دوسروں کو بھی اس کا کہنا جائز ہے چند آدمیوں کے نام ہرگز وہاں نہیں لیے جاتے۔ غازی الدین خاں عماد الملک جس کی قبر کالپی میں ہے اور اس نے شاہ عالم ثانی کے باپ کو قتل کیا ہے اس کو نمک حرام اول کہتے ہیں دوسرے غلام قادر خاں خلف نواب ضابطہ خاں اس کو نمک حرام دوم کہتے ہیں تیسرے والی اودھ نواب آصف الدولہ۔

بادشاہ کی سواری کے وقت پیادہ اور اسپ سوار اسی حالت میں البتہ گاڑی اور پالکی سوار نیچے اتر کر آداب بجالاتا ہے۔ ہاتھی سوار نیچے اترے یا ہاتھی جھکائے اور خود کھڑا ہو جائے۔ بادشاہ اگر تخت ہوادار پر سوار ہو تو ہندوستانی امراء یا صاحبان انگریز سب پیدل دوڑتے ہیں اور ہاتھی کی سواری کے وقت دور کر پیچھے رکھتے ہیں۔ لیکن سر پر چھتری نہیں رکھتے۔ ان آداب میں شہزادے بھی دوسروں کے برابر ہیں۔ خواصی میں خادم بادشاہ پر چھتری لگائے بیٹھا ہوتا ہے اگر وہ پانی طلب کرے تو خود بیدار، گیلاس اپنے ہاتھ سے پیش کرتا ہے۔ خادم کے پانی کو آب حیات

کہتے ہیں۔ قلعے کے محاورات میں سے یہ بھی ہے کہ جب بادشاہ قضائے حاجت کے لیے جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ حضرت تخلیہ میں تشریف فرما ہیں۔ اور جس جگہ علما و زہاد سے ملاقات ہوتی ہے اس کو تسبیح خانہ کہتے ہیں اور جب یہ کہنا ہو کہ فلاں بادشاہ کو قید کر دیا ہے تو یوں ہی کہیں گے کہ داخل سلاطین کر دیا۔ اور بادشاہ کے جیل خانے کو عبادت خانہ کہتے ہیں۔ تمام اولاد تیموری کی علامت یہ ہے کہ جب قلعہ سے باہر جائیں گے تو ایک خواص کے ہاتھ میں مکھی اڑانے کے لیے طاؤسی پنکھا مورچھل ہوتا ہے۔ قلعہ مبارک سے شاہی سواری برآمد ہوتے وقت اکیس توپیں چلتی ہیں جب شہر کے دروازے سے گزریں گے تو آتی ہی انگریزی توپیں چلیں گی۔ قلعہ کا صدر دروازہ بادشاہ کی واپسی تک بند ہو جاتا ہے اس کے بجائے دوسرا کھل جاتا ہے اور ولی عہد قلعہ مبارک میں رہتے ہیں۔ عیدین اور جشن سالگرہ پر پہلے ولی عہد نذر پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد شہزادے پھر بیگمات۔ اور پھر جو کچھ وہاں عنایت ہو دامن یا رومال میں لیتے ہیں اور آداب بجا لاتے ہیں۔ اور جو کچھ بادشاہ کے صرف خاص کے لیے شہر کے باہر سے آتا ہے اس پر محصول نہیں لیا جاتا۔ اور ہرگز کوئی مقدمہ جو بادشاہ سے متعلق ہے اس میں سرکار انگریزی کے احکام جاری نہیں ہوتے۔

صفر کے آخری چہار شنبہ کو بادشاہ کی جانب سے طلائی انگوٹھی اور چھلے تقسیم ہوتے ہیں اور بقر عید پر عید گاہ میں اونٹ، گائے اور بکریوں کی قربانی ہوتی ہے۔ ایک جانور بادشاہ خود اپنے ہاتھ سے ذبح و نحر کرتا ہے۔ باقی دوسرے لوگ ذبح کرتے ہیں اور ان کے کباب بھوننے جاتے ہیں اور ہر ایک شخص کو دیتے ہیں چاہے مسلمان ہو یا نہ ہو۔

سلونو پر جو ہندوؤں کا ایک خاص دن ہے ایک ہندو بادشاہ کے ہاتھ پر راکھی باندھتا ہے اور بادشاہ دوسرے ہندوؤں کے ہاتھ پر راکھی باندھتا ہے اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ اکبر اول نے ہندوؤں کے ملانے کے لیے ایسے بہت سے کام کیے تھے تاکہ ہندو اس کو عقیدۂ تناسخ کی بنا پر مکند برہمچاری سمجھنے لگیں جس نے کاشی میں بادشاہت کی امید میں اپنے جسم کو آرہ سے کٹوایا اور اپنے خیال میں دوسرے جسم میں ہو گیا تھا۔ اور کہتے ہیں کہ اسی روز اکبر نے امر کوٹ (سندھ) میں عالم ہستی میں قدم رکھا۔

گائے کو شہر سے باہر مذبحوں میں لے جا کر ذبح کرتے ہیں۔ حکومت کی جانب سے بھی سوائے بقر عید کے دنوں کے شہر میں ذبح کرنے کا حکم نہیں ہے۔ ہر چاند رات کو توپیں چلتی ہیں۔ رمضان میں ایک مرتبہ افطار اور ایک مرتبہ سحر کے وقت توپ سر کرتے ہیں۔

بسنت

اس دار السلطنت اسلام دہلی میں بہت سی بدعتیں رائج ہیں جن میں ایک بسنت بھی ہے جو ہندوؤں کا تہوار ہے۔ طرفہ تر یہ ہے کہ اس بے ہودہ عمل کا زیادہ اہتمام صوفیوں کی قبروں اور مشائخ کی خانقاہوں میں ہوتا ہے۔ ہندوؤں میں اس کی تعظیم اس قدر نہیں ہوتی جتنی کہ شہر کے مشائخ میں ہوتی ہے۔ جب گانے والوں کو مطرب لاتے ہیں تو سب بزرگ استقبال کرتے ہیں اور مجلس سماع منعقد ہوتی ہے معلوم نہیں اس کی ابتدا کتنی مدت سے ہوئی مگر رقعات عالمگیری میں اورنگ زیب نے اپنے بیٹے کو اس معاملے میں ہدایت کی ہے اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں اس کی چنداں شورش نہ تھی۔

دوسری رسم مردوں کی حنا بندی ہے مذہب امامیہ کے جہلا اور عوام کا عمل اس کا ماخذ ہوگا، کیوں کہ یہ لوگ محرم میں ساتویں تاریخ کو قاسم ابن حسن رضی اللہ عنہ سے حنا بندی منسوب کرتے ہیں۔ فریقین کے علما اس رسم سے بیزار ہیں۔

اب اس شہر کے وہ اہل کمال گنتا ہوں جو بندے کے زمانے میں موجود تھے۔

مولانا شاہ عبدالعزیز خلیفۂ حقیقی و پسر شاہ ولی اللہ محدث ہیں۔ ہر زبان اردو فارسی، ایرانی، تورانی[1]، دہلی کی فصیح زبان اور عربی میں ایسا خوش بیان میں نے بہت کم دیکھا ہے۔ شاہ صاحب کی کتاب تحفۂ اثنا عشریہ دہلی کی فارسی عبارت میں ہے کیونکہ اسی ملک والوں کے لیے تصنیف کی ہے۔ عربی عبارات عمدہ لکھتے تھے عربی میں ان کے قصاید اور اشعار بھی ہیں۔ شاہ عبدالعزیز صاحب بینائی جاتے رہنے کی وجہ سے نہیں لکھ سکتے املا فرماتے تھے۔

دوسرے علماء مولوی محمد رفیع الدین فنون ریاضیہ کی تعلیم کی طرف زیادہ متوجہ تھے۔ قرآن کا حافظہ ان کے ذہن سے بڑھا ہوا تھا۔ مولوی عبدالقادر تینوں بھائیوں میں چھوٹے ہوتے تھے۔ تمام فنون سے واقف تھے لیکن تفسیر اور حدیث کی خدمت ان کا معمول تھا۔ اکبرآبادی بیگم کی مسجد[2] میں درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ سب سے پہلے ان کو حکم اجل پہنچا۔ ان کے بعد مولوی محمد رفیع الدین جو تمام خاندان میں قوی المزاج تھے اچانک بیٹھے بیٹھے راہیِ ملکِ عدم ہوئے اور مولانا عبدالعزیز باوجودیکہ طرح طرح کے امراض میں گرفتار رہتے تھے لیکن سب کے بعد انہوں نے سرائے قدیم کو چھوڑ دیا۔

ان سب بزرگواروں کے شاگرد رشید الدین خاں تھے۔ ہر بات میں اساتذہ کی پیروی کرتے تھے مگر مناظرے میں بہت جلد رنجیدہ ہو جاتے تھے۔ نمائش کے بہت زیادہ پابند تھے۔ جو کچھ لکھتے بعد تفصیل سے اور جو کچھ کہتے دراز و طویل۔ بالخصوص مباحث اختلافیہ مذہبیہ میں یہی طریقہ مختار سمجھتے تھے کہ اب مقابل میں رد و قدح کی گنجائش نہیں رہی۔ بندہ سے بہت شفقت فرماتے تھے۔ ان سے آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب سنہ ۱۲۴۳ھ (۱۸۲۷ء) مسئلہ متعہ کے متعلق لکھنؤ کے شیعہ علماء کے جواب میں جو کتاب لکھ رہے تھے اس کا مقدمہ کئی جزو کا ہو گیا تھا اور ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ مجھے کتاب دکھا کر کہا کہ جب یہ کتاب اس شرح و بسط کے ساتھ جیسی میں چاہتا ہوں پوری ہو جائے گی اور لکھنؤ پہنچے گی تو وہاں کے علماء اس کے جواب کی فکر میں مر جائیں گے اور گریباں سے سر نہ اٹھا سکیں گے۔ میں نے کہا کہ جناب اس کتاب کا نام "لوحِ محفوظ" رکھیں کہ اسم بامسمّیٰ ہو جائے۔

فضل امام خیرآبادی اس شہر میں فضل امام خیرآبادی کی زیارت سے مستفید ہوا جو مولوی عبدالواجد کے شاگرد اور اپنے زمانے کے استاد تھے۔ ان کا تبحر فن معقول میں کیا لکھوں۔ منطق میں شیخ کی شفا کا خلاصہ انہوں نے کیا ہے۔ اس وقت دہلی میں مفتی عدالت تھے۔ قتل اور قصاص کا فتویٰ قلم برداشتہ جیسا چاہتے تھے لکھ دیتے تھے۔

مولوی فضل امام کے بڑے بیٹے منشی فضل عظیم فارسی نظم و نثر میں مہارت رکھتے تھے۔ ولیم فریزر بہادر کی ان پر بے حد شفقت ہے۔ جو ملتا ہے اس سے زیادہ خرچ کر دیتے ہیں۔ ظاہر میں پریشان اور باطن میں خوش ہیں۔

منشی عظیم کے بھائی مولوی فضل حق ہیں۔ کہتے ہیں کہ فنون عقلیہ میں ریاضی کے سوا سلف کی یادگار ہیں۔ عربی ادب میں ابوالحسن اخفش جیسے ہیں۔ ان کی نثر مقامات حریری سے اور نظم دیوان متنبی سے ممتاز ہے۔ بندہ نے اس یکتائے زمانہ کو ایک مرتبہ دیکھا ہے۔ علاوہ علم کے جرأت

---

[1] خدا جانے وقائع نگار نے فارسی، ایرانی، تورانی میں کیا فرق ملحوظ رکھا ہے!

[2] یہ مسجد غدر کے بعد مسمار کر دی گئی اس کا محل وقوع موجودہ ایڈورڈ پارک تھا۔

وشہرہ کا بھی رکھتے تھے۔ مولوی کرامت علی ابن مولوی حیات علی خوش نویس ان کی قوتِ تقریر کا ذکر کرتے تھے کہ ایک روز میں نے کہا کہ حج عمرہ ہے اور حج اکبر میں عرفات کا قیام بھی ضروری ہے جناب مولوی فضل حق نے فرمایا کہ حج اکبر وہ ہے کہ جمعہ کے دن ہوا ہو۔ ہر چند میں نے اپنے مدعا پر عقلی دلیل لایا مگر انہوں نے اپنے حسن بیان سے سب کو ہیچ در ہیچ بنا دیا[1] میں نے سنا ہے ان کی تصنیفات بہت ہیں لیکن بندے کو ان کا دیکھنا نصیب نہیں ہوا

شعرائے دہلی

اس شہر میں شعرا بہت ہیں۔ بلکہ اردو زبان میں ریختہ شعر کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔

نصیر الدین نصیر مشہور ہیں ان کا یہ مطلع مشہور زمانہ ہے ؎

پشت لب پر ہے تری یہ خط ریحاں ایسا
نہ تو دیکھو لکھے یاقوت رقم عنواں ایسا

سعادت یار خاں رنگین کی عمر ستر سال سے زیادہ ہو چکی ہے، اب تک ان کے کلام کی شوخی نوجوان ہے ریختی میں میر سوز اور میر انشاء اللہ خاں سے اور غزل میں معاصران سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اردو زبان میں ان کا ایک فرس نامہ ہے جو سب فرس ناموں سے بہترین ہے۔

نوجوان شاعروں میں مومن خاں مومن ہیں۔ کوچہ چیلان سے متصل کلاں محل کے بہت قریب مکان ہے۔ بزرگوں کا مسکن کشمیر ہے۔ ان کے دادا کے بھائی، باپ اور چچا فن طبابت میں مشہور ہیں۔ ان لوگوں کی جاگیر کے دیہات خالصہ شریفہ میں شامل ہو گئے۔ اب دہلی کے دوسرے پرانے خاندانوں کی طرح تنگی سے بسر کرتے ہیں۔ ریختہ اور فارسی میں بہت اشعار ہیں۔ ایک بیت مجھے یاد ہے ؎

نہ جاؤں گا کبھی جنت کو میں نہ جاؤں گا
اگر وہاں نہیں نقشہ تمہارے گھر کا سا

آزردہ

مولوی صدر الدین، مفتی و صدر امین شاہ جہان آباد، مولوی فضل امام کے نامور شاگرد، ایک عرصے تک جنرل اختر لونی بہادر کے ساتھ اجمیر، پنچ اور جے پور کے سفر میں رہے۔ جنرل اور اس کے ادارہ کی کلید دانش رہے۔ چار سو روپیہ تنخواہ ملتی تھی۔ صاحب صدروت نے ان کی تعریف میں دفتر کے دفتر صدر کو لکھ مارے اور اس قدر ان پر اعتماد تھا کہ راول سرسال اور راجا جے پور کی والدہ کے درمیان کرار کے قضیہ میں مفتی صدر الدین پولیٹکل ایجنٹ پر امین مقرر کیا۔ فاضل، زود فہم، خوش تقریر، دوست نواز، دشمن گداز شخص ہیں۔ ان کے بزرگوں کی اصل کشمیر ہے اور اقربا میں مولوی رشید الدین خاں ہیں۔ جس وقت بندہ نے ان کو دیکھا تھا ان کی توجہ اشعار ریختہ اور فارسی کی طرف مطالعہ کتب علمیہ سے زیادہ تھی اسی بنا پر میں نے ان کا ذکر شعراء کے سلسلے میں کیا ہے ورنہ ان کا کلام یہ نہیں ہے بلکہ یہ بات ان کے لیے باعث عار ہے۔

---

[1] مولوی عبد القادر نے مولانا فضل امام اور ان کے صاحبزادوں کی کافی بڑائی بیان کی ہے۔ وہ صوفیہ اور مشائخ کے عقائد کا بھی جا بجا ذکر کرتے ہیں، یہ عقائد کے اختلاف کا معاملہ ہے۔

صہبائی مولوی امام بخش تخلص ان کا صہبائی ہے۔ فارسی کتابیں پڑھانے میں اس شہر کے ناموروں میں سے ہیں۔ اگرچہ عربی کے علوم درسیہ سے چنداں لگاؤ نہیں، مگر فارسی کتابیں اچھی لکھتے ہیں اور فارسی نظم کے مختلف اقسام میں اشعار کہتے ہیں۔ نہایت حلیم الطبع اور نیک دل ہیں۔ ان کے حسن خلق کو دیکھتے ہوئے مجھے تعجب ہے کہ جناب مولوی صدر الدین سے فن فارسی بلکہ ہر بات میں کیوں جھگڑتے رہتے ہیں۔

علم و ہنر کی کساد بازاری کی وجہ سے مفتی پر گذر اوقات ہے۔ ایک ہندو سیٹھ کے دو لڑکوں کو جنہیں دوسرے معلم "طوطی زبان کرنے کے گُروں کو سکھانا" سمجھ رہے تھے ایسا لکھنا پڑھنا سکھایا کہ گفتار میں انسان جیسے ہو گئے۔ لیکن لڑکوں کے وحشی سیرت باپ نے جو معاوضے کا وعدہ کیا تھا اس کے پورا کرنے میں پہلو تہی کی۔ اور اس مظلوم نے اپنا حال صاحب عدالت تک پہنچایا۔ معلوم نہیں کہ فریاد رسی ہوئی یا نہیں۔

دہلی اور لکھنؤ کی زبان اکثر لوگوں کا اس میں اختلاف ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے محاورے میں ترجیح کس کو دی جائے۔ یہ اختلاف بھی غیر منتہی اختلافات کے قریب قریب ہو گیا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ زبان ریختہ اُردو کا مولد شاہ جہاں آباد، اکبر آباد، لاہور اور سندھ ہے۔ شاہی لشکریوں کے بعض الفاظ ہندی میں داخل ہو گئے اور اکثر ہندی الفاظ لشکریوں کی زبان پر جاری ہو گئے۔ رفتہ رفتہ اختلاط اس حد تک پہنچا کہ لشکری ہندو بعض ہندی الفاظ کے معنی بھول گئے اور بعض ہندی الفاظ فارسی میں داخل ہو گئے۔ خصوصاً دفتر مال اور محاسبہ میں۔ اب ان الفاظ کی ریختہ میں گنجائش نہیں رہی جنہیں شہری ہندو بھی زبان پر نہیں لاتے۔

تذکیر و تانیث کے متعلق ان کا سماعی ماخذ ہندوؤں کی زبان پر ہے۔ پنجاب اور بنگال کے محاورے میں اصل تذکیر و تانیث ہندی زبان کی سی ہوئی ہے۔

دہلی کے محاورے سے مراد شہر پناہ سے باہر کی زبان نہیں ہے جیسا کہ مغل پورے کے باشندے چھتر کو "چھتڑ" بولتے ہیں، نہ شہر کے اندر سب کی زبان کا نام ہے، کیونکہ کشمیری کٹڑے کے لوگ "خدا واسطے" کی بجائے "خدا کا واسطہ" کہتے ہیں اور پنجابی دہلی کو ہونٹ اور دائیں بائیں کو "سجا کھبا" اور محلہ سونی پت وغیرہ کے لوگ جو شاہ جہاں آباد میں آ بسے ہیں اب تک "یہ بات کبھی نہیں" کی بجائے "یہ بات کہیں نہیں" بولتے ہیں۔ اور روشن پورے کے باشندے گلی کے معنی میں کنی اور چچا کو چاچا کہتے ہیں۔ بعض لکھنؤ اور کالپی کے لوگ "والا" کی جگہ "ہارا" کہتے ہیں۔ یہ محاورے شاہ جہاں آباد کی اردو کے نہیں بلکہ بنگال، مغل بچے یا ہندی فرنگی دوغلے کلمہ "ہارا" کو اردو ظاہر کرتے ہیں۔ سند کا محاورہ قلعہ مبارک، دہلی دروازے سے کھڑکی فراش خانہ اور بازار خانم تک ہے۔

تخفیف الفاظ میں مثلاً ادھر کے بجائے ایدھر اور کدھر کے بجائے کیدھر لکھنؤ حق بجانب ہے۔ شاہ جہاں آباد کے لوگوں نے متعلقات کے ناموں میں بھی تخفیف کر کے سونی پت کو "سنپت" کر دیا، چاچا کو چچا بنا لیا۔ محاورے کی سند میں پتھر اور اینٹ کی دیوار نہیں بلکہ اس شہر کے فصحا کا کلام ہے جہاں بھی ہوں۔

اس زمانے میں دونوں شہروں کے فصحا نے بعض الفاظ کے ترک میں اتفاق کر لیا ہے۔ جیسے اُدر، بھیتی، طرف، رنگ، جہاں، بھیتر، اندر، بعض دوسرے الفاظ مثلاً ترور، کہ دہلی کی بول چال میں ترور اور لکھنؤ کے محاورے میں تکورا استعمال ہوتا ہے۔

چونکہ یہ ہندی لفظ ہے اور دیہاتی ہندو بکثرت بولتے ہیں۔ اس لیے دہلی کا محاورہ پختہ دلیل ہے انصاف یہ ہے کہ دہلی کی پیروی کریں۔ اور اگر اس وجہ سے کہ اب وہاں لکھنؤ کا ہر ایک امیر و فقیر انگریز کی حمایت کی جا پر دہلی کے اتباع سے غیرت رکھتا ہے تو انہیں اختیار ہے لیکن دوسروں کو بے سوا غدرے سے معاف رکھیں۔

اندھیاری بمعنی تاریکی دہلی کے استعمال میں شروع سے "اندھیری" تخفیف کے ساتھ ہے اب کسی کو اندھیاری لکھنا نہیں چاہیے گھوڑے کی ایک آنکھ بند ہوتی ہے جس کو اصل ہندی میں اندھیری بولتے ہیں۔ حاکم اودھ کے اصطبل میں بھی اس لفظ کے سوا دوسرا نہیں ہے اگرچہ یہ تحقیق ہے کہ انشا اور مصحفی تک بلکہ دہلی اور لکھنؤ کے تمام شعرا "اندھیاری" اسی معنی میں بولتے ہیں۔ لیکن جب تک لشکریوں اور سائیسوں میں عام نہ ہو جائے لغت گزشتہ ہوں گے نہ کہ محاورہ داں۔ مرزا رفیع سودا نے ایک شعر میں جو شیدی فولاد خاں کی ہجو میں ہے۔

چور جاتے رہے کہ اندھیاری

کہا ہے لوگوں نے گمان کیا کہ اس زمانے میں اندھیاری بمعنی تاریکی اردو میں مروج تھا یہ نہ سمجھے کہ یہ ایک مشہور مثل ہے اور امثال میں تغیر جائز نہیں۔

بادشاہی جلوس کے آرائشی سامان میں دہلی، آگرہ بلکہ شہر بنارس کے محاورے کو لکھنؤ کے محاورے پر ترجیح ہے کیوں کہ ان مقامات پر تین سو سال سے یہ سامان مروج ہے اور لکھنؤ میں تیس سال بھی ابھی نہیں ہوئے۔ پس "چنور ڈھلنا" بالکل صحیح ہے کیونکہ دہلی کے ہر شاہ و گدا کے روزمرہ میں شامل ہے اخفاس کا اچھوتا نہ ہے۔

زبان داں کی پہچان

ایک کلیہ بتاتا ہوں جس سے زبان داں کو "بوزنہ سرشت" مقلدوں سے ممتاز کر سکو گے۔ جس کسی کی اردو نظم و نثر میں فارسی عربی اور ترکی کے مقابلے میں ہندی کے رائج الفاظ زیادہ ہوں تو وہ زبان داں ہے اور اگر دوسری زبان کے لغت کا غلبہ ہے تو وہ اس راستے کا رہرو نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ اس حیلے سے اپنی کم مائیگی کا عیب چھپائے۔ خاص طور سے وہ لفظ جس کو عام اردو دانوں کے علاوہ فارسی جاننے والے بھی نہ سمجھتے ہوں فصاحت میں خلل انداز ہے خواہ شہر دہلی کا استاد لے یا لکھنؤ کا سبحان فرماتے خواہ آگرے کی ہزار داستان زبان سے یا بلب گڑھ کے طوطی ذہن سے نکلے۔ عصاگیر، رشتا، نشیمن چشم غول، اردو کی عاشقانہ غزلوں میں اور در کوب آمادہ "تعالی اللہ چہ فندق چہ انگشت" نادرہ کار، جفا، کیے، مثنوی افسانۂ عشق میں، ایسے کانوں کو کھٹکتے ہیں گویا کوئی سر شام ہی بے ہودہ راگ گا رہا ہے، البتہ جہاں خواص مخاطب ہوں جیسا کہ اکثر قصاید اور مسائل علمیہ میں اتفاق پڑتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں مثلاً اگر کوئی احمد شاہ درانی اور بھاؤ کی جنگ کو اس عبارت میں بیان کرے:

> "یہ سنتے ہی نجیب خاں نے سب بات ٹھیک کر کے اپنے کیل کانٹے گھوڑے ہتھیار لے بن سنور، سو ساٹھ ویروں کو اپنے ساتھ لے کے چلا اور دکن سے بڑی بھیڑ بھی ول دوڑے۔ بات کی بات میں پانی چٹ پر دونوں دلوں کا بچاؤ ہوا۔ ادھر والوں نے دیکھا کر ہم پر گیروں کے آگے جیسے آٹے میں لون ہیں۔ سگرا پنے پاس آ بیٹھا اور گیروں نے گھیر ڈالا بھگروا ہے بھوک سے مرنے لگے تو رہا نہ گیا...."

اس میں نہ اردو کے خلاف کوئی لفظ ہے نہ کوئی فارسی وغیرہ صنعت۔ اور دوسرے کا طرز بیان اس طرح ہے:

> ''وہ بعجز و استماع کے نجیب خاں سے کل امور بتحقیق اور قوع فرما کے اپنے سوار و قلاب ذخیل واصل سے مرتب و مزین ہو کے ابطال سپاہ فوج کو اپنی معیت میں لے کے روانہ ہوا اور جنوب پر گنہ بھی بجنور واصل ہوا، لبرگی خاطفت آتے، مستقر عسکر جاہ کم ابصر پانی پت وارد ہوا اس جماعت نے بعیون بصیرت مشاہدہ کیا کہ برگیوں کے جنب میں باعتبار قلب کا سیحوٰی الدقیق میں حصار خیامات حول اپنے نصب کیا اور برگیوں نے محاصرہ کیا۔ مستقر جوع سے معدوم ہونے لگے بمقول مشہور ''الغریق یتشبث بکل حشیش''……

پہلی عبارت انشا کے افسانے کی سی ہے کہ اس میں سوائے ہندی کے دوسری زبان کا لفظ نہیں آیا اور دوسری عطا حسین خاں کے چہار درویش کا طرز ہے۔

جو عربی فارسی کے الفاظ کہ شہری اور دیہاتی عوام کی زبان پر جاری ہیں ان کے بدلے ہندی الفاظ لانا ریختہ سے دور ہے جیسے عالم، راضی، خوش، عقل، یاد۔

اکبر شاہ ثانی اب میں بادشاہ اور سلاطین قلعہ دہلی کا ذکر کرتا ہوں۔ جہاں پناہ نفسے کے بھوت پر جیسا کہ اور رکھتے ہیں شاہ و گدا میں جیسے مل سکے گا کہتے ہیں کہ ایک روز شاہ گنج کی محفل میں کسی نے مصافحہ کرتے ہوئے انگوٹھی نکال لی انہوں نے اب تک مرد و زن کا پردہ فاش نہیں کیا۔

مرزا ابو جعفر نیکو کار، بے آزار، نماز روزہ کا پابند، عربی خط میں خوش نویس اور اردو زبان کا شاعر ہے۔

مرزا سلیم کا لقب کیخسرو جیسا ہے اور اس کا کام قبلۂ عالم (بادشاہ) کی تضمین حاضر باشی ہے اکثر حضور والا ہاتھی کی سواری میں اس کو خواصی کا اعزاز بخشتے تھے۔

ارباب موسیقی جب بندہ اس شہر میں پہنچا تا محمد علی میں اور بہت خاں کا گانا سنا۔ بہت خاں بیشک اس فن کا ماہر تھا لیکن سکھانے میں بہت دھوکے دیتا تھا۔ راگنی میں پوریا دھیر، دونوں گلے سے نکالنا مشکل کام ہے لیکن میں ایک محفل میں موجود تھا اس میں بہت خاں نے خوب ادا کیا۔ تاہم خاں پسر عالم خاں بھی فن موسیقی میں مشہور ہے میں نے لکھنؤ میں نواب نصرت اللہ خاں کے زمانے میں بارہا اس کا گانا سنا ہے۔ وہ ایک طرز پر گاتا تھا اور اس کے تین ساتھی تین تال گاتے تھے اور سم برابر پڑ رہا تھا۔ بہت سے لوگ اس عجیب صفت پر اس کے کمال کی تعریف کرتے تھے حالانکہ یہ کوئی بڑی کاریگری نہیں ہے اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ اگر چند تال جو ان میں ادا ہوں تو ان کی باہمی نسبت دوگنی، آدھی اور تہائی یا چوتھائی برابر ہو گی جیسا کہ ایک کرچ تال دو رہ کی دھمالی ہے اور چیک دو جو ان میں آدھ چوتال کی برابری رکھتا ہے اور سم پر برابر آجاتے ہیں۔

بھوانی شنکر بھوانی شنکر جسونت راؤ ہولکر کے لشکر سے چھوڑ کر انگریزوں سے آ ملا تھا اس کے بعد اس نے بھٹ گڑھ انگریزوں کی طرف سے لے لیا تھا۔ یہ شخص متواضع تھی اور درویش دوست تھا اکثر مسلمانوں کی سی رسمیں اور عبادت کرتا تھا۔ ایک دن میں بھیا اور جسونت راؤ کا واقعہ سنتے ہیں بھٹ گڑھ سے گزرا۔ بھوانی نے ایک کیفیت سے جو کی بالا تو دلی محافظ اس شخص کو پکڑ کر شیخی کے پاس لے گئی

اس نائی نے بہت منت سماجت کی کہ تاوان یا جرمانہ لے کر مجھ پر احسان کریں یا میرے بھوتی کے بدلے مجھے سزا دیں کیونکہ میں اس کو یہاں لایا ہوں اس کی ذلت میں میری بڑی بے عزتی ہے بخشی نے غصے میں تو جوتی کی بجائے میں اور بھوتی کو سر محفل جوتوں سے پٹوایا۔ وہ نائی اسی وقت سے ایک کٹار اپنے ساتھ رکھنے لگا۔ دسہرے کے دن بخشی نے اپنی تو تصویر جو کی دیکھنے کی عام اجازت دی وہ نائی بھی پہنچا اس نے دیکھا کہ بھوانی ایک طرف بیٹھا ہے اس کے قریب گیا اور اس پر حملہ کیا۔ کٹار کے زخم سے بھوانی شنکر کو ملک عدم پہنچا دیا۔ خود کو چھت سے نیچے گرا دیا دونوں بیکار ہو گئے پکڑ کر کوتوال لے گئے۔ قصاص میں مارا گیا۔ بخشی کی جاگیر سرکار میں شامل ہو گئی۔ کچھ تھوڑی سی رقم مٹکاف صاحب کی مہربانی سے پس ماندوں کے لیے مقرر ہو گئی۔

مرتضیٰ خاں بنگش

نواب مرتضیٰ خاں[1] شکستہ حال گو قسمت کے دھنی تھے۔ ہلکر کے لشکر میں سر رسالہ داری حاصل کر لی ایک لڑائی میں انگریزی سپہ سالار کی فوج میں شامل ہو گئے۔ نوابی کا خطاب اور حسین حیات علاقہ پلول خرچ کے لیے مل گیا۔ شاہجہاں آباد میں ایک حویلی بنوائی۔ ایک شب بالا خانے کے صحن میں سو رہے تھے آندھی کے جھونکے سے آنکھ کھل گئی چاہا کہ اندر جائیں، اندھیرے اور نیند کے غلبے کی وجہ سے باہر کو جا گئے اور بازار میں گر پڑے۔ سخت چوٹ آئی۔ آخر راہی ملک عدم ہوئے۔ پلول خالصہ شریف میں شامل ہو گیا۔ ان کے فرزندوں کے لیے کچھ نقد رقم ریذیڈنٹ دہلی کی نوازش سے مقرر ہو گئی۔

نواب احمد بخش خاں

ان بزرگوں کا وطن سمرقند علاقہ ازگراں ہے۔ جب انگریزوں نے جناب مہاراجہ الور کی ملک پر قبضہ کرنے کے لیے ہنگامہ کیا تو احمد بخش خاں وکیل بن کر انگریزی افواج کے سپہ سالار لارڈ لیک بہادر کی خدمت میں پہنچے ان کے ذریعے سے سرکار انگریزی اور راجا الور کے درمیان عہد نامہ مستحکم ہو گیا۔ مشہور سپہ سالار سر جان مالکم کی نظر عنایت سے نواب احمد بخش خاں نے الور کی ریاست کے علاوہ فیروزپور جھرکا کی سند نسلاً بعد نسل حاصل کر لی۔

جنرل اکٹرلونی کے زمانے میں ۱۸۰۵ء سے ۱۸۲۳ء تک نواب سے بے انتہا موافقت تھی حتیٰ کہ اجمیر، جے پور اور نیمچ میں ہر جگہ جنرل صاحب راستے میں ایک گاڑی میں نواب کے ساتھ ہوتے تھے۔ رات کو جب تک نواب میز پر آ کر نہ بیٹھ جاتے کھانا بھی نہ کھاتے تھے اور نواب کی قد آدم تصویر نیمچ کے تعمیر مکان میں سامنے لگا رکھی تھی۔ اکٹرلونی جب دہلی واپس آئے تو نواب سے اس درجہ رنجش ہوئی کہ صاحب کے حکم سے ان کی تصویر جلا دی گئی اور صاحب کے سامنے نواب کا کوئی نام بھی نہ لیتا تھا۔

الغرض اس شہر دہلی سے ہم آقا کے ساتھ روانہ ہو کر لشکر میں پہنچے اور گوہانہ میں داخل ہو گئے ان ہی ایام میں بھوانی میں ایک ہنگامہ ہو گیا وہاں کے لوگوں نے نائب تحصیلدار کو مار ڈالا۔ تھانے پر حملہ آور ہوئے اس لیے تھانے کے لوگ بھاگ گئے صاحب نے گوہانہ سے بھوانی کی طرف کوچ کیا۔ بندہ ساتھ گیا۔ واقعہ یہ تھا کہ تحصیل کا ایک چپراسی ان لوگوں کی عورتوں میں جاتا اور کہتا کہ اپنے چہرے مجھے دکھاؤ جو خوبصورت ہوگی اس کو فلاں صاحب کے لیے جس کا نام لیتا، لے جاؤں گا کیونکہ مجھے حکم ملا ہے۔ ان لوگوں نے چپراسی کی شکایت تحصیل میں کی وہاں شنوائی نہ ہوئی بلکہ ان لوگوں ہی کو ڈانٹ ڈپٹ کیا۔ ان لوگوں نے آپس میں پنچایت کر کے نائب کو مار دیا اور یہاں بھی کوئی فریاد رس نہ ہوا کیونکہ وہ [illegible]

---

[1] نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے والد

کہ سب اس سے ڈرتے تھے۔ ناچار وہ لوگ مرنے مارنے پر آمادہ ہو کر یہ کارروائی کر بیٹھے اوّل اس چپراسی کو مارا اس کے بعد اس شخص کو جو تحصیل کی کچہری میں رہتا تھا اور نائب تحصیلدار سمجھا جاتا تھا۔

اس عرصے میں میں نے دیکھا کہ ابھی کچہری پر دری سے نکلنے کا رنگ بدلا ہوا ہے اور اب آقا کو میری چنداں ضرورت بھی نہیں۔ میں نے رخصت چاہی مگر رخصت نہ دی۔ ایک دن انتظام علی نے جو حرف شناس ہونے کی وجہ سے اکثر دیوڑھی پر حاضر رہتا تھا مجھ سے آ کر کہا صاحب نے فرمایا ہے کہ فتح آباد کے چپراسی نے رخصت لی ہے مگر ابھی نہیں ہے اس قسم کی بد انتظامی تمہاری برخاستگی کا سبب ہو گی مجھے اس بات کا علم نہیں کہ انتظام علی نے یہ بات خود کہی ہے یا کسی کے بہکانے سے کہی۔ میں نے کہا چپراسیوں کا تعلق ناظر سے ہے یہ بات ناظر کے لیے کہی ہے یا میرے لیے؟ انتظام نے کہا آپ کے لیے فرمایا ہے میں نے کہا صاحب سے عرض کر دو میں از خود نہیں آیا تھا صاحب طلب کرنے سے آیا تھا جیسے پہلے چلا گیا تھا اب بھی چلا جاؤں گا۔ اور اس بات کی مجھے قطعاً پروا نہیں کہ نیک نامی کا پروانہ عنایت ہو یا استعفا منظور ہو یا برطرفی کا حکم صادر ہو۔

میں فوراً دفتر سے اٹھا، بامنیت کے گھاٹ تک بار برداری کا انتظام کیا اور سامان درست کر کے طلوع آفتاب سے پیشتر روانہ ہو گیا اور ایک اطلاعی عرضی لکھ دی کہ حضور والا کے مجھ سے بہتر ہزاروں غلام ہیں چونکہ میں چپراسیوں کی وجہ سے عتاب کا مخاطب ہو گیا اس لیے حضور والا کے خطاب کے لائق نہیں رہا۔

میں گڑھ مکتیسر سے امروہہ گیا، امروہہ سے مراد آباد اور مراد آباد سے رامپور پہنچا۔ میرے والد نے میرا سر اور میں نے ان کے قدم چومے۔ گڑھ سے روانگی کی تاریخ ۱۰ رجب ۱۲۱۱ھ تھی دو تین روز کے بعد بزرگوں کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا ......

(ترجمہ: معین الدین افضل گڑھی)

سید غوث علی شاہ قلندر

ہمارے جدِ بزرگوار سید ظہور الحسن صاحب عرف سید ظہور محمد صاحب نے علوم ظاہری کی تحصیل و تکمیل کے بعد اپنے والد ماجد سید محمد علی عرف سید محمود صاحب سے علم باطن کی تعلیم پائی جب اُن کے والد نے رحلت فرمائی تو سندھ سے عزم ہندوستان کیا اور امصار و دیار کی سیر فرماتے ہوئے مقام مونگیر مضافات صوبہ بہار میں قیام کیا اور موضع استھاواں میں ایک سید بزرگ کی دختر سے نکاح ہو گیا۔ اللہ تعالے نے دو فرزند عطا فرمائے ایک سید احمد حسن عرف سید احمد علی دوسرے سید محمد حسن عرف سید محمد علی۔ سید ظہور الحسن صاحب تا زیست وہیں رہے اور ہزارہا آدمی آپ کے شرف بیعت اور فیضان صحبت سے مشرف ہوئے۔

حضرت جد امجد رحمۃ اللہ علیہ کے چھوٹے بھائی نے جب سنا کہ بڑے بھائی صاحب نے صوبہ بہار کی سکونت اختیار کی ہے تو وہ بھی مع قبائل و عشائر ملک سندھ سے نہضت فرمائے ملک بہار ہوئے اور موضع استھاواں میں پہنچ کر برادر بزرگ کے شامل حال ہو گئے۔ چونکہ اُن کی اولاد جبلی نہ تھی اس لئے ہمارے والد بزرگوار سید احمد علی صاحب کو اپنی فرزندی میں لے لیا۔ اُن کی گذر اوقات کی عجیب صورت تھی۔ چار ٹکے لے کر حال کھیلا کرتے کوئی ہنسی کرے یا بُرا کہے اس کی کچھ پروا نہ تھی۔ اکثر بیاہ شادی کی محفلوں میں ان کے حال کا تماشا بھی مروج و معمول ہو گیا تھا۔ حضرت سید ظہور الحسن صاحب کو یہ امر ناپسند ہوا بارہا سمجھاتے کہ بھائی اس نازیبا حرکت سے باز آؤ کیوں بزرگوں کو بدنام کرتے ہو وہ جواب دیتے کہ مجھ کو حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کا یہی حکم ہے یہ جواب سن کر وہ خاموش ہو جاتے۔

ایک دن کسی امیر کے لڑکے کی شادی تھی حضرت کو چار ٹکے دے کر بلایا حسب عادت مجلس قوالی میں حال آیا تماشائی تمسخر سے پیش آئے اتفاقاً نوشاہ نے بھی دست گستاخی دراز کیا اور شکم مبارک میں انگلی ماری وہ اور لوگوں سے یوں خطاب کرتے تھے "ابے کیوں چھیڑتا ہے، کیا کرتا ہے" لیکن نوشہ کو کہا "ابے کیوں لونڈیوں کے سے کام کرتا ہے" یہ کہنا تھا کہ تمام آثار عورتوں کے نمودار ہو گئے۔ بالآخر لڑکا اپنی ماں کے پاس گیا اور حقیقت حال سنائی وہ بھی حیرت زدہ ہو گئی۔ فوراً اس کے باپ کو خبر کی۔ امیر اور اس کے صلاح کار و مشیر آپ کے بڑے بھائی صاحب کی خدمت میں آئے کیفیت ماوقع عرض کی وہ بھی بہت متعجب ہوئے کہ ہم اُن کو ایسا نہیں جانتے تھے۔

پھر مع ان سب آدمیوں کے اُن کے پاس گئے دیکھ کر بولے کہ بھائی صاحب خیر ہے یہ مجمع کیسا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ بھائی یہ سب تمہاری ہی توخوبیاں ہیں۔ آج تم نے کیا کہہ دیا۔ بولے کہ حضرت اس وقت نہ تو زبان میری ہوتی ہے نہ میرے اختیار میں ہوتی ہے۔ پوچھا کہ اب کیا علاج؟ جواب دیا کہ یہ لوگ پھر مجلس منعقد کرائیں اور یاروں کے چار ٹکے دلوائیں اگر اس وقت حال وارد ہوا اور لڑکا پھر اسی طرح چھیڑے تو دیکھیے زبان سے کیا نکلتا ہے۔ الحاصل پھر وہی سامان کیا گیا حال وارد ہوا اور لڑکے نے چھیڑنا شروع کیا تو آپ کی زبان مبارک سے نکلا کہ "ابے لونڈے کیا کرتا ہے؟" یہ کہنا تھا کہ وہ اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ اس دن سے آپ نے

حال ترک فرما دیا چونکہ کمال ظاہر ہو گیا تھا، سب لوگ تعظیم کرنے لگے تھے یہ بات پسند نہ آئی ناچار وطن چھوڑا اور موضع جھنجل مشہور جھجر میں جا رہے جو وہاں سے تین کوس پر تھا جب تک جیے محنت خشت سازی اور لدائی (مزدوری) سے اوقات بسر کرتے رہے۔ باقی عمر وہیں بسر کی بعد وفات ایک عالی شان گنبد مزار پر بنایا گیا جو اب تک زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

جب جھجرنے دادا نے رحلت فرمائی تو ہمارے والد ماجد سید احمد علی اپنی تائی صاحب کی خدمت میں ریاض و محنت سے اوقات بسر کرتے رہے۔ جب تائی صاحبہ نے بھی وفات پائی تو اپنے والد ماجد کی خدمت میں حاضر ہوئے اگرچہ فیض بطون تایا صاحب سے بھی حاصل کیا تھا مگر بیعت نہ تھی کیونکہ اس خاندان میں اول والد ماجد سے بیعت کرتے ہیں من بعد اجازت دی جاتی ہے۔ اس وقت حضرت والد ماجد کی عمر شریف سولہ برس کی تھی اور اپنے بزرگوار سے شرف بیعت حاصل کیا۔ سترھویں سال آپ کی پہلی شادی ہوئی پھر دوسری اور تیسرے نکاح کی نوبت پہنچی۔ اس کے بعد سواروں میں نوکری کر لی رفتہ رفتہ رسالدار بہادر ہو گئے مدت تک اسی عہدے پر مامور رہے آخر کار رخصت لے کر گھر آن بیٹھے اور گوشۂ عافیت میں یاد الٰہی کرتے رہے۔ قوت جسمانی بھی آپ کی ایسی تھی کہ بھرا چرس ڈول کی طرح کھینچ لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بارہ فرزند عطا فرمائے۔ زوجۂ اولیٰ سے سات، زوجۂ ثانی سے دو ابوالحسن عرف غوث علی اور سید الحسن (ولادت، دسمبر ۱۸۰۴ء) زوجۂ ثالث سے تین صاحبزادے تھے۔

ہمارے برادر عم زاد سید قاسم علی ہمارے والد ماجد کی معرفت رسالے میں نوکر ہوئے۔ چند روز کے بعد ایک انگریز کو جو رسالہ کا افسر تھا اردو پڑھانے لگے چونکہ بھائی صاحب آزاد وضع اور رنگین طبع آدمی تھے دیوالی، دسہرہ، محرم، شبرات، رمضان سب کا لطف اٹھاتے تھے الاّ شراب خواری و زناکاری سے نہایت محترز و مجتنب رہتے۔ خوش نویسی و نقاشی و مصوری میں بے بدل تھے لکھنے میں یہ کمال حاصل تھا کہ ہر خط میں خط ملا دیتے تھے۔ اتفاق سے دیوالی آئی خرچ پاس نہ تھا اس انگریز کے نام سے تنخواہ کا بل بنایا اور بعینہٖ اس کے دستخط کر کے خزانے سے جنگی روپیہ وصول کر لیا اور ایام دیوالی میں خوب کھایا اڑایا جب انگریز نے حسب معمول خزانے پر بل بھیجا تو افسر خزانہ نے وہ پہلا بل دکھلایا اور کہا کہ تم روپیہ وصول کر چکے ہو دیکھا تو بعینہٖ اس کے دستخط موجود تھے متحیر ہو گیا۔ بعد تحقیق پتا لگا کہ یہ صناعی سید قاسم علی کے سوا کوئی نہیں کر سکتا ان کو بلا کر حال دریافت کیا تو آپ نے سارا حال سچ سچ بیان کر دیا۔ ضابطہ کے موافق سنگین پہرے میں نظر بند کئے گئے۔ تیسرے دن پہرے والوں سے بولے کہ میاں اب تو جی گھبرا گیا ہم جاتے ہیں یہ کہہ کر آنکھوں آنکھوں میں غائب ہو گئے بیڑی اور ہتھکڑی پڑی رہ گئی پھر جو دیکھا تو کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے بآواز کہتے ہیں کہ صاحب سے ہمارا سلام کہہ دینا لو بھائی ہم جاتے ہیں اگر کچھ حوصلہ پکڑنے کا رکھتے ہو تو آ جاؤ۔ پہرے والوں نے دوڑ کر صاحب کو اطلاع دی اس نے فوراً رسالہ کو تیار کیا اور گرفتاری کا حکم دیا۔ سواروں نے آ کر چاروں طرف سے محاصرہ کر لیا اور چاہا کہ گرفتار کریں دیکھا تو صرف ایک جھنڈا کھڑا ہے وہاں سے غائب ہو کر دور جا کھڑے ہوئے اور بولے کہ صاحبو سلام اب ہم جاتے ہیں صاحب سے بھی سلام کہنا۔ پھر سوار دوڑے اور ہر طرف سے گھیر لیا دیکھا کہ ایک ببول کا درخت کھڑا ہے اور سید صاحب کا پتہ نہیں۔ ادھر ادھر تلاش کرنے لگے اس میدان میں ایک ندی بہتی تھی دیکھا کہ ندی کے اس کنارے پر کھڑے ہوئے کہتے ہیں۔ یہ آخری سلام ہے۔

اب تو جاتے ہیں مے کدے سے میر　　پھر ملیں گے اگر خدا لایا

تعلیم

جب ہم چار برس چار مہینے کے ہوئے تو ہماری والدہ نے بسم اللہ پڑھا کر قرآن شریف شروع کرایا اور پنڈت رام سہنی نے جو پدر رضاعی تھے زنگار کا نام لے کر شاستر کا آرمبھ (آغاز) کیا۔ دس برس کی عمر میں قرآن شریف نصف حفظ کر لیا اور نصف ناظرہ پڑھا کتب فارسیہ بھی کچھ سکندر نامہ تک والدہ صاحبہ سے پڑھیں اور سنسکرت سارت صد چندرکا تک پنڈت جی سے حاصل کی اور عربی کی صرف نحو نانا محمد حیات صاحب سے جو ہماری والدہ صاحبہ کے والد تھے۔ پڑھی بعد چند مدت کے ہمارے والد ماجد نے اپنے پاس دہلی میں بلا لیا جہاں مولوی محمد اسماعیل صاحب سے ایک سبق کافیہ کا اور مولوی شاہ محمد اسحاق صاحب اور مولانا شاہ عبد العزیز صاحب سے حدیث شریف پڑھی باقی کتابیں مولوی فضل امام خیر آبادی سے پڑھیں۔ یہ مرحوم مغفور ہمارے حال پر نہایت شفقت فرماتے تھے اور ان کی اہلیہ کو بھی کمال مادرِ مشفقہ کے محبت تھی حتیٰ کہ بغیر ہمارے کھانا تناول نہ فرمایا کرتی تھیں ہم ان کے ساتھ خیر آباد بھی گئے اور ضروری کتب عربیہ و منطق پڑھتے رہے جب وہ عالم قدس کو رحلت فرما ہوئے تو ہم کو نہایت رنج و الم ہوا اس دن سے کتابیں بالائے طاق رکھ دیں کہ اس شفقت سے کون پڑھائیگا جو ہم پڑھیں گے۔

بیعت

ہم نے حسب دستور اپنے خاندان کے، اوّل اپنے والد ماجد سے بیعت کی حضرت والد نے بعد تعلیم و تلقین دیکھا کہ درد طلب غالب ہے خود اولیاء اللہ کی خدمت بابرکت میں لے جانے لگے اور جہاں جہاں مناسب سمجھا بیعت کرایا۔

زمانہ طفلی میں ہم کو ایک سنیاسی نے جوگ تاڑی کی ابتدائی تعلیم کی۔ اس شغل میں حواس ظاہری مفقود ہو جاتے ہیں اور روح دماغ میں آجاتی ہے جس خیال میں انسان بیٹھتا ہے اسی میں رہتا ہے جب ہم کو مشق ہو گئی تو ایک دن خیال آیا کہ دیکھیں تو دوسرے پر بھی اس کا اثر ہوتا ہے یا نہیں۔ ہم نے اپنے بھائی کو جو والدہ صاحبہ کلاں سے تھے کہا چڑھائی وہ بالکل بے ہوش ہو کر مثل مردہ گر پڑے۔ اتارنا ہم کو آتا نہ تھا نہایت حیرانی دامن گیر ہوئی کہ اب کیا علاج کریں والدہ صاحبہ کلاں کو خبر ہوئی مضطرب ہو کر تشریف لائیں اور فرمایا کہ ایک تو گیا ہی دوسرا بھی چلا لوگ گمان کرینگے اس نے بھائی کو مار ڈالا ہے ایک پیالہ دہی کا لاکر اس کے سامنے گرا دیا جو آن کر پوچھا اس سے فرمائیں کہ نہیں معلوم کیا ہوا دہی کھاتے گری ہے۔ میں گھبرا کر اس سنیاسی فقیر کے پاس گیا اور سارا حال بیان کیا اس نے بہت ملامت کی اور کہا کہ تم کو اس واسطے یہ عمل سکھایا تھا کہ لوگوں کا تماشا دیکھو ہم نے تو اس سے سکھایا تھا کہ یاد الٰہی میں مشغول رہو گے۔ خیر اب پھر ایسی حرکت نہ کرنا یہ کہہ کر ہمارے گھر آئے اور بھائی کے سر پر مشکیں چھڑکوائیں جب تیسری مشک کی نوبت پہنچی تو اٹھ بیٹھے پھر ہم نے بھائی سے بے ہوشی کی کیفیت دریافت کی کہا میں تو زندہ تھا اور تم سب کو پکار پکار کے کہتا تھا کہ میں زندہ ہوں تم گھبراؤ مت میں کنوئیں میں پڑا ہوں مجھ کو نکال لو لیکن تم سنتے نہ تھے اور مجھے کسی طرح کی تکلیف بھی نہ تھی۔ اس دن سے ہم نے توبہ کر لی کہ پھر ایسا کام ہرگز نہ کریں گے۔

ہمارے وطن کے چمار کا لڑکا دریا کے کنارے جا کر کچھ پڑھا کرتا تھا ہم نے دریافت کیا اس نے کہا میاں صاحب میں ایک منتر سدھ کرتا ہوں ہم نے کہا جس روز تیرا منتر سدھ ہو ہم کو بھی ساتھ لے چلنا۔ وہ ایک رات کو آیا اور ہم کو بھی ساتھ لے گیا دریا کے کنارے پہنچ کر پوری، لونگ اور چاول وغیرہ پکائے بھینٹ دی پوجا کی اور منتر پڑھ کر فارغ ہوا دونوں گھر کو چلے میں نے کہا اب اس کا تماشا تو دکھا۔ اس نے کنکر پڑھ کر ایک درخت پر مارا نیچے سے اوپر تک آگ لگ گئی اور جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ یہ طرفہ ماجرا دیکھ کر ہم نے کہا کہ اب تو ایک کنکر ہمارے اوپر مار۔ اس نے اول تو بہت انکار کیا مگر کہنے سننے سے مجبور ہو کر بولا ہوشیار ہو جاؤ۔ ہم نے "یا شیخ عبد القادر جیلانی شیئاً للہ" کہہ کر اپنے گرد حصار کھینچ لیا اس

سے کنکر مارا کچھ نہ ہوا دوسرا اور تیسرا مارا کچھ بھی نہ ہوا پھر تو ہم حصار کو توڑ کر باہر نکل آئے کہ یہ بھروسا اچھا نہیں اس بچارے کا کہ بھلا اب تو کنکر پھینک۔ اس نے غصہ میں آکر ایک اور مارا تو وہ کنکر ہمارے سینے پر آن کر ایسا لگا جیسے لٹو لگتا ہے۔ پھر ہمارے سینے سے اچٹ کر اس کی پیشانی پر جا لگا وہ اوندھے منہ گرا اور تمام سر و رخ اسکے جسم سے خون جاری ہوگیا ہم نے دوڑ کر اس کے باپ کو اطلاع دی وہ اپنے لڑکے کو اٹھا کر ہمارے نانا محمد حیات صاحب کی خدمت میں لایا نانا صاحب نے کیفیت دریافت فرمائی ہم نے حال مفصل بیان کر دیا آپ نے دو تین طمانچے لگائے اس وقت ہماری عمر کوئی دس بارہ برس کی تھی پھر فرمانے لگے کہ شیخ عبد القادر جیلانی کیا تیرے لئے دوربیں لگائے بیٹھے ہیں کہ ہر دم تاکے پیچھے یا ہر وقت تیرے ساتھ پھریں گے خیر دو تم جانو گے جو پھر ایسا کیا اگر یہ مر جاتا تو کیا علاج ہوتا غرض ہم کو مارا پیٹا اور بہت سرزنش کی تب حضرت کا غصہ فرو ہوا پھر سورۂ مزمل دم کر کے اسے پانی پلایا اور نہلایا کئی دن کے بعد وہ اچھا ہوا۔

جب حضرت قبلہ گاہی رحمۃ اللہ علیہ کی تبدیلی دہلی کو ہوئی تو مجھ کو بھی دہلی سے طلب فرمایا اور مولانا شاہ عبد العزیز صاحبؒ کی خدمت میں سپرد کر دیا اور ایک لڑکا رسالدار کا ہمارا ہم عمر و ہم سبق تھا اور چونکہ حضرت والد ماجد اور رسالدار میں دوستانہ اتحاد تھا اس لئے ہم دونوں میں بھی انس ہو گیا۔ وہ لڑکا ہمارا بڑا یار نہایت حسین و جمیل آدمی تھا یہاں تک کہ اپنے حسن صورت پر آپ فریفتہ ہو گیا ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ آئینہ روبرو ہے اور آنکھ سے آنسو رواں ہے میں نے پوچھا کیوں بھائی خیر ہے؟ بولا کیا کہوں مجھ کو اپنی صورت پر آپ پیار آتا ہے اگر دوسرے پر عاشق ہوتا تو بھلا اس کو گلے سے تو لگا سکتا اب خود ہی عاشق خود ہی معشوق۔ کروں تو کیا کروں۔ میں نے کہا یہ تو کچھ بڑی بات نہیں تم آئینے میں اپنے آپ کو دیکھو اور میری چھاتی سے لگ جاؤ۔ ہنسنے لگا اور کہنے لگا کہ بھائی تم کو تو ہر وقت دل لگی ہی سوجھتی ہے تمہاری بلا سے کوئی مرے یا جیے۔ پھر آئینہ پھینک کر کھڑا ہو گیا۔

ہمارے والد کے رسالے میں ایک نئے کرنیل صاحب بدل کر آئے ان کے ملازموں سے معلوم ہوا کہ کرنیل صاحب صرف ڈیوٹی کے وقت باہر جاتے ہیں ورنہ رات دن اپنے کمرے میں تنہا اور چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں نصف تنخواہ تو قوم کو دیتے ہیں اور نصف خدا کے نام خیرات کر دیتے ہیں رفتہ رفتہ ہمارے والد سے بہت ربط بڑھ گیا ایک دن کہا کہ رسالدار صاحب آپ کی نسبت ذوق و شوق میں بہت بڑھی ہوئی ہے مگر توحید کی بو بھی نہیں۔ یہ بات سن کر والد ہوشیار ہو گئے کمرے سے باہر آن کر کہنے لگے کہ بھلا مجھے تیری توحید دیکھنی ہے چونکہ حضرت کی نسبت قوی اور بڑے زور کی تھی تین چار دن میں ایسی غالب آئی کہ کرنیل صاحب پر بھی ذوق و شوق طاری ہو گیا یہاں تک کہ کمرے میں تنہا بیٹھے رویا کرتے ایک روز والد نے پوچھا کہ صاحب اب وہ توحید کہاں گئی؟ جواب دیا کہ رسالدار صاحب ہم نہیں جانتے آپ نے کیا کر دیا۔ اب تو ہمارا جی رونے ہی میں لگتا ہے آپ کی نسبت نہایت زبردست ہے۔

شہزادہ روس اجمیر میں

جب والد کا رسالہ نصیر آباد کی چھاؤنی میں تھا تو ہم اور والد ہمیشہ پنجشنبہ کے دن عصر کے وقت حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر جایا کرتے تھے اس زمانے میں ولی عہد روس یعنی الگزنڈر اول اس زار کا باپ جو بالفعل تخت نشین ہے وہاں کشمیری فقیر کے بھیس میں موجود تھا بہت لوگ اس کے مرید بھی ہو گئے تھے ہمارے والد بھی کبھی کبھی اس کے پاس تشریف لے جاتے مگر پہلی ہی ملاقات میں فرما دیا کہ یہ شخص نصرانی ہے اور فقیری کا صرف بہروپ بھر رکھا ہے پھر تو بیٹھتے میں ایسی محبت بڑھی کہ اگر والد ہفتے میں ایک بار اس سے نہ ملتے تو آدمی بھیج کر بلاتا اسی عرصے میں ایک اشتہار صدر سے کمشنر اجمیر کے پاس آیا جس میں لکھا تھا کہ عرصہ دو سال سے ولی عہد روس گھر چھوڑ کر نکلا ہے کہیں پتا لگے تو اطلاع دو اس کے ساتھ ہی شہزادے کی تصویر بھی

تھی۔ غرض بھی غضب کے ہوتے ہیں کسی نے پتہ لگا لیا اور کمشنر کو خبر دی کہ شہزادہ فقیری کے بھیس میں حضرت کی خانقاہ کے اندر موجود ہے۔ کمشنر صاحب اوّل بطور سیر آئے اور اس کشمیری الفقیر کو تصویر سے مطابق کیا تو سر مو فرق نہ پایا دوسرے دن تمام انگریز مع رسالہ اور پلٹن کے درگاہ شریف میں آئے اور فقیر کے سامنے ٹوپیاں اتار کر کھڑے ہو گئے بولا بابا خیر ہے؟ انگریزوں نے کہا کہ آپ ولی عہد روس ہیں چھاؤنی میں تشریف لے چلیے۔ پہلے تو انکار کیا لیکن جب تصویر دکھائی تو مان گیا اور ساتھ ہو لیا۔ لشکر نے سلامی اتاری بڑی تعظیم ہوئی شہر میں روشنی کرائی گئی ملک روس کو خبر کی گئی کہ شہزادہ مل گیا وہاں سے جہاز لینے کو آئے۔ کئی روز بعد اجمیر سے روانہ ہو گیا اس عرصہ میں ایک دن ہمارے والد کو بلا کر دو تین گھنٹے تک باتیں کیں اور بہت کہا کہ ہمارے ساتھ چلیے اپنے باپ سے کہہ کر آپ کو بڑا عہدہ دلاؤں گا۔ والد نے کہا کہ بھلا میں اپنے بال بچوں کو چھوڑ کر کہاں جاؤں گا وہاں کے لئے یہ تنخواہ بھی کافی ہے۔ شہزادے نے کہا اچھا آپ اپنے بال بچوں کو بھی ساتھ لے چلیے خرچ ہمارے ذمہ رہا اور اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو چھ مہینے ہمارے پاس رہ لیجئے اور چھ مہینے اپنے بال بچوں میں اور اس آمد و رفت کا خرچ بھی دوں گا تنخواہ آپ کی اس کے علاوہ رہی۔ ہر چند شہزادے نے سمجھایا مگر والد راضی نہ ہوئے۔ جب شہزادہ اپنے ملک میں پہنچ گیا تب بھی جرنیل صاحب کو چٹھی لکھی کہ میر احمد علی رسالدار سے ہمارا سلام کہو اور اگر اب بھی وہ آنا چاہے تو روانہ کر دو۔ جرنیل صاحب نے بلا کر کہا کہ شہزادہ تم پر بہت مہربان ہے تم چلے کیوں نہیں جاتے ہم تو ذرا سا بھی سہارا پاتے تو فوراً چلے جاتے معلوم نہیں تم سے کیوں اس قدر خوش ہے کہ بار بار طلب کرتا ہے ہمارے نزدیک اگر مستقل طور پر نہیں جاتے تو بطور سیر ہی چلے جاؤ رخصت دلا دینا ہمارا کام ہے۔ مگر والد نے جانے کا ارادہ نہیں کیا۔

سید اعظم علی شاہ صاحب قبلہ کے ہمراہ راجپورہ جانے کا اتفاق ہوا تو کپتان کے مکان پر ٹھہرے ان کو افیون کی دھت تھی ہر دم پلنگ میں رہتے اور رات کے بارہ بجے کھانا کھاتے پھر آرام کرتے کرتے دو بجے سو جاتے صبح کی نماز قضا ہو جاتی۔ ہماری طبیعت گھبراتی ناچار ہم نے یہ تدبیر کی کہ جس وقت موذن عشاء کی اذان دینے کھڑا ہوا تو ہم نے سکھا دیا کہ "الصلوٰۃ خیر من النوم" بھی کہہ دے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ کپتان صاحب پلنگ سے چونکے ارے میاں جلد کھانا لاؤ آج تو صبح ہی ہو گئی کھانا آیا جب کھا پی چکے تو گھڑی میں دس بجے کپتان صاحب بولے ہیں یہ کیا؟ تو پھر صبح کی اذان کس نے کہہ دی؟ موذن بلایا گیا اس نے کہہ دیا کہ حضور مجھ سے تو مولوی غوث علی نے فرمایا تھا کہ تو "الصلوٰۃ خیر من النوم" اسی وقت پڑھ دے میں نے ان کے کہنے کے موافق عمل کیا ہے۔ کپتان صاحب ہماری طرف مخاطب ہوئے ہم نے کہا کہ صاحب بارہ بجے تک بھوک کے مارے آنتیں قل ہو اللہ پڑھتی ہیں پھر دو بجے سوتے ہیں تو صبح کو آنکھ نہیں کھلتی بجز اس بات کے کوئی چارہ نہ دیکھا۔ کپتان صاحب نے اسی وقت اپنے آدمیوں کو بلا کر حکم دیا کہ ان کو آٹھ بجے کھانا کھلا دیا کرو۔

ولیم فریزر

ہم سونی پت میں میر اعظم علی شاہ کے ہمراہ قلعہ کی مسجد میں رہتے تھے ایک دن فریزر صاحب ریذیڈنٹ دہلی تشریف لائے اس وقت میر صاحب مکان کے اندر تھے ہم سے پوچھا کہ "یہ کس کا مکان ہے؟" ہم نے کہا کہ: "ایک پیرزادے کا!" صاحب نے کہا کہ: "پیرزادے تو ٹھگ ہوتے ہیں" ہم نے کہا کہ "ہاں صاحب ہوتے ہوں گے!" یہی گفتگو تھی کہ میر صاحب تشریف لائے صاحب نے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ ہم نے کہا صاحب یہ وہی ٹھگ ہیں جن کا مکان ہے بولے نہیں نہیں یہ تو پادری صاحب ہیں اور ہم کو اشارے سے منع کیا کہ وہ بات ان سے ذکر نہ کرو پھر میر صاحب کا مزاج پوچھا اور پانچ روپے نذر دیئے دوسرے دن بڑے تکلف سے دعوت کی اور جب تک وہاں قیام رہا ہر روز میر صاحب کے سلام کو آتے رہے پھر دہلی کی جانب کوچ کیا۔ نہایت خلیق و خوش مزاج انسان تھا۔

کلیر شریف

جب اوّل مرتبہ ہم پیران کلیر گئے ہیں تو وہ وقت کا فاقہ ہوا ہم نے مخدوم صاحبؒ کے مزار پر جا کر کہا کہ حضرت آپ نے تو عمر بھر گزریں پر گزران کی ہم کو بھوکا ہی ماریے گا؟ غور سے جو دیکھا تو قبر کو ایک سیاہ سانپ لپٹا پڑا تھا خیر ہم اپنا سوال کہہ کر چلے آئے تھوڑی دیر میں ایک خادم کھانا لایا اور معذرت کرنے لگا کہ میں بھول گیا تھا آپ معاف کریں۔ غرض وہاں سال بھر رہنے کا اتفاق ہوا۔ ایک بار تمام خادمان درگاہ حضرت عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے عرس میں چلے گئے تھے وہاں سوائے ہمارے اور کافر شاہ مجذوب کے کوئی نہ تھا وہ عارضۂ اسہال میں مبتلا تھے۔ ایک دن ہم سے کہا کہ اب میرا وقت قریب آگیا ہے میرا بدن اور کپڑے سب ناپاک ہیں کپڑے تو تالاب پر دھو لاؤ اور مجھ کو نہلا دو۔ ہم نے کپڑے دھو دیئے اور اُن کو خوب نہلا دیا۔ بعد مغرب چادر تان کر لیٹ گئے اور السلام علیکم کہہ کر جان بحق ہوگئے۔

اس زمانے میں مزار کے آس پاس بہت جنگل تھا ہم اُن کی لاش کی نگہبانی کرتے رہے جب آدھی رات گزری تو خیال آیا کہ لاش کو تنہا چھوڑتے ہیں تو خوف ہے کہ کوئی جانور نہ کھا جائے اور نہیں جاتے تو نماز قضا ہوتی ہم اسی فکر میں تھے کہ وہ مجذوب اِلّا اللہ کہہ کر اٹھ بیٹھے۔ ہم نے لاحول پڑھی اور اپنا ڈنڈا سنبھالا کہ شاید کوئی بھوت لاش کے اندر حلول کر گیا مارنے کا ارادہ کیا تھا کہ وہ گھبرا کر بولے میاں غوث علی شاہ خبردار کوئی بھی بھوت نہیں ہیں تو وہی کافر شاہ ہوں تم جو مرتے دیکھتے تھے اس لئے میں سرکار سے دو پہر کی رخصت لے کر آیا ہوں اب تم جاؤ نماز پڑھو میں دو گھڑی دن چڑھے مروں گا۔ خیر ہم نے ڈنڈا رکھ دیا اور ان سے باتیں شروع کیں۔ اوّل تو ہم نے پوچھا کہ آپ ہیں کون دوسرے یہ کہ آپ کو فیض کہاں سے ہوا تیسرے یہ کہ مرنے کے بعد کیا گزری؟ جواب دیا کہ میں شہزادہ ہوں تیموریہ خاندان سے اور فیض باطنی مجھ کو حضرت مخدوم علی احمد صابر کی روح پرفتوح سے ہوا ہے اور وہاں کا حال مختلف ہے مجھ پر خیر گزری زیادہ حال گفتنی نہیں تم جب آؤ گے تو خود معلوم کر لو گے اب جاؤ نماز پڑھو دیر ہوتی ہے مگر اشراق پڑھ کر جلدی چلے آنا۔ ہم ٹھیک وقت پر آپہنچے تو بولے کہ اب ہم جاتے ہیں تم کفن دفن کا کچھ فکر نہ کرنا مولوی قلندر صاحب جلال آبادی آتے ہیں دو طالب علم بھی ان کے ہمراہ ہیں وہ تمہارے شریک حال ہو جائیں گے۔ وہ چادر اُن کی اور ایک چادر ان میں لپیٹ کر دفن کر دینا اور میری قبر مخدوم صاحب کے پائنتی بنانا۔ پھر بولے کہ اب انگوٹھوں میں سے جان نکل گئی اب ٹخنوں میں آگئی اب گھٹنوں میں اب کمر میں اب سینے میں اب حلق میں السلام علیکم۔ اتنا کہہ کر رخصت ہوئے۔ تھوڑی دیر میں مولوی صاحب بھی تشریف لائے اور بموجب وصیت ان کو دفن کر دیا پھر ہم نے تمام حال مولوی صاحب سے بیان کیا بہت دیر تک متحیر رہے اور کہنے لگے کہ حقیقت میں یہ فقیر اپنے فن کا پورا تھا۔

ہم اور کمبل پوش دلّی سے پیران کلیر کو چلے اُن دنوں گنگا اشنان کرنے والے بھی ہردوار کو جا رہے تھے۔ اثنائے سفر میں ایک دن میں نے کمبل پوش سے کہا کہ یار بھوک لگی ہے کہیں کھانا کھاویں اس نے کہا کہ اگر تم میرے چیلے بن جاؤ تو میں ابھی حلوا پوری کھلاتا ہوں میں نے کہا اچھا۔ اس نے ہم کو تو چیلا بنایا اور خود ایک غرقی لنگوٹی باندھ بھبوت مل سڑک کے کنارے بیٹھ گیا۔ جسیم آدمی، داڑھی صفاچٹ خاصہ پرمہنس معلوم ہونے لگا۔ اتفاقاً ایک بیکانیر کا امیر اس طرف سے گزرا کمبل پوش ہاتھوں سے اشارہ کرکے ایں ایں کرنے لگا ہم سے پوچھا کہ بابا جی کیا چاہتے ہیں؟ ہم نے کہہ دیا کہ کھانا مانگتے ہیں مگر ان کو حلوا پوری مرغوب ہے لیکن اپنے ہاتھ سے نہیں کھاتے اس نے فوراً تیار کرایا۔ ایک کونڈے میں حلوا اور بہت سی پوریاں نذر کیں وہ پھر ایں ایں کرنے لگا پوچھا کیا کہتا ہے میں نے کہا کہ کھلانے کو کہتا ہے۔ اس نے کہا کہ خدا جانے کتنی دیر میں کھائے گا ہماری منزل کھوٹی ہوتی ہے مہربانی کر کے تم اس کو کھلا دو اتنا کہہ کر خود تو چل دیا اور ہم دونوں نے کنوئیں کے کنارے بیٹھ کر حلوا پوری کھایا۔ اَلدُّنْیَا زُوْرٌ وَّلَا یَحْصُلُ اِلَّا بِالزُّوْرِ۔ کمبل پوش نے کہا کہ میں چیلا ہوں تو ایسا ہو کہ گرو کے اشارے کو انتہا تک پہنچا دے۔

جب ہم دوبارہ کلیر میں گئے تو وہاں ایک بزرگ غلام فرید صاحب جو بابا فرید شکر گنج کی اولاد میں سے تھے مع چند مریدوں کے تشریف لائے۔ ان کے ہر ایک مرید کو ایک ایک خدمت سپرد تھی۔ اتفاق سے جس مرید کو گھوڑے کی گھاس لانے کا کام تھا اس کو بخار اس شدت سے آیا کہ بے چارہ گھاس نہ لا سکا۔ اس پر پیر جی کا غضب نازل ہوا فرمایا کہ جا ہم نے تجھے مردود کیا اور چودہ خانوادے سے باہر نکال دیا۔ یہ سن کر اس بے چارے کا دم نکل گیا بہت رویا پیٹا توبہ استغفار کی مگر پیر جی نے ایک نہ مانی۔ آخر وہ روتا ہوا ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا کہ حضرت آج بڑا غضب ہوا میرا کہیں ٹھکانا نہیں رہا۔ دونوں جہان سے راندہ ہو گیا ہم نے کہا کہ ابھی اس جہان میں تو موجود معلوم ہوتا ہے بات تو کہہ۔ اس نے رو رو کر اپنا تمام قصہ بیان کیا۔ ہم نے کہا ارے بے وقوف روتا کیوں ہے تیرے پیر جی کو صرف چودہ خاندان یاد تھے ہم کو پچیس یاد ہیں آ تجھ کو پندرھویں خانوادے میں بھرتی کرلیں۔ تو گھبرا مت۔ لیکن تو جا اور اپنے پیر جی سے پہلے یہ بات دریافت کر کہ حضرت جب آپ نے مجھ کو چودہ خانوادوں میں داخل کیا تھا تو میں کہاں کا بادشاہ یا وزیر یا ولی کامل ہو گیا تھا اب جو آپ نے نکال دیا تو میرے پاس سے کیا چھن گیا؟ میں تو جیسا جب تھا ویسا ہی اب ہوں البتہ آپ کے نکالنے سے ایک فائدہ ہوا کہ گھاس کے بوجھ سے سبکدوش ہو گیا اگر تجھ سے پوچھیں کہ یہ بات تجھ کو کہاں سے سوجھی تو کہنا کہ میں پندرھویں خانوادے میں داخل ہو گیا ہوں یہ اسی کی بسم اللہ ہے۔ غرض اس نے جا کر اسی طرح سے بیان کیا یہ سن کر ان کے مریدوں کے کان کھڑے ہو گئے اور پیر جی سے کہنے لگے کہ حضرت یہ خاندان تو بہت ہی اچھا معلوم ہوتا ہے اوّل تو گھوڑے کی گھاس سے چھوٹا دوسرے ہم سے ایک خاندان آگے بڑھ گیا اگر آپ کو آگے کے خاندان میں دسترس ہوتی تو ہم بھی پندرھویں خاندان میں داخل ہو جاتے۔ پھر تو پیر جی کے چھکے چھوٹے اور گھبرا کر بولے کہ کہیں میاں غوث علی شاہ کے پاس تو نہیں جا پہنچا یہ سارا فساد اُن ہی کا معلوم ہوتا ہے ورنہ اور کسی کو یہ باتیں کیا سوجھتیں۔ الحاصل وہ ہمارے پاس دوڑے آئے اور گلہ کرنے لگے کہ واہ صاحب تم نے ہمارے سارے مرید فرنٹ کر دیئے میں نے کہا کہ میاں صاحب ذرا غور کرو وہ بے چارے گھر بار جورو بچے چھوڑ کر آپ کے پاس خدا کا نام سیکھنے آئے ہیں یا گھوڑے کی گھاس کھودنے۔ اگر تم کو خدا کا نام آتا ہو تو بتلا کر رخصت کرو ورنہ جواب صاف دے دو۔ وہ بے چارے تو تمہاری خدمت گزاری کریں اور تم کسی طرح ان پر شفقت نہ کرو یہ کیا آدمیت ہے۔ اور جس بات کے لیے وہ مرید ہوئے اس کی تو آپ کو ہوا بھی نہیں لگی۔ بقول شخصے ع وے خود درماندہ شفاعت کرا کند۔ آپ یہ تو فرمائیں کہ سوائے بزرگوں کی اولاد میں ہونے کے کچھ آپ گرہ کا کمال بھی رکھتے ہیں؟ اور تماشا یہ ہے کہ اس بے ہنری پر اس قدر ناز۔ ذرا شرم کرو اور خدا سے ڈرو۔ میری یہ تقریر سن کر پیر جی بہت گھبرائے اور منت کرنے لگے کہ خدا کے واسطے ایسی تدبیر کرو کہ میرے مرید برگشتہ نہ ہو جائیں ورنہ مجھ کو بڑی تکلیف ہوگی۔ خیر میں نے پیر جی کے سب مریدوں کو جمع کر کے سمجھا دیا اور ان کے حوالے کیا۔

کلیر میں ایک خاں صاحب تشریف لائے۔ کمر باندھے، تلوار لگائے۔ نہ سلام نہ دعا۔ اوّل یہی سوال کیا کہ غوث علی شاہ کون ہے؟ میں نے کہا فرمائیے؟ بولے آپ کو کیا آتی ہے؟ میں نے جواب دیا کہ ہاں آتی ہے! کہا کہ ہم کو بتا دو۔ میں نے کہا نہیں بتاتے۔ بولے کیوں؟ میں نے کہا: ہماری خوشی! پھر مجھ کو خیال آیا کہ یہ پٹھان ایک جاہل سپاہی اور ہتھیار بند ہے ایسا نہ ہو کہ چل کر چوٹ کر بیٹھے۔ میں نے کہا کہ خاں صاحب آپ کمر کھولیں آرام فرمائیں بھلا ایسی چیز زبردستی یا راہ چلتے کوئی بتاتا ہے؟ آپ ٹھہریں تو سہی دیکھا جائے گا۔ غرض خاں صاحب نے کمر کھول دی اور ہمارے پاس قیام کیا۔ ان دنوں ہماری غذا یہ تھی کہ روکھی سوکھی نان جویں یا جوار کا ساگ جو اس جنگل میں خودرو ہوتا تھا۔ شام کو یہی کھانا ہم نے ان کے سامنے رکھا۔ خیر خاں صاحب نے مجبوری کھانا شروع کیا مگر لقمہ حلق سے اترنا دشوار تھا ہم نے پوچھا کیوں صاحب خیر ہے؟

اچھی طرح کھاتے ہیں۔ بولے کہ صاحب یہ آگ اور غذا تو لگتی نہیں ہوتی ہم نے کہا کہ واہ آپ تو کیمیا کے طالب ہیں بس یہی تو کیمیا کے مزے ہیں اگر سیکھ لوگے تو ایسی ہی پھکیاں تم کو بھی نصیب ہوں گی بہت چپ ہوئے اور دل سرد ہو گیا۔ ہم نے کہا کہ خان صاحب ذرا خیال تو کرو اگر ہم کو صنعت یاد ہوتی تو کیوں لنگر کی روٹی اور یہ ترہ بے نمک کھاتے؟ کہا کہ مجھ کو تو میاں امیر الدین شاہ صاحب نے بتا دیا تھا کہ آپ کو کیمیا آتی ہے ہم نے کہا کہ میاں اصل بات تو یہ ہے نہ ان کو آتی ہے نہ ہم کو۔ اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے انہوں نے یہ حیلہ کیا اور تم کو ٹال دیا اور جس طرح تم طلب کرتے ہو اس طریقے سے تو کوئی جاننے والا بھی نہیں بتائے گا بڑی خدمت و اطاعت سے یہ بات حاصل ہوتی ہے۔ تم ایسا کرو کہ سری نگر کے پہاڑ پر ایک ہندو بابا جی رہتے ہیں ان کے پاس چلے جاؤ اور کچھ مدت ان کی خدمت میں رہو شاید تمہارے حال پر رحم کھا کر کچھ بتا دیں۔ خدا خدا کر کے اس پٹھان کو ہم نے ٹالا۔ اگلے روز میاں امیر الدین شاہ صاحب بھی تشریف لائے ہم نے کہا کہ حضرت یہ کیا بلا میرے پیچھے لگا دی تھی بولے کہ میاں وہ تو ایسا ہمارے سر ہوا کہ کسی طور سے مانتا ہی نہ تھا مجبوری تمہارے پاس بھیج دیا تھا کہ تم کسی نہ کسی ڈھنگ سے اس کو سمجھا دو گے اور ہم تم دونوں اس بلائے ناگہانی سے چھوٹ جائیں گے۔

دہرہ دون

جب ہم دہرہ دون کو گئے وہاں ایک ہندو فقیر کی خبر سن کر پہاڑ پر پہنچے ان کی ملاقات سے طبیعت بہت خوش ہوئی جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ چار پانچ روز رہنے کا اتفاق ہوا۔ ایک روز تنہائی میں ہم گئے اس وقت بابا جی رام گیتا لکھ رہے تھے ہم نے کہا ”نمو نارائن“ بولے ”نمو نارائن“ پھر لاحول بھیجو السلام علیکم کہو۔ یہ کلام سن کر ہم چونکے فرمانے لگے میں سید ہوں اور میرا نام محمد حسین ہے پہلے تو شاہ عبد العزیز صاحب سے تحصیل علم کی پھر وید اور شاستر کا شوق دامنگیر ہوا بنارس جا کر یہ بھی پڑھا۔ خاندان قادریہ میں مرید ہوں اب جوگ لے کر یہاں آ رہا ہوں چیلے کام کرتے ہیں میں یاد خدا میں مصروف ہوں ہم نے دریافت کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی فقیری میں آپ نے کیا فرق دیکھا کہا کہ فقیری کی بات تو دونوں طرف یکساں ہے صرف الفاظ و اصطلاحات جدا ہیں۔

سری نگر

ہم دہرہ دون کے پہاڑ کی سیر کرتے ہوئے سری نگر میں پہنچے ایک پہاڑ پر بابا جی رہتے تھے اُن سے ملاقات ہوئی بڑی خلق و مدارات سے پیش آئے دیکھتے ہی بولے کہ ایسی صورت تو بہت مدت دیکھنے میں آئی ہے۔ ہم کو ایک جدا مکان دیا چارپائی منگائی ہر چند ہم نے انکار کیا کہ آپ زمین پر سوتے ہیں ہم بھی اسی طور سے بسر کریں گے ہرگز نہ مانا اور اصرار کیا کہ نہیں تم کو چارپائی ضرور چاہئے چند روز میں بے تکلفی ہو گئی ایک دن ان کے کسی چیلے کو پدم ناگ نے جو انگل بھر کا اور نہایت زہریلا ہوتا ہے کاٹ لیا دوسرے چیلے نے سانپ کو پتھر کے کونڈے سے ڈھانک دیا اور خود جا کر گرو جی کو خبر کی فرمایا کہ جلدی بھبھوت یعنی اکسیر اعظم لا۔ اتنے میں ایسا زہر چڑھا کہ چیلے کا منہ بند ہو گیا اور گردن کا منکا ڈھل گیا کہا کہ جس طرح ہو سکے اس کے حلق سے بھبھوت اتارو چیر پھاڑ کی مشکل سے ایک خشخاش کی برابر راکھ سینک سے اس کو کھلا دی اس کا اترنا تھا کہ چیلا جھر جھری لے کر سیدھا ہو گیا اور چیلوں کو حکم دیا کہ اب اس کو بٹھاؤ تھوڑی دیر میں اس نے بھوک کی فریاد کی تو دودھ میں گھی اس کو پلایا اور پھر ٹہلانا شروع کیا اور جب قے اور جوش ہوئی گھی پلا دیا کچھ دیر بعد اس کو خون کا دست آیا پھر گھی پلا کر کچے لہو کا دست آیا اس کے بعد غذا دی اور بھلا چنگا ہو گیا۔ اب گرو جی نے کہا کہ اس سانپ کو لاؤ۔ چیلے پکڑ لائے، ایک سینک سے اس کے منہ میں ذرا بھبھوت ڈال دی اسی دم اینٹھ کر رہ گیا اور ذرا دیر میں پانی پانی ہو کر بہہ گیا۔ اور وہ خاک پانی پر تیرنے لگی بابا جی نے کہا کہ اس کا زہر تو اس کے لیے اکسیر ہے مگر انسان کے لیے قاتل ہے اور انسان کی اکسیر اس کے لیے زہر ہلاہل ہے۔

اس کے بعد باباجی نے کہا کہ لاؤ تم کو ایک اور تماشا دکھائیں ایک کڑھائی دودھ کی بھری ہوئی منگائی اور اس میں سرکہ اور نمک ڈال کر دودھ کو پھاڑ دیا مجھ سے بولے کہ بھلا اب کوئی شے اس کو درست کر سکتی ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں پھر وہی خاک چاول پھر اس میں ڈال کر لکڑی سے چلانا شروع کیا فوراً دودھ اصلی حالت پر آ گیا پھر کتنا ہی سرکہ اور نمک اس پر ڈالا کچھ اثر نہ ہوا جیسا تھا ویسا ہی رہا باباجی نے چیلوں کو حکم دیا کہ گڑھا کھود کر اس دودھ کو دبا دو ہم نے کہا کہ صاحب ان چیلوں کو آپ کیوں نہیں پلا دیتے۔ فرمایا یہ پئیں گے تو کاہل و شہوت پرست ہو جائیں گے پھر ہم سے براہِ عنایت فرمایا کہ تم کھاؤ تو ہم کھلا دیں سات پشت تک اس کی تاثیر رہے گی میں نے کہا بہت اچھا مگر اس کا اتار بھی بتا دیجیے ورنہ پانچ سیر مرغن کھانا ہر روز کہاں سے لائیں گے فرمانے لگے میاں خدا مالک ہے ہم نے کہا سبحان اللہ دوا کھانے کے تو آپ مالک ہیں اور کھانا کھلانے کے لئے خدا مالک۔ میں ایسی دوا سے باز آیا۔ اُن باباجی کی عمر چار سو برس کی تھی ستر برس میں کایا پلٹ کرتے تھے۔ اس طرح کہ چھ مہینے ایک کوٹھری میں بیٹھ کر جہاں ہوا کا گذر نہ ہو ایک دوا کھاتے تھے پہلا جسم پھٹ کر اس کے اندر سے بارہ برس کی عمر کا ایک جسم نکل آتا تھا جن دنوں میں ہم گئے تھے وہ دوا تیار ہو رہی تھی۔

ایک زمانہ میں حضرت مخدوم علاؤ الدین علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ کے مزار متبرک کی زیارت کو ہم گئے۔ پیران کلیر میں رہنے کا اتفاق ہوا جب عرس شروع ہوا تو اطراف و جوانب سے صوفیہ کا ورود ہونے لگا غرض اعتقادوں کے ہجوم اور آہنگ و سرود کی دھوم ارباب شوق کی مستی و اصحاب ذوق کی والا دستی سے ہنگامہ بزم گرم ہوا جس میں وجد و حالت کی گرماگرمی میں اس مجلس کے اندر پہنچا دیکھا کہ تین شخص رنگین لباس، بادۂ شوق سے سرمست ہیں اور اصحاب ذوق کا پر خاموش۔ مطربان خوش آہنگ کسی سوختہ دل کا یہ شعر گاتے ہیں:

یہ شکایت ہے ہمیں اس ساقیٔ گلفام سے
دورِ ساغر میں ہمیں محروم رکھا جام سے

اُن میں سے ایک فریاد خواں کا ہاتھ میں نے پکڑ لیا اور پوچھا کہ آپ نے اس شعر سے کیا کیفیت اخذ کی اور تحقیق معانی سے کیا اثر آپ کے دل پر مترتب ہوا انھوں نے فرمایا کہ ہم جو گوہر اشک پروتے ہیں سو اللہ کو روتے ہیں۔ میں نے کہا کہ حضرت کیا آپ کے دل مردہ کی طرح حی القیوم لاتاخذہ سنۃ" ولا نوم بھی دامِ اجل میں گرفتار ہو گیا؟ جس کے ماتم میں آپ نوحہ گری کرتے ہیں اور اگر ایسا ہو تو مقام تہنیت ہے نہ جائے تعزیت۔ کیونکہ اس نے تمھارے بزرگوں کو مارا اور تمھاری فکر میں ہے۔ یہ بات سن کر چپ چاپ ایک گوشہ مجلس میں جا بیٹھے معلوم نہیں کبیدہ خاطری سے گردن جھکائی یا خدا سے جی لگا بیٹھے۔ پھر میں نے دوسرے نالہ کش سے وہی سوال کیا جو پہلے سے کیا تھا وہ بولے کہ حضرت کیسی غزل اور کہاں کا شعر۔ نہ ہم سمجھتے ہیں نہ اس کو سنتے ہیں یہاں تو الاپ اور سرے بھلی معلوم ہوتی ہے ڈھولک کی تھاپ پر سر دھنتے ہیں۔ میں نے کہا کہ بہت درست:

کسانیکہ ایزد پرستی کنند — بر آواز دولاب مستی کنند

پھر تیسرے صاحب ذوق سے بھی یہی سوال کیا انھوں نے فرمایا کہ حضرت شعر کا مطلب یہ ہے کہ جب حضرت خاتم الانبیاء علیہ التحیہ والثنا شب معراج کو مدارج و مقامات طے کرتے ہوئے پردۂ وحدت تک پہنچے تو آواز آئی کہ السلام علیک ایہا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ بس اس ساغر کو حضرت رسالت پناہ نے دو بخش فرمایا ایک حصہ تو خود نوش کیا اور دوسرا حصہ بندگان صالح کو عنایت کیا یعنی فرمایا کہ السلام علینا و علی عباد اللہ الصالحین حسرت تو یہ ہے کہ بندگان صالح کو تو ان کی صالحیت کافی تھی وہاں ہم جیسے تشنہ لبان بادۂ معصیت کو یاد کیوں نہیں فرمایا

ع کہ مستحق کرامت گناہگار انند

میں نے عرض کیا کہ حضرت خیر اور اللہ نے تو گناہگاروں کو صالحین سے بھی پہلے دو دو صالحین کی اس شفقت کے ساتھ شریک فرمایا ہے۔ چنانچہ علیہا میں ضمیر جمع اس پر شاہد ہے۔ صالحین کو بعد عطف جدا یاد کیا اور عاصیوں کو اپنے ساتھ رکھا بھلا اس سے زیادہ اور کیا عنایت ہو سکتی ہے یہ بات سن کر ان کا جوش و خروش دھیما ہو گیا اور خاموش ہو کر ایک جانب بیٹھ گئے۔

شاہ ابوسعید نقشبندی

جب ہم میرٹھ میں تھے تو کپڑے بالکل پھٹ گئے گھر میں کوئی رقم نہ تھی مجبوراً لڑکے پڑھانے شروع کیے۔ جب کپڑوں کے لائق دام آ گئے تو پڑھانا ترک کر دیا اسی زمانے میں مولوی حبیب اللہ شاہ کی خدمت میں رہے فی الواقع حضرت کی اصلاحی توجہ نہایت عمدہ تھی ہماری طبیعت کو بہت درستی اور اصلاح حاصل ہوئی اور یہ تمام سلوک نقشبندیہ شاہ صاحب قبلہ سے طے کیا جب سیر لطائف و دوائر و انوار کی ہو چکی تو حضرت نے فرمایا کہ لو سید صاحب تعلیم ختم ہوئی۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کی توجہ سے لطائف و دوائر کا خوب تماشا دیکھا مگر گستاخی معاف ہو خدا کا پتا تو کسی دائرے میں ملا نہ کسی لطیفے میں یہ سب جہان حق کا سراغ معلوم ہوتا ہے اس وقت تو یہ بات ان کو بہت ناپسند ہوئی مگر رات کو خود غور و فکر کیا تو بات سمجھ میں آ گئی چونکہ نہایت منصف اور دانا آدمی تھے صبح کو فرمانے لگے: سید تم سچ کہتے ہو ہم نے جو غور و انصاف کیا تو درحقیقت خدا تو بے چون و چگون کسی دائرے اور لطیفے میں مقید نہیں آفریں صد آفریں تم نے یہ بات سمجھائی صدہا طالب ہمارے پاس آئے مگر کسی نے اس سمجھ بوجھ کی گفتگو نہیں کی۔ آؤ دہلی چل کر شاہ ابوسعید صاحب سے یہ بات عرض کریں چنانچہ شاہ صاحب مجھ کو دہلی لے گئے اول تو شاہ ابوسعید صاحب نے بڑے زور شور کی توجہ دی لوگوں کو خیال تھا کہ دیکھیے کیا حالت ہوتی ہے مگر ہم تو جیسے تھے ویسے ہی اٹھ کھڑے ہوئے بعد اس کے مولانا حبیب اللہ شاہ صاحب نے وہ تقریر عرض کی شاہ ابوسعید صاحب نے فرمایا کہ یہ سوال تمہارا تو نہیں معلوم ہوتا۔ میاں صاحب نے میری طرف اشارہ کیا اس وقت جناب شاہ صاحب نے نہایت ہی انصاف کی بات فرمائی اور بہت ہی معقول جواب دیا کہ سو صاحبزادے جو کچھ ہم کو بزرگوں سے پہنچا تھا وہ تم کو پہنچا دیا اب اگر تمہارا حوصلہ فراخ اور طلب غالب ہے تو اور جگہ تلاش کرو۔

میرٹھ

میرٹھ میں حافظ جلال الدین صاحب گیارھویں کیا کرتے تھے۔ ایک بار ہم پانچ آدمیوں کی دعوت کی جب فاتحہ شروع کی تو گھنٹہ بھر تک بزرگوں کے نام پڑھتے رہے بروح پاک فلاں فلاں۔ آخر ہم نے تھک کر ان سے عرض کیا کہ حضرت سب کے شمار تو ہو گئے ان پانچ صورتوں کے نام بھی پکار دیجیے جو اصل کھانے والے ہیں بزرگوں کو تو اب جب پہنچے گا جب ان پانچوں کا شکم سیر ہو گا اس بات پر بعض لوگ تو ہنس پڑے اور بعض ناراض ہوئے لیکن عبارت فاتحہ جلد ختم ہو گئی۔

منڈاور

موضع منڈاور میں ہم پہنچے تو سنا کہ یہاں ایک سید صاحب شیعہ تھے مرتے دم انھوں نے یہ وصیت کی ہے کہ ہماری دونوں لڑکیوں کی شادی نہ کی جائے جب حضرت امام مہدی آخر الزماں کا ظہور ہو تو یہ دونوں ان کے نکاح میں دی جائیں۔ ہم نے سید صاحب کی بیوی سے کہا کہ امام مہدی علیہ السلام تو شریعت محمدی کے تابع ہوں گے اور اس شریعت میں دو بہنوں کا جمع کرنا جائز نہیں پس مناسب ہے کہ ان میں سے ایک کی شادی کر دو اور ایک امام صاحب کی نذر کے لیے رہنے دو چنانچہ ایک کی شادی ہو گئی اس کے بعد ہم نے کہا کہ اب اس ایک غریب کو بھی کیوں بٹھا رکھا ہے خدا جانے امام مہدی علیہ السلام کے ظہور تک اس کی عمر وفا کرے یا نہ کرے اس سے تو یہی بہتر ہے کہ اس کی بھی شادی کر دو اور اس کی اولاد سے امام کے زمانے میں جو کوئی موجود ہو وہ امام صاحب کی نذر کی جائے تاکہ

وصیت بھی پوری ہو جائے۔ غرض اس کی بھی شادی ہو گئی۔

کرت پور

جب ہم کرت پور میں گئے تو دیکھا کہ صبح دم آ کر سجادہ نشین صاحب نے حضرت احمد شاہ کے مزار کا طواف و سجدہ کیا۔ ہم نے کہا کہ صاحب طواف و سجدہ تو یہاں ادا ہوا۔ اگر حضرت غوث الاعظم کے مزار پر آپ ہوں تو وہاں کیا کیجئے گا؟ اور حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے کیا باقی رکھا؟ اور خدا سے تو کچھ مطلب ہی نہیں جس کے لیے کچھ ادب و تعظیم درکار ہو۔ وہ خفا ہو گئے اور بولے کہ میاں طالب علم بھی ہوتے ہیں اسی واسطے ان کو فیض نہیں ہوتا ہم نے کہا کہ صاحب ایسے فیض کو ہمارا سلام ہے کہ جس کے لیے خدا کو چھوڑ کر دوسرے کے سامنے سر جھکائیں اور توحید سے نکل کر شرک میں مبتلا ہوں۔

شاہ نیاز احمدؒ بریلوی

ایک بار شہر بریلی میں گزر ہوا وہاں شاہ نیاز احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی نہایت اخلاق سے پیش آئے ہمہ صفت موصوف تھے۔ ہم چند روز وہاں ٹھہرے ایک دن میاں صاحب فرمانے لگے تم ہمہ اوست کیوں نہیں کہتے ہم نے عرض کیا کہ حضرت جو کہتے ہیں وہ قالی اور خالی ہیں اور جو حالی ہیں وہ کہتے نہیں۔

ایں مدعیاں در طلبش بے خبرانند　　کاں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

دوسرے یہ کہ ہم ٹھہرے طالب۔ اگر ہمہ اوست کہیں تو طلب کس کی کریں؟ مولانا صاحب تو چپ ہو رہے مگر ان کے خلیفہ صاحب بولے کہ ہمارے حجرے میں آؤ ہم کو توجہ دیں گے ہم نے کہا بسم اللہ۔ وہ حجرے میں جا کر توجہ دینے بیٹھے ہم نے کہا کہ صاحب اس وقت تو آپ بالکل مولانا نیاز احمد معلوم ہوتے ہیں۔ خلیفہ صاحب نے کہا "ای استغفر اللہ۔ ذرہ کو آفتاب سے کیا نسبت ہے۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک"۔ ہم نے کہا سبحان اللہ خدا بننے کو تو آپ تیار ہیں مگر نیاز احمد نہیں بن سکتے۔ بس دیکھے اپنی توجہ۔ ایسی توجہ کس کام کی جو کبھی تو خدا بن بیٹھے اور کبھی بندے کا بھی بندہ۔

لکھنؤ میں مولوی عبد الرحمٰن صاحب موحد سے ملاقات ہوئی ان کی عادت تھی کہ جب کوئی آتا تو فرماتے آؤ معبود اور جاتا تو کہتے جاؤ معبود۔ ہم سے بھی حسب عادت یہی کلام کیا ہم نے کہا کہ حضرت معبود و معبود تو ہماری سمجھ میں آ گیا لیکن آؤ جاؤ کے معنی کچھ نہ سمجھے۔ مولوی صاحب نے کچھ جواب نہ دیا لیکن سر اٹھا کر بہت دیر تک ہماری طرف کو دیکھتے رہے۔ خیر تھوڑی دیر بعد ہم چلے آئے پھر نہ گئے۔

لنگڑے حضرت

گوالیار میں لنگڑے حضرت کی زیارت کو گئے (یہ بزرگ، مولوی حبیب اللہ شاہ رامپوری کے شیخ تھے، اور شاہ ابو البرکات کے مرید) بہت خاطر و مدارات سے پیش آئے حال دریافت کیا ہم نے اپنی سرگزشت سنا دی پھر ان کو کچھ جوش جو آیا تو ہماری طرف متوجہ ہو کر الا اللہ کی ضربیں لگانے لگے خیر اثر تو کیا ہونا تھا مگر کسی قدر گرمی ہمارے مزاج میں آگئی۔ ہم نے کہا کہ حضرت قصور معاف ہو تو کچھ عرض کریں۔ کہا کہ فرمایئے۔ ہم نے کہا کہ پرجتا جی ایک صاحب کمال گرو تھے انہوں نے پیرانہ سالی میں ایک نوجوان لڑکی سے شادی کی۔ لوگوں نے منع بھی کیا مگر وہ کب مانتے تھے۔ جب شغل معمور کا وقت آیا تو پرجتا جی بے چارے شیخ فانی سے کیا ہو سکتا تھا ع تراکہ دست بلرزد گہر چہ دانی سُفت۔

ناچار ہاتھ سے تھپ تھپ کرنے لگے۔ وہ بھولی بھالی سدھ حرف، الھڑ البیلی سمجھی کہ مرد و عورت میں یہی معاملہ ہوتا ہو گا چند روز کے بعد پرجتا جی نے گنگا کے اشنان کا ارادہ کیا اور اپنا خاص چیلا جو نوجوان تھا گھر کی حفاظت کے لیے چھوڑا وہ گھر کے اندر آنے

جانے لگا دونوں طرف جذبات شوق نے زور کیا اور جو ہوتا تھا سو ہو گیا یعنی ترکیب اور مردانہ طریقہ دیکھ کر وہ عورت بولی کہ تمہارے گرو کو تو یہ ڈھب یاد نہ تھا اس نے جواب دیا کہ وہ بھڑوا کیا جانے یہ مردوں کا کام ہے۔ جب گرو جی اشنان کر کے واپس آئے اور رات کو وہی تھپ تھپ شروع کی تو بولی کہ مہاراج اب تھپ تھپی سے کام نہیں چلے گا کچھ زور رکھتے ہو تو مردمی دکھلاؤ۔ گرو جی فوراً تاڑ گئے کہ یہ اسی حرام زادے کی شرارت ہے اس نے ہمارا کام خراب کر دیا اور اس بھولی انجان کو غضب کی چاٹ لگا دی۔

سو حضرت سلامت۔ کوئی کام مردوں کا اگر یاد ہو تو مضائقہ نہیں ورنہ ان تھپ تھپیوں سے تو یہاں کام چلتا نہیں اور یہ کچھ پہلوانی اور بہادری کی بات نہیں ہے کہ کوئی شخص بے خبر چلا جاتا ہے پیچھے جا کر دھکا دے دیا ہم تو آپ کو فقیر سمجھ کر زیارت کو آئے تھے آپ زور آزمائی کرنے لگے۔ یہ بات سن کر لنگڑے صاحب بہت خفا ہوئے اور بولے کہ میاں اگر ہم کچھ نہیں تو ہمارے بڑے تو تھے۔ ہم نے کہا کہ سبحان اللہ وہ آپ ہی کے بڑے تھے کیا آپ نے اوروں کو ڈوم ڈھاری یا دھنیا جلاہا فرض کیا ہے۔ اس گفتگو کے بعد ہم اپنا بستر باندھ کر چل دیے۔

کوٹ پتلی

جب ہم کوٹ پتلی سے چلے تو راستے میں ایک مندر ملا وہاں ایک سادھو نہایت دل آویز الحان سے بھجن گا رہا تھا ہم بھی اس کے پاس جا بیٹھے بھجن سنتے رہے پھر ان سے باتیں ہونے لگیں یہاں تک کہ نماز کا وقت آیا ہم نے مصلیٰ بچھا کر نماز پڑھ لی۔ بعد نماز وہ سادھو جی مخاطب ہوئے کہ میاں صاحب آپ کی طبیعت میں تو بڑی آزادی معلوم ہوتی ہے پھر یہ علت کیوں لگا رکھی ہے ہم نے کہا کہ بابا جی علت سے تو نہ تم خالی نہ ہم خالی۔ تم کو اس پتھر کے پوجنے کی علت لگی ہوئی ہے ہم کو نماز کی تم گھنٹہ بجاتے ہو ہم تسبیح ہلاتے ہیں۔ بے قید تو خدا کی ذات ہے ورنہ سب اپنی اپنی قید میں مبتلا ہیں۔

حج اول کے سفر میں بھوپال جانے کا اتفاق ہوا وہاں سنا کہ ایک سید العالم صاحب بڑے کامل فقیر ہیں ان سے بھی ملے انھوں نے تعلیم کا دعویٰ کیا مگر کچھ اس کا ظہور نہ دیکھا گیا چند روز تال بھوپال کے کنارے ایک پہاڑی پر رہے ایک دن سکندر بیگم والیۂ بھوپال یہ سن کر کہ کوئی فقیر نواح شہر میں وارد ہے ملاقات کو آئیں چند خواص و ارکین بھی ہم رکاب تھے خود گھوڑے پر سوار، ہمارے قریب آن کر یہ شعر پڑھا:

کیوں شہر چھوڑ عابد غار جبل میں بیٹھا
جس کو تو ڈھونڈھتا ہے تیری بغل میں بیٹھا

اور فرمایا کہ شاید آپ کا ارادہ بیت اللہ کا ہے، ہم نے کہا کہ ہاں ہے تو سہی۔ اتنے میں دوسری بیگم صاحبہ جو ان کی وزیر تھیں یوں گویا ہوئیں ؎

عابد و معبود دونوں پاس ہیں غافل ترے
کیوں کرے پھر تو ارادہ طوف بیت اللہ کا

ہم نے دیکھا کہ یہ تو سر پر چڑھی جاتی ہیں اب سکوت مصلحت نہیں ناچار تیغ زبان کو خاموشی کی نیام سے کھینچ کر ایک ضرب اس شعر کی لگائی ؎

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خا را

یہ سن کر بیگم صاحبہ بولیں کہ یہ تو شہری معلوم ہوتے ہیں مگر چھوٹ گئے ہیں۔ ہم نے کہا کہ آپ سے ——— بیگم صاحبہ لوٹ گئیں اور گھوڑے سے اتر پڑیں اور کہا کہ ہمارا قصور معاف ہو معلوم ہوا کہ آپ سب طرح درست اور پورے ہیں ہم نے کہا کہ آپ آزمائش و جانچ کر لیں اگر کمی رہتی ہو تو قصور ہمارا ہی ہے۔ پھر تو بھڑک گئیں اور کہنے لگیں میاں صاحب کیا یہاں بولنا بھی خطا ہے؟ ہم نے کہا اس میں شک کیا ہے آپ نے نہیں سنا من سکت سلم و من سلم نجا۔ یہاں سب طرح کا سامان موجود ہے دیکھ لو، دکھاؤ، پرکھ لو، پرکھا دو، سودا نقد ہے اس ہاتھ دو اس ہاتھ لو۔ بیگم صاحبہ بولیں بے شک میاں صاحب ہمارا بولنا غضب ہوا اب ہماری تمہاری صلح ہے۔ ہم نے کہا بہت اچھا غرض عذر تقصیر کے بعد نذر پیش کی اور کہا کہ آپ شہر میں تشریف لے چلیں تو ہم کو ہر وقت آپ کی زیارت نصیب ہو اور آپ کو ہر طرح کا آرام ملے۔ ہم نے کہا کہ بیگم صاحبہ ہم کو تو یہی بڑا آرام ہے کہ آپ اپنا آرام نہ بنائیں اور ہمیں آرام کرنے دیں۔ مسکرا کر چپ ہو گئیں۔ اور رخصت ہوئیں۔

بابا سیتل داس

بھوپال میں ایک ہندو فقیر تھے بابا سیتل داس۔ ہم نے سنا کہ وہ توجہ دیا کرتے ہیں ہم بھی ان کے پاس گئے اور درخواست کی۔ کہا کہ تین دن تک فاقہ کرو نہ ان کھاؤ نہ پانی پیو ہم نے ایسا ہی کیا تیسرے دن باباجی نے توجہ کی تو تمام جسم مثل آئینہ ہو گیا۔ اندرونی و بیرونی رگ و ریشہ سب عیاں تھے اور ایک شعلۂ نورانی زمین سے آسمان تک منور معلوم ہوتا تھا ہم نے عرض کیا کہ باباجی ہم کو من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ کے معنی سمجھا دو۔ اس توجہ سے تو یہ بات حاصل ہوئی نہیں۔ ہم تو دیدِ جاں چاہتے ہیں نہ دیدِ جسم و جہان۔ فقیر کو دیکھا تو کیا دیکھا اصل دیکھنا تو اپنا ہی دیکھنا ہے۔ کہا کہ یہ مشکل ہے ہم نے کہا کہ اگر یہ مشکل ہے تو ہمارا بھی سلام ہے۔

جب ہم نے بھوپال سے آگے کا عزم کیا تو میاں وزیر علی سے پوچھا کچھ خرچ بھی ہے؟ بولے گیارہ ٹکے موجود ہیں ہم نے کہا خرچ تو بہت ہے اب کیا دیر ہے چلو۔ آدھی رات کے وقت ہم دونوں چل نکلے جب اندور میں پہنچے تو کچھ پاس نہ تھا مجبوری رسالہ کی مسجد میں قیام کیا۔ وہاں کا ملاں نہایت نیک بخت آدمی تھا اس نے دس بارہ روز ٹھہرایا بوقت روانگی پانچ روپے پیش کیے۔ ہم نے سید وزیر علی صاحب کی طرف اشارہ کیا اس نے انکار کیا ہم نے بھی یا کہ میاں صاحب دعوتِ خدا کیوں رد کرتے ہو۔ آپ بھیک نہیں مانگتے مزدوری اور تجارت نہیں کرتے۔ اس فقیری جامے میں تو اسی طور سے گذارہ ہوگا مان گئے اور روپے لے لیے وہاں سے روانہ ہو کر چاندور پہنچے اکیس دن رہنے کا اتفاق ہوا سید وزیر علی صاحب نے کمر ہمت باندھی اور کتابت و طبابت کے ذریعے سے نو روپے جمع کیے تب وہاں سے آگے کو چلے ایک منزل میں سخت بارش ہوئی ہم دونوں کمبل تان کر بیٹھ گئے تاہم کپڑے بہت بھیگ گئے سردی نے غلبہ کیا سامنے ایک مردہ ہندو کا جل رہا تھا وہاں خوب آگ تاپی اور کپڑے سکھائے۔ لیکن کپڑوں میں اس کی بو بس گئی دماغ پریشان ہونے لگا جب ذرا ابر کھلا تو ہم نے غسل کیا اور کپڑے دھوئے تب ذرا طبیعت صاف ہوئی۔ غرض چلتے چلتے بمبئی میں پہنچے ——— جب بمبئی سے جہاز پر سوار ہوئے تو اس کے معلم سے پوچھا کہ میاں تم کو کبھی کوئی مردِ خدا بھی ملا ہے اس نے کہا کہ ہاں دو مرشد ہیں ایک تو اس زمانے میں تشریف لائے تھے جب میں نو دس سال کا تھا اور میرا باپ معلم تھا اور دوسرے اب ملے ہیں۔ ہم نے کہا دوسرا کہاں ہے بولا کہ میرے پاس بیٹھا ہے ہم نے کہا کہ تم نے کیونکر جانا کہا کہ مجھ کو ہزاروں آدمیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا اور بہت سے فقرا کی زیارت کی مگر کسی نے یہ سوال نہ کیا اور مردِ خدا کا حال نہ پوچھا کیونکہ مرد کو مرد ہی پوچھتا ہے۔

بیت اللہ شریف

بیت اللہ شریف میں حسن علی نامی کے حجرے میں ٹھہرے بعد چندے مولوی محمد یعقوب اور مولانا شاہ اسحاق صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ہم نے مولوی محمد یعقوب صاحب سے پوچھا کہ یہاں آپ نے کوئی فقیر بھی دیکھا کہا کہ

ان ایک زوار دو شہر کے باہر قبر سے ہوئے ہیں وہ بڑے کامل ہیں۔ کل ان کے پاس چلیں گے۔ دوسرے دن گئے تو بہت ارادت سے پیش آئے مولوی صاحب نے ان سے توجہ کی درخواست کی بولے کہ ابھی تم اس قابل نہیں مگر جو بیٹھتے تنگ آتے رہو تو شاید توجہ کے قابل ہو جاؤ۔ ہم نے عرض کیا کہ صاحب آپ کی توجہ میں ایسی کیا بات ہے۔ کہا کہ مولوی صاحب کی تو کیا ہستی ہے پتھر بھی پاش پاش ہو جاتا ہے۔ ہم نے کہا کہ توجہ تو بہت قسموں کی دیکھی لیکن پتھر توڑ کبھی نہیں دیکھی۔ یہ سن کر چار آدمی پہاڑ پر گئے اور ایک بھاری پتھر لڑھکا کر لائے اور ان بزرگ کے سامنے رکھ دیا۔ ایک نگاہ ڈالی تو پتھر ٹوٹ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ ہم متحیر ہو گئے کہ اللہ اکبر بڑے زور کی نگاہ ہے۔ ان کا طریقہ پوچھا تو کہا شیطانیہ۔ ہم سمجھے کہ معتزلہ یہ ملامتیہ ہیں۔ اس دن سے ہم روز جانے لگے رفتہ رفتہ بے تکلفی ہو گئی ایک دن ان کا نام پوچھا تو بے ساختہ کہہ اٹھے کہ محمد۔ ہم نے کہا کہ سبحان اللہ آپ کا نام تو ابلیس ہونا چاہیے تھا۔ وہ ہنس پڑے اور کہنے لگے کہ لوگ مجھ کو بہت تنگ کرتے ہیں اس لئے یہ بہروپ بھرا ہے اس میں بہت امن ہے میرا نام محمد ہے اور خاندان قادریہ ہے اس وقت جو صاحب بغداد میں سجادہ نشین ہیں سید محمود رزاقی انھیں سے مجھ کو بیعت ہے۔ میرا وطن بھی بغداد ہے اور پیشہ تجارت۔ ملک ملک کی سیر کی ہندوستان کے بڑے بڑے شہر دیکھ آیا ہوں۔ اب کی بار حج کے لیے یہاں چلا آیا۔ ہم نے کہا کہ صاحب یہ سب کچھ سہی لیکن یہ تو فرمائیے کہ آپ کو تطہیر القلب عن ماسوی اللہ بھی حاصل ہوئی یا نہیں۔ آدمی سچے تھے کہنے لگے کہ میاں اس کی تو ہوا بھی نہیں لگی ہم نے کہا بس صاحب تو پھر پتھر توڑ ہوئی تو کیا اور نہ ہوئی تو کیا ؎

قوی شدیم چہ شد ناتواں شدیم چہ شد
چنیں شدیم چہ شد یا چناں شدیم چہ شد
بہیچ گونہ دریں گلستاں قرارے نیست
تو گر بہار شدی ما خزاں شدیم چہ شد

بیت اللہ شریف میں ہمارے والد ماجد کا ایک مرید شب برات کے دن تھوڑا سا حلوا پکا کر لایا اور کہا کہ بزرگوں کی فاتحہ دے دیجئے ہم نے کہا کہ بھلے مانس دیکھو تو کیسی مصیبت اٹھا کر ہم یہاں پہنچے ہیں بھلا اس ذرا سے حلوے کے لیے کیوں بزرگوں کو تکلیف دیتا ہے اتنی دور دراز مسافت بیچ میں سمندر حائل۔ اور بالفرض وہ آ بھی گئے تو اتنے سے حلوے میں کیا بھلا ہوگا کیا تم ان کو آپس میں لڑانا چاہتے ہو۔ ہنس کر کہنے لگا میاں صاحب آپ کو تو ہمیشہ ہنسی کی بات سوجھتی ہے۔ اپنے بزرگوں سے بھی نہیں چوکتے۔ خیر ہم نے فاتحہ پڑھ کر حلوا تقسیم کر دیا۔ ایک دن بام کعبہ کی مرمت ہو رہی تھی ہم بھی مزدوروں میں شامل ہو گئے اور چونے کی ٹوکری سر پر رکھ کر اوپر پہنچے اور دوگانہ ادا کیا۔ دوسرے دن یہ حال مولوی محمد یعقوب صاحب سے بیان کیا وہ بولے ارے میاں کعبے کی چھت پر تو شیطان نماز پڑھا کرتا ہے ہم نے کہا الحمد للہ یہ منزل بھی طے ہوئی اور ایک عقدہ حل ہوا کہ شیطان بھی نماز پڑھتا ہے۔

بیت اللہ شریف سے واپسی میں ایک دن حضرت معروف کرخیؒ کی زیارت کو گئے۔ گور غریباں میں آسودہ ہیں مزار خام مگر مرجع انام ہے سنی شیعہ سب ان کی زیارت کو آتے تھے بقول سعدی شیرازی ؎

شنیدم کہ در کرخ تربت بسے است
بجز گور معروف نیست

چند روز کے بعد ہمارے ہمنام جس سے بنارس میں ملاقات ہوئی تھی مل گئے۔ ایک روز سنا کہ ہندوستان کے تین چار جولاہے سجادہ نشین صاحب کو ایک ایک ریال دے کر حسنی بن گئے اور نسب نامہ بھی حاصل کر لیا حسب اتفاق ایک روز ہم اور ہمنام اور میاں سید علی شاہ صاحب

سجادہ نشین ایک دسترخوان پر کھانا کھا رہے تھے اس وقت میاں غوث علی شاہ کو جو کہ سید حسینی تھے ہم نے چھیڑا کہ پیر صاحب آپ بھی ایک دن حضرت غوث کے اولاد میں شامل ہو جائیے پھر خوب بن آئے گی اس بات پر وہ بہت خفا ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم میں کچھ کسر ہے یا تم سے کچھ کم ہیں یہ بات سن کر سجادہ نشین صاحب نے فرمایا کہ تم کو کیوں رشک آیا ہم نے کہا کہ صاحب رشک تو نہیں مگر شک ضرور پیدا ہو گیا کہ کہیں ہمارے بزرگ بھی دھنے جولاہے ہی نہ ہوں یہاں نام لکھوا کر سید بن گئے ہوں ہم کو تو آج سے اپنی سیادت میں کلام ہو گیا۔

بصرہ

بعد چندے ہم بصرے کو روانہ ہوئے سجادہ نشین صاحب نے ہم کو ایک ناخدا کے نام خط دیا اور کہا کہ وہ تم کو جہاز پر سوار کرا کے بمبئی پہنچا دے گا۔ ہم نے بصرے میں پہنچ کر اس ناخدا کو خط دیا اول اس نے سر پر رکھ کر رقص کیا اور کہا زہے قسمت۔ پھر ہم کو بہت عمدہ مکان میں ٹھہرایا اور کہا کہ ابھی جہاز کی روانگی میں پندرہ دن کا عرصہ ہے آپ گھبرائیے نہیں شہر کی خوب سیر کیجئے ہم نے کہا کہ اتنا خرچ نہیں کہ سیر کریں۔ کہا کہ خرچ کا فکر نہ کیجئے جو درکار ہو یہاں موجود ہے۔ پھر ہم نے شہر کی خوب سیر کی نہایت ویران اور کنگال شہر ہے حضرت حسن بصری اور حضرت زبیر و طلحہ رضی اللہ عنہم کے مزارات متبرکہ کی زیارت کی جو پرانے بصرے میں ہیں اور وہ دوکان بھی دیکھی جہاں حضرت حبیب عجمی کپڑے رنگا کرتے تھے اور حضرت حسن بصری آ آ کر بیٹھتے تھے لیکن رابعہ بصری کے مزار کا پتہ نہ لگا۔ پندرہ روز کے بعد جہاز بغلہ پر سوار ہو کر شہر سورت میں پہنچے۔ وہاں سے منزل بمنزل سیر کرتے ہوئے دہلی میں پہنچے اور چھ مہینے تک زینت المساجد میں رہے۔

مرزا غالب سے ملاقات

ایک روز ہم مرزا نوشہ کے مکان پر گئے۔ نہایت حسن اخلاق سے ملے۔ لب فرش تک آکر لے گئے اور ہمارا حال دریافت کیا۔ ہم نے کہا کہ مرزا صاحب ہم کو آپ کی ایک غزل بہت ہی پسند ہے علی الخصوص یہ شعر:

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو
تیرے کوچے کی شہادت ہی سہی

کہا صاحب یہ شعر تو میرا نہیں کسی استاد کا ہے فی الحقیقت نہایت ہی اچھا ہے۔

اس دن سے مرزا صاحب نے یہ دستور کر لیا کہ تیسرے دن زینت المساجد میں ہم سے ملنے کو آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے ہر چند ہم نے عذر کیا کہ یہ تکلف نہ کیجئے مگر وہ کب مانتے تھے ہم نے ساتھ کھانے کے لیے کہا تو کہنے لگے کہ میں اس قابل نہیں ہوں میں خوار و رو سیاہ گنہگار مجھ کو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ البتہ اوش کا مضائقہ نہیں۔ ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ طشتری میں لے کر کھایا۔ ان کے مزاج میں کمال کسر نفسی اور فروتنی تھی۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف فسانۂ عجائب لکھنؤ سے آئے مرزا نوشہ سے ملے اثنائے گفتگو میں پوچھا کہ مرزا صاحب اردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے۔ کہا چار درویش کی۔ میاں رجب علی بولے اور فسانۂ عجائب کی کیسی ہے؟ مرزا بے ساختہ کہہ اٹھے لا حول ولا قوۃ اس میں لطف زبان کہاں۔ ایک تک بندی اور بھٹیارخانہ جمع ہے۔ اس وقت تک مرزا نوشہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں۔ جب چلے گئے تو حال معلوم ہوا بہت افسوس کیا اور کہا کہ ظالم پہلے سے کیوں نہ کہا دوسرے دن مرزا نوشہ ہمارے پاس آئے یہ قصہ سنایا اور کہا کہ حضرت یہ امر مجھ سے نادانستگی میں ہو گیا ہے آئیے آج ان کے مکان پر چلیں اور کل کی مکافات کر آئیں ہم ان کے ہمراہ ہو گئے اور میاں سرور کی فرودگاہ پر پہنچے۔ مزاج پرسی کے بعد مرزا صاحب نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور ہماری طرف مخاطب ہو کر بولے کہ جناب مولوی صاحب رات

میں نے فسانۂ عجائب کو جو غور سے دیکھا تو اس کی خوبی عبارت اور رنگینی کو کیا بیان کروں نہایت ہی فصیح و بلیغ عبارت ہے۔ میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی نہ آگے ہوگی اور یہ کیونکر ہو اس کا مصنف اپنا جواب نہیں رکھتا غرض اس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں اپنی خاکساری اور اُن کی تعریف کرکے میاں سرور کو نہایت مسرور کیا دوسرے دن ان کی دعوت کی اور ہم کو بھی بلایا اس وقت بھی ان کی بہت تعریف کی۔ مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دل آزاری بڑا گناہ ہے اور در حقیقت یہ خیال بہت درست تھا۔ المومن من سلم المسلمون من یدہ و لسانہ۔

ایک دن ہم نے مرزا غالب سے پوچھا کہ تم کو کسی سے محبت بھی ہے کہا کہ ہاں حضرت علی مرتضیٰ سے۔ پھر ہم سے پوچھا کہ آپ کو؟ ہم نے کہا کہ واہ صاحب آپ تو مغل بچہ ہو کر علی مرتضیٰ کی محبت کا دم بھریں اور ہم ان کی اولاد کہلائیں اور محبت نہ رکھیں کیا یہ بات آپ کے قیاس میں آسکتی ہے۔

جب ہم زینت المساجد میں ٹھہرے ہوئے تھے ہمارے دوست گل پوش نے جو باقی باللہ صاحب میں رہتے تھے ہماری دعوت کی۔ مغرب کے بعد ہم کو لے کر چلے چاندنی چوک میں پہنچ کر ایک طوائف کے کوٹھے پر ہم کو بٹھا دیا۔ اور آپ چمپت ہو گئے پہلے تو ہم نے خیال کیا کہ شاید کھانا اسی جگہ پکوایا ہوگا مگر پھر معلوم ہوا کہ یونہی بٹھا کر چل دیا ہے ہم بہت گھبرائے کہ بھلا ایسی جگہ کم بخت کیوں لایا دو گھڑی کے بعد حضرت ہو آیا اور کہنے لگا کہ میاں صاحب میں آپ کی بھوک مٹانے کو یہاں بٹھا گیا تھا۔ بعدہٗ اپنی قیام گاہ پہ لے گیا اور کھانا کھلوایا۔

دوسرا حج

جب ہم کو زینت المساجد میں چھ مہینے گذر گئے تو ایک دن حسب اتفاق شہزادہ مرزا مغل آئے اور کہنے لگے کہ حضرت حج کو چلیے کہ ہم نے کہا کہ میاں ایک بار تو حرم دیکھ کر آئے اب اگر کوئی اسی مقام سے سوار کر کے لے چلے اور وہیں لا کر اتار دے تو غیر مضائقہ نہیں۔ دوسرے دن انھوں نے بیج گاڑی لا کر کھڑی کر دی اور کہا کہ سوار ہو جائیے۔ پہلے تو ہم حیران رہ گئے کہ کل کی بات ہم تو ہنسی سمجھے تھے۔ خیر اسی دم سوار ہوئے اور منزل بمنزل لدھیانہ پہنچے وہاں منا کر مکلم الدین شاہ بڑے کامل فقیر ہیں ان کے مکان پر گئے۔ بہت اخلاق سے پیش آئے۔ ہم نے پوچھا حضرت آپ کا اسم شریف بولے: خدا۔ ہم نے کہا سبحان اللہ ہم تو آپ کو آسمان پر تلاش کرتے تھے آپ زمین ہی پر نکلے۔ پھر ہمارا نام پوچھا ہم نے کہا صاحب آپ خدا کیسے ہیں کہ مخلوق کا نام بھی نہیں جانتے۔ ذرا تامل کیا اور سوچ کر بولے کہ تم خوش علی ہو۔ اور تمہارے والد کا نام احمد حسن اور دادا کا نام ظہور الحسن۔ ہم نے کہا کہ بس معلوم ہو گیا آپ رمال ہیں خدا نہیں جب تک زائچہ نہیں کھینچتے کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ غرض تین دن وہاں ٹھہرے اور لاہور و ملتان ہوتے ہوئے کراچی بندرگاہ پہنچے وہاں سے جہاز پر چڑھے اور بغداد جا اترے پھر کربلائے معلیٰ اور نجف اشرف کی زیارت کر کے مکہ معظمہ میں پہنچے اور بعد حج روضۂ منورہ کی زیارت کو گئے۔ پھر مکے ہی واپس آئے مولوی محمد یعقوب صاحب سے ملاقات ہوئی فرمانے لگے میاں تم تو ابھی گئے تھے پھر چلے آئے ہم نے کہا کہ صاحب گناہ عظیم ہوا معاف فرمایئے انشاء اللہ پھر ایسا قصور سرزد نہ ہوگا۔ ہنس پڑے کہ میاں تم تو ہر بات میں قائل کر دیتے ہو۔

مکے سے روانہ ہو کر بمبئی اور بمبئی سے چل کر دلی آ پہنچے اور جس جگہ سے سوار ہوئے تھے وہیں پھر اترے۔ ہمارے حج بھی ایسے تھے جیسے بچوں کی نماز۔ یعنی نہ ان پہ نماز فرض نہ ہم پہ حج فرض۔

لکھنؤ

لکھنؤ میں ایک امیر زادہ شیعہ ہمارے پاس آیا کرتا تھا اتفاق سے اس کی تاریخ نکاح قرار پائی برات کے وقت خود آیا اور باصرار تمام ایک ہاتھی پر سوار کر کے ہم کو بھی لے گیا اور حسب وعدہ ہم کو علیحدہ مکان میں اتارا کوئی آدھی رات گذری ہوگی کہ نوشہ کا باپ

بزم عقد میں شریک ہونے کے لیے ہم کو لے گیا۔ صیغہ شروع ہونے کو تھا کہ ایک دایہ سرِ محفل آن کر کہنے لگی کہ اس نیک بخت پارسا لڑکی کو پانچ مہینے کا حمل بھی ہے مگر حرام کا نہیں بلکہ متعہ شرعی کا ہے۔ یہ بات سن کر دولہا چڑ گیا اور بے باکانہ کہہ اٹھا کہ میں نکاح نہیں کرتا۔ ہر چند لوگوں نے سمجھایا ایک نہ مانی۔ اس کے باپ نے ہم سے کہا کہ صاحب یہ آپ کا معتقد بہت ہے کچھ آپ ہی اس کو سمجھائیے ہمارا تو کہنا مانتا نہیں۔ ناچار ہم نے پاس جا کر کہا کہ صاحبزادہ وجہ انکار کیا ہے؟ بولا کہ حضرت یہ بچپن کی چاٹ لگی ہوئی آئندہ کب چھوٹے گی۔ ہم نے کہا کہ میاں جب تمہارے مذہب میں یہ امر جائز و درست ہے تو برا کیوں سمجھتے ہو۔ کہا کہ صاحب بس ایسے مذہب کو بھی میرا اسلام ہے۔ اس کے باپ نے کہا کہ میں کیا تو سنی ہو گیا؟ بولا کہ ہاں پہلے تو ڈر تھا مگر اب بے شک ہو گیا۔ یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا اور محفل درہم برہم ہو گئی۔ ہم بھی اپنے مکان کو چلے آئے۔ صبح کو وہ امیرزادہ آیا کہ حضرت مجھ کو مرید کر لیجیے۔ ہم نے کہا کہ بھائی ہم ہیں قادری اور تم کو اُن سے عداوت ہے پھر بات کیونکر بنے گی۔ جواب دیا کہ حضرت گذشتہ سے توبہ اور آئندہ کو ان کا غلام ہوں۔ جب اس نے بہت اصرار کیا تو مجبوراً ہم نے بیعت کر لیا۔

گھر کو مراجعت

لکھنؤ سے ہم اپنے وطن کو روانہ ہوئے جب ننھیال کے گاؤں نورپور میں پہنچے تو مسجد میں جا اترے۔ عصر کے وقت ہمارے ماموں صاحب چری کا بوجھا سر پر رکھے مسجد کے سامنے سے گزرے ایک صاحب نے مسجد میں سے پکار کر کہا کہ ہمارے میر صاحب بڑے بھاگوان ہیں جب باہر سے تشریف لاتے ہیں تو بھرے بھرائے آتے ہیں۔ آپ ہنستے ہوئے چلے گئے۔ پھر نماز کے وقت مسجد میں تشریف لائے میاں جی نے کہہ دیا کہ میر صاحب آج ایک مسافر بھی آگیا ہے۔ بعد نماز مغرب ہم کو اپنے گھر لے جا کر بٹھایا اور خود کسی کام کے لیے باہر گئے۔ گھر میں صرف نانی صاحبہ بخار کی شدت میں پڑی کراہ رہی تھیں۔ وقت فرصت کو غنیمت سمجھ کر ہم ان کے پاؤں دابنے لگے۔ فرمایا کون؟ عرض کیا مسافر ہوں اور سید آپ کا نواسا۔ خفا ہو کر بولیں کہ تو میرا نواسا کیوں ہونا چاہتا ہے کون ہے کہیں نہیں میرے پاؤں کو ہاتھ مت لگا۔ اتنے میں ماموں صاحب آ گئے پوچھا کیا ہے؟ نانی صاحبہ نے فرمایا کہ یہ نامحرم مسافر کہتا ہے کہ میں تمہارا نواسا ہوں اور پاؤں دبانے کو آ بیٹھا۔ ماموں صاحب نے کہا خیر نواسا نہ سہی تو ماموں کے برابر تو ضرور ہے اگر پاؤں دباتا ہے تو کیا مضائقہ ہے۔ لیکن انھوں نے نہ مانا۔ کھانا کھا کر ہم مسجد میں آ گئے۔ سویرے اٹھ کر گھر کو روانہ ہوئے۔ جب ننھیال کے گاؤں سے چل کر وطن میں پہنچے تو محلے کی مسجد میں جا ٹھہرے۔ مسجد کے ملاں نے ہمارے گھر خبر دی کہ آج ایک مسافر وارد مسجد میں آیا ہے۔ شام کے وقت ہمارا چھوٹا بھائی حیدر حسن جس کی عمر بارہ برس کی تھی ہمارے سامنے کھانا لایا۔ ہم نے اس کا اور باپ دادا کا نام اور قوم پوچھی سب باتوں کا جواب ٹھیک دیا بڑی دلیری سے گھر گیا اور والدہ صاحبہ سے ساری باتیں بیان کیں وہ سن کر چپ ہو رہیں۔ ایک روز ہم نے حجام کو بلایا اور حجامت بنوائی۔ ہمارے سر میں ایک نشان تھا بشکل چلیپا وہ دیکھ کر بولا کہ اگر قصور معاف ہو تو کچھ عرض کروں ہم نے کہا کہ اچھا کہو بولا کہ یہ نشان جو آپ کے سر پر ہے میرے ہاتھ کا ہے اب یہ نہیں معلوم کہ آپ وہی ہیں یا کوئی اور۔ ہم نے حال پوچھا تو اس نے ہمارا قصہ یوں سنایا کہ سید احمد علی صاحب کا ایک لڑکا تھا خوش نام اس کے سر میں میں نے ایسا ہی نشان دیا تھا۔ مدت ہوئی کہ وہ گم ہو گیا۔ آج تک پتہ نہیں ہم نے اس کو لطائف الحیل سے ٹال دیا۔ بھائی حیدر حسن ہمارے واسطے روز کھانا لاتا اور ہم اس سے کچھ دل لگی ہنسی کی بات کہہ دیتے۔ ایک دن ہم نے کہا کہ آؤ بھائی ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔ اس نے برا مانا اور والدہ سے جا کر کہا کہ یہ مسافر مجھ کو روز چھیڑتا ہے اور دیکھتا رہتا ہے آج سے روٹی دینے نہیں جاؤں گا۔ اتفاق سے اس دن ملاں کی کہیں دعوت تھی مغرب کی اذان ہم کو دینی پڑی والدہ صاحبہ نے آواز پہچان لی شام کو جب حیدر حسن کھانا لایا تو یہ پیام دیا کہ کل صبح کو آپ کی دعوت ہے ہمارے مکان پر چل کر کھانا۔ ہم نے دل میں کہا کہ خدا خیر کرے کہیں بڑی بی نے پہچان تو نہیں لیا۔ صبح کو

ہم جانے لگے پردہ ہوا گھر میں بیٹھے والدہ نے پہلے تو پس پردہ ہم کو خوب دیکھا بھالا پھر باہر نکل ہمارے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور فرمایا کہ ماروں تھپڑ — "ہیں ہیں!! مائی صاحبہ میرا کیا گناہ ہے۔ گھر میں جا کر غریب مسافر کو مارتی ہو۔ فرمایا خوب ابھی انکار کیے جاتا ہے۔ ہم نے تجھ کو کھلایا پلایا پالا پرورش کیا۔ ہماری گود میں پرورش سنبھالا چھوٹے سے بڑا ہوا ہم تجھ کو نہ پہچانیں گے۔ اب چودہ برس بعد آیا تو چوروں کی طرح مسافر بن کر مسجد میں ٹھہرا۔ اس وقت ہم سے کیا بھول ہوئی کہ بے ساختہ زبان سے نکل گیا کہ میں وہ نہیں ہوں۔ یہ بات منہ سے نکلی تھی کہ انھوں نے ہنس کر فرمایا کہ ہاں تو وہ نہیں تو اس کا نام کیسے معلوم ہوا۔ اس کے بعد ہم نے قدم بوسی کی انھوں نے ہم کو چھاتی سے لگایا اور زار زار رونے لگیں۔ اتنے میں دوسری والدہ صاحبہ بھی خفا ہوتی آئیں کہ اے بے مروت بے وفا تو ہم سب کو بھول گیا چودہ برس میں ایک دفعہ بھی اپنی خیر نہ بھیجی بڑی والدہ سے فرمایا کہ کیا اس نے کہیں شادی کر لی تھی یا کہیں کا بادشاہ ہو گیا تھا جو بھول گیا۔ بے چارہ قسمت کا مارا نصیبوں کی گردش سے در بدر پھرتا رہا یہی غنیمت سمجھو کہ آنکلا اور ہم کو اپنی صورت دکھا دی۔ اگر نہ آتا تو ہم اس کا کیا کر لیتے۔ المختصر ہم نے منت سماجت کر کے سب کو راضی کیا اور چودہ بیس روپے جو ہمارے پاس تھے سب کے سامنے رکھ دیئے۔ بعد دوسرے ہم نے کہا کہ اب تو ہم تمہارے بھائی ہیں آ ڈالو وہ رونے لگا ہم نے پیار کیا اس کا عجیب حال تھا جہاں ہم کو دیکھتا رو دیتا ہم نے بہت پوچھا کہا میں نہیں جانتا کیا بات ہے آپ کو دیکھ کر بے اختیار میرا جی بھر آتا ہے۔ ہمارے آنے کی خبر سن کر نانی صاحبہ بھی تشریف لائیں۔ میں نے کہا اس وقت آپ نے پہچانا نہیں ورنہ اب میں بھی آپ سے نہیں ملتا۔ فرمایا کہ تو بڑا دغا باز اور فریبی ہے کیوں نہیں کہا تھا کہ میں وہی ہوں پھر میں نے قدم بوسی کی انھوں نے بہت پیار کیا

چند روز کے بعد سب گھر والے ہمارے سر ہوئے کہ تمہاری منسوبہ اب تک بیٹھی ہوئی ہے اور کسی سے نکاح نہیں کرتی بہتر ہے کہ اب تم شادی کر لو۔ یہ مضمون سن کر ہم بہت گھبرائے آخر بڑی مشکل سے اس نیک بخت کی شادی بھائی سید الحسن کے ساتھ کرا دی کیونکہ ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا پھر ایک دن والدہ صاحبہ نے کہا کہ تیرے حصے کی جائیداد موجود ہے مناسب ہے کہ سید الحسن اپنے حقیقی بھائی کے نام لکھ دے۔ میں نے عرض کیا کہ اس سے کیا خصوصیت ہے مجھ کو تو سب بھائی برابر ہیں۔ چنانچہ سب کو برابر تقسیم کر دی۔

مولانا فضل حق خیر آبادی

جب ہم دوبارہ رامپور میں گئے تو سرائے میں ٹھہرے اتفاقاً مولوی فضل حق صاحب سے ملاقات ہوئی نہایت محبت و عنایت سے پیش آئے اور اپنے نوکر سے کہا کہ جاؤ آپ کا اسباب اٹھا لاؤ میں نے کہا کہ حضرت برائے خدا مجھے وہیں رہنے دیجئے کہ بہت آرام سے ہوں۔ کہا اچھا جہاں آپ خوش رہیں لیکن بھٹیاری کو کہلا بھیجا کہ ان کے خرچ کا حساب ہمارے ذمہ ہے۔ اگر پانچ روپے روز بھی خرچ کریں تو کچھ مضائقہ نہیں ہم دیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ میاں صاحب بلا اجازت ہمارے کہیں چلے نہ جائیں۔ ایک روز پچھلی باتوں کا ذکر آگیا۔ اپنے والد بزرگوار کو یاد کر کے روتے رہے ہم نے کہا کہ مولوی صاحب آپ کو وہ دن بھی یاد ہے کہ مولوی صاحب نے تھپڑ مارا تھا اور آپ کی دستار فضیلت دور جا پڑی تھی ہنسنے لگے اور فرمایا کہ خوب یاد ہے وہ عجب زمانہ تھا اور وہ قصہ اس طرح تھا کہ مولوی فضل امام صاحب نے ایک طالب علم کو فرمایا کہ جاؤ فضل حق سے سبق پڑھ لو۔ وہ آیا۔ غریب آدمی بد صورت عمر زیادہ علم کم ذہن کند۔ یہ نازک طبع نازپرور وہ جمال صورت و معنی سے آراستہ چودہ برس کا سن دو سال تک فضیلت ذہن میں جودت بھلا ایسے سے تو کیسے ملے اور صحبت راس آئے تو کیونکر آئے۔ تھوڑا سبق پڑھایا تھا کہ بگڑ گئے جھٹ اس کی کتاب پھینک دی اور برا بھلا کہہ کر نکال دیا۔ وہ روتا ہوا مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا سارا احوال بیان کیا۔ فرمایا کہ بلاؤ اس خبیث کو۔ مولوی فضل حق صاحب آئے اور دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ مولانا صاحب

نے ایک قہقہہ مارا ایسے زور سے کہ ان کی دستار فضیلت دور جا پڑی اور فرمانے لگے کہ تو تمام عمر بسم اللہ کے گنبد میں رہا ناز و نعمت میں پرورش پائی جس کے سامنے کتاب دیکھی اس نے خاطر داری سے پڑھایا طالب علموں کی قدر و منزلت تو کیا جانے؟ اگر مسافرت کرتا بھیک مانگتا اور طالب علم بنتا تو حقیقت معلوم ہوتی اسے طالب علم کی قدر ہم سے پوچھ۔ خبردار تم جانو گے اگر آئندہ ہمارے طالب علموں کو کچھ کہا۔

مفتی صدر الدین آزردہ

غرض ہم رامپور میں مہینہ بھر تک مولوی صاحب کے مہمان رہے۔ رامپور میں میاں سبحان شاہ صاحب سے ملاقات ہوگئی انھوں نے نہایت خاطر مدارات سے اپنے مکان پر ٹھہرایا ہم نے ان کو نماز پڑھتے کبھی نہیں دیکھا مگر ہر وقت تسبیح ہاتھ میں اور با وضو درود شریف پڑھا کرتے تھے۔ ان کی نسبت ایسی تھی کہ جب کوئی مشائخ اُن کے کوچے میں جا نکلتا تو اس کی کیفیت سرد ہو جاتی چنانچہ مست گُرن کا قول تھا کہ اس بدعتی فقیر کے کوچے میں جانے سے قلب پر تاریکی چھا جاتی ہے ایک دن کا ذکر ہے کہ ایک نابینا اُن کی خدمت میں آیا اور ارادت ظاہر کی۔ شاہ صاحب نے کہا بھلا حافظ جی تم کب سے نابینا ہوئے ہو کہا کہ لڑکپن کی عمر میں چیچک نکلی تھی جب سے آنکھیں جاتی رہی ہیں۔ پھر پوچھا بھلا آنکھیں کس نے پھوڑی ہیں حافظ جی نے کہا کہ اللہ نے۔ شاہ صاحب نے کہا ارے عقل کے دشمن جس نے تیری آنکھیں پھوڑیں تیرے ماں باپ کو مارا اور تیری فکر میں ہے ایسے دشمن کو کیوں تلاش کرتا ہے خبردار اس جنجال میں مت پڑ۔ یہ باتیں سن کر وہ گالیاں دیتا چلا گیا۔ ایک روز مفتی صدر الدین صاحب صدر الصدور بمع شاہ صاحب کے پاس تشریف لائے مفتی صاحب کی عادت تھی کہ ہر وقت تسبیح پر نفی اثبات کا ورد رکھتے تھے۔ حسب عادت یہاں بھی تسبیح پڑھتے رہے شاہ صاحب نے کہا مفتی صاحب کیا اب تک آپ کا شک رفع نہیں ہوا؟ مفتی صاحب نے سکوت کیا کئی بار پوچھا کچھ جواب نہ دیا جب مفتی صاحب تشریف لے گئے تو ہم نے کہا کہ میاں صاحب آپ نے کیا عجب سوال کیا تھا وہ عالم متبحر تھے اگر چاہتے تو ہزار طرح سے جواب دیتے مگر وہ اپنی کسر شان سمجھے ورنہ شاید ان کی بحث تنگ نہ تھا۔ ان کی پختگی تو دیکھو آپ نے بہت ہی سر مارا لیکن انھوں نے اپنی عادت کو ترک نہ کیا۔ اب میں ان کی طرف سے جواب دیتا ہوں یہ تو فرمائیے کہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ نماز میں اھدنا الصراط المستقیم کیوں پڑھتے تھے اور ہر نماز کے بعد تین بار استغفار کس واسطے کہا کرتے تھے کیا حضرت کو کچھ شک تھا؟ شاہ صاحب نے جواب دیا کہ حضرت کو شک نہ تھا بلکہ مراتب اعلیٰ کی ترقی کے لیے طلب ہدایت تھی اور مراتب حاصل شدہ کی نسبت استغفار۔ ہم نے کہا کہ یہی مقصد ہمارا بھی ہے اگر ہم نے رسول خدا کی متابعت کی تو کیا قباحت لازم آئی۔ خدا کی کوئی حد نہ اس کی طلب کی کچھ انتہا۔

غدر ۱۸۵۷ء

ہم رامپور سے چل کر میرٹھ آئے اور چند روز ٹھہرے یہاں ایک مجذوب شتر خانے کے قریب رہتے تھے ہم بھی ان کے پاس جایا کرتے تھے ایک دن گوروں کا رسالہ ادھر سے گزرا ایک افسر ان میں سے جدا ہو کر میاں صاحب کے پاس آیا اور گلے لگ کر رونے لگا پھر دو چار باتیں کر کے چل دیا ہم نے پوچھا کہ میاں صاحب یہ کیوں روتا تھا اور آپ سے کیا کہتا تھا۔ فرمایا کہ یہ بھی خدا تعالیٰ کا ایک بھید ہے ہم نے کہا کہ یہ تو ہم خود بھی جانتے ہیں کہ بھید ہے لیکن آپ بتلائیے کہ وہ بھید کیا ہے کہنے لگے کہ یہ افسر کہتا تھا کہ اس رسالے کے قتل کا حکم ہوا ہے ہم میں سے بہت لوگ مارے جائیں گے اور بہت کشت و خون ہوگا آپ دعا کریں۔ میں نے کہا قطعی حکم ہو چکا ہے اب دم مارنے کی جگہ نہیں راضی برضا رہو اس وقت تک بالکل امن و امان تھا چند روز بعد ہم وہاں سے باہر چلے گئے اس سے ایک مہینے بعد یکایک غدر شروع ہو گیا۔

جب کسی قدر غدر فرو ہوا اور مجرموں کو انگریزوں نے پھانسی دینی شروع کی ہم کو بھی ایک انگریز نے جو تحقیقات کرتا تھا بمقام شاملی طلب کیا اور پوچھا کہ جب یہاں لڑائی ہوئی اور تحصیل و تھانہ پر لوگوں نے یورش کی تو تم کہاں تھے؟ ہم نے کہا کہ صاحب ہم تو ہابڑی میں تھے اور وہاں دنوں میں ہم کو بخار آتا تھا۔ بولا کہ تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟ ہم نے کہا کہ صاحب گھبرانے کی بات یہ ہے کہ آپ حاکم ہیں آپ نے بلایا ہم فوراً دوڑے چلے آئے اب تک کھانا بھی نہیں کھایا دوسرے یہ اندیشہ ہے کہ دیکھیے آپ کیا حکم دیں۔ بولا کہ سنو صاحب ہم ظلم نہیں کرتا اور خواہ مخواہ کسی کو نہیں ستاتا جس کی نسبت تمہارے بھائی بند قسم کھا کر گواہی دیتے ہیں کہ یہ مجرم ہے اسی کو ہم سزا دیتا ہے اس میں ہمارا کچھ قصور نہیں اگر جھوٹ بولا تو یہ عذاب ان کے سر پر ہوگا۔ پھر اپنے خانساماں کو بلا کر کہا کہ ان کو کھانا کھلاؤ وہ ہم کو اپنے پاس لے گیا۔ اتفاق سے اس دن صاحب کا بچہ نہایت بیچین ہو رہا تھا ہر دم روتا تھا زبان تالو سے نہیں لگتی تھی کسی شخص نے صاحب سے کہہ دیا کہ جس کو آپ نے باہر سے بلایا ہے وہ بہت بزرگ آدمی ہے اس بچے پر دعا پڑھ دے گا تو یقین ہے کہ اس کو جلد آرام ہو جائے گا۔ اس نے آیا کے ہاتھ بچے کو ہمارے پاس بھیجا ہم نے کچھ پڑھ کر دم کر دیا۔ خدا کی قدرت بچہ اسی دم چپ ہو گیا۔ صاحب اور میم دونوں اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ پھر ہم کو بلا کر کہا کہ آپ کو اختیار ہے جہاں چاہو چلے جاؤ کوئی مزاحم نہیں ہم وہاں سے رخصت ہو کر واپس آئے اور بعد چندے سونی پت چلے گئے۔ میر اعظم علی شاہ صاحب قبلہ کے مزار پر چھ مہینے تک قیام کیا۔ وہاں مولوی محب اللہ صاحب پانی پتی سے ملاقات ہوئی ہم نے کہا کہ مولوی صاحب کسی کامل فقیر کی خبر دو۔ انھوں نے کہا کشمیر میں سید احمد شاہ صاحب نہایت کامل و آزاد ہیں اور منشی دولت رام میرا بھی جانے کا ارادہ ہے اگر آپ کا عزم ہو تو باتفاق چلے چلیں ہم نے کہا کہ پہلے اپنے حال کا ایک عریضہ لکھ کر ہم آپ کو دیتے ہیں جو کچھ اس کا جواب آئے گا اس پر عمل کیا جائے گا۔ چنانچہ مولوی صاحب عریضہ لے گئے جس کا جواب شاہ صاحب نے یوں تحریر فرمایا کہ میں تو اس قابل نہیں ہوں اگر آپ تشریف لائیں تو شاید آپ کی ذات سے مجھ کو کچھ فائدہ ہو جائے۔

اس کے بعد ہم نے مصمم ارادہ کر لیا کہ پچیس روپے جمع ہو جاویں تو چل دیں مگر یہ کیوں کر ہوتا ہے

قرار در کف آزادگاں نگیرد مال
نہ صبر در دل عاشق نہ آب در غربال

ایک مدت کے بعد کچھ روپیہ جمع ہوا تو قصد کشمیر کیا۔ سونی پت سے چل کر بستم شعبان ۱۲۷۶ھ کو پانی پت پہنچے تو دس دن ماہ صیام میں باقی تھے دل میں آیا کہ یہ ایام یہیں بسر کریں۔ رمضان شریف کی پانچویں تاریخ تھی کہ مولوی محب اللہ صاحب اور منشی فضل رسول صاحب کا خط آیا کہ سید احمد شاہ صاحب اس جہان فانی سے رخصت ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ یہ خبر سن کر ہم نے ارادہ ملتوی کیا اور قلندر صاحب کے حجرے میں رہنے لگے۔ مشیت ایزدی یہی تھی کہ پانی پت میں قیام ہو۔ (۲۰ مارچ ۱۸۸۹ء کو مرد میدان تجرید شہنشاہ ممالک توحید سلطان جہان تفرید نے نہایت الوصال کا پردہ درمیان سے اٹھایا)

سر سید احمد خاں

تاب یک جلوہ نیاورد نہ موسیٰ و نہ طور
ایں دلم ہست کہ زیں گونہ ہزاراں دیدست

میرا خاندان

سید متقی خاں ابن سید ہادی جواد الدولہ جواد علی خاں راقم کے والد اور خواجہ فرید الدین احمد کے داماد کو دربار شاہی میں پشتینی عروج تھا۔ اور اکبر شاہ سے ان کو زمانہ شاہزادگی سے بہت زیادہ راہ و رسم تھی اور بادشاہ کبھی کبھی ان کو بھائی متقی کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ سید ہادی فارسی شعر کہتے تھے اور ان کا دیوان ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا میرے پاس موجود تھا جو غدر کے زمانے میں تلف ہو گیا۔ بارہا میں اپنے والد کے ساتھ اور تنہا بھی بادشاہ کے خاص دربار میں گیا ہوں۔

اکبر شاہ نے سید محمد متقی سے چاہا کہ وہ انتظام امور بادشاہت اپنے ہاتھ میں لیں اور خرابیوں کا انتظام کریں۔ سید متقی نے اس سے عذر کیا مگر اپنے خسر خواجہ فرید الدین احمد کا اور ان کی سفارت ایران اور اس کی کامیابی کا ذکر کیا اور یہ صلاح دی کہ ان کو بلا کر وزیر مقرر کیا جائے تو غالباً سب امور کا انتظام ہو جائے۔ اکبر شاہ نے اس صلاح کو پسند کیا اور خواجہ فرید کو کلکتہ سے بلانے کا حکم دیا اور وہ کلکتہ سے اسی سال یعنی ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۵ء کو دلی میں آئے۔ بادشاہ کی ملازمت کی۔ اکبر شاہ نے ان کو وزیر مقرر کیا، خلعت وزارت اور خطاب دبیر الدولہ امین الملک مصلح جنگ کا عطا کیا۔ انھوں نے کئی لاکھ روپیہ قرض شاہی ادا کیا۔ ان انتظاموں سے آمدنی اور خرچ برابر ہو گیا اور تنخواہیں ماہوار ملنے کا انتظام ہو گیا۔ مگر شاہزادے اور بیگمات اور درباری سب اس بات سے کہ ان کی تنخواہیں کم ہو گئی تھیں نہایت ناراض تھے۔ رفتہ رفتہ ان شکایتوں کا اثر بادشاہ پر بھی ہوا اور دبیر الدولہ نے جو عہدۂ وزارت کو اپنے ہاتھ میں نہ رکھ سکتے تھے استعفا دے دیا اور چند روز بعد پھر کلکتہ کو چلے گئے۔

ان واقعات کے چند روز بعد بادشاہ نے پھر اضافہ پنشن کی تحریک کرنی چاہی اور اس باب میں ایک مراسلہ بنام گورنر جنرل تیار کیا گیا جس میں زیادہ تر شکایت اس بات کی کی تھی کہ آمدنی واسطے اخراجات ضروری کے کافی نہیں ہے۔ سید محمد متقی خاں نے موقع پا کر بادشاہ سے عرض کیا کہ دبیر الدولہ کلکتہ میں موجود ہے اور آمدنی اور اخراجات کا حال اُن کو معلوم ہے۔ اگر گورنر جنرل ان سے دریافت کرے تو کچھ اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ آمدنی اور خرچ برابر ہے۔ بادشاہ کے دل میں اس بات نے جگہ کی اور کہا تم ٹھیک کہتے ہو مگر اس کی تدبیر کیا ہے۔ سید محمد متقی خاں نے عرض کیا کہ خواجہ فرید کا علیحدہ کر دینا مصلحت نہیں تھا۔ اگر اس میں کچھ سعی و کوشش ہو سکے گی تو دبیر الدولہ ہی کی تدبیر و کوشش سے ہو سکے گی۔ بادشاہ نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد اس بات کو پسند کیا اور دبیر الدولہ کے کلکتہ سے بلانے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ کلکتہ سے آئے اور دوبارہ ۱۲۳۴ھ مطابق ۱۸۱۹ء تک بدستور اپنے عہدۂ سابق پر مامور ہوئے۔ چنانچہ دبیر الدولہ نے درحقیقت پنشن کے اضافہ کی کوشش نہیں کی۔ ۱۲۳۵ھ مطابق ۱۸۱۹ء کے دبیر الدولہ

نے استعفا دے دیا۔

وزارت سے استعفا دینے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے معتمد اور تیس ہزار روپیہ بطور سفر خرچ دبیر الدولہ کے پاس بھیجا اور لاہور بلایا۔ سب لوگوں کی خواہش تھی کہ وہ منظور کر لیں۔ مگر ان کی بڑی بیٹی یعنی والدہ راقم نے کہا کہ خدا نے آپ کو اس قدر دیا ہے کہ جس طرح پر چاہیں آپ آرام کیجیے اور اگر اس سے کچھ اور زیادہ ہو جائے تو بھی جو آرام و آسایش آپ کو اب ہے اس میں کچھ زیادتی نہیں ہو سکتی۔ خود لاہور جانا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سلطنت کے اختیارات لینا اور ہم سب کو انگریزوں کی عملداری میں دینا اچھا نہیں ہے۔ معلوم نہیں کیا اتفاقات پیش آئیں اور کیا انقلابات ہوں اور کس قسم کی مشکلات پیش آئیں۔ پس اس زمانہ ضعیفی میں کہ آپ کی طبیعت بھی علیل رہتی ہے وہاں جانا میں پسند نہیں کرتی۔ دبیر الدولہ کے دل پر اس بات نے ایسا اثر کیا کہ جانے سے انکار کر دیا اور سفر خرچ واپس کیا۔

نواب دبیر الدولہ درحقیقت حکیم مشرب یا صوفی مذہب تھے۔ منگا شاہ کے جو رسول شاہ کے ایک ممتاز چیلے تھے مرید تھے۔ دو برس قبل اپنی وفات کے ان کو خیال ہوا کہ ایک دفعہ تو اپنے مرشد کے طریقے میں پورے طور پر داخل ہونا چاہیے۔ حجام جو حاضر ہوا، اس سے کہا ڈاڑھی مونچھ کا صفایا کر دے۔ اس نے اس نورانی اور نہایت خوبصورت ڈاڑھی اور مونچھوں کو مونڈ دیا۔ شہر میں اس کا بڑا چرچا ہوا۔ ایک دفعہ کے سوا پھر ڈاڑھی مونچھ کا قطعاً صفایا نہیں کیا

خواجہ فرید الدین احمد کی شادی غالباً [illegible] مطابق [illegible] میں خواجہ محمد مراد احراری کی بیٹی سے ہوئی۔ خواجہ محمد مراد احراری نقیب الاولیا کے عہدہ پر مامور تھے۔ خواجہ فرید کی ایک ہی بیوی تھی اور ان سے پانچ اولادیں پیدا ہوئی تھیں۔ دو بیٹے اور تین بیٹیاں اور یہ اولادیں تین برس کے فاصلے سے غالباً [illegible] مطابق [illegible] کے پیدا ہو چکی تھیں۔ بڑے لڑکے کا نام خواجہ وحید الدین احمد اور چھوٹے کا نام خواجہ زین العابدین خاں تھا۔ بیٹیاں ایک عزیز النساء بیگم والدہ راقم کی، دوسری فاطمہ بیگم اور تیسری فخر النساء بیگم۔ خواجہ فرید نے ۷ محرم [illegible] مطابق [illegible] کے انتقال کیا۔

ابتدائی تعلیم

مجھ کو اپنی بسم اللہ کی تقریب بخوبی یاد ہے۔ سہ پہر کا وقت تھا اور آدمی کثرت سے جمع تھے۔ حضرت شاہ غلام علی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ مجھ کو لا کر حضرت کے سامنے بٹھا دیا تھا۔ میں اس مجمع کو دیکھ کر ہکا بکا سا ہو گیا۔ میرے سامنے تختی رکھی گئی اور غالباً شاہ صاحب ہی نے فرمایا کہ کہو: بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ مگر میں کچھ نہ بولا۔ اور حضرت صاحب کی طرف دیکھتا رہا۔ انھوں نے اٹھا کر مجھے اپنی گود میں بٹھا لیا اور فرمایا کہ ہمارے پاس بیٹھ کر پڑھیں گے۔ اور بسم اللہ پڑھ کر اقرا کی اول کی آیتیں مالم یعلم تک پڑھیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ پڑھتا گیا۔ شاہ صاحب اپنی خانقاہ سے کبھی نہیں اٹھتے تھے اور کسی کے ہاں نہیں جاتے تھے۔ الا ماشاء اللہ۔ صرف میرے والد پر جو نہایت درجہ کی شفقت تھی، اس لیے کبھی کبھی ہمارے گھر قدم رنجہ فرماتے تھے۔

میرا قرآن ختم ہونے پر ہدیہ کی مجلس جو زنانہ میں ہوئی تھی وہ اس قدر دلچسپ اور عجیب تھی کہ پھر کسی ایسی مجلس میں وہ کیفیت میں نے نہیں دیکھی۔

عزیز النساء بیگم نہایت لائق ذہین قدرتی نہایت عالی دماغ تھیں۔ وہ صرف قرآن مجید پڑھی ہوئی تھیں اور کسی زمانہ میں فارسی کی بھی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں۔ میں نے خود گلستان کے چند سبق ان سے پڑھے ہیں اور اکثر ابتدائی کتابوں کے سبق ان کو سنائے ہیں مجھ کو خوب یاد ہے

کو جب میں سبق سنا آتا تو سبق کا سنانا ان کے پاس بیٹھ کر دیکھتا تو وہ سوت کی گندھی ہوئی تین لڑیں ایک کھونٹی میں بندھی ہوئی میری تنبیہ کو اپنے پاس رکھ لیتی تھیں۔ اگرچہ وہ خفا تو کئی دفعہ ہوئی ہوں گی مگر ان سوت کی لڑوں سے مجھے کبھی مار نہیں پڑی۔

ان کی تعلیم اور ان کی نصیحتیں نہایت ہی طفلانہ اور دلوں پر اثر کرنے والی تھیں مجھ کو یاد ہے کہ ایک شخص نے جس کے ساتھ میں نے نیکی کی تھی، میرے ساتھ نہایت بدی کی اور تمام وجہ ثبوت جس سے اس کو کوئی عدالت سے کافی سزا مل سکتی تھی میرے ہاتھ آگئی۔ میرے نفس نے مجھ کو بھڑکایا اور انتقام لینے پر آمادہ کیا۔ میری والدہ مرحومہ نے یہ خبر سن کر مجھ سے کہا کہ اگر تم اس کو معاف کر دو تو اس سے عمدہ کوئی بات نہیں ہے۔ اگر تم کو اس کی بدی کی مکافات سزا دوانی ہے تو نہایت نادانی ہے کہ اس قوی اور زبردست حاکم احکم الحاکمین کے چنگل سے جو ہر ایک کے اعمال کی سزا دینے والا ہے اپنے دشمن کو چھڑا کر ضعیف اور عاجز دنیا کے حاکموں کے ہاتھ ڈالنا چاہو۔ پس اگر دشمنی اور انتقام ہی منظور ہے تو قوی حاکم کے ہاتھ میں اس کو رہنے دو۔ اس نصیحت کا میرے دل پر ایسا اثر ہوا کہ کبھی دور نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔ اور جب سے میرے دل میں کسی شخص سے گو اس نے میرے ساتھ کیسی ہی دشمنی کی ہو، انتقام لینے کا خیال تک نہیں آیا بلکہ ان کی نصیحت پر غور کرنے سے میرے دل میں یہ بات پیدا ہو گئی ہے کہ اب میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آخرت میں خدا بھی اس سے بدلہ لے۔

جس زمانے میں میری عمر گیارہ بارہ برس کی تھی، میں نے ایک نوکر کو جو بہت پرانا اور بڈھا تھا کسی بات پر تھپڑ مارا۔ جس وقت میری والدہ کو خبر ہوئی اور تھوڑی دیر کے بعد میں گھر میں گیا، تو میری والدہ نے ناراض ہو کر کہا کہ ”اس کو گھر سے نکال دو، جہاں اس کا دل چاہے چلا جائے۔ یہ گھر میں رہنے کے لائق نہیں رہا۔“ چنانچہ ایک ماما میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور باہر سڑک پر چھوڑ دیا۔ اسی وقت ایک ماما دوسرے گھر سے یعنی میری خالہ کے گھر سے جو قریب تھا نکلی اور مجھ کو میری خالہ کے گھر میں لے گئی۔ میری خالہ نے کہا کہ ”دیکھو تمھاری والدہ تم سے کس قدر ناراض اور خفا ہیں اور اس سبب سے جو تم کو گھر میں رکھے گا، اس سے بھی خفا ہوں گی۔ مگر میں تم کو چھپا رکھتی ہوں“ اور کوٹھے پر کے ایک مکان میں مجھ کو چھپا دیا۔ تین دن تک میں اس کوٹھے پر چھپا رہا۔ میری خالہ میرے سامنے نوکروں اور میری بہنوں کو کہتی تھیں کہ ”دیکھنا آپا جی یعنی میری والدہ کو خبر نہ ہو کہ یہاں چھپے ہوئے ہیں“ تین دن بعد میری خالہ جن کو میں آپا کہا کرتا تھا میری والدہ کے پاس قصور معاف کرانے کے واسطے گئیں۔ اُنھوں نے کہا کہ ”اگر اس نوکر سے قصور معاف کرائے تو میں معاف کر دوں گی۔“ وہ نوکر ڈیوڑھی پر بلایا گیا۔ میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے تب تقصیر معاف ہوئی۔ بے شبہ ایک اچھی ماں ہزار استادوں سے بہتر ہے۔

ان کی چند خاص عادتوں میں سے ایک یہ امر تھا کہ لاوارث بڑھیا عورتوں کی ہمیشہ خبرگیری کرتی تھیں ایک لاوارث بڑھیا زیبا تھی۔ اتفاق سے ایک زمانہ میں میری والدہ بھی بیمار ہوئیں اور زیبا بھی۔ بیماری قریب قریب ایک سی تھی جو دوا ان کے لیے تیار ہوتی تھی اُسی میں سے زیبا کو پلاتی تھیں۔ دونوں کو صحت ہو گئی۔ حکیم صاحب نے میری والدہ کے لیے ایک نسخہ معجون کا جو قیمتی تھا، تجویز کیا۔ میں اس کو بنوا کر گھر گیا۔ اُنھوں نے اس کو لے لیا اور خفیہ زیبا کو کھلایا اور اس معجون سے زیبا کی صحت میں بہت ترقی ہوئی اس کے ساتھ ان کی صحت میں بھی زیادہ ترقی ہو گئی۔

ان کا دستور تھا کہ جو کچھ گھر میں آتا، روپیہ پیسہ گاؤں کا یا کھیتوں کا غلہ، مکانوں کا کرایہ، تنخواہ، قلعہ کی یا باغوں کا میوہ سب میں سے بحساب دہ یک خدا کے نام پر علیحدہ کر دیتی تھیں۔ ان کے پاس ایک مستقل سرمایہ جمع ہو جاتا تھا اور اس میں سے غریب پردہ نشین عورتوں کی جو معاش سے تنگ ہوتیں امداد کرتیں۔

میرے ننھیال کو شاہ عبدالعزیز سے اور ان کے خاندان سے عقیدت تھی مگر میری والدہ کو حضرت شاہ غلام علیؒ سے بیعت و عقیدت تھی۔ ان کے ہاں گنڈے تعویذ کا چرچا بھی نہ تھا۔ شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان کے بزرگ لڑکوں کو بعض بیماریوں سے محفوظ رہنے کے لیے ایک گنڈا دیا کرتے تھے جس میں ایک تعویذ ہوتا تھا اور اس تعویذ میں ایک حرف یا چند حرف سفید مرغ کو ذبح کر کے اس کے خون سے لکھا جاتا تھا۔ اور جس لڑکے کو پہنایا جاتا تھا بارہ برس کی عمر تک انڈا یا مرغ کھانے کا اس کو امتناع ہوتا تھا۔

سید حامد اور سید محمود میرے دونوں بیٹوں کو بھی ان کی ننھیال والوں نے وہ گنڈا پہنایا۔ مگر میری والدہ کو یہ خیال تھا کہ اس گنڈے کے سبب سے انڈا یا مرغ نہ کھانا اور یہ سمجھنا کہ اگر کھائیں گے تو کوئی آفت آئے گی خدا پر ایمان رکھنے کے خلاف ہے۔ وہ ان دونوں لڑکوں کو جب کبھی وہ ان کے ساتھ کھاتے اور کوئی ایسی چیز بھی موجود ہوتی تھی جس میں انڈا پڑا ہو یا مرغ کا سالن یا مرغ پلاؤ ہوتا تو بے تامل ان کو کھلا دیتیں۔ وہ لڑکے مرغے اور انڈے بہت پسند کرتے تھے۔

میں دلی میں منصف تھا تو میری والدہ مجھ کو نصیحت کرتی تھیں کہ "جہاں جہاں تم جانا لازمی سمجھتے ہو اور ہر حالت میں تم کو وہاں جانا لازمی ہو گا تو کبھی سواری پر جایا کرو کبھی پیادہ پا۔ زمانے کا کچھ اعتبار نہیں ہے کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ پس ایسی عادت رکھو کہ ہر حالت میں اس کو نباہ سکو۔" چنانچہ میں نے جامع مسجد اور حضرت شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ میں جانے کا یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ کہ اکثر دونوں جگہ پیدل جاتا تھا اور کبھی سواری پر۔

میرے بھائی سید محمد خاں اور حکیم غلام نجف صاحب سے بہت دوستی تھی میں بھی ان کو اپنے بڑے بھائی کے برابر سمجھتا تھا۔ سید محمد خاں کے انتقال کے بعد جب میں دہلی میں منصف ہو کر آیا میں اسی طرح حکیم غلام نجف صاحب سے ملتا تھا اتفاقاً حکیم غلام نجف صاحب کچھ بددماغ ہو گئے۔ میں بدستور ان کے پاس جاتا رہا۔ مگر انھوں نے آنا چھوڑ دیا۔ آخر کو میں نے بھی اُن کے ہاں جانا بہت کم کر دیا۔ ایک دفعہ میری والدہ نے مجھ سے کہا کہ میں سمجھتی ہوں کہ اب حکیم غلام نجف کے پاس بہت کم جاتے ہو، اس کا کیا سبب ہے؟ میں نے جو بات تھی وہ کہی۔ انھوں نے کہا "نہایت افسوس ہے کہ جس بات کو تم اچھا نہیں سمجھتے، وہی بات تم بھی کرتے ہو۔ تم کو بدستور ملنا اور اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ اس سے تم کو کیا کہ دوسروں کو اپنا فرض ادا کرنا ہے یا نہیں۔"

اس زمانہ میں کہ میرے خیالات مذہبی محققانہ اصول پر ہیں اس وقت بھی میں اپنی والدہ کے عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ جس پر کسی قسم کے شرک یا بدعت کا اطلاق ہو سکے نہیں پاتا بجز ایک عقیدہ کے کہ وہ سمجھتی تھیں کہ عبادت بدنی یعنی قرآن مجید پڑھ کر بخشنے کا یا کھانا پکوا کر تقسیم کرنے کا ثواب مردے کو پہنچتا ہے۔ میں ان دونوں باتوں کا قائل نہیں ہوں عبادت بدنی میں تو میں نیابت کا قائل نہیں ہوں اور عبادت مالی میں بھی بجز اس صورت کے کہ متوفی اپنی زندگی میں کچھ مال کسی کار خیر کے لیے کسی کے سپرد کر جاوے نیابت کا قائل نہیں ہوں۔ تعجب ہے کہ میرا عقیدہ اس نکتے کے وہابیوں یا اہلِ حدیث سے بھی زیادہ سخت ہے۔ کیونکہ وہ عبادت بدنی کے ثواب پہنچنے میں مختلف ہیں۔ مگر ہر حالت میں عبادت مالی کے ثواب پہنچنے میں سب کو اتفاق ہے۔

ایک امر جو نہایت صبر و استقلال کا ان سے ظہور میں آیا وہ نہایت ہی عجیب ہے۔ سید محمد خاں ان کے بڑے بیٹے نے سینتیس اڑتیس برس کی عمر میں انتقال کیا سب لوگ گریہ وزاری کرنے لگے جو رنج و غم ان کو ہوا ہو گا ظاہر ہے۔ بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو نکلتے تھے۔ لیکن اس حالت میں انھوں نے کہا کہ "خدا کی مرضی" اور وضو کر کے صبح کی نماز پڑھنے لگیں اور اشراق تک مصلے پر سے نہیں اٹھیں۔ میں اس زمانہ میں فتح پور سیکری میں منصف تھا اس واقعہ کے بعد میں نے دلی میں اپنی تبدیلی کرائی۔

اتفاق سے بعض رشتہ داروں کی ایک بیٹی دختر کی شادی اسی زمانہ میں قرار پا چکی تھی اور صرف چار دن شادی کے باقی رہے تھے، سید محمد خاں کا انتقال ہو گیا۔ ان لوگوں نے شادی ملتوی کرنا چاہا۔ میری والدہ تیسرے دن رشتہ دار کے گھر میں گئیں اور کہا کہ میں تمھاری بیٹی کی شادی میں آئی ہوں، تین دن سے زیادہ ماتم رکھنے کا حکم نہیں ہے۔ شادی ملتوی کرنے سے تمھارا بڑا نقصان ہوگا۔ شادی کی اجازت دیتی ہوں۔"

وہ مجھ کو نصیحت کرتی تھیں کہ اگر کسی نے ایک دفعہ تمھارے ساتھ نیکی کی ہو اور پھر برائی کرے یا دو دفعہ نیکی کی ہو اور دو دفعہ برائی کرے تو تم کو آزردہ نہ ہونا چاہیے کیوں کہ ایک یا دو دفعہ نیکی کرنے والا کیسی ہی برائی کرے اس کی نیکی کے احسان کو بھلایا نہیں جا سکتا۔"

اگر لوگ ان باتوں پر غور کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ میری والدہ کیسی عالی خیال اور نیک صفات اور عمدہ اخلاق و دانشمند اور دور اندیش فرشتہ صفت بی بی تھیں اور ایک ایسی ماں کا ایک بیٹے پر جس کی اُنھوں نے تربیت کی ہو کیا اثر پڑتا ہے۔

• بچپن

مجھے خوب یاد ہے کہ ہماری انّا ماں بی بی مرنے سے چند گھنٹے پہلے فالسہ کا شربت مجھ کو پلا رہی تھی۔ جب وہ مر گئی تو مجھے اس کے مرنے کا نہایت رنج ہوا۔ میری والدہ نے مجھے سمجھایا کہ وہ خدا کے پاس گئی ہے۔ بہت اچھے مکان میں رہتی ہے۔ بہت سے نوکر چاکر اس کی خدمت کرتے ہیں اور اس کی بہت آرام سے گذرتی ہے۔ تو کچھ رنج مت کرو۔ مجھ کو ان کے کہنے کا پورا یقین تھا کہ فی الواقع ویسا ہی ہے۔ مدت تک ہر جمعرات کو اس کی فاتحہ ہوا کرتی تھی اور کسی محتاج کو کھلا دیا جاتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ سب کھانا ماں بی بی کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اس نے مرتے وقت کہا تھا کہ میرا تمام زیور سید کا ہے۔ مگر میری والدہ اس کو خیرات میں دینا چاہتی تھیں۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ اگر تم کہو تو یہ گہنا ماں بی بی کے پاس بھیج دوں۔ میں نے کہا ہاں بھیج دو۔ والدہ نے وہ سب گہنا مختلف طرح سے خیرات میں دے دیا۔

کھیل میں جب کچھ جھگڑا ہو جاتا تو بیبیوں میں سے کوئی اس کا تصفیہ کر دیتا اور جس کی طرف سے "چنیہ" معلوم ہوتی اس کو برا جانتیں اور شرمندہ کرتیں کہ چنیہ کرنا بے ایمانی کی بات ہے۔ کبھی چنیہ مت کرو اور چنیہ جو کرے اس کو ہرگز اپنے ساتھ مت کھیلنے دو۔ باوجود اس قدر آزادی کے بچپن میں مجھے تنہا باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ جب میری والدہ نے اپنے رہنے سہنے کی جدا حویلی بنائی اور وہاں آرہیں تو باوجودیکہ اس حویلی میں اور نانا صاحب کی حویلی میں صرف ایک سڑک درمیان تھی، جب کبھی میں اُن کی حویلی میں جاتا تو ایک آدمی میرے ساتھ جاتا۔ اس لیے بچپن میں مجھے گھر سے باہر جانے اور عام صحبتوں میں بیٹھنے یا آوارہ پھرنے کا بالکل اتفاق نہیں ہوا۔

جنرل اکٹرلونی اور وزیر اعظم و میرے نانا خواجہ فرید الدین احمد میں بڑی دوستی تھی۔ ایک دن جنرل اکٹرلونی نانا سے ملنے آئے تھے۔ اتفاقاً میں کسی سبب سے وہاں گیا اور جنرل صاحب کو دیکھ کر واپس آنے لگا مگر انھوں نے بلا لیا۔ اور کچھ بات کی۔ میں نے جنرل سے، جو فل ڈریس اپنی پوشاک یا وردی پہنے ہوئے تھے پوچھا کہ "آپ نے ٹوپی میں پر کیوں لگائے ہیں اور کوٹ میں دہرے بٹن کیوں لگائے ہیں۔" جنرل اس سوال سے بہت خوش ہوئے اور مسکرا کر خاموش ہو رہے۔ اس وقت میری عمر پانچ یا چھ برس کی ہوگی۔

ایک بار میں نے اپنے ایک رشتہ دار بھائی کو جو استنجا کر رہا تھا، چپکے چپکے اس کے پیچھے جا کر چت کر دیا۔ اس کے سارے کپڑے خراب ہو گئے۔ وہ چھوٹے تو مجھے مارنے کو دوڑے اور کئی پتھر پھینکے۔ گھر میں جا چھپا۔ آخر سب عزیزوں نے بیچ بچاؤ کر کے صلح کرا دی۔ اسی طرح ایک بار میں شطرنج کھیلنے میں اپنے ایک رشتہ دار بھائی سے جو عمر میں مجھ سے بڑے تھے، اس کی ناک میں انگلی ڈال دی اور کئی دن بعد بھی ہمیشہ یوں ہی روٹھی جھڑائی رہتی تھی

کو آخر سب ایک ہو جاتے تھے۔

بخشی محمود خاں ایرانی نژاد تھے۔ اُن کی زبان سے ہندوستانی لفظوں کا جن میں ٹ اور ڈ ہوتی تلفظ نہیں ہو سکتا تھا۔ جب بخشی محمود خاں آتے تو اکثر ہم لڑکوں کو جو پوتے اور نواسے نواب وزیر الدولہ کے تھے اور مکتب میں پڑھتے تھے بلاتے اور ٹوپی ٹوپی کی شرط بد کر کسی فارسی لفظ کے تلفظ کی فرمائش کرتے جب وہ پوری طرح پر تلفظ ادا ہوتا تو اُس لڑکے کی ٹوپی لے لیتے۔ لڑکے بھی ان سے ہندوستانی لفظوں کی فرمائش کرتے، ٹ ڈ جیسے حروف ثقیل کا تلفظ ان سے نہیں ہو سکتا تھا۔ ہمیشہ ت یا د کہتے تھے۔ لڑکے شرط جیت جاتے اور ان کی ٹوپی لے لیتے اور جب تک وہ لڑکوں کی ٹوپیاں نہ دیتے لڑکے بھی ان کی ٹوپی نہ دیتے۔

تیراکی۔

میں نے اور بڑے بھائی نے اپنے والد سے تیرنا سیکھا تھا۔ ایک زمانہ تو وہ تھا کہ ایک طرف دلی کے مشہور تیراک مولوی علیم اللہ کا غول ہوتا تھا۔ جن میں مرزا مغل اور مرزا خضر بہت سربرآوردہ اور نامی تھے اور دوسری طرف ہمارے والد کے ساتھ سو سوا سو شاگردوں کا گروہ ہوتا تھا۔ یہ سب ایک ساتھ دریا میں اترتے تھے اور جمنا کے نیچے سے شیخ محمد کی باؤلی تک یہ سارا گروہ تیرتا جاتا تھا۔ پھر جب ہم دونوں بھائی تیرنا سیکھتے تھے اس زمانے میں بھی تیس چالیس آدمی والد کے ساتھ ہوتے تھے۔ انھیں دنوں میں نواب اکبر خاں اور چند اور رئیس زادے بھی تیرنا سیکھتے تھے۔ زینت المساجد کے پاس نواب احمد بخش خاں کے باغ کے نیچے جمنا بہتی تھی۔ وہاں سے تیرنا شروع ہوتا تھا۔ مغرب کے وقت سب تیراک زینت المساجد میں جمع ہو جاتے تھے۔ اور مغرب کی نماز جماعت سے پڑھ کر اپنے اپنے گھر چلے آتے تھے۔ میں ان جلسوں میں اکثر شریک ہوتا تھا۔

مجھے اپنے ماموں اور والد کے شوق کا وہ زمانہ جب کہ نہایت دھوم دھام سے تیراندازی ہوتی تھی یاد نہیں۔ مگر جب دوبارہ تیراندازی کا چرچا ہوا وہ بخوبی یاد ہے۔ اس زمانے میں دربار کا جانا موقوف ہو گیا تھا۔ ظہر کی نماز کے بعد تیراندازی شروع ہوتی تھی۔ نواب فتح اللہ بیگ خاں، نواب سید عظمت اللہ خاں، نواب ابراہیم علی خاں اور چند شاہزادے اور رئیس اور شوقین اس جلسے میں شریک ہوتے تھے۔ نواب شمس الدین خاں رئیس فیروز پور جھرکہ جب دلی میں ہوتے تھے تو وہ بھی آتے تھے میں نے بھی اسی زمانے میں تیراندازی سیکھی اور مجھ کو خاص مشق ہو گئی تھی مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دفعہ میرا نشانہ جو تودے میں نہایت صفائی اور خوبی سے جا کر بیٹھا تو والد بہت خوش ہوئے اور کہا "مچھلی کے جائے کو کون تیرنا سکھائے" زین العابدین خاں نے تیراندازی کا فن سید محمد حسنی خاں راقم کے والد سے جو اس فن میں بے نظیر تھے سیکھا تھا۔ ایک پیر مرد مسلمان ان کو تیراندازی کا بڑا شوق تھا۔ میر اللہ اللہ، ان کا نام پڑ گیا تھا کیونکہ وہ تیر لگاتے وقت اللہ اللہ کہا کرتے تھے۔ ایک ذی عزت ہندو مرصع ساز کو بھی تیراندازی کا بہت شوق تھا۔ وہ تیر لگاتے وقت "اللہ غنی" کہتا تھا۔ اس کا نام اللہ غنی ہی پڑ گیا۔

مرزا صاحب (حضرت میرزا مظہر جان جاناں) کے عرس میں شاہ صاحب (حضرت شاہ غلام علی نقشبندی) ایک روپیہ اُن کے مزار پر چڑھایا کرتے تھے اور اس روپے کے لینے کا حق میرے والد کے سوا اور کسی کو نہ تھا۔ ایک دفعہ عرس کی تاریخ سے کچھ پہلے ایک مرید نے شاہ صاحب سے اجازت لے لی کہ اب کی بار نذر کا روپیہ مجھے عنایت ہو۔ میرے والد کو بھی خبر ہو گئی۔ جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھانے کا ارادہ کیا تو والد نے عرض کی کہ حضرت میرے اور میری اولاد کے جیتے جی آپ نذر کا روپیہ لینے کی اوروں کو اجازت دیتے ہیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا نہیں نہیں تمہارے سوا کوئی نہیں لے سکتا۔ میں اس وقت صغیر سن تھا۔ جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھایا۔ والد نے مجھ سے کہا جاؤ روپیہ اٹھا لو۔ میں نے آگے

بڑھ کر روپیہ اٹھایا۔

شاہی خلعت

ایک بار خلعت ملنے کی تاریخ پر ایسا اتفاق ہوا کہ والد صاحب سویرے اٹھ کر چلے گئے اور میں بہت دن چڑھے اٹھا۔ ہر چند بہت جلد گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچا۔ مگر پھر بھی دیر ہو گئی۔ جب اول پردہ کے قریب پہنچا تو قاعدہ کے موافق اول دربار میں جا کر آداب بجالانے کا وقت نہیں رہا تھا۔ داروغہ نے کہا کہ میں اب خلعت پہن کر ایک ہی دفعہ دربار میں جاؤں۔ جب خلعت پہن کر میں نے دربار میں جانا چاہا تو دربار برخاست ہو چکا تھا۔ اور بادشاہ تخت سے اٹھ کر ہوادار پر سوار ہو چکے تھے۔ بادشاہ نے مجھے دیکھ کر والد سے جو اس وقت ہوادار کے پاس ہی تھے پوچھا کہ تمہارا بیٹا ہے۔ انھوں نے کہا "حضور کا خانہ زاد" بادشاہ چپکے ہو رہے۔ لوگوں نے جانا میں اب محل میں چلے جائیں گے۔ مگر تسبیح خانہ میں پہنچے تو وہاں ٹھہر گئے اور جواہر خانہ کے داروغہ کو کشتی جواہر حاضر کرنے کا حکم ہوا۔ میں بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ بادشاہ نے مجھے اپنے سامنے بلایا۔ اور کمال عنایت سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ "دیر کیوں کی؟" حاضرین نے کہا۔ عرض کرو کہ تقصیر ہوئی۔ مگر میں چپکا کھڑا رہا۔ جب حضور نے دوبارہ پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ سو گیا تھا۔ بادشاہ مسکرائے اور فرمایا بہت سویرے اٹھا کرو اور ہاتھ چھوڑ دیئے لوگوں نے کہا۔ آداب بجالاؤ۔ میں آداب بجا لایا۔ بادشاہ نے جواہر کی معمولی رقمیں اپنے ہاتھ سے پہنائیں میں نے نذر دی اور بادشاہ اٹھ کر خاص ڈیوڑھی سے محل میں چلے گئے۔ تمام درباری میرے والد کو بادشاہ کی اس عنایت پر مبارک سلامت کہنے لگے۔ اس زمانے میں میری عمر آٹھ برس کی ہوگی تقریباً انہی دنوں میں راجہ رام موہن رائے جو برہمو سماج کے بانی تھے ان کو اکبر بادشاہ نے کلکتہ سے بلایا تھا۔ تاکہ اضافہ پنشن بادشاہی کے لیے ان کو لندن بھیجا جائے۔ چنانچہ وہ بادشاہ کی طرف سے لندن بھیجے گئے اور ۱۸۳۱ء میں وہاں پہنچے۔ راقم نے راجہ رام موہن رائے کو متعدد دفعہ دربار شاہی میں دیکھا ہے۔ دلی کے لوگ یقین کرتے تھے کہ ان کا مذہب اسلام کی نسبت زیادہ میلان خاطر ہے۔

اس عمر میں گاؤں میں جا کر رہنا جنگل میں پھرنا۔ عمدہ دودھ اور دہی اور تازہ تازہ مکھن اور جاٹنیوں کے ہاتھ کی پکی ہوئی باجرے یا مکئی کی روٹیاں کھانا نہایت مزا دیتا تھا۔ وہ ایک عجیب قسم کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ کے شرفاء خاندانوں کے نوجوان جو کچھ کرتے تھے ایسی طرح پر کرتے تھے کہ کوئی اس سے واقف نہ ہوتا تھا۔ اور پردہ ڈھکا رہتا تھا۔ کوئی حرکت عام طور پر برملا ہونے نہیں پاتی تھی۔ اس زمانے کے شرفاء نوجوانوں کا عمل درآمد اس قول پر تھا کہ اپنے جسم کے زخم کو ڈھانکے رکھو تاکہ لوگ اسے دیکھ کر نفرت نہ کریں۔ یہ ایک ایسی اچھی نصیحت ہے کہ اگر انسان سے کوئی برائی ہو مگر اس برائی کا برا ہونا دل سے نہیں جاتا اور انسان کے لیے یہی رستہ برائی سے نکلنے کا ہے۔

زمانۂ شباب

دلّی کے پان کشی ایک معزز رئیس اور نہایت ہی وضعدار اور دولت مند تھے اور اسی زمانہ میں ایک طوائف جو نہایت خوش آواز اور دھرپت خیال گانے اور بین بجانے میں بے مثل تھی۔ اس کا نام دولہا تھا اور اس نے اپنا تمام پیشہ چھوڑ دیا تھا اور دلّی کے پان کشی کے گھر میں پڑ گئی تھی۔ اس کی خاطر سے وہ ہر مہینے کی سترھویں کو ایک جلسہ کیا کرتے تھے۔ شہر کے رئیس بڑے بڑے گویے اور بہادر خاں ستاریے جو ستار بجانے میں بے مثل تھا اور میر ناصر احمد جو بین بجانے میں اپنا مثل نہیں رکھتا ہے سب جمع ہوتے تھے۔

بی جان کے بیٹھنے کے لیے صدر کے مقابل بائیں سمت میں مسند تکیہ لگتا تھا۔ اور لوگ ان کے آنے کا انتظار کرتے تھے۔ جب وہ کوٹھے پر سے اُترتی

وہاں کے ناچ کے زیور کی آواز اور ناچ رنگ کے زیادہ مشتاق ہوتے تھے وہ نہایت متانت اور وقار سے اگر مسند پر بیٹھتی تھیں۔ اول دھرپت و خیال گاتی تھیں اور پھر بین بجاتی تھیں اور پھر ہاتھ کر کے مسند پر چلی جاتی تھیں۔ لوگ ان کے گانے بجانے کی نہایت تعریف کرتے تھے نواب زین العابدین خاں ہمیشہ اس جلسہ میں جاتے تھے راقم بھی متعدد دفعہ ان کے ساتھ ان جلسوں میں گیا ہے۔

اس زمانے کی بعض مجلسیں بھی قابل یادگار ہیں۔ خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کے جانشین ہر مہینے کی دوسری کو رات کے وقت ایک جلسہ درویشانہ کیا کرتے تھے۔ اس میں بڑے بڑے گویّے آتے تھے دھرپت و خیال گاتے تھے اور میر ناصر احمد بین بجاتے تھے۔ نواب زین العابدین خاں ہمیشہ جاتے تھے راقم بھی بہت دفعہ ان کے ساتھ ان جلسوں میں گیا ہے خواجہ محمد نصیر صاحب جو نہایت بزرگ و متقدس تھے اس زمانہ میں سجادہ نشین تھے۔

ہم اس رنگ میں مست تھے ایسی گہری نیند سوتے تھے کہ فرشتوں کے بھی اٹھائے نہ اٹھتے۔ کیا کیا خیالات ہماری قوم کے جی جو ہم میں نہ تھے اور کس کس کالی گھٹائیں ہماری قوم پر چھا رہی ہیں جو ہم پر چھائی ہوئی نہیں تھیں۔ جب رند تھے تو فرہاد سے بڑھ کر تھے جب زاہد خشک تھے تو زاہد اکبر تھے۔ جب صوفی تھے تو رومی سے بڑھ تھے اب خاکسار ہیں اور اپنی قوم کے غمخوار۔

ملازمت

جب میں دلی میں منصف تھا تو اپنی کل تنخواہ والدہ کو دیتا تھا۔ وہ اس میں صرف پانچ روپیہ مہینہ اوپر کے خرچ کے لیے مجھ کو دے دیتی تھیں باقی پیسے تمام اخراجات ان کے ذمہ تھے۔ جو کپڑا بنا دیتی تھیں پہن لیتا تھا اور جیسا کھانا وہ کھلاتی تھیں کھا لیتا تھا۔ میرے پدری اجداد نے سلطنت مغلیہ کی خدمات خصوصاً صیغہ فوج میں ذمہ داری کے معزز عہدوں پر وفاداری اور محبت سے خدمات کیں اور میں اپنے خاندان کا پہلا شخص ہوں کہ سب آرڈینیٹ جوڈیشل عہدہ پر برٹش سروس میں داخل ہوا۔

میں نے قانون کی تعمیل انصاف کے ساتھ بلا لحاظ کسی کے رتبہ اور قوم اور رنگ یا مذہب کے کی۔ مجھ کو تمام عمر اس بات کی فکر رہی کہ جو فرض مجھ کو تفویض ہوا ہے اس کو ایمانداری کے ساتھ انجام دوں۔ مجھ کو اس بات کے دیکھنے سے کچھ کم خوشی حاصل نہیں ہوئی کہ جو کوشش میں نے سب لوگوں کے حق میں انصاف کرنے میں کی تھی اس کی قدر شناسی میرے ہم وطنوں نے کی ہے۔

آثار الصنادید

مدت دراز سے یہ اندیشہ دامن گیر تھا کہ اگر حیلہ گری زمانہ کے پنجہ سے امن کے نجات حاصل ہو جائے اور کچھ مہلت ہاتھ آئے تو ایک ایسا نسخہ عجیبہ اور مجموعہ غریبہ لکھا جائے کہ عمارات عمدہ شاہجہاں آباد اور مکانات درون شہر اور قلعہ مبارک کا حال اس میں مندرج ہو اور اطوار و اوضاع ساکنین شہر کا احوال اس میں مندرج ہو اور بسبب کثرت مشاغل اور ہجوم عوائق کے یہ امر صورت پذیر نہ ہوتا تھا۔ الحمدللہ والمنہ کہ کارسازی لطف ایسی دستگیر ہوئی اور ملازم زمانی نے اعانت کی کہ یہ آرزو دیدۂ شوق میں جلوہ نما ہوئی۔ عرصہ دراز تک آرام کو آرام نہ سمجھا اور آسائش کو آسائش نہ جانا جب یہ شاہد جلوہ طراز جلوہ شیریں لباس عمر پردہ راز سے دلربا ہوا۔ قطب صاحب کی لاٹ کے بعض کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جا سکتے تھے ان کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوا لیا جاتا تھا۔ اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربہ اتارتا تھا۔ جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تو مولانا صہبائی فرط محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔ ناظرین انصاف کریں کہ مؤلف نے اس کی تالیف میں کیا دود چراغ کھایا اور کس قدر خون جگر پیا ہے۔

ایامِ غدر

غدر میں جو حال انگریزوں اور ان کے بچوں اور عورتوں پر گزرا اور جو حال ہماری قوم کا ہوا اور نامی نامی خاندان برباد و تباہ ہوئے ان دونوں واقعات کا ذکر دل کو شق کرنے والا ہے۔ غدر کے بعد نہ مجھ کو اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب تلف ہونے کا اور جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا۔ اور ہندوستانیوں کے ہاتھوں سے جو کچھ انگریزوں پر گزرا اس کا رنج تھا۔

میں بجنور میں تھا اور نواب محمود خاں سے کہتا، آپ اس ارادہ کو دل سے نکال ڈالیں۔ انگریزوں کی عمل داری ہرگز نہیں جانے کی۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ تمام ہندوستان سے انگریز چلے جائیں گے تو بھی انگریزوں کے سوا ہندوستان میں کوئی عمل داری نہ کر سکے گا۔ آپ سرکار کی اطاعت کو ہاتھ سے نہ دیں۔ اگر بالفرض انگریز جاتے رہے تو آپ نواب بنے بنائے ہیں۔ آپ کی نوابی کو کوئی نہیں چھینتا۔ آپ خیر خواہ بنے رہیں۔ مگر انہوں نے اس کو منظور نہیں کیا۔

جس زمانہ میں غدر ہوا میری والدہ اور گھر کے لوگ اور بچے اور سب عزیز و اقارب دہلی میں تھے اور میں بجنور میں صدر امین تھا۔ وہ (والدہ) زمانۂ غدر میں لوگوں سے کہتی تھیں کہ انگریز تھوڑے دنوں میں پھر آ جائیں گے، تم سب خاموش اپنے گھروں میں بیٹھے رہو۔ جو لوگ فساد میں شریک نہ ہوں گے، انگریز ان کو کچھ نہیں کہنے کے۔ ان کو یقین کامل تھا کہ انگریز بجز ان کے جنھوں نے فساد کیا ہے کسی کو کچھ تکلیف نہیں دینے کے۔ جب زمانۂ فتح دہلی قریب ہوا اور کشمیری دروازہ فتح ہو گیا، سب زن و مرد شہر سے باہر چلے گئے مگر وہ اور ان کی ایک بہن جو نابینا تھیں، اس یقین پر کہ انگریز بے گناہوں کو نہیں ستانے کے اپنے گھر سے نہیں گئیں۔ مگر افسوس کہ ان کا خیال غلط نکلا اور ایسی تکلیف پائی کہ اخیر عمر میں تکلیف پہنچی۔ جب دلی فتح ہوئی تو سپاہی گھروں میں گھس آئے، تمام گھر لوٹ لیا۔ وہ مع اپنی بہن کے حویلی کو چھوڑ کر اس کوٹھڑی میں چلی آئیں جس میں زیبا لاوارث بڑھیا رہتی تھی۔ آٹھ دس دن انھوں نے نہایت تکلیف سے بسر کیے۔ اس عرصہ میں، میں جو میرٹھ میں آ گیا تھا، میرٹھ سے دہلی پہنچا اور اپنی والدہ کے پاس گیا۔ اس وقت تین دن سے ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ گھوڑے کا دانہ مل گیا۔ اسی پر بسر تھی۔ دو دن سے پانی بھی ختم ہو چکا تھا۔ اور پانی کی نہایت تکلیف تھی۔ میں نے کوٹھڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز دی۔ انھوں نے دروازہ کھولا۔ پہلا فقرہ جو ان کی زبان سے نکلا یہ تھا کہ "بیٹا تم یہاں کیوں آ گئے یہاں تو لوگوں کو مارے ڈالتے ہیں۔ تم چلے جاؤ۔ ہم پر جو کچھ گزرے گی، گزرے گی۔" میں نے کہا "آپ خاطر جمع رکھیے مجھے کوئی نہیں مارے گا۔ میرے پاس سب حاکموں کی چٹھیاں ہیں اور میں ابھی قلعہ کے انگریزوں اور دہلی کے گورنر سے مل کر آیا ہوں۔" ان کی طمانیت ہوئی اور معلوم ہوا کہ دو دن سے پانی مطلق نہیں پیا ہے۔

میں پانی کی تلاش کو نکلا۔ پانی اس طرف کہیں نہیں ملا۔ ناچار قلعہ گیا اور ایک صراحی پانی کی لے کر چلا۔ جب اپنے گھر کے قریب کے بازار میں پہنچا تو دیکھا کہ وہی لاوارث بڑھیا سڑک پر بیٹھی ہے۔ پانی کی تلاش کو نکلی تھی۔ میں نے اس کے آبخورہ میں پانی دیا اور کہا پانی پی لے۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے آبخورہ کا پانی صراحی میں ڈالا اور کچھ گرا دیا اور گھر کی طرف اشارہ کیا۔ اور کچھ کہا جس کا مطلب یہ تھا کہ بیگم صاحبہ پیاسی ہیں۔ اس غرض سے پانی صراحی میں ڈالتی تھی۔ میں نے کہا "میرے پاس پانی بہت ہے تو پانی پی لے۔" اس نے پیا اور لیٹ گئی۔ میں جلدی جلدی گھر کی طرف آیا۔

اب میں گھر سے نکلا کہ کچھ سواری کا بندوبست کر کے ان کو میرٹھ لے جاؤں۔ جب اس مقام پر پہنچا جہاں بڑھیا بیٹھی تھی تو معلوم ہوا کہ وہ مر چکی ہے۔ سارے شہر میں باوجودیکہ حکام نے بھی احکام جاری کیے، لیکن کہیں سواری نہیں ملی۔ آخر کار حکام قلعہ نے اجازت دی کہ شکرم جو سرکاری

ڈاک میرٹھ کو جاتی ہے بھجوا دی جائے۔ میں وہ حکم لے کر گھر پر آیا اور اپنی والدہ اور خالہ کو اس میں بٹھا کر میرٹھ لے آیا۔

منشی الطاف حسین صاحب سررشتہ دار کلکٹری میرٹھ نے جو میرے ساتھ بچپن سے کھیلے ہوئے تھے اور ان کے خاندان اور میرے خاندان میں ارتباط قدیمی تھا میرے رہنے کو ایک مکان خالی کر دیا۔ میں ہمیشہ ان کے اس احسان کو یاد رکھتا ہوں۔

اس تکلیف سے میری والدہ کی طبیعت جادۂ اعتدال سے منحرف ہو گئی اور یکم ربیع الثانی ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷ء کو انھوں نے بمقام میرٹھ انتقال کیا۔ انھوں نے انتقال سے ایک روز پہلے صرف دو وصیتیں مجھ کو کیں۔ ایک یہ کہ ان کو نئی قبر میں جو مسنون ہے دفن کیا جائے۔ دوسری یہ بات کہی کہ ان کے ذمہ تو کوئی روزہ قضا کا ہے اور نہ کوئی نماز قضا کی ہے۔ صرف ان ہی دنوں کی نمازیں اگرچہ میں پڑھتی ہی ہوں لیکن اگر میں زندہ رہتی تو ان کی بھی قضا پڑھتی۔ میرے مرنے کے بعد نمازوں کا حساب کر کے کفارہ کے گیہوں غریبوں کو دے دینا۔ دوسرے دن انھوں نے قضا کی اور میں نے ان کی دونوں وصیتوں کو پورا کیا۔

جاگیر سے انکار

جب ہمارے مرحوم دوست مسٹر شیکسپیئر نے جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے، بعوض اس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپیہ سے زیادہ مالیت کا تھا مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق اس دنیا میں نہ ہوگا۔ کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔ میں نے اس کے لینے سے انکار کر دیا اور کہا میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے۔ اور درحقیقت یہ بالکل سچ بات تھی۔ میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور کچھ عزت پاوے گی اور جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز میں اسی خیال اور اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجیے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیئے۔ جب میں مرادآباد میں آیا جو ایک بڑا غم کدہ ہماری قوم کے رئیسوں کی بربادی کا تھا۔ اس غم کو کسی قدر اور ترقی ہوئی مگر یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں اس کی مصیبت میں شریک رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑے اس کے دور کرنے میں ہمت باندھنا قومی فرض ہے۔ میں نے ارادۂ ہجرت موقوف کیا اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔

اس وقت میرا مصمم ارادہ ہو گیا کہ جب کبھی موقع ملے۔ تمام ہندوستانی مسلمانوں سے چندہ لے کر کسی صدر مقام میں ایک بہت بڑا یتیم خانہ قائم کیا جائے جہاں ہندوستان کے لاوارث بچوں کی پرورش ہو اور ان کو تعلیم دی جائے۔ لیکن آخر کو یقین ہو گیا کہ جب تک ہندوستان میں تعلیم عام نہ ہو گی ان خرابیوں کا کلی انسداد کسی طرح نہیں ہو سکتا۔

لائل محمڈنز آف انڈیا

میں اس زمانہ میں دیکھتا تھا کہ مسلمانوں نے جو خیر خواہیاں کیں۔ ان کا ذکر اخباروں میں بہت کم چھپتا ہے اور بغاوت کی جو کتابیں چھپی ہیں۔ ان میں تو اس کا ذکر ہی نہیں۔ اس لیے میں نے ارادہ کیا کہ مسلمان خیر خواہوں کا تذکرہ رسالہ میں شروع کروں۔ میں نے چند رسالے لکھے۔ اور مشتہر کیے، جو لائل محمڈنز کے نام سے مشہور ہیں۔

رسالہ اسباب بغاوتِ ہند

مگر میں نے غور کیا کہ یہ سب فروعی باتیں ہیں۔ اصل سبب سوچنا چاہیے کہ قوم پر یہ مصیبت کیوں پڑی اور کیوں کر دور ہو سکتی ہے اس کا یہ جواب ملا کہ قوم میں تعلیم و تربیت نہیں تھی اور انگریزوں سے جن کو خدا نے ہم پر مسلط کر دیا ہے میل جول اور اتحاد نہ تھا اور باہم ان دونوں میں مذہبی اور رسمی منافرت بلکہ خس آب زیرہ کا عداوت کا ہونا تھا۔ میں نے یقین کیا کہ اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوتیں تو یہ غدر واقع نہ ہوتا۔ اگر ہوتا تو جو سخت مصیبت گورنمنٹ پر ملک پر ہماری قوم پر واقع ہوئی اس قدر نہ ہوتی تو میں نے رسالہ "اسباب بغاوت ہند" لکھا۔ غدر کے اصلی سببوں پر غور کرنا اور اپنی صداقت سے سچے سببوں کا بیان کرنا میں ایک عمدہ خیر خواہی اپنی گورنمنٹ کی سمجھتا ہوں۔ اس لیے مجھ پر واجب ہے کہ جو سبب میرے دل میں ہیں۔ ان کو بھی ظاہر کر دوں۔ سچ ہے کہ بہت بڑے بڑے واقف اور تجربہ کار لوگوں نے اس بغاوت کے سبب لکھے ہیں۔ مگر امید ہے کہ شاید کسی ہندوستانی آدمی نے اس میں کوئی بات نہ لکھی ہو بہتر ہے کہ ایسے شخص کی بھی ایک رائے رہے۔

مراد آباد میں اسکول کا قیام

پھر میں نے اپنے دل سے پوچھا کہ قوم اس زمانہ کی ضرورت کے موافق تعلیم دنیا اور یورپ کے علوم کا ان میں جاری رکھنا آیا درحقیقت اسلام کے برخلاف ہے۔ مجھے جواب ملا کہ نہیں۔ پھر میں نے سوچا کہ انگریزوں سے جو ہمارے حاکم ہیں اور عموماً عیسائیوں سے سچی دوستی اور بے ریا اتحاد اور دلی محبت کرنا اور دوستانہ میل جول اور دوستانہ معاشرت اور آپس میں ایک دوسرے کے ہمدرد ہونا کیا اسلام کے خلاف ہے؟ جواب ملا کہ نہیں پس انھیں دونوں امروں کو میں نے اختیار کیا۔ قومی بھلائی پر کمر باندھی ایک تعلیم دوسرا انگریزوں سے اتحاد و دوستی تو اول ۱۸۵۹ء میں میں نے ایک اسکول مراد آباد میں قائم کیا جہاں اس زمانے میں کسی قسم کے اسکول کا وجود نہ تھا۔ مگر مسٹر جان اسٹریچی کی مہربانی سے وہاں ایک اردو انگریزی اسکول قائم ہوا اور دونوں کو ملا

تبیین الکلام

دوم تفسیر بائبل مقدس کی لکھی کسی مسلمان نے آج تک بائبل مقدس کی تفسیر نہیں لکھی جو اس کلام کے لکھنے کا باعث ہوا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان عیسائی مذہب کی کتابوں کو ہمیشہ ایک بیکار اور جھوٹی اور جھوٹے قصوں کا مجموعہ سمجھتے اور یقین کرتے رہتے ہیں۔ یہ تفسیر جو انجیل کو بجائے خود سمجھنے کے جیسا کہ اب تک خیال تھا، واجب التعظیم بیان کرتی ہے، اور اس کا ثبوت خود قرآن سے دیتی ہے۔ اس کا ترجمہ مسلمانوں کی ہر زبان میں اور بالخصوص عربی میں ہو۔ کیونکہ مسلمانوں کے واسطے اس سے زیادہ مفید بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

رسالہ احکام طعام اہلِ کتاب

میں اس دن کے دیکھنے کا نہایت مشتاق ہوں جب یہ سنوں کہ سید احمد خان نے اپنے قول کے موافق عمل بھی کیا۔ میں اسلام کو ماں باپ کی تقلید سے نہیں بلکہ بقدر اپنی طاقت کے خود تحقیق کر کے تمام مذاہب معلومہ سے اعلیٰ عمدہ اور سچا یقین کیا ہے اس سچے مذہب نے مجھے سکھایا ہے کہ سچ کہنا اور سچ کرنا۔ میں کسی انگریز کے ساتھ کھانے پینے میں بشرطیکہ شراب اور سور یا کوئی اور حرام چیز نہ ہو، کچھ تامل نہیں کرتا۔

بجنور چھوٹنے کے بعد میں اور مسٹر پامر مجسٹریٹ ضلع بجنور نجیب آباد سے بجنور کو آتے تھے رستے میں ایک جگہ ہم دونوں اترے اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ مسٹر پامر نے مجھ سے پوچھا کہ چائے پیو گے۔ میں نے کہا۔ یہاں چائے کہاں۔ انھوں نے کہا، ہمارے ساتھ بنی ہوئی بوتل میں موجود ہے۔ میں نے کہا۔ بہت بہتر۔ غرضیکہ ہم نے چائے پی۔ اور ایک آدھ آدمی کو بھی پلا دی۔ وہاں سے چل کر نگینہ میں مقام ہوا۔ عصر کے وقت سب لوگ

جماعت سے نماز پڑھ رہے تھے۔ میں بھی جا کر جماعت میں شریک ہو گیا۔ نماز کے بعد لوگوں نے مولوی قادر علی تحصیلدار سے جو نماز میں شریک تھے۔ پوچھا کہ صاحب انہوں نے تو انگریز کے ہاں کی بنی ہوئی چائے پی ہے اور توس کھائے ہیں۔ یہ نماز میں کیوں کر شریک ہوئے۔ جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے ان کو سمجھایا کہ قرآن مجید کی رو سے انگریزوں کے ہاں کا کھانا اور ان کے ساتھ کھانا درست ہے۔ ان لوگوں نے میری اس روز کی تقریر کو نہایت تعجب سے سنا۔ پھر ایک روز بجنور میں رات کو مسٹر پامر کے یہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ کھانے پر جانے والے تھے۔ انھوں نے کہا کہ تم بھی کھانا یہیں کھاؤ اور خانساماں کو اشارہ کیا کہ میرے سامنے بھی رکابی لگا دے۔ خانساماں کو اس بات سے ایسا تعجب ہوا کہ کئی دفعہ اشارہ کرنے پر بھی نہ سمجھا کہ آج مسلمان انگریز کے ساتھ کھائے گا۔

مرزا غالب

جب میں مراد آباد میں تھا اس وقت مرزا اسد اللہ خاں غالب، نواب یوسف علی خاں مرحوم سے ملنے کو رامپور گئے تھے۔ ان کے جانے کی تو مجھے خبر نہیں ہوئی۔ مگر جب دلی کو واپس جاتے تھے تو میں نے سنا کہ وہ مراد آباد میں سرائے میں ٹھہرے ہیں۔ میں فوراً سرائے میں پہنچا اور مرزا صاحب کو مع اسباب اور تمام ہمراہیوں کے اپنے مکان میں لے آیا۔

قیام اسکول غازی پور

جب میں غازی پور گیا یہاں کے لوگوں کو اس بات کا خیال تھا کہ اس ضلع میں کوئی عمدہ وسیلہ تربیت کا قائم کیا جائے۔ بعض رئیسوں اور اہلکاران سرکار نے ماہوار چندہ مقرر کر کے ایک ماسٹر انگریزی پڑھانے کو اور ایک مولوی عربی پڑھانے کو نوکر رکھا تھا۔ ماہواری چندہ کا وصول کرنا اور اس کارخانہ کا جاری رہنا مشکل بلکہ غیر ممکن تھا۔ اس لیے دل میں خیال آیا کہ رئیسوں سے یکمشت چندہ جمع کر کے اس کے منافع سے ایسا مدرسہ قائم کیا جائے کہ جس میں عمدہ درجہ کی تعلیم انگریزی اور سنسکرت اور عربی، فارسی اور اردو کی ہو۔ اس ارادہ پر اکثر رئیس جمع ہو کر میرے پاس آئے اور مجھ سے یہ بات چاہی کہ اس امر عظیم کے انجام دینے میں، میں بھی شریک ہوں اور کوئی تدبیر بتاؤں کہ جو چندہ وہ جمع کریں اس سے کس طرح پر منافع حاصل کیا جائے اور طریقہ تعلیم اور قواعد انتظام مدرسہ کس طرح پر مقرر کیے جائیں۔ میں نے اپنے شمول سے صاف انکار کیا۔ لوگوں نے مکرر اور سہ مکرر اصرار کیا۔ میرا انکار اس وجہ سے تھا کہ میں اس ضلع میں ایک سرکاری عہدہ رکھتا ہوں۔ لیکن جب بہت سے لوگوں نے درخواست کی خیال کیا میں بھی ایک ہندوستانی باشندہ ہوں میرا فرض ہے کہ علیحدہ ہو کر سرکاری عہدہ سے اپنے ہم وطنوں کی بھلائی اور بہتری میں سعی کروں۔ اس اسکول کا فونڈیشن اسٹون میرے دوست راجہ دیو نرائن سنگھ بہادر اور جناب مولانا فصیح الدین صاحب کے ہاتھوں رکھا گیا یہ اسکول کامیابی سے چلتا ہے اور وکٹوریا اسکول کے نام سے موسوم ہے۔

سائنٹفک سوسائٹی

اسی زمانے میں میرے خیالات یہ تھے۔ کہ ہندوستان میں علم کے پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک مجلس مقرر کرنی چاہیے جو اپنے قدیم مصنفوں کی عمدہ کتابیں اور انگریزی کی مفید کتابیں، اردو میں ترجمہ کر کے چھاپے۔ بذریعہ ترجموں کے جو اردو زبان میں ہوں اپنی قوم کو اعلیٰ درجے کے یورپین علوم و فنون سے بہرہ یاب کر سکتے ہیں۔ اسی پر کوشش کی اور ۱۸۶۴ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس کی عالی شان عمارت علی گڑھ میں آپ دیکھتے ہیں بہت سی کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہوا اور اس کا ایک اخبار میرے اہتمام سے جاری ہوا۔

برٹش انڈین ایسوسی ایشن

جو انگریز ہندوستان میں رہتے ہیں انھوں نے اس بات کی ضرورت سمجھی کہ ایک نہایت عمدہ ایسوسی ایشن یعنی مجلس، بنایا کے ذریعے سے پارلیمنٹ میں اپنا تعلق پیدا کریں اور اس کے فیاض ممبروں کو اپنا حامی بنائیں۔ پس اگر ہم نے بھی اسی طرح پر اپنے لیے راہ نہ نکالی تو ہمیشہ کے لیے پچھتائیں گے چنانچہ ہم سب نے مل کر ایک ایسوسی ایشن بنانے کی تدبیر کی جو شمال و مغربی اضلاع کی ایسوسی ایشن کہلاتی ہے، اور اس ایسوسی ایشن کے ساتھ جو انگلستان میں قائم ہوئی ہے، اپنے مطالب و مقاصد کو گورنمنٹ اور پارلیمنٹ تک پہنچانے کی تدبیر کریں تاکہ آئندہ قوم کو پھر حسرت و افسوس نہ ہو۔ لیکن جس غرض سے یہ کمیٹیاں قائم ہوئی تھیں وہ ان کے قیام سے پوری نہیں ہوئی کیونکہ یورپین ممبر ہندوستانی ممبروں کو ایک مخالف فریق سمجھتے تھے۔ ہم کو شکست دینا وہ اپنا حق جانتے ہیں اور ہندوستانی ممبر کمیٹیوں میں اُن موم کی مورتوں کی مانند معلوم ہوتے ہیں جو میڈم تساڈ کے نمائش گاہ میں تھی۔

حمایتِ زبان

۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے میں کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔

یہ پہلا موقع تھا جب کہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب ہندو مسلمان کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔ جب یہ چرچا بنارس میں پھیلا اور ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے آخر انھوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے، آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ انھوں نے کہا اگر آپ کی یہ پیشین گوئی صحیح ہوئی تو نہایت افسوس ہے۔ مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔ ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایک ایسے امر کے مزاحم ہوتے ہیں جو ان کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے۔

یہ بات بخوبی میرے ذہن نشین ہو گئی تھی کہ ہندوستان کی فلاح اور بہبودی کو کامل ترقی دینے، اور گورنمنٹ انگریزی کو رعیت کی محبت کا فخر پورا حاصل ہونے، باہمی استحکام و پائیداری بخشنے کے واسطے اس کے سوا اور کسی امر کی ضرورت نہیں ہے کہ ہندوستانیوں کو یورپ کے سفر کی ترغیب دی جائے تاکہ وہ مغربی ملکوں کی شائستگی کے عجیب و غریب نتیجوں اور اس کی ترقی کے نتیجے خود مشاہدہ کریں۔ تجارت کے باب میں انگلستان کے باشندے کیسے مستعد ہیں اور کارخانوں اور کاشتکاری شفاخانوں اور خیرات اور اس کے شہروں کی صفائی اور اس کی دولت اور علم سے روز بروز زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ پس یہ خواہش ہوئی کہ میں خود انگلستان جا کر اپنے ہم وطنوں کے لیے ایک نظیر قائم کروں اور سفر کے نتیجوں سے ان کو اطلاع کر کے ان کو بھی فائدہ پہنچا سکوں۔

اس زمانے میں گورنمنٹ نے اضلاع شمال و مغرب کے طالب علموں میں سے سید محمود کو لندن میں جا کر تعلیم پانے کو منتخب کیا جس کے لیے سب سے اول مسٹر جان اسٹریچی کا اور اس کے بعد سر ولیم میور اور لارڈ لارنس کی مرحمت کا ممنون ہوں۔ مجھے موقع ملا کہ میں بھی لندن جاؤں، اور تعلیم و تربیت کے ان طریقوں سے واقف ہوں، جن طریقوں سے انگلش قوم نے ایسی اعلیٰ درجہ کی ترقی پائی۔

یورپ کا سفر اختیار کرنے سے چند روز پیشتر یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو ہم بنارس سے چلے ہمارے دوست مسٹر وارڈ اسمتھ نے بنارس اسٹیشن سے

بچشم نم رخصت کرتے وقت محمد محمود کو سونے کی نہایت عمدہ ایک گھڑی بطور یادگار دی اور مجھے ایک گھڑی چاندی کی۔ دوسری تاریخ کو الٰہ آباد میں قیام کیا۔ تیسری اپریل کو ہم سب مسافر جبل پور پہنچے یہاں ریلوں کی دو کوٹھریں کرایہ کیں اور تین دن اور تین رات برابر چلے اور ناگ پور پہنچے۔ ناگ پور سے ریل پر سوار ہوئے اور آٹھویں تاریخ قریب دو بجے کے بمبئی پہنچے۔ الٰہ آباد سے بمبئی تک کیا گاؤں اور کیا چوکیات کیا ریل پر کیا گورنمنٹ کے اہلکاروں سے ہر ایک جگہ اردو میں گفتگو کی سب لوگ ہر جگہ بخوبی سمجھتے تھے اور اردو میں ہی جواب دیتے تھے۔ بمبئی میں پالن جی ہوٹل میں دو کمرے لیے ہم وہاں نہائے دھوئے کپڑے بدلے اور میں اور حامد، مرزا امداد اور بیگ شہر و بازار کو روانہ ہوئے۔ اول ہم گنیش داس کشن جی کی دوکان پر گئے۔ ہنڈیاں دے کر روپیہ لیا۔ پھر پی اینڈ او کمپنی جہاز کے دفتر آئے۔ رسید کرایہ جہاز اور ٹکٹ واسطے ریل گاڑی مصر جو سویز سے اسکندریہ تک پڑے گی۔ ان سے لیے۔ بمبئی میں مسٹر سہراب جی اور رحمت اللہ خاں سلیمان سیٹھی سے ملاقات ہوئی۔ بمبئی میں مجھ کو پارسی بہت پسند آئے۔ انھوں نے نہایت عمدہ طور سے قومی ترقی شروع کی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمان ہر جگہ سب سے پیچھے ہیں۔ ہم سب اگن بوٹ پر سوار ہو کر بڑے دخانی جہاز میں پہنچے۔ قریب چھ بجے شام کے دسویں اپریل [illegible] کو جہاز نے لنگر اٹھایا۔ دن رات چلتے چلتے سترھویں اپریل کو عدن پہنچے۔ جہاز میں سب سے اول جن سے ملاقات ہوئی وہ میجر جنرل جیکسن تھے یہ صاحب نہایت با اخلاق اور حد سے زیادہ خوش مزاج تھے۔ شمالی حصہ مدراس کے کمانڈر تھے۔

عدن

مس کارپینٹر سے بھی اسی جہاز میں ملاقات ہوئی۔ جب جہاز عدن میں لنگر کر چکا تو ہم چاروں شخصوں نے ایک چھوٹی سی کشتی کرایہ کی اور کنارے پر پہنچے۔ بگھی اور گھوڑی کرایہ کی اور قلعہ و چھاؤنی کو دیکھنے گئے۔ سب سے عمدہ اور عجیب اور نہایت قدیم چیز جس کی تعمیر کی تاریخ اب تک معلوم نہیں ہے۔ عدن کے حوض ہیں۔ جن کو یہاں کے لوگ "ٹانکا" کہتے ہیں۔ عدن میں گرمی اس شدت سے ہوتی ہے کہ بیان سے باہر ہے کوئی ہرا درخت یا ہری گھاس کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ پینے کا پانی گراں قیمت بکتا ہے برف نام کو بھی میسر نہیں بازار میں گئے اور خوب سیر کی۔ جہاں ترکاری بکتی ہے وہاں دو دوکانیں بھٹے والوں کی تھیں۔ ہم کو اپنا ہندوستان یاد آیا اور چار بھٹے بھونے ہوئے ہم نے خریدے۔ ایک نان وائی پراٹھے پکاتا تھا جیسے قطب صاحب میں پکتے ہیں۔ عدن میں متعدد قومیں موجود ہیں عرب اور صومالی اکثر ہیں صومالی قوم سب سے زیادہ ہے۔ یہ عربی بولتے ہیں مگر سمجھ میں نہیں آتا۔ واہ ری ہماری قسمت کہ یہاں کے بازار کے لوگ اور صومالی قوم بھی کسی قدر اردو بولتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ کوئی ضروری کام بند نہیں رہ سکتا سب اردو میں انجام ہو سکتا ہے۔ عدن میں تین سمندر بھی ہیں۔ قلعہ جو کہلاتا ہے وہ حقیقت میں پہاڑ ہے۔ چاروں طرف سے بلند پہاڑ ہے اور اس کے حلقے کے اندر جو جگہ ہے وہاں چھاؤنی اور بازار وغیرہ ہیں۔

سترھویں اپریل [illegible] کو جہاز نے لنگر اٹھایا اور سویز کی راہ لی۔ بائیسویں تاریخ کی رات کے وقت دفعتاً تند ہوا چلی اور سمندر میں موجیں اٹھیں سمندر کا پانی کھڑکی کے اندر اس قدر آگیا کہ تمام پلنگ اور بچھونے تر بتر ہو گئے۔

سویز

۲۳ اپریل [illegible] کو ہم سب صبح الفجر سویز پہنچے۔ جہاز نے لنگر کیا ہم نے [illegible] جہاز کو [illegible] کر کے رخصت کیا اور سویز ہوٹل میں جا کر ٹھہرے نہر سویز اور شہر دیکھنے کا ارادہ کیا وہ مقام جہاں دیکھنے جانا تھا۔ وہاں سے پانچ میل تھا ہم نے وہاں جانے کا ارادہ کیا مگر جب لوگوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ جس مقام کو لوگ دیکھنے جاتے ہیں وہاں بجز اس کے کہ زمین کھودی جا رہی ہے اور کچھ نہیں ہے تب جانا ارادہ شکست ہو

گیا پھر شہر کی سیر کو گئے۔ ایک بہت چھوٹا تنگ بازار دیکھا ہر قسم کے لوگ مصری، ترکی، جرمنی اور یونانی دوکان دار وہاں تھے سویز سے بذریعہ ریل اسکندریہ پہنچے۔ راستہ میں دریائے نیل کی زیارت ہوئی اس پر ایک پل بندھا ہوا تھا۔ پل نہایت مستحکم طور پر بنا ہوا ہے لیکن کچھ خوبصورت نہ تھا۔ افسوس ہے کہ ہم کو اسکندریہ دیکھنے کی ذرا بھی فرصت نہیں ملی۔ یہاں ہمارے لیے جہاز تیار تھا۔ ریل سے اترتے ہی سیدھے جہاز پر پہنچ گئے اور اپنا اپنا مال جہاز میں جا بیٹھے۔ اتفاق سے ڈی فیرز پیٹرک سابق ڈپٹی کمشنر دہلی بھی اسی جہاز میں تھے نہایت مہربانی سے ملے نہایت خوشی اور بہت ہی مبارک جو اس جہاز میں ہوئی وہ مسٹر ڈی لیسپس صاحب بہادر کی ملاقات ہے یہ صاحب وہ فرانسیسی انجینئر تھے جنھوں نے نہر سویز بنانے کی تجویز کی۔ جہاز میں میں نے ایک چیز دیکھی جس سے مجھ کو کمال تعجب ہوا۔ مس کارپینٹر اپنی کتاب میں ہر ایک سے کچھ رائیں لکھواتی ہیں۔ ہمارے شفیق میجر جنرل جیکسن نے ایک رائے لکھی اس میں انھوں نے ہندوستانیوں کی نسبت یہ کلمے لکھے۔

"احسان فراموش اور بے دل یا بے ہمت" ان لفظوں کے دیکھنے سے مجھے تعجب یہ ہوا کہ باوجودیکہ وہ نہایت بشاشت سے ہندوستانیوں سے ملے مگر ان کے دل میں ہندوستانیوں کی طرف سے کیا بات سمائی ہوئی ہے۔ وہ کمپنی جس کے دخانی جہازوں میں ہم نے بمبئی سے مارسیلز تک سفر کیا۔ یہ کمپنی صرف مارسیلز تک مسافروں کے پہنچانے کا انتظام کرتی ہے۔ پہلا یورپ کا شہر جس کو ہم نے دیکھا مارسیلز ہے۔

مارسیلز

مارسیلز فرانسیسوں کی عملداری میں ہے کسٹم ہاؤس کے بڑے کمرے میں سامان کی تلاشی ہوئی جب کہ ہم لنگرگاہ مارسیلز میں جہاز سے اترے تو ہم نے دیکھا کہ بہت سی گاڑیاں اور آدمی بھی کھڑی ہوتی ہیں۔ ہوٹل کا کمشنر ہمارے پاس آیا اور آدمی بھی جو اس ہوٹل کا تھا حاضر کیا اور ہمارے تمام اسباب گاڑی میں رکھ کے لادا اور ہوٹل میں جا اترے جب ہمارا ڈیرا بھی بازار میں پہنچا ہم دیہاتیوں کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگے کبھی ایسا آراستہ بازار اور اس قدر روشنی شیشہ آلات ہم نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

پیرس

یکم مئی کو ہم مارسیلز سے روانہ ہوئے اور عجائبات قدرت کو دیکھتے ہوئے دوسری مئی کو صبح پیرس میں داخل ہوئے چونکہ ہم نے دو روز تک پیرس میں رہنے کا قصد کیا تھا اس لیے وہاں اترے اور ہوٹل میں ٹھہرے۔ مارسیلز کا ہوٹل اور وہاں کو کھانے کا عمدہ کمرہ اور کھانا کھلانے کا نہایت عمدہ طریقہ اور کھانا کھلانے والوں کی نہایت نفیس وردیاں ہماری آنکھ میں سمائی ہوئی تھیں اس لیے یہ ہوٹل ہماری نگاہ میں کچھ نہیں جچا جب سب جگہ دیکھ چکے تب ہماری خوش نصیبی نے مدد کی اور ہم نے کمشنر سے کہا کہ اور کسی اچھی جگہ لے چلو۔ اس نے کہا کہ ورسیل چلو وہ ہر پہلے اتوار کو کھلتا ہے بذریعہ ریل وہاں پہنچے۔ جب ہم محل میں گھس گئے تو ہم نے جانا کہ ہم دنیا میں نہیں بہشت کے کسی محل میں پہنچ آئے ہیں۔ ہم سب مکانوں اور کمروں کی سیر کرتے ہوئے اس کمرے میں جہاں شہنشاہ لوئی چہاردہم دربار کرتا تھا اور تمام رئیس اور امرا وہاں آن کر ملازمت کرتے تھے پہنچے۔ اس تمام محل میں مصوروں کا کام بے نظیر ہے۔ لیبرن، مکنارڈ، گرپی، ریکارڈ، ہوری نٹ، ویرن جو نہایت نامی مصور تھے ان سب کا اس میں کارنامہ ہے۔ ایک اور بہت بڑا کمرہ ہے جس کا نام کمرہ کروسیڈ ہے۔ اس کمرے میں تمام واقعات و محاربات کی تصویریں جو کروسیڈ کی لڑائی میں ہوئی تھیں بنی ہوئی ہیں۔ پیرس سے چوتھی مئی کو روانہ ہونے کے لیے انگلش چینل تک ریل پر آئے ریل سے اتر کر اسٹیمر میں گئے۔ انگلش چینل بہت چوڑا نہیں ہے۔ صرف ڈھائی تین گھنٹہ کا راستہ ہے مگر اس کے پانی کو ایک عجیب قسم کی حرکت ہے کہ جہاں اسٹیمر چلا اور پانی نے اس کو ہوا و اداری کرتے آئی۔

لندن

خدا خدا کر کے وہ رستہ طے کیا کنارہ آیا۔ ڈوور میں اترے اور ریل پر سوار ہوئے چیرنگ کراس اسٹیشن واقع لندن میں اترے۔ ہمارے شفیق دوست جان ڈالیٹ ڈیمی صاحب بہادر سابق کلکٹر آگرہ ہمیں ملنے آئے۔ برسٹل میں سرائے ورڈ اسٹریٹ میں آگئے۔ میرے پاس نہ اتنا روپیہ تھا نہ مجھ کو ایسا مقدور تھا کہ میں ایک علیحدہ مکان کرائے پہ لے کر اس میں رہتا۔ اور تمام اسباب خریدتا۔ اس لیے میں نے لاجنگ کرایہ پر لیا۔ لاجنگ کے یہ معنی ہیں کہ جس مکان میں صاحب مکان رہتا ہے۔ اسی میں سے چند کمرے وہ کرایہ پر دے دیتا ہے۔ میں جس مکان میں رہتا تھا وہ مسٹر بے ڈلم کے قبضے میں تھا۔

یہاں اگر معلوم ہو کہ سفر چنداں سخت نہیں۔ نہایت آرام کا سفر ہے۔ اور کوئی چیز ہم کو ایسی نہیں کہ مسلمان اس کو اپنی خاطر خواہ ذبح کر سکے یہاں تک ذبیحہ مسلمان کا دستیاب ہو سکتا ہے۔

کتب خانہ انڈیا آفس

کتب خانہ انڈیا آفس میں نے دیکھا ہوش جاتے رہے۔ کتب خانہ نہیں ہے کتابوں کی دنیا ہے مجھے وہاں جانے کی اور پڑھنے کی اجازت ہو گئی یہاں ہندوستان کی تمام قوموں کی تصویریں اور حالات و رسومات کی ایک کتاب ہے اور جس رسم کا اس میں بیان ہے اس کی بعینہٖ تصویر بھی ہے کتب خانہ برٹش میوزیم ایک نہایت بڑا جنگل کتابوں کا ہے کئی الماریاں صرف فہرست کی ہیں۔

خطاب و تمغہ

حضور ملکہ معظمہ نے مجھ کو خطاب کمپینین آف دی سٹار آف انڈیا (COMPANION OF THE STAR OF INDIA) سے معزز و ممتاز فرمایا اور تمغائے سٹار آف انڈیا مرحمت کیا۔ احباب کی دعا سے سید احمد خاں بہادر سی۔ ایس۔ آئی ہو گیا۔ یہاں کے تمام معزز انگریز دوستوں نے اس قدر مبارکباد اس درجہ کی دی اور ایسا معزز خیال کیا کہ بیان سے باہر ہے۔ لارڈ لارنس گورنر جنرل و وائسرائے ہندوستان میرے ملنے کو تشریف لائے انھوں نے میرے لیے جلسہ منعقد کیا۔ بڑے بڑے مدبران کو ملاقات کے لیے بلایا۔ پھر ۱۱ مارچ ۱۸۷۰ء کو ملکہ معظمہ کی دربار کے محل میں مجھ کو بلایا گیا۔ درباریوں کے ساتھ بٹھایا گیا۔ جب ملکہ معظمہ تشریف لائیں تو میں نے بھی مثل تمام درباریوں کے اپنے نمبر پر جا کر سلام کیا۔ سلام کرنے کا دستور یہ ہے کہ ملکہ معظمہ سے ہاتھ ملا کر بایاں گھٹنا ٹیک کر حضور ممدوحہ کے ہاتھ پر بوسہ دیتے ہیں۔ جب تک تمام درباریوں کا اس طرح سلام نہیں ہوتا اس وقت تک ملکہ معظمہ کھڑی رہتیں۔ اس کے بعد پرنس آف ویلز کی لیوی میں شریک کیا گیا۔

میں انڈیا آفس میں صاحب سکرٹری وزیر ہند کے پاس گیا۔ انھوں نے مجھ کو کونسل کے کاغذات میں میری کتاب اسباب بغاوت ہند مع تمام و کمال انگریزی ترجمے کے دکھلائی۔ اسے دیکھ کر میرا دل بہت خوش ہوا۔ انڈیا کونسل کے بعض ممبروں نے فرمایا کہ ہم ایک دن فرصت کا مقرر کر کے ہندوستان کے باب میں گفتگو کریں گے۔ جس دن ڈیوک آف آرگائل یعنی اہل خانہ وزیر ہند نے دعوت میں مجھے بلایا اس رات وہاں مسٹر پالک سے ملاقات ہوئی۔ مجھے سواری کے خرچ کے مارے امراء اور لارڈز اور سب کی ملاقات کو نہ جا سکا۔

جان ڈیون پورٹ کی کتاب کا چھپوانا

ایک انگریز مسٹر جان ڈیون پورٹ نے حمایت اسلام میں ایک عجیب و غریب کتاب اپالوجی فار محمد اینڈ قرآن لکھی۔ چونکہ یہ کتاب اکثر انگریزوں کے خلاف تھی۔ لندن کا کوئی پبلشر اس کتاب کو چھاپنے کو تیار نہیں ہوا۔ میں نے کل لاگت چھاپہ کی دینی قبول کی۔

خطباتِ احمدیہ

دن رات کی محنت و مشقت سے اور طرح طرح کی تکالیف سے جو میرا دل ہی خوب جانتا ہے خطباتِ احمدیہ کی تصنیف تمام ہوئی۔ سر ولیم میور صاحب اور مصنفوں نے جو کچھ لکھا ہے سب کے ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے۔ نہایت محققانہ جواب ہیں اور شرط اگر کسی شخص کے آگے ڈال دو وہ کیسا ہی بے دین کیوں نہ ہو اگر وہ کہے کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے تو میرا نام ورنہ میرا نام نہیں۔

کیمبرج یونیورسٹی

میرا ایک بڑا مقصد انگلستان کے طریقۂ تعلیم کو دیکھنا تھا۔ اور اس پر غور کرتا تھا چنانچہ اسی غرض سے کیمبرج یونیورسٹی کو خود جا کر دیکھا اور بڑی اور چھوٹی چیز کو غور سے دیکھا۔ تمام نقشہ ذہن نشین کر لیا۔ اور عام تعلیم پر غور کیا۔ کیب مین اور کوچوان اپنی گدی کے نیچے کوئی اخبار یا کتاب دبائے رکھتے ہیں۔ جہاں سواری پہنچائی اور کیب رکا اور جو سواری ہو وہ کھڑی کی اور انھوں نے اخبار نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔ جو لوگ حقیقت میں ہندوستان کی بھلائی اور ترقی چاہنے والے ہیں وہ یقین جانیں کہ ہندوستان کی بھلائی صرف اسی پر منحصر ہے کہ تمام علوم اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک انھیں کی زبان میں دیئے جائیں اور تمام علوم سے واقف ہو جائیں۔

میرے ایک معزز دوست نے ایک بہت بڑے جلسے میں جہاں نہایت تکلف کی پوشاک پہنے کئی سو مرد اور لیڈیاں خوبصورت، خوش کلام اور قابل جمع تھیں، پوچھا کہ کیوں لندن بہشت ہے اور حوروں کا ہونا سچ ہے یا نہیں۔ مگر ہماری قسمت میں وہی جلنا ہے۔ یہاں کا حال دیکھ دیکھ کر اپنے ملک اور قوم کی حماقت، بے جا تعصب، موجودہ تنزل اور آئندہ ذلت کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا۔

کئی انگریزوں سے یہاں یعنی انگلستان میں ملاقات ہوئی اُن پر اُن کی عام لیاقت کا اور اس بات کا کہ جن شخصوں نے اُن سے ہندوستان کی بابت گفتگو کی ان سب کو میرا ایک امر سے بخوبی آگاہ کر دیا بہت عمدہ اثر ہوا۔ یہاں کے بہت سے مدبران سلطنت کی رائے ہے کہ اگر ہم ایک ایسے لیق اور واقف کار ہندوستان کے مسلمان سے جیسے کہ سید احمد خاں ہیں واقف نہ ہوتے تو ہندوستانیوں کی لیاقت کی نسبت ہماری رائے ہمیشہ ضعیف اور ردی ہوتی۔

واپسی

میرے ایجنٹ نے وعدہ کر لیا کہ تمام اخراجات جہاز وہ دے کر ہندوستان پہنچا دے گا۔ میں نے حسب ضابطہ انڈیا آفس میں اطلاع کر دی کہ میں ۲ ماہ اگست ۱۸۷۰ء کو لندن سے روانہ ہوں گا۔

لندن میں جو دیکھا سو دیکھا اور جو سوچا وہ سوچا مگر اپنی قوم کو دین و دنیا دونوں کے اعتبار سے ایسے پست و تاریک گڑھے میں گرا ہوا پایا جس سے نکلنا محال معلوم ہوتا ہے مگر اپنی ہمت نہ ہاری۔

لندن ہی میں اس مدرسے کے قائم کرنے کی اور تعلیم کی تمام تجویزوں کو پورا کیا یہاں تک کہ جس نقشے پر آپ کالج کی عمارتوں کو دیکھتے ہیں یہ بھی لندن ہی میں قرار پا چکا تھا۔ میں بدنصیبی سے انگریزی سے ناواقف تھا۔ میں سید محمود کا نہایت مشکور ہوں کہ تمام واقفیت اور اطلاع میں جو کچھ حاصل ہوئی اس میں سید محمود نے میری بہت بڑی مدد کی۔ مجھ کو اس بات کے اقرار کرنے سے نہایت خوشی ہے کہ اگر ان کی مدد نہ ہوتی تو جس مقصد سے میں لندن گیا تھا میرا جانا فضول تھا۔

مدرسے کے بورڈنگ ہاؤس کی اور تعلیم کے طریقے کی جس پر اس وقت چل رہا ہے۔ ان کی نسبت یہ کہتا ہوں کہ ان کا تجویز کرنے والا اور قرار دینے

والا تھا ایک نقصانی ہوگی بلکہ صاف صاف کہنا چاہیے کہ اس کا بہت بڑا حصہ سید محمود کا تجویز کیا ہوا تھا، جو انھوں نے اپنی واقفیت اور اپنے نہایت لائق دوستوں سے صلاح و گفتگو کرنے کے بعد قرار دیا تھا۔ سید محمود کا خیال تھا کہ کالج ایسا اعلیٰ درجہ کا قائم ہو جس میں تمام یورپین علوم و فنون مع اُن ایشیائی علوم کے جو ہمارے بزرگوں کے لیے مایۂ فخر تھے، اعلیٰ درجہ پر تعلیم ہو سکے۔ اور وہ کالج محمڈن یونیورسٹی کے نام سے موسوم ہو۔

غرضیکہ ان تجویزوں کو مکمل کرکے میں نے لندن سے واپس آنے کا ارادہ کیا۔ اور لندن ہی میں اس کام کے جو نہایت اہم تھا شروع کرنے کے تین طریقے قرار دیے۔

اوّل۔ ایک ایسی تدبیر اختیار کی جائے۔ جس سے کہ وہ خیالات و تعصب جو مسلمانوں کے دلوں میں بیٹھے ہوئے ہیں اور یورپین سائنس و لٹریچر کا پڑھنا کفر اور مذہب اسلام کے برخلاف سمجھتے ہیں، دور ہوں۔

دوم۔ خود مسلمانوں سے پوچھا جائے کہ وہ یورپین سائنس اور لٹریچر کو کیوں نہیں پڑھتے اور اس میں ان کو کیا اندیشہ ہے۔

سوم۔ کالج کے لیے چندہ شروع کیا جائے اور جس وقت روپیہ جمع ہو علی گڑھ میں کالج قائم کیا جائے۔

تہذیب الاخلاق

ہندوستان میں پہنچ کر تجویز اوّل کے مطابق میں نے تہذیب الاخلاق جاری کیا اس کے سرورق پر جو اس کا نام اور اس کے گرد خوبصورت بیل بنی تھی وہ ٹھپہ لندن ہی میں بنوایا تھا۔ اور اپنے ساتھ لایا تھا۔ گو تہذیب الاخلاق کی بہت مخالفت ہوئی خاص اخبار اور پرچے اس کی مخالفت پر جاری ہوئے لیکن اس کو بڑی کامیابی ہوئی اگر لوگوں کا یہ خیال صحیح ہے کہ تہذیب نے تمام ہندوستان کو ہلا دیا اور لوگوں کے دلوں کو بڑی ہمدردی پر مائل کر دیا تو شاید میری نجات کے لیے کافی ہوگا لیکن بمقتضائے عمر اور بعض عوارض سے میں تہذیب الاخلاق جاری نہ رکھ سکا اس کے بند ہونے کا مجھ کو بھی افسوس ہوا۔

کمیٹی خواستگار ترقی و تعلیم مسلمانان

دوسری تجویز کے مطابق ایک کمیٹی قائم ہوئی اور کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان اس کا نام رکھا اور بذریعہ جواب مضمونوں کے عموماً مسلمانوں سے اس کی نسبت استفسار کیا۔ اس کا اشتہار لندن ہی میں چھپوایا تھا۔ اور وہ مضمون جس کا جواب پوچھا گیا تھا سید محمود کے لکھے ہوئے اور تجویز کیے ہوئے تھے اس کمیٹی کو نہایت کامیابی ہوئی اور بہت بڑی کامیابی کے ساتھ اس کا کام ختم ہوا۔ اور کام ختم ہونے پر اس کالج کا قیام ہونا قرار پایا۔

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی

کالج کا قائم ہونا ہی مقصود تھا جو تجویز سوم میں قرار پایا تھا ۱۸۷۲ء میں چندہ جمع کرنے کے لیے بمقام بنارس ایک کمیٹی قائم ہوئی جس کا نام محمڈن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی رکھا گیا۔ اس کا کام چلنا شروع ہوا۔ اس کمیٹی نے ۱۰ جون ۱۸۷۲ء کے اجلاس میں مختلف مقامات میں سب کمیٹیاں واسطے وصول چندہ کے مقرر کیں۔ منجملہ ان سب کمیٹیوں کے ایک سب کمیٹی علی گڑھ میں مقرر کی اور مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب اور راجہ سید باقر علی خاں صاحب محمد عنایت اللہ خاں مرحوم، کنور محمد لطف علی خاں صاحب منشی محمد مشتاق حسین صاحب کو سب کمیٹی کا ممبر مقرر کیا۔

میں نے کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جس سے قوم کے بچوں کے اخراجات تعلیم میں مدد پہنچے۔ کون ہے جو مجھ کو اسٹیج پر دیکھ کر حیران

بتاؤ وہی جن کے دل میں قوم کا درد نہیں وہی جن کا دل جھوٹی شیخی اور جھوٹی مشیخت سے بھرا ہوا ہے۔ آہ اس قوم پر جو شرمناک باتوں کو اپنی شیخی اور افتخار کا باعث سمجھیں۔ خود لوگوں سے بھیک مانگی۔ مگر ذلیل ہی والنٹیئر بنانے چاہے مگر سبقت کرنے جو بیٹھے ان سے کچھ بن نہ آئی۔ میں میں اسٹیج پر آیا قوم کے بچوں کی تعلیم کے لیے کچھ کرسیوں میں نے کما کر مجھ کو اس کے قائم کرنے میں ایک قلی چمار کی مانند تصور کیجیے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے بچے گھر بیٹھے دیکھئے اور اس وجہ سے کہ اس کا بنانے والا یا اس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چمار ہے اپنے گھر کو مت ڈھائیے۔ ایک دفعہ ایک دوست نے دعوت کی بابت ایک روپیہ عنایت کیا میں نہایت خوش ہوا کہ مدرسۃ العلوم کے کئی مزدوروں کو مزدوری ملی ہمارا اب یہ حال ہو گیا ہے کہ ہمارے دوست بھی ہم سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کر بیٹھیں۔ ہماری صورت ہی اب سوال ہی ہو گئی ہے۔ میں نے ایک دوست سے کہا کہ بھائی میری قسمت میں بھیک مانگنا لکھا تھا سو اس لکھے کی بدولت ہوں مگر شکر ہے کہ اپنے لیے نہیں بلکہ قوم کے لیے۔ ارے میاں اب کوئی دن میں ہم مر جائیں گے۔ پھر کون چندہ مانگے گا۔ ہمارا حال تو اس بڑھیا کا سا ہو گیا ہے جس کو بازار کے لونڈے چھیڑا کرتے تھے اور جب وہ چھیڑنے والے نہ ہوتے تو کہتی کیا آج بازار کے لونڈے مر گئے۔ ؟

گورنر جنرل لارڈ نارتھ بروک نے دس ہزار روپیہ بطور چندہ مرحمت فرمایا اور مسٹر بدائی نے مجھ کو ایک ہزار روپے دیے تھے اور یورپین عہدہ داروں میں سے کسی سے مدد نہیں ملی اسی سال بنارس کی کمیٹی میں تجویز پیش ہوئی کہ مدرسہ کہاں بنایا جائے اور بعد تحقیقات اور طلب ۹ر نومبر ۱۸۷۲ء کے اجلاس میں یہ فیصلہ ہوا کہ مدرسہ بمقام علی گڑھ بنایا جائے۔

دسویں فروری ۱۸۷۳ء کے اجلاس میں سید محمود نے ایک نہایت کامل تجویز تعلیم علوم کی جو انھوں نے لندن ہی میں بصلاح وہاں کے واقف پروفیسروں اور معلموں کے مرتب کی تھی پیش کی۔ اگر اس درجہ تعلیم تک مدرسہ پہنچ جائے تو قوم کے نصیب کھل کھل جائیں گے۔

چودھویں اپریل ۱۸۷۳ء اجلاس میں چھوٹے چھوٹے مدرسوں کے مختلف مقامات پر قائم ہونے پر بحث ہوئی جو آخر کار مدرسۃ العلوم کے ماتحت اور اس کی ایک شاخ قرار پائی۔

علی گڑھ کے مدرسہ کے لیے مولوی محمد سمیع اللہ خاں بہادر سی۔ ایم۔ جی سے التماس کیا گیا کہ ابتدائی مدرسہ کھولنے کی تدبیر کریں چنانچہ انھوں نے کوشش کی جس کے لیے ہم سب کو ان کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

دسویں جنوری ۱۸۷۴ء کے اجلاس میں کمیٹی نے متعدد تجویزیں منظور کیں۔

ا۔ علی گڑھ میں جو زمین پرانی چھاؤنی فوج کی بیکار پڑی ہے تعمیر مدرسہ کے لیے گورنمنٹ سے لی جائے۔

۲۔ سیکرٹری کو اجازت دی گئی کہ اگر زمین مل جائے تو اس میں تعمیر مدرسہ کا کام شروع کرے۔ مگر تعمیر میں روپیہ سرمایہ کا خرچ نہ ہو بلکہ اس کی آمدنی یا چندہ خاص تعمیر کا صرف کیا جائے۔

۱۰ر مارچ ۱۸۷۴ء کے اجلاس میں سیکرٹری نے اطلاع دی کہ گورنمنٹ نے اس زمین کے دینے کا وعدہ کر لیا ہے جہاں مدرسۃ العلوم کا تعمیر ہونا تجویز کیا گیا ہے اس زمین کے متصل چار بنگلے لوگوں کی ملکیت تھے۔ جن کا خریدنا لازمی تھا۔ ان میں تین بنگلوں کے خریدنے کا معاملہ مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب نے بعوض پندرہ ہزار روپیہ کے قرار دیا۔

۱۵ر فروری ۱۸۷۵ء کے اجلاس میں بنارس کی کمیٹی نے علی گڑھ میں ابتدائی تعلیم کے لیے مدرسہ کھولنا تجویز کیا۔ ۲۴ر مئی ۱۸۷۵ء مدرسہ کھلا

کو مدرسہ کی تاریخ افتتاح قرار دی۔

جس وقت علی گڑھ میں مدرسہ کھولنے کا ارادہ ہوا اس وقت میں نے پنشن لینے کا قصد کیا اور بذریعہ صاحب جج ہائیکورٹ کو اطلاع دی کہ میرا ارادہ پنشن لینے کا ہے اور اکونٹنٹ جنرل سے نقشہ طلب کیا اور درخواست کی کہ میری مدت ملازمت اور استحقاق پنشن کی تصدیق فرمادیں۔ میں وسط ۱۸۷۶ء میں علی گڑھ آگیا۔ میں نے اپنے قدیم مالوف اور پرانے شہر دلی کو جہاں میرے بزرگوں اور عزیزوں کی ہڈیاں اب تک زیر زمین دبی ہیں اور جہاں بہت سے عزیز اب تک رہتے ہیں۔ جس کی مٹی سے لوگوں نے خیال کیا تھا کہ میں بنا ہوں اور پھر اسی میں میری خاک مل جائے گی۔ محض مدرسۃ العلوم کی محبت اپنی قوم کی بھلائی اور رئیسان ضلع علی گڑھ و چند شہر کی محبت و عنایت کے خیال سے چھوڑا۔ اور یہاں ایک غریب مسافر کی طرح سکونت اختیار کی۔ میں نے صرف اس خیال سے کہ کیا شے ہے جس سے قوم کی حالت درست ہو دور دراز سفر اختیار کیا اور بہت کچھ دیکھا جو دیکھنے کے لائق تھا۔ جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی، جب کبھی عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا، جب کبھی علمی مجلس دیکھی، جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے، جب کبھی کھیل کود، عیش و آرام کے جلسے دیکھے، یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوبصورت شخص کو دیکھا مجھ کو ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں۔ جہاں تک ہو سکا ہر موقع پر میں نے قومی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا۔ سب سے اول یہی تدبیر سوجھی کہ قوم کے لیے قوم ہی کے ہاتھ سے ایک مدرسۃ العلوم قائم کیا جائے۔

ابتدا میں طالب علموں کی تعداد قلیل تھی اور کوئی بورڈنگ ہوس نہ تھا۔ طالب علم جس قدر تھے چھوٹے چھوٹے کمروں میں بھر دیئے جاتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ ہر ایک چیز میں ترقی ہوتی گئی۔ آٹھویں جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن علی گڑھ تشریف لائے اور ایک نہایت پُرتکلف جلسہ میں رسم فونڈیشن ادا ہوئی۔

اسکول جو ۱۸۷۵ء میں انٹرنس کی پڑھائی تک کے لیے کھولا گیا تھا ۱۸۷۸ء میں ایف اے کی پڑھائی تک اور ۱۸۸۱ء میں بی اے اور ایم اے کی پڑھائی تک ترقی کر گیا۔ قومی بھلائی کے چاہنے والوں نے مجھ ناچیز پر اس قدر بھروسا کیا کہ لاکھوں روپیہ چندہ مجھ کو دے دیا۔ نہ کسی نے پوچھا اور نہ یہ جانا کہ روپیہ جو دیتے ہیں کہاں جاتا ہے اور کیا ہوتا ہے۔ میں اپنی تمام زندگی میں کسی امر پر اس قدر فخر نہیں کر سکتا جس قدر کہ اس اعتماد اور طمانیت پر فخر کرتا ہوں جو میری قوم اور غیر قوم کے بزرگوں نے مجھ پر کیا۔

ہمارے یورپین دوست جو دل سے ہمارے کالج کی ترقی و بھلائی کا خیال رکھتے تھے اور خصوصاً مسٹر ڈویٹ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن ہم کو دوستانہ نصیحت کرتے تھے اور صلاح دیتے تھے کہ اب کالج کی حالت ایسی ہو گئی ہے کہ اس کے لیے باضابطہ ٹرسٹی مقرر کرنے اور تمام کارروائی کے لیے ایک مکمل کوڈ بنانا نہایت ضروری ہے۔ ان تمام حالات کے لحاظ سے میں نے ممبروں کے اجلاس منعقدہ [illegible] مارچ ۱۸۸۹ء میں اس کو پیش کیا، ٹرسٹیوں کے انتخاب کا ایسا قاعدہ بنایا گیا کہ جس سے ہر صوبہ کے بزرگ ٹرسٹیوں میں شامل ہوں۔ ضلع علی گڑھ اور چند شہر کے معزز خاندان میں سے بلا لحاظ اس کے کہ وہ مخالف ہیں یا موافق، ایک ایک رئیس خاندان کو ٹرسٹیوں میں منتخب کیا۔ میں نے یہ کارروائی نہایت صاف دل اور نیک نیتی سے کی مگر بدبختی سے میری یہ کارروائی بدنیتی پر محمول ہوئی اور ان لوگوں کو جو ٹرسٹیوں میں نامزد نہیں ہوئے تھے، مخالفت پر برانگیختہ کرنے کی تحریک دی گئی۔ اس میں ان کو کسی قدر کامیابی بھی ہوئی۔

اس بات کے کہنے سے شرم آتی ہے کہ یہ میری محنت اور جانفشانی اور تدبیر تھی جو آج کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی اس قدر عالیشان

عمارتیں بنی ہوئی دیکھتے ہیں جن کو دیکھ کر نہ صرف ہندوستان کے لوگ بلکہ یورپ اور امریکہ کے سیاح بھی حیران رہ جاتے ہیں میں نے جاڑے، گرمی برسات میں محنت اُٹھائی۔ قلی کا کام میں نے کیا، اُوورسیر کا کام میں نے کیا، انجینئر کا کام میں نے کیا، اپنا ذاتی روپیہ قرض کرنے میں دریغ نہیں کیا اس کا صلہ ہمارے دوستوں نے اُس پمفلٹ میں جو خاص علی گڑھ میں چھاپ کر مشتہر کیا، یہ دیا ہے کہ تعمیر کا کام سکرٹری اس لیے اپنے اختیار میں رکھتے ہیں کہ اُن کو بھی نفع کثیر ہوا کرے۔

کوئی کہتا کہ کالج میں یورپین اسٹاف کا خرچ بہت بڑھا دیا ہے۔ بعض دوست کہتے کہ نہیں یورپین اسٹاف کا ہونا ضروری ہے۔ یورپین اسٹاف جو پرنسپلیں ہو اپنی قوم کی کچھ بھلائی اور بہتری کر سکتا ہے۔

میرے کل دوستوں نے صلاح دی کہ کالج کی بہتری کے لیے نہایت ضروری ہے کہ یورپین اسٹاف کو کافی طمانیت سے رکھا جائے اور قوم کی بہتری کالج کے ضروری ہے کہ بہت جلد اس بات کا تصفیہ کر دو کہ تمہارے بعد سید محمود کالج کے لائف سیکرٹری ہوں گے۔ لیکن اس سبب سے کہ سید محمود میرے فرزند ہیں۔ اس میں مجھ کو تامل ہوتا۔ لیکن سید محمود ابتدا سے آج تک ان تمام صلاحوں میں شریک غالب رہے اور مجھ کو اس بات کا یقین کامل تھا کہ سوائے سید محمود کے اور کوئی شخص کالج کو اس طریقہ پر نہیں چلا سکتا۔ مگر ہاں ایک مدت بعد جب کالج مستحکم ہو جائے گا۔ تو ہر کوئی چلا سکے گا۔

خدا اس کا اجر بھی قوم کو دے۔ کالج سے کوئی میری ذاتی غرض بجز اس کے کہ میں نے قومی بھلائی قومی ترقی کے لیے کیا ہے۔ اگر فرض کرو کہ اس میں کامیابی نہ ہو تو کیا؟ ہزاروں انبیاء اور رفارمر زمین کے تلے دبے پڑے ہیں۔ جن کی بے انتہا کوششیں اپنی قوم کے لیے برباد ہو گئی ہیں پھر میری ادنیٰ کوشش کی اگر برباد ہو جائے تو کیا حقیقت ہے۔

کالج کے روپے میں غبن

شام بہاری لال نے جو تصرف کیا وہ اس خیال سے تھا کہ چونکہ میری عمر زیادہ ہو گئی ہے اور موت کے دن قریب آتے جاتے ہیں۔ ایک دن میں مر جاؤں گا۔ اور جو کچھ اُس نے جعل سازی کی ہے، وہ سب تلپٹ ہو جائے گی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میری زندگی ہی میں اس کی جعل سازی اور فریب کھل گیا۔ ورنہ میرے بعد بڑی مشکل پڑتی اور لوگ سمجھتے کہ میں نے ہی روپے میں تصرف کیا ہے پس خدا کی مہربانی تھی کہ میرے سامنے ہی راز کھل گیا۔ بعض لوگ اپنی حماقت سے سمجھتے ہیں کہ روپیہ میری تحویل میں اور میرے قبضے میں تھا۔ حالانکہ یہ امر بالکل غلط ہے۔ تمام ٹرسٹیوں کو علم ہے کہ روپیہ بنک میں جمع کیا جاتا ہے۔ چنانچہ کل روپیہ بنک میں جمع تھا۔ اور بنک کے خزانہ سے بذریعہ جعلی چیکوں کے تصرف ہوا اور جعلی چیکوں کو روکنا جب تک بنک کو اُن کا حال نہ کھلے کسی بشر کے اختیار میں نہیں۔ بہر حال میں تو خدا کی رحمت سمجھتا ہوں کہ میری زندگی میں یہ حال کھل گیا۔ گو کہ مجھ کو کیسا ہی رنج اور صدمہ ہو۔

سیّد محمود کی نسبت

جب سیّد محمود ۱۸۶۹ء میں واسطے تعلیم کے انگلستان گئے تو میری خواہش صرف یہ تھی کہ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں علوم انگریزی کی اعلیٰ خصوص لٹریچر کی کامل طور پر تحصیل کریں۔ کیونکہ جو کوئی اس انگریزی لٹریچر سے واقف ہے جو انگریزوں نے نسبت اسلام اور بانی اسلام اور نسبت مسلمانوں اور ان کی حکومت کی سلطنت اور معاشرت کے لکھے ہیں، وہ ضرور اس بات کی خواہش کرے گا کہ کوئی ایسا مسلمان موجود ہونا چاہیے۔ جس کا دماغ قدرتی طور پر اس قابل ہو کہ اُن غلطیوں کی گرفت کر سکے۔ ایسے شخص کا اس تعلیم سے مقصد یہ نہ ہو کہ وہ روٹی کے پیچھے دوڑے۔ میرے تمام دوستوں کی جو

ہندوستان اور انگلستان کی گورنمنٹ میں اعلیٰ درجہ رکھتے تھے یہ خواہش تھی کہ سید محمود سول سروس کے امتحان میں داخل کیے جائیں اور ان کو سید محمود کی کامیابی کا کامل یقین تھا۔ مگر میں نے ہرگز اس کو پسند نہیں کیا۔ بیرسٹری میں داخل ہونے کی میری چنداں خواہش نہ تھی کیوں کہ میں ان کو ایسا شخص بنانا چاہتا تھا، جو قومی خدمت انجام دے۔ مگر چوں کہ بیرسٹری کی تعلیم میں داخل ہونا میرے مقاصد کا خارج نہ تھا۔ میں نے اس کو گوارا کیا جب وہ انگلستان سے واپس آئے تو انھوں نے بیرسٹری شروع کی۔ میں یہ سمجھا تھا کہ وہ چند روزہ ہے اور بہت جلد وہ اس کام پر متوجہ ہوں گے۔ جو میرا مقصد ان کی تعلیم سے ہے مگر اس بات سے خوش ہوں کہ زمانۂ بیرسٹری میں بھی اُنھوں نے چند نہایت مفید آرٹیکل پائنیر اخبار میں لکھے ۱۸۷۸ء میں بعض امور ان کی طبع کے ناگوار ہوئے اور وہ ہائی کورٹ کی بیرسٹری کے ترک کرنے کے ارادہ سے علی گڑھ چلے آئے لارڈ لٹن نے مجبور کیا کہ سید محمود رائے بریلی میں ڈسٹرکٹ جج ہونا منظور کریں۔ اس کے بعد وہ باقاعدہ ہائیکورٹ الٰہ آباد کے جج مقرر ہوئے اور اس قابلِ افسوس غلط فہمی کے بعد جو اس میں اور سر جان ایج میں واقع ہو گئی۔ استعفا دے دیا۔

انڈین نیشنل کانگریس

اس سے بہت پہلے کہ انڈین نیشنل کانگریس کا خیال بھی ہوا ہو میں نے اس مسئلہ پر غور کیا تھا کہ آیا ریپریزینٹیٹو (REPRESENTATIVE) گورنمنٹ ہندوستان کے مناسب حال ہے؟ اور جان اسٹورٹ مل کی آزادانہ رائے ریپریزینٹیٹو گورنمنٹ کے پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا۔ کہ چوں کہ اوّل لازمی امر ایسے طریقہ حکومت کے لیے جس کا انتظام صرف کثرت رائے پر چلتا ہو، یہ ہے کہ ووٹر ہم جنسیت ہو، یعنی اقوام کے اور مذاہب کے اور عادات معاشرت کے اور رسومات کے اور تمدنی حالات کے اور بلحاظ تاریخی و ملکی روایات کے یعنی ریپریزینٹیٹو طریقہ سے رائے دینے میں یہ مسلم امر ہے کہ رائے دینے والوں اور ملک کی آبادی میں ہم جنسیت یا مشابہت امور بالا میں ہو۔ اور جب یہ باتیں موجود ہوں تو یہ طریقہ حکومت عمل میں آسکتا ہے یا مفید ہو سکتا ہے۔ جہاں یہ امور موجود نہ ہوں یا ان کا خیال نہ کیا جائے تو ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے کہ جہاں کہیں کسی امر بالا میں ہم جنسیت نہیں، سوائے ملک کے امن اور بہبودی کو نقصان پہنچنے کے اور کوئی نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ اگر انگلش حکومت آئرلینڈ پر عرصہ دراز تک قائم رہی تو اس کی وجہ صرف وہ ہم جنسیت اور میل جول ہے۔ جو رنگ کی اور مذہب کی مشابہت سے باہمی مناکحت اور تمدنی حالات اور عادات کا ایک سا ہونا اور باہمی سلوک ہے۔ جس پر جمہوری سلطنت بے خطرہ کے قائم ہو سکتی ہے لیکن بایں ہمہ انڈین نیشنل کانگریس کے مقاصد جس میں تاریخی واقعات زمانۂ گذشتہ و حال کے بھلا دینے پر اور ہندوستان کی مختلف اقوام کا لحاظ نہ کرنے پر اور یہ فرض کر لیتے ہیں کہ مسلمان اور مرہٹہ، برہمن اور کھتری، بنیا اور شودر، سکھ اور بنگالی، مدراسی اور پشاوری سب سے ایک قوم کی طرح برتاؤ کیا جا سکتا ہے۔ میں اس خیال کو وہم سے کم نہیں سمجھتا کہ جمہوری طریقہ کل اقوام اور مذاہب اور ممالک اور ازمنہ کے لیے یکساں موزوں ہے۔ ہندوستان جہاں مختلف الجنس اقوام ہیں ایسا ملک ہے جو سب سے کم جمہوری طریقہ کے لیے موزوں ہے اور اس تجربہ کو جو انڈین نیشنل کانگریس کرنا چاہتی ہے۔ ایک ایسا تجربہ سمجھتا ہوں جو شک اور مصائب سے بھرا ہوا ہے۔ کل اقوام ہند کے لیے اور خصوصاً مسلمانوں کے لیے جو ایک مینارٹی (MINORITY) ہیں۔

اگر کونسل کے ممبر انتخاب سے مقرر ہوں تو کسی طرح مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے برابر نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ ہندوؤں کی تعداد ہندوستان میں بمقابلہ مسلمانوں کے چوگنی ہے۔ پس جو طریقہ انتخاب کا قرار دیا جائے گا۔ اس سے اگر ایک مسلمان ممبر ہوگا تو چار ہندو ہوں گے۔ اور اگر بفرضِ محال کوئی ایسا قاعدہ رکھا جائے جس کی رو سے ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے ممبر برابر رہیں تو موجودہ حالت میں ایک مسلمان بھی ایسا نکلے گا جو ان ممبروں سے

کی کونسل میں مقابلہ ہندوؤں کے کام کرنے کے قابل ہو۔ غدر ہوا، ہندوؤں نے شروع کیا، مسلمان دل جلے تھے بیچ میں کود پڑے۔ ہندو تو گنگا نہائے جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانگریس ۱۸۸۶ء

مسلمانوں میں ہر قسم کی تعلیم کے تنزل کا لحاظ کر کے اور اس خیال سے کہ ان کی ہر قسم کی ترقی میں قومی اتفاق اور قومی امداد سے کوشش کی جائے مناسب معلوم ہوا کہ ہر سال ان امور پر غور کرنے کے لیے مختلف اضلاع کے لوگوں کا ایک جلسہ ہوا کرے جو محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے نام سے موسوم ہو۔ یہ جلسہ کسی خاص مقام پر مخصوص نہ ہوگا بلکہ ہر سال کسی ایسے مقام پر جہاں کے لوگ اس جلسہ کے منعقد ہونے کی خواہش کریں۔ اس کا انتظام منظور فرمائیں منعقد ہوا کرے گا۔

حبِ وطن

جب تک مذہبی معاملات میں ہم کو ہر قسم کی آزادی ہندوستان میں حاصل ہے اپنے مذہبی فرائض بے کھٹکے ادا کرتے ہیں۔ اذان جس قدر بلند آواز سے چاہیں مسجدوں میں دے سکتے ہیں شارع عام میں دعوتِ اسلام کر سکتے ہیں۔ پادری جو اعتراض مذہب اسلام پر کرتے ہیں ان کا جواب بے خوف و خطر دے سکتے ہیں۔ خود مذہب عیسوی پر اعتراض کر سکتے ہیں۔ اس کے خلاف کتابیں چھاپ سکتے ہیں اور عیسائیوں کو بلا کسی مزاحمت اور اندیشے کے جب وہ مسلمان ہونا چاہیں مسلمان کر سکتے ہیں۔ اس وقت تک انگریزی امن سے علیحدہ ہونا اور غنیم کو مدد دینا کسی مسلمان کا مذہبی فرض نہیں ہے اور اگر مسلمان ایسا کریں تو وہ گنہگار خیال کیے جائیں گے کیونکہ ان کا یہ فعل اس پاک معاہدہ کو توڑنا ہوگا جو رعایا اور حکام کے درمیان ہے اور جس کی پابندی مرتے دم تک کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ البتہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اگر آئندہ کوئی مسلمان یا کوئی اور بادشاہ ہندوستان پر حملہ کرے تو اس صورت میں باعتبار عمل درآمد کے ٹھیک ٹھیک مسلمان کیا کریں گے میں یقین کرتا ہوں کہ ایسی حالت میں مسلمان وہی کریں گے جو ان کی پولیٹیکل حالت ان سے کرا لے۔

میں نے قوم کا ہی گیت گایا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم کو اور قوموں سے محبت اور برادرانہ محبت نہیں ہے۔ ہماری قوم بہت خراب حالت میں ہے اس لیے اس کا گیت گایا جاتا ہے۔ ورنہ ہم اور قوموں سے بھی ایسی ہی محبت رکھتے ہیں جیسے اپنے عزیزوں سے اس کے اعلانیہ دو ثبوت موجود ہیں۔ ایک سید محمود اور مسٹر راس، دونوں میں نہایت دوستی اور برادرانہ اور عزیزانہ محبت ہے۔ جب سید مسعود پیدا ہوئے تو مسٹر راس اور ان کی میم صاحبہ نے موافق انگریزی رسم کے جو نہایت محبت پر دلالت کرتی ہے اپنا نام اس مولود مسعود کو دیا۔ اور ہم نے نہایت خوشی کے ساتھ ان کا نام اس کے نام کے ساتھ شامل کیا اور اسی سبب سے اس کا نام سید راس مسعود قرار پایا۔ دوسرا نمونہ دلی مشفق دوست راجہ جے کشن داس بہادر سی ایس آئی ہے۔ ان کو میں اپنا معزز اور محسن بھائی سمجھتا ہوں۔ سید محمود ان کو چچا کہتے ہیں اور سید راس مسعود دادا راجہ۔ ہم اپنے دوستوں سے محبت رکھنے میں فرق نہیں کرتے۔

ہندو مسلم اتحاد

ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں اس طرح آباد ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے۔ ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے۔ ایک آب و ہوا میں دونوں شریک ہیں۔ مقدس گنگا و جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں۔ مرنے جینے میں ہم دونوں نے مل کر ایک نئی زبان اردو پیدا کر لی جو نہ ہماری زبان تھی نہ ان کی۔

ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جائے گی اور اگر ایک دوسرے کو برباد کر دیں گے تو وہ کانڑی بن جائے گی۔ پس اے ہندوستان کے رہنے والے ہندو مسلم اب تم کو اختیار ہے کہ چاہو اس دلہن کو بھینگا بناؤ چاہو کانڑا۔

قوم کے نام

قوم کوئی چیز نہیں۔ جب تک کہ وہ قوم "قوم" نہ ہو۔ ایک ایک شخص جو اسلام کے گروہ میں داخل ہے وہ سب مل کر مسلمانوں کی ایک قوم کہلاتی ہے جب تک وہ اپنے عزیز مذہب کے پیرو اور پابند ہیں۔ تب ہی تک وہ قوم ہے۔ یاد رکھو کہ اسلام جس پر تم کو جینا ہے اور جس پر تم کو مرنا ہے اس کو قائم رکھنے سے ہماری قوم قوم ہے اگر کوئی آسمان کا تارا ہو جائے گر مسلمان نہ رہے تو ہم کو کیا وہ تو ہماری قوم ہی نہ رہا۔ پس اسلام قائم رکھ کر ترقی کرنا قومی بہبودی ہے۔

ہمارے باپ دادا اگر بہت عالی قدر تھے اور ہم نہیں ہیں تو ہم کو اس پر ناز کرنا نہیں چاہیے بلکہ رونا چاہیے کہ ہم اپنے بزرگوں کا بھی نام ڈبونے والے پیدا ہوئے۔ نواب خلیل اللہ خاں شاہجہانی کا آپ لوگوں نے نام سنا ہو گا۔ ان کے پڑپوتے کو میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ کہ لوگوں کے پاؤں دابنے آتا تھا اور دو چار پیسے لے جاتا تھا۔ تغلق آباد گاؤں میں جس قدر مسلمان گھسیارے آباد ہیں جو سارے دن گھاس کھود کر شام کو بیچتے ہیں میں نے خوب تحقیق کیا ہے کہ سلطان محمد عادل تغلق شاہ کی اولاد ہیں۔

تمنا

میں اپنی قوم کو آسمان کے ستارے کی مانند کرنا چاہتا ہوں جو رات کے وقت ہم کو دکھائی دیتا ہے۔ جب میں رات کو آسمان دیکھتا ہوں تو اس کے اس حصہ کو جو نیلا نیلا سیاہ رنگ ڈراؤنا دکھائی دیتا ہے کچھ بھی پروا نہیں کرتا۔ مگر ان ستاروں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ جو اس میں چمک رہے ہیں اور عاشقانہ انداز کی چمک سے ہم کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اور جن کی سبب سے اس تمام سیاہ رنگ آسمان کو عجیب قسم کی خوبصورتی حاصل ہوتی ہے۔

انتقال

مجھ کو رنج کے اس نقصان کا بے اعتبار رنج ہے زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں ہے خصوصاً مجھ سے شخص کی جو ایک حد تک زندگی پہنچ گئی ہے چند روز چند برس اور باقی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں یہ نقصان کالج کا کم سے کم اتنا جتنا کہ بنک کا غاصل ہو گیا ہے پورا ہو جائے -- اب وہ وقت قریب ہے کہ ہمیشہ چپ رہنا ہو گا۔ اس لیے خاموش رہنے کی عادت ڈالتا ہوں۔

(اور ۲۷ ؍ مارچ ۱۸۹۸ء کو سر سید احمد خاں ہمیشہ کے لیے چپ ہو گئے)

راقم سید احمد مخاطب بخطاب عارف جنگ

مولوی عبدالحق

میں نے جب ہوش سنبھالا تو مسلمانوں میں کچھ چل چل نظر آئی۔ مسلمان شرفا خصوصاً بڑے بوڑھے اپنے دیوان خانوں میں بیٹھتے تو کسی نہ کسی طرح علی گڑھ کالج یا سید احمد خاں کا ذکر نکل آتا۔ سید احمد خاں اس زمانے میں مسلمانوں کے ہر طبقے میں موضوع بحث تھے۔ ان کی نسبت کفر و الحاد کا فتویٰ تو عام تھا۔ مولوی صاحبان اس ذکر عزیز کو اپنے وعظوں، بحثوں، تحریروں اور تقریروں میں طرح طرح سے مزے لے لے کر بیان کرتے اور تخیل کی باگ ڈھیلی چھوڑ دیتے۔ سننے والے اور معتقدین ان باتوں پر اپنی طرف سے خوب خوب حاشیے چڑھاتے کوئی کہتا کہ ان مردود کی مرغی کھاتا ہے اور حلال حرام میں کچھ فرق نہیں کرتا۔ کوئی کہتا اس نے اپنا مذہب بدل دیا ہے۔ مرنے کے بعد انگریز اس کا مردہ لے جائیں گے ...... یہ سب کچھ تھا لیکن اتنی بات ضرور تھی کہ ان کی دانش مندی کے سب قائل تھے۔ مدرسے کا نقشہ اسی بنا پر مشہور رہا۔

میں یہ ساری باتیں سنتا رہتا تھا۔ کچھ سمجھ میں آتا تھا۔ اتفاق سے ایک روز میرے ایک ہم جماعت مجھے اپنے گھر لے گئے۔ وہاں میں نے "تہذیب الاخلاق" کے پرچے دیکھے اور پڑھنے شروع کیے۔ اس میں ایسا دل لگا کہ اس کے بعد میں ان سے پرچے مانگ لاتا اور پڑھتا رہتا۔ اب میری آنکھیں کھلیں کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ "تہذیب الاخلاق" کا مطالعہ مجھے کھینچ کر علی گڑھ لے گیا اور میں کالج کے اسکول میں داخل ہو گیا۔ پہلے کانوں نے پھر غائبانہ آنکھوں نے جلوہ دکھایا لیکن دور سے۔ دیکھنے اور قریب سے دیکھنے میں فرق ہے۔ جب میں کالج میں پہنچا تو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ آخری دو سال میں زیادہ قربت نصیب ہوئی اور سید علیہ الرحمت کو کام کرتے، ہم کلام ہوتے، اٹھتے بیٹھتے، لکھتے پڑھتے، بورڈنگ ہاؤس کے کمروں کی جانچ کرتے، مسجد میں نماز پڑھتے، جلسوں میں تقریر کرتے اور گرجتے دیکھا۔ ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔

میں جب اول روز مدرسۃ العلوم مسلمانان (ایم اے او کالج علی گڑھ) کے اسکول میں داخل ہوا اور بورڈنگ ہاؤس میں پرنسپل صاحب کی ہدایت سے کمرہ مل گیا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ نئی دنیا میں آ گیا ہوں۔ وہاں کے طالب علم، ان کی عادات اور شرارتیں اور مصروفیات، وہاں کے اساتذہ، وہاں کا ڈائننگ ہال اور اس کے کھانے، دنیا بدلی ہوئی تھی پر ان کا مزہ کبھی نہ بھولا۔ مسجد اور نمازیں اور موذن کی کڑک دار آواز، یہ سارا ماحول میرے لیے بالکل نیا اور عجیب سا تھا۔ ۱۸۸۸ء یا ۱۸۸۹ء کی بات ہے۔ اس وقت طالب علموں کی تعداد تین سو سے زیادہ نہ تھی۔ طالب علم ہندوستان کے ہر صوبے اور ہر علاقے کے تھے۔ بعض اوقات ہندوستان کے باہر کے بھی اگر داخل ہو جاتے تھے اور کوئی صوبائی امتیاز باقی نہ رہتا۔ سب اردو بولتے تھے اور بے تکلف بولتے تھے۔ میرے ایک ہم جماعت بنگالی چاٹگام کے اس قدر صاف اور بے تکلف اردو بولتے تھے اور ان کا لہجہ بھی ایسا تھا کہ میں ابتدا میں انھیں یو پی کے کسی مقام کے رہنے والے سمجھتا رہا۔ ایک خاص بات جو مجھے یہاں نظر آئی وہ قومیت کی جھلک تھی جو کسی دوسری جگہ نہیں پائی جاتی تھی۔ یہ کالج کے بانی سرسید احمد خاں کا طفیل تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں میں قومیت کا احساس پیدا کیا اور اس احساس کو تقویت ان اکابر قوم سے پہنچتی تھی جو کسی نہ کسی تقریب سے کالج میں یا سید صاحب کے پاس آتے رہتے تھے۔

انٹرینس دے کے آج کل میٹریکولیشن کہتے ہیں، کے امتحان میں کامیابی کے بعد میں کالج کی جماعتوں میں چلا گیا۔ اسکول میں سب معلم ہندوستانی تھے سوا ہیڈ ماسٹر ہورسٹ کے جو بلند قامت گراں ڈیل شخص تھے اور کسی فوج کے کرنیل معلوم ہوتے تھے۔ سیکنڈ ماسٹر ولایت حسین تھے جو بڑے محقق اور فرض شناس تھے۔ بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی انہیں کے ذمہ تھی اور وہ بورڈنگ ہاؤس ہی کے کمرے میں رہتے تھے۔ ان کے ذمہ اور بھی کئی کام تھے۔ مرحوم محسن الملک اور دیگر اکابر ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ میرے حال پر بڑی مہربانی فرماتے۔ وہ ہماری جماعت کو ریاضی بھی پڑھاتے تھے۔ ایک دن میں کسی وجہ سے ان کا کام کر کے نہ لایا۔ وہ بہت خفا ہوئے اور کہنے لگے میں تو تمہارا مداح بنا ہوا ہوں اور جگہ جگہ تعریف کرتا پھرتا ہوں اور تم ہی میرا کام کر کے نہیں لاتے۔ مجھے بہت شرم معلوم ہوئی اور اس کے بعد سے میں نے ان کے کام میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ میں کبھی کسی کھیل میں شریک نہ ہوا۔ مسٹر بیک کئی بار مجھے کمرے سے پکڑ کر کھیل کے میدان میں لے گئے۔ میں ساتھ ہو لیتا، فیلڈ میں پہنچ کر جل دے کر دوسری طرف نکل جاتا۔ یونین کے الیکشن میں بڑا ہنگامہ رہتا تھا۔ یونین کے جلسوں اور تحریکوں سے ہمیشہ الگ رہا۔ کالج میں کئی انجمنیں تھیں "لجنۃ الادب" وغیرہ۔ میں نے ان میں شرکت نہ کی۔ البتہ "اخوان الصفا" میں جس کے بانی پروفیسر آرنلڈ تھے دو ایک مضمون پڑھے۔ ایک مضمون میں نے سینٹ پال پر پڑھا۔ اس دن سے لڑکے مجھے سینٹ پال کہنے لگے۔ مطالعہ کا شوق مجھے ابتدا سے تھا۔ تعطیلوں میں طالب علم اپنے وطن چلے جاتے تھے۔ چھٹیوں کے دنوں میں پڑھنے کے لیے کچھ طالب علم لائبریری سے کچھ کتابیں مستعار لے جاتے تھے۔ یہ کام پروفیسر آرنلڈ کے سپرد تھا۔ میں بہت سی کتابیں مختلف نوعیت کی انتخاب کرتا تو آرنلڈ صاحب کہتے تمہیں بڑی ہوس ہے۔ اتنی ساری کتابیں کیسے پڑھو گے؟ وہ ٹھیک کہتے تھے۔ سب کتابیں کہاں پڑھ سکتا تھا، بعض ویسی کی ویسی ہی واپس لے آتا۔

کالج میں تمام پروفیسر سوا عربی، فارسی، سنسکرت اور ریاضی کے انگریز تھے۔ فارسی، عربی کے پروفیسر مولانا شبلی اور مولانا عباس حسین تھے۔ ریاضی کے بابو کرجی۔ مولانا شبلی شاعر، ادیب اور مؤرخ تھے ان کی جماعت میں بیٹھ کر جی خوش ہو جاتا تھا۔ وہ موقع موقع سے ادبی نکات اور اساتذہ کے اشعار اور لطائف یا تاریخی واقعات اس طرح بیان کرتے تھے کہ درس کا حق ادا ہو جاتا تھا۔ عباس حسین صاحب ذرا [illegible] تھے۔ ادبی ذوق سے عاری اور ضلع جگت کے استاد تھے۔ ضلع بولنے سے کبھی نہ چوکتے اور جو کوئی ان کے جواب میں ویسا ہی بول جاتا تو باغ باغ ہو جاتے۔ ایک بار کالج کی تنخواہوں میں بہت دیر ہو گئی۔ مولوی شبلی سے بہت شکایت کرنے لگے کہ تنخواہ نہ ملنے سے بہت تکلیف ہے۔ مولوی شبلی نے کہا آج کل روپے کا بہت توڑ ہے۔ روپے کے ساتھ توڑ کا لفظ سن کر اس قدر خوش ہوئے کہ ساری تکلیف بھول گئے۔ ریاضی کے پروفیسر بہت ہی شریف اور نیک انسان تھے۔ سب لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔ انٹرمیڈیٹ میں میرا ایک مضمون ریاضی بھی تھا اس لیے مجھے ان سے اکثر ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ حاضری لیتے وقت میرا نام "آبدل ہوک" کہہ کر پکارتے۔ بنگالی زبان میں ہر لفظ گول ہو جاتا ہے۔ گھوڑا، گھوری اور بنگالی بنگوری ہو جاتا ہے۔ حق بھی ہوک ہو جاتا ہے۔ پروفیسر آرنلڈ کی حیثیت کالج میں خاص بلکہ امتیازی تھی۔ وہ سچے علم کے طالب اور علم دوست تھے۔ کالج میں انہیں کبھی انگریزی لباس میں نہ دیکھا۔ وہ کالج میں عربی لباس میں آتے تھے۔ سر پر عمامہ، بدن پر عبا و قبا اور پیروں میں سلیم شاہی جوتا اور ہاتھ میں موٹے سے دستے کی چھتری لیے جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے ٹھیک وقت پر آ جاتے۔ راستے میں کوئی دیکھے تو یہ معلوم ہو کہ مولوی کسی مسجد میں درس دینے جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی تیسرے پہر مغرب سے قبل میرے کمرے میں آ جاتے اور مجھے سیر کے لیے ساتھ لے جاتے۔ راستے میں پوچھتے کہ آج کل کیا پڑھ رہے ہو، کیا کچھ لکھ رہے ہو۔ جب میں بتاتا کہ فلاں موضوع پر لکھ رہا ہوں تو اس کے متعلق مجھ سے بحث کرتے اور بعض کتابوں کی نشاندہی کرتے۔ ایک بار ایسی ہی سیر میں جب ان کے پوچھنے پر میں نے کہا کہ میں بابیوں کے مذہب پر کچھ لکھ رہا ہوں تو پوچھا تمہیں اس کا خیال کیسے پیدا ہوا اور اس کے لیے

مجھے مسالا کہاں سے ملا۔ دوسرے دن انہوں نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے چند نمبر بھیجے جن میں پروفیسر براؤن نے بابی مذہب پر مضامین لکھے تھے۔ پروفیسر آرنلڈ میں عالمانہ اور طالب علمانہ دونوں شانیں پائی جاتی تھیں۔

ہمارے پرنسپل مسٹر تھیوڈور بیک چھریرے بدن کے بڑے مستعد، تیز آنکھیں چمکتی ہوئی، ذہین شخص تھے۔ اس منصب کے لیے ان کا انتخاب سید محمود نے کیا تھا۔ کیمبرج یونیورسٹی کے ممتاز گریجویٹوں میں سے تھے اور وہاں کی یونین کے صدر بھی رہ چکے تھے جب یہ کالج میں آئے تو بالکل نوجوان تھے اور ہم سے خوب گھل مل گئے .... کچھ عرصے کے بعد جب انہیں ہندوستان کی ہوا لگی اور یہاں کی تاریخ و حالات سے زیادہ واقفیت ہوئی تو رفتہ رفتہ ان کا جھکاؤ سیاست کی طرف ہو گیا۔ اس زمانے میں انڈین نیشنل کانگریس کا ملک بھر میں چرچا تھا۔ سر سید کی مخالفت سے ملک میں ایک عجیب ہنگامے کی سی حالت پیدا ہو گئی تھی .... یہ ایک طویل بحث ہے یہاں اس موضوع پر کچھ لکھنا بے موقع ہوگا۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا مسٹر بیک کو یہ زریں موقع ہاتھ آیا اور انہوں نے نیشنل کانگریس کے خلاف خوب زہر اگلنا شروع کیا۔ مسلمان بہت خوش ہوتے۔ مسٹر بیک میں کچھ کچھ ٹھیٹ انڈین رنگ پیدا ہو چلا تھا۔ سو بجائے [illegible] کے [illegible] حکم فرمانے لگے تھے۔ مگر میں تحکمانہ شان ہے وہ [illegible] میں کہاں۔ یہ زمانہ تھا کہ انگریز اپنے آپ کو لاٹ صاحب سمجھتا اور ہر ہندوستانی کو اپنی رعایا۔ جب تک سر سید زندہ رہے یہ دبے دبے رہے۔ ان کے مرنے کے بعد یہ کھل کھیلے اور کالج کے ٹرسٹیوں تک کو طفل مکتب سمجھنے لگے اور ان پر حکم چلانے لگے۔ گورنمنٹ میں ان کا رسوخ تھا اور اعلیٰ حکام سے راہ و رسم تھی اس لیے ٹرسٹی بھی ان سے ڈرتے تھے۔ میرا یہ گمان ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ غلط نہیں کہ وہ مسلمانوں سے اپنی قوم کا کام لیتے تھے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں لارڈ کرزن ہندوستان کے وائسرائے ہو کر آئے۔ کرزن زبردست امپیریلسٹ تھے ان کے دماغ میں شہنشاہیت کی بو سمائی ہوئی تھی۔ مسٹر بیک ان سے جا ملے۔ کرزن بھی کیمبرج کے نامور گریجویٹ تھے اور یونیورسٹی کی یونین کے صدر رہ چکے تھے۔ بیک کرزن کی ٹکر کے آدمی تھے یہ شملے میں کرزن سے پینگیں بڑھا رہے تھے کہ وہاں ہیضے سے ان کا انتقال ہو گیا۔ اگر جیتے رہتے تو کرزن کی حکومت میں بڑے آدمی ہوتے اور بڑا مقام حاصل کرتے۔ اس خیال کے آتے ہی میرا دل کانپ اٹھتا ہے کہ نامعلوم اُس وقت مسلمانوں کا کیا حشر ہوتا۔ ایک مشہور ہندی دوہے کا ٹکڑا "نا گھر میرا نا گھر تیرا چڑیا رین بسیرا رے" انہیں بہت پسند تھا اور اکثر پڑھا کرتے تھے یہی ان کی قبر پر کندہ ہے۔

ابھی مجھے کالج میں آئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ ایک دن میں کیا دیکھتا ہوں کہ وکٹوریہ گیٹ سے داخل ہوتے ہی جو پکی بارک شروع ہوتی ہے اُس کے برآمدے میں کچھ طالب علم کھڑے ہیں اور ان کے بیچ میں مسٹر بیک تشریف رکھتے ہیں۔ طالب علموں کے ہاتھ میں لمبی لمبی فردیں تھیں جن پر ناموں کی فہرست تھی۔ طالب علم یہ فہرست مسٹر بیک کو دکھا رہے تھے۔ یہ جمعہ کا دن تھا طالب علموں نے شہر کی جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کی تھی اس زمانے میں مسٹر بیک انڈین نیشنل کانگریس کے خلاف مسلمانوں کے ناموں کی فہرستیں انگلستان کی پارلیمنٹ کو بھیج رہے تھے۔ یہ طالب علم مسٹر بیک سے کہہ رہے تھے کہ ہم نے ان فردوں پر نمازیوں سے یہ کہہ کر دستخط لیے کہ ہندو "گاؤکشی" کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں اور قانون پاس کرانا چاہتے ہیں، ہم اس کے خلاف گورنمنٹ میں معروضہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مسٹر بیک یہ سن کر ہنسے۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی اور افسوس ہوا کہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ذمہ دار انگریز ایک ایسے فعل پر خوشی کا اظہار کر رہا ہے جو دیانت اور راستی کے خلاف ہے .... انگریز بلاشبہ معاملات میں بہت احتیاط اور دیانت سے کام لیتا ہے لیکن جہاں قومی مفاد کا معاملہ آتا ہے تو ضمیر، انصاف اور راستی کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں بھی اس کا ایسا تلخ تجربہ ہوا ہے جسے ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد بھارت اور پاکستان کے بعض سرحدی اضلاع تنازعے کے چکانے

کے لیے انگلستان کی ہائی کورٹ کے ایک جج کو حکم بنایا گیا اور یہ قرار پایا کہ یہ جو فیصلہ کرے گا وہ ہر دو فریق کو تسلیم کرنا پڑے گا اور اس کے خلاف کوئی اپیل نہ ہو سکے گی۔ مسٹر جناح کا خیال تھا کہ مسٹر ریڈکلف انگلستان کی ہائی کورٹ کا جج ہے وہ کبھی ایسی بات نہیں کرے گا جو راستی و انصاف کے خلاف ہو۔ اس نے جو فیصلہ کیا وہ ہمارے سامنے ہے پاکستان جسے اب تک رو رہا ہے اور نہ معلوم کب تک روتا رہے گا۔ بعد میں قائدِ اعظم نے اس فیصلے کے خلاف بہت سخت سست کہا اور کہا اور لعنت ملامت کی لیکن کیا ہوتا ہے زبان دے چکے تھے ماننا ہی پڑا۔

مسٹر بیک مسلمانوں کی سرشت سے خوب واقف ہو گئے تھے اور ان کے بہلانے کے لیے طرح طرح کے جتن کرتے مثلاً کبھی جبہ اور ترکی ٹوپی پہنے آ پہنچتے یا کانفرنس کے جلسے میں تقریر کرتے کرتے مسدس حالی کا کوئی بند انگریزی لہجے میں پڑھتے تو مسلمان خوشی سے اچھل پڑتے۔ ان کا پورا نام تھیوڈور بیک تھا۔ مسلمان تھیوڈر بیگ کہنے لگے البتہ ایک بات ضرور کہوں گا کہ انہیں طالب علموں سے بہت ہمدردی تھی۔ اُن کی بہبودی کے لیے ملازمتیں دلانے میں کوشش کرتے یا جب کبھی پولیس یا ریلوے اسٹیشن والوں سے لڑکوں کا جھگڑا ہو جاتا اور مار پیٹ کی نوبت آ جاتی تو مسٹر بیک ہمیشہ اپنے طالب علموں کی حمایت کرتے۔

کالج جب نیا نیا قائم ہوا تو سر سید کا یہ معمول تھا کہ...... صبح کو کالج کی عمارت باغ وغیرہ دیکھنے آتے۔ اس زمانے میں جب کہ اسٹریچی ہال قریب تکمیل کے تھا اور آس پاس کے کمروں کی ابھی بنیادیں ہی پڑی تھیں ایک دن میں اور خواجہ غلام الثقلین مرحوم مسجد روبہ کے ایک کمرے کی بنیاد پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں سید صاحب تام جھام میں آتے ہوئے نظر آئے مسجد کی سیڑھیوں کے پاس ٹھہر گئے۔ ہمیں جو دیکھا تو آپ نے مجھے فرمایا کہ اس کے ساتھ مت پھرا کرو تم کو شیعہ کر دے گا۔ میں نے کہا حضرت اب تو لوگ شیعہ رہے نہ سنی۔ میرا اشارہ اس مذہب کی طرف تھا جسے عام لوگ نیچری کہتے اور آپ سے منسوب کرتے تھے۔ فرمانے لگے اسے ایسا بنا دو تو جانوں۔

سید محمود کی چیف جسٹس ہائی کورٹ الہ آباد سے اَن بن ہو گئی تھی اور استعفیٰ دے کر علی گڑھ آ گئے تھے۔ ایک بار جو سید صاحب کے پاس گیا تو مجھے پچھلے کمرے میں لے گئے۔ کوٹھی میں سب سے بڑا کمرہ یہی تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ چیف جسٹس کا جواب لکھ رہے ہیں۔ چیف جسٹس نے اُن کے خلاف گورنمنٹ میں ۵۰ صفحے کی رپورٹ بھیجی تھی سید محمود نے اس کی تردید میں پانچ سو صفحے کا جواب لکھا۔ میں اس میں کبھی کبھی شریک ہو جاتا تھا مثلاً کسی حوالے کی تلاش کرنے میں یا کسی اقتباس کی نقل کرنے میں۔ تعلیم پر کتاب بھی انہوں نے اسی زمانے میں تالیف کی۔ ایک اور اچھی اور مفید تالیف بھی شروع کی اور وہ محمڈن لا تھی۔ اس کے پروف کئی بار میرے سامنے آئے۔ میں ہر روز سہ پہر کو سید محمود کے پاس چلا جاتا۔ کبھی روز دیر ہو جاتی تو آدمی بھیج کر بلا لیتے۔ رات کے کھانے کے لیے روک لیتے۔ اس طرح کوئی ڈیڑھ سال شب کا کھانا میں سید صاحب اور سید محمود کے ساتھ کھاتا رہا۔ کھانے پر کبھی کبھی ایک آدھ اور بھی شریک ہو جاتے۔ کھانے کی صحبت بھی بہت دلچسپ ہوتی تھی۔ کھانے کے بعد پھر سید صاحب کے ساتھ اُن کے کمرے میں چلا جاتا اور مختلف امور اور موضوعات پر گفتگو رہتی...... کبھی چائے آتی تو سید محمود ایک پیالی مجھے بھی دیتے۔ میرے زمانے میں چائے کا رواج نہ تھا۔ میں ایک دو گھونٹ پی کر چھوڑ دیتا تو وہ میری چائے پی لیتے اور کہتے "سؤر المؤمنین شفا"۔ گالیاں بھی کبھی کبھی خوب دیتے تھے ایک بار مولانا شبلی سے کہنے لگے مولانا! آپ بہت دن سے ادھر نہیں آئے۔ مولانا نے کہا آپ گالیاں بہت دیتے ہیں۔ آبرو موتی کی سی آب ہے آب جاتی رہے تو وہ موتی کچھ بھی نہیں۔ سید محمود نے کہا مولانا میں آدمی کو دیکھ کر گالی دیتا ہوں! —— وہ بڑے ظریف اور بذلہ سنج بھی تھے۔ افسوس شراب نے کہیں کا نہ رکھا۔ رات کو جب میں اُن کے پاس بیٹھا ہوتا تو کچھ کچھ دیر کے بعد وہ غسل خانے میں جاتے اور پی کے چلے

آ سکے۔

غالباً ۱۸۹۹ء یا ۱۹۰۰ء کا ذکر ہے جب میں مدرستہ العلوم مسلمانان علی گڑھ میں طالب علم ہی تھا۔ مولانا حالی اس زمانہ میں یونین کے پاس کی بنگلیا میں مقیم تھے میں ان تعطیلوں کے زمانے میں وطن نہیں گیا اور بورڈنگ ہاؤس ہی میں رہا اکثر مغرب کے بعد کچھ دیر کے لیے مولانا کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا مولوی صاحب اس زمانے میں "حیات جاوید" کی تالیف میں مصروف تھے اور ساتھ ہی "یادگار غالب" کو بھی ترتیب دے رہے تھے۔

بات میں بات نکل آتی ہے جب حیات جاوید شائع ہوئی تو مولانا نے تین نسخے مجھے بھیجے ایک میرے لیے، ایک مولوی عزیز مرزا کے لیے اور تیسرا مولانا شبلی کے لیے جو اس وقت اتفاق سے حیدر آباد میں وارد تھے میں نے یہ کتاب لے جا کر ان کی خدمت میں پیش کی اس وقت وہاں اور بھی کئی اشخاص موجود تھے مولانا شبلی نے یہ کتاب دیکھتے ہی فرمایا "کذب و افترا کا آئینہ ہے" مولانا نے کتاب کو پڑھے بغیر ہی یہ رائے دے دی۔ ...... ان کی طبیعت میں ضبط بالکل نہ تھا۔ ...... اس کے برخلاف مولانا حالی بڑے صاحب دل آدمی تھے۔ مجھے اپنے زمانے کے بعض نامور اصحاب سے اور اپنی قوم کے اکثر بڑے بڑے شخصوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن مولانا حالی جیسے پاک سیرت اور خصائل کا بزرگ ابھی تک کوئی نہیں ملا۔ آخر میں ان کی دو بڑی تمنائیں تھیں ایک تو اردو زبان میں تذکیر و تانیث کے اصول منضبط کرنا اور ایک کوئی اور بات تھی جو اس وقت میرے ذہن سے بالکل نکل گئی ہے۔ جب میرا تقرر اورنگ آباد ہوا تو میں نے مولانا کی خدمت میں لکھا کہ یہاں کی آب و ہوا بہت معتدل اور خوشگوار ہے پانی بہت لطیف ہے اور خصوصاً جس مقام پر میں رہتا ہوں وہ بہت ہی پر فضا ہے آپ کچھ دنوں کے لیے یہاں تشریف لے آئیے صحت کو بھی فائدہ ہوگا اور جو کام آپ کرنا چاہتے ہیں وہ بھی آسانی سے انجام پا جائے گا۔ کوئی مخل اوقات بھی نہ ہوگا اور یقین ہے کہ آپ یہاں آ کر بہت خوش ہوں گے وہ آنے کے لیے بالکل آمادہ تھے مگر ان کے فرزند سجاد حسین صاحب اور دوسرے عزیز و اقارب رضامند نہ ہوئے عذر یہ تھا کہ دور دراز کا سفر ہے۔ ضعیفی کا عالم ہے۔ طبیعت یوں بھی ناساز رہتی ہے ایسی حالت میں اتنی دور کا سفر خلاف مصلحت ہے مولانا نے یہ سب کیفیت مجھے لکھ کر بھیجی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ جب تم ادھر آؤ تو ایک روز کے لیے پانی پت چلے آنا۔ اس وقت میں تمہارے ساتھ ہو لوں گا کوئی مجھ کو روک نہیں سکے گا۔ جب میں گیا تو وہ بیمار ہو چکے تھے اور بیماری نے اتنا طول کھینچا کہ جان لے کر گئی۔

[illegible] میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ علی گڑھ ہی میں ہوا۔ اسی سال اور اسی کانفرنس کے اجلاس میں راس مسعود کی بسم اللہ ہوئی۔ اس تقریب کے وقت کانفرنس کے تمام نمائندے اور کالج کے اکثر طالب علم موجود تھے۔ ...... تقریب کے خاتمے پر شیرینی تقسیم ہوئی ان موتی چور لڈوؤں کا مزہ مجھے اب تک یاد ہے۔ ایک روز میں سید محمود کے پاس بیٹھا تھا۔ مسعود اندر گھر میں سے نکل کے آئے تو میں نے کہا "اب بڑا ہوتا جاتا ہے اس کی باقاعدہ تعلیم کا انتظام نہیں کرتے۔" کہنے لگے میں اسے خود پڑھاؤں گا۔ ...... محمود تو کیا پڑھاتے دادا ہی ان کے لکھنے پڑھنے کی نگرانی کرتے تھے۔ ایک سال میں گرمی کی تعطیلوں میں کالج ہی میں رہا۔ ایک دن سید صاحب نے مولوی حمید الدین مرحوم اور مجھ سے فرمایا کہ میرے کتب خانے کی کتابیں بہت بے ترتیب رکھی ہیں انہیں آپ کسی وقت ترتیب سے لگا دو۔ ...... ایک روز دوپہر کو اسی کمرے میں ہم کتابیں ٹھیک کر رہے تھے اور سید صاحب دوسری طرف تخت پر لیٹے ہوئے تھے اور مسعود ان کی بغل میں لیٹا تھا۔ اتنے میں سید صاحب نے اپنی بھاری گونجیلی آواز میں مسعود کو لوری سنانی شروع کی۔ ہمیں ان کے گانے کی آواز سن کر اس قدر ہنسی آئی کہ ضبط نہ کر سکے اور چپکے سے دوسرے دروازے سے باہر بھاگ گئے۔

اسکول کے معلمین میں مولوی جلیل احمد صاحب کی دھج بھی نرالی تھی، وہ عربی کے استاد تھے۔ چھوٹے قد کے ٹخنوں سے اونچا شرعی پاجامہ کرتا انگرکھا۔ وہ بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے۔ ان کا کمرہ وہاں تھا جہاں پکی بارک ختم اور کچی بارک شروع ہوتی ہے، دونوں کے بیچ میں تھا۔ عربی کے فاضل تھے۔ اسلامی تاریخ اور جغرافیہ پر بھی ان کی نظر تھی۔ اپنے کمرے میں بیٹھے یا لیٹے آنکھوں سے لگائے کتاب پڑھتے رہتے تھے جب کمرے کے سامنے سے کسی کے آنے جانے کی آہٹ سنتے تو کہتے کون ہے؟ کوئی طالب علم یا استاد ہوا تو چپ ہو جاتے اور جو کوئی بیرا یا ملازم ہوتا تو کہتے چلم بھر لاؤ۔ بہت سیدھے سادے شخص تھے تنخواہ ملتی تو تکیے کے ایک طرف دری کے نیچے رکھ دیتے۔ بیرا کچھ نہ کچھ اس میں سے چرا لیتا۔ ایک بار انہوں نے کہیں سے آم منگائے اور کمرے میں رکھے۔ لڑکوں کو معلوم ہوا تو غیر حاضری میں چٹ کر گئے۔ واپس آئے تو دیکھا آم غائب ہیں۔ کہنے لگے آم کھائے مضائقہ نہیں، گٹھلیاں تو چھوڑ جاتے۔ میں نے یہ آم باغ میں بونے کے لئے منگائے تھے۔ کبھی کبھی چھٹیوں کے بعد گھر سے آتے تو بہت سی کھیر یا ساول لاتے اور اپنے بعض طالب علموں کو بھی کھلاتے۔ کبھی مجھے اپنے ساتھ فالیز پر لے جاتے۔ چاقو جیب میں رہتا۔ خربوزے کاٹ کاٹ کر خود بھی کھاتے اور مجھے بھی کھلاتے۔ کھانے کے شوقین تھے۔ جب میں مڈل پڑھتا تھا تو میں نے نجی طور پر عربی پڑھی تھی۔ علی گڑھ آ کر میں نے دوسری زبان فارسی لی۔ میں خوش تھا کہ میں نے فارسی لی اور اس کی بدولت مجھے شبلی جیسے صاحبِ ذوق استاد ملے۔ اردو بیچاری کی اس زمانے میں اسکولوں اور کالجوں میں رسائی نہ تھی۔ مولوی جلیل احمد مجھ سے کہا کرتے عربی پڑھو، یہ تمہارے کام آئے گی چنانچہ انہوں نے مجھے الف لیلیٰ پڑھانی شروع کی۔ کہتے تھے اس کی زبان بہت فصیح اور سادہ ہے اور اس میں قسم قسم کے معاملات کا ذکر آتا ہے۔ عربی سے اردو میں اور اردو سے عربی میں ترجمہ بھی کرتا۔ یعنی الف لیلیٰ کا جو سبق پڑھتا اس کی کچھ سطروں کا ترجمہ اردو میں کرتا اور دوسرے روز اسی اردو کا ترجمہ عربی میں کرتا۔ صرف و نحو کے قواعد وہ مجھے زبانی لکھوا دیا کرتے تھے۔ خوب آدمی تھے۔ یہ اچھا ہوا کہ وہ اسکول سے کالج میں لے لئے گئے۔ وہ اسکول کی گوں کے نہ تھے بعد میں شمس العلماء کا خطاب بھی ملا۔ باتیں کرتے تو ان کے جملے مشکل سے ہوتے۔ فعل کمتر ادا ہوتا تھا۔ اسماء و صفات اور حروفِ ربط سے مطلب ادا کرتے۔

میرے زمانے میں بورڈروں کی تعداد کوئی تین سو تھی۔ ہندو طالب علم بھی تھے۔ زیادہ تر ڈے اسکالر تھے۔ شہر سے پڑھنے آتے تھے میرے ہم جماعت بھی کئی ہندو تھے۔ میرے ہم جماعت جنہوں نے بعد میں نام پایا اور مشہور ہوئے یہ تھے ڈاکٹر ضیاء الدین، مولوی حمید الدین، مولوی ظفر علی خاں، حافظ ولایت اللہ، سید محفوظ علی، شیخ عبداللہ۔ انٹرنس میں سیٹھ یعقوب حسن میرے ساتھ پڑھتے تھے انٹرنس میں کامیاب ہونے کے بعد وہ چھوڑ کر چلے گئے۔ سوا شیخ عبداللہ کے باقی سب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ شیخ عبداللہ صاحب اس قدر ضعیف اور نحیف ہو گئے ہیں کہ کام سے معذور ہیں۔

وہ کالج جو کبھی [illegible] تھا مسلمانانِ ہند کی تہذیب و تعلیم اور سیاست کا مرکز بن گیا۔ یہاں سے جو آواز اٹھتی وہ تمام مسلمانوں کی آواز سمجھی جاتی تھی۔ اس کالج کا مسلمانوں پر کیا اثر ہوا ایک الگ بحث کا موضوع ہے لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مسلمانوں میں بیداری اور حیاتِ نو پیدا کرنے میں اس کالج نے جو کام کیا ہے وہ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

۳

میں نے بہت ڈرتے ڈرتے انجمن ترقی اردو کے بارِ گراں کو اپنے ذمے لیا کیوں کہ جس قدر یہ کام ضروری تھا اُسی قدر مشکل بھی تھا......

ایک مشکل اس کام میں کافی سرمایہ بہم پہنچانے کی تھی۔ یہ کام اس قدر وسیع اور ایسا اہم تھا کہ جب ہزاروں نہیں، لاکھوں کا سرمایہ نہ ہوتا اس کا خاطر خواہ چلنا ممکن نہیں تھا.... اگرچہ میں اس عزت کے قابل نہیں لیکن حسنِ اتفاق سمجھیے یا سوءِ اتفاق، مجھے علی گڑھ کا طالب علم ہونے کا فخر حاصل ہے۔ مگر میں کالج میں ایک متھا طالب علم تھا، اور جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں، نہ کبھی کھیلوں میں شریک ہوا، نہ یونین کلب میں حصہ لیا اور نہ انتخاب پریذیڈنٹ و سیکرٹری کے ہنگامے میں شامل ہوا۔ غرض جو خوبیاں ایک علی گڑھ کالج کے طالب علم کے لیے طغرائے شرافت ہیں ان میں سے مجھ میں ایک بھی نہ تھی لیکن نامعلوم کیوں کر کبھی کبھی چندہ کرنے کی عزت مجھے حاصل ہوتی۔ یہ سنت سرسید کی تھی مگر وہ طالب علمی کا زمانہ تھا۔ طالب علم بڑا آزاد ہوتا ہے...... وہ جس سے چاہتا مل سکتا اور جہاں چاہتا گھس جاتا ہے۔ نہ اُسے کسی کے چیں بجبیں ہونے کا ڈر، نہ کسی کے انکار سے شرم...... لیکن اتنی مدت کے بعد جب انجمن کا بوجھ سر پر آ پڑا اور اس کی خاطر چار و ناچار چندے کے لیے ہاتھ پھیلانا پڑا تو معلوم ہوا کہ یہ کیسی کڑی منزل ہے۔

مجھ پر دو وقت ایسے گزرتے ہیں جب میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس کام کو میں نے اپنے سر لیا ہے اس کا اہل نہیں ہوں۔ ایک تو اس وقت جب میں کسی سے چندہ مانگنے جاتا ہوں۔ بہت کچھ سوچ کے جاتا ہوں لیکن مانگتے وقت زبان بند ہو جاتی ہے اور آنکھیں جھک جاتی ہیں، غیرت مانع ہوتی ہے۔ دوسرے جب کسی سے معاملہ کرنے بیٹھتا ہوں، کاروباری آدمی کی طرح اس طرح سودا کرنا کہ پسینہ آ جاتے، مجھے نہیں آتا، اور مروت غالب آجاتی ہے۔ ان کاموں کے لیے ڈھٹائی کی ضرورت ہے، یہ وصف شریف فطرتی ہوتا ہے سیکھنے سے نہیں آتا اور مشکل یہ ہے کہ دیکھو بنو تو بناوٹ کھل جاتی ہے...... بعض اوقات مجھے ایسے حضرات کے دروازوں پر بھی حاضر ہونا پڑا جن سے کبھی ملنا بھی عار سمجھتا تھا لیکن انجمن کی خاطر سب کچھ کرنا پڑا۔ اس کوچے میں ہر ذلت، عزت تھی!

آخر دسمبر ۱۹۰۳ء میں جب اوّل اوّل انجمن کی بنیاد رکھی گئی تو اس کا مقصد ادبی اور علمی قرار دیا گیا تھا یعنی ترجمے، ترتیب و تالیف کے ذریعے اُردو زبان کے ادبی و علمی سرمائے میں اضافہ کرنا۔ اس مقصد کی ۱۹۳۶ء تک پوری پوری پابندی کی گئی۔ انجمن نے کبھی ہندی یا کسی دوسری زبان کی مخالفت نہ کی یہ اس کے اصول اور شعار کے خلاف تھا البتہ جب اس کی مخالفت کی گئی اور اس کے رستے میں روڑے اٹکائے گئے تو اسے مجبوراً مدافعت کرنی پڑی۔ حفاظت اور سلامتی کے لیے مدافعت لازم ہے۔

۱۹۳۵ء میں مسٹر کنہیا لال منشی (تعلیمی وزیر) مجھ سے حیدرآباد آکے ملے اور بیان کیا کہ ہم ایک ایسی انجمن بنانا چاہتے ہیں جس میں ہر زبان کے ادیب شریک ہوں تاکہ ایک دوسرے کے ادب کے حالات اور معلومات سے واقفیت ہو سکے۔ آپ اس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر ہو جائیے چونکہ یہ ادبی معاملہ تھا میں نے منظور کر لیا۔ ۱۹۳۶ء میں اس کا سالانہ جلسہ ناگپور میں گاندھی جی کی صدارت میں ہوا۔ اس انجمن کا نام اکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد تھا۔ اس میں ایک مسئلہ یہ پیش ہوا کہ پریشد کی زبان کیا ہونی چاہیے۔ مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا ہندوستانی۔ گاندھی جی نے دریافت کیا کہ میں ہندوستانی کیوں تجویز کرتا ہوں۔ میں نے کہا اس لیے کہ انڈین نیشنل کانگرس کا یہ ریزولیوشن ہے کہ کانگرس کی اور ملک کی زبان ہندوستانی

ہوگی نیز کانگریس کے آئین کی دفعہ ۱۸ میں صاف طور سے یہ درج ہے۔ گاندھی جی نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ پندرہ برس سال کے بعد مطلب ہوا تو انگریزی کام کیسے چلے گا۔ گاندھی جی ہندی کے حق میں تھے۔ جب بحث زیادہ بڑھی تو گاندھی جی نے پینترا بدلا اور ایک نئی زبان اور نیا نام تجویز کیا یعنی ہندی ہندوستانی۔ میں نے پوچھا ہندی سے آپ کی کیا مراد ہے فرمایا وہ زبان جو کتابوں میں ہے بول چال میں نہیں۔ پھر میں نے پوچھا ہندوستانی سے آپ کا مطلب کیا ہے تو فرمایا وہ زبان جو بول چال میں ہے جو کتابوں میں نہیں۔ اس پر میں نے دریافت کیا تو پھر ہندی ہندوستانی زبان کیا ہوئی۔ فرمایا وہ زبان جو آگے چل کر ہندوستانی ہو جائے گی۔ میں نے عرض کیا کہ جب ہندوستانی پہلے سے موجود ہے تو پچاس سال اور انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے اس پر انہوں نے جھنجھلا کر کہا میں ہندی نہیں چھوڑ سکتا۔ میں نے عرض کیا کہ جب آپ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم اُردو کیوں چھوڑیں۔ اس پر انہوں نے ایک غلط اور عجیب و غریب جواب دیا جس کی اُن سے توقع نہیں ہو سکتی تھی فرمایا مسلمان چاہیں تو اُردو رکھ سکتے ہیں یہ ان کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حرفوں میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمان بادشاہوں نے پھیلائی۔ اس کے بعد بحث کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی اور میں نے مجلس چھوڑ دی۔ ساہتیہ پریشد کی کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا اب ہماری آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا کہ زمانے کا رنگ کچھ اور ہے۔

انجمن اب تک خاموشی سے علمی اور ادبی کام کر رہی تھی۔ اب اسے ایک نئی مہم سے سابقہ پڑا چنانچہ اس پر غور کرنے کے لیے اسی سال علی گڑھ میں ایک کل ہند اُردو کانفرنس منعقد کی گئی جس میں علاوہ دوسرے مسائل کے ایک مسئلہ قابلِ غور یہ تھا کہ انجمن کا مستقر کہاں ہو کیوں کہ اب حالات بدلنے سے حیدرآباد میں وہ کام حسب منشا انجام نہیں پا سکتا۔ اسی کانفرنس میں یہ طے پایا کہ انجمن کا صدر مقام دلی میں منتقل کر دیا جائے۔ ملک میں اس وقت کانگریس حکومتوں کا راج تھا اس لیے اُردو کی طرف سے تشویش پیدا ہو گئی اور انجمن کو ہر علاقے اور ہر مقام پر نظر رکھنی پڑی۔ بمبئی، یوپی، بہار، اور خاص کر سی پی کی حکومت سے بڑے معرکے کرنے پڑے۔

انجمن کے سیکرٹری کی حیثیت سے سی پی، ناگ پور، تو خیر میں بار بار گیا لیکن ہندوستان کے دوسرے صوبوں اور علاقوں میں بھی اسی غرض سے دورے کیے۔ بنگال، بہار، یوپی، سندھ، کشمیر، گوالیار، رانچی (چھوٹا ناگ پور)، جنوبی ہند میں مدراس، آندھرا، شمالی ارکاٹ، جنوبی ارکاٹ، ملیبار، تامل ناڈ، تراونکور تک گیا اور راس کماری پر جا کر دم لیا۔ لوگ مبالغے سے "کشمیر سے راس کماری تک" کا فقرہ کہا کرتے ہیں لیکن میں نے حقیقت میں کشمیر سے راس کماری تک کی خاک چھانی ہے۔ ...... مجھے راس کماری میں بھی اُردو بولنے والے ملے۔ ان مقامات پر جگہ جگہ تقریریں کیں، اُردو مدرسے دیکھے، لوگوں کو اُردو کی امداد کے لیے آمادہ کیا، انجمن کی شاخیں قائم کیں، معترضین کے جواب دیے، غلط فہمیوں کا ازالہ کیا اور غلط بیانیوں کی تردید۔ جہاں جہاں اُردو پر آنچ آتی سینہ سپر ہو کر سامنے آتا کہیں کامیابی ہوتی کہیں ناکامی۔ کامیابی سے پھول کر غافل نہ ہوا اور ناکامی سے میری آس نہ ٹوٹی۔ میں برابر کام میں لگا رہا اور یہی میری زندگی کا مشن تھا۔ میں بے وجہ مارا مارا نہیں پھرا، مجھے دیوانے کتے نے نہیں کاٹا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس عمر میں مجھے آسائش کی ضرورت تھی۔ علاوہ اس کے کئی ضروری علمی و ادبی ایسے کام تھے جنہیں بیٹھ کر پورا کرنے کی ضرورت تھی لیکن کیا کرتا مجبور تھا۔ عربی کی ایک مشہور مثل ہے کہ کسی چیز کی محبت انسان کو اندھا اور بہرہ

کرتی ہے۔ مجھے اُردو سے محبت ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ یہ محبت جنون کی حد تک ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اُردو سے میری وابستگی کا یہ سلسلہ پوری قوم کی تہذیب، ثقافت، تصورات، نظریات اور اس کے عزائم اور حوصلوں سے ملتا ہے اور کون ایسا بدبخت ہے جسے اپنی قومی روایات اور تہذیبی اقدار سے محبت نہ ہو گی۔

عثمانیہ یونی ورسٹی کی تجویز، اس کے منصوبے اور پھر اس کے قیام کے ہر ہر مرحلہ پر شروع اور عملی طور پر میں اس سے وابستہ رہا تھا۔ اس لیے جب انجمن ترقی اُردو ہند کا دفتر اورنگ آباد سے دلی منتقل ہوا تو میں نے ۱۹۳۹ء میں ایک کل ہند انجمن ترقی اُردو کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا اور پھر اس کانفرنس میں اتفاق رائے سے ایک تجویز بھی منظور ہوئی۔۔۔۔۔۔ کانفرنس کے ختم ہونے کے بعد میں نے اس تجویز کے سلسلے میں متعلقہ یونی ورسٹیوں کے ارباب اختیار سے خط و کتابت شروع کی، لیکن یہ زمانہ سخت سیاسی خلفشار کا تھا اور دوسری عالمگیر جنگ کی وجہ سے حالات حد درجہ غیر یقینی ہو گئے تھے۔ اس لیے اس مہم میں کامیابی کی صورت نہ پیدا ہو سکی۔۔۔۔۔۔ یہ دیکھ کر میں نے طے کیا کہ انجمن ترقی اُردو ہند کے اہتمام و انتظام میں برطانوی ہند کے کسی موزوں مقام پر ایک اُردو یونی ورسٹی قائم کی جائے چنانچہ ۳ر جنوری ۱۹۴۰ء کو تیسری کل ہند انجمن ترقی اُردو کانفرنس ناگ پور کے کھلے اجلاس میں اُردو یونی ورسٹی کے قیام کے سلسلے میں اتفاق رائے سے اس کی تجویز پاس ہوئی یہ کوئی وقتی اور ہنگامی تجویز نہ تھی بلکہ بہت پہلے سے اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور متعلقہ اصحاب کی رائے و مشورے کے بعد مرتب ہوئی اور کانفرنس میں منظوری کے لیے پیش کی گئی۔۔۔۔۔۔ اُردو یونی ورسٹی کے قیام کی اس اہم اور تاریخی تجویز کا ملک کے طول و عرض میں بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔۔۔۔۔۔

ناگ پور کانفرنس کی شرکت سے دلی واپس آنے پر میں نے ایک روز قائداعظم محمد علی جناح کو اپنے ساتھ دوپہر کا کھانا کھانے کی زحمت دی۔ قائداعظم نے بکمال مہربانی میری دعوت قبول فرمائی۔ کھانے پر جہاں قومی تعمیر کے مختلف مسائل پر گفتگو ہوئی، مجوزہ اُردو یونی ورسٹی کا بھی ذکر آیا اور قائداعظم نے اس سے بڑی دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار فرمایا۔

روز بروز کام اس قدر بڑھتا جاتا تھا کہ بعض وقت گھبرا جاتا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیوں کر سمیٹوں۔ میں تو کمبل کو چھوڑتا ہوں کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ انجمن کے کام اور اس کی مشکلات اس قدر بڑھتی جاتی تھیں کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے سے جو بیٹھتا تو کام کرتے کرتے شام ہو جاتی۔ بیچ میں چائے پینے اور اخبار پڑھنے کے لیے ایک گھنٹہ ضرور مل جاتا پھر بھی کام پورا نہیں ہوتا تھا۔ اس کا مضائقہ نہیں، کام ہو ہی جاتا تھا لیکن بعض مشکلات ایسی آ پڑی تھیں کہ ان کا حل سمجھ میں نہیں آتا تھا۔۔۔۔

رائے دینے میں بڑا لطف ہوتا ہے۔ جب کوئی ہم سے رائے طلب کرتا ہے تو ہم فوراً اپنے آپ کو بڑا آدمی سمجھنے لگتے ہیں کم سے کم اپنے تئیں افضل خیال کرتے ہیں رائے پوچھنے کے ساتھ ہی ہماری متانت قابل دید ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے جس شخص سے لوگ زیادہ تر رائے پوچھتے ہیں وہ آخر میں بہت خود پسند اور مغرور ہو جاتا ہے خیال کرنے کی بات ہے! جب ہم یہ سمجھتے ہوں کہ ہم دس کروڑ اُردو بولنے والوں کی ہدایت کے لیے رائے دے رہے ہیں تو ہمارے دماغ کی کیا حالت ہو گی! جب کوئی لفظ پیش ہوتا ہے اور ہم غور و فکر کی صورت بنا

کرنا بھی سر پیچھے ڈال کر اور آنکھیں بند کر کے سوچتے ہیں تو وہ عالم ملاحظہ کے قابل ہوتا ہے کہ حضرت کا دماغ عرش پر ہے اور دنیا مافیہا ہیچ ہے! دہاں، جب میں الفاظ کی تحقیق کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ کیا کچھ حیرت انگیز معلومات ان سے آشکار ہوتے ہیں۔ میں نوجوانوں کو ہدایت کرتا ہوں کہ وہ لکھتے رہیں! اس میں بڑی کرامت ہے۔ یہ عجیب چیز ہے۔ لکھتے وقت انسان کے تمام قوائے ذہنی مجتمع ہو جاتے ہیں آنکھ دل اور دماغ سب ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور ایک محویت طاری ہو جاتی ہے۔ آپ پہلے سے ہر مضمون کو اچھی طرح سوچ لیجیے اور جب آپ لکھنے بیٹھتے ہیں تو نیا خیال پیدا ہوتا ہے یہی کرامت ہے۔ اس سے اخلاق درست ہوتے ہیں۔ صوفیائے کرام کے ہاں جسے "توجہ" کہتے ہیں وہ اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سے انسان فرشتہ ہو جاتا ہے اس عمل سے انسان کا دماغ وسیع ہو جاتا ہے۔ بحث اس عقل میں کثافت پیدا کرتی ہے، بحث اس کم کرنی چاہیے اور کام زیادہ۔

۳

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دُور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو!

انجمن کے مکان (نمبر ۱ دریا گنج) میں یوں تو پہلے ہی سے مہمانوں اور جہانوں کی آمد رہتی تھی لیکن جب دلّی کی آبادی اور رونق اور اس کی اہمیت بڑھنے لگی تو ہمارے مہمانوں کی چہل پہل بھی پہلے سے بہت بڑھ گئی ہمارے گھر بھرے پڑے نظر آتے تھے۔ ان میں لیگی بھی تھے کانگریسی بھی، خاکسار بھی تھے اور کمیونسٹ بھی، کونسلوں کے ممبر بھی تھے اور لیڈر بھی، اہلِ علم بھی تھے اور طالبِ علم بھی، گاندھی جی کے معتقد اور چیلے بھی تھے اور اُن کے مخالف بھی، ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہیں سیاست سے یا دوسرے کاروبار سے کچھ سروکار نہ تھا۔ گو یہ مختلف خیالات اور مختلف اصول کے لوگ تھے مگر اُردو کے بہی خواہ اور انجمن کے ہمدرد تھے...... اس لیے وہ مجھے سب عزیز تھے۔ ان میں اور مجھ میں صرف ایک رشتہ تھا اور وہ رشتہ اُردو زبان کا تھا۔ ایک بڑی خوبی اس صحبت میں یہ تھی کہ نہ میں اُن کے معاملات میں دخل دیتا تھا نہ وہ میرے کام میں حارج ہوتے تھے۔ میں بڑے اطمینان سے اپنا کام کرتا رہتا تھا اس لیے ان صاحبوں کا آنا مجھے کبھی ناگوار نہ ہوتا بلکہ...... ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ کام سے فارغ ہونے کے بعد ان سے باتیں اور گپ شپ کرنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ دن بھر کی تھکن اور کوفت دُور ہو جاتی تھی اور دوسرے دن کے کام کے لیے ہشاش بشاش تیار ہو جاتا تھا۔ کام کرنے والے کے لیے ایسی تفریح ٹانک کا کام دیتی ہے۔ پھر ایسی صحبت ہر کسی کو کہاں نصیب ہوتی ہے یہ خدا کی دین ہے...... اب اُن دنوں کی یاد میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے......

جولائی ۱۹۴۷ء کی ۱۴ر تاریخ اور پیر کا دن تھا۔ حسبِ معمول اپنے کمرے میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ دن میں کھانا کھاتا نہیں اس لیے بے تکان کام کرتا ہوں۔ تیسرے پہر یکایک میرے ایک عزیز مہمان جو کئی روز سے ٹھہرے ہوئے تھے میرے کمرے میں داخل ہوئے اور کہنے لگے تیار ہو جائیے، آپ کو میرے ساتھ (حیدر آباد) چلنا ہوگا۔ میں آپ کا ٹکٹ خرید چکا ہوں کل صبح ہوائی جہاز جاتا ہے...... میں تیار ہو گیا اور اپنے آدمی سے کہا کہ وہ دہلی سے میرا سامان لے کر حیدرآباد آ جائے۔ یہ ۱۵ر جولائی منگل کا دن تھا۔ اسی روز ہم دوپہر کے بعد حیدرآباد پہنچ

گئے۔ وہاں مجھے ...... بعض معاملات طے کرنے تھے ...... ان تمام کاموں سے ۴ر اگست تک بہت کچھ فراغت ہوگئی۔ اب دلّی کا قصد کیا۔ ۵ر ستمبر کی شام کو گرانڈ ٹرنک سے بھوپال روانہ ہوا۔ وہاں سے بذریعہ جہاز دلّی جانے کا ارادہ تھا۔ اس سفر میں سید علی شبر حاتمی میرے ہمراہ تھے۔ ۶ر ستمبر کی شب کو بھوپال پہنچے۔ اسٹیشن پر میرے کرم فرما مہربان شعیب قریشی صاحب ملے ...... انہوں نے کہا دلّی کے حالات آجکل خراب ہو رہے ہیں ایسے وقت میں جانا خلاف مصلحت ہے ...... اس باب میں شعیب صاحب نے بڑی شدت سے اصرار کیا۔ میں ٹھہرنے پر رضامند نہ تھا۔ اب وہ اصرار سے تشدد پر اتر آئے اور فرمانے لگے آپ اس طرح نہ مانیں گے تو میں نواب صاحب سے کہہ کر آپ کے نام وارنٹ جاری کرا کر گرفتار کرا دوں گا۔ آخر یہ طے پایا کہ چند روز بھوپال میں قیام کر کے انتظار کروں اگر وہاں کے حالات قابل اطمینان پائے جائیں تو شوق سے چلا جاؤں، ورنہ اس خیال کو ترک کر دوں۔ تین چار روز ہی کے بعد جو خبریں آئیں وہ بہت پریشان کن تھیں۔ جس ریل سے میں بھوپال آیا اسی میں حیدرآباد کے چند نوجوان طالب علم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جا رہے تھے۔ ان میں سے جو دلّی کے رستے گئے وہ رستے ہی میں قتل کر دیے گئے۔ شعیب صاحب کا فرمانا صحیح نکلا۔

بھوپال میں پڑے پڑے بارہ روز ہوگئے تھے ..... ۱۸ر ستمبر کو انجمن کے کارکنوں کے خط پہنچے کہ بلوائیوں نے انجمن کے مکان پر حملہ کیا تمام سامان اور مال و اسباب لوٹ لیا اور غارت کر دیا۔ مکان کھلا پڑا ہے اور اللہ کی امان میں ہے۔ یہ خط پڑھ کر مجھے بے حد پریشانی ہوئی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ سب سے زیادہ المناک سانحہ یہ تھا کہ جب فسادیوں نے انجمن پر حملہ کیا تو جو ملازم اس وقت مکان میں رہ گئے تھے وہ ادھر ادھر بھاگ کر جان سلامت لے گئے لیکن ہمارا ایک بڈھا کاتب اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ ہر چند دوسرے ملازموں نے اسے ساتھ لے چلنے کے لئے کہا مگر وہ نہ مانا اس کی بیوی علیل تھی اس لیے وہ وہاں سے نہیں جانا چاہتا تھا۔ ظالموں نے اسے اور اس کی بیوی بچوں کو بڑی بے دردی سے قتل کر ڈالا۔ یہ بہت قابل اور فرض شناس کاتب تھا اور اپنا کام خاموشی سے بڑی احتیاط اور صحت کے ساتھ کرتا رہتا تھا۔ اس واقعے سے میرے دل کو سخت رنج اور تکلیف ہوئی۔ گاندھی جی اس زمانے میں دلّی آ گئے تھے اور قتل و غارت اور خونریزی اور باہمی منافرت کے جو شعلے بھڑک رہے تھے ان پر پانی چھڑکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس وقت مجھے سب سے بڑی فکر ان کتابوں کی تھی جو میرے کمرے میں تھیں اور کتاب خانے کی جان تھیں ...... میں چاہتا تھا کہ خود جاؤں اور دیکھوں کہ کیا گیا، اور کیا رہا، کیا کھویا اور کیا بچا۔ لیکن شعیب صاحب اور دوسرے احباب سب مانع آئے کہ یہ وقت دلّی جانے کا نہیں۔ دلّی سے دو ایک خط بھی اسی مضمون کے آئے کہ وہاں جانا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ ناچار دل مسوس کے رہ گیا۔

بھوپال میں خالی پڑے رہنا مناسب خیال نہ کیا اتنے دن بھی جو وہاں لگ گئے تو وجہ یہ تھی کہ ملیریا نے آ دبوچا تھا۔ اچھا ہوتے ہی ۵ر اکتوبر کو حیدرآباد چلا گیا اور وہاں جو کام باقی رہ گیا تھا اسے سمیٹنا تھا وہاں پہنچ کر کام شروع کیا۔

دلّی ان دنوں مصائب و آلام کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ قتل و غارت اور خونریزی کا بازار گرم تھا۔ جس کے سامنے نادر شاہ کا قتل عام اور غدر کے مظالم ہیچ تھے۔ گاندھی جی کے پرارتھنا جلسوں میں نہ عبادت کا تقدس باقی رہا تھا اور نہ روحانیت کی روشنی اب وہ جلسے کانگریس کا ادنیٰ درجے کا سیاسی پروپیگنڈہ ہو کر رہ گئے تھے۔ جونا گڑھ کے حملے کو انہوں نے جائز قرار دیا اور کشمیر کے محاذ پر فوجوں کو اپنی دعاؤں کے ساتھ روانہ

کیا وہ اہنسا جس کا فلسفہ سارے عالم میں پھیلا ہوا تھا اور جس کی بنا پر گاندھی جی مہاتما، مثل مسیح اور بدھ سمجھے جاتے تھے اس کا خاتمہ جمنا کے کنارے پر ہوا؟ معلوم ہوا کہ یہ اصول نہ تھا بلکہ وقت کی مصلحت تھی جس کی حیثیت ایک سیاسی چال سے زیادہ نہ تھی۔ ۵ اکتوبر کو میں نے گاندھی جی کی خدمت میں اسی بارے میں ایک عریضہ لکھا تھا اور اس کا انہوں نے جواب دیا۔ اس کا ذکر یہاں مناسب نہ ہوگا۔ پھر کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

میں حیدر آباد میں پڑے پڑے گھبرا گیا تھا اور دلی جانے کے لیے بے چین تھا۔ آخر ۲۹ اکتوبر کو بھوپال روانہ ہو گیا۔ ...... ۴ نومبر کو سید علی اکبر حیدر آباد سے دلی روانہ ہو گئے اور ۶ نومبر کو میں۔ ہم مولانا ابو الکلام آزاد کے یہاں رہے۔ دوسرے دن یعنی ۷ نومبر کو اردو باغ گیا یعنی انجمن کا مکان دیکھنے گیا تو مکان کا نقشہ ہی کچھ دوسرا نظر آیا کہ بھارت انشورنس کمپنی لاہور نے قبضہ کر رکھا ہے۔ ...... میرا دل دھک دھک کر رہا تھا اور یہ جاننا چاہتا تھا کہ میری ان کتابوں کا کیا حشر ہوا جو میرے کمرے میں تھیں۔ جس کمرے میں میں کام کرتا تھا وہ بہت بڑا اور وسیع تھا کوٹھی بھر میں اس سے بڑا کوئی ہال نہ تھا۔ اس میں کتابوں کی متعدد الماریاں تھیں۔ کھلی الماریوں کے سوا دو بڑی فولادی الماریاں جن میں خاص خاص نادر قلمی نسخے اور قدیم فرامین اور کاغذات اور بعض نامور اشخاص مثلاً ناسخ، غالب، سرسید، حالی، محسن الملک، اقبال، سر تیج بہادر سپرو وغیرہ کے خطوط اور اسی قسم کی بہت سی عزیز اور بیش قیمت اشیاء تھیں۔ ان کے علاوہ کئی بڑے صندوق تھے جن میں میرے نوٹ اور مختلف قسم کی اور خاص کر اردو لغات کے متعلق بہت سامان، الفاظ کی اصل تحقیقی سرمایہ، اردو زبان کی تاریخ کی یادداشتیں اور مضمون، اور اردو ...... ہندی تنازعہ کے متعلق بہت سے قدیم کاغذات (میرا ارادہ اس تنازعہ کی تاریخ لکھنے کا تھا) اور بہت بڑا اردو لغات کے صاف کیے ہوئے مسودوں کا تھا۔ اس سے ملا ہوا ایک کمرہ تھا جس میں میرے کپڑوں کی الماری اور صندوق۔ کپڑے اور دوسری چیزیں جو اس کمرے میں تھیں وہ لٹیروں نے سب لوٹ لیں۔ جو صندوق بڑے، نئے اور اچھے تھے وہ بھی لے گئے باقی ردی چھوڑ گئے۔ بڑے کمرے میں کاغذات کے جو صندوق تھے وہ انہیں بہت پسند آئے۔ کاغذات تو انہوں نے وہیں پھینک دیے اور صندوق لے کر چلتے بنے۔ فولادی مقفل الماریوں پر ان کی للچائی ہوئی نظریں پڑیں اور سمجھے کہ ان میں ضرور مال و زر ہوگا۔ ہتھوڑا مار کر انہیں توڑا۔ جب ان میں کتابوں اور کاغذوں کے سوا کچھ نہ ملا تو بڑی مایوسی ہوئی اور غصے کی جھنجھلاہٹ میں وہ سب کتابیں اور کاغذ نکال نکال کر باہر پھینک دیے۔ کتب خانے کے کمروں میں زیادہ گنجائش نہ رہی تھی اس لیے دو اور مقفل الماریاں کھانے کے کمرے میں رکھوا دی تھیں۔ ان میں اردو لغات کے پرچوں اور کارڈوں کے بنڈل بھرے ہوئے تھے انہیں پرچوں پر سے کاتب نقل کر کے لغات کا مسودہ تیار کرتا تھا جو نظر ثانی اور ترمیم و اصلاح کے بعد چھپنے کے لیے کاتب کو دے دیا جاتا تھا۔ میرے کھانے پینے کا سامان اور ظروف وغیرہ تو لوٹ لے گئے تھے مگر ان مقفل فولادی الماریوں کو دیکھ کر قیاس کیا کہ ان میں ضرور قیمتی اشیاء ہوں گی۔ انہیں توڑا تو یہاں بھی وہی ناکارہ کاغذ نکلے جو انہیں دوسرے کمروں میں ملے تھے ان میں کچھ قلمی رسالے بھی تھیں ان کا بھی وہی حشر ہوا اٹھا اٹھا کر فرش پر اس طرح بکھیرے پڑے تھے جیسے پت جھڑ کے موسم میں درختوں کے پتے۔

بھارت کمپنی کو کمروں کی ضرورت تھی اور مالک کو کرایہ کا لالچ۔ لہٰذا کمرے خالی کرنے کے لیے انہوں نے یہ سب چیزیں جو میرے کتب خانے کی جان تھیں بے دردی سے صحن میں کوڑے کرکٹ کی طرح پھینک دیں، جہاں وہ کئی روز تک پڑی رہیں۔ بہت سے کاغذ ہوا میں اڑ گئے اور آنے جانے والوں کی ٹھوکروں میں آ گئے اور جو کتاب یا کوئی چیز کسی کو پسند آئی مال غنیمت سمجھ کر لے لی۔ ان میں بعض نہایت خوش خط قدیم قرآن شریف تھے وہ پھاڑ ڈالے۔ قدیم اردو کتابیں جو نسخ میں لکھی ہوئی تھیں انہیں بھی وہ قرآن سمجھے اور پھاڑ ڈالا۔ پیچھے کے کمرے میں رسالوں اور

چاروں سے بھرے پڑے تھے مالک مکان نے اپنی مہربانی سے وہ سب اخبار اور رسالے اور بہت سی ردّی اور صحن میں باقی ماندہ پڑی ہوئی کتابیں اور کاغذات ڈھو کر باورچی خانے، غسل خانوں، گودام، برآمدوں اور کتاب خانے کے جنگلی کمرے میں پھنکوا دیے۔ ردّی کے یہ بڑے بڑے انبار جگہ جگہ پڑے تھے کتاب خانے کو کھول کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہاں بھی لٹیروں کے قدم آ گئے تھے۔ الماریوں کی کتابیں درہم برہم کر دی گئیں اور کچھ نیچے پڑی تھیں، اور جو الماریاں مقفل تھیں ان کے تالے بھی توڑ کر صفایا کیا اور کتابیں اُلٹ پلٹ کر دیں اور جو پسند آئیں وہ نکال کر لے گئے۔ اب ہم نے ردّیوں کے ڈھیروں کا ایک ایک کاغذ دیکھنا شروع کیا۔ کسی کتاب کا کوئی کاغذ ایک جگہ اور کوئی دوسری جگہ ملا۔ اس تلاش اور چھان بین میں کئی مہینے لگ گئے۔ اس کام میں چودھری رحم علی الہاشمی، رفیق الدین احمد، محمد یعقوب بیگ اور بعد میں حامد علی صاحب برابر مصروف رہے۔ بعض نسخوں کے کاغذات جو مختلف ردّیوں میں سے جوڑ جوڑ کر الگ کیے جو پھر بھی ناقص رہے، بعض کے حصے پھٹے ہوئے تھے صرف چند درست حالت میں تھے مگر اکثر ضائع ہو گئے۔ یہ کام ہمارے لیے بہت اجیرن ہو گیا تھا۔ شام کو جب ہم اس سے فارغ ہوتے تو ہماری صورتیں دیکھنے کے قابل ہوتی تھیں بعض تو بالکل بھوت نظر آتے تھے...... غرض ہماری اور ہماری کتابوں اور کاغذوں کی یہ درگت بنی۔ اس سے جو رنج اور کوفت ہوئی اُسے کیوں کر بیان کیا جائے۔ الفاظ اس کے بیان سے قاصر ہیں۔ ایسے مقام پر ان چیزوں کا کیا رنج کیا جائے جہاں ہزاروں لاکھوں عزیز جانیں ایسے ظلم و جبر کا شکار ہو گئی ہوں جو دید نہ شنید، جہاں بے حرمتی اور بے عزتی کی انتہا ہو گئی ہو، جہاں معصوم بچوں اور بے گناہ عورتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہوں، جہاں خون پانی کی طرح بہایا گیا ہو۔

میں اور علی اشرف مولانا کے ہاں پہلے ہی سے مہمان تھے دو روز کے بعد رفیق الدین احمد بھی آ گئے۔ اب ہم تین ہو گئے۔ میں نے وہاں زیادہ قیام مناسب نہ سمجھا۔ ایک ہفتے کے بعد ہم نظام پیلس کے گیسٹ ہاؤس (مہمان خانہ) میں اٹھ گئے۔ وہاں گئے ہمیں چار روز ہوئے تھے کہ معلوم ہوا حیدر آبادی وفد آ رہا ہے اور ان کے ساتھ بڑی جماعت ہو گی ہمارے لیے کوئی جگہ نہ رہے گی۔ ہم نے ہر چند کوشش کی کہ کوئی مکان مل جائے یا کوئی اور صورت ٹھہرنے کی نکل آئے مگر کامیابی نہ ہوئی لہٰذا مجبوراً کراچی روانہ ہو گئے جہاں ہم نے اپنے قدیم کرم فرما اور شفیق آنریبل پیر الٰہی بخش کے ہاں قیام کیا۔۔۔ ...... دلّی کے اس پندرہ روزہ قیام میں ہم شہر کو زیادہ دیکھ نہ سکے۔ ہماری قسمت میں تو ردّیوں کی چھان بین لکھی تھی۔

انجمن کی شاخیں سارے ملک میں تھیں۔ تقسیم کے بعد پاکستان کی شاخوں کا الحاق ہندوستان سے قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے ضرور ہوا کہ پاکستان کے لیے نیا مرکز قائم کیا جائے۔ اس معاملے میں بڑی بحث رہی کہ یہ مرکز لاہور میں ہو یا کراچی میں۔ آخر طے یہ پایا کہ کراچی ہی میں رکھا جائے جو مرکزی حکومت کا بھی دارالحکومت ہے اس سے امداد ملنے کی بھی توقع ہے اور سندھ کی حکومت بھی ضرور کچھ مدد دے گی۔ لاہور میں تو کام کرنے والے بہت ہیں مزید ضرورت سندھ، بلوچستان اور سرحد میں کام کرنے کی ہے اب ہمیں ایسے مکان کی تلاش ہوئی جو انجمن کی ضرورت کے لیے مناسب ہو۔ شاردا مندر گجراتیوں کا سب سے بڑا ادارہ تھا اور اس میں تخمیناً ۸۰۰ طالب علم تعلیم پاتے تھے۔ انجمن کے لیے اس سے بہتر عمارت کراچی بھر میں نہیں مل سکتی۔ ...... میں دلّی جانے کے لیے تڑپ رہا تھا میرے بعض دوست احباب سمجھاتے تھے کہ اب اس ملک میں اردو کے کام کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ ..... میں ان سے بحث نہیں کرتا تھا۔ میرا ایک ہی جواب تھا کہ ہندوستان میں ہمارے لاکھوں، کروڑوں بھائی اس زبان کے بولنے والے ہیں ان کی خدمت کرنا بھی تو ہمارا فرض ہے۔

آخر میں نے ...... پھر ایک بار دلّی جانے کا قصد کیا۔ ۲۰ جنوری کو علی اشرف نے مجھے اور حامد علی صاحب کو زاہد حسین کے ہمراہ

ہوائی جہاز میں سوار کرا دیا۔ میں زاہد حسین صاحب کے ہاں جا رہا ...... انجمن کے مکان میں گیا وہاں ردیوں کی چھٹائی کا کام جاری تھا جس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ ان ردیوں کی چھٹائی اور کتب خانے کے معائنے کے بعد بہت سی کتابوں اور مسودوں کے تلف ہونے کا ٹھیک ٹھیک علم ہوا۔ جب کوئی عزیز کتاب یا مسودہ نہیں ملتا تھا اس کے ضائع ہونے پر دل کو چوٹ سی لگتی تھی۔

دلی پہنچنے کے بعد میں دوسرے روز گاندھی جی سے ملنا چاہتا تھا لیکن اسی روز انہوں نے فاقہ شروع کر دیا۔ پانچ روز بعد انہوں نے فاقہ توڑ دیا لیکن فوراً ملنا مناسب خیال نہ کیا کیونکہ ان پر نقاہت کا اثر تھا ...... میں رفیق صاحب کے ساتھ علی گڑھ چلا گیا اور سفر سے واپسی پر ملاقات کو منحصر رکھا ......

۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو ۴ بجے شام کو میری درخواست پر اولڈ بوائز لاج میں ہمدردانِ اردو کا اجتماع ہوا۔ اس میں قریباً پچیس حضرات تشریف لائے ...... اس کا مقصد ان دو امور پر غور کرنا تھا اوّل یہ کہ انجمن ترقی اردو کا صدر مقام اب کہاں رکھا جائے دوسرے موجودہ حالات میں اس کا پروگرام کیا ہو۔ اس اجتماع میں جو صاحب شریک تھے ان کی گفتگو سے مجھ پر یہ اثر ہوا کہ یہ لوگ موجودہ حالات کی وجہ کچھ سہمے ہوئے ہیں اور کوئی عملی کام نہیں کر سکتے یا صاف صاف کچھ کہنا نہیں چاہتے۔

۱۸ جنوری کو میں الہ آباد روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کے ہاں قیام تھا ...... ۳۰ جنوری کو مغرب کے وقت اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ میاں زبیر فرزند ڈاکٹر عبدالستار صدیقی گھبرائے ہوئے آئے اور کہنے لگے کسی نے گاندھی جی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا ......

...... میں دوسرے دن دلی جانے والا تھا اور ارادہ تھا کہ یکم فروری کو گاندھی جی سے ملاقات کروں گا۔ افسوس دل کی یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی ...... دوسرے روز دلی واپس آ گیا۔

دلی کے اس دوران قیام میں مکان کی تلاش میں حامد علی صاحب اور میں دلی کے کوچوں کی خاک چھانتے پھرے کوئی مکان ایسا نظر نہ آیا جہاں ہم اپنا دفتر اور کتب خانہ منتقل کر سکیں۔ مجھے کراچی واپس جانا پڑا کہ زاہد حسین صاحب کا دلی سے تبادلہ ہو گیا اور میرے قیام کی کوئی صورت نہ رہی ......

یہاں آتے ہی ہم اپنے کام میں مصروف ہو گئے اور انجمن ترقی اردو پاکستان کا ڈول ڈالنا شروع کر دیا۔ ایک کام اس اثنا میں یہ کیا کہ قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح کو لکھا ...... ہماری یہ تمنا ہے کہ انجمن کا افتتاح اپنے دستِ مبارک سے فرمائیں تو قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح نے اپنے جواب میں بڑی مسرت کا اظہار کیا (۱۹ مارچ ۱۹۴۸ء) اور لکھا کہ آج کل بہت مصروف ہوں۔ سرحد کے دورے سے واپسی پر ۱۵ اپریل کے بعد کسی روز بڑی خوشی سے انجمن ترقی اردو پاکستان کا افتتاح کروں گا۔

کراچی میں انجمن کا کام آہستہ آہستہ جم رہا تھا مگر میرے دل میں دلی کی لو لگی ہوئی تھی اور سوتے جاگتے دلی کے خواب دیکھتا تھا۔ خاص کر اپنے کتب خانے کی بربادی کا خیال بہت ستاتا تھا۔ بدقسمتی سے اسی زمانے میں میری طبیعت سخت ناساز ہو گئی ...... سب کی رائے قرار پائی کہ تبدیلِ آب و ہوا کے لیے کوئٹہ چلا جاؤں جہاں کی آب و ہوا صحت کے لیے بے نظیر ہے۔ چنانچہ میں ۱۰ جولائی کو کوئٹے روانہ ہو گیا ......

وہاں میرے لیے ایک نہایت عظیم الشان چنار کے درخت کے متصل کہ جس کی بلندی اور پھیلاؤ کو دیکھ کر قدرت کا تماشا نظر آتا ہے، ایک بڑا ڈیرا لگا دیا گیا تھا۔ میں دن بھر اس درخت کے زیر سایہ بیٹھا کام کرتا رہتا اور اس تناور درخت کی شوکت و عظمت اور گھنے سایہ کا لطف اٹھاتا رہتا

ابھی مجھے کراچی آئے سولہ سترہ دن ہوئے تھے کہ کراچی سے یہ وحشت ناک خبر پہنچی کہ اگر میں جلد دلی نہ پہنچا تو حکومت انجمن کو امداد بھی نہ دے گی جس کی منظوری ہو چکی تھی، اور عمارت بھی ضبط کرے گی اور کتب خانے سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ یہ خبر بعض نہایت معتبر اشخاص دلی سے لائے تھے۔ اس سے مجھے بے حد پریشانی ہوئی۔ .... دوسرے عذر تھی۔ ۸ اگست کو کراچی روانہ ہو گیا ..... چند احباب نے جو اس وقت کے حالات سے زیادہ باخبر تھے یہ مشورہ دیا کہ پہلے جناب کیفی صاحب کو دلی بھیجا جائے ...... وہ دلی پہنچ کر وہاں کا رنگ دیکھیں اور تمام حالات معلوم کر کے لکھیں اس کے بعد مجھے دلی کا قصد کرنا چاہیے۔

۱۱ ستمبر کی شب کو قائد اعظم رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پاکستان پر اندھیرا چھا گیا۔ لوگ اس خبر کو سن کر مبہوت رہ گئے ان کے ہاتھوں انجمن کے افتتاح کی حسرت ہی رہ گئی۔ دوسرے دن یہ خبر پہنچی کہ بھارت کی فوج حیدرآباد پر چڑھ آئی ہے۔ ... کو معلوم ہوا کہ ہندی فوجیں حیدرآباد میں داخل ہو گئیں۔ دوسرا یہی کالا داغ جو کبھی بنگال اور دکن کے چہروں پر نمایاں ہوا تھا اس تاریخ کو حیدرآباد کی پیشانی پر چمکا——

میں ۲۰ اکتوبر کو ہوائی جہاز سے دلی روانہ ہوا اور پہنچنے کے دو دن بعد یعنی ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں حاضر ہوا اور حقیقت حال بیان کی کہ انجمن کے لیے کوئی مکان نہیں ملتا۔ انجمن کے نام سے لوگ کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ بہت بدگمانیاں ہیں آپ لاہور یا کراچی کو اپنا صدر مقام بنائیے۔ یہ ٹھیک نہیں کہ آپ کی ایک ٹانگ یہاں ہے اور ایک وہاں۔ میں نے کہا میں دونوں جگہ کام کرنا چاہتا ہوں بلکہ اس سے بھی آگے افغانستان، ایران، چین، عرب، انڈونیشیا وغیرہ میں۔ یہ بدگمانیاں تو ان کے رفع کرنے کی یہی تجویز ہے کہ زبان اور کلچر جو پاکستان اور بھارت کی اکثر آبادی میں مشترک ہے اس کے لیے پوری آزادی ہو خصوصاً اردو کے لیے یہاں کے کروڑوں انسانوں کی زبان ہے۔ کہا یہ ٹھیک ہے لیکن موجودہ حالات ایسے نہیں کہ آپ یہاں کام کریں۔ میں نے کہا آپ تعزیرات ہند میں ایک کا اضافہ کیوں نہیں کر دیتے کہ ہمیشہ کے لیے جھگڑا ہی ختم ہو جائے۔ جناب کیفی صاحب سے علاوہ اس سے قبل ڈاکٹر تارا چند سے ملے تھے انھوں نے بھی ایسی ہی باتیں کیں۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ حکومت ہم سے بدگمان ہے۔

اب ہمارا کام بس اتنا رہ گیا تھا کہ صبح ناشتے کے بعد کتب خانے جاتے، کتابوں کی ترتیب درست کرتے اور جو خراب اور شکستہ ہو گئی تھیں یا بارش کی وجہ سے جن کی حالت بہت ابتر ہو گئی تھی ان کو الگ رکھے جاتے۔ شام کو قیام گاہ پر واپس آتے۔

میں نے کلکتہ عبدالرحمن صدیقی کو خط لکھا اور انجمن پر جو گزر رہی تھی اس کی اطلاع دی اور لکھا کہ آپ یہاں آکر ہماری مدد کیجیے۔ چنانچہ وہ ...... دلی پہنچ گئے اور .... دوسرے ہی روز سے اپنی مہم شروع کر دی۔ .... مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا آخر بیزار ہو کر ۲۸ دسمبر کو ہوائی جہاز سے بھوپال چلے گئے۔

یہ لکھنا بھول گیا کہ جب تک دلی میں رہے سی آئی ڈی کی ہم پر نگرانی رہی بعض اوقات میرے ملازموں کو ستاتے تھے اور پوچھتے تھے کہ یہ آج کل کیا کر رہے ہیں اور کون کون ملنے آتا ہے .... دلی میں رہ کر ہم نے سب جتن کر کے دیکھ لیا کہ یہاں دال گلتی نظر نہیں آتی۔

آخر تنگ آکر اسی میں خیریت دیکھی کہ دلی کو خیرباد کہیں۔ چنانچہ .... ۴ جنوری کو بھوپال سے روانہ ہو کر ۵ کو بمبئی پہنچا دو تین روز قیام کر کے بعض احباب سے ملا اور دو ایک کام تھے وہ کیے آخر ۸ جنوری ۱۹۴۹ء کو بمبئی سے یہ شعر پڑھتا ہوا جہاز پر سوار ہوا

رخصت اے ہندوستان، اے بوستانِ بے خزاں
رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی میہماں

یہ جو کہتے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری، کبھی کبھی یہ بات سچ ثابت ہوتی ہے۔ حالی نے یہ شعر ۷۰ سال پہلے لکھا تھا اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ کبھی ایسا وقت آئے گا!

جہاز ساڑھے بارہ بجے کراچی پہنچا...... خدا کا لاکھ لاکھ شکر کیا کہ خیر و عافیت سے پاکستان پہنچ گیا۔ اب یہاں نئی مہم کا آغاز ہوگا۔

۳

ہم آ کے بیٹھے ہیں ترتیب دینے دفتر کو
ورق جب اس کا اڑا لے گئی ہوا ایک ایک!

مصیبت بعض وقت رحمت ثابت ہوتی ہے...... یہ تازیانے کا کام دیتی ہے جس سے سوئی ہوئی قوتیں جاگ اٹھتی ہیں اور دبی ہوئی قوتیں کھل جاتی ہیں...... جو کام پہلے ناممکن ہونے معلوم ہوتے تھے وہ آسان نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ وقت ہم پر بھی ایسا ہی آیا تھا۔ یہ درحقیقت ہمارے امتحان کا وقت تھا۔ ہمیں تو سدا کا پردیسی ہو لئے، نہ کبھی گھر بنایا اور نہ گھر میں رہنا نصیب ہوا۔ ایک جھونپڑا تھا سو خدا کا شکر ہے وہ بھی نہیں رہا تھا۔ انجمن ایک لٹے پٹے قافلے کی طرح پاکستان پہنچی اور کراچی آکر اطمینان کا سانس لیا۔ باوجود بے سروسامانی اور ناداری کے اور باوجود طرح طرح کی مشکلات کے ہم ہمت نہیں ہارے اور کچھ دنوں کے بعد انجمن نے پھر اپنا کام شروع کر دیا......

انجمن نے یہاں ایک اردو کالج قائم کر دیا، جس میں یونیورسٹی کے مضامین کی تعلیم اردو کے ذریعے دی جاتی تھی۔ کوئی رسم افتتاح کی نہ کی، کسی وزیر یا گورنر یا بڑے لوگوں کو نہیں بلایا، یہ سب بیچارے لایعنی اور بے سہارے ہیچ اور پوچ ہوتے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ اپنا ایمان اور اللہ کا سہارا کافی ہے۔ چلے گا تو اسی سہارے چلے گا...... الحاق کا مسئلہ ابھی طے نہیں ہوا تھا۔ میں نے انتظار بھی نہیں کیا ورنہ ایک سال ضائع ہو جاتا۔ لوگ ہمارے کالج کو آکر دیکھتے تو حیرت کرتے۔ ہم نے ایک عام اردو کتب خانہ بھی قائم کر دیا جس میں ابتدا میں دس ہزار کتابیں فراہم ہو گئیں۔ اس کے افتتاح کے لیے وزیر اعظم کو تکلیف دی۔ بڑی شان سے جلسہ کیا۔ ایک ایڈریس کالج کی طرف سے اور دوسرا انجمن کی طرف سے پیش کیا گیا لیکن وزیر اعظم نے تحسین و تعریف تو ایک طرف، ایک لفظ بھی ہمت افزائی کا نہ کہا۔ امداد کی درخواست کا جواب انکار ہے...... مرکز کا محکمہ تعلیم ہمارے کاموں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا، وہ حسد کرتا تھا، خود کچھ نہیں کرتا تھا، دوسرے کرتے تو انہیں کرنے نہیں دیتا تھا۔

پہلے ہی پریشانیاں کیا کم تھیں، یہ کالج قائم کر کے میں نے بیٹھے بٹھائے ایک پریشانی اور مول لے لی۔ کوئی یونیورسٹی اس کے الحاق کے لیے آمادہ نہیں تھی۔ سندھ یونیورسٹی نے انکار کر دیا۔ پنجاب یونیورسٹی کی حدود اراضی سے باہر تھا...... ہم ہندوستان سے لٹ پٹ کے برباد ہو کے آئے تھے۔ توقع تھی کہ پاکستان ہمارے آنسو پونچھے گا اور ہماری ہمت افزائی کرے گا لیکن اب جو دیکھا تو یہاں کا رنگ ہی کچھ اور تھا...... کہاں تک لکھوں بڑی طولانی داستان ہے۔

لوگ مجھے لڑاکا کہتے ہیں میں طبعاً لڑاکا نہیں لیکن حالات نے مجھے ایسا بنا دیا۔ وہاں غیروں سے لڑتا رہا یہاں اپنوں سے ۔۔۔۔۔۔ ساری عمر یونہی لڑتے بھڑتے گزری۔ مجھے اپنے مشن میں بڑی بڑی ناکامیوں اور مایوسیوں سے سابقہ پڑا ہے دنیا دار التجربہ ہے یہاں سب کچھ صبر و شکر کے ساتھ جھگتنا پڑتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ بہت کام پڑا ہے اور بہت کچھ کرنا ہے۔ بعض اوقات مجھے بھی مایوسی ہونے لگتی ہے لیکن اس پر کاربند ہوں ـــ

دست از طلب ندارم تا کام من برآید
یا جاں رسد بہ جاناں یا جاں ز تن برآید

جیسے جیسے عمر گھٹتی جاتی ہے کام کا ہجوم بھی بڑھتا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ میں نے حکومت سے کچھ رقمی امداد طلب کی ہے تاکہ تمام محاورات اور عوامی الفاظ و اصطلاحات کی ڈکشنری تیار کر دوں۔ علمی اصطلاحات جو اس وقت تک بن چکی ہیں وہ سب جمع کر رہا ہوں۔ انجمن اور کالج کا کام اس سے الگ ہے (خدا) وہ بیڑا ساحل مراد تک سلامتی سے پہنچائے۔ ہمارے تعلیم یافتہ عربی فارسی کتابوں کو مطلق قابل التفات نہیں سمجھتے ہاں اگر کوئی یورپین یا امریکی کسی کتاب یا ہمارے کسی قدیم نظریہ کے متعلق کوئی تعریفی کلمہ کہہ دے تو وہ ان کے لیے وحی والہام ہو جاتا ہے۔ ایک واقعہ (۱۹۵۶ء) میں انجمن کو پیش آیا۔ انجمن میں ایک جامع فہرست اردو کتب مطبوعہ و غیر مطبوعہ کی تیاری ہو رہی تھی وزارت تعلیم کو اس کے لیے لکھا کوئی توجہ نہ کی۔ خدا بھلا کرے یونیسکو نے حکومت سے دریافت کیا کہ آپ کے پاس اپنی زبان کی کوئی ببلیوگرافی ہے اور اگر نہیں تو کیا وہ تیار ہو سکتی ہے اب وزارت تعلیم والے بھاگے ہوئے ہمارے پاس آئے اور امداد دینے پر آمادہ ہو گئے اور رقم دے دی یہ حال ہے ہمارے اہل حکومت اور قدر دانان علم و ادب کا۔

میں نے غلام محمد صاحب سے ملنے کی کوشش کی اور نہ ایسا ارادہ تھا لیکن (۱۹۵۵ء) کی بات ہے ایک عجیب اتفاق ہوا میں حسب معمول شام کو ٹہلنے کے لیے نکلا تھا ایک دن سڑک کے کنارے پیدل تیز تیز چلا جا رہا تھا اُدھر سے گورنر جنرل بہادر کی سواری آگے پیچھے جیپوں کے درمیان سڑک سے نکلی اور یکایک رک گئی۔ گورنر جنرل اپنی کار سے اتر کر مجھے سڑک پر سے پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ انہوں نے رستے میں خود ہی انجمن کا ذکر چھیڑا اور کہا اردو کے بنیادی اور بڑے کام بغیر حکومت کی امداد کے نہیں ہو سکتے میں فضل الرحمن وزیر تعلیم کو بلا کر اس کے متعلق کہوں گا اور بہت کچھ تم تم کرتے رہے۔ کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا۔۔۔۔۔

حکومت پاکستان نے پانسو روپیہ ماہانہ میری پنشن منظور کی اور لکھا یہ پنشن اردو کی لائق توصیف خدمت کے سلسلے میں دی جاتی ہے۔ پاکستان کے وزیر تعلیم بنگالی تھے اردو نہیں جانتے تھے مگر اردو کے سب سے زیادہ حامی یہی تھے انہوں نے انجمن اور کالج کے معاملے میں ہماری بڑی مدد کی۔ انہیں کسی طرح معلوم ہو گیا کہ میری حالت سقیم ہے اور میں اب نادار ہو گیا ہوں حکومت میں تحریک کر کے پنشن کرائی اور مجھ سے بہت معافی مانگی کہ میری اجازت بغیر انہوں نے ایسا کام کیا اور ایک ہمدردانہ خط لکھا۔ میں نے ۔۔۔۔۔۔۔ تو نہیں مانگی تھی مجھے شرم معلوم ہوتی تھی یہاں پاکستان کی خدمت کے لیے آیا تھا میری غیرت گوارا نہیں کرتی تھی کہ میں اس پر بار ہوں اس طرف سے کئی بار تقاضا ہو چکا تھا۔ تو خیال آیا کہ انکار بھی نہیں کر سکتا تھا کرتا بھی تو کس برتے پر۔ تقدیر کا لکھا پورا ہوتا ہے یہ دن بھی دیکھنے تھے۔

(۱۹۵۴ء) میں، جس روز مجلس دستور ساز میں زبان کا مسئلہ پیش ہونے والا تھا، میں ایک لاکھ اشخاص کا جلوس لے کر کی

گرمی میں تین میل پیدل چل کر ایوان اسمبلی میں پہنچا اور اس مقام میں جہاں بلا اجازت داخل ہونا ممنوع اور جرم ہے ہزاروں آدمی گھس گئے پولیس اور مسلح فوج مشین گنیں اور ٹینک لیے کھڑی تھی۔ سارے شہر میں کامل ہڑتال تھی۔ عاملان حکومت کا خیال تھا کہ خون خرابہ ہوگا لیکن یہ ایسا پر امن احتجاج تھا کہ سب حیرت میں رہ گئے۔ اسمبلی کا اجلاس برخاست کرنا پڑا اور دوسرا دن مجھ سے بات چیت کا ٹھہرا۔ گفتگو ہوئی۔ سمجھوتا بھی ہوا لیکن عمل اس کے خلاف کیا...... جن صاحبوں کے ہاتھ اقتدار تھا ان کو زبان، ادب، علم و تعلیم سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔

میری کشتی عمر اب کنارے آلگی ہے جو چاہتا تھا نہ ہو سکا، حالات سے مجبور ہو گیا اور برا بھلا جو کچھ کیا تھا اس پر پانی پھر گیا...... ہاتھ پاؤں مارتا رہا تھا لیکن زمانہ روز بروز ناسازگار ہوتا جاتا تھا کام بن بن کے بگڑ جاتا، ساتھی ہوا کا رخ دیکھتے اور ساتھ چھوڑ بیٹھتے بے وفائی اور غداری آج کل کے شرفا کا معمول ہو گیا ہے پاکستان آنے کے بعد...... بھلے گھرانے کے شریف لوگ اب...... ایسی کمینہ اور ذلیل حرکتیں کرنے لگے ہیں کہ حیرت اور شرم معلوم ہوتی ہے۔ مجھے ایسی باتوں سے روزانہ سابقہ پڑتا۔

میں نے یہاں آکر پانچ رسالے جاری کیے تھے ان میں سے تین رسالے (معاشیات، سائنس، تاریخ و سیاسیات) اقتصادی کی بدولت بند کرنے پڑے۔ اب "اردو" اور "قومی زبان" رہ گئے ہیں یہ بھی سسک رہے ہیں۔ "اردو" پرانا رفیق ہے، خدانخواستہ اگر اسے بند کرنا پڑا تو اس کا صدمہ شاید برداشت نہ کر سکوں۔ انجمن کے حالات کچھ ایسے درہم برہم ہو گئے تھے جس کی توقع نہ تھی میں نے اس خیال سے کہ روزمرہ کے انتظامی جھگڑوں، حسابات اور پریس وغیرہ کی نگرانی سے نجات مل جائے اور میں ایک دو ادبی کام جو ادھورے پڑے ہیں پورے کر سکوں جدید سیکرٹری، جائنٹ سیکرٹری کا انتخاب کرایا۔ نئے خازن کا بھی انتخاب ہوا۔ میں سمجھا اب کام اطمینان سے چلے گا اور مجھے بھی فرصت مل جائے گی مگر معاملہ برعکس نکلا۔ ان صاحبوں نے غلط پروپیگنڈہ اور سازش سے مجلس نظما میں اپنی اکثریت بنا لی اور تخریبی کارروائیاں شروع کر دیں چونکہ سب اختیارات ان کو حاصل ہو چکے تھے الٹی سیدھی جو چاہتے...... کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حالات ابتر ہو گئے۔ میرے پاس علم و ادب اصطلاحات و لغات کا ذخیرہ رکھا تھا لیکن اشاعت کے لیے روپیہ نہیں تھا، انجمن ایسے نااہل، تخریب پسند، غدار اشخاص کے ہاتھ میں آگئی تھی جو علم و ادب سے بے بہرہ تھے، سارا روپیہ برباد کر دیا اور کام صفر۔ یہ حالت زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتی تھی۔

مجھے اس زمانے میں جو تکلیف اور روحانی کوفت ہوئی، وہ بیان نہیں کر سکتا۔ ہماری قوم ایک عجیب قوم ہے۔ اس میں وہ تمام عیوب موجود ہیں جو ایک پس ماندہ اور زوال آمادہ قوم میں ہوتے ہیں۔ ہمارے بھائی اپنے کسی بھائی کو آگے بڑھتا ہوا نہیں دیکھ سکتے اور جو علی الرغم ان کے آگے بڑھ گیا ہے اسے گرانے اور رسوا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

میرے قدیم ساتھی اور رفیق، ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے اور میں اکیلا ان کا ماتم کرنے اور پاکستان میں ٹھوکریں کھانے کے لیے رہ گیا...... ضعف بصارت کی معذوری اور انجمن کی الجھنوں کی وجہ سے مجبوری بڑھتی ہی جاتی تھی، کم ہونے کو نہیں آتی تھی۔ دشمنوں کے دماغ تخریبی جوڑ توڑ سے مالا مال تھے...... انہوں نے مجھے اذیت پہنچانے اور رسوا کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ یہ لوگ صاحب اقتدار بھی تھے اور صاحب ثروت بھی۔ ایک شیطانی لشکر ان کے ساتھ تھا جس کا شغل پروپیگنڈا تھا۔ اس کام پر بے دریغ روپیہ صرف کرتے۔ یہ روپیہ کہاں سے آتا تھا؟ اس تعلیمی ادارے سے جو میں نے بڑے شوق سے قائم کیا تھا۔ جب اسے لوٹ لوٹ کر کھوکھلا کر دیا تو آپس میں بانٹ ڈال کر ہزاروں روپیہ رشوت میں اُن اعمال کو دیتے، جو رعایا کے محافظ سمجھے جاتے تھے تاکہ وہ ہم پر الزامات

قائم کر کے ہمیں بدنام کریں......

اب جو باوجود تمام شرارتوں، پروپیگنڈے اور رشوت کے انہیں اپنی مہم کچھ ناکام سی نظر آنے لگی تو انہوں نے مصالحت کے نام سے ایک نیا شوشہ چھوڑا —— ہم نے اور خاص کر ہمارے تعلیم یافتہ گروہ اور قدیم سول سروس والوں نے انگریزوں سے بہت سی بُری بھلی باتیں سیکھی ہیں، ان میں ایک (COMPROMISE) ہے۔ انگریز کی زندگی سراسر (COMPROMISE) ہے۔ اس کی سیاست اس کی تجارت، اس کا مذہب اور اس کے اخلاق، اس کا بیاہ اور بین قومی تعلقات، یہاں تک کہ اس کے زن و شو کے تعلقات بھی (COMPROMISE) پر مبنی ہیں.......... اس مفاہمت یا مصالحت.......... کی تہ میں یہ بات تھی کہ ان کی بداعمالیوں پر پردہ پڑا رہے۔ میں نے بار بار انجمن، کالج اور پریس پر تحقیقاتی کمیشن قائم کرنے کی تجویز کی مگر وہ کبھی اس طرف مائل نہیں ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر تحقیقات ہوئی تو ان بدکاروں کی بداعمالیاں آشکارا ہو کر رہیں گی اور یہ انہیں منظور نہیں تھا۔ یہ تحریر میں نے تلافیِ مافات کے خیال سے اصل کے گھسیٹ گھسیٹ کر لکھی ہے۔ اگر اس میں کوئی بے ربطی یا غلطی نظر آئے تو یہ سمجھ کر معاف کر دیا جائے کہ یہ ایک ایسے مظلوم شخص کی تحریر ہے، جس نے کام کو ایمان سمجھ کر کیا، پر افسوس کہ اب کام رہا اور نہ ایمان رہا

عیب نکلا، جو ہنر پیدا کیا
ہم نے کھویا، جس قدر پیدا کیا

سالہا سال کی محنت دلّی میں آزادی کی نذر ہو گئی تھی اس کا صدمہ ایسا تھا کہ نہ بھلا سکا۔ جب یہاں قدم اچھی طرح جم گئے تو میں نے پھر کام شروع کر دیا۔ تنہا تھا، کوئی مددگار نہ تھا۔ اتنی مقدرت نہ تھی کہ مدد کے لیے کسی ملازم کو رکھ لیتا۔ انجمن کی مالی حالت بھی سقیم تھی کئی سال تک دن رات کام کرتا رہا.......... میرے رفقائے کار نے مجھے ایسی اذیتیں پہنچائیں اور انجمن کو ایسے نقصانات پہنچائے کہ میں کسی کام کا نہ رہا۔ میرا کتب خانہ تک سربمہر کر دیا۔ میرے مسودات سب کتب خانے میں بند رہ گئے۔ سازشوں کا بازار گرم ہو گیا خیانت اور بددیانتی پر پردہ ڈالنے کے لیے طرح طرح کی الجھنیں پیدا کر دیں۔

نیا انقلاب آیا تو خائن اور بددیانت گھبرائے، سازشوں کا زور کم ہوا۔ اس کے ساتھ حکومت نے اردو ترقی بورڈ قائم کیا اور لغت کی ترتیب کے لیے مجھ سے درخواست کی۔ میں نے بخوشی اس کام کو اپنے ذمے لے لیا۔ یہ بھی اجازت دی کہ اپنی پسند کے مددگار وغیرہ انتخاب کروں۔ اللہ نے چپ کی داد دی اور صبر کا پھل ملا۔ انشاءاللہ اب کام پوری مستعدی کے ساتھ شروع ہو جائے گا۔ اور گزشتہ آفات کی تلافی ہو جائے گی!

۵

اردو یونیورسٹی کی تجویز کی جس طرح تائید و حمایت کی گئی تھی اس کو دیکھتے ہوئے مجھے پورا یقین تھا کہ شمالی ہندوستان میں یونیورسٹی قائم ہو کر رہے گی لیکن اس کے بعد ہی بدلتے ہوئے سیاسی حالات نے اتنا موقع نہ دیا کہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا، یہاں تک کہ نوبت تقسیم ملک تک پہنچ گئی اور سارے ارادے دل کے دل میں رہ گئے لیکن اس کے باوجود ابھی امید کی ایک کرن باقی تھی اور بجھی ہوئی راکھ میں ایک

چنگاری روشن تھی کہ اگر ہندوستان میں ناگ پور کی تجویز عمل میں نہ آ سکی تو پاکستان میں تو اسے عمل میں لانے میں کوئی دشواری نہ پیش آئے گی۔ جب میں نے دلی میں قائداعظم سے اُردو یونیورسٹی کے قیام کے بارے میں گفتگو کی تھی تو انہوں نے اس سے بڑی دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار کیا تھا اور مجھے قوی اُمید تھی کہ میں اُن کی امداد و اعانت سے کراچی میں اُردو یونیورسٹی کے قائم کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا، لیکن اس وقت خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ قائداعظم ہم سے ہمیشہ کے لیے جُدا ہو گئے اور اُن کے بعد ہماری بدنصیبی سے زبان کا طے شدہ مسئلہ بھی ایک نزاعی مسئلہ بن گیا اور بعض خود غرض اور مفاد پرست سیاست کاروں کی بدولت اس نے ایک "فتنۂ بیدار" کی شکل اختیار کر لی۔ لیکن میں اس وقت بھی مایوس نہ ہوا اور میں نے اللہ کا نام لے کر اسی کراچی میں انجمن ترقی اُردو پاکستان کے زیر اہتمام اُردو کالج قائم کیا جو خدا کے فضل و کرم سے اب بھی کامیابی سے چل رہا ہے اور جس میں بی۔ اے، بی ایس۔ سی، بی کام اور ایل ایل بی تک اُردو کے ذریعے سے تعلیم دی جاتی ہے اور اب سے چند سال پہلے ایم۔ اے کی تعلیم بھی اس میں اُردو کے ذریعے سے دی جاتی تھی۔

موجودہ انقلابی حکومت کے مقرر کردہ تعلیمی کمیشن نے بھی انجمن کے اُردو کالج میں قومی زبان کے ذریعے تعلیم دینے کے کامیاب تجربے کا اعتراف کیا اور اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ یہ تجربہ جاری رہنا چاہیئے —— یہ سچ ہے کہ میں اپنی عمر کی نوّے منزلیں طے کر چکا ہوں لیکن میرے ارادے اب بھی جوان ہیں اور میرا عزم و حوصلہ اب بھی زندگی کی حرارت سے سرشار ہے۔ میرے سامنے ایک مقصد ہے اور اس مقصد کی تکمیل ہی میری زندگی کا حاصل ہے اور وہ مقصد ہے جلد سے جلد کراچی میں ایک چارٹرڈ اُردو یونیورسٹی کا قیام —— میں اب زندگی کی اُس منزل میں ہوں جہاں کام سے زیادہ آرام کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اُردو یونیورسٹی کا قیام اب میری زندگی کا مشن ہے اور اس مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں، چاہے مجھے اس سے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ پہنچے۔

پچھلے ایک دو سال کے عرصے میں ہند و پاک کے بعض رسالوں نے میرے بارے میں نمبر شائع کیے ان میں "الشجاع"، "نورس" اور "مجلس" شامل ہیں۔ جلد ہی اُردو کالج کراچی کی طرف سے بھی ایک خاص نمبر "برگِ گل" شائع ہو رہا ہے جو کم و بیش بارہ سو صفحات پر مشتمل ہے …… ان سب کے پڑھنے سے (ناظرین) کو میرے متعلق بہت کچھ معلوم ہو جائے گا ویسے مجھے اپنے حال کے متعلق حالی کی ایک رباعی یاد آتی ہے ؎

جیسا نظر آتا ہوں نہ ایسا ہوں میں
اور جیسا سمجھتا ہوں نہ ویسا ہوں میں
اپنے سے بھی ہوں عیب چھپاتا اپنے
بس مجھ کو ہی معلوم ہے جیسا ہوں میں

ریاض خیرآبادی

دس سال کی عمر سے اپنے والد ماجد کے ہمراہ میں گورکھپور گیا۔ وہیں عربی تعلیم کا سلسلہ مولوی حکیم سید فیاض حسین صاحب مرحوم مشہور سوداگر محلہ سے شروع ہوا۔ فارسی اپنے والد ماجد سے پڑھی۔ پندرہ برس کی عمر تھی کہ خیرآباد آ کر مولوی حافظ سید نبی بخش صاحب مرحوم کے مدرسۂ عربیہ میں داخل ہوا۔

میرے مورث اعلیٰ سید شاہ شجاع والی کرمان دو سو سال پیشتر اس نواح میں آئے۔ خدمتی امام کے قبائل بھی ہمراہ تھے۔ شاہی خاندان کا شجرہ خاندانی اب بھی چھپا ہوا موجود ہے۔

میرے اجداد میں قاضی بخش صاحب قدس اللہ سرہ العزیز اولیائے کرام سے گذرے ہیں جن کا ذکر تذکرۂ اولیا میں ہے۔ آپ حضرت شیخ سعد رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں۔ مزار حضرت قاضی بخش صاحب کا مکان مسکونہ سے متصل ہے اور انھیں کے زیر سایہ میرے بزرگ خواب راحت میں ہیں۔

میرے بچپن سے جب اٹکھیلیاں کرتا شباب آیا

یہی دور رنگ زمانہ ہے جس کا آغاز جتنا خوش آیند ہے، انتہا بھی خوفناک بھی ہے۔ شباب کی اٹکھیلیاں بچپن ہی سے ہو رہی تھیں کہ میں نے مدرسۂ عربیہ خیرآباد کو خیرباد کہا۔ تعلیم سے طبیعت کا اچاٹ ہونا اس وحشت کا نتیجہ تھا جو شاعری و درسِ عشق کی طرف رجوع کرنے کو اپنے ساتھ لائی تھی۔ شمس العلماء مولانا عبدالحق صاحب علامہ خیرآبادی آمادہ مسند تھے کہ ریاض نادر نسخے ادب میرے درس میں ختم کرے مگر بدنصیبی نے یہ موقع کھو دیا۔

سیتاپور کے بعض مشاعرے

میں نے ابتدائے مشق سخن کے لیے دیوان غالب کو پسند کیا تھا۔ دیوانِ غالب کے اشعار پر بترتیب قافیہ پیمائی کرتا۔ کلام جناب تدبیر الدولہ مدبر الملک منشی مظفر علی خاں امیر شاگرد مصحفی کو دکھاتا۔ اسیر مرحوم مجھ سے محبت بہت کرتے مگر مرحوم کی خدمت سے میں اکثر اس لیے پژمردہ واپس ہوتا کہ جناب اسیر بیاض پریشان صحبت کو میرے اشعار پڑھ کر سناتے۔ یہ امر خفت کا باعث ہوا یہاں تک کہ آخر میں اس خاص رنگ کا دیوان اور کلام تلف کر دینا پڑا۔ طبیعت صفائی کلام اور صحت کی طرف رجوع ہو گئی۔ سیتاپور و خیرآباد میں مشاعروں کا زور تھا۔ خیرآباد کے مشاعروں میں حضرات سیتاپور بخصوصیت شریک ہوتے۔ سیتاپور کے مشاعروں نے بھی نمود کمال و ترقی پر کی تھی۔

رشید لکھنوی، وفا سیتاپوری، نسلق کاکوروی، میر تجمل حسین تجمل نیز دیگر مشاہیر کا کلام بزم سخن کی رونق تھا۔ ایک خاص مشاعرہ

سید ریاض احمد خلف مولوی سید طفیل احمد کرمانی خیرآبادی

کا انعقاد مولوی سید محمد صادق صاحب مرحوم وکیل سیتاپور ہی کی کوٹھی پر ہوا۔ اہتمام آپ کے خلف الرشید مولوی حاجی سید محمد اسمٰعیل کا تھا۔ میرے جوشِ شاعری کو ترقی تھی، لکھنؤ کی مسلسل آمد و رفت کو اور سونے پر سہاگہ سمجھئے۔

مجھے بھی شرکت کے لیے مجبور کیا گیا۔ ذیل کا شعر اس وقت کی طرحی غزل کا ہے، جس کو ابتدائے مشق سے تعلق ہے۔

شہیدِ ناز خوابِ مرگ سے گھبرا کے اُٹھ بیٹھے
تری ٹھوکر میں ان سے چل گیا فقرہ قیامت کا

اب میں نے امیر مرحوم کے فرمانے سے اپنا کلام بغرضِ اصلاح امیر مینائی کی خدمت میں رامپور بھیجنا شروع کیا تھا اور جب تک امیر مرحوم حیات رہے کسی کو بغیر اصلاحی شعر نہ سنایا نہ شائع کیا۔

سیتاپور کے ایک مشاعرہ میں میر محمد حسین صاحب تجلی مرحوم کی غزل بہت شہرت پا چکی تھی۔ میرے پاس بھی ان کا یہ مشہور مصرع بھیجا گیا

مجھ کو رہنے دیجئے نیکی بدی کے واسطے

میں نے بھی غزل کہی جس نے زیادہ شہرت حاصل کی، بعض اشعار درج ذیل ہیں۔

تم مجھے دیتے ہو دشمن کی خوشی کے واسطے
کیوں برے بنتے ہو ناحق تم کسی کے واسطے
لوٹتے ہیں کاتبِ اعمال یوں آنکھوں میں لطف
حاشیہ چھوڑا ہے گویا آپ ہی کے واسطے
دونوں عالم تنگ ہیں کچھ اور وسعت چاہیے
پاؤں پھیلانے کو میری بے کسی کے واسطے
لطفِ دل مل کے دونوں سے رہی کی وضعِ خاص
کچھ بناوٹ بھی ہو تیری سادگی کے واسطے
پاس ہی تو آپ بزرگ ہے یہ اپنی وضعِ جنوں
جب ملے ناصح جھکے ہم بندگی کے واسطے
حشر میں وہ کاتبِ اعمال کچھ تو ہو شریک
ساتھ رکھتی تھی تمھیں نیکی بدی کے واسطے
کیا نہ دل حضرتِ ناصح کو آتے دیکھ کر
کچھ ابھی تھوڑی سی کی پہل دل لگی کے واسطے
سال چھپنے کے تم پھیری کو نکلے ہیں میاں
مے کدے سے کچھ وقت ہیں اس شاعری کے واسطے

اس کے بعد ہی امیر مینائی کی ایک مشہور غزل کا مصرع سیتاپور میں طرح دیا گیا ؎

"آواز دے رہی ہیں ستوں کچہری کی"

مشاعرہ بہت ہی خاص اہتمام سے تھا، جو دن کو شروع ہو کر نماز مغرب کے وقت میری غزل پر ختم ہوا۔ میرے روبرو مولوی عبدالحق صاحب وکیل سیتاپور، شاگرد و خویش حکیم مومن خاں مرحوم دہلوی بیٹھے تھے۔ فرشی پاجامہ، سفید داڑھی، صوم و صلوٰۃ کے پابند، جیتے جاگتے پرانے بزرگ تھے۔ میں نے آپ کو مخاطب کر کے مقطع کچھ اس انداز سے پڑھا کہ لطف آ گیا، ممکن ہے مولانا کو کچھ ناگوار بھی ہوا ہو۔

شرما رہا ہوں حضرتِ شیخ سے
جن کی داڑھی ہے ہاتھ بھر کی

اسی طرح ایک مشاعرہ سیتاپور میں غزل کا مقطع پڑھنے پر میں جس طرف سے گزرتا تھا لوگ تبسم کرتے تھے۔

بگڑا تھا اس گلی میں عجیب وضع سے ریاضؔ　　اک پشتِ خار ہاتھ میں اور سر گھٹا ہوا

اس سلسلے میں ایک دوسرے مقطع کا بھی ذکر بے محل نہ ہوگا۔ جس سے مجھ کو خفیف ہونا پڑا۔ منشی سجاد حسین صاحب مرحوم ایڈیٹر اودھ پنچ لکھنؤ نے پنچ ہی کا ایک ناول شائع کیا جس کے گرد پوش پر شیخ جی کی تصویر نہایت مضحکہ خیز دی گئی تھی اور اس پر جلی قلم سے ذیل کا مقطع درج کیا گیا تھا۔ جو دیکھتا سمجھتا ریاض کی تصویر ہے۔

دیکھ کر ہنستے ہو کیا تم صورتِ پاکِ ریاضؔ　　یہ بڑے پہنچے ہوئے اللہ والے لوگ ہیں

اس زمانہ کا ایک اور مقطع بھی میرے لیے بار بار پریشانی کا باعث ہوا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار آنجہانی نے فسانۂ آزاد میں میری یہ غزل شائع کی۔

دل کسی طرح چین پا جائے　　غیر کی آئی مجھ کو آ جائے
جان اک کچھ گزر گئی اس پر　　منہ چھپائے جو کوستا جائے
ہے ریاضؔ اک جوانِ مستِ مدام　　دو پیئے اور جھومتا جائے

مقطع خصوصیت کے ساتھ ہندوستان میں مشہور ہے جو زیادہ تر بدگمانی کا سبب ہوا۔

سرشار مجھ سے بے تکلف تھے۔ ہم مشرب بھی سمجھتے تھے۔ ریاض الاخبار کے نامہ نگار بھی تھے ایک روز آپ نے مجھ کو پیام دعوت دیا۔ سرشار فرنگی کے قریب مقیم تھے میں وہیں گیا۔ دوپہر سے زیادہ وقت گزر گیا آخر سرشار نے گاڑی منگائی اور مجھ کو لے کر مرے کمپنی کے ایک خاص کمرہ میں داخل ہوئے۔ سرشار بار بار یہ مصرع پڑھتے تھے ؎

دو پیئے اور جھومتا جائے

بات کہتے میز پر وہ سامان آگیا جس کا نظم میں بھی ذکر تھا۔ میرے ہوش شیشہ کی پری بن کر اڑے مگر سرشار کے خوش کرنے کو اس سے بیشتر کہ وہ جام میں اور جام سے لب تک آئے۔ میری باچھیں کھلی ہوئی تھیں دفعتاً میں سرشار سے دو منٹ کہہ کر کسی طرح اٹھا گویا ابھی رفع ضرورت کے بعد واپس آتا ہوں مگر واپس آیا تو کب اور کہاں بیس سال بعد دکن میں حضور مہاراجہ پیشکار بہادر کے کاشانہ پر! یہاں بھی سرشار کا لحاظ نہ تھا البتہ مہاراجہ بہادر کی طرف سے میری خدمت مداراتی انھیں کے سپرد تھی۔

دکن میں بھی اسی مقطع کی وجہ سے اس سے ملتا جلتا واقعہ پیش آیا۔

میں ایک شب جریدۂ روزگار مدراس کے ایڈیٹر سے ملنے ان کی قیام گاہ پر گیا۔ ۱۹۰۳ء والے دربار دہلی کے بچھڑے ہوئے مدت مدید کے بعد ملے۔

بہت سے احباب اور مشتاقینِ ریاض جمع ہو گئے یعقوب صاحب بھی آئے اور دکن کے مشہور شاعر گرامی بھی گرامی کے ہمراہ ایک موقر درانی شاعر بہ اصرار مجھ کو اپنی فرودگاہ پر لے گئے۔ دو چار ہم مشرب و ہم مذاق بھی شریک صحبت ہوئے۔ یہاں بھی تکلف کے ساتھ میز پر وہی سب رنگینی والا سامان آگیا۔ میں نے بھی بظاہر دست شوق بڑھایا پھر کچھ جھجکا کہ استغفار کیا خوف رکھتا ہے۔ طبیعت راضی نہیں جگر کے خراب ہونے سے ڈاکٹر نے ایک سال کے لیے قطعی ممانعت کی ہے۔ اس کا خیال ہے استعمال سے ہلاکت واقع ہوگی۔ انکار سے پارسائی کا یقین نہ ہوا

اور یقین ہو تو۔

ریاستی شاعر یا افسر وراثت سے بن جاتی ان کا تعلق بھی مہاراجہ پیش کار بہادر سے تھا۔ "البشیر" اٹاوہ میں پہلے پہلے مضامین میری مے نوشی پر شائع ہوئے ہیں۔ قیام گورکھپور میں پارسائی ایسی تھی جیسے جنت میں رہ کر کوئی مے طہور سے دستکش رہے۔

توبہ کے پاس نے روکا لب کوثر مجھ کو
آج پینے کو طبیعت میری چاہی کیسی

دربار قیصری

جس زمانہ میں ریاض الاخبار ہفتہ وار اور گلدستہ ریاض ماہوار خیرآباد سے شائع ہوتا تھا، جس کے مطبع کا تاریخی نام طور تجلی تھا، اعلیٰ حضرت جناب نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں نے مجھے میرے استاد حضرت امیر مینائی مرحوم و مغفور کے ذریعہ سے یاد فرمایا۔ اس وقت دربار قیصری میں شرکت کے لیے دہلی جانے کو تیار تھا۔ اس سے پہلے دربار قیصری میں تمام اخبار نویس ہر صوبے سے مدعو تھے۔ ان کا کیمپ خاص تھا جسے بکمال تزئین و تکلف نصب کیے تھے۔ دو دو ایڈیٹروں کے لیے ایک خیمہ ضروری فرنیچر و اسباب آرام کے ساتھ مخصوص تھا۔ کھانے اور ناشتے کے لیے خاص سرکاری اہتمام تھا۔ پُرتکلف کھانے ہر وقت تیار رہتی تھیں۔ بگھیاں جہاں چاہئے پہنچا دیں۔ جہاں تک نظر جاتی ہر طرف خیمے۔ میں منشی نظام احمد مرحوم مالک ریاض الاخبار دہلی گیا۔ کیمپ کے سوا مولانا ابو المنصور مرحوم امام فن مناظرہ کے دولت خانہ پر بھی مہمان رہا چنانچہ شب باشی کا اتفاق وہیں ہوتا۔ کیمپ میں پنجابی اخبار کا خیمہ ہماری شرکت میں تھا۔ مولانا مرحوم کے بڑے صاحبزادے خاں بہادر اور سید ناصر علی صاحب غالباً موجود تھے۔ بعد کو نکلے۔ آپ کے چھوٹے بھائی سید نصرت علی صاحب مالک نصرت الاخبار دہلی کا زیادہ ساتھ رہتا۔ دن تو والیان ملک کے عالیشان پُرفضا و فردوسی کیمپوں میں گزرتا جو دہلی کے باہر کوسوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ ہر طرف لہلہاتے ہوئے چمن زار، سجے ہوئے بازار اور سب کی وضع و قطع ان کی آراستگی بھولا ہوا خواب کہاں تک بیان کر سکتا ہوں۔ اسی گلگشت میں مہاراجہ اور سے بھی شرف نیاز حاصل ہوا، میری باریابی۔ نواب مردان علی خاں صاحب بہادر خیرپور سندھ کے حضور میں یہ امتیاز خاص ہوئی تھی۔ حضور نواب صاحب اور تمام دربار فارسی زبان کا استعمال کرتے تھے۔ مجھے مہاراجہ کشمیر کے کیمپ میں بھی جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس بنا پر کہ مہاراجہ اس سے پیشتر رونق افروز لکھنؤ تھے تو سیٹھ سیتا رام صاحب تعلقدار بسوان جن کے روابط مہاراجہ سے تھے مجھے بھی اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ مگر اس وقت مہاراجہ بعزم روانگی سوار ہو رہے تھے، سرسری شرف تعارف حاصل ہو سکا۔ دربار دہلی کی تقریب میں سیٹھ صاحب موصوف بھی تشریف لائے تھے مجھے بھی مہاراجہ کے کیمپ میں ہمراہ لے گئے۔

دربار کیمپ کے قریب پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ دربار کیمپ سے شمس العلما مولانا عبدالحق صاحب علامہ خیرآبادی کسی قدر خفا آ رہے ہیں۔ کشمیر کے ایک اعلیٰ افسر بھی بلحاجت کمال ساتھ ہیں۔ مولانا اسی تعطّف کے ساتھ فٹن پر سوار ہو گئے۔ ہم لوگ ریڈی کانک کے ہمراہ خیمے میں آئے، ہر طرف خاموشی تھی۔ سیٹھ صاحب نے دریافت کیا کیا واقعہ ہے۔ جواب ملا اس وقت واقعہ یہ پیش آیا ہے کہ شمس العلما کے تشریف لانے کے واسطے یہ وقت مقرر کیا گیا تھا۔ شمس العلما تشریف لائے، مہاراجہ نے براہ تعظیم گاؤ تکیہ مسند پر جگہ دی، مزاج پرسی زبانی ساتھ ہی حکم دیا کہ ولیعہد کے اتالیق کو تکلیف دو۔ وہ بھی تشریف لائے، مہاراجہ نے انھیں بھی شمس العلما کے مقابل گاؤ تکیہ مسند پر جگہ دی۔ ظاہر ہے شمس العلما کی نازک مزاجی نے اسے پسند نہ کیا۔ پھر مہاراجہ نے فرمایا مجھے مدت سے آرزو تھی کہ دو جنت پایہ علما کا کسی مسند پر مناظرہ دیکھوں۔ یہ سنتے ہی شمس العلما نے برافروختگی کے ساتھ کہا مہاراجہ آپ نے مرغ اور بٹیر کی پالیاں دیکھی ہوں گی، علما کی یہ شان نہیں ہے۔ ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ مہاراجہ کو عرق آ گیا۔ اس پر اس ناگوار واقعہ کا زیادہ اثر تھا۔ ہم لوگ بھی بغیر ملاقات واپس آ گئے۔

دوسرے روز مجھے معلوم ہوا کہ مہاراجہ کشمیر نے افسر اعلیٰ کے ذریعہ سے گیارہ پارچہ کا خلعت اور نقد دو ہزار روپے معذرت کے ساتھ شمس العلماء کی خدمت میں بھیجے شمس العلماء نے جواب دیا کہ مجھے افسوس ہے کہ مہاراجہ نے براہِ قدردانی خلعت و نقد سے عزت افزائی کی مگر میں اس کے قبول کرنے سے معذور ہوں کیونکہ میں رئیس رامپور کا ملازم ہوں، یہ پیرو نواب مشتاق علی خاں بہادر ولی عہد رامپور کو ان کے کیمپ میں گھر خلد آشیاں فرمانروائے رامپور بیماری کی وجہ سے دہلی نہ آئے اور دربار قیصری میں شرکت سے معذور رہے تھے، یہ پگڑی لے کر ولی عہد بہادر نے خلد آشیاں کو اس واقعہ کی اطلاع تار پر دی، تار کا جواب آیا ہماری طرف سے گیارہ پارچہ کا خلعت اور نقد دو ہزار پیش کرو۔

شمس العلماء جو کسی بات پر مدار المہام رامپور سے برہم ہو کر دہلی اس غرض سے آئے تھے کہ واپس نہ جائیں اور کسی ریاست میں ملازمت کر لیں۔ اس قدر افزائی پر دربار قیصری کے بعد رامپور چلے آئے اور پھر کبھی خلد آشیاں سے جدا نہ ہوئے۔

ایک لطیفہ

اول مرسالار جنگ بہادر نابالغ فرمانروائے دکن اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں بہادر کی معیت میں مع رفقاء فرزند اپنے شاہی کیمپ میں تھے۔ وہیں ہم لوگوں کو اڈیٹر صاحب جریدہ روزگار مدراس اور حیدرآبادی جعفر صاحب سے ملنے کا بار بار اتفاق ہوا ایک روز ہم لوگوں کو گشت میں شام ہو گئی شہر کو واپس آتے ہوئے پرنس آف ارکاٹ مدراس کے کیمپ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ نواب ناصر علی خاں بہادر نیر آبادی حریش پرنس آف ارکاٹ پرنس کے ہمراہ شرکت دربار کی غرض سے آئے ہوئے تھے ممدوح ہمارے اور نظام احمد مرحوم کے قریبی بزرگ عزیز تھے۔ وہاں ہم سوا ناشتہ کے کچھ کھانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اور جلد واپس ہونے کا قصد تھا۔ ہمیں شب کو واپسی کی اجازت چاہی مگر فرش پر دسترخوان بچھ چکا تھا بیٹھے مجبور ہے۔ اصرار کیا گیا مگر میں نے معذرت کی جب نظام احمد سے کہا گیا وہ بے تکلف دسترخوان پر تشریف لے گئے میری طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ اشارے سے کچھ کام لیتا۔ اب میرے لیے صبر کے سوا چارہ کیا تھا۔ کھانے کے ساتھ سرخ سبز مختلف رنگ کی مٹھائی کی طشتریاں بھی تھیں غرض گرسنہ بہ جان گرسنہ دسترخوان ختم ہوا تو خواب گاہ کے اندر میز کی طرف طشتریاں جاتی نظر پڑیں۔

کچھ دیر کے بعد میں نے اجازت چاہی بزرگ ممدوح نے فرمایا شب بہت ہو رہی ہے رات زیادہ ہو گئی ہے اب واپسی کی ضرورت نہیں میں کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ نظام احمد صاحب مرحوم نے منظور کر لیا۔ خواب گاہ میں سامان استراحت ہو گیا سب حضرات آرام فرمانے لگے میں گرسنگی کی شدت میں کروٹیں بدل رہا تھا نیند کا کیا ذکر۔

مجھے کچھ سوجھا تو رنگین شیرینی کی طشتریوں کا، جب ہر طرف سے تخیر خواب جھنجھوڑی میں اٹھا اور دبے پاؤں میز کے قریب پہنچ کر ہاتھ بڑھایا اور کچھ محسوس ہوا تھا کہ وہ منہ کے اندر پہنچ گئی میں چاہتا تھا زبان پر پہنچنے سے پہلے حلق میں اتر جائے مگر وہ کمبخت سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن گئی نہ اگلنے کی نہ نگلنے کی رہ گئی تھی جو نہی تو منہ تیز کا دھواں کا ہوا یہ رنگین شیرینی کی نہ تھی صابن کی بٹی تھی میری مصیبت کا پورا لطف اٹھانا ہو تو کچھ دیر کے لیے صابن کی ٹکیہ منہ میں رکھ کر کام و دہن کو لذت پہنچائیے۔

وہاں سے صاف ہو کر وہ چیز وہیں گئی جہاں سے اٹھائی گئی تھی پانی کی تلاش میں کسی کی آنکھ کھل جانے کا اندیشہ تھا۔ صابن کی کڑواہٹ منہ کے اندر بھی رہی ہم اس آسانی سے پلنگ تک نہ پہنچ سکے جس طرح وہ چیز میز تک پہنچی اب صابن اپنی جگہ پر تھا مگر اس کی لذت زبان پر۔ سب حضرات پابند نماز تھے نماز فجر ادا کی ساتھ ہی چائے مع بسکٹ وغیرہ کے سامنے آگئی میں نے دو چار گھونٹ پیئے اور بسکٹ اٹھا کر تنے زیادہ پیالی میں ڈال دیے کہ بزرگ ممدوح کو میری طرف توجہ ہو گئی دوسری پیالی بڑھا کر کہا اب بسکٹ اس میں ڈالے جائیں۔ نظام احمد مرحوم کو ہنسی آ گئی جو معنی خیز تھی استفسار

پر افسوس کہ آپ تمام دن بھوکے بیٹھے تھے پھر بھی شب گزارنے میں تکلف کیا۔ واپسی کا بھی سہارا ڈھونڈنے میں تکلف رخصت ہو گیا اور بے تکلف سے زیادہ بے تکلف ہو گئے ہیں۔ وہاں بھی خوش تھا۔ گرفتہ صاحب کے دفتر کا پتہ دکھایا گیا صاحب اور اقتضائے ذاتی شعری رکھنے والے کے لیے، اچھے شعر سے کم ہے۔

اب میں دربار دہلی کا ذکر چھوڑتا ہوں اس کے لیے پرستان خیال کی ضخامت درکار ہے کم بخت کی یاد جوانی سے کم نہیں۔ یہی کہتے ہوئے وہاں سے چلے اور یہی کہتے ہوئے واپس ہوئے ؎

دربار قیصری کے عجب رنگ ڈھنگ ہیں
دلی ہے اور ہم ہیں شب اپ ترنگ ہیں

اشاعت پذیر پرچے

تعلیم کو خیر باد کہے زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ریاض الاخبار بھی جاری ہوا "گلکدہ" بھی۔ گلکدہ ریاض کا ذکر مولانا حسرت موہانی نے خاص طور پر "اردوئے معلیٰ" میں کیا ہے گلکدہ کو اپنی طرح ادبیت کا شرف تھا اس وقت لکھنؤ سے دو اخبار "نگار نامہ" اور ایک پرچہ حشمت مرحوم کی اڈیٹری میں نکلتا تھا۔

گلکدہ کو خاص اور امیراللہ مرحوم راجہ محمد امیر حسن خاں بہادر والی محمود آباد سے حق تھی پیر جلی حسین تجمل مدیر تھے چند نمبر شائع ہوئے تھے کہ نواب کلب علی خاں بہادر فردوس مکاں رامپور نے مجھ کو یاد فرمایا مگر قیصری دربار دہلی کی وجہ سے یہ تاخیر ہو گیا اور خلد آشیاں کی طرف سے اپنے استاد کا مہمان ہوا۔

رامپور آ کے ریاض تم نے بہت خوب ہوا   اپنے استاد کے پاؤں کا ارماں نکلا

منیر اور داغ بڑے محبوب نوازی سے تھے تو تھی کی طرف سے اعجاز صحبت ہوا۔ میں خود گیا اور بطور ملازم بار بار گیا۔ دربار میں شعرا اور علما فضلا سے صاحب منزل میں ملاقات ہوتی امراء میں میں نے یہ غزل سنائی ؎

ہنگام نزع گر یہ یہاں بے کسی کا تھا   تم ہنس پڑے یہ کون سا موقع ہنسی کا تھا
یہ اپنی وضع اور یہ دشنام مے فروش   سن کر جو پی گئے یہ مزہ مفلسی کا تھا

داد مجھی سے حوصلہ افزائی کی گئی۔

سفر رامپور

خلد آشیاں کے رحلت کے بعد میں مولانا تسلیم اور شاد بیاسی استاد بچھڑ کر رامپور گئے۔ اس وقت مراد آباد میں اتر کر رامپور سواری پر جانا پڑتا تھا۔ شیخ امداد اللہ خاں بہادر مرحوم کے صاحبزادے بھی لکھنؤ سے شریک سفر ہوئے۔ رات تکلف سے باتوں میں گذری پچھلے پہر سے تو مراد آباد سے پانچ چھ اسٹیشن ادھر کے چھوٹے اسٹیشن پر آنکھ کھل گاڑی کم ٹھہرتی تھی بہ ہزار دقت اترے۔ دکھانے کا سہارا نہ پان نہ تنباکو۔ جنگلی اسٹیشن، اسٹیشن ماسٹر نے خشک جواب دیا قصبہ چار پانچ میل۔ مراد آباد جانے کی ریل کا وقت ساڑھے تین بجے کے بعد۔ اسباب ایک پیدل سے ملازم کے سپرد کیا بھوک کی شدت میں بازار کا سہارا کا قصبہ کی طرف سے پیدل چلنے لگے۔ پہنچتے جاتے منزل دور ہوتی جاتی آخر دور سے کچھ شاندار چند عمارتیں نظر آئیں۔ خوش ہوئے کہ شاید بازار کی خاک نہ چھاننا پڑے۔ معلوم ہوا کہ یہ عمارتیں چودھری صاحب کی ہیں۔ سنا ہے یہ چودھری صاحبان سنڈیلہ کے خیال سے اور تسکین ہوئی مگر دولت پر پہنچ کر وہ چودھری صاحبان سفر کو گئے۔ دو دن ہوئے کہ امروہہ مراد آباد ہو گئے ہیں یہاں نائب صدر صاحب ہیں اور وہ مسلمان

یہیں کسی صحن سے گزر کے دیوان خانہ تک رسائی ہوئی جو بہت مرتفع تھا۔

شاندار دالان در دالان میں سفید چاندنی کا فرش گرد متعدد دیوان، دو سرے کے سرخ سرخ گاؤ تکیے لگے ہوئے، دروں والوں کے وسطی در میں مسند بھی گاؤ تکیہ بھی نائب صاحب بھی۔

بہت بڑا شاندار پیچواں منہ سے لگا ہے
یہ جان ہوتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

ناخواندہ مہمان اب فرش تک رو بہ رو گئے روکا کوئی نہیں، نائب صاحب کی نظر کاغذات پر جمی ہوئی، کچھ دیر انتظار کی زحمت اٹھا کر ہم نے بلند آواز سے السلام علیکم کہا۔ نظر اٹھی مگر کس طرح سے

اٹھے فتنہ نگاہ خشمگیں سے
گلے ملتے ہوئے چین جبیں سے

ناخواندہ مہمانوں کی آمد مسلمانہ تھی مگر صورت ساحرانہ تھی اب انتظار فضول تھا نگاہ خشمگیں و علیکم السلام کے بعد کاغذات کی طرف پلٹ چکی تھی میں آگے بڑھ کر نائب صاحب کے برابر مسند پر جا بیٹھا مولانا شرر اور شاد نے بھی ساتھ دیا نائب صاحب کا یہ عالم،

غصہ میرے بانکے کا اترا ہی نہیں ہے۔

حاشیہ نشینان بساط پر جواز کے پڑھنے میں غصہ کا اظہار ہونے لگا، کچھ دیر کے بعد دوسری شکل کھینچی تو میں نے دست بستہ عرض کیا ہم لوگ نام سن کر دور سے آئے ہیں سنا ہے حضور کو موسیقی کا شوق ہے۔ جبیں پُر چیں ہو کر فرمایا بالکل غلط ہے چودھری صاحب مراد آباد میں ہیں وہاں جاؤ۔

میں نے کہا ہم چودھری صاحب کی واپسی کا یہیں انتظار کریں گے کھانے کا انتظام فرما دیا جائے اور حضور بھی کچھ سن لیں۔ رخ پھیر کر بلند آواز سے کہا کوئی ہے دو تین خدمتگار سپاہی پہنچے۔ وقت نازک آ جانے سے شاد کو تاب ضبط نہ رہی ایک ہی سانس میں کہہ گئے آپ حضرت ریاض مالک ریاض الاخبار ہیں آپ مولانا عبدالحلیم شرر مالک دلگداز ہیں اور میں شاد حسین مہتمم پیام یار ہوں، ساتھ ہی واقعہ بھی بیان کر دیا۔ اب نائب صاحب عرق عرق لاحول ولا قوۃ، غضب کیا کہتے ہوئے اٹھے ہر ایک سے معانقہ کیا، اسٹیشن سے اسباب لینے کو آدمی دوڑائے۔ مگر میرے دل میں گدگدی کی خلش تفریح کے لیے باقی تھی ہارمونیم یا کوئی ساز ساتھ ہوتا تو شاد کو معافی میں دقت ہوتی۔ سب مہمان معہ گھنشی صورت کے ساتھ ایک مختلف کمرے میں پہنچا دیے گئے۔ پنکھے کی ہوا ملی مولانا شرر اور شاد کو ٹھنڈک ہوئی مگر ان کی گرمی کی انھیں نائب صاحب سے زیادہ مجھ پر غصہ کی بے وجہ ابال تھی، میں نے سمجھایا موجودہ صورت مذاق اور موسیقی کے صدقے میں ہے جس نے ہماری پوزیشن کر دیا۔ میں نے دونوں معزز ساتھیوں سے الٹی شکایت کی کہ آپ نے اپنے ساتھ مجھے بھی نقصان پہنچایا اگر اس وقت کچھ بھی بے عنوانی ہو جاتی تو وقت رخصت پانچ سو سے کم کا نذرانہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی گفتگو در پیش تھی کہ نائب صاحب سر کو جنبش دیتے لاحول ولا قوۃ اور غضب کیا کہہ کر کلام بلند آتے رکی تکلیف نہ ہو تو ذرا عمارات باغات ملاحظہ فرمائیے۔ واقعی ہر چیز قابل تعریف تھی۔ خوش سلیقگی کی حد نہ تھی ایک بجے واپس آئے دسترخوان مختلف اقسام کھانوں سے بھرا تھا مربے بھی چٹنیاں بھی، وغیرہ بھی، میرے ساتھی رفیق نے سیر ہو کر کھانا کھایا کچھ دیر استراحت کی۔ نائب صاحب کو دو چار روز قیام پر اصرار تھا مگر ہمیں موقع نہ تھا، نائب صاحب نے بھی اسٹیشن تک مشایعت کی تکلیف کی اور فوراً ایک ہاتھی پر میں اور نائب صاحب اور دوسرے پر مولانا شرر اور شاد اسٹیشن پہنچے۔ نائب صاحب نے ضد کر کے دوسرے درجہ کے ٹکٹ ناخواندہ مہمانوں کے واسطے لیے اور خدا حافظ کہا۔

یہ واقعہ چھپا دیا گیا مگر منشی امیر احمد صاحب کو معلوم ہوا اور مراد آباد میں خود چودھری نعمان سنگھ کو بھی۔ رامپور میں اب نہ وہ صحبت نہ وہ رنگ تھے مرزا شائق باورچی نے دھوم دھام کی دعوت کی اور یاد کی ایک تازہ غزل کا مقطع وقت پر اظہار مدعا کے لیے لکھ بھیجا۔

شور شادی سیاحی آئی مشرق سے تا کل　　غریب خانہ میں نیاز ماحضر بھی ہے
دعوت خوب تھی مگر کا شو کا لطف نہ تھا

ایک اور سفر

ترتیب و طبع امیر اللغات کے سلسلے میں منشی صاحب نے ہندوستان کے مشہور مقامات کے سوا کلکتہ کا سفر کرنا چاہا، مجھ کو بھی مجبور کیا۔ لکھنؤ میں منشی امتیاز علی صاحب کاکوروی مشہور وکیل نے اپنی کوٹھی پر سب کو ٹھہرایا۔ صاحبزادہ منشی خورشید احمد ہمراہ تھے اور سید محمد عسکری صاحب وسیم وغیرہ بھی۔ حکیم عابد علی صاحب کو خیرآباد سے اور میں لکھنؤ سے ساتھ ہمراہ ہوا تھا۔ شمرہ اور شاد بجنوری بھی شامل ہو گئے۔ فیض آباد میں منشی محفوظ علی صاحب مرحوم ڈپٹی کلکٹر نے مہمان کیا اور لغت کے متعلق اپنے فرائض ادا کیے۔

عقب سرائے میں میر قاسم علی صاحب مرحوم آنریری مجسٹریٹ اور بنارس میں منشی الطاف حسین مرحوم ڈپٹی کلکٹر نے دعوتیں دیں۔ بانی دی شمیم صاحب کے موجود ہونے کی وجہ سے مجلس شعرا کا جلسہ ملتوی کر دیا۔ پٹنہ بنارس سے بانکی پور پٹنہ کا قصد کیا۔ وہاں منشی مہدی حسن مرحوم شاداب رئیس پٹنہ نے اپنی لال کوٹھی میں مہمانوں کے قیام کا انتظام کیا۔ بانکی پور پٹنہ کی صحبتیں یادگار ہیں ایک شب کی صحبت میں علما زیادہ تعداد میں موجود تھے میں نے موقع سمجھ کر مختصر الفاظ میں امیر اللغات کے متعلق پبلک توجہ کی ضرورت کو غایت سفر بتاتے ہوئے مخاطبین سے چاہا کہ وہ بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں سب نے تائیدی جواب دیا اور کہا کہ پچاس ہزار کی پیشکش صرف اسی مقام سے ہو سکتی ہے ایک تاریخ کا تعین ہو جانا چاہیے کہ جو حضرات موجود نہیں ہیں وہ بھی شریک ہو سکیں۔ ابھی تاریخ کا تعین نہیں ہوا تھا کہ شاداب صاحب نے فرمایا غایت سفر یہ دیکھتا ہے کہ لغت کے لیے منشی صاحب کی خدمات کو ملک کس حد تک پسند کرتا ہے ورنہ منشی صاحب بذات خاص مصارف طبع و ترتیب گوارا کر سکتے ہیں۔ میزبان کے شاگرد بھی اور ریاض کی تحریک بغیر مشورہ ہے جس میں منشی صاحب اور ان کے میزبان کی پوزیشن کا خیال نہیں کیا گیا۔ کچھ دیر کے بعد صحبت برخاست ہو گئی مگر شاداب پر اثر رہا اور یہ اثر ریاض کے لیے خفت افزا تھا۔ میں اور یا استاد کے روبرو اپنا شعر نہیں پڑھتا تھا اس لیے منشی صاحب کے اوقات استراحت میں دوسرا مکان اسی احاطہ سے مخصوص تھا جس میں شعر و بیت جات کے اصحاب ریاض کا کلام سنتے۔ ہنوز شاداب پر میری تحریک کا اور مجھ پر شاداب کی تقریر کا اثر تھا کئی روز کی کوشش کے بعد منشی صاحب کے توسط سے یہ رکاوٹ دور ہوئی اور دونوں میں بہ تخصیص زیادہ لطف پیدا ہو گیا۔

وقت زیادہ گزر جانے اور ایام برسات کے قریب آ جانے سے کلکتہ کا عزم سفر فسخ کر دیا گیا۔ میری یہ کوشش ناکام رہی کہ امیر اللغات کے متعلق شاداب مرحوم کے خیالات معلوم ہو سکیں میں نے گورکھپور کی واپسی کا قصد کیا اور غایت منشی صاحب کو سمجھا دی۔ اجازت طلبی پر شاداب نے قیام کے لیے اصرار کیا مگر منشی صاحب کے فرمانے سے دوسرے روز کی روانگی منظور کر لی۔ وقت رخصت مسٹر محبوب حسن بیرسٹر مظفر پور نے شاداب کی طرف سے ایک کشتی میرے لیے منشی صاحب کے روبرو پیش کی جس میں نفیس پارچہ جات اور دو سو روپے نقد تھے۔ سعادت کی بات نے طول کھینچا شاداب مرحوم خود تشریف لائے اور منشی صاحب سے عرض کیا کہ ریاض کے انکار سے یہ سمجھوں گا کہ آپ باوصف امکان مجھے دل صدمہ سے محفوظ نہ رکھ سکے میں نے عطیہ قبول کیا اور روانہ ہو گیا منشی صاحب بھی ایک ہفتے کے بعد روانہ ہوئے مگر اس مضمون کی ایک یادداشت لائے۔ یادداشت کے طبع و ترتیب امیر اللغات کے لیے ہر سال اس نیک کے ساتھ پانچ ہزار روپے چندہ ہوا کریں گے کہ ریاض بانکی پور خود روپیہ لینے کے لیے آیا کریں گے۔

سفر ختم ہو گیا سال کے مقررہ مہینے پر منشی صاحب نے پندرہ سو کے تحائف لے کر وسیم صاحب کو گورکھپور روانہ کیا وہ گورکھپور آئے اور مجھ کو لے کر بانکی پور روانہ ہوئے۔

بانکی پور کے اسٹیشن پر اس خیال سے کہ شاد صاحب مرحوم کہاں کوٹھی میں ہیں یا اپنے مکان واقع صادق پور میں، شاد صاحب کو دریافت کیا۔ شاد صاحب کا نام سنتے ہی مخاطب کا رنگ متغیر ہو گیا ایک آہ کھینچ کر چشم پرآب کہا ان کا کل ہیضے سے انتقال ہو گیا ——— برسم تعزیت کوٹھی پر جانا میری قوت سے باہر تھا۔

بن بن کے بگڑیں لاکھوں بگڑ گئے ہیں

جلال کا ایک مصرع!

سفر بانکی پور کے سلسلے میں منشی صاحب منشی امتیاز علی صاحب کے مہمان تھے جلال کی ایک تازہ غزل منشی صاحب کے ملاحظہ سے گذری تو یہ مصرع پڑھ کر

غنچہ میرے بانکے کا اتنا ہی نہیں ہے۔

منشی صاحب نے مجھے غزل لکھنے کی فرمائش کی۔ میں نے غزل کہہ کر پیش کی جس کے بعض اشعار درج ذیل ہیں۔

وہ سچا کبھی کوئی کہتا ہی نہیں ہے　　اندیشۂ فردا تو گذرتا ہی نہیں ہے
اس دل سے تو بیٹھے کا ہے داغ ہی اچھا　　کم بخت اجاڑے سے اجڑتا ہی نہیں ہے
دامن کی شکن دور سے لیتی ہے بلائیں　　بل دیکھ کے ابرو کا اتنا ہی نہیں ہے
دیوانہ ریاض اوروں سے کیا بات کریگا　　معشوقوں سے تو بات وہ کرتا ہی نہیں ہے

جلال نے یہ واقعہ شاد سے سنا، میری غزل بھی دیکھی فرمایا، امیر شاگردوں کو اُبھار کر میرا رنگ مٹانا چاہتے ہیں۔ جلال کا یہ محض خیال تھا امیر کا برتاؤ جلال سے نہایت محبت کا تھا جلال خود میری قدر کرتے تھے میرے دو شعر مرحوم کی زبان پر تھے جنھیں یہ کہہ کر سناتے تھے کہ ریاض کا حصہ ہو گئے ہیں۔

شگفتہ پھول حسینوں کے ہار کے قابل　　جو خشک ہوں تو ہمارے مزار کے قابل

اب تو وعدہ بھی وہ نہیں کرتے　　دن قریب آ گئے قیامت کے

آخر زمانہ میں "گھبرانے" کی طرح پر جلال نے غزل کہی میں نے بھی، جلال نے خود تشریف لا کر داد دی۔

خیالِ شبِ غم سے گھبرا رہے ہیں　　ہمیں دن کو تارے نظر آ رہے ہیں
جنوں میں یہ اُن کو دعا دے رہا ہوں　　چنیں پھول تنکے جو چنوا رہے ہیں
کمر سیدھی کرنے ذرا میکدے میں　　عصا ٹیکتے کیا ریاض آ رہے ہیں

داغ و ریاض

جس زمانہ میں سید محمد عسکری صاحب وسیم خیرآبادی رامپور میں امیر اللغات کی خدمات انجام دے رہے تھے اکثر جناب داغ کی خدمت میں حاضر ہوتے مشغلۂ سخن کے ساتھ مشغلۂ شطرنج بھی رہتا ہے۔ ایک مرتبہ جناب داغ نے میرا مندرجہ ذیل شعر سنا کر

یہاں وضع اور یہ دشنام فروشی　　مسکرا جو پی گئے یہ مزہ مفلسی کا تھا

اپنا شعر بھی اس انداز سے سنایا کہ جو اور دل موزونیت کے سوا فرق و امتیاز بھی ظاہر ہوتا۔

واعظ ترے لحاظ سے ہم سن کے پی گئے
کیا ناگوار ورنہ شراب طہور تھی

اس شعر کے بلند پایہ ہونے میں کیا شک ہے۔ میرے لیے یہ امر باعث ناز ہے کہ مدتوں گزر جانے پر بھی میرا یہ شعر یاد تھا۔ داغ کا یہ برتاؤ میرے ساتھ ہمیشہ بالخصوصیت رہا۔ میں قیام دکن میں جب دیکھنے گیا داغ خانہ ویرانی کی وجہ سے بہت مغموم تھے حادثہ کو آٹھ دس روز گزرے تھے مجھے پیش کر رہے تھے۔ مجھ کو اسی طرح پر تازہ غزل سنائی مقطع میں خانہ ویرانی ہوئی۔ نہایت درد انگیز تھا۔ جاتے وقت دوبارہ آنے کا اصرار کیا دن اور وقت بھی مقرر کر دیا۔ میں گیا تو غیر معمولی صحبت تھی۔ پچیس تیس ممتاز اشخاص کا مجمع تھا ان میں علاوہ داغ بھی تھے ایک معزز صاحب کی نشست مسند پر تھی لگے ملاقاتی رکھی تھی ہر شخص کو ان کا ادب ملحوظ تھا غالباً وہ اعلیٰ حضرت حضور نظام سے قریبی واسطہ رکھتے تھے۔ جناب داغ کے ایما پر بعض حضرات نے اپنا کلام سنایا پھر جناب داغ نے اپنے اشعار سے سامعین کی عزت افزائی کی آخر میں مجھ کو ایما فرمایا میں نے معذرت کی کہ ادب مانع ہے اصرار پر بھی عذر کیا تو داغ نے حاضرین سے کہا کہ میری طرح ریاض حق آپ کو بھی اہل نہیں سمجھتے۔ میں نے عرق عرق ہو کر فوراً تعمیل ارشاد ذیل کی غزل سنائی۔

چھپ مرے تو زمیں بھی نہیں
اب ٹھکانا مرا کہیں بھی نہیں

اُڑ کے پہونچے اشک کے چھینٹے
آسماں بھی نہیں زمیں بھی نہیں

کل تو روتے تھے اپنے دامن کو
لے جنوں آج آستیں بھی نہیں

چپ ہیں وہ سن کے آرزوئے وصال
منہ سے ہاں بھی نہیں نہیں بھی نہیں

کتنی نازک ہیں چوڑیاں اُن کی
اتنی تو چین آستیں بھی نہیں

اب جبیں تک تھے جو تھی دل میں
جائیے اب دل حزیں بھی نہیں
حسرت آور دل نہ حسرت دل
وہ مکاں بھی نہیں مکیں بھی نہیں

ایسی بھی لے ریاض توبہ کیا
کوئی آغوش میں حسیں بھی نہیں

داغ سا استاد جب انتہائی ستائش سے کام لے تو تحسین کا کیا ذکر دوسرے تیسرے روز اسی زمین میں داغ نے اپنی تازہ غزل سنائی اور کہا کہ صرف ایک شعر اس میں اچھا ہے۔ مگر وہ بھی رکھنے کے قابل نہیں پھر غزل چاک کر دی۔ داغ کی طرف سے ریاض کے لیے یہ حوصلہ افزائیاں شاید ہی کسی شاگرد کے ساتھ بھی ہوں۔

دربار رامپور

مصاحب منزل میں صحبت گرم تھی کہ خلد آشیاں نے بعض جناب کو یاد فرمایا پھر مجھ کو شرف باریابی حاصل ہونے پر دیر میں آنے کی شکایت زبانی میں نے عذر خواہی کی۔ کچھ دیر بعد خلد آشیاں کے ایما پر داغ نے متعدد اشعار خلد آشیاں کے سنائے ستائش نے یہ اثر کیا کہ خلد آشیاں نے اپنی زبان مبارک سے بھی چند اشعار اپنے سنائے آخر میں امیر مینائی کو ایک فارسی قصیدہ سنانے کے لیے ایما ہوا۔ یہ قصیدہ اس دیوان کا تھا جس پر لسان الملک طہران کی مہر تھی اور وہ سفیر طہران اسی زمانہ میں رامپور وارد ہوئے تھے۔ موجودہ ترمیم شدہ زبان میں عربی الفاظ وغیرہ معروف لغات کا زیادہ استعمال ہوا تھا۔ منشی اسمٰعیل حسین منیر کی نشست میرے پہلو میں تھی انھوں نے ہر شعر کی توضیح اس لطف سے کی کہ ستائش میں مجھ کو بھنائی سے کچھ وقت نہ محسوس ہوتی۔ میں درباری آداب اور زانو تنگ نشست کا عادی نہ تھا دو گھنٹہ کی نشست نے نیم جان بنا دیا اور بمشکل کام آثار یا تاہم دو تین بار کم وقت میں حسب الطلب شرف حضوری حاصل کر پایا۔

میں نے خلد آشیاں کی غزل پر اپنی ایک تضمین پیش کی اور اسی زمین میں اپنی غزل بھی۔ خلد آشیاں نے بعض اشعار کی زیادہ تعریف کی اور مندرجہ ذیل شعر بار بار پڑھا۔

باہم شبِ وصال اُٹھاتے ہیں کیا مزے — وہ بھی دعا کریں ہیں الٰہی سحر نہ ہو

شاگردِ امیر ہونے کی وجہ سے حوصلہ افزائی کے لیے یہ بھی فرمایا کہ مشقِ سخن بڑھ جانے پر تمہارا کلام مجھ سے بہتر ہوگا۔ یہ الفاظ سامعین کے لیے تعجب افزا تھے۔ قیامِ ملازمت کے لیے بھی ایما ہوا مگر میں اپنے اخباری تعلق کی وجہ سے مجبور تھا۔ بے نظیر کے میلے میں پھر حاضری کے لیے تاکید فرمائی۔ وقتِ رخصت خلعتِ دوشالہ دے کے مجھے اپنے دستِ مبارک سے زیبِ دوش فرمایا۔

میں قیام گاہ پر واپس منشی صاحب کے استفسارات کا جواب دے رہا تھا کہ دو کشتیاں لیے ہوئے چوبدار جمعدار کے ہمراہ آئے اور منشی صاحب سے عرض کیا کہ یہ کشتیاں ریاض کے لیے ہیں۔ کشتی پوش علیحدہ کیے گئے تو ایک کشتی میں زرِ نقد اور دوسری میں مطبوعہ دواوینِ ناظم۔

اخبار اور گلکدہ کی اشاعت خیرآباد سے تھی مگر میرا قیام اکثر لکھنؤ میں رہتا۔ زمانۂ جنگِ روم و روس میں میں نے روزانہ "تار برقی" جاری کیا۔

دربارِ رامپور کے شعراء

میں جس زمانہ میں خلد آشیاں کا طلبیدہ رامپور گیا تھا جناب داغ کا پہلا دیوان "گلزارِ داغ" زیرِ نگرانی امیر مینائی طبع ہو رہا تھا۔ جلال و تسلیم جب تک لکھنؤ میں تھے ہمسائے اور صبا البتہ رامپور میں تشریف رکھتے تھے۔ لکھنؤ میں تسلیم اور اشرف ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے۔ کتابت میں دونوں ہم پیشہ، دونوں گلشن آنجہانی کی نظر میں وقیع، دونوں کو نسیم دہلوی سے تلمذ اور وضع بھی خلیق بھی، سراپا عجز بھی۔ کبھی کبھی شمس لکھنوی بھی ان کے ہمراہ نظر آجاتے۔ مشتری طوائف مشہور شاعرہ ان کی شاگرد تھی اس کی شاگردی نے شمس کی شہرت کو چار چاند لگا دیے تھے۔ زہرہ، جمشیدہ، مشتری بھی انھیں کی شاگرد تھیں۔ یہ لوگ واقعی مرتبہ کے تھے۔

صحیح ہو یا غلط مندرجہ ذیل شعر میں نے شمس کے نام سے سنا تھا۔

جینے نہ دیں گی آنکھیں تری دلربا مجھے — ان کافروں سے بچالے بس اب تو خدا مجھے

نواب آفتاب الدولہ بہادر قلق بھی میرے جانے پر رامپور ہی موجود تھے۔ قیامِ لکھنؤ کے زمانہ میں بارہا ان سے ملا تھا گو وہ زمانہ عسرت کا تھا مگر آن بان پابندیٔ وضع اور خودداری ان کا حصہ تھی۔ امیر مینائی کی وساطت سے خلد آشیاں نے آپ کو رامپور طلب فرمایا تھا۔ یہاں آنے پر کچھ عرصہ کے بعد میں نے سنا کہ سرکاری مشاعرہ میں وقتِ مقررہ پر پہنچنے سے بعض معزز شعراء معتوب ہوئے۔ بغیر شرکتِ مشاعرہ واپس آنا پڑا۔ مرزا بھی روزانہ دربار میں یاد فرمائی نہ ہوئی۔ دو چار روز کے بعد معذرت آمیز عرضداشتیں پیش ہونے پر سرکار نے عفو سے کام لیا۔ سب لوگ باریاب ہونے لگے لیکن قلق نے نہ عرضداشت بھیجی نہ کسی کی وساطت سے عذر خواہی کی۔ سرکار نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ قیام گاہ پر واپس جاتے ہی روانہ لکھنؤ ہو گئے۔

ریاض ایسا گیا گزرا نہیں ہے شان جانے دے
گدائی کے لیے وہ مے کے جامِ جم نکلتا ہے

حسبِ ایمائے سرکار امیر و داغ نے محبت نامے بھیجے جواب آئے مگر قلق نہ آئے۔ بایمائے سرکار ماہوار تنخواہ لکھنؤ جانے لگی پھر کئی مہینے کے بعد خود خلد آشیاں کی مستقل تحریر بھیجی جب اس طرح آئے گویا گئے نہ تھے۔

میر شکوہ آبادی

منشی اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی سے جب مجھے جانا یاد وہ تشریف لاتے میری درخواست پر کچھ سناتے ضرور۔ ہر سنگلاخ زمین میں خاک اڑانا ان کا حصہ تھا اور قادر و پر رنگ پر تھے۔ غزل میں بہت شعر کہتے۔ زود گوئی میں امیر کے بعد عجب نہیں ان کا درجہ ہو مجھے ان کی دو غزلوں کے دو شعر بھی یاد ہیں اور ایک مضمون کا بھی۔ زبان پر بعض کے نزدیک قادر نہ تھے مگر میں نے ان کی لغزش کا ذکر کسی سے نہیں سنا مرزا اور میر پر ناسخ کے اعتراضوں کا جواب انھوں نے دیا ہے۔ اشعار منیر

داغ سجدہ ہے جبیں میں داغ میں خاک سجود
خط قسمت کی شکن میں گل ہے گل میں خاک ہے

اس میں شکن قافیہ ہے باقی ردیف۔ دوسری زمین میں ذلیل علیل قافیہ ہے اور "ہے" ردیف

تھے ہماری خاک کے ہیں ان کے ہاتھ میں
اس خفیف حستہ کی بھی دشمن علیل ہے

ناسخ کے شاگرد تھے ان کا تتبع ان کا ناز تھا۔ رعایت لفظی کے ساتھ اسی رنگ کے شعر زیادہ ان کے دیوانوں میں ہیں۔

ہاتھوں سے ناپتے ہیں راہ جنوں
آستینوں میں کوس پڑتے ہیں

روزانہ تاربرقی

جنگ روم و روس کے زمانہ میں اودھ اخبار لکھنؤ کے سوا کوئی اردو اخبار روزانہ نہ تھا میں نے ایک پرچہ خیرآباد سے روزانہ تاربرقی نکالا تھا جس کی تمام تر ترتیب کا انتظام پانیر اور دیگر انگریزی اخبارات سے محمد نور خاں صاحب رسالدار و دیگر افسران رسالہ نے انگریزی اور فوجی کلب سے کر دیا تھا اور سیتاپور میں اشاعت و فروخت کا انتظام ایک انگریز انسپکٹر پولیس نے اپنا ذمہ لیا تھا یہ انگریز سیتاپور میں جتنا میرا گہرا دوست تھا اتنا ہی دشمن گورکھپور جا کر بزمانہ سپرنٹنڈنٹی ہو گیا تھا۔ یہ پرچہ کتابی تقطیع کے دو ورق پر چھپتا تھا قیمت ایک پیسہ مگر سیتاپور و خیرآباد کے سوا اور مقامات پر ایجنٹ کچھ اسے زیادہ فروخت کرتے تھے۔ زیادہ تر کام کرنے والے احباب تھے بعض کے پاس ریاض الاخبار بھی بلا قیمت جاتا تھا ہر گلی کوچہ میں مختلف مقامات پر کارپردازوں کی معرفت فروخت کے انتظام میں اور قیمت ریاض الاخبار پریس خیرآباد ہی کو رہے۔

ریاض الاخبار کو بھی ولایتی اور ہندوستانی انگریزی اخبارات کے چیدہ دلچسپ تمام جنگ کے متعلق جیسے ملتے تھے شاید ہی اس وقت کسی دوسرے ہفتہ وار اخبار کو ملتے ہوں۔

غازی عثمان پاشا مرحوم معروف بہ رستم پلیونا کی آخری جنگ روس اور بلغاریہ و سرویہ سے زار روس کی کمان میں جس تفصیل اور شان سے ریاض الاخبار میں چھپی ہے دیکھنے کے قابل ہے مگر اس وقت کے پرچے اب کہاں۔

قیام گورکھپور

[illegible] میں ریاض گورکھپور گئے۔ مسٹر بال ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس گورکھپور کی تحریک پر ریاض الاخبار گورکھپور منتقل ہوا۔ احکام و روسا ضلع نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ گو مسٹر بال کا خاص طور پر اور پنڈت [illegible] کی کشش جو کی تحقیقات کر چکے تھے پھر بھی سرکاری کام بہت ملا۔ مسٹر بلک چیف کمشنر اس وقت جائنٹ مجسٹریٹ تھے اور مسٹر ڈوس سپرنٹنڈنٹ پولیس دونوں علم دوست تھے اور مجھ پر نہایت مہربان یہی حال تمام ضلع اور شہر کا میرے ساتھ تھا۔ ریاض الاخبار گورکھپور کی ترقی کا باعث ہوا۔ گورکھپور ریاض الاخبار کی مسٹر ڈوس نے مجھ کو شکار کی سیر کرائی۔ مختصر اسی زمانہ میں جاری ہوا تھا مجھ کو دیکھ کر ہر ایک کہہ اٹھتا

آمد بہت بری ہے تمھارے شباب کی
یہ دن ضرور تمھیں ستم گر بنائیں گے

گورکھپور سے ہی چھوڑ دیا۔ "صبح کل" بھی فتنہ کمپنی کی طرف سے میں نے جاری کیا جس کے لیے سید جالب دہلوی کو بلا لیا گیا۔ ریاض الاخبار کی دوکان اب "مشرق"۔ گورکھپور میں ہے اور میرا نام البلد یتیم برجم!!

فتنہ

فتنہ کی اشاعت کو ابھی پورا سال بھی نہ گزرا تھا کہ ایکن گورنمنٹ کو بدگمانی ہوئی اور زور دیا گیا کہ نام تبدیل کیا جائے یہ ناممکن تھا چند روز کے لئے اشاعت رُک گئی۔ مسٹر ڈیوی نے دورے سے واپس آنے پر تحریک کی اور محمد عمر کی ذمہ داری پر "فتنہ" پھر سے جاری ہوا اور برسوں کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔ آخر بربنائے اتفاقات ایک مقطع میں مجھے کہنا پڑا۔

فتنہ کو چھیڑتا ہے کوئی اِس ادا کے ساتھ
چھوٹا سا وہ ریاض کا اخبار کیا ہوا

گورکھپور کے بعض لطیفے

مینا تڑپ رہی ہے کہ باز قفس میں ہے

گورکھپور میں پہاڑی مینا زیادہ بکنے آتے ہیں۔ مگر فتنہ کے اِس لوکل کے "مینا" کو غازی پور سے واسطہ تھا۔ اس زمانہ میں اس مینا کا طوطی خوب بول رہا تھا۔

واعظ تجھے بھی قلقلِ مینا سنائیں گے
تو ناہم آج وعظ سنے ہی کیا بات ہوا۔

غازی پور مینا کے لیے خوب خوب دستِ شوق بڑھ رہے تھے۔ ہو سکتا ہے اُمراء شک کے لوگ: ہوں مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ رنگ پیدا ہو ہی جاتا ہے۔ واقعہ جو کچھ ہو نتیجے میں حقیقی "قوتِ بازو" اسی حالات میں بھیجا گیا جو "زیر تجویز" کے نام سے مشہور ہے۔ مینا کی گرفتاری کا اثر بھی پڑا تھا ہی سخت پڑا کہ فتنہ کو مندرجہ بالا سرخی والی خبر کے ماتحت لکھنی پڑی۔

مینا کی قدر و قیمت اس زمانہ میں بہت تھی نام کا بھی تقاضہ اس میں شامل تھا۔

مینا نے "میں نا" کیا مول بیر وہ ہیں
بکرے نے "میں" کیا تو سر کٹایا ہیں

مجھ کو حاجیہ مینا دو مورے سیّاں

یہ لوکل جب شائع ہوا اس وقت کی ہوا اور تھی تہذیب اور تھی ایک دیسی حاکم نے سمجھتے ہوئے اس کی جرأت کی تھی کہ اپنی شریک دلیس کی بے باکی بڑھائیں بے پردہ سواری پر ہوا کھلائیں کلب میں لے جائیں انگریز حکام سے بے تکلف ملیں اور ملائیں۔ کلب میں دیسی وضع سے جانا انگریزوں کے بھی ہنسنے کا سبب ہوتا تھا اسی وجہ سے یہ لوکل شائع ہوا بالآخر واقعات نے وہ لوکل قائم کی ہے داس یار خدا ڈھانک لے پردہ تیرا۔

۲۔ ذرا سے "بابے" میاں اتنی بڑی دُم

مسٹر علی لفٹیننٹ گورنر اودھ اس زمانہ میں جائنٹ مجسٹریٹ تھے آپ کی شادی شہر کے مشہور اور ہر دلعزیز پاجی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ علی صاحب فقط قامت کوتاہ قد تھے اور دلہن قامت میں قیامت سے نکلتی ہوئی یعنے اس شعر کے مصداق ۔

وہ قامت سے قد میں کم بن میں بڑی ہے
قیامت ناپ میں چھوٹی بڑی ہے

۳۔ "فاکس" نے شیر مارا

مسٹر فاکس شیر کے شکار کو تشریف لے گئے۔ لوکل میں فاکس، "ومڑی" کے لفظ نے "معنیٰ" لطف پیدا کر دیا۔

۵۔ سچ تو کسی جہاں میں ہے تیرا اف ذ گیا

لڑکا کے دیکھتے ہی دیکھنے والے کو ذرا خیال ہوتا کہ اس وکیل کا تعلق میری ذات سے تو نہیں ہے۔ جیسے سے بھی چور کی داڑھی میں تنکے کا خیال آیا تو اپنے اعمال پر فتنہ کے خوف سے نظر رہتی۔ یہ تو عام حالت تھی اس وکیل کا تعلق ایک دھوم دھام کی دعوت سے تھا تمام معزز رؤسا حکام متوسلین شریک دعوت تھے ایک پنشنر عہدہ دار نے ایک شاہد ناز کو جس نے اسی بزم میں منظور نظر ہونے کی خصوصیت پیدا کی تھی جو کہ اپنے ہمجولی کھلنے میں بھی شریک کیا پیچھے چلنے کو پاکیزہ بزم میں ذکر ہی۔ تقاضا خود بھی معتاد بزرگ تھے یہ کہنے کو بھی موقع نہ تھا۔

پھر عجب طرح کے ہیں رند ریاض — آپ پیتے نہیں پلاتے ہیں

انگشت نمائی کے ساتھ سرگوشیاں بھری بزم میں ہونے لگیں۔ صبح کو فتنہ میں یہ وکیل بعنوان مصرع شائع ہوا تو پیچھے جا کر کھل کھیلنے والے بھی فتنہ کے ڈر سے احتیاط کرنے لگے۔

چوری بھی ہوگی تو ڈر ڈر کے ہمارے ہی ہوگی

۶۔ گٹھری نے بقچہ باندھا

مسٹر گاڈفری ایک یورپین افسر تھے وہ دوسرے ضلع کو تبدیل ہوئے اس لیے ان کو گٹھری اور ان کے تبادلہ کو بقچہ باندھنا لکھا گیا۔

۷۔ بیلا تبدیل

شگفتہ چہرے سے نے آ دیکھا ہوا ماحصل — کہ اور راہ کھلی ہے بیلا کے تبدیل کی

مسٹر بیل اور گاڈفری جو اودھ پرشاد ریاض الاخبار اور فتنہ کی بی گستاخی سے سخت پریشان تھے۔ نئے مجسٹریٹ اور کلکٹر نے آتے ہی مخالفین کو موقع ملا کر انھیں پولیس سے اور پولیس سے ہم گریبان ہو اس لیے کہ ریاض کو مسٹر ڈیوس و مسٹر گرٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے بیجا پریشان کر دیا تھا۔

مسٹر ڈیوس نہایت نازک جسم شاہانہ مزاج کے مشہور خاندانی انگریز تھے۔ سونے کے لیے دن کو رات بنانا معمولی بات تھی دریچوں اور دروازوں پر پڑنے والے دن کی روشنی کا روشنی ہونا اور ویسے ہی انتظامات کرتے رہتے تھے۔ برسات میں جب وہ جی ان کی بھری کچہری تو کچہری جانے کے لیے سواری میں پیچھے والے پنکھوں کا سامان جو برقی پنکھے اس زمانے میں تھے نہیں۔ نئے مجسٹریٹ نازک مزاج تو تھے ہی مخالفین نے ان کو تنگ کر دیا اور گھبرا کر بنارس سے اپنے فوراً تبدیل کیے جانے کے احکام منگانے تار پر حکم آیا بیلا تبدیل۔

کاتب نے بیلا کو بالکسر بیلا گیا مسٹر بیل کو نکال کے لکھ دیا حالانکہ مقصود بیل کی تحقیر نہ تھی مگر اشارہ ضرور تھا کہ تبدیلی کی کوشش میں مسٹر بیل بھی شریک ہیں یہ کوشش ریاض الاخبار اور فتنہ پر مقدمے قائم کیے گئے ہائی کورٹ میں درخواست انتقال مقدمہ پر معرکہ آرائیاں رہیں بالآخر گورنمنٹ کو مقدمہ واپس لینا پڑا۔

۸۔ آ بیل مجھے مار

ایک شخص پر مسٹر Bulach نے اس طرح حملہ کیا کہ وہ اس مثل کا مصداق ہو گیا۔

۹۔ مسٹر مرے کا انتقال

نازک مزاج مجسٹریٹ مسٹر مرے کی زندگی میں یہ وکیل شائع ہوا فوراً ہی کوٹھی پر مسٹر مرے کے روبرو فتنہ پیش کیا گیا نازک مزاج انگریز غضب سے

شائع ہو گیا، وقت پر صاحب پکڑی گئے تھے، نقل بھی کی تھی جس میں ساتھ تھا حقیقی غضب میں سر رشتہ دار کو زبانی حکم جاری کرنے کا دیا ہو، سر رشتہ دار صاحب سے عرض کیا کہ یہ خبر حضور کے متعلق نہیں ہے اس کی صراحت اسی سرخی کے نیچے دوسرے صفحہ پر درج ہے۔

قصہ مہاراج کی تقطیع۔ ورق چپک کر موڑ دیا جاتا تھا جب تک ورق تراشے نہ جائیں بعد کے صفحات دیکھے نہیں جا سکتے تھے۔ سر رشتہ دار نے دوسرا صفحہ پڑھ کر سنایا جو بنگال کے ایک حاکم مسٹر مری کی موت کے متعلق یہ صراحت درج تھا جو ایک شکار میں واقع ہوئی تھی۔ صاحب کو خفت ہوئی تاہم ارشاد فرمایا شرارت ضرور کی گئی ہے۔

مجسٹریٹ جب اتفاق سے تبدیل ہو گئے تو میں ملنے گیا۔ ممدوح کمال اخلاق اور تعظیم سے ملے۔ وقت رخصت ارشاد ہوا کہ یا واقعی قصہ میں ہمارے متعلق وہ خبر شرارت سے نہیں شائع کی گئی تھی۔

۱۰۔ اوّل "ہوئی"

گورکھپور کی ہڑتال بعدہ ہوئی واقعہ [illegible] یادگار ہے اس زمانہ میں ہندوستان نے ہڑتال کا شاید نام بھی نہیں سنا تھا۔ ڈاکٹر مجسٹریٹ ضلع ہونے کے سوا [illegible] بھی تھے۔ [illegible] اشیاء پر چنگی کا محصول لگا دیا گیا شہر کے سب قبرستان بند ہو کر ایک قبرستان بنا، ایک مسجد کلب کا باورچی خانہ بنائی گئی۔ پے بہ پے حالات ناقابل برداشت ہو گئے لوگ گورنر کے پاس شکایت سے بھری ہوئی عرضیوں کے سوا ایک محضر کو چیف سیکریٹری بذریعہ خط سے بھیجا گیا۔ گورنر بنارس اور اعظم گڑھ سے ہوتے ہوئے گورکھپور آنے والے تھے۔ جب گورنر آئے تو سڑک پر دو رویہ ہجوم تھا ہجوم ہر طرف سے کمشنری کی کوٹھی کو گھیرے ہوئے تھا، وفد بھیج کر پیام دیا گیا کہ کچہری میں درخواست دیں ہم ملاحظہ کریں گے۔ یہ سن کر ہجوم منتشر ہو گیا مگر اس طرح کہ ذریعہ کے چوراہوں پر تقسیم ہو گیا۔ کچھ حصہ کلب اور مسجد کے قریب جمع رہا۔ یہ معلوم تھا کہ گورنر اس طرف سے جائیں گے۔ جب گورنر صاحب تشریف لائے تو لوگ پھر جمع ہو گئے لیکن اس خیال سے کہ تماشائیوں پر [illegible] جائے گا۔ پھر منتشر ہو گئے مگر جب دیکھا گیا کہ کوئی [illegible] نہیں ہوا تو [illegible] اور مکمل ہڑتال کا انتظام ہوا۔ اس زمانہ میں جیل کی جنس صبح ہی صبح بازار صاحب گنج سے جایا کرتی تھی۔ انکار پر جیلر نے سپرنٹنڈنٹ کو اور اس نے ڈاکٹر ہوئی کو اطلاع دی۔ مسٹر ہوئی نے تحصیلدار سے کہا کہ کارروائی کی جائے۔ بالآخر بازار گنج صاحب میں ہنگامہ ہوا مگر ملازمین تحصیل کو جبر کی کامیابی نہ ہوئی۔ چیف سیکرٹری مسٹر [illegible] نے تمام بازاروں کا گشت کیا مگر ایک دکان بھی نہ کھلی۔ مسٹر [illegible] نے دو گز بانات بازار سے منگوانے کا کمشنر کو حکم دیا۔ بازار سے واپسی پر [illegible] کو تکلیف دی گئی اور بانات پیش کی گئی مگر استفسار پر قیمت معلوم ہو گئی بانات واپس ہوئی اور دوسرے روز احکام آ گئے

"مسجد اپنی حالت پر واگذاشت۔ چنگی کا محصول موقوف۔ ایک قبرستان کے
سوا دوسرے خاندانی قبرستانوں کے استعمال کی بھی اجازت"

گلچیں مجھے جب لکھنؤ سے گورکھپور منتقل ہوا اس کا تعلق مجھ سے مستقل ایک اخباری سے ہو گیا۔ میں نے یہ التزام کیا کہ مصرع طرح ہر روز کسی استاد سے یا ایسے ممتاز شاعر سے لیا جائے جو زندہ ہو۔

اس التزام سے کئی نمبر گلچیں کے بہت کامیاب نکل چکے تھے اسی سلسلے میں استاد مرحوم کو تکلیف دی گئی اور جناب امیر مینائی نے یہ مصرع لطف فرمایا ؎

کچھ بھیڑ سے کی قلم میں جوڑی ہے

جب یہ مصرع شائع کیا گیا تو گلچیں میں یہ مصرع طرح پر مصرع ہم پہنچانے کی بھی فرمائش کی گئی۔ ابھی اس طرح میں دو تین ہی نمبر نکلے تھے کہ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں مرحوم خسروِ دکن کی بالخصوص توجہ اس طرف ہوئی۔ اعلیٰ حضرت کی غزل کا یہ مصرع اس قدر مقبول و شہرت پذیر ہوا کہ تمام ہندوستان پر چھا گیا اور گویا یہی مصرع طرح قرار پا گیا۔

یہ چوٹی کس بلا کی پیچھے پڑی ہے

متعدد شعراء نے اس پر مصرع لگائے شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے اس میں پوری قوت سے فکر نہ کی ہو۔ گلچیں کے نمبر ایک سال تک اسی طرح میں نکلتے رہے۔

حیدر آباد کا واقعہ

جب خسرو دکن نے غزل کہی اور اس مصرع نے ہر طرف دور دور شہرت حاصل کی تو دکن سے ابراہیم خاں کا خط ان کے پیش دست کا لکھا ہوا میرے نام آیا جس میں تحریر تھا۔

یہ تمہارے لیے کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دو۔ تم یہاں آنے کے لیے تیار ہو بہت جلد اعلیٰ حضرت تمہیں یاد فرمائیں گے۔ تمہیں مصرع طرح گلچیں کے لیے اعلیٰ حضرت نے مرحمت فرمائے ہیں ان کو ضرور شائع کرتے رہنا۔ مجھے کل تحریر اور تم کی تکرار خط میں ناگوار گزری میں ابراہیم خاں سے واقف تھا وہ ان کے پیش دست سے بھی میں نے جناب داغ کو یہ نامہ بھیجا اور اس کے ساتھ ابراہیم خاں کے خط کی نقل بھیج کر اعلیٰ حضرت کے چند طرحی مصرعوں کی اشاعت کے لیے ممدوح کی رائے دریافت کی۔ ممدوح نے تحریر فرمایا کہ جو لکھ رہے ہیں جب تک استاد کی وساطت سے موصول نہ آئیں گے گلچیں ان کی اشاعت سے قاصر رہے گا۔

اس کا اثر جو کچھ ہونا چاہیے تھا ظاہر ہے شمس العلماء علامہ عبدالحق خیرآبادی دستِ افسوس مل کر اس واقعہ کو جناب داغ کی غلطی اور میری انتہائی بدنصیبی پر محمول کرتے تھے ساتھ ہی ساتھ ابراہیم خاں کے اقتدار و اختیارات کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر فرماتے ہیں۔ میں دل ہی دل میں کہتا

چشم ما بیدار ازیں خواب پریشاں دیدہ است

جناب داغ کی نسبت میں شمس العلماء کا ہم خیال ہو کر ان کی غلطی اپنے متعلق کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ جناب داغ تاحیات نہایت کشادہ دلی سے رسالہ اور اخبار کے پرچے میں میری امداد فرمانا اپنی وضع میں داخل سمجھتے رہے ممدوح کے ہر نوازش نامہ میں حرف حرف سے محبت ٹپکتی تھی بلکہ سطر سطر سے بھی محبت کے چشمے ابلتے تھے۔

دوسرا واقعہ

ترکی کی شکست نے عراق و حجاز وغیرہ میں جو حکم برداری کا جال پھیلا دیا تھا جس میں جناب علی امام مرحوم نے بزمانہ وزارت بعض ایسے اقدام کی اعانت فرما دی۔ جناب ظفر علی خاں کی تنخواہ جو جناب سے بھی جاری تھی وہ بھی بند کر دی گئی۔ ان واقعات سے مشتعل ہو کر میں نے ایک نظم کہی اور ایسی زمین میں کہی کہ اگر دوسری تعلیم یافتہ نسل اس کا تتبع کرے تو کامیابی کا بظاہر امکان نہیں نظر آتا۔

بھاری پتھر تھا اسے چوم کے بس چھوڑ دیا

یہ دو شعر اس نظم کے ہیں جس کا نام "جوہن آشوب" ہے اور تعداد اشعار ڈیڑھ سو سے زیادہ۔ دو قافیہ "غلام" اور "امام" جو سلسلہ بیان میں اپنے اپنے موقع پر درج ہوئے ہیں یادگار ہیں۔

"غلام" کا قافیہ ایک موقع پر قاضی محمد خلیل صاحب میرانی رئیس بریلی نے علی برادران کو ڈیرہ دون میں حکیم اجمل خاں کی قیام گاہ پر سنایا تھا اور

سننے والوں نے نہایت ستائش فرمائی تھی ۔

اب مرد بنی ہے قوم اپنی ۔۔۔ لونڈی سے غلام ہو گئی ہے

دوسرا قافیہ حیدرآباد دکن کی مکہ مسجد کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہا گیا تھا ۔

مکہ مسجد میں شورِ ناقوس ۔۔۔ آوازِ "امام" ہو گئی ہے

گلچیں کے چھوٹے بڑے ذکر کے سلسلہ میں ایک تضمینی مصرع اعلیٰ حضرت کے مصرع پر گرہ کسی درجہ کا بہرحال یاد آگیا۔ استفہامیہ طرز سے پڑھنے کی ضرورت ہے ۔

جو کروٹ تو میں سمجھوں شب ہجر ۔۔۔ یہ چوٹی کس کے پیچھے پڑی ہے

مگر اصل مصرع طرح کی تضمین یعنی یہ

کنی ہیرے کی نیلم میں جڑی ہے

باوصف توجہ دلانے کے کسی بلند پایہ شاعر سے بھی نہ ہو سکی۔ عام شعرا کے لیے ایک ہی پیش پا افتادہ مضمون کے سوا کوئی صورت نہ تھی اور اسی لیے توارد ہونا بھی لازمی تھا ۔

گلِ سوسن پہ شبنم کب پڑی ہے ۔۔۔ کنی ہیرے کی نیلم میں جڑی ہے

بلند پایہ شعرا نے ضرور توجہ کی ہوگی مگر کہہ سکے صرف امیر مینائی نے مصرع لگایا ہے دیکھ کر ہمیشہ کے لیے قوت شعری گویا عاجز ہو گئی ۔

سیہ چوٹی پہ افشاں کی پڑی ہے ۔۔۔ کنی ہیرے کی نیلم میں جڑی ہے

اس زمانے کے دوسرے گلدستے

گلدستوں میں پیامِ یار و گلچیں نے زیادہ عمر پائی۔ نکلے اچھے اچھے پرچے، خورشید صاحب کا پرچہ فصیح الملک بھی (جس کا نام غالباً پہلے گلزار خلیل تھا) قنوج کا پرچہ بھی جس کے مہتمم بنگو خاں تھے اور باوصف اقتداری نام کے لگتے تھے ہمیشہ چلی۔ سب سے اچھا دور ہی گلچیں۔ تقاضوں کے چند پرچے نکلے مگر ہمیشہ کے لیے یادگار۔ اس کے بند ہوتے ہی مرحوم آغا نے مخفی وسیم نے یہ کہا کر۔

گلچیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

گلچیں نکال دیا۔ اوّلیت میں مقبولیت کے ساتھ صرف گل کدۂ ریاض کے سر سہرا رہا ساتھ ہی غالباً کہہ دوں تو مضائقہ نہیں۔ مولانا حسرت موہانی نے اردوئے معلی نمبر ۱ جلد ۱۰ اکتوبر میں گل کدۂ ریاض خیرآباد نمبر ۵ کے عنوان میں اس کا ذکر لکھا ہے۔ اس سے پہلے ایک مضمون شوق نیموی مرحوم کے متعلق ہے ساتھ ہی ان کے "اصلاح" نام پرچے کا بھی ذکر ہے۔ بہرحال صلاح پیدا کرنی اور پرچہ شرفِ اولیت گل کدۂ ریاض ہی کا ہے اور پرچے بہت بعد کے ہیں متقدمین پر متاخرین پر ترجیح اسی قیامت کو ہے ۔

قیامت کی خلش کیوں ہر گھڑی ہے ۔۔۔ وہ تم سے قد میں کم سن میں بڑی ہے

گل کدۂ ریاض کی خاص خوبی یہ تھی کہ اس میں حتی الامکان سب شعر منتخب درج کئے جاتے تھے اور اس اصول کی پابندی اس سختی سے کی جاتی تھی کہ بعض پرچوں میں امیر ایسے استادِ کامل کی غزل کا صرف ایک ہی شعر چھپا ہوا نظر آتا ہے ۔

مستقل قیام لکھنؤ

ریاض کو گورکھپور سے اور گورکھپور کو ریاض سے ہمیشہ خاص تعلق رہا۔ اس شہر کی گرویدگی ہمیشہ میرے ساتھ رہی میری آرزو تھی کہ مر کر بھی یہیں رہوں۔

ریاض اب کیا کریں اس شہر سے ہم قصد جانے کا
نصیبوں میں لکھا ہے خاکِ گورکھپور ہو جانا

جب گورکھپور سے جدا ہو سکنے کا تذکرہ گورکھپور کو خیرباد کہنا پڑا گیا جب مہاراجہ محمد علی محمد خاں بہادر رونق افزائے والی محمود آباد کی قدر افزائی مجھ کو کھینچ لائی۔ مہاراجہ ممدوح نے ریاست کا پیش بھی دیا ریاست کا کام بھی اور میری آزادی بھی قائم رکھی۔ آزادی کا قائم رہنا میرے لیے خاص نعمت تھی۔ نخاس میں ایک وسیع مکان بھی قیام کے لیے عطا ہوا، وظیفہ بے خدمت بھی۔

ہم ان کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

قیام لکھنؤ کے زمانہ میں ہز ہائی نس نواب حامد علی خاں بہادر فرمانروائے رامپور کی طرف سے صاحبزادہ مصطفیٰ علی خاں بہادر مرحوم دو مرتبہ اس قصد سے لکھنؤ آئے کہ مجھ کو رامپور لے جائیں مگر میں لکھنؤ میں موجود نہ تھا۔ تیسری مرتبہ ہز ہائی نس بالقابہ نے راجہ نوشاد علی خاں تعلقہ دار کو گنج سے لکھا کہ آپ ریاض کو راضی کریں مگر میں نہ جا سکا۔ چند روز بعد خاص ضرورت سے میں خود رامپور جانے کے لیے مجبور ہوا۔ اسٹیشن پر سرکاری سواری موجود تھی حافظ کرامت اللہ خاں گستر کی کوٹھی پر قیام ہوا مگر مہمان ریاست کا رہا۔ رامپور کے پہنچے دس بجے شب کا وقت تھا ہز ہائی نس نے قدر تیری فرمائی ساتھ ہی ارشاد ہوا تین مرتبہ جانے پر بھی آپ نہ آئے نشست کے لیے ایما ہوا۔ استفسارات کے بعد چیف سیکرٹری صاحب کو یاد کیا گیا کچھ مشورہ ہوا۔ پھر ایک پرچہ افسر طلب کیا گیا اور اس سے دیر تک گفتگو رہی آخر مجھ کو معاملہ خاص کے متعلق مطلع فرمانے کا ارشاد ہوا وہ مطلع سنیئے۔

واقعہ یہ تھا کہ ایک مرتبہ رامپور میں صاحبزادہ مصطفیٰ علی خاں بہادر کے اہتمام میں مشاعرہ سرکاری کا انعقاد ہوا تھا جس کی بہت دھوم تھی دور دور کے نامور شعرا مدعو کیے گئے تھے افتخار الملک مضطر خیرآبادی پہلے ہی سے مہمان ریاست تھے آپ نے مصحفی کی مشہور غزل پر جس کا مطلع درج ذیل ہے غزل کہہ کر صلہ حاصل کیا تھا۔

دھوکا دیا تھا کس نے پھولوں نے رنگ و بو کا
دھوئیں صبا نے دامن شبنم نے منہ پہ تھوکا

ریاض نے بھی جب آپ مصحفی مطلع کی تھا جب یہ سنا تو عرض داشت بھیجی کہ ایک ہزار صلہ اس قید کے ساتھ چاہتا ہوں کہ مطلع مصحفی سے کم درجہ کا ہو یا کوئی اور ایسا مطلع کہے تو کچھ پانے کا مستحق نہیں ہوں۔

ہز ہائی نس کے ذکر فرمانے پر کسی نے میری شرط سے اس کو تعبیر کیا کسی نے جنون سے مگر کسی نے عرض کیا کہ مطلع طلب فرمایا جائے۔

مشاعرہ ختم ہونے پر منشی محمود صاحب متخلص بہ رعنا امیر مینائی استاد محترم کو نوازش نامہ آیا کہ مطلع بھیجئے دیکھنے کے بعد سرکار میں تحریک کروں گا جواباً عرض کیا گیا آپ کا ہر ارشاد واجب التعمیل ہے مگر سرکار میں نہ بھیجا اور آپ کو بھیجنا میں گستاخی خیال کرتا ہوں۔

ہز ہائی نس بالقابہ کو اس وقت وہی مطلع یاد آیا اب مجھ کو سنانے کے سوا چارہ کیا تھا۔ تعمیل ارشاد میں عرض کیا مصحفی نے ... مقدور کیا ہے میں اسے ترک کر چکا ہوں اب میں مطلع کے سوا دوسرا لفظ نہیں کہتا ہے کہ شعر کے کانٹوں پر منہ کے ساتھ کس قدر آسان ہے اور میں منہ کے ساتھ اسی وقت تک

کمال ہے جب تک دوسرا مصرع موزوں کیا جائے حضور نے ارشاد فرمایا بیشک۔ اس وقت تک درباری شعراء اور معززین صف نشین تھے میں نے مطلع سنایا۔

حضور نے تک گھوڑا و اصطبل بہت ہی چوکا
بیلوں نے ڈاڑھی پکڑی خوشی سے منہ میں تھوکا

حضور نے عجیب انداز سے واہ واہ کی اور ساتھ ہی حاضرین نے بھی جس نے مطلع کو اور چار چاند لگا دیئے۔ اس کے بعد میں نے حضور کی مدح میں ایک قطعہ پڑھا جو راہ میں جیب سے لکھ لیا گیا تھا ایک شعر اس کا درج ذیل ہے۔

قدرت حق کا کرشمہ ہے عنایت ان کی
جس کو دیتے ہیں مقدر سے سوا دیتے ہیں

اس قطعہ نے بھی خاص لطف پیدا کیا۔ قابل رشک والی ملک سے خراج تحسین حاصل کرنے کے بعد پہلے میرا کچھ اور کلام سنا گیا اس کے بعد کلام الملوک کی نوبت آئی حضور نے اپنا کلام نہایت شوق سے سنایا مجھ کو ماننا پڑا کہ جناب رشک بالقابہ بلحاظ فراست و قابلیت نہ صرف غیر معمولی ذہانت و طباعی نے وسیع مملکت سخن کو بھی زیر نگین کر رکھی ہے۔

صبح کو مجھے رخصت کی اجازت ملی آج مجھ کو اس دو گھنٹہ کی قدر ہوئی جو حضور میں گزرے تھے۔ مجھ کو استاد مرحوم کے آستانہ پر فوراً پہنچنے اور میری جدائی کی خدمت میں حاضر ہو سکنے سے سخت گرانی تھی اب اور بھی شوق حاصل ہوا کہ استاد نے خود سبقت کی اور میری قیام گاہ پر لکھا مجھ سے کی زحمت بھی گوارا فرمائی گو میں روزانہ جا کر صبح سے شام تک جیسی چاہیے ملازمت باقی رہا دربار میں ہر حاضری پر میرا۔ بالقابہ میرا کلام سنتے نقل بھی لی جاتی جو صلہ افزا داد بھی دی جاتی۔ سرحق خاص کے متعلق بھی کامیابی ہوئی حضور نے اپنے دست مبارک سے چٹھی لکھ دی اور بمقام شملہ جناب سر ہارکورٹ بٹلر گورنر کے حضور میں پیش کر دوں میں پہنچے حضور سر مہاراجہ محمود آباد بہادر کے ہمراہ شملہ گیا جناب ممدوح نے چٹھی ملاحظہ فرما کر مجھ کو باریاب کیا تو سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ آپ ہندوستان میں سب سے بڑا شاعر ہے؟ نہیں کہا جا سکتا کہ حضور نے میرا کچھ ذکر چٹھی میں لکھا تھا یا مہاراجہ صاحب بہادر نے اپنی زبان مبارک سے کچھ کہا۔ میں جب لکھنؤ واپس آیا تو کسی کو دیکھ کر بے ساختہ یہ مقطع کہا۔

ریاض تھی جو مقدر میں بازگشت شباب
جوان ہو کے پیری میں لکھنؤ آئے۔

یہ عجیب اتفاق ہے جسے دیکھ کر مقطع کہا تھا دوسرے دن اس کا جنازہ دیکھا

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

لکھنؤ میں مولانا شرر و نثار کے سوا جناب بشیر احمد صاحب تعلقدار سے مجھ کو لطف تھا اور لطف یہ ہے کہ جناب عزیز بھی زیادہ تشریف لاتے تھے مولانا محشر نے میرے یہاں ایک انجمن اصلاح سخن بھی قائم کی تھی کاظم حسین صاحب ایم اے ہم مشورہ تھے اور خواجہ عشرت سیکرٹری انجمن کا دفتر بھی ریاض الاخبار کے ساتھ تھا اور نسیم صاحب کا بھی یہیں قیام تھا۔

تپش کا امیر مرحوم پر اعتراض

مولوی غلام محمد خاں تپش مرحوم سابق اڈیٹر اودھ اخبار نے جب سلسلہ جاری کیا تو میر خیال کے معتقد فرمان نے پر اعتراض کا سلسلہ شروع کیا۔ کسی کو توجہ نہ ہوئی تو یہ دعویٰ کیا کہ اعتراض کا جواب نہیں ہو سکتا میں نے خط و کتابت کی تو ایک مطبوعہ اعتراض تپش نے یہ پیش کیا۔

ناگوں کو دیا حکم تو بوسے دیے ہم کو
سوائے ہر کس قابل تحسین تو نہیں ہم

تابع مہملوں کی ترکیب پر اعتراض تھا۔

میں نے لکھا اس سے زیادہ کم بینی واقع کیا ہو سکتی ہے کہ کلکتہ نہ ہونے سے کوئی تابع کو تابع ہی "پڑھے اور چیزوں کو میوں" !

ایشائی شاعری کا اعتراف

غازی پور میں شاہ احمد اللہ مرحوم سب جج اور شاہ احمد اللہ مرحوم منصف کے دولت خانہ پر چند معززین حضرات بی۔ اے، ایم۔ اے تشریف فرما تھے ایشائی شاعری کے متعلق کسی قدر برے پہلو لیے ہوئے اظہار خیال ہو رہا تھا میں نے عرض کیا میرے جد مرحوم و مغفور کے نیچرل مناظر کا ذکر ہی کیا میں امیر مینائی کا ایک شعر سنانا چاہتا ہوں شاید وہ اس صحبت میں وجہ قبولیت حاصل کرے اور آپ حضرات اس سے بہتر یا اس کے برابر کسی انگریزی شعر کے ترجمے سے مجھے ممنون فرمائیں پھر میں نے یہ شعر سنایا۔

لچک ہے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں
بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

ریش مومن

لکھنؤ میں کسی تقریب سرکاری کے ذریعہ سے کچھ والیان ملک بھی آئے تھے داروغہ عباس علی مرحوم انجنیئر ریختے کے فن زرگراز کے دولت خانہ پر جس کا اب نشان تک نہیں ہے چند معتقد ارباب ذوق مع شعراء تشریف فرما تھے۔

منشی نولکشور آنجہانی بھی موجود تھے اور میں بھی کہ ایک رئیس با اقتدار، مع مختصر اسٹاف کے ہمراہ زیب بنے آئے تشریف لائے۔ اطلاع کے ساتھ ہی سب حضرات تعظیماً استقبال کے لیے بعجلت بڑھے۔ دیکھا کہ ریش دونوں جانب دہانے پر چڑھی ہوئی شکل خشمگیں۔ چہرہ غضب ناک نہ سلام میں ابتدا کی نہ سلام کا جواب دیا زبان پر لکھنؤ کا نام اور صد ہا صلواتیں لعنت و پھٹکار کی بوچھار کرتے اسی طرح مقام نشست تک تشریف لائے اور باوصف تعظیم کی گئی ہوا دار کے ساتھ بٹھائے گئے مگر گفتار و رفتار و لہجہ میں فرق نہ آیا۔ مزاج پرسی کی جرأت کون کر سکتا تھا وہ بدستور سخت درشت الفاظ فرماتے جاتے تھے کچھ دیر کے بعد جب زبان رک گئی تو ایک سن رسیدہ گرم و سرد دیدہ نواب صاحب نے بہ ادب عرض کیا کہ لکھنؤ سے برافروختگی کا سبب معلوم ہو تو ہم بھی عذر خواہی کی جرأت کریں۔ فرمایا یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے اسلامی شہر مگر جسے دیکھئے داڑھی صاف مسلمان و غیر مسلمان میں امتیاز نہیں نہ مصافحہ و معانقہ کا موقع نہ سلام علیک کا ساتھ ہی پھر لعنت کی تکرار۔ صد ڈھنگ پر نواب صاحب نے عرض کیا برافروختگی کا سبب تو معلوم ہو گیا مگر حضور نے اس کی علت دریافت نہ فرمائی۔ ادب سے عرض کرتا ہوں سنیے غدر سے پہلے میں بھی اور سب مسلمانان لکھنؤ بھی ریش کے ساتھ رکھا کرتے تھے اور آپ کے ہی متفق تھے۔ ایک روز میں خط بنوا رہا تھا کہ پے در پے اطلاع پر اطلاع مسجدوں اور امام باڑوں کے منہدم کیے جانے کی آ رہی تھی دفعتاً معلوم ہوا کہ نواب آصف الدولہ کا مشہور امام باڑہ اور اس کی وسیع اور حسین مسجد گھوڑوں کا اصطبل بنا دی گئی۔ نہ روک تھام کی قوت تھی نہ انتقام کی میں نے مشتعل ہو کر خاص نائی سے کہا کہ ریش منڈا کر مسلمان صورت رہوں اور یہ غیر مسلموں کو دے صاف کر دے۔

وضع زمانہ رہے ریش رہے صاف کیا ہی   خوف کی چیز ہے اس وقت مسلماں ہونا

ایک حادثہ

مؤلف فرہنگ آصفیہ امیر اللغات کی اشاعت سے آتش زیرپا تھے ان کی ہمدردی میں اکمل الاخبار دہلی نے سلسلہ اعتراضات شروع کیا تھا شروع میں اودھ پنچ نے نوٹ لکھ کر مجھ کو متوجہ کیا امیر مینائی کی تاکید تھی کہ کچھ نہ لکھا جائے آخر مجھ کو توجہ ہوئی اور سلسلہ مضامین عنوان کے تحت میں شروع ہوا۔

شور و غل کم نہیں ہوتا تو لگا دو دے   اک ذرا او تلقی بیٹا بلند آواز سے

دو مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہا تھا کہ مجھ کو ایک سخت حادثہ پیش آیا اور بحث ناتمام رہ گئی۔ اسی الاخبار میں سید صاحب جالب دہلوی ایڈیٹر ہمدم اس وقت بحیثیت مضمون نگار التفات و ریاض الاخبار کے خلاف مضامین لکھتے تھے۔ میں جب قیام لکھنؤ کے ارادے سے خیرآباد آیا تو ایک بڑا بنڈل ریل سے جس اتار گیا یہ بنڈل دو گز کپڑے کا تھا اس بنڈل میں تیس سالہ خریداران اخبار کے رجسٹر حساب خطوط کے فائل اصلاحی مسودات امیر مینائی اور میرے دونوں دیوان تھے کسی ناخواندہ نے کپڑا لے لیا اور کاغذات اور رجسٹر ضائع کر دیے۔ متفرق اشعار بھی کام نہ آیا پہلے دیوان کا نام تحفہ نہ تھا جو چھپ چکا تھا۔ اخباروں اور گلدستوں میں جو کلام چھپ گیا تھا وہ بہ وقت فراہم ہو سکا۔

آخری وقت اور آخری قدردانی

میں نے لکھنؤ کی طرح میں ایک غزل کہی۔ مطلع مولوی سبحان اللہ خاں رئیس گورکھپور کو لکھ کر بھیج دیا ہوا پر اس کیفیت طاری ہوئی تار پر مجھ کو بلایا۔ وقت آخر تھا مشتی پر غور ہے تا بادہ موجود تھے۔ بعض احباب بھی ساتھ تھے نعیمہ مطلع کی بے انتہا تعریف کی اور ایک ہزار روپیہ صلہ پیش کیا۔ مطلع یہ ہے

گل مرقع ہیں ترے چاک گریبانوں کے شکل معشوقوں کی انداز ہیں دیوانوں کے

دس بارہ سال ہوئے مسٹر ابرام حیدری حسن اداوی الاقتصادی نے الہ آباد کے مشہور رسالہ ادیب میں مجھ کو مرحوم لکھا مگر میں حضور راجہ صاحب بہادر محمود آباد کی مہربانی سے اب تک زندہ ہوں اور خدایا ابھی زندہ رہوں گا عمر چھہتر سال سے زیادہ نہ ہو گی۔ اسی سال کی عمر میں لکھا جا رہا ہے۔ کبھی کبھی حسرت سے اب زبان پر یہ مقطع آجاتا ہے۔

وقت نازک رات آخر ہے ریاضؔ
لگی ہے شمع کی اللہ سے

مولوی محمد جعفر تھانیسری

اخیر ۱۸۶۳ء مطابق ۱۲۸۰ھ سرحد غربی ہند پر ملک یاغستان میں خود سرکار انگریزی کی زبردستی سے ایک جنگ عظیم شروع ہو گئی اور دسمبر ۱۸۶۳ء مطابق ماہ جمادی الثانی ۱۲۸۰ھ کو ایک سوار پولیس متعینہ چوکی پانی پت ضلع کرنال مسمی غزن خاں نام ایک درانی افغان نے کسی ذریعہ سے میرے حال سے واقف ہو کر ایسے وقت میں اپنی دنیوی بھلائی کا موقع جان کر ایک چٹھی [illegible] کیفیت خیر خواہی کے ساتھ [illegible] صاحب ڈپٹی کمشنر کرنال کے حاضر ہو کر بتلایا کہ یہ جنگ جو ہندوستانی مجاہدین کے ساتھ سرحدوں پر ہو رہی ہے۔ ان لوگوں کو محمد جعفر نمبردار تھانیسری روپیہ اور آدمیوں سے مدد دیتا ہے۔ تین بجے وقت کے سپرنٹنڈنٹ پولیس مع وارنٹ خانہ تلاشی کے میرے دروازہ پر موجود ہیں۔ انھوں نے اول مجھ کو وارنٹ دکھلایا [illegible] کہ آپ اپنے مکان کی تلاشی دو۔ اس وقت میں سمجھا کہ مجھ پر وبال آیا ہے تب میں نے چاہا کہ اول تلاشی میرے گھر کے اندر کی ہو تو بہتر ہے کیونکہ بیٹھک میں جو جو کاغذ چھپا ہوا خط و کتابت کا تھا کسی طرح پولیس کے ہاتھ نہ آئے۔ جب بیٹھک میں تلاشی ہونے لگی اور وہی خط جس کا ڈر تھا سب سے پہلے پولیس کے ہاتھ آ گیا۔ جب پولیس میرے گھر سے چلی گئی تو یہ بات خوب ظاہر تھی کہ اس وقت مجھ کو گرفتار کرنا چاہیے۔ میں نے اس وقت اپنا فرار ہونا اور اس نامردی سے جان کو بچانا مناسب جانا اور ۱۱ دسمبر ۱۸۶۳ء کو اپنے شہر سے روانہ ہو کر اول [illegible] دہلی میں آیا اور بوقت شام براہ سڑک کلاں [illegible] کو روانہ ہوا اور [illegible] ایک میل راستہ چلنے کے بعد اپنی والدہ سے آخری ملاقات کی اور اپنی بیوی اور بچوں کو ساتھ لے کر پانی پت پہنچا وہاں سے بسواری ڈاک دوسرے دن چالیس کوس دہلی میں پہنچ گیا پھر چند روز [illegible] علی گڑھ کو روانہ ہو گئے علی گڑھ میں میرے وہاں پہنچنے کے وقت خبر تار پہنچی تو اسی وقت [illegible] پولیس نے تار کے ذریعہ ہم کو گرفتار کیا اور ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ علی گڑھ کے [illegible] اسی دن شام کو پارسن صاحب وہاں پہنچ گئے دوسرے دن پارسن صاحب ہم تینوں آدمیوں یعنی محمد جعفر حسنی پٹھان اور عبد اللہ کو ساتھ لے کر دہلی کو روانہ ہوئے علی گڑھ سے چل کر دہلی تک [illegible] کو کسی سخت ضروری حاجت کے واسطے بھی نہ اترنے دیا گیا۔ آخر بصد مصیبت اس حال سے [illegible] ہوئے ہم دہلی میں داخل ہوئے۔ جہاں سے جا کر زیر حراست [illegible] سپرنٹنڈنٹ پولیس دہلی کے ہم کو ایک تہ خانہ کے اندر بند کر دیا دوسرے دن وہاں سے کرنال اور پھر کرنال سے انبالہ روانہ کیے گئے۔

دوسرے دن صبح کے وقت پارسن صاحب سپرنٹنڈنٹ اور [illegible] ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس اور کپتان [illegible] صاحب ڈپٹی کمشنر انبالہ میری کوٹھری میں آئے اور مجھ سے کہا کہ تم اس مقدمہ کا سب حال بتا دو تمھارے واسطے بہتر ہوگا۔ میں نے کہا میں کچھ نہیں جانتا۔ اس وقت پارسن صاحب نے مجھ کو پہلے بہت دھمکایا اور پھر مارنا شروع کیا اور جب میری [illegible] کو پہنچی اور میں گر پڑا تو [illegible] صاحب اور [illegible] صاحب کوٹھری سے باہر نکل گئے اور جب [illegible] میں نے کچھ نہ بتایا تو وہ سب کے سب [illegible] ہو کر چلے گئے۔ دوسرے دن جب میں روزہ سے تھا [illegible] شروع ہوئی۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے میری [illegible] کہ ہم [illegible] کہ اگر تم دوسرے [illegible] اور [illegible] تو تم کو پھانسی نہیں ہوگی میں نے [illegible] پھر پارسن صاحب ان دونوں سے انگریزی میں کچھ باتیں کر کے مجھ کو ایک الگ کمرے میں لے گیا جہاں سے جا کر پھر مارنا شروع کیا یہاں تک کہ [illegible] آٹھ بجے پھر

سے آٹھ بجے رات تک مجھ پر اس قدر مار پیٹ ہوئی کہ شاید کسی پر ہوئی ہو لیکن بفضلِ الٰہی میں سب سہہ گیا۔

جب میری طرف سے قطعاً مایوسی ہو گئی تو محمد شفیع اور مولوی محمد تقی کو جو میری طرح سے قید ہی تھے مخبر بنا کر رہا کر دیا انہیں کے بیان سے بے چارہ محمد شفیع پکڑا گیا پھر انہیں کی رہبری سے پادری حسن صاحب پٹنہ گئے اور انہوں نے مولوی یحییٰ علی صاحب، مولوی عبدالرحیم صاحب، الٰہی بخش صاحب اور میاں عبدالغفار کو گرفتار کر کے انبالہ بھیج دیا۔

ٹیمبریں صاحب اس دار و گیر وہابیوں کے کمشنر ہوئے راولپنڈی میں اس کا صدر مقام ہوا چنانچہ مولوی نذیر حسین صاحب محدث دہلوی جو ایک نامی پیشوا وقت اہلحدیث کے ہیں اسی واسطے خدمت گزیدہ گیری وہابیوں کے دہلی سے راولپنڈی طلب ہوئے مگر ٹیمبریں کے انتقال کے بعد وہ محکمہ ہی ٹوٹ گیا اور مولوی نذیر حسین صاحب رہا ہو کر اپنے گھر کو واپس آگئے۔

دسمبر سے اپریل تک یہ سب دار و گیر ہو کر ماہ اپریل مجسٹریٹی ضلع انبالہ میں مقدمہ پیش ہوا کثرت گواہوں کے سبب سے ایک مہینہ تک فقط یہی مقدمہ کچہری مجسٹریٹی میں پیش ہوتا رہا۔ ایک مہینہ کی کارروائی کے بعد ہمارا مقدمہ سیشن سپرد ہوا اس وقت تک ہم پھانسی گھروں میں علیحدہ علیحدہ قید تھے بعد سپردگی سیشن حکام سب کو ایک جگہ حوالات میں بند کر دیا۔ اس وقت مولوی یحییٰ علی صاحب کی صحبت ایک غنیمت سے تھی کچھ عرصہ کے بعد آخر اپریل میں یہ مقدمہ راجرس ایڈورڈ صاحب حاکم سیشن کے روبرو پیش ہوا۔ وہاں بھی ایک مہینہ تک مقدمہ جاری رہا۔ سرکار کی طرف سے میجر ونکفیلڈ صاحب اور پادری حسن صاحب پیروکار اور وکیل تھے۔ اور اس مدعا علیہم کی طرف سے دو وکیل اور میں ایک جانب خود اپنی جواب دہی کرتا تھا آخر میں صاحب سیشن جج نے میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ تمہارا کیا جواب ہے تب میں نے جو ایک ثبوت مقدمہ سرکاری کی تردید کر کے اپنا جواب نہایت مشرح اور مدلل لکھانا شروع کیا صاحب جج نے کہا تم اس میں سے کس قدر لکھو گے تمہارے لکھنے سے مجھ کو اس جواب سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ تم اپنے قصور کا اقبال کر کے عدالت کی مہربانی اور رحم سے اپنی معافی مانگو میں یہ الفاظ تسلیم کا سبق سن کر چپ ہو رہا اور کہا کہ میں فقط انصاف چاہتا ہوں جناب سے اس کی امید نظر نہیں آتی۔

جماعت نے دو مئی ۱۸۶۴ء کو پھر ایک آخری اجلاس سیشن ہوا اور جج صاحب اپنی تجویز اور فتویٰ سزا اپنے گھر پر بیٹھ کر چھپا دیا گو رز صاحب کے لکھوائے تھے۔ سب سے پہلے میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم نے سوائے انکار بحث کے کچھ بیان نہیں کیا تم بہت عقلمند ہو اور سرکار کا دم بھی بھرتے ہو اور باوجود فہمائش کے حق ثابت کرنے میں پوری کوشش نہیں کی اس واسطے تم کو پھانسی دی جاوے گی۔ میرے بعد مولوی یحییٰ علی صاحب کو اس کے بعد محمد شفیع صاحب کو اس کے بعد باقی سب آدمیوں کو حکم سزا کا سنا دیا گیا یعنی میں اور مولوی یحییٰ علی اور حاجی محمد شفیع تین آدمیوں کے واسطے پھانسی وغیرہ حسب مذکورہ بالا اور باقی آٹھ مجرموں کو دوام الحبس عبور دریائے شور مع ضبطی کل جائداد کے سزا ملی اور دوسرے صرفات کے علاوہ ہم نے پھر ایک اپیل خوب مدلل لکھ کر معرفت سپرنٹنڈنٹ جیل کے چیف کورٹ روانہ کر دیا۔

پھر چیف کورٹ میں بھی چند اجلاسوں میں بڑی دھوم دھام کے ساتھ یہ مقدمہ پیش ہوا۔

اب اس منقلب القلوب کی ظاہری کارروائی کو سنئے جب بہت سے صاحب اور میم ہم کو پھانسی گھروں میں نہایت شاداں اور فرحاں دیکھ گئے تو یہ چرچا سب صاحب لوگوں میں ہوا تب ان صاحب لوگوں نے جو ہمارے جانی دشمن تھے یہ خیال کیا کہ ایسے دشمنوں کو مرغوب مرتبہ شہادت جس کے واسطے وہ ایسے خوش ہو رہے ہیں ہرگز نہیں دینا چاہئے۔ بلکہ ان کو کالے پانی بھیج کر ان کی مصائب اور مصیبتوں سے ہلاک کرنا چاہئے۔ ڈپٹی کمشنر انبالہ ۱۶ ستمبر کو پھانسی گھروں میں تشریف لائے اور چیف کورٹ کا حکم ہم کو پڑھ کر سنایا کہ تم لوگ پھانسی چڑھنے کو بہت دوست رکھتے ہو اور شہادت سمجھتے ہو۔ اس واسطے سرکار تمہاری دل چاہی سزا تم کو نہیں دیوے گی تمہاری پھانسی سزائے دوام الحبس عبور دریائے شور سے بدل گئی۔ بعد سنانے حکم پھانسی کے دوسری تحریر کر کے ہم بھی دوسرے قیدیوں کے ساتھ

مشقت پر بھیجے گئے۔ ہم جیل انبالہ ہی میں تھے کہ وہاں بخار مرض عام بڑے زور شور سے قیدیوں میں پھیلا کوئی چار قیدی اس مرض سے فوت ہو گئے۔ یہ عاجز بھی اس وبائے عام سے نہ بچا۔

بعد تبدیلی حکم پھانسی ہم ستمبر ۱۸۶۴ء سے فروری ۱۸۶۵ء تک انبالہ جیل میں رہے۔ پھر فروری ۱۸۶۵ء کو مجھ کو اور مولوی صاحب (محمد یحییٰ) اور میاں عبدالغفار کو سنٹرل جیل لاہور کو روانہ کر دیا اور محمد شفیع، عبدالکریم، الٰہی بخش، عبدالغفور وغیرہ کو جیل انبالہ میں رکھا۔ اب پس ہمارا اس جیل سے روانہ ہونا تھا کہ محمد شفیع اور عبدالکریم وغیرہ سرکاری گواہ ہو گئے۔ ان کی شہادت پر مولوی احمد اللہ صاحب بھی ماہ مئی ۱۸۶۵ء دائم الحبس بعبور دریائے شور و ضبطی جائداد کے سزایاب ہو کر ہم سے پہلے جون کے مہینے میں داخل انڈمان ہو گئے۔

قریب تین بجے شام کے ہم لوگ سنٹرل جیل لاہور کے دروازہ پر پہنچے اور ہمارے چالان کے کل قیدی ایک قطار کر کے دروازہ جیل پر بٹھا دیئے۔ ڈاکٹر گرے صاحب سپرنٹنڈنٹ جیل رونق افروز ہوئے۔ انھوں نے سب سے اول ہم لوگوں کا ملاحظہ کیا اور بڑے غصے سے حکم دیا کہ ایک ایک آڑا ڈنڈا بھی ان لوگوں کے پاؤں میں ڈال دو۔ تمام جیل بھر میں ہمارے سوا اور قیدی کے پاؤں میں یہ ڈنڈا نہیں دیکھا جاتا تھا۔ پھر اٹھنا بیٹھنا نہایت مشکل ہو گیا اور رات کو پاؤں پسار کر سونا بھی محال تھا۔

اخیر اکتوبر ۱۸۶۵ء میں ایک بڑا بھاری چالان قیدیوں کا تیار ہو کر ملتان کو روانہ کرنے کا بندوبست ہوا۔ ایک ایک ہتھکڑی دو دو آدمیوں کے ہاتھوں میں لگا دی۔ میرے ساتھی نے مجھ سے یہ رعایت کی کہ میرا بایاں اور اپنا داہنا ہاتھ ہتھکڑی میں ڈلوایا۔ ہمارے مقدمہ کے فقط تین آدمی تھے میں اور مولوی یحییٰ علی صاحب اور میاں عبدالغفار صاحب ملتان کو روانہ ہوئے گو کہ آٹھ بجے رات کے بعد ہم ملتان پہنچے دو روز ہم جیل ملتان میں رہے۔

دو روز کے بعد وہاں سے ہم کو آگن بوٹ پر سوار کرایا۔ اس وقت قریب آدھا داڑھی کے ہمارے جسم پر تھا۔ ہم پانچ چھ روز بعد کوٹری پہنچ گئے کوٹری اور رستے کا کل حال بھی ہم کو راہ کوٹری میں سندھ کے کنارے جا تھا کوٹری کے سامنے دوسرے کنارے حیدرآباد سندھ کی عالی بستی بھی ہم دیکھتے ہیں۔ کوٹری سے اس روز ریل پر سوار ہو کر ہم کراچی میں پہنچ گئے۔ الحمدللہ کراچی کے جیل میں پہنچنے کے ساتھ ہی ہماری ہتھکڑی اور آڑے ڈنڈے سے تو نجات ہوئی فقط بیڑی آہنی زیب تن رہی۔ ایک ہفتہ کراچی میں ٹھہر کر ایک بادبانی جہاز پر ہم سوار ہوئے۔ دو تین روز کے بعد بمشکل تمام ہم داخل بندر بمبئی کے ہوئے اور قلعہ بمبئی کے ڈونگیوں میں بٹھلا کر ہم کو جہاز سے اتارا اور وہاں سے بذریعہ سواری ریل جیل تھانہ کو جو بمبئی سے ... میل ہے ہم کو لے گئے۔

پچھلے پہر قریب شام کے ہم تھانہ جیل کے دروازہ پر پہنچے جیل ایک مرہٹوں کے وقت کا بنا مستحکم اور مضبوط قلعہ ہے۔ جیل کے اندر داخل ہونے کے ساتھ ہی ہماری تلاشی شروع ہوئی اور ہم سب کی جوتیاں اتروا لی گئیں اور پھر چلتے وقت واپس دی گئیں۔

۸ دسمبر ۱۸۶۵ء بمورد کا جہاز جو ہم بمبئی سے کالے پانی کو روانہ ہوئے ہم دو روز کے سفر دریائی کے بعد ۱۱ جنوری ۱۸۶۶ء کو ہمارا جہاز قبل از دوپہر پورٹ بلیئر انڈمان میں پہنچا۔ انبالہ سے چل کر گیارہ مہینے کے بعد ہم داخل انڈمان ہوئے۔

بڑے بڑے بوٹ اور کشتیاں کنارے سے آئیں اور ہم لوگوں کو اس میں ڈال کر مقام راس میں لے گئے۔ جب ہم کنارے کے نزدیک پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ بہت سے منشی اور مولوی سفید اور فاخرہ لباس پہنے ہوئے ہمارے منتظر کھڑے ہیں۔ پیچھے ہم کو معلوم ہوا کہ مولوی احمد اللہ صاحب ہم سے ایک برس پہلے سے قید ہو کر جون ۱۸۶۵ء کو ہم سے چھ مہینے پہلے پورٹ بلیئر میں پہنچ گئے اور یہ سب لوگ انھیں کے اشارے پر ہمارے پیشوائی کو گھاٹ پر آئے تھے۔ ہم لوگ بوٹ سے اتر کر اس مجمع کے ساتھ مصافحہ اور معانقہ کرتے ہوئے اپنے چالان کے قیدیوں سے جدا ہو کر منشی غلام نبی صاحب محرر ڈپٹی کمشنر کے مکان پر

پہنچے وہاں مولوی احمد اللہ صاحب اور دوسرے اکثر معزز لوگوں سے ہماری ملاقات ہوئی اور اسی مکان میں ہم تینوں آدمی رہنے لگے اسی دم ہماری بیڑی کٹوا دی اور عمدہ لباس ہم کو پہنایا گیا۔

اتفاق حسنہ اور فضل الٰہی سے ہمارے انڈمان پہنچنے کے ایک ہفتے بعد کچھ قیدی بغاوت ۱۸۵۷ء کے جن میں اکثر منشی اور جمعدار وغیرہ بھی تھے حسب طلب راجہ بروک حبس بزیرہ سراواک کہ ایک ملائی ملک سنگاپور کے مشرق میں واقع ہے بھیجے گئے تھے۔ اس سبب سے عمدہ عمدہ عہدے منشیوں کے خالی تھے میری لیاقت کا حال ان لوگوں کو اس وقت بذریعہ اخبارات کے اور مولوی احمد اللہ صاحب سے معلوم ہو چکا تھا۔ اس لیے میں آج جہاز سے اترنے کے ساتھ ہی کچہری صاحب سپرنٹنڈنٹ اور چیف کمشنر میں عہدہ سکنڈ نائب ہیڈ منشی مقرر ہو گیا ایک گھر رہنے کو ایک نوکر تنخواہ دار خدمت کو مل گیا اس وقت میرا عین عالم شباب قریب ستائیس کے سن و سال تھا اس واسطے اول میں نے چاہا کہ ملک سے اپنی بیوی کو بلاؤں مگر اس کو قانون مانع ہوا اس لیے میں نے اپنے پہنچنے کے چند ماہ بعد ایک نو آمدہ کشمیری عورت سے شادی کر لی وہ عورت نہایت کمسن تھی کچھ عرصہ میرے ساتھ رہنے سے بڑی دیندار اور خدمت گزار ہو گئی وہ ۲۷ ۱۸۶۷ء کو رنگون سے مولوی عبدالرحیم صاحب بھی انڈمان پہنچ گئے۔ سمندر کے کنارے کے ملکوں اور جزائر میں طوفانوں اور سیلابوں پر اکثر بڑی آفات بھی پڑا کرتی ہیں کالے پانی میں ہر سال بہت سے آدمی اور کشتیاں سمندر کی نذر ہو جاتی ہیں۔ مجھ کو بھی اس مدت بست سالہ میں بارہا ان آفات کا سامنا ہوا اگر میں ڈوبنے کے وقت جب میں چاروں طرف سے نا امید ہو کر اللہ رب العزت کی طرف دل سے رجوع ہوا تو پھر اس رب قدیر نے فوراً بچا دیا

جنوری ۱۸۶۸ء میں یہ خاکسار جزیرہ چیدہ کو بدل گیا اور وہاں سپرنٹنڈنٹ کا محرر مقرر ہو گیا۔ ۲۰ فروری ۱۸۶۸ء کو بمقام راس مولوی یحییٰ علی صاحب راہی فردوس ہوئے میری بیوی مولوی یحییٰ علی صاحب سے مرید تھی اور ان سے بہت محبت کرتی تھی اس کو اس موت کے سبب سے زیادہ صدمہ پہنچا بلکہ ۲۰ اپریل ۱۸۶۸ء کو وہ نیک بیوی بھی راہی فردوس ہوئی۔ اس بیوی کی وفات کے بعد میں نے سب زیور فروخت کر کے بقدر تین سو روپیہ کے دہلی کو اپنی بیوی کلاں کے پاس بھیجے کہ ان کا مال قسم جوتہ وغیرہ سے خرید کر میرے پاس بھیجے لیکن کراس ایام میں پورٹ بلیر میں دہلی کا مال لگنے پھر گئے دام پر ہوتا تھا مگر یہ مال راہ میں ضائع ہو گیا اور ایک سو پچاس روپیہ خسارہ ہوا۔ غرض پیشہ تجارت میرے واسطے منظور الٰہی نہ تھا۔

اس بیوی کی وفات کے بعد دو برس مجرد رہا مگر وہ ٹاپو عورتوں سے بھرا ہوا تھا اور میں اس ٹاپو میں افسر تھا بہت سی عورتوں نے مجھ کو اپنا شکار کرنا چاہا میں یہ کیفیت دیکھ کر اپنی بیوی کو پانی پت سے بلوانا چاہا مگر اس وقت وہ راضی نہ ہوئی جب ایک دفعہ اس کی کچھ رضامندی بھی ہوئی تھی تو میری درخواست حاکم وقت نے نامنظور کر دی اس واسطے مجبوراً کسی نیک بخت عورت سے دوبارہ عقد کرنے کی صلاح ٹھہری ایک ہندو عورت قوم برہمن ضلع الموڑہ کی رہنے والی نئی قید ہو کر وہاں پہنچی اور باتفاق عورات چند دنوں میں ہمارے حوالے ہوئی۔

میں نے ستائیسویں شب رمضان شریف کی ایک بڑا دھوم دھام کا جلسہ کر کے اس کو مسلمان بنا لیا اور جب ارکان اسلام اور نماز وغیرہ خوب سیکھ لی تو حاکم وقت سے اطلاع کر کے ۵ اپریل ۱۸۷۰ء کو اس سے نکاح کر لیا۔ صدہا آدمی میرے نکاح میں شریک ہوئے اور ہمارے مولوی احمد اللہ صاحب نے یہ نکاح پڑھایا تھا دوسرے دن بڑے دھوم دھام سے اس کا ولیمہ ہوا اس بیوی سے مجھ کو دس بچے پیدا ہوئے اور یہی بیوی کالا پانی سے ہندوستان میرے ساتھ آئی۔

کرنل مین صاحب کے عہد میں ۱۸۶۸ء تا ۱۸۷۱ء ایک بڑے یورپین کی تحریک سے میرے اوپر ایک جھوٹا مقدمہ امانت تصرف بیجا کا یا اس وقت میرے بہت سے دوستوں نے یہ صلاح دی تھی کہ جان بچانے کے واسطے جھوٹ بولنا جائز ہے تم اس مقدمے میں اپنی لاعلمی ظاہر کر کے اپنی

جان بچا لو گے میں سمجھ لوں کہ جو کچھ ہو سو ہو میں تو بچ رہوں گا اور میں اپنے سچ کی برکت سے صاف بری ہو گیا۔

اپریل ۱۸۶۸ء میں ہماری بقر عید آئی ایک بیل مول لے کر اپنے دستور کے موافق ہم نے قربانی کرنا چاہا مگر قربانی کرتے وقت ہندوؤں نے بلوہ کر کے وہ بیل ہم سے چھین لینا چاہا ہمارے ساتھی بھی چند آدمی تھے ہم نے ان کا عذر واجبی محمد ہجوم کے پیش نہ دیا اور پولیس اور افسر کے جلد پہنچ جانے پر نوبت کشت و خون کی نہ پہنچی۔

اس واقعہ قربانی کے بعد حسب عادت خود سب پورٹ بلیر کے ہندو متفق ہو گئے اور یہ صلاح ہوئی کہ جیسے بنے اس مردود پر جرم ہو جائے گو مجھ کو سخت سزا دلائی جائے اور وہ جھوٹے مقدمہ میں پھنسایا۔ ۱۸۶۹ء میں ایک رات کو جبکہ میرے گھر میں قریب پانچ سو روپیہ کے سرکاری روپیہ تنخواہ قیدیان اسٹیشن ہند کا رکھا ہوا تھا میرے گھر کی کھڑکی توڑ کر ایک چور میرے مکان میں اندر گھس آیا۔ لیکن قدرت الٰہی سے یک بیک میری آنکھ کھل گئی میں نے کچھ آہٹ پا کر ادھر ادھر دیکھا تو چور خالی ہاتھ نامراد ہو کر اسی دم بھاگ گیا۔

اگست ۱۸۷۰ء میں، میجر ٹیچر صاحب چیف کمشنر بہادر بھی جزیرہ ہذا سے صدر مقام جزیرہ روس کو تبدیل ہو گیا مئی ۱۸۷۰ء میں صاحب جزیرہ مدراس میں تھا۔ مولوی محمد حسن صاحب ہم لوگوں کی ملاقات کو پٹنہ سے پورٹ بلیر کو آئے۔

نومبر ۱۸۷۱ء میں جنرل اسٹورٹ صاحب جو اخیر میں جنگی لاٹ ہند کے ہو گئے تھے چیف کمشنر ہو کر انڈمان کو تشریف لائے ۸ فروری ۱۸۷۲ء کو لارڈ میو صاحب گورنر جنرل کا قتل ایک قیدی شیر علی کے ہاتھ سے، اس سپرنٹنڈنٹ کے عہد میں ہوا یہ وقوعہ لارڈ صاحب کا ایک ایسے ادنیٰ قیدی کے ہاتھ سے ہونا ایک نمونہ قدرت الٰہی کا تھا ورنہ کہاں گنگو تیلی اور کہاں راجا بھوج۔

۱۸۷۰ء میں مسٹر سروپ نام ایک انگریزی خواں کی ترغیب سے ایک برس کی محنت میں مجھ کو انگریزی بولنے اور لکھنے پڑھنے میں خوب مہارت ہو گئی پھر میں نے عرضی وا پیل بھی انگریزی زبان میں لکھنے شروع کر دیئے تھے جس میں میرا لئے ترقی استعداد علمی کے ہزاروں روپے کا فائدہ بھی مجھ کو حاصل ہوا کہ میرے سوا وہاں کوئی مسلمان انگریزی خواں نہ تھا میں نے بڑے بڑے اہم مقدمات اہل اسلام میں ان کو ہمیشہ بڑی بڑی مدد دی میں نے انگریزی سیکھ کر بڑے بڑے کتب خانوں کی سیر کی انگریزی زبان دعلم اور فنون کا گھر ہے جو انگریزی نہیں جانتا وہ بلاشبہ دنیا کے حالات سے بالکل باہر نہیں ہے جس طرح یہ زبان دنیوی فائدہ سے بھری ہوئی ہے اس طرح سے زیادہ دین کے واسطے مضر بلکہ سم قاتل ہے میرا یہی حال سن لیجئے کہ اسی علم کی بدولت مجھ پر کیا اثر ہوئے میرا دل روگی اور مریض ہو گیا تھا کہ اس پر نزع کی حالت تھی قریب تھا کہ دل مردہ ہو جائے میں سمجھتا تھا کہ فقط اقرار کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ جنت میں جانے کو بس ہے۔ یہ تکالیف شرعی سب بے فائدہ ہیں۔

جو آگ گرفتاری وہابیان ۱۸۶۴ء میں ہمارے سر سے روشن ہوئی تھی اس کو روز بروز ترقی ہوتی گئی ۱۸۷۰ء کے اخیر تک پٹنہ اور بنگال میں سلسلہ گرفتاری بے گناہوں کو جاری رکھا بے چارے امیر خاں سوداگر چرم اور مولوی تبارک علی وغیرہ بہت سے آدمی پٹنہ میں پکڑے مولوی امیر الدین صاحب کو پٹنہ میں جا کر پکڑا اور ابراہیم منڈل کو اسلام پور میں اور اپنے معمولی اور پالتو گواہوں سے گواہی دلوا کے بے چاروں کو کالے پانی کو روانہ کیا میاں عبد الغفار نے درخواست کی تھی کہ میری بیوی اور بچے ہند سے بلوائے جائیں۔

۱۸۷۳ء سے یہ بات غیب سے دل میں جم ہوئی تھی کہ ہم جلد رہا ہو کر ہند کو جانے والے ہیں جون ۱۸۷۴ء میں یہ خاکسار میر منشی ضلع جنوبی پورٹ بلیر کا مقرر ہو کر راس کو بدل گیا اور اپنے پرانے آقا اور شاگرد میجر جا نفرد صاحب ڈپٹی کمشنر کا میر منشی تھا جہاں میں اپنی رہائی اور معافی کی تاریخ تک

بخار اسی صدمہ پر آیا۔ ۲۱ نومبر ۱۸۸۱ء مطابق ۲۸ محرم ۱۲۹۹ھ شب دوشنبہ کو بوقت ایک بجے رات کے مولوی احمد اللہ صاحب کی روح فردوس بریں کو پرواز کر گئی۔

بظاہر کوئی سامان میری رہائی کا اس وقت نہ تھا مگر مستجاب الدعوات نے وہ فریاد اس کی اسی دم قبول کر لی۔ ۲۰ دسمبر ۱۸۸۲ء کو بلا عرضی اور درخواست اور بلاکسی سفارش میری رہائی ہو کر مجھ سے پہلے پانی پت میں میری بیوی کو اطلاع ہو گئی اب جو میری رہائی کا زمانہ قریب آیا میں ہر انگریز سے اپنی رہائی کا منتظر رہتا تھا۔ آخر ۲۲ جنوری ۱۸۸۳ء کو سرکاری نام انگریزی یہ حکم آیا کہ پنجاب میں جس قدر آدمی بجرم بغاوت وہابی کیس میں قید ہیں سب یک قلم رہا کر کے ہند کو روانہ کر دیئے جاویں ان کی رہائی گورنمنٹ ان کی سکونت کے واسطے بندوبست معقول کرے گی جب یہ حکم وہاں پہنچا تو میں اور مولوی عبدالرحیم صاحب میاں عبدالغفار مولوی مبارک علی مولوی امیر الدین اور میاں مسعود گل۔ غرض اس مقدمہ کے وہاں موجود تھے سو سب کی رہائی ہو گئی۔

اسی عرصہ میں میرا ایک پرانے شاگرد کپتان ٹمپل صاحب نے جو بوقت میری رہائی کے خاص کیمپ انبالہ میں مجسٹریٹ تھے میری رہائی کی خبر پا کر مجھ کو لکھا کہ اگر تم میرے پاس رہنا قبول کرو تو میں گورنمنٹ سے اجازت لے کر تم کو اپنے پاس بلا لوں میں نے اس پیام کو تائید غیبی سمجھ کر فوراً قبول کر لیا تب انھوں نے گورنمنٹ پنجاب سے اجازت حاصل کر کے اور خود میرے ضامن ہو کر کل شرائط نگرانی وغیرہ میرے اوپر سے اٹھوا دیں۔

جب میری رہائی کا حکم پورٹ بلیئر میں آیا تو میری بیوی خود دائم الحبس تھی اور اس کو فقط چودہ برس قید میں ہوتے تھے اس واسطے اس گورنمنٹ کو اطلاع دی گئی کہ جب تک محمد جعفر کی بیوی رہا نہ ہو گی وہ ہند کو نہیں جا سکتا یکم مئی ۱۸۸۳ء کو میری بیوی کی رہائی بھی آ گئی۔ مگر اس وقت میری بیوی کو چھ مہینے کا حمل تھا اور سمندر میں موسم طوفان کا شروع ہو گیا تھا اس واسطے میں نے تا ماہ نومبر ۱۸۸۳ء پورٹ بلیئر میں رہنے کی اجازت حاصل کر لی۔

اس مدت میں میں نے اپنے گھر کا اسباب فروخت کرنا شروع کر دیا۔ اکتوبر ۱۸۸۳ء میں میں نے چاہا کہ میرا گھر جو پکا جس میں رہتا تھا مسجد بنا کر ہمیشہ وقف کر دیا جائے اور سب مسلمان اس وقف سے بہت خوش ہوئے مگر ڈپٹی کمشنر نے ازراہ تعصب کے یہ رپورٹ کر دی کہ یہ شخص وہابی ہے اور یہ مسجد بھی وہابیوں کے قبضہ میں رہے گی اس واسطے یہاں مسجد بنانے کی اجازت نہ دی جائے۔

جب میں ۸ نومبر ۱۸۸۳ء کو سوار ہونے کو تھا تو اسی وقت میں نے ایک عام دعوت کر کے اپنے سب دوستوں کو مدعو کیا تھا جس کسی کو یہ دعوت پہنچی جو [illegible] چلا آیا یہ دعوت میرے گھر میں میرے سوار ہونے سے فقط ایک گھنٹہ پہلے دوپہر کے وقت ہوئی تھی اس دن اتفاق سے جمعہ تھا بعد کھانا کل حاضرین مولوی لیاقت علی صاحب کے ساتھ آخری نماز جمعہ پڑھ کر گاڑیاں تیار کھڑی تھیں جب بوقت چار بجے شام کے ہم مع اپنے متعلقین خود مقام جزیرہ راس سے کشتی پر سوار ہو کر انگریزی جہاز کو چلا تو بے شمار خلقت خوشی اور رنج سے زار و زار رو رہی تھی قریب پانچ بجے شام کے ہم نے انگریزی جہاز مہارانی نام پہ سوار ہو کر ایک چبوترہ پر اپنا ڈیرہ کر لیا بوقت غروب آفتاب کے جہاز کا لنگر اٹھایا گیا اور ہم لوگوں نے چشم پر آب ایک کے بعد ایک جزائر انڈمان کو خیرباد کہہ کر پیچھے چھوڑنا شروع کیا۔

غرض بفضل الٰہی ہم چار دن اور چار رات کے سفر کے بعد ۱۲ نومبر ۱۸۸۳ء کو داخل کلکتہ ہوئے اور تیسری شب کو بوقت ۹ بجے رات کے ہم بسواری ریل کلکتہ سے ہند کو روانہ ہوئے اور کلکتہ سے الٰہ آباد اور وہاں سے کانپور، کانپور سے علی گڑھ اور علی گڑھ سے سہارنپور اور وہاں سے انبالہ تک منزل بمنزل ٹکٹ لیتے ہوئے ۲۰ نومبر ۱۸۸۳ء کو بوقت ۹ بجے شب کے اسٹیشن کیمپ انبالہ پر پہنچ گئے۔ دوسرے دن فوراً ہم شہر انبالہ پہنچے اور وہاں کے حکام ضلع سے اجازت لے کر کیمپ انبالہ میں اپنے آقائے قدیم کپتان ٹمپل صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے انھوں

نے بہت تسلی و تشفی کی اور فرمایا کہ آج کی تاریخ سے ہم بیس روپے ماہوار تنخواہ تم کو اپنے پاس سے دیا کریں گے اور تمھاری نوکری کے واسطے بھی جلد اچھا بندوبست ہو جاوے گا۔

خیر سفر کے ختم ہونے کے بعد میں بمقام پانی پت اپنے گھر میں پہنچا میری بیوی اور لڑکے مجھ کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئیں۔ بروز فرار میں لڑکے کو میں نے چند مہینے کا چھوڑا تھا اب اس کو بیس برس کی عمر میں دیکھا پانچ روز وہاں ٹھہرنے کے بعد پھر میں براہ کرنال تھانیسر آیا اور ایک شب چند گھنٹے تھانیسر میں ٹھہر کر پھر انبالہ کو لوٹ آیا۔

جب ٹمپل صاحب بوجہ تبدیلی خود اس ملک سے چلے گئے تو ان کے بعد خود بخود بلا میری درخواست کے ریاست اروری میں میرا روزگار مستقل تجویز کرایا جہاں میں اب تک بڑے آرام اور آسائش سے نوکر ہوں۔

ہمارے ہندوستان میں واپس آنے کے بعد جو نگرانی پولیس وغیرہ ہمارے اوپر مقرر ہوئی تھی، اول تو یہ سرداری و ضمانت خود کپتان ٹمپل صاحب نے میرے اوپر سے اٹھوا دیا تھا اور بعد تبدیلی کپتان ٹمپل صاحب کے محض بتائید غیبی بلا کسی سفارش کسی بشر کے وہ احکامات نگرانی وغیرہ بذریعہ چٹھی نمبری [illegible] مورخہ ۹ جنوری ۱۸۸۳ء منجانب سکرٹری گورنمنٹ پنجاب بنام صاحب کمشنر قسمت دہلی میرے اوپر سے اٹھوا دیئے گئے۔

یہ فقط اسی رب قدیر کا کام ہے کہ یہ سارے تماشے گرم و سرد زمانے کے دکھلا کر اس اپنے نالائق مفرور غلام کو پھر جیتے کا جیتا اس ملک میں لا کر پہلے سے دو چند لوگوں کی آنکھوں میں معزز اور ممتاز کر دیا ہے۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ

(تلخیص: محمد ایوب قادری)

پریم چند

ابتدائی حالات

میری زندگی ہموار میدان کی طرح ہے۔ جس میں کہیں کہیں گڑھے تو ہیں، لیکن ٹیلوں، پہاڑوں، گہری گھاٹیوں اور غاروں کا پتہ نہیں ہے۔ جن حضرات کو پہاڑوں کی سیر کا شوق ہو انھیں یہاں مایوسی ہوگی۔

میرا جنم سمت ۱۹۳۷ (سنہ ۱۸۸۰ء) میں ہوا۔ باپ کا نام منشی عجائب لال۔ سکونت موضع مڈھوا متصل پانڈے پور، بنارس۔ والد ڈاک خانے میں کلرک تھے۔ والدہ مریض تھیں۔ ایک بڑی بہن تھی۔ اس وقت والد شاید بیس روپے پاتے تھے۔ چالیس تک پہنچتے پہنچتے ان کا انتقال ہوگیا۔ والدہ بھی ساتویں سال گزر چکی تھیں یوں تو وہ بڑے دور اندیش تھے اور دنیا میں آنکھیں کھول کر چلنے والے تھے۔ لیکن آخری عمر میں ایک ٹھوکر کھا ہی گئے اور خود تو گرے ہی تھے۔ اسی دھکے میں مجھے بھی گرا دیا۔ جس کے چند سال بعد ہی انھیں سفر آخرت درپیش ہوگیا۔ گھر میں میری بیوی، سوتیلی ماں اور ان کے دو لڑکے تھے مگر آمدنی ایک پیسے کی نہ تھی۔ گھر میں جو کچھ تھا چھ ماہ تک والد کی علالت اور اس کے بعد تجہیز و تکفین میں خرچ ہوگیا۔ اس وقت میں نویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ مجھے ایم۔ اے پاس کر کے وکیل بننے کا ارمان تھا۔ سرکاری ملازمت اس زمانے میں بھی اتنی ہی مشکل سے ملتی تھی جتنی کہ اب۔ دوڑ دھوپ کر کے شاید دس بارہ روپیہ کی کوئی جگہ پا جاتا۔ مگر یہاں تو آگے پڑھنے کی دھن تھی مگر پاؤں میں لوہے کی نہیں، اشٹ دھات کی بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اور میں پہاڑ پر چڑھنا چاہتا تھا۔

اپنی آپ بیتی کس سے کہوں۔ پاؤں میں جوتے نہ تھے۔ بدن پر ثابت کپڑے نہ تھے۔ گرانی الگ، دس سیر کے جو تھے۔ اسکول سے ساڑھے تین بجے چھٹی ملتی تھی۔ کوئینس کالج بنارس میں پڑھتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے فیس معاف کر دی تھی۔ امتحان سر پر تھا اور میں "بانس کے پھاٹک" پر ایک لڑکے کو پڑھانے جایا کرتا تھا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ چار بجے شام کو پہنچ جاتا اور چھ بجے چھٹی پاتا تھا۔ وہاں سے میرا گھر پانچ میل پر تھا۔ تیز چلنے پر بھی آٹھ بجے رات سے پہلے گھر نہ پہنچتا۔ رات کو کھانا کھا کر کپی کے سامنے پڑھنے بیٹھتا اور نہ معلوم کب سو جاتا۔

اتفاق سے ایک وکیل صاحب کے لڑکوں کو پڑھانے کا کام مل گیا۔ پانچ روپے تنخواہ ٹھہری۔ میں نے دو روپیہ میں گزر کر کے تین روپیہ گھر دینے کا مصمم ارادہ کیا۔ وکیل صاحب کے اصطبل کے اوپر ایک چھوٹی سی کچی کوٹھری تھی۔ اسی میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ ایک ٹاٹ کا ٹکڑا بچھا لیا۔ بازار سے ایک چھوٹا سا لیمپ لے آیا اور شہر میں رہنے لگا۔ گھر سے کچھ برتن بھی لایا۔ ایک وقت کھچڑی پکا لیتا اور برتن دھو مانجھ کر لائبریری چلا جاتا۔

جن وکیل صاحب کے لڑکوں کو پڑھاتا تھا، ان کے سالے میٹریکولیشن میں میرے ساتھ پڑھتے تھے۔ انھیں کی سفارش سے مجھے یہ ٹیوشن ملا تھا۔ اس دوستی کی وجہ سے جب ضرورت ہوتی ان سے پیسے ادھار لے لیا کرتا اور تنخواہ ملنے پر حساب بیباق کر دیتا۔ کبھی دو روپے ہاتھ آتے کبھی تین۔ جس دن تنخواہ کے دو تین روپے ملتے میری قوت ارادی کی باگ ڈھیلی ہو جاتی، للچائی آنکھیں حلوائی کی دوکان کی طرف کھینچ لے جاتیں۔

اور دو تین آنے کے پیسے ختم کیے بغیر واپس نہ آتا۔ پھر اسی دن گھر جاتا اور دو ڈھائی روپے دے آتا۔ دوسرے دن سے پھر اُدھار لینا شروع کر دیتا۔ لیکن کبھی کبھی ادھار لینے میں پس و پیش بھی ہوتا۔ جس کی وجہ سے سارا دن روزہ رکھنا پڑتا۔

اسی طرح چار پانچ مہینے گزر گئے۔ اسی درمیان ایک بزاز سے دو ڈھائی روپے کے کپڑے لیے تھے۔ روز ادھر سے نکلنا ہوتا تھا۔ اس کو مجھ پر پورا بھروسا تھا۔ جب مہینے دو مہینے ہو گئے اور میں روپے نہ چکا سکا تو پھر میں نے ادھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا چکر دے کر نکل جاتا۔ تین سال کے بعد اس کے روپے ادا کر سکا۔ اسی زمانے میں شہر کا ایک بیلدار مجھ سے کچھ ہندی پڑھنے آیا کرتا تھا۔ اس کا گھر وکیل صاحب کے مکان کی پشت پر تھا ”جان و بھیا“ اس کا سخن تکیہ تھا۔ چنانچہ سب لوگ اُسے جان و بھیا ہی کہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے اس سے آٹھ آنے پیسے اُدھار لیے تھے۔ یہ پیسے اس نے مجھ سے میرے گھر گاؤں میں جا کر پانچ برس کے بعد وصول کیے۔ اب بھی میری پڑھنے کی خواہش تھی لیکن روز بروز ناامید ہوا جاتا تھا۔ یہی چاہتا تھا کہ کہیں نوکری مل جائے تو کر لوں۔ لیکن نوکری کس طرح اور کہاں ملتی ہے یہ مجھے معلوم نہ تھا۔

جاڑے کا موسم تھا مگر کوڑی پاس نہ تھی دو دو دن تک تو ایک ایک پیسے کے بھنے ہوئے چنے کھا کر کاٹے۔ میرے مہاجن نے ادھار دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور میں لحاظ کے مارے اس سے مانگنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا، چراغ جل چکے تھے۔ اسی وقت میں ایک بک سیلر کی دوکان پر ایک کتاب بیچنے گیا جو چکرورتی کی بنائی ہوئی ارتھمیٹک کی شرح تھی اور جسے میں نے دو سال ہوئے خریدا تھا۔ اب تک اُسے بڑی احتیاط سے رکھا تھا۔ لیکن آج جب چاروں طرف سے مایوسی ہو گئی تو اُسے فروخت کرنے کا ارادہ کیا۔ کتاب کی قیمت دو روپے تھی لیکن ایک روپے میں سودا ہوا۔ مصائب کا ایک اخلاقی پہلو بھی ہوتا ہے آزمائشیں ہی انسان کو انسان بناتی ہیں۔ اور انہیں سے آدمی میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔

تعلیم

ابتداً آٹھ سال تک فارسی پڑھی۔ پھر انگریزی پڑھنا شروع کیا۔ کوئینس کالج بنارس میں پڑھتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے فیس معاف کر دی تھی۔ میٹریکولیشن تو کسی طرح پاس ہو گیا۔ لیکن سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوا اور کوئینس کالج میں داخلہ کی کوئی امید نہ رہی۔ فیس صرف اوّل درجہ میں پاس ہونے والوں کی معاف ہو سکتی تھی۔ خوش قسمتی سے اسی سال ہندو کالج کھل گیا تھا۔ میں نے اس نئے کالج میں پڑھنے کا ارادہ کیا۔ مسٹر رچرڈسن پرنسپل تھے۔ ان کے مکان پر گیا وہ سر سے پاؤں تک ہندوستانی لباس میں ملبوس تھے اور دھوتی پہنے فرش پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ لیکن مزاج تبدیل کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ میری گزارش سن کر ابھی میں آدھی ہی بات کہہ پایا تھا بولے کہ گھر پر میں کالج کی بات نہیں سنتا۔ ناچار کالج گیا۔ ملاقات تو ہوئی مگر ناامیدی کے سوائے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اب کیا کروں۔ اگر کسی کی سفارش لے آتا تو شاید میری درخواست پر غور ہوتا۔ لیکن ایک دیہاتی لڑکے کو شہر میں جانتا ہی کون تھا۔

روز گھر سے اسی ارادہ سے نکلتا کہ کہیں سے سفارش لکھا لاؤں۔ لیکن بارہ میل کی منزل مار کر شام کو ویسی ہی گھر واپس آ جاتا۔ شہر میں کوئی بات پوچھنے والا بھی نہ تھا۔ کئی دنوں بعد ایک سفارش ملی، ایک صاحب ٹھاکر اندر نارائن سنگھ ہندو کالج کی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے ان سے جا کر رو دیا۔ انہیں مجھ پر رحم آ گیا۔ اور انھوں نے سفارشی چٹھی لکھ دی۔ اس وقت میری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ بہر حال خوش خوش گھر آیا۔ دوسرے دن پرنسپل صاحب سے ملنے کا ارادہ تھا لیکن گھر پہنچتے ہی مجھے بخار آ گیا۔ اور دو ہفتے سے پہلے نہ ٹلا۔ نیم کا کاڑھا پیتے

پیتے ناک میں دم آگیا۔ ایک دن دروازہ پر بیٹھا ہوا تھا کہ میرے پروہت جی آگئے۔ میری حالت دیکھ کر مزاج پرسی کی اور فوراً کسی کھیت سے ایک جڑی کھود لائے اُسے دھو کر سات دانے کالی مرچ کے ساتھ پسوا کر مجھے پلا دیا اس نے جادو کا اثر کیا۔ بخار چڑھنے میں گھنٹے بھر کی دیر تھی مگر اس دوا نے گویا گھنٹہ بھر کے اندر ہی اس کا گلا گھونٹ دیا۔ میں نے پنڈت جی سے بار بار اس جڑی کا نام پوچھا مگر انھوں نے نہ بتایا۔ کہا نام بتا دینے سے اس کا اثر جاتا رہے گا۔

غرض ایک مہینے کے بعد دوبارہ مسٹر رچرڈس سے ملا اور انہیں ٹھاکر صاحب کا سفارشی خط دکھلایا انھوں نے میری طرف گھور کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اتنے دنوں تک کہاں تھے"

"بیمار ہو گیا تھا"

"کیا بیماری تھی؟"

میں اس سوال کے لئے تیار نہ تھا۔ اگر بخار بتاتا ہوں تو شاید صاحب مجھے جھوٹا سمجھیں۔ بخار میری سمجھ میں معمولی بات تھی جس کے لیے اتنی لمبی غیر حاضری کی ضرورت نہ تھی۔ کوئی ایسی بیماری بتانے کی فکر ہوئی جو مجبوری و تکلیف کے علاوہ رحم کے جذبات کو بھی ابھار سکے۔ اس وقت مجھے اور کوئی بیماری کا نام یاد نہ آیا، ٹھاکر اندر نارائن سنگھ سے جب میں سفارش کے لیے ملا تھا تو انھوں نے اپنے اختلاج قلب کے مرض کا ذکر کیا تھا۔ ان کے الفاظ مجھے یاد آگئے۔

میں نے کہا "پلپیٹیشن آف ہارٹ سر" PULPITATION OF HEART SIR صاحب نے متعجب ہو کر میری طرف دیکھا اور کہا "اب تم بالکل اچھے ہو"؟

"جی ہاں"

اچھا فارم داخلہ بھر کر لاؤ۔

میں سمجھا چلو بیڑا پار ہوا۔ فارم لیا۔ خانہ پُری کی اور پیش کر دیا۔ صاحب اس وقت کسی کلاس میں پڑھا رہے تھے۔ تین بجے مجھے فارم واپس ملا۔ اس پر لکھا تھا "اس کی لیاقت کی جانچ کی جائے"۔

یہ نیا مرحلہ پیش آیا تو میرا دل بیٹھ گیا۔ انگریزی کے سوا اور کسی مضمون میں پاس ہونے کی امید نہ تھی اور حساب و ریاضی سے تو میری روح کانپتی تھی۔ جو کچھ یاد تھا وہ بھی بھول گیا تھا۔ اب کوئی دوسری صورت کیا ہو سکتی تھی۔ تقدیر پر بھروسہ کر کے کلاس میں گیا۔ اور اپنا فارم دکھایا۔ پروفیسر صاحب بنگالی تھے۔ انگریزی پڑھا رہے تھے۔ واشنگٹن اورنگ کا RIPVA WINKLE کا سبق تھا میں پیچھے کی قطار میں جا کر بیٹھ گیا۔ اور دو ہی چار منٹ میں مجھے معلوم ہو گیا کہ پروفیسر صاحب اپنے مضمون پر پوری طرح حاوی ہیں۔ گھنٹہ ختم ہونے پر انھوں نے آج کے سبق پر مجھ سے مختلف سوالات کئے اور میرے جوابات سن کر میری عرضی پر "اطمینان بخش" SATISFACTORY کا لفظ لکھ دیا۔

دوسرا گھنٹہ حساب کا تھا اس کے پروفیسر بھی بنگالی تھے۔ میں نے اپنا فارم دکھایا۔ نئی درسگاہوں میں عموماً نئے طلبا آتے

دیں جنھیں کہیں جگہ نہیں ملتی۔ یہاں بھی یہی حال تھا۔ کلاسوں میں کم استعداد اور ناقابل طلبا بھرے پڑے تھے۔ پہلے ریلے میں جو آیا بھرتی ہوگیا۔ بھوک میں ساگ پات بھی لذیذ معلوم ہوتا ہے۔ مگر اب پیٹ بھر گیا تھا۔ طلبا چن چن کر لئے جاتے تھے۔ ان پروفیسر صاحب نے حساب میں میرا امتحان لیا اور میں فیل ہوگیا۔ فارم پر حساب کے خانہ میں "ناقابل اطمینان" لکھ دیا گیا۔ میں اتنا ناامید ہوا کہ فارم لے کر پھر دوبارہ پرنسپل کے پاس نہ گیا۔ سیدھا گھر چلا آیا۔ حساب میرے لئے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی تھی جس پر میں کبھی نہ چڑھ سکا۔ خیر میں ناامید ہو کر گھر لوٹ آیا لیکن پڑھنے کی تمنا باقی رہی۔ گھر بیٹھ کر کیا کرتا۔ کسی طرح حساب پختہ کر کے کالج میں داخل ہو جاؤں یہی دھن تھی۔ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں حساب میں دو مرتبہ فیل ہوا اور ناامید ہو کر امتحان دینا چھوڑ دیا۔ دس بارہ سال کے بعد ریاضی کا مضمون اختیاری ہو گیا تو میں نے دوسرے سبجکٹ لے کر آسانی سے انٹرمیڈیٹ پاس کر لیا۔ اس وقت تک ریاضی کی بدولت صدہا طلبا کی آرزوؤں کا خون ہوا۔ گورکھپور میں (۱۹۱۹ء) میں پرائیویٹ طور پر بی۔ اے بھی پاس کیا۔ عالم ضعیفی میں ایم۔ اے پاس کرنے کی دھن سوار ہوگئی۔ کاش میں نے اوائل عمر میں ایم۔ اے تک علم حاصل کر لیا ہوتا تو یہ کس مپرسی کی حالت نہ ہوتی۔ اور نہ وہ زمانہ فسانہ نگاری کی قدر ہوتا اور اب ضرورتیں ڈگری کے لیے مجبور کرتی ہیں۔ (۱۹۰۴ء) میں جونیئر انگلش ٹیچرس سرٹیفکیٹ کا امتحان اوّل درجہ میں پاس کیا۔ اسی سال قدیم الہ آباد یونیورسٹی اسپیشل ورنیکلر امتحان بھی اردو ہندی دونوں میں پاس کیا۔

شادی

شباب انسانی زندگی کی معراج ہے۔ طفلی میں اگر ہم سنہرے خواب دیکھتے ہیں تو شباب ان خوابوں کی تفسیر ہے۔ عہد طفلی کے بعد ایسا زمانہ آتا ہے جب ایک بیجا جنون سر پر سوار ہو جاتا ہے اس میں شباب کا مستقل ارادہ نہیں ہوتا بلکہ ایک زبردست اُمید آفرینی جو مشکل کو آسان اور ناممکن کو ممکن سمجھتی ہے۔ کچھ بہت ہی معمولی قسم کی باتیں ضرور ہوئیں۔ لیکن انھیں عشق و محبت نہیں کہہ سکتا۔ میری ازدواجی زندگی میں بھی کوئی رومانس نہیں ہے۔ زندگی میں عشق و محبت کا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ زندگی اتنی مصروف اور زندگی گزارنا اتنا کٹھن کام تھا، اس میں رومانس کے لیے گنجائش نہیں تھی۔ پندرہ برس کی عمر میں انھوں (والد) نے میری شادی کر دی۔ وہ ایک بدنصیب عورت تھی۔ دیکھنے میں ذرا بھی اچھی نہیں تھی۔ اور میں اس سے مطمئن نہیں تھا۔ پھر بھی جیسے سبھی شوہر کرتے ہیں میں بغیر کسی قسم کے شکوہ شکایات کے اس کے ساتھ نباہ کرتا رہا۔ اپنی بیتی کس سے کہوں، ضبط کئے کے کوفت ہو رہی ہے۔ جوں توں کر کے ایک عشرہ (والد کے انتقال کے بعد) کاٹا تھا کہ خانگی ترددات کا تانا بندھا۔ بیوی صاحب نے ضد پکڑی کہ یہاں نہ رہوں گی میکے جاؤں گی۔ میرے پاس روپیہ نہ تھا۔ ناچار کھیت کا منافع وصول کیا۔ ان کی رخصتی کی تیاری کی وہ رو دھو کر چلی گئیں۔ میں نے پہنچانا بھی پسند نہ کیا۔ ان کو گئے ہوئے آٹھ روز ہو گئے نہ خط نہ پتر ——— میں ان سے پہلے ہی ناخوش تھا اب تو صورت سے بیزار ہو گیا۔ غالباً اب کی ان کی جدائی دائمی ثابت ہو۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ میں بلا بیوی کے رہوں گا۔ ادھر نانا سے اور والدہ کی طرف سے ضد کہ بیاہ رچے اور ضرور رچے جب کہتا ہوں مفلس ہوں تو والدہ کہتی ہیں کہ تم اپنی رضامندی دے دو، تم سے ایک کوڑی نہ مانگی جائے گی۔ بہر حال ابکی تو گلا چھڑا ہی لونگا۔ آئندہ کی بات نارائن کے ہاتھ ہے۔

جب میری پہلی بیوی (۱۹۰۴ء) میں مر گئی[عہ] تو میں نے ایک بال بیوہ (شیورانی دیوی) کے ساتھ (۱۹۰۵ء) شادی کی اور میں اس

[عہ] پریم چند کا یہ بیان حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ ان کی پہلی بیوی دوسری شادی کے کافی عرصہ بعد تک زندہ رہی اور پریم چند انھیں کچھ روپیہ بھی بھیجتے رہے (پریم چند گھر میں)

کے ساتھ بسر کر سکتی ہوں۔ اسے بھی ادب سے ذوق پیدا ہو چلا ہے اور وہ کبھی کبھی کہانیاں بھی لکھتی ہے۔ وہ نڈر، حوصلہ مند، نہ جھکنے والی، ایماندار عورت ہے جو کچھ وہ دے نہیں سکتی اس کی اُس سے اُمید نہیں رکھتا۔ وہ ٹوٹ سکتی ہے لیکن آپ اُسے جھکا نہیں سکتے جب کسی قوم کی عورتوں میں غیرت نہیں رہتی تو وہ قوم مردہ ہو جاتی ہے۔ مگر کتنی ہی مقدس علائم اور خوشگوار یادوں کو بیدار کر دیتا ہے۔ گرہست کی آماجگاہ ہے۔ محبت نے بہت ریاضت کے بعد یہ پروان پایا ہے۔ میں بیاہ کو روحانی ارتقا کا ذریعہ سمجھتا ہوں عورت مرد کے رشتے کا اگر کوئی مطلب ہے تو یہی ورنہ میں بیاہ کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔

دو بچے تھے۔ چھوٹا بچہ (منو) چیچک میں مبتلا ہو گیا اور ہمیشہ کے لیے (۱۹۲۳ء) داغ دے گیا۔ اس صدمے سے کمر ٹوٹ گئی ہمت پست ہو گئی۔ اب چہار سالہ (بڑا لڑکا پت رائے عرف دھنو) شیرخوار رہ گیا اور ایک لڑکی —— پرماتما ان ہی دونوں کو زندہ رکھے (۱۹۲۲ء میں چھوٹا لڑکا امرت رائے پیدا ہوا)

ابتدائی مطالعہ اور تحریریں

میری عمر کوئی تیرہ سال ہو گی۔ ہندی بالکل نہ جانتا تھا۔ اُردو کے ناول پڑھنے کا جنون تھا۔ لائبریری چلا جاتا۔ حساب تو بہانہ تھا۔ ناول پڑھا کرتا تھا۔ مولانا شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا رسوا، مولوی محمد علی ہردوئی نواسی، اُس وقت کے مقبول ترین ناول نویس تھے ان کی تحریریں یہاں مل جاتی تھیں۔ سکول کی یاد بھول جاتی تھی کتاب ختم کر کے ہی دم لیتا تھا۔ اس زمانے میں رینالڈز کے ناولوں کی دھوم تھی۔ اُردو میں ان کے ترجمے دھڑا دھڑ نکل رہے تھے۔ اور ہاتھوں ہاتھ بکتے تھے۔ میں بھی ان کا عاشق تھا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا فسانہ آزاد انہیں دنوں پڑھا، "چندر کانتا سنتت" بھی پڑھا۔ بنکم بابو کے اردو ترجمے بھی جتنے لائبریری میں ملے سب پڑھ ڈالے۔ اور پنڈت رتن ناتھ سرشار سے تو سیری نہ ہوتی تھی۔ اُن کی تمام کتابیں میں نے پڑھ ڈالیں۔ ان دنوں میرے چچا جی گورکھپور میں رہتے تھے۔ اور میں بھی گورکھپور کے اسکول میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ جو تیسرا درجہ کہلاتا تھا۔ ریتی میں ایک کتب فروش بدھی لال رہتا تھا میں اس کی دوکان پر جا بیٹھتا تھا اس کے اسٹاک سے ناول لے لے کر پڑھتا تھا۔ مگر دوکان پر سارے دن تو بیٹھ نہ سکتا تھا اس لیے میں اس کی دوکان سے انگریزی کتابوں کی کنجیاں اور خلاصے لے کر اپنے سکول کے لڑکوں کے ہاتھ بیچا کرتا تھا اور اس کے معاوضے میں ناول دوکان سے گھر لا کر پڑھتا تھا اور تین برسوں میں میں نے سینکڑوں ہی ناول پڑھ ڈالے ہوں گے۔ جب ناولوں کا اسٹاک ختم ہو گیا تو میں نے نول کشور پریس سے نکلے ہوئے پُرانوں کے اردو ترجمے بھی پڑھے اور "طلسم ہوشربا" کے کئی حصے بھی پڑھے۔ اس عظیم طلسمی کتاب کے ۱۷ حصے اُس وقت نکل چکے تھے۔ اور ایک ایک حصہ بڑے سُپر رائل کی شکل میں دو دو ہزار صفحات سے کم نہ ہو گا۔ اور ان ۱۷ حصوں کے بعد اس کتاب کے مختلف موضوعات پر پچیسوں حصے چھپ چکے تھے۔ ان میں سے بھی میں نے کئی پڑھے۔ جس نے اتنے بڑے گرنتھ کی تخلیق کی اس کی قوت تخیل کس قدر زوردار ہو گی۔ اس کا صرف قیاس ہی کیا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں یہ کہانیاں مولانا فیضی نے اکبر کی تفریح طبع کے لئے فارسی میں لکھی تھیں۔ اس میں کس قدر صداقت ہے کہہ نہیں سکتا۔ لیکن اتنی طویل کہانی شاید ہی دنیا کی کسی زبان میں ہو۔ اسے پوری انسائیکلوپیڈیا سمجھ لیجئے۔ ایک آدمی تو اپنی ساٹھ برس کی عمر میں نقل کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ تخلیق تو دوسری بات ہے۔

میری پہلی تخلیق

میرے ماموں گاؤں میں رہتے تھے۔ موروثی زمین تھی۔ اس سے کھانے بھر کو آ جاتا تھا۔ لیکن مجرد زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ سماجی رکاوٹوں کے باعث شادی نہیں ہو سکی۔ اس لیے ایک چمارن سے جو اُن کے گھر میں گوبر پاتھنے

اور کوڑا کرکٹ اٹھانے دیا کرتی تھی، عشق لڑانے لگے۔ چماری چالاک تھی اس نے سماج کے مظلوم اس آدمی کی کمزوری کو بھانپ لیا۔ ادھر اس سے اچھے اچھے کپڑے لیتی اور تر مال کھاتی رہی اور ادھر اس عشق کو چرچا چمار بستی میں کر دیا۔ اس لیے جس روز ماموں صاحب کو اس عشق کا آخری مرحلہ طے کرنا تھا ان کی خوب مرمت ہوئی۔ چماری کے اندر آتے ہی جونہی انھوں نے سانکل لگائی کہ لٹھ بند چماروں نے دروازہ توڑنا شروع کر دیا۔ وہ خوف کے مارے بھوسے والے کمرے میں جا چھپے۔ مگر چمار اپنی سی کرنے پر تلے ہوئے تھے انھیں اندر سے نکال کر خوب پیٹا۔

سارے گاؤں میں ان کی کھلّی اڑی اور وہاں رہنا مشکل ہو گیا۔ اس لئے وہ بستی کے گھر اٹھ آئے۔ اس سے پہلے بھی جب کبھی اکیلے رہتے رہتے جی گھبراتا تھا اکثر آ جاتے تھے۔ میری عمر اس وقت بارہ تیرہ سال تھی۔ وہ مجھ پر ہمیشہ رعب گانٹھا کرتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اس واقعے کے بعد ماموں صاحب کا رویہ نرم پڑ جائے گا۔ لیکن جب دیکھا کہ ایسا نہیں ہوا اور ماموں صاحب بدستور رعب گانٹھ رہے ہیں تو میں نے اس واقعے کی بنا پر ایک مزاحیہ ڈراما لکھا جس میں چماروں کے ہاتھوں ماموں کی مرمت کا ذکر خوب مزے لے کر کیا تھا۔

میں صبح اسکول جاتے وقت یہ ڈراما ماموں صاحب کے سرہانے رکھ گیا۔ چھٹی ملنے پر میں یہ خیال دل میں لیے لوٹ رہا تھا کہ دیکھیں ڈراما پڑھنے کے بعد ان پر اس کا کیا ردعمل ہوا۔ لیکن گھر پہنچا تو وہاں نہ ماموں موجود تھے اور نہ وہ ڈراما۔ شاید وہ جاتے وقت اس کو نذر آتش کر گئے تھے۔

ملازمت

میں روپیہ لے کر دوکان سے اترا ہی تھا کہ لمبی مونچھوں والے ایک متین شخص نے مجھ سے پوچھا۔

"تم کہاں پڑھتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "پڑھتا تو کہیں نہیں پر کہیں نام لکھانے کی فکر میں ہوں۔"

"میٹریکیولیشن پاس کیا ہے؟"

"جی ہاں"

"نوکری تو نہیں چاہتے؟"

"نوکری کہیں ملتی ہی نہیں۔"

یہ بھلے مانس کسی چھوٹے سے اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اور انھیں ایک اسسٹنٹ ماسٹر کی ضرورت تھی۔ اٹھارہ روپے تنخواہ پر مجھے ملازم رکھ لیا۔ اس وقت یہ اٹھارہ روپے میری یاس تمنا کی معراج تھے۔ میں دوسرے دن ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس حاضر ہونے کا وعدہ کر کے چلا تو پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ یہ ۱۸۹۹ء کی بات ہے میں گردوپیش کے حالات کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔ اور اگر ریاضی کی وجہ سے اٹک نہ جاتا تو ضرور آگے نکل جاتا مگر ریاضی نے سارے ارمان خاک میں ملا دیئے۔ ٹریننگ کے بعد انھیں ٹریننگ کالج ماڈل اسکول کا ہیڈ ماسٹر مقرر کر دیا گیا۔ کچھ دنوں پرتاب گڑھ گورنمنٹ ہائی اسکول سے بھی وابستہ رہے۔ ۱۹۰۵ء میں ان کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول کانپور کو ہو گیا[1]۔ ۱۹۰۹ء میں مہوبا ضلع ہمیر پور میں ڈسٹرکٹ بورڈ کے سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہو گئے[2]۔ جس انسپکٹری

---

[1] پریم چند کا تنقیدی مطالعہ ص۔ ۳۰۲-۳۰۳

[2] زمانہ پریم چند نمبر ص ۸۳

کو جن آرزوؤں اور تمناؤں کے بعد حاصل کیا تھا وہی اب جی کا جنجال ہو رہی ہے۔ میں بستی ہی میں تھا کہ مجھے پیچش پیدا ہو گئی۔ کانپور آ کر علاج کرایا۔ ایک بار مہینہ بھر الٰہ آباد میں ایورویدک اور ڈاکٹری دوائی کھاتا رہا۔ لیکن فائدہ نہ ہوا۔ تب میں نے اپنے تبادلہ کی درخواست کی چاہتا تو یہ تھا کہ روہیلکھنڈ میں تبدیل ہوں مگر پھینکا گیا بستی کے ضلع میں لیکن بستی آ کر پیچش اور بڑھ گئی۔ تب میں نے دورے کی ڈیوٹی (دسمبر ۱۹۱۵ء) چھوڑ کر بستی ہائی اسکول میں اسکول ماسٹری قبول کر لی۔

استعفا

یہاں سے تبدیل ہو کر (اگست ۱۹۱۶ء) گورکھپور پہنچا۔ یہ ۱۹۲۱ء کا واقعہ ہے ان دنوں تحریک عدم اشتراک عمل زوروں پر تھی۔ جلیانوالہ باغ کا واقعہ ہو چکا تھا۔ انہیں دنوں مہاتما گاندھی نے گورکھپور کا دورہ کیا۔ غازی میاں کے میدان میں اونچا پلیٹ فارم تیار کیا گیا۔ دو لاکھ سے کم کا مجمع نہ تھا۔ تمام ضلع کی عقیدت مند پبلک دوڑی آئی تھی۔ ایسا مجمع اس سے پہلے میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ مہاتما جی کے درشنوں کی یہ برکت تھی کہ میرے ایسے مردہ دل آدمی میں بھی جان آ گئی۔ اس کے دو ہی چار دن کے بعد میں نے اپنی بیس سال کی سرکاری ملازمت سے استعفا دے دیا۔[1]

جولائی ۱۹۲۱ء میں مارواڑی ودیالیہ میں صدر مدرس مقرر ہوئے۔ انتظامی امور میں اختلاف ہونے کی وجہ سے نو ماہ بعد مارچ ۱۹۲۲ء میں ملازمت سے استعفا دے دیا۔ اسی زمانہ میں ہندی ماہنامہ "مریادا" بنارس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ مریادا سے علیحدہ ہو کر کچھ دنوں بحیثیت محرر کام کیا۔[2] ۱۹۲۵ء میں "گنگا پستک مالا" میں ملازم ہو گئے۔ ۱۹۲۹ء میں نولکشور پریس کے مشہور ہندی ماہنامہ "مادھوری" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

صحافت

اخبار کا ایڈیٹر ہمیشہ کے قاعدوں کے مطابق قوم کا خادم ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے۔ قومی وسیع النظری سے اور جو کچھ سوچتا ہے اس پر بھی قومیت کی مہر لگی ہوتی ہے۔ ہمیشہ قومی خیالات کی وسیع فضا میں گھومتے رہنے سے شخصیت کا دائرہ اس کی نگاہوں میں بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ وہ شخصیت کو ہیچ، حقیر، اور ناقابل توجہ خیال کرنے لگتا ہے۔ شخصیت کو قومیت پر قربان کرنا اس کی روش کا مقدم ترین اقتضا ہے۔ حتیٰ کہ اکثر وہ اپنی غرض کو قوم پر نچھاور کر دیتا ہے اس کی زندگی کا مقصد عظیم اور اس کا معیار پاکیزہ ہوتا ہے۔ وہ ان زبردست شخصیتوں کا معتقد ہوتا ہے۔ جنھوں نے قوموں کو بنایا اور سنوارا ہے۔ جن کا نام امر ہو گیا ہے۔ جو مظلوم قوموں کے لیے نجات دہندہ ثابت ہو چکی ہیں۔ وہ حتی الامکان کوئی کام ایسا نہیں کرتا۔ جس سے اس کے پیشروؤں کی چمکتی ہوئی شہرت میں داغ لگ جانے کا اندیشہ ہو۔

اب میں سرکاری اخبار نویس کیا ہوں گا۔ جنگ کے متعلق مضامین لکھنے کی بھی اس وقت مجھے فرصت نہیں ہے۔ بس اسی اپنی رفتار قدیم پر رہوں گا۔ کسی پرائیویٹ اسکول کی ہیڈ ماسٹری اور ایک اچھے اخبار کی ایڈیٹری اور کچھ پبلک کام یہی میری

---

[1] پریم چند نے گورکھپور سے بذریعہ کارڈ مورخہ ۱۵ر فروری ۱۹۲۱ء دیا نرائن نگم کو اطلاع دی تھی کہ کل سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو گیا۔ آج استعفا منظور ہو گیا (تنخواہ ۱۲۵/- روپے ماہوار تھی)

[2] پریم چند کا تنقیدی مطالعہ/۵۲

مزاج زندگی ہے۔ اخبار بھی کسانوں کا حامی اور مددگار ہو۔ اگر کمال اسے کر کیفیت نہیں گزرتا تو کیا ہوا پھر بھی دل میں کمال سے کام کرتا رہا قلم ہی میری کمال ہے[1]۔ افسوس ہے کہ میرا کوئی بھی اخبار خود کفیل نہیں ہوا۔ "ہنس" پر کچھ زیادہ خرچ نہیں ہوتا۔ لیکن "جاگرن" کراہ رہا ہے۔ ان حالات سے کیسے چھٹکارا حاصل ہو۔ یہی سوچ کر پریشان رہتا ہوں۔ ہر مہینے تقریباً دو سو روپے کا خسارہ رہتا ہے۔ میں کب تک برداشت کروں گا۔ ایک مرتبہ جاری کر کے بند کر دینا دانش مندی معلوم نہیں ہوتی۔ لوگ کیا کیا باتیں بنائیں گے۔ ہنسیں گے۔ اگر مجھ میں انہیں بند کر دینے کی ہمت ہوتی تو میں اس پریشانی سے بچ جاتا۔ لیکن میں ہمت پیدا بھی نہیں کر سکتا۔

بمبئی سے آکر اپنے تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گیا۔ (۱۹۳۶ء) میرا ماہواری رسالہ "ہنس" تو نکلتا ہی تھا۔ اس کا مقصد مندرجہ بالا عنوان سے واضح ہو جائے گا۔ یعنی وہ ہندی رسم الخط کے ذریعے ہندوستان کی سبھی زبانوں کی ادبیات سے بہترین مواد فراہم کر کے پبلک کو دے گا۔ اور اس طرح قومی ادب کی بنیاد ڈالے گا۔ جس میں ہر ایک زبان کے مصنف اور ادیب موجود ہوں گے۔ فی الحال ایک زبان والوں کو دوسری زبان سے ایک بیگانگی سی ہوتی ہے۔ بنگلہ والوں کو گجراتی کی کچھ خبر نہیں اور مرہٹوں کو بنگلہ کی کچھ خبر ہوتی ہے۔ صوبجاتی ادبیات میں کیا کیا جواہر بھرے ہوئے ہیں۔ اور روز بروز پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں۔ "ہنس" نے یہ خدمت اپنے ذمہ لی ہے۔ اس میں تلگو۔ کناڈی۔ گجراتی۔ بنگلہ۔ مرہٹی۔ اردو۔ ملیالم وغیرہ زبانوں کے باکمالوں کے تخلیقی کارنامے رہتے ہیں۔ اور کوشش کی جاتی ہے کہ سبھی زبانوں کے ادیبوں سے ہم واقف ہو جائیں۔ زبان کی حدود کے باعث کسی باکمال بزرگ کی ادبیات سے فیض اٹھانے سے ہم کیوں محروم رہیں۔ اردو کے لیے بھی ایک حصہ وقف ہے پہلے نمبر کے لیے ہم نے ڈاکٹر اقبال و ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب۔ اور سید محی الدین قادری صاحب زور کے مضامین شائع کیے ہیں۔ میں یہ تفصیل اس لیے دے رہا ہوں کہ میں بمبئی سے آکر بیکار نہیں بیٹھا اور تضیع اوقات نہیں کر رہا ہوں۔

اردو میں اچھے رسالوں کا قائم رہنا غیر ممکن ہو گیا ہے۔ معلوم نہیں اس کا باعث کیا ہے۔ اردو پڑھنے والوں کی تعداد کم نہیں ہے۔ مگر غالباً سب مفت کے پڑھنے والے ہیں۔ سب کا دعویٰ ناول نگاری کا ہے۔ سبھی اہل قلم ہیں۔ پڑھنے والا کوئی نہیں ہے۔ اگر ہمیں اپنی لاج رکھنی ہے تو اپنے لٹریچر کو فروغ دینا پڑے گا۔ اور چاہے یہ کام افراد کریں یا مجموعہ افراد، مگر اسے کاروباری اصول پر کیے بغیر استحکام نہیں ہو سکتا[2]۔

"ہنس" سے تو میرا تعلق ٹوٹ گیا۔ مفت کی سر مغزی، ہندیوں کے ساتھ کام کر کے شکریے کی جگہ یہ صلہ ملا کہ تم نے "ہنس" میں زیادہ روپیہ صرف کر دیا۔ اس کے لیے میں نے دل و جان سے کام کیا۔ بالکل اکیلا۔ اپنے وقت اور محنت کا کتنا خون کیا۔ اس کا کسی نے لحاظ نہ کیا۔ میں نے "ہنس" ان لوگوں کو اس خیال سے دیا تھا کہ وہ میرے پریس میں چھپتا رہے گا

---

[1] پریم چند نے جنوری ۱۹۳۰ء میں ہندی ماہ نامہ "ہنس" جاری کیا اور اگست ۱۹۳۲ء میں انھوں نے جاگرن ہندی ہفتہ وار کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی تھی۔

[2] رسالہ ہنس جون ۱۹۳۰ء میں بند ہو گیا تھا، جنوری ۱۹۳۱ء میں دوبارہ جاری ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں اس کا انتظام ہندی ساہتیہ پریشد نے سنبھال لیا۔ (مرتب)

اور مجھے پریس کی طرف سے گو نہ بے فکری رہے گی۔ لیکن اب دہلی میں سستا ساہتیہ منڈل کی طرف سے نکلے گا اور اس تبادلے میں پریشد کی اندازاً پچاس روپے مہینے کی بچت ہو جائے گی۔ میں بھی خوش ہوں۔ جس لٹریچر کی اشاعت کر رہا تھا وہ ہمارا لٹریچر نہیں ہے وہ تو وہی بھگتی والا مہاجنی لٹریچر ہے۔ جو ہندی زبان میں کافی ہے۔

فلم

بمبئی کی ایک فلم کمپنی مجھے بلا رہی ہے۔ تنخواہ کی بات نہیں ٹھیکے کی بات ہے۔ آٹھ ہزار روپیہ سالانہ پر۔ میں اس حالت پر پہنچ گیا ہوں جب مجھ کو اس کے سوائے کوئی چارہ نہیں رہ گیا ہے کہ یا تو وہاں چلا جاؤں یا اپنے ناول کو بازار میں بیچوں (اجنتا سینے ٹون کمپنی والے حاضری کی کوئی قید نہیں رکھتے۔ میں جو چاہوں لکھوں جہاں چاہے چلا جاؤں۔ وہاں سال بھر رہنے کے بعد ایسا کنٹریکٹ کروں گا کہ یہیں (بنارس میں) بیٹھے بیٹھے میں چار کہانیاں لکھ دیا کروں اور چار پانچ ہزار روپے مل جایا کریں۔ جس سے "جاگرن" اور "ہنس" دونوں مزے میں چلیں گے اور مجھے پیسے کی تکلیف جاتی رہے گی۔

میں یکم جون (۱۹۳۴ء) کو بمبئی چلا آیا۔ اس کمپنی سے معاہدہ کر لیا۔ سال بھر میں چھ قصے اسے دینا ہوں گے۔ رسالوں سے متواتر نقصانات ہو رہے تھے۔ بک سیلروں سے روپے وصول نہ ہوتے تھے۔ کاغذ وغیرہ کا بار بڑھتا جاتا تھا۔ مجبور ہو کر یہ معاہدہ کر لیا۔ چھ قصے لکھنا مشکل نہیں۔ وہاں ڈائرکٹروں کے مشورے سے لکھنا ضروری ہے۔ کہ کیا چیز فلم کے لیے موزوں ہو گی۔ اس کا بہترین فیصلہ وہی کر سکتے ہیں ——

مگر میں جن ارادوں سے یہاں (بمبئی) آیا تھا ان میں سے ایک بھی پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ یہ پروڈیوسر جس طرح کی کہانیاں بناتے رہے ہیں اس لیک سے ذرا بھر نہیں ہٹ سکتے۔ رکیک مذاق کو یہ لوگ تماشے کی جان سمجھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ انوکھا ہے۔ راجہ رانی وزیروں کی سازشیں، نقلی لڑائیاں، بوسہ بازی یہی ان کے مقصد ہیں۔ میں نے سماجی کہانیاں لکھی ہیں جنہیں تعلیم یافتہ طبقہ بھی دیکھنا چاہتا ہے لیکن ان کو فلم کرتے وقت شبہ ہوتا ہے کہ چلیں یا نہ چلیں۔ اگر مولانا ابو الکلام مکالمے لکھیں تو قصوں میں جان پڑ جائے مگر آپ تو جانتے ہیں فلم کی قدر و درجہ تھرڈ کے تماشائیوں پر ہے اور یہ اچھے مکالمے کی قدر نہیں کر سکتے۔ مگر خیر یہ لوگ قدر نہ کریں سمجھنے والے تو کرتے ہیں۔ بازار حسن کی مٹی پلید کر دی" "مل مزدور" البتہ کچھ اچھی رہی۔ یہ سال (۱۹۳۴ء) تو پورا کرنا ہی ہے۔ قرضدار ہو گیا تھا قرض پٹ جائے گا۔ مگر اور کوئی فائدہ نہیں۔ اپنے پرانے اڈے پر جا بیٹھوں گا وہاں دولت نہیں ہے۔ مگر سکون قلب ضرور ہے۔ یہاں تو معلوم ہوتا ہے زندگی برباد کر رہا ہوں۔

سینما کے ذریعہ مغرب کی ساری بیہودگیاں ہمارے اندر داخل کی جا رہی ہیں اور ہم بے بس ہیں۔ پبلک میں تنظیم نہیں نہ نیک و بد کا امتیاز ہے۔ آپ اخباروں میں کتنا ہی فریاد کیجئے وہ بیکار ہے اور اخبار والے بھی تو صاف گوئی سے کام نہیں لیتے۔ جب ایکٹریسوں اور ایکٹروں کی تصویریں دھڑا دھڑ چھپیں اور ان کے کمال کے قصیدے گائے جائیں تو کیوں نہ ہمارے نوجوانوں پر اس کا اثر ہو۔ سائنس ایک برکت ایزدی ہے۔ مگر نا اہلوں کے ہاتھوں میں پڑ کر لعنت ہو رہا ہے۔ جن ہاتھوں میں فلم کی قسمت ہے وہ بدقسمتی سے اسے انڈسٹری سمجھ بیٹھے ہیں۔ انڈسٹری کو مذاق اور اصلاح سے کیا نسبت وہ ایکسپلائٹ EXPLOIT کر رہی ہے۔ برہنہ اور نیم برہنہ تصاویر، رقص، خون اور جبر کی وارداتیں۔ مار پیٹ۔ غصہ اور غضب اور نفسانیت یہی اس انڈسٹری کے اوزار ہیں اور اسی سے وہ انسانیت کا خون کر رہی ہے۔

میں بمبئی میں زندگی سے تنگ آ گیا۔ یہاں کی آب و ہوا اور فضا دونوں ہی میرے موافق نہیں۔ ہم مذاق آدمی نہیں ملتا۔ محض زندگی میں ایک نیا تجربہ حاصل کرنے کی غرض سے بمبئی آیا تھا۔ میری کمپنی کی تصاویر ایک بھی مقبول نہ ہو سکیں۔ اور ادھر ایکٹروں کے مستعفی ہو جانے سے اور بھی نقصانات ہوئے چنانچہ ان کے آزمودہ کار ایکٹر مثلاً جے راج۔ ببو۔ تارا بائی وغیرہ کنارہ کش ہو گئے۔ سینما میں کسی اصلاح کی توقع کرنا بیکار ہے۔ یہ صنعت بھی اسی طرح سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے جیسے شراب فروشی۔ انھیں اس سے بحث نہیں کہ پبلک کے مذاق پر کیا اثر پڑتا ہے انھیں تو اپنے پیسے سے مطلب۔ برہنہ رقص۔ بوسہ بازی اور مردوں کا عورتوں پر حملہ۔ یہ سب ان کی نظروں میں جائز ہے۔ پبلک کا مذاق اتنا گر گیا کہ جب تک یہ مخرب اور حیا سوز نظارے نہ ہوں اس تصویر میں مزا نہیں آتا۔ مذاق کی اصلاح کا بیڑا کون اٹھائے۔ میرے خیال میں شریف خواتین کا فلم سازی میں حصہ لینا ہرگز درست نہیں کیونکہ نگار خانوں کی فضا اُن کے لیے راس نہیں آ سکتی اور نہ آئندہ اس میں کسی قسم کی اصلاح ممکن ہے۔ سینما کی بدولت ہمارے نوجوانوں پر جو برے اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ ان اخبارات کی بدولت اُس میں دن بدن ترقی ہو رہی ہے۔

میرا تصفیہ ہو گیا۔ ۲۵ر تاریخ (مارچ ۱۹۳۵ء) کو اپنے وطن بنارس جا رہا ہوں۔ اجنتا کمپنی اپنا کاروبار بند کر رہی ہے۔ میرا کنٹریکٹ تو سال بھر کا تھا اور ابھی تین مہینے باقی ہیں۔ لیکن میں ان کی زیر باری میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔ محض اس لیے رکا ہوا ہوں کہ فروری مارچ کی رقم وصول ہو جائے۔ اور جا کر پھر اپنے لٹریری کام میں مصروف ہو جاؤں۔ آج کل میری صحت نہایت کمزور ہو رہی ہے۔ لکھنا پڑھنا ترک کر دیا ہے۔ ایک ادبی انسان کے لیے سینما میں کوئی گنجائش نہیں ہے میں اس لائن میں اس لیے آیا کہ مجھے اس میں مالی نقطۂ نظر سے آزاد ہونے کے کچھ امکانات نظر آئے۔ لیکن اب میں دیکھتا ہوں کہ میں دھوکے میں تھا اور میں پھر ادب کی طرف لوٹ رہا ہوں۔

ادب شاعری اور دوسرے فنون کا مقصد ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ آدمی میں جو بہیمیت ہے اُسے مٹا کر اُس کے ملکوتی صفات کو جگایا جائے اُس کے ادنیٰ جذبات کو دبا کر یا مٹا کر لطیف، نرم و نازک اور پاکیزہ جذبات کو بیدار کیا جائے۔ اگر سینما اسی آدرش کو سامنے رکھ کر تصویریں پیش کرتا تو آج وہ دنیا کو آگے بڑھانے میں سب سے مؤثر طاقت ثابت ہوتا۔

جس زمانہ میں بمبئی میں کانگریس کا اجلاس تھا بیشتر سینما ہال خالی رہتے تھے اور ان دنوں جو تصویریں دکھائی گئیں اُن میں نقصان ہی رہا۔ اس کا سبب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ عوام کے بارے میں جو خیال ہے کہ وہ مار کاٹ اور سنسنی پیدا کرنے والی تصویروں کو ہی پسند کرتے ہیں محض وہم ہے۔ عوام محبت ایثار۔ اخوت اور انسانی ہمدردی کے جذبات سے بھری ہوئی فلمیں زیادہ شوق سے دیکھنا چاہتے ہیں مگر ہمارے سینما والوں نے پولیس والوں کی ذہنیت سے کام لے کر یہ سمجھ لیا ہے۔ کہ صرف بھدے مسخرے پن میں لڑائی اور زور آزمائی میں یا سو فٹ کی اونچی دیوار سے کودنے میں اور جھوٹ موٹ ٹین کی تلوار چلانے میں ہی جنتا کو آنند آتا ہے۔ اور کچھ تھوڑی سی بوس رانی اور بوس و کنار تو گویا سینما کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا جسم کے لیے آنکھیں۔ بے شک عوام شجاعت اور جوانمردی دیکھنا چاہتے ہیں۔ عشق و محبت کے مناظر بھی ان کے لیے خاص کشش رکھتے ہیں۔ لیکن یہ خیال کہ آلنگن اور بوس و کنار کے بغیر محبت کا اظہار ہو ہی نہیں سکتا۔ اور صرف نقلی تلوار چلانا ہی جوانمردی ہے اور بغیر کسی ضرورت کے گیتوں کا لانا خوش ذوقی کا تقاضا ہے یا تشدد اور جبر و اذیت سے عوام کو تسکین حاصل ہوتی ہے نفسیات کی بالکل غلط تعبیر ہے۔

گرگھوں کا کام

پونتا راجی کا دیہات میں ایک مکان تھا ہم اور وہ دونوں (سنہ ۱۹۲ء میں) وہاں چلے گئے اور چرخے چلانے لگے۔ میں قربانی کو اپنی ذات تک رکھنا چاہتا ہوں۔ عیال کو اس چکی میں پیسنا نہیں چاہتا فی الحال روٹیاں مل جاتی ہیں۔ کچھ لٹریری کام کر لیتا ہوں۔ یہ قربانی ہے۔ خدا اور دُنیا نے دونوں (قوم اور ذات دونوں) کو ساتھ لیے ہوں۔ میں لٹریری کام کو تھوڑی قربانی نہیں سمجھتا جو شخص اپنی فاضل آمدنی کا ایک حصہ کسی مدرسے کے لیے خیرات کر دیتا ہے۔ وہ ہماری قربانی کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔ جو اپنے لیے سونا تک حرام کر لیتی ہے۔ میرے لیے کوئی ایسی تجویز نہیں جس میں فکرِ معاش سے آزاد ہو کر میں زندگی کاٹتا۔ اس سے زیادہ نفس کشی میرے امکان سے باہر ہے۔ آکاشی معاش سے مجھے اطمینان نہیں ہوتا۔ ضروریات کے لیے مستقل صورت چاہیے۔ تکلفات کے لیے اکاشی صورت ہو تو مضائقہ نہیں۔ اخباری زندگی میں کس قدر جھنجھٹ ہے۔ ابھی ہمارے یہاں وہ زمانہ نہیں آیا کہ جرنلزم کو CAREEV بنایا جا سکے۔

پریس

میں نے کلکتہ کے ایک ہندی پریس میں شرکت کر لی۔ گیارہ آنے میرے ایک دوست کا پانچ آنے میرا۔ میرا ارادہ بنارس میں ایک لیتھو پریس رکھنے کا ہے (۱۹۲۳ء) لوگ کہتے ہیں چل نہیں سکتا۔ لیکن ایک بار کوشش کر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میری کتابیں نکلنے کے لیے تیار ہو رہی ہیں۔ پریم پچیسی ختم ہو گئی۔ گوشۂ عافیت۔ محض اس لیے نا تمام ہے کہ کوئی پبلشر نہیں ہے۔ جب تک یہ کتابیں تیار ہوں غالباً میرا نیا ناول تیار ہو جائے گا۔

جس توجہ سے (پریس میں) کام کرنا چاہیے وہ نہ دے سکا۔ مگر یہ لٹریری کام کرتا ہی ہوں۔ اس کام کو تفریح کے طور پر کرتا رہا مگر تفریح خرچ کی چیز ہے۔ تجارت دل و جان دونوں چاہتی ہے۔ پریس (سرسوتی پریس) کے جنجال سے کسی طرح رہائی نہیں ہوتی۔ اب تک (۱۹۳۵ء) پندرہ ہزار کا نقصان ہو چکا ہے۔ مگر کیا کروں گلے میں جو ڈھول پڑ گیا ہے۔ اُسے بجائے جاتا ہوں۔ اگر بیچ میں بمبئی نہ چلا جاتا تو شاید اب تک پریس بند ہو گیا ہوتا۔ بہت اچھا ہوتا۔ لیکن انسان ہوس کا پتلا ہے۔ نقصان اور پریشانی اُٹھا رہا ہوں۔

میری صحت

میں (سنہ ۱۹۰۰ء) میرپور بی میں تھا۔ کہ مجھے پیچش پیدا ہو گئی۔ گرمی کے دنوں میں یہاں کوئی سبز ترکاری نہ ملتی تھی۔ ایک بار کئی دن لگاتار خشک اردی کھانا پڑی ایک روز پیٹ میں ایسا درد ہوا کہ تمام دن مچھلی کی طرح تڑپتا رہا۔ چورن کھایا۔ پیٹ پر گرم بوتل پھیری۔ جامن کا عرق پیا۔ غرض دیہات میں جتنی دوائیں مل سکتی تھیں سب کھائیں۔ لیکن درد کم نہ ہوا۔ دوسرے دن پیچش ہو گئی۔ لیکن درد جاتا رہا۔ اس طرح ایک مہینہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد میں ایک قصبے پہنچا تو وہاں کے تھانہ دار صاحب نے مجھے تھانے ہی میں ٹھہرنے اور کھانے کو کہا۔ کئی دن سے مونگ کی دال کھاتے کھاتے اور پرہیز کرتے کرتے پریشان ہو گیا تھا۔ سوچا کیا ہرج ہے۔ آج یہیں ٹھہر جاؤ۔ کھانا تو لذیذ ملے گا۔ تھانے ہی میں اڈا جما دیا۔ داروغہ جی نے زمین قند پکوایا۔ پکوڑیاں۔ دہی بڑے پلاؤ۔ سب کچھ بنوایا۔ میں نے بھی خاص طور پر کھایا۔ لیکن کھا پی کر جب تھانے میں داروغہ کے پیروں کے بنگلے میں لیٹا تو دو ڈھائی گھنٹے کے بعد پھر پیٹ میں درد ہونے لگا۔ ساری رات اور اگلے دن بھر کراہتا رہا۔ سونٹھ کی دو خوراکیں پینے کے بعد تب کہیں جا کر چین ملا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ تمام زمین قند کی خرابی ہے۔ تب سے اردی اور زمین قند دونوں کی صورت دیکھ کر کانپ جاتا ہوں۔ درد تو خیر جاتا رہا لیکن پیچش کی دائمی شکایت ہو گئی۔ ٹہلنے جاتا۔ کسرت کرتا۔ پرہیزی کھانا کھاتا۔ اور کوئی نہ کوئی دوا بھی کھایا کرتا۔ لیکن پیچش میں کوئی کمی نہ ہوتی اور

بدن بھی سوکھا جاتا تھا۔ کئی مرتبہ کانپور آ کر علاج کرایا۔ ایک بار مہینہ بھر الہ آباد میں آیورویدک اور ڈاکٹری دوائیں کھاتا رہا۔ لیکن فائدہ نہ ہوا۔

تب میں نے اپنے تبادلہ کی درخواست کی۔ چاہتا تو یہ تھا کہ روہیلکھنڈ میں تبدیل ہوں مگر پٹکا گیا۔ بستی کے ضلع میں، اور وہ حلقہ ملا جو نیپال کے قریب ہے۔ میں عاجز ہوں ماتحتی سے۔ کام ایسا کرنا چاہتا ہوں، جس میں بجز میری طبیعت کے اور کسی کا تقاضا نہ ہو۔ جی میں آئے تو رات دن کام کرتا رہوں، اور جی چاہے تو آرام کروں مگر یہ صرف مالکانہ حیثیت سے ہو سکتا ہے۔ خوش قسمتی سے یہاں (بستی) میرا تعارف پنڈت منن دویدی گجپوری سے ہوا۔ جو ڈمریا گنج میں تحصیلدار تھے۔ ان کے ساتھ اکثر علمی مسائل پر بات چیت ہوتی رہی۔ لیکن بستی آ کر پیچش اور بڑھ گئی۔ تب میں نے چھ مہینے کی چھٹی لی اور لکھنؤ کے میڈیکل کالج میں علاج کرایا۔ یہاں فائدہ نہ ہوا۔ تو بنارس کے ایک حکیم کا علاج کیا۔ تین چار مہینے کے بعد تھوڑا فائدہ معلوم ہوا۔ لیکن بیماری جڑ سے نہ گئی۔ رخصت کے بعد جب پھر بستی پہنچا تو وہی حالت ہو گئی۔

پوت داری جی کے مشورے سے میں نے پانی کا علاج شروع کیا۔ لیکن تین چار مہینے کے غسل اور پرہیز کا الٹا اثر یہ ہوا کہ میرا پیٹ بڑھ گیا۔ اور مجھے پیدل چلنے میں تکلیف محسوس ہونے لگی۔ ایک مرتبہ کئی دوستوں کے ساتھ مجھے ایک زینہ پر چڑھنا پڑا۔ اور لوگ تو دھڑا دھڑ چڑھ گئے مگر میرے پاؤں اٹھتے ہی نہ تھے۔ بڑی مشکل سے ہاتھوں کا سہارا لیتے ہوئے اوپر پہنچا۔ اسی دن مجھے اپنی کمزوری کا احساس ہوا۔ سمجھ گیا کہ اب تھوڑے دنوں کا مہمان اور ہوں۔ پانی کا علاج بند کر دیا۔ میرے لیے بڑھاپے کا ذکر فضول ہے۔ میں کس بڈھے سے کم ہوں۔ مگر موت کی فکر مارے ڈالتی ہے۔ کتنا چاہتا ہوں، پرماتما پر بھروسہ رکھوں مگر دل موذی ہے۔ سمجھتا نہیں۔ کسی مہاتما کی صحبت ملے تو شاید راستہ پر آئے۔ یہی فکر ہے کہ آج مر جاؤں تو ان بال بچوں کا کون پرسان حال ہوگا۔ گھر میں کوئی ایسا نہیں۔

ایک دن شام کے وقت اردو بازار میں شری یت دشرتھ پرشاد جی دویدی ایڈیٹر سودیش سے ملاقات ہو گئی۔ کبھی کبھی ان سے لٹریچر کا تذکرہ ہوتا رہتا تھا۔ انھوں نے میری زرد صورت دیکھ کر کہا "بابو جی آپ تو بالکل ہی پیلے پڑ گئے ہیں۔ اس کا علاج کیجیے۔" مجھے اس کی آرزو ہے کہ کوئی مجھے نیک رہبر ملے۔ اپنی بیماری کا ذکر برا لگتا تھا۔ میں اپنی بیماری کو بھول جانا چاہتا تھا۔ زندگی کو بامزہ بنانے کے لیے صرف ایک تدبیر ہے خود فراموشی۔ جو ایک لمحے کے لیے مجھے دنیاوی تفکرات سے چھٹکارا دے۔ میں اپنے گرد و پیش کے حالات کو بھول جاؤں۔ اپنے کو بھول جاؤں، ذرا ہنسوں، ذرا قہقہے لگاؤں، ذرا دل میں تازگی پیدا ہو۔ جب دو ہی چار مہینے کی زندگی ہے تو پھر کیوں نہ ہنستے ہوئے مروں۔ میں نے چڑھ کر کہا "مر ہی تو جاؤں گا۔ بھلا یا اور کچھ؟" "میں موت کے خیر مقدم کو تیار ہوں۔" بیچارے دویدی جی نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ بعد کو مجھے بھی اپنی اس تلخ گفتاری پر بڑا افسوس ہوا۔ اب دیہات میں کچھ کام کرنے کی طبیعت ہوئی۔ ایک ہی ہفتہ بعد میری پیچش کم ہو گئی۔ یہاں تک کہ ایک مہینے کے اندر بالکل صحت ہو گئی مگر اس کے بعد ہی بنارس چلا آیا۔ غلامی سے نجات پاتے ہی دس سال کے پرانے مرض سے چھٹکارا پا گیا۔ انسان کا بس ہو تو کہیں دیہات میں جا بسے دو چار جانور پال لے اور زندگی کو دیہاتیوں کی خدمت میں گزار دے۔

اخلاق و عادات

میں بند کالر کا کوٹ اور سیدھا پاجامہ پہنتا ہوں اور پگڑی باندھتا ہوں —— ایسے مواقع بھی آئے جب مجھے دوستوں کی خاطر اپنے اوپر انتہائی جبر کرنے پڑے ہیں لیکن میں نے اپنی اصلی حالت کو ان پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اور انھیں یہ بھرم رہا کہ میں کوئی متمول آدمی ہوں۔ فضول خرچی سے مجھے آشنائی نہیں لیکن تمول کا اظہار مجھے پنپنے نہیں دیتا۔

انسان کا دل لاکھ کی مانند ہے۔ اس کے نشانات مٹانا یوں تو ممکن ہے اسے گرم کر کے ہم اس کی جگہ نئے نشانات مرتسم کر سکتے ہیں۔ نوجوانی اور زندہ دلی کا تعلق مزاج سے ہے۔ بہت سے نوجوان ہیں جو مزاج کے اعتبار سے مجھ سے زیادہ بڈھے ہو گئے ہیں۔ اور بہت سے مسن لوگ ہیں جو خیالات کے لحاظ سے مجھ سے بھی کہیں زیادہ نوجوان ہیں۔ لیکن ان کو یہی خیال ہے کہ اس اعتبار سے میری نوجوانی روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔ میں عقبیٰ کا معتقد نہیں۔ اس لیے آخرت کا خیال جو انسان کی نوجوانی کے لیے سب سے زیادہ مہلک ہے۔ مجھے کبھی ستاتا ہی نہیں۔ مذہب کو توڑنے کے لیے عقل اتنی ہی بیکار ہے جتنا بیگن کو توڑنے کے لیے سونار کا کانٹا۔ یا تو مذہب کی روشنی اتنی تیز ہے کہ عقل کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ یا پھر اس میں ایسی زبردست تاریکی ہے کہ عقل کو کچھ نظر ہی نہیں پڑتا۔ جوانی بھی دو طرح کی ہوتی ہے ایک صحت بخش اور دوسری جنوں انگیز۔ صحت بخش جوانی کا خاصہ یہ ہے کہ انسان خطرناک غاروں سے بچتا ہوا ایک ترقی پذیر اور پُر امید راستہ اختیار کرے۔ جنوں انگیز شباب میں آدمی اندھا رہتا ہے۔ اور اپنی قابلیت کے متعلق مبالغہ آمیز خیالات رکھتا ہے اور اپنے ارمانوں کی تکمیل کے شاندار خواب دیکھا کرتا ہے۔ میں بھی کبھی خواب دیکھتا ہوں اور بعض اوقات عاقبت اندیشی بھی کر بیٹھتا ہوں مگر افراط و تفریط سے بچا رہتا ہوں۔ اس لیے جوانی کے بہتر حصے ہی سے فائدہ اٹھاتا ہوں اور اب یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ قناعت کی گھریلو زندگی دنیا کی بہترین نعمت ہے۔ علم و ذہانت فہم و فراست اور دیگر ذہنی اور روحانی اوصاف کو ہوس پرستی اور زر پرستی کا مقدمہ نہیں بنا دینا چاہیے۔

میری آمدنی

میری آمدنی کا کچھ نہ پوچھیے۔ تمام ابتدائی کتابوں کا حق طباعت پبلشرز کو دے دیا۔ سیوا سدن۔ پریم آشرم بہت مرجع سنگرام کے لیے ہندی پستک ایجنسی نے یک مشت تین ہزار روپے دیئے تھے اور نرملا کے لیے شاید اب تک دو سو روپے ملے ہیں۔ دولارے لال جی نے رنگ بھومی کے لیے اٹھارہ سو روپے دیئے تھے اور دوسرے مجموعوں کے لیے سو دو سو روپے مل گئے ہوں گے۔ کایا کلپ۔ آزاد کتھا۔ پریم پرتما۔ پرتگیاں۔ میں نے خود چھاپیں۔ لیکن ابھی تک مشکل سے چھ سو روپے وصول ہوئے ہیں۔ تصانیف سے متفرق آمدنی پچیس روپے ماہوار ہو جاتی ہے۔ مگر کبھی کبھی اتنی بھی نہیں۔ اور ترجموں میں شاید دو ہزار سے زائد نہیں ملا۔ آٹھ سو روپے میں رنگ بھومی اور پریم آشرم دونوں کے ترجموں کا معاملہ ہو گیا۔

ناول

”ہم خرما و ہم ثواب“ ”کشنا“ وغیرہ میری ابتدائی تصانیف ہیں۔ پہلی کتاب تو لکھنؤ کے نول پریس نے شائع کی تھی دوسری کتاب بنارس کے میڈیکل ہال پریس نے۔ یہ غالباً ۱۹۰۴ء کی تصانیف ہیں۔ ۱۹۰۷ء میں ایک ہندی ناول پریما لکھ کر انڈین پریس سے شائع کرایا۔ ۱۹۱۲ء میں جلوۂ ایثار لکھا۔ پھر دار جی کی صلاح سے میں نے ”بازار حسن“ ”سیوا سدن“ نامی ناول لکھا۔ ۱۹۱۶ء میں سیوا سدن کی جو قدر و منزلت ہوئی اس سے میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی اور میں نے دوسرا ناول پریم آشرم ”گوشۂ عافیت“ لکھا۔ رنگ بھومی، کایا کلپ چاروں ناول دو دو سال کے وقفہ کے بعد نکلے۔ بازار حسن میری ڈیڑھ سال کی محنت اور خامہ فرسائی کا نتیجہ ہے۔ ہندی میں ترجمے پانچ سو ملے اور ہندی ناول نے خوب شہرت حاصل کی۔ اکثر نقادوں نے اُسے ہندی زبان کا بہترین ناول کہا ہے۔ یہ بازار حسن کا ترجمہ ہے۔ مجھے ابھی تک یہ اطمینان نہیں ہوا کہ کونسا طرز تحریر اختیار کروں۔ کبھی تو بنکم کی نقل کرتا ہوں کبھی آزاد کے پیچھے چلتا ہوں۔ آج کل کاؤنٹ ٹالسٹائی کے قصے پڑھ چکا ہوں۔ تب سے کچھ اسی رنگ کی طرف طبیعت مائل ہے۔ یہ اپنی کمزوری ہے۔

الہ آباد میں ایک برہمن پارٹی ہے۔ اُپادھیائے جی اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں اور اوٹ پٹانگ باتیں کہہ کر مجھے بدنام

کرتے ہیں۔ رنگ بھومی اور "ونیٹی فیر" میں ذرہ بھر بھی مناسبت نہیں ہے اور پریم آشرم (گوشۂ عافیت) کو RESURRECTION کے مماثل بتلانا تو صریحاً بے جا ہی ہے۔ میں نے آج تک ریسرکشن پڑھا ہی نہیں۔ حالانکہ اس کی تعریف بہت سن چکا ہوں۔ ایسی مماثلت جیسی آپ یا دوسرے ہی دکھلاتے ہیں قریب قریب سبھی کتابوں میں ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ونیٹی فیر میں ایک ایسا غلط سلط انگریزی بولتا ہے اس سے رنگ بھومی میں ایک بنگالی بابو لانے لگے۔ اس شخص کو یہ بھی خبر نہیں کہ بنگالی بابو کیوں لائے گئے اس کے وجود کا منشا کیا ہے۔ اسی طرح آپ صوفیہ سے ملاتے ہیں۔ حالانکہ صوفیہ دراصل مسز ایبی بسنٹ ہیں۔

اس صوبے میں پبلشروں کا قحط ہے۔ دو ناولوں کے ترجمے دارالاشاعت پنجاب کو دیئے۔ پر وہ حضرات ابھی تک پبلشر نے نہیں چھپائی۔ خطوط لکھ چکا ہوں، روپیہ بھیجتا ہے نہ کتابیں، نہ جواب دیتا ہے۔ معلوم نہیں بیچارے کو کیا ہو گیا۔ ادھر میں نے ترجمہ بھی شروع کر دیا۔ مگر سرد بازاری جیسی یہاں ہو رہی ہے کتابوں کی کوئی پوچھ نہیں ہے۔ بک سیلروں کا تجربہ مجھے ہوا۔ میرے تین سو روپے دبا بیٹھا ہے۔ لاہور ہی میں ایک دوسرا پبلشر میرے سات سو روپے ہضم کر جاتا ہے۔ اخبارات کا یہ حال ہے۔ بک سیلروں کا یہ۔ بیچارہ مصنف کیا کرے۔ میری دو کتابیں جامعہ ملیہ کے اہتمام سے چھپ رہی ہیں۔ ایک کا نام میدان عمل، دوسری کا نام واردات ہے۔ تیسری زیر تصنیف ہے۔

اردو میں رسالے اور اخبارات تو بہت نکلتے ہیں شاید ضرورت سے زیادہ۔ اس لیے کہ مسلمان ایک تحریری قوم ہیں اور ہر تعلیم یافتہ شخص اپنے تئیں مصنف ہونے کے قابل سمجھتا ہے۔ لیکن پبلشروں کا بالکل قحط ہے۔ سارے قلمرو ہند میں ایک بھی ڈھنگ کا پبلشر موجود نہیں۔ بعض جو ہیں ان کا عدم اور وجود برابر ہے کیونکہ ان کی ساری کائنات چند ردی کے ناول ہیں جن سے ملک یا زبان کو کوئی فائدہ نہیں۔

میں ناول کو انسانی کردار کی مصوری سمجھتا ہوں۔ انسان کے کردار پر روشنی ڈالنا اور اس کے اسرار کو کھولنا ہی ناول کا بنیادی مقصد ہے۔ ہمارا کرداروں کا مطالعہ جتنا واضح اور وسیع ہو گا اتنی ہی کامیابی سے ہم کرداروں کی مصوری کر سکیں گے۔ انسانی فطرت نہ تو بالکل سیاہ ہوتی ہے اور نہ بالکل سفید۔ اس میں دونوں رنگوں کا عجیب اتصال ہوتا ہے۔ اگر گرد و پیش کے حالات اس کے موافق ہوئے تو فرشتہ بن جاتا ہے اور ناموافق ہوئے تو شیطان۔ وہ حالات مذکورہ کا محض ایک کھلونا ہوتا ہے۔

وہی ناول اعلیٰ درجہ کے سمجھے جاتے ہیں جن میں حقیقت اور آدرش آمیز ہو گئے ہوں۔ اسے آپ آدرش وادی یا حقیقت پسندی کہہ سکتے ہیں۔ چوگان ہستی کا ماخذ ایک اندھا بھکاری ہے جو ہمارے گاؤں میں رہتا تھا۔ بازار حسن تقریباً (۳۰۰) صفحات کا ہے۔ اس قصہ میں میں نے ایک اخلاقی بے شرمی یعنی بازار عصمت فروشی پر چوٹ کی ہے۔ کامیاب ناول نگار کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کے دل میں بھی ان ہی جذبات کو بیدار کر دے جو اس کے کرداروں میں رونما ہوں۔ پڑھنے والا بھول جائے کہ وہ کوئی ناول پڑھ رہا ہے۔ ایسے واقعات کی تخلیق کرنی ہوتی ہے جو ہمارا دل ہلا دیں جو ہمارے جذبات کی گہرائی تک پہنچ جائیں۔ اکثر احباب کو شکایت ہے کہ اصلاحی مقاصد میرے قصوں کو خراب کر دیتے ہیں۔ میرے نصف سے زائد قصے کسی نہ کسی تمدنی معاملے سے متعلق ہیں۔ بازار حسن، پریم آشرم، رنگ بھومی کوئی بھی اصلاح سے خالی نہیں۔

ناول نگار کے لیے ایک نوٹ بک رکھنا ضروری ہے اگرچہ راقم الحروف نے کبھی نوٹ بک نہیں رکھی لیکن اس کی ضرورت کا وہ اعتراف کرتا ہے۔

میرا ناول، گئودان، حال ہی میں نکلا ہے۔ ایک پبلشر کی تلاش کر رہا ہوں، مگر اُردو میں بہت ہوا تو ایک روپیہ فی صفحہ کوئی دے دیگا۔

افسانے

ہر بچے کو اپنے بچپن کی کہانیاں یاد ہوں گی جو اس نے اپنی والدہ یا بہن سے سنی تھیں۔ کہانیاں سننے کے لیے وہ کس قدر بیقرار رہتا تھا، کہانی شروع ہوتے ہی وہ کس انہماک سے اسے سنتا تھا۔ کتے اور بلیوں کی کہانیاں سن سن کر وہ کس قدر خوش ہوتا تھا۔ اسے وہ شاید کبھی نہیں بھول سکتا۔ عہد طفلی کی یادوں میں سب سے خوشگوار یاد شاید کہانی ہی ہے۔ کھلونے، مٹھائیاں اور کھیل تماشے تو تقریباً سبھی ذہن سے اتر جاتے ہیں، محض انہیں کہانیوں کی یاد ذہن میں باقی ہے۔

پہلے پہل سنہ ۱۹۰۷ء میں میں نے کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی کئی کہانیاں میں نے انگریزی میں پڑھی تھیں ان میں سے بعض کا ترجمہ کیا۔ میری پہلی کہانی کا نام تھا "دنیا کا سب سے انمول رتن" وہ سنہ ۱۹۰۷ء میں رسالہ 'زمانہ' میں چھپی۔ اس کے بعد میں نے زمانہ میں چار پانچ کہانیاں اور لکھیں۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں پانچ کہانیوں کا مجموعہ سوز وطن کے نام سے زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا۔ اس وقت ملک میں تقسیم بنگال کی شورش برپا تھی۔ اور کانگریس میں گرم دل کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ ان پانچوں کہانیوں میں حب وطن کا ترانہ گایا گیا تھا۔

اس وقت میں سررشتہ تعلیم میں سب انسپکٹر مدارس تھا اور ہمیر پور کے ضلع میں تعینات تھا۔ کتاب کو نکلے چھ مہینے ہو چکے تھے۔ ایک دن رات کو میں اپنے کیمپ میں بیٹھا ہوا تھا کہ کلکٹر صاحب کا پروانہ پہنچا کہ "فوراً آ کر مجھ سے ملو" جاڑے کا موسم تھا میں نے بیل گاڑی جتوائی اور راتوں رات تیس چالیس میل کا سفر طے کر کے دوسرے دن صاحب سے ملا۔ ان کے سامنے "سوز وطن" کی ایک جلد رکھی ہوئی تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا اس وقت "نواب رائے" کے نام سے لکھا کرتا تھا۔ مجھے اس کا کچھ کچھ پتہ مل چکا تھا۔ کہ خفیہ پولیس اس کتاب کے مصنف کی کھوج میں ہے۔ میں سمجھ گیا کہ ان لوگوں نے مجھے کھوج نکالا اور صاحب کلکٹر نے اس کی جوابدہی کے لیے مجھے بلایا ہے۔

صاحب نے مجھ سے پوچھا "کیا یہ کتاب تم نے لکھی ہے؟"

میں نے کہا "ہاں"

صاحب نے ایک کہانی کا مجھ سے مطلب پوچھا اور آخر میں بگڑ کر بولے "تمہاری کہانیوں میں سڈیشن بھرا ہوا ہے۔ اپنی تقدیر پر خوش ہو کہ انگریزی عملداری میں ہو۔ مغلوں کا راج ہوتا تو تمہارے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے جاتے۔ تمہاری کہانیاں یک رخی ہیں۔ تم نے انگریزی سرکار کی توہین کی ہے وغیرہ۔"

ان کے خیال میں وہ انقلاب انگیز تھا حالانکہ اس وقت سے اب تک مختلف رسالوں میں اس کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ آخر کار فیصلہ یہ ہوا کہ "سوز وطن" کی کل کاپیاں سرکار کے حوالے کر دوں اور آئندہ صاحب سے اجازت لیے بغیر کچھ نہ لکھوں۔ میں یہ سمجھا کہ چلو سستا چھوٹ گیا۔ خود ہی سوچا ایک سرکاری ملازم اور "سوز وطن" ایسی مسموم کتاب کا مصنف توبہ توبہ وہ تو اچھا ہوا کہ کتابوں پر بلا ٹل گئی ورنہ کیا عجیب تھا کہ مانڈلے کی ہوا کھانی پڑتی۔ کل ہزار کاپیاں چھپی تھیں۔ اور ابھی مشکل سے تین سو جلدیں فروخت ہو سکی تھیں۔ میں نے بقیہ سات سو کاپیاں زمانہ پریس

؎ پریم چند نے ایک جگہ لکھا ہے جب سوز وطن لکھنے کے بعد مجھے میرے ڈیپارٹمنٹ نے مضامین لکھنے سے مجبور کر دیا اور پابندیاں عاید کر دیں تو "میں نے بھی بابو دیا نرائن صاحب کے مشورے سے نواب رائے نام تجویز کر لیا۔"

سے منگا کر صاحب کی نذر کر دیں۔

میں بچا بلا ٹل گئی لیکن افسرانِ ضلع کی اس سے سیری نہ ہوئی چنانچہ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کلکٹر صاحب نے ضلع کے دوسرے افسروں سے بھی میرے بارے مشورہ کیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس، دو ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی انسپکٹر مدارس جن کا میں ماتحت تھا میری تقدیر کا فیصلہ کرنے بیٹھے۔ ایک ڈپٹی کلکٹر نے میری کہانیوں سے ثابت کیا کہ ان میں شروع سے لے کر آخر تک باغیانہ خیالات اور انقلاب انگیز جذبات کے سوا اور کچھ نہیں۔ محکمہ پولیس کے خداوند نے کہا کہ ایسا خطرناک آدمی سخت سزا کا مستحق ہے۔ ڈپٹی انسپکٹر صاحب کو مجھ سے بڑی محبت تھی۔ اس ڈر سے کہ کہیں معاملہ طول نہ پکڑ لے، انھوں نے کہا کہ وہ دوستانہ طریقہ پر میرے سیاسی خیالات کا پتہ لگا کر کمیٹی کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کریں گے۔ دراصل ان کا ارادہ تھا کہ مجھے سمجھا بجھا کر رپورٹ میں لکھ دیں کہ مصنف صرف قلم کا مرد ہے مگر سیاسی امور سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کمیٹی نے اس مشورے کو پسند کیا۔ حالانکہ پولیس کے خداوند اس وقت بھی پینترے بدلتے رہے۔

مگر کلکٹر صاحب نے ڈپٹی صاحب سے پوچھا: "آپ کو امید ہے کہ وہ اپنے دل کی باتیں آپ سے کہہ دے گا؟" ڈپٹی صاحب نے کہا۔ "ان سے میری گہری دوستی ہے۔" "آپ دوست بن کر اُس کے دل کی تھاہ لینا چاہتے ہیں۔ میں اسے کمینہ پن سمجھتا ہوں۔"

ڈپٹی صاحب اس جواب کے لیے تیار نہ تھے۔ صاحب کی باتوں سے مرعوب ہو کر بولے "میں تو حضور کے حکم ...." مگر صاحب نے بیچ ہی میں بات کاٹ دی، "نہیں یہ میرا حکم نہیں ہے۔ میں ایسا حکم نہیں دینا چاہتا۔ اگر کتاب سے سڈیشن ثابت ہوتا ہو تو مصنف پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے ورنہ تنبیہ کر کے چھوڑ دیجیے۔ منہ میں رام اور بغل میں چھری مجھے پسند نہیں۔"

جب کئی دن بعد یہ واقعہ ڈپٹی صاحب نے مجھ سے بیان کیا تو میں نے پوچھا "کیا آپ سچ مچ میری مخبری کرتے؟" وہ ہنس کر بولے۔ "نہیں بیٹا ممکن تھا کوئی لاکھ روپے بھی دیتا تو بھی میں ایسا نہ کرتا۔ میں تو صرف عدالتی کارروائی روکنا چاہتا تھا۔ اور میں خوش ہوں کہ وہ رک گئی۔ مقدمہ عدالت میں جاتا تو سزا یقینی تھی۔ یہاں آپ کی پیروی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ صاحب بڑے شریف آدمی ہیں۔" میں نے بھی اعتراف کیا کہ واقعی بہت شریف ہیں۔

دیباچہ سوز وطن

"ہر ایک قوم کا علم و ادب اپنے زمانہ کی سچی تصویر ہوتا ہے۔ جو خیالات قوم کے دماغوں کو متحرک کرتے اور جو جذبات قوم کے دلوں میں گونجتے ہیں وہ نظم و نثر کے صفحوں میں ایسی صفائی سے نظر آتے ہیں جیسے آئینہ میں صورت۔ ہمارے لٹریچر کا ابتدائی دور وہ تھا کہ لوگ غفلت کے نشے میں متوالے ہو رہے تھے۔ اس زمانہ کی یادگار ریختہ، عاشقانہ غزلوں اور چند خیالی کہانیوں کے اور کچھ نہیں۔ دوسرا دور اسے سمجھنا چاہیے، جب قوم نئے اور پرانے خیالات میں زندگی اور موت کی لڑائی شروع ہوئی اور اصلاح تمدن کی تجویزیں سوچی جانے لگیں۔ اس زمانہ کے قصص و حکایات زیادہ تر اصلاح اور تجدید ہی کا پہلو لیے ہوتے ہیں۔ اب ہندوستان کے قومی خیال نے بلوغت کے زینہ پر ایک اور قدم بڑھایا اور حب وطن کے جذبات لوگوں کے دلوں میں سر ابھارنے لگے۔ کیونکر ممکن تھا کہ اس کا اثر ادب پر نہ پڑتا۔ یہ چند کہانیاں اس اثر کا آغاز ہیں اور یقین ہے جوں جوں ہمارے خیال وسیع ہوتے جائیں گے اسی رنگ کے لٹریچر کو روز افزوں فروغ ہوتا جائے گا۔ ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حب وطن کی عظمت کا نقشہ جمائیں۔"

"خواب راحت" تو کچھ دنوں کے لیے اس جہان سے گئے دوبارہ یاد دہانی ہوئی کہ تم نے معاہدہ میں گو اخباری مضامین نہیں لکھنے مگر

اس کو منشا ہر قسم کی تحریر سے تھا گویا میں خواہ کسی عنوان پر لکھوں۔ خواہ وہ واقعی واقعات ہی پر کیوں نہ ہو مجھے پہلے جناب فیض مآب کلکٹر صاحب بہادر کی خدمت میں پیش کرنا پڑے گا۔ اور مجھے پچھلے چھ ماہ سے لکھنا نہیں۔ یہ تو میرا روز کا دھندا ٹھہرا، ہر ماہ ایک مضمون، صاحب بہادر کی خدمت میں پہنچے تو وہ یہ سمجھیں گے کہ میں اپنے فرائض سرکاری میں خیانت کرتا ہوں۔ اور کام سر پر تھوپا جائے گا۔ اس لیے نواب رائے مرحوم ہو گئے۔

پریم چند اچھا نام ہے مجھے پسند ہے۔ افسوس صرف یہ ہے کہ پانچ چھ سال میں "نواب رائے" کو فروغ دینے کی جو محنت کی گئی وہ سب اکارت ہو گئی۔ یہ حضرت قسمت کے ہمیشہ ٹھنڈے رہے اور شاید رہیں گے۔ میرے لیے کلکٹر کو ہر ایک مضمون دکھانے کی ایسی قید لگی ہے کہ ایک مضمون مہینوں میں لوٹ کر آتا ہے۔ ایجوکیشنل گزٹ میں پریم چند کا نام نہیں دینا چاہتا۔ معلوم نہیں یہ حضرت اتھر پر سنبھالنے پر کیا لکھیں پڑھیں۔ انہیں قصہ گوئی سے چھٹی دیجئے "بیٹھے بیٹھے پریم اور پریس کے قصے لکھا کریں۔"

میں نے "نوکر ماورت کا تیغ" ایک قصہ لکھنا شروع کیا۔ یہ قصہ میرے خیال میں کئی مہینے سے تھا۔ میں نے اپنے خیال میں رابندر ناتھ کے طرز کی کامیابی کے ساتھ پیروی کی ہے۔ مگر نری نقل نہیں ہے پلاٹ بالکل اوریجنل ہے میں نے تو کئی قلم توڑ دیئے ہیں۔ اور دس پانچ ورق بھی کالے کر ڈالے۔ آپ کو پسند آتا ہے یا نہیں ——— یہ قصہ ملا کر میرے پانچ قصوں کا مجموعہ نکلنے کا کافی مسالہ جمع ہو جائے گا۔ اس مجموعے کا نام میں نے "برگ سبز" سوچا ہے۔

میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ "پریم پچیسی" کئی سال ہوئے شائع ہوا تھا۔ جہاں تک معاصر اخباروں کا تعلق ہے انھوں نے میری ناچیز کاوش کی داد دی لیکن شائقین پر اس کا بہت کم اثر ہوا۔ پہلا ایڈیشن ختم ہوتے میں کم و بیش پانچ سال لگ گئے یہ قدر دانی بہت حوصلہ انگیز تو نہ تھی لیکن مصنف کو تصنیف کے سوا چارہ نہیں۔ اس لیے یہ دوسرا مجموعہ "پریم بتیسی" کے نام سے پبلک کے سامنے پیش کرتا ہوں ممکن ہے کہ پہلے مجموعہ کی نسبت اس کا زیادہ چرچا ہو یا سارا طومار وفور اشاعت کے گودام میں پڑا اپنے قرض سے سبکدوش ہو چکا۔ اب صرف اتنی آرزو ہے کہ ایک مجموعہ "پریم چالیسا" یا "پریم پچاسا" کے نام سے اور نکل جائے۔ بس یہی زندگی کا حاصل ہو گا۔ اور اسی پر قناعت کروں گا۔

"دیر و حرم" میں فرقہ پرستوں کی ذہنیت کا پردہ فاش کیا گیا ہے۔ بلا کسی رو رعایت کے ایک طرف ہندو پنڈتوں اور پجاریوں کی مذہب پروری کا نظارہ ہے۔ دوسری جانب مولویوں کی مذہب پروری کا۔ دونوں مذہب کے پردے میں اپنی اپنی نفس پروری کا شکار ہو رہے ہیں۔ اگر کچھ لوگوں کو برا لگتا ہے تو میرا کیا اختیار ہے۔

پریم پچیسی کے ہندی ترجمے کے لیے کئی جگہ سے اصرار ہو رہے ہیں۔ میں خود ہی اس کام کو ہاتھ میں لوں گا۔ ہندی لکھنے کی مشق بھی کر رہا ہوں۔ اردو میں اب گزر نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بال مکند گپت مرحوم کی طرح میں بھی ہندی لکھنے میں زندگی صرف کر دوں گا۔ اردو نویسی میں کس ہندو کو فیض ہوا جو مجھے ہو جائے گا۔

میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدے یا تجربے پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس میں میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر محض واقعے کے اظہار کے لیے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اس میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں ملتی میرا قلم ہی نہیں اٹھتا۔ زمین تیار ہونے پر میں کیرکٹروں کی تخلیق کرتا ہوں۔ بعض اوقات تاریخ کے مطالعے سے بھی پلاٹ مل جاتے ہیں۔ لیکن کوئی واقعہ افسانہ نہیں ہوتا تاوقتیکہ وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے۔

میں جب تک کوئی افسانہ اوّل سے آخر تک ذہن میں نہ جما لوں لکھنے نہیں بیٹھتا۔ کیرکٹروں کا اختراع اس اعتبار سے کرتا ہوں کہ اس افسانے کے حسب حال ہوں۔ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ افسانے کی بنیاد کسی پُر لطف واقعہ پر رکھوں۔ اگر افسانے میں نفسیاتی کلائمکس CLIMAX موجود ہو، تو خواہ وہ کسی واقعے سے تعلق رکھتا ہو، میں اس کی پروا نہیں کرتا۔ ابھی میں نے جنوری میں ایک افسانہ لکھا ہے۔ جس کا نام ہے "دل کی رانی" میں نے تاریخ اسلام میں تیمور کی زندگی کا ایک واقعہ پڑھا تھا جس میں حمیدہ بیگم سے اس کی شادی کا ذکر ہے۔ مجھے فوراً اس تاریخی واقعے کے ڈرامائی پہلو کا خیال آیا۔ تاریخ میں کلائمکس کیسے پیدا ہو۔ اس کی فکر ہوئی۔ حمیدہ بیگم نے بچپن میں اپنے باپ سے فن حرب کی تعلیم پائی تھی۔ اور میدان جنگ میں کچھ تجربہ بھی حاصل کیا تھا۔ تیمور نے ہزاروں ترکوں کو قتل کر دیا تھا۔ ایسے دشمن قوم سے ایک ترک عورت کس طرح مانوس ہوئی۔ یہ عقدہ حل ہونے سے کلائمکس نکل آتا تھا۔ تیمور وجیہہ نہ تھا۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ اس میں ایسے اخلاقی اور جذباتی محاسن پیدا کئے جائیں جو ایک عالی نفس خاتون کو اس کی طرف مائل کر سکیں۔ اس طرح وہ قصہ تیار ہو گیا۔

کبھی کبھی سنے سنائے واقعات ایسے ہوتے ہیں، کہ ان پر افسانے کی بنیاد آسانی سے رکھی جا سکتی ہے۔ لیکن کوئی واقعہ محض چٹپٹے دار چست عبارت میں لکھنے اور انشاپردازانہ کمالات کی بنیاد پر افسانہ نہیں ہوتا۔ میں ان میں کلائمکس لازمی چیز سمجھتا ہوں اور وہ بھی نفسیاتی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ افسانے کے مدارج اس طرح قائم کئے جائیں کہ کلائمکس قریب تر آتا جائے۔ جب کوئی ایسا موقع آجاتا ہے جہاں ذرا طبیعت پر زور ڈال کر ادبی یا شاعرانہ کیفیت پیدا کی جا سکتی ہے تو میں اس موقعے سے ضرور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں یہی کیفیت افسانے کی روح ہے۔

میں سست رفتار بھی ہوں۔ مہینہ بھر میں شاید میں نے کبھی دو افسانوں سے زیادہ نہیں لکھے۔ بعض اوقات تو مہینوں کوئی افسانہ نہیں لکھتا۔ واقعہ اور کیرکٹر تو سب مل جاتے ہیں، لیکن نفسیاتی بنیاد مشکل ملتی ہے۔ یہ مسئلہ حل ہو جانے پر افسانہ لکھتے میں دیر نہیں لگتی۔ مگر ان چند سطور سے افسانہ نویسی کے حقائق نہیں بیان کر سکتا۔ یہ ایک ذہنی امر ہے سیکھنے سے بھی لوگ افسانہ نویس بن جاتے ہیں۔ لیکن شاعری کی طرح اس کے لیے بھی اور ادب کے ہر شعبے کے لیے کچھ فطری مناسبت ضروری ہے۔ فطرت آپ سے آپ پلاٹ بناتی ہے۔ ڈرامائی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ تاثیر لاتی ہے۔ ادبی خوبیاں جمع کرتی ہے۔ نادانستہ طور پر آپ ہی سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ ہاں قصہ ختم ہو جانے کے بعد میں خود اسے پڑھتا ہوں۔ اگر اس میں مجھے ندرت۔ کچھ جدت۔ کچھ حقیقت کی تازگی۔ کچھ حرکت پیدا کرنے کی قوت کا احساس پیدا ہوتا ہے تو میں اسے کامیاب افسانہ سمجھتا ہوں۔ ورنہ سمجھتا ہوں فیل ہو گیا۔ حالانکہ فیل اور پاس دونوں افسانے شائع ہو جاتے ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس افسانے کو میں نے فیل سمجھا تھا اسے احباب نے بہت پسند کیا۔ اس لیے میں اپنے معیار پر زیادہ اعتبار نہیں کرتا۔

دل پر جتنا گہرا صدمہ ہوتا ہے اپنے ردعمل کی صورت میں اتنا ہی مؤثر ہوتا ہے۔ کہانی میں نام اور سنہ کے سوا باقی سب کچھ سچ ہے اور تاریخ میں نام اور سنہ کے سوا کچھ بھی حقیقت نہیں۔ ہماری روح کو عروجی قوت کہاں سے ملتی ہے۔ قوت تو مسلسل جد و جہد میں مصروف ہے۔ ہمارا دل رکاوٹوں کو پھاند کر اپنے فطری مقام پر پہنچنے کی خواہش کرتا رہتا ہے۔ اسی جد و جہد سے تو ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔

میرے بہترین افسانے

اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے کہ میرے سب سے اچھے افسانے کون سے ہیں۔ میری سب سے اچھی کہانی ابھی لکھی ہی نہیں گئی۔ اب تک دو سو سے زیادہ افسانے لکھ چکا ہوں۔ ان میں سے

کہاں تک انتخاب کروں یادداشت پر بھروسا کر کے لکھتا ہوں:

(۱) بڑے گھر کی بیٹی (۲) رانی سارندھا (۳) نمک کا داروغہ (۴) سوت (۵) زیور (۶) کفارہ (۷) تنہا (۸) مندر اور مسجد (۹) گھاس والی (۱۰) حج اکبر (۱۱) ستیا گرہ (۱۲) بدنامی (۱۳) ستی (۱۴) لیلیٰ (۱۵) منتر۔

میں کسی مصنف کے طرز سے خاص طور پر متاثر نہیں ہوا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا زیادہ اور ڈاکٹر ٹیگور کا اثر مجھ پر ضرور ہوا ہے۔

میرے قصوں کے آجکل بہت چور ہیں میری عبارت کے پورے پیراگراف نقل کر لیے، اوٹ پٹانگ قصہ لکھ کر اسے سرقے کے لباس سے بچانے کی کوشش کی ہے فروری کے "ذخیرہ" میں "ظریف الطبع" ایک قصہ ہے۔ لکھنؤ کے ایک صاحب نے لکھا ہے۔ اسے پڑھیے اور میرا قصہ "دو سکھیاں" پڑھیے۔ صاف چوری معلوم ہوگا۔ صرف جزئیات میں ردو بدل کر دیا گیا ہے۔ دماغ پر زور ڈالا نہیں اور مضمون نگار بننے کا خبط یا جنون سوار کیسے، ان چوروں پر ایک چھوٹا سا شگوفہ چھوڑ دوں۔ یہ حضرات جز بز ہوں گے۔ ہوا کریں مگر اردو میں یہ باتیں معمولات میں ہیں۔ "ایں ہمہ اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر"۔ اب کچھ دنوں سے چھوٹے قصے لکھنا بند کر کے علمی مضامین لکھنے کی کوشش کروں گا۔ اگر ریڈریں منظور ہوگئیں تو تین سال تک کوئی پریشانی نہ ہوگی۔

ڈرامے

ناٹک لکھنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ خون جگر جلانا پڑتا ہے۔ میرے خیال میں ایک ناٹک لکھنے کے لیے پانچ سال کا وقت بھی کافی نہیں ہے بلکہ اچھا ڈرامہ زندگی میں ایک ہی لکھا جا سکتا ہے۔ یوں قلم گھسنا دوسری بات ہے۔ بڑے بڑے ماہرین کا قول ہے کہ ڈرامہ زندگی میں ایک ہی لکھا جا سکتا ہے۔ ڈرامہ ایسا ہونا چاہیے کہ پڑھنے والے دل ہاتھوں سے تھام لے۔ ایک ایک فقرہ تیر و نشتر کی طرح دل میں اتر جائے۔ روسی، فرانسیسی، جرمنی، تمام زبانوں کے ڈرامے پڑھے مگر کوئی نہ کوئی نقص ہر ایک میں موجود ہے۔ کہیں جذبات ہیں تو زبان نہیں، زبان ہے تو جذبات نہیں، ظرافت ہے تو گانے نہیں، اور گانے ہیں تو ظرافت نہیں۔ جب تک یہ چاروں ارکان پورے نہ ہوں اسے ڈرامہ کہنا ہی بیکار ہے۔

(کربلا) میں نے حضرت حسین کا حال پڑھا۔ ان سے عقیدت ہوگئی۔ ان کے ذوق شہادت نے مفتون کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ڈرامہ تھا۔ میں نے احترام کہیں نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ ایک ایک لفظ پر اس بات کا خیال رکھا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی احساسات کو صدمہ نہ پہنچے اس کا مقصد ظاہر ہے۔ باہمی اتحاد کو بڑھانا اور کچھ نہیں۔ اگر مسلمانوں کو یہ بھی منظور نہیں ہے کہ کسی ہندو کے دل و قلم سے ان کے کسی مذہبی پیشوا یا امام کی مدح سرائی ہو تو میں اس کے لیے مُصر نہیں ہوں۔

احسن لکھنوی صاحب فرماتے ہیں کہ شیعہ حضرات یہ نہیں پسند کر سکتے کہ ان کے کسی مذہبی پیشوا کا ڈرامہ تیار کیا جائے۔ اگر شیعہ حضرات اپنے مذہبی پیشوا کی مثنوی پڑھتے ہیں۔ افسانے پڑھتے ہیں۔ مرثیے سنتے اور پڑھتے ہیں تو انھیں ڈرامے سے کیوں اعتراض ہو۔ کیا اس لیے کہ ایک ہندو نے لکھا ہے؟

تاریخ اور تاریخی ڈرامے میں فرق ہے۔ تاریخی ڈرامے کے خاص کیرکٹروں میں تو کوئی تغیر نہیں کر سکتا۔ مگر ثانوی کیرکٹروں کے تبدیل اور ترمیم یہاں تک کہ تخلیق میں بھی اسے آزادی ہے۔ حضرت اصغر کی عمر چھ ماہ کی تھی۔ لیکن بعض روایتوں میں چھ سال کی بھی لکھی ہے۔ میں نے وہی روایت اختیار کی جو میرے موافق حال تھی۔ اگر بالفرض ایسی روایت نہ بھی ہو تو حضرت اصغر اس ڈرامے کے کوئی خاص کیرکٹر نہیں ہیں۔

یزید کی اخلاقی حیثیت مجھ سے کہیں زیادہ پست مؤرخین نے دکھلائی ہے۔ میں مجبور تھا میں نے تو صرف اس کی شرانگیزی اور عیش پسندی کا ذکر کیا ہے، شرابخوار تھا ہی۔ خلفائے راشدین کے بعد اور جتنے خلفا ہوئے سب پیتے تھے۔ اور دھڑلے سے پیتے تھے۔

تاریخی حیثیت سے ساہس راؤ کے تعاقب پر اعتراض ہے۔ بیشک قدیم روایات میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ مگر ایک روایت ہے جو میں نے رسالہ آئینہ الٰہ آباد سے لی ہے۔ ممکن ہے وہ روایت غلط ہو لیکن اگر مان لیجیے۔ زیب داستان ہی کے لیے لی گئی ہے تو کیا؟ ڈراما تاریخ تو نہیں ہے۔ اس سے کسی تاریخی کیریکٹر پر اثر نہیں پڑتا۔ ان کیریکٹروں کا منشا ہے ہندوؤں کا حضرت حسین پر فدا ہو جانا۔ ان کا وجود بھی اسی لیے ہوا ہے یہ ڈراما تاریخی ہونے کے ساتھ پولیٹیکل ہے۔

ادبی حیثیت کے متعلق اعتراض کو بسر و چشم تسلیم کرتا ہوں میں نے کبھی ادیب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ مجھے لوگ زبردستی انشا پرداز اور ناول نگار اور اہل قلم لکھ دیا کرتے ہیں۔ میں بات کو سیدھی طرح سیدھی زبان میں کہہ دیتا ہوں۔ رنگ آمیزی اور انشا پردازی میں خام ہوں۔ اور جب ڈراما اس لیے تیار کیا گیا ہے کہ ہر خاص و عام اسے پڑھے تو زبان آرائی اور بھی بے موقع ہو جاتی۔ خواجہ حسن نظامی نے کرشن بیتی لکھی۔ ایک ہندو نقاد نے اس کی تعریف کی۔ صرف اس لیے کہ مولانا نے کرشن سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا تھا۔ میرا بھی یہی منشا تھا۔ اگر حسن نظامی کو وہ آزادی حاصل ہے اور مجھے نہیں ہے تو مجھے اس کا افسوس نہیں۔ ہاں میں یہ عرض کرنا بھول گیا۔ ڈراما دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک قرأت کے لیے ایک اسٹیج کے لیے یہ ڈراما محض پڑھنے کے لیے لکھا گیا تھا۔ کھیلنے کے لیے نہیں۔

میں نے حضرت حسین کی زبان سے کوئی عاشقانہ غزل کہیں نہیں ادا کرائی ہے۔ یزید کی مجلس میں غزلیں گائی گئی ہیں اور بے موقع نہیں ہیں۔

سنگرام

آج کل ڈراما لکھنے کے لیے موسیقی کا جاننا ضروری ہے۔ کچھ شعر کہنے کی صلاحیت بھی ہونی چاہیے۔ میں ان دونوں باتوں سے کم واقف ہوں۔ پر اس کہانی کو ڈھنگ ہی کچھ ایسا تھا کہ میں اسے ناول کی شکل نہ دے سکتا تھا۔ یہی اس ڈرامے کے لکھنے کی خاص وجہ ہے۔ ادب کے اس میدان میں یہ میری پہلی اور آخری ناکام کوشش ہے مجھے یقین ہے یہ ڈراما تھیٹر میں کھیلا جا سکتا ہے۔ وہاں اسٹیج منیجر کو کہیں کہیں کانٹ چھانٹ کرنی پڑے گی۔ میرے لیے ڈراما لکھنا ہی کم مشکل نہ تھا۔ اسے اسٹیج کے لائق بنانا تو اور بھی مشکل ہے۔ میری غلطیوں کا خاتمہ ابھی نہیں ہوا ہے میں نے ایک تیسری خطا بھی کی ہے۔ موسیقی سے انجان ہوتے ہوئے بھی میں نے جہاں کہیں دل میں آیا ہے۔ گانے دے دیے ہیں۔ دو خطائیں معاف کرنے کی درخواست تو میں نے کی ہے۔ پر تیسری خطا کس منہ سے معاف کراؤں اس کے لیے پڑھنے والے اور تنقید نگار حضرات جو سزا دیں مجھے قبول ہوگی۔

میرے سیاسی اور سماجی تصورات

میں ریفارم اسکیم یا ایکٹ کے متعلق مسٹر چنتامنی وغیرہ سے متفق نہیں ہوں۔ میرے خیال میں معتدل پارٹی اس وقت ضرورت سے زیادہ مغرور اور نادان ہے حالانکہ اصلاحوں میں اگر کوئی خوبی ہے تو صرف یہ کہ تعلیم یافتہ جماعت کو کچھ آسامیاں زیادہ مل جائیں گی۔ اور جس طرح یہ جماعت وکیل بن کر رعایا کا خون پی رہی ہے اسی طرح آئندہ یہ حاکم بن کر رعایا کا گلا کاٹے گی۔ اس کے سوائے اور کوئی جدید اختیار نہیں دیا گیا ہے جو اختیارات دیے گئے ہیں ان میں بھی اتنی شرطیں لگا دی ہیں کہ ان کا دینا نہ دینا برابر ہوگا۔

نمک ستیاگرہ

جس طرح موت ہمیشہ قبل از وقت ہوتی ہے ساہوکار کا تقاضہ ہمیشہ قبل از وقت ہوتا ہے اسی طرح ایسے سارے

کام جن میں مالی یا وقتی نقصان کا اندیشہ ہو قبل از وقت معلوم ہوتے ہیں اس تحریک کی مقبولیت ہی جتلا رہی ہے کہ وہ قبل از وقت نہیں ہے۔

اس موقع پر صاف ظاہر ہوا کہ اگر دو فیصدی انگریزی خواں اصحاب تحریک کے ساتھ ہیں تو ۹۸ فیصدی اس کے مخالف ہیں۔ قومی اعتبار سے یونیورسٹیوں اور اسکولوں پر جتنا روپیہ صرف ہوا وہ قریباً ضائع ہوگیا۔ یہ لوگ سرکار کے آدمی ہو گئے قوم کے نہیں ہیں۔ غیر انگریزی داں کاروباری اور پیشہ ور طبقوں ہی نے اس تحریک میں جان ڈالی ہے۔ اگر تعلیم یافتہ آدمیوں کے بھروسے ملک بیٹھا رہے تو شاید قیامت تک اُسے آزادی نصیب نہ ہوگی۔

جب معلوم ہے اور اس کے لیے ثبوت اور دلیل کی ضرورت نہیں کہ سرکار کوئی رفارم اس وقت تک نہیں دیتی جب تک اسے یہ یقین نہ ہو جائے کہ اس تحریک کے پیچھے کتنی طاقت ہے تو تعلیم یافتہ جماعت کا اس سے کنارہ کش رہنا کتنا دل شکن ہے۔ قانون پیشہ، طبابت پیشہ، پروفیسر اور سرکاری ملازمین ان سب نے جتنی غلامانہ ذہنیت کا ثبوت دیا ہے اس کی مجھے امید نہ تھی یہ طبقہ اپنی خیریت گورنمنٹ کا اقتدار قائم رہنے ہی میں سمجھتا ہے۔ وہ ملک کے لیے بھی اپنی آسائش اور دنیا طلبی کو فراموش نہیں کر سکتا۔ یہی اس کا دین و ایمان ہے۔ وہ یا تو آزادی چاہتا ہی نہیں یا اس کے لیے قیمت نہ دے کر دوسروں پر تکیہ کرنا ہی اپنی شان کے مناسب سمجھتا ہے یا وہ اس خیال میں گم ہے کہ آپ ہی آپ آزادی مل جائے گی۔ کانگریس کے دور اول میں وہ اس سے خائف رہا کانگریس کے دور ثانی میں بھی اس کی یہی حالت رہی وہ صریح دیکھ رہا ہے کہ جو کچھ اسے ملا۔ اور جسے اب وہ اپنا حق سمجھتا ہے وہ دوسروں کے ایثار و قربانی کا نتیجہ ہے۔ یہی ابرژوا BOURGEOWE طبقہ ہے جو نادار فرقہ کو "زردار فرقہ" کا دشمن بنا دیتی ہے (ایک دوست) نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں کس پارٹی میں ہوں؟ میں کسی پارٹی میں نہیں ہوں اس لیے کہ اس وقت دونوں میں کوئی پارٹی کچھ عملی کام نہیں کر رہی ہے۔ میں اس آنے والی پارٹی کا ممبر ہوں جو عوام الناس کی سیاسی تعلیم کو اپنا دستور العمل بنائے۔ سوراجیہ خلافت پارٹی کی جانب سے جو کانسٹی ٹیوشن نکلا ہے اس سے البتہ مجھے کلی اتفاق ہے مگر تعجب یہی ہے کہ یہ ایک پارٹی سے کیوں نکلا میرے خیال میں دونوں ہی پارٹیاں اس معاملے میں متفق ہیں مجھے تو اس وقت علی برادران کی صلح کل پالیسی فریفتہ کر رہی ہے ان کے خیالات میں جو حیرت انگیز انقلاب ہوا ہے میں اس کو اصل شدھی سمجھتا ہوں اور ایسی ہی شدھی دیرپا ہو سکتی ہے۔

گورنمنٹ کی زیادتیاں ناقابل برداشت ہو رہی ہیں۔ پنڈت جواہر لال کی ضعیف ماں کے ساتھ کیسی بدعتیں کی گئیں۔ اب باہر رہنے میں مجھے بھی بے حیائی معلوم ہو رہی ہے۔ شہر لکھنؤ فوجی کیمپ بنا ہوا ہے۔ بالکل بے ضرورت۔ اگر کہیں گرفتار ہو جاؤں یا ڈنڈے پڑ جائیں اور روح قالب عنصری سے پرواز کر جائے تو میرے پسماندگان کی خبر لیتے رہیے گا۔

ہندو مسلم اتحاد

اس بیداری کے زمانے سے تو وہ بے خبری کا زمانہ ہی غنیمت تھا جبکہ لوگوں میں پاسداری تھی شادی و غمی میں شریک ہونے کی توفیق تھی۔ اگر مذہب ہمیں اتنا تنگ نظر بنا دیتا ہے تو میں ایسے مذہب کو دور سے سلام کرتا ہوں۔ ہر قوم اپنی تہذیب کی اپنی کلچر کی حفاظت کرنا چاہتی ہے۔ اور اس کا مطالبہ حق بجانب ہے اپنی زبان کی رسم الخط کی ادب کی معاشرت کی۔ رسوم و رواج کی محبت ہر ایک باخبر انسان میں ہوتی ہے اور ہونی بھی چاہیے لیکن اس کی بھی حد ہے یہی آزادی دینی ہے جو دوسروں کی آزادی کی بھی قدر کرے۔ میں اسلامی اخوت اور مساوات کا قائل ہوں اور ہندو تہذیب پر اسلامی تہذیب کا جو اثر ہوا ہے اسے بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں میرا اعتقاد ہے کہ ہندوستان میں دونوں تہذیبیں پہلو بہ پہلو رہ کر ہی ترقی کر سکتی ہیں۔ اور روز بروز اس میں ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے کانگریس کے اثر سے بہت

کی بے معنی بندشیں ٹوٹ چکی ہیں اور آئندہ بھی ٹوٹتی جائیں گی فطری رفتار قائم رہنے دی جائے مگر اس کے ساتھ میرا یہ بھی ایمان ہے کہ اتحاد خالص مساوات کے سوا اور کسی طرح ممکن نہیں۔ جب تک کسی طرف سے خاص حقوق کے مطالبے ہوتے رہیں گے۔ اس وقت تک یہ کشمکش جاری رہیگی اب تمام امید قوم کے نوجوانوں سے ہے۔ انھیں کے ہاتھ قوم کی کشتی ہے اگر انھوں نے نئی روشنی اور نئی تہذیب اور سیاسیات کے زرّیں اصول کی پابندی کی اور مذہب کو اس کے صحیح معنوں میں سمجھا تب تو مستقبل قریب روشن ہوگا۔ ورنہ ایک دن آئے گا کہ دونوں جماعتیں لڑ لڑ کر مر جائیں گی۔ اس لیے کہ ایک میں بھی طاقت نہیں ہے کہ دوسرے کو فنا کر کے خود زندہ رہے۔

ادھر میں نے اردو میں لکھنا بند سا کر رکھا ہے فرصت ہی نہیں ملتی لیکن شدھی پر ایک مختصر سا مضمون لکھ رہا ہوں مجھے اس تحریک سے سخت اختلاف ہے آریہ سماج والے بھنّائیں گے۔

آج کل فطرتاً میرے دل میں ایک خواہش شدید ہوتی جارہی ہے آزادی کی لڑائی۔ لڑائی میں ہمیں فتح مند ہونا ہوگا۔ عہدہ، دولت، مکان، گاڑی، ہم کچھ نہیں چاہتے ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے اسی میں خوش ہیں۔ مصنف ہونے کی حیثیت سے اچھی اچھی کتابیں لکھنے کی آرزو فطری ہے لیکن ان سب کتابوں کا واحد نصب العین ہوگا: آزادی ——

دنیا میں انسانی معاشرہ کی فلاح و بہبود کے لیے جتنی تحریکات بھی رونما ہوئیں ادب نے ان کے لیے نہ صرف اچھی زمین ہی تیار کی بلکہ اس کی تخم ریزی اور آب پاشی کا بھی کام کیا۔ ادب سیاست کا مقلد نہیں بلکہ قائد ہے میں خاموش نہیں بیٹھوں گا ہر لمحہ ادب اور ملک کے لیے کچھ نہ کچھ کرتا رہوں گا۔

نظریۂ فن

ادیب انسانیت کا، دیانت کا، شرافت کا علمبردار ہے۔ جو پامال ہیں، مظلوم ہیں، محروم ہیں۔ چاہے وہ فرد ہوں یا جماعت۔ ان کی حمایت اور وکالت اس کا فرض ہے۔ اس کی عدالت سوسائٹی ہے۔ اسی عدالت کے سامنے وہ اپنا استغاثہ پیش کرتا ہے۔

میں لٹریچر کو MASCULINE دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے زنانہ FEMININE خواہ وہ کسی صورت میں ہو مجھے پسند نہیں۔ اسی وجہ سے مجھے ٹیگور کی اکثر نظمیں نہیں بھاتیں۔ یہ فطری نقص ہے کیا کروں۔ اشعار بھی مجھے وہی اپیل کرتے ہیں جن میں کوئی جدت ہو۔ غالب کے رنگ کا میں عاشق ہوں۔ عزیز لکھنوی کے گلکدے کی خوب سیر کی تھی مگر بدقسمتی سے آج تک ایک شعر بھی موزوں نہیں کر سکا۔ جی چاہتا ہے غالبؔ شاعر و درد عشق دل میں ہے ہی نہیں۔

شاعری سچے جذبات کی تصویر ہے اور سچے جذبات خواہ درد کے ہوں یا مسرت کے اسی وقت دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ جب ہم درد یا مسرت کا مزہ چکھتے ہیں۔ اور جذبات کے پیدا ہونے کے بعد ان کا زبان قلم تک آنا تو ایک آسان بات ہے۔

مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ "زمانہ" کا قریب قریب ایک پورا نمبر محض آتش کے کلام کے تبصرہ کی نذر ہو گیا۔ میں آتش کی استادی کا قائل ہوں۔ لکھنوی شاعری کا مذموم پہلو آتش کی شاعری میں مقابلۃً کم ہے۔ پھر بھی اتنا زیادہ ہے کہ باستثنا ان حضرات کے جو لکھنوی شاعری کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ اور سبھی طباع کو موجودہ معیار اور ذوق صحیح سے گرا ہوا نظر آتا ہے۔

لٹریچر کا موضوع تہذیب اخلاق، مشاہدہ جذبات، انکشاف حقائق اور واردات و کیفیات قلب کا اظہار ہے جو شاعری حسن و عشق کو آئینہ و شانہ، خنجر و نشتر، سبزہ و خط اور دیگر کے تخیل سے ملوث کرتی ہو، وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ آج ہم اس کا ورد کریں جن کی استاد

طبیعت اس رنگ کی ہے۔ انھیں اختیار ہے۔ آتش یا ناسخ، رند، اور امانت کا وظیفہ پڑھیں۔ لیکن زمانے کے مختلف الطبائع شعرا کو اس ورد وظیفہ میں شریک ہونے کے لیے مجبور کرنا کہاں کا انصاف ہے؟ اس مجموعے میں آتش کے کلام کا انتخاب پیش کیا گیا ہے مگر اس انتخاب میں بیشتر ایسے اشعار ہیں جنھیں ذوق لطیف ہرگز قابل ستائش نہ سمجھے گا۔ ملاحظہ ہو:

آنکھ اُٹھا کر جو کبھی تم نے ادھر دیکھ لیا   بھر گیا دامن نظارہ گل نرگس سے

آنکھ کی رعایت سے نرگس کو لاکر دامن نظارہ کو گل نرگس سے بھر دیا۔ اس میں کیا ندرت خیال ہے کیا حقیقت ہے سمجھ میں نہیں آتا؟

خط دیا لیکن نہ بتلایا نشاں کوئے دوست   قاصدوں کے پاؤں توڑے بدگمانی نے مری

نشاں کیوں نہیں بتلایا؟ وہ تھی آپ کی حماقت یا نہیں۔ آپ کو خون بہا میں معشوق قاصد کا دم بھرنے لگے۔ واہ رے معشوق اور واہ رے عاشق دونوں زندہ درگور۔ ایسے اشعار ایک نہیں سیکڑوں ہیں۔ بہت چھان بین کرنے سے سو دو سو اشعار سارے دیوان میں ایسے نکلیں گے جو پاکیزہ کہے جا سکیں۔ جن میں واقعی جذبہ بیقرار، درد، حسرت، چونکا دینے والی جدت، رعشہ بر اندام کر دینے والی نازک خیالی، جنون انگیز مستی ہو۔

موزونیت ایک وہبی صفت ہے۔ جسے خدا نے یہ صفت عطا کی ہے اسے عروض و قوافی کا منت شناس بننے کی ضرورت نہیں۔ طبیعت اگر اس صفت کو حشو و زوائد سے پاک، دائرہ نگاہ کو وسیع اور قوت بیان کو مؤثر کر دیتی ہے وہاں شاعری میں تصنع اور آورد کا رنگ بھی پیدا کر دیتی ہے۔ ان اُمّی شعرا کے کلام میں شاعر کے اصلی جذبات نظر آتے ہیں۔ اور اپنی بے ساختگی سے دل پر ایک خاص کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ اگرچہ ان شعرا نے اپنے زمانے کے اساتذہ کی تقلید کی ہے۔ اور ان کا انداز بیان بھی وہی ہے لیکن ان کے مؤثر ترین اشعار وہی ہیں جو بندشوں کی قید اور ترکیبوں کی پیچیدگیوں سے پاک ہیں۔

مصوری

شاعری کی طرح مصوری بھی انسان کے نازک احساسات کا نتیجہ ہے۔ جو کام شاعر کرتا ہے۔ وہی مصور کرتا ہے۔ شاعر زبان سے مصور پنسل یا قلم سے۔ سچی شاعری کی تعریف یہ ہے کہ تصویر کھینچ دے اور سچی تصویر کی صفت یہ ہے کہ اس میں شاعری کا مزہ آئے۔ شاعر کانوں کے ذریعے روح کو مسرت پہنچاتا ہے اور مصور آنکھوں کے ذریعے اور چونکہ قوت باصرہ بہ نسبت سامعہ کے زیادہ نازک اور ذکی الحس ہے۔ اسی لیے جو بات مصور ایک نشان، ایک خط یا ذرا سے رنگ سے ادا کر دے گا۔ وہ شاعر کے صدہا اشعار سے ادا نہ ہو سکے گا۔ شاعر جب اپنے اشعار پڑھنے لگتا ہے تو محض زبان کو اظہار خیال کے لیے کافی نہ دیکھ کر آنکھ، ابرو اور انگلیوں سے ایسے اشارے کنائے کرتا ہے جس سے اس کے اشعار کا لطف دوبالا ہو جائے گویا اسے اپنا مطلب ادا کرنے کے لیے تصویر نگاری کی ضرورت ہوتی ہے مگر مصور کی تصویر ہی اس کا خیال ادا کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔

ہندوستانی مصوری

ہندوستان کی قومی بیداری کا سب سے اہم اور مبارک نتیجہ وہ بینک اور کارخانے نہیں ہیں نہ وہ تعلیم گاہیں جو ملک کے ہر ایک حصے میں وجود پذیر ہوتی جاتی ہیں بلکہ وہ فخر جو ہمیں اپنے قدیم صنعت و حرفت اور علم و ادب پر ہونے لگا ہے۔ ہم اب ہومر اور ملٹن کو اقلیم سخن کا بادشاہ نہیں مانتے بلکہ سعدی، اور کالیداس کو بھی۔ خودداری ہر صیغے میں نمایاں ہے۔ اب ہمارا قدیم فن تعمیر اور نقاشی دنیا میں حیرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ہندوستانی فن تصویر تاریخی حیثیت سے تین قرنوں میں منقسم ہوتا ہے۔ متقدم، متوسط، اور جدید۔ پہلا دور سنہ عیسوی کے دو سو سال قبل

سے عیسیٰ کی ساتویں صدی تک ختم ہوتا ہے۔ یہ زمانہ بودھوں کا تھا۔ بودھوں نے نقاشی اور تعمیر کے فنون کو جس کمال تک پہنچایا اس پر آج ساری دنیا کے لوگ حیرت کرتے ہیں۔ اس دور کی سب سے قابلِ قدر اور مشہور یادگار غار اجنتا کی تصاویر ہیں۔ ساتویں صدی کے بعد ہندوستانی فنِ تصویر کے رُخِ زیبا پر ایک تاریک پردہ سا پڑ جاتا ہے اور شاہانِ مغلیہ کے عہد تک اس کا کچھ حال نہیں معلوم ہوتا۔

اکبر کا زمانہ ہمہ گیر ترقیوں کا زمانہ تھا۔ فنِ تصویر نے بھی اس میں نمایاں حصہ لیا۔ فتح پور سیکری میں جو عمارتیں بنوائیں ان میں ہندو اور مسلمان طرزِ تعمیر کو اس نفاست سے ملایا ہے کہ اس کی عمارات نگاہ پر حیرت ہوتی ہے۔ شاہجہان اس فن کا پرجوش قدردان تھا۔ مغلیہ خاندان کے زوال اور خاتمہ کے ساتھ ان تصاویر کا بھی زوال اور خاتمہ ہو گیا۔

حقیقت نگاری

واقعیت چاہتی ہے کہ آرٹسٹ دنیا کو اس طرح دکھائے، جیسے وہ اُسے دیکھتا ہے۔ اگر اس سے اس کے انسانی احساسات کو صدمہ پہنچتا ہے تو پہنچے اگر اس سے اس کے حسِ انصاف کو چوٹ لگتی ہے تو لگے۔ پر اسے واقعیت سے منحرف ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ مگر ادیب سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی آئیڈیلسٹ IDEALIST بننے کے لیے مجبور ہے۔ جب تک اس کی نظروں میں سوسائٹی کی کوئی بہتر صورت نہیں ہے۔ موجودہ معاشرت کی ناہمواریاں کیسے اُسے بیتاب کریں گی۔ اگر کسی زندگی اور زیادہ خوبصورت سوسائٹی کی صورت ہمارے ذہن میں نہیں ہے تو ہم موجودہ سوسائٹی کو اصلاح کی کس منزل مقصود کی طرف لے جائیں گے۔

تنقید کی اہمیت

ہر ایک زبان کی ذہنی اور علمی ترقیوں کا اندازہ لگانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کی تصنیف و تالیف پر نظر ڈالی جائے۔

ناول اس افسانے کو کہتے ہیں جو زمانہ کا (جس کا وہ تذکرہ کر رہا ہو) صاف صاف چربہ اتارے اور اس کے رسم و رواج مراسم آداب طرزِ معاشرت وغیرہ پر روشنی ڈالے اور مافوق العادت واقعات کو دخل نہ دے۔ اگر سرشار کے افسانوں کو دیکھیے تو ایسی کون سی خوبی ہے جو اس میں بدرجہ اتم موجود نہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ان کی سب کتابیں اپنے زمانہ کی سچی تصاویر ہیں۔ اگر آج سے سو برس بعد کوئی شخص فسانۂ آزاد کا مطالعہ کرے تو اس کو پچیس برس کی تہذیب و روش خیالات و مذاق عامہ کی جھلکیاں صاف نظر آئیں گی۔ جو تاریخ کے مطالعہ سے چاہے وہ کیسا ہی وسیع اور دقیق کیوں نہ ہو ہرگز نظر نہیں آسکتیں۔ —— خلاصہ یہ ہے کہ تصویر زمانہ جتنے جزئیات پر حاوی ہے ان سب پر سرشار کے طلسمی قلم نے جادو طرازی کی ہے۔

برعکس اس کے حضرت شرر کے جو ناول مشہور ہیں۔ وہ کوئی تو صلیبی لڑائیوں کا زمانہ ہے کوئی روس و روم کی لڑائی کے وقت کا کوئی اس زمانے کا جب مسلمانوں کے قدم اسپین سے اکھڑ چکے تھے۔ الغرض سبھی ناظر کو دس پانچ صدیاں پیچھے لے جاتے ہیں۔ اور چونکہ حضرت شرر کو ان باتوں کا ذاتی تجربہ نہیں ہے اس لیے وہ اس وقت کے واقعات کی ایسی تصویر ہرگز نہیں کھینچ سکتے جو اصل سے مطابقت رکھے۔ ان کی معلومات کا سب سے زرخیز ذریعہ تاریخ ہے اور تاریخی معلومات کتنی ہی وسیع کیوں نہ ہوں ذاتی و عینی مشاہدے سے لگا نہیں کھا سکتیں۔

اُردو، ہندی، ہندوستانی

اگر بھارت میں اردو اور ہندی دو بھاشائیں الگ الگ رہیں گی۔ انھیں اپنے اپنے ڈھنگ پر اپنی اپنی سنسکرتی کے مطابق بڑھنے دیا جائے ان کو ملانے کی اور اس طرح دونوں کی ترقی کو روکنے کی کوشش نہ کی جائے یا ایسا ممکن ہے کہ دونوں بھاشاؤں کو اتنا قریب لایا جائے کہ ان میں رسم الخط کے سوا کوئی فرق نہ رہے۔ جن کا خیال ہے کہ دونوں

بھاشاؤں میں ایکتا لائی جا سکتی ہے۔ یہ لوگ ہندی اور اردو دو ناموں کا استعمال نہیں کرتے دونوں کو ایک نام سے پکارتے ہیں اور وہ ہے ہندوستانی۔ ان کا آدرش ہے کہ جہاں تک ممکن ہو لکھی جانے والی بول چال کی زبان کی صورت ایک ہو اور وہ تھوڑے سے پڑھے لکھے آدمیوں کی زبان نہ رہ کر ساری قوم کی زبان ہو۔ چونکہ اردو زبان عرصے سے عدالت اور مہذب سماج کی بھاشا رہی ہے۔ اس سے اس میں ہزاروں فارسی اور عربی کے لفظ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ دیہاتی بھی ان کا مطلب سمجھ جاتا ہے۔ ایسے لفظوں کو الگ کر کے ہندی میں خالص پن لانے کی جو کوشش جاری ہے ہم اسے زبان اور قوم دونوں ہی کے ساتھ ناانصافی سمجھتے ہیں اسی طرح ہندی سنسکرت یا انگریزی کے جو بگڑے ہوئے لفظ اردو میں مل گئے ان کو چن چن کر نکالنے اور ان کی جگہ خالص فارسی اور عربی لفظوں کے استعمال کو بھی اتنا ہی اعتراض کے لائق سمجھتے ہیں۔ جب تک اردو ہندی دونوں بھاشاؤں کا میل نہ ہوگا۔ ہندوستانی زبان کی گاڑی جہاں جا کر رک گئی ہے اس سے آگے نہ بڑھ سکے گی۔

خطبۂ صدارت جلسۂ ترقی پسند مصنفین

ہمارے سبھاؤں اور انجمنوں میں اب تک عام طور پر زبان اور اس کی اشاعت سے بحث کی جاتی رہی ہے۔ یہاں تک کہ اردو اور ہندی کا جو لٹریچر موجود ہے اس کا منشا خیالات اور جذبات پر اثر ڈالنا نہیں بلکہ محض زبان کی تعمیر تھا وہ بھی نہایت ہی اہم کام تھا۔ جب تک زبان ایک مستقل صورت نہ اختیار کرے اس میں خیالات اور جذبات ادا کرنے کی طاقت ہی کہاں سے آئے۔ ہماری زبان کے بانیوں نے ہندوستانی زبان کی تعمیر کر کے قوم پر جو احسان کیا ہے اس کے لیے ہم ان کے مشکور نہ ہوں تو یہ ہماری احسان فراموشی ہوگی۔

زبان بول چال کی بھی ہوتی ہے اور تحریر کی بھی بول چال کی زبان تو میر امن اور للو لال کے زمانے میں بھی موجود تھی۔ انھوں نے جس زبان کی داغ بیل ڈالی وہ تحریری زبان تھی اور وہی اب ادب ہے۔ ادب اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں حقیقت کا اظہار ہو۔ جس کی زبان پختہ، شستہ اور لطیف ہو اور جس میں دل اور دماغ پر اثر ڈالنے کی صفت ہو اور ادب میں یہ صفت کامل طور پر اسی حالت میں پیدا ہوتی ہے جب اس میں زندگی کی حقیقتیں اور تجربے بیان کیے گئے ہوں۔

ترقی پسند مصنفین کا عنوان میرے خیال میں ناقص ہے ادیب یا آرٹسٹ طبعاً اور خلقتاً ترقی پسند ہوتا ہے اگر یہ اس کی فطرت نہ ہوتی تو شاید وہ ادیب نہ ہوتا وہ آئیڈیلسٹ ہوتا ہے اسے اپنے اندر بھی ایک کمی محسوس ہوتی ہے —— داخلیت وہ شے ہے جو جمود، پستی، سہل انگاری کی طرف لے جاتی ہے اور ایسا آرٹ ہمارے لیے نہ انفرادی حیثیت سے مفید ہے نہ اجتماعی حیثیت سے۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ میں اور چیزوں کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کی میزان میں تولتا ہوں۔ ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔

ہماری انجمن نے کچھ اسی طرح کے اصولوں کے ساتھ میدان میں قدم رکھا ہے وہ ادب کو مریضات اور شبابیات کا دست نگر نہیں دیکھنا چاہتا وہ ادب کو سعی اور عمل کا پیغام اور ترانہ بنانے کا مدعی ہے اسے زبان سے بحث نہیں آئیڈیل کی وسعت کے ساتھ زبان خود بخود سلیس ہو جاتی ہے۔ حسن معنی آرائش سے بے نیاز رہ سکتا ہے۔ ہمارا مدعا ملک میں ایسی فضا پیدا کرنا ہے جس میں مطلوبہ ادب پیدا ہو سکے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ادب کے مرکزوں میں ہماری انجمنیں قائم ہوں اور وہاں ادب کے تعمیری رجحانات پر باقاعدہ چرچے ہوں۔

بہرحال جب تک ادب کا کام تفریح کا سامان پیدا کرنا محض لوریاں گا گا کر سلانا محض آنسو بہا کر غم غلط کرنا تھا۔ اس وقت تک ادیب کے لیے عمل کی ضرورت نہ تھی، وہ دیوانہ تھا جس کا غم دوسرے کھاتے تھے مگر ہم ادب کو محض تفریح اور تعیش کی چیز نہیں سمجھتے ہماری کسوٹی

پھر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو عوام میں حرکت اور ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں، کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔

میری تمنائیں

میری تمنائیں بہت محدود ہیں۔ اس وقت سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ ہم اپنی جنگ آزادی میں کامیاب ہوں۔ میں دولت اور شہرت کا خواہشمند نہیں ہوں، کھانے کو بھی مل جاتا ہے۔ موٹر اور بنگلے کی مجھے ہوس نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار بلند پایہ تصنیفیں چھوڑ جاؤں۔ لیکن ان کا مقصد بھی حصول آزادی ہی ہو۔ اپنے دونوں لڑکوں کے لیے بھی کوئی منصوبہ نہیں رکھتا، صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ ایماندار، مخلص، اور مستقل مزاج ہوں۔ عیش پسند اور دولت پرست اور خوشامدی اولاد سے مجھے نفرت ہے۔ میں بے حرکت زندگی کو بھی ناپسند کرتا ہوں۔ ادب اور وطن کی خدمت کا مجھے ہمیشہ دھیان ہے یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دال روٹی اور معمولی کپڑے میسر ہو جائیں۔ ادبی خدمت اور غریبی میں خدا واسطے کا بیر ہے اگر کوئی ادیب موٹا تازہ ہے تو سمجھ لیجیے کہ اس میں سوز نہیں تڑپ نہیں، دل نہیں۔ چراغ کا کام جلنا ہے۔ چراغ وہی لاجواب بجھا ہوگا جو جلتا نہیں۔ میں نے سمجھ لیا ہے کہ ادبی خدمت پوری عبادت ہے۔

سونے روپے سے لدا ہوا آدمی کسی بھی حیثیت سے بڑا نہیں ہو سکتا ہے۔ دولت مند کو دیکھتے ہی آرٹ اور علم کے متعلق اس کے بلند بانگ دعووں کو میں دوسرے کان سے نکال دیتا ہوں۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس شخص نے اس سماجی نظام کی تائید کی ہے جو امیروں کے ہاتھوں، غریبوں کی خون آشامی پر قائم ہے۔ ایسا کوئی بڑا نام مجھے متاثر نہیں کر سکتا۔ جو دولت کا پجاری ہو ممکن ہے کہ میری ناکام زندگی نے میرے جذبات کو اتنا تلخ بنا دیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ جنگ میں کوئی موٹی رقم جمع کرنے کے بعد شاید میں بھی ان جیسا ہو جاتا اور لالچ کا مقابلہ نہ کر سکتا۔ لیکن مجھے فخر ہے کہ فطرت اور قسمت نے میری مدد کی اور مجھے غریبوں کا شریک غم بنا دیا۔ اس سے مجھے روحانی تسکین ملتی ہے۔

ترتیب : عظیم الشان صدیقی

علی حیدر نظم طباطبائی

ولادت : ۱۶ ؍صفر ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲ء)

وفات : ۱۷ ؍محرم ۱۳۵۲ھ (۲۲ مئی ۱۹۳۳ء)

۱۵ ؍صفر ۱۳۵۱ھ (۱۹۳۲ء) کو اکاسی برس کا میرا سن ہوا۔ لکھنؤ میں پرانا حیدر گنج کوٹھی منشی جاتے ولادت ہے۔ منشی فیض علی آزاد میرے والد کے دوستوں میں میرے ہم محلہ تھے۔ ان سے فارسی پڑھی۔ ملا طاہر صرفی سے صرف و نحو عربی کی حاصل کی۔ جناب خاتم الدین سے درس نظامی کی کتابیں پڑھیں۔ ۱۳۰۰ھ میں تشریح الافلاک پر میرا حاشیہ کلکتہ کے مطبع اردو گائیڈ اخبار سے شائع ہوا جسے میں نے مسٹر کرافٹ وزیر تعلیمات کے نام سے معنون کیا تھا۔ اسی زمانے میں مدرسۂ شاہ اودھ میں شاہزادوں کی تعلیم پر میرا تقرر ہوا۔ تقریب الافعال میں نے انہی طلبہ کے لیے تصنیف کی۔ اسے دیکھ کر صدہا کتابیں اسی طرز کی لوگوں نے تصنیف کر کے شائع کرنا شروع کیں۔ کلکتہ سے میں نے دکن میں آ کر اسی طرز کی دو کتابیں ہیئات و مرآت لکھیں جنہیں لوگ کرامات سمجھتے ہیں۔

نظام کالج میں تقرر ہونے کے بعد مدراس یونیورسٹی کے بورڈ آف اسٹڈیز کا ایک رکن میں بھی مقرر ہوا اور میری ہی تحریک سے اردو دیوان مرزا نوشہ کا بی۔ اے کے نصاب میں شامل ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے سارے دیوان کی شرح لکھنا پڑی۔ اس شرح کو دیکھ کر استاذ السلطان سادات العلماء آقا سید علی شوستری نے کہا کہ اردو دیوان کی شرح لکھنا میری رائے میں اس کے لیے سبکی کا باعث ہوا۔ اسے چاہیے تھا کہ عربی کے کسی دیوان کی شرح لکھتا۔

یہ قول مجھ تک پہنچا اور میں نے امرؤ القیس کے دیوان کی بھی شرح اردو میں لکھ ڈالی۔ یہ عرب کا ملک الشعراء اسلام سے پہلے کا شاعر ہے۔ میں یہی سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں شرحیں لکھ کر میں نے اپنی زبان کو بڑی رونق دی۔

حیدر آباد کے مدرسۂ دار العلوم میں عربی و فارسی پڑھنے والے طلبہ ہمیشہ سے پنجاب یونیورسٹی میں فاضل و عالم کے امتحانات دیا کرتے تھے۔ پنجاب سے مدرسے میں سوالات آجایا کرتے تھے۔ لارڈ کرزن کے عہد فرمانروائی میں ملک ہند کی تعلیمات کا دورہ کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ پنجاب یونیورسٹی سے حیدر آباد کا تعلق نہ رہا۔ یہاں یہ خبر جب پہنچی کہ امتحان دینے کا زمانہ بہت قریب تھا۔ طلبہ سال بھر کی محنت کا صلہ پانے کے مستحق ہو چکے تھے۔ میں نظام کالج میں تھا۔ مجھے دار العلوم کے مدرسے سے بس اتنا ہی تعلق تھا کہ برسوں سے ہر سال وہاں کے اعلیٰ درجوں کا امتحان لینا میرے ہی ذمہ تھا۔ اس سال بھی میں امتحان لے چکا تھا اور اسی امتحان کے بموجب جو طلبہ پنجاب یونیورسٹی کے فاضل و عالم کے امتحان میں شریک ہونے والے تھے ان کا انتخاب بھی ہو چکا تھا۔ مجھے ان طلبہ کی مایوسی پر نہایت افسوس ہوا۔ میں نے نظام کالج میں ڈاکٹر اگھور ناتھ سے یہ ذکر کیا کہ ہم لوگ ان طلبہ کا امتحان یونیورسٹی سے بہتر لے سکتے ہیں۔ خطابات بھی دے سکتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ڈاکٹر اگھور ناتھ، ڈاکٹر نیشی کانتا، محمد عبد المنعم صاحب ایک اعلیٰ درجہ کے

طالب علم اس بات پر آمادہ ہو گئے۔ حیدر آباد کے مشاہیر علما کا ایک بورڈ مقرر کر کے امتحان کا اشتہار دے دیا۔ سوالات مرتب ہوئے اور ہم لوگوں کی نگرانی میں چھاپے گئے۔ غرضیکہ پنجاب یونیورسٹی کے امتحان سے بڑھ کر یہ امتحان ہوا اور ان طلبہ کو آج تک اس امتحان پر فخر و ناز ہے۔

اس سے پیشتر مدراس یونیورسٹی میں فارسی و عربی کے امتحانات اور "دبیر" و "افضل العلما" کے خطابات وغیرہ نہ تھے۔ یہ بھی میری کوشش سے جاری ہوئے ہیں۔

جاری تو ہو گئے لیکن کئی برس کے بعد رجسٹرار کا ایک مراسلہ میرے نام آیا کہ فلاں تاریخ سینٹ ہوس میں مجلس شوریٰ میں آ کر اس بات کا فیصلہ کر دیا چاہیے کہ چھ برس سے برابر فارسی و عربی کے امتحانات کا نصاب "دبیر" و "افضل العلما" کے طلبہ کے لیے یونیورسٹی کے کلنڈر میں شائع ہو رہا ہے لیکن آج تک کسی نے شریک امتحان ہونے کی درخواست نہیں دی۔

حیدر آباد میں عربی و فارسی کا جس قدر چرچا تھا اس سے میں واقف تھا۔ درخواست نہ دینے کی وجہ بھی فوراً میں سمجھ گیا۔ وہ یہ کہ مدراس والوں نے عربی و فارسی کے طلبہ کے لیے "افضل العلما" اور "دبیر" وغیرہ کے خطابات تو تجویز کیے مگر شرط یہ لگا دی کہ انگریزی میں میٹرک پاس ہونا ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے۔ یہ شرط پنجاب میں نہ تھی۔ میں نے مصمم ارادہ کیا کہ حقیقتِ امر کو مجلس کنگاش کے آگے عرض کر کے میٹرک کی شرط کو موقوف کرانا چاہیے۔

مدراس یونیورسٹی کی مجلس نصاب کے صدر اس زمانہ میں سر عبد الرحیم صاحب تھے۔ مجلس شوریٰ ہونے سے دو دن پیشتر میں جناب ممدوح کی کوٹھی پر گیا۔ میں نے پوچھا کہ جناب نے کیا فیصلہ اس امر کا تجویز فرمایا ہے؟" انھوں نے فرمایا کہ "عربی و فارسی کے امتحان میں جب کوئی آتا ہی نہیں تو سوا موقوف کر دینے کے اور کیا فیصلہ ہو سکتا ہے؟" اب میں نے عرض کیا کہ "حیدر آباد میں متنبی و شرح چغمینی و حماسہ و معلقات و اسرار البلاغہ و درۂ نادرہ و عرفی و ظہوری و اخلاقِ ناصری و جلالی وغیرہ کے درس جابجا ہو رہے ہیں۔ میٹرک انگریزی کی شرط انھیں امتحان میں آنے کو مانع ہے اور پنجاب یونیورسٹی میں یہ شرط نہ تھی۔ ہر سال سیکڑوں طلبا فاضل و عالم و مولوی و منشی کے امتحانوں میں کامیاب ہوا کرتے تھے۔"

اسی طرح شفیق مکرم مولوی خلیل اللہ خاں صاحب کے پاس بھی گیا۔ یہ مدراس کارپوریشن کے صدر، مجلس نصاب کے رکن رکین تھے۔ کرم فرما نواب عبد الرحمٰن خاں صاحب شاکر وغیرہ سے بھی اس باب میں گفتگو کی۔ ان سب صاحبوں نے یہی فرمایا کہ خوب ہوا۔ آپ نے پہلے سے ذکر کر دیا ورنہ عربی و فارسی کے امتحانات مدراس یونیورسٹی سے اڑ گئے ہوتے۔ دو دن بعد سینٹ ہاؤس میں ارکان مجلس نصاب جمع ہوئے۔ مسئلہ پیش ہوا۔ میٹرک کی شرط آسانی سے اڑ گئی اور میرے مجموعۂ اشعار کا پہلا حصہ "نظم طباطبائی" مدراس کے بی۔ اے اور ایم۔ اے کے کورس میں داخل ہوا۔

اعلیٰ حضرت غفران مکان کے جشن جوبلی کی تاریخ نواب فصاحت جنگ جلیل نے دو جلدوں میں لکھی تھی۔ وہ تاریخ نواب صاحب بہادر دام اقبالہٗ کی دیوانی کے زمانہ میں پیشگاہ خسروی سے اس فرمان کے ساتھ بھیجی گئی کہ مولوی حیدر طباطبائی کو یہ تاریخ دے دی جائے کہ نظرِ ثانی کر کے بھیجیں۔ اس تاریخ دکن کے متعلق میں نے بڑا کام یہ کیا کہ حیدر آباد افیرز کی سب جلدیں اول سے آخر تک پڑھیں اور مضامین ضروری کا انتخاب

گیا۔ سنتا ہوں کہ یہ تاریخ شائع ہونے والی ہے۔ ایک بڑا گلہ میں کرتا ہوں لیکن باللہ العظیم بالکل صحیح ہے یعنی فارسی و اردو والے عروض کو نہ سمجھتے تھے۔ اس فن کو الجھا کے رکھ دیا تھا۔ یہی حال قافیہ کا بھی تھا۔ میں نے تلخیص عروض و قافیہ لکھ کر تمام گتھیوں کو سلجھایا اور حشو و زوائد کو چھانٹ دیا۔

۱۳۳۵ھ میں شاہزادگانِ والاجاہ دام اقبالہما کی تعلیم ادب پر میرا تقرر ہوا۔ اس خدمت گزاری کا شرف چار برس مجھ کو حاصل رہا۔

۱۳۳۶ھ میں دارالترجمہ کی اصلاح زبان و طرزِ بیان کی خدمت بھی مجھ سے متعلق ہوئی۔ تین سال یہاں رہ کر کبر سنی کے سبب سے وظیفہ ہو گیا۔ وظیفہ کے چند ماہ کے بعد اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہ نے از سرِ نو دارالترجمہ میں میرا تقرر فرمایا۔ چھ برس تک میں نے پھر ترجموں کی اصلاح کا کام بھی کیا اور تاریخِ طبری کی ایک جلد کا ترجمہ بھی کیا۔ صلہ جس کا مجھ کو تنخواہ کے علاوہ عنایت ہوا اور یہ جلد دارالطبع میں چھپ گئی۔

گو اب میں وظیفہ لے کر دارالترجمہ سے الگ ہوں مگر دارالترجمہ نے مجھے نہیں چھوڑا۔ اصطلاحات علمی کی کمیٹیوں میں روزانہ مجھے جانا پڑتا ہے۔ سرکار فیس دیتی ہے اور مجھ سے کام لیتی ہے۔

دادا بھائی نوروجی

پیدائش —— ۴ ر ستمبر ۱۸۲۵ء   وفات —— ۳۰ ر جون ۱۹۱۷ء

زمانۂ طفولیت کی اس وقت تک مجھے ایک بات یاد ہے۔ میرے ذہن نشین نہ جانے کس طرح ہو گیا تھا کہ وہ لوگ میرے ساتھ ہمدردی سے جہاں کہیں میں جاتا تھا مجھے خیال ہوتا تھا کہ وہ میرے ساتھ رہتا ہے۔ اس خیالی ہمدردی کے گمان سے میرے بھولے دل کو اس وقت بہت تسکین ہوتی تھی اور اب تک تشفی ہوتی ہے۔ دوسری بات کہ بچپنے کی اپنی ماں کی زبانی معلوم ہوئی وہ یہ ہے کہ جب کوئی ہم عمر بچہ مجھے سخت سست کہتا تو میں اس کو جواب ترکی بہ ترکی دینا ہرگز گوارا نہ کرتا بلکہ صرف یہ کہہ دیتا کہ بد زبانی کرنے سے تمہاری ہی زبان خراب ہوگی، میری عزت میں فرق نہیں ہو سکتا۔

لڑکپن میں مجھے گلی ڈنڈے سے بہت شوق تھا اور میں اس میں مشتاق بھی ہو گیا تھا۔ جس وقت کہ دوپہر کو آدھ گھنٹے کے لیے تعلیم سے فراغت ملتی میں اسی کھیل میں جا لگتا اور گرمی اور دھوپ کی تپش کے مشغول ہو جایا کرتا تھا۔ شہر کے مدرسے میں جب کوئی شخص حیثیت کا تماشائی یا افسر معائنہ کے لیے آتا تو میں بطور نمائش پیش کر دیا جاتا۔ مجھے پہاڑے وغیرہ خوب یاد تھے اور زبانی حساب کرنے میں بھی بہت ملکہ تھا۔ یہ لوگ کم سنی اور قبول صورت پا کر مجھ پر بہت متوجہ ہوتے تھے۔ میری باتوں کو شوق سے سنتے اور بار بار آفرین کہتے تھے۔

میرے خوبصورت اور خوش اندام ہونے کی وجہ سے لوگ مجھ سے بہت انس کرتے تھے۔ شادی بیاہ کے جلسوں میں بھی ہر شخص میری طرف متوجہ ہو جاتا تھا اور مجھ کو ایسے موقعوں پر ہمیشہ اوروں کی شوخ پوشاک پہنائی جاتی تھی۔ میرے والدین اور ان کے عزیز و بیگانے مجھ کو محبت سے پیارا فرنگی بچہ کہہ کر پکارتے۔ مجھے اس وقت اس کا شبہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ واقعی میری زندگی کا بہترین حصہ ولایت ہی میں صرف ہوگا اور مجھ کو انگریزی لباس پہننا ہوگا۔ کئی اور صرف ایک واقعہ کی وجہ سے یاد رہ گئے۔ ایک مرتبہ مجھے زری کی درباری پوشاک پہنا کر ایک شاہی جلسے میں بھیجا گیا۔ اس وقت میرے دل میں خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اب میں بھی درباری ہوں۔

لڑکپن میں مجھے شاہنامہ پڑھنے کا اور دوسروں کو سنانے کا بہت ذوق تھا۔ اس کتاب کے بار بار پڑھنے اور سنانے سے میرے خیالات اور چال چلن پر بہت اثر پڑا۔

بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتیں نہایت نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہیں۔ انیسویں صدی کے آغاز میں بمبئی میں ایک سوسائٹی ہندوستانیوں میں تعلیم کا چرچا پھیلانے کی غرض سے قائم ہوئی تھی۔ اس سوسائٹی کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک ابتدائی اسکول قائم ہوا جس میں کہ انگریزی اور دیسی زبانوں کی تعلیم علیحدہ علیحدہ دی جانے لگی۔

میرے دیہاتی اسکول کا مدرس اس سوسائٹی کے اغراض سے پورے طور پر واقف نہ تھا۔ اس کو صرف اتنا معلوم تھا کہ اس اسکول کے اغراض سے سرکار کو بھی ہمدردی ہے۔ اس خیال سے اسے اپنے لڑکے کو اس اسکول میں بھیجنے کی جرأت ہوئی۔ اس نے میری والدہ سے بھی مجھے وہاں تحصیل علم کے لیے بھیجنے کی سفارش کی۔ یہ ایک ایسا نازک معاملہ تھا جس پر کہ میرے بننے اور بگڑنے کا دارومدار تھا۔ اگر والدہ مجھے وہاں

پیچھے میں تامل کریں تو میں کندۂ ناتراشیدہ رہ کر توہمات میں پڑا رہتا۔ اس وقت تعلیم مفت دی جاتی تھی۔ اگر اس زمانہ کی طرح سے اس قدر زیادہ فیس لی جاتی تو شاید میری والدہ بوجہ اس خرچ کے متحمل نہ ہو سکنے کے مجھے وہاں نہ بھیج سکتیں۔ یہ اسی زمانہ کا خیال ہے کہ میں ہمیشہ مفت تعلیم کی تلقین کرتا رہا ہوں۔ میں ہمیشہ یہ اصول گوش گزار کرتا ہوں کہ ہر فرد بشر کے لیے عام اس سے کہ وہ غریب ہے یا امیر اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے اسباب مہیا ہونے چاہئیں۔

پاک منشی کا خیال مجھے پندرھویں سال سے پیدا ہو گیا۔ اسی عمر میں میں نے ایک مرتبہ ایک خاص شخص پر بدزبانی سے پرہیز کرنے کی قسم کھائی تھی اور یہ واقعہ مجھ کو اب تک اس طرح یاد ہے گویا کل ہی گزرا تھا۔ اسی طرح جیسے جیسے تعلیم کی جلا مجھ پر زیادہ ہوتی گئی میں بڑے اطوار و عادات یکے بعد دیگرے ترک کرتا گیا اور ہمیشہ اپنے ارادے پر مستقل رہا۔ جو بات چھوڑ دی کبھی اس کا دوبارہ خیال بھی دل میں جمنے نہ دیا۔

شروع میں حسب عادت قبل کھانے کے میں تھوڑی سی شراب ضرور پیتا تھا۔ ایک روز گھر میں اتفاقاً شراب مطلق نہ رہی مجھے اس کی خریداری کے لیے باہر دکان پر جانا پڑا۔ یہ میرے حق میں فال نیک ہوئی۔ مجھے سڑک پر سے اپنے ہاتھ میں خود شراب لاتے ہوئے سخت ندامت اور شرمندگی محسوس ہوئی۔ دل میں خیال ہوا کہ بری چیز ہے۔ بس یہ خیال کافی تھا اس دن سے آج تک کبھی شراب کو منہ نہیں لگایا۔

جس وقت کہ میں اسکول میں داخل ہوا تھا وہاں دو انگریز معلم تھے۔ ایک علم ادب کی تعلیم کی غرض سے اور دوسرا ریاضی کے لیے۔ ان دونوں میں کسی وجہ سے کچھ چشمک ہو گئی۔ یہاں تک کہ کچھ زمانے کے بعد دونوں شعبوں کی تعلیم علیحدہ علیحدہ ہونے لگی۔ ایک معلم بہت سخت تھا۔ اس کو ادب آداب کا بہت خیال تھا۔ ذرا سی گستاخی اس کو ناگوار گزرتی تھی۔ دوسرا بہت لاپروا تھا۔ مجھے دوسرے ہی سے سابقہ پڑا کل طالب علموں کو مطلق آزادی حاصل تھی جو چاہتے کرتے اور جو نہ چاہتے نہ کرتے۔ لیکن مجھے بذات خود بیکار بیٹھنے سے نفرت تھی میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا۔ سبق نہ تو روزانہ مقرر کیا جاتا تھا اور نہ وہ باقاعدہ کبھی سنا جاتا تھا میں اپنے تئیں مشغول رکھنے کے سامان تلاش کرتا رہتا تھا میری قوت حافظہ بہت اچھی تھی جو قصہ کہیں ایک مرتبہ سن لیتا مجھے اس کا مطلب ہی نہیں بلکہ الفاظ تک یاد رہ جاتے تھے۔

اس طرح مجھے صدہا قصے یاد ہو گئے۔ اسکول میں میرا بیکاری کا شغل یہی رہا کرتا تھا میں اپنے ہم مکتبوں کے مجمع میں قصے کہا کرتا تھا بعض اوقات یہاں تک نوبت پہنچتی تھی کہ طلبا درجوں سے نکل کر تمام دن میرے قصے سننے میں مشغول رہتے اور کوئی پرسان حال نہ ہوتا۔ اس کا صریحی اثر یہ ہوا کہ ایک سال میری تعلیم کا مفت ضائع ہوا۔ لیکن اس تضیع اوقات سے اتنا تو ضرور ہوا کہ ہم کھیلوں میں مشتاق ہو جانے کے اور یہ جو قوت تقریر کے میرے ہم مکتب مجھے اپنا سرغنہ سمجھنے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھ کو اپنی غیر معمولی لیاقت کا یقین ہو گیا اور میں مجھے مشکل کے وقت میں اس سے کام لے سکتا ہوں کیونکہ ایسی حالتوں میں عموماً ایسا خیال پیدا ہو جایا کرتا ہے۔

مجھے بخوبی یاد ہے کہ ایک مرتبہ اسکول کے امتحان میں ایک طالب علم نے پہاڑے وغیرہ زبانی یاد کر کے اول انعام حاصل کر لیا جس کو میں اپنا حصہ سمجھا ہوا تھا۔ لیکن تقسیم انعام کے وقت جب مقررہ کتابوں کے علاوہ ذاتی لیاقت کی آزمائش کے کچھ سوالات پوچھے گئے تو یہ حضرت خاموش رہ گئے اور بغلیں جھانکنے لگے۔ میں نے بڑھ کر یکے بعد دیگرے سب کے جواب دے دیے۔ ایک معزز انگریز اس جلسے میں موجود تھا۔ اس نے مجھے اپنے جیب خاص سے انعام عطا فرمایا۔ مسز پوسٹن بھی اس موقع پر تشریف فرما تھیں۔ آپ نے اپنی کتاب معروف بہ مغربی ہندوستان (ویسٹرن انڈیا) میں اس واقعہ کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔

انگریزی اور دیسی زبانوں کے اسکولوں کی اعلیٰ تعلیم سے فارغ ہو کر کالج کی تعلیم حاصل کرنے کی فکر ہوئی۔ اسکول میں تو فیس نہ تھی۔ یہاں فیس کی ضرورت تھی۔ اس کی مقدرت نہ تھی مگر یہاں بھی خوش قسمتی شاملِ حال ہوئی۔ ایک اچھا وظیفہ مل گیا جس کی امداد سے میں سلسلۂ تعلیم قائم رکھ سکا۔ کتب بینی کا شوق مجھے اوائل عمر سے تھا۔ اس وقت میں شاہنامہ فردوسی اور ایک گجراتی زبان کی کتاب جس کا نام "فرائض پیروانِ زردشت" تھا بہت دیکھا کرتا تھا۔ انہی دو کتابوں نے میرے اخلاق پر بہت اثر ڈالا۔

پاکیزگی، راست بازی اور خوش خلقی کے پاک سبق مجھے انہی کتابوں سے ملے۔ لیکن انگریزی علم و ادب سے مجھ کو زیادہ اُنس رہا اور اسی سے کام بھی زیادہ رہا۔ جس کتاب نے کہ میرے خیالات کو پختگی بخشی وہ واٹ صاحب کی تصنیفات سے تھی۔ اس کتاب کا نام "امپرومنٹ آف مائنڈ" (ترقی دماغ) تھا۔ جہاں ایک لفظ میں مطلب ادا ہو سکتا تھا میں کبھی دو لفظ استعمال نہ کرتا۔ میری طبیعت اختصار پسند واقع ہوئی تھی۔ تحریر میری صاف اور سیدھی سادی ہوتی تھی۔ شاعرانہ جذبہ پردازی، استعارہ اور بناوٹ سے مجھے ہمیشہ نفرت رہی۔ روزمرہ کے الفاظ میں مافی الضمیر ادا کر دینے پر اکتفا کرتا رہا۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ خیالات کی پختگی بھی بڑھتی گئی۔ اس امر کا میرے دل پر بہت اثر تھا کہ میں غرباء کی مدد سے تعلیم پا رہا ہوں۔ میں خود بھی مفلس ہوں، یہاں تک کہ مجھے ذاتی درسی کتب بھی میسر نہ تھیں۔ ان کے لیے بھی میں اپنے ایک رئیس ہم جنس کا احسان مند تھا۔ یہ رئیس کاما خاندان سے تھے۔ اس خاندان سے بعد کو بھی مجھے بہت تعلق اور اُنس رہا۔ یہ خیال میرے دل میں ہمیشہ جاگزیں رہا اور روز بروز قوی ہو گیا کہ چونکہ میں عوام کے دستِ کرم سے مستفید ہوا ہوں لہٰذا مجھ کو ان کا یہ احسان کبھی نہ بھولنا چاہیے۔ مجھے لازم و واجب ہے کہ اپنی زندگی ملکی خدمات کے لیے وقف کر دوں۔ حسنِ اتفاق سے اسی زمانہ میں مجھے کلارکسن صاحب کی کتاب موسومہ "تاریخ تجارت غلاماں" اور ہاورڈ صاحب کی کارنامۂ حیات جو کہ انسانی ہمدردی کے لیے مشہور رہی ہے پڑھنے کا موقع ملا۔ ان کے پڑھنے سے میری ہمت دوبالا ہوئی اور یہ بات میرے دل میں پورے طور سے حاوی ہو گئی کہ اپنے ملک کی خدمت میں کوئی موقع اور محل فروگذاشت نہیں کروں گا۔

جب میں کالج کے اعلیٰ مراتب طے کر چکا تو سر ارسکائن پیری صاحب نے جو اس وقت سررشتۂ تعلیم کی کمیٹی کے پریذیڈنٹ تھے تجویز کیا کہ میں ولایت بغرضِ تعلیم قانون بھیجا جاؤں۔ صاحب موصوف مجھ سے اس قدر خوش تھے اور مجھ پر اس قدر مہربان تھے کہ آپ نے آدھا خرچ اپنی جیبِ خاص سے عطا فرمانے کا وعدہ کیا بشرطیکہ باقی نصف خرچ میرے بزرگ اور خاندان کے لوگ دے دیں۔ میرے بزرگوں کو کسی غلط فہمی کی وجہ سے شبہ ہو گیا تھا کہ ولایت میں پادری لوگ مجھے عیسائی بنا دیں گے۔ برسوں کے بعد جب مجھے سر ارسکائن پیری صاحب سے نیاز حاصل ہوا اس وقت صاحب موصوف کونسل کے ممبر تھے۔ اثنائے گفتگو میں آپ نے فرمایا کہ بہتر ہوا تم اس وقت ولایت نہ جا سکے۔ تم کو اس حالت میں یہ اُنس اپنی قوم و ملک سے نہ پیدا ہوتا اور تم میں یہ جوش قائم نہ رہتا۔

اب مجھے یہ فکر لاحق ہوئی کہ حصولِ معاش کا کوئی ڈھنگ نکالوں۔ بمبئی کے سررشتۂ تعلیم کے سیکرٹری صاحب میرے بڑے کرم فرما تھے۔ انہوں نے دفتر سیکرٹریٹ میں میرے لیے ایک جگہ کی سفارش کر دی۔ میں نے اس کو بہت غنیمت سمجھا۔ لیکن چند امور ایسے درپیش آ گئے کہ میں اسے قبول کرنے سے مجبور رہا۔ شکر کا مقام ہے کہ اس سے انکار کر دینا میری آئندہ زندگی کے حق میں بہت مفید ثابت ہوا۔ اس جگہ کے قبول کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ میں عمر بھر ہمیشہ کے لیے سرکاری عہدوں پر بندھا رہتا۔

چھ سات برس قبل ولایت جانے کے جہاں کہ میں پہلی مرتبہ تجارتی اغراض سے کاما اینڈ کو کی طرف سے عین لندن میں ایک کاروبار کی بنا ڈالنے گیا تھا، میں اور میرے چند ہم عمر مختلف سوشل، تعلیمی، پولیٹیکل اور مذہبی اصلاحات میں دل و جان سے ساعی رہے۔ یہ زمانہ اس انقلاب کا زمانہ تھا جب بمبئی کی سوسائٹی کا رنگ بدل رہا تھا۔ چاروں طرف تعلیم نسواں، عورتوں کی آزادی، سوشل کانفرنس کے انعقاد اور طلبا اور علم دوست اصحاب کے لیے علمی اور سائنٹفک کتب خانہ جاری کرنے کی کوشش میں ہر ایک فہمیدہ نوجوان مشغول تھا۔ دیسی زبانوں کی ترقی، صغر سنی کی شادی کی رسم کو مفقود کرنا اور ازدواج بیوگان کے جاری کرنے کی بھی ہر تعلیم یافتہ نوجوان کو فکر تھی۔ چند امور اصلاح طلب میں یہ نوجوانوں کا گروہ بزرگوں کی ہمدردی سے بھی محروم رہ گیا تھا لیکن سر ارسکائن پیری اور پروفیسر پیٹن صاحب وغیرہ کی اخلاقی امداد اور ہمدردی نے ہم لوگوں کی ہمت اور جرأت دوبالا کر رکھی تھی۔ یہ سب ایلفنسٹن کالج کی تعلیم کا پہلا اثر تھا۔

بے شک اگر میں اپنی زندگی کے اس حصے پر اپنے دل میں ناز کروں تو بے جا نہ ہو گا کیوں کہ مجھے پورا اطمینان ہے کہ میں اپنے فرائض کی کوشش اصلی سے انجام دیتا رہا۔ فی الحقیقت عنفوان شباب کا زمانہ میری رائے میں بہت اچھے کام میں صرف ہوا۔ جب میں اس زمانے کا خیال کرتا ہوں تو مجھے ایک گونہ مسرت ہوتی ہے۔

میرے آغاز شباب کا سب سے بڑا واقعہ یہ ہے کہ مجھے علم ریاضی اور تعلیم طبیعی کی پروفیسری پر مامور کیے جانے کا اعزاز بخشا گیا۔ میں پہلا ہندوستانی تھا جس کو ایلفنسٹن کالج کا پروفیسر ہونے کا فخر نصیب ہوا۔ میں اپنے خیال میں اس رتبہ کو بہت عزیز سمجھتا ہوں اور اس خطاب کو ہر اعزاز سے برتر جانتا ہوں۔ پروفیسری کے خطاب سے مجھ کو اب تک خوشی ہوتی ہے اور اکثر میرے ہم عمر مجھے پروفیسر دادا بھائی کہتے ہیں۔ جو پودا کہ میں نے آغاز جوانی میں بویا تھا اس کے کافی ثمر سے میں اب بہرہ یاب ہو رہا ہوں۔ یعنی کہ اہل ملک مجھے نہایت اعزاز، انس اور محبت سے یاد کرتے ہیں۔ لوگوں کا میری نسبت کچھ ہی خیال کیوں نہ ہو اور چاہے وہ مجھ پر غرور کا الزام لگائیں لیکن اصلیت یہ ہے کہ میرے دل میں ہندوستان کے عظیم الشان بزرگ کے خطاب سے نہایت ہی مسرت ہوتی ہے۔ بلکہ یہ خطاب جس سے کہ میرے ہم وطنوں کی دلی ہمدردی اور شکر گزاری کا اظہار ہوتا ہے اور جس کا میں مستحق نہیں ہوں میرے نزدیک میری مدت العمر کی کوششوں کا اچھا ثمر ہے۔

ایک مرتبہ میرے ایک دوست نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہاری گزشتہ زندگی کا تجربہ تمہیں ایک مرتبہ پھر حاصل ہو؟ میں نے جواب دیا ”بے شک۔“ مضمون تمام ہوا۔ کامیابیوں اور نیکیوں کے آ جانے پر اس سلسلے کا خاتمہ کر دینا مناسب ہے۔ لیکن اس موقع پر ایک پاک روح کا ذکر نہایت ضروری ہے گو کہ بجائے مقدم ہونے کے آخر میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔ میری مراد اپنی والدہ سے ہے۔ میرے بچپن ہی میں والد نے انتقال کیا۔ والدہ نے اپنی تمام آسائشوں کو خیرباد کہہ کر میری پرورش اور تربیت میں کوشش کی۔

میری پرورش کے لیے اس نے سخت جفاکشی سے کام لیا گو میری ماں تعلیم یافتہ نہ تھیں اور وہ انتہائے محبت سے مجھ پر فدا تھیں پھر بھی وہ مجھ پر سخت تنبیہ رکھتی تھیں کہ میں بری صحبتوں اور قبیح افعال میں نہ پڑ جاؤں۔ وہ ایک عقل مند عورت تھی۔ قریب و جوار کے لوگ مختلف مسئلوں پر اس سے صلاح و مشورہ کو غنیمت سمجھتے تھے۔ اس نے میرے ہمراہ تعلیم نسواں میں کوشش کی اور اکثر قومی اصلاح کی کوششوں میں وہ بھی میرے ساتھ رہیں حالانکہ چاروں طرف اختلاف کا طوفان زور پر تھا۔ الغرض مجھے انہوں نے ایسا شخص بنا دیا ہے کہ آپ اس حالت میں دیکھتے ہیں۔

ہوش بلگرامی

پیارا وطن

میں اس سرزمین (بلگرام یو۔ پی) میں پیدا ہوا جو علامہ سید مرتضیٰ کا بھی وطن تھا جو "تاج العروس" (عربی لغت) کی بدولت فرشتۂ لغت کہلائے اور جن کو عظمتِ رضواں نے غیر فانی بنا دیا۔ جہاں کے علامہ سید عبدالجلیل "تبحہ سیارہ" بن کر چمکے جنہوں نے سات شاہیاں دیکھیں اور سات ہی سلطنتوں کی "سفارت" کے فرائض انجام دیئے۔ جہاں کے میر غلام علی آزاد "حسان الہند" کے لقب سے مشہور ہوئے، جنہوں نے ماثر الکرام لکھی، "خزانۂ عامرہ" تالیف کی، ید بیضا کا قلمی معجزہ دکھایا، "سبحۃ المرجان" کے ایک ایک دانہ پر اللہ کا نام جپا۔ "شمامۃ العنبر" کی خوشبوؤں سے کائنات کو معطر کیا اور عربی زبان میں سب سے پہلی مثنوی لکھ کر اہلِ عرب کو دنگ کر دیا۔

میں بدنصیب اس زمانہ میں پیدا ہوا جب ہندوستان کے اس قرطبہ (بلگرام) پر نکبت و فلاکت کے آثار نمایاں ہو چکے تھے، صرف چند گھر ایسے تھے جن میں خوشحالی کی مسرتیں دکھائی دیتی تھیں ورنہ عوام کو پیٹ بھر کر روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ نہ جھوگیا پور کے دھوم دھڑکے رہے تھے نہ آصف پور کے ہارمونیم ماسٹر (سید محمد جواں) اور دو تریا کے مرثیہ خواں (سید محمد عابد) سب نے یکے بعد دیگرے امام باڑہ کی مقدس سرزمین کو آباد کیا۔ موتوں نے آبادیاں ویرانوں میں منتقل کر دیں۔ محلے کے محلے کھنڈروں میں تبدیل ہو گئے۔ ان باغوں پر خزاں آ گئی جہاں ساون میں جھولے پڑتے تھے۔ تالابوں میں آم بھیگتے تھے، اعزہ و احباب کھاتے بھی تھے اور گٹھلیوں سے چھیڑ چھاڑ بھی کرتے رہتے تھے۔

اگرچہ کمسن تھا مگر وطن کے ادبار کا احساس دل میں لیے ہوئے رہتا تھا۔ مجبوری کا نام شکر ہے اس لیے یا تو مکتبی تعلیم میں میاں جی کی قمچیوں سے بیتاب ہو کر رہتا تھا یا اسکول ماسٹر کی بید پر نظر رہتی تھی یا گھر کی تنہائی میں تصورات کی دنیا بسا لیتا تھا۔ اس ناگفتنی ماحول میں نہ معلوم کس طرح کچھ لکھ پڑھ بھی لیا۔ والد مرحوم کی شفقتیں دور رہتی تھیں، اعزا کی محبتوں سے بیگانہ اور احباب کی ذہنیتوں سے دور دور رہتا تھا۔ جہاں کی سرزمین کسی زمانہ میں علما و فضلا ہی پیدا کرتی تھی وہاں نہ تعلیم و تربیت کا چرچا تھا نہ مذہب کی روح سے کسی کو واسطہ۔ نہ پیغمبر کی سیرت پر کوئی عمل کرنے والا تھا، نہ حسین کی شہادت کی غرض و غایت کوئی سمجھتا تھا اور نہ بزرگوں کی تہذیب کا کوئی پابند نظر آتا تھا۔ رسم و رواج ان کا مذہب اور توہمات ان کا مشرب ہو گئے تھے اور جن کے جو نتائج ہوا کرتے ہیں ان میں شدت سے مبتلا تھے۔ ایسی فضا کو ہوش کی سیمابی فطرت کب تک برداشت کرتی۔ آخر چند برس میں اس شعر کی صداقت پر لبیک کہتا ہوا وطن کو خیرباد کہا ۔

ہم نے جب وادیِ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

ماں کو چھوڑا، بہنوں سے جدا ہوا اور بھائی کو حسرت سے دیکھا اور پہلا سفر قنوج سے ہوتا ہوا کانپور کا کیا۔ وہاں نہ کسی سے جان نہ پہچان۔ سرائے میں بستر لگایا۔ چند دن سے کھانا بچایا، آخر پہنچے باغ میں ایک ہمدرد پیدا کر ہی لیا اور ایک کمپنی کی ملازمت قبول کر لی۔ کام ایسا کیا کہ بن گیا

اور کمپنی نے اپنی سوداگری شاخ کا منیجر بنا کر بھیج دیا، جہاں قصائیوں سے سابقہ پڑا۔ پنجابیوں سے واسطہ ہوا، جو ڈھوروں کی کھال کھینچتے تھے، جانوروں کا گوشت اور ہڈیاں بیچتے تھے جو زراعت کو جاتے تھے اور دبے کو پہنچاتے تھے جہاں کے کمیلے میں جانوروں کو بے رحمی سے ذبح کیا جاتا تھا۔ اس ماحول نے طبیعت اچاٹ کر دی اور وہاں سے بھی رخصت ہوا جہاں آباد اور دل کا قلعہ ہے جہاں کے پان بہت لطیف اور نرم ہوتے ہیں جہاں پان والیاں دوکانوں کی زینت ہوتی ہیں، جہاں برٹش فوج کی چھاؤنی تھی جس کی آب و ہوا اچھی تھی دیر تک۔ آخر دکن کی طرف پھر پلٹا اور ڈاکٹر سید علی بلگرامی جو اس وقت حیدرآباد میں مقیم تھے، نے ہونہار سمجھ کر اپنی نگرانی میں لے لیا۔ ان کی علمی صحبت میں کچھ تیار ہوا ان کے تمدن ہند کا مسودہ تیار ہوا مگر ع

روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

کا مصداق ہو گیا۔ صرف چند ماہ ہی ان کی عالمانہ صحبت میں گزرے تھے کہ وہ بلگرام کے امام باڑہ میں دفن ہو گئے اور میں تھوڑے ہی عرصہ بعد مسز سید علی بلگرامی کے ہمراہ حیدرآباد پہنچ گیا۔

میرا اسلامی مسلک

میں چونکہ ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا تھا اس لیے جب میری عمر چار برس چار سال کی ہوئی تو تسمیہ خوانی کی رسم ادا کی گئی۔ بازار سے مٹھائی پر فاتحہ دلایا گیا اور میرا استاد بیٹھا کر قرآن کی ایک آیت تلاوت کرا دی گئی۔ پہلے استاد تو خود میرے والد ہوتے تھے اس کے بعد مکتبی تعلیم چھپر کے نیچے بوریہ پر بیٹھ کر شروع ہوئی۔ مولوی شرافت علی نے قرآن طوطوں کی طرح رٹوایا۔ دستور الصبیان پڑھائی۔ گلستان و بوستان کے بھی اخلاقی سبق دئے اور آمد نامہ کی بھی نحوی ترکیبوں سے روشناس کرایا لیکن ان سے پڑھتا بھی رہا، ان کے ہر سال پیدا ہونے والے بچوں کو کھلاتا بھی رہا ان کی بطوں کو چراتا بھی رہا مقررہ تنخواہ کے علاوہ ہر عید پر ایک روپیہ بھی نذر کرتا رہا اور ہر تقریب میں مولوی صاحب کا حق استادی بھی ادا کرتا رہا۔ اس کے باوجود کبھی کبھی میری فطری شرارتیں ایک چمڑے کے تسمے سے کم کی جایا کرتی تھیں۔

مکتبی تعلیم کے بعد جب اسکول میں داخل ہوا تو پنڈت بشیشر ناتھ کا ایسا استاد ملا۔ پنڈت دیپ نرائن کے طریق تعلیم نے کسی ساتھی سے پیچھے نہ رہنے دیا۔ مولوی مدن کی خاموش شاعری کی تقلید میں کبھی کبھی شعر موزوں کر لیا کرتا تھا۔ منشی تلوار پرشاد ڈرل ماسٹر نے ورزش بھی کرائی جس میں کھیلنا کم تھا مگر دوسروں کو اپنی فطرت ضرور کھینچ لیتا تھا۔ فٹ بال میں تلابازیاں کم کھاتا تھا مگر گھٹنوں کے دھکوں اور پیروں کی پھرتی سے دوسروں سے گیند چھیننے میں کامیاب رہتا تھا۔ جمناسٹک میں سر نیچے اور پاؤں اوپر دونوں ہاتھوں کے سہارے کر دیتا تھا مگر دوسرے بچوں کی طرح زیادہ دیر تک پیروں کو یوں بیٹھنے سے لگائے رکھنا بے ادبی سمجھتا تھا اس خوف سے کہ کہیں اللہ میاں گستاخی کی پاداش میں ایسی سزا نہ دیں جو میں دوسرے جنم میں چمگادڑ کی طرح الٹا ہی لٹکا رہوں۔

سن شعور کے بعد جب مطالعہ کی عادت پڑی تو یہ سمجھ میں آیا کہ اسلاف میں جتنیں اور مردانہ وار قوم تو تھے مگر خلافت کے دماغوں میں زمانہ عروج کے جو افسانے بسے ہوئے ہیں ان کی بدولت ملوکیت کے قصر و ایوان نے، ملوکیت کے ناز و نعم نے، ملوکیت کی عیش و راحت نے، ملوکیت کے تمدن و معاشرت نے، ملوکیت کی کنیزوں اور مہ جبینوں نے، ملوکیت کے شراب و کباب نے اور ملوکیت کے زر و جواہر کی چمک دمک نے ان کی یہ صفات سلب کر لیں۔

میں نے اپنے گھر میں تعزیہ داری کا رواج پایا۔ میں نے اپنے گھر میں نماز روزے دوسروں کو رکھتے ہوئے دیکھا اگرچہ خود اس فرض کو ادا

کرنے کی بہت کم توفیق ہوئی مگر شام کے وقت افطاری میں ہمیشہ شریک رہتا تھا۔ نماز تو طوطوں کی طرح سیکھ لی تھی اور دو چار سورتیں بھی رٹ لی تھیں۔ مگر رکوع و سجود کا کبھی کبھار اتفاق ہو جاتا تھا۔ مولویوں کے وعظ و پند گاہے ماہے سن لیتا تھا مگر اس میں جی نہ لگتا تھا اور نہ اس پر غور کرنے کی دماغ کو زحمت دیتا تھا۔ عیدین میں نئے کپڑے تو بہت خوش ہو کر پہنتا تھا مگر نماز میں پیش نماز کی طولانی قرأت سے بہت گھبراتا تھا۔ بدو شعور ہی سے مذہبی امور سے وہ لگاؤ کسی وقت نہ ہوا جو ماحول کا تقاضہ ہو سکتا تھا اور اس وجہ سے بھی نہ ہوا کہ دنیا میں مختلف مذہبوں کی ایک ایسی بھیڑ لگی ہوئی دیکھ رہا تھا جس میں بغیر سوچے سمجھے گھس پڑنے میں اس لیے تامل ہوتا تھا کہ وہ مذہبی جنگل سکون خاطر کیلئے کوئی ایسا سامان پیدا نہ کر سکتا تھا جس سے حقانیت کا پردہ چاک ہو جاتا۔

میں چونکہ مسلمان گھر میں پیدا ہوا تھا اس لیے اسلامی تعلیمات کے مطالعہ نے یہ بتایا کہ کلام مجید میں اگلوں کے قصے بھی ہیں عبادت کے طریقوں کے اظہار سے بھی ہیں مگر اس میں اخلاقیات کے جتنے جواہر پارے بکھرے ہیں وہ اس دنیا کے انسانوں کیلئے ایک ایسی نعمت ہیں جن پر عمل کرنے سے انسان انسانیت کے وقار کو باقی رکھ سکتا ہے اور اپنی زندگی کو مذہبی فرقہ بندیوں کے جنجال سے بچا سکتا ہے۔ میں مذہب کو اخلاق کا مترادف سمجھتا ہوں میرے نزدیک مذہب اخلاق کا دوسرا نام ہے جس سے ہم سب کو محسوس کرتے اور جانتے ہیں۔ میں مذہب کو اخلاق کی ایسی زندہ طاقت جانتا ہوں جو اپنی ہستی کو حسن اخلاق کی شکل میں ظاہر کرتی رہتی ہے اور بگڑی ہوئی سوسائٹی اس بات کی محتاج ہوتی ہے کہ وہ مذہب کو اخلاقی طرز عمل کا محرک بنائے۔

خدا ہر ذی روح کا خالق ہے بلکہ کائنات کی ہر چیز اسی کی مخلوق ہے مگر اس کی عالمگیر تہذیب اس امت کے ہاتھوں بدنام ہو رہی ہے جو توحید پرستی کے دعوے دار ہونے کے باوجود خود ہی مختلف قسم کی پرستشوں میں مبتلا ہو گئی اور یہاں تک جرأت بڑھ گئی ہے کہ اسلام کا ایک فرقہ ان کو برا بھلا کہنے میں بدنام ہے جن کو اگر وہ خلیفہ نہیں مانتا ہے تو ان کے صحابی ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا ہے اور اس پر بھی کہ وہ تبرا بازی کو مرتضوی محبت سے تعبیر کرتا ہے اور مدح و قدح کے قضیے نکھر کر کے مسلمانی طاقت کو کمزور کر ہی چکا ہے۔ علی کی شان میں بھی گستاخیوں کا محرک ہوتا ہے جس طرح بتوں کو برا کہنے سے خدا کو برا کہلوانے کا حوصلہ پیدا کیا جاتا ہے اسی طرح خلفائے ثلاثہ کی شان میں بے ادبیاں کر کے علی مرتضے کو جاہ و جبروت بنایا جاتا ہے۔

اسے کون سمجھائے اور اگر سمجھائے بھی تو مذہبی جنون کب سمجھنے دیتا ہے۔ افتراق پردازوں کا اجتہاد کب صحیح راستہ اختیار کرنے دیتا ہے۔ علی کی یکتا روش پر اگر ان کے متبع چلتے اور کسی کی مدح نہیں کر سکتے تو قدح بھی نہ کرتے تو یہ راستہ ہوتا جس سے دوسروں کے معتقدات کو صدمہ نہ پہنچتا۔ ان کے جذبات عقیدت نہ بھڑکتے اور انتقامی جذبہ اس حد تک نہ پہنچ جاتا جس سے خدا محفوظ رہا، نہ رسول

میرا سیاسی مسلک

گو عہد حاضر میں سیاست کا دوسرا نام مکر و فریب ہے جھوٹ اور دغا ہے مگر ایشیائی ممالک کی روحانی ریاضتوں کا تقاضا یہ ہے کہ وہ سیاست میں صداقت پسندی کے ذریعے مذہب کو جب تک الگ نہ رکھیں گے وہ کبھی سیاست کی منزل میں شرافت کے ساتھ طے کر سکیں گے۔ ایشیا کی خاص خصوصیت ہے جس نے اس کو مادیت سے ہمیشہ ممیز رکھا ہے اور اسی روحانیت نے ان سے ایسے ایسے اخلاقی کام کرائے ہیں جہاں تک سیاست کی دنیا بھی رسائی نہیں پا سکی ہے۔ گو مکر و فریب ہی کی قوتوں کی بدولت سیاست نے اپنا مغربی دنیا میں نام اچھالا ہے مگر اس کی عمر بھی دراز نہ ہو سکی۔

ہندوستان کی سیاست ابھی وہ درجہ کیونکر حاصل کر سکتی ہے جو اشتراکیوں کی سیاست سے ٹکرا سکے اور روس کی نظری سیاست کا مقابلہ کر سکے۔ ایک کی سیاست کمیونزم کو پروان چڑھا رہی ہے اور دوسرے کی سیاست سرمایہ داری کی پرورش کر رہی ہے اور دونوں کے پروپیگنڈے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے سیاست کی تمام شعبوں میں اس قدر شور مچا رہے ہیں کہ غیر ملکوں میں انہی کا مسلک پھیلایا جا رہا ہے اور اپنے ملکوں کی آبادیوں سے انہیں بے چین کیا جا رہا ہے انہی سے ان کی حکومتوں میں ہلچل پیدا کرائی جا رہی ہے جس کی ابتدا کلکتے نے کر دی ہے اس کی انتہا تمام مسلک میں کیسی ہوگی۔ اگر ایسی جہالت حکومت قائم کر کے اپنے مسلک سے ذہنی اور جہالتی کی عملی سیاست سے روگردانی نہ کرتی تو اس کی سیاست اتنی جلد بدنام نہ ہو جاتی۔

ہندوستان ایسے جہالت آباد کو جمہوریت سے روشناس کرایا جا رہا ہے جہاں نہ کوئی جمہوریت کے مفہوم سے واقف ہے نہ اس کے نفع و ضرر کو جانتا ہے اور نہ وہ اس کے ماحول کی پیداوار ہے اور پھر جہاں ہزاروں برس حکم بادشاہ کا ان کی ذہنیت کو پیدا کر چکا ہو اس کی سیاست طفل دبستان ہی کہلائی جا سکتی ہے۔

ہندوستان کی تقسیم ہو جائے۔ یہ مسلم لیگ کا ایک خوش آئند نعرہ ہے جو اس کے پلیٹ فارم پر لگایا جاتا ہے اور اس لیے لگایا جاتا ہے کہ اس کے عمل میں مسلمانوں کے حقوق محفوظ ہو سکیں اور اس کی صورت نکالی جا رہی ہے کہ شمالی اور مغربی سرحد پر پاکستان قائم کر دیا جائے اور یہ اس وجہ سے کہ اب ہندو مسلمان میں اتفاق اور اتحاد ناممکن ہو گیا ہے اور اس لیے ناممکن ہو گیا ہے کہ دونوں کے دلوں میں محبت کی جھلک بھی باقی نہیں رہی اور رواداری کے مفہوم کو بھی یہ دونوں فرقے بھول چکے تھے......... اس لیے...... دونوں فرقوں کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کر دینا ہی ان کی زندگیوں کی ضمانت ہو سکتا ہے۔

میں سیاسی میدان کا مرد نہیں ہوں اور نہ میں نے سیاست کا کوئی خاص مطالعہ کیا ہے اور نہ میں نے سیاسی اسٹیج پر کھڑے ہو کر دھواں دھار تقریریں کی ہیں اور نہ میں لیڈری کے زعم میں مبتلا ہوں اور نہ نمود و نمائش سے میری زندگی کو کوئی مسرت ہوتی ہے۔ میرا مسلک تو یہ ہے کہ انسان ہی کو ذرہ رہوار اشرف المخلوقات ہی سے نہیں بلکہ ہر ذی روح سے محبت رکھو۔

بدقسمتی سے ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں بے شمار قومیں آباد ہیں ہر مذہب اور ہر فرقہ کا تمدن الگ ہے اور معاشرت جدا ہے رسم و رواج نرالے ہیں ان گنت زبانیں بولی جاتی ہیں اور اس بھارت ورش میں وہ سب کچھ ہے جس کو دنیا عجائب روزگار سے تعبیر کرتی ہے۔ اور جب کہ ہر چیز بیرونی دنیا کے لیے حیرت انگیز اور ششدر کر دینے والی ضرور ہے۔

باوجود مغربی تعلیم حاصل کرنے اور علوم و فنون سے بہرہ ور ہونے کے ہندوستان کے مذاہب توہمات کا مجموعہ بنے ہوئے ہیں ان کی ریت رسمیں، ان کے عادات و اطوار ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں عبادتوں کے طریقے بھی بالکل جدا ہیں اور مسلمان بھی اسی ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ جب ہندوستان کی یہ حالت ہے تو ظاہر ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کو ایک مذہب دوسرے مذہب کو ایک تمدن دوسرے تمدن کو ایک معاشرت دوسری معاشرت کو اور ایک زبان دوسری زبان کو کیوں کر گوارا کر سکتی ہے اور کب تک گوارا کر سکتی ہے۔ جب نہ ان دونوں قوموں میں یکسانیت ہے نہ ہم خیالی نہ اتحاد ہے اور نہ اتفاق تو بے دھڑک یہ پیشین گوئی کی جا سکتی ہے کہ ان کا ایک ہی مسلک میں انسانیت کا احترام کرتے ہوئے رہنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو گیا ہے۔

خوش قسمتی سے مجھے جب سے وظیفہ ملا ہے اور دفتری الجھنوں سے آزاد ہوا ہوں میری دنیا میرا کتب خانہ رہ گئی ہے جس میں تمام اخبارات آتے ہیں ان پر ایک طائرانہ نظر ڈال لیتا ہوں۔ اس مطالعہ کے دوران میں یہ خبر بھی دنیا میں پھیل گئی ہے کہ ہندوستان تقسیم ہو گیا پاکستان بن گیا چاروں طرف خوشیاں منائی جانے لگیں اعزازات ہونے لگے اور تقسیم کے نتیجوں کے دنوں میں ان کی تصویریں چھپنے لگیں کوئی گورنر جنرل ہو گیا کوئی گورنری کی ہدایت پانے لگا کہیں بلبل ہند چہکنے لگیں کہیں سر اشتراکیت کا سبق دینے لگیں کوئی ہائی کمشنری پر فائز ہو گیا کوئی ہندوستان چھوڑ کر پبلک سروس کمیشن میں مسلمانوں کی صلاحیتوں کو جانچنے لگا۔ کوئی جنت ارضی سے باہر بیٹھا کسی کی سرداری اور نشینی کا خواب دیکھنے لگیں۔ کہیں سرحدی لشکر بھیجے گئے کہیں لیاقت کا امتحان ہونے لگا اور کہیں جواہر پرکھے جانے لگے۔ غرض کہ آزادی نے مردہ ہندوستان میں ایک جان ڈال دی۔ خدا انجام بخیر کرے۔

جب آزادی حاصل ہو چکی ہے تو اب دونوں ملکوں کے باشندوں کو خوشی خوشی رہنا چاہئے۔ کانگریس کی مراد بر آئی۔ لیگ کا مقصد پورا ہو گیا۔ پھر یہ جان لیوا جھگڑے کیوں۔ آئے دن کے یہ جھگڑے بتا رہے ہیں کہ انگریز اس آسانی سے نہیں جا سکے گا۔ تقسیم میں جو صورت اختیار کی گئی ہے حد بندی میں تفریقی سیاست سے کام لیا گیا وہ صاف صاف بتاتا ہے کہ انگریزوں نے برادر کشی اور غارت گری کا جو بیج دونوں قوموں کی کھیتی میں بویا ہے وہ رہے گا نہیں بلکہ نشو و نما پاتا ہی رہے گا اور دنیا ہمارے اس غیر انسانی مشغلہ کا تماشا دیکھتی اور دنگ ہوتی رہے گی۔

میری زندگی کی اہم غلطیاں

یوں تو میں نے اپنی خوش تدبیریوں سے اپنے متوسط الحال خاندان کے نام کو اتنا ہند میں چمکایا۔ اپنی "علمی ذہانت" سے اہل قلم میں اپنا شمار کرا لیا۔ کم و بیش دو ہزار صفحے مختلف عنوانوں پر سیاہ کیے۔ سب سے بڑھ کر اپنا ایک طرز بیان اختیار کیا بڑی بڑی ہستیوں سے بے تکلف تعلقات پیدا کیے اور فرمانروایان ملک اور امرائے عظام سے بے تکلفانہ ملیں کیں .... رام پور میں مجسٹریٹی کی، تحصیلداری کی، آڈٹ افسر رہا اور گشتی فوج میں۔ ان محکموں کے پیچیدہ فرائض کو حق پرستی کا لازم سمجھ کر انجام دیتا رہا اور اپنی ادبی تحریروں سے طبیعت کو بھی شگفتہ بناتا رہا۔ حیدرآباد میں شریک معتمد کی حیثیت سے مذہبی مسائل باتوں باتوں میں سلجھاتا رہا اور تعمیرات میں معتمد کی حیثیت سے انتظامی امور اس طرح سے بناتا رہا کہ ارباب حکومت حیران رہ جاتے تھے .... یہ تو اپنی عقل کے بھروسہ پر سب کچھ کرتا رہا اور کامیابی کے منازل سے گزرتا رہا۔ مگر اس کے باوجود انسانوں کی مختلف النوع فطرتوں کو پہچاننے میں غلطیوں پر غلطیاں کرتا رہتا تھا ان کی میٹھی میٹھی باتوں سے دھوکا کھاتا تھا۔ بغیر تجربہ و آزمائش کے ان پر پورا بھروسہ کر لیتا تھا۔ قیافہ شناسی کا یہ وہ پہلو تھا جس کے نتائج نقصانات ہی کی شکل میں نکل سکتے تھے۔

قیافے کی دوسری غلطی

ماں باپ کو اپنے پوت کا سہارا رکھنا تھا۔ بیٹے کو مستقل زندگی کا مزہ چکھانا تھا۔ اس لیے پندرہ ہی سال میں شادی رچا دی گئی اور طعام ولیمہ کی دعوت دے دی گئی۔ ناتجربہ کاری نے اس کو نعمت سمجھا۔ کسی نے اس کو ایک کھیل جانا اور کچھ عرصہ تک شہوانیت کے جنون میں گھوڑا دوڑاتا رہا۔ مگر کسے خبر تھی کہ اس کا خمیازہ کن کن صورتوں سے بھگتنا پڑے گا جب حیدرآباد آیا تو دو مرتبہ معصوم کی تلافی کرنی پڑی۔ جدید رشتوں نے گو راحت بھی پہنچائی اور آخری بیوی نے نصف درجن کی آبادی بھی بڑھا دی اور ذمہ داریوں میں اضافہ کرتے ہوئے دل بہلنے کا بھی سامان کر دیا۔

بچپنے کی عادتیں جوانی میں رنگ لاتی ہیں اور جوانی کی بے اعتدالیاں بڑھاپے میں زحمت بن جاتی ہیں یا وقت کے تقاضوں سے ناقابل برداشت

ہو جاتی ہیں۔ ماں باپ کے لاڈ پیار بچوں کے مستقبل کو تاریک بنا دیتے ہیں۔ کچھ میں بھی اسی قسم کی عادتوں کا خوگر رہا ہوں۔ بچپن کی طفلی نے ست و خرچیوں کی عادت ڈلوائی۔ جو جیب خرچ ملتا تھا اس کا چوگنا دوست احباب کی خاطر مدارت میں، رنگ رلیوں کی چاٹ میں صرف ہو جاتا تھا اور حافظہ میں صرف حساب کا تصور رہ جاتا تھا جب سے میں نے اپنی زندگی خود سنبھالی خوش قسمتی ہر جگہ ساتھ رہی۔ طلب سے زیادہ ملتا رہا اور حوصلہ سے زیادہ خرچ کرتا رہا اور اس پر کبھی غور نہ کر سکا کہ دولت لٹانے کے لیے نہیں بلکہ جائز ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ہوتی ہے۔...... جس نے اس کی قدر نہ کی وہ رسوا ہوا جس نے اس کی حفاظت نہ کی وہ دنیا میں ناکام ہی نہیں خستہ و خراب ہوا۔

حیدر آباد دکن

میں حیدر آباد میں خیریت آباد کے اس بنگلہ میں ٹھہرا ہوا تھا جو پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے۔ جو شاہ منزل اور گلشن سے قریب ہے۔ جس کے سامنے ریل گاڑی دوڑتی ہے اور یہاں سے حسین ساگر کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ میں سید تقی علی بلگرامی کے ساتھ ادھر ادھر پھرا کرتا تھا۔ ان کے ساتھ کبھی نواب سرور جنگ مرحوم کے یہاں چلا جاتا تھا۔ کبھی اسپنسر کمپنی میں وقت ضائع کرتا تھا اور راتیں تو تھیٹر کے لیے بلا ناغہ وقف تھیں۔ نو بجے شب کو سائیکل پر بیٹھتا اور ڈھائی تین بجے آکر پلنگ پر دراز ہو جاتا۔

یہی وہ زمانہ ہے جب میں مدارس بھی گیا تھا جو تین سو سال قبل ایک گاؤں کی حیثیت رکھتا تھا...... مدارس کے مستقل رنگ کے انسانوں کو بھی دیکھا جہاں بے شمار دیوتاؤں پر عقیدت رکھنے والے انسانوں کو چلتے پھرتے دیکھا جہاں مردوں تک کو لمبے بالوں کا جوڑا باندھے ہوئے دیکھا...... رکشا پر سب سے پہلے یہیں سوار ہوا۔ گھوڑے گاڑیوں پر بھی راستے طے کیے۔ یہاں کی اسلامی معاشرت دیکھی...... ناریل کا عرق پیا۔ جھینگوں کے سالن کھائے اور کھوپرے کی مٹھائیاں بھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کھائی گئیں اور تقریباً دس دن اس طرح کاٹ کر حیدر آباد واپس آیا۔

نواب سالار جنگ بہادر ثالث کی مدار المہامی کے زمانہ میں سر سید علی امام سے ملنے کے لیے شملہ گیا تھا...... جب میں پہنچا تو لارڈ ہارڈنگ وائسرائے تھے جن کا کتا ان کے آگے چلتا تھا اور جب کتا کمرے سے باہر نکلتا تھا تو معلوم ہو جاتا کہ ہارڈنگ برآمد ہو رہے ہیں۔ شملہ کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا اور سر علی امام سے کئی مرتبہ ملا...... یہ حیدر آباد میں سب سے پہلے صدر اعظم ہوئے تھے۔ مگر آصف جاہ سابع کی درباری سازشوں سے بیزار ہو گئے تھے۔ سر اکبر حیدری کی زمانہ سازیوں سے تنگ آکر مستعفی ہو گئے تھے کہ حضور نظام نے کوشش کی کہ وہ مستعفی واپس لے لیں مگر ان کے مضبوط کردار نے گوارا نہ کیا اور ریذیڈنٹ کو اطلاع دے کر چل دیئے۔

حیدر آباد میں دو تین سال اس طرح گزرے۔ آخر جوئندہ یابندہ ایک رفیقۂ زندگی مل گئی۔ ۱۹۱۵ء میں میں نے اپنی معروفیت کے لیے ایک ماہانہ رسالہ ذخیرہ نکالا جس کی سرپرستی نواب عماد الملک بلگرامی نے فرمائی اور مضامین بھی لکھ کر اس کا شمار معیاری پرچوں میں کرا دیا۔ سر امین جنگ نے بھی دو تین فلسفیانہ مضامین لکھے۔ ہندوستان کے بھی اہل قلم نے دلچسپی لی۔ حیدر آباد میں اس وقت صرف دو اخبار مشیر دکن اور صحیفہ نکلتے تھے جن کی صحافتی دنیا میں کوئی حیثیت نہ تھی۔ ادھر ادھر کی خبریں ان میں چھپ جاتی تھیں۔ کوئی اچھا اخبار کیسے نکل سکتا تھا جب کہ اکبر جنگ مرحوم کوتوال ایسے نا آشنائے صحافت مولانا ظفر علی خاں جیسے بلند مرتبہ صحافی اور زمیندار کو یہ کہہ کر شہر بدر کرا دیتے تھے کہ حضور نظام کے برابر کوئی نہیں ہو سکتا:

علاوہ بریں اس زمانہ میں اخبار بینی کا عام ذوق بھی نہ تھا اور نہ علمی مضامین سے کسی کو دلچسپی تھی۔ ایسی حالت میں بھی ذخیرہ نکلتا رہا جس کی مقبولیت بڑھتی رہی اس کی بدولت علامہ طباطبائی کی صحبتوں سے فائدہ اٹھایا۔ ظہیر کے مرثیئے نے ذہین کی فقیرانہ زندگی دیکھی۔ مستعد کی بھی شاعری سے کبھی کبھی لطف اٹھایا۔ ذخیرہ ہی نے مہدی حسن افادی الاقتصادی سے تحریری شناسائی کرائی۔ انھی نے اورنگ آباد تک پہنچایا اور اکبر سے ملوایا اور قطعہ ذیل ان کی زبان سے فی البدیہہ فرمایا۔

بڑھا جاتا ہے ضعف اپنا زور آہستہ آہستہ
لیے جاتی ہے پیری سوئے گور آہستہ آہستہ
تمہاری احتیاطیں مطمئن کرتی نہیں مجھ کو
سمجھتا ہوں قدم رکھتا ہے جور آہستہ آہستہ

مولانا سید سلیمان ندوی سے حیدرآباد میں ملا۔ وہ مجھے وہابی عربی شیعہ کہتے ہیں۔ ان کی سرسید کی روش، ان کی خاموش مسکراہٹیں ان کا علم وفضل ان کے ادبی لطیفے ان کی علمی بذلہ سنجیاں ایسی نہیں ہیں جن کو بھلایا جا سکے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال سے بھی حیدرآباد ہی میں ملاقات ہوئی۔ [illegible] سے ان کے تعلقات یورپ میں قائم ہو چکے تھے۔ حیدرآباد جب آئے تو میرے ساتھ کھانا کھایا، حقہ [illegible] پیا اور میری بے تکلف باتوں نے ان ان کو کافی ہنسایا۔ مولانا ظفر علی خاں سے کئی ملاقاتیں حیدرآباد میں ہوئیں جب کبھی وہ تشریف لاتے نان جویں سے مجھے محروم نہ رکھا۔ ان کے نظم و نثر کا رنگ سب سے اچھوتا ہے اور شعر تو برجستہ کہتے ہیں: طوفان محبت کا ہی کہ آپ دیدہ تنگ ہو گئے...... نواب عماد الملک بلگرامی کی شفقتوں سے گراں بار ہوتا رہا تھا، جنھوں نے ذخیرہ کی وقتاً فوقتاً مالی امداد کی۔ میرے مضامین کی اصلاح فرمائی۔ میرا تخلص ہوش رکھا۔ مجھ میں علمی و ادبی ذوق پیدا کیا۔

اب میں حیدرآباد میں کمال قبر کے پاس ایک مکان میں رہنے لگا تھا جہاں ذخیرہ پریس بھی تھا اور ذخیرہ کا دفتر بھی۔ نواب شوکت جنگ آتے جاتے تھے۔ نواب ابو الفتح خاں سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ راجہ نارائن پرشاد (مہاراجہ سر کشن پرشاد کے بھانجے) اردو کے سچے تھے حکیم مقصود علی خاں سے بھی ملنا جلنا تھا............ سید علی اصغر بلگرامی سے میرے برادرانہ تعلقات تھے۔ جنہوں نے ذخیرہ کی مالی امداد کی...... ان کی فلسفہ ازدواج پڑھیے، مآثر دکن دیکھیے، انفرادی ذخیرہ میں علمی و ادبی مضامین کا مطالعہ کیجیے۔ اگر ان کا سفر نامہ عراق چھپ جاتا تو سیر و سیاحت کے لٹریچر میں قیمتی اضافہ ہوتا۔ اسی زمانہ میں منشی پیارے لال شاکر میرٹھی ایڈیٹر ادیب الہ آباد میرے مہمان ہوئے تھے۔ یاس عظیم آبادی (جناب یگانہ چنگیزی) سے سب سے پہلے یہیں ملاقات ہوئی تھی۔

نواب عماد الملک بلگرامی نے ذخیرہ کو حضور نظام کے ملاحظہ میں پیش کیا جس کے ایڈیٹر کی حیثیت سے سالگرہ کی تقریب میں باریابی نصیب ہوئی........ اعلیٰ حضرت کی شاعری کا اس وقت شباب تھا۔ جلیل استاد السلطان تھے جن کی خطاب شہرہ آفاق ہے جن کے لکھنوی پٹے جن کی بانکی بہادری عادات اور جن کی امیری شاعری نے ان کو دربار عثمانی کا ملک الشعرا بنا دیا تھا۔ ذخیرہ میں بھی جلیل کا کلام چھپتا رہا ہے......

جب استاد کا کلام ذخیرہ میں نظر سے گزرا تو شاگرد رشید نے بھی کلام ملکوت سے سرفراز فرمایا۔

دربار عثمانی میں باریابی حاسدین کی نظروں میں کھٹکی۔ ذخیرہ کے سالگرہ نمبر میں ایک مضمون بھی ایسا شائع ہوا جو طبع شاہانہ پر ان کے ان کے کہنے سننے پر گراں گزرا۔ ذخیرہ پریس بند کر دیا گیا۔ ذخیرہ کی کاپیاں ضبط ہو گئیں اور [illegible] کو تین دن کی مہلت دی گئی کہ وہ حیدرآباد سے

ہو جائے۔ جوش نے ... نہیں کی اور تیسرے دن بھوپال پہنچا۔

بھوپال میں میر عبد الصمد خاں (جو اب حیدر آباد میں ہیں اور نواب صمد یار جنگ بہادر کے خطاب سے سرفراز ہو رہے ہیں) نے ہمایوں منزل میں ٹھہرایا۔ وہاں کے ادیبوں اور شاعروں کو اطلاع ہوئی تو نیاز آئے، فانی ملے اور ان کے علاوہ دوسرے شعراء اور اہل قلم سے بھی ملاقاتیں ہوئیں جو بھوپال تک محدود رہیں۔ فانی سے اس کے بعد حیدر آباد میں ملاقات ہوئی تھی اور نیاز سے تو اب تک عزیزانہ تعلقات ہیں۔

سلطان جہاں بیگم صاحبہ پردہ نشین تھیں مگر ضرورتوں کی خاطر سے نقاب ڈال کر امیر حبیب اللہ خاں سے فارسی میں باتیں بھی کرتی تھیں انگریزوں سے بھی ملکی و سیاسی مسائل میں گفتگو کرتی تھیں............ بیگم صاحبہ کے تین بیٹے تھے ولی عہد تو نواب نصر اللہ خاں تھے۔ یہ جب سیر و شکار سے فرصت پاتے تھے تو ماں کے پاس چلے جاتے تھے۔ جنرل عبید اللہ خان کے مشاغل جب موقع دیتے تھے تو ماں کی دعائیں لینے کے لیے جایا کرتے تھے۔ ہاں نواب حمید اللہ خاں ماں کے ساتھ رہتے تھے اور چیف سیکرٹری کے فرائض انجام دیتے تھے جب نواب نصر اللہ خاں اور جنرل عبید اللہ خاں دنیا سے رخصت ہو گئے تو بیگم صاحبہ نے یورپ کا سفر کیا اور نواب حمید اللہ خاں کو اپنا جانشین بنایا۔

ویسے تو میں بھوپال میں نادری علاؤ الدین کی بزرگی سے ملا۔ سید تقی بلگرامی کے یہاں قورمہ بھی کھایا۔ فانی کے ڈھلتے ہوئے شباب کی بے احتیاطیاں بھی دیکھیں۔ نیاز کو جوتے پہنے ہوئے نماز بھی پڑھتے دیکھا۔ شوکت ایرانی کی سفید ڈاڑھی سے بھی پیچھا چھڑاتا رہا۔ محمد امین زبیری کو تاریخ کی ورق گردانی کرتے دیکھا۔ مفتی انوار الحق کو سیرت رسول سناتے دیکھا اور نہ معلوم کس کس سے ملا......

بھوپال سے آگرہ روانہ ہوا یہی وہ اکبر آباد ہے جہاں نظیر کا سا درویش شاعر پیدا ہوا تھا جس نے —

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

کی ایسی نظمیں کہی تھیں اور حقائق کے دریا میں ڈوب کر کہی تھیں جس نے اپنے شاعرانہ الہامات سے اپنے دیس والوں کو زندگی کے ایسے ایسے نکتے بتائے۔ حیات کے ایسے ایسے راز فاش کیے۔ نشیب و فراز کی ایسی ایسی راہیں دکھائیں جن کو اہل دنیا اگر اب بھی نقش کالحجر کرے تو پھر اس کی زندگی کا بیڑا پار ہے۔

وہ آگرہ جہاں میرے شناساؤں میں دلگیر کے ایسے بچارے بھی کم شاعر گزرے ہیں، جنھوں نے نقاد نکالا تھا اور ایک عرصہ تک کامیابی کے ساتھ اس کو جاری رکھا تھا۔ احباب کی ادبی شوخیوں نے ایک قمرنساں پیدا کر دی تھیں جن سے دلگیر سے فرضی خط و کتابت اکثر ہوتی تھی۔ یہ اپنی خوش قسمتی پر اکثر اچھلنے لگے تھے کہ نقاد کا دوسرا دور شروع نہیں ہوا بلکہ دلگیر کی بھی ڈھلتی جوانی میں شباب کی امنگیں بیدار ہو گئیں قمرنساں کے خطوط برابر نقاد میں شائع ہوتے تھے۔ جو بانکے ادب دیکھا کرتی تھی آخر کار پردہ اٹھا تو نسوانیت کے بھیس میں نہ معلوم کون نکلا۔ یاروں نے جو ادبی مذاق کیا تھا اس کی عمر دراز نہ ہوئی دلگیر کے منصوبے میوہ کٹرہ میں اچھل کر رہ گئے اور ان کے وارفتہ ارادے بجھ گئے اور یاران بلند ان کے ادبی جنون سے لطف اٹھا کر خاموش ہو گئے۔

دلگیر کے میوہ کٹرہ میں دھوبیوں کی آبادی تھی جو دوسرے کپڑوں کے ساتھ ساریاں بھی دھوتے تھے۔ ساریاں دیکھ کر دلگیر کا تصور نہ معلوم

کہاں سے کہاں پہنچ جاتا تھا اور جب کوئی بس نہ چلتا تھا تو از خود رنگینی پیدا کر کے جھاڑتے تھے۔ صوفیانہ کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اصطلاحی معانی وادیوں تک اپنے والہانہ جذبات کو پہنچا کر صدائے بازگشت سے نہ معلوم کیا سنا کرتے تھے۔

وزیر ہوٹل میں قیام کیا۔ دوستوں کی دلجوئیوں کے ساتھ حسینی گرفت نے بھی حیدر آباد کی یاد کو بہت کچھ بھلا دیا۔ آگرہ ہی کے قیام میں جے پور دیکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ مختصر سامان سفر لے کر دو چار دن کے ارادے سے وہاں پہنچا۔ سر فیاض علی خاں وزیر اعظم نے جے پور ہوٹل میں سرکاری مہمان کی حیثیت سے رکھا۔ مہاراجہ مان سنگھ گدی نشین تھے۔ سر فیاض علی خاں بھیکم پور کے زمیندار بھی تھے اور جے پور کے اسوقت وزیر اعظم تھے۔

یہاں کی ہندو عورتیں بہت لمبا گھونگھٹ نکالتی ہیں۔ زنانہ چلمنوں کی تیلی بنا کر اور گھونگھٹ کو نیچا کر کے آئینہ در روزن کو روشن رکھتی ہیں۔ منہ کو اس طرح چھپاتی ہیں مگر تہذیب پیٹ کی نمائش سے بالکل نہیں شرماتیں جن کی خوبصورت ناف نافۂ ہرن کی طرح ابھری ہوتی ہے کہ اگر اس میں ایک تولہ مشک سما سکتا ہے تو اس میں ایک چلو پانی نظر بازوں کو ڈوب مرنے کا موقع دے سکتا ہے۔

سر فیاض علی خاں نے اپنی بزرگانہ شفقت سے دو ہفتے تک مہمان رکھا اور بہت مشکل سے واپسی کی اجازت دی تو میں جے پور سے رخصت ہوا اور آگرہ پہنچ گیا جہاں نواب عماد الملک بلگرامی کا گرامی نامہ ملا جس میں تحریر فرمایا تھا کہ مجھے فوراً رام پور چلا جانا چاہیئے۔ جس کی تعمیل میں آگرہ کے احباب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رام پور روانہ ہو گیا۔

رام پور

رام پور پہنچا، مہمان خانہ میں ٹھہرایا گیا اور دو چار روز کے بعد ہز ہائینس نواب سید حامد علی خاں کی بارگاہ میں باریاب ہوا۔ ...... میں نے اپنے دس سالہ قیام (رام پور) میں دو وائسرایوں کو آتے دیکھا۔ ڈیوک آف کناٹ کا بھی خیر مقدم دیکھا۔ والیان ملک میں پٹیالہ، گوالیار، بیکانیر، الور اور کپور تھلہ کے مہاراجوں کی بھی خاطر مدارات دیکھی ...... ان مہمانداریوں پر لاکھوں روپے صرف کر دیئے جاتے تھے۔ ایسی خوش سلیقگی سے انتظام کیا جاتا تھا میں نے کسی دوسری ریاست میں نہیں دیکھا ...... تقریباً دو سو باورچی ملازم تھے اور ہر ایک باورچی ایک ہی چیز پکاتا تھا جس میں وہ ایسا ماہر ہوتا تھا کہ اس کے ہاتھوں کی سبک حرکت، ہلکی اور تیز آنچ کا اندازہ، سامان اور مسالوں کی مقدار ان کھانوں کو فردوس کی نعمت بنا دیتی تھی۔

ایک دن مہاراجہ بہادر کا حیدر آباد سے تار آیا کہ اجمیر جب آ رہے ہیں تو میں مسرت سے اچھل پڑا۔ حیدر آباد کی صحبتیں یاد آ گئیں۔ ہز ہائینس کی خدمت میں (جو اس وقت بمبئی میں تھے) اجازت کے لیے تار دیا۔ دوسرے ہی دن جواب ملا کہ جاؤ اور مہاراجہ کو بمبئی لے آؤ۔ رام پور سے نکل کر بغیر رکے اجمیر پہنچا ...... تو معلوم ہوا کہ مہاراجہ ابھی اجمیر نہیں پہنچ سکے ہیں۔ میں نے مہاراجہ کی خاطر وہاں دو ہفتے گزارے ؟ اگر ادبی ذوق نہ ہوتا اور سید محمد حنیف صاحب کی بزرگانہ دعائیں نہ ہوتیں تو میں نہ مہاراجہ کا انتظار کر سکتا اور نہ ہی مسافرت کے دن کاٹ سکتا۔ آخر مہاراجہ یہاں آئے اور ان کی معیت میں بمبئی روانہ ہوا۔

یہاں مسلمانوں میں خوجے ہیں، بوہرے ہیں اور آغا خانی ہیں اور سب تاجر پیشہ ہیں۔ جہاں کے بھولے بھالے انسان آغا خاں کو روحانی پیشوا مانتے ہیں اور بغدادی صاحب کے دراز قد سے بیعت کرتے ہیں اور ان کے تقدس کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ یہ مقام ایسے مذہبی پیشواؤں کی جاگاہ ہے جن کی بھی عبادتوں کو یہاں کے مسلمان غلاف کعبہ سے کم نہیں سمجھتے اور جن کے شراب کے گھونٹوں کو شربت جانتے ہیں۔

مہاراجہ بہادر اٹھارہ دن تک ہز ہائینس کے یہاں رہے۔ امیروں کی خاطر مدارت تھی اور میزبان نواب حامد علی خاں ایسا مہمان نواز تھا اٹھارہ دنوں میں نہ معلوم کیا صرف کر دیا۔ مخصوص دعوتیں بھی ہوئیں۔ ارباب نشاط کے مجرے بھی ہوئے۔ روزانہ ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں سنجیدہ مذاق بھی ہوتے تھے۔ تحفہ تحائف کے تبادلے بھی ہوئے۔ اور آخر اسٹیشن پر دونوں بغلگیر ہو کر روئے اور رخصت ہوئے۔ میں نے [illegible] تک مہاراجہ کو پہنچایا۔۔۔۔۔۔ اور پھر رام پور کا رخ کیا۔

واپس آیا تو اپنے دوست صفدر علی قدوائی کو مصائب میں مبتلا پایا۔۔۔۔۔۔ ان کے والد ماجد قدوائی کا دماغ تو ان کے جیب کا تھا شوق حلوائی "ناحق جوت جلایا کھائے" کے مصداق ہو رہے تھے۔

رام پور میں یہ وہ گھر تھا جہاں شعر و شاعری کی محفلیں گرم رہتی تھیں شوق و ابر دونوں حقیقی بھائی تھے اور جب کوئی پھنس جاتا تھا تو دونوں شرط باندھ کے اپنا اپنا کلام سناتے تھے اور اتنا سناتے تھے کہ سامعین کا مادہ شعر فہمی مفقود ہو جاتا تھا، پناہ مانگنے لگتے تھے۔ جوتے چھوڑ کر بھاگ جانا چاہتے تھے۔ تاجور کی دیر بندی کی موریت اور میلا رام وفا کی برہمنی شجاعت داد دیتے دیتے تھک جاتی تھی۔ ایک ہی سانس میں وہ بھی بے اختیاری سے نکل رہا تھا "منشی صاحب کا کیا کہنا" اور اسی بیچ میں یہ بھی کہ "جوش صاحب جان بچاؤ"۔

نیاز ویسے تو رام پور کے قیام کے دوران میں نیاز کئی مرتبہ آئے مگر اس وقت بھی آئے جب میں تحصیل بلک میں تحصیلدار تھا نیاز دوستی کے اتنے پکے وضعداری میں اتنے سچے اور نفسیات کے تو ایسے ماہر ہیں کہ کسی دوست کو ان کی کسی ادا سے کسی وقت بھی کوئی تکلیف نہ پہنچی ہوگی کیا پہنچی بلکہ وہ دوستی کے وسیع تر مفہوم سے آشنا اور اس نازک فن کے ایسے نباض ہیں جس کو ہر پل مختلف الطبائع صحبتوں سے پوری طرح باخبر رکھتی ہے اور جس کا زندگی کے موڑ پر لحاظ رکھتے ہیں۔

عبدالماجد رام پور میں ملت جذبات و احتیاج کے عبد الماجد نہیں بلکہ مولانا عبد الماجد بھی میرے مہمان ہوئے تھے جن کو دنیا نے کسی وقت دہریہ بھی کہا اور ملحد بھی پکارا۔ مگر قدرت نے قلب ماہیت کر کے اس دہریہ اور ملحد کو خدا پرست بنا دیا۔ رسول کا پرستار بنا دیا۔ بزرگان دین کا شیدا بنا دیا۔ وہ سنت کی پیروی سے کہ کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ حافظ کے شاعرانہ ابیات پر مرمٹتے ہیں۔ دل میں وہ رنگ رنگینیاں سے بھرے ہیں اور خدا لگتی بات پر آنکھوں سے آنسوؤں کے سیلاب بہا دیتے ہیں۔ جن کا فلسفیانہ طرز بیان صوفیانہ رنگ کی نذر ہو گیا جن کی عبارات عقلیات اور جن کی سیرت افلاطون سامد ہونے لگی۔ جن کی زبان چلتی ہے تو صرف قرآن و حدیث کے لیے۔ جن کی تحریریں اللہ سے رجوع کراتی ہیں۔ بھٹکے ہوؤں کو سیدھا راستہ دکھاتی ہیں۔ اور اسلامی تعلیمات سے دور رہنے والوں کو للکارتی ہیں جو عصر حاضر کے مسلمانوں کی بے حیائی کے قصے سناتی ہیں اور ہر ہفتہ سچی باتیں سنا کر بے حس دلوں میں احساس پیدا کرتی ہیں۔

عبدالحق انجمن ترقی اردو کے مولوی عبد الحق بھی میرے مہمان ہوئے تھے۔ وہ جس طرح اردو کی بقا میں لگے رہتے ہیں اسی طرح روپیہ کی بقا کو بھی سب کاموں پر مقدم سمجھتے ہیں۔ یہ وہ کھانے کے بہت شوقین ہیں اور ان کا عشق نہ یتیم برگ خوردن ہے۔ پھلوں اور درخت سے ہرگز نہیں کھاتے بلکہ اس کی شاخوں تک یا تو اچک اچک کر پہنچتے ہیں یا سیڑھی لگا کر پھلوں تک اپنے منہ کو پہنچاتے ہیں۔ رام پوری بیر چلتے پھرتے کھاتے ہیں۔ ان کو دنیا مقدمہ باز کے نام سے بھی یاد کرتی ہے۔

حیدر آباد میں خوب گزری، سر اکبر سے جو چاہا کرا لیا۔ نواب عماد الملک بلگرامی سے چیک پر چیک لکھواتے رہے۔ اردو کی ترقی کے لیے امراء کے خزانوں کو بھی ٹٹولتے رہتے تھے اور سرمایہ داروں کی بھی تھیلیوں کا اپھارا انہیں بے چین کر رہا تھا۔ ملک غلام محمد سے چالیس ہزار سالانہ انجمن کے لیے مقرر کرا لیے مگر سر مرزا اسمٰعیل کے وزارتی عہد نے ایسے روڑے اٹکائے کہ لائق علی وزارت بھی اس پر نظر ثانی نہ کر سکی۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد جو دہلی میں جان لیوا ہنگامہ ہوا تو انجمن کا دفتر بھی لٹا۔ اس کے دوران ہی اردو پر جیسے چڑھے، بابائے اردو بھی خانماں برباد ہو کر کبھی بھوپال میں ٹھوکریں کھاتے، کبھی حیدر آباد میں تقی الاس کے یہاں مرغ مسلم کھایا۔ وطن سے بے وطن ہوئے۔ اب کراچی میں اردو کا بیج بکھرا رہے ہیں۔ کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح اردو سارے پاکستان کی زبان بن جائے۔

تاجور وغیرہ

شمس العلماء تاجور نجیب آبادی اور پنڈت میلا رام وفا جتنوں میرے مہمان رہے۔ جوش ملیح آبادی سے سب سے پہلی ملاقات رام پور ہی میں ہوئی تھی۔ حفیظ جالندھری۔ حفیظ جالندھری نے شاہنامہ اسلام کا خاکہ رام پور ہی میں سنایا تھا۔ میں نے ان کی شاعری سے زیادہ ان کی موسیقی سے لطف اٹھایا تھا۔

الور

رام پور میں جب جی اچاٹ ہونے لگتا تھا تو کبھی دہلی چلا جاتا تھا کبھی کبھی گومتی کی تازہ آب و ہوا میں ایک آدھ ہفتہ گزار دیتا تھا۔ اب کی ۲۶-۱۹۲۷ء میں ارادہ ہوا کہ میواڑ کی سیر کر کے چتوڑ کے قلعہ کی اکبری معرکہ آرائی کا تصور کروں۔ .... دہلی پہنچ کر پروگرام میں صرف اتنی ترمیم کی کہ پہلے الور کی مذہبی سواری دیکھ لوں کیونکہ مہاراجہ سے رام پور میں تعارف ہو چکا تھا۔ ان کی صحبتوں میں گھنٹوں بیٹھ چکا تھا۔ دہلی سے الور دوسرے دن پہنچا۔ مہمان خانے میں ٹھہرا اور مہاراجہ سے تین مرتبہ ملا۔ الور سے اودے پور پہنچ گیا۔ .... محلات دیکھے، جھروکہ درشن دیکھا، بڑے بڑے مگرمچھ اوپر موجیں مارتے ہوئے تالاب پر تالاب دیکھے، سادھوؤں کی صرف ٹاٹ کی آبادی دیکھی، بنگلوں کے بے خبر بچے دیکھے۔ موروں کی دلکش صدائیں سنیں۔ .... ایک ہفتہ اودے پور میں قیام کر کے اور دور سے چتوڑ گڑھ کے قلعے کو دیکھتا ہوا آخر رام پور روانہ ہو گیا۔

اودے پور سے جب رام پور واپس آیا تو بہت سے خطوط اور تار رکھے ہوئے تھے۔ پہلے تاروں کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام نے مجھ کو حیدر آباد آنے کی اجازت دے دی ہے۔ گو رام پور کے قیام سے خوش تھا، اعلیٰ حضرت رام پور کے توجہات بے کراں سے مطمئن تھا مگر حیدر آباد میں اعزہ اور سسرالی اقربا کی وجہ سے جانے کو جی چاہا۔ اس کے علاوہ اس وقت بیوی بھی وہیں تھیں۔ رخصت کی درخواست کرتے ہوئے تکلف ہوتا تھا آخر ایک ہفتہ توقف کر کے ہز ہائینس سے عرض کرنے پر مجبور ہوا۔ اجازت تو ملی مگر مشکل سے۔

حیدر آباد دس سال کے بعد

رام پور سے حیدر آباد روانہ ہوا اور چوتھے دن کاچی گوڑہ اسٹیشن پر جب پہنچا تو اعزہ و احباب کا ایک کافی مجمع پذیرائی کے لیے موجود تھا .... سب سے بغل گیر ہوتا ہوا یاقوت پورہ کے اس مکان میں پہنچا جہاں میری بیوی اپنے چچا کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی۔

دوسرے دن ایک دستار بنی بنائی بازار سے منگوائی۔ نذر کے لیے چار دیناری کی اشرفی خریدی اور ٹیکسی منگا کر نو بجے کنگ کوٹھی پہنچا .... نذر پیش کی .... ارشاد فرمایا ابھی جا کر اب کیا کرو گے یہیں رہو۔ ہفتہ عشرہ کے بعد فرمان مبارک جاری فرمایا گیا۔

ہوش بلگرامی کا تقرر چار سو روپے کی جگہ پر عثمانیہ یونیورسٹی میں کیا جائے۔ ۔ میں درس و تدریس کے فن کو جانتا تھا: طلبا کو افہام و تفہیم کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور نہ جذب سرزنش سے ان کی شرارتوں کو کم کر سکتا تھا اس لیے خدمت سے خود کو معذور سمجھ کر معذرت کرنی پڑی۔ آخر دو تین ماہ کی دوڑ دھوپ کے بعد فسپلائز سیونگ بنک کو قبول کرنا پڑا .... چھ ماہ کے بعد انسپکٹری سے جنتمی پر ترقی ملی اور اس کے چند ماہ بعد نواب محمد یار جنگ بہادر معتمد فوج نے اپنی مددگاری پر منتقل کر لیا۔ اس طرح ترقی کرتے کرتے ۱۹۴۷ء میں معتمدی تعمیرات تک پہنچا اور سر مرزا اسمٰعیل کی صدارت سے مستعفی ہو جانے کی وجہ سے اتحاد المسلمین کی ریشہ دوانیوں کے سبب سے اور یہاں کے سازشی ماحول سے تنگ آ کر جنوری ۱۹۴۸ء سے وظیفہ لے لیا۔

ابتدائی زمانہ میں ایک عرصہ تک روزانہ بارگاہ خسروی میں حاضر ہوتا رہا، پھر جمعہ مقرر ہوا۔ تھوڑے عرصہ تک نہ روزانہ کی حاضری رہی نہ جمعہ کی۔ آخر وہ زمانہ آ گیا جب اعلیٰ حضرت نے یکایک یاد فرمایا اس وقت سے ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۳ء تک (تقریباً ۱۰ سال) [illegible] حضوری میں حاضر رہتا تھا۔

مغلیہ بادشاہوں کے آداب کا لحاظ یہاں قدم قدم پر ہوتا تھا۔ رکوع، تسلیمات کا طریقہ، دستار سر پر اور بجلوس کمر میں جب تک نہ ہو تو امراء بھی شاہی محلات کے حدود میں داخل نہ ہو سکتے تھے۔ رام پور اور بھوپال میں بجلوس تو اسی قسم کا ہوتا تھا مگر سر پر شملہ بمقدار علم ادب ہوتا تھا ہندو ریاستوں میں بھی اسی قسم کی پابندیاں تھیں۔ اودے پور کا عام درباری لباس وہی ہوتا تھا جیسا مہارانا زیب تن فرماتے تھے جے پور، گوالیار، الور وغیرہ میں بھی ایسی ہی پابندیاں دیکھی گئیں۔ میسور کی درباری لباس سر مرزا کی تصویر میں دیکھا اور بڑودہ و کشمیر کے لباس کا ان کے مہاراجگان کے لباس سے اندازہ کیا...... چونکہ نظام دکن مغلیہ کے جانشین کہلاتے تھے اور آصف جاہ اول دربار مغلیہ کے تمام شاہانہ آداب سے واقف ہی نہ تھے بلکہ اس کے عادی تھے اس لیے وہی آداب یہاں بھی رواج پا گئے۔ ہندو امراء ہوں یا مسلمان سب کی عجیب عجیب وضع کی نوکدار پگڑیاں سروں پر رکھی رہتی تھیں۔

اعلیٰ حضرت کے ہمراہ میں نے پانچ سفر کیے۔ سب سے پہلے اورنگ آباد گیا۔ پھر گلبرگہ کا بہمنی دارالحکومت دیکھا اور ولنگڈن کے زمانے میں دہلی کی سردیوں کا لطف اٹھایا۔ کرسمس کے زمانہ میں کلکتہ کی چہل پہل بھی دیکھی اور راجمندری میں دوران آندھی اور پانی میں ٹرین کی زندگی کا بھی تجربہ ہوا۔

۹ مارچ ۱۹۳۶ء کو خسرو دکن کی اسپیشل ٹرین صبح ۹ بجے دہلی پہنچی .... تو [illegible] پیلس اور نظام پیلس میں دکن کا قافلہ فروکش ہوا۔ اہل دہلی نے قصر شاہی کی پرشوکت بلندیوں پر آصف جاہی پرچم لہراتے دیکھا۔ اس کے مرمریں فرش پر بچھتے جوڑوں کو سجتے دیکھا اس کے در و دیوار کے رنگ و حسن سے آنکھیں سینکیں .... بیش قیمت سازوسامان کی فراوانی پر لوگوں کو حیران ہوتے دیکھا ......

غرض کہ یہ دیکھا اور وہ دیکھا مگر اعلیٰ حضرت کو ایک برآمدہ میں بیٹھے دیکھا۔ وہ اعلیٰ حضرت جو ڈیڑھ کروڑ انسانوں پر حکومت کرتے ہیں، وہ اعلیٰ حضرت جن کے ملک کی آمدنی بارہ کروڑ ہے۔ وہ اعلیٰ حضرت جن کا صرف خاص دو کروڑ کا ہے اور جو دولت کے لحاظ سے تمام دنیا میں مشہور ہیں۔ جو دولت و حکومت کی ریل پیل میں پلے ہیں جو اسباب عیش و مسرت کے انبار میں بڑھے ہیں جن کے ملک میں ہزاروں جاگیردار ہیں جن میں چند ایسے امرائے عظام بھی گزرے ہیں جو اگر ہندوستان میں ہوتے تو والیٔ ملک کہلاتے۔ ہز ہائینس پکارے جاتے۔

ویسے تو امرائے عظام اور جاگیردار ہزاروں ہیں مگر سر وقار الامراء اور مہاراجہ سر کشن پرشاد ایسے بھی امیر گذرے ہیں جن کی فیاضیاں کبھی حاتم طائی سے شرمندہ نہ ہوتی تھیں۔ دونوں بلا مذہب و ملت کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے تھے۔ مہاراجہ کی فیاضیاں تو میں نے دیکھی ہیں مگر سر وقار الامرا کی فیاضیاں معزز ہستیوں سے سنی ہیں۔

حضور نظام کے یہاں نہ مہاراجگان ہند کے ایسے ٹھاٹھ باٹ ہیں نہ لباس میں کوئی امتیاز ہے نہ جواہرات کے زیور پہن کر پھرا کرتے ہیں اور سادہ درجہ کا لباس ضرورت کے وقت پہن لیتے ہیں۔ سادگی حقیقی معنوں میں یقیناً قابل قدر ہوتی ہے مگر بعض لوگ اس کو سادگی سے تعبیر نہیں کرتے بلکہ اس کو خدا کی دی ہوئی نعمت کے استفادہ سے محرومی سمجھتے ہیں۔

دربار عثمانی بیس سال تک جو بلا ناغہ "دربار عثمانی" میں حاضر رہا ہو اس نے وہاں دن کے اُجالوں اور رات کی تاریکیوں میں کیا کچھ نہ دیکھا ہوگا اس نے اعلیٰ حضرت کی خوش مزاجیاں بھی دیکھی ہوں گی اور بد مزگیاں بھی۔ حکمرانی کے طمطراق بھی دیکھے ہوں گے اور انسانیت کی وہ سادگی جو عصرِ حاضر کی دنیا کے ملوکیت میں کہیں نظر نہیں آ سکی .... ان واقعات کو اگر پھیلایا جا سکتا تو اس کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت پڑ جاتی اور اس طرح گو چشم دید واقعات کی ایک معتبر تاریخ مرتب ہو جاتی مگر یادداشت کے محدود صفحات اس کی تاب نہ لا سکتے تھے اگر الطاف عثمانی پر نظر کر کے اور مشرقی روایات کے احترام میں حال کو حافظے سے کچھ محو بھی کر دیا جائے تو اس احسان کو کیسے فراموش کیا جا سکتا ہے جس کے نقوش تاریخی صداقت میں اُبھرے ہوئے ہیں ....

اعلیٰ حضرت کے الطاف و کرم کا ہوش کو اعتراف ہے۔ اس کا ابتدا تقرر خسرو دکن ہی کے فرمان سے ہوا اور دیرینہ وفاداری کے صلے میں ہوش بلگرامی سے ہوش یار جنگ ہوا۔ خون کی ندیاں بہانے والی بواسیر کا اپنی خاص توجہات سے علاج کرایا اور صحت سے ہم آغوش کر دیا میرے بچے کا سرفراز حسین خود بدولت نے رکھا اور پیدائش کے چند گھنٹے بعد ہی تحریری [illegible] سے مفتخر فرمایا۔ سفر و حضر میں ہمیشہ ساتھ رکھا .... اسی قسم کے متعدد نوازشات کا میرے قلب پر اب تک اثر ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ یہی وہ اثرات تھے جس کی وجہ سے خاندانِ شاہی کی عمر دراز کرنے کے لیے اپنی جان تک جوکھوں میں ڈال دی۔ اتحادی پارٹی کے سیاسی طرز عمل کا میں چونکہ حامی نہ تھا اس لیے وہ دربار عثمانی میں میرے وجود سے گھبراتی تھی۔

میں آخر وقت تک ایڑی چوٹی کا زور اس اندیشے سے لگاتا رہا کہ کہیں وزارت و قیادت کے غلط مشوروں سے اعلیٰ حضرت اور ملک کا مستقبل تباہ نہ ہو جائے۔ مگر ہمارے درباروں میں کسی زمانہ میں بھی سچائی کی قدر نہیں کی گئی اور نہ صحیح مشوروں کو مانا گیا۔

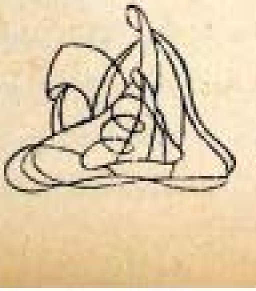

جب حُسن نِکھرتا ہے

زِندگی مُسکراتی ہے

Rexona
GOOD FOR YOUR SKIN

جب آپ کا حسن نکھرتا ہے تو قدم قدم پر خوشیاں بکھر جاتی ہیں۔ زندگی اپنے خزانے آپ پر کھول دیتی ہے۔ رنگ روپ نکھارنے کے لئے رکسونا صابن کا جواب نہیں۔ اس میں قیمتی جڑی بوٹیوں سے تیار کئے ہوئے حسن بخش تیلوں کا ایک ایسا مرکب کیڈیل شامل ہے جو آپ کے قدرتی رنگ روپ کو نکھارتا ہے۔ کیڈیل آمیز رکسونا صابن کے استعمال سے آپ کی جلد ملائم، شگفتہ اور بے داغ ہو جاتی ہے اور آپ کا فطری حسن نکھر آتا ہے۔

رکسونا صابن آپ کے
رنگ و روپ کو
نکھارتا ہے

رکسونا

لیور برادرز کا بنایا ہوا

R.P. 37-193-UD

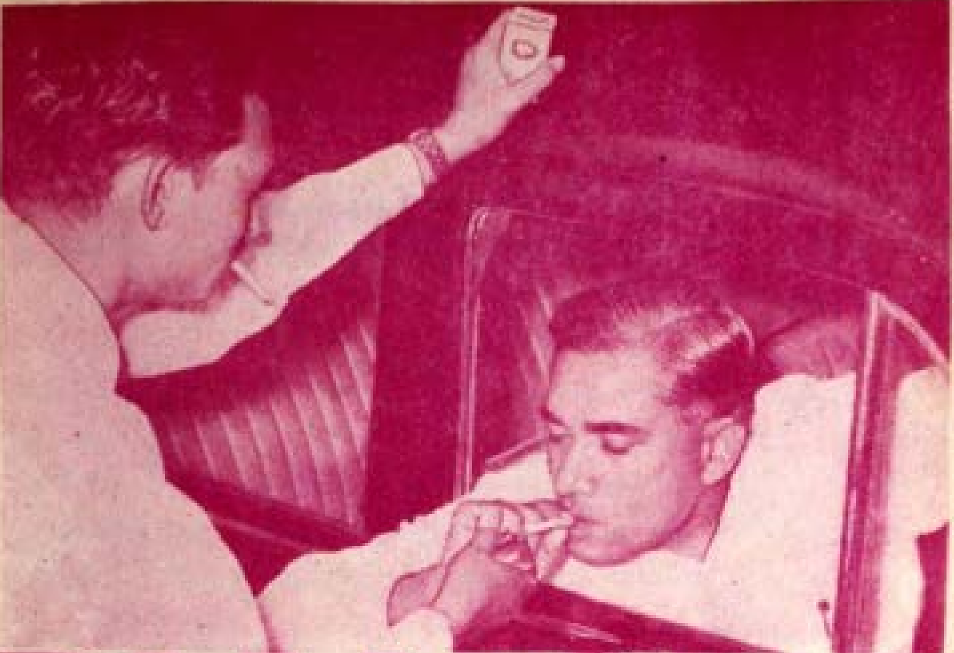

DIAMOND

- ورجینیا تمباکو
- نفیس بلنڈنگ اور لطیف کش
- اوروں سے زیادہ تسکین بخش
- جدید طرز کی آٹومیٹک مشینوں سے اعلیٰ معیار پر تیار کیا جاتا ہے۔

آپ جہاں بھی ہوں

ڈائمنڈ پیجیے

آپ کو یقیناً فرحت ہوگی

Diamond
CIGARETTES

ڈائمنڈ

- لاجواب سگریٹ

MOGUL TOBACCO CO., LTD.

NATIONAL 531

یہ صاحب کدھر گئے؟

جی! وہ اس وقت اپنے گھر میں اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ وہ بھی دوسروں کی طرح تنخواہ لینے گئے تھے اور قطار میں کھڑے رہے تھے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بیٹھا تو وہ کام کرتے ہیں۔ تنخواہ انہیں ملتی ہے لیکن وہ براہ راست اُن کے سیونگ بینک اکاؤنٹ میں جمع ہو جاتی ہے جس میں سے وہ حسب ضرورت کچھ رقم نکال لیتے ہیں اور اس طرح فضول خرچی کے امکانات بھی پیدا نہیں ہوتے۔

بچت کی عادت اور بینک اکاؤنٹ میں بڑھتی ہوئی رقم اُن کے لئے باعث طمانیت ہے۔

دی مسلم کمرشل بینک لمیٹڈ

سن ماسٹر

ماڈل/ ۱۹۶۴ء

دُھوپ کے جدید ترین چشمے،

آنکھوں کو پُرسکون ٹھنڈک پہنچاتے ہیں!

اپنے قریبی شاکسٹ سے طلب فرمائیے!

تیارکنندگان: ویسٹرن آپٹیکل انڈسٹریز رجسٹرڈ

شوروم: ۱۴۳- انارکلی۔ لاہور فون ۶۶۳۳۴ سیلز ڈپو: بیرون لوہاری دروازہ لاہور۔ فون [illegible]

S.S.

واجد علی شاہ اختر

مخفی نہ رہے کہ خداوند عالم نے ہر متنفس کو قوتِ عشق عطا فرمائی ہے اور ہر ذی حیات نے اس گلشن بے خزاں میں پرورش پائی ہے بنا برآں میرا خمیر بھی اسی آب و گلِ عشق سے ہوا ہے اور یہی دردِ جگر روزِ ازل سے مجھ کو بھی ملا ہے۔ لہٰذا میں اپنی سرگذشت عشق و محبت جو اوائل عمر سے اس وقت تک گذری قلم بند کرتا ہوں۔ اب میری عمر کا چھبیسواں سال آغاز ہے اور میں اسی صحرائے پُر فضا میں بہت کچھ بادیہ پیمائی کر چکا ہوں۔

اوّل کارِ محبت

جب میرا سن آٹھ برس کا تھا اس زمانے میں ایک عورت رحیمن نامی جس کی عمر تقریباً ۵۰ سال کی ہوگی میری خدمت کے لیے متعین تھی جو ہر وقت میرے پاس حاضر رہتی تھی۔ ایک روز اس نے عین خواب میں مجھ کو پاکر مجھے چھیڑنا شروع کیا از بسکہ میں صغیر سن تھا خوف زدہ ہوا بیدار ہو کر بھاگنا چاہا لیکن اس نے جانے نہ دیا بلکہ میرے معلم اور اتالیق سے کہہ کر سزا دلانے کی دھمکی سے ڈرایا۔ میں حیران تھا کہ خدایا یہ کیا آفت ہے۔ اس روز سے اس کا معمول ہو گیا کہ ہر روز میرے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتی تھی۔ میری دس برس کی عمر تک اس کا یہی دستور رہا۔ اس کے بعد مجھے یاد نہیں وہ کہاں چلی گئی۔ چونکہ ابتدا سے میری طبیعت عشق و محبت کی طرف مائل تھی۔ اکثر عاشقوں کے حال پر متاسف ہوتا اور معشوقوں کو بُرا کہتا تھا۔

اسی زمانے میں امیرن نامی ایک عورت جو جناب جنت مکان والدہ صاحبہ کی ملازم تھی جس کا سن ۲۰ یا ۲۴ برس کا ہوگا گیہواں رنگ، دبلی پتلی، اور داہنی آنکھ کی پتلی میں ایک سفید تِل تھا۔ ہمیشہ رنگین لباس پہنتی تھی تاکہ حسن زیادہ معلوم ہو۔ یہ عورت نہایت بدچلن تھی۔ ہمیشہ لوگوں کو مکر و فریب میں پھانس کر ناز و انداز کیا کرتی تھی اور ہمیشہ مبلغ چار روپیہ کی ماہوار نوکری کرتی اور اسی محدود آمدنی میں عیش و عشرت بسر کرتی اگرچہ اس قلیل رقم سے گزر اوقات محال ہے لیکن ادھر کی آمدنی تمام سامان، سج دھج، آرائش کی کفیل تھی۔

گیارہ برس کی عمر تک

ایک روز میرے سب عزیز نصیر الدین حیدر بادشاہ خلد منزل کے یہاں مُنّا جان کے ختنہ کی تقریب میں گئے جب گھر خالی ہوا تو اس عورت نے رات کے وقت جب میں بستر استراحت پر محو خواب تھا اپنے دونوں ہاتھوں سے مجھے دبایا مجھے بھی پہلے سے اس کا خیال تھا اس وجہ سے اس قدر بے تکلفی سے برہم نہ ہوا۔ بلکہ خود کو سوتا ہوا بنا لیا۔ کہ اس کے دل جوش میں کسی قسم کی کمی نہ واقع ہو۔ اور دل ہی دل میں اس کے ولولۂ شوق کا لطف اٹھایا۔ مگر مجھے اس وقت اس کے ناز بے جا سے مجبوراً درگزر کرنا پڑا۔ لیکن گیارہ برس کی عمر تک اس کی محبت کا خیال رہا۔

جب میرا سن گیارہ برس کا ہوا تو میں ہر حسین عورت سے بجائے چھیڑ چھاڑ کرنے اور ان کی دل ستاں اداؤں سے محظوظ ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں ایک عورت جو صاحب نامی جس کا باپ حبشی قوم سے شیدی سلطان نام اور ماں ہندوستانی تھی وہ میری والدہ کے ہاں مغلانی کے عہدے پر معزز و ممتاز تھی۔ لیکن یہ عورت شوہر دار تھی۔ اس کے خاوند کا نام مرزا جان تھا۔ میں کچھ روز سے اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اور اس کے وصال کا خیال محال دل و دماغ میں گزرا کرتا تھا۔ چونکہ وہ عورت بکمال عقل مند و عصمت مآب تھی مجھے حکمت عملی سے خوش کر کے ٹال دیتی تھی۔

از راہ دنیا داری

ساون کے مہینے میں ایک دن اپنی دادی مریم مکانی کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عورت جس کی عمر بائیس یا اس سے کچھ زیادہ تھی، صورت سے شوخی و شرارت نمایاں جسے مقتضائے سن سمجھنا چاہیئے، عطر میں ڈوبی ہوئی ایک پانچ سالہ بچہ گود میں لیے بصد ناز و انداز وہاں آئی اور دادی صاحبہ کو بصد ادب جھک کر تسلیم بجا لائی۔ میں نے پہلی ہی نگاہ میں اس کا تیر محبت کھایا۔ دل ہی دل میں کہتا تھا خداوندا کیا اچھا ہو اگر ایسی حور وش پری پیکر کے باغ جوانی کا میں بلبل ہوں۔ بہ تاثیر میری حالت تباہ برباد ہوتی گئی۔ اس عورت حاجی خانم کی ایک آتا اماں خانم اور بعد کریہہ و بدشکل تھی جس کی عمر چالیس برس یا اس سے بھی کچھ زیادہ ہوگی۔ اسے حاجی خانم کے معاملے میں درمیانی مقرر کیا گیا۔ اماں خانم باوجود اس قدر سیاہ فام و بدصورت ہونے کے خود کو نہایت رنگین و حسین سمجھتی تھی۔ اس نے توسط درمیانی کو بالائے طاق رکھ دیا اور اپنا عشق مجھ پر جتانے لگی۔ تاہم اس کا کوئی فریب مجھ پر کارگر نہ ہوا۔ ہم اور حاجی خانم دونوں مل کر از راہ دنیا داری اس کی خاطر و تواضع میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے۔ اگرچہ وہ زشت رو عورت کب کرتی تھی کہ میں حاجی خانم کی ہمدم اور رازدار ہوں۔ میرا لحاظ رکھو علاوہ بریں تم عاشق و معشوق صرف میری اطاعت سے بہرہ مند ہو سکتے ہو ورنہ تمہیں اپنے مطالب میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔ ہم دونوں عاشق و معشوق جب ایک مقام پر بیٹھتے تو بڑے مزے سے آپس میں عشق و محبت کی باتیں کیا کرتے تھے۔ بعض اوقات حاجی خانم اثنائے گفتگو میں اپنے شوہر کا تذکرہ کرتی تھی اس وقت میں اس کی باتوں سے از حد ملول و افسردہ خاطر ہو جاتا تھا۔

شادی کی فکر

جب میرا سن پندرہ برس کا ہوا تو میرے والدین کو میری شادی کی فکر ہوئی اور تجویز کے بعد انہوں نے چاہا کہ منیر الدولہ بہادر کی لڑکی سے اب جن کا خطاب تاجدار بیگم صاحبہ ہے اور میرے چچا مرزا اسکندر حشمت بہادر کے عقد میں اور میری حقیقی چچی کی دختر میری نسبتی بہن ہیں شادی کی جائے لیکن میں نے منظور نہ کیا۔ بعد ازاں نواب علی نقی خاں مرحوم کی دختر سے میری نسبت کا پیام دیا گیا۔ چونکہ یہ خیال حال تھا میں نے بخوشی خاطر قبول کیا۔ آخر کار ۱۲۵۳ھ پندرہ شعبان المعظم کو مانجھے کی رسم قرار پائی۔ لیکن بقضائے الٰہی میری سسرال میں میری زوجہ کی چچی نے انتقال کیا اور اس طرح میرے چچا نے رحلت کی اس وجہ سے رسم کتخدائی میں بہت زیادہ تاخیر ہوئی اور میں دو مہینے تک مانجھے کے کپڑے پہنے رہا جو اتنے دن گذر جانے سے بے حد کثیف ہو گئے تھے۔

الغرض دو ماہ بعد حسب معمول دنیا رسم حنابندی و کتخدائی سے فراغت پائی۔ مجھ میں اور میری زوجہ میں پانچ مہینے تک وہ محبت و اخلاص جو زن و شوہر میں ہونا چاہیئے قائم رہا۔ میری شادی کے پانچ مہینے بعد نصیر الدین حیدر نے اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کیا اور میرے دادا نصیر الدولہ بہادر نے تخت نشین ہو کر ہر شخص کو حسب قدر و مراتب انعامات و خطابات سے سرفراز فرمایا۔ میرے والد ماجد کو خلعت ولی عہدی عنایت ہوا اور میرا اولیٰ الحکم میرے اور میری زوجہ کے معقول مشاہروں سے ممتاز کیا۔ میرے والد ماجد ثریا جاہ نے اپنی جیب خاص سے مبلغ پانچ سو روپیہ ماہانہ میرا اور مبلغ چار سو روپیہ ماہوار میرے محل کا مقرر فرمایا۔

اس عرصے میں اکثر اوقات میں اپنے محل کے نوکروں اور ملازموں کے پوشیدہ طور سے چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق کیا کرتا تھا یہ بات میرے محل کو گراں گزرتی تھی اسی سبب سے انہوں نے چند عورتوں کو اپنی ملازمت سے برطرف کر دیا۔

میرے والد ماجد کی ولی عہدی کو ایک برس کا زمانہ گذرا تھا کہ میرے یہاں نواب اعظم بہو صاحبہ محل موصوفہ کے بطن سے ایک فرزند ارجمند پیدا ہوا جس کا نام مرزا نوشیرواں قدر بہادر ہے۔ میرے جد امجد اس خوشخبری کو سن کر مسرور ہوئے اور مجھے خلعت معمول سے سرفراز فرما کر ناظم الدولہ فخر الملک محمد واجد علی خاں بہادر حشمت جنگ کا خطاب عطا فرمایا۔

سنہ ۱۲۵۴ھ میں دوسرا فرزند محل مذکورہ کے بطن سے پیدا ہوا اسے میرے جد امجد نے مرزا فلک قدر بہادر خطاب دیا۔ اس زمانے میں میری عمر سترہ برس کی تھی۔ ازبسکہ عنفوانِ شباب تھا مجھے جوشِ جوانی اور ولولۂ طبیعت کی وجہ سے یہ خیال گزرا کہ کسی طرح ایامِ شباب حسین و خوش جمال مستورات کی صحبت میں بسر کرنا چاہیے۔ مگر کوئی تدبیر نہ بن پڑتی تھی۔ آخر وحشتِ قلب و جوشِ سودا نے یہ ترکیب ذہن نشین کرائی کہ میں اپنی راحت کے واسطے عورتوں کو بطریق خدمت گذاری نوکر رکھ کر ان سے پوشیدہ رابطۂ محبت پیدا کروں۔ میں نے حکمتِ عملی سے کام لے کر ایک عورت موتی خانم نامی، دبلی پتلی، گیہواں رنگ، بڑی بڑی خوش نما آنکھیں، کشادہ ابرو، درشت و چالاک، تیز مزاج نوکر رکھی۔ میرے محل کو یہ صورت بے حد ناگوار ہوا۔ انھوں نے بہت کچھ شور و غل مچانا شروع کیا۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ ملازمت سے علیحدہ کر دی گئی اور مجھ پر والد ماجد کا عتاب نازل ہو کر نظر بند کر دیا گیا۔

مجبوراً شعر و شاعری

اس کے بعد میں نے مجبوراً گوشۂ تنہائی اختیار کر کے شعر و شاعری کی طرف اپنے دل کو منعطف کیا، لیکن جناب والد ماجد کی خفگی کی وجہ سے زندگی تلخ ہو گئی۔ جب یہ حال والد ماجد پر منکشف ہوا تو انھوں نے ارشاد فرمایا کہ وہ عورت میرے حوالے کر دی جائے لیکن اس شرط سے کہ اس گھر سے علیحدہ کسی دوسرے مکان میں رہے اور میرے سلام کو بھی نہ حاضر ہوا کرے۔ اس حکم کے نافذ ہونے کی یہ وجہ معلوم ہوتی تھی کہ مجھے جو یہ ضد تھی کہ جب تک وہ عورت مجھے نہ ملے گی اس وقت تک مجھ پر کھانا پینا حرام ہے۔ الحاصل اس حکم کے صادر ہوتے ہی وہ عورت موتی خانم میری خدمت میں حاضر کی گئی۔ چونکہ خداوند کریم نے والدین کی اطاعت و فرماں برداری کل خیر و امور پر مقدم کی ہے اس لیے میں نے اس عورت سے دست کشی کر کے والد ماجد کی خدمت میں عرض کی کہ غلام ہر طرح فرمان اقدس کا مطیع ہے کسی صورت سے خلاف مرضی والد کوئی کام نہیں کر سکتا۔ یہ پیام سن کر حکم ہوا کہ اس عورت کو بخوشی خاطر اپنے پاس سے جدا کر دو۔ اس حکم کے سنتے ہی میں نے تعمیل کی اور اس وقت سے آج تک کبھی خواب میں بھی اس عورت کی صورت نہیں دیکھی۔

اس وقت میرا سن اٹھارہ برس کا تھا۔ انھیں دنوں میں نے فن شعر گوئی حاصل کر کے اس عورت کے عشق میں باوجود ولولۂ طبیعت دو دیوان اور تین مثنویاں نظم کیں۔ لیکن دل اضطراب سے کسی کو آگاہ نہ کیا۔ اسی صدمے کی وجہ تھی جو میں نے چشم لطف سے پھر کبھی اپنے محل کی طرف نہیں دیکھا اور ان کی جانب سے میرے دل میں شدید رنج آ گیا۔ اگرچہ انھوں نے لاکھ منت سماجت سے میرا حال دریافت کیا اور اس کشیدگی کی وجہ پوچھی لیکن میں نے سوائے خاموشی کے اپنی زبان سے کچھ بیان نہ کیا۔

ازبسکہ وہ نہایت فہیم و عقیل تھیں۔ تلاش و تفتیش کر کے جو کچھ بھی ہے سب میرا ہی کیا دھرا ہے۔ بغیر انھیں خوش رکھے ہوئے آرام سے زندگی بسر کرنا مشکل ہے لہٰذا بڑی دل جوئی اور تشفی کے استفسار کیا۔ اگر تمھارا اصرار میری جانب سے کچھ مکدر ہے تو میں ہر طرح تمھارا امر پوشیدہ کرنے کے لیے تیار ہوں جس سے تمھارا دل چاہے عشق و محبت کرو۔ چونکہ اس وقت میرا مطلب نکلتا تھا میں نے کہا خیر اگر تم جو ایسا کہتی ہو تو بہتر ہے۔ اسی زمانے میں میرا تیسرا لڑکا میرے محل کے بطن سے پیدا ہوا میرے جد امجد نے مرزا کیواں قدر بہادر خطاب عنایت فرمایا۔

دودھ کا جلا

انھیں دنوں میں صاحب خانم گانے والی ایک عورت جو جناب والد ماجد کی ملازم و شوہر دار تھی، میری نظر سے گزری۔ اس کا سن ۲۴ برس یا اس سے کچھ زیادہ تھا۔ رنگت بے مثال، ہر وقت سر کے بال کھلے ہوئے دونوں کندھوں پر پڑے رہتے تھے۔ اس کے لیے بہت ہی مناسب اور ادائے خاص تھی۔ اس عورت سے مجھے محبت پیدا ہوئی اسے بھی میرے ساتھ اتنا تعشق تھا کہ بغیر میری صورت دیکھے ہوئے رات کو سوتی نہ تھی اور ہر وقت میرے پاس بیٹھی ہوئی گنجفہ کھیلا کرتی یا گانے بجانے میں مصروف رہتی تھی۔ میری تو تصنیف غزلیں بڑے مزے سے گاتی تھی جس

میں ایک غزل کا مطلع یہ ہے ؎

پڑا ہے پاؤں میں جب سے سلسلہ محبت کا
بڑا بھاری ہوا ، ہر بھلا محبت کا

میں اسے دو ایک روپیہ دیا کرتا تھا۔ گو میرے محل کو میری اور اس کی ان باتوں کی اطلاع تھی لیکن اس ہندی مثل کے مطابق زبان تک نہ لا سکتی تھیں کہ دودھ کا جلا مٹھا پھونک پھونک پیتا ہے۔ میرے خوش رکھنے کے لیے خانم مذکور کی خاطر تواضع کیا کرتی تھیں۔ الغرض میرا عشق صاحب خانم کے دل میں اس قدر بڑھ گیا کہ اس نے جوش محبت میں میرے ستار کی سندری کھول کر آگ میں خوب گرم کی جب وہ انگارے کی طرح دہکنے لگی تو اپنی بائیں ران داغ دی کہ ستار کی تمام سندری گوشت میں پیوست ہو گئی اس کے بعد وہ زخم کو باندھ بوندھ کر بائیں پاؤں سے لنگڑاتی ہوئی میرے پاس آئی میں نے اسے ایک پاؤں سے لنگ کرتے ہوئے دیکھا تو سخت متحیر ہوا۔ آخر کار اس نے بہت الحاح و زاری سے کہا: "آہ آپ نے مجھے مرہم عطا فرمایا" میں نے کہا تم مرہم سے کیا کرو گی؟ اس نے جواب دیا میں اپنی بائیں ران کے زخم پر لگاؤں گی۔ اگر خلاف مصلحت نہ ہو تو تھوڑا سا مرہم برائے اندمال زخم مرحمت ہو۔ میں نے جو محبت بھری نظر سے اس کی بائیں ران کی طرف دیکھا تو اس کے کلام کی تصدیق ہو گئی۔ اس کے بعد ہم دونوں میں لیلیٰ مجنوں کی طرح ایک برس رابطہ محبت قائم رہا۔

انھیں دنوں میں جناب والد ماجد مرزا ثریا جاہ امجد علی شاہ تخت نشین ہوئے۔ جب محل موصوفہ میرے اور صاحب خانم کے تپاک سے مطلع ہوئیں تو ایک روز مجھ سے استفسار کیا کہ تمہارا یہ عشق تو تمہاری مرضی کے موافق ہوا یا نہیں۔ میں نے جواب دیا تمہیں دوسروں کے ملازموں سے کیا مطلب۔ یہ میری تقدیر کی بات ہے اگر تم کوئی عورت میری ملاقات کے واسطے تجویز کرتیں تو البتہ میں تمہارا شکر گذار ہوتا۔ چونکہ وہ عاقلہ و فرزانہ تھیں بخوبی سمجھ گئیں کہ بغیر ان کی اطاعت و فرماں برداری کیے ہوئے اپنا کوئی مطلب نکالنا دشوار ہے اس لیے در پے ہو فی الفور دوسری عورتیں نوکری کے واسطے بلانا شروع کیں۔

آخر کار عمدہ بیگم جو اس سے قبل نصیر الدین حیدر کے یہاں نوکر تھیں۔ میرے محل کے یہاں نوکری کے لیے آئیں اس زمانے میں ان کا سن چھبیس برس کا تھا۔ وہ میرے پسند آئیں اور ان کی محبت میرے دل میں روز بروز بڑھنے لگی۔

انشا کی نواسیاں

اسی زمانے میں والد ماجد کے یہاں تین بہنیں مرثیہ خوانوں میں ملازم تھیں۔ جیدی بیگم بڑی، محمدی بیگم منجھلی اور ننھی بیگم چھوٹی کا نام تھا۔ یہ تینوں میر انشاء اللہ خاں کی نواسیاں اور ذاکرہ جناب سید الشہداء صلوٰۃ اللہ علیہ کی تھیں ننھی بیگم ایک عورت کی ہم شکل تھی جسے پارہ والی سرفراز دیکھتے تھے۔ جب ننھی بیگم کو پارہ والی کا ہم شکل پایا تو مجھے یہی غنیمت معلوم ہوا لیکن ننھی بیگم نے میری چشم لطف کو ہرگز اعتنا نہ کی بلکہ میرے بڑھے ہوئے عشق کو بچوں کا کھیل سمجھ کر سخت لاپروائی سے کام لیا۔ اگر حسن اتفاق سے مجھے کبھی کوئی تنہائی کا وقت مل جاتا جہاں وہ بھی موجود ہوتی اور دیکھتی کہ یہاں گفت و شنید کا اچھا موقع ہے تو وہ وہاں سے فوراً بھاگ جاتی اور مجھ سے از راہ شوخی و شرارت کبھی کہتی میں بڑی دیر سے تمہاری راہ دیکھتی تھی تم اس وقت کہاں گئے تھے۔ جب عمدہ بیگم کے سبب سے صاحب خانم سے ملاقات ترک کی تو وہ اپنے کیے سے بہت پشیمان ہوئی لیکن اس سے دو چار حرکتیں ایسی وقوع پذیر ہوئیں جو میرے مزاج کے بالکل خلاف تھیں جن میں سے ایک یہ تھی میں نے اس سے ہزارہا مرتبہ کہا کہ تیری دو تین لڑکیاں ہیں وہ میرے یہاں بہت آرام سے رہیں گی لہٰذا تو اپنے شوہر سے طلاق حاصل کر کے میرے پاس چلی آ۔ لیکن کی

بدنصیب نے ہرگز میرے کہنے پر عمل نہ کیا۔ آخر الامر سراسے چھوڑ دینے کے کوئی ترکیب مفید مطلب میرے ذہن میں نہ آئی جب صاحب خانم سے ملاقات ترک ہوئی تو عمدہ بیگم سے سلسلۂ ربط و محبت بڑھا لیکن باطن میں نخی بیگم ہی کا تیر عشق کھائے ہوئے تھا۔

جب جناب والد ماجد امجد علی شاہ بادشاہ نے تخت آبائی پر جلوس فرمایا اور میں ولی عہدی کے عہدے پر فائز ہوا تو اسی وقت سے مجھے عمدہ بیگم صاحبہ کے محل بنانے کی فکر دامن گیر ہوئی۔ انھوں نے اپنے حسن خدمت سے میرے دل میں پوری پوری جگہ کر لی تھی اور ان سے سلسلۂ ربط و محبت اس قدر بڑھ گیا تھا کہ سوا پہر بھر سونے یا چار گھڑی والد کی خدمت میں سلام کے لیے جانے کے مجھے کوئی دوسرا کام نہ تھا۔ اس صورت میں نخی بیگم ہی کو میں نے دیکھا ان کی بھی خواہش یہی تھی کہ میں انہیں بھی اپنا محل بنالوں۔ اس کا سبب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ طامع بہت تھیں شاید یہ خیال ہوا ہو کہ ایسی حالت مند سرکار میرے ہاتھ سے مفت نہ جانے پائے۔ چونکہ عفیفہ و پارسا مرثیہ خواں ساتویں امام کی اولاد میں اور میر انشاء اللہ خاں کی نواسی تھیں۔ ان کا رنگ گورا قد مناسب، اعضا، بھویں باریک اور آنکھیں بھولی تھیں۔ ان کے پہلے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا تین برس کی ایک لڑکی تھی جس کا نام احمدی تھا اور پہلے شوہر کے صلب سے تھی۔ نخی بیگم اپنے شوہر کی وفات کے بعد میری والدہ کے یہاں مرثیہ خوانوں میں ملازم ہوئیں پھر مجھ سے محبت کر کے اس امر کی خواہش مند ہوئیں کہ میرا رتبہ بھی عمدہ بیگم کے مرتبے کے برابر ہو جائے۔ لیکن عمدہ بیگم کے اقبال کا ستارہ چونکہ آسمان پر چمک رہا تھا اس لیے نخی بیگم کا منتر نہ چلا۔

یہاں جواہرات اور شیشے کی کشتیاں، چاندی کے برتن اور دوسری قسم کا سامان محل عمدہ بیگم کے واسطے تیار کرایا گیا۔ اور ایک مہینے کے بعد میری ولی عہدی کے زمانے میں عمدہ بیگم صاحبہ محل ہو گئیں اور خورد محل نواب عمدہ بیگم صاحبہ کے خطاب سے ممتاز کی گئیں۔ ڈیڑھ مہینے تک نواب خورد محل کا اختر طالع آفتاب عالمتاب کی طرح سپہر اقبال پر درخشاں رہا اس کے بعد پھر وہی مثل ہوئی کہ چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیرا پاکھ ہے۔

جبر و اکراہ سے

آخر کار میں نخی بیگم کے دام مکر سے نہ بچ سکا اور انھوں نے ہزاروں چھل و فریب سے مجھے اپنا محل بنانے پر راضی و آمادہ کر لیا۔ ایک روز چھتر والا مکان جو اب چھتر منزل کہلاتا ہے۔ اس کے برج پر جو دریا کی طرف ہے چڑھ گئی اور چاہتی تھی کہ خود کو نیچے گرا دے لیکن میں نے جھپٹ کر ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ اس قدر جہالت سے اپنے کل عورتوں میں خود کو رسوا کرتی ہے۔ اس عرصے میں وہ لڑکی جو ان کی گود میں تھی مر گئی۔ الغرض خورد محل ہونے کے ڈیڑھ مہینے بعد نخی بیگم صاحبہ بھی محل قرار پائیں۔ اور انہیں نشاط محل نواب نخی بیگم صاحبہ خطاب دے کر کچھ جواہرات تھوڑے کپڑے لتے سے سرفراز کیا۔ پندرہ روز نہایت جبر و اکراہ سے ان کا ستارۂ تقدیر روشن ہوا۔

برسات کی فصل میں ایک دن چاروں طرف کالی کالی گھٹائیں گھری ہوئی تھیں میرے متعلقین میرے گرد حلقہ کیے بیٹھے تھے ناچ گانا ہو رہا تھا ناگاہ اسی جلسۂ عیش و سرور میں میرے چھوٹے بھائی جرنیل صاحب مرزا سکندر حشمت بھی آکر شریک ہوئے اور مجھ سے کہا میں نے ایک عورت کو مجرے کے واسطے بلایا ہے جو حسن و خوبی کے علاوہ ڈھولک بجانے میں اپنا مثل و نظیر نہیں رکھتی۔ میں نے کہا آہ بھائی کیا اچھا ہوتا اگر تم اسے میرے ملاحظے میں پیش کرتے۔ دوسرے دن صبح کو جب بزم طرب مجتمع ہوئے تو میرے چھوٹے بھائی جلسے میں آگئے ان کے ہمراہ ایک عورت بھی تھی جس کا رنگ کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ اس کا سن تخمیناً اٹھارہ برس یا اس سے کچھ زیادہ ہوگا وزیرن نام تھا اصل بہمان کی بیٹی تھی معلق والے پل پر مکان تھا۔ اس سے نگاہ چار ہوتے ہی عشق کا تیر جگر کے پار ہو گیا۔

اسی زمانے میں نجم النساء بیگم مرحومہ میرے محل میں داروغگی کے عہدے پر سرفراز تھیں یہ نواب خاص محل کی نسبتی بہن اور علی نقی خاں میرے

دیا۔ اُس کی نسبتیں بھی تھیں میری اس قدر مزاج داں ہو گئی تھیں کہ جو میرے دل میں ہوتا تھا اسے میری آنکھوں سے سمجھ جاتی تھیں۔ انھوں نے اٹھارہ نفر اسامیہ جوریہ اور ایسی شوخ اور طناز ڈھونڈ کر رکھوائی تھیں جن میں ہر ایک اپنے عشوہ و انداز و دل ربائی میں ایک دوسرے سے علیحدہ تھی۔ انہی دنوں میر محمد مہدی میرے یہاں عہدہ داروغگی ممتاز ہوئے تھے، یہ امین الدولہ کے متوسلین میں تھے جو میرے والد ماجد کے عہد حکومت میں وزیر اور مدار المہام تھے اور میرے استاد بھی تھے۔ انھوں نے مجھے میزان و شرح اسباب کا سبق دیا تھا۔ ان کو امین الدولہ نے از راہ دوستی میری سرکار میں عہدہ داروغگی ملازم رکھوایا تھا۔ میر محمد مہدی داروغہ حال سے کسی طرح میرا دل ربط نہ کھاتا تھا اس نے اس واقعے سے زیادہ کوئی ذریعہ نہ پاکر اس کام میں اپنا ہاتھ ڈال جانا۔ اور ایک دن نہایت منت و لجاجت سے عرض کی اے جان عالم میں دیکھتا ہوں حضور کے دشمن ہر روز غمگین و مضطر منہ لپیٹے ہوئے پلنگ پر پڑے رہتے ہیں اور راگ رنگ کی صحبتیں بھی یک قلم موقوف ہیں اس کا کیا باعث ہے؟

اسی زمانے میں دو عورتیں گانے والی امن اور امامن جو میری سرکار میں ملازم ہونے سے پہلے رئیس فرخ آباد کے یہاں اسی پیشے کی بدولت افتخار حاصل کر چکی تھیں، خدا جانے اب کس طرح وہاں سے نکل کر میری ملازمت میں سرفراز ہوئی تھیں اور انھیں سرو محفل والیاں خطاب دیا گیا تھا، یہ دونوں حقیقی بہنیں تھیں ان کی ماں کا نام بحر اور باپ تھرچپا غلام نبی تھا، میرے ساتھ سچے دل سے محبت رکھتیں اور ہمیشہ داروغہ نجم النسا بیگم کے ہمراہ میری خدمت گذاری میں مصروف رہتیں۔ میں نے بھی ان دونوں کو اپنی زبان سے بہنیں کیا تھا اور انھوں نے حسن خدمت سے میرے دل میں اس قدر رسوخ پیدا کر لیا تھا کہ بغیر ان تینوں عورتوں یعنی امن امامن اور نجم النساء اور ان کے مشورے کے مجھے ایک گھڑی قرار نہ آتا تھا جب آتش عشق وزیرن طوائف کی میرے دل میں شعلہ زن ہوئی تو یہ لوگ غم عشق انگیز کا کر اسے ٹھنڈا کیا کئے۔

اسی زمانے میں مجھے ٹھمریاں تالیف کرنے کی مشق بہم پہنچی۔

ٹھمریاں سن جلوان کے ایک ٹھمری کا سرا استائی یہ ہے۔

سن او گوئیاں ستیاں بے دا ہو دیں

ان تینوں نے نہایت دل جوئی و رفاقت سے میرے عشق کا کل حال دریافت کر لیا اور باہر دربار میں داروغہ میر مہدی بھی زار دل دہی و جاں نثاری پر چھا کر تا تھا۔ ایک دن داروغہ نجم النسا بیگم کسی حیلے سے بی جان کے گھر پہنچیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں وزیرن کے مزاج کی کیفیت تاڑنا شروع کی، تو ان پر ظاہر ہوا کہ وزیرن بھی میرا اسیر عشق کھا کر زخمی ہو چکی ہے۔ یوں کہ اس کی ماں علامہ دہر تھی کوئی ترکیب پیش نہ گئی۔ ایک روز داروغہ نجم النسا بیگم اس کے گھر گئیں تو دیکھا وہ پلنگ پر بیٹھی ہوئی رو رہی ہے داروغہ مذکورہ نے چاہا کہ اسے تنہائی میں لے جا کر کلمات محبت آمیز میری طرف سے کہے ناگاہ اس کی بے رحم ماں نے شور و غل مچانا شروع کیا داروغہ سرکاری کو رنڈیوں کے مکان پر آنے کی کیا ضرورت ہے، ہمیں ان سے کوئی تعلق نہیں بہانے ٹھہرایا کریں نہیں تو میں دولت پر حاضر ہو کر دہائی دوں گی یہ شور و غل سن کر نجم النسا بہ جہت تمام اس کے مکان سے نکل کر میرے پاس آئیں میں نے دیکھا ان کے چہرے سے رنج کی علامتیں نمایاں ہیں اور باتوں حیرت سے غصہ ظاہر ہوتا ہے۔ میں نے سبب دریافت کیا تو انھوں نے اس کی ماں کے شور و غل مچانے کا حال بیان کیا۔ یہ واقعہ سن کر مجھے غصہ آیا اس وقت میر مہدی کو بلا کر کہا جب تک میری محبوبہ نہ آئے گی تمہیں جاننا مجھ پر خواب و خور حرام ہے بلکہ کیا عجب ہے جو میں اپنی جان دے دوں۔

خون بے گناہ ایک دن میں اپنے مکان میں جسے بادشاہ منزل کہتے ہیں ایک ٹیلہ پیرے کر اس کی چھت پر چڑھ گیا اور اس کے روزن سے اندر کی

جانب سے بندگی کے جاؤ، اپنا کام تمام کرکے گلزار حسن کو خون بے گناہ سے رنگین کروں۔

نے دستم اس زمانے میں نے سام رہ گیا
مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا

دارو غہ نجم النساء بیگم نے میرا حال دیکھا، اپنا سر دروازے پر دے مارا اور کہنے لگی: "جان عالم، خدا اور رسول کا واسطہ، میری ایک بات سن لیجئے۔" میں نے اندر سے آواز دی، کیا ہے؟ کون سی بات کہنا چاہتی ہو؟ وہ انھوں نے عرض کی: "اگر میں اس کو لا دوں تو میں تا عمر رہوں، تو پھر جو آپ کا دل چاہے کیجئے گا۔" میں نے ان کی عرض قبول کی۔ اسی وقت شیخ غلام علی ایک تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہوکر اس کے گھر گیا۔ میں نے اس طرف مکان کو طرح طرح کی آرائش سے آراستہ کیا، ہنر کے درمیان میں اپنی پلنگ بچھوائی، بجز میرے اور مہدی کے دوسرا وہاں نہ تھا۔ پہر رات گذر گئی یکایک میں نے دیکھا اس ماہ وش کے پرتو جمال سے مکان روشن ہوگیا۔ میں نے فرط خوشی سے دوڑ کر اسے گود میں اٹھا لیا اور رات بھر اس کی شمع جمال پر پروانہ وار نثار ہوتا رہا۔ القصہ آواز نوبت و گجر و صدائے مرغ و اللہ اکبر نے میرے سر خواب کو عین وصال میں ہجر کی چھری سے حلال کر ڈالا۔ ناگاہ ویسے ہی مہدی نے آواز دی کہ ظلمت شب برطرف ہوئی، حضور کو رخصت کرنا چاہیے۔ بہزار ناگواری اسے رخصت کیا۔ ایک مہینے تک یہی سلسلہ آمد و رفت جاری رہا۔ آخر کار ایک روز میں نے اس ماہ پیچ کو جانے نہ دیا اور اپنے گھر بٹھا لیا۔ اور امین الدولہ کو اس خدمت کے صلے میں پانچ پارچے کا خلعت مع پیادہ و قندیل کے مرحمت کیا۔

مشکل کشا کا دسترخوان

جس دن وہ میرے گھر بیٹھی ہر طرف سے صدائے مبارک باد آنے لگی چاروں طرف سے نوبتوں کی آوازیں گرجنے لگیں۔ میں نے خوشی میں حضرت مشکل کشا کا دسترخوان کیا۔ ملازموں نے نذریں گذرانیں اور حسب مراتب سرفراز کئے گئے۔ اس کی ماں بی جان حسب ایماء امین الدولہ مقید کی گئی۔ دو تین ماہ بعد میری رائے سے رہا ہوئی اور اس کی لڑکی کی طرف سے دو ہزار روپیہ نقد مع خلعت اور دو شالہ و رومال مرحمت ہوا۔ الغرض نفیس نفیس جواہرات بے بہا اعلیٰ اعلیٰ ظروف نقرئی و طلائی عمدہ عمدہ ملازم انہیں عطا کئے گئے اور بہت بڑے خطاب سے سرفراز کی گئیں۔ ایک برس تک ان کا نجم اقبال بڑے کروفر سے چمکتا رہا۔ اس زمانے میں میری عمر ۱۹ سال تھی۔ انہیں دنوں میں اٹھارہ نو عمر اسامیاں چند بدمعاش دارو غہ نجم النساء بیگم کی معرفت ملازم ہوئیں۔ وہ سب پر گوئے سبقت لے گئیں اور انہیں حضور والیوں کا خطاب مرحمت ہوا۔ میں دو برس تک ہزار حیل فریب کے ساتھ ہر ایک سے صحبت کرتا رہا۔

اسی زمانے میں بشیر و فیروز دو خواجہ سرا حضور جنت مکان نے مجھے عنایت فرمائے تھے۔ میں نے فیروز کو رحمت خانے کی داروغگی پر اور بشیر کو نظارت کے عہدے پر سرفراز کیا۔ بشیر نے یہ کوشش شروع کی کہ شمس بیگم مہدی کے ہو جائے۔ رفتہ رفتہ اس کا تیر دعا ہدف اجابت پر پہنچا یعنی میں ایک ماہ تاباں کے عشق کا گھائل ہوا۔ اور اس نے نشاط کی شرط کی کیونکہ بغیر اس کے عروج دشوار تھا۔

میں نے قطب علی خاں ستار باز کو ستار بازی میں اپنا استاد مقرر کیا اور اس سے یہاں تک اس قدر حاصل کیا کہ مغنیاں حیران ہو گئیں لوگ سننے میں رو دیتے تھے اور رونے میں ہنس دیتے تھے۔ چونکہ میری طبیعت عالی ہو گئی تھی بغیر گانا بجانا کے میرا دل نہ بھرتا تھا اور جو عورت اس فن سے واقف ہوتی تھی وہ نظروں میں سما جاتی تھی۔ میں چاہتا تھا اگر کوئی ناچنے گانے والی میرے ہاتھ لگے تو اس سے بہتر ہوگا۔ آخر امام حیدری و دلبر طرح الفت جو لکھنؤ بھر میں گانے ناچنے میں اپنا مثل و نظیر نہ رکھتی تھیں اور دلبر حیدری کی بڑی بہن میری خدمت سے شرف یاب ہونے کا بار اپنی گردن پر رکھتی تھی۔ اسی وجہ سے اپنی چھوٹی حقیقی بہن بطور نذر میرے حضور میں گذرانا جس کی عمر گیارہ برس کی تھی۔ میں نے اسے قبول کیا اور اس کا خطاب سلطان پری

دکھایا، بشیر خواجہ کے ذریعے یاسمن پری، میر اکبر علی کے وسیلے سے سلیمان پری، نواب خاص محل صاحب کے ذریعے سے حورت پری، داروغہ نجم النساء کی معرفت محل تک پہنچی تھیں۔

خدا کو کیا جواب دیں گے اس کے بعد داروغہ ارباب نشاط نے جس کا نام مہدی تھا محبوب جان کو جو سرود بجانے میں شہرۂ آفاق تھی زبردستی حیلے سے میرے گھر بھیجا۔ اس لئے کہ ہر زمانے میں داروغاؤں کا یہی طریقہ رہتا تھا کوئی فرقہ ان سے راضی ہو خواہ ناراض ان کو ان بے چاروں کے توڑ جوڑ کرنے سے کام۔ میں نہیں جانتا وہ خدا کے سامنے کیا جواب دیں گے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ولی عہد کا حکم گانے والیوں کو لانے اور اپنے گھر بٹھانے کے واسطے عام ہے تو خیال کیا میری بہتری اور بہبودی اسی میں ہے کہ کسی کو زبردستی حیلے سے میرے حضور میں حاضر کرے۔ جب میں نے اس (محبوب خان) سے اپنے گھر میں رہنے کو کہا تو اس نے انکار محض کیا اور عرض کی مجھے حیلے سے بلایا ہے۔ میں نے فرمایا اے نیک بخت خوش خاطر اپنے گھر جاؤ خدا تجھے اور دے گا اس خوش خبری کے سنتے ہی وہ میرے قدموں پر گر پڑی اور عرض پرداز ہوئی۔ اے جان عالم میں آپ کے اوپر سے قربان ہو جاؤں اب میں ان قدموں کو چھوڑ کر کہاں جاؤں گی امیدوار ہوں پریوں کے زمرے میں شامل کی جاؤں۔ اس کی عرض کے موافق عمل درآمد کیا گیا اور اسے ماہ رخ پری کا خطاب دیا۔

ایک روز اس کے عزیزوں میں سے ایک عورت نے خود کو میری بگھی کے گھوڑوں کے پاس ڈال دیا اور فریاد شروع کی۔ اس زمانے میں حضرت جنت مکان کے سامنے قلمدان کی خدمت میرے سپرد تھی اور میں اپنے والد کے مجرے کے واسطے دربار میں جا رہا تھا۔ اس کا شور و غوغا سن کر سخت پریشان ہوا میں نے دریافت کیا تو کون ہے اس نے عرض کی داد خواہ ہوں۔ داروغہ ارباب نشاط نے میری لڑکی کو زبردستی بندگان عالی میں بھیج دیا ہے۔ امیدوار ہوں اپنی داد کو پہنچوں۔ اسی وقت اس عورت کو اپنے ساتھ لے آیا اور ماہ رخ پری سے کہا تم اس کو پہچانتی ہو؟ اس نے کہا ہاں۔ اس کو آپ میرے روبرو طلب کریں میں اپنے طور پر سمجھا لوں گی۔ الغرض میں نے پانسو روپیہ ماہ رخ پری پر تصدق کر کے اس عورت کے حوالے کیا اور وہ راضی نامہ لکھ کر خوش و خرم اپنے گھر گئی۔

چپڑی اور دو دو وزیرن طوائف جس کا حوالہ آچکا ہے۔ گیہوں رنگ کی عورت ہے اس زمانے میں اس کی عمر تیس برس تھی۔ ہاتھ پاؤں بلحاظ تناسب خوش اسلوب تھے۔ پہلے میرے بھائی مرزا سکندر حشمت اس کے دام تزویر میں گرفتار تھے اور اس نے ہزار ہا روپیہ ان سے پیدا کیا۔ اکثر میرے ساتھ بھی ناز و نخرے کیا کرتی تھی۔ کبھی اپنی انگلی کے خون سے بیعت نامے پر مہر کرتی تھی اور ہزاروں خطوط عشق آمیز بھیجا کرتی۔ ایک روز میں نے اس سے کہا تو میرے بھائی سے بھی اپنی محبت جتاتی ہے اور مجھ سے بھی خواہش کرتی ہے چپڑی اور دو دو کیوں کر ہو سکتا ہے؟ اس نے قسم کھائی مجھے تمہارے بھائی سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک روز محفل طرب آراستہ تھی چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ میرے بھائی سکندر حشمت بھی محفل میں شریک تھے میں نے پوچھا وزیرن سے تم سے ملاقات ہے یا نہیں۔ انہوں نے جواب دیا وہ اکثر خطوط عاشقانہ میرے پاس بھیجا کرتی ہے میں نے جواب دیا اس نے میرے ساتھ بھی یہی طریقہ اختیار کیا ہے آخر الامر یہ بات طے پائی کہ اس محفل میں ہم دونوں میں سے جس کا ہاتھ وزیرن پکڑ لے اسی کی سمجھی جائے۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا مجھے مرزا سکندر حشمت بہادر سے کوئی واسطہ نہیں میں نہیں جانتی یہ کون ہیں اس وقت تمام محفل میں قہقہوں کی صدائیں بلند ہوئیں میرے بھائی شرمندہ ہو کر فوراً چلے گئے۔

پری خانہ مجھ کو جلسہ ترتیب دینے اور گانے والیوں کو جمع کرنے کا بہت خیال تھا۔ اس سبب سے سازندے اور علم موسیقی کے کاملوں

کی خواہش بہت تھی کہ پریوں کو تعلیم دی جائے۔ ہر روز جلسۂ عیش و طرب ہوا کرتا تھا خاص مکان کی چلمنیں چھوڑ دی جاتی تھیں اس کے باہر رقص و سرود کی تعلیم ہوا کرتی تھی۔ ایک مختصر مکان برائے تعلیم قواعد علم موسیقی تجویز کیا گیا۔ فرش فروش مع پردہ و دیگر سامان آرائش و زیبائش سے اچھی طرح سجا کر پری خانہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ صحن مکان میں سنگ مرمر کا فرش کیا گیا اور اس پر چینی کے نفیس گلدستے جا بجا رکھے گئے۔ تختوں کے چوکے اور پلنگ وغیرہ بچھائے گئے دروازہ مکان پر ترک سواریوں کا پہرہ مقرر ہوا۔ تاکید تھی کہ سوائے نجم النساء بیگم اور امامن دایہ پریوں اور مرد رفیقوں کے دوسرے لوگ اندر نہ جا سکیں۔ یہاں ہر روز دو وقت تین تین پہر بساط عیش و نشاط گرم رہتی اور پریوں کی تعلیم ہوا کرتی تھی میں بھی قواعد علم موسیقی حاصل کرنے میں بدل مشغول و مصروف رہتا تھا۔

تھوڑا زمانہ گذرنے پر میرے دل میں خیال آیا جس قدر گانے بجانے والی عورتیں مل سکیں اپنے گھر میں ڈالی جائیں اور ہر شخص سے

معروضہ حاضر ہے

یہی فرمائش تھی جو اس قسم کی عورتیں حاضر کرتا تھا وہ لفظ "معروضہ" عرض کرتا تھا یعنی "فلاں معروضہ حاضر ہے۔" کیا معنی کہ فلاں ناچنے گانے والی عورت حضور کے گھر پڑنے پر راضی ہے۔ یہ اصطلاح رکھا گیا تھا۔ اگر کسی مقام پر لفظ معروضہ آئے تو اس سے یہی معروضہ مراد ہوگی اور اگر لفظ عرض یا عرض داشت آئے تو اس کا مفہوم وہی ہوگا جو اس کے اصلی معنی ہیں۔

ایک روز امامن و نجم النساء بیگم نے عرض کی "حضور عالی کے لیے ایک معروضہ ہم لوگوں نے تجویز کیا ہے جو بے مثل و نایاب زمانہ ہے یقین ہے ایسی صورت کبھی چشم فلک نے نہ دیکھی ہوگی۔ گانے بجانے میں بھی یکتائے روزگار ہے سترہ اٹھارہ برس کا سن ہے ایک روز حضور کو راہ میں دیکھ لیا۔ اسی روز سے خواب و خور حرام ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ میں پریوں کے زمرے میں منسلک کر لی جاؤں۔ مُنّا نام ہے" جب میں نے اس کے خاندان کو دریافت کیا تو معلوم ہوا وزیرن کی بہن کی لڑکی ہے۔ لیکن اپنی خالہ سے پوشیدہ حضور کے وصل کا ارادہ رکھتی ہے یہ سن کر عنان صبر و طاقت میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ یہ خبر رفتہ رفتہ وزیرن کے کانوں تک پہنچی کہ یہ میری بھانجی کی محبت میں گرفتار ہیں یہ سن کر وہ از حد چراغ پا ہوئی اس نے مُنّا کی ملاقات سے مجھے روکنا شروع کیا لیکن عشق کی آگ بھڑکتی ہی جاتی تھی آخرکار ان بعض عورتوں کے توسط سے ایک شب کو وہ میرے گھر آئی اور وہ رات عیش و عشرت میں بسر ہوئی۔ لیکن صبح کو اس جرم کی پاداش میں صاحب نشاط کی کچہری سے قید ہو گئی۔ مگر قید خانے میں بھی اس کے دل سے میری یاد نہ گئی آخر بمجبوری کسی حیلے سے اس نے قید سے نجات پائی اور میرے گھر بیٹھ گئی۔ میرے دل میں اس کے عشق کی آگ روز بروز تیز ہوتی گئی۔ جب اس نے دیکھا یہاں معشوقوں کا مجمع تھا آتش رشک سے جلنے لگی اور اس جلاپے سے بچنے کی تدبیریں شروع کیں۔ وزیرن نے بھی اسی کی وجہ سے مجھ سے ترک ملاقات کر کے مجھو نواب مرزا اور علی بخش خاں حبشیوں کے رسالدار سے محبت کا آغاز کیا۔ بھچوان کو بھی بالائے طاق رکھ کے حاجی خانم کے بھائی یعنی حجو کے گھر بیٹھ گئی اور ابھی تک انھیں کے گھر میں ہے۔ یہ تنگ زندگی بسر کرتی ہے شیدی احمد پچاس برس کی عمر کا آدمی ہے لیکن وہ خدا جانے کیوں ایک سن رسیدہ کے گھر بیٹھی ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

منھ پر تھوک دیا

اسی عرصے میں ایک طبلہ بجانے والا شاہجہان آباد سے وارد ہوا۔ اور میرے یہاں ملازم ہوا۔ اس کا سن ۲۰ برس کا تھا۔ رنگ سرخ سفید اور کسی قدر تیار تھا۔ خوش طبع و خوش رو طاقت ور اور از حد قماش بین تھا اکثر رنڈیاں اس پر جان دیتی تھیں۔ عاشق تو معشوق مزاج تھا رفتہ رفتہ بہار محل کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ اسے مُنّا یعنی امتیاز پری کے عشق کا بھی کسی قدر خیال تھا ایک روز امتیاز پری نے اپنے گھر جانے کا ارادہ کیا میں مانع ہوا اس نے عرض کی ایک گھنٹے کے واسطے جانا چاہتی ہوں ابھی ابھی حاضر ہوں گی میں اس کے دام تزویر میں آ گیا۔ اس کے وعدے سے دو روز زیادہ گزر گئے میں نے داروغہ نجم النساء بیگم سے یہ حال بیان کیا وہ اس کے گھر گئیں مگر بسبب رشک

میرے یہاں آنے پر راضی نہ ہوئی۔ مجھے نہایت غصہ آیا اور اپنے دانتوں سے اپنا ہاتھ کاٹنے لگا۔ میں نے محمد حسین علی خاں (خواجہ سرا) کو حکم دیا اسی وقت اس کو کھینچتے ہوئے یہاں لے آؤ۔ خان نے کوئی تساہل نہ کیا اور امتیاز پری کی فریاد و زاری کا کوئی خیال نہ کر کے اسے کھینچتا ہوا میرے گھر لے آیا۔ میں نے جب اسے دیکھا تو اس کے منہ پر تھوک دیا اور کہا لعنت خدا کی۔ اسی منہ پر محبت کا دعویٰ تھا؟ ایک یا دو روز میں نے اسے اپنے گھر رکھا جب دیکھا وہ میری دشمن ہو گئی ہے اور اس کا دل اپنے گھر جانے کے لیے مچھلی کی طرح تڑپتا ہے تو ایک انگوٹھی ہیرے کی اپنی نشانی دے کر بہزار رنج و الم اسے اپنے سے علیحدہ کر کے اس کے گھر بھجوا دیا۔ اس واقعہ کے ایک برس بعد وہ مدقوق ہو کر مر گئی۔

راضی نامہ

ایک مرتبہ اکبر الدولہ بہادر کے وسیلے سے حجن نامی ایک طوائف میری محفل میں مجرا کرنے حاضر ہوئی۔ میں اس کو دیکھتے ہی عاشق ہو گیا۔ اس نے اسی وقت اپنا کل زیور اتار کر اپنی ماں نیفو چونے والی کے حوالے کیا اور کہا اب میں یہاں سے نہ جاؤں گی وہ روتی پیٹتی رخصت ہوئی۔ اس نے اپنے اوپر سے تصدق کر کے مبلغ دو ہزار روپیہ اپنی ماں کے حوالے کیا اس پر اس نے خوشی خوشی راضی نامہ لکھ دیا اور اپنے گھر چلی گئی۔ میں نے دل ربا پری کا خطاب مرحمت فرمایا۔ مخبروں نے عرضی میرے والد ماجد کی خدمت میں گزاری وہاں سے دل ربا پری طلب ہوئی جب یہ وہاں پہنچی تو عرض کی کہ میں بادشاہ سلامت سے عدل و انصاف چاہتی ہوں مجھ کو حرام کاری سے نجات ملے لونڈی بطیب خاطر ولی عہد بہادر کے گھر بیٹھنے پر راضی ہوئی ہے بلکہ میری ماں کا لکھا ہوا راضی نامہ بھی میرے پاس موجود ہے۔ ارشاد ہوا راضی نامہ گزرانا جائے بعد ملاحظہ ارشاد ہوا اسی طرح بحفاظت تمام ولی عہد کے مکان پر پہنچا دی جائے۔ اس کے اس احسان سے میرا سر نہیں اٹھتا۔

میں نے اپنی پریوں کے لیے رنگ برنگے لباس تیار کرائے تھے اور اس کے انتظام کے لیے نواب خاص محل کو مقرر کیا تھا۔ کئی لاکھ روپیہ سالانہ ان اشغال و افعال میں صرف ہوتا تھا۔

ایک روز ایک زن کسبیہ جس کا نام گنا تھا اور اب اس پیشہ سے توبہ کر کے اپنی ماں کے رشتہ داروں میں سے ایک کے ساتھ عقد شرعی کر لیا تھا مجھے خواب میں دیکھ کر دیوانوں کی طرح خواب سے بیدار ہوئی اسی وقت سے میری محبت کا تیر اس کے جگر میں پیوست ہو گیا۔ اس کی عمر بیس کی تھی۔ شیخ غلام علی گھیاں کے ذریعے سے پریوں میں شامل ہونے کا پیغام بھیجا میں نے قبول تو کیا لیکن وہ شوہر دار تھی اس سبب سے انکار کر دیا۔ اس نے اسی وقت جناب مجتہد العصر والزمان قبلہ و کعبہ کے یہاں جا کر طلاق حاصل کی اس کے بعد میں نے اس کو اپنے گھر بٹھا لیا۔ اور سرفراز پری خطاب دے کر ممتاز کیا۔

اسی زمانے میں امن داماں کی معرفت محبوبہ طوائف کی لڑکی جس کی عمر گیارہ برس تھی اور اس کمسنی پر بھی نہایت سرخ و سفید بڑی بڑی آنکھیں ابرو خوبصورت تھے بطور نذر میری حضور میں حاضر ہوئی۔ اسے بھی تعلیم دی گئی اور ظریف پری خطاب مرحمت ہوا۔

درگاہ حضرت عباس میں

ایک روز ان پریوں کو عمدہ عمدہ لباس و مرصع زیورات سے آراستہ کر کے پُر تکلف فنسوں اور نفیس نفیس پالکیوں میں نہایت کر و فر سے سوار کر کے بجائے زیارت درگاہ حضرت عباس رجب کی نوچندی میں بھیجا۔ ان کی ہمراہی میں داروغہ میر محمد مہدی اور داروغہ نجم النسا بیگم بھی تھیں۔ واللہ میں نے سنا کہ تمام بازار والوں میں اور ان تمام لوگوں میں جو درگاہ میں تھے نظریں اسی طرف تھیں بلکہ اسی رات کو حیدر حسین خاں سے نظارہ بازی کی بابت درگاہ میں ایک جھگڑا بھی ہو گیا۔ حضرت جنت مکان یہ خبر سن کر سخت برہم اور آشفتہ مزاج ہوئے اور اس امر کے بارے میں نہایت تاکید سے منع فرمایا۔ مردوں کے بیچ میں ہو کر ان لوگوں کے درگاہ جانے کا یہ سبب تھا کہ میں سنتے ہیں

محل کئے تھے اور ان کو پردے میں بٹھایا تھا۔ لیکن اس پردے کی وجہ سے میں پریشان تھا۔ ایک روز میرے دل میں خیال آیا کہ طرف ثانی اگر جبر سے محبت نہیں ہوتی تو ٹھیک ان لوگوں کو خود مختار نہ کیا جائے۔ ان کی محبت کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ اسی وجہ سے میں ان کے سوال کو رد نہ کرتا تھا۔

ماہ و مشتری طالع ہوئے

تھوڑا زمانہ گذرا تھا کہ میں نے سنا کہ نواب نشاط محل نجمی بیگم صاحبہ اور سلیمان پری حاملہ ہیں۔ میں نے اسی وقت سلیمان پری کو محل میں داخل کیا اور سلیمان پری محل صاحبہ خطاب عنایت فرمایا۔ عمدہ عمدہ چیزیں نفیس لباس جواہرات کی کشتیاں مع دیگر ساز و سامان کے مرحمت کیں اور اسی دن سے ان کو پردے میں بٹھایا۔ بعد انقضائے ایام حمل ان دونوں صاحبات محل کے ماہ و مشتری طالع ہوئے۔ نواب نشاط محل صاحبہ کے بطن سے مرشد زادہ والا دودمان پیدا ہوا۔ اس کے دادا نے اس کی ماں کو خلعت خوشی اور زیورہ تہنیت سے سرفراز فرمایا اور اس کو مرزا ابیر قدر خطاب دیا۔ نواب سلیمان محل کے بطن سے لڑکی پیدا ہوئی تھی اس کے دادا نے سپہر آرا اکبری بیگم کے خطاب سے معزز و ممتاز فرمایا۔

چند روز بعد نواب خاص محل کے حاملہ ہونے کا مژدہ جاں بخش سننے میں آیا۔ ایک لڑکا پیدا ہوا اس کے دادا نے گیارہ ضرب مبارکباد کی سر کرائیں۔ میں نے ایک جشن جمشیدی منعقد کیا اس کے دادا نے مرزا بیدار بخت خطاب مرحمت فرمایا۔ کچھ روز بعد مخبر نے فرخندہ خانم کے حاملہ ہونے کی خبر میرے گوش گذار کی۔ میں نے اسے پردے میں بٹھایا لیکن محل کا افتخار نہ بخشا۔ ایک دختر پیدا ہوئی اس کے دادا نے بخطاب شمس آرا بیگم ممتاز فرمایا۔

نواب نشاط محل صاحبہ کے یہاں پہر قدر تولد کی بزم میں ایک طوائف اچھے صاحب بیا والی بھی شامل تھی۔ ایسی صورتیں کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ سراپا کیا تھا خدا کی قدرت تھی۔ اگرچہ میں بھی اس زمانے میں بتوں کے مانند شوخ و شنگ تھا۔ حسن و خوبی لطافت میرے غلام تھے۔ وہ معشوقہ بہ ہزار ادا و ناز میری طرف دیکھتی تھی اور میں بھی بے اختیار ہو رہا تھا۔ وہ بہر تبرا ناچنے میں میرا ہاتھ پکڑ لیتی تھی اور میں بھی چھیڑ چھاڑ کرتا تھا۔ اس واقعہ کو بھی تین چار ماہ کا عرصہ گذر گیا۔ لیکن وہ اپنی ماں کے خوف سے اپنے دل میں پیچ و تاب کھایا کرتی تھی۔ آخر اسی زمانے میں میر اکبر علی کی معرفت وہ میرے گھر میں داخل ہوئی اور مبلغ پانچ ہزار روپیہ اپنے سر سے اتار کر اپنی ماں کے حوالے کیا۔

اسی زمانے میں یاسمن پری تعلیم رقص و سرود حاصل کر کے نادر روزگار ہوئی یوں کہ مجھے اس سے پہلے ہی محبت تھی لیکن بہ سبب لاغری اور کم سنی علم موسیقی حاصل کرنے کے لیے اسے چھوڑ دیا تھا۔ کچھ زمانے کے بعد خدا کے فضل سے وہ پری کی طرح ہو گئی۔ میں نے خدائے بزرگ کا شکر ادا کر کے اس سے محبت کی ابتدا کی۔ ایک برس تک اس کا اختر محبت میرے آسمان دل میں چمکتا رہا پھر ازرو بات چند در چند رشتہ الفت ٹوٹ گیا۔ اور میرا دل سرفراز بیگم کی طرف مائل ہوا۔

معشوق پری کی تعلیم موسیقی کو صرف تین ماہ گذرے تھے کہ قاصد نے اس کے حاملہ ہونے کی خبر سنائی۔ میں نے پردے میں بٹھا کر محل کے رتبے پر فائز کیا اور زیورات و پارچہ جات تحفہ اور محل سرائے مکلف برائے بود و باش تجویز کی۔ ایام حمل گذرنے کے بعد خدا کے فضل سے نویں تاریخ محرم الحرام کو فرزند پیدا ہوا۔ اس کے دادا نے مرزا فریدون قدر بہادر خطاب عطا فرمایا اور مجھے خلعت فاخرہ سے سرفراز کیا۔ اسی عرصے میں پیک فرخندہ فال نے خبر تازہ پہنچائی یعنی عزت پری کے حمل کے آثار ظاہر ہوئے۔ میں نے انہیں پردے میں بٹھا کر عزت محل خطاب تجویز فرمایا۔ یہ اور نواب معشوق محل صاحبہ دونوں ہمراہ حاملہ ہوئی تھیں۔ ایام حمل گذرنے کے بعد ساتویں محرم الحرام کو دختر پیدا ہوئی دادا نے مہر آرا بیگ

خطاب مرحمت فرمایا۔

دیگر کاروبار

ابتدائے ولی عہدی میں میں نے ایک عورت جو قوم کی کہاری تھی اپنی خدمت اور دیگر کاروبار کے واسطے نوکر رکھی۔ چونکہ یہ عورت نمکین اور تند و شوخ تھی اور اس کے قبل مرزا نصیر الدین حیدر کے یہاں کہاریوں کے زمرے میں ملازم تھی میں نے چاہا اسے اپنے مصرف میں لاؤں اور اس نے وعدہ و اقرار بھی کیا اگر مہری گری کا عہدہ مجھے عطا ہو تو میں حضور کا فرمان منظور کروں۔ میں نے یہ سوال قبول کر لیا دوسرے روز اس کو مہتر النسا خانم صاحبہ خطاب دے کر مہری گری کے عہدے پر سرفراز فرمایا۔ لیکن جب اس سے گھر بیٹھنے کو کہا تو اس نے تسلیم نہ کیا۔ ایک روز مجھے زیادہ غصہ آگیا اور اسے گھر بیٹھنے کی علت میں نوکری سے برطرف کر دیا اس نے اس تذلیل کو پایا اور اپنا حال تباہ کیا کہ میں نے خوف زدہ ہو کر پھر نوکری پر بحال کر دیا۔ مہری مجھ کو دونوں وقت خاصہ نوش کراتی تھی۔

ازراہ شفقت

اسی زمانے میں بادشاہ محل سے میرے والد ماجد کی قبیل میں چھوکریاں آئیں جو انھوں نے ازراہ شفقت مجھے مرحمت فرمائیں۔ میں نے ان میں سے دو اپنی خدمت میں لے لیں اور باقی کی شادیاں کر دیں جو میرے تصرف میں آئیں ان میں سے ایک فرخندہ بخش اور دوسری شاہ بخش کے نام سے موسوم کی گئیں۔

اس مہتر پری خانے نے جیسا چاہتے ویسا عروج حاصل کیا۔ ایک کے فریب سے چھوٹتا تھا تو دوسری کے چنگل میں گرفتار ہو جاتا تھا۔ ہمیشہ اور ہر گھڑی خواب و خور، ناز و نوش، گفتگو و حکایات، سیر و تماشا بغیر ان پریوں کے ہرگز اچھا نہ معلوم ہوتا تھا۔ ان میں سے اکثر حاملہ ہو کر محل کے رتبے پر فائز ہوئیں۔ مصروف رہ تین سال گذرے اور نجم النسا بیگم کے انتقال، میری رفیقہ اس کی رحلت اور روز مرہ کا ارتحال سمع خراش والا ہوا ورنہ میں نہیں جانتا کہ ظلم و ملال کیسا ہوتا ہے۔ اور صاحبات محل جو پردے میں بیٹھی تھیں اور مجھ کو نہیں پاتی تھیں از حد رشک و حسد کرتی تھیں اسی وجہ سے ان کی آراستگی و اہتمام میں فرق آنے لگا۔ ناچار ہو کر ان کی آراستگی کی خدمت امین علی خاں کے سپرد کی۔ اسے معتمد علی خاں کا خطاب فرمایا۔ وہ نہایت خواہش و آرزو سے اس خدمت میں سرگرمی کرتا تھا۔

رشک فوج انگریزی

اس زمانے میں میری طبیعت سپاہیوں کے فرقے کی نگہداشت کی جانب زیادہ متوجہ تھی لیکن قلت آمدنی و کثرت خرچ اور ممانعت والد ماجد کی وجہ سے ان کی نگہداشت کی نوبت کہاں۔ ناچار تیس عورتیں زنان خانے کی چوکی پہرے کے واسطے ملازم رکھی تھیں۔ جنھیں روز مرہ فارسی زبان میں قواعد تعلیم کیا کرتا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ ایسی ہوشیار ہو گئیں کہ قواعد انگلشیہ میری نظروں میں نہ سماتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک صفائی و شفافی سلاح میں رشک فوج انگریزی تھی اور پچاس نفر ترک سوار بھی میں نے ملازم رکھے تھے۔ انھیں بھی فارسی زبان میں ایسی ہی تعلیم دی تھی کہ درحقیقت رشک دہ فوج انگریزی تھے۔ الغرض ان دونوں فرقوں کی افسری حاجی محمد شریف علی خاں خواجہ سرا کو عنایت فرما کر جانباز سرکار مرزا ولی عہد بہادر کرنیل حاجی محمد شریف علی خاں بہادر کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

جزاکم اللہ

چونکہ مجھ سے غلام رضا وغیرہ اس کے عزیز و اقارب سے روز بروز ملاقات و ارتباط بڑھتا جاتا تھا اور یہ سب سنت جماعت تھے اور قطب علی خاں میرے استاد بھی سنی المذہب تھے مجھ کو رات دن یہی تشویش دامن گیر رہتی تھی کہ کسی طرح یہ لوگ میرے مذہب میں آجائیں۔ جب اس امر میں ان لوگوں کا عندیہ لیتا تھا تو انھیں ناراض پاتا تھا۔ آخر ایک روز برسات کی فصل میں میں نے نہایت دل جوئی اور منت سماجت و طمع دے کر ان لوگوں کو تبدیل مذہب کے لیے مجبور فرمایا۔ چونکہ اس امر خیر کا انجام میرے ہاتھوں ہونا تھا سب نے منظور کیا۔

میں نے اسی وقت سوار کروا کے سبھوں کو سلطان العلما مولوی سید محمد مجتہد وقت کی خدمت میں بھیج دیا اور وہاں یہ سب بصدق دل مذہب امامیہ سے سرفراز ہوئے۔ سلطان العلما کا مہری خط ان لوگوں کے دین مبین سے مشرف ہونے کا میرے ملاحظے سے گذرا میں بہت خوش ہوا اور سب کو خطابوں اور خلعت سے سرفراز فرمایا۔ انھوں نے بھی اقرار کیا ہم لوگ حضور کے غلام ہو گئے ہیں۔ جزاکم اللہ فی الدارین خیرا۔

انھیں ایام میں مہک پری کے حاملہ ہونے کا مژدہ میں نے سنا۔ مہک پری کو پردے میں بٹھا کر افتخار النسا خانم صاحبہ خطاب مرحمت فرمایا بعد انقضائے ایام فرزند پیدا ہوا۔ والدہ نے گیارہ ضرب توپ سلامی اور مبارک باد بجوائیں۔ اور مرزا یہ عیش قدر بہادر خطاب مرحمت فرمایا میں نے جشن خوب آراستہ کیا۔

صرف دھوکا تھا

اس زمانے میں یاسمن پری اور سرفراز پری پر احتمال حمل ہوا میں نے حسب دستور انھیں پردے میں بٹھایا لیکن چند روز کے بعد معلوم ہوا صرف دھوکا تھا۔ آخر میں نے انھیں باہر لا کر رقص و سرود کی تعلیم میں مشغول کر دیا۔

اس عرصے میں حور پری کے حاملہ ہونے کی خبر پہنچی چونکہ ایک مرتبہ یاسمن پری اور سرفراز پری سے دھوکا کھایا تھا۔ اس لیے پانچ ماہ گذرنے کے بعد اسے پردے بٹھلایا۔ ہر چند اسے پردے میں بیٹھنا بہت شاق ہوا لیکن میں نے بہت کچھ سمجھایا مگر وہ سوائے گریہ و زاری کے دوسرا کام نہ جانتی تھی مجھے خیال تھا شاید میری جدائی کی وجہ سے روتی ہے۔ کبھی اسے سمجھاتا کبھی اسے تشفی دیتا لیکن وہ کہتی تھی میں ہرگز ہرگز پردے میں نہیں رہوں گی بلکہ کیا عجب جو اپنا حمل گرا دوں۔ جب اس سے یہ باتیں سنیں تو پھر سمجھایا۔ ایک بندۂ خدا کا خون کرنا بے حد گناہ ہے۔ الغرض سات ماہ کے بعد لڑکا پیدا ہوا چالیس روز زندہ رہ کر مر گیا میں نے اسے تاج پٹے کا خلعت بھیجا حسب دستور ناچ گانے کی تعلیم میں شرکت کرنے کی اجازت دے دی لیکن وہ ظاہرا مردوں کا سامنا کرنے سے روتی تھی اور باطن میں باہر آنے سے خوش تھی۔ لاحول و لا قوۃ الا باللہ

ثابت ہو تو

جب والدہ نجم النسا بیگم نے انتقال کیا تھا تو وہ کنیزیں چھوڑی تھیں میں نے ایک کا نام ثمن اور دوسری کا حیدری رکھا۔ ثمن کا عقد غلام حیدر کے ساتھ کر دیا تھا اور حیدری کو اپنی خواصوں کے زمرے میں بھرتی کیا تھا۔ اسے آثار حمل نمایاں ہوئے مجھے اس جرم سے سخت حیرت ہوئی اور فرط غضب سے کوڑا ہاتھ میں لے کر دریافت حال کے درپے ہوا لیکن وہ کبھی کسی کا نام لیتی تھی کبھی کسی کا۔ جب میں نے تازیانے کی ضرب سے ڈرایا تو اس نے اقبال کیا کہ مجھ کو ثابت علی خاں کا حمل ہے۔ یہ سن کر مجھے بہت غصہ آیا اور ان چاروں بھائیوں کو طلب کر کے ان سے استفسار حال کیا۔ وہ میرے قدموں پر گر کر عرض کرنے لگے حضور کے سامنے ہم اپنا سر کٹوانے کو حاضر ہیں اگر یہ فعل ہمارا ثابت ہو تو۔ لیکن خداوند ہم نہیں جانتے یہ کس کا حمل ہے۔ یہ ہم پر ناحق اتہام رکھتی ہے۔ آخر آتش فساد حیدری کے نکال دینے پر فرو ہونا قرار پائی۔ چونکہ اس کا بھائی میرے یہاں فراشوں میں ملازم تھا میں نے حیدری کو سپرد کیا اور چاروں بھائیوں کے قصور سے درگذر کی۔

عین اختلاط میں

ایک روز دلدار پری نے عین اختلاط میں سرفراز پری کی بے وفائیوں کا ذکر چھیڑ کر کہا: اے جان عالم آپ کس قدر نادان ہیں عورتیں آپ پر سبقت لے جاتی ہیں اور آپ ان کی اطاعت میں غافل بیٹھے ہیں۔ برائے خدا اس غفلت سے باز آئیے افسوس آپ کو اپنے گھر کا مطلق خیال نہیں ہے اور لاکھوں روپیہ مفت برباد ہو رہا ہے اگر آپ مجھ سے محبت کرتے تو کیوں یہ حال ہوتا۔ آپ پر معشوقاں جفا پیشہ کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ فی الواقع دلدار پری عورت ہے مرہم صفات۔ سبحان اللہ ایسی ایسی عورتیں بھی پروردگار نے دنیا میں پیدا کی ہیں جس کے ایک ایک عشوۂ ناز پر میرا دل فدا ہوتا تھا جب میں نے دیکھا ایسی نوخیز دوشیزہ میری طالب ہے بے اختیار قبول کیا۔

لیکن اس بے وفا سے زمانہ (سرفراز پری) کے عشق میں بھی سرشار تھا۔ یہ باتیں کرنے میں کبھی رونے لگتی تھی کبھی ہنسنے لگتی۔ کبھی کہتی کہ تم ہرجائی عاشق نہیں ہو۔ ایک روز میں نے اس کے ہاتھ کی انگوٹھی لے کر اپنے تن زار پر جلانے کو تیار ہو گیا۔ جب صبح کے واسطے بیدار ہو کر چوکی پر بیٹھا کے لیے حقہ ہاتھ میں لے کر گیا تو چاہا اس انگوٹھی کو آگ میں ڈال دوں اور گرم کر کے اپنے جسم پر رکھ لوں چونکہ وہ انگوٹھی اس بے وفا کے ہاتھ کی تھی جو میرے دل نے قبول نہ کیا کہ اسے آگ میں ڈالوں۔ آخر انگوٹھی اپنے ہاتھ میں رہنے دی اور حقے کی منہال خوب گرم کر کے بائیں ران میں آٹھ جگہ گل دیے جب بھی محبت کی آگ میرے دل سے کم نہیں ہوئی۔ ایک دن میں نے اس سے کہا دیکھو میں نے خود کو تیری محبت میں جلایا ہے۔ یہ سن کر وہ بہت کھلکھلا کر ہنسی اور ران کے گلوں کو خوب چوما چاٹا۔

ران میں مہر

سلطان پری کی طرف غیروں نے بے وفائی کا الزام لگایا تھا، لیکن درحقیقت وہ میری شیفتہ و فریفتہ تھی۔ یہ خبر جب اس کے کانوں تک پہنچی تو وہ اس قدر روئی کہ دو تین روز میں از حد دبلی ہو گئی اور رنج و غصے کی وجہ سے کچھ نہ کھایا پیا۔ آخر ضبط نہ کر سکی اور میری لاعلمی میں میری ولی عہدی کی مہر کا نگینہ گرم کر کے اپنی ران پر تین جگہ جما لیا کہ تمام مہر کے حروف ران کی کھال میں پیوست ہو گئے اور لنگڑاتی ہوئی میرے پاس آئی۔ جب میں نے حال دریافت کیا تو رو کر میری مہر میرے ہاتھ میں دے کر کہا کہ اے جان عالم قربان ہو جاؤں تم نے مجھے بے وفاؤں کے زمرے میں شمار کیا تھا اب دیکھو میرے پاؤں کا کیا حال ہے۔ جب میں نے دیکھا تو واقعی اس کی ران میں تین جگہ مہر اتر گئی تھی اور میری مہر کے تمام حروف مثل آفتاب درخشاں و تاباں تھے۔ شرمندہ ہو کر عذر کرنے لگا وہ میرے گلے سے چمٹ گئی اور اس کی طرف سے میرا دل صاف ہو گیا۔

حضور باغ

چونکہ میرا دل صفائی، پاکیزگی اور راستی میں یکتائے زمانہ تھا اس بنا پر آراستگی باغ کے لیے علی نقی خاں کو مقرر کیا۔ یہ نہایت نظم و نسق کے ساتھ اس کی تیاری میں مشغول ہوئے۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس باغ اور نہروں کو دلہن بنا کر میرے ملاحظے سے گزرانا۔ میں نے باغ کا نام حضور باغ اور نہروں میں ایک کا نام چشمہ شیریں دوسری کا چشمہ فیض رکھا۔ اس کے گرد فوارے نصب کیے گئے ہیں۔ ہر چمن میں علیحدہ علیحدہ ایک قسم کے پھول ہیں۔ جگہ جگہ چینی کے مرتبان اور پتھر کے تراشے ہوئے گلدستے رکھے ہیں۔ بڑے درختوں میں خصوصاً شہتوت کا درخت اتنا بڑا ہے کہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ اس کے نیچے سنگ مرمر کا چبوترہ بنا ہے تاکہ وہاں برسات کے موسم میں نشست ہو سکے۔ ہر جمعہ کو اس درخت کے نیچے پریوں اور گانے والوں کا مجمع ہوتا ہے۔ یہاں شکار کرنے کی ممانعت ہے اس سبب سے اس کو گوشہ عافیت کہتے ہیں۔

وزارت کی علامت

چونکہ علی نقی خاں کی چندیا پر بال کم تھے میں نے ایک روز مذاقاً کہا نواب صاحب سر پر بالوں کا کم ہونا وزارت کی علامت ہے۔ انہوں نے عرض کی حضور کے تصدق میں یہ بھی ہو جائے گا۔ یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی اور میں نے اپنے دل میں کہا یہ دل لگی میں نے جھوٹ نہیں کہا ہے اگر تو چاہے گا تو اپنے وقت پر اس قول کا حال بخوبی ظاہر ہو جائے گا۔

اس زمانے میں گانے والوں کا مجمع، پریوں کا ہجوم، میرے عشق کا ولولہ اور زمانہ شباب اس درجے پر تھا کہ دن کا رات، رات کا دن ہوا معلوم نہ ہوتا تھا۔ خوش انداز گانے والے خوش رو بجانے والے، گانے بجانے کا شور، ناچ رنگ کا ہنگامہ، چار چار پانچ پانچ پہر تک طبلہ بجانے کی صدا آسمان تک پہنچتی تھی اور کوئی رنج و غم بجز معشوقوں کے درد و الم کے نہ تھا۔ معشوقوں کو بھی سوا لہو و لعب کے دوسرا کام نہ تھا۔ بجز اس کے کہ عمدہ عمدہ کھانا کھایا، نفیس پوشاک پہنی یا گانے بجانے میں مصروف رہنا تھا۔ خدا کے فضل و کرم سے رنج و غم کا نام مثل عنقا کے تھا۔ میں ہمیشہ شادی و عشرت سے ہم آغوش رہتا تھا۔

اُدھر جاتا ہے دیکھیں...

ایک روز بزم منزل آراستہ تھی میرے اور چھوٹے خاں کے درمیان میں شرط ہوئی تھی ہم لوگوں کی طبیعت کے امتحان کے واسطے ایک عورت بلانا چاہیے اس زمانے میں چھوٹے خاں بھی حسن صنم پر عشوہ و ادا تھا اس سبب سے اپنی صورت پر مغرور تھا۔ اس نے عرض کی پیر و مرشد مجھ پر بھی ہزاروں عورتیں مرتی ہیں۔ جناب والا مجھ سے ہرگز مقابلہ نہ فرمائیں۔ یہ تدبیر ہوئی کہ ایسی عورت بلانا چاہیے کہ جو ہماری تمہاری صورت سے واقف نہ ہو اور کبھی کسی جلسہ یا محفل میں بھی نہ دیکھا ہو۔ آخر ایک خوبصورت خوبرو عورت بلائی گئی چھوٹے خاں نے غسل و ادا آراستہ ہو کر دوپلی ٹوپی اگلی سر پر رکھی بادلہ لوٹ کا پیچ دار صافہ لہردار انگرکھا اور زردوزی کا جڑا پاجامہ پہن کر عطر عبیر ملا۔ بالوں میں خوشبودار تیل لگایا، پان وغیرہ کھا کر خود کو مالک مکان قرار دے کے اس عورت کو بلایا اور مجھ سے پوشیدہ اس عورت سے رابطہ محبت پیدا کیا۔ میں نے اس سے کہا کہ تم پہلے جس طرح ہو اسے اپنی کمند زلف میں اسیر کرو جب وہ بخوبی تمہارے عشق میں مبتلا ہو جائے گی اس وقت میں خود کو ظاہر کروں گا۔ موافق شرط کے اس نے تپاک شروع کیا یہاں تک کہ وہ عورت بخوبی چھوٹے خاں کی طرف مائل ہو گئی۔ اس وقت میں صرف سفید چادر اوڑھ کر اور سادی دوپلی ٹوپی سر پر رکھ کر اس کے سامنے آیا چونکہ رات تھی میں نے دیکھا نہایت اختلاط کے ساتھ چھوٹے خاں اس سے باتوں میں مشغول ہے میں نے خود کو چھوٹے خاں کا دوست قرار دے کر سلام علیکم کی آواز دی چھوٹے خاں نے بھی وعلیکم السلام جواب دیا اور مجھ سے نہایت خاطرداری کے ساتھ کہا۔ جناب والا کہاں تشریف رکھتے تھے؟ آیئے یہاں بیٹھئے۔ میں نے جواب دیا چند روز سے میں تمہاری ملاقات کا ارادہ رکھتا تھا خدا کا شکر ہے آج ملاقات ہو گئی۔ دو تین روز اس شہر میں قیام کر کے شاہ جہاں آباد چلا جاؤں گا۔ اس عرصے میں میں نے دیکھا وہ عورت جو چھوٹے خاں کی طرف مائل تھی یا ایک مرتبہ اپنے ہاتھ سے چراغ کی بتی بڑھانے لگی اور مجھ سے تھوڑی چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ اور پاندان کھول کر دو مسالہ دار پان بنائے ایک چھوٹے خاں کو اور دوسرا چھوٹے خاں کی پشت کی جانب سے مجھے دیا۔ میں نے اس کی یہ حرکت پوشیدہ نہ کی بلکہ چھوٹے خاں کے ظاہر میں وہ پان لیا۔ یہ اعلان اس پر ناگوار گزرا۔ پھر اس نے چھوٹے خاں کی پشت کی جانب سے میرے پاؤں پر ناخن مارنا شروع کیے میں نے چھوٹے خاں سے شکایت کی کہ دیکھو تمہاری عورت مجھے رسوا کرے گی۔ اس کلمہ کو سن کر وہ یا تو چھوٹے خاں کے پہلو میں بیٹھی تھی یا وہاں سے اٹھ کر میرے پہلو میں آکر بیٹھ گئی۔ آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ اس نے چھوٹے خاں کا دیا ہوا روپیہ جس قدر تھا زمین پر پھینک دیا اور کہا مجھے آج کی رات تمہارے یہاں بسر کرنا منظور ہے مجھ سے کہا تم اپنے مکان کا پتا بتاؤ ان شاء اللہ کل میں تمہارے مکان پر آؤں گی۔ میں نے کہا میں کل شاہ جہاں آباد چلا جاؤں گا یہ کہہ کر اپنی خوابگاہ میں جا کر سو رہا۔

رہس دھاری

ایک روز میں نے ناچ گانے کی صحبت سے فلک سیر کو زینت دی تھی۔ پریوں کو رہس دھاری تیار کرنے کا حکم دیا۔ رہس دھاری ایک ناچ کا سامان ہے۔ ہندوؤں کے مذہب میں اس کی پرستش کی جاتی ہے۔ ہزاروں روپیہ لگاتے ہیں۔ اس میں کنہیا اور اس کے معشوقوں کی شبیہ بنائی جاتی ہے حقیقت میں جیسا رہس میری سرکار میں تیار ہوا ہے ایسا کہیں نہ تیار ہوا ہوگا۔ سب پریوں کو استادوں نے تیار کیا ہے۔ یہ ایک فن ہے جس کے سات مرد میری سرکار میں بانی ہوئے ہیں۔ انہوں نے کنہیا اور اس کے معشوقوں کی شبیہ تیار کی ہے سلطان پری نے رادھا کا بھیس بدلا۔ ماہ رخ پری نے کنہیا کی صورت بنائی ہے سر پر مکٹ ہاتھ میں بانسری اور اس کے دوسرے لوازمات جو کئی لاکھ روپے میں تیار ہوئے ہیں باوجود سب چیزوں کے موجود ہونے کے صرف ان کی درستی میں پانسو روپیہ صرف ہوا ہے۔ یاسمن پری، عزت پری، دلربا پری، حور پری وغیرہ کنہیا کے دوسرے معشوقوں کی صورت بنی تھیں جنہیں سنسکرت میں گوالن کہتے ہیں۔ ان کا ناچ جس سنگیت کچھی اور بریم کے ہے جو نام تالوں کے ہیں۔

اس کتاب میں صرف کنہیا اور رادھا کے معاشقے کی کیفیت ہے جو وصل و فراق کی حالت میں ہوتا ہے جسے ہندی میں دوہیروں میں بیان کرتے ہیں یہ جلسہ صبح کو نہیں ہوتا شام کو ہوتا ہے۔

مینا بازار

ایک روز میں نے پریوں کی خواہش کے مطابق مینا بازار اور میلے کے واسطے حکم دیا چنانچہ میلے اور مینا بازار کا سب سامان پیشہ وروں نے لا کر حاضر کیا۔ قرینے سے دکانیں آراستہ کی گئیں میں نے اس جلسے میں خورد سال کہاریوں کو زربفت اور تمامی کے جوڑے اور بہت سا روپیہ میلے کے خرچ کے واسطے عنایت فرمایا تھا اور وہ کمال ناز و انداز کے ساتھ بجلی کی طرح میلے میں پھرتی تھیں۔ ما بدولت و اقبال ہاتھی پر سوار ہو کر دونوں ہاتھوں سے روپیہ لٹاتے ہوئے اور میلے کے وضیع و شریفوں پر سایہ ڈالتے ہوئے سیر میں مصروف تھے۔ فقیر و بے نواؤں کو اپنی بخشش سے بے نیاز کر دیا اور کارپردازان سرکار کو حکم دیا کہ میلے کی کل چیزیں مع رکھنے کے برتنوں کے دو گنی قیمت سے خرید لو تاکہ بیچنے والے مستفیض ہو جائیں اور یہ بے حساب بخشش صفحۂ روزگار پر یادگار رہے۔ مینا بازار کی خریدی ہوئی چیزیں اعلیٰ حضرت امجد علی شاہ کی خدمت میں بھیجیں انھوں نے از راہ شفقت پدری فرمایا تمام مینا بازار خرید لیا گیا اور ہمیں جلسہ کی خبر جو ہوا وہ ہوا آئندہ اطلاع دینا شرط ہے۔

سابقین کا پابند

بادشاہوں نے رسم قدیم کے موافق اپنے نظر کردوں کو ہر فن کی تعلیم دلوائی ہے اور اسے درجہ کمال تک پہنچانے میں بہت کوشش کی ہے۔ مثل ہندوستان کے محمد شاہ بادشاہ دہلی اور ابراہیم عادل شاہ سلطان بیجاپور وغیرہ شاہان سلف نے اکثر جمیل و شکیل عورتوں کو علم موسیقی کی تعلیم دلا کر گائن کے لفظ سے ملقب کیا ہے۔ لہٰذا ما بدولت و اقبال نے سابقین کا پابند ہو کر اکثر زہرہ جبینان ماہ تمثال کو موسیقی کی تعلیم کا حکم دیا۔ ایک روز چودہ تاریخ جب چاند درجہ کمال پر تھا میں نے اس فن کے کاملوں کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور فرمایا طرح طرح کے کھانے لذیذ و خوش ذائقہ اور جس چیز کی ضرورت ہو سب مہیا کرو۔ الحاصل شام کو سب کاملین فن در دولت پر حاضر ہوئے جب محفل جمع ہو چکی تو ان حسینوں نے راگ گا کر روح فلک کو سرشار کر دیا ان سب میں خصوصاً سلطان پری نے اپنے کمال کا ایسا اظہار کیا کہ غش کی نوبت پہنچی۔

سحری کے بعد

میں ماہ رمضان المبارک میں سحری کھا کر سو رہا تھا کہ محمد مستعد علی خاں خواجہ سرا نے خلاف وقت حاضر ہو کر بیدار کر دیا۔ جب میں نے بیدار ہو کر دریافت کیا اس وقت تو نے جگا کر کیوں تکلیف دی اس نے عرض کی کہ ایک عورت ہندنی عمدہ والی جاہ کے عشق میں مبتلا ہو کر یہاں تماشا دیکھنے آئی ہے چونکہ اس پر پہلے ہی سے میری نظر التفات تھی اسی وقت مکان مذکور میں گیا۔ دیکھا وہ بیٹھی ہوئی ہے مجھے دیکھ کر دوڑ کر لپٹ گئی آخر احوال دریافت کیا تو اس نے کہا میں محرم کے بہانے یہاں آئی ہوں اگر میری والدہ یہ سن لیں تو مجھ پر بہت غصہ کریں۔ میں نے کہا اس کے بعد کیونکر ملاقات ہو گی اس نے کہا ماتم کے دن ختم ہونے کے بعد جناب امیر علیہ السلام کی شہادت کی شبیں جو تھیں ان میں تم کو دم تک پہنچاؤں گی۔ میں نے قبول کیا چند بار اس سے ملاقات ہوئی لیکن بوجوہات چند در چند گھر میں بٹھانے کا اتفاق نہ ہوا۔

تخت نشینی

جب میرے والد ماجد راہی گلزار جناں ہوئے چار گھڑی گزری تھی انگریزی چپراسی یعنی بڑے صاحب کے فرستادے نے آکر عرض کی بڑے صاحب نے کہلا بھیجا ہے چھوٹے صاحب حاضر نہیں ہیں۔ لہٰذا ملکہ صاحب بندگان والا شان کی ہمراہی کے لیے حکم ہے ان کے ساتھ تشریف لائیے الحاصل میں اسی حزن و ملال کی حالت میں نقرئی ہودج پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔ یہ وقت بھی دیدنی تھا سب جاں نثار ہالے کی طرح اس ہودج کو گھیرے ہوئے تھے اس کا پایہ نہیں چھوڑتے تھے۔ جس وقت میں گلستان ارم میں داخل ہوا تو بڑے صاحب سے گفتگو ہوئی اس کے بعد میں نے بارہ دری پر آکر دوگانہ ادا کیا۔ اور مجتہد العصر والزمان نے اپنے ہاتھ سے میرے سر پر تاج رکھا اس کے بعد میں تخت پر جلوہ

آراستہ ہوا اور جس قدر اراکینِ سلطنت حاضر تھے سب نے نذریں پیش کیں اور سلامی کی توپیں سر ہوئیں۔ میں نے لمحہ بھر تخت پر توقف کیا چونکہ اس رات کو معشوقوں اور پریوں سے دور رہا تھا لہٰذا محمد علی خاں کو کہا تھا ایک ایک انگوٹھی ہر بیگم اور پری سے بطور نشانی منگوا کر اپنے گلے میں ڈال لی۔ دوسرے روز سب مصاحبانِ خاص کو عمدہ تلواروں، خلعتوں اور معقول خطابوں سے سرفراز فرمایا۔ تھوڑے عرصے کے بعد امین الدولہ زخمی ہو کر موقوف ہو چکے اور علی نقی خاں مدار الدولہ بہادر خطاب پا کر وزارت کی خدمت پر ممتاز ہوئے۔

طمع دے کر

ولی عہدی کے زمانے میں سب بیگموں پریوں کی عادت اور حالت بے وفائی مجھ پر ظاہر ہو چکا تھا۔ اس بنا پر خیال کیا کہ اب روپے کی طمع دے کر پردے میں بٹھایا جائے لیکن ان میں سے چند عورتیں جو وفادار نہ تھیں اس سے بھاگ گئیں۔ میں نے ایک روز سب پریوں کو پردے میں بٹھا کر خطابوں سے سرفراز فرمایا۔ نواب خاص محل صاحبہ ملکۂ عظمیٰ نواب بادشاہ محل صاحبہ خطاب پا کر مبلغ پانچ ہزار روپے ماہوار پر سرفراز ہوئیں۔ تھوڑے عرصے کے بعد سب صاحبانِ محل اور صاحبانِ نواب وغیرہ کو نوٹ کے کا خلعت اور کئی کئی لاکھ روپیہ دے کر سرفراز فرمایا۔ مرزا فلک قدر بہادر ولی عہدی کے مرتبے پر، مرزا کیوان قدر بہادر جرنیلی کے عہدے پر ممتاز ہوئے۔

رفع خفقان

اس عرصے میں میرے دل کو بہت خفقان ہو گیا۔ صاحبانِ محل کی جدائی جو پردے میں بیٹھی تھیں مجھ کو نہایت گراں معلوم ہوئی لہٰذا رفع خفقان کے واسطے چند عورتیں ناچنے والی ملازم رکھیں۔ جب سرفراز محل کے باہر آنے جانے کی راہ مسدود ہو گئی تو سنا گیا سرفراز محل کو پردے کا مطلق خیال نہیں۔ چبوترا دار مکان سے دریائے گومتی کا نظارہ کیا کرتی ہیں۔ اکثر نواب عمدہ محل کی زبانی معلوم ہوا کہ پردے کی وجہ سے بے حد روتی ہیں اور جب مجھ سے ملاقات ہوتی ہے تو کہتی ہیں کہ تمہارے فراق میں روتی ہوں۔ میں نے دل میں کہا پردہ دار کس بلا میں مبتلا ہوں۔ ایک روز تو ان کے حرکات میں نے بچشم خود ملاحظہ کیے جب ان سے دریافت کیا تو انھوں نے سخت قسمیں کھائیں۔ اس بات کے درپے تھیں کہ یا تو میرے پاس رہیں یا مجھ کو بھی باہر لے چلو۔ ہر چند میں نے سمجھایا کہ اب محل میں بیٹھنے کے بعد باہر آنا بڑی قباحت ہے مگر وہ بجز رونے دھونے کے میرے سمجھانے کا کچھ خیال نہ کرتی تھیں۔ ادھر نواب سلطنت محل صاحبہ نے قسم کھائی کہ اگر سرفراز محل باہر گئیں تو واللہ باللہ میں بھی بے تابانہ محل سے باہر نکل پڑوں گی۔ حقیقت میں نواب سلطنت محل کا میرے فراق میں ایسا حال ہو گیا تھا کہ ایک برس اور چند مہینے کی جدائی میں برسوں کی بیمار معلوم ہوتی تھیں۔

میرے فراق میں

ایک روز ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی مجھے بادشاہ باغ جانے کا خیال آیا۔ سب محلوں کو سوار ہونے کے واسطے حکم دیا لیکن نواب سرفراز محل کو سوار ہونے کی اجازت نہ دی۔ سنا گیا اسی رات کو نواب سرفراز محل نے میرے فراق میں ہیرے کا نگینہ انگوٹھی سے نکال کر کھا لیا۔ جب میں نے سنا تو بسترِ غم پر گر پڑا۔ بادشاہ باغ سے چبوترا دار مکان تک چپراسیوں کی ڈاک بٹھا دی تھی کہ گھڑی گھڑی کی خبر پہنچے۔ آخر خدا کے فضل سے انھوں نے شفا پائی لیکن ہر روز مجھے اپنے ہمراہ رکھنے کے واسطے تنگ کرتی تھیں۔ اس عرصے میں ناصر فرخندہ فال نے نواب سرفراز محل صاحبہ کے حاملہ ہونے کی خبر سنائی۔ میں خدا کا شکر بجا لایا اور ان کا عشق پہلے سے زیادہ بڑھ گیا۔ پانچ ماہ بعد سنا گیا کہ حمل ساقط ہو گیا۔ میں بہت رویا۔ انھوں نے غسلِ صحت کیا۔ پھر مجھ سے ملاقات ہوئی لیکن روز نواب سلطنت محل صاحبہ اور نواب سرفراز محل صاحبہ مجھ سے باہر آنے کے لیے کہتی تھیں اور طرح طرح کی وحشت خیز خبریں جن کا ذکر سابق میں ہوا ہے پے در پے میرے کانوں تک پہنچتی تھیں۔ میں نے اپنے دل سے کہا کہ اے بے ہودہ جس امر کے واسطے تو نے پردہ داری کی تھی جب وہی نہ ہوا تو پھر محل میں بٹھانا کیا ضرور۔ ایک روز دونوں کا ہاتھ پکڑ کر سمجھانے میں مشغول ہوا کہ تم لوگوں کو

خدائے تعالیٰ نے عزت دی ہے محل کے رتبے تک پہنچایا ہے ۔ تیرے دونوں کا ہاتھ پکڑ کے باہر لایا اور یہ پھر نئے جلسے میں شامل ہوئیں اور محل کا رتبہ چھوڑ کر اپنی عزت کا سامان توڑا ، حیا کے پردے پھاڑ ڈالے شرم کی نقاب الٹ کر پھر بازار والیوں میں شامل ہو گئیں ۔ صرف ان دونوں کی خاطر مداری کے لیے یہ کام کیا ورنہ ہرگز نہ ہوتا کہ محل بنا کے پھر باہر لاتا ۔ ایک روز انھیں تبدیلی مکان یعنی ماں کے گھر بھیج دیا ۔ مگر دو چار دن کے بعد دل نے ریشہ دوانی شروع کی مجبوراً اپنے کیے سے پشیمان ہو کر قطب الدولہ کو بھیجا اس نے جواب میں کہا اب میں ہرگز نہیں آ سکتی چونکہ میری بے عزتی ہوئی ہے لہٰذا میں زیارت عتبات عالیات کے لیے جانا چاہتی ہوں ۔

کارِ خیر ایک روز میں نے چاہا کہ لڑکیوں کے کارِ خیر سے یعنی ان کی نسبت سے سبکدوش ہو جاؤں خدا معلوم آج کیا ہے کل کیا ہوگا ۔ آخر والدہ صاحب کے مشورے سے ہر ایک کی نسبت کا پیغام دیا چنانچہ جو نواب محسن الدولہ اپنے چچا کے دل بند مرزا عالی قدر سے مہر آرا اصغرا بیگم نواب عزت محل کی دختر سے نسبت ٹھہرائی ۔ وہ ماشاء اللہ شاب پانچ برس کی ہے ۔ مرزا ابوالقاسم ابن ابو طالب خاں ، اپنے ماموں کے لڑکے سے نسبت مہر آرا بیگم دختر نواب سلیمان محل قرار دی اس امرِ خیر سے فراغت کے بعد حال و قال کی محفلیں ، مشاعرے کی صحبتیں ، مے خواری کے جلسے اس خوبی سے ہوتے کہ ناظرین و سامعین سالہا سال اس کیفیت اور لذت میں رہے ۔

لاحول ولا قوۃ اس عرصے میں نواب قمر رشید محل ، نواب امیر محل اور جناب خانم محل کو چھوڑ کر سرائے میں تشریف لائیں لیکن خفت و ذلت اٹھانے کے بعد خدا جانے کیا سمجھا جو پھر پردے میں بیٹھیں لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم ۔ اگر پردے میں بیٹھنا تھا تو باہر آنا کیا ضرور تھا اگر باہر آ گئی تھیں تو پھر پردے میں بیٹھنے کی کیا حاجت تھی ۔ لیکن انھوں نے عصمت کو لڑکوں کا کھیل سمجھا تھا بلکہ ایک روز لڑائی کے وقت حضرت بیگم اور نواب سلطنت محل نے بھی اپنے آدمیوں کو نعش کے واسطے شیخ صاحب بہادر کی کوٹھی میں بھیجا تھا لیکن وہ سب سڑک سے گرفتار ہو کر قید ہو گئے یہ بھی ایک نامعقول امر تھا کہ اپنے معشوق پر غیر جگہ تلاش کرنا ۔ سبحان اللہ دنیا کی رسم اس طرح سے ہے دوسرے اسی عرصے میں معشوقۂ خاص نے میری انگوٹھی کے گل کھانے کے واسطے مجھ سے تحریک کی جب میں نے قبول کیا تو [illegible] کرنے لگیں اس بات سے معلوم ہوا کہ صرف دنیا داری تھی ۔ ایک روز ایک عورت کو نذر دینے کے واسطے میں عرض کی تھی چونکہ وہ بد شکل تھی پسند طبع اقدس نہ ہوئی ۔

کتابیں بھری پڑی ہیں اسی طرح صدہا ان صاحبان کی بے وفائی کے حالات ہیں جو باوجود میرے اس حکم و ثروت اور صورت و سیرت اور ہزاروں خوبیوں کے جن سے کتابیں بھری پڑی ہیں ان لوگوں نے اس قدر بے وفائی کی تو دوسروں کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے ۔ اس عرصے میں میں نے خلقت کی دادخواہی کے واسطے چاندی کے صندوقچے لکڑیوں پر نصب کروا کر اردلی کے سواروں کو دے دیئے کہ جو شخص جو یادداشت اس میں چھوڑے وہ جمع ہو کر میرے ملاحظے میں گزرانی جاوے ۔ ان میں بھی ایک بند لفافہ ملاحظہ کیا جب اسے کھولا تو یہ حال نواب امراؤ محل صاحبہ اور دوسرے محلوں کی بے وفائیوں کا لکھا تھا اس غیرت سے وہ سلطانی مشغلہ بھی موقوف کیا کیوں کہ اس سے میرا رنج تازہ ہو جاتا ہے ۔

سر بگریباں ہو کر نواب سکندر محل اپنا جواب نہ رکھتی تھیں انھوں نے بڑے ناز و نیاز سے عرض کی کہ اے جانِ عالم خدا کے فضل و کرم سے میری سب دینی و دنیوی آرزوئیں پوری ہو گئیں صرف تم سے نکاح کرنے کی حسرت باقی ہے میں نے سر بگریباں ہو کر شرم کی کہا میں اب نکاح کرنے کے لائق ہوں سب صاحبان محل اور بازاری لوگ ہنسیں گے یہ بھی نصیر الدین حیدر بادشاہ کی

طرح دیوانہ ہو گیا ہے لیکن انہوں نے ہرگز میری منت و الحاح سے قبول نہ کی۔ آخر میں نے ناچار ہو کر یہ راز سربستہ جناب والدہ کی خدمت میں عرض کیا۔ انہوں نے فرمایا کیا مضائقہ ہے۔ آخر انہیں ایک حجرے میں بٹھا کر نکاح پڑھوایا اور انہوں نے محفل کی آراستگی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

سرمہ ہو جاتیں

اسی عرصے میں لارڈ صاحب کی ملاقات کے لیے کانپور کا سفر کیا تھا اور سب صاحبان محل روزانہ میرے مزاج کی کیفیت دریافت کرتی تھیں۔ لیکن نئی بیگموں میں سے ایک بھی پرسان حال نہ ہوئی یہ بھی محبت کی بربادی کا باعث ہوا۔ قیصر بیگم نے باوجود میری اس قدر اطاعت کے اپنی ماں کو بلایا اور میں چند مرتبہ ان کی خوشنودی مزاج کے لیے ان کی عرض پر کاربند ہوا لیکن قیصر نے میری محبت پر التفات نہ کی۔ اسی طرح خسرو بیگم نے بھی بے التفاتی کرنا شروع کی۔ ایک روز جھٹپٹے وقت میں محبوبہ عالم اور حضرت بیگم کے ساتھ بگھی پر حضرت باغ کی گلگشت میں مصروف تھا۔ اس وقت حضرت بیگم میری گود میں تھیں میں ان سے لطف آمیز باتیں کر رہا تھا یہ محبوبہ عالم کو ناگوار گزرا اور انہوں نے بے تاب ہو کر خود کو بگھی کے نیچے گرا دیا مگر اس روز خدا کا فضل نہ ہوتا تو ہڈیاں تک سرمہ ہو جاتیں۔

سنگ تفرقہ

ایک روز تجاہل عارفانہ کر کے سب بیگموں سے بطریق مزاح کہا اگر تم سب لوگ اپنے قدیم گھروں کو چلی جاؤ تو میں بار گراں سے نجات پاؤں۔ یہ سنتے ہی سب مع حضرت بیگم رضامند ہو گئیں۔ لیکن امراؤ بیگم راضی نہ ہوئیں کیونکہ انہیں حمل کا گمان تھا۔ میں نے ان کے حسب خواہش اسی وقت سواری طلب کی۔ ہر چند سب مصاحبوں نے سمجھایا لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ سب بیگمیں مع محبوبہ عالم کے جس نے خود بگھی سے گرایا تھا چلی گئیں۔ میں جانتا تھا قیصر بیگم مجھ پر مرتی ہے لیکن سب سے ہم تو کم غلط نکلے۔ اپنے گھروں میں جا کر ایک نے بھی مجھے نہ پوچھا

دیکھئے ہے منجنیق چرخ تاک کے سنگ تفرقہ
بیٹھ کر ایک جا خوش ہوں کہیں ہم کلام دو

مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ ایک نے بھی میرا دامن نہ پکڑا کہ میں تمہارے گھر سے نہ جاؤں گی۔ اس روز سے سب بیگموں کی طرف سے میرا دل کھٹا ہو گیا۔ اور میں نے کان اینٹھے کہ اب کسی سے محبت نہ کروں گا۔ اور عورتوں کی طرف سے اتنا بدظن ہو گیا تھا کہ اگر کوئی عورت مر جاتی تو میں کہتا تھا یہ قبر میں بھی فریب کرنے گئی ہے اور جب تک چالیسواں نہ ہو لے مجھے یقین نہ آتا تھا۔

وقنا ربنا عذاب النار

اسی زمانے میں قیصر بیگم کی حرارت سے نار فارسی کے عارضے میں مبتلا ہو گیا اور روز بروز مرض زیادہ ہوتا گیا۔ تمام زخم آگ کی طرح جلتے تھے۔ اس پیکر محبوب گلرخوں کا رنج میرے دل سے نہ جاتا تھا لہٰذا اپنے دل سے کہا بے عیبی اور صحت کی حالت میں تجھے کون پوچھتا تھا جو اب پوچھے گا۔ ایک روز نواب مغل صاحب نے مجھے اپنا ہاتھ دکھایا تو واللہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا انہوں نے اپنے ہاتھ آتے ہی اور میں نے خوب دھو کے طہارت کی ہیں یہ دیکھ کر رو دیا۔ اس سے زیادہ یہ ہوا انہوں نے میرے پاس آ کر کہا خدا تم کو شفا عطا کرے لیکن اس قسم کے مریضوں کو کوٹھری میں روئی باندھ کر دیتے ہیں اور اس کے جسم میں ہاتھ لگانا نقصان رکھتا ہے اس واسطے میں نے ہاتھ دھوئے تھے میں خوب رویا۔ اس روز سے شہنشاہ منزل کو بند کر دیا اور کسی کو اپنے پاس نہ آنے دیتا تھا۔ مرض روز بروز ترقی کرتا جاتا تھا یہاں تک کہ میں رات رات بھر زخموں کی تکلیف سے جاگا کرتا تھا۔

کئی بار سہل حب السلاطین کی دوا کھائی لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ کئی مرتبہ باسلیق کی فصد کی مگر مفید نہ ہوئی۔ آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ [illegible] میں ہر چند زخم خشک ہو گئے تھے مگر یہ عالم تھا کہ ابتدائی زمانے سے حضرت سید الشہداء کے چہلم کے زمانے میں مجلس سے فراغت کر کے کئی ہری بھری

کھائیں اس سبب سے عارضہ خفقان مجھ کو پیدا ہو گیا۔ اپنا گریبان چاک کر ڈالا، کپڑے پھاڑ ڈالے۔ آخر دوسرے روز غش آگیا۔ اس روز سے آج تک دو ماہ کا عرصہ ہوا، برابر دنبل نکلتے ہیں پھر خشک ہو جاتے ہیں اسی جھگڑے میں گرفتار ہوں۔ اگر کسی وقت ہوش آجاتا ہے تو البتہ شعر و شاعری کا شغل ہونے لگتا ہے۔ پھر غفلت ہوتی ہے اور میرے تمام اعضا مع منہ اور آنکھوں کے بید کے مانند لرزتے ہیں۔ خدا رحم کرے **فاعتبروا یا اولی الابصار** حق سبحانہ و تعالیٰ کل مومنین و مومنات و مسلمین و مسلمات کو ہر دغا باز عورتوں کے شر سے محفوظ رکھے۔ اس عرصے میں جملہ منہیات و عقار وغیرہ سے بوجہ شدت مرض انکار کیا اور اس وقت سے کبھی گانے کی آواز میرے کان تک نہیں گئی۔ اسی وجہ سے میرا تمام پری خانہ برباد ہو گیا، نگوڑے بیجے وغیرہ سب ملازمت سے برطرف کر دیے گئے۔ سب سلیمانی ساز و سامان تلف ہو گیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

چھوڑ جانے کو کیا جمع جہاں کا اسباب
دارِ فانی میں ہے سب وہم و گماں کا اسباب

(تلخیص: نثار احمد فاروقی)

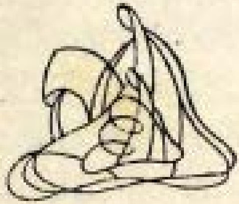

ڈاکٹر طہٰ حسین

وہ اس دن کا نام نہیں بتاتا اور نہ بتا سکتا ہے کہ خدا نے اس کو کس سال کے کس مہینے میں کہاں رکھا تھا۔ بلکہ وہ اس روز کا معین وقت بھی نہیں بتا سکتا البتہ وہ اس وقت کا صرف تقریبی اندازہ لگا سکتا ہے۔

اس وقت کا غالب گمان یہ ہے کہ یہ وقت اس روز کے فجر یا عشا کا تھا اپنے اس خیال کو وہ اس لیے ترجیح دیتا ہے کہ اس وقت اس کے چہرے کو جو ہوا لگ رہی تھی وہ کس قدر ٹھنڈی تھی اور اس میں دھوپ کی گرمی نہیں پائی جاتی تھی، وہ اندھیرے اور روشنی کی حقیقت سے واقف ہونے پر کہہ سکتا ہے کہ جب وہ گھر سے نکلا تو اس نے ایسی ہلکی ہلکی روشنی محسوس کی جس کے اطراف میں کچھ کچھ اندھیرا بھی تھا جس وقت اس نے یہ ہوا اور روشنی محسوس کی تو اس کو اپنے گرد و پیش ابھی بیداری کی چہل پہل کے آثار نہیں دکھائی دیئے بلکہ ایسی حالت تھی جو بیداری کے بعد یا سونے سے پہلے ہوتی ہے

وہ اپنے باپ کے تیرہ بچوں میں ساتواں اور اپنے گیارہ سگے بھائیوں میں پانچواں تھا بھائیوں اور بہنوں کی اس بڑی تعداد میں نسبتہً جو امتیاز اس کو حاصل تھا وہ اس سے بھی باخبر تھا۔ آیا یہ امتیازی مقام اسے پسند تھا یا کلفت دہ تھا اس کا پتہ نہیں چلتا ایک تو یہ ہے۔ وہ خود بھی اس کے متعلق کچھ حکم نہیں لگا سکتا۔ محبت و مہربانی میں بھی ماں کی طرف سے کچھ بے پروائی بلکہ کبھی کچھ درشتی بھی محسوس ہوتی تھی اور باپ کی طرف سے بھی اس مہربانی و نرمی کے ساتھ ساتھ کبھی بے توجہی بھی معلوم ہوتی تھی۔ اپنے بھائی بہنوں کی اس احتیاط سے اسے دکھ ہوتا تھا کیونکہ اسے یہ معلوم ہوتا تھا ان کی اس شفقت میں کچھ حقارت بھی شامل تھی۔

لیکن اس کو ان سب باتوں کا سبب معلوم کرنے کا انتظار نہیں کرنا پڑا وہ یہ محسوس ہو گیا کہ دوسروں کو اس پر فضیلت حاصل ہے اور اس کے بھائی بہنوں میں کوئی ایسی قوت ہے جو اس کو نصیب نہیں اور وہ کوئی کام ایسا بھی کرتے ہیں جو اس کو یہ نہیں کر سکتا۔ یہ بھی محسوس ہوا کہ اس کی ماں اس کے بھائیوں کو بعض ایسی باتوں کی اجازت دیتی ہے جن سے اس کو منع کرتی ہے ماں کی یہ احتیاط اس کو بہت ناگوار تھی مگر تھوڑے ہی عرصے میں اس کی یہ ناگواری گہری خاموشی اور گہرے رنج میں بدل گئی، کیوں کہ اس نے اپنے بھائیوں کو ایسی باتیں کرتے ہوئے سنا جن سے یہ واقف تھا لیکن وہ سمجھ گیا کہ وہ بینا ہیں اور یہ نابینا۔

ایک دن رات کے کھانے پر وہ اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور اس کی ماں بھی حسب عادت دسترخوان پر موجود تھی نوکر اور ماں کے ساتھ اس کی جو بہنیں سربراہی میں شریک تھیں ان سب کو ماں کھانے والوں کی ضروریات کے متعلق ہدایتیں دے رہی تھی اور یہ بھی سب کی طرح کھا رہا تھا کہ یکایک اس کے جی میں ایک عجیب و غریب خیال آیا کہ حسب معمول ایک ہاتھ سے نوالہ لینے کی بجائے اگر وہ اپنے دونوں ہاتھ سے نوالہ لے تو کیا مضائقہ ہے؟ اس کا تجربہ کرنے کے لیے کون مانع ہے؟ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس برتن میں ڈال دیئے جس میں سب لوگ کھا رہے تھے اور نوالہ اٹھا کر منہ تک لے گیا۔ اس حرکت پر بھائی تو ہنستے ہنستے لوٹ گئے مگر اس کی ماں کا دل بھر آیا اور باپ نے نہایت نرم و غمگین

ہو وہ میں کہا کہ میرے پیارے بیٹے تو اس طرح نہیں لیتے۔ یہ رات اس نے کس حالت میں گزاری خود اس کو بھی اس کی خبر نہیں۔ اس وقت سے اس کی حرکت میں کچھ سنجیدگی آگئی اور اس کے دل میں ایسی شرم اور لحاظ پیدا ہوگیا جس کی کوئی حد نہیں۔ اسی وقت اسے اپنے متعلق ایک مضبوط ارادے کا علم ہوا اس نے اپنے آپ پر اس قسم کے کھانوں کو حرام کر لیا جو اس کے لیے نا روا ہوں۔ مگر یہ احتیاط اس وقت تک ہوتی رہی جب تک اس کی عمر دس سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ اس نے اپنے آپ پر حریرہ، چاول اور تمام ایسے کھانے جو چمچوں سے کھائے جاتے ہیں حرام کیے کیونکہ اس نے سمجھ لیا تھا وہ چمچے کا استعمال اچھی طرح نہیں کر سکتا۔ یہ بھی اسے گوارا نہ تھا کہ اس کے بھائی اس پر ہنسیں۔ یا اس کی ماں روئے، یا اس کا باپ دھیمی اور غمگین آواز میں اسے نصیحت کرے۔

اس واقعہ سے اس کو وہ قصہ اچھی طرح سمجھنے میں مدد ملی جو ابو العلاء کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک روز کھجور کا شیرہ یا شہد کھا رہا تھا جس میں سے کچھ اس کے سینے پر بھی ٹپک گیا اور اس کو خبر نہ ہوئی مگر سبق پڑھانے کے لیے جب وہ حلقہ درس میں آیا تو اس کے کسی شاگرد نے کہا جناب آپ نے شہد کھایا ہے۔ یہ سن کر اس نے فوراً اپنا ہاتھ سینے کی طرف بڑھایا اور جواب دیا کہ ہاں کھایا ہے خدا اس حرص کا ستیاناس کرے پھر اس نے زندگی بھر کے لیے اپنے اوپر شہد کو حرام کر لیا۔ اس حادثے سے اس کو ابو العلاء کی عادات و اطوار سمجھنے میں بڑی مدد ملی۔ ابو العلاء کھاتے وقت اپنے نوکر سے بھی پردہ کیا کرتا تھا اور ایک تہ خانے میں کھانا کھاتا تھا نوکر کو حکم دیتا تھا کہ کھانا تہ خانے میں چھوڑ کر آجائے خود تنہا دسترخوان پر بیٹھتا کہتے ہیں کہ اس کے شاگردوں نے اس کے سامنے حلب کے تربوز اور اس کی تعریف بیان کی ابو العلاء کو بھی اس کا شوق ہوا اس نے کسی کو بھیج کر ان کے لیے حلب سے تربوز منگوائے شاگردوں نے ان کو کھایا نوکر نے کچھ تربوز اپنے مالک یعنی ابو العلاء کے لیے محفوظ کر لیے اور انہیں تہ خانے میں رکھ دیا۔ مگر غلطی سے اس جگہ نہیں رکھا جہاں ہمیشہ شیخ کا کھانا رکھا جاتا تھا۔ شیخ نے یہ پوچھنا خلاف شان سمجھا کہ میرے تربوز کہاں ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تربوز اپنی جگہ رکھے رکھے سڑ گئے۔ اور شیخ نے ان کو نہیں چکھا۔

ابو العلاء کی زندگی کے عادات و اطوار اب ہمارے دوست کی سمجھ میں اچھی طرح سے آگئے کیونکہ ان میں اس کو خود اپنی حقیقت دکھائی دی۔ بچپن ہی سے اس کی تمنا تھی کہ وہ تنہائی میں کھانا کھا سکتا۔ لیکن وہ اپنی خواہش کو ظاہر کرنے کی جرات نہ کر سکا۔ جب اس کو اپنے حسب منشا کام کرنے کی قدرت حاصل ہوئی تو اس نے اس خصلت کو اپنا طریقہ کار بنا لیا۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ پہلی مرتبہ جب اس نے یورپ کا سفر کیا تو کھانے کے ڈر سے جہاز کی میز پر جانے سے انکار کر دیا لہٰذا کھانا اس کے کمرے میں پہنچا دیا جاتا تھا پھر جب وہ فرانس پہنچا تو اس نے یہ قاعدہ مقرر کر لیا کہ جس ہوٹل یا خاندان میں ٹھہرتا اس کا کھانا اس کے کمرے میں ہی پہنچا دیا جاتا اور اس کو عام میز تک جانے کی تکلیف نہ کرنی پڑتی۔ یہ عادت اس وقت چھوٹی جب اس نے اپنی ہم نشین کو شادی کا پیغام دیا جس نے اس کی ایسی بہت سی عادتیں چھڑا دیں جن سے وہ مانوس تھا

مصر میں عورتیں خاموشی کو پسند نہیں کرتیں کوئی عورت جب اکیلی ہوتی ہے تو وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتی ہے اگر خوش ہے تو گانے لگتی ہے اور غمگین ہے تو بین کرتی ہے مصر میں ہر عورت جب چاہتی ہے غمگین ہو جاتی ہے دیہات کی عورتیں اکیلی ہوں تو ان کا واحد مشغلہ یہی ہے کہ وہ اپنے دکھوں اور مردوں کو یاد کر کے بین کریں اور اس کی انتہا اکثر بیچ بیچ رونے پر ہوتی ہے۔ ہمارے دوست کے لیے سب سے بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ وہ اپنی بہنوں کو گاتے ہوئے اور اپنی ماں کو بین کرتے ہوئے سنے مگر اپنے بھائیوں کے گانے پر اسے بڑا غصہ آتا تھا کیونکہ یہ گانا اسے خراب اور بے اثر معلوم ہوتا تھا۔ اپنی والدہ مرثیہ خوانی سے کبھی کبھی وہ جھومنے لگتا اور کبھی رونے لگتا اس ہمارے دوست نے بہت

سارے گیت، مرثیے اور قصے یاد کر لیے جن میں اچھے برے سبھی طرح کے تھے۔ ان کے سوا اس نے کچھ اور چیزیں بھی یاد کر لیں، یعنی وہ وظیفے جو اس کے نانا یا دادا صبح و شام زور زور سے پڑھا کرتے تھے۔

ان دادا صاحب کی تشریف آوری بڑی ناگوار گزرتی تھی یہ حضرت اس بچے کے دشمن تھے ہر سال موسم سرما اسی مکان میں گزارتے تھے ان کی زندگی نے جب ان کو تنگی اور پرہیزگاری پر مجبور کر دیا تو یہ حضرت نیک اور پارسا بن گئے اور پانچوں وقت کی نمازیں ادا کرنے لگے ان کی زبان خدا کے ذکر سے کبھی خالی نہ رہتی تھی صبح کا وظیفہ پڑھنے کے لیے پچھلی رات ہی سے بیدار ہو جاتے اور رات میں نماز عشا پڑھنے کے بعد بھی تھوڑی بہت دیر قیام کرتے۔ ہمارے دوست کے سونے کا کمرہ بھی ان بڑے حضرت کے کمرے کے پاس تھا لہٰذا وہ پڑھتے رہتے اور یہ سنتا رہتا یہاں تک کہ بہت سے وظیفے اور دعائیں اس نے یاد کر لیں۔ اس گاؤں کے لوگ تصوف کو بہت پسند کرتے اور ذکر کی مجلس منعقد کیا کرتے یہ باتیں ہمارے دوست کو پسند تھیں کیوں کہ اثنائے ذکر میں گانے والے جو شعر پڑھتے ان سے وہ اپنا جی بہلایا کرتا تھا۔ حالانکہ اس وقت اس کی عمر نو سال کی بھی نہ ہوئی تھی مگر اس نے بہت سے گیت، مرثیے، قصے، اوراد، دعائیں اور صوفیانہ شعروں کا اچھا خاصا مجموعہ ازبر کر لیا تھا ان کے ساتھ ساتھ اس نے پورا قرآن بھی حفظ کر لیا تھا۔

وہ چہار شنبہ کا دن تھا جو ہمارے دوست نے نہایت خوشی سے گزارا تھا اس روز اس نے ہمارے میاں جی (استاد) سے کہہ دیا تھا کہ اس نے مقررہ حصے کی تلاوت دن کے پہلے حصے ہی میں ختم کر دی ہے پھر سارے دن بھر قصے سننے اور باتیں بنانے کی کھلی چھٹی ہو گئی تھی۔ وہ مکتب سے گھر واپس نہیں گیا بلکہ اپنے دوستوں کی ایک پارٹی کے ساتھ عصر کی نماز پڑھنے جامع مسجد چلا گیا۔ اس روز اس کا جوتا گم ہو گیا جو اس نے دیوار کے ایک گوشے میں رکھا تھا، اس کو کچھ رنج تو ہوا مگر اس روز وہ بہت خوش تھا اس لیے زیادہ متاثر نہیں ہوا ننگے پاؤں گھر واپس آیا جب گھر میں داخل ہوا تو شیخ (والد) حسب عادت اپنے برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے آواز دی اور پوچھا تمہاری جوتیاں کہاں ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ مکتب میں بھول آیا ہوں۔ شیخ نے اس جواب کی پروا نہیں کی وہ گھر میں چلا گیا اپنی ماں اور بھائیوں سے تھوڑی دیر گفتگو کی اور روٹی کا ایک ٹکڑا کھایا کیونکہ مکتب سے واپس آنے کے بعد اسے ناشتہ کرنے کی عادت تھی۔ اتنے میں شیخ نے پھر پکار لیا اور پوچھا کہ تم نے آج قرآن کا کتنا حصہ تلاوت کیا ہے؟ اس نے کہا کہ میں نے ختم کر دیا اور آج آخری چھ پارے پڑھے ہیں۔ شیخ نے کہا کہ تم قرآن اچھی طرح یاد کرتے ہو؟ اس نے کہا جی ہاں! باپ نے کہا اچھا مجھے سورۂ سبا سناؤ، مگر ہمارا دوست اور سورتوں کی طرح سورۂ سبا بھی بھول گیا تھا، لہٰذا خدا نے اس کو ایک حرف بھی یاد نہ دلایا پھر شیخ نے کہا: "اچھا سورۂ فاطر سناؤ" خدا نے اس کو ایک حرف بھی یاد نہ دلایا پھر شیخ نے نرم آواز لیکن تمسخر کے انداز میں فرمایا تمہارا دعویٰ ہے کہ تم ہمیشہ قرآن یاد کرتے رہے ہو، اچھا سورۂ یٰسین پڑھو۔ خدا نے اس کو اس صورت کی پہلی آیتیں تو یاد دلائیں مگر اس کی زبان رکے بغیر اور منہ کا لعاب خشک ہوئے بغیر نہ رہا۔ اسے عجیب طرح کی کپکپی سی آنے لگی جس کے بعد اس کے چہرے پر ٹھنڈا پسینہ نکلنے لگا شیخ نے نہایت نرم آواز میں فرمایا کہ جاؤ اور روزانہ اپنی جوتیاں بھول جانے کی کوشش کرو۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ تم نے اپنی جوتیاں بھی اسی طرح ضائع کر دیں جس طرح تم نے قرآن کو ضائع کر دیا۔ لیکن میں تمہارے میاں جی کے ساتھ دوسرے طریقے سے پیش آؤں گا۔

ہمارا دوست برآمدے سے سر جھکاتے ہوئے نہایت پریشان اور لڑکھڑاتا ہوا نعمت خانے میں پہنچ گیا وہ کمرہ جس میں قسم قسم کے کھانے رکھے جاتے تھے اور اسی میں کبوتر بھی پلتے تھے اسی کے ایک کونے میں لکڑی کا ایک کندہ تھا جس پر اس کی ماں گوشت کاٹا کرتی تھی اس

کنڈے پر بہت سی چھریاں رکھی ہوئی تھیں جن میں بڑی چھوٹی ہلکی اور وزنی سبھی قسم کی ہوتی تھیں۔ ہمارا دوست نعمت خانے تک پہنچ گیا اور اس کونے کی طرف مڑا جس میں کنڈہ رکھا ہوا تھا۔ اس کو اپنے سیدھے ہاتھ میں لیا اور اٹھا کر اپنی گردن کے پچھلے حصے پر مار لیا۔ پھر اس نے ایک چیخ ماری اور ساتھ ہی اس کے ہاتھ سے گر گیا اس کی والدہ دوڑتی ہوئی آئی وہ اس کے نزدیک ہی تھی مگر جب یہ اس کے پاس سے گزر رہا تھا تو اس وقت اس نے اس پر توجہ نہ دی تھی اب کیا دیکھتی ہے کہ بچہ کھڑا ہوا تھر تھر کانپ رہا ہے اور اس کی گردن سے خون بہہ رہا ہے۔ اس کی ماں نے فوری زخم پر نظر ڈالی اور دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ زخم کچھ اندیشہ ناک نہیں ہے۔ فوراً ہی وہ اس بچے کی طرف برا بھلا کہتی ہوئی پلٹ پڑی اور ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی باورچی خانے کے ایک کونے میں لے گئی جہاں ہمارا دوست اپنی جگہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اس کے بھائی بہن اس کے اطراف دوڑ بھیل کود رہے تھے مگر وہ اس کے پاس نہ آتے تھے اور نہ اس کی طرف توجہ کرتے تھے۔

مغرب کا وقت آ گیا تو معلوم ہوا کہ اس کے والد اس کو بلا رہے ہیں یہ شرمندگی کے ساتھ لڑکھڑاتا ہوا نکلا یہاں تک کہ برآمدے میں پہنچ گیا باپ نے اس سے کسی چیز کی نسبت بھی نہیں پوچھا البتہ ہمارے میاں جی نے جلدی سے یہ سوال کیا: کیوں جی تم نے آج قرآن کے چھ پارے میرے سامنے نہیں پڑھے تو اس نے کہا کیوں نہیں! کل تم نے سورۃ تبارک مجھے نہیں سنایا تھا اس نے کہا کیوں نہیں! پھر آج تم کو کیا ہو گیا جو اس سورہ کو نہیں پڑھ سکے اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہمارے میاں جی نے کہا کہ اچھا سورۃ تبارک پڑھو، مگر خدا نے اس کا ایک حرف بھی نہ یاد دلایا۔ اس کے باپ نے کہا کہ سورۃ سجدہ پڑھو تو وہ بھی اچھی طرح نہ پڑھ سکا۔ اب شیخ کا غصہ تیز ہو گیا مگر یہ غصہ میاں جی پر تھا شیخ نے کہا کہ یہ بچہ مکتب تو جاتا ہے مگر پڑھنے یا حفظ کرنے کے لیے نہیں بلکہ ایک کھیل اور تماشا ہے آج وہ ننگے پاؤں واپس آیا اور کہہ رہا ہے کہ اپنی جوتیاں مکتب میں بھول گیا۔ میرا خیال تو یہی ہے کہ اس کے حفظ کی طرف بھی تمہاری توجہ ویسی ہی ہے جیسے اس کے جوتے کے پہننے یا ننگے پاؤں چلنے کی طرف۔

ہمارے میاں جی نے کہا کہ میں تین بار اس عظمت والے خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے کسی دن بھی اس سے غفلت نہیں کی۔ اور اگر آج میں مکتب سے بچوں کی واپسی سے پہلے نکل گیا ہوتا تو وہ ننگے پاؤں واپس نہ آتا۔ مجھے ہر ہفتے ایک قرآن سنایا کرتا ہے صبح جیسے ہی مکتب میں پہنچتا ہوں اس سے چھ پارے سنتا ہوں۔ شیخ نے کہا ان میں سے ایک بات کو بھی میں سچ نہیں سمجھتا۔ ہمارے میاں جی نے کہا، میری بی بی پر تین طلاق ہوں میں نے کبھی آپ سے جھوٹ نہیں کہا۔ اور نہ اب جھوٹ کہہ رہا ہوں میں اس سے یقیناً ہر ہفتے ایک قرآن سنا کرتا ہوں۔ شیخ نے کہا میں نہیں مانتا۔ ہمارے میاں جی نے کہا کیا آپ کا گمان یہ ہے کہ آپ جو ماہوار مجھے دیا کرتے ہیں وہ مجھے اپنی بی بی سے زیادہ عزیز ہے۔ یا آپ کو خیال ہے کہ اتنا گیا گزرا ...... ہوں کہ اس کی لالچ میں اپنے حرام کو بھی اپنے اوپر حلال کر لیا ہے۔ اور ایسی عورت کے ساتھ زندگی بسر کروں گا جسے آپ کے سامنے تین طلاق دے چکا ہوں شیخ نے کہا مجھے ان باتوں سے کچھ سروکار نہیں مگر یہ بچہ کل سے مکتب ہرگز نہ جائے گا۔ پھر وہ وہاں سے اٹھ کر جانے لگے۔ ہمارے میاں جی بھی اٹھے مگر نہایت ملول اور رنجیدہ۔ ہمارا دوست اپنی جگہ پر چلا گیا مگر وہ قرآن پر یا جو کچھ ہوا اس پر غور نہیں کر رہا تھا بلکہ وہ ہمارے میاں جی کے اس ڈھٹائی سے جھوٹ بولنے اور ان تین طلاقوں پر سوچ رہا تھا میاں جی نے اپنی بی بی پر اس بے پروائی سے ڈال رکھے تھے جیسے کوئی سگریٹ کا جلا ہوا ٹکڑا پھینک دیتا ہے۔

شیخ کے سامنے اس بچے کے امتحان سے ہمارے میاں جی کو جو حادثے بار بار پیش آتے وہ اسی حد پر ختم نہیں ہو گئے بلکہ ان کی تقدیر میں ایک اور ذلت لکھی تھی جس کا اس شخص کو وہم و گمان بھی نہ تھا یہ ذلت تمام ذلتوں سے زیادہ سخت تھی کیوں کہ اس کا اثر ان کے خاص کام پر اور

پیشے پر پہنچا ایک روز قاہرہ کا رہنے والا ایک شخص اس شہر میں آیا جو زراعتی راستوں کا ناظر تھا۔ یہ شخص ادھیڑ عمر کا تھا طربوش پہنتا تھا اور فرانسیسی بولتا تھا۔ اس نے فنون و صنائع میں تعلیم پائی ہے۔ یہ بہت دلکش تھا تھوڑے ہی دنوں میں لوگ اس سے محبت کرنے لگے اپنے گھروں اور جلسوں میں لے جاتے دعوتیں دیں۔ اس کو یہاں آتے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اس بچے کے باپ اور اس شخص میں گہری دوستی ہو گئی۔ اس شخص نے ہمارے میاں جی کو اپنے پاس مقرر کر لیا کہ وہ اس کے گھر پر روزانہ قرآن کا کوئی سورہ پڑھا کریں جس کے لیے میاں جی کو دس قرش ماہوار مقرر کیے گئے۔ یہ ایک ایسی معقول اُجرت تھی جو بڑے لوگ ہی دیا کرتے ہیں لہٰذا ہمارے میاں جی بھی اس کے بہت دوست اور ثنا خواں ہو گئے۔ لیکن رمضان آ گیا۔ رمضان کی راتوں میں لوگ اس شہر کے ایک سربرآوردہ شخص کے مکان پر جمع ہوا کرتے تھے جو تجارت پیشہ تھا۔ ہمارے میاں جی بھی اس شخص کے پاس مہینہ بھر قرآن پڑھتے رہے۔ ہمارے میاں جی کے ساتھ یہ بچہ بھی ہوتا تھا۔ جو ان کو آرام دینے کے لیے کبھی میاں جی کی بجائے کوئی سورہ پڑھ دیا کرتا تھا۔ ایک رات کو اس بچے نے حسبِ عادت قرآن پڑھا جس کو ناظر صاحب نے سن لیا اور اس بچے کے باپ سے کہا کہ تمہارے لڑکے کو تجوید قرآن سیکھنے کی سخت ضرورت ہے۔ شیخ نے کہا کہ وہ اب قاہرہ جانے والا ہے وہاں ازہر کے کسی شیخ سے بہت جلد تجوید سیکھ لے گا۔ ناظر صاحب نے کہا حفص کی قراءت کے ساتھ میں بھی اسکو قرآن تجوید پڑھا سکتا ہوں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ روزانہ ایک گھنٹہ اس کے لیے خاص کر دوں اور اسے اصول سے ہی آگاہ کروں۔ لوگوں نے کہا کہ طربوش پہننے والا اور فرانسیسی بولنے والا قرآن کا حفظ اور قراءتوں کی روایت کس طرح کر سکتا ہے۔

ناظر صاحب نے جواب دیا کہ میں بھی ازہری ہوں پہلے مدت تک عربی علوم کی تحصیل کرتا رہا پھر مدرسوں میں گیا اور مدرسہ فنون و صنائع میں تعلیم پائی۔ لوگوں نے کچھ پڑھنے کی فرمائش کی تو اس نے جوتے اتار دیے اور چار زانو بیٹھ کر سورۂ ہود کو ایسی عمدگی سے پڑھا کہ انہوں نے ایسی قراءت کبھی نہیں سنی تھی۔ لوگوں نے جو اس کی داد دی اور جو عظمت اس شخص کی ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ ہمارے میاں جی کے دل کو اس کی جو چوٹ لگی اور جو غصہ آیا کچھ نہ پوچھو۔ میاں جی کی یہ رات ایسی تھی، جیسے اس پر بجلی گر پڑی ہو۔ شیخ نے صبح کو اپنے بچے کو یہ حکم دیا کہ وہ روزانہ ناظر کے گھر جایا کرے۔

کیا یہ بچہ اس گھر کی آمد و رفت سے خوش تھا؟ کیونکہ وہ ناظر صاحب کو بہت پسند کرتا تھا اس لیے کہ اس کو تجوید کے ساتھ قرآن کو اچھی طرح پڑھنے کا شوق ہو گیا تھا۔ اس سال کے پہلے دو مہینوں تک تو یہی بات تھی مگر بعد میں ناظر کے گھر کی کشش دوسری ہی چیز کے سبب سے تھی۔

ناظر صاحب متوسط عمر کے آدمی تھے اگر چالیس سے زیادہ نہیں تو چالیس کے لگ بھگ ضرور تھے مگر انہوں نے ایک ایسی نوجوان لڑکی سے شادی کی تھی جو ابھی سولہویں سال تک بھی نہیں پہنچی تھی۔ ناظر صاحب کے اولاد نہیں تھی ان کے اتنے بڑے گھر کی آبادی یہی نوجوان لڑکی اور اس کی نانی تھی جس کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی۔ لہٰذا جب یہ بچہ اس گھر میں آنے جانے لگا تو وہ وہاں جاتا اور واپس ہوتا مگر سوا ناظر صاحب کے کوئی اور اس کی طرف توجہ نہ کرتا مگر جیسے جیسے آمد و رفت بڑھی یہ نوجوان لڑکی بھی اس سے باتیں کرنے لگی وہ اس بچے کے بارے میں پوچھا کرتی۔ اس نوجوان عورت اور بچے میں ایک معصوم سی دوستی ہو گئی اس کا اثر بچے کی روح پر شیریں اور قلب پر خوشگوار تھا اس بڑھیا کو یہ دوستی ناگوار گزرتی تھی مگر ناظر صاحب ان سب سے بالکل بے خبر تھے۔ ناظر صاحب کے گھر یہ بچہ مقررہ وقت سے پہلے جانے لگا تاکہ اس لڑکی سے گھڑی دو گھڑی باتیں کرنے کا موقع مل جائے۔ یہ لڑکی بھی اس کی آمد کا انتظار کرتی رہتی جیسے ہی وہ آتا اسے اپنے کمرے میں لے جاتی خود بیٹھ جاتی اور اسے بھی اپنے پاس بٹھا لیتی اور باتیں شروع ہو جاتیں اس گفتگو نے بہت جلد کھیل کود کی شکل اختیار کر لی جیسے عموماً بچوں کے کھیل ہوا

کرتے ہیں۔ نہ اس سے کم نہ زیادہ۔ مگر یہ کھیل بڑا ہی پُر لطف تھا۔ بچے نے یہ سارا قصہ اپنی ماں سے بیان کیا تو وہ ہنسی اور اس لڑکے پر ترس کھا کر اس بچے کی بہن کو مخاطب کر کے کہنے لگی کمسن بچی ایک عمر رسیدہ آدمی سے بیاہ دی گئی ہے یہاں نہ تو وہ کسی کو جانتی ہے نہ اس کا کوئی جاننے والا ہے اس لیے کھیل کود کا موقع نہ ملنے سے اس کا دل اداس رہتا ہے۔ اس روز سے اس بچے کی ماں نے اس لڑکی سے ملاقات کی کوشش کی اور اس کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی پھر تو یہ لڑکی اکثر اس کے پاس آنے جانے لگی۔

میری بیٹی تم نہایت سیدھی سادی، صاف دل اور پاکیزہ روح ہو۔ تمہاری عمر کا یہ نواں سال ہے اس عمر کے بچے اپنے ماں باپ پر فخر کرتے ہیں اور انہیں اپنی زندگی کا اعلیٰ نمونہ قرار دیتے ہیں۔ اور یہ چاہتے ہیں کہ ہر چیز میں خود بھی ماں باپ جیسے ہو جائیں وہ کھیل کود میں اپنے ہم سنوں سے باتیں کرتے ہیں تو اپنے ماں باپ پر فخر جتاتے ہیں کیوں یہی بات ہے نا؟ کیا تم نہیں سوچتیں کہ تمہارا باپ بہترین آدمی اور نہایت معزز شخص ہے کیا تم نہیں جانتیں کہ تمہارا باپ اپنے بچپن میں بھی سب سے اچھا اور شریف بچہ تھا۔ کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ تم بھی ویسی ہی زندگی بسر کرو جیسی تمہارا باپ اپنی عمر کے آٹھویں سال میں بسر کرتا تھا۔ تمہارا باپ تمہارے لیے تکلیف اٹھاتا ہے تاکہ تمہیں اپنے باپ کے بچپن کی سی زندگی بسر نہ کرنی پڑے مجھے خیال ہے کہ تم ایک روز اپنے باپ کی گود میں بیٹھی ہوئی تھیں اور وہ تم سے شاہ اودیپ کا قصہ بیان کر رہا تھا کہ شاہ اودیپ کی آنکھیں جانے کے بعد جب وہ محل سے نکلا تو اسے راستہ سجھائی نہ دیتا تھا اس کی بیٹی آگے بڑھی اور اسے راستہ بتانے لگی۔ میں نے دیکھا کہ اول اول تو یہ کہانی تم خوش خوش سنتی رہیں پھر تمہارا رنگ بدلنے لگا اور تمہاری پیشانی پر شکنیں پڑنے لگیں، تمہارے چہرے پر تبدیلی بڑھتی گئی آخر تم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ تم اپنے باپ پر گر پڑیں اور اس کو لپٹ لپٹ کر پیار کرنے لگیں۔ آخر تمہاری ماں آگئیں اور انہوں نے تم کو تمہارے باپ کے سینے سے الگ کیا۔ تم محض اس لیے روئیں کہ تمہارا باپ بھی شاہ اودیپ کی طرح اندھا تھا۔ مگر میں تمہارے باپ کی زندگی اور اس کے طور طریقوں کے بارے میں وہ باتیں بھی جانتا ہوں جن سے نہ تمہارے دل کو کوئی رنج پہنچے گا نہ وہ تم کو ہنسی کھیل معلوم ہوگا۔

میری اس سے جب شناسائی ہوئی تو اس کی عمر کا تیرھواں سال تھا۔ وہ قاہرہ بھیجا گیا تاکہ ازہر کے علمی درسوں میں جایا کرے اس وقت اس بچے کی کوشش اور عمل بے شک دیکھنے کی چیز تھی۔ وہ دبلا پتلا، اس کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا اس کا حال اور خوش حالی نسبت افلاس سے زیادہ قریب تھا۔ ایک آنکھ تو اس کی گندی عبا، عمامہ جس کی سفیدی گہری سیاہی سے بدل گئی تھی، اور قمیص جو جبے کے نیچے سے دکھائی دیتی تھی اور جس پر کھانا گر جانے کی وجہ سے بہت سے دھبے پڑ گئے تھے اور پیوند لگی ہوئی جوتیوں کو نہایت حقارت سے دیکھتی تھی مگر وہی آنکھ یہ دیکھ کر مسکرا بھی دیتی تھی کہ وہ اس حقیر حالت میں اور نابینا ہونے کے باوجود دلشاد و دل ہے خندہ جبیں ہے۔ وہ تبسم کناں اپنے رہبر کے ساتھ ازہر کی طرف چلا جا رہا ہے۔ نہ اس کے قدم ڈگمگاتے ہیں، نہ چال بگڑتی ہے نہ اس کے چہرے سے وہ تاریکی ظاہر ہوتی ہے جو عموماً نابیناؤں کے چہرے سے جھلکا کرتی۔ وہ ان آنکھوں کو حقیر دکھائی دے گا مگر یہی آنکھیں مسکرائیں گی اور اس کے ساتھ نرمی سے پیش آئیں گی جب دیکھیں گی کہ وہ حلقۂ درس میں شیخ کی گفتگو ہمہ تن گوش ہو کر سن رہا ہے۔ اس کے ارد گرد اور بچے کھیلتے ہیں مگر اسے کھیل سے رغبت نہیں ہوتی۔ میری بیٹی جب میں نے اسے جانا تو اس کی زندگی کا یہ طریقہ کار تھا اور میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اس کو ایسے ہی پہچان لو۔ پھر تمہیں اس فرق کا اندازہ ہو جائے گا، جو تم میں اور اس میں ہے مگر تم تو ابھی اپنی عمر کے نویں سال میں ہو۔ تمہیں تو ساری

زندگی نعمت و راحت معلوم ہوتی ہے۔ میں نے جب اس کو پہچانا ہے، وہ اپنے دن، بچتے اور بس صرف ایک ہی قسم کا کھانا کھایا کرتا تھا صبح و شام دونوں وقت۔ مگر اس نے کبھی شکایت نہیں کی۔ میری بیٹی اگر تم کو ویسا کھانا ایک دن بھی ملے تو تمہاری ماں کو تم پر ترس آنے لگے گا، وہ معدنی پانی لے کر دوڑیں گی اور وہ ڈاکٹر کا انتظار کریں گی۔

تمہارا باپ ہفتوں اور مہینوں اندھیری کی روٹیوں پر دن بسر کرتا رہا۔ اس میں ہر قسم کا کوڑا اکٹھا ہوتا ہے۔ رنگ برنگے پتھر ہوتے ہیں بھانت بھانت کے کیڑے مکوڑے نکلتے ہیں۔ تمہارے باپ نے ہفتوں اور مہینوں ایسے گزارے کہ اس روٹی کو سیاہ شہد میں ڈبو ڈبو کر کھایا۔ تم نہیں جانتیں کہ سیاہ شہد کیسا ہوتا ہے تمہارے لیے اس کا نہ چکھنا ہی بہتر ہے!

اس طرح تمہارا باپ زندگی اور معیشت کی کوششوں میں مسکراتا رہا۔ وہ ایسا محروم جس کو اپنی محرومی کی خبر تھی یہاں تک کہ وہ تعلیمی سال ختم ہو گیا اور وہ اپنے والدین کے پاس واپس گیا انہوں نے پوچھا وہ کیسا تھا ہے وہ کیسی زندگی بسر کرتا رہا ہے تو وہ ان کے سامنے ایسی ہی جھوٹی باتیں بنانے لگا جیسے قصے وہ کبھی بھلانے کو اصرار کرتا ہے وہ ان کے سامنے اپنی زندگی کو اس طرح پیش کرتا جیسے وہ بڑی خوش حال اور کشادہ دستی کی زندگی ہو مگر یہ اس لیے نہیں کہ اسے جھوٹ پسند تھا بلکہ وہ اپنے بزرگوں کو اطمینان دلانا چاہتا تھا اور اپنی محرومی سے ان کو آگاہ نہیں کرنا چاہتا تھا اس کو اپنے ادھوری بھلائی کا بھی خیال تھا اس بچے کو یہ پسند نہ تھا کہ اس کے والدین کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اس کو چھوڑ کر تھوڑا اور دو جو دہی اترا جاتا ہے جب تمہارا باپ عمر کے تیرہویں سال میں تھا تو یہ اس کی زندگی تھی!

اگر تم مجھ سے یہ سوال کرو کہ پھر وہ اس مرتبے تک کیسے پہنچ گیا اس کی عزت لوگوں میں ایسی مقبول کیسے ہو گئی کہ کوئی آنکھ اس کو حقارت سے نہیں دیکھتی نہ یہ قدرت کیسے ہوئی کہ تمہارے لیے اور تمہارے بھائیوں کے لیے ایسی عمدہ زندگی فراہم کر دے جو آج تمہیں حاصل ہے یہ کیسے ہوا اور وہ بہت سے لوگوں کا محسود بن جائے اور کتنے ہی لوگوں میں مقبول بن جائے۔ میں اس کا جواب نہیں دے سکتا ہاں ایک شخص ہے جو تمہارے اس سوال کا جواب دے سکتا ہے۔

کیا تم اسے پہچانتی ہو؟ دیکھو یہ ہے وہ فرشتہ۔ جب شام ہوتی ہے تو یہی فرشتہ تمہارے لیے بستر کی فکر کرتا ہے تاکہ تم سکون اور خوشی کے ساتھ نیند کا استقبال کرو۔ اور صبح کو وہ تمہاری مسہری پر جھک جاتا ہے تاکہ تم خوشی خوشی دن کا سواگت کرو۔ اس فرشتے کی بدولت تمہیں دن کا سکھ اور رات کا چین میسر ہے کیا تم اس فرشتے کا احسان نہیں مانتیں؟ —— میری بیٹی یہی فرشتہ تمہارے باپ پر بھی مہربان ہو گیا تو اس کی تکلیفوں کو راحت سے اس کی یاس کو آس سے اس کی محتاجی کو تونگری سے اور بدبختی کو خوشی سے بدل ڈالا۔ جتنی تم اس فرشتے کی مرہون احسان ہو تمہارا باپ بھی اس سے کچھ کم نہیں ہے۔

۲

یہ بچہ اپنے ٹھکانے کے گرد و پیش کے متعلق بس اس سے زیادہ نہیں جانتا تھا اس کا دوسرا کام گھر اور ادھر کے راستے پر چلنا تھا جب وہ چھتے سے باہر نکلتا تو بائیں طرف وہ اپنے چہرے پر قہوے کی گرمی محسوس کرتا اور داہنی جانب حقہ گڑگڑانے کی آواز آتی پھر وہ آگے اور ایک دکان کی طرف بڑھتا۔ اس دکان کا اس کی زندگی پر بہت گہرا اثر ہے۔ یہ حاجی فیروز کی دکان تھی جو وہاں بیٹھنے والوں کے ہاتھ بکاتے

بیچنے کی چیزیں فروخت کرتا تھا۔ صبح کو پراٹھا بیچتا تھا۔ جب شام ہوتی تو حاجی فیروز ان طالبوں کے ہاتھ پنیر زیتون حلبیہ اور شہد بیچتا۔ بعض لوگوں کے ہاتھ ایسی چیزیں بھی فروخت کرتا جن کا نام نہیں لیا جاتا مگر وہ کھانے کی چیزیں ہیں۔ ان اشیاء کے بارے میں لوگ کھسر پھسر کیا کرتے تھے۔

حاجی فیروز ایک کالا کلوٹا لمبا تڑنگا اور کم عقل آدمی تھا۔ وہ صاف گفتگو نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی زبان عربی الفاظ کو عجب پیچیدگی سے ادا کرتی تھی۔ اس کی صورت کا نقش اس بچے کے ذہن سے کبھی نہ مٹا۔ خصوصاً یہ جب جاحظ کی کتاب البیان والتبیین میں زیاد اور اس کے غلام کا قصہ پڑھتا ہے کہ اس کے غلام نے زیاد سے کہنا چاہا کہ حمار وحشی عنایت فرمایئے تو دونوں لفظوں میں بڑی ح کو چھوٹی ہ سے بدل دیا ہمار وہشی کہا۔ زیاد کو بڑا عجیب معلوم ہوا اور کہنے لگا کم بخت یوں ہی کہہ دیا ہوتا کہ مجھے ایک عیر (جنگلی گدھا) دیجیے۔ غلام نے جب یہ جملہ ادا کیا تو عین کو ہمزہ الف سے بدل کر ایر کہا اور یہ عربی میں مرد کے حصہ مستور کو کہتے ہیں۔ یہ سن کر زیاد کانپ گیا اور اسے جنگلی گدھا دے کر بھگایا۔ یہ بچہ جب اس قصے کو پڑھتا ہے تو اسے حاجی فیروز یاد آتا ہے۔ طلبہ میں حاجی فیروز کی بڑی اہمیت تھی۔ جب وظیفہ آنا یا تنخواہ ملنے میں دیر ہوتی تو سب گھبرا کر اس کے پاس پہنچتے تاکہ وہ انہیں ادھار کھلائے۔ کبھی وہ لوگ ایک آدھ قرش بھی ادھار لیتے۔ اس کے علاوہ ان طلباء کے خطوط بھی اسی کے پتے سے آتے تھے۔ کبھی ان خطوں میں کاغذ کا ہر پرزہ بھی ملفوف ہوتا جسے لے کر وہ ڈاک خانے جاتے تو واپسی میں ان کی جیب گرم ہوتی تھی!

اس بچے کو اپنی زندگی کے تمام اوضاع و اطوار میں سب سے زیادہ عزیز یہی زمانہ ہے جب اسے اپنے کمرے میں اپنی مسافرت کی تکلیف و احساس ہوتا تھا۔ وہ نہ اس کمرے سے واقف تھا، نہ اس سامان سے جو وہاں رکھا ہوا تھا مگر اس کے دل میں یہ بات جاگزیں ہو چکی تھی کہ علم کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ لوگ اس میں اپنی جانیں کھپا دیتے ہیں تب بھی یہ تھوڑا ہی حاصل ہوتا ہے۔ وہ بھی اپنی زندگی علم کے حصول میں صرف کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اس کے قاہرہ اور ازہر آنے کا مقصد یہی تھا کہ وہ اپنے علم کو بحر ناپیدا کنار میں ڈال دے اور اللہ نے اس کے نصیب میں جتنا لکھا ہے پی لے پھر اسی میں ڈوب کر مر جائے۔ ایک شریف انسان کے لیے وہ موت بہت پسندیدہ ہے جو علم میں آئے۔ اسے بھی موت آئے مگر اس وقت جب وہ علم میں ڈوبا ہوا ہو۔ اس کی ننھی سی جان پر یکایک ان خیالات کا ہجوم ہو جاتا اور وہ ایسے مسلط ہو جاتے کہ اس وحشت ناک کمرے کو، پیچیدہ راستے کو بلکہ اس کے وطن ریف اور اس کی لذتوں کو بھلا دیتے اور اسے معلوم ہوتا کہ اس کا ریف سے تنگ آ جانا اور ازہر کے شوق میں کڑھنا غلط نہ تھا۔

"لوگو اٹھو۔ اے جانورو جاگو تم کب تک سوؤ گے۔ میں کفر سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ میں گمراہی سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں" یہ آواز دینے والا ہاتھ دروازہ کھٹکھٹاتا اور لاٹھی سے زمین کو ٹھوکے دیتا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہنسی کی آوازیں آتیں۔ بچے نے اس آواز کو پہچانا۔ یہی وہ آواز ہے جو ہر رات اس کو پریشان کیا کرتی ہے تاکہ لوگوں کو نماز کے لیے بیدار کر دے۔ اس کے جوان بھائی کے نوجوان دوست بڑھنے کے ساتھ ہو جاتے تھے اب اس بچے کو معلوم ہوا کہ یہ چچا حاجی علی ہیں۔ یہ ایک بڈھا شخص تھا جس کی عمر ۷۰ سال سے زیادہ تھی لیکن اس نے اپنی قوت بالکل محفوظ رکھی تھی۔ اپنی قوت عقل کی حفاظت سے وہ خوش طبع اور زندہ دل تھا اور اپنی جسمانی قوت کی حفاظت سے وہ سیدھا اور مضبوط کاٹھی والا تھا۔ جب وہ حرکت کرتا تو اس کی حرکت سخت ہوتی، بولتا تو زور سے۔ وہ آہستہ بولنا جانتا ہی نہ تھا۔ یہ اپنی عمر کے سابقہ حصے میں تاجر تھا اسکندریہ میں پیدا ہوا اور وہیں جوان ہوا۔ اس نے اپنی جسمانی قوت، سختی، خلوص اور ظرافت کی حفاظت کی جو اہل اسکندریہ کی خصوصیات میں، یہ

چاول کا تاجر تھا اسی لیے ان کا نام چچا حاجی اَرُز (یعنی چاول فروش) پڑ گیا تھا چچا بڑے بکواسی اور بدترین باتوں کو بدترین لفظوں میں پیش کرنے کے عادی تھے اس کے باوجود یہ نوجوان ان سے محبت کرتے تھے۔ ایک روز جماعت کے افراد کو شیخ کی خبر مرگ پہنچی اور یہ بھی ایک معتبر ذریعے سے معلوم ہوا کہ شیخ نے عالم نزع میں آخری الفاظ جو اپنی زبان سے نکالے وہ اس بچے کے بچاؤ کے لیے دعا تھی۔ حاجی علی چچا پر خدا رحم کرے ان کی ذات اگرچہ بچے پر بار خاطر تھی مگر ان کے بعد ان کی یاد اس کے دل کو رحم اور بے قراری سے بھر دیتی ہے۔

یہ نوجوان اپنی خوشی اور مسرت میں تنہا اس بڈھے سے مدد نہیں لیتے تھے بلکہ بعض وقت ان کی خوشی اور مسرت کا ایک دوسرا ذریعہ بھی تھا لیکن ان کی خوشی معتدل اور یہ مسرت گھٹیا ہوتی جب وہ ان کو دوسرے ذریعے سے حاصل ہوتی تھی۔ وہ اس سے ایک محدود مسرت حاصل کرتے مگر یہاں ایسی خوشی ہوتی تھی جو گویا پس پردہ ہوتی تھی یعنی جب یہ لوگ اپنے اس ساتھی سے ملتے تھے جو اس منزل کی سیدھی جانب آخری کمرے میں رہتا تھا۔ جس منزل کے بائیں طرف حاجی چچا رہتے تھے۔ یہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا جس کی عمر ۴۰، ۵۰ کے درمیان ہوگی۔ یہ شخص لذت پسند تھا بلکہ اس میں ڈوبا ہوا تھا اپنی لذتوں کی داستان بیان کرنا اس کو بہت پسند تھا اسے ان کے بیان میں اصل لذت سے زیادہ لطف ملتا وہ اپنی ان لذتوں کو بھی بیان کر دیتا تھا جو اس کو اپنے اہل خانہ سے تخلیہ میں حاصل ہوتی تھیں اور ان کی جائز تفصیل بھی بیان کرتا جس کے دوران اس کی نادر جنسی سے ربط پڑ جاتا تھا۔

وہ مشرقوں اور محلوں میں دوڑتے ہوئے لذتوں کا بیان کرتا اور جب محمود کسی احترام میں رہتا اور جا کر سو جاتا یا نیچے کی منزل پر نظر ڈالتا یا کوئی عورت کو دیکھ پاتا تو اس کی پوری اور حقیقی تفصیل مزے لے لے کر بیان کرتا۔ اپنے خیال میں اس کے کپڑے اتار دیتا۔ یہ شخص کسی عورت کو عام لوگوں کی طرح بیگم صاحبہ، بی بی یا اور کچھ نہ کہتا بلکہ محض تحفہ وردان کہہ کر پکارتا۔ دبلی پتلی عورت اس کی نظر میں کوئی چیز نہیں تھی بھرپور عورت وہ موٹی تازی ہی کو سمجھتا تھا جس کے اعضاء گوشت اور چربی سے بھرے ہوئے ہوں ایسی بھرپور عورتوں کو وہ کبھی تکیہ سے تشبیہ دیتا کبھی توشک سے۔

اپنے مذہب کی تائید میں وہ کعب بن زہیر صاحب قصیدہ بانت سعاد کی اس بیت سے دلیل پیش کرتا۔

هَيْفَاءُ مُقْبِلَةً عَجْزَاءُ مُدْبِرَةً
لَا يُشْتَكَى قِصَرٌ مِنْهَا وَلَا طُولُ

(یعنی جب وہ سامنے سے آتی ہے تو پتلی لچکیلی کمر والی ہے اور جب بیٹھتی ہے تو بھاری سرینوں والی نظر آتی ہے اس سے نہ تو پست قامتی کی شکایت ہے نہ درازی قد کی۔ یعنی متوسط اور متناسب جسم والی ہے) وہ اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا آپ لوگ اس پر غور نہیں فرماتے کہ شاعر اپنی محبوبہ کی صفت بیان کرتا ہے کہ جب وہ سامنے آتی ہے تو ہیفاء (پتلی کمر والی) ہے یہاں تک تو اس کا امر معلوم اور رائے معلوم ہو گئی اس کے بعد شاعر کہتا ہے کہ جب وہ بیٹھتی ہے تو بھاری سرینوں والی معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح نئی نئی تفصیلات بیان کرتا۔ وہ خوب ہنستا تھا مگر ان باتوں سے نوجوانوں کا ذہن خراب ہوتا تھا اور برائی ان کے دل نشین ہو جاتی خصوصاً وہ نوجوان جو ان لذتوں سے محروم تھے ان پر کون سی چیز ان باتوں سے زیادہ اثر انداز ہو سکتی ہے۔

یہ بچہ ستونوں کے سہارے لگا ہوا چپ چاپ ایسی باتیں سنتا تھا۔ اور دل میں سوچتا کہ اگر ان لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ایک کم سن بچہ ان

کہ ایسی باتوں کا کیا اثر ہوتا ہے تو وہ دیدہ ور بچوں کے آگے ایسی باتیں ہرگز نہ کریں گے۔

یہ شخص کسان تھا جب یہ اپنے گاؤں کو جاتا تو اس پر صرف روپے کی دھن سوار ہوتی۔ اسکی طالب علمی اور روپے کا انتظار بھی اس کے اور وسائل کے من جملہ ایک وسیلہ تھا یا یوں کہو کہ اس کے مقاصد میں سے یہ بھی ایک مقصد تھا کہ جب وہ روپے کی کوشش کرتا اور یہ کوشش اس کو تھکا دیتی تو وہ اس وقت بھی اس طالب علمی سے راحت حاصل کرتا تھا۔ جب وہ لذت سے بہرہ ور ہونے کی طلب میں تباہ ہو جاتا یہاں تک کہ اس سے فائدہ اٹھانے کا ثمرہ اس کی لاغری ہو جاتی تو وہ اپنے ٹھکانے کو واپس آتا اور اپنے کمرے میں ٹھہر جاتا، اور اپنے ہم دوستوں اساتذہ اور جماعت کے متعلق سوچتا۔ مگر ان سب باتوں کے ساتھ وہ پکا مومن تھا اس میں عجیب و غریب صوفیانہ میلانات تھے اور کبھی کبھی اس پر ان کا اثر غالب ہو جاتا تو ان کے اثر سے اس کے یہ سب عادات و اطوار بدل جاتے اور وہ پکا ایک ایسا زاہد پشمینہ پوش بن جاتا جو اپنی جان پر سختی برداشت کرنا اور بھوک پیاس کی تکلیف اٹھانا اپنا فرض قرار دے لیتا۔

اس شخص کا ایک روز اپنے خسر سے کسی بات پر اختلاف ہو گیا تو اس نے اپنی کسان بیوی کو چھوڑ دیا۔ اور اسے یہ سوجھی کہ قاہرہ کے باشندوں میں سے اپنے لیے کوئی بی بی تلاش کرے اور شہر کے کسی مہذب خاندان میں رشتہ جوڑے وہ اپنے دوستوں سے نہایت تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کرتا کہ شہر اور گاؤں کی عورتوں میں کیا فرق ہوتا ہے لیکن ایک دن ایسا آ گیا کہ اس نے مال و دولت شہری عورتوں اور دیہاتی عورتوں سب سے منہ پھیر لیا کیونکہ اس نے محسوس کیا کہ وہ امتحان میں شریک ہو تو قسمت یاوری کرے گی۔

وہ صبح کو مجلس امتحان کے سامنے گیا۔ اسے اس سال سوم میں کامیابی نصیب ہو گئی موسم گرما میں اس کے دوست اس سے جدا ہو گئے تھے جب وہ موسم خریف میں ملے تو اس شخص نے اپنا کمرہ چھوڑ دیا تھا اور اپنی آرزوؤں کی تکمیل بھی کر لی تھی یعنی اس نے شہر کے ایک خاندان میں شادی کر لی تھی ایک اس پر صوفیت کا غلبہ ہوا اور اس نے سوچا کچھ دنوں کے لیے مسجد میں معتکف ہو جائے جب وہ خلوت سے برآمد ہوا تو نہایت دبلا پتلا اور کمزور تھا جب وہ اپنی بی بی کے پاس آیا تو بی بی نے اسے نہ پہچانا اور شاید اس کی مردانگی کا مذاق اڑایا۔ اب اس کی لذت دوست دیہاتی روح پھر جاگ پڑی وہ صبح کو نکلا اور ایک کھانے کی دکان پر پہنچا یہاں اس نے لوبیا، زیتون، پیاز، ، روٹی جی بھر کر کھائی اور اوپر سے چائے پی اور پھر وہ چیز بھی جس کی طرف لوگ اشارہ کرتے مگر اس کا نام نہ لیتے تھے۔ بعد ازاں جوش و خروش سے بھرا ہوا اپنی اہلیہ کے پاس پہنچا اس نے اب بھی اس کی قربت سے انکار کیا اور اس سے کنارہ کشی کرنے لگی۔ نوبت بریں جا رسید کہ ایک دن وہ کھڑکی میں سے کود کر اس کے کمرے میں داخل ہونا چاہتا تھا مگر گھر والوں نے اس حرکت سے باز رکھا اور اسے باندھ دیا۔ وہ پکا ایک دیوانہ ہو گیا۔

یہ بیہودہ آواز وہی تھی جو ایک رات کو عشاء کی نماز کے وقت سنائی دے رہی تھی اور جس آواز پر سب نوجوان طلبہ کان لگائے ہوئے تھے یہ آواز اس شخص کی تھی جس پر دیوانگی کا غلبہ تھا وہ ہذیان بک رہا تھا۔ اسے دماغی امراض کے شفا خانے پہنچا دیا گیا۔ اس شفاخانے سے نکلا تو اس کی حالت بالکل بدل گئی تھی اس کی آواز پہلے سے زیادہ دھیمی تھی اس کی حرکتیں نہایت دھیمی اور جنسی موقوف ہو گئی تھی اس کا یہ حال ہو گیا کہ جو اس سے ملتا اس کے دل میں اس شخص کی طرف سے ایک عجیب طرح کا خوف محسوس ہوتا اور اس پر ترس آتا تھا ـــ ایک روز کسی بخور دینے والے نے بخور دی کہ وہ مر گیا۔

اس بچے کی عمر بڑی ہو گئی اور اس کا سبق بھی ترقی کر گیا اس نے بلاغت کا سبق پڑھنا شروع کیا۔ شیخ نے تلخیص کے اس مشہور جملے کی

شرح بیان کی کہ ہر کلمے کا اپنے ساتھ والے کلمے سے ایک مقام ہوتا ہے۔ تلخیص کی شرحوں المطول، المختصر، الاطول اور دوسری شرحوں میں اس جملے کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے حالانکہ یہ جملہ نہایت صاف اور واضح ہے نہ اس میں معما ہے نہ کوئی باریک بات۔ یہ شیخ بھی جامعہ ازہر کے دوسرے شیوخ کی طرح اس کی تفسیر میں طولانی تقریر کرنے لگا اور اس بیان میں دیر تک رہا، اس کی آواز بیٹھ گئی اور پیشانی پر پسینہ آ گیا۔ یہ لڑکا جس طرح اپنے اور استادوں سے بحث کیا کرتا تھا اسی طرح اس نے شیخ کی بعض باتوں پر شبہات پیش کیے۔ شیخ نے انہیں نہ مانا۔ پھر اس بچے نے ایسا اعتراض کیا کہ شیخ لاجواب ہو گئے اور کہنے لگے ”اے میرے بیٹے تم اس سبق کو چھوڑ دو، تم اسے اچھی طرح نہیں پڑھ سکتے۔ تم صرف انہیں چھلکوں کو اچھی طرح پڑھ سکتے ہو جنہیں تم چاشت کے وقت پڑھنے جاتے ہو۔ رہا مغز علم، نہ تو تم اس کے لیے پیدا ہوئے ہو نہ وہ تمہارے لیے۔“ یہ کہہ کر شیخ بھی ہنسا اور دوسرے طلبہ بھی ہنسنے لگے۔ اس لڑکے کو سبق ختم ہونے سے پہلے اٹھنے میں شرم آئی۔ کانٹوں پر بیٹھا رہا یہاں تک کہ دوسرے طلبہ کے ساتھ یہ بھی وہاں سے واپس ہوا۔ جن چھلکوں کا شیخ نے طعنہ دیا تھا وہ ادب کے سبق تھے اور خاص کر المبرد کی کتاب الکامل۔ بس اسی وقت سے یہ شیخ اس بچے کی نظروں سے گر گیا۔

بہتر یہی ہے کہ اب ہم اس منزل اور اس کے رہنے والوں کے بیان کی طرف چلیں جہاں یہ بچہ مقیم تھا۔ اس منزل میں ایک شخص رہتا تھا، اگر کسی خاص کمرے یا مقررہ جگہ پر نہیں۔ یہ خود ملاقات کو آیا کرتا تھا۔ وہ ملاقات کرنے تنہا کبھی نہ آتا تھا بلکہ اس کے ساتھ ایک عدد اور ہوتا تھا۔ وہ عموماً گہری نیند کے وقت ملنے آتا تھا۔ اس کی ملاقات کا آغاز میٹھا مگر انجام تلخ ہوتا تھا۔ جن لوگوں سے ملتی انہیں تکلیف اور معصیت میں مبتلا کرتی۔ بعض وقت ان کی جانوں کو بھی دکھ پہنچاتی۔ ان کے علم و جسم کے لیے نقصان دہ ہوتی۔ یہ شخص ابوطرطور کے نام سے مشہور تھا۔ دوسری ہستی اسی شیطان کی ہوتی جو ان میں سے کسی نوجوان کے پاس وارد ہوتا۔ اور یہ ہستی جب واپس ہوتی تو اس وقت خوف زدہ، بچنے والے، گناہ گار اور درماندہ نوجوان کو چین ملتا۔ وہ فجر کے وقت کا منتظر رہتا کہ اپنے بستر سے اٹھے اور طہارت کر کے صبح کے سبق میں شریک ہو۔ موسم گرما میں تو یہ آسان اور قابل برداشت تھا لیکن جاڑے کی راتوں میں اگر ابوطرطور کسی کے پاس آتا تو یہ ملاقات سخت اذیت ناک بن جاتی تھی کیونکہ اس وقت اس نوجوان کو گرم پانی کرنے کا وقت بھی نہیں ملتا تھا۔ ازہر کا جانا بھی ضروری اور فجر کا سبق سننا بھی، نفس اور بدن کا پاک ہونا بھی۔ لہٰذا وہ نوجوان اپنے جسم پر جلدی جلدی ٹھنڈا پانی ڈال لیتا۔

ابوطرطور اس منزل کے بالائی حصے کے زینے میں چھپ کر کھڑا ہو جاتا اور جب طلبا اپنی کتابیں کو پڑھ کر واپس ہوتے تو یہ ان کی طرف جھپٹتا اور ان کے کمرے میں داخل ہو جاتا، ان سے گفتگو کرتا اور ان کے برے خیالات کو شہ دیتا۔ جب وہ اپنے بستروں میں پناہ لیتے تو ابوطرطور ان میں سے اپنا شکار انتخاب کر لیتا اور اس سے اپنی ناجائز اور پر معصیت ملاقات کرتا۔

بعض وقت ابوطرطور سیڑھی کے بائیں حصے کی طرف چھپ جاتا یہاں تک کہ وہ جوان عورت جو اس کے ساتھ ہوتی نیچے کے درجے سے اوپر کی طرف چڑھ جاتی اور کسی طالب علم کے دھوئے ہوئے کپڑے اس کے پاس لے جاتی۔ ابوطرطور اس کا مزاحم ہوتا اور اسکے ساتھ ایسے چلتا کہ وہ خود کسی کو دکھائی نہ دے۔ وہ جوان عورت ابھی کسی طالب علم کے پاس جانے بھی نہ پاتی کہ ابوطرطور کی اس سے نظریں چار ہو جاتیں۔ اس عورت کی زبان سے کوئی لفظ نکلتا، اور اشاروں میں کچھ سمجھوتہ ہو جاتا۔

اسی طرح اس ازہری منزل اور ازہر کے طلبہ کی زندگی نہ تو بالکل پاک و صاف تھی نہ پوری طرح علمی زندگی تھی ان طلبا کے درمیان

اس بچے کی زندگی بھی نہ خاص علمی رہی نہ پاک صاف رہی۔ یہ بچہ بھی ان لوگوں کی باتوں کو سنا کرتا تھا جو اسے دعوت فکر دیتی تھیں۔

اب اس بچے کی مادی زندگی میں یہ صورت تھی تبدیلی ہوئی کہ اس نے اپنے کمرے کی پہلی جگہ چھوڑ دی جہاں ایک پرانی چٹائی پر پرانا بستر بچھا ہوا تھا وہ اپنا سارا دن ازہر ہی میں گزارتا اور اس کے اطراف و جوانب میں جو مسجدیں ہیں ان میں بعض سبقوں کی شرکت کے لیے آیا جایا کرتا تھا چھٹی کا زمانہ آیا مگر یہ بچہ اپنے گھر جانا نہیں چاہتا بلکہ قاہرہ ہی میں رہنا چاہتا ہے کیا وہ اس میں رہ جانے کی خواہش میں سچا ہے یا یہ بناوٹ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سچا ہے اس لیے کہ وہ قاہرہ سے محبت کرتا ہے اور اس کی جدائی اس پر شاق ہے اور بناوٹ یہ ہے کہ اس کا بھائی اپنی اکثر چھٹیاں قاہرہ ہی میں گزارا کرتا تھا تو اس پر اس کا خاندان بہت اتراتا تھا اس کو وہ لوگ محنت اور لگن کی نشانی سمجھتے تھے۔ اس بچے کا ارادہ تھا کہ وہ بھی ویسا ہی کرے جیسا اس کا بھائی کیا کرتا ہے۔

وہ گاڑی میں اپنے دوست کے ساتھ سوار ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں تیسرے درجے کے ایک ایسے ڈبے میں ٹھونس دیئے جاتے ہیں جس میں بہت لوگ بھرے ہوئے ہیں گاڑی ابھی تھوڑی ہی دور گئی ہے کہ دونوں دوست اپنے ازہر، اپنے قاہرہ اور اپنے جوش کو بھول گئے ان دونوں کو ایک ہی چیز یعنی اپنے گاؤں کی یاد ہونے لگی۔

اس کے بعد جب گھر اور بستی میں زندگی اس طرح گزرنے لگی جیسی قاہرہ جانے سے پہلے گزرا کرتی تھی گویا یہ بچہ کبھی قاہرہ گیا ہی نہیں علما کی صحبت میں بیٹھا ہی نہیں۔ گویا اس نے فقہ، نحو، منطق، اور حدیث کے سبق کبھی پڑھے ہی نہیں!

یکایک یہ بچہ پہلے کی طرح بے چین ہو جاتا کہ ہمارے میاں جی سے ملے اور ان کو ادب سے سلام کرے ان کے ہاتھ چومے اور ان کی فضول و طویل گفتگو سنے۔ اسے یہ اشتیاق ہوتا کہ کبھی کبھی مکتب جایا کرے اور وہاں کے طلبہ پہلے ہی کی طرح اس کو سمجھیں، جو تقریباً اس سے ناواقف ہیں کہ یہ ان کے درمیان سے غائب ہو گیا ہے اور اس نے پورا ایک تعلیمی سال قاہرہ میں گزارا ہے۔

ان سب باتوں سے بڑھ کر یہ کہ بستی کے لوگوں میں سے کوئی بھی اس بچے کی واپسی کے بعد اس کو سلام کرنے نہیں آیا۔ حالانکہ وہ پورا تعلیمی سال وہاں گزار چکا ہے۔

اس بچے کے جی میں یہ بات بیٹھ گئی کہ قاہرہ جانے سے پہلے اس کی جو حالت تھی ویسی ہی اب بھی ہے ان لوگوں کی نظر میں اس کی کوئی ہیبت بھی نہیں ——— نہ یہ ان کی توجہ کا مستحق ہے نہ یہ لوگ اس کے متعلق کوئی سوال کرتے ہیں اس سے اس کے غرور کو تکلیف پہنچی اس کی خاموشی زیادہ ہو گئی اور وہ سب سے الگ تھلگ رہنے لگا۔

لیکن اس نے اپنے خاندان اور بستی میں یہ دن یونہی نہیں گزارے بلکہ ایسی ترکیب نکالی کہ اس نے اپنے متعلق لوگوں کی رائے بدل دی اور انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ محبت و مہربانی سے نہ تھی بلکہ انکار و روگردانی سے تھی۔ یکایک وہ ان باتوں سے انکار کر دیتا ہے جن سے لوگ مانوس تھے جن سے بظاہر اسے عقیدت تھی اس سے سرکشی کرتا ہے۔ پہلے پہل تو یہ اس معاملے میں سچا تھا مگر جب اس نے لوگوں کی مخالفت، انکار اور ناراضی محسوس کی تو اس نے بھی تعصب اور عناد سے کام لیا اور مخالفت میں غلو کرنے لگا۔ اس نے ہمارے میاں جی کو سنا کہ وہ علم اور دین کے بارے میں اس بچے کی والدہ کو کچھ حدیثیں سنا رہے ہیں اور کچھ وہ فضائل بیان کر رہے ہیں جو قرآن کے حافظوں کے بارے میں ہیں تو اس نے میاں جی کی بیان کردہ حدیث کو مسترد کر دیا اور کہا "یہ فضول بات ہے۔" ہمارے میاں جی غصے میں آ گئے اور کہا کہ اس نے تو ازہر میں سوا بدخلقی کے کچھ نہیں

سیکھا اور اچھی تربیت کی محنت کو ضائع کر دیا۔

اس کی ماں بھی غصے میں آگئی اور اسے جھڑک دیا۔ غضب یہ ہوا کہ ہمارے دوست نے اپنے والد کو دلائل الخیرات پڑھتے ہوئے سنا جسے وہ ہمیشہ صبح کی یا عصر کی نماز کے بعد پڑھا کرتے تھے۔ اس نے اپنا سر ہلایا، ہنسا اور اپنے بھائیوں سے کہا کہ دلائل پڑھنا بے کار کام ہے اس سے کچھ فائدہ نہیں۔

اس کے چھوٹے بھائی بہنوں نے تو کچھ نہ سمجھا مگر بڑی بہن نے جھڑکا۔ شیخ نے اس آواز کو سن لیا مگر انہوں نے پڑھنا موقوف نہیں کیا۔ حزب پورا کر لیا پھر اس بچے کی طرف سنجیدگی سے مسکراتے ہوئے متوجہ ہوئے اور اس سے پوچھا "کیا کہہ رہے تھے؟" بچے نے اپنی بات دہرائی۔ شیخ نے اپنے بیٹے کو حقارت سے دیکھا اور کہا کیا تم نے ازہر میں یہی تعلیم حاصل کی ہے۔ اس بچے کو بھی غصہ آگیا اس نے کہا "جی ہاں" اور ازہر میں میں نے یہ علم بھی حاصل کیا ہے کہ آپ اس کتاب میں جو کچھ پڑھتے ہیں اس کا اکثر حصہ حرام اور معصیت رساں ہے۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں انسان کو انبیاء و اولیاء کا وسیلہ اختیار نہیں کرنا چاہیئے اور نہ اللہ اور لوگوں کے درمیان واسطہ ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک طرح کی بت پرستی ہے!" یہاں شیخ غصے میں آگئے انہوں نے اپنا غصہ ضبط کر لیا اور ایسی بات کہی جس پر سارا گھر ہنس پڑا "گونگا ہو جائے خدا تیری زبان کاٹ لے" یہ بات دوبارہ نہ کہنا اور میں قسم کھاتا ہوں کہ اگر آئندہ تم نے ایسی حرکت کی تو میں تم کو ازہر سے اٹھا لوں گا۔ مگر اس قصے نے ہمارے دوست کی ضد اور مخالفانہ خیالات میں اضافے کے سوا کچھ نہ کیا۔

سب لوگ بچے کی باتیں سنتے اور اکثر ایسی باتیں جسے وہ اپنے علم کا جزو سمجھتے تھے یہ بچہ انہیں جھٹلاتا تھا اولیاء کی کرامتوں کا مذاق اڑاتا انبیاء و اولیاء کے توسل کو حرام کہتا۔ یہ سن کر لوگ آپس میں کہتے کہ یہ بچہ گمراہ ہے اور دوسروں کو بھی بہکاتا ہے یہ قاہرہ گیا اور وہاں شیخ محمد عبدہ اور ان کے فاسد خیالات اس نے سنے وہیں سے یہ زہر لے کر آیا ہے۔

بہرحال اس بچے نے اپنا انتقام لیا وہ اپنے گوشۂ تنہائی سے نکلا محلے والوں اور شہر کے لوگوں کو اس نے اپنے متعلق بات چیت کرنے میں مصروف کر دیا۔

اس لڑکے کو علم نحو کا جو حصہ ملا وہ اس کے علم فقہ کے حصے سے بہتر تھا۔ اس نے قطر اور شذور شیخ عبداللہ دراز رحمۃ اللہ علیہ سے سنی۔ استاد کی ذہانت، اس کی آواز کی شیرینی اور علم نحو میں اس کے کمال اور اپنے شاگردوں کو نحو کی مشق کرانے میں ان کی مہارت یہ ایسی باتیں تھیں جنہوں نے اس بچے کے دل میں نحو کی محبت زیادہ پیدا کر دی۔

جوں ہی نئے سال کی تدریس شروع ہوئی اس نے شیخ عبداللہ دراز سے شرح ابن عقیل کی سماعت شروع کی۔ اس دوران میں استاد اور شاگرد اپنے سبقوں میں مصروف اور اپنے کام سے خوش تھے کہ استاد کے نام حکم صادر ہوا کہ ان کا تبادلہ اسکندریہ کے ادارے میں کر دیا گیا ہے۔ استاد نے اس تبادلے کو رد کرنے کی امکانی کوشش کی اور طلبہ نے بھی۔ مگر اقتدار اعلیٰ نے نہ استاد کی سنی نہ شاگردوں کی۔ یہ لڑکا اس دن کو نہیں بھولا ہے جب استاد نے اپنے طلبہ کو الوداع کہا۔ وہ فرط محبت سے رو رہے تھے اور استاد کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

اس شیخ کا قائم مقام ایک نابینا استاد کو بنایا گیا۔ یہ شخص اپنی ذکاوت اور مہارت کے لیے مشہور تھا۔ یہ شیخ آیا اور شیخ عبداللہ دراز نے جہاں سے چھوڑا تھا وہاں سے سبق پڑھانا شروع کیا۔ شیخ دراز کا حلقۂ درس بہت بڑا تھا ابوالذہب کی مسجد کے قبہ تک بھر جاتا تھا

یہ شیخ جب آئے تو اس حلقے کی وسعت اور بڑھ گئی ابھی اس نے اپنا چوتھا سبق بھی پوری طرح نہیں پڑھایا تھا کہ اس کے اور ہمارے دوست کے درمیان ایک ایسا واقعہ پیش آگیا جس نے اس لڑکے کو علم نحو سے بددل کر دیا۔ یہ شیخ تابط شرا کے اس شعر کی تشریح کر رہا تھا۔

تابت الی فہم وما کدت آیباً
وکم مثلہا فارقتہا وھی تصفر

(میں قبیلہ فہم کی طرف واپس آگیا اور قریب تھا کہ نہ آتا تو میں ہلاک ہو جاتا۔ ایسی کتنی ہی ہیں جنہیں میں بچا کر نکل گیا اور وہ سیٹیاں بجاتی رہ گئیں)

جب وہ شاعر کے قول تصفر پر پہنچا تو کہا عرب کی عادت ہے کہ ان میں سے کسی پر کوئی سختی ہو یا تکلیف پہنچے تو اپنی انگلیاں منہ میں رکھ کر سیٹی بجاتے تھے۔ لڑکے نے شیخ سے کہا کہ اس صورت میں شاعر کے قول "وہی تصفر" کا مرجع کیا ہے؟ (یعنی کون سیٹی بجاتی ہو) اور شاعر کا دوسرا قول (وکم مثلہا فارقتہا) کی ضمیریں کس طرف پھر رہی ہیں؟ شیخ نے فرمایا "ارے کودن مغز اس کا مرجع فہم ہے۔" لڑکے نے کہا کہ شاعر تو فہم کی طرف لوٹ آیا ہے! اس شرح کے مطابق شعر کا مطلب ٹھیک نہیں ہوتا۔ کیونکہ شاعر کہتا ہے کہ میں اس سے جدا ہوا، اگر قبیلہ بنو فہم مراد لیا جائے تو اس سے وہ جدا کہاں ہوا ہے؟ شیخ نے فرمایا "تو بے حیا ہے، تیرا جی جوتا ہی بس ہے" لڑکے نے کہا، "مگر اس سے ضمیر کا مرجع تو نہیں معلوم ہوتا"۔ شیخ پڑھانے سے رک گئے اور طلبہ سے کہا تم سب چلے جاؤ جب تک یہ بے حیا موجود ہے میں نہیں پڑھا سکتا۔

تعلیمی سال کے آغاز میں نوجوان طلبہ ایک نیا سبق پڑھنے کے لیے بڑے جوش و اشتیاق کے ساتھ آئے یہ سبق چاشت کے وقت ہوتا تھا، رواق عباسی میں۔ یہ ادب کا سبق تھا جسے سید مرصفی پڑھاتے تھے۔ اس کا نام دیوان حماسہ تھا۔ ہمارا دوست اس نئے سبق کی طرف دوڑا جیسے جیسے یہ شیخ مرصفی کی تقریریں سنتا جاتا تھا شیخ سے اس کی دل چسپی اور محبت بڑھتی جاتی تھی۔

یکایک شیخ مرصفی بھی اس پر بہت مہربان ہو گئے وہ اس کو اپنے ساتھ لے جانے لگے ایک روز یہ شیخ کے ساتھ ایک قہوہ خانے میں گیا۔ قہوہ خانوں سے اس نوجوان کا یہ پہلا سابقہ تھا نماز ظہر کے بعد سے عصر کے وقت تک وہاں بیٹھے۔ یہ شیخ مرصفی ادب کا سبق ختم کرنے کے بعد اپنے شاگردوں سے جو گفتگو کرتے تھے وہ محض ازہر طریق تعلیم کی خرابی کے متعلق ہوتی تھی۔ وہ ازہر کے استادوں کی خامیاں بڑی صفائی سے اور ترش الفاظ میں بیان کرتے تھے مگر وہ اپنے شاگردوں کے دل میں ایک امنگ پیدا کر دیتے تھے خصوصاً اس نوجوان کے دل پر انہوں نے بہت دوررس اثر ڈالا ان نوجوانوں کے دل ازہر سے تنگ ہو گئے ان نوجوانوں کے دل آزادی کے مشتاق تھے شیخ مرصفی اور ان کے سبق نے ان بندشوں کو کھول دیا۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ طلبہ اپنے شیخ کے نقش قدم پر چلنے لگے۔ ان کو بہت بڑا آدمی خیال کرتے تھے۔ ان کا مکرر بات پر صبر کرنا، تھوڑی سی آمدنی میں خوش رہنا اور ایسی باتوں سے جو علما کی شان کے خلاف ہوں ان کا پرہیز کرنا۔ ایسی برائیاں جن میں شیوخ ازہر پھنسے ہوئے تھے مثلاً، مکر، بہانہ بازی، ارباب اقتدار اور امرا کی خوشامد۔ ان سب سے شیخ مرصفی بہت بلند و بالا تھے ان کے شاگردوں کو ان کی زندگی "مثل اعلیٰ" دکھائی دیتی تھی۔

شیخ کے شاگرد اپنے استاد کی ان خوبیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور اپنے ہاتھ سے چھو سکتے تھے جب وہ ان کے گھر پہنچ جاتے

تو گویا ان کے گھر کے ایک فرد ہوتے۔ ان کا مکان ایک پرانا شکستہ اور ویران سا گھر تھا جو ایک گندے محلے میں واقع تھا جسے رکراکی کہتے تھے ایک روز انہوں نے عصر کے بعد شیخ سے ملاقات کی شیخ مرصفی بالکل ادنیٰ درجے کی ایک چٹائی پر بیٹھے تھے۔ ان کے برابر میں ایک بہت ضعیف بڑھیا تھی وہ اتنی کمر خمیدہ تھی کہ سر زمین سے لگ جانے کے قریب تھا۔ شیخ اپنے ہاتھ سے اس ضعیفہ کو کھانا کھلا رہے تھے تھوڑی دیر بعد تشریف لائے اور ہنستے ہوئے فرمایا: "میں اپنی والدہ کو کھانا کھلا رہا تھا!"

اپنے گھر سے جب وہ متانت اور سکون نفس کے ساتھ باہر نکلتے تو ان کی صورت سے دولت مندی اور اطمینان قلب برستا تھا۔ لیکن ان کے شاگرد اور قریبی دوست اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ سب سے زیادہ غریب اور سب سے بڑھ کر تنگ دست تھے۔ اکثر یہی تھے اس طرح گزارتے کہ راشن کی روٹی نمک کے پانی میں بھگو کر کھایا کرتے تھے۔ مگر اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلاتے تھے اور اپنی بیٹی کی بھی نازبرداری میں کمی نہ کرتے تھے۔ یہ سب وہ اتنی حقیر تنخواہ میں کرتے تھے جو ساڑھے تین گنی سے زیادہ نہ تھی۔ وہ اپنی تنخواہ مہینے کے آخر دنوں میں لینے سے شرماتے تھے ان کو یہ ناپسند تھا کہ خود بھی استادوں کی بھیڑ میں جا کھڑے ہوں جو تنخواہ تقسیم کرنے پر گرے جا رہے ہیں ان کے شاگرد ان کا افلاس مگر آزاد و ممتاز زندگی سے بہت متاثر تھے۔ دوسرے شیوخ کو دیکھتے تو ان کے بارے میں ایسی باتیں سننے میں آتی تھیں کہ ان کے دل حقارت سے بھر جاتے تھے۔ لہٰذا اگر یہ لوگ شیخ مرصفی کے گرویدہ ہو جائیں، ان کی سیرت اور خیالات سے متاثر ہوں اور ان کے ساتھ ازہریوں کی تحقیر کریں اور تقلید پرستی کے خلاف آواز بلند کرنے میں اپنے شیخ کے ہم نوا ہوں، تو کون سے تعجب کی بات ہے؟

سچ تو یہ ہے کہ اس نوجوان نے اپنے دل میں اور اپنے ضمیر کی گہرائی میں ازہر سے اپنا رشتہ منقطع سا کر لیا تھا۔ مگر ازہر کے رجسٹروں میں اس کا نام درج تھا۔ اس نے جامعہ (یونیورسٹی) سے اپنا رشتہ قائم کر لیا۔ اب ایسی مشترک زندگی بسر کرتا ہے کہ قدیم ازہر اسے اپنے گروہ کی طرف کھینچتا ہے جو باطنیہ اور کفر طحین کے درمیان واقع ہے اور نئی جامعہ جو اپنی طرف قصر العینی کے شاہراہ کوبری کے خوبصورت محلے میں ہے۔

اب ہمیں اس کو قدیم و جدید کے درمیان کشتی لڑنے کے لیے اسی حال پر چھوڑ دینا چاہیے اور کون جانتا ہے کہ شاید ہم دوبارہ اس کی طرف واپس ہوں۔

لو میرے پیارے بیٹے —— تم اپنے وطن اور اپنے شہر اور گھر سے دور جا رہے ہو، اپنے گھر والوں اور ساتھیوں سے بچھڑ رہے ہو ابھی اس کم سنی میں تم تنہا پیرس بھیجے جا رہے ہو۔ لہٰذا مجھے اجازت دو کہ یہ قصہ تمہیں بطور زاد راہ دے دوں تاکہ اس سے تم کبھی کبھی اپنا جی بہلاؤ جب تم سبق سے تھک جاؤ، لاطینی اور یونانی زبان کے سیکھنے میں تمہیں مشقت کرنی پڑے تو اس میں تم ایسا رنگ دیکھو گے جو عمر کی زندگی کے لحاظ سے تمہارے لیے نیا ہوگا تم ایسے شخص کو یاد کرو گے جسے تمہارے قریب سے راحت ملتی ہے اور جو تمہاری شرارت اور شائستگی دونوں سے لطف اٹھاتا ہے۔

خود نوشت

(ترجمہ: عبدالباقی شطاری)

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی

تمہید

عرصہ دراز سے احباب مجھ سے میری سوانح عمری کی مختلف باتیں دریافت فرماتے رہتے تھے، اور میں جواب دیتا رہتا تھا۔ بعض احباب نے مختلف اخبارات و رسائل میں ان کو شائع بھی کر دیا۔ مگر افراط و تفریط سے وہ مضامین خالی نہیں تھے۔ اور بعض چیزیں غلط بھی شائع ہوئیں گونا گوں مشاغل اس کی فرصت ہی نہ دیتے تھے کہ مختصر سے مختصر طریقہ پر بھی تحریر کروں۔ بالآخر ۱۹۴۲ء میں نظر بندی کی نوبت آئی اور جب میں نینی جیل، الٰہ آباد میں تھا تو اس کی پُر زور تحریک ہوئی اور کہا گیا کہ اس وقت تم کو بہت سی مصروفیتوں سے نجات حاصل ہے اس کو غنیمت جان کر اس مہم کو پورا کر دینا چاہیئے، کیونکہ اس میں علاوہ تاریخی واقعات کے آنے والے لوگوں کے لیے ہدایت اور روشنی بھی ہے۔ اور تحدیث نعمت بھی!

خاندانی روایات تھیں کہ ہر زمانہ میں کم از کم ایک یا دو شیخ مجذوب اور بکثرت اہل سلوک موجود رہتے تھے، مگر ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے اہل عرفان سے خاندان خالی ہو گیا، اور سب کے سب دنیا دار ہو گئے۔ علم و معرفت کی جگہ جہالت اور نفس پروری نے لے لی تھی۔ پھر ۱۸۵۷ء کے واقعات نے رہی سہی حالت بھی بالکل گرا دی۔ مال و دولت سب لٹ گئے جائیدادیں تقریباً سب کی نکل گئیں۔ اور افلاس نے بے دست و پا کر دیا۔ خاندان کے قدم اکھڑ گئے، اور ابھرنے کے سامان نابود۔ عالمگیر اور پے در پے قحطوں نے جو انگریزی چیرہ دستیوں اور ان کی کوششوں سے ۱۹ ویں صدی کے آخیر میں ظہور پذیر ہوئے، تمام ہندوستان بالخصوص یو پی اور اودھ کے مشرقی اضلاع میں لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ خاندان کے خاندان بے نام و نشان ہو گئے۔ بقول مرحوم ڈگبی ۱۸۵۴ء سے ۱۹۰۱ء تک ہندوستان میں ۱۸ قحط پڑے۔ اور تقریباً ۳ کروڑ آدمی ہلاک ہوئے۔ ایسے حالات میں خاندانی یتیموں کی باعزت زندگی خدا کا بے نظیر انعام ہے جس کے شکریہ سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی

اگر بر روید زہر مو زبانم ؎
ادائے شکر لطفش کے توانم

میں دیکھ رہا ہوں کہ اسلاف نے اپنی اپنی سوانح عمریاں خود لکھی ہیں جیسا کہ شاہ ولی اللہؒ سے منقول ہے اور زمانہ حال میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں میں اس کی بکثرت مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اور اپنی آپ بیتی اور سرگذشت سے انسان جس قدر واقف ہوتا ہے دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے یہ تذکرہ نہ لکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی —— یہ امید بھی ہے کہ صحیح معلومات سامنے آئیں۔ وہ بدظنی اور بدگمانی کی فضا ختم ہو جو [illegible] پروپیگنڈہ سے قائم ہو گئی تھی۔

سن تاریخ ولادت

۱۲۹۶ھ ماہ شوال کی ۱۹ ویں تاریخ کی شب میں گیارہ بجے شنبہ کا دن گذر جانے کے بعد شب یکشنبہ میں بمقام بانگرمئو (اناؤ) میں پیدا ہوا۔ تاریخی نام چراغ محمد ہے۔ (حضرت والد صاحب مرحوم نے اپنی بیاض میں صرف یہی تحریر فرمایا ہے۔ تاریخ ولادت عیسوی نہیں لکھا حساب سے ۱۸۷۹ء ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں والد صاحب مرحوم قصبہ بانگرمئو میں اردو مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اور کئی سال سے مع متعلقین وہاں مقیم رہے۔

۱۲۹۳ھ میں اس سے پہلے میرے منجھلے بھائی مولانا سید احمد صاحب مرحوم بھی وہیں پیدا ہوئے تھے۔ جس زمانہ میں میری پیدائش

ہوئی اس زمانہ میں موسمی تپ ولرزہ (انفلوئنزا) کا بہت دور دورہ تھا۔ اموات زیادہ ہوتی تھیں۔ والدہ مرحومہ فرماتی تھیں کہ عموماً بچے اور ان کی ہی جو زچہ تھیں ضائع ہو گئے۔ پورے قصبہ میں صرف میں اور ایک دوسری عورت ایک بچہ کے ساتھ سالم بچی تھی۔

ابتدائی پرورش بانگرمئو ہی میں ہوئی۔ میں بہت ہی چھوٹا تھا۔ جب والد مرحوم بانگرمئو چھوڑ کر آبائی وطن ٹانڈہ میں قیام گزیں ہوئے۔

چونکہ اس پردیسی اقامت کی وجہ سے زمینداری کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا اس لیے انھوں نے کوشش کی کہ تبدیلی ٹانڈہ ہو جائے۔ حکام بالا نے اس وجہ سے ایسی لیت ولعل کی کہ ٹانڈہ کے ہیڈ ماسٹری کی تنخواہ [illegible] ہے تو یہاں [illegible] ملتے ہیں مگر ضروریات وقت نے مجبور کیا کہ اس قلت تنخواہ پر بھی تبدیلی کرا لی جائے۔ بالآخر ٹانڈہ چلے آئے۔ مجھ کو وہاں سے آنا بالکل یاد نہیں۔ غالباً ۳ برس کی عمر ہوگی۔ اس کے بعد ۱۲ برس کی عمر تک ٹانڈہ ہی کی رہائش اور ابتدائی تعلیم نصیب ہوئی۔

سلسلۂ نسب حسین احمد بن سید حبیب اللہ بن سید پیر علی بن سید جہانگیر بخش، بن شاہ نور اشرف بن شاہ مدن، بن شاہ محمد ماہ شاہی، بن شاہ خیر اللہ، بن شاہ صفت اللہ، بن شاہ عجب اللہ، بن شاہ محمود، بن شاہ لدھن بن شاہ قلندر بن شاہ منور بن شاہ راجو بن شاہ عبد الواحد بن شاہ محمد زاہدی، بن شاہ نور الحق رحمہم اللہ تعالیٰ۔

شاہ نور الحقؒ کہ مورث اعلیٰ ہیں جو اللہ داد پور قصبہ ٹانڈہ" (ضلع فیض آباد) میں پہلے پہل تشریف لا کر اقامت گزیں ہوئے۔ اس زمانہ میں قوم بھر کا قبضہ ٹانڈہ کے تمام گرد و نواح اور دیہات پر تھا، اور وہ مسلمانوں کو ستاتے رہتے تھے۔ شاہ نور الحقؒ نے پہنچ کر دعوت اسلام دی مگر راجہ اور عوام مقابلہ پر آگئے۔ آپ نے بزور کرامت ان کو روک دیا۔ ان کا راجہ قلعہ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ آپ نے وہیں اقامت فرمائی اور اس موضع کا نام اللہ داد پور رکھا، جس کی وجہ تسمیہ ظاہر ہے۔ قلعہ کے آثار اب تک موجود ہیں۔ شمالی دیوار اور مشرقی برجوں کے بقایا اور پتھر وغیرہ باقی ہیں۔ اسی قلعہ میں آپ کے اور آپ کی تمام اولاد کے مزار اب تک بنتے چلے آتے ہیں۔

آج ہمارے خاندان میں کوئی ایسا کاغذ یا تحریر موجود نہیں جس سے ظاہر ہو کہ موصوف کہاں سے آئے تھے اور آگے کا سلسلۂ نسب کیا ہے اور کس زمانہ میں آئے تھے؟ مگر مخطوطہ شجرۂ طریقت میں دکھلایا گیا ہے کہ آپ شاہ داؤد چشتی کے اور وہ شاہ قطب الدین چشتی کے اور وہ شاہ نجم الدین چشتی اور وہ شاہ ولی چشتی کے اور وہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے خلیفہ ہیں۔ یہ شجرۂ طریقت پرانے کاغذات میں پایا تھا۔ لکھنے والا والد کے پردادا شاہ نور اشرفؒ کا کوئی مرید یا بیٹا ہے۔

والد صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ جب میں صفی پور اور بانگرمئو میں ہیڈ ماسٹر تھا اور لوگوں سے اپنی سادات سیادت کا تذکرہ کرتے تو لوگ تصدیق نہیں کرتے تھے کیونکہ اودھ کے شہروں میں ٹانڈہ نوربافوں کی بستی مشہور تھا اور یہاں کے کپڑے واقع میں امتیازی شان رکھتے تھے۔ اس لیے یہ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ بھی اسی قوم سے ہوں گے۔ مگر مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادیؒ نے ایک روز بھرے مجمع میں فرمایا کہ وہ ماسٹر تو سید اور پیرزادے ہیں ان کے مورث اعلیٰ شاہ نور الحقؒ بہت بڑے اولیاء اللہ میں سے ہیں رات میرے پاس وہ آئے تھے اور مجھ سے کہتے تھے کہ میرے بیٹے حبیب اللہ کا خیال رکھو، یہ بھی تو بڑے پیرزادے ہیں۔"

اس کے بعد سے ان کی نظر التفات مجھ پر بہت زیادہ ہوگئی اور لوگوں کے خیالات میرے نسب کے متعلق بدل گئے اور حضرتؒ کا یہ مقولہ مشہور ہو گیا —— والد صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ میں نے اوائل عمر میں ایک خواب دیکھا تھا کہ حضرت فاطمہؓ ایک بڑے تالاب

کے کنارے ایک درخت کے نیچے حبشی برقعوں پر خواتین رہی ہیں اور میں اپنے آپ کو بچہ پاتا ہوں اور تالاب کے دوسرے کنارہ پر بیوی ہیں نے دیکھا میں تالاب میں تیرتا ہوا ان کی طرف اس طرح جاتا ہوں جیسے بچہ اپنی ماں کے پاس جاتا ہے۔ میں خواب ہی میں ان کو ماں سمجھ کر ان تک پہنچ گیا ہوں۔ ہجرت کے بعد انھوں نے مدینہ منورہ میں اس کو ذکر کیا اور فرمایا کہ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا مطلب تھا۔ میں نے عرض کیا کہ تعبیر تو ظاہر ہے آپ سمندر کے کنارہ پر تھے ہجرت کر کے مدینہ منورہ حضرت فاطمہؓ تک پہنچ گئے، نسبی سلسلہ میں وہ ماں ہی ہیں۔

نیز ایک بار فرمایا کہ مجھ کو نسب نامہ کی تلاش تھی تو میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت امام حسینؓ گھوڑے پر سوار جہاد کو جا رہے ہیں اور میں ان کے پاس کھڑا ہوا ہوں تو مجھ کو فرمایا کہ "تو میری اولاد ہے" بہرحال یہ امور اگرچہ قطعی تعیین نسب نہیں مگر کچھ نہ کچھ روشنی ضرور ڈالتے ہیں——

قدیم زمانہ سے ہماری ان سادات و شیوخ میں بھی رشتہ داری چلی آتی ہے جو شیعہ ہیں اور یہ مرض اودھ کی شیعی حکومت کی وجہ سے تمام یوپی اور اودھ میں بہت پھیلا۔ اگر اس زمانہ میں چند اولیاء اللہ نہ ہوتے تو غالباً ہمارا خاندان بھی اس لعنت سے محفوظ نہ رہتا۔ تاہم آخر میں بغیر اس کے چارہ نہ تھا کہ نانا حسن علی شاہ نے (جو اپنے زمانہ کی تمام جائداد کے متولی تھے) ایک امام باڑہ بنایا اور ۶ محرم کی شب کو مہندی نکالنی اور بڑے تزک و احتشام سے تمام شہر میں روشنی اور باجوں کے ساتھ گشت جاری کر دیا۔ جو اب تک چلا آ رہا ہے۔ نیز خاندان کے ہر گھر میں تعزیہ رکھنا جاری ہوا جو ہمارے بچپن تک چلتا رہا۔ الحمد للہ کہ یہ معصیت تمام خاندان سے اٹھ گئی۔ مگر مہندی کی لعنت رہ گئی۔ شیعوں سے رشتہ داری بھی تھوڑی سی بہت باقی ہے۔

ذریعۂ معاش

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے وقت خاندان کے پاس ۲۳ یا ۲۴ گاؤں تھے جن کی وجہ سے مشترکہ خاندان نہایت ثروت اور فراغت سے گزر کرتا تھا مشہور ہے کہ تخت دہلی سے کسی زمانہ میں ۲۱ دیہات کی جاگیر ۳ خاندانوں پر تقسیم ہوئی تھی۔ جن میں اللہ داد پور کا ہمارا خاندان بھی تھا جس کو ۷ گاؤں دیئے گئے تھے۔ کاغذات کے ضائع ہو جانے کی وجہ سے پتہ نہیں چل سکا کہ یہ کس بادشاہ کے وقت میں ملا تھا؟ والد مرحوم فرماتے تھے کہ بادشاہ دہلی کے ہاں یہ ہم گزرنے پر مصارف خانقاہ کے لیے یہ دیہات دیئے گئے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں خانقاہ کے کوئی آثار باقی نہ تھے۔ گیارہ گاؤں غیر معلوم انقلابات و اسباب کی وجہ سے قبضہ سے نکل گئے۔ صرف ۱۳ باقی رہ گئے۔ اللہ داد پور، بڑا گاؤں پور، چاند پور، گوبردھن پور، ہری پور، قریب پور، دھول پور، بھکنا وغیرہ۔

امیٹھی کے راجہ کے ظلم اور مہاجنوں کے قبضہ کی وجہ سے ساری جائداد نکل گئی، نہایت تنگی اور افلاس سے سب کی بسر اوقات ہوتی تھی۔ مدار آمدنی پیری مریدی اور تھوڑی زمین پر رہ گیا۔ (بڑا گاؤں اور اللہ داد پور بچے تھے) ان میں دادا مرحوم کا حصہ دو آنے ۸ پائی تھا۔ والد مرحوم جب بانگر مؤ سے تبدیل ہو کر کانڈلہ پہنچے ہیں تو یہ حصہ بھی مہاجنوں کے ہاں مرہون تھا فقط سیر کی زمین باقی تھی جس میں ہمارے تایا اشرف علی صاحب مرحوم زراعت کرتے تھے۔

والد مرحوم کی پیدائش اور تربیت

والد مرحوم اللہ داد پور میں ۱۸۵۷ء سے ۴، ۵ برس پہلے پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۷ء میں ان کو ہوش و حواس تھا۔ والد مرحوم ۳ بھائی تھے۔ نوازش علی، پیر علی، تیغ علی —— نوازش علی، تیغ علی لاولد تھے، صرف پیر علی صاحب اولاد ہوئے۔

تیغ علی دادا نے دادا مرحوم کے منجھلے بیٹے نجیب اللہ کو متبنیٰ بنایا اور گود لیا۔ مگر عمر نے وفا نہ کی اور بچپن ہی میں انتقال کر گئے۔ اس کا اثر سب پر سخت ہوا۔ اس کے بعد جب والد مرحوم پیدا ہوئے تو دادا نے زور دیا کہ اب اس بچہ کو لے لو وہ تامل کرتے تھے مگر ان کو مجبور کیا گیا بالآخر انھوں نے والد صاحب مرحوم کو لے لیا۔ اور دونوں میاں بیوی نے نہایت محبت اور شفقت سے والد صاحب مرحوم کو پالا۔ تقدیر نے پلٹا کھایا اور سنہ ۵۷ء میں تینوں بھائی انتقال کر گئے۔ گھر میں سوائے عورتوں اور بچوں کے کوئی مربی صاحب اثر باقی نہ رہا زمینداری اور ثروت چھن گئی۔ افلاس و ادبار نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ منجھلی دادی مرحوم نے بڑی تنگدستی میں والد صاحب کی پرورش کی۔ میں نے بچپن میں ان کو دیکھا ہے فرمایا کرتی تھیں۔

”میں نے بڑی مشکلات سے حبیب اللہ کو پالا ہے“۔ والد صاحب نے خدا کے فضل سے ذہن اور حافظہ بہت عمدہ پایا تھا طبیعت نہایت تیز تھی۔ اس یتیمی اور افلاس کی حالت میں ٹانڈہ کی علمی درسگاہوں میں پڑھتے رہے۔ اور قرآن شریف، فارسی، اردو، اور مڈل پاس کر لیا۔ اور عنفوان شباب ہی میں ٹانڈہ کے قریب ”التفات گنج“ میں آٹھ روپے ماہوار پر مدرس ہو گئے۔ اس ملازمت کی بنا پر کسی قدر بسر اوقات کی سہولتیں پیدا ہو گئیں۔ اگر اس زمانہ میں کوئی کفیل ہوتا تو اپنی تعلیم میں بڑی ترقی کر سکتے۔ التفات گنج میں ان کو بطور خود ترقی کا خیال پیدا ہوا تنخواہ اور ملازمت میں ترقی بغیر نارمل اسکول پاس کئے نہیں ہو سکتی تھی اس لیے ان کو لکھنؤ جانا پڑا۔ اس زمانہ میں تمام صوبہ میں نارمل اسکول صرف لکھنؤ میں تھا (وہاں اچھے نمبروں سے پاس ہوئے) اور قصبہ صفی پور (اناؤ) میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ پھر بانگرمئو تبدیل کر دیئے گئے اور وہاں متواتر کئی برس مقیم رہے۔ اسی تنگی و فکر معاش کی وجہ سے علوم عربیہ نہیں حاصل کر سکے۔ اگرچہ لوگ ان کو مولوی کہتے تھے مگر وہ علوم عربیہ سے بالکل ناواقف تھے صرف فارسی، اردو، ہندی اور بھاشا سے واقف تھے اور اسکول میں پڑھاتے تھے اس زمانہ میں ایسے لوگ مولوی کہے جاتے تھے۔ نارمل پاس کرنے کے بعد بعض احباب کی ترغیب سے انگریزی شروع کی۔ مگر پہلی ہی شب میں خواب میں دیکھا کہ دونوں ہاتھ پاخانہ سے ملوث ہیں۔ اس وجہ سے انگریزی سے ان کو نفرت ہو گئی اور ملازمت کی کوشش میں کامیاب ہو گئے۔

والد کی شادی

جب والد صاحب ۱۸ویں سال میں تھے اور التفات گنج پرائمری اسکول میں ملازم تھے منجھلی دادی مرحومہ نے شادی کرنی چاہی۔ نانا اکبر علی مرحوم جائداد کے متولی تھے اور سنہ ۵۷ء میں دریائے گنگا میں ڈوب گئے تھے۔ تین لڑکے اور ایک لڑکی (والدہ مرحومہ) چھوڑ گئے تھے۔ والدہ ان کی وفات کے وقت ۶ ماہ کی تھیں۔ ان سب بچوں کی پرورش بڑی تنگدستی میں ہوئی۔ نانی صاحبہ بہت منتظم اور تعلیم یافتہ تھیں۔ انھوں نے بچوں کو عام رواج کے مطابق اردو فارسی وغیرہ پڑھائی۔ دادی نے کوشش کی رشتہ خاندان ہی میں ہو جائے جب والدہ کی عمر ۱۳ برس کی تھی شادی ہو گئی۔ سب سے بڑے بھائی محمد صدیق صاحب مرحوم الہ داد پور ہی میں ۱۲۸۳ھ میں پیدا ہوئے۔ نانی مرحومہ سندوری علاقہ بیگم پور (فیض آباد) کے سادات میں سے تھیں۔ ان کے ماموں بڑے کامل ولی اور صاحب علم تھے۔ انھوں نے نانی صاحبہ کی تربیت فرمائی تھی۔ ہندی اردو تعلیم کے علاوہ طریقت و تصوف میں بھی باکمال تھے۔ کشف قبور میں ان کو مہارت تامہ تھی۔ انھوں نے والدہ کو بھی اردو ہندی پڑھائی۔ ہندی لکھنا بھی سکھایا اور ہندی بھاشا میں پدماوت اور جنس جواہر بھی پڑھائی۔ تصوف کا چسکہ بھی پیدا کر دیا جو مولانا گنج مرادآبادیؒ کی بیعت کے بعد اور زیادہ ہو گیا۔ چنانچہ باوجود کثیر الاولاد ہونے کے وہ ہمیشہ شب خیز و تہجد گزار رہیں۔ اخیر تک معمول رہا کہ روزانہ دو سو مرتبہ سورہ اخلاص پڑھ کر حضورؐ کو ہدیہ کرتی تھیں۔ امور خانہ داری میں

آخر تک جفاکش رہیں۔ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد عسرت کی بنا پر آٹا خود پیسنا پڑتا تھا حالانکہ ہندوستان میں اس کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ مگر اس پیرانہ سالی میں روزانہ ایک طرف خود اور دوسری طرف تینوں بہوؤں کو باری باری بٹھا کر آٹا پیسا کرتی تھیں۔ ان کی محبت بھی اولاد سے عاقلانہ تھی اولاد کو تعلیم کے لیے جدا کرنے میں کبھی انھوں نے پس و پیش نہیں کیا، بچوں کی تعلیم و تربیت کا انھیں بہت خیال تھا اور بچپن ہی سے مذہبی جذبات اور اخلاق تربیت کی کہانیوں اور چٹکلوں میں خیال رکھتی تھیں۔ والدہ مرحومہ ۱۳۳۲ھ میں وفات پاکر بقیع میں مدفون ہوئیں۔

ہجرت مدینہ

(وفات مرشد (مولانا فضل رحمان گنج مراد آبادی) سے بڑے غمگین رہا کرتے تھے) بھائی سید احمد صاحب نے ایک خط میں والد صاحب کو لکھ دیا کہ یہاں اب ہندوستان رہنے کی جگہ نہیں اب تو مدینہ منورہ چل بیٹھیے باغ وغیرہ لگانے کی فکر فضول ہے۔ یہ کلمات ایسے مؤثر ہوئے جیسے اسپرٹ میں دیا سلائی۔ اس خط کو دیکھنا تھا کہ عشق محمدی کی آگ بھڑک اٹھی ہر دم یہی دھن تھی کہ تمام گھرانہ کو لے کر وہیں چلنا چاہیے۔ تدبیریں سوچنے لگے، بارہ نفوس پر مشتمل خاندان کا سفر معمولی بوجھ نہ تھا۔ لوگوں نے سمجھایا کہ آپ خود جائیے اور حج و زیارت کر آئیے۔ مگر نہ مانے۔ جب کہ سسرال والوں نے زور دیا تو جواب دیا کہ اپنی اپنی لڑکیوں کی طلاق لے لو میں تو اپنے لڑکوں کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔

بہوؤں سے کہا جسے چلنا نہ ہو وہ طلاق لے لے۔ میری کتابیں ادب و ہیئت کی کچھ باقی تھیں میں نے عرض کیا کہ آپ تشریف لے جائیں میں ایک دو سال بعد آجاؤں گا۔ فرمایا کہ مدینہ منورہ میں پوری کر لینا۔ میرے حقیقی خسر تو بہت عرصہ پہلے فوت ہو چکے تھے۔ میری اہلیہ کو اس کے حقیقی ماموں شیخ کفایت اللہ مرحوم قتال پوری نے پالا تھا اور وہی شادی کے کفیل ہوئے تھے۔ ریاست جلال پور میں ملازم تھے۔ ان دنوں ریاست لکھنؤ کے معتمد ہو کر وہیں مقیم تھے انھوں نے مجھ کو روکنا چاہا اور والد سے کہا کہ میں خود لکھنؤ میں موجود ہوں حسین احمد کو اپنے پاس رکھ کر حکیم عبدالعزیز صاحب مرحوم کے ہاں طب پڑھانا چاہتا ہوں اس کو یہاں چھوڑ دیجیے۔ والد نے جواب دیا کیا حسین احمد کو گھوڑے پر سوار کرنے کے بعد میں گدھے پر سوار کروں گا۔ اس کو علوم دینیہ کی تعلیم دلائی گئی ہے اس سے بڑھ کر کونسی تعلیم ہے۔ الغرض دوستوں، رشتہ داروں، اغیار سبھوں نے سمجھایا مگر بقول شاعر ؎

مریض عشق پر رحمت خدا کی　　مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

یہاں تک ان کا جوش اور عشق بڑھا ہوا تھا کہ سفر حجاز میں جب گورنمنٹ کی طرف سے بہت سختیاں کی جاتی تھیں۔ الٰہ آباد کے قرنطینہ کی سختیاں دکھلا کر ایک صاحب نے کہا کہ اس سال ارادہ نہ کیجیے۔ تو فرمانے لگے کہ اگر مجھ کو یہ کہا جائے کہ تجھ کو توپ کے منہ پر گولہ چلائیں گے اور تو مدینہ پہنچ جائے گا تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔

گھر میں بجز چھوٹے بھائی سید احمد کے پورا ہم خیال والد مرحوم کا کوئی نہیں تھا۔ بڑے بھائی نے جب والد کا یہ عزم مصمم دیکھ کر حضرت گنگوہیؒ سے شکایت کی آپ نے فرمایا کچھ حرج نہیں چلے جاؤ۔ انھوں نے عرض کیا میری تعلیم باطنی پوری نہیں ہوئی تو فرمایا کہ اب ساتھ چلے جاؤ پھر سب کو چھوڑ چھاڑ کر چلے آنا!

والد صاحب کا شوق و اضطراب بڑھتا رہا۔ فکر تھی کہ کسی طرح جائداد فروخت ہو جائے تو روانہ ہو جائیں اس جد و جہد میں عرصہ

لگ گیا۔ بڑی کوششوں کے بعد ٹانڈہ کے ایک رئیس راجہ علی حسین تیار ہو گئے اور غالباً ۳ ہزار روپیہ پر اٹاوہ پور اور جوڑا اول پور کا زرعی حصہ فروخت کر دیا۔ اواخر شعبان ۱۳۰۸ھ میں روانگی ہوئی۔

والد کی نعت

ایں جمالِ دلربائے عالم سوزِ تو　　ویں رخِ پُر نور دل افروزِ تو
کرد بسمل صد ہزاراں جبرئیل　　ناوکِ مژگانِ سینہ دوزِ تو!

اے بہارِ باغِ رضواں کوئے تو　　بلبلِ سدرہ اسیرِ موئے تو
سجدہ ریزاں کو بسویت حبیب　　اے ہزاراں کعبہ در ابروئے تو!

اردو نعت:۔

جان سے جاتا ہے تیرے پاس کہاں جاتا　　جیتے جاتے ہیں مگر مردہ بنے جاتے ہیں
ایک ہم ہی رہے اس بزم میں باقی ساقی!　　لوگ میخانے سے پی پی کے چلے جاتے ہیں
سر رہے یا نہ رہے پر رہے سودا سر میں　　عشقِ احمد کا خدایا یہی ہم چاہتے ہیں
اس حبیبِ دلِ خستہ پہ نظر ہو جائے　　دردمندوں کی دوا آپ کیے جاتے ہیں

میری تعلیم و تربیت

(میرے کھیل کود کو دیکھ کر) بالآخر والد صاحب نے طے کر لیا کہ اس کو یہاں نہ رکھنا چاہیے اور دیوبند ہی بھیج دیا جائے۔ چنانچہ بھائی صاحب کی روانگی کے بعد ۳ ماہ بعد منشی فیروز الدین صاحب جالوی کے ساتھ دیوبند بھیج دیا۔ منشی صاحب مرحوم بٹالہ (گورداسپور پنجاب) کے باشندہ اور والد مرحوم کے بہت دوست اور فیض آباد میں محافظ دفتر تھے۔ پنجابی ہونے کی وجہ سے آپس میں خلوص اور ربط تھا وہ کسی ضرورت سے اپنے وطن بٹالہ جا رہے تھے۔ والد مرحوم نے ان کو کہا کہ حسین احمد کو اپنے ساتھ لیتے جائیے اور دیوبند پہنچا دیجئے۔ چونکہ سہارنپور ہو کر ان کا راستہ تھا۔ اس لیے ان کو کوئی دقت نہ تھی۔ چنانچہ اوائل صفر ۱۳۰۹ھ ہی میں ان کے ساتھ دیوبند پہنچ گیا اور دونوں بھائیوں کے ساتھ انہی کے کمرے میں حضرت شیخ الہندؒ کے مکان کے قریب رہنے لگا یہ کمرہ حضرتؒ کی مسجد کے سامنے کوٹھی میں واقع تھا۔ یہاں پہنچنے کے بعد گلستان اور میزان شروع کی بڑے بھائی صاحب مرحوم نے حضرت شیخ الہندؒ سے درخواست کی آپ تبرکاً اس کو دونوں کتابیں شروع کرا دیں۔ مجمع میں حضرت مولانا خلیل احمد اور دوسرے اکابر موجود تھے۔ حضرتؒ نے مولانا خلیل احمدؒ سے فرمایا کہ آپ شروع کرا دیں چنانچہ انہوں نے دونوں کتابیں شروع کرا دیں۔

اور مجھے بھائی صاحب نے میزان منشعب پڑھائی اگرچہ تیرھواں سال عمر کا شروع ہو چکا تھا۔ مگر جسم اس قدر دبلا اور پستہ تھا کہ سب ۱۱ سال کا سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے وہاں مجھ پر شفقت زیادہ کی گئی وہاں اس قدر دور کے نوعمر اور چھوٹے طالب علم نہیں جاتے تھے اور چونکہ میں تحریر و حساب وغیرہ سے بخوبی واقف تھا اور خط بھی فی الجملہ اچھا تھا اس لیے اساتذہ کے سارے خانگی خطوط اور حسابات کی خدمت انجام دیتا تھا۔ بالخصوص حضرت شیخ الہندؒ کی اہلیہ محترمہؒ بہت زیادہ شفقت فرماتی تھیں مستورات میں منشی مشہور ہو گیا تھا۔ دیوبند پہنچنے کے بعد کھیل کود کی رہی سہی آزادی بھی جاتی رہی۔ دونوں بھائی بڑے سخت تھے۔ اس وجہ سے

علمی شغف زیادہ ہو گیا۔

دار العلوم کی تعلیمات

بھائی مرحوم نے گلستان کے شاید ایک ہی دو سبق پڑھائے تھے مگر میزان منشعب خوب توجہ سے پڑھائی جب دونوں خوب یاد ہو گئیں تو اس کے بعد پنج گنج، صرف میر حضرت حکیم محمد حسن صاحب مرحوم یکے بعد دیگرے پڑھیں، یہ اسباق خارج میں ہوئے۔ صفر ۱۳۰۹ھ سے شعبان ۱۳۱۶ھ تک دیوبند میں قیام رہا اس مدت میں مندرجہ ذیل کتابیں ذیل کے اساتذہ کے پاس ہوئیں۔

۱۔ حضرت شیخ الہندؒ ——— دستور المبتدی، زرادی، زنجانی، مراح الارواح، اقول، مرقات، تہذیب، شرح تہذیب قطبی، میر قطبی، منیۃ الطالبین، نفحۃ الیمن، مطول، ہدایہ، اخیر آخرین۔ ترمذی، بخاری، ابوداؤد، بیضاوی، نخبۃ الفکر، شرح عقائد، حاشیہ خیالی، موطا مالک و محمد۔

۲۔ مولانا ذوالفقار علی صاحب (والد ماجد حضرت شیخ الہندؒ) ——— فصولِ اکبری۔

۳۔ مولانا عبدالعلی صاحبؒ ——— مسلم شریف، نسائی، ابن ماجہ، سبعہ معلقہ، حمد اللہ، صدرا، شمس بازغہ، توضیح تلویح، تحریر۔

۴۔ مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم ——— تلخیص المفتاح۔

۵۔ مولانا حکیم محمد حسن مرحوم ——— پنج گنج، صرف میر، نحو میر، مختصر، مسلم، ملا حسن، جلالین، ہدایہ اولین۔

۶۔ مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ۔ شرح جامی، کافیہ، ہدایۃ النحو، منیۃ المصلی، کنز، شرح وقایہ، شرح مائۃ عامل، اصول شاشی۔

۷۔ مولانا غلام رسول صاحب مرحوم۔ نور الانوار، حسامی۔ قاضی مبارک شمائل ترمذی۔

۸۔ مولانا منفعت علی صاحب مرحوم میر زاہد، ملا جلال، میبذی، خلاصۃ الحساب، رشیدیہ، سراجی۔

۹۔ مولانا حافظ محمد احمد صاحب۔ شرح جامی بحث اسم۔

۱۰۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب۔ مقامات حریری، دیوان متنبی۔

۱۱۔ بڑے بھائی۔ میزان منشعب۔ ایسا غوجی۔

مدینہ منورہ میں درس

درس و تدریس کی تفصیل یہ ہے کہ اواخر شعبان ۱۳۱۶ھ میں جب ہم تینوں بھائی دیوبند سے آخری طور پر روانہ ہوئے تو رخصت کرنے والوں میں خود حضرت شیخ الہندؒ ساتھ ساتھ دیوبند اسٹیشن تک پیدل تشریف لائے تھے۔ راستہ میں پُر زور طریقہ پر ہدایت فرمائی کہ پڑھانا ہرگز نہ چھوڑنا چاہے ایک ہی دو طالب علم ہوں۔ اس لیے تعلیمی مشغلہ کا خیال بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ مدینہ پہنچنے کے بعد بعض ہندوستانی اور عرب طلبہ پڑھنے کے خواستگار ہوئے۔ اگرچہ عربی زبان میں عرصہ تک کتابیں پڑھنے کی نوبت آئی تھی مگر بولنے کی مشق نہ تھی۔ اس لیے مشکل کا سامنا ہوا۔ مگر حسب ہدایت حضرت شیخ الہندؒ اوقاتِ کتابت کے علاوہ دوسرے اوقات میں شروع کر دیا۔ اس زمانہ میں بہت سے علما اعزازی طور پر حرم نبوی میں پڑھایا کرتے تھے۔ اس سے تو مجھ کو یہ فائدہ ہوا کہ ابتدائی کتابیں صرف و نحو فقہ وغیرہ کی محفوظ ہو گئیں اور زبان صاف ہو گئی۔

اہل علم میں عموماً اور علمائے حجاز میں حسد اور رقابت کا مادہ بہت ہوتا ہے۔ اس لیے جب کوئی عالم آتا ہے تو اس کی طرف

آنکھیں بہت اٹھتی ہیں اور تنقید ہوتی ہے۔ علمائے ہند چونکہ عربی بولنے کے عادی نہیں ہوتے اس لیے بسا اوقات شکست کھا جاتے ہیں۔ بہر حال ہم جیسے ٹٹ پونجیوں کے لیے ان عرب علما پر دھاک بٹھانا نہایت مشکل تھا اس لیے ہمارا گوشۂ گمنامی میں ایک ایک دو دو طالب علموں کو پڑھانا بہت مفید ہوا۔

شوال ۱۳۱۸ھ تک اسی طرح ابتدائی کتابیں پڑھاتا رہا۔ حلقۂ درس میں کوئی امتیازی شان نہیں پیدا ہوئی اس لیے کسی کی تنقیدی نظر نہیں پڑی۔ سنہ ۱۳۱۸ھ میں حضرت قطب عالم مولانا گنگوہیؒ کے ارشاد کے مطابق گنگوہ کا سفر کیا۔ اور محرم ۱۳۲۰ھ میں واپس مدینہ پہنچا۔ اس وقت سے سلسلۂ تعلیم بڑے پیمانہ پر شروع ہوا۔ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد شمسیہ باغ (قرطیہ) کے مدرسہ میں عـــہ ماہوار پر ملازم ہو گیا۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم بھی ایک نو وارد سورتی سیٹھ کے ہاں اس کے بچوں کو پڑھانے لگے۔ میں نے اس زمانہ میں مشغلۂ کتابت ترک کر دیا، اور چونکہ طلبا کا ہجوم ہوا اس لیے مدرسہ کے علاوہ اوقات میں حرم نبویؐ میں کتابیں پڑھانے لگا۔ صبح، عصر، مغرب، عشا کی نمازوں کے بعد مختلف علوم و فنون کی کتابیں شروع کرا دیں۔ طلبا کی کثرت دیکھ کر آنکھیں اٹھیں اور تنقید کے ارادے ہوئے۔ مگر عربی رواں ہو چکی تھی۔ اور ابتدائی کتابیں منجھ گئی تھیں۔ ادھر میں نے حافظہ کی تقویت کے لیے علمائے خیر آباد کا طریقہ اختیار کیا تھا کہ کتاب، شرح اور حاشیہ پڑھاتے وقت سامنے نہیں رکھتا تھا۔ بلکہ طالب علم کے عبارت پڑھنے کے بعد مسائل پر تقریر کرتا اور سمجھاتا تھا۔ گھر پر کتاب اور اس کے شروح و حواشی خوب دیکھ کر مسائل کو منضبط کر کے جاتا تھا اور علمائے مدینہ نہ صرف کتاب بلکہ اس کی شرح بھی ہاتھوں میں لے کر پڑھاتے تھے اور تقریر کرتے وقت اکثر شرح یا حاشیہ کی عبارت سنا دیتے تھے۔ خاص خاص حضرات بلا کتاب پڑھاتے تھے۔ مگر نہ ان کے پاس تمام علوم و فنون کی کتابیں ہوتی تھیں اور نہ زیادہ وقت صرف کرتے تھے۔

عام طلبا اور علما میں ہماری دھاک بیٹھ گئی۔ اور سمجھنے لگے کہ اس کو تمام فنون درسیہ میں نہ صرف مہارت ہے بلکہ محفوظ بھی ہیں۔ اس بنا پر میرے پاس سمجھدار اور ذہینوں کا اجتماع بہت زیادہ ہو گیا۔ جس سے حرم کے متعدد مدرسین کو حسد اور رقابت پیدا ہو گئی۔ ناظم مدرسہ شمسیہ باغ کا اصرار تھا کہ جو طلبہ مجھ سے پڑھتے ہیں وہ مسجد نبویؐ میں نہیں بلکہ مدرسہ میں آ کر پڑھا کریں مگر سب طلبا اس پر راضی نہ ہوئے۔ طلبا میں صرف اہل مدینہ ہی نہ تھے ترک، بخاری، قازانی، قزق، ترکستانی، مصری اور کابلی وغیرہ بھی تھے۔ ناظم مدرسہ کا یہ اصرار بھی تھا کہ مدرسہ کے خارج اوقات میں کہیں بھی نہ پڑھایا جائے اس قسم کی چند اور باتیں پیش آئیں جن کی وجہ سے مجبوراً استعفا دینا پڑا۔ اور یہ ارادہ کر لیا گیا کہ لوجہ اللہ بلا معاوضہ حرم محترم میں اسباق پڑھائے جائیں اور رزق کو کفیل حقیقی کے سپرد کر دیا جائے۔ استعفا دینا تھا۔ کتب درسیہ کا میدان وسیع کر دیا گیا۔ حضرت گنگوہیؒ کی بارگاہ میں ان اسباق کی فہرست اور مشاغل کی تفصیل لکھی اور یہ عرض کی کہ جو تعلیم شغل طریقت کی عالیجاہ نے فرمائی ہے جب اس کے لیے بیٹھتا ہوں تو غنودگی غالب ہو جاتی ہے، نیز وسوسے سخت پریشان کرتے ہیں طلبا کے اصرار پر میں نے دن رات کا اکثر حصہ اسی میں لگا رکھا ہے۔ جواب میں حضرت نے ارشاد فرمایا "پڑھاؤ خوب پڑھاؤ" اس سے ہمت اور بندھ گئی۔ روزانہ ۱۴ اسباق پڑھاتا تھا صبح کو ۳ یا ۴ ظہر بعد دو عصر بعد دو مغرب بعد ایک عشاء کے بعد۔

بشارات ورویائے صالحہ

خواب میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرام، اولیائے عظام، اکابر اور جناب باری عزاسمہٗ کو بارہا دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔

(۱) ایک مرتبہ دیکھا کہ آقائے نامدار مسجد شریف کے شمالی دروازے باب مجیدی کے باہر شمال کی طرف منہ کیے ہوئے مسجد سے نکل کھڑے ہیں اور آپ کے لپ میں میٹھے کدو کے بیج بھرے ہوئے ہیں میں سامنے سے حاضر ہوا۔ جب قریب پہنچا تو آپ نے لپ کو نیچے سے کھول دیا۔ پھر بیج نیچے کو گرے تو میں نے دامن میں لے لیے ان کا عدد تقریباً ۳۰ تھا۔

(۲) دیکھا کہ مسجد شریف میں منبر کے سامنے کٹہرہ کے نیچے لیٹا ہوں اور مجھ پر سبز شال پڑی ہے اور ایک شخص یہ کہتا ہے تیرے قدم تو حضورؐ کے قدم جیسے ہیں۔ اس کی تعبیر حضرت گنگوہیؒ نے اتباع سنت سے دی تھی۔

(۳) دیکھا کہ ایک جگہ پر حضرت رسول اللہؐ کی قبر کھلی ہوئی ہے لاش مبارک سفید کفن میں قبر کے پاس ہے کفن کھلا ہوا ہے چہرۂ مبارک نہایت تروتازہ گورا گورا اور تمام جسم مبارک بھی تروتازہ ہے اور آنحضرتؐ چت سو رہے ہیں مگر آپ کی لبیں اور ناخن بڑھے ہوئے ہیں میں نے قینچی سے لبیں اور ناخن کتر دیے۔

(۴) باب السلام سے مسجد میں داخل ہوا اور حجرۂ مطہرہ کی جانب جاتا ہوں حضرت رسول اللہؐ ایک کرسی پر رونق افروز ہیں قبلہ کی طرف آپ کا چہرۂ مبارک ہے۔ میں داہنی جانب سے حاضر ہوا جب میں بالکل قریب پہنچا تو آپ نے مجھ کو ۴ چیزیں عطا فرمائیں ان میں سے ایک علم ہے باقی تین اشیا معلوم نہیں کیا تھیں۔

(۵) ایک روز اشعار کی ایک کتاب دیکھ رہا تھا ایک مصرع تھا ع ہاں اے حبیب رُخ سے ہٹا دو نقاب کو! یہ اس وقت بہت بھلا معلوم ہوا میں مسجد شریف میں حاضر ہوا اور مواجہہ شریف میں بعد آداب و تحیات کے بعد انھی الفاظ کو پڑھتا اور شوقِ دیدار میں رونا شروع کیا دیر تک یہی حالت رہی جس پر یہ محسوس ہونے لگا کہ مجھ میں اور حضرت رسول اللہؐ میں دیواروں اور جالیوں کا کوئی حجاب نہیں آپ کرسی پر سامنے بیٹھے ہوئے ہیں آپ کا چہرۂ مبارک سامنے ہے اور بہت چمک رہا ہے۔

(۶) جب میں کراچی سے گنگوہ شریف کے قصبے سے سفر کر رہا تھا۔ گاڑی ملتان کے قریب چل رہی تھی خواب میں دیکھا کہ حضرت رسول اللہؐ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ تشریف لائے ہیں اور ہاتھ اس طرح ڈالے ہیں کہ انگلیاں بھی ایک ساتھ ملی ہوئی ہیں۔

(۷) ایک بہت بڑا درخت ہے جس کی ٹہنیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی سایہ فگن ہیں درخت کی اوپر کی سطح پر جناب باری عزاسمہٗ جلوہ فرما ہیں ہیبت و جلال بے حد محسوس کر رہا ہوں اور کچھ اوپر سے ارشاد ہو رہا ہے جس کی پوری تفصیل یاد نہیں۔

مدینہ کو واپسی

مدینہ منورہ محرم ۱۳۳۲ھ میں پہنچنا ہوا اسی زمانہ میں ترکی کا اعلان جنگ بھی ہو گیا اور فوج کشی کے

سامانوں اور جنگی تحفظات کا اثر حجاز اور بالخصوص حرمین میں شروع ہوگیا۔ میں متعلقین کے ساتھ مدینہ پہنچ کر حسب سابق مشاغل علمیہ میں مشغول ہوگیا۔ اسی اثنا میں جب ترکی فوجیں حدود مصر کی طرف بھیجی جا رہی تھیں اور مجاہدین (والنٹیئروں) کی بھرتی کی جا رہی تھی تو ترغیب جہاد کے لیے مناخہ (مدینہ) میں ایک بڑا جلسہ کیا گیا۔ اور میری اردو تقریر ہوئی۔ خیری برادران بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ ان کی تقریریں بھی ہوئیں اور ہندوستانی مجاہدوں کا ایک گروہ والنٹیئروں میں داخل ہوگیا۔ جس میں مولانا محمد جان قازانی اور مولانا حرمت اللہ قازانی بھی تھے۔ یہ دونوں اسی مدینہ اور دیوبند سے تعلیم پاکر اسی سال پہنچے تھے۔ جمال پاشا کے زیر کمان کنال سویز اور بیرسبع کے معرکوں میں داد شجاعت دی۔

سیاست سے میرا تعلق

یہاں تک ذاتی اور خانگی حالات تھے۔ اس جنگ عظیم نے سوانح زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا یعنی "سیاست سے میرا تعلق اور برطانوی سامراج کے مقابلہ میں عزم انقلاب" جس طرح میری علمی زندگی کا منبع فیض حضرت شیخ الہندؒ تھے ایسے ہی سیاسی زندگی کا سرچشمہ بھی حضرت شیخ کے افکار و خیالات اور وہ جذبات تھے جو عرصۂ دراز سے حضرت شیخ کے سینۂ پُرنور اور ضمیر روشن میں پرورش پا رہے تھے اور جن کی چنگاریاں اس جنگ عظیم نے بھڑکا دی تھیں۔

سیاسیات میں داخلہ

میں اس وقت تک نہ مشن آزادئ ہند میں شریک ہوا تھا نہ حضرت شیخ الہندؒ کی عملی سرگرمیوں سے واقفیت رکھتا تھا۔ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے ایک خصوصی مجلس میں مجھ کو اور مولانا خلیل احمد صاحب کو طلب فرما کر اپنے خیالات اور عملی کارروائیوں سے مطلع فرمایا۔ میں اس وقت تک فقط علمی جدوجہد میں مشغول تھا۔ عملی جدوجہد کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اب حضرت شیخ الہند کے خیالات اور واقعات سن کر میں بھی متاثر ہوا اور مولانا خلیل احمد صاحب بھی۔ یہ وقت میری سیاسیات کی ابتدا اور بسم اللہ کا ہے۔

مسجد نبویؐ میں جلسہ

مفتی مامون بری صدر علمائے مدینہ کے پاس انور پاشا کا حکم پہنچا کہ میں علمائے مدینہ کی تقریریں سننے کا شائق ہوں۔ اجتماع ہوا۔ حضرت شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد صاحب نے عربی تقریر کی عدم مہارت کی وجہ سے معذرت کر دی۔ پھر مجھ کو حکم کیا گیا۔ میں نے حسب مناسب وقت فلسفۂ جہاد پر مبسوط تقریر کی۔ جس میں عقلی اور نقلی دلائل سے ثابت کیا کہ نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لیے جہاد ضروری ہے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ سے زیادہ جاری رہی۔ حاضرین مجلس نے بہت پسند کیا۔

گرفتاری

محرم ۱۳۳۵ھ میں شیخ الاسلام مکہ معظمہ عبداللہ سراج کی طرف سے نقیب علمائے مکہ محضر لے کر آیا اور کہا کہ ترکوں کے خلاف اس فتویٰ پر دستخط کر دیں ـــ حضرت شیخ الہندؒ نے انکار کر دیا۔ اور چار دن کے بعد شریف حسین خود جدہ گیا اور وہاں سے حکم بھیجا کہ فوراً مولانا محمود حسن اور ان کے رفقا اور سید ہاشم اور حکیم نصرت حسین کو گرفتار کر کے بھیجو۔ اس پر بہت تشویش ہوئی اور مختلف طرفوں سے اس کی منسوخی کا مطالبہ کیا گیا مگر کچھ اثر نہ ہوا ـــ خلاصہ یہ کہ ہم سب گرفتار کر کے جدہ بھیجے گئے۔ ۲۴ صفر ۱۳۳۵ھ کو بوقت صبح زیر حراست جدہ پہنچے اور تقریباً ایک مہینہ زیر حراست

رکھے گئے۔ پھر ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ کو خدیوی جہاز سے زیر حراست سویز بھیجے گئے۔ ۲۲ کو سویز پہنچے۔ وہاں سے گوروں کی حراست میں (جو پندرہ یا سولہ تھے اور ہندوستانی قوم سنگینوں سے مسلح تھے) ہم کو قاہرہ ریل میں بھیجا گیا اور اسی دن عصر بعد ہم کو جیزہ کے سیاسی جیل میں داخل کر دیا گیا۔ اور اگلے دن سے بیانات لینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ بیان لینے والا شخص انگریز تھا اردو نہایت سلیس اور صاف بولتا تھا۔ اس کے پاس بڑی بڑی ضخیم کتابیں اور فائل تھے۔ جن میں سی آئی ڈی کے بیانات اور رپورٹیں تھیں۔ پہلے ہمارا خیال تھا کہ فقط شریف کے محضر پر دستخط نہ کرنے اور شریف کی شکایت کی وجہ سے ہوئی ہے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ گرفتاری تحریک آزادی کی ان جملہ کارروائیوں کی بنا پر ہوئی ہے جو یاغستان، کابل، فرانٹیر اور دیوبند وغیرہ میں مدتوں سے ہوتی رہی ہیں۔ اور جن کی مخبری اپنے اور پرایوں دونوں نے کی ہے۔ بہت سی باتیں ایسی پوچھی گئیں جن کے متعلق یقین تھا کہ کسی کو معلوم نہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ کے متعلق اس کے پاس بہت بڑا رجسٹر تھا۔ جیزہ کے جیل میں ایک ماہ رکھنے اور بیانات لینے کے بعد پاسپورٹ مرتب کیا گیا اور ہم ۲ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ - ۱۶ فروری ۱۹۱۷ء کو ہمیں مالٹا روانہ کر دیا گیا۔ گوروں کی پوری گارد سنگینوں سے مسلح ہماری حراست کرتی تھی۔ اسی روز شام کو مالٹا جانے والے جہاز پر سوار کیے گئے۔ اور ۲۹ ربیع الثانی کو مالٹا پہنچ گئے۔

۲ جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ کو تقریباً ۳ برس دو مہینہ مالٹا میں رہ کر ہم روانہ ہوئے روانگی کے وقت رخصت کے وقت تمام ترکی افسر (جو اس وقت تک رہا نہیں ہوئے تھے) صدر اعظم ترکی سے لے کر نیچے کے عہدہ داروں تک سب کے سب خود بخود جمع ہو گئے تھے۔ اور بہت زیادہ مہر و محبت کا ثبوت دیتے رہے۔ شیخ الاسلام خیر الدین آفندی نے خاص طور پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنی شروع کی اور تمام افسروں نے ان کی موافقت کی آمین کی آواز سے فضا گونج رہی تھی۔ پھر سب نے نہایت تپاک سے آبدیدہ ہو کر رخصت کیا۔

۲۵ جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ ۱۵ مارچ ۱۹۲۰ء انگلبرٹ اسکندریہ پہنچا۔ اور ۲۶ جمادی الثانی سیدی بشر میں جو مصری قیدیوں کی جگہ تھی داخل کر دیئے گئے۔ ۱۸ روز کے قیام کے بعد ۱۲ رجب ۱۳۳۸ھ ۲ اپریل ۱۹۲۰ء کو وہاں سے سویز کو روانہ کیے گئے۔ سویز میں بھی ہم سنگینوں کے پہرہ میں اسیروں کے کیمپ میں داخل کیے گئے۔ یہاں پونے دو مہینہ رہنا پڑا۔ ۵ رمضان ۱۳۳۸ھ ۱۲ مئی ۱۹۲۰ء اتوار کے دن۔ انگلبرٹ پر پہنچایا گیا۔ ۱۲ رمضان ۱۳۳۸ھ کو جہاز عدن پہنچا۔ چونکہ عدن میں جہاز ایک دن ٹھہرا تھا تو ہم کنارہ پر گئے اور ۳ تار ہندوستان کو ایک حضرت حکیم محمد حسن صاحب کو دیوبند میں، دوسرا ڈاکٹر انصاری کو دہلی میں، تیسرا حکیم اجمیری کو بمبئی میں ہم نے دے دیا۔ جس سے تمام احباب کو اطلاع ہو گئی۔ تار کے الفاظ حسب ذیل تھے۔ "ہم لوگ ۸ جون تک بمبئی پہنچیں گے" مختصر یہ کہ ۲۰ رمضان ۱۳۳۸ھ - ۸ جون ۱۹۲۰ء کو ۳ برس ۷ ماہ کے بعد بمبئی پہنچا کر ہم کو رہا کیا گیا۔

بمبئی میں خلافت کمیٹی کی طرف سے استقبال

بمبئی پہنچنے پر سب سے پہلے سی، آئی، ڈی کا انگریز افسر مع دو تین ہندوستانی افسروں کے آیا۔ اور حضرت شیخ الہندؒ سے کہا

کریں تنہائی میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ حضرت اس کے ساتھ کمرہ میں چلے گئے اس نے کہا مولوی رحیم بخش یہاں آئے ہوئے ہیں آپ بغیر ان کے ملے ہوئے ہرگز جہاز سے نہ اتریں۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا ہم کو جہاز ہی پر معلوم ہو گیا تھا کہ اب ہم بالکل آزاد ہیں ہم نے مولوی رحیم بخش کا بہت انتظار کیا جب وہ پہنچے تو میں اور مولانا عزیر گل صاحب اسباب لے کر کنارہ پر چلے گئے۔ بعد کو مولوی رحیم بخش آئے۔ حضرت شیخ الہندؒ سے ملاقات کی اور کہا کہ آپ کے لیے اسپیشل ڈبہ ریزرو کراؤں گا آپ بھی اتریں اور ریل پر چلے چلیں۔ حضرت نے فرمایا کہ آپ کا انتظار کر کے حسین احمد اور عزیر گل کنارہ پر چلے گئے ہیں وہ آجائیں تو چلیں۔ ہمارے پہنچے پر زور کی بارش ہوئی۔ دریا میں طوفان آ گیا جہاز دریا میں کنارہ سے لنگر انداز ہوا تھا اس لیے اس روز کوئی سواری حضرت شیخ الہندؒ کو جہاز سے لانے کے لیے نہ مل سکی۔ اگلے روز ۱۴ رمضان کو حضرتؒ اتر سکے۔ مولوی رحیم بخش گورنمنٹ کے بھیجے ہوئے آئے تھے مقصد یہ تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ تحریکِ خلافت میں شریک نہ ہوں اور بالا بالا رہیں پھر سوار ہو کر دیوبند چلے جائیں۔ سیاسیات سے بالکل کنارہ کش ہو جائیں اسی لیے وہ اگلے دن اتارنے کے لیے اسٹیمر پر پہنچے۔ مگر جب لانچ کنارہ پر پہنچی تو مولانا شوکت علی مرحوم اور ہزاروں اشخاص اور ممبرانِ خلافت کمیٹی نے زور دار شاندار استقبال کیا۔ نعرۂ تکبیر سے فضا گونج اٹھی اور حضرت کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور کار میں سوار کر کے اپنی قیام گاہ پر لے گئے۔ مولوی رحیم بخش ہجوم کی شدت کی وجہ حضرت کے پاس بھی نہیں پہنچ سکے —— مسلمانانِ بمبئی کی طرف سے خلافت کمیٹی کے زیر اہتمام کھتری مسجد میں جلسۂ عام کیا گیا" اور ایڈریس" پیش کیا گیا۔

بمبئی کے دو روزہ قیام میں حضرت مولانا عبد الباری صاحب مرحوم بھی قیام گاہ پر تشریف لائے اور تنہائی میں سیاسیات حاضرہ پر بہت دیر تک گفتگو فرماتے رہے اسی اثنا میں مہاتما گاندھی بھی تشریف لائے اور حضرتؒ سے گفتگو کی۔

سفرِ کلکتہ

مولانا آزاد کی پُرزور تقریروں کی وجہ سے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے طلبا علیحدہ ہو گئے تھے اور چاہتے تھے کہ کلکتہ میں ایک آزاد اور نیشنل مدرسہ عالیہ قائم کیا جائے خلافت کمیٹی کے ارکان اس کی سرپرستی کریں۔ اس کے لیے ایک جید عالم کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے مولانا آزاد نے مولوی عبد اللہ مصری کو بھیجا تھا اور حضرت انور شاہؒ کو طلب کیا تھا۔ مگر شیخ الہندؒ نے فرمایا شاہ صاحب تو دار العلوم چھوڑ نہیں سکتے مگر ہم دوسرا شخص دیں گے جو تمام کتب حدیث کی تعلیم دے سکتا ہو اور تجربہ کار و مشہور بھی ہو۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا مرتضیٰ حسن صاحب نے عذر کیا۔ بالآخر مجھے حکم ہوا۔ میں مجبوراً کلکتہ روانہ ہوا۔ اور وہاں اسباقِ حدیث سنبھال لیے۔ مگر چونکہ خلافت اور آزادی کی تحریک زوروں پر چل رہی تھی اطرافِ کلکتہ میں بکثرت جلسے ہو رہے تھے ان میں بار بار حاضر ہونا پڑتا تھا اس زمانہ میں اندرونِ بنگال بھی دور دراز شہروں میں بڑے بڑے جلسوں میں جانا پڑا ان میں سے مولوی بازار کے مشہور کانگریس اور خلافت کے جلسوں میں بھی جانا پڑا۔ اجلاس کانگریس کے صدر آنجہانی سی آر داس تھے اور جلسۂ خلافت و جمعیۃ علماء کی صدارت مجھ کو انجام دینی پڑی تھی۔ دوسرا جلسہ رنگ پور میں بڑے پیمانہ پر ہوا تھا۔ دونوں کے خطبات چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ اسی طرح دو مرتبہ یوپی بھی آنا پڑا۔ ایک جلسہ سیوہارہ بجنور کا تھا اجلاس جمعیۃ کی صدارت مولانا حبیب الرحمان صاحب نے فرمائی تھی اور جلسۂ خلافت کی خدمتِ صدارت مجھے انجام دینی پڑی تھی۔ اس موقع پر بھی کانگریس

کے اجلاس مشترک طور پر ہوا تھا۔ اس کے صدر دیرہ دون کے ایک پنڈت صاحب تھے۔ میرا خطبہ اس وقت بھی شائع ہوا تھا۔ اسی طرح خطبہ علوم سہارنپور کے جلسہ میں بھی کلکتہ سے حاضر ہونا پڑا تھا۔ اس کے بعد کراچی کے مشہور جلسہ میں حاضر ہونا پڑا۔ جس پر کراچی کا تاریخی مقدمہ چلا اور دو دو سال قید بامشقت کی عزت مجھے اور مولانا محمد علی مرحوم اور مولانا شوکت علی وغیرہ میرے ساتھیوں کو حاصل ہوئی اور کلکتہ کی ملازمت اسی کی وجہ سے ختم ہو گئی۔

کانگریس سے تعلق

میں اگرچہ پہلے سے کانگریس میں شامل نہ تھا مگر مالٹا سے واپسی پر کانگریس کا باقاعدہ ممبر بن گیا اور ہمیشہ جد و جہد آزادی میں شریک رہا اور قید و بند کی مصائب بھی اہل ملک کے ساتھ جھیلتا رہا۔ بفضلہ تعالیٰ اس میں کامیابی ہوئی اور انگریزوں کی غلامی سے تمام ہندوستان آزاد ہو گیا۔ والحمد للہ اولاً و آخراً۔

تلخیص: شمس تبریز خاں

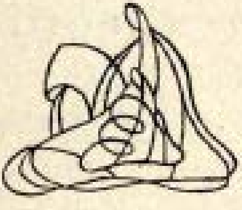

سیّد سلیمان ندوی

ولادت ۲۲ر نومبر ۱۸۸۴ء

وفات ۲۲ر نومبر ۱۹۵۳ء

انیسویں صدی ختم ہو رہی تھی، تو میرے ہوش اور تمیز کی آنکھیں کھل رہی تھیں۔ پندرہ سولہ برس کا میں ہوں گا، اس وقت قدیم و جدید کی کشمکش سے سارا ہندوستان خیالات کا دنگل بن رہا ہے۔ کانوں میں دو قسم کی تحریکوں کی آوازیں دم بدم آ رہی تھیں۔ ایک سرسید کی تحریک یعنی انگریزی تعلیم کی اشاعت اور مذہب میں عقل اور فطرت کی مطابقت کی کوشش، اور دوسرے علما کو نئے زمانے کے نئے خیالات اور فلسفہ سے آشنا کر کے پرانی عربی تعلیم کی ازسرِنو تنظیم کی تحریک، جس کو لے کر چند روشن خیال علماء اُٹھے تھے اور یہ بھی عجیب بات تھی کہ اس تحریک کا مرکز بھی علی گڑھ کی ایک عربی درس گاہ تھی، جو مولانا لطف اللہ صاحب کی ذات سے عبارت تھی۔ اس تحریک کا دوسرا مرکز دہلی تھا، جہاں مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی درس دیتے تھے۔ کانوں میں یہ دونوں آوازیں پڑ رہی تھیں مگر میرا خاندانی ماحول اسی دوسری تحریک سے متاثر تھا، اس لیے اسی دوسری تحریک سے دلچسپی ہوتی اور وہ بڑھتی گئی اور پھیلتی گئی اور وہی میری زندگی کا جزو بن گئی۔

اس تحریک کا پہلا اثر یہ تھا کہ علماء نے قدیم و جدید کی آمیزش سے نئی عربی درس گاہ کے قیام کی کوشش کی اور سب سے پہلے مولوی سید نذیر حسین محدث کے مشہور شاگرد مولانا ابراہیم صاحب آروی نے آرہ صوبہ بہار میں مدرسہ احمدیہ کی بنیاد ڈالی اور اس کے بعد ندوۃ العلماء نے لکھنؤ میں نیا مدرسہ دارالعلوم کھولا۔ میرے والد مرحوم نے مدرسہ احمدیہ میں مجھے بھیجنے کا ارادہ کیا مگر میرے خاندان کے چند عزیزوں کا تعلق ندوۃ العلماء کی تحریک سے تھا، اس لیے دارالعلوم ندوۃ لکھنؤ میں داخلہ کی تجویز میرے لیے مناسب بتائی گئی مگر ابھی اس کے داخلہ میں کچھ تاخیر تھی، تو چند ماہ بہار کے مشہور علمی و مذہبی حلقہ خانقاہ پھلواری میں مجھے رکھا گیا۔ یہاں خانقاہ میں ہر ہفتہ قوالی ہوتی تھی۔ اس کے اثر سے اس قصبہ میں شعر و سخن کا خاصا چرچا تھا اور سب سے پہلے میں نے بھی اسی فضا میں سانس لی اور یہیں سب سے پہلے مولوی عبدالحلیم شرر کا ناول منصور موہنا دیکھا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ جس وقت کتاب ختم کی، خوب پھوٹ پھوٹ کر رویا۔

ایک برس کے بعد مجھے دربھنگہ کے ایک اور نئے مدرسہ امدادیہ میں جو دارالعلوم ہی کے خاکہ پر بنا تھا اور اب تک ہے، چند ماہ رکھا گیا، یہاں سب سے پہلے میں نے طلبہ کی انجمن دیکھی اور لوگوں کی تقریریں سنیں اور دوسرے ہی ہفتہ میں وقت کے عنوان پر ایسی تقریر کی کہ ہر طرف سے شاباش ملی۔

میں نے جس ندوۃ العلماء کا اوپر ذکر کیا وہ علماء کی ایک مجلس کا نام ہے جس نے سب سے پہلے علماء کی منتشر جماعت کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا اور قوم و ملت اور علم و دین کی خدمت کے نئے راستوں اور نئے طریقوں سے ان کو مانوس کیا۔ اس کے جلسے سال بسال ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں ہوتے تھے۔ ۱۹۰۰ء پورا ہو رہا تھا جب اس مجلس کا سالانہ جلسہ بڑے دھوم دھام سے پٹنہ میں ہوا۔ یہ جلسہ کیا تھا؟ جوش و خروش کا ایک سمندر تھا

یہ پہلا موقع تھا جب عمائے اور جدید یک جا جمع تھے۔ علماء اور نئے تعلیم یافتہ اصحاب دونوں نے ایک پلیٹ فارم پر بیٹھ کر قوم وقت کی چارہ نوازی کی فکر کی تھی۔ میں بھی اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ اس جلسہ میں شریک تھا۔ میری آنکھوں نے قومی خدمت کا یہ پہلا تماشا دیکھا تھا۔ میں نے اسی جلسہ میں یہ پُر اثر منظر دیکھا کہ کوٹ پتلون میں ملبوس ایک بیرسٹر تقریر کر رہے تھے اور خود رو رہے تھے اور بڑے بڑے جبّہ و دستار والے علماء اور مشائخ کو رُلا رہے تھے۔

اسی جلسہ میں سب سے پہلے میں نے اس صنف تقریر کے اچھے مقرر یعنی شیخ (مسٹر) عبدالقادر لاہوری کو دیکھا۔ وہ اس وقت آبزرور کے ایڈیٹر تھے۔ وہ یہی اس تقریر کی تمہید میں ٹرانسوال میں بوئروں کی لڑائی کی مختلف خبریں جو اس وقت آ رہی تھیں دلچسپ انداز میں ان کا حوالہ دے کر یہ کہہ رہے تھے کہ اخبار نویسوں کی بات پر اعتبار کیوں کر کیا جائے؟ اس تمہید کے بعد انھوں نے کہا کہ میں بھی اخبار نویس ہوں اور اگر قسم سے یہ کہوں کہ تمھارے بزرگوں کی بہت بڑی دولت آج بھی الماریوں اور صندوقوں میں بند پڑی ہے جس کی تم کو خبر نہیں، تو تم کو بھی میری اس بات کا کیونکر یقین آئے گا؟ یہ کہہ کر انھوں نے ندوۃ العلماء کی نگرانی میں اگلے بزرگوں کی کتابوں کو محفوظ کرنے کی تجویز پیش کی۔ ان کی تقریر ایسی دلچسپ تھی کہ جس نے پورے جلسے کے ساتھ مجھے بھی محو حیرت بنا دیا اور دل میں ایسی ہی تقریر کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا۔ جس کی مشق بعد کو ہوئی۔ جلسے کے اختتام پر میرے شوق نے پر و بال پیدا کیے اور میں اڑ کر لکھنؤ پہنچا اور ندوۃ العلماء کی درس گاہ میں داخل ہو گیا۔ یہ وہ مقام تھا جو اس وقت سارے ہندوستان کے علماء کا مرکز اور قوم کے بڑے بڑے لوگوں کا مرجع بنا ہوا تھا۔ یہیں آنکھوں نے سب کچھ دیکھا اور کانوں نے سب کچھ سنا۔

یہاں ہندوستان کی ایک مشہور ہستی صدر مدرس تھی، یعنی مولانا فاروق چڑیا کوٹی۔ یہ اپنے زمانہ میں ادب اور معقولات کے امام تھے۔ ان کی خاص چیز ان کے پڑھانے کا طریقہ تھا۔ وہ جو کچھ پڑھاتے تھے عملی طور سے پڑھاتے تھے اور اس کی مشق کراتے تھے۔ صرف و نحو، ادب، معانی، منطق و فلسفہ ہر ایک فن میں ان کا یہی طرز تھا۔ دوسری خصوصیت ان کی یہ تھی کہ وہ کتاب کے لفظوں کے پابند نہ تھے، یعنی وہ کتاب نہیں پڑھاتے تھے بلکہ اس فن کے مسائل پڑھاتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ طالب علم فن پر قابو پا لیتا تھا۔ ان کے طرز تعلیم کی بہتری کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ مولانا شبلی جیسا کامل ان کی درس گاہ سے پیدا ہوا۔

بہرحال موصوف کے طرز تعلیم نے چند ہی دنوں میں یہ کیفیت پیدا کر دی کہ آنکھوں سے پردے ہٹ گئے اور وہ مسئلے جو پہلے استادوں کے سمجھانے سے بھی سمجھ میں نہیں آتے تھے، وہ روز روشن کی طرح نظر آنے لگے۔ یہ پہلی شخصیت تھی جس نے میرے دل و دماغ پر اپنا پرتو ڈالا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ اردو ادب کی پہلی کتاب مولانا شرر کی منصور موہنا میرے ہاتھ میں آئی۔ اس لیے میری تحریر پر سب سے پہلا اثر شرر کے طرز تحریر کا پڑا۔

۱۹۰۱ء میں شیخ عبدالقادر نے لاہور سے مخزن نکالا۔ آج کل کے بہت سے بڑے اہل قلم اس کے نوجوان مضمون نگار تھے۔ میں نے بھی اپنی زندگی کا پہلا مضمون اسی میں لکھا، بلکہ اسی کو پڑھ کر مضمون لکھنے کی تحریک دل میں پیدا ہوئی۔

۱۹۰۴ء میں خود ندوہ کی طرف سے الندوہ نکلا۔ مولانا سید عبدالحی صاحب مددگار ناظم ندوہ نے مجھے اس میں مضمون لکھنے کی طرف متوجہ کیا۔ میں نے ایک مضمون علم حدیث اور دوسرا منطق پر لکھ کر پیش کیا۔ دونوں قبول ہوئے اور الندوہ میں چھپنے کو دے دیے گئے۔ مگر عین وقت پر میری علمی زندگی کے اصل رہنما مولانا شبلی ۱۹۰۵ء میں ندوہ آ گئے۔ یہ دونوں مضمون شرر مرحوم کے طرز میں تھے۔ مولانا نے پہلے مضمون کو تو کچھ اصلاح دے کر باقی رکھا اور دوسرے کو جس میں شرریت زیادہ تھی نکال ڈالا۔ اس وقت سے مولانا کے رنگ کی تقلید شروع کی مگر اصل منزل تک پہنچنے میں کچھ دیر لگی، کیوں کہ ابھی یہ رنگ پوری طرح چڑھنے بھی نہ پایا تھا کہ ۱۹۰۶ء میں شمس العلماء آزاد دہلوی کی تصنیفات نثر کے مطالعہ کا اتفاق ہوا۔ اس کی دلکشی نے اپنی طرف کھینچا۔ ایک دو مضمون اسی رنگ میں لکھے مگر یہ طرز تحریر ایسا تھا کہ

جواب ہوتا گیا لکھنا اور تقریر دو اور جو اس سے بڑھ کر کی اور نہیں۔ ادھر ادھر سے ہٹ کر پھر استاد کی تیاری ہوتی تھی [illegible] کے علاوہ تحریر سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز کار آمد نہیں اس لیے ہر دو سے صلاحیتیں ہیں۔ ان کی ایک ایک تصنیف کی گئی۔ وقت میں وہ سارے سال ان کی صحبت اٹھائی تو عملی زندگی کا ایک نیا تقریر کا ایک حلقہ اور تحریر کا ایک رنگ مل گیا۔

میرا سیاسی ذوق بھی مولانا شبلی مرحوم کا فیض ہے۔ وہ اخبار میں سرسید کے ساتھ رہنے کے باوجود ان کے سیاسی خیالات کے سخت مخالف تھے پھر طرابلس کی لڑائی، مسجد کانپور کا ہنگامہ اور بلقان کی جنگ نے اس نشہ کو اور تیز کیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مولانا ابوالکلام نے جو خود بھی مولانا شبلی کی صحبتوں سے متاثر تھے جب ۱۹۱۲ء میں اپنا اخبار الہلال نکالا تو میں اس کے اسٹاف میں شامل ہو گیا۔ اخبار کے اڈیٹوریل میں مسائل پر کچھ لکھنے کے لیے میں نے اسی کے طرز میں لکھنا شروع کیا۔ چنانچہ الہلال میں اس زمانہ میں جو تقریریں میرے قلم سے نکلیں ان میں ابوالکلام کا طرز تحریر نمایاں تھا اور لوگ غلط فہمی سے اس کو مولانا ابوالکلام کے نام سے بے تکلف چھاپ رہے ہیں اور پڑھ رہے ہیں۔ اور میری پہلی کتاب ارض القرآن میں بہت کچھ فلسفہ پر بھی اس کی جھلک موجود ہے۔

معارف میں جو شذرات لکھے جاتے ہیں ان کا آغاز میں نے الہلال ہی میں کیا تھا۔ لیکن معارف میں آکر جو حیثیت کم ہوئی ایک اور حیثیت کا رنگ ابھر آیا۔

لیکن بہرحال چند روز ادھر ادھر پھر کر پھر اسی راستہ پر آگیا جس پر استاد مرحوم نے ڈال دیا تھا خصوصیت کے ساتھ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنے جانشین کے حق ادا کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔

میں نے شروع میں اپنے ایک جرم کا جس کو میں چھپا رہا ہوں بلکہ سب کا اقرار کیا ہے یعنی شعر گوئی کا ذوق۔ میں نے جب آنکھیں کھولیں تو ملک میں امیر و داغ کے معرکے تھے۔ میرے ایک استاد شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحب مرحوم جو ندوۃ العلماء کے زمانہ میں رام پور میں رہتے تھے اور وہاں منشی امیر احمد صاحب مینائی کی صحبت بہت اٹھائی تھی۔ وہ اکثر امیر مرحوم کے تذکرے کیا کرتے تھے اور ان کے شعر سناتے تھے۔ ایک اور اتفاق یہ ہے کہ حضرت امیر مینائی کے [illegible] میں رہتے ہیں جو اب نواب [illegible] جنگ سے مخاطب ہیں۔ ان کے بڑے صاحبزادے مولوی صدیق صاحب [illegible] سرکار نظام میرے ساتھ دارالعلوم ندوہ میں پڑھتے تھے۔ ان کے ذریعہ سے حضرت امیر کی بہت سی غزلیں میری نظر سے گزریں اور دل میں امیر مرحوم کی عقیدت نے گھر کر لیا۔ اسی کا اثر تھا کہ مرآۃ الغیب [illegible] ندوہ میں لڑکوں کے مشاعرے ہوتے تھے غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ لیکن جب داغ کا دور چلا تو مجھے امیر مرحوم کی پیروی کا دعویٰ تھا۔ لیکن ۱۹۰۸ء میں جب مولانا شبلی نے نئی اردو شاعری کی طرح ڈالی تو دل نے اس میں [illegible] چاہی۔ متعدد نظمیں اس رنگ میں لکھیں جن کا خاتمہ استاد کے ماتم پر ہوا۔ جو غزلیں استاد کے ماتم سے ۱۹۱۴ء میں [illegible] چھپ چکی ہیں [illegible] میں غزل ہی کا غلبہ رہا۔

میں نے جب یہ غزل لکھی تو اکبر الہ آبادی، ڈاکٹر اقبال، خواجہ عزیز الحسن مجذوب، مولانا حسرت موہانی وغیرہ اور استاد مرحوم کے اکثر دوستوں اور قدردانوں کے پاس اس کو تحفہ بھیجا۔ سب نے تعریفیں لکھیں اور دل بڑھایا۔ مگر ایک استاد مولانا صاحب کا یہ خیال رہا تھا، جس نے شفقت کی راہ سے مجھے لکھا کہ آپ شاعر نہیں، اور اس کے بعد ایک دوسرا خط مجھے لکھا جو میرے دل میں پیوست ہو گیا۔ انھوں نے فرمایا جب تک انسان کسی فن میں کمال نہ ہو جائے اس کو دوسروں کے سامنے عرض ہنر نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے اسی دن سے بساط سخن لپیٹ دی اور شاعری سے توبہ کر لی۔ اس کے بعد اگر کبھی دل کے تقاضے سے مجبور ہو کر کچھ کہا تو اس کو عیب کی طرح چھپایا اور اگر چھپ نہ سکا اور چھپ گیا تو نام کو [illegible] اشارہ کر دیا۔ یہ [illegible] صاحب کا

جنھوں نے مجھے یہ قیمتی نصیحت کی جس نے میرے رُخ کو نظم سے تمام تر نثر کی طرف پھیر دیا، نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی تھے۔

اسی طرح طالب علمی کے زمانہ میں ایک اور بزرگ نے عین وقت پر میری ایسی رہبری کی جس نے میرے خیالات کی دنیا پلٹ دی۔ یہ بزرگ ندوۃ العلماء کے پہلے ناظم مولانا سید محمد علی صاحب ہیں۔ مجھے اس زمانہ میں عربی ادب اور منطق کا شوق تھا۔ ایک دن انھوں نے مجھے بلا کر پوچھا کہ تم کو کس فن سے ذوق ہے؟ میں نے عربی ادب اور منطق کا نام لیا۔ فرمایا کیوں؟ میں نے کہا۔ اس لیے کہ یہ دونوں دوسرے اصل مقصود علوم کے خادم اور ذریعہ ہیں۔ ارشاد ہوا کہ آخر ان اصل علوم کی طرف توجہ کب ہوگی؟ عرض کی جب ان میں کمال پیدا ہو جائے گا۔ فرمایا، تو انھی خادم اور ذریعہ علوم میں تو ہمارے علماء کی پوری عمریں بسر ہو جاتی ہیں اور اصل مقصود کی نوبت نہیں آتی۔ اس پر انھوں نے یہ حکایت بیان کی کہ ایک صاحب کو تصنیف کا شوق پیدا ہوا تو وہ قلم بنا بنا کر رکھتے گئے یہاں تک کہ تمام کمرہ قلموں سے بھر گیا۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت یہ آپ اتنے قلم بنا بنا کر کیوں رکھ رہے ہیں؟ تو متانت سے ارشاد ہوا کہ "میرا ارادہ تصنیف کا ہے" پوچھنے والے نے کہا کہ "پھر وہ کب ہوگی؟" فرمایا "جب ان قلموں سے فرصت ملے گی"۔

یہ تمثیل اس بات کی تھی کہ عربی نصاب تعلیم کا بڑا حصہ دینی علوم کی تمہید اور ذریعہ کے طور پر پڑھایا جاتا ہے مگر ہوتا یہ ہے کہ یہ ذریعہ تعلیم اصل تعلیم کی جگہ لے لیتا ہے۔ مولانا کی یہ حکایت میرے لیے اس درجہ موثر ہوئی کہ میں نے پھر تمام عمر ذریعہ علوم اور مقصد علوم کے درمیان کبھی مغالطہ نہیں کھایا۔

دار العلوم ہی میں تھا کہ ایک اور بزرگ سے نیاز حاصل ہوا۔ یہ مولانا شبلی کے ماموں زاد بھائی مولانا حمید الدین صاحب بی اے تھے۔ یہ عربی کے عالم اور انگریزی کے گریجویٹ تھے۔ فلسفہ میں وہ ڈاکٹر آرنلڈ کے اور ادب میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے شاگرد تھے۔ یہ ان لوگوں میں تھے جو آلی علوم کی تکمیل کی بھول بھلیوں سے نکل کر اصل مقصد کی منزل تک پہنچ گئے تھے۔ سالہا سال سے وہ قرآن پاک کے حقائق و معانی پر غور کر رہے تھے۔ ان سے قرآن پاک اور فلسفہ جدید کے سبق تو کم ہی پڑھے مگر صحبت بارہا اٹھائی اور مشکلات میں مشورے بار بار کیے۔ سیرت کی تیسری جلد میں جو معجزات پر ہے انہی کے فلسفہ کی تقلید کی ہے۔

سب جانتے ہیں کہ میرا تصنیفی ذوق مولانا شبلی مرحوم کی تربیت کے دامن میں پرورش پایا ہے۔ استاد مرحوم کا طریقہ یہ تھا کہ وہ تلامذہ کو پہلے مضمون لکھنے کی ہدایت کرتے تھے۔ کبھی وہ عنوان خود بتاتے تھے اور کبھی طالب علم خود ہی مقرر کر لیتے تھے۔ پھر وہ اس مضمون کے متعلق معلومات کا سراغ کتابوں میں بتاتے تھے۔ طالب علم اپنی محنت سے ان کا کھوج لگاتے تھے اور جب کافی معلومات جمع ہو جاتیں تو ان کو لکھ کر ان کے سامنے پیش کرتے، وہ اس میں کاٹ چھانٹ کرتے۔ مضمون کے بعد پھر رسالوں کی اور اس کے بعد کتابوں کی تصنیف کی باری آتی۔ تاکید ہوتی کہ معلومات اور مواد کو ہر کونہ اور گوشہ سے اس محنت سے ڈھونڈا جائے کہ پھر کوئی گوشہ خالی نہ رہ جائے۔ اس عنوان پر اگر پہلے کسی نے لکھا ہو تو اس سے تمہارا مضمون الگ رہے یا اس سے بڑھ جائے۔ مستند حوالہ کے بغیر کوئی واقعہ نقل نہ کیا جائے۔ حوالہ میں سب سے قدیم اور سب سے مستند ماخذ کا خیال رکھا جائے۔ صحت کے ساتھ عبارت کی چستی، طرز ادا کی شگفتگی اور تشبیہ و استعارہ کی ندرت ہاتھ سے نہ جائے۔ پامال معلومات، مبتذل محاورات اور عامیانہ الفاظ سے پوری طرح پرہیز کیا جائے۔ یہ ان کا طریقہ تھا اور اسی طریقہ کی پابندی ہمارے دار المصنفین میں جس میں علماء اور گریجویٹ اصحاب کو تصنیف و تالیف کی تعلیم دی جاتی ہے، اب تک کی جاتی ہے۔

حالی

ولادت

میری ولادت تقریباً ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت جو شاہجہاں آباد (دہلی) سے جانب شمال ۵۳ میل کے فاصلے پر ایک قدیم بستی ہے واقع ہوئی۔

سلسلۂ نسب

اس قصبہ میں کچھ کم سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ جس سے راقم کو تعلق ہے آباد چلی آتی ہے۔ ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی میں جب کہ غیاث الدین بلبن تخت دہلی پر متمکن تھا شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ "پیر ہرات" کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی نام جو علوم متعارفہ میں اپنے عام معاصرین سے ممتاز تھے، ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ جن کا سلسلۂ نسب ۲۹ واسطے سے حضرت ابوایوب انصاری تک اور ۱۰ واسطے سے شیخ الاسلام تک اور ۱۰ واسطے سے ملک محمود شاہ ابجو ملقب بہ آق خواجہ تک جو غزنوی دور میں فارس و کرمان اور عراق عجم کا فرمانروا تھا، پہنچتا ہے۔

آبا و اجداد کا ہندوستان آنا

چونکہ غیاث الدین اس بات میں نہایت مشہور تھا کہ وہ قدیم اشراف خاندانوں کی بہت عزت کرتا ہے۔ اور اس کا بیٹا سلطان محمد علماء و شعراء اور دیگر اہل کمال کا حد سے زیادہ قدرداں تھا۔ اس لئے اکثر اہل علم اور خاندانی لوگ ایران و ترکستان سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے۔ اسی شہرت نے خواجہ ملک علی کو سفر ہندوستان پر آمادہ کیا تھا۔ چنانچہ سلطان غیاث الدین نے چند[1] عمدہ اور سیر حاصل دیہات پرگنہ پانی پت میں اور معتدبہ[2] اراضی سواد قصبہ پانی پت میں بطور مدد معاش کے۔ اور بہت[3] سی زمین اندرون آبادی قصبہ پانی پت واسطے سکونت کے ان کو عنایت کی۔ اور منصب[1] قضاء و صدارت[2] و تخفیف[3] نرخ بازار اور تولیت[4] مزارات ائمہ جو سواد پانی پت میں واقع ہیں اور خطابت[5] عیدین ان کے متعلق کر دی۔ پانی پت میں جو اب تک ایک محلہ انصاریوں کا مشہور ہے وہ انہی بزرگ کی اولاد سے منسوب ہے۔

میں باپ کی طرف سے اسی شاخ انصار سے علاقہ رکھتا ہوں۔ اور میری والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی جو یہاں سادات شہدا پور کے نام سے مشہور ہیں، بیٹی تھیں۔

خاندان کا ذریعہ معاش

اگرچہ خواجہ ملک علی کی اولاد میں سے بہت سے لوگوں نے اوّل سلطنتِ مغلیہ کے عہد میں اور پھر شاہان اودھ کی سرکار میں نہایت درجہ کا امتیاز حاصل کیا تھا۔ مگر زیادہ تر یہ لوگ اسی ملک و مدد معاش پر قانع رہے جو سلاطین اسلام کی طرف سے وقتاً فوقتاً ان کو عطا ہوتی رہی۔

میرے آباؤ اجداد نے جہاں تک معلوم ہے ظاہرا کوئی خدمت دلی یا لکھنؤ میں اختیار نہیں کی۔ سب سے پہلے میرے باپ نے سرکار انگریزی کی نوکری سررشتہ پرمٹ میں اختیار کی تھی۔

والد کا انتقال اور بھائی کی سرپرستی

میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہو گیا تھا اور میرے والد نے سن کہولت میں انتقال کیا جبکہ میں نو برس کا تھا۔ اس لئے میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہ پایا۔

تعلیم

انھوں نے اول مجھ کو قرآن حفظ کرایا۔ اس کے بعد اگرچہ تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں حد سے زیادہ تھا۔ مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہیں ملا۔ ایک بزرگ سید جعفر علی مرحوم جو میر ممنون دہلوی کے بھتیجے اور نیز داماد بھی تھے اور بوجہ تعلق زناشوئی کے پانی پت میں مقیم تھے۔ اور فارسی لٹریچر، تاریخ اور طب میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اُن سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اور ان کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے ایک گونہ مناسبت پیدا ہو گئی۔ پھر عربی کا شوق ہوا۔ انھی دنوں میں مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم، لکھنؤ سے امامت کی سند لے کر آئے تھے، اُن سے صرف و نحو پڑھی۔

شادی

چند روز بعد بھائی اور بہن نے جن کو میں بمنزلہ والدین کے سمجھتا تھا تأہل پر مجبور کیا۔ اُس وقت میری عمر ۱۷ برس کی تھی اور زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گذارہ تھا۔ کہ یہ جوا میرے کندھے پر رکھا گیا۔

تعلیم کا شوق دہلی لے گیا

اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہو گئے۔ سب کی یہ خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں۔ مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکا آسودہ حال۔ میں گھر والوں سے روپوش ہو کر دلی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر کچھ صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے جو وہاں ایک مشہور واعظ اور مدرس تھے پڑھیں۔

انگریزی نہ پڑھنے کی وجوہات

اگرچہ اُس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا۔ مگر جس سوسائٹی میں میں نے نشو و نما پائی تھی وہاں علم۔ صرف عربی اور فارسی زبان میں منحصر سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی تعلیم کا خاص کر پانی پت میں اول تو کہیں ذکر سننے میں نہیں آتا تھا اور اگر اس کی نسبت لوگوں کا کچھ خیال تھا بھی تو صرف اس قدر کہ وہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے۔ نہ یہ کہ اُس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ برخلاف اس کے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علماء "مجہلے" (یعنی جہالت کی جگہ) کہتے تھے۔ دلی پہنچ کر جس مدرسہ میں مجھ کو رہنا پڑا وہاں سب مدرس اور طلبہ کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے۔ غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گزرتا تھا۔ ڈیڑھ برس تک دلی میں رہنا ہوا۔ اس عرصہ میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں اور نہ اُن لوگوں سے (اُس زمانے میں) کبھی ملنے کا اتفاق ہوا جو اس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے۔ جیسے مولوی ذکاءاللہ، مولوی نذیر احمد۔ مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ وغیرہ۔

دلی سے جبری واپسی

میں نے دلی میں شرح سلم۔ ملا حسن اور میبذی پڑھنی شروع کی تھی کہ سب عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چار و ناچار مجھ کو دلی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ یہ ذکر ۱۸۵۵ء کا ہے۔ دلی سے

اگر برس ڈیڑھ برس تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہاں بطور خود اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔

ملازمت

۱۸۵۶ء میں مجھے ضلع حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی آسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی۔

۱۸۵۷ء کا غدر اور ملازمت کا چھوٹ جانا

۱۸۵۷ء میں جب کہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا اور حصار میں بھی اکثر سخت واقعات ظہور میں آئے اور سرکاری عملداری اُٹھ گئی تو میں وہاں سے پانی پت چلا آیا اور قریب چار برس کے پانی پت میں بے کاری کی حالت میں گزرے۔

دوبارہ تعلیم کا آغاز

اس عرصہ میں پانی پت کے مشہور فضلا مولوی عبدالرحمٰن۔ مولوی محب اللہ اور مولوی قلندر علی مرحوم سے بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ، کبھی حدیث، کبھی تفسیر پڑھتا رہا اور جب ان صاحبوں میں سے کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا اور خاص کر علم ادب کی کتابیں شروح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھتا تھا اور کبھی کبھی عربی نظم و نثر بھی بغیر کسی کی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا۔ مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا میری عربی اور فارسی تحصیل کا منتہا صرف اسی قدر ہے جس قدر اوپر ذکر کیا گیا۔

مرزا غالب کی خدمت میں باریابی

جس زمانہ میں میرا دلی جانا ہوا تھا، مرزا اسداللہ خاں غالب مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور اکثر اُن کے اُردو اور فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے اُن کے معنی اُن سے پوچھا کرتا تھا۔ اور چند فارسی قصیدے اپنے دیوان میں سے انھوں نے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر سے منع کیا کرتے تھے۔ مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اُردو یا فارسی کی ان کو لکھ کر دکھائی تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ "اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا۔ لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔" مگر اس زمانے میں ایک دو غزلوں سے زیادہ دلی میں شعر کہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے تعلق

غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بے کاری کی حالت میں گزر گئے تو فکر معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا۔ حسن اتفاق سے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے جو فارسی میں حسرتی اور اُردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے، شناسائی ہو گئی اور سات آٹھ برس تک بطور مصاحبت کے ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔

نواب صاحب جس درجہ کے فارسی اور اردو زبان کے شاعر تھے اُس کی بہ نسبت اُن کا مذاق شاعری بمراتب بلند تر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا۔ انھوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اُردو کلام مومن خاں کو دکھایا تھا۔ مگر اُن کے مرنے کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے اُن کا پرانا شعر و سخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ ہو گیا اور ان کی صحبت میں میرا جبلی میلان جو اب تک محذورات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا، چمک اُٹھا۔ اُسی زمانے میں اُردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب صاحب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انھیں کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے

پاس بھیجتا تھا۔ مگر درحقیقت مرزا کے مشورے اور اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا، اسی کو انتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔

نواب شیفتہ کے مذاق کا اندازہ اس ایک واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ایک روز انیس کا ذکر ہو رہا تھا۔ انھوں نے انیس کے مرثیے کا یہ پہلا مصرع پڑھا ع

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے

اور کہا کہ انیس نے ناحق مرثیہ لکھا۔ یہی ایک مصرع بجائے خود ایک مرثیہ کے برابر تھا۔

اُن کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا۔

گورنمنٹ بکڈپو کی ملازمت

نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بکڈپو میں ایک آسامی مجھ کو مل گئی۔ جس میں مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اُردو میں ہوتے تھے اُن کی عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی تھی۔ تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہو گئی۔

لاہور میں ایک نئے قسم کے مشاعرہ کا انعقاد

لاہور ہی میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایما سے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے پرانے ارادے کو پورا کیا۔ یعنی ۱۸۷۴ء میں ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں۔

میں نے بھی اسی زمانہ میں چار مثنویاں ایک برسات پر، دوسری امید پر، تیسری انصاف پر اور چوتھی حب وطن پر لکھیں۔

اینگلو عربک سکول دہلی کی مدرسی

اس کے بعد لاہور سے دہلی میں اینگلو عربک سکول کی مدرسی پر بدل آیا۔

مسدس اور بعض دیگر نظموں کی تصنیف

یہاں آ کر اول میں نے ایک آدھ نظم بطور خود اسی طرز کی جس کی تحریک لاہور میں ہوئی تھی لکھی۔ پھر سرسید احمد خاں مرحوم نے ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی و تنزل کی حالت اگر نظم میں بیان کی جائے تو مفید ہو گی۔ چنانچہ اوّل مسدس مدوجزر اسلام اور اس کے بعد اور نظمیں جو چھپ کر بار بار شائع ہو چکی ہیں لکھیں۔

تریاق مسموم کا لکھنا

نظم کے سوا میں نے نثر اُردو میں بھی چند کتابیں لکھی ہیں۔ سب سے پہلے غالباً ۱۸۶۷ء میں ایک کتاب "تریاق مسموم" ایک نیٹو کرسچن کی کتاب کے جواب میں جو میرا ہم وطن تھا اور مسلمان سے عیسائی ہو گیا

تھا لکھی تھی۔ جس کو اُسی زمانہ میں لوگوں نے مذہبی میگزینوں میں شائع کر دیا تھا۔

علم طبقات الارض پر ایک کتاب کا ترجمہ

اس کے بعد لاہور میں ایک عربی کتاب کا جو جیولوجی میں تھی اور فرنچ سے عربی میں کسی مصری فاضل نے ترجمہ کی تھی، اُردو میں ترجمہ کیا۔ اور اس کا کاپی رائٹ بغیر کسی معاوضہ کے پنجاب یونیورسٹی کو دے دیا۔ چنانچہ ڈاکٹر لائٹنر کے زمانہ میں اس کو یونیورسٹی نے چھاپ کر شائع کر دیا تھا مگر اوّل تو وہ اصل کتاب پچاس ساٹھ برس کی لکھی ہوئی تھی۔ جب جیولوجی (علم طبقات الارض) کا علم ابتدائی حالت میں تھا دوسرے مجھ کو اس فن سے محض اجنبیت تھی۔ اس لیے اصل اور ترجمہ دونوں غلطیوں سے خالی نہ تھے۔

مجالس النساء کی تصنیف

لاہور ہی میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لیے قصہ کہانیوں کے پیرایہ میں موسوم بہ "مجالس النساء" لکھی تھی۔ جس پر کرنل ہالرائڈ نے ایک ایجوکیشنل دربار میں بمقام دہلی مجھے لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے چار سو روپے کا انعام دلوایا تھا۔ اور جو اودھ اور پنجاب کے مدارس میں مدت تک جاری رہی اور شاید اب بھی کہیں کہیں جاری ہو۔

حیاتِ سعدی کا لکھنا

پھر دلی میں سعدی شیرازی کی لائف اور ان کی نظم و نثر پر ریویو لکھ کر شائع کیا۔ جس کا نام "حیاتِ سعدی" ہے اور جس کے دس بارہ ایڈیشن اب سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔

مقدمہ شعر و شاعری اور دیوان کا شائع کرنا

پھر شاعری پر ایک مبسوط اپنے (مضمون) لکھ کر بطور مقدمہ کے اپنے دیوان کے ساتھ شائع کیا۔

"یادگارِ غالب" کی تصنیف

اس کے بعد مرزا غالب مرحوم کی لائف جس میں ان کی فارسی اور اُردو نظم و نثر کا انتخاب بھی شامل ہے اور نیز ان کی شاعری پر ریویو بھی کیا گیا ہے۔ "یادگارِ غالب" کے نام سے لکھ کر شائع کی۔

"حیاتِ جاوید"

اب سر سید احمد خاں مرحوم کی لائف موسوم بہ "حیاتِ جاوید" جو تقریباً ہزار صفحے کی کتاب ہے لکھی۔ جو امید ہے کہ مارچ یا اپریل میں شائع ہو جائے گی۔

فارسی صرف و نحو کے متعلق چند کتابیں

ان کے سوا اور بھی بعض کتابیں فارسی گرامر وغیرہ میں لکھی ہیں جو چنداں ذکر کے قابل نہیں ہیں۔

مختلف مضامین

اس کے علاوہ تیس بتیس مضمون بھی مختلف عنوانوں پر مختلف اوقات میں لکھے جو "تہذیب الاخلاق"، "علیگڑھ گزٹ" اور دیگر اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے ہیں۔

فارسی نظم و نثر

نیز اُردو کے علاوہ فارسی میں کسی قدر زیادہ اور عربی میں کم میری نظم و نثر موجود ہے۔ جو ہنوز شائع نہیں ہوئی۔ جب سے ان دونوں زبانوں کا رواج ہندوستان میں کم ہونے لگا ہے، اس وقت سے ان کی طرف توجہ نہیں رہی۔

سب سے اخیر فارسی و اُردو نظم

میری سب سے اخیر فارسی نظم وہ ترکیب بند ہے جو سرسید کی وفات پر میں نے ۱۸۹۸ء میں لکھا تھا۔ اور اُردو میں سب سے اخیر وہ نظم ہے جو حال میں ایمپرس وکٹوریہ کی وفات پر لکھی ہے اور علیگڑھ گزٹ میں شائع ہو چکی ہے۔

حیدرآباد سے وظیفہ کا تقرر اور ملازمت سے علیحدگی

۱۳۰۵ھ میں جبکہ میں اینگلو عربک سکول دہلی میں مدرس تھا۔ نواب سرآسمان جاہ بہادر مرحوم مدارالمہام سرکار عالی نظام اثنائے سفر شملہ میں علی گڑھ محمڈن کالج کے ملاحظہ کے لئے سرسید احمد خاں مرحوم کی کوٹھی واقع علیگڑھ میں فروکش ہوئے تھے اور میں بھی اس وقت علی گڑھ گیا ہوا تھا۔ نواب صاحب ممدوح نے بصیغہ امداد مصنفین ایک وظیفہ تعدادی ۷۵ روپے ماہوار کا میرے لئے مقرر فرمایا اور ۱۳۰۹ھ میں جب کہ میں سرسید مرحوم کے ہمراہ بشمول دیگر ممبران ڈیپوٹیشن ٹرسٹیان محمڈن کالج علی گڑھ حیدرآباد گیا تھا۔ اُس وظیفہ میں پچیس روپے ماہوار کا اضافہ کر کے سو روپے سکۂ حالی کا وظیفہ میرے لئے مقرر کر دیا۔ جو اب تک ماہ بماہ مجھ کو سرکار عالی سے ملتا ہے۔ اور اسی وقت سے میں نے اینگلو عربک سکول دہلی کا تعلق قطع کر دیا ہے۔

الطاف حسین حالی از پانی پت

عمر کے آخری ایام اور وفات

مولانا نے اپنے یہ سوانح ۱۹۰۱ء تک لکھے تھے۔ بعد کے حالات زندگی بہت مختصر ہیں۔ جون ۱۹۰۴ء میں آپ کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۹۰۵ء میں آپ نے اپنے اہل وطن کے چندہ سے پانی پت میں ایک لائبریری قائم کی۔ اسی سال کے آخر میں نظام حیدرآباد میر محبوب علی مرحوم کے جشن چہل سالہ کی روئیداد مرتب کرنے کے لیے سرکاری طور پر آپ کو حیدرآباد بلایا گیا۔ جون ۱۹۰۶ء میں وہاں سے واپسی کے بعد آپ کی ایک آنکھ میں پانی اُتر آیا جس کا آپریشن ۱۹۰۷ء میں پٹیالہ میں ہوا۔ اسی سال آپ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے اور کراچی میں آپ نے اپنا خطبہ صدارت پڑھا۔ ۱۹۱۱ء میں آپ کی دوسری آنکھ کا اپریشن ہوا۔ آخر عمر میں آپ نے نہایت محنت اٹھا کر اپنا عربی و فارسی نظم و نثر کلام مرتب کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ ان کی زندگی ہی میں اگست ۱۹۱۴ء میں شائع ہو گیا تھا۔

مولانا کا انتقال مختصر علالت کے بعد ۳۱۔ دسمبر ۱۹۱۴ء کو رات کے وقت ہوا۔ اور آسمان ادب کا یہ سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلیہِ رَاجِعُون

محمد اسماعیل پانی پتی

میر امن دہلوی

ولادت: ۱۱۴۶ھ　　　　وفات: ۱۲۱۵ھ

پہلے اپنا احوال یہ عاصی گنہگار میر امن دلی والا بیان کرتا ہے کہ میرے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ کے رکاب میں پشت بہ پشت جانفشانی بجالاتے رہے۔ اور وہ بھی پرورش کی نظر سے قدردانی سے سرفراز کرکر مالامال اور نہال کر دیا اور خانہ زاد موروثی اور منصب دار قدیمی زبان مبارک سے فرمادیا۔ چنانچہ یہ لقب شاہی دفتر میں داخل ہوا۔ جب ایسے گھر کی (کہ سارے گھر اس گھر کے سبب آباد تھے) یہ نوبت پہنچی کہ ظاہر ہے، عیاں راچہ بیاں، تب سورج مل[1] جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا۔ اور احمد شاہ درانی نے گھر بار تاراج کیا۔ ایسی ایسی تباہی کھا کر ویسے شہر سے (کہ وطن اور جنم بھوم میرا ہے اور آنول نال وہیں گڑا ہے) جلاوطن[2] ہوا۔ اور ایسا جہاز (کہ جس کا ناخدا بادشاہ تھا) غارت ہوا۔ میں بے کسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ ڈوبتے کو تنکے کا آسرا بہت ہے۔ کتنے برس بلدۂ عظیم آباد[3] میں دم لیا۔ کچھ بنی کچھ بگڑی۔ آخر وہاں سے بھی پاؤں اکھڑے۔ روزگار نے موافقت نہ کی۔ عیال و اطفال کو چھوڑ کر تن تنہا کشتی پر سوار ہو اشرف البلاد کلکتے میں آب و دانے کے زور سے آپہنچا۔ چندے بے کاری گزری۔ اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بلوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خان کی اتالیقی کے واسطے مقرر کیا۔ قریب دو سال کے وہاں رہنا ہوا۔ لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا۔ تب منشی[4] میر بہادر علی جی کے واسطے سے حضور تک جان گلکرسٹ صاحب بہادر (دام اقبالہٗ) کے رسائی ہوئی۔ بارے طالع کی مدد سے ایسے جوانمرد کا دامن ہاتھ لگا ہے۔ چاہیے کہ کچھ دن بھلے آویں۔ نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں۔ اور گھر میں دس آدمی چھوٹے بڑے پرورش پا کر دعا اس قدردان کو کرتے ہیں۔ خدا قبول کرے۔

حقیقت اردو کی زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے کہ دلی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے۔ انھیں کے راجا پرجا قدیم سے وہاں رہتے تھے اور اپنی بھاکا بولتے تھے۔ ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا۔ سلطان محمود غزنوی آیا۔ پھر غوری اور لودھی بادشاہ ہوئے۔ اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی۔ آخر امیر تیمور نے (جن کے گھرانے میں اب تک نام نہاد سلطنت کا چلا جاتا ہے) ہندوستان کو لیا۔ ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا۔ اس واسطے شہر

---

[1] سورج مل جاٹ کے جاگیر ضبط کرنے کا واقعہ ۱۷۶۱ء سے پہلے کا ہے۔

[2] میر امن غالباً ۱۷۶۱ء ہی میں جلاوطن ہوئے۔

[3] عظیم آباد میں ۱۷۶۱ء سے ۱۷۹۹ء تک غالباً قیام رہا۔

[4] منشی بہادر علی کا تقرر فورٹ ولیم میں بحیثیت صدر شعبۂ ہندی ۱۸۰۱ء میں ہوا۔

کا بازار اردو کہلایا۔ پھر ہمایوں پادشاہ پٹھانوں کے ہاتھ سے حیران ہو کر ولایت گئے۔ آخر وہاں سے آن کر پسماندوں کو گوشمالی دی۔ کوئی مفسد باقی نہ رہا کہ فتنہ و فساد برپا کرے۔

جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم۔ قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئے۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف سوال جواب کرتے لیکن ایک اُردو زبان کی مقرر ہوئی۔ جب حضرت شاہجہان صاحبِ قرآن نے قلعہ مبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کرایا اور تختِ طاؤس میں جواہر جڑوایا۔ اور دَل بادل سا خیمہ چوبوں پر ایستادہ کر طنابوں سے کھچوایا۔ اور نواب علی مردان خان نہر کو لے کر آیا۔ تب پادشاہ نے خوش ہو کر جشن فرمایا۔ اور شہر کو اپنا دارالخلافت بنایا۔ تب سے شاہجہان آباد مشہور ہوا (اگرچہ دلی جدی ہے۔ وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے) اور وہاں کے بازار کو اردوئے معلےٰ کا خطاب دیا۔

امیر تیمور کے عہد سے محمد شاہ کی بادشاہت بلکہ احمد شاہ اور عالمگیر ثانی کے وقت تک پیڑھی بہ پیڑھی سلطنت یکساں چلی آئی۔ ندان زبان اُردو کی منجھتے منجھتے ایسی منجھی، کہ کسو شہر کی بولی اس سے ٹکر نہیں کھاتی۔ لیکن قدردان منصف چاہیے جو تجویز کرے۔ جو اب خدا نے بعد مدت کے جان گلکرسٹ[1] صاحب سا دانا نکتہ رس پیدا کیا کہ جنھوں نے اپنے گیان اور لگت سے اور تلاش و محنت سے قاعدوں کی کتابیں تصنیف کیں۔ اس سبب سے ہندوستان کی زبان کا ملکوں میں رواج ہوا۔ اور نئے سر سے رونق زیادہ ہوئی۔ نہیں تو اپنی دستار و گفتار و رفتار کو کوئی بُرا نہیں جانتا۔ اگر ایک گنوار سے پوچھیے تو شہر والے کو نام رکھتا ہے۔ اور اپنے تئیں سب سے بہتر سمجھتا ہے۔ خیر عاقلاں خود می دانند۔

جب احمد شاہ ابدالی کابل سے آیا اور شہر کو لٹوایا۔ شاہ عالم پورب کی طرف تھے۔ کوئی وارث اور مالک ملک کا نہ رہا۔ شہر بے سر ہو گیا۔ سچ ہے۔ بادشاہت کے اقبال سے شہر کی رونق تھی۔ ایک بارگی تباہی پڑی۔ رئیس وہاں کے میں کہیں تم کہیں ہو کر جہاں جس کے سینگ سمائے وہاں نکل گئے۔ جس ملک میں پہنچے، وہاں کے آدمیوں کی ساتھ سنگت سے بات چیت میں فرق آیا اور بہت ایسے ہیں کہ دس پانچ برس کسو سبب سے دلی میں گئے۔ اور رہے، وہ بھی کہاں تک بول سکیں گے۔ کہیں نہ کہیں چوک ہی جائیں گے اور جو شخص سب آفتیں سہہ کر دلی کا روڑا ہو کر رہا۔ اور دس پانچ پشتیں اسی شہر میں گزریں اور اس نے دربار امراؤں کے اور میلے ٹھیلے عرس چھڑیاں، سیر تماشا اور کوچہ گردی اس شہر کی مدت تک کی ہوگی۔ اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہو گا۔ اس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے۔ یہ عاجز بھی ہر ایک شہر کی سیر کرتا اور تماشا دیکھتا یہاں تک پہنچا ہے۔

---

[1] ڈاکٹر گلکرائسٹ اُردو زبان کے بہت بڑے محسن تھے۔ ۱۷۸۲ء سے اُردو کی خدمت شروع کی۔ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ۱۸۴۱ء میں بمقام پیرس ۸۲ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

میر امن کا نام میر امان بھی لکھا ہوا ہے (خمخانۂ جاوید جلد اول ص[illegible] ، داستان تاریخ اُردو ص[illegible]) لالہ سری رام اور پروفیسر حامد حسن قادری دونوں نے یہ نہیں بتایا کہ ان کو میر امن کا نام "میر امان" کہاں سے دستیاب ہوا۔ میر امن لطف تخلص بھی فرماتے تھے۔

مرزا مظہر جانِ جاناں

خاندان اس فقیر کے سرمایۂ وجود کا آغاز ایک قطرۂ آب اور انجام ایک مشتِ خاک ہے۔ اس عالمِ اعتبار میں خاکساری کی نسبت کا سلسلہ چھبیس واسطوں سے حضرت محمد بن حنفیہ کے توسط سے شیرِ بیشۂ کبریا حضرت علی مرتضیٰ علیہ التحیۃ والثنا تک پہنچتا ہے۔ فقیر کے اجداد میں سے ایک بزرگ امیر کمال الدین آٹھویں صدی ہجری میں کسی تقریب سے طائف سے ترکستان آئے تھے۔ انھوں نے اس علاقے کے ایک حاکم کی لڑکی سے جو قبیلہ اوس قاقشال کا سردار تھا، شادی کی۔ ان کی بہت زیادہ اولاد تھی چونکہ اس کا کوئی وارث نہیں تھا اس لیے اس علاقے کی حکومت کا تعلق ان کی اولاد سے ہوگیا۔ جب ہمایوں بادشاہ نے مملکتِ ہندوستان کو سرکش پٹھانوں سے نجات دلائی، تو اس خاندان کے دو بھائی محبوب خاں اور بابا خاں کو ساتھ لایا جن کا سلسلہ تین پشت اوپر امیر کمال الدین سے ملتا تھا۔ ان دونوں کا حال عہدِ اکبری کی تاریخوں میں لکھا ہوا ہے۔ ان دونوں کا نسب مادری امیر صاحبقراں کے خاندان تک پہنچتا ہے۔ اس کے سبب سے سلاطین گورگانیہ کی خدمت اور رفاقت اس خاندان کا شعار رہی ہے۔ اور فقیر کا سلسلہ چار واسطوں سے بابا خاں پر منتہی ہوتا ہے۔ خان مذکور نے عہدِ اکبری میں بغاوت کی تھی۔ اس جرم کی پاداش میں میرے دادا بھی کم سنی کی عمر ہی میں گرفتار تھے۔ انھوں نے عمر کا بڑا حصہ اورنگ زیب کی خدمت میں گذارا۔ آخر ترکِ دنیا کی دولت سے مشرف اور ممتاز ہوئے اور قادریہ سلسلہ کے ایک بزرگ کی خدمت سے استفادہ کیا۔ انھوں نے ۱۱۳۰ھ میں اس دنیا سے رحلت کی۔

ولادت فقیر کی ولادت ۱۱۱۱ھ میں ہوئی۔ سولہ سال کی عمر میں یتیم ہوگیا تھا۔ ظاہری نشو و نما اکبرآباد میں ہوئی اور باطنی تربیت شاہ جہان آباد میں۔ بیس سال کی عمر میں کمرِ ہمت باندھ کر دنیا سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اور فقر کی راہ میں ریاضت شروع کی۔ علوم متعارف والد کے زمانے میں پڑھے اور کتبِ حدیث حاجی محمد افضل سیالکوٹی کی خدمت میں پڑھیں۔ جو شیخ المحدثین شیخ عبداللہ بن سالم مکی کے شاگرد تھے اور قرآن مجید شیخ القراء شیخ عبدالخالق شوقی کے شاگرد حافظ عبدالرسول دہلوی سے سند کیا۔ طریقۂ نقشبندیہ کا خرقہ اور اجازتِ مطلق جناب سید السادات نور محمد بدایونی رضی اللہ عنہ سے حاصل کیے جن کا سلسلہ دو واسطوں سے حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے۔ ایک عمر ان کی خدمت میں گذری۔ ان کی وفات کے بعد اس طریقہ کے متعدد مشائخ سے استفادہ کیا اور آخر کار مدت تک حضرت شیخ الشیوخ محمد عابد سنامی رضی اللہ عنہ کے آستانۂ فیض آشیانہ پر جبہ سائی کی۔ ان کا سلسلہ بھی دو واسطوں سے حضرت مجدد سے ملتا ہے۔ ایک مدت تک ان کی خدمت کرکے قادریہ، سہروردیہ اور چشتیہ طریقوں کا خرقہ اور اجازت حاصل کی۔

باطنی تربیت تیس سال تک مدرسہ و خانقاہ میں جذب و کشش کی باقی زندگی بھی اسی شغل شریف میں گذار دی۔ اشغال دینی بھی ہمت اور توفیق سے زندگی بھر دولتِ طلب کو دنیا کی گندگی سے آلودہ نہیں کیا اور اپنے مسکن کو اس راہ میں نذر رکھا۔ بیس سال سے کنجِ عزلت میں پناہ گزیں ہوں اور حضرتِ مشائخ کے احکام کے مطابق انسانوں کے تسویۂ وجود کی تعلیم میں مشغول ہوں جن کی ذات کی اصل فروع میں ہزاروں غلطیاں ہیں۔

شاعری عہدِ جوانی میں شورِ عشق کی تحریک پر جو جوانی کے عالم کا تقاضا ہے کچھ ریختے موزوں کیے تھے۔ جن سے میرا نام شاعری میں آگیا۔ والا ہمتی کی

دوسرے اجزائے مسودات و مسودۂ کلیات اکٹھا کر دیا۔ بہت سا سرمایۂ سخن برباد ہو گیا۔ باقی میں ارباب نقل و روایت نے نمایاں تصرف کر کے غلط کلام کو رواج دے دیا اور سوادوں نے جو کی آنکھیں جیسی تھیں، انصاف سے درگزر کیا۔ شاعری پر اعتراضات کیے اور معنی سخن تک نہ پہنچ پائے۔ ان اعتراضات کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوئی۔ اس کم فرصتی کے زمانے میں جب کہ رات کا وقت بہت زیادہ اور سفر در پیش ہے۔ ان اعتراضات کا جواب میرے اختیارات میں نہیں تھا۔ ایک نوجوان مرزا جان نے اس کلام کو ترتیب دینے اور تصحیح کرنے کے لیے کہا۔ بہت تلاش و جستجو کے بعد بیس ہزار اشعار میں سے تقریباً ایک ہزار ملے اور وہ بھی بے ترتیب ردیف۔ اور اکثر غزلیں نا تمام تھیں۔ اگر ان اجزا کے سوا جو کچھ نقوش سے خارج سمجھا جائے۔ ہاں وہ تازہ کلام جس کے لکھنے کا بہت کم اتفاق ہوتا ہے۔ جو کلام قدیم مسودات سے ملے اسے اسی میں شامل کر لیا جائے۔ بیس سال پہلے ایک عزیز فقیر کے کچھ اشعار فراہم کر کے میری خدمت میں لایا تھا اور اس پر کچھ لکھنے کی درخواست کی تھی۔ میں نے چند سطریں لکھ دی تھیں۔ اب اسے معتبر نہ جانیں۔ کیوں کہ وہ تمام بھی اسی میں شامل ہیں۔

ترک و تجرید

بچپن سے اس خاکسار کو ہوس جاہ و مال نے پریشان نہیں کیا۔ تحصیل ضروریات کے بعد اس فقیر نے خود کو فقیروں کے دامن سے وابستہ کر لیا۔ اس امید پر کہ دوسری دنیا پر آنکھ وا ہو سکے۔ نقش قدم کی طرح ان کے دروازے پر بیٹھ گیا۔ تجرید و تفرید اختیار کی۔ گل کی طرح تمام زندگی ایک ہی جامہ میں گزار دی۔

بیوی کی

اس مستورہ نے عارضۂ سل اور طویل علالت کی وجہ سے مجھے پریشان کیا ہے جو دوستوں سے مخفی نہیں ہے۔ لیکن میں نے سب معاف کر دیا ہے۔ اس محبت کے خیال سے جو انھیں خدا اور اس کے رسول سے ہے۔ میرے مخلصوں پر میرے حق و رضا کے مطابق ان کی دل جوئی لازم ہے۔ میرے مخلصوں کو یہی وصیت کافی ہے کہ وہ آخر تک اتباعِ سنت میں کوشاں رہیں اور خدا کے سوا کسی کو مقصودِ حقیقی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو شرعاً واجب الاتباع نہ سمجھیں۔ فقیروں کے طور طریقوں کو اپنائیں اور دنیاداروں سے ملنے جلنے سے گریز کریں۔ علوم دین کے شغل سے خود کو معذور نہ رکھیں۔

سفر سنبھل اور امروہہ

جب قسمت اور احباب کی کشش کی وجہ سے فقیر سنبھل پہنچا اور مراد آباد بھی دیکھا تاکہ قیام کے لیے جگہ کا انتخاب کیا جائے اور متعلقان کو بلانے کا خیال کیا۔ کیوں کہ دہلی میں روز روز کی پریشانیوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ دہلی سے شاہ جہان پور دور ہے۔ اس لیے یہاں آ گیا۔ سنبھل، مراد آباد اور امروہہ تینوں شہر کے لوگوں نے سماجت کی کہ میں ان کے شہر میں ٹھہروں لیکن نواب ارشاد خاں کے حقوق اور کشش نے نہ چھوڑا کہ کسی دوسری جگہ کا ارادہ کرتا۔ اس شہر میں طالبان طریقہ بہت زیادہ ہیں۔ اقامت کا ارادہ کر لیا تھا۔ متعلقان کو بلانے کے لیے آدمی بھیجا تو انھوں نے معقول عذر کیے۔ مجبوراً دہلی جانا پڑا۔

؎ باقی رہ و شتاب باقیست   ما را بتو صد حساب باقیست

فقیر امروہہ اور مراد آباد کی سیر سے فارغ ہو چکا ہے۔ اور اب شاہ جہاں پور جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ جلد پہنچے گا۔ روانہ ہونے سے پہلے دو تین مقام راہ میں اور باقی چھ مقام شاہ جہاں پور میں ہوں گے۔ اس کے بعد فقیر سنبھل واپس چلا جائے گا۔ اور پھر دہلی کے لیے روانہ ہو گا۔ بڑھاپے کی کمزوری کے باوجود اس مشکل سفر کو آخرت کی نیک اغراض کے لیے پسند کیا ہے جیسے خدا جانتا ہے مجھے بھی دوستوں سے ملنے کا اتنا ہی شوق ہے جتنا کہ انھیں ہے۔

روہیلوں سے تعلق

یہ خاکسار تنہائی و گوشہ نشینی کو پسند کرتا ہے۔ اہل ثروت سے نہیں ملتا۔ خانساماں و بخشی یعنی فتح خاں اور سردار خاں کو میں نے تمام عمر نہیں دیکھا۔ دوندے خاں مجھ سے ملنا چاہتا تھا میں نے منع کر دیا۔ حافظ رحمت خاں مجھ سے ملنے آئے تھے

مجھے ان کی صحبت پسند نہیں آتی اور میں محمد خاں کے وظیفوں کو بھی نہیں جانتا۔

پانی پت میں قیام

اس وقت فقیر اوائل ماہ صفر [illegible]ھ میں پانی پت کے اندر عافیت سے ہے علاوہ دہلی کے لوگ بھی بخیر ہیں۔ میری عمر اب اسی کے قریب پہنچ گئی ہے۔ بڑھاپے کا ضعف غالب ہے روزانہ چار وقت حلقہ ہوتا ہے، صبح، دوپہر، شام اوقات کو لوگ حاضر ہوتے ہیں علاوہ سادات ہیں سے گروہ گروہ لوگ اجازت حاصل کرکے اپنے اپنے شہروں کو جانے کی رخصت پاتے ہیں۔ اب میرے ہم عصروں میں کم لوگ باقی رہے ہیں اس وقت ہندوستان کی حالت ابتر ہے۔ میرا عرصہ دراز سے ارادہ حج تھا، ناتوانی اور بے سروسامانی نے اجازت ہی نہ دی، اب تو سفر آخرت درپیش ہے حق تعالیٰ بزرگوں کے صدقے میں آسانی سے منزل مقصود تک پہنچائے

ہمارے پیر بھائیوں میں سے ہندوستان میں سوائے مرزا مظہر کے جو ارشاد و تلقین میں مشغول ہیں اب کوئی زندہ نہیں رہا بلکہ خاندان عالی شان میں بھی ایسے صاحبزادگان جو صاحب ارشاد و تاثیر ہوں نہیں ہیں۔

ذوق سماع

سماع کے مسئلے میں اہل فقہا اور حضرات صوفیہ میں سخت اختلاف ہے۔ پہلا فرقہ فتنہ و فساد کے دروازے کو بند کرنے کی مصلحت سے کہتا ہے کہ سماع قطعی حرام ہے دوسرا فرقہ غلبہ ذوق کے اقتضا سے اسے مطلقاً حلال جانتا ہے۔ انصاف کی اور اصل بات تو یہ ہے کہ سماع دو طرح کا ہوتا ہے ایک تو وہ کہ کوئی شخص جو محل فتنہ نہ ہو موزوں کلام کو موزوں آواز میں، مزامیر غیر شرعی کی مداخلت کے بغیر گائے اور سننے والوں کو باطن میں اس سے کوئی فساد پیدا ہونے کے بجائے ان کے دل میں خوشی یا حزن و ملال پیدا ہو۔ سماع کی یہ قسم البتہ مباح ہے کیوں کہ یہ مرکب ہے دو مباح چیزوں، کلام موزوں اور آواز موزوں سے پھر وہ کیسے غیر مباح ہو؟ بلکہ قرون اولیٰ میں شرعی تقریبات مثلاً نکاح یا ولادت کے موقعوں پر یہ گانا بجانا کا معمول رہا ہے اور امت کے علماء نے کبھی کبھی ایسا کیا ہے جیسا کہ حدیث کی کتابوں سے ظاہر ہے۔ لیکن ان بزرگوں نے اس عمل کا کوئی التزام نہیں کیا بلکہ بعض اتفاقاً ایسا ہو گیا۔ دوسری قسم وہ ہے جسے انتہا پسند متاخرین نے رواج دیا، اس کا التزام کیا ہے اور بہت سی غیر شرعی باتوں کو اس میں داخل کر دیا۔ اس قسم کے سماع میں جس قدر غیر مباح امور داخل ہوں گے یہ اتنا ہی حرام ہوگا۔ اور اس کے کرنے والوں کی اباحت کا اعتقاد کفر تک پہنچ جائے گا۔

افیون اور شراب

ارباب کمال میں سے بعض لوگ سماع مباح کی رغبت نہیں رکھتے تو یہ اپنے اپنے ذوق کی بات ہے احکام شرعی پر منحصر نہیں ہے مثلاً شراب پینے والا میٹھی چیز کو پسند نہیں کرتا، اور افیون کھانے والا نمکین چیز سے رغبت نہیں رکھتا۔ حالانکہ ان میں سے ایک شخص دوسرے کی نقل کو حرام نہیں کہتا۔ اسی طرح چشتیہ سلسلے کے بزرگوں کی نسبت کا نشہ شراب کے نشے کی طرح ہے وہ سکوت کے بجائے شور و نغمات سے لطف لیتے ہیں اور نقشبندیہ طریقے کے بزرگ جن کی خدا سے نسبت افیون کے نشے کی طرح ہے۔ شور اور ہنگامے کے بجائے سکوت سے لطف اٹھاتے ہیں۔ اس اختلاف کی وجہ ذوق اور طبیعت ہے نہ کہ دین اور شرع۔ تمام طریقوں کے بزرگ دین اور سنت کے تابع ہیں ذکر جہر والے ہوں اور خواہ چشتیوں کے۔ اور سب غیر مباح سے اجتناب کے سلسلے میں متفق ہیں اور طرفین کے جاہل قابل اعتبار نہیں۔ افراط و تفریط ممنوع ہے۔ اس مسئلے کی تفصیل کے لیے حجۃ الاسلام غزالی اور شیخ الشیوخ سہروردی جیسے محققین کی مبسوط کتابیں دیکھنی چاہئیں۔

خدا کا شکر ہے کہ بندہ سماع غیر مباح سے تائب اور سماع مباح کو ترک کر چکا ہے۔ اور اباحت و غیر اباحت کے سلسلے میں کتاب و سنت کافی ہے۔ اور ذوق و وجدان کے متعلق اس سے زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس گروہ کی کتابوں سے ظاہر ہے کہ صحیح احوال اور بلند مقامات والے بزرگوں نے سماع مباح میں اپنی جانیں دی ہیں۔ جو علمائے صوفیہ کے مذاق سے واقف ہے اور عقل سلیم رکھتا ہے وہ اس تحریر کی قدر و قیمت جانتا ہے۔

فقیر صحیح تو اپنی پوری کمزوری اور ناتوانی کے ساتھ زندہ ہے اور ابھی تک تقریباً سو آدمیوں کو دونوں وقت روٹی دی جاتی ہے۔

ذوق سخن باقی نہیں رہا۔ بہت عرصے کے بعد ایک تازہ غزل ہوئی ہے دو تین شعر لکھے جاتے ہیں۔

بایں فرصت چہ خوش باشد ز سیر گلستاں ما را / کہ رفتن لازم افتاد است چوں آب رواں ما را
قفس داریم و بس راہ چمن از ما چہ می پرسی / کہ چیدی از بال و پر برداشتند از آشیاں ما را
نفس نالی کنم از سینہ صد جا بگسلد تا آتش / چو نار و نالہ نتواں کردست آں مجمع میاں ما را

معلوم نہیں کہ میری موت کہاں طاق و ز غیرت گر غائب ہے جو مجھ تک نہیں پہنچتی اور دوست ہیں کہ چلے جاتے ہیں

وصیت فقیر اس حالت میں کہ ہوش میں ہے اور وہ فقرہ صحیح و معتبر ہوتا ہے، احباب کو چند وصیتیں کرتا ہے، جنھوں نے اس سے اخذ طریق کیا ہے۔ فقیر کی تجہیز و تکفین کے بعد سنت نبوی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے۔ اس کے بعد میرے مزار پر دوکان لگائی جائے۔ کیوں کہ میں زندگی میں بھی اس کا مخالف تھا۔

میں بندہ گناہ گار اس سے ایک ہوں اور میں نے خدا کے نام پر تعلیم دی ہے اور میں چند روز پہلے میری بیوی نے درخواست کی تھی کہ اپنے اس آخری کی تیاری پر چھوڑ دوں میں نے اس سلسلے میں انھیں ایک تحریر دے دی ہے کہ میرے بعد میرے خلف الرشید سے مخالفت نہ کریں اور وہ جہاں چاہیں مجھے دفن کریں میں نے اس بات کا زبانی اقرار کر لیا ہے۔ لیکن ان دنوں مستورہ کسی قطعہ زمین کی مالک نہ تھی حال ہی میں انھوں نے ایک حویلی خرید لی ہے۔ میں اس جگہ سے سخت متنفر ہوں اگر وہ چاہیں کہ مجھے اس جگہ دفن کریں تو دوستی کے تقاضے سے میرے احباب پر واجب ہے کہ ہرگز یہ بات قبول نہ کریں ہاں، اس جگہ کے علاوہ جہاں کہیں بھی جگہ میسر ہو ان کی مرضی کا خیال رکھیں بیرون دہلی دروازہ مناسب تر جگہ ہے۔ والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

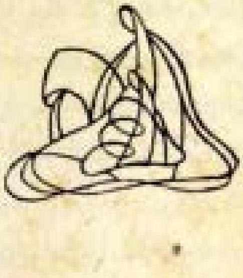

میر غلام علی آزاد بلگرامی

فقیر آزاد الحسینی الواسطی عفی اللہ عنہ۔ یہ کون گستاخ ہے جو کج مج زبانی کے باوجود شیوا بیانوں کے پہلو میں بیٹھنا چاہتا ہے اور تنگ سرمایگی کے باوصف بھری پونجی والے لوگوں کے بازار میں دکان لگا رہا ہے شاید مبداء فیاض نے روح القدس کو اس کی تائید کرنے کا حکم دیا اور اپنی عنایت خاص کا دروازہ اس پر کھول دیا ہے یقیناً ۔۔۔ خدا کی قدرت بالغہ نے سرو آزاد کو موزوں بنایا ہے۔ اگر اس آزاد کو بھی موزونیت عطا فرما دے تو اس سے کیا بعید ہے۔ اس نے قمری کو سرو سہی کا مصرع یاد کرا دیا ہے اگر اسے بھی مصرعوں کے موزوں کرنے کی تلقین کر دے تو اچنبھے کی کیا بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت لسان الغیب قدس سرہ نے ساڑھے تین سو سال پہلے فقیر کے نام اور تخلص کی طرف اشارہ کر دیا تھا اور اپنی عنایت بے غایت سے یہ شعر گویا اپنے عقیدت مند کی زبان سے کہا تھا۔

فاش می گویم و از گفتۂ خود دلشادم
بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم

بندۂ عشق غلام علی کا ترجمہ ہے کیونکہ عشق امیر المومنین حضرت علی سے عبارت ہے چنانچہ روح الامین شہرستانی کہتا ہے ۔

ہرچہ گویم عشق زاں برتر بود
عشق امیر المومنین حیدر بود

اور مسیحائے کاشی کہتا ہے ۔

علی باشد کہ کشش عشق خوانی
محبت حضرت ممتاز اوست

شبستان عدم سے انجمن وجود میں اس فقیر کا ورود ۲۵ صفر ۱۱۱۶ ہجری روز یکشنبہ کو ہوا۔ مولد و منشا محلہ میدان پورہ واقع قصبہ بلگرام صوبہ اودھ سرزمین پورب ہے۔ اس فقیر کا نسب عیسیٰ مؤتم الاشبال بن زید شہید بن امام زین العابدین رضی اللہ عنہم پر منتہی ہوتا ہے۔ اسی لیے میں نے کہا ہے

گرچہ باشد مؤتم الاشبال عیسیٰ جد من
عیسیٰ جاں بخش شیرانم بامداد نفس

مؤتم الاشبال کے معنی ہیں شیر کے بچوں کو یتیم کرنے والا۔ چونکہ وہ اکثر شیر کا شکار کرتے تھے اس لیے اس لقب سے مشہور ہوئے۔ میرا ہی ایک اور شعر ہے ۔

مرا بہ تیغ ستم کشت و گفت از سر ناز
چراغ دودۂ زید شہید روشن شد

تحصیل علم پانچ استادوں سے کی۔ سب سے پہلے میر طفیل محمد قدس سرہ جن سے علوم درسی کا سرمایہ حاصل ہوا۔ دوسرے علامہ میر عبدالجلیل ان سے لغت و حدیث و سیر نبوی و فنون ادب حاصل کیے۔ فقیر فن شعر عربی میں بھی ان کا شاگرد ہے۔ تیسرے سید میر محمد خلف علامہ مرحوم ان سے عروض و قوافی اور بعض فنون ادب میں استفادہ کیا۔ چوتھے شیخ محمد حیات جن سے مدینہ منورہ میں صحیح بخاری کی سند حاصل کی اور صحاح ستہ کی اجازت بھی ان سے حاصل ہوئی۔ پانچویں شیخ عبدالوہاب طنطاوی ان سے مکہ معظمہ میں علم حدیث کے فوائد حاصل کیے۔ شیخ عبدالوہاب فرد فرقہ اپنے زمانے کے سرآمد علما تھے مکے میں مقیم تھے اور ہمیشہ تشنگان علوم کو سیراب کرتے رہے ۱۱۵۷ھ میں انتقال فرمایا۔ شیخ عبدالوہاب فقیر کے اشعار عربی کی بہت تعریف کیا کرتے تھے جب انہوں نے بندے کا تخلص آزاد سنا اور اس کے معنی معلوم کیے تو فرمایا۔

یا سیدی أنت من عُتَقَاءِ اللہ ”

(یا سیدی تم اللہ کے آزادوں سے ہو) میں اس کلمے کی بدولت جو اس سراپا گرفتار کے حق میں ان کی زبان مبارک سے سرزد ہوا، بہت کچھ امید میں رکھتا ہوں۔ ۱۱۳۸ھ میں بیعت کی رسم میر سید لطف اللہ بلگرامی سے پوری کی۔ ان چھ اکابر کے حالات مآثر الکرام اور سرو آزاد میں لکھے جا چکے ہیں۔

تمام عمر میں مجھے تین سفر پیش آئے۔ پہلا سفر شاہ جہاں آباد۔ یہ علامہ مغفور (میر عبدالجلیل بلگرامی) کی خدمت میں پہنچنے کے لیے کیا جو اس زمانے میں وہاں تشریف فرما تھے۔ ۱۱۴۰ھ میں میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی کے ساتھ یہ سفر ہوا تھا۔ دو سال تک علامہ کے ظل تربیت میں رہ کر بلگرام کو واپس ہوا۔

دوسرا سفر سیوستان کا ہوا یہ بلاد سندھ میں ایک شہر ہے۔ اس سفر پر ۱۱۴۲ھ میں بلگرام کے گھوڑے پر روانہ ہوا۔ شاہ جہان آباد (دہلی) لاہور، ملتان، اوچ وغیرہ ہوتا ہوا اگلے سال۔ ۱۰ ربیع الاول (۱۱۴۳ھ) کو اس شہر میں پہنچا اور اپنے ماموں میر سید محمد کی ملازمت حاصل ہوئی جو بادشاہ دہلی کی طرف سے وہاں کے میر بخشی اور وقائع نگار تھے۔ انہوں نے فقیر کو سپرد و خدمت کی نیابت عطا کر کے خود بلگرام کا سفر طے کیا اور چار سال کے بعد سیوستان میں پھر تشریف لائے۔ اور فقیر جس راستے سے گیا تھا ۱۱۴۷ھ میں اسی راستے سے دہلی واپس پہنچا یہاں آ کر معلوم ہوا کہ فقیر کے والد ماجد اور تمام اہل خاندان کسی تقریب کے سلسلے میں الٰہ آباد آئے ہوئے ہیں جو بلگرام سے مشرق کی طرف دس منزل کے فاصلے پر ہے پہلے اکبر آباد گیا وہاں سے سیدھا الٰہ آباد کا رخ کیا۔ اسی سال رمضان کی چاند رات کو الٰہ آباد پہنچ کر گھر والوں سے ملاقات کی مسرت حاصل کی۔ کچھ دن وہاں قیام رہا اس اقامت کے دوران میں دو مرتبہ بلگرام بھی گیا۔

تیسرا سفر حرمین شریفین کا تھا۔ جب میں دوسری بار الٰہ آباد سے بلگرام آیا تو زیارت حرمین کا شوق دامن گیر ہوا اور رجب ۱۱۵۰ھ کو روانہ ہوا تاریخ۔ سفر خیر اور خشکی و تری کی راہیں قطع کرتا ہوا ان مقدس سر زمین میں پہنچا۔ چونکہ حج کا زمانہ دور تھا چند دن مکہ معظمہ میں رہ کر مدینہ منورہ کو چلا گیا اور آستان رسالت کی خاک کو آنکھوں کا سرمہ بنایا۔ وہاں عید الفطر کر کے ام القریٰ کا رخ کیا، واپس آیا اور اگلے سال مناسک حج ادا کیے اس کی تاریخ عمل اعظم ہے۔ سالم کشمیری نے فقیر کے حسب حال کہا ہے

عید فطر است بہ در پیغمبر
شیئاً للہ گفتم بس یا در

ای عید و مدینہ بخت من طالع من
ان شاء اللہ مکہ و عید دگر

خان آرزو مجمع النفائس میں بذیل ترجمہ سالم لکھتے ہیں کہ جب وہ گجرات میں تھا تو اسے حج کی توفیق حاصل ہوئی اور زیارت بیت اللہ کے لیے روانہ ہوا۔ اتفاقاً ایام حج سے پہلے مدینہ منورہ گیا ہوا تھا کہ ایام حج تمام ہو گئے تو اس نے مذکورہ بالا رباعی کہی۔ مؤلف کہتا ہے کہ انقضائے ایام حج کا مضمون اس رباعی سے برآمد نہیں ہوتا۔ خدا جانے خان آرزو نے کیا سمجھ لیا۔ سالم کی مراد وہی ہے جو فقیر نے بیان کی ہے۔

۱۱۵۲ھ میں حجاز سے دکن کی طرف مراجعت کی تاریخ "سفر بخیر" ہے اور ۶ ذی قعدہ کو بلدہ خجستہ بنیاد اورنگ آباد میں پہنچ کر اقامت کی۔ چند بار اطراف ملک دکن کی سیر کو بھی نکلا اور رمضان ۱۱۵۴ھ کو سیاحت کا شوق قلعہ محمد آباد بیدر کی سیر کے لیے گیا۔ وہاں سے ۴ محرم ۱۱۵۵ھ کو حیدرآباد پہنچا اور ۱۹ صفر کو وہاں سے چل کر اسی سال ۱۵ جمادی الاول کو پھر اورنگ آباد آ گیا۔ اب اورنگ آباد ہی میں گوشہ نشین ہوں۔ اب فقیر کی عمر ۶۰ سال کی ہے۔ آفتاب زندگی لب بام آ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ خاتمہ بخیر فرماوے اور اس پروانے کو بے بال و پر شعلہ دیدار تک پہنچا دے۔ فقیر ایک مدت سے میخانۂ سخن میں ساغر کشی کر رہا ہے۔ ہر چند چاہتا ہے کہ پائے فکر کو حنا بند کرے اور وادی تخیلات میں سرگردانی نہ کرے لیکن موزونی فطری پیچھا نہیں چھوڑتی اور نزہت کدۂ معانی کی سیر کو کشاں کشاں لے آتی ہے۔ اس خیال سے تسلی ہو جاتی ہے کہ ساحر طبع نے صرف مجھی پر یہ افسوں نہیں پھونکا ہے بلکہ بہت سے اکابر دین اس کے دام میں اسیر رہے ہیں۔ فقیر کا دیوان فارسی و عربی مرتب ہو چکا ہے۔ دیوان عربی میں تین ہزار شعر ہوں گے۔ عربی شعر میں طرز خاص سے کہتا ہوں بابل کے ساحروں کا بازار ٹھنڈا کر دیا ہوں۔ طوطی ہندوستان ہوں مگر قمریان عرب سے دمسازی کر رہا ہوں۔ فقیر کا دیوان عربی حرمین شریفین اور بلاد مصر و یمن میں مشہور ہے اور عربوں کی محفلیں اس پردیسی تازہ وارد کے ذکر سے معمور ہیں۔ شوکت بخاری نے میرے حسب حال کہا ہے ؎

شنیدہ اند بتان یمن کلام مرا
نوشتہ اند بر آب عقیق نام مرا

فقیر نے کبھی گوہر ہجران فکر کے گراں مایہ موتیوں کو سرمایہ داروں کے ہاتھ فروخت نہیں کیا۔ نہ ارباب دولت کی مدح سرائی کی ہے مگر جب بیت اللہ شریف کا سفر درپیش ہوا تو راستے میں نواب آصف جاہ سے ملاقات ہوئی اور ایک رباعی موزوں کر کے ان کی خدمت میں گزاری ؎

اے حامی دیں، محیط جود و احساں
حق داد ترا خطاب آصف شایاں
او تخت بدرگاہ سلیمان آورد
تو آل نبی را بدر کعبہ رساں

نواب بہت محظوظ ہوئے اور زاد و راحلہ سے اعانت فرمائی۔

موزونیت فطری کبھی سمند فکر کو بیدار کر دیتی ہے حتیٰ کہ عالم مثال میں بھی شعر موزوں ہونے لگتے ہیں۔ چنانچہ رمضان ۱۱۶۰ھ

کے آخیر عشرے میں بندے کے مزاج میں وحشت پیدا ہوئی اور خیال آیا کہ سب سے قطع تعلق کر کے دوبارہ دیار عرب کا سفر کرنا چاہیے۔ یہ خواہش اتنی غالب ہوئی قریب تھا کہ قوۃ سے فعل میں آ جائے ناگاہ ۸ ر رمضان کی شب میں صبح کے وقت عالم خواب میں طبیعت شعر کی طرف متوجہ ہوئی خواب میں ایک شعر موزوں ہو گیا۔ بیدار ہوا تو وہ شعر مجھے یاد تھا

چہ خوش گفت گوینده نامدار
مکش دست از دامن روزگار

کچھ دیر میں نے تامل کیا اور یہ سوچا کہ شعر کہنے والا غیبی اور اس کا مخاطب یہ فقیر ہے۔ امر غیب کی بجا آوری کو میں نے واجب جانا اور ارادۂ سفر جو مصمم ہو چکا تھا فسخ کر دیا۔ اس الہام میں نکتہ یہ ہے کہ حج کا فرض تھا وہ پہلے ہی ادا ہو چکا اگر میں علائق ظاہری کے دامن سے ہاتھ کھینچ کر حج نافلہ کے لیے چل دیتا تو کتنے ہی واجبات فوت ہو جاتے ؎

ترک واجب نتواں کرد پئے نافلہ

۱۱۵۰ھ میں نواب نظام الدولہ اپنے والد نواب آصف جاہ کی طرف سے صوبہ داری اورنگ آباد پر مامور ہوئے۔ اور نواب شہید کو فقیر سے ربط خاص ہو گیا۔ اگلے سال نواب آصف جاہ حیدر آباد سے مہمات ملکی کے بندوبست کا بیڑا اٹھایا اور نواب شہید کے نام طلب نامہ پہنچا۔ انہوں نے فقیر پر بھی کمند تسخیر پھینکی اور اپنے حسن اخلاق کا ثبوت دیا کہ باوجود اپنی ہمہ آزادگی ان کے دام محبت میں گرفتار ہونا پڑا اور ۵ ذی قعدہ ۱۱۵۹ھ کو اورنگ آباد واپس آیا۔ اسی سال دارالسرور برہان پور کی سیاحت کا اتفاق ہوا۔ ۱۱۶۰ھ میں دوسری بار برہان پور کا سفر پیش آیا اور دریائے نربدا کے کنارے تک سیاحت کر کے اورنگ آباد کو واپس ہوا۔ ۱۳ شوال سال مذکورہ کو نواب کے لشکر نے ملک ارکاٹ کی طرف کوچ کیا ایک سال اور چند ماہ اس علاقے میں بسر ہوئے۔ ارکاٹ ہی میں شمامۃ العنبر فیما ورد فی الھند من سید البشر ﷺ کی تصنیف ہوئی۔ آخر کار نواب نظام الدولہ مرتبۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ ان کی شہادت کے بعد اس ملک سے دل بھر گیا اور ۵ ر جمادی الاول ۱۱۶۵ھ کو سوار ہو کر ۹ شعبان کو بلدہ حیدر آباد پہنچا۔ اور اسی سال ۱۶ ذی قعدہ کو وہاں سے چل کر ۵ ذی الحجہ کو اورنگ آباد آ گیا

حق سبحانہ علیم ہے کہ ہلال کی طرح اس سیر و سفر کا مقصد تن پروری کبھی نہیں رہا۔ بلکہ بدر کی طرح شکست نفس منظور تھا۔ کچھ دنوں آب رواں کا طریقہ پسند رہا کہ اس سے مشت گیاہ کی نشوونما ہو جائے اور باد صبا کی روش بھائی کہ کچھ غنچے متبسم ہو جائیں۔ امیدوار ہوں کہ یہ سعی پائے شکستہ کی دستگیری کرے اور قلمرو سیر فی اللہ کا جادۂ مستقیم بن جائے ۔

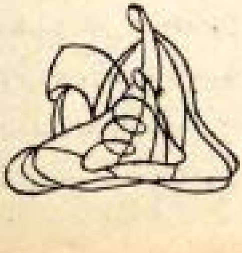

سید مظہر علی سندیلویؒ

ولادت :- ۱۰ ستمبر ۱۸۳۹ء

وفات :- ۲۴ دسمبر ۱۹۱۱ء

ٹوپی کی قطع ۹ نومبر ۱۸۶۶ء آج میں نے ٹوپی گول مخمل اودی خدا بخش خیاط سے تیار کرائی جو نہایت خوشنما اور قابل عمل ہے۔

الطاف برادرانہ ۳۰ ستمبر ۱۸۶۶ء زبانی اکبر علی معلوم ہوا کہ کرامت حسین آج کل مجھ سے ناخوش ہیں۔ بظاہر کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ شاید الطاف برادرانہ ہو۔

احساس کم لیاقتی ۸ نومبر ۱۸۶۶ء مجھے آج کمال افسوس رہا کہ باوصف اس قدر سن آنے کے میں نے اب تک کوئی لیاقت حاصل نہیں کی۔ لہٰذا کمال عاجزی سے درگاہ خدا میں دعا کرتا ہوں کہ مجھے لیاقت عطا فرمائے کہ میں اپنے ہم چشموں سے شرمسار نہ ہوں۔

طمانچہ ۷ فروری ۱۸۶۹ء غلام علی کاشتکار موضع مخدوم پورہ نے بلاوجہ گستاخی کی۔ لہٰذا ایک طمانچہ اس کے مارا لیکن تھوڑی دیر کے بعد اپنے اس فعل سے نادم ہوا کہ خلاف تہذیب میں نے ایسا کیا۔

صفاتِ حمیدہ ۲۵ دسمبر ۱۸۶۹ء آج میں حسب تحریک منشی فضل رسول بوقت شام لکھنؤ پہنچا۔ وقت ملاقات کے منشی صاحب نے فرمایا کہ میں تم کو بمقابلہ عنایت حسین، کرامت حسین و فضل حسین و حامد حسین کے چند وجہوں سے اچھا جانتا ہوں۔ اول تم جھوٹ نہیں بولتے ہو، دوسرے مزاج میں جہالت نہیں، تیسرے مغلوب الغضب نہیں ہو، چوتھے معاملہ فہم ہو۔ اس وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ اپنے علاقہ کا جو کورٹ ہونے والا ہے تم کو سربراہ کار مقرر کراؤں اور اس میری خواہش کو ضرور حکام منظور کریں گے۔

محکمہ ریل میں ملازمت ۷ مئی ۱۸۷۰ء آج کل محکمہ ریل میں کام کی کثرت ہے۔ اس وجہ سے آٹھ بجے رات کو مجھے مہلت ملتی ہے۔ ۱۰ بجے سے رات تک کام کرتے کرتے طبیعت مضمحل ہو جاتی ہے۔

ﮧ روزنامچہ یادگار مظہری

تقریب میں اسراف

یکم جولائی [illegible]۔ تقریب ختنہ میں، میں نے عمدہ ہندوستانی کھانا پکوا کر دونوں وقت مارٹن صاحب کو بھیجا جس کو تناول فرما کر بہت خوش ہوئے۔ مجھ سے کہا کہ اس تقریب میں کتنا روپیہ صرف ہوا؟ میں نے ایک ہزار روپیہ از روئے حساب بتلایا۔ بہت تاسف کیا کہ تم نے ایک سال کی تنخواہ ایک چھوٹی سی تقریب میں صرف کر ڈالی۔ یہ طریقہ ناپسندیدہ ہے۔

فال

۱۱ جون [illegible] خبر برخاستگی دفتر ریل دریافت کر کے مجھے کمال تشویش لاحق ہوئی۔ نہیں معلوم کہ اب آب و دانہ کہاں لے جائے گا اور اس حالت پریشانی میں خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہ کے دیوان میں فال دیکھی۔ اشعار ذیل برآمد ہوئے جس سے ہر گونہ آئندہ اُمید کامیابی کی پائی جاتی ہے ؎

گرچہ از جائے بروں ہست ولیکن بخدا — کہ شب و روز درون دل ما جا دارد
عاقبت چہرہ دلدار عیاں خواہد بود — ہر کہ آئینہ ز زنگار مصفا دارد
حسن آں ماہ چو خورشید پدید است معین
محرم آں است کہ او دیدۂ بینا دارد

بے ادبی

۱۶ اگست [illegible] مولوی ظہور احمد نے خشت ہائے چبوترہ مزار حسن میاں صاحب واقع مسجد قدیم اپنے پاخانۂ زنانہ میں صرف کیں۔ میں نے منع کیا کہ یہ فعل ناجائز ہے۔ جواب میں ناخوش ہوئے کہ یہ فعل ناجائز نہیں ہے۔ میں نے سکوت کیا اور اس جملہ پر کفایت کی کہ خدا مبارک کرے۔

ایک نصیحت

۱۲ ستمبر [illegible] آج یہ نصیحت "سوچ سمجھ کر بات کرو کہ پشیمان نہ ہو" مصطفیٰ حسین سے لکھا کر شیشہ کے چوکھٹے میں رکھ کر اپنے کمرہ نشست گاہ میں آویزاں کی۔ تاکہ ہر وقت کے دیکھتے رہنے سے مجھے اور دوسروں کو نصیحت نیک حاصل ہو۔

ملازمت تعلقہ جلال پور

۲ مارچ [illegible] چونکہ میں تعلقہ جلال پور سے سوائے تنخواہ کے نذر نیاز تک نہیں لیتا ہوں اور کوئی چیز فصل باغات و دیہات کی اپنے مکان پر آنے نہیں دیتا ہوں اس وجہ سے میری طبیعت کو کسی وقت کسی قسم کی پژمردگی و تردد لاحق نہیں رہتا اور نہایت بے خوفی اور مستقل مزاجی سے کام تعلقہ جلال پور انجام دیتا ہوں۔

متفرق ذمہ داریاں

۲۳ اپریل [illegible] آج کل تین قسم کے کام میں انجام دیتا ہوں۔ کار مجسٹریٹی متعلقہ سندیلہ، خاص انتظام علاقہ داری جلال پور، کارروائی میونسپل سندیلہ۔ اس وجہ سے مجھے بہت کم فرصت رہتی ہے۔ تاہم میں کام سے گھبراتا نہیں ہوں اور مستقل مزاجی سے ان کو انجام دیتا ہوں۔

کچھ اپنا حال

۲۱ دسمبر [illegible] ابتداً میری جائداد آبائی و موروثی کچھ نہ تھی۔ حتیٰ کہ مکان سکونت بھی مشترک تھا جس میں چند اعزا کے گھروں سے کھڑکیاں تھیں۔ اس سے مکان غیر محفوظ اور موجب تکلیف کا متصور تھا۔ ابتداً میری

ملازمت مدرسہ سندیلہ میں ہوئی اور اسی وقت سے مجھے شوق حصول ریاست کا پیدا ہوا اور میں نے معاملات رہن و بیع کرنا شروع کیے۔ اول ۱۲ مارچ ۱۸۸۸ء کو ایک قطعہ اراضی زرعی موسومہ کر تعدادی ۵ بیگہ واقع موضع مخدوم پورہ ملوکہ میر احمد بخش صاحب مرحوم مخدوم زادہ درگاہ مبلغ ۱۵۰ روپے پر رہن رکھا جس کا حاصلات مبلغ چار روپے سالانہ تھا۔ اس کے بعد جوں جوں میری تنخواہ میں ترقی ہوتی گئی میں ریاست پیدا کرتا گیا اور اس کے حصول میں بہ باعث کمی زر کے اپنے اوپر بہت تکلیف گوارا کی لیکن شوق کو کسی نہج سے کم نہیں کیا اور اس بات کا ہمیشہ خیال ملحوظ خاطر رکھا کہ اس قدر جائداد غیر منقولہ پیدا کر لینا چاہیے کہ بوقت بیکاری معین بہ مصارف روزینہ کی ہو سکے اور قیام سندیلہ بحالت بیکاری مجبوراً ترک کرنا نہ پڑے۔ ہزار ہزار شکر پروردگار عالم کا کہ اس نے اپنے فضل سے میرے ان خیالات کو پورا کیا اور بقدر میرے صرف کے جائداد غیر منقولہ مجھے حاصل ہوئی جس سے ایام بیکاری بآسانی بسر ہو رہے ہیں۔ میں نہایت مناسب تصور کرتا ہوں کہ جس قدر جائداد منقولہ علاوہ زر نقد اور زیور جو اس وقت میرے قبضہ میں ہے حوالہ قلم کروں اور جس قدر تمتع منافع زرعی سے حاصل ہوتا ہے اس کو بھی لکھوں تاکہ میرے جانشینان کو معلوم ہو کہ ہمارے مورث نے اکیس سال کی مدت میں کس قدر ترقی کی، جس سے اکثر رؤسائے قصبہ بلاد وغیرہ خوش روزگار کو باعث حسد متصور ہے۔ دس پندرہ برس قبل جائداد غیر منقولہ کی اتنی قدر نہ تھی جیسی کہ اس وقت ہے۔ اسی وجہ سے اس زمانہ میں بہت کم قیمت پر حاصل ہوئی۔ اگر وہ زمانہ حال میں بہ نرخ بازار فروخت کی جائے تو محل شک کا نہیں ہو سکتا کہ دو چند قیمت اس کی ملے۔ میزان کل جائداد منقولہ و غیر منقولہ — چوالیس ہزار پانچ سو تریسٹھ روپے سات آنے چار پائی۔

رفاہ عامہ کے کام

۱۲ فروری ۱۹۰۵ء۔ اخبار خیر خواہ عالم دہلی محررہ ۱۰ فروری ۱۹۰۵ء اور اخبار دبدبۂ سکندری رام پور محررہ ۲۰ فروری ۱۹۰۵ء میں میرے باغ و کنواں واقع موضع پرکالپوری کی بہت تعریف لکھی ہے میں نے یہ دونوں چیزیں محض واسطے رفاہ عام کے بنوائی ہیں۔

احتساب نفس

۵ جولائی ۱۹۱۰ء۔ انسان کا دنیا سے بہ نیک نامی گزر جانا اس زندگی سے بہتر ہے جو بدنامی زندہ رہے جب کسی شخص کی عمر قریب المرگ پہنچے تو اس کو اپنے خدائے لم یزل سے یہی دعا کرنا چاہیے کہ انجام بخیر ہو اور کوئی بدنامی اپنے ساتھ قبر میں نہ جائے۔ میں اس وقت جو اپنی حالت پر غور کرتا ہوں تو تعالیٰ شانہٗ نے اپنے فضل و کرم سے بہت قسم کی نعمت ہائے دنیاوی مجھے عطا فرمائی ہیں اور کوئی تمنا ایسی باقی نہیں رہی جس کا میں آرزو مند ہوں اور یوں انسان جب تک زندہ ہے اس کی تمناؤں کا خاتمہ ہی نہیں ہو سکتا۔ اب میری خواہش دلی یہ ہے کہ قبل پیش آنے کسی بدنامی یا حزن و ملال یا رنج و غم، فکر و تردد کے اگر سفر آخرت مجھے پیش آئے تو اس سے بڑھ کر کوئی آرزو مجھ کو پیش نہاد نہیں۔

علالت

۲۸ ستمبر ۱۹۱۹ء میری طویل علالت سے جس کو ایک سال کا زمانہ ہوا اعزا و احباب عیادت کرتے کرتے اکتا گئے اور تیمار دار سر انجام دہی خدمات سے گھبرا گئے ہیں۔ خود اول علالت، دوسرے طوالت سے پریشان ہوں۔ کہ ایسی چیز کی زیادتی جو باعث تکلیف دہی ہو داخل بے قدری ہے۔

قسم کھانا

۱۲ جون ۱۹۲۵ء۔ جب میں کمسن تھا مجھے خوب یاد ہے ۱۸۹۷ء سے قسم کھانا جیسا اس کا آج کل ضرورت بلا

ضرورت عام رواج ہے مطلقاً ترک کر دیا تھا اور کبھی سہواً اس کا اتفاق نہیں ہوتا اور میں بہت بُرا جانتا ہوں کہ لوگ معمولی بات چیت میں بلا ضرورت اس کے عادی ہیں جس سے ان کی بے اعتباری متصور ہے۔ جب مجھے کسی عدالت میں اتفاق ادائے شہادت کا ہوتا ہے تو وہاں بھی حتی الامکان انہی الفاظ کا استعمال کرتا ہوں کہ اپنے علم و یقین سے سچ کہوں گا جھوٹ نہ کہوں گا۔ لیکن قسم کھانا اللہ اور رسولؐ کی بالکل میں نے چھوڑ دیا ہے۔ خدا سے اُمید ہے کہ وہ ان باقی ایام زندگی میں وہی عادت قائم رکھے گا۔

تحسین ۱۳ رمئی ۱۸۹۵ء۔ آج مرزا یعقوب حسن صاحب تحصیلدار کے مکان پر منشی سدیوشن زائن صاحب حاکم بندوبست تحصیل سندیلہ سے ملاقات ہوئی۔ تحصیلدار صاحب نے میرا ڈپٹی صاحب سے تعارف کرایا کہ یہ صاحب رئیس سندیلہ نہایت لائق اور وقت کے فلاسفر ہیں۔ کوئی وقت ان کا فضول و رائگاں صرف نہیں ہوتا۔ سرکاری کاموں کی طرف بہت دلچسپی ہے آنریری مجسٹریٹی کا کام مثل تنخواہ دار مجسٹریٹ کے بہت مستعدی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔

محنت کی عادت ۲۲ ستمبر ۱۸۹۵ء...... میں خود ہی اپنی ذات سے تمام اوقات مصروف رہتا ہوں۔ حتیٰ کہ سوائے رات کے نصف تک چارپائی پر نہیں لیٹتا اور زیادتی محنت سے بوقت شب دماغ تپنے لگتا ہے لیکن باوصف ان سب باتوں کے میں تکملہ کام کا اپنے آرام پر مقدم تصور کرتا ہوں۔ خدا میری اولاد کو بھی یہی ہدایت کرے۔

وقت کی قدر ۲۰ جولائی ۱۸۹۵ء۔ دنیا میں وقت ایک نہایت عمدہ نعمت ہے۔ جو شخص اس کی قدر کرتا ہے وہ نعمت حاصل کرتا ہے۔ جو ضائع کرتا ہے وہ تکلیف و خرابی میں مبتلا رہتا ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنے ساتھیوں سے اس کی زیادہ قدر کی۔ حتیٰ کہ موسم گرما میں دن کو بہت کم سویا اور وہ بھی وقت کسی نہ کسی شغل میں صرف کیا جس کا یہ خوش نتیجہ پیدا ہوا کہ میرے کل کام متعلقہ نہایت آسانی سے طے ہو گئے۔ جس کا نیک پھل مجھے ملا۔ یہی سبب ہے کہ میں ہر ایک کام غیر معلوم سے بہت جلد واقف ہو گیا اور عوام میں میری قابلیت مشہور ہوئی۔ لہٰذا وقت ضرور قابل قدر ہے۔

دعا اور محنت ۱۰ رنومبر ۱۸۹۵ء میں نہایت راستی سے لکھتا ہوں کہ میں نے جس کام کو شروع کیا اس کا تکملہ میں نہایت کوشش کے ساتھ مصروف ہوا اور اپنے خدا سے اس کے اتمام کی نسبت دعا کرتا رہا۔ بالآخر وہ کام ضرور خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام ہوا۔ ملک ہسپانیہ میں ایک مثل ہے خدا سے مانگو اور ہتھوڑے کو بھی لوہے پر مارتے رہو ورنہ صرف دعا مانگنے سے لوہا کبھی نرم نہیں ہو سکتا۔"

پابندیٔ نماز و وظائف ۲ رمئی ۱۸۹۶ء۔ ۴۰ سال کا زمانہ ہوا جب سے میں نے نماز کی پابندی کی اسی وقت سے درود شریف ہر نماز کے بعد ایک صد بار و سبحان اللہ بحمدہٖ ۔ ۱۵ بار و سورہ مزمل ایک بار ضرور پڑھتا ہوں...... اور چھتیس سال سے یا مظہر العجائب بالخیر بعد نماز عشاء کے ۳۰۰ بار ورد میں ہے جس کے اول و آخر سات مرتبہ درود شریف پڑھتا ہوں اور ۲۰ سال گزشتہ سے چہل کاف بعد نماز صبح و مغرب ایک بار پڑھا کرتا ہوں۔ ان اوراد کی برکت و ورد سے مجھے بہت بڑا نفع دُنیاوی حاصل ہوا اور ہو رہا ہے۔

قحط کا انجام ۹ رجون ۱۸۹۶ء۔ آج مجھے دریافت سے معلوم ہوا کہ میرے یہاں گیارہ لونڈیاں واسطے پرورش و خدمت

کے اس قحط سالی میں حاصل کی گئیں۔

دربار تاجپوشی ہردوئی

۲؍ جنوری ۱۹۰۳ء۔ کل کے دربار جشن تاجپوشی ہردوئی میں میری کرسی صف اوّل میں تھی اور آنریری مجسٹریٹوں کے سلسلے میں پہلی تھی اور میری کرسی کے پیچھے وکلاء اور اہل کاروں وغیرہ کی کرسی تھی جس کا ہر آئینہ مجھے فخر ہے کہ ایسا اعزاز اپنے رتبہ اور ہم چشموں میں مجھے حاصل ہوا۔

اپنی سوانح عمری

۳۰؍ مئی ۱۹۰۴ء میں اپنی کتاب سوانح عمری کے لکھنے میں برابر مصروف رہتا ہوں جو میں ابتدائے جون ۱۹۰۳ء لغایت جون ۱۹۰۴ء قریب ختم ہو رہی ہے۔ کام مشکل و محنت ہے۔ اگرچہ محنت بہت کرتا ہوں لیکن بعض اوقات اس کی تکمیل میں دشواری بہت نظر آتی ہے۔ خدا کرے کہ میری یہ کتاب میری حیات میں طبع ہو جائے اور اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے کیونکہ اس میں ہر ایک مذاق کے موافق تذکرہ لکھا گیا ہے۔ شاید میں اپنی یادگار قائم کر جاؤں۔

بیوی کا انتقال

۲۵؍ جولائی ۱۹۰۴ء۔ افسوس صد افسوس کہ آج چار بجے صبح میری مونس و غمگسار مسماۃ شمس النساء بنت شیخ کریم بخش صاحب ایٹوی نے قضا کی اور مجھے جیتے جی رنج و الم دائمی کیا جو تاحیات فراموش نہیں ہو سکتا اور نہ کبھی ایسا صدمہ مجھے پہنچا۔ مرحومہ ۳؍ ذوالحجہ ۱۲۷۲ھ مطابق ۲۴؍ نومبر ۱۸۵۵ء روز دوشنبہ بوقت ۱۰ بجے ۵ منٹ پر پیدا ہوئی تھیں اس حساب سے بلحاظ سال قمری ان کی عمر ۵۰ سال ۵ مہینے ۲۰ یوم ہوئی۔ مطابق ۲۴ نومبر ۱۸۵۵ء لغایتہ ۲۵ جولائی ۱۹۰۴ء، ۴۸ سال ۸ مہینے ۱ دن۔ مرحومہ سے میرا عقد ۲۹ رجب ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۰ جنوری ۱۸۷۳ء بوقت ۸ بجے صبح یوم سنیچر کو ہوا تھا جس کو بتیس سال نو مہینے پانچ یوم بحساب قمری اور بلحاظ سن عیسوی اکتیس سال چھ مہینے ایک دن ہوئے۔ مرحومہ شکل و صورت میں حسین اور سلیقے میں نہایت خوش سلیقہ صاحب عصمت، حلیم و فیاض ثابت ہوئیں اور بدرجہ غایت میری فرمانبردار تھیں۔ اہل برادری ان کے خلق و ملنساری سے رضامند و ثنا خواں تھے۔ مرحومہ کے پندرہ لڑکے اور لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ منجملہ ان کے چار فرزند تین لڑکیاں وقت وفات حی القائم ہیں اور ان کی خدمت گزاری و تجہیز و تکفین سے افتخار کونین حاصل کیا۔

عقد بیوہ

۵؍ جنوری ۱۹۰۵ء۔ چونکہ یہ رسم (العقد ثانی نواسی بیوہ) خلاف رواج و مطابق سنت نبوی رسول پاک کے اختیار کی اس وجہ سے کل اکابر و پسر و نوجوانان قصبہ ہذا بہت خوش ہوئے اور میرے حق میں دعائے خیر کی کہ میں نے رسم قبیحہ کو دور کر کے سنت نبوی کو تازہ کیا۔ امید ہے کہ اب اہل قصبہ میری تقلید کریں گے۔

علالت

۲۰؍ اکتوبر ۱۹۱۱ء۔ بوجہ شکایت ہچکی و کمزوری خود سات بجے شام تک دو گھنٹے رات گزارنا نہایت دقت معلوم ہوتی تھی۔ یا تو غنودگی اپنا غلبہ کرتی تھی یا خیالات پریشانی از دماغی خاطر ہوا کرتے تھے۔ لہٰذا بہ نظر مناسب میں قصہ حاتم طائی ۹ بجے سے ۱۱ بجے تک سنا کرتا ہوں جو جان علی خدمت گار پڑھتا ہے جس سے طبیعت کو فی الجملہ دل بستگی ہے۔

۱۲؍ دسمبر ۱۹۱۱ء۔ کل میری طبیعت شام کو خوش نہ تھی اور ہچکی کی شکایت زیادہ ہے اور رات کو بخار بھی کچھ تیزی پر تھا جس سے مجھے انواع و اقسام کا اندیشہ ہے کہ آج رات کو شب سنیچر شروع ہو گی اور سنیچر میری اولاد کے حق میں کچھ مفید نہیں۔ چنانچہ یہی حالت رات کو رہی کہ مجھے بوجہ نیند کم آئی اور شاید ۴ گھنٹے سے زیادہ سو سکا ہوں۔ لہٰذا شب کو میرے چاروں لڑکے براہ ہمدردی میرے

کمرہ شب باشی میں رہے اور مولوی خلیق الدین نے بھی اس میں قیام کیا یعنی بیٹھے رہے اور شیخ سخاوت علی میرے کارندہ بھی میرے مکان ہی میں رہے اور میری حالت موجودہ کو دیکھتے رہے۔ تمام رات کھانسی بذریعہ ہچکی آتی رہی اور چند قسم کی ادویات یونانی استعمال ہوئیں جن سے شکایت ہائے لاحقہ رفع نہ ہوئی اور دو مرتبہ پانچ پانچ قطرے دوا ڈاکٹر برمن صاحب کلکتہ کی مجوزہ میں نے تھوڑے تھوڑے پانی میں پیے۔ مگر اس سے دیر میں فائدہ نظر آیا اور آج صبح کئی گھنٹے نیند کی پریشانی برداشت کر کے میں اٹھا اور جب حکمائے یونانی حکیم ظہور الحسن و حکیم اشفاق حسین نے مجھے دیکھ لیا۔ تب میں نے چاہا کہ میں سو رہوں لیکن افسوس کہ نیند نہ آسکی اگرچہ اس رات کو میں اپنی دنیائے دوں کو نہ چھوڑ سکا لیکن تاہم یہ رات پریشانی سے گزری۔

وفات ۲۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو سہ پہر بوقت تین بجے مولوی سید ظہیر علی ولد سید مظفر علی راقم روزنامچہ نے بعارضہ ضیق النفس انتقال کیا اور بوقت شب آٹھ بجے اپنی باغیچی میں حسب وصیت دفن ہوئے۔ مولوی صاحب نے اپنی سوانح عمری دو جلدوں میں لکھی تھی۔ پہلی جلد میں ۱۸۳۵ء سے ۱۸۹۰ء تک کے حالات ہیں اور یہ ۱۹۰۸ء میں شائع ہو گئی تھی۔ اور دوسری جلد ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ اس میں ۱۸۹۰ء سے ۱۹۰۳ء تک کے حالات ہیں۔ یادگار ظہیری مرحوم کا روزنامچہ ہے جو ۱۸ جنوری ۱۸۶۶ء سے تقریباً پینتالیس سال یعنی مولوی صاحب کے یوم وفات تک بلاناغہ لکھا گیا۔ یہ روزنامچہ اٹھارہ جلدوں پر مشتمل ہے جس کے صفحوں کی کل تعداد ۹۹۰۰ ہے اور یہ مولوی صاحب کے خاندان میں تمام و کمال موجود ہے۔ اس کا انتخاب ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا تھا۔ مندرجہ بالا چند واقعات جن سے مرحوم کی ذاتی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی سے پیش کیے گئے ہیں۔

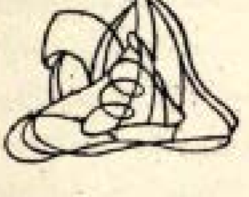

منیر شکوہ آبادی

(منظوم آپ بیتی)

نام و نسب

اب آیا وقت اے نطقِ گہر بار ــ کہ کر نام و نسب اپنا تو اظہار
خدا اول سے ہے میرا مؤید ــ کیا مجھ کو شریکِ قومِ "سیّد"
"شکوہ آباد"[1] اک قصبہ ہے آباد ــ وہی ہے مسکنِ آبا و اجداد
سنبھالا ہوش جا کر لکھنؤ میں ــ ہوا گلچیں ریاضِ گفتگو میں
جنابِ والدِ مرحوم و مغفور ــ کہ تھا احمد حسین[2] اسم ان کا مشہور
معزز تھے وہ اس قصبہ میں سب سے ــ رہے مشہور "منشی" کے لقب سے
خدا دے رتبۂ عالی و برتر ــ رہیں جنت میں ہمراہِ پیمبر
بحمد اللہ ہے یہ شہرۂ عام ــ کہ میرا "سید اسماعیل" ہے نام
تخلص ہے منیرؔ از بسکہ مشہور ــ برنگِ مہرِ تاباں مطلعِ نور

ذوقِ شعر و سخن و شاگردی

چل اے ذہنِ رسا ہو عرش پرواز ــ کہ ابوابِ فلک ہیں شام سے باز
توجہ جانبِ لوح و قلم کر ــ خطِ باطل ملائک پر قلم کر
شبِ معراجِ افکارِ رسا ہے ــ درِ گنجِ معانی آج وا ہے
فروغِ روشنانِ آسماں دیکھ ــ عبادت میں صفوفِ قدسیاں دیکھ
نہیں بجز حمدِ حق ان کا تکلم ــ سحر تک رہتے ہیں بیدار انجم

---

[1] شکوہ آباد ضلع مین پوری میں ایک مشہور قصبہ ہے۔ [2] حضرت منیر شکوہ آبادی کا سلسلۂ نسب امام علی نقی تک پہنچتا ہے۔ ان کے والد سید احمد حسین شاہ تھے جو میرزا اسود کے شاگرد تھے۔ ان کا انتقال سنہ ۱۲۵۰ھ میں شکوہ آباد میں ہوا۔

مشاہدِ قدرتِ ربِّ علا کے
تماشائی اسی عبرت سرا کے
ازل سے سالکِ راہِ رضا ہیں
مطیعِ خالقِ ارض و سما ہیں
اِدھر ہے جلوہ گر بزمِ ملائک
کوئی ہے ان میں رضواں کوئی مالک
ہمائے عالمِ علوی ہے کوئی
ریاضِ قدس کا طوطی ہے کوئی
کوئی ہے بلبلِ سدرہ نشیمن
کسی کا سایۂ طوبیٰ ہے مسکن
کہیں ہے محفلِ تسبیح و تقدیس
کہیں ہے مستفیضِ بزمِ برجیس
کہیں گنجورِ الفاظ و معانی
جواہر سنجِ اسرارِ نہانی
قریبِ عرش کھولے ہیں خُدا نے
مضامینِ نفیسہ کے خزانے
خدا کی خاص دولت لُٹ رہی ہے
عجب نایاب نعمت لُٹ رہی ہے
معانی و مضامین کے جواہر
لُٹے ہیں آج مدّاحوں کی خاطر
ملائک دیتے ہیں یہ مژدہ گویا
کہاں ہیں گوہرِ معنی کے جویا
تامّل کیا ہے لوٹ اے فکرِ عالی
خزانے یہ نہیں ہونے کے خالی
کمیتؔ و دعبلیؔ و حسّانؔ ، فرزدقؔ
یہی ہیں مقتدا اس فن کے الحق
اِدھر فردوسیؔ و سعدیؔ کی کیا بات
نظامیؔ ، خاقانیؔ ، فیضیؔ کی کیا بات
کلیمؔ و خسروؔ ، جامیؔ و ناظمؔ
مگر جو زلیخا کا ہے ناظم
یہ سب غوّاصِ بحرِ مثنوی ہیں
ہم ان کے گردِ راہِ پیروی ہیں
مگر جس کوچہ کا بندہ ہے سالک
رفیعِ باذلؔ ایک اس کے ہیں مالک
ادب سے وزن اُن کا گو کہ چھوڑا
تتبّع سے ولیکن منہ نہ موڑا
مطالب سے جو کی باذلؔ کی تقلید
کچھ ان کی رمز نے کی میری تائید
جنابِ شیخ[1] ناسخؔ بحرِ مواج
ملی اُردو زباں کو جن سے معراج
سراجِ نظم ان کی مثنوی ہے
اسی سے بازوئے ایماں قوی ہے
مفصّل کی حدیثِ پاک مضموں
ہوئی اس مثنوی میں خوب موزوں

---

[1] جناب منیر شکوہ آبادی نے اپنے اُردو دیوان "منتخب العالم" (۱۲۶۴ھ) کے شروع میں جو فارسی دیباچہ لکھا ہے اس میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ پہلے ناسخ سے بذریعہ خط و کتابت اصلاحِ سخن لیتے تھے جب وہ کانپور میں نظام الدولہ کی ملازمت میں تھے اور شیخ ناسخ وہاں پہنچے۔ وہ ان کی قدم بوسی کے لئے گئے اور ان ہی کی ہدایت سے وہ رشک لکھنوی سے بھی مشورۂ سخن کرنے لگے۔ منیر دونوں بزرگوں کا بہت ادب و احترام کرتے تھے

جناب رشک فردوس آشیاں نے　　شہ اقلیم معنوی وبیاں نے
اسی صورت کی ہے نظمِ خوشتر　　حدیثِ رجعتِ آلِ پیمبر
امیرِ پاک گوہر اور کامل　　کتاب ان کی ہے معراج الفضائل
یہ اردو میں آئمہ کے ہیں مداح　　جہانِ مثنوی گوئی کے سیاح

اساتذہ کی تعریف

یکتائے عصر و عالم و فاضل جناب رشک　　علامہ و محققِ کامل جناب رشک
استادِ شاعرانِ جہاں سیدِ جلیل　　محتاط و عابد و متوکل جناب رشک
اردو لغات قاعدۂ فنِ شاعری　　طے کر چکے تمام منازل جناب رشک
دیوان تینوں مصحفِ اعجازِ نظم ہیں　　رد کر چکے ہیں جادوئے بابل جناب رشک
سوئے بہشت حضرت ناسخ رواں ہوئے　　جب ہو چکے اُستاد کے کامل جناب رشک
تاریخ تھے آفتابِ سپہرِ کمال کے　　برجِ علوم کے مہِ کامل جناب رشک
کیونکر نہ میری قدر زیادہ ہو اے منیر
سمجھا گئے تمام مسائل جناب رشک

سفرِ کلکتہ

کلکتہ کو میں ڈاک سے جاتا ہوں اے منیر　　فکرِ غزل ہے راہ میں کیا خوب بات ہے

لکھنؤ کی یاد

منیر لکھنؤ میں[1] چل کے دیکھو قیصر باغ　　ہوائے گلشنِ جنت اگر دماغ میں ہے

قید[2]

فرخ آباد[3] اور یارانِ شفیق　　چھٹ گئے سب گردشِ تقدیر سے

---

[1] منیر لکھنؤ میں کچھ عرصہ تک نواب علی اصغر خان، سید باقر علی خاں اور نواب سید محمود ذکی کی ملازمت میں رہے۔ نواب تجمل حسین خاں کے ساتھ فرخ آباد میں بھی کچھ دن قیام کیا۔ نواب علی بہادر خان والی باندہ کی ملازمت میں رہے۔ سنہ ۱۸۶۹ء میں قید سے رہائی کے بعد نواب کلب علی خاں خلد آشیاں کے دربار میں ملازم ہوئے۔　(۲، ۳ کا حاشیہ اگلے صفحے پر)

گئے باندہ میں مقید ہو کے ہم — سو طرح کی ذلت و تحقیر سے
اک مرا شاگرد تھا اس شہر میں — پھل وہ پائے گلشنِ توقیر سے
مظفر خاں کا جزوِ اوّل کر وزیر — نام اس کا جان اس تقریر سے
کیں سعادت مندیاں اس نے بہت — رہ گیا عاجز مری تقدیر سے
جس قدر احباب خالص تھے وہاں — در گزر کرتے نہ تھے تدبیر سے
پر کہوں کیا کاوشِ اہلِ نفاق — تھے وہ خونریزی میں بڑھ کر تیر سے
شمر کا خنجر زبانیں ان کی تھیں — قتل کرتے تھے مجھے تزویر سے
مصطفےٰ بیگ ایک صاحب ان میں تھے — کج روی میں بڑھ کے چرخِ پیر سے
کچھ شدائد قید کے کہہ دوں اگر — خوں ٹپکے ہر لبِ تقریر سے
باندے کے زنداں میں لاکھوں ستم — سہتے تھے ہم گردشِ تقدیر سے
کوٹھڑی تاریک پائی مثلِ قبر — تنگ تر تھی حلقۂ زنجیر سے
بول و غائط کی جگہ بستر کے پاس — تھی نجس تر خانۂ خنزیر سے
پانی تھا نایاب مثلِ آبرو — چاہتے تھے خنجر و شمشیر سے
مثلِ گوہر جانتے اس کو عزیز — قطرۂ پیکاں جو تھا تیر سے
کیا تیمم کیا وضو ممکن نہ تھا — کیسے طاہر رہتے کس تدبیر سے
ترک افیوں سے اذیت جو ہوئی — ہے فزوں اندازۂ تحریر سے
گالیاں تھیں کھانے کو یا زخم و داغ — تھا یہ حاصل بیخِ تقدیر سے
روٹیاں گوبر کی گویا ملتی تھیں — نانِ گندم تھی سوا اکسیر سے
گھاس ترکاری کے بدلے تھی نصیب — خشک تر تھی سبزۂ شمشیر سے
کرکری بدبو کثیف و بے نمک — سرد تر تھی وہ مزاجِ پیر سے

(پچھلے صفحے کا حاشیہ) [1] منیر کی قید کا واقعہ صحیح ہے۔ یہ واقعہ تذکروں میں دو طرح سے ملتا ہے:
۱۔ غدر کے بعد ایک رنڈی نواب جان کے قتل کی سازش میں ان پر مقدمہ قائم ہوا اور کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی (تاریخِ ادبِ اردو [illegible])
۲۔ جنرل وٹ لاک کی سرکردگی میں اپریل ۱۸۵۸ء میں باندہ پر فوج کشی ہوئی۔ ۲۰ اپریل ۱۸۵۸ء کو انگریزی فوج نے باندہ پر قبضہ کر لیا۔ مرزا ولایت حسین اور منیر فرخ آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ ادھر نواب گرفتار ہوا۔ ادھر راستے میں یہ دونوں پکڑے گئے (لکھنؤ کا دبستانِ شاعری [illegible])

[2] قطعہ تاریخ مصائبِ قید و حالاتِ زندان از باندہ و الٰہ آباد تا کلکتہ)

تھا بچھونا ٹاٹ کمل اوڑھنا ۔۔۔ گرم تر پشمینۂ کشمیر سے
کوٹھڑی گرمی میں دوزخ سے فزوں ۔۔۔ دست و پا بدتر تھے آتشگیر سے
کانپتے تھے موسم سرما میں یوں ۔۔۔ جیسے عریاں سردی کشمیر سے
محنت و مزدوری و تکلیف و رنج ۔۔۔ تھا زیادہ حیطۂ تحریر سے
اس جہنم کے موکل سب کے سب ۔۔۔ دشمنی رکھتے تھے بے تقصیر سے
قائل اشراف اہل علم تھے ۔۔۔ رنج پہنچاتے تھے ہر تدبیر سے
بے مروت بے حیا اہل دغا ۔۔۔ کج طبیعت ہر جوان و پیر سے
ان کے ہونٹوں نے خلش کے واسطے ۔۔۔ باتیں سیکھی تھیں زبان تیر سے
جہل میں ٹھگ بدیا میں بے بدل ۔۔۔ نقد جاں تک چھین لیں تزویر سے
کاہ سے اٹھوائیں وہ کوہ گراں ۔۔۔ ورنہ گزریں کوک بے شیر سے
پھر الٰہ آباد میں بھجوا دیا ۔۔۔ ظلم سے تلبیس سے تزویر سے
تنگ تلواریں کھچی تھیں گرد و پیش ۔۔۔ نوکیں سنگینوں کی بدتر تیر سے
پھر ہوئے کلکتہ کو پیدل رواں ۔۔۔ گرتے پڑتے پاؤں کی زنجیر سے
ہتھکڑی ہاتھوں میں بیڑی پاؤں میں ۔۔۔ ناتواں تک قیس کی تصویر سے
بے حواس و بے لباس و بے نوا ۔۔۔ دل گرفتہ جور چرخ پیر سے
نقشہ کلکتہ میں کھچوایا مرا ۔۔۔ رنگ منہ کا اڑ گیا تصویر سے
کالے پانی میں جو پہنچے یک بیک ۔۔۔ کٹ گئی قید ستم تقدیر سے

یہ بھی تاریخ ہم نے اے حقیر
صاف نکلے خانۂ زنجیر سے
۱۲۷۷

کالے پانی کی قید

اسیر ہو کے جو ہم آئے کالے پانی میں[1] ۔۔۔ ہوئی مصائب و آلام کی فراوانی
محال شرح ہمارے ہی اس مصیبت کی ۔۔۔ اگر بیاں کریں مل کے انسی و جانی
برہنگی میں مگر سب سے تھی سوا تکلیف ۔۔۔ وبال دوش ہوا تھا لباس انسانی

---

[1] قطعۂ تاریخ در حال سرقت لباس پوشیدنی۔

شفیق بندہ ولایت حسین مرزا نے   کہ ہیں وہ دوست قدیمی برادر جانی
بنا دیئے مجھے کپڑے بڑے تردد سے   چھپا دیئے مرے بالکل عیوب جسمانی
ہنوز صرف میں ابھی اس قدر نہ آئے تھے   چرا کے لے گئے غارت گران زندانی
یہاں کے چور وہ شاطر ہیں جن کی زوری میں   چرالیں آنکھ نہ سمجھے نگاہ انسانی
وہ دست برد دکھائیں وہ اپنی ایسی کہ   اجل نہ پائے کبھی نقد جان قربانی
کمند وحشت کی ہو احتیاج اگر ان کو   اڑا ہی لائیں رم آہوے بیابانی
تونگری جو وہ پائیں کسی کی قسمت سے   چرالیں غیب سے مضمون خط پیشانی
تراش لائیں نقاط نجوم دم بھر میں   نہ بچنے پائے بیاض سپہر افشانی
گہر سے آنسوؤں کو اپنے مثل آئینہ   یہ لوگ آنکھ چرا لینے میں ہیں لاثانی
سحاب تیرہ بنیں یا کسوف بن جائیں   جو جام مہر سے پائیں بھنے کا پانی
برہنہ مثل حباب تم بنا دیا سب کو   اتار لے گئے بالکل لباس انسانی

یہاں کی چوری کی تاریخ کہہ دی ہاتف نے
وہ کہنہ دزد چرا لیں گے ثوب عریانی
۱۲ ھ ۷ ۹

تاریخ رہائی

آج میں نے قید سے پائی رہائی اے خبیر   فضل حق سے یہ خوشی کی دور پھر مسعود ہو
اس جزیرے سے سوئے کلکتہ ہوتا ہوں رواں   اے خدا ہندوستاں کا اب سفر مسعود ہو
آکے بیٹھا ہوں جہاز تیز رو پر شکر ہے   لنگر اٹھا، ساعت فتح و ظفر مسعود ہو
مادہ منظور ہے کہنا دعائیہ مجھے   نیک ساعت ہو کہ آپ کی نظر مسعود ہو

آج کے دن کی ہے یہ تاریخ صوری معنوی
روز شنبہ نیمۂ ماہ صفر مسعود ہو
۱۲ ھ ۸ ۲

ہندوستان میں واپسی

تھے قید ہم جزیرۂ دریائے شور میں   نیرنگ گردش فلک نیلہ رنگ سے
خوش تھے عملہ میں کمشنر کے ہم وہاں   محفوظ تھے مشقت و جیل و کلنگ سے
انعام میں معاف ہوئے ہم کو دو برس   شکر خدا رہا ہوئے کام نہنگ سے

ہندوستاں میں لگنے لگے ہم پراگ میں　　اب کانپور جاتے ہیں دل کی امنگ سے
مشتاق ہیں لقائے جناب عروج کے　　طے راہ شوق کرتے ہیں جست و شلنگ سے
کرتے ہیں صید آہوئے مضموں کو راہ میں　　پایا فراغ صحبتِ گرگ و پلنگ سے
فضلِ خدا سے سالِ رہائی کہو منیر
اب ہم گھر آئے چھوٹ کے قیدِ فرنگ سے
۱۲۸۲ھ

ولادت

۱۲۲۹ھ مطابق ۱۸۱۳ء میں ہوئی۔

تصانیف

۱۔ منتخب العالم (۱۲۶۴ھ) دیوان اول
۲۔ تنویر الاشعار (۱۲۸۰ھ) دیوان دوم
۳۔ نظم منیر (۱۲۹۰ھ) دیوان سوم
۴۔ معراج المضامین (۱۲۸۶ھ) مذہبی مثنوی
۵۔ حجاب زناں　　اخلاقی مثنوی
۶۔ داستان موسوم بطلسم گوہر (تکملہ بالا باختر) سرکاری کتاب خانہ رامپور میں موجود ہے۔

وفات

۵۔ رمضان المبارک ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۲/اگست ۱۸۸۰ء کو جمعہ کے دن رام پور میں عام وبائے ہیضہ سے انتقال کیا اور مقبرہ لاڈلی بیگم میں دفن ہوئے۔ انتقالِ منیر عالی قدر (۱۲۹۷ھ) سے تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے۔

(مرتبہ: کسریٰ منہاس)

---

[۱] خاندان میر انیس کے مشہور مرثیہ گو سید خورشید حسن عروج سے مراد ہے جو طرزِ مرثیہ خوانی میں لاجواب تھے۔ میر نفیس کے صاحبزادے تھے اور دولہا صاحب کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ آپ کا انتقال سنہ ۱۹۳۱ء میں ہوا۔

سر سید رضا علی

پیدائش ———— ۲۹ر مئی ۱۸۸۰ء

میرا خاندان رضوی ہے اور ہم امام علی رضا کی اولاد ہیں جن کے ساتھ مامون الرشید نے ازراہ عقیدت اپنی بیٹی کا عقد کر دیا تھا۔ عباسیوں کو یہ حرکت ناگوار گزری۔ بنی فاطمہ کو وہ اپنا دشمن سمجھتے تھے جس قدر وقار امام علی رضا کا مامون کی نظر میں بڑھتا گیا، ان عباسیوں کی سازشیں جو اپنے کو خلافت کا وارث سمجھتے تھے، گہری ہوتی گئیں۔ بالآخر زہر دے کر اس مقدس زندگی کا صفر ۲۰۳ھ میں خاتمہ کر دیا۔

ہمارے جد امجد سید محمد اکرم صاحب مشہد کے رہنے والے تھے۔ ہمایوں بادشاہ ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ سے شکست کھا کر مدد کے لیے شاہ ایران کے پاس پہنچے اور ایرانی فوج کی مدد سے واپس پھر دوبارہ ہندوستان پر قابض ہوئے۔ ہمایوں کے دوسرے دور میں سید محمد اکرم ہندوستان آئے۔ اور آگرہ میں جو اس وقت دارالسلطنت تھا، قیام کیا۔ ان کے پوتے سید محمد ابراہیم جو مشہد میں پیدا ہوئے تھے شاہجہان کے عہد میں ہندوستان آئے اور عرصہ تک آگرہ میں قاضی رہے۔ وہیں وفات پائی جہاں آپ کا مزار اب تک موجود ہے۔

قاضی سید محمد ابراہیم کے بیٹے قاضی سید عبدالرزاق بذریعہ فرمان شاہی عہدۂ قضا پر مقرر ہوئے اور سرکار سنبھل میں اس نواح کے قاضی قرار پائے جو مراد آباد سے دس بارہ میل جنوب میں واقع ہے۔ ان اطراف کی سب سے بڑی آبادی قصبہ کندرکی میں تھی جس سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر شیخ پور آباد تھا۔ قاضی سید عبدالرزاق صاحب بڑے صاحب علم بزرگ تھے۔ عہدۂ قضا کے فرائض بڑی آزادی سے انجام دیتے تھے۔ موصوف نے کندرکی میں پختہ مسجد تعمیر کی، اور قصبہ سے آدھ میل کے فاصلہ پر جو گاؤں آباد کیا تھا اس کا نام قاضی پورہ ہے۔

دادا صاحب کا نام میر ہادی علی تھا۔ مراد آباد میں تعلیم حاصل کی۔ خاندانی مذہب شیعہ تھا، مگر غالب ہے کہ زمانۂ طالب علمی میں دادا صاحب نے سنی مذہب اختیار کیا تھا۔ تفضیلیہ سنی تھے۔ دادا صاحب کے بڑے بیٹے میرے والد سید واجد علی آخر ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ جب غدر شروع ہوا ہے تو والد کی عمر چھ مہینے کی تھی۔ دادا صاحب نے ۱۸۶۸ء میں بڑے بیٹے کو انگریزی تعلیم دلائی اور گو توقعات پوری نہ ہوئیں۔ پھر بھی دوسرے بیٹے یعنی میرے چچا میر رضا علی کو بھی گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل کرایا۔

میری ننھیال موضع نگریا سادات ضلع بریلی میں تھی اور میرے لیے یہ فخر کی بات ہے کہ میں باپ کی طرف سے قصباتی اور ماں کی طرف سے دیہاتی ہوں۔ میرے نانا کا نام میراں برکات حسین تھا۔ ان کے والد میراں ذوالفقار علی اپنے زمانے میں اس نواح میں بہت اثر رکھتے تھے۔ بڑے خوش نویس تھے۔ علمی استعداد بھی اچھی تھی۔ میرے ننھیال کا سلسلۂ نسب امام جعفر صادق سے ملتا ہے جو امام ابو حنیفہ کے استاد تھے۔ نانا صاحب ضبطی اودھ سے پہلے واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی فوج میں افسر تھے۔ اودھ کی ضبطی پر وطن چلے آئے اور گھر کا کاروبار سنبھالا۔

میں ۲۹ مئی ۱۸۸۰ء کو قصبہ کندرکی میں پیدا ہوا۔ میری پیدائش کے ایک سال پہلے دادا صاحب نے پختہ دو منزل کا مکان بنایا تھا۔ دو منزلہ ہونے کے باعث یہ مکان سادات کے سب مکانوں سے اونچا تھا۔ اسی مکان میں میری پیدائش ہوئی۔ میرے بچپن میں اس مکان کو لوگ محل میر ہادی

کامل کہتے تھے۔ مکان بہت بڑا نہیں ہے۔

میں اپنے والدین کی پہلی اولاد، دادا کا اکلوتا پوتا اور نانا نانی کا اکلوتا نواسا تھا۔ دنیا کی سب ماؤں کو اولاد آنکھ کا تارا ہوتی ہے۔ لیکن خدا بخشے والدہ کو جو محبت مجھ سے تھی۔ اس کی مثالیں اپنی زندگی میں تین چار سے زیادہ میں نے نہیں دیکھیں۔ میں منہ چڑھا بچہ نہ تھا۔ مگر ددھیال اور ننھیال کی محبت اور ماں کے لاڈ پیار نے تنک مزاج بنا دیا تھا۔

دادا صاحب نے میرا نام محمد عبدالجلیل تجویز کیا تھا۔ چاہتے تھے کہ مجھے عربی پڑھائیں اور میں مولوی بنوں۔ مگر والدہ صاحبہ کو یہ نام پسند نہ آیا۔ فرمایا کہ یہ تو بڈھوں کا سا نام ہے۔ میرے بیٹے کا نام عبدالجلیل نہ رکھوں گی۔ والدہ صاحبہ نے میرا نام رضا علی رکھا۔ دادا صاحب اپنی رائے پر قائم رہے۔ والدہ صاحبہ فرمایا کرتی تھیں کہ دادا صاحب مجھے گود میں لے کر اچھالتے اور فرماتے کہ محمد عبدالجلیل کیسا اچھا نام ہے۔ میرا پوتا مولوی ہوگا۔ لوگ اسے مولوی محمد عبدالجلیل کہہ کر پکاریں گے۔ بالآخر ماں کی ممتا نے دادا کی شفقت پر غلبہ پایا۔ اور مجھے رضا علی نام ملا۔ والدہ صاحبہ اردو بہت اچھی لکھتی تھیں۔ کسی قدر فارسی بھی جانتی تھیں۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتی تھیں۔

میری بسم اللہ پانچویں سال میں ہوئی اور میں نے پڑھنا شروع کر دیا۔ بسم اللہ میاں جی عزیز الدین نے پڑھائی تھی۔ موصوف اس مسجد کے امام بھی تھے جو دادا صاحب کے کھنڈسار کے کارخانے کے قریب تھی۔ پھر تخمیناً دو سال تک فارسی منشی عشرت علی سے پڑھی۔ آمد نامہ، کریما، مامقیماں، اور حکایات لطیف موصوف نے مجھے پڑھائے تھے۔ میرا ذہن اور حافظہ اچھا تھا۔ استاد مجھے ہونہار سمجھتے تھے۔ یہ خوب یاد ہے کہ جس دن صبح کو دیر سے سو کر اٹھتا تھا غل شور کرتا۔ اور روتا تھا کہ مجھے پہلے کیوں نہ جگایا۔ مکتب جانے کو دیر ہو جائے گی۔ میں شریر بالکل نہیں تھا۔ چھ سات سال کی عمر میں گیارہ بارہ سال کی عمر کے لڑکے جیسی متانت تھی۔ ایک شرارت ضرور کرتا تھا۔ ہمارا گھرانا دولت مند نہ تھا۔ مگر جب تک دادا صاحب زندہ رہے فارغ البالی سے گزر ہوتی تھی۔ اچھا خرچ تھا۔ میں اس تاک میں رہتا تھا کہ جو کھانا ہمارے گھر عموماً پکتا تھا۔ اس میں آج کون چیز نہیں پکی ہے مثلاً ایک وقت ترکاری نہ ہوتی تو میں والدہ صاحبہ سے کہتا کہ میرا جی تو شلغم کا قلیہ کھانے کو چاہتا ہے۔ وہ سن کر بہت افسوس کرتی اور کہتی تھیں کہ مجھے کیا معلوم تھا۔ کہ میرا بچہ ترکاری کھائے گا۔ اب اس کا جی میلا ہوگا۔ خبر نہیں پڑوس میں کہیں ترکاری پکی ہے یا نہیں۔

دوسری حرکت میں یہ کرتا تھا کہ جب کوئی بات مجھے زیادہ ناگوار ہوتی تھی تو بھوک ہڑتال کر دیتا تھا یعنی کھانا نہ کھاتا تھا۔ باپ اور ماں دونوں پریشان ہو جاتے تھے اور چاہتے تھے کہ میں فاقہ کشائی کروں۔ والد صاحب زیادہ لاڈ پیار کے قائل نہ تھے۔ ان کا خیال تھا اور بجا خیال تھا کہ بے جا ناز برداری سے بچے بگڑ جاتے ہیں۔ مگر والدہ صاحبہ میری ہڑتال کے زمانے میں کانٹوں پر لوٹتی تھیں۔ عزیزوں کو بلاتی تھیں کہ رضی (میرا پیار کا نام تھا) کو سمجھاؤ۔ والد صاحب سے خفا ہو جاتی تھی کہ بچہ بھوکا ہے اور تمہارے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ جب تک میں کھانا نہ کھاتا، خود بھی فاقہ سے رہتی تھیں۔ اب یہ باتیں یاد کر کے ہاتھ ملتا ہوں اور اپنے کو ملامت کرتا ہوں۔

۱۸۸۶ء میں دادا صاحب کی وفات کے بعد والدہ صاحبہ نے میری تعلیم مولوی سید اسد حسین مرحوم ساکن کندرکی کے سپرد کی اور ہمارے مردانہ مکان میں میرے لیے مکتب کھولا۔ مرحوم کی فارسی استعداد اچھی تھی۔ شعر بھی کہتے تھے۔ الفت تخلص تھا۔ ان کے انتقال کے بعد مکتب کے مولوی محمد حسین مقبول مقرر کیے گئے۔ موصوف بڑے ذکی الطبع، اردو فارسی کی اچھی عبارت لکھنے والے اور بڑے خوش خط تھے۔ میں نے فارسی کی اونچی درسی کتابیں مثلاً ابوالفضل و پنج رقعہ ان سے پڑھیں۔ فارسی اور اردو کی عبارت لکھنا اور خوش خطی میں ان

سے کیں۔ مولوی مقتول شاعر بھی تھے۔ ایک غزل کے مقطع کا آخری مصرع یاد رہ گیا ہے ؎

میں ہوں مقتول، تو قاتل ہے، جہاں جاتا ہے

مولوی مقتول کے مراد آباد چلے جانے کے بعد میرا نام کندرکھی کے اردو پرائمری مدرسے میں درج کرا دیا گیا۔ وہاں کی خاص تعلیم جس کا مجھ کو فائدہ پہنچا یاد نہیں۔ میں نے جلد تیسرا درجہ جو ہمارے مدرسہ کا سب سے اونچا درجہ تھا، پاس کر لیا۔ پھر وظیفہ یعنی اسکالرشپ کے امتحان میں بیٹھا۔ کچھ دن بعد معلوم ہوا کہ میں کامیاب ہوا۔ اور اگر مراد آباد جا کر اردو مڈل کے مدرسے میں داخل ہو جاؤں تو مجھے دو روپے ماہوار وظیفہ ملے گا۔ میں نے وظیفہ لینے اور مڈل اسکول میں پڑھنے سے انکار کر دیا۔

اسی زمانہ میں مجھے تحت اللفظ مرثیہ خوانی کا شوق پیدا ہوا۔ دبیر، انیس، مونس اور انس کے مطبوعہ مرثیوں کی جلدوں میں سے مرثیوں کا خود انتخاب کر کے اپنے قلم سے مرثیے نقل کر لیتا تھا۔ عشق، خلیق، فصیح، اوج اور نفیس کے چیدہ مرثیے اور سلام بھی بعض رشتہ داروں کی شفقت سے مجھے مل گئے تھے۔ میں مجلسیں پڑھتا تھا۔ قصبہ والوں نے پڑھنے کی داد دے کر میری ہمت اس قدر بڑھائی کہ میں نے مراد آباد جا کر بھی مجلسیں پڑھیں۔ مرثیہ خوانی کا میرے ادبی مذاق پر بہت اثر پڑا۔

کندرکھی کا سرکاری اردو مدرسہ چھوڑنے کے بعد میں آٹھ دس مہینے بیکار رہا۔ اس عرصہ میں والد صاحب نے چند مرتبہ رائے دی کہ میں انگریزی پڑھنے کے لیے مراد آباد چلا جاؤں۔ مگر انگریزی تعلیم کی اہمیت کا اس وقت مجھے اندازہ نہ تھا۔ مذہبی جوش سر پر سوار تھا۔ اس بیکاری کے زمانہ میں یہ تین شغل تھے۔ نماز پڑھنا، مرثیہ پڑھنا یا مرثیوں کی کتابت کرنا، اور سنی شیعوں کے مذہبی مناظروں کی کتابیں پڑھنا۔ اسی زمانہ میں چھوٹے چچا صاحب عربی پڑھنے مراد آباد گئے۔ میرے مذہبی جوش نے گوارا نہ کیا کہ وہ عربی پڑھیں اور میں اس دولت سے محروم ہو جاؤں۔ اکتوبر ۱۸۹۱ء میں میں نے والد صاحب سے اپنا عربی پڑھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اور آٹھ دس دن بعد مولوی بننے اور عربی پڑھنے کی غرض سے مراد آباد چلا گیا۔

میں نے شوق میں عربی شروع تو کر دی مگر جی نہ لگا۔ عربی کا طریقہ تعلیم نہایت قابل اعتراض ہے۔ صرف و نحو کی تعلیم میں بہت سا بیش قیمت زمانہ لگ جاتا ہے۔ اور پانچ چھ سال پڑھنے کے بعد بھی طالب علم عربی کے جملے ٹھیک نہ بول سکتا ہے نہ لکھ سکتا ہے۔ آٹھ دس مہینے میں بڑی دشواری سے منشعب تک پہنچتے پہنچتے میرے صبر کا پیالہ لبریز ہو گیا اور مجھے عربی چھوڑنا پڑی۔

مولوی محمد حسین مقتول سے میں نے بارہ سال کی عمر میں انگریزی پڑھنا شروع کی۔ مولوی مقتول کندرکھی سے چلے آنے کے بعد اپنے گھر پر پڑھاتے تھے اور میں صبح اور سہ پہر کو دونوں وقت ان کے گھر جا کر درس لیتا تھا۔ ستمبر ۱۸۹۳ء میں میرے والد کے دوست پنڈت پرتاپ کشن صاحب مجھے گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل کرانے گئے۔ ۱۸۹۶ء میں میں نے انگریزی مڈل کا امتحان اول درجہ میں پاس کیا بلکہ سررشتہ تعلیم چار روپے ماہوار کا وظیفہ یا اسکالرشپ بربنائے قابلیت دیتا تھا۔ مجھ کو بھی یہ وظیفہ ملا۔ صوبہ میں میرا نمبر بائیسواں تھا۔

مڈل پاس کرنے کے بعد مجھے اطمینان کی پڑھائی نصیب نہ ہوئی۔ بار بار نگریا سادات جانا پڑتا تھا۔ میں نے فارسی کا مضمون چھوڑ دیا تھا۔ اس کی بجائے سائنس یعنی فزکس کیمسٹری لی تھی۔ مجھے سائنس پڑھنے میں لطف آتا تھا مگر نگریا سادات کے آنے جانے نے ساری خواندگی میں خلل ڈال رکھا تھا۔ جوں توں کر کے مارچ ۱۸۹۸ء میں امتحان کے لیے ہم آگرہ روانہ ہوئے۔ اس زمانہ میں انٹرنس کا امتحان مراد آباد میں نہ ہوتا تھا۔ سرسید احمد خاں کے انتقال کی خبر ہم نے آگرہ میں سنی تھی۔ خبر سن کر مجھے افسوس نہیں بلکہ صدمہ ہوا تھا۔ جون میں انٹرنس کا نتیجہ آیا۔ میں دوسرے درجہ (سیکنڈ ڈویژن)

میں پاس ہوا۔ انٹر یا سادات گیا اور علی گڑھ جانے کی تیاریاں کیں۔

۲۸ جولائی ۱۸۹۷ء کو علی گڑھ پہنچا اور دوسرے دن کالج میں داخل ہو گیا۔ علی گڑھ سے مجھے وہ وظیفہ ملا جو ہونہار غریب طلبہ کو دیا جاتا ہے۔ کالج کی فیس، کمرہ کا کرایہ اور کھانے پینے کا سب خرچ ملا کر اور تمام وظیفہ مجرا کرنے کے بعد مجھے صرف سات روپے ماہوار کالج کو دینے پڑتے تھے۔ نیچے کچی بارک میں ستاون نمبر کا کمرہ ملا۔ اور بی اے پاس کرنے تک میں اسی کمرہ میں رہا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور بانی کالج کی روح کو دعا دی۔

جولائی کے آخر یا اگست کے شروع میں کالج کی سالانہ تعطیل ہوئی۔ میں کنڈکی پہنچا۔ والدہ نے شادی کا تقاضا پھر شروع کر دیا۔ پرانی منگنی چھوٹ چکی تھی۔ والدہ چاہتی تھیں کہ کسی اور جگہ میری شادی ہو جائے۔ میں جانتا تھا کہ شادی کرنا اپنے پاؤں میں کلہاڑی مارنا ہے۔ مگر ماں اور پھوپھی ماں کے حکم سے سرتابی مشکل تھی۔ انہوں نے میرا نکاح اپنے ایک عزیز کی لڑکی سے کرنا چاہا۔ میں یہ سمجھ کر کہ میری بیوی والدہ کی عزیز ہوگی تو ساس بہو کے جھگڑوں سے نجات ملے گی، راضی ہو گیا۔ اب دوسرا جھگڑا شروع ہوا۔ نکاح کے دن معلوم ہوا کہ والد صاحب اس رشتہ کے سخت مخالف ہیں۔ اگر مجھے پہلے معلوم ہو جاتا۔ تو میں اس جھگڑے میں نہ پڑتا۔ اب صورت یہ تھی کہ سب برادری کو معلوم ہو چکا تھا کہ نکاح ہونے والا ہے۔ میں نے سوچا ہر چہ بادا باد، اب زیادہ بدنامی اٹھانا مناسب نہیں۔ برادری کو اطلاع کرا دی کہ ۹ ستمبر ۱۸۹۸ء مطابق ۲۲ ربیع الثانی ۱۳۱۶ھ کی شام کو نکاح ہے۔ والد صاحب نکاح میں شریک نہیں ہوئے۔ بڑے چچا اور مجھلے چچا شریک ہوئے اور ضروری انتظامات دونوں صاحبوں نے خود کئے۔

اکتوبر کے آخر میں کالج کھلنے پر علی گڑھ پہنچا۔ مجھے اخبار اور کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ اس مناسبت سے بجائے فٹ بال اور کرکٹ کے میدان کے کالج یونین کو میں نے اپنی طبیعت کا جولانگاہ بنایا۔ میری خوش قسمتی سے سید سجاد حیدر، سردار محمد حیات خاں، حیدر حسن مرحوم تینوں کچی بارک میں رہتے تھے۔ بڑے صاحب مطالعہ تھے۔ کرکٹ، فٹ بال وغیرہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ تینوں علی گڑھ کی زندگی کے گہرے نقاد تھے۔ حیدر حسن اور سجاد حیدر بڑے بذلہ سنج تھے۔ محمد حیات کی شگفتہ مزاجی کا اظہار خاص خاص دوستوں کی سوسائٹی میں ہوتا تھا۔

فروری ۱۸۹۹ء کے تیسرے ہفتہ میں امتحان ایف۔ اے کا نتیجہ معلوم ہوا۔ جب والدہ نے دوبارہ رخصتی کا تقاضا کیا۔ تو میں اپنے دل میں کہا

ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

پڑھ کر راضی ہو گیا۔ اور رخصتی کی تاریخ ۱۱ مارچ ۱۸۹۹ء مطابق ۲۹ ذی قعدہ ۱۳۱۶ھ مقرر کر دی گئی۔ یہ تقریب بالکل سادہ طور پر منائی گئی۔ والد صاحب خفا۔ تلخی اور کدورت کی فضا اداس، بارات پریشان، برادری والے انگشت بدنداں، والدہ صاحبہ کے چہرے پر ہنسی مگر دل میں دھکڑ پکڑ۔ میں دولہا تھا مگر یہ سب حالتیں دیکھ کر حیران تھا کہ اس آغاز کا انجام کیا ہوگا۔ میری بیوی کا نام صغیر فاطمہ تھا۔ والدہ صاحبہ کے پھوپھی زاد بھائی کی بڑی بیٹی تھیں۔ جب رخصتی ہوئی تو اردو لکھنا پڑھنا سیکھ گئی تھیں کہ معمولی خط لکھ پڑھ لیں۔ بڑی بردبار اور نیک مزاج تھیں۔ ان کے والد کا نام سید شجاعت حسین تھا۔ رخصتی کے بعد میں تین دن گھر پر رہا اور پھر علی گڑھ چلا گیا۔

مارچ ۱۸۹۹ء کے وسط میں علی گڑھ پہنچ کر بی اے میں داخل ہو گیا۔ اب مجھے دس روپے ماہوار وظیفہ بربنائے قابلیت ملا۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اس زمانہ میں مسلمانوں کی سب سے بڑی جماعت تھی۔ دسمبر ۱۸۹۹ء میں کانفرنس کا اجلاس کلکتہ میں جسٹس سید امیر علی کے زیر صدارت ہو چکا تھا۔ نواب محسن الملک کی خواہش تھی کہ دسمبر ۱۹۰۰ء کا اجلاس پٹنہ میں منعقد ہو۔ لیکن پٹنہ والوں کو کانفرنس

سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی اسی لیے مجھے پٹنہ بھیجا گیا کہ وہاں کی تعلیم یافتہ جماعت اور با اثر حضرات کو آمادہ کروں کہ کانفرنس کو پٹنہ میں اجلاس منعقد کرنے کی دعوت دیں۔

جون ۱۹۰۰ء کے تیسرے ہفتہ میں نواب محسن الملک کا خط خان بہادر مولوی فضل امام کے نام لے کر میں پٹنہ پہنچا۔ اور یہ سمجھ کر کہ کانفرنس کو دعوت دینے کا بار تنہا ایک شخص پر نہ پڑے۔ میں نے اس شہر کے عمائد اور با اثر حضرات کی خدمت میں آنا جانا اور کانفرنس کو پٹنہ میں مدعو کرنے کی ضرورت پر گفتگو کرنی شروع کر دی۔

آخر جولائی میں کلکتہ پہنچا اور خان بہادر مرزا شجاعت علی بیگ کا مہمان ہوا۔ کلکتہ میں بہت سے حضرات نے مجھ سے علی گڑھ کالج کے حالات اور علی گڑھ تحریک کے اغراض و مقاصد دریافت کرنا شروع کیے۔ فرداً فرداً ہر شخص کے سوالات کا جواب دینے میں گھنٹے گزر جاتے۔ اس لیے میں نے علی گڑھ کے مختصر حالات انگریزی میں لکھ کر ایک پمفلٹ چھپوا لیا، جس کا نام تھا "بنگال پریذیڈنسی کے مسلمانوں کی خدمت میں اپیل"۔ یہ پہلا پمفلٹ تھا جس میں علی گڑھ کالج کے حالات شائع کیے گئے تھے۔

کلکتہ سے ڈھاکہ اور ڈھاکہ سے کلکتہ ہوتا ہوا پھر پٹنہ پہنچا اور کانفرنس کے کام کے لیے باقاعدہ دفتر کھول دیا۔ ۱۰ر اکتوبر سے کام خوب زور شور سے شروع ہو گیا تھا، اور امید تھی کہ پٹنہ کا اجلاس بڑا کامیاب رہے گا۔ مگر نومبر کے مہینے میں شہر میں طاعون شروع ہو گیا۔ ۲ر نومبر کو نواب صاحب کا تار آیا، کہ پٹنہ میں طاعون ہونے کے باعث باہر کے لوگ کثیر تعداد میں وہاں جانے پر آمادہ نہ ہوں گے۔ لہٰذا کانفرنس کا اجلاس بجائے پٹنہ کے رام پور میں ہوگا۔ ۳ر نومبر کو میں پٹنہ سے روانہ ہو کر دوسرے دن علی گڑھ پہنچ گیا۔

رام پور کے مدار المہام مولوی عبد الغفور تھے۔ نواب محسن الملک کی تحریک پر انھوں نے کانفرنس کو رام پور میں مدعو کیا۔ صدارت کے لیے نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی منتخب کیے گئے۔ میری بہار اور بنگال کی ناچیز خدمات کا اعتراف اس طرح کیا گیا کہ نواب محسن الملک نے مجھے اپنا آنریری پرائیویٹ سیکرٹری مقرر فرمایا۔ دسمبر کے آخری ہفتہ میں نواب محسن الملک مع احباب کے علی گڑھ سے روانہ ہو کر رام پور پہنچے۔ خاص باغ میں مہمانوں کی آسائش اور آرام کے لیے بہت بڑا کیمپ بنایا گیا تھا۔ خاص خاص مہمان کوٹھی میں ٹھہرے تھے۔ بقیہ حضرات ڈیروں میں ٹھہرائے گئے تھے۔ نواب محسن الملک کا سیکرٹری ہونے کے باعث مجھے بھی کوٹھی میں جگہ دی گئی تھی۔ کانفرنس کا یہ اجلاس بڑی شد و مد سے ہوا تھا۔

جب علی گڑھ واپس آئے چند دن ہوئے تھے کہ ملکہ وکٹوریہ نے وفات پائی۔ بی۔ اے کے پہلے سال کا بیشتر وقت اردو ناگری کے قضیہ اور بہار اور بنگال کے دورے کی نذر ہوا۔ جنوری ۱۹۰۱ء میں کالج کھلنے کے بعد میں نے باقاعدہ درجہ میں شرکت اور کتابوں کا مطالعہ شروع کیا۔ بی۔ اے کا امتحان مارچ ۱۹۰۱ء میں ہونے والا تھا اور اس زمانے میں الہ آباد ہوا کرتا تھا۔ مگر الہ آباد میں طاعون کا زور شور ہونے کی وجہ سے یہ طے پایا کہ علی گڑھ کے طلبا امتحان میں بمقام لکھنؤ شرکت کریں۔ امتحان کیننگ کالج میں ہوا۔ آخر جون ۱۹۰۱ء میں نتیجہ آیا جس سے مجھے دوسرے درجہ میں اپنے بی۔ اے پاس ہونے کا حال معلوم ہوا۔

میں نے ایل۔ ایل۔ بی اور ایم۔ اے دونوں درجوں میں اپنا نام لکھوایا۔ قانون کے پروفیسر پہلے مولوی سید کرامت حسین صاحب تھے جو جنوری ۱۹۰۸ء میں الہ آباد ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ پروفیسری سے مولوی صاحب کے استعفا دینے پر ان کی جگہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں

صاحب کا تقرر شروع ۱۹۳۰ء میں ہوا تھا۔ ایم۔ اے کی تعلیم کا کالج میں خاطر خواہ انتظام نہ تھا۔ میں نے اقتصادیات میں ایم اے کی ڈگری لینا چاہی۔ اس لیے یہ طے پایا کہ مسٹر ٹول (TOWER) جو سال ڈیڑھ سال پہلے ولایت سے علی گڑھ میں پروفیسر ہو کر آئے تھے مجھے ہفتہ میں چار دن پڑھایا کریں۔ وظیفہ بربنائے قابلیت دینے کے بارے میں جو برتاؤ سر ضیاءالدین نے میرے ساتھ کیا۔ اس کا احسان مندی کے ساتھ تذکرہ کرنا میرا فرض ہے۔ موصوف نے چالیس روپے ماہوار کا اسکالرشپ مجھے عنایت فرمایا تھا۔

نومبر ۱۹۳۰ء میں یونین کے انتخابات کا وقت آیا۔ اور یونین کے ممبروں نے زبردست کثرتِ رائے سے مجھے وائس پریذیڈنٹ منتخب کیا۔ مجھے وائس پریذیڈنٹ مقرر ہو جانے سے مسرت ہوئی۔ ہائے کیا زمانہ تھا۔ اور کیا صحبتیں تھیں۔ ؎

کیا دن مزے کے تھے کہ جو راتوں کو صبح تک
میں تھا تری جناب تھی دستِ سوال تھا!

ہماری صحبتوں میں معشوق ہی نہ تھا تو دستِ سوال کہاں سے پھیلاتے۔ مگر فرہاد کو کوہ کنی میں اور قیس کو صحرانوردی میں وہ لطف نہ آیا ہوگا جو ہمیں علی گڑھ میں حاصل تھا۔ اپریل کی چاندنی راتوں میں ہمارا ٹہلتے ہوئے قلعہ تک جانا۔ محمد حیات خاں کا ع

تیری کافر نظر سے خبرداری رہے کرتی نہ لایا ٹول کی

گانا۔ اور ہم سب کا ترنم کے ساتھ مناجات کے یہ شعر پڑھنا ؎

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین کہ بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

جو حال بنتا تھا۔ اس کا لطف کبھی گوہر جان اور نور جہاں کے گانے میں بھی نہ آیا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے زندگی بڑے لطف سے کٹی اور کٹتی ہے۔ اور تو اور غالب کا یہ شعر ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا!
درد کی دوا پائی، دردِ لا دوا پایا!

پورے طور پر میرے حال پر صادق نہ آتا ہو۔ لیکن میری زندگی میں اس کی بھی جھلک موجود ہے۔ میں شراب نہیں پیتا۔ مگر میری طرح پوری جوانی کو سیاسی زندگی میں اور خاص کر اس زمانے کی سیاسی زندگی میں بتانے سے خود بخود ایک بوتل کا نشہ ہو جاتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جینے کا مزہ بھی اسی وقت تک ہے جب تک بقول ریاض انسان کی یہ حالت رہے کہ ع

نہ پیے اور جھومتا جائے!

یہ سب مزے چکھے اور خوب چکھے۔ تاہم علی گڑھ کا لطف علی گڑھ کے ساتھ گیا۔ اور باتوں کو جانے دیجئے۔ تنہا ایک بات کو لیجئے۔ علی گڑھ میں دوستوں اور محبت کے اندر کوئی ذاتی غرض پنہاں نہ تھی۔ علی گڑھ چھوڑنے کے بعد دوست بہت سے مگر دوستی کا پتہ بہت

کم ہوا۔ زمانہ کی رفتار کہیے یا ہماری پرانی تہذیب و شائستگی کے زوال کا اثر، دوستی اور خورد نوازی ہم معنی الفاظ ہو گئے ہیں۔

ایل۔ ایل۔ بی کے امتحان کی کافی تیاری نہ کر سکنے کے باعث میں نے اس سال امتحان میں شرکت کا قصد ترک کر دیا تھا اور یہ بات مارلیس صاحب کو معلوم تھی۔ اگرچہ میرے اور استاد شفیق کے تعلقات ویسے ہی ہوتے جیسے عربی تعلیم کے مسئلہ پر اختلاف رائے پیدا ہونے سے پہلے تھے تو غالباً موصوف مجھے ذہنی تفکر سے آزاد کر دیتے۔ اور میرے نجی حالات نے جو صورت اختیار کر لی تھی، اس کے باعث میں نے بمشکل واقتضاں کے ساتھ یہ عہدہ قبول کر لیا۔ تاہم میں استاد شفیق کا احسان مند ہوں کہ جب مسٹر ایل۔ جی۔ ایوانس ڈسٹرکٹ جج سہارنپور نے اپنے اجلاس کی پیش کاری کے لیے مارلیس صاحب سے علی گڑھ کا ایک تعلیم یافتہ نوجوان مانگا تو موصوف نے میری سفارش کی۔ چند دن بعد ایوانس صاحب کا خط ملا جس میں لکھا تھا کہ اپریل کے دوسرے ہفتہ میں سہارنپور پہنچ کر میں اپنے عہدہ کا چارج لے لوں۔ میرے ساتھیوں کو تعجب تھا کہ میں ملازمت کرنے اور ایسی چھوٹی جگہ منظور کرنے پر کیسے تیار ہو گیا۔ تیرا احوال مردہ جانتا ہے۔ دوسروں کو اس حال سے آگاہی نہیں ہو سکتی۔ والد صاحب کی نادا شتگی کے باعث میری بیوی اس وقت تک اپنے باپ ہی کے یہاں رہتی تھیں۔ میری حمیت نے گوارا نہ کیا کہ وہ میکے میں رہیں اور میں بی۔ اے ہو جانے کے باوجود ان کا خرچ نہ برداشت کروں۔

میں نے ۶ اپریل ۱۹۰۸ء کو علی گڑھ کالج کو بحیثیت طالب علم خدا حافظ کہا۔ میری روانگی سے ایک دن پہلے میرے دونوں شفیق استادوں یعنی مسٹر ٹشیوڈر مارلیس اور لیڈی مارلیس نے مجھے رخصتی لنچ دیا جس میں کالج کے بعض اور پروفیسروں کو بھی مدعو کیا تھا۔ میں علی گڑھ سے کشیدہ دل آیا تھا، اسی روز وہاں سے بغیر کسی رنج کے سہارنپور روانہ ہو گیا۔

۱۰ اپریل ۱۹۰۸ء کو میں سہارنپور پہنچا۔ ۱۱ اپریل کو کچہری میں پہنچ کر منصرم سے ملا، اور قائم مقام پیش کاری پر اپنا تقرر منظور کر لیا۔ تین چار روز میں نے اجلاس میں پیش کار کے ساتھ بیٹھ کر اس کو پیشی کا کام کرتے دیکھا۔ اور تھوڑا سا تجربہ حاصل ہونے کے بعد خود کام کرنا شروع کر دیا۔

اگست ۱۹۰۸ء میں جج خفیفہ دیرہ دون کے منصرم نے ایک مہینہ کی رخصت لی۔ اس کی جگہ پر ایوانس صاحب نے میرا تقرر کیا۔ مسوری جا کر میں نے جج خفیفہ کی کچہری کا چارج لے لیا۔ تنخواہ ستر روپیہ ماہوار تھی۔ گرمی کے موسم میں جج خفیفہ مقدمات فیصل کرنے دیرہ دون جاتے تھے تو مجھے ایک روپیہ روز بھتہ ملتا تھا۔ مسوری میں رہنے کے لئے کچہری کی عمارت میں دو کمرے تھے جو میری ضروریات کے لئے بالکل کافی تھے۔ مسوری کے کام کو میں نے پیش کاری کے کام سے زیادہ خوشگوار پایا۔

سہارنپور کے قیام تک میں رمضان شریف کے پورے روزے رکھتا تھا۔ مسوری جا کر بھی کچھ دن تک اس وضع کو نباہا۔ مگر پہاڑ پر دو پہر کو بھوک خوب لگتی ہے۔ نشاط آدمی ہو تو دوسری بات ہے، کسی نہ کسی طرح دن کاٹ دے۔ یہاں یہ حالت تھی کہ دن کے سات گھنٹے مجھے کام کرنا پڑتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے گنڈے دار روزے رکھنے شروع کر دیئے۔ اسی زمانہ میں ایک دن روزہ رکھا۔ اتفاق کی بات کہ بارش ہوئی اور خوب ٹھنڈ ہو گئی۔ میرا طریقہ بہت زمانہ سے یہ ہے کہ جتنے روزے رکھتے ہوں بغیر سحری کھائے رکھتا ہوں۔ سوتے وقت چائے کی دو پیالیاں البتہ پی لیتا ہوں۔ اسی روز دوپہر سے آنتوں نے قل ہو اللہ پڑھنا شروع کر دی۔ تعطیل کا دن تھا۔ ایک دوست ملنے آ گئے۔ میں نے روزہ بہلانے کی غرض سے شطرنج کی بازی جمائی۔ حسب معمول چالیں غور و خوض کے بعد چلتا۔ دو بازیاں کھیلیں۔ یہ تو یاد نہیں رہا کہ کون جیتا اور کون ہارا۔ مگر اتنا جانتا ہوں کہ سہ پہر کو میرے سر میں اس شدت کا درد ہوا کہ آج تک یاد ہے۔ خیر جوں توں شام پڑی۔ دوستوں سے بھوک کی تکلیف

اور روزہ بہلانے کی غرض سے دو دوسرے سول بیٹھنے کا حال بیان کیا۔ منشی ارتضیٰ علی اس زمانہ میں دیرہ دون میں آبکاری کے انسپکٹر تھے۔ کاکوری جیسے مردم خیز خطہ کے رہنے والے تھے، شعر خوب کہتے تھے۔ موصوف نے روزہ رکھنے کے واقعہ کو منظوم کیا اور مادہ تاریخ بھی نکالا۔ نظم تو یاد نہیں رہی۔ مگر آخری مصرع یہ تھا

پئے تاریخ پوچھا کیا رضا کا پہلا روزہ ہے

الفاظ "کیا رضا کا پہلا روزہ ہے" سے ۱۳۲۴ھ نکلتے ہیں۔

مسٹر اے۔ ڈبلیو۔ آر۔ کول اس زمانہ میں دیرہ دون اور منصوری کی عدالت خفیفہ کے جج تھے۔ ایک روز ایک سرکاری خط کا مسودہ میں نے مسٹر کول کی منظوری کے لئے پیش کیا۔ جس میں کچھ تبدیل موصوف نے اپنے قلم سے کی اور ایک یا دو باتوں کے بارے میں لکھا کہ مسل دیکھ کر بعض اور امور بھی جو ان کے خیال میں ضروری تھے خط میں درج کر دیئے جائیں۔ دو تین دن بعد پیشی کے وقت مجھ سے دریافت کیا۔ فلاں خط بھیجا گیا یا نہیں۔ میں نے جواب دیا۔ مسل آج ہمارے پاس آئی ہے۔ آج ہی خط روانہ ہو جائے گا۔ موصوف بگڑ کر بولے "یس مین ین یہ ویسی ہی بات ہے جیسی بابو لوگ کرتے ہیں۔" موصوف کا یہ ارشاد مجھے اس لیے شدت سے گراں گزرا کہ علی گڑھ میں ہم سب لوگ لفظ بابو کو ہتک آمیز خطاب سمجھتے تھے۔ جس کا استعمال انگریز افسر ہندوستانیوں کی تحقیر کے لیے کرتے ہیں۔ مسٹر کول کی بات مجھے ایسی ہی گراں گزری جیسا انڈین سول سروس کے کسی متمدن انگریز عہدہ دار کو ٹامی کا خطاب برا معلوم ہو۔ میں نے دوسرے ہی دن چھ مہینے کی رخصت کی درخواست مسٹر کول کی خدمت میں پیش کر دی۔ رخصت دینا بہ حیثیت ڈسٹرکٹ جج کے مسٹر اوبین کے اختیار میں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ایل ایل بی کے امتحان کی تیاری کے لیے میں رخصت لینا چاہتا ہوں۔ چنانچہ میری رخصت ۸ نومبر ۱۹۰۶ء سے منظور ہو گئی۔

کچھ دن کندرکی میں ٹھہر کر میں الٰہ آباد چلا گیا اور محمڈن بورڈنگ ہاؤس میں قیام کیا۔ بورڈنگ ہاؤس کے بانی مولوی سمیع اللہ خاں صاحب مرحوم سی۔ ایم۔ جی تھے۔ میں الٰہ آباد اس لئے آیا تھا کہ اطمینان کے ساتھ ایل ایل بی کی تیاری کر سکوں مگر "بہ ہر زمیں کہ رسیدیم آسمان پیداست" والی مثل یہاں بھی میرے حال پر صادق آئی۔ فروری ۱۹۰۷ء میں علی گڑھ میں وہ زبردست ہڑتال جس کے باعث ٹرسٹیوں کو مجبوراً کالج بند کرنا پڑا۔ میں نے ۱۹۰۷ء میں متعدد مضمون انگریزی اور زیادہ تر اردو اخباروں میں لکھے جن میں ہڑتال کے اصلی وجوہ سے مفصل بحث کی بعض مختصر مضامین میں نے محسن الملک کی تائید میں بھی لکھے۔

ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان جولائی ۱۹۰۷ء کے تیسرے ہفتہ میں ہونے والا تھا۔ مجھے تیاری کے لئے بمشکل ڈھائی مہینہ کا وقت ملا ہوگا۔ میں نے اپنے کمرہ میں خس کی ٹٹی لگوائی تھی اور دوپہر میں پنکھا کھینچنے کے لئے ایک قلی کو نوکر رکھ لیا تھا۔ صبح کے دو ڈھائی گھنٹے قانونی کتابوں کے مطالعہ میں صرف کرتا تھا۔ اور دن کے دس بجے سے سہ پہر کے پانچ بجے تک اپنے کمرہ میں پڑھتا تھا۔ اس درمیان میں کسی کو اپنے کمرہ میں نہ آنے دیتا تھا۔ دن کے بارہ اور ایک بجے کے درمیان پلنگ پر لیٹ کر کمر سیدھی کرتا تھا۔ بقیہ وقت پڑھنے میں صرف ہوتا تھا۔ وقت مقررہ پر میں امتحان میں شریک ہوا۔ امتحان دس بارہ دن تک جاری رہا۔ میں نے پرچے اچھے کیے۔ غالباً ۸ اکتوبر کو تار ملا جس سے معلوم ہوا کہ میں پہلے درجہ میں امتحان میں کامیاب ہو گیا۔ یونیورسٹی میں میرا تیسرا نمبر تھا۔

تین مہینے اور ملازمت کی اور دسمبر ۱۹۰۷ء کے بڑے دن کی تعطیل میں مراد آباد آ کر وکالت شروع کرنے کے بارہ میں ضروری انتظامات

گئے۔ دوستوں سے قرض لے کر میں نے بحیثیت وکیل ہائی کورٹ اپنا نام ۲۲ جنوری ۱۹۰۸ء کو درج کرایا اور محرم کی تعطیل کے بعد کچہری کھلنے پر کام شروع کر دیا۔ میرا کل سرمایہ ایک بائیسکل، تھوڑا سا فرنیچر، چند کتابیں اور گورنمنٹ ہند کے غیر شرح ایکٹ تھے۔

سر والٹر کالون الہ آباد ہائی کورٹ کے فوجداری کے مشہور بیرسٹر تھے۔ روپیہ کمانے کے ڈھب ان کو خوب آتے تھے۔ سر آکلینڈ کالون ۱۸۸۷ء سے ۱۸۹۲ء تک صوبجات متحدہ کے لفٹنٹ گورنر رہے۔ ان کے چچا زاد بھائی تھے۔ بھائی کی لفٹنٹ گورنری کے زمانہ میں اپنی فیس بڑھا کر پانسو روپیہ روزانہ کر دی تھی۔ ہمارے صوبہ میں اتنی بڑی فیس اس زمانے میں کسی اور وکیل بیرسٹر کی نہ تھی۔ مجھے وکالت شروع کئے چند مہینے گزرے تھے جو مراد آباد میں دغا کرنے اور جعلی دستاویز بنانے کا ایک بڑا ہنگامہ خیز مقدمہ سیشن سپرد ہوا۔ زن، زر، زمین کی بدولت ہمیشہ ہنگامے برپا ہوتے ہیں۔ اس مقدمہ کی جان بھی ایک جوان عورت کی ذات باصورت تھی۔ کئی ملزم تھے مگر ایک ملزم مراد آباد کے ایک بڑے معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ مالی حالت بہت اچھی تو نہ تھی مگر مرتا کیا نہ کرتا، مثل مشہور ہے۔ چپ چاپ الہ آباد جا کر سر والٹر کالون کو اپنی طرف سے پیروی کے لئے مقرر کر آئے۔ پبلک کی وکالت کا قرعہ میرے نام نکلا۔ ممکن ہے یہ سمجھا گیا ہو کہ سید ہونے کے باعث شاید میں پری کے آسیب سے محفوظ رہوں گا۔ خودستائی ہوتی ہے مگر آشنا اور بیگانہ دونوں کی یہ رائے صحیح ثابت ہوئی۔ وہ مجھ سے بڑے انداز سے باتیں کرتی تھیں۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ پری مجھے شیشے میں اتارنا چاہتی ہے مگر میں نے راجہ اندر بننا اپنے مناسب حال نہ سمجھا۔ مراد آباد کے فوجداری میں کام کرنے والے وکیل بیرسٹر تقریباً سب اس مقدمہ میں مختلف ملزموں کی طرف سے کام کر رہے تھے۔ ایک کو مستغیثہ نے بھی اپنی طرف سے مقرر کیا تھا۔ دو وکیل سرکار (گورنمنٹ پلیڈر) کی مدد کر رہے تھے۔ سر والٹر کالون اردو اچھی بولتے تھے۔ سوچ ساچ کر سر والٹر کالون اس نتیجہ پر پہنچے کہ مقدمہ کا دار و مدار دو باتوں پر ہے۔ ایک یہ کہ ان کے موکل کا بدچلن ملزمہ سے، جو روپ رنگ میں پری تھی، تعلق تھا یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ ایک دستاویز جس کا شہادت ثبوت میں تذکرہ تھا، تحریر و تکمیل ہوئی یا نہیں۔ ملزموں کو دونوں باتوں سے انکار تھا۔ سر والٹر کالون کی زبردست شخصیت نے اصل ملزم سے یہ بیان عدالت میں کرایا کہ وہ ناگن کے حسن کا زہر چکھ چکا ہے یعنی جوان ملزمہ سے اس کا تعلق ہے۔ نیز دستاویز لکھی گئی مگر تکمیل کی نوبت نہیں پہنچی۔ میں سر والٹر کا احسان مند ہوں کہ باوجود حریف وکیل ہونے کے انہوں نے ہر بات میں مجھ سے مشورہ کیا اور اختلاف رائے ہونے کی صورت میں مجھ سے میرے دلائل اسی طرح سنے گویا میں ان کا ہم پلہ شریک کار ہوں۔ صفائی کی شہادت مجھ سے پیش کرائی اور اسیسروں کو خطاب کرنے کا کام بھی میرے سپرد کیا۔ وکیل بیرسٹروں کے سامنے انہوں نے میری بابت یہ رائے ظاہر کی تھی کہ جوان ہوشیار ہے اور سمجھتا ہے کہ مقدمہ کے کس واقعہ کی کیا حیثیت ہے۔ تجربہ حاصل ہو جانے کے بعد کامیاب اور ممتاز وکیل ہوگا۔ والدہ صاحبہ نے جب یہ رائے سنی تو ان کو بڑی مسرت ہوئی۔ مقدمہ ختم ہونے کے چار پانچ دن بعد جج نے فیصلہ سنایا اور سب ملزموں کو بری کر دیا۔

مسٹر مارلے کے زمانہ میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی جو ترمیم ہوئی اور جو قواعد اس ترمیم کے ماتحت بنے ان کی رو سے صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کی کونسل میں سب سینتالیس ممبر علاوہ پریسیڈنٹ کے تھے۔ سترہ ممبروں کا انتخاب ہوتا تھا اور تیس ممبروں کو لفٹنٹ گورنر نامزد کرتے تھے۔ منجملہ ان سترہ کے چار ممبروں کے انتخاب کا حق اسلامی حلقہ ہائے انتخاب کو دیا گیا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں پہلا انتخاب ہوا۔

۱۹۱۲ء میں جب دوبارہ انتخاب کا زمانہ قریب آیا تو روہیلکھنڈ اور کماؤں کے حلقہ انتخاب میں میرے امیدوار ہونے کا اعلان دوستوں نے کیا۔ میری تائید میں بزرگوں اور دوستوں نے بہت سے مضامین لکھے اور خطوط جاری کئے۔ جن میں سب سے زیادہ

قابلِ قدر اور میرے لئے موجبِ عزت وہ خط تھا جو نواب وقار الملک مرحوم نے رائے دہندہ حضرات کے نام بھیج کر ان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنا پرچہ میرے حق میں ڈالیں۔ میں اس زمانہ میں دیوانی کے ایک بڑے مقدمہ میں کام کر رہا تھا جس میں فریق ثانی کی طرف سے پیروی کرنے کے لئے پنڈت موتی لال نہرو الہ آباد سے بلائے گئے تھے۔ مقدمہ سے فارغ ہو کر میں نے حلقہ انتخاب کا دورہ شروع کیا۔ جو تجربے اس دورہ میں حاصل ہوئے وہ بیش قیمت اور عجیب و غریب تھے۔ حلقہ انتخاب میں کل رائے دہندوں کی تعداد دو سو کے قریب تھی جن میں سے ڈیڑھ سو نے تاریخ انتخاب پر پرچے ڈالے تھے۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۱۰ء کو کمشنر بریلی نے جو مہتمم انتخاب تھے پرچے شمار کئے اور چالیس ووٹوں کی بیشی سے میرے انتخاب کا اعلان کیا۔ مجھے مسرت ہے کہ میرے اور مولوی ریاض الدین کے تعلقات میں انتخاب کی وجہ سے کوئی خرابی نہیں ہوئی بلکہ موصوف نے میرے ساتھ یہاں تک دوستانہ اور برادرانہ برتاؤ کیا کہ کچھ عرصہ بعد معقول فیس کا ایک مقدمہ میرے پاس بھیجا۔ روہیلکھنڈ کے احباب کا شکریہ میں نے اس طرح ادا کیا کہ انتخاب کے بعد مجھے روہیلکھنڈ کے جس ضلع میں کسی مقدمہ کی پیروی میں جانے کا اتفاق ہوا اس موکل سے میں نے فیس نہیں لی۔

مسجد کانپور کا واقعہ انگریزی تدبیر کی بدترین مثال ہے۔ بازار مچھلی شہر کی مسجد میں جو لب سڑک ہے کچھ غسل خانے جانب مشرق واقع تھے۔ جب نئی سڑک نکلی تو گورنمنٹ نے قانونی کارروائی کے ذریعے سے غسل خانوں کی زمین کو حاصل کر لیا۔ مسلمان چیختے چلاتے رہے کہ مسجد کا جزو ہونے کی وجہ سے غسل خانوں کی اراضی قانوناً حاصل نہیں کی جا سکتی مگر کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ کانپور کے کلکٹر اس زمانہ میں مسٹر ٹائلر اور امپرومنٹ ٹرسٹ کے چیئرمین مسٹر سم تھے۔ آخر جولائی ۱۹۱۳ء میں مسٹر سم کی تحریک پر پولیس کی مدد سے غسل خانے منہدم کر دیئے گئے اور امپرومنٹ ٹرسٹ نے بلا اہتمام قبضہ لے لیا۔ تیسری اگست ۱۹۱۳ء کو مسلمان مچھلی بازار کی مسجد میں جمع ہوئے اور منہدم غسل خانوں کی جو اینٹیں موقع پر موجود تھیں وہ بغیر مسالہ یا گارے کے ایک کے اوپر ایک رکھنا شروع کر دیں۔ غالباً سادہ دل مسلمان جو موقع پر موجود تھے گورنمنٹ کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ :۔

نہ مل سکا طلبِ نیم گرم سے کچھ بھی اب ایک بار تقاضائے اجابت ہی

مقامی حکام نے مسلح پولیس بلا کر مجمع کو منتشر کر دیا۔ بے تحاشا بندوقوں کے فیر اور بھالوں کے وار کئے۔ بہت سے آدمی جان سے مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ اس واقعہ کی خبریں شائع ہونے پر مسلمانوں میں بڑی سخت بے چینی پیدا ہوئی۔ اس بے چینی کو سرجیمس مسٹن کے طرزِ عمل نے اور بڑھا دیا۔ ملک معظم کا قائم مقام ہونے کی حیثیت سے لاٹ صاحب کا فرض تھا کہ سب معاملات کو دیکھتے بھالتے ان کی چھان بین کرتے اور مسلمانوں میں جو برہمی پیدا ہو گئی تھی اس کو رفع کرنے کے لئے عاقلانہ تدابیر عمل میں لاتے مگر موصوف نے تو کمال ہی کر دیا۔ واقعہ کے چار پانچ دن بعد ہی کانپور پہنچے پولیس کا معائنہ کیا وہاں تقریر فرمائی اور نہتے مجمع کے اوپر دھاوا کر کے پولیس نے بقول لاٹ صاحب جو بہادری دکھائی تھی اس کو بہت سراہا اور پولیس والوں کو کارگزاری کی سندیں عطا کیں۔ لاٹ صاحب کی اس غیر دانشمندانہ کارروائی سے مسلمانوں میں آگ لگ گئی۔ علماء کی صف سے مولوی عبدالباری صاحب مرحوم و مغفور جیسی بلند پایہ مذہبی ہستی کو درس و تدریس کے خاموش اور پرسکون حجرہ سے نکال کر سیاست کے میدان میں لا کھڑا کیا۔ تعلقداروں کے گروہ میں سے جن کی جاگیروں کے برقرار رہنے کی وفاداری ایک ضروری شرط ہے سر محمد علی خاں بہادر راجہ محمود آباد پکار اٹھے کہ ناموس ملت اور قومی مفاد

کی خاطر جو جد و جہد موصوف نے کی اس کے باعث رولٹ صاحب کی میزانِ عدل میں جس کا ایک پلّہ تول سے بہت پہلے مقامی حکام کی طرف جھکا ہوا تھا اور غیر وفادار قرار پائے۔ سر سید احمد خاں کا سن رسیدہ جانشین وقار الملک، جو خرابیٔ صحت کے باعث سیکرٹری کے عہدہ سے دست بردار ہو چکا تھا اللہ جل شانہٗ کے نام کا عصا ہاتھ میں لے کر ایک دفعہ پھر فرعونیت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔ انگریزی دانوں کی جماعت سے وہ داڑھی مونچھ منڈا بیرسٹر مظہر الحق، آگے بڑھا جس کے دل میں اسلام کا سچا درد تھا اور جس نے آخر دم تک اپنے خیال کے بموجب قوم و ملت کی خدمت کی۔ مشائخ کی جماعت کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے خواجہ حسن نظامی صاحب نے حق کی تائید میں وہ صدا بلند کی جو آج تک بہت سے مسلمانوں کے کانوں میں گونج رہی ہے اور جس کو انگریزی حکومت نے بھی عارضۂ قلّتِ سماعت میں مبتلا ہونے کے باوجود اچھی طرح سنا۔ مولوی آزاد سبحانی نے سب سے پہلے قربانی پیش کی۔ مسلمانانِ کانپور پر جو زیادتیاں مقامی حکام کی طرف سے ہو رہی تھیں وہ موصوف نے ایک تقریر میں بیان کیں۔ اس تشدد کے طوفان نے مولوی صاحب کی راست گوئی کو گھیر لیا ان پر مقدمہ چلایا گیا اور قید کی سزا ہوگئی۔

بڑی خرابی یہ تھی کہ ہنگامہ کانپور کے صحیح واقعات پبلک کو معلوم نہ تھے موقع کو بچشمِ خود دیکھنے اور حالات معلوم کرنے کی غرض سے میں ۱۰ اگست کو کانپور پہنچا اور مسٹر ٹائلر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی اجازت سے ان ملزموں سے ملا جو زیرِ حراست تھے ان میں بہت سے آدمی بندوقوں اور بھالوں سے زخمی ہوئے تھے اور متعدد اشخاص کے زخم ایسے شدید تھے کہ وہ اٹھنے بیٹھنے سے بالکل معذور تھے۔ میں نے سب زخمیوں کی اسم وار فہرست بنائی اور جس جس کے جسم پر جہاں جہاں چوٹیں تھیں ان سب کو لکھ لیا۔ کانپور پہنچ کر معلوم ہوا کہ مولانا ابو الکلام آزاد بھی جو اس زمانہ میں الہلال کے ایڈیٹر تھے حالات معلوم کرنے کی غرض سے کانپور آئے تھے مگر مقامی حکام کے طرزِ عمل کے باعث ان کو واپس جانا پڑا۔ کانپور ہی میں میں نے ایک طویل مضمون انگریزی اخباروں کے لئے لکھنا شروع کر دیا تھا، جس میں ان زخمیوں کے نام درج تھے جن کی پیٹھ پر چوٹیں آئی تھیں۔ یہ چوٹیں اس بات کا بیّن ثبوت تھیں کہ ان لوگوں نے پولیس کا مقابلہ نہیں کیا تھا بلکہ چوٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بھاگتے ہوئے آدمیوں کے اوپر پولیس نے فیر کئے اور ان کو بھالوں سے بھی زخمی کیا۔ مراد آباد پہنچ کر میں نے فوراً مضمون انگریزی اخبارات کو بھیج دیا۔ انڈین ڈیلی ٹیلیگراف لکھنؤ کے ایڈیٹر نے مضمون چھاپ دیا اور لکھنؤ کی اس انجمن نے جو تحفظ مسجد مچھلی بازار اور امداد ملزمان مقدمہ کانپور کے لئے راجہ صاحب محمود آباد، مولوی عبد الباری صاحب فرنگی محلی، مولوی محمد سلیم صاحب ایڈووکیٹ، منشی احتشام علی صاحب، مسٹر اظہر علی وکیل اور دیگر مقتدر مسلمانوں کی سرپرستی میں قائم تھی۔ اس خط اور خط کے ترجمہ کی ہزاروں کاپیاں چھپوا کر ملک میں تقسیم کیں۔ اب مقتدر مسلمانوں کے کانپور جانے کا تانتا بندھ گیا تھا اور سچی خبریں پھوٹ کر مسلمانوں تک پہنچنے لگی تھیں۔

سید علی امام وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے دوسرے ہندوستانی ممبر اور مسٹر سنہا (بعد کو لارڈ سنہا) کے جانشین تھے سید علی امام پکّے ہندوستانی ہونے کے ساتھ سچے مسلمان تھے۔ وہ شملہ میں بیٹھے کانپور کے واقعات کا بغور مطالعہ کرتے رہے۔ اور وقت مناسب پر یعنی اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں انہوں نے لارڈ ہارڈنگ کو آمادہ کیا کہ کانپور کے قضیہ کو رفع کرائیں اور آگے نہ بڑھنے دیں۔ میں ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو شملہ اس نیت سے گیا تھا کہ وہاں کچھ دن قیام اور آرام کروں گا۔ میرا قیام سیسل ہوٹل میں تھا۔ علی امام

صاحب کی کوٹھی وہاں سے بالکل قریب تھی۔ میں نے ٹیلی فون کیا معلوم ہوا کہ راجہ صاحب محمود آباد بھی مع نبی اللہ ان کے یہاں مقیم ہیں اور ایک ضروری کام میں مجھ سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ علی امام صاحب انوڈ آرم میں رہتے تھے میں کوٹھی پر پہنچا راجہ صاحب سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ مسجد کانپور کے تصفیہ کی گورنمنٹ سے علی امام صاحب کی وساطت سے بات چیت ہو رہی ہے۔ بعض معاملات طے ہو گئے ہیں اور بعض ہنوز باقی ہیں۔ آج ہی دن کے ایک بجے کی ٹرین سے مولوی عبدالباری صاحب سے مشورہ کرنے لکھنؤ جا رہا ہوں۔ آپ بھی میرے ساتھ چلئے۔

میں اسی دن راجہ صاحب کے ساتھ لکھنؤ روانہ ہو گیا۔ ایک دن لکھنؤ ٹھہر کر مولوی عبدالباری صاحب اور دوسرے احباب سے مسئلہ مسجد کانپور کے متعلق مشورہ کیا اور ضروری مراتب طے کرنے کے بعد راجہ صاحب اور میں پھر شملہ روانہ ہو گئے اور سید علی امام کے یہاں ٹھہرے۔ موصوف کی معرفت گورنمنٹ سے جن شرائط پر معاملہ طے ہونا قرار پایا تھا وہ حسب ذیل تھے۔

اول مسجد کی سطح چونکہ زمین سے کئی فٹ بلند تھی اس لئے جس جگہ غسل خانے واقع تھے وہ بدستور تعمیر کئے جائیں گے مگر نیچے کی زمین پر فٹ پاتھ بنا دیا جائے گا تاکہ راہرو اس پر سے گزر سکیں۔ دوم فوجداری کا وہ مقدمہ جس میں مسلمان ملزم سیشن سپرد ہو چکے تھے اور جس کی سماعت کے لئے مسٹر ڈی۔ آر۔ لائل کی عدالت میں اکتوبر ۱۹۱۳ء مقرر تھی وہ اٹھا لیا جائے گا اور جملہ ملزمان بری کر دیئے جائیں گے۔

اسی شام کو سید علی امام نے لارڈ ہارڈنگ سے مل کر سارا معاملہ تفصیل کے ساتھ طے کیا۔ رات کو کھانے کے بعد ایگزیکٹو کونسل کے اپنے ساتھیوں سے ٹیلی فون پر بات چیت کی اور رات کے دو بجے تک تار کی لین پر کار سرکار صاف کرا کر مسٹر مظہر الحق سے جو کانپور میں تھے اور بعض دیگر مسلمان احباب سے ٹیلی فون پر گفتگو کی۔ دوسرے دن ہم شملہ سے کانپور روانہ ہوئے اور لارڈ ہارڈنگ بھی بذریعہ اسپیشل ٹرین کالکا سے کانپور پہنچے۔

دن کے گیارہ بجے وہ جلسہ شروع ہوا جس میں لارڈ ہارڈنگ شرائط تصفیہ کا اعلان کرنے والے تھے معزز مسلمان اس جلسہ میں بڑی کثرت سے شریک تھے۔ مقامی حکام نے بھی شرکت کی تھی۔ مسٹر بیلی قائم مقام لیفٹیننٹ گورنر اور سید علی امام بھی موجود تھے وقت مقررہ پر لارڈ ہارڈنگ آئے اور اپنی تقریر شروع کی۔ لارڈ ہارڈنگ کے تصفیہ کے بموجب سارے ملزم بری کر دیئے گئے اور مسلمانوں کو اراضی متنازعہ کے بالائی حصہ پر جو فرش مسجد کی ہم سطح تھا دوبارہ غسل خانے تعمیر کرنے کی اجازت مل گئی۔ یہ مسلمانوں کی ایسی نمایاں کامیابی تھی جس کی نظیر برٹش گورنمنٹ اور ہماری قوم کے باہمی تعلقات میں اس وقت تک موجود نہ تھی۔

ایسے مذہبی ماحول میں پرورش پانے کے باعث جہاں بزرگ خاندان دادا صاحب قبلہ سنّی اور بقیہ خاندان والے شیعہ تھے میں مذہب سے بیگانہ نہ تھا۔ مرثیہ گو شعرا کے کلام نے میرے ادبی مذاق پر یقیناً اثر ڈالا۔ مذہبی خیالات بھی متاثر ہوئے ہوں گے۔ تاہم طبیعت میں جو کرید تھی وہ نہ مرثیہ خوانی سے مغلوب ہوئی نہ مناظرہ کی کتابوں کے مطالعہ سے۔ پچاس سال گزر جانے کے بعد اسی زمانہ کے اپنے مذہبی رجحانات کا مرقع پیش کرنا میرے لئے مشکل ہے مگر خدا کے فضل سے میرا حافظہ اچھا ہے۔ ایک معمولی واقعہ بیان کرتا ہوں جس سے میرے مذہبی خیالات کا اندازہ ہو سکے گا۔

شروع ۱۹۰۵ء کی بات ہے میں نے انگریزی پڑھنی شروع کر دی تھی۔ ایک دن کتابیں لئے مولوی محمد حسین مقتول کے گھر جا رہا تھا۔ ایک کتا بیچ راستہ میں بڑے اطمینان سے اپنے بزرگوں اور ہم جنسوں کی عادت کے مطابق لیٹا آرام کر رہا تھا۔ راستہ تنگ تھا۔ میں نے قریب پہنچ کر ڈپٹا تو بہ اکراہ کتا راستے میں سے اٹھا مگر بطور اظہار ناراضی ایک پھنکار ماری جس کی آواز اس آواز سے مشابہ تھی جو ناک صاف کرتے وقت آدمی کی ناک سے پیدا ہوتی ہے۔ کتے کی ناک اور منہ کی تری کے چھینٹے میرے پاجامے کے پائنچوں پر آ گئے۔ اس وقت تک توفیق شامل حال تھی اور میں نمازی تھا۔ شیعوں کے ہاں طہارت کے مسائل بڑے سخت ہیں وہ مشرک کی تری کو ناپاک سمجھتے ہیں میں بھی نص قرآنی کی تعبیر میں شیعوں کا ہم خیال تھا اور ہندو دھوبی کے ہاتھ کے دھلے ہوئے کپڑوں کو پاک سمجھتا تھا۔ اب مجھے یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ بغیر پاجامہ بدلے یا پائنچے دھوئے نماز ہو سکتی ہے یا نہیں۔ میں چاہتا تھا کہ کسی روشن خیال شیعہ مولوی سے یہ مسئلہ دریافت کروں کہ "جو شیعہ مشرک کی تری کی نجاست کا قائل نہ ہو وہ کتے کی ناک اور منہ کی تری کے چھینٹے جس کپڑے پر ہوں اس کپڑے کو پہن کر نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟" سوائے مولوی رضا حسین پیش امام کے اور کوئی شیعہ مولوی مراد آباد میں نہ تھا۔ مولوی صاحب موصوف میرے استاد رہ چکے تھے۔ میں جانتا تھا کہ ان کی پہنچ کہاں تک ہے۔ اگر میں ان سے یہ مسئلہ دریافت کرتا تو وہ یہی جواب دیتے کہ جو شیعہ مشرک کی تری کو نجس نہ سمجھے وہ گمراہ ہے کیونکہ مذہبی معاملات میں عقل اور فکر سے کام لیتا ہے۔ میں کئی گھنٹے تک اسی سوچ میں رہا۔ بالآخر بہت سے ہیر پھیر کے بعد اسی پاجامہ سے نماز پڑھی۔ پچاس سال گزر جانے کے بعد آج بھی میرا خیال ہے کہ مسئلہ کی جو شکل و صورت میرے ذہن میں آئی تھی وہ بے معنی نہ تھی۔ علی گڑھ جا کر میرے مذہبی عقائد کی کایا پلٹ ہو گئی۔

مذہب کا معاملہ خالق اور مخلوق، عبد و معبود کے باہمی تعلق کا معاملہ ہے۔ تیسرے کو اس میں دخل نہیں۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ بحیثیت مسلمان ہوں انسانی الوہیت کو خواہ کسی درجہ اور کسی قسم کی ہو ناممکن عقل اور اسلامی تعلیم کے بالکل متناقض سمجھتا ہوں اور اس بارے میں اہلحدیث کا ہم خیال ہوں۔ اسلام کی روح و رواں باری تعالیٰ کے وجود اور توحید کا مسئلہ ہے۔ اسلام نے خدا کی وحدانیت کا جو تصور پیش کیا ہے وہ کامل ہے۔ نہ اس جیسا تصور کسی مذہب نے پہلے پیش کیا تھا نہ اسلام کے بعد کسی مذہب نے پیش کرنے کی آج تک جسارت کی۔

نبوت کے بارہ میں میرا خیال ہے کہ جب انگلستان میں نیلسن، ایجلس اور شکسپیئر وغیرہ کے اور امریکہ میں جارج واشنگٹن اور لنکن کے مجسمے محض اس وجہ سے پوجے جاتے ہیں کہ انہوں نے اپنی قوم کو بڑے عروج پر پہنچانے کی تدبیر کی بنیاد ڈالی تو ہم مسلمانوں کو حضرت خیر البشرؐ کا کس قدر احسان مند ہونا چاہیئے جنہوں نے ہم کو وہ سبق سکھایا جس پر قائم رہ کر ہم دین اور دنیا دونوں جگہ سرخ روئی حاصل کر سکتے ہیں۔ سو درود و سلام ہو ہمارے آقا پر جو بنی نوع انسان کے سب سے بڑے محسن ہیں۔

ہماری پستی کی انتہا یہ ہے کہ بار بار میری اس گزارش پر کہ شہید کربلا کی سچی یادگار یہ ہے کہ مسلمان بجائے گریہ و بکا کے جگر گوشہ رسولؐ کے عمل کی پیروی کریں۔ مجھے دس میں سے نو مرتبہ جواب ملا ہے کہ بھلا ہم گنہگار بندگان خدا کی برابری کیسے کر سکتے ہیں۔ یہ جواب دو طرح سے خالی نہیں یا تو ہماری قوم معرکہ کربلا کے سبق کو پس پشت ڈالنے کے بہانے ڈھونڈتی ہے یا حسین علیہ السلام کے کارناموں کو ایسا معجزہ تصور کرتی ہے جو انسانی قوت سے باہر ہے۔ اگر پہلی بات صحیح ہے تو امام حسینؑ کا مقدس نام ہم کو اپنی زبان پر لانا شہید کربلا کی توہین کرنا ہے۔ دوسری توجیہ ہماری قوم کی کم حوصلگی اور پست ہمتی کا بیّن ثبوت ہے۔ امام حسینؑ کا کارنامہ انسان کا کارنامہ ہے وہ اپنا اور اپنے عزیزوں کا سر کٹوانے اور گھر بار

لڑنے پر مجبور نہ تھے اگر چاہتے تو یزید سے صلح کر کے اپنی جان بچا سکتے تھے۔ ۲۸ شعبان ۶۰ھ کو روانگی مدینہ سے لیکر ۱۰ محرم ۶۱ھ کو میدان کربلا میں وارد ہونے کے وقت تک امام حسینؓ نے جو کچھ کیا ان سب باتوں کے اندر وہی جذبات پائے جاتے ہیں جو محبت کے وقت ہر انسان کے دل میں موجود ہوتے ہیں۔ یہ سب ایسے امور تھے جن میں کوئی بات انسانی طاقت کے باہر نظر نہیں آتی۔ غور سے دیکھا جائے تو یقیناً یہی محبت ان تمام واقعات کی [illegible] جو بعد میں محرم کو میدان کربلا میں ظہور پذیر ہوئے۔

میں اب تک سوچتا رہا کہ دل کے معاملہ کا اعمال نامہ میں ذکر کروں یا نہ کروں۔ خلاق عالم نے جو خوبیاں انسان کو عطا فرمائی ہیں ان میں محبت کا درجہ اونچا اور بہت اونچا ہے۔ وہ انسان تو مشکل سے ملے گا جس کا دل محبت سے خالی ہو۔ اس وقت اس محبت کا بیان ہے جو ایسے مرد اور ایسی عورت کے درمیان ہوتی ہے کہ باہم میاں بیوی یا عاشق و معشوق کے تعلقات قائم ہونے کو سوسائٹی روا رکھتی ہے یا کم از کم ایسے تعلقات پر سختی سے معترض نہیں ہے کسی ایسے شخص کیلئے جس کا کم و بیش چالیس برس تک ملک کی سیاسی زندگی سے تعلق رہا ہو۔ اپنی داستان محبت بیان کرنا اور اس کو کتاب کی صورت میں اپنی زندگی میں شائع کرنا بڑا دشوار کام ہے۔ میں تو خود یہ کتاب اس لئے لکھ رہا ہوں کہ لوگ اسے پڑھیں اور میری بابت جو رائے چاہیں قائم کریں۔

میں ایشیائی محبت یعنی معشوق کی بے تکلفی جفا اور عاشق کی لجاجت نزد وفا کا قائل نہیں ہوں۔ میرا طریقہ بقول حضرت داغ ہمیشہ یہ رہا ہے ؎

اے داغ اپنی وضع ہمیشہ یہی رہی
کوئی کھچا کھچے کوئی ہم سے ملا کرے

میں کبھی جھجکتا نہیں۔ جا بجا مجھے تو اس میں مزہ آتا ہے ؎

زہے رندی کہ پامالش کند صد پارسائی را
زہے تقوی کہ من با جبہ و دستار می رقصم

ترجمہ۔ میری رندی نے پارسائی کا دامن چاک کر ڈالا میری پرہیزگاری کو دیکھئے کہ عمامہ سر پر اور قبا دوش پر کر کے بھری محفل میں ناچتا ہوں۔

میں ملک ہند کے سارے صوبوں سے واقف ہوں میں ہمالیہ کا سفر [illegible] سے لیکر جاوا تک کر چکا ہوں یورپ کے دو سفر کئے اور دو مرتبہ جنوبی افریقہ گیا مجھے یورپ کے تقریباً سارے ملکوں سے واقفیت ہے سال بھر کے قریب یورپ کے مختلف ملکوں میں رہنے کا موقع ملا اور میں نے آنکھیں کھول کر سب چیزیں دیکھیں اور کانوں کو کھول کر سب باتیں سنیں ؎

شکوہ کروں تو کس کا، ہائے رے التفات دوست
جو نہ کہیں بھی جھک سکا تو نے وہ سر جھکا دیا

اس کتاب میں دل کا سب سے بڑا معاملہ درج ہے جنوبی افریقہ دوسری مرتبہ میں ۱۹۳۵ء کے شروع میں گیا تھا۔ تین سال وہاں رہا۔ وہاں پہنچے دو مہینے گذرے تھے کہ مس پونو بیلو سامی کا [illegible] انگریزی میں بیان ہوا اور میں نے شادی کا تہیہ کر لیا۔ ان کو مجھ سے اور مجھ کو ان سے محبت نہیں تھی عشق تھا۔ وہ آج دنیا میں نہیں ہیں مگر یہ مصرع صادق ہے ؎

شور بلبل کم نگردد گر رود گل از چمن

[illegible] شادی سے قبل وہ مجھے [illegible] ایک [illegible] انگریزی میں [illegible] زندہ ہوں [illegible] عالم خیال میں [illegible] جنوبی افریقہ کے [illegible] کی بابت بقول مرزا رسوا لکھنوی یہ ہوئی ؎

کعبہ میں جا کے بھول گیا راہ دیر کی
ایمان بچ گیا میرے مولا نے خیر کی

[illegible] جنوبی افریقہ [illegible] کے ساتھ [illegible] انتقال [illegible] کا حال یہ ہے ؎

اب بلبل نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا دے

(تلخیص از محمد عبداللہ قریشی)

امام ربانی مجدد الف ثانی
شیخ احمد سرہندی

(اپنے مکتوبات کی روشنی میں)

ولادت : ۱۴ر شوال ۹۷۱ھ
وفات : ۲۸ر صفر ۱۰۳۴ھ

نام مبارک آپ کا احمد، آپ کے والد کا عبدالاحد، نسب اٹھائیس واسطے سے امیرالمومنین حضرت فاروق اعظمؓ تک پہنچتا ہے۔ اس نسب پر آپ کو ناز بھی تھا۔ مکتوب ۱۰۰ دفتر اول حصہ دوم میں ملا حسن کشمیری کے اس سوال کے جواب میں کہ اللہ تعالیٰ کو عالم الغیب کہنے سے فلاں بزرگ نے منع کیا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ فرماتے ہیں۔

"آپ نے [illegible] کہ شیخ عبدالکبیر یمنی نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب نہیں ہے۔ میرے مخدوم! فقیر کو ایسی باتیں سننے کی تاب و طاقت نہیں۔ اس قسم کی باتوں سے میری رگِ فاروقی بے اختیار پھڑک اٹھتی ہے اور ان کی تاویل و توجیہ کی بھی مہلت نہیں دیتی۔ ان باتوں کے کہنے والے شیخ کبیر یمنی ہوں یا شیخ اکبر شامی۔ کلام محمد عربی درکار ہے نہ کہ کلام محی الدین عربی و صدرالدین قونوی و عبدالرزاق کاشی۔ ہم کو نص سے کام ہے نہ کہ فص[1] سے۔ فتوحات مدنیہ نے ہم کو فتوحات مکیہ[2] سے بے نیاز بنا دیا ہے۔"

مکتوب ۱۵ حصہ ششم دفتر دوم میں یہ خبر سن کر کہ قصبہ سامانہ ضلع لدھیانہ میں خطیب نے خطبۂ جمعہ میں خلفائے راشدینؓ کا ذکر عمداً ترک کر دیا، فرماتے ہیں۔

"چونکہ اس خبر وحشت اثر نے طبیعت میں ایک شورش پیدا کر دی اور میری رگِ فاروقی پھڑکا دی اس لیے یہ چند کلمے تحریر کرتا ہے۔"

وطن قدیم آپ کے آبائے کرام کا بعد مدینہ طیبہ کے شہر کابل تھا مگر کوئی بزرگ ہندوستان تشریف لا کر پنجاب میں سکونت پذیر ہو گئے۔ وہیں آپ کی ولادت باسعادت ظہور میں آئی۔ سرہند اس وقت ایک بڑا اسلامی شہر تھا لیکن اب صوبہ مشرقی پنجاب ریاست پٹیالہ میں ایک قصبہ ہے۔ حضرت نے اپنے مکتوبات میں جابجا اس شہر کی عظمت اور برکت کا ذکر فرمایا ہے۔

"سرہند میں جو ایک بڑا اسلامی شہر ہے کئی سال سے قاضی نہیں ہے۔" (مکتوب ۱۹۵ دفتر اول)

---

[1] [2] فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ شیخ محی الدین عربی کی دو کتابوں کے نام ہیں۔

"شہر سرہند کو میرے تولد ہونے کی جگہ سمجھنا چاہئے جیسے ایک گہرے اور تاریک کنوئیں کو پاٹ کر ایک ایسا چبوترہ بنایا گیا ہے جس کو اکثر شہروں اور مقاموں پر بلندی بخشی گئی ہے اور اس میں بے صفتی و بے کیفی کا نور ودیعت رکھا گیا ہے جو سرزمین بیت اللہ شریف میں ظاہر ہونے والے نور کی مانند ہے ...... ایک مدت کے بعد یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ یہ نور اس فقیر کے انوار ظلیہ کا ایک حصہ ہے۔ یہیں سے حاصل کر کے اس سرزمین میں روشن کیا گیا ہے جس طرح شعلہ سے چراغ روشن کرتے ہیں۔ یہ سب اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ اللہ ہی کا نور ہے آسمانوں میں اور زمین میں۔ تیرا رب جو عزت والا ہے ان باتوں سے پاک ہے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں اور صلوٰۃ و سلام ہے خدا کے رسولوں پر اور تمام تعریفیں ہیں اس اللہ کی جو کل جہانوں کا رب ہے۔" (مکتوب ۹۴ حصہ ششم دفتر دوم)

ولادت ۱۴ر شوال ۹۷۱ھ بروز جمعہ بوقت نصف شب ہوئی۔ حفظ قرآن مجید سے فارغ ہونے کے بعد اکثر کتب درسیہ اپنے والد بزرگوار سے کچھ سرہند کے دوسرے علماء سے اور معقولات کی بعض کتابیں مولانا کمال کشمیری سے پڑھیں۔ کتب حدیث کی سند شیخ یعقوب صرفی کشمیری سے اور تفسیر کی قاضی بہلول بدخشانی سے حاصل کی۔ طریقہ چشتیہ میں اپنے والد سے بیعت کی اور اس کا سلوک تمام کیا۔ پھر طریقہ قادریہ اور کبرویہ حاصل کیا۔ خرقۂ خلافت حضرت شیخ محمد نبیرہ حضرت شاہ کمال کیتھلی سے حاصل ہوا ——— غرض سترہ برس کی عمر میں آپ جامع کمالات ظاہری و باطنی ہو کر اپنے والد کے سامنے ہی کتب درسیہ کی تعلیم اور طریقہ کی تبلیغ فرمانے لگے۔

۱۰۰۷ھ میں اپنے والد کی وفات کے بعد حج بیت اللہ کے ارادہ سے روانہ ہو کر دہلی پہنچے اور حضرت خواجہ باقی باللہ نقشبندیؒ کے مرید ہوئے۔ آپ نے اپنے حلقہ توجہ میں آپ کو سر حلقہ بنا کر بٹھایا اور مریدوں سے فرمایا کہ ان کی موجودگی میں کوئی میری طرف متوجہ نہ ہوا کرے۔ رخصت کرتے وقت فرمایا کہ اب ضعف بہت معلوم ہوتا ہے، امید حیات بہت کم ہے۔ پھر اپنے دونوں صاحبزادوں حضرت خواجہ عبید اللہ و حضرت خواجہ عبد اللہ کو کہ اس وقت شیر خوار تھے اپنے سامنے حضرت امام ربانی سے توجہ دلائی اور فرمایا کہ ان کی ماؤں کو بھی غائبانہ توجہ دیجئے۔ مکتوبات میں یہ واقعات جستہ جستہ مذکور ہیں۔ چنانچہ مکتوب ۲۹۶ دفتر اول حصہ چہارم میں اپنے پیرزادوں یعنی خواجہ عبید اللہ اور خواجہ عبد اللہ کو لکھتے ہیں:۔

"یہ فقیر از سرتاقدم آپ کے والد بزرگوار کے احسانوں میں غرق ہے۔ اس راہ میں الف بے کا سبق انہی سے لیا ہے اور اس راہ کے حروف تہجی انہی سے سیکھے ہیں اور ابتدا سے انتہا کے مدارج حاصل ہونے کی دولت انہی کی صحبت کی برکت سے حاصل کی ہے اور "سفر در وطن" کی سعادت انہی کی خدمت کے صدقہ میں پائی ہے۔ ان کی توجہ نے ڈھائی ماہ میں اس ناقابل کو نسبت نقشبندیہ تک پہنچا دیا اور اکابر نقشبندیہ کا "حضور خاص" عطا فرمایا۔ اس قلیل مدت میں جو تجلیات، ظہورات، انوار، الوان، بے رنگیاں اور بے کیفیاں حاصل ہوئیں ان کی شرح و تفصیل کیا بیان کی جائے۔ حضرت کی توجہ شریف کی برکت سے معارف توحید و اتحاد، قرب و معیت اور احاطہ و سریان میں سے شاید ہی کوئی دقیقہ ایسا ہو جو اس فقیر پر واضح نہ ہوا ہو اور اس کی حقیقت کی اطلاع نہ دی گئی ہو۔ کثرت میں وحدت کا معائنہ اور وحدت میں کثرت کا مشاہدہ تو ان معارف کی ابتدائی باتیں ہیں۔ بہرحال جس جگہ نسبت نقشبندیہ اور اس کے اکابر کا حضور خاص موجود ہو وہاں

معارف کا زبان پر لانا اور اس شہود و مشاہدہ کی نشان دہی کرنا کوتاہ نظری ہے۔ ان اکابر کا کارخانہ بلند ہے جو کسی حیلہ گر رقاص کے کاروبار سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ جب اس فقیر کو ایسی بلند مرتبہ دولت آپ کے والد بزرگوار سے حاصل ہوئی تو اگر یہ فقیر عمر بھر آپ کے دربار عالی کے خدام کے قدموں میں سر پامال کرے تب بھی اس نے کوئی حق ادا نہ کیا۔ یہ فقیر اپنی کوتاہیوں کو کیا بیان کرے اور اپنی شرمندگی کو کیا ظاہر کرے۔

معارف آگاہ خواجہ حسام الدین احمد کو اللہ تعالیٰ ہماری طرف سے جزائے خیر عطا کرے کہ انہوں نے ہم تقصیر کرنے والوں کا بار خود اٹھایا اور خدام دربار عالی کی خدمت کے لیے کمر ہمت باندھی اور ہم دور افتادہ لوگوں کو اس سے سبکدوش کیا۔ اگر میرے جسم کا ہر رواں زبان بن کر شکر ادا کرے تو ان کے ہزار شکروں میں سے ایک شکر بھی ادا نہ ہو سکے۔ اس فقیر کو تین مرتبہ حضرت کے دید دولت کی قدمبوسی کا شرف حاصل ہوا۔ جب آخری مرتبہ زیارت ہوئی تو ارشاد فرمایا کہ مجھ پر ضعف بدن غالب آگیا ہے۔ امید حیات کم رہ گئی ہے۔ تم بچوں کے احوال سے باخبر رہنا۔ (پھر) آپ کو اپنے سامنے طلب فرمایا۔ اس وقت آپ دودھ پیتے بچے تھے۔ اس فقیر کو حکم دیا کہ ان پر توجہ دو۔ حضرت کے حکم سے ان کی موجودگی میں میں نے آپ کو توجہ دی یہاں تک کہ اس کا اثر بھی ظاہر ہوا۔ اس کے بعد حضرت نے فرمایا کہ ان صاحبزادوں کی والدات کو بھی غائبانہ توجہ دو۔ چنانچہ ان کو بھی غائبانہ توجہ دی گئی۔ امید ہے کہ حضرت کی موجودگی کی برکت سے اس توجہ کے بھی اچھے نتائج ظاہر ہوتے ہوں گے:

اس مکتوب میں آگے چل کر صاحبزادوں کو شریعت و طریقت کی بہت سی باتیں تعلیم فرمائی ہیں اور ضمناً علم کلام کے بڑے اہم مسائل آگئے ہیں۔ مکتوب ۵۸ دفتر سوم حصہ نہم میں فرماتے ہیں:

"حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے میری ارادت بہت سے واسطوں سے ہے۔ طریقہ نقشبندیہ میں اکیس واسطے درمیان میں ہیں۔ طریقہ قادریہ میں پچیس واسطے اور طریقہ چشتیہ میں ستائیس واسطے۔ میرا سلسلہ رحمانی ہے کیونکہ میں رحمان کا بندہ ہوں۔ میرا رب رحمان ہے اور میرا مربی ارحم الراحمین۔ میرا طریقہ سبحانی ہے کیونکہ میں تنزیہ کی راہ سے پہنچا ہوں۔ اسم و صفت سے مقصود سوائے ذات حق کے کچھ نہیں۔"

مکتوب ۲۹۰ دفتر اول حصہ پنجم میں اپنے مرید مولانا محمد ہاشم کو لکھتے ہیں:

"خوب جان لو کہ جو طریقہ سب طریقوں میں اقرب اور سب سے سابق، سب سے زیادہ (کتاب و سنت کے) موافق، سب سے زیادہ قابل اعتماد، سب سے زیادہ محفوظ، سب سے زیادہ مضبوط، سب سے زیادہ سچا، سب سے زیادہ راہ بتانے والا، سب سے برتر، سب سے بزرگ، سب سے بلند اور سب سے کامل ہے وہ طریقہ نقشبندیہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس طریقہ پر چلنے والوں کی ارواح کو مقدس اور اس سے محبت رکھنے والوں کے اسرار کو پاکیزہ بنائے۔ اس طریقہ کی یہ تمام بزرگی اور اس کے بزرگوں کی یہ سب علو شان دو وجہوں سے ہے۔ (ایک) اتباع سنت نبویہ کے التزام علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام (دوسرے) بدعت نامرضیہ سے اجتناب ......

جب اس فقیر کو اس راہ کا شوق پیدا ہوا تو عنایت خداوندی نے اس کی راہ نمائی فرمائی اور اس کو ولایت پناہ، حقیقت آگاہ، ہادی طریق اندراج النہایۃ فی البدایۃ، رہبر درجات ولایت، مؤید الدین الرضی شیخنا و مرشدنا و امامنا شیخ محمد الباقی قدس سرہٗ کی خدمت بابرکت میں پہنچایا جو اکابر نقشبندیہ کے خاندان کے خلفائے کبار میں سے تھے۔ حضرت والا نے اس درویش کو ذکر اسم ذات کی تعلیم دی اور اس طریقہ کے

بزرگوں کے موافق توجہ دی۔ یہاں تک کہ اس ذکر میں مجھ کو پوری لذت ملنے لگی اور کمال شوق میں گریہ وزاری کی کیفیت پیدا ہوئی۔ پھر ایک روز کے بعد وہ بے خودی کی کیفیت پیدا ہوئی جو ان بزرگوں کے نزدیک نہیں ہے اور جس کا نام ان کی اصطلاح میں غیبت ہے۔ اس بے خودی کے عالم میں مجھ کو ایک دریائے محیط نظر آ رہا تھا اور اس دنیا کی شکلیں اور صورتیں سایہ کی طرح معلوم ہو رہی تھیں۔۔۔۔۔۔ جب میں نے حضرت والا سے اپنا حال عرض کیا تو حضرت نے فرمایا کہ تم کو ایک قسم کی فنا حاصل ہوئی ہے اور ذکر سے منع فرمایا اور اس آگاہی کی نگاہ داشت کا حکم دیا۔ دو روز کے بعد فنائے اصطلاحی حاصل ہوئی۔ جب میں نے حضرت سے عرض کیا تو فرمایا کہ اپنے کام میں لگے رہو۔ ۔۔۔۔۔ اے برادر! جب حضرت خواجہ نے مجھ کو کامل و اکمل سمجھ کر تعلیم طریقہ کی اجازت دی اور طالبانِ راہ کی ایک جماعت میرے سپرد فرمائی تو اس وقت مجھے اپنے کمال و تکمیل میں تردد تھا۔ حضرت والا نے فرمایا کہ تردد کی بات نہیں کیونکہ مشائخ عظام نے ان مقامات کو کمال و تکمیل کا مقام فرمایا ہے اگر اس مقام کے کمال و تکمیل میں تردد کیا جائے تو ان مشائخ کے کمال میں تردد لازم آتا ہے۔ حضرت کے حکم کے مطابق طریقہ کی تعلیم شروع کی اور طالبانِ راہ کو توجہ دینے لگا۔ پھر ان طالبانِ راہ میں بڑے اثرات محسوس ہونے حتیٰ کہ برسوں کا کام ساعتوں میں پورا ہوا۔۔۔۔۔۔ حضرات خواجگان نقشبندیہ قدس اللہ اسرارہم کے طریقہ کا حاصل یہ ہے کہ عقائد اہل سنت والجماعت کا معتقد ہو اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کا متبع اور بدعت و ہوائے نفسانی سے مجتنب تا حتی الامکان عزیمت پر کاربند اور رخصت سے محترز۔"

طلب معاش کی فکر کبھی آپ کے قریب نہیں آئی۔ مکتوب ۹۵ دفتر دوم حصہ ہفتم میں مولانا محمد ہاشم کو لکھا۔

"امور دنیا بے فائدہ ہیں۔ دنیا و مافیہا اس لائق نہیں کہ انسان احوالِ آخرت کی یاد ترک کر کے ان فضول باتوں میں مشغول ہو۔۔۔۔۔ بس ایک امر ضروری سمجھیں اور قاعدہ ہے کہ ضرورت بقدرِ ضرورت ہوتی ہے (اس سے زیادہ نہیں) اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ یہاں کے فقرا باوجودیکہ رزق معین نہیں رکھتے پھر بھی بغیر سعی و کوشش کے فراغت و وسعت سے زندگی گزارتے ہیں۔ کافی سے زیادہ کو روزی پہنچتی ہے۔ تیار روزی کی دولت ہم کو ہر وقت حاصل ہے۔"

اتباع سنت کی کیسی عظیم الشان اہمیت آپ کی نظر میں تھی اور نظر کتنی گہری؟ اس کا حال مکتوب ۵۴ دفتر دوم حصہ ہفتم سے معلوم ہوتا ہے۔ اس مکتوب میں اتباع سنت کے سات درجے بیان فرماتے ہیں اور مقطع میں لکھا ہے۔

"حاصل کلام یہ کہ جو دولت بھی آتی ہے انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کے لیے آتی ہے۔ یہ امتوں کی سعادت ہے کہ ان کے طفیل میں اس دولت سے بہرہ ور ہوں۔

در قافلہ کہ اوست دانم نرسم　　این بس کہ رسد ز دور بانگ جرسم

(میں جانتا ہوں کہ جس قافلہ میں وہ ہیں میں اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ میرے لیے یہی کافی ہے کہ دور سے ان کے جرس کی آواز مجھ تک پہنچتی رہے)

تبع کامل وہ ہے جو اتباع سنت کے ان ساتوں درجوں سے آراستہ ہو اور جو شخص ان میں سے بعض میں متابعت رکھتا ہو اور بعض میں نہ رکھتا ہو وہ فرقِ مراتب کے ساتھ فی الجملہ تابع ہے۔ علمائے ظواہر پہلے ہی درجہ کی متابعت میں خوش ہیں۔ کاش وہ اسی کو پوری طرح انجام دیتے۔ انہوں نے تو تابعداری و پیروی کو صورت شریعت کی پیروی تک محدود کر دیا ہے۔ اس سے آگے ان کے خیال میں

پکے نہیں۔ صوفیہ کے طریقہ کو جو تمام درجات متابعت کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہے بیکار سمجھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر اپنا پیر و مقتدا سوائے پیٹ اور بڑوں کے کسی کو نہیں جانتے ۔

چوں آں کرمے کہ در سنگے نہان ست
زمین و آسمان او ہماں ست

(اس کیڑے کی مانند جو کسی پتھر میں پوشیدہ ہو کر بس وہی اس کا زمین و آسمان ہے)"

مکتوب ۱۱۱ دفتر اول حصہ دوم صفحہ ۱۱ میں اپنے متعلق معاندین کی ریشہ دوانی کا حال یوں لکھتے ہیں۔

"جو مکتوب محبت آثار مولانا قاسم علی نے بھیجا تھا، پہنچا۔ مضمون مکتوب واضح ہوا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو اچھا کام کرتا ہے وہ اپنے لیے کرتا ہے اور جو برائی کرے گا اس کا وبال بھی اسی پر ہے۔ خواجہ عبداللہ انصاری فرماتے ہیں کہ خداوندا جس کو تو گرانا چاہتا ہے اس کو ہم سے بھڑا دے۔ میں ان لوگوں کے بارے میں جو شراب محبت کا گھونٹ پینے والوں پر خندہ زنی کرتے ہیں یہ اندیشہ کرتا ہوں کہ وہ شراب خانہ ہی میں اپنا ایمان ضائع کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو فقراء کے انکار اور ان پر طعنہ زنی سے محفوظ رکھے۔ بطفیل حضرت خیر البشر علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والتسلیمات والسلام۔"

دنیا دار علماء آپ کے خلاف جو سازش کر رہے تھے وہ کامیاب ہوئی اور جہانگیر نے آپ کو اپنی ریاست گوالیار کے قلعہ میں محبوس کر دیا۔ مکتوب ۵ دفتر سوم حصہ ہشتم ص۱۱ میں قید خانہ سے حضرت میر محمد نعمان کو لکھتے ہیں:

"مخفی نہ رہے کہ جب تک اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی عنایت سے جو اس کے جلال و غضب کے رنگ میں ظاہر ہوتی ہے، نفس زنداں میں محبوس نہیں ہوا تھا ایمان شہودی کی راہ تنگ سے بالکل آزاد نہیں ہوا تھا اور سایہ اسے خیال و مثال کے کوچوں سے پوری طرح باہر نہیں تھا اور قادر مطلق کے غیب پر ایمان رکھنے کی شاہراہ پر چلنے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی تھی اور حضور سے غیب میں، عین سے علم میں اور شہود سے استدلال میں پوری طرح سے داخل نہیں ہوا تھا۔ دوسروں کے ہنر کو عیب اور ان کے عیب کو ہنر کمال ذوق اور وجدان صحیح کے ساتھ نہ سمجھ پایا تھا اور بے ننگی و بے ناموسی کا خوشگوار شربت اور خواری و رسوائی کا خوش ذائقہ مزہ نہ چکھا تھا اور خلق خدا کی ملامت و طعنہ زنی کے جمال سے لطف اندوز اور لوگوں کی جفا و بلا کے حسن سے محظوظ نہ ہوا تھا اور مردہ بدست زندہ بن کر اپنے ارادہ و اختیار سے بالکلیہ دست بردار نہ ہوا تھا اور آفاق و انفس سے تعلق کے رشتے تمام و کمال نہ ٹوٹے تھے اور تضرع و التجا و انابت و استغفار، ذلت و انکسار کی حقیقت معلوم نہ ہوئی تھی۔ استغنائے حق سبحانہ و تعالیٰ کی میزان بلند مرتبہ جو عظمت و کبریائی کی تناؤں سے گھری ہوئی ہے مشاہدہ میں نہ آئی تھی اور اپنے کو ایک بندۂ خوار و زار، ذلیل و بے اعتبار، بے چارہ و بے اقتدار اور سراپا احتیاج و افتقار معلوم نہ کر سکا۔ وما ابری نفسی...... الخ۔ میں اپنے نفس کی برات نہیں کرتا۔ یقیناً نفس برائی پر بہت آمادہ کرنے والا ہے سوائے اس کے کہ میرا رب مجھ پر رحم کرے۔ اس میں شبہ نہیں کہ میرا رب بہت مغفرت کرنے والا مہربان ہے۔"

مکتوب ۵ دفتر سوم حصہ ہشتم ص۱۵ میں اپنے مخلص حق گزیں شیخ بدیع الدین کو قید خانہ سے لکھتے ہیں:۔

”جب یہ فقیر اس قلعہ میں پہنچا تو اوائل حال ہی میں محسوس ہوتا تھا کہ ملامت خلق کے انوار شہروں اور دیہاتوں سے نورانی بادلوں کی طرح پے در پے پہنچ رہے ہیں اور میرے معاملہ کو پستی سے بلندی کی طرف لیے جا رہے ہیں۔ برسوں تربیت جمال سے میری منزلیں طے کرائی گئیں۔ اب تربیت جلال سے قطع مسافت کرائی جا رہی ہے لہٰذا آپ مقام صبر بلکہ مقام رضا میں رہیں اور جمال و جلال کو مساوی جانیں۔ آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ جس وقت سے اس فتنہ کا ظہور ہوا ہے نہ ذوق باقی رہا ہے نہ حال، حالانکہ ذوق و حال مضاعف ہونا چاہیے اس لیے کہ محبوب کی جفا اس کی وفا سے زیادہ لذت بخش ہے۔“

مکتوب ۴۴ دفتر دوم حصہ ہفتم ص۱۱ میں اپنے خادم رفیع المکان میرزا مظفر خان کو لکھتے ہیں:۔

”درد و محن اور مصائب وغیرہ دوستوں کے لیے ان کی لغزشوں کا کفارہ ہیں۔ تضرع و زاری اور التجا و انکسار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ قدس میں عفو و عافیت طلب کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ قبولیت کے آثار پیدا ہوں اور فتنوں کی تسکین معلوم ہو۔ اگرچہ میرے دوست اور خیر اندیش اسی کام میں مشغول ہیں لیکن صاحب معاملہ پر اس کام کا حق زیادہ ہے۔ دوا پینا اور پرہیز کرنا بیمار کا کام ہے۔ دوسرے لوگ ازالۂ مرض میں اس کے مددگار ہونے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ حقیقت معاملہ یہ ہے کہ محبوب حقیقی کی طرف سے جو تکلیف بھی پہنچے اس کو کشادہ روئی اور فراخدلی کے ساتھ احسان مند ہو کر قبول کرنا چاہیے بلکہ اس سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔ جو رسوائی یا آزار محبوب کو مطلوب ہو وہ محب کے نزدیک اس ناموس اور ننگ و نام سے بہتر ہے جو اس کے نفس کو مطلوب ہو۔ اگر محب میں یہ بات پیدا نہ ہو تو وہ محبت میں ناقص بلکہ کاذب ہے۔

گر طمع خواہد زمن سلطانِ دیں   خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

(اگر سلطان دین مجھ سے طمع کا طالب ہے تو پھر قناعت کے سر پر خاک)“

مکتوب ۱۰ دفتر دوم حصہ ششم ص۱۲ میں اپنے فرزند رشید اور خلیفہ راشد عروۃ الوثقیٰ محمد الدین خواجہ محمد معصوم کو لکھتے ہیں:۔

”میں خیال کرتا ہوں کہ میری پیدائش کا مقصد یہ ہے کہ ولایت محمدی ولایت ابراہیمی کے رنگ میں رنگین ہو اور ولایت محمدی کا حسن ملاحت ولایت ابراہیمی کے حسن صباحت سے آمیز ہو۔ حدیث شریف میں ہے کہ ”میرے بھائی یوسف میں صباحت زیادہ ہے اور مجھ میں ملاحت زیادہ ہے۔“ اس رنگینی و آمیزش سے محبوبیت محمدیہ کا مقام اپنے درجہ علیا تک پہنچ جائے۔ شاید ملت ابراہیمی کی اتباع کا حکم اسی نعمت عظمیٰ کو حاصل کرنے کے لیے دیا گیا ہو اور درود شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ان صلوٰۃ و برکات کی درخواست جو حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صلوٰۃ و برکات کے مانند ہوں اسی غرض سے ہو۔ ...... میں اپنی پیدائش کا جو مقصد سمجھتا تھا معلوم ہوا کہ وہ حاصل ہو گیا اور دیرینہ سوال و درخواست قبول ہو گئی۔ کامل ترین تعریفیں اللہ کے لیے ہر حال میں جس نے مجھ کو دو سمندروں کو ملانے والا بنایا اور دو جماعتوں میں صلح کرانے والا اور صلوٰۃ و سلام ہو بہترین خلائق پر اور ان کے اخوان کرام یعنی انبیاء و ملائکہ عظام پر ......

فرزند من! باوجود اس بات کے جو میری پیدائش سے مربوط ہے ایک دوسرا عظیم الشان کارخانہ میرے حوالے کیا گیا ہے۔ مجھ کو پیری مریدی

کے لیے نہیں پیدا کیا گیا۔ میری پیدائش کا مقصد تکمیل و ارشاد خلق نہیں بلکہ دوسرا معاملہ اور دوسرا کارخانہ ہے۔ اس ضمن میں جس شخص کو مناسبت ہوگی فیض حاصل ہوگا ورنہ نہیں۔ اس کارخانۂ عظیم کے مقابلہ میں تکمیل و ارشاد کا معاملہ راہ کی گری پڑی چیزوں کے مانند ہے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دعوت ان کے معاملات باطنی کے مقابلے میں یہی حکم رکھتی ہے۔ ہرچند کہ منصب نبوت ختم ہو چکا ہے لیکن انبیاء کے متبعین کاملین کو بطور تبعیت و وراثت کمالات و خصائص نبوت سے حصہ ملتا ہے۔"

مکتوب ۴ دفتر دوم حصہ ششم صفحہ ۱ میں کچھ معارف خاصہ بیان فرمانے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"یہ معارف دائرہ ولایت سے بالاتر ہیں۔ ان کے ادراک سے اصحاب ولایت بھی علمائے ظاہر کی طرح عاجز و قاصر ہیں۔ یہ علوم درحقیقت انوار نبوت کے مشکوٰۃ سے ماخوذ ہیں جن کی اس الف ثانی کے آغاز میں نیابت و وراثت تجدید ہوئی ہے اور ان کو تر و تازگی ملی ہے۔ جس شخص پر اللہ تعالیٰ نے یہ علوم و معارف ظاہر فرمائے وہ اس الف ثانی (دوسرے ہزار) کا مجدد ہے جیسا کہ ان لوگوں سے یہ بات پوشیدہ نہیں جنہوں نے اس کے ان علوم و معارف کا مطالعہ کیا ہے جو ذات و صفات اور افعال باری تعالیٰ سے متعلق ہیں یا جو احوال و جذبات اور تجلیات و ظہورات سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ یہ معارف علماء علوم اور اولیاء اللہ کے معارف سے ماوراء ہیں بلکہ علماء و اولیاء کے علوم ان علوم و معارف کے مقابلے میں پوست کی حیثیت رکھتے ہیں جس کا مغز یہی معارف مذکورہ ہیں۔ اللہ سبحانہٗ کی ذات ہی ہدایت کرنے والی ہے۔ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ ہر صدی کے شروع میں ایک مجدد گزرا ہے۔ لیکن صدی کا مجدد اور ہے اور الف کا مجدد کچھ اور۔ جو فرق سو اور ہزار میں ہے وہی فرق ان کے مجددوں میں بھی ہے بلکہ اس سے زیادہ۔ مجدد وہ شخص ہے کہ اس کے زمانہ میں امتوں کو جو فیض پہنچے اسی کے واسطے سے پہنچے۔ اگرچہ وہ اس زمانہ کے اقطاب اوتاد اور ابدال و نجباء ہی کیوں نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ بعض وقت اپنے کسی بندہ کو مصلحت عامہ کے لیے مخصوص کر لیتا ہے اور اسی کے ذریعہ سے فائدہ پہنچاتا ہے ؎ خاص کند بندۂ مصلحت عام را۔

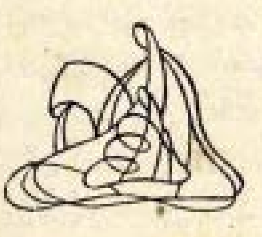

ظہیر الدین محمد بابر

ظہیر الدین محمد بابر بن عمر شیخ مرزا تیموری شہزادہ لکھتا ہے کہ میں نے یہ چند سطریں مختصر اپنے زمانے کے حالات اور واقعات کی اپنی آل اولاد کے لیے بطور یادگار لکھی ہیں۔

میری عمر بارہ برس کی تھی اور پانچویں رمضان ۸۹۹ھ تھی جب ملک فرغانہ میں بادشاہ ہوا۔ میرے باپ عمر شیخ مرزا بمقام سمرقند ۸۶۰ھ ہجری میں پیدا ہوئے۔ ان کی اولاد میں تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں میں سب سے بڑا بیٹا ظہیر الدین بابر ہوں۔ میری ماں قتلق نگار خانم تھیں۔ جب عمر شیخ مرزا کا انتقال ہوا ہے تو میں اندجان کے چار باغ میں تھا۔ رمضان شریف کی پانچویں تاریخ منگل کے دن مجھے اندجان میں یہ خبر ملی گھوڑے پر سوار ہوا اور جس قدر ملازم پاس تھے ان کو لے کر قلعے کی جانب روانہ ہوا۔

امیر تیمور نے سمرقند کا حاکم اپنے بیٹے جہانگیر مرزا کو کیا تھا جہانگیر مرزا کے مرنے کے بعد اس کے چھوٹے بیٹے کو رہا اس کے انتقال کے بعد اس کے بڑے بیٹے محمد سلطان گورگان کی حکومت رہی تھی۔ شاہرخ مرزا نے سارا ملک ماوراء النہر اپنے بیٹے الغ مرزا کو دیا تھا۔ الغ مرزا سے اس کے بیٹے عبد اللطیف مرزا نے لے لیا اور اس پنج روزہ بے ثبات دنیا کے لیے اپنے دانشمند اور بوڑھے باپ کو شہید کیا۔ عبد اللطیف مرزا کے بعد عبد اللہ مرزا تخت پر بیٹھا یہ مرزا ڈیڑھ برس یا قریب دو برس کے بادشاہ رہا ہوگا۔ اس کے بعد سمرقند کو سلطان ابو سعید مرزا نے لے لیا اور اپنے جیتے جی اپنے بڑے بیٹے سلطان احمد مرزا کو دے دیا تھا۔ سلطان ابو سعید مرزا کے انتقال کے بعد سلطان احمد مرزا سمرقند کا بادشاہ ہوا جب سلطان احمد مرزا کو تخت پر بٹھایا ترخانیوں کے فساد میں بایسنغر مرزا کو تخت سے اتار دیا اور اس کے چھوٹے بھائی سلطان علی مرزا کو دو ایک دن کے لیے بٹھایا اس کے بعد پھر وہی بایسنغر مرزا بادشاہ ہو گیا۔ بایسنغر مرزا سے میں نے چھینا۔

سمرقند کے تخت پر بیٹھتے ہی میں نے وہاں کے امراء کے ساتھ گزشتہ زمانے کی طرح عنایت و مہربانی کرنی شروع کی۔ جو امراء میرے ہمراہ تھے ان کے ساتھ بھی ان کے موافق سلوک کیا۔

عائشہ سلطان بیگم میرے چچا سلطان احمد کی بیٹی جس سے میرے باپ اور چچا کی زندگی میں منگنی ہو گئی تھی وہ خجند میں آ گئی۔ شعبان کے مہینے میں ۹۰۵ھ میں نے اس سے شادی کر لی اگرچہ ابتدا میں مجھے اس سے بہت محبت تھی مگر مارے شرم کے دسویں، پندرھویں، بیسویں دن اس کے پاس جایا کرتا تھا

آخر خود ہی وہ محبت نہ رہی اور حجاب اور زیادہ ہو گیا۔ مہینے ڈیڑھ مہینے بعد میری والدہ خانم نے بہت دھمکایا اور بڑی دقتوں سے مجھے اس کے پاس بھیجا۔

اُردو بازار میں ایک لڑکا تھا بابری نام۔ جس میں ہمنامی کی بھی ایک مناسبت تھی انہیں دنوں میں مجھے اس کے ساتھ ایک عجیب لگاؤ پیدا ہو گیا۔ اس سے پہلے میں کسی پر فریفتہ نہ ہوا تھا۔ کسی سے مہر و محبت کی بات تک نہ کی تھی بلکہ دل لگی کا نام بھی نہ سنا تھا۔ اس زمانے میں ایک آدھ شعر فارسی میں بھی کہا کرتا تھا ان میں سے ایک شعر یہ ہے:۔

ہیچ کس چوں من خراب و عاشق و رسوا مباد
ہیچ محبوبے چو تو بے رحم و بے پروا مباد

مگر حال یہ تھا کہ اگر کبھی بابری میرے سامنے آجاتا تھا تو مارے شرم کے میں نگاہ بھر کر اس کی طرف نہ دیکھ سکتا تھا چہ جائیکہ اس سے مل سکوں اور باتیں کر سکوں۔ اضطراب دل کی یہ حالت تھی کہ اس کے آنے کا شکریہ تک ادا نہ کر سکتا تھا۔ اس شیفتگی کے زمانے میں ایک دن اپنے خدم و حشم کے ساتھ میں ایک گلی میں چلا جاتا تھا دفعتاً بابری سے میرا آمنا سامنا ہو گیا۔ میری عجیب حالت ہوئی قریب تھا کہ میں اپنے آپے میں نہ رہوں۔ آنکھ اٹھا کر دیکھنا یا بات کرنا تو ممکن نہ تھا جھینپتا ہوا اور گھبراتا ہوا میں آگے بڑھ گیا۔ ان دنوں میں عشق و محبت کا ایسا زور اور جوانی و جنون کا اتنا غلبہ ہوا کہ کبھی ننگے سر ننگے پاؤں محلوں میں اور باغیچوں میں تنہا پھرا کرتا تھا۔

ایک دن استرک کے قلعے میں مصاحبوں میں سے دوست ناصر نویان کوکلتاش قاسم کوکلتاش خان قلی کریم داد شیخ درویش خسرو کوکلتاش اور میرم ناصر وغیرہ سب حاضر تھے اور میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا آؤ حکم تو لگائیں کہ خدا کے فضل سے ہم سمرقند کب تک لے لیں گے۔ بعض نے کہا کہ بہار کے موسم میں لے لیں گے۔ کسی نے کہا مہینے بھر میں بعض نے کہا چالیس دن میں بعض نے کہا بیس دن میں نویان کوکلتاش نے کہا کہ ہم چودہ دن میں لے لیں گے۔ خدا نے اس کا کہا پورا کیا۔ چودہ ہی دن میں ہم نے سمرقند کو دوبارہ فتح کر لیا۔

اُن ہی دنوں میں نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا کہ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار آئے ہیں میں ان کے استقبال کے لیے اٹھا ہوں خواجہ آکر بیٹھ گئے ہیں۔ خواجہ کے سامنے دسترخوان بچھایا۔ شاید پُر تکلف نہ ہونے کے سبب سے حضرت کے دل میں کچھ خیال آیا ہو۔ ملا بابا میری طرف دیکھ کر اشارہ کرتا ہے میں بھی اشارے سے جواب دیتا ہوں کہ میرا قصور نہیں ہے دسترخوان بچھانے والے کا قصور ہے۔ خواجہ سمجھ گئے اور یہ عذر قبول کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں پہنچانے کے واسطے ساتھ ہوا۔ اسی مکان کے دالان میں میرے سیدھے بازو کو یا الٹے بازو کو پکڑ کر اس طرح اٹھاتے ہیں کہ میرا ایک پاؤں زمین سے اونچا ہو گیا اور ترکی زبان میں فرماتے ہیں: "شیخ مصلحت بیردی" (یعنی تمہارا شیخ تم کو صلاح دیتا ہے)۔ اس کے چند روز بعد میں نے سمرقند فتح کر لیا۔

میں سمرقند لینے کے زمانے میں کل انیس برس کا تھا۔ نہ اس قدر معاملات سے واقف تھا نہ صاحب تجربہ تھا دوسرے یہ کہ میرا مقابلہ شیبانی خاں جیسے ترقی یافتہ گرگ باراں دیدہ اور گھاگ آدمی سے تھا تیسرے یہ کہ سمرقند میں کسی نے مجھ سے سازباز نہ کی تھی البتہ شہر والے دل سے میرے ساتھ تھے مگر شیبانی خاں کے ڈر سے کوئی کان نہ ہلا سکتا تھا۔ چوتھے یہ کہ میرا دشمن قلعے میں تھا میں نے قلعہ بھی لیا اور دشمن کو بھی بھگا دیا۔ پانچویں یہ کہ پہلی بار جو سمرقند پر حملہ کرنے کے لیے آیا تو آتا دشمن کو چوکنا کر گیا۔ باوجود اس کے اب دوسری دفعہ آیا اور خدا کے حکم سے شہر کو فتح کر لیا۔

اس کے لکھنے سے میری غرض کسی کی حقارت کرنی نہیں ہے یہ ایک واقعی بات ہے جو بیان کی گئی۔ میرے چلے آنے کے بعد اندجان سے میری ماں اور اہل و عیال مع اسباب وغیرہ بڑی کد و قت اور مصیبت سے اوراتیپہ میں آ گئے تھے میں نے آدمی بھیج کر سب کو سمرقند میں بلا لیا تھا۔ ان دنوں میں سلطان احمد مرزا کی بیٹی عائشہ بیگم، جو میری پہلی بیوی تھی، اس کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی اس کا نام فخر النساء بیگم رکھا یہ میری پہلوٹی کی اولاد تھی اس وقت میری عمر انیس برس تھی چالیس دن کے بعد یہ مر گئی۔

شیبانی خاں نے سمرقند کا محاصرہ کر لیا اور اس نے طول کھینچا۔ کہیں سے امداد کسی نے مدد بھیجی آخر کار فوج اور رعیت کے دل ٹوٹ گئے ایک ایک دو دو کر کے شہر چھوڑ چھوڑ کر بھاگنا شروع کیا۔ شیبانی خاں محصورین کے دق ہونے کو سمجھ گیا اور غار عاشقاں میں آن اترا میں بھی شیبانی خاں کے روبرو لڑنے کو آیا اور میں ملک محمد مرزا کے مکانوں میں آ گیا۔ میں سب طرف کی کمک سے مایوس ہو گیا مجبور ایک طرح کی صلح کر لی۔ آدھی رات گئی ہوگی جو اپنی والدہ خانم کو ساتھ لیکر شیخ زادہ دروازے سے نکل کھڑا ہوا اور عورتیں اور بھی ساتھ تھیں۔ میری بڑی بہن خانزادہ بیگم اسی جھگڑے میں رہ گئیں اور شیبانی خاں کے ہاتھ آ گئیں۔ راستے میں قنبر علی اور قاسم بیگ کے ساتھ گھوڑے دوڑائے گئے۔ میرا گھوڑا آگے نکل گیا میں نے مڑ کر دیکھا کہ ان کے گھوڑے کتنے پیچھے ہیں گھوڑے کا تنگ ڈھیلا ہو گیا زین الٹ گیا اور میں سر کے بل زمین پر گرا اگرچہ میں اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا اور سوار ہو گیا لیکن شام تک میری عقل بے ٹھکانے رہی۔ عصر کا وقت ہو چکا تھا ہم ایلان اوتی میں جا اترے ایک گھوڑا ذبح کیا اور گوشت کے ٹکڑے کر کے کباب کھائے۔ صبح ہونے سے پہلے موضع خلیلہ میں آئے جہاں فربہ گوشت اور میدہ کی روٹیاں وہاں خوب سستی تھیں۔ میٹھے خربوزے اور عمدہ انگور ڈھیروں تھے ایسی ناسیری کے بعد یہ ارزانی اور ایسی آفت کے بعد یہ امن نصیب ہوا۔ اپنی عمر میں ہم کو کبھی ایسا لطف آیا تھا نہ اس ارزانی کی ایسی قدر ہوئی تھی۔ سچ ہے کہ عسرت کے بعد عشرت کی بڑی لذت آتی ہے اور محنت کے بعد فراغت کی بہت قدر ہوتی ہے۔ ساری عمر میں پانچ چار دفعہ اسی طرح تکلیف کے بعد راحت اور محنت کے بعد فراغت نصیب ہوئی ہے۔

تھوڑے دن بعد میں مقام دہکت میں آ گیا۔ میں وہاں ایک چودھری کے ہاں ٹھہرا یہ شخص تقریباً ۷۰۔۸۰ برس کا تھا اس کی ماں بھی اب تک زندہ تھی یہ عورت بڑی عمر رسیدہ تھی کوئی ایک سو گیارہ برس کی ہوگی۔ امیر تیمور جب ہندوستان آئے ہیں تو اس کے عزیزوں میں سے ایک شخص ان کے لشکر میں تھا یہ بات بڑھیا کو یاد تھی کبھی کبھی وہ کہانی کے طور پر بیان کیا کرتی تھی اس عورت کے اپنے پیٹ کے بچے پوتا پوتی پڑپوتا پڑپوتی اور سرپوتا سرپوتی سب مل کر چھیانوے آدمی اس وقت زندہ تھے اور مرے ہوؤں سمیت دو سو آدمی بیان کیے جاتے تھے۔ اس کا ایک پڑپوتا اس وقت پچیس چھبیس برس کا جوان تھا جس کی داڑھی سیاہ تھی۔

اندجان کی چڑھائی کے وقت لڑائی میں ایک تیر میری سیدھی ران میں لگا اور وار پار ہو گیا میرے سر پر جو بکتر کی ٹوپی تھی تنبل نے جھپٹ کر تلوار کا ایک وار ایسا لگایا کہ میرا سر سن ہو گیا اگرچہ ٹوپی کا ایک تار نہ کٹا مگر میرا سر اچھی طرح زخمی ہو گیا۔ میں نے تلوار صاف نہ کی تھی وہ کسی قدر زنگ آلود ہو گئی تھی اس کے نکالنے کی مہلت نہ ملی بہت سے دشمنوں میں اکیلا تھا اب ٹھہرنے کا موقع نہ تھا میں نے گھوڑے کی باگ الٹ پھیری۔ سلطان محمود نے میرے زخم کے علاج کے لیے اپنے جراح اتکہ بخشی نامی کو بھیجا۔ مغل جراح کو بھی بخشی کہتے ہیں۔ یہ شخص بڑا کارگر جراح تھا جس کا بھیجا نکل جاتا تھا۔ اس کو بھی اچھا کر دیتا تھا۔ رگوں میں کیسا ہی زخم آئے بہت آسانی سے اس کا علاج کر لیتا تھا۔ بعض زخموں پر مرہم کی طرح دوا لگاتا تھا اور بعض کو قسم قسم کی دوا کھلاتا تھا۔ میری ران کے زخم پر میووں کے چھلکے جو خشک کیے ہوئے تھے باندھے اور زخم میں بتی رکھی۔ جیسے پتے ہوتے ہیں ایسی دوا بھی ایک مرتبہ

کھلائی۔ اس کا بیان تھا کہ ایک دفعہ ایک شخص کا پاؤں ٹوٹ گیا تھا ہتھیلی کے برابر ہڈی چورا ہو گئی میں نے وہاں کا گوشت چیر کر ہڈی کی ساری کرچیں نکال لیں اور ان کی جگہ ایک پسی ہوئی دوا بھر دی۔ وہ دوا ہڈی کی جگہ مثل ہڈی کے ہو گئی۔

ماہ محرم ۹۱۰ھ میں خراسان جانے کے لیے ملک فرغانہ سے نکل کر ایلاق اولانگ میں جو ملک حصار کے ییلاقوں میں سے ہے ڈیرا ڈالا۔ اسی پڑاؤ میں مجھے تیئسواں سال شروع ہوا۔ میں نے داڑھی منڈوائی۔ جو لوگ ایک امید پر میرے ساتھ پھرتے وہ چھوٹے بڑے سب مل کر دو سو سے زیادہ اور تین سو سے کم تھے ان میں اکثر پیدل تھے بہت سوں کے پاس صرف لاٹھیاں تھیں کوئی ننگے پاؤں تھا اور کسی کے پاؤں میں موزے تھے۔ مفلسی اس درجے کی تھی کہ ہمارے فقط دو خیمے تھے میرا خیمہ میری والدہ کے لیے لگا دیتے تھے۔ میرے لیے ہر پڑاؤ پر ایک چھولداری کھڑی کر دیتے تھے۔ میں اسی میں بیٹھتا تھا۔

قلعہ آدینہ پور کے پاس جنوب کی طرف ایک بلندی پر ۹۱۴ھ میں میں نے ایک باغ لگایا اس کا نام "باغ وفا" رکھا۔ یہ باغ ندی کے کنارے ہے ندی باغ اور قلعے کے بیچ میں بہتی ہے۔ جس سال میں نے بہار خاں کو شکست دی ہے اور لاہور اور دیپالپور فتح کیا ہے اسی سال کیلے کے درخت یہاں لا کر بوائے۔

۹۲۵ھ میں جب میں نے چغتائی سرائے کو فتح کیا تو کونر کی بھی زیارت کی۔ یہاں کے لوگ ایک عجیب بات بیان کرتے ہیں جو بالکل غلط معلوم ہوتی ہے مگر متواتر سننے میں آتی ہے۔ ان سب میں یہ رسم ہے کہ جو عورت مرتی ہے اس کو ایک تختے پر ڈال دیتے ہیں اور چاروں طرف سے تختے کو پکڑ کر اٹھاتے ہیں اگر پارسا ہوتی ہے ان اٹھانے والوں میں خود بخود اس درجے کی حرکت پیدا ہوتی ہے کہ اگر سنبھلے نہ رہیں تو مردہ تختے پر سے گر پڑے اور جو عورت پارسا نہیں ہوتی تو حرکت بھی پیدا نہیں ہوتی۔ یہ بات کچھ یہیں والوں نے بیان نہیں کی بلکہ بجوڑ وغیرہ کے تمام پہاڑیوں نے متفق اللفظ بیان کی۔ حیدر علی بجوڑی جو حاکم بجوڑ تھا جب اس کی ماں مری تو وہ نہ رویا نہ اس نے عزاداری کی رسم ادا کی نہ سیاہ لباس پہنا۔ لوگوں سے کہا اسے تختے پر ڈال دو اگر حرکت پیدا نہ ہو تو میں لاش کو جلا دوں گا۔ تختے پر ڈالتے ہی حرکت معہود لاش میں پیدا ہو گئی یہ سن کر اس نے ماتمی کپڑے بھی پہنے اور عزاداری بھی کی۔

بجزاو کابل کے شمال مشرق کی جانب کوہستان میں واقع ہے یہاں پہاڑوں میں روباہ پرّاں ہوتی ہے۔ یہ ایک جانور ہے گلہری سے بہت بڑا۔ اس کے دونوں ہاتھوں پاؤں کے بیچ میں ایک پردہ ہوتا ہے چمگادڑ کے پر کا سا اس کا رنگ سمجھتے ہیں کہ ایک درخت سے دوسرے درخت پر نیچے کی جانب گز بھر کے قریب یہ جانور اُڑ جاتا ہے۔ میں نے اس کا اُڑنا نہیں دیکھا ہاں یہ دیکھا کہ ایک درخت سے چمٹی ہوئی تھی ہانکی اور پرندے کی طرح بازو کھول کر جھٹ سے نیچے آ گئی۔ اس کوہستان میں لوخہ جانور ہوتا ہے جسے بوقلموں کہتے ہیں۔ سر سے دُم تک پانچ چھ طرح کے مختلف رنگ ہوتے ہیں کبوتر کی گردن جیسا براق اور کبک دری کے برابر قد و قامت ہوتا ہے کیا عجب ہے کہ ہندوستان کی کبک دری یہی ہو۔ وہاں والوں نے بیان کیا کہ جاڑے کے موسم میں یہ جانور دامن کوہ میں اُڑ آتا ہے اگر اس کو اڑاؤ اور یہ انگوروں کے تختے پر بیٹھ جائے تو پھر نہیں اُڑ سکتا۔ وہیں اس کو پکڑ لیتے ہیں۔ بجزاو میں ایک چوہا ہوتا ہے اس کا نام موش مشکیں ہے اس میں سے مشک کی خوشبو آتی ہے۔ یہ چوہا میرے دیکھنے میں نہیں آیا۔

جس سال میں نے کابل لیا ہے اسی سال افغانستان میں کوہاٹ اور بنوں دشت کو لوٹتا ہوا انتقام دوکی سے ہوتا ہوا آب ستادہ کے

کنارے کنارے غزنی آیا۔ لوگوں نے بیان کیا کہ غزنی ایک مزار ہے کہ اگر اس پر درود پڑھو تو وہ ہلنے لگتا ہے۔ میں نے جاکر اسے دیکھا قبر ہلتی ہوئی معلوم ہوئی آخر بھید کھل گیا کہ وہاں کے مجاوروں کی چالاکی ہے۔ قبر پر ایک چھپر بنایا ہے جس وقت وہ چھپر پر جاتے ہیں وہ ہلنے لگتا ہے اور قبر بھی ہلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ جنبش ایسی ہے جیسے کشتی میں بیٹھنے والوں کو کنارہ چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے میں نے مجاوروں کو وہاں سے الگ کھڑا کر دیا پھر بہتیرا درود پڑھا مگر قبر کو حرکت نہیں ہوئی میں نے حکم دیا کہ چھپر قبر سے اکھاڑ ڈالو اور گنبد بنا دو۔ مجاوروں کو دھمکایا اور منع کیا کہ وہ آئندہ ایسی حرکت نہ کریں۔ غزنی چھوٹا سا شہر ہے۔ تعجب آتا ہے کہ جن بادشاہوں کے تحت میں ہندوستان اور خراسان رہا انہوں نے ایسی چھوٹی سی جگہ کو اپنا دارالسلطنت کیوں بنایا۔

جب میں کابل آگیا تو دریا خاں کا بیٹا یار حسین بھیرہ سے میرے پاس حاضر ہوا۔ چند روز بعد میں نے فوج کشی کا ارادہ کیا جو لوگ ملک کے حالات سے واقف تھے ان سے اطراف و جوانب کا حال دریافت کیا بعض نے تو دشت کی طرف چلنے کی صلاح دی کسی نے بنگش کی طرف چلنا مناسب جانا بعض نے ہندوستان کا مشورہ دیا آخر ہندوستان پر یورش کرنے کی ٹھہری۔ شعبان کے مہینے میں جب آفتاب برج دلو میں تھا کابل سے ہندوستان کا رخ کیا۔ کسی گرم ملک تو آج تک ہندوستان کو کبھی دیکھا ہی نہیں تھا یہاں پہنچتے ہی دوسرا عالم نظر آیا۔ چوپائے اور قطع کے پیڑ بوٹے دوسری وضع کے قوموں اور قبیلوں کی رسمیں کچھ اور۔ ایک حیرت سی پیدا ہو گئی۔ اور حقیقت میں حیرت کی جگہ ہے۔

محرم کے مہینے میں ۹۱۱ھ میری والدہ قتلق نگار خانم بیمار ہوئیں فصد کھلوائی لیکن اچھی نہ ہوئیں ایک خراسانی طبیب تھا اس کو سید طبیب کہتے تھے خراسانی طریقے سے اس نے ہندوانہ دیا قضا ہی آگئی تھی چھ دن کے بعد پیر کے دن ان کا انتقال ہو گیا۔ دامن کوہ میں الغ مرزا نے ایک باغ بنایا تھا جس کا نام باغ نوروزی تھا اس کے وارثوں کی اجازت سے اس باغ میں ہفتہ کے دن جنازہ لائے میں نے قاسم کوکلتاش نے قبر میں اتار کر دفن کیا۔

ماہ جمادی الاولیٰ ۹۱۳ھ میں میں نے کابل سے ہندوستان کی طرف کوچ کیا آج تک تیمور لنگ کی اولاد کو بادشاہ ہونے پر بھی مرزا کہتے تھے۔ اب میں نے حکم دیا کہ مجھے بادشاہ کہا کرو۔ اسی سال کے آخر میں شب سہ شنبہ ماہ ذی قعدہ کی چوتھی تاریخ ارک کابل میں ہمایوں پیدا ہوا۔ مولانا مشہدی نے اس کی تاریخ ولادت "ہمایوں خاں" کہی۔ کابل کے ایک شاعر نے "شاہ فیروز قدر" نکالی تین چار دن کے بعد ہمایوں ہی نام رکھ دیا۔ ہمایوں کے پیدا ہونے کے پانچ چھ دن بعد چار باغ میں ہمایوں کے پیدا ہونے کی شادی ہوئی۔ امراء اور متعلقین نے ساچق کی رسم ادا کی۔ زر سفید کا ڈھیر لگ گیا۔ اس سے پہلے کبھی اتنے روپوں کا ڈھیر دیکھنے میں نہ آیا تھا۔

جمعہ کے دن صفر کی پہلی تاریخ (۹۳۲ھ) میں جب کہ آفتاب برج قوس میں تھا ہندوستان کی طرف چلنے کا قصد کیا۔ ہفتہ کے دن باغ وفا میں اترے۔ دو شنبہ کی رات کو نئے باغ میں جو سلطان پور اور خواجہ رستم کے درمیان میں بنا ہے آئے دوسرے دن لشکر کو چلتا کیا اور ہم جالہ میں بیٹھے۔ جالہ میں اکثر وہ لوگ تھے جو شعر کہتے تھے جیسے ابوالوجد، شیخ زین، ملا علی خاں، تردی بیگ، اور [illegible] وغیرہ۔ اثنائے صحبت میں محمد صالح کا یہ شعر پڑھا گیا۔

مجھ کو ہر عشوہ گرے راپ کندکس
جانے کہ تراشی گرے راپ کندکس

فرمایش کی کہ اس زمین پر کچھ کہو۔ شاعر اور موزوں طبع فکر کرنے لگے۔ ملا علی خاں سے بہت ہنسی ٹھٹھی ہوتی تھی ہنسی سے میں نے فی البدیہہ یہ شعر کہا۔

مانند تو مدہوش گرے راپ کندکس
زن گاؤ کے مادہ خرے راپ کندکس

اس سے پہلے جو کچھ اچھا برا کہنے یا ہزل نظم کرنے کا اتفاق ہوتا تھا تو لکھ لیا جاتا تھا جب سے مبین کو نظم کرنے لگا تو دل میں خیال آیا کہ جس زبان سے یہ پاک الفاظ نکلیں حیف ہے کہ اس سے بے ہودہ لفظ بھی نکلیں۔ اسی دل نے ہزل کہنا ترک کر دیا۔

القصہ وہاں سے کوچ کیا اور علی مسجد میں ٹھہرنا ہوا۔ جمعرات کے دن جمادی الآخری کی سلخ کو ہم پانی پت آئے۔ دست راست کی طرف شہر کو رکھا اور ادھر جو چھکڑے اور جال تیار کیے تھے قائم کر دیے دست چپ وغیرہ کی سمتوں میں خندق کھود دی۔ فوج کو فرد اندر داور ہراس تھا مگر یہ بے ہودہ بات تھی خدا نے جو قسمت میں لکھ دیا ہے وہی ہوتا ہے۔ لوگوں میں یہ عیب تھا لیکن اس عیب کی گرفت نہیں ہو سکتی کیونکہ وطن چھوڑے تین مہینے ہو گئے تھے۔ ایک اجنبی قوم سے کام پڑ گیا تھا۔ نہ ہم ان کی زبان سے آشنا تھے نہ وہ ہماری زبان سے — غنیم کا لشکر جتنا سامنے تھا اس کا تخمینہ ایک لاکھ کیا جاتا تھا۔ اور ہزار کے قریب ہاتھیوں کی تعداد بیان کی جاتی تھی۔ ہندوستان میں یہ رسم ہے کہ جس وقت پڑتا ہے اس وقت کچھ دن کے لیے فوج بھرتی کر لیتے ہیں اس کو سربندی کہتے ہیں۔ اگر ایسا کیا جاتا تو حریف ایک لاکھ فوج اور رکھ سکتا تھا۔ خدا کی قدرت نہ وہ اپنے لشکر کو راضی رکھ سکا نہ خزانہ تقسیم کر سکا۔ لوگوں کو راضی کیونکر کرتا اس کی طبیعت بہت ہی ممسک تھی۔ اپنے خزانے میں روپیہ رکھنے کا مزہ تھا۔ ایک جوان آدمی تھا ناتجربہ کار۔ نہ اس نے آتے وقت معقول بندوبست کیا نہ ٹھہرنے کا اور بھاگنے کا ٹھکانا کیا۔ جب ہم پانی پت میں ٹھہر کر چھکڑوں اور خندق سے اپنا بندوبست کر رہے تھے اس موقع پر حملہ کرنے کا خیال نہ کیا۔

درویش محمد ساربان نے کہا اب ایسی احتیاط ہو گئی ہے کہ دشمن کی ہوا بھی ہمارے لشکر میں نہیں آ سکتی — آفتاب ایک نیزہ بلند ہوا ہو گا کہ جنگ مغلوبہ شروع ہو گئی۔ دوپہر تک تلوار چلتی رہی دوپہر ہوتے ہی دشمن پست ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ایک ایسا مشکل کام ہم پر آسان کر دیا کہ وہ بے شمار لشکر دوپہر کے عرصے میں خاک میں مل گیا۔ پانچ چھ ہزار آدمی تو سلطان ابراہیم کے ساتھ ایک جگہ مارے گئے تھے باقی ہر جگہ کشتوں کے پشتے لگے ہوئے تھے ہم نے اس وقت مقتولوں کا تخمینہ اپنے نزدیک پندرہ سولہ ہزار آدمی کا کیا مگر آگرے میں ہندوستانیوں کی زبانی معلوم ہوا کہ اس معرکے میں پچاس ساٹھ ہزار فوج کام آئی۔

القصہ بقیۃ السیف فرار ہوئے اور ہم آگے بڑھے۔ جو امراء آگے بڑھے تھے وہ بھاگے ہوئے افغانوں کو پکڑ لائے ہاتھیوں کے غول کے غول فیل بانوں سمیت گرفتار کر کے لائے اور نذر کیے۔ ظہر کے وقت طاہر تبریزی نے ابراہیم کی لاش بہت سی لاشوں میں پڑی ہوئی دیکھی وہ فوراً اس کا سر کاٹ لایا۔ اسی دن ہمایوں مرزا، خواجہ کلاں، محمدی، شاہ منصور برلاس، یونس علی، عبداللہ، اور

دلی خازن کو حکم دیا کہ ابھی چلے آؤ اور آگرے پر قبضہ کر لو اور خزانے ضبط کر لو۔ مہدی کو خواجہ محمد سلطان مرزا، عادل سلطان، جنید برلاس اور قتلق کو حکم دیا کہ میرے علیحدہ ہو کر فوراً دلی پہنچو اور وہاں کے خزانوں کی احتیاط رکھو۔ دوسرے دن ہم کوس بھر چلے گھوڑوں کو آسائش دینے کے لیے جمنا کے کنارے پر ڈیرے ڈالے پھر دو منزل چل کے سہ شنبہ کو دہلی میں داخل ہوئے۔ اول شیخ نظام الدین اولیا قدس سرہٗ کے مزار کی زیارت کی۔ دلی کے قریب جمنا کے کنارے پر اترے بدھ کی رات کو دلی کے قلعے کی سیر کر کے رات وہیں گزاری۔ صبح حضرت قطب الدین قدس سرہٗ کے مزار مبارک کی زیارت سے مشرف ہوا۔ سلطان غیاث الدین بلبن اور سلطان علاؤ الدین خلجی کے مقبروں عمارتوں، لاٹھ، شمسی تالاب، حوض خاص، مقبرہ سلطان بہلول، مقبرہ سلطان سکندر اور باغ کی سیر کر کے کشتی میں بیٹھ کر عرق پیا۔ ولی بیگ قزلی کو دلی کا صوبہ دار اور دوست بیگ کو دلی کا دیوان مقرر کیا خزانوں پر مہریں لگا کر ان کے سپرد کر دیے۔ جمعرات کو دلی سے کوچ کر دیا۔ اور تغلق آباد کے قریب جمنا کے کنارے پر لشکر اترا جمعہ کے دن یہاں مقام ہوا۔ مولانا محمود اور شیخ زین وغیرہ یہاں سے شہر گئے دلی کی جامع مسجد میں انہوں نے نماز پڑھی میرے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ فقرا کو بہت سا روپیہ تقسیم کر کے واپس آئے۔ ہفتہ کو اس منزل سے چلے میں نے تغلق آباد کی سیر کی۔ کوچ در کوچ آگرہ چلے گئے جمعہ کے دن بائیسویں رجب کو نواح آگرہ میں پہنچے اور سلیمان فرملی کے مکان میں اترا ہوا یہ مقام شہر سے بہت دور تھا۔ صبح یہاں سے جلال خاں جگہت کے محلوں میں جا ٹھہرے۔ ہمایوں وغیرہ پہلے سے آ گئے تھے۔ قلعہ والوں نے قبضہ دینے میں حیلے حوالے کیے انہوں نے دیکھا کہ لوگ بگڑے ہوئے ہیں۔ تاکید کی کہ خزانوں کو کوئی ہاتھ نہ لگائے اور کوئی باہر نہ نکلنے پائے یہ انتظام کر کے میرے منتظر رہے۔ بکرماجیت ہندو گوالیار کا راجہ تھا اور سو برس سے اس کے بزرگ وہاں راج کرتے تھے۔ سلطان سکندر گوالیار چھیننے کے لیے کئی برس سے آگرے کو دار السلطنت بنائے ہوئے تھا۔ ابراہیم کے وقت میں اعظم ہمایوں اور سروانی نے کئی بار چڑھائی کی آخر صلح سے گوالیار لے لیا اور شمس آباد اس کو دے دیا۔ ابراہیم کی شکست کے زمانے میں بکرماجیت مر گیا۔ بکرماجیت کے بال بچے اور متعلقین آگرے میں تھے۔

جب ہمایوں آگرے میں آیا تو بکرماجیت کی اولاد بھاگنے کے خیال میں تھی۔ ہمایوں نے پاہی متعین کر دیے تھے، انہوں نے روکا مگر ہمایوں نے ان کے لوٹنے اور مارنے کی اجازت نہیں دی۔ انہوں نے اپنی خواہش سے بہت سا جواہر ہمایوں کو نذر کیا۔ اس میں ایک مشہور ہیرا تھا جو سلطان علاؤ الدین لایا تھا۔ کہتے ہیں کہ بعض نے اس کی قیمت ساری دنیا کے خراج کا نصف تشخیص کی تھی۔ غالباً اس کا وزن ۸ مثقال ہے۔ جب میں آیا تو ہمایوں نے اس کو میرے آگے پیش کیا۔ میں نے ہمایوں کو ہی دے دیا۔

حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے سے آج تک ادھر کے بادشاہوں میں سے تین حملہ آور بادشاہ کامیاب ہوئے ہیں۔ ایک سلطان محمود جس کی اولاد بھی مدتوں تک ملک ہند پر فرماں روا رہی ہے۔ دوسرا سلطان شہاب الدین غوری کہ اس کے متعلق اور غلام برسوں یہاں کے حکمران رہے ہیں۔ تیسرا میں ہوں۔ مگر میری اور ان بادشاہوں کی پوری مماثلت نہیں ہو سکتی کیونکہ سلطان محمود نے جب ہندوستان کو لیا ہے اس وقت سلطان کی قوت اتنی تھی کہ خراسان اس کے تحت میں تھا۔ شاہان خوارزم و دار المرز اس کے مطیع تھے۔ سمرقند کا بادشاہ اس کا محکوم تھا۔ اس کا لشکر حملہ کے وقت اگر دو لاکھ نہیں تو ایک لاکھ ضرور ہوگا۔ دوسرے تمام ہندوستان میں ایک بادشاہ نہ تھا۔ مختلف راجہ تھے۔ ایک اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ تھا۔ سلطان شہاب الدین غوری اگرچہ خراسان پر قابض نہ تھا مگر اس کا بڑا بھائی سلطان غیاث الدین

غوری کا ملک خراسان تھا۔ طبقات ناصری میں لکھا ہے کہ سلطان مرحوم ایک لاکھ ۲۰ ہزار مسلح سواروں سے ہندوستان پر آیا تھا اس کے مقابل میں بھی متفرق راجہ تھے۔ سارے ہندوستان کا ایک بادشاہ نہ تھا۔ جب میں پہلے بھیرے میں آیا ہوں تو زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ ہزار فوج میرے ساتھ تھی۔ اب پانچویں مرتبہ جو میں نے حملہ کیا ہے اور سلطان ابراہیم کو شکست دے کر ہندوستان فتح کر لیا ہے تو سارا لشکر مع بہیر و بنگاہ بارہ ہزار لکھا گیا تھا۔ اور کبھی اتنی جمعیت لے کر آنے کا موقع نہ ملا تھا۔ بدخشاں، قندھار، کابل اور قندز کا ملک میرے قبضہ میں تھا پر ان کی آمدنی بہت نہ تھی بلکہ بعض علاقے دشمنوں کے ملک سے ایسے قریب تھے کہ وہاں بڑی مدد دینی پڑتی تھی۔ سارا ماوراءالنہر ازبکوں کے قبضہ میں تھا۔ ان کی فوجیں تخمیناً ایک لاکھ کے قریب بیان کی جاتی تھیں اور وہ ہمارے قدیمی دشمن تھے ہندوستان کے قلمرو بھیرے سے ملک بہار تک پٹھانوں کے تحت میں تھی۔ یہاں کا بادشاہ سلطان ابراہیم تھا۔ پانچ لاکھ سے کم اس کی فوج نہ سمجھنی چاہیئے۔ بے شک پورب کے بعض امراء اس وقت اس کے خلاف تھے۔ اس پر بھی کہتے ہیں کہ تخمیناً ایک لاکھ سوار پیدل اور ہزار امرائے فیل نشین حاضر رکاب تھے۔ بایں ہمہ میں نے خدا پر بھروسہ کیا۔ ازبک جیسے لاکھ دشمنوں کو پیچھے چھوڑا اور سلطان ابراہیم جیسے صاحب لشکر و ملک سے جو سلیمان حشم تھا جا بھڑا۔ خدائے تعالیٰ نے میری محنت اور کوشش ضائع نہ کی۔ ایسے زبردست مقابل کو مغلوب کر دیا۔ اور ہندوستان جیسا وسیع ملک فتح کرا دیا۔ میں اس دولت کے حاصل کرنے کو اپنی تاب و طاقت پر محمول نہیں کرتا اور اس سعادت کے نصیب ہو جانے کو اپنی کوشش و ہمت کی بدولت نہیں جانتا بلکہ محض خدا تعالیٰ کی عنایت سمجھتا ہوں۔

ہندوستان وسیع، بہت آباد اور بہت حاصل ملک ہے۔ اس کے مشرق و جنوب بلکہ کسی قدر مغرب میں بھی دریائے سمندر ہے۔ شمال میں ایک پہاڑ ہے جو کوہ ہندوکش ہے کافرستان اور کوہستان کشمیر سے ملا ہوا ہے۔ اس کے مغرب و شمال میں کابل، غزنی اور قندھار ہے۔ ہندوستان کا دارالملک آج تک دلی ہے۔ سلطان شہاب الدین غوری کے بعد سے سلطان فیروز شاہ کے آخر زمانے تک ہندوستان کا تقریباً سارا ملک شاہان دہلی کے زیرنگیں رہا ہے۔ اب جب کہ میں نے اس کو فتح کیا ہے تو پانچ مسلمان بادشاہ اور دو ہندو راجہ یہاں حکومت کرتے ہیں۔ گو چھوٹے چھوٹے رائے اور راجہ پہاڑوں اور جنگلوں میں بہتیرے ہیں مگر معتبر اور مستقل یہی ہیں۔ ان میں سے ایک پٹھان تھے جن کا تسلط بھیرے سے بہار تک تھا۔ ان افغانوں سے پہلے جونپور سلطان حسین شرقی کے پاس تھا۔ ان کو پوربی کہتے ہیں۔ ان کے بزرگ سلطان فیروز کے دربار کے امراء میں سے تھے۔ فیروز شاہ کے بعد جونپور کے یہی مستقل بادشاہ ہو گئے۔ دلی سلطان علاؤالدین کے قبضہ میں رہی۔ یہ لوگ سید تھے۔ امیر تیمور نے دلی فتح کر کے ان کو دے دی تھی۔ سلطان بہلول لودھی اور اس کے بیٹے سلطان سکندر نے دلی سے جونپور تک قبضہ کر لیا تھا۔ دونوں دارالسلطنتوں میں ایک ہی بادشاہ ہو گیا۔

دوسرا سلطان مظفر گجرات میں تھا۔ ابراہیم سے چند روز پہلے اس کا انتقال ہو گیا وہ بڑا متشرع بادشاہ تھا۔ عالم تھا، محدث تھا، اور ہمیشہ قرآن شریف لکھا کرتا تھا۔ اس خاندان کو ٹانک کہتے ہیں ان کے بزرگ بھی سلطان فیروز شاہ کے اہل خدمت میں سے شراب دار تھے۔ فیروز شاہ کے بعد گجرات دبا بیٹھے۔ تیسرا دکن میں بہمنی تھا۔ آج کے زمانے میں بہمنی سلطنت میں دم نہیں رہا اس کا سارا ملک بڑے بڑے امراء میں منقسم ہو گیا ہے۔ بادشاہ وقت امراء کا محتاج ہے۔ چوتھا مالوہ میں (جس کو منڈو بھی کہتے ہیں) سلطان محمود تھا۔ اس خاندان کو خلجی کہتے ہیں۔ اس کو رانا سانگا نے زیر کر لیا ہے۔ اور اس کے ملک کے اکثر حصے چھین لیے۔ یہ سلطنت اب بودی ہو گئی ان کے باپ دادا

بھی فیروز شاہی امیر تھے۔ پھر مالوہ کے حاکم بن بیٹھے۔

پانچواں نصرت شاہ بنگالہ میں تھا۔ اس کا باپ بنگالہ کا بادشاہ ہوا تھا جس کا نام سلطان علاؤالدین تھا اور جس کی قوم سید تھی۔ نصرت شاہ کو سلطنت ترکہ میں ملی ہے۔ بنگالہ میں سلطنت ملنے کی یہ عجیب رسم ہے کہ میراثی بہت کم ہوتی ہے۔ حقیقت میں بادشاہ تخت ہے۔ بادشاہ کے لیے بھی اس کی جگہ معین ہے۔ اور امراء و وزراء و اہل مناصب کے واسطے بھی ایک ایک جگہ مقرر ہے۔ گویا بنگالیوں کے نزدیک وہ تخت اور وہ جگہ ہی کچھ چیز ہے۔ اس ہر جگہ سے نوکروں چاکروں کی ایک جماعت متعلق ہے۔ جس امیر یا وزیر کا عزل و نصب بادشاہ کو منظور ہوتا ہے اس کی جگہ بدل دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ جو حشم و خدم ہوتے ہیں وہ جدید شخص کے متعلق ہو جاتے ہیں یہی بادشاہی تخت کی صورت ہے بادشاہی یوں حاصل ہوتی ہے کہ جو کوئی بادشاہ حال کو مار کر جھٹ پٹ تخت پر بیٹھ جاتا ہے اسی کو تمام امراء، وزراء، فوج اور رعیت بادشاہ سمجھنے لگتی ہے۔ مقتول بادشاہ کی طرح قاتل بادشاہ کے سب مطیع ہو جاتے ہیں۔ بنگالیوں کا قول ہے کہ ہم تو تخت کے نوکر ہیں۔ جو تخت پر بیٹھ جائے وہی ہمارا بادشاہ ہے۔ چنانچہ نصرت شاہ کے باپ سلطان علاؤالدین سے پہلے ایک حبشی بادشاہ کو قتل کر کے تخت پر جو بیٹھا تھا۔ مدتوں اس نے حکومت کی۔ حبشی کو سلطان مار کر بیٹھ گیا۔ اور بادشاہ ہو گیا۔ البتہ علاؤالدین کے بعد اس کا بیٹا نصرت شاہ بطور وراثت اب بادشاہ ہوا۔ بنگالہ میں یہ بھی دستور ہے کہ ہر بادشاہ کو نیا خزانہ جمع کرنا لازم ہوتا ہے۔ خزانہ جمع کرنا ان لوگوں کے نزدیک بڑے فخر کی بات ہے۔ یہ بھی قاعدہ ہے کہ خزانہ عامرہ بلکہ تمام خانگی اخراجات شاہی کے واسطے ہمیشہ سے تنخواہیں جاگیریں مقرر ہیں۔ ان کی آمدنی اور کاموں میں بالکل نہیں صرف ہوتی۔ یہ تو مسلمانوں کے پانچ بادشاہوں کا حال ہے۔ ان کے علاوہ مسلمان سردار صاحب ملک و فوج اور بہت سے ہیں جو خود مختار اور ذی اقتدار ہیں۔

ہندوؤں میں سب سے بڑا راجا تو آج کل ایک بیجا نگر والا ہے اور دوسرا رانا سانگا ہے جس نے اپنی چالاکی اور جرأت سے اقتدار حاصل کیا ہے۔ اس کا اصلی ملک چتوڑ ہے۔ مندو کے بادشاہوں کی کمزوری کے زمانہ میں رنتھنبور، رنگ پور، بھیلسا اور چندیری کے علاقے اس کے قبضہ میں آگئے۔ ۹۳۴ھ میں عنایت الٰہی سے چندیری کو جو کئی برس سے دارالحرب تھا رانا سانگا کے بڑے سردار میدنی راؤ حاکم چندیری سے دو گھڑی میں بزور شمشیر میں نے چھین لیا۔ اور کفار کو قتل کر کے دارالاسلام بنا دیا۔

ہندوستان کے شہر بہت غلیظ رہتے ہیں۔ تمام شہروں اور زمین کی ایک قطع ہے۔ یہاں کے باغوں کی دیواریں نہیں ہوتیں۔ اکثر باغ میدان میں ہوتے ہیں۔ اکثر دریاؤں اور ندیوں کے کناروں پر اور جہاں گھاس ہوتی ہے برسات میں دلدل ہو جاتی ہے جس سے آمد و رفت میں دقت پڑتی ہے۔ کہیں کہیں کنوئیں اور تالاب ہیں جن میں برساتی پانی جمع ہو جاتا ہے گزران کرتے ہیں۔ ہندوستان میں دیہات بلکہ شہر بہت جلد بس جاتے اور اجڑ جاتے ہیں۔ بڑے بڑے شہر والے جہاں برسوں سے بود و باش کرتے ہوں اگر بھاگ گئے یا بھاگیں تو ایک دن یا دوپہر میں ایسے وہاں سے کافور ہو جاتے ہیں کہ نشان تک نہیں رہتا۔ اگر لوگ بسنا چاہیں تو نہر وغیرہ کھودنے کی یا بند باندھنے کی احتیاج نہیں ہوتی۔ لوگ جمع ہو گئے، تالاب بنا لیا یا کنواں کھود لیا اور فارغ ہو گئے۔ نہ مکان بنانا نہ دیواریں چننی۔ ڈھیروں پھونس اور بے شمار درختوں سے جھونپڑیاں بنا بیٹھتے ہیں بس آن کی آن میں گاؤں یا شہر خاصا آباد ہو جاتا ہے۔

ہندوستان میں لطافت کم ہے لوگ نہ حسین ہیں نہ میل جول کے اچھے ہیں۔ نہ ان کا ادراک اعلیٰ درجہ کا ہے۔ نہ ان میں مروت

مہربانی ادب ہے۔ ہنروں اور کاموں کی ترتیب بھی اچھی نہیں۔ گھوڑیاں اچھی نہیں ہوتیں۔ گوشت اچھا نہیں ہوتا۔ انگور، خربوزے اور میوے اچھے نہیں ہوتے۔ برف نہیں، ٹھنڈا پانی نہیں، بازاروں میں جو کھانے اور روٹیاں بکتی ہیں وہ سب خراب۔ حمام، مدرسے، شمع، مشعل اور شمع دان کا نام نہیں۔ شمع اور مشعل کی جگہ چکٹ اکٹھا کر کے جلاتے ہیں۔ اور اس کو دیوٹی کہتے ہیں۔ الٹے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی تپائی لیتے ہیں۔ اس تپائی کے ایک پایہ کے کنارے میں شمعدان کے سر کی طرح ایک لوہے کو خوب مضبوط باندھ دیتے ہیں۔ انگوٹھے کی برابر پلیتا آہن دو لکڑی کے دو شاخہ میں باندھ دیتے ہیں۔ سیدھے ہاتھ میں ایک خشک کدو رکھتے ہیں اس میں ایک باریک سوراخ کرتے ہیں۔ جس سے تیل ٹپکتا ہے۔ اس کدو میں تیل بھر دیتے ہیں۔ جب پلیتے پر ڈالنے کی حاجت ہوتی ہے تو اس کدو سے تیل ٹپکاتے ہیں۔ کدو کے سوراخ سے تیل کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں مقدور والوں کے ہاں ایسی دیوٹیاں سو دو سو ہوتی ہیں۔ شمع و مشعل کی جگہ اسی کو برتتے ہیں بادشاہوں اور امراء کے سامنے بھی رات کو ضرورت کے وقت یہی چکٹ کے دیوٹ شمع کے بدلے لا کر پاس کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سوائے ندیوں اور بڑے دریاؤں کے نالوں وغیرہ میں پانی ہمیشہ جاری نہیں رہتا۔ باغوں اور مکانوں میں نہریں نہیں ہوتیں عمارتیں بے ہوا اور صفا اور خوش قطع نہیں۔ عوام ننگے پاؤں پھرتے ہیں۔ ناف سے دو بالشت نیچے ایک کپڑا باندھتے ہیں اس کو لنگوٹا کہتے ہیں۔ یہ ایک ہاتھ کپڑا لپٹا ہوا ہے۔ اس کے نیچے کو آڑ کونا لٹکا رہتا ہے۔ اس کا دوسرا کونا اور ہے۔ جب لنگوٹا باندھتے ہیں تو اس کونے کو دونوں رانوں کے بیچ میں سے لے کر پیچھے گھرس دیتے ہیں اس لنگوٹے کو خوب مضبوط باندھتے ہیں۔ عورتیں ایک لنگی باندھتی ہیں۔ آدھی کمر میں باندھتی ہیں اور آدھی سر سے اوڑھتی ہیں۔

ہندوستان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وسیع ملک ہے۔ اس میں سونا چاندی بہت ہے۔ برسات کی ہوا نہایت اچھی ہوتی ہے۔ برسات میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دن بھر میں دس پندرہ اور بیس دفعہ مینہ برس جاتا ہے۔ بارش کے موسم میں ایک بار ہی رو آ جاتی ہے اور ایسی آتی ہے کہ جہاں پانی کی بوند بھی نہیں ہوتی وہاں دریا بہنے لگتا ہے۔ مینہ برستے میں اور مینہ برسنے کے بعد بڑے مزے کی ہوائیں چلتی ہیں۔ چنانچہ ہوا ٹھنڈی ہوتی ہے اور اعتدال کے ساتھ چلتی ہے۔ اتنا عیب ضرور ہے کہ مرطوب بہت ہوتی ہے۔ یہاں کی برسات میں ہمارے ملک کی کمان سے تیر اندازی نہیں ہو سکتی۔ تیر بیکار ہو جاتا ہے۔ کمان پر ہی کیا منحصر ہے بلکہ جبہ، کتاب، لباس اور اسباب وغیرہ ہم سب میں سیل دوڑ جاتی ہے مکان سارے بھیگے ہوئے ہوتے ہیں۔ علاوہ برسات کے جاڑے اور گرمی میں بھی مزے کی ہوائیں چلتی ہیں۔ شمالی ہوا ہمیشہ چلتی رہتی ہے جس کے ساتھ گرد و غبار اتنا اڑتا رہتا ہے کہ کبھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتا۔ اسی کو یہاں آندھی کہتے ہیں۔ ثور اور جوزا میں گرمی ہوتی ہے مگر اس قدر بے اعتدال گرمی نہیں۔ جیسے بلخ اور قندھار میں۔ یہاں کی گرمی کی مدت وہاں سے آدھی ہو گی۔

ہندوستان میں ایک عمدگی یہ بھی ہے کہ ہر فرقہ اور حرفہ کا آدمی کثرت سے ہے۔ اور ہر کام اور ہر چیز کے لیے ہزاروں آدمی موجود ہیں جن کے باپ دادا کے وقت سے یہی کام ہوتا آیا ہے۔ ظفر نامہ میں ملا شرف الدین علی یزدی نے لکھا ہے کہ حضرت امیر تیمور نے جب سنگین مسجد بنوائی ہے تو آذربائیجان، فارس، ہندوستان وغیرہ ملکوں کے دو سو سنگ تراش کام کرتے تھے اور اس تعداد کو وہ بہت خیال کرتے تھے۔ میں نے جو عمارت آگرہ میں بنوائی ہے اس میں آگرہ ہی کے چھ سو اسی سنگ تراش لگے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ سیکری، بیانہ، دولت پور، گوالیار اور کول میں ایک ہزار چار سو اکیانوے سنگ تراش روزانہ میرے مکانوں میں کام کرتے ہیں۔ اسی پر قیاس کر لینا چاہیے کہ ہر کام اور پیشہ کا آدمی ہندوستان میں بے شمار ہے۔

بھیرہ سے بہار تک اب جتنا ملک میرے قبضے میں ہے باون کروڑ روپے کا ہے۔ اس میں آٹھ نو کروڑ کے علاقے اُن راجاؤں اور رئیسوں کے تصرف میں ہیں جنہوں نے ہمیشہ سے اطاعت کی ہے۔ اور یہ جاگیریں نسلاً بعد نسلٍ ان کو گزاشت کر دی گئی ہیں۔

ہم جو آگرہ میں پہلے پہل آئے تو ہمارے لوگوں میں اور یہاں والوں میں باہم بے حد نفرت اور غیریت تھی۔ رعایا اور سپاہی ہمارے آدمیوں کی آواز سے کوسوں بھاگتے تھے۔ تھوڑے ہی دنوں میں دلی، آگرہ وغیرہ مقامات کے لوگوں نے جہاں قلعے تھے قلعے مضبوط کر لیے اور سب آمادۂ فساد ہو گئے کسی نے اطاعت قبول نہ کی۔

جب میں آگرہ میں آیا ہوں تو گرمی کا موسم تھا۔ لوگ مارے ڈر کے اِدھر اُدھر بھاگ گئے ہمارے آدمیوں کے لیے غلہ اور جانوروں کے واسطے گھاس دانہ وغیرہ نہ آتا تھا۔ راجہ اور زمیندار غیریت اور نفرت کے سبب سے سرکش ہو کر لوٹ مار مچا رہے تھے۔ راستے بند تھے۔ ہم کو اتنی فرصت نہ ملی کہ خزانے کا منہ کھول دیتے، ہر پرگنے اور ہر ضلع میں آدمی مقرر کرتے۔ دوسرے اس سال گرمی اس شدت کی پڑی کہ لوگ لُو کے مارے مرے جاتے تھے۔ ان وجوہات سے امراء اور اچھے اچھے سپاہیوں کے جی چھوٹ گئے۔ ہندوستان میں رہنے کو اُن کا دل نہ چاہتا تھا بلکہ یہاں سے کھسکنے لگے۔ بیگ بوڑھے اور تجربہ کار امراء کا ایسا کرنا مضائقہ نہیں۔ مگر یہ لوگ ایسے بیوقوف ہیں کہ ان باتوں کے منہ سے نکالنے کے بعد کی برائی بھلائی اور بہتری بدتری کو نہیں سمجھتے ان سب نے جب ایک کام کا ارادہ کر لیا تو پھر اس کے بیان کرنے سے کیا فائدہ۔ سارے چھوٹے بڑوں کی ایسی باتیں کیسی بے جا ہیں۔ غرض یہ کہ اب کے جو میں کابل سے چلا تو بہت سے نئے لوگ ہیں جن کو مرتبہ امارت نصیب ہوا۔ ان سے مجھے یہ امید تھی کہ اگر میں جلتی آگ میں گروں گا تو یہ میرے ساتھ گر پڑیں گے اور اگر میں بہتے پانی میں گروں گا تو میرا ساتھ دیں گے۔ جہاں میرا پسینہ گرے گا وہاں اپنا خون گرائیں گے۔ نہ کہ میری طبیعت کے خلاف باتیں کریں گے۔ جس بات کا میں مشورہ کرنا چاہتا ہوں اور بالاتفاق اس کے کرنے کا ارادہ کر چکا ہوں مشورے سے پہلے یہ لوگ اس بات سے انحراف کر جاتے ہیں۔ اور لوگ اگر یہ نکلے تو احمدی پروانچی اور ولی خازن ان سے بدتر نکلے۔ کابل سے چل کر ابراہیم کو زیر کرنے کے بعد آگرہ فتح ہونے تک خواجہ کلاں نے اچھے اچھے کام کیے۔ اور ہمت والوں اور مردوں کی سی باتیں کیں۔ مگر آگرہ پہنچنے کے بعد چند ہی روز میں اس کی رائے پلٹ گئی۔ سب سے زیادہ جانے پر خواجہ کلاں ہی تلا ہوا تھا۔

جب مجھے لوگوں کی بددلی معلوم ہوئی تو سارے امراء کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ میں نے کہا کہ جس طرح سلطنت اور جہانگیری کے لیے اسباب اور ہتھیار کا ہونا لازم ہے اسی طرح بادشاہی اور امیری بے آدمیوں اور ملک کے ناممکن ہے۔ غور کرو کئی برس کوشش کی۔ محنت اٹھائی، فوجیں لے کر چڑھائیاں کیں۔ ہم نے اپنی جان کو اور فوجوں کو لڑائی کی جلتی آگ میں ڈالا۔ خدا نے فضل کیا کہ ایسے ایسے زبردست دشمن زیر کیے۔ وسیع ملک ہاتھ آیا۔ اس وقت کون سی بھیڑ پڑی ہے اور کیا دباؤ ہے کہ جس ملک کو اتنی جانکاہی سے لیا ہے اس کو یوں ہی چھوڑ کر کابل چلتے ہیں اور تنگ دستی کی بلا میں پھنسیں۔ جو میرا دوست ہے وہ بیہودہ باتیں منہ سے نہ نکالے۔ جس کو ٹھہرنے کی تاب نہ ہو اور جو جانا چاہے وہ بسم اللہ کرے۔ یہ معقول تقریر سنا کر خواہ مخواہ لوگوں کو ان خیالوں سے باز رکھا اور ان کے دلوں سے اندیشہ نکالا۔

ہندوستان میں بڑا عیب یہ ہے کہ نہر نہیں ہے۔ جہاں موقع کی جگہ ہو وہاں چرخ لگا کر پانی جاری کیا جائے۔ اور خوش قطع جگہ بنائی جائے۔ آگرہ میں آنے کے بعد اسی کام کے لیے جمنا کے پار باغ لگانے کے واسطے مقامات ملاحظہ کیے۔ ایسے اجاڑ اور گندے مقامات تھے کہ بڑی کراہیت اور ناخوشی کے ساتھ وہاں سے عبور کیا گو ایسی جگہ چار باغ بنانے کو دل نہ چاہتا تھا۔ مگر آگرہ کے قریب کوئی اور جگہ بھی دل

خواہ نظر آئی۔ اس واسطے ضرور ہوا کہ اسی کو درست کیا جائے۔ پہلے ایک بڑا کنواں جس سے حمام میں پانی لیا جائے بنوایا۔ پھر وہ قطعہ زمین کا جہاں املی کے درخت اور مثمن حوض ہے درست کرایا۔ اس کے بعد بڑا حوض اور اس کی پٹری بنی۔ پھر بارہ دری کے آگے جو حوض ہے اور بارہ دری بنائی گئی۔ یہ بن چکے تو خلوت خانہ کا باغیچہ اور اس کے مکان بنے۔ پھر حمام تیار ہوا۔ غرض اس بے ڈھنگی اور خراب جگہ پر ہندوستانی وضع کے خوبصورت باغ اور عمارتیں تیار ہو گئیں۔ ہر گوشے میں معقول چمن بن گیا۔ ہر چمن میں طرح طرح کے گل بوٹے لگائے گئے۔ ہندوستان کی تین چیزوں سے مجھے نفرت ہے۔ ایک گرمی۔ دوسری آندھی اور تیسری گرد۔ حمام سے ان تینوں چیزوں کا علاج ہو گیا۔ پھر حمام کے لیے کیا چاہیے۔ گرمی کی شدت میں ایسا ٹھنڈا ہوتا ہے کہ سردی کے مارے کانپنے کی نوبت ہو جاتی ہے۔ ایک حجرہ، حمام اور حوض تینوں سنگین بنے ہیں۔ اجارہ سنگ مرمر کا ہے۔ باقی کل چھت اور فرش سنگ سرخ کی ہے جو بیانہ کا پتھر ہے۔ اس کے علاوہ خلیفہ، شیخ زین اور یونس علی نے دریا کے کنارے پر خوش قطع اور وضع دار باغات اور حوض بنوائے۔ لاہور اور دیبال میں جیسے رہٹ ہیں ویسے رہٹ کنوؤں پر لگائے اور پانی جاری کیا۔ ہندوستانیوں نے جو اس طرح اور صورت کے مکان کبھی خواب میں نہ دیکھے تھے تو اس واسطے جمنا کے اس جانب کا نام جہاں یہ عمارتیں بنی ہیں کابل رکھ دیا۔

بیانہ کے قلعہ اور بعض اور قلعوں کے خیال سے جو ہنوز فتح نہ ہوئے تھے استاد علی قلی کو حکم دیا کہ ایک بڑی توپ ڈھالو۔ علی قلی نے بھٹی وغیرہ تیار کر کے مجھے اطلاع دی۔ ماہ محرم روز دو شنبہ کو میں توپ ڈھلنے کا تماشا دیکھنے گیا۔ جہاں توپ ڈھلنے کا سانچا تھا وہاں آٹھ بھٹیاں لگائی تھیں۔ ہر بھٹی کے نیچے سے ایک نالی سانچے تک بنا دی تھی۔ بھٹیوں کی نالیوں کا منہ کھولتے ہی نالیوں سے مسالہ پانی کی طرح بہہ کر آیا ابھی سانچا پورا نہ بھرا تھا کہ بھٹیوں سے مسالہ آنا موقوف ہو گیا۔ یا تو بھٹیوں میں قصور، یا مسالہ میں۔ بہرحال استاد علی بہت ہی شرمندہ ہوا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ جو تانبا قالب میں پگھلا ہوا ہے اس میں جا پڑوں۔ میں نے اس کی دل جوئی کی اور خلعت دے کر اس شرم ساری کو دور کیا۔

ماہ صفر کے آخر میں خواجگی اسد جو شاہ طہماسپ صفوی کے پاس ایلچی ہو کر عراق گیا تھا سلیمان نام ترکمان کو ساتھ لے کر آیا اور بہت سی سوغاتیں لایا۔ ان میں دو چرکس لڑکیاں بھی تھیں۔ ربیع الاول کی سترھویں تاریخ جمعہ کے دن عجیب واقعہ ہوا۔ چنانچہ میں نے اس کا حال بھی مفصل لکھ بھیجا تھا۔ اور یہاں بھی کم و کاست لکھتا ہوں۔ مفصل کیفیت یوں ہے کہ ابراہیم لودھی کی بد نصیب ماں نے سنا کہ ہندوستانیوں کے ہاتھ کا کھانا میں کھانے لگا ہوں اور بات یہ ہوئی تھی کہ میں نے کبھی ہندوستانی کھانے دیکھے نہ تھے اب سے تین چار مہینے پہلے میں نے حکم دیا کہ ابراہیم کے باورچیوں کو بلاؤ اس واسطے کہ مجھے ہندوستانی کھانوں کے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ پچاس ساٹھ آدمی آئے ان میں سے چار چن کر میں نے رکھے۔ اس کمبخت (ابراہیم کی ماں) نے یہی حال سنا۔ احمد چاشنی گیر (ہندوستانی چاشنی گیر بکاول کو کہتے ہیں) اسے جو اٹاوہ سے آیا تھا۔ سازش کر کے ایک ماما کے ہاتھ زہر کی پڑیا جس میں تولہ بھر (تولہ دو مثقال سے زیادہ ہوتا ہے) زہر تھا بھیجی۔ احمد نے باورچی خانے کے ہندوستانی باورچی کو چار پرگنوں کے انعام کا لالچ دیا اور کہلا بھیجا کہ جس طرح ہو سکے بادشاہ کو زہر دے دے۔ جس ماما کے ہاتھ احمد کے پاس زہر بھیجا تھا اس کے پیچھے پیچھے ایک اور ماما کو یہ دریافت کرنے کے لیے بھیجا کہ پہلی ماما نے زہر احمد کے حوالے کر دیا یا نہیں۔ اور ہدایت کی کہ بہتر ہے کہ دیگچی میں زہر نہ ڈالا جائے بلکہ رکابی میں ڈالا جائے۔ اس لیے کہ میں نے بکاولوں کو حکم دے دیا تھا کہ ہندوستانیوں سے غافل نہ رہنا۔ جب کھانا

تیار ہو جاتا ہے تو تیلی میں چاشنی چڑھا دی جاتی ہے۔ دسترخوان بچھنے کے وقت نالائق بکاولوں کو ہوش نہیں رہتا۔ چینی کی رکابی میں رکھ کر چپکے لائے جاتے ہیں۔ آدھے سے کم زہر تو اس پر چھڑکا اور آدھے سے زیادہ رکھ لیا کہ قلیہ کے پیالے میں ڈال دے یا چٹنی میں۔ اگر ایسا کیا جاتا تو برا ہوتا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور جو رہ گیا تھا گھبرا کر چولہے میں ڈال دیا۔

جمعہ کے دن عصر کے وقت دسترخوان بچھا۔ مرغ گوشت پکا تھا کچھ وہ کھایا۔ کچھ اندرس کا قلیہ کھایا۔ مگر کوئی چیز اچھی معلوم نہ ہوتی۔ قاق کے گوشت کی دو ایک بوٹیاں چکھیں۔ دل الجھن کرنے لگا قاق کے گوشت کی بوٹیاں زیادہ بدمزہ معلوم ہوئی تھیں۔ میں سمجھا اسی سے دل الجھن کرتا ہے۔ ذرا ٹھہر کر پھر متلی ہونے لگی۔ غرض دو تین بار دسترخوان پر بیٹھے بیٹھے یہی حال ہوا۔ قریب تھا کہ قے ہو جائے۔ آخر میں گھبرا ہوا۔ آب دار خانہ تک جاتے جاتے ایک ابکائی آئی۔ آب دار خانہ کے پاس جا کر خوب استفراغ ہوا۔ میں نے کھانا کھا کر بلکہ شراب پی کر بھی کبھی قے نہ کی تھی۔ میرے دل میں اس طرح کی قے سے شک پیدا ہوا۔ میں نے حکم دیا کہ باورچی کو نظر بند رکھو۔ کھانا کتے کو کھلاؤ اور کتے کو نظر بند رکھو دوسرے دن پہر چڑھے تک کتے کا حال بگڑا رہا۔ اس کا پیٹ ابھر گیا۔ ہر چند اس کو مارتے تھے اور اٹھاتے تھے لیکن وہ ہلتا نہ تھا۔ دوپہر تک اس کا یہی حال رہا۔ پھر چت لیٹ گیا اور مر گیا۔ دو ایک چیلوں نے بھی اس کھانے میں سے کھایا۔ دوسرے دن وہ بھی قے کرتے رہے۔ ایک کی حالت تو بہت بگڑ گئی تھی مگر دونوں بچ گئے۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔ اللہ تعالیٰ نے دوبارہ زندگی عنایت فرمائی۔ گویا میں پھر ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔

سلطان محمد بخشی کو میں نے حکم دیا کہ باورچی سے اچھی طرح حال دریافت کرو۔ اس نے سارا کچا چٹھا بیان کر دیا۔ پیر کے دن میں نے دربار کیا۔ حکم ہوا کہ تمام وزراء اور عمائد وغیرہ حاضر دربار ہوں۔ سب حاضر ہوئے۔ ان دونوں مردوں اور عورتوں کو لائے۔ ان کے اظہار لیے گئے۔ سب نے پورا پورا واقعہ بیان کر دیا۔ چاشنی گیر کے ٹکڑے ٹکڑے کرا دیئے گئے۔ باورچی کی زندہ کھال کھنچوا دی۔ ایک عورت کو ہاتھی کے پاؤں سے کچلوا دیا۔ دوسری کو گولی مار دی۔ کم بخت بوا لعینی ابراہیم کی ماں کو قید کیا گیا۔ اس نے بھی اپنے کیے کی سزا پائی اور آئندہ پائے گی۔ جمعہ کو ایک پیالہ دودھ کا بھی نہ پیا اور دو شنبہ کو دودھ میں گل مختوم اور تریاق فاروقی ملا کر پیا۔ دودھ نے زہر کو خوب صاف کر دیا۔ دو شنبہ کو پہلے دن کی طرح پھر قے ہوئی۔ جلا ہوا صفرا کالا قے میں نکلا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب اچھی طرح ہوں۔ میں نہ جانتا تھا کہ جان ایسی عزیز چیز ہے۔ سچ ہے جس کے مرنے کی نوبت آ جاتی ہے وہی جان کی قدر جان جاتا ہے۔ اب اس واقعہ کا اور اس حادثہ کا جب خیال آ جاتا ہے تو بے ساختہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت تھی کہ اس نے دوبارہ زندگی عطا فرمائی۔ اس کا شکر کس زبان سے ادا کروں۔

منگل کے دن تیسری جمادی الثانی کو میں سیر کرنے سوار ہوا۔ اثنائے راہ میں خیال آیا کہ ہمیشہ سے دل میں توبہ کی نیت تھی اور خلاف شرع فعل کرنے سے دل خوش نہ تھا۔ میں نے کہا اے نفس است

دور ساز از جہل شاہی خود را
پاک ساز از ننگ گناہی خود را

اسی سوچ میں وہاں سے جا کر میں نے شراب سے توبہ کی۔ نقرئی اور طلائی صراحیاں اور گلاس وغیرہ تمام سامان بزم اسی وقت منگا کر توڑ ڈالا۔ ساری شراب پھنکوا دی اور اپنے دل کو پاک کر لیا۔ ٹوٹا ہوا سامان محتاجوں اور مستحقوں کو بانٹ دیا۔ سب سے پہلے میں

ساتھ عسس نے توبہ کی اس نے داڑھی منڈانے اور رکھنے میں بھی ساتھ دیا تھا۔ اسی رات میں اور دوسرے دن امرا، مصاحبین، سپاہی اور دوسرے لوگوں میں سے تقریباً تین سو آدمیوں نے توبہ کی اور شراب تند جو بابا دوست کی لائی ہوئی شراب میں نمک ڈلوا دیا گیا تاکہ وہ سرکہ ہو جائے ایک گڑھا کھدوا کر شراب گرا دی گئی۔ جہاں یہ تند صراحی تھیں میں نے حکم دیا کہ اس جگہ ایک پتھر نصب کر دیا جائے اور ایک مکان اس کے پہلو میں بنا دیا جائے۔ ۹۳۵ھ میں گوالیار کی سیر سے جب میں پلٹ کر دھولپور سے سیکری آیا تو یہ مکان تیار ہو گیا تھا۔ میں نے پہلے نیت کی تھی کہ اگر رانا سانگا پر مجھے فتح حاصل ہو تو میں مسلمانوں سے محصول لینا معاف کر دوں گا۔ اثنائے توبہ میں محمد سارباں اور شیخ زین نے یاد دلایا۔ میں نے کہا خوب یاد دلایا۔ اس وقت جو ملک میرے پاس ہے اس میں مسلمانوں سے محصول لینا معاف کر دیا۔ منشیوں کو حکم دیا کہ ان دونوں عظیم الشان باتوں کے مشتہر ہونے کے فرامین لکھو۔ شیخ زین نے فرمانوں کا مسودہ لکھا اور فرمان تمام قلمرو میں بھیجے گئے۔

ان ہی دنوں میں گزشتہ واقعات کے سبب سے جیسا بیان ہوا چھوٹے بڑے سب بہت ہی ہراساں اور اندیشہ ناک تھے۔ کسی سے کوئی بہادری کی بات اور دلیرانہ رائے سننے میں نہ آتی تھی۔ وزیروں اور امیروں کا بھی یہی حال تھا کہ ایسی بات ذکر تے تھے جس سے جوانمردی ظاہر ہو اور نہ کوئی رائے ایسی دیتے تھے جس سے ہمت بہت بندھے۔ البتہ ایک خلیفہ اس یورش میں مستقل رہا۔ اس نے انتظام وغیرہ میں بہت کوشش کی۔ آخر لوگوں کی اتنی بے دلی اور اس قدر کم ہمتی دیکھ کر میں نے ایک تدبیر سوچی۔ میں نے سب امیروں اور سرداروں کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ:

اے امراء اور سرداران فوج! ؎

ہر کہ آمد بجہاں اہل فنا خواہد بود
آنکہ پائندہ و باقی است خدا خواہد بود

جس نے ماں کا پیٹ دیکھا ہے وہ ضرور ایک دن قبر بھی دیکھے گا۔ جو دنیا میں آیا ہے وہ یہاں سے جائے گا بھی۔ بدنام ہو کر جینے سے نیک نام مرنا بہتر ہے ؎

بنام نکو گر بمیرم رواست
مرا نام باید کہ تن مرگ راست

اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہ سعادت عطا کی ہے اور یہ دولت عنایت فرمائی ہے کہ جو اس میں مرے وہ شہید ہو اور جو مارے وہ غازی ہو۔ اب سب کو حلف کرنا چاہیے تاکہ کوئی اس موت سے نہ بھاگے اور جب تک دم میں دم ہے اس لڑائی سے منہ نہ پھیرے۔ سارے سردار، نوکر، چھوٹے بڑے سب نے قرآن شریف ہاتھوں پر لے کر اسی بات کا عہد کیا اور قسمیں کھائیں۔ یہ ایسی تدبیر ہوئی جس سے سب یک جہت ہو گئے۔ اسی زمانے میں ادھر ادھر بھی فتنے اور فساد برپا ہو گئے۔

اسی فتح کے بعد سے فرمانوں پر جو طغرا لکھا جاتا ہے اس میں غازی کا لفظ لکھنا شروع ہو گیا۔ محمد شریف منجم جس نے وہ منحوس باتیں بکی تھیں فتح کی مبارکباد دینے آیا۔ میں نے بھی خوب برا بھلا کہہ کر دل کا بخار نکالا۔ اگرچہ وہ بڑا بے ایمان، بدنفس، بڑا مغرور اور بے اعتبار آدمی تھا مگر چونکہ قدیم الخدمت تھا اس لیے ایک لاکھ انعام دے کر اس کو رخصت کیا اور حکم دیا کہ میری قلمرو

میں نہ ٹھہرنے پائے۔

پیر کے دن چھٹی تاریخ باغ میں جشن ہوا۔ اس کے بعد حکم دیا کہ ہندوستان کے نٹ اور بازی گر تماشے دکھائیں۔ ان لوگوں نے تماشے کرنے شروع کیے۔ ہندوستانی نٹ اور بازی گر بعض تماشے ایسے کرتے ہیں کہ ہماری ولایت والے نہیں کرتے۔ ان میں سے ایک تماشا یہ ہے کہ اپنی پیشانی اور ران پر سات حلقے چپکاتے ہیں۔ چار حلقے ہاتھ کی انگلیوں کے گرد چپکاتے ہیں ان کے علاوہ چار حلقے اور لیتے ہیں۔ ان میں سے دو کو ہاتھ کی دو انگلیوں سے اور دو کو پاؤں کی دو انگلیوں ——— سے آہستہ چکر دیتے ہیں دوسرے مور چال کی طرح اپنا ایک ہاتھ زمین پر ٹیکا اور دوسرے ہاتھ سے اور دونوں پاؤں سے تین حلقوں کو جلدی جلدی چکر دیا۔ تیسرے یہ کہ وہاں کے نٹ پاؤں کو باندھتے ہیں اور ان میں جو میں پاؤں سے چلتے ہیں۔ یہاں کے نٹ پاؤں کو باندھتے نہیں۔ چوتھے یہ کہ اس ولایت کے وطن میں سے ایک دوسرے کو کاندھے پر کھڑا کر کے چلتا ہے۔ ہندوستانی نٹ اس طرح تین چار کو معلق لے کر چلتا ہے۔ پانچویں یہ بات گز کا بانس ایک نٹ اپنی کمر پر رکھ کر بانس کو پکڑے ہوئے کھڑا رہتا ہے اور دوسرا اس پر قلابازی کرتا ہے چھٹے یہ کہ چھوٹی عمر کا نٹ بڑی عمر کے نٹ کے سر پر کھڑا ہو جاتا ہے اور جدا نہیں ہوتا ہے۔ اس کے بعد پاتروں کا ناچ ہوا۔ مغرب کے وقت تک جلسہ رہا۔ بہت روپیہ بانٹا اور بڑا شور و غل رہا۔ مغرب اور عشا کے بیچ میں چند مصاحبوں کا جلسہ ہوا۔ یہ جلسہ پہر بھر سے زیادہ رہا۔

پیر کے دن پانچویں تاریخ بنگال اور بہار سے فارغ ہو کر دریائے سرو کے کنارے کی منزل سے لکھنؤ کی نواح میں بیبن اور شیخ بایزید کے فساد فرو کرنے کا مصمم قصد کر کے کوچ کیا۔ دو منزل چل کے بدھ کے دن چتر موک ندی کے گھاٹ پر جو سکندر پور کے پاس ہے لشکر فرو کش ہوا۔ آج ہی اہل لشکر عبور کرنے لگے۔ ان حرام خوروں کی متواتر خبریں آئیں کہ وہ سرو سے پار ہو کر لکھنؤ کی طرف گئے ہیں۔ ان کا راستہ روکنے کے لیے ترک اور ہندوستانی سرداروں میں سے جلال الدین شرقی، علی خاں فرملی، نظام خاں سالار، تردی بیگ، قربان چرخی اور حسین خاں دریا خانی مقرر ہوئے۔ ان سرداروں کو جمعرات کے دن رخصت کیا۔ آج ہی رات کو تراویح پڑھ چکے تھے اور ایک پہر گھڑیاں گزر رہی تھیں کہ دھوندوکا ابر اٹھا اور ایک ساتھ ہی ایسی طوفانی آندھی چلی کہ شاید ہی کوئی خیمہ کھڑا رہ گیا ہو۔ میں اپنے خیمے میں بیٹھا تھا کتاب کے اجزا سمیٹنے تک کی فرصت نہ ملی۔ خیمہ مع پیش خانہ میرے سر پر آ رہا۔ خیمہ کی رسیوں وغیرہ کے ٹکڑے اڑ گئے۔ خدا نے مجھے بال بال بچایا۔ کہیں چوٹ تک نہیں آئی۔ کتاب کے اجزا بھیگ گئے تھے بڑی مشکل سے میں نے سب کو سمیٹا۔ سقرلات کے توشک میں لپیٹ کر کتاب کو میں نے پیٹ کے نیچے رکھ لیا۔ اور اوپر سے کمبل اوڑھ لیا۔ دو گھڑی کے بعد طوفان فرو ہوا تو شے خانہ کا خیمہ کھڑا کر کے شمع روشن کی اور بڑی دقت سے آگ سلگائی۔ صبح تک آنکھ نہ لگی۔ کاغذوں کو سکھانے میں مصروف رہا۔ جمعرات کو ہم دریا سے پار ہو گئے۔

گاندھی

خاندان

گاندھی خاندان کے لوگ ذات کے بنیے ہیں اور ابتدا میں پنساری کی دکان کرتے تھے لیکن تین پشتوں سے یعنی میرے دادا کے وقت سے وہ کاٹھیاواڑ کی مختلف ریاستوں میں دیوان رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے میرے دادا اُتم چند گاندھی عرف اوتا گاندھی اپنے اصول کے بڑے پکے تھے۔ اوتا گاندھی کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا اور انہوں نے دوسری شادی کی۔ پہلی بیوی سے ان کے چار لڑکے تھے اور دوسری سے دو لڑکے۔ ان چھ بھائیوں میں تلسی داس گاندھی سب سے چھوٹے تھے اور اُن سے بڑے کرم چند گاندھی عرف کبا گاندھی تھے۔ یہ دونوں بھائی آگے پیچھے پوربندر کے دیوان رہے۔ کبا گاندھی میرے والد تھے۔ وہ راجستانی عدالت کے رکن بھی تھے، وہ کچھ دن راجکوٹ میں دیوان رہے اور اس کے بعد میں بھی۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے چار شادیاں کیں۔ چوتھی بیوی سے ایک لڑکی اور تین لڑکے ہوئے جن میں سب سے چھوٹا میں ہوں۔

والدہ کے متعلق میرے حافظے میں سب سے گہرا نقش ان کی عبادت اور پرہیزگاری کا ہے وہ بڑی پکی دیندار تھیں انہیں ریاست کے معاملوں کے متعلق اچھی معلومات تھیں اور محل کی خواتین ان کی ذہانت کو بہت مانتی تھیں۔

ولادت

میں ان ماں باپ کے گھر ۲ر اکتوبر ۱۸۶۹ء کو بمقام پوربندر پیدا ہوا۔ میرا بچپن کا زمانہ پوربندر ہی میں گزرا مجھے یاد ہے کہ میں مدرسے میں بٹھایا گیا تھا مجھے پہاڑے یاد کرنے میں کسی قدر دقت ہوئی مجھے اس زمانے کے متعلق اس سے زیادہ کچھ یاد نہیں کہ میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ اپنے استاد کو برا بھلا کہا کرتا تھا اس سے ظاہر ہے کہ میرا ذہن کند تھا اور حافظہ کمزور۔ میری عمر سات برس کی ہو گی کہ میرے والد راجستانی عدالت کے رکن ہو کر راجکوٹ چلے گئے۔

وہاں میں ایک ابتدائی مدرسے میں داخل کیا گیا، میں بہت شرمیلا تھا اور کسی سے ملتا جلتا نہ تھا۔ سوا میری کتابوں اور میرے کام کے کوئی میرا رفیق نہ تھا۔ ہائی اسکول میں پہلے سال امتحان کے موقعے پر ایک واقعہ پیش آیا جو قابل ذکر ہے۔ مسٹر جائلس انسپکٹر اسکول معائنے کے لیے آئے تھے انہوں نے ہمیں ہجے کی مشق کے لیے پانچ لفظ لکھوائے میں نے ہجے غلط لکھے۔ استاد نے مجھے اپنے بوٹ کی نوک سے ٹھوکا کر آگاہ کرنا چاہا مگر میں باخبر نہ ہوا۔ یہ بات کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آسکتی تھی کہ وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے ساتھی کی سلیٹ سے ہجے نقل کروں نتیجہ یہ ہوا کہ میرے سوا سب لڑکوں کے یہاں ہر لفظ کے ہجے صحیح نکلے ایک میں ہی بیوقوف ثابت ہوا۔

میں سبق یاد تو کر لیتا تھا لیکن بے دلی سے۔ غرض جب سبق ہی جیسا چاہیے یاد نہ ہوتا تھا تو اور کتابوں کے پڑھنے کا ذکر ہی کیا ہے۔ مگر خدا جانے کیونکر میری نظر ایک کتاب پر پڑی یہ شرون کمار پتر بھگتی ناٹک تھا میں نے اسے بے حد شوق سے پڑھا

اسی زمانے میں ہمارے یہاں سفری ناٹک والے آئے۔ میں نے جو سین دیکھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ شرون اپنے کندھوں پر ایک بہنگی رکھے اپنے اندھے ماں باپ کو یاترا کے لیے لے جا رہا ہے۔ یہ کتاب اور منظر میرے دل پر ایسے نقش ہو گئے کہ مٹائے نہ مٹے میں نے اپنے دل میں کہا دیکھو یہ مثال ہے جس کی تجھے تقلید کرنا چاہیے۔ اسی قسم کا واقعہ ایک اور ناٹک کا ہے۔ اپنے والد کی اجازت سے میں ایک ناٹک کمپنی کا تماشا دیکھنے گیا۔ اس تماشے "ہریش چندر" نے میرے دل کو موہ لیا میں اسے بار بار دیکھتا تھا اور نہ تھکتا تھا "سب لوگ ہریش چندر کی طرح سچے کیوں نہ ہو جائیں"۔ یہ سوال میں اپنے دل میں دن رات کیا کرتا تھا۔ حق کی پیروی کرنا اور سب کچھ سہنا۔ بس یہی ایک نصب العین تھا جس کی لگن اس تماشے نے میرے دل کو لگا دی تھی۔

شادی

میرا دردناک فرض ہے کہ اپنی شادی کا بیان کروں جو تیرہ برس کی عمر میں ہوئی تھی جب میں اس عمر کے لڑکوں کو دیکھتا ہوں جو میری نگرانی میں ہیں تو مجھے اپنے اوپر افسوس ہوتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ انہیں مبارک باد دوں۔ میری منگنی تین بار ہوئی حالانکہ مجھے متعلق خبر نہیں کہ یہ کب ہوا۔ مجھ سے صرف اتنا کہا گیا کہ دو لڑکیاں جو میرے لئے پسند کی گئی تھیں مر گئیں۔ میرے نزدیک اس کی اہمیت بس اتنی تھی کہ اچھے اچھے کپڑے پہننے میں آئیں گے، ڈھول بجے گی، بارات نکلے گی عمدہ عمدہ کھانے ملیں گے اور ایک اجنبی لڑکی ساتھ کھیلنے کو ملے گی۔

جب میری شادی ہوئی اس زمانے میں چھوٹے چھوٹے رسالے ایک پیسہ یا ایک پائی کو بکا کرتے تھے جن میں بیوی میاں کی محبت، کفایت شعاری، بچپن کی شادی اور اسی قسم کی اور باتوں پر بحث ہوتی تھی جب مجھے کوئی اس قسم کا رسالہ ملتا تو میں شروع سے آخر تک پڑھتا تھا اور میری عادت تھی کہ جو بات پسند نہ آتی اسے بھول جاتا اور جو پسند آتی اس پر عمل کرتا ان رسالوں میں شوہر کا یہ فرض بتایا گیا تھا کہ عمر بھر بیوی کا وفادار رہے اور یہ بات ہمیشہ کے لیے میرے دل پر نقش ہو گئی اس کے علاوہ حق کا عشق میرے خمیر میں تھا اور یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ میں اپنی بیوی کو دھوکا دوں مگر اس وفاداری کے سبق کا ایک برا نتیجہ بھی ہوا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر میں اپنی بیوی سے وفاداری کرنے کا پابند ہوں تو انہیں بھی اس کا پابند ہونا چاہیے کہ مجھ سے وفاداری کریں اس خیال نے مجھے بدگمان شوہر بنا دیا۔ مجھے اپنی بیوی کی پاک دامنی پر شبہ کرنے کی متعلق کوئی وجہ نہ تھی لیکن بدگمانی وجہ اور سبب کی پابند نہیں ہے۔ ہمیشہ ان کی حرکات و سکنات کی نگرانی کیا کرتا اس نے ہمارے آپس میں سخت نزاع کا بیج بو دیا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ جس زمانے میں میری شادی ہوئی میں اسکول میں پڑھتا تھا۔ میری پڑھائی جاری رہی۔ ہائی اسکول میں میں کودن نہیں سمجھا جاتا تھا۔ میرے استادوں کو ہمیشہ مجھ سے محبت رہی۔ مجھے کبھی خراب سرٹیفکیٹ نہیں ملا بلکہ دوسرا درجہ پاس کرنے کے بعد میں نے انعام بھی پائے۔ میں کسی ورزش یا کرکٹ فٹ بال میں ان کے لازمی ہونے سے پہلے کبھی شریک نہیں ہوا تھا۔ اس علیحدگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں جھینپتا تھا مگر ورزش میں شریک نہ ہونے سے میری صحت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے کتابوں میں کھلی ہوا میں ٹہلنے کے فوائد پڑھے تھے اور یہ ہدایت مجھے پسند آ گئی تھی اس لیے میں نے ٹہلنے کی عادت ڈال لی تھی جو اب تک ہے پابندی سے ٹہلنے کی وجہ سے میرا جسم خاصا مضبوط ہو گیا۔

غفلت کی سزا

ورزش میں غفلت کرنے سے تو مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا لیکن ایک روز غفلت کی سزا میں اب تک

بھٹک رہا ہوں خدا جانے میرے دماغ میں یہ خیال کہاں سے آگیا کہ خط اچھا ہونا تعلیم کا کوئی ضروری جزو نہیں۔ آگے چل کر خصوصاً جنوبی افریقہ میں جب میں نے وہاں کے وکیلوں اور خاص وہاں کے رہنے والے نوجوانوں کا خوبصورت خط دیکھا تو مجھے بڑی شرم آئی اور اپنی غفلت پر بہت پچھتایا مجھے معلوم ہو گیا کہ برے خط کو ناقص تعلیم کی علامت سمجھنا چاہیئے۔ میں نے اپنا خط درست کرنے کی انتہائی کوشش کی لیکن وقت گزر چکا تھا، لڑکپن کی غفلت کی کبھی تلافی نہ ہو سکی۔

ہائی اسکول میں جن لڑکوں سے مجھ سے مختلف اوقات میں دوستی رہی ان میں سے دو قلبی دوست کہے جا سکتے ہیں ایک سے میری دوستی زیادہ دن نہیں رہی میں نے اسے نہیں چھوڑا بلکہ اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ دوسری دوستی کو میں اپنی زندگی کا ایک المناک واقعہ سمجھتا ہوں میرا یہ رفیق اصل میں میرے منجھلے بھائی کا دوست تھا۔ جن دنوں میری ملاقات اس دوست سے ہوئی راج کوٹ میں ریفارم کا بڑا زور تھا اس نے مجھے بتایا کہ ہمارے بہت سے استاد چھپ کر شراب اور گوشت کا استعمال کرتے ہیں۔ اس نے کہا "ہماری قوم گوشت نہیں کھاتی اس لیے کمزور ہے۔ انگریز لوگ گوشت کھاتے ہیں اسی لیے وہ ہم پر حکومت کرنے کے قابل ہیں، تم جانتے ہو میں کیسا مضبوط ہوں اور کتنا تیز دوڑتا ہوں اس کا سبب یہی ہے کہ میری غذا گوشت ہے"۔ وہ کہتا تھا کہ میں زندہ سانپ پر ہاتھ رکھ سکتا ہوں، چوروں کا مقابلہ کر سکتا ہوں اور بھوتوں کا قائل ہی نہیں ہوں یہ سب گوشت کھانے کی برکت ہے"۔ ان سب باتوں کا مجھ پر کافی اثر پڑا، میں نے ہتھیار ڈال دیئے مجھے رفتہ رفتہ یقین ہونے لگا کہ گوشت کھانا اچھا ہے اس سے مجھ میں قوت اور جرأت پیدا ہو جائے گی اور اگر سارا ملک گوشت کھانے لگے تو انگریز مغلوب ہو جائیں گے۔ میں چاہتا تھا کہ میں قوی اور بہادر ہو جاؤں اور میرے دیس کے لوگ بھی ایسے ہی ہو جائیں تاکہ ہم انگریزوں کو شکست دیں اور ہندوستان کو آزاد کرا لیں"۔ آخر کار وہ دن آگیا، ہم نے دریا کے کنارے جا کر ایک گوشۂ تنہائی ڈھونڈا اور میں نے اپنی عمر میں پہلی بار گوشت دیکھا... مجھ سے کسی طرح نہیں کھایا جاتا تھا مجھے قے ہو گئی اور کھانا چھوڑ کر اٹھنا پڑا۔ اس کے بعد کی رات بڑی بری طرح گزری مجھے بڑا ہولناک خواب نظر آیا جب آنکھ کھلتی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندہ بکری میرے پیٹ کے اندر میا رہی ہے اور میں گھبرا کر اچھل پڑتا تھا مگر میں اپنے دل کو سمجھاتا تھا کہ گوشت کا کھانا فرض ہے اور اس سے مجھے کچھ تسکین ہو جاتی تھی۔ کھانا کھانے کے لیے اب ہمیں دریا کے کنارے سونی جگہ ڈھونڈنے کی ضرورت نہ رہتی بلکہ ریاست کے ایک مکان میں کھاتے تھے۔ میرے دوست نے وہاں کے بڑے باورچی سے ساز باز کر کے یہ انتظام کیا تھا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا "اگرچہ گوشت کھانا بہت ضروری ہے اور یہ بھی بہت ضروری ہے کہ ملک میں غذا کی اصلاح کی جائے لیکن اپنے ماں باپ کو دھوکا دینا گوشت کھانے سے بھی بدتر ہے جب تک وہ زندہ ہیں گوشت کھانا ممکن نہیں اس فیصلے کی اطلاع میں نے اپنے دوست کو کر دی، اس دن سے آج تک میں نے پھر کبھی گوشت نہ کھایا۔

شرم اور درد میرے والد ناسور میں مبتلا اور صاحب فراش تھے زیادہ تر میری والدہ، گھر کا ایک پرانا نوکر اور میں ان کی خدمت کرتے تھے۔ اُسی زمانے میں میری بیوی کے بچہ ہونے والا تھا۔ ادھر میرے والد کی طبیعت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔ آخر وہ خوفناک رات آگئی میرے چچا اس دن راج کوٹ ہی میں تھے مجھے خفیف سا خیال ہے کہ وہ یہ بری خبر سن کر کہ میرے والد کی طبیعت گرتی جاتی ہے راج کوٹ آئے تھے۔ کوئی ساڑھے دس یا گیارہ کا وقت تھا۔ میں پیر دبا رہا تھا میرے چچا

نے کہا اب تم جاؤ میں دباتا ہوں۔ میں خوش ہوا، سیدھا سونے کے کمرے میں پہنچا، میری بیوی بے چاری غافل سو رہی تھی مگر جلد جب میں پہنچ گیا تو وہ کب سونے پاتی تھیں میں نے انہیں جگا دیا۔ ابھی پانچ چھ منٹ ہوئے ہوں گے کہ نوکر نے دروازے پر دستک دی میں ڈر سے چونک پڑا۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ میرا دل شرم اور درد سے معمور تھا۔

اہنسا کا سبق

میں وشنو ماں باپ کے یہاں پیدا ہوا اس لیے مجھے اکثر حویلی جانا پڑتا تھا لیکن یہ مندر میرے دل کو نہیں لگتا تھا۔ اسی زمانے میں میرے ایک رشتے کے بھائی نے جو رامائن پر بڑا گہرا عقیدہ رکھتے تھے میرے اور میرے بھائی کے لیے رام رکھشا سیکھنے کا انتظام کیا ہم نے اسے زبانی یاد کر لیا میں تو اسے ایک مدت تک اس لیے پڑھتا تھا کہ مجھے رام رکھشا صحیح تلفظ سے ادا کرنے پر گھمنڈ تھا۔ جس چیز نے میرے دل پر گہرا اثر کیا وہ رامائن کی تلاوت تھی جو والد صاحب کے سامنے ہوا کرتی تھی۔ راج کوٹ میں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ مجھے ابتدا ہی سے ہندو مذہب کی تمام شاخوں اور دوسرے مذہبوں کے ساتھ رواداری برتنے کی تربیت ملی۔ میرے والد کے پاس جین سادھو بھی آیا کرتے تھے وہ میرے والد سے دینی اور دنیوی موضوعات پر گفتگو کیا کرتے تھے اس کے علاوہ ان کے مسلمان اور پارسی دوست بھی تھے جو اُن سے اپنے اپنے مذہب کی باتیں کیا کرتے تھے اور وہ ہمیشہ ادب سے اور اکثر دلچسپی سے سنا کرتے تھے میں ان کا تیماردار تھا اس سے مجھے اکثر یہ باتیں سننے کا موقع ملتا تھا ان سب باتوں نے مل کر مجھے سب مذہبوں سے رواداری کرنا سکھایا۔ لیکن میرے دوسرے مذہبوں سے رواداری کرنے کے یہ معنی نہیں تھے کہ میں خدا پر جیتا جاگتا عقیدہ رکھتا تھا۔ اسی زمانے میں میری نظر سے منوسمرتی گذری جو میرے والد کے کتب خانے میں تھی۔ اس میں تخلیق اور اسی قسم کے دوسرے مسائل کا ذکر پڑھ کر میں زیادہ متاثر نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس میرا رجحان دہریت کی طرف ہو گیا۔ بہر حال منوسمرتی سے مجھے اس زمانے میں "اہنسا" کا سبق نہیں ملا۔ میں اپنے گوشت کھانے کا قصہ بیان کر چکا ہوں منوسمرتی سے بظاہر اس فعل کی تائید ہوتی تھی۔

تعلیم

میں نے میٹرک کا امتحان ۱۸۸۷ء میں پاس کیا۔ میرے بزرگ چاہتے تھے کہ میں میٹرک پاس کرنے کے بعد کالج میں پڑھوں، کالج بھاؤنگر میں تھا، میں نے طے کیا کہ وہاں جا کر کالج میں داخل ہو جاؤں، جانے کو تو میں چلا گیا۔ لیکن وہاں پہنچ کر میرے حواس جاتے رہے۔ ہر چیز میرے لیے مشکل تھی، پہلی ٹرم ختم ہوتے ہی میں گھر چلا آیا۔

ماوجی دوے ایک عالم اور دانشمند برہمن اور ہمارے خاندان کے قدیم دوست اور مشیر تھے وہ میری تعطیل کے زمانے میں ایک دن آئے اور والدہ اور بڑے بھائی سے باتیں کرنے لگے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں سامل داس کالج میں پڑھتا ہوں تو انہوں نے کہا کہ میری رائے میں اس سے کہیں بہتر ہے کہ تم اسے انگلستان بھیج دو۔ میرا بیٹا کیول رام کہتا ہے کہ بیرسٹری کا امتحان بہت سہل ہے تین سال میں یہ لوٹ آئے گا۔ خرچ بھی زیادہ نہ ہوگا۔ میری ماں سے مخاطب ہو کر انہوں نے کہا جو بات میں نے کہی ہے مہربانی سے اس پر غور کیجیے۔ اب کی میں یہاں آؤں گا تو امید ہے کہ انگلستان کی تیاریاں ہو رہی ہوں گی۔ میرے بڑے بھائی بہت متفکر تھے کہ مجھے انگلستان بھیجنے کے مصارف کہاں سے آئیں۔ یہ تردد بھی تھا کہ میرے جیسے کسی لڑکے کو پردیس بھیجنا مناسب ہے یا نہیں ادھر میری والدہ عجیب شش و پنج میں تھیں۔ بیچارجی سوامی بھی جوشی جی کی طرح ہمارے خاندان کے مشیر تھے انہوں نے میری مدد کی۔ مجھ سے قسم کھلوائی

اور یہ عہد لیا کہ میں شراب، عورت اور گوشت کو ہاتھ نہ لگاؤں گا جب یہ ہو گیا تو میری ماں نے جانے کی اجازت دے دی۔ میں خوشی خوشی بمبئی روانہ ہوا اور خدا خدا کر کے ۴ ستمبر کو بمبئی سے روانہ ہوئے۔ ہم ساؤتھمپٹن پہنچ گئے۔ میں نے دیکھا کہ سب نے اپنا اپنا سامان مع کنجیوں کے گرنڈلے کمپنی کے ایک ایجنٹ کے سپرد کر دیا اس لئے میں نے بھی یہی کیا۔

جیسے ہی اسباب آیا ہم نے ہوٹل کا بل ادا کر دیا اور ان کمروں میں اٹھ گئے جو سندھی دوست نے ہمارے لیے کرائے پر لیے تھے۔ مجھے اپنا گھر اور اپنا ملک بہت یاد آتا تھا۔ ماں کی محبت کا خیال دم بھر دل سے جدا نہیں ہوتا تھا۔ میں انگریزی آداب و رسوم کے معاملے میں بالکل مبتدی تھا، پھر ترکاری کے سوا کچھ نہ کھانے کا عہد ایک اور مصیبت تھی۔ ابھی میری باقاعدہ پڑھائی کی ابتدا نہیں ہوئی تھی البتہ میں نے حال ہی میں شکل جی کے کہنے سے اخبار پڑھنا شروع کیا تھا۔ میں نے سوچا کہ بمبئی کے بنے ہوئے کپڑے جو میں پہنے ہوں انگلستان کی سوسائٹی کے قابل نہیں ہیں اس لیے میں نے آرمی اینڈ نیوی کی کوٹھی سے نئے کپڑے خریدے، دس پونڈ ضائع کر کے ایک ایوننگ سوٹ بنوایا مگر ان سب باتوں کے باوجود بھی "جنٹل مین" بننے میں ایک کسر تھی اس لیے میں نے دوسری چیزوں کی طرف توجہ کی۔ میں نے طے کیا کہ ایک رقص کی کلاس میں ناچ سیکھوں گا۔ تین ہفتے میں کوئی چھ بار کلاس گیا لیکن یہ میرے بس کی بات نہ تھی کہ جسم کی حرکت میں موزونیت پیدا کروں۔

نباتاتی انجمن

میں نے فیصلہ کیا کہ الگ کمرے لے کر رہوں اور اپنے کام کے لحاظ سے تبدیل مقام کرتا رہوں، تاکہ کفایت بھی ہو اور تجربہ بھی بڑھے کمروں کا انتخاب میں اس طرح کرتا تھا کہ جہاں مجھے کام کرنا ہو وہاں پیدل چل کر آدھ گھنٹے میں پہنچ جایا کروں۔ غرض میں نے دو کمرے کرائے پر لیے۔ میں نے کوشش کی کہ اپنی زندگی کو اور سادہ بناؤں مجھے یہ احساس تھا کہ میری زندگی کا معیار ابھی تک میرے خاندان کی محدود آمدنی کی نسبت سے اونچا ہے۔ یقیناً دو کمروں کی بجائے ایک کمرے سے کام چلا سکتا ہوں اور دو ایک وقت کا کھانا گھر پر پکا سکتا ہوں میں نے سادہ زندگی کے متعلق بعض کتابیں بھی پڑھیں۔ اس تبدیلی کی بدولت میری بیرونی اور اندرونی زندگی میں ہم آہنگی پیدا ہو گئی۔ میری زندگی زیادہ سچی بن گئی اور میری روحانی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

انگلستان میں ایک نباتاتی انجمن تھی جس کا ایک ہفتہ وار اخبار نکلتا تھا۔ میں اس اخبار کا خریدار اور انجمن کا رکن ہو گیا اور تھوڑے ہی دن میں اس کی مجلس انتظامیہ میں شامل کر لیا گیا مگر جلسوں میں ہمیشہ خاموش بیٹھا رہتا تھا۔ جب تک میں انگلستان میں رہا مجھ میں یہ حجاب باقی رہا اگر میں کسی سے ملنے بھی جاتا اور وہاں پانچ چھ آدمی موجود ہوتے تو میری زبان نہ کھلتی تھی۔ جنوبی افریقہ پہنچ کر میرا حجاب کچھ کم ہوا۔

میں نے اب تک اس چیز کا ذکر نہیں کیا ہے جس کے لیے میں انگلستان گیا تھا یعنی بیرسٹری کا امتحان۔ اس کا بھی مختصر سا حال بیان کر دوں۔ باضابطہ بیرسٹر بننے کے لیے دو شرطیں پوری کرنا پڑتی تھیں یعنی تین سال کی حاضری اور امتحانوں میں کامیابی۔ نصاب تعلیم بہت سہل تھا ہر شخص جانتا تھا کہ امتحانوں کی کوئی وقعت نہیں ہے میرے زمانے میں دو امتحان ہوتے تھے ایک رومی قانون میں اور ایک عام قانون میں ان کے لیے باقاعدہ کتابیں مقرر تھیں جن میں لوگ کئی بار کر کے امتحان دے سکتے تھے مگر شاید ہی کوئی شخص ان کتابوں کو پڑھتا ہو بہت سے لوگوں نے صرف خلاصہ اور شرح پڑھ کر رومی قانون کا امتحان دو ہفتے میں ——— اور عام قانون کا دو تین مہینے میں پاس کر لیا لیکن میں نے اپنے لیے دشواری پیدا کر ہی لی۔ میں اپنا فرض سمجھتا تھا کہ میں ساری درسی کتابیں پڑھوں میرے لیے کتابوں کو نہ پڑھنا دغابازی

تھی۔ میں نے ان کے خریدنے میں بہت روپیہ صرف کیا اور یہ طے کیا کہ رومی قانون لاطینی کتابوں سے پڑھوں گا۔ مجھے نو مہینے تک اچھی خاصی محنت کرنی پڑی اور ۱۰ رجون ۱۸۹۱ء کو مجھے بیرسٹری کی سند ملی ۱۱ رجون کو میرا نام ہائی کورٹ میں درج ہوا اور ۱۲ رجون کو ہندوستان روانہ ہو گیا لیکن باوجود تعلیم ختم کرنے کے مجھ پر خوف اور مایوسی طاری تھی۔ بیرسٹر ہو جانا سہل تھا مگر بیرسٹری کرنا دشوار۔ علاوہ اس کے میں نے ہندوستان کا قانون بالکل نہیں پڑھا تھا مجھے عرضی دعویٰ تک لکھنا نہ آتا تھا۔ غرض دل میں مایوسی کے ساتھ خفیف سی امید لیے ہوئے میں "آسام" نامی جہاز سے ساحل بمبئی پر آ اترا۔

پاک دریا میں اشنان

میری برادری کے لوگوں میں میرے پردیس کے سفر کے سبب سے اب تک ہلچل مچی ہوئی تھی اس مسئلے نے برادری کو دو فرقوں میں تقسیم کر دیا جن میں سے ایک نے تو مجھے فوراً پھر سے ذات میں شامل کر لیا مگر دوسرا میرے اخراج پر اڑا ہوا تھا۔ پہلے فریق کو خوش کرنے کے لیے میرے بھائی مجھے راج کوٹ جانے سے پہلے پاک دریا میں اشنان کرانے ناسک لے گئے۔

بیوی سے میرے تعلقات اب تک حسب دل خواہ نہیں تھے انگلستان کے قیام سے بھی میری بدگمانی کی عادت دور نہیں ہوئی تھی۔ میں ذرا ذرا سی بات میں بے جا شک اور چڑچڑے پن سے کام لیتا تھا۔ میں نے طے کیا تھا کہ بیوی کو پڑھنا لکھنا سکھاؤں لیکن میری شہوت پرستی اس میں حائل ہوتی تھی۔

پہلا مقدمہ

راج کوٹ میں وکالت شروع کرنا اپنا مضحکہ کرانا تھا۔ میری قابلیت ایک اچھے وکیل کے برابر بھی نہ تھی اور فیس میں دس گنی چاہتا تھا۔ کون ایسا بیوقوف موکل تھا کہ میرے پاس آتا؟ دوستوں نے مشورہ دیا کہ کچھ دن کے لیے بمبئی جاؤں وہاں ہائی کورٹ کے کام کا تجربہ حاصل کروں۔ میں نے ان کے مشورے پر عمل کیا اور بمبئی چلا گیا۔ بمبئی کے قیام کے زمانے میں ایک طرف تو میں نے ہندوستانی قانون کا مطالعہ شروع کیا اور دوسری طرف غذائیات کے تجربے۔ ہندوستانی قانون سے میری طبیعت بہت گھبراتی تھی۔ اسی زمانے میں پہلی بار میرے پاس ایک عورت کا مقدمہ آیا۔ یہ سادہ سا معاملہ تھا میں نے تیس روپے نقد لیا۔ میں مدعا علیہا کی طرف سے تھا اس لئے میرا کام یہ تھا کہ مدعی کے گواہوں سے جرح کروں۔ میں کھڑا ہو گیا لیکن میرا دل بیٹھ گیا میرے سر میں چکر تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ ساری عدالت گھوم رہی ہے۔ جج یقیناً ہنسا ہوگا اور وکیلوں کو اس تماشے سے لطف آیا ہوگا مگر مجھے کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ میں بیٹھ گیا اور میں نے مختار سے کہا کہ میں پیروی نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد بمبئی میں ایک کام اور ملا یہ ایک عرضداشت لکھنے کا تھا۔ میں نے مسودہ لکھ کر دوستوں کو دکھایا انہوں نے پسند کیا اور اس سے مجھے تھوڑا بہت اطمینان ہوا کہ میں عرضداشت لکھنے کی قابلیت رکھتا ہوں۔ بمبئی میں چھ مہینے قیام کر کے میں بوریا بندھنا اٹھا کر چل دیا اور راجکوٹ آ کر اپنا دفتر قائم کیا۔ اب میرا کام خاصا چلنے لگا۔ میرا خرچ تنگی ترشی سے چل رہا تھا مگر اسی زمانے میں مجھے اپنی زندگی میں پہلی بار غم اور غصے کا دھچکا لگا۔

میرے بھائی آں جہانی راجہ صاحب پوربندر کے تخت نشین ہونے سے پہلے ان کے سیکرٹری اور مشیر رہے تھے آج کل ان پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے اپنی ملازمت کے زمانے میں ممدوح کو غلط مشورہ دیا تھا۔ معاملہ پولیٹیکل ایجنٹ تک پہنچا میں ان صاحب سے انگلینڈ میں مل چکا تھا اور وہاں ان کا برتاؤ مجھ سے خاصا دوستانہ تھا میرے بھائی کا خیال تھا کہ مجھے پولیٹیکل ایجنٹ سے مل کر ان کی سفارش کرنا چاہیئے مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں آئی مگر جبراً و قہراً ایجنٹ کے پاس گیا۔ میں نے انہیں پرانی واقفیت یاد دلائی۔ انہوں نے اس کا اقرار کیا لیکن اس

کے یاد دلانے سے وہ مجھ سے کھنچ گئے۔ میں نے اپنا مدعا کہہ ڈالا صاحب جھنجھلا کر بولے "تمہارا بھائی بڑا فطرتی آدمی ہے میں تم سے اس بارے میں کچھ نہیں سننا چاہتا"۔ یہ جواب کافی تھا مگر میں اپنا دکھڑا روتا رہا۔ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے بس اب تم یہاں سے چلے جاؤ" میں نے کہا "مگر میری پوری بات تو سن لیجئے" یہ کہنا تھا کہ ان کا پارہ اور چڑھ گیا انہوں نے چپراسی کو بلا کر حکم دیا کہ مجھے دروازے کے باہر پہنچا دے۔ میں ملول اور دل شکستہ گھر آیا اور بھائی سے بیان کیا انہیں بہت رنج ہوا مگر وہ حیران تھے کہ مجھے کیونکر تسلی دیں۔ میں اس توہین کو چپ چاپ پی گیا اور میں نے اس سے آئندہ کے لیے سبق بھی حاصل کیا۔

سیٹھ عبدالکریم

میں بہت پژمردہ رہتا تھا اور میرے بھائی اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اسی عرصے میں ایک میمن فرم جن کی دوکان پوربندر میں تھی میرے بھائی کو پیغام بھیجا کہ ہم جنوبی افریقہ میں تجارت کرتے ہیں وہاں ہمارا ایک بڑا مقدمہ ہے اگر آپ اپنے بھائی کو وہاں بھیج دیں تو ان کے لیے بھی اچھا ہے اور ہمارے لیے بھی۔ بھائی صاحب نے مجھے سیٹھ عبدالکریم سے ملوایا میں نے بغیر رد و بدل کے شرطوں کو منظور کر لیا اور جنوبی افریقہ جانے کی تیاریوں میں لگ گیا۔ اپریل ۱۸۹۳ء میں میں جنوبی افریقہ روانہ ہو گیا اور مئی کے آخر میں نٹال پہنچا۔ میں دکان کی عمارت میں پہنچایا گیا اور جس کمرے میں عبداللہ سیٹھ رہتے تھے اس کے برابر والے کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ عبداللہ سیٹھ قریب قریب ان پڑھ تھے مگر ان کا تجربہ بہت وسیع تھا ان کی صحبت میں مجھے اسلام سے اچھی خاصی عملی واقفیت ہو گئی۔ میرے آنے کے دوسرے یا تیسرے روز وہ مجھے ڈربن کی عدالت دکھانے لے گئے وہاں کئی آدمیوں سے ملوایا اور اپنے وکیل کے پاس بٹھایا۔ مجسٹریٹ مجھے دیر تک گھورتا رہا آخر میں اس نے مجھ سے کہا "پگڑی اتار ڈالو" میں نے انکار کیا اور عدالت سے اٹھ کر چلا آیا۔ پگڑی اتارنے کے معنی یہ تھے کہ گویا چپ چاپ ذلت سہنی اس لیے میں نے سوچا کہ اب ہندوستانی پگڑی کو خیرباد کہہ کر انگریزی ہیٹ استعمال کرنا چاہئے تاکہ ذلت نہ ہو مگر عبداللہ سیٹھ نے اس خیال کو ناپسند کیا۔ میں نے اخباروں میں اس واقعے کا حال لکھا اور پگڑی باندھ کر عدالت میں جانے کو جائز ثابت کیا۔

ادھر میں اپنے حلقہ ملاقات کو وسیع کر رہا تھا اور ادھر ہماری دکان کے نام وکیل کا خط آیا جس میں اطلاع ملی کہ اب مقدمے کی تیاری کرنے کا وقت ہے اور عبداللہ سیٹھ کو چاہئے یا تو وہ خود پریٹوریا جائیں یا اپنے کسی نمائندے کو بھیجیں۔ عبداللہ سیٹھ نے مجھے یہ خط پڑھنے کو دیا اور مجھ سے پوچھا کہ تم پریٹوریا جاؤ گے میں نے کہا میں اس وقت کہہ سکتا ہوں جب آپ سے مقدمہ سمجھ لوں اس پر انہوں نے محرروں کو حکم دیا کہ مجھے مقدمہ سمجھائیں۔ ڈربن آنے کے ساتویں آٹھویں دن میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس زمانے میں چارلس ٹاؤن اور جوہانسبرگ کے درمیان ریل نہ تھی بلکہ شکرم چلتی تھی۔ شام کو آٹھ بجے گاڑی پریٹوریا پہنچی۔

پہلی تقریر

سیٹھ طیب حاجی خان محمد کی پریٹوریا میں وہی حیثیت تھی جو نٹال میں دادا عبداللہ کی تھی۔ کوئی عام تحریک بغیر ان کے نہیں چل سکتی تھی۔ میں نے پہلے ہی ہفتے ان سے واقفیت پیدا کر لی میں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہاں کے ہندوستانی باشندوں کے حالات کا جائزہ لوں اور ان سے مدد چاہی انہوں نے بڑی خوشی سے مدد دینے کا وعدہ کیا۔ میں نے سوچا کہ پہلا قدم یوں اٹھاؤں کہ پریٹوریا کے سارے ہندوستانیوں کا جلسہ کر کے ایک تقریر کروں جس سے انہیں یہ اندازہ ہو کہ ٹرانسوال میں ان کا کیا حال ہے۔ یہ جلسہ سیٹھ حاجی محمد کے یہاں ہوا اس میں زیادہ تر میمن تھے مگر اکا دکا ہندو بھی نظر آتے تھے۔ پریٹوریا میں ہندوؤں کی آبادی بہت

کم تھی میں نے اس جلسے میں جو تقریر کی وہ ہماری عمر میں میری پہلی تقریر کہی جا سکتی ہے میں نے تاجروں کے دل میں ان کے دہرے فرض کے احساس کو اُبھارا میں نے کہا کہ غیر ملک میں رہ کر ہم پر سچائی کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے کیونکہ یہاں کے لوگ ہم چند ہندوستانیوں کو دیکھ کر ہمارے ہم وطنوں کی سیرت کا اندازہ کریں گے۔ میں نے انہیں اس بات کی طرف توجہ دلائی اور زور دیا کہ ہندو مسلمان، پارسی، عیسائی، گجراتی، مدراسی پنجابی وغیرہ کا امتیاز مٹا دینا چاہیئے۔ میں جلسے کے نتیجے سے مطمئن تھا جہاں تک مجھے یاد ہے یہ طے ہوا کہ اس قسم کے جلسے ہفتے میں ایک بار ہوا کریں۔ یہ جلسے کم و بیش پابندی سے ہوتے تھے۔

اب میں نے مناسب سمجھا کہ مسٹر جیکوبس ڈی ویٹ سے جو یہاں برطانوی ایجنٹ تھے ملوں انہیں ہندوستانیوں سے ہمدردی تھی مگر ان کا اثر بہت کم تھا بہرحال وہ اس پر راضی ہو گئے کہ جہاں تک ہو سکے گا ہماری مدد کریں گے اور مجھے دعوت دی کہ جب ضرورت ہو مجھ سے آکر مل لیا کرو۔ ایجنٹ نے مجھے کچھ کاغذات دکھائے طیب سیٹھ نے بھی مجھے اس قسم کے کاغذات دیئے تھے ان سے مجھے معلوم ہوا کہ ہندوستانی کس بے دردی سے اورنج فری اسٹیٹ سے نکالے جا رہے ہیں۔ پریٹوریا کے قیام سے مجھے یہ موقع ملا کہ ٹرانسوال اور اورنج فری اسٹیٹ کے ہندوستانیوں کی سماجی، معاشی اور سیاسی حالت کا گہرا مطالعہ کروں یہاں ٹرانسوال اور اورنج فری اسٹیٹ کے ہندوستانیوں کی حالت تفصیل سے بیان کرنے کا موقع نہیں جو لوگ اس سے پوری طرح واقف ہونا چاہتے ہیں وہ میری کتاب "جنوبی افریقہ کے ستیاگرہ کی تاریخ" پڑھیں۔

اس طرح مجھے نو آباد ہندوستانیوں کی مشکلات کا اندازہ کرنے کا موقع ملا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ جنوبی افریقہ کسی خوددار ہندوستانی کے رہنے کی جگہ نہیں اور میں دن رات اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا کہ اس حالت میں اصلاح کرنے کی کیا صورت ہے۔ پریٹوریا میں ایک سال کا قیام میری زندگی میں سب سے زیادہ قابل قدر تجربہ تھا یہیں مجھے قومی خدمت کے طریقے سیکھنے کا موقع ملا۔

لڑائی کا بیج

اب مقدمہ طے ہو چکا تھا اور مجھے پریٹوریا میں ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہ تھی اس لیے میں ڈربن واپس آیا اور وطن جانے کی تیاریاں کرنے لگا مگر بھلا عبداللہ سیٹھ مجھے بغیر رخصتی جلسے کے کب جانے دیتے انہوں نے مجھے رخصت کرنے کے لیے سڈنہم میں جلسہ منعقد کیا۔ ہم لوگ وہاں دن بھر رہنے کے ارادے سے گئے۔ میں بیٹھا کچھ اخباروں کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اتفاق سے ایک اخبار کے ایک کونے میں میری نظر ایک پیراگراف پر پڑی جس کا عنوان تھا "ہندوستانیوں کو ووٹ کا حق" یہ اس مسودہ قانون کے متعلق تھا جو ان مجلس قانون ساز میں پیش تھا اور جس میں یہ تجویز تھی کہ ہندوستانی نٹال کی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب کرنے کے حق سے محروم کر دیئے جائیں میں نے عبداللہ سیٹھ سے اس کے متعلق پوچھا انہوں نے کہا بھلا ہم لوگ ان معاملات کو کیا جانیں۔ . . . میں نے عبداللہ سیٹھ سے صرف اتنی بات کہی کہ اگر یہ مسودہ پاس ہو کر قانون بن گیا تو ہماری زندگی دشوار ہو جائے گی یہ ہمارے لیے موت کا پیغام ہے اور مہمان اس گفتگو کو غور سے سن رہے تھے ان میں سے ایک نے کہا کہ آپ اپنا جہاز کا ٹکٹ منسوخ کرا دیجئے اور یہاں ایک مہینہ اور ٹھہریئے ہم آپ کی ہدایت کے مطابق لڑیں گے سب کے سب بول اٹھے "بالکل ٹھیک ہے۔ عبداللہ سیٹھ آپ گاندھی بھائی کو ہرگز نہ جانے دیجئے۔" اس طرح خدا نے میری جنوبی افریقہ کی زندگی کی بنیاد ڈالی اور اس لڑائی کا بیج بو دیا جو قومی خودداری کی حفاظت کے لیے لڑی گئی۔

سیٹھ حاجی محمد حاجی دادا ۱۸۹۳ء میں نٹال کے ہندوستانیوں کے ممتاز ترین رہنما سمجھے جاتے تھے۔ دولت کے اعتبار سے سیٹھ

عبداللہ حاجی آدم سب سے بڑھے ہوئے تھے لیکن پبلک معاملات میں وہ اور دوسرے لوگ سیٹھ حاجی محمد ہی کو اپنا سردار مانتے تھے اس لیے ان کی صدارت میں ایک جلسہ سیٹھ عبداللہ کے گھر پر ہوا جس میں یہ طے کیا گیا کہ مسودہ قانون حق رائے دہندگی کی مخالفت کی جائے۔ چنانچہ رضاکار بھرتی کیے گئے۔ جلسے میں وہ ہندوستانی بھی بلائے گئے جو نٹال میں پیدا ہوئے تھے۔ جن میں اکثر نوجوان عیسائی تھے۔ سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ مجلس قانون ساز کے صدر کے نام تار بھیجا کہ مہربانی کر کے اس مسودے پر مزید بحث ملتوی کر دیجیے اسی قسم کا تار وزیر اعظم کو دیا گیا۔ صدر نے فوراً جواب دیا کہ بحث دو دن کے لیے ملتوی کر دی گئی اس لیے ہم لوگوں کو بڑی خوشی ہوئی۔

دس ہزار دستخط

اس تحریک کے جوش و خروش نے نٹال کے ہندوستانیوں میں ایک نئی روح پھونک دی اور انہیں یقین دلا دیا کہ ان کی جماعت ایک متحدہ جماعت ہے۔ اسی زمانے میں لارڈ رپن برطانیہ کے وزیر نوآبادیات تھے ہم نے فیصلہ کیا کہ ان کو ایک عرضداشت بھیجی جائے جس پر ہزاروں آدمیوں کے دستخط ہوں۔ میں نے اس عرضداشت کے تیار کرنے میں بڑی محنت کی اس موضوع پر جتنا مواد مل سکتا تھا سب کا مطالعہ کیا۔ دو ہفتے کے اندر دس ہزار دستخط کیے گئے۔ درخواست بھیجی گئی۔ گشت کرانے اور تقسیم کرانے کے لیے اس کی ایک ہزار کاپیاں چھپوائی گئی تھیں اس کے ذریعہ ہندوستان کے لوگوں کو پہلی بار نٹال کے حالات معلوم ہوئے میں نے اس کی کاپیاں ہندوستان کے سب اخباروں اور سیاسی مضمون نگاروں کو جن سے میں واقف تھا بھیجیں۔ ٹائمز آف انڈیا نے اس عرضداشت پر ایک مقالہ افتتاحیہ لکھا جس میں ہندوستانیوں کے مطالبات کی زوردار تائید کی ہم نے انگلستان کی مختلف پارٹیوں کے اخباروں کو بھی اس کی کاپیاں بھیجیں لندن ٹائمز نے بھی ہماری تائید کی۔

اب میرے لیے نٹال سے جانا ممکن نہ تھا ہندوستانی دوستوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے پیچھے پڑ گئے کہ وہاں مستقل قیام کروں۔ ہندوستانیوں کو ووٹ کے حق سے محروم کرنے والے قانون کے خلاف محض عرضداشت بھیج دینا کافی نہ تھا وزیر نوآبادیات کو متاثر کرنے کے لیے اس کی ضرورت تھی کہ لوگوں میں جوش پھیلانے کی کوشش کی جائے۔ یہ قرار پایا کہ اس مقصد کے لیے ایک مستقل ادارہ ہونا چاہیے میں نے سیٹھ عبداللہ اور دوسرے دوستوں کے مشورے سے ایک مستقل انجمن قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں بڑے شش و پنج میں تھا کہ نئی انجمن کا نام کیا رکھا جائے اسے نام کی ضرورت تھی جس کا تعلق کسی خاص پارٹی سے نہیں بلکہ سارے ہندوستانیوں سے ظاہر کرتا ہو اس لیے میں نے مفصل دلائل کے ساتھ یہ تجویز کی کہ اس کا نام نٹال انڈین کانگریس رکھی جائے اس طرح ۲۲ مئی کو یہ انجمن وجود میں آئی۔ ساری جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے بہت سے دوست پیدا ہو گئے اور ہندوستان کی سب پارٹیوں کو اس مسئلے سے ہمدردی اور دلچسپی ہو گئی اس کے علاوہ خود افریقہ کے ہندوستانیوں کو ایک صحیح راہ عمل نظر آنے لگی۔

۱۸۹۴ء میں حکومت نٹال نے ارادہ کیا کہ پابند مزدوروں پر پچیس پاؤنڈ سالانہ محصول لگائے مجھے اس تجویز نے حیرت میں ڈال دیا۔ میں نے فوراً اس مسئلے کو کانگریس کے سامنے پیش کیا اور یہ تجویز منظور کرائی کہ اس محصول کی مخالفت کے لیے ضروری انتظام کیا جائے وائسرائے اس زمانے میں لارڈ ایلگن تھے انہوں نے پچیس پاؤنڈ کے محصول کو پسند نہیں کیا مگر اس پر راضی ہو گئے کہ فی کس تین پاؤنڈ محصول لگایا جائے۔ کانگریس کے کارکنوں کو اب بھی یہ قلق تھا کہ وہ پابند مزدوروں کے حقوق کی پوری حفاظت نہیں کر سکے وہ ہمیشہ اس ارادے پر مضبوطی سے قائم رہی کہ محصول کو معاف کراؤ مگر اس کا یہ ارادہ بیس سال بعد پورا ہوا ہندوستانیوں نے جو تکلیفیں برداشت کیں وہ گویا حق کی آواز

تھی لیکن اگر اس کے ساتھ استوار عقیدہ، انتہائی صبر اور انتھک کوشش نہ ہوتی تو یہ آواز غالب نہ آتی۔

معمولی انصاف

اب مجھے جنوبی افریقہ آئے تین سال ہو چکے تھے میں یہاں کے لوگوں سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا ۱۸۹۶ء میں میں نے چھ مہینے کی اجازت مانگی کیونکہ اب مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ جنوبی افریقہ میں مجھے بہت دن رہنا ہے میں نے یہ بھی سوچا کہ وطن جا کر لوگوں کو جنوبی افریقہ کے حالات سے واقف کروں اور یہاں کے ہندوستانیوں کا ہمدرد بناؤں تو کچھ قومی خدمت بھی ہو جائے ۱۸۹۶ء کے وسط میں وطن روانہ ہوا۔ چوبیس دن بعد کلکتے پہنچ گیا اور اسی دن بمبئی روانہ ہو گیا۔ بمبئی جاتے ہوئے میری ریل الہ آباد میں ٹھہری۔ میں نے سوچا اتنی دیر میں شہر کی سیر کر آؤں مگر جب اسٹیشن پہنچا تو میری ریل سامنے سے نکل گئی۔ میں نے ہوٹل میں ایک کمرہ لے لیا اور یہ قصد کر لیا کہ اپنا کام فوراً شروع کر دوں گا۔ میں نے الہ آباد پانیر کا نام بہت سنا تھا اور مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ ہندوستانیوں کے مطالبات کا مخالف ہے۔ میں نے ایڈیٹر کو ایک پرچہ لکھا اور ان سے درخواست کی کہ مجھے ملاقات کے لیے وقت دیں وہ مجھ سے اسی وقت ملنے پر راضی ہو گئے۔ انہوں نے میری داستان صبر سے سنی۔ انہوں نے کہا تم جو کچھ لکھو گے اس پر اپنے اخبار پر تبصرہ کروں گا۔ میں نے کہا میرا مطالبہ بس اتنا ہے کہ ہمارے ساتھ معمولی انصاف کیا جائے جو ہمارا حق ہے۔

میں بغیر بمبئی ٹھہرے سیدھا راج کوٹ پہنچا اور جنوبی افریقہ کے حالات پر ایک پمفلٹ لکھنے کی تیاری کرنے لگا اس کا سرورق سبز تھا اس لیے آگے چل کر اس کا نام سبز پمفلٹ پڑ گیا۔ میں نے اس کی دس ہزار کاپیاں چھپوائیں اور سارے اخباروں اور مشہور لیڈروں کو بھیجیں۔ سب سے پہلے پانیر کے ایڈیٹر نے تبصرہ کیا رپورٹر نے اس کے مضمون کا خلاصہ تار کے ذریعے لندن بھیجا۔ ہندوستان کے ہر معقول اخبار میں اس پر بحث کی گئی۔ جن دنوں میں راج کوٹ میں پمفلٹ لکھنے میں مشغول تھا مجھے ایک آدھ روز کے لیے بمبئی جانے کا اتفاق ہوا میرا ارادہ تھا کہ سب شہروں میں جلسے کر کے لوگوں کو جنوبی افریقہ کے حالات سے واقف کروں اور ابتدا میں نے بمبئی سے کی سب سے پہلے جسٹس راناڈے سے ملا انہوں نے میری گفتگو غور سے سنی اور مجھے سر فیروز شاہ مہتہ سے ملنے کی ہدایت کی اس کے بعد طیب جی سے ملا انہوں نے بھی یہی مشورہ دیا کچھ دن بعد میں ان کے پاس حاضر ہوا۔ میں نے اپنا مدعا بیان کیا جسے وہ غور سے سنتے رہے۔ آخر انہوں نے کہا "گاندھی میں سمجھتا ہوں کہ مجھے تمہاری مدد ضرور کرنا چاہیئے"

سر فیروز شاہ نے میرا کام بہت آسان کر دیا۔ بمبئی سے میں پونا پہنچا جہاں دو پارٹیاں تھیں میں ہر خیال کے لوگوں کی مدد چاہتا تھا۔ پہلے میں لوکمانیہ تلک سے ملا۔ مجھے ان سے ملنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ میری سمجھ میں آ گیا کہ ان کی ہر دلعزیزی کا راز کیا ہے۔ اس کے بعد گوکھلے کے پاس گیا انہوں نے بڑی محبت سے میرا استقبال کیا۔ اور ان کے اخلاق نے دل کو جیت لیا۔ میرے دل کو جو تعلق گوکھلے سے ان کی زندگی میں تھا اور اب مسلسل ہے وہ اور کسی سے نہیں۔

اس کے بعد میں مدراس گیا یہاں لوگوں میں بے حد جوش تھا۔ مدراس سے کلکتے گیا۔ یہاں مجھے بڑی دقت کا سامنا ہوا کیونکہ میں اس شہر میں کسی کو نہیں جانتا تھا۔ مجھے سب سے پہلے "بنگال کے دیوتا" سر سریندر ناتھ بنرجی سے ملنا تھا۔ جب ان کے پاس پہنچا تو وہ دوستوں کے حلقے میں بیٹھے ہوئے تھے میری درخواست سن کر کہنے لگے "مجھے اندیشہ ہے کہ یہاں لوگوں کو آپ کے کام سے دلچسپی نہ ہو گی"۔ میں اخباروں کے ایڈیٹروں سے بھی ملتا رہا "اسٹیٹس مین" اور "انگلش مین" نے اس مسئلے کی اہمیت محسوس کی میں نے ان سے طویل گفتگو کی اور انہوں نے یہ پوری گفتگو چھاپ دی۔ "انگلش مین" کے ایڈیٹر نے اپنا اخبار اور دفتر میرے لیے وقف کر دیا بلکہ

یہاں تک کہا گیا کہ اس مسئلے پر جو ایڈیٹوریل لکھا تھا اس کے پروف میرے پاس بھیج دیے اور اجازت دے دی کہ حسب دل خواہ کمی بیشی کر دوں۔ انہوں نے حتی الامکان مدد دینے کا وعدہ کیا اور اسے پورا کیا انہیں میرا سچ بولنا اور مبالغے سے پرہیز کرنا بہت پسند آیا۔ مجھے تجربے سے یہ معلوم ہوا کہ دوسروں سے انصاف چاہنے کا سب سے زود اثر طریقہ یہ ہے کہ آدمی خود دوسروں کے ساتھ انصاف کرے مجھے امید ہو چلی تھی کہ تعجب نہیں کلکتے میں بھی جلسہ کرنے کی صورت نکل آئے کہ میرے پاس ڈربن سے تار پہنچا کہ پارلیمنٹ کا اجلاس جنوری سے شروع ہے فوراً واپس آؤ۔

اس لیے میں نے ایک خط کے ذریعے اخباروں کو اطلاع دی اور بمبئی روانہ ہو گیا اور شروع دسمبر میں اپنی بیوی دونوں لڑکوں اور بیوہ بہن کے اکلوتے لڑکے کو ساتھ لے کر جنوبی افریقہ روانہ ہو گیا اور ۱۸ یا ۱۹ کو ڈربن پہنچا۔ مسٹر ایسکومب نے کپتان سے کہلا بھیجا کہ گاندھی سے کہو وہ رات کو اترے سخت بیزار ہیں تمہاری اور تمہارے خاندان کی جان خطرے میں ہے۔ جیسے ہی ہم کنارے پر پہنچے چند لڑکوں نے مجھے پہچان لیا اور "گاندھی گاندھی" پکارنے لگے پانچ چھ آدمی اور دوڑتے آئے اور انہوں نے لڑکوں کے ساتھ مل کر چلانا شروع کیا۔ جوں جوں ہم بڑھتے گئے مجمع بھی زیادہ ہوتا گیا ایک شخص میری پگڑی لے بھاگا اور کچھ لوگ مجھے گھونسے اور لاتیں مارنے لگے۔ اتفاق سے سپرنٹنڈنٹ پولیس کی بیوی جو مجھ سے واقف تھیں اُدھر سے گزر رہی تھیں۔ یہ بہادر خاتون میری مدد کے لیے آئیں اور اپنی چھتری کھول کر میرے اور مجمع کے درمیان حائل ہو گئیں۔ ان سے لوگوں کا جوش کچھ کم ہوا۔ اس عرصے میں ایک ہندوستانی لڑکا جس نے یہ واقعہ دیکھا تھا کوتوالی پہنچ گیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے سپاہیوں کا ایک دستہ بھیجا یہ سپاہی عین وقت پر پہنچے۔ کوتوالی ہمارے رستے میں تھی جب ہم وہاں پہنچے تو سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ تم یہیں کوتوالی میں پناہ لو مگر میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔

عظیم الشان درخت

جنوبی افریقہ میں جو خدمت میں نے ہندوستانیوں کی انجام دی اس سے مجھے ہر ہر قدم پر نئے نئے پہلو نظر آئے۔ حق ایک عظیم الشان درخت کی طرح ہے۔ اسے جتنا زیادہ سینچئے اتنا ہی زیادہ پھل دیتا ہے حق کے معدن کو جتنا گہرا کھودیے اتنے ہی زیادہ جواہرات ہاتھ لگتے ہیں یعنی سماج کی خدمت کے نت نئے اور بہتر موقعے ملتے ہیں۔

جنگ کی خدمت سے فرصت پانے کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ میرا کام اب جنوبی افریقہ میں نہیں بلکہ ہندوستان میں ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ جنوبی افریقہ میں اب کچھ کرنے کے لیے نہ تھا بلکہ یہ خوف تھا کہ کہیں میرے وقت کا زیادہ حصہ روپیہ کمانے میں نہ صرف ہو جائے۔ وطن میں میرے احباب میری واپسی پر مصر تھے اس لیے میں نے اپنے رفیقوں سے رخصت کی درخواست کی یہ درخواست بڑی مشکل سے اس شرط پر منظور ہوئی کہ اگر جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کو ایک سال کے اندر میری ضرورت پڑی تو مجھے واپس آنا پڑے گا۔

جب میں پہلی بار یہاں سے جا رہا تھا تب بھی مجھے تحفے دیے گئے تھے مگر اس مرتبہ تحفوں میں سونے چاندی کی چیزوں کے علاوہ بعض جڑاؤ چیزیں بھی تھیں۔ مجھے ان کے قبول کرنے کا حق تھا؟ اگر میں انہیں قبول کر لیتا تو اپنے دل میں کیونکر سمجھتا کہ اپنے بھائیوں کی خدمت بلا معاوضہ کر رہا ہوں۔ ایک سونے کا کنٹھا جس کی قیمت پچاس گنی تھی میری بیوی کو دیا گیا تھا، یہ بھی میری قومی خدمات کی وجہ سے ملا تھا۔ جس شام کو یہ تحفے دیے گئے تھے اس کے بعد کی رات مجھے جاگتے گزری۔ میں الجھن اور پریشانی کے عالم میں اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ مگر اس مسئلے کو حل کرنے کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی تھی سیکڑوں کی قیمت کے تحفوں کو پھیر دینا کچھ سہل نہ تھا مگر انہیں رکھ لینا

اس سے زیادہ دشوار تھا۔ میں نے سوچا اگر میں انہیں رکھ لوں تو میرے بچوں پر اور میری بیوی پر اس کا کتنا خراب اثر پڑے گا۔ انہیں میں یہ تعلیم دے رہا تھا کہ اپنی زندگی قومی خدمت میں گزاریں اور خدمت کو معاوضے سے بے نیاز سمجھیں۔ آخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں ان چیزوں کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا۔ میں نے بیٹھ کر خط کا مسودہ لکھا کہ میں ان چیزوں کو قومی کاموں کے لیے وقف کرتا ہوں۔ صبح کو میں نے اپنی بیوی بچوں سے مشورہ کیا اور خدا خدا کر کے اس بوجھ کو اپنے سر سے ہٹایا۔ مجھے آج تک کبھی اپنے اس فعل پر افسوس نہیں ہوا اور میری بیوی کو بھی رفتہ رفتہ یقین ہو گیا ہے کہ یہ دانش مندی کا فعل تھا۔

کانگرس کی محرری

غرض میں پھر وطن روانہ ہو گیا۔ ہندوستان پہنچ کر میں کچھ دن سارے ملک کا دورہ کرتا رہا۔ ۱۹۰۱ء میں کانگریس کلکتے میں ہو رہی تھی اس کے صدر مسٹر ڈنشا واچا تھے میں بھی اس میں شریک ہوا میرے لیے کانگریس کی شرکت کا یہ پہلا موقع تھا۔ میں نے پہلے سے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ اپنی خدمات کانگریس کے دفتر کے لیے پیش کروں گا تاکہ کچھ تجربہ حاصل ہو جائے چنانچہ کلکتے پہنچتے ہی میں سیدھا کانگریس کے دفتر پہنچا۔ بابو بھوپندر ناتھ باسو اور گھوشال بابو سیکرٹری تھے میں نے بھوپندر بابو کے پاس جا کر اپنی خدمات پیش کیں انہوں نے میری طرف دیکھ کر فرمایا "میرے یہاں تو کوئی کام نہیں مگر ممکن ہے گھوشال بابو آپ کو کوئی کام دے دیں۔ میں ان کے پاس گیا انہوں نے کہا "میں تمہیں صرف محرری کا کام دے سکتا ہوں تم کرو گے؟" میں نے جواب دیا "ضرور کروں گا میں اسی لیے آیا ہوں کہ جو کام بھی ملے اسے انجام دوں" چند روز میں میں کانگریس کے طور طریقے سے اچھی طرح واقف ہو گیا۔ مجھے اکثر لیڈروں سے ملنے اور گوکھلے اور سریندر ناتھ جیسے شیر مردوں کے طرز عمل کو دیکھنے کا موقع ملا۔

خدا خدا کر کے میں کانگریس پہنچا اس دل بادل خیمے کو، رضاکاروں کی صفوں کو اور ڈائس پر بڑے بڑے لیڈروں کو دیکھ کر میری آنکھیں کھل گئیں۔ اس نقار خانے میں بھلا طوطی جیسی آواز کون سنتا۔ جب میں نے دیکھا کہ رات ہونے آئی اور وہ ریزولیوشن (جنوبی افریقہ کے بارے میں) اب تک پیش نہیں ہوا تو میرا دل دھڑکنے لگا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے آخری ریزولیوشن بہت جلدی جلدی نپٹائے جا رہے تھے۔ میں گوکھلے سے مل کر ان کو اپنا ریزولیوشن دکھا چکا تھا اس لیے میں نے ان کی کرسی کے پاس جا کر کہا "مہربانی کر کے میرے معاملے میں کچھ کیجیے" انہوں نے کہا "میں تمہارے ریزولیوشن کو بھولا نہیں ہوں تم دیکھتے ہو کتنی تیزی سے کام ہو رہا ہے دم لینے کی فرصت نہیں مگر میں اس کا خیال رکھوں گا کہ تمہارا ریزولیوشن نظر انداز نہ ہونے پائے" اتنے میں سر فیروز شاہ مہتہ نے کہا "اب تو سب ریزولیوشن ختم ہو گئے؟" گوکھلے چلا اٹھے "نہیں نہیں ابھی جنوبی افریقہ والا باقی ہے" سر فیروز شاہ نے پوچھا "آپ نے وہ ریزولیوشن دیکھا ہے؟" "جی ہاں دیکھا ہے" "آپ کو پسند ہے؟" "ہاں اچھا خاصا ہے" "اچھا گاندھی اپنا ریزولیوشن پڑھ کر سناؤ" میں نے کانپتے ہوئے وہ ریزولیوشن پڑھا، گوکھلے نے تائید کی، سب چلا اٹھے "بالاتفاق منظور" میرے لیے یہی کچھ کم خوشی کی بات نہ تھی کہ اسے کانگریس نے پاس کر دیا اور مجھ پر کیا موقوف ہے جس کو یہ علم ہوتا وہی اس بات پر خوش ہوتا۔

تیسرے درجے میں

میں گوکھلے کے یہاں جا کر رہا تو وہ مجھ سے اس طرح پیش آئے کہ میں پہلے ہی دن سے بے تکلف ہو گیا وہ مجھ سے ایسی محبت کرتے تھے جیسے بڑے بھائی کو چھوٹے بھائی سے ہوتی ہے۔ ان کے ساتھ ٹھہرنے کی بدولت مجھے کلکتے میں اپنا کام کرنے میں بڑی آسانی ہوئی اور بنگال کے ممتاز خاندانوں سے میل جول کرنے کا موقع ملا۔ کلکتے سے میں چند

دن کے لیے رہ گیا اور وہاں کے پھونگیوں سے ملا۔ برما سے لوٹ کر میں گوکھلے سے رخصت ہو گیا۔ ان سے جدا ہونا مجھ پر بہت شاق تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ کسی جگہ مستقل قیام کرنے سے پہلے تیسرے درجے میں ہندوستان کا سفر کروں اور یہ معلوم کروں کہ تیسرے درجے کے مسافروں کو کیا کیا تکلیفیں اُٹھانا پڑتی ہیں۔ گوکھلے اور ڈاکٹر رائے مجھے پہنچانے اسٹیشن آئے۔ میں صبح کے وقت بنارس پہنچا۔ میں نے طے کیا کہ کسی پنڈے کے یہاں ٹھہروں گا۔ جیسے ہی گاڑی سے اترا مجھے بہت سے برہمنوں نے آ گھیرا۔ میں نے ان میں سے ایک کا انتخاب کیا جو دوسروں کے مقابلے میں صاف ستھرا اور معقول معلوم ہوتا تھا۔ میں درشن کے لیے کاشی وشوا ناتھ پہنچا۔ میں نے وہاں جو کچھ دیکھا اس سے مجھے بڑی تکلیف ہوئی۔ مندر کی زیارت کے بعد میں مسز اینی بیسنٹ کے درشن کے لیے گیا مجھے معلوم تھا کہ وہ ابھی بیماری سے اٹھی ہیں میری اطلاع ہوتے ہی وہ باہر تشریف لے آئیں۔

گوکھلے کا اصرار تھا کہ میں بمبئی میں بس جاؤں اور وکالت کے ساتھ ساتھ قومی کام بھی کروں مجھے گوکھلے کا مشورہ پسند آیا مگر وکالت چلنے کی کچھ زیادہ اُمید نہ تھی اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ پہلے راج کوٹ میں کام شروع کروں وہاں میرے پرانے خیر خواہ کیول رام دوے موجود تھے انھوں نے مجھے پہلے ہی دن مقدمے لا کر دیئے۔ میرا قصد ابھی کچھ دن راج کوٹ ہی میں رہنے کا تھا مگر ایک دن کیول رام دوے آ کر مجھ سے کہنے لگے "بمبئی کا ذمہ ہم سے۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ تم راج کوٹ میں پڑے سڑا کرو۔ اب تو تمھیں بمبئی جا کر رہنا چاہیے۔" میں نے پوچھا مگر وہاں میرے لیے کام کون فراہم کرے گا؟" انھوں نے جواب دیا "میں اس کا ذمہ لیتا ہوں" میں نے کہا "مجھے نٹال سے ایک رقم کا انتظار ہے اس کے آتے ہی چلا جاؤں گا۔" کوئی دو ہفتے میں روپیہ آ گیا اور میں بمبئی روانہ ہو گیا۔ اِدھر تو میری وکالت میں کسی قدر اطمینان کی صورت پیدا ہو رہی تھی اور اُدھر گوکھلے جو ہمیشہ نظر میں رکھتے تھے میرے لیے کچھ اور ہی تدبیریں سوچ رہے تھے۔ ٹھیک اس وقت جب میں یکسوئی سے اپنے کاروبار میں مشغول ہونے والا تھا جنوبی افریقہ سے تار پہنچا کہ "چیمبرلین کے آنے کی خبر ہے مہربانی کر کے فوراً چلے آئیے"۔ میں نے اس مضمون کا تار دیا کہ "میں آنے کو تیار ہوں" تار پہنچتے ہی روپیہ آ گیا اور میں جنوبی افریقہ روانہ ہو گیا اور عین وقت پر ڈربن پہنچا۔ میرے لیے کام تیار تھا۔ مسٹر چیمبرلین کی خدمت میں وفد کے جانے کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی مجھے ان کے سامنے پیش کرنے کے لیے عرضداشت مرتب کرنا تھی اور وفد کے ساتھ جانا تھا۔

پروانہ راہ داری

مسٹر چیمبرلین جنوبی افریقہ سے ساڑھے تین کروڑ پونڈ نذرانہ لینے اور انگریزوں اور بوئروں کی دل جوئی کرنے آئے تھے اس لیے انھوں نے ہندوستانی وفد کو سر سے ٹال دیا۔ وفد کے ارکان کی اُمیدوں پر اوس پڑ گئی مجھے بھی بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ نٹال سے ٹرانسوال گئے مجھے ٹرانسوال کے ہندوستانیوں کے مطالبات بھی مرتب کر کے ان کی خدمت میں پیش کرنا تھے۔ وہاں جانے کے لیے پروانہ راہ داری لینا پڑتا تھا جو کہ یورپینوں کو آسانی سے مل جاتا تھا مگر ہندوستانیوں کے لیے بڑی دشواریاں تھیں۔ میں نے اپنے پرانے دوست یعنی ڈربن کے سپرنٹنڈنٹ سے جا کر کہا "مہربانی کر کے پرمٹ کے افسر سے میرا تعارف کرا دیجیے"۔ انھوں نے فوراً ہیٹ سر پر رکھی اور میرے ساتھ جا کر مجھے پروانہ دلوا دیا۔ میں نے ایلگزینڈر کا شکریہ ادا کیا اور پریٹوریا روانہ ہو گیا۔ پہنچتے ہی میں نے عرضداشت مرتب کرلی۔ پریٹوریا کے ہندوستانیوں کو یہ خبر مل گئی تھی کہ اس محکمے کے افسر میرا نام وفد سے خارج کرنا چاہتے ہیں۔ نئے محکمے کے افسر حیران تھے کہ میں ٹرانسوال میں کیونکر داخل ہوا۔ انھوں نے ذرا بگڑ کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ میں پروانہ لے کر آیا ہوں۔ مگر یہ ہار ماننے والے نہ تھے

انھوں نے کہا یہ شخص ٹرانسوال آگیا تو آجائے، اسے مسٹر چیمبرلین سے نہ ملنے دیں گے۔ ہندوستانی لیڈر اکثر اس محکمے کے افسروں سے ملنے جایا کرتے تھے۔ ایک بار سیٹھ طیب جی، حاجی خان محمد افسر اعلیٰ سے ملنے گئے تو انھوں نے پوچھا کہ یہ گاندھی کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے؟" سیٹھ طیب نے کہا "وہ ہمارے مشیر ہیں اور ہمارے بلانے پر آگئے ہیں" صاحب بہادر نے پوچھا "پھر ہم لوگ کس لیے ہیں؟ گاندھی کو یہاں کے حالات کی کیا خبر؟ صاحب بہادر نے طیب سیٹھ کو حکم دیا کہ مجھے ان کے سامنے پیش کریں۔ میں طیب سیٹھ وغیرہ کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ صاحب نے پوچھا "تم یہاں کیوں آئے ہو؟" میں نے جواب دیا "اپنے ہم وطنوں کے کہنے سے آیا ہوں کہ انھیں مشورہ دوں ۔۔۔" "مگر کیا تمھیں معلوم نہیں کہ تمھیں ٹرانسوال آنے کا کوئی حق نہیں؟ جو پروانہ تمھارے پاس ہے وہ غلطی سے دے دیا گیا تھا۔ تمھیں واپس جانا پڑے گا۔" مجھے اس توہین سے بڑی تکلیف ہوئی۔ میں نے طے کیا کہ یہ وقت بھی چپ چاپ سہہ لوں گا۔ افسر اعلیٰ کے محکمے (ایشیائی محکمے) کے یہاں سے ایک خط آیا کہ چونکہ گاندھی ڈربن میں مسٹر چیمبرلین سے مل چکے ہیں اس لیے ان کا نام وفد سے خارج کر دیا گیا ہے۔ اس خط کو دیکھ کر میرے رفیقوں میں ضبط کی تاب نہیں رہی مگر میں نے صلاح دی کہ میری جگہ مسٹر گاڈفرے کو لے جائیں چنانچہ مسٹر گاڈفرے کی سرکردگی میں وفد گیا۔ میں نے ہرچہ بادا باد کہہ کر کام شروع کر دیا اور جوہانسبرگ میں اپنا دفتر قائم کیا۔ ایشیائی محکمے کے عہدہ داروں کا جتنا زور جوہانسبرگ میں تھا اور کہیں نہ تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ یہ لوگ ہندوستانیوں، چینیوں وغیرہ کے حقوق کی حفاظت کرنے کے بجائے اور اُلٹا انھیں پیس رہے ہیں۔ اس لیے میں نے ان شکایتوں کے ثبوت فراہم کرنا شروع کیے اور جب کافی مسالہ جمع ہو گیا تو میں پولیس کمشنر کے پاس پہنچا وہ منصف مزاج آدمی نکلا۔ مجھے بہت سے عہدہ داروں پر شبہ تھا مگر چونکہ میرے پاس ان کے خلاف قطعی شہادت نہیں تھی اس لیے میں نے صرف دو شخصوں کے نام وارنٹ جاری کرائے جن پر جرم بالکل ثابت تھا۔ ان میں سے ایک تو فرار ہو گیا تھا۔ کمشنر پولیس نے اس کے لیے وارنٹ جاری کرا کر دوسری حکومتوں کے پاس بھیجا اور وہ گرفتار کر کے ٹرانسوال لایا گیا۔ ان دونوں کے مقدمے کی تحقیقات ہوئی اور باوجودیکہ ان کے خلاف کافی شہادت تھی مگر بے قصور قرار دے کر بری کر دیے گئے۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی کمشنر پولیس کو بھی بہت رنج ہوا مگر ان کے بری ہو جانے پر بھی حکومت انھیں اپنی ملازمت میں نہ رکھ سکی اور برخاست کر دیے گئے اس واقعے سے میری دھاک بیٹھ گئی۔

اسی زمانے میں مدن جیت جی نے میرے سامنے ایک اخبار "انڈین اوپینین" (INDIAN OPENION) کے نام سے نکالنے کی تجویز پیش کی اور اس بارے میں میری رائے پوچھی۔ یہ اخبار ۱۹۰۴ء میں جاری کیا گیا اور منسکھ لال جی نظر ایڈیٹر ہوئے مگر زیادہ تر کام مجھی کو کرنا پڑتا تھا۔ اس اخبار نے ہماری برادری کی مفید خدمت انجام دی۔ اس کے لہجے نے نقادوں کو قلم روک کر لکھنے پر مجبور کر دیا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو ستیہ گرہ کبھی نہ چل سکتی۔

اب میرے ہندوستان جلد واپس جانے کی کوئی امید نہیں رہی تھی اس لیے میں نے طے کیا کہ بیوی بچوں کو اپنے پاس بلاؤں۔ جس طرح میں نے فرنگی دوستوں کو شادی کی ترغیب دی اسی طرح ہندوستانی دوستوں کو بھی اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے بال بچوں کو وطن سے بلائیں۔ فینکس آہستہ آہستہ چھوٹا سا گاؤں بن گیا اب وہاں چند خاندان بس گئے تھے۔ بظاہر میں جوہانسبرگ میں بس گیا تھا مگر ٹھکانے کی زندگی میرے نصیب ہی میں نہ تھی۔ عین اس وقت جب میں یہ سمجھتا تھا کہ ذرا اطمینان سے بیٹھوں گا ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس

کی باقاعدہ ترتیب نہ تھی۔ اخباروں سے معلوم ہوا کہ نٹال میں زولو بغاوت شروع ہو گئی ہے مجھے زولو قوم سے کوئی خلش نہیں تھی مگر اس زمانے میں میرا یہ عقیدہ تھا کہ دولت برطانیہ دنیا کی بہبود کے لیے قائم ہے۔ میں نے گورنر کو خط لکھا کہ اگر ضرورت ہو تو میں ہندوستانیوں کی ایمبولنس کور قائم کرنے کو تیار ہوں انہوں نے فوراً منظوری بھیج دی۔ میں نے ڈربن جا کر رنگروٹوں کے لیے تحریک کی۔ بہت بڑے جتھے کی ضرورت نہیں تھی ہم کل چوبیس آدمی تھے چیف میڈیکل افسر نے دستور کے مطابق مجھے سرجنٹ میجر کا عارضی منصب دے دیا۔

زولو بغاوت کے سلسلے میں مجھے نئے نئے تجربے ہوئے۔ جنگ بوئر میں مجھے لڑائی کے خوفناک نتائج کا اتنا اندازہ نہیں تھا جتنا اس بغاوت میں ہوا۔ یہ نام کو لڑائی تھی مگر اصل میں آدمیوں کا شکار تھا۔ جنوبی افریقہ کی اور بہت سی باتیں مجھے یاد ہیں مگر مجبوراً ان کا ذکر چھوڑتا ہوں۔ ۱۹۱۴ء میں جب ستیہ گرہ کی جدوجہد ختم ہو گئی تو گوکھلے کا حکم پہنچا کہ لندن ہوتے ہوئے ہندوستان آ جاؤ۔ اس لیے میں انگلستان روانہ ہو گیا۔ لڑائی کا اعلان ۴ر اگست کو ہوا تھا ہم ۶ر اگست کو لندن میں داخل ہوئے۔

پہلی جنگ عظیم

انگلستان پہنچ کر معلوم ہوا کہ گوکھلے جو علاج کے لیے پیرس گئے تھے آمد و رفت کا سلسلہ بند ہو جانے کے سبب وہیں رہ گئے ہیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کب لوٹیں گے۔ میں ان سے ملے بغیر ہندوستان نہیں جانا چاہتا تھا میری یہ رائے تھی کہ جتنے ہندوستانی انگلستان میں مقیم ہیں سب کو اپنی بساط کے مطابق جنگ میں حصہ لینا چاہیے اس پر بہت سے اعتراض کیے گئے بعض لوگوں نے کہا کہ ہندوستانیوں اور انگریزوں میں زمین آسمان کا فرق ہے ہمیں تو اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر اپنی آزادی کی فکر کرنا چاہیے۔ اس وقت اس دلیل سے میری تسکین نہیں ہوئی۔ جو لوگ میری رائے کے مخالف تھے ان کا قول تھا کہ ہندوستانیوں کے مطالبات پر زور دینے کا یہی وقت ہے۔ میں یہ کہتا تھا کہ ہمیں انگلستان کی مصیبت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے بلکہ شرافت اور دور اندیشی کا تقاضا ہے کہ جنگ کے اختتام تک ہم اپنے مطالبات ملتوی رکھیں۔ غرض میں اپنی رائے پر قائم رہا اور میں نے کہا کہ جس کا جی چاہے وہ اپنا نام رضاکاروں میں لکھوا دے مجھے اچھی خاصی کامیابی ہوئی۔ میں نے لارڈ کریو کو خط لکھا انہوں نے ہماری خدمات کچھ تامل کے بعد قبول کر لیں اور ہمارا شکریہ ادا کیا۔ لندن کی حالت اس زمانے میں دیکھنے کے قابل تھی شہر میں ذرا بھی انتشار نہ تھا سب لوگ اپنی اپنی بساط کے مطابق مدد کرنے میں مصروف تھے۔ جتنے مضبوط جوان تھے وہ تو فوجی قواعد سیکھ ہی رہے تھے مگر ضعیف اور بیمار لوگ یہاں تک کہ عورتیں بھی بیکار نہ تھیں۔

مجھے یہ امید تھی کہ میں برطانوی سلطنت کے ذریعے سے اپنی اور اپنی قوم کی حیثیت بڑھا سکوں گا میں سوچتا تھا کہ جب تک انگلستان میں ہوں برطانوی بیڑے کی حفاظت سے فائدہ اٹھا رہا ہوں اور اس مسلح قوت سے فائدہ اٹھانا گویا اس تشدد میں شریک ہونا ہے جو اس کے ہاتھ سے عمل میں آ سکتا ہے۔ اس لیے اگر میں سلطنت برطانیہ سے تعلق قائم رکھنا اور اس کے زیر سایہ رہنا چاہتا ہوں تو مجھے ان تین طریقوں میں سے ایک اختیار کرنا چاہیے۔ یا تو میں کھلم کھلا لڑائی کی مخالفت کروں اور ستیہ گرہ کے اصول کے مطابق سلطنت برطانیہ سے اس وقت تک ترک موالات کروں جب تک وہ اپنی فوجی پالیسی نہ بدل دے۔ یا میں اس کے قابل اعتراض قوانین کی خلاف ورزی کر کے جیل چلا جاؤں یا لڑائی میں سلطنت کا ساتھ دے کر لڑائی کو روکنے کی قابلیت اور قوت حاصل کروں۔ میں جانتا تھا کہ ابھی تک مجھ میں یہ قابلیت اور قوت نہیں ہے اس لیے مجھے سوائے لڑائی میں شامل ہونے کے اور کوئی صورت نظر نہیں آئی۔

انگلستان پہنچ کر میں پسلی کے ورم میں مبتلا ہو گیا تھا میرے پہنچنے کے تھوڑے دن بعد گوکھلے لندن واپس آ گئے ہم دونوں میں زیادہ تر لڑائی کے متعلق گفتگو ہوا کرتی تھی۔ جب میرے مرض نے شدت پکڑی تو یہ بھی روزمرہ کی گفتگو کا موضوع بن گیا۔ میرے غذائی تجربے اس زمانے میں بھی جاری تھے میری غذا مونگ پھلی، کچے اور پکے کیلے، میٹھے لیموں، زیتون کا تیل، ولایتی بینگن اور انگور وغیرہ پر مشتمل تھی۔ ڈاکٹر جیوراج مہتا میرے معالج تھے اُن کا اصرار تھا کہ اناج اور دودھ استعمال کروں مگر میں راضی نہیں ہوتا تھا۔ پسلی کا ورم کسی طرح دور نہیں ہوتا تھا اس لیے مجھے کسی قدر اندیشہ پیدا ہو گیا۔ میں نے ڈاکٹر ایلینسن سے رجوع کیا جو محض غذا کی تبدیلی سے علاج کیا کرتے تھے ان کے علاج سے میں بالکل اچھا ہو گیا مگر پوری صحت نہیں ہوئی۔ اس اثناء میں ایک دن مسٹر رابرٹس مجھے دیکھنے آئے اور انہوں نے بڑے اصرار سے کہا کہ آپ وطن چلے جایئے پوری صحت آپ کو وہیں ہو سکتی ہے اگر اس وقت تک لڑائی جاری رہی تو وہاں بھی آپ کو سلطنت کے بہت سے موقعے ملیں گے۔ میں نے اُن کا مشورہ قبول کر لیا اور ہندوستان جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ چنانچہ چند روز بعد ہم بمبئی پہنچ گئے۔ دس سال کی جلاوطنی کے بعد وطن کی صورت دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ دل ہی جانتا ہے۔

جیسے ہی میں بمبئی میں داخل ہوا گوکھلے کا پیغام پہنچا کہ گورنر تم سے ملنا چاہتے ہیں پونا آنے سے پہلے اُن سے مل لو چنانچہ ہز ایکسی لینسی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اس کے بعد انہوں نے فرمایا "میں آپ سے ایک بات کا وعدہ لینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ جب بھی کوئی ایسی تجویز سوچیں جس کا تعلق گورنمنٹ سے ہو تو مجھ سے ضرور مل لیا کریں۔" میں نے جواب دیا "مجھے یہ وعدہ کرنے میں کوئی تامل نہیں۔" لارڈ ولنگڈن نے میرا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ "آپ کا جب جی چاہے میرے پاس چلے آیا کیجئے آپ دیکھ لیں گے کہ میری گورنمنٹ جان بوجھ کر برائی نہیں کرنا چاہتی۔" میں نے اس کے جواب میں عرض کیا "اسی عقیدے کی بدولت میری جماعت بندھی ہوئی ہے۔"

آشرم

اس کے بعد میں پونا گیا، گوکھلے اور "سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی" کے ممبروں نے مجھے محبت کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ گوکھلے دل سے چاہتے تھے کہ میں انجمن (سوسائٹی) کا ممبر بن جاؤں میں نے ان سے کہا کہ میرا ارادہ ہے کہ خواہ میں انجمن میں داخل کیا جاؤں یا نہ کیا جاؤں دونوں صورتوں میں اپنا ایک الگ آشرم گجرات کے کسی حصے میں قائم کروں۔ گوکھلے کو یہ تجویز پسند آئی انہوں نے کہا تم ضرور آشرم قائم کرو تمہارے آشرم کو میں اپنا آشرم سمجھوں گا اور اس کا کل خرچ دوں گا۔ میں خوشی سے پھولا نہ سمایا میرے لیے اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا تھا کہ چندہ جمع کرنے کی ذمہ داری سے آزاد رہوں۔ پونا سے میں راج کوٹ اور پور بندر گیا۔ اس زمانے میں طاعون پھیلا ہوا تھا اور ویرگام بادھوان میں تیسرے درجے کے مسافروں کا ڈاکٹری معائنہ کیا جاتا تھا۔ مجھے خفیف سی حرارت تھی انسپکٹر نے یہ دیکھ کر میرا نام لکھ لیا اور مجھ سے کہا کہ تم راج کوٹ کے میڈیکل افسر کے پاس حاضر ہو جانا غرض میں راج کوٹ پہنچ گیا اور دوسرے دن صبح کو میڈیکل افسر کے پاس حاضر ہوا وہاں لوگ مجھ سے واقف نہیں تھے۔ ڈاکٹر صاحب بہت شرمندہ ہوئے اور انہیں انسپکٹر پر بڑا غصہ آیا۔ ایسے موقعوں پر تیسرے درجے کے مسافروں کا طبی معائنہ حفظانِ صحت کے لحاظ سے ضروری ہے سرکاری ملازم تیسرے درجے کے مسافروں کو اپنا ہم جنس نہیں بلکہ بھیڑ بکری سمجھتے ہیں وہ اُن کے ساتھ حقارت آمیز گفتگو کرتے ہیں بیچارے مسافر نوکروں کی طرح ان کی اطاعت کرتے ہیں اور یہ بے تکلف انہیں مار بیٹھتے ہیں ان سے ذرا دھمکا کر روپیہ اینٹھتے ہیں اور انہیں ٹکٹ

ختم نہ کر دیئے ہیں۔ میں کاٹھیاواڑ میں جہاں کہیں گیا میں نے یہی شکایت سنی اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ لارڈ ولنگڈن کی فرمائش سے فائدہ اٹھاؤں اس مسئلے کے متعلق جتنا مواد مل سکا میں نے جمع کیا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ لوگوں کی شکایتیں بجا ہیں تو میں نے حکومت بمبئی سے خط و کتابت شروع کی۔ خود ہز ایکسی لینسی کی خدمت میں بھی حاضر ہوا موصوف نے ہمدردی کا اظہار کیا لیکن اس معاملے میں اپنی مجبوری ظاہر کر کے دہلی کے حکام کو ذمہ دار ٹھہرایا میں نے حکومت ہند کو لکھا لیکن سوائے خط کی رسید کے کوئی جواب نہیں ملا بہت دنوں بعد جب مجھے لارڈ چیمسفورڈ سے ملنے کا اتفاق ہوا تب جا کر شنوائی ہوئی اور چند روز کے بعد میں نے اخباروں میں پڑھا کہ ویرا گام کی چنگی کی چوکی اٹھا دی گئی۔

ناخدا کی ضرورت

پونا پہنچ کر شرادھ کی رسم سے فراغت پانے کے بعد یہ مسئلہ چھڑ گیا کہ انجمن کا مستقبل کیا ہوگا اور مجھے اس میں شرکت کرنا چاہیئے یا نہیں میرے لیے یہ مسئلہ بہت نازک تھا جب تک گوکھلے زندہ تھے مجھے انجمن (SEWANTS OF INDIAN SOCIETY) کا رکن بننے کی ضرورت ہی نہیں تھی میری رہنمائی کے لیے ان کی ذات کافی تھی۔ ہندوستانی سیاست کے تلاطم خیز سمندر میں سفر کرنے کے لیے مجھے ایک ناخدا کی ضرورت تھی اور گوکھلے کا دامن تھام لینے سے یہ مشکل حل ہو گئی تھی۔ ان کی وفات کے بعد میں بے کس و تنہا رہ گیا اور اب میں نے اپنا فرض سمجھا کہ انجمن کا رکن بن جاؤں۔ میں انجمن کا باضابطہ ممبر نہیں بنا مگر روحانی حیثیت سے میں اپنے آپ کو اس کا رکن سمجھتا ہوں۔

۱۹۱۵ء میں ہردوار میں کنبھ کا میلہ تھا جو بارہ سال کے بعد ہوا کرتا ہے۔ مجھے میلہ دیکھنے کا شوق نہیں تھا مگر میں گروکل میں جا کر منشی رام جی کے درشن کرنا چاہتا تھا۔ سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی نے رضاکاروں کا ایک بڑا دستہ بھیجا تھا۔ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو اس دستے کے سردار تھے۔ میرا کام زیادہ تر یہی تھا کہ خیمے میں بیٹھا "درشن" دیا کروں اور ان یاتریوں سے جو سیکڑوں کی تعداد میں میرے پاس آتے تھے مذہبی بحثیں کیا کروں۔ یہ "درشن" کے بھوکے گھاٹ تک میرا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ غرض ہردوار میں مجھے معلوم ہوا کہ جنوبی افریقہ میں جو ناچیز خدمات میں نے انجام دی ہیں ان کا اثر سارے ہندوستان میں کس قدر ہوا ہے۔ میری یہ حالت ایسی نہیں تھی کہ کسی کو رشک آئے کیونکہ میری جان پر دو طرفہ عذاب تھا۔ جہاں مجھے کوئی پہچانتا نہیں تھا مثلاً ریل کے سفر میں وہاں مجھے اپنے کروڑوں بھائیوں کی طرح سختیاں جھیلنی پڑتی تھیں اور جہاں ایسے لوگوں کا ہجوم تھا جو میری شہرت سن چکے تھے وہاں "درشن" کی مصیبت تھی۔ ان دنوں میرے جسم میں طاقت تھی اور میں دور دور تک چکر لگایا کرتا تھا۔ میں نے یاتریوں کو اچھی طرح دیکھا بھالا مجھے ان میں بے حسی، ریاکاری اور بدتمیزی زیادہ نظر آئی۔

پانچ پیر کی گائے

یہاں میں نے ایک گائے دیکھی جس کے پانچ پیر تھے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی مگر واقف کار لوگوں نے مجھے اس کا بھید بتا دیا۔ یہ بیچاری سنگدل انسانوں کی حرص و طمع کا شکار تھی۔ یہ پانچواں پیر اصل میں ایک زندہ بچھڑے کے جسم سے کاٹ کر اس غریب کے کندھے پر کھال چیر کر لگا دیا گیا تھا۔ اس دوہرے ظلم سے جاہلوں کو ٹھگنے کا یہ ذریعہ ہاتھ آیا تھا۔ یہ پاپی جانتے تھے کہ ہندو پانچ پیر کی گائے دیکھنے کے شوق میں دوڑا آئے گا اور اس زندہ معجزے پر حسب حیثیت چڑھاوا چڑھائے گا ستیاگرہ آشرم ۲۵ مئی ۱۹۱۵ء کو قائم ہوا۔ شردھانند جی چاہتے تھے کہ میں ہردوار میں سکونت اختیار کروں کلکتے کے

بعض احباب نے میرے لیے ویدیاناتھ دھام تجویز کیا تھا اور دوستوں کا اصرار تھا کہ راجکوٹ میں رہو مگر احمد آباد سے نکلتے وقت وہاں کے لوگ پیچھے پڑ گئے کہ یہیں بس جاؤ اور انہوں نے ہم لوگوں کے لیے ایک مکان اور آشرم کے کل مصارف دینے کا وعدہ کیا۔ میں احمد آباد ہی کو ترجیح دیتا تھا کیونکہ گجرات میرا وطن ہے گجراتی زبان کے ذریعے سے میں ملک کی اچھی خدمت کر سکتا تھا پھر یہ بھی خیال تھا کہ احمد آباد پارچہ بافی کا قدیم مرکز ہے یہاں چرخے کا کام بہت اچھا چلے گا۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ آشرم احمد آباد میں قائم کروں میں نے سوچا کہ ہم حق کے پرستار ہیں اور ہمارا کام حق کی تلاش اور حق کی پیروی ہے ہمارے پیش نظر یہ ہے کہ ستیاگرہ کی تحریک کو ہندوستان میں چلا کر دیکھیں اس لیے ہمیں آشرم کا نام ستیاگرہ آشرم رکھنا چاہیے۔ میرے دوستوں کی بھی یہی رائے ہوئی اس لیے یہی نام رکھا گیا۔ ان دنوں ہماری جماعت میں تیرہ تامل تھے پانچ نوجوان تامل جنوبی افریقہ سے ہمارے ساتھ آئے تھے اور باقی آٹھ ہندوستان کے مختلف حصوں سے آ کر شامل ہوئے تھے۔ ہم پچیس تھے جن میں چند عورتیں بھی تھیں ہم سب اکٹھے کھانا کھاتے اور عزیزوں کی کی طرح مل جل کر رہتے تھے۔

ابھی آشرم کو قائم ہوئے چند مہینے ہوئے تھے کہ ہمیں ایک بڑا سخت امتحان پیش آیا۔ میرے پاس امرت لال ٹھکر کا خط آیا جس کا مضمون یہ تھا کہ "اچھوتوں کا ایک غریب اور دیانت دار خاندان آپ کے آشرم میں آنا چاہتا ہے کیا آپ اسے داخل کرنے کو تیار ہیں؟" میں نے اپنے رفیقوں کو سنایا انہوں نے اس تجویز کو پسند کیا۔ یہ خاندان تین نفوس پر مشتمل تھا۔ ان تینوں نے ضابطوں کی پابندی منظور کر لی اور آشرم میں داخل کر لیے گئے۔ مگر ان کے داخلے سے آشرم کے سرپرستوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ ہمیں جو مالی امداد ملتی تھی بند ہو گئی۔ ادھر امداد بند ہوئی اور ادھر یہ افواہیں سننے میں آئیں کہ ہم ذلت سے باہر کر دیے جائیں گے۔ میں نے اپنے رفیقوں سے کہا کہ اگر ایسا ہوا تو ہم احمد آباد چھوڑ کر نہیں جائیں گے بلکہ اچھوتوں کے محلے میں اٹھ جائیں گے اور محنت مزدوری کر کے پیٹ پالیں گے یہاں تک نوبت پہنچی کہ ایک دن مگن لال گاندھی نے مجھے اطلاع دی کہ "ہمارا سرمایہ ختم ہو گیا۔ اگلے مہینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا "تو ہم اچھوتوں کے محلے میں اٹھ چلیں گے۔"

اس معاملے میں یہ میرا پہلا امتحان نہیں تھا جب کبھی ایسا موقع آیا زمانے نے عین وقت پر میری مدد کی۔ میری اور مگن لال کی گفتگو کو تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ایک روز صبح ایک بچے نے آ کر کہا کہ ایک سیٹھ موٹر میں بیٹھ کر آئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں میں ان کو لینے گیا انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں آشرم کی مدد کروں تو آپ قبول کریں گے۔ میں نے کہا بڑی خوشی سے۔ سچ پوچھیے تو میں آج کل بالکل خالی ہاتھ ہوں۔ سیٹھ بولے میں کل اسی وقت یہاں آؤں گا کیا آپ یہاں ہوں گے میں نے کہا "جی ہاں" سیٹھ چلے گئے دوسرے دن ٹھیک اسی وقت موٹر ہمارے گھر کے سامنے رکا سیٹھ اندر نہیں آئے بلکہ مجھے باہر بلا لیا۔ انہوں نے تیرہ ہزار روپے کے نوٹ میرے ہاتھ میں دیے اور رخصت ہو گئے۔ اس مدد کے مل جانے سے ہم نے اچھوتوں کے محلے میں اٹھ جانے کا خیال ترک کر دیا۔ اب ہمیں ایک سال کے لیے اطمینان ہو گیا۔

پابند مزدوری

مارچ ۱۹۱۶ء میں پنڈت مدن موہن مالوی جی نے مرکزی مجلس قانون ساز میں پابند مزدوری کو منسوخ کرنے کی تحریک پیش کی اس تحریک کو قبول کرتے ہوئے لارڈ ہارڈنگ نے اعلان کیا کہ گورنمنٹ برطانیہ نے وعدہ

کیا ہے کہ یہ طریقہ کچھ عرصے بعد موقوف کر دیا جائے گا۔ وائسرائے نے صاف کہہ دیا کہ کچھ عرصے کے بعد منسوخی کے معنی ہیں اتنے دن کے بعد کہ آجروں کو کوئی دوسرا انتظام کرنے کی مہلت مل جائے۔ فروری ۱۹۱۷ء میں مالوی جی نے پابند مزدوری کی فوری منسوخی کے لیے ایک مسودہ پیش کرنے کی اجازت مانگی لارڈ چیمسفورڈ نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اب وہ وقت آگیا کہ میں سارے ہندوستان میں احتجاج کا شور برپا کرانے کے لیے دورہ کروں مگر میں نے مناسب سمجھا کہ پہلے وائسرائے سے مل لوں۔ لارڈ چیمسفورڈ سے جو گفتگو ہوئی وہ قابل اطمینان تھی انہوں نے کوئی صریح بات تو نہیں کہی مگر یہ کہا کہ میں مدد کروں گا۔ میں نے اپنا دورہ بمبئی سے شروع کیا۔ ہم نے طے کیا کہ حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ ۳۱ جولائی تک منسوخی کا اعلان کر دے۔ جلسۂ عام میں اس مضمون کا رزولیوشن پاس ہو گیا اور سارے ہندوستان میں اس کی تائید میں جلسے کئے گئے میں نے کراچی، کلکتہ اور بہت سے شہروں کا دورہ کیا۔ ہر مقام پر شاندار جلسے ہوئے اور بے انتہا جوش کا اظہار کیا گیا۔ مجھے اس تحریک کو شروع کرتے وقت اتنی کامیابی کی توقع نہ تھی۔

خفیہ پولیس ان دنوں میں تنہا سفر کرتا تھا خفیہ پولیس والے ہمیشہ میرے پیچھے لگے رہتے تھے۔ ایک بار خفیہ پولیس والوں نے مجھے کئی اسٹیشنوں پر آکر پریشان کیا، بار بار میرا نام پوچھتے اور ٹکٹ کا نمبر لکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ میں بڑی خوشی سے ان کے سوالوں کا جواب دیتا رہا۔ میرے ہم سفر مجھے یہ سمجھتے تھے کہ کوئی سادھو یا فقیر ہے۔ انہیں یہ دیکھ کر کہ خفیہ پولیس والے مجھے ہر اسٹیشن پر پریشان کرتے ہیں غصہ آگیا اور انہوں نے ان لوگوں کو خوب ڈانٹا۔ مجھے خفیہ پولیس والوں کے سبب سے کوئی تکلیف نہیں تھی البتہ تیسرے درجے کے سفر میں بڑی تکلیفیں اٹھانا پڑتی تھیں۔

۳۱ جولائی سے پہلے حکومت نے اعلان کر دیا کہ ہندوستان سے پابند مزدوروں کا بھیجنا بند کیا جاتا ہے۔ ۱۸۹۴ء میں میں نے پابند مزدوری کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے پہلی درخواست لکھی تھی اور مجھے اسی زمانے میں پوری امید تھی کہ یہ طلسم کسی نہ کسی دن ٹوٹ کر رہے گا۔

چمپارن راجہ جنک کا ملک ہے جس طرح وہاں آم کے باغوں کی کثرت ہے اسی طرح ۱۹۱۷ء تک نیل کی کاشت پھیلی ہوئی تھی۔ چمپارن کے کاشتکار اس کے پابند تھے کہ اپنی زمین کے بیس حصوں میں سے تین میں زمیندار کے لئے نیل کی کاشت کریں۔ رام کمار شکل ایک کاشت کار تھے جنہوں نے خود اس شکنجے کی اذیت سہی تھی اور ان کے دل میں یہ جوش تھا کہ اپنے ہزاروں بھائیوں کے دامن سے یہ نیل کا دھبہ چھڑائیں۔ میں ۱۹۱۶ء کی کانگریس میں لکھنؤ گیا تھا وہاں رام کمار شکل نے آن پکڑا اور اصرار کرنے لگے کہ چمپارن چلو۔ میں نے حسب معمول یہ جواب دیا "میں جب تک سارے حالات خود نہ دیکھ لوں کوئی رائے نہیں دے سکتا" میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں اپنے دورے کے سلسلے میں دو ایک دن چمپارن میں بھی آکر ٹھہروں گا۔ ۱۹۱۷ء کے شروع میں ہم کلکتے سے چمپارن روانہ ہوئے اور صبح کو پٹنہ پہنچ گئے۔ رام کمار مجھے راجندر بابو کے گھر لے گئے وہ کسی جگہ گئے ہوئے تھے بنگلے میں دو ایک نوکر تھے جنہوں نے ہماری بات تک نہیں پوچھی۔

مظہر الحق مجھ سے اور مولانا مظہر الحق سے اس زمانے کی ملاقات تھی جب وہ لندن میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ میں نے انہیں ایک رقعہ بھیجا وہ فوراً اپنی موٹر میں پہنچے اور بڑا اصرار کرنے لگے کہ میرے یہاں چل کر ٹھہرو میں نے ان کا شکریہ ادا کیا

اور درخواست کی کہ مجھے سب سے پہلی گاڑی میں جو چمپارن جاتی ہو بٹھا دیں۔ چنانچہ شام کو انہوں نے مجھے مظفر پور کی گاڑی سے روانہ کر دیا۔

میرا مقصد یہ تھا کہ چمپارن کے کسانوں کی حالت کا مطالعہ کروں اور یہ معلوم کروں کہ انہیں نیل کی کوٹھی والوں سے کیا کیا شکایتیں ہیں۔ یہ تحقیقات شروع کرنے سے پہلے میں نے کوٹھی والوں کے خیالات سے واقف ہونا اور اس جگہ کے کمشنر سے ملنا ضروری سمجھا چنانچہ میں نے کوٹھی والوں کی انجمن کے سیکرٹری اور ترہٹ کے کمشنر سے ملاقات کی درخواست کی جسے دونوں نے منظور کر لیا۔ انجمن کے سیکرٹری نے مجھ سے صاف صاف کہا کہ تم باہر کے آدمی ہو تمہیں ان معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے میں نے نرمی سے جواب دیا کہ جب کسان خود چاہتے ہیں کہ میں ان کے حالات کی تحقیقات کروں تو مجھے اس کا پورا حق ہے۔ کمشنر صاحب سے ملا تو وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ انہوں نے مجھے بہت دھمکایا کہ تم فوراً ترہٹ سے چلے جاؤ۔ چمپارن ترہٹ کی قسمت کا ایک ضلع ہے اور اس کا صدر مقام موتی ہاری ہے۔ میں اپنے رفیقوں کے ساتھ موتی ہاری روانہ ہو گیا۔ وہاں ہم بابو گورکھ پرشاد کے مہمان ہوئے۔ ایک شخص سپرنٹنڈنٹ کا پیغام لایا کہ صاحب نے آپ کو سلام بولا ہے۔ میں ان کا مطلب سمجھ گیا اور کرائے کی گاڑی میں بیٹھ گیا جو سپرنٹنڈنٹ کا آدمی لایا تھا۔ اس نے مجسٹریٹ کا حکم دکھایا کہ چمپارن سے فوراً چلے جاؤ۔ میں نے لکھ دیا کہ میں اس حکم کی تعمیل نہیں کروں گا۔ اس پر میرے پاس سمن پہنچا کہ کل تمہیں عدالت میں خلاف ورزی کی جواب دہی کرنا ہوگی۔ قانون کے مطابق میرے مقدمے کی تحقیقات درپیش تھی مگر سچ پوچھیے تو حکومت کا امتحان ہو رہا تھا کمشنر نے جو جال میرے لیے پھیلایا تھا اس میں خود حکومت پھنس گئی۔ کارروائی شروع ہوئی۔ سرکاری وکیل اور مجسٹریٹ وغیرہ بڑی مشکل میں پڑ گئے تھے۔ سرکاری وکیل زور ڈال رہا تھا کہ پیشی بڑھا دی جائے مگر میں نے کہا اس کی کوئی ضرورت نہیں میں خود اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نے چمپارن سے چلے جانے کے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ دوسری پیشی سے پہلے مجسٹریٹ کی تحریر پہنچی کہ لفٹنٹ گورنر نے مقدمہ واپس لینے کا حکم دیا ہے۔ اس طرح ہندوستان نے سول نافرمانی کا پہلا عملی سبق سیکھا۔ چمپارن کے معرکے سے یہ ثابت ہو گیا کہ لوگوں کی بے غرض خدمت سے خواہ وہ کسی شعبے میں کی جائے ملک کو ایک نہ ایک دن سیاسی فائدہ بھی ضرور پہنچتا ہے۔

بہار سے زیادہ واقفیت حاصل ہو جانے کے بعد مجھے یہ یقین ہو گیا کہ جب تک یہاں کے دیہات میں تعلیم نہ ہو کوئی مستقل کام نہیں کیا جا سکتا۔ برج کشور بابو اور راجندر بابو جیسے دو آدمی مشکل سے ملیں گے۔ ان کے خلوص اور انہماک کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ میں کوئی کام ان کے بغیر نہیں کرتا تھا۔ پروفیسر کرپلانی بھلا ہمارا ساتھ دیئے بغیر کیسے رہ سکتے تھے۔ ہونے کو تو وہ سندھی تھے مگر اصل میں بہاریوں سے زیادہ بہاری تھے۔ مولانا مظہر الحق نے اپنا نام امیدوار رضا کاروں میں لکھوا دیا تھا کہ جب ضرورت ہو ان سے مدد لوں۔

اپنے رفیقوں کے مشورے سے میں نے طے کیا کہ چھ گاؤں میں ابتدائی مدارس کھولے جائیں۔ اب سوال یہ تھا کہ مدرس کہاں سے آئیں۔ مقامی لوگوں میں ایسے مدرس ملنا مشکل تھے جو بلا معاوضہ یا کم معاوضے پر کام کریں اس لیے میں نے رضا کار مدرسوں کے لئے عام اپیل کیا اور اس کا فوراً اثر ہوا۔ ایک طرف تو یہ اصلاحی کام ہو رہا تھا اور دوسری طرف کسانوں کے بیانات لکھے جا رہے تھے۔ ایک دن میرے پاس گورنر کی طرف سے خط آیا کہ آپ کی تحقیقات کو بہت طول ہو گیا ہے کیا یہ مناسب ہوگا

کہ آپ اسے جلد ختم کر دیں اور بہار سے رخصت ہو جائیں۔ میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ جب تک اس کے ذریعے سے کسانوں کی شکایتیں دور نہ ہو جائیں میں بہار سے نہیں جاؤں گا۔ اگر حکومت چاہتی ہے کہ یہ تحقیقات روک دی جائے تو یا تو وہ کسانوں کی شکایتوں کو تسلیم کر لے اور چارہ جوئی کرے یا کم از کم ایک سرکاری تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دے” گورنر نے مجھے بلا کر گفتگو کی اور کہا کہ میں تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرنے کو تیار ہوں اور اگر آپ چاہیں تو آپ کو بھی اس کا ممبر بنا دوں گا۔ گورنر نے میری شرطوں کو قبول کر لیا اور تحقیقات کا اعلان کر دیا۔ کمیٹی نے کسانوں کے موافق رپورٹ دی اور یہ تجویز کی کہ جو رقمیں کوٹھی والوں نے ناجائز طور پر وصول کی ہیں ان کا کچھ حصہ ان سے واپس دلایا جائے اور "تین کٹھیا" کا طریقہ منسوخ کر دیا جائے۔

احمد آباد سے انسویا بائی نے وہاں کے مزدوروں کے حالات لکھے۔ ان لوگوں کو مزدوری بہت کم ملتی تھی۔ بیچارے بہت دن سے فاقے پر مار رہے تھے کہ کچھ اضافہ ہو جائے۔ اس لیے میں موقع ملتے ہی احمد آباد روانہ ہو گیا۔ مزدوروں کی شکایتیں واجبی تھیں۔ اس جنگ میں کارخانوں کے مالکوں کے سپہ سالار امبالال جی تھے ان کی سگی بہن انسویا بائی مزدوروں کی طرف سے ان کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ میرے اور مالکوں کے دوستانہ تعلقات تھے اس لیے یہ لڑائی اور بھی دشوار ہو گئی تھی۔ میں نے ان کو کئی بار سمجھایا کہ اس معاملے کو پنچوں کے سپرد کر دیجئے مگر انہوں نے کہا ہم مزدوروں کے مقابلے میں پنچایت کے اصول کو تسلیم نہیں کرتے اس لیے مجھے سوائے اس کے کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ مزدوروں کو ہڑتال کا مشورہ دوں۔

تقدیر نے مجھے دم لینے کی بھی مہلت نہیں دی۔ احمد آباد کے مزدوروں کی ہڑتال ختم ہوتے ہی مجھے کھیدا کی ستیہ گرہ میں شریک ہونا پڑا جہاں فصل برباد ہو جانے سے قحط کی سی صورت پیدا ہو گئی تھی اور وہاں کے پٹی دار لگان کی وصولی ملتوی کرانے کے مسئلے پر غور کر رہے تھے۔ یہ ستیہ گرہ خلاف توقع بہت جلد ختم ہو گئی۔ لوگوں میں مقابلے کا دم نہیں رہا تھا اور میں اس خیال سے کہ کہیں یہ غریب بالکل تباہ نہ کر دیئے جائیں لڑائی کو جاری رکھتے ہچکچاتا تھا۔ بالکل خلاف توقع ایسی صورت پیدا ہو گئی۔ ندیاد تعلقے کے معاملت دار (تحصیل دار) نے مجھ سے کہلا بھیجا کہ اگر خوشحال پٹی دار لگان ادا کر دیں تو غریب لوگوں سے وصولی ملتوی کر دی جائے گی۔ میں نے اپنے دل میں کہا اگر یہ سچ ہے تو کسانوں کا عہد پورا ہو گیا یہ احکام بالکل ان کی خواہش کے مطابق تھے اس لیے ہم ان کی تعمیل پر راضی ہو گئے۔

علی برادران

جس زمانے میں کھیدا کا معرکہ ختم ہوا ہے یورپ کی مہلک جنگ جاری تھی اب اس میں ایک بڑا نازک موقع آن پڑا وائسرائے نے ہر خیال کے لیڈروں کو دلی میں "وار کانفرنس" میں شریک ہونے کے لیے بلایا۔ میں نے یہ دعوت قبول کر لی اور دہلی پہنچ گیا مگر کئی وجوہ سے مجھے کانفرنس کی شرکت سے تامل تھا جن میں ایک وجہ یہ تھی کہ اس میں علی برادران شامل نہیں کیے گئے تھے یہ دونوں ان دنوں جیل میں تھے مجھ سے ان سے صرف دو ایک بار کی ملاقات تھی مگر میں نے ان کا ذکر بہت سنا تھا۔ ہر شخص ان کی خدمات اور ان کی جرأت کی تعریف کرتا تھا۔ حکیم صاحب سے مجھے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن سے بھی میری ملاقات ہو چکی تھی۔ مجھے اچھے مسلمانوں کی صحبت کی تلاش تھی میں چاہتا تھا کہ ان میں جو پاک باطن اور نیشنلسٹ لوگ ہیں ان سے مل کر مسلمانوں کی طبیعت کا اندازہ کروں میں انتہائی کوشش کرتا تھا کہ باہمی اتحاد کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ دور ہو جائیں

میں نے علی برادران کی رہائی کے لیے حکومت سے خط و کتابت شروع کی اس سلسلے میں میں نے اس سے واقفیت حاصل کی کہ خلافت کے مسئلے میں ان دونوں بھائیوں کے خیالات کیا ہیں مجھے یہ محسوس ہوا کہ اگر میں مسلمانوں کا سچا دوست بننا چاہتا ہوں تو مجھے چاہیے کہ علی برادران کی رہائی اور مسئلہ خلافت کی کوشش میں ہر طرح کی مدد دوں مجھے اس سے بحث نہ تھی کہ اس مسئلے کی مذہبی صورت کیا ہے میرے لیے یہی کافی تھا کہ یہ مسلمانوں کا مطالبہ ہے۔ مجھے مسلمانوں کا ساتھ دینے کا مطلق افسوس نہیں، اگر ایسا موقع پھر آئے تو میں پھر یہی طرز عمل اختیار کروں گا۔ غرض جب میں دہلی گیا تو پوری طرح ارادہ کر لیا تھا کہ مسلمانوں کے مطالبات وائسرائے کے سامنے پیش کروں گا۔

میں نے وائسرائے کے نام خط میں لکھا کہ،

”آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے اپنے ۲۶؍ اپریل کے خط میں وہ وجوہ عرض کی تھیں جن کی بنا پر مجھے کانفرنس کی شرکت میں تامل تھا۔ . . . مجھے کانفرنس کی شرکت میں سب سے قوی اعتراض یہ تھا کہ لوکمانیہ تلک مسز بیسنٹ اور علی برادران جیسے بااثر لیڈر اس میں نہیں بلائے گئے . . . . . میری آخری درخواست آپ سے یہ ہے کہ برطانوی وزراء سے کہیے کہ اسلامی ممالک کے بارے میں ہمیں پوری طرح مطمئن کر دیں میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہر مسلمان کا دل ان کے درد سے بے چین ہے اور میں بھی ہندو ہونے کی حیثیت سے اس درد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ان کی مصیبت ہماری مصیبت ہے سلطنت کی حفاظت کی یہی صورت ہے کہ اسلامی ممالک کے حقوق کی دل و جان سے حمایت کی جائے، مقامات مقدسہ کے بارے میں مسلمانوں کے جذبات کا پورا احترام مدنظر رکھا جائے اور ہندوستان کے مطالبہ ہوم رول کا جلد منصفانہ تصفیہ کر دیا جائے . . .“

رنگروٹوں کی بھرتی میں میں نے اتنی محنت کی کہ میری صحت نے جواب دے دیا۔ ابھی اچھی طرح صحت نہیں ہو پائی تھی کہ اخبار دیکھتے دیکھتے میری نظر رولٹ کمیٹی کی رپورٹ پر پڑی اس کی تجویزیں دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔ شنکر لال بینکر اور عمر سبحانی نے درخواست کی کہ اس معاملے میں فوری کاروائی کرنا چاہیے۔ میری تحریک پر ایک خاص انجمن ستیہ گرہ سبھا کے نام سے قائم کی گئی اور میں صدر بنایا گیا۔ ادھر تو رولٹ رپورٹ کے خلاف شورش بڑھ رہی تھی اور ادھر حکومت کو کد تھی کہ کمیٹی کی تجاویز پر عمل کر کے رہے گی۔ میں نے وائسرائے کو منت سماجت سے سمجھایا، ان کے نام نجی خط بھی لکھے مگر ساری کوششیں بیکار گئیں۔

حکیم اجمل خاں

مجھے یہ خیال آیا کہ اس قانون کے جواب میں ہمیں سارے ملک میں عام ہڑتال کرنا چاہیے اس لیے ایک دن مقرر کیا جائے اور اس دن سارے ہندوستانی اپاس (روزہ) کریں۔ مسلمانوں کے یہاں ایک دن سے زیادہ کا روزہ ناجائز ہے اس لیے اپاس چوبیس گھنٹے کا رکھا جائے۔ ہڑتال کے لیے ۳۰؍ مارچ ۱۹۱۹ء رکھی گئی مگر آگے چل کر یہ تاریخ بدل دی گئی اور ۶؍ اپریل مقرر ہوئی۔ اس دن سارے ہندوستان کے ایک ایک شہر میں ایک ایک گاؤں میں مکمل ہڑتال ہوئی۔ دہلی میں ۳۰؍ مارچ کو ہڑتال ہو چکی تھی وہاں شردھانندجی اور حکیم اجمل خاں کا طوطی بولتا تھا۔ انہیں ہڑتال کے التوا کا تار دیر میں پہنچا۔ دہلی میں جیسی ہڑتال اس دن ہوئی کبھی نہ ہوئی تھی۔ ہندو مسلمان ایک ہو گئے۔ بھلا حکام ایسی باتوں کو کیسے برداشت کر سکتے تھے! پولیس نے ہڑتال کے جلوس کو اسٹیشن کی راہ میں روکا اور گولی چلائی۔ قریب قریب یہی لاہور اور امرتسر میں گزرا۔ امرتسر سے میرے پاس ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر کچلو کی تاکیدی دعوت آئی میں نے وعدہ کیا کہ دہلی سے امرتسر آؤں گا۔ غرض ۸؍ اپریل کی شام کو میں دہلی اور امرتسر کے قصد سے روانہ

ہوگیا۔ ۸را متھرا پہنچ کر میں نے سنا کہ حکومت مجھے گرفتار کرنے والی ہے۔ پلول کے اسٹیشن پر میں گاڑی سے اتار کر پولیس کی حراست میں دے دیا گیا۔

ادھر عدم تشدد کی تحریک آہستہ آہستہ ترقی کر رہی تھی۔ اور اُدھر حکومت کے جبر و تشدد کا بازار گرم تھا۔ خصوصاً پنجاب میں تو اس نے ظاہرداری کا پردہ بھی اٹھا دیا تھا۔ میں نے وائسرائے سے خط لکھ کر اجازت مانگی۔ تار بھی دیا مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اسی زمانے میں حکومت نے مسٹر ہارنیمن کو جن کی ادارت میں بمبئی کرانیکل نے بڑا زبردست اثر پیدا کر لیا تھا ملک بدر کر دیا۔ حکومت کا یہ فعل میرے نزدیک اس قدر مکروہ تھا کہ مجھے آج تک اس خیال سے گھن آتی ہے۔ جب بمبئی کرانیکل ان کی خدمات سے محروم ہو گیا تو اس کے ڈائرکٹروں نے مجھ سے کہا کہ آپ اس کی نگرانی اپنے ہاتھ میں لے لیجیے۔ بریلوی صاحب موجود ہی تھے اس لیے میرا کام محض برائے نام تھا مگر حکومت نے کرانیکل کو بند کر کے مجھے اس مشکل سے بچا لیا۔

ینگ انڈیا

ان دنوں کرانیکل کا انتظام سیٹھ عمر سبحانی اور شنکر لال بینکر کے ہاتھ میں تھا اور ینگ انڈیا کو بھی وہی چلا رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کرانیکل تو اب بند ہو گیا اب آپ "ینگ انڈیا" کی ادارت قبول کر لیجیے اور اسے بجائے ہفتہ وار کے سہ روزہ کر دیجیے۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا مجھے یہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ لوگوں کو ستیہ گرہ کے حقیقی اصول سمجھاؤں۔ میرے کام کا خاص میدان گجرات تھا اس لیے مجھے ایک گجراتی اخبار کی بھی ضرورت تھی۔ ان دنوں اندو لال جی یاجنک، سیٹھ عمر سبحانی اور شنکر لال بینکر کے حلقے میں شامل تھے وہ اپنے دوستوں کی مالی امداد سے گجراتی میں ایک ماہوار رسالہ "نوجیون" نکال رہے تھے ان دوستوں نے نوجیون میرے حوالے کر دیا۔ دو ہفتہ وار اخبار دو مختلف مقامات سے نکالنے میں مجھے بڑی دقت تھی اور مصارف بھی زیادہ تھے اس لیے میری درخواست پر ینگ انڈیا بھی احمد آباد منتقل کر دیا گیا۔

گئو رکھشا

کانگریس کی طرف سے پنجاب کی ڈائرشاہی کی تحقیقات بھی شروع ہی ہوئی تھی کہ میرے پاس ہندو مسلمانوں کی اس مشترکہ کانفرنس میں شریک ہونے کی دعوت آئی جو مسئلہ خلافت پر غور کرنے کے لیے دہلی میں ہو رہی تھی۔ اس دعوت نامے پر منجملہ اور لوگوں کے حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اور مسٹر آصف علی کے دستخط تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے سوامی جی (شردھانند) اس کانفرنس کے نائب صدر منتخب ہوئے تھے۔ اس کانفرنس کا مقصد اس صورت حال پر غور کرنا تھا۔ جو خلافت کے معاملے میں حکومت کی بد عہدی سے پیدا ہو گئی تھی اور یہ طے کرنا تھا کہ ہندو مسلمان جشن صلح میں شرکت کریں یا نہ کریں۔ دعوت نامے میں یہ بھی تھا کہ کانفرنس میں علاوہ خلافت کے گئو رکھشا کے مسئلے پر بحث ہوگی۔ مجھے گئو رکھشا کا ذکر اس سلسلے میں پسند نہیں آیا میں نے اس دعوت نامے کے جواب میں جو خط لکھا اس میں شرکت کا وعدہ کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ ان دونوں مسئلوں کو گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ان دونوں کے بارے میں بحث کرنا ہے تو اس طرح نہ کیجیے جیسے سودا چکایا جاتا ہے بلکہ دونوں کے حسن و قبح پر الگ الگ غور کیجیے۔ یہ خیالات دل میں لیے ہوئے میں کانفرنس میں گیا۔ اس میں مجمع بہت کافی تھا میں نے اس مسئلے پر سوامی شردھانند جی سے گفتگو کی انہوں نے میری تجویز کو پسند کیا اور کہا کہ آپ اسے کانفرنس میں پیش کیجیے۔ میں نے حکیم صاحب سے بھی مشورہ کیا کانفرنس میں میں نے یہ کہا کہ اگر خلافت کا مسئلہ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں حق پر مبنی ہے اور اگر حکومت نے اس معاملے میں صریحی بے انصافی کی ہے تو ہندوؤں

کا فرض ہے کہ وہ اس کی تلافی کے مطالبے میں مسلمانوں کا ساتھ دیں۔ ان کے لیے یہ بات نازیبا ہے کہ اس موقع پر گئو رکشا کا مسئلہ بیچ میں لے آئیں اور صورت حال سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں سے سودا چکائیں اور مسلمانوں کے لیے بھی اس شرط پر گاؤ کشی بند کرنا مناسب نہیں ہے کہ ہندو خلافت کے معاملے میں ان کا ساتھ دیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے مذہبی جذبات کے لحاظ سے ہمسائیگی اور ملکی برادری کے حقوق کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی خوشی سے گاؤ کشی ترک کر دیں۔ مولانا عبدالباری صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ "خواہ ہندو ہماری مدد کریں خواہ نہ کریں۔ مسلمانوں کو اپنے برادران وطن کے جذبات کا لحاظ کر کے گاؤ کشی ترک کر دینا چاہیے۔" مولانا حسرت موہانی بھی اس جلسے میں موجود تھے۔ میں انہیں پہلے سے جانتا تھا مگر یہ اس کانفرنس میں معلوم ہوا کہ وہ کس غضب کے لڑنے والے ہیں۔

حسرت موہانی

کانفرنس میں ایک ریزولیوشن یہ بھی پاس ہوا کہ ہندو اور مسلمان سودیشی چیزوں کے استعمال کا عہد کر لیں۔ یہ ریزولیوشن حسرت صاحب کے مذاق کا نہ تھا، وہ چاہتے تھے کہ اگر خلافت کے معاملے میں سلطنت برطانیہ انصاف نہ کرے تو اس سے اس کا بدلہ لیا جائے اس لیے انہوں نے اس کے مقابلے میں یہ تجویز پیش کی کہ جہاں تک ممکن ہو ولایتی چیزوں کا مقاطعہ کیا جائے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ "آپ شوق سے بدیشی کپڑے کا مقاطعہ کیجیے ہمیں اس میں کوئی عذر نہیں مگر اس کے علاوہ کوئی ایسی تجویز بھی ہونا چاہیے جس پر فوراً عمل ہو سکے" جس وقت وہ یہ الفاظ کہہ رہے تھے میں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ واقعی ہمیں کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہے۔

آئندہ سال کانگریس کے پیش نظر دو چیزیں ایسی تھیں جن سے مجھے مناسبت اور دلچسپی تھی ان میں ایک جلیانوالہ باغ کے قتل عام کی یادگار تھی۔ اس کے علاوہ مجھ میں مسودے تیار کرانے کی صلاحیت تھی اور یہ بھی کانگریس کے کام آ سکتی تھی۔ کانگریس کا موجودہ دستور اساسی گوکھلے کا بنایا ہوا تھا، انہوں نے چند قواعد قلمبند کر دیے تھے جن کے مطابق کانگریس چل رہی تھی مگر ہر شخص محسوس کر رہا تھا کہ موجودہ قواعد اس کی رہنمائی کے لیے کافی ہیں۔ میں نے یہ تجویز پیش کی کہ تین ممبروں پر مشتمل کمیٹی ہو چنانچہ کیلکر جی اور آئی۔ بی۔ سین بابو نمائندے مقرر کر دیے گئے اور آخر میں ہم تینوں نے متفقہ رپورٹ پیش کر دی۔ جب سے میں نے یہ ذمہ داری اپنے سر لی اس وقت سے میں واقعی کانگریس کی سیاست میں شریک ہو گیا۔

اب میں اس مقام پر پہنچ گیا ہوں جہاں ان اوراق کو ختم کر دینا چاہیے اس کے بعد میری زندگی کے جتنے واقعات ہیں ان سے لوگ بخوبی واقف ہیں۔ پھر ایک اور وجہ بھی ہے جو مجھے خاموشی پر مجبور کرتی ہے۔ ۱۹۲۱ء سے مجھ سے اور کانگریس کے لیڈروں سے اس قدر ربط ضبط رہا کہ اگر میں اس کے بعد کا کوئی واقعہ اپنی زندگی کا بیان کروں تو اپنے اور ان کے تعلقات کا ذکر کرنا پڑے گا اور یہ کم سے کم اس وقت کسی طرح مناسب نہیں اس لیے میں اپنا صریحی فرض سمجھتا ہوں کہ اس داستان کو یہیں پر ختم کر دوں۔ بالفعل میں ناظرین سے رخصت ہوتا ہوں اور ان سے اس دعا میں شرکت کا طالب ہوں کہ حق تعالیٰ مجھے خیال، قول اور فعل میں اہنسا کی توفیق عطا کرے۔

ترجمہ :- ڈاکٹر سید عابد حسین
(تلخیص :- خورشید مصطفیٰ رضوی)

مسیح الدین خان سفیر اودھ

نام اس بے نام و نشاں کا محمد مسیح الدین ہے اور مولد و منشا قصبہ کاکوری لکھنؤ سے پچھم طرف قریب پانچ کوس کے بادشاہی مکانات سے واقع ہے۔ مدت سے سنتے چلے آئے ہیں کہ ہم لوگ علوی ہیں محمد ابن حنفیہ کی اولاد سے اور مادری نسب ہمارا عباسی ہے۔ اب یہاں پہلے ہم کو منظور ہے کہ کچھ مختصر حالات اپنے اجداد کا جہاں تک ہم کو معلوم ہے لکھیں پس راقم محمد مسیح الدین خاں ابن مولوی محمد علیم الدین خاں بہادر ابن قاضی القضاۃ مولوی نجم الدین علی خاں بہادر ابن مولوی حمید الدین ابن مولوی غازی ابن ملا محمد غوث مرحوم ہے۔ لقب ہم لوگوں کا ملک زادے مشہور ہے۔ یہ ہم کو نہیں معلوم کہ کس بزرگ کو ہمارے اجداد میں سے کس بادشاہ کی طرف سے یہ خطاب عطا ہوا تھا۔

ملا محمد غوث اورنگ زیب کے عہد میں بڑے عالم باعمل تھے اوّل ان کو منصب وکالت مرزا کام بخش کا مفوض ہوا اس عہدے سے ترقی ہوئی تب بمنصب مستقر الخلافہ یعنی اکبر آباد سے مقرر ہوئے پھر صدر الصدور صوبۂ الٰہ آباد کے ہوئے۔ ۲۹۔ صفر ۱۱۱۹ھ میں باسٹھ برس کی عمر میں قضا کی۔ آپ کے بیٹے مولوی غازی الدین مغفور تھے۔ اپنے سن شباب میں تعلیم اور تربیت کے لیے دلی میں تشریف لے گئے تھے وہاں کسی مدرسے میں پڑھتے تھے کہ طلبہ میں خانہ جنگی ہوئی آپ رفع فساد کے واسطے بیچ میں پڑے اسی حالت میں قتل عمد یا قتل خطا سے شہید ہوگئے وہ ایک بیٹے حمید الدین کو وطن میں چھوڑ گئے تھے۔ جو ہمارے والد ماجد تھے۔ ایک حکایت نہایت تعجب اور حیرت افزا مشہور ہے کہ نواب آصف الدولہ نے سارے باغات آم کے تمام ممالک محروسہ کے یا لکھنؤ کے گرد و پیش کے ضبط کر لیے تھے اور سب آم ہمارے باغات کے لوٹ کے سرکار میں چلے جاتے تھے مگر بازاروں میں آم کچھ کچھ بکا بھی کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ وہ سب آم یا چوری کے ہوتے تھے یا اگر سرکار کے علم سے بکتے ہوں تو غیر کا مال چھینا ہوا ظلم سے بکتا تھا۔ قریب آٹھ نو برس کے یہ ضبطی عام رہی اس سارے ایام ضبطی میں حضرت نے بالکل آم نہیں کھائے۔ ایک روز آپ موضع دگھیا اپنی زمینداری کے گاؤں میں تشریف لے گئے تھے وہاں کے کارپردازوں نے آم کی چٹنی پسوا کے کھانے کے وقت آپ کے دسترخوان پر رکھی۔ اور ہر چند اس نے اصرار کیا کہ آپ ہی کے باغ کے آم ہیں، میں نے یہ چٹنی پیسی ہے۔ آپ نے ہرگز وہ چٹنی بھی نہیں کھائی یہ حکایت بعینہٖ اسی طرح کی ہے جو حضرت ابو حنیفہ کی احتیاط کی مشہور ہے کہ کسی شخص کی بکری کھو گئی تھی حضرت نے اس نظر سے کہ عمر طبعی بکری کی بارہ برس ہے، بارہ برس تک گوشت بکری کا نہیں کھایا۔

ایک حکایت آپ کے اخلاق اور مروت کی مشہور ہے کہ کسی سفر میں ایک دن رستے میں ایک مقام پر آپ نماز پڑھ چکے تھے مگر جائے نماز پر بیٹھے ہوئے وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ ایک صاحب ارباب تعارف سے، گھوڑے پر سوار اور ایک برچھا ہاتھ میں ان کے تھا اور برچھا زمین میں گاڑ دیا۔ چونکہ اندھیرا تھا، اتفاقاً وہ برچھا آپ کے ہاتھ کی پشت پر گڑ گیا دو تین دقیقے جب تک وہ صاحب کھڑے ہوئے باتیں کرتے رہے آپ نے اُف نہ کیا۔ صرف اس نظر سے کہ ان کو ندامت ہوگی۔ جب وہ برچھا اکھاڑ کے چلے گئے تب آپ نے زخم کو دھو

کر رہا تھا۔

آپ نے غرہ ذیقعدہ ۱۲۱۵ھ میں قضا کی۔ ۴۸ برس، ایک مہینہ ۲۵ دن کی عمر میں۔ آپ کے اعقاب میں تین صاحبزادے ہیں۔ سب سے بڑے ہمارے جد بزرگوار قاضی القضاۃ مولوی محمد نجم الدین علی خاں بہادر تھے۔ نواب الماس علی خان خواجہ سرا نے جو قریب ایک کروڑ روپے کے مالک کا اودھ کی سرکار سے اجارہ دار تھا ایک گنج قریب قصبہ آسیون کے جو بارہ کوس پچھم طرف لکھنؤ سے ہے ڈالا تھا۔ اس میں ایک مدرسہ بھی مقرر کیا تھا۔ اسی مدرسے میں جناب ممدوح کو مدرس اول مقرر کیا۔ اسی قریب زمانے میں جو اواخر اٹھارھویں صدی عیسوی اور شروع تیرھویں صدی ہجری کے تھے کمپنی انگریزی کی سلطنت میں ایک منصب قاضی القضاۃ کا بنگالے میں قرار پایا۔ اس منصب پر آپ کا تقرر ہوا۔ قریب ۲۵ برس کے جناب ممدوح نے اس عہدے کو انجام دیا اس کے بعد مستعفی ہوئے۔ صدر عدالت کے حکام نے گورنر جنرل کو باجلاس کونسل تحریر طول طویل آپ کے محامد اور اوصاف میں لکھی اور درخواست کی کہ کل مشاہرہ آپ کا جو چھ سو پچاس روپے تھے پنشن مقرر ہو۔ گورنر جنرل نے جواب میں لکھا کہ ہم کو نصف تنخواہ سے زیادہ پنشن مقرر کرنے کا اختیار نہیں ہے اس واسطے ہم ولایت میں کورٹ آف ڈائرکٹرز کے پاس رپورٹ کرتے ہیں اور وہاں سے جواب آنے تک نصف مشاہرہ مقرر کیا گیا۔ اگرچہ ولایت سے منظوری کل مشاہرہ پنشن مقرر کرنے کی آگئی لیکن آپ کو آدھا درماہہ بھی بہت کم لینے کا اتفاق ہوا کہ استعفا دینے سے تیسرے یا چوتھے مہینے آپ نے قضا کی۔ بنارس میں آپ کا انتقال ہوا چونکہ آپ نے لاش کے نقل کرنے سے ممانعت کی وصیت کی تھی اس واسطے وہیں بنارس میں مدفون ہوئے۔ اور جب ولایت سے منظوری کل مشاہرہ بحال رہنے کی آگئی تب گورنر جنرل نے ایک خط تعزیت کا جناب جدۂ ماجدہ کے نام پر لکھا۔

والد ماجد

اب سوانح مختصر جناب والد ماجد مغفور کے لکھتا ہوں۔ راقم نے ابتدا میں کچھ کتابیں آپ سے پڑھیں اور آخر میں شرح چغمینی بھی آپ ہی سے پڑھی۔ جس عرصے میں آپ قاضی عدالت دائرہ وسائرہ بریلی سے متعلق اضلاع کے تھے ایک مقدمہ انتساب جرم قتل میں ایک عورت کے اوپر پیش ہوا کہ اس کا لڑکا جو ولد الزنا پیدا ہوا تھا اس نے اس لڑکے کو موافق مجسٹریٹ کے دعوے کے ایک اندھے کنوئیں میں پھینک دیا تھا مگر وہ لڑکا زندہ رہا۔ جب وہ مقدمہ پیش ہوا آپ نے فتوے میں لکھا جرم قتل بہت سخت جرم ہے اور اس عورت پر ثابت نہیں ہوتا۔ ہماری رائے میں جرم اس لڑکے کا بٹھلانا مقام خوف پر البتہ ہو سکتا ہے اور گمان یہ ہوتا ہے کہ اس لڑکے کو کسی طرح اس مقام پر اتار دیا ہے۔ دو قرینے سے: ایک یہ کہ ایک دن کا لڑکا اتنی دور سے پھینک دیا جائے اور زندہ رہے حسب عادت بعید معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ شفقت مادری بھی مقتضی نہیں معلوم ہوتی کہ اس کو اتنی دور سے پھینک دے۔ عدالت کے حاکم نے اس کا بہت تجسس کیا تب ثابت ہوا کہ ایک ڈلری میں رکھ کے اس نے وہاں اتار دیا تھا۔

بیدار بخت

آپ کی اولاد ذکور میں ہم پانچ بھائی تو اپنی عمروں کے متمتع ہوئے اور ایک بھائی سب سے بڑے شریف الدین امام نہایت حسین اور خوش رو پیدا ہوئے تھے مگر تین چار برس سے زیادہ عمر انھوں نے نہ پائی۔ راقم پندرھویں یا سولھویں شب کو شعبان کے مہینے کی ۱۲۱۹ھ میں پیدا ہوا۔ ہمارے بڑے چچا ممتاز العلماء بہادر نے تاریخ ولادت کی "بیدار بخت" پائی۔ جس زمانے میں راقم شملہ میں گورنر جنرل کے ساتھ ۱۲۳۹ھ میں مقیم تھا اور گورنر جنرل نے خطاب خانی اور بہادری کا مجھ کو عطا کیا اس وقت میں جناب والد ماجد کے خط سے اس مضمون سے مطلع ہوا کہ جب عم اکرم نے وہ تاریخ ولادت کی پائی تب جد امجد نے یہ تفاؤل فرمایا

کریں گا ضرور بیدار بخت ہوگا۔ چنانچہ والد نے لکھا کہ عطا اس خطاب کا اس نہج پر کلکتہ کے گزٹ میں اور اخباروں میں حکم اس کے طبع کا ہوا۔ یہ امر مختص رؤسا صاحبان ملک کے واسطے ہے ہم لوگوں میں جو روزگار پیشہ ہیں ابتدائے عملداری سرکار سے آج تک کسی کے واسطے سننے میں نہیں آیا۔ لامحالہ یہ نشان اسی تفاؤل کا ہے۔

الغرض جب میرا سن نو کا ہوا۔ تب بزرگوں نے مکتب میں سپرد کیا اور اخوند شیخ قیام الدین مرحوم کو قصبہ موہان کے رہنے والے تھے جد امجد نے ہمارے بھائیوں کی تعلیم کے واسطے مقرر فرمایا۔ ان کی خدمت میں حروف تہجی سے لے کر سارا قرآن شریف اور رسائل متداول فارسی کے کر لیا، مامقیماں، آمدنامہ، گلستاں، بوستاں، بہار دانش، ابوالفضل اور دیوان غنی اور بعض رسائل نظم و نثر کے راقم نے پڑھے۔

۱۲۲۹ھ میں میزان الصرف جناب حاجی امین الدین سے شروع کی۔ ساری وہ کتاب اور منشعب، اور پنج گنج جس کو تصریف بھی کہتے ہیں جناب ممدوح سے پڑھی۔ اس عرصہ میں جناب والد نے مولوی حسن بخش سنائی کو ہماری تعلیم کے واسطے مقرر کیا ان کی خدمت میں زبدۃ الصرف، صرف میر، مائۃ عامل، شرح مائۃ عامل، مصباح، ضریری، کافیہ اور شرح ملا جامی پڑھی۔

زیارت

اسی عرصے میں جناب والد نے ہم سب بھائیوں کو اکبر آباد میں طلب کیا۔ قریب چار برس کے وہاں رہنے کا اتفاق ہوا۔ جب والد مع سب بھائیوں کو وطن میں لے آئے تو یہاں ہم لوگوں کی تعلیم کے واسطے مولوی فضل اللہ صاحب کو جو رتی کے رہنے والے تھے مقرر کیا اسی عرصے میں ایک شب کو خواب میں زیارت با برکت حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہوا۔ اس صورت سے کہ آپ ہمارے گھر کی مسجد میں نماز جماعت کی پڑھاتے ہیں اور میں اسی مسجد کی فصیل پر بیٹھا ہوا وضو کرتا ہوں اور بہت جلدی کر رہا ہوں کہ جماعت کی نماز میں شریک ہو جاؤں لیکن اس قدر مجھے محرومی حاصل ہوئی کہ جب میں جماعت کے قریب پہنچا تو آپ نے سلام پھیر دیا اور جماعت کی طرف منہ پھیر کر دعا مانگنا شروع کی۔ اس میں میں بھی شریک ہوا لیکن چہرۂ مبارک پر ایک برقع تھا کہ چہرے کی زیارت بھی نصیب نہیں ہوئی۔ انھیں دنوں میں کچھ قبل یا بعد ایک شب کو حضرت باری تعالیٰ جل شانہ کو خواب میں دیکھا ایک بہت بڑے سانپ کی صورت پر ما بین الجو طیران میں ہیں۔ اس سے نہایت وحشت اور خوف اس وقت مجھے حاصل ہوا۔ خداوند تعالیٰ مجھ کو اپنے ثمرات اور نتائج قہر سے محفوظ رکھے۔

جب والد عدالت دائر و سائر کے دورے کے ذریعے سے فرخ آباد تشریف لائے، راقم کو اکبر آباد سے طلب کیا۔ دو تین مہینے یہاں آپ نے تشریف رکھی وہاں سے اسی تقریب میں کانپور میں تشریف لائے۔ پانچ چھ مہینے یہاں قیام ہوا۔ جب آپ وہاں سے ضلع میں بوری کے دورے کے واسطے روانہ ہوئے تب راقم کو اجازت دی کہ لکھنؤ میں اقامت کر کے کتب درسیہ بقیہ سے فراغت کروں۔ غرض راقم نے چھوٹے چچا مولوی خلیل الدین خاں کے مکان پر لکھنؤ میں اقامت کی اور جناب مرزا حسن علی محدث سے کہ ارشد تلامذہ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی سے تھے صدرا قرأت شروع کیا۔

اسی زمانے میں جناب والدین نے تقریب شادی راقم کی بڑے طمطراق سے قرار دی غلام حیدر خاں صاحب کی منجھلی بیٹی کے ساتھ عقد نکاح باندھا گیا۔ اس کے پندرہ بیس دن کے بعد جیسا کہ رواج ہے شادی ہوئی۔ ایک بزرگ مولوی محمود علی نے مادہ تاریخ میری شادی کا جو ماہ ربیع الاول ۱۲۳۲ھ میں ہوئی تھی یہ مصرع پایا ہے۔

ہمایوں وصل مہ با مشتری باد

پھر جو وطن آنے کا اتفاق ہوا ساری ہمت تلاش روزگار کی طرف مصروف ہوئی۔ مگر مطالعہ کتب کا شغل بے تعلقی میں بھی اور تعلق روزگار میں بھی رہا۔ اسی عرصے میں جناب بڑے بھائی نے مجھ کو اکبر آباد میں طلب کیا۔ وہاں کے کلکٹر مسٹر ٹکسبری نے جو صاحب اختیار تھے ایسا میری طلب کی۔ قریب تین برس وہاں اقامت ہوئی، وہ دو تین برس اکبر آباد میں نہایت بے شغلی اور ملاہی اور ملاعب میں بسر ہوئے۔ اسی عرصے میں ایک عہدہ مشترک سررشتہ داری کلکٹری و فوجداری کی ڈیڑھ سو روپیہ مشاہرہ کی قرار پائی تھی صاحب کلکٹر نے مجھے طلب کیا تھا اس نے کلکٹر سے ایسا کیا کہ راقم کو اس عہدے پر مقرر کرے۔ کلکٹر نے ان بزرگ سے جو خود پیشتر سررشتہ دار کلکٹری تھے پوچھا کہ فلاں شخص اس عہدے کا انجام کر سکتا ہے؟ انھوں نے راقم کی بہت تعریف کی مگر از جنس تاکید الذم بما یشبہ المدح۔ یعنی بظاہر ایسی تقریر کی کہ وہ ہمارے صاحبزادے ہیں اور بزرگ زادے ہیں، بڑے عالم فاضل ہیں مگر یہ کام بہت مشکل ہے۔ غرض کلکٹر نے جب یہ امر سنا تو اس کی رائے ہوئی کہ اکبر آباد کے مدرسے میں مجھے مدرس مقرر کرے وہاں دو مدرس پچاس روپیہ ماہوار کے تھے ایک عربیت کی تعلیم کے واسطے اور ایک ریاضی پڑھانے کے لیے اور ایک ڈاکٹر مدرسے کا مہتمم تھا اس کی بدمزاجی کے سبب سے دونوں نے استعفا دیا۔ کلکٹر نے جب ڈاکٹر سے میرے مقرر کرنے کے واسطے کہا اس تقریر سے کہ تمھاری بدمزاجی کے سبب سے ہمیں بہت شبہ ہے کہ وہ قبول نہ کریں گے اگر قبول کریں تو سو روپیہ مشاہرہ ان کا مقرر کرو اور دونوں عہدوں کا انجام انھیں کو سپرد کرو۔ ڈاکٹر نے مجھے طلب کر کے کہا۔ میں نے انکار کیا۔ تب اس نے بھائی صاحب کو طلب کر کے نہایت اصرار اور سماجت سے کہا کہ اپنے بھائی کو سمجھائیے مدرسی قبول کریں اور بموجب بھائی صاحب کے اصرار کے میں ان کے پاس گیا اور کہا کہ مجھے ہرگز خوف کسی طرح کا آپ سے نہیں ہے۔ صرف اس سبب سے کہ سو روپے میں میری بسر نہیں ہوگی اور محنت اور مشقت بہت ہے میں قبول نہیں کرتا۔ اگر آپ کی مرضی ہو تو میں دو آدمی اچھے فاضل بلا دوں پچھلے دستور کے مطابق ایک کو عربیت کی تعلیم کے واسطے اور ایک کو ریاضی کی تعلیم کے واسطے مقرر کیجیے۔ جب والد کو خبر ہوئی تو بہت ناراض ہوئے اور خط عتاب کا مجھ کو لکھا کہ ایسا عمدہ عہدہ خاندانی تو نے قبول نہ کیا نہایت خلاف عقل حرکت کی۔ اصل غرض آپ کی یہ تھی کہ وہاں مقرر ہونے سے میرے علم کی تجدید ہوتی اور شغل مطالعے کا ہمیشہ رہتا۔

دو عالموں میں جاہل

جناب بھائی صاحب نے یہ فکر کی کہ خود رخصت لی اور صاحب جج سے درخواست کر کے مجھ کو قائم مقام مقرر کروا دیا تاکہ جب حکام کے سامنے کام کرنے کا اتفاق ہو تو وہ زعم باطل ان کا نکل جائے۔ قریب سات آٹھ مہینے کے بھائی کی غیبت میں ہر طرح کا کام پیش آیا حکام بہت راضی ہوئے۔ ایک مقدمہ بابت نزاع سرحد تین برس سے بھائی صاحب کی کچہری میں دائر تھا جس میں اسناد کی مثل پانچ سیر سے وزن میں کم نہ ہوگی۔ صدر عدالت سے حکم اس کے فوراً انفصال کا آیا اور کیفیت التوا کی طلب ہوئی۔ اس کے بموجب صاحب جج نے میرے اوپر نہایت تاکید اور تشدد کیا کہ اسی مہینے میں اس کو فیصل کرو۔ میں نے جو اس مقدمے کو روبکار کیا اور متصل قریب ایک ہفتے کے ہر روز کچہری میں وہ پیش ہوتا تھا اور پھر سب مثل کو میں گھر میں لے آتا تھا۔ آدھی رات تک میں تنہائی میں غور کرتا تھا مطلق حقیقت کسی جانب کی میرے ذہن میں نہ آئی اور تحقیقات ضرور معلوم ہوئی۔ میرا ارادہ تھا کہ اسے پنچایت میں پیش کروں مگر جج صاحب نے نہ مانا اور نہایت تاکید کی کہ جس طرح سے ہو اسی مہینے میں فیصلہ کرو۔

جہاں تک ممکن تھا عقل لڑا کے اور کچھ استخارے کی مدد سے اس کو میں نے فیصلہ کیا لیکن میری اس فیصلے سے تشفی نہ ہوئی۔ بعد فیصلہ کرنے کے دفعتہً میری حالت متغیر ہوئی اور خود بخود گریہ و بکا میرے اوپر طاری ہوا اور یہ خیال ہوا کہ میں ایک جاہل محض ہوں بموجب مضمون حدیث کے القاضی جاہل بین العالمین (قاضی دو عالموں کے درمیان ایک جاہل ہوتا ہے) محض دنیا کی طمع سے اپنے تئیں اس بلا میں مبتلا کیا ہے۔ اس کا مآل عقبیٰ میں کیا ہوگا اسی حالت میں راقم دست بدعا ہوا کہ الٰہ العالمین مجھے فاقہ قبول ہے مگر تو مجھ کو ایسے عہدے اور نوکری سے محفوظ رکھ۔ یہ دعا ایسی تیر بہدف ہوئی کہ آج تک جناب اقدس نے اس بلا سے مجھے محفوظ رکھا۔

بائیں مونچھ

دوسرا امر عجیب یہ ہے کہ ایک شب کو میں نے خواب میں دیکھا میری بائیں طرف کی مونچھ خود بخود جاتی رہی۔ صبح کو آپ ہی آپ دل میں تعبیر آئی کہ لفظ ہندی بال کے فارسی میں بازو کے معنی ہیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی اخوان میں سے جو قوت بازو ہوتے ہیں اس عالم میں نہ رہا۔ اس کے تین چار روز کے بعد وطن کے خط سے معلوم ہوا کہ میری چھوٹی بہن بصعوبت ولادت جنین توام سے قضا کر گئی اور چونکہ مونچھ مؤنث ہے تو بائیں مونچھ کا جانا میری دونوں بہنوں میں چھوٹی بہن کے قضا کرنے پر جو تعبیر میرے ذہن میں گذری تھی بعد وقوع کے مثل آفتاب نیمروز کے ظاہر ہوئی۔

انھیں ایام میں شوق علم ہیئت کا بہت ہو گیا تھا۔ تصور یہ ہوا کہ ہیئت جدید انگریزی کی چونکہ بہت تکمیل ہوئی ہے اس کو دیکھنا چاہیئے اس واسطے انگریزی کے حروف تہجی وغیرہ سیکھنے اور ہاتھ کی لکھی ہوئی چٹھیاں ایک انگریزی داں سے پڑھنا شروع کیں۔ غرض یہ تھی کہ پہلے انگریزی کے لکھنے پڑھنے میں طاقت ہو جائے بعد اس کے ہیئت کی کتابیں دیکھیے۔ ایک کتاب قصہ کہانی کی بھی پڑھنے لگا کہ چھاپے کی کتابیں بھی پڑھنے کی طاقت ہو جائے۔ جب میں ولایت آمادہ روانگی کا ہوا ان دنوں میں انگریزی کے بولنے اور سمجھنے کی طاقت بالکل نہ تھی مگر ہاتھ کا لکھا ہوا خط اور چھاپے کا اخبار کتب لغت کی اعانت سے سمجھ لیتا تھا اور نقل انگریزی کی ہاتھ سے بہت اچھی طرح سے کر لیتا تھا مگر مضمون چٹھی بنانے کی طاقت نہ تھی۔ ولایت میں جا کے جب آٹھ برس قیام ہوا اتنی مدت میں باتیں انگریزی سمجھنا اور خود باتیں کرنا تو خوب آ گیا اور خط لکھنے پڑھنے میں بھی مشق ہو گئی کتابیں ہر قسم کے علوم کی سمجھنے لگا لیکن چونکہ درس انگریزی کا ترتیب معمول سے نہیں ہوا اور انگریزی زبان بہ نسبت ہم لوگوں کے نہایت عسیر ہے اور زیادہ عمر میں ہر زبان اور ہر علم کا سیکھنا دشوار ہے اس میں مجھے کمال نہ حاصل ہوا۔ ناقص اور ناتمام رہا۔ صرف یہ امر ہوا کہ اس زبان سے جہالت مطلق رفع ہو گئی اور جناب اقدس الٰہی نے جو میری تقدیر میں مقرر کیا ہے کہ کسی علم میں کمال نہ حاصل ہو اور کسی علم سے علوم متداولہ میں سے جہالت مطلق بھی نہ رہے وہ ہو گیا۔

تقریب میرے تقرر کی عجیب و غریب ہوئی۔ دو تین ملاقات کے بعد جب معلوم ہوا کہ کچھ مطلب (مسٹر مکسرین) اسے نہیں نکلتا تو ایک دن میں ان سے رخصت ہونے کے واسطے گیا۔ باتوں باتوں میں میں نے اپنے تعلق کا حال قائم مقامی میں عہدہ افتا کے اکبر آباد میں مذکور کیا۔ کچھ اسناد انگریزی جو اس عرصے میں متعلق میری کارگزاری کے تھے اس کی نقل میں نے اپنے ہاتھ سے کی تھی۔ فی الجملہ اس میں خامی تھی وہ نقول میں نے ان کے دیکھنے کے واسطے پیش کیں۔ انھوں نے وہ دیکھ کے پوچھا یہ کس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ میں نے اپنے ہاتھ سے لکھنا بیان کیا۔ ان کی میز پر ایک مسودہ دفتری چٹھی کا، ظاہرا انھیں کا اپنا لکھا ہوا رکھا تھا، وہ مجھے دیا کہ اس کو پڑھو۔ چونکہ ہاتھ کی لکھی ہوئی چٹھیوں کے پڑھنے کی کچھ مشق میں نے کی تھی میں اس کو اوّل سے آخر تک پڑھ گیا۔ کچھ الفاظ نہیں معلوم ہوئے وہ نہیں

نے خود بتا دیا ہے۔ چونکہ اس عرصے میں حکام کی نہایت خواہش تھی کہ یہاں کے شرفا انگریزی سیکھیں اور خصوصاً اہل اسلام کے بڑے بڑے خاندانوں کے لوگوں کی نفرت انگریزی سیکھنے سے سب کے دلوں میں تھی اسی قدر میری مشق اور توجہ انگریزی میں موجب نہایت ان کی مسرت کا ہوا۔ اسی وقت مجھے حکم دفتر میں حاضر رہنے کا کیا۔ اس دن کا فارسی کا کام میرے ہاتھ سے لیا پھر گورنر سے استجازت کر کے مجھ کو اپنے دفاتر عدالت اور مال میں میر منشی مقرر کیا۔ ۱۸۳۲ء میں راقم اس عہدے پر مامور ہوا۔

۱۸۳۶ء میں جب لارڈ آکلنڈ گورنر جنرل نے کلکتے سے ممالک مغربیہ ہندوستان کا سفر کیا اور دستور کے موافق لفٹیننٹ گورنر آگرے کے برخاست ہوئے وہ کام بھی گورنر جنرل کے ذمے پر رہا اور چونکہ وہ جا کے شملہ پر ٹھہرے تو وہاں آگرے کی گورنری کے دفتر بھی طلب کیے۔ راقم بھی بموجب طلب کے شاہجہان آباد میں لشکر کے شامل ہوا۔ چونکہ سفر میں دستور ہے مشاہرہ معینہ ہر شخص کا جو حضور میں ہوتا ہے گورنری کے دفاتر میں بڑھ جایا کرتا ہے اس سبب سے اور بسبب سیر و سیاحت کے ایک گونہ تمتع حاصل ہوا مگر کوہستان پر بسبب تنہائی کے کچھ اوراد و وظائف بڑھ گئے اور اس کی برکت سے رند مشربی اور آزادی جو طبیعت میں باقتضائے سن شباب تھی وہ جاتی رہی اور کچھ تقویٰ زیادہ ہو گیا۔

مبارک ولادت

چونکہ جب سے شادی ہوئی تھی دو لڑکے پیدا ہوئے تھے اور وہ کم سنی میں گزر گئے۔ اس کے بعد میرے گھر کے لوگوں کو ایک ایسا عارضہ ہوا کہ اکثر سقوط حمل ہوا اور اولاد کی طرف سے ایک صورت یاس کی سی ہو گئی۔ وہیں کوہستان میں خبر ولادت ایک لڑکی کی آئی کہ غرہ جمادی الاول ۱۲۵۳ھ میں وطن میں پیدا ہوئی۔ یہ خبر سن کے راقم نے نہایت گریہ و زاری سے جناب اقدس الٰہی میں دعا اس کی حیات کی کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی زندگی میں بھی برکت دی اور اس کی ولادت اتنی مبارک میرے واسطے ہوئی کہ روز ولادت کے چوتھے یا پانچویں دن گورنر جنرل کی طرف سے مجھے خطاب خانی اور بہادری کا عطا ہوا اور پھر روز بروز ترقی ہوتی گئی۔

الف لیلہ کا ترجمہ

ہنری طارنس نام ایک ارباب قلم میں سے نائب سیکرٹری گورنر جنرل کے تھے اور اہتمام فارسی دفتر کا انھیں سے متعلق تھا اور لارڈ آکلنڈ کو ایک شفقت خاص ان پر تھی۔ شملے میں انھوں نے الف لیلہ عربی میں مجھ سے پڑھ کے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا اس سبب سے ان کو ایک توجہ باطنی میری طرف تھی۔ میرے بہت خیر طلب تھے اور چاہتے تھے کہ کسی عہدے پر میری ترقی ہو۔

اس مقام پر ایک واقعہ غریب لکھنا مجھے مناسب معلوم ہوا۔ وہ یہ ہے کہ میں کلام اللہ کی تلاوت کرتا تھا۔ اس وقت ڈاک کے ہرکارے نے ”چٹھی گورنر جنرل کا لفافہ مجھ کو دی جس میں لکھا تھا ہم کو تمھارا مقرر کرنا اس عہدے (میر منشی) پر منظور نہیں۔ تلاوت سے فراغت کر کے میں نے اس چٹھی کو پڑھا باقتضائے بشریت مجھے ملال ہوا لیکن اب تک میں مایوس اس عہدے کے تقرر سے نہیں تھا۔ گمان یہ تھا کہ ہنری طارنس مجھ کو ضرور اس عہدے پر مقرر کرائیں گے۔ کلام اللہ میں راقم نے فال دیکھی شروع صفحے سے یہ شروع ہوا تھا:

بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا۔

اس دن سے غالباً ایک ہفتہ نہیں گزرا ہو گا کہ میر منشی فارسی دفتر خانے گورنر جنرل کا میں مقرر ہو گیا۔

خطارسی

ایک بار عجیب اتفاق ہوا کہ ایک خطارسی بادشاہ کے نام پر، اظہار کچھ تنخواہ وثیقے میں مقرر کرنے کے واسطے ملکہ نور جہاں کے لیے جو محمد علی شاہ کا ایک محل ہے، لکھا گیا۔ اس خط میں میرے نائب کے سہو سے خطاب ملکہ جہاں کا نہ لکھا گیا صرف ان کا نام یا شاید "حرم محترم" کے لفظ ان کے نام کے بعد لکھے گئے۔ اس خط کو بادشاہ نے پھیر دیا اور شکایت لکھی۔ اگر وہ خط مسل میں پھر آتا تو راقم اپنے سہو کا اقرار کر کے اس کو بدل دیتا۔ لیکن کرنل کالفیلڈ نے اس کو بہت طول دیا یعنی دفتر میری شکایت کے کھول دیئے۔ جناب سر ہربرٹ نے مجھ سے فرمایا اور ظاہرا وہی تقریر گورنر جنرل کے سامنے کی ہوگی کہ کرنل کالفیلڈ کو بسبب شدت عداوت کے مجھ سے اپنے تناقض تحریرات کا بھی خیال نہیں رہتا۔ ہمیشہ شکایت سازش آمیزی کی بادشاہ سے لکھتے تھے اب کی دفعہ بادشاہ کی نارضامندی مجھ سے لکھتے ہیں۔ خیر اس میں پورا خطاب ملکہ جہاں کا لکھ کے خط کو بدل دو۔ کچھ الفاظ بدل دیئے مگر اصل جو ان کی غرض تھی ملکہ جہاں کا لقب بنظر ملکہ معظمہ دام اقبالہا کے لحاظ سے نہیں لکھا گیا۔

ایک مرتبہ کرنل کالفیلڈ کو بادشاہ کے ایک خط میں شجاعت و تہور دستگاہ لکھا گیا تھا اور ہمیشہ سے عادت تھی کہ ریذیڈنٹ کو شہامت و والا مرتبت، عظمت و معالی منزلت لکھا جاتا تھا۔ حالانکہ بنظر اس کے کہ وہ ارباب فوج سے تھے کچھ قباحت نہ تھی مگر اس امر میں شرف الدولہ محمد ابراہیم خاں جو اس عرصے میں بادشاہ کے مدار المہام تھے انھوں نے کرنل کالفیلڈ کو برانگیختہ کیا اور ان سے کہا کہ اس خط کے آنے سے آپ کی وقعت بادشاہ کے دل سے گھٹ گئی۔ چند مرتبہ اور اسی طرح کے مزخرفات وہاں کے روزنامچے میں درج ہو کے آئے کسی طرح کا ضرر مجھ کو نہ پہنچا۔

الغرض جب تک راقم اس منصب پر رہا نہایت آسائش اور ناموری سے بسر ہوئی۔ لیکن جس طرح سے پچھلے میر منشیوں کو تمول حاصل ہوا اور اتنا اندوختہ انھوں نے جمع کیا کہ بقیہ مدت العمر ان کو نوکری کی حاجت نہ ہوئی راقم اس نعمت سے محروم رہا اور افلاس و بے بضاعتی کی نوبت پہنچی کہ برس چھ مہینے بھی خانہ نشینی دشوار تھی جس طرح سے ہوا اثاث البیت کو بیچ باچ کے تین چار برس بسر ہوئے۔ ان دنوں میں یہ تصور ہوا کہ نوکری کرنا غلامی سے بدتر ہے معیشت اپنی تجارت وغیرہ کے ذریعے سے حاصل کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس فکر میں تین چار ہزار روپے چھاپہ خانے میں اور کاغذ کی کل جاری کرانے میں لگائے لیکن اس میں کچھ انتفاع نہ ہوا اور وہ ساری رقم ضائع ہوئی۔ مجبوری سے پھر تلاش روزگار کی عزیمت ہوئی سر ہربرٹ مادک بنگالہ کے ڈپٹی گورنر تھے ان سے مستدعی ہوا کہ کوئی عہدہ عدالت یا مال کا مجھے عنایت فرمایئے۔ مسٹر ہنری طارنس اور سر ہربرٹ مادک نے باہم یہ بندوبست کیا کہ نواب ناظم مرشد آباد کی طرف سے ایک خط بدرخواست میرے تقرر کے نواب امیر النساء بیگم عرف دلہن بیگم کی ڈیوڑھی کی دیوانی پر منگوا کے بنگالے کی گورنمنٹ میں بھیجا اور وہاں سے منظوری منگوا کے مجھے مقرر کیا۔ نواب ناظم نے خلعت فاخرہ عطا فرما کے مجھ کو اس ڈیوڑھی پر مامور کیا۔ یہ نواب امیر النساء بیگم نواب عالی جاہ نواب مبارک الدولہ کے بیٹے کی بی بی تھیں جو اپنے وقت میں نواب ناظم تھے اور بعد اس کے وہ گدی نشین نواب منی بیگم کی مقرر ہوئیں جو کمپنی انگریزی کی ماں کہلاتی تھیں یہ عہدہ نہایت معزز تھا اور اس کا اعزاز و امتیاز گورنر جنرل کے دفتر کے میر منشی سے بمراتب زائد تھا۔ ایک لاکھ روپیہ سال اس ڈیوڑھی کے مصارف کے واسطے نظامت فنڈ سے نقد مقرر تھا اور بہت سی ریاست زمینداری وغیرہ کی تھی لیکن ان کی ڈیوڑھی میں چند بدمعاش ایسے گھسے تھے کہ وہاں سخت ابتری اور بدنظمی تھی، بے انتہا قرضداری تھی برسوں کی تنخواہ نوکروں کی چڑھی ہوئی تھی۔ مجھے حکم اس ڈیوڑھی کے

انتظام کو اس طرح ہوا تھا کہ مطلق بیگم صاحبہ کی رائے مصارف کے باب میں نہ سنوں اور جیسا مناسب سمجھوں اپنی رائے سے انتظام کروں جہاں تک کوشش ممکن تھی راقم نے درستی کی۔ تنخواہیں برسوں کی لوگوں کی چڑھی ہوئی بے باق کیں۔ آئندہ مہینے مہینے منقسم ہونے لگی۔ قرض ادا ہوگیا۔

بنگال کا جادو

عجیب اتفاق ہوا کہ دفعتہً نواب ناظم کا مزاج میری طرف سے برہم ہوگیا اور فی الجملہ میرے مربی قدیم مسٹر ہنری طارنس بھی مجھ سے ناراض ہوگئے۔ حقیقت یہ ہے کہ قبل مرشد آباد جانے کے سحر کی طرف سے میرے دل میں یہ عقیدہ تھا کہ اس زمانے میں چونکہ جیسے علوم ظاہری و باطنی میں کمی ہے ویسے ہی اس کا وجود نہیں، جو کچھ اس زمانے میں لوگ کہتے ہیں اور کرتے ہیں نرا دھوکا ہے۔ یہ امر مرشد آباد میں میرے دل سے نکل گیا اور اب مجھے یقین کلی ہے کہ سحر میں اب بھی اسی طرح کا اثر ہے جیسا پچھلے زمانے میں سنتے تھے میرا خوب عقیدہ واثق ہے کہ دونوں کی طبیعت دفعتہً میری طرف سے صرف جادو کے زور سے پھر گئی۔ پہلے مدت تک مجھ کو اس کا تصور نہ تھا حالانکہ یہ چار برس برابر ایام قیام مرشد آباد میں انواع اور اقسام طرح سے میرے اوپر جادو ہوئے۔ کہ میرے پلنگ کے نیچے کبھی تکیوں میں کبھی مسند کے نیچے کبھی آمد و رفت کے راستے میں عجیب عجیب چیزیں پائی گئیں۔ لونگیں اور سیندور اور الائچی اور سوئیاں اور کالی مرچیں اور کئی کئی چیزیں بنی ہوئی لوہے وغیرہ کی نکلیں اور پھینک دی گئیں۔ ایک دفعہ پاخانے میں جس زینے پر میں اکثر بیٹھتا تھا دیکھا کہ ایک مٹی کا برتن ہے اس پر دوسرا مٹی کا برتن بند ہے یہ دیکھ کے میں نے رفع حاجت نہ کی اٹھوا دیا۔ اس کو اٹھوا کے جو دیکھا تو اس میں ایک چراغ کسی چیز کے برادے کا بنایا ہے اور کسی میں کسی جانور کی چربی بھر کے چراغ جلایا ہے۔ اس کے گرد سیندور اور کچھ اور چیزیں ہیں اور جس مٹی کے برتن میں وہ رکھا تھا اس میں اور جو برتن بند تھا دونوں میں کسی قسم کے حروف غیر متعارف لکھے ہیں۔ اس کو اٹھا کے پھینکوا دیا۔ چونکہ بہت سے لوگ شاگرد پیشہ کے قریب تیس چالیس آدمی بلکہ کچھ زائد نظامت کی طرف سے میری ڈیوڑھی پر متعین رہتے تھے اور پچھلے عہدہ میں بھی چوبدار اور ہرکارے اور پہرہ مکانوں کا متعین تھا اور صبح و شام ہر کارخانے سے وردی پہنچانے کو بہت سے لوگ آیا کرتے تھے کچھ اس کا بندوبست نہ ہوسکا اور نہ یہی کھلا کہ کون شخص ایسی حرکت کیا کرتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اسما اور اوراد اور تلاوت کلام اللہ کی اور حزب البحر وغیرہ جو میں پڑھتا تھا اس سے میری حفاظت تھی۔ جب دفعتہً جناب عالی نواب ناظم اور صاحب ایجنٹ کے مزاج میری جانب سے بدل گئے خوب یقین ہوگیا کہ سحر نے اثر کیا۔

طرفہ معاملہ

اب ایک طرفہ معاملہ پیش آیا۔ مسٹر ہنری طارنس ہفتہ عشرے کے لیے کلکتے کے عازم ہوئے۔ ایک دھوئیں کا جہاز نظامت کا تھا وہ آمادہ اُن کے لے جانے کے واسطے ہوا۔ جس دن صبح کو وہ سوار ہوں گے اس کے قبل شام کو ایک شخص نے مجھ کو آکے خبر دی کہ آپ اسی وقت جا کے صاحب ایجنٹ کو منع کیجیے کہ اس جہاز پر سوار نہ ہوں دو آدمی ساحر اس جہاز پر بٹھائے گئے ہیں اور انھوں نے وعدہ مصمم کیا ہے کہ صاحب ایجنٹ کلکتے میں پہنچ نہیں سکیں گے راستے میں ہم ان کو تمام کر دیں گے۔ اگرچہ اب سحر کی تاثیر کا یقین زمانے میں ان کے عامل موجود ہونے کا مجھ کو یقین ہوگیا تھا لیکن اس کے ساتھ اتنی تاثیر سریع کا مجھے مبالغہ معلوم ہوا اور اس وقت کبھی عادت صاحب ایجنٹ کے پاس جانے کی نہ تھی اور وہ میری ملاقات سے انکار بھی کر چکے تھے۔ وہاں جانا اور اس کی اطلاع کرنا بے سود معلوم ہوا میں نہ گیا۔ صبح کو وہ سوار ہوئے۔ جہاز اسی دن شام کو یا دوسرے دن کلکتہ میں پہنچا جونہی مسٹر طارنس نے ارادہ جہاز پر سے اترنے کا کیا دفعتہً مصروع ہوکر گر پڑے اور مجنون ہوگئے دو تین دن کے عرصے میں قضا کر گئے۔ کسی دوسرے شخص کو یقین ہو یا نہ ہو مجھ کو اس وقت

سے عقیدہ وواثق ہوگیا کہ زمانے میں ساحر کامل اب تک موجود ہیں۔

میرے عمل کی تاثیر

اسی مقام کے مناسب ذکر تاثیر اعمال علوی کا ہے۔ چونکہ راقم کو مرشد آباد میں ایسے امور پیش آنے سے نہایت رنج تھا اسی حالت میں میں نے ایک عمل نہایت تضرع اور زاری کے ساتھ پڑھا اور یہ دعا کی کہ اللہ تعالیٰ سب میرے دشمنوں کو ہلاک اور خراب کرے۔ عجیب اتفاق ہوا کہ جناب عالی نواب ناظم ہنوز سفر میں تھے کہ وہاں ایک شخص متہم چوری کا کیا گیا یا حقیقت میں کسی خواجہ سرا کی کوئی چیز اس نے چرائی تھی۔ اس شخص پر اتنا ظلم ہوا کہ مر گیا۔ روز ہاتھی کے پاؤں میں باندھ کر سفر میں اس کو لے جاتے تھے جب لشکر فرودگاہ پر پہنچتا تھا تو اس پر ضرب اور شلاق ہوتی تھی۔ آخرش وہ شخص متحمل نہ ہوا مر گیا۔ صاحب مجسٹریٹ نے مرشد آباد کے سارے رفقا اور مصاحبین نواب ناظم کی دار و گیر کی۔

خود نواب ناظم چونکہ محکوم عدالت نہیں ہیں محفوظ رہے اور سب خواجہ سرا اور رفقا ماخوذ ہوئے۔ سب پر جرم اس شخص کے ہلاک کا ثابت ہوا۔ خصوص وہ وفات شریف جو میری جگہ پر عرض بیگی مقرر ہوئے تھے سیشن کی عدالت سے سب کے واسطے چودہ چودہ برس کی قید ہوئی۔ عرض بیگی ظاہر امر و شریف تھا، وہ کسی قسم کا زہر اپنے پاس رکھتا تھا۔ جب حکم اس کے حبس بے جانے کا ہوا تو وہ زہر کھا کے مر گیا اور سب دس بارہ آدمی خواجہ سرا وغیرہ با جلاس مشقت کے ساتھ قید ہوئے۔ بعد مرافعہ کے صدر عدالت میں صرف دو خواجہ سراؤں کی رہائی ہوئی۔ کہتے ہیں کہ گواہوں کی بہم رسانی اور تدابیر میں قریب ایک روپیہ کے انھوں نے خرچ کیا۔ مجھ کو خوب عقیدہ واثق ہے کہ وہ سب کچھ جو واقع ہوا صرف میرے عمل کی تاثیر سے ہوا اس واسطے کہ اس عمل کی تاثیر میں لکھتے ہیں کہ وہ کبریت احمر ہے۔ نا لائقوں کو اسے مت سکھاؤ۔

میری علیحدگی جناب عالی کے پاس سے پھر باقتضائے عَسیٰ اَن تَکرَھُوا شَیئاً وَّھُوَ خَیرٌ لَّکُم ہوئی۔ بعد ان حوادث کے خصوص ہنری طارنس کی وفات کے بعد اگر میں ہنوز اپنے عہدوں پر بحال ہوتا تب بھی بالضرور استعفا دیتا۔ لیکن مجھے ایک بڑا کھٹکا تھا کہ چار برس تک میں نواب امیر النسا بیگم کی ڈیوڑھی پر رہا لاکھوں روپیہ میرے ہاتھ سے خرچ ہوا اور عرض بیگی کے اور مدار المہامی نظامت کے عہدے پر اگرچہ تھوڑے دن قیام ہوا وہاں بھی روپیہ میرے ہاتھ سے اٹھا ہے۔ واصلات کے بکھیڑے میں سب حسابات تک مجھے جلا دیں گے اگرچہ میں اس قدر بے لوث تھا کہ اگر حاکم مجھ سے حساب سمجھتے تو دس بیس دن میں فراغت ہو جاتی لیکن اس کا ہرگز گمان نہ تھا۔ خصوص بعد مسٹر ہنری طارنس کے قضا کرنے کے ایک صاحب مرشد آباد کے جج تھے وہ قائم مقام ایجنٹ گورنر جنرل کے ہو گئے اور بعضے وجوہ سے مجھ سے کچھ ناراض تھے۔ اس سبب سے مجھ کو نہایت دغدغہ پیدا ہوا۔ اس عرصے میں کپتان گرگر مستقل ایجنٹ ہوئے یہ پچھلے دنوں لارڈ آکلنڈ کے صاحب تھے جب راقم فارسی دفتر کا میر منشی تھا مجھ کو خوب جانتے تھے انھوں نے اول دفتر سے بالا بالا تحقیقات کر کے میری بے لوثی پر یقین کیا اور مجھے اجازت دی کہ تم جہاں جی چاہے چلے جاؤ۔

اودھ کی ضبطی

قریب دو برس کے میں خانہ نشین رہا اتنے میں اودھ کی سلطنت سرکار انگریزی نے ضبط کر لی۔ جس دن ضبطی کا حکم بادشاہ کو سنایا گیا راقم اپنے گھر میں تھا۔ چنانچہ میری طلب ہوئی اور بادشاہ نے اپنے پاس مجھے بلا کے نہایت تاکید سے دوسرے یا تیسرے دن مجھے کلکتہ کی روانگی کا حکم دیا یہاں تک تاکید تھی کہ اسی طرف سے میں روانہ ہو جاؤں اور پھر گھر میں نہ جاؤں ایسے اضطراب میں مجھ کو روانہ کیا کہ طبیعت نہایت منتشر ہوئی۔ میں مخفی ایک شب کے واسطے اپنے عزیزوں سے رخصت ہونے کے لیے گھر میں آیا اس کی صبح

کو کلکتہ کی طرف روانہ ہوا۔ بادشاہ کو ان کے خیر طلبوں نے صلاح دی تھی کہ بذات خود انگلستان کی طرف روانہ ہوں اور مرافعہ اپنی مظلومی کا ملکہ معظمہ کے حضور میں اور پارلیمنٹ میں استغاثہ پیش کریں۔ حقیقت میں یہ رائے بادشاہ کے واسطے بہت بہتر تھی اگر ایسا کرتے وہ دو برس جو انھوں نے قلعہ میں رہنے سے مصیبت جھیلی اس سے محفوظ رہتے۔ الغرض بادشاہ نے کلکتہ کی روانگی کا قصد کیا اسی بندوبست کے واسطے پہلے راقم کو روانہ کیا اور تھوڑے دنوں کے بعد خود بھی روانہ ہوئے مگر چونکہ جبلت سے ضعیف القلب ہیں اور دریا کے سفر سے ان کو نہایت خوف و خطر تھا۔ کلکتے میں پہنچ کے رائے بدل گئی۔ اپنی عزیمت موقوف کی۔ ملکہ کشور اپنی والدہ اور مرزا حامد علی خاں بہادر ولی عہد اور مرزا جواد علی سکندر حشمت کو جو اپنے باپ کے وقت میں جنرل کہلاتے تھے ولایت کی روانگی کے واسطے تجویز کیا اور راقم کو سفیر مقرر کیا اور ملکہ معظمہ کے نام جو عریضہ لکھا تھا اس میں یہ لکھا کہ "میں نے اپنی والدہ اور بیٹے اور بھائی کو صرف حضور کی دربار داری کے واسطے روانہ کیا ہے اور مولوی محمد مسیح الدین خاں بہادر کو اپنا مختار اور وکیل استغاثہ پیش کرنے کے واسطے مقرر کیا ہے ان تینوں کو متعلق میرے مقدمے اور دعوے سے علاقہ نہیں ہے۔

قبل روانگی کے راقم نے بادشاہ کے حضور میں عرض کیا کہ جس امر کے واسطے قبلۂ عالم فدوی کو اور اپنے عزیزوں کو اس سفر دور و دراز میں بھیجتے ہیں بہت صعب امر ہے اور انجام اس کا موقوف نہایت صبر اور تحمل اور محنت اور مشقت اور مصارف کثیرہ پر ہے۔ اگر گھر کے نقدی قبول کر لینا منظور ہے تو ناحق اس امر کو آپ اختیار فرماتے ہیں مجھے حکم ہو راقم یہیں بہت اچھا بندوبست سلطان عالم کے واسطے کرا دے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ میں بھیک مانگوں گا اور دریوزہ گری کروں گا مگر زنہار ایک حبہ نقدی قبول نہیں کروں گا۔ غرض راقم مع سارے قافلے کے اٹھارہ جون ۱۸۵۶ء کو بنگال نام جہاز پر سوار ہوا۔

خاصہ دان میں جواہرات

پہلا فساد جو مرزا ولی عہد بہادر کے ہمراہیوں سے ہوا کہ بعضے رقوم جواہرات گراں بہا کے جو بادشاہ نے حضرت ملکہ معظمہ کی نذر کے واسطے ہمراہ کیے تھے وہ مرزا ولی عہد بہادر کے مفوض ہوئے تھے اور ایک خواجہ سرا حبشی ان کی طرف سے خزینہ دار تھا۔ جب بندر سویز میں جہاز کا لنگر ہوا چونکہ وہ بڑا بھاری جہاز گھاٹ تک نہیں جا سکتا تھا اس واسطے ایک اور چھوٹے جہاز پر سب مال و اسباب اتار کے گھاٹ پر لے جاتے تھے رستے میں ان خواجہ سرا صاحب نے جو خزینہ دار تھے، ظاہر کیا کہ وہ رقوم جواہرات گراں بہا جس کی قیمت واقعی مجھے معلوم نہیں تھی مگر میری تخمین میں دو تین لاکھ روپے سے زیادہ کے نہ تھے کم کا احتمال ہے۔ انھوں نے بڑے جہاز سے چھوٹے جہاز پر آنے کے وقت ان کو ایک خاصہ دان میں رکھ کے اپنے ایک خدمتگار کے سپرد کر دیا تھا جو ڈیڑھ دو روپے مہینے کا ان کے پاس نوکر تھا اس کے ہاتھ سے وہ خاصہ دان بحر زخار میں گر پڑا۔ اب اس قضیہ میں غور کرنا چاہیے اول تو وہ رقوم گراں بہا صندوق سے نکال کے خاصہ دان میں بدون کسی سے صلاح مشورہ کے رکھ لینا۔ بعد اس کے خواجہ سرا صاحب خود اس چھوٹے سے خاصہ دان کے بوجھ کے کاہے کو متحمل ہوتے۔ اپنے دو پیسے کے خدمتگار کو سپرد کر دیا اور اس کو بھی اپنی آنکھ کے سامنے نہ رکھا اجازت دی جہاز پر جہاں چاہے بیٹھے۔ غرض واقعی حقیقت اس معاملہ کی خدا کو معلوم ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ امر ابتدا سے بادشاہ کے ایک محل کے بندوبست کے بموجب ظہور میں آیا اور وہ خاصہ دان بجنسہ اس محل کے پاس داخل ہو گیا یا کلکتہ سے وہ مال گیا ہی نہ تھا۔

ملکہ کشور کا دربار

غرض لندن میں بادشاہ کے مقدمہ کا بہت عمدہ بندوبست ہوا۔ اول ملکہ کشور کا آٹھویں دن دربار مقرر کیا کہ ہر پنجشنبہ کو سینکڑوں بی بیاں تشریف لاتی تھیں اور مشرف ملاقات سے ہوتی تھیں۔ متوسلین سے لے کر اونچے طبقے تک کم انگلستان وغیرہ کی عورتوں میں کوئی باقی رہی ہوگی جو ان کی ملاقات کے واسطے نہیں آئی۔ خود ملکہ معظمہ کی خواہش ملاقات کی ہوئی اور ایک خوبصورتی سے ملکہ معظمہ سے ملاقات ہوئی۔ کہ جب سے انگلستان کی سلطنت قائم ہوئی ہے کبھی وہاں ایسا ظہور میں نہیں آیا تھا۔ یعنی زنانہ دربار ہوا کہ کوئی مرد وہاں نہ تھا اور دربار خاص میں صرف ملکہ کشور اور دونوں شہزادے اور راقم گئے۔ ملکہ کشور سے آ کر ملکہ معظمہ نے ہاتھ ملایا اور خود بیٹھیں اور محاذات میں ایک اسی نیچ کی کرسی پر ملکہ کشور بیٹھیں اور مرزا ولی عہد بہادر ایک پہلو میں ملکہ کشور کے اور ایک پہلو میں مرزا اسکندر حشمت کھڑے ہوئے اور پشت پر راقم کھڑا ہوا۔ اس وقت ملکہ کشور نے اپنے چہرہ سے برقع اٹھایا۔ میری پشت پر سر جارج کلارک کھڑے ہوئے اس واسطے کہ اس وقت تک میں بخوبی انگریزی میں گفتگو نہیں کر سکتا تھا۔ جب دونوں ملکہ آمنے سامنے بیٹھیں اس وقت راقم نے خریطہ بادشاہ کا گذرانا اس کو ملکہ معظمہ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بعد گفتگو ذوق و شوق ملکہ معظمہ نے ارشاد کیا کہ میرا بڑا بیٹا پرنس آف ویلز جو ولی عہد سلطنت برطانیہ اعظم ہیں چونکہ پندرہ سولہ برس عمر کے ہیں اس واسطے ان کو اجازت یہاں آنے کی نہیں ہوتی ہے اگر آپ اجازت دیں تو وہ بھی آ دیں۔ ملکہ کشور نے فرمایا: "آپ کا بیٹا میرا بیٹا ہے آپ بے تکلف ان کو بلا دیں۔"

بعد اس کے ملکہ معظمہ نے دونوں شہزادوں کو اور راقم کو حکم دیا کہ اس کے تیسرے دن ہم تینوں آدمی کھانے کی میز پر حاضر ہوں اور یہ ایما کی گئی کہ ہر تقریب میں جو ملکہ معظمہ کے یہاں ہوگی ہم تینوں شخصوں کی طلب ہوا کرے گی لیکن تقدیر نے مجاز نہ کیا یعنی دوسرے دن تار برقی بکلکتے سے خبر آئی کہ بادشاہ کو قلعے میں مقید کیا ہے وہ سارا بندوبست جو وہاں ہوا تھا سب ملتوی ہو گیا۔ جب بادشاہ کے مقید ہونے کی خبر وہاں پہنچی اور معلوم ہوا کہ ہندوستان میں نہایت زور اور شور سے غدر شروع ہو گیا ہے جو تدبیریں مقدمے کی درستی کی ہم نے کی تھیں وہ سب برہم ہو گئیں۔ پہلے تو ہندوستان کے غدر نے معاملہ خراب کیا پھر بادشاہ کی بے صبری نے سب بالکل ابتر کر دیا کہ وہ عہد نامہ جو پہلے آیا تھا قبول نہ کیا اور بغیر کسی عہد نامہ کے بارہ لاکھ روپیہ قبول کر لیے جو غالباً انھیں کی وفات تک باقی رہیں گے۔

ملکہ کشور کی وفات

ملکہ کشور کا عارضہ دائمی استحاضہ کا تھا اس میں زیادتی ہوئی وہ نہایت گھبرائیں۔ انھوں نے قصد مراجعت کا کیا۔ لندن سے پارس پہنچی تھیں کہ قضا کر گئیں۔ پارس میں وہاں کے شہنشاہ نے ایک قطعہ زمین کا سلطان روم کے سفیر کے اختیار میں چھوڑا ہے کہ جو شخص اہل اسلام میں سے ان کے ہمراہیوں میں قضا کر جائے وہ وہاں دفن ہو۔ مگر دستور کے موافق قیمت زمین کی داخل کرنا ضرور ہے اگر برس دو برس کے واسطے مول لیوے تو قیمت کم دینی پڑتی ہے بعد برس دو برس کے ہڈیاں مردوں کی نکال کے کسی غار میں ڈال دیتے ہیں اور اگر ہمیشہ کے واسطے زمین مول لیوے اور قبر پر حظیرہ وغیرہ بنا دے تو قیمت بہت دینی پڑتی ہے۔ پہلے تو اجازت روم کے سفیر سے لی گئی پھر وہاں دفن کیا گیا اس وقت تک اس احاطے میں کوئی مسلمان مدفون نہیں ہوا تھا۔ چار پانچ گز کا مربع ایک قطعہ زمین کا دس ہزار روپیہ کو خرید کیا صرف ایک سنگ مرمر کا چبوترہ وہاں بنایا گیا اس میں تین ہزار روپیہ خرچ ہوئے۔

دھوم دھام

لاش ملکہ کشور کی اس دھوم دھام سے اٹھائی گئی کہ اگر لکھنؤ میں ہوتیں تو اس عظمت و شوکت سے گمان نہیں ہے کہ اٹھتی۔ سلطان روم کے سفیر اور بادشاہ ایران کے سفیر اور بعضے وزرا فرانسیس کے اور بہت سے امرا وہاں موجود تھے۔

سینکڑوں گاڑیاں سواری کے ساتھ تھیں اور اس مہمان سرائے سے جہاں اقامت تھی مقابر تک قریب چار یا پانچ میل کا فاصلہ تھا، چنانچہ برابر اس رستے میں دو رویہ تماشائیوں کی ایک ٹھٹ تھی کہ اگر تھالی پھینکتے تو سروں سر جاتی۔

گول مضمون

شہنشاہ نے کسی کو اپنے وزراؤں میں سے تعزیت کے واسطے بھیجا اور پیغام دیا کہ دونوں شاہزادوں کو لے کے ان کے دربار میں راقم حاضر ہو۔ دوسرے دن راقم قصر سلطنت میں حاضر ہوا۔ ایک بڑے وزراؤں میں شہنشاہ کے تھے جن کو ہماری مملکت کی اصطلاح میں عرض بیگی کہنا چاہیے۔ ان کے پاس میں گیا۔ جہاں وہ بیٹھے تھے وہ ایک بہت بڑا دالان تھا بیچ میں ایک پردہ پڑا ہوا تھا۔ پردے کے اس طرف خود شہنشاہ بیٹھے تھے۔ ظاہر اس واسطے کہ جو کچھ گفتگو ہو وہ خود سنیں۔ راقم نے عرض کیا کہ ہمارے شہزادوں کو شہنشاہ کے حضور میں حاضر ہونا نہایت ان کا موجب فخر اور اعزاز کا ہے اور گویا وہ تقریب نہایت مسرت کی ہے ایسی مسرت کی تقریب میں اپنی اس حالت ماتم داری میں جس میں اللہ تعالیٰ نے ان کو مبتلا کیا ہے۔ شہنشاہ کے دربار میں حاضر ہونے کو خلاف ادب سمجھتے ہیں۔ امید یہ ہے اس عدم حضوری کو شہنشاہ معاف کریں۔ بعد اس کے راقم نے عرض کیا کہ ملکہ کشور کا اس سفر دور و دراز میں آکے شہنشاہ کے دار السلطنت میں قضا کرنا اس پر دلیل ہے کہ وہ مستغاثی اُن مظالم کی جو ان پر واقع ہوئے، خدا کی درگاہ میں شہنشاہ کے وسیلے سے ہوتی ہیں اس واسطے ہم لوگ امیدوار ہیں کہ شہنشاہ ہم لوگوں کی حق رسی کی اعانت فرمائیں مگر اعانت دوستانہ سلطنت برطانیہ اعظم کے ساتھ ہمیں مطلوب ہے مخاصمانہ اعانت کی درخواست نہیں ہے۔ بعد اس کے راقم نے انھیں وزیر سے کہا کہ میں اُمیدوار ہوں کہ اس کا جواب جو شہنشاہ دیویں اس سے مجھ کو اطلاع ہو۔ دوسرے یا تیسرے دن ایک خط حسب الحکم شہنشاہ کے انھوں نے مجھے لکھا اس کا عجب گول گول مضمون تھا کہ شہنشاہ کی دل سے خواہش ہے کہ سارے عالم کے اقوام اپنے حق کو پہنچیں۔ اگرچہ اعانت ہماری موقوف بہت بکھیڑوں پر ہے مگر شہنشاہ کو یقین واثق ہے کہ سلطنت برطانیہ کی خواہ مخواہ خود دادرسی کرے گی۔

سکندر حشمت

الغرض وہاں سے معاودت کر کے پھر لندن میں آگئے یہاں مرزا جواد علی سکندر حشمت بہادر نہایت مریض ہوئے اور پورے ایک مہینے کے بعد ملکہ کشور کے قضا کرنے سے، وہ بھی قضا کر گئے۔ ان کا عارضہ عجیب و غریب ہوا۔ ایک دنبل اُن کے مبرز پر نکلا تھا وہ ناسور ہو گیا تھا کبھی اس کا بہنا بند ہو جاتا تھا تو پھر دنبل ہو کے پکتا اور پھوٹتا تھا پھر جب بہنے لگتا تو تسکین ہو جاتی تھی اب کی دفعہ اس ناسور نے بڑا زور کیا کہ اس کے سبب سے تپ محرقہ ہوئی آخرش اسی عارضے میں قضا کر گئے۔ مرزا سکندر حشمت مزاج کے نہایت خلیق اور بامروت تھے لیکن مذہب تشیع میں ان کو بہت تعصب اور غلو تھا۔ چنانچہ کمال جہالت سے انھوں نے ایک طشت چاندی یا تانبے کا بنوایا تھا اس پر خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم اور بزرگان دین کے نام کندہ کروائے تھے اور وہ طشت ہمیشہ پاخانے کی چوکی میں لگا رہتا تھا۔ قطع نظر اس بے ادبی کے میرے زعم میں شیعہ مذہب میں بھی یہ بے ادبی اُن حروف سے جائز نہ ہوگی۔ بہرصورت میرے عقیدے میں اللہ تعالیٰ نے اسی بے ادبی کے انتقام کے واسطے ان کے مبرز پر ناسور پیدا کیا اور اسی عارضے میں قضا کر گئے تاکہ اوروں کو عبرت ہو۔ ان کی لاش کو راقم لندن سے پارس میں لے گیا اور ان کو بھی اسی دھوم دھام سے جو ملکہ کشور کی لاش اٹھانے میں ہوئی تھی، ماں کے پہلو میں دفن کیا۔

جعلسازی کا مقدمہ

میں اپنے مصارف ذاتی میں تنگ ہوا اور نوبت قرض لینے کی پہنچی اور اسی مجبوری سے میں جعلسازوں کے

ہاتھ میں پھنس گیا۔ ایک صاحب ہندوستان میں بڑی ناموری کے عہدے پر تھے اور لندن میں بڑے نامور لوگوں کی آمد و رفت ان کے یہاں تھی وہ بھی لوگوں کے یہاں آتے جاتے تھے جب میرا ارادہ ہوا کہ کچھ اپنا اسباب منقولہ رہن یا بیع کر کے کچھ روپیہ بہم پہنچاؤں، انھوں نے کہا: "استغفر اللہ اسباب کے رہن اور بیع کی کیا حاجت ہے جس قدر روپیہ مطلوب ہے ہم بے تکلف دے دیں گے چونکہ اس وقت مجھے پانچ ہزار مطلوب تھا پانچ قطعہ کاغذ اسٹام کے انھوں نے پیش کیے جن کو ان کی اصطلاح میں BILL OF EXCHANGE کہتے ہیں اس غرض سے کہ سو پونڈ کے واسطے ہزار ہزار روپیہ ہونے ایک ایک بل ہوگا۔ اس کو دستخط کر دیجیے ہم روپیہ ابھی لیے آتے ہیں۔ بالکل انھیں لوگوں کے اعتماد پر بھروسے کے ان پانچوں قطعہ اسٹام پر دستخط کر دیے۔ اس عرصے میں بادشاہ نے قریب ساٹھ ہزار روپے کے گورنر جنرل کی معرفت بھیجے جب یہ روپیہ آیا تو راقم نے ایک چٹھی ان کے نام لکھ کر اور بہت شکریہ ان کی محبت اور عنایت کا لکھ کے بھیجا کہ کل صبح ان کاغذات کے جو میں نے دستخط کیے تھے، آپ تشریف لائیے میں قرض کا روپیہ ادا کروں۔ انھوں نے کہا کہ وہ کاغذات تو حسب الرقم ہم نے تم سے لکھوا لیے تھے لیکن اس کی حفاظت کی نہیں رہی وہ گم ہو گئے ملتے نہیں تب فی الجملہ میرے دل میں کھٹکا پیدا ہوا میں نے اصرار ان کی واپسی پر کیا۔ انھوں نے کہا کہ تم گھبراتے کیوں ہو اگر کچھ تمھارے دل میں شبہ پیدا ہوا ہے تو ہم اسی طرح کے سادے کاغذ کو دستخط کر کے دے دیں اگر ہماری طرف سے کچھ بددیانتی ہو تو تم بھی جو چاہو ان کاغذات پر لکھ لیجیو۔ جب انھوں نے اسی طرح کے سادے کاغذ مجھ کو دستخط کر کے دیے میں نے وہ گیارہ ہزار روپیہ ادا کر دیا۔

معزولی

معلوم ہوا کہ بادشاہ نے پنشن قبول کرنے کی گورنر جنرل کو درخواست دے دی اس کا علاوہ اس کے عمل میری معزولی پر عہدۂ سفارت سے ہوا۔ حکم میری معزولی کا جاری ہوا اور ظاہراً گورنر جنرل کی اجازت سے اخباروں میں اشتہار دیا گیا کہ فلاں شخص عہدۂ سفارت سے معزول ہوا کوئی اس کی درخواست اور اس کا دعویٰ بادشاہ کی طرف سے کسی محکمے میں لائق پذیرائی نہیں ہوگا۔ اب راقم آمادہ مراجعت کا ہوا تب معلوم ہوا کہ ہمارے احباب نے ان پانچ قطعہ اسٹام میں جعل کیا ہے ایک قطعہ پر چھ ہزار پانچ سو پونڈ کا ایک BILL OF EXCHANGE بنا کے ایک شخص سے روپیہ لے لیا جس کا ۶۵ ہزار روپیہ ہوا اس شخص نے فوراً عدالت میں استغاثہ اس کا میرے اوپر پیش کر دیا اور چار قطعہ پر ہزار ہزار پونڈ یعنی دس دس ہزار روپیہ کا بل آف ایکسچینج بنایا، مفصل کہانی لکھنا دردِ سر ہے۔ خلاصہ یہ کہ سب استغاثوں کی جواب دہی کے سبب میں پانچ چھ برس گویا وہاں مقید ہو گیا۔

پہلا مقدمہ جعل کا جب ڈسمس ہو گیا تو میں نے ارادہ کیا کہ فوراً لندن سے میں ہندوستان کی طرف معاودت کروں اس واسطے ہندوستان کے وزیر کے پاس میں نے ایک درخواست گزرانی کہ میں یہاں قرض دار ہو گیا ہوں اگر پندرہ ہزار روپیہ نقد مجھے عطا ہوں اور جہاز کی سواری کا اجازت نامہ ملے تو میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔ ہندوستان میں پہنچ کے یہ رقم مع جہاز کے کرایے کے بادشاہ سے دلوا دوں گا۔ اگر بادشاہ نہ دیں گے تو میں اپنے پاس سے ادا کروں گا۔ اس جواب میں ایک خط آیا کہ پندرہ ہزار روپیہ تمھارے قرض کے ادا کے واسطے دیا جائے گا اور جہاز کا اجازت نامہ بھی ملے گا اور ہندوستان میں تم سے مواخذہ اس کا نہیں ہوگا مگر اس شرط پر کہ جعل کے مقدمہ کی جو مدعی نے تجویز ثانی کی درخواست کی ہے جب وہ مقدمہ بالکل ختم ہو جائے تب تم یہاں سے روانہ ہو۔ اس کے جواب میں راقم نے لکھا کہ مجھ کو یہاں توقف کرنے میں کچھ عذر نہیں ہے لیکن بادشاہ نے میری اعانت سے ہاتھ کھینچا ہے میری یہاں بسر کس طرح

ہوگی۔ اس کے جواب میں دس پونڈ فی ہفتہ میرے خرچ کے واسطے معین ہوئے جس کے چار سو روپیہ مہینہ سے کچھ زیادہ ہوا۔

تباہی در تباہی

وہاں کے حکام نے یہ تجویز کیا کہ مقدمہ میں جعل اور فریب خواہ مخواہ ہے مگر مدعی اس سے آگاہ نہ تھا اس واسطے مجھ پر لازم ہے کہ مدعی کا روپیہ ادا کروں اس فیصلے کے بعد وزیر ہندوستان نے وظیفہ میری اعانت سے ہاتھ کھینچ لیا ہر چند میں نے شور و شغب کیا کہ صرف تمہارے روکنے سے میں یہاں ٹھہرا۔ اگر اس مقدمے کا فیصلہ ہونے کے بعد میں یہاں سے چلا جاتا تو کوئی میرا دامن گیر نہ تھا مگر کسی نے کچھ نہ سنا۔ دوسری مصیبت یہ ہوئی کہ تیس چالیس ہزار روپے کا میرا اسباب چوری ہو گیا چور پکڑے گئے ایک مدت تک اس کے کچہری میں راقم رہا۔ ان کو سات سات برس کی قید ہوئی۔ مگر دو چار چیزوں کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا تیسری مصیبت یہ کہ کچھ حصے ہندوستان کی ریلوے کے قریب ساٹھ ستر ہزار روپیہ کے مدت سے میرے قبضے میں تھے اس کے منافع پانچ روپیہ سیکڑہ کے جو تھے وہ کلکتے میں اپنے اہل و عیال کے مصارف کے واسطے آمادہ دیتے تھے وکلا کو اس سے اطلاع ہو گئی اور وزیر ہندوستان نے خلف وعدگی کر کے میری اعانت سے دست برداری کی وکلا نے وہ سب حصے بکوا کے تصرف کر لیا۔

ہندوستان میں غدر کے ایام میں جو غداروں نے چھوڑا۔ وہ سرکاری فوج نے لوٹ لیا کچھ مکانات میرے اکبرآباد میں تھے وہ وہاں کے حکام نے نیلام کر ڈالے اب میں مفلس بحت ہو گیا نوبت فاقہ کشی کے قریب پہنچی۔

سرکار کو رسوا کیا

جب میں نے بہت شور و شغب مچایا تب ایک بڑے افسر نے مجھ سے فرمایا کہ تم نے حتی المقدور سرکار کی بدنامی میں کچھ قصور نہیں کیا بادشاہ کے مقدمے میں کتابیں چھاپ چھاپ کر سارے عالم میں سرکار کو رسوا کیا اب سرکار سے کس منہ سے اُمید اپنی رفاہ کی رکھتے ہو۔ اس کے ساتھ اب یہ بھی مجھے یقین ہو گیا کہ ارباب اقتدار یہی نہیں چاہتے کہ میں ہندوستان میں جاؤں اس گمان سے کہ شاید پھر بادشاہ کو آمادہ پارلیمنٹ میں استغاثے کا کروں۔ جب وزیر ہندوستان سے درخواست کی کہ اب میری نوبت فاقہ کشی کی آئی میری رہائی کروا دیجئے وہاں سے یہ جواب ہوا کہ وہ مدعی جس کی میرے اوپر ڈگری ہوئی ہے اس کی تحریری اجازت داخل کرو تب قرض بھی میرا ادا کیا جائے گا اور جہاز کی سواری کی بھی اجازت دی جائے گی۔

کپڑے پھاڑے گھر کو آئے

راقم نے مدعی سے درخواست کی کہ تم اپنی ڈگری میرے اوپر جاری کراؤ تو مجھے کچھ چارہ نہیں ہوگا بجز اس کے کہ انسالونسی (دیوالہ) کی درخواست گذرانوں اور اگر جاری کروانا ڈگری کا منظور نہیں ہے تو اجازت تحریری مجھے دو۔ اس نے کہا نہ بالفعل مجھے تمہارے اوپر ڈگری جاری کرانا منظور ہے اور نہ میں تحریری اجازت دوں گا اور اگر تم چلے جاؤ گے تو میں تمہیں نہیں روکوں گا۔

اب راقم نے اپنے وکلا سے کہا کہ ہزاروں روپیہ تم میرا کھا چکے ہو کچھ ایسا سامان کر دو کہ میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔ بہزار دشواری قریب ایک ہزار روپے کے انھوں نے تدبیر کی۔ اس سے راقم نے ایک فرانسیسی کمپنی سے بندوبست کیا جس کے ذریعے نومبر ۱۸۶۳ء میں راقم لندن سے روانہ ہوا چار دن ریل کا خشکی میں سفر ہوا اور سات دن دریا میں پارس اور مارسیلس کے راستے سے گیارھویں دن بلدہ اسکندریہ میں پہنچا۔ ارادہ تھا کہ مکہ معظمہ کے سفر میں جاؤں۔ بہ نیت صادق بارگاہ الٰہی کی طرف متوجہ ہو کر دعا کی اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو ذریعہ گردانا اور عرض کیا کہ میں نے اب اپنے تئیں خدا اور رسول کی حمایت میں سپرد کیا۔ جس طرح ہو مجھ کو بیت اللہ اور مدینۃ النبی پہنچائے

کچھ شبہ نہیں کہ اس روسیاہ کی دُعا تیر بہدف ہوئی اور خدا اور رسول نے ایسی مہمانی کی کہ باوصف اس افلاس کے مثل امرا کے دو حج کروائے اور چھ مہینے اقامت مدینۃ النبی میں میسر ہوئی۔

سامان لُٹ گیا!

اتفاق سے میں مارسلز میں جہاز پر اس وقت پہنچا جب اس کا لنگر اُٹھتا تھا متعینین نے جھٹ پٹ صندوق اُٹھا کے مخزن میں پھینک دیا اس پر نشان لکھنے کی نوبت نہ آئی کہ یہ صندوق اسکندریہ میں اتریں گے۔ اس جہاز پر چین کے مسافر بہت تھے جب لنگر ہوا میں منتظر رہا کہ میرے صندوق خزانے سے نکلیں تو پہچان کے میں لے لوں۔ لوگوں نے کہا گھاٹ پر چلو وہیں اسباب آتا ہے وہاں لے لیجیو۔ گھاٹ پر پہنچا تو شام ہو گئی وہاں لوگوں نے کہا اب اندھیرے میں اسباب نہیں مل سکتا۔ اس وقت کہیں جا کے اقامت کرو۔ صبح کو آکے اسباب لے جانا میں تو شہر میں چلا آیا اور وہاں اسباب رات ہی کو چین کے مسافروں کے ساتھ ریل پر لد گیا صبح کو پھر گھاٹ پر پہنچا، اسباب ڈھونڈھا کہیں نہ ملا۔ جہاز کی کمپنی کے مہتمم جو اسکندریہ میں تھے ان کے پاس جا کے ظاہر کیا۔ انھوں نے اسی وقت قاہرہ میں اور سویز میں ٹیلی گراف کے ذریعے خبر بھیجی کہ اس اس طرح کے صندوق فلانے مسافر کا اسباب ہے وہ آگے نہ بڑھنے۔ مجھ سے کہا تم قاہرہ جاؤ وہاں تم کو اسباب ملے گا۔ راقم قاہرہ میں آیا اور وہ اسباب سویز میں بھی نہ رکا۔ جہاز پر لد کے چین کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب میرے پاس وہی کپڑے جو بدن پر تھے رہ گئے۔ شب کو راقم ایک فرنگی مہمان سرا میں جا کے رہا تین چار اشرفی انگریزی جو بٹوہ میں میرے پاس تھیں وہ کسی نے چرا لیں۔ اب میرے پاس ایک حبّہ نہ رہا جو روزمرہ کے خرچ کو کافی ہو۔

میرا اسباب چھ مہینے کے بعد سیلان یعنی سراندیب میں پہنچ کے وہاں سے پھر کے آیا۔ تین چار روپیہ میرے پاس باقی تھے۔ مجبوری سے ایک بڑے تعلقدار علی گڑھ کے ان جو مہاجر ہو کے رہتے ہیں ان کے پاس میں گیا کہ ان سے کچھ قرض مانگوں گا مگر حمیت مقتضی طلب کی نہ ہوا اور ذہن میں یوں گذرا کہ مفلسانہ پیادہ پا چل کے حج کرو کسی سے کچھ طلب نہ کرو۔ یہ دل میں تصور کر کے اٹھ کھڑا ہوا اسی وقت ایک شخص نے آکے خبر دی کہ مولوی محمد یعقوب صاحب مغفور کے پاس ایک ہزار روپیہ کی ہنڈوی میرے گھر سے میرے مصارف کے واسطے آئی ہے۔ مولوی صاحب حضرت شاہ عبدالعزیز کے نواسے مولوی اسحاق صاحب مرحوم کے چھوٹے بھائی وہاں مہاجر ہو کے جا رہے تھے راقم جا کے انھیں کے گھر میں فروکش ہوا تھا۔

ایک شب کو ایک بزرگ کے دفن کرنے کے واسطے جنت المعلیٰ میں اتفاق جانے کا ہوا چونکہ وہاں لاشوں کو بہت اتھلا غار کھود کے دبا دیتے ہیں ہزاروں لاشیں گویا زمین پر رکھی ہوئی تھیں۔ شدت تعفن سے میری عجیب کیفیت ہو گئی کہ معاودت دشوار ہوئی۔ غش کی صورت پر مکان میں پہنچ کے گر پڑا۔ عشا کی نماز کے واسطے حرم میں جانے کی نوبت نہ آئی۔

ربیع الاول سنہ ۱۲۹۲ھ کے شروع میں جہاز نے جدّہ سے لنگر اٹھایا اور پچیس روز میں بمبئی میں داخل ہوا۔ چوتھی شعبان سنہ ۱۲۹۲ھ مطابق ۲۴ دسمبر سنہ ۱۸۷۵ء دہلی میں داخل ہوا۔

گلبدن بیگم

جب حضرت فردوس مکانی (بابر) اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف سدھارے اس وقت مجھ ناچیز کی عمر آٹھ سال کی تھی۔ اس لیے آپ کے عہد کی کچھ زیادہ باتیں تو مجھے یاد نہیں، مگر جتنا بھی یاد ہے اور جو کچھ سُنا ہے وہ بموجب فرمانِ شاہی لکھے دیتی ہوں بادشاہی کرنے میں جتنی تکلیفیں اور شدید خطرے ہمارے حضرت بادشاہ (بابر) کو پیش آئے اتنے شاید ہی کسی کو پیش آئے ہوں اور جنگ کے میدانوں اور خطروں میں جیسا تحمل اور مردانگی اور دلیری آپ نے دکھائی اس کی مثال کسی بادشاہ کے ذکر میں بمشکل ملے گی۔ کابل کی فتح خدائے تعالےٰ نے آپ کے لیے بہت مبارک کی، کیونکہ اس کے بعد آپ کے ہاں اٹھارہ بچے پیدا ہوئے۔

اوّل آکم یعنی ماہم بیگم سے حضرت ہمایوں بادشاہ، باربول میرزا، مہرجہاں بیگم، ایشاں دولت بیگم اور فاروق میرزا۔

معصومہ سلطان بیگم دختر سلطان احمد میرزا کے ہاں ایک لڑکی ہوئی جس کی پیدائش کے وقت آپ فوت ہوگئیں۔ لڑکی کا نام ماں کے نام پر رکھ دیا گیا۔

گلرخ بیگم سے کامران میرزا، عسکری میرزا، شاہرخ میرزا، سلطان احمد میرزا اور گلعذار بیگم۔

دلدار بیگم سے گلرنگ بیگم، گلچہرہ بیگم، ہندال میرزا، گلبدن بیگم اور آلور میرزا۔ غرض کابل بہت نیک فال سمجھتے تھے کیونکہ سب بچے وہیں پیدا ہوئے۔ سوائے دو لڑکیوں کے جن کی پیدائش خوست میں ہوئی۔ مہرجہاں بیگم، ماہم بیگم سے اور گلرنگ بیگم دلدار بیگم سے

حضرت فردوس مکانی کے سب سے بڑے بیٹے ہمایوں بادشاہ کی پیدائش مبارک سہ شنبہ کی رات ۴۔ ذیقعدہ ۹۱۳ھ کو کابل کے قلعے میں ہوئی۔ اس وقت آفتاب برج حوت میں تھا۔ پیدائش کی تاریخ "سلطان ہمایوں خاں" ہوئی۔ ایک اور تاریخ "شاہ فیروز قدر" ہوئی۔ ۸۔ ماہ رجب ۹۳۲ھ جمعہ کے روز پانی پت کے مقام پر سلطان ابراہیم بن سلطان سکندر بن سلطان بہلول لودھی سے سامنا ہوا، عنایتِ الٰہی سے آپ اس پر غالب آئے۔ خواجہ کلاں بیگ نے کئی دفعہ کابل واپس جانے کی اجازت چاہی اور عذر کیا کہ ہندوستان کی آب و ہوا میرے مزاج کے موافق نہیں اگر اجازت ہو تو کچھ عرصہ کابل میں رہوں۔ مگر حضرت بادشاہ خواجہ سے جدا ہونا ہرگز پسند نہ کرتے تھے۔ آخر جب آپ نے دیکھا کہ خواجہ بہت ہی مصر ہیں تو اجازت دے دی اور کہا کہ جب جاؤ تو ہندوستان کے تحفے اور نادر چیزیں جو سلطان ابراہیم پر فتح حاصل کرکے ہمارے ہاتھ آئی ہیں وہ اپنے ساتھ لیتے جانا اور انھیں بزرگ بیگمات اور ہماری بہنوں اور گھر کی عورتوں کو دے دینا۔ ہم تمھیں ایک فہرست بنا دیں گے اس کے مطابق تقسیم کر دینا اور کہنا کہ دیوان خانے کے باغ میں سب بیگمات کے لیے جدا جدا خیمے اور سراپردے نصب کیے جائیں اور جب مجمع خوب پُر رونق ہو جائے تو سب خدا کے حضور میں سجدۂ شکر بجا لائیں کہ ایسی مکمل فتح

نصیب ہوئی اور ہر ایک بیگم کو اس تفصیل سے تحفے دینا: ایک رقاصہ لونڈی سلطان ابراہیم کی لونڈیوں میں سے، اس کے ساتھ ایک سونے کی رکابی جو جواہر اور لعل اور مروارید اور یاقوت، الماس، زمرد، فیروزہ، زبرجد اور عین الہر سے پُر ہو اور دو چھوٹے صدفی خوان اشرفیوں سے پُر، اور دو خوان شاہرخی کے، اور ان کے علاوہ ہر قسم کے کپڑے جن میں سے ہر ایک کی تعداد نو ہو، اس طرح (ہر بیگم کے حصے کے) چار خوان اور ایک رکابی ہوئی۔ اور میری ہدایت کے بموجب ایک رقاصہ لونڈی اور ایک رکابی جواہرات کی، ایک اشرفی کی اور ایک شاہرخی کی بزرگ بیگمات کو پیش کرنا اور ہر ایک کو وہی جواہرات کی رکابی اور وہی لونڈی دینا جو میں نے اس کے لیے تجویز کی ہے۔ اس کے علاوہ اور تحفے بھی ہوں گے، انھیں بعد میں پیش کرنا۔ غرض میری بہنوں اور بچوں کو اور گھر کی عورتوں اور رشتہ داروں اور بیگمات کو اور گھر کی منگو عورتوں اور اناؤں اور ان کے بچوں کو اور ان سب کو جو میرے دعاگو ہیں، الگ الگ جواہر اور اشرفیاں اور شاہرخی اور کپڑے دیے جائیں۔ چنانچہ اسی تفصیل سے دیے گئے۔ تین دن تک باغ اور دیوان خانہ میں سب جمع ہو کر خوشی مناتے رہے اور فخر کرتے رہے۔ حضرت بادشاہ کی سلامتی اور اقبال کے لیے سب نے دعا مانگی اور خوشی سے شکر کے سجدے بجا لائے۔

پندرہ سیر کی اشرفی

بادشاہ نے خواجہ کلاں کے ہاتھ عسس کے لیے ایک بڑی سی اشرفی بھیجی تھی جو وزن میں تین بادشاہی سیر یعنی پندرہ ہندستانی سیر کے برابر تھی۔ آپ نے خواجہ سے کہہ دیا تھا کہ اگر عسس تم سے پوچھے کہ بادشاہ نے میرے لیے کیا بھیجا ہے تو کہہ دینا کہ ایک اشرفی بھیجی ہے اور واقعی ایک ہی اشرفی تھی۔ عسس نے اس پر تعجب کیا اور تین دن تک اس بات پر اپنے دل میں کڑھتا رہا۔ بادشاہ نے فرمایا تھا کہ اشرفی میں سوراخ کر کے اس میں ڈوری ڈالی جائے اور عسس کی آنکھیں بند کر کے اشرفی اس کے گلے میں لٹکا دی جائے اور اسے گھر کے اندر بھیج دیا جائے۔ جونہی کہ اشرفی عسس کے گلے میں ڈالی گئی تو اس کے بوجھ سے وہ بہت گھبرایا مگر دل میں بہت خوش ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی اشرفی کو تھام لیا اور خوش ہو کر کہتا تھا دیکھو میری اشرفی کو کوئی نہ لے۔ بیگمات میں سے ہر ایک نے اسے دس بارہ اشرفیاں دیں، اس طرح ستر اسی اشرفیاں اس کے پاس اور جمع ہو گئیں۔

جمادی الاول ۹۳۲ھ کو کوہ سیکری کے دامن میں، جس کے اوپر اب پورا فتح پور آباد ہے، رانا سانگا کے خلاف سخت جنگ آراستہ کی اور خدا کی عنایت سے اس پر فتح حاصل کر کے غازی بنے۔ ایک سال بعد آکام یعنی ماہم بیگم کابل سے ہندستان آئیں اور یہ ناچیز (گلبدن بیگم) بھی ان کے ساتھ اپنی اور بہنوں سے پہلے ہندستان پہنچی اور حضرت بادشاہ کے حضور میں باریاب ہوئی۔

کول سے آگرے تک آکام کی سواری کے ساتھ نو سوار تھے اور اٹھارہ تانگھن گھوڑے، اور دو تانگھن پالکیاں جو بادشاہ بابام نے بھیجی تھیں اور ایک پالکی جو آپ کے ساتھ کابل سے آئی تھی اور آپ کے جلو میں ایک سو مغلانیاں تھیں جو بہت عمدہ گھوڑوں پر سوار اور خوب آراستہ پیراستہ تھیں۔

بادشاہ بابام کے وزیر اپنی بیوی سلطانم کے ساتھ نوگرام تک استقبال کے لیے آئے تھے۔ میں پالکی میں تھی اور میری ماؤں

نے مجھے باغیچے میں اتارا اور وہیں ایک چھوٹا سا قالین بچھا کر مجھے اس پر بٹھا دیا اور مجھے یہ سکھایا کہ جب بادشاہ کے وزیر صاحب آئیں تو تم کھڑے ہو کر ان سے ملنا۔ جب وہ آئے تو میں کھڑے ہو کر ان سے ملی۔ اتنے میں ان کی بیوی سلطانم بھی آ گئیں۔ میں انجانے میں ان کی تعظیم کے لیے بھی کھڑا ہونا چاہتی تھی مگر وزیر صاحب نے اعتراض کیا اور کہا یہ تو تمھاری پرانی بڑھیا ماما ہے اس کے لیے کھڑے ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ تمھارے والد نے اس بوڑھے غلام کی بہت عزت افزائی کی کہ اس کے بارے میں یہ حکم دیا کہ اس سے کھڑے ہو کر ملو۔ ان کے لیے سب کچھ روا ہے مگر بندوں کی کیا مجال ہے کہ ایسی گستاخی کریں۔

وزیر کے گھر دعوت

وزیر صاحب نے پانچ ہزار شاہ رخی اور پانچ گھوڑے مجھے پیش کیے جو میں نے قبول کئے اور ان کی بیوی سلطانم نے تین ہزار شاہ رخی اور تین گھوڑے پیش کئے اور کہا کھانا تیار ہے اگر تناول فرمائیں تو بندوں کی عزت افزائی ہو گی۔ میں نے ان کی دعوت قبول کی۔ ایک اچھی سی جگہ پر ایک تخت بچھایا گیا اور اس پر ایک سرخ ریشمی چادر کا فرش کیا گیا جس کا حاشیہ گجراتی زربفت کا تھا اور سرخ ریشم اور زربفت کے چھ شامیانے کھڑے کیے گئے جن میں ہر ایک کا اپنا جدا رنگ تھا اور سراپردہ کے چاروں طرف کپڑا سقرلات تھا اور سراپردہ کی چوبیں رنگ برنگ تھیں۔

میں وزیر صاحب کے پاس بیٹھی۔ کھانے میں تقریباً پچاس بھنی ہوئی بھیڑیں اور نان اور شربت اور بہت سے پھل تھے۔ کھانے کے بعد میں اپنی پالکی میں بیٹھ کر بادشاہ بابام کے حضور میں گئی اور آداب بجا لائی۔ میں آپ کے قدموں میں گر پڑی۔ آپ بہت خاطر سے پیش آئے اور کچھ دیر تک مجھے اپنی گود میں بٹھایا۔ اس وقت مجھے ایسی خوشی ہوئی کہ اس سے بڑھ کر خوشی نہیں ہو سکتی۔

میں آگرے سے آئے تین مہینے گذرے تھے کہ حضرت بادشاہ دھول پور روانہ ہو گئے۔ حضرت ماہم بیگم اور میں ناچیز بھی آپ کے ساتھ دھول پور کی سیر کو گئے۔ دھول پور میں آپ نے ایک پتھر کے ٹکڑے سے دہ در دہ حوض بنوایا تھا۔ وہاں سے ہم سیکری گئے۔ وہاں تالاب کے بیچ میں آپ نے ایک بارہ دری بنوائی تھی۔ جب وہ بن کر تیار ہو گئی تو آپ کشتی میں بیٹھ کر جاتے تھے اور سیر کرتے تھے اور بارہ دری کے اندر بیٹھتے تھے۔ یہ بارہ دری اب تک موجود ہے۔ سیکری کے باغ میں آپ نے ایک چوکنڈی بنوائی تھی اور اس چوکنڈی میں ایک تورخانہ بنوایا تھا جہاں بیٹھ کر آپ اپنی کتاب لکھا کرتے تھے۔

میں اور افغانی آغاچہ بیچ کی منزل کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور آکام نماز پڑھنے چلی گئی تھیں۔ میں نے افغانی آغاچہ سے کہا کہ ذرا میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچو۔ افغانی آغاچہ نے میرا ہاتھ ایسے زور سے کھینچا کہ میرا پہنچا اتر گیا۔ میں تکلیف سے رونے لگی۔ آخر کمال جراح کو بلایا گیا۔ اس نے میرا ہاتھ باندھا۔ پھر بادشاہ آگرے کی طرف روانہ ہوئے۔

ہمایوں کی بیماری

اسی اثنا میں مولانا محمد فرغلی کی عرض داشت دہلی سے آئی کہ ہمایوں میرزا بیمار ہیں اور ان کا عجیب حال ہے۔ یہ سن کر حضرت آکام بہت پریشان ہوئیں اور دہلی کا رستہ لیا۔ متھرا میں ہمایوں میرزا سے جا ملیں۔ جب اپنی آنکھ سے انہیں دیکھا تو جتنا سنا تھا اس سے دس گنا زیادہ کمزور

اور بیمار پایا۔ وہاں سے دونوں ماں بیٹے آگرے کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب وہ آگرہ پہنچے تو یہ حقیر اپنی بہنوں کے ساتھ حضرت ہمایوں کے حضور میں گئی۔ اس وقت آپ کا ضعف بڑھتا جاتا تھا۔ جب کبھی ہوش میں آتے تو کہتے تھے "میری بہنوں خوش آمدید۔ آؤ ایک دوسرے سے گلے ملیں۔ میں اب تک تم سے گلے نہیں ملا۔ جب حضرت بادشاہ نے آکر آپ کو گلے سے لگایا تو ان کے چہرے پر کلفت کے آثار ظاہر ہوتے اور ہمایوں بادشاہ بھی زیادہ گھبراہٹ اور اضطراب کرنے لگے۔

اس اثنا میں حضرت آکام نے کہا کہ آپ میرے بیٹے سے غافل ہیں۔ آپ بادشاہ ہیں آپ کو کیا فکر ہے آپ کے اور بھی بیٹے ہیں۔ فکر تو مجھے ہے کہ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ حضرت بادشاہ نے جواب دیا "ماہم اگرچہ میرے اور بیٹے بھی ہیں مگر تیرے ہمایوں کے برابر مجھے کوئی عزیز نہیں کیونکہ میں سلطنت اور بادشاہی اور یہ روشن دنیا ہمایوں کے لیے چاہتا ہوں۔"

ہمایوں میرزا کی بیماری کے دوران میں حضرت بادشاہ نے روزہ حضرت مرتضےٰ علی کرم اللہ وجہہ شروع کیا۔ یہ روزہ چہار شنبہ سے کیا جاتا ہے مگر آپ نے گھبراہٹ میں سہ شنبہ سے شروع کر دیا۔ ان دنوں میں ہوا بہت گرم تھی۔ آپ کا دل اور جگر گرمی سے خشک ہو گیا۔ آپ نے خدا سے دعا مانگی کہ "اے خدا اگر جان کا عوض جان ہو سکتی ہے تو میں یعنی بابر اپنی جان ہمایوں کو دیتا ہوں۔" اسی دن سے حضرت فردوس مکانی بیمار ہو گئے اور ہمایوں بادشاہ غسل کر کے باہر آئے اور دربار کیا۔

آپ تقریباً دو تین مہینے بیمار رہے۔ اس اثنا میں میرزا ہمایوں کالنجر چلے گئے۔ جب آپ کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو آپ نے ہمایوں بادشاہ کو بلانے کے لیے ایک قاصد بھیجا وہ جلدی جلدی سفر کرتے ہوئے آئے۔ جب بادشاہ کے حضور پہنچے تو دیکھا کہ آپ بہت ہی کمزور ہو گئے ہیں۔ حضرت ہمایوں بادشاہ پر رقت طاری ہو گئی اور اضطراب کا اظہار کرنے لگے۔

حضرت بادشاہ بابام ہر گھڑی یہ پوچھتے تھے کہ "ہندال کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے؟ ہندال میرزا اب کتنا بڑا ہو گیا ہے اور اس کی شکل کس جیسی ہے؟" میر بردی بیگ میرزا کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس نے دکھایا کہ یہ شہزادہ کا لباس ہے جو انھوں نے بندہ کو عنایت کیا ہے۔ آپ نے قریب بلایا اور کہا دیکھیں ہندال کا قد و قامت اب کتنا ہو گیا ہے۔" ہر ساعت آپ یہی کہتے تھے کہ ہزار افسوس ہندال کو نہیں دیکھا اور جو کوئی سامنے آتا تھا اس سے پوچھتے تھے کہ ہندال کب آئے گا؟

اس اثنا میں آپ کے پیٹ کی تکلیف اور بڑھ گئی۔ آنحضرت کی نبض دیکھ کر طبیبوں نے عرض کی کہ اسی زہر کی علامات موجود ہیں جو سلطان ابراہیم کی والدہ نے دیا تھا۔

بابر کی وفات

دوسرے دن آپ نے سب امرا کو بلا کر فرمایا "مدت سے یہ بات میرے دل میں تھی کہ اپنی بادشاہی ہمایوں میرزا کے سپرد کروں اور خود باغ زر افشاں میں گوشہ نشین ہو جاؤں۔ خدا کی مہربانی سے سب نعمتیں میسر ہوئیں مگر یہ نہ ہوا کہ تندرستی کی حالت میں یہ کرتا۔ اب جب میں بیماری سے لاچار ہو گیا ہوں تو میں یہ وصیت کرتا ہوں کہ سب لوگ ہمایوں کو میری جگہ تصور کریں اور اس کی وفاداری میں کوتاہی نہ کریں۔ ہمایوں میں تجھے اور تیرے بھائیوں کو اور اپنے عزیزوں کو، اپنے آدمیوں کو اور تیرے آدمیوں کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔

یہ سن کر سب لوگ رونے لگے اور آپ کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ تین دن کے بعد آپ اس عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف سدھارے۔ یہ واقعہ ۵ ماہ جمادی الاوّل روز دوشنبہ، ۹۳۷ھ میں ہوا۔

ہمایوں کی تخت نشینی

آپ کا واقعہ پوشیدہ رکھا گیا۔ آخر آرائش خاں نے جو ہندی امرا میں سے تھا عرض کی کہ اس بات کو چھپائے رکھنا اچھا نہیں ہندوستان میں یہ عام بات ہے کہ جب کسی بادشاہ کا انتقال ہوتا ہے تو بازاری لوگ لوٹ مار شروع کر دیتے ہیں۔ اس کا اندیشہ ہے کہ کہیں بے خبری میں مغل مکانوں اور حویلیوں میں گھس کر لوٹ مچائیں۔ مناسب یہ ہے کہ ایک آدمی کو سرخ کپڑے پہنا کر ہاتھی پر سوار کریں اور وہ یہ منادی کر دے کہ حضرت بابر بادشاہ نے درویشی اختیار کر لی ہے اور اپنی بادشاہی ہمایوں بادشاہ کو دے دی ہے۔ حضرت ہمایوں بادشاہ نے کہا اسی طرح کرو۔ اس مہینے کی نو تاریخ کو آپ تخت شاہی پر بیٹھے۔

اسی دن میرزا ہندال کابل سے آکر حضرت ہمایوں بادشاہ کی خدمت میں باریاب ہوئے۔ ان پر آپ نے بہت سی عنایتیں کیں اور بہت خوش ہوئے جو خزانہ ورثے میں ملا تھا۔ اس میں سے بہت سا میرزا ہندال کو عنایت فرمایا۔

جب تک آکام زندہ رہیں ان کے دولت خانے میں آکر حضرت بادشاہ کو دیکھتی تھیں۔ آکام کی وفات کے بعد حضرت ہمایوں بادشاہ اس شکستہ دل کی اس قدر عنایت سے خاطر جوئی کرتے تھے اور اس بے چاری سے اتنی شفقت برتتے کہ میں اپنی یتیمی اور لاوارثی بھول گئی۔

یونہی دھوکا تھا

آکام یعنی ماہم بیگم کی یہ بہت تمنا اور آرزو تھی کہ ہمایوں کے بچے کو دیکھیں۔ جہاں کہیں کوئی صاحب حسن و جمال لڑکی دیکھتی تھیں اسے حضرت بادشاہ کی خدمت میں لے آتی تھیں۔ خدنگ یساول کی بیٹی میوہ جان میرے پاس نوکر تھی۔ حضرت فردوس مکانی کی وفات کے بعد ایک دن آکام نے فرمایا "ہمایوں میوہ جان بری نہیں۔ اپنی خدمت میں اس کو کیوں نہیں لے لیتے؟" آخر ان کے کہنے سے ہمایوں بادشاہ نے اسی رات میوہ جان سے نکاح کر لیا۔ تین دن بعد بیگہ بیگم کابل سے آئیں آپ کے ہاں امید ہوئی۔ میوہ جان نے آکام سے کہا "میرے ہاں بھی امید ہے" غرض آکام نے دو قسم کا سامان تیار کیا اور کہا کہ تم میں سے جس کے ہاں لڑکا ہوگا زیادہ اچھا سامان میں اس کو دوں گی۔ اس انتظار میں بیگہ بیگم کے ہاں عقیقہ بیگم ہوئی۔ اب آپ کی نظر میوہ جان کی طرف لگی ہوئی تھی مگر دس مہینے گزر گئے اور گیارھواں مہینہ بھی ختم ہونے کو آیا۔ میوہ جان نے کہا کہ میری خالہ الغ بیگ کے حرم میں تھیں ان کے ہاں بارہ مہینے میں لڑکا پیدا ہوا تھا شاید میں بھی انہی کی طرح ہوں۔ تکیے سیے گئے، توشکیں بھری گئیں۔ آخر معلوم ہوا کہ یونہی دھوکا تھا۔

ماہ شوال میں آکام تشویش شکم میں مبتلا ہوئیں اور اسی مہینے کی تیرہ تاریخ کو ۹۴۰ھ میں چل بسیں۔ حضرت بابم کے ہجر کا داغ ابھی تازہ ہو گیا خصوصاً میرے لیے کیونکہ انھوں نے ہی میری پرورش کی تھی میرا عجب حال ہو گیا۔ اضطراب مصیبت اور رنج و الم نے آ لیا۔ رات دن میں روتی رہتی تھی۔ حضرت بادشاہ نے کئی دفعہ آکر میری تسلی اور غم خواری فرمائی۔ حضرت آکام مجھے اپنے ہاں لے گئی تھیں۔ اس وقت میری عمر دو سال

کی تھی۔ آپ نے میری پرورش کی اور ابھی میں دو سال کی تھی کہ آپ نے رحلت فرمائی۔ انتقال کے ایک سال بعد تک میں آپ کے مکان میں رہی۔

جب حضرت بادشاہ دھول پور کی سیر کو گئے تو میں بھی اپنی والدہ کے ہمراہ آپ کے ساتھ گئی۔ اس وقت میں گیارھویں سال میں تھی۔ ماہ رجب کی پندرہ تاریخ کو ۹۴۱ھ میں آپ نے گجرات کی طرف جانے کا عزم کیا اور اپنا پیش خانہ باغ زر افشاں میں نصب کیا اور اس باغ میں لشکر جمع ہونے تک ایک مہینہ رہے۔ جب تک اس باغ میں آپ کا قیام رہا ہم یعنی میری والدہ دلدار بیگم اور میری بہنیں اور بیگمات زیادہ تر آپ کے ساتھ رہیں۔ دوسرے دن اس ناچیز کے قیام گاہ میں جلوہ افروز ہوئے۔ تین پہر رات تک مجلس رہی۔ اس میں بہت سی بیگمات، میری بہنیں اور بہت سی مستورات شریک تھیں اور گانے بجانے والے موجود تھے۔ سہ پہر رات کے بعد حضرت بادشاہ نے آرام فرمایا اور آپ کی بہنیں اور بیگمات بھی سب وہیں آپ کے قریب سو گئیں۔

صبح کے وقت بیگہ بیگم نے آپ کو جگا کر کہا کہ نماز کا وقت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وضو کا پانی یہیں منگوا لو۔ جب بیگم نے دیکھا کہ بادشاہ بیدار ہو گئے ہیں تو شکایت شروع کی کہ اس باغ میں آپ کو تشریف لائے کئی دن ہو گئے مگر ایک دن بھی ہمارے ہاں نہ آئے۔ حضرت نے کچھ جواب نہ دیا اور نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے۔ جب ایک پہر دن نکل آیا تو اپنی بہنوں اور بیگمات کو بلایا۔ جب ہم آپ کے سامنے گئے تو آپ خاموش رہے اور ہم سب سمجھ گئے کہ آپ خفا ہیں۔ کچھ دیر کے بعد آپ نے بیگہ بیگم کو مخاطب کر کے کہا "بی بی میں نے تم سے کیا بدسلوکی کی جس کی آج صبح تم شکایت کر رہی تھیں۔ تم جانتی ہو میں افیونی آدمی ہوں اگر تمہارے ہاں آنے جانے میں دیر ہو تو اس میں تمہاری خفگی کی کوئی وجہ نہیں۔ تم سب مجھے اپنی ایک ایک تحریر اس مضمون کی دے دو کہ آپ کا جی چاہے آئیں یا نہ آئیں۔ ہم سب آپ سے خوش اور مطمئن رہیں گے۔ گلبرگ بیگم نے فوراً یہ لکھ کر آپ کو دے دیا۔ بیگہ بیگم نے تھوڑا سا اپنی بات پر اصرار کیا اور کہا عذر گناہ سے بدتر معلوم ہوتا ہے۔ آخر انھوں نے بھی اقرار نامہ لکھ کر دے دیا۔

شیرشاہ

ایک دن سب غافل بیٹھے ہوئے تھے کہ شیر خاں نے آ کر حملہ کر دیا۔ بادشاہی لشکر کو شکست ہوئی اور بہت سے بادشاہی آدمی قید ہو گئے۔ حضرت بادشاہ کے دست مبارک میں بھی زخم آیا۔ آگرہ پہنچنے سے پہلے خبر آئی کہ شیر خاں چوسہ کی طرف سے آ رہا ہے اس کے آدمیوں میں بہت اضطراب پھیل گیا۔ اس ہلچل میں بعض آدمی ایسے غائب ہوئے کہ پھر ان کا کچھ بھی نام و نشان نہ ملا۔ ان ہی میں عائشہ سلطان بیگم دختر سلطان حسین میرزا، بیگہ جان کوکہ، عقیقہ بیگم، چاند بی بی (جو سات مہینے سے حاملہ تھیں) اور شاد بی بی شامل ہیں۔ موخر الذکر تین بیبیاں حضرت بادشاہ کے حرم میں تھیں۔ گم شدہ لوگوں میں سے بعض کی بالکل خبر نہ ملی کہ دریا میں ڈوب گئے یا کیا ہوئے۔ حضرت بادشاہ نے بعد میں ہر چند تلاش کی کچھ پتا نہ ملا۔ چالیس روز تک حضرت بادشاہ بیمار رہے اس کے بعد صحت پائی۔

چند دن کے بعد باغ زر افشاں سے نکل کر میرزا کامران بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جس دن بادشاہ آئے تھے ہم اسی دن شام کو ان کے حضور میں باریاب ہوئے تھے۔ جب آپ نے اس ناچیز کو دیکھا تو فرمایا کہ "میں نے تو تجھے پہلے پہچانا ہی نہیں کیونکہ جب ہمارا لشکر

کو بنگالہ گیا تھا۔ اس وقت تو تو ٹوپی پہنا کرتی تھی اور اب جو میں نے تجھے لچک نقاب پہنے دیکھا تو نہیں پہچانا کہ کون ہے۔ گلبدن تو مجھے بہت یاد آتی تھی اور بعض دفعہ میں پشیماں ہو کر کہتا تھا کہ کاش تجھے اپنے ساتھ لے آتا۔ مگر جب وہاں یہ ہل چل پڑی تو میں نے شکر کیا اور کہا کہ الحمد للہ میں گلبدن کو اپنے ساتھ نہیں لایا۔ عقیقہ بیوی تو ذرا سی لڑکی تھی مگر اس کے لیے میں نے بے انتہا غم اور افسوس کیا اور پشیمان ہوتا تھا کہ اسے میں اپنے ہمراہ کیوں لایا۔"

میرزا ہندال سے صفائی

کچھ دن کے بعد حضرت بادشاہ میری والدہ سے ملنے آئے اور قرآن شریف اپنے ساتھ لائے۔ فرمایا تھوڑی دیر کے لیے اور لوگ ہٹ جائیں۔ سب اٹھ کر چلے گئے تو آپ نے آکم اور اس ناچیز کو مخاطب کر کے کہا "ہندال میرا دست و بازو ہے جس طرح ہمیں آنکھ کی بینائی مطلوب ہے اسی طرح قوت بازو بھی پسند ہے۔ میرے دل میں ہندال کی طرف سے کوئی میل نہیں مگر تمہیں اس کا یقین نہیں تو . . . . " آپ نے قرآن شریف کو اونچا اٹھایا تھا مگر میری والدہ دلدار بیگم اور ناچیز نے اسے آپ کے ہاتھ سے لے لیا اور سب نے کہا "یہ سب سچ ہے! آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں۔"

آپ نے دوبارہ فرمایا "گلبدن بیگم کیا اچھا ہو اگر تو جا کر اپنے بھائی ہندال کو لے آئے۔" میری والدہ نے کہا "یہ ذرا سی بچی ہے کبھی اس نے اکیلے سفر نہیں کیا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں خود چلی جاؤں۔" حضرت بادشاہ نے فرمایا "اگر میں آپ کو تکلیف دوں تو یہ اس لیے ہے کہ بچوں کی غمخواری ماں باپ پر لازم ہے۔" آخر میر ابو البقا کو آپ نے میری والدہ کے ساتھ میرزا ہندال کو لانے کے لیے بھیجا۔ میرزا ہندال آ گئے۔ حضرت والدہ بہت خوش ہوئیں۔ میرزا ہندال آپ کی ہمراہی میں الور سے روانہ ہو کر حضرت بادشاہ کے حضور میں باریاب ہوئے۔ شیخ بہلول کے بارے میں میرزا ہندال نے یہ کہا کہ وہ زرہ بکتر، زین ساز اور سپہ گری کا سامان شیر خاں کو بھیجا کرتے تھے اس لیے میں نے انہیں قتل کیا۔

نظام سقہ

چند روز کے بعد خبر آئی کہ شیر خاں لکھنؤ کے قریب پہنچ گیا ہے۔ ان دنوں ایک سقہ حضرت بادشاہ کا خادم تھا۔ جب حضرت بادشاہ چوسہ کے مقام پر دریا میں اپنے گھوڑے سے الگ ہو گئے تھے تو اس سقے نے آ کر آپ کی مدد کی تھی اور آپ اس بھنور سے صحیح سلامت باہر نکلے۔ اس کے صلے میں آپ نے اس سقے کو تخت پر بٹھا دیا۔ اس جان نثار خادم کا نام مجھے ٹھیک معلوم نہیں ہوا۔ بعض لوگ اسے نظام کہتے تھے اور بعض سنبل کہتے رہے۔ غرض اس سقے کو تخت پر بٹھا کر حکم دیا کہ سب امراء اس کے سامنے کورنش کریں اور اس کا جو جی چاہے کسی کو دے اور جس کسی کو جی چاہے منصب عطا کرے۔ دو دن کے لیے اس سقے کو بادشاہی دی گئی۔ میرزا ہندال اس کے دربار میں حاضر نہ ہوئے۔ دوبارہ الور چلے گئے۔ میرزا کامران بھی نہ آئے۔ بیمار تھے۔ حضرت بادشاہ کو یہ کہلا کر بھیجا کہ اس غلام پر عنایت اور مہربانی کسی اور شکل میں کرنی چاہیے تھی بھلا اس کی کیا ضرورت تھی کہ اس کو تخت پر ہی بٹھا دیا جائے۔ آج کل شیر خاں تو قریب آ پہنچا ہے اور آپ یہ کھیل کر رہے ہیں۔

میرزا کامران

ان دنوں میں میرزا کامران کی بیماری نے بہت زور پکڑا۔ بچنے کی کوئی امید نہ رہی تھی مگر خدا کی عنایت سے آپ کی حالت بہتر ہو گئی۔

خبر آئی کہ شیر خاں لکھنؤ سے روانہ ہو گیا۔ حضرت بادشاہ نے قنوج کا رخ کیا اور میرزا کامران کو اپنی جگہ آگرے میں چھوڑ گئے۔ چند دن کے بعد میرزا کامران نے سنا کہ بادشاہ نے دریائے گنگا کو عبور کر لیا ہے۔ یہ سن کر آپ بھی آگرے سے چل کھڑے ہوئے۔ ہم لوگ لاہور کے قریب مقیم تھے کہ میرزا کامران نے ایک بادشاہی فرمان بھیجا کہ تم میرے ساتھ لاہور چلو۔

میرزا کامران نے بادشاہ سے کہا تھا کہ میری بیماری بہت شدید ہے اور اس پردیس میں میرا کوئی دوست اور غم خوار نہیں اگر آپ گلبدن بیگم سے کہیں کہ وہ میرے ساتھ لاہور چلے تو مہربانی ہوگی۔ حضرت بادشاہ نے کہلا کر یہ کہہ دیا تھا کہ "اچھا چلی جائے" اب بادشاہ لکھنؤ کی طرف دو تین منزل چلے گئے تو میرزا کامران نے مجھے شاہی فرمان دکھایا اور اصرار کیا کہ تم میرے ساتھ ضرور چلو۔ میری والدہ نے کہا کہ اس نے کبھی ہم سے الگ ہو کر سفر نہیں کیا۔ میرزا کامران نے جواب دیا "تو آپ بھی ساتھ چلیں۔" اس کے بعد کوئی پانچ سو سپاہی اور معتبر افسر اپنے رضاعی باپ اور بھائی دونوں کو میری والدہ کے پاس بھیجا اور کہا کہ اگر آپ لاہور تک نہیں جاتیں تو ایک منزل تک ہی میرے ساتھ چل چلو چنانچہ ہم ایک منزل تک ان کے ساتھ گئے۔ یہاں آ کر میرزا کامران نے پھر بہت سی قسمیں کھائیں اور دوبارہ یہی کہا کہ میں تجھے اپنے پاس سے نہیں جانے دوں گا۔

آخر بہت گریہ و زاری کے ساتھ اپنی سوتیلی ماؤں سے اور اپنی والدہ اور بہنوں سے اور اپنے بھائیوں سے غرض ان سب سے جن کے ساتھ میں بچپن سے پل بڑھی تھی مجھے جدا ہونا پڑا اور میرزا کامران زبردستی مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ بادشاہ کے پاس میں نے عرضداشت بھیجی کہ مجھے جناب سے یہ توقع نہ تھی کہ آپ اس ناچیز کو اپنی خدمت سے جدا کر کے میرزا کامران کے حوالے کر دیں گے۔" آپ نے فرمایا "میرزا نے اصرار کیا اور منت سماجت کی تو مجبوراً تجھے ان کے سپرد کرنا پڑا۔ آج کل مہم درپیش ہے۔ انشاء اللہ اس جنگ سے فارغ ہوں گے تو سب سے پہلے تجھے اپنے پاس بلا لیں گے۔"

شیر شاہ

جب ہم لاہور پہنچے تو سنا کہ دریائے گنگا کے کنارے پر جنگ ہوئی اور شاہی لشکر کو ہزیمت ہوئی۔ ہمارے حضرت بادشاہ اپنے بھائیوں اور عزیزوں سمیت اس شدید خطرے سے نکل آئے۔ لاہور میں حضرت بادشاہ نے خواجہ غازی کے باغ میں بی بی حاج تاج کے مقبرے کے قریب قیام کیا۔ ان دنوں ہر روز شیر خاں کی خبریں سننے میں آتی تھیں۔ تین مہینے لاہور میں رہے۔ آئے دن یہی خبر آتی تھی کہ اب دو کوس اور اب تین کوس آگے بڑھ آیا ہے۔ آخر سنا کہ سرہند پہنچ گیا ہے۔ بادشاہ کے پاس مظفر بیگ نامی ایک ترکمان امیر تھا اسے قاضی عبداللہ کے ہمراہ شیر خاں کے پاس بھیجا اور کہلوایا کہ یہ کیا انصاف ہے۔ سارا ہندوستان میں نے تیرے لیے چھوڑ دیا۔ ایک لاہور میرے پاس رہ گیا ہے بس اب سرہند ہمارے اور تمہارے درمیان سرحد ہونی چاہیے۔ اس خدا ناترس نے یہ بات قبول نہ کی اور کہا کہ "میں نے کابل تمہارے لیے چھوڑ دیا ہے وہاں چلے جایئے" مظفر بیگ اسی وقت واپس روانہ ہو گئے اور اپنے آگے ایک قاصد کو دوڑایا کہ جا کر حضرت بادشاہ سے کہو بس اب لاہور سے روانہ ہو جائیں۔ یہ خبر پاتے ہی آپ چل کھڑے ہوئے وہ بھی دن گویا قیامت کا دن تھا۔ لوگوں نے اپنے آراستہ مکان اور ساز و سامان کو خیر باد کہا، ہاں جو کچھ نقدی پاس تھی وہ لے گئے۔

چند دن دریا راوی کے کنارے پر قیام کیا۔ یہاں شیر خاں کی طرف سے ایک ایلچی آیا۔ بادشاہ نے فیصلہ کیا کہ دوسرے دن صبح

اس سے ملاقات کریں۔ میرزا کامران نے یہ درخواست پیش کی کہ کل صبح جو مجلس ہوگی اور شیر خاں کا ایلچی حاضر ہوگا۔ اس وقت اگر میں آپ کی مسند کے ایک کونے پر بیٹھ جاؤں، تاکہ مجھ میں اور میرے بھائیوں میں کچھ امتیاز ہو جائے، تو یہ بات میرے لیے بہت سرفرازی کا باعث ہوگی۔ حمیدہ بانو بیگم کہتی ہیں کہ حضرت بادشاہ نے یہ رباعی لکھ کر میرزا کامران کو بھجوا دی۔ مگر میں نے سنا تھا کہ آپ نے جواباً شیر خاں کو اس کے ایلچی کے ہاتھ یہ رباعی بھجوائی تھی ــ

در آئینہ گرچہ خود نمائی باشد   پیوستہ ز خویشتن جدائی باشد
خود را بمثال غیر دیدن عجب است   ایں بوالعجبی کار خدائی باشد

شیر خاں کی طرف سے جو ایلچی آیا تھا وہ آپ کے حضور میں آکر آداب بجا لایا۔

ایک خواب

آپ کی خاطر مبارک ملول ہوگئی۔ اسی غمگینی کی حالت میں آپ سو گئے۔ خواب میں دیکھا کہ آپ کے ایک عزیز آئے جو سر سے پاؤں تک سبز لباس پہنے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھ میں ایک عصا تھا۔ ان بزرگ نے آپ سے کہا کہ جواں مرد ہو اور رنج نہ کرو۔ انھوں نے اپنا عصا حضرت بادشاہ کو دیا اور کہا، خدائے تعالیٰ تجھے ایک لڑکا دے گا اس کا نام جلال الدین محمد اکبر رکھیو۔ حضرت بادشاہ نے پوچھا۔ آپ کا اسم شریف کیا ہے۔ فرمایا۔ ژندہ پیل احمد جام۔ اور کہا کہ وہ لڑکا میری نسل سے ہوگا۔

حضرت بادشاہ نے فرمایا کہ اگر میرے بھائی اس سے اتفاق کریں تو اچھا ہے کہ میں بدخشاں چلا جاؤں اور کابل میرزا کامران کے پاس رہے۔ مگر میرزا کامران اس پر بھی راضی نہ ہوئے کہ حضرت بادشاہ کابل کے راستے سے بدخشاں چلے جائیں اور کہنے لگے کہ اپنی زندگی میں حضرت فردوس مکانی نے کابل میری والدہ کو دے دیا تھا۔ آپ کا اس طرف جانا مناسب نہیں ہے۔ ہر چند بادشاہ نے میرزا کامران کو اطمینان دلایا اور صلح کی کوشش کی مگر مخالفت اور بڑھتی گئی۔ جب آپ نے دیکھا کہ میرزا کے ساتھ بہت سی جمعیت ہے اور وہ ہرگز آپ کو کابل کی طرف نہیں جانے دیں گے تو اس کے سوا اور کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ ملتان اور بھکر کا رخ کریں۔ ملتان پہنچ کر آپ نے ایک دن قیام کیا۔ یہاں غلہ کافی مقدار میں مہیا نہ ہوا۔ اس علاقے میں بخشو نامی ایک بلوچ تھا۔ حضرت بادشاہ نے اپنے ایک آدمی کے ہاتھ علم اور نقارہ اور گھوڑا اور خلعت اس بلوچ کو بھجوائی اور کشتی اور غلہ طلب کیا۔ بخشو بلوچ نے تقریباً ایک سو کشتیاں غلے سے بھر کر بھیج دیں۔ اس شائستہ خدمت سے آپ بہت خوش ہوئے۔ غلہ اپنے آدمیوں میں تقسیم کیا اور خیر و سلامتی سے دریا کو عبور کیا۔ خدا بخشو بلوچ کا بھلا کرے کہ ایسے آڑے وقت میں وہ ایسی مناسب خدمت بجا لایا۔

پھر مسافت طے کر کے آپ بھکر پہنچے۔ اس قلعے کے حاکم سلطان محمود نے دروازے بند کر لیے۔ آپ نے میر سمندر کو شاہ حسین کے پاس بھیجا کہ ہم ضرورتاً تمھاری ولایت میں آئے ہیں۔ تمھارا ملک تمھیں مبارک رہے۔ ہم اس میں مداخلت کرنا نہیں چاہتے۔ ایک مرتبہ تم خود ہمارے پاس آؤ اور جو ضروری خدمت ہے وہ بجا لاؤ۔ شاہ حسین کچھ کچھ بہانے بناتا رہا۔ تین مہینے انتظار کیا۔ غلہ کبھی ملتا تھا کبھی نہیں ملتا تھا۔ لشکر کے آدمی اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کو ذبح کر کے کھا لیتے تھے۔ دوبارہ آپ نے شیخ عبدالغفور کو شاہ حسین کے پاس بھیجا اور کہلوایا آخر کب تک انتظار کراؤ گے؟ اس نے جواب بھیجا کہ میری بیٹی میرزا کامران سے منسوب ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ آپ سے ملوں اور میں خود بھی آپ کی خدمت

میں حاضر نہیں ہو سکتا۔

اسی اثنا میں میرزا ہندال نے دریا کو عبور کیا۔ حضرت بادشاہ میری والدہ سے ملنے کے لیے تشریف لائے۔ اس مجلس میں میرزا ہندال کے گھر کی عورتیں بھی حضرت بادشاہ کے سلام کو آئیں۔ ان میں حمیدہ بانو بیگم کو دیکھ کر آپ نے پوچھا: "یہ کون ہے؟" اوروں نے کہا: "میر بابا دوست کی بیٹی ہیں۔" خواجہ معظم آپ کے سامنے کھڑا تھا، اسے دیکھ کر آپ نے کہا تو یہ لڑکا ہمارے عزیزوں میں سے ہوا اور حمیدہ بانو بیگم کی طرف دیکھ کر کہا اور ان سے بھی ہماری قرابت ہے۔

حمیدہ بانو بیگم

ان دنوں حمیدہ بانو بیگم اکثر میرزا ہندال کے ہاں رہتی تھیں۔ دوسرے دن حضرت بادشاہ دوبارہ میری والدہ دلدار بیگم سے ملنے آئے اور فرمایا۔ میر بابا دوست ہمارے عزیزوں میں سے ہیں۔ یہ بہت اچھا ہو اگر آپ ان کی بیٹی سے ہماری شادی کر دیں۔ یہ سن کر میرزا ہندال نے بہت سے عذر کیے اور کہا کہ اس لڑکی کو میں اپنی بیٹی اور بہن سمجھتا ہوں۔ آپ بادشاہ ہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی اس سے موافقت نہ ہو سکے اور اس سے آپ کو تکلیف ہو۔ اس پر حضرت بادشاہ خفا ہو گئے اور اٹھ کر چلے گئے۔

اس کے بعد میری والدہ نے ایک خط لکھ کر آپ کو بھیجا کہ لڑکی کی ماں تو اس سے بھی زیادہ ناز نخرے کرتی ہے۔ آپ میرزا ہندال کی اتنی سی بات پر خفا ہو کر چلے گئے۔ حضرت بادشاہ نے جواب میں لکھا کہ وہ جو کچھ بھی ناز کریں ہمیں بسر و چشم منظور ہے گزارش کی بات جو لکھا ہے، انشاء اللہ اسی طرح کیا جائے گا۔

ایک دن پھر آپ میری والدہ کے پاس آئے اور کہا کسی کو ذرا بھیجیں کہ جا کر حمیدہ بانو بیگم کو بلا لائے۔ میری والدہ نے کسی کو بھیجا مگر حمیدہ بانو نہ آئیں اور یہ کہلا بھیجا کہ اگر آداب سے غرض ہے تو میں پہلے ہی اس دن آداب بجا لا چکی ہوں اب دوبارہ کس لیے آؤں؟ پھر حضرت بادشاہ نے سبحان قلی کو بھیجا کہ میرزا ہندال سے جا کر کہو حمیدہ بانو بیگم کو یہاں بھیج دیں۔ میرزا نے کہا ہر چند میں کہتا ہوں وہ نہیں جاتی تو خود جا کر کیوں نہیں کہتا؟ سبحان قلی نے خود جا کر کہا۔ بیگم نے جواب دیا: "بادشاہوں سے ایک دفعہ ملاقات کرنے میں تو مضائقہ نہیں مگر دوسری دفعہ انھیں ملنا گویا نامحرم سے ملنا ہے۔ اس لیے میں نہیں آتی۔" بیگم کا یہ جواب سبحان قلی نے آکر بیان کیا حضرت بادشاہ نے فرمایا: "اگر نامحرم ہیں تو ہم محرم بنا لیں گے۔"

غرض چالیس دن تک حمیدہ بانو کی طرف سے حیل و حجت رہی اور وہ کسی طرح راضی نہ ہوتی تھیں۔ آخر میری والدہ دلدار بیگم نے کہا کہ کسی نہ کسی سے تو تم بیاہ کرو گی پھر بادشاہ سے بہتر اور کون ہو سکتا ہے۔ بیگم نے جواب دیا: "ہاں میں کسی ایسے سے کروں گی جس کے گریبان تک میرا ہاتھ پہنچ سکے۔ نہ ایسے آدمی سے جس کے دامن تک بھی میرا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔" میری والدہ نے انھیں بہت سی نصیحتیں کیں اور آخر راضی کر لیا۔

غرض چالیس دن کے بحث و مباحثہ کے بعد ماہ جمادی الاول ۹۴۸ھ میں بمقام پاتر بروز دوشنبہ دوپہر کے وقت حضرت بادشاہ نے اصطرلاب اپنے ہاتھ میں لیا اور نیک ساعت دیکھنے کے بعد میر ابوالبقا کو بلا کر فرمایا کہ نکاح پڑھا دو۔ مبلغ دو لاکھ کا مہر میر ابوالبقا کے

سپرد کیا۔ نکاح کے بعد تین دن تک آپ پاتر میں رہے۔ اس کے بعد کشتی کے ذریعے بھکر کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک مہینہ بھکر میں رہے وہاں میر ابوالبقا بیمار ہو گئے اور رحمت حق سے پیوستہ ہوئے۔

ملا سرخ کتابدار ہندوستان کی شکست اور ویرانی کے زمانے میں راجا مال دیو کی ولایت (جودھ پور) میں جا کر ملازم ہو گئے تھے۔ انھوں نے حضرت بادشاہ کے پاس عریضہ بھیجا کہ مال دیو آپ کو قید کرنے کی فکر میں ہے اس کی باتوں پر اعتبار نہ کریں۔ شیر خاں کا ایلچی اس کے پاس پہنچ گیا ہے اور شیر خاں نے لکھا ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے آپ کو گرفتار کرے۔ اگر یہ کام سرانجام ہو گیا تو ناگور اور الور اور جو جگہ تم چاہو میں تمھیں دے دوں گا۔ حضرت بادشاہ چل کھڑے ہوئے۔ امرکوٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ ہوا بہت گرم تھی، گھوڑے اور چوپائے زانو تک ریت میں دھنس رہے تھے۔ پیچھے پیچھے مال دیو کا لشکر چلا آرہا تھا۔ اور اب نزدیک آپہنچا تھا۔ ذرا سی دیر ٹھہر کر پھر بھوکے پیاسے چل کھڑے ہوتے تھے۔ زیادہ تر مرد اور عورتیں پیدل چل رہی تھیں۔ حضرت بادشاہ تمام رات سفر کرتے رہے۔ جب صبح ہوئی تو تین دن ہو گئے تھے، گھوڑوں کو پانی تک نہیں ملا تھا۔ اب ایک جگہ پانی دستیاب ہوا تو حضرت بادشاہ سواری سے اُتر پڑے۔ ابھی اُترے ہی تھے کہ ایک شخص دوڑا ہوا آیا اور کہا کہ بہت سے ہندو آرہے ہیں جو گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہیں۔ حضرت بادشاہ نے شیخ علی بیگ، روشن کوکہ، ندیم کوکہ اور میر ولی کے بھائی میر پاینده محمد کو بعض اور آدمیوں کے ساتھ فاتحہ پڑھ کر رخصت کیا کہ جاؤ کافروں سے جنگ کرو۔ یہ لوگ فتح حاصل کرنے کے بعد آکر لشکر کے ساتھ شامل ہو گئے۔

صبح کے وقت پھر روانہ ہوئے۔ تین دن اور پانی نہ ملا۔ تین دن بعد چند کنوئیں نظر آئے۔ یہ بہت گہرے تھے اور ان کا پانی بہت سرخ رنگ کا تھا۔ جب کسی کنوئیں میں سے ڈول اوپر آتا تھا تو آدمی اس پر پل پڑتے تھے۔ ایک رسی ٹوٹ گئی اور پانچ چھ آدمی ڈول کے ساتھ کنوئیں میں جا پڑے۔ بہت سے تو پیاس سے مر گئے تھے۔ کچھ اس طرح ہلاک ہوئے۔ ایک دن ایک رات برابر سفر کرنے کے بعد ایک سرائے میں پہنچے جہاں بڑا سا تالاب تھا۔ اونٹ اور گھوڑے اس تالاب میں اُتر گئے اور اتنا پانی پیا کہ بہت سے ہلاک ہو گئے۔

امرکوٹ بہت اچھی جگہ ہے یہاں کا رانا بادشاہ کے استقبال کو آیا اور اپنے قلعہ کے اندر لے جا کر بہت اچھا مکان رہنے کے لیے دیا اور امرا کو قلعے کے باہر جگہ دی۔

اکثر چیزیں یہاں بہت سستی تھیں۔ ایک روپے میں چار بکرے آجاتے تھے۔ بادشاہی خزانہ ختم ہو گیا تھا، مگر تردی بیگ کے پاس بہت سا روپیہ موجود تھا۔ بادشاہ نے اس سے بطور قرض کچھ رقم طلب کی۔ اس نے اسی ہزار اشرفیاں بیس فیصدی سود پر دیں۔ آپ نے حصہ رسد انھیں سب لشکر میں تقسیم کر دیا۔

اکبر کی ولادت

رانا امرکوٹ کے باپ کو میرزا شاہ حسین نے قتل کر دیا تھا۔ کچھ اس وجہ سے بھی رانا نے اپنے دو تین ہزار جرار سوار بادشاہ کی مدد کے لیے ساتھ کر دیے۔ آپ نے بھکر کا رُخ کیا، مگر اپنے گھر بار کے بہت سے آدمیوں کو امرکوٹ میں رہنے دیا اور خواجہ معظم کو بھی وہیں چھوڑ گئے تاکہ وہ حمیدہ بانو کی خبر گیری رکھیں۔ ان کے ہاں بچہ ہونے والا تھا۔ آپ کے جانے کے تین دن بعد بتاریخ چہارم

ماہ رجب المرجب سنہ ۹۴۹ھ بوقت صبح بروز یک شنبہ حضرت بادشاہ عالم پناہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی تولد ہوئے۔ آپ کی پیدائش کے وقت قمر برج اسد میں تھا۔ پیدائش کا برج ثابت میں ہونا بہت اچھا ہوتا ہے۔ نجومیوں نے کہا کہ جو بچہ اس ساعت میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ بہت صاحب اقبال ہوتا ہے اور بڑی عمر پاتا ہے۔

حضرت بادشاہ پندرہ کوس طے کر چکے تھے کہ تردی محمد خاں نے یہ خوش خبری سنائی۔ آپ بہت ہی خوش ہوئے اور تردی محمد خاں کی پہلی خطائیں معاف کر دیں۔ آپ نے لاہور میں جو خواب دیکھا تھا اس کے مطابق بچے کا نام جلال الدین محمد اکبر رکھا۔

حضرت بادشاہ حیران اور متفکر تھے کہ کیا کریں اور کہاں جائیں۔ تردی محمد خاں اور بیرم خاں نے یہ رائے دی کہ سوائے شال اور شال مستان کے جو قندھار کی سرحد ہے کسی جگہ کا قصد کرنا ممکن نہیں غرض منزلیں طے کرتے ہوئے قندھار کی طرف روانہ ہوئے۔ شال مستان کے قریب پہنچ کر موضع درکی میں قیام کیا۔ عصر کا وقت تھا کہ ایک ازبک جوان ٹٹو پر سوار پہنچا اور چلا کر کہا کہ حضرت بادشاہ سوار ہو جائیں، راستے میں کچھ عرض کروں گا۔ وقت تنگ ہے اور بات کرنے کی مہلت نہیں۔ بادشاہ یہ شور سن کر فوراً سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ ابھی دو تیر کے فاصلے پر گئے تھے آپ نے خواجہ معظم اور بیرم خاں کو واپس بھیجا کہ جا کر حمیدہ بیگم کو ساتھ لے آؤ۔ وہ آئے اور بیگم کو سوار کرا کے ساتھ لے گئے مگر اتنی مہلت نہ تھی کہ جلال الدین محمد اکبر کو بھی لے جاتے۔ جونہی بیگم حضرت بادشاہ کے ہمراہ جانے کے لیے لشکر گاہ سے باہر ہوئیں اسی وقت میرزا عسکری دو ہزار سوار سمیت آن پہنچے اور ایک ہلچل مچ گئی۔

آتے ہی میرزا عسکری نے پوچھا بادشاہ کہاں ہیں؟ لوگوں نے کہا بہت دیر ہوئی جب شکار کھیلنے کے لیے باہر گئے تھے۔ میرزا عسکری سمجھ گئے کہ بادشاہ چلے گئے انہوں نے جلال الدین محمد اکبر کو اپنے ساتھ لیا اور سب بادشاہی آدمیوں کو قید کر کے قندھار لے گئے وہاں جا کر محمد اکبر کو اپنی بیوی سلطانم کے سپرد کیا وہ آپ سے بہت مہربانی اور غم خواری سے پیش آئیں۔

راستے کے مصائب

حضرت بادشاہ جب وہاں سے روانہ ہوئے تھے تو آپ نے پہاڑ کا رخ کیا تھا۔ چار کوس پرے جا کر آپ رکے تھے۔ حمیدہ بانو بیگم کا بیان ہے کہ کل تیس آدمی ساتھ تھے۔ جب آپ پہاڑ کے دامن میں پہنچے تو پہاڑ پر اتنی برف پڑی تھی کہ اوپر جانے کا راستہ نہیں رہا تھا آپ اس خیال سے بہت پریشان تھے کہ کہیں بے انصاف میرزا عسکری پیچھے سے نہ آ جائے۔ آخر ایک راستہ مل گیا اور جوں توں کر کے پہاڑ پر چڑھ گئے ساری رات وہاں برف کے بیچ میں گزاری۔ نہ آگ جلانے کے لیے ایندھن پاس تھا اور نہ کھانے کے لیے کوئی چیز موجود تھی۔ بھوک کے مارے آدمی نڈھال ہوئے جا رہے تھے۔ حضرت بادشاہ نے فرمایا ایک گھوڑا ذبح کرو۔ گھوڑا ذبح کیا گیا مگر پکانے کو برتن نہ ملا۔ ایندھن ڈھونڈھ کر لائے اور ایک خود میں تھوڑا سا گوشت ابالا۔ کچھ انگاروں پر بھونا۔ اور سب آگ سلگا کر بیٹھ گئے۔ حضرت بادشاہ نے اپنے ہاتھ گوشت بھون کر نوش کیا۔ آپ فرماتے تھے کہ وہاں ایسی سردی تھی میرا سر بالکل شل ہو گیا تھا۔ بارے جب صبح ہوئی تو آدمیوں نے ایک اور پہاڑ کا پتا دے کر کہا وہاں آبادی ہے کچھ بلوچ رہتے ہیں وہاں جانا چاہیئے۔ اسی طرف روانہ ہوئے اور دو دن میں وہاں پہنچے۔ دیکھا کہ چند مکان ہیں اور باہر چند وحشی بلوچ پہاڑ کے دامن میں بیٹھے ہیں۔ حضرت بادشاہ کے ساتھ تقریباً تیس آدمی تھے۔ بلوچوں نے جب ان آدمیوں کو آتے دیکھا تو سب جمع ہو کر ان کی طرف

رہے۔ حضرت بادشاہ ایک خیمہ میں تشریف فرما تھے۔ جب ان بلوچوں نے دُور سے آپ کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ اگر ہم انھیں پکڑ کر میرزا عسکری کے پاس لے جائیں تو وہ ضرور ان کے گھوڑے اور ہتھیار وغیرہ ہمیں دے دے گا، بلکہ کچھ اور انعام بھی دے گا۔ حسن علی ایشک کی بیوی بلوچ تھیں۔ اس لیے بلوچیوں کی زبان سمجھتی تھیں۔ وہ سمجھ گئیں کہ یہ بیابانی غول دل میں بدی رکھتے ہیں۔ جب صبح کے وقت حضرت بادشاہ نے روانگی کا ارادہ کیا تو انھوں نے کہا کہ ہمارا سردار بلوچی یہاں موجود نہیں۔ وہ آجائے تو آپ جا سکتے ہیں۔ روانگی کے لیے وقت بھی موزوں نہیں رہا تھا۔ ساری رات بہت احتیاط سے وہیں بسر کی۔ رات کا ایک حصہ گزرا تھا جب وہ بلوچ سردار آپ کے حضور میں آیا اور کہا کہ میرزا کامران اور میرزا عسکری کے فرمان ہمارے پاس آئے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ حضرت بادشاہ تمھارے ہاں تشریف رکھتے ہیں۔ اگر ہوں تو ہرگز ہرگز انھیں وہاں سے نہ جانے دینا بلکہ گرفتار کر کے ہمارے پاس لے آنا۔ ان کا مال و اسباب اور گھوڑے تم لے لو۔ جب میں نے آپ کو دیکھا نہیں تھا تو میرے دل میں آپ کے خلاف برائی تھی مگر اب جب میں آپ کے دیدار سے مشرف ہوا تو میری جان اور میرا خاندان، میرے پانچ چھ بیٹے سب آپ کے سر صدقے۔ آپ جہاں جانا چاہیں بے روک ٹوک جائیں خدا آپ کا محافظ ہے میرزا عسکری کا جو جی چاہے مجھ سے کرے۔ آپ نے ایک پارۂ لعل و مروارید اور بعض اور چیزیں اس بلوچ سردار کو عنایت کیں۔ دوسرے دن قلعہ حاجی بابا کی جانب تشریف لے گئے۔

جب حضرت بادشاہ نے دیکھا کہ بھائی دشمن ہو گئے ہیں اور بہت سے امرا آپ کو چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں تو اس لاچاری کی حالت میں آپ نے یہی مناسب سمجھا کہ خراسان کا قصد کریں۔ بہت سی منزلیں طے کرنے کے بعد خراسان کے نواح میں پہنچے۔ جب باب ہند پہنچے تو شاہ طہماسپ کو آپ کی آمد کی خبر ہوئی۔ وہ یہ سن کر حیران رہ گیا کہ فلک کی گردش نے ہمایوں بادشاہ کی یہ حالت کر دی اور وہ اس بے سر و سامانی سے خدا کی حفاظت میں یہاں پہنچے۔ شاہ طہماسپ نے اپنے سب اہل دولت، اشراف و اکابر، وضیع و شریف، کبیر و صغیر کو حضرت بادشاہ کے استقبال کے لیے بھیجا۔ جب نزدیک پہنچے اور شاہ کو خبر کی وہ خود سوار ہو کر آپ کے استقبال کو آیا۔ دونوں بغل گیر ہوئے۔ ان دونوں عالی مقام بادشاہوں میں ایسی دوستی ہو گئی گویا ایک پوست دو مغز ہیں۔ جتنے دن حضرت بادشاہ وہاں رہے اکثر شاہ طہماسپ آپ کے پاس آتے تھے اور جس دن نہیں آتے تھے تو حضرت بادشاہ ان کے ہاں جاتے تھے۔

نیک ساعت دیکھ کر حضرت بادشاہ نے قندھار کا رخ کیا۔ میرزا عسکری نے جب یہ سنا کہ حضرت بادشاہ خراسان سے قندھار کی سمت آرہے ہیں تو انھوں نے جلال الدین محمد اکبر کو میرزا کامران کے پاس کابل بھجوا دیا۔ کامران نے آپ کو ہماری پھوپھی خانزادہ بیگم کے سپرد کیا۔ اس وقت آپ کی عمر اڑھائی سال تھی۔ آکہ جانم (پھوپھی) آپ سے بہت محبت کرتی تھیں اور ہاتھ پاؤں چومتی تھیں اور کہتی تھیں کہ بالکل میرے بھائی بابر بادشاہ کے ہاتھ پاؤں معلوم ہوتے ہیں، پوری پوری مشابہت ہے۔ میرزا کامران نے خانزادہ بیگم کے پاس جا کر بہت اصرار کیا کہ حضرت بادشاہ کے پاس قندھار جائیں اور ہماری صلح کروا دیں۔ خانزادہ بیگم کی کابل سے روانگی کے بعد میرزا کامران نے اکبر بادشاہ کو اپنی بیوی خانم کے سپرد کیا اور خود بہت سرعت سے قندھار چلے گئے۔

حمیدہ بانو بیگم کو قندھار میں چھوڑ کر آپ (ہمایوں) میرزا کامران کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ آکہ جانم (خانزادہ بیگم) بھی آپ کے ہمراہ تھیں۔ قبلک کے مقام پر آپ بیمار ہو گئیں۔ ہر چند حکیموں نے علاج کیا۔ کچھ فائدہ نہ ہوا، چوتھے دن سنہ ۹۵۲ھ میں رحلت کی

سے پیوستہ ہوئیں۔ اسی قبلچک میں آپ کو دفن کیا گیا۔ مگر بعد میں وہاں سے لا کر حضرت بادشاہ بابام کے مقبرے میں سپردِ خاک کیا گیا۔

خراسان سے واپسی

بارہ رمضان المبارک کی رات کو حضرت بادشاہ نے بالاحصار میں اقبال مندی سے نزولِ اجلال فرمایا۔ میرزا کامران کے آدمی جو آپ کی ملازمت میں آ گئے تھے۔ خوشی کے نقارے بجاتے ہوئے کابل میں داخل ہوئے اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اسی مہینے کی بارھویں تاریخ کو حضرت والدہ دلدار بیگم، گلچہرہ بیگم اور میں ناچیز آپ کے حضور میں آ کر آداب بجا لائے۔ پانچ سال سے ہم لوگ آپ سے جدا اور آپ کی زیارت سے محروم رہے تھے۔ اب اس دُوری اور مجبوری کی سختی سے نجات حاصل کر کے دولتِ وصال سے مالامال ہوئے۔ خوشی سے بار بار ہم سجداتِ شکر بجا لاتے تھے۔ بہت سے جلسے اور دعوتیں ہوئیں جن سے ساری رات جاگتے گزرتی تھی اور برابر گانا بجانا ہوتا رہتا تھا۔

چند دن کے بعد آپ نے کچھ آدمیوں کو بھیجا کہ جا کر حمیدہ بانو بیگم کو قندھار سے لے آئیں۔ جب وہ آ گئیں تو آپ نے جلال الدین محمد اکبر کی ختنہ کی شادی کی۔ اس موقع پر دعوت کا سامان کیا اور نوروز کے بعد سترہ دن تک جشن منایا۔ سب نے سبز پوشاک پہن لی۔ آپ نے فرمایا کہ تیس چالیس لڑکیاں سبز لباس پہن کر باہر پہاڑیوں پر نکلیں۔ نوروز کے دن ہفت وادران کی پہاڑی پر گئے اور بہت سا وقت ہنسی خوشی میں گزارا جب محمد اکبر بادشاہ کے ختنے ہوئے۔ اس وقت آپ پانچ سال کے تھے۔

بھائیوں سے جنگ

اب حضرت بادشاہ قلعہ ظفر کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ میرزا سلیمان کے قبضے میں تھا۔ بادشاہ خیر و سلامتی سے قلعے میں داخل ہوئے۔ منعم خاں کے بھائی فضائل بیگ کو کابل بھیجا کہ وہاں کے آدمیوں کی تسلی کرے۔ کابل سے غلط خبر میرزا کامران کے پاس بھکر پہنچی۔ وہ یلغار کرتے ہوئے کابل روانہ ہو گئے۔ غزنی پہنچ کر زاہد بیگ کو قتل کیا۔ صبح کا وقت تھا، کابل کے لوگ بے خبر بیٹھے تھے، شہر کے دروازے حسبِ معمول کھول دیے گئے۔ سقے اور گھیارے وغیرہ آ جا رہے تھے۔ انھیں عام آدمیوں کے ساتھ میرزا اندر جا پہنچے۔ محمد علی تغائی اس وقت حمام میں تھے انھیں قتل کر دیا اور ملا عبدالخالق کے مدرسے میں مقیم ہو گئے۔ حضرت بادشاہ نوکار کو حرم کے دروازے پر مقرر کر گئے تھے۔ نوکار نے عورتوں کے کپڑے پہن لیے اور بچ کر نکل گیا۔ اتنے میں میرزا کے آدمیوں نے قلعے کے دربانوں کو گرفتار کر لیا اس کے بعد وہ خود قلعے میں گئے اور اہلِ حرم کا مال و اسباب اور بے شمار چیزیں لوٹ لیں۔ بڑی بیگمات کو مرزا عسکری کے مکان میں رکھا اور اس کا دروازہ اینٹ چونے اور گوبر سے بند کر دیا۔ مکان کی چاردیواری کے اوپر سے ان بیگمات کو کھانا پانی دیا جاتا تھا۔ جو لوگ حضرت بادشاہ سے جا ملے تھے۔ اُن کے اہل و عیال سے مرزا کامران نے بہت برا سلوک کیا۔ جب حضرت بادشاہ نے سُنا کہ میرزا کامران نے بھکر سے آ کر یہ گل کھلائے ہیں تو قلعہ ظفر اور اندراب کو چھوڑ کر کابل کی طرف روانہ ہوئے۔ میرزا کامران نے میری والدہ کو اور مجھے

اپنے پاس بلوایا۔ والدہ سے کہا کہ آپ قوربیگی کے مکان میں رہیں اور مجھ سے کہا یہ تمھارا اپنا گھر ہے۔ تم یہیں میرے پاس رہو۔ میں نے کہا۔ میں کیوں یہاں رہوں جہاں میری والدہ رہیں گی وہیں میں بھی رہوں گی۔ پھر مرزا کامران نے کہا تم خضر خواجہ کو خط لکھو کہ وہ ہمارے ساتھ شامل ہو جائے خاطر جمع رکھو جس طرح میرزا عسکری اور میرزا ہندال میرے بھائی ہیں، وہ بھی اسی طرح میرے بھائی ہیں۔ یہ مدد کرنے کا وقت ہے میں نے جواب دیا خضر خواجہ کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا وہ میرا خط کیونکر پڑھیں گے اور میں نے خود کبھی انھیں خط نہیں لکھا بلکہ کسی بیٹے کی طرف سے کوئی اور لکھ دیتا ہے۔ آپ کا جو جی چاہے وہ انھیں خود لکھ کر بھیج دیں۔ آخر میرزا کامران نے مہدی سلطان اور شیر علی کو بھیجا کہ جا کر خان کو جا لاؤ۔ میں شروع سے ہی خان سے یہ کہہ چکی تھی کہ زنہار حضرت بادشاہ سے جدا ہونے کا خیال دل میں نہ لانا۔ خدا کا شکر ہے خان نے اس سے تجاوز نہیں کیا۔

آخر جب حضرت بادشاہ منار کی پہاڑی سے گزر کر آگے بڑھے تو میرزا کامران نے بھی اپنے لشکر کو آراستہ کیا۔ ہم قلعے کے اُوپر سے یہ دیکھ رہے تھے کہ شیر افگن نقاروں کی آواز کے ساتھ بادشتی سے گزر کر جنگ کے لیے آگے بڑھا۔ ہم دل میں کہہ رہے تھے خدا نکرے کہ تو جا کر حضرت بادشاہ کا مقابلہ کرے اور ہم سب رونے لگے۔

حضرت بادشاہ کے آدمیوں نے میرزا کامران کے آدمیوں کو بھگا دیا اور بہت سے گرفتار کر کے بادشاہ کے پاس لے آئے۔ آپ نے مغلوں کو حکم دیا اور انھوں نے اُن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔

سات مہینے تک آپ کابل کا محاصرہ کیے رہے۔ ایک دن یہ اتفاق ہوا کہ مرزا کامران حویلی سے دالان میں جا رہے تھے۔ کسی نے عقابین کی پہاڑی سے گولی چلائی۔ وہ جلدی سے اوٹ میں ہو گئے۔ اس کے بعد سے انھوں نے یہ حکم دیا کہ اکبر بادشاہ کو توپوں کی زد کے سامنے رکھ دیا جائے۔ حضرت بادشاہ کو اس بات کی خبر ہوئی۔ آپ نے حکم دیا کہ توپیں بندوقیں نہ چلائی جائیں۔ اس کے بعد قلعے پر کوئی گولا نہیں کرتا تھا۔ مگر مرزا کامران کے آدمی بادشاہ کے لشکر میں گولے پھینکتے رہتے تھے۔ حضرت بادشاہ نے بیگمات کو لکھا کہ اگر ہم قلعے پر حملہ کریں تو تھوڑی دیر کے لیے محمد اکبر کو کہیں چھپا دینا۔ غرض ہمیشہ لوگ شام کی نماز سے صبح تک قلعے پر پہرا دیتے تھے۔ قلعے میں ایک تنگ زینہ تھا جس سے لوگ فصیل کے اُوپر چڑھ جاتے تھے۔ ایک رات کو جب سب لوگ آرام سے سو رہے تھے زینے کی طرف سے زرہ بکتر اور ہتھیاروں کی جھنکار سنائی دی۔ ہم نے ایک دوسرے سے کہا یہ کیسا شور ہے؟ اُٹھ کر دیکھا تو جلو خانے کے سامنے تقریباً ایک ہزار آدمیوں کا مجمع ہے اس اثنا میں میرزا کامران اچانک قلعے سے نکل گئے۔ خواجہ معظم کو دیوار کے اُوپر سے رسی لٹکا کر باہر نکالا گیا۔ جس مکان میں ہم لوگ بند تھے اس کے دروازے کو ہمارے آدمیوں نے کھول دیا۔ بیگہ بیگم نے اصرار کیا کہ چلو اپنے اپنے مکانوں میں چلے جائیں۔ میں نے کہا ابھی ذرا انتظار کرنا چاہیے۔ گلی کی طرف سے جانا ہو گا شاید حضرت بادشاہ خود ہی کسی کو ہمیں لانے کے لیے بھیجیں گے۔ اتنے میں عنبر ناظر آیا اور کہا کہ حضرت بادشاہ نے فرمایا ہے جب تک میں نہ آؤں تم لوگ اسی مکان میں رہو۔ کچھ دیر کے بعد آپ تشریف لائے۔ مجھے اور دلدار بیگم کو گلے لگایا اور بیگہ بیگم اور حمیدہ بانو بیگم سے ملے اور کہا آؤ جلدی سے یہاں سے نکل چلو۔ خدا دوستوں کو ایسے مکان سے بچائے اور دشمنوں کو نصیب کرے۔ غرض سب اس مکان سے نکلے۔ اس رات ہم سب بادشاہ کے پاس رہے اور ہنسی خوشی میں ساری رات گزاری۔

ایران سے واپس آنے کے بعد ڈیڑھ سال تک آپ صحت اور سلامتی سے کابل میں رہے۔ کچھ عرصے بعد میرزا کامران نے اطاعت قبول کر لی حضرت بادشاہ نے کولاب ان کو دے دیا اور قلعہ ظفر میرزا سلیمان کو، قندھار میرزا ہندال کو اور طالقان میرزا عسکری کو۔

ایک نیام میں چار تلواریں

ایک دن آپ نے اپنا خیمہ کشم میں نصب کیا تھا اور سب بھائی ایک جگہ جمع تھے۔ حضرت ہمایوں بادشاہ، میرزا کامران، میرزا عسکری، میرزا ہندال اور میرزا سلیمان۔ آپ نے فرمایا۔ ہاتھ دھونے کے لیے آفتابہ اور چلمچی لاؤ۔ ہم سب مل کر کھانا کھائیں گے۔ پہلے حضرت بادشاہ نے ہاتھ دھوئے۔ اس کے بعد میرزا کامران نے۔ میرزا سلیمان بلحاظ عمر میرزا عسکری اور میرزا ہندال سے بڑے تھے۔ اس لیے تعظیم کے خیال سے ان دونوں بھائیوں نے آفتابہ اور چلمچی میرزا سلیمان کے آگے رکھ دی۔ ہاتھ دھونے کے بعد میرزا سلیمان نے اپنی ناک چلمچی میں صاف کر دی۔ اس پر میرزا عسکری اور میرزا ہندال بہت خفا ہوئے اور کہا یہ کیا گنوار پن ہے۔ اول ہم لوگوں کی بھلا کیا مجال ہے کہ حضرت بادشاہ کے سامنے ہاتھ دھوئیں۔ آپ نے ہم پر یہ عنایت فرمائی اور حکم دیا تو خیر ہم خلاف حکم نہ کر سکے۔ مگر اس بینی جنبانی کی ادا کے کیا معنی؟ میرزا عسکری اور میرزا ہندال نے باہر جا کر ہاتھ دھوئے۔ میرزا سلیمان بہت شرمندہ ہوئے۔

غرض سب بھائیوں نے مل کر ایک دسترخوان پر کھانا کھایا اس مجلس میں حضرت بادشاہ نے مجھ ناچیز کو یاد فرما کر اپنے بھائیوں سے کہا۔ لاہور میں گلبدن بیگم نے کہا تھا کہ اس کی یہ آرزو ہے کہ اپنے سب بھائیوں کو اکٹھا دیکھے۔ صبح سے جب سے ہم یہاں جمع ہیں اس کی یہ آرزو میرے دل میں آ رہی ہے۔ انشاءاللہ ہماری یکجہتی کو حق سبحانہ اپنے حفظ و امان میں رکھے گا۔ بخدا میرے دل کو یہ گوارا نہیں کہ کسی مسلمان کا بھی نقصان کروں، چہ جائیکہ اپنے بھائیوں کا زیاں چاہوں۔ خدا تم سب کو یہ توفیق دے کہ ہمیشہ ایک دوسرے کے موافق اور معاون رہو۔ سب لوگوں میں ایک عجیب انبساط اور خوشی رونما تھی۔

حرم بیگم

۹۵۶ھ میں بلخ کی طرف روانہ ہوئے۔ میرزا کامران ان دنوں کولاب میں تھے۔ وہاں ترخان بیگہ نام کی ایک عورت تھی جو بہت چالاک اور مکار تھی۔ اس نے میرزا کامران کو یہ پٹی پڑھائی کہ حرم بیگم سے اظہار عشق کرو، اس میں بہت سے فائدے ہیں۔ میرزا کامران اس ناقص العقل کی بات میں آ گئے اور ایک خط اور رومال بیگہ کے ہاتھ حرم بیگم کے پاس بھجوایا۔ اس عورت نے خط اور رومال حرم بیگم کے آگے رکھ دیا اور میرزا کامران کا سلام کہا اور ان کی طرف سے بہت اشتیاق کا اظہار کیا۔ حرم بیگم نے جواب دیا ابھی یہ خط اور رومال اپنے پاس رہنے دو، جب میرزا یہاں باہر سے آ جائیں گے تو پھر یہ لانا۔ بیگہ آغاچہ نے بہت گریہ وزاری کی کہ یہ خط تو میرزا کامران نے آپ کو بھیجا ہے۔ وہ مدت سے تم پر فریفتہ ہیں اور تم اس قدر بے مروتی کرتی ہو۔ یہ سن کر حرم بیگم بہت خفا ہوئیں اور میرزا سلیمان اور میرزا ابراہیم کو اسی وقت باہر بلایا اور کہا معلوم ہوتا ہے کہ میرزا کامران تمہاری بزدلی اور بے غیرتی کو خوب جان گیا ہے جو اس نے مجھے اس قسم کا خط

لکھا ہے۔ کیا میں اسی قابل ہوں۔ میرزا کامران تمھارے بڑے بھائی ہیں اور میں ان کی بہو کی جگہ ہوں، بھلا وہ مجھے ایسا خط بھیج سکتے ہیں۔ پکڑو اس جروا کے ٹکڑے کر ڈالو، تاکہ دوسروں کو عبرت ہو اور آئندہ کوئی کسی کے اہل و عیال کو بری نظر سے نہ دیکھے۔ یہ بھی تو اپنی ماں کی جنی ہے اس کو ایسے پیغام سلام کرتے شرم نہ آئی اور پھر میرے خاوند اور بیٹے کا بھی اسے ڈر نہ ہوا۔ فوراً بیگی آغا بی بی کو پکڑ کر اس کے ٹکڑے کر دیے گئے۔ اس کی قسمت میں اسی طرح خون ہونا تھا۔

حضرت بادشاہ کابل سے نکل کر قبچاق پہنچے تھے۔ وہاں ایک نشیب جگہ میں آپ نے قیام کیا تھا اور میرزا کامران کی نیت سے بے خبر تھے۔ موقع پا کر میرزا کامران پہاڑی کے اوپر سے اپنی فوج لے کر آ گئے اور دفعۃً حضرت کے سر پر ٹوٹ پڑے۔ خدا کی مرضی کچھ یہی تھی کہ ایک کور باطن نے بادشاہ کو زخمی کر دیا۔ آپ کے سر میں زخم آیا، پیشانی اور آنکھیں خون آلود ہو گئیں۔ اسی طرح ایک دفعہ بابر بادشاہ زخمی ہو گئے۔ آپ کے سر پر جو تلوار کا وار ہوا تھا۔ اس سے ٹوپی اور دستار نہیں کٹی تھی مگر سر میں زخم آ گیا تھا۔ ہمایوں بادشاہ ہمیشہ اس پر تعجب کیا کرتے تھے کہ یہ کیا بات ہے ٹوپی اور دستار ثابت رہے اور سر زخمی ہو جائے۔ اب آپ کے سر مبارک کو بھی بالکل ایسا ہی حادثہ پیش آیا۔

مرزا ہندال کی وفات

حضرت بادشاہ کبھی کبھی نارنگیوں کا باغ دیکھنے جایا کرتے تھے۔ اس سال بھی حسب معمول سیر کرنے گئے۔ میرزا ہندال آپ کے ساتھ تھے۔ بیگمات میں سے بیگہ بیگم، حمیدہ بانو بیگم، ماہ چوچک بیگم اور بعض اور عورتیں آپ کے ساتھ تھیں۔ میرا لڑکا سعادت یار ان دنوں بیمار تھا اس لیے میں نہیں جا سکی۔ ایک دن بادشاہ شکار کھیل رہے تھے۔ میرزا ہندال آپ کے ہمراہ تھے۔ میرزا نے بہت سے جانوروں کا شکار کیا تھا اور چنگیز خانی دستور کے مطابق سب حضرت بادشاہ کو پیش کر دیا۔ اپنا سب شکار دے دینے کے بعد خیال آیا کہ بہنوں کا بھی تو حصہ ہونا چاہیے۔ میرزا ہندال دوبارہ شکار کھیلنے میں مصروف ہو گئے۔ میرزا کامران نے ایک آدمی کو مقرر کیا تھا وہ راستے میں چھپا بیٹھا تھا۔ اس نے ایک تیر چلایا وہ آپ کے کندھے میں آ کر لگا۔ آپ نے سوچا کہ کہیں میری بہنیں یا گھر کی عورتیں بہت پریشان نہ ہو جائیں اسی وقت یہ لکھ کر بھجوا دیا کہ

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

یہ زخم ایک سال میں اچھا ہوا۔

ایک سال بعد خبر آئی کہ میرزا کامران دوبارہ فوج جمع کر کے جنگ کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ بادشاہ بھی سامان جنگ کر کے پہاڑی دروں کی طرف روانہ ہوئے۔ میرزا ہندال بھی آپ کے ساتھ گئے۔ جاسوس برابر یہ خبریں لا رہے تھے کہ میرزا کامران آج شب خون ماریں گے۔ میرزا ہندال نے حضرت بادشاہ کو مشورہ دیا کہ آپ بلندی پر چلے جائیں اور برادرم جلال الدین محمد اکبر کو اپنے ساتھ رکھیں۔ میرزا ہندال نے اپنے لیے زرہ بکتر اور جامہ ٹوپی اور خود طلب کیا توشکچی نے بقچہ اٹھایا ہی تھا کہ ایک آدمی نے چھینک دی۔ توشکچی نے تھوڑی دیر کے لیے بقچہ زمین پر رکھ دیا۔ میرزا ہندال نے تاکید کے لیے آدمی بھیجا جب توشکچی حاضر ہوا تو پوچھا اس قدر دیر کیوں ہوئی۔ اس نے جواب دیا کہ

میں نے تیغچہ اٹھایا ہی تھا کہ ایک شخص نے چھین لی۔ میں نے تیغچہ پھر رکھ دیا یوں دیر ہو گئی۔ فرمایا تم نے غلط کیا۔ بلکہ یہ کہو کہ انشاءاللہ شہادت مبارک ہو۔ دوبارہ آپ نے کہا "دوستو گواہ رہو، میں سب حرام چیزوں سے اور ناشایستہ افعال سے توبہ کرتا ہوں۔" حاضرین نے دعا مانگی اور مبارکباد دی۔ فرمایا تیغچہ، جامہ اور زرہ لاؤ۔ پہن کر خندق میں گئے اور سپاہیوں کو حوصلہ دیا۔ اتنے میں آپ کے طبلچی نے آواز سنی اور چلا کر فریاد کی کہ مجھ پر تلوار سے حملہ کر رہے ہیں۔ میرزا آواز سنتے ہی گھوڑے سے اترے اور کہا یارو مردانگی سے بعید ہے کہ ہمارا طبلچی دشمن کی تلوار سے ہلاک ہو جائے اور ہم اس کی مدد نہ کریں۔ آپ خود خندق میں اترے۔ سپاہیوں میں سے کسی کی جرأت نہ ہوئی کہ آپ کے ساتھ جاتا۔ میرزا دو دفعہ خندق سے باہر نکلے اور دشمن پر حملہ کرتے رہے۔ اسی کشمکش میں آپ شہید ہوئے۔

نہیں معلوم کس ظالم نے اس جوان کم آزار کو بے جان کر دیا۔ کاش اس کا وار میرے دل و دیدہ یا میرے بیٹے سعادت یار یا خضر خواجہ خاں پر ہوتا۔ ہائے افسوس ہزار افسوس ؎

اے دریغا اے دریغا اے دریغ　　آفتابم شد نہاں در زیر تیغ

غرض میرزا ہندال نے بادشاہ کے لیے اپنی جان قربان کی۔ میر بابا دوست نے حضرت بادشاہ سے جا کر کہا کہ میرزا ہندال زخمی ہو گئے ہیں۔ آپ نے کہا میرا گھوڑا لاؤ، میں جا کر انھیں دیکھوں گا۔ میر عبدالحئی نے کہا ان کا زخم کاری ہے آپ کا جانا مناسب نہیں۔ بادشاہ سمجھ گئے۔ ہر چند ضبط کیا۔ نہ رک سکے اور رونے لگے۔ جو ساہی خضر خواجہ خاں کی جاگیر تھی۔ بادشاہ نے خضر خواجہ کو بلا کر فرمایا۔ میرزا ہندال کی لاش کو جو ساہی لے جا کر دفن کر دو۔

میرزا کامران

اگر میرزا کامران ظالم، برادر کش، بیگانہ پرور اس رات کو حملہ کرنے نہ آتا تو یہ بلا آسمان سے نازل نہ ہوتی۔ حضرت بادشاہ نے کابل خط لکھے۔ جب آپ کی بہنوں کے پاس یہ خط پہنچے تو تمام کابل ماتم سرا بن گیا۔ گلچہرہ بیگم قراخاں کے مکان میں گئی ہوئی تھیں۔ جب وہ واپس آئیں تو گویا قیامت برپا ہو گئی۔ اس قدر رونے دھونے سے وہ بیمار اور حزیں ہو گئیں۔ اس دن کے بعد ہم نے پھر کبھی نہیں سنا کہ میرزا کامران کو اپنی کسی بات میں کامیابی نصیب ہوئی بلکہ روز بروز تنزل ہوتا گیا اور حالت ابتر ہوتی گئی۔ آخر میں بالکل ہی برباد ہو گئی۔ یوں کہنا چاہیے کہ میرزا کامران کی جان اور ان کی آنکھ کی بینائی میرزا ہندال تھے۔ اس شکست کے بعد میرزا کامران بھاگ کر سیدھے شیر خاں کے بیٹے سلیم شاہ کے پاس پہنچے۔ سلیم شاہ نے انھیں ایک ہزار روپے دیے۔ میرزا کامران نے اپنی کیفیت بیان کی اور مدد چاہی۔ سلیم شاہ نے سامنے کچھ نہیں کہا مگر بعد میں کہا جو شخص اپنے بھائی ہندال کو قتل کر چکا ہو ہم اس کی کس طرح مدد کریں۔ ایسے آدمی کو نیست و نابود کر دینا ہی اچھا ہے۔

میرزا کامران نے بھی سلیم شاہ کی یہ رائے کسی طرح سن لی اور بغیر اپنے آدمیوں سے مشورہ کیے، راتوں رات وہاں سے بھاگ جانے کی ٹھان لی۔ سلیم شاہ نے میرزا کے آدمیوں کو قید کر دیا۔ میرزا کامران بھیرہ اور خوشاب کے قریب پہنچ گئے مگر وہاں آدم گکھڑ نے انھیں گرفتار کر لیا اور بادشاہ کے پاس لے گیا۔ سب خوانین، وضیع و شریف اور سپاہی و رعیت نے متفق ہو کر حضرت بادشاہ سے عرض کی کہ حکومت اور بادشاہی میں رسم برادری نبھ نہیں سکتی۔ آپ کو بھائی کی خاطر منظور ہے تو بادشاہی چھوڑ دیں اور بادشاہ رہنا چاہتے ہیں تو ترک برادری

کریں۔ یہ وہی میرزا کامران ہے جس کی وجہ سے دشت قپچاق میں آپ کا سر زخمی ہوا اور یہ وہی ہے جو مکر اور فریب سے افغانوں کے ساتھ شامل ہو گیا اور جس نے میرزا ہندال کو قتل کیا۔ بہت سے چغتائی اس کے ہاتھوں ہلاک ہو چکے ہیں۔ قصہ مختصر سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ

رخنہ گر ملک سر افگندہ بہ

حضرت بادشاہ نے جواب دیا: "اگرچہ تمھاری یہ باتیں مجھے معقول معلوم ہوتی ہیں مگر میرا دل گوارا نہیں کرتا۔ اس پر سب نے بہت فریاد کی اور کہا کہ جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے وہ عین مصلحت ہے۔ بادشاہ نے فرمایا۔ تم سب کی یہی خواہش ہے تو ایک محضر نامہ لکھ کر پیش کرو۔ دائیں بائیں سب طرف کے امرا نے جمع ہو کر تحریر پیش کر دی۔ اسی مصرع کے مطابق کہ

رخنہ گر ملک سر افگندہ بہ

حضرت بادشاہ مجبور ہو گئے۔

جب آپ رہتاس کے قریب پہنچے تو سید محمد کو حکم دیا کہ میرزا کامران کی دونوں آنکھوں میں سلائی پھیر دو۔ اس نے اسی وقت جا کر حکم کی تعمیل کی۔

اس کے بعد حضرت بادشاہ ......

ترجمہ : عثمان حیدر مرزا

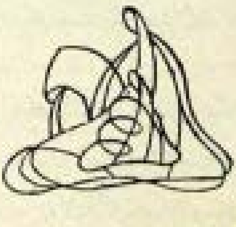

مُلّا عبدالقادر بدایونی

بنی نوع انسان کے اس دعا گو عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی نے سنہ ۹۹۹ھ کے اوائل میں حضرت خلیفۂ زماں ظل الٰہی اکبر شاہ کے حکم کی تعمیل میں انتخاب تاریخ کشمیر کا ہندی سے فارسی زبان میں ترجمہ کرنے سے فراغت پائی۔ مجھے چونکہ بچپن سے بڑھاپے تک اس علم تاریخ سے انسیت رہی ہے اس لیے اس عرصے میں کوئی وقت ایسا نہیں گزرا کہ میں اس علم کے مطالعہ یا تحریر میں مشغول نہیں رہا خواہ اپنی رغبت سے تھا یا کسی دوسرے کے حکم کی تعمیل میں — چنانچہ بار ہا میرے دل میں خیال آیا کہ دارالسلطنت دہلی کے بادشاہوں کے بارے میں اختصار کے ساتھ کچھ لکھا جائے۔ ہو سکتا ہے اس کے مطالعے سے اخلاف میں سے کوئی اس سرائے فانی کی محبت دل سے نکال کر ان جامع اوراق کی جانب دست اعانت بڑھائے۔ چنانچہ یہ امید موہوم نہیں تھی جب کہ ہر دن نئے غم و اندوہ کے ساتھ طلوع ہوتا اور بے اندازہ مصائب و آلام اپنے ساتھ لاتا۔ امداد کم ملتی اور موانع زیادہ پیش آتے اور زمانے کے رنج و محن کے باعث کسی ایک جگہ قیام دشوار تھا۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ میرے ذریعہ معاش کی کوئی مستقل اور یقینی صورت نہ تھی وہ زمین و آسمان کے مابین معلق تھا نیز دل اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کی جدائی میں پریشان تھا اس لیے تاخیر لازمی تھی۔ حسن اتفاق کہیے میرے مشفق دوستوں میں سے ایک نے تاریخ نظامی کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی مگر عمر نے وفا نہ کی۔ اس مرحلے پر جب زمانے نے مجھے قدرے فرصت ے نوازا تو میں نے اپنی زندگی کے گرانمایہ اوقات کا ایک حصہ چرا لیا چنانچہ تاریخ مبارک شاہی اور نظام التواریخ نظامی دونوں کو پیش نظر رکھ کر کچھ مواد ن سے اخذ کیا کچھ اپنی طرف سے بھی اضافہ کیا۔ اس مجموعے کا نام منتخب التواریخ رکھا جس کا مقصد وحید یہ کہ بادشاہان اسلام کے ناموں کو باقی رکھا جائے تاکہ مؤلف کی یادگار بھی اس سرائے مستعار میں رہ جائے۔ امید ہے کہ یہ ناتمام تاریخ آخرت میں بھی میری مغفرت کا موجب ہوگی چونکہ میری اس ریر کی بنا دیانتداری ہے اگر اتفاقاً کوئی سہو اور لغزش زبان قلم پر آ جائے تو امید ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ اپنے کرم عمیم سے درگزر کرے گا۔ اور بخش دے گا

میری ولادت

شیر شاہ نہایت منصف مزاج بادشاہ تھے۔ اس کے عدل و انصاف کی ایسی دھاک تھی کہ بڑھیا بھی اگر جنگل میں سونا اچھالتی ہوئی چلی جائے تو کسی کی مجال نہ تھی کہ اسے نیچی نگاہ سے دیکھ سکے۔ خدا کا میں بڑا شکر گزار ہوں کہ میری پیدائش اس عادل بادشاہ کے انے میں ماہ ربیع الثانی سنہ ۹۴۷ھ میں ہوئی۔

سلیم شاہ نے اپنے ہر سردار کو ایک ایک جوتی اور ایک ایک ترکش دے رکھی تھی ہر جمعہ کو بیس ہزاری دس ہزاری اور پانچ ہزاری کے تمام امیر ہاتھ اونچا خیمہ لگوا کر سلیم شاہ کی جوتی اور ترکش کو ایک کرسی پر رکھتے تھے اور ان چیزوں کو جھک جھک کر سلام کرتے تھے پھر منشی حکم نامہ جو اسی صفحات مل تھا لے کر داخل ہوتا تھا اور اسے اول سے آخر تک پڑھتا تھا اس میں ہر مشکل مسئلے کے حل درج تھے۔ سلیم شاہ کے آخری عہد تک یہی عمل تھا میں ۹۶۰ھ میں کم عمر تھا اس وقت میں فرید تارن پنج ہزاری کے لشکر کے ساتھ اپنے نانا کے ہمراہ گیا تھا جو بجواڑہ کے ماتحت علاقہ ہے وہاں میں نے یہ کیفیت انکھوں سے دیکھی تھی اس سے پہلے سنہ ۹۵۵ھ میں بھی ایک مرتبہ ایسی محفل دیکھ چکا تھا۔

حاکم سنبھل علی قلی خان بہت بہادر اور دانش مند سردار تھا۔ ۹۶۱ھ میں اس نے عدلی (سلیم شاہ کا سالا) کے بیس امیروں کو جو سنبھل پر فوج کشی کے ارادے سے آئے تھے بداؤں کے میدان میں مقابلہ کر کے بھگا دیا تھا۔ پھر اس نے راجا مترسین کٹھریہ کو بھی جو پہلے بھی سنبھل پر قابض تھا اور اب پھر قوت پیدا کر کے حملے کا ارادہ کر رہا تھا قصبہ کندرکی کے میدان میں لڑ کر بُری طرح شکست دی تھی۔ میں اس وقت اپنے والد کے ساتھ سنبھل میں تحصیل علم کے لیے گیا ہوا تھا۔ میری عمر بارہ سال تھی۔ اس پر میں نے فتح کی تاریخ نکالی تھی۔

چہ بس خوب کردہ اند

میرے سنبھل میں آنے سے پہلے میاں حاتم سنبھلی بھی اس لڑائی کا قصہ سن چکے تھے جب میں ان کے پاس "کنز" کا درس لینے گیا تو انھوں نے فرمایا۔

ہم نے فی البدیہہ تاریخ کہی ہے۔ فتح آسمانی شد۔

ذرا حساب کر کے تو بتاؤ اس میں کتنے عدد ہوتے ہیں؟ جب میں نے حساب کیا تو نو سو ساٹھ عدد نکلے میں نے عرض کیا کہ ایک عدد کی کمی ہے۔ فرمایا اضافت کا ہمزہ علما کے اصطلاح کے مطابق پڑھا جائے۔ اس طرح "فتحِ آسمانی شد" مکمل تاریخ ہو گئی۔ اس تاریخ گوئی کے بعد انھوں نے دعائے خیر کر کے میرا سبق شروع کرایا اور کتاب "ارشاد قاضی" کے چند ورق جو خود اپنے ہاتھ سے لکھے تھے مجھے بطور یادگار عنایت فرمائے۔ پھر انھوں نے میاں شیخ ابو الفتح الہدیہ خیر آبادی کے سپرد کر دیا۔ یہ بزرگ اس وقت سے اپنے باپ کے سجادہ نشین ہیں۔

جس وقت علی قلی خان نے کانٹھ اور گولہ کے علاقے فتح کیے اور بداؤں سے گزر کر قصبہ آبار میں گنگا پر پل بندھوایا تو میں اپنے والد کے ہمراہ ان کے لشکر میں امروہہ تک گیا اور وہاں لشکر سے جدا ہو کر سید میر عدل کے ہاں جا کر پڑھنے لگا۔

خشم ایزد ہیمو تین مہینے تک قلعہ بیانہ کا محاصرہ کیے رہا اور بیانہ کے سارے علاقے کو لوٹ مار کر کے برباد کر دیا۔ اسی غارت گری میں میرے والد کی جمع کی ہوئی کتابیں جو بیانہ میں تھیں منتشر ہو گئیں اور ہندوستان کے سارے مشرقی علاقے میں قحط پھیل گیا خاص طور سے آگرہ، دہلی اور بیانہ میں تو ایسا سخت قحط پڑا کہ ڈھائی تنکہ میں ایک سیر جوار ملنے لگی اس دام پر بھی ملنا محال ہو گیا تھا اکثر لوگ گھروں کو بند کر کے بیٹھ گئے اور ایک ایک گھر میں دس دس بیس بیس بلکہ اس سے بھی زیادہ آدمی بھوک سے مر گئے۔ ان بے چاروں کو کفن ملا نہ قبر۔ ہندوؤں کا بھی یہی حال تھا۔ لوگ کیکر کے بیج اور مویشیوں کے چمڑے کھا کھا کر جان بچا رہے تھے۔ ایسی چیزوں کو کھانے کے سبب سے تھوڑے ہی دنوں میں ان کے ہاتھ پیر سوج جاتے تھے اور وہ مر جاتے تھے۔ اس سال کی تاریخ ہے "خشم ایزد"۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ آدمی آدمی تک کا گوشت کھا جاتے تھے۔ ان لوگوں کی شکلیں ایسی ڈراؤنی ہو گئی تھیں کہ ان کی طرف دیکھا نہیں جاتا تھا [illegible] ہیمو کے لشکر میں پانسو ہاتھیوں کو روزانہ چاول، شکر اور گھی کا راتب ملا کرتا تھا۔

۹۶۲ھ میں گوالیار کا قلعہ فتح ہوا "فتح باب قلعہ گوالیار" سے اس کی تاریخ نکلتی ہے۔ اس زمانے میں پڑھنے کے ارادے سے دہلی سے بیانہ اور وہاں سے آگرہ پہنچا تھا اور مہر علی بیگ سے تعارف ہو جانے کی وجہ سے اسی کے گھر پر رہا کرتا تھا۔ مہر علی بیگ نے سفر قلعہ چنار میں مجھے بھی اپنے ہمراہ لے جانے کے لیے بڑا اصرار کیا اور میرے استاد مرحوم شیخ مبارک ناگوری اور والد مرحوم شیخ ملوک شاہ سے بھی سفارش کرائی یہاں تک مجبور کیا کہ اگر وہ میرے ساتھ نہ چلے گا تو میں سفر کا ارادہ ہی ترک کر دوں گا۔ میں مجبوراً تعلیم ترک کر کے عین برسات میں اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ہم لوگ قنوج، لکھنؤ، جون پور اور بنارس کی سیر کرتے ہوئے جگہ جگہ کے عجائبات دیکھتے اور ہر شہر کے علما و مشائخ کی صحبتوں سے استفادہ کرتے ہوئے ماہ ذی قعدہ ۹۶۴ھ میں گنگا کے کنارے آئے اور دریا عبور کر کے چنار پہنچے۔ جمال خاں نے اپنے آدمیوں کو ہمارے استقبال کے لیے بھیجا۔ قلعہ والوں نے ہماری مہمانداری اور ضیافت بڑی کشادہ

ملی کے ساتھ کی جس وقت جمال خاں کو شاہی فرمان پڑھ کر سنایا گیا جس میں قلعہ چنار کے عوض جون پور کے پانچ پرگنے دیئے جانے کا وعدہ تھا تو جمال خاں نے جسے اس سے زیادہ کی توقعات تھیں یہ چاہا کہ مہر علی کو اس وقت تک قلعے میں روک لے جب تک دربار سے اس کے عریضے کا جواب آ جائے۔ اسی اثنا میں اس نے خان زماں سے علیحدہ گفت و شنید شروع کر دی اور تیسری طرف فتح خاں افغان بنی سے بھی جو اپنی جمعیت کے ساتھ رہتاس کے قلعے پر قابض تھا قلعہ سپرد کر دینے کا وعدہ کر لیا۔ جب مہر علی کو اس کے مکر و فریب کا علم ہوا تو اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں فتح خاں اور جمال خاں مل کر اسے کسی آفت میں نہ ڈال دیں۔ اسی ڈر کے مارے وہ یہیں اسی جگہ چھوڑ کر سیر کے بہانے قلعے سے نکلا اور گنگا عبور کر کے تنہا چلا گیا۔ اس کے تمام ساتھی قلعے ہی میں رہ گئے۔

شیخ محمد غوث گوالیاری

اس صورت حال کو دیکھ کر میں نے جمال خاں سے چاپلوسی کی باتیں کیں اور اسے یقین دلایا کہ میں مہر علی کو واپس لا دوں گا۔ اس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی چنانچہ میں شام کے وقت ایک کشتی میں بیٹھ کر گنگا عبور کرنے لگا اتفاق سے کشتی پہاڑ کے دامن میں ایک خوفناک بھنور میں پھنس گئی یہ بھنور قلعے کی دیوار کے قریب ہی تھا۔ اسی وقت ہوا کا ایک تیز سناٹا آیا اور کشتی ڈانواڈول ہونے لگی۔ اگر اللہ کی مہربانی شامل حال نہ ہوتی تو یقیناً کشتی پہاڑ سے ٹکراتی اور اس کے پرخچے اڑ جاتے۔ غرض بڑی مشکلوں سے ساحل سے جا کر لگی۔ اور ہم اس جنگل میں جو کوہ چنار کے دامن میں ہے شیخ محمد غوث کے ٹھکانے پر آ گئے۔ یہ ہندوستان کے ممتاز شیخ اور صاحب دعوت بزرگ تھے اور اس ویرانے میں بارہ سال سے مقیم تھے۔ ان کی گذر بسر جنگل کے پھلوں اور درختوں کے پتوں پر تھی۔

جب مہر علی آگرہ پہنچ گیا تو چنار کے قلعے پر عدلی کے غلام فتو نے قبضہ کر لیا۔ ۹۶۶ھ میں شیخ موصوف اپنے مریدوں اور معتقدوں کے ہمراہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ گجرات سے آگرہ پہنچے اکبر بادشاہ نے بھی نہایت عقیدت مندی کے ساتھ ان کی زیارت کی۔ شیخ گدائی کو حسد اور نفاق کی وجہ سے آگرے میں ان کا قیام نہایت ناگوار گزرا کیونکہ شیخ محمد غوث کی وجہ سے ان کی مشیخت کی دکان پھیکی پڑ رہی تھی۔ ان باتوں سے شیخ محمد غوث ناراض ہو کر گوالیار چلے گئے اور ایک کروڑ کی جاگیر پر جو انھیں بادشاہ کی طرف سے ملی تھی قناعت کر لی۔

سنہ ۹۶۹ھ میں اکبر نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زیارت کے لیے اجمیر کا ارادہ کیا اور وہاں پہنچ کر درگاہ کے مجاوروں کو کثیر انعامات دیے۔ اسی سفر میں جب شاہی قافلہ سانبھر کے قصبے میں پہنچا تو انبیر کے حاکم راجا بہاڑا مل اور اس کا بیٹا بھگوان داس حاضر خدمت ہوئے۔ راجا نے اپنی ایک لڑکی بھی بادشاہ کے نکاح میں دے دی۔ اسی سال میرے والد شیخ ملوک شاہ بھی ۲۰ رجب کو آگرے میں انتقال فرما گئے۔ میں ان کی میت بساور میں لے جا کر دفن کی۔ یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ والد مرحوم کے پیر شیخ ابو الفتح سنبھل جن کے ساتھ مرحوم کو بڑی عقیدت تھی اسی سال محبوب حقیقی سے جا ملے۔

سنہ ۹۷۰ھ میں شیخ محمد غوث کا انتقال ہو گیا۔ ان کی تاریخ وفات ملا اسماعیل عطائی صحافی نے نکالی ہے: "بندۂ خدا شد"۔ اسی سال میرے مخدوم اشرف نے ۲ رمضان کو رحلت کی ان کی تاریخ وفات "فاضل جہاں" ہے۔

محرم ۹۷۱ھ میں بادشاہ نے مندو سے قصبہ آگرہ کا رخ کیا۔ بادشاہ نے شہر نگرچین اسی سال تعمیر کرایا تھا جس وقت اکبر نامہ کی تصنیف ہو رہی تھی ابو الفضل نے اس شہر کی تعریف میں چند سطریں مجھ سے لکھوائی تھیں۔ اب اس شہر اور اس کی عمارتوں کا کوئی نشان نہیں رہا۔ اسی سال بادشاہ نے قصبہ اندری کرنال سے شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے شیخ عبدالنبی محدث کو بلا کر صدر الصدور بنایا اور انھیں یہ اجازت دی کہ مظفر خاں کی مدد سے لوگوں کے روزینے اور معاش مقرر کیا کریں۔

شیخ سلیم چشتی اسی سال شیخ الاسلام فتح پوری چشتی نے جو سنہ ۹۷۱ھ میں حرمین شریفین سے تشریف لائے تھے ایک نئی خانقاہ تعمیر کرائی اس کی عمارت ایسی خوش وضع ہے کہ دنیا میں شاید ہی اس جیسی کوئی خانقاہ ہو۔ ان کی آمد پر میں نے عربی میں ایک خط لکھ کر بدایوں سے روانہ کیا تھا اور ان کے خیر مقدم کی دو تاریخیں درج کی تھیں۔ خانقاہ آٹھ سال میں مکمل ہوئی۔ اکبر نے اسی سال آگرے کے قلعے کی تعمیر کا ارادہ کیا تعمیر کے اخراجات کے لیے فی جریب تین سیر غلے کا محصول لگایا گیا۔ یہ محصول سارے ملک میں امراء اور جاگیرداروں کے کارندوں نے وصول کیا۔ یہ قلعہ پانچ سال میں بن کر تیار ہو گیا۔ اس کی تعمیر پر تقریباً تین کروڑ روپیہ خرچ ہوا۔

سنہ ۹۷۲ھ میں شہنشاہ لاہور سے آگرہ تشریف لائے تھے تو حسین خاں دربار میں حاضر ہوا تھا۔ اس موقع پر اس کی جاگیر میں پٹیالی کے ساتھ شمس آباد کے پرگنے کا اضافہ بھی کر دیا گیا تھا۔ میں اس سے ایک سال پہلے پٹیالی گیا تھا۔ وہاں حسین خاں سے جب ملاقات ہوئی تو میں نے اسے نہایت با اخلاق، منکسر مزاج، درویش صفت، بہادر، سخی، خوش اوقات، پکا سنی، علم پرور اور علم دوست پایا۔ وہ میرے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آیا چنانچہ اس کی رفاقت چھوڑ کر دوسری جگہ جانا اور کسی اور کی ملازمت اختیار کرنا میں نے مناسب نہ جانا اور اسی جگہ ٹھہر گیا اور دس سال اسی گوشہ گمنامی میں اس کی دوستی اور رفاقت میں گزار دیے۔ آسمان بھلا اس خوش وقتی کو کہاں دیکھ سکتا تھا۔ ہماری آپس میں کچھ ایسی رنجش ہو گئی کہ جدائی کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ اس نے میری خفگی دور کرنے کے لیے بڑی کوشش کی اور معذرت چاہی یہاں تک کہ بدایوں جا کر والدہ مرحومہ تک کو بیچ میں ڈالا لیکن میرا دل ایسا پھر اٹھا کہ میں اس کے پاس نہ گیا اور بادشاہ کی خدمت میں پہنچ گیا۔

اسی سال بدایوں میں میری دوسری شادی ہوئی اور "وللآخرة خير لك من الأولى" کا ثبوت مل گیا۔ اس نکاح کی تاریخ ہے۔ ماہی قمری مہر سے شد۔

سنہ ۹۷۶ھ کی پہلی رجب کو بادشاہ دہلی تشریف لائے یہاں سے آخر ماہ شعبان کو شاہی لشکر قلعہ رنتھمبور پہنچا۔ بروز چہار شنبہ ۳ شوال کو یہ قلعہ فتح ہو گیا۔ اکبر نے قلعہ مہتر خاں سلطانی کے سپرد کر دیا اور خود حضرت خواجہ اجمیری کے مزار کی زیارت کے لیے چلا گیا۔ اجمیر سے بادشاہ کی سواری ۲۴ ذی قعدہ سنہ ۹۷۶ھ کو آگرہ پہنچ گئی۔

بادشاہ کے مسلسل کئی ایک لڑکے ہوئے تھے لیکن وہ کمسنی ہی میں اس دنیا سے گزر گئے اسی سال بادشاہ کی ایک بیوی حاملہ ہوئی بادشاہ نے شیخ الاسلام چشتی سیکری سے دعا کرائی اور اس بیوی کو شیخ کے گھر بھجوا دیا۔ شیخ نے اسے پہلے ہی شاہزادے کی ولادت کی خوشخبری دی تھی اور شہنشاہ کو اس سے بڑی مسرت ہوئی تھی اس لیے وہ بار بار شیخ کے گھر جاتے رہے اور بے چینی سے اس وعدے کا انتظار کرنے لگے۔

بادشاہ نے کوہ سیکری پر شیخ کی قدیم خانقاہ کے قریب ایک بڑی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا ایک نئی خانقاہ بنوائی اور ایک وسیع اور بلند سنگین مسجد تعمیر کرائی جو سنگینی میں پہاڑ کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی اور دنیا میں ایسی مسجد کم ہی ہوگی۔ یہ مسجد تقریباً پانچ سال کی مدت میں تعمیر ہوئی۔ اس بستی کا فتح پور نام رکھا گیا اس میں بازار، حمام، چوک وغیرہ بنائے گئے۔

شیخ نے اپنے گھر کی عورتوں کو بادشاہ سے بے پردہ کر دیا۔ ان کے عزیزوں اور لڑکوں نے اعتراض کیا کہ آپ نے تو ہماری عورتوں کو ہم سے بیگانہ کر دیا ہے۔ شیخ نے جواب دیا تم کو میں نے امیر بنا دیا ہے دنیا میں عورتوں کی کمی تو نہیں ہے دوسری بیویاں کرو۔ آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے

یا مکن با پیل باناں دوستی یا بنا کن خانۂ درخورد فیل

قصۂ موسیٰ و موہنی

اس سال کا دلچسپ و عجیب واقعہ سید نکری گرم بیری کے لڑکے سید موسیٰ کی موت کا سانحہ ہے۔ سید موسیٰ کالپی کے معزز سادات کے گھرانے کا نوجوان تھا اور بادشاہی فوج میں ملازم تھا۔ وہ آگرے میں ایک سنار کی لڑکی موہنی پر عاشق ہو گیا جس وقت اعتضیور پر لشکر کشی ہوئی تھی وہ لشکر کے ساتھ نہیں گیا اور قلعہ آگرہ میں جمنا کے کنارے اپنی محبوبہ کے پڑوس میں ایک مکان لے کر رہنے لگا۔ یہ مکان میر سید جلال متوکل کے گھر کے قریب تھا۔ اس کا عشق جنون تک پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ اپنے ہمجولوں کے چند آدمیوں کو لے کر ایک دو بار اپنی معشوقہ کو اس کے گھر سے نکال لایا لیکن ہر مرتبہ یا تو محافظ سپاہیوں نے یا سناروں نے اسے گرفتار کر لیا۔ اس طرح کوئی دو سال چار مہینے بیت گئے۔ اس عرصے میں یہ عاشق و معشوق کبھی کبھی دور سے ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کر لیتے تھے اور بس۔ لیکن دوری و مجبوری آخر کب تک۔ ایک رات موہنی کے اشارے پر وہ کمند لگا کر اپنے محبوب کے کوٹھے پر جا پہنچا۔ وہ رات دونوں نے ہم آغوشی میں گذاری لیکن دونوں پاکباز اور باعفت ہی رہے۔ اس بات کو سید موسیٰ کے بھائی سید شاہی نے اپنی مثنوی "دلفریب" میں بیان کیا ہے۔ رخصت ہوتے وقت اچانک دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ موہنی اپنے گھر بار کو وداع کر کے اور ننگ و ناموس کا خیال چھوڑ کر اپنے چاہنے والے کے ساتھ ہی نکل جائے۔ غرض وہ دونوں اس محلے سے نکل کر بھاگے موسیٰ کے ایک دوست کے گھر پہنچے اور وہاں تین دن تک چھپے رہے۔ موہنی کے عزیزوں نے سید موسیٰ کے گھر کا محاصرہ کر کے ایک فتنہ مچا دیا۔ سید موسیٰ کے بھائی سید شاہی نے مذکورہ بالا مثنوی میں یہ سارا واقعہ لکھا ہے۔ میرے ساتھ اس کا بڑا یارانہ تھا۔ سناروں کو کسی نہ کسی طرح ٹال دیا۔ جب موہنی کو اس ہنگامے کی اطلاع ملی تو اسے سید موسیٰ کی زندگی کی فکر پڑ گئی کہ کہیں اس کے عزیز حاکم شہر کے ذریعے اس کو نقصان نہ پہنچائیں۔ یہ سوچ کر اس نے اپنے چاہنے والے کو بادل ناخواستہ رخصت کر دیا اور اس سے دوبارہ ملاپ کا وعدہ کیا۔ خود بدنامی سے بچنے کے لیے اپنے گھر لوٹ گئی۔ گھر جا کر اس نے ایک بڑا دلچسپ اور کارگر بہانہ کیا کہ اس رات میں بے خبر سو رہی تھی کہ ایک حسین و جمیل شخص آیا اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میری آنکھ کھل گئی تو میں نے اس شخص کو خوب دیکھا۔ اچھی طرح دیکھا تو اس کے سر پر جواہرات کا جڑاؤ تاج رکھا تھا اور اس کے دو نورانی پر تھے۔ اس نے میرے چہرے پر کوئی افسوں پڑھ کر پھونکا اور جب میں مارے حیرت کے دم بخود رہ گئی تو مجھے اپنے پروں میں چھپا لیا اور ایک ایسے شہر میں لے گیا جس کا ذکر داستانوں میں ملتا ہے۔ وہاں لے جا کر اس نے مجھے ایک نہایت خوبصورت اور شاندار محل میں رکھا۔ جاہل ہندوؤں نے اس افسانے کو صحیح سمجھ لیا۔ مصلحت یہی تھی کہ اس واقعہ کو چھپاتے لیکن بچنے کے مارے انھوں نے چند دن تک موہنی کو بالا خانے میں قید کر دیا۔ سید موسیٰ بے چارہ درد فراق میں تڑپتا رہا۔ موہنی کے خیال میں تقریباً دیوانہ ہو گیا۔ ان دونوں کی عشق بازی کا ہر جگہ چرچا ہونے لگا۔ جہاں چار آدمی مل بیٹھتے بس یہ داستان چھڑ جاتی۔ آخر کار موہنی نے مشاطہ کے ذریعے موسیٰ کے پاس کہلا بھیجا کہ میں نے بڑی مشکل اور حیلہ گری سے نجات حاصل کی ہے۔ سید موسیٰ نے اپنی محبوبہ کے کہے پر عمل کیا اور ایک دن صبح اس کے پاس جا کر رخصت ہوا۔ ایک رازدار کو وہاں چھوڑ کر اپنی ملازمت پر اعتضیور چلا گیا۔

موہنی نے موسیٰ کو بھیج تو دیا لیکن رات کا سناٹا اور دن کو گذارنا اس کے لیے دوبھر ہو گیا۔ چند دن بعد اس نے رازدار سے کہا۔ تم ہمارے گھر آکر فقیروں کی طرح صدا لگانا میں دان دینے کے بہانے گھر سے نکل آؤں گی پھر تم مجھے اس شہر سے نکال کر لے جانا۔ چنانچہ اس رازدار کے ساتھ بھاگ گئی۔

سفر کی تیاری پہلے سے کر رکھی تھی۔ تین دن تک تو شہر میں چھپے رہے۔ جب ہر طرح اطمینان کر لیا تو فتح پور اور بیانہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اتفاق سے موہنی کا ایک رشتہ دار اسی راستے پر آ نکلا اور اس نے موہنی کو پہچان کر پکڑ لیا۔ اس زمانے میں آگرے کا کوتوال پہلوان جمال تھا اس نے موہنی

کو رشتہ داروں کے حوالے کیا اور بھگا لے جانے والے کو قید میں ڈال دیا۔ جب بے چارے سید موسیٰ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو مرنے کے قریب ہو گیا۔ جنون کے عالم میں آگرے جانا چاہتا تھا لیکن بھائیوں اور دوستوں نے سمجھا بجھا کر اسے ارادے سے باز رکھا۔ جب لشکر دارالخلافے کو لوٹ آیا تو سید موسیٰ کا حال اور برا ہو گیا۔ چونکہ موہنی کو ایک محفوظ مقام پر رکھا گیا تھا اس لیے باوجود ہزار کوشش کے وہ غریب اپنی محبوبہ کی جھلک تک نہیں دیکھ سکا۔

سید موسیٰ کا ایک دوست قاضی جمال نامی ہندی کا شاعر تھا۔ یہ شخص کالپی کے نواح میں سیوکن پور کا رہنے والا تھا۔ اپنے دوست کی یہ حالت اس سے دیکھی نہ گئی۔ جرأت سے کام لے کر ایک دن وہ مغرب کے وقت اس مکان پر جا پہنچا جہاں موہنی نظر بند تھی اور اسے وہاں سے نکال کر ایک تیز رفتار گھوڑے پر بٹھا لیا اور دریائے جمنا کے چڑھاؤ کی طرف کنارے کنارے گھوڑے کو بھگایا۔ موہنی کے رشتہ دار اس کا تعاقب کرنے لگے۔ گھوڑا تیز تھا لیکن راستے میں بہت سے نالے اور گڑھے تھے اس لیے وہ بچ کر نہ نکل سکا۔ جب موہنی نے یہ حال دیکھا تو خود کو گھوڑے سے نیچے گرا دیا اور قاضی سے کہا تم بچ کر نکل جاؤ، میرا سلام اس بے چارے کو پہنچا دینا۔ جب سید موسیٰ کو اس ناکامی کی خبر ملی تو بالکل ہی مایوس ہو گیا۔ قلعہ آگرہ میں اپنے مکان کا دروازہ بند کر کے بیٹھ رہا۔ اور اس صدمے کے باعث جلد ہی اس کی روح دنیا کی قید سے چھوٹ گئی۔ مرتے وقت اس نے جمالی کی دلسوزی کے ساتھ یہ شعر تین مرتبہ پڑھا۔

از یار دلم ہزار جاں یافت
یارے بہ ازو نمی تواں یافت

پھر اس نے کہا: اے اللہ اس درد کو میری بدنصیب روح کے ساتھ وابستہ رکھنا!

جب اس کا جنازہ موہنی کے گھر کی طرف نکالا گیا، موہنی نے کوٹھے پر سے اس شہید کا جنازہ دیکھا تو جس حال میں تھی اسی میں مبہوت و متحیر رہ گئی۔ اس کا معمول یہ بن گیا کہ صبح سے شام تک کوٹھے پر کھڑی ہوئی سرِ راہ اس طرح تکتی رہتی جیسے وہ برابر جنازے کو سامنے سے گزرتا ہوا دیکھ رہی ہے۔ آخر کار اس کی تاب ختم ہوئی اور اچانک بے قرار ہو کر اسی حالت میں ایک چیخ مار کر کوٹھے پر سے نیچے کود گئی اور بیڑیوں کی زنجیر توڑ، ننگے پیر دیوانہ وار بھاگتی ہوئی اپنے عاشق کے محلے میں جا پہنچی۔ ماں باپ نے یہ حال دیکھا تو صبر کر کے بیٹھ رہے اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اس حالت میں میر سید جلال متوکل کے جو ایک بزرگ درویش و عالم تھے آستانے پر پہنچی اور ان کے سامنے کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کیا پھر اپنے عاشق کی قبر پر جا کر کھڑے قد سے اس طرح گری کہ پھر نہیں اٹھی۔

شہزادہ سلیم کی ولادت

۹۷۷ھ کی ۱۷ ماہ ربیع الاول دن کے سات بجے فتح پور میں شیخ سلیم چشتی کے مکان پر شاہزادہ سلطان سلیم کی ولادت ہوئی۔ سات دن تک شاہانہ جشن منعقد کیا گیا۔ جمعہ ۱۲ شعبان کو بادشاہ نے اپنی منت کے مطابق شہزادے کی ولادت کے شکرانے میں آگرے سے پیدل اجمیر کا سفر کیا، ہر روز چھ سات کوس طے کرتے تھے۔

مہدی قاسم خاں حج سے واپس آ کر قلعہ رنتھنبور میں حاضر خدمت ہوا تھا۔ اکبر بادشاہ نے اس سال لکھنؤ کا پرگنہ حسین خاں سے لے کر اس کی جاگیر میں دے دیا۔ اس کارروائی سے حسین خاں کو بہت رنج ہوا۔ کچھ عرصے بعد جہاد کا ارادہ کر کے لکھنؤ سے اودھ کے راستے سے کوہ کا رخ کیا۔ اس سفر کے موقع پر میں حسین خاں سے اجازت لے کر لکھنؤ سے بداؤں آ گیا تھا۔ بداؤں آنے کے بعد میں نے اپنے مرحوم بھائی شیخ محمد کو جسے میں نے دل و جان سے پالا پوسا تھا اور وہ اپنے اخلاق و عادات میں نہایت سعادت مند لڑکا تھا، ایک اچھے گھرانے میں بیاہ دیا۔

یہ شادی نہیں بلکہ بربادی تھی کیوں کہ تین ماہ بعد ہی شیخ محمود میرا لڑکا عبداللطیف بیمار پڑے اور ایک کے پیچھے ایک سرائے فانی سے کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تیرہ ماہ محرم ۹۷۷ھ کو شیخ سلیم کے مکان میں شہزادہ مراد کی ولادت ہوئی۔ اسی سال ماہ رمضان کے آخر میں شیخ سلیم چشتی فتح پوری نے رحلت فرمائی۔ ان کی تاریخ وفات "شیخ ہندی" ہے۔ اس سال مجھے ایک ہولناک واقعے سے دوچار ہونا پڑا۔ قصہ یہ ہوا کہ جس وقت محمد حسین خاں کو کانت و گولہ کی جاگیر دی گئی تو میں بھی تقدیر کا مارا کچھ عرصے تک اس کی ملازمت میں اس جگہ رہا۔ مجھے اس صوبے کی صدارت اور فقراء کی خدمت سپرد کی گئی تھی۔ قنوج کے مضافات میں بمقام مکن پور حضرت شاہ مدار کا مزار ہے۔ میں اس کی زیارت کے لیے گیا ہوا تھا۔ انسان کی سرشت میں غفلت و جہل ابوالبشر آدم سے وراثتاً چلا آتا ہے۔ میں نے بھی کیا دودھ پیا ہے۔ میری آنکھوں پر بھی غفلت و جہالت کا پردہ پڑ گیا۔ یہاں ایک خوبرو کے کرشمہ و ادا نے مجھے دام ہوس میں پھنسا دیا۔ میں اس حرص و ہوس کو عشق سمجھ بیٹھا۔ پھر جو کچھ گزری، سو گزری۔ درگاہ میں مجھ سے جو بے ادبانہ حرکت سرزد ہو گئی، اس کا خمیازہ خدا کا شکر ہے کہ اسی دنیا ہی میں مل گیا۔ میرے معشوق کی قوم کے چند افراد نے حملہ کر کے مجھے زخمی کر دیا۔ چنانچہ میرے سر، ہاتھ اور کندھے پر پے در پے تلوار کے نو زخم لگے۔ دوسرے تمام زخم تو مندمل ہو گئے لیکن سر کا زخم بڑا گہرا تھا۔ تلوار ہڈی کو توڑتی ہوئی بھیجے تک پہنچ گئی تھی اور بائیں ہاتھ کی ایک انگلی کی رگ بھی کٹ گئی اور انگلی لٹکنے لگی تھی۔ بس جان جانے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں اس حادثے کو جھیل گیا۔ قصبہ بانگر مئو میں ایک ماہر جراح نے علاج کیا اور ہفتہ بھر کے اندر تمام زخم ٹھیک ہو گئے۔ اسی بیماری اور مصیبت میں میں نے منت مانی کہ اچھا ہو جاؤں گا تو حج کروں گا لیکن افسوس ایفائے عہد کی اب تک نوبت نہ آئی۔ غرض کچھ صحت پانے کے بعد میں وہاں سے کانت و گولہ چلا گیا۔ غسل صحت کے بعد پھر میں دوبارہ بیمار ہو گیا۔ حسین خاں نے خدا اسے بہشت جاوداں عطا کرے، باپ اور بھائی کی طرح میری خدمت کی۔ ان دنوں سردی سخت پڑ رہی تھی اس لیے سر کا زخم دوبارہ ہرا ہو گیا تھا۔ اس نے چوب گز کا مرہم اور کھانے کے لیے گز حلوہ تیار کرا دیا۔ میں وہاں سے بدایوں چلا آیا۔ وہاں طبیب نے سر کے زخم کو دوبارہ کھول کر مرہم پٹی کی۔ اس علاج میں ایسی تکلیف ہوئی کہ بس میں موت کے منہ میں جا کر نکل آیا۔ اسی دوران میں ایک دن میں نے کچھ نیند اور کچھ بیداری کے عالم میں خواب دیکھا کہ سپاہی مجھے پکڑ کر آسمان پر لے گئے ہیں۔ وہاں باقاعدہ کچہری لگی ہوئی ہے جس میں کاتب اور محرر مصروف ہیں۔ پیادوں کا ایک جتھا شاہی اجلاس کی طرح ہاتھ میں چھڑیاں لیے ہوئے لوگوں کو ہٹانے اور مؤدب رکھنے میں مصروف ہے۔ مجھے پیش کیا گیا تو ایک محرر ایک کاغذ کو ہاتھ میں لے کر بغور دیکھنے لگا۔ پھر اس نے کہا: "یہ وہ شخص نہیں ہے" اسی عالم میں میری آنکھ کھل گئی۔

آتش زدگی اسی سال بدایوں میں آتش زدگی کا بہت بڑا واقعہ پیش آیا۔ اس حادثے میں اتنے ہندو اور مسلمان ہلاک ہوئے کہ ان کا شمار ممکن نہیں تھا۔ جلی ہوئی لاشوں کو گاڑیوں میں بھر بھر کر دریا میں بہا دیا جاتا تھا۔ ہندو اور مسلمان میت کی کوئی تمیز نہ تھی۔ بہت سے لوگ آگ سے بچ کر قلعے کی فصیل پر چڑھ گئے تھے لیکن آگ نے پیچھا نہ چھوڑا اور وہاں تک پہنچ گئی۔ چنانچہ بہت سی عورتیں اور مرد فصیل پر سے دوسری طرف کود گئے۔ بہت سے گر کر مر گئے اور جو بچے وہ معذور و اپاہج ہو گئے۔ آگ بجھانے کے لیے جس قدر پانی ڈالتے تھے اس کے شعلے اور بلند ہو جاتے تھے۔ پانی بھی تیل کا کام کر رہا تھا۔ میں نے اس آتش زدگی کو خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے بلکہ اس کی لپٹیں میرے کان تک پہنچ چکی تھیں۔ اس حادثے سے پہلے کا قصہ ہے کہ دو آبے کا ایک مجذوب بدایوں آیا تھا۔ میں اسے اپنے گھر لے آیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ تنہائی میں اس نے مجھ سے کہا "اس شہر سے نکل جاؤ"۔ میں نے پوچھا کیوں؟ مجذوب نے جواب دیا "یہاں قدرت ایک کھیل کھیلنے والی ہے"۔ وہ مجذوب مرد درست معلوم ہو رہا تھا

اس لیے مجھے اس کی بات کا یقین نہ آیا، لیکن اس نے غلط نہیں کہا تھا۔

۹۸۰ھ میں گجرات فتح ہوا۔ بعدی قاسم خاں ابراہیم حسین مرزا کے دہلی آنے سے پہلے حسین خاں اپنی جاگیر کانت وگولہ میں بداؤں اور سنبھل کے سرکشوں کی خبر گیری کے لیے گیا ہوا تھا۔ اسی اثنا میں مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری اور راجا بہارامل نے جو وکیل اور وزیر مطلق تھے فتح پور سے اس کو اس مضمون کا خط بھیجا کہ ابراہیم حسین مرزا وہ جگہ شکست کھا کر دہلی کے نواح میں آرہا ہے اور پایۂ تخت بالکل خالی پڑا ہے۔ اس لیے تم جلد از جلد یہاں آ پہنچ جاؤ۔ حسب الطلب وہ دار الخلافہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جس وقت وہ موضع اودھ سے کوچ کر رہا تھا پرگنہ جلیسر کے یہ خبر آئی کہ راجا اودیسر نے جو بادشاہ کے جلوس سے پہلے اب تک آگرے کے نواح میں ملک زنی اور لوٹ مار کرتا رہا ہے بادشاہی امرا کے خلاف سرکشی کر دی ہے اور مردانہ وار جھولا کے بعض بہادر تجربہ کار آدمیوں کو ہلاک کر دیا ہے اب وہ پرگنہ جلیسر میں موضع قنراہی میں چھپا ہوا ہے۔

میدانِ جنگ میں

ماہ رمضان کی پندرھویں دوپہر کو اچانک گولی چلنے اور تیر چھوڑنے کی آواز آئی اور معاملہ الجھ گیا۔ راجا اودیسر نے گنوار اور کی مدد سے اونچے اونچے درختوں پر تختے رکھ کر مچانیں بنالی تھیں وہاں سے اس نے شاہی رسالے پر بندوقوں اور تیروں سے آتش باری کر دی۔ اس اچانک حملے سے بعض مارے گئے اور بعض زخمی ہوئے ایک گولی حسین خاں کے زانو کو زخمی کرتی ہوئی نکل گئی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ میں نے اس پر پانی کے چھینٹے مارے جو لوگ آس پاس تھے ان کو گولی لگنے کا علم نہیں ہوا وہ یہ سمجھے کہ روزے کی وجہ سے غشی ہو گئی ہے میں نے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر ایک درخت کے نیچے جا چھپا تاکہ تیروں کی بوچھاڑ سے پناہ مل جائے اسی حالت میں اس نے اپنی آنکھ کھولی اور حسب عادت مجھے غصے سے گھور کر دیکھا، بھنگے سے اشارہ کرتے ہوئے کہا، الگ ہٹ، یہ کون سا موقع ہے، پھر اس نے خود کو گھوڑے سے اترنے کا حکم دیا سب لوگ پیادہ ہو گئے اس کے بعد ایسی سخت لڑائی ہوئی اور جانبین سے اتنے آدمی قتل ہوئے کہ گنتی محال تھی آخر کار اسلام کی برکت سے ان مٹھی بھر غازیوں کو دشمن پر فتح حاصل ہو گئی۔ بعض خدا کے بندے ایسے بھی تھے کہ اس سختی اور دشواری میں بھی اپنے روزے کی حفاظت کرتے رہے۔ مجھ میں اتنی برداشت نہیں تھی جب میں بالکل ہی بے طاقت ہو گیا تو ایک چلو پانی سے اپنے حلق کو تر کر لیا۔ بعض تو پیاس سے مر گئے۔

اس فتح کے بعد حسین خاں نے کانت وگولہ کا رخ کیا اس وقت ابراہیم حسین مرزا سنبھل سے پندرہ کوس پر لکھنور کے پرگنے میں پہنچا ہوا تھا حسین خاں باوجود زخمی ہونے کے پالکی میں سوار ہو کر مرزا کے مقابلے پر بانس بریلی پہنچا۔ مرزا امروہہ کے راستے سے لوٹ گیا اس اثنا میں خبر ملی کہ مرزا نے امروہہ پر حملہ کر کے تاخت و تاراج کیا اور اب گنگا عبور کر کے لاہور کی طرف یلغار کر رہا ہے۔ حسین خاں یلغار کرتے ہوئے گڑھ مکتیسر پہنچ گیا۔ حسین خاں مرزا کے پیچھے لگا ہوا تھا اس کے پیچھے دوسرے امیر بھی تعاقب میں شامل تھے یہاں تک کہ یہ سب سرہند جا پہنچے یہاں سے یلغار کرتے ہوئے لدھیانہ پہنچ گیا۔

شیخ داؤد جہنی وال

مرزا آگے بڑھ کر شیر گڑھ جہنی تک پہنچا اس وقت حسین قلی خاں نگرکوٹ اور قلعہ کانگڑہ کی تسخیر پر لگا ہوا تھا جب اسے مرزا کے متعلق اطلاعات ملیں تو اس نے جلدی سے مصالحت کر لی اور مرزا کے تعاقب میں سکھ پہنچ گیا۔ حسین خاں نے قسم کھائی کہ جب تک میں حسین قلی سے جا کر نہ مل لوں کھانا نہیں کھاؤں گا چنانچہ اس نے دریائے بیاہ و دریاس کو عبور کیا اور شیر گڑھ میں جہنی کے قریب پہنچا وہاں حضرت غوث الاقطاب شیخ داؤد قادری جہنی وال کی خدمت میں حاضری دی۔ جب دسترخوان بچھایا گیا تو حسین خاں نے کھانے سے معذرت چاہی۔ حضرت نے فرمایا، قسم کا کفارہ آسان ہے اور دوستوں کا دل دکھانا بڑی نادانی ہے خان نے اسی وقت ایک

غلام آزاد کر کے کفارہ دیا اور کھانا تناول کیا۔ حضرت کی دعاؤں سے فیض یاب ہوا۔ سارے لشکر کی بھلائی حضرت کے لنگر کی طرف سے کی گئی۔ گھوڑوں کے لیے حضرت کے خاص مزرعہ سے گھاس اور دانہ مہیا کیا گیا۔ حسین خاں نے صبح وہاں سے کوچ کیا۔

میں اس کی روانگی کے تیسرے دن لاہور سے شیر گڑھ پہنچا اور حضرت موصوف کی خدمت میں چار دن تک رہا۔ میں نے وہاں جو انوار و فیوض دیکھے ان کا اس سے پہلے میں تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ میرا تو ارادہ ہو گیا تھا کہ ترکِ دنیا کر کے حضرت کی خانقاہ میں جاروب کشی اختیار کر لوں لیکن حضرت راضی نہ ہوئے اور فرمایا کہ بس اب تم ہندوستان چلے جاؤ۔ مجبوراً میں ان سے رخصت ہو کر نہایت غمگین اور پریشان حال روانہ ہوا۔ خانقاہ سے نکلتے وقت غم کے مارے بے اختیار میری چیخیں نکل گئیں۔ جب حضرت کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے باوجود اس معمول کے کہ ان کی خانقاہ میں تین دن سے زیادہ کسی کو ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی چوتھے دن بھی مجھے رہ جانے کی اجازت دے دی۔ اور مزید افادات مرحمت فرمائے۔ جو باتیں بتائیں ان کی لذت سے دل اب تک مسرور ہے۔

بارگاہ سلطانی میں

ماہ ذی الحجہ ۹۸۱ھ کے آخر میں، میں حسین خاں کی ملازمت ترک کر کے بداؤں سے آگرہ پہنچا اور جلال خاں قورچی اور جالینوس مرحوم حکیم عین الملک کے وسیلے سے دربار شاہی میں باریاب ہوا۔ ان دنوں علم کی بڑی قدر و قیمت تھی۔ پہلی حاضری میں ہی بادشاہ سے مخاطبت کا اعزاز حاصل ہوا۔ اور ہم نشینوں میں داخل کر لیا گیا۔ بادشاہی محفل کے علما کا یہ حال تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی علمیت کا ڈنکا بجانے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ کسی دوسرے کو ذرہ برابر بھی اہمیت نہ دیتے تھے۔ بحث مباحثہ کر کے اسے نیچا دکھانے اور خود سربلند ہونے کی تدبیریں کرتے تھے۔ میری جوانی کا عالم تھا۔ اللہ کی عنایت سے قوتِ طبع، ذکاوت اور دلیری کوٹ کوٹ کر بھری تھی اس لیے میں جلد ہی ان میں سے اکثر پر چھا گیا۔ جس وقت میں دربار میں حاضر ہوا بادشاہ نے میری تعریف کرتے ہوئے کہا: "بداؤں کا یہ عالم حاجی ابراہیم سرہندی کا مزاج ٹھکانے لگا دے گا۔" بادشاہ کی خواہش تھی کہ حاجی ابراہیم کو نیچا دکھایا جائے۔ میں نے اس پر بڑے چست الزامات لگائے جو بادشاہ کو پسند آئے۔ شیخ عبدالنبی صدر الصدور کے پاس میرا وسیلہ اور رسائی نہیں تھی اس لیے وہ مجھ سے ناخوش ہی تھا۔ وہ مناظرے کے وقت فریق کی طرفداری کر رہا تھا۔ بعد میں عبدالنبی کے ساتھ یہ پرخاش ختم ہو گئی اور ہماری آپس میں خوب نبھنے لگی۔ انھی دنوں شیخ مبارک ناگوری کا لڑکا شیخ ابوالفضل کہ اس کے علم و فضل کا ستارہ عروج پر تھا، باریاب ہوا اور بڑے اعزاز و اکرام سے نوازا گیا۔

۹۸۲ھ میں صفر کی آخری تاریخ کو اکبر نے بنگالہ کی فتح کے ارادے سے کوچ کیا اور بذات خود سرتاہی کشتی پر سوار ہوا۔ مرزا یوسف خاں کو لشکر کی سرداری پر مامور کر کے خشکی کے راستے روانگی کا حکم دے دیا اور شہاب الدین احمد خاں کو آگرے کی حفاظت پر چھوڑا۔ خود دریا کے راستے روانہ ہو گئے۔ اس موقع پر میں نے یہ رباعی کہی تھی۔

شاہنشہ دادگستر دیں پرور جمشید جہاں ستاں محمد اکبر
بنشست بہ روئے بحر چوں اسکندر ہم بحر بہ فرمان وے آمد ہم بر

اس مہم میں بڑے شاہزادے بھی بادشاہ کے ہمراہ تھے۔ اس وقت دریا پر اتنی کشتیاں اور ڈونگے تھے کہ دریا کی سطح نظر نہیں آ رہی تھی۔ ملاح اپنی مخصوص زبان میں بڑی خوش آوازی کے ساتھ الاپ رہے تھے۔ ان کے گیت ایسے سریلے تھے کہ مچھلیاں پانی میں اور پرندے ہوا میں رقص کرتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ یہ سارا منظر اتنا دلکش تھا کہ اس کے بیان سے زبان قاصر ہے۔ روزانہ کشتیوں سے اتر کر سیر و شکار کیا جاتا تھا اور

رات میں جب لشکر ڈال دیے جاتے تو علمی مباحثے اور شعر گوئی کی محفلیں جمتیں اور آپس میں بڑی دلچسپ چشمکیں ہوتیں۔

اہل بیت کا خاص علم

دریائے اٹک کی سیاحت میں تاریخ گو سید میر کی اصفہانی منجم نے جو خان زماں کی شکست کے بعد سے جون پور ہی میں مقیم تھا نقیب خاں کی فرمائش پر نجوم کی کتاب اعظم کا مطالعہ کیا اور مرکب و مرتب حروف کا استخراج کر کے اس نے فال نکالی تو یہ شعر بر آمد ہوا۔

بزودی اکبر از بخت ہمایوں برد ملک از کف داود بیروں

حسن اتفاق کہ اس فال کے مطابق پیش آیا۔ واپسی میں جب جون پور میں بادشاہی لشکر نے کیمپ لگایا تو سید موصوف دربار میں حاضر ہوا۔ پھر نجوم سے فال نکالی اس وقت یہ شعر بر آمد ہوا۔

مژدۂ فتح بناگاہ رسید سر داود بدرگاہ رسید

میری اس ماہر نجوم سے انہی دنوں شناسائی ہوئی تھی۔ میں نے اس علم کے سکھانے کی درخواست کی تو اس نے قبول کر لیا اور کہا "یہ اہل بیت کا خاص علم ہے اور اس کے لیے چند شرائط کی پابندی لازمی ہے۔" آخر مجھے معلوم ہوا کہ یہ شرطیں شیعوں کے بعض مسائل کی تقلید سے متعلق ہیں اور یہ فال بھی دوسری فالوں کی طرح جعلی اور اختراعی ہوتی ہے۔ ہر شخص اپنی قوت ارادی سے کام لے کر ایسی فال بر آمد کر سکتا ہے۔ اس کا مجھے مشاہدہ بھی ہوا۔ بلکہ میں نے خود بھی تجربہ کر کے دیکھ لیا اور سید کی تعلیم کا احسان اٹھائے بغیر ہی میں نے فال کے اس طریقے کو سیکھ لیا۔

سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ

ہماری لاہور آمد سے قبل جب خیر گڑھ صوبہ فتح پور میں منزل ہوئی تو بادشاہ نے مجھے مخاطبت سے نوازا اور حکم دیا کہ میں مطلع آمر کی طرح سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ کروں۔ اس میں ۳۲ حکایتیں ہیں جو مالوے کے راجا بکرماجیت سے متعلق ہیں۔ بادشاہ کا ارشاد تھا کہ میں آج ہی اس کام کو شروع کر دوں اور اس کا ایک ورق لکھ کر دکھا دوں۔ ایک برہمن کو ترجمانی کے لیے مقرر فرما دیا۔ اسی دن میں نے جب ایک کہانی کا پہلا صفحہ لکھ کر پیش کیا تو بادشاہ نے بڑی تحسین و تعریف کی۔ جب اس کتاب کا ترجمہ ہو گیا تو اس کا نام نامہ خرد افزا تجویز ہوا اس میں اس کا تصنیفی پس منظر اور تاریخ بھی شامل کر دی گئی ہے۔ بادشاہ نے اس کو پسند فرمایا اور شاہی کتب خانے میں داخل کرا دیا۔

انہی دنوں بادشاہ کی محفل میں ایک بڑا دلچسپ لطیفہ پیش آیا۔ حاجی ابراہیم سرہندی ہمیشہ علماء سے الجھتا رہتا تھا جس وقت تاشکندی نے اپنی تفسیر پیش کی تو حاجی نے مرزا مفلس کو چھیڑنے کے لیے پوچھا کہ "موسیٰ" کون صیغہ ہے اور کس مادے سے مشتق ہے۔ مرزا مفلس علوم عقلیہ کے بڑے عالم تھے۔ اتفاق کی بات اس کا جواب جیسا دینا چاہئے نہ دے سکے اور عوام نے باور کر لیا کہ حاجی ابراہیم بلحاظ علم سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ کچھ لوگوں نے قاضی زادہ لشکر سے جسے بادشاہ نے متھرا کا قاضی بنایا تھا کہا کہ تم بحث میں حصہ کیوں نہیں لیتے؟ اس نے بے ساختہ جواب دیا اگر حاجی ابراہیم مجھ سے "عیسیٰ" کا صیغہ پوچھ بیٹھے تو میں بھلا کیا جواب دوں گا؟

اس تاریخ سے اب تک دس سال کی مدت گذر چکی ہے ان مباحثہ کرنے والوں میں سے جو سب سے زیادہ تھے، محقق و معتقد کوئی بھی نظر نہیں آتا۔ سب کے چہروں پر موت اپنا سیاہ نقاب اوڑھا چکی ہے۔ بے شک کل نفس ذائقۃ الموت

ذلیل درد کشاں غیر یا نماند کسے بیار بادہ کہ ما ہم غنیمتیم بسے

وہ محفلیں اجڑ گئیں اور میں اکیلا سوگوار رہ گیا ہوں۔ جب بھی ان کی یاد آتی ہے تو میری غمزدہ آنکھیں حسرت کے ساتھ خون کے آنسو روتی ہیں اور دل نالہ و فریاد کرنے لگتا ہے کاش وہ لوگ کچھ دن اور جی جاتے۔ بس کس سے بات کریں۔ تبادلہ خیالات کی لذت تو بس ان کے ساتھ ہی چلی گئی اب مجھ ناکارہ و افسردہ کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں رہا کہ ان کی جدائی کے داغ سے جلتا اور چپکے چپکے آہ و فریاد کرتا رہوں۔

افسوس کہ یاراں ہمہ از دست شدند
در پائے اجل یگاں یگاں پست شدند
بودند تنک شراب در مجلس عمر
یک لحظہ زما پیشترک مست شدند

انھی دنوں شیخ ابوالفضل جسے علامی بھی لکھا جاتا ہے اور اسی نے بے دینی کا یہ سارا ہنگامہ برپا کیا تھا بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔ باریابی کے وقت اس نے آیت الکرسی کی تفسیر پیش کی لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ تفسیر دراصل اس کے والد کی لکھی ہوئی تھی۔ بادشاہ نے اس تفسیر کو پسند فرمایا اس کی تاریخ "تفسیر اکبری" نکالی گئی بادشاہ نے مغرور و متکبر علما کی سرکوبی کی توقع مجھ سے لگا رکھی تھی اس کام کے لیے اب انھیں موزوں آدمی مل گیا۔

شیخ ابوالفضل نے جلد ہی اپنی خدمات، زمانہ سازی، بددیانتی، مزاج شناسی اور خوشامد کے ذریعے بادشاہ کا تقرب حاصل کر لیا۔ بحث و مباحثہ کے وقت اگر کوئی کسی مجتہد کا قول پیش کرتا تو وہ نہایت جسارت سے کہا کرتا تھا کہ فلاں حلوائی، فلاں موچی، اور فلاں چرم فروش کا قول ہمارے لیے حجت نہیں ہے۔ غرض علما کا انکار اور ان کی توہین اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

دین الٰہی کی ابتدا

۹۸۳ھ میں عبادت خانوں کی تعمیر مکمل ہوئی اکبر کا معمول تھا کہ ہر جمعہ کو نماز کے بعد شیخ الاسلام کی جدید خانقاہ سے اس عبادت خانے میں آکر مجلس منعقد کرتا تھا۔ اس میں نامی علما، مشائخین اور چند خاص مصاحب اور ندیم ہی شریک ہوا کرتے تھے دوسروں کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس محفل میں عموماً علمی مباحث اور مذاکرے ہوا کرتے تھے۔ بادشاہ کے قریب نشستیں لینے کے لیے اکثر تقدیم و تاخیر کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور لوگ آپس میں بڑی بدتہذیبی کا مظاہرہ کرتے تھے اس لیے اکبر نے باقاعدہ نشستوں کا تعین کر دیا تھا کہ امرا تو مشرقی جانب بیٹھیں، سادات مغربی جانب، علما کی نشست جنوبی حصے میں اور مشائخین شمال میں۔ اکبر باری باری ہر ایک کی نشست گاہ میں جا کر ان کے مباحثوں میں حصہ لیا کرتا تھا۔ گجرات کی فتح کے موقع پر اعتماد خاں گجراتی کی جمع کی ہوئی بہت ساری قیمتی کتابیں غنیمت میں آئی تھیں۔ ان کتابوں کو اکبر نے خود اپنے ہاتھ سے اس محفل میں آنے والے علما میں تقسیم کیا۔ مجھے بادشاہ نے جو کتابیں دی تھیں ان میں ایک کتاب "انوار المشکوٰۃ فی الانوار" کے نام سے ایک فصل کا اضافہ بھی شامل تھا۔

ایک رات اس محفل میں بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا وہ چیخ چیخ کر بحث کرنے لگے۔ ان کے شور و غل سے بادشاہ نے برہم ہو کر مجھ سے کہا: "اس کے بعد جو شخص بھی ناشائستہ بات کرے اس کی اطلاع مجھے دینا۔ میں اس کو مجلس سے اٹھا دوں گا۔" میں نے اس وقت آصف خاں سے چپکے سے کہا: "اس طرح تو تقریباً سبھی کو اٹھانا پڑے گا۔" اکبر نے مجھے یہ بات کہتے ہوئے دیکھ لیا، پوچھا: "کیا کہہ رہے ہو؟" جو کچھ میں نے کہا تھا دہرایا وہ بہت خوش ہوا اور اپنے مصاحبوں کو بھی یہ بات بتائی۔

انھی دنوں بادشاہ نے مجھے امامت کی خدمت سپرد کی اور کچھ خرچ دے کر فرمایا: "ضابطہ جدیدہ کے مطابق تم بھی بیس گھوڑوں کو داغ

کرالو۔ اسی زمانے میں شیخ ابوالفضل بھی دربار میں پہنچا تھا اور جیسا کہ شبلی نے جنید کے متعلق کہا تھا ہم دونوں ایک ہی تنور سے نکلے ہیں میرا اور ابوالفضل کا معاملہ یکساں تھا لیکن وہ نہایت ہوشیار اور زمانہ ساز آدمی تھا۔ اس کو بھی بادشاہ نے گھوڑے داغ کرانے کے لیے فرمایا تو اس نے فوراً ہی داغ اور محلّہ کرا کے اپنی ملازمت مضبوط کر لی اور ترقی کرتے کرتے دو ہزار کے عہدہ اور وزارت کے منصب تک پہنچ گیا۔ اس کے برعکس میں نے ناتجربہ کاری اور سادہ لوحی کی وجہ سے اس ملازمت کی پیشکش کو قبول نہ کیا۔ میں اسی خام خیالی میں رہا کہ بجائے ملازمت کے مجھے مددِ معاش کے لیے اگر بادشاہ کوئی اراضی وغیرہ عنایت فرما دیں تو ایک گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر آزادی کے ساتھ علمی خدمت میں مصروف رہوں گا۔ کیوں کہ قناعت اور توکل سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اور پونجی نہیں ہو سکتی۔

لیکن میری بدنصیبی دیکھو، مجھے وہ بھی میسر نہ ہوا۔ آخر ماہ شوال ۹۸۲ھ میں میں نے دربار سے رخصت کی درخواست دے دی۔ بادشاہ نے اسے منظور نہ فرمایا۔ مجھے ایک گھوڑا اور ہزار بیگہ اراضی عطا فرمائی جو اس زمانے میں بیس گھوڑوں کے متوقع واتب کے لیے کافی ہو جاتی تھی۔ اس سلسلے میں جو فرمان لکھا گیا تھا اس میں یہ عطیہ مددِ معاش کے صیغہ میں لکھا گیا تھا۔ میں نے بہت کچھ عرض کیا کہ اس مختصر اراضی پر ہمیشہ خدمت سے وابستہ رہنا میرے لیے مشکل ہوگا لیکن کوئی توجہ نہ کی گئی۔ بادشاہ نے صرف یہ فرمایا: "لشکروں میں قیام کے موقع پر امداد اور انعام تمھیں دیا جاتا رہے گا۔" اس مختصر معاش پر بھی شیخ عبدالنبی نے کہا: "ہم نے تمھارے گروہ کے آدمیوں میں کسی کو اتنی امداد نہیں دی۔" جس امداد اور انعام کا وعدہ کیا گیا تھا کہ وہ اب تک کہ بائیس سال ہو چکے ہیں بجز ایک دو بار کے پورا نہیں کیا گیا اور وہ وعدہ ایک سراب سے زیادہ نہ تھا جس کے عوض میں خواہ مخواہ بے ہودہ بندشوں اور لاحاصل خدمتوں میں پھنس کر رہ گیا۔ اب خدا ہی چاہے تو ان سے نجات ملے۔ بہرحال جس طرح بھی گذری اور گذر رہی ہے اس پر خدا کا شکر ہی ادا کرنا چاہیے۔

متعہ پر اتفاق

اس زمانے میں اکبر نے علماء سے یہ مسئلہ پوچھا تھا کہ کتنی آزاد عورتوں کو نکاح میں رکھنا درست ہے؟ علماء نے کہا "چار سے زائد آزاد عورتوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنا منع ہے۔" اکبر نے کہا: "ہم تو جوانی میں اس کے پابند نہیں رہے۔ جتنی عورتوں کو چاہتے تھے نکاح میں لے لیتے تھے خواہ وہ آزاد ہوں یا غلام۔ اب اس کی تلافی کیسے ہو سکتی ہے؟" اس سلسلے میں مختلف لوگوں نے مختلف باتیں بتائیں۔ اکبر نے پھر کہا: "ہم نے شیخ عبدالنبی سے سنا ہے کہ ایک مجتہد کے نزدیک تو نو عورتوں سے بھی نکاح کیا جا سکتا ہے۔" علماء نے کہا: "ہاں ایک مجتہد ابن ابی لیلیٰ کا یہ بیان ہے۔ بعض نے تو آیت پاک فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ کے ظاہری مفہوم پر تو اٹھارہ عورتوں تک کو جائز قرار دیا ہے لیکن یہ ساری روایتیں مرجوح ہیں۔ ان پر عمل جائز نہیں ہوگا۔" بادشاہ نے شیخ عبدالنبی سے بھی دریافت کیا۔ اس نے جواب دیا: "میں نے جو کچھ کہا تھا اس سے ان اختلافات کا اظہار کرنا مقصود تھا۔ اس کے جواز کا میں نے فتویٰ نہیں دیا تھا۔" عبدالنبی کا یہ جواب بادشاہ کو بڑا ناگوار گذرا اور اس نے کہا: "اس طرح تو شیخ نے ہمارے ساتھ منافقت برتی کہ اس وقت کچھ کہا تھا اور اب کچھ اور کہہ رہا ہے۔" بس اسی وقت سے شیخ عبدالنبی کی طرف سے بادشاہ کا دل کھٹک گیا۔

ایک رات "انوپ تلاؤ" کے حجرے میں بادشاہ کے پاس قاضی یعقوب، شیخ ابوالفضل، حاجی ابراہیم اور ایک اور عالم بیٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت شیخ ابوالفضل نے علماء کی مخالفت کرتے ہوئے ان روایتوں کو جو اس کے والد نے جمع کی تھیں بیان کیا۔ بادشاہ نے مجھے بھی وہاں بلا کر پوچھا: "تم کیا کہتے ہو؟" میں نے عرض کیا: "ان تمام روایتوں کا جھگڑا بس ایک بات پر ختم ہو جاتا ہے۔ متعہ امام مالک اور شیعہ علماء کے نزدیک مباح

ہے امام شافعی اور امام اعظم کے نزدیک حرام ہے جب مالکی مذہب کا قاضی اس کا حکم باضابطہ صادر کر دے تو اسی وقت امام اعظم کے مذہب میں بھی بالاتفاق مباح ہو جاتا ہے۔" بادشاہ کو میری بات بہت پسند آئی۔ قاضی یعقوب نے مجھ سے بہت بحث کی۔ میں نے کہا۔ "جو مسئلہ مختلف فیہ ہو وہ قاضی کے حکم کے بعد متفق ہو جاتا ہے۔" اپنے اس دعوے پر امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے مسئلے کو اور دوسری مثالوں کو بطور دلیل پیش کیا۔ بادشاہ نے فرمایا۔ "ہم قاضی حسین عرب مالکی کو قاضی بناتے ہیں اور قاضی یعقوب کو آج سے معزول کرتے ہیں۔" اسی وقت قاضی حسین کو وکیل بنا دیا گیا اور اس نے اپنے مذہب کے مطابق متعہ کے جواز کا حکم دے دیا۔ تمام بڑے عالموں، صدر سے لے کر مخدوم الملک اور قاضی وغیرہ کے لیے ایک عجیب صورت حال پیدا ہو گئی اور اسی روز سے ان سب کا زوال شروع ہو گیا۔

فرنگیوں کی آمدورفت

کچھ عرصے بعد ملا محمد یزدی جسے عام طور پر یزیدی کہا جاتا تھا، ایران سے آیا اور گیلان کے ان بھائیوں کے ساتھ مل کر بادشاہ کو شیعیت کی طرف مائل کرنے لگا۔ چناں چہ وہ صحابہ پر زبان طعن دراز کرتا تھا۔ اور بادشاہ سے جھوٹے قصے بیان کرتا تھا۔ بیربر حرام زادہ، شیخ ابوالفضل اور حکیم ابوالفتح تو اس یزیدی سے بھی آگے بڑھ گئے انھوں نے بادشاہ کو سرے سے دین ہی سے منحرف کر دیا اور وحی، نبوت، معجزہ، کرامت، اور شریعت کے متعلق انکار پر آ گئے۔ میں ان لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکا۔ اسی زمانے میں فرنگیوں کی آمدورفت بھی ہونے لگی اور بادشاہ نے ان کے بعض عقلی اعتقادات کو بھی قبول کر لیا۔

اتھروید

اسی سال (۹۸۳ھ) شیخ بھاون جو دکن کا ایک عقلمند برہمن تھا دربار میں پہنچا اور اپنی مرضی سے مسلمان ہو کر بادشاہ کے مصاحبوں میں شامل ہو گیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اتھربن جو ہندوؤں کی مشہور چوتھی وید ہے اور اس کے بعض احکام اسلام کے مطابق ہیں ترجمہ کیا جائے۔ ہندی سے فارسی میں ترجمے کے لیے مجھے نامزد کیا گیا۔ اس کتاب کی بعض عبارتیں نہایت پیچیدہ تھیں اور جو شخص مقرر تھا وہ اس کی صحیح تعبیر نہیں کر پاتا تھا اس لیے اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ میں نے یہ مشکل بادشاہ کے سامنے پیش کی تو بادشاہ نے یہ کام پہلے تو شیخ فیضی کے اور بعد میں حاجی ابراہیم سرہندی کے سپرد کیا۔ وہ بھی خاطر خواہ اس کا ترجمہ نہ کر سکا۔

حسین خاں کی وفات

حسین خاں بسنت پور کے کوہستان میں لڑتے ہوئے زخمی ہو گیا۔ ایک گولی اس کے شانے کو توڑتی ہوئی نکل گئی۔ جب وہ ہر طرف سے مجبور ہو گیا تو ناکام و نامراد لوٹ آیا اور دریائے گنگا کے راستے سے پٹیالی کی طرف جہاں اس کے اہل و عیال مقیم تھے روانہ ہوا۔ جب گڑھ مکتیسر پہنچا تو سرکاری آدمیوں نے اسی زخمی حالت میں اسے گرفتار کر لیا اور آگرے لے جا کر نظر بند کر دیا۔ بادشاہ کے حکم سے شیخ بینا طبیب علاج کے لیے فتح پور سے آگرہ آیا۔ اس نے اطلاع دی کہ زخم نہایت خطرناک ہے۔ بادشاہ نے معالجے کے لیے حکیم عین الملک کو جانے کا حکم دیا۔ قدیم روابط کی بنا پر میں بھی حضور سے اجازت لے کر حکیم عین الملک کے ساتھ گیا۔ عرصہ بعد اس سے میری ملاقات ہوئی۔ دو بچھڑے ہوئے دوست گزرے ہوئے زمانے کی یادوں کو سنبھالے نہایت رقت و حسرت کے ساتھ ایک دوسرے سے ملے۔ ابھی میں اسے اور وہ مجھے دیکھ ہی رہا تھا کہ بادشاہی جراح آ گئے اور انھوں نے ایک بالشت لمبا نشتر زخم میں ڈال کر اسے چیر دیا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس نے اُف تک نہ کی، نہ پیشانی پر بل آیا بلکہ وہ بے تکلفی کے ساتھ مسکراتا رہا۔ جب میں رخصت ہوا تو گویا معلوم تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ چناں چہ فتح پور پہنچنے کے تین چار دن بعد ہی ہمیں اطلاع ملی کہ حسین خاں سخت اسہال میں مبتلا ہے اسی عارضے میں وہ گھل گھل کر مر گیا۔ جس وقت میں بھکر کے سفر میں میر عدل مرحوم کے ساتھ جا رہا تھا تو میں نے اس

آزاد دل درویش دوست کی وفات کی خبر میر عدل کو سنائی، وہ اس خبر کو سن کر زار زار رونے لگے اور فرمایا کہ جو شخص دنیا سے بے نیاز رہنا چاہے اسے اس طرح زندگی گزار کر رخصت ہونا چاہیے جیسا حسین خاں نے کیا۔ اتفاق دیکھو کہ میر عدل سے میری یہ ملاقات بھی آخری ہی تھی انھوں نے بھی اس موقع پر خود ہی فرمایا کہ "ہمارے سارے دوست رخصت ہو چکے ہیں، معلوم نہیں اب تم سے بھی دوبارہ ملنا نصیب ہوتا ہے یا نہیں۔" ان کی یہ بات سچ نکلی اور وہ بھی جلدی ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

میں تقریباً نو سال تک اس یگانۂ روزگار حسین خاں کی خدمت میں رہا۔ سپاہ گری اور دنیا داری کی ظاہرا وضع کے باوجود میں نے جو وصف اس میں پائے اس زمانے کے پیشتر پیشواؤں اور مرشدوں میں ان کا عشر عشیر بھی دکھائی نہیں دیتا۔ میں اس کے ساتھ کسی میدانی معرکے میں نہیں رہا لیکن اکثر جنگل کی لڑائیوں میں اس کے ساتھ رہنے کا موقع ملا ہے ان لڑائیوں میں ایسی ثابت قدمی اور دلیری خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے جس کا ذکر انھیں داستانوں ہی میں سننے میں آتا ہے۔ اس کی دریا دلی اور سخاوت ایسی تھی کہ اگر روئے زمین کے خزانے اور سلطنت بھی اس کو مل جاتی تو پہلے ہی دن سب کچھ لٹا کر قرض دار ہو جاتا۔ اس سے پہلی بار میں اس وقت ملا تھا جب کانت و گولہ پر لشکر متعین کیا گیا تھا اس نے ایک عراقی گھوڑا پانسو روپے میں خریدا اور اسی وقت مجھے عطا کر دیا کہتے ہیں جب وہ دنیا سے رخصت ہوا تو ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ رقم اس کے ذمے قرض تھی۔ اس کے انتقال پر تمام قرض خواہوں نے دستاویز پھاڑ دیے اور اس کے لیے مغفرت کی دعا کی اور ورثا سے قرضوں کا کوئی مطالبہ نہ کیا۔ میں اپنی اس کوتاہ زبان سے حسین خاں کی تعریف و توصیف کا حق ادا کرنے سے قاصر ہوں اب جب کہ میں پیری کی ذلتوں سے دوچار ہوں اس بات کا شکر کرتا ہوں کہ میری زندگی کا بہترین حصہ یعنی عنفوان شباب کا زمانہ اسی کی خدمت میں گزرا اور یہ اسی کی توجہات کے طفیل ہے کہ میری نشو و نما نہایت عمدہ طریقے پر ہوئی کہ آج میں دنیا میں مشہور و معروف شخصیت کا مالک ہوں۔

اسی سال بادشاہ نے میری خوش آوازی کی وجہ سے چہار شنبہ کے دن کی امامت میرے سپرد فرمائی اور مجھے سات اماموں میں داخل کر لیا اور خواجہ دولت ناظر کو مقرر فرمایا کہ وہ اس دن اور رات میں پانچوں نمازوں کے وقت حاضری کی یاد دہانی کرا دے۔

شوقِ جہاد

اوائل محرم ۹۸۴ھ میں کنور مان سنگھ ولد بھگوان داس کو حضرت معین الدین چشتیؒ کے روضے میں ساتھ لے گیا اور وہاں خلوت میں حضرت سے مدد کی دعا کر کے مان سنگھ کو خلعت، گھوڑا اور دوسرے تمام لوازمات عطا فرمائے اور اسے کوکندہ اور کونبھل میر کے دارالحرب پر جو رانا کیکا کی عملداری میں تھا فوج کشی کے لیے مامور کیا۔ لشکر کے کوچ کے وقت میں بھی دو تین کوس تک گیا تھا۔ اس وقت میرے دل میں بھی جہاد کا شوق چٹکیاں لینے لگا اور میں وہاں سے اسی وقت لوٹ کر شیخ عبدالنبی کی خدمت میں آیا اور ان کو بادشاہ کے پاس سفارش کے لیے آمادہ کیا۔ انھوں نے حامی تو بھری لیکن میرے معروضے کو اپنے وکیل سید عبدالرسول کے ذمے کر دیا۔ نقیب خاں کے ساتھ اچھا خاصا یارانہ تھا میں نے اس کو وسیلہ بنایا۔ غرض نقیب خاں نے اس وقت جب بادشاہ مزار شریف کے اونچے چبوترے کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے میرا معروضہ پیش کیا پہلے تو انھوں نے فرمایا: "اس کے ذمے تو امامت کے فرائض ہیں وہ کس طرح جا سکتا ہے؟" نقیب خاں نے عرض کیا: "اس نے جہاد کی نیت کر لی ہے۔" بادشاہ نے مجھے بلا کر پوچھا: "مصمم ارادہ ہے؟" میں نے عرض کیا: "ہاں!" فرمایا: "کیوں؟" میں نے کہا: "میں اپنے اعمال کی سیاہی کو جاں نثاری کے ذریعے دور کرنا چاہتا ہوں۔" اس پر فرمایا: "انشاء اللہ تم فتح کی بشارت لے کر آؤ گے۔" اتنا کہہ کر بادشاہ مراقبے میں بیٹھ گئے اور بڑی توجہ سے فاتحہ پڑھتے رہے جب میں نے چبوترے پر ہاتھ بڑھا کر پابوسی کا ارادہ کیا تو انھوں نے اپنے پیر کھینچ

لیے جس وقت میں دیوان خانے سے رخصت ہوا تو مجھے دوبارہ بلوایا اور دونوں ہاتھوں سے بھر کر ۹۶ اشرفیاں عطا کیں اور مجھے رخصت کیا۔ یہ سفر اول سے آخر تک نہایت خوش گوار اور مبارک ثابت ہوا۔ آخر کار ہم فتح نامہ لے کر فتح پور لوٹ آئے۔

واپسی میں ہم امیر شہر میں چار دن رہے اور قصبہ تودہ کے راستے سے جو میری جائے پیدائش ہے بساور، جہاں میرا خاندان مقیم ہے، گئے۔ وہاں سے اوائل ماہ ربیع الآخر میں فتح پور پہنچ گئے۔ بادشاہی دیوان خانے میں کورنش بجا لا کر امراء کے عریضے اور ہاتھی کو پیش کیا۔ بادشاہ نے پوچھا "امراء نے تیری بہت تعریف لکھی ہے۔ سچ بتا تو کون سی فوج میں تھا؟" جو کچھ واقعہ تھا میں نے ٹھیک ٹھیک بتا دیا۔ ان دنوں بادشاہ کے سامنے اشرفیوں کا ایک ڈھیر لگا رہتا تھا چنانچہ مٹھی بھر اشرفیاں اٹھا کر جو گنیں تو ۹۶ تھیں، مجھے انعام دیا۔ پھر ایک اعلیٰ قسم کا [illegible] دوشالہ مجھے دیا۔

اسی سال ماہ ذوالحجہ میں نوروز ہوا اور جلوس کا تیئیسواں سال شروع ہوا۔ نوروز کا جشن مالوہ کے قریب قصبہ دیپال پور میں منایا گیا۔ میں ان دنوں بری طرح بیمار ہو گیا تھا اور بساور ہی میں ٹھہر گیا تھا۔ میں نے جشن مالوہ میں شرکت کے لیے بانس والا کے راستے سے لشکر میں پہنچنے کا ارادہ کیا۔ چند دن میں سید عبداللہ سے ملاقات ہوئی۔ اس نے راستہ خطرناک بتایا اور مجھے بھونہ میں لے آیا۔ شاہی امامت کی ذمہ داریوں کا خیال کر کے دلاوری خاں کے ساتھ ہو لیا۔ سارنگ پور اور اجین ہوتے ہوئے بارہ ذی الحجہ کو میں دیپال پور پہنچا، اور دربار میں حاضری دی۔ بادشاہ کی خدمت میں ایک نفیس حمائل شریف اور خطبوں کی ایک بیاض جس میں نہایت عمدہ خطبے درج تھے پیش کی۔ یہ دونوں چیزیں حافظ محمد امین خطیب کی تھیں۔ جس وقت بساور کے محل گرد میں منزل لگائی گئی تھی حافظ کے پاس سے یہ دونوں چیزیں چرا لی گئی تھیں۔ بعد میں عبداللہ خاں نے تفتیش کر کے ان کو حاصل کیا تھا۔ اور میرے سپرد کر دیا تھا۔ جب میں نے بادشاہ کو نذرانے میں پیش کیں تو بہت خوش ہوئے اور حافظ محمد امین کو بلا کر فرمایا "ایک حمائل شریف کسی جگہ سے ہمارے پاس تحفے میں آئی ہے۔ دیکھو تمہیں عطا کرتے ہیں۔" حافظ نے دیکھتے ہی پہچان لیا اور ایسے خوش ہوا جیسے اسے نئی زندگی مل گئی۔ بادشاہ نے مجھ سے ان نسخوں کے ملنے کا حال دریافت کیا تو میں نے عرض کیا کہ مزدوروں کی ایک جماعت بساور کے قصبوں میں حوض اور کنوئیں کھودنے کا کام کرتی ہے اور اسی بہانے چوری ڈکیتی بھی کرتی رہتی ہے۔ انہی مزدوروں نے یہ چیزیں چرائی تھیں۔

اسی منزل میں بادشاہ نے از سر نو مجھے امامت کرنے کا حکم دیا اور حسب سابق خواجہ دولت ناظر کو مقرر کیا گیا کہ ہفتہ میں ایک دن اور ایک رات مجھے چوکی پر حاضر کیا کرے۔

جب بانس بریلی کی فوجداری سے دیپ چند راجہ منجھولا کو ہٹا دیا گیا تو وہاں کا فوجدار حکیم عین الملک کو بنایا گیا۔ اس نے وہاں سے ایک طویل عریضہ لکھا کہ "جب سے دربار سے علیحدہ ہوا ہوں اس بیابان میں میرے ساتھ کوئی عزیز دوست نہیں ہے۔ اگر جناب والا فلاں شخص کو (یہاں میرا نام لکھا تھا) جو اس علاقے کے حالات سے بخوبی واقف ہے اور دربار میں بھی اس کے ذمہ کوئی اہم خدمت نہیں ہے، میرے پاس بھیج دیں تو اس کے حق میں بھی بڑی عنایت ہوگی اور اس بندہ درگاہ پر بھی احسان ہوگا۔" بادشاہ کے حکم سے خواجہ منصور ایک ایک فقرے کو پڑھتا جاتا تھا اور اس کا جواب لکھتا جاتا تھا۔ جب مذکورہ فقرے پر پہنچا تو بادشاہ نے ہاں لکھوایا نہ نہیں۔

کیا قافلہ جاتا ہے...

۹۸۶ھ ماہ رجب میں بادشاہ نے شاہ ابوتراب کو حاجیوں کا امیر بنا کر اعتماد خاں گجراتی کے ساتھ کافی رقم دے کر مکہ معظمہ کے لیے رخصت کیا اور عام منادی کرا دی کہ جو بھی چاہے اس قافلے کے ساتھ جا سکتا ہے۔ میں نے بھی شیخ عبدالنبی سے درخواست کی کہ میرے لیے آپ بادشاہ سے اجازت لیجیے تو اس نے پوچھا "کیا تمہاری والدہ زندہ ہیں؟"

میں نے کہا: "ہاں"۔ اس نے کہا: "تمہارا کوئی بھائی بھی ایسا ہے جو ان کی خدمت کر سکتا ہے؟" میں نے کہا: "نہیں۔ صرف میں ہی ان کا سہارا ہوں۔" شیخ نے فرمایا: "اگر تم اپنی والدہ سے اجازت لے لو تو بہتر ہوگا۔" غرض مجھے حج کی سعادت نصیب نہ ہوئی۔ اور میں اس محرومی پر حسرت و افسوس کرتا رہتا ہوں۔

اسی سال ماہ رمضان المبارک کے آخری عشرے میں میرے پاس بساور سے خبر آئی کہ میری ایک خادمہ کو کافی مدت اور آرزوؤں کے بعد لڑکا تولد ہوا ہے۔ میں نے بادشاہ کے پاس اشرفی کا نذرانہ پیش کر کے نام رکھنے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے فاتحہ پڑھ کر پوچھا: "تیرے باپ اور دادا کا کیا نام ہے؟" عرض کیا: "ملوک شاہ ولد حامد"۔ بادشاہ نے فرمایا: "اپنے اس بچے کا نام عبدالہادی رکھو۔" ہادی کا کلمہ اس زمانے میں رات دن بادشاہ کے ورد زبان رہتا تھا۔ سات بادشاہی اماموں میں ایک محمد امین خطیب بھی تھے انھوں نے بڑے اصرار سے کہا تھا کہ فضول خیال چھوڑ دو اور حافظوں کو اپنے گھر پر جمع کر کے بچے کی درازی عمر کے لیے قرآن کا ختم کرا دو۔ میں نے اس کی بات پر دھیان نہ دیا۔ آخر وہ بچہ چھ ماہ کا ہو کر انتقال کر گیا۔ میں نے اس منزل سے پانچ مہینے کی رخصت لی اور بساور چلا گیا۔ بعض مصروفیتوں بلکہ بے کار مشغلوں میں پھنس کر حسب وعدہ خدمت پر واپس نہ جا سکا اور بساور میں ایک سال تک رہ گیا۔ ان کوتاہیوں اور بعض لوگوں کی شکایتوں کی وجہ سے بادشاہ رفتہ رفتہ میری طرف سے بے توجہ ہوتے چلے گئے۔ اب جب کہ اس واقعے کو اٹھارہ سال گذر چکے ہیں اسی معمولی خدمت سے چمٹا ہوا ہوں کہ نہ جیتے بنے نہ بھاگتے۔

چہل حدیث

۲ رجب ۹۸۶ھ کو بروز جمعہ صبح کے وقت بادشاہ نے تودہ کی منزل پر آکر قیام فرمایا۔ میں بساور سے لوٹ کر بادشاہ کے حضور کے لیے اسی منزل میں حاضر ہوا اور ایک کتاب "چہل حدیث" جس میں جہاد کی فضیلت اور تیر اندازی کے ثواب پر حدیثیں ہیں اور اس کا نام تاریخی ہے، خدمت عالی میں پیش کی۔ بادشاہ نے یہ کتاب کتب خانے میں داخل کرا دی۔

فتح پور آنے کے بعد بادشاہ کے اکثر اوقات عبادت خانے میں علما کی محفل میں گذرتے تھے۔ دینی مسائل کی تحقیق اور اصول و فروع کی بحثیں گرم رہتی تھیں۔ علما کے ان جھگڑوں کی وجہ سے اہل بدعت کو خوب کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ انھوں نے حقائق کو مسخ کر کے بادشاہ کو جو خلوص کے ساتھ طالب حق تھا لیکن ان پڑھ ہونے کی وجہ سے حقائق کا ادراک کرنے سے قاصر تھا اور علما کے ان مباحث کی وجہ سے عالم حیرت میں مبتلا تھا اصل دین ہی سے پھیر دیا۔

مجھے یاد ہے کہ ان مباحث کے آغاز میں ایک بار فتح پور کے دیوان خانہ خاص میں شیخ ابوالفضل سے میری گفتگو ہوئی تھی میں نے اس سے پوچھا: "ان مشہور مذہبوں میں سے تمہارا میلان کس مذہب کی طرف ہے؟" اس نے کہا: "میں تو ابھی چند روز الحاد کی وادی میں سیر و سیاحت کا ارادہ رکھتا ہوں۔" میں نے چھیڑتے ہوئے کہا: "نیک ارادے ہیں بشرطیکہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو۔" میری؟ پھر وہ مجلس [illegible] اور بات آئی گئی ہوئی۔ جب دربار کا یہ رنگ ہوا تو میں نے گوشہ عزلت اختیار کر لیا اور دربار داری سے بڑی حد تک دور ہی رہنے لگا۔ بادشاہ کی نظریں بھی مجھ سے پھر گئی تھیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے اسی حال میں خوش رہا۔

۱۹ ماہ صفر ۹۸۹ھ کو چالیس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک لڑکا عنایت فرمایا۔ اس کا نام میں نے محی الدین رکھا۔ یہ بساور میں پیدا ہوا تھا۔

قسمت کا ضعف

اسی سال ماہ رمضان میں اجمیر کے قیام کے وقت قاضی علی نے مجھے بھی کہ میں عرصے سے ملازمت سے علیحدہ ہو کر گھر بیٹھ رہا تھا بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور بادشاہ کو میری مدد معاش کے سلسلے میں ہزار بیگھہ اراضی کا وعدہ یاد دلایا۔ بادشاہ نے کہا: مجھے بھی خیال ہے کہ اس کے فرمان میں ایسی کوئی شرط تھی۔ اس سے پوچھو کہ کیا کوئی ضعف و عارضہ تھا کہ اس نے ملازمت ترک کر دی؟ غازی خاں بدخشی نے فی البدیہہ کہا: قسمت کا ضعف تھا۔ بادشاہ نے جواب دیا: ہم کسی کو ملازمت رہنے پر مجبور نہیں کرتے۔ اگر یہ ملازمت کا ارادہ نہیں رکھتا تو اس کی زمین ضبط ہو جائے گی۔ میں نے فوراً ہی اس بات کو تسلیم کر لیا۔ یہ بات بادشاہ کو بڑی ناگوار گزری اور میری طرف سے رخ پھیر لیا۔ قاضی علی نے مکرر عرض کیا آخر اس کے بارے میں کیا حکم ہوتا ہے؟ تھوڑے عرصہ کے بعد فرمایا: شیخ عبدالنبی سے پوچھا جائے کہ وہ ملازمت کی شرط کے بغیر کس قدر اراضی کا حقدار ہو سکتا ہے۔ شیخ نے مولانا اللہ داد امروہی مرحوم کے ذریعے کہلوا بھیجا کہ وہ عیال دار آدمی ہے اور اس کے ذمے کافی اخراجات ہیں۔ میں سب سے کم اس کے لیے آٹھ سو یا سات سو بیگھہ اراضی تجویز کرتا ہوں۔ بعض صاحبوں کا خیال تھا کہ اب ایسی کوئی معروض داشت مناسب نہ ہوگی۔ وہ سب مجھے ملازمت پر مجبور کرنے لگے۔ مجبوراً میں دوبارہ اسی جال میں پھنس گیا جس سے مشکل چھٹکارا نصیب ہوا تھا۔

عالم کیف و مستی

۹۸۹ھ میں، جب کہ بادشاہ کی سواری کابل میں داخل ہوئی، ماہ شوال کو بادشاہ سلامت دہلی تشریف لائے۔ میں اس سفر میں خود نہ جا سکا تھا۔ مجھے ایک شدید درد سے پیدا شدہ مرض لاحق ہو گیا کہ میں پورے ایک سال تک بیمار ہی رہا اور مجھے اس دوران میں عجیب و غریب تجربے اور سخت مصائب برداشت کرنے پڑے۔ پورے سال بادشاہ سے جدا رہنے کے بعد میں نے فتح پور کا رخ کیا اور اسی مہینے کی چھ تاریخ کو دربار میں حاضری دی۔ بادشاہ نے شیخ ابوالفضل سے پوچھا کہ یہ اس سفر میں ساتھ کیوں نہیں تھا؟ اس نے کہا: یہ بھی مفت خوروں معاش داروں میں شامل ہے۔ میری غیر حاضری کا قصہ بس اسی بات پر ختم ہو گیا۔

جب لشکر کابل کے قریب تھا تو بادشاہ نے صدر جہاں کو حکم دیا تھا کہ جو اہل علم ہمارے لشکر کے ساتھ ہیں اور جو نہیں آئے ہیں سب کے ناموں کی فہرست پیش کرو۔ جب میرا نام آیا تو خواجہ نظام الدین احمد مرحوم مصنف تاریخ نظامی نے جن سے میری دوستی ایک سال سے قائم تھی مجھے مریض لکھوا دیا۔ اس دوران میں انھوں نے مجھے کئی خط بھی لکھے اور تاکید کی تھی کہ چونکہ تم لشکر کے ساتھ نہیں آ سکے ہو، اب استقبال کے لیے کم از کم لاہور، دہلی یا متھرا جہاں تک بھی ہو سکے آنے کی کوشش کرو۔ کیونکہ یہ دنیاوی معاملات ہیں ان میں احتیاط ضروری ہے۔ اس بے چارے نے خیر خواہی سے یہ سب کچھ لکھا لیکن میں اس عالم میں مست تھا کہ مجھے ایک محرم جاودانی سے ازلی وارثی معلوم ہوتا تھا۔ مصلحت اور نفع نقصان کی کسے فکر تھی۔ اس مستی و کیفیت کے عالم میں حالت خراب ہی رہی۔ کبھی کبھی شعر کہتا تھا۔ رب العزت کی قسم اس واقعہ کو گزرے پورے سترہ سال بیت گئے ہیں مگر اب تک اس ذوق و مستی کی لذت سے میرا دل سرشار ہے۔ جب بھی میں ان دنوں کو یاد کرتا ہوں نعرہ زناں رونے لگتا ہوں۔ کاش میں اسی عالم میں اس دنیا کے جھگڑوں سے پاک ہو جاتا۔ ان دنوں مجھے سررشتہ معرفت ہاتھ آگیا تھا اور میرا دل اپنے فیض سے سرشار تھا۔ اگر میں ساری عمر اس کا ذکر کرتا رہوں تو بھی حق ادا نہیں ہو سکتا۔

حجام کا قصور

جو لوگ ڈاڑھی منڈواتے تھے بادشاہ ان کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ اس وجہ سے ڈاڑھی منڈوانے کا عام رواج ہو گیا۔ زمانے کی نیرنگی دیکھو کہ جب میں نیا نیا دربار شاہی میں گیا تھا تو اس وقت اتفاق سے میری ڈاڑھی حد شرعی سے کسی قدر کم تھی۔ جب حکیم ابوالفتح نے مجھے دیکھا تو میر ابوالغیث بخاری مرحوم کے سامنے لعنت ملامت کرنے لگا کہ تم جیسے آدمیوں کو ڈاڑھی گھٹانا زیب

نہیں رہتا۔ میں نے جواب دیا کہ یہ حجام کا قصور ہے میرا نہیں۔ اس نے کہا آئندہ ہرگز ایسا نہ کرنا یہ بات نہایت نازیبا ہے۔ دن ایسے پھرے کہ اس ابوالفتح نے حیدری جوقلی فقیروں بلکہ ہندوؤں سے بھی کہیں زیادہ اپنے رخساروں کا بالکل ہی صفایا کر دیا اور نو عمر چھوکروں کی طرح چھیل چھبیلا بن مو تراشی کی تائید میں بڑھ چڑھ کر موشگافیاں کرنے لگا۔

عربی پڑھنا عیب ہو گیا۔ فقہ، حدیث اور تفسیر پڑھنے والے مطعون کیے جانے لگے۔ حکمت، طب، ریاضی، شعر، تاریخ اور افسانے کی تحصیل فرض ہو گئی۔ عربی کے خاص حروف جیسے ث، ح، ع، ص، ض، ط، ظ کو لغت سے نکال دیا گیا چنانچہ عبداللہ کو ابداللہ اور احدی کو اہدی لکھا جاتا تو اکبر بہت خوش ہوتا تھا۔

رفض کا نور

انھی دنوں ملا شمشیر کا ملا احمد متعصب رافضی دکن سے آکر باریاب ہوا۔ اس کے آبا و اجداد فاروقی سلسلے کے حنفی تھے وہ ناپاک ان بدنصیبوں پر بھی لعنت بھیجتا تھا۔ میری اس سے بازار میں ملاقات ہو گئی۔ مولویوں نے اس کے سامنے میری بڑی تعریف کی تھی۔ پہلی ملاقات میں اس نے مجھے دیکھ کر کہا: "رفض کا نور ان کی پیشانی سے صاف جھلکتا ہے" میں نے فی البدیہہ جواب دیا: "ہاں جس طرح تسنن، تمہارے چہرے پر جھلک رہا ہے" جو لوگ وہاں کھڑے تھے بے ساختہ ہنس پڑے اور اس جواب سے بہت خوش ہوئے۔

اسی سال (۹۹۰ھ) بادشاہ نے حکم دیا کہ ہجرت کے ہزار سال ختم ہو چکے ہیں اب تک سب لوگ ہجری تاریخ ہی لکھتے آئے ہیں اب ایک تاریخ مرتب ہونی چاہیے جس میں آج تک کے تمام بادشاہوں کے واقعات مندرج ہوں اس کا نام "تاریخ الفی" رکھا جائے چنانچہ سات اشخاص مامور کیے گئے۔ لکھنے والوں میں اس ناچیز کا نام بھی شامل تھا۔

میں نے ساتویں سال کے تذکرے میں خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات مرتب کیے تھے ایک رات یہ مسودہ ملاحظہ میں تھا۔ جب پڑھتے پڑھتے شہر کوفہ کی تعمیر، قصر الامارت کے انہدام، حضرت علی کی صاحبزادی ام کلثوم کے نکاح کے قضیے، شہر نصیبین کی فتح اور وہاں سے مرغ کی قدو قامت کے بچھوؤں کے نکلنے کے ذکر پر پہنچے تو اکبر نے ان روایات پر بڑی رد و قدح کی۔ میں نے عرض کیا میں نے کچھ اپنی طرف سے نہیں لکھا۔ کتابوں میں جو کچھ دیکھا مرتب کر دیا۔ اکبر نے اسی وقت شاہی کتب خانے سے روضۃ الاحباب اور سیرۃ کی دوسری کتابیں منگائیں اور نقیب خاں سے کہا وہ تحقیق کر کے بتائے یہ صحیح ہے یا غلط۔ اس نے تمام واقعات کے صحیح ہونے کی تصدیق کی اور خدا کے فضل سے مجھے اس بے جا گرفت و گیر سے چھٹکارا ملا۔ تاریخ الفی کے بقیہ حالات لکھنے کی ذمہ داری اب آصف خاں کے سپرد کی گئی اس نے یہ واقعات ۹۹۷ھ تک پہنچا کر دیے۔ سنہ ۱۰۰۰ھ میں بادشاہ نے لاہور میں مجھے حکم دیا کہ میں مسودات کا مقابلہ اور تصحیح کروں اور سنوں میں جو تقدیم و تاخیر ہو گئی ہے وہ درست کر دوں۔ میں ایک سال تک یہ خدمت انجام دیتا رہا۔ میں نے پہلی دو جلدوں کو مکمل کر دیا تیسری جلد کا کام آصف خاں کے حوالے کر دیا۔

مہابھارت کا ترجمہ

اس سال کا اہم واقعہ مہابھارت کے ترجمے کی تکمیل ہے۔ مہابھارت کے ترجمے کا سبب یہ ہوا کہ بادشاہ نے شاہنامہ اور امیر حمزہ کے قصے کو سترہ جلدوں میں پندرہ سال کی مدت میں لکھوایا تھا اس کی تصویروں پر کافی روپیہ بھی خرچ ہوا تھا اکبر کو خیال آیا کہ ان کتابوں کے مقابلے میں ہندوؤں کی کتابوں کو فارسی میں ترجمہ کرا کے اپنے نام سے منسوب کیا جائے چنانچہ اکبر نے خود بھی ذاتی طور پر وقت دینے کا فیصلہ کیا چند راتوں تک نقیب خاں کی مدد سے اس کے مضامین کو سمجھتا رہا اور اس کے مطالب فارسی میں لکھواتا رہا۔

تیسری رات بادشاہ نے مجھے بھی بلایا اور حکم دیا کہ میں نقیب خاں کے ساتھ مل کر اس کا ترجمہ کرتا رہوں۔ تین چار مہینے کی مدت میں اس مجموعہ خرافات کے اٹھارہ فنوں میں سے صرف دو فن لکھے جا سکے۔ اس کام میں مجھے بجز طعن و تعریض کے کچھ نہیں ملا۔ بعد میں اس کے ایک حصے کو ملا شیری اور نقیب خاں نے پورا کیا اور ایک حصے کی تنہا سلطان حاجی تھانیسری نے تکمیل کی۔ اس کے بعد شیخ فیضی نے اس کے دو فنوں کی نظم و نثر مرتب کی۔ بادشاہ کو اصل اور نقل کی مطابقت پر بھی اب اصرار تھا کہ کسی کا داغ بھی نہ چھوٹنے پائے۔ مہابھارت کی ترجمانی کرنے والے اکثر حضرات کورو پانڈو سے جا ملے ہیں جو باقی رہ گئے ہیں خدا ان کو نجات دے اور توبہ کی توفیق عطا کرے۔

رامائن کا ترجمہ

(۹۹۲ھ میں) بادشاہ نے مجھے رامائن کے ترجمے کا حکم دیا جو بلحاظ تصنیف مہابھارت سے پہلے کی کتاب ہے۔ اس میں ۲۵ ہزار اشلوک ہیں، ہر اشلوک ۶۵ حروف کا ایک طویل فقرہ ہے۔

ان دنوں ایک عجیب اور دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ فتح پور کے دیوان خانے میں ایک خاکروب کی بیوی پیش کی گئی کہ یہ مرد بن گئی ہے۔ رامائن کا ایک ترجمان بھی دفتر کتابت سے اٹھ کر اسے دیکھنے گیا اور واپس آکر اس نے بیان کیا کہ وہاں ایک عورت تھی جس نے شرم و حیا سے چہرہ چھپا رکھا تھا۔ حکیموں نے اس کی تائید میں دلائل پیش کیے اور بتلایا کہ ایسے واقعات بہت پیش آتے رہتے ہیں۔

ماہ جمادی الاول ۹۹۹ھ میں میں نے رامائن کا ترجمہ مکمل کر کے پیش کیا۔ یہ ترجمہ میں نے چار سال میں ختم کیا تھا اور اس کے دو نسخے مرتب کر دیے تھے۔ ترجمے کے آخر میں میں نے یہ شعر لکھا تھا۔

ما قصہ نوشتیم بسلطاں کہ رساند
جاں سوختہ کردیم بجاناں کہ رساند

بادشاہ کو یہ شعر بہت پسند آیا اور پوچھا یہ کتنے جزو میں مکمل ہوا؟ میں نے عرض کیا پہلی بار اختصار کے ساتھ تقریباً ستر جزو میں اور دوسری مرتبہ تفصیل کے ساتھ ایک سو بیس جزو میں۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ جس طرح مصنفوں کا دستور ہے، اس کا دیباچہ بھی لکھ دو۔ دیباچے کی اتنی ضرورت نہ تھی، پھر نعت کے بغیر اس کا خطبہ لکھنا پڑتا، اس لیے میں دیباچے کے معاملے کو ٹال دیا۔

انھی دنوں بادشاہ کو خیال آیا کہ رامائن کے ترجمے کا کچھ صلہ مجھے مرحمت فرمایا جائے۔ چنانچہ ایک دن بادشاہ نے شیخ اللہ عرف اللہ داد سے مخاطب ہو کر کہا فی الحال یہ شال عبدالقادر کو دے دو، گھوڑا اور خرچ بھی اسے عنایت کیا جائے گا۔ بادشاہ نے شاہ فتح اللہ کو بساور کی جاگیر عطا کر دی اور وہاں کے اماموں کی اراضیات کے متعلق فرمایا کہ یہ سب تم کو بخش دی گئیں۔ پھر میرا نام لے کر کہا کہ یہ ترجمان بداؤں کا رہنے والا ہے۔ اس کی مدد معاش کو ہم بساور سے منتقل کر کے بداؤں میں مقرر کیے دیتے ہیں۔ جب میری مدد معاش کے متعلق نیا فرمان تیار ہو گیا تو میں ایک سال کی رخصت لے کر پہلے بساور اور پھر وہاں سے بداؤں گیا۔

تاریخ کشمیر

اسی سال مجھے حکم دیا گیا کہ تاریخ کشمیر جسے ملا شاہ محمد شاہ آبادی نے فارسی میں ترجمہ کیا تھا، سادہ اور آسان عبارت میں لکھوں۔ میں نے اسے دو مہینے میں مکمل کر دیا۔ یہ نسخہ شاہی کتب خانے میں داخل کر دیا گیا۔ بادشاہ کے سامنے جزو جزو اس کو پڑھا جاتا ہے۔

اسی زمانے میں حکیم ہمام نے ایک کتاب معجم البلدان کی جس کی ضخامت دو سو جزو تھی، بڑی تعریف کی اور اس کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کرنے کی تجویز پیش کی۔ بادشاہ نے دس بارہ عراقی اور ہندوستانی آدمیوں کو جمع کر کے اس کتاب کے اجزا تقسیم کر دیے۔ میرے حصے

میں بھی دس جز آئے ان کا ترجمہ میں نے ایک مہینے میں کر دیا اور سب سے پہلے اسے پیش کر دیا۔ اس خدمت کو وسیلہ بنا کر بدایوں جانے کے لیے رخصت کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی۔

سجدے سے انکار

اس مرتبہ مجھے پانچ مہینے کی رخصت ملی۔ مرزا نظام الدین احمد نے سفارشاً عرض کیا کہ عبدالقادر کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ رخصت کا طلبگار ہے۔ بادشاہ نے بڑی خفگی کے ساتھ یہ رخصت عطا کی۔ صدر جہاں نے اس موقع پر دہرا دہرا کر کہا "بادشاہ کو سجدہ کرو" لیکن میں نے سجدہ نہیں کیا۔ بادشاہ نے صرف اتنا کہا "چھوڑو" سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے ناراض ہو کر مجھے سفر خرچ کے لیے کچھ نہیں دیا۔

جامع رشیدی

ماہ ذی الحجہ ۱۰۰۰ھ میں بدایوں سے لشکر میں حاضر ہو گیا۔ بھنبر کی منزل میں حکیم ہمام نے عرض کیا "عبدالقادر کورنش بجا لانا چاہتا ہے۔" بادشاہ نے پوچھا "وہ وعدے کے خلاف کتنے دن غیر حاضر رہا؟" حکیم نے جواب دیا "پانچ مہینے۔" بادشاہ نے پوچھا "غیر حاضری کا کیا سبب تھا؟" لوگوں نے کہا "وہ بیمار ہو گیا تھا۔" تصدیق کے لیے بدایوں کے اکابرین کا محضر اور حکیم عین الملک کا عریضہ بھی پیش کیا گیا۔ جب بادشاہ نے یہ سارے کاغذات پڑھ لیے تو فرمایا "بیماری پانچ مہینے تک نہیں رہتی۔" اور مجھے کورنش کی اجازت نہیں دی۔ میں نہایت شرمندہ، رنجیدہ اور غمزدہ شاہزادہ دانیال کے لشکر میں جو مدد رجاس میں تعیین کیا گیا تھا ٹھہر رہا اور حضور اکرم پر درود بھیج کر قصیدہ بردہ کا ورد کیا۔ خدا سے گڑگڑا کر دعائیں مانگیں جو آخر کار بفضل ایزدی مستجاب ہوئیں۔ میرے پہنچنے کے پانچ ماہ بعد جب لشکر کشمیر سے لاہور پہنچا تو بادشاہ نے مجھ پر عنایت فرمائی اور جامع رشیدی کے ترجمے کے لیے میر نظام الدین کے ساتھ میرا نام بھی غائبانہ تجویز فرمایا اور مجھے حاضری کا حکم دیا۔ میں نے حاضر ہو کر ایک اشرفی نذر دی۔ بادشاہ نے بڑی مہربانی کا اظہار کیا اور وہ خفگی آسانی رضامندی میں بدل گئی۔

بادشاہ نے علامی ابوالفضل کے مشورے سے مجھے جامع رشیدی کے انتخاب کا حکم دیا۔ میں نے اسے عربی سے فارسی میں ترجمہ کر کے خدمت شاہی میں پیش کیا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر اس انتخاب کو خزانۂ عامرہ میں داخل کرا دیا۔

تاریخ الفی کی تصحیح

تاریخ الفی کے تین دفتروں میں سے دو دفتر تو ملا احمد ٹھٹھوی رافضی نے اور تیسرا دفتر آصف خاں نے لکھا تھا۔ ان تینوں دفتروں کی تصحیح اور مقابلے کا کام میرے سپرد کیا گیا۔ میں نے یہ کام ملا مصطفیٰ کاتب لاہوری کی مدد سے انجام دیا۔ بادشاہ نے اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور فرمایا کہ اس نے (ملا احمد) انتہائی تعصب کے ساتھ لکھا ہے اس لیے دوسرے دفتر کی بھی تصحیح کر دو۔ میں نے ایک سال میں اس کا مقابلہ اور تصحیح بھی کر دی لیکن اس خوف سے کہ مبادا مجھ پر بھی تعصب کا الزام آ جائے میں نے اصل مضمون میں زیادہ تبدیلی نہیں کی بس سنین وغیرہ کی ترتیب درست کر دی۔

۱۰۰۳ھ شرف آفتاب کے دن اکبر نے کسی کے کچھ بغیر اپنے آپ صدر جہاں کو خطاب کر کے فرمایا کہ "اگر فلاں (عبدالقادر بدایونی) کو ہم حضرت خواجہ اجمیری کے روضے کی تولیت دے دیں تو کیسا رہے گا؟ کیوں کہ اس روضہ منورہ کا کوئی متولی نہیں ہے۔" صدر جہاں نے کہا "یہ بہت اچھی تجویز ہے۔" میں بھی دل سے چاہتا تھا کہ درباری الجھنوں سے کسی طرح نجات مل جائے۔ اس غرض سے میں نے دو تین مہینے تک دربار میں بڑی کوششیں بھی کیں اور دو تین عرضیاں بھی لکھ کر پیش کیں لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

ایک دن میرے سامنے اکبر نے شیخ ابوالفضل سے فرمایا "عبدالقادر اجمیر کی خدمت کو حسن و خوبی انجام دے گا۔ لیکن ہم اس سے

جب کسی کتاب کا ترجمہ کراتے ہیں تو وہ ہماری خاطر خواہ ترجمہ کر دیتا ہے اس لیے ہم اسے جدا کرنا نہیں چاہتے۔ ابوالفضل اور دوسروں نے اس بات کی تائید کی۔

بحرالاسمار اسی دن بادشاہ نے مجھے حکم دیا کہ سلطان زین العابدین شاہ کشمیر نے جس ہندی افسانے کا بحرالاسمار کے نام سے ترجمہ کرایا تھا اور اس کا بیشتر حصہ باقی رہ گیا ہے، اس کا ترجمہ کر کے تکمیل کر دو۔ میں نے یہ کام شروع کر دیا اور آخری جلد کو جس کی ضخامت ساٹھ جز ہے پانچ مہینے میں پورا کر دیا۔ بادشاہ سلامت نے خواب گاہ خاص میں مجھے اپنے تخت کے قریب بلایا اور صبح تک ہر باب کی حکایتیں سنتے رہے۔ پھر حکم دیا کہ بحرالاسمار کی پہلی جلد جسے سلطان زین العابدین نے ترجمہ کرایا تھا پرانی اور غیر معروف فارسی میں ہے اس کو بھی تم روزمرہ زبان میں تحریر کر دو۔ میں نے اس خدمت کو قبول کر لیا۔ بادشاہ نے دس ہزار تنکہ اور گھوڑا انعام میں عطا فرمایا۔

یہ دور اکبر شاہ کے وہ واقعات ہیں جن کا ذکر میں نے صفر سنہ ۱۰۰۴ھ مطابق سنہ ۴۰ جلوس تک اجمالاً کیا ہے۔ میں نے اپنی دانست میں تو یہ سارے واقعات ٹھیک ٹھیک ادا کر دیئے ہیں۔ اگر جیتا رہا اور توفیق و اطمینان حاصل ہوا تو ان شاء اللہ آنے والے حالات کا بھی انتخاب کر جاؤں گا۔

مراد ما نصیحت بود گفتیم
حوالت با خدا کردیم و رفتیم

ترجمہ: محمود احمد فاروقی

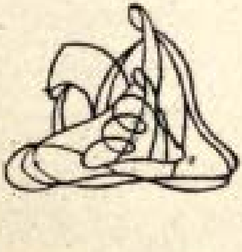

محمد عبدالرزاق کانپوری

ولادت : ۱۷ ر رمضان المبارک ۱۲۹۱ھ (اکتوبر ۱۸۷۴ء)
وفات : ۱۰ ر فروری ۱۹۴۶ء

آنریبل سرسید احمد خاں بہادر غفرلہٗ (ولادت : ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء ۔ رحلت : ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۸ء)

دیرینہ سال بزرگوں میں سب سے پہلے مجھے سرسید احمد خاں بہادر سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ بچپن سے نام سنتا تھا، تصویر بھی دیکھی تھی، لیکن دست بوسی کا شرف ۱۸۸۷ء میں حاصل ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب لکھنؤ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا اجلاس ہو رہا تھا۔

سرسید کی صحبت نہایت دلچسپ ہوتی تھی، خصوصاً شب کے کھانے پر نہایت اطمینان سے گفتگو ہوا کرتی تھی۔ مجھے بھی چھ سات مرتبہ علی گڑھ میں یہ موقع ملا ہے۔ مولانا شبلی اکثر کھانے پر تاریخی واقعات اور سلاطین مغلیہ وغیرہ کے حالات دریافت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا نے داغ کا ایک شعر پڑھا جس میں سلاطین کی جمع الجمع "سلاطینوں" آئی تھی۔ اس پر میرے دوست نے داغ کا مضحکہ اڑایا۔ سرسید ہنس کر چپ ہو رہے۔ جب دوبارہ یہ بحث شروع ہوئی تو فرمایا کہ سلطان کی جمع عربی میں سلاطین آتی ہے، لیکن اس شعر میں سلاطین سے (قلعۂ معلی کی اصطلاح کے مطابق) دوسرے معنی مراد ہیں۔ تب مولانا نے عرض کیا کہ تفصیل سے ارشاد فرمایئے، میری سمجھ میں نہیں آیا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ "ولی عہد کے علاوہ جس قدر تیموریہ شاہزادے قلعۂ معلی میں تھے، ان میں سے ہر ایک کا لقب سلاطین تھا اور یہ صیغۂ جمع بمعنی مفرد اردو میں مستعمل ہوتا تھا۔ اس سبب سے سلاطین کی جمع سلاطینوں صحیح ہے۔ داغ نے قلعۂ معلی میں عہد طفلی سے جوانی تک تعلیم و تربیت پائی تھی۔ لہٰذا اس کا کلام مستند ہے۔"

ایک صحبت میں مولانا شبلی نے ایک ایسا سوال کیا جو تہذیب و متانت کے خلاف تھا، لیکن معلومات کی غرض سے استفسار کیا اور وہ سوال یہ تھا: "میں نے بارہا سنا ہے کہ دلی میں جو امیرزادے طوائفوں سے تعلق رکھتے تھے وہ طوائف پھر دوسرے سے ناجائز تعلق نہ رکھتی تھی اور صرف ایک کی ہو رہتی تھی۔ حالانکہ بازار کی مٹھائی خرید کر کے ہر شخص کو کھانے کا اختیار ہے۔"

سید صاحب نے فرمایا: "آپ اس کا تعجب نہ کیجیے۔ یہ ادا ان میں شریف زادوں کی صحبت کی وجہ سے تھی اور اس عہد کے دستور کا بھی یہ حال تھا کہ وہ طوائفوں کو بھی بمنزلہ ازواج سمجھتے تھے اور جب تک قطع تعلق نہ ہو جائے، کوئی دوست اس طوائف سے ہرگز تعلق پیدا نہ کرتا تھا۔ یہ ہرجائی پن اس صدی کا نتیجہ ہے۔"

دسمبر ۱۸۸۷ء کے یہ پانچ دن (۲۷ تا ۳۱ دسمبر) میرے ایام حیات میں نہایت قیمتی تھے۔ چنانچہ دن اور رات کے مختلف گھنٹوں میں تعلیمی مسائل میں سرسید سے میں نے گفتگو کی۔ جب کانپور کے مسلمانوں کی تاریخ سن چکے تو فرمایا کہ مسلمانوں کی اولاد کی آئندہ تعلیم و تربیت کے لیے

امور ذیل پر عمل کرنا چاہیے:

اول: شہر کے جملہ مسلمانوں کی صحیح مردم شماری کی جائے اور جو بچے (۶ سے ۱۵ سال تک) ہنوز زیر تعلیم نہ ہوں ان کی تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔

دوم: خورد سال بچوں کے لیے قدیم اصول پر بکثرت مکاتب جاری کیے جائیں اور ہر خوش حال مسلمان کے دیوان خانے میں ایک مکتب ہو اور ابتدائی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم دی جائے۔

سوم: جب مکاتب میں بچے بلا تکلف اردو پڑھ لکھ سکیں، تب ان کو انتخاب کر کے سکول اور مدارس میں داخل کیا جائے۔

چہارم: مکاتب کے علاوہ یہ بھی کوشش کی جائے کہ عام قومی چندہ سے انگریزی اسکول کھولے جائیں جن میں تقاضائے وقت اور مسلمانوں کے حالات کے لحاظ سے تعلیم دی جائے اور مذہبی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔

پنجم: مردم شماری کے مطابق میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ سے اپیل کیا جائے کہ وہ شہر کے ہر حلقے میں تعداد طلبا کے مطابق ابتدائی مدرسے جاری کرے اور اسی اصول کے مطابق دیہات میں بھی کیا جائے۔

چنانچہ انجمن اخوان الصفا نے جس کے سیکرٹری منشی رحمت اللہ رعد (مالک نامی پریس) تھے فوراً تعلیمی مردم شماری کا انتظام کیا اور نقشہ جات مکمل ہو جانے پر ابتدائی تعلیم کا حسب ہدایت معقول انتظام کیا۔

جب پہلی مرتبہ میری کتاب البرامکہ شائع ہوئی تو میں نے ایک نسخہ نذر کیا۔ اس وقت سرسید بستر مرگ پر تھے۔ مولوی وحید الدین سلیم نے کتاب اور میرا عریضہ پیش کیا۔ کتاب ہاتھ میں لے کر چند صفحے پڑھے اور بہت خوش ہوئے اور فرمایا: "کتاب احتیاط سے رکھو میں ان شاء اللہ اس پر ریویو لکھوں گا۔" لیکن جب تہدیہ کا صفحہ دیکھا تو فرمایا: "مصنف نے بڑی غلطی کی ہے۔ اس کتاب کا تہدیہ مولوی شبلی کے نام کیا گیا۔ یہ تو میرا حق تھا۔" مولوی سلیم نے تائید کرتے ہوئے عرض کیا کہ بحیثیت ایک بزرگ قوم اور اردو کے معلم ثانی ہونے کی حیثیت سے ضرور یہ آپ کا حق تھا (اردو کے معلم اول اسد اللہ خاں غالب دہلوی تھے)۔ یہ سن کر سرسید غصے ہوئے اور فرمایا کہ تم نے میرا منشا نہیں سمجھا۔ جب مولوی صاحب نے اصرار کیا تو ارشاد ہوا، "تم جانتے ہو کہ میں خاندان وزارت سے ہوں۔ میرے نانا دولت مغلیہ میں وزیر تھے اور البرامکہ ایک خاندان وزارت کی تاریخ ہے۔ لہٰذا میرا حق انتساب شبلی سے بدرجہا فائق تھا۔"

مولوی سلیم نے ذریعہ خط جب اس واقعہ سے اطلاع دی تو مجھے بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا اور میں نے فیصلہ کیا کہ ان شاء اللہ نظام الملک طوسی کو سرسید کے نام پر معنون کروں گا۔ لیکن افسوس ہے کہ جب یہ کتاب تیار ہوئی تو سرسید کا انتقال ہو چکا تھا۔

شمس العلماء پروفیسر شبلی نعمانی (ولادت: ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء ـ رحلت: ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۴ء)

صبح سات بجے کا وقت ہے اور دسمبر ۱۸۸۷ء کی ۲۷ تاریخ کو شاہی بارہ دری قیصر باغ لکھنؤ میں محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا سالانہ اجلاس ہو رہا ہے اور اس تقریب سے باغ کے احاطے میں سیکڑوں گاڑیاں، جوڑیاں اور پالکیاں (موٹر کار اس وقت تک جاری نہیں ہوئی تھی) چلی آ رہی ہیں۔

آٹھ بجے تک بارہ دری مہمانوں سے بھر گئی تھی۔ یکایک یہ صدا بلند ہوئی کہ سر سید احمد خاں بہادر مع اپنے خاص احباب اور کالج اسٹاف کے تشریف لا رہے ہیں۔ اس وقت بارہ دری کے کل دروازے کھلے ہوئے تھے۔ مہمانوں نے صدر دروازے کی طرف دیکھنا شروع کیا اور یہ جلوہ نظر آیا کہ واقعی سر سید، مسٹر بیک پرنسپل کالج اور مولانا شبلی نعمانی وغیرہ بارہ دری کے چبوترے پر آگئے ہیں۔

آج کے پروگرام (نظام الاوقات) میں سب سے اہم باشان مولانا شبلی کا لیکچر تھا جو سر سید کی ہدایات کے مطابق کامل ایک سال میں تیار ہوا تھا۔ چنانچہ سید صاحب نے بحیثیت سیکرٹری کانفرنس مولوی صاحب سے ارشاد فرمایا کہ "مولانا! اب آپ اپنا لیکچر شروع کریں۔" مولانا نے اپنی جگہ سے اٹھ کر چبوترہ پر تشریف لائے اور ریڈنگ کا مجازی (کارچوبی) رومال سر سے ہٹایا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ آپ کی عمر تقریباً ۳۵ سال ہوگی اور چہرے پر گول سیاہ داڑھی تھی۔ آنکھوں میں خاص قسم کی چمک اور بشرہ سے فراست ٹپکتی تھی اور کبھی کبھی بائیں ابرو بھی پھڑک گئی تھی۔ جدید فیشن کی گرم اچکن تھی اور سر پر پارسی نما سیاہ اونچی ٹوپی جو تقریباً نصف رومال سے چھپی ہوئی تھی۔

اب مولانا منظر عام پر تھے اور سب کی نظریں ان پر پڑ رہی تھیں۔ چنانچہ مختصر زبانی تمہید کے بعد مولانا نے لیکچر شروع کیا جس کا عنوان تھا "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم"۔ فی الحقیقت موضوع کے لحاظ سے اردو میں یہ پہلا خطبہ تھا۔ ... ختم تقریر کے بعد اجلاس ختم ہوا اور سب مہمان کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔ اس کے بعد دوسرے وقت مہمان خانے میں سر سید اور مولانا شبلی سے ملاقات ہوئی۔ مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی (اڈیٹر دلگداز) بھی ساتھ تھے۔ انھوں نے شبلی نعمانی سے خاکسار کا تعارف کرایا۔ چنانچہ مولوی صاحب سے یہ پہلی ملاقات تھی اور یہ رشتۂ اتحاد ان کے زمانۂ حیات تک قائم رہا۔

ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس مدرسہ فیض عام، ۱۵ تا ۱۷ شوال ۱۳۱۱ھ (۲۲ تا ۲۴ اپریل ۱۸۹۴ء) بمقام کانپور بڑی شان سے منعقد ہوا۔ پہلے اجلاس کے بعد جو جلسے ندوہ کے ہوتے رہے ان میں بھی شرکت کا موقع ملا۔ وہ لکھنؤ کا اجلاس تھا۔ لکھنؤ کے اجلاس کے بعد خاکسار کو بنارس کے جلسے میں شرکت کا موقع ملا۔ یہ گیارھواں اجلاس مارچ ۱۹۰۶ء میں ہوا تھا۔ مولانا شبلی نے اس جلسے میں ایک علمی نمائش کا بھی اہتمام کیا تھا۔ جس میں شاہی فرامین، قطعات، نادر قلمی کتابیں، تصاویر، آلات علم ہندسہ جمع کئے گئے تھے اور یہ کوشش بھی کاشی سے کی گئی تھی جس عمارت میں ندوہ کا اجلاس ہوا یہ دارا شکوہ کا مدرسہ تھا جو اس نے تعلیم سنسکرت کے لیے بنوایا تھا۔

ایک خصوصیت اس جلسے کی یہ ہے کہ چند منتخب طلبا جنھوں نے دارالعلوم میں تعلیم پائی تھی اور مولانا شبلی نے خود ان کو ادب، علوم القرآن اور تفسیر کا درس دیا تھا۔ بطور نمونہ انھوں نے جلسۂ عام میں تقریر کی۔ پہلے دن جنھوں نے تقریر کی۔ وہ سید سلیمان اور مولوی عبدالباری بہاری تھے۔ ان طلباء کی تقریریں عموماً پسند ہوئیں اور علمائے کرام سے خراج تحسین حاصل کیا۔

ختم جلسے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں تقریر کے لیے اٹھا اور نام بنام ہر ایک طالب علم کی تقریر کا تجزیہ کر کے بتایا کہ ان میں اور دیگر مدارس کے طلباء میں کیا فرق ہے۔ یہ طرز استدلال پسند آیا۔

ختم تقریر کے بعد میرے عزیز دوست شبلی نعمانی نے فرمایا کہ "میں تو آپ کو صرف ادیب سمجھتا تھا لیکن آپ مقرر بھی ہیں۔" میں نے بعد شکریہ عرض کیا ؎

ہر فن میں ہوں طاق مجھے کیا نہیں آتا ؟

تاریخی ذوق اور علمی تحقیقات کی بنا پر مولانا ہر قسم کے میلوں اور تقریبات میں شریک ہوا کرتے تھے۔ کانپور میں رام لیلا کا میلہ ہوتا

تھا اور آخری دن تھا کہ مولانا لکھنؤ سے یکایک تشریف لائے اور فرمایا کہ آج راون جلایا جائے گا اور اس ڈرامے کا اخیر سین ہے۔ میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ کانپور سے بہتر ہندوستان میں یہ میلہ کہیں نہیں ہوتا۔ میں نے عرض کیا یہ آپ کی شان کے خلاف ہے۔ کسی قدر برہم ہو کر بولے۔ تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہو تو ہندوستان کی بھاشائیں اور ڈرامے ضرور دیکھو کیونکہ عملی طریقے سے دکھائے جاتے ہیں۔ میں نے نہایت خاموشی سے ایک پالکی گاڑی کرا لی۔ مولانا نے حسب عادت رومال کو اس طرح سر سے لپیٹا کہ چہرہ کا کچھ حصہ اور پوری داڑھی چھپ گئی۔ گاڑی میں بیٹھ کر تلسی کی رامائن کے حسب حال اشعار سنائے اور تقریباً چار گھنٹے میں میلہ ختم ہو گیا۔

جس زمانے میں مولانا کا بندوق سے ایک پاؤں ضائع ہو چکا تھا لکھنؤ میں قیام تھا اور تنہائی سے پریشان رہتے تھے۔ ایک دن میں لکھنؤ گیا تو فرمایا کہ "میں لکھنؤ میں بھی ایک نکاح کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے دریافت کیا کہ شرائط نکاح کیا ہیں؟" ارشاد ہوا کہ "منسوبہ شریف خاندان سے ہو اور عمر ۲۰ سال سے زائد نہ ہو حسن و جمال کے علاوہ شاعری اور موسیقی میں بھی دخل ہو اور خاص شرط یہ ہے کہ اس کے رشتے داروں کا دائرہ وسیع نہ ہو بلکہ صرف والدین ہوں تو مضائقہ نہیں اور نکاح سے قبل میں اس کو ایک نظر دیکھ سکوں۔ چنانچہ ایسی خاتون کا بعض احباب نے پتہ لگایا ہے۔"

میں نے مذاقاً کہا کہ تیمور کا اقبال گر چکا ہے۔ داڑھی تل چاولی ہو گئی ہے۔ دوسروں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر آپ چلتے ہیں۔ لہٰذا کوئی حسین اور جوان عورت آپ کو پسند نہیں کرے گی۔" یہ سنتے ہی خفا ہو گئے۔ اس کے بعد میں نے فوراً تقریر کا رُخ پلٹ دیا اور ان کو وہ طریقے بتائے جس پر عمل کرنے سے نکاح ہو سکتا تھا تو خوش ہو گئے اور فرمایا "معلوم ہوتا ہے کہ برسوں مشاطہ گری کی ہے۔"

جب میں دوسرے ہفتے میں ملا تو فرمایا کہ بھائی صاحب آپ سچ کہتے تھے۔ لکھنؤ کی نازک مزاج خواتین سے نباہ محال ہے اور ممکن ہے کہ اس نکاح میں میرے ساتھ فریب کیا جائے۔"

مولانا شبلی نہایت لطیف غذاؤں کے عادی تھے اور ہمیشہ پندرہ بیس روپے ماہوار کا باورچی نوکر رہتا تھا۔ ایک دن میں لکھنؤ پہنچا تو محض میری خاطر سے زردہ تیار کرایا اور آدھ سیر چاول میں ڈیڑھ سیر قند ڈالا گیا اور ایک پلیٹ اپنے ہاتھ سے بھر کر میری طرف بڑھایا مگر واقعہ یہ ہے کہ میں دو تین لقموں سے زیادہ نہ کھا سکا اور شدت حلاوت کا عذر کر کے دست کش ہو گیا۔ مسکرا کر فرمایا کہ "میرے ہم مذاق اور بد مذاق۔" یہ اپنے اور میرے تاریخی ذوق کی طرف اشارہ تھا۔

خان بہادر سید اکبر حسین الٰہ آبادی (ولادت ۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۵ء ۔ رحلت ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء)

۱۹۰۹ء سے قبل میں چند مرتبہ سید صاحب سے مل چکا تھا لیکن جب وہ سنہ مذکور میں سب جج ہو کر کانپور میں تشریف لائے اس وقت سے رشتۂ اتحاد اور بڑھ گیا۔ ہر شنبہ کی رات اور تعطیلوں میں احباب جمع ہوتے تھے۔ ان میں منشی رحمت اللہ رعد (مالک نامی پریس)، مولوی احسان اللہ وکیل منشاوری اور خاکسار اور طبقۂ وکلاء میں منشی گور سہائے اور ایک کشمیری پنڈت بھی تھے۔ یہ ایک مجلس مذاکرہ تھی جس میں سید صاحب متقدمین کا اور نیز اپنا کلام سناتے تھے اور جدید نظمیں عشرت حسین سے پڑھوائی جاتی تھیں اور کھانے کے بعد ۱۱ یا ۱۲ بجے شب کو جلسہ برخاست ہوتا تھا۔

میں نے سید اکبر حسین سے ایک موقع پر یہ سوال کیا کہ آپ جیسے مذہبی شخص نے ظریفانہ شاعری کیوں اختیار کی اور سرسید اور کالج کے خلاف مضامین کس بنا پر لکھنا شروع کئے۔ وہ ہنس کر فرمایا کہ یہ رنگ اودھ پنچ کے مضامین سے پیدا ہوا تھا اور ظریفانہ مذاق بھی اس زمانے کے ماحول کا نتیجہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ شہرت و ناموری کا ذریعہ اس عہد میں اخباری مضامین ہی تھے۔ لہٰذا اکبر حسین سے جو غلطی ہوئی وہ معافی کے قابل ہے اور مجھے یہ بھی علم ہے کہ اخیر دور میں سید اکبر حسین کے احباب نے بھی ان کو سرسید کی اور کالج کی مخالفت سے منع کیا تھا۔ چنانچہ ان کی شاعری کا رنگ اس کے بعد بدل گیا تھا۔

آنریبل جسٹس سید امیر علی

ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دسمبر ۱۸۹۹ء میں بمقام کلکتہ ہونے والا تھا۔ اس سے قبل میں دو مرتبہ کلکتہ کی سیر کر چکا تھا لیکن مولانا ابوالکلام آزاد، جسٹس امیر علی اور نامور شاعر رضا علی وحشت کے شوقِ ملاقات میں کلکتہ جانا پڑا۔ چنانچہ کلکتہ پہنچ کر دارالسلطنت کی حیثیت سے اس بڑے شہر کو بہ نظرِ غائر دیکھا۔ ۲۰ دسمبر سے ۳۱ دسمبر تک کانفرنس میں شرکت رہی۔ سید (امیر علی) صاحب کا خطبۂ صدارت نہایت عمدہ اور مفید تھا۔ اس میں یہ بحث بھی تھی کہ ہندوستان کی ترقی عورتوں کی دماغی تربیت پر منحصر ہے۔ سید صاحب عورتوں کو مردوں سے بھی بلند درجے پر دیکھنا چاہتے تھے۔

تیس سال قبل البتہ سید امیر علی صاحب کے ملاحظے سے گزر چکی تھی۔ چنانچہ اس ذریعے سے بنگلے پر سات مرتبہ حاضری کا موقع ملا اور چار بار قومی مسائل پر گفتگو رہی۔ سید صاحب مسلمانوں کے لیے قانونی تعلیم اور تجارت پسند کرتے تھے۔ سرسید احمد خاں کی قومی خدمات کے بھی معترف تھے۔ سید امیر علی پہلے ہندوستانی ہیں جن کے مضامین نائنٹینتھ سنچری لندن میں شائع ہوتے اور تمام یورپ میں وہ ایک بہترین انشا پرداز تسلیم کیے گئے۔

ختمِ اجلاس کے بعد جسٹس امیر علی نے کانفرنس کے ایک سو انتخابی ممبروں کو ایک فرانسیسی جہاز پر پارٹی دی۔ یہ دعوت اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک نئی چیز تھی۔ چنانچہ جسٹس کی اہلیہ کی جانب سے مہمانوں کے نام دعوتی خطوط آئے تھے۔ ہماری یہ میزبان علمی حیثیت سے ممتاز خاتون اور غالباً لارڈ کرزن کی سالی تھیں اور ایک نمائش میں حسن کا تمغہ بھی پا چکی تھیں۔ انھوں نے نہایت گرم جوشی سے مہمانوں کا استقبال کیا غالباً لفظ "سلام" اور "مزاج شریف" کے الفاظ ان کو یاد کرا دیے گئے تھے۔ ہر مہمان سے آمد و رفت پر مصافحہ کیا تھا۔

یہ جہاز ساحل سے کھلتے ہی تقریباً ۲۰ میل تک گیا تھا۔ جاتے وقت مہمانوں نے جہاز کی ساخت، مشنری اور اس کے تمام اجزا کو دیکھا اور واپسی کے وقت گھنٹی ہوتے ہی پارٹی شروع ہوئی۔ ہر قسم کے تازہ پھل اور انگریزی مٹھائیاں اور چائے کافی موجود تھی اور میاں بی بی مہمانوں کی مدارات میں مصروف تھے۔ حقیقت میں یہ پارٹی عدیم النظیر تھی جو کامل دو گھنٹے رہی۔

مٹیا برج

میں نے مٹیا برج کو تین مرتبہ دیکھا۔ اوّل عہدِ طفلی میں دیکھا تو کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا دیکھا۔ البتہ عالمِ شباب میں پہنچ کر شاہ کی حیات میں

مٹیا برج کا ایک ایک گوشہ دیکھا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ لکھنؤ کی سیر کر رہا ہوں جس میں واجد علی شاہ کی حکومت ہے۔ تیسری بار جان عالم کی رحلت کے بارہ سال بعد دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اب مٹیا برج کی ہر در و دیوار سے حسرت و بیکسی ٹپک رہی تھی اور وہ ایک عبرت کدہ تھا۔

پٹنہ لائبریری

مجھے اورینٹل لائبریری پٹنہ کے دیکھنے کا از حد اشتیاق تھا۔ لہٰذا خان بہادر خدا بخش خان صاحب کی خدمت میں ایک عریضہ بھیج دیا تھا۔ خان بہادر نے شفقت بزرگانہ سے مجھے خاص لائبریری کے ایک حصے میں مہمان کیا اور میں نے اطمینان سے کتب خانے کو دیکھا۔ اور کل سولہ گھنٹے پٹنہ میں قیام رہا۔

دہلی دربار

یکم جنوری ۱۹۰۳ء کو ملک معظم ایڈورڈ ہفتم کا دربار تاجپوشی دلی میں منعقد ہوا۔ اس دربار کی خوش نصیبی یہ ہے کہ اس کو لارڈ کرزن جیسا سلیقہ شعار و نفیس مزاج منتظم مل گیا تھا۔ دسمبر کی ۲۰ تاریخ تھی کہ ہماری مختصر جماعت کانپور سے بعد نماز مغرب دلی کو روانہ ہوئی۔ کوچہ چیلاں میں جامع مسجد کے قریب ایک مکان دس یوم کے لیے سو روپے کرائے پر پہلے سے لے لیا تھا اس میں مقیم ہوئے اور نہاری کے بعد ہی دلی کی سیر شروع ہو گئی تھی چنانچہ دسمبر کے چار دن بمشکل ختم ہوئے اور وہ رات آئی کہ جس کی صبح کو دربار تھا۔ بقول سودا یہ وہ رات تھی کہ جو

نہ لگی شوق میں جس کے کبھی شائق کی پلک

نماز صبح سے بہت پہلے جامع مسجد کی سیڑھیوں کے مچان پر قبضہ کیا گیا (فی ٹکٹ دس روپیہ کرایہ تھا) مسجد کا یہ وہ رخ تھا جس کے سامنے قلعہ معلّیٰ واقع تھا اور اسی راستے سے شاہی جلوس گزرنے والا تھا۔ سورج کی کرنیں جامع مسجد کے میناروں اور طلائی برجیوں پر پڑ رہی تھیں کہ دور سے انگلش بینڈ کی سُریلی آواز کانوں میں آنے لگی اور تقریباً ۴۵ منٹ میں یہ وہ منظر تھا جو کسی مغل فرماں روا کو بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ میں آہستہ خرامی کے ساتھ یہ جلوس ختم ہوا اور مہمان درباری پنڈال (امفی تھیٹر) میں جاکر ٹھہر گئے۔

داغ دہلوی

میں نے اپنی زندگی کے ہر دور میں پچاس سال کے اندر ہندوستان کے مشاہیر شعرا کو دیکھا اور ان کی زبان سے ان کا کلام بھی سنا ہے۔ میرے والد منشی الٰہی بخش معتقد (نجم ہند) چونکہ خود شاعر تھے اور انھوں نے عالم شباب تک آگرہ اور لکھنؤ میں باکمال شعرا کو دیکھا تھا اور مشاعروں میں شریک ہو کر غزلیں پڑھی تھیں۔ اس لیے مجھے ہدایت تھی کہ ان کی مجالس سے استفادہ کروں۔ عجیب اتفاق ہے کہ تعلیم کے زمانے میں بھی ادب سے ہمیشہ دلچسپی رہی لیکن کبھی شاعری کی طرف توجہ نہیں ہوئی اور تمام عمر سیاحت میں گزری۔ البتہ بھوپال میں چند فارسی نظمیں لکھیں جو مرثیوں اور تاریخی واقعات تک محدود تھیں۔

اب یہ سنئے کہ داغ کی ملاقات کیونکر ہوئی؟

دلی میں حضور نظام کی کوٹھی شہر سے الگ تھی اور کئی ہزار گز احاطہ رقبہ کوٹھی کے متعلق تھا جس میں امرائے دولت کے سیکڑوں خیمے اور بارگاہیں تھیں۔ ہر خیمے کے دروازے پر خوش رنگ زرد رنگ کی تختی پر سیاہ گہرے حروف میں صاحب خیمہ کا نام لکھا ہوا تھا۔ دو منٹ کے بعد میرزا داغ کا نام نظر آیا۔ صدر دروازے پر ایک چوبدار نے جس کی سرخ مخمل کی وردی پر طلائی و نقرئی کام تھا چک اٹھائی اور ہم لوگ اندر داخل ہوئے۔ پہلے گول کمرے میں بٹھائے گئے چند منٹ کے بعد طلبی ہوئی۔ دو درجے طے کر کے جب تیسرے میں پہنچے تو دیکھا کہ ایک قوی الجثہ شیخ تکیے کی چوب تھام کر ہمارے استقبال کو اٹھ رہا ہے کیونکہ چلنے سے معذور ہے اور پنڈلیوں پر گرم اُونی پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ درد عرق النسا میں مبتلا تھے۔

میرزا صاحب نے کھڑے کھڑے معانقہ کیا پھر ہمارے اصرار پر بیٹھ گئے۔ کارڈ سے نام تو پہلے ہی معلوم ہو چکے تھے اب نام بنام تعارف ہوا اور بیٹھتے ہی میری جانب پیچوان بڑھایا اور ارشاد فرمایا کہ شغل فرمائیے۔ میں نے عرض کیا کہ پیر و مرشد خدا نے اس آگ سے مجھے اب تک محفوظ رکھا ہے۔ فرمایا کہ اس کا نعم البدل بھی موجود ہے۔ اجازت ہو تو ایک جام پیش کیا جائے۔ اس لطیفے پر خوب ہنسی ہوئی۔ یہ محض شاعرانہ مذاق تھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ داغ آخر عمر تک زندہ دل رہے۔

میری کتاب ابر کرم ۱۹۰۲ء میں شائع ہو چکی تھی اور میرزا صاحب پڑھ چکے تھے۔ چنانچہ اس کتاب کے بعض مضامین پر بحث ہوتی رہی۔ اس کے بعد سلطان سنجر سلجوقی کے متعلق مجھ سے چند سوالات کئے۔ صحیح جواب ملنے پر بہت خوش ہوئے اور حیدرآباد آنے کی دعوت دی اور فرمایا کہ اپنا فوٹو کانپور پہنچ کر بھیج دینا۔

اس کے بعد موجودہ شاعری پر مناظرہ شروع ہوا۔ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد یہ طے ہوا کہ اگرچہ ہماری شاعری عیوب سے خالی نہیں لیکن اُردو ادب کی ترقی کے لیے شاعری اور مشاعروں کا بقا ضروری ہے۔

جب یہ دلچسپ بحث ختم ہو گئی تو میں نے دریافت کیا کہ مولوی سید احمد دہلوی نے تیس سال کی محنت میں فرہنگ آصفیہ (لغت اُردو) لکھی ہے۔ تحقیقات لغات اور محاورات اور زبان کی حیثیت سے اس کتاب کی نسبت جناب کی کیا رائے ہے؟ فرمایا کہ "سید احمد جوب سرائے کے باشندے تھے" اور یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

انگیٹھی کے سامنے پر چاندی کی ایک تپائی پر ریشمی بستے میں ایک کتاب رکھی ہوئی تھی۔ منشی رحمت اللہ نے اجازت لے کر اس کو کھولا۔ اندر سے طلائی کام کی ایک جلد نکلی۔ رعد نے خیال کیا کہ مصحف ہے۔ چاہتے تھے کہ آنکھوں سے لگائیں۔ اس پر میرزا صاحب کو ہنسی آگئی اور رعد بھی کچھ جھجک گئے۔ سرورق کھولا تو مہتاب داغ کا جلوہ نظر آیا۔

یہ دکن کی پیداوار تھی (رعد اپنے تخلص کے اعتبار سے بلند آواز تھے) ایک غزل پڑھی۔ حاضرین بزم نے بہت داد دی لیکن جناب داغ کی موجودگی میں رعد کی یہ کڑک مجھے پسند نہ آئی۔ میں نے میرزا صاحب سے عرض کیا کہ مسافر نوازی کی تو یہ شان ہے کہ جناب خود بھی کچھ ارشاد فرمائیں۔ درخواست منظور ہوئی۔ رعد سے دیوان لے کر کئی غزلیں پڑھیں۔ پڑھتے وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ایک بیست سالہ نوجوان غزل پڑھ رہا ہے۔ نہ آنکھیں مٹکتی تھیں نہ ہاتھوں کو حرکت تھی اور یہ محسوس ہو رہا تھا کہ متن کے ساتھ شارح تفسیر کرتا جاتا ہے۔ بیس منٹ میں غزل خوانی ختم ہوئی۔ میری زبان سے برجستہ نکلا کہ آج میں نے داغ نہیں بلکہ ذوق علیہ الرحمۃ کی زبان

سے یہ غزلیں لکھائی ہیں۔ ذوق کا نام لیتے ہی آنکھوں میں آنسو آگئے اور چند منٹ تک خاموشی رہی۔

اس علمی مذاکرہ کے بعد چائے کی کشتیاں آئیں جن میں زرد پیالیوں کے سوا کل سامان نقرئی تھا۔ بسکٹ، کیک، مٹھائیاں، پھل ہر قسم کے تھے خود شریک نہیں ہوئے کہ ناشتے کا وقت گزر چکا تھا۔ اس درمیان میں چند اصحاب دہلی کے ملاقات کے لیے آئے اور ہم لوگ رخصت ہوئے۔

میرزا صاحب نے مصافحہ اور دعائے خیر کے بعد جانے کی اجازت دی۔ افسوس ہے کہ آج کی یہی پہلی ملاقات تھی اور یہی آخری۔

ایجوکیشنل کانفرنس ڈھاکہ (سنہ ۱۹۰۶ء)

کلکتہ سے ڈھاکہ کا سفر شروع ہوتا ہے۔ لہٰذا بنگالے کا یہ اخیر سفر تھا اور کانفرنس میں بھی یہ آخری شرکت تھی۔ کیونکہ اسی سال میں حضور سرکار عالیہ ہز ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ فرمانروائے ریاست بھوپال نے خاکسار کو ریاست میں تحصیلدار مقرر فرمایا تھا۔ حاکم پرگنہ ہو کر موسم سرما میں کبھی اس قدر فرصت نہ ملی کہ کسی قومی جلسے میں شریک ہوتا۔

ڈھاکہ کانفرنس کے میزبان نواب خواجہ سر سلیم اللہ خاں صاحب جی۔ سی۔ آئی۔ ای تھے۔ نواب صاحب نے سنہ ۱۹۱۵ء میں انتقال کیا۔ جہاں تک ڈھاکہ میں جو دعوتیں ہوئیں وہ شاہانہ تھیں۔ بزرگان بہار اور بنگال کی شرکت سے ڈھاکہ کا اجلاس نہایت شاندار ہوا۔ مشاہیر قوم میں سے سر علی امام، حسن امام (رئیس نیورہ ضلع عظیم آباد) جسٹس شرف الدین اور مسٹر مظہر الحق بیرسٹر موجود تھے۔ جلسے کی عام تقریروں کے علاوہ پرائیویٹ صحبتوں میں بھی خاص طور سے علمی مذاکرات دلچسپ تھے کیونکہ ان جلسوں میں سیاسیات پر زیادہ گفتگو رہی اور سب سے بڑی نعمت مجھ کو یہ ملی کہ خلیفہ محمد حسین صاحب وزیر ریاست پٹیالہ کی دست بوسی نصیب ہوئی۔ گزشتہ صدی میں یہ وہ بزرگ ہیں جنھوں نے تاسیس علی گڑھ کالج میں سر سید کو بڑی مدد دی تھی۔ دوران تعمیر کالج میں یہ بحث پیش ہوئی کہ شیعوں کے لیے جداگانہ مسجد تعمیر کی جائے لیکن خلیفہ صاحب نے طے کیا کہ مسجد ایک ہی رہے گی۔ دونوں جماعت کے طلبا ایک ہی مسجد میں اوقات معینہ پر نماز ادا کریں گے۔ چنانچہ آج تک یہی عمل جاری ہے۔

خلیفہ صاحب شکل و صورت سے فرشتہ معلوم ہوتے تھے۔ اخلاق نہایت وسیع تھے۔ میری کتاب نظر سے گزر چکی تھی۔ لہٰذا بزرگانہ شفقت سے ملے اور کتاب کی تحقیقات اور طرز انشا کی داد دی۔ پھر ارشاد ہوا کہ آپ نظام الملک طوسی لکھ رہے ہیں۔ خواجہ حسن نظام الملک کے ذیل میں حسن بن صباح کا بھی ذکر آئے گا لہٰذا حسن کے حالات منصفانہ لکھنا تعصب اور شیعہ سنی کے مباحث سے ممیز ہو کر موجودہ قومی معاملات کو پیش نظر رکھنا۔ میں نے اس ہدایت کا شکریہ ادا کیا۔ چار مرتبہ حاضر خدمت ہوا اور ہر مرتبہ نصائح سے مستفید ہوا۔ پٹیالہ حاضر ہونے کی دعوت دی مگر افسوس ہے کہ میں نہ جا سکا۔ اب یہ صحبتیں خواب و خیال ہیں۔

نواب سید مہدی علی خاں منیر نواز جنگ محسن الملک بہادر (۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۲ء — ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء)

نواب محسن الملک سے میں اس وقت ملا ہوں جب کہ ایجوکیشنل کانفرنس قائم ہو چکی تھی اور یہ تعلقات اس وقت اور بڑھ گئے جب سید صاحب کی رحلت (۲۷ جنوری سنہ ۱۸۹۸ء) پر وہ علی گڑھ کالج کے سیکرٹری ہوئے۔ محسن الملک بہادر نے کانفرنسوں کے مباحثے میں کئی مرتبہ (سر سید کے مقابلے میں) میری اعانت کی تھی اور جب میری تقریر پسند آئی تھی تو حوصلہ افزائی کے لیے ارشاد ہوتا کہ شاباش! مرحوم کے اس لفظ کو میں تمغۂ قیصری سے زیادہ قیمتی سمجھتا ہوں۔

خان بہادر شمس العلماء منشی ذکاء اللہ دہلوی (ولادت ۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۲ء ۔ رحلت ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء)

میں جس زمانے میں فتح پور کے تحصیلی اسکول میں پڑھ رہا تھا، اس وقت نصاب میں ٹاڈ ہنٹر کی کتاب حساب اور پیمائش میں داخل تھی جو خان بہادر کی ترجمہ کی ہوئی تھی۔ اس بنا پر شوق تھا کہ موقع پر موصوف سے شرف نیاز حاصل کروں گا۔ چنانچہ اسی دوران میں خان بہادر کانپور تشریف لائے اور اپنے شاگرد بابو محبوب بخش اوورسیر کے مہمان ہوئے۔ میں ایک ماسٹر کے ہمراہ ملنے گیا اور بحیثیت طالب علم کامیابی امتحان کے طریقے دریافت کئے۔ نہایت شفقت سے اصول سمجھائے۔

ابتدائی ملاقات کے پانچ سال بعد الہ آباد جانے کا اتفاق ہوا (خان بہادر اُن دنوں میور سنٹرل کالج الہ آباد میں پروفیسر تھے) دیکھتے ہی پہچان لیا اور فرمایا: "تم مڈل پاس کر چکے ہو گے؟" میں نے عرض کیا "جی ہاں۔ امتحان میں کامیاب ہو گیا ہوں اور اب شرح جامی پڑھتا ہوں۔" یہ سُن کر خوش ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ بہترین تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہو تو فرنگی محل لکھنؤ چلے جاؤ یا دیوبند۔"

اس کے بعد میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ مدارس کے طلبا آپ سے بہت ناراض ہیں۔ پوچھا "سبب؟" میں نے کہا کہ آپ کی نسبت یہ شہرت ہے کہ ایک نمبر کی غلطی پر آپ طالب علم کو فیل کر دیتے ہیں۔ مسکرا کر فرمایا: "ہاں یہ واقعہ ہے لیکن اس سختی سے غرض یہ ہے کہ طلبا اسکول و کالج سے کامیاب اور قابل ہو کر نکلیں۔ نالائق نہ اپنی ذات کے لیے مفید ہے نہ قوم کے لیے نہ گورنمنٹ کے لیے۔ ایسی ناقص تعلیم سے جاہل رہنا بہتر ہے اور اس اصول کو ہمیشہ یاد رکھنا۔"

یہ میرے بچپن کے حالات تھے۔ ایک عرصے کے بعد ۱۹۰۶ء میں خان بہادر سے ملاقات ہوئی اور کئی دن تک علی گڑھ کالج کے ایک کمرے میں ایک جگہ رہنے کا اتفاق ہوا تو میں نے سوال کیا کہ آپ کے عالم شباب میں قلعۂ معلیٰ دہلی کی کیا حالت تھی اور شاہ ظفر کا شغل کیا تھا؟ دربار میں کس قسم کے اصحاب تھے اور دلی کالج میں طریقہ تعلیم کیا تھا۔ درس کس زبان میں دیا جاتا تھا؟ یہ دلچسپ سوالات تھے۔ لہٰذا خان بہادر نے مسلسل تقریر کی۔

میں نے بچپن سے جوانی تک بیسیوں مرتبہ خان بہادر کو دیکھا اور ملا۔ ان کو ہمیشہ ایک ہی وضع میں پایا۔ قدیم طرز کی اچکن، گول سیاہ ٹوپی اور دلی کا سادہ جوتا پہنتے تھے اور یہ وضع مرتے دم تک قائم رہی۔

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد (ولادت ۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۵ء ۔ رحلت ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء)

آزاد کو برسوں سے یہ آرزو تھی کہ وہ اپنے بزرگوں کے وطن کو دیکھیں اور شیراز و اصفہان کی خاک کو آنکھوں کا سرمہ بنائیں۔ چنانچہ یہ غلبۂ محبت ان کو ایران لے گیا۔ اس سفر کا ایک حصہ اگرچہ سیاست سے بھی متعلق تھا لیکن وہ مخفی رہا۔

جب یہ بوڑھا مسافر ایران کے سفر سے واپس آیا تو دوستوں اور شاگردوں نے مجبور کیا کہ وہ سیر و سیاحت ایران پر ایک لکچر دیں۔ چنانچہ جب اس لکچر کا اعلان ہوا تو یہ خاکسار بھی کانپور سے لاہور گیا اور لکچر میں شریک ہوا۔ لاہور میں میرا قیام مولوی ممتاز علی (مالک رفاہِ عام پریس) کے مکان پر تھا اور انھیں کی معیت میں لکچر سنا۔ جس کی گونج ہنوز میرے کانوں میں ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آزاد ریڈیو پر بول رہے ہیں۔

کانپور سے اخبار "عالم تصویر" (ہندوستان کا سب سے پہلا مصور اُردو اخبار) جاری ہو چکا تھا اور میں اس لیکچر کی نقل ایڈیٹر رفیق ہند لاہور سے لے آیا تھا چنانچہ اس کو عالم تصویر میں چھپوایا۔ یہ لیکچر نہایت دلچسپ تھا جس کے متعدد فقرے جزو زبان ہو چکے ہیں اور اس وقت بھی آزاد کو یاد کر رہے ہوں گے مگر آزاد کہاں۔ وہ تو گہری نیند میں سو رہا ہے۔

واپسی ایران کے بعد جنون کا غلبہ ہوا۔ ان کے اس دورِ حیات کا واقعہ ہے کہ لاہور میں چند روز میرا بھی قیام رہا۔ ایک دن میں نے مولوی ممتاز علی سے کہا کہ مجھے آزاد سے ملا دیجئے۔ فرمایا کہ اب تو آزاد کا صرف نام باقی ہے۔ آزاد کہاں! جب میں نے بہت اصرار کیا تو ترکیب بتائی کہ صبح کو وہ ہوا خوری کے لیے نکلتے ہیں اور اکثر کنارِ راوی تک جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہو جاؤ۔ جب موقع ملے تو ممکن ہے کہ دو چار باتیں کر سکو۔ دوسرے دن میں نے ایسا ہی کیا۔ گھر سے نکل کر دو فرلانگ چلے گئے ہوں گے کہ ایک ہندو طالب علم بھی میرے ساتھ ہو لیا۔ وہ بھی آزاد سے گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد اس طالب علم کو بات کرنے کا موقع ملا۔ اس نے سلام کیا اور کچھ کہنا چاہتا تھا کہ آزاد نے غضب ناک تیوروں سے دیکھا اور کہا: "چل دُور ہو۔ اپنی راہ لگ"۔

یہ سنتے ہی وہ طالب علم فرار ہو گیا۔ اب میں چند گز کے فاصلے پر ہٹ گیا لیکن ساتھ ہی ساتھ چلتا رہا۔ کچھ وقفے کے بعد آزاد ایک دکان پر بیٹھ گئے۔ چند منٹ کے بعد جب طبیعت میں سکون ہوا تو دوکاندار سے مخاطب ہو گئے۔ یہ بہترین موقع تھا۔ اب تو میں نے بھی بڑھ کر سلام کیا۔ غور سے دیکھا۔ نام پوچھا۔ اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ برسوں سے ملاقات کی آرزو تھی۔ وہ آج پوری ہوئی۔ اس کے بعد دریافت کیا کہ کیا چاہتے ہو؟ میں نے کہا کہ دعائے خیر! یہ سنتے ہی دعا کو ہاتھ اُٹھائے۔ دعا کے الفاظ کیا تھے؟ سمجھ میں نہ آئے۔ اس کے بعد پھر کبھی آزاد کی زیارت نصیب نہ ہوئی۔

شمس العلماء حافظ مولوی نذیر احمد دہلوی

(ولادت: ۱۲۵۲ھ / ۱۸۳۶ء، رحلت: ۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۲ء)

مولوی نذیر احمد ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو کر الٰہ آباد میں تعینات ہوئے اور چھ ماہ کے اندر بقدر ضرورت انگریزی حاصل کی اور اس قدر ترقی کی کہ تعزیرات ہند کے مترجم قرار پائے۔ ترجمہ کے صلے میں لفٹنٹ گورنر (میور صاحب) نے تحصیلدار مقرر کر کے کانپور میں تعینات کیا۔

میں ایک زمانہ میں محافظ خانہ کلکٹری کانپور میں اہلمد متعین تھا اور تحصیل نزول کی مثلیں دیکھ رہا تھا کہ یکایک مولوی نذیر احمد کے چند فیصلے سامنے آ گئے۔ میں نے ان کو پڑھنا شروع کیا تو خاص لذت محسوس ہوئی اور ہر جملے سے ادب کی شان نمایاں تھی اور قدیم و جدید انشا میں بے نام فرق تھا۔

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی

(ولادت: ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء، رحلت: ۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۵ء)

اشاعت مسدس کے بعد کانپور میں مولوی فرید الدین سب جج نے محفل میلاد مرتب کی۔ خود بھی مولود خواں تھے اور اس محفل میں مشاہیر شعراء کو جمع کیا تھا چنانچہ محفل ولادت کے موقع پر مسدس کے مشہور بند پڑھ کر سنائے۔ یہ نظم سن کر تمام شعراء بدحواس ہو گئے اور ان کی وہی حالت ہو گئی تھی جس طرح شعرائے جاہلیت عرب میں قرآن پاک سن کر سر دھنتے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے مسدس حالی سنا۔

دلی کانفرنس (سنہ ۱۹۰۳ء) میں جب انجمن ترقی اردو کا سنگ بنیاد رکھا گیا، اس جلسہ میں شمس العلماء نذیر احمد، شبلی نعمانی اور حالی موجود تھے جب خواجہ صاحب تشریف لائے تو انھوں نے اپنا جوتا اُتار کر فرش کے نیچے رکھ دیا تھا۔ جب جلسہ ختم ہو گیا تو تمام حضرات اُٹھے اور خواجہ صاحب اپنا جوتا تلاش کرنے لگے۔ اس وقت میں نے بڑھ کر فرش کے نیچے سے جوتا نکالا اور سامنے رکھ دیا۔ میری اس خدمت پر خواجہ صاحب نہایت منفعل ہوئے اور چند منٹ تک خاموش رہے۔ میں نے نہایت ادب سے عرض کیا کہ مجھے جو عزت آج حاصل ہوئی ہے وہ تمام عمر یاد رہے گی اور جب ہم کفش برداری نہ کریں گے تو آئندہ نسلیں کیا یاد کریں گی۔ یہ سن کر خواجہ صاحب چونک اُٹھے اور بزرگانہ شفقت سے دعائیں دیں اور رخصت ہوئے۔

جب شب کو میں قیام گاہ پر حاضر ہوا، اس وقت بھی دیر تک معذرت کرتے رہے۔

تمام عمر میں تقریباً ۱۰ مرتبہ خواجہ صاحب سے ملاقات ہوئی ہے اور جس زمانے میں "حیات جاوید" نامی پریس کانپور میں چھپ رہی تھی خواجہ صاحب کئی مرتبہ کانپور تشریف لائے اور کئی کئی دن قیام رہا اور مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ حیات جاوید کے تمام پروف کی میں نے صحت کی ہے۔

رحلت سے دو سال قبل میں پانی پت میں حاضر ہوا اور ایک ہفتہ مہمان رہا۔ دسترخوان پر دونوں وقت بالائی ہوتی تھی اور انتہائی شفقت سے اپنے ہاتھ سے کھانے کی پلیٹ بڑھا دیتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خواجہ صاحب نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ بہت کم بولتے تھے۔ چائے اور کھانے کے وقت باتیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک دن میں نے دریافت کیا کہ اس عمر میں بھی جذبات شاعری اُبھرتے ہیں تو حسرت سے فرمایا ؎

نہ رہی چیز وہ مضمون سجھانے والی

پھر ارشاد ہوا کہ بعض مفید خیالات جو دماغ میں آتے ہیں، ان کو رباعی کے سانچے میں ڈھال لیا کرتا ہوں۔ چنانچہ رباعیات کا کثیر حصہ اخیر عمر کا سرمایہ ہے۔

اس کے بعد نصیحت فرمائی کہ تم کو تاریخ سے ذوق ہے تو چند بار توراۃ المقدس کو پڑھ ڈالو۔ بغیر توراۃ کے مطالعہ کے وقائع نگاری نہیں آسکتی۔ چنانچہ میں نے اس نصیحت سے بہت فائدہ اُٹھایا۔

نواب وقار الدولہ وقار الملک انتصار جنگ مولوی حاجی مشتاق حسین خان بہادر

ولادت : ۱۲۵۵ھ / ۱۸۴۱ء رحلت : ۱۳۳۶ھ / ۱۹۱۷ء

۱۹۰۵ء میں ڈھاکہ ایجوکیشنل کانفرنس میں مسلم لیگ کی بنیاد پڑی۔ سر علی امام، حسن امام، مظہر الحق، مولوی جسٹس شرف الدین وغیرہ نے اسی جلسے میں مسلم لیگ کے ابتدائی قواعد وضع کیے اور مسلمانوں کو نیشنل کانگریس کے مقابلے میں اپنے قومی حقوق کے تحفظ پر آمادہ کیا۔ نواب صاحب نے دورہ کر کے مسلم لیگ کی کمیٹیاں مختلف شہروں میں قائم کیں اور جب اس تقریب سے کانپور تشریف لائے تو ان کی معیت میں کام کرنے کا مجھے بھی موقع ملا اور نواب صاحب کے اخلاق و عادات کا کامل اندازہ ہوا۔

جب کانپور میں مچھلی بازار کی مسجد کے معاملے میں قتل عام ہوا، اس دن میں دلی میں تھا۔ اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد امروہہ جانے کا اتفاق ہوا۔ اس زمانے میں نواب صاحب علیل تھے۔ جب میں دردولت پر پہنچا اور اطلاع ہوئی کہ ایک مسافر سلام کے لیے حاضر ہوا ہے تو مکان سے نکل کے باہر استقبال کو تشریف لائے اور جب میں کمرے میں داخل ہو گیا تو نہایت تیزی سے جھکے اور میرے بوٹ کو آنکھوں سے لگایا۔ اس وقت میں بدحواس تھا

کہا کروں؟ میں نے شانہ پکڑ کر نواب صاحب کو اُٹھایا اور عرض کیا کہ حضور والا! یہ عزت افزائی کس بنا پر؟ فرمایا ۔ میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ مصنف البرامکہ بھی واقعہ کانپور میں شہید ہو چکا ہے ۔ اس لیے عالم بیقراری میں اس طریقے سے میں نے تمھاری تعظیم کی اور تم کو دیکھ کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا ۔

ایک معمولی مصنف کا یہ احترام باعث حیرت ہے ۔ یہ وہ واقعہ ہے جس کی دوسری نظیر کتب اخلاق میں بھی ہرگز نہیں ملے گی ۔ آئندہ زمانے میں نواب وقار الملک جیسے شریف پیدا نہ ہوں گے ۔ یہ واقعہ مجھے لکھنا نہیں چاہیے تھا لیکن اس لیے لکھ دیا کہ تاریخ میں یادگار رہے اور نئی نسلوں کو معلوم ہو کہ ان کے بزرگوں کا اخلاق بچوں اور جوانوں کے ساتھ کس درجے کا تھا ۔

منشی محمد رحمت اللہ رعد مالک نامی پریس کانپور

(ولادت: ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء — رحلت: ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء)

عین زمانہ غدر میں بمقام کانپور ولادت ہوئی ۔ تعلیم و تربیت کے بعد رعد کو شفیق باپ (شیخ مراد بخش) نے کتب فروشی کی دوکان پر بٹھایا اور اُردو ہندی کتابوں سے دوکان سجائی ۔ دو تین سال میں وہ کامیاب تاجر بن گئے ۔ سنہ [illegible] میں نامی پریس قائم کیا ۔ چنانچہ اس ضرورت سے خوش نویسی، صحیح سنگی اور مصوری میں کمال حاصل کیا ۔ جنتری کی تمام ہندوستان میں مقبول ہوئی اور کامل تیس سال تک خاکسار نے شاہان اسلام وغیرہ کی مختصر تاریخ لکھی ۔ سنہ [illegible] میں اخبار "عالم تصویر" جاری کیا جو اُردو میں پہلا مصور اخبار تھا ۔ اس کے بنانے میں روزانہ سات آٹھ اخبار آتے تھے جن کا پڑھنا میرا بہتر مشغلہ تھا اور رحمت اللہ کی چھوٹی سی دوکان میرے حق میں امام غزالی کا حجرہ تھا ۔ سنہ ۱۸۸۶ء میں سرسید نے ایجوکیشنل کانفرنس جاری کی ۔ اب ان کی صحبت میں میں نے ہندوستان کا سفر اختیار کیا اور کوئی جلسہ کانفرنس کا بغیر شرکت باقی نہ رہا ۔

پچاس سال کی خدمات کے بعد رعد نے سنہ ۱۹۲۱ء میں انتقال کیا ۔ تقریباً دو سال تک نامی پریس کانپور میں کام کرنے کا مجھے موقع ملا ۔ البرامکہ اور نظام الملک طوسی رعد نے بڑے اہتمام سے شائع کیں جس کا میں شکر گزار ہوں ۔

مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی اڈیٹر رسالہ دلگداز

(ولادت: ۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۸ء — رحلت: ۱۳۴۵ھ / ۱۹۲۶ء)

مولوی عبدالحلیم شرر سے میری پہلی ملاقات سنہ [illegible] میں ہوئی اور تقریب یہ ہوئی کہ کانپور میں بڑے پیمانے پر انجمن اخوان الصفا قائم ہوئی اور لکھنؤ سے مولانا شرر، عاشق حسین اڈیٹر پیام یار اور نواب بدھن صاحب نیشاپوری شریک ہوئے ۔ دو یوم تک شاندار جلسے ہوتے رہے ۔ اس کے بعد لکھنؤ میں مسلسل ملاقاتیں ہوتی رہیں اور کم از کم سال میں دو مرتبہ ضرور ہی ملاقات ہوتی تھی ۔ چنانچہ میں نے شرر مرحوم کی زندگی کے تین دور دیکھے ۔ پہلے دور میں وہ خالص لکھنوی تھے اور فرنگی محل میں زیر تعلیم تھے ۔

دوسرا دور وہ تھا جب وہ لندن سے حیدرآباد آئے ۔ اب کوٹ پتلون میں ملبوس تھے ۔ میں نے ان کو برہنہ سر بھی دیکھا اور ہیٹ بھی دیکھی ۔ اصلی ترکی ٹوپی بھی ۔ تیسری مرتبہ سنہ ۱۹۲۵ء میں ملاقات ہوئی ۔ فرمایا کہ آئندہ لکھنؤ ایک ہفتہ کے لیے آنا چاہیے ۔ میں اسلام کی ایک سیاسی تاریخ لکھنا چاہتا ہوں ۔ اس میں تبادلۂ خیالات کی ضرورت ہے ۔ چنانچہ میں ربیع الاول سنہ ۱۳۴۵ھ میں لکھنؤ گیا اور سال گزشتہ کا وعدہ یاد دلایا ۔ فرمایا میں نے جو نوٹ لکھے ہیں وہ پیش کروں گا ۔ لیکن چند گھنٹوں کی صحبت میں معلوم ہوا کہ اب شرر ایک خالص صوفی اور ملا ہو گئے ہیں ۔ ان سے جس مسئلہ پر گفتگو

کی جائے۔ وہ چند منٹ میں طے کر کے صرف قرآن یا حدیث کے مسائل بیان کرنا شروع کر دیتے تھے اور ۲۳ گھنٹے مذہبی مسائل میں منہمک رہتے تھے۔ چنانچہ ۲۴ گھنٹے لکھنؤ میں قیام کر کے میں چلا آیا۔ تیسرے ہفتے اخبارات میں پڑھا کہ مولوی عبدالحلیم شرر نے بروز جمعہ ۹ بجے صبح ۱۰ جمادی الثانی ۱۳۴۵ھ میں انتقال کیا۔

مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی (ولادت: ۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ء ـ رحلت: ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۸ء)

میری پہلی ملاقات سلیم سے ۱۸۹۵ء میں بمقام علی گڑھ ہوئی۔ اس وقت وہ ۳۰ سال کے ہوں گے۔ یہی زمانہ میں سرسید تفسیر القرآن لکھ رہے تھے، مولانا سلیم، سید صاحب کے معاون تھے۔ سید صاحب کی رحلت پر حاجی محمد اسمٰعیل خاں رئیس دتاولی نے علی گڑھ سے رسالہ معارف جاری کیا اور وحید الدین سلیم نائب اڈیٹر مقرر ہوئے۔ معارف چار سال زندہ رہ کر مرحوم ہو گیا۔ مگر سلیم کی قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا۔ اس رسالے میں سب سے پہلے میں نے عبارات العجم پر ایک سلسلہ لکھا اور دو سال تک یہ مستقل جاری رہا۔

جس زمانے میں البرامکہ زیر تصنیف تھی، میں سرسید احمد کا مہمان ہوا اور سلیم صاحب کی اعانت سے سید صاحب کے تاریخی سرمایہ (مطبوعات یورپ) سے مستفید ہوا۔ فرصت کے گھنٹے شعر و شاعری اور لطائف و ظرافت میں گزرتے تھے۔

دوران آمد و رفت حیدرآباد، بھوپال میں دو ایک روز میرے مہمان رہتے تھے۔ مولانا کی یہ عارضی صحبت بھی بڑی پُرلطف ہوتی تھی۔ مولانا شبلی نعمانی کی تصنیفات پر ان کی تنقید بہت سخت ہوتی تھی اور شعر العجم پر اکثر مباحثے ہوا کرتے تھے۔

خان بہادر میر ناصر علی ادیب دہلوی ایڈیٹر رسالہ صلائے عام (رحلت: ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء)

جب میں ۱۹۳۲ء میں دلی گیا تو میر صاحب سے نیاز حاصل کیا۔ نومبر کا مہینہ تھا اور ۸ بجے صبح کا وقت کہ میں نے زنجیر در کھٹکھٹائی۔ بالاخانہ پر طلبی ہوئی۔ بعد سلام، بزرگانہ شفقت سے میر صاحب نے معانقہ کیا اور قریب بٹھا کر باتیں شروع کیں۔ چند سال سے بصارت جا چکی تھی۔ کتابیں اور اخبارات سنا کرتے تھے۔ فرمایا کہ البرامکہ دو بار پڑھوا کر سن چکا ہوں۔ تمہارے آنے سے مجھ کو بہت مسرت ہوئی۔ میر صاحب کی گفتگو خالص دلی کی زبان میں تھی۔ اگر مخاطب کی زبان سے کوئی غلط لفظ یا محاورہ نکل جاتا تو اسی وقت فرماتے۔ جی! یہ کون محاورہ ہے۔ میں نے عرض کیا کہ قبلہ (دیکھو) کانپور کا رہنے والا ہوں۔ میری زبان ٹکسالی کیونکر ہو سکتی ہے؟ میں تو بحیثیت طالب علم حاضر خدمت ہوا ہوں کہ کچھ فیض حاصل کروں۔ اگر میں معذرت نہ کرتا تو مباحثہ شروع ہو جاتا۔

کچھ وقفے میں چاء تیار ہو گئی۔ خادم نے کشتی سجا کر سامنے رکھی۔ اس کو حکم دیا کہ میرے لیے میٹھی پوریاں، بالائی، بسکٹ اور گھنٹہ گھر والی دوکان سے کچھ مٹھائی فوراً جا کر لائے۔ اس درمیان میں میر صاحب نے قلعہ معلیٰ کی بیگمات اور ان کی زبان دانی پر گفتگو شروع کی۔ بڑی دلچسپ تقریر تھی۔ اس کے بعد زوال مغلیہ پر گفتگو شروع ہوئی۔ مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ اکبر اعظم کی پالیسی باعث زوال تھی یا اورنگزیب کی مذہبی سختیاں۔ میر صاحب نے دو گھنٹے تقریر کی۔ بعد میں ملزم عالمگیر کو قرار دیا اور اس کی اولاد کو نااہل۔ میر صاحب کے اعتراضات کے میں نے جواب دیئے۔ وہ پسند آئے اور میں امتحان میں کامیاب ہوا۔

بعد نمازِ عصر فراش خانے میں ایک کتب فروش کی دوکان پر تقریباً تشریف لاتے تھے۔ میں بھی مسلسل سات یوم تک حاضرِ خدمت ہوتا رہا۔ قدیم دلّی کے متعلق میں نے جو سوال کیا۔ اس کا میر صاحب نے صحیح جواب دیا۔

آنریبل جسٹس سیّد محمود۔ (رحلت: ۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۹ء)

میرٹھ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس تھا اور دسمبر کی اخیر تاریخیں تھیں۔ کانفرنس سے ہم تین احباب رخصتی جلسے سے اٹھ کر باہر آئے۔ صبح کے جلسے میں سرسیّد کے نام ایک تار آیا تھا۔ چنانچہ کارروائی جلسہ کے بعد جب تار کھولا گیا تو معلوم ہوا کہ دلّی میں سیّد حامد (سیّد محمود کے بڑے بھائی) کا انتقال ہو گیا ہے۔ لہٰذا تعزیت کے لیے میں سیّد محمود کی قیام گاہ پر گیا۔ میرے ہمراہ منشی رحمت اللہ رعد تھے اور منشی عطاء اللہ خاں (کوتوال شہر کانپور) بھی تھے۔ ادائے تعزیت کے بعد جب ہم نے اُٹھنا چاہا تو سیّد صاحب نے جانے کی اجازت نہ دی۔ کچھ وقفے کے بعد کھانا آیا۔ سب نے مل کر کھانا کھایا اور رات کے دس بج گئے۔ اب ہم پھر اُٹھے۔ ارشاد ہوا کہ برسوں کے بعد آج جناب رعد سے ملاقات ہوئی ہے۔ کچھ دیر اور تشریف رکھیے۔ حکم کی تعمیل کی گئی۔

سیّد صاحب سب سے پہلے عطاء اللہ خاں سے مخاطب ہوئے اور پوچھا آپ کو کس مضمون سے دلچسپی ہے؟ انھوں نے کہا میں بہت شکرگزار ہوں گا۔ اگر مختصر الفاظ میں سمجھا دیا جائے کہ کانگرس کیا ہے اور اس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟ سیّد صاحب نے تقریر شروع کی اور کوتوال صاحب نے اعتراضات کی بھرمار کی۔ یہ ایک دلچسپ مکالمہ تھا جو ۱۲ بجے شب کو ختم ہوا۔

اب سیّد صاحب رعد کی طرف متوجہ ہوئے کہ کچھ سنائیے۔ رعد نے مجبوراً اپنا کلام سنایا۔ اس کے بعد فرمائش کی کہ جناب بھی تو کچھ اپنا کلام سنائیے۔ فرمایا کہ لندن میں بزمانہ طالب علمی کچھ انگریزی نظمیں لکھی تھیں اور ہندوستان آ کر کچھ نظمیں اتفاقیہ طور پر فارسی میں لکھی تھیں۔ البتہ اگر آپ متقدمین و متاخرین شعرا کا کلام سننا چاہیں تو عرض کروں۔

رعد نے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ اُردو غزل کی فرمائش کی اور عرض کیا کہ ولی دکھنی سے آغاز کیا جائے۔ چنانچہ رعد ولی کی غزل کا کوئی شعر پڑھتے اور سیّد صاحب پوری غزل سنا دیتے۔ شعرائے دکن کے بعد میر کا کلام سُنایا اور غالب کے کلام پر شعرائے اُردو کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

اُردو کے بعد متقدمین شعرائے عجم کا کلام سُنایا۔ جب عاشقانہ رنگ سے طبیعت سیر ہو گئی تو منشی صاحب نے مثنوی مولانا روم کی فرمائش کی۔ چنانچہ یہ درخواست بھی منظور ہو گئی اور چند منٹ کے لیے سیّد صاحب دوسرے کمرے میں تشریف لے گئے۔ جب واپس آئے تو قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور داڑھی سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ تولیے سے مُنہ ہاتھ پونچھ کر کرسی پر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ مثنوی مولانا روم میں کبھی بغیر وضو نہیں پڑھتا ہوں۔ اب جو حکایت آپ کو پسند ہو اُس کا پہلا شعر پڑھیے۔ رعد کی زبان سے نکلا ؏

دید مجنوں را یکے صحرا نورد

چنانچہ سیّد صاحب نے نہایت ذوق و شوق اور بلند آواز سے یہ پوری حکایت سُنا دی اور ارشاد ہوا کہ میں حضرت فصیحی غازی پوری کے یہاں مثنوی پڑھا کرتا ہوں۔ مولانا والد مرحوم کے قدیم دوست تھے۔ الغرض بزم محمودی میں شعرائے عجم کا سلسلہ ۲ بجے شب کو ختم

ہو گیا ؏

شب آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ می خیزد

اب خاکسار کی باری آئی اور مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ مجھے کچھ سنائیں گے یا مجھ سے سننا چاہتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ خوش نصیبی سے یہ قیمتی رات ملی ہے۔ میں تو استفادہ کرنا چاہتا تھا۔ میرے اس جواب سے مسرور ہوئے۔ تب میں نے دریافت کیا کہ پرندوں میں سب سے بہتر اور مقوی گوشت کس کا ہے۔ یہ سوال سن کر خاموش ہو گئے۔ چند منٹ بعد بولے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ مختلف درختوں کے نیچے سات سات چڑیوں کے غول علیحدہ علیحدہ اڑتے پھرتے ہیں۔ جن کو لوا کہتے ہیں۔ اس غول میں چھ مادہ ہوتی ہیں اور ایک نر اور ایک مادہ بقیہ پانچ پر حکومت کرتی ہے جس کو ہماری دلی کی اردو میں "ڈھڈو" کہتے ہیں۔ اس نائکہ کا یہ کام ہے کہ اپنے غول کی پانچ مادائوں کو دوسرے جھنڈ میں داخل ہونے سے روکے اور اگر کوئی اس کے حکم کی خلاف ورزی کرے تو ان کو سزا دے (پنجوں سے سر کے بال نوچنا) لہٰذا لوے کا گوشت اور وہ بھی نر کا سب سے مقوی اور لذیذ ہوتا ہے۔

جب یہ دلچسپ گفتگو ہوئی تو میں نے دریافت کیا کہ یورپ اور عربوں کی تاریخ نویسی میں کیا فرق ہے؟ اس موضوع پر ایک بسیط تقریر کی۔

ہنوز سلسلۂ کلام جاری تھا کہ لیمپ کا تیل ختم ہو گیا اور کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ اسی اثناء میں مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ ارشاد ہوا کہ میرا دلی شکریہ قبول فرمایئے۔ اب آپ بھی نماز فجر ادا کیجئے اور اجازت دیجئے کہ میں بھی آرام کروں۔ چنانچہ بعد مصافحہ اور سلام ہم سب سید صاحب سے رخصت ہوئے۔

اس واقعہ کے بعد بھی متعدد مرتبہ سید محمود سے الٰہ آباد وغیرہ میں ملاقات ہوئی مگر وہ رات عجیب و غریب تھی۔

نواب مسعود جنگ بہادر سر سید راس مسعود (ولادت: ۱۸۸۹ء ۔ رحلت: ۱۹۳۷ء)

میں نے پہلی مرتبہ سید مسعود کو تین سال کی عمر میں دیکھا تھا۔ جب سید محمود نے میرے سامنے ان کو خواجہ حالی کی گود میں دیا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ تقریباً پانچ سال کی عمر میں دیکھا جب ۱۸۹۳ء میں ان کی رسم بسم اللہ اسٹریچی ہال میں ہوئی۔ پھر کامل ۴۲ سال کے بعد ۱۹۳۵ء میں جبکہ وہ بھوپال میں وزیر تعلیم ہو کر تشریف لائے۔ مصنف البرامکہ اور نظام الملک طوسی کی حیثیت سے وہ مجھ سے خوب واقف تھے مگر ہنوز ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے جب سید صاحب کو علم ہوا کہ میں بھوپال میں موجود ہوں تو یاد فرمایا اور اپنے بچپن کے حالات سن کر بہت مسرور ہوئے اور جمعہ کے جلسے میں شرکت کی تاکید کی گئی۔

سید صاحب کا حیدرآباد میں بھی یہ طریقہ تھا کہ وہ جمعہ کے دن کسی قسم کا سرکاری کام نہ کرتے تھے اور دس بجے نماز جمعہ کے وقت تک یاران جلسہ کی صحبت میں اپنا وقت گزارتے تھے چنانچہ مسلسل جون ۱۹۳۶ء (باستثنائے شاذ) تک میں اس جلسے میں شریک ہوا۔ جمعہ کی صحبت میں جب کوئی پنڈت یا فاضل ہندو آ جاتا تو اس سے ہندی الفاظ کی تحقیق کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھ سے دریافت کیا کہ سورس کی اصل کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اس کا مادۂ اشتقاق تو کوئی ہندو فاضل بتائے گا لیکن فارسی، عربی میں اس کے رسم الخط

جداگانہ ہیں۔ ہارون الرشید کے دسترخوان پر جو بیس قسم کے کھانے باری باری آتے تھے جس میں سموسہ (سنبوسہ) بھی تھا اور ہندی ویدوں کے ذریعہ سے سموسہ بغداد پہنچ گیا تھا۔

ایک دن سوال کیا کہ تحفہ کا ماخذ کیا ہے؟ میں نے فوراً عرض کیا کہ اس کا ماخذ ٹکا ہے۔ جواب سن کر خاموش ہو رہے اور کتب خانے سے ایک ضخیم لغت اُٹھا لائے۔ یہ جرمن زبان میں تھی اور اس میں صرف ہندی لغات کی تحقیقات تھی۔ اس میں لفظ تحفہ نکالا اور جو میں نے جواب دیا تھا وہی اس محقق جرمنی کی تحقیقات تھی۔ اس وقت وہ بے انتہا مسرور ہوئے اور آئندہ سے یہ معمول ہو گیا کہ جس لفظ میں شبہ ہوتا وہ صرف مجھ سے دریافت کیا کرتے تھے۔ یہ نتیجہ تھا اُردو علم و ادب کے ذوق کا کیونکہ اُردو نے سنسکرت اور برج بھاشا کی آغوش میں پرورش پائی تھی۔

۳۰۔ جنوری ۱۹۳۷ء کی آخر شب تھی کہ کوٹھی ریاض منزل (بھوپال) سے سید مسعود فردوس بریں کو سدھارے اور چند روز کی علالت میں دُنیا سے رُخصت ہو گئے۔ عجیب اتفاق ہے کہ سید مسعود کو تین برس کی عمر میں میں نے گود میں لیا تھا۔ کامل ۴۵ سال کے بعد بھوپال ریلوے اسٹیشن کے پُل پر ان کے تابوت کو اٹھایا اور پلیٹ فارم سے ریل کے ڈبے میں سوار کیا گیا۔ حافظوں نے قرآن خوانی شروع کی اور جب ریل نے سیٹی دی تو میں نے بلند آواز سے الوداع کہہ کر سید کو رخصت کیا ؎

الوداع اے ملّتِ اسلام کے روشن چراغ
الوداع اے منزلِ محمود کے روشن چراغ

خدا کا شکر ہے کہ زندہ ہوں اور باوجود رعشہ کے قلم چل رہا ہے۔ ۱۹۱۷ء لغایت ۱۹۲۷ء اس مدت میں حسب حکم سرکار عالیہ مرحومہ فرمانروائے بھوپال میں نے تاریخ اسلام کے پانچ ہزار صفحے لکھے۔ از عہد جاہلیت عرب تا خلافت فاروقِ اعظمؓ۔ عہد جاہلیت کی دو جلدیں مطبعہ کے عمل سے گم ہو گئیں جن کا انتہائی صدمہ ہے اور دوبارہ لکھنا غیر ممکن ہے۔ اب ریاست اس کو طبع نہیں کرے گی۔ روپیہ کا انتظام ہو گیا تو خود شائع کروں گا۔

ابرالکہ بعد نظرِ ثانی زیرِ طبع ہے۔ تقریباً تین سو صفحات کا اضافہ ہو کر سات سو صفحات پر کتاب ختم ہوئی ہے۔ اب کتاب مکمل ہو گئی ہے اور صدہا نئے مضامین بڑھ گئے ہیں۔ انشاء اللہ اسی ششماہی میں شائع ہو گی۔ کانپور میں زیرِ طبع ہے۔

میں فی الحال اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال کی سوانح عمری لکھ رہا ہوں۔ از ولادت تا صدارت ۲۹ سال کے واقعات لکھ چکا ہوں اور ایک جلد باقی ریاست بھوپال کی تاریخ مکمل ہو گئی ہے۔ یہ سرکاری پریس میں طبع ہو گی۔

(۷ مئی ۱۹۳۹ء)

عبدالقادر بیدلؔ

ابوالمعانی عبدالقادر بیدلؔ مختصر الفاظ میں یہ عرض کرتا ہے کہ جب قادریت کے پیکر نے عبدیت کا لباس پہنا تو بیدلِ آرزو فنا کی پیدا ہوئی۔ کچھ ہی دنوں میں والد مجازی چل بسے اور مجھے آشوبِ یتیمی میں چھوڑ دیا۔ چھٹے سال کے چھٹے مہینے میں والدہ نے ابجد سکھانا شروع کیا۔ سات ماہ تک ورق گردانی کرتا رہا۔ سال کے اختتام تک قرآن مجید ختم کر لیا۔ اس کے بعد دسویں سال تک عربی قواعد و فارسی میں مصروف رہا۔ ابھی ذہن بلوغ کو بھی نہیں پہنچا تھا کہ تحصیل علم کی کوشش چھوڑ دی۔ اس وقت سے اب تک کہ عمر اکتالیس کے قریب ہے وہی نقش تسلیم لوحِ جبیں ہے۔

اساتذۂ معنوی سے علمی فیضان

شیخ کمال

فقیر کے والد حضرت شیخ کے توسط سے غوث الاعظمؒ کی روح سے فیض حاصل کرتے تھے اور میرے چچا مرزا قلندرؔ کو بھی ان کی ہم کلامی پر فخر تھا۔ شروع میں حضرت شیخؒ تماشائے سخن کیا کرتے تھے لیکن آپ کے تقدس کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی تھی کہ وہ دیوان حسن و اضداد ہوں۔ بہار میں بہتیرے آپ کے فیض سے ہدایت یافتہ تھے۔

بیدلؔ بچپن ہی میں جہاں جاتا تھا راحت کا سامان کر دیتا تھا۔ کبھی عوام فسوں خوانوں کی طرح ہونٹ ہلاتا تھا اور مریض کے سر پر ہاتھ پھیرتا تھا۔ کبھی اپنے گلے کی حمائل مریض کی گردن میں ڈال کر فاتحہ پڑھتا تھا۔ اگرچہ یہ حرکتیں طفلانہ تھیں مگر فضل ایزدی سے صحت ہو جاتی تھی۔ جب حروف و خطوط کی تمیز ہوئی تو جہاں کہیں بھی کوئی دعا نظر آتی اسے لکھ لیتا اور یاد کر لیتا۔ اس سلسلہ میں جن اذکار کے لیے مولانا کی زبان سے جو عمل سنا تھا وہ مدتوں فقیر کے ذہن میں محفوظ تھا۔

ایک دن میں ساتھیوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ گھر میں ایک عورت جن میں مبتلا ہے اور دو دن سے بیہوش ہے۔ عاملوں کا ایک گروہ بیکار سپند جلا رہا تھا۔ اچانک امتحان کا خیال آیا۔ گھر میں ایک شخص کو بلا کر وہی اسم اعظم اس کی انگلی پر دم کر دیا تاکہ مریض کے کان میں ڈالے۔ عمل کرتے ہی جن چیخ پڑا اور وہاں سے رفوچکر ہو گیا۔ جب مولانا کو اس بات کی خبر ہوئی تو آپ نے پوچھا اس طرح کے عملیات محض خیال نہیں ہوتے تمہیں کہاں سے علم ہوا۔ عرض کیا آپ ہی کی زبانِ حقائق بیان سے سیکھا ہے۔ چنانچہ آپ کی رحمت نے جوش مارا۔ فرمایا: آج تک ہم نے جو عملی فائدے حاصل کئے ہیں وہ اس کام کے عوض تمہارے حوالے کیے۔ باخبر ہو کہ تمہارا طالع سلیمانی نظر اور تمہارا دم عیسوی اثر ہے۔ اس وقت سے اب تک بہت سے ایسے اعمال جنہیں لوگ عمر بھر میں بھی حاصل نہیں کر پاتے، فقیر نے امتحاناً کامیاب کر دکھائے۔

شاہ ملوک

شاہ صاحب سرائے بنارس میں جو بہار کے نواح میں ایک جگہ تھی ایک درخت کے نیچے رہتے تھے۔ بھوک نے کبھی آپ کو غذا نہیں پہنچائی اور نہ پیاس نے پانی۔ ایک بار مرزا قلندر کو قصبہ رانی ساگر میں جو مولانا کمال کا وطن تھا ٹھہرنا پڑا۔ سرائے بنارس سے رانی ساگر کا فاصلہ ایک کوس سے زیادہ نہیں تھا اس لیے شاہ ملوک اکثر قدم رنجہ فرماتے تھے اور ہفتوں ہماری کٹیا کو مشرف کرتے تھے۔

ایک بار چند قلندروں نے آپ سے بے ادبی کی، اچانک آپ کی برق غیرت کوندی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سب ایک دوسرے سے گتھ پڑے اور ایک دوسرے کو جان سے مار ڈالا۔

ایک دن آپ نے باتوں باتوں میں فرمایا کہ میرے کچھ اشعار یاد کر لو —— میں نے قلم کاغذ سنبھالا اور تین دن تک لگاتار لکھتا رہا۔ چونکہ اکثر اشعار ہندی میں تھے اس لیے یہاں لکھنے مناسب نہیں۔

شاہ یکہ آزاد

جس زمانے فقیر قصبہ آرہ میں مقیم تھا، شاہ صاحب بھی وہاں نزول فرما تھے۔ مرزا قلندر خصوصاً ان کی کرامات کی تعریف سے نہیں تھکتے تھے۔ ایک دن آپ ایک کشتی میں دریائے گنگا پار کر رہے تھے، جب کشتی بیچ دریا میں پہنچی تو ملاح نے ہر ایک سے ایک درہم کا مطالبہ کیا۔ آپ نے ہر چند اپنی تہی دستی کی معذرت کی، ملاح نہ مانا بلکہ آپ کے آزار کے درپے ہو گیا۔ چنانچہ آپ کشتی سے اچھل کر پانی کی سطح پر جا بیٹھے۔ یہ دیکھ کر سب لوگ چیخ پڑے۔

شاہ فاضل

آپ کی نثر نظم سے زیادہ رنگین اور آپ کی نظم نثر سے زیادہ روشن ہوتی تھی۔ اکثر میرزا قلندر سے جب آپ گفتگو فرماتے میں ہمہ تن گوش رہتا تھا۔ بیدل کے فہم ناقص کی تعریف فرماتے اور کہتے تیرے جیسا سننے والا کہاں ہے تاکہ ہم خاموشی سے باہر آئیں۔ کھجور کے رس سے آپ کو بہت رغبت تھی۔ پینے پر آتے تو سبو کے سبو خالی کر دیتے۔

رزا قلندر

آپ کی پیل تنی کا یہ عالم تھا کہ اکثر لوہے کی چیزیں جو ہتھوڑے سے سیدھی نہیں ہوتی تھیں ہاتھ سے سیدھی کر دیتے تھے۔ جس فوج کی سرداری کرتے اسے لازمی فتح ہوتی۔ اُمّی ہونے کے باوجود موزوں طبیعت رکھتے تھے۔ ان کے خصائص میں یہ ہے کہ ان کے سایہ میں بچھو مر جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ انگلی کے اشارے سے تالا کھول دیتے تھے۔ والد کی حلت کے بعد فقیر بیدل کی تربیت انھی کے ذمہ تھی۔ آداب و اخلاق کی تعلیم پر وہ پوری توجہ کرتے تھے بلکہ میری شاعری بھی انھی ی غذا و طبیعت کا عکس ہے۔

ایک دن مدرسے میں جلسہ تھا۔ دو مولوی بحث کر رہے تھے، اس سے مرزا قلندر کا دل رنجیدہ ہو گیا۔ فرمایا یہ بے عقل ندگی بھر تعلیم حاصل کرتے ہیں اور اس کے بعد غرور یا پشیمانی۔ چنانچہ فقیر کو درس سے منع کر دیا اور کہا کہ تحقیق کتابوں کی پابند نہیں۔ ری پیدائش کی تاریخ 'فیض قدس' اور 'انتخاب' سے ظاہر ہے کہ مجھ میں کمال کے لیے استعداد ہے۔ قدماء کے کلام کا مطالعہ کیا کر۔ رچہ ان کے انتقال کو ایک زمانہ گزرا لیکن بیدل ان کا احسان مند ہے۔

اہ قاسم ہواللہی

۱۰۷۱ھ میں فقیر بیدل کے ماموں مرزا ظریف اڑیسہ کے سفر پر روانہ ہوئے اور فقیر کو بھی ساتھ چلنے پر مجبور کیا۔ اتفاق سے ان دنوں شاہ صاحب بھی ہندوستان کی سیر کرتے ہوئے اس علاقہ میں مقیم تھے۔

تین سال تک مرزا ان سے فیض حاصل کرتے رہے اور یہ زلہ پرست بھی طفیلی بنا رہا۔

ان دنوں خان دوران سید محمود اڑیسہ کا حاکم تھا۔ اتفاق سے اس کے ہاتھ پاؤں کے ناخن زہر آلود ہو گئے اور سارا جسم پھوڑوں سے بھر گیا۔ جب حکما اس کے علاج سے عاجز آ گئے تو اس نے روحانی مدد طلب کی۔ بارہا شاہ صاحب کی خدمت میں بھی پیغام بھیجا، مگر صحیح نہ ہوا۔ آخر کار مرزا ظریف کی درخواست پر آپ وہاں تشریف لے گئے، ایک ہی نظر میں اس کا سارا مرض جاتا رہا اور دو تین دن میں اس نے غسل صحت کر لیا۔

اتفاقاً وہاں اسد نامی ایک بے دین آپ کی اور فقرا کی شان میں گستاخی کرنے لگا۔ جب وہ گھر چلا تو ابھی شہر کے دروازہ تک پہنچ پایا تھا کہ غیب سے ایک بجلی چمکی اور اس کی پالکی الٹ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب پالکی برداروں نے اسے تلاش کیا تو اسے نالے میں پایا جہاں شہر کی تمام گندگی جمع ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر مستقل سیاہی جم گئی تھی۔ ہر چند اسے صاف کرنے کی کوشش کی گئی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ جب شاہ صاحب سے ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اس گستاخی کے عوض اس کی جان لینی مقدر ہو چکی ہے۔ ساتھ ہی یہ خبر ملی کہ حکما نے یہ طے کیا کہ اس کا علاج وہی نالے کی گندگی ہے، چنانچہ اسے پیالہ بھر کر دیا گیا۔ ابھی اس نے پیا ہی تھا کہ قے کیا اور دم توڑ دیا۔

اس واقعہ کے بعد ایک دن حکیم طاہر گیلانی آپ کے پاس آئے۔ آپ نے فرمایا ہم نے خدا سے یہ دعا کی ہے کہ تیرا باطن بھی ظاہر کی طرح خوب ہو جائے۔ اس کے تیسرے روز خبر ملی کہ حکیم کو سوداوی بحران ہو گیا ہے۔ آپ نے مرزا ظریف کو بلا کر فرمایا کہ اس کی ہدایت کا وقت آ پہنچا ہے۔ القصہ جب شاہ صاحب اس کے پاس پہنچے تو اس نے اپنی درد بھری داستان سنائی کہ میرے باپ حکیم نورالدین اسی گھر کے باغیچہ میں دفن ہیں۔ اس روز شام کو جب میں ان کی قبر پر فاتحہ کے لیے پہنچا تو میرے دماغ میں تیز بو پہنچی۔ میں نے دیکھا قبر میں انتہائی کریہہ گڑھا ہے۔ میں لوٹنے لگا تو آواز آئی 'میں نورالدین ہوں، مجھ سے مت ڈر بلکہ مجھ سے عبرت حاصل کر۔ یہ ان گناہوں کا نتیجہ ہے جو میں نے اپنے باطل دنیا میں کیے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ حضور کی توجہ کا اثر ہے، ایسا نہ ہو میں مر جاؤں اور آپ کی شفاعت سے محروم رہوں۔ تیسرے روز حکیم طاہر آپ کے پاس آئے، آپ نے انہیں اپنے پہلو میں جگہ دی مگر وہ پیچھے ہی اٹھ کر وہاں سے جانے لگے، زمین پر گرے اور ڈھیر ہو گئے۔ حضرت نے خود اپنے ہاتھ سے ان کی تجہیز و تکفین فرمائی۔

پیک تورانی مرزا ظریف کا آشنا تھا، اتفاقاً وہ بیمار پڑ گیا اور مرض نے شدت کھینچی۔ اس نے مرزا سے التماس کی میں ایک مدت سے وادیٔ غربت میں پڑا ہوں اور گھر والے کوسوں دور ہیں، کوئی ایسی صورت ہو کہ میں انہیں دیکھ سکوں۔ مرزا نے اسے مشورہ دیا کہ شاہ صاحب کے آستانہ پر حاضری دو اور جب تک مراد نہ ملے مت اٹھو۔ وہ تین دن تک حضرت کے آستانہ پر سماجت کرتا رہا، چوتھے دن آپ نے مرزا کو طلب کر کے فرمایا کہ یہ مصیبت ہمارے لیے کہاں سے لاتے ہو؟ یہ چراغ تو بس بجھنے والا ہے۔ مرزا نے عرض کیا، آپ کی حمایت درکار ہے۔ فرمایا تمہارے التماس پر ہم یہ ذمہ لیتے ہیں کہ وہ جب تک اس شہر میں مقیم رہے گا اس کی زندگی محفوظ رہے گی لیکن جب وہ کسی اور سمت کا قصد کرے گا تو ہمارے احاطہ سے باہر ہو جائے گا۔ اس واقعہ کے ایک سال بعد پیک نے توران کا رخت سفر باندھا اور شہر کے باہر قافلہ سے جا ملا۔ اتفاق سے مرزا ظریف نے فقیر کو بعض اہلِ قافلہ کے پاس بھیجا تھا،

پتا لگا کر معلوم ہوا کہ پیک کل شام سویا تو پھر نہیں اٹھا۔ اس کے ہمراہیوں نے سمجھا کہ سو رہا ہے اس لیے اسے بیدار نہیں کیا۔ جب ہم شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے پہلے ہی فرمایا کہ کل ہم نے وہ بوجھ اپنے کندھے سے اتار دیا۔ آخر ایک مردہ جسم کب تک زندہ شکل میں رکھا جاتا عہد کی بنا پر ہم نے سال بھر تک جنازہ کھینچا۔

فقیر بیدل جب کٹک پہنچا تو دریا کے کنارے مقیم ہوا۔ ایک دن مرزا ظریف سے تفسیر پڑھ رہا تھا کہ ایک فقیر نے آکر یہ مژدہ دیا کہ شاہ صاحب تمہارے پاس آ رہے ہیں۔ آپ نے آتے ہی پہلے یہ فرمایا الحمد للہ ہم تم ایک شہر میں ہیں۔ اس کے بعد آپ نے چند آیتوں کی تفسیر فرمائی۔ مرزا نے سر آپ کے پائے مبارک پر رکھ دیا اور عرض کیا میں چالیس سال تک مدرسہ کی خاک چھانتا رہا ہوں لیکن اب معلوم ہوا کہ وہ بے تمیزی کی تحصیل تھی۔ رخصت کے وقت فقیر ہمراہ تھا۔ آپ نے فرمایا ہم نے تمہاری بیہودی کی وجہ پا لی ہے۔ اگر کبھی نظم یا نثر لکھو تو ہم سے اصلاح لے لیا کرو۔

ایک روز آپ کے بھائی میر عبدالسلام نے کہا کہ اگر بیدل جیسا قابل آپ کی صحبت سے فیض پاتا رہا تو بہت جلد یہ ہلال کمال کو پہنچ جائے گا۔ فرمایا یہ اس گروہ میں سے ہے جو ازل سے فضل حقیقی لے کر آیا ہے۔ اسرار نبوی ان کے باطن کی تربیت کرتا ہے اور انوار ولایت ان کے شامل حال ہے۔ لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون۔

جب میری عمر دس سال ہوئی اس وقت ایک ہم درس اکثر اپنے منہ میں لونگ رکھے رہتا تھا۔ اس کی خوشبو سے متاثر ہو کر میں نے پہلی رباعی منظوم کی۔

یارم ہر گاہ در سخن می آید — بوئے عجبش از دہن می آید
ایں بوی قرنفل است یا نکہت گل — یا رائحہ مشک ختن می آید

جب کبھی فکر میں اہتزاز ہوتا بے اختیار کوئی مصرعہ موزوں ہو جاتا۔ لیکن دس سال تک ان کی ترتیب سے تغافل برتتا رہا۔ یہاں تک کہ دوستوں کی ترغیب سے تالیف کا شوق ہوا اور چند شیرازے مرتب کیے۔

ایک دن شاہ ابوالفیض معانی پٹنہ میں مرزا ظریف کے گھر کو زینت بخشے ہوئے تھے۔ فقیر نے یہ رباعی موزوں کر کے پیش کی

بیدل ز غم و نشاط دوراں بگذر — از بیش و کم مشکل و آساں بگذر
در گلشن دہر چوں نسیم دم صبح — آزادہ و دامن افشاں بگذر

مطالعہ کے بعد فرمایا "اس کلام سے کمال کی بو آتی ہے۔ اس صغر سنی میں ایسا پختہ مذاق ندرت اور قدرت کی دلیل ہے۔

فقیر ایک مدت تک متھرا میں مقیم رہا۔ ایک دن ایک دوست نے جس کے ذمے قریب کے قلعہ کا انتظام تھا یہ فریاد کی کہ تین سال سے زیادہ عرصہ ہو رہا ہے اس قلعہ پر جنوں کا ہجوم ہے اور وہاں کے مقیم خوف زدہ ہیں۔ اسی وقت یہ شعر موزوں کیا۔

ای عمارت جائی دیگر
جائی کم نیست مکانی دیگر

اور ایک جھنڈے پر لکھ کر آسیب کی جگہ نصب کر دیا۔ فقیر تین سال اور وہاں رہا لیکن قلعہ میں آنے جانے والوں سے یک زبان ہی سنا کہ اس وقت سے اب تک اس آسیب کا کوئی نشان نہیں۔

اس واقعہ کے ایک سال بعد ۱۳۰۰ھ میں دہلی جانا ہوا۔ ایک دوست کے یہاں مجذوبوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ ایک شخص نے کہا آج کل ایک مجذوب ایک ویرانہ میں مقیم ہے، اسے شاہ کابل کہتے ہیں۔ ابھی ہم کھانے بیٹھے ہی تھے کہ شاہ کابلی آ گئے۔ جب انھیں کھانا پیش کیا گیا تو مجھے ہم کاسگی کا شرف بخشا۔ چند لقمے تناول کیے اور اس کے بعد میرا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے چل دیئے۔ اس طرح ہم شہر کے باہر پہنچے اور ایک جگہ جا بیٹھے۔ عصر سے لے کر رات گئے تک ہم ایک دوسرے کی حقیقت میں محو رہے۔ صبح ہوئی تو شاہ صاحب کا پتہ نہیں تھا۔ بہت خاک چھانی مگر وہ گوہر گم گشتہ ہاتھ نہ آیا۔ اس ملاقات کے دو سال بعد ایک دن میں بند ما بھا سے گزر رہا تھا۔ گرمی کا موسم تھا آنکھ میں ریت پڑ گئی اور درد کھٹکنے لگی۔ مضطر ہو کر ایک رفوگر کی چھوٹی سی دکان میں میں نے پناہ لی۔ تھوڑی دیر بعد ایک شخص آ کر دکان کے پاس کھڑا ہو گیا۔ رفوگر نے کہا اگر بیٹھنا ہو تو مجھے اٹھنا پڑے گا۔ اس نے کہا نہیں یہ شخص ہمارے دوستوں میں ہے۔ میں نے دیکھا شاہ کابل ہیں۔ فوراً آنکھ کی تکلیف جاتی رہی۔

اس ملاقات ثانی کے بعد بھی دو سال گزر گئے۔ اب میں نے تاہل کی سرگرانی قبول کر لی تھی اور باپ دادا کے تتبع میں سپاہی کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ ایک دن سواری پر دہلی کے بازار سے گزر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کچھ لوگ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ اتنے میں ایک شخص پکارا۔ لوگو! دیکھو ایک دیوانہ اس سوار کے پیچھے دوڑتا اور وجد کرتا ہوا آ رہا ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا شاہ کابلی تھے۔ فوراً گھوڑے سے اتر پڑا اور آپ کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ آپ نے سینے سے لگایا۔ عرض کیا تجرد کے بیچ میں تاہل کی کونپل پھوٹ چکی ہے مگر میری تمنائی کے درخت میں اولاد کا پھل نہیں لگے گا۔ آپ نے فرمایا ایسا ہی ہوگا۔ ہم ایسے افراد ہیں کہ لم یکن لہ کفواً احد۔ آج بیس سال ہو گئے اسی ساغر سے مست ہوں۔

چند دنوں سے اکبر آباد میں مقیم تھا۔ اکثر شاہ قاسم کی ملاقاتیں سامنے متصور رہتی تھیں۔ ۱۳۰۳ھ میں ایک رات یہ خواب دیکھا کہ میں آنحضرت کی خدمت میں باریاب ہوں۔ میرے ہاتھ میں پانی کا پیالہ تھا۔ میں نے پینا چاہا لیکن احتراماً آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آپ سارا پیالہ پی گئے۔ دوسری رات یہ خواب دیکھا کہ شاہ صاحب ہاتھ میں پیالہ اور بغل میں صراحی لیے تشریف لائے اور میرے حوالے کر دیا۔ میں نے پیالہ بھر کر پیش کیا تو فرمایا ہم اپنا حصہ کل پی چکے، یہ تمہارا حصہ ہے۔ اس خواب کے بعد عرصے تک میری چال میں مستانہ لغزش رہی۔ تیسری رات پھر خواب دیکھا کہ نورانیوں کی محفل ہے، جیسے ہی میں پہنچا لوگوں نے کہا اگر شاہ صاحب کی رحلت کی کوئی تاریخ کہی ہو تو ہم سراپا گوش ہیں۔ فقیر نے فوراً یہ مصرع پڑھا ؎

ز بے یقینی ذات رفت نام صفت

لوگوں نے وجد کیا اور کہا اتنی عمدہ تاریخ نہیں کہی جا سکتی۔ آخر اڑیسہ سے چند دوست آئے اور انھوں نے یہ واقعہ سنایا کہ اسی شب شاہ صاحب رحلت فرما گئے۔

ایک بار دہلی سے لاہور کے لیے کمر باندھی۔ باہمہ اسباب بے تعلقی میرے پاس ایک زنگ خوردہ قلم تراش تھا۔ اسے ٹھیک کرانے کے لیے سرائے نگور میں چند لوہاروں کے پاس پہنچا۔ ہر ایک اس کی اصلاح کی طرف جھپٹا لیکن ایک استاد کی توجہ اور سب سے زیادہ تھی۔ اس نے پوری تعظیم کے ساتھ میرے ہاتھ سے چاقو لیا اور محض ابرو کے اشارہ سے اس کی خرابی دور کر دی۔ میں نے کچھ اجرت

دی چاہی تو منع کر دیا کہ ہم اس گوشہ میں بیٹھے نزولِ رحمت کے منتظر رہتے ہیں۔ میں نے دیکھا اس کی آواز اس عالم حرف و صوت سے متعلق نہیں تھی۔ اگر ایک لمحہ اور وہ میری طرف دیکھ لیتا تو میں پگھل جاتا۔ فوراً میں نے ہوش سنبھالا اور وہاں سے بھاگا۔

متھرا کے مضافات اکبر آباد میں ایک بار ابھی تھوڑا ہی دن نکلا تھا کہ مغرب کی طرف سے نور کے دو فوارے چھوٹے۔ میں اس کی تفتیش کے لیے چلا۔ جیسے جیسے قریب ہوتا گیا میرے بدن میں آگ سی لگتی گئی۔ جب راز فاش ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک مکان میں چند درویش بیٹھے ہیں اور ان میں ایک پری ہے۔ اس کی نگاہوں کی شعاع گھر سے نکل رہی ہے۔ یہ دیکھ کر میرا پتہ پانی ہو گیا اور میں وہاں سے پلٹ گیا۔ اس کے بعد تین مہینے میں متھرا میں رہا لیکن بخار سے بدن پھنکتا رہا۔

انوپ چند نام مصور ایک مدت سے فقیر کا آشنا تھا۔ اکثر عرض کرتا کہ میری ایک تصویر بنانے لیکن میں ان فضول باتوں پر توجہ نہیں دیتا تھا۔ ایک دن بہت ہی عاجزی کی اور آخر کار ایسی تصویر بنا ڈالی کہ میں جتنا بھی غور کرتا اپنے اور تصویر میں فرق نہ پاتا۔ اتفاقاً ادھر میں مجھے بیماری لاحق ہوئی اور سات ماہ تک بستر پر پڑا رہا۔ ایک دن ایک دوست اس کتاب کو جس میں تصویر تھی دیکھ رہا تھا، اچانک بولا افسوس یہ تصویر خراب ہو گئی۔ شاید کسی بچے نے ہاتھ اس پر پھیر دیا اور اس کا رنگ جاتا رہا۔ میں نے بھی دیکھا تصویر کا رنگ غائب تھا۔ جب صحت ہوئی تو اس تصویر کا خیال آیا۔ وہ کتاب منگوا کر دیکھی تو تصویر پھر سے نئی تھی گویا ابھی مسکرا اٹھے گی۔ دیکھنے والے چلا پڑے کہ یہ کیا بلا ہے۔ فقیر بھی ہوش کھو بیٹھا۔ جب افاقہ ہوا تو میں نے تصویر چاک کر ڈالی۔

ابتدا میں چند عملیات اپنے اثر سے مجھے مسرور رکھتے تھے۔ میری مسیحائی کا ایسا جوش تھا کہ کمزوروں کو طاقت دیتا تھا اور دیوانوں کی دیوانگی دور کر دیتا تھا۔ گرم [illegible] کاغذ کے دو ٹکڑے دے دیتا لوگ محفوظ رہتے۔ جہاں کہیں جمع ہوتے تھے میرا زبانی سلام ان کے ظلم سے بچانے کو کافی تھا۔ کسی مریض پر دم کر دیتا تو صحت پا جاتا اور اگر کسی غائب کے واسطے کوئی تعویذ لکھ دیتا تو اسے عافیت ہو جاتی تھی۔ چونکہ خدا کی مہربانی مجھے شرمندہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی اس لیے اگر کوئی مریض مرنے ہی والا ہوتا تو یا تو قلم تعویذ کے لیے نہ اٹھتا اور یا قاصد تعویذ راستے میں گم کر دیتا۔

شادی کے بعد جب دہلی میں قیام ہوا تو ایک کنیز بخار سے بستر پر پڑ گئی اور ساری دوائیں بے اثر ثابت ہوئیں۔ ایک صبح یہ خبر ملی کہ اس کی زندگی کی شمع گل ہو گئی ہے۔ فوراً میں اس کے گھر پہنچا۔ لوگ بے اختیار رو رہے تھے۔ میں کنیز کے پاس پہنچا اس کے جسم پر سے چادر ہٹائی اور جنون میں ایک مکا اس کے سینے پر مارا۔ ابھی دوسرا مکا نہیں مارنے پایا تھا کہ کنیز وہاں سے اچھل پڑی اور صحن میں جا کھڑی ہوئی۔ اس تاریخ سے آج تک بتیس سال ہونے وہ کنیز زندہ ہے۔

دہلی کے ایک محلے میں ایک خوبصورت مکان تھا مگر وہاں پریوں کا قیام تھا۔ اتفاقاً مجھے اس مکان میں رہنا پڑا۔ دو مہینے کے بعد ایک شام بلیک کوؤں نے مکان کو گھیر لیا۔ مجبوراً میں نے کمان اٹھائی اور ایک کو نشانہ بنایا۔ ابھی تیر نشانے پر نہیں لگا تھا کہ اس کے سارے پر ہوا میں پھیل گئے اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک آسمان پر کالی لکیر بن گئی اور پھر چشم زدن میں غائب ہو گئی۔ میں نے کمان ایک گوشے میں رکھی اور نماز کے لیے نیت باندھ لی۔ اچانک کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز کان میں آئی، دیکھا تو کمان کی لکڑی دو ٹکڑے تھی اور اس کی تانت غائب تھی۔

اس مکان میں ایک درخت تھا جس پر چڑیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ ایک دن میں نے ایک چڑیا کو غلّہ مارا۔ میں نے دیکھا چڑیا آہستہ آہستہ زمین پر آ رہی ہے۔ خاصی دیر کے بعد وہ زمین پر گری۔ ایک کنیز اسے اٹھانے پہنچی۔ ہاتھ آگے بڑھاتے ہی چڑیا اُڑ گئی۔ اگلے روز کنیز پاگل ہو کر چلانے لگی۔ مدتوں عامل اس کا علاج کرتے رہے مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر کار فقیر کے ایک تعویذ سے وہ درست ہوئی۔ اس واقعہ کے بعد پندرہ سال میں دوبارہ اس مکان میں قیام کرنا پڑا۔ اس علاقہ کے لوگ متفق تھے کہ اس واقعہ کے بعد اس محلہ میں جہاں کہیں جنات کا اثر تھا معدوم ہو گیا۔

جس زمانے میں میں دہلی میں تنہا رہتا تھا، ایک رات بازار کی سیر کو نکلا۔ چلتے وقت میں نے اپنے اندر عجیب تبدیلی محسوس کی۔ میں نے دیکھا کہ میں غبار کی طرح زمین سے بلند ہو رہا ہوں۔ جتنا ہی نیچے آنے کی کوشش کرتا ہوں زمین سے اونچا ہو رہا ہوں۔ یہاں تک کہ نیچے دیکھنے سے مجھے ڈر لگنے لگا۔ بڑی مشکل سے میں بازار سے ایک گلی میں پہنچا۔ ایک گھر میں دیکھا کہ ایک عورت چراغ کے سامنے بیٹھی کچھ سی رہی ہے۔ ایک بچہ کو میں نے گھر کے اندر بھیجا تاکہ حقیقتِ حال سے مجھے آگاہ کرے۔ اس نے جو کچھ بتایا اس میں سرِ مو فرق نہ تھا۔

ایک بار اکبرآباد میں بھوک کی وجہ سے میں کافی بے طاقت ہو رہا تھا۔ اچانک میں بازار کی سیر کو چل پڑا۔ میں اپنا افلاس ہر شخص سے چھپا رہا تھا لیکن وضع سے میں محتاج نہیں لگتا تھا۔ لوٹتے ہوئے جب میں مدار دروازے کے قریب پہنچا تو پاؤں لڑکھڑا گیا اور میں بیٹھ گیا۔ فوراً یہ شرم دامنگیر ہوئی کہ کوئی میرے حال کی تفتیش نہ کرے۔ چنانچہ استنجا کے بہانے وہاں سے اٹھا اور ڈھیلا تلاش کرنے لگا۔ میرے ہاتھ میں ایک سنگریزہ آ گیا۔ دیکھا تو وہ اکبری کا سکہ تھا جس کی قیمت اس وقت پانچ گنی تھی۔ بارے یہی مدت تک میرے لیے سرمایۂ قناعت رہی۔

جس سال شاہ شجاع نے باپ کی بیماری کی خبر سن کر دہلی کی طرف لشکر کشی کی۔ تربت کی تسخیر کے لیے مرزا قلندر کے رشتہ دار مرزا عبداللطیف کو متعین کیا تھا۔ اتفاق سے فقیر مرزا کے ساتھ تھا۔ جب جاسوس یہ خبر لائے کہ اورنگ زیب نے شوکت شجاعی ختم کر دی تو لوگ پریشان ہو گئے۔ آخر کار مرزا میں شکار کے بہانے نکل کھڑے ہوئے۔ دس روز میں ہم پٹنہ پہنچے۔ ایک دن چاند پور کی طرف جا رہے تھے کہ سامنے ایک ٹیلہ نظر آیا۔ فقیر سرمست خاں اور مبارز خاں کی معیت میں اس کی تفتیش کے لیے چلا۔ ہم ایک ٹیلے کے احاطہ کے پاس پہنچے۔ احاطہ میں تالاب کے کنارے ایک دو بنگلہ تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو ایک سوراخ سے دھواں نکلتا نظر آیا۔ وہاں پہنچ کر دیکھا کہ زمین دوز ایک چھوٹا سا حجرہ ہے اور اس میں فرش پر ایک پری زاد بیٹھا ہے۔ اس کے سامنے آگ جل رہی ہے اور وہ حقہ پینے میں مشغول ہے۔ ہر چند میں نے اس کے حال کا استفسار کیا اس نے توجہ نہ کی۔ آخر جب حد سے زیادہ اصرار کیا تو یہ شعر پڑھا ؎

سالہا در طلب روی نکو در بدر آئیم   روی بنما و خلاصم کن ازیں در بدری

اس کے بعد وہ وہاں سے اٹھ کر اس دو بنگلہ میں آن بیٹھا۔ ہم لوگ پیچھے پیچھے آئے۔ صبح تک وہ وہی شعر پڑھتا رہا اور ہمیں مدہوش کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ہم بیخود ہو گئے۔ جب صبح کی روشنی ہوئی تو ان تمام باتوں کا کوئی نشان نہیں تھا۔

ادھر مرزا عبداللطیف کو یہ یقین ہو گیا کہ ہم لوگ بیاباں مرگ ہو گئے۔ اس نے آدمی بھیجے۔ ایک دن کی تلاش کے بعد وہ لوگ ہم تک پہنچے اور ہمیں واپس لائے۔ ہمیں کچھ پتہ نہ تھا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ جب قافلہ میں ہم پہنچے تو دوست احباب خیریت پرسی کے لیے دوڑے لیکن ہم سے جو

حقیقت حال بھی پوچھتے اس شعر کے علاوہ ہمارا جواب نہیں تھا۔ بعد میں لوگوں نے بتایا کہ اس علاقے میں اس طرح کی کوئی چیز نہیں تھی۔

۱۰۰۷ھ میں مرزا قلندر بنگالہ کے سفر پر گئے تو سامان قصبہ مسی میں جو پٹنہ سے بیس کوس کے فاصلہ پر ہے چھوڑ دیا۔ فقیر کو ایک ضرورت سے قصبہ میں جانا پڑا۔ ایک خادم کے ساتھ پیدل چل پڑا۔ چونکہ کبھی پیدل چلنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اس لیے پہلے دن ہی پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ رات ہم نے سرائے جگناپور میں بسر کی۔ صبح کو کرایہ کی سواری کرنی چاہی مگر راستے کے خطرے سے کرایہ والے تیار نہ ہوئے۔ آخر کار خدا پر توکل کر کے چل پڑے۔ دوپہر کے وقت گرمی اتنی زیادہ ہوئی کہ ایک درخت کے نیچے آرام کرنا پڑا۔ اچانک کان میں آواز آئی۔ سر اٹھا کر دیکھا کہ ایک محترم بوڑھا گھوڑی پر سوار چلا آ رہا ہے۔ اس نے نزدیک پہنچ کر سلام کیا اور کہا کہ میرا نام جان محمد ہے۔ میں خواجہ شاہ محمد کا نوکر ہوں جو مسی میں مرزا قلندر کے پڑوسی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد گھوڑی پیش کی اور سوار ہونے کو کہا۔ میں مجبوراً سوار ہوا اور بوڑھا آگے آگے چل پڑا۔ جب ہم مسی پہنچے تو وہ خواجہ شاہ محمد کے دروازہ پر کھڑا تھا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور گھر کی راہ لی۔ اگلے روز جب خواجہ صاحب کے لڑکے فقیر سے ملنے آئے تو میں نے بوڑھے کی تعریف کی۔ انھوں نے قسم کھا کر کہا کہ اس نام کا ان کے گھر کوئی نوکر نہیں ہے۔

جس زمانے میں عالمگیر بادشاہ دکن کی تسخیر میں لگے ہوئے تھے اور ہندوستان پر بےکسی کی بجلی چمک رہی تھی مفسد لوگ اکثر گرگِ ظلم کی زد میں تھے۔ فقیر بیوی بچوں کی بے دست و پائی سے تشویش ناک تھا۔ آخر ۱۰۹۹ھ میں یہ خیال کیا کہ جیسے بھی ہو دہلی جانا ہے۔ چند بیل کرایہ پر لیے اور دہلی روانہ ہوا۔ اعظم آباد پہنچ کر لوگوں نے منع کیا کہ بغیر بدرقہ کے سفر کرنا مناسب نہیں۔ فقیر نے فسخ عزیمت مناسب نہیں سمجھی اور سفر جاری رکھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک فقیر ہاتھ میں طوطی کا پنجرہ لیے نمودار ہوا اور صدا دی کہ اقبال ہمارا ہم سفر ہے۔ شیر گڈھ میں رات بسر کی۔ اگلی صبح بہلبانوں نے فریاد کی کہ جلد تیاری کرو ورنہ قافلہ کوچ کر جائے گا۔ اسی وقت ہم تیار ہوئے۔ یہ بہلبان درحقیقت قریب کے دیہات کے قزاقوں سے ملے ہوئے تھے۔ جب ہم دیہات میں پہنچے تو ایک مسلح سوار کو میں نے دیکھا کہ قزاقوں کے گروہ سے ہماری طرف آیا جب ہمارے نزدیک پہنچا تو بہلبانوں پر چلایا کہ اے بدبختو! تمھیں کس چیز نے اندھا کیا ہے کہ تم خدا کے محبوب بندوں کے ساتھ بے ادبی کرتے ہو۔ انھوں نے عرض کی کہ ڈاکو لوٹنے کا خیال ہمیں یہاں تک لے آیا۔ سوار نے لگام موڑی اور اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ تھوڑی دیر میں ہم قافلہ میں تھے اور اس طرح ہلاکت کے بھنور سے نجات پائی۔

۱۱۰۰ھ میں ایک رات اکبرآباد میں میں نے خواب میں ایک شخص کو دیکھا جو میرے سرہانے بیٹھا ہے۔ جب غور کیا تو معلوم ہوا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسرے عالم میں پہنچا۔ سروش غیب نے آواز دی یہ علی مرتضیٰ ہیں۔ آپ نے خطاب فرمایا قریب آؤ۔ میں آپ کے سامنے پہنچا تو اتنا قریب کر لیا کہ میرا داہنا پہلو آپ کے بائیں پہلو سے فرق نہ رہا۔ عرض کیا آج رات میں نے رسولِ خدا کو خواب میں دیکھا کہ میرا سرِ نیاز آپ کے زانوئے مبارک پر ہے۔ اس کی تعبیر کا خیال مجھے بیتاب کیے ہوئے ہے۔ آپ نے فرمایا اس خواب کی تعبیر یہ ہے کہ حقیقت محمدیہ ہر وقت تیرے حال پر سایہ فگن رہے گی اور باطن نبوت تربیت کا دامن کبھی تیرے سر سے نہیں اٹھائے گا۔

(تلخیص نورالحسن انصاری)

سراج الدین علی خاں آرزوؔ

فقیر سراج الدین علی خان آرزو، والد کی طرف سے حضرت شیخ نصیر الدین مشہور بہ چراغ دہلی کے بھانجے کا پوتا اور ماں کی جانب سے شیخ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں ہے۔ ۱۰۹۹ ہجری میں پیدا ہوا۔ والد مرحوم شیخ حسام الدین نے لفظ "نزل غیب" سے تاریخ ولادت برآمد کی۔ کتاب گلستان و بوستان و پندنامہ شیخ سعدی و نام حق جو پانچ چھ سال کی عمر میں پڑھی تھیں، ان کے سوا کوئی فارسی کی کتاب نہیں پڑھی اور چودہ سال کی عمر تک علوم عربیہ کے حاصل کرنے میں مشغول رہا۔ اس کے سوا یہ کہ والد مرحوم جس زمانے میں لشکر عالمگیر سے نکل کر گوالیار میں آئے تو راتوں کو متاخرین کے سو دو سو اشعار یاد کرا دیئے تھے وہی میری شاعری کا سرمایہ ہو گیا۔ چودہ سال کی عمر میں مجھے شاعری کا چسکا پیدا ہوا اور شہر متھرا میں، جو خاک قیامت خیز و سرزمین شور انگیز ہے، جنون شعر میرے سر پر سوار ہوا۔ کچھ عرصے بعد جب گوالیار کو واپس ہوا تو دو تین مہینے تک میر عبد الصمد سخن کی خدمت میں، جو وہاں "مشرفی جزیہ" کی خدمت پر مامور تھے، میں نے اپنے اشعار اصلاح کے لیے پیش کئے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ میر مرحوم گوالیار سے اکبر آباد تشریف لے گئے اور فقیر ایک مدت تک بے کسی و تنہائی کا رفیق رہا۔ اتفاقاً میر غلام علی احسنی کی صحبت میسر آ گئی۔ کچھ دن تک ان کی خدمت میں کسب شعر کیا اور کچھ پڑھتا بھی رہا۔ پھر دکن کی سمت جانے کا اتفاق پیش آیا۔ ابھی پہنچا بھی نہ تھا جو لشکر میں بادشاہ غفران پناہ عالمگیر کی وفات کا حادثہ پیش آ گیا۔ وہاں سے پھر گوالیار کی طرف واپس آیا جو میری ننھیال تھی۔ پھر ایک تقریب سے اکبر آباد آنا ہوا جو میرا مولد ہے۔ یہاں پانچ سال تک عربی کی کتب متداولہ مولانا شیخ عماد الدین المشتہر بہ درویش محمد قدس سرہ سے پڑھیں۔ اس زمانے میں مشق شعر بھی کرتا رہا۔ انہی دنوں اکثر یاران موزوں مثلاً شیخ گلشن، میرزا حاتم بیگ حاتم، میاں عظمت اللہ کامل و محمد مقیم آزاد و میاں علی عظیم خلف الصدق میاں ناصر علی اور دوسرے صادر و وارد سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ یہاں تک کہ فرخ سیر کے ابتدائی زمانے میں نوکری کی تقریب سے شاہ جہان آباد پہنچا اور مضافات گوالیار سے متعلق ایک خدمت پر متعین ہوا۔ اس طرح چھ سال پھر وطن میں بسر ہوئے۔ اس زمانے میں شعر کہنے کا موقع بہت کم ملا۔ پھر سادات بارہہ کے تسلط کے زمانے میں فقیر کی یہ ملازمت بدل گئی اور فقیر دوبارہ بادشاہی لشکر میں شامل ہو کر، جو نیکو سیر کا ہنگامہ فرو کرنے کے لیے تیار ہوا تھا، اکبر آباد پہنچا۔ یہاں سے سوانح نگاری گوالیار کی خدمت پر مامور ہوا۔ اس کو دو ہی مہینے ہوئے تھے کہ سادات بارہہ کا ستارہ گردش میں آ گیا اور فقیر بھی اپنی خدمت سے معزول کر دیا گیا اور دار الخلافہ شاہجہان آباد آ گیا۔ اسے تقریباً تیس سال ہوئے، تب سے یہیں رہتا ہوں۔ جو کچھ برا بھلا کہا ہے وہ بزرگوں کی نظر سے گزار دیتا ہوں، خدا اسے "ملحوظ آرزو" بخشے۔ فقیر آرزو کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) دیوان غزل و قصائد — تقریباً ۵۰ ہزار بیت

(۲) مثنوی محمود و ایاز، در جواب زلالی مسمی بہ حسن و عشق۔ چار ہزار بیت۔

(۳) ساقی نامہ۔ مسمی بہ "عالم آب"

(۴) مثنوی دیگر۔ در بحر غیر متعارف جس میں یہ شعر ہیں:

آدم گل باغ است جہاں   شیطاں باشد نافرماں
راست براست رقم کردم   شاخ سرو قلم کردم

(۵) مثنوی جوش و خروش۔

(۶) مثنوی دیگر۔ در بحر حدیقہ حکیم سنائی (یہ ابھی ناتمام ہے)

ان کے علاوہ رباعیات، مخمسات، ترکیب بند، ترجیع بند، مقطعات تواریخ اور رقعات مسمی بہ پیام شوق اور نثر ہائے متفرقہ تقریباً پانچ ہزار سطریں۔ اور فن معانی و بیان میں دو رسالے، جو فارسی زبان میں ابھی تک کسی نے نہیں لکھے تھے۔ ان میں ابیات فارسی سے نظائر بھی پیش کی ہیں اور

(۷) فرہنگ سراج اللغۃ۔ تقریباً ۴۰ ہزار سطریں۔   (۸) شرح گلستاں۔
(۹) شرح سکندر نامہ۔   (۱۰) شرح قصائد عرفی شیرازی۔

اور کچھ ناتمام مثنویاں بھی ہیں۔ یہ اس عالم میں ہے کہ فقیر کی عمر ۴۰ سال ہو چکی ہے۔ اگر اس کے بعد بھی زندگی باقی رہی اور فرصت ملی تو اور بھی لکھوں گا اور کہوں گا۔ اس وقت کسی استاد کا یہ شعر یاد آ گیا۔ تھوڑی سی تبدیلی کے بعد اسے اپنے موافق حال بنا کر لکھتا ہوں:

گر بمانیم زندہ می گوئیم   شعر کز دست و دلم ہلاک شدہ
ور نمانیم عذر ما بپذیر   اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

خدا آگاہ اور انصاف گواہ ہے کہ فقیر آرزو چودہ سال کی عمر سے مشق شعر کر رہا ہے اور اب تک بھی اپنے اوپر اعتماد نہیں ہے، جتنی چھان بین اور غور و فکر بڑھتی جاتی ہے، سوائے اپنی نارسائی طبع اور قصور ذہن کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ہر چند میرے نظم و نثر کے مسودات اور شرح و فرہنگ وغیرہ کی کتابیں تقریباً ایک لاکھ سطریں (بیت مکتوبی) ہو گئی ہوں گی، لیکن بحمداللہ اس لیے نہیں ہیں کہ کچھ دانشور اسے پڑھ کر داد دیں:

عاشق دیوانہ از تحسین و نفریں فارغ است

لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی کونسی چیز لکھوں جو خود اپنی طبع کو پسند آ جائے۔ یہ شعر بے ساختہ زبان قلم پر جاری ہو گیا:

چوں شمع تمام تن عرق از شرمیم   ما را چہ زبان بے زبانی دادند

فقیر آرزو جلوس محمد فرخ سیر بادشاہ کے اوائل میں دار الخلافہ شاہجہاں آباد نوکری کی تلاش میں آیا تھا۔ اس وقت سخن گوئی کا آفتاب نصف النہار پر تھا اور بزرگان سخن کے فیض صحبت سے مستفید ہوتا تھا۔ ایک دن محمد افضل سرخوش کی ملاقات کو گیا۔ وہ مرد

عزیز اس وقت بینائی سے محروم ہو چکا تھا، اور ان کا ایک لڑکا تھا جس کا نام فضل اللہ تھا، اُسے ہدایت دی کہ اپنے پدر بزرگوار کا کلام پڑھ کر سنائے۔ میں نے کہا شاید اسی لیے بیٹے کو "نورِ چشم" کہتے ہیں۔ اپنے اشعار سنانے کے بعد انھوں نے فقیر سے درخواست کی۔ میں اس وقت نوجوان تھا، عرض کیا کہ کم مشقی کے باوجود بزرگوں کی خدمت میں کلام سنانا شوخی ہے۔ اس عزیز نے بہت اصرار کیا، ناچار فقیر نے ایک غزل سنائی جس میں ایک شعر یہ تھا ؎

افتادگیست مایۂ نشو و نمائے من
تخمم چو گرد باد زخاک آب می خورد

اس شعر سے بہت ہی زیادہ لطف اندوز ہوئے، میرے سر پر اور پیشانی پر بوسہ دیا اور کہنے لگے، میں ایک مدت سے شہر میں رہتا ہوں لیکن نو آمدگان شہر میں ایسا صاحب طبع میں نے نہیں دیکھا۔ پھر میں نے یہ رباعی پڑھی جو نعت میں کہی تھی: ؎

اے احمد مرسل اے امیر لولاک
بر گرد سر کوئے تو گردد افلاک
منظور خدا بود زبس رفعت تو
برداشتہ است سایہ ات را از خاک

اس پر تو پھڑک گئے۔ جب فقیر ان کی خدمت سے رخصت ہوا تو وہ مرد بزرگ اسی حالت میں اپنے قدیم دوست محمد حسین خاں ناجی کے پاس گئے اور یہ اشعار انھیں سنائے۔ انھوں نے بھی اس ناکارہ کی بہت تعریف کی اور کہا کہ میں نے اپنی ساری عمر میں ایسا بلند تلاش جوان نہیں دیکھا۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔

میں نے یہ سطریں ۱۵ صفر ۲۳ھ موافق ۱۱۵۳ھ جلوس محمد شاہی میں لکھی ہیں۔

مولوی کریم الدین

کریم الدین مؤلف تذکرہ ہذا یعنی طبقات شعرائے اردو نام بندہ کا کریم الدین اور والد بزرگوار شیخ سراج الدین ساکن پانی پت جو شاہجہان آباد سے چالیس کوس پر شمال کی جانب سائی مغرب واقع ہے۔ مجھ کمترین کے جد بزرگوار پیلی بھیت جو گنگا پار ہے وہاں کی پیدائش رکھتے تھے۔ انھوں نے اکثر بلاد کی سیاحی کی پانی پت میں آکر مقیم ہوئے چونکہ بادشاہی جاگیر کی آمدنی رکھتے تھے وجہ معیشت سے بے فکر تھے ملکوں کی سیاحی کرتے رہتے تھے۔ جب میرے قبلہ گاہ سراج الدین پانی پت میں پیدا ہوئے انھوں نے بھی اقامت پانی پت میں اختیار کی۔ نادر شاہ کے وقت میں ہمارا بہت اسباب اور مال لٹ کر برباد ہو گیا تھا اور اس وقت سے پھر اسلوب گھر کا درست نہ ہوا۔ دادا صاحب نے شوق زہد و تقویٰ کا کر کے مسجد نشینی اختیار کی جن ایام میں ایک صاحب جو کہ اول ایک انگریز واسطے بندوبست ملک مفتوحہ ہندوستان کے آکر انتظام جاگیرات کا کر گیا وارد پانی پت ہوا۔ سب حکیموں نے فرمان بادشاہی دکھا کر کھیتیں واگذاشت کرا دیں میرے دادا کو جب بلایا وہ بسبب ورع اور تقویٰ اور بسبب اس کے کہ وہ بے پرواہ تھے اور ایک یہ بھی تھا کہ کچھ جنون بھی ان کو ہو گیا تھا۔ ایک صاحب کے پاس نہ گئے اس سے جاگیر مذکور ضبط کی۔ ان ایام میں قبلہ گاہ میرے کچھ ہوش نہ رکھتے تھے جب وہ ضبط ہو گئی کوئی صورت آمدنی اور خرچ کی متصور نہ ہوتی جو کچھ زیور یا اسباب گھر میں تھا وہ بیچ کر کھایا گئے اور دادا صاحب نے مسجد میں بیٹھ کر توکل اختیار کیا۔ قبلہ گاہ صاحب کو بھی کتب صوفیہ پڑھا کر مسجد نشینی کی تعلیم دی چنانچہ بعد ان کے انتقال کے میرے قبلہ بھی مسجد نشین رہے۔ ساکنین پانی پت ان کی خدمت خرچ کے موافق کر دیتے تھے وہ مسجد میں نماز پڑھایا کرتے تھے یا چند لڑکوں کو تعلیم کر کے اپنا گذارہ ان کی آمدنی سے کرتے تھے میں نے جب ہوش سنبھالا اور سن تمیز کو پہنچا اول میں نے فارسی کی دو چار کتابیں عربی کی پڑھنی شروع کیں۔ علم صرف و نحو پانی پت میں پڑھ کر شاہجہان آباد میں آیا۔ اس جائے پھر کر صرف و نحو معانی و منطق اور فلسفہ اور طب اور فقہ اور اصول اور کچھ حدیث تحصیل کی۔ ان ایام میں اپنے ہاتھ سے کتابت کرتا اس کی مزدوری پر گذران کرتا تھا یہاں تک کہ درمیان ۱۲۴۱ھ کے جناب مستطاب صاحبین لفٹننٹ گورنر بہادر نے بندوبست مدرسہ دہلی کا بخوبی کیا اور نئے طالب علم تلاش کر کے اس میں واسطے تحصیل کے رکھے گئے چنانچہ میں بھی اٹھارہ برس کی عمر اس میں داخل ہوا۔ میری تنخواہ [illegible] روپیہ ہوئی۔ اس جائے میں علم منطق اور فلسفہ اور ہندسہ اور حساب اور ہیئت اور پیمائش اور مناظر اور مرایا اور جبر و مقابلہ اور کتب تاریخ اور علم ادب عربی زبان میں اور علم فقہ پڑھا۔ بعد ازاں جب کتب انگریزی کا ترجمہ اردو زبان میں سوسائٹی اردو نے کروا کے چھپوا کر مشہور کرنا شروع کر دیا میں نے بھی ایک کتاب کو جو ترجمہ انگریزی سے اردو میں ہوئی تھی شوق تمام پڑھی اور آج کے دن تک یہ التزام کر رکھا کہ جو ترجمہ سوسائٹی کرواتی ہے میں بالضرور اس کو تمام پڑھ کر لیتا ہوں بعد ازاں بطرس صاحب پرنسپل مدرسہ دہلی کے حکم سے قوانین دیوانی اور فوجداری اور اصول قوانین اور پولیٹیکل اکونومی یعنی سیاست مدن اور علم ریاضی انگریزی یہ سب تحصیل کیا۔ بعد فراغت اس اس تحصیل کے اسی شہر میں میں نے اپنا نکاح کیا اور اس جائے رہنا اختیار کیا اور ایک چھاپہ خانہ واسطے چھپوانے ترجموں کے بنایا۔ میرا یہ ارادہ تھا

کی اکثر فنون کی کتابیں جو مشکل ہیں ان کو ترجمہ کر کے اور بہت سہل ان کا حق ادا کر کے اس مطبع میں چھپوایا کروں اور اگر مجھ کو کچھ نفع نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ عوام ہندوستانیوں کو جو علوم سے بے بہرہ ہیں سستی قیمت پر وہ کتابیں بیچ کر علوم اور کتب علم مشہور کروں مگر اس ارادہ کو توڑنے والے بھی پیدا ہو گئے یعنی دو چار صاحبوں نے اس مطبع میں میرے شریک ہو کر مجھ سے فریب کر کے وہ مطبع چھین لیا ہر چند کہ میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ اگر میں دعویٰ کروں گا حاکم بے شک میرا انصاف کرے گا لیکن بسبب واقع ہونے چند صدمات کے اب تک وہ ارادہ پورا نہ ہوا لاچار صبر کیا۔ اتفاقات تو عجیب سے انھی ایام میں یہ ہوا کہ بسبب قدردانی اور مہربانی کے ڈاکٹر اسپرنگر صاحب پرنسپل مدرسہ دہلی نے جو کہ سیکرٹری سوسائٹی اردو کے ہیں باوجود اس کے کہ وہ میری اس حالت تنگ سے خبر نہ رکھتے تھے۔ عنایت فرما کر مجھ کو کام ترجمہ کرنے کا دیا میں نے بموجب حکم ڈاکٹر صاحب ممدوح کے کئی کتابیں ترجمہ کیں جن کا حال مفصل لکھا ہوں اور شوق اشعار اُردو کہنے کا مجھ کو مطلق نہیں ہے بلکہ شعر کہنا میں برا جانتا ہوں کیونکہ اہل علم کا یہ پیشہ نہیں ہے۔ وہ لوگ جو حیثیت سے فارغ البال ہیں اپنے دل بہلانے اور حسرت نکالنے کا انھوں نے یہ طور اختیار کر لیا ہے۔

تالیفات سے میری یہ کتابیں ہیں۔

تعلیم النساء

یہ کتاب اردو میں آٹھ تعلیموں پر مشتمل ہے۔ تعلیم اول خدا اور رسول کی شناخت میں تعلیم دوم فرائض مذہبی اور اسلام کی حقیقت کے بیان میں۔ تعلیم سوم مسائل حیض اور نفاس کے بیان میں۔ تعلیم چہارم نسخہ جات مجرب اور تدابیر حفظ صحت بدن کی میں۔ تعلیم پنجم رسوم باطلہ کے رد اور شرک کے بیان میں۔ تعلیم ششم حقوق عورت پر شوہر کے اور شوہر پر عورت کے بیان میں۔ تعلیم ہفتم بندوبست خانگی اور انتظام خانہ اور نوکروں سے ہوشیاری اور اموال کی دیانت داری میں۔ تعلیم ہشتم دلائل عقلی اور نقلی اور متعہ اور زنا اور چھنالی اور اغلام اور غیر محرم سے ہم کلام ہونے میں۔

گلستان ہند

گلشن اول میں لطائف و ظرائف۔ گلشن دوم میں حکایات عجیب اور قصص غریب۔ گلشن سوم میں نقلیات ہندی۔ گلشن چہارم میں ضرب الامثال ہند۔ گلشن پنجم میں عشق کے فسانے۔ گلشن ششم میں عورتوں کے چلتر کا بیان۔ گلشن ہفتم علم اخلاق کی باتیں اور پند و پسند اور نصائح حکماء کی۔ گلشن ہشتم میں اشعار منتخبہ قابل یادداشت اور حفظ کرنے کے اُردو زبان میں یہ کتاب بہت اچھی تیار ہوئی ہے۔

تذکرہ شعرائے ہند

یہ کتاب جو تالیف کی گئی بموجب حکم ڈاکٹر اسپرنگر صاحب پرنسپل مدرسہ دہلی کے۔

گلدستہ نازنیناں

یہ مجموعہ اشعار اساتذہ اردو کا مشہور ہندوستان کا ہے میں نے جمع کر کے اور شعر منتخب کر کے سنہ ۱۲۶۱ ہجری میں چھپوایا ہے اس نے بہت جائے اشتہار پایا ہے۔

عجالۃ العلالہ

یہ ایک رسالہ عروض کا زبان اُردو میں میں نے تالیف کیا ہے اور ۱۲۶۱ھ میں چھپوا کر مشہور کیا اس رسالہ کو بہت خواہش سے

اکثر شعراء نے لیا ہے۔

رسالہ فرائض

یہ ایک رسالہ علم فرائض کا زبان اردو میں بہت مختصر بایں خیال کہ ہر ایک ہندوستانی جانے کو علم میراث ہو جاوے کیونکہ اکثر جھگڑے ورثہ کے عدالتوں میں ہوتے ہیں اور ہندوستانی اپنے حقوق سے واقفیت نہیں رکھتے۔ ۵۰۰ جلد ۱۲۶۱ھ ہجری میں چھپوا کر مشہور کی۔

روض الاجرام

یہ ایک کتاب اردو میں میں نے علم ریاضی بدیں تفصیل تالیف کی ہے کہ اس کے اول میں فن حساب اور پھر فن پیمائش پھر الجبرا پھر ہیئت پھر جغرافیہ سب کا بیان مستوعب اس میں لکھا گیا ہے اور مختصر ہے۔

فرائد الدہر

یہ ایک تذکرہ زبان عربی میں شعرائے عرب کا میں نے لکھا ہے اس کو تیرہ صدیوں پر مرتب کیا ہے ہر ایک صدی کے شاعر کو اسی صدی میں لکھا ہے جس میں وہ مرا اور ہر ایک شاعر کا حال مع حال پیدائش اور نسب اور ماجرا اور تاریخ وفات کے لکھا ہے کسی کی تاریخ نہیں چھوڑی۔ یہ بہت بڑا تیار ہوا ہے۔

تذکرۃ النساء

یہ ایک تذکرہ عورتوں کا میں نے لکھا ہے اس میں یہ التزام کیا ہے کہ جو عورت نامور کسی فن میں پائے یا تذکرہ وہ لکھوائے یا ملک اس نے سلطنت مستقل کی عرب میں یا فارس یا ہندوستان میں یا یورپ میں یا تمام ایشیا میں کسی جاتے یا افریقہ میں ہوئی ہے۔ میں نے حتی المقدور نہیں چھوڑی۔ اس میں فقط عورتوں کا ہی تذکرہ ہے کسی مرد کا حال نہیں ہے۔

اب تک وہ معرض تالیف میں ہے تیار نہیں ہوا اردو زبان میں لکھا ہے۔

ترجمہ ابوالفدا

یہ ایک تاریخ ابوالفدا اسماعیل بادشاہ ملک حمایت کی تصنیف سے عربی زبان میں تھی بموجب حکم ڈاکٹر اسپرنگر صاحب کے زبان اردو میں اس کا ترجمہ ۱۲۶۳ھ ہجری میں اس طرح پر تیار کیا کہ اصل میں اس کتاب کی چھ جلدیں ہیں پانچ جلدوں کا بدیں تفصیل کہ اول اور دوسری اور چوتھی اور پانچویں چھٹی کا میں نے ترجمہ کیا تیسری کا بسبب جلدی کے مولوی محمد امیر سے صاحب بہادر نے کروایا ہے بعد چھپنے کے اس کو دو جلدوں میں منقسم کیا ہے تین جلدیں اصل کی اول جلد میں اور تین جلدیں اصل کی دوسری جلد میں، درمیان ۱۲۶۴ھ کے وہ چھپ گئی ہیں۔ اس تاریخ میں حال ابتدائے دنیا سے ۷۲۹ھ تک لکھا گیا ہے۔ اردو میں میں نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔

تاریخ شعرائے عرب

یہ کتاب تاریخ شعرائے عرب کی مرتب تیرہ صدیوں پر اس تذکرہ سے مولفہ اپنے سے جس کا نام فرائد الدہر رکھا ہے اردو زبان میں بموجب حکم سیکرٹری سوسائٹی کے میں نے ترجمہ کر کے ۱۲۶۳ھ ہجری میں چھپوایا ہے بالفعل ۱۲۶۵ھ میں وہ چھپ کر تیار ہو گیا۔

معطا الحلی

یہ ایک کتاب عربی زبان میں میں نے تالیف کی ہے اس میں وہ نکات جو قابل یاد رکھنے کے ہیں اور وہ لفظ جو حل مطالب میں کام آتے ہیں یا کوئی کسی ضرب المثل کی وہ قصہ بنیاد ہے اور حکایات عجیب و غریب کے اس میں لکھے ہیں۔

ترجمہ کتاب ڈاکٹری

یہ ایک ترجمہ زبان اردو میں عربی سے میں نے کیا ہے اصل میں وہ ترجمہ عربی بموجب حکم والی مصر محمد علی شاہ کے فرنچ زبان سے تیار کیا ۱۲۵۰ھ ہجری میں چھپا تھا میں نے اس کو اردو میں درمیان کوہستان کوہ منصوری پر جاکر ترجمہ ۱۲۶۳ھ میں کیا۔ پیدائش میری ماہ عید الفطر ۱۲۳۶ھ مطابق ۱۸۲۱ء بتاریخ یکم روز عید بوقت نماز صبح بلدہ پانی پت میں افغانوں کے محلہ میں متصل مسجد لشکر خان کے ہوئی۔ اب میری عمر چھبیس برس کی درمیان ۱۸۴۷ء کے ہے۔

(طبقات شعرائے ہند مؤلفہ مولوی کریم الدین پانی پتی۔ مطبوعہ دہلی ۱۸۴۸ء صفحہ ۴۶۹ تا ۴۷۳)

۱۸۴۸ء تک جو کتابیں مولوی کریم الدین نے لکھیں، اُن کا بیان انھوں نے خود کر دیا ہے اس کے بعد جو کتابیں تالیف کیں اُن میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔

تاریخ انگریزی، منتخبات اردو (نصاب کلکتہ یونیورسٹی)، تسہیل القواعد، انشاء اردو، پند سودمند، دیوان سعدی مع سوانح عمری، انتخاب دیوان حافظ مع ترجمہ، خط تقدیر، مفتاح الارض، واقعات ہند وغیرہ

مولوی کریم الدین کی سب سے زیادہ مشہور کتاب "کریم اللغات" ہے۔ یہ فارسی کی کتاب ہے جس میں الفاظ کے معنی اردو میں دیے گئے ہیں۔ یہ کتاب فارسی کے طلباء کے لیے نہایت موزوں تھی اس لیے اس کے بہت سے ایڈیشن بار بار چھپے۔

۱۸۷۹ء میں مولوی کریم الدین کا انتقال ہو گیا۔ (محمد اسماعیل پانی پتی)

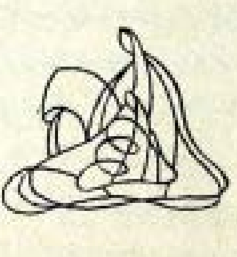

مرزا اسد اللہ خاں غالب

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے   کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

خاندان

میں اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ غالب تخلص، قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ سلطان برکیاروق سلجوقی کی اولاد میں سے۔ میرا ابنائے قوم سراسر قلمرو ہند میں نہیں، سمرقند میں دو چار یا دشت قپچاق میں سو دو سو ہوں گے مگر ان اقربائے نسبی ہیں :

غالب از خاک پاک تورانیم   لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی   بہ سترگان قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعۂ اتراک   در تمامی ز ماہ دہ چندیم

میرا دادا قوقان بیگ خاں ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت سمرقند سے ہندوستان میں آیا۔ سلطنت ضعیف ہو گئی تھی۔ صرف پچاس گھوڑے، نقارہ نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ پہاسو جو اب سمرو بیگم کو سرکار سے ملا تھا، سیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالے کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اس کے جو طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم تھا وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر دلی کی ریاست چھوڑ کر اکبر آباد میں جا رہا۔ لکھنؤ جا کر آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدر آباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجا بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں بڑی بہادری سے مارا گیا :

کافی بود مشاہدہ، شاہد ضرور نیست

در خاک راج گڑھ پدرم را بود مزار

نصر اللہ بیگ خاں میرا حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار تھا۔ اس نے مجھے پالا۔ ۱۸۰۳ء میں جب جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا تو نصر اللہ بیگ خاں نے شہر سپرد کر دیا اور اطاعت کی۔ صوبہ داری کمشنری ہو گئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا کو جرنیل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سوار کا بریگیڈیر ہوا۔ اس نے اپنے زور بازو سے سونک اور سونسا دو پرگنے بھرت پور کے قریب ہولکر کے سواروں سے چھین لیے۔ جرنیل صاحب نے وہ دونوں پرگنے بہادر موصوف کو بطریق استمرار عطا فرمائے۔ ایک ہزار سات سو روپیہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر حین حیات، علاوہ سال بھر

مرزبانی کے تھی کہ دس مہینے بعد ہاتھی پر سے گر کر بگ ناگاہ مر گیا۔ رسالہ برطرف ہو گیا، ملک کے عوض نقدی مقرر ہو گئی۔

عالم دو ہیں: ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے۔ جو خود فرماتا ہے: لمن الملک الیوم؟ اور پھر آپ جواب دیتا ہے: للہ الواحد القہار۔ ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں، لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہ گار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب سنہ ۱۲۱۲ھ (۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء، یک شنبہ) میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا ؎

"تاریخ ولادت من از عالم قدس
ہم "شورش شوق" آمد و ہم لفظ "غریب"

تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب سنہ ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔

قیام آگرہ

پانچ برس کا تھا جو باپ مر گیا، آٹھ برس کا تھا جو چچا مر گیا۔ ایام دبستان نشینی میں شرح مائۃ عامل تک پڑھا۔ بعد اس کے لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور و عیش و طرب میں منہمک ہو گیا۔ فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری و طبعی تھا۔ ناگاہ، ایک شخص کہ ساسان پنجم کی نسل میں سے تھا، معہذا منطق و فلسفہ میں مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر، اور مومن موحد اور صوفی صافی تھا، میرے شہر میں وارد ہوا۔ اور اکبر آباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا۔ غرض فارسی آمیختہ بعربی اس سے میرے حالی ہوئے۔ سونا کسوٹی پر چڑھ گیا۔ ذہن معوج نہ تھا۔ زبان دری سے پیوند ازلی اور استاد بے مبالغہ جاماسپ و بزرجمہر عصر تھا۔ حقیقت اس زبان کی دل نشین و خاطر نشان ہو گئی۔ اب مجھے اس امر خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے مگر دعویٰ اجتہاد نہیں۔ بحث کا طریقہ یاد نہیں۔

ناظر بنسی دھر کے والد محمد نجف خانی و ہمدانی ہیں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے، جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو (انھوں) نے بھی کمر کھولی اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں، مگر جب جوان ہوا تو میں نے دیکھا کہ بنسی دھر، خاں صاحب کے ساتھ ہیں اور انھوں نے کیتھم گاؤں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا تو منشی بنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں۔ میں اور وہ ہم عمر تھے۔ شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ انیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر ان کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت۔ آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی، چونکہ گھر ان کا بہت دور نہ تھا، اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے۔ بس ہمارے اور ان کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹڑے درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے جو اب لکھمی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔ اسی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اس کے ایک کھٹیا والی حویلی اور اس سے

آگے بڑھ کر ایک کٹرا کہ وہ گڈریوں والا کہلاتا تھا اور ایک کٹرا کشمیری والا کہلاتا تھا، اس کٹڑے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجا بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔ واصل خاں نامی ایک سپاہی پیش دست رہتا تھا اور کٹڑوں کا کرایہ اوگاہ کر بھیجا کرتا تھا۔

سفر کلکتہ

کلکتے کا جو ذکر کیا تُو نے ہم نشیں ایک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

چچا کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے، شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں، دس ہزار روپیہ سال مقرر ہوئے۔ اُنھوں نے نہ دیئے مگر سات ہزار روپیہ سال۔ اس میں سے خاص میری ذات کا حصہ اور شرکا کو دے دلا کر ساڑھے سات سو روپیہ سال۔ وہ اب تک پاتا ہوں۔ میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا۔

۱۸۳۰ء میں کلکتے گیا۔ کوبرگ صاحب بہادر ریزیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سکرتر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر۔ ریزیڈنٹ معزول ہو گئے۔ سکرتر گورنمنٹ بمرگ ناگاہ مر گئے۔ نواب گورنر سے ملنے کی درخواست کی۔ دفتر دیکھا گیا، میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا۔ ملازمت ہوئی، سات پارچے اور جیغہ سرپیچ، مالائے مروارید، یہ تین رقم خلعت ملا۔

زاں بعد جب دہلی میں دربار ہوا مجھ کو بھی خلعت ملتا رہا۔ بعد غدر بجرم مصاحبت بہادر شاہ، دربار و خلعت دونوں بند ہو گئے۔ میری براءت کی درخواست گزری، تحقیقات ہوتی رہی، تین برس کے بعد پنڈ چھوٹا، خلعت معمولی ملا۔ غرض یہ کہ خلعت ریاست کا ہے، عوض خدمت نہیں۔

اللہ اللہ کلکتے میں جو شور نشور اُٹھا تھا۔ پانچ ہزار آدمی فراہم تھے۔ میرا شعر ؎

جزوے از عالمم و از ہمہ عالم بیشم
ہمچو موئے کہ بتاں را ز میاں برخیزد

خستۂ جراحت ہائے اعتراض ہوا۔ منشاء اعتراض یہ کہ عالم مفرد ہے، اس کا ربط ہمہ کے ساتھ بحسب اجتہادِ قتیل ممنوع ہے۔ قضا را اس زمانے میں شاہزادہ کامران درانی کا سفیر گورنمنٹ میں آیا تھا۔ کفایت خاں اس کا نام تھا۔ اس تک یہ قصہ پہنچا، اُس نے اساتذہ کے اشعار پانچ سات ایسے پڑھے جن میں "ہمہ عالم" و "ہمہ روز" و "ہمہ جا" مرقوم تھا اور وہ اشعار "برہانِ قاطع" میں مندرج ہیں۔

چکنی ڈلی

"فعلاتن فعلاتن فعلن" کی بحر میں میرا ایک قطعہ ہے کہ وہ میں نے کلکتے میں کہا تھا۔ تقریب یہ کہ مولوی کرم حسین میرے ایک دوست تھے، اُنھوں نے ایک مجلس میں ایک چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ اپنے کفِ دست پر رکھ کر مجھ سے

کہا کہ اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجیے۔ میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ کر ان کو دیا اور صلے میں وہ ڈلی اُن سے لے لی۔ اب سوچ رہا ہوں جو شعر یاد آتے جاتے ہیں لکھتا جاتا ہوں :

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی   زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے   ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجیے   خالِ مشکینِ رخِ دلکشِ لیلیٰ کہیے
حجر الاسود دیوارِ حرم کیجیے فرض   نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے
صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر مہرِ نماز   میکدے میں اسے خشتِ خمِ صہبا کہیے
مسی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے   سرِ پستانِ پری زاد سے مانا کہیے

غرض کہ یہی باتیں پھبتیاں ہیں۔ اشعار سب کب یاد آتے ہیں۔ اخیر کی بیت ہے :

اپنے حضرت کے کفِ دست کو دل کیجیے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

میں سیر و سیاحت کو بہت دوست رکھتا ہوں :

اگر بدل نہ خلد ہر چہ از نظر گُذرد
زہے روانیِ عمرے کہ در سفر گُذرد

بنارس خوب شہر ہے اور میرے پسند ہے۔ ایسا شہر کہاں پیدا ہوتا ہے۔ انتہائے جوانی میں میرا وہاں جانا ہوا تھا۔ اگر اُس موسم میں جوان ہوتا تو وہیں رہ جاتا اور اِدھر کو نہ آتا ؎

عبادت خانۂ ناقوسیاں است   ہمانا کعبۂ ہندوستاں است

ایک مثنوی میں نے اُس کی تعریف میں لکھی ہے اور "چراغِ دیر" اُس کا نام رکھا ہے، وہ فارسی دیوان میں موجود ہے

اُفتد ودائی

شعراء میں فردوسی اور فقراء میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں۔ یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے۔ فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالمِ رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے ہم کو یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانعِ فسق و فجور نہیں، پیو، کھاؤ، مزے اُڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجا مُنہ کو آتا ہے۔ ہے ہے

وہ حور اجیرن ہو جائے گی، طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی، وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ، چشمِ بد دور وہی اک حور۔

زن نو کن اے دوست در ہر بہار
کہ تقویم پارینہ ناید بکار

مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں اسے مار رکھتے ہیں، میں بھی مغل بچہ ہوں، عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے، چالیس چالیس برس کا واقعہ ہے، بااینکہ یہ کوچہ چھٹ گیا، اس فن سے بیگانۂ محض ہو گیا ہوں، لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا:

سعدی اگر عاشقی کنی و جوانی   عشق محمد بس است و آل محمد

اللہ بس ماسویٰ ہوس۔

حُلیہ

میرا قد درازی میں انگشت نما ہے۔ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستایش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے ؎

تا دسترسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقہ و پشمینہ ندارم

جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔ مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام۔ ملا، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقہ، بھٹیارا، جولاہا، کنجڑا، منہ پر داڑھی، سر پر بال، فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اُسی دن سر منڈوا دیا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم کیا بک رہا ہوں۔

دربار اودھ

ایک قصیدہ منشی محمد حسن کی معرفت روشن الدولہ کے پاس اور روشن الدولہ کے توسط سے نصیر الدین حیدر کے پاس گزرا اور جب دن گزرا اسی دن پانچ ہزار روپے بھیجنے کا حکم ہوا، متوسط یعنی منشی محمد حسن نے مجھ کو اطلاع نہ دی۔ مظفر الدولہ مرحوم لکھنؤ سے آئے انھوں نے یہ راز مجھ پر ظاہر کیا اور کہا خدا کے واسطے میرا نام منشی محمد حسن کو نہ لکھنا۔ ناچار میں نے شیخ امام بخش ناسخ کو لکھا کہ تم دریافت کر کے لکھو کہ میرے قصیدے پر کیا گزری؟ انھوں نے جواب لکھا کہ پانچ ہزار ملے۔ تین ہزار روشن الدولہ نے کھائے دو ہزار منشی محمد حسن کو دیے اور فرمایا کہ اس میں سے جو مناسب جانو غالب کو بھیج دو۔ اس نے جو تم کو کچھ نہیں بھیجا، اگر نہ بھیجا ہو تو مجھ کو لکھو۔ میں نے لکھ بھیجا کہ مجھے پانچ روپے بھی نہیں پہنچے۔ اس کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ اب تم مجھے خط لکھو اگر

مضمون یہ کہ میں نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ بھیجا ہے اور یہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ وہ قصیدہ حضور میں گزرا، مگر یہ میں نے نہیں جانا کہ اس کا صلہ کیا مرحمت ہوا۔ میں کہ ناسخ ہوں، اپنے نام کا خط بادشاہ کو پڑھوا کر، ان کا لکھایا ہوا روپیہ ان کے حلق سے نکال کر تم کو بھیج دوں گا۔ یہ خط لکھ کر میں نے ڈاک میں روانہ کیا۔ آج خط روانہ ہوا، تیسرے دن شہر میں خبر اڑی کہ نصیرالدین حیدر مرگیا۔ اب کہو میں کیا کروں۔ اور ناسخ کیا کرے؟

دربار اودھ امجد علی شاہ (۱۸۴۲-۴۷ء) کی سلطنت کے آغاز میں ایک صاحب میرے نیم آشنا یعنی خدا جانے کہاں کے رہنے والے، کسی زمانے میں وارد اکبرآباد ہوئے تھے، کبھی کہیں کے تحصیلدار بھی ہو گئے تھے۔ زبان آور اور چالاک۔ اکبرآباد میں نوکری کی جستجو کی، کہیں کچھ نہ ہوا۔ میرے ہاں ایک دو بار آئے تھے۔ پھر وہ خدا جانے کہاں گئے۔ میں دلی میں آ رہا۔ کم و بیش بیس برس ہو گئے۔ امجد علی شاہ کے عہد میں ان کا خط ناگاہ مجھ کو بسبیل ڈاک آیا، چونکہ ان دنوں میں دماغ درست اور حافظہ برقرار تھا، پہچانا کہ وہی بزرگوار ہیں۔ خط میں پہلے مجھ کو یہ مصرع لکھا:

از بخت شکر دارم و از روزگار ہم

آپ سے جدا ہو کر بیس برس آوارہ پھرا۔ جے پور میں نوکر ہو گیا، وہاں سے دو برس کے بعد کہاں گیا اور کیا کیا۔ اب لکھنؤ میں آیا ہوا اور وزیر سے ملا ہوں۔ بہت عنایت کرتے ہیں۔ بادشاہ کی ملازمت انھیں کے ذریعے سے حاصل ہوئی ہے۔ بادشاہ نے خان اور بہادر کا خطاب دیا ہے، مصاحبوں میں نام لکھا ہے، مشاہرہ ابھی قرار نہیں پایا۔ وزیر کو میں نے آپ کا بہت مشتاق کیا ہے۔ اگر آپ کوئی قصیدہ حضور کی مدح میں اور عرضی یا خط جو مناسب جانیں۔ وزیر کے نام لکھ کر میرے پاس بھیج دیجئے تو بے شک بادشاہ آپ کو بلائیں گے اور وزیر کا خط فرمان طلب آپ کو پہنچے گا۔ میں نے اسی عرصے میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کی بیت اسم یہ ہے:

امجد علی شہ آں کہ بہ ذوق دعائے او
صدرہ ثنا ز سبح قضا کرد روزگار

متردد تھا کہ کس کی معرفت بھیجوں۔ توکلت علی اللہ بھیج دیا۔ رسید آ گئی صرف۔ پھر دو ہفتے بعد ایک خط آیا کہ قصیدہ وزیر تک پہنچا، وزیر پڑھ کر بہت خوش ہوا۔ بہ آئین شائستہ پیش کرنے کا وعدہ کیا۔ میں متوقع ہوں کہ میاں بدرالدین مُہرکن سے مہر خطابی کھدوا کر بھیج دیجئے۔ چاندی کا نگینہ ہو، مربع اور خط جلی۔ فقیر نے سرانجام کر کے بھیج دیا۔ رسید آئی اور قصیدے کے بادشاہ تک گزرنے کی نوید۔ بس پھر دو مہینے تک ادھر سے کوئی خط نہ آیا۔ میں نے جو خط بھیجا، اُلٹا پھر آیا، ڈاک کا یہ ترقیم کہ مکتوب الیہ یہاں نہیں۔ ایک مدت کے بعد حال معلوم ہوا کہ اس بزرگ کا وزیر تک پہنچنا اور حاضر رہنا سچ۔ بادشاہ کی ملازمت اور خطاب غلط۔ بہادری کی مُہر تم سے بہ فریب حاصل کر کے مرشدآباد کو چلا گیا۔ چلتے وقت وزیر نے دو سو روپے دیئے تھے۔

واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بصلۂ مدح گستری پانسو روپے سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیے، یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں، مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔

چودہ پارچے کا خلعت ایک بار اور ملبوس خاص، شال، رومال، دوشالہ ایک بار پیش گاہ حضرت سلطان عالم (واجد علی شاہ)

سے پا چکا ہوں۔ مدح کی فکر نہ کر سکا۔ قصیدہ ممدوح کی نظر سے گزرا نہ تھا۔ میں نے اسی میں امجد علی شاہ کی جگہ واجد علی شاہ کو بٹھا دیا۔ خدا نے بھی تو یہی کیا تھا۔ انوری نے بارہا ایسا کیا ہے کہ ایک قصیدہ دوسرے کے نام پر کر دیا۔ میں نے اگر باپ کا قصیدہ بیٹے کے نام پر کر دیا تو کیا غضب ہوا۔

حیدرآباد

صنعت سہل ممتنع میں میں نے نواب مختار الملک کو قصیدہ بھیجا، کچھ قدردانی نہ فرمائی، دو فرقہ وہابیہ میں ایک مثنوی جو سابق میں لکھی تھی، وہ بھی العود احمد کر بھیجی، رسید بھی نہ آئی۔ اب سنتا ہوں کہ مولوی غلام امام شہید شاگرد قتیل وہاں کوس انا ولا غیری بجا رہے ہیں اور سخن ناشناسوں کو اپنا زور طبع دکھا رہے ہیں۔ ایک کم ستر برس کی میری عمر ہوئی۔ سوائے خشک شہرت کے فن کا کچھ پھل نہ پایا۔ صنعت ورجا کا شور سامعہ فرسا ہوا۔ غیر ستائش کا حق ستائش سے ادا ہوا۔ مختار الملک نے یہ بھی نہ کیا۔ نہ مدح کی داد دی نہ ممدوح کا صلہ دیا۔ حیران ہوں کہ نواب صاحب مجھے کیا سمجھے۔ مع العود سے اور کچھ نہیں کہتا مگر یہ کہ خدا سمجھے۔

ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اب جو میں والیِ دکن کی طرف رجوع کروں، یاد رہے کہ متوسط مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع ہو جائے گی اور والیِ شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔ اے خداوند بندہ پرور! یہ سب باتیں وقوعی واقعی ہیں۔

اگر ان سے قطع نظر کر کے قصیدے کا قصد کروں، قصد تو کر سکتا ہوں، تمام کون کرے گا۔ سوائے ایک ملکہ کے کہ وہ پچاس پچپن برس کی مشق کا نتیجہ ہے کوئی قوت باقی نہیں رہی۔ کبھی جو سابق کی اپنی نظم و نثر دیکھتا ہوں تو یہ جانتا ہوں کہ یہ تحریر میری ہے مگر حیران رہتا ہوں کہ یہ نثر میں نے کیونکر لکھی تھی اور یہ شعر کیوں کر کہے تھے۔ عبدالقادر بیدل کا یہ مصرع گویا میری زبان سے ہے ؎

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ !

دسواں نمبر

میں انگریزی ریاست میں علاقہ ریاست دودمانی کا رکھتا ہوں، معاش اگرچہ قلیل ہے مگر عزت زیادہ پاتا ہوں۔ گورنمنٹ کے دربار میں دسواں نمبر اور سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید خلعت مقرر ہے۔ لارڈ ہارڈنگ کے عہد تک پایا۔ لارڈ ڈلہوزی یہاں آئے نہیں۔ اب زمانے کا رنگ اور۔ کوئی حاکم، کوئی سکرتر میرا آشنا نہیں۔ میرے بڑے مربی قدردان، جناب ایڈمنسٹن صاحب وہ بھی چیف سکرتر نہ رہے، لفٹنٹ گورنر ہو گئے۔ وہ سکرتر رہتے تو مجھے کچھ غم نہ تھا۔

تاریخ نگاری

دلّی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی۔ سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ بادشاہ دہلی نے پچاس روپیہ مہینہ مقرر کیا، ان کے

ولی عہد نے چار سو روپے سال۔ ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔

جب بادشاہ دہلی نے مجھ کو نوکر رکھا اور خطاب دیا اور خدمت تاریخ نگاری سلاطین تیموریہ مجھ کو تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرز تازہ پر لکھی۔ مقطع اس کا یہ ہے ؎

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

بادشاہ، اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے، بخشش، انعام، تکریم کسی سے توقیر کم نہیں مگر فائدہ وہی قلیل۔

اب وہ بات گئی گزری بلکہ وہ کتاب اب چھپانے کے لائق ہے نہ چھپوانے کے قابل۔ اجزائے خطابی کا لکھنا نامناسب بلکہ مضر ہے۔

دہلی بعد غدر

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو یہاں فساد شروع ہوا، میں نے اسی دن گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کر دیا۔ بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی۔ اپنی سرگزشت لکھنا شروع کی:

تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں طرح طرح کے معاملات مہر و محبت درپیش آئے شعر کہے، دیوان جمع کیے، ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا، کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔

اب پوچھو کہ کیوں کر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا؟ میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرائے کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا، دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے۔ اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والیٔ پٹیالہ کے۔ راجا صاحب نے صاحبان عالی شان سے عہد لیا تھا کہ بروقت غارت دہلی یہ لوگ بچے رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجا کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا، ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا امیر غریب سب نکل گئے، جو رہ گئے تھے نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولت مند اور اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں، ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے۔ باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں، مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔ میں غریب شاعر، دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہ اس کو نوکری سمجھو، خواہ مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا، صرف اشعار کی خدمت بجا لاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے مگر چونکہ میری طرف سے بادشاہی دفتر میں سے، یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی، لہٰذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں، میری کیا حقیقت تھی۔ غرض اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا، سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں، مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں، جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال معلوم نہیں۔

بسکہ فعّالِ مایرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک
آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے، پھر کیا؟
وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ
سوزشِ داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم
ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے غالبؔ
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

روپوش نہیں ہوں، بلایا نہیں گیا، دارو گیر سے محفوظ ہوں مگر ہاں جیسا کہ بلایا نہیں گیا، خود بھی بروئے کار نہیں آیا، کسی حاکم کو نہیں ملا، خط کسی کو نہیں لکھا، کسی کو درخواست نہیں کی۔ جنوری سے پنشن نہیں پایا۔ کہو یہ دس مہینے کیونکر گزرے ہوں گے۔ انجام کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا ہوگا۔ زندہ ہوں مگر زندگی وبال ہے۔

میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں، عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجومِ غم میں میری قوتِ متفکرہ میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے؟ غمِ مرگ، غمِ فراق، غمِ رزق، غمِ عزت ـــــ غمِ مرگ میں قلعۂ نامبارک سے قطع نظر کر کے اہلِ شہر کو گنتا ہوں، مظفر الدولہ، میر ناصر الدین، مرزا عاشور بیگ میرا بھانجا، اس کا بیٹا احمد مرزا، انیس برس کا بچہ۔ مصطفیٰ خاں ابن اعظم الدولہ، اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں۔ قاضی فیض اللہ۔ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا؟ اے لو بھول گیا۔ حکیم رضی الدین احمد خاں، میر احمد حسین میکش، اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں؟

غمِ فراق ـــــ حسین مرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب، خدا ان کو جیتا رکھے، کاش یہ ہوتا جہاں ہوتے وہاں خوش ہوتے، گھر ان کے بے چراغ وہ خود آوارہ۔ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں، کلیجا ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے مگر میں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں، عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔

حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مر گیا، اس کی بیٹی، اس کے چار بچے، اس کی ماں یعنی میری بھاوج ـــ جے پور میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس تین برس میں ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا۔ بھتیجی کیا کہتی ہوگی کہ میرا بھی کوئی چچا ہے۔ یہاں اغنیاء اور امراء کے ازواج و اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں۔ اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے۔ اب خاص اپنا دکھ روتا ہوں۔ ایک بیوی دو بچے

تین چار آدمی گھر کے، کلو، کلیان، ایاز یہ باہر۔ مداری کی جورو، بچے بدستور، گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھمن گئے گئے مہینہ بھر آگے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں۔ بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود۔ مقام معلوم سے کچھ آئے جاتا ہے۔ وہ بقدر سدرمق ہے۔ محنت وہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہے۔ آدمی ہوں دیو نہیں، بھوت نہیں، ان رنجوں کا تحمل کیوں کر کروں۔

قلزمِ خوں

وہی بالاخانہ ہے اور وہی میں ہوں، سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے، وہ یوسف میرزا آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا، بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنے ہیں۔ اللہ اللہ اللہ۔ ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا؟

خود میاں کالے صاحب مغفور کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جھاڑو پھیر دی، کاغذ کا پرزہ، سونے کا تار، پشمینے کا بال باقی نہ رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کا مقبرہ اجڑ گیا۔ ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی۔ ان کی اولاد کے تمام لوگ اس موضع میں آباد ہو گئے تھے۔ اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر، اس کے سوا کچھ نہیں، وہاں کے رہنے والے اگر گولی سے بچے ہوں گے تو خدا ہی جانتا ہو گا کہ کہاں ہیں۔ میں مع زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزمِ خوں کا شناور رہا ہوں، دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا، نہ پکڑا گیا، نہ نکالا گیا، نہ قید ہوا، نہ مارا گیا۔ کیا عرض کروں کہ میرے خدا نے مجھ پر کیسی عنایت کی اور کیا نفس مطمئنہ بخشا۔

دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دلّی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔ نواب گورنر جنرل بہادر ۱۵ دسمبر (۱۸۵۹ء) کو یہاں داخل ہوں گے۔ دیکھیے کہاں اترتے ہیں اور کیوں کر دربار کرتے ہیں۔ آگے کے درباروں میں سات جاگیردار تھے کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا، جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی، لوہارو۔ چار معدوم محض ہیں جو باقی رہتے ہیں ان میں سے دوجانہ و لوہارو تحت حکومت ہانسی و حصار، پاٹودی حاضر۔ اگر حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئے تو تین ورنہ ایک رئیس۔ دربار عام والے مہاجن لوگ سب موجود۔ اہل اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں، میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدر الدین خاں، بلی ماروں میں یہ سگ دنیا موسوم بہ اسد۔ تینوں مردود، مطرود و محروم و مغموم۔

توڑ بیٹھے ہیں ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

ہو کا مکان

اب اہل دہلی ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔ مصیبت عظیم یہ کہ قاری کا کنواں بند ہو گیا۔

لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر کھاری پانی ہی پیتے۔ گرم پانی نکلتا ہے۔ میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا، جامع مسجد ہوتا ہوا راج گھاٹ کے دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہُو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا وہ اب باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگرے کھلے رہے ہیں، باقی سب اَٹ گیا۔ آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتا نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا، اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں، واہ رے حسن اعتقاد۔ ارے بندۂ خدا، اُردو بازار نہ رہا، اُردو کہاں؟ دلی، واللہ اب شہر نہیں، کیمپ ہے، چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر۔

نظام دین ممنون کہاں، ذوق کہاں، مومن خاں کہاں، ایک آزردہ سو خموش، دوسرا غالب وہ بے خود و مدہوش، نہ سخنوری رہی نہ سخن دانی، کس برتے پر تتا پانی۔ ہائے دلی، وائے دلی، بھاڑ میں جائے دلی۔

چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا۔ اس میں سنگ و خشت و خاشاک ڈال کر بند کر دیا۔ بلی ماروں کے دروازے کے پاس کئی دکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا۔ شہر کی آبادی کا حکم، خاص و عام کچھ نہیں۔ پنشن داروں سے حاکم کا کام کچھ نہیں۔ تاج محل، مرزا قیصر، مرزا جواں بخت کے سالے مرزا ولایت علی بیگ ہے پدری کی زوجہ، ان سب کی الٰہ آباد سے رہائی ہو گئی۔ بادشاہ، مرزا جواں بخت، میرزا عباس شاہ، زینت محل کلکتہ پہنچے اور وہاں سے جہاز پر چڑھائی ہوگی۔ دیکھیے کیپ میں رہیں یا لندن جائیں۔ خلق نے از روئے قیاس جیسا کہ دلی کے خبر تراشوں کا دستور ہے، یہ بات اُڑا دی۔ سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری ۱۸۵۹ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد کیے جائیں گے اور پنشن داروں کو جھولیاں بھر بھر کر روپے دیے جائیں گے۔

جامع مسجد کے باب میں کچھ پرسشیں لاہور سے آئی تھیں، یہاں سے اُن کے جواب گئے ہیں۔ یقین ہے کہ واگذاری کا حکم آئے اور مسلمانوں کو مل جائے۔ ہنوز بدستور پہرا بیٹھا ہوا ہے اور کوئی جانے نہیں پاتا۔

تیشے کی طغیانی

یہاں شہر ڈھے رہا ہے، بڑے بڑے نامی بازار، خاص بازار اور اُردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا، اب پتا نہیں کہ کہاں تھے۔ صاحبانِ امکنہ و دکاکین نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دکان کہاں تھی۔ برسات بھر مینہ نہیں برسا۔ اب تیشہ اور کلنڈری کی طغیانی سے مکان گر گئے۔ غلہ گراں ہے، موت ارزاں ہے۔ میوہ اناج کے مول بکتا ہے۔ ماش کی دال آٹھ سیر، باجرہ سولہ سیر، گیہوں بارہ سیر، چنے سولہ سیر، گھی ڈیڑھ سیر، ترکاری مہنگی۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ کنوؤں کا پینا جیسے جانے کا دوار کھلتے ہیں، پانی گرم، دھوپ تیز، لو چلتی ہے۔ جیٹھ اساڑھ کی سی گرمی پڑتی ہے۔

کشمیری کٹرہ ڈھ گیا ہے۔ ہائے وہ اونچے اونچے در اور وہ بڑی بڑی کوٹھریاں، وہ در و دیوار نظر نہیں آتیں کہ کیا ہوئیں۔ ماچی واڑے کا ڈھانا اور اس کی رہ گزر کا صاف ہونا ہنوز ملتوی ہے۔ فیل خانہ، فلک پیرا، لال ڈگی کے محاذی کے مکانات سب گرائے گئے۔ بلاقی بیگم کا کوچہ التوا میں ہے۔ اہلِ فوج ڈھانا چاہتے ہیں، اہلِ شہر بچاتے ہیں، پایانِ کار دیکھیے کیا ہو۔

آج کل یہاں پنجاب کے احاطے کے بہت حاکم فراہم ہیں۔ یوں چونگی کے باب میں کونسل ہوئی۔ ۸ نومبر (۱۸۵۹ء) کو جاری ہو گئی۔ سالگ رام خزانچی، چھنا مل، بھیش داس، ان تین شخصوں کو یہ کام بطور امانی سپرد ہوا۔ ٹکے اور اُپلے کے سوا کوئی جنس ایسی نہیں کہ جس پر محصول نہ ہو۔ آبادی کا حکم عام ہے۔ خلق کا اژدہام ہے۔ آگے حکم دیا کہ مالکان رہیں، کرایہ دار نہ رہیں (۱۷ نومبر ۱۸۵۹ء) سے حکم ہو گیا کہ کرایہ دار بھی رہیں۔ کہیں یہ نہ سمجھنا کہ میں یا کوئی اور اپنے مکان میں کرایہ دار کو آباد کرے۔ وہ لوگ جو گھر کا نشان نہیں رکھتے اور ہمیشہ سے کرائے کے مکان میں رہتے تھے، وہ بھی آ رہیں مگر کرایہ سرکار کو دیں۔

احکام قضا و قدر

حکیم احسن اللہ کے مکانات شہر ان کو مل گئے اور یہ حکم ہے کہ شہر سے باہر نہ جاؤ۔ دروازے سے باہر نہ نکلو، اپنے گھر میں بیٹھے رہو۔ نواب حامد علی خاں کے سب مکانات ضبط ہو گئے۔ باغ کی صورت بدل گئی۔ محل اور کوٹھی میں گورے رہتے ہیں۔ اب چھانگ اور سرتاسر دکانیں گرا دی گئیں، سنگ و خشت کو نیلام کر کے روپیہ داخل خزانہ ہوا، مگر یہ نہ سمجھو کہ حامد علی خاں کے مکانات کا ملبہ بکا ہے۔ سرکار نے اپنا مملوکہ و مقبوضہ ایک مکان ڈھا دیا۔ جب بادشاہ اودھ کی املاک کا وہ حال ہو تو رعیت کی املاک کو کون پوچھتا ہے؟

جو احکام کہ دلّی میں صادر ہوئے ہیں وہ احکام قضا و قدر ہیں۔ ان کا مرافعہ کہیں نہیں۔ اب یوں سمجھو کہ نہ ہم کبھی کہیں کے رئیس تھے، نہ جاہ و حشم رکھتے تھے، نہ املاک تھے نہ پنشن رکھتے تھے۔

زندگی میری کب تک، سات مہینے یہ اور بارہ مہینے سال آئندہ (۱۲۷۷ھ) کے۔ اسی مہینے میں اپنے آقا کے پاس جا پہنچتا ہوں۔ وہاں نہ روٹی کی فکر، نہ پانی کی پیاس، نہ جاڑے کی شدت، نہ گرمی کی حدت، نہ حاکم کا خوف، نہ مخبر کا خطرہ، نہ مکان کا کرایہ دینا پڑے، نہ کپڑا خریدنا پڑے، نہ گوشت گھی منگاؤں، نہ روٹی پکواؤں۔ عالم نور اور سراسر سرور۔

یارب ایں آرزوے من چہ خوش است
تو بدیں آرزو مرا برساں!

زبان زدِ خلق ہے کہ قدیم نوکروں سے باز پرس نہیں۔ مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ اسے کئی دن ہوئے کہ حمید خاں گرفتار آیا ہے۔ پاؤں میں بیڑیاں، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، حوالات میں ہیں۔ دیکھیے حکم اخیر کیا ہو۔ جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ ہر شخص کی سرگزشت کے مطابق حکم ہو رہے ہیں۔ نہ کوئی قانون ہے نہ قاعدہ ہے۔ نہ نظیر کام آئے، نہ تقریر پیش جائے۔ ارتضیٰ خاں ابن مرتضیٰ خاں کی پوری دو سو روپے کی پنشن کی منظوری کی رپورٹ گئی اور اُن کی دو بہنیں سو سو روپے مہینا پانے والیوں کو حکم ہوا کہ چونکہ تمھارے بھائی مجرم تھے تمھاری پنشن ضبط۔ بطریق ترحم دس دس روپے مہینہ تم کو ملے گا۔ ترحم یہ ہے تو تغافل کیا قہر ہوگا۔

میں خود موجود ہوں، حکامِ صدر کا روشناس، پنشن نہیں اکھڑ سکتا۔ تریپن برس کا پنشن۔ مقرر اس کا بہ تجویز لارڈ لیک اور بہ منظوری گورنمنٹ، اور پھر نہ ملا ہے نہ ملے گا۔ خیر احتمال ہے ملنے کا۔

جانتے ہو کہ علی کا بندہ ہوں، اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا۔ اس وقت ۱۵؍ جولائی (۱۸۵۹ء) کلو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اس کے نہ کہیں سے قرض کی امید ہے نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل۔ اگر رامپور سے کچھ آیا تو خیر۔ ورنہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دو سڑکیں

یہاں دو سڑکیں دوڑتی پھرتی ہیں۔ ایک ٹھنڈی سڑک، ایک آہنی سڑک۔ محل ان کا الگ الگ۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ گوروں کا بارک بھی شہر میں بنے گا اور قلعے کے آگے جہاں لال ڈگی ہے۔ ایک میدان نکالا جائے گا۔ حبش کی دکانیں، بھیلیوں کے گھر، فیل خانہ، بلاقی بیگم کے کوچے سے خاص بازار تک یہ سب میدان ہو جائے گا۔ یوں سمجھو کہ اتوجان کے دروازے سے قلعے کی خندق تک سوائے لال ڈگی کے اور دو چار کنوؤں کے آثار عمارت باقی نہ رہیں گے۔ کیوں میں دلی کی ویرانی سے خوش نہ ہوں جب اہلِ شہر ہی نہ رہے، شہر کو لے کے کیا چولھے میں ڈالوں؟

بڑھاپا، ضعفِ قویٰ، اب مجھ کو دیکھو تو جانو میرا کیا رنگ ہے۔ شاید کوئی دو چار گھڑی بیٹھتا ہوں ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ گویا صاحبِ فراش ہوں۔ نہ کہیں جانے کا ٹھکانا، نہ کوئی میرے پاس آنے والا۔ وہ عرق جو بقدر طاقت بنائے رکھتا تھا اب میسر نہیں۔ سب سے بڑھ کر آمد آمد گورنمنٹ کا ہنگامہ ہے۔ دربار میں جاتا تھا، خلعتِ فاخرہ پاتا تھا، وہ صورت اب نظر نہیں آتی۔ نہ مقبول ہوں، نہ مردود ہوں، نہ گنہگار ہوں، نہ مخبر نہ مفسد۔ بھلا اب تم ہی کہو اگر یہاں دربار ہوا اور میں بلایا جاؤں تو نذر کہاں سے لاؤں؟ دو مہینے دن رات خونِ جگر کھایا اور ایک قصیدہ چونسٹھ بیت کا لکھا، محمد فضل مصور کو دیا، یہ اس کا مطلع ہے:

ز سالِ نو دگر آمد بروئے کار آمد
ہزار و ہشت صد و شصت در شمار آمد

اس میں التزام اپنی سرگزشت لکھنے کا کیا ہے۔ اس بجھے ہوئے بلکہ مرے ہوئے دل پر کلام کا یہ اسلوب ہے!

پنشن کا اجرا

صاحب کمشنر بہادر دہلی یعنی سانڈرس صاحب بہادر نے مجھ کو بلایا۔ پنجشنبہ ۲۴؍ فروری (۱۸۵۹ء) کو میں گیا، جب شکار کو سوار ہو گئے تھے، میں الٹا پھر آیا۔ جمعہ ۲۵؍ فروری کو گیا۔ ملاقات ہوئی۔ کرسی دی۔ بعد پرسشِ مزاج کے ایک خط چار ورق کا اٹھا کر پڑھتے رہے۔ جب پڑھ چکے تو مجھ سے کہا کہ یہ خط ہے میکلوڈ صاحب حاکم اکبر صدر بورڈ پنجاب کا۔ تمہارے باب میں لکھتے ہیں کہ اس کا حال دریافت کر کے لکھو، سو ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم ملکۂ معظمہ سے کیا خلعت مانگتے ہو؟ حقیقت کہی گئی۔ ایک کاغذ مدح ولایت

لے گیا تھا وہ پڑھوا دیا۔ پھر پوچھا۔ تم نے کتاب کیسی لکھی ہے؟ اس کی حقیقت بیان کی۔ کہا ایک میکلوڈ صاحب نے دیکھنے کو لی ہے اور ایک ہم کو دو۔ میں نے عرض کیا۔ کل حاضر کروں گا۔ پھر پنشن کا حال پوچھا۔ وہ گزارش کیا۔ اپنے گھر آیا اور خوش آیا۔

حاکم پنجاب کو مقدمہ دویت کی کیا خبر؟ کتابوں سے کیا اطلاع؟ پنشن کی پرسش سے کیا مدعا؟ یہ استفسار بحکم نواب گورنر جنرل بہادر ہوا ہے۔ بصورت مقدمہ فتح و فیروزی ہے۔ غرض کہ دوسرے روز یک شنبہ یوم تعطیل تھا، میں اپنے گھر رہا۔ دو شنبہ ۲۸ فروری کو گیا۔ باہر کے کمرے میں بیٹھ کر اطلاع کروائی۔ کہا اچھا توقف کرو۔ بعد تھوڑی دیر کے گزشتہ کپتان کی چٹھی آئی۔ سواری مانگی، جب سواری آ گئی۔ باہر نکلے، میں نے کہا وہ کتابیں حاضر ہیں، کہا منشی جیون لال کو دے جاؤ۔ وہ ادھر سوار ہو گئے، میں ادھر سوار ہو کر اپنے مکان پر آیا۔ سہ شنبہ یکم مارچ (۱۸۵۹ء) کو پھر گیا۔ بہت اختلاط اور التفات سے باتیں کرتے رہے۔ کچھ سرٹیفکیٹ گورنروں کے ساتھ لے گیا تھا وہ دکھائے۔ ایک خط میکلوڈ صاحب بہادر کے نام کا لے گیا تھا۔ وہ دے کر یہ استدعا کی کہ کتاب کے ساتھ یہ بھی بھیجا جائے۔ بہت اچھا کہہ کر رکھ لیا۔ پھر مجھ سے کہا کہ ہم نے تمہاری پنشن کے باب میں ایجرٹن صاحب بہادر کو لکھا ہے تم ان سے ملو۔ عرض کیا بہتر۔ ایجرٹن صاحب بہادر گئے ہوئے تھے۔ ان کو خط لکھا۔ جیسا وہ حکم دیں گے اس کے موافق کروں گا۔ جب بلائیں گے تب جاؤں گا۔ دیکھو اسد الغالب علیہ السلام کی مدد کو۔ اپنے غلام کو کس طرح سے بچایا! بائیس مہینے تک بھوکا پیاسا نہ رہنے دیا۔ پھر کس ڈھنگ سے کہ وہ آج سلطنت کا دھندہ ہے۔ میرے مقدمہ کا حکم ہو آیا۔ حکام سے مجھ کو عزت دلائی۔ میرے صبر و ثبات کی داد ملی۔ صبر و ثبات بھی اسی کا بخشا ہوا تھا۔ میں کیا اپنے باپ کے گھر سے لایا تھا!

۲۹۔ دسمبر ۱۸۵۹ء لشکر کو گیا۔ میر منشی سے ملا۔ ان کے خیمے میں بیٹھ کر صاحب سکرتر بہادر کو اطلاع کروائی۔ چپراسی کے ساتھ کلو بھی گیا۔ جواب آیا کہ ہمارا سلام دو اور کہو کہ فرصت نہیں ہے۔ خیر، میں اپنے گھر آیا۔ ۳۰۔ دسمبر کو پھر گیا۔ خبر کروائی۔ حکم ہوا کہ غدر کے زمانے میں تم باغیوں کی خوشامد کرتے رہتے تھے۔ اب ہم سے ملاقات کیوں مانگتے ہو۔ عالم نظر میں تیرہ و تار ہو گیا۔ یہ جواب پیام نومیدی جاوید ہے، نہ دربار نہ خلعت نہ پنشن۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اتنا مسموع ہوا ہے کہ ایک محکمہ لاہور میں معاوضہ نقصان رعایا کے واسطے تجویز ہوا ہے اور یہ حکم ہے کہ جو رعیت کا مال گوروں نے لوٹا ہے، البتہ اس کا معاوضہ بحساب دہ یک ($\frac{۱}{۱۰}$) سرکار دے گی یعنی ہزار روپے کے مانگنے والے کو سو روپے ملیں گے اور جو گوروں کے وقت کی غارت گری ہے وہ ہدر اور بحل ہے، اس کا معاوضہ نہ ہو گا۔

حافظ ممو

حافظ ممو بے گناہ ثابت ہو چکے، رہائی پا چکے، حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں۔ اپنی املاک مانگتے ہیں۔ قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا، صرف حکم کی دیر ــــ پرسوں وہ حاضر ہوئے، مثل پیش ہوئی، حاکم نے پوچھا: "حافظ محمد بخش کون؟" عرض کیا کہ "میں!" پھر پوچھا کہ "حافظ ممو کون؟" عرض کیا کہ "میں ــــ اصل نام میرا محمد بخش ہے، ممو ممو مشہور ہوں۔" فرمایا: "یہ کچھ بات نہیں، حافظ محمد بخش بھی تم، حافظ ممو بھی تم، جو دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں؟" مثل داخل دفتر ہوئی۔ میاں ممو اپنے گھر

چلے گئے۔

جو کچھ ہوتا جاتا ہے وہ اس قسم کا ہے کہ جس طرح صبح ہوئی، شام ہوئی، ابر آیا، مینہ برسا، یعنی سعی کو، تدبیر کو، خواہش کو دخل نہیں۔ آبادی کا آوازہ پھر فرو ہے۔ لاہوری دروازے کے علاقے میں کچھ کم سو گھر آباد ہوئے ہیں، کئی ہزار گھر کی بستی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ دو چار برس میں وہ علاقہ آباد ہو جائے گا اور جب وہ علاقہ آباد ہو جائے گا تو دوسرا علاقہ شروع ہوگا۔

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانے دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے۔ اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس کے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا، بھائی تو مجھے نقشے میں نہ لکھ، میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ عبارت یہ کہ اسد اللہ خاں پنشن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پیارے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا، نہ گوروں کے زمانے میں نکلا اور نکالا گیا۔ کرنل براون صاحب کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکم وقت کو اختیار ہے۔ یہ عبارت جمعدار نے محلے کے نقشے کے ساتھ کوتوالی میں بھیج دی۔ یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں۔ جو مکان بن چکے ہیں انھیں ڈھا دو اور آئندہ کی ممانعت کا حکم سنا دو۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے، بقدر مقدور نذرانہ دے۔ اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہو جائے، آپ شہر میں آباد ہو جائے۔ آج تک یہ صورت ہے۔ دیکھیے شہر بسنے کی کون سی صورت ہے۔ جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں یا باہر پڑے ہوئے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں۔ الحکم للہ والملک للہ۔

سکہ کا الزام

بھاگا نہیں، پکڑا نہیں گیا، دفتر قلعہ سے کوئی میرا کاغذ نہیں نکلا، کسی طرح کی بے خیالی و نمک حرامی کا دھبا مجھ کو نہیں لگا۔ یہاں ایک اخبار جو گوری شنکر یا گوری دیال یا کوئی اور غدر کے دنوں میں چھپتا تھا اس میں ایک مخبر اخبار نویس نے یہ بھی لکھی کہ فلانی تاریخ اسد اللہ غالب نے یہ سکہ کہہ کر گذرانا:

بزر زد سکۂ کشور ستانی
سراج الدین بہادر شاہ ثانی

مجھ سے عند الملاقات صاحب کمشنر نے پوچھا کہ یہ کیا لکھتا ہے؟ میں نے کہا: "غلط لکھتا ہے! بادشاہ شاعر، بادشاہ کے بیٹے شاعر، بادشاہ کے نوکر شاعر، خدا جانے کس نے کہا، اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا۔ اگر میں نے کہہ کر گذرانا تو دفتر سے وہ کاغذ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا گذرتا اور آپ کو چاہیے حکیم احسن اللہ خاں سے پوچھیے۔"

اس وقت تو چپکا ہو رہا۔ اب جو اس کی بدلی ہوئی تو جانے سے دو ہفتے پہلے ایک فارسی روبکار لکھی کہ یہ جو اسد اللہ خاں نامی فارسی کے علم میں بڑا مشہور ہے۔ اس سے کام نہیں نکلتا، یہ شخص بادشاہ کا نوکر تھا اور اس کا سکہ کہا۔ ہمارے نزدیک پنشن پانے کا مستحق نہیں ہے۔ غرض اس مقصود سے یہ ہے کہ میں یہاں موجود ہوں اور مجھ سے راہ و رسم ہے۔ یہ تو کوئی بتاتا نہیں کہ تاریخ روبکاری کیا ہے اور یہ صدر کو بھیجی گئی یا نہیں۔ اب حیران ہوں کہ کیا کروں۔ کمشنر جدید سے ملوں گا، اسی سے۔ اگر دے گا تو نقل لوں گا، جواب انداز احتیاطاً اسی کمشنر کے عہد میں بھی بھیج چکا ہوں۔ — میں تو حل حل کر رہا ہوں، جیوں تو اور مروں تو۔ لیکن جواب صاف مل چکے تو اس شہر سے نکل جاؤں، یہ دو روپے سو بھی اس غاصب ملعون کی گور میں جائیں جس نے مجھے دس ہزار روپیہ سال میں سے یہ کچھ دیا ہے۔ علیہ اللعنۃ والعذاب۔

یہاں میر احمد حسین والد میر روشن علی خاں نے مجھ سے کہا کہ حضرت جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے ہیں تو میں مرشد آباد میں تھا، وہاں میں نے یہ سکہ سنا تھا۔ ان کے کہنے سے مجھے یاد آیا کہ مولوی محمد باقر نے خبر وفات اکبر شاہ و جلوس بہادر شاہ، 'جہاں' چھاپی تھی وہاں اس سکے کا گذرنا، ذوق کی طرف سے چھاپا تھا اور جلوس بہادر شاہ اکتوبر کے مہینے ۱۸۳۷ء میں ہوا ہے۔ میں نے اکبر آباد، فرخ آباد، مارہرہ، میرٹھ اپنے احباب کو لکھا۔ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۳۷ء، ان تینوں مہینوں کے بارہ پرچے دیکھے جائیں۔

سکے کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا کوئی گراب۔ کس سے کہوں، کس کو گواہ لاؤں؟ یہ دونوں سکے ایک وقت میں کہے گئے ہیں۔ یعنی جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے ہیں تو ذوق نے یہ دو سکے کہہ کر گذرانے، بادشاہ نے پسند کئے۔ مولوی محمد باقر جو ذوق کے معتقدین میں تھے انھوں نے دلی اُردو اخبار میں یہ دونوں سکے چھاپے۔ اس کے علاوہ اب تک وہ لوگ موجود ہیں جنھوں نے اس زمانے میں مرشد آباد اور کلکتے میں یہ سکے سنے تھے اور ان کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سکے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گذرانے ہوئے ثابت ہوئے ہیں۔ میں نے ہر چند قلمرو ہند میں "دلی اُردو اخبار" کا پرچہ ڈھونڈھا، کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبا مجھ پر رہا، پنشن بھی گئی اور ریاست کا نام و نشان خلعت و دربار بھی گیا۔ خیر جو کچھ ہوا، موافق رضائے الٰہی ہوا، اس کا گلہ کیا:

چوں جنبش سپہر بہ فرمان داور است
بیداد نبود آنچہ بما آسماں دہد

وہ دلی اُردو اخبار کا پرچہ اگر مل جائے تو بہت مفید مطلب ہے، ورنہ خیر۔ کچھ محل خوف و خطر نہیں ہے۔ احکام صدر ایسی باتوں پر نفاذ کریں گے۔ میں نے سکہ کہا نہیں۔ اگر کہا تو اپنی جان و حرمت بچانے کو کہا، یہ گناہ نہیں۔ اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکۂ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے۔ سبحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بینک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں۔ ہاں صاحب گولہ انداز کا بہنوئی مددگار ہے اور شاعر کا سالا بھی جانب دار نہیں!

اب تم روداد سنو، عرضی میری سر جان لارنس چیف کمشنر بہادر کو گذری، اس پر دستخط ہوئے کہ یہ عرضی مع کاغذ ضمیمہ سائل کے پاس بھیج دی جائے اور یہ لکھا جائے کہ بوساطت کمشنر دہلی کے پیش کرو۔ اب سر رشتہ دار کو لازم تھا کہ میرے نام موافق قاعدے کے خط لکھتا، یہ نہ ہوا۔ وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ میں نے خط صاحب کمشنر دہلی، چارلس سانڈرس کو لکھا اور وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی اس میں ملفوف کر کے بھیج دی۔ صاحب کمشنر نے کلکٹر کے پاس بحکم چڑھا کر بھیجی کہ سائل کے پنشن کی کیفیت لکھو۔ اب وہ مسل یہ

کلکٹر صاحب کے ہاں آیا۔ بہر حال خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر میں سے میرا کچھ شمول فساد میں نہیں پایا گیا اور میں حکام کے نزدیک یہاں تک پاک ہوں کہ پنشن کی کیفیت طلب ہوئی ہے اور میری کیفیت کا ذکر نہیں ہے۔ یعنی سب جانتے ہیں کہ اس کو لگاؤ نہ تھا۔

گورنر اعظم نے میرٹھ میں دربار کا حکم دیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے سات جاگیرداروں میں سے جو تین بقیۃ السیف تھے، ان کو حکم دیا اور دربار عام میں سے سوائے میرے کوئی نہ تھا یا چند مہاجن۔ مجھ کو کوئی حکم نہیں پہنچا۔ جب میں نے استدعا کی تو جواب ملا کہ اب نہیں ہو سکتا۔ جب یہ شہر مخیم خیام گورنری ہوئی، میں اپنی عادت قدیم کے مطابق خیمہ گاہ میں پہنچا۔ مولوی اظہار حسین خاں صاحب بہادر سے ملا۔ چیف سکرتر بہادر کو اطلاع کی۔ جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ میں سمجھا کہ اس وقت فرصت نہیں۔ دوسرے دن پھر گیا۔ میری اطلاع کے بعد حکم ہوا کہ ایام غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے، اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو۔ اس دن چلا آیا۔ دوسرے دن میں نے انگریزی خط ان کے نام کا لکھ کر ان کو بھیجا۔ مضمون یہ کہ باغیوں سے میرا اخلاص مظنۂ محض ہے۔ امیدوار ہوں کہ اس کی تحقیقات ہو تاکہ میری صفائی اور بے گناہی ثابت ہو۔ یہاں سے تقاضات پر جواب نہ ہوا۔ فروری میں پنجاب کے ملک سے جواب آیا کہ لارڈ صاحب فرماتے ہیں کہ ہم تحقیقات نہ کریں گے۔ بس یہ حکم طے ہوا۔ دربار و خلعت موقوف۔ پنشن مسدود۔ وجہ نہ معلوم۔ لا موجود الا اللہ۔ لا مؤثر فی الوجود الا اللہ۔

۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں بہادر والی رامپور کہ میرے آشنائے قدیم ہیں، اس سال (۱۸۵۵ء) میرے شاگرد ہوئے۔ نظم ان کی تخلص دیا گیا۔ جیسی جیسی غزلیں اردو کی بھیجتے، میں اصلاح دے کر بھیج دیتا۔ گاہ گاہ کچھ روپیہ ادھر سے آتا رہتا۔ قلعے کی تنخواہ جاری، انگریزی پنشن کھلا ہوا، ان کے عطایا فتوح گنے جاتے تھے۔ جب وہ دونوں تنخواہیں جاتی رہیں تو زندگی کا مدار ان کے عطیے پر رہا۔ بعد فتح دہلی وہ ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں رہتے تھے۔ میں عذر کرتا تھا۔ جب جنوری ۱۸۶۰ء میں گورنمنٹ سے وہ جواب پایا کہ اوپر لکھ آیا ہوں تو میں آخر جنوری میں رامپور گیا۔ چھ سات ہفتے وہاں رہ کر دلی آیا۔

ہمیشہ نواب گورنر جنرل کی سرکار سے دربار میں مجھ کو سات پارچے اور تین رقم جواہر خلعت ملتا تھا۔ لارڈ کیننگ صاحب میرا دربار اور خلعت بند کر گئے۔ ناامید ہو کر بیٹھ رہا اور مدت العمر کو مایوس ہو رہا۔ اب جو یہاں لفٹنٹ گورنر پنجاب آئے، میں جانتا تھا کہ یہ بھی مجھ سے نہ ملیں گے۔ انھوں نے مجھ کو بلا بھیجا۔ بہت سی عنایت فرمائی اور فرمایا کہ لارڈ صاحب دلی میں دربار نہ کریں گے، میرٹھ ہوتے ہوئے اور میرٹھ میں ان اضلاع کے علاقہ داروں اور جاگیرداروں کا دربار کرتے ہوئے انبالہ جائیں گے۔ دلی کے لوگوں کا دربار وہاں ہو گا۔ تم بھی انبالے جاؤ۔ شریک ہو کر خلعت معمولی لے آؤ۔ بھائی کیا کہوں کیا میرے دل پر گذری۔ گویا مردہ جی اٹھا۔ ساتھ اس مسرت کے یہ بھی سناٹا گذرا کہ سامان سفر انبالہ اور مصارف بے انتہا کہاں سے لاؤں؟ اور علاوہ یہ کہ نذر معمولی میرا ایک قصیدہ ہے۔ ادھر قصیدے کی فکر، ادھر روپے کی تدبیر۔ حواس ٹھکانے نہیں۔ شعر کام دل و دماغ کا ہے، وہ روپے کی فکر میں پریشان۔ میرا خدا یہ مشکل بھی آسان کرے گا۔ مگر ان دنوں میں نہ دن کو چین ہے نہ رات کو نیند ہے۔ . . . لفٹنٹ گورنر کی ملازمت اور خلعت پر قناعت کر کے انبالے جانا موقوف کیا۔ اور بڑے گورنر کا دربار اور خلعت اور وقت پر موقوف رکھا۔ بیمار ہوں۔ ہاتھ پر ایک زخم، وہ زخم کیا، ایک غار ہو گیا ہے۔

کمشنر و ڈپٹی کمشنر وغیرہ حکام سے ترک ملاقات ہے مگر ڈپٹی کلکٹر شہر سے کہ وہ مہتمم خزانہ ہے، ہر مہینے میں ایک بار ملنا ضرور ہے۔ اگر نہ ملوں تو مختار کار کو تنخواہ نہ دے۔ ڈاکٹر ودر صاحب ڈپٹی کلکٹر چھ مہینے کی رخصت لے کر پہاڑ پر گئے۔ ان کی جگہ ری ٹنگس صاحب مقرر ہوئے۔ ان سے

ناچار صاحب ایک تذکرہ شعرائے ہند کا انگریزی میں لکھتے ہیں۔ مجھ سے بھی انھوں نے مدد چاہی۔ میں نے سات کتابیں بھائی ضیاء الدین خاں صاحب سے مستعار لے کر ان کے پاس بھیج دیں۔ پھر انھوں نے مجھ سے کہا کہ جن شعرا کو تم جانتے ہو اُن کا حال لکھ بھیجو۔ میں نے سو آدمی لکھ بھیجے بقید اس کے کہ اب زندہ موجود ہیں، اور اس سواد کی صورت یہ ہے:

"نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر رئیس لوہارو، فارسی و اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں، فارسی میں نیّر اور اردو میں رخشاں تخلص کرتے ہیں، اسد اللہ خاں غالب کے شاگرد۔" "نواب مصطفیٰ خاں بہادر علاقہ دار جہانگیر آباد، اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے ہیں۔ اردو میں مومن خاں کو اپنا کلام دکھاتے ہیں۔" "منشی ہرگوپال معزز قانون گو سکندر آباد کے فارسی شعر کہتے ہیں، تفتہ تخلص کرتے ہیں اور اسد اللہ خاں غالب کے شاگرد۔"

اصل یہ ہے کہ تذکرہ انگریزی زبان میں لکھا جاتا ہے۔ اشعار ہندی اور فارسی کا ترجمہ شامل نہ کیا جائے گا۔ صرف شاعر کا نام اور اس کے اُستاد کا نام اور شاعر کے مسکن، وطن کا نام مع تخلص درج ہوگا۔

میں ہمیشہ نواب گورنر جنرل بہادر کے دربار میں بیدھی صف میں دسواں نمبر اور سات پارچے اور تین رقم جواہر خلعت پاتا تھا۔ غدر کے بعد پنشن جاری ہو گیا لیکن دربار اور خلعت بند۔ اب کے جو لارڈ صاحب یہاں آئے تو اہلِ دفتر نے بموجب حکم مجھ کو اطلاع دی کہ تمھارا دربار اور خلعت بحال ہو گیا مگر دلی میں دربار نہیں، انبالے آؤ گے تو دربار میں نمبر اور خلعت معمولی پاؤ گے۔ میں نے خبر میں وجدان کا مزا پایا اور انبالے نہ گیا۔ رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب یہاں آئے، دربار کیا، میں دربار میں نہ گیا۔ دربار کے بعد ایک دن بارہ بجے چپراسی آکر مجھ کو لے گیا۔ بہت عنایت فرمائی اور اپنی طرف سے خلعت عنایت کیا۔

پنشن کا مقدمہ

یہاں پنشن کا مقدمہ پیش ہے۔ کبھی صاحب کمشنر بہادر کے پاس، کبھی صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کے پاس جانا ہوتا ہے۔ نہ خود جاؤں، تو خیال رہتا ہے کہ خدا جانے کس وقت بلا بھیجیں یا کسی وقت کوئی پرسش آ جائے۔ باہر بیٹھنے سے وہ رزق کہ جو مقوم جسم اور مفرح روح تھا مسدود ہے۔ کیا کھاؤں اور کیونکر جیوں۔ الحمد للہ کہ گنہگار نہیں ٹھہرا۔ پنشن پاؤں گا مگر وہ پنشن گورنمنٹ کے پولیٹیکل سر رشتے سے مقرر کی ہوئی ہے، سو دلی کا انگریزی دفتر فرد فرد لُٹ گیا۔ کوئی کاغذ باقی نہیں رہا۔ اب یہ شہر پنجاب احاطے میں مل گیا۔ پنجاب کا نواب لفٹنٹ گورنر بہادر یہاں کا صدر ٹھہرا۔ اس دفتر میں میری ریاست کا، میری معاش کا، میری عزت کا نام و نشان نہیں ہے۔ ایسے ایسے پیچ پڑ گئے ہیں، کچھ نکل گئے ہیں، کچھ باقی رہے ہیں، یہ بھی نکل جائیں گے ع

کارہا آساں شود اما بہ صبر

پنشن قدیم اکیس مہینے سے بند، اور یہ سادہ دل فتوح جدید کا آرزومند۔ پنشن کا احاطہ پنجاب کے حکام پر مدار ہے۔ سو اُن کا شیوہ اور شعار ہے کہ نہ روپیہ دیتے ہیں نہ جواب۔ نہ مہربانی کرتے ہیں نہ عتاب۔ خیر اس سے قطع نظر کی۔ اب بیٹھے ادھر کی۔ ۱۸۵۶ء سے بموجب تحریرِ عطیہ شاہی کا امیدوار ہوں، تقاضا کرتے ہوئے شرماؤں۔ اگر گنہگار ہوں، گنہگار ٹھہرتا، گولی یا پھانسی سے مرتا۔ اس بات پر کہیں بے گناہ ہو

قید اور مقتول نہ ہونے سے آپ اپنا گواہ ہوں پیش گاہ گورنمنٹ کلکتہ میں جب کوئی کاغذ بھیجا ہے۔ بتوسط چیف سکرتر بہادر اس کا جواب پایا ہے۔ اب کی بار وہ کتابیں بھیجیں، ایک پیش کش گورنمنٹ اور ایک نذر شاہی ہے۔ نہ اس کے قبول سے اطلاع نہ اس کے ارسال سے آگاہی ہے۔ جناب ولیم میور بہادر نے بھی عنایت نہ فرمائی۔ ان کی بھی کوئی تحریر مجھ کو نہ آئی۔ یہ سب ایک طرف، اب خبریں ہیں مختلف کہتے ہیں کہ چیف سکرتر بہادر لفٹنٹ گورنر ہوئے۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ ان کی جگہ کون سے صاحب عالی شان چیف سکرتر ہوئے۔ مشہور ہے کہ جناب ولیم میور صاحب بہادر صدر بورڈ میں تشریف لے گئے۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ لفٹنٹ گورنری کے سکرتر کا کام کس کو دے گئے۔

۱۰ دسمبر ۱۸۵۶ء کو لکھا ہوا حکم وزیر اعظم کا ولایت کی ڈاک میں مجھ کو آیا ہے کہ قصیدے کے صلے اور جائزے کے واسطے جو بتوسط لارڈ ایلن برا سائل نے بھیجا ہے۔ خطاب اور خلعت اور پنشن کی تجویز ضرور ہے جو حکم صادر ہوگا، سائل کو بتوسط گورنمنٹ اس کی اطلاع دی منظور ہے۔ یہ حکم ۱۰ دسمبر ۱۸۵۶ء آخر جنوری ۱۸۵۷ء میں میں نے پایا۔ فروری، مارچ، اپریل خوشی اور توقع میں گزرے۔ ۱۸۵۷ء میں فلک نے یہ فتنہ اٹھایا۔ اب اس کتاب اور دوسرے قصیدے کے جابجا نذر کرنے کا یہ سبب ہے کہ سائل حکم ولایت کو یاد دہی کرتا ہے اور گورنمنٹ سے تحسین طلب ہے۔ جب یہاں سے زہ تحسین نہیں تو ولایت کو نذر کے ارسال کا بھی یقین نہیں۔ تحسین اور آفرین سے قطع نظر نذر کے ولایت جانے کا یقین کیونکر حاصل ہو۔ جہاں یہ تفرقہ اور بے اتفاقی اور یہ دشواری اور یہ مشکل ہو۔

میرے پنشن اور ولایت کے انعام کا حال کما ہو حقہٗ سمجھ لو۔ والرحمٰن الطاف خفیہ۔ ایک خاص طرز پر تحریک ہوئی نواب گورنر جنرل بہادر نے حاکم پنجاب کو لکھا کہ حاکم دہلی سے فلاں شخص کے پنشن کے چڑھے ہوئے روپے یک مشت پانے کی اور آیندہ ماہ بماہ ملنے کی رپورٹ منگوا کر اپنی منظوری لکھ کر ہمارے پاس بھیج دو، تاکہ ہم منظوری دے کر تمھارے پاس بھیج دیں اور یہاں کمشنر صاحب بہادر نے یہ بھی کہا کہ اگر تم کو روپے کی ضرورت ہو تو سو روپے خزانے سے منگوا لو۔ میں نے کہا۔ صاحب یہ کیسی بات ہے کہ اوروں کو برس دن کا روپیہ ملا اور مجھے سو روپے دلواتے ہو۔ فرمایا کہ اب چند روز میں سب روپیہ اور اجراء کا حکم مل جائے گا۔ الٰہا کہ یہ بات برسوں میں میسر آئے گی۔ میں چپ ہو رہا۔

پر ہاں ولایت کے انعام کی توقع خدا ہی سے ہے۔ حکم تو اسی حکم کے ساتھ اس کی رپورٹ کرنے کا بھی آیا ہے مگر یہ بھی حکم ہے کہ اپنی رائے لکھو۔ اب دیکھیے یہ دو حاکم یعنی حاکم دہلی اور حاکم پنجاب اپنی رائے کیا لکھتے ہیں۔ پنجاب کے گورنر بہادر کا یہ بھی حکم ہے کہ دستنبو منگا کر اور دیکھ کر ہم کو لکھو کہ وہ کیسی ہے اور اس میں کیا لکھا ہے۔

میرے اللہ نے ایک اور عنایت کی اور اس غم زدگی میں ایک گونہ خوشی اور کیسی بڑی خوشی دی ہے۔ ایک دستنبو نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی نذر بھیجی تھی۔ نواب بہادر کا خط مقام الٰہ آباد سے بسبیل ڈاک آیا، وہی کاغذ افشانی، وہی القاب قدیم، کتاب کی تعریف، عبارت کی تحسین، مہربانی کے کلمات۔ اور یہ بھی توقع پڑی کہ گورنر جنرل بہادر کے ہاں سے بھی کتاب کی تحسین اور عنایت کے مضامین کی تحریر آ جائے۔

میں اجرائے پنشن سرکار انگریزی سے مایوس تھا۔ بارے وہ نقشہ پنشن داروں کا جو یہاں سے بن کر صدر کو گیا تھا اور یہاں کے حاکم نے بہ نسبت میرے لکھ دیا تھا کہ یہ شخص پنشن پانے کا مستحق نہیں ہے۔ گورنمنٹ نے برخلاف یہاں کے حاکم کی رائے کے میرے پنشن کے اجراء کا حکم دیا۔

زرِ سالانہ مجھ، ہزاروں کہاں سے ہوئے، سات سو پچاس روپے سال پاتا ہوں، تین برس میں دو ہزار دو سو پچاس ہوئے، سو روپے مجھے مدِ خرچ ملے تھے، وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو متفرقات میں گئے۔ رہے دو ہزار، میرا مختار کار ایک بنیا ہے اور میں اس کا قرضدار قدیم ہوں، اب وہ دو ہزار روپے لایا، اس نے اپنے پاس رکھ لیے اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجیے۔ سات کم پندرہ سو اس کے سود مول کے ہوئے، قرض متفرق کا اس سے حساب کروایا گیا۔ گیارہ سو کئی روپے وہ نکلے۔ پندرہ اور گیارہ چھبیس سو ہوئے، اصل میں یعنی دو ہزار میں چھ سو کا گھاٹا۔ وہ کہتا ہے، پندرہ سو میرے دے دو، پانسو سات روپے باقی کے تم لے لو۔ میں کہتا ہوں متفرقات گیارہ سو چکا دے۔ نو سو باقی رہے، آدھے تو لے لے، آدھے مجھ کو دے۔ بعد ادائے حقوق چار سو روپے دینے باقی رہے اور ننانوے روپے گیارہ آنے مجھے بچے۔ آخر جون ۱۸۶۰ء میں حکم ہو گیا کہ پنشن دار علی العموم ششماہی پایا کریں۔ ماہ بماہ پنشن نہ تقسیم ہوا کرے۔ اب ماہ بماہ روپیہ ملتا ہے مگر دسمبر ۱۸۶۰ء سے تنخواہ ششماہی ہو جائے گی۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ چار روپے سیکڑہ سالانہ عموماً وضع ہوا کرے گا۔ اس حساب سے میرے حصے میں ڈھائی روپے مہینہ آیا۔ باسٹھ آنے کے ساٹھ رہیں گے۔ کچھ رامپور سے ماہ بماہ آتا ہے۔ یہ دونوں آمدیں مل کر خوش و ناخوش گزارا ہو جاتا ہے۔

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرتِ تعمیر سو ہے

یہاں کیا دھرا تھا جو کوئی لوٹے گا۔ چند گوروں نے اہلِ بازار کو ستایا تھا، اہلِ قلم اور اہلِ فوج نے باتفاقِ ہم دگر ایسا بندوبست کیا کہ وہ فساد مٹ گیا۔ اب امن و امان ہے۔ مسجد جامع واگذاشت ہو گئی۔ ۱۸۶۲ء میں جنگلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنائیں۔ انڈا، مرغی، کبوتر بکنے لگا۔ دس آدمی منتظم ٹھہرے۔ مرزا الٰہی بخش، مولوی صدر الدین، تفضل حسین خاں تین، یہ سات اور۔

۷۔ نومبر ۱ء ۱۴۔ جمادی الثانی (۱۲۷۹ھ – ۱۸۶۲ء) جمعہ کے دن ابوالظفر سراج الدین بہادر شاہ قیدِ فرنگ اور قیدِ جسم سے آزاد ہوئے۔ اِنّا لِلّٰہ و اِنّا الیہ راجعون۔

ہندوستان کا بغداد

ہائے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گزری۔ اموال کیا ہوئے، اشخاص کہاں گئے، خاندانِ شجاع الدولہ کے زن و مرد کا کیا انجام ہوا۔ قبلہ و کعبہ مجتہد العصر (سید محمد) کی سرگزشت کیا ہے۔

لکھنؤ کا کیا کہنا — وہ ہندوستان کا بغداد تھا، وہ سرکار امیر گر تھی جو بے سر و پا وہاں پہنچ گیا، امیر بن گیا۔ اللہ اللہ اس باغ کی یہ فصلِ خزاں! اگر وہاں بعد فساد کے ایک کون ہو گا۔ یعنی راہیں وسیع ہو جائیں گی، بازار اچھے نکل آئیں گے جو دیکھے گا وہ داد دے گا۔ دلی کے فساد کے بعد کون نہیں ہے۔ یہاں فساد در فساد چلا جائے گا۔ شہر کی صورت سوائے اس بازار کے جو قلعے کے لاہوری دروازے سے شہر کے لاہوری دروازے تک ہے، سراسر گر گئی اور گرتی جاتی ہے۔

پانچ لشکر

دلی پر پانچ لشکروں کا حملہ ہوا۔ ایک غدر کالوں کا، ایک ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنہ انہدام مکانات کا، ایک آفت وبا کی، ایک مصیبت کال کی۔ اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج (۲۹ - جولائی ۱۸۶۲ء) اکیسواں دن ہے۔ آفتاب اس طرح نظر آجاتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ ان کو جگنو سمجھ لیتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی۔ کوئی دن نہیں کہ دو چار گھر کی چوری کا حال نہ سنا جائے۔ مبالغہ نہ سمجھنا ہزار ہا مکان گر گئے۔ سیکڑوں آدمی جابجا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہہ رہی ہے۔ قصہ مختصر وہ ان کال تھا کہ مینہ نہ برسا، اناج نہ پیدا ہوا۔ یہ پن کال ہے، پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہہ گئے۔ جنھوں نے ابھی نہیں بویا تھا وہ بونے سے رہ گئے۔

برسات خدا کا قہر ہے۔ قاسم خاں کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں، عالم بیگ کے کٹرے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنی ہو گئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ کتابیں، قلمدان، سب توشے خانے میں۔ فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا، کہیں چلمچی دھری ہوئی۔

واہ رے بندر

پنجشنبہ ۲۵ - مئی (۱۸۶۵ء) کو اول بڑے زور کی آندھی آئی۔ پھر خوب مینہ برسا، وہ جاڑا پڑا کہ شہر کرۂ زمہریر ہو گیا۔ بڑے پیچے کا دروازہ ڈھایا گیا۔ خلیل عطار کے کوچے کا بقیہ مٹایا گیا۔ کشمیری کٹرے کی مسجد زمین کا پیوند ہو گئی۔ سڑک کی وسعت دوچند ہو گئی۔ اللہ اللہ گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں اور ہندوؤں کی ڈیوڑھیوں کی جھنڈیوں کے پرچم لہراتے ہیں۔ ایک شیر زور آور اور پیل تن بندر پیدا ہوا ہے۔ مکانات جابجا ڈھاتا پھرتا ہے۔ فیض اللہ خاں بنگش کی حویلی پر جو کلسے ہیں جن کو عوام کنگری کہتے ہیں۔ انھیں ہلا ہلا کر ایک ایک کی بنیاد ڈھا دی۔ اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ واہ رے بندر، یہ زیادتی اور پھر شہر کے اندر!

سفرِ رامپور

ایک قرن بارہ برس سے فردوس مکان نواب یوسف علی خاں والیِ رامپور اپنے اشعار میرے پاس بھیجتے تھے اور سو روپیہ مہینہ ماہ بماہ بسبیل ہنڈوی بھجواتے تھے۔ اس مغفور کی اندازہ دانی دیکھیے کہ بھولے سے کبھی اس روپے کی رسید نہ لی۔ اپنے خط میں ہنڈوی بھیجا کرتے، میں خط کا جواب لکھ بھیجتا۔ اس ماہانہ کے علاوہ کبھی دو سو، کبھی ڈھائی سو بھیجتے رہتے۔ فتنہ و فساد کے دنوں میں قلعے کی آمد مفقود، انگریزی پنشن مسدود، یہ بزرگوار وجہ مقرری ماہ بماہ اور فتوح گاہ گاہ بھیجتا رہا۔ تب میری اور میرے متوسلوں کی زیست ہوئی۔

نواب یوسف علی خاں بہادر اکتیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس کے میرے شاگرد ہیں۔ آگے گاہ گاہ کچھ بھیج دیا

کرتے تھے۔ اب جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ مہینہ ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ بلاتے رہتے تھے۔ اب میں گیا۔ دو مہینے رہ کر چلا آیا۔ وہ سو روپیہ مہینہ یہاں رہوں، وہاں رہوں، خدا کے ہاں سے میرا مقرر ہے۔

میں نے دلی کو چھوڑا اور رامپور کو چلا۔ پنجشنبہ ۱۹ جنوری ۱۸۶۰ء کو مرادنگر اور جمعہ ۲۰ جنوری کو میرٹھ پہنچا۔ شنبہ ۲۱ کو جناب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے کہنے سے مقام کیا۔ شاہ جہاں پور، گڑھ مکتیسر، مرادآباد ہوتا ہوا رامپور پہنچا۔ چار دن والی شہر نے اپنی کوٹھی میں اتارا۔ میں نے مکان جداگانہ مانگا۔ دو تین حویلیاں برابر مجھ کو عطا ہوئیں۔ حسب اتفاق ڈاک گھر مسکن کے پاس۔ ڈاک منشی آشنا ہو گیا۔ برابر دلی سے خط چلے آتے ہیں۔ صرف رامپور کا نام اور میرا نام، محلے کی اور عرف کی حاجت نہیں۔

نواب صاحب مانع رہے اور بہت دریغ کرتے رہے۔ برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے مگر جہاں میں ایسے انداز سے چلا کہ رمضان کی چاند رات کے دن یہاں پہنچا۔ یکشنبہ کو غرہ ماہ مقدس ہوا۔ اسی دن سے ہر صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں۔ شب کو مسجد جامع جا کر نماز تراویح پڑھتا ہوں۔ کبھی جو جی میں آتی ہے تو وقت صوم مہتاب باغ میں جا کر روزہ کھولتا ہوں اور سرد پانی پیتا ہوں۔ واہ واہ کیا اچھی طرح عمر بسر ہوتی ہے۔

اب اصل حقیقت سنو۔ لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا۔ وہاں انھوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ تنہا بھیج دینے میں وہم آیا کہ خدا جانے اگر کوئی امر حادث ہو تو بدنامی عمر بھر رہے۔ اس سبب سے چلا آیا ورنہ گرمی برسات وہاں کاٹتا۔

قرارداد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپے مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ اب جو میں وہاں گیا تو سو روپیہ مہینہ بنام دعوت اور دیا، یعنی رامپور رہوں تو دو سو روپیہ ماہانہ پاؤں اور دلی رہوں تو سو روپیہ۔ سو دو سو میں کلام نہیں۔ کلام اس میں ہے کہ نواب مجھ دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں۔ مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے۔ ملاقات بھی دوستانہ رہی۔ معانقہ و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے، وہ صورت ملاقات کی ہے۔ لڑکوں سے میں نے نذر دلوائی تھی۔ بس۔ بہرحال غنیمت ہے۔ رزق اچھی طرح ملنے کا شکر چاہیے، کمی کا شکوہ کیا!

تعظیم و توقیر بہت، ملاقاتیں بھی ہوتی نہیں۔ ایک مکان کہ وہ تین چار مکانوں پر مشتمل ہے رہنے کو ملا ہے۔ یہاں پتھر تو دوا کو بھی میسر نہیں۔ خشتی مکان گنتی کے ہیں۔ کچی دیواریں اور کھپریل۔ سارے شہر کی آبادی اسی طرح پر ہے۔ مجھ کو جو مکان ملے ہیں وہ بھی ایسے ہیں۔ کھانا دونوں وقت سرکار سے آتا ہے اور وہ سب کو کافی ہوتا ہے۔ غذا میرے بھی خلاف طبع نہیں۔ پانی کا شکر کس منہ سے ادا کروں۔ ایک دریا ہے کوسی، سبحان اللہ ایسا میٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ چیکا شربت ہے۔ صاف، سبک، گوارا، سریع النفوذ۔ صبح کو بھوک خوب لگتی ہے۔

میں جو آخر جنوری کو رامپور جا کر آخر مارچ کو یہاں آ گیا تو کیا لکھوں کہ یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کیا بکتے ہیں۔ ایک شخص کا قول ہے کہ یہ شخص والی رامپور کا استاد تھا اور وہاں گیا تھا۔ اگر نواب نے کچھ سلوک نہ کیا ہوگا تو بھی پانچ ہزار سے کم نہ دیا ہوگا۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ نوکری کو گئے تھے مگر نوکر نہ رکھا۔ ایک فرقہ کہتا ہے کہ نواب نے نوکر رکھ لیا تھا۔ دو سو روپیہ مہینہ کر دیا تھا۔ لفٹنٹ گورنر الہ آباد جو رامپور آئے اور ان کو غالب کا وہاں ہونا معلوم ہوا تو انھوں نے نواب صاحب سے کہا کہ اگر ہماری خوشنودی چاہتے ہو تو اس کو جواب دو۔ نواب صاحب نے برطرف کر دیا۔

زمیں کی طرف سے بطریق وکیل محکمہ کمشنری میں متعین نہیں ہوں۔ جس طرح امراء واسطے فقراء کے وجہ معاش مقرر کر دیتے ہیں، اسی طرح

اس سرکار سے میرے واسطے مقرر ہے۔ وہاں فقیر سے دعائے خیر اور مجھ سے اصلاح نظم مطلوب ہے۔ جاتا ہوں، رہوں یا نہ رہوں، جاتا ہوں اگر آیا تو پھر لاہور جاتا ہوں ورنہ۔ ایک گاڑی کپڑوں کے واسطے کروں، کپڑوں کے صندوق میں کوئی درجن شراب دھروں، سنا ہے کہار ٹھیکے کے دن پچاس روپے دیتا ہوں۔ وہ جہاں چھوڑیں وہ ساتھ لوں چل دوں۔ رامپور سے جو لفافہ آیا کرے گا۔ لڑکوں کا حافظ تم یا رو بھیجا کرے گا۔ گاڑی پہنچ گئی ہے، شراب مل گئی ہے، کہار بھی پہنچ گئے ہیں، عافیت کہاں سے لاؤں۔ روٹی کھانے کو باہر کے مکان سے محل میں کو وہ بہت قریب ہے جب جاتا ہوں تو ہندوستانی گھڑی بھر میں دم ٹھہرتا ہے اور یہی حال واپس آنے میں ہوتا ہے۔ والی رامپور نے مرشد زادے کی شادی میں بلایا تھا نہیں گیا۔ کہیں اب معدوم محض ہوں، تمہارا اقبال تمہارے کلام کو اصلاح دیتا ہے۔

رئیس رامپور سو روپے مہینہ دیتے ہیں۔ سال گذشتہ (۱۸۶۳ء) ان کو لکھ بھیجا کہ اصلاح نظم جو اس کا کام ہے اور میں اپنے میں نہیں پاتا، متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں۔ جو کچھ مجھے آپ کی سرکار سے ملتا ہے، عوض خدمات سابقہ میں شمار کیجئے تو میں منت پذیر ہوں ورنہ خیرات خوار سمجھیں اور اگر وظیفہ بشرط خدمت ہے تو یہ آپ کی مرضی ہے وہی میری قسمت ہے۔ برس دن سے کلام نہیں آیا۔ تنخواہ متواتر نومبر ۱۸۶۴ء تک آئی۔ اب آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ آج تک نواب صاحب از راہ جوان مردی دیے جاتے ہیں۔

دوسرا سفر رامپور

رامپور کی سرکار کا فقیر تکیہ دار اور وظیفہ خوار ہوں۔ رئیس حال نے مسند نشینی کا جشن کیا۔ دعاگوئے دولت کو در دولت پر جانا واجب ہوا۔ ۱۰ اکتوبر ۱۸۶۵ء دوشنبے کے دن دو پہر گھڑی دن چڑھے احباب کو رخصت کر کے راہی ہوا۔ تصور یہ تھا کہ ٹھہرتے رہوں، وہاں قافلے کی گنجائش نہ پائی۔ پالکی روانہ کی، دونوں بھائی گھوڑوں پر سوار ہو کے چل دیئے۔ چار گھڑی دن رہے غازی الدین نگر کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا۔ میں نے چاہا کہ بھی داغ کیا۔ دو شامی کباب اس میں ڈال دیئے بات ہو گئی تھی، شراب پی، کباب کھائے، لڑکوں نے اپنی کھچڑی پکائی، خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ ان کے واسطے سادہ سالن پکوایا۔ ترکاری بڑی وافی۔ چار بجے پچھلی رات سے چل دیا، سورج نکلے بابوگڑھ کی سرائے میں آ پہنچا۔ بعد قطع منازل سہ شنبہ ۱۲ اکتوبر کو وہاں پہنچا۔ موسم اچھا تھا، گرمی گذر گئی تھی، جاڑا ابھی چمکا نہ تھا۔ عالم اعتدال آب و ہوا، سالم رامپور پہنچا۔

۳ نومبر نواب صاحب بریلی روانہ ہو گئے۔ فرما گئے کہ دو ہفتے میں آؤں گا۔ اگر چار روز یہاں رہیں گے۔ پھر قافلہ اپنی گاہ کی سیر کو جائیں گے وہاں سے پھر جب آئیں گے تو صاحب کمشنر بریلی کا انتظار فرمائیں گے۔ ۲۰ دسمبر تک آئیں گے۔ تین دن تک جشن رہے گا۔

جشن کی رونق کا کیا کہنا دیکھتا تو حیران رہ جاتا۔ شہر سے دو کوس کے فاصلے پر ایک بستی ہے۔ ۱۸ دن تک وہاں قیام رہا تھے۔ صاحب کمشنر بہادر بریلی چند لیٹیا جوں اور چیچوں کے ہمراہ آتے اور خیمہ میں اتر آئے۔ پھر کم سو صاحب اور میم جمع ہوئے۔ سب سرکار رامپور کے مہمان۔ سہ شنبہ ۱۸ دسمبر ۱۸۶۵ء کو حضور پر نور شوکت اور بیگم سے آ کر تشریف لے گئے۔ بارہ پر دو بج گئے اور تمام خلعت پہن کر آتے اور بیل تھی جاتا۔ کوئی نہیں پایا ہوا تھا۔ دو کوس کے عرصے میں دو رویہ جھرمٹ اور مہتاب جلتی گئی۔ روشنی، آتش بازی کی دو رویہ

کرامات دین کا سامان کرے۔ طوائف کا وہ ہجوم، حکام کا وہ مجمع کہ اس مجلس کو طوائف الملوک کہا چاہیے۔

ذیل کی تصویر کھینچتا ہوں۔ قد، رنگ، شکل، شمائل رعیت جیسا، والئی رعیت خان۔ عمر کا فرق اور کچھ کچھ چہرہ اور بیہ سخاوت۔ حلیم، خلیق، باذل، کریم، متواضع، متشرع، متورع، شعر فہم، سیکڑوں شعر یاد، نظم کی طرف متوجہ نہیں۔ نثر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ جلالات طباطبائی کا طرز برتتے ہیں۔ شگفتہ جبیں ایسے کہ ان کے دیکھنے سے غم کروں بھاگ جائے۔ فصیح بیان ایسے کہ ان کی تقریر سن کر ایک اور ہی روح قالب میں آئے۔

میں یہاں بخوش اور تندرست ہوں۔ ان کا کھانا ایسے وقت آتا ہے کہ پہر دن چڑھے تک میرے آدمی بھی روٹی کھا چکے ہیں۔ شام کا کھانا بھی سویرے آتا ہے۔ کئی طرح کے سالن، پلاؤ، متنجن، میٹھے، دونوں وقت روٹیاں، خمیری چپاتیاں، مربے، اچار۔ میں بخوش، لڑکے بھی خوش۔ سقا، مشعلچی، خاکروب سرکار سے تعیین ہے۔ حجام اور دھوبی نوکر رکھ لیا ہے۔ تعظیم، توقیر، اخلاق کسی باب میں کمی نہیں۔ نواب صاحب کا اخلاص و التفات روز افزوں ہے۔ کھانے کی اور گھوڑوں اور بیلوں کے گھاس دانے کی نقدی ہو گئی۔ لیکن اس میں میرا فائدہ ہے نقصان نہیں۔

میں شعر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا، بھیک مانگنے آیا ہوں۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا، سرکار سے ملتی ہے۔ وقت آئے میری قسمت اور مسلم کی ہمت۔ نواب صاحب از روئے صورت روح مجسم اور باعتبار اخلاق آیۂ رحمت ہیں۔ خزانۂ فیض کے خزانہ دار ہیں۔ جو شخص دفتر ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے اس کے بٹنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپے سال بھر کا محصول معاف کر دیا۔ ایک اہلکار پر ساٹھ ہزار کا محاسبہ معاف کیا اور بیس ہزار روپیہ نقد دیا۔ منشی نولکشور صاحب کی عرضی پیش ہوئی، خلاصہ عرضی سن لیا، واسطے منشی صاحب کے کچھ خلعت بتقریب شادی، جس میں تجویز ہو رہا ہے۔ منتظر ہوں۔ نواب مصطفیٰ خان صاحب بتقریب تہنیت مسند نشینی جو بخوش آنے والے ہیں، اس وقت تک نہیں آئے۔ جشن کو دسمبر سے شروع۔ ماہ دسمبر کو خلعت کا آنا مسموع۔

بی صاحبت، اس کو چاہیے تستی ہمہ علوم کسبیہ سے آگہی، ہمہ زبان آوری پھر قسمت کی یاوری شرط ہے۔ باقر علی خان کو بھی شعر طلبی و نکات رسی علی التواتر موجود۔ بعد جشن وقت رخصت ان دونوں لڑکوں کے باب میں کلام کروں گا۔

وہ صاحب، یعنی کھائی، دن بہلائے، کپڑے چھانٹے گھر کو آنے کے ۸ جنوری ۱۸۶۶ء، اور پہنچنے کے دن غضب الٰہی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہوا۔ عید دوالی کے مراد آباد میں پہنچ کر بیمار ہو گیا۔ پانچ دن صدر الصدور صاحب کے ہاں پڑا رہا۔ انھوں نے تیمار داری اور غم خواری بہت کی۔

مذہب

میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوئے ہوں۔ انبیاء سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعۃ تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ

علی علیہ السلام ہے، ثم حسن، ثم حسین۔ اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام؛

بریں زیستم ہم بریں بگذرم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقے کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا تاکہ مشرکین و منکرین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اس میں جلیں۔ نہ مجھے خوف مرگ، نہ دعوائے صبر ہے۔ میرا مذہب بخلاف عقیدۂ قدریہ جبر ہے ـــــ صاحب، بندہ اثنا عشری ہوں۔ ہر مطلب کے خاتمے پر ۱۲ کا ہندسہ کرتا ہوں۔ خدا کرے میرا بھی خاتمہ اسی عقیدے پر ہو ۱۲۔

میر نصیر الدین اولاد میں سے ہیں شاہ محمد اعظم کے۔ وہ خلیفہ تھے مولوی فخر الدین صاحب کے اور میں مرید ہوں اس خاندان کا۔ صوفی صافی ہوں اور حضرات صوفیہ حفظ مراتب ملحوظ رکھتے ہیں؛

گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

میں بنی آدم کو، مسلمان یا ہندو یا نصرانی، عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں، دوسرا مانے یا نہ مانے۔ رہی وہ عزیز داری جس کو اہل دنیا قرابت کہتے ہیں۔ اس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے اور اس کے مدارج و مراتب ہیں۔ میں جھوٹے سے بیزار ہوں اور جھوٹے کو ملعون جانتا ہوں، کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔

مکان

میں کالے صاحب کے مکان سے اٹھ آیا ہوں۔ مارچ ۱۸۵۴ء بلی ماروں کے محلے میں ایک حویلی کرائے کرکے اس میں رہتا ہوں۔ وہاں کا میرا رہنا تخفیف کرائے کے واسطے نہ تھا، صرف کالے صاحب کی محبت سے رہتا تھا۔ حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں رہتا ہوں۔ وہ حویلی غلام اللہ خاں نے مول لے لی۔ آخر جون ۱۸۶۰ء میں مجھ سے کہا کہ حویلی خالی کر دو۔ دس بارہ برس سے اس تنگ ٹلے میں رہتا تھا۔ سات برس تک ماہ بماہ چار روپیہ دیا گیا۔ اب تین برس کا کرایہ کچھ اوپر سو روپے یک مشت دیا گیا۔ مالک نے مکان بیچ ڈالا۔ جس نے لیا ہے اس نے مجھ سے پیام بلکہ ابرام کیا کہ مکان خالی کر دو۔ مکان کہیں ملے تو اٹھوں۔ بے درد نے مجھ کو عاجز کیا اور [illegible] لگادی۔ وہ صحن بالاخانے کا جس کا دو گز کا عرض اور دس گز کا طول ہے اس میں پاٹ بند ہو گئی۔ رات کو وہیں سویا۔ گرمی کی شدت، پاڑھ کا قرب، گمان یہ گزرتا تھا کہ کٹہر ہے اور صبح کو مجھ کو پھانسی ملے گی۔ تین راتیں اسی طرح گزریں۔ اب مجھے فکر پڑی کہ کہیں دو حویلیاں قریب بہم ایسی ملیں کہ ایک محل سرا اور ایک دیوان خانہ ہو۔ نہ ملیں۔ ناچار یہ چاہا کہ بلی ماروں میں ایک مکان ایسا ملے کہ جس میں جا رہوں۔ نواب علاؤ الدین خاں علائی کی چھوٹی پھوپھی نے بے کس نوازی کی۔ کڑوڑا والی حویلی مجھ کو رہنے کو دی۔ ۹ جولائی ۱۸۶۰ء ہرچند وہ رعایت رہی نہ رہی کہ محلسرا سے قریب ہو، مگر خیر بہت دور بھی نہیں۔

میرا مکان گھر کا نہیں ہے۔ کرائے کی حویلی میں رہتا ہوں۔ جولائی ۱۸۶۲ء سے مینہ شروع ہوا۔ شہر میں سیکڑوں مکان گرے اور مینہ کی نئی صورت۔ دن میں دو چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہہ نکلیں۔ بالاخانے کا دالان جو میرے اٹھنے بیٹھنے

سونے جاگنے، مرنے جینے کا محل ہے، اگرچہ گرا نہیں، لیکن چھت چھلنی ہو گئی، کہیں لگن، کہیں چلمچی، کہیں اگال دان رکھ دیا۔ قلمدان، کتابیں اٹھا کر توشے خانے کی کوٹھڑی میں رکھ دیئے۔ مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں۔ کشتیٔ نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔

دیوان خانے کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا، فقدانِ راحت سے گھبراتا ہوں۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیوں کر کرے۔ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمت میں بیٹھا کس طرح رہوں۔

نامور آدمی کے واسطے محلے کا پتا ضرور نہیں۔ میں غریب آدمی ہوں، مگر فارسی انگریزی خط جو میرے نام کے آتے ہیں، تلف نہیں ہوتے۔ بعض فارسی خط پر محلے کا نام نہیں ہوتا۔ انگریزی خط پر تو مطلق پتا ہوتا ہی نہیں۔ شہر کا نام ہوتا ہے۔ تین چار خط انگریزی ولایت سے مجھ کو آئے۔ جانے اُن کی بلا بلی ماروں کا محلہ کیا چیز ہے۔ میرے نام کا لفافہ جس شہر سے چلے اسی شہر کے ڈاک گھر میں رہ جائے تو رہ جائے ورنہ دلی کے ڈاک خانے میں پہنچ کر کیا امکان ہے کہ تلف ہو جائے۔

ملازم

بی وفادار باہر نکلتی ہیں۔ سودا تو کیا لائیں گی، مگر خلیق اور ملنسار ہیں، رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں، جب وہ محل سے نکلیں گی، ممکن نہیں کہ اطراف شہر کی سیر نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں، ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ "یہ پھول تمانے چچا کے بیٹے کی کانی کے ہیں" (تمھارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں)

اولاد

میں لم یلد و لم یولد ہوں، اکہتر برس کی عمر تک سات بچے پیدا ہوئے، لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی۔ اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہ ہوئی۔ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا اور اب اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں وہ میرے پاس آ رہے ہیں اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں۔ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے، ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں، کہیں پانی لڑھاتے ہیں، کہیں خاک اڑاتے ہیں، میں تنگ نہیں آتا۔

وبا

اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دوبار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں، ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، نہ تو پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم نکلتا ہے۔

وبا کو کیا پوچھتے ہو، وہ باقی کہاں جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ، ایک چھیاسٹھ برس کا مرد، ایک چونسٹھ برس کی عورت ان دونوں میں سے ایک بھی مرتا تو ہم جانتے کہ ہاں وبا آئی تھی۔ تف برین وبا!

قدر اندازِ قضا کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا۔ قتل عام ایسا، لوٹ ایسی سخت، کال ایسا پڑا، وبا کیوں نہ ہو۔ لسان الغیب نے دس برس پہلے فرما دیا تھا:

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

عزیز و اقارب

میرا حقیقی بھائی کل ایک تھا، وہ تیس برس دیوانہ رہ کر مر گیا۔

میرا ایک بھائی، ماموں کا بیٹا، نواب ذوالفقار بہادر کی حقیقی خالہ کا بیٹا ہوتا تھا اور مسند نشین حال باندہ کا چچا تھا، وہ میرا ہم شیر بھی تھا یعنی میں نے اپنی ممانی اور اس نے اپنی پھوپھی کا دودھ پیا تھا۔

علی بخش مرحوم (میرا برادر نسبتی) مجھ سے چار برس چھوٹا تھا، اس نے دو برس کی عمر پائی۔ [illegible] کا آدمی تھا، اکبر آباد میں میرو صاحب سے ملے۔ انہوں نے ملاقات میں کہنے لگے کہ میں چچا جان کے ساتھ لارڈ لیک کے لشکر میں موجود تھا اور جو معرکے جو محاربات ہوئے ان میں شامل رہا ہوں۔ بے ادبی ہوتی ہے ورنہ اگر قبا و پیرہن اتار کر دکھاؤں تو سارا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہے۔ جا بجا تلوار اور برچھی کے زخم ہیں۔ وہ ایک بیدار مغز اور وجیہ مرد آدمی۔ ان کو مجھ دیکھ کر کہنے لگا کہ نواب صاحب ہم ایسا جانتے ہیں کہ تم جرنیل صاحب کے وقت میں چار پانچ برس کے ہو گے۔ میں نے کہا آپ نے کہا "درست، بجا ارشاد ہوتا ہے۔"

نوازش [illegible] مرزا اور [illegible] وہ دم [illegible] سے بے تکلف بیگم ادا

احباب

اللہ اللہ، اب بھی ہندوستان میں ایسے لوگ ہیں کہ میں نے ان کو دیکھا نہ انھوں نے مجھ کو دیکھا، نہ میرا کوئی حق ان پر ثابت، نہ ان کو کوئی خدمت مجھ سے بھی منظور، مگر فقیر ہوں، جب تک جیوں گا دعا دوں گا، تمام عمر ممنون اور شرمندہ رہوں گا۔

نواب مصطفیٰ خاں، بہ جہاد سات برس کے قید ہو گئے تھے، سو ان کی تقصیر معاف ہوئی اور ان کو رہائی ملی۔ جہانگیر آباد کی زمینداری اور دلی کی املاک اور پنشن کے باب میں کچھ حکم نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ گئے ہیں۔ ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ میں مجرد استماع خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا، ان کو دیکھا۔ چار دن وہاں رہا، پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔ تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں۔

حضرت جناب مولوی صدر الدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا، روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبانِ کورٹ نے جاں بخشی کا حکم دے دیا۔ نوکری موقوف، جائداد ضبط، ناچار خستہ و تباہ لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے ازراہِ ترحم نصف جائداد واگذاشت کی۔ اب نصف جائداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں۔ کرائے پر معاش کا مدار ہے۔ اگرچہ یہ امداد ان کے گزارے کو کافی ہے، کس واسطے کہ ایک آپ اور ایک بی بی۔ تیس چالیس روپے مہینے کی آمد۔ لیکن چونکہ امام بخش کی اولاد ان کی عترت سے ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں۔ لہٰذا فراغ بال سے نہیں گزرتی۔ ضعفِ پیری نے بہت گھیر لیا ہے۔ عشرۂ ثامنہ کے اواخر میں ہیں، خدا سلامت رکھے غنیمت ہیں۔

مولانا فضل حق خیر آبادی کا مرافعہ میں حکم دوام حبس بحال رہا بلکہ تاکید ہوئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ ان کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے۔ کیا ہوتا ہے جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ہائے میر جان صاحب کیا جوان مارا گیا۔ سچ اس کا شیوہ تھا کہ اردو کے نظم کا نام آتا اور فارسی زبان میں شعر کہنے کی رغبت دلاتا۔ یہی ایک ہی میں باقی ہے جس کا میں ماتمی ہوں۔ ہزار ہا دوست مر گئے۔ کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں۔ جیوں تو کوئی غم خوار نہیں، مروں تو کوئی عزادار نہیں۔

وبا کی آمد مدھم ہو گئی، اور دبی بھی رہا ہے۔ پانچ سات دن بڑا شور رہا۔ انگریز جدید دلی مشتہر ہے۔ ملک صاحب مر گیا۔ واقعی بے تکلف مو میرا ہم عمر اور رفیق خواہ اور صلاح میں اور مجھ میں متوسط تھا۔ اس عرصہ میں ماخوذ ہو کر مرا۔ خیر یہ عالم اسباب ہے اس کے حالات سے ہم ہو گیا۔

آم

آم مجھ کو بہت مرغوب ہیں۔ انگور سے کم عزیز نہیں۔ مالدے کا آم یہاں پیوندی اور ولایتی کر کے مشہور ہے، اچھا ہوتا ہے۔ یہاں دیسی آم انواع و اقسام کے بہت پاکیزہ، لذیذ، خوشبو، افراط سے ہیں۔ پیوندی آم بھی بہت ہیں۔ رامپور سے نواب صاحب اپنے باغ کے آم اکثر بسبیل ارمغان بھیجتے رہتے ہیں۔

شیخ محسن الدین مرحوم سے بطریق تمنا کہا گیا تھا کہ جی یوں چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں۔ اب وہ دل کہاں سے لاؤں، طاقت کہاں سے پاؤں، آموں کی طرف رغبت، نہ معدے میں اتنی آموں کی گنجائش۔ نہار منہ میں آم نہ کھاتا تھا۔ کھانے کے بعد میں آم نہ کھاتا تھا، رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں جو کہوں بین العشائین۔ ہاں آخر روز بعد ہضم معدی آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بے تکلف عرض کرتا ہوں، اتنے آم کھاتا تھا کہ پیٹ بھر جاتا تھا اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں۔ مگر دس بارہ۔ اگر پیوندی آم بڑے ہوئے تو پانچ سات۔

دریغا کہ عہد جوانی گذشت　　جوانی مگو زندگانی گذشت

شراب

دو قسم کی انگریزی شراب ایک تو کاس ٹیلن اور ایک اولڈ ٹام یہ میں میرٹھ سے منگوایا کرتا تھا اور یہ دونوں قسم بیس روپے علاوہ بیس روپے درجن آتی تھی۔ اب یہاں پہلے تو نظر نہیں آتی تھی، اب پچاس روپے اور ساٹھ روپے درجن آتی ہے۔ بیگم بھجالکی شراب میں نہیں پیتا، بیگم کو عطر کرتی ہے اور مجھے اس سے نفرت ہے۔ بیکوار ایک انگریزی شراب ہوتی ہے۔ قوام کی بہت لطیف اور رنگت کی بہت خوب اور طعم میں ایسی جیسا قند کا قوام پتلا۔

بیس برس آگے کی یہ بات تھی کہ ابر و باراں میں دو پہر بعد از طعام یا قریب شام تین گلاس پی لیتا تھا اور شراب شبانہ معمول سے علاوہ تھا۔ اب بیس برس میں یہ باتیں ہوئیں، پشے پٹے چند برس سے پینا ایک طرف، دل میں خیال بھی نہ گزرا بلکہ رات کی شراب کی مقدار کم ہو گئی۔

غذا

بہتر برس کا آدمی، پھر بجور دائمی۔ غذا یک قلم مفقود۔ آٹھ پہر میں ایک بار آب گوشت پی لیتا ہوں۔ نہ روٹی نہ بوٹی، نہ چاول نہ خشکہ۔ گلقند اور شیرۂ بادام مقشر، دوپہر کو گوشت کا پانی۔ سرِ شام گوشت کے تلے ہوئے چار کباب۔ سوتے ہوئے پانچ روپے بھر شراب اور اسی قدر گلاب۔ خرف ہوں، پوچ ہوں، عاصی ہوں، فاسق ہوں، روسیاہ ہوں۔ میر تقی کا یہ شعر میرے حسبِ حال ہے ؎

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

آنکھ کی بینائی میں فرق، ہاتھ کی گیرائی میں فرق، رعشہ مستولی، حافظہ معدوم۔ مشہور یہ بات ہے کہ جو کوئی اپنے عزیز کی فاتحہ دلاتا ہے مردے کی روح کو اس کی بو پہنچتی ہے، ایسے ہی سونگھ لیتا ہوں غذا کو۔ پہلے مقدارِ غذا تولوں پر منحصر تھی۔ اب ماشوں پر ہے۔ زندگی کی توقع آگے مہینوں پر تھی۔ اب دنوں پر ہے۔ سترا بہترا اُردو میں ترجمہ خرف ہے۔ میری بہتر برس کی عمر ہے۔ پس میں "اخرف" ہوا۔ گویا حافظہ کبھی تھا ہی نہیں۔ سامعہ باطل بہت دن سے تھا، رفتہ رفتہ وہ بھی حافظے کی طرح معدوم ہو گیا۔ اب مہینے بھر سے یہ حال ہے کہ جو دوست آتے ہیں رسمی پرسشِ مزاج سے بڑھ کر جو بات ہوتی ہے وہ کاغذ پر لکھ دیتے ہیں۔

ضعیفی

میں عشقِ فنا میں مستغرق ہوں۔ بوعلی سینا کے علم کو اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا۔ دنیا میں نامور ہوئے تو کیا اور گمنام جیے تو کیا۔ کچھ وجہِ معاش ہو اور کچھ صحتِ جسمانی، باقی سب وہم ہے اے یارِ جانی۔ ہر چند وہ بھی وہم ہے، مگر میں ابھی اسی پایے پر ہوں۔ شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے اور وجہِ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گزر جاؤں، عالمِ بے رنگی میں گزر جاؤں۔ جس سناٹے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتا نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیئے جاتا ہوں اور جس سے جو معاملہ ہے اس کو ویسا ہی برت رہا ہوں، لیکن سب کو وہم جانتا ہوں۔ یہ دریا نہیں، سراب ہے۔ ہستی نہیں پندار ہے۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور ہوں گے۔ ان کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم کو ہوگا۔

ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا۔ ضعف، سستی، کاہلی، گراں جانی، گرانی۔ رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور و دراز درپیش ہے۔ زادِ راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر۔ اگر بازپرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے، دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

میں مریض نہیں ہوں، بوڑھا ہوں اور ناتواں۔ گویا نیم جاں، رہ گیا ہوں۔ ایک بڈھا کسی گلی میں جاتے جاتے ٹھوکر کھا کر گر پڑا کہنے لگا: ہائے بڑھاپا! ادھر ادھر دیکھا، جب جانا کوئی نہیں ہے، کہتا ہوا اٹھا کہ "جوانی میں کیا پتھر پڑتے تھے؟" ایک کم ستر برس دنیا میں رہا۔ کوئی کام دین کا نہیں کیا۔ افسوس! ہزار افسوس!!

ضعف نہایت کو پہنچ گیا۔ رعشہ پیدا ہو گیا۔ بینائی میں بڑا فتور پڑا۔ حواس مختل ہو گئے۔ پاؤں سے اپاہج، کانوں سے بہرا، ضعفِ بصارت، ضعفِ دماغ، ضعفِ دل، ضعفِ معدہ، ان سب ضعفوں پر ضعفِ طالع!!

گویند از ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ پرسش وقت کہ چہ حال داری؟ فرمود: کدام حال خواہد بود کسے را کہ خدا از وے فرض طلبد و پیمبر سنت و زن مال خواہد و ملک الموت جان۔"

جہاں تک ہو سکا، احباب کی خدمت بجا لایا۔ اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ اچھی طرح سوجھے نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں، شاہ شرف علی بو قلندر کو بسبب کبرِ سن خدا تعالیٰ نے فرض اور پیمبر نے سنت معاف کر دی تھی۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست خدمتِ اصلاحِ اشعار مجھ پر معاف کریں۔ خطوطِ شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہو سکے گا لکھ دیا کروں گا۔

سرو چراغاں

کیا کروں، ایک برس سے عوارضِ فسادِ خون میں مبتلا ہوں۔ بدن پھوڑوں کی کثرت سے سرو چراغاں ہو گیا ہے۔ طاقت نے جواب دیا۔ دن رات لیٹا رہتا ہوں۔ حاجتی پلنگ کے پاس لگی رہتی ہے، اکثر پیشاب کیا جاتا ہے۔ بیت الخلا جانا ایک مصیبت ہے۔ نشست چوکی سہی، مگر کئی قدم جانا، پھر آنا، کیا ایسا آسان ہے؟ آگے میں لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا۔ اب وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہاتھوں میں رعشہ، آنکھوں میں ضعفِ بصر۔ کوئی متصدی میرا نوکر نہیں، دوست آشنا کوئی آ جاتا ہے تو اس سے جواب لکھوا دیتا ہوں۔ میں تو کوئی دن کا مہمان ہوں، اور اخبار والے میرا حال کیا جانیں۔ ہاں اکمل الاخبار اور اشرف الاخبار والے کہ یہاں کے رہنے والے ہیں اور مجھ سے ملتے رہتے ہیں۔ سو ان کے اخبار میں میں نے اپنا مفصل حال چھپوا دیا ہے اور اس میں میں نے عذر چاہا خطوں کے جواب اور اشعار کی اصلاح سے۔ اس پر کسی نے عمل نہ کیا۔ اب تک ہر طرف سے خطوں کے جواب کا تقاضا اور اشعار واسطے اصلاح کے چلے آتے ہیں اور میں شرمندہ ہوتا ہوں۔

۲

اُردو مکتوب نویسی

فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری و ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارتِ غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے:

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

سب کہیں سے خط و کتابت رہتی ہے۔ اردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں۔ جن جن صاحبوں کی خدمت میں آگے میں نے فارسی زبان میں خطوط و مکاتیب لکھے اور بھیجے تھے۔ ان میں جو صاحب الی الآن ذی حیات موجود ہیں۔ ان سے بھی عندالضرورت اسی زبان مروج میں مکاتبت و مراسلت کا اتفاق ہوا کرتا ہے۔ پارسی مکتوبوں، رسالوں، نثروں اور کتابوں کے مجموع شیرازہ بستہ چھاپا ہو کر اطراف و اقصائے عالم میں پھیل گئے۔ حال کی نثروں کو کون فراہم کرنے جائے، جان کنی کے خیالات نے مجھ کو ان کی تحریر و تعلق و بار سے دست بردار و آزاد و سبک دوش کر دیا جو نثریں کہ مجموع و یک جا ہو کر جہاں جہاں منتشر ہو گئی ہیں اور آئندہ ہوں انھیں کو جناب باعلامت بحق عظمیٰ مقبول قلوب اہل معنی و مطبوع طبائع ارباب فن فرمائیے۔

اگلوں کے خطوط کی تحریر کی طرز —— ہائے کیا اچھا شیوہ ہے۔ جب تک یوں نہ لکھوں وہ خط ہی نہیں ہے، چاہ بے آب ہے۔ ابر بے باراں ہے، نخل بے میوہ ہے، خانہ بے چراغ ہے، چراغ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں تم زندہ ہو، تم جانتے ہو ہم زندہ ہیں۔ امر ضروری لکھ دیا، زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا۔ میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔

میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں، یعنی جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے، ایک دو صبح کو ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔

ایک لطیفہ نشاط انگیز سنیے: ڈاک کا ہرکارہ جو بلی ماروں کے خطوط پہنچاتا ہے۔ ان دنوں میں ایک بنیا پڑھا لکھا حرف شناس کوئی فلاں ناتھ ڈھاک داس ہے۔ میں بالاخانے میں رہتا ہوں، حویلی میں آ کر اس نے داروغہ کو خط دیے کہ مجھ سے کہا کہ ڈاک کا ہرکارہ بندگی عرض کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مبارک ہو، آپ کو جیسا کہ بادشاہ نے نوابی کا خطاب دیا تھا۔ اب کالپی سے خطاب کپتانی کا ملا۔ حیران یہ کیا کہتا ہے۔ سرنامہ غور سے دیکھا، کہیں قبل از اسم "مخدوم نیاز کیشاں" لکھا تھا، اس قرم ساق نے اور الفاظ سے قطع نظر کر کے "کیشاں" کو "کپتان" پڑھا۔

فولاد میں جوہر

میں کتاب کو دیکھ لیتا ہوں، نقل نہیں لیتا۔ عربی کا عالم نہیں، مگر نرا جاہل بھی نہیں۔ بس اتنی بات ہے کہ اس زبان کے لغات کا محقق نہیں ہوں، علما سے پوچھنے کا محتاج اور سند کا طلب گار رہتا ہوں۔ فارسی میں مبدء فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے اور اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر۔ اہل پارس میں اور مجھ میں دو طرح کے تفاوت ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کا مولد ایران اور میرا مولد ہندوستان۔ دوسرے یہ کہ وہ لوگ آگے پیچھے سو دو سو چار سو آٹھ سو برس پہلے پیدا ہوئے ہیں۔

اہلِ ہند میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت نہیں۔ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا وہ لکھ دیا۔ نظامی، سعدی وغیرہ کی لکھی ہوئی فرہنگ ہو تو ہم اس کو مانیں۔ ہندیوں کو کیونکر مسلم الثبوت جانیں۔ گائے کا بچہ جو دو بکر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا بنی اسرائیل اس کو خدا سمجھے۔

ایک سپاہی زادہ ہیچدان اور دل افسردہ و روان فرسودہ۔ ہاں ایک طبع موزوں اور فارسی زبان سے لگاؤ رکھتا ہوں اور یہ بھی یاد رہے کہ فارسی کی ترکیب الفاظ اور فارسی اشعار کے معنی کے پردہ از میں میرا قول اکثر خلاف جمہور پائیے گا اور حق بجانب میرے ہوگا۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ صاحب جو شرحیں لکھتے ہیں کیا یہ سب ایزدی سروش ہیں؟ اور ان کا کلام وحی ہے؟ اپنے اپنے قیاس سے معنی پیدا کرتے ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ ہر جگہ ان کا قیاس غلط ہے، مگر یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ فرماتے ہیں وہ صحیح ہے۔

شعرائے ایران کلہم اجمعین مسلم الثبوت ہیں اور ان کا کلام سند ہے۔ سخنورانِ ہند میں امیر خسرو دہلوی بھی ایسے ہی ہیں۔ اہلِ ایران میں رودکی و فردوسی سے لے کر جامی تک اور جامی سے صائب و کلیم تک کسی نے لغت کی کوئی کتاب لکھی ہو، کوئی فرہنگ جمع کی ہو تو ہمیں دکھاؤ۔ اس کو اگر نہ مانوں اور سند نہ جانوں تو گنہگار۔

جتنی فرہنگیں اب موجود ہیں نام ان کے کہاں تک لوں، مشہور و غیر مشہور، کچھ کم سو رسالے ہوں گے۔ ان سب رسالوں کے جامع ہندی ہیں۔ کوئی اہلِ زبان نہیں ہے۔ اشعار اساتذۂ ایران کو ماخذ ٹھہرا کر جو لغات ان کی نظم میں دیکھے، بہ مناسبت مقام ان لغات کے معنی لکھ دیئے۔ اختیار معنی کا مدار قیاس پر، یہ بھی نہیں کہتا کہ قیاس ان کا سراسر غلط ہے۔ میرا قول یہ ہے کہ کمتر صحیح اور بیشتر غلط ہے۔

کلیاتِ نظم فارسی

فارسی کا دیوان دس ہزار بیت کا ہے۔ بیس پچیس برس کا عرصہ ہوا جب چھپا تھا، پھر نہیں چھپا۔ مگر ہاں سال گزشتہ میں منشی نولکشور نے شہاب الدین خاں کو لکھ کر کلیات فارسی جو ضیاء الدین خاں نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا، وہ منگا لیا اور چھاپنا شروع کیا۔ وہ پچاس جزو ہیں۔ یعنی کوئی مصرع میرا اس سے خارج نہیں۔ اب سنا ہے کہ وہ چھپ کر تمام ہو گیا ہے۔ روپے کی فکر میں ہوں، ہاتھ آجائے تو ہنڈوی بھیج کر بیس جلدیں منگواؤں۔

ابرِ گہربار

ایام شباب میں کہ طبع روانی پر تھا، جی میں آیا کہ غزوات صاحب ذوالفقار لکھنا چاہیے۔ حمد و نعت و منقبت و ساقی نامہ و مغنی نامہ لکھا گیا۔ داستان طرازی کی توفیق نہ پائی۔ ناچار اسی قدر سو دو سو شعر کو چھپوا لیا۔

پنج آہنگ

میرا ایک نسبتی بھائی ہے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں سلمہ اللہ تعالیٰ۔ وہ میری نظم و نثر کو فراہم کرتا رہا۔ چنانچہ مجموعہ نثر اور کلیات نظم

اُردو سب نسخے اس کے کتب خانے میں تھے، وہ کتب خانہ، ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں، بیس ہزار روپے کی مالیت کا ہوگا، لُٹ گیا۔ ایک ورق نہیں رہا۔ ہاں چھاپے کی پنج آہنگیں اب بھی بکتی ہیں اور معیوب و بدعیب ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو بعد انطباع از قسم نثر تحریر ہوا ہے وہ اس میں نہیں، دوسرے کاپی نویس نے وہ اصلاح میری نثر کو دی ہے کہ میرا جی جانتا ہے۔ اگر کوئی سطر غلطی سے خالی نہیں تو اتفاق ہے۔ بے مبالغہ عرض ہے کہ کوئی صفحہ اغلاط سے خالی نہیں۔

پرتوستان

اکثر صاحب اطراف و جوانب سے "ماہ نیم ماہ" بھیجنے کا حکم دیتے ہیں اور میں جی میں کہتا ہوں کہ جب "مہر نیم روز" کی عبارت کو نہیں سمجھے تو ماہ نیم ماہ کو لے کر کیا کریں گے۔ مہر نیم روز کے دیباچے میں میں نے لکھ دیا ہے کہ اس کتاب کا نام پرتوستان ہے اور اس کی دو جلدیں ہیں۔ پہلی جلد میں ابتدائے خلقت عالم سے ہمایوں کی سلطنت تک کا ذکر۔ دوسرے حصے میں اکبر سے بہادر شاہ تک کی سلطنت کا بیان۔ پہلے حصے کا نام مہر نیم روز، دوسرے حصے کا نام "ماہ نیم ماہ" — بارے پہلا حصہ تمام ہوا، چھاپا گیا۔ قصد تھا جلال الدین اکبر کے حالات لکھنے کا کہ امیر تیمور تک کا نام و نشان مٹ گیا۔ آن دفتر را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب برد و قصاب در راہ مُرد۔ جو کتاب میں نے لکھی ہی نہ ہو وہ بھیجوں کہاں سے؟ وہ آسماں ہی ٹوٹ پڑا جس پر ماہ نیم ماہ طلوع کرتا۔ بات یہ ہے کہ جس طرح مسافر سفر میں آدھی منزل طے کر کے دم لیتا ہے، میں نے آدم سے ہمایوں تک کا حال لکھ کر دم لیا تھا۔ قصد تھا کہ اب جلال الدین اکبر کی سلطنت کا حال لکھوں گا کہ ناگاہ یہ فتنۂ عظیم رونما ہوا۔ عرفت ربی بفسخ العزائم۔

پنج آہنگ، مہر نیم روز، دستنبو، قاطع برہان، دیوان اُردو۔ یہ پانچ رسالے البتہ کتب میں شمار کئے جائیں۔ بادِ مخالف ایک مثنوی ہے۔ من جملہ ان مثنویوں کے جو کلیات نظم فارسی میں مندرج ہیں۔ بجائے خود کتاب نہیں ہے۔ مثنوی ابر گہربار بھی کلیات میں موجود ہے۔

دستنبو

میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد شہر اور اپنی سرگزشت یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے۔ صرف اپنی سرگزشت اور مشاہدے کے بیان سے کام رکھا ہے اور خاتمے میں اس کی اطلاع دے دی ہے۔ امین الدین خاں کو جاگیر ملنے کا حال اور بادشاہ کی روانگی کا حال کیونکر لکھتا۔ اس کو جاگیر اگست میں ملی۔ بادشاہ اکتوبر میں گئے۔ کیا کرتا اگر تحریر موقوف نہ کرتا۔ التزام اس کا کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی کا نہ آئے۔ جو نظم اس میں درج ہے وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں اشخاص کا نام نہیں بدلے جاتے۔ وہ عربی، انگریزی، ہندی جو ہیں وہ لکھ دیئے ہیں۔ مثلاً "منشی ہرگوپال"۔ منشی لفظ عربی ہے نہیں لکھا گیا۔ اس کی جگہ "شیوا زبان" لکھ دیا ہے۔ بڑا خط، چھدرا، نہ گنجان، اوراق بے مسطر پر اس طرح کہ کسی صفحے میں بیس اور کسی صفحے میں بائیس سطر بلکہ کسی میں ۱۹ سطر بھی آئے، چالیس صفحے یعنی بیس ورق ہیں۔ ایک قصیدہ فارسی متعارف عربی و فارسی ملی ہوئی زبان میں حضرت فلک رفعت جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی ستائش میں اس نثر کے ساتھ شامل ہے۔ یہ پندرہ سطر کے مسطر سے چار جزو کی کتاب مطبع مفید خلائق آگرہ میں منشی نبی بخش

صاحب جعفر اور مرزا حاتم علی بیگ مہر اور منشی ہرگوپال تفتہ کے اہتمام میں چھاپی گئی۔

منشی امید سنگھ اندور والے دلی آئے تھے۔ سابقہ معرفت مجھ سے نہ تھا۔ ایک دوست اُن کو میرے گھر لے آیا، اُنھوں نے وہ نسخہ دیکھا، چھپوانے کا قصد کیا۔ آگرے میں میرا شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ تھا، اُس کو میں نے لکھا، اُس نے اس اہتمام کو اپنے ذمہ لیا۔ مسودہ بھیجا گیا۔ آٹھ آنے فی جلد قیمت ٹھہری۔ پچاس جلدیں منشی اُمید سنگھ نے لیں۔ پچیس روپے چھاپے خانے میں بطور ہنڈوی بھجوا دیے۔ صاحب مطبع نے بقول اس کا منشی ہرگوپال تفتہ چھاپنا شروع کیا۔ آگرے کے حکام کو دکھایا، اجازت چاہی۔ حکام نے بکمال خوشی اجازت دی۔ پانسو جلد چھاپی۔ فارسی قدیم اور پھر حسن معنی اور صنعت الفاظ۔ بایں ہمہ ہر امر کی احتیاط اور ہر بات کا لحاظ۔ میں پہلے سے مداحوں میں اپنا نام لکھوا چکا ہوں اور وزرائے عظام دارا دربان کے دو سرٹیفکیٹ پا چکا ہوں۔ اگر اس اجمال کو بہ تفصیل معلوم کیا چاہیے تو اسی کتاب موسوم دستنبو میں دیکھا چاہیے۔

آخر یہ جنس پڑی نہ رہی اور بک گئی اور میں ایسا جانتا ہوں کہ یا تو صاحبان انگریز کی خریداری آئی ہوگی یا پنجاب کے ملک کو یہ کتابیں گئی ہوں گی۔ پورب میں کم بکی ہوں گی۔ میں نے ایک بار سات روپے کی ہنڈوی بھیج کر بارہ جلدیں اور ایک جنتری منگوائی۔ پھر اٹھارہ آنے کے ٹکٹ بھیج کر دو جلدیں لکھنؤ کو بھجوائیں اور اس کے بعد پھر اٹھارہ آنے کے ٹکٹ بھیج کر دو جلدیں سورت کو بھجوائیں۔ غرض اس تحریر سے یہ کہ میں بعد اس پچاس جلد کے سولہ جلدیں اور لے چکا ہوں مگر نقد، ہرگز قرض میں نے نہیں منگوائیں۔

دو جلدیں طلائی لوح کی ولایت کے واسطے تیار ہوں گی اور وہ چار جلدیں جو یہاں کے حکام کے واسطے درکار ہوں گی، اُن کی صورت یہی ٹھہری ہے کہ سیاہ قلم کی لوح اور انگریزی جلد۔ پھر لکھا چاہیے کہ یہ چار جلدیں کس کس کی نذر ہیں: نواب گورنر جنرل بہادر، چیف کمشنر بہادر، صاحب کمشنر بہادر دہلی، ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی۔ یہ کیا میری بدوضعی ہے کہ جناب ایڈمنسٹن بہادر کی نذر نہ بھیجوں۔ آخر گورنمنٹ کی نذر انھیں کی معرفت بھیجوں گا۔ ایک جلد ان کی نذر بہت ضروری ہے۔

۳۳ کتابیں بھیجی ہوئی منشی شیو نرائن کی، جمعہ کے دن ۱۲۔ نومبر (۱۸۵۸ء) کو پہنچیں۔ کاغذ اور سیاہی اور خط کا حسن دیکھ کر میں نے از روئے یقین جانا کہ طلائی کام پر یہ کتابیں طاؤس بہشت بن جائیں گی، حوریں ان کو دیکھ کر شرمائیں گی۔ آدمی کو موافق اس کی تمنا کے آرزو برآئی بہت محال ہے۔ میری آرزو ایسی برآئی کہ وہ برتر از وہم و خیال ہے۔ یہ بناؤ تو میرے تصور میں بھی نہیں گذرا تھا۔ میں صرف اس قدر خیال کرتا تھا کہ جلدیں بندھی ہوئی دو کی لوحیں زریں اور پانچ کی لوحیں سیاہ قلم کی ہوں گی۔ واللہ اگر تصور بھی گزرتا ہو کہ کتابیں اس رقم کی ہوں گی۔

بندہ نے دستنبو جناب اشرف الامراء جارج فریڈرک ایڈمنسٹن صاحب بہادر لفٹننٹ گورنر بہادر غرب و شمال کی نذر بھیجی، اُس کا فارسی خط مورخہ دہم مارچ مشتمل بر تحسین و آفرین و اظہار خوشنودی بطریق ڈاک آگیا۔ پھر میں نے تہنیت میں لفٹننٹ گورنری کی قصیدہ فارسی بھیجا، اس کی رسید نظم کی تعریف اور اپنی رضامندی پر متضمن خط فارسی بسبیل ڈاک آگیا۔ پھر ایک قصیدہ فارسی مدح و تہنیت جناب رابرٹ منٹگمری صاحب بہادر لفٹننٹ گورنر پنجاب کی خدمت میں بواسطہ صاحب کمشنر بہادر دہلی بھیجا تھا، اُن کا فارسی خط بذریعہ صاحب کمشنر بہادر دہلی آگیا۔ پنشن کے باب میں ابھی کچھ حکم نہیں ہوا۔ اسباب توقع فراہم ہوتے جاتے ہیں۔

قاطع بُرہان

ان سب فرہنگ لکھنے والوں میں یہ دکن کا آدمی یعنی جامع برہان قاطع احمق اور غلط فہم اور معوج الذہن ہے مگر قسمت کا اچھا ہے۔ مسلمان اس کے قول کو آیت اور حدیث جانتے ہیں اور ہندو اس کے بیان کو مطالب مندرجہ بید کے برابر مانتے ہیں۔

اس واماندگی کے دنوں میں چھاپے کی برہان قاطع میرے پاس تھی۔ اس کو میں دیکھا کرتا تھا، ہزارہا لغت غلط۔ ہزارہا بیان لغو۔ عبارت پر پیچ۔ اشارات پادر ہوا۔ میں نے سو دو سو لغت کے اغلاط لکھ کر یہ ایک مجموعہ بنایا ہے اور قاطع برہان اس کا نام رکھا ہے۔ جو صاحب اس کو دیکھیں گے وہ ہرگز نہ سمجھیں گے۔ صرف برہان قاطع کے نام پر جان دیں گے۔ کئی باتیں جس شخص میں جمع ہوں گی وہ اس کو مانے گا۔ پہلے تو عالم ہو، دوسرے فن لغت کو جانتا ہو، تیسرے فارسی کا علم ہو، چوتھے منصف ہو۔ ہٹ دھرم نہ ہو، پانچویں طبع سلیم و ذہن مستقیم رکھتا ہو۔ معوج الذہن اور کج فہم نہ ہو۔ نہ یہ پانچ باتیں کسی میں جمع ہوں گی اور نہ کوئی میری محنت کی داد دے گا۔

نہ ہٹ دھرم ہوں، نہ مجھے اپنی بات کی پچ ہے۔ دیباچہ و خاتمے میں جو کچھ لکھ آیا ہوں سب سچ ہے۔ کلام کی حقیقت کی داد جدا چاہتا ہوں۔ طرز عبارت کی داد جدا چاہتا ہوں۔ نگارش ظرافت سے خالی نہ ہوگی۔ گذارش لطافت سے خالی نہ ہوگی۔ علم و ہنر سے عاری ہوں، لیکن بچپن سے محو سخن گزاری ہوں۔ مبدا فیاض کا مجھ پر احسان عظیم ہے، ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی و سرمدی لایا ہوں۔ مطابق اہل پارس کے منطق کا بھی مزا ابدی لایا ہوں۔ مناسبت خداداد و تربیت استاد سے حسن و قبح ترکیب پہچاننے لگا۔ فارسی کے غوامض جاننے لگا۔ بعد اپنی تکمیل کے تلامذہ کی تہذیب کا خیال آیا۔ قاطع برہان کا لکھنا کیا تھا گویا باسی کڑھی میں ابال آیا۔ لکھنا کیا تھا کہ سہام ملامت کا ہدف ہوا، ہے ہے یہ ننگ، یہ معارض اکابر سلف ہوا۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ قاطع بُرہان کی ترکیب غلط ہے، عرض کرتا ہوں کہ حضرت بُرہان قاطع و قاطع بُرہان ایک نمط ہے۔ برہان قاطع نے کیا لشتا بنو میں سکہ قطع کیا ہے جو آپ نے اس کو قاطع کا لقب دیا ہے۔ بُرہان جب تک غیر کی کسی بُرہان کو قطع نہ کرے گی کیونکر بُرہان قاطع نام پائے گی۔ بُرہان قاطع کی صحت میں جتنی تقریر کیجئے گا وہ قاطع برہان کی صحت کے ثبوت میں کام آئے گی۔ ۱۸۶۲ء میں برہان قاطع چھپی۔ پچاس جلدیں میں نے مول لیں۔

درفش کاویانی

میرے پاس روپیہ کہاں جو قاطع بُرہان کو دوبارہ چھپواؤں، پہلے بھی نواب مغفور (یوسف علی خان ناظم) نے دو سو روپے بھیج دیئے تھے۔ تب پہلا مسودہ صاف ہو کر چھپوایا گیا تھا۔ اب بھی وعدہ کیا تھا کہ اپریل کی وجہ مقرری کے ساتھ دو سو بھیجیں گے۔ وہ آخر اپریل ۱۸۶۵ء میں مر گئے۔ اپریل کا روپیہ رئیس حال سے میں نے پایا۔ مصرف کتاب کا روپیہ نہ آیا۔ اس مرحوم کا وعدہ صرف سررشتہ دفتر سے نہ تھا جو از روئے دفتر اس کی تصدیق ہو۔

قاطع برہان میں اور مطالب بڑھائے اور ایک دیباچہ دوسرا لکھا اور درفش کاویانی اس کا نام رکھا اور اس کو چھپوایا، پانچ

سے اگر (۱۸۶۶ء) تین سو جلدیں درفش کاویانی کی تیار پائیں۔

مؤیدِ بُرہان

میں بعنایت الٰہی کثیر الاحباب ہوں۔ ایک دوست نے کلکتے سے مجھے اطلاع دی کہ مولوی احمد علی مدرس مدرسہ کلکتہ نے ایک رسالہ لکھا ہے، نام اس کا "مؤید برہان" ہے۔ اس رسالے میں درج کیے ہیں تیرے وہ اعتراض جو تو نے دکنی پر کیے ہیں اور تحریر پر کچھ اعتراض وارد کیے ہیں اور اہلِ مدرسہ اور شعرائے کلکتہ نے تقریظیں اور تاریخیں بڑی دھوم کی لکھی ہیں۔ میں نے اتنے علم پر ایک قطعہ لکھ کر چھپوایا اور کئی ورق اس دوست کو اور دو چار جلدیں درفش کاویانی علاوہ اوراق مذکور بھیج دیئے۔

نامۂ غالب

نامۂ غالب کا مکتوب الیہ رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دس برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ کتاب پڑھ نہیں سکتا، سُن لیتا ہے۔ عبارت لکھ نہیں سکتا، لکھوا دیتا ہے، بلکہ اس کے ہم وطن ایسا کہتے ہیں کہ وہ قوتِ علمی بھی نہیں رکھتا، اوروں سے مدد لیتا ہے۔ اہلِ دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے، اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو ان کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں وائے اس ہیچ و پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجبِ عزّ و وقار ہو۔ نامۂ غالب صاحبِ مطبع نے اپنی بکری کے واسطے نہیں چھاپی۔ میں نے آپ تین سو جلدیں چھپوائیں، دُور و نزدیک بانٹ دیں۔

لطائفِ غیبی

میں نے اپنے صرفِ زر سے لطائفِ غیبی کی جلدیں نہیں چھپوائیں۔ مالکِ مطبع نے اپنی بکری کو چھاپا ہے۔ بیس میں نے مول لے لیں۔ بیس بھائی ضیاء الدین نے لے لیں، دس مصطفیٰ خاں صاحب نے لے لیں۔ باقی کا حال مجھے معلوم نہیں۔

محرقِ قاطع

میں اس خرافات کا جواب کیا لکھتا، مگر ہاں کئی تن دوستوں کو غصّہ آگیا۔ ایک صاحب نے فارسی عبارت میں اس کے عیوب ظاہر کیے۔ دو طالب علموں نے اُردو زبان میں دو رسالے جُدا جُدا لکھے۔ محرق کو دیکھ کر جانو گے کہ مؤلف اس کا احمق ہے اور جب وہ احمق دافع ہذیان و سوالات عبدالکریم اور لطائفِ غیبی کو پڑھ کر خفیف نہ ہوا اور محرق کو ڈھونڈ ڈالا تو معلوم ہوا کہ بے حیا بھی ہے۔

دافعِ ہذیان

مولوی نجف علی صاحب سے میری ملاقات نہیں، صرف اتحادِ معنوی کے اقتضا سے اُنھوں نے دافع ہذیان لکھ کر [illegible] مجھ کو

مودودی ہے۔ مولوی صاحب مرشد آباد بنگالے میں ہیں۔ نواب ناظم نے ان کو نوکر رکھ لیا ہے۔ ہر شخص نے بقدرِ حال ایک ایک قدردان پایا، غالبِ سوختہ اختر کو خبری وہ بھی نہ ملی:

کسم بحرف نہ پذیرفت و دہر نامم بود
چو نامہ کہ بود نانوشتہ عنوانش

ساطع برہان

وہ ایک لڑکے پڑھانے والا، ملائے مکتب دار کا خبط ہے۔ رحیم بیگ اس کا نام۔ وطن اصل میرٹھ، اور فی الحال میرٹھ میں مقیم اور معلمی اس کا پیشہ ہے۔ آٹھ دس برس سے اندھا ہو گیا ہے، باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے۔ نظم و نثر میں مولوی امام بخش کا شاگرد اور فارسی شعر کہتا ہے۔

سبد چیں

میں نے سبد چیں کی ایک جلد مع عرضی، اقبال نشان تفضّل حسین خاں کی معرفت الور کو بھجوائی تھی۔ سو حضور پُر نور مہاراجا راجا بہادر کا خط انھیں کی معرفت مجھ کو آیا۔ حضور نے ازراہِ بندہ پروری و قدر افزائی القاب بہت بڑا مجھے لکھا اور خط میں فقرے بہت عنایت و التفات کے بھرے ہوئے درج کیے۔

اُردو دیوان

میرا کلام کیا نظم کیا نثر، کیا اُردو کیا فارسی، کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اس کا التزام تھا کہ وہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو ان کے لاکھوں روپے کے گھر لٹ گئے، جن میں ہزاروں روپے کے کتب خانے بھی گئے۔ اس میں وہ مجموعے پریشان بھی غارت ہوئے۔ اب میں اپنے کلام کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی، ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اس نے جو وہ کاغذ مجھ کو دکھایا یقین کیجیے کہ رونا آیا۔ اُردو کے دیوان چھاپے کے بہت ناقص ہیں۔ بہت غزلیں اس میں نہیں ہیں۔ قلمی دیوان جو اتم و اکمل تھے وہ لٹ گئے۔ مگر ہاں میں نے غدر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خاں بہادر کو رامپور بھیج دیا تھا۔

میری غزل پندرہ سولہ بیت کی بہت شاذ و نادر ہے، بارہ بیت سے زیادہ اور نو شعر سے کم نہیں ہوتی۔ ایک دوست کے پاس اُردو کا دیوان چھاپے سے کچھ زیادہ ہے، اُس نے کہیں کہیں سے مسودات متفرق بہم پہنچا لیے ہیں۔ چنانچہ "پنہاں ہو گئیں" "ویراں ہو گئیں" یہ غزل بھی کہیں سے ہاتھ آ گئی ہے۔ دیوان اُردو چھپ چکا ہے، وائے لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا اُس کو آسمان پر چڑھا دیا، حسنِ خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دلی پر اور اس کے پانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت۔ صاحبِ دیوان کو اس طرح یاد کرنا جیسے کوئی کتے کو آواز دے۔ ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں، اکا دکا غلط نکلتا رہا تھا۔ تو مسودہ جو میرے پاس کاپی لایا کرتا تھا وہ اور تھا۔ اب جو دیوان چھپ چکے، حق التصنیف ایک مجھ کو ملا۔ غور کرتا ہوں تو وہ اغلاط جوں کے توں ہیں یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے۔ ناچار غلط نامہ لکھا، وہ چھپا۔ مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خاں ملتمس مرزا امو جان، مطبع شاہدرہ میں۔ محمد حسین خاں دلی شہر میں رائے مان کے کوچے میں مستوروں کی حویلی کے پاس۔ قیمت مجھ کو نہ معلوم، ڈاک خریدار کے ذمے۔

دیوان ریختہ اس عرصے میں (بعد غدر) دلی اور کانپور دو جگہ چھاپا گیا اور تیسری جگہ آگرے میں چھپ رہا ہے۔

۳

طرز بیدل

ابتدائے فکر سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا، چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا:

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا　　اسد اللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا، اوراق یک قلم چاک کر دیے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیے۔

پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم نے ایک نئی زمین نکالی۔ میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ ہے:

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

مقطع یہ ہے:

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور اس بیت الغزل کو شامل کر کے غزل بنائی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی الو کے۔ جب شاعر کی زندگی میں گانے والے شاعر کے کلام کو مسخ کر دیں تو کیا بعید ہے کہ شاعر متوفی کے کلام میں مطربوں نے خلط کر دیا ہو۔

حاشا ثم حاشا اگر یہ غزل میری ہو:

اسد اور لینے کے دینے پڑیں گے

اس طرح کو میں کچھ کیوں کہوں۔ لیکن اگر یہ غزل میری ہو تو مجھ پر ہزار لعنت۔ ایک شخص نے یہ مطلع میرے سامنے پڑھا کہ قبلہ آپ نے کیا خوب مطلع کہا ہے:

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی　　مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

میں نے ان سے یہی کہا تھا کہ اگر یہ مطلع میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔ بات یہ ہے کہ ایک شخص میر امانی اسد ہو گزرے ہیں، یہ غزل ان کی کلام معجز نظام سے ہے اور تذکروں میں مرقوم ہے۔ میں نے تو کوئی دو چار برس ابتدا میں اسد تخلص رکھا ہے ورنہ غالب ہی لکھتا رہا ہوں۔ بچپن میں جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں، لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوافی پیش نظر رکھ لیے ہوں۔ صرف بحر اور ردیف قافیہ دیکھ لیا اور اس زمین میں غزل، قصیدہ لکھنے لگا۔ شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں ہے۔

سہل ممتنع

سہل ممتنع اس نظم و نثر کو کہتے ہیں کہ دیکھنے میں آسان نظر آئے اور اس کا جواب نہ ہو سکے۔ بالجملہ سہل ممتنع کمال حسنِ کلام ہے اور بلاغت کی نہایت ہے۔ ممتنع درحقیقت ممتنع النظیر ہے۔ شیخ سعدی کے بیشتر فقرے اس صفت پر مشتمل ہیں اور رشید وطواط وغیرہ شعرائے سلف نظم میں اس شیوے کی رعایت منظور رکھتے ہیں۔ خود ستائی ہوتی ہے۔ سخن فہم اگر غور کرے گا تو فقیر کی نظم و نثر میں سہل ممتنع اکثر پائے گا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی سمجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کردیں۔ میرے قصیدے دیکھو، تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کمتر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں کے تذکرے کی تقریظ کو ملاحظہ کرو۔ وہ جو تقریظ دیوان حافظ کی، بموجب فرمائش جان جاکوب بہادر کے لکھی ہے، اس کو دیکھو کہ فقط ایک بیت میں ان کا نام اور ان کی مدح آتی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی مطالب ہیں۔

تاریخ و معما

فن تاریخ گوئی و معما سے بیگانۂ محض ہوں۔ اُردو زبان میں کوئی تاریخ میری نہ سنی ہوگی، فارسی زبان میں دو چار تاریخیں ہیں، اُن کا حال یہ ہے کہ مادہ اوروں کا ہے اور اشعار میرے ہیں۔ تم سمجھے کہ میں کیا کہتا ہوں، حساب سے میرا جی گھبراتا ہے اور مجھ کو جوڑ لگانا نہیں آتا۔ جب کوئی مادہ بناؤں گا حساب درست نہ پاؤں گا۔ وہ ایک دوست ایسے تھے کہ اگر حاجت ہوتی تو مادہ تاریخ وہ مجھے ڈھونڈھ لا دیتے، موزوں میں کرتا۔ اگر آپ مادے کی فکر ہے اور یہی حساب جمل منظور رکھا ہے تو ایسے تعمیے اور تخرجے آ گئے ہیں کہ وہ تاریخ ہنسی کے قابل ہو گئی ہے بلکہ میں قاضی القضاۃ سراج الدین علی خاں مرحوم کی قبر پر مسجد بنی ہے۔ اُن کے بھتیجے مولوی ولایت حسین خاں نے استدعائے تاریخ کی، میں نے لکھی، چنانچہ وہ فارسی دیوان میں موجود ہے۔

مفتی عقل از پئے تاریخ ایں بنا ایما بسوے من ز رہ احترام کرد
گفتم بوے بدیہہ "خوشا خانۂ خدا" شد خشمگیں دمے کہ نظر در کلام کرد
خاشاک آفت رہ پائے ادب در نگر ریخت ایہام را بہ تخرجہ معنی تمام کرد

واسطے خدا کے غور کرو، "خوشا خانۂ خدا" مادہ، پھر اس میں سے خاشاک کے عدد دور کرو، تو سوا کیں کا تخرجہ، پھر بھی دو اور زیادہ ہیں، پائے ادب میں بے کو اڑایا۔ بھلا یہ بھی کوئی تاریخ ہے!

مگر یہ حساب کے قاعدے سے باہر کچھ معنی سنگالی کے طور پر میرا ایجاد ہے اور وہ لطف رکھتا ہے۔ ایک شخص ۱۲۷۷ھ میں مرا، اس کی تاریخ میں نے لکھی:

ز سال واقعۂ میرزا اسیا بیگ آں راست شمار آمد امجاد
صحیفہ ہائے سماوی مبین از عشرات حدیقہ ہائے بہشتی مشخص از آحاد

اٹھ بارہ یعنی بارہ سو، پھر کتب سماوی چار، دہائی کے چار یعنی چالیس، بہشت آٹھ، چالیس اور آٹھ اڑتالیس۔ بارہ سو اڑتالیس۔
دوسری تاریخ بارہ سو ستر کی :

از بروج سپہر جوئی مآت
عشرات از کواکب سیار

بروج بارہ، سات دہا کے ستر۔

اصل فطرت میں میرا ذہن تاریخ و معمے کے ملائم و مناسب نہیں پڑا ہے۔ جوانی میں ازراہ شوخی طبع گنتی کے چار پانچ معمے لکھے ہیں۔ وہ بادی کلیات فارسی میں موجود ہیں۔

۴

اپنا تماشائی

اگرچہ یک فن ہوں، مگر مجھے اپنے ایمان کی قسم، میں نے اپنی نظم و نثر کی داد باندازہ بایست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا اور آپ ہی سمجھا۔ قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں، بقدر ہزار ایک، ظہور میں نہ آئے، نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکاؤں اور پیادہ پا چل دوں، کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف میں جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں، اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے تو نہ سہی، جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے :

نہ بستاں سرائے نہ میخانہ ای　　نہ دستاں سرائے نہ جانانہ ای
نہ رقص پری پیکراں بر بساط　　نہ غوغائے رامشگراں در نشاط

خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، فقیر، نکبت میں گرفتار۔ میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو۔ وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے وہ میں ہوں۔

یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے، جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں۔ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا، ہم نے ازراہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرامگاہ و عرش نشیمن خطاب دیتے ہیں، چونکہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا، "سقر مقر" اور "ہاویہ زاویہ" خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آئیے نجم الدولہ بہادر! ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں اجی حضرت نواب صاحب۔ نواب صاحب کیسے اوغلان صاحب۔ آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے، کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا۔ بے غیرت۔ کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے

جاتا ہے۔ یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔

کافرِ مطلق

کہتے ہیں خدا سے ناامیدی کفر ہے۔ میں تو اپنے آپ ہی خدا سے ناامید ہو کر کافرِ مطلق ہو گیا ہوں۔ موافق عقیدہ اہلِ اسلام جب کافر ہو گیا تو مغفرت کی بھی توقع نہ رہی۔ چل بھی، نہ دنیا نہ دین!

اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں شاعرِ سخن گو اب نہیں رہا، صرف سخن فہم رہ گیا ہوں۔ بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گوں کا ہوں، بناوٹ دیکھتا، شعر کہنا بالکل مجھ سے چھوٹ گیا، اپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ میں نے کیونکر کہا تھا۔

فقیر نے شعر کہنے سے توبہ کی ہے، اصلاح دینے سے توبہ کی ہے، شعر سننا تو ممکن ہی نہیں، شعر دیکھنے سے نفرت ہے۔ پچھتر برس کی عمر، پندرہ برس کی عمر سے شعر کہتا ہوں۔ ساٹھ برس بکا۔ نہ مدح کا صلہ ملا نہ غزل کی داد۔ بقول انوری ؎

اے دریغا نیست ممدوحے سزاوارِ مدیح
وے دریغا نیست معشوقے سزاوارِ غزل

سب شعرا اور احباب سے متوقع ہوں کہ مجھے زمرۂ شعرا میں شمار نہ کریں اور اس فن میں مجھ سے کبھی پرسش نہ ہو۔

زندہ درگور

میں اب انتہائے عمر پا تمام کو پہنچ کر آفتابِ لبِ بام اور ہجومِ امراضِ جسمانی و آلامِ روحانی سے زندہ درگور ہوں۔ کچھ یادِ خدا بھی چاہیے۔ نظم و نثر کے طرز کا انتظام ایزد دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی و قائم رہے گا۔

اس نمائش گاہ کی سیر سے جس کو دنیا کہتے ہیں دل بھر گیا، اب عالمِ بے رنگی کا مشتاق ہوں۔ لا الٰہ الا اللہ، لا موجود الا اللہ، لا مؤثر فی الوجود الا اللہ۔

ہر دم دمِ نزع ہے، دل غم سے خوں ریز ہو گیا ہے۔ کسی بات سے خوش نہیں ہوتا۔ مرگ کو نجات سمجھے ہوئے ہوں اور نجات کا طالب ہوں۔

کمالِ یاس مقتضیِ استغنا ہے۔ پس اب اس سے زیادہ یاس کیا ہوگی کہ بہ امیدِ مرگ جیتا ہوں۔ اس راہ سے کچھ مستغنی ہو چلا ہوں کہ دو ڈھائی برس کی زندگی اور ہے، ہر طرح گزر جائے گی۔ جانتا ہوں کہ تم کو ہنسی آئے گی کہ یہ کیا بکتا ہے، مرنے کا زمانہ کون بتا سکتا ہے۔ چاہے الہام سمجھئے چاہے اوہام سمجھئے۔ بیس برس سے یہ قطعہ لکھ رکھا ہے:

من کہ باشم کہ جاوداں باشم
چوں نظیری نماند و طالب مُرد
ور بگویند در کدامیں سال
مُرد غالب بگو کہ : غالب مُرد
۱۲۷۷

اب بارہ سو چھہتر ہیں اور "غالب مُرد" بارہ سو ستتر ہیں۔ اس عرصے میں جو کچھ مسرت پہنچنی ہو پہنچ لے ورنہ پھر ہم کہاں۔

۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔ بعد رفعِ فساد ہوا سمجھ لیا جائے گا۔

ہجومِ غم ہائے نہانی کا کیا ذکر کروں، جیسے ابرِ سیاہ چھا جاتا ہے یا ٹڈی دل آتا ہے۔ بس اللہ ہی اللہ ہے ؎

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو! بس اللہ ہی اللہ ہے

(ترتیب: نثار احمد فاروقی)

مومن[1]

خاندان سعد علی خاں بہادر ہمارے خاندان کے غلاموں میں سے تھا جس کو بیگم سمرو (جو اس ذلیل شخص کی آقا تھی) کی دولت مل گئی تھی۔ چنانچہ اس کا نام نجف خاں اور نجیب خاں کی ہم نشینی کی بدولت تاریخ عالم شاہی اور سیر المتاخرین میں رہ گیا۔

جائداد ایک نیا ظلم جو پرانے دشمن (آسمان) نے کیا، یہ ہے کہ تھوڑی سی زمین جو مجھے والدہ سے ورثہ میں ملی تھی وہ بھی زبردستی چھین لی۔ اس اجل گرفتہ نے جس کے قتل سے اب تک فتنہ بپا ہے اور جس کی روح ناپاک جنات کی طرح ہل چل ڈالے ہوئے ہے۔ اپنے مقتول ہونے سے ایک دن پہلے میری موروثی زمین جو میری نان جویں کے لیے کافی تھی سرکار اندرپت میں ضبط کرلی۔[2]

پہلی بیوی سے اختلاف میں نے دو تین مہینے نادانی اور سادہ دلی سے نااہلوں کے ساتھ نباہنے کی غلطی کی تھی جس کے سبب سے ملامت اور نفرین سننی پڑی۔ چونکہ میں نے نابکار جاہلوں سے تکلیف اٹھائی ہے اور بداطوار گنواروں سے رشتہ کرنے میں مصیبتیں جھیلی ہیں۔ اس لیے ارادہ ہے کہ اب کسی عالی خاندان میں رشتہ کروں۔ اگر وہ شخص (خسر) انصاف سے کام لے تو قیامت تک اس نسبت پر کہ میں اس کی لڑکی کو عقد نکاح میں لایا ہوں فخر و نازش کے سوا کوئی لفظ زبان پر نہ لائے۔[3]

عشق آج کل میں کسی کے گیسو کے خم میں تازہ اسیر ہوا ہوں۔ اتنی فرصت کہاں کہ شانہ کی طرح موشگافی کے لیے زبان کھولوں اور تعمیل حکم میں کاغذ کو اپنے نامۂ اعمال کی طرح سیاہ کروں۔[4]

---

[1] مومن کی زندگی کے یہ حالات ان کے فارسی خطوط "انشائے مومن" سے مرتب کیے ہیں۔ بعض جگہ جہاں ان کے خطوط خاموش نظر آئے وہاں ان کے کلام کا سہارا لیا ہے۔ [2] جب سرکار انگریزی نے جھجر کی ریاست نواب فیض طلب خاں کو دی تو پرگنہ نارنول بھی اس میں شامل کر دیا گیا اور حکیم نامدار کے خاندان کو ایک ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر ہو گیا۔ غلام نبی (والد مومن) نے بھی اپنا حصہ پایا۔ [3] یہ ذکر مومن کی پہلی شادی (۱۲۳۹ھ) کا ہے جو انھوں نے سرو جنہ میں کسی زمیندار خاندان میں کی تھی مگر اختلاف طبع کی بنا پر جلد علیحدگی ہو گئی۔

[4] یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مومن اپنے کس عشق کی داستان کا ذکر کر رہے ہیں۔ ان کی مثنویات سے ان کے چھ عشقوں کی داستان دستیاب ہوئی ہے اور محبوباؤں میں صرف امۃ الفاطمہ متخلص صاحب جی کا نام معلوم ہو سکا۔ ان کے پہلے عشق کی داستان کا آغاز نو برس کی عمر سے ہوتا ہے

تھے برس ہم شمارۂ افلاک　　کہ ہوا پائمال صورت خاک

سفر سردھنہ میں نے دوستوں کو خیرباد کہا اور ناکامی کی راہ پر چل پڑا۔ میں پیچھے مڑ مڑ کے دیکھتا رہا مگر کوئی تدبیر نظر نہ آئی۔ آواز پر کان لگایا مگر کوئی آواز نہ سنائی دی۔ جس کسی کو دیکھا۔ اس نے مجھ پر نظر نہ کی اور جس کے پاس پہنچا۔ اس نے التفات نہ کیا۔ آخر بیکسانہ اشک خوں کی طرح روانہ ہوا۔ یہاں تک کہ دریا کے قریب پہنچا۔ ملاح ایک کشتی جو میرے دل سے زیادہ شکستہ تھی لائے اور کچھ ہم جنسوں کے ساتھ اس میں مجھے سوار کیا۔ جب ساحل پر پہنچا تو میں نے ایک زہرہ جبیں کو برجِ ثور[1] میں طالع دیکھا۔ اس نے بھی مجھے نظرِ تثلیث[2] سے دیکھا۔ مگر زحل نے جو میرا طالع ہے نظرِ مقابلہ[3] نہ چرائی۔ خوش و ناخوش میں صحرا کی طرف روانہ ہوا اور زبانِ یاس سے یہ شعر پڑھا:

ترجمہ شعر: میں چاہتا ہوں کہ اس زہرہ جبیں کا چہرہ پھر دیکھوں
لیکن میں کیا کروں وہ آسمان پر ہے اور میں زمین پر

چونکہ میرا گھوڑا میرے غموں کے بوجھ کی طاقت نہیں رکھتا تھا جو قدم بھی وہ رکھتا تھا پھر اٹھانا مشکل تھا مگر میں اپنی پامردی سے اس کو لیے چلتا تھا اور طعام کی جگہ اس کی مرگِ ناگہانی کا غم کھاتا تھا۔ وہ ہر قدم پر کھڑا ہو جاتا تھا۔ جب تک میں نہ اترتا۔ وہ دوسرا قدم نہ اٹھاتا۔ اس میں اتنی دیر ہو گئی کہ چوتھے آسمان کے سوار (آفتاب) نے مغرب کی منزل میں بسیرا لیا۔ تین فرسنگ کے فاصلے پر میں ایک قصبہ میں جو وادیِ مجنوں سے زیادہ ویران تھا پہنچا۔ وہاں ایک دوکان میں ٹھہرا۔ جب ظلمت کے سیاہ گھوڑے نے فنا کی راہ لی اور سوارِ آفتاب نے میدانِ فلک میں گھوڑا دوڑایا۔ میں بھی گھوڑے پر سوار ہوا اور اس ناپاک وادی سے نکلا۔ ایک فرسنگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد منزلِ مقصود[4] ملی۔

والد اور والدہ کی وفات آسمان کے اس ظلم نے مجھے نیم جان کر دیا کہ شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھا لیا۔ ابھی یہ زخم نہ بھرا تھا کہ مادرِ مہربان کی وفات نے سینہ فگار[5] کر دیا۔

---

[1] دوسرا برج جو زہرہ کا گھر ہے۔

[2] قمر کا کسی سعد سیارہ کے ساتھ پانچ یا نو برجوں کے فاصلے پر ہونا یہ نظر دوستی کی ہے۔

[3] ایک سیارے کا دوسرے سے چھ برجوں کے فاصلے سے ہونا جس کو نجوم میں دشمنی کی علامت خیال کیا جاتا ہے۔

[4] غالباً یہ سفر مومن نے سردھنہ کا کیا ہے جو ان کی سسرال ہے۔ اس سفر کی بڑی دلچسپ رُوداد تفصیل کے ساتھ مومن نے اپنے ایک خط میں غلام ضامن کرم (شاگردِ مومن) کو لکھی ہے۔ داستان کی صورت۔ بازاروں کی ویرانی۔ مکانوں کی شکستگی کا نقشہ بڑے انوکھے انداز سے پیش کیا ہے۔ مومن کے خطوط میں صرف اسی سفر کا ذکر ملتا ہے۔ البتہ ان کے کلام سے سہسوان اور بدایوں اور رام پور کے سفر کا بھی اشارہ ملتا ہے:

دلی سے رام پور میں لایا جنوں کا شوق — ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم
چھوڑ دلی کو سہسوان آیا — ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں
بدایوں میں مجھے جوشِ جنوں لایا ہے دلی سے — یہ کیونکر چارۂ پندِ خردمنداں کا ہوش آیا

ان اشعار کے علاوہ جہانگیر آباد اور سہارنپور کا سفر بھی ثابت ہے

[5] مومن کے والد غلام نبی کا انتقال ۱۲۳۱ھ میں ہوا۔ ع

جنازہ اٹھایا فرشتوں نے آ
تو قد فاز فوزاً عظیما کہا
۱۲۳۱ھ

تلامذہ

مومن کے تلامذہ کا ذکر ان کے خطوط سے نہیں۔ البتہ ان کی ایک مثنوی "حنین مغموم" سنہ ۱۲۴۳ھ سے چند شاگردوں کا ذکر ملتا ہے۔

کون سے شاگرد وہ اُستادِ فن   بے سخن ہے دل رُبا جن کا سخن
وحشت و مضطر، کرم، تسکین و یاس   بے خودی میں بھی ہے جن کے حواس
اکبر و عظمت، سر افرازِ سخن   پایہ بالا تر بر افرازِ سخن
شیفتہ سر دفترِ اہلِ قلم   نکتہ خاطر نشاں جن کا رقم

(خطوط میں ایک شاگرد محمود کا ذکر بھی موجود ہے) محمود کو جو میرا اپنا شاگرد ہے: "من احیا سنتی قد امیتت بعدی" (جو میری سنت کو کہ مُردہ ہو چکی ہے زندہ کرے گا۔ اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔ حدیث) کا پیام پہنچائیے۔

علوم و فنون

مومن نے اپنے علم و فضل اور کمالات پر فخر تو اکثر و بیشتر کیا ہے مگر ان کو کن کن علوم سے آگاہی تھی۔ اس کے بعض ضمنی اشارے ملتے ہیں۔ البتہ ان کی نثر و نظم میں اصطلاحات کا استعمال اس انداز سے ہے کہ ان کے علم و فضل پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ ذیل میں کچھ عنوانات کے تحت ان کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے لیے بھی ہم کو ان کے کلیات کا سہارا لینا پڑتا ہے:

طب: حکیم وہ ہوں کہ جاتے رہیں حواس اگر   کرے معارضہ سر دفترِ عقول و نفوس
طبیب وہ ہوں کہ ہو سوزِ سینۂ بلبل   نظارۂ رُخِ گلفام سے مجھے محسوس
جو ہوں معالجِ مبطون تو قابضِ ارواح   کرے دکھائے رواجِ طریقِ جالینوس

نجوم: میرے کلام سے ہیں گونہ گونہ فائدہ مند   ادیب و نبض شناس و منجم و فاضل
کہاں ہیں بدرسیا وہ ترحم   کہ ہوں میں رازدانِ سیرِ انجم

عملیات: کروں جو گردشِ انجم کی میں رصد بندی   خدا ہو وجد میں آ کر روانِ بطلیموس
طلسم ماہ لکھوں گر پئے زبان بستن   بنائے مہرِ دہن چرخ نکتہ جاسوس

شعر گوئی: دیوانوں سے شوق ہے نہایت   اشعار کا ذوق بے نہایت
تصحیحِ سخن پہ طبع مائل   علمِ شعرا میں فرد کامل

موسیقی: زمزمہ ساز بہ تنگِ بلبل   نغمہ پرداز، برنگِ بلبل
نغمگی و خوش الحانی و بس   شعر گوئی و غزل خوانی و بس

---

[1] وحشت: غلام علی خاں۔ مضطر: مرزا سنگین بیگ۔ تسکین: میر حسین۔ یاس: خیر الدین۔ اکبر: اکبر علی خاں عظمت: عظمت اللہ۔ شیفتہ: مصطفیٰ خاں۔ محمود، بہ، کرم، غلام ضامن ان ناموں کو شامل کر کے اکتالیس شاگردوں کے نام مختلف تذکروں سے دستیاب ہوئے ہیں۔

عقائد مومن کی زندگی کے بہت سے گوشوں کی طرح ان کے عقائد اور مسلک کے بارے میں بھی ان کے خطوط خاموش ہیں البتہ ان کے فارسی اور اُردو کلام سے ان کے عقائد کے بارے میں نشان دہی ہوتی ہے۔ یہاں ہم بعض کچھ غزلیات اور رباعیات ان کے مسلک کی وضاحت کریں گے :

ارباب حدیث کا فرماں بر ہوں　　تقلید کے منکروں کا سر دفتر ہوں
مقبول روایت آئمہ نہ قیاس　　یعنی کہ فقط مطیع پیغمبر ہوں

ہے بس کہ محبت رسولؐ مختار　　مذہب کو میں سوچتا ہوں لیکن ہر بار
آتا ہے قیاس میں حق اہل حدیث　　ہر چند قیاس سے نہیں ہے سروکار

حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے مقاصد سے کس طرح قلبی تعلق کا اظہار کیا ہے ؎

خدایا لشکر اسلام تک پہنچا کہ آپہنچا　　لبوں پہ دم چلا ہے جوش خوں شوق شہادت کا
نہ رکھ بے گانہ مہر امام اقتدا سنت　　کہ انکار آشنائی کفر ہے اس کی امامت کا

سیرت مومن کی سیرت کے ذیل میں بعض چیزیں دلچسپ سامنے آتی ہیں۔ ان کو دروغ بیانی سے سخت نفرت تھی۔ نجوم پر کامل دستگاہ کے باوجود اس پر اعتقاد نہ تھا۔ ان کو اپنے فن کی عظمت کا شدید احساس تھا جس نے ان کی شخصیت کو انا کے جذبے سے معمور کر دیا تھا۔

حاشا ثم حاشا کہ یہ بیان صدق نشان، کذب و دروغ سے آلودہ اور یہ تحریر راستی تاثیر شک و ریا سے ملوث ہو۔ (ترجمہ شعر) خوب۔ میری بدگمانی مجھے کہاں سے کہاں لے گئی۔

بھلا کہاں مومن اور کہاں حرفِ دروغ

افسوس کہ مومن "لا تتحرک ذرۃ الا باذن اللہ" (کوئی ذرہ خدا کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کرتا) کے اعتقاد کے باوجود ستارہ پرست ہے اور اتنی دُنیا سے بے تعلقی کے باوجود صبح سے شام تک اصطرلاب کا علاقہ ہاتھ میں لئے رہتا ہے۔ آفتاب کا ارتفاع (بلندی) اختر شناس (مومن) کے طالع کی پستی کا گواہ ہے اور تسویۃ البیوت اس سست بنیاد (مومن) کی خانہ خرابی کی دلیل۔ الحاصل غروب آفتاب تک میں نجوم کے مدرسے سے اُٹھتا ہوں اور ثواب کی گنتی کے مطابق اشک ندامت کے قطرے زمین کے دامن پر گراتا ہوں۔

ترجمہ رباعی : دیکھئے میرا طالع اور نصیب کیا ہوگا
میرا دن میرا شب ہے پھر شب کیا ہوگی
میں ستارہ شناس ہوں لیکن اتنا نہیں جانتا
کہ میرا طالع اور نصیب کیا ہوگا۔[۱]

(۱ حاشیہ اگلے صفحے پر)

میرے گوہر معانی تمام بے بہا ہیں اور میرے دُرہائے مضامین سب کے سب دریا سے حاصل ہوئے ہیں۔ میرے کلام کے خالص سونے کے مقابلے میں پرویز کا طلائے دست افشار کھوٹا ہے اور میرے سینہ کے خزینہ کے سامنے خزانۂ قارون بے اعتبار ہے۔ میرے مضامین رنگین نے جو یاقوت کی طرح قیمتی ہیں، رنگین لب حسینوں کے لعل لب کا بازار سرد کر دیا۔ لیکن زمانے کی ناقدری اور ناقہمی کے باعث کوئی میرا خریدار نہیں ہے اور میرے آبدار موتیوں کا تاریکی میں بازار مندا ہے۔ اس کے برخلاف لوگ ان نااہلوں کو جو عجلاً جسداً لہ خوار (وہ گوسالہ ایک پیکر تھا جس میں سے بچھڑے کی آواز نکلتی تھی) کے مصداق ہیں۔ سونے میں تولتے ہیں۔ اس ناقدری کے باوجود میں نے کبھی ہنر کی آبرو نہیں بیچی اور امراء کی آستین سے توقعات وابستہ نہیں کیں۔ میں نے جو کی روٹی پر قناعت کی ہے اور آسمان کے خوشۂ گندم پر کبھی نظر نہیں ڈالی۔

میں کہ قارون کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا اور خزانۂ پرویز کو اپنے سینۂ پُر داغ پر قربان کرتا ہوں۔ کب تک اپنے سخن کے موتیوں کو مفت لٹاؤں اور معانی کے گوہر شب چراغ کو ٹھیکریوں کے مول بیچوں۔ المختصر میں اس طرح نغمے گاتا ہوں کہ بلبل بھی میری ہمسری نہیں کر سکتی اور وہ گل افشانیاں کرتا ہوں کہ زرگل ان کی حسرت میں جلتا ہے۔ لیکن کیا کروں کہ سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھیں نہیں۔

وفات

مومن کی حیات کے سلسلہ میں بعض انفرادی واقعات ہیں مگر خصوصیت کے ساتھ ان کی وفات کا واقعہ عجیب ہے۔ عجیب کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ اپنے مرنے کے بارے میں روایت دوسروں سے پہنچا کرتی ہے مگر مومن کے مرنے کی روایت خود ان کی زبان سے سنئے[1]:

مومن فتاد از بام۔ گفتم چہ رفت۔ گفتا   خود با خروش گفتم بشکست دست و بازو
گفتم کہ بایدت۔ گفت تاریخ ایں مصیبت   گفتا بخروش۔ گفتم "بشکست دست و بازو"
۱۲۶۹ھ

ترتیب: ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

دیکھئے صفحے کا حاشیہ) یہ اشعار رباعی کے وزن میں نہیں ہیں۔ نیز مصرعہ اول و چہارم میں تکرار ہے۔

[1] آزاد کی روایت ہے کہ کوٹھے سے گرنے کے بعد انھوں نے حکم لگایا کہ پانچ دن یا پانچ ماہ یا پانچ سال میں مر جاؤں گا۔ نتیجہ پانچ ماہ میں مر گئے۔

ظہیر دہلوی

چہ پرسی از سر و سامانم ہم تربیت چوں کاکل
سیہ بختم پریشاں روزگارم خانہ بر دوشم

نسب

سلسلۂ نسب فقیر ظہیر حضرت علی مرتضےٰ تک پہنچ کر ختم ہوتا ہے۔ ستر و پشتیں جد امجد حضرت شاہ نعمت اللہ ولی تک پہنچتی ہیں۔ حضرت شاہ نعمت اللہ ولی کے بزرگان زمانۂ سلطنت صفیہ میں حسب الطلب ہندوستان تشریف لائے اور بادشاہ ہند کے پیر و مرشد تھے۔ دیگر بزرگان فقیر دربار سلاطین گورگانیہ آل تیمور میں عہدہ ہائے جلیلہ و مناصب عظمےٰ پر فائز و ممتاز ہوتے چلے آئے ہیں حتیٰ کہ تا اختتام سلطنت تیموریہ بادشاہ آخر حضرت سراج الدین محمد ابوالظفر بہادر شاہ بادشاہ دہلی والد بزرگوار حضرت شاہ جلال الدین حیدر المخاطب بخطاب صلاح الدولہ مرصع رقم خان بہادر منصب استادی حضرت بادشاہ عرش آرام گاہ پر سرفراز تھے و نیز فقیر ظہیر سن دوازدہ سالگی میں بخدمت داروغگی قورچگی میں سرفراز کیا گیا تھا اور تمام کارخانہ جلوس شاہی مثل ماہی و مراتب و علم و سواری وغیرہ فقیر کی تفویض میں تھا و بصلۂ خدمت گاری خطاب راقم الدولہ داروغہ قورچگی پیشگاہ سلطنت سے عطا ہوا تھا۔

ولادت

جب میں پیدا ہوا تو میرے بزرگوں کو نہایت خوشی حاصل ہوئی اور غایت ناز و نعم سے میری پرورش ہونے لگی جب میرا سن چار سالگی کو پہنچا تو میری والدہ نے مجھے روزہ رکھوایا۔ نہایت دھوم سے روزہ کشائی کی تقریب عمل میں آئی۔ ساڑھے چار برس کا ہوا تو میرا ختنہ کرایا گیا۔ میں نے اپنے والد بزرگوار کی زبانی سنا ہے کہ میری بسم اللہ کی روز عزیز و اقارب وغیرہ نے تیرہ اشرفی میرے ہاتھوں میں دی تھیں۔ بعد بسم اللہ مجھے مکتب میں بٹھایا گیا اور جناب شیخ صفدر علی صاحب میری اتالیقی اور استادی پر مقرر ہوئے۔

بارہ وہیں شتابہ

ابتدا شعر و سخن کی یہ ہے کہ میں جس زمانے میں بہار دانش و زلیخا پڑھتا تھا۔ ایک روز والد بزرگوار کے ایک دوست میاں نبی بخش صاحب تشریف لائے اور میرے مکتب ہی میں دونوں بزرگوار بیٹھے ہوئے تھے کہ میاں نبی بخش صاحب نے ایک شعر کسی استاد کا

پڑھا، میرے والد نے فرمایا، کیا لاجواب و عمدہ مطلع کہا ہے۔ سبحان اللہ۔ وہ شعر یہ تھا ؎

ہم سے پھری چشمِ یار دیکھئے کب تک رہے
گردشِ لیل و نہار دیکھئے کب تک رہے

مطلع کا کلمہ سُن کر میرے کان کھڑے ہوئے۔ ڈرتے ڈرتے اپنے والد بزرگوار سے دریافت کیا کہ مطلع کے کیا معنی ہیں۔ والد ماجد نے پہلے تو مجھے مطلع و مقطع کے معنی سمجھائے اور پھر فرمایا کہ علم عروض میں پہلے جو شعر لکھا جاتا ہے۔ اس کے دونوں مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے اسے مطلع کہتے ہیں۔ میں نے فی البدیہہ ایک مطلع اور ایک شعر اسی وزن پر موزوں کر کے پڑھا تو والد صاحب اور عموی صاحب میاں نبی بخش نہایت خوش ہوئے۔ وہ مطلع اور شعر یہ ہیں ؎

صحبتِ اغیار و یار دیکھئے کب تک رہے — مجھ سے یہ دار و مدار دیکھئے کب تک رہے
غیر سے دل تیرا یار صاف ہے آئینہ وار — میری طرف سے غبار دیکھئے کب تک رہے

بس وہ تعریف اور عنایات اُن بزرگواروں کی میرے حق میں بارود میں شتابا اور سونے پہ سہاگے کا کام کر گئی اور مجھے شعر و سخن کا شوق پیدا ہو گیا۔ اب یہ کیفیت ہوئی کہ جس کی زبان سے شعر اچھا سنا وہ دل میں نقش ہو گیا۔ اُردو کی غزل جس استاد کی سُنی یاد کر لی۔ ایک دو غزلیں بھی ٹوٹی پھوٹی لکھیں اور میاں نبی بخش کو سنائیں۔ غرض کہ انہی ایام میں حافظ قطب الدین صاحب مشیر شاگرد شاہ نصیر صاحب مرحوم نے شاہ صاحب کے مکان میں مشاعرہ قرار دیا چونکہ مکان مشاعرہ میرے مکان سے بہت قریب تھا میں شامل بزم ہونے لگا۔ اوّل غزل میں نے اسی مشاعرے میں پڑھی ہے اور جناب شیخ محمد ابراہیم ذوق کا شاگرد ہوا۔ بعد انتقال حکیم مومن خاں مومن اور شیخ ابراہیم ذوق، مرزا اسد اللہ خاں صاحب غالب، مفتی صدرالدین خاں صاحب آزردہ، حکیم آغا جان عیش، غلام علی خاں صاحب وحشت اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ مشاہیر روزگار مسند استادی کے سزاوار تھے۔

شادی

غدر سے چار ماہ پیشتر میری شادی ہوئی۔ اُس زمانے میں میرا سن کم و زیادہ بائیس سال کے قریب تھا۔ اوّل تو والدین ہر طرح کی ناز برداری فرماتے تھے۔ دوم میں اپنی ذات سے بھی پچاس روپیہ ماہوار کا ملازم تھا۔ تیسرے باعث شعر و سخن راجہ اجیت سنگھ بہادر والی پٹیالہ قدر دانی فرما کر میرے ساتھ سلوک ہوتے تھے۔ چہارم خرید و فروخت اسپاں میں مجھے مفاد کثیر ہوتا رہتا تھا۔ کبھی شکایت تنگدستی نہ ہونے پاتی تھی۔ تیرہ سے بائیس سال کی عمر تک نوکری میں حاضر رہا۔ غدر میں جب بادشاہ کے سب ملازموں کو جدا کیا گیا، میں بھی جدا ہوا۔

مجھے تو شادی کے دو مہینہ بعد بھی آرام سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ ساتویں تاریخ رمضان کو شام کے وقت میں اور میرا بھائی امراؤ مرزا انور گھر سے روزہ بہلانے کے واسطے جامع مسجد کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر گذری کی سیر کر کے گھر کو واپس آتے تھے تو وقت تنگ ہو گیا تھا۔ میں نے بھائی سے کہا، چلو مٹیا محل میں چل کر روزہ کھولیں گے۔ میں اپنی سسرال میں گیا۔ باہر مکان کے صحن میں

بنگلے کے آگے تختوں کا فرش تھا، وہاں نواب صاحب میرے خسر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اور میرے بھائی نے آگے بڑھ کر آداب کیا۔ فرمایا، آؤ بیٹا بیٹھ جاؤ۔ روزہ افطار کر کے نماز پڑھی گئی۔ پھر کھانے کا دسترخوان بچھا۔ دو لقمے لیے کہ میرے خسر مجھ سے فرمانے لگے بھئی نواب مرزا! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہر میں تلوار چلے اور خون ریزی عظیم ہو۔ میں نے عرض کی، حضرت آپ بزرگ ہیں، یوں ہی فرمایا کرتے ہیں۔ شہر میں تلوار چلنے کے آثار کون سے ہیں؟

نواب صاحب: بیٹا کیا تم میری بات کو خلاف جانتے ہو۔ خدا کی قسم ایسا امر ہونے والا ہے۔

میں نے پوچھا: کیا روس کی فوج آئے گی؟

نواب صاحب: اس کا علم اللہ کو ہے۔

پھر میں نے پوچھا: حضرت یہ امر کب تک ہونے والا ہے؟

نواب صاحب: کہنے والے تو یہی کہتے ہیں کہ جو کچھ ہونا ہے، اسی رمضان میں ہو جائے اور بھئی دیکھو میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ میں بھی شہید ہوں گا۔

میں نے عرض کی۔ حضرت! خدا کے لیے یہ تو نہ فرمائیے۔ خدا آپ کو ہمارے سروں پر زندہ سلامت رکھے۔ آپ ہماری سپر ہیں۔

ہر چند سلطنت تو ڈیڑھ سو برس پہلے خاندان عالی شان تیموریہ دودمان اولوالعزم گورگانیہ سے رخصت ہو چکی تھی مگر عظمت، جلال و شان و شوکت و تزک و احتشام و ادب و آداب دربار و انتظام جلوس سواری کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کسی زمانے میں یہ خاندان عالی شان، سزاوار فرماں روائی ہندوستان جنت نشان ہوگا۔ جو قرینے دربار سلاطین دہلی کے تھے سوائے سلطنت ایران کے کسی سلطنت یورپ میں مروج نہیں۔ دیوان خاص کے وسط میں تخت طاؤس نصب ہوتا تھا اور بالائے تخت نگیرہ زریں جو بجائے نقرہ قمع طلائی پر نصب کیا جاتا تھا۔ تخت طاؤس کے برابر چار گوشوں پر چار طاؤس طلائی مینا کار نصب ہوتے تھے اور ان کی منقاروں میں بڑے بڑے موتیوں کی مالائیں جن میں زمرد کے گچھے ہوتے تھے، آویزاں ہوتی تھیں۔ تخت طاؤس میں مسند تکیے لگائے جاتے تھے جب بادشاہ دربار فرماتے۔ تخت طاؤس کے دونوں پہلوؤں میں دو صفیں درباریوں کی دو طرفہ استادہ ہوتی تھیں۔ دیوان خاص کے مقابل لال پردے کا دروازہ تھا۔ وہاں سرخ بانات کا پردہ لٹکا رہتا تھا جو شخص دروازے میں سے داخل دیوان خاص ہوتا تھا آداب تسلیمات بجا لاتا تھا اور نقیب لال پردے کے برابر سے آواز لگاتا: ملاحظہ آداب ہے۔ آداب بجا لاؤ جہاں پناہ بادشاہ سلامت عالم پناہ بادشاہ سلامت۔ بعد اس کے شخص سلامی پہلو میں ہو کر عقب حمام کی جانب کے زینے سے دیوان خاص کے چبوترے پر چڑھتا تھا۔ اگر نذر پیش کرنی ہے تو سیدھا تخت کی جانب جا کر نذر پیش کرے گا۔ اگر کچھ عرض معروض کرنی ہے تو عرض بیگی دونوں صفوں دربار کے سرے پر کھڑے رہتے تھے۔ عرضی ان کو دے دی جاتی تھی۔ وہ بادشاہ کے سامنے عرضی کو کھول کر ملاحظہ کرا دیتے۔ بادشاہ پنسل سے دستخط فرما دیتے۔ جس محکمے کے نام حکم ہوا فوراً تعمیل ہو گئی۔ بادشاہ کی سواری کی گاڑی میں سولہ گھوڑے لگائے جاتے تھے اور نواب زینت محل بیگم صاحبہ کی سواری میں آٹھ گھوڑے لگائے جاتے تھے۔

مولا بخش

مولا بخش نامی ایک قدیمی ہاتھی معتبر تھا۔ کئی بادشاہوں کی سواری دی تھی۔ اس ہاتھی کی عادتیں بالکل انسان کی سی تھیں۔ یہ ہاتھی بچا ہوا اور ہاتھیوں کے قد کی برابر ہوتا تھا۔ جس دن بادشاہ کی سواری ہوتی۔ اس سے ایک دن پیشتر شاہی چوبدار جاکر حکم سنا دیتا تھا۔ میاں مولا بخش کل تمہاری نوکری ہے ہشیار رہو جاؤ۔ جس وقت ہوادار سواری میں بادشاہ نقار خانے کے دروازے سے برآمد ہوا چیخ مار کر زمین سلام کیے اور خود ہی جھک گیا جب بادشاہ سوار ہو لیے اور چوبدار نے اشارہ کیا فوراً استادہ ہوگیا جب فیل خانہ شاہی اور اصطبل پہ انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو اسپ ہمدم اور مولا بخش ہاتھی نے دانہ پانی چھوڑ دیا۔ مولا بخش کے فیل بان نے جاکر ساﺅنڈرس صاحب کو اطلاع دی کہ ہاتھی نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے۔ ساﺅنڈرس صاحب کو باور نہ آیا۔ فیل بان کو گالیاں دیں اور کہا کہ ہم خود چل کر کھلائیں گے اور پانچ روپیہ کے لڈو اور کچوریاں ہمراہ جاکر ہاتھی کے تھان پر پہنچے اور ٹوکرہ شیرینی کا ہاتھی کے آگے رکھوایا۔ ہاتھی نے جھلا کر ٹوکرا کھینچ کر مارا۔ اگر کسی آدمی کے لگتا تو کام تمام ہو جاتا۔ ساﺅنڈرس بولے۔ ہاتھی باغی ہے اسے نیلام کردو۔ اسی روز صدر بازار میں لاکر استادہ کیا اور نیلام کی بولی بولی۔ کوئی خریدار نہ ہوا۔ ایک پنساری یک چشم جس کی دکان کھاری باؤلی میں تھی اس نے ڈھائی سو روپیہ کی بولی دی۔ اسی بولی پر صاحب نے نیلام ختم کردیا۔ فیل بان نے ہاتھی سے کہا کہ بے حیا تمام عمر تو نے اور میں نے بادشاہوں کی نوکری کی اور اب میری اور تیری تقدیر پھوٹ گئی کہ ہلدی کی گرہ بیچنے والے کے دروازے پر چلنا پڑا۔" یہ سنتے ہی ہاتھی کھڑے قد سے دھم دینی زمین پر گر پڑا اور جاں بحق ہوگیا۔

یہ روشنی کیسی ؟

مرغانِ خوش الحان درختوں پر بیٹھے چہچہا رہے ہیں۔ مستانِ بادۂ توحید عالمِ وجد میں جھوم رہے ہیں۔ عجب کیفیت کا وقت ہے۔ آفتاب کی شعاعیں قلعۂ معلیٰ کے چند منظروں کے سنہرے کلسوں پر پڑ کر اپنی چمک دمک دکھا رہی ہیں۔ جھلک کا سنہری برج عکس شفق سے سنہری نظر آتا ہے۔ اس برج کو مثمن برج کہتے ہیں۔ یہ بادشاہانِ تیموریہ کی خاص نشست گاہ ہے۔ اس کے نیچے چھت بھی ہے اور پیچھے میں سیڑھیاں ہیں۔ حضرت ظل سبحانی خلیفۃ الزمانی سراج الدین ابو ظفر بہادر شاہ ثانی فریضہ صبح سے فارغ ہو کر جھروکے میں بیٹھے ہوئے وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ تسبیح خانے کے صحن میں خواجہ سرا اور خواص بادشاہی وغیرہ اور چند معززین دربار میں حاضر ہیں۔ انتظار برآمد حضور ہے۔ تسبیح خانے کے چبوترے کے نیچے پچاس ساٹھ کہار جن کی نوکری ہے سرخ بانات کی وردیاں اور سرخ پگڑیاں باندھے ہوئے کمر بستہ استادہ ہیں۔ مثمن برج کے نیچے پٹڑی پر کوئی دو سو خاص بردار سرخی دستار اور سرخی پٹکے باندھے ہوئے بغلوں میں تلواریں دبائے دست بستہ کھڑے ہیں۔ ایک جانب کو تیس جوان حبشی نوعمر گراں ڈیل سرخ کوٹ کی وردیاں سرخ صافہ میں سرخ پٹکے باندھے دست بستہ مؤدب کھڑے ہیں۔ نیچے پٹڑی کے پار رسالہ سواروں کا پرا جمائے ہوئے استادہ ہیں۔ جھروکہ کی جانب سب کی نگاہ ہے کہ یکایک بالائے جھروکے سے جھنکارے کی آواز آئی۔ میر فتح علی ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھا

اشارے سے دریا کے پُل کی جانب ایما ہوا۔ اب جو دریا کے پُل کی جانب نگاہ کی تو دیکھا کہ دریا پار جو بیر بیری کا جنگل ہے اس کو آگ لگ رہی ہے اور شعلے اڑ اڑ کر آسمان کو جاتے ہیں۔ دریا کا کنارہ گرد و غبار اور دُودِ آتش سے تیرہ و تار ہو رہا ہے۔ میر فتح علی نے رسالدار کو حکم دیا کہ سوار بھیج کر خبر منگاؤ کہ یہ روشنی کیسی ہے؟ کوئی پانچ منٹ میں واپس آ کر خبر دی کہ کوئی غنیم دلّی پر چڑھ آیا ہے اس کی فوج نے تاخت و تاراج پر کمر باندھی ہے۔ جنگل پھونک دیا۔ میر بحر کو مار ڈالا۔

پیشگاہ حضور پُرنور سے حکم ہوا کہ اپنی جمعیت لے جاؤ، پُل توڑ دو، کشتیاں کھینچ لو کہ فوج اترنے نہ پائے۔ دروازے شہر پناہ کے بند کرا دو۔ حسب الحکم تعمیل ہو گئی مگر یہاں سے جو جمعیت شکست پُل کے واسطے روانہ ہوئی تھی۔ اس کو حصول مطلب میں ناکامی ہوئی اور بے نیل و مرام واپس آنا پڑا۔ ہنوز یہ سلیم گڑھ کے نیچے تھے کہ سامنے ملک الموت کی طرح سوار آتے دکھائی دیئے۔ بادشاہ رعیت پناہ کمال جرأت و تہوّر کو فرما کے نہایت اوسان اور استقلال سے بجائے خود جس طرح بیٹھے تھے بیٹھے رہے، ہرگز جنبش نہ کی۔ ادھر سواران باغیہ زیر جھروکہ پہنچے اور حسب قاعدہ سلامی ادا کی۔ حضور لامع النور نے حکیم احسن اللہ خاں کو حکم دیا کہ ان لوگوں سے دریافت کرو کہ تم کون لوگ ہو اور کہاں سے آئے ہو اور کس کے نوکر ہو اور یہاں کیوں آئے ہو۔

بائیس صوبے کا مالک

حکیم احسن اللہ نے بموجب حکم تسبیح خانے میں آ کر سواران باغیہ سے استفسار حال کرنا شروع کیا۔ چند افسر گھوڑوں پر سے اتر کر پٹری پر آ کر کھڑے ہو گئے اور زیر جھروکہ ہاتھ جوڑ کر عرض کرنا شروع کیا۔ “حضور جہاں پناہ سلامت۔ آپ دین و دنیا کے بادشاہ ہیں۔ حق تعالیٰ نے آپ کو بائیس صوبے کا مالک کیا ہے۔ ہم لوگ آپ کے پاس فریادی آئے ہیں۔ اُمیدوار انصاف ہیں۔ ہم لوگ ملازم انگریزی ہیں۔ ہمیں لوگوں نے اپنی جانیں بیچ کر اور سر کٹوا کر کلکتہ سے لگا کر کابل کے ڈیرے تک فتح کر کے چودہ سو کوس میں عملداری انگریزی قائم کرا دی۔ یہ ولایت سے کوئی فوج ہمراہ لے کر نہیں آئے تھے۔ سب ہندوستانی فوج کی کارگزاری ہے۔ اب چونکہ تمام ہندوستان پر تسلط ہو گیا اور کوئی سرکش باقی نہ رہا۔ اب سرکار کی نیت میں فتور واقع ہوا ہے اور ہمارے دین و مذہب کے درپے تخریب ہوئے اور چاہا کہ تمام ہندوستان کو عیسائی کر لیں۔ ایک قسم کی بندوق ایسی ایجاد کی گئی کہ جس میں ٹوٹا یعنی کارتوس دانتوں سے کاٹ کر بندوق کے منہ میں دینا پڑے اور اس ٹوٹے (کارتوس) کو جانوروں کی چربی سے منڈھوایا گیا وہ بندوقیں ہم کو دی گئیں۔ . . . افسران نے معذرت کی کہ سرکار معاف فرمائیے۔ ہم دین سے بے دین کبھی نہ ہوں گے۔ پھر دوبارہ ان کو حکم سنایا گیا کہ تم کو ٹوٹا کاٹنا پڑے گا۔ پھر بالاتفاق سب نے اسی طرح انکار کیا۔ انجام کو سہ بارہ یہی حکم صادر ہوا۔ اس جانب سے جواب صاف ملا۔ حکم ہوا کہ ہتھیار دے دو۔ ہم لوگوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ حکم ہوا کہ افسر لوگ فوج سے علیحدہ ہو جائیں۔ ہم چوراسی افسر رسالے سے الگ ہو کر کھڑے ہو گئے۔ پھر حکم ہوا کہ ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دو۔ جب بھی عدول حکمی نہ کی۔ پھر حکم ہوا کہ تم لوگوں کو عدول حکمی کی سزا دی جاتی ہے تم جیل خانے جاؤ۔ ہم سلام کر کے جیل خانے کو چلے گئے۔ جب ہم داخل جیل خانہ ہوئے، تو میرٹھ میں تہلکۂ عظیم برپا ہو گیا اور گھر گھر کھچڑی پکنے لگی۔ باہم یہ صلاح قرار پائی کہ شب کو چل کر جیل خانہ توڑ کر افسران فوج

کو بھجوا دو۔ چنانچہ ایسا ہی ظہور میں ہوا۔ اب تمام شہر میں غدر مچ گیا اور ہنگامۂ جدال و قتال گرم ہوا۔ تمام شب گوروں کی اور ہماری جنگ ہوتی رہی۔ صبح کو ہم لوگ دہلی روانہ ہوئے اور آج اس وقت یہاں پہنچے ہیں۔ بادشاہ سلامت ہمارے سر پر ہاتھ رکھیں اور ہمارا انصاف فرماویں۔ ہم دین پر بگڑ کر آئے ہیں۔

بادشاہ کا جواب

"سنو بھائی! مجھے بادشاہ کون کہتا ہے۔ میں تو فقیر ہوں۔ ایک تکیہ بنائے ہوئے اپنی اولاد کو لیے بیٹھا ہوں۔ بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی۔ سلطنت تو سو برس پہلے میرے گھر سے جا چکی ہے . . . . میں تو ایک گوشہ نشین آدمی ہوں مجھے ستانے کیوں آئے۔ میرے پاس خزانہ نہیں کہ میں تم کو تنخواہ دوں گا، فوج نہیں کہ تمھاری مدد کروں گا۔ ایک امر میرے اختیار میں ہے البتہ وہ ممکن ہے کہ میں تمھارے درمیان ہو کر انگریزوں سے تمھاری صلح صفائی کرا سکتا ہوں . . . .

غرض یہ گفتگو نا تمام تھی کہ صاحب رزیڈنٹ مع ہمراہی قلعدار صاحب داخل دیوان خاص ہو گئے . . .

صاحب رزیڈنٹ بہادر: کیوں بابا لوگ یہ کیا فتنہ و فساد تم نے برپا کر دیا۔ شرط نمک خواری یہی تھی کہ آج تم ہمارے مقابلے کو تیار ہوئے ہو۔ ہم نے تم کو اسی واسطے تیار کیا تھا؟

سواران فوج باغیہ: اس میں کوئی شک نہیں۔ سرکار نے ہم لوگوں کو اسی طرح پالا اور پرورش کیا ہے مگر ہم لوگوں نے آج تک سرکار کی کوئی نمک حرامی نہیں کی۔ جہاں سرکار نے ہم کو جھونک دیا۔ ہم آنکھیں بند کر کے آگ میں پانی میں کود پڑے۔ سر کٹوانے میں کبھی دریغ نہیں کیا۔ اب جبکہ تمام ہندوستان پر سرکار کا قبضہ ہو گیا تو سرکار ہمارے دین و آئین کے درپے ہوئی ہے ہم کو مر جانا قبول ہے مگر دین سے بے دین نہ ہوں گے۔

صاحب رزیڈنٹ: ہم انجیل پر ہاتھ دھر کے کہتا ہے کہ ہم تم سے ہرگز دغا نہ کریں گے اور بادشاہ صاحب کا بھی فرمانا یہی ہے۔ اب تم مار کٹائی ترک کر دو اور لوٹ مار سے باز آؤ۔"

اکثر جو سمجھدار تھے۔ اُنھوں نے کہا۔ ہاں صاحب بہادر سچ تو فرماتے ہیں مگر بعض نافہم بولے کہ انگریزوں کے قول و قسم کا اعتبار نہیں۔ یہ لوگ قول دے کر پھر جاتے ہیں۔ اُن میں باہم تکرار ہونے لگی۔ آخر ایک بولا کہ لو ہم فیصلہ ہی کیے دیتے ہیں۔ جھٹ بندوق چھتیا کر صاحب رزیڈنٹ بہادر پر فیر کر ہی دیا مگر اس وقت قضا نہ تھی۔ وہ گولی صاحب بہادر اور حکیم احسن اللہ خاں کے برابر میں سے نکل کر تسبیح خانے کے ستون پر جا کر لگی اور سنگ مرمر کا ٹکڑا ٹوٹ کر گر پڑا۔

صاحب بہادر تو ادھر رخصت ہو کر آئے۔ چرخ شعبدہ باز نے اُدھر تازہ بازی آغاز کی۔ سواران باغیہ واپس ہو کر ہو کر کلکتہ دروازے کی طرف تو گئے نہیں۔ اُنھوں نے راج گھاٹ دروازے کی طرف رُخ کیا۔ راج گھاٹ کے دروازے سے شہر میں داخل ہوئے۔ ایک جم غفیر اور اوباش عام کثیر فرقہ باغیہ میں شامل ہو گیا۔ مردمان باغیہ سے جس قدر لوٹا گیا۔ خوب روپیہ لُوٹا کہ اُٹھانے سے عاری ہو گئے۔

صدائے ہولناک

پانچ بج چکے ہیں، دن ڈھل گیا ہے۔ ہنوز قیامت بپا ہے۔ ملازمانِ شاہی مع حکیم احسن اللہ خاں خانسامانی کے دالان میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ یکایک اس زور کی مہیب آواز آئی کہ اگر ہزار توپ کا برابر فیر ہوتا تو اتنی گرج نہ ہوتی۔ مغرب کی جانب جو نگاہ کی تو دیکھا کہ ایک تتق گرد و غبار اور دھوئیں کا زمین سے لے کر آسمان تک بندھا ہوا ہے اور لاشیں آدمیوں کی زاغ و زغن کی طرح منڈلا رہی ہیں۔ اب عقل حیران ہے کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ ہرکاروں کی جوڑی نے منکر و نکیر کی طرح آ کر خبر دی کہ میگزین اڑا دیا گیا۔ اب شہر میں پوربیوں کا راج ہو رہا تھا جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ تمام خزائن انگریزی اور سرمایہ بنک اور مال بازار لوٹ لوٹ کر مالا مال ہو رہے تھے۔ روپیہ رکھنے کو جائے نہ تھی۔

ہنڈن[1] ندی کے اس طرف غازی آباد میں گوروں کی فوج آ گئی ہے۔ اب چہار طرف سے بگل کا شور و شغب ہو رہا ہے اور جلدی جلدی فوج کی کمر بندی ہو رہی ہے۔ کوچ کی بولی گئی اور فوج مسلح اور مکمل ہو کر پل کے دروازے سے سلیم گڑھ کے نیچے ہوتی ہوئی دریائے جمن کے پل پر سے عبور کر کے شاہدرے کی سڑک پر روانہ ہوئی۔ پورے بارہ کا وقت تھا کہ توپ کی آواز کان میں آئی۔ لگاتار توپ کی آواز چلی آتی ہے۔ پھر یکبارگی باڑ کی آواز آنے لگی۔ اب توپ بھی چل رہی ہے اور بندوقوں کی باڑیں بھی جھڑ رہی ہیں۔ غرض کہ پانچ بجے کے قریب میں قلعے سے سوار ہو کر جاتا ہوں۔ جب لاہوری دروازے کے پھاٹک میں پہنچا تو مجھے فوج واپس آتی ہوئی ملی۔ آگے آگے توپ خانہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک جوان میگزین کی گاڑی پر صندوق سے لگا بیٹھا ہے مگر بیہوش آنکھیں بند ہیں۔ میں سمجھا زخمی ہے۔ گھوڑوں پر جو چتر سوار تھے میں نے ان سے پوچھا کہ اس کے زخم کہاں آیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ زخم نہیں آیا اس کے ٹھنڈا گولا لگا ہے۔ اس کے صدمے سے بے ہوش ہو گیا ہے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ سوار اور پیدل بھنگڑے کودتے باجا بجاتے چلے آتے ہیں۔ قلعے کے دروازے سے نکل کر ایک سوار سے میں نے پوچھا کہ تم اتنی جلدی کیوں کر واپس چلے آئے۔ اس نے بیان کیا کہ ہماری فتح ہو گئی۔ گورے مقابلے پر سے بھاگ گئے۔

سولھویں رمضان (یعنی ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء) کی ڈیڑھ ماہ کے بعد ایک دن پانچ بجے دن کے میں گھوڑے پر سوار قلعے سے گھر آتا ہوں تو قلعے کے پھاٹک میں مجھے دو سوار نیلی وردی کے ملے اور ان کی نیلی جھنڈیاں تھیں۔ صاحب سلامت ہوئی۔ چونکہ اس رنگ کا کوئی اور سوار میری نظر سے نہیں گزرا تھا مجھے شک ہوا کہ شاید نئے سوار ہیں۔ میں نے پوچھا۔ تم کون سے رسالے کے سوار ہو؟ انھوں نے بیان کیا۔ چوتھے رسالے کے۔ میں نے کہا چوتھا رسالہ تو یہاں کوئی نہیں۔

سوار: چوتھا رسالہ انگریزوں کی نظر بندی میں ہمراہ آیا ہے۔

میں نے پوچھا: انگریزوں کی فوج کہاں ہے؟

---

[1] ہنڈن ندی پر یہ جنگ ۳۰ مئی ۱۸۵۷ء کو لڑی گئی۔

سوار : علی پور

میں : علی پور سے تم کیونکر چلے آئے؟

سوار : ہم نگاہ بچا کر چلے آئے اور اپنے بھائی بند فوجیوں کو اطلاع دینے آئے ہیں کہ وقت دھاوے کے ہم تم میں آملیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ تم ہم کو آتا دیکھ کر گوروں کے شبہے میں گراب مار کر اڑا دو۔

تھوڑی دیر نہ گذری تھی۔ شام کے چھ بجے تھے کہ تیاری کا بگل ہوا اور فوج کی کمر بندی ہوگئی۔ کوئی دو ہزار کی جمعیت تو مورچے پر رہی اور باقی کل فوج علی پور پہنچ گئی۔ چار گھڑی رات باقی رہے، توپ چلنی شروع ہوگئی۔ سننے میں آیا ہے کہ ان بڑی توپوں نے بڑا کام دیا اور فوج انگریزی کا بہت نقصان ہوا۔ اب نماز کے وقت سے پہلے مورچوں کے رسالوں نے ان بڑی توپوں پر دھاوا مارا اور ان کے پاس بھی جھنڈیاں اور بھی وردیاں تھیں۔ ان کو یہ دھوکا ہوا کہ شاید یہ وہی جو تھا رسالہ ہے جس کے یہ ہم آکر شام کو کہہ گئے تھے کہ وقت جنگ میں ہم تم میں آکر شامل ہوجائیں گے۔ انھوں نے ان پر فیر نہیں کی۔ یہ دھوکا کھا گئے۔ غرض یہ کہ کانوں سے توپیں چھین لیں اور وہی توپیں پھر کر جماعت باغیہ پر فیر کرنی شروع کر دیں۔ پیدلوں کی جو پلٹنیں طرفین کی تھیں ان میں مقابلہ ہوگیا اور دونوں طرف سے باڑیں چلنے لگیں۔

اب ہر چہار طرف سے فوج باغیہ کی آمد شروع ہوگئی اور کمپو آنے لگے۔ ایک سدھاری سنگھ کا کمپو تھا اور ایک جرنیل غوث محمد خاں کا کمپو تھا جس کے دونوں ہاتھ لڑائی میں گولے سے اڑ گئے تھے۔ بخت خاں جرنیل چودہ ہزار کا کمپو اور چند توپ خانے اور دو تین رجمنٹیں سواروں کی اور کئی لاکھ روپیہ خزانہ بریلی سے لے کر دہلی میں وارد ہوا۔

جنرل بخت خاں

ایک رات میں ڈیوڑھی پر موجود تھا۔ پچھلا پہر تھا کہ باریدار نے محل میں سے آواز دی۔ ہشیار ہوجاؤ۔ ہم لوگ جلدی سے پگڑیاں سر پر رکھ کر کمریں باندھ کر تیار ہولئے۔ بادشاہ برآمد ہوئے۔ ہم سب آداب بجا لائے۔ بادشاہ تسبیح خانے کے سنگ مرمر کے تخت پر مسند تکیے پر ہو بیٹھے۔ ہم سے مخاطب ہوکر فرمایا۔ تم جانتے ہو۔ آج کل جو سامان ہو رہا ہے اس کا انجام کیا ہونا ہے؟ مجھ سے سن لو، میرے جھگڑے کا کوئی سامان نہ تھا۔ یعنی بنائے فساد مال و دولت، خزانہ، ملک و سلطنت وغیرہ ہوا کرتے ہیں، میرے پاس ان میں سے ایک موجود نہ تھی۔ میں تو پہلے ہی فقیر ہوا بیٹھا تھا۔ اب جو منجانب اللہ میرٹھ میں آگ لگی اور دلی میں آکر بھڑکی تو معلوم ہوا کہ فلک غدار اور زمانۂ ناہنجار کو میرے گھر کی تباہی منظور ہے۔ آج تک سلاطین چغتائی کا نام چلا آتا تھا اور اب آئندہ کو نام و نشان یک قلم معدوم و نابود ہوجائے گا۔ ایک دن کا اور ذکر ہے کہ صبح کا وقت تھا۔ دن کے سات بجے ہیں۔ بادشاہ برآمد ہوئے اور دیوان خاص کے بیچ کے در میں کرسی بچھوا کر بیٹھے ہیں۔ کچھ تھوڑے سے آدمی اس وقت موجود ہیں۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک پوربیہ فربہ اندام، پستہ قد، ادھیڑ پچاس پچپن برس کی عمر، خشخشی داڑھی، گاڑھے کا کرتہ، دھوتی بندھی ہوئی، سر پر ایک انگوچھا لپٹا ہوا، چندھیا کھلی، عقب حمام کے چبوترے کی طرف سے دربار میں آیا اور بادشاہ کو سلام کر کے پاس چلا آیا۔

میرے بھوئی نے روکا بھی کہ جی ہیں کہاں چلے آتے ہو مگر وہ کب سنتا تھا۔ پاس آکر بادشاہ کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا: "سنو بڈھے، ہمیں پھنسا دیا۔" یہ بات سن کر مجھے تاب نہ رہی اور مارے غصے کے کانپنے لگا اور ایک ہاتھ زور سے اس کے سینے پر رکھ کر دھکا دیا۔ وہ اس دھکا دینے سے دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا اور گرتے گرتے سنبھلا اور اس نے تلوار کے قبضے پر ہاتھ ڈالا۔ میں نے بھی تلوار کھینچ لی۔ ایک سید کا لڑکا بخت گڑھ کا رہنے والا میری ہی عمر کا ہوگا۔ وہ انگریزی رسالے میں کوئی عہدہ دار تھا۔ میرے برابر سے بڑھ کر اس نے اس کا گلا اس زور سے دبوچا کہ قریب تھا اس کی آنکھیں نکل پڑیں . . . . لوگوں نے اسے دھکے دے کر دیوان خاص کے باہر کر دیا . . . . مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ بدبخت جرنیل بخت خاں ہی ہے۔ پیچھے حال کھلا کہ وہ بریلی والا جرنیل ہی تھا۔[1]

دھماکے کی آواز

بخت گڑھ کی لڑائی کے پوربیوں کی بہت شکست ہونی شروع ہو گئی اور وہ جوش و خروش کم ہو گیا۔ اسی اثنا میں ایک ستم اور ہوا کہ چوڑی والے کے محلے شرو بیگم کی حویلی میں میگزین تھا اور وہاں بارود تیار ہوتی تھی۔ ایک دن تیسرے پہر کا وقت ہے دن کے تین بجے ہوں گے کہ یکایک ایک دھماکے کی آواز کان میں آئی مگر دھماکا ایسا ہوا جیسے سو توپ کی باڑ اس کی صدا تھی۔ میں اپنے مکان کے دو منزلے پر چڑھا اور چاروں طرف نگاہ کی تو اپنے مکان کی جنوب کی جانب دیکھتا کیا ہوں کہ ایک تنی گرد و غبار اور دھوئیں کا آسمان سے باتیں کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ میگزین اڑ گیا۔ ادھر تو میگزین اڑا ادھر پوربیے حکیم جی (حکیم احسن اللہ) کے گھر پر چڑھ گئے کہ حکیم جی انگریزوں سے سازش رکھتے ہیں۔ انھوں نے میگزین اڑوا دیا ہے اور جا کر سب اثاث البیت (گھر کا سامان) لوٹ لیا۔ حکیم جی گھر پر نہ تھے۔ ورنہ خود جان سے مارے جاتے۔[2]

انگریزی فوج نے یہ کام کیا کہ جو مورچہ ان سے چھینا تھا۔ اس کو خوب مستحکم کیا اور وہاں پڑاؤ ڈال دیا اور رفتہ رفتہ شہر کی جانب مورچہ بڑھانا شروع کیا۔ دروازے کے باہر جو چند قدم پر سڑک تھی۔ وہ کابلی دروازے سے مڑ کر کشمیری دروازے کو جاتی تھی۔ وہاں لکڑی والے کی ٹال تھی۔ ایک شب انگریزی فوج نے یہ کام کیا کہ اس ٹال میں آگ لگا دی اور اس دھوئیں کی اوٹ میں مورچہ

---

[1] غالباً ظہیر دہلوی کو یہاں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ جنرل بخت خاں اودھ کے شاہی خاندان سے متعلق تھا اور انگریزی فوج میں بڑے عہدے پر رہا تھا۔ پھر بریلی سے جو چودہ ہزار فوج اور کئی لاکھ روپیہ لے کر شان و شوکت سے دہلی آیا اور یہاں کا انتظام سنبھالا۔ شکست دہلی کے بعد اپنی فوج کے ساتھ آخر تک جنگ کرتا رہا اور خیال ہے کہ کام آیا۔ کیا یہ تاریخی واقعات اور حقائق ایک ایسے چند قسم کے پوربیے سے متعلق ہو سکتے ہیں جس کا نقشہ کھینچا گیا ہے؟ اور کیا بخت خاں سے بہادر شاہ کے دربار میں یہ سلوک روا رکھا جا سکتا تھا کہ ایک تلنگہ برابر بڑھ کر اس کی گردن دبوچ لے تو آنکھیں نکل پڑیں؟

[2] اس امر میں اب کوئی شبہ نہیں کہ حکیم انگریزوں سے ساز باز رکھتا تھا اور اس کی سازش نے باغیوں کو بے حد نقصان پہنچایا۔ عجب نہیں کہ میگزین کا اڑجانا بھی حکیم جی کا کارنامہ ہو۔ (خورشید رضوی)

باندھنے شروع کیے۔ سیاہ بُرج والے حیران تھے۔ کچھ حال معلوم نہ ہوا۔ جب مورچہ تیار ہو گیا تو چالیس قلعہ شکن توپیں اس میں لا کر لگا دیں اور یکبارگی اُن چالیس توپوں کا فیر سیاہ بُرج پر کیا۔ اُس وقت سیاہ بُرج والوں کی آنکھیں کھلیں۔ آخر آٹھویں روز جب انگریزی سپاہ نے دیکھ لیا کہ سیاہ بُرج خالی پڑا ہے تو چار گھڑی رات پچھلے سے تمام فوج انگریزی پہاڑ سے اتر کر بیر جین کے کھنڈرات میں آگئی اور کابلی دروازے کے اس جانب لا کر توپ خانے لگا دیئے۔ اس طرف سے بھی تمام فوج کل سوار پیدل توپ خانے لے کر مقابل ہوئی۔ یہ لاہوری دروازے سے لگا کر کابلی دروازے کی نہر تک تمام تیلی واڑے کے میدان میں پھیلی ہوئی تھی۔ گولہ گراب اور باڑھوں کا دونوں طرف سے مینہ برس رہا تھا۔ اس دن شہر کی زمین اور مکانات اور سب دیوار و در لرزہ رہے تھے۔ غرضیکہ یہ کیفیت صبح کے پانچ بجے سے شروع ہوئی تھی اور دس بجے تک یہ قیامت برپا رہی۔ آٹھ بجے دن کے میں پانچ چھ آدمی لے کر قلعہ کو چلنے لگا تو دیکھا کہ چہ بندی کے پھاٹک سب بند ہیں۔ دروازوں کو قفل لگے ہوئے ہیں مگر کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ میں واپس آیا ہوں۔ اس وقت بازار کی سب دکانیں بند تھیں اور ایک دو آدمی چلتے پھرتے تھے۔ میں نے اپنے گھر کا رخ کیا۔ جب میں بھوانی شنکر کے چھتے کے پاس پہنچا تو میں نے دیکھا کہ پوربیے بے تحاشا بھوانی شنکر کے چھتے میں سے بھاگے چلے آتے ہیں۔ میں قدم اٹھا کر تیلی واڑوں کے پھاٹک پر پہنچا تو دروازہ بند پایا۔ دوڑ کر چھوٹے دریبے کے پھاٹک پر پہنچا۔ بارے وہ دروازہ بند تھا اور کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس وقت ایک تماشا اور نظر آیا۔ جب میں کھڑکی کے پاس پہنچا ہوں تو سامنے کوتوالی کے آگے سے ایک بندوقوں کی باڑھ مجھ پر پڑی۔ میں نے سامنے دیکھا تو انگریزی فوج کا ایک بزن کوتوالی کے آگے موجود کھڑا تھا۔ میں بھاگ کر گھر پہنچا مگر میں نے ابھی گھر میں والدہ سے یہ خبر بیان نہیں کی کہ گھر والے مضطرب ہوں گے بیٹھا ہوا اللہ اللہ کر رہا ہوں۔ ایک ڈیڑھ گھڑی کا عرصہ گزرا ہے کہ یکایک توپ کی صدا میرے کان میں آئی اور اتنی قریب معلوم ہوئی گویا اس محلے میں چل رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک اور آواز آئی۔ جب تو مجھے حیرت ہوئی کہ محلے میں توپ کہاں سے آگئی۔ پھر میں دو تین آدمیوں کو لے کر نکلا۔ دیکھا کہ آدمیوں کی آمد و رفت برابر ہے۔ آنے جانے والوں سے پوچھا کہ بھئی کیا ہوا۔ انھوں نے بیان کیا کہ لوگوں نے انگریزوں کو مار بھگایا اور شہر میں بلوہ ہو گیا۔ پھر میں وہاں سے چاؤڑی کے بازار میں جا پہنچا تو دیکھا کہ واقعی ہزاروں آدمی لاٹھی، چونگا، تلوار، گنڈاسا وغیرہ لیے ہوئے شہر میں پھرتے ہیں۔ غرض کہ جامع مسجد کے نیچے ہو کر گلیوں کے بازار میں پہنچا تو وہاں عجیب تماشا نظر آیا۔ لاشوں کا ایک ایسا انبار تھا جیسے لکڑیوں کی ٹال لگی ہوتی ہے بازار کے لوگوں سے دریافت کیا۔ لوگوں نے بیان کیا کہ ایک بزن انگریزی فوج کا مسجد کی سیڑھیوں تک آ پہنچا تھا اور پیچھے تو فوج کے رعایا کے گھروں میں گھس کر لوٹ مار کرنے لگے۔ ادھر فوجیوں نے یہ چاہا کہ جامع مسجد میں داخل ہو جائیں۔ مسجد میں جو مسلمان مسافر جمع تھے۔ اُنھوں نے دیکھا کہ اب یہ خدا کے گھر میں آ کر کشت و خون کریں گے۔ آؤ بہتر تو یہ ہے کہ مسجد سے نیچے اُتر کر ان سے بھڑیں۔ یہ کہہ کر وہ مسجد کے دروازے سے باہر نکل کر سیڑھیوں پر سے اُترنے لگے۔ فوج والوں نے ان پر بندوقیں سر کیں مگر جو زندہ رہے وہ سامنے چلے اور باہم جنگ مغلوبہ دست بدست ہونے لگی۔ لوگ گھروں میں سے لکڑیاں، پلنگ کی پٹیاں، تلواریں لے کر دوڑ پڑے۔ اس بزن میں سے کچھ آدمی مارے گئے جن کی یہ لاشیں موجود ہیں اور باقی بھاگ کر اپنے لشکر کو چلے گئے ہیں۔ یہ تماشا دیکھتا ہوا بڑے دریبے میں ہو کر خونی دروازے سے نکل کر کوتوالی کے آگے پہنچا۔ میں نے جامع مسجد سے لگا کر کوتوالی تک

لاشیں پڑی دیکھیں۔ آگے بڑھ کر جب میں چھوٹے دریبے کے پھاٹک پر پہنچا ہوں تو میں نے دیکھا کہ پیپل کے پیڑ کے نیچے ایک توپ کھڑی ہوئی ہے اور کوئی گولہ انداز وہاں نہیں۔ اس وقت مجھ کو یقین ہوا کہ یہ توپ دغی ہے جس کی صدا میرے کان میں پہنچی تھی۔ جب تحقیق واضح ہوا کہ کچھ آدمی اس توپ کو لاہوری دروازے سے کھینچ کر لائے اور یہاں قائم کر کے انھوں نے انگریزی فوج پر گراب مارا اور اس سے افواج انگریزی کو جو کوتوالی کے آگے کھڑی تھی نقصان پہنچا۔ جب دوبارہ گراب مارا ہے اور اس سے زیادہ نفوس تلف ہونے لگے تو ان لوگوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ غرض کہ شہر میں شام تک یہ آتش فتنہ و فساد مشتعل رہی۔ شام بھگی بھگائی خلقت اپنے اپنے گھروں میں آ کر پڑ رہی۔

کُشت و خُون

آدھی رات کے وقت سپاہ انگریزی نے یکایک کشت و خون کرنا شروع کیا اور سوتے آدمیوں کو گھروں میں گھس گھس اور سیڑھیوں کے ذریعے کوٹھوں پر چڑھ کر ہلاک کرنے لگے۔ اب شہر کی یہ کیفیت ہے کہ دوکانیں سب بند اور رسد آنی بند۔ دانہ پانی خلقت پر حرام۔ لگے بھوک کے پیاسے مرنے۔ تین روز یہی کیفیت رہی۔ آخر تیسرے روز شام کے وقت بادشاہ قلعے سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے پہنچے اور رعیت بھی سراسیمہ حیران پریشان ہو کر شب کے وقت سب گھر بار جوں کا توں چھوڑ کر اپنے بال بچوں اور عورتوں وغیرہ کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر شہر سے نکلنی شروع ہو گئی۔ غرض کہ اس وقت وہ قیامت عظیم برپا ہوئی کہ بیان نہیں ہو سکتی۔ جس شام کو بادشاہ قلعے سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے پہنچے۔ میں چار گھڑی رات گئے نواب حامد علی خاں صاحب کا آدمی میرے والد کے پاس آیا اور اس نے آ کر کہا کہ آپ گھر میں کیا بے فکر بیٹھے ہیں، بادشاہ قلعے سے سوار ہو گئے اور رعیت سب نکل رہی ہے۔ خدا کے لیے چھوڑو گھر بار کو اور بال بچوں کو لے کر شہر سے نکلو۔ غرض کہ میں اور میرے والد اور میری والدہ اور میرے سب چھوٹے بھائی بہن سوار ہو کر ضیا محل میرے سسرال پہنچے اور وہاں جا کر میری خوشدامن یعنی بڑی بیگم صاحبہ سے جا کر نواب حامد علی خاں صاحب کی بیوی نے کہا کہ بیگم صاحبہ بیٹھی کیا ہو، جلد سوار ہو جاؤ، وہ بھی راضی ہو گئیں۔ قریب ایک بجے رات کے ضیا محل کے پھاٹک پر پہنچے کہ ایک بلائے ناگہانی کا سامنا ہوا۔ ضیا محل کے عین دروازے کے پہلو کی چوکی پر کلو نامی ایک دیوانی مجذوبہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس بدبخت نے جو میرے خسر کی شکل دیکھی تو یکایک گھبرا کر یہ آواز بلند پکار اٹھی کہ ہیں میاں امیر مرزا تم کہاں جاتے ہو۔ تمھارے واسطے تو خدا کا حکم نہیں ہے کیا تم بھول گئے۔" وہاں اس کے منہ سے تو یہ بات نکلی تھی اور یہاں امیر مرزا صاحب کے قدم زمین نے پکڑ لیے اور کلو سے کہا کہ "بلاشک مجھ سے سہو ہوا۔" اسی وقت گاڑی بان کو حکم ہوا کہ سواریاں گھر کو واپس لے چل۔ ہر چند میں نے قدموں پر سر رکھا مگر ایک نہ سنی۔ سب نے سمجھایا مگر وہ یہی فرمانے لگے کہ حکم خدا نہیں ہے۔ مجبوراً میں تو اپنے یہاں کی سواریوں کو لے کر روانہ ہوا اور وہ مع اہل و عیال گھر کو واپس چلے گئے۔

بہ ہزار مصیبت و مشقت افتاں و خیزاں ہمارا قافلہ برف خانے پہنچا۔ شب کو بے آب و دانہ سب نے بسر کی۔ خیر وہ دن رات تو گذری۔ اب دوسرے روز کی حقیقت سنیے کہ وہ فوج باغیہ بیرون شہر افتادہ تھی۔ انھوں نے نو بجے دن کے

پہلے تو اپنا میگزین اُڑایا اور عین سورج گہن میں اپنا ڈنڈا ڈیرا اٹھا کر وہاں سے کوچ کیا اور اثنائے راہ میں افسران فوج مل کر بادشاہ کے پاس گئے کہ حضور تشریف لے چلیے، یہاں لڑائی بگڑ گئی ہے مگر بادشاہ نے اُن کا ساتھ نہ دیا اور وہ کوچ کر گئے جو لوگ شہر میں رہ گئے تھے اُن پر وہی کیفیت گزری کہ کر گیا داڑھی والا اور پکڑا گیا مونچھوں والا۔ مجھے اپنے عزیز و اقارب کا خیال تھا خصوصاً سسرال کا کہ ناگہاں صبح کے وقت دیکھتا کیا ہوں کہ میرے سسر کا گامی خدمتگار چلا آتا ہے۔ میں نے صورت دیکھتے ہی پوچھا۔ گامی خیر ہے۔ اس نے دبی زبان سے کہا جی ہاں خیریت ہے۔ میں نے پوچھا کہ کہاں ہیں؟ کہا شاہ مردان میں نواب نجف خاں کے مقبرے میں کل سے آئے ہوئے ہیں۔ میں تم کو ڈھونڈھتا ہوا آیا ہوں آپ کو بلایا ہے۔ میں گامی کے ہمراہ روانہ ہوا۔ جب شاہ مردان پہنچا ہوں اور نجف خاں کے مقبرے میں داخل ہوا ہوں اور مستورات نے مجھے دیکھا تو ایک کہرام مچ گیا۔ غرض شور و غل جب فرو ہوا تو میں نے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ بڑی بیگم صاحبہ نے بیان کیا کہ جس دن تم ہم سے جدا ہوئے۔ اس کے ایک دن بعد سُنا گیا کہ جرنیل صاحب کا ڈیرا جامع مسجد میں ہو گیا ہے اور تھوڑی دیر کے بعد پانچ چار گورے گھر میں گھس آئے آکر کہا۔ ہم کو روپے دو۔ عورتیں تو کوٹھڑیوں میں چھپ گئیں اور مردوں نے کچھ دے کر ٹال دیا۔ تھوڑی دیر بعد اور آئے۔ ان کو بھی کچھ دیا۔ غرض کہ اب تار بندھ گیا۔ ایک آتا ہے ایک جاتا ہے۔ میاں ناصر الدین نے کہا کہ میں جاتا ہوں جرنیل صاحب کے پاس وہ دو خدمتگاروں کو لے کر جامع مسجد پہنچے۔ وہاں جانے کی گفتگو ہوئی کہ ایک خدمتگار آیا اور ان عورات عیسائیہ کو جن کو انھوں نے ہنگامِ غدر اپنے گھر میں چھپا رکھا تھا اور وہ عورات سے کہہ گئیں کہ ہم ابھی آتے ہیں اور میاں ناصر الدین کو اپنے ساتھ لاتے ہیں مگر پھر نہ وہ عورتیں آئیں اور نہ میاں ناصر الدین۔ رات بھر سب کو تشویش رہی۔ صبح کے وقت منشی آغا جان اور ان کا بیٹا یہ سب باغ میں بیٹھے ہوئے تھے اور میاں امیر مرزا نماز پڑھ کے اپنے شغل اشغال میں حسبِ معمول مشغول تھے کہ ناگہاں دو گورے باغ میں آئے اور سامنے سے کہا۔ ہم کو روپیہ دو۔ میاں امیر مرزا نے کہا۔ ہمارے پاس روپیہ کہاں ہے کہ اُن میں سے ایک نے بندوق ماری کہ منشی آغا جان کے بیٹے کے سینے پر لگی۔ اُس نے باپ کو پکارا۔ میاں امیر مرزا نے کہا۔ بیٹا خدا کا نام لے کہ دوسرے نے گولی ماری۔ وہ اُن کے سینے پر لگی۔ وہ چت لیٹ گئے اور تسبیح کا ہاتھ اُن کے سینے پر رہا۔ تمام محل میں ایک قیامت برپا ہو گئی اس غل شور کی آواز جامع مسجد میں پہنچی۔ وہاں سے دو انگریز واویلا سُن کر آئے۔ پوچھنے لگے کہ یہ کیا غل شور ہے۔ عورتوں نے بیان کیا کہ دیکھیے تو تمھاری فوج نے یہ ظلم کر رکھا ہے۔ بولے ہم کو روپے دو تم کو شہر کے باہر کر دیں گے۔ وہ ہم کو لیے ہوئے ترکمان دروازے آئے اور جس جس کے پاس جو تھا وہ اُن کے حوالے کیا اور انھوں نے دروازہ کھلوا کر ہم کو باہر کر دیا۔

شہر کا حال

جو لوگ شہر میں رہ گئے تھے۔ ان میں کئی اشخاص باکمال نامور اور فردِ روزگار مارے گئے۔ عورتوں کا یہ حال تھا کہ گھروں میں سے نکل نکل کر بچوں سمیت کنوؤں میں جا گریں۔ چیلوں کے کوچے کے تمام کنوئیں لاشوں سے پٹ گئے۔ آگے میرا قلم نہیں چل سکتا ہے اور نہ مجھے اس کی تحریر کی تاب ہے جو کچھ سنا گیا ہے۔ اور اضلاع شہر کا یہ حال ہوا کہ عورتوں اور مردوں کو تہ

سے نکالا گیا تو اس طرح کہ مردوں کو تو کشمیری دروازے سے باہر کیا اور عورتوں کو کابلی دروازے کی راہ سے شہر بدر کیا کہ باہم مفارقت ہو گئی ایک کو ایک ڈھونڈھتا پھرا۔ میر نواب کپتان بادشاہی کو پھانسی دلوا دی گئی۔ باوجودیکہ وہ میر حیدر علی داروغہ فیل خانہ انگریزی کا داماد تھا اور تمام غدر میں ہمراہ صاحبان انگریز پہاڑی پر رہا کرتا تھا اور سرکار کی بہت سی خیر خواہی کی تھی۔ اس نے بہت کچھ منت سماجت کی مگر کچھ نہ سنی گئی اور اس خیر خواہی پر کچھ نظر نہ ہوئی۔ جب یہ واقعہ نظر سے گزرا تو سب کو اپنی اپنی جانوں کا فکر ہوا۔ نواب حامد علی خاں نے میری والدہ سے کہا کہ میں ان لڑکوں کا یہاں رہنا مناسب نہیں جانتا ہوں۔ ان کو رخصت کیجئے۔ یہ امر مجھے پہلے ہی مرکوز خاطر تھا۔ میں نے والد بزرگوار کی خدمت میں عرض کیا کہ بلا شک نواب صاحب نے سچ فرمایا۔ مصلحت وقت یہی ہے۔ میں نے یہ کام کیا کہ تھوڑی سی چاندی کے پترے کر جوتی کے تلے کے دونوں پرت جدا کر کے اس کے جوف میں بھری۔ میری بی بی نے ایک زرد سونے کی پہنچی میرے آگے رکھ دی۔ میں نے اس کا ڈورا توڑ کر دانے الگ کر کے کمربند کے اندر بھرے اور دستار باندھی کمر سے دوپٹہ باندھا۔ لکڑی ہاتھ میں لی اور چلنے کو تیار ہوا۔ میرا بھائی امراؤ مرزا اور آغا سلطان بھی تیار ہو گئے۔ اس وقت ہماری رخصت کا حال قیامت سے کم نہ تھا۔ میری بی بی ہر چند شرم کے مارے منہ سے کچھ نہ بولی اور نیچی آنکھیں کئے ہوئے رو رہی تھی۔ آخر جب اٹھنے لگا تو پیچھے سے یہ فقرہ کہا کہ باپ چچا تو مارے گئے۔ تمہارے دم کا سہارا تھا۔ مجھے کس پہ چھوڑے جاتے ہو؟ میں نے جواب دیا۔ خدا کے حوالے کرتا ہوں۔ زندہ رہا تو پھر آملوں گا۔ اگر میں مارا گیا اور تم سن لو تو مہر بخش دینا۔ یہ کہہ کر میں مکان سے باہر ہوا اور بسم اللہ کہہ کر خواجہ صاحب کی طرف روانہ ہوا۔ کوئی نصف میل کے قریب راہ طے کی ہوگی کہ ادھر سے سوار آئے۔ آتے ہی انھوں نے گھیر لیا اور کہا۔ تلاشی دو اور سب کے سب کا بدن ٹٹول لیا۔ ایک سوار نے میری پگڑی اتار لی اور اپنا رستہ لیا۔ میں نے دوپٹہ کمر سے کھول کر سر سے باندھ لیا۔ آگے بڑھا اور سوار ملے۔ انھوں نے بھی یہی بات کی۔ جب تو میں کمربند پاجامے میں سے کھینچ کر ایک گیند بنالی اور پاجامے کے نیفے کو گرہ لگا دی اور وہ گیند اپنے ہاتھ میں رکھ لی۔ جب سواروں کو دور سے آتے دیکھتا تو اس گیند کو دور پھینک دیتا۔ وہ آکر تلاشی لے کر آگے بڑھ جاتے۔ میں دل میں کہتا کہ اے تم ڈاکو ہو مگر میں تمہارا استاد ہوں۔ بھلا تم مجھے کیا لوٹ سکتے ہو اور جب وہ دور چلے جاتے۔ پھر اپنی گیند اٹھا کر اپنے ہاتھ میں لے لیتا۔ بہزار خرابی خواجہ صاحب میں پہنچا۔ وہاں دیکھا کہ ایک ہجوم کثیر مرد و زن کا فراہم ہے۔ صبح کو ایک پندرہ بیس ہزار آدمی کا قافلہ جس میں نواب امین الدین خاں اور ضیاء الدین خاں اور احمد قلی خاں بادشاہ کے خسر (زینت محل کے باپ) اور بہت سے بڑے آدمی شامل تھے۔ وہ گوجروں کو دو ہزار روپیہ دے کر اور انھیں ہمراہ لے کر خواجہ صاحب سے روانہ ہوئے۔ ہم بھی اسی قافلے کے ہمراہ ہوئے۔ غرض خدا خدا کر کے وہ منزل قطع ہوئی اور قریب شام موضع بسنت کی سرائے میں پہنچے۔ صبح ہوتے ہی پھر قافلے کے ہمراہ ہوئے۔ دوپہر کو جا کر فرخ نگر میں داخل ہوئے۔ آخر ایک شخص کی زبانی معلوم ہوا کہ یہاں سے جھجر قریب ہے۔ یہ نام سنتے ہی جان میں جان آگئی۔ آہا۔ وہاں تو ہمارے ماموں حکیم مرزا قاسم علی خاں صاحب مختار ریاست ہیں۔ ان کے پاس چلئے اور ان کی صلاح کے کاربند رہئے۔ غرض کہ دوسرے روز جھجر کا راستہ پوچھ کر روانہ ہوئے اور اسی دن پہنچے اور مکان پوچھ کر ان کے ہاں پہنچے۔ ماموں صاحب نے جب شکل دیکھی تو چیخیں مار کر رونے لگے۔ ممانی سے کہا۔ دیکھو تو بھانجوں کا کیا حال ہے۔ میری بہن بادشاہ بیگم نے کس مصیبت سے انھیں پرورش کیا تھا۔ آج یہ اس بلا میں مبتلا ہیں۔ ہم آٹھ روز آسائش سے وہاں رہے۔ یہیں تک

کو ناگوار ہوا اور ظالم حاکم نے ایک اور ستم ڈھایا۔ آدھی رات کے وقت اُن کو نواب صاحب نے بُلوایا وہ وہاں گئے۔ ایک گھنٹے بعد واپس آئے اور آبدیدہ آئے۔ میں نے کہا۔ ماموں خیر ہے۔ فرمایا: بھائی کیا پوچھتے ہو جس بلا میں تم مبتلا ہو کر یہاں آئے ہو وہ بلائے ناگہانی یہاں بھی نازل ہو گئی اور انگریزی فوج یہاں بھی آ پہنچی۔ اب تم ایک کام کرو۔ یہاں سے سیدھے پانی پت براہ سونی پت روانہ ہو جاؤ۔ تمہارے والد اور خالائیں اور سارا کنبہ پانی پت پہنچ گیا ہے۔ مجھے خبر آ گئی ہے۔ غرضیکہ بہلی تیار ہوئی اور ہم سوار ہو کر سونی پت گئے۔ یہاں میرے نانا کے حقیقی بھائیوں کے مکان تھے۔ اُنھوں نے مجھے روکا کہ اب تم غدر تک یہاں رہو کہیں نہ جاؤ۔ میں نے کہا۔ میرے والد والدہ بھائی بہن بیوی سب برسا میں میری خالہ کے ہاں ہیں۔ میں روانہ ہو کر وقت شب برسا پہنچا اور میں نے آواز دی کہ دروازہ کھولو۔ دروازہ کھلا اور میں نے جا کر والد کے قدم لیے۔ اُنھوں نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ وہاں سے پانچ چار روز بعد ہم پانی پت پہنچ گئے اور وہاں سکونت اختیار کی۔ پانچ ماہ تک ذرا امن و آسائش رہی کہ یکایک آسمان سے سنگ حوادث برسنے لگے یعنی دہلی سے وہی بدروزی و بدمعاش گاہی بلائے ناگہانی کی طرح پانی پت میں نازل ہوا اور دلی والے گرفتار ہونے شروع ہو گئے مگر آفریں مردمانِ پانی پت پر، وہ مسافر نوازی فرمائی کہ باپ بیٹے کے ساتھ یہ سلوک نہ کرے گا۔ قصہ مختصر میں ایک دن دو گھڑی دن پچھلے سے اپنی پھوپی کے مکان پر گیا۔ میں نے دیکھا۔ بہت سے آدمی اس گلی میں چلے آتے ہیں اور آگے تھانے دار ہے۔ میں نے سوچا۔ اب جو تو اُلٹا پھر کر جاتا ہے تو یہ گھر میں جا کر گرفتار کر لیں گے۔ میں سیدھا یہ کہتا ہوا اُن کے سامنے سے چلا گیا "بھئی ان دلی والوں کے سبب ہم لوگ بھی مصیبت میں آ گئے۔" اُنھوں نے مجھے نہ پہچانا۔ وہ آدمی اسی مکان میں گھسے جس میں سے میں برآمد ہوا تھا۔ تھانہ دار نے میرے پھوپا اور میرے بھائی اور بہنوئی کو گرفتار کیا اور میرے آگے سے لے گیا۔ میں اپنی خوشدامن کے مکان پر پہنچا اور یہ حقیقت بیان کی اور کہا کہ اب میرا یہاں سے نکل جانا بہتر ہے۔ ورنہ گرفتار ہو جاؤں گا چنانچہ اُنھوں نے ایک شخص کو بُلوایا اور کہا کہ بھائی تو مجھ پر ایک احسان کر کہ میرے دو بچوں کو یہاں سے نکال کر بچا اور کسی حفاظت کی جا پہنچا دے۔ وہ مجھے اور یوسف سلطان کو لے کر چلا۔ ہم آٹھ کوس پر ایک گاؤں شیخ زادوں کا تھا وہاں پہنچے۔ گاؤں والوں کو اس نے جگا کر ساری حقیقت سُنا دی۔ وہ لوگ نہایت مرد آدمی اور مسافر نواز تھے۔ اُنھوں نے میری بہت خاطر مدارات کی۔ پھر میں نے بوعلی سے کہا کہ بھائی اب تم میرے بھائی اور میرے والد کو کہ پیر جی محمد حسین کے مکان میں چھپے ہوئے ہیں۔ نکال لاؤ تو بڑا کام کرو۔ اس نے کہا۔ بہت اچھا۔ غرضیکہ اُس دن روانہ ہوا اور تیسرے دن میرے بھائی اور آغا سلطان میرے بہنوئی کو لے کر میرے پاس پہنچ گیا۔ دوسرے روز ہم جمنا پار اُتر کر سیدوں کی بستی میں پہنچے مصطفےٰ آباد کی سادات نے ہماری بڑی خاطر مدارات کی۔ ہم نے کہا۔ یہ سب آپ کی عنایت ہے۔ اس کے عوض اور ہم پر عنایت فرمائیں اور وہ یہ ہے کہ میراں پور جانسٹھ والوں کے ذریعے سے ہمیں گنگا پار اُتروا دیں۔ اُنھوں نے کہا یہ کتنی بڑی بات ہے۔ ہم آپ کو خط لکھ دیتے ہیں۔ آپ وہ خط لے کر میر طالب علی کے پاس چلے جائیے۔ وہ آپ کو گنگا کے پار اُتروا دیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میر طالب علی نمبردار کے پاس وہ خط بھیجا مگر اُنھوں نے اس امر سے صاف انکار کیا لیکن ان کے بھتیجے میر عنایت حسین نے نہایت آدمیت کی۔ رات کو اپنے مکان میں پوشیدہ رکھا اور تین روز ہماری دعوت کی اور اپنے دیہات کے گوجروں کو بُلا کر کہا کہ ساٹھ آدمی ہمارے بھائی بند آ گئے ہیں اِن کو کسی طرح

گنگا جمنا پار اُتار دو۔ انھوں نے کہا۔ دن کو تو ممکن نہیں مگر آیندہ شب کو ہم ایسا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک شب تین آدمی مسلح ہو کر آموجود ہوئے اور ہم سب کو پار اُتار دیا۔ فیروزآباد گاؤں ہندوؤں کا تھا۔ وہاں پہنچ کر نمبردار صاحب کو میر عنایت حسین کا رقعہ دیا اور ہماری رسید لکھوا کر واپس ہوئے۔ اُس شب وہاں رہے۔ صبح کو کوچ کیا۔ منزل بمنزل مرادآباد ہوتے ہوئے بریلی پہنچے۔ وہاں ایک دوست آغا زین صاحب کے مکان پر قیام کیا۔ وہاں سے بڑھنے کا ارادہ تھا کہ معلوم ہوا کہ لکھنؤ کی بھی وہی کیفیت ہوئی جو دلّی کی ہوئی تھی۔

توپ کے مُنہ میں

پندرہ روز بریلی میں رہے۔ ایک دن کا اتفاق ہے کہ میں اور ایک شخص دہلی کا باشندہ جنگ باز خاں نامی میرے ہمراہ بازار گیا۔ ایک جوتے والے کی دکان پر جوتا پہننے کو گئے۔ میں نے جوتا اٹھا کر قیمت پوچھی۔ اس نے بیان کیا "سوا روپیہ"۔ میں نے وہ جوتا رکھ دیا۔ اس نے پھر مجھ سے کہا "رکھ کیوں دیا، تم بھی تو کچھ قیمت کہو"۔ میں نے کہا "بھائی مجھ میں اس قیمت کا مقدور نہیں۔ میں سستی قیمت کا جوتا چاہتا ہوں۔ میں غریب تباہی زدہ ہوں"۔ پھر اس نے پوچھا "تم کہاں کے رہنے والے ہو؟" میں نے کہا "دلّی کے"۔ وہ بولا کہ "تم لوگ بڑے نامرد ہو کہ تم نے دلّی تڑوا دی"۔ میں تو خاموش رہا مگر جنگ باز خاں نے جواب دیا "بیٹا گھبراؤ نہیں۔ ہم تمہارے پیچھے آئے جاتے ہیں۔ جورو کے پاجامے میں چھپتے پھرو گے"۔ یہ کہنا تھا کہ اس بجنت فروش نے کھڑے ہو کر ایک ہاتھ سے میرا ہاتھ پکڑا۔ دوسرے ہاتھ سے جنگ باز خاں کا اور آواز بلند پکار کر کہا "یارو دوڑو۔ یہ دونوں انگریزی مخبر ہیں"۔ یہ کلمہ ہمارے حق میں غضب ہو گیا۔ چار طرف سے پوربیے دوڑ پڑے۔ اس وقت بازار میں سواروں پیادوں کی بہ کثرت تھی کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ بازار میں رستہ رکتا تھا۔ آتے ہی پوچھا "کیا ہے؟" ہم دونوں کی مشکیں کس لیں اور کہا کہ جرنیل صاحب کے پاس لے چلو۔ نصف میل پر قلعہ تھا۔ قلعے کے سامنے ڈیرے کھڑے تھے۔ وہاں ایک ڈیرے کے تلے ایک پوربیا پچاس پچپن برس کی عمر کا گلے میں موتی سونے کے دانوں کا کنٹھا پہنے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا اور بیان کیا کہ یہ دونوں انگریزی مخبر ہیں۔ ہم ان کو گرفتار کر کے لائے ہیں۔ جرنیل صاحب کا عدل و انصاف ملاحظہ ہو کہ بغیر تحقیق حال کے حکم دے دیا کہ توپ سے باندھ کر اُڑا دو۔ اُسی وقت ہم دونوں کو توپ کے مُنہ سے باندھ دیا گیا اور نواب خان بہادر خاں والی بریلی سے کہلا بھیجا کہ دو مخبر انگریزی گرفتار ہوئے ہیں۔ ان کو اڑانے کا حکم ہو جائے۔ تھوڑی دیر میں وہاں سے بھی سوار نے آ کر حکم پہنچایا کہ اڑا دو۔ یہ باتیں ہم سن رہے تھے اور آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے کہ یا الٰہی کس بلائے ناگہانی میں گرفتار ہو گئے۔ ناگاہ دیکھتے کیا ہیں کہ قلعے کے دروازے میں سے کچھ سپاہی دوڑتے ہوئے چلے آتے ہیں اور پیچھے ان کے ایک شخص سفید گھوڑے پر سوار ہماری طرف آتا ہے۔ نووارد سوار نے جنگ باز کو دیکھا اور دیکھتے ہی کہا: "ارے جنگ باز تو کہاں؟"

جنگ باز: "مجھے کیا دیکھتے ہو۔ دوسرے کو دیکھو کون ہے؟"

جب مجھے دیکھا تو فی الفور گھوڑے سے کود کر جلدی تلوار سے وہ رسی کاٹ دی جس سے مجھے جکڑ رکھا تھا اور جنگ باز کی بھی رسی کاٹ کر ہم دونوں کو چھڑا لیا۔ اب یہ بات معلوم کرنی چاہیے کہ وہ ہمارا محسن کون تھا۔ وہ ہمارا خواجہ تاش بادشاہی ملازم کہاروں کا داروغہ میر فتح علی تھا۔ اس واقعے کے بعد یہ خیال ہوا کہ یہ جائے معرضِ خطر ہے۔ یہاں سے نکلنا چاہیے۔ سب کی رائے اس پر قرار پائی کہ رام پور

چلو مگر چلیں کیونکر۔ راستہ مسدود ہے اور وقت وہ ہے کہ بریلی میں سب طرف کے مفروروں کا اجتماع ہے اور سب سرغنہ مثل نانا راؤ، فیروز شاہ وغیرہ اور دلی لکھنؤ کے آدمی جمع ہیں۔ رام پور کے تیس ہزار آدمی بریلی میں ملازم ہیں۔ قصہ مختصر اُس کے دوسرے روز ہم سات آدمی جنوب کی جانب روانہ ہوئے اور قصبہ آنولہ میں پہنچے۔ آنولے کے ایک دو آدمی شخص ہم سے آکر ملے اور تفتیش حال کرنے لگے۔ بروقت دریافت حال وہی کلمات اُنھوں نے بیان کئے جو تحفت فروش نے کئے تھے۔ دوسرے روز وہاں سے روانہ ہو کر شاہ آباد میں پہنچے وہاں عملداری رام پور کی تھی۔ اُس شب کو وہیں مقیم رہے۔ صبح ہم رام پور کو چل نکلے۔ قریب شام پہنچے، اب یہ فکر ہوئی کہ شہر میں تو آگئے۔ اب کہاں قیام کریں۔ میر غلام عباس نے کہا کہ ایک شخص میر ابراہیم علی نامی دلی کے رہنے والے یہاں رہتے ہیں۔ ان کے مکان پر چلو۔ غرض کہ ہم کو اطمینان حاصل ہو گیا۔ داغ صاحب کو خبر ہوئی۔ وہ اسی روز آکر ملے۔ اُنھوں نے یہ حسن سلوک کیا کہ مجھے اور میرے چھوٹے بھائی کو صاحبزادہ محمد رضا صاحب داماد نواب یوسف علی خاں صاحب بہادر مرحوم کی سرکار میں نوکر رکھوا دیا۔ صاحبزادہ موصوف کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا اور منشی امیر احمد مینائی مرحوم آکر نواب کی غزل اور اپنی غزل پڑھا کرتے تھے۔ صاحبزادے محمد رضا خاں صاحب نے فرمایا کہ تم بھی غزلیں لکھو۔ ہم نے ہر چند انکار کیا مگر صاحبزادے صاحب نے زیادہ تر اصرار کیا۔ ناچار ہم نے غزلیں لکھ کر مشاعرے میں پڑھیں۔ بس اُسی روز سے تمام رام پور میں ہمارے کلام کی شہرت ہو گئی۔ عرصہ چار سال کے قریب ہم رام پور میں رہے۔ اُنھیں ایام میں ہمارے گھر کے آدمی بھی پانی پت سے رام پور پہنچ گئے تو ایک سال بعد میرے گھر میں لڑکا پیدا ہوا اور اُس کا نام سجاد مرزا رکھا گیا۔ وہ سات مہینے کا تھا جب اشتہار واگذاشت جائداد دہلی کا میرے پاس پہنچا۔ اسی خوشی میں میں رام پور سے دلی آیا تو اسی خوشی میں میں رام پور سے دلی آیا تو اس زمانے میں ہملٹن صاحب کمشنر تھے۔ اس کے بعد میرے والد بزرگوار سب اہل و عیال کو ہمراہ لے کر دہلی آگئے۔ بعد سال کے میرے والد میرے چھوٹے بھائی امراؤ مرزا کی شادی کرنے کے لیے پانی پت میں آئے اور اس کی شادی کر کے اسے پانی پت میں چھوڑ کے میرے پاس دلی چلے آئے اور آتے ہی بیمار ہو گئے۔ ادھر میں بیمار ہو گیا۔ اسی حالت میں بنارسی داس خزانچی نے اپنے قرضے کی نالش مجھ پر اور میرے والد پر کر دی۔ کوئی جواب دہی کرنے والا نہ تھا۔ یک طرفہ ڈگری ہو گئی۔ اسی اثنا میں میرے والد صاحب نے انتقال فرمایا۔ میں تین ماہ میں تندرست ہوا تو وہ اجرائے ڈگری ہو کر مکانات کے نیلام کا حکم چڑھ چکا تھا۔ ایک حبہ مجھے دستیاب نہ ہوا۔ اب تندرست ہوا تو فکر معاش کی ہوئی۔ تھوڑی سی تنخواہ کا چنگی میں نوکر ہو گیا اور اسی زمانے میں حکیم احسن اللہ خاں نے مجھ سے قصیدہ ممتاز لکھوایا۔ بعد سال بھر کے میں معزول ہو کر خانہ نشین ہوا مگر انھیں دنوں میں اخبار "جلوہ طور" جو بلند شہر سے نکلتا تھا، میں اس کا ایڈیٹر ہو کر بلند شہر چلا گیا۔ اس اخبار نے بہت ترقی پائی۔ وہ ریاست الور میں بھی جاتا تھا اور مہاراجہ شیودان سنگھ والیِ ریاست کے ملاحظے سے گزرتا تھا۔ اُنھوں نے دریافت فرمایا کہ اس اخبار کا ایڈیٹر کون ہے اتفاق سے میرے ایک دوست مرزا علی تقی صاحب تحصیلدار موجود تھے۔ اُنھوں نے میرا نام بتایا۔ مہاراجہ صاحب نے فرمایا کہ اسے یہاں بلواؤ۔ ہم نوکر رکھ لیں گے۔ چنانچہ اُنھوں نے مجھے لکھا۔ دو چار بار میں نے عذر کیے مگر ایسی صورت واقع ہوئی کہ الور میں آنے پر مجبور ہو گیا۔ میں اور امراؤ مرزا دونوں الور پہنچے۔ اسی روز میں اور میرا بھائی ملازم ہو گئے۔ عجب عیش و عشرت سے بسر ہوتی تھی۔ کوئی رنج و فکر پاس نہ آتا تھا۔ میرے جیسے آدمی شریف زادے نوجوان، خوش فکر، خوش پوشاک فراہم ہو گئے تھے۔ باہم اتفاق تھا۔ مہاراجہ کو خوش و خرم رکھتے تھے۔ ہر تقریب میں انعام و اکرام خلعت وغیرہ ملتے تھے۔ عجب ایک صحبت رنگین فراہم ہوئی تھی۔ اس چھوٹی سی ریاست الور کا جاہ و تجمل دیکھ

دیکھا۔ وہ بڑی سے بڑی ریاستہائے ہندوستان میں کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ ہر فن کا صاحب کمال ایسا الور میں موجود تھا۔ جس کا ہندوستان کیا ممالک غیر میں بھی جواب نہ تھا۔

الور سے قطع تعلق

مہاراجہ صاحب بہادر کو شعر و سخن کی جانب از حد رغبت تھی اور نہایت درجہ کے سخن فہم، عالی دماغ تھے۔ مذاق سخن اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ اچھا شعر سن کر بیتاب ہو جاتے تھے۔ مہاراجہ صاحب کے روبرو مشاعرہ ہوا کرتا۔ شاعر کی نہایت عزت و آبرو فرماتے اور شعر کی قدر دانی کرتے تھے۔ غرض کہ تین چار سال کے عرصے تک الور میں اسی عیش و آرام کے ساتھ بسر ہوئی۔ اب فلک تفرقہ انداز کو یہ صحبت بھی ناگوار گزری اور درپئے تخریب ہوا۔ سکھدیو سنگھ راجی نے ایک جماعت بدسگال غارتگر جمعداری جلیپور میں فراہم کر کے پانچ چھ ہزار آدمی سے الور پر چڑھائی اور تحصیلیں لوٹ لیں۔ جب یہ خبر مہاراج کو پہنچی تو الور سے دولہا خاں کپتان کو مع مسلح پلٹن اور نواب کامدار خاں کو مع رسالہ سواران واسطے سرکوبی روانہ کیا۔ سکھدیو سنگھ باغی ہزیمت پا کر علاقہ پرتاپ گڑھ راجگڑھ کی طرف مفرور ہوا۔ جب وہ مایوس اور پشیمان ہو کر عملداری جے پور میں پناہ گزیں ہوا، اب راجپوتوں نے عرضیاں بھیجنی شروع کیں کہ یہ لوگ راجہ کو بہکا کر خراب کرتے ہیں اور راجہ کو مسلمان کر لیا ہے۔ ان لوگوں کا الور سے اخراج ہونا مناسب ہے۔ ان کی وجہ سے الور میں فتنہ و فساد برپا ہوتا ہے۔ سرکار سے مسلمانوں کے علیحدہ کر دینے کا حکم مہاراجہ صاحب کے پاس پہنچا۔ ایک حکم ٹال دیا، دوسرا حکم ٹال دیا، آخر تیسرے حکم پر ہم لوگوں نے متفق ہو کر عرض کی۔ ہم لوگوں کے واسطے آپ اپنی ریاست کو کیوں برباد کرتے ہیں۔ آپ ہم لوگوں کو رخصت فرمائیں۔ غرضکہ بہزار دقت بمشکل سمجھا کر ہم الور سے رخصت ہو کر دلی میں آ بیٹھے۔ برس روز تک ہماری تنخواہیں گھر پر آتی رہیں۔ بعد ایک سال کے میں نے نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ سے ایک روز یہ بات کہی کہ الور کی صورت آپ کو معلوم ہے۔ یہ امر تابکے۔ گھر بیٹھے ہوئے کون تنخواہ دیتا ہے۔ اگر آپ کے ذریعے سے ریاست جے پور میں کوئی سبیل روزگار کی نکل آئے تو بہت مناسب ہے۔ میں آپ کا ممنون احسان ہوں گا۔ انھوں نے اسی وقت نواب فیض علی خاں صاحب بہادر مدار المہام کے نام میری سفارش میں خط لکھ کر روانہ فرمایا اور ان کے صاحبزادے نواب محمد علی خاں نے بخشی امداد علی خاں صاحب بہادر کو یک نواب صاحب کے نام خط بھیجا۔ پانچویں روز نواب مصطفیٰ خاں نے مجھے بلا کر نواب فیض علی خاں کا خط جو میری طلب میں آیا تھا مجھے دیا اور فرمایا۔ اب بسم اللہ کیجئے اور جے پور کو روانہ ہو جائیے۔ جب جے پور پہنچا ہوں تو اول احمد مرزا خاں آنگاہ کے مکان پر فروکش ہوا۔ نواب فیض علی خاں نے بعد دو ماہ کے کھنڈار کا تھانہ دار کر کے بھیج دیا۔ پانچ چھ ماہ تک اس پرگنے پر حکمرانی کی۔ اس حکومت میں وہ لطف حاصل ہوا کہ الور کے عیش و عشرت فراموش ہو گئے۔ بعد چھ ماہ کے تھانہ امرہ میں تبدیلی ہو گئی۔ اہل و عیال دلی سے اب جے پور آ گئے تھے۔ میں نے جے پور میں آ کر مکان کرایہ کو لیا۔

جے پور میں

جب میری کارگزاری کا مہاراج کے دل میں گھر ہوا تھا اور عزت و آبرو فرماتے تھے اور وعدہ پرورش بے حد کا فرمایا تھا پھر

اُن سے فرمایا۔ تم اپنی تبدیلی سانگانیر پر کرا لو۔ مجھے زیادہ تر اتفاق سانگانیر میں رہنے کا ہوتا ہے۔ میں نے عرض کی۔ یہی اختیار حضور کو ہے۔ چنانچہ کونسل میں حکم لکھوا دیا گیا تھا کہ ظہیر الدین حسین افسر کرایہ کی تبدیلی سانگانیر میں ہو جائے۔ پھر میں ایسا درخورِ خدمت ہو گیا تھا کہ بڑے بڑے صاحبین کو رشک و حسد ہوتا تھا۔ ہوا خوری کے وقت نکلتے تھے تو سوائے ہم دو آدمیوں کے تیسرا نہ ہوتا تھا۔ آگے مہاراج اور عقب میں کشن لال چیلا اور میں۔ اکثر راز ایسے ہوتے تھے کہ وہ مجھے معلوم تھے یا مہاراج کو۔ میں بہت بڑا بدنصیب ہوں۔ اگر مہاراج دو چار برس اور زندہ رہتے تو خدا جانے میں کس پایۂ اعلیٰ کو پہنچتا۔ میری شومئ طالع سے وہ کوئی تین مہینے میں انتقال فرما گئے۔ مہاراجہ صاحب بہادر مہاراجہ رام سنگھ جی سری سوائی نہایت دانش مند، روشن دماغ۔ بیدار مغز۔ مدبر۔ مصلحت اندیش۔ موحد کیش۔ رعایا پرور۔ داد گستر۔ عادل۔ فیاض۔ بے تعصب۔ انصاف دوست۔ حلیم الطبع۔ سلیم الفکر۔ خوش تدبیر۔ مستقل المزاج۔ خوش رو۔ خوش خو۔ جمیع محامد ذاتی و صفاتی موصوف تھے۔ اس مزاج کا کوئی رئیس ہندوستان میں نہ تھا۔ عدل و انصاف کا یہ حال تھا کہ چند انصاف مہاراجہ صاحب کی ذات سے ایسے ظہور میں آئے جیسے بادشاہانِ سلف کے مشہور روزگار ہیں۔ از آں جملہ ایک یہ معرضِ بیان میں آتا ہے کہ ریاست ٹونک کے چند قصاب کچھ مویشی خرید کے ریاست جے پور سے ٹونک کو لیے جاتے تھے۔ اثنائے راہ میں ایک منزل پر مقیم ہوئے کچھ گھاس چارہ وغیرہ خرید کر مویشی کے آگے ڈال دیا۔ اس قصبے کا ایک سانڈ آیا اور اسے کھانے لگا۔ قصابوں نے جو یہ امر دیکھا تو اس نرگاؤ کو لکڑی سے مار بھگایا۔ پھر تھوڑی دیر میں وہ آ کر چرنے لگا۔ پھر ہٹا دیا۔ جب دو چار مرتبہ ایسا ہوا تو ایک قصائی کو غصہ آیا اور اس نے تلوار کھینچ کر اس کے پاؤں پر ہاتھ مارا۔ نرگاؤ کا پاؤں کا قلم ہو کر دور جا گرا۔ پھر کیا تھا۔ تمام قصبے میں غل مچ گیا۔ بیچارے قصاب گرفتار ہوئے۔ حتیٰ کہ مثل مقدمہ محکمۂ کونسل میں پہنچی۔ ممبران کونسل کی یہ رائے ہوئی کہ مقدمہ مذہبی ہے۔ چنانچہ دھرم شاستری جی کو بلایا گیا اور ویوستھا (فتویٰ) لیا گیا تو انھوں نے حکم قصاص کیا یعنی درجہ اول کی سزا تو اور درجہ دوم کی سزا قطع ید ہے، درجہ سوم حبس دوام۔ اب اختیار سزا احکام کو ہے۔ غرض کہ منظوری کے واسطے پیشی میں رکھی گئی۔ مہاراج نے از ابتدا تا انتہا مسل کا ایک ایک حرف سنا اور سب محکمہ جات کی رائے سنی۔ پھر حکم دیا کہ شاستری جی کو بلاؤ۔ جب شاستری جی آئے تو ان سے فرمایا کہ "آپ نے یہ سزا بموجب اپنے مذہب کے تجویز کی ہے یا بموجب شریعت مسلمانان؟" انھوں نے جواب دیا "بموجب دھرم شاستر۔ مسلمانوں کے مذہب سے کیا کام ہے۔" مہاراج نے فرمایا کہ مجرم غیر مذہب کا آدمی ہے۔ شرطِ عدالت یہی ہے کہ اس کے مذہب کے موافق سزا ہونی تھی۔ اس مقدمے میں شریعت اہلِ اسلام سے فتویٰ لینا تھا۔ یہ کارروائی ناجائز ہے کیونکہ ان کے مذہب میں اس کا (گائے) کھانا روا ہے۔ ہمارے نزدیک یہی سزا کافی ہے کہ دورانِ مقدمہ کو عرصہ ڈیڑھ سال کا ہو گیا ہے۔ یہی میعاد قید کافی ہے۔ مجرم کو رہائی دی جائے۔ اسی طرح کے بہت سے انصاف مہاراج کے ہیں۔

باجو میاں

مہاراج رام سنگھ کی صحبت میں ہر قسم کے اشخاص موجود رہتے تھے۔ دو چار درویش معمر مسلمان صوفی الطریق۔ دو چار ہندو فقیر بیراگی۔ مہاراجہ کا طریقہ صوفیہ موحدانہ تھا۔ بیشتر مسائل تصوف کا ذکر کرتے رہتے۔ درویشانہ مزاج رکھتے تھے۔ زیادہ تر

امراض سے نفور تھے۔ لباس سادہ رکھتے۔ تکلف سے برکنار تھے۔ گھوڑے کی گدّی بچھا کر سو جایا کرتے۔ مزاج میں عجز و انکسار بدرجہ غایت تھا۔ مسلمانوں سے بہت رغبت تھی۔ ایک مرد پیر نابینا باجو میاں نام پرانا رفیق تھا اور شب و روز پاس رہتا تھا۔ صبح کو اوّلاً اس کا منہ دیکھ کر بیدار ہوا کرتے تھے۔ محرم کی تعزیہ داری کے واسطے بارہ ہزار روپے خرچ کرتے تھے۔ حجاج کو ہر سال میں پچیس ہزار روپیہ زادِ راہ و حج کے لیے اور چھ ماہ کی رخصت عطا ہوتی تھی۔ جب مہاراج رام سنگھ جی نے انتقال فرمایا ہے تو رعیت آسودہ حال فارغ البال، خزانے مالا مال، ملازم شاد و آباد تھے۔ تمام شہر میں تین روز ماتم رہا ہے۔ بعد انتقال ایک انقلاب عظیم برپا ہوا اور مہاراجہ مادھو سنگھ بہادر تخت نشین ہوئے۔ غرض کہ اس انقلاب پر آشوب میں جتنے ملازم مہاراج کے وقت تھے سب خانہ نشین ہو گئے اور نئے نئے آدمی روپے خرچ کر کے نوکر ہو گئے۔ ہم چار اضلاع میں چار ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تھے۔ چاروں یک قلم موقوف ہوئے۔ چودہ برس تک مہاراج رام سنگھ کی نوکری کی تین برس مہاراج مادھو سنگھ بہادر کی۔ مگر ریاست نے میرے حقوق قدیم الخدمتی پر نظر کر کے میرے فرزند سجاد مرزا کو تھانہ دار کر دیا تھا۔ آج تک وہی نظام برقرار ہے جو بنا دو ڈال گئے ہیں اور یہ سب کچھ انکی بیدار مغزی کا ہے حالانکہ مہاراجہ صاحب بہادر مہاراج سری سوائی مادھو سنگھ جی کے مزاج میں کسی درجہ تعصب مذہبی نسبت فرقہ اہل اسلام ہے مگر رعایا پروری کی نظر سے حقوق سب کے برابر سمجھے جاتے ہیں جو سلوک ہنود کے ساتھ ہوتے ہیں اُس سے زیادہ کچھ مسلمانوں کے ساتھ مرعی رکھے جاتے ہیں۔

ٹونک میں

بعد انتقال مہاراجہ رام سنگھ جی بیکنٹھ باشی تین سال تک میں ملازم ریاست جے پور رہا۔ بعد خانہ نشین ہو کر دو ڈھائی سال بے روزگار پریشان سرگرداں رہا۔ بعد نواب احمد علی خاں صاحب کی رفاقت میں چھ سال بسر کیے۔ اس اثنا میں شعر و سخن کا بہت چرچا رہا۔ بہت سا کلام فراہم ہو گیا۔ بعد انتقال نواب احمد علی خاں صاحب نواب حافظ محمد ابراہیم علی خاں صاحب امین الدولہ صولت جنگ فرماں روائے ریاست ٹونک کی طرف سے فقیر کی طلب ہوئی۔ غرضیکہ جب میں ٹونک پہنچا ہوں تو پہلے ایک شاگرد کے مکان پر فروکش ہوا۔ دوسرے روز معیت ہر دو صاحبان میں نواب صاحب بہادر کی خدمت میں پہنچا۔ نذر گزرانی حضور بہت خوش ہوئے۔ اپنا کلام مجھے سنایا۔ دوسرے روز مشاعرے میں ایک ہجوم کثیر صاحبزادگان اراکین دولت کا فراہم ہوئی۔ غزل خوانی شروع ہوئی۔ اوّل نواب صاحب بہادر کی غزلیں پڑھی گئیں اور بہت سی تعریف ہوئی۔ مجھے حکم ہوا تو میں نے غزل کا مطلع پڑھا۔ بس مطلع سنتے ہی مشاعرے میں شور برپا ہو گیا۔ نواب صاحب بہادر نے تین تین چار چار بار مطلع کو پڑھوایا۔ غرضیکہ تمام غزل پر یہی کیفیت طاری رہی۔ نواب صاحب بہادر نے مجھے سے اندرون قنات بلا کر بہت قدر افزائی فرمائی۔ اسی اثنا میں نواب خاقون زمانی بیگم صاحبہ ہمشیرہ زادہ نواب کلب علی خاں صاحب مرحوم محل خاص حضور نواب صاحب بہادر میری شاگرد ہوئیں اور کچھ تنخواہ میری وہاں سے بھی مقرر ہو گئی۔ میں خوش و خرم رہنے لگا۔ اچھی خاصی طرح بسر کرتا تھا۔ ادھر میں نوکر اور ادھر میرا بیٹا نوکر تھا وہ تھانے دار تھا۔ اب چرخ جفا کار دل آزار نے ایک تیر ستم تاک کر ایسا دل پر لگایا کہ دل اور جگر کو چھوڑ کر پار ہو گیا۔

یکایک خط پہنچا کہ جھلی لڑکی بیمار ہو کر دلی سے جے پور میں آئی تھی۔ اس کا انتقال ہو گیا۔ اس خط کو دیکھتے ہی روح تن سے پرواز کر گئی۔ رویا پیٹا لیکن کیا کر سکتا تھا۔ گھر پر آیا۔ بی بی کو دیکھا تو وہ دیوانی ہو رہی تھی۔ جھلی لڑکی پانچ ماہ کی ایک دختر نہایت خوبصورت چھوڑ کر مر گئی تھی۔ انا دودھ پلانے پر رکھ کر پھر نوکری پر روانہ ہوا۔ دس روز بعد اس بچی کا انتقال ہو گیا۔ اس پر بھی صبر کیا۔ ہنوز پہلے زخم دل کے بھرنے نہ پائے تھے کہ صدمۂ عظیم واقع ہوا۔ چار بچے چھوٹے چھوٹے تھے۔ جوان بیٹی بیوہ ہو گئی۔ میر جیون علی (داماد) کے مرنے کے بعد ایک سال کے چھوٹی لڑکی کی شادی قرار پائی سجاد مرزا جب سوائی مادھو پور میں آئے ہیں ڈگری پر تھا۔ مجھے لکھا کہ آپ کچھ سامان اور زیور پارچہ وغیرہ کا کر کے بھیجئے اور میں بھی کچھ بندوبست کرتا ہوں۔ جو خط میں نے بندوبست روپیہ وغیرہ کا کر کے زیور چاندی کا اور کوئی اسی روپیہ کا کپڑا وغیرہ خریدا اور کچھ روپیہ کا انتظار تھا اور وہ قرض نکلوایا تھا کہ وہ دستیاب ہو جائے تو میں جے پور چلا جاؤں۔ وہ کم بخت ساہوکار ایسا پیچ تھا کہ وہ آج کل آج کل کرتا تھا۔ اس اثنا میں مجھلے بیٹے وہ (سجاد مرزا) رخصت لے کر جے پور پہنچ گیا۔ وہاں جاتے ہی جنرل سپرنٹنڈنٹ نے اس کی تبدیلی کر دی۔ ہر چند اس نے عذر کئے کہ میری بہن کی شادی ہے میں نہیں جا سکتا۔ سپرنٹنڈنٹ درپے ہو گیا کہ ایک ہفتے کے واسطے چلا جا۔ پھر جے پور کی تبدیلی ہو جائے گی۔ اس کی ماں نے ہر چند روکا کہ تو نہ جا۔ بیٹا باپ اب آتے ہیں، شادی ہو جانے دے۔ ایک نہ مانی۔ یہی کہا کہ ابا جی کے آنے میں دیر ہے میں جب تک ہو آؤں گا۔ وہ یہاں سے سوار ہو کر نراولی مقام لکھنڈیرہ پہنچا۔ تیسرے روز سجاد مرزا اور دوسرا اہلکار داسنگھ جس کی تبدیلی پر یہ گیا تھا اور ڈپٹی کا بھائی لکھنڈیرے میں آئے۔ سجاد مرزا نے داسنگھ سے کہا کہ اب تم دفتر مجھے سنبھلوا دو۔ کہا آج تو نہیں سنبھلوا، کل سنبھلوا دوں گا۔ اس میں زیادہ تکرار کی نوبت پہنچی۔ سجاد مرزا کو لوگوں نے خفیہ طور پر مشتبہ کر دیا تھا کہ اس نے ڈپٹی کو زہر دے کر مارا ہے۔ اس کے منہ سے نکل گیا۔ سیدھی طرح سے دفتر سنبھلوا دو۔ ورنہ ہتھکڑی بیڑی ڈال کر تم کو جے پور بھیجوں گا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کو خبر ہو گئی ہے ڈپٹی کے مارے جانے کی۔ تو اس کا کام بھی تمام کرو بس اس نے چالاکی یہ کی کہ پہلے تو اس آدمی کو جو سجاد مرزا کے پاس تھا بہکا کر نکال دیا۔ اب یہ دو بچے رہ گئے۔ اس دن سجاد مرزا تو دفتر میں بیٹھے ڈپٹی دوسرے میں بیٹھے تھے۔ ان سے ملنے گیا اور بشارت حسین گوشت بھون رہا تھا کہ وہ داسنگھ آیا اور کہا کہ پانی ڈال، گوشت جلتا ہے۔ یہ اٹھ کر پانی لینے گیا اور اس ظالم بے رحم نے سنکھیے کی پڑیا دیگچی میں ڈال دی اور پیچھے سے چلا دی۔ شام کو جب سجاد مرزا آیا تو اس نے پوچھا، بچو! آج کیا پکایا ہے۔ انھوں نے کہا، ہاں ماموں پکائی ہے۔ ان بچوں نے جی بھر کر کھائی۔ بس کھاتے ہی قے اور دست لگ گئے۔ آدھی رات کے وقت قے دست ٹھہرے ہیں کہ داسنگھ نے پوچھا، اب تمہاری طبیعت کیسی ہے۔ کہا دل پر جلن ہے۔ کہا سکنجبین پی لو۔ میں لاتا ہوں۔ دوبارہ پھر اور سنکھیا سکنجبین میں ملا کر پلا دی۔ صبح ہوتے اس کا کام تمام ہو گیا۔ تھانہ دار اور منشی تھانے نے آ کر تجہیز و تکفین کی۔ دوسرے روز شام کو بچے گھر کے محلے میں ایک برپا ہو گئی۔ جیسے گھر میں آئے تو تمام محلے کی عورتیں جمع ہو گئیں۔ غریب بچے سہمے ہوئے اپنی مصیبت میں آپ گرفتار، ہیں کیا زبان سے کچھ حقیقت بیان کی۔ صبح کو احمد مرزا خاں نے مجھے خط لکھا کہ خط کو دیکھتے ہی چلے آؤ، سجاد مرزا کا حال غیر ہے۔ اسی وقت سرکار میں جا کر رخصت طلب کی۔ شام کو اونٹ گاڑی میں جے پور روانہ ہوا۔ میری بی بی نے سب کو منع کر دیا تھا کہ کوئی تذکرہ کچھ نہ کرنا۔ میں گھر میں گیا تو سب خاموش تھے۔ ہر چند پوچھتا ہوں، کوئی نہیں بتاتا۔ یہی کہتے ہیں کہ وہ لکھنڈیرے میں ہے۔ میں نے کہا، خدا کے واسطے بتاؤ تو سہی۔ ماجرا کیا ہے۔ میں سمجھ گیا۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے زور سے زمین پر سر دے مارا کہ میرے دماغ سے خون جاری ہو گیا۔ تب عزیزوں نے میرے ہاتھ پکڑے اور کہا صبر کرو۔ ہم بیان کرتے ہیں۔ جب احمد مرزا خاں نے یہ حقیقت زبانی بچوں کی بیان کی تو میں چیخیں مار کر رونے لگا۔ بس اس صدمہ

جانکاہ نے میری کمر توڑ دی اور زندگی تلخ کر دی۔ ہوش و حواس میں اختلال واقع ہو گیا۔ دل و دماغ منتشر ہو گئے۔ لطفِ زندگی جاتا رہا۔ بصارت و سماعت میں فرق آگیا۔ اب آنکھوں سے سوجھتا نہیں۔ کانوں سے بالکل بہرا جھنڈ ہو گیا ہوں۔ بے حیائی سے زندگی بسر کر رہا ہوں۔ جائے غور ہے کہ ایسی حالت میں کوئی شعر کہہ سکتا ہے؟

حیدر آباد میں

گردشِ نصیب کی۔ خواہ مخواہ وطن سے بے وطن ہو کر حسبِ ترغیب بعض احباب حیدر آباد میں چلا آیا۔ اکثر دوستوں کے خطوط پہنچے حیدر آباد میں آ جاؤ۔ تمھارے کلام کے بہت لوگ مشتاق ہیں۔ چونکہ میرا قصد بھی حیدر آباد کا تھا۔ قرض دام کا بندوبست کیا۔ چار ماہ کی رخصت لے کر جے پور سے آیا۔ گھر میں جب آیا تو بی بی کی طبیعت علیل پائی۔ آٹھ روز کے اندر اندر اُن کا انتقال ہو گیا۔ جو کچھ روپیہ کا بندوبست کر کے لایا تھا وہ تجہیز و تکفین میں صرف ہوا۔ اب ارادہ فسخ ہو گیا۔ میں نے جے پور سے لکھ بھیجا کہ مجھ پر تو یہ واقعہ گزرا ہے۔ پھر تحریر کی کہ مشیتِ ایزدی میں دخل کیا ہے جو امر تقدیری تھا وہ ہوا۔ مگر آپ چلے آئیں۔ مجبوراً وہاں سے روانہ ہوا۔ راجہ بھگوان سہائے بہادر نے مجھے باغ میں اتروایا۔ سب بار میرا اُن پر پڑ گیا۔ پورے ایک سال تک بھگوان سہائے بہادر میرے کفیل رہے اور میرے کل اخراجات اُن کے ذمے تھے۔ اُسی ایام میں سرکار دولت مدار کی نذر ہو گئی۔ میں نے قصیدہ مدحیہ سنایا۔ وقتِ رخصت فرمایا ہم تم کو جواؤں گا۔ اب یہ صورت ہوئی۔ مجھ سے کہا گیا کہ نوکری کا ڈھب لگنا تو مشکل ہے۔ رخصت معقول طور سے ہو جائے گی۔ اُسی اُمید میں آٹھ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ ایک سوائے راجہ بھگوان سہائے بہادر کے کسی نے بات تک نہ پوچھی۔ جن صاحبوں نے مجھے بلایا تھا وہ منہ چھپانے لگے۔ آخر میں نے سرکار خداوند نعمت کو عرضی لکھی۔ سرکار نے یہ خیال کہ بڈھا اندھا بہرا اپاہج بے کارِ محض سمجھ کر ازراہِ رحم میری یہ پرورش فرمائی کہ اس زمانے میں روٹی نصیب ہو گئی۔ اب چند روز کی زندگی باقی ہے۔ آفتاب لبِ بام و شمعِ سحر کا عالم ہے، ہر کمالے را زوالے۔ اب زمانہ انحطاط و تنزل کا ہے۔ معراجِ کمال تو حاصل ہو چکی۔ اب میرا سن ستر سے تجاوز کر گیا۔ دل و دماغ میں طاقت نہ رہی۔ قویٰ مضمحل ہو گئے۔ ہوش و حواس مختل۔ سہو و نسیان کی یہ کثرت ہے بات کہتے ہی بھول جاتا ہوں۔ اولاد کے صدموں سے دل پاش پاش ہو گیا۔ افکارِ اہل و عیال نے آدمیت سے کھو دیا۔ قرض ہر وقت گردن پر سوار ہے۔ لامحالہ شعر و سخن کی جانب سے دست بردار ہونا پڑا اور شعر و شاعری کو سلام کر کے مہرِ خاموشی دہن پر لگا کر گوشہ نشینی اختیار کی۔

(تلخیص: خورشید مصطفیٰ رضوی)

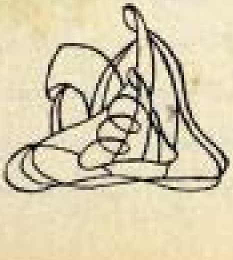

عبدالغفور نسّاخ

ایک غیر مطبوعہ نسخہ

ذیل کے حالات نساخ کی خود نوشت سوانح سے لیے گئے ہیں۔ یہ کتاب ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ کاتب نے اپنا نام نہیں لکھا۔ تاریخ کتابت درج کی ہے۔ تقطیع ۷ × ۹، صفحات ۲۲۰۔ آخر کے کچھ صفحے غائب ہیں۔ واقعات کے بیان کرنے میں کسی ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ اس وقت تک کی تحقیق کے مطابق اس کا کوئی دوسرا نسخہ کسی دوسرے کتب خانہ میں دستیاب نہ ہو سکا۔

نساخ نے یہ تذکرہ جیسا کہ خود ان کا بیان ہے حسب خواہش احباب ترتیب دیا تھا۔ چنانچہ شروع تذکرہ میں فرماتے ہیں: "خاکسار عبدالغفور متخلص بہ نساخ، ڈپٹی کلکٹر ڈھاکہ، برادر خورد نواب عبداللطیف خاں بہادر سی آئی ای وزیر ریاست بھوپال ابن جناب منشی قاضی فقیر محمد مرحوم مؤلف نسخۂ جامع التواریخ وکیل عدالت دیوانی صدر کلکتہ حسب خواہش احباب اپنی زندگی کے مختصر حالات و سوانح درج کرتا ہوں"۔ اس کے بعد اپنا سلسلۂ نسب بیان کیا ہے جو سیف اللہ حضرت خالد بن ولید تک پہنچتا ہے۔ خاندان کے سب سے اولین بزرگ جن کا تذکرہ اس سوانح میں ملتا ہے وہ کوئی مولوی عبداللہ قیراطی ہیں جو بقول نساخ اپنے وقت کے فاضل عصر تھے۔ یہ بزرگ حلب میں پیدا ہوئے اور [illegible]ھ میں دمشق میں انتقال فرمایا۔ ان کے بعد جن بزرگ کا تذکرہ اس سوانح میں ملتا ہے وہ کوئی شاہ معین الدین ہیں جو انہیں مولوی عبداللہ قیراطی کی اولاد میں سے تھے۔ یہ ایک صوفی منش اور درویش صفت آدمی تھے۔ معقولات و منقولات میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ بغداد میں قیام تھا یعنی شام سے ہجرت کر کے عراق میں آ بسے تھے۔ نساخ کے خاندان کے یہ سب سے پہلے بزرگ ہیں جو ہندوستان تشریف لائے اور یہیں پیوند خاک ہوئے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ۱۰۳۲ھ میں شاہ معین الدین بغداد میں تشریف رکھتے تھے۔ شاہ عباس صفوی والی ایران نے عراق پر حملہ کیا اور بغداد کو فتح کر لیا۔ یہ بغداد کو خیرباد کہہ کر دہلی آ گئے۔ جہانگیر اس وقت سریر آرائے سلطنت تھا۔ شاہ صاحب نے دہلی میں قیام کیا اور چند سال بعد ۱۰۳۶ھ میں رحلت کی۔ شاہ صاحب کو تو مرتبہ نہیں ملا مگر ان کے صاحبزادے مولوی عبدالرسول نے دربار شاہجہانی میں بار حاصل کر لیا۔ شاہجہاں نے سرکار فتح آباد کا عہدۂ قضا ان کے سپرد کیا اور ضلع فریدپور (بنگال) جاگیر میں عطا کی۔ جاگیر حاصل کرنے کے بعد قاضی صاحب فریدپور چلے آئے۔ یہاں ایک بزرگ مسمی قطب صاحب کی صاحبزادی سے شادی ہوئی جو پرگنہ فتح آباد (جہاں کے یہ قاضی تھے) کے زمیندار کی نواسی تھیں۔ شادی کے بعد قاضی عبدالرسول نے یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کی موت کے بعد ان کے لڑکے مولوی عبدالوہاب کو عہدۂ قضا پر بحال رکھا گیا اور جاگیر بھی بدستور انہیں کے قبضہ میں رہی۔ قاضی عبدالوہاب نے بھی اسی ضلع کے کسی رئیس کی لڑکی سے شادی کی اور وہیں

سکونت پذیر رہے۔

اس کے بعد نساخ اپنے والد ماجد مولوی فقیر محمد کا بیان شروع کر دیتے ہیں اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ قاضی عبدالوہاب اور مولوی فقیر محمد میں کتنا بُعد ہے۔ اپنے دادا مولوی محمد رضا کا بھی کوئی تذکرہ نہیں کرتے۔ نہ یہ بتاتے ہیں کہ عہدۂ قضا ان کے خاندان میں کب تک اور کس کے نام رہا۔ اور بعد کے لوگ قاضی کے لقب پر جو در اصل ایک عہدہ کا نام ہے کس طرح اور کیوں کر اختیار کرتے رہے۔ خود فقیر محمد کا تذکرہ بھی غیر مکمل اور بے ترتیب ہے اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ مولوی صاحب کی ابتدائی زندگی کیسی گذری، ان کو تعلیم کیسی ملی اور کہاں۔ شادی کس جگہ ہوئی اور کب؟ صرف اتنا پتہ چلتا کہ مولوی فقیر محمد نے شادی کے بعد اپنے چچا سسر منشی بقاء اللہ کی اسسٹنٹی اختیار کر لی تھی جو اس وقت کلکتہ کی عدالت دیوانی میں حکومت کی طرف سے وکیل مقرر تھے اور جب منشی بقاء اللہ کا انتقال ہو گیا تو حکومت نے مولوی فقیر محمد کو ان کی جگہ وکیل مقرر کیا۔ یہ اٹھائیس سال مسلسل اس عہدہ پر قائم رہے تا آنکہ ۱۲۶۰ھ میں انتقال کیا۔

مولوی فقیر محمد نے دو شادیاں کی تھیں جن سے ان کے پانچ اولادیں ہوئیں، چار بیٹے اور ایک بیٹی۔ بہن کا نام تو نساخ نے نہیں لکھا ہاں بھائیوں کے نام دیے ہیں جو اس طرح ہیں، مولوی عبداللطیف، مولوی عبدالحمید اور مولوی عبدالباری۔ ان میں مولوی عبداللطیف اور نساخ ایک ماں سے تھے اور مولوی عبدالحمید، عبدالباری دوسری ماں سے۔ بہن کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ وہ کس بیوی سے تھیں۔ نساخ ان سب میں چھوٹے اور مولوی عبداللطیف منجھلے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے مولوی فقیر محمد صاحب نے اپنی پہلی بیوی کے حیات ہوتے ہوئے دوسری شادی کی تھی اور دونوں بیویاں ایک ساتھ رہتی تھیں۔ اپنی پیدائش کے بارے میں نساخ لکھتے ہیں "والد مرحوم کلکتہ کے لال گنج میں مسرو خانساماں کی گلی میں اپنے خریدے ہوئے مکان میں رہتے تھے۔ وہ مکان شکست ہو گیا۔ اسی جگہ [illegible] ۱۲۴۹ھ میں روز دوشنبہ قبل نماز عید الفطر پیدا ہوا"[۱] اس کے بعد ساڑھے چار سال کی عمر میں جیسا کہ اس زمانہ کے شرفاء کا عام دستور تھا، پڑھنے کو بٹھا دیئے گئے اور سات سال کی عمر میں ان کو مدرسہ عالیہ کلکتہ میں داخل کر دیا گیا۔ مدرسہ میں داخل ہوئے ابھی تین سال ہوئے تھے کہ والد کے انتقال کا حادثہ پیش آگیا اور نساخ مع متعلقین راجپور چلے آئے۔

کچھ زمانہ بعد وہ پھر کلکتہ آ گئے۔ یہاں آ کر مولوی عبداللطیف خاں برسر روزگار ہو گئے اور نساخ پھر مدرسہ عالیہ میں داخل ہوئے اور اپنی تعلیم جاری کی۔ مگر پڑھانے کو ایک مولوی مسمی [illegible] سلہٹی مقرر کئے گئے، مگر یہ نہایت تیز مزاج اور چڑچڑی طبیعت کے آدمی تھے، بچوں کو اکثر بے قصور پیٹا کرتے۔ نساخ کے ساتھ بھی ان کا یہی سلوک تھا۔ شروع شروع میں تو انہوں نے برداشت کیا لیکن جب تشدد کسی طرح کم نہ ہوا تو ایک روز پڑھنے کے بعد درس سے اٹھے اور روتے ہوئے سیدھے اپنے عم بزرگوار قاضی محمد صاحب کے یہاں چلے گئے۔ ایک کمرے میں ایک ننگی تلوار لٹک رہی تھی اتنے میں مولوی صاحب بھی ان کو تلاش کرتے ہوئے وہاں آ پہنچے اور ان کو برا بھلا کہنے لگے۔ مگر نساخ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ مولوی صاحب سے بھلا یہ کہاں برداشت ہو سکتا تھا۔ "وہ بید لے کر مجھ کو مارنے آئے۔ میں نے جھٹ شمشیر میان سے نکال ان پر حملہ کیا۔ وہ بھاگے یہاں تک کہ مکان کے دروازہ سے سڑک پر نکل گئے اور میں شمشیر عریاں بکف دوڑا کرتا ہوا ان کے پیچھے پیچھے دو تین سو قدم تک گیا۔ بعد ازاں پھر آیا۔ استاد صرف ایک لنگی پہنے ہوئے تھے اور ننگے پاؤں ننگے سر تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک بید تھا۔ اس روز کے بعد میں نے ان کو نہیں دیکھا۔"

اس کے بعد ایک دوسرے مولوی مقرر ہوئے، حسن اتفاق سے یہ بھی سلہٹ ہی کے باشندے تھے۔ مولوی رضوان علی نام تھا۔ دیکھنے میں آدمی بہت اچھے تھے اور پڑھانے میں محنت سے تھے لیکن خدا جانے کیا شامت آئی کہ ایک بار وہ نساخ پر خواہ مخواہ بگڑ بیٹھے اور زدوکوب بھی کیا۔ آدمی نحیف اور لاغر

تھے۔ ادھر نساخ خاصے قوی اور توانا۔ ان کو جو غصہ آیا تو انھوں نے اُستاد کو دے مارا۔ بیچارے کو سخت چوٹ آئی۔ اب تو نساخ بہت گھبرائے کہ خدا جانے کیا افتاد پڑے۔ یہ سوچتے ہی وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ کی عمارت قریب تھی۔ رات کا وقت تھا۔ یہ وہیں جا گھسے اور جب کچھ طلباء نے تعاقب کرنا چاہا تو چالاکی سے چور چور کہہ کر شور مچانا شروع کیا۔ اس ہنگامے سے طلباء کچھ گھبرائے تو نساخ کے لیے یہ موقع غنیمت تھا۔ تیزی سے وہاں سے نکل بھاگے۔ پاس ہی مولوی امداد اللہ خاں صاحب ڈپٹی مجسٹریٹ کا مکان تھا۔ اس میں داخل ہو گئے اور چپ چاپ ایک گوشہ میں پڑ رہے۔ دوسرے دن منھ اندھیرے وہاں سے نکلے۔ جرم کا احساس غالب تھا اس لیے گھر واپس نہ جا سکے۔ خالہ کا مکان قریب تھا وہاں پہونچے اور ڈٹ گئے مگر اس طور کہ صرف کھانے کے وقت گھر پر حاضر رہتے اور بقیہ وقت اِدھر اُدھر گھوم پھر کر گزار دیتے۔ تین دن اسی طرح گزر گئے۔ آخر مولوی عبداللطیف خاں صاحب خود گئے اور ساتھ لے آئے۔ اس واقعہ کے بعد ایک تیسرے مولوی محمد فیض صاحب ان کے پڑھانے کو مقرر ہوئے۔

۱۸۴۷ء میں جب نساخ کی عمر کوئی تیرہ چودہ سال کی تھی ان کو مع ان کے منجھلے بھائی مولوی عبدالباری صاحب کے ہوگلی مدرسہ میں پڑھنے کو بھیجا گیا اور جوڑا گھاٹ کے قریب ایک دو منزلہ مکان ان لوگوں کے رہنے کو کرایہ پر لے دیا گیا۔ یہ مدرسہ اس وقت شباب پر تھا۔ مولوی کرامت علی متولی اور حاجی محمد محسن جیسی معزز شخصیتیں اس وقت موجود تھیں۔ مدرسہ کے مدرس بھی اچھے تھے۔ مولوی رمضان علی اور خواجہ محمد مستقیم جو بالترتیب عربی اور فارسی ادب پڑھاتے تھے اپنے وقت کے فضلائے عصر میں سے تھے۔ خواجہ محمد مستقیم شعر بھی کہتے تھے اور نساخ کو چونکہ شعر و شاعری سے فطری لگاؤ تھا اس لیے بہ نسبت دوسرے اساتذہ کے ان کی طرف زیادہ کھنچے۔ مولوی رمضان علی کے متعلق خود نساخ کا قول ہے کہ وہ شرح ملا جامی پڑھانے میں بے مثل تھے اور ان سے بہتر شرح ملا پڑھانے والا نظر نہ آتا تھا۔ بہت سے طالب علم جا بجا سے شرح ملا پڑھنے کے لیے ہوگلی میں جاتے تھے اور شرح ملا پڑھ کے چلے جاتے تھے۔ خواجہ مستقیم کی صحبت اور تعلیم نے نساخ کی شعری صلاحیت کو کافی جلا بخشی اور یہ خوب خوب شعر کہنے لگے۔ یہاں تک کہ چند ایک لوگ ان کے شاگرد بھی ہو گئے۔ نساخ کے ان دونوں کے شاگردوں میں مولوی محمد اصغر کا نام زیادہ مشہور ہے جو ان کے شاگرد بھی تھے اور دوست بھی۔

فنِ شاعری میں نساخ کے سب سے پہلے باضابطہ استاد مولوی رشید النبی صاحب قاضی ضلع ہوگلی تھے۔ مگر یہ دس بارہ غزلوں سے زیادہ پر اصلاح نہ دے سکے۔ اسی دوران میں ان کا کلام کافی مقبول ہو گیا اور لوگ اصلاح کی غرض سے ان کے پاس آنے لگے۔

نساخ کو فنِ خطاطی سے بھی دلچسپی تھی۔ کلکتہ میں ایک شخص کو خطِ ناخن لکھتے دیکھا تو بہت پسند کیا اور چاہا کہ اس کو سیکھ لیں مگر جب وہ جانے پر طیار نہ ہوا تو یہ خود ہوگلی گئے اور مرزا امیر جان خوش نویس سے جو اس خط کا ماہر تھا اور جس نے شخص مذکور کو یہ فن سکھایا تھا دوستی بڑھائی اور اکثر اس کے یہاں آنے جانے لگے۔ مگر جب حرفِ مطلب کا اظہار کیا تو مرزا امیر جان نے صاف انکار کر دیا۔ یہ خاموش ہو گئے اور کلکتہ واپس لوٹ آئے۔ خطِ ناخن کا ایک پرچہ حاصل کیا اور اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔ پھر آہستہ آہستہ مشق کرنے لگے یہاں تک کہ تھوڑے سے عرصہ میں اتنی استعداد بہم پہونچائی کہ بس خوشنویس کے ہاتھ کا لکھا ہوا خطِ ناخن دیکھ لیتے بجنسہٖ اس کی نقل کر دیتے۔

۱۸۵۷ء میں جب نساخ اپنے گاؤں راجہ پور میں مقیم تھے۔ ایک دن مولوی عبداللطیف خاں کا خط پہونچا کہ مسٹر ہنری بیلی جو ڈھاکہ کے اڈیشنل جج ہیں اپنے سررشتہ میں ایک ملازمت دینے کو تیار ہو گئے ہیں۔ تم ڈھاکہ پہونچو۔ چنانچہ پندرہ نومبر ۱۸۵۷ء کو یہ ڈھاکہ پہونچے اور صاحب مذکور سے ملاقات کی۔ مسٹر بیلی بڑی شفقت و مہربانی سے ان کے ساتھ پیش آئے اور جو گفتگو ان سے کی وہ خود نساخ کی زبان میں اس طرح ہے: "بیلی صاحب نے مجھ سے کہا کہ سررشتہ کا کام آدمی سیکھ نہیں سکتا ہے جب تک اس کے ذمہ کوئی کام نہ ہو چونکہ تم کام نہیں جانتے ہو اس لیے تم کو بڑا عہدہ دیا نہیں جا سکتا

تم کو سررشتہ دس روپیہ کی محرری میں مقرر کیا جاتا ہے اور دس روپیہ میں تمہاری گزر اوقات کسی صورت ہو نہیں سکتی لیکن تمہارے بھائی نواب عبداللطیف بہادر نے کہا ہے کہ وہ تمہارا خرچ برداشت کریں گے۔ لیکن ان کا بھی خرچ بہت ہے اگر وہ تمہارا خرچ نہ دے سکیں تو ہم تمہارا خرچ برداشت کریں گے اور مجھ کو سررشتہ میں کام کرنے کا حکم دیا تاکہ میں ہر طرح سررشتہ کا کام سیکھ جاؤں۔ بعد ازاں میں صاحب موصوف کی کوٹھی سے کچہری میں گیا اور وہاں حلف لیا کہ خود بھی رشوت نہیں لوں گا اور اپنے ساتھ و دوسرے کو بھی رشوت لینے نہیں دوں گا۔ بعد حلف کے میں سررشتہ میں گیا اور سب عملوں سے کہہ دیا کہ میں نے اس طرح پر حلف لیا ہے۔ اگر میرے سامنے رشوت کا ذکر بھی ہو گا تو میں صاحب موصوف سے کہہ دوں گا۔

قیام ڈھاکہ کے سلسلہ میں نساخ کی ملاقات وہاں کے جن امرا و رؤسا و شرفا اور فقرا سے ہوئی انھوں نے قریب قریب سب کا نام اپنی سوانح میں درج کیا ہے جو ایک لمبی چوڑی فہرست ہے۔

غرض ڈھاکہ میں شعر و شاعری کا بڑا چرچا تھا اور مولوی واحد علی صاحب متخلص بہ اور حکیم حیدر علی صاحب اور منشی وارث علی تخلص بہ صبا میرے شاگرد ہوئے۔ ان لوگوں میں حکیم حیدر صاحب بڑے ذہین اور مستعد تھے۔ انھیں دنوں میں منشی ولاور علی صاحب زمیندار ڈھاکہ نے قدسی[1] کی غزل پر غزل کہنے کی فرمائش کی اور میں نے چند شعر کہے۔

اے از خیال عارضت دارم گلستاں در بغل — وز تار زلف پرخمت صد شبستاں در بغل
گر بشنود یک نغمۂ کلک نوا سنج مرا — منقار خود سازد نہاں مرغ خوش الحاں در بغل
ہر تار گیسوئے ترا آمد ہمیں زیر نگیں — یاقوت لبہائے ترا کوہ بدخشاں در بغل
شادی بیاد رنگ رو بیں کہ [illegible] — ہر طفل اشک لالہ گوں دارد گلستاں در بغل
رخسارہ پر نور ترا صبح وطن در آستیں — چشم سیہ مست ترا شام غریباں در بغل

---

[1] قدسی کی غزل یہ ہے۔

دارم دلے اما چہ دل صد گونہ حرماں در بغل — چشمے و خونے در آستیں اشکے و طوفاں در بغل
کو قاصدے از کوئے او تا از نثار مقدمش — ہر طفل اشک از دیدہ ام آید بروں جاں در بغل
بوئے ترا یک صبحدم گر باد آرد در چمن — گل بچہ گیرد تا کند بوئے ترا پنہاں در بغل
برقع ز عارض برفگن یک صبحدم بالا صبا — گردد فراموش صبح را خورشید تاباں در بغل
یارب بلا ثابت قدم از کوئے قاتل گر زناں — من سر بجیب انداختہ او تیغ عریاں در بغل
روز قیامت ہر کسے در دست گیرد نامۂ — من نیز حاضر می شوم تصویر جاناں در بغل

قدسی ندارم چوں شود سودائے بازار جزا
او نقد آمرزش بکف من جنس عصیاں در بغل

کچھ دنوں بعد سررشتہ داری میں جگہ خالی ہوئی۔ نساخ نے اپنے کرم فرما مسٹر بیلی سے سفارش کی درخواست کی۔ بیلی نے حکام بالا کے پاس ان کی سفارش کر دی۔ مگر وہاں مقابلہ کا امتحان پاس کرنا ہوتا تھا اس لیے سفارش نہ چل سکی اور نساخ کو امتحان میں شریک ہونا پڑا۔ کامیاب تو ہوئے مگر پوزیشن کچھ نیچے تھی اس لیے جگہ نہ مل سکی۔ اب انھوں نے ڈپٹی مجسٹریٹی کی طرف توجہ کی جس کی خواہش ان کے دل میں مدتوں سے کروٹیں لے رہی تھی۔

انھیں دنوں کلکتہ میں ایک نہایت قابل افسر سیلی کاول آیا ہوا تھا۔ یہ شخص کم و بیش بارہ تیرہ زبانیں جانتا تھا خصوصاً سنسکرت پر تو عبور کامل رکھتا تھا۔ فارسی اور اردو سے بھی دلچسپی تھی مگر ان پر پوری دستگاہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور اس کے لیے اُسے ایک ایسے قابل آدمی کی ضرورت تھی جو اس کی پوری تشفی سے اس کو پڑھا سکے اور اس سلسلہ میں متعدد منشیوں کو آزما چکا تھا مگر کوئی اس کے معیار پر پورا نہ اترتا تھا یہاں تک کہ کالج (فورٹ ولیم) سے بھی چند منشی طلب کیے گئے مگر سب کے سب "نقلاً اس وجہ سے لوٹا دیے گئے کہ وہ امتحان میں پورے نہیں اترے"۔ نساخ جب پہنچے تو حسب عادت اس نے ان کا بھی امتحان لینا چاہا اور اپنی بیوی سے کہا کہ خمسہ خسرو دے آؤ۔ خمسہ خسرو کا نام سن کے تو بہت گھبرائے اس لیے کہ خمسہ مذکورہ میں سے انھوں نے صرف لیلےٰ مجنوں، شیریں خسرو اور ہشت بہشت کو دیکھا تھا وہ بھی سرسری طور پر مگر چونکہ آدمی باصلاحیت تھے اس لیے زیادہ دقت نہ ہوئی۔ کاول نے مطلع الانوار کے چند اشعار کی تشریح ان سے پوچھی۔ انھوں نے بتلا دی اور ایسی کہ صاحب موصوف خوش ہوئے۔ بعد ازاں دیوان حافظ کے چند شعر پوچھے۔ ان کے معنی بھی بتلائے بعد ازاں دیوان سودا کے اس شعر کے معنے پوچھے۔

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی

نساخ نے اس کے معنی بھی بتلائے۔ اس پر صاحب موصوف نے کہا کہ بعض بعض شخصوں نے دوسرے معنی بتلائے ہیں۔ اس وقت میں نساخ نے ان سے کہا کہ آپ خود فیصلہ کیجیے کہ میں نے جو معنی بتلائے ہیں وہ معنی اچھے ہیں یا دوسرے معنی اچھے ہیں۔ اس پر انھوں نے دونوں معنوں کا ترجمہ انگریزی میں کر لیا اور دونوں کو دیکھتے رہے آخر میز پر ہاتھ مارا اور کہا کہ "آپ کے بتلائے ہوئے معنی اچھے ہیں"۔ غرض اس طرح یہ امتحان میں کامیاب ہوئے اور کاول کے معلم ہو گئے۔ مسٹر کاول کو نایاب اور نادر کتابیں جمع کرنے کا بھی نہایت شوق تھا۔ نساخ کو باضابطہ تاکید کر رکھی کہ اُردو فارسی کی نادر و نایاب کتابیں جہاں سے دستیاب ہوں بصد تلاش کر لایئے اور اس پر ان کو کافی کمیشن دیا کرتا۔ نساخ لکھتے ہیں "اس سے مجھ کو بڑا فائدہ ہوا۔"

انھیں دنوں کی بات ہے کہ ایک دن ان کے جی میں آیا کہ صدر دیوانی کی سیر کر آؤں۔ وہاں میرے چند احباب بھی ہیں ان سے ملاقات ہو جائے گی۔ جب پالکی وہاں پہنچی اور میں پالکی سے اتر کے برآمدہ پر پہنچا اس وقت رسل صاحب کا چپراسی وہاں تھا اس نے کہا کہ آپ رسل صاحب سے ملاقات کیجیے۔ حالانکہ مجھ کو ان سے رنج تھا کہ مجھ کو انھوں نے باوجود سفارش کے مترجمی کا عہدہ نہ دیا تھا۔ غرض چپراسی مذکور کے کہنے سے میں گیا اور چپراسی نے مجھ کو ان سے ملنے کو کہا اس کی غرض یہ تھی کہ اگر میں ان سے ملاقات کروں تو وہ دوسرے دن آکر مجھ سے ایک روپیہ لے جائے گا۔ چپراسی نے صاحب مذکور کو خبر دی۔ صاحب نے مجھ کو بلایا اور بہت تعظیم کی اور ایک کرسی پر کچھ کتابیں تھیں ان کو خود صاحب موصوف نے اپنے ہاتھ سے اٹھا کر میز پر رکھ دیا۔ میں اس کرسی پر بیٹھا اور مجھ سے میرے وطن و خاندان کا ذکر پوچھا۔" پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں اور اس کے بعد مترجمی کا کام ان کو مل گیا اس سے ان کی آمدنی میں کافی اضافہ ہوا۔ ڈھائی تین سو روپیہ ماہوار کمانے لگے۔ بلکہ کسی کسی مہینہ میں تو ایسا ہوا کہ ہزار روپیہ تک آمدنی ہو پہنچ گئی۔

نساخ لکھتے ہیں کہ "اسی طرح مترجمی کرتے چند روز گزر گئے کہ ۱۸۵۷ء مطابق ۱۲۷۳ھ میں غدر ہو گیا۔ کلکتہ میں لوگوں کا عجب حال ہو گیا

کہ بیان سے باہر ہے۔ گوروں میں میرے چند دوست تھے وہ ایسے مضطرب ہوئے کہ شہر چھوڑ کر میرے گاؤں میں جانے کا ارادہ کیا۔ میں ان کو سمجھا کر روزانہ کاول صاحب کے یہاں جاتا تھا اور وہاں سے بالکل صحیح خبریں سن کے احباب سے کہتا تھا۔ ایک دن یہ خبر معلوم ہوئی کہ کل بارک پور کے سپاہی ہتھیار دے دیں گے۔ ورنہ کلکتہ پر تاخت کریں گے۔ ان دنوں بیشتر اہل یورپ شب کو جہازوں پہ جاکے سوتے تھے۔ دوسرے دن میں ایک بجے دن کو گھر سے نکلا۔ گرمیوں کا دن تھا۔ میں نے دو جوڑے کپڑے پہن لیے یعنی دو انگرکھے اور دو پائجامے اور دو موزے اور اپنا دیوان جو اس وقت تک مرتب نہ ہوا تھا اس کو بھی لے لیا۔ اور جتنے روپے میرے پاس تھے سب لے لیے اور گھر سے نکلا۔ اس انتظام کا سبب یہ تھا کہ اگر باغی سپاہی شہر میں آگئے تو پھر شاید میرا گھر میں آنا نہ ہو سکے۔ جو گھر سے نکلا تو دیکھا کہ شہر میں خاک اڑ رہی ہے۔ ہر طرف انگریز سوار اور پیدل دریا کی طرف جا رہے ہیں۔ ایسا حال میں نے شہر کا کبھی دیکھا نہ تھا۔ میں اسی طرح کاول صاحب کی کوٹھی میں گیا تو معلوم ہوا کہ چار بجے تحقیق حال معلوم ہو جائے گا کہ باغیوں نے ہتھیار دے دیے یا نہیں۔ چار بجے سنا کہ باغیوں نے ہتھیار دے دیے۔ اس کے سنتے ہی ایسی خوشی ہوئی کہ کچھ کہہ نہیں سکتا ہے۔" اس کے بعد غدر کا ذکر بالکل ختم ہو جاتا ہے اور صرف اتنا لکھ کر یہ داستان ختم کر دیتے ہیں کہ "شہر میں ہر طرح امن ہو گیا۔"

اس کے بعد ایک ضیغم کی شاگردی اختیار کرنے کا ذکر شروع ہو جاتا ہے جو مختصراً اس طور پر ہے کہ ضیغم کی شاگردی اپنے پہلے استاد حافظ رشید الحق صاحب کے ایما پر اختیار کی گئی۔ حافظ صاحب نے مزید اصلاح دینے سے اس لیے معذرت ظاہر کی کہ وہ نہایت عدیم الفرصت تھے۔ ضیغم کو نساخ نے اول اول ایک زمین کی تین غزلیں دکھلائیں۔ پھر ان سے فن عروض سیکھا اور صنائع بدائع شعری کا علم حاصل کیا، جس میں ضیغم صاحب کو خاص کمال حاصل تھا۔ اس کے بعد علم رمل سیکھا۔ کہتے ہیں ایسا جامع کمالات آدمی نظر نہیں آیا۔ کوئی علم کوئی حرفہ، کوئی فن نہ تھا جس میں ان کو معقول دخل نہ ہو۔ اور بہت سی باتوں میں کمال رکھتے تھے۔ عروض و صنائع و بدائع میں ایسا کمال تھا کہ ان کی ایک غزل بیس بحروں میں تھی اور آج تک اتنی بحروں میں کسی شاعر عرب و عجم کا ایک شعر بھی نظر سے گزرا نہیں۔ طب یونانی و انگریزی و ہندی میں ایسا کمال رکھتے تھے کہ سو سو جز کا نسخہ ترتیب دیتے تھے۔ کیمیا گر تھے جواہرات بنانا جانتے تھے اور استغنا حد درجہ کا تھا۔ بہرحال استاد کے تتبع میں ان کو بھی مختلف علوم و فنون سیکھنے کا خیال ہوا۔ فن خطاطی اور علوم رمل سیکھ ہی چکے تھے۔ اب جفر کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک شخص مرزا غلام حسین کی جو اس زمانہ میں اس فن کا استاد مانا جاتا تھا، شاگردی اختیار کی۔ پھر علم غالب و مغلوب سیکھا۔ اس کے بعد نجوم سیکھی اور نجوم کے بعد فن شعبدہ بازی۔ کہتے ہیں یہ علم انھوں نے اپنے استاد مولوی ضیغم سے سیکھا تھا۔ ضیغم ایک اچھے شعبدہ باز بھی تھے۔

ڈپٹی مجسٹریٹی کی خواہش نساخ کو ایک عرصے سے تھی اور وہ دل ہی میں رہی تھی۔ ادھر ان کے بھائی مولوی عبد اللطیف خاں صاحب اپنی ذاتی کوشش و صلاحیت کی بنا پر روز افزوں ترقی کر رہے تھے اور گورنمنٹ میں اچھا رسوخ بھی پیدا کر لیا تھا۔ نساخ کو لطیف صاحب سے یہ شکایت ہو گئی کہ سگے بھائی ہوتے ہوئے بھی یہ ان کے لیے کچھ کوشش نہیں کرتے۔ درآنحالیکہ حکام کی نظروں میں کافی نیک نام ہیں۔ شاید ان کی طرف سے بے پروا ہیں یا پرانی چشمک رکھتے ہیں۔ یہ خیال روز بروز گہرا ہوتا گیا یہاں تک کہ ایک روز جب مولوی عبد اللطیف خاں صاحب نے ان سے کہا کہ تمہارے پاس جو سرٹیفکیٹ ہے وہ دے دو کہ ڈپٹی مجسٹریٹی کے لیے درخواست کی جائے۔ تو نساخ نے سمجھا کہ بھائی صاحب اسی بہانے ان کی سرٹیفکیٹ بھی چھین لینا چاہتے ہیں اس لیے اول کچھ تامل کیا مگر چونکہ خلاف حکم جانے کی ہمت نہ تھی اس لیے بھیج دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد تاریخ [illegible] ستمبر [illegible] کو ان کا (نساخ) تقرر ڈپٹی مجسٹریٹی کے عہدہ جلیلہ پر ہو گیا اور ضلع باقر گنج معروف بہ بریسال (مشرقی بنگال) میں پوسٹنگ ہوئی۔ تقرری کے چند روز بعد مولوی عبد اللطیف صاحب نے

ایک کتابچہ نساخ کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا کہ اس میں خطوط انگریزی کی نقلیں ہیں، تمہارے متعلق جو خطوط ہیں ان سب کو پڑھ لینا۔ نساخ کہتے ہیں کہ میں نے جابجا بہت سے خطوط انگریزی کی نقلیں بڑے بڑے جلیل القدر انگریزوں کے نام دیکھے جن میں میری نوکری کے واسطے جناب ابوی صاحب قبلہ نے سفارش کی تھی۔ اس سے مجھ کو معلوم ہو گیا کہ وہ برابر میری نوکری کی تدبیر کرتے تھے مگر مجھ سے کہتے نہ تھے اور میں اپنی ناتجربہ کاری کی بنا پر سمجھتا تھا کہ وہ میری نوکری کی تدبیر نہیں کرتے۔ بہرکیف، عہدہ منشی گری پر مامور ہونے پر حسد کرنے والوں کی کمی نہ تھی۔ مختلف لوگوں نے مختلف طریقوں سے ستایا۔ ایک صاحب نے ان کے عہدہ سنبھالنے سے پہلے ان کے افسر انچارج کو یہ کہہ کر بدظن کرنا چاہا کہ نساخ محض جاہل آدمی ہے اور قوانین سے کوئی واقفیت نہیں رکھتا۔ مگر عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد جب یہ اپنے افسر انچارج سے ملے تو وہ ان سے باتیں کرکے بہت خوش ہوا۔ اور اس کے تاثرات بالکل برعکس ہو گئے۔

نساخ ایک دیانتدار اور عدل پسند آدمی تھے۔ زندگی بھر کبھی رشوت نہ لی۔ مگر رشوت کی بھی قسمیں ہوتی ہیں چنانچہ اس کی ایک قسم سے نادانستہ طور پر دوچار ہو کر رہے۔ تفصیل اس اجمال کی خود ان کے الفاظ میں اس طرح ہے کہ "منشی امین الدین (ایک صدر امین) کسی زمیندار یا تعلقدار کے مکان میں کھاتے نہ تھے اور مجھ کو (نساخ) یہ نہایت ناگوار معلوم ہوتا تھا۔ آخر تجربے سے معلوم ہوا کہ بہت اچھا کرتے تھے۔ کیونکہ امین الدین صاحب (ایک رئیس) روزانہ میرے واسطے کھانے کی چیزیں جیسے پلاؤ، قورمہ، کباب، میٹھا چاول، مربہ، مٹھائی، اچار وغیرہ بھیج دیا کرتے تھے اور میں کھاتا تھا۔ آخر ایک مقدمہ ان کا میرے پاس آیا اور مجھ کو معلوم ہوا کہ حق بجانب ان کے نہیں ہے بلکہ ایسا معلوم ہوا کہ انھوں نے جو دستاویزات داخل کی ہیں وہ جعلی ہیں۔ ان کی جانب وکیل سے بارہا کہا کہ وہ لوگ اس مقدمہ کو میری عدالت سے اٹھا کے دوسری عدالت میں لے جاویں۔ لیکن ان لوگوں نے نہ مانا اور جب میں نے چاہا کہ ان کے خلاف فیصلہ کروں تو ہر وقت ان کا بھیجا ہوا پلاؤ، قورمہ میرے خیال میں پھرتا تھا اور خیال آتا تھا کہ اگر ان کے خلاف رائے دوں گا تو وہ کیا کہیں گے اور لوگ کیا کہیں گے۔ لیکن آخر ایسا ہی ہوا کہ میں نے ان کے خلاف فیصلہ کیا اور انھوں نے اپیل بھی نہیں کی لیکن لوگوں سے کہا کہ جناب حضور کے ہاتھ مجھ پر ظلم ہوا۔"

بریسال کے بیشتر مقدمات جیسا کہ اوپر ذکر ہوا نہایت پیچیدہ اور مشکل ہوا کرتے تھے۔ بعض تو اس قدر پیچیدہ ہوتے کہ معمولی فہم و فراست اور قوت فیصلہ سے ان کا فیصلہ کرنا نہایت مشکل ہوتا۔ ایسے حالات میں نساخ کو اپنے علم نجوم سے کام لینا پڑتا تھا چنانچہ فرماتے ہیں کہ "قیام بریسال میں میں نے بہت سے مقدمے بذریعہ نجوم فیصل کیے۔" پھر ان مقدمات میں سے ایک کا ذکر کرکے کہتے ہیں کہ "ایک دن ایک مقدمہ میرے پاس آتش زدگی کا پیش ہوا۔ اس میں ایک شخص نے مدعا علیہ پر دعویٰ کیا تھا کہ مدعا علیہ نے بسبب عداوت کے اس کے گھر میں آگ لگا دی ہے اور آٹھ ہزار روپیہ مدعی کا تباہ کر دیا۔ میں نے جو نجوم سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مدعی کا مکان مع اسباب کے بے شک جل گیا ہے مگر مدعا علیہ نے جلایا نہیں بلکہ آپ سے آپ آگ لگ کے جل گیا ہے۔" پھر تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ بات ٹھیک تھی چنانچہ اسی مطابق فیصلہ ہوا۔

۱۸۶۲ء میں جب ڈپارٹمنٹل امتحان دینے کا وقت آیا تو نساخ کو بڑی دقت پیش آئی کیونکہ تیاری خاطر خواہ نہ ہوئی تھی۔ اس لیے کامیابی مشتبہ تھی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یعنی فیل ہو گئے۔ اس ناکامی نے ان کو بڑا صدمہ پہنچایا اور خود اعتمادی کھو بیٹھے۔ لیکن دوسرے سال کامیاب ہو گئے۔

ایک بار یہ کچھ علیل ہوئے، طبیب نے علاج میں افیون تجویز کر دی۔ یہ کھانے لگے۔ بیماری اچھی ہو گئی۔ مگر یہ مسلسل کھاتے رہے یہاں تک کہ عادی ہو گئے۔ روزانہ صبح و شام کالی مرچ کے برابر افیون کھا جاتے تھے پھر یکایک خیال ہوا کہ بری چیز ہے چھوڑ دینا چاہیے۔ کہتے

شب انگور کی افیون نہیں چھٹتی۔ مگر نساخ کا تجربہ ہے کہ...... پھر یکایک میں نے افیون چھوڑ دی۔ روز اول اعضا شکنی معلوم ہوئی دوسرے روز اس میں کمی ہوئی، تیسرے روز کچھ نہ تھا۔

شاعر جہاں جاتا ہے وہاں کچھ اور کرے نہ کرے مگر شعر و سخن کی ایک محفل ضرور جما لیتا ہے۔ نساخ کی پوسٹنگ جب بریسال میں ہوئی تو مقدمات فیصل کرنے کے ساتھ ساتھ مشق شعر و سخن بھی جاری رہی۔ اور شاگرد بھی بنائے۔ مگر ان شاگردوں میں صرف ایک شخص مسمی الا چی رام متخلص بہ طالب[1] کا تذکرہ اس کتاب میں ملتا ہے جن کی غزلوں پر یہ اکثر اصلاح دیا کرتے تھے۔

چند سال بریسال میں کام کرنے کے بعد جب ان کی انتظامی صلاحیت حکام بالا پر اچھی طرح ظاہر ہو گئی تو ان کی تبدیلی فیروز پور نامی ایک علاقہ میں کر دی گئی۔ فیروز پور اور اطراف بریسال میں ایک نہایت ہی خطرناک جگہ تھی۔ چوری ڈکیتی اور قتل و ڈکیتی کے وارادات بند ہو کے پورے علاقہ میں امن و امان ہو گیا۔ اس کے بعد ۱۸۷۳ء کے لگ بھگ انھیں کلکتے کے کوارٹر میں واپس بلا لیا گیا۔

کلکتہ پہنچتے ہی شعر و سخن کی پرانی محفلیں پھر سجنے لگیں۔ مشاعرے آباد ہونے اور اشعار سنائے جانے لگے ایک مشاعرہ جس کی طرح تھی۔ ؏ کم حدیث لب مست سے اپنا قلم نہیں[2] کا ذکر کر کے کہتے ہیں کہ میں نے اس میں شرکت کی اور یہ طرحی غزل پڑھی ؎

کب فیضیاب شادی وصلت سے ہم نہیں
کب چاک اپنے ہاتھوں سے داماں غم نہیں
دیر و حرم کسی کا کوئی چھال پر پا
تعویذ جب فقط ہے نقش قدم نہیں
ڈالے مجھے جو روکے تو جلے غیر رشک سے
اس بت کی دشمنی بھی محبت سے کم نہیں
کٹتے ہیں غیر حال مرا دیکھ کر
تیغ جفا سے تیری، وفا یار کم نہیں
جاں پاتے ہیں عدو جو ہجراں میں دیکھ کر
ہے چشمۂ حیات مری چشم نم نہیں
کرتا ہے قتل مجھ کو ترا وعدۂ وصال
دم بازِ تیغ تیز سے کم تیرا دم نہیں
آسان ہجر اہل دول ہے جہاں کی سیر
کم خلعت جام سے بھی نقش درم نہیں
اس بت کے ہجر میں جو نکلتے ہیں اشک تھا
سنگ گراں سے کم مری چشم نم نہیں
سیر جہاں جو ہوتی ہے حاصل کتاب سے
حرفوں کا دائرہ بھی کم از جام جم نہیں
حل ہو گیا ہے مسئلۂ جبر و اختیار
ہیں قید زلف یار سے میرا الم نہیں

نساخ ہے جو طائر مضموں کی فکر میں
شہباز تیز پر ہے ہمارا قلم نہیں

مگر ابھی یہ غزل تمام ہونے پائی تھی کہ اہل لکھنؤ کے گروپ میں سے ایک شخص نے ان کو للکارا اور کہا "ذرا غور سے سنئے کہ شعرا اس کو کہتے ہیں" اور پھر ایک مطلع پڑھا۔

---

[1] منشی الا چی رام طالب ابن لالہ گنگا رام ساکن قصبہ امرت سر کے باشندے تھے۔ باپ کا نام سری رام برہمن تھا۔ ۱۸۶۳ء میں تلاش معاش میں بریسال پہنچے۔ شعر و سخن سے اچھی دلچسپی رکھتے تھے۔ نساخ کے شاگرد ہوئے۔

مرتفع جب اپنی آہوں کا دھواں ہو جائے گا
آسماں ایک اور زیر آسماں ہو جائے گا

نساخ لکھتے ہیں کہ اس مطلع کے پڑھتے ہی اہل لکھنؤ نے بڑے زور سے تعریف کی۔ میرے دوست مولوی سید عصمت اللہ انیسؔ[1] کو ناگوار ہوا اور انھوں نے باوجود مخالفت پکار کے کہہ دیا کہ اس مطلع کا پورا مضمون خواجہ وزیر کا ہے اور خواجہ وزیرؔ[2] کا یہ شعر پڑھ دیا۔ (مگر کتاب میں جگہ خالی ہے اور وہ شعر نہیں دیا گیا۔) جس پر ان لوگوں کی بڑی خفت ہوئی۔ پھر موضع مٹیا برج میں ایک مشاعرہ ہوا۔ طرح تھی کہ

آمدِ فصلِ بہاری کی چمن میں دھوم ہے

نساخ نے اس میں شرکت کی اور اس طرح پر تین غزلیں کہیں۔ تینوں کے منتخب اشعار درج ذیل ہیں۔

تیرے جاتے ہی غم و رنج و الم کی دھوم ہے
سینہ سوزاں ہے جگر پر درد و دل مغموم ہے
زلفِ سنبل نے سنواری مستی سوسن نے لی
آمدِ فصلِ بہاری کی چمن میں دھوم ہے
نے صدا سنتے ہیں نے دیدار ہوتا ہے نصیب
گوش ہیں مجبور چشم منتظر معدوم ہے
تشنہ کامی رہ گیا نساخ کی مقتل میں ہم
آبِ خنجر سے نہ ہو تر خشک وہ حلقوم ہے

میرے تیرے عشق کی سب مرد و زن میں دھوم ہے
لیلیٰ و شیریں و قیس و کوہکن میں دھوم ہے
تیری باتیں چٹکیاں لیتی ہیں وہ دل میں کہ بس
اے شکر گفتار [illegible] میں دھوم ہے
تیری زلف و چشم و رخسار و قد و اندام کی
نرگس و سنبل و گل و سرو و سمن کی دھوم ہے
جلوہ گر شب کو ہوا وہ مایۂ عیش و نشاط
کس قدر نساخ کے بیت الحزن میں دھوم ہے

آمدِ فصلِ بہاری کی چمن میں دھوم ہے
بلبلوں کی بیقراری کی چمن میں دھوم ہے
آمد آمد باغ میں ہے آج کس خوش چشم کی
نرگسوں کی انتظاری کی چمن میں دھوم ہے
وہ سمجھتے ہیں ہمارے نساخ آئے باغ میں
آج گل کی دلفگاری کی چمن میں دھوم ہے

---

[1] انیسؔ الصیا باڑہ ضلع ہوگلی کے باشندے تھے۔ باپ کا نام چودھری رحمت اللہ تھا۔ انیسؔ کا سال ولادت ۱۲۳۰ھ ہے۔ نساخ کے شاگردوں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ اور انیسؔ تخلص استاد کے تخلص کی رعایت سے رکھا تھا۔ پہلے مہر تخلص کرتے تھے۔

[2] وزیر ۱۲۰۰ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خواجہ فقیر محمد تھا۔ وزیر کا سلسلہ نسب حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند سے ملتا ہے۔ فن شعر میں آتش کی شاگردی اختیار کی تھی اور ان کے ارشد تلامذہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ جو ایک دوسرے مشہور شاعر مولوی فقیر محمد صاحب گویا کے استاد تھے۔ وزیر نے ۱۲۷۰ھ میں انتقال کیا۔ تاریخ وفات اس مصرع سے نکلتی ہے۔ مزہ شعر کا آج سے جاتا رہا۔ — وزیر کا وہ شعر جو کتاب میں درج نہیں کیا، غالباً یہ تھا۔

کم زمیں سے ہو گیا دود دل سوزاں بلند
آسماں اور ایک اور زیر آسماں ہو جائے گا

ایک جلسہ میں قوال نے حضرت جامی علیہ الرحمۃ کا یہ مطلع پڑھا۔[1]

احن شوقاً الی دیار لقیت فیہا جمال سلمیٰ کہ میرساند نوید لطفش ازاں نواحی بجانب ما

احباب نے نساخ سے تقاضہ کیا کہ آپ بھی اسی زمین اور اسی طرز میں ایک غزل کہیے۔ نساخ نے کہا:

تمہارے ہجر نے ہم کو رکھے نہ شام وصال جلا لطف دل انحوم عطفت آورت وجدا وعلا
فروغ داغ دل عزیزاں ہے نور سودائے زلف پیچاں کشمس حین کبرق مزن کبدر دین اذا تجلا
شب ملاقات یار جانی لیے چلا ساتھ زندگانی نعاہ نفسی نعاہ نفسی فان شرخ الشباب ولا
کشاں کشاں اشتیاق مجھ کو گلی میں لاتا ہے کوئے دلبر لانت کہف وست ذی الاوادن ماسلت اصلا
فزوں ہے اشک سے داغ سینہ ہوا ہے تار مژہ جو پیچاں تلیت والنوء حتاہ علی الحمی اشرق بیک تعلا
کمال انوار رو نے روشن کیا ہے کونین کو گلشن ضلال تحلی ضیاء علیین وعین جنۃ الا انی تعلا

ہمیں تو نساخ ہے یہ غم کہ وہ پری چہرۂ جہان عالم
سریع وصل بطی تحیتی اذا اتی الخلیط ہلا

کلکتہ آئے ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ ۱۸۶۹ء کے اواخر میں ان کا تبادلہ راجشاہی ہو گیا۔ اس مختصر قیام کی دیگر ادبی مشغولیتوں میں دیوان دفتر بے مثال اور اردو ترجمہ پندنامہ عطار موسوم بہ چشمۂ فیض کی اشاعت خاص طور پر قابل ہیں۔

کلکتہ سے راجشاہی جاتے ہوئے مرشد آباد راہ میں پڑتا ہے۔ نساخ ایک دن کے لیے اتر پڑے۔ جن علمائے شہر سے ملاقات ہوئی ان میں منشی اعظم الدین صاحب کاکوروی دیوان نواب ناظم بہادر آف بنگال اور سرآمد علمائے زماں مولانا نجف علی خاں المتخلص بہ خستہ باشندۂ جھجر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خستہ نہایت قابل و فاضل شخص تھے اور بقول نساخ ان کو زبان عربی و دری میں ایسا دخل تھا کہ شاید جہاں میں اور کسی کو نہ تھا۔ اور ان

---

[1] حضرت جامی کی پوری غزل اس طرح ہے۔

احن شوقاً الی دیار لقیت فیہا جمال سلمیٰ کہ میرساند ازاں نواحی نوید لطفی بجانب ما
بود دلم در غم تو گاہی ز دام حسرت زدہ ز لطف یار در حقم رہبر تو آمدت الحبیبا
نسیم جمال تو قبلہ جان حرم کرستہ گلہائی فان سمعنا ایک نسیم دان سمعنا ایک نسیما
ز سر عشق تو بوسہ کی زدہ رباب شوق بیکس نسیم افام حیات ازجان کی سلامت شد آشکارا
اگر نظر بر آری جان دگر تیغ بیکسی ترجمات کہ بر ندارم سر ارادت ز خاک کویا
بہار گلشن قتال کہ انور جہ وحالت درین جدائی فرصت شوق تو دست ہجر آمیختہ اشکبار گویا

بر آستانت گہے جامی عجب ال بودن امید ازاں در
بکنج فرقت نشستہ محروم بکوئے محنت گرفتہ ماوا

کی تصانیف میں سیکڑوں کتابیں ہیں ان میں سے مقامات حریری کی ایک بے نقط شرح بھی ہے۔ راجشاہی پہنچے تو ان سے پہلے کی شہرت وہاں پہنچ چکی تھی۔ یہاں جن لوگوں سے تعلقات بڑھے ان میں مولوی امجد علی خاں ابن چودھری دوست محمد خاں رئیس راجشاہی پیرو میاں صاحب سجادہ نشین اور شاہ برکت بیہاری پوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شاہ صاحب موصوف ایک صوفی منش اور درویش صفت آدمی تھے اور نساخ کو ایسے لوگوں سے فطری طور پر حسن عقیدت اور گرویدگی تھی اس لیے بہ نسبت دوسروں کے شاہ صاحب سے ان کے تعلقات زیادہ گہرے ہوئے۔ یہ ۱۲۶۳ھ کے لگ بھگ کی بات ہے اس وقت نساخ کی عمر کم و بیش اکیس بائیس سال کی تھی۔ نساخ لکھتے ہیں کہ دوران قیام راجشاہی ہی میں میں نے مرزا جہانگیر بخت ابن مرزا اعظم بخت ابن مرزا جواں بخت معروف بہ مرزا جہاندار شاہ ابن شاہ عالم بادشاہ دہلی کی دختر نیک اختر سے شادی کی۔

یہیں کا ذکر ہے کہ ایک روز چند برہمو گیانی[1] حضرات نے ان سے اسلام کے کثرت ازدواج کا مسئلہ پوچھا اور اس کے لیے عقلی دلائل مانگے نساخ کہتے ہیں کہ میں نے وہ دلیلیں دیں۔ اوائل میں کفار سے اور نصرانی سے اور یہودی سے لڑائیاں ہوتی تھیں اس میں مسلمان لوگ مارے جاتے تھے اور وقف پہنچے کہ اوائل اسلام میں تین چار سو مرد اور تین چار سو عورتیں مسلمان ہوئی تھیں بعد ازاں کفار سے لڑائی میں چند مسلمان مرد مارے گئے اور ان کی جورو بیوہ رہ گئیں اور وہ مسلمان ہیں ان کے قرابت دار کفار ان کو بلایا کرتے تھے کہ وہ عورتیں پھر ان کے پاس پہنچ جائیں اور دین اسلام چھوڑ دیں۔ اب ان عورتوں کو چھوڑ دینا مناسب نہیں تھا اور جب ان عورتوں کو چھوڑ نہیں سکتے تو ضرور ہوا کہ ان کے خورد و نوش کی خبر گیری پس ضرور ہوا کہ ان عورتوں سے نکاح کر لینا چاہیے۔ ایسے وقت میں ایک ایک مرد کی دو دو بیویاں ہو گئیں اور اسی طرح چار تک جائز کیا گیا پھر کہا کہ حقیقت میں ایسا ہوا ہے۔ میرے مذہب کی کسی کتاب سے ثابت نہیں ہے لیکن آپ لوگوں کے پوچھنے پر میں نے یہ عقلی دلیل بیان کی اور دوسری عقلی دلیل بہت صاف اور روشن یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو آدمی کو خلق کیا تو اس کی غرض اس سے یہ تھی کہ ابن آدم اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں پس ایک مرد کی اگر ایک بی بی سے زائد بیبیاں ہوں گی تو اولاد زائد ہوگی۔

۱۲۶۵ھ میں نساخ کا تبادلہ جہانگیر نگر ڈھاکہ کے ضلع میں ہو گیا یہاں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں شاہ مزری صاحب شہبازی سجادہ نشین مولوی رشید الدین خاں صاحب جج عدالت جہانگیر نگر اور مولوی امداد علی خاں صاحب اہل صدر امین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ابھی قیام جہانگیر نگر کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ایک دن ان کے گلے سے کچھ خون آیا۔ یہ سخت گھبرائے اور دو مہینے کی رخصت لے کر کلکتہ چلے آئے۔ پہلے تو یہیں علاج معالجہ کرایا لیکن جب حسب دلخواہ فائدہ نہ ہوا تو احباب نے مشورہ دیا کہ دلی چلے جاؤ۔ اس وقت دلی میں حکیم مرتضیٰ خاں اور حکیم محمود خاں صاحب کا طوطی بولتا تھا۔ یہ دلی پہنچے اور دونوں صاحبوں کو دکھلایا چنانچہ ان کے علاج سے مکمل فائدہ ہو گیا۔ پھر یہ پروگرام بنا کہ کچھ دنوں یہاں قیام کیا جائے اور دلی کی سیر کی جائے اس لیے کہ پہلی پہل بار دلی آنا ہوا تھا۔ غرض کچھ ٹھہر گئے اور جب تک یہاں رہے یہاں جن معزز شخصیتوں سے ملاقات ہوئی اور جن کی پر بہار صحبتوں سے یہ لطف اندوز ہوئے ان میں مفتی صدر الدین خاں آزردہ، نواب ضیاء الدین خاں نیر

---

[1] مذہب برہمو گیانی ہے۔ یعنی وہ لوگ جن کو برہما کا گیان یا عرفان حاصل ہو یہ توحید کے قائل ہوتے یعنی خدا اور برہما کو وحدہٗ لاشریک مانتے ہیں جو عبادات کی اصل تسلیم ہے۔ مشہور برہمو گیانیوں میں راجہ جنک، دستری رام چندر جی کے ستسر، اور شری کرشن جی کا نام سرفہرست ہے۔ برہمو گیانیوں کو برہمو سماجیوں سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ یہ اور ہیں اور وہ اور۔ م۔ ح

درخشاں، نواب سعد الدین خاں طالب، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، مولانا الطاف حسین حالی اور میرزا اسد اللہ خاں غالب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مرزا غالب سے ایک ملاقات کا ذکر کرکے نساخ لکھتے ہیں کہ "مرزا غالب نے ایک دن مجھ سے کہا کہ مولوی معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی میری طرح سے سات آٹھ برس کے سن سے شعر کہتے ہوگے۔ میں نے کہا ہاں اور عید کے روز مرزا صاحب نے اپنی مثنوی "ابر گہربار" کے تین چار سو شعر مجھے سامنے پڑھے سن کر یہاں والوں کو بڑا تعجب ہوا کہ مرزا صاحب نے چار پانچ برس سے کسی کے سامنے شعر پڑھے نہ تھے بلکہ کوئی اگر ان کو شعر پڑھنے کو کہتا تو خفا ہو جاتے تھے۔" یہ واقعہ ۱۲۸۳ھ کا ہے۔ غرض اس طرح تین مہینے قیام کرنے کے بعد نساخ اپنے وطن مالوف کو واپس آگئے۔ واپسی میں آگرہ اور کانپور ہوتے ہوئے جب لکھنؤ پہنچے تو سوچا کہ لگے ہاتھوں یہاں کا محرم کیوں نہ دیکھ لیا جائے۔ محرم کا مہینہ قریب تھا۔ یہ سوچ لکھنؤ رکے اور محرم و تعزیہ داری کا لطف اٹھایا۔ لکھنؤ میں جن قابلِ ذکر لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں آفاق صاحب، وارد، واجد علی شاہ اور منشی نول کشور خاص ہیں۔ یہاں نساخ کے اعزاز میں ایک چھوٹا سا مشاعرہ منعقد ہوا جس میں انھوں نے حسب ذیل غزل سنائی۔

تم وہ ہشیار ہو کہ ہشیاروں کو مارا مجھ سمجھے نادان کہیں، نادان نہیں ایسا کوئی
طعن کرتے ہیں عدو میری وفاداری پر خوف اس کا نہیں ہو جائے گا رسوا کوئی
پردۂ دیدۂ دل میں جو نہیں جلوہ نما کیا چھپائیں کہ نہیں آپ سے پردا کوئی
وصل مجھ کو نہ ہوا اور نہ دشمن کو فراق ہائے نکلی نہ مرے دل کی تمنا کوئی
ظلم کرتے ہو تو تم سے خدا سمجھے گا تم سمجھتے ہو کہ گویا نہیں سب کا کوئی
یار و احباب سے نساخ توقع کیسی وہ زمانہ نہیں ہووے جو کسی کا کوئی

اس کے چند روز بعد آپ اپنی ملازمت پر واپس چلے آئے۔ مگر ابھی کچھ ہی روز قیام کر پائے تھے کہ ۱۲۸۲ھ میں آپ کا تبادلہ چھپرہ ضلع سارن ہو گیا اور یہ مالدہ سے چھپرہ پہنچے۔ مگر یہاں بھی چین سے نہ گزری۔ ایک بار تو گنگا کے سیلاب نے پریشان کیا پھر کچھ روز بعد اپنے استاد و کرم فرما خواجہ اکرام احمد صاحب ضیغم کے انتقال پُرملال کی خبر ملی اور پھر چند ماہ بعد خود بیمار پڑ گئے۔ یہ بیماری پہلی کی بہ نسبت زیادہ سخت اور خطرناک تھی چنانچہ انہوں نے پھر رخصت لی اور چونکہ علاج معالجہ کے معاملہ میں دہلی کے طبیبوں کے معتقد ہو گئے تھے اس لیے پھر دہلی کا رخ کیا۔ اللہ نے صحت بخشی اور بعافیت تمام واپس لوٹ آئے۔ اس سفر میں کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی اور ہوتی بھی کیونکر جبکہ صحبت شب کی جلی ہوئی وہ ایک شمع بھی خاموش ہو گئی تھی۔ غالب کی موت نے ساری بزم کو درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ بہر طور جب یہ چھپرہ واپس ہوئے تو ان کا جی وہاں نہ لگا۔ آخر اپریل ۱۸۷۰ء کو انہیں پھر جہانگیر نگر تبادلہ کر دیا۔ یہاں وہ رہ چکے تھے اور وہاں کی آب و ہوا انہیں راس نہ آئی تھی اس لیے یہ پریشان ہوئے تو آپ کے حکام بالا نے انہیں مونگیر بھیج دیا۔ یہاں کچھ چین سے گزری اور لکھنے پڑھنے کا کام بھی جاری رہا چنانچہ دیوان دوم موسوم بہ "اشعار نساخ" اور تذکرہ "سخن شعرا" یہیں مرتب کیا۔ کچھ شاگرد بھی بنائے جن میں منشی دیانت حسین صاحب نبی[1] بہاری، شیخ وزیر علی مسلسل[2] اور شاہ خلیل اللہ خلیل[3] خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مگر چشم فلک کو جو کہتے ہیں ہمیشہ سے کج رہی ہے، غریب نساخ چین

---

[1] نبی، بہار (بہار شریف) کے باشندے تھے۔ والد کا نام شیخ ہدایت علی تھا۔ جن دنوں نساخ کی پوسٹنگ مونگیر میں تھی نبی ضلع اسکول مونگیر میں ہیڈ مولوی تھے۔

[2] مسلسل خاص مونگیر کے باشندے تھے۔ والد بزرگوار کا نام شیخ زاہد علی عرف رمضان علی تھا۔

[3] خلیل، شاہ شرف الدین احمد صاحب یحییٰ منیری معروف بہ مخدوم بہاری کی اولاد میں تھے۔ نساخ جب مونگیر آئے تو یہ سب رجسٹرار مونگیر کے دفتر میں محرر تھے۔

اہلیان سے بیٹھنا بھی آنکھوں نہ بھایا اور ان کو ایسی گردش میں کہ بیچارے سخت پریشان ہوئے۔ واقعہ یوں ہوا کہ ایک بار جب ایک نیا حاکم آیا تو دستور کے مطابق دوسرے افسروں کے ساتھ یہ بھی اس کی پذیرائی کے لیے اس کی کوٹھی پر پہنچے۔ شامت اعمال یہ ہوئی کہ یہ انگریز افسر ان کو پہلے سے جانتا تھا اور ان سے مل بھی چکا تھا۔ اس بنا پر اس کو توقع تھی کہ نساخ اس سے کچھ خاص طور پر ملیں گے۔ ادھر بدقسمتی سے نساخ اس پہلی ملاقات کو بالکل فراموش کر چکے تھے اور اس انگریز افسر کا حلیہ ان کے ذہن سے اتر چکا تھا۔ اس لیے اوروں کی طرح یہ بھی تکلف سے ملے۔ ایک دن معائنہ میں آیا اور فیصلوں میں نقص نکالنے لگا۔ پھر کچھ فیصلے اپنے دفتر میں منگوائے اور سب میں کچھ نہ کچھ نقص نکال نکال کر ایک سخت قسم کی رپورٹ تیار کی اور حکام بالادست کے پاس بھیج دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو فوراً منگیر کا چارج واپس دے دینا پڑا اور سلہٹ چلا آنا پڑا جو نہایت ہی غیر صحت بخش مقام ہے۔ بیچارے نے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے بہت ساری تدبیریں کیں مگر کچھ پیش نہ گئی۔

نساخ جہاں جاتے تھے ان کی دو حیثیتیں ہوتی تھیں، ایک حیثیت افسر، ایک حیثیت شاعر۔ چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا کہ ان کی شاعری کی شہرت خود ان کے پہنچنے سے پہلے یہاں پہنچ گئی اور کچھ روز بعد لوگ شاگردی اختیار کرنے پہنچنے لگے۔ اس گروہ شاگرداں میں خاص طور پر نمایاں نظر آتے ہیں ایک حکیم اشرف علی مست اور دوسرے حاجی عبداللہ صاحب آشفتہ۔ مست دراصل حافظ اکرام احمد ضیغم کے شاگرد تھے مگر چونکہ نساخ سے بھی انھیں خاص عقیدت تھی اس لیے ان کی شاگردی بھی اختیار کی۔

سلہٹ میں جن صوفیائے کرام اور بزرگان دین کے مزارات ہیں، ان میں حضرت جلال مجرد یمنی کا مزار سب سے زیادہ مرجع خلائق ہے۔ کہتے ہیں یہ بزرگ حضرت معین الدین اجمیری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہمعصر تھے۔ بہر نوع ہمارے نساخ کو معلوم ہوا کہ ایک ایسے عالی مرتبہ بزرگ بھی یہاں مدفون ہیں تو اس قدیم عقیدت اور فطری گرویدگی کے سبب جو ان کو صوفیوں اور درویشوں سے تھی، یہ ان کے مزار کی زیارت کے لیے چل پڑے اور جب وہاں پہنچے تو صاحب مزار کے رعب و جلال سے کافی متاثر ہوئے۔

۱۸۶۸ء میں ان کا تبادلہ ڈھاکہ میں ہو گیا۔ اس بار ڈھاکہ میں جن معززین شہر سے ملاقات ہوئی ان میں شاہ ولی اللہ صاحب سجادہ نشین اعظم پورہ، نواب عبدالغنی خاں سی۔ ایس۔ آئی، نواب احسن اللہ خاں بہادر، مولوی عبیداللہ صاحب عبیدی[1] اور سید محمد صاحب

---

[1] عبیدی، اگست ۱۸۳۴ء میں ضلع میدنی پور کے ایک قصبہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ چلے آئے اور بقیہ تعلیم کی تکمیل یہیں سے کی۔ اس کے بعد مدرسہ عالیہ ڈھاکہ میں بحیثیت مدرس داخل ہوئے اور ترقی کرتے کرتے صدر مدرس کے عہدہ تک پہنچے اور اخیر تک اسی عہدہ پر فائز رہے۔ عبیدی عربی اور فارسی کے ایک جید عالم اور شعر و سخن کے استاد تھے۔ فکر شعر زیادہ تر فارسی ہی میں ہوتی تھی، کبھی کبھی اردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ ان کا اردو دیوان جو بہت مختصر ہے ۱۸۸۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔ کہتے ہیں اس فن میں مولوی عبدالرحیم صاحب تمنا گورکھپوری المتوفی، عبدالرحیم وغیرہ کے شاگرد تھے (وہ بھی شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی کے شاگرد اور مولانا شاہ اسمٰعیل شہید کے ہم درس تھے تفصیل کے لیے دیکھئے آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، بہ روایت ملیح آبادی) مگر نواب نصیر حسین خاں صاحب خیال ان کو فریاد عظیم آبادی استاد شاد کا شاگرد بتاتے ہیں۔ عبیدی نثر بھی بہت اچھی لکھتے تھے اور تصنیف و تالیف کا بھی ذوق تھا۔ ان کی کتاب مفتاح الادب، جو تین جلدوں میں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی تصنیفات کے مالک تھے اور بقول مؤلف ارمغان پاک انھوں نے ایک مختصر عمر میں کوئی بارہ کتابیں تصنیف کیں۔ عبیدی خاندان سہروردیہ کے ایک روشن چراغ تھے۔ ۱۸۸۵ء میں ڈھاکہ میں انتقال کیا۔ م۔ ح۔

آزاد[1] خاص ہیں۔ اس مرتبہ ڈھاکہ میں یہ دو حضرات ان کے شاگرد ہوئے ایک منشی احمد حسین وافر، دوسرے مولوی عبدالغفور صاحب زار، وافر مدرسہ محسنیہ ڈھاکہ میں مدرس تھے، ۱۳۰۳ھ میں انتقال کیا۔ زار کا کچھ حال معلوم نہ ہو سکا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نساخ کی شہرت بحیثیت ایک شاعر اور استاد فن کے مسلم ہو چکی تھی اور کم از کم ارض بنگال میں تو کوئی ان کا جواب نہ تھا۔ ان کے اشعار زبان زد ہو چکے تھے اور ان کی غزلیں محفلوں میں گائی جاتی تھیں۔ مثلاً ایک غزل ملاحظہ ہو۔

قابو میں شبِ وصل میں وہ آئے ہوئے ہیں — رخ فق ہے لٹیں بکھری ہیں گھبرائے ہوئے ہیں
آنکھوں کو جھکائے ہوئے شرمائے ہوئے ہیں — کچھ بات مرے دل کی مگر پائے ہوئے ہیں
ادنیٰ یہ شگوفہ ہے مرے داغِ جگر کا — جو پھول ہیں گلزار میں مرجھائے ہوئے ہیں
شاید دلِ عشاق سے پیچ کریں گے — گیسو ترے رخسار پہ بل کھائے ہوئے ہیں
گویا دلِ افسردۂ عشاق ہیں اے جاں — ہاتھوں میں ترے پھول جو کمھلائے ہوئے ہیں
ہنگامہ سا ہنگامہ جو ہے راہ گزر میں — ہمسائے میں شاید وہ کہیں آئے ہوئے ہیں
آجاؤ کہیں جلد خدا را نہ کرو دیر — ہم جان کو لب پر ابھی ٹھہرائے ہوئے ہیں

کاذب ہے تسلی تو تجھے دیتے ہیں تسکیں
اب تک دلِ نساخ کو بہلائے ہوئے ہیں

انھیں دنوں ان کا دیوان سوم موسوم بہ ارمغان، اور گنج تاریخ جس میں صرف تاریخی قطعات ہیں مرتب ہو کر شائع ہوئیں اور انتخاب نقص جو دراصل میر انیس اور میرزا دبیر کے مرثیوں پر ایک طولانی اعتراض ہے مرتب ہوئی اور انہیں دنوں انھوں نے دہلی کا تیسرا سفر کیا اس بار وہاں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں شاہزادہ عبدالغنی المعروف بہ مرزا ارشد گورگانی[2] کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ پتہ نہ

---

[1] مولانا سید محمد صاحب آزاد عرف مجھلے سید صاحب، [illegible] کے قریب ڈھاکہ میں پیدا ہوئے۔ والد بزرگوار کا نام سید سعید الدین حیدر تھا جو رؤساء ڈھاکہ میں اپنا ایک خاص مرتبہ رکھتے تھے۔ آزاد ایک فطری شاعر تھے اور نہایت پرگو۔ اردو اور فارسی دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی ان کے کلام کا مجموعہ "دیوان آزاد" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ پہلے ضیا تخلص کرتے تھے پھر آزاد اختیار کر لیا۔ اردو کلام میں مومن اور غالب کا رنگ نمایاں تھا۔ اساتذہ کے بہت سے اشعار ازبر تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک لاکھ چیدہ ابیات کے حافظ تھے۔ نو عمری میں تسنیم کے شاگرد تھے حضرت غالب سے اصلاح لینے کا موقع ملا تھا۔ ۵۰ سال کی عمر میں بعارضۂ فالج [illegible] میں وفات پائی۔ ڈھاکہ میں مدفون ہیں۔ "م م ح"

[2] مرزا ارشد گورگانی، خلف مرزا علی بہادر ابن شاہزادہ بہادر شاہ خلف حضرت احمد شاہ بادشاہ دہلی ہیں۔ بہادر شاہ ظفر سے آپ کا رشتہ یہ ہے کہ آپ نواب کاشف سلطان بیگم کے حقیقی نواسے تھے جو حضرت ظفر کی بڑی شاہزادی تھیں۔ مرزا ارشد گورگانی قلعہ معلیٰ میں پیدا ہوئے۔ سات برس کے تھے کہ غدر کا واقعہ پیش آگیا اور قلعہ کی سکونت ترک کرنی پڑی۔ حضرت قطب صاحب میں آ رہے اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ پھر [illegible] پنجاب میں ملازم ہو گئے۔ اس کے بعد ریاست فیروز پور چلے آئے اور فیروز پور کالج میں فارسی کے معلم اعلیٰ مقرر ہوئے۔ شعر و سخن کی گود میں تربیت پائی تھی اسی لیے اس سے شغف پیدا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس فن میں اپنے ماموں مرزا قادر بخش صاحب المتخلص بہ صابر سے اصلاح لی جو فن شعر و سخن میں اپنے وقت کے ایک مسلم الثبوت استاد تھے۔ مرزا ارشد گورگانی [illegible] میں پیدا ہوئے اور [illegible] میں انتقال کیا

چل سکا کہ اس مرتبہ کس تقریب سے دلی گئے اور کتنا عرصہ وہاں قیام کیا۔ غالباً سیر و تفریح مقصود تھی اور جلد ہی پلٹ آئے۔ بہرکیف! واپسی کے تھوڑے دن بعد ۱۸۶۱ء میں ان کا تبادلہ بیر بھوم (مغربی بنگال) میں ہو گیا۔ یہاں کے قیام میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہے اور پھر تقریباً سال ڈیڑھ سال بعد ان کو ہوگلی بھیج دیا گیا۔ یہاں وہ پہلے (زمانہ طالب علمی میں) بھی کافی عرصہ رہ چکے تھے اور یہ کوئی نئی جگہ ان کے لیے نہ تھی مگر مولانا کرامت علی جونپوری کی موت نے یہاں کی علمی و ادبی محفلوں کو ایک گونہ ویران کر دیا تھا۔ اس لیے ہوگلی کچھ اجنبی اجنبی سی لگتی تھی اس مرتبہ یہاں جن لوگوں کے ساتھ ان کی صحبتیں رہیں ان میں مولوی اشرف الدین[1] صاحب متولی ہوگلی امام باڑہ قابل ذکر ہیں، جو مولانا کرامت علی کے جانشین تھے۔ کچھ عرصہ رہنے کے بعد ان کی صحت خراب ہونے لگی اور اکثر بیمار رہنے لگے۔ آخر تنگ آکر تبدیلی کے لیے درخواست کی جو منظور ہو گئی اور جون ۱۸۶۴ء میں ان کو ڈھاکہ بھیج دیا گیا۔ اس بار یہ ڈھاکہ میں کوئی تین سال کے قریب رہے۔ اس عرصہ میں ایک بار ان کی ملاقات مولوی کبیر الدین صاحب اڈیٹر اردو گائیڈ کلکتہ سے ہوئی جو کسی غرض سے کلکتہ سے ڈھاکہ آئے ہوئے تھے۔ مولوی کبیر الدین، نامور خاتون جمیلہ راضیہ صاحبہ زوجہ مولوی خدا بخش، بانی اورینٹل پبلک لائبریری، بانکی پور پٹنہ کے والد بزرگوار تھے۔

۱۸۶۷ء میں ان کا تبادلہ میدنی پور میں ہو گیا۔ مگر یہاں کی ہوا راس نہ آئی اور صحت خراب رہنے لگی۔ ایک بار سخت بیمار ہو کر تپ بلغی میں مبتلا ہو گئے اور یہ باعث ہوا ان کے دلی کے چوتھے سفر کا۔ مگر اب تک دلی کافی بدل چکی تھی، چنانچہ نساخ نے اس کو محسوس کیا، فرماتے ہیں: ’’قبل ازیں تین بار دلی گیا۔ اس دفعہ جو دلی گیا تو دیکھا کہ وہاں کے بعض ہندو اور مسلمان انگریزوں کے کپڑے پہننے لگے ہیں‘‘ یعنی انگریزوں کا اثر و اقتدار اچھی طرح نفوذ کر گیا تھا۔ اس سفر دلی میں ان کی ملاقات نواب مرزا خاں داغ دہلوی سے ہوئی اور اچھی بے تکلفی ہو گئی۔ وہاں سے واپس آنے پر دسمبر ۱۸۶۹ء میں ان کو پھر ڈھاکہ واپس بھیج دیا گیا مگر ڈھاکہ پہونچنے کے بعد ابھی گرد سفر بھی دامن سے نہ جھڑی تھی کہ جنوری ۱۸۷۰ء میں پھر تبادلہ کی بات چیت ہونے لگی جو بہرحال کسی طرح موقوف ہو گئی اور چند روز بعد اسی مہینہ میں ان کو یہ خوشخبری ملی کہ نواب عبداللطیف خاں بہادر (نساخ کے سگے بڑے بھائی) کا تقرر بھوپال میں بحیثیت قائم مقام وزیر ریاست بھوپال ہو گیا ہے۔ یہ داستان[2] یہیں پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔

اس کے دو سال بعد ۱۸۸۹ء میں نساخ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ تمام تذکرے نساخ کے اس سال وفات میں متفق ہیں۔ ان کی خود نوشت

---

[1] اشرف الدین احمد، متولی امام باڑہ حسینیہ واقع ہوگلی، خلف نواب سید امیر علی خاں بہادر۔ اشرف الدین جنوری ۱۸۴۴ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ ہوگلی کی متولی شپ سے پہلے نواب واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے متوسل تھے۔ اور شرافت الدولہ کا خطاب وہیں حاصل کیا تھا۔ ۱۸۷۳ء میں مولوی کرامت علی کے انتقال کے بعد حکومت نے امام باڑۂ حسینیہ کا چارج ان کے سپرد کر دیا۔ اور یہ اس کے ساتویں متولی ہوئے۔ تصنیف و تالیف کا بھی ذوق تھا اور چند رسالے ان سے یادگار ہیں۔ (۱) تحفۂ سخن اپنے اردو فارسی کلام کا مجموعہ (۲) نور تن دو فارسی شعرا کا تذکرہ۔ (۳) طبقات حسینیہ و تاریخ امام باڑۂ حسینیہ ہوگلی (۴) حیرت نامہ۔ (۵) دو ورقہ خیال۔ (۶) یادگار وغیرہ۔‘‘ م ح

[2] یہ قلمی نسخہ جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے مجھے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے ذخائر کتب میں ملا۔ میں لائبریرین صاحب ایشیاٹک سوسائٹی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس نسخہ سے یہ چند اقتباسات لینے کی اجازت مرحمت فرمائی اور ساتھ ساتھ اپنے محترم بزرگ مولوی طیع الرحمٰن صاحب (انچارج اُردو پرشین سیکشن) کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے اس مضمون کی تیاری میں میری مدد فرمائی ہے۔

سوانح سے ان کی جن تالیفات و تصنیفات کا پتہ چلتا ہے ان میں دفترِ بے مثال۔ اشعارِ ناسخ۔ ارمغان۔ سخن شعراء۔ گنج تواریخ۔ چشمۂ فیض اور انتخابِ نفیس وغیرہ شامل ہیں۔ مگر ان کے مطبوعہ کلیات اور دیگر تذکروں سے جن مزید تالیفات کا حال معلوم ہوتا ہے اُن میں قطعۂ منتخب شاہدِ عشرت۔ زبانِ ریختہ۔ قندِ پارسی۔ مرغوبِ دل۔ مظہرِ صفا۔ باغِ فکر۔ ترانۂ خامہ اور تذکرۃ المعاصرین کے نام بھی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی تالیفات کی مجموعی تعداد سولہ تک پہنچتی ہے۔ ناسخ کی آل اولاد میں سب سے زیادہ روشن نام ان کے بڑے صاحبزادے مولوی ابوالقاسم محمد صاحب متخلص بہ شمس کا ہے۔ ان کا تاریخی نام مظہرالحق (۱۲۸۴ھ) تھا۔ شمس نے باپ کی تربیت کے بعد فنِ شعر و سخن میں سب سے پہلے جن سے اصلاح لی وہ خود ان کے باپ کے شاگرد مولوی عصمت اللہ صاحب انیخ تھے۔ اس کے بعد داغ کی شاگردی اختیار کی۔ شمس اپنے وقت کے استادوں میں تھے اور کئی اچھے شاگرد پیدا کیے جن میں مولانا رضا علی وحشت مرحوم کا نام سرِفہرست ہے۔ شمس نے ۱۹۰۵ء میں انتقال کیا۔

ترتیب: سید حقیقت الحق

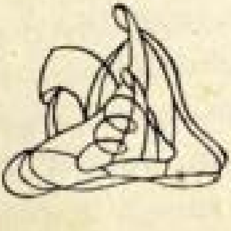

مسولینی

بچپن اور جوانی

میں اسے اپنی زندگی کے ابتدائی مراحل کہوں گا۔

تقریباً تمام تر کتابیں جو میرے متعلق لکھی گئی ہیں۔ ان کے اوّلین صفحات پر میری ولادت کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سب معلومات میری یادداشتوں سے حاصل کی گئی ہیں اور ہاں! میں بھی اپنی آپ بیتی یہیں سے شروع کر رہا ہوں:

میں ۲۹ر جولائی ۱۸۸۳ء کو ورانو ڈی کوستا میں پیدا ہوا۔ یہ ایک مختصر قدیمی پہاڑی گاؤں ہے۔ مکانات پتھر کے ہیں جن کے در و بام پر سورج کی شعاعیں اور سائے مختلف انواع کی رنگ آمیزی کرتے ہیں۔ جس کا نقش ابھی تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔

اتوار کے روز دو بجے بعد از دوپہر میں پیدا ہوا۔ اتفاق سے یہ پرانے کلیسا اور کیمینیٹ کے گرجوں کے سرپرست مقدس کے تہوار کا دن تھا جہاں تک میرے خاندان کا تعلق ہے۔۔۔ اکثر اصحاب نے میرے شجرۂ نسب کی اچھی طرح تحقیق کی ہے۔ میرے حسب و نسب معلوم کرنے میں کسی قسم کی دقت پیش نہیں آتی۔ کلیسائی یادداشتیں اس بات کی مظہر ہیں کہ میرا تعلق ایک نہایت شریف خاندان سے ہے۔ میرے آبا و اجداد کاشتکاری کرتے تھے اور زمین کی زرخیزی کی وجہ سے نہایت فارغ البال تھے۔ میرے خاندان کے قدیم ترین حالات یہ بتاتے ہیں کہ مسولینی خاندان تیرھویں صدی کے دوران میں بولونا کا ایک نہایت معزز خاندان تھا۔ ۱۲۷۰ء میں جیوانی مسولینی اس جنگجو علاقہ کا قائد تھا۔ "فلیری یو گشتی ڈی کا بول" اس حکومت میں اس کا حصہ دار تھا۔ اس کا تعلق بھی پیڈیمو کے ایک خاندان سے تھا اور آج تک اس کا خاندان ممتاز خاندانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

مجھے سترھویں صدی عیسوی کے دوران کے اپنے آبا و اجداد کے متعلق کچھ علم نہیں۔ اٹھارویں صدی میں لندن میں مسولینی خاندان کا ایک فرد رہتا تھا۔ انیسویں صدی کے خاندانی حالات ذرا واضح ہیں۔ میرے دادا قومی فوج کے ایک لفٹیننٹ تھے اور والد ایک لوہار۔۔۔ اس کے ہاتھ سخت، لمبے اور موٹے تھے۔ ہمسائے اسے "الزینڈرو" کے نام سے پکارتے۔ اس کے دل و دماغ میں ہمیشہ اشتراکی جذبات موجزن رہتے۔ وہ دلائل اور نظریوں کا دلدادہ تھا۔ اس کے پاس قومی بہی خواہوں کی آمد و رفت رہا کرتی۔

مسولینی خاندان نے بعض مستقل یادگاریں چھوڑیں۔ بولونا میں ابھی تک ایک بازار اس کے نام سے منسوب ہے اور کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ وہاں ایک برج اور قلعہ بھی اسی کے نام پر تھا۔ فوجی نشانوں کے ذخیرہ میں ابھی تک مسولینی خاندان کا فوجی نشان

موجود ہے۔ یہ نشان بہت خوبصورت ہے۔ ایک زرد میدان میں کچھ سیاہ تصویریں ہیں — بہادری، جرأت اور قوت کی مظہر۔

مانوس مناظر، غبار آلود زمین پر ابرِ بہاراں کی بارش کے بعد سوندھی سوندھی خوشبو اور برآمدوں میں کسی کے پاؤں کی آہٹ۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں جن سے بھولے بسرے بچپن کے نقوش میرے ذہن پر ابھرتے ہیں۔ مجھے ابھی تک وہ سنگلاخ جگہ یاد ہے جہاں میں شام کو کھیلا کرتا تھا۔

مجھے کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں ہے جس سے میرے والدین میرے مستقبل کے متعلق پُرامید معلوم ہوتے ہوں۔ میں کوئی، ہونہار لڑکا نہ تھا۔ میں نے اپنے خاندان میں کسی قسم کا غرور انگیز ارتعاش پیدا کیا اور نہ کبھی جماعت میں اوّل آیا جس سے میرے ہم جماعت مجھ سے حسد کرتے۔

میں کبھی نچلا نہ بیٹھتا تھا — اور میں ابھی تک ویسا ہی ہوں۔ مجھے اس وقت اس امر کا احساس تک نہ تھا کہ کام کے لئے مہلت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ تکان دُور کرنے کے لئے آرام کرنا میرے لیے اسی طرح لایعنی تھا جس طرح کہ اب ہے۔

مجھے اپنی ماں سے بہت محبت تھی۔ وہ خاموش طبع، نرم دل مگر توانا تھی۔ اس کا نام روزا تھا۔ ہماری ماں نہ صرف ہماری تربیت کرتی بلکہ ایک ابتدائی مدرسے میں تعلیم بھی دیتی۔ بنی نوع انسان کے کارناموں کی ابتدائی قدر شناسی کے ایام ہی میں میرے دل پر اس بات کا اثر تھا کہ ہماری ماں کتنی وفاکوش اور اپنے کام کے لیے کتنی مستقل مزاج ہے۔ اسے ناراض کرنا میرے لیے خوف انگیز تھا۔ بچپن میں اپنی شرارتوں اور شوخیوں کے کسی نتیجے کو چھپانے کے لئے اپنی دادی اور ہمسایوں کو بھی ان میں شامل کر لیتا۔ حروفِ تہجی میری دُنیا میں سب سے پہلی دُنیاوی شے تھی اور میں نے انھیں شوق سے یاد کر لیا۔ کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر میرے دل میں مدرسے جانے کا شوق پیدا ہو گیا جو تقریباً دو میل دُور پریڈیپیو میں واقع تھا۔ اس کا استاد میرے والد کا ایک دوست "مارانی" تھا۔ میں ادھر اُدھر گھومتا رہا اور اس کی پروا نہ کی۔ پریڈیپیو کے لڑکوں نے ایک غیر گاؤں کے اجنبی لڑکے کی آمد کو بُرا محسوس کیا۔ انھوں نے مجھ پر پتھر پھینکے۔ میں نے بھی ان کا جواب دیا مگر اکیلا ہونے کی وجہ سے میں اکثر پٹ جاتا۔ میں خواہ کتنا ہی کم حوصلہ تھا مگر میرا جسم یہ سب کچھ برداشت کر لیتا۔ میں چوٹوں کو اپنی ماں سے چھپایا کرتا تاکہ اسے اس دُنیا کا علم نہ ہو جس میں میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ شام کے کھانے پر میں ڈرتے ڈرتے روٹی کے لیے ہاتھ نکالتا تاکہ کہیں میری ننھی سی کلائی کا زخم اس پر عیاں نہ ہو جائے۔ کچھ عرصے کے بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا اب مجھے بہترین ہمعمر دوست مل گئے تھے۔

اسکول سے فارغ ہونے کے بعد میں ایک بورڈنگ اسکول میں داخل ہو گیا۔ یہ فنزا کے شہر میں تھا۔ یہاں مجھے مہذب انسانوں کے حالات سے آگاہی حاصل کرنے کا موقع ملا۔ میرے والد میری تربیت میں کافی دلچسپی لے رہے تھے۔ میری توقع سے زیادہ وہ میرا خیال رکھتے۔ جوں جوں میں جوان اور بالغ نظر ہوتا گیا۔ ہم دونوں مشترکہ مقاصد کے زیرِ اثر ایک دوسرے کے قریب تر ہو گئے۔ غلہ چھاننے کی زراعتی مشین کو پہلی دفعہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا جو میری زراعتی زندگی میں پہلی مرتبہ داخل کی جا رہی تھی۔ میں اپنے باپ کے ہمراہ مشین سازی کا کام سیکھنے کے لیے چلا گیا اور تعمیری اور عملی دُنیا کا ایک جزو بننے میں میں نے ایک خاص سرور محسوس کیا۔

لیکن اپنے باپ کی دکان پر صرف صنعتی کام کرنا ہی ہم دونوں میں ایک مشترکہ امر نہ تھا۔ میرے لیے یہ ضروری تھا کہ ان

سیاسی اور معاشرتی مسائل سے آگاہی حاصل کروں جو اپنے ہمسایوں کی گفتگو میں مجھے صرف لفظوں کی دُنیا معلوم ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ میں جدید سیاسی تخیلات سے مانوس ہو رہا تھا جو کچھ عرصہ بعد اپنا اثر دکھانے والے تھے۔

میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ میرے اردگرد کی مختصر سی دُنیا بیقراری محسوس کر رہی ہے۔ عوام کے دلوں کی گہرائیوں میں تجسس کا تاریک جذبہ موجود تھا۔ سرمایہ دار طبقے کی ناجائز خواہشات عوام پر بارِگراں ثابت ہو رہی تھیں۔

میں ابھی تک آغازِ شباب ہی میں تھا کہ میرے والدین نے غائرانہ صلاح و مشورہ کے بعد میری زندگی کا رُخ ایک نئی طرف موڑ دیا۔ میری ماں نے کہا: "یہ بچہ تو کچھ بنے گا۔" اس فقرے کی گونج میرے کانوں کو ابھی تک سُنائی دے رہی ہے۔

مجھے "فورم پوپولی" کے نارمل مدرسہ میں داخل کرا دیا گیا۔ آخر کار میں نے سند حاصل کر لی اور اُستاد بن گیا۔ لیکن اب مجھے تلاشِ ملازمت کے لئے سفارشی خطوط اور ذی اثر اصحاب کی اعانت کی ضرورت تھی مگر اتفاق سے "ریگو ایمیلیا" کے صوبے میں استاد کے عہدے کے سلسلے میں امتحان ہوا جس میں میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے ایک سال تک کام کیا۔ سال کے آخری روز میں نے ایک مضمون لکھا جس کا عنوان مجھے اب تک یاد ہے "کامیابی کی راہ استقلال ہے۔" افسرانِ بالا نے اس پر میری بہت تعریف کی۔ مدرسہ بند ہو گیا۔ میں گھر واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ جہاں میری محدود شفقت کی ایک مختصر سی دُنیا آباد تھی۔ دولت میرے پاس بالکل قلیل تھی۔ البتہ جرأت میرے اندر موجود تھی۔ آخر میں نے ترکِ وطن کا ارادہ کر لیا اور سرحد عبور کر کے سوئٹزرلینڈ میں داخل ہو گیا۔ (یہاں) زندگی کے مصائب نے مجھے روحانی تقویت دی اور میرے جذبات کو استوار کر دیا اور بتلا دیا کہ کس طرح زندگی بسر کرنا چاہیے۔

فاقہ کشی

سوئٹزرلینڈ میں ایک مزدور کی حیثیت سے میں کام کرتا رہا۔ اس کے علاوہ مجھے جو بھی کام ہاتھ لگ جاتا کر ڈالتا۔ وہاں میں نے پناہ گزیں مہاجرین کی سیاست میں دلچسپی سے حصہ لینا شروع کر دیا۔ مجھے ان دنوں شدید فاقہ کشی کا تجربہ ہوا لیکن میں نے کبھی قرضہ نہیں مانگا اور نہ اپنے احباب یا سیاسی رفقاء سے نظرِ کرم کا ملتجی ہوا۔ میں نے اپنی ضروریات بہت ہی کم کر دیں۔ یہاں میں نے معاشرتی علوم کا بہت شوق سے مطالعہ کیا۔ میں سیاسی مجالس میں حصہ لیا کرتا اور تقریریں کیا کرتا۔ میری دُرشت کلامیاں سوئٹزرلینڈ کے حکام کے لئے ناگوار ثابت ہوئیں اور مجھے لوزان اور جنیوا سے نکال دیا گیا۔

میں وطن واپس آ گیا اور برساگلیری کی پلٹن میں داخل ہو گیا۔ مجھے فوجی زندگی بہت پسند آئی۔ ایک روز کپتان مجھے ایک طرف لے گیا۔ وہ اتنا سنجیدہ تھا کہ مجھے یہ محسوس ہوا جیسے کوئی حادثہ پیش آنے والا ہے۔ اُس نے مجھے ایک تار پڑھنے کے لئے دیا۔ یہ میرے والد کی طرف سے تھا۔ ماں قریبِ مرگ تھی اور اُس نے میری واپسی پر زور دیا تھا۔ میں نے سب سے پہلی گاڑی سے جانے کی کوشش کی مگر میں بہت دیر سے پہنچا۔

ماں بسترِ مرگ پر تھی۔ لیکن اس کے سر کی ایک غیر مرئی حرکت سے میں سمجھ گیا کہ اسے میری آمد کا علم ہو گیا ہے۔ میں نے اُس کے لبوں پر تبسم کھیلتا ہوا دیکھا۔ پھر اس کا سر آہستہ آہستہ جھکتا چلا گیا اور وہ ہستی جو ہمیشہ میرا خیال رکھتی تھی۔ مجھ سے چھین لی گئی۔ میں محبت

دنوں تک کھویا کھویا رہا۔

میں پلٹن میں واپس آگیا۔ میں نے اپنی فوجی ملازمت کے آخری ایام پورے کر لیے اور پھر ——— میری زندگی کا مستقبل غیر یقینی ہو گیا۔

میں دوبارہ استاد ہو کر اونگلیا چلا گیا۔ کچھ عرصہ بعد میں اخبار "جمہور" کے ایڈیٹر سیزر بطیستی کے ساتھ چلا گیا۔

ایک روز میں نے اس مضمون کا مقالہ لکھا کہ اطالیہ کی سرحد "آلا" نہیں، جو اس وقت ہمارے ملک اور آسٹریا کے درمیان پرانی سرحد پر ایک مختصر سا گاؤں تھا۔ اس مضمون کی بنا پر مجھے ویانا کی شاہی حکومت نے آسٹریا سے نکال دیا۔

میں جلاوطنی کا عادی ہو رہا تھا۔ پھر سیلانی بن کر فورلی واپس آگیا۔

میرے اندر صحافتی جذبہ موجود تھا۔ مجھے ایک اشتراکی اخبار کے ادارے میں جگہ مل گئی۔ مجھے اس امر کا احساس ہو گیا تھا کہ اطالوی سیاسی زندگی کے عقدۂ لاینحل کی صرف تشدد ہی گرہ کشائی کر سکتا ہے۔ چنانچہ میں اس تشدد کے بنیادی نظریے کا ترجمان بن گیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد مجھے صندی اشتراکی انقلابی جماعت کا ناؤس گروانا گیا۔ جنگ عظیم سے دو سال قبل "رگیو ایمیلیا" میں ۱۹۱۲ء کی کانگرس کے موقع پر جبکہ میری عمر صرف انتیس سال کی تھی۔ مجھے "آونتی" اخبار کا نگران مقرر کیا گیا۔ اشتراکی جماعت کا صرف یہی روزنامہ تھا جو "میلان" سے شائع ہوا کرتا تھا۔

والد کی وفات

اس نئی ذمہ داری کو سنبھالنے کے لئے میں میلان کو چلا ہی تھا کہ میرے والد کا ستاون برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ اس کے زمانہ کے بہترین سیاسیین اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے۔ وہ غریب ہو کر مر گیا۔ میرا یقین ہے کہ اس کی زندگی کی آخری خواہش یہی تھی کہ عوام کی نظروں میں اپنے بیٹے کی صحیح قدر و قیمت دیکھ لے۔

میرے والد کی وفات نے ہماری خاندانی جمعیت کا خاتمہ کر دیا۔ میلان میں "آونتی" کو سنبھالتے ہی میں اہم سیاسیات میں حصہ لینے لگا۔ میرا بھائی آرنلڈو صنعتی تعلیم حاصل کر رہا تھا اور بہن ایڈوائج کو ایک بہترین شوہر مل گیا۔ اگرچہ ہم منتشر تھے مگر ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات موجود تھے۔

میں نے عامۃ الناس یا کسی فرد کی کبھی مدح و ثنا نہیں کی۔ میں ہمیشہ فتوحات، قربانی، محنت اور خون کی قدر کیا کرتا۔

میں نہایت اطمینان کے ساتھ گھریلو زندگی بسر کر رہا تھا۔ میری بیوی "راشیل" عقلمند اور سلیقہ شعار خاتون تھی۔ جس نے میری زندگی کے تمام حوادثات میں نہایت ہی استقامت اور اطاعت سے میرا ساتھ دیا۔ میری بچی "ایڈا" ہمارے لئے مسرت کا سامان تھی۔ ہمیں کسی چیز کی طمع نہیں تھی۔

جنگ عظیم سے قبل کے یہ سال سیاسی پیچیدگیوں سے معمور تھے۔ اطالیہ نہایت مشکل میں تھا۔ عوام کے لئے بہت سے مصائب کا سامنا تھا۔ "طرابلیتانیا" کی فتح پر توقع سے زیادہ جانی اور مالی نقصان ہوا۔ "گیولیٹی" کی ایک وزارت کے دوران میں ۳۳ فسادات ہوئے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ ہماری سیاسی جماعتوں میں بھی اقتدار حاصل کرنے کے لئے سخت مقابلہ جاری تھا۔

میرا اس وقت بھی یہی خیال تھا اور اب بھی یہی ہے کہ ایک مشترکہ خونی قربانی ہی سے اطالوی قوم میں اتحاد و یک جہتی پیدا ہو سکتی ہے۔ باغیانہ سی — سُرخ ہفتہ — ایک بغاوت نہیں تھی بلکہ ایک غیر منظم تحریک تھی جس کا نہ کوئی رہنما تھا اور نہ کوئی لائحہ عمل۔

ایک کتاب، ایک اُستاد

مجھے کُتب کے مفروضہ اثر پر کچھ یقین نہیں اور نہ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ عظیم المرتبت شخصیتوں کی زندگی یا نفسیات کا گہرا مطالعہ کوئی اثر کر سکتا ہے۔

میں نے صرف ایک ہی عظیم الشان کتاب کا مطالعہ کیا ہے —
اور میرا صرف ایک ہی رفیع الشان اُستاد رہا ہے —
وہ کتاب میری اپنی زندگی ہے اور وہ اُستاد میرا روز مرہ کا تجربہ ہے۔

بعض احباب یہ جاننے کے بہت مشتاق نظر آتے ہیں کہ میں کن کن علوم پر حاوی ہوں۔ انھیں معلوم ہو جانا چاہیے کہ میں نے کبھی اپنے نام یا دل کو کسی خاص مدرسے سے منسوب نہیں کیا اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ میں کتابوں کو زندگی کا صحیح اور درست زاویہ تصور نہیں کرتا۔

میں نے قدیم و جدید اطالوی مصنفین۔ مفکرین۔ سیاسیئین اور ماہرینِ فنونِ لطیفہ کا مطالعہ کیا ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنے ملک کی تحریک احیائے علوم کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ نہایت دلچسپی سے کیا ہے۔ انیسویں صدی کے فنی اور ذہنی تضاد، کلاسیزم اور رومانیت اور ان کے تقابل میں میرے لئے کافی جاذبیت رہی۔

میں نے انقلاب کے تاریخی دور جسے "ری زرجیمنٹو" کہتے ہیں کی اخلاقی اور سیاسی اہمیت کا مطالعہ کیا ہے۔ میں نے ۱۸۷۰ء سے لے کر آج تک اپنے ملک کی ذہنی ترقیوں کا جائزہ نہایت احتیاط سے لیا ہے۔ غیر ملکی مصنفین میں سے میں نے جرمن مفکرین کا بہت مطالعہ کیا ہے۔ مجھے فرانسیسی مصنفین بھی پسند آئے۔ گستاو لیباں کی کتاب "روح الاجتماع" مجھے سب سے زیادہ پسند آئی۔ لیکن جو کچھ میں نے پڑھا ہے یا پڑھ رہا ہوں وہ صرف ایک نقشہ ہے جو میری آنکھوں کے سامنے کھلا پڑا ہے۔

مگر وہ مجھ میں کسی قسم کا انقلاب پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ میں ایک بیباک اطالوی ہوں اور لاطینیت کا دلدادہ۔

جرمن اینگلو سیکسن۔ سلاونیک اور تمام دُنیا کی تاریخ کے ناقدانہ مطالعے سے میں ان نتائج پر پہنچا ہوں۔ میں نے دوسرے براعظموں کی تاریخ کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔

امریکی قوم کی عملی تعمیری زندگی نے مجھ پر بہت اثر کیا ہے۔ امریکی قوم صحیح راستے پر کام کرنے والی دانشمند قوم ہے۔ یہ قوم اقتصادیات کی ماہر ہے جو نئے نئے علوم و فنون ایجاد کر رہی ہے۔ ہر قوم کے ادوار ہوا کرتے ہیں اور ریاستہائے متحدہ کا یہ سنہری دور ہے۔ ان کے رجحانات اور مقاصد کا مطالعہ نہ صرف امریکہ کے لئے بلکہ تمام دنیا کے مفاد کے لئے ضروری ہے۔

جنگ کے میدان میں

میں اس باب میں جنگ کے حالات اور اپنے تجربات و تاثرات بیان کروں گا۔

یہ خیال حماقت پر مبنی ہے کہ یہ جنگ دُنیا میں پہلی جنگ تھی اور یہ ایک بالکل نیا تجربہ ہے۔ جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء کے اقتصادی و اخلاقی اس کے دور میں یکایک شروع ہو گئی تھی۔ رجائیت پسند اشتراکی اور جمہوریت پسند حضرات آج تک یہ یقین کرتے گئے ہیں کہ یہ جنگ بربریت کی طرف اچانک رجوع کی بنا پر تھی۔ حالانکہ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ یہ امر فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ روس نے ۱۹۰۵ء میں جاپان کے ساتھ ایک طویل، خطرناک اور خوفناک جنگ لڑی تھی۔ ۱۹۱۱ء میں جنگِ طرابلس ہوئی۔ ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۳ء کی بلقانی جنگوں سے تمام یورپ کی نگاہیں متحارب اقوام کے انجام پر لگ گئی تھیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ تمام یورپ میں جنگی جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ اس کے لامحدود آثار موجود تھے۔

میں پہلے اپنے حافظے سے کام لیتے ہوئے اپنے تاثرات پیش کروں گا۔ میں اپنی قوتِ حافظہ پر زور ڈالوں گا تاکہ انسانی تاریخ کے اس عدیم النظیر پُر عمل دور کے لامحدود و پیچیدہ واقعات کو اپنے اعمال و افکار کے مطابق پیش کر سکوں۔

آسٹریا ہنگری کے ولی عہد آرچ ڈیوک فرانسس فرڈی ننڈ اور اس کی اہلیہ کے سراجیوو کے مقام پر الم انگیز قتل نے تمام یورپ میں خوف و ہراس پیدا کر دیا۔ یہ یاد رہے کہ میں اس وقت ایک بین الاقوامی اشتراکی روزنامے کا مدیر تھا۔ اس حادثے سے مختلف اقوام کے جذبات مجروح ہوئے۔

فرانسس فرڈی ننڈ اطالیہ کا دشمن تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ ہمیشہ ہماری قوم کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ قیصر نے ولی عہد کے خورد بچوں کی یتیمی کا قصہ چھیڑا اس سے ہمارے جذبات اور بھی مشتعل ہو گئے۔

فرانسیسی اور جرمن اشتراکیین کا اجتماع اور پیرس میں جارس کا قتل ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ میرے نزدیک یہ جنگِ عظیم کا پیش خیمہ تھا۔

یکم اگست ۱۹۱۴ء کو جنگ شروع ہو گئی۔ اطالیہ نے کچھ عرصہ قبل "میثاقِ اتحادِ ثلاثہ" کی تجدید کی تھی۔ یہ کسی سیاسی ضرورت کے بجائے حربی پہلو لیے ہوئے تھی۔ میثاق اس بات کا مظہر تھا کہ اگر کسی اتحادی حکومت پر کوئی غیر حکومت حملہ کرے تو اس اتحادی حکومت کی عملی امداد کی جائے۔ اطالیہ نے سب سے پہلے جو قوت و حریت کا قدم اٹھایا وہ اس کو تسلیم کرنا تھا۔ اسی دوران میں روس نے سربیا کی حمایت کی۔ یہ فرانس کو دعوت تھی کہ وہ آسٹریا ہنگری کے اتحادی جرمن کے خلاف میدانِ جنگ میں کود پڑے۔ میں انگلستان کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ نہایت غور سے اس مسئلہ پر سوچ رہا تھا کہ کیا قدم اٹھائے۔ آخر کار اس نے اپنے اقتدار، وقار اور بنی نوعِ انسان کی خاطر اپنی مضبوط مشینری کو حرکت دی تاکہ جرمنی کے پنجے سے قدیم براعظم کو آزاد کرائے۔ مشرقی فرانس پر جرمن حملے نے اطالیہ میں ایک سنسنی پیدا کر دی۔ جرمنی نشر و اشاعت نے اطالوی عوام پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا جس سے ہماری قوم کے جذبات مجروح ہوئے۔ میں مشتعل ہو گیا۔ اس نشر و اشاعت کے لیے ایک مدبرِ اعظم "پرنس وون بولو" کو بھیجا گیا تھا جو اطالیہ اور روما سے اچھی طرح آشنا تھا۔

اس کا مقصد اطالیہ کے غیر جانبدارانہ رویّہ کو مفید ظاہر کرنا تھا۔

لیکن ہماری قوم جنگ کی طرف رجوع کر رہی تھی۔ میں اس کا حامی تھا۔ دانش مند اور اصول پرست کئی افراد اس بات پر غور کرنے لگے کہ قیصر جرمنی کے سیاسی مقاصد کی امداد اطالیہ اور دُنیا کے مستقبل کے لئے کہاں تک مفید ثابت ہوگی۔ میں نے خود بھی یہی سوال جریدہ "آونتی" میں کیا تھا۔ صرف یہی سوال رائے عامہ کے ایک جزو کو اس امر کا قائل کرنے کے لئے کافی تھا کہ ہمارا جنگ میں فرانس اور انگلستان کی امداد کرنا ممکن ہے۔ سیاسی اسباب و علل کے علاوہ چند جذباتی وجوہ بھی ہمیں مجبور کر رہی تھیں کہ اس جنگ عظیم میں اپنی اشتراکی تحریک کے متعلق اپنے پرانے رویّے پر نظر ثانی کی جائے جو ۱۸۶۶ء کی ہماری آسٹریا سے جنگ کی بنا پر جاری تھا۔

میں نے ایک افتتاحیہ اس مضمون کا لکھا کہ یہ خیال کتنا احمقانہ ہے کہ اشتراکی حکومت کا قیام نسل و رنگ کے قدیم امتیازات اور ملکی اختلافات کی جنگوں کا انسداد کر دے گا۔ اشتراکی مجلس اعلیٰ نے میری اس روش کو دیکھتے ہوئے مجھے آونتی کی نگرانی سے علیحدہ کر دیا۔ مجھے جماعت سے خارج کر دیا گیا۔ میں نے عام اجلاس منعقد کئے۔

میں نے فسطائیوں کا گروہ پیدا کر دیا — نوجوانوں کی ایک جماعت جو اطالیہ کو زبردستی جنگ میں شریک کرنا چاہتی تھی لیکن مجھے اس امر کا احساس تھا کہ میں تب تک اپنے خیالات کا اچھی طرح اظہار نہیں کر سکتا، جب تک میرے پاس وہ جدید حربہ یعنی اخبار نہ ہو۔ میں نے گزشتہ جدوجہد کے اپنے سیاسی رفقا کو اکٹھا کر کے ایک "حربی مجلس" منعقد کی۔ ذوق یقین کے مالک چند جوشیلے احباب نے میلان میں "ڈومو" کے میدان کے پاس "پالو ڈا گیلو یو" کے تنگ کوچہ میں مختصر سے کمروں پر مشتمل ایک بالاخانہ تلاش کر لیا۔ جس کے پاس ہی ایک مطبع تھا جس کا مالک نہایت ارزاں شرح پر ہمارا اخبار شائع کرنے پر رضامند ہو گیا۔

۱۵ نومبر سنہ ۱۹۱۴ء کو "اطالوی جمہور" کا پہلا پرچہ شائع ہوا۔ میں اس اخبار کو آج تک اپنا نازو نعم سے پالا ہوا بچہ کہا کرتا ہوں۔ یہ سنہ ۱۹۱۴ء میں جاری ہوا اور سنہ ۱۹۲۲ء تک میرے لئے پلیٹ فارم کا کام دیتا رہا۔ "اطالوی جمہور" کے میرے سب سے پہلے مقالے نے عوام کے ایک وسیع عنصر کو اس بات کا حامی بنا دیا کہ انگلستان اور فرانس کی حمایت میں اطالیہ جنگ میں شامل ہو جائے۔

ملک میں جذبات عامہ کو اُبھارا گیا۔ گیولیٹی کی مخالفت نے فوری فیصلہ کر دیا۔ جنگ کی حمایت میں میلان کے جوش، روما، جینوا اور نیپلز کے مشتعل جذبات نے ملک معظم وکٹر ایمینول سوم کو مجبور کر دیا کہ وہ اس وقت کے وزیر اعظم گیوو لتی گیولیٹی سے استعفیٰ طلب کرے۔ بعد ازاں اس نے سالانڈرا کو نئی وزارت مرتب کرنے کی دعوت دے۔

نئی وزارت نے جنگ پر آمادگی ظاہر کی۔ اعلانِ جنگ ہوتے ہی میں نے فوجی حکام کو ایک رضاکار کی حیثیت سے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ انھوں نے مجھے رضاکار بھرتی کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ ایک صدمہ تھا۔ خوش قسمتی سے میری باری جلد ہی آ گئی۔ اطالیہ کے اعلانِ جنگ سے صرف تین ہی ماہ بعد یکم ستمبر کو برسا گلیری پلٹن کے عام فوجی کی وردی میں نے پہن لی۔ مجھے لمبارڈی کے علاقہ میں "برسیا" کے مقام پر قواعد کے لئے بھیج دیا گیا۔ یہ جگہ ہوائی حملوں سے محفوظ نہیں تھی۔

مجھے فوراً ہی ایلپس کے پہاڑی علاقہ میں میدان جنگ میں بھیج دیا گیا جو میرے لئے خوشی کا باعث تھا۔ چند ماہ تک میں نے پہاڑی خندقوں میں سخت مرحلے طے کئے۔

مجھے صدر دفتر کی معتمدیت کے لیے منتخب کیا گیا مگر میں نے اس سے بالکل انکار کر دیا اور اس کی بجائے قراولی کی خطرناک مہمات سے حصہ اُٹھایا اور یہی خواہش و آرزو تھی۔ میرے افسر اعلیٰ نے میرے متعلق لکھا کہ جینیٹو مسولینی اقدام جرأت و مردانگی میں پیش پیش رہا ہے۔ چنانچہ میری جنگی خدمات کی بنا پر مجھے چند ماہ ہی میں کارپورل بنا دیا گیا۔

ہماری بٹالین کو "کارسو" جو ۱۹۱۶ء میں مقدمۃ الجیش کی حیثیت سے جارحانہ کارروائی کے لیے بھیج دیا گیا۔ مجھے سپاہیوں کے دستے میں شامل کر دیا گیا جو دستی بم اندازی میں ماہر تھے۔ ہم اپنے دشمن سے بھی کوئی بارہ گز کے فاصلے پر تھے۔

دشمن کی طاقت کو کمزور کرنے کے لئے اطالوی فوج اس پر حملے کر رہی تھی۔ مجموعہ مشکلات کے باوجود ہماری افواج میں مکمل نظم برقرار رہا۔ ۱۹۱۶ء میں ڈیبی کے میدان میں جو حملہ کیا گیا تھا۔ اُسے ہم نے فی الفور پسپا کر دیا۔ کارسو کے فوجی جن میں میں بھی شامل تھا سب کے سب تجربہ کار معلوم ہوتے تھے۔

میرے لئے یہ لازمی ہو گیا تھا کہ وقتاً فوقتاً اخبارات میں اپنے متعلق اطلاعات شائع کراتا رہوں۔ یہ سب کچھ ان افراد کے شکوک کی دھجیاں اڑانے کے لئے تھا جو مجھے کسی عہدہ کا خواہاں خیال کرتے تھے اور میرے دل میں فتح کے امکان کے متعلق شبہات پیدا کرتے تھے۔ میں جمہور میں ایک لامتناہی تفاخر پر اُبھارنے کے لئے مضامین چھپایا کرتا۔ فوجی نظم و ضبط کی بنا پر میں نے ایک فرضی نام اختیار کر لیا۔ اس طرح مجھے دو مقابلے کرنے پڑتے تھے — ایک غیر ملکی دشمن کا جو میرے سامنے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا اور ایک اس بزدل حریف کا جو میرے عقب میں وطن کے اندر موجود تھا۔

۲۲ر فروری ۱۹۱۷ء کی صبح کو سکٹر ۱۴۴ پر دشمنوں کی خندقوں پر بمباری کے دوران ایک ایسا حادثہ پیش آیا جو خندقی زندگی میں روزمرہ کا واقعہ بن چکا تھا۔ ہمارا اپنا ہی ایک دستی بم ہماری خندق میں پھٹ گیا۔ اس میں ہم بیس کے قریب فوجی مقیم تھے۔ ہم سب پر دھواں اور غبار چھا گیا۔ بم کے دھاتی اجزاء سے جسم پھٹ گیا۔ چار ہلاک ہو گئے اور بعض بہت بری طرح مجروح تھے۔

مجھے فوراً ایک ہسپتال پہنچایا گیا جو دشمنوں کی خندقوں سے چند میل کے فاصلے پر تھا۔ اطباء کی استقامت اور قابلیت میرے جسم سے دستی بم کے ۴۴ ٹکڑے نکالنے میں کامیاب ہو گئی۔ گوشت پھٹ گیا تھا۔ ہڈیاں شکستہ ہو چکی تھیں۔ ایک ماہ میں ۲۷ آپریشن کیے گئے اور ان میں سے صرف دو بے ہوشی کی دوائی کی مدد سے عمل میں لائے گئے۔

چند ماہ کے بعد میں نے اپنے آپ کو میلان کے ایک جنگی شفاخانے میں پایا۔ اگست میں میں نے عصا کے سہارے چلنا شروع کر دیا۔ میرے اعصاب اتنے کمزور تھے کہ وہ میرے وزن کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

میں نے اپنے اخبار میں ایک منافق کی جگہ لے لی۔ رُوسی قوت کی ناگفتہ بہ اور ناقابلِ یقین شکست نے ہم پر نئے فرائض عائد کر دیے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ملک میں گمراہ کن نشر و اشاعت کی جا رہی تھی اور اس قابلِ نفرین" زہرآلود تحریک کا نعرہ ایک اشتراکی رکن پارلیمان کا قابلِ ملامت فقرہ تھا کہ "ہم آئندہ سرما سے قبل خندقیں چھوڑ جائیں گے۔"

ان خفیہ قوتوں کا استیصال لازمی تھا جو عوام کے جذبات سے کھیل رہی تھیں۔ نحیف پارلیمانی صورتِ حالات اور قابلِ مذمت اشتراکی نشر و اشاعت ابھی تک تباہ کن حالات کے لئے میدان صاف کر رہی تھیں۔ مجھے اس پر ناز ہے کہ اس سال کے بیباک

ایام میں میرے اخبار نے ملک کی سیاسی زندگی کو اعلیٰ بنا دیا۔ میں نے آخر دم جنگ مقابلہ کرنے کی عملی تحریک شروع کر دی اور پُرجوش پیرایہ میں مرکزی حکومت سے ان اشخاص کے خلاف شدید کارروائی کرنے کا مطالبہ کیا جو جنگ سے کتراتے تھے۔ میں نے ایک رضاکار فوج کی تنظیم کا اعلان کیا۔ اشتراکی جائداد کی ضبطی پر اصرار کیا۔ یہ تحریک آہستہ آہستہ اخبار میں، پھر اجلاس عام اور میدان جنگ کے اجتماعات میں بڑھتی گئی۔

۱۹۱۸ء میں پیاوا کے مقام پر ہم ایک جانباز فوج کے ساتھ مستعد کھڑے تھے۔ دشمن کا بہت نقصان ہوا۔ ایک لاکھ کے قریب ہنگری پیاوا کے میدان میں مارے گئے۔ اس سے بوڈاپسٹ میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔

موسم سرما گزر گیا اور اکتوبر ۱۹۱۸ء میں ہماری اعلیٰ کمان نے اکاون اطالوی ڈویژنوں کے ساتھ آسٹریا کی سرحد پر آخری اور فیصلہ کن حملے کا تہیہ کر لیا۔ آسٹریا ہنگری کی بڑی فوج کو شکست ہو گئی۔ اس کی بحری طاقت کو نقصان عظیم پہنچا۔ ہم نے ٹریسٹ پر قبضہ کر لیا اور ٹرینٹو حاصل کر لیا (ان دونوں مقامات پر آسٹریا ہنگری کا ناجائز قبضہ تھا)

اطالیہ پر فاتحانہ فخر و اطمینان کی کیفیت طاری تھی۔ جنگ نے ہماری توقع سے زیادہ طول کھینچا تھا۔ ہماری دولت میں کمی پیدا کر دی تھی اور ہمارا مستقبل کمزور کر دیا تھا۔ تاہم فتح نے ہمارے قلوب و جذبات کو سرگرم رکھا۔ جنگ نے اپنے ناگزیر صدمات کے علاوہ ہماری زندگی میں شہریت کا عمیق جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ کوئی شخص مجھ سے زیادہ اس کو محسوس نہ کرتا تھا اور نہ کسی شخص نے مجھ سے زیادہ اس میں حصہ لیا تھا۔

آخری چنگاریاں

جنگ کا شعلہ روشن ہوا اور بجھ گیا!

لیکن جنگ کے بعد کے ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء کے سال مجھے اطالوی زندگی کے پُرحزن و تاریک ایام دکھائی دیتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۱۸ء کی نمایاں کامیابی کے بعد ہم فوجی اور مجروحین یہ دلکش خواب دیکھا کرتے تھے کہ ہم ملک میں اتحاد و یک جہتی کی خوبصورت عمارت تعمیر کریں گے مگر اب یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

اگرچہ اشتراکیوں کو دوران جنگ میں ذرا دبا دیا گیا تھا مگر ابھی صلح میثاق ستار کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ انھوں نے جنوری ۱۹۱۹ء میں باغیانہ سرگرمیاں شروع کر دیں۔ ہر جماعت کے دل کی گہرائیوں میں تخریب کا جذبہ سرایت کر گیا تھا۔ مگر روسیہ کے اس طوفان کو روکنے میں مرکزی حکومت یقیناً ناکام رہی تھی۔

۲۳ مارچ ۱۹۱۹ء کو میں نے میلان کے مقام پر اطالوی فسطائی جنگی لائحہ عمل کے اساسی اصولوں کی بنیاد رکھی۔ اطالوی جنگی فسطائیین کا پہلا جلسہ میلان کے مقام پر تجار کے "ایس سیپو یرو" چوک میں ایک ہال کے اندر منعقد ہوا۔ دو دن کے بحث مباحثہ کے بعد صرف چون افراد نے ہمارے لائحہ عمل پر دستخط کئے اور ہماری تحریک کے اساسی اصولوں پر پابند ہونے کا حلف اٹھایا۔

بعض حضرات ایسے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ وہ فسطائی مقاصد نہیں سمجھتے اور چند اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ فسطائیت بغیر کسی

کی کوششوں کے خود بخود پیدا ہو گئی ہے۔ مجھے اس وقت اس امر کا کامل احساس تھا کہ جدید تحریک کا ایک غیر مبہم ضروری لائحۂ عمل مرتب کرنا چاہیے۔ اس لئے میں نے تین تجاویز مرتب کیں۔ سب سے پہلی یہ ہے:

ان فرزندانِ اطالیہ کی خدمت میں جو وطن کی عزت کی خاطر اور آزادیٔ عالم کے لئے شہید ہوئے۔ ان سب کی خدمت میں ۲۳ مارچ کا یہ اجتماع اپنی دلی عقیدت و تہنیت کا ہدیہ پیش کرتا ہے۔

دوسرے اعلان کے ذریعے سے جنگی فسطائیین کو یہ حلف دلایا گیا کہ وہ ہر اس غیر ملکی ملوکیت کا مقابلہ کریں گے جو اطالیہ کے لئے خطرناک ثابت ہو رہی ہو۔

تیسری تجویز میں مستقبل کے نئے انتخابات کے متعلق کہا گیا۔ سب سے آخر میں ہم نے تنظیم کا اظہار کیا۔ یہ خیال میرے لئے دلچسپی کا موجب ہے کہ یہ جلسہ مخالفین کی نظروں سے بچا رہا۔

اطالوی مفاد و لائحۂ عمل کے لئے اطالیہ میں کوئی شخص بھی اتنا نقصان دہ ثابت نہیں ہوا تھا جتنا کہ "نٹی" جو اب برسرِ اقتدار آیا تھا۔ وہ مستقبل کے اطالوی جمہوریہ کی صدارت کے خواب دیکھ رہا تھا۔

جون ۱۹۱۹ء میں جرمنی کے ساتھ میثاقِ صلح کو ورسیلز کے مقام پر مکمل کیا گیا۔ اس واقعہ سے یورپ کے بھیانک خواب کا خاتمہ ہو گیا۔

۱۶ نومبر کے انتخابات ہو گئے اور فسطائیوں کو شکست ہوئی۔ ہمارے ابتلا اب بہت بڑھ چکے تھے۔ عوام کے قلوب کی تہ میں ایک المناک باطل تخیل پرورش پا رہا تھا۔ ان کے دلوں میں بالشویت کی آمد کی بھیانک امید مرتعش تھی۔

نٹی کی قیادت میں اشتراکی اراکینِ پارلیمان کا ایک وفد "پری فیتو" — میلان کے گورنر کے دفتر میں میری اور فسطائی اکابر کی گرفتاری کا مطالبہ لے کر گیا۔ انتظامیہ نے ہماری مجلسِ مرکزیہ توڑ دی۔ ہم میں سے اکثر گرفتار کر لئے گئے اور کئی دیگر جمعیتیں جو بنائی گئی تھیں، وہ غائب ہو گئے۔ رفتہ رفتہ سکون قائم ہو گیا اور میں نے "اطالوی جمہور" کے ذریعے سے اپنے مقصد کی دوبارہ نشر و اشاعت شروع کر دی اور اپنی تنظیم دوبارہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ مشکلات اور وسائل کی کامیابی کی ذرہ برابر پرواہ نہ کرتے ہوئے میں اپنے اخبار کو زندہ رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ غربت کے موٹے موٹے ہاتھ میرا گلا گھونٹ رہے تھے۔ میں اخبار کو بیچ سکتا تھا لیکن میں اسے چلاتا رہا۔ یہ بات غلط ہے کہ میں خارج رہنے کے مقابلے سے قاصر رہا۔

انتخابات کے دوسرے ہی روز مجھے میلان کے صدر ڈاک خانے میں ڈاک کے قوانین کے مطابق ایک منی آرڈر وصول کرنے کے لئے جانا پڑا۔ بالشویک کلرک نے ایک عریاں طنز کے ساتھ کہا کہ میں اپنی واقفیت کراؤں کیونکہ وہ کسی مسولینی کو نہیں جانتا۔ اس بحث کو ڈاک خانے کے ایک بوڑھے کلرک نے بڑھنے سے روک دیا۔ اس نے کہا: "یہ منی آرڈر ادا کر دو۔ احمق مت بنو۔ مسولینی ایک ایسے نام کا مالک ہے جس سے نہ صرف ہم واقف ہیں بلکہ ایک دن تمام دنیا اسے جانتی ہوگی اور اس کی صحیح قدر و منزلت معلوم کرے گی۔"

فرسودہ نظامِ جمہوریت کی جان کنی

اشتراکی فتح کے خلاف اب مخالفانہ آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ اشتراکیوں کی اکثریت تھی

وہ حکومت کے لئے مسلسل پریشانی کا باعث تھے۔ فسطائی لائحہ عمل ہر شخص کی منشا کے مطابق تھا۔ ہم نے مزدوروں اور ملازمین کی ان تمام جماعتوں کو برقی ہدیہ تہنیت بھیجا جو ان تمام سیاسی جماعتوں کی قیادت کے آگے سر تسلیم خم کرنے پر تیار نہیں تھے جو عوام کو فریب و معلس کرکے اور انھیں دغا دے کر اپنی تنخواہیں اور مدح و ستائش حاصل کرنے کے لئے کوشاں تھے۔

(مختلف مقامات پر جلسے منعقد کرنے سے فسطائیت کو فروغ ہوا) مجھے صلح، اتحاد اور عہد نامے کی پیشکش کی گئی۔ میں نے ہر قسم کے عہد ناموں کو ٹھکرا دیا اور اس خیال کو بھی ایک لمحے کے لئے بھی تسلیم نہ کیا کہ ان اشخاص کے ساتھ صلح کی جائے جنھوں نے اطالیہ کو دوران جنگ میں ٹھکرا دیا تھا اور اب اس امن کے زمانہ میں غداری کر رہے تھے۔ اکثر حضرات مجھے نہ سمجھ سکے ــــ یہاں تک کہ وہ بھی جو میرے قریب تھے ــــ میرے اخبار "اطالوی جمہوریہ" کے دو مدیروں نے علیحدگی کی درخواست دے دی۔ انھوں نے مجھ پر یہ الزام لگایا کہ اطالوی جمہوریہ کے ذریعہ جو چندہ فیوم کے مصیبت زدگان کے لئے اکٹھا کیا گیا تھا، اسے میں نے اپنی انتخابی جنگ میں خرچ کیا ہے

اسی اثنا میں اس واقعہ کی بنا پر اشتراکیین اور پادریوں کی ہردلعزیز جماعت نے میرے خلاف انتہائی غیظ و غضب ظاہر کیا میری زندگی کی چھان بین کے لئے جاسوس بھیجے گئے، سپاہیوں اور ذہنیوں کو رشوت دی گئی۔ مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔ تحقیقات کے طول و عرض اور نشیب و فراز میں میرے خلاف کچھ بھی برآمد نہ ہو سکا۔ میں نے اپنے اخبار میں دستاویزات اور تصدیقات شائع کیں جنھیں کبھی بھی تو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

مجھے اس امر پر ناز ہے کہ مجھ پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جاتا ــــ یہاں تک کہ میں خود بھی اپنے پر شبہ نہیں کرتا ــــ اور میری اندرونی اخلاقی قوت ناقابل تسخیر ہے ــــ

فسطائیت بزدلی اور صلح کے گرد آلود بھربھریاں اور تاریک تحقیق کے درمیان جدوجہد میں مصروف تھی۔ نٹی کی حکومت کا میں نشانہ بنا ہوا تھا۔ اس نے میرے پیچھے اپنے شکاری کتے چھوڑ دیے تھے۔ اشتراکیین جو میری اخلاقی و جسمانی قوت سے آگاہ تھے۔ میرے خلاف انتقامی جذبات رکھتے تھے اور مجھے جلا وطن کرنا چاہتے تھے۔ جن دنوں میلان "بے اصول افراد" کے رحم پر تھا۔ میں نے ایک شام کے وقت لیمارڈی بے، وارا ملانو کے صدر میں ڈی ڈودو کے چوک کے قہوہ خانہ میں اپنے آپ کو تن تنہا گھرا ہوا پایا۔ جب کہ میں چائے پی رہا تھا ایک ہجوم کے قریب اشتراکی غنڈے قہوہ خانہ پر چڑھ آئے اور گالیاں اور مغلظات شروع کر دیں۔ مجھے پہچان لیا گیا تھا۔ ہجوم بڑھتا اور مشتعل ہوتا چلا گیا۔ اس سے قہوہ خانہ کا مالک اور خزانچی خاتون جلدی سے جا کر دروازے بند کر آئے۔ اس خاتون نے ان ہنگامی لمحوں کے دوران کے [illegible] مجھے باہر نکل جانے کو کہا۔ کیونکہ میں ان کے مفاد کے لیے ضرر رساں ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے اسے دوبارہ یہ کہنے کا موقع ہی نہ دیا۔ میں نے رہنمایان کی طرف دیکھ کر کہا: "آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ مجھ کو پیٹنا؟ بہت خوب۔ آئیے! لیکن اپنی حفاظت کا خیال کر لیجئے۔ کیونکہ آپکے ہاتھوں میری بے توقیری اور آپ کے ایک ایک گھونسے کے لئے آپ کو گراں معاوضہ دینا پڑے گا۔" وہ واپس چلے گئے اور کچھ فاصلے پر جا کر آخری مرتبہ گالیاں دینے لگے۔

مجھے احساس تھا کہ ہر انسان انقلابات کی ایک جھلک دیکھ سکتا ہے جو کسی انقلاب کا پیش خیمہ تھے۔ کون سا انقلاب؟

میں نے میلان میں فسطائی تحریک کے ذمہ دار زعماء، پو وادی، بالائی اطالیہ، قصبات اور دیہات کے عناصر کو طلب کیا۔

میں نے انھیں سمجھایا کہ اخباری نشر و اشاعت یا شانوں سے ہم کوئی نمایاں فتح حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ لازمی تھا کہ متشدد دشمن کو رزم گاہ تشدد ہی میں شکست دی جائے۔

چمنستانِ فسطائیت

ہمارے ملک میں کوئی بھی متشدد جماعت موجود نہیں تھی۔ اعتدال پسند جماعتوں نے سب کچھ اشتراکیوں کے سپرد کر دیا تھا۔ (۱۹۲۱ء میں) تشدد کی اہم ضرورت قبل ازیں تسلیم کی جا چکی تھی۔ میں نے اپنی عقل سے کام لیتے ہوئے جنگی رسالوں اور دستوں کو جس طرح ترتیب دی وہ اب پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔ انھوں نے تنظیم کا قدم اٹھایا اور جارحانہ کارروائی شروع کر دی۔

عملی جتھوں نے شہر کے مضافات میں تحریک شروع کر دی۔ جہاں پر اشتمالیین اور اشتراکیین کا قبضہ تھا۔ فسطائیین کے فیصلہ کن اقدام نے عملاً اس کے مخالفین کو ان کے گھونسلوں سے نکال کر اڑنے پر مجبور کر دیا۔ مجھے بہت زیادہ کام کرنا پڑا۔ "اطالوی جمہور" کا انتظام میرے ذمہ تھا اور میں ہر صبح کو نہ صرف میلان بلکہ قومی سیاست سے بیدار اطالیہ کے ہر اہم مقام کو سیاسی درس دیتا۔

جس دن ویانا میں قتل و غارت گری برپا ہوئی، اسی دن انارکیوں نے ایک شخص ماسی نامی مجھے قتل کرنے کے لئے میلان بھیجا۔ وہ میرے مکان پر آیا، گھنٹی بجائی اور دیدہ دلیری سے زینے پر چڑھ گیا۔ میری بیٹی ایڈا نے دروازہ کھولا۔ اس نامعلوم آدمی نے میرے متعلق پوچھا۔ اسے "اطالوی جمہور" کے دفتر میں بھیجا گیا مگر وہ نیچے جا کر فورو بوناپارٹ کے چوراستے پر میرا انتظار کرنے لگا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پہلے تیز تیز قدموں سے اور پھر آہستہ آہستہ میری طرف بڑھا۔ وہ لرزہ بر اندام تھا۔ اس نے مجھ سے شکستہ آواز میں پوچھا کہ آیا میں ہی پروفیسر مسولینی ہوں۔ جب میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے کہا کہ وہ مجھ سے گفتگو کرنا چاہتا ہے۔ اس کا انداز اتنا عجیب و غریب تھا کہ میں نے اسے اپنا مدعا بڑی خوشی سے مکمل طور پر بیان کرنے کو کہا۔

کچھ پس و پیش کے بعد اس نے مجھے بتایا کہ وہ بدقسمتی سے اس امر کے لئے بذریعہ قرعہ اندازی منتخب ہوا ہے کہ بریٹا کے پستول سے مجھے نہایت بے دردی کے ساتھ قتل کر دے۔ اُف! انارکسٹ میرے جنازہ کا ارادہ کر رہے تھے۔

سیاسی اُفق پر فسطائی ستارہ طلوع ہو چکا تھا۔ اس امر کے زیر اثر اس وقت کے صدر کونسل نے پارلیمانی رائے شماری سے جماعتوں کی قوت کا اندازہ کرنا مناسب سمجھا اور ماہ مئی میں انتخاب کا اعلان کر دیا۔ نومبر ۱۹۱۹ء میں میں چار ہزار سے زائد رائیں حاصل نہ کر سکا تھا۔ مگر سنہ ۱۹۲۱ء میں میری رائیں سب سے زیادہ یعنی ایک لاکھ اٹھتر ہزار تھیں۔ اطالوی ایوان میں میرے منتخب ہونے پر میرے احباب، رفقا اور معاونین میں زندگی بخش مسرت دوڑ گئی۔

فاتحانہ اقدام

اطالوی سکونتا کے بنک کے سقوط نے ہماری کمزوریاں واضح کر دیں۔ سرمایہ داروں کی مخالف جماعتوں میں جنگ شروع ہو گئی جس سے متوسط الحال طبقہ میں حاسدانہ جنگ کی فضا پیدا ہو گئی۔ دیگر اقوام اپنے ماہرینِ مالیات کی آنکھوں سے ہماری مالی بدحالی کا معائنہ

کر رہی تھیں۔

اطالیہ اپنے کمزور امدادی و دیہاتی بنکوں حد سے زیادہ قابلِ تعریف قناعت اور فیاضی کے ساتھ صرف ایسے خادم کی حیثیت اختیار کر چکا تھا جو ٹوپی اٹھائے بین الاقوامی کانفرنسوں میں دوسروں کے منہ پونچھنے پر مطمئن ہو۔ لیکن فسطائیت کی مضبوط مشینری قبل ازیں حرکت میں آ چکی تھی۔ کوئی بھی شخص اس کی ترقی کو روک نہیں سکتا تھا کیونکہ یہ لازوال حکومت کے قیام کے مقصدِ وحید کی خاطر سرگرمِ عمل تھی۔

انھیں ایام میں فسطائیت کو علیحدہ رکھنے کے لئے چند کوششیں کی گئیں۔ میں نے انھیں قلم کی چند حرکات اور انضباطی کارروائیوں سے ناکام کر دیا۔

۱۹ر جولائی ۱۹۲۲ء کو میں نے پارلیمان میں ایک تقریر کی جس میں یہ اعلان کر دیا کہ فسطائی جماعت حکومت سے اپنا اتحاد منقطع کرتی ہے۔ میں نے اشتراکیین کی دو رنگیوں کو ظاہر کر دیا کہ وہ کس طرح ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے حکومت سے تعاون کرنا چاہتے ہیں۔ اسی دن فکٹا وزارت کو شکست ہو گئی اور فوراً ہی اس کے جانشین کی تلاش شروع ہو گئی مگر اندریں حالات کوئی بھی وزارت کی ذمہ داری اٹھانے کو تیار نہ تھا۔

دستِ چپ کی تمام جماعتوں نے اطالیہ بھر میں ایک عام اسٹرائک کر دی۔ یہ اسٹرائک فسطائیت کے خلاف ایک طرح کا مظاہرہ تھا۔ ان مخالفینِ فسطائیت کی اشتعال انگیزیوں کے جواب میں میں نے اطالوی نقل و حرکت کا دوبارہ حکم دے دیا۔ میلان کے فسطائیین نے "آونتی" کے دفاتر پر حملہ کر کے انھیں جلا دیا جنھیں مخالفین کی جائے پناہ خیال کیا جاتا تھا۔ غلہ کی لاریوں پر قبضہ کر لیا گیا اور اسٹرائک کے اعلان کے باوجود انھوں نے خدمتِ عامہ کا کام زیادہ تندہی کے ساتھ شروع کر دیا۔

مجھے مجبور کیا جا رہا تھا کہ وزارت میں ایک عہدہ لے لوں مگر یہ کتنا احمقانہ خیال تھا۔ فطرتاً مجھے اس اتحادی وزارت سے علیحدہ رہنا چاہئے تھا تاکہ میں وزارت پر اچھی طرح نکتہ چینی کر سکوں۔ میں نے اپنے اخبار کے مقالوں میں حقیقت پر مبنی واقعات کی تکذیب کرنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا: "فسطائیت کا یسوع مسیح کی طرح یہ پہلا دور ہے اور عنقریب ہی سینٹ پال والا دور بھی شروع ہونے والا ہے۔"

میرا اخبار "اطالوی جمہور" اگرچہ اخبار اور مخالفین کے لئے کسی قسم کی کشش کا باعث نہ تھا مگر اب وہ روما کی طرف روانگی کے لئے روحانی اور مادی تیاریوں کا مرکز بن گیا۔

میں نے "فسطائی مجلسِ حربی" — جنگی جماعت — کا اجلاس طلب کیا اور ہم متفقہ طور پر ایک لائحہ عمل مرتب کرنے میں کامیاب ہو گئے، جس کے مطابق سیاہ پوشوں کو روما کی طرف جانے والی مقدس سڑکوں پر نہایت کامیابی کے ساتھ گامزن ہونا تھا۔

فتح روما

اب ہم غیرفانی شہر کی طرف تاریخی یلغار کرنے والے تھے۔

جونہی فسطائی نقل و حرکت اور حملہ کا فیصلہ کیا گیا، عملی کارروائی شروع کر دی گئی۔ مارشل لاء اور فسطائیت کے شدید قوانین افسران کے علاوہ عوام پر بھی نافذ کیے گئے۔

بارکوں اور ڈاک خانوں پر فسطائی حملوں کے نتیجہ کے طور پر دونوں طرف سے گولیوں کی بارش ہوئی۔ اس نے شہر میں خانہ جنگی کا کریہہ منظر پیش کیا۔ میں نے اپنے اخبار کے دفاتر میں ہر قسم کے مدافعانہ ذرائع مہیا کر لیے تھے۔ میں جانتا تھا کہ حکومت اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لیے سب سے پہلا متشددانہ حملہ "اطالوی جمہور" کے دفتر پر کرے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

گولیاں میرے کان کے پاس سے "سن سن" کرتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ شاہی دستے کے بیورو نے آخر کار صلح کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ مختصر سی ابتدائی بات چیت کے بعد یہ طے پایا کہ شاہی دستہ دو سو میٹر پرے ہٹ جائے۔ اس عارضی معاہدہ کے ساتھ ہی مذاکرہ کا آغاز ہوا۔ ایوانِ زیریں اور ایوانِ اعلیٰ کے اراکین اکٹھے ہو کر رات کے وقت "اطالوی جمہور" کے دفتر میں میرے پاس اس جنگ کو ختم کر دینے کے لیے آئے۔

میں نے ان پارلیمانی شخصیتوں کی طرف متبسم نگاہوں سے دیکھا اور انھیں مندرجہ ذیل الفاظ میں جواب دیا:

"بندہ پرور! کسی جزوی یا کلی انقلاب کا سوال نہیں اور نہ ایک وزارت کی جگہ دوسری وزارت مرتب ہونے کا سوال ہے۔ اعلانِ جنگ ہو چکا ہے۔ میں اپنے ملک کی روایات کو برقرار رکھوں گا۔ کسی قسم کی صلح نہیں ہو سکتی۔"

۲۹ر کی شام کو روما سے کوئرنیل نے میرے ساتھ ٹیلیفون پر ایک نہایت اہم گفتگو کی۔ ملک معظم کے اے ڈی کانگ جنرل سیتادینی نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں براہ مہربانی روما آؤں کیونکہ بادشاہ نے صورتِ حالات کا اندازہ کرتے ہوئے میرے وزارت مرتب کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

اگرچہ یہ فتح نہیں تھی مگر ایک اہم ترقی تھی۔ میں نے "پیروگیا" کے مرکز اور میلان کے مختلف سیاہ پوش رہنماؤں سے براہِ راست تبادلۂ خیالات کیا۔ میں نے حکمنامے کی خبر کو "اطالوی جمہور" کی ایک غیر معمولی اشاعت کے ذریعہ مشتہر کیا۔

۳۰ر اکتوبر ۱۹۲۲ء کی رات کو میں نے "اطالوی جمہور" کی نگرانی ترک کر دی اور اپنے اس محبوب اخبار کو اپنے بھائی آرنلڈو کے سپرد کر دیا۔

بعض جوشیلے حضرات کا خیال تھا کہ میں بادشاہ سے ملاقات کے لیے روما ایک اسپیشل ٹرین میں جاؤں۔ میں نے ان سے کہا میرے لیے عام گاڑی کا ایک ڈبہ کافی ہے۔ انجن اور کوئلے فضول ضائع نہیں کرنے چاہئیں۔ اس سفر کے اور ان دنوں کے معمولی واقعات قابلِ ذکر نہیں ہیں۔

چند در چند وجوہات کی بنا پر میں صرف اتنا کہوں گا کہ یہ ملاقات محبت کے جذبات سے معمور تھی۔ میں اپنا اسباب سیدھا ہوٹل میں اٹھا لایا اور کام شروع کر دیا۔

عوام کا جائزہ لینے کے بعد میں نے قومی اصولوں پر وزارت کرنے کا فیصلہ کیا اور اس وقت یہ محسوس کر لیا تھا کہ مستقبل میں میرے لیے وزارت کو پاک و صاف کرنا ضروری ہو جائے گا۔ مگر میں اس بات کو ترجیح دیتا تھا کہ یہ چیز خود بخود آیندہ اثرات کے ماتحت وقوع پذیر ہو جائے۔ لیکن یہ آخری موقع تھا کہ میں نے پرانی اطالوی جماعتوں اور سیاسیین کو دعوت دی۔

نئی وزارت وزراء میں اور حکومت کے سترہ ماتحت میں پندرہ فسطائی، تین قوم پرست، تین اعتدال پسند جماعت راست کے اراکین، ایک پوپولاریز (مذہبی جماعت) اور تین جمہوریت پسند اشتراکی تھے۔

پنجسالہ دورِ حکومت

میں نے اپنی تمام تر توجہ مکمل طور پر تعمیری کاموں کی طرف منعطف کرا دی۔ آج بھی میرے اس طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہیں۔ میں نے ہر قسم کی تفریحات ترک کر دی ہیں۔ صرف کھیل اس امر سے مستثنیٰ ہیں جو میرے قویٰ جسمانی کو چھریرا اور مستعد بنا دیتے ہیں اور میری سنجیدہ زندگی میں کچھ تفریح طبع کا سامان بہم پہنچا دیتے ہیں۔ میں ہر قسم کے کھیلوں کو پسند کرتا ہوں اور ایک ماہر موٹر ران ہوں۔ میں نے نہایت تیز رفتاری سے سفر طے کئے ہیں جو نہ صرف میرے احباب کے لئے بلکہ تجربہ کار موٹر رانوں کی بھی حیرت کا باعث تھے۔ مجھے ہوائی جہاز سے اُنس ہے اور لاتعداد مرتبہ میں نے پرواز کی ہے۔ جب میں حکومت کی ذمہ داریوں کے تفکرات میں محو تھا تو ہوا بازی کی اجازت حاصل کرنے کے لئے صرف چند اسباق باقی رہ گئے تھے۔ ایک دفعہ میں پچاس میٹر کی بلندی سے گر پڑا مگر اس نے میری ہوا بازی کے سلسلے کو منقطع نہیں کیا۔ ایک عالیشان سُرخی مائل بھورے رنگ کے گھوڑے کی سواری میرے لئے دلچسپ تفریح طبع کا باعث ہے۔ میں موسیقی کے پُر سکون لمحات میں بربط بجایا کرتا ہوں۔ میں بڑے بڑے شعراء مثلاً دانتے اور شہرۂ آفاق فیلسوف مثلاً افلاطون کی شاعری و افکار کا مطالعہ اکثر اوقات کیا کرتا ہوں۔

اس کے علاوہ اور کوئی بھی چیز میرے لیے تفریح طبع کا باعث نہیں ہے۔ میں نہ شراب پیتا ہوں اور نہ سگریٹ اور نہ ناچ یا جُوئے میں دلچسپی لیتا ہوں بلکہ مجھے ان لوگوں کی حالت پر رحم آتا ہے جو تضیع اوقات و زر کرتے ہیں۔

میں لذیذ اور بیش قیمت کھانوں کا عادی بھی نہیں ہوں اور نہ ان کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ گذشتہ سالوں سے میرا طعام ایک محتاج کی طرح بالکل سادہ ہوتا ہے۔ زندگی کے ہر لمحہ میں روحانی قوت میری رہنمائی کرتی ہے۔

اس اثنا میں مخالفینِ فسطائیت کے حملے اور سازشیں جاری رہیں۔ مطلع کہر آلود تھا۔ اسے مصائب کے سلجھانے کا سال قرار دیا جا سکتا ہے۔ جب پارلیمان نے اہم قانونی سوالات حل کر دیئے تو میں نے ایوان کی برطرفی کا فیصلہ کر لیا اور تمام اختیارات حاصل کر کے ۶ر اپریل ۱۹۲۴ء کو نئے انتخابات کا اعلان کر دیا۔

۶ر اپریل کی رائے شماری کے نتیجے میں قوم پرستوں کو نمایاں، واضح اور کُل اکثریت حاصل ہو گئی۔

اپریل ۱۹۲۶ء میں جب میں نے "بین الاقوامی اطبا کانگرس" کا افتتاح کیا تھا۔ ایک مخبوط الحواس، آسیب زدہ، متعصب انگریز خاتون نے میری موٹر کے نزدیک آ کر مجھ پر گولی چلا دی جو میری ناک کے نتھنوں میں دھنس گئی۔ صرف ایک سنٹی میٹر کا فرق رہ گیا تھا ورنہ یہ فائر ہلاکت آفریں ثابت ہوتا۔

دوسری سازش جو خطرناک ثابت ہو سکتی تھی ایک نراجی "لیوشی" نامی نے کی۔ وہ آٹھ دن تک روما میں نہایت خطرناک بم لئے پھرتا رہا۔ جب میں پیلازو چیگی جا رہا تھا، تو اس نے میری کار کو پہچان لیا اور اسے دیکھتے ہی مجھ پر بم پھینکا جو کار کے ایک جوڑ پر

ٹک کر واپس زمین پر گر گیا اور میرے گذر جانے کے بعد پھٹ گیا۔

دوسری کوشش رائگاں گئی۔ اشتعال حد سے زیادہ بڑھ چکا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اب مخالفین کی ان قابلِ نفرین حرکات کے سلسلے کا قلع قمع کر دیا جائے۔

قوت کے مظاہرہ کی سخت ضرورت تھی۔ میں نے وزارتِ داخلہ اپنے اختیار میں لے لی اور حکومت کی طرف سے انسدادی قوانین بنا دیے۔ ایسے قوانین جو کسی متحدہ قومیت کے بنیادی اصولوں میں سے ہوتے ہیں۔ میں نے ان مخالف مطابع کا استیصال کر دیا، جن کا کام صرف اشتعال انگیزی تھا۔

تجدیدِ نظام

یہ خیال کرنا غلط ہے کہ میری زندگی میرے موجودہ اور گذشتہ افعال سے علیحدہ کی جا سکتی ہے۔ فسطائی حکومت کا قیام، اور جنگ کے لمحات کا طلوعِ آفتاب سے رات کی گہری گہرائیوں تک پہنچنا اور پھر نئی صبح کی امید پر نئی محنت و مشقت کے لئے کمر بستہ ہونا، یہ سب ایسے امور ہیں جو علیحدہ نہیں کئے جا سکتے۔ میں اسی سلسلے میں منسلک ہوں۔ یہ اور میں دونوں ایک ہی رشتے میں پروئے ہوئے ہیں۔ دیگر اشخاص شاندار پہیوں کے شور میں رومان پنہاں پا سکتے ہوں لیکن میں خواہ کچھ بھی ہوں، میرے نفس اور قسمت نے مجھے ایسا بنا دیا ہے کہ میری آنکھیں، کان، تمام حواس، جملہ تخیلات، تمام وقت اور تمام قوتِ ذہنی خارجی زندگی کے تجربے کے تنے پر مرکوز ہونی چاہییں۔

میری زندگی کا ترانہ تعمیری ترانہ بن گیا ہے۔ میری زندگی کے رومانی اقدامات و حکمتِ عمل اور حکومت کے مستقبل کے رومان بن گئے ہیں۔ میرے لئے ان سب میں تسلی بخش چاشنی اور جھلک موجود ہے۔ اسی لئے جب کبھی میں اپنی چھ سالہ قیادت پر نگاہ ڈالتا ہوں تو ہر مسئلہ کا حل میری اور میرے وطن کی زندگی کا ایک باب معلوم ہوتا ہے۔

میں اس امر سے آگاہ تھا کہ میرا خلوص و وقار کا جدید جذبہ جو میری وزارت کے ہر عمل میں موجود تھا۔ یہ افواہ پھیلا دے گا کہ میں بین الاقوامی سیاسی روایات، تنظیم اور مراتب کو کلیتہً ختم کر دینا چاہتا ہوں۔

کتنی سخت غلطی تھی! اثباتِ قدری کا مطلب بین الاقوامی معاملات میں انقلاب پیدا کرنا نہیں ہوتا۔ ہمارا یہ مطالبہ تھا کہ ہماری وسیع النسل مضبوط قوم کے امکانات کا صحیح اندازہ لگاتے ہوئے اطالیہ کو بہتر درجہ دیا جائے تاکہ ہماری حقیقی حیثیت برقرار ہو جائے۔

میری خارجی حکمتِ عمل بین الاقوامی اقتصادی حالات کے زیرِ اثر ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے ۱۹۲۳ء میں اکثر اقوام کے ساتھ سیاسی مصلحتوں کے ماتحت کئی اقتصادی عہدنامے کئے۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ امن اور پُرسکون بین الاقوامی تعلقات کے لئے ہمارے مواثیق اور ہماری مساعی کے باوجود مجھے مخالفِ امن کہا جاتا ہے۔

دنیا میں اطالیہ کی پُرسکون حیثیت کی دوبارہ تعمیر کے لئے اور ہمارے اقتصادی مسائل کو سلجھانے کے لئے ہر قسم کے نوآبادیاتی علاقوں کو کماحقہ ترقی دینے کے لئے میں نے مسلسل شبانہ روز نہایت تن دہی سے محنت کی ہے۔ لیکن یہ خیال غلط ہے کہ میری زندگی اتنی تن آسان تھی کہ صرف بین الاقوامی اور اقتصادی مسائل تک محدود رہی۔

حکومت کی اقتصادی اور مالی حالت کو بہتر بنانے کے بعد میں نے انفرادی پیداوار کو بڑھانے کی کوشش کی۔ میں نے قانونِ وراثت ایسے اکثر بنیادی حقوق قائم رکھے۔

فسطائی حکومت اور مستقبل

ہم مصیبت سے بچ نکلے تھے۔

جدید فسطائی تہذیب کی جدتیں اور تجربات تمام دُنیا کے لئے دلچسپی کا باعث ہیں اور فسطائیت اب سرکاری جماعت کی حیثیت رکھتی ہے۔

روسی اشتمالی یہ خواب دیکھا کرتے ہیں کہ سرمایہ کو دُنیا سے یکسر خارج کر دیا جائے مگر ہم نے ایسا نہیں کیا بلکہ ہم اسے پیداوار کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

میں نے اپنی کوششوں کو صرف اس حد تک محدود نہیں رکھا کہ اطالوی زندگی کو ظاہری زیب و زینت سے آراستہ کروں بلکہ چاہتا تھا کہ اطالوی زندگی کی گہرائیوں تک اثر ڈالوں۔

مدارس کے مجلاً ارتقائی مدارج کا مطالعہ کر کے میں نے ان کی از سرِ نو تنظیم کا اصلاحی کام کیا۔

حکومت کی مسلح فوجوں کی حالت ۲۱-۲۰-۱۹۱۹ء میں ابتر ہو گئی تھی۔ حالات یہاں تک خراب ہو گئے تھے کہ ان اعتدال پسند دنوں میں وزیرِ جنگ نے ایک حکم نامہ صادر کر دیا کہ کوئی فوجی افسر فوجی لباس پہن کر پبلک میں نہ آئے اور مسلح رہنے سے اجتناب کرے تاکہ غنڈوں اور بازاری شوریدہ سر افراد کا تختۂ مشقِ ستم نہ بنے۔

یہ بہتر تھا کہ ملک کی خاطر اس ستم کو جلدی دُور کر دیا جائے۔ چنانچہ فسطائیت اس معاملہ میں نجات دہندہ ثابت ہوئی۔ آج حکومت کی مسلح قوتوں کو یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ حقیقی طور پر قوم کی محافظ و نگہبان ہیں اور قوم کے لئے قابلِ فخر ہیں۔

بحری طاقت کے سلسلے میں بھی یہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔ اس کی دوبارہ تنظیم کی گئی۔

۱۹۲۳ء میں میں نے جماعت کا داخلہ بند کر دیا اور اس کے بعد نہایت احتیاط کے ساتھ نوجوانوں کو تعلیمی اداروں میں سے انتخاب کیا۔ اس لائحہ عمل سے عدیم النظیر نتائج نکلے اور جماعت کو کبھی بھی کسی خطرناک بحران کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

میں یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ کلیسا کے اعلیٰ طبقات نے میرے کام کو کبھی نہیں سراہا جس کی وجہ غالباً سیاسی وجوہات ہیں۔ میرا کام کچھ آسان اور سہل نہ تھا۔ ہماری استعماریت نے مذہب کے خلاف ایک پیچیدہ جال پھیلا دیا تھا۔ اس نے خیالات پر اثر کیا، اور مطابع، مدارس، محکمہ جات انصاف اور بعض اہم فوجی قوتوں پر بھی اپنا اثر کیا۔

صرف یہی ایک واضح مثال یہ ظاہر کر دے گی کہ حالات کہاں تک پہنچ چکے تھے۔ فسطائی انقلاب کے بعد ۱۶ نومبر ۱۹۲۲ء کو میں نے پارلیمان میں جو تقریر کی تھی اس کے آخر میں میں نے اپنے مشکل کام کے لئے خُدا سے مدد کی دُعا کی تھی۔ یہ فقرہ اس وقت کے حالات کے ماتحت ایک ناموزوں فقرہ تھا کیونکہ اطالوی پارلیمان جو اطالوی استعماریت کا میدانِ عمل بنی ہوئی تھی۔ وہاں خُدا کا نام لینا

ایک طویل عرصے سے محروم تھا۔ یہاں تک کہ ہر دو عزیز جماعت کو ــــ جو کیتھولک جماعت ہونے کی دعویدار تھی۔ اسے بھی کبھی خدا کا ذکر کرنے کا خیال تک نہ آیا تھا۔ اس قسم کا دلیرانہ انقلاب میرے ہی حصہ میں تھا اور وہ بھی انقلاب کے ایک نازک دور میں۔ صداقت کیا ہے؟ یہی کہ کسی عقیدہ کو علانیہ اختیار کرنا قوت کی ایک علامت ہے۔

مذہبی جذبہ ایک دفعہ پھر پیدا ہو گیا ہے۔ گرجوں میں لوگ پھر جوق در جوق جاتے ہیں اور مذہبی رہبروں کی پھر عزت کی جاتی ہے فسطائیت نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے اور کر رہی ہے۔

سرِ راہے

بعض قارئین کرام میری سوانح عمری کے ان اوراق کو شاید میری زندگی کی مکمل داستان سمجھیں مگر ان کا یہ خیال غلطی پر مبنی ہے۔ یہ ایک عبث خیال ہے کہ کوئی شخص ۴۵ برس کی عمر میں اپنی معرکہ آرا زندگی کو ختم کر سکتا ہے۔ میں ۳۹ برس کی عمر میں بغاوت کا رہنما اور حکومت کا افسرِ اعلیٰ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اپنے فرائض کو سرانجام دینا تو کجا میں نے ان کا آغاز بھی نہیں کیا۔

میری زندگی کا بہترین دور اب شروع ہوا ہے۔ میں اس بات پر نازاں ہوں کہ میں نے فسطائیت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کر دیا ہے۔ میری یہ خواہش ہے کہ اطالوی جوش کے ساتھ ہماری قوم گزشتہ سالوں بلکہ گزشتہ صدی کے نقصانات کی تلافی کرے۔ ہماری محافظ ہماری جماعت ہے۔

میں نے اپنے دل میں خود پسندی کا ہر جذبہ ختم کر ڈالا ہے۔ میں دیگر بہی خواہانِ وطن کی طرح اطالیہ کی خدمت کو مقدم رکھتا ہوں اور اپنے آپ کو ایک خادم سمجھتا ہوں۔ مجھے اس چیز کا احساس ہے کہ تمام اطالیہ مجھے اچھی طرح سمجھتا ہے اور مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں اس امر سے بھی آگاہ ہوں کہ صرف انھیں اشخاص سے محبت کی جاتی ہے جو بغیر کسی کمزوری یا غلطی کے بے غرض اور سچے دل سے رہنمائی کرتے ہیں۔

(تلخیص: نسیم عباسی)

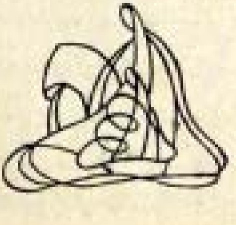

انعامی بونڈ

انعامی بونڈ سال میں چار مرتبہ جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر کی ۱۵ تاریخ کو معقول انعامات حاصل کرنیکا موقعہ دیتے ہیں۔

ہر سلسلہ میں ۱۳۶ نقد انعامات — بیس ہزار سے لے کر سو روپے تک — پیش کئے جاتے ہیں۔

ہر سلسلہ کے انعامی بونڈ خریدیئے!
اپنے بونڈ اپنے پاس رکھیئے — اور قسمت آزمایئے!

کیا معلوم اب کے آپ انعام جیت لیں!

تمام منظور شدہ بینک اور ہیڈ اور سب پوسٹ آفس انعامی بونڈ فروخت کرتے ہیں

انعامی رقم پر انکم ٹیکس معاف!

آج ہی
خریدیئے!

کنبہ کیلئے بچایئے • قوم کیلئے بچایئے

C.D.N.S. 194/180

PRESTIGE

اعلیٰ قسم

بہترین ذائقہ

مینگو اسکوئش
لیمن اسکوئش
اورنج اسکوئش
لائم جوس کارڈیل

تیار کنندگان

F.P.I.

گورنر شیلڈ یافتہ

MANGO SQUASH

فوڈ پروسیسنگ انڈسٹریز لمیٹڈ
نصرپور پشاور

ایجنٹس:

(۱) برائے مغربی پاکستان: میسرز محبوب ٹریڈرز۔ ۲۲ سایونگ روڈ۔ نیلا گنبد۔ لاہور
(۲) برائے کراچی: میسرز ایم صادق اینڈ کو۔ اولڈ پولیس لائنس۔ صدر۔ کراچی
(۳) برائے مشرقی پاکستان: میسرز دی پاک بے کمپنی لمیٹڈ۔ ۸۱ - ۷ موتی جھیل روڈ۔ پوسٹ آفس ماری۔ ڈھاکہ
(۴) برائے انگلستان: میسرز نگوری والا امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ (این۔ سی) لمیٹڈ۔ ایکسچینج بلڈنگ۔ کوائے سائیڈ نیوکیسل۔ اپان ٹائین۔ ۱ انگلینڈ

حالات حاضرہ،
بین الاقوامی،
ملکی اور ملی مسائل،
تاریخ اسلام سے
روشن اسباق،
اساتذہ اور شعرائے حال کا کلام،
مشرقی اقدار کے حامل
افسانوں کے لیے

ہفت روزہ
قندیل
لاہور

کا

باقاعدہ مطالعہ کیجئے۔ قندیل ہی ایک ایسا ہفت روزہ ہے جسے خاندان کے تمام افراد بلا جھجک پڑھ سکتے ہیں۔

بدل اشتراک

سالانہ : دس روپے
ششماہی : چھ روپے
فی کاپی : پچیس پیسہ

مینجر ہفت روزہ "قندیل"
۳- اے شاہ دین بلڈنگ
مال روڈ - لاہور

سکولوں کے لئے

ہماری چھپی ہوئی کتابیں انشاء اللہ ایم۔ اے تک مددگار ثابت ہوتی ہیں

کتب برائے مڈل

	پیسے روپے
پاک اردو گرامر حصہ اوّل برائے جماعت ششم	۱/۲۵
پاک اردو گرامر مع انشا پردازی برائے جماعت ہفتم و ہشتم	۳/۱۲
کلید مصادر فارسی	-/۲۵
نادر الترجمہ	-/۵۰
پاک فارسی گرامر مرتبہ مولوی محمد عبداللہ	۱/-
پاک فارسی ترجمہ " " "	۱/-
رفیق اردو قواعد و ترجمہ	۱/۵۰
رفیق اردو قواعد مع انشا پردازی برائے جماعت ششم	۱/۵۰
" " " " " " ہفتم	۱/۵۰
" " " " " " ہشتم	۲/۲۵
رفیق نقشہ کشی برائے جماعت ششم	۱/۲۵
" " " " ہفتم	۱/۵۰
" " " " ہشتم	۱/۵۰
ناولٹی انگلش ٹرانسلیشن برائے جماعت ششم	-/۷۵
" " " " ہفتم	۱/-
" " " " ہشتم	۱/۲۵
ناولٹی انگلش گرامر اینڈ کمپوزیشن برائے جماعت ششم	۱/۲۵
" " " " " ہفتم	۱/۵۰
" " " " " ہشتم	۱/۷۵
نادر القواعد فارسی	۱/۲۵

کتب برائے جماعت نہم و دہم

	پیسے روپے
ناولٹی انگلش گرامر اینڈ کمپوزیشن	۲/۷۵
ناولٹی انگلش ٹرانسلیشن بورڈ کے نیو سلیبس کے مطابق	۲/۷۵
دستور فارسی گرامر	۱/۷۵
کلید ترجمہ فارسی	۲/۲۵
کلید مصادر فارسی	-/۲۵
دستور اُردو گرامر مع کمپوزیشن	۲/۵۰
کلید انشا پردازی	۳/۵۰
رفیق اُردو قواعد مع انشا پردازی	۳/-
رفیق فارسی قواعد " "	۲/-
رفیق نقشہ کشی برائے جماعت نہم	۱/۲۵
رفیق علمی کیمیا و طبیعات برائے جماعت نہم و دہم	۴/-
فزیالوجی نوٹ بک	۴/-
ازہار القواعد عربی گرامر	۱/۵۰
ازہار التراجم عربی	۱/-
پاک پرشین کمپوزیشن برائے ہائی کلاسز	۱/۷۵

حاجی فرمان علی اینڈ سنز

تاجران کتب

اُردو بازار۔ لاہور

لالہ سری رام دہلوی

ولادت :- ۳ر دسمبر ۱۸۷۵ء

وفات :- ۲۵ر مارچ ۱۹۳۰ء

جب میں ابتدائی تعلیم کے پنجے سے چھوٹا اور کالج میں داخل ہوا۔ تو ادھر مذاق سخن دامنگیر ہوا۔ ادھر تعلیم کی مشکلیں گلوگیر۔ غرض ایک طرف کلام اور اہل کلام کی واقفیت کا عشق تمام تھا۔ دوسری جانب مربی و مشفق والدین اور خاندانی حصول علم اور تقاضائے صبح و شام نہ اسے مجبور رکھے بیٹھی تھی اور نہ اس سے منہ موڑنے سے عاری تھی۔

یہ ازخود رفتہ جنوں یہاں تک بڑھا کہ گھر کے مطالعہ کو طاق پر اور اوقات کالج کو زبردستی سر پر رکھا۔ اساتذۂ سلف و حال کی خوش کلامی کو مونس اور اُن کے حالات کو اپنا وظیفہ قرار دیا اور دل میں ٹھہرا لیا کہ جملہ اساتذۂ و دلدادگان سخن کی ایک مجلس منعقد ہو اور اُن کے کلام کا لبِّ لباب یکجائی صورت میں مہیا کیا جائے۔

اس خیال سے مختلف تذکروں کی فراہمی اور مطالعہ شروع کیا۔ مگر افسوس ان میں سے کوئی بھی دل میں نہ کھبا۔ آب حیات جو تلاش و تحقیقات کی انتہا، تنقید حسنہ کا قابل قدر نمونہ اور اردو ادب و زبان کی خدمت میں ایثار کے ساتھ فصاحت و بلاغت اور اعلےٰ انشاپردازی کا ایک بے مثال مرقع ہے۔ اس کی نسبت شروع سے میرا یہ خیال تھا کہ یہ تذکرۂ محققان زبان و مشتاقان عروض اور خاص کر شائقین انشاپردازی کے حق میں خضر راہ ہوگا اور آب حیوان کا کام دے گا۔ مگر جب مجھ تشنہ لب سخن کی ان اوصاف سے پیاس نہ بجھی تو کسی دوسرے سرچشمہ کی تلاش ہوئی کیونکہ اس کے جامع نے اول تو اس میں خاص الخاص چند مشاہیر شعرا کے حال اور برائے نام کلام کے سوا دیگر مشتاقان سخن سے غرض نہیں رکھی دوسرے کلام بھی لیا تو بطور نمونہ ہی لیا۔ انتخاب کا حظ نہ آنے دیا۔ گو انھوں نے مجبوراً یہ امر اختیار کیا۔ ورنہ چار دور کیا۔ وہ ایک دور کے شاعر بھی نہ لکھ سکتے مگر اس سے وہ بات نہ ہوئی جس سے اپنی طبیعت کھلتی اور ان اہل دور کا میلان طبع معلوم ہوتا۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو جدید و قدیم بیسیوں تذکرے دیکھ ڈالے سیکڑوں بیاضیں وقف نظر کر دیں۔ لیکن افسوس صد افسوس جملہ تذکروں کو عام اور بھرتی پایا۔ ان مؤلفوں نے رطب و یابس۔ عام و خاص بلکہ عوام الناس میں بھی کچھ تمیز نہ رکھی۔ یہاں تک کہ بعض تذکرے تو حامیادہ درجے پر پہنچ گئے۔ بھرتی کے شاعروں اور ان کے کلام کی وہ بھرمار دیکھی کہ ان سے طبیعت پھر گئی۔ اس طوفان بے تمیزی میں تو لنگڑے لولے ہر قسم کے سوار بھرتی تھے جنھیں قافیہ کی خبر۔ نہ ردیف کی سُدھ۔ خوبی مضمون سے بحث نہ موزونیت سے لینا۔

ہاں گلستان سخن، گلشن بیخار اس سے مستثنےٰ ہیں۔ یہ دونوں تذکرے مجھے پسند آئے اور دل سے پسند آئے۔ ارکان تذکرہ نویسی سے بالکل متفقانہ پابندی سے اپنے مؤلفوں کا کمال دکھا رہے تھے۔ لیکن گلستان سخن نے جس کی تدوین مولانا امام بخش صہبائی نے کی اور مرزا قادر بخش صابر نے اپنے نام سے چھپوایا۔ دلی سے آگے قدم بڑھانے کو عار سمجھا۔ لفظاً صابر کی رعایت سے اس نے شاہجہانی شہر پناہ کے اندر کی زمین کو زمین اور اس کے اوپر کے آسمان کو آسمان جانا۔ صرف سرو قدان دہلی سے کام رکھا۔ باہر کے لہلہاتے ہوئے شمشادوں کو وہیں کا وہیں کھڑا رہنے دیا۔ البتہ

دوسرے گلشنِ سدا بہار نے خاص خاص رنگ کے پھول چنے اور ان کے گلدستے بنائے۔ مگر پھر بھی چمنستانِ سخن کے صدہا خوشنما پھول کلیوں کی مہربانی یا اتفاقی وجہ جو چاہو اس کو نام رکھ لو، کی بدولت اپنی شاخوں پر پژمردہ ہو کر رہ گئے۔

متاخرین میں سخن شعرا کا پایہ بڑھ جاتا۔ اگر وہ غلط بیانی اور ذاتی تعریف پر نہ جھک پڑتا۔

غرض ادھر تو کوئی دلپسند مجموعۂ کلام دستیاب نہ ہوا اور ادھر اپنا شوق پورا کرنے کے واسطے مختلف شعراء کا کلام جمع کرنا پڑا۔ پس یہی اس کی تدوین اور ترتیب کا باعث ہوا اور یہاں تک ذخیرہ بڑھا کہ اس تذکرۂ ہزار داستان کو پانچ جلدوں میں تقسیم کئے بغیر کوئی اور صورت نظر نہ آئی۔

اس تذکرہ کی پہلی جلد پیشِ نظر ہے۔ اس وقت کو جب میں نے دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے ہاتھ سے اس کا اول جزو لکھا تھا۔ آج پورے سترہ برس ہو گئے۔ گو سترہ برس کہنے میں دو لفظ اور سننے میں ایک بات ہے۔ مگر اس برق رفتار زمانے میں کسی کام کو انجام تک پہنچانا درحقیقت نہایت دشوار کام ہے۔ تعلیم کی تکمیل۔ امتحانات کی تیاری۔ ملازمت کی پابندی۔ خاندانی سانحات تفکرات و مکروہات اور دائمی مریض رہنے کے باعث یہ تذکرہ اس عرصہ تک تعویق اور التوائے اشاعت میں پڑا رہا۔ مگر پھر بھی اس کا کچھ نہ کچھ کام ہوتا ہی رہا۔ میرے دل کی کیسی ہی حالت کیوں نہ ہوئی۔ ناپسند واقعات زندگی نے کتنا ہی مجبور کیوں نہ کیا۔ مجھے مختلف بیماریوں نے کیسا ہی کیوں نہ گھیرا۔ گرم و سرد زمانے نے کتنا ہی جی سرد اور دماغ بیکار کیوں نہ کیا۔ لیکن اس تذکرے کی تکمیل کا جن میرے سر سے نہ اترا اور اس کی اشاعت کی دھن عاشقانہ دھن بن کر میرے دل و دماغ کو الجھائے گئی۔

بارے خدا خدا کر کے جنابِ باری کے فضل و کرم سے آج یہ دن نصیب ہوا کہ اربابِ مذاق کے حضور میں یہ دل شگفتہ کرنے والا گلدستہ جو گیان چمن کے پھولوں، گلشن گلشن کی کلیوں۔ ڈال ڈال اور پات پات کی کلیوں سے چن چن کر موزوں ہوا ہے پیش کش کرنے سے ان کے دل کی شگفتگی اور قبولیت کا فخر حاصل کروں۔ جس طرح گلدستہ کی زیب و زینت کے واسطے طرح طرح کی پتیاں اور اس کے دلآویز بنانے کے لئے رنگ برنگ کے پھول قرینے سے لگائے جاتے ہیں اسی طرح آپ اس مجموعۂ کلام و مجمعِ اہلِ کلام میں مختلف مذاق۔ مختلف خیال۔ مختلف انداز پائیں گے۔ کہیں طرزِ جدید۔ کہیں طرزِ قدیم کے سخن سنجوں سے ملاقات فرمائیں گے۔ یہ وہ محفل ہے کہ اس میں سلطان ابن السلطان۔ خاقان ابن الخاقان۔ امیر سے امیر اور غریب سے غریب موزوں طبع۔ فصیح الکلام کا پہلو بہ پہلو بیٹھے نظر آئیں گے۔ اگرچہ میں اس بات کو دل سے مانتا اور انصاف سے جانتا ہوں کہ تاریخ نویسی کی نسبت تذکرہ نگاری ایک بڑے دماغ۔ بڑی تلاش۔ طبع نقاد اور ذہن رسا کا کام ہے جملہ شعراء کے ماضی و حال کا تمام حال لکھنا۔ کیا بقید ولدیت و سکونت۔ کیا بہ تخصیص استاد یا ولادت و ممات سخت دشوار امر ہے اور خاص کر زمانۂ حال کی شاعری کہ طوائف الملوکی سے کم درجہ نہیں رکھتی اور ہر شخص بزعم خود استاد ہے۔ ایسی صورت میں شعرائے حال کا حصر محالات سے تھا۔ اساتذہ نے بہت سے تذکرے لکھے اور لکھیں گے۔ لیکن ہر شخص کا مذاق جدا۔ کوئی بال کی کھال کھینچنی پسند کرتا۔ کوئی نکتہ چینی کو اپنا فرض جانتا ہے۔ کوئی بلند نظری پر گرا ہوا ہے۔ کوئی معاملہ بندی پر جھکا ہوا ہے۔ کوئی محاورہ بندی کا دلدادہ ہے۔ کوئی سوز و درد پر فریفتہ۔ کسی کو سادگی پسند ہے۔ کسی کو لفاظی۔ کوئی رعایات و مناسبات لفظی کا پابند ہے۔ کوئی تاثیر نظارہ کا دلبستہ۔ کوئی بلاغت پسند ہے۔ کوئی فصاحت طلب۔ مگر میں ان دونوں باتوں کا دیکھنے والا ہوں۔ میرے نزدیک جس کلام سے دل پر چوٹ لگے۔ جس بات سے سوتا ہوا چونک پڑے۔ جو نصیحت دل میں گھر کرے۔ جو کر گزرنے کا سبق دے۔ جو حقائق شکایت سے بچاتے ہیں وہی غذائے روح اور حظِ نفس ہے۔ لیکن ہمیں پھر بھی اس تذکرہ کی خوش اسلوبیوں پر ناز زیبا نہیں۔ جس طرح ہر گل کے ساتھ خار لازم اور ہر ایک پنکھڑی کے ساتھ

کچھ ربط خاص مستلزم ہے۔ پس ممکن ہے کہ اس مجموعے میں بعض مندرجات نقادانِ سخن اور مبصرانِ کلام جدید و کہن کی نظروں میں کھٹکیں۔ مگر ان کی ذات بابرکات سے امید ہے کہ وہ میری اُس حالت پر جس کا ذکر اوپر آچکا ہے منصفانہ نظر ڈال کر ان لغزشوں اور کوتاہیوں کو راقم کی کم مائگی پر محمول فرما کر طبع ثانی کے موقع تک اُن نقائص سے آگاہ فرمائیں گے تاکہ اس کا دوسرا ایڈیشن حسب دلخواہ ہو سکے۔ کیونکہ میں نے اس تذکرہ کے لکھنے میں بہم رسانی حالات فراہمی کلام گمشدہ از یاد رفتہ سے ہی سترہ برس تک سروکار نہیں رکھا۔ بلکہ جہاں تک بنا ہے ان ڈانواں ڈول طبیعتوں کو ابھار دیا جو مرور زمانہ کی تیز رفتاری سے ٹھوکریں کھا کھا کر گر رہی تھیں۔ ان افسردہ اور مرجھائے ہوئے دلوں کو گرمایا ہے جو زمانہ کی سرد مہری اور ناگزیر صدموں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دم واپسیں سے کشمکش کرنے والوں۔ بستر مرگ پر دم توڑنے والوں کے سرہانے جا جا کر بیٹھا۔ تذکرہ کا ذکر چھیڑ کر اپنی طرف مخاطب کیا۔ جن جواہر نایاب کے اُن کے ساتھ دفن ہو جانے میں ذرا شبہ نہ تھا۔ دم دلاسا دے کر اُن کے سینوں کے گنجینوں سے اکثر ایسے بے بہا لعل اور دُرِ شاہوار جن کی چمک کے آگے چاند ماند اور آفتاب بے آب و تاب تھا۔ نکال کر لایا۔ اکثر سخن سنجوں کو یہ سمجھایا کہ اس سے تمہاری زندگی ہمیشہ قائم رہے گی۔ لوگ گھروں میں رہتے ہیں۔ تم دلوں میں رہو گے۔ سخن فہم تمہارے اشعار سے حظ اٹھائیں گے اور ہمیشہ دعائے خیر سے یاد رکھیں گے۔ گو زمانے کی ناموافقت نے انہیں خاک میں ملا رکھا تھا اور انہوں نے مجبوراً ان جگر گوشوں کو سات پردوں میں چھپا رکھا تھا۔ لیکن اس خوش نصیبی ارباب سخن نے ہم پہنچا کر آنکھوں سے دھویا۔ پلکوں سے برش کیا اور مبصران سخن کو دکھایا۔ جنہوں نے اس تلاش و جستجو کی داد دی۔ اور میری قدردانی سے حوصلہ بڑھایا۔

میں اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ مجھ اکیلے کا انتخاب۔ ذاتی پسند۔ شخصی مذاق اس قابل ہو کہ ہر رنگ میں اپنا رنگ پیدا کر دے اور سب کو اپنا سا بنا لے۔ لہٰذا اس کے انتخاب اور اقتباس میں التزام رکھا کہ متقدمین کا کلام ہو یا متاخرین کا۔ طرز قدیم کے وابستہ ہوں یا طرز جدید کے ہوا خواہ۔ ان کی طبیعتوں کا اصلی میلان۔ ان کے دلوں کا رجحان۔ بلند پروازوں کا رنگ جوں کا توں قائم ہے۔

نہ تو میں شاعر کہ شعراء کے کسی زمرہ میں شامل ہو کر دھڑے بندی یا طرف داری سے کام رکھوں۔ یا حریفانہ دل آزاری سے اپنا دل ٹھنڈا کروں۔ نہ میں کسی خاص ٹکسالی شہر کی محبت کا گرفتار کہ ہر طرح سے اس کو ترجیح دیئے جاؤں۔ مجھے اپنے وطن اور غیر وطن کی تخصیص منظور نہیں۔ فرخ آبادی ہو یا دہلوی ہو یا تر ہو۔ اچھے کھرے سے کام ہے وہ بے پری ہو خواہ جو معیار پورا کرے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کن استادوں کے نام لیے ہیں اور کن شہروں کے لیے۔ میں ایک ادنیٰ سا خوشہ چیں کلاموں کے کلام کا جامع اور اُن کی مختلف طبائع کا مداح ہوں۔ حسد میرے پاس نہیں۔ حسد کا روادار نہ تھا۔ جو لوگ کچھ بھی شاعر کہلانے کا استحقاق رکھتے تھے۔ انہیں کو بزم داستان کے مشاعرہ میں جگہ دی اور انہیں کے آگے شمع مشاعرہ نے پھیرا۔ تک بندوں سے علاوہ اور مزاحی کے کلام سے اس مجلس مشاعرہ کو بچا رکھا کہ تک بندی کا نام شاعری نہیں۔ اور ہمارے تذکرے کو دو معمولی شاعروں سے واسطہ نہیں۔ بہت سے اصحاب صرف تذکرہ کے شاعر ہیں۔ مگر اشعار کہنے کے شائق نہیں۔ ہمیں فہرست کو طوالت دینا مقصود نہیں۔ اس انتخاب کی حالت میں بھی جو سات سو صفحوں کی اول جلد ناظرین با تمکین کی پیش نظر ہے۔ گویا اس خمخانۂ جاوید کے پانچ دوروں میں سے ایک دور۔ یا پانچ کٹوروں میں سے ایک ساغر ہے۔ اس سے صاحب نظر معلوم کر سکتے ہیں کہ اس کے مرتب نے نازک مزاجی یا اختراع و ترجیح سے واسطہ نہیں رکھا۔ ان بعض جگہ معمولی شعراء کے بعض اشعار کی خوبی نے جو ہمارے نزدیک کسی حالت میں بھی مسلم الثبوت استادوں کے کلام سے گرے ہوئے نہ تھے۔ ہمارے قلم کو نہیں روکا۔

اس تذکرہ میں صرف مروجہ یا اب تک شائع شدہ تذکروں ہی سے مدد نہیں لی۔ بلکہ چند غیر مطبوعہ قلمی تذکرے بھی ایسے بہم پہنچے جو ان تذکرہ نگاروں کے ورثا یا شوقینوں کے کتب خانوں میں محفوظ تھے۔

جن جن تذکروں سے ہم نے مدد لی۔ ان کے نام ذیل میں درج ہیں:۔

گلستانِ سخن، گلشنِ بے خار، نغمۂ عندلیب، انتخابِ یادگار، سخن شعرا، سراپا سخن، آبِ حیات، شمیم سخن، تذکرۂ شعرائے دہلی، طبقات الشعرائے شوق، تذکرۂ قاسم، تذکرۂ مصحفی، تذکرۂ سرور، [illegible] مجموعۂ [illegible]، دیوانِ [illegible]، تذکرۂ نواب قطب حسین خاں [illegible]، طور کلیم، طرازِ عشق، غنچۂ آرزو، تذکرۂ شبستان [illegible] عالمگیری، آثار الشعرا، چمنستان کشمیر، مجموعۂ سخن، تذکرۂ شعرائے پنجاب، تذکرۂ لطف، مجموعۂ نغز، نکات الشعرا، فرح بخش، طبقات الشعرائے ہند (ڈاکٹر فیلن صاحب نے فرانسیسی زبان سے گارساں دتاسی کے تذکرہ سے اردو میں ترجمہ کیا اور مولوی کریم الدین نے اس میں اپنے وقت کے شعرا کا حال بھی اضافہ کیا)، تذکرۂ شعرائے ہنود، تذکرۂ شعرائے جے پور، بریلی، تذکرۂ شعرائے ٹونک، تذکرۂ حکیم، تذکرۂ مولوی عظیم الحق۔ غرض ؎

تمتع ز ہر گوشۂ یافتم
ز ہر خرمنے خوشۂ یافتم

ان کے علاوہ سینکڑوں قلمی بیاضوں، جنگوں، اگلے پچھلے گلدستوں، رسالوں، قلمی و مطبوعہ دیوانوں، تاریخی اخباروں، غیر مشہور قلمی دیوانوں سے بھی بہت کچھ سامان حاصل کیا اور اپنے وقت کے موجودہ شعرا میں خاص خاص شعرا سے خط و کتابت کر کے ان کا کلام اور ان کے حالات منگوائے۔ بعض بزرگوں کے دیوان اپنے صرف سے چھپوائے۔ صدہا احباب سے وعدے لیے کہ ہم اپنا اور اپنے بزرگوں کا کلام تذکرہ کے لیے دیں گے۔ لیکن ۹۵ فی صدی صورتوں میں وہ ۱۰۰ کی شکل کے وعدے آج تک پورے ہونے ہیں۔ فقط کلام اور حالات کے فراہم کرنے اور بہم پہنچانے پر ہی جس کی اکثر تذکروں میں کمی ہے، زور نہیں دیا بلکہ جہاں تک ممکن ہوا بقید سن و سال درج تذکرہ کیا تاکہ ہر زمانے کے شعرا کی زبان ان کے خیالات کا فرق، زبان کی ترقی و تنزل کا فرق خود بخود پتہ لگ جائے۔

اگرچہ آج کل کے لوگوں کا دماغ اور ہی خیالات اور مصروفیت کا رخ لیے ہوئے ہے۔ جو غزل اور شاعری کے بالکل خلاف ہے اور ایک دن ایک زمانے میں یہ رنگ بالکل بدل جائے گا۔ مگر ایسی صورت میں بھی ہمارا تذکرہ گراموفون کا کام دے گا۔ جو زبان، جو ادا، جو رنگ، جو لہجے اس میں آج محفوظ ہیں گے۔ وہ ہمیشہ اپنے اپنے وقت کا راگ گائیں گے اور مصنوعی زبان کو پکار پکار کر رستہ بتائیں گے۔ اس برق رفتار تبدیلی کے زمانے میں اور نئی روشنی کے شور و شغب کے سامنے ممکن ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک یہ گراموفون جس میں گلشن سخن کے ذہینوں کے رنگا رنگ ترانے بھرے ہوئے ہیں ایک آواز بے ہنگام ٹھہرے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ جس اس وقت جب کہ ہماری تہذیب اور تمدن کا ہر صیغہ معرضِ تعمیر میں ہے تو ان کے ساتھ ساتھ زبان اور فن شاعری بھی تکمیل پر ہے۔ مرقع ہے کہ پرانی آوازوں کو نئی زندگی عنقریب بھلا دے گا۔ ایک عجوبی اور یادگاری حیثیت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا جائے۔ پس یہ مخزن جو اہل سخن [illegible] کا اکھاڑہ ہے، ابد تک زبان و اہل زبان کو اپنی مستانہ دُھن سناتا اور غفلت کے ماتوں کو جگاتا رہے گا۔

ہم نے کسی شاعر پر جرح کرنے اور نوک جھونک کرنے سے کام نہ لیا۔ ہر شخص کو اپنے اپنے رنگ اور اپنی اپنی حالت میں اچھا جانا ہے۔ جس طرح کوئی مخلوق بے کار نہیں، اسی طرح کوئی تصور کوئی مضمون خالی از اسرار نہیں۔ بقول غالب ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

ہم نے ساتھ ہی اس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ جن کے دیوان ابھی تک نہیں چھپے۔ ان کا کلام زیادہ لیا ہے تاکہ ان کو اپنی جوہر نمائی کا موقع از سرِ نو مل جائے اور تلافیٔ مافات ہو سکے۔

استادانِ دہلی میں اکثر کے کلام جو تو ان کے خاندان والوں نے جمع کرائے اور جن لوگوں کے ہاتھ دستبردِ زمانہ سے لگے انھیں یہ بات گوارا تھی۔ مگر میری نظر سے وہ گزرے ان کا انتخاب کیا اور بہت سا کلام ایسے لوگوں کے عزیزوں سے سن سن کر لکھا۔ جب مختلف لوگوں سے بھی اس کی تصدیق ہو گئی۔ جو درجِ تذکرہ کیا مشہور مستند شعرا کے شاگردوں اور رشید تلمیذوں کے حالات سے بھی پہلو تہی نہیں کی۔ بلکہ کوئی تاریخی واقعہ ان سے متعلق ہوا تو اسے بھی بخوشی تذکرہ میں جگہ دی۔

زمانہ جس عاشقانہ روش پر چل رہا ہے اس سے کوئی بے خبر نہیں۔ بچے بچے کے دل میں عشق و محبت کا بیج بڑھتا چلا جاتا ہے۔ موزونیٔ طبع اور تُک بندی گھٹی میں پڑ گئی ہے۔ سریلی آواز ہو یا نہ ہو مگر تھیٹروں کی لَے نے ادھا گویا بنا دیا ہے۔ جو گاتے گاتے ایک دن کلاونت ضرور ہو جائے گا۔ پس ان ہونہار امنگوں کا توڑنا اور انھیں مایوس کر دینا میری طبیعت نے گوارا نہ کیا جس طرح مجھے اپنے ذاتی سخن کا خیال رہا۔ اسی طرح میں نے پابندی کے ساتھ اس امر کا بھی لحاظ رکھا کہ شعرائے قدیم و جدید کے نتائجِ افکار جنھیں انھوں نے خونِ جگر کھا کر پبلک کی تفریحِ دل لگی کے واسطے تیار کیا تھا۔ بقائے نام و یادگارِ دوام کے واسطے قائم و برقرار رکھوں۔

گو کسی تذکرہ نویس نے اس فن کو شاخِ تاریخ قرار نہیں دیا۔ بطور بیاض یا کشکول جس طرح چاہا۔ ان کے حالات اور کلام کو لکھ لیا لیکن اس وقت کہ زبانِ اردو منجدھار میں غوطے کھا رہی ہے۔ یہ بھی بسا غنیمت ہوا کہ پچھلے حالات کی جستجو کے لیے بنیاد پڑ گئی۔ اور آئندہ کے لیے اساس اٹھانے کی آس بندھی۔ ہمارا تذکرہ اس حالت میں بھی ایسے لوگوں کا ممنون اور ان کا خوشہ چیں ہے۔ گو انھوں نے بپاسِ حسد یا بلحاظِ رشک سچے حالات لکھنے سے گریز کی۔ یا اپنے کمال کے آگے اوروں کے کمال کی حقیقت نہ سمجھی۔ البتہ عبارت آرائی میں آسمان زمین کے قلابے ملا دیے۔ کالے کوسوں کے رہنے والے۔ فرانس کے باشندے گارسن ڈی ٹیسی نے فرانس میں بیٹھے ہوئے انھیں تذکروں اور اپنے ایجنٹوں کی تحقیقات سے فرنچ زبان میں ایسا با اصول تذکرہ لکھا کہ ہر ایک ملک والے کو پسند آیا اور کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔

مجھے افسوس ہے تو اس کا کہ ہم لوگ اپنے ملک میں رہ کر وہ کام نہیں کر سکتے۔ جو ہزاروں کوس کے رہنے والے ہم سے بہتر اور صحیح کر گزرتے ہیں۔ میں اس تذکرہ کو آئندہ نسلوں کے واسطے ایک ذخیرہ سمجھ کر ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں اور بشرطِ حیاتِ مستعار آئندہ بھی اضافہ کے ساتھ طبع کراتا رہوں گا۔

یہ مثل سچ ہے کہ خدا تعالیٰ کسی کی محنت رائیگاں نہیں کرتا۔ پس میری محنت بھی ٹھکانے لگی اور ایسی صورت سے ٹھکانے لگی کہ اس کا فخر مجھ کو، میرے خاندان کو، میرے احباب کو بلکہ ہزار داستان کے تمام موجودہ و از جہاں رفتہ ندیموں، جلیسوں، ہمنشینوں کو تاقیامِ تذکرہ وہ شرف و افتخار حاصل رہے گا۔ جس کی تمنا میں لوگ عمریں گنوا دیتے ہیں اور میسر نہیں ہوتا۔ بھلا وہ کونسا فخر ہے وہی فخر ہے کہ ہمارے ہندوستان کی شاہی زبان کے حامی۔ اردو کے پورے سرپرست۔ اہلِ سخن کے قدردان۔ سخن سنج۔ سخن گو۔ سخن شناس۔ سخن فہم۔ اعلیٰ حضرت۔ والا شوکت بندگان

عالی متعالی سپہ سالار مظفر الملک، فتح جنگ، ہز ہائینس میر محبوب علی خاں بہادر نظام الملک، آصف جاہ، سادس جی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ جی۔ سی۔ بی شاہ دکن خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ نے اپنی کمال قدر دانی و جوہر شناسی سے اپنے نام نامی کے ساتھ اس کا معنون ہونا منظور فرمایا۔ نہیں نہیں بلکہ دیگر ہوا خواہان اردو کا دل بڑھایا۔

آخر میں ان دوستوں کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا جنہوں نے ترتیب تذکرہ میں شعرا کے حالات اور کلام کی فراہمی سے امداد کی۔ ان میں سب سے اول نمبر پر اردو زبان کے فدائی اور اس کے استقلال و قیام پر اپنی عمر کا بڑا حصہ صرف کرنے والے منشی سید احمد دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ و وظیفہ خوار نظام قابل تذکرہ ہیں۔ منشی صاحب ممدوح نے جلد اول کے ابتدائی اجزا کی نظر ثانی کی اور ضروری مشوروں سے امداد دی۔

ان کے بعد صاحب عالم مرزا مجاہد الدین گورگانی جنہیں اب مرحوم اور مغفور لکھتے سخت افسوس ہوتا ہے۔ آپ نے اکثر حضرات خاندان شاہی دہلی کے حالات اور بالخصوص مرزا ارشد کے سوانحات زندگی بہ تصریح ارقام فرمائے اور ہمیشہ اس کام سے دلچسپی ظاہر کرتے رہے۔ آپ نے ایک چند روزہ علالت کے بعد عین ہنگام اشاعت تذکرہ میں انتقال کیا۔ صاحب عالم مغفور آخری تاجدار ہند بہادر شاہ کے نبیرہ اور مرزا مغل مرحوم کے فرزند تھے۔

مشفق و مکرمی شیخ عبد القادر صاحب بیرسٹر ایٹ لا کو بھی ہمیشہ اس علمی خدمت سے خاص دلچسپی رہی اور اس کی اشاعت کے متعلق وقتاً فوقتاً ضروری مشوروں سے راقم کی امداد کرتے رہے۔

اسی طرح میرے محب بے ریا مخلص باوفا سیٹھ کیخسرو صاحب جی جو پارسی نژاد ہونے کے باوصف ہماری مادری زبان سے ایک خاص مذاق رکھتے ہیں، میرے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ انہوں نے اس تذکرہ کی تالیف و ترتیب میں غیر معمولی دلچسپی ظاہر کی۔ ان کی اس عنایت کا نہ صرف مجھے بلکہ تمام ہوا خواہان اردو کو شکر گزار ہونا چاہیئے۔

بھی پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی بھی ہمیشہ تذکرہ کی عام ترتیب اور انتظام اشاعت میں معقول امداد دیتے رہے۔

آخر میں اپنے محب صادق اور مخلص گرامی نواب ذوالفقار علی خاں صاحب رئیس مالیر کوٹلہ کا خاص طور پر ممنون ہوں، جنہوں نے دوران اشاعت تذکرہ میں انتہا درجے کے خلوص اور نوازش کا اظہار فرمایا اور اس علمی کام کی نسبت اظہار پسندیدگی سے راقم کا حوصلہ بڑھایا۔ فقط

لاہور ۱۵ مارچ ۱۹۰۸ء۔ خادم انام گمنام سری رام دہلوی

(مقدمہ خمخانۂ جاوید)

تصانیف: خم خانۂ جاوید حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم، حصہ چہارم، شعرائے اردو کا تذکرہ (مطبوعہ)

خم خانۂ جاوید حصہ پنجم، حصہ ششم، حصہ ہفتم، حصہ ہشتم، شعرائے اردو کا تذکرہ (غیر مطبوعہ)

لالہ سری رام نے مندرجہ ذیل دواوین بھی شائع کئے:

۱۔ دیوان انور

۲۔ انتخاب داغ

۳۔ ضمیمہ یادگار داغ

چند مشاہیر

زمانہ کے مدیر نے ۱۹۱۰ء میں ملک کے بعض مشہور مصنفین سے ان کے علمی کارناموں کے متعلق چند سوالات کئے تھے۔ سوالات یہ تھے:

(۱) اردو فارسی کی کتابوں میں آپ اس قدر تصنیف و تالیف اور غور و مطالعہ کے بعد کن کی تصانیف کو بہترین خیال فرماتے ہیں؟

(۲) اوائل عمر میں کن کن کتابوں کے مطالعہ نے آپ کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچایا اور محظوظ کیا؟

(۳) کیا کسی کتاب یا کتابوں کو آپ کی علمی زندگی کے آغاز سے کوئی خاص تعلق ہے یعنی کسی خاص کتاب کو پڑھ کر آپ کی طبیعت تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوئی تھی؟

(۴) کیا کسی کتاب کے مطالعہ کا آپ کی زندگی پر کوئی خاص اثر پڑا ہے؟

(۵) آپ کی سب سے پہلی تصنیف کا کیا نام ہے اور اس کی ملک نے کیسی قدر کی تھی؟

(۶) اپنی تصانیف میں آپ سب سے بہترین کس کو سمجھتے ہیں؟

بہت سے بزرگوں اور مشہور انشاپردازوں نے ان سوالات کے تفصیلی جوابات لکھے جن سے ان کی سرگزشت حیات کے کئی پہلو روشنی میں آگئے۔ یہ اگرچہ مکمل آپ بیتیاں نہیں۔ لیکن ان سے کم از کم ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت، ذوق مطالعہ اور علمی کارناموں کا کچھ حال تو معلوم ہو ہی جاتا ہے۔ یہ دلچسپ معلومات کئی لحاظ سے مفید بھی ہیں۔ ان سے کئی قسم کی غلط فہمیاں رفع ہوتی ہیں اور ان سے بہت سے سبق اخذ کئے جاسکتے ہیں۔

میں نے جہاں تک ممکن ہو سکا ہے ان مصنفین کی تاریخ ولادت و وفات اور ان کی تصانیف کی فہرست کا اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے۔

(محمد عبداللہ قریشی)

شبلی نعمانی

ولادت ۱۸۵۷ء - وفات ۱۸ رنومبر ۱۹۱۴ء

۱- فارسی نثر و نظم میں بے شمار کتابیں ہیں۔ کس کس کا نام لوں؟ مختلف مضامین میں جو کتابیں بہترین تصانیف ہیں، ان میں سے بعض کتابوں کے نام لکھتا ہوں:

شاہ نامہ۔ یہ ایشیا کا ایلیڈ ہے۔ عربی میں آج کل ایلیڈ کا ترجمہ چھپا ہے اور اس کی بلاغت اور نکات کو حواشی میں نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔ یہ میرے پیش نظر ہے۔ اگر اس سے کچھ رائے قائم ہو سکتی ہے تو میں ہر حیثیت سے شاہ نامہ کو اس سے بڑھ کر پاتا ہوں۔ شاہ نامہ کی لڑائیاں میں نے شعر العجم حصہ ۵ کے لیے انتخاب کی تھیں۔ اب تفصیل سے لکھ رہا ہوں۔ غزل میں حافظ کا جواب نہیں۔

نثر میں گلستاں اور فلسفیانہ شاعری میں مولانا روم اور سحابی کو میں سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں۔

۲۔ اردو میں حیات سعدی، آب حیات، بعض تصانیف سرسید، توبۃ النصوح، دیوان غالب، دیوان انیس کو میں دل سے پسند کرتا ہوں۔

۳۔ تصنیفات کا شوق ابتداءً مجھ کو ان تاریخی تصنیفات کے دیکھنے سے ہوا تھا جو یورپ میں چھپی ہیں اور ایک مرتبہ مجھ کو بہت سی یکجا ملی تھیں، جن کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

۴۔ میری سب سے پہلی تصنیف عربی زبان میں ایک چھوٹا سا رسالہ اسکات المعتدی نام ہے۔ لیکن وہ چونکہ عربی زبان میں تھا اور ایک جزئی مسئلہ پر تھا اس لیے وہ چنداں شائع نہیں ہوا۔ اس کے بعد سب سے پہلی تصنیف مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم ہے۔ وہ بہت پھیلی اور بار بار چھپی۔ میں اپنی تصنیفات میں الفاروق کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

مشہور تصنیفات (۱) المامون (۲) کتب خانہ اسکندریہ (۳) سیرۃ النعمان (۴) سوانح مولانا روم (۵) الغزالی (۶) الکلام (۷) علم الکلام (۸) موازنہ انیس و دبیر (۹) شعر العجم (پانچ جلد) الفاروق (۱۰) سیرۃ النبیؐ (۱۱) دستۂ گل (فارسی) (۱۲) مجموعہ کلام شبلی (اردو) (۱۳) مقالات (آٹھ حصے) (۱۴) سفرنامہ روم و شام و مصر (۱۵) مکاتیب (۱۶) مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم (۱۷) اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر وغیرہ۔

محمد عبدالحلیم شرر

ولادت ۱۸۶۹ء۔ وفات ۲۲ر دسمبر ۱۹۲۶ء

۱۔ اردو میں سرسید مرحوم، مولانا حالی، مولانا آزاد مرحوم، مولانا شبلی نعمانی کی تصانیف میرے مذاق میں بہترین تصانیف ہیں۔ فارسی میں زیادہ کتابیں مجھے پسند ہیں جن کی فہرست تیار کرنے کے لیے وقت چاہیے۔

۲۔ مجھے زیادہ فائدہ عربی کتابوں کے مطالعہ سے پہنچا اور انہیں سے میں محظوظ بھی ہوتا رہا۔ مگر اردو میں سرسید کی تصانیف اور مولانا آزاد کی کتاب آب حیات اور نیرنگ خیال نے مجھ پر بہت بڑا اثر ڈالا۔ اور نیز بلکہ بہت زیادہ مسدس حالی نے۔

۳۔ انہیں کتابوں نے مجھے کچھ لکھنے کی جانب مائل کیا۔ لیکن زیادہ محرک یہ بات ہوئی کہ مجھے انگریزی لٹریچر کی شان اور عربی مصنفین کی

تحقیق اور ان کے فراہم کیے ہوئے مواد نے اس جانب مائل کیا کہ عربی سے حاصل کیے ہوئے خیالات اور واقعات کو انگریزی مذاق کا لباس پہناؤں اور دراصل میرے لیے محرک یہی خیال تھا۔

۴۔ ایسی بہت سی کتابیں ہیں، کسی خاص کتاب کا نام نہیں لے سکتا۔

۵۔ میری سب سے پہلی تصنیف "دلچسپ" ہے۔ مگر جس رنگ کے تاریخی ناول میں اب لکھتا ہوں، ان کا آغاز "ملک العزیز ورجنا" سے ہوا۔ لیکن ان تصانیف سے پہلے میں نے اودھ اخبار اور رسالہ محشر میں بہت سے تاریخی، خیالی اور محققانہ مضامین لکھے جو ملک میں بہت مشہور ہوئے اور پسند کیے گئے۔ ان کتابوں کی اشاعت سے پہلے میں پبلک میں ایک خاص شہرت حاصل کر چکا تھا جو ان کتابوں کی اشاعت میں معین ہوئی۔

ملک نے میری کتابوں کی عموماً بہت قدر کی اور چونکہ میں حیدر آباد چلا گیا تھا اور ان کتابوں سے متمتع ہونے کا خیال نہ تھا، اس لیے بہت سے مطابع نے میری کتابیں چھاپ لیں اور میں نے ان کو ابتداءً نہیں روکا۔ جس کی وجہ سے میرے پہلے تصانیف ہر جگہ چھپ کر شائع ہوئے اور عموماً بہت پسند کیے گئے آج تک پبلک میں ان کی بے حد قدر ہے۔

۶۔ یہ بہت مشکل سوال ہے۔ ناولوں میں فردوس بریں، ملک العزیز ورجنا، فلورا فلورنڈا، فتح اندلس، ایام عرب کو میں بہترین سمجھتا ہوں اور تاریخوں میں تاریخ سندھ۔

تصانیف

(۱) دلچسپ (۲) دلکش (۳) بدر النساء کی مصیبت (۴) فلورا فلورنڈا (۵) ملک العزیز ورجنا (۶) حسن انجلینا (۷) دربار حرام پور (۸) الفانسو (۹) فردوس بریں (۱۰) قیس و لبنیٰ (۱۱) لعبت چین (۱۲) تاریخ سندھ (۱۳) تاریخ عہد قدیم۔ (۱۴) جویائے حق (۱۵) تاریخ یہود (۱۶) غیب دان دلہن (۱۷) حسن بن صباح (۱۸) ابوبکر شبلی (۱۹) جنید بغدادی (۲۰) مشرقی تمدن کا آخری نمونہ (۲۱) مضامین شرر (آٹھ جلد) (۲۲) قدیم مسیحیت (۲۳) منصور موہنا۔

محمد عزیز مرزا بی اے۔ ایم آر۔ اے ایس

ولادت ۱۸۶۵ء۔ وفات ۲۹ فروری ۱۹۱۲ء

۱۔ فارسی کتابوں میں میرے نزدیک تصانیف شیخ سعدی، مثنوی مولانا روم، دیوان حافظ اور انوار سہیلی بہترین کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ خمسہ نظامی، شاہنامہ اور اکثر مسلم الثبوت استادوں کے دیوان بھی ایک ایسا علمی ذخیرہ ہیں جن کا جواب کسی دوسری زبان کے لٹریچر میں مشکل سے مل سکتا ہے۔

اردو نثر میں غالب کی "اردوئے معلیٰ" سر سید احمد خاں کی تصانیف خاص کر خطبات احمدیہ اور تہذیب الاخلاق کے مضامین اور لکچر، مولانا شبلی کی تاریخی تصنیفات اور مولانا خواجہ الطاف حسین حالی کی حیات سعدی اور حیات جاوید اور مولوی محمد حسین آزاد کی آب حیات میری ناقص رائے میں بہترین تصانیف ہیں۔

نظم میں میر اور غالب کے کلام کا سب سے زیادہ دلدادہ ہوں اور موجودہ زمانے کے شاعروں میں مضامین اور ندرت خیال

کے لحاظ سے حالی اور زبان دانی کے لحاظ سے داغ کو سب پر ترجیح دیتا ہوں۔

۲۔ بچپن میں جب میں نے لکھنا پڑھنا شروع کیا تو میرے استاد جو بڑے روشن خیال آدمی تھے روز رات کے وقت فتوح واقدی سنایا کرتے تھے۔ اس سے میرے دل پر بڑا گہرا اثر پڑا اور اسی وقت سے تاریخ کا شوق ہو گیا جو اس وقت تک باقی ہے۔ اس کے بعد غالب کے رقعات اور تہذیب الاخلاق کے مضامین سے بھی بہت فائدہ ہوا اور میرؔ، مومنؔ اور غالبؔ اور ذوقؔ کے کلام سے اکثر محظوظ ہوتا اور حالی کی مسدس نے ایک عجیب طرح کی آگ دل میں لگا دی جو ابھی تک پنہاں پنہاں سلگ رہی ہے۔

۳۔ پروفیسر ایڈورڈ ڈاؤڈن کی لائف آف ساؤدی (LIFE OF SOUTHEY) اور نواب محسن الملک کے لکچر سے جو مسلمانوں کی علمی ترقیوں پر ہے اور مولانا شبلی کے مضمون "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" اور مولانا خواجہ الطاف حسین حالی کی حیات سعدی کے مطالعہ سے میری طبیعت تالیف و تصنیف کی طرف مائل ہوئی۔

۴۔ فتوح واقدی اور پروفیسر ایڈورڈ ڈاؤڈن کی لائف آف دی ساؤدی اور مضامین تہذیب الاخلاق اور مسدس حالی نے خاص اثر میری زندگی پر ڈالا ہے اور انہیں کے مطالعے سے مجھے ابتدا سے قومی اور علمی خدمات کا شوق ہوا ہے۔

۵۔ میں نے سب سے پہلے نواب مہدی حسن فتح نواز جنگ مرحوم کے سفر نامہ یورپ کا ترجمہ "گلگشت فرنگ" کے نام سے چھپوایا۔ لوگوں نے اگرچہ ترجمہ کی بہت داد دی مگر دو سو جلدوں سے زیادہ فروخت نہ ہو سکیں اور تقریباً تین سو جلدیں مفت تقسیم ہوئیں۔

اگرچہ میں بخوبی جانتا ہوں کہ میں نے ابھی تک کوئی ایسی علمی خدمت نہیں کی ہے کہ صف مصنفین میں بیٹھنے کے قابل ہوں مگر محض بہ تکمیل ارشاد عرض کرتا ہوں کہ میرے خیال میں "سیرۃ المحمود" کو میری تصانیف میں سب پر ترجیح ہے۔

تصنیفات
(۱) گلگشت فرنگ۔ (۲) سیرۃ المحمود۔
(۳) وکرم اروسی (۴) خیالات عزیز۔

احمد علی شوق قدوائی

ولادت ۱۸۵۲ء۔ وفات ۲۷ اپریل ۱۹۲۵ء

۱۔ اردو کا ذخیرۂ تصنیف و تالیف اور ترجمے کے ذریعوں سے اب معمور ہو رہا ہے۔ اچھی اچھی کتابیں نکل رہی ہیں، لیکن میری رائے میں یہ فیصلہ ابھی ممکن نہیں کہ کون کتاب سب سے اچھی ہے۔

فارسی نثر میں گلستاں، رزمیہ مثنویوں میں فردوسی کا شاہنامہ، بزمیہ میں نظامی کا خمسہ، رباعیوں میں عمر خیام کی رباعیاں، قطعات میں ابن یمین کے قطعے، قصائد میں انوری کے قصیدے، یہ میری رائے میں بہترین تصنیفات ہیں۔

۲۔ اوائل عمر میں اردو کی کتابوں کو تو میں نے اس قدر کم دیکھا کہ وہ دیکھنا نہ دیکھنے میں داخل ہے۔ غزلوں کے دیوانوں سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں ہوئی۔ میری مشق سخن کا ابتدائی زمانہ ضرور غزل سرائی ہی سے شروع ہوا مگر مشق کے بڑھ جانے پر میرا دل غزل کی جانب سے ہٹ گیا۔ البتہ فارسی کی کتابیں میں نے ایسی کثرت سے دیکھیں جن کا شمار تو درکنار، اب وہ خیال میں بھی نہیں ہیں۔ ایک عزیز شخص کا عمدہ کتب خانہ مجھے دیکھنے

کر لی گیا تھا۔ لہٰذا میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کن کن کتابوں نے مجھے خاص فائدہ پہنچایا۔

۳۔ میری طبیعت کسی خاص کتاب کو دیکھ کر نظم یا تصنیف اور تالیف کی طرف نہیں متوجہ ہوئی تھی۔ میں بدایوں کے ہائی اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ وہاں شاعری کا چرچا دیکھ کر دل اس طرف مائل ہوا۔ کچھ دنوں بعد میں اپنے وطن (اودھ) کو آیا۔ لکھنؤ میں تدبیر الدولہ حضرت اسیر مرحوم کا شاگرد ہوا۔ شوق کے ساتھ مشق بڑھتی گئی۔ مشق کے بڑھنے پر اس وقت کا مذاق دیکھ کر میں نے ایک مثنوی تصنیف کی جس کا نام "تراد شوق" ہے۔

۴۔ کسی خاص کتاب کے مطالعے سے میری زندگی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا ہے۔ جو اثر پڑا ہے وہ کتب بینی کی کثرت سے پڑا ہے۔

۵۔ میری سب سے پہلی تصنیف "تراد شوق" ہے۔ میری تصنیفات میں یہی ایک کتاب ایشیائی مذاق اور اردو شاعری کے پھیکے رنگ کی ہے۔ اس کے بعد کی جتنی تصنیفات ہیں، سب نئے مذاق اور نئی شاعری کی ہیں۔ میری سمجھ میں ملک نے تراد شوق کی اچھی قدر کی۔

۶۔ آپ کے چھٹے سوال کا جواب دینے سے پہلے میں ذرا تفصیل لکھنا چاہتا ہوں تاکہ صحیح اندازہ قائم ہو سکے۔

میں نے تراد شوق کے بعد ایک تاریخی اور قومی مسدس "میل و نساد" کہا۔ اس کو سر سید مرحوم نے مجھ سے لے لیا تھا اور علی گڑھ کو بھی بھیجا۔

پھر میں نے ایک مثنوی "حسن" لکھی۔ اس میں اکثر بیکن اور اسکی وغیرہ حکما کی فلسفیانہ بحثوں کا اخذ ہے جو میری (حسن) ایما انھوں نے کی ہیں اس کو پہلے منشی سجاد حسین صاحب مالک اودھ پنچ نے کتاب کی شکل میں چھاپا تھا اور اب میری نظرثانی کے بعد دہلی سے مخزن میں پوری شائع ہوئی ہے۔

پھر میں نے ایک مثنوی کہی جس کا نام "قاسم اور زہرہ" ہے۔ یہ چھپنے کو گئی ہے۔ ابھی شائع نہیں ہوئی۔

میری ایک نظم "دُرِ یتیم" میرے معزز دوست منشی محمد امین صاحب قصبہ مارہرہ سے کتاب کی شکل میں طبع کرا رہے ہیں۔

پھر میں نے اپنے معزز دوست مسٹر محمد سلیمان بیرسٹر ایٹ لا کی فرمائش سے ایک مستقل نظم لکھی جس کا نام سائنس اینڈ ریلجن (SCIENCE AND RELIGION) "علم طبیعیات اور مذہب" ہے۔ یہ اہم مسائل کی جرح و تعدیل کے ساتھ ہے۔ ابھی چھپی نہیں۔ تیار ہے۔

ان مستقل کتابوں اور نظموں کے علاوہ اور بہت سی متفرق نظمیں میں نے کہیں جو مخزن اور الناظر میں شائع ہوئیں۔

میں اپنی تصانیف میں سب سے بہتر "قاسم اور زہرہ" کو سمجھتا ہوں۔ غالباً اردو کی نظموں میں یہ اپنے رنگ کی پہلی کتاب ہو۔ انگریزی قصوں کی طرز کا ایک اوریجنل قصہ ہے۔ فطری حالتوں سے باہر قصے کا کوئی حصہ نہیں۔ ایسا واقعہ ہے جو ہو سکتا ہے۔ پرانے مذاق کے استعارات وغیرہ سے پاک ہے۔ متعلقین قصہ (مثل ڈرامے کے) اپنی اپنی زبان سے خود اپنی اپنی حالت بیان کرتے ہیں۔ وسط میں شوق انگیز اور دلچسپ، آخر میں ٹریجڈی یعنی درد انگیز ہے۔ سوا تیرہ سو اشعار سے زیادہ ہیں۔ اول سے آخر تک اضافت کہیں نہیں ہے۔ سیدھی سادی اردو ہے جس کو فصیح، بامحاورہ اور لطیف بنانے کے واسطے میں نے اپنی زبان اور اپنی شاعری کی قوت بہت صرف کر دی ہے۔ میں اس کی پوری خوبیاں لکھ نہیں سکتا۔ دیکھنے ہی سے ان کا تعلق ہے۔ مجھے امید ہے کہ ملک اس کی اتنی ہی قدر کرے گا جتنی میں نے اس کے دلکش بنانے میں محنت کی ہے۔

مرزا محمد ہادی رسوا لکھنوی

ولادت ۱۸۵۸ء ۔ وفات ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء

۱۔ اخلاق ناصری حکمت عملی میں، اوصاف الاشراف تصوف میں، دانش نامہ غیاث منصور قدیم فلسفہ میں، فارسی شرح تجرید علم کلام میں، گوہر مراد

عبدالرزاق لاہیجی علم کلام میں، دبستان مذاہب، دساتیر، مجموعہ ابراہیمی، حملۂ حیدری۔

۲۔ دیباچہ اقلیدس مصنفہ رام پرشاد مدرس نارمل اسکول لکھنؤ۔ اس نے ریاضیات اور دیگر علوم کے پڑھنے کا ذوق دلایا۔ دیوان غالب تیرہ برس سے مجھ کو حفظ یاد ہے اور منتخب کلام میر و سودا و انشاء اللہ خاں، مجموعہ مرثیہ ہائے مرزا دبیر۔

۳۔ مرزا دبیر صاحب کے مرثیے اور کلام فارسی خصوصاً مخمس ہفت بند کاشی کو خود مصنف سے سن کر مجھ کو شعر کہنے کا شوق ہوا۔ پہلے فارسی کہنا شروع کیا پھر سودا کی نصیحت نے جو ان کو علی حزیں   نے کی تھی کہ ہر شخص کو چاہیے کہ شعر اپنی مادری زبان میں کہے، مجھ پر یہ اثر کیا کہ میں نے سوائے اردو زبان کے اور کسی زبان میں شعر نہیں کہا۔

۴۔ مجموعہ ابراہیمی ایک نہایت بسیط کتاب دو جلد نہایت خوش خط اور ضخیم جو شاید چاند خاں کے کتب خانہ سے ایک صحاف کے پاس جلد بندھنے کو آئی تھی اور والد ماجد مرحوم اس کو اٹھا لائے تھے۔ اس میں اکثر علوم کی تعریفات اور اس کے اغراض اور فوائد پر دس گیارہ برس کے سن میں مجھ کو اطلاع ہو گئی تھی۔ اس زمانے سے مجھ کو مختلف علوم کے اکتساب کا شوق پیدا ہوا۔ یہ کتاب پھر میں نے اپنی تمام عمر میں نہیں دیکھی مگر اس کی تقطیع اور خط اور بعض مضامین اور جلد کی ضخامت سب بخوبی یاد ہیں۔ یہ کتاب بہاؤالدین عاملی علیہ الرحمۃ کے کسی شاگرد کی تصنیف ہے جن کا نام ابراہیم تھا اور کچھ نہیں معلوم۔

کشکول بہائی نہایت خوش خط والد کے کتب خانے میں تھی۔ اس کے مضامین بھی جستہ جستہ اس زمانہ میں نظر سے گزر گئے تھے۔ اوقات فرصت میں سرور سلطانی ترجمہ شمشیر خانی جو شاہنامہ کا خلاصہ ہے اور دونوں ترجموں میں شاہنامہ کے اشعار شامل ہیں۔ ان اشعار نے خاص اثر کیا اور طبیعت میں شجاعت کا جوش اور مہمات میں در آنے کا ذوق پیدا ہوا۔

۵۔ سب سے پہلے میں نے اصول علم کیمیا یعنی کیمسٹری کی فلاسفی پر ایک کتاب لکھی اور اس کو "اشراق" (جس میں ترجمہ کتب افلاطون شائع ہوتا تھا اور میرے ہی اہتمام سے نکلتا تھا) ——— میں شائع کیا پھر مفید المزارعین میں دوبارہ شائع ہوئی۔

مرقع لیلیٰ مجنوں (ڈراما نظم)، امراؤ جان ادا، ذات شریف، افشائے راز ناول چھپے اور شائع ہوئے اور ملک نے حسب دلخواہ قدر کی لیکن مجھ کو شریف زادہ جس میں ایک شریف زادہ کی خیالی لائف اور ذہنی ترقیوں کی صورت دکھائی ہے، مجھے اپنی جملہ تصانیف سے زیادہ پسند ہے۔ اگرچہ ملک نے جیسی چاہیے اس کی قدر نہ کی۔ اس لیے کہ اس میں دل خوش کن اور ناپاک عشق بازی کا شائبہ نہ تھا بلکہ محنت و استقلال کی مجسم اور سچی تصویر دکھائی گئی ہے۔

تصنیفات

(۱) نظرۃ الاسلام مطبوعہ (۲) جدیدہ سنیہ در علم کلام (۲۶ جلد) غیر مطبوعہ (۳) جوزف آف لاجک (ترجمہ) (۴) افلاطون کی حکومت جمہوریہ (۵) کتاب الاخلاق (عطر) (۶) زیج مرزائی در ہیئت (غیر مطبوعہ) (۷) ابطال الرقام (۸) رسالہ در توحید و اثبات واجب الوجود (۹) رسالہ در منطق استقرائی (غیر مطبوعہ) (۱۰) رسالہ در اصول مناظرہ (غیر مطبوعہ) (۱۱) رسالہ در علم النفس (غیر مطبوعہ) (۱۲) مصطلحات کیمیا (غیر مطبوعہ) (۱۳) رسالہ در اعمال اصطرلاب (غیر مطبوعہ) (۱۴) طلسمات (۱۵) امراؤ جان ادا (۱۶) ذات شریف (۱۷) شریف زادہ۔ (۱۸) مرقع لیلیٰ مجنوں ڈراما منظوم (۱۹) افشائے راز (۲۰) بہرام کی رہائی (۲۱) خونی بھید (۲۲) خونی جورو (۲۳) مثنوی لذت فنا (۲۴) مثنوی بہار جہد

(۲۵) مثنوی امید و بیم (۲۶) کلیات اردو، قصائد، مثنویات، غزلیات کا ایک کافی ذخیرہ تھا جس کا پتہ نہیں۔

پیارے لال آشوب دہلوی

ولادت ۱۸۳۶ء ۔ وفات ۱۹۱۴ء

میں نے اپنے تئیں کبھی مصنفوں کی فہرست میں نہیں شمار کیا۔ کیونکہ میری تالیف کا تعلق زیادہ تر ترجمے سے رہا ہے اور مترجم اور مصنف میں فرق ظاہر ہے۔ لیکن چونکہ بعض اہل قلم مترجموں کو بھی مصنفوں کے سلسلے میں شمار کر لیتے ہیں اس نظر سے آپ کے سوالوں کے جواب بر ترتیب حسب ذیل عرض کیے جاتے ہیں۔

۱۔ اردو تصانیف میں میرے نزدیک اردوئے معلیٰ، آب حیات اور حیات جاوید نہایت عمدہ کتابیں ہیں۔ تینوں کتابوں کو میں بہت وقعت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔

۲۔ اوائل عمر میں میری مدت تعلیم کا زیادہ حصہ پرانے دہلی کالج میں گزرا ہے جو غدر ۱۸۵۷ء سے پیشتر اس شہر میں قائم تھا۔ اس کالج میں انگریزی خوان جماعتوں کے طلبہ کو اردو کی بھی تعلیم ہوتی تھی اور یہ کتابیں داخل درس تھیں۔ گلستان ترجمہ منشی فیض پارسا، باغ و بہار، قصہ گل بکاؤلی، انوار سہیلی وغیرہ اور سب سے اعلیٰ جماعت کے طالب علموں کو ایک کتاب پڑھائی جاتی تھی جس میں اردو کے مشہور مشہور شاعروں کا منتخب کلام درج تھا۔ اس کتاب کے پڑھنے سے مجھے کسی قدر شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا اور میں نے چند غزلیں بھی کہیں اور مشاعروں میں پڑھیں۔ اس فن میں مولوی عبد الکریم سوز خلف الرشید مولوی امام بخش صہبائی مرحوم میرے استاد تھے۔ مگر یہ شوق چند ہی روز رہا اور انگریزی کی تحصیل کے شوق نے اس کی طرف سے توجہ ہٹا دی۔ آپ کے تیسرے سوال کا جواب بھی اسی میں آ گیا۔

۴۔ جب بعد از غدر میں گوڑگانوہ سکول میں ہیڈ ماسٹر ہوا تو جو طریق استادوں نے انگریزی سے اردو ترجمہ کرنے کا اختیار کر رکھا تھا مجھے پسند نہ آیا۔ اس ترجمہ سے خاص طلبہ کو بہت کم فائدہ پہنچتا تھا اور جس فقرے کو وہ پڑھتے تھے یہ نہیں سمجھتے تھے کہ اس کا مفہوم کیا ہوا۔ حکام سررشتہ تعلیم نے اس نقص کے رفع کرنے کے لیے یہ تجویز فرمائی کہ ترجمہ با محاورہ کرایا جائے مگر اس میں بھی ایک نقص رہا۔ وہ یہ کہ طلبہ کو انگریزی کے لفظوں کے یا محاوروں کے علیحدہ علیحدہ معنی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ آخر ان دونوں نقصوں کے دور کرنے کے لیے میں نے ترجمہ کا وہ طریق اختیار کیا جس کو ہیملٹونین سسٹم کہتے ہیں۔ اس طرح ترجمہ کرنے سے طلبہ کو با محاورہ ترجمہ کرنا بھی آ جاتا ہے اور کوئی لفظ یا انگریزی محاورہ ایسا نہیں رہ جاتا جس کو لڑکے سمجھ نہ سکیں۔ یہ طریق افسران سررشتہ تعلیم کو بہت پسند آیا تو میں نے انگریزی کی پہلی کتاب کا ترجمہ اسی طرح کر کے طبع کرایا اور افسران سررشتہ تعلیم نے اس کی قدر دانی اور میری قدر افزائی کی اور اس کے صلے میں گورنمنٹ عالیہ سے مجھے انعام بھی عطا ہوا۔

یہ ترجمہ کسی قدر میری شہرت کا باعث ہوا چنانچہ ۱۸۶۹ء میں جب فوج کے انگریزی افسروں کے امتحان کے لیے کتابیں تجویز کرنے کو گورنمنٹ انڈیا نے ایک کمیشن مقرر کیا اور کرنل ہالرائڈ صاحب جو اس وقت مدارس حلقہ انبالہ کے انسپکٹر تھے اس کمیشن کے ممبر ہوئے اور درسی کتابوں کی تالیف شروع ہوئی تو صاحب ممدوح نے شمس العلماء خان بہادر مولوی ضیاء الدین مرحوم کو اور مجھ کو تالیف کے کام میں اپنا شریک کیا۔ سب سے پہلی کتاب کرنل صاحب نے فوجی افسروں کے امتحان کے لیے رسوم ہند تالیف کی۔ اس کتاب کے پانچ باب ہیں۔ پہلے میں ہندوؤں

کے مذہبی اصول کا ذکر ہے۔ دوسرے اور تیسرے باب میں دو قصے ہیں جن سے اس زمانے کے ہندوؤں کے رسم و رواج کا حال دلچسپ طور پر ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ تینوں باب خاص میری تالیف سے ہیں اور رسموں کے دریافت کرنے میں کئی اور احباب سے مدد لی گئی تھی۔ آخر کے دو باب مولوی صاحب مرحوم کی تصنیف سے ہیں۔ جن میں سے ایک میں مسلمانوں کے مذہبی عقائد اور پیغمبروں کے حالات درج ہیں اور دوسرے میں جو کتاب کا پانچواں باب ہے ایک قصہ اسی طرز کا جیسا دوسرے اور تیسرے باب میں ہے لکھا گیا ہے۔ اس کتاب کے سوا کرنل صاحب نے اور کتابوں کی تصنیف میں بھی ہم دونوں سے مدد لی۔ چنانچہ ایک کتاب کے دیباچے میں جس کا نام ہندوستانی ریڈر (تسہیل زبان اردو) ہے، اس امداد کا اعتراف کیا ہے اور جو کلمات تحسین اس میں لکھے ہیں ہم اس کے شکر گزار ہیں۔

ان کتابوں کی تالیف سے صاحب ممدوح کے دل میں میری قابلیت کا نقش جم گیا اور وہ ڈائرکٹر ہوتے ہی انہوں نے مجھ کو انگریزی کتابوں کا ترجمہ کرنے پر معین کر دیا۔ صاحب ڈائرکٹر کے سررشتے سے ایک اخبار جس کا نام سرکاری اخبار تھا جاری ہوا کرتا تھا۔ اس میں سررشتہ تعلیم کی خبریں درج ہوا کرتی تھیں۔ صاحب ممدوح نے اس اخبار کو سررشتے کے لیے کچھ مفید نہ پایا۔ اس غرض سے کہ طلبہ کو اس کے مطالعہ سے فائدہ پہنچے، مجھ کو اس کا مینیجر اور شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد مرحوم کو سب ایڈیٹر مقرر کیا۔ اس اخبار کے نامہ نگار کئی جلیل القدر اور فاضل صاحبان انگریز بھی تھے۔ جو آرٹیکل وہ لکھتے تھے، ہمارے پاس آتے تھے اور ہم اس کو ترجمہ کر کے اور اپنے طور پر درست کر کے اخبار میں درج کر دیتے تھے اور خود بھی اکثر مفید مضمون لکھا کرتے تھے۔

اس اخبار کی دھاک ایسی بندھی کہ پنجاب کے کئی مشہور اخبار مثلاً کوہ نور اور پنجابی اخبار ہیچ اٹھے اور گورنمنٹ میں عرضداشت کی کہ اس سرکاری اخبار کے نئی طرز پر جاری ہونے سے ہماری سراسر کساد بازاری ہوتی ہے اور آمدنی میں بھی نقصان آ گیا ہے۔ سرکار نے ان کے حال پر رحم فرمایا اور یہ مناسب سمجھا کہ جو کام سرکار کی مداخلت بغیر ہو رہا ہے اس کو تقویت دینی چاہیے۔ چنانچہ وہ اخبار بند کر دیا گیا اور اس کے بجائے ایک ماہواری رسالہ جس میں مضامین علمی کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تھا جاری کیا۔ اس کا نام اتالیق پنجاب رکھا گیا۔ جب تک میں ڈائرکٹر صاحب کے دفتر میں ترجمے کے کام پر رہا اس رسالے کا اہتمام کرتا رہا اور نیز یہ کتابیں بھی لکھیں:

”اردو کی تیسری کتاب۔ قصص ہند حصہ اول۔ تاریخ انگلستان۔ تاریخ زمانۂ قدیم۔ جغرافیہ طبیعی وغیرہ۔“

اس کے بعد ترجمے کے عہدے سے میری ترقی کیوریٹری کے عہدے پر ہو گئی۔ ان ایام میں میں نے اپنے فرض منصبی کے سوا تاریخ جلسہ قیصری کا ترجمہ کیا اور ترجمے میں وہی امر ملحوظ رکھا کہ ترجمے میں انگریزی خیالات سب ادا ہو جائیں مگر عبارت میں انگریزی کی بو نہ ہو اور صاف اور سلیس ہو۔

۲۔ میری تالیفات جتنی ہیں سب یکساں ہیں۔ ان میں کسی کو کسی پر کوئی فوقیت نہیں۔ میری تالیفات سب ۱۸۹۱ء سے پہلے کی ہیں۔ ۱۸۹۱ء سے چودہ سال تک میں انسپکٹر مدارس رہا۔ اس عرصے میں کثرت کار کے سبب سے تالیفات کا شوق نہ ہو سکا اور اب فرصت سے خانہ نشین ہوں۔

بیج ناتھ، جج پنشنر

*

میں نے اردو فارسی کم پڑھی ہے لیکن جس قدر فارسی پڑھی اس میں شیخ سعدی کی تصنیفات مثل گلستان و کریما کو اخلاق میں اور مثنوی مولانا روم کو تصوف میں بہت اچھا پایا۔ اردو میں کلام نظیر کو بہت اچھا خیال کرتا ہوں مگر ان جملہ کتابوں میں جو اخلاق یا تصوف سے ہیں وہ ہمارے یہاں

کے اپنشدوں، رامائن والمیکی، مہابھارت اور منو وغیرہ کے گیان اور نیتی سے کسی طرح پر فائق نہیں ہے۔ میں نے اپنا وقت بیشتر سنسکرت کے پڑھنے میں صرف کیا ہے اور وہی میری زندگی کا آدھار ہے۔ میں خیال کرتے ہیں کہ جو شخص اس دنیا میں سکھ اور آنند کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہے اسے چاہیے کہ والمیکی رامائن اور مہابھارت کو اپنا آدھار بنائے اس سے اس کا یہاں کلیان ہوگا اور عاقبت بھی سدھر جائے گی۔ بھگوت گیتا اور اپنشدوں کا گیان ان لوگوں کے لیے جو اس زندگی کو ناچیز خیال کر کے آتم گیان ہی کو ذریعہ بہبودی خیال کرتے ہیں، دنیا کے تمام اخلاق اور تصوف پر فائق ہے اور یہ نہ صرف میرا تجربہ ہے بلکہ غیر ملک کے لوگوں کا بھی ہے۔ اردو کا علم ادب ابھی بن رہا ہے۔ پرانا علم ادب زمانہ حال میں زیادہ کارآمد نہیں۔ اس پر پنجاب میں حال ہی میں کچھ اچھی درسی کتابیں سررشتہ تعلیم کی طرف سے شائع ہوئی ہیں۔ میں مسدس حالی اور تصانیف مولوی نذیر احمد کو اردو کی اچھی کتابیں خیال کرتا ہوں۔ ہندی کا علم ادب بھی بن رہا ہے اور اس میں روز بروز ترقی ہے۔ پچھلے شاعروں میں بھارت اندو اور بابو ہریش چندر داس کے اور پہلے مہاتماؤں میں نانک، کبیر، سورداس، تلسی داس، سندرداس پڑھنے لکھنے والے ہوئے ہیں۔ میرے اوپر کیا ہر شخص پر تلسی داس کے کلام کا اثر پڑے گا۔ ہندی زبان جب تک ہے تب تک تلسی داس کی رامائن اور ونے پترکا رہیں گی۔

۲-۳- مجھ کو اردو کی تصنیف کی طرف کسی خاص کتاب کے پڑھنے سے رغبت نہیں ہوئی۔ ہندی لکھنے میں ان تمام مہاتماؤں کا جن کا ذکر اوپر کیا ہے کم و بیش اثر ہوا۔ اردو کی تحریر میں میں نے وہ طرز تحریر اختیار کیا جو سر سید احمد خاں صاحب کے وقت میں جاری ہوا۔

۴- اردو یا فارسی کی کسی خاص کتاب کا میری زندگی پر اثر نہیں ہوا۔ سنسکرت میں مہابھارت کا بہت بڑا اثر ہوا۔ اس نے میری زندگی کی حالت کو تبدیل کر دیا اور اس اخیر وقت میں وہی میرا سہارا ہے۔

۵- اردو میں سب سے پہلی کتاب مسائل قانون ۱۸۸۹ء میں نے لکھی۔ وہ خوب چلی۔ پھر ۱۸۹۲ء میں ہندو سوشل ریفارم لکھی۔ وہ بھی خوب چلی۔ پھر ۱۸۹۶ء و ۱۸۹۷ء میں انگلینڈ اور انڈیا لکھی۔ وہ ان دونوں سے بھی زیادہ چلی۔ بہت سے لوگ اب تک اس کے شائق ہیں اور میرا نام اس کے ساتھ مشہور ہو گیا۔ پھر ۱۹۰۵ء میں ہندوستان گزشتہ و حال لکھی۔ وہ بھی چلی مگر اتنی نہیں۔ ہندی میں دھرم وچار خوب چلا اور بہت پسند آیا۔ کتاب دھرم سنکشا جواب لکھی ہے وہ بھی بہت پسند آئی۔ شاستر وکت ایان مشکل ہونے کی وجہ سے کم چلتی ہے۔

شیوبرت لال ورمن

۱- ہندی سنسکرت کی کتابوں میں گوسوامی تلسی داس کی رامائن اور رائے سالگ رام صاحب کے سنت سنگرہ کو بہترین خیال کرتا ہوں۔

۲-۳-۴- رامائن، سنت سنگرہ حصہ اول نے مجھے سب سے زیادہ فائدہ پہنچایا اور انہیں کے مطالعہ کا مجھ پر خاص اثر ہوا۔

۵- میری سب سے پہلی تصنیف راجستھان ہے جو تین بار چھپی تھی۔ اب ایک کاپی بھی نہیں۔

۶- میں نے دو سو کتابیں قریب قریب لکھیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کون اچھی اور کون بری ہیں۔ بہت سی بار بار چھپی ہیں۔

بابو شیوبرت لال ورمن ایم۔ اے رسالہ سادھو لاہور کے ایڈیٹر تھے۔ یہ رسالہ سوشل اور مذہبی مضامین شائع کرتا تھا اور ۱۹۱۱ء میں جاری تھا۔

امداد امام اثر

ولادت ۱۸۴۹ء۔ وفات ۱۹۳۴ء

۱۔ میں تمام فارسی تصنیفات میں فردوسی کے شاہنامہ، سعدی کی گلستان و بوستان، حافظ کا دیوان، مولانا روم کی مثنوی اور حکیم سنائی کے حدیقہ کو اس عظمت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ بے شک یہ ایسی کتابیں ہیں جو الہامی مدد کے بغیر تصنیف نہیں ہو سکتیں ہیں۔

اسی طرح اردو میں کلام میر تقی، مثنوی میر حسن اور مراثی میر انیس قابل توقیر ہیں۔ میرے زعم میں ان بزرگواروں کو بھی مضامین الہامی وسیلہ سے تفویض ہوتے تھے۔ جن حضرات کو لٹریچر کا صحیح مذاق حاصل ہے، لاریب ان فارسی اور اردو کے استادوں کی ضرور قدر فرماتے ہیں۔ میں سہ نثر ظہوری اور فسانۂ عجائب کے انداز تحریر سے بیگانگی رکھتا ہوں۔ ہر چند میں اس کا معترف ہوں کہ ملا نور الدین ظہوری اور رجب علی سرور بڑے قابل انشا پرداز تھے۔

۲۔ طالب العلمی کے زمانہ میں مصنفین بالا کے علاوہ مجھے قصائد سبعہ معلقہ، ہومر کی ایلیڈ، شکسپیر کے پلیز (PLAYS) شاہ حکایات کی الف لیلہ والمیکی راماین اور ویاس کی مہابھارت کے ساتھ بڑی دلچسپی تھی اور آج بھی ہے۔

۳۔ یوں تو مجھے عربی اور فارسی کی درسی کتابوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور ہر فن میں کچھ عمدہ کتابیں ہیں مگر جا بجا مصنفین بالا کی تصنیفات کا اثر بیش و کم درجہ پر ضرور میری طبیعت پر پڑ گیا ہے۔ ظاہراً ایسا نہیں معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص کتاب کے اثر نے مجھے تصنیف کی توفیق بخشی بلکہ مختلف علوم کی تحصیل نے مجھے اس کام کی طرف مائل کر دیا۔

۴۔ بہ اسباب ظاہر مجھ پر کسی خاص کتاب کے مطالعہ کا اثر نہیں پڑا ہے۔ مجھ پر جس قدر شکسپیر کا اثر پڑا ہے اتنا ہی میر حسن کا اور اسی طرح جس قدر ہومر اور والمیکی کا اسی قدر حافظ اور میر انیس کا۔

۵۔ میری سب سے پہلی تصنیف کا نام مرآۃ الحکماء ہے۔ یہ کتاب علم فلسفہ میں ہے اور تاریخ فلسفہ کی بھی حیثیت رکھتی ہے۔ ثالیس ملیطی (THALES OF MALITUS) کے وقت سے لے کر عہد جان مل (JOHN MILL) تک کے فلسفہ سے اس کتاب میں بحث کی گئی ہے۔ میری اس کتاب کی کوئی قدر میرے ملک نے نہیں کی۔ صرف اس کے قدر دان ڈاکٹر لیٹز صاحب نکلے۔ یہ صاحب ایک وقت میں سر رشتہ تعلیم پنجاب کے ڈائرکٹر تھے۔ سر سید احمد خاں صاحب نے البتہ اتنا فرمایا کہ "یہ کتاب ہندوستان میں بہت قبل از وقت لکھی گئی ہے" انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اب یہ کتاب خریطۂ نسیاں میں پڑی ہوئی ہے۔

۶۔ میری تصنیفات سے جن کو زیور طبع نصیب ہوا ہے مرآۃ الحکماء کے علاوہ کتاب الزراعت، کتاب الاثمار، معیار الحق اور دیوان اثر ہیں۔ آخر میں جو کتاب فلسفہ شاعری میں لکھی ہے چار جلدوں میں ہے۔ اس کے چھپوانے کی فکر میں ہوں۔ میرے لیے تصنیف و تالیف کا کام بہت مالی نقصان کا سبب ہوا ہے۔ اسی وجہ سے میری اور بہت سی تصنیفات شائع نہیں ہو سکیں۔ میں اپنی تصنیفات سے کسی کو بہترین تصنیف کہوں میری تجویز سے باہر ہے۔ جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں مختلف فنون سے تعلق رکھتی ہیں۔ پس ان کا موازنہ مجھ سے دشوار ہے۔ میری یہ آخری کتاب دیکھنی ہے۔ کاش میں آپ کے قریب ہوتا، تاکہ آپ کو کچھ اس کے اجزا پڑھ کر سنا سکتا۔

علی حیدر نظمؔ طباطبائی لکھنوی

ولادت ۱۸۵۳ء۔ وفات ۱۹۳۳ء

فارسی میں حافظؔ، خسروؔ، بیدلؔ کی غزلیں مجھے بہت پسند ہیں۔ قاآنی ایران میں عجب شاعر گزرا ہے لیکن انتہا کا فحش گو ہے۔ اس کے دیوان کا انتخاب کیا جائے تو کام کا ہو۔ اردو شاعروں میں سوداؔ کا مثل نہیں۔ لیکن زبان اس زمانہ کی اب اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ میرؔ نے غزلیں عجب انداز کی کہی ہیں لیکن دردؔ کی غزلیں کچھ اور ہی شان رکھتی ہیں۔ سید انشاء اللہ بڑے ہزل گو ہیں اور مصحفیؔ کہتے ہیں۔ سعادت علی خاں سے مرید و مذہب امیر کا ان سے متنفر ہو جانا بے جا نہ تھا۔ شعرائے لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ اور نواب محمد تقی خاں ہوسؔ کا رنگ قدما کا ہے۔ چوچلے اور اختلاط کی شاعری جرأتؔ کا نرالا طرز ہے۔ ناسخؔ نے ان کا تتبع کیا مگر کسی قدر اس رنگ میں اصلاح کی۔ ناسخؔ نے فارسی ترکیبوں سے احتراز کیا ہے اور ایک دن اپنے شاگردوں کو جمع کر کے کہا کہ عارض و گیسو و بناگوش و ابرو و دہن و ذقن وغیرہ اردو کے محاوروں میں کہاں داخل ہیں جو شعر میں بے تکلف اس کا استعمال جائز رکھا جائے اور یہ مصرع پڑھا کہ:

من نکردم شما حذر بکنید

غالبؔ نے اس کے برعکس اردو کو بالکل فارسی بنا دیا ہے بلکہ فارسی کا محاورہ اردو میں ترجمہ کر لینا بھی ان کے آگے کوئی بات نہ تھی مگر پھر بھی چند شعر ایسے صاف صاف کہے کہ ان کا جواب نہیں۔ مومنؔ گو پست جاتے ہیں مگر چند شعر ان کے بھی نہایت دلکش ہیں۔ امیرؔ سا ماہر فن اور محقق اردو میں نہیں ہوا۔ جس رنگ میں وہ شعر کہتے ہیں اس میں اکثر شعر بگڑتے تو ہیں مگر جو شعر ان کے رنگ میں پورے اترتے ہیں وہ بے مثل ہیں۔ امیرؔ اپنے استاد کے قدم بقدم چلتے ہیں مگر فحش سے بچے ہوئے۔ انہوں نے اور جلالؔ نے کچھ دہلی کے رنگ سے بھی اپنے کلام کو رنگا۔ یہ دونوں شخص مقتضیات زمانہ سے تھے۔ حالیؔ کی غزلیں بہت مہذب ہیں۔ میرے خیال میں اکثر ان کی اخلاقی نظموں سے غزلوں کا پایہ بلند ہے۔ آتشؔ و رندؔ و صباؔ و وزیرؔ و بحرؔ و گویاؔ کے دیوان مقبول خلائق ہو گئے ہیں۔ بار بار چھپا کرتے ہیں۔ یہ سب لوگ تو غزل گو ہیں۔ اصل میں واقعہ نگاری کا سلیقہ ہونا جزو اعظم شعر ہے جو غزل میں نہیں ظاہر ہوتا اور اس اعتبار سے میر حسنؔ و نسیمؔ لکھنوی و نواب مرزا شوقؔ بڑے واقعہ نگار تھے مگر اخلاق پر ان کی مثنویوں کا اثر اچھا نہیں پڑتا۔ البتہ میر انیسؔ کا کلام خصوصاً ان کی آخری عمر کے مرثیے جو آغا ابو صاحب کی مجلسوں میں پڑھے جاتے ہیں اور ان کے بعد سلیسؔ انہیں مرثیوں کو پڑھا کیے اردو میں عجیب چیز ہیں۔ لکھنؤ کی خاص زبان جو ہر طرح کے فحش و آمیزش سے پاک ہے اس سے سیکھنا چاہیے اور مردانگی و حمیت و ثابت قدمی و شجاعت و استغنا و وفا کا سبق اس سے لینا چاہیے لیکن لکھنؤ ہی میں تنقید شعر کے جو اصول مقرر ہوتے ہیں اور خود میرؔ صاحب بھی ان اصول کو تسلیم کر چکے ہیں ان کا کلام اس معیار پر پورا نہیں اترتا اور اس میں بھی شک نہیں کہ وہ اہل زبان ہوں گے اور اپنے کا استعمال صحیح طور سے کر سکتے ہیں ان سب میں میر انیسؔ افصح ہیں۔

نثر فارسی میں ابو الفضل کی دقیقہ سنجی ایک کارنامہ ہے۔ لیکن وہ شخص اپنے دست و قلم کو زبان کا مالک سمجھتا ہے اور اس سبب سے تصرف بے جا بہت کر جاتا ہے جسے اہل زبان نہ مانیں گے۔ ناسخ التواریخ کا طرز بیان قابل ترجیح ہے۔ اردو میں غالبؔ کی نثر نگاری کا جواب نہیں سر سید کے مضامین بھی بے مثل ہیں۔ آزادؔ کی خوش بیانی میں شک نہیں لیکن وہ نے کے استعمال میں غلطی کرتے ہیں۔ اودھ پنچ کی ابتدائی جلدیں زبان

اُردو کا زیور ہیں۔ خصوصاً مرزا رجب علی بیگ کی تحریروں میں لکھنؤ کی زبان کا مزہ ایسا ہے کہ لب بند ہوتے ہیں اور شوقِ بیان ہی بے چین کر دیتی ہے۔ سرشار نے خوب ان کا تتبع کیا ہے۔ شرر نے جو طرز نکالا وہ عالمگیر ہو گیا اور اب اکثر وہی رائج ہے۔ مرأۃ العروس، رویائے صادقہ، توبۃ النصوح اردو میں عجیب کتابیں ہیں۔ مصنف نے محاورے کوٹ کوٹ کر بھر دیئے ہیں۔ حالی و شبلی کی نثر بھی بڑے پایہ کی ہے۔ دہلی میں ٹھونسنے کے محل استعمال کو بھولے جاتے ہیں مگر ناصر علی کا بیان و زبان منظم و دلگداز ہے۔

ادبی رسالے جو اردو میں نکلتے ہیں ان میں نظم کا حصہ بہت کچھ قابلِ اصلاح ہے۔ اکثر نظمیں پایۂ شاعری سے گری ہوئی ہوتی ہیں۔ مدیرِ رسالہ شاعر نہ ہو نہ سہی موزوں و ناموزوں میں تو اسے امتیاز ہونا چاہیئے۔ عربی و انگریزی میں کسی قدر دخل ہو گیا ہے، تو اردو کی کتابیں میں زیادہ نہیں دیکھتا نہ اس میں میرا جی لگتا ہے۔ بہت سے اردو میں تصنیفات ہوئے اور ہو رہے ہیں جس کی مجھے خبر نہیں۔ میں اس عالم میں نہیں ہوں۔ یہ جانتا ہوں کہ اردو کو ایسے رسالوں کی بہت ضرورت ہے جو یورپ کے فنونِ جدیدہ و اکتشافاتِ علمیہ کو انگریزی رسالوں کی طرح وقتاً فوقتاً شائع کرتے ہیں بشرطیکہ مترجم خود سمجھتا ہو ورنہ لفظی ترجمہ کر دینا کچھ مفید نہیں۔

میری اوائل عمر کا حال آپ کیا پوچھتے ہیں۔ فسانۂ عجائب و زہرِ عشق نئی نئی شائع ہوئی تھیں۔ اس نظم و نثر نے طبقۂ اردو میں وہ زلزلہ ڈال دیا تھا کہ جو بیان کیا موقوف ہے۔ اس زمانہ کے لوگوں میں کوئی اس کے بُرے اثر سے نہیں محفوظ رہا جس کے چرچے آج تک نہ مندمل ہوئے۔ مرزا دبیر مرحوم و میر انیس مغفور کے نئے مرثیوں کی مجلسیں بھی یادگار زمانہ ہوئیں۔ میر باقر کا امام باڑہ اور نواب محمد حسین خاں کا مکان ایک عجیب مرکز شعر و سخن تھا۔ اسی زمانہ میں کچھ اردو کی نثر بھی شروع ہوئی۔ فرنگی محل سے اخبار کارنامہ مسجع شائع ہونے لگا۔ والد مرحوم کے ساتھ میرا کلکتہ جانا ہو گیا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ بادشاہ نے بھی اردو میں خط و کتابت شروع کی ہے۔ اور مسجع عبارت بہت پسند کرتے ہیں۔ بعض تحریریں میری بھی ملاحظہ سے گزریں اور یہ فقرہ جو میرے لیے سرمایۂ نازش ہے ارشاد ہوا۔

”تمہاری عبارت پسندِ خاطر ہے دریائے مقاطر ہے“

ایک دن نواب تاباں محل کی کہاری میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ جہاں پناہ نے ہمارے حضور کے لیے ایک غزل کہہ کر بھیجی ہے۔ حضور فرماتی ہیں کہ اس غزل کا جواب لکھ دیجئے۔ پہلے تو میں حیران ہوا کہ بادشاہ کی غزل کا جواب اور میں یہ کیسی فرمائش ہے۔ پھر اس کے ہاتھ سے غزل لے کر دیکھی تو معلوم ہوا کہ خاص تاباں محل کی مدح میں وہ غزل ہے۔ طرحدار ہے تاباں بیگم اور عیار ہے تاباں بیگم۔ یہ دیکھ کر جواب میرے ذہن میں فوراً آ گیا کہ

زلفِ مشکیں میں گرفتار ہے تاباں بیگم ؎
کشتۂ ابروئے خم دار ہے تاباں بیگم

ساری غزل اسی وقت لکھ کر دے دی اور حضرت کے ملاحظہ میں گزر گئی بہت پسند فرمائی۔ بادشاہ کی غزل تو ان کے کسی دیوان میں غالباً موجود ہے لیکن میں نے جو کچھ لکھ دیا تھا حسبِ ضابطہ اس کی نقل بیت الاخبار کے دفتر میں ضرور ہو گی مگر میں اپنے پاس مسودہ نہ رکھتا تھا نہ ان چیزوں کی میری نظر میں کچھ قدر تھی۔ وہ دفتر ہی تباہ ہو گیا۔ نیلام میں نہ جانے وہ سب جلدیں کسی پنساری کے ہاتھ لگیں جس میں بہت ناموں کی نقلیں رہتی تھیں۔

میر منشی بادشاہ کے رفعت الدولہ مرحوم تھے اور سرکار انگریزی میں جو محبت نامے بادشاہ کی طرف سے جاتے تھے وہ حسبِ ضابطہ عہدِ سلطنت فارسی میں ہوا کرتے تھے۔ ان مرحوم کی عبارت تاریخ وصاف و درۂ نادرہ سے کسی طرح کم نہ تھی۔ شاید وہ سب تحریریں ان کے صاحبزادوں کے پاس ابھی تک

لکھنؤ میں موجود ہوں گی جو قتی صاحب کے قلم سے نکلیں۔ یہ خدمت تو انہیں کے متعلق تھی مگر مجھے بھی ایک مرتبہ بادشاہ کی طرف سے وائسرائے کو محبت نامہ لکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور اودھ پنچ میں اس عنوان سے چھپا بھی تھا کہ ع

راز درونِ پردہ ز رندانِ مست پرس

کئی ہزار روپے کر ایک کونسلی نے اس کا مسودہ انگریزی میں کیا تھا۔ مولوی محمد حیدر رضا صاحب جو بالفعل مٹیا برج میں اس امام باڑہ کے متولی ہیں جس میں بادشاہ مدفون ہیں انگریزی کا مطلب مجھے اردو میں بتاتے جاتے تھے کہ میں اس زمانہ میں انگریزی نہ جانتا تھا اور میں ہر ہر فقرہ کو فارسی میں لکھتا جاتا تھا۔ اس کا اخبار میں شائع کرنا بھی قرینِ مصلحت تھا ورنہ اور سب تحریریں صیغہ راز میں ہمیشہ رہا کرتی تھیں۔

شعر کی طرف رجحان ہونے کے اسباب یہ ہیں کہ مولوی محمد صمدی صاحب ادیب لکھنؤ جو اہل علم میں آفتاب الدولہ قلق کے شاگرد ہوئے اور اشرف آباد میں پر تکلف کے مشاعرے انہوں نے شروع کیے۔ میں اس زمانے میں پرانے حیدر گنج میں تھا، بسبب قرب کے اور ان مرحوم کے اصرار سے ہر مشاعرہ میں شریک ہونے لگا۔ فارسی میں عرفی و ظہوری و طغرا وغیرہ پڑھ چکا تھا۔ ان کتابوں کے سامنے میں اردو کی شاعری کا ہیچ ہو گئی۔ اس زمانہ میں تمام شہر کا مذاق یہی تھا کہ شعر کو معراج کمال سمجھتے تھے۔ میں بھی کچھ کہنے لگا۔ جب مٹیا برج میں رہنا ہوا تو وہاں حامد علی مرزا ولی عہد مرحوم نے مشاعرے شروع کیے۔ ہر مہینے کی گیارھویں تاریخ شام ہوتی کہ شاعروں کے مکانوں پر چوبدار موجود کہ چلیے صاحب عالم یاد فرماتے ہیں۔ میری زبان پر فارسی عربی پڑھنے کا بڑا اثر پڑا تھا کہ تعقید کا مس تو بالکل جاتا ہی رہا تھا اور میں ایہام کو ابتذال سمجھتا تھا۔ اس وجہ سے شعر کہنے کو جی نہ چاہتا تھا اور بہت کم کہتا تھا۔ اس اثنا میں غالب کا دیوان پہلے لکھنؤ سے چھپ کر نکلا اور اس بات کا فیصلہ ہو گیا کہ اردو کو فارسی سے چارہ نہیں۔ میرا قلم بھی چل نکلا۔ غالب مرحوم کے دیوان کا اثر بھی بہت پھیلا مگر خاص طبقہ میں رہا۔ داغ و عشق نے جیسا اثر کیا تھا وہ اثر میں نے کسی کتاب کی اشاعت میں نہ دیکھا۔ شعر و سخن کے ذوق نے اکثر لوگوں کی رہزنی کی ہے کہ تحصیل علم کو چھوڑ کر تمام عمر کے لیے اسی فن کے ہو رہے۔ میرے لیے شعر رہبر ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ طالبان فن حدائق البلاغہ و معیار الاشعار کو عمر بھر پڑھتے ہیں اور ہم نہیں سمجھے۔ سکاکی و زمخشری و تفتازانی کی کتابیں زبان عربی کے قفل میں اور معقولات کے حصار میں بند پڑی ہیں۔ علما کے طبقہ میں جو لوگ ہیں انہوں نے مختصر المعانی کے چند مسئلے پڑھ لیے تو کیا وہ شاعر نہیں ہیں۔ میں نے اس ہفت خواں میں قدم رکھا۔ پھر شعر کہا۔ ادھر یہ قیامت ہوئی کہ مرزا ولی عہد مر گئے اور جہاں مر گئے۔ مٹیا برج ماتم کدہ ہو گیا۔ شعر کہنے کی طرف سے اکثر لوگوں کی طبیعت افسردہ ہو گئی۔ میں نے یک قلم فکر شعر ترک کی۔ میرے ہم خیال و ہم مذاق مولوی محمد صمدی مرحوم نکلے۔ قلق کے مرنے کے بعد وہ بھی مٹیا برج میں چلے آئے تھے۔ میں نے انہوں نے شریک ہو کر میبذی کے طبیعیات و الٰہیات پڑھے تھے۔ انہوں نے تو پھر اردو میں شعر نہیں کہا۔ تحصیل علم سے فارغ ہو کر لکھنؤ میں عربی قصائد میں فصاحت و بلاغت کا علم بلند کیا۔ مجھے فلسفہ کا ذوق ایسا ہو گیا کہ شعر کہنے میں جی نہ لگا۔

میرے دیوان میں جتنی غزلیں ہیں یا قصائد ہیں سب طرح مشاعرہ میں ہیں یا کسی کی فرمائشی زمین میں فکر کی ہے۔ دوسری تصنیفوں کا بھی یہی حال ہے۔ کسی کی تحریک ہوئی قلم نے حرکت کی نہیں تو فرصت سے بے جا بھی۔ خدا مغفرت کرے مولوی میر افضل حسین صاحب میر مجلس عدالت عالیہ کی شرح عشقیہ انہوں نے مجھ سے لکھوائی اور خدا بھلا کرے نواب عماد الملک بہادر کا کہ دیوان غالب کی شرح محض ان کی فرمائش سے میں نے لکھی اور کوئی ہوتا تو اس کام کو اپنے شان کے خلاف سمجھتا۔ میری کسی تصنیف کی ملک نے قدر نہ کی۔ احباب کی قدر شناسی کے طفیل میں کچھ کلام دیوان کی صورت میں جمع ہو گیا اور ملک کی ناشناسی کے سبب سے تصنیف و تالیف کی بہت آرزوؤں کا خون ہو گیا۔

تصنیفات وتالیفات (۱) شرح دیوان غالب (۲) شرح دیوان امراء القیس (۳) تشریح الافلاک (۴) نظم طباطبائی (۵) دیوان طباطبائی (۶) تاریخ یورپ حصہ اول (۷) تاریخ طبری۔ المعروف حوت الغزل (۸) تلخیص عروض وقوافی (۹) خطبۂ شقشقیہ کا اردو نظم میں ترجمہ۔

مرزا سلطان احمد

ولادت ۱۸۵۳ء۔ وفات ۲ جولائی ۱۹۳۱ء

اردو فارسی میں اب تک پرانے اور نئے رنگ میں جس قدر کتابیں لکھی گئی یا شائع کی گئی ہیں، وہ ایک ہی قسم کی نہیں، مختلف اقسام کی ہیں اور پھر صوبہ وار ان کی تقسیم بھی جداگانہ ہیں اور ان صوبہ وار اقسام کا اکثر حصہ مذاق کے تابع ہے۔ ایک صوبہ ہندوستان کا مذاق دوسرے صوبے سے کسی نہ کسی حد تک ضرور اختلاف رکھتا ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ بالکل ہی اصولی اختلاف ہو بلکہ کہ ہر ایک صوبہ کی تعلیمی حیثیت اور تعلیمی سرمایہ کی حیثیت سے کسی نہ کسی حد تک اختلاف ہے۔ صوبہ بنگال کی تصنیفات یا تالیفات کا کچھ اور حال ہے اور ممالک متحدہ کی حیثیت اور طور کچھ اور ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کا کچھ اور ڈھنگ ہے اور صوبہ پنجاب کو کچھ اور صوبہ بمبئی کا کچھ اور صوبہ مدراس کا کچھ اور۔ یہ سوال ایک بڑا لمبا جواب چاہتا ہے اور اس میں کتابوں کی ایک بڑی فہرست کے دینے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہم مختصر طور پر یہ جواب دیتے ہیں۔ وہ بھی اپنے رنگ میں، نہ کسی اور کے رنگ میں، کیونکہ بہت سے لوگ صوفیانہ خیال سے اگر دیوان حافظ تو بہت سے دیوان سعدی کے ثناخواں ہیں۔

(الف) فارسی کے دواوین میں سے حافظ، سعدی، صائب، عرفی اور واقف کو پسند کرتا ہوں اور رباعیات حضرت خیام، مثنوی مولانا روم علیہ الرحمۃ، ابیات مولانا جامی، بوستان، کریما۔

(ب) نثر میں سے گلستان اخلاقی رنگ میں۔

۱۔ اردو دواوین میں سے دیوان غالب، دیوان سودا، دیوان میر، دیوان داغ، دیوان حبیب، کلام اقبال، کلام حضرت اکبر الہ آبادی، کلام حضرت ریاض، کلام حضرت ظفر، کلام حضرت جمیل، کلام جلال، کلام پنڈت بشن نرائن ابر لکھنوی، کلام حضرت حالی، مولانا آزاد مرحوم۔

۲۔ نثر میں سے کلام مولانا عبد الحلیم ناولسٹ، مولانا سید احمد صاحب مرحوم، ادبی رنگ میں توبۃ النصوح مولوی نذیر احمد صاحب، تصانیف مولوی عبد الحلیم صاحب شرر، تصانیف پنڈت سرشار صاحب لکھنوی، طرز تحریر پنڈت چکبست، کلام مولوی ظفر علی خاں بی اے (علیگ) مالک رسالہ پنجاب ریویو، مضامین شیخ عبد القادر ایڈیٹر مخزن پنجاب، سید ناصر علی صاحب خان بہادر مالک صلائے عام دہلی، تنقیدات رسالہ زمانہ، مہر ایڈیٹر رسالہ الناظر لکھنؤ۔

اوپر جس قدر حوالے دیئے گئے ہیں یا استقرائی ہیں اور ان کا نام باعتبار جداگانہ رنگوں کے لیا گیا ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ ان میں اضافہ نہیں ہو سکتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی اور صاحب ان میں کچھ کمی بھی کر سکیں۔ میں نے ان کا نام بطور ایک نظیر کے لیا ہے۔

۳۔ اوائل عمر میں مجھے ہمیشہ وہ کتاب اور وہ تصنیف یا تالیف پسند ہوا کرتی تھی جس میں حقیقت الامور پر بحث کی گئی ہو، جو نرا قصہ اور کہانی نہ ہو۔ میں صوفیانہ رنگ کی تصانیف خواہ کسی مذہب کی ہوں زیادہ پسند کرتا رہا ہوں۔ فلسفی رنگ کی کتابوں اور تصانیف سے مجھے شروع سے ایک خاص

قسم کا شوق رہا ہے اور یہی سلسلہ مجھے سب سے زیادہ پسند بھی آیا ہے اور یہی رنگ مجھے زیادہ محظوظ کرنے کا ذریعہ ہے۔ دواوین اور اشعار میں سے میں وہ سلسلہ پسند کرتا ہوں کہ جس میں سوز و گداز ہو اور جس میں شاعر نے کوئی حقیقت ظاہر کی ہو۔ ان کا ایک مصرع بھی میرے دل پر خاص اثر کرتا اور مجھے ایک خاص حظ بخشتا ہے۔ اسی طرح فلسفی رنگ کی کتابیں اور صوفیانہ رنگ کی تصانیف سے میں ایک خاص خوشی کا احساس کرتا ہوں۔ بعض دفعہ مجھے ساری کتاب ناپسند ہوئی لیکن اس کا ایک جملہ بجائے ساری کتاب کے میرے لیے ایک خوشی کا ذخیرہ ثابت ہوا۔ ایک دفعہ مجھے ہندی دوہوں کی ایک کتاب ملی میرے دل پر ان دوہوں نے اتنا اثر کیا کہ میں کبھی کبھی اکیلا ہو کر انہیں بار بار پڑھتا تھا۔ اس وقت میرے دل سے ایک جوش اٹھتا تھا اور میں اپنے دل میں ایک خاص قسم کا سرور محسوس کرتا تھا۔ بعض دفعہ ایک شعر نے وہ حالت کی ہے کہ ہزاروں شعر سے بھی وہ سماں نہیں پیدا ہوا۔ ایک دفعہ ایک پنجابی فقیر سے اپنی صحیح پنجابی زبان میں یہ گا رہا تھا کہ

”جو پتا ایک دفعہ اپنی شاخ سے گر جاتا ہے وہ پھر کبھی اس شاخ پر نہیں لگ سکتا۔“

میں نے دیکھا کہ ایک اچھا پڑھا لکھا آدمی یہ سن کر زار زار رو رہا تھا اور اس کی حالت واقعی کسی اور رنگ میں تھی۔

میرے مطالعہ کی ترقی اور وسعت کا باعث اسی قسم کی کتابیں اور مضامین ہوئے ہیں۔ اب مجھے یہاں تک خبط ہے کہ میں ایسے ہی مضامین یا اشعار، فقرات، جملوں کی تلاش میں صدہا صفحے پڑھ ڈالتا ہوں۔ اگر ایک ہزار صفحہ کی کتاب سے ایک فقرہ بھی میرے مذاق کے مطابق آ گیا تو میں سمجھ لیتا ہوں کہ کتاب کی قیمت وصول ہو گئی اور میرا وقت رائگاں نہیں گیا۔

مجھے کسی کتاب نے اتنا فائدہ نہیں پہنچایا اور محظوظ کیا جس قدر اس قسم کے فقرات اور مضامین نے فائدہ پہنچایا اور محظوظ کیا۔

میری رائے میں اگر کسی کتاب کا ایک فقرہ بھی دل پر اثر کرتا ہے اور خیالات میں تموج اور جوش پیدا کرنے کی قابلیت رکھتا ہے تو وہ کتاب کی جان، کتاب کی کفالت ہے اور وہ کتاب لائق انتخاب ہے۔

دسواں میں کوئی خاص ایسی کتاب بیان نہیں کر سکتا کہ جس نے میری علمی زندگی میں کوئی خصوصیت پیدا کی ہو اور میں اس خصوصیت کی وجہ تصنیف یا تالیف کی طرف متوجہ ہوا ہوں۔ میں نے اپنے ارد گرد ایک لمبی چوڑی کتاب لکھی دیکھی اور اسے دلچسپ پایا۔ ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرہ نے میرے خیالات میں خاص تموج پیدا کیا۔ بعض دفعہ ایک ہی فقرہ اور ایک ہی بیت نے مجھ پر وہ اثر کیا کہ میں بیٹھے بیٹھے صدہا صفحے لکھ گیا۔ نہ ہاتھ روکے سے رکا اور نہ قلم رکتا ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں ایک اعلیٰ پایہ کی کتاب کوئی اڑھائی سو صفحہ تک پڑھ گیا لیکن میرے دل و دماغ پر کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ میں جب کسی مضمون کے لکھنے پر قلم اٹھاتا تھا تو ایک دو سطریں لکھ کر خود بخود رک جاتا تھا۔ میں قریباً اکتا گیا۔ دیوان صائب پاس پڑا تھا۔ اٹھا کر پڑھنے لگا۔ میں نے مندرجہ ذیل شعر دو دفعہ پڑھے ہوں گے کہ دل و دماغ میں اس قسم کا جذبہ ہوا کہ میں رات کے ایک بجے تک لکھتا رہا اور نئے نئے مضامین جوش میں آتے گئے ؎

ہر چہ دیدیم دریں باغ نہ دیدن بہ بود — ہر گلے تازہ کہ چیدیم نہ چیدن بہ بود
ہر کجا منزل آرام تصور کردیم — چوں نفس راست نمودیم رسیدن بہ بود
ہر متاعے کہ خریدیم بہ اوقات عزیز — بود اگر یوسف مصری نہ خریدن بہ بود

اس کا باعث کیا تھا کہ ان مضامین نے دل و دماغ پر اثر کیا اور جذب مضامین کی طاقت خود بخود پیدا ہو گئی تھی یا محض تاثیر۔

میری رائے میں سلسلہ تصنیف اور تالیف کے واسطے کسی بڑے مصالحہ کی ضرورت نہیں۔ صرف چند مؤثر جاذب فقرات کی ضرورت ہے۔

(۴) جو کتابیں حقیقی واقعات اور صادق امور پر لکھی گئی ہیں۔ جن میں یا اخلاقی رنگ یا فلسفیانہ طرز میں بحث کی گئی ہے۔ ان کے لفظ لفظ نے میری زندگی اور میرے ضمیر پر خاص اثر کیا ہے۔ کتاب پر ہی موقوف نہیں ایسے مؤثر فقرات نے بھی میری زندگی اور میرے دل و دماغ پر اثر کیا ہے۔ پڑھ کر ہی نہیں بلکہ سن کر بھی بہت متاثر ہوا ہوں۔ خوش مضمون خوش صدا کا مجھ پر ایک خاص اثر ہوتا ہے اور ان حالات میں میرے دل میں جو تبحر مضامین کا تموج ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص بانسری خوش الحانی سے بجا رہا ہو اور اردگرد کوئی شور و شغب نہ ہو تو میرے دل و دماغ میں مضامین جدید کا ایک خاص تسلسل پیدا ہوتا ہے اور لکھنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ موسم کی خوش گواری بھی مجھ پر بہت اثر کرتی ہے۔ کبھی کبھی اداسی اور اداسی کا بھی بڑا فوری اثر ہوتا ہے۔

ایک دفعہ طبیعت کند پڑی ہوئی تھی۔ بہتیرا چاہا کہ کچھ لکھوں یا لکھ سکوں مگر طبیعت کہنے میں نہ آئی۔ دیوان حضرت جینائی اٹھا لیا کھولتے ہی اس شعر پر نظر پڑی ؎

ہر جام میں ہے جلوۂ مستانہ کسی کا
میخانہ ہمارا ہے جلو خانہ کسی کا

نہیں معلوم اس بزرگ شاعر کے اس شعر میں کیا کچھ اثر بھرا تھا طبیعت پڑھتے ہی کھل گئی اور قلم خود بخود عرصہ قرطاس پر چل پڑا۔

(۵) میں نے سب سے پہلے ٹھیٹ پنجابی زبان میں مولوی غلام رسول صاحب مرحوم کی بحر میں سسی پنوں کی داستان لکھی۔ ناظرین نے اسے بہت پسند کیا اور میں بھی ایک حد تک اسے پسند کرتا تھا کیونکہ وہ ایک درد کی کہانی تھی۔ اس سے میری طبیعت مضامین نویسی پر متوجہ ہوئی اس کے بعد دوسرے نمبر کی کتاب (مراۃ الخیال) اسی فلاسفی پر لکھی گئی۔

(۶) یہ کہنا کسی قدر مشکل ہے کہ کونسی کتاب میری تصنیفات میں سے بہتری کے درجہ میں ہے۔ کسے بہتر کہوں اور کسے ناقص، ورنہ درجہ بدرجہ میں شاید میری رائے میں کوئی بہتر ہو اور دوسروں کے خیال میں مجموعہ ناقص۔ "ہر شخص اپنی اپنی پسند کتاب و مضمون اپنی اپنی پسند" ہاں اتنا کہوں گا کہ جیوں جیوں زمانہ گزرتا جاتا ہے اور ہر ایک عمر منازل تجربہ طے کرتے کرتے بڑھتا جاتا ہے پچھلے خیالات میں سے بعض خیالات قابل ترمیم یا قابل تشریح ضرور معلوم دیتے ہیں۔

پچھلے سال فن شاعری پر ایک چھوٹا سا رسالہ جو لکھا ہے وہ میری اور چند مبصرین کی رائے میں ایک اچھے پیرایہ میں لکھا گیا ہے۔ اب ایک کتاب کو سات سو صفحہ کی موسوم بہ اساس اخلاق مطبع وکیل جند امرتسر میں شائع ہوئی ہے۔ میری رائے میں اس رنگ میں اردو زبان میں بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس کتاب میں خاص اصولوں کی پابندی سے اساس الاخلاق پر بحث کی گئی ہے۔ اگر نقادانِ ملک نے اسے پسند کیا تو میری رائے میں میری پینتالیس چھیالیس تصانیف میں سے یہ کتاب بہترین ہوگی اور شاید بعض کی نظروں میں یہی کتاب بہترین میں سے شمار ہو کیونکہ ہر ایک کا مذاق جدا جدا ہے۔ اگر سب نہیں تو فقرے دو فقرے شاید اچھے نکل آئیں۔

تصنیفات

(۱) اساس اخلاق (۲) قوت اور محبت (۳) الوجد (۴) جبر و قدر (۵) تبیین الحق (۶) مراۃ الخیال (۷) صدائے الم۔
(۸) صیاد (۹) اصول (۱۰) سسی پنوں (پنجابی) (۱۱) اخلاق احمدی (۱۲) ریاض الاخلاق (۱۳) سراج الاخلاق۔

(۱۴) رفیق الاخلاق (۱۵) فرحت (۱۶) صداقت (۱۷) امثال (۱۸) دل نواز (۱۹) دلسوز (۲۰) ایک اعلیٰ ہستی (۲۱) بزم خیال (۲۲) زمیندارہ جنگ (۲۳) نظم خیال (۲۴) الفت (۲۵) راز الفت (۲۶) فن شاعری (۲۷) مشیر عاقل (۲۸) نبوت (۲۹) الصلوٰۃ (۳۰) اعتصام۔ (۳۱) حیات صادقہ (۳۲) نساء المومنین (۳۳) خیالات (۳۴) یاد رسولؐ (۳۵) یادگار حسینؓ (۳۶) ایثار حسینؓ (۳۷) علوم القرآن۔ (۳۸) وقت (۳۹) انتظر (۴۰) فنون لطیفہ (چند نظمیں) زندگی، (۴۱) درس بیخودی (۴۲) طلاق و کثرت ازدواج (۴۳) تنقید بر مثنوی مولانا قدوائی (۴۴) ذبح گائے (۴۵) فلسفہ (۴۶) صفات باری (۴۷) سفرنامہ (۴۸) مجموعہ مضامین (بارہ جلد) وغیرہ

محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار

ولادت ۱۸۶۵ء۔ وفات ۲۴ مئی ۱۹۳۳ء

(۱) اگر آپ کا قدیم اور مستند فارسی کتب کی طرف اشارہ ہے تو میں گلستان سعدی، دیوان حافظ اور کیمیائے سعادت امام غزالی کو بہترین سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد مثنوی مولانا روم، عمر خیام اور ایسی ہی وغیرہ کو بلحاظ تقدیم و تاخیر۔

(۲) سعدی، جامی اور نظامی کی کتابوں نے۔

(۳) گلستان سے مجھے بہت دلچسپی ہے اور پھر دیوان حافظ سے۔

(۴) اس انگریزی کتاب آٹو بایوگرافی آف بنجمن فرینکلن کے عنوان شباب میں مطالعہ کرنے سے میری زندگی پر اس کا بہت اثر پڑا اور میں ہر ایک ہندوستانی نوجوان کو انگریزی یا اردو میں اس سلف میڈ امریکن فلاسفر و مدبر کے دلچسپ حالات زندگی مطالعہ کرنے کی صلاح دوں گا۔ میں نے اس کتاب کا اردو میں بھی ترجمہ کر دیا تھا۔

اس کے بعد امریکہ کے ڈاکٹر ماردن کی انسپی ریشنل کتابوں کے مطالعہ سے بھی میری زندگی پر اثر پڑا ہے۔

(۵) میں نے گزشتہ بیس سال کی اخبار نویسی کے زمانہ میں کئی چھوٹی موٹی کتابیں مرتب کی ہیں۔ میرے سیاحت نامہ یورپ و ترکی وغیرہ کی خاص قدر ہوئی۔ کل پرسوں ہی ایک لوکل کالج کے پروفیسر نے جو بیس سال سے ایم اے ہوں گے کہا تھا کہ مجھے تمہارا سفرنامہ اس قدر پسند آیا ہے کہ میں اس کے بعض حصے دوبارہ سہ بارہ پڑھ رہا ہوں۔

(۶) درحقیقت میری مستقل تصنیفات کوئی نہیں ہیں تاہم جو کچھ ہیں ان میں سفرنامہ یورپ خاصا ہے۔

تصانیف

(۱) محبوب الامثال (۲) تلوار اور مذہب

(۳) سفرنامہ یورپ (۴) سفرنامہ عراق وغیرہ۔

چودھری افضل حق

بچپن کی بھولی ہوئی کہانیوں کو یاد کرنے کو بیٹھے تو شاید ہی کسی کو دایہ کے دوش اور ماں کے آغوش کا کوئی واقعہ یاد ہو۔ میرے بچپن کی کہانی استاد کی مار پیٹ سے شروع ہوتی ہے۔ زندگی کا پہلا واقعہ یوں یاد ہے کہ تعلیم کے ابتدائی درجے میں داخلے کا پہلا دن تھا۔ پیشاب جو لگا میں جماعت سے باہر چلا گیا۔ فارغ ہو کر واپس آیا تو خلیفہ جی سے ازار بند باندھنے کی فرمائش کی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ خلیفہ جی کو بچوں کے ازار بند باندھنے سے چڑ ہے۔ پہلے ہی دن مجھ پر یہ بری وقت آن پڑا۔ خلیفہ جی کا غصہ ان کی عقل اور فرض سے زیادہ تھا۔ ازار بند باندھنے کے بجائے مجھے پنکھے کے رسے سے باندھ کر مارنا شروع کیا۔ اس بدسلوکی کا سزاوار میں ہی نہ تھا بلکہ خلیفہ جی ایک دو پیشاب پہلے بھی خطا کر چکے تھے۔ غرض پہلا سبق جو استاد نے پڑھایا اور جسے میں عمر بھر نہ بھولا وہ یہ تھا "مدرسے میں پیشاب نہ کرو"

اس طرح پٹتے پٹاتے پانچویں جماعت میں پہنچے۔ یہاں کے ماسٹر صاحب کی ایک آنکھ تھی۔ مگر خلیفہ صاحب سے غصہ دوگنا تھا۔ وہ جماعت میں گھنٹی سے پانچ منٹ پہلے ہی آ بیٹھتا۔ میں اور چند لڑکے سکول سے گھر دور ہونے کے باعث ایک آدھ منٹ بعد پہنچے۔ ماسٹر صاحب نے نہایت اطمینان سے فرمایا۔ کان پکڑو۔ ہم ٹانگوں کے نیچے سے ہاتھ ڈال کان پکڑ آسمان اور زمین کے متوازی ہو گئے۔ اسی پر بس نہیں کی بلکہ اس نے تھوڑی دیر کے بعد اسی حال میں کتابیں کھول کر پڑھنے کا حکم دیا۔ قیاس کرو کہ کان یوں پکڑے ہوئے کوئی سبق کیا پڑھے گا۔ ہم تھک چکے تھے۔ اتنا آرام غنیمت ہو گیا کہ ہم نے کتابیں بستے سے آہستہ آہستہ نکالیں، سامنے کھول کر رکھیں اور مُردوں کی جان کو لٹکا پھر کانوں کو اسی طرح پکڑ لیا۔ سر نیچا ہونے کے باعث آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ ایک ایک کے دس دس حرف نظر آنے لگے۔ ٹانگیں جسم کا بوجھ برداشت نہ کریں۔ آنکھوں سے کچھ نظر نہ آئے۔ ایسے معلموں سے کوئی پوچھے کہ یہ کیا تعلیم کا طریقہ ہے؟

چھٹی جماعت میں پہنچ کر قدرے اطمینان کا سانس نصیب ہوا۔ مار پیٹ کا قاعدہ تو یہاں بھی جاری تھا لیکن ایک دن کے قصور پر مہینہ بھر سزا نہ ملتی تھی۔ یہ ۱۹۰۵ء کے واقعات ہیں۔ اسی سن میں صبح کے وقت کانگڑہ کا قیامت خیز زلزلہ آیا جس نے پنجاب بھر کو خواب غفلت سے بیدار کر دیا۔ کچھ عرصہ تو میں نے سمجھا کہ قیامت آ گئی۔ مائیں بچوں کو گھروں میں چھوڑ کر جان بچانے کھلی جگہ کی طرف بھاگیں تاکہ عمارتوں میں دب کر نہ رہ جائیں۔ نفسا نفسی کا یہ عالم تھا کہ بجز اپنی جان کے کسی کو کسی کا خیال نہ رہا۔ اس واقعہ کے بعد قیامت اور اس کی تفصیلات پر مجھے کبھی شبہ نہیں ہوا۔

یہ زمانہ دنیائے اسلام پر بدترین ابتلا کا عہد تھا۔ روس اور انگلستان کی پالیسی ایشیا کی آزاد مسلم سلطنتوں کا خاتمہ کرنے پر مصر تھی۔ روس کی نسبت انگلستان کے اقدامات اسلام کی ذلت کا زیادہ باعث بن رہے تھے۔ انگلستان کے ارباب بست و کشاد ہندوستانی مسلمان کی حسیات سے بے پروا ہو کر نشۂ غرور میں وہ باتیں کہہ دیتے تھے جیسے ہندوستان کا آزاد خیال مسلمان آج سننے کا متحمل نہیں۔ قصرِ حکومت اسلامی کی اینٹ سے اینٹ بجتی دیکھ کر بچپن میں میرا غصہ جوان ہو گیا۔ اس وقت میں اپنی طبیعت کو انگریزی حکومت سے تعاون پر آمادہ نہیں کر سکا۔

گھر بھر کے مذہبی رجحانات کے باعث مجھے بھی بچپن میں عبادت کا شوق ہو گیا۔ اس زمانہ میں شاید ہی کوئی نماز قضا ہوئی ہو۔ فرض چھوڑ نوافل میں بھی رغبت زیادہ تھی۔ اُس زمانہ میں اِس زمانہ کی نسبت لوگوں کی مذہبی سیرت زیادہ بہتر تھی۔ اس زمانہ میں بعض ایسے مذہبی علما بھی تھے جو گو قومی عبادت میں مصروف تھے مگر انگریزی سلطنت کے اثر و رسوخ سے بے پروا تھے۔ مجھ پر ان کی سیرت کا بے حد اثر تھا۔ میں محلہ کی مسجد میں گھنٹوں نماز پڑھا کرتا تھا۔ ایک روز مجھ پر عجب کیفیت طاری ہوئی۔ یک بیک طبیعت میں اطمینان بڑھنا شروع ہوا۔ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ میں اس وقت پانی میں مچھلی کی طرح تیرتا تھا۔ میرے منہ کا ذائقہ ایسا خوشگوار ہو گیا کہ زندگی بھر میں کسی خوش ذائقہ پھل سے وہ حلاوت نصیب نہیں ہوئی۔ ذائقہ کی یہ صورت خاصی دیر قائم رہی۔ فرحت قلب کئی گھنٹے جاری رہی۔

کئی روز کے بعد ہمارے دینیات کے استاد جو شب زندہ دار اور بڑے پرہیزگار تھے فرمانے لگے کہ بعض اوقات خدا انسان پر مہربان ہو کر اس کی زبان کا ذائقہ ایسا بدل دیتا ہے گویا وہ بہشت کے پھلوں سے لذت اندوز ہو رہا ہے۔ میں خوش خوش پھر مسجد میں گیا کہ خدا کی مہربانی کا پھل کھاؤں۔ طبیعت کو یکسو کرنے کی بڑی کوشش کی کچھ مزہ نہ آیا۔ تاہم اتنا تو معلوم ہوا کہ کوئی میرا جوتا اٹھا کر لے گیا ہے۔ اب تو پہلا مزا بھی کرکرا ہو گیا۔ ندامت سے گھر پہنچا تو جوتا کھو جانے پر سخت فہمائش ہوئی۔ میں پھر زبان کا مزا ڈھونڈنے کے ارادے سے مسجد میں نہیں گیا۔

باوجود خرابیٔ صحت کے انٹرنس اسلامیہ سکول امرتسر میں پاس کر کے لاہور اسلامیہ کالج میں داخل ہوا۔ یہاں آ کر معلوم ہو گیا کہ صحت تعلیم کا ساتھ نہ دے سکے گی۔ تاہم کوشش جاری رکھی۔ غلطی سے سائنس اور حساب دونوں لے لیے نتیجہ یہ ہوا کہ کالج میں کامیابی کی امید مشتبہ ہو گئی۔ میں اس سال (۱۹۱۲ء) ایف اے میں فیل ہو گیا اور دوسرے سال دیال سنگھ کالج میں داخل ہو گیا۔ یہاں پہلی دفعہ غیر مسلم سٹاف سے واسطہ پڑا۔ یہاں کے پروفیسر اسلامیہ کالج کے پروفیسروں سے ہزار درجہ قربانی، حلم اور علم میں بہتر تھے۔

ایک دن دیال سنگھ کالج کے پروفیسر ر۔ کے۔ ایم۔ اختر نے فارسی پڑھاتے ہوئے برسبیل تذکرہ کہا کہ ہجرت کے کئی سو سال بعد مسلمانوں نے تصوف کو غیر مسلموں سے لیا۔ ان کی یہ بات میرے اوپر بجلی بن کر گری۔ تصوف میرا اوڑھنا بچھونا ہو چکا تھا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی چیز کا حاصل کرنا علم کہلانے کا مستحق ہے۔ مذہب کا جزو کہلانے کا مستحق نہیں۔ اس لیے مذہبی دیوانے کی طرح پروفیسر اختر کو ڈانٹ دیا کہ آپ ابھی اسلام سے واقف نہیں۔ پروفیسر نے میری

طرف تعجب سے دیکھا۔ مسلمان طالب علموں نے میری جرأت کی داد دی۔ پروفیسر شرمندہ سا ہو کر کلاس میں بیٹھا رہا۔ تمام مسلمان طالب علموں کا میرے ساتھ اتفاق تھا کہ تصوف مذہب اسلام کا ضروری جزو ہے۔

دوسرے روز پروفیسر بہت سی کتابیں لے آیا۔ حوالے پر حوالہ دینا شروع کیا کہ قرونِ اولیٰ میں تصوف کا کوئی نام نہ جانتا تھا۔ خانقاہ اور تکیہ کا نام غیر اسلامی۔ تصوف کا لفظ قرآن بھر میں نہیں۔ رسولِ عرب سے نہ دم کشی ثابت، نہ قلب پر ضربات لگانے کی سنت کا کہیں ذکر۔ یہ علم صاف طور پر غیر اسلامی ہے اور اسلام میں چوتھی صدی ہجری کی پیداوار ہے جب مسلمان یونانی اور ہندوستانی فلسفہ مذاہب سے دوچار ہوئے تو انہوں نے تصوف کا پیوند اسلام میں لگا دیا۔

پروفیسر نے کہا، جاؤ تصوف اور شریعت کے کسی عالم کے پاس پہنچ کر پہلی تین صدیوں میں مسلمانوں میں تصوف کی موجودگی کا مستند حوالہ لا دو، میں قائل ہو جاؤں گا۔ علم میں ضد جہالت ہے۔ علم، علم کے معیار پر پورا اترے تو صحیح ہے۔ جہلاء کا اعتقاد و اتفاق کے ہونے کے لیے سند نہیں۔

میں نے کہا، پروفیسر صاحب! اگر مسلمان علماء اور صوفیا کے پاس یہ سند نہ ہوتی تو یہ خانقاہیں اور تکیے نہ ہوتے۔ ذکر شغل جاری نہ رکھتے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی چیز کو داخلِ عبادت و دین سمجھنا بدعت ہے۔

پروفیسر۔ اور یہ بھی کہو کہ بدعت گمراہی ہے۔

میں۔ ہاں! بدعت گمراہی ہے کیونکہ دین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کامل ہو چکا تھا۔

پروفیسر۔ تو تم استدلال کرتے ہوئے کہ تصوف کی داغ بیل ضرور رسولِ عربی نے ڈالی۔ یا کم از کم اس کی اجازت دی عقل کو الجھنوں میں کیوں ڈالتے ہو۔ قرآن اور حدیث سے کوئی سند لے آؤ معاملہ ختم ہو جائے گا۔

لاہور کے علما سے میری واقفیت نہ تھی۔ اس لیے امرتسر اپنے ایک استاد کے پاس گیا۔ وہ قرآن کے مکمل ہونے پر ہمیشہ زور دیتے تھے۔ بعد میں یہ بزرگ اہلِ قرآن مشہور ہوئے۔ انہوں نے نہایت رازداری سے پاکیزہ زبان میں مجھ سے کہا کہ جو تصوف کو قرآن میں ڈھونڈتا ہے وہ خدا اور رسولؐ پر بہتان باندھتا ہے۔

میں شرمندہ سا ہو کر چلا آیا۔ ایک اور اہلِ حدیث بزرگ کے پاس گیا۔ ان کا علم اور زہد اب بھی زبان زدِ خلائق ہے۔ آپ نے فرمایا کہ بیعت کی سند ہے۔ تصوف کی باتیں غیر مستند ہیں۔ سیدھے اسلام پر جمے رہو۔ تصوف پر عمل کر کے ٹھوکر کھا جاؤ گے۔ کتاب اور سنت پر اعتقاد رکھو۔ یہی کامل ہدایت ہے۔ اس بات میں تمہارا پروفیسر برحق ہے۔

ان کی زبان اور بیان میں بڑی نرمی تھی لیکن میرے لیے کوئی بات باعثِ تسلی نہ ہوئی۔ یہاں سے اٹھا اور بھاگ لپک کر اپنے پیر بھائی کے پاس پہنچا۔ وہ شریعت اور طریقت کے شاہسوار مانے جاتے تھے۔ انہوں نے فرمایا نقلی سند تو تسلی بخش نہیں مگر یہ علم سینہ بسینہ پہنچا ہے۔ ہر شخص اس علم کا اہل نہیں۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص خاص کو رازدار بنایا۔ اس طرح یہ طریقہ ہم تک پہنچا۔

یہ بات ڈوبتے ہوئے کو تنکے کا سہارا ہو گئی۔ پروفیسر کو آ کر آخری بات کہی۔ اس نے حقارت سے میری طرف دیکھا۔

اور ہار کر مجھ کو جھٹلانے کی کوشش میں اپنے پیغمبر پر بھی بہتان باندھنے لگے۔ پیغمبر کو خدا کا حکم ہو کہ میرے احکام کھول کھول کر بیان کرو اور وہ سینہ بہ سینہ بیان کرے۔

میری آنکھ کے آگے اندھیرا سا آ گیا۔ میں نے گردن جھکا لی۔ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

مجھ سے بڑا بھائی تپ دق میں مبتلا ہو کر فوت ہو گیا تھا۔ مجھے خود کھانسی کی شدت ہو گئی۔ اس لیے ۱۹۱۳ء میں خرابیٔ صحت کی بنا پر کالج کی تعلیم کو ختم کرنا پڑا۔

میری طبیعت کے رجحانات انگریزی کی طرف مائل نہ تھے۔ تاہم وقت کے رواج کے مطابق سلسلۂ ملازمت میں منسلک ہو کر حلقہ بگوش انگریز ہو گیا۔ ۱۹۱۵ء میں بطور سب انسپکٹر پولیس بھرتی ہو گیا۔ انگریز پرستی نے مسلمانوں کی لٹیا ڈبو دی تو سب مسلمانوں کے ساتھ میری بھی آنکھوں سے غفلت کی پٹی کھلنا شروع ہوئی۔

جفاکار جنرل ڈائر کے ہاتھوں ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیانوالہ باغ کا خونچکاں واقعہ پیش آیا۔ گاندھی، موتی لعل نے پنجاب میں ڈیرے ڈال دیے۔ مردہ ہندوستان میں جان آ گئی۔ یہ پہلا موقع تھا جب ہندوستانیوں نے مظالم کے خلاف آواز اٹھانا سیکھا۔ ہندوؤں کے لیڈروں کے اس اقدام سے مسلمانوں نے بھی کروٹ لی اور انہیں بھی خلافت کے مٹنے پر خلیفہ یاد آیا اور اسلامی سلطنتوں کی ڈوبتی کشتی کو بچانے کے لیے ہندوستان میں خلافت کمیٹیوں کا نظام استوار کرنے کی سوجھی۔

اگرچہ میں نالائق افسر نہ تھا۔ تاہم انگریزی ملازمت کی ایک ایک ساعت میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ استعفا دیا۔ تو بوجھ ہلکا ہوا۔ میں ان دنوں لدھیانہ تھانہ صدر میں تعینات تھا۔ اسی جگہ میرا کامیاب لیکچر ہوا۔ جب ہاتھ ہلاتا گھر پہنچا تو گاؤں کے لوگوں نے میری حرکت پر تعجب کیا۔ کچھ لوگوں نے میرے اچانک استعفا کو میری بے وقوفی پر محمول کیا۔ اس آگ کا علم نہ تھا جو مدت سے میرے سینے میں سلگتی تھی۔

اس واقعہ کے بعد میں نے پورے جوش سے دیہات میں کام کرنا شروع کر دیا۔ میرے کام میں کوئی ہاتھ بٹانے والا نہ تھا۔ جلسہ عام کرنے کا خیال ہوا مگر منادی کون کرے؟ ناچار خود ہی گشت کرکے اپنی صدارت میں اپنی تقریر کا اعلان کرنا پڑا۔ میں خود ہی دریاں سر پر اٹھاتا اور خود ہی میز کرسی لگاتا۔ اب لوگوں کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اول تو بہت کم لوگ یہ تماشا دیکھنے آئے اور جو آئے وہ دری پر بیٹھنے کے بجائے آس پاس کی حویلیوں میں گھس کر باپردہ بیبیوں کی طرح دروازے کی دراڑوں میں سے دیکھنے لگے کہ کیا ہوتا ہے۔ سامعین میں سے کوئی سامنے نہ ہونے کے باوجود میں نے گورنمنٹ کے خلاف اناپ شناپ کہنا شروع کر دیا۔

میں آہستہ آہستہ لوگوں کی عزت کا مرکز بننے لگا۔ باوجودیکہ خالص اسلامی نکتۂ نگاہ پیش کرتا تھا تاہم ہندوؤں اور سکھوں نے زیادہ اثر قبول کیا اور مسلمان خائف اور لرزاں رہے۔ اتنا ضرور ہوا کہ ان کا بھی کچھ نہ کچھ مجھ سے تعلق پیدا ہو گیا۔ حکام ضلع میرے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے خائف ہونے لگے۔ گو میں حکام کے نزدیک ایجی ٹیشن کا بدترین مرکز بن گیا تو کمشنر حالات کا جائزہ لینے آیا اور مجھے ملاقات کے لیے بلایا۔ میں نے کہلا بھیجا کہ بغیر وارنٹ کے کسی افسر کی ملاقات منظور

نہیں کرسکتا۔ ان کا ملاقات سے محروم ہونا میری گرفتاری کا پیش خیمہ تھا۔ اس حقیقت کو دوسروں سے زیادہ میں خود سمجھتا تھا۔

ضلع جالندھر کے ایک ہم درس اور ہم جلیس سب انسپکٹر پولیس کے ہاتھوں کام سرانجام کو پہنچا جو ان دنوں تھانہ گڑھشنکر کا افسر انچارج تھا۔ تھانہ پہنچ کر میں نے وارنٹ دیکھنا چاہا تاکہ افسر جاری کنندہ، تاریخ و مقام، سماعت مقدمہ کا پتہ چل سکے۔ مگر میرے دوست سب انسپکٹر نے حق دوستی و قانونی فرض جواب صاف سے ادا کرکے مجھے وہاں داخل کیا جہاں میں اپنی قوت فیصلہ کو کام میں لاکر خوف زنداں سے ہراساں و لرزاں انسانوں کو بند کر دینے کا خود حکم دیا کرتا تھا۔

۱۶ فروری ۱۹۲۲ء کو عدالت میں عدل کی تماشاگری ہونی تھی۔ تاروں کی چھاؤں میں پولیس مجھے جیل سے لے کر روانہ ہوئی۔ اس غیر معمولی کارروائی سے گمان گزرا کہ شاید اندھیرے ہی اندھیرے میں مجسٹریٹ عدالت کی کرسی کو زینت دے کر اندھیر نگری چوپٹ راج کا ثبوت پیش کرے گا مگر نہیں مجھے دفتر پولیس میں بٹھلا کر اردگرد کے دروازے بند کر دیے گئے۔ سورج انصاف کو دن کی روشنی میں لانے کے لیے نکلا ہی تھا کہ سپرنٹنڈنٹ، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس مع دیگر افسران پولیس باوردی اندر آئے۔ نظر میری طرف دیکھتے رہے اور چلے گئے۔ ٹھیک گیارہ بجے عدل کا ڈراما عدالت میں کھیلا گیا۔ مجسٹریٹ صاحب نے ۶ ماہ قید کا حکم دیا۔ اب میں ملزم سے مجرم بن گیا تھا۔ لباس جیل سے بندہ کو بندر بنانے کی کسر باقی تھی — دن بعد بزرگ ہوشیارپور پنڈت شامی داس صاحب و عزیز پنڈت ورکا داس اسسٹنٹ سیکرٹری ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی کی گرفتاری عمل میں آئی۔ مجھے اور میرے ساتھی کو ہوشیارپور سے انبالہ جیل منتقل کر دیا گیا۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے دو سو کے قریب سیاسی قیدی آچکے تھے۔ دن عید رات شب برات ہو کر گزر رہی تھی۔ ہاں ایک ناخوشگوار بات سننے میں آئی کہ چند رضاکاروں کو وحشیانہ زدوکوب کرکے قید تنہائی میں ڈالا ہوا ہے۔ ہوشیارپور جیل کی نسبت یہ جیل نہایت خستہ و خراب تھی۔ کوٹھڑیوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ بول و براز کے برتنوں کو دیکھ کر بلا مبالغہ کہا جاسکتا تھا کہ تعزیرات ہند کے اول سزا یافتگان کے زیر استعمال رہ چکے ہوں گے۔

اس کوٹھڑی میں جہاں ماہ ضیاپاش کی نورانی کرنیں اکثر ملاقات سے محروم تھیں۔ افسران جیل کا شکار ہو کر پورے پانچ ماہ کاٹنے پڑے۔ چاند جب چاندنی کی چادر روئے زمین پر ڈالتا تو بے اختیار باہر نکل کر نگاہ شوق سے حسن کائنات دیکھنے کو جی چاہتا مگر ہوا بن کر کس طرح سلاخوں سے نکلا جاتا۔ وہاں آسمان کے ایک گوشہ یا کوٹھڑی کے مختصر صحن کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ کوٹھڑی کی اونچی دیواریں خواہش نظارہ کو مسترد کر دیتیں۔ کئی قسم کے درخت میری کوٹھڑی کے آگے تھے۔ شبنم ان کے پتوں پر پڑتی تو چاندنی میں ایسی روپہلی جھلک مارتے کہ جنت الفردوس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا۔ سخت گرمی کا موسم اور کوٹھڑی میں بسا اوقات کے تصور سے بدن کانپ اٹھتا ہے مگر میں اسی طرح خارستان کو گلستان بناتا رہا۔ خوش فکری سے فکر کو پاس نہ آنے دیتا۔

میرے اس غریب خانے میں بکثرت موش خانے تھے۔ اس مختصر گھر میں ہمیشہ چوہے قلابازیاں کھاتے۔ کبھی ایسی بے تکلفی برتتے کہ چھاتی پر چڑھ آتے۔ کچھ ایسے نڈر کہ کمبل اٹھا کر اندر آ گھستے۔ آخر جانتے تھے کہ قیدی ہے کیا کرے گا۔ ان کی شوخی ایسی بڑھی کہ بوٹیاں نوچنے کی نوبت آئی۔ ایک رات میں ہاتھ سرہانے لیٹا ہی تھا کہ انگلی کاٹ کھائی۔ سانپ سنپولیے کے شبہ میں دھڑ دھڑا کر اٹھا۔ ہاتھ میں جوتا لیا اور بستر کمبل الٹا سیدھا کیا۔ دل میں بڑا تردد کیا کہیں بری بلا ہے مگر فکر و تردد کے اس پہاڑ

کوٹھا تو جیسا تھا۔ جان میں جان آئی۔ مجھے دوپہر قیلولہ کی عادت تھی۔ شاید آنکھ لگی ہو گی پھر بھی آنکھ لگائے۔ جیسی کہ پلک لگتے ہی بیر بڑے کی مانند مکھیوں نے کاٹ کاٹ کر توبہ توبہ کرا دی۔ یہ چھیڑ چھاڑ کئی دن جاری رہی۔ میں عدم تشدد کا حامی ہونے کی وجہ سے ہاتھ نہ اٹھاتا مگر مکھی نے میری ناک میں دم کر دیا۔ تنگ آمد بجنگ آمد۔ ایک دن جھوٹ موٹ ہاتھ میں جوتا لے کر سو گیا۔ مکھی دبے پاؤں آئی اور کارستانی شروع کر دی۔ میں نے آنکھ بچا کر جوتا اچھالا۔ پہلے تو لوٹ پوٹ ہو گئی، پھر چڑچڑاتی بھاگی۔ ایک کھٹمل بھی نہ ادھر کاٹا کیا۔ اگرچہ اس جیل میں مچھر میرے گناہوں سے بھی زیادہ تھے۔ خدا کی عنایت کہ بے یار مچھروں کی نظر کرم کہ میرے جسم کو انہوں نے خوان یغما نہیں بنایا۔ بناتے بھی کیا۔ نہ میری ہڈی نہ بوٹی نہ جسم میں قطرہ خون۔ تنہائی میں ڈالے ہوئے قیدی پر ایک پنکھے کی مہربانی سرکار سے ہوتی ہے۔ ہوا کوٹھڑی میں قسمت سے پہنچتی ہے۔ ساری رات ہائے وائے کرتے اور پنکھا کرتے کٹتی ہے۔

قیدی پولیس افسر کی درگت جو جیل میں ہوتی ہے اس کو خدا ہی جانتا ہے۔ کون قیدی ہے جس کا افسر پولیس کی شکل دیکھ کر ہاتھ نہیں کھجلاتا اور بے چارے کی چندیا پر چپت نہیں جاتا۔ گالیوں کا تو ذکر ہی کیا۔ گال مار مار کے لال کیے جاتے ہیں۔ دانوں کی بوریاں اٹھوائی جاتی ہیں۔ بوجھ برداشت سے زیادہ ہوتا ہے۔ بوری گر جاتی ہے۔ نگران کار قیدی جوتا اتار کر دھڑا دھڑ سر گنتا ہے۔ جب ننانوے پر پہنچتا ہے تو جان بوجھ کر گنتی بھول جاتا ہے۔ پھر ایک دو سے گنتی شروع کر دیتا ہے۔ جس بے چارے کا پیٹ بڑھا ہوا ہو اس پر لاتیں مار مار کر کہتے ہیں کہ اس میں ہمارے تمام گاؤں کے مرغے جمع ہیں۔

خدا کا احسان ہے کہ میں جیل میں دوسرے رنگ میں موجود تھا، ورنہ کیا جانے کیا بیتتی۔ ایک روز انبالہ جیل میں میں بھی غلطی کا شکار ہونے لگا تھا۔ فیروزپور جیل سے ایک چالان قیدیوں کی آئی ان کے کان میں کہیں بھنک پڑی کہ ایک تھانیدار یہاں قید ہے ان کی صلاح ہوئی کہ چل کر دستور پورا کریں۔ کسی پرانے قیدی کو خبر لگی تو اس نے روکا کہ وہ اب سرکاری تھانیدار نہیں رہا، اب ہمارا تھانیدار ہے۔ یہ خبر پا کر سب میرے پاس آئے اور پاؤں چھوئے کہ اگر معاملہ کا پتہ نہ لگ جاتا تو آج بے ادبی ہو جاتی۔ (تلخیص از محمد عبداللہ قریشی)

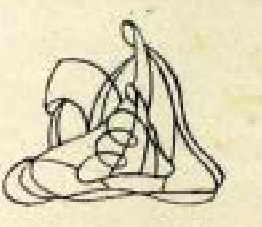

مرزا فرحت اللہ بیگ

ہر قدم پر ہوتی ہے جیل حوادث پائے ہوں
یہ ہماری زندگی ہے جس پہ یہ کچھ ناز ہے

جب سے یہ دنیا قائم ہوئی ہے سب ہی کہتے آئے ہیں کہ یہ ایک جیل خانہ ہے اور کہتے بھی ٹھیک ہیں۔ پہلے ہر آنے والا ماں کے پیٹ میں قید رہتا ہے۔ پھر بڑے بوڑھوں کی قید میں رہتا ہے۔ اس کے بعد مدرسہ کی قید میں رہتا ہے۔ بعد ازاں نوکری کی قید میں رہتا ہے اور آخر چل چلا کر ہمیشہ کے لیے قبر میں قید ہو جاتا ہے۔ میں بھی سوائے اس آخری قید کے بقیہ ساری قید یا بھگت چکا ہوں اور اللہ کے فضل سے اس آخری قید کا زمانہ بھی قریب آگیا ہے۔ اس سے پہلے کہ اس آخری قید کی میعاد شروع ہو جائے میں چاہتا ہوں کہ اپنی حبس دوام کے کچھ حالات لکھ دوں تاکہ "داشتہ آید بکار" ہو سکیں۔

سبھوں کی طرح میرا پہلا جیل خانہ ماں کا پیٹ تھا۔ جہاں تک میرا علم ہے اس جیل خانہ کی قید کا حال بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ ڈاکٹروں، حکیموں اور ویدوں نے اس کے متعلق کچھ اٹکل پچو غیر معقول باتیں ضرور لکھی ہیں، لیکن اس کال کوٹھری میں قید تنہائی کے کس طرح نو مہینے گزرتے ہیں۔ اس کا حال کچھ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ایسی صورت میں جھوٹی سچی باتیں بنانے کی بجائے خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ زمانہ میں انسانی ترقی اس جیل خانہ کے حالات کو بھی منظر عام پر لا سکے۔ اور وہاں کے قیدیوں کے افعال کو بجلی کی روشنی میں دکھایا جا سکے۔

پیدا ہونے کے بعد بڑے بوڑھوں کی قید میں بچوں کی جس طرح گزرتی ہے وہ ناقابل اظہار ہے۔ یہ بزرگ سمجھتے ہیں کہ بچے ہمارے دست نگر ہیں۔ اور بجز ہماری مدد کے جی نہیں سکتے۔ اس لیے ہم کو حق حاصل ہے کہ جس طرح چاہیں ان کو چلائیں، ان کو روکیں اور جس کام کو چاہیں انھیں کرنے دیں۔ یہ اختیارات استعمال ہو رہے ہیں یا نہیں۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ فرض کیجیے کہ ایک

(اردو کے مشہور مزاح نگار مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم نے "میری داستان — یعنی چونتیس برس کی قید با مشقت کے کچھ حالات و واقعات" کے نام سے مرحوم ریاست حیدر آباد میں اپنی ملازمت کی داستان لکھی ہے۔ یہ کتاب چند در چند وجوہ کی بنا پر ابھی تک شائع نہیں ہو سکی۔ مرزا صاحب مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا اس کتاب کا قلمی نسخہ مرحوم کے فرزند نجیب شرافت اللہ بیگ صاحب، اسسٹنٹ کمشنر، گلبرگہ (ریاست میسور، بھارت) کے پاس موجود ہے۔ موصوف کی اجازت سے اس داستان کا پہلا باب یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ ان کی اس کرم گستری کے لیے میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مبارز الدین رفعت)

بچہ ہے۔ وہ ماں کے گھڑکنے پر خفا ہو کر بھاگتا ہے اور کوئی ایسا کام کرنا چاہتا ہے جس کو اس کے بزرگ پسند نہیں کرتے۔ وہ اس کو اپنی طاقت کے زور پر اس کو یہ کام کرنے سے روک دیتے ہیں۔ اب آپ خود ہی ارشاد فرمائیے کہ کیا یہ اس بچہ کی آزادی پر جبر نہیں ہے؟ اور کیا یہ اس کی آزادیٔ خیال اور آزادیٔ افعال کے گرد ایک گھیرا نہیں ہے۔ ہے اور ضرور ہے۔ یہ کیوں ہوتا ہے؟ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ یہ بزرگ ایک طرح اپنے آپ کو خالق اور بچے کو مخلوق سمجھتے ہیں۔ مگر یہی بات منہ سے نہیں نکالتے۔ بلکہ اس کے بجائے یہ کہتے ہیں کہ کیا کریں ہم کو بچوں سے محبت ہے۔ ممکن ہے کہ ہو مگر بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ محبت نہیں ضرورت ہے اور آپ جانتے ہیں کہ جہاں محبت کے ساتھ غرض کا دُم چھلا لگ جاتا ہے تو وہ محبت نہیں رہتی ضرورت ہو جاتی ہے۔ آپ اس مسئلہ کو ایک مثال سے سمجھ لیجئے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا کوئی شخص بطور تفنن طبع چوری کرتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ چنانچہ اس اصول کو نظیر اکبر آبادی نے یوں بیان کیا ہے کہ ؎

نٹ کھٹ، اچکے، چور، دغا باز، راہ مار — عیار، جیب کترے، نظر باز، ہوشیار
سب اپنے اپنے پیٹ کے کرتے ہیں کاروبار — کوئی خدا کے واسطے کرتا نہیں شکار
بلّی بھی مارتی ہے چوہا پیٹ کے لیے

جس طرح بلّی اپنے پیٹ کے لیے چوہا مارتی ہے اسی طرح ہمارے بزرگ اپنے دل خوش کرنے کے لیے بچوں سے محبت کرتے ہیں اور "کوئی خدا کے واسطے کرتا نہیں پیار" خیر یہ تو فلسفہ کا ایک بڑا گہرا مسئلہ ہے۔ اس کو چھوڑیئے اور اصل مطلب پر آئیے۔ یعنی یہ کہ پیدا ہونے کے بعد ہر بچہ کسی نہ کسی طرح بزرگوں کی قید میں رہتا ہے۔ لیکن مزا تو یہ ہے کہ بعد میں بھی ان بزرگوں کے خلاف کچھ نہیں لکھتا اور شاید اس لیے نہیں لکھتا کہ ایک دن اس کو خود بڑا بننا اور اس خطرناک مقولہ کی تائید کرنا ہے کہ

"خطائے بزرگاں گرفتن خطاست"

میں نے اپنے اس بچپن کی قید اور مدرسہ کی قید کے بہت سے واقعات اپنے ایک مضمون "یادِ ایامِ عشرتِ فانی" میں لکھے ہیں۔ اب ان کا یہاں دہرانا بے ضرورت اور بے موقع ہے۔ چوتھی قید یعنی ملازمت کے حالات لکھنے کو بہت جی چاہتا تھا کیونکہ یہ وہ قید بامشقت ہے جو سب سے زیادہ سخت اور سب سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے اور جس میں "دم نہ مارو شکر گزار رہو" کا وظیفہ پڑھتے پڑھتے عمر کا سب سے بڑا اور سب سے اچھا حصہ بیت جاتا ہے۔ مگر مشکل یہ تھی اور رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ اول تو میری باتوں پر شاید سو میں سے دو چار صاحب ہی اعتبار کریں گے اور دوسرے یہ کہ سچی بات سننا اور سہنا بقول شخصے "کارے دارد"۔ آخر خدا خدا کر کے اس قید کا زمانہ ختم ہوا۔ کچھ کچھ آزادی کی ہوا لگی۔ اور اس وقت خیال آیا کہ میاں جو کچھ لکھنا ہے وہ جلدی لکھ لکھا کر ختم کرو۔ سب سے لمبی قید کا زمانہ سامنے آ گیا ہے۔ بہتر ہے کہ اس قید کی میعاد شروع ہونے سے پہلے کچھ لکھ کر چھوڑ جاؤ تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہر قوم اور وقت کو اپنی "روایات و حکایات" جمع کرنے کا شوق ہے اور رہا ہے۔ کیونکہ یہی چیزیں ان کی تاریخ ہیں۔ لیکن افسوس تو اس کا ہے کوئی اللہ کا بندہ اپنے افسروں اور بالادستوں کے کارنامے اور ان کے سچے

حالات اور واقعات خوش مذاقی کی چاشنی دے کر نہیں لکھتا۔ کیونکہ بے چارہ ڈرتا ہے کہ اگر لکھ بیٹھا تو نوکری جائے گی اور نوکری گئی تو پھر "اناللہ" ہو جانے میں کیا کوئی کسر رہ جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک ہمارے کسی مضمون نگار صاحب نے اس "قید سخت و بامشقت" کے متعلق کچھ لکھنے پر قلم نہیں اٹھایا ہے اور یہ "روایات و حکایات" سینہ بسینہ اور "زبان در زبان" باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے پر منتقل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ کیونکہ ہر شخص ڈرتا اور دعا کرتا ہے کہ "یا اللہ! بچا مجھ کو اس مصیبت سے جو فوجداری عدالتوں میں شریفوں پر نازل ہوتی ہیں۔" میں ہمت کر کے یہ مضمون لکھ تو رہا ہوں، مگر تعزیرات کی دفعہ ۲۲۵ ہر وقت پیش نظر ہے۔ پھر بھی مجھے یقین کامل ہے کہ ایک عرصہ تک فوجداری کام کرنے کی وجہ سے میری تحریر کا ہر لفظ "دفعہ محولہ بالا" کے مستثنیٰ اول میں داخل ہو سکے گا یا داخل کیا جا سکے گا۔ اب رہا یہ امر کہ میری اس تحریر پر اعتبار کیا جائے گا یا نہیں تو اس کے متعلق میں صرف یہ عرض کرنا کافی سمجھتا ہوں کہ میرے تمام دوست اور احباب اس وقت تک مجھے ایک بڑا سچا آدمی سمجھتے چلے آئے ہیں۔ اب آپ شریفوں کی بات کا یقین نہ فرمائیں تو اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ ضرور کہے دیتا ہوں کہ جو حالات اور واقعات میں نے دوسروں کی زبانی کہے ہیں ان کے سچے یا جھوٹے ہونے کا میں کسی طرح ذمہ دار نہیں ہوں۔ براہ کرم "دروغ برگردن راوی" کی مثل مجھ سے متعلق نہ کی جائے۔ البتہ جو کچھ اپنی آنکھوں دیکھا میں نے لکھا ہے اس کے متعلق یقین مانیے کہ اس کا ایک ایک حرف صحیح ہے اور اللہ میاں کے سامنے بھی ان واقعات کی حد تک اس مضمون کو سنانے کے لیے میں بالکل تیار ہوں۔ اور میں باور کرنے کی وجہ رکھتا ہوں "کہ اگر کراماً کاتبین کی تحریر بھی میری جیسی ہے تو یقیناً ان حالات سے متعلق میری اس تحریر اور میرے نامۂ اعمال کی تحریر میں رتی بھر فرق نہ ہوگا۔ تو پھر

چل رے خامہ بسم اللہ!

تعلیم کے جرم کی تکمیل کرنے کے بعد فکر ہوتا ہے کہ کسی بڑے جیل خانہ کی تلاش کی جائے۔ تاکہ وہاں سزا کی میعاد پوری کی جا سکے۔ اس کے لیے سب سے پہلے تحریراً "اقبال جرم" کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ ہم نے تعلیم پانے کا جرم کتنا، کہاں، کس طرح اور کس خوبی سے کیا ہے۔ اس تحریر کو عرف عام میں "درخواست ملازمت" کہتے ہیں اور اس کے ساتھ محکمہ تعلیمات کے مجسٹریٹوں کے فیصلے بغرض تصدیق شامل کیے جاتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اکثر و بیشتر یہ ساری کارروائی اکارت جاتی ہے اور ہر جگہ سے یہی جواب ملتا ہے کہ اس جیل خانہ میں گنجائش اتنی نہیں ہے کہ آپ کے لیے کوئی کونہ نکل سکے۔ کسی دوسرے جیل خانہ کی تلاش کی جائے۔" آخر "ملک خدا تنگ نیست پائے مرا لنگ نیست" کا خیال کر کے دوسری جگہ اپنی قسمت کا رونا رویا جاتا ہے اور وہاں سے بھی دھکے کھا کر واپس ہونا پڑتا ہے۔ وہ جو مثل ہے کہ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ آخر کسی نہ کسی جگہ تقدیر لڑ ہی جاتی ہے اور حکم ہو جاتا ہے کہ اس شخص کو کم سے کم ۲۵ برس کے لیے اس جیل خانہ میں پابہ زنجیر قید بامشقت میں رکھا جائے۔ اس حکم کے ہوتے ہی سمجھ لیا جاتا ہے کہ چلو مشکل آسان ہوئی۔ اب سوائے اپنے عہدہ دار کے دین اور دنیا میں کہیں بھی کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور ہمارے رزق کا تعلق اللہ میاں سے منقطع ہو کر جیل کے داروغہ صاحب بالقابہ سے ہو گیا ہے۔

ہے یہ کہ ملازمت کی یہ قید بھی ایک عجیب قید ہے۔ نہ یہاں اقبالِ جرم کام دیتا ہے اور نہ مجسٹریٹ تعلیم کا کوئی فیصلہ۔ اور اکثر و بیشتر اس وقت تک کوئی شخص جیل خانہ میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ مالکان اور قابضانِ جیل خانہ کے پاس کسی زبردست شخص کی سفارش نہ پہنچے۔ ہم کو بھی یہی مصیبت پیش آئی اور سفارش کے لیے کسی بڑے آدمی کی تلاش کرنی پڑی پھرتے پھراتے ہماری نظر ہز ہائی نس سر امیر الدین خان نواب لوہارو پر پڑی۔ خدا مغفرت کرے یہ نواب صاحب درجہ میں تو بڑے تھے۔ مگر دماغ و دل میں بڑے نہیں تھے۔ ہمارے رشتہ دار بھی تھے اور گورنمنٹ میں با اثر بھی۔ اس لیے ۱۹۰۵ء میں بی اے اور شروع ۱۹۰۶ء میں ایم اے میں پڑھنے کے بعد ہم لفٹننٹ گورنر الہ آباد کے نام سفارشی خط لینے کے لیے ان کے پاس گئے۔ انھوں نے دو خط دیے۔ ایک لفٹننٹ گورنر کے نام اور دوسرا ہز ہائی نس نواب صاحب رام پور کے نام۔ لفٹننٹ گورنر اس زمانہ میں نینی تال میں تھے اور نواب صاحب اپنے دار الحکومت رام پور میں۔ خیال آیا کہ چلو پہلے نواب صاحب ہی سے مل لیں۔ ان کا ممالکِ متحدہ کی گورنمنٹ میں بہت اثر ہے۔ ضرور کام نکل جائے گا۔ اسباب وسباب باندھ رامپور پہنچے۔ پہلے سیدھے نواب عبد الصمد خاں صاحب کے پاس گئے جو نواب صاحب لوہارو کے عزیز اور نواب صاحب رام پور کے وزیر تھے۔ یہ بہت مہربانی سے پیش آئے۔ مگر مشکل یہ آ پڑی کہ نواب صاحب اس زمانے میں رام گنگا کے اس پار مقیم تھے۔ دریا چڑھاؤ پر تھا۔ اس لیے کشتی میں پار ہونے کا موقع نہ تھا۔ کئی روز تک رام پور میں ٹھیرے۔ مگر دریا کو ہم سے کچھ ایسی مخالفت ہو گئی تھی کہ نہ اس کو اترنا تھا اور نہ اترا۔ انتظار کرتے کرتے تھک گئے چونکہ کالج سے نئے نئے نکلے تھے اور دنیا کے اس رنگ سے ناواقف تھے اس لیے سب سے بگڑ بیٹھے۔ نواب عبد الصمد خاں صاحب نے کہا بھی کہ خط مجھ کو دے دو میں سفارشی چٹھی منگوا دیتا ہوں لیکن ہم نے صاف انکار کر دیا اور اس لیے انکار کر دیا کہ وہاں کے بعض لوگوں نے کہا کہ دریا کے چڑھاؤ کا بہانہ ہے۔ دراصل تم کو چٹھی دینے سے پہلو تہی کی جا رہی ہے۔ بھلا کوئی تعلیم یافتہ آدمی ایسی بات سنے اور اس کو تاؤ نہ آ جائے۔ ہم کو بھی تاؤ آ گیا اور ہم ایک دن بغیر کچھ کہے سنے "مہمان خانہ" سے بھاگ کر سیدھے اسٹیشن پہنچے اور دہلی تشریف لے آئے۔ نواب صاحب لوہارو سے ملے۔ انھوں نے واقعات دریافت کیے۔ ان کے پاس نواب عبد الصمد خاں صاحب کا بھی خط آ گیا تھا۔ اس میں ہماری فراری کے واقعات سے اطلاع دی گئی تھی۔ نواب صاحب نے ہمارا بڑا مذاق اڑایا۔ اور کہا کہ "تم دو چار روز اور ٹھہر جاتے یا نواب صاحب رام پور کو میرا خط بھجوا دیتے تو سفارشی چٹھی مل جاتی۔ تم نے یہ کیا غضب کیا کہ اطلاع ہونے کے بعد بغیر ملے چلے آئے۔ اب پھر جاؤ اور جب تک ملنا نہ ہو رام پور ہی میں ٹھیرے رہو۔ تم نے کیا نواب صاحب رام پور کو بھی نواب صاحب لوہارو سمجھ لیا ہے۔" میں نے کہا: "معاف فرمائیے، میں مر بھی جاؤں گا تو رام پور نہ جاؤں گا۔ خدا کی قسم وہاں بعض وقت تو خودکشی کرنے کو جی چاہتا تھا۔" کہنے لگے "خیر کیوں؟" میں نے کہا: "یہ اس لیے کہ کمرے ٹھیرنے کو ملے تھے، لیکن نوکروں کی یہ حالت تھی کہ ہم نے گھنٹی بجائی کوئی نوکر آیا۔ اس سے کام کو کہا۔ اس نے وہ کام پورا کیا اور چلا گیا۔ جانتا تھا کہ نواب صاحب کے عزیز ہیں۔ ان سے بات کرنا خالی از خطرہ نہیں ہے۔ اس کے بعد بیٹھے پھر ہم ہیں اور وہی خالی کمرے۔ اتنے دنوں تک کوئی ایک آدمی بھی تو بات کرنے کو نہیں ملا۔ نواب عبد الصمد خاں صاحب کی یہ حالت تھی کہ ان کو کام سے فرصت ہی نہیں تھی۔ ان کی بچی کو غشی ہو رہی تھی اس کو دیکھنے دن میں ایک دفعہ آتے تھے۔ اس وقت کچھ بات ہو جاتی تھی۔ ورنہ ہم تھے اور قیدِ تنہائی۔ بعض وقت تو یہ جی

چاہتا تھا کہ دو ایک آدمیوں کا گلا گھونٹ کر خود چھت پر سے کود پڑوں۔ اب آپ فرمائیں یا اور کوئی کہے میں تو رام پور جانے کا نہیں آپ کا خط لے کر لاٹ صاحب کے پاس جاتا ہوں۔ نوکری ملی تو ملی۔ نہیں تو جائے جہنم میں۔" نواب صاحب بہت ہنسے اور کہنے لگے "میاں فرحت، ابھی تم نے دنیا کی ٹھوکریں نہیں کھائی ہیں۔ دماغ میں نوابی کے خیالات بھرے ہیں۔ میاں یہ دنیا ہے، یہاں وہی اُبھرتا ہے جو پس کر خاک ہو جاتا ہے۔" میں نے کہا "آگے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ ابھی تو میں اپنی خودداری کھونے کو آمادہ نہیں ہوں۔" غرض اس گفتگو کے بعد یہ تصفیہ ہوا کہ سر جیمس لاٹوش لفٹننٹ گورنر ممالک متحدہ سے مل لیا جائے۔ آگے یا قسمت یا نصیب۔

اس تصفیہ کے بعد پھر اسباب بندھا اور سفر وسیلۂ ظفر پر عمل ہونے لگا۔ ہماری اس بھاگ دوڑ میں لفٹننٹ گورنر بہادر کے دورہ کا زمانہ شروع ہو گیا۔ اب آگے آگے وہ ہیں اور پیچھے پیچھے ہم۔ جہاں جاتے ہیں وہاں یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے کیمپ اٹھ گیا۔ لکھنؤ میں تو ان سے ٹکر ہوتے ہوتے رہ گئی۔ آخر خدا خدا کر کے الٰہ آباد میں ہماری ان کی سواری ایک ساتھ اُتری۔ وہ گورنمنٹ ہاؤس میں گئے اور ہم اپنے بھائی میاں رحمت اللہ بیگ کے ساتھ ان کے خالو عبدالمجید خاں کے ہاں گئے جو فوج میں ہیڈ کلرک تھے۔ ان کا مکان کنٹونمنٹ میں گنگا کے کنارے پر قلعہ الٰہ آباد کے قریب تھا۔ جاتے ہی لفٹننٹ گورنر صاحب کے سکریٹری کو اپنی تشریف آوری کی اطلاع دی اور یہ بھی لکھا کہ ہم نواب صاحب لوہارو کا خط لائے ہیں، ملاقات کا وقت مقرر کر دیا جائے تو ہم خود آ کر یہ خط پیش کریں گے۔ جواب آنے میں کئی دن لگے، لیکن الٰہ آباد میں دل نہیں گھبرایا اور کیوں گھبراتا۔ میاں رحمت موجود تھے۔ ان کے خالو کے بچے موجود تھے اور سب سے زیادہ یہ کہ گنگا مائی موجود تھیں۔ صبح اُٹھتے، ناشتہ کیا، گنگا کے کنارے گئے، کشتی میں بیٹھے، اس پار پہنچے۔ وہاں سیر گشت کی۔ گیارہ بجے واپس آئے۔ کھانا کھایا۔ کچھ دیر سوئے، تیسرے پہر کو اُٹھے۔ شہر چلے گئے۔ رات کو آئے۔ کھانا کھایا، سو رہے۔ شہر میں میرے ایک بچپنے کے دوست اعجاز حسین بھی رہتے تھے۔ ان کی صحبت میں وقت معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ کب گزر گیا اور کیسے گزرا۔ غرض اسی طرح وہاں رہتے رہتے کوئی ایک ہفتہ ہو گیا۔ ایک روز جو شہر کے چکر سے واپس آئے تو یہ بڑی لال مہر کا ایک خط ملا۔ لکھا تھا کہ "آپ کل صبح آٹھ بج کر پینتالیس منٹ پر آ سکتے ہیں۔ یہ کارڈ ساتھ لیا جائے۔" چلو یہ مشکل بھی آسان ہو گئی۔

دوسرے روز صبح ہی اُٹھے، ہاتھ منہ دھو، کپڑے بدل، سبز پھول دار اطلس کی شیروانی اور گہرے سرخ رنگ کی ترکی ٹوپی پہن ہم گورنمنٹ ہاؤس پہنچے۔ میاں رحمت ساتھ تھے۔ وہاں جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ برآمدہ میں اس سرے سے اس سرے تک آدمی ہی آدمی بیٹھے ہیں۔ ایک صاحب بہادر نے ہمارا کارڈ دیکھا۔ ایک اور کرسی پر ہم کو متمکن کرایا۔ ظاہر ہے کہ جب آدمی کسی نئی جگہ جا کر بیٹھتا ہے تو اِدھر اُدھر نظریں ضرور دوڑاتا ہے۔ ہم نے بھی یہی کیا۔ جو صاحب ہمارے برابر بیٹھے تھے وہ گھڑی گھڑی اپنا کارڈ نکالتے تھے، پڑھتے تھے، کچھ مسکراتے تھے اور پھر جیب میں رکھ لیتے تھے۔ مجھے بڑی فکر ہوئی کہ یا اللہ! کارڈ تو ان کا بھی ایسا ہی ہے جیسا میرا ہے پھر آخر یہ پڑھتے کیا ہیں اور مسکراتے کیوں ہیں۔ آخر نہ رہا گیا اور جب انھوں نے کوئی بیسویں دفعہ اپنا کارڈ نکالا تو میں نے کہا کہ "کیا میں آپ کا کارڈ دیکھ سکتا ہوں؟" انھوں نے "لکھنوانہ انداز" سے کہا: "جی ہاں، شوق سے۔" میں نے کارڈ لے کر دیکھا۔ اس کی عبارت یہی تھی

جو میرے کارڈ کی تھی، یہاں وقت ملاقات بجائے ۸ — ۴۵ کے ۸ — ۵۰ لکھا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑی الجھن ہوئی۔ گویا اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہماری ملاقات کا وقت صرف پانچ منٹ ہے۔ بھلا اس پانچ منٹ میں کیا بات ہو سکے گی۔ میں نے ان صاحب سے کہا کہ "ذرا اپنے برابر والے صاحب کے کارڈ کو تو دیکھئے۔ ان کے ہاں وقتِ ملاقات کیا لکھا ہے؟" کارڈ دیکھا گیا تو وقتِ ملاقات ۸ — ۵۵ نکلا۔ اب کیا تھا۔ سب بیٹھنے والوں نے اپنے اپنے کارڈ نکال کر وقت ملانا شروع کیا۔ معلوم ہوا کہ کسی کو بھی پانچ منٹ سے زیادہ ملنے کا وقت نہیں دیا گیا ہے۔ میرے برابر جو صاحب بیٹھے تھے کہنے لگے: "اے حضرت، غضب خدا کا، ملنے کا وقت اور پانچ منٹ۔ آپ کی جان کی قسم پانچ منٹ میں تو مزاج پرسی بھی نہ ہو سکے گی۔" میں نے کہا: "آپ مزاج پرسی کیوں کرتے ہیں۔ جاتے ہی مطلب کی باتیں شروع کر دیجئے۔" کہنے لگے "اے جناب، آپ کیا فرماتے ہیں۔ لفٹنٹ گورنر صاحب بہادر سے ملنے جاؤں اور ان کی اور ان کے بال بچوں کی خیریت بھی نہ پوچھوں۔ ہم پرانے زمانے کے لوگ ہیں۔ اپنے پرانے ادب آداب کے طریقے کبھی چھوڑ سکتے ہیں؟ کام ہو نہ ہو، صاحب کی خیریت تو معلوم ہو جائے گی!"

ابھی ہم دونوں میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک چپراسی نے آکر آواز لگائی: "مرزا فرحت اللہ بیگ"۔ ہم اٹھے۔ ذرا شیروانی درست کی اور نہایت ٹھاٹھ سے کمرے میں داخل ہوئے۔ ہمارا کمرے میں داخل ہونا تھا کہ سامنے سے ایک بڑے لمبے تڑنگے صاحب بہادر فسٹ کلاس سوٹ پہنے ہوئے آئے۔ بہت مسکرا کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا اور کہا: "آپ ہی مرزا فرحت اللہ بیگ ہیں؟" میں سمجھا لاٹ صاحب یہی ہیں۔ نہایت فیشن سے انگریزی طریقہ پر گردن کو جھکا کر کہا: "یور آنر! میں ہی فرحت اللہ بیگ ہوں۔" میرے اس کہنے پر ان صاحب نے کہا: "معاف فرمائیے گا، آپ کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں لفٹنٹ گورنر نہیں ہوں، ان کا سکریٹری ہوں۔" اس کے بعد آپ کچھ سمجھے کہ مجھے کتنا پسینہ آیا ہوگا۔ وقت کم تھا۔ اس لیے سکریٹری صاحب نے بھی اس غلط فہمی کو طول دینا مناسب نہ سمجھا، مڑے، آگے بڑھے، سامنے والا دروازہ کھولا اور کہا "مرزا فرحت اللہ بیگ!" کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑی سی میز کے سامنے فرنچ فیشن کی داڑھی والے ایک بڑے میاں بیٹھے ہیں۔ پہلو میں ایک چھوٹی سی میز ہے۔ اس پر ایک چوکھٹا رکھا ہے اور چوکھٹے کے اندر جو کاغذ ہے اس پر نہایت خوبصورت حرفوں میں "سر جے، بی، لاٹوش، لفٹنٹ گورنر" لکھا ہوا ہے۔ یہ معاملہ ٹھیک تھا، اور یہاں کسی غلط فہمی کا اندیشہ نہیں تھا۔ اس لیے بے تکان ہم آگے بڑھے۔ لاٹ صاحب بھی کرسی سے اٹھے۔ میز کے پہلو میں جو کرسی بچھی ہوئی تھی اس پر بیٹھنے کا انھوں نے اشارہ کیا۔ ہم بیٹھ گئے۔ انھوں نے نواب صاحب کی خیریت پوچھی اور کہا: "کیا آپ ان کا کوئی خط لائے ہیں؟" میں نے کہا: "جی ہاں" کہنے لگے: "بہتر ہوتا کہ آپ یہ خط پہلے سے میرے سکریٹری کے پاس بھیج دیتے کیونکہ سرکاری طریقہ یہی ہے۔" میں نے نہایت متانت سے جواب دیا "اور جو یہ خط آپ کے سکریٹری صاحب کہیں کھو دیتے تو؟" یہ سن کر وہ مسکرائے اور خط لینے کو ہاتھ بڑھایا۔ میں نے خط دیا۔ انھوں نے خط لیا اور پڑھنا شروع کیا۔ معلوم نہیں نواب صاحب لوہارو نے اس خط میں کونسی امیر حمزہ کی داستان لکھی تھی کہ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی دو منٹ ہو گئے تھے۔ لاٹ صاحب خط پڑھتے رہے اور ہم سامنے والی گھڑی کی طرف دیکھتے رہے۔ پانچ منٹ ہوتے ہی کیا ہیں، انھوں نے خط ابھی ختم ہی نہیں کیا تھا کہ میں اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ "اب میں اجازت چاہتا ہوں۔" کہنے لگے "کیوں؟" میں نے کہا کہ "اس لیے ۸ — ۵۵ سے ایک دوسرے صاحب کو ملاقات کا وقت دیا گیا ہے۔"

یہ سن کر وہ بے اختیار ہنس پڑے اور کہنے لگے: ”وہ کون صاحب ہیں؟“ میں نے کہا: میں ان کا نام تو نہیں جانتا لیکن وہ فرما رہے تھے کہ مجھے کہنا تو بہت کچھ ہے مگر ملاقات کے پانچ منٹ شاید لاٹ صاحب کے خاندان کی خیریت معلوم کرنے میں گزر جائیں گے اور پھر کسی اور دن ملاقات کے لیے آنا پڑے۔“ کہنے لگے: ”تمھاری طبیعت میں مذاق بہت ہے۔“ میں نے کہا: ”اس میں مذاق کی کونسی بات ہے۔ آپ ۔۔۔ والے صاحب کو بلا کر پوچھ لیجیے کہ وہ آپ کے سارے خاندان کی خیر دریافت کرنا ضروری سمجھتے ہیں یا مطلب کی بات کرنا۔“ کہنے لگے: ”تم بیٹھے رہو، یہ جتنے لوگ آتے ہیں سب اسی قسم کے ہیں۔ ہر ہفتہ ملنے چلے آتے ہیں اور میرا اور اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔“ غرض ہم اطمینان سے بیٹھ گئے اب ہر پانچ منٹ کے بعد سیکرٹری صاحب گھنٹی بجاتے۔ یہاں سے جواب نہیں ملتا، اور ہر پانچ منٹ پر ایک صاحب بلا کے رخصت کر دیے جاتے۔

لاٹ صاحب سے ہماری جو باتیں ہوئیں وہ بھی سننے کے قابل تھیں۔ انگریز پروفیسروں اور خاص کر پرنسپل ایف ایڈ روز کی صحبت میں رہتے رہتے دل کھل گیا تھا اور سمجھنے لگے تھے کہ ہم بھی کوئی ہیں۔ طبیعت میں مذاق تھا اس لیے اگر کوئی دلچسپ بات دل میں آتی تھی تو اس کے صاف صاف کہنے میں باک نہیں تھا اور یہ خیال تک نہیں رہتا تھا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں اور کہاں کہہ رہے ہیں۔ ادھر یہ حال تھا اور ادھر ایک جہاندیدہ، خوش خلق، ہنس مکھ بڑے میاں تھے۔ سمجھتے ہوں گے کہ اس بیوقوف کی باتیں ہی سُن لو۔ اب میری اور ان کی جو گفتگو ہوئی وہ ذرا غور سے سنیے:

لاٹ صاحب: تو آپ اس علاقہ میں بحیثیت ڈپٹی کلکٹر منتخب ہونا چاہتے ہیں؟

میں: جی ہاں، اگر یہ نہ ہوتا تو میں اتنی دور سے آتا ہی کیوں؟

لاٹ صاحب: مرزا صاحب، آپ کو یہاں کا قانون معلوم ہے؟

میں: جی نہیں!

لاٹ صاحب: قانون یہ ہے کہ جب تک اس علاقہ میں کوئی چھ سال تک نہ رہا ہو۔ اس وقت تک اس کا انتخاب نہیں ہو سکتا۔ کیا آپ یہاں چھ سال تک رہے ہیں؟

میں: جی نہیں!

لاٹ صاحب: تو پھر میں مجبور ہوں۔ قانون تو قانون ہی ہے۔

میں: کیا میں آپ سے ایک سوال کر سکتا ہوں؟

لاٹ صاحب: ضرور

میں: جناب والا! آپ کے علاقہ میں میرے خاندانی حقوق بھی ہیں جائداد بھی۔ مگر میں خود یہاں چھ سال نہیں رہا ہوں۔ اس لیے مجھے آپ کے علاقہ میں نوکری نہیں مل سکتی۔ علاقہ پنجاب میں میری سکونت رہی ہے۔ مگر وہاں نہ میرے خاندانی حقوق ہیں اور نہ جائداد۔ اس لیے وہاں میرا انتخاب کسی خدمت پر نہیں ہو سکتا۔ اب رہے ہندوستان کے دوسرے احاطے اور علاقے تو وہاں میں کبھی رہا ہوں نہ وہاں میری کوئی جائداد ہے اور نہ وہاں میرے خاندانی حقوق۔ اس لیے وہاں بھی مجھے کوئی جگہ نہیں مل سکتی تو گویا میں سمجھ لوں کہ مجھ پر سارے ہندوستان میں ملازمت کا دروازہ بند ہے؟

یہ سن کر لاٹ صاحب نے بڑے زور کا قہقہہ مارا اور کہا:

لاٹ صاحب: میاں صاحبزادے! تم بڑے دلچسپ آدمی ہو۔ دیکھو میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ تم کہتے ہو کہ اس علاقے میں تمھاری جائداد بھی ہے اور تمھارے کچھ عزیز بھی برسرِ خدمت ہیں۔ تم کبھی کبھی اپنی جائداد دیکھنے یا عزیزوں سے ملنے تو ضرور یہاں آتے ہوگے۔ کیا یہ سب مُدّت مل ملا کر چھ سال نہیں ہو گئی ہوگی؟

میں: میں نے اس کا کوئی حساب تو نہیں رکھا۔ ممکن ہے کہ ہو گئی ہو، ممکن ہے کہ نہ ہوئی ہو۔

لاٹ صاحب: نہیں بھی ہوئی ہو تو تکمیلِ ضابطہ کے لیے تم کہہ دو کہ ہو گئی ہے۔

میں: یہ میری زندگی میں پہلا موقع ہے کہ ایک اتنا بڑا آدمی مجھے جھوٹ بولنے کی تلقین کر رہا ہے۔ خیر آپ کی خاطر کہے دیتا ہوں کہ چھ برس ہو چکے ہیں۔

یہ سُن کر انھوں نے میری درخواست پر کچھ لکھا اور کہا:

لاٹ صاحب: مشکل یہ آن پڑی ہے کہ میں اب عنقریب پنشن پر جا رہا ہوں۔ اس سال کے انتخاب ہو چکے ہیں۔ اس لیے فی الحال تو میں کچھ کر نہیں سکتا، ہاں تمھاری درخواست کے جو مشکل مرحلے ہیں وہ طے کیے دیتا ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ آئندہ سال اس درخواست کی منظوری میں کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ تم نینی تال میں آکر مجھ سے کیوں نہیں ملے۔ میرے پاس آگئے ہوتے تو جب ہی انتخاب ہو جاتا۔

میں نے اس پر رام پور کے سارے واقعات بیان کر دیے اور یہ بھی کہا کہ آپ کے دورہ کی وجہ سے مجھے خدا معلوم کہاں کہاں بھاگنا پڑا ہے۔ یہ سُن کر وہ بہت ہنسے اور کہنے لگے:

لاٹ صاحب: میں پنشن پر تو جا رہا ہوں۔ مگر میرا خیال ہے کہ اپنے جانشین کے ساتھ مجھے کچھ دنوں اور اس لیے کام کرنا ہوگا کہ امیر کابل آرہے ہیں اور شاید ہم دونوں کو ان کی خدمت میں رہنا پڑے۔ میں جنوری ۱۹۰۷ء میں آگرہ میں ہوں گا۔ میرے جانشین سر جان ہیوٹ بھی وہیں ہوں گے اور نواب صاحب لوہارو بھی وہیں ہوں گے۔ ممکن ہے کہ وہیں تمھارے انتخاب کا فیصلہ ہو جائے۔

غرض اسی قسم کی گفتگو میں کوئی پون گھنٹہ لگ گیا۔ یہ سوچ کر کہ اس وقت تک لاٹ صاحب سے ملنے والے نوں آدمی رخصت ہو چکے ہوں گے اور خدا معلوم مجھے دل میں کیا کچھ بُرا بھلا کہہ گئے ہوں گے اور جو بیٹھے ہیں وہ کیا کچھ بُرا بھلا کہہ رہے ہوں گے میں نے اجازت طلب کی۔ لاٹ صاحب نے اُٹھ کر ہاتھ ملایا۔ گھنٹی بجائی۔ سکرٹری صاحب نے دروازہ کھولا۔ ہم سلام کر کے مسکراتے ہوئے باہر نکلے۔ سکرٹری صاحب نے پہلے سے کہیں زیادہ ہماری آؤ بھگت کی۔ ہم برآمدہ میں آئے۔ ایک دوسرے پانچ منٹ والے صاحب اندر گئے۔ ہم اور میاں رحمت تانگہ میں بیٹھے اور گھر واپس آئے۔ گھر پر آکر سارا قصہ اپنے میزبان عبدالمجید خاں کے سامنے دہرایا۔ وہ بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ ایسی گفتگو لاٹ صاحب سے شاید ہی کسی نے کی ہو تو کی ہو۔ وہ تو کہو کہ بڑا شریف انگریز ہے جو ہنس ہنس کر تمھاری یہ مسخرے پن کی باتیں سنا کیا۔ کوئی سر پھرا انگریز ہوتا تو ٹھوکر سے خبر لیتا۔

میں نے کہا: جی ہاں ٹھوکر سے خبر لیتا۔ مجھے تو کوئی ایسا بڑے باپ کا بیٹا نظر نہیں آتا جو ایک مارے اور دو نہ کھائے۔"

کہنے لگے: "مرزا صاحب، کیوں خفا ہوتے ہو؟ ابھی تم نے دنیا نہیں دیکھی ہے جو ایسی باتیں کر رہے ہو۔ کچھ دن نوکری میں گزار لو، اس

کے بعد پوچھیں گے کہ اب کیا ارشاد ہوتا ہے؟"

لاٹ صاحب کی ملاقات کے بعد ہم دو تین روز الٰہ آباد میں رہے اور پھر دہلی آگئے۔ نواب صاحب لوہارو دہلی ہی میں تھے۔ ان سے تمام واقعات بے کم و کاست بیان کر دیے۔ وہ بڑے جہاں دیدہ شخص تھے اور زمانہ کی چالوں کو خوب سمجھتے تھے کہنے لگے کہ "میری رائے میں تمہارا مسخرہ پن میرے خط سے کہیں زیادہ کام کر گیا ہے۔" میں نے تعجب سے پوچھا "جناب والا! میں نے کون سا مسخرہ پن کیا؟ جو بھی بات تھی وہ صاف صاف کہہ دی۔" کہنے لگے "تم نہیں جانتے۔ ایسے بڑے لوگوں کے سامنے اس طرح کوئی صاف صاف باتیں نہیں کرتا اور خاص کر ایسی کوئی بات زبان سے نہیں نکالتا جس سے ان کا مذاق اڑتا ہو اور اگر کوئی ایسی باتیں کرتا ہے تو وہ دیوانہ سمجھا جاتا ہے یا مسخرا۔" جیل خانہ کی تعلیم کا یہ پہلا سبق تھا جو ہم کو اس روز ملا۔ کچھ دنوں کے بعد لاٹ صاحب کا خط نواب صاحب کے پاس آیا۔ وہ انھوں نے میرے پاس بھجوا دیا۔ خط دیکھ کر دل خوش ہو گیا اور معلوم ہوا کہ واقعی شریف آدمی اس کو کہتے ہیں۔ خط میں وہ تمام واقعات مختصراً لکھے تھے جو اس عجیب رنگ کی ملاقات میں گزرے تھے۔ میری زندہ دلی اور صاف گوئی کی بہت تعریف کی تھی۔ میرے انتخاب کے متعلق اپنی تحریک کا ذکر کیا تھا۔ اور آخر میں اشارتاً یہ بھی لکھ دیا تھا کہ اپنے بھانجے صاحب کو یہ ضرور سمجھا دیجیے کہ صاف گوئی اچھی ہے۔ بشرطیکہ موقع و محل سے ہو۔ اور خوش مذاقی خدا کی ایک دین ہے بشرطیکہ اس کا استعمال مناسب موقع پر کیا جائے۔ نواب صاحب نے یہ خط مجھے بطور سارٹیفکیٹ رکھنے کو بھیجا تھا۔ میں سمجھا کہ شاید دیکھنے کو بھیجا ہے۔ پڑھ کر واپس کر دیا۔ دو چار روز کے بعد جا کر پوچھا تو پتہ چلا کہ کہیں کھو گیا۔

شروع ۱۹۰۷ء میں ہم آگرہ پہنچے۔ وہاں امیر حبیب اللہ خان شاہ کابل بھی آئے۔ سرجان ہیوٹ بھی آئے۔ نواب صاحب لوہارو بھی آئے۔ نہیں آئے تو سر جیمس لاٹوش۔ معلوم ہوا کہ طبیعت خراب ہو گئی تھی اس لیے ولایت چلے گئے۔ یہاں نواب صاحب نے لاٹ صاحب کے سکریٹری سے ہماری درخواست کے متعلق پوچھا۔ انھوں نے کہا "لاٹوش صاحب اس درخواست پر ایسا نوٹ لکھ گئے ہیں کہ اس کو گویا منظور ہی سمجھیے۔ اس سال ڈپٹی کلکٹری کا جو انتخاب ہو گا اس میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا نام ضرور آجائے گا۔" ظاہر ہے کہ اس کے بعد کسی فکر کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس لیے امیر کابل کے کیمپ کو اپنا گھر بنایا اور وہاں جشنوں اور تماشوں کا لطف اٹھایا اور خوب اٹھایا۔

دیکھا جائے تو انسان کی قسمت بھی ایک تماشہ ہے۔ کبھی جڑتی ہے تو کبھی ٹوٹتی ہے اور کبھی ٹوٹتی ہے تو کبھی جڑتی ہے۔ ہماری شادی عبدالمجید خواجہ کی بہن سے ٹھیری تھی۔ وہ بیچاری ایک دفعہ ہی چل بسی۔ اب دوسری جگہ کی تلاش ہوئی اور آخر ہماری نسبت اپنے ایک چچا مرزا ساجد بیگ صاحب کی بڑی لڑکی سے ٹھیر گئی۔ میں یہاں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمارا سارا خاندان حیدرآباد میں تھا اور یہ سب کے سب اچھی خدمتوں پر تھے۔ میرے والد صاحب بھی حیدرآباد میں رہتے تھے البتہ میں دلی میں اس وجہ سے رہتا تھا کہ میری پھوپھی صاحبہ نے مجھ کو بیٹا بنا لیا تھا۔ کیونکہ میری والدہ کا انتقال اس زمانہ میں ہو گیا تھا جب میں نو دس دن کا تھا۔ مرزا ساجد بیگ صاحب حیدرآباد میں ناظم ضلع (ڈسٹرکٹ جج) تھے۔ اپنی منگیتر کو میں نے دیکھا

ضرور تھا۔ مگر یہ دیکھنا نہ دیکھنے کے برابر تھا کیونکہ اس وقت اس لڑکی کی عمر چار سال کی تھی اور میری نو سال کی۔ نسبت ٹھیرنے کے بعد یہ وحشت ہوئی کہ کسی طرح حیدرآباد جاؤں اور اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھوں۔ ایک روز میں اور میرے عزیز دوست میاں وانی سہ پہر کے وقت پریڈ کے میدان میں سے ہو کر کالج گراؤنڈ جا رہے تھے کہ یہی ذکر نکلا۔ انھوں نے کہا کہ "میرا دل بھی حیدرآباد دیکھنے کو بہت چاہتا ہے۔ تم یہ کہہ کر وہاں جاؤ کہ نوکری کی تلاش میں جاتا ہوں۔ میں بھی کسی نہ کسی ترکیب سے وہاں آجاؤں گا۔" صلاح بہت اچھی تھی۔ دل کو لگ گئی۔ بجائے کالج جانے کے ہم گھر واپس آئے۔ پھوپھی صاحبہ کو الٹا سیدھا بہت کچھ سمجھایا۔ وہ بے چاری ان چکروں کو کیا سمجھ سکتی تھیں۔ راضی ہو گئیں۔ دوسرے ہی دن میں اور میرے ماموں زاد بھائی مرزا سلیم بیگ ریل سے روانہ ہو کر بھوانی پہنچے بھوانی سے لوہارو کوئی (۱۵) کوس ہے۔ پہلے سے اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی تھی۔ اس لیے ریاست سے سواری کا کوئی انتظام نہیں ہوا تھا۔ جتنا راستہ تھا سب کا سب ریتلا تھا۔ بھوانی سے لدو اونٹ کرایہ پر لیا اور چل دیے۔ راستے میں بڑے زور کا مینھ برسا۔ مگر مزا تو یہ تھا کہ ہم دونوں کا صرف ایک ہی پہلو بھیگا اور دوسرا بالکل خشک رہا۔ ممکن ہے کہ اونٹ کی بلندی کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔ مگر یہ امر واقع ہے کہ جب ہم دونوں جوئی پہنچے تو ایک طرف سے بھیگ کر چڑی ہو گئے تھے اور دوسری طرف پانی کی ایک چھینٹ بھی نہیں پڑی تھی۔ رات جوئی میں گزاری۔ وہاں کے مچھروں اور کھٹملوں نے ہماری جس طرح خبر لی اس کی شکایت اب لاحاصل ہے۔ غرض صبح آٹھ بجے پھر اونٹ پر سوار ہوئے اور لوہارو پہنچ گئے۔ نواب صاحب سے ملے اور کہا کہ سفارشی خط لکھ دیجیے۔ یہ سن کر وہ ذرا خفا ہوئے اور کہا کہ "ملازمت کا جب ایک جگہ انتظام ہو گیا ہے تو اب بے ضرورت حیدرآباد کیوں جاتے ہو؟" لیکن جب ہم نے حیدرآباد جانے کی اصلی غرض کا اظہار کیا تو وہ مسکرائے اور دو خط لکھ دیے۔ ایک بیلی صاحب رزیڈنٹ حیدرآباد کے نام تھا اور دوسرا سر کیس واکر معین المہام فینانس کے نام۔ یہ دونوں خط لینے کے بعد ہم کئی دن تک لوہارو میں رہے اور بڑے مزے سے رہے۔ ماموں علیم بیگ (مرحوم) نے پستے بادام کھلا کھلا کر معدہ خراب کر دیا اور ماموں شفیق بیگ (مرحوم) نے شاہنامہ سنا سنا کر دماغ پریشان کر دیا۔

آخر لوہارو سے نکلے اور بڑے ٹھاٹھ سے نکلے۔ کئی سانڈنیاں ساتھ تھیں۔ ایک پر میں اور سلیم بیگ تھے۔ دوسرے پر شاہ رخ مرزا فرزند نواب صاحب لوہارو اور ان کے ایک دوست تھے۔ تیسری پر ان کے دو مصاحب اور چوتھی پر پولیس کے دو جوان تھے۔ رات کے کوئی دو بجے ہوں گے کہ ہم نے لوہارو چھوڑا۔ ریت میں قدم رکھتے ہی سانڈنیاں ریل ہو گئیں۔ گردن لمبی کر کے جو قدم بڑھانے شروع کیے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ دریا میں کشتی بہی جا رہی ہے۔ کوئی دس بجے ہوں گے کہ ایک طرف سے دو اور سانڈنیاں آتی ہوئی دکھائی دیں۔ شاہ رخ مرزا نے آواز دے کر ان کو روکا۔ ان دو سانڈنیوں پر دو ٹھاکر اور ان کے دو نوکر سوار تھے۔ پوچھا "کہاں جاتے ہو؟" جواب ملا "شکار کے لیے!" بعد میں معلوم ہوا کہ شکار کو جانے کے معنی ہیں ڈاکہ ڈالنے کے لیے۔ اور ان کا یہ کمال بھی معلوم ہوا کہ یہ لوگ اپنی سانڈنیوں پر پچاس ساٹھ میل جاتے ہیں۔ ڈاکہ ڈالتے ہیں اور صبح سے پہلے گھر واپس آجاتے ہیں۔ غرض وہ تو شکار کے لیے چلے گئے اور ہم آگے بڑھے۔ چاندنی خوب کھلی ہوئی تھی۔ شاہ رخ مرزا نے اپنی سانڈنی بڑھائی۔ سلیم بیگ اور ہم بھلا ان کا کیا ساتھ دے سکتے تھے۔ تھوڑی دیر میں وہ نظروں سے غائب ہو گئے۔ اب

ہماری حالتِ زار کا نقشہ ملاحظہ ہو۔ جنگل بیابان کفِ دست میدان ہے۔ راستہ کا نام و نشان نہیں۔ کچھ اونٹوں کے پاؤں کے نشان ہیں۔ مگر ان نشانوں نے ایک دوسرے کو اس طرح کاٹا ہے خاصہ بھول بھلیوں کا ناقابلِ حل نقشہ بن گیا ہے۔ ہم دو عدد شخص ہیں اور اونٹ کی پیٹھ ہے۔ نیچے ریت ہے اوپر چاندنی اور آسمان کے اوپر اللہ میاں۔ جب سانڈنی کو جگاتے جگاتے تھک گئے اور رستہ پتا نہ ملا تو لاچار ٹھیر گئے۔ مشورے ہوئے۔ غور کیا گیا اور اللہ کا نام لے کر سانڈنی کی ڈوری ڈھیلی کر کے اس کو اجازت دے دی گئی کہ تیرا جہاں جی چاہے لے چل۔ سانڈنی نے فراٹے بھرنے اور ہم نے اس کے اوپر جھٹکے کھانے شروع کیے۔ رات کے کوئی دو بجے ہوں گے کہ دور سے چاندنی میں دو اونٹ کھڑے نظر آئے۔ ڈر ہوا کہ کہیں یہ وہ "شکاری" ہی نہ ہوں۔ لیکن کیا کیا جاتا۔ سانڈنی رکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ آخر ان اونٹوں کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت معلوم ہوا کہ شاہ رخ مرزا اور ان کے ساتھی آرام فرما رہے ہیں۔ وہاں ہم بھی اترے۔ تھوڑی دیر آرام کیا اور چل کھڑے ہوئے۔ جوئی کے پاس تھوڑا سا پہاڑی حصہ اور خاصا اچھا اتار ہے۔ اس جگہ ہماری سانڈنی نے ٹھوکر کھائی۔ میاں حلیم بیگ نے ڈوری زور سے گھسیٹی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈوری چٹ سے ٹوٹ گئی۔ وہ تو کہو کہ سانڈنی اس گھسیٹم گھساٹ سے سنبھل چکی تھی جو سیدھی کھڑی ہو گئی۔ ورنہ ہم دونوں کو ختم ہو جانے میں کوئی کسر نہیں رہی تھی۔ چلتے وقت سگریٹ کے ایک بڑے سے ڈبے میں کوئی ڈیڑھ سو پان لے کر چلے تھے۔ یہ ڈبہ میرے پاس تھا۔ میں نے راستے میں "شغلِ تنہائی" اس تیزی سے کیا کہ جوئی پہنچتے پہنچتے یہ "دیسی خاصدان" سخی کے دل کی طرح صاف ہو گیا۔ سانڈنی کے سنبھلنے کے بعد میاں حلیم بیگ نے پان مانگا۔ بھلا اب پان کہاں دھرا تھا۔ یہ سن کر انھیں بہت تاؤ آگیا۔ مگر یہ سمجھ کر کہ اونٹ پر بیٹھ کر غصہ کرنا یا ہاتھ پاؤں ہلانا خالی از خطرہ نہیں ہے، چپ ہو گئے۔ صبح ہم بھوانی پہنچے اور ۹ بجے "داخلِ دلی" ہو گئے۔

اب کیا تھا۔ حیدرآباد جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور ہم نے تیسرے ہی روز دہلی چھوڑ دی۔ یہ جلدی اس لیے کی گئی تھی کہ کہیں حیدرآباد جانے کی اصلی وجہ نہ کھل جائے اور ساری کی کرائی محنت برباد ہو جائے۔ ۸ / اگست ۱۹۰۶ء کو صبح کے ۸ بجے پنجاب میل سے روانہ ہوئے۔ دوسرے دن بارہ بجے کے قریب منماڑ پہنچے۔ ایک بجے چھوٹی لائن سے منماڑ چھوڑا۔ اس زمانے میں لاسور کے اسٹیشن پر قرنطینہ تھا۔ اس سے ڈر لگتا تھا۔ کیونکہ سنا تھا کہ مسافروں کو زبردستی یہاں اتار کر کئی روز تک رکھتے ہیں۔ لیکن ہماری تو یہاں صرف نبض دیکھی گئی اور ایک حکم نامہ دے دیا گیا کہ افضل گنج اسپتال میں جا کر روزانہ ۸ دن تک معائنہ کرایا کرو۔ بے چارے درجہ سوم کے مسافروں پر مصیبت آئی۔ سب کے سب اتارے گئے اور ساری گاڑی خالی ہو گئی۔ اورنگ آباد کے اسٹیشن پر بھائی حیدر حسین بیگ ملے جو یہاں ناظم ضلع (ڈسٹرکٹ جج) تھے۔ یہاں سے نکل کر جو گاڑی نے جوں کی چال چلنی شروع کی تو طبیعت بے زار ہو گئی۔ دوسرے دن شام کے ۵ بجے حیدرآباد پہنچے۔ منماڑ سے تار دے دیا تھا اس لیے اسٹیشن پر والد صاحب قبلہ اور بھائی مرزا حسین احمد بیگ اور مرزا رفیق بیگ موجود تھے۔ ان کے ساتھ عابد کی دوکان سے ہوتے ہوئے اور ریذیڈنسی کے پہلو سے گزرتے ہوئے چنچل گوڑہ پہنچے اور بھائی خواجہ امیرالدین (مرحوم) کے ہاں جا ٹھہرے۔ لیجیے ایک مشکل آسان ہو گئی۔

دوسرے دن عزیزوں سے ملنے کے لیے نکلے۔ سب سے پہلے مولوی عزیز مرزا (مرحوم) کے ہاں گئے۔ ان سے میری

خالہ منسوب تھیں۔ اور یہ خود یہاں ہوم سکریٹری تھے۔ جمعہ کا دن تھا۔ دربار لگا ہوا تھا۔ گوشہ محل کے تالاب کے سامنے ان کا مکان تھا۔ ان کے دو لڑکے احمد مرزا اور ابو سعید مرزا تو مجھ سے دہلی میں مل چکے تھے۔ مگر خود مولوی عزیز مرزا صاحب (مرحوم) کو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ والد صاحب میرے ساتھ تھے۔ ان کو دیکھ کر یہ مجلس سے اٹھ کر برآمدے میں آ گئے۔ والد صاحب سے ملے۔ انھوں نے میرا تعارف کرایا۔ جس محبت سے مولوی عزیز مرزا (مرحوم) نے مجھے گلے لگایا وہ تمام عمر مجھے یاد رہے گا۔ اس کے بعد ہم بھی اس مجلس میں جا بیٹھے۔ اس وقت وہاں ڈاکٹر سراج الحسن (نواب سراج یار جنگ)، عبدالحلیم صاحب شرر (مرحوم)، ظفر علی خان صاحب، مولوی عبدالحق صاحب اور بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ مولوی عزیز مرزا صاحب نے کہا۔ "کہو بھائی کیسے آنا ہوا اور کب آئے؟" میں نے کہا۔ "کل آیا ہوں اور صرف سیر ہی کی غرض سے آیا ہوں۔" کہنے لگے "یہاں نوکری کیوں نہیں کر لیتے؟ تمھارا سارا خاندان یہیں ہے۔ آخر پردیس میں اکیلے پڑے رہنے سے فائدہ؟" میں نے کہا۔ "میرا نام ڈپٹی کلکٹری کے لیے گیا ہوا ہے۔ ایسی خدمت یہاں ملنی مشکل ہے۔" اس پر انھوں نے کہا۔ "کیوں مشکل ہے۔ ہم سب مل کر اس سے کہیں اچھی خدمت تم کو دلوا سکتے ہیں۔" میں تو خاموش ہو گیا، مگر والد صاحب کو مجھے حیدرآباد میں روکنے کا موقع مل گیا۔ انھوں نے کہا۔ "ہاں، آپ اس کو یہیں کہیں اٹکا دیجئے۔ اگر ہندوستان (یہ پہلا موقع تھا جو مجھے معلوم ہوا کہ یہاں کی اصطلاح میں حیدرآباد ہندوستان سے خارج ہے اور ہندوستان کے مفہوم اور معنی میں صرف شمالی ہند داخل ہے) میں رہا تو پھر ہم لوگوں کا اس سے ملنا مشکل ہو گا۔" اس کی تائید وہاں کے تمام حاشیہ نشینوں نے کی۔ اور اب بحث یہ چلی کہ اس شخص کو نوکر رکھا جائے تو کہاں نوکر رکھا جائے۔ آخر بہت سوچ کر خود مولوی عزیز مرزا صاحب نے کہا۔ "ہاں بھائی، خوب یاد آیا۔ اس وقت فینانس میں ایک تین سو روپے کی جائداد خالی ہے۔ میں نے کئی موقعوں پر وہاں کے سکریٹری نند لال سیل کی مدد کی ہے۔ وہ برسوں ہی کہہ رہے تھے کہ آپ کا کوئی آدمی ہو تو مجھے دیجئے۔ میں ان کو خط لکھے دیتا ہوں۔ کل ہی ان کا تقرر وہاں ہو جاتا ہے۔"

اس کی سب نے تائید کی اور وہیں نند لال سیل کے نام خط لکھ کر ہمارے حوالے کیا اور ہدایت کر دی گئی کہ کل ہی مکان پر جا کر ان سے مل لینا۔ یہاں سے نکل کر ہم نواب سربلند جنگ (مرحوم) چیف جسٹس کے ہاں گئے جو اسٹیشن نام پلی کے سامنے ایک کوٹھی میں رہتے تھے۔ ان سے ایک تو میری چچا زاد بہن منسوب تھیں۔ دوسرے ان کے والد مولوی سمیع اللہ خان (مرحوم) مجھ کو اپنے بچوں کی طرح سمجھتے تھے۔ خود سربلند جنگ بہادر بھی مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کے گھر پر جو پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ یہاں بھی دربار لگا ہوا ہے۔ مجھ کو دیکھ کر وہ کچھ پریشان سے ہو گئے کہ آخر یہ شخص ایک دفعہ ہی یہاں کیسے آ گیا۔ فوراً دربار برخاست کیا اور میرے والد صاحب اور مجھ کو لے کر اوپر زنانہ میں لے گئے۔ وہاں جاتے ہی میرے والد صاحب سے پوچھا۔ "آخر ان حضرت کو یہاں کیوں بلوا لیا؟" والد صاحب نے کہا۔ "یہ خود آ گیا ہے اور اب اس کی نوکری کی بھی کچھ صورت نکل آئی ہے۔" اس کے ساتھ جو گفتگو مولوی عزیز مرزا صاحب کے ہاں ہوئی تھی وہ بھی بیان کی اور نند لال سیل والا خط بھی دکھایا۔ یہ سن کر وہ ہنسے اور مجھ سے کہنے لگے۔ "میاں فرحت تم حیدرآباد کی نوکری کے جھگڑوں میں نہ پڑو۔ یہ بڑی خطرناک جگہ ہے۔ میں افسر جنگ بہادر کو لکھ کر فلک نما اور گولکنڈے کے پاس منگائے دیتا ہوں۔ انھیں جا کر دیکھو۔ حسین ساگر کے کٹے کی سیر کرو۔ شہر کی عمارتیں

دیکھو اور دہلی واپس چلے جاؤ۔ اگر یہاں رہنے کا ارادہ کیا تو یاد رکھنا کہ تمھاری زندگی برباد ہو جائے گی اور جینا اجیرن ہو جائے گا۔" ان کی یہ باتیں سن کر مجھے بڑا تاؤ آیا۔ بھلا میں نے ان سے کب کہا تھا کہ نوکری دو اور وہ جو اس طرح دفع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے ذرا ہنس کر کہا۔ "بھائی صاحب، جس روز میں آپ سے کوئی نوکری مانگوں اس روز اور اسی وقت مجھے کھڑے کھڑے گھر سے نکلوا دیجئے گا۔ آخر میرے حیدرآباد میں رہنے سے آپ کا کیا نقصان ہوتا ہے؟" کہنے لگے: "میرا کیوں نقصان ہونے لگا۔ میں تو تمھارے ہی بھلے کی کہتا ہوں۔ جی چاہے مانو، جی چاہے نہ مانو۔" آپا صاحبہ بھی ان پر بہت بگڑیں۔ مگر ایسی باتوں کا ان پر کیا اثر ہوتا تھا۔ ہنسے اور ہنس کر کہنے لگے: "خیر جب پڑے گی تو خود معلوم ہو جائے گا۔" یہاں سے نکل کر ہم دوسرے عزیزوں کے ہاں گئے۔ اور شام کو گھر واپس ہوئے۔ جب ہمارے عزیزوں نے یہ سنا کہ دہلی کا ایک اور آزاد پرندہ حیدرآباد کے پنجرے میں پھنس رہا ہے تو سب نے مبارک باد دی اور ہمارے ڈپٹی کلکٹری کے ارادے میں بھی کچھ تزلزل پیدا ہونے لگا۔

دوسرے دن صبح کے نو بجے ہم ماموں مرتضیٰ شاہ (مرحوم) کے ساتھ نند لال سیل کے مکان پر پہنچے۔ خط دیکھ کر تو اس شخص کی یہ حالت ہوئی کہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا کی دولت اس کو مل گئی ہے۔ بار بار یہی الفاظ زبان پر تھے کہ "آج خدا کے مولوی عزیز مرزا صاحب کے احسانوں کا بدلہ دینے کے قابل ہوا ہوں۔" میری تعلیم کی حالت پوچھی اور مجھ سے کہا: "میاں یہ جگہ تمھاری ہے۔ کل یا پرسوں تک تمھارے گھر پر حکم پہنچ جائے گا۔" میں نے کہا کہ "میں سر کیسن واکر کے نام نواب صاحب لوہارو کا بھی خط لایا ہوں۔ ان دونوں میں بڑے گہرے تعلقات ہیں۔ کہو تو صاحب سے بھی مل لوں۔" کہا: "نہیں، اس کی کیا ضرورت ہے۔ جب میں یہ کام کر سکتا ہوں تو صاحب کو تکلیف دینے سے فائدہ؟" غرض کوئی دس بجے ہم وہاں سے نکلے اور بہت خوش خوش نکلے۔ اور آتے آتے راستے میں ساری کیفیت مولوی عزیز مرزا صاحب سے کہہ آئے۔

دو تین دن تک حکم کا انتظار کیا۔ جب نہیں آیا تو ایک دن ہم پھر نند لال سیل کے پاس گئے۔ انھوں نے ویسی ہی آؤ بھگت کی جیسی پہلے کی تھی اور کہا: "آج کل صاحب کو فرصت نہیں ہے۔ اس لیے تقرر کے حکم پر دستخط نہیں ہو سکے۔ آج نہیں تو کل ضرور دستخط لے لوں گا۔" اس گفتگو کو جب کئی دن اور گزر گئے تو پھر ہم سیل صاحب کے پاس پہنچے۔ وہ کہنے لگے: "کیا کہوں، مجھے تم سے اور خاص کر مولوی عزیز مرزا صاحب سے کیسی شرمندگی ہے۔ میں سمجھا تھا کہ مولوی صاحب کی عنایتوں کا کچھ بدلہ تمھارے تقرر سے اتار سکوں گا۔ مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ ہمارے صاحب ایک دوسرے شخص کو مقرر کرنے کی سوچے بیٹھے ہیں۔ میں نے تمھارا نام پیش کیا۔ بہت کچھ تعریف بھی کی۔ مگر انھوں نے ایک نہ سنی اور ان صاحب کا نام لکھ دیا۔ خیر کیا ہے۔ اب کوئی اور جگہ نکلے گی تو پھر کوشش کروں گا۔" سیل صاحب کی گفتگو کا انداز ایسا تھا کہ میں سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو اس دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ میں نے کہا: "خیر کیا ہرج ہے۔ آپ آئندہ کے لیے کوشش کیجئے۔ میں واکر صاحب کو نواب صاحب لوہارو کی چٹھی تو دے آتا ہوں۔" کہنے لگے: "اس کی کیا ضرورت ہے۔ اب کوئی جگہ خالی تو ہے نہیں۔ جب خالی ہو گی تو میں کہلا بھیجوں گا۔ اس وقت مل لینا۔" میں نے کہا: "مجھے یہاں نوکری کرنی ہی نہیں ہے۔ اس لیے آپ میری فکر نہ کیجیے۔" یہ کہہ میں وہاں سے چلا آیا۔ اس قدر کوفت تھی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ تمام واقعہ شام کو جا کر مولوی عزیز مرزا صاحب سے بیان کیا۔ ان کو بھی تاؤ تو ضرور آیا۔ مگر کہنے لگے کہ "بھئی، بات یہ ہے کہ

تم سے غلطی ہوئی۔ اگر واکر صاحب سے بھی مل لیتے تو اچھا تھا۔" میں نے کہا "صاحب، میں خود ملنا چاہتا تھا۔ مگر آپ کے سیل صاحب نے روک دیا۔" یہ سن کر وہ کہنے لگے۔ "اگر یہ بات ہے تو اس میں ہمارے سیل صاحب نے بھی کچھ گڑبڑ ضرور کی ہے۔ تم ذرا واکر صاحب سے مل کر تو دیکھو کہ اصل معاملہ کیا ہے۔"

غرض دوسرے دن ہم واکر صاحب کے بنگلہ پر پہنچے۔ کارڈ بھجوایا۔ انھوں نے اندر بلا لیا۔ اس وقت وہاں ہنکن صاحب انسپکٹر جنرل پولیس بھی بیٹھے تھے۔ میں نے نواب صاحب کا خط واکر صاحب کو دیا۔ انھوں نے پڑھ کر کہا۔ "اب تک تم مجھ سے کیوں نہیں ملے؟ اس وقت تو میرے ہاں کوئی جائیداد خالی نہیں ہے۔ دو تین روز ہی ہوئے جب میں نے ایک خالی جائیداد کا انتظام کر دیا۔" میں نے کہا۔ "اسی جائیداد کے لیے سیل صاحب نے میرا نام لکھا تھا۔ وہ آپ نے کاٹ کر دوسرے کا نام لکھ دیا۔" واکر صاحب پہلے کچھ سوچ میں پڑ گئے اور اس کے بعد کہنے لگے۔ "تمھارا نام تو پیش نہیں ہوا تھا، ہاں سیل نے مجھ سے یہ ضرور کہا تھا کہ اس جائیداد پر عزیز مرزا اپنے ایک نالائق آدمی کو ٹھونسنا چاہتے ہیں۔ آپ اس جائیداد کا جلد انتظام کر دیجیے۔ اور جس شخص کا تقرر ہوا ہے اس کا نام بھی انھوں ہی نے پیش کیا تھا۔" یہ سن کر مجھے اتنا غصہ آیا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ اور میں نے شروع سے لے کر آخر تک سارا قصہ بیان کر دیا۔ اور یہ بھی کہہ دیا کہ سیل صاحب نے مجھے آپ سے ملنے سے روکا تھا۔ یہ سن کر ہنکن صاحب اچھل پڑے اور کہنے لگے۔ "واہ رے سیل، عزیز مرزا پر کیا اچھا ہاتھ مارا ہے!"

اس کے بعد ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ لیکن میری طبیعت ایسی جلی ہوئی تھی کہ بات کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر میں وہاں سے رخصت ہو کر سیدھا سیل صاحب کے مکان پر پہنچا۔ اور وہ کچھ ان سے دل کھول کر عرض کیا کہ اگر آج مجھ سے پوچھا جائے تو میں یقیناً کہوں گا کہ مجھ پر ازالۂ حیثیت عرفی کا جرم پوری طرح عاید ہو گیا تھا۔ مگر واہ رے میرے سیل! ذرا جو آنکھ میں میل یا ماتھے پر شکن آئی ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ عرض کیا جا رہا ہے وہ ان سے متعلق ہی نہیں ہے۔ آپ فرماتے تھے تو یہی فرماتے تھے۔ "نہیں صاحب، آپ کو کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے یا واکر صاحب ہی معاملہ کو نہیں سمجھے۔ ورنہ دیکھیے نا کہ میں بھلا عزیز مرزا صاحب کے عزیز کو نقصان پہنچاتا جن کے سینکڑوں احسان مجھ پر ہیں؟" آپ یقین مانئے کہ جس طرح ان حضرت نے مٹھار مٹھار کر مجھ سے باتیں کیں اس سے تو مجھے شبہ ہونے لگا تھا کہ واکر صاحب جھوٹے ہیں اور یہ شخص سچا ہے۔ مگر جب حیدر آباد میں کچھ عرصہ رہ کر مسٹر سیل کا رنگ دیکھا تو اس وقت معلوم ہوا کہ دنیا اس طرح چلائی جاتی ہے۔ اور سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنانے کے لیے کتنی بڑی سمجھ کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس کے بعد مولوی عزیز مرزا (مرحوم) نے ہمارے متعلق دوسری تجویز کی۔ یعنی مجھ کو ایک نواب صاحب کے صاحبزادے صاحب کا اتالیق بنا کر بمبئی بھیجنا چاہا۔ مگر وہ وار بھی خالی گیا۔ یہ واقعات مضامین فرحت حصہ دوم میں صراحت سے درج ہیں۔

یہ کارروائیاں چل ہی رہی تھیں کہ ایک دفعہ ہی پتہ لگا کہ مرزا ساجد بیگ صاحب کا تبادلہ عادل آباد سے گلبرگہ شریف ہو گیا ہے۔ اور وہ دو روز میں اپنے بال بچوں کے ساتھ سکندر آباد پر سے گزریں گے۔ لیکن حیدر آباد نہیں ٹھیریں گے۔ اطمینان ہو گیا کہ چلو جس کام کے لیے آئے تھے وہ تو پورا ہو چکا۔ اب رہی نوکری تو اس کی کچھ پروا نہیں ہے۔ کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی بڑی مشکل سے

یہ زمانہ گزرا۔ تاریخ مقررہ پر ہم حیدرآبادی دستار ڈانٹ، بڑے ٹھاٹھ کی شیروانی پہن اسٹیشن پر گاڑی کے آنے سے ایک گھنٹہ پہلے ہی پہنچ گئے۔ ریل آئی۔ مرزا ساجد بیگ صاحب آئے۔ ان کا سارا خاندان آیا۔ مگر ہم کو درجہ میں کسی نے نہیں بلایا۔ کہا گیا کہ "پردہ ہے۔" اس وقت ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارا حیدرآباد آنا ہی سراسر بیوقوفی پر مبنی تھا۔ بھلا غور کیجیے کہ کہیں کوئی ہونے والے شوہر کے سامنے آتی ہے؟ خواہ وہ اس کا چچا زاد بھائی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ قافلہ تو گلبرگہ شریف روانہ ہو گیا ہم شرمندہ شکل واپس گھر آئے۔ اسی گاڑی میں میرے پھوپھی زاد بھائی فصیح الدین احمد بھی آئے تھے۔ میں نے تو دہلی بھاگنا چاہا۔ مگر انھوں نے ٹانگ پکڑ لی۔ دوسرے ان ہی دنوں میں مولوی عزیز مرزا کے بڑے فرزند احمد مرزا کی شادی ہونے والی تھی۔ اس لیے ٹھیرنا پڑا۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر سراج الحسن (مرحوم) ناظم تعلیمات سر ہو گئے کہ میرے سررشتہ میں نوکری کرو۔ اس وقت تو ذرا کم تنخواہ کی جگہ ہے۔ مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ چھ مہینے کے اندر ڈھائی سو کی جگہ دے دوں گا۔ احمد مرزا کی شادی میں شریک ہونے کے لیے مرزا ساجد بیگ اور ان کے چھوٹے بھائی مرزا واجد بیگ صاحب بھی آ گئے تھے۔ انھوں نے بھی یہی رائے دی۔ مولوی عزیز مرزا صاحب نے بھی زور دیا۔ اور کہا "نوکری چھوڑنا تمھارے اختیار میں ہے۔ اگر ڈپٹی کلکٹری میں نام منظور ہوا تو یہ جگہ چھوڑ کر چلے جانا۔" غرض سوائے سربلند جنگ بہادر کے جتنے عزیز یہاں تھے، سب نے نوکری کے لیے اصرار کیا۔ ہم نے بھی سوچا کہ چلو "خالی سے بیگار بھلی۔" راضی ہو گئے۔ اور بتاریخ ۷ر دسمبر ۱۹۰۵ء ہمارا تقرر چادر گھاٹ ہائی اسکول کی مددگاری دوم انگریزی پر ہو گیا۔

میں نے مدرسہ میں جو کچھ اودھم مچایا ہے اس کی کچھ نہ پوچھو۔ تھوڑے ہی دنوں میں مدرسے میں جل تھل ہو گیا اور جتنے ماسٹر تھے ان پر چھا گیا۔ مسٹر رامانجم پہلے ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ مجھ سے کھنچنے اور چھوٹوں سے لے کر بڑے لڑکوں تک سب میری محبت کا دم بھرنے لگے۔ آخر یہ کیوں ہوا؟ یہ اس لیے ہوا کہ پڑھائی کے وقت تک میں استاد تھا اور وہ شاگرد۔ اور پڑھائی کے بعد ہم اور وہ ایک تھے۔ سب سے پہلے تو میں نے یہاں کرکٹ جاری کیا۔ اس کے بعد دوسرے کھیلوں کو بڑھایا۔ اور آخر میں اسٹیج پر لڑکوں کو (بقول یہاں والوں کے) لا کر نچا دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ یہاں کے طالب علم اسٹیج پر آئے ہوں۔ بڑے زور کی دعوت ہوئی بڑے بڑے عہدہ دار جمع ہوئے۔ مولوی عزیز مرزا صاحب نے بڑے زور کی اسپیچ دی۔ ڈاکٹر سراج الحسن کو بہت کچھ جوش آیا۔ ڈراما ختم ہوا اور ہماری ہر دلعزیزی کے پروانہ پر مہر لگ گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مدرسہ میں ہم سب کچھ ہو گئے۔ اور بقیہ ماسٹر کچھ نہ رہے۔ لڑکوں کی یہ حالت تھی کہ ہر بات میں مجھ سے اجازت لیتے اور میں جو کچھ کہتا اس پر عمل کرتے۔ بے چارے ہیڈ ماسٹر کو تو یہ لڑکے ایک عضو معطل سمجھنے لگے تھے۔

میری اس حکومت خود اختیاری کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ صبح کا مدرسہ تھا۔ میں جو اپنی سائیکل پر مدرسہ پہنچا تو دیکھا کہ کوئی پچیس تیس لڑکے مدرسہ کے پھاٹک پر کھڑے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے غل مچایا "ماسٹر صاحب، آپ سے کچھ کہنا ہے" میں سائیکل سے اتر پڑا۔ اور پوچھا کہ "آخر ایسی کونسی بات ہے جو دروازہ پر مجھے روکا جا رہا ہے۔" انھوں نے کہا "ماسٹر صاحب آج ہمارے یہاں پوجا کا دن ہے، چھٹی دلوا دیجیے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب مر جائیں گے مگر چھٹی نہیں دیں گے۔" میں نے کہا "تو پھر ان

سے پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تم سب گھروں کو چل دو۔ جب مدرسہ میں کوئی نہ ہوگا تو خود ہی بند ہو جائے گا۔" میرا یہ کہنا تھا کہ سب نے غل مچا دیا کہ "ہُرّے ہُرّے، ماسٹر صاحب نے مدرسہ کو چھٹی دے دی۔" میرے اثر کا اندازہ کیجیے کہ پانچ منٹ کے اندر ہی اندر سارا مدرسہ خالی ہو گیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو خبر ہوئی۔ وہ دل میں بہت اونٹے۔ مگر کیا کر سکتے تھے۔ ایک سرپھرے سے واسطہ تھا۔ رپورٹ کی۔ مگر وہ بھی نظر انداز ہو گئی۔ اس کے بعد سوائے اس کے رہ ہی کیا گیا تھا کہ تمام ماسٹر میرے ساتھ ہو جائیں اور تعلیم کے وقت کے بعد اپنی شان تہ کر کے رکھ دیں۔ ایک بہت کالے سائنس ماسٹر تھے۔ وہ کچھ دنوں ذرا اکڑے رہے۔ مگر آخر ان کو بھی اس "جلسۂ یاراں" میں شریک ہونا پڑا۔

یہ سب کچھ تھا۔ مگر میں پڑھانے میں بڑا سخت تھا۔ رعایت کا نام نہیں جانتا تھا۔ پنسل سے مارتا تھا۔ اور بُری طرح مارتا تھا۔ شاید آپ تعجب کریں کہ پنسل سے مار پڑ ہی کیا سکتی ہے؟ تو میں آپ کو بتاتا ہوں کہ جسے مارنا ہو اس سے کہو کہ ہاتھ آگے بڑھاؤ۔ اس کے ہاتھ کی اُنگلیاں پکڑ کر ذرا کھینچو اور پنسل اُٹھا کر "چٹ سے" انگلیوں کی پشت پر مارو۔ اگر بلبلا نہ جائے تو میرا ذمہ۔ مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ جو ماسٹر لڑکوں سے محبت کرتا ہے اس کی مار کا بھی یہ لڑکے بُرا نہیں مانتے۔ اور سمجھتے ہیں کہ ہماری ہی غلطی تھی جو مار پڑی۔ میں پڑھانے میں مارنے کا مخالف ہوں۔ لیکن نہ اتنا کہ اس "پیٹا پیٹ" کو بالکل بیکار ہی سمجھ لوں۔ بچوں سے محبت کرو۔ کھیل کود میں ان کا ساتھ دو۔ ان سے اس طرح ملو جیسے ان کے بزرگ ملتے ہیں۔ پڑھانے میں پوری محنت کرو۔ جو ایک دفعہ نہ سمجھے اس کو دوبارہ سمجھاؤ اور پھر سمجھاؤ۔ اگر اس کے بعد بھی کوئی حضرت اپنا رنگ نہ بدلیں تو یقیناً مارو۔ اور بہت بُری طرح مارو۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ یہ طالب علم مدرسہ چھوڑ کر چلا جائے گا۔ جانے دو۔ خس کم جہاں پاک۔ ایسے نالائقوں کے مدرسہ میں رہ کر مدرسہ کو بدنام کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ یہ دفع ہوں۔ اور اپنے مرض سے دوسروں کو متاثر نہ کریں۔

ہم کو مدرسہ میں آ کر پورے چار مہینے ہوئے تھے کہ ایک بڑا دلچسپ اور عجیب واقعہ پیش آیا۔ جس کی وجہ سے ہماری یہ مدرسی کی زندگی کی کشتی بہتے بہتے ایک دوسرے ساحل پر جا لگی۔

گرمیوں کا زمانہ تھا۔ صبح کا مدرسہ تھا۔ ایک روز جو بارہ بجے میں مدرسہ سے گھر آیا تو آپا اختر سلطانہ کا خط ملا کہ تمہارے بھائی نے تم کو بلایا ہے خط دیکھتے ہی آ جاؤ۔ بڑی فکر ہوئی کہ آخر بھائی صاحب نے بلایا کیوں۔ اور اگر بلانا ہی تھا تو ایسے وقت کیوں بلایا ہے۔ دو میل جانا تو کجا اس دھوپ میں ایک قدم چلنا بھی مشکل ہے لیکن صاحب کیا کیا جائے۔ بڑوں کی بات ٹالی بھی تو نہیں جا سکتی۔ آخر اُوپر تلے کھانا کھایا۔ سیکل سنبھالا اور نام پلی اسٹیشن پہنچے۔ بھائی سربلند جنگ کو دیکھا کہ کھانا کھا کر پنکھے کے نیچے بیٹھے کروٹیں بدل رہے ہیں۔ میں نے جا کر سلام کیا۔ کہنے لگے "تکلیف تو نہیں ہوئی؟" میں نے کہا۔ "جی نہیں، کوئی ضروری کام ہوگا، جو آپ نے اس وقت یاد کیا ہے۔" کہنے لگے "ہائی کورٹ میں ترقی سے آتے ہو؟" میں نے کہا۔ "میں اس کا کیا جواب دوں؟ جو آپ مناسب سمجھیں کیجیے۔" کہنے لگے۔ "میرے ہاں ایک ڈیڑھ سو روپیہ کی جگہ خالی ہوئی ہے۔ اگر تم چاہتے ہو تو کل ہی اس پر تقرر کیے دیتا ہوں۔ مگر دیکھو ابھی تمہارا تقرر عزیز مرزا صاحب نے کیا ہے۔ ترقی کا بھی انھوں نے ٹھیکہ لیا ہے۔ پہلے ان سے اجازت لے لو۔ یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ ان کے آدمی کو میں چھین لوں۔ آج شام کو ان سے مل کر پوچھ لو۔ اور کل دوپہر کو آ کر مجھ سے

لو۔ اچھا اب جاؤ۔"

میں سلام کرکے واپس آیا۔ مگر حیران تھا کہ یا اللہ یا تو میرے حیدر آباد میں ٹھیرنے سے یہ ایسے خفا تھے یا خود اپنے دفتر میں لے رہے ہیں۔ بہت سوچتا تھا مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ گھر میں آکر ذکر کیا۔ سب کو تعجب تو ہوا مگر آخر یہی قرار پائی کہ آخر بھائی ہیں۔ یہ مدد نہ کریں گے تو اور کون مدد کرے گا۔ شام کو میں نے جاکر مولوی عزیز مرزا صاحب سے اس کا ذکر کیا اور کہا کہ "بھائی صاحب چاہتے ہیں کہ اگر آپ بخوشی اجازت دیں تو وہ ڈیڑھ سو کی جگہ پر میرا تقرر کردیں۔" انھوں نے کہا، "بھئی مجھے تمھاری ترقی سے خوشی ہے۔ وہ میں دوں یا سربلند جنگ دیں۔ دونوں ایک ہی بات ہے۔ میری طرف سے نواب صاحب سے کہنا کہ میں اس تقرر کی اجازت ہی نہیں دیتا بلکہ آپ کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں۔" دوسرے دن دوپہر کو جاکر ہم نے ان کا پیام بھائی صاحب کو پہنچا دیا۔ انھوں نے کہا، "دیکھو میز پر کاغذ، قلم، دوات ہے۔ وہ لے کر آؤ۔ اور جس طرح میں کہتا ہوں اس طرح درخواست لکھو۔" ہم میز پر سے لکھنے کا سامان لائے۔ اور انھوں نے ہائی کورٹ کے معتمد صاحب کے نام یہ مختصر سی درخواست لکھوائی کہ "آپ کے دفتر میں ایک ڈیڑھ سو کی جگہ خالی ہوئی ہے۔ اس پر میرا تقرر فرمایا جائے۔" اس کے بعد انھوں نے کہا کہ "ابھی نواب ذوالقدر جنگ کے پاس جاؤ۔ ان سے ڈاکٹر سراج الحسن کے نام ایک خط لکھواؤ کہ وہ بحیثیت ناظم تعلیمات اس خدمت کے لیے تمھاری سفارش کریں۔ یہ خط لے کر ڈاکٹر صاحب کے پاس جاؤ۔ ان سے اس درخواست پر سفارش لکھواؤ۔ اور پھر یہ درخواست مجھے لاکر دے دو۔"

اب آپ ٹھیک گرمی کے مہینے خورداد (مئی) میں سائیکل پر ہماری یہ دوڑ ملاحظہ فرمائیے۔ اپنے چنچل گوڑے کے گھر سے بھائی صاحب کے مکان نام پلی گئے۔ وہاں سے درخواست لے کر بھائی ذوالقدر جنگ بہادر کے پاس اجالے شاہ کی درگاہ پہنچے۔ ان سے سفارشی خط لے کر ڈاکٹر سراج الحسن کے مکان پر پہنچے جو سیف آباد کے نکڑ پر تھا۔ وہاں سے سفارش لکھوا کر پھر نواب سربلند جنگ بہادر کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ اس بھاگ دوڑ میں کوئی ۲ بج گئے۔ بھائی صاحب نے ڈاکٹر سراج الحسن کی سفارش دیکھی اور کہا، "یہ ڈاکٹر صاحب بھی عجیب آدمی ہیں۔ تمھاری تعریفوں کے پل باندھ رہے ہیں۔ مجھے اس کی کچھ زیادہ ضرورت نہیں تھی۔ اصل ضرورت تو مولوی عزیز مرزا صاحب کی سفارش تھی۔ لو، میں تمھارے تقرر کی تجویز کیے دیتا ہوں۔ یہ بند لفافہ لے جاؤ اور شام کو عزیز مرزا صاحب کو دکھا دو۔ وہ بہت خوش ہوں گے!"

میں پریشان تھا کہ آخر یہ طنزیہ باتیں کیوں ہو رہی ہیں۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ حیدر آباد میں نیا نیا آیا ہوا تھا۔ اس لیے اس سے واقف نہیں تھا کہ ان دونوں حضرات میں صفائی نہیں ہے۔ بہرحال بھائی صاحب نے ہماری درخواست پر خود اپنے قلم سے تجویز کرکے درخواست لفافہ میں بند کی اور کہا، "یہ لفافہ عزیز مرزا صاحب کو دینا اور کل آکر اپنی خدمت کا جائزہ لے لینا۔"

شام کو جو میں عزیز مرزا صاحب کے ہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہ اپنے ڈرائنگ روم میں کھڑکی کے پاس کھڑے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔ "کہو بھئی، تقرر ہوگیا؟" میں نے کہا، "جی ہاں، بھائی صاحب نے تقرر کا حکم اس لفافہ میں بند کرکے دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ لفافہ مولوی صاحب ہی کے ہاتھ میں دینا۔ وہ پڑھ کر بہت خوش ہوں گے۔" میں نے لفافہ دیا۔ انھوں نے کھولا، پڑھا

اور ایک دفعہ ہی "لاحول ولا قوت" اس زور سے کہا کہ میں گھبرا گیا۔ میں نے کہا۔ "کیا تقرر نہیں کیا؟" کہنے لگے۔ "کیا کیوں نہیں، مگر ایسا ہاتھ مارا ہے کہ مجھے چکرا دیا۔ میں سربلند جنگ کو اتنا ہوشیار نہیں سمجھتا تھا۔ خیر اب تقرر تو ہو گیا ہے۔ جاؤ، جائزہ لے لو۔ خدا مبارک کرے۔" ان کی کچھ ایسی اکھڑی اکھڑی باتیں تھیں کہ میں سمجھ گیا کہ اس معاملہ میں کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ رات کے کوئی سات بجے گھر آیا۔ خوش قسمتی سے مرزا ساجد بیگ صاحب گلبرگہ شریف سے آ گئے تھے۔ ان سے میں نے سارا واقعہ بیان کیا۔ انھوں نے کہا کہ "اس جائیداد کے متعلق کچھ جھگڑا معلوم ہوتا ہے۔ تم انکار کر دو۔" میں نے کہا۔ "بہت اچھا۔" اس کے بعد گھر والوں کی ایک بڑی کمیٹی ہوئی اور قرار پایا کہ چچا صاحب مجھے لے کر عزیز مرزا صاحب کے پاس جائیں۔ تمام واقعات دریافت کریں۔ اور اگر اس جائیداد کے متعلق کوئی "لم یافیہ" ہو تو اس سے انکار کر دیا جائے۔

غرض ہم دونوں رات کے کوئی ساڑھے آٹھ بجے "گوشہ محل" پر پہنچے۔ عزیز مرزا صاحب اس وقت آرام کرسی پر لیٹے سر میں تیل ڈلوا رہے تھے۔ مرزا ساجد بیگ صاحب کو دیکھ کر اٹھ بیٹھے اور کہنے لگے "مبارک ہو، میاں فرحت کی ترقی ہوئی اور ہوئی بھی کس کے ہاتھوں، سربلند جنگ بہادر کے ہاتھوں!" مرزا ساجد بیگ صاحب نے کہا۔ "دیکھیے بھائی صاحب، اس کارروائی میں مجھے آپ کی اور سربلند جنگ کی کچھ کشمکش معلوم ہوتی ہے۔ تم دونوں ہاتھیوں کی ٹکروں میں ہم اس بچے کو پسوانا نہیں چاہتے۔ اس لیے ہم سب کی یہی رائے ہوئی ہے کہ اس تقرر سے انکار کر دیا جائے۔" یہ سن کر مولوی عزیز مرزا صاحب کہنے لگے "مرزا صاحب اب چھٹے بھی دیکھیے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر فرحت کے سوا کسی دوسرے کا تقرر اس جائیداد پر ہوتا تو اس کو اور سربلند جنگ دونوں کو چیں کر رکھ دیتا!" ساجد بیگ صاحب نے کہا۔ "آخر معلوم تو ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے؟" عزیز مرزا صاحب نے کہا۔ "مرزا صاحب، کیا خاک بتاؤں کہ کیا معاملہ ہے۔ ہے یہ کہ ہائی کورٹ میں سررشتہ دار انتظامی کی جائیداد خالی ہوئی تھی۔ یہ جائیداد ڈھائی سو کی ہے۔ آپ کو معلوم ہے مفتی نور الضیاء الدین (نواب ضیا یار جنگ بہادر) کا مہاراجہ بہادر کے ہاں بڑا زور ہے۔ اور اس لیے زور ہے کہ وہ مہاراجہ بہادر کے استاد ہیں۔ انھوں نے مہاراجہ بہادر سے یہ حکم حاصل کر لیا کہ ڈھائی سو کی خدمت پر دو سو پانے والے سررشتہ دار مرافعہ کا تقرر کیا جائے اور دو سو کی جگہ مفتی صاحب کے داماد نور المنیب اللہ کو دی جائے۔ سربلند جنگ نے نور المنیب کو لینے سے صاف انکار کر دیا۔ یہ عجیب کشمکش کوئی پندرہ روز سے چل رہی تھی۔ پرسوں مہاراجہ بہادر نے قطعی حکم دے دیا کہ دو روز کے اندر حکم کی تعمیل کر کے اطلاع دی جائے۔ مہاراجہ بہادر کے احکام کی تعمیل کرانے کے لیے میں سب سے زیادہ پیش پیش تھا۔ اب سربلند جنگ بہادر کی چالاکی کو دیکھیے کہ عین وقت پر ایسا داؤں چلایا کہ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ اگر دو سو کی جگہ پر فرحت کا تقرر کیا جاتا تو فوراً میرا خیال اس جھگڑے کی جائیداد کی طرف جاتا۔ لیکن انھوں نے یہ چالاکی کی کہ اس جائیداد کو ڈیڑھ سو کا ظاہر کر کے میری منظوری پہلے سے لے لی۔ اور سلسلہ یوں قائم کیا کہ سررشتہ دار انتظامی کی سررشتہ دار مرافعہ اور سررشتہ دار مرافعہ کی جگہ مترجم انگریزی اور مترجم انگریزی کی جگہ فرحت۔ گو اس طرح کی شکست تقرر کا اختیار ان کو نہیں ہے۔ مگر اب کیا جا سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ لکھا جائے گا کہ جس کا تقرر ہوا ہے اس کی ڈیڑھ سو نہیں دو سو دینے ہوں گے۔ اس پر وہ راضی ہو جائیں گے۔ اور اس طرح مہاراجہ بہادر کے حکم اور میری کوشش سب رائگاں جائے گی۔ انھوں نے فرحت کو بیچ میں ڈال کر میری ساری کی کرائی محنت

خاک میں ملا دی۔ بلکہ یوں کہو کہ مجھے پوری زک دی۔"

مرزا ساجد بیگ صاحب نے کہا: "تو ایسی صورت میں کم سے کم میں تو کسی طرح راضی نہیں ہوں کہ فرحت کی وجہ سے آپ کی بات نیچی ہو۔ یہ کل ہی اس تقرر سے انکار کر دیں گے۔ ترقی ہونا یا نہ ہونا اللہ کے اختیار میں ہے۔ چنانچہ آج ہی سررشتہ تعلیمات سے ان کی ترقی کا مراسلہ آ گیا ہے۔" عزیز مرزا صاحب نے کہا: "یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ میری وجہ سے فرحت کو ذرا بھی نقصان پہنچے۔ میں نورالغیب اللہ کے لیے اور کوئی صورت پیدا کر لوں گا۔ اور مہاراجہ بہادر سے بھی کہہ سن کر کارروائی ختم کرا دوں گا۔ آپ فرحت کو حکم کے آتے ہی ہائی کورٹ بھیج دیجیے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر اس معاملہ میں ذرا بھی میں نے کچھ لکھا تو سربلند جنگ مجھے کو بنا دیں گے اور کہیں گے، 'دیکھیے، میں نے اجازت لینے کے بعد تقرر کیا اور جب تقرر ہو گیا تو اس کی مخالفت کی جا رہی ہے۔ اور ساتھ ہی ہر ایک سے کہا جاتا ہے کہ فرحت کے لیے کچھ کرو، فرحت کے لیے کچھ کرو۔'" پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے: "میاں فرحت تم ان جھگڑوں میں نہ پڑو۔ تم اپنی ترقی سے غرض رکھو۔ اور یہ یقین مانو کہ میری طرف سے تم کو ان شاء اللہ فائدہ ہی پہنچے گا۔"

ان باتوں میں رات کے کوئی گیارہ بج گئے۔ ہم دونوں گھر واپس آ گئے۔ اس وقت تک گھر پر سب لوگ اس جھگڑے کی روئیداد سننے بیٹھے تھے۔ ان سے تمام واقعات بیان کیے گئے۔ اور آخر یہ رائے قائم ہوئی کہ جائزہ دے دیا جائے۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ خدمت جاتی رہے گی۔ جاتی رہے۔ اللہ کوئی اور صورت نکال دے گا۔

صبح اُٹھ کر درخواست مع تجویز ہائی کورٹ میں بھیج دی گئی۔ اور ہم سررشتہ تعلیمات کی ترقی سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے چادر گھاٹ اسکول کا جائزہ دے کر بتاریخ ۲۸ اپریل سنہ ۱۹۰۸ء سٹی ہائی اسکول کا جائزہ لینے روانہ ہوئے۔ افضل گنج کے پل پر پہنچے تو کیا دیکھا کہ تقریباً سارے کا سارا مدرسہ ہمارے استقبال کے لیے کھڑا ہے۔ ہم سائیکل پر سے اُترے۔ سب سے ہاتھ ملائے۔ تھوڑی سی اسپیچ دی۔ ان کے اس طرح اسکول چھوڑ کر آنے کی مذمت کر دی اور پھر ان سب کے ساتھ ٹہلتے ٹہلتے اسکول پہنچ گئے۔ یہ اسکول پتھر گٹی میں اس جگہ تھا جہاں اب علاج حیوانات کا اسپتال ہے۔ یہاں جا کر مسٹر راس ہیڈ ماسٹر سے جائزہ لیا۔ مگر سب سے یہ کہہ دیا کہ یہاں ہم پڑھا نہیں سکیں گے کیونکہ ہمارا تقرر ہائی کورٹ کی مترجمی پر ہو گیا ہے۔ غرض دو روز یہاں "ہوہو ہاہا" میں گزارے۔ ۲۹ اپریل سنہ ۱۹۰۸ء کو ہائی کورٹ کا مراسلہ آ گیا۔ اور ۳۰ اپریل سنہ ۱۹۰۸ء کی صبح کو ہم نے ہائی کورٹ کی مترجمی کا جائزہ حاصل کر لیا اور اب ہم اس جیل خانہ میں داخل ہو گئے جہاں ہماری عمر کا بہت بڑا حصہ گزر گیا اور جہاں سے ہم نے ابھی تھوڑے دن ہوئے رہائی پائی ہے۔

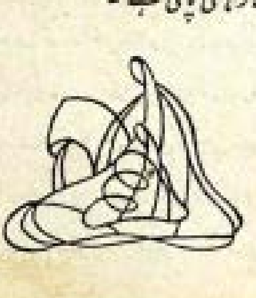

شاد عظیم آبادی

ولادت :- نوزدہم محرم ۱۲۶۲ھ (۸ جنوری ۱۸۴۶ء)

وفات :- ۷ جنوری ۱۹۲۷ء

"میں نے اپنی سوانح حیات تیس جزو میں لکھ کر اپنے ایک قابل شاگرد کو سپرد کر دی ہے اور وصیت کر دی ہے کہ میرے مرنے کے بعد ضرور چھپوا کر عبرت کے لئے مشتہر کرنا۔" (۲۱ اپریل ۱۹۲۶ء)

سنہ ولادت و خاندان

سید علی محمد نام، تخلص شاد، مخاطب بہ خان بہادر، نوزدہم محرم ۱۲۶۲ھ مطابق جنوری ۱۸۴۶ء کو شہر عظیم آباد (پٹنہ) محلہ پورب دروازہ اپنے ننہیال میں پیدا ہوئے۔ حسن اتفاق یہ کہ اس زمانہ بلکہ پانچ چھ برس بعد تک اکثر بزرگ اس خاندان میں ایسے موجود تھے جو پانی پت اور دہلی کے خاص خاص امراء اور اہل علم میں سے تھے۔ مردوں پر منحصر نہیں عورتیں بھی تعلیم یافتہ تھیں حتیٰ کہ اس خاندان کے ساتھ جو شاگرد پیشہ یہاں آکر مقیم ہو گئے تھے وہ سب بھی دہلی کے تھے۔ اس اعتبار سے یہ محلہ دہلی کا ایک چھوٹا سا محلہ ہو رہا تھا۔ پانچ سال کی عمر تک سید صاحب اپنے ننہیال ہی میں رہے اور انہیں لوگوں میں پرورش پائی۔ زبان پاکیزہ اور خو بو میں یہاں کی عام خلقت کا اثر نہ ہونے پایا۔ پانچ سال کے کچھ پہلے مکتب ہوا۔ چونکہ سید صاحب کی ددھیال میں بھی امارت و خوش حالی تھی اور یہ خانوادہ بھی عظیم آباد میں معزز و ممتاز تھا۔ یہاں بھی علمی چرچے برابر رہتے تھے۔ اس زمانہ میں مسلمانوں میں تجارت کا شغل تھا۔ دور دور سے بڑے بڑے تجار متمول و ذی علم شہر میں آیا کرتے تھے یہ خاندان از بسکہ خلیق و مہمان نواز تھا۔ شاید اس لیے محلہ حاجی گنج میں سکونت کے زنانہ و مردانہ مکانات نہایت وسیع اور ان میں متعدد متعلقات تھے ذی مرتبہ تجار پیشہ یہیں مہمان و مقیم رہتے۔ ان میں اکثر بڑے با لیاقت و صحبت دیدہ ہوا کرتے۔ خصوصاً عرب و عجم۔ شام سے گیارہ بجے شب تک عجیب پاکیزہ علمی صحبت رہتی تھی۔ شہر کے چیدہ رؤسا بھی التزاماً آیا کرتے تھے۔

اتفاق سے میر سید محمد فیض آبادی بھی کسی وجہ سے ترک وطن کر کے یہیں مقیم تھے۔ تیس برس کامل یہیں رہ گئے۔ سید صاحب کا قیام بھی مستقل طور سے یہیں ہوا۔

سید صاحب کے پدر بزرگوار کا نام سید عباس مرزا اور دادا کا نام سید تفضل علی خان تھا اور دادی کے باپ کا نام سید بادشاہ علی خاں

---

[1] یہ خود نوشت سوانح حیات جو حضرت شاد نے "کمال عمر" کے نام سے صیغۂ غائب میں لکھے تھے پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی نے "شاد کی کہانی شاد کی زبانی" کے نام سے شائع کر دیئے ہیں

سادات بارہہ سے تھے۔ نانا کا نام نواب مہدی علی خاں اور نانی کے باپ نواب مولوی مرزا محمد ابراہیم خاں تھے۔ افسوس اس کا ہے کہ باوجود ان چاروں خاندانوں کے تمول و امارت کے جائداد اس قدر تلف اور تقسیم در تقسیم ہو کر سید صاحب کو ترکہ میں ملی کہ وہ پورے آرام اور عزت کے ساتھ بمشکل رہ سکتے تھے۔ اگر ان کی سسرال کی معاش سہارا نہ دیتی تو خاندان کی یہ حیثیت قائم نہ رہتی۔ تاہم باوجود اس قلت معاش کے جس سلیقہ و آرام اور عزت و آبرو سے انہوں نے زندگی کی اور امرائے شہر کے دوش بدوش رہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

غرضکہ سید صاحب اپنی دادھیال میں تعلیم پانے لگے۔ اس وقت مردوں میں بزرگ خاندان سید صاحب کے دادا میر بخش صاحب اور عورتوں میں اہلیہ نواب کاظم علی خاں مرحوم تھیں۔ سید صاحب کے والد ماجد سید عباس مرزا ایک نہایت متقی و خلیق رئیس تھے۔ انہوں نے پچیس برس کی عمر میں رحلت کی۔ سنہ [illegible]ھ سال وفات ہے۔ سید صاحب کے حقیقی بھائی صرف ایک ہی تھے جن کا نام سید امیر حسن خاں اور تخلص ارتجی تھا۔ سید صاحب سے عمر میں چار برس بڑے تھے۔ صاحب استعداد، ذکی الطبع، بڑے منکسر، نہایت بے آزار و متواضع تھے۔ ایک جوان، لڑکی اور جو ہونہار بیٹا ان کا سید محمد نام جس کا تخلص وصال تھا، ان کے سامنے قضا کر گیا۔ خود بھی رحلت کی۔ اب ان کی صرف دو صاحبزادیاں زندہ ہیں

سید صاحب کی شادی سنہ [illegible]ھ میں سید میر آغا عرف میر مغل مرحوم رئیس و دولت مند عالی خاندان ساکن حاجی گنج سے ہوئی۔ سید صاحب کو ان مخدرہ سے آٹھ اولادیں ہوئیں۔ سات نے یکے بعد دیگرے ایام رضاعت ہی میں انتقال کیا۔ آخری سید حسین خاں ہیں ان کی ولادت کے ایک دن بعد ان کی والدہ نے قضا کی۔ اہلیہ کی رحلت کے ۴ سال بعد سید صاحب نے کلکتہ میں نہایت حسیب نسیب جگہ دوسری شادی کی۔

تعلیم

سید صاحب کی ذکاوت و ذہانت دیکھ کر ننھیال اور دادھیال دونوں جگہ کے بزرگوار بے حد محبت و شفقت سے پیش آتے تھے۔

مولوی سید فرحت حسین صاحب تعلیم دیتے تھے۔ مکتب بزرگوں کی نشست سے متصل تھا۔ خاندان کے اور محلے کے شرفاء کے پندرہ بیس لڑکے ایک جگہ پڑھتے تھے۔ ہر پنجشنبہ کو بزرگوں کے سامنے امتحان دینا ہوتا تھا۔ گھر کی بعض عورتیں صرف و نحو تک پڑھی ہوئی تھیں۔ اکثر راتوں کو بیگم صاحب کے سامنے لڑکوں کا امتحان لیا جاتا تھا۔ روزمرہ اور محاورہ میں جہاں کسی لڑکے نے غلطی کی ڈانٹا جاتا تھا۔ فرصت کے وقت بھی وسیع صحن میں بزرگوں کے سامنے کھیلنا ہوتا تھا۔ لٹو گھمانا یا تکلیاں لڑانا بھی سب ایک تمیز کے ساتھ ہوتا تھا۔ میر سید محمد فیض آبادی بڑے زبان دان اور با تمیز بزرگ تھے۔ ہزاروں شعر ان کو یاد تھے۔ چونکہ سید صاحب کو فطرتاً شعر سے مناسبت تھی۔ کھیل کے گھنٹوں میں بھی انہیں کے پاس بیٹھے رہتے اور غور سے ان کی بات چیت اور لب و لہجہ کو دیکھتے۔ ان مرحوم کی بھی یہ عادت تھی کہ جب ان سے کسی محاورے میں کوئی غلطی ہوتی ذرا ٹوکتے اور اصلاح کرتے۔ یوں تو اہل عرب و عجم اکثر اس گھر میں مہمان رہتے تھے مگر مولوی محمد رضائے شیرازی قابل ذکر ہیں۔ وہ ان کو فارسی ترجموں پر اصلاح دیتے اور فارسی ہی میں ان سے باتیں بھی کرنے لگے۔ اس سے

بہت جلد فارسی زبان میں سید صاحب کو دست گاہ ہو چلی۔ چونکہ سیاق و رسم و طرز تحریر مکتوبات سے بھی واقف ہو گئے تھے۔ اکثر اہل محلہ اپنی عدیم الفرصتی کے سبب سے خطوط کے مضمون زبانی بتا دیتے تھے اور یہ انہیں کے موافق ان کو خطوط لکھ دیا کرتے تھے۔

۹ برس کی عمر میں سید صاحب کو عربی شروع کرائی گئی۔ چند کتابیں صرف و نحو کی مولوی سید فرحت حسین صاحب سے پڑھیں مولوی شیخ آغا جان مرحوم پدر مولوی شیخ علی باقر آزاد اور مولوی سید عبد اللہ شاہ صاحب فاضل کشمیر تعلیم کے لئے مقرر کئے گئے۔ سید صاحب عربی کتابیں شاہ صاحب سے اور فارسی مولوی صاحب سے پڑھنے لگے۔ شاہ صاحب سے شرح ملا جامی و میزان منطق تک پڑھی۔ اور مولوی صاحب سے ابوالفضل و مینا بازار، پنج رقعہ ظہوری وغیرہ پڑھی۔ یہاں تک کہ غدر ۵۷ء کا ہنگامہ پیش آیا۔ بعد کو سید صاحب نے مولوی لطف علی صاحب سے پڑھنا شروع کیا۔ یہ بزرگ فرنگی محل سے تازہ تحصیل کر کے آئے تھے۔ پھر شرح مسلم مولوی محمد اعظم صاحب فاضل پھلواروی اور میبذی اور دوسری کتابیں حکیم مولوی گلزار علی مرحوم اور دینیات کی کتابیں مولوی سید مہدی شاہ مرحوم سے پڑھیں۔ طب میں موجز حکیم شیخ محمد علی مرحوم لکھنوی سے اور ادبیات و فن معانی و بیان وغیرہ مولوی شیخ آغا جان مرحوم سے حاصل کئے۔

شاعری کی ابتدا

سید صاحب پانچ ہی برس کے تھے کہ طبیعت رنگ دکھانے لگی۔ اکثر اردو کے شعر یاد کر لیتے تھے اور بڑے تلفظ سے اس کو پڑھا کرتے تھے۔ ان کی طبع موزوں کی ایک نقل یہ ہے کہ ان کے والد کی صحبت میں ایک شعر کسی صاحب نے قطعہ تاریخ کے آخر کا پڑھا۔ دوسرے صاحب نے اس کے پہلے مصرع کو ناموزوں بتایا۔ دونوں صاحب کے آپس میں جھگڑا ہوا۔ اس وقت وہاں کوئی شاعر موجود نہ تھا کہ تصفیہ کر دیتا۔ ناظر وزیر علی عبرتی سے پوچھنے پر منحصر ہوا۔ وہی منصف قرار پائے۔ رات کا وقت تھا۔ سید صاحب کی چھ برس کی عمر تھی۔ گھر میں سو رہے تھے ان کے والد نے جگا کر دونوں مصرعے پڑھ کر پوچھا کہ بتاؤ تو دونوں مصرعے درست ہیں یا نہیں؟ وہ شعر یہ تھا۔

رشک گفت مصرعۂ تاریخ   او بخوابید در رواق حسین

انہوں نے دو دفعہ مصرعوں کو دہرا کر کہا کہ "رشک ہاں گفت مصرع تاریخ" البتہ ہو سکتا ہے۔ دوسرے دن عبرتی صاحب نے غور کر کے کہا کہ مصرع اول ناموزوں ہے۔ یوں ہونا چاہیے۔

رشک بگفت مصرع تاریخ

ایک دفعہ سات آٹھ برس کی عمر میں آپ نے تکلّی پر اپنا یہ شعر موزوں کر کے لکھا ۔

جو کوئی اس تکلّی کو لوٹے   گر پڑے ہاتھ پاؤں سر ٹوٹے

شیخ برکت اللہ صاحب اپنے وقت میں پٹنہ کے بہت با اثر بزرگوں میں تھے قریب اسی برس کی عمر تھی۔ خود نہایت ذی علم و موقر اور اگلے امرا کی صحبتیں دیکھے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی کتب کے طالب علموں کو بلا کر اپنے سامنے بیت بازی کرواتے تھے۔ ہمیشہ فتح اسی گروہ کی ہوتی تھی جدھر سید صاحب رہتے تھے۔ اکثر شعر موزوں کر کے جواب دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کسی ہوشیار طالب علم نے چند شعر ایسے یاد کئے جن کے آخر میں غین تھا۔ جواب میں سید صاحب اور ان کے ساتھیوں کو جو شعر غین کے یاد تھے دیئے۔ لیکن اس نے پھر غین ہی پر توڑا۔ سید صاحب

نے فوراً شعر موزوں کر کے پڑھا ۔

غصہ کیجئے نہ میری باتوں پر   ماریئے لات اب نہ لاتوں پر

اس نے پھر فیل پر توڑا ۔ پھر انہوں نے جواب میں کہا ۔

غور سے دیکھئے سبق کی طرف   دیکھئے یوں نہ آپ ورق کی طرف

ایک دفعہ اس نے رلّے بندی پر شعر توڑا ان سے کچھ نہ بن پڑی ۔ یہ شعر موزوں کر کے پڑھا ۔

زنجرو ۔ بجرو چڑھتے پہاڑ   ٹوٹ گئیں ٹانگیں چھوڑ بھوٹے باڑ

اگرچہ مصرع دوم میں "بھوٹے" کی ے تقطیع سے الگ ہے مگر اس عمر میں یہی غنیمت تھا ۔

سید صاحب کے والد اور دوسرے بزرگوں کو سید صاحب کا یہ شوق ناپسند تھا وہ ہرگز نہ چاہتے تھے کہ یہ شاعر بنیں بلکہ ذہن و ذکاوت دیکھ کر یہ منصوبہ باندھ چکے تھے کہ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد دینیات پڑھنے کو عراق عرب بھیج دیئے جائیں ۔ اساتذہ پر تاکید کی تھی کہ کسی طرح سے یہ شوق ان سے چھڑایا جائے ۔ مگر سید صاحب اپنے شوق سے مجبور تھے چھپ چھپ کر شعر نظم کیا کرتے تھے ۔ جن دنوں شرح ملا جامی پڑھتے تھے حاصل حصول کی بحث کو اردو میں نظم کیا ۔

اتفاق سے نواب محمد حسن خاں مرحوم عرف منجھلے صاحب تخلص والد بزرگوار نواب سید محمد رضا خاں صاحب مع اپنے بزرگوں کے ہمراہ لکھنؤ گئے ۔ چونکہ میر صاحب کے ہم عمر اور آپس میں صحبت اور قرابت قریبہ تھی انہوں نے لکھنؤ سے سید صاحب کو ایک نظم رقعہ لکھ بھیجا ۔ پھر کیا تھا سید صاحب نے اس کے جواب میں دو یا تین منظوم خطوط بھیجے ۔ وہ خطوط پٹنہ میں لا کر منجھلے صاحب نے اپنے استاد حضرت عبرتی کو دکھائے ۔ اتفاق سے سید مہدی نواب مرحوم نے مرزا علی مرحوم کے امام باڑہ میں صحبت مشاعرہ قرار دی ۔ یہ تذکرہ سنہ ۱۲۶۵ھ کا ہے ۔ جبکہ سید صاحب کی عمر بارہ تیرہ برس سے زیادہ نہ تھی ۔ مشاعرہ کی فہرست میں ان کا بھی نام لکھا گیا ۔ طرح یہ تھی ۔ ع

سامنے تقریر کے حاجت نہیں تحریر کی

سید صاحب نے بھی غزل کہی اور یہی غزل مستقل طرح سے کہی ۔

اسی زمانہ میں جناب سید شاہ الفت حسین صاحب فریاد تخلص جو ایک نامی گرامی صاحب کمال اور عظیم آباد کے علماء میں تھے چالیس برس بعد چند مہینوں کے لئے کلکتہ سے پٹنہ تشریف لا کر بلحاظ ربط قدیم اسی گھر میں تشریف رکھتے تھے ۔ سید صاحب نے ڈرتے ڈرتے اپنے عم بزرگوار سید محمد حسن کی خدمت میں ایک عرضی لکھ کر پیش کی کہ مجھ کو اجازت ہو کہ مشاعرہ میں جا کر اپنی غزل پڑھوں ۔ ہونے والی بات ، انہوں نے منظور کر لیا اور غزل مانگ کر ملاحظہ کی اور جناب فریاد کے سامنے رکھ کر کہا کہ اس لڑکے نے یہ غزل کہی ہے ۔ آپ اصلاح دے دیں ۔ شاہ صاحب نے غزل دیکھ کر کتاب میں رکھ لی اور کہا کہ اصلاح دے کر دوں گا ۔ جب سید صاحب سامنے سے الگ ہوئے تو ان کے والد اور چچا سے مخاطب ہو کر کہا کہ اگر پانچ برس اور میں اور یہ لڑکا زندہ رہ گیا تو یہ بھی ثانی مہدی بخش ہو جائے گا ۔ مختصر کہ شاہ صاحب نے دوسرے دن جو عین مشاعرے کا دن تھا ، اصلاح دے کر غزل مرحمت کی جس کا مطلع یہ ہے ۔

جب سے اس ابرو نے پیدا تیغ عالمگیر کی
آبرو جاتی رہی آب دم شمشیر کی ،

شاد تخلص بھی جناب ممدوح نے تجویز کیا۔ پہلے مشاعرہ میں تو کسی نے چنداں اعتنا نہ کی۔ پندرھویں دن پھر مشاعرہ تھا اور طرح یہ تھی۔ ع

بھلا کیا فائدہ سر پہ جو ہوں احسان دشمنوں کے

انہوں نے بھی غزل کہی جب مشاعرہ میں یہ شعر پڑھا ؎

کئے شمشیر چنگیزی نے ایک عالم کے تن بے سر
ذرا جوہر تو اب تو بھی دکھا شمشیر براں کے

تو عبرتی مرحوم نے پکار کر کہا کہ بھائی آپ کیا حضرت فریاد کے شاگرد ہیں؟ تب اہل مشاعرہ کو خبر ہوئی۔ اس وقت غزل پر اتنی تعریفیں ہوئیں کہ مشاقوں کی غزل سے زیادہ چمک گئی۔

غرضکہ چند ہی مشاعروں میں سید صاحب کی اس شہرت اور بزرگوں کی تعریف نے ہم عمر شعرا اور ان کے دوستوں کے دلوں میں رشک و حسد پیدا کر دیا۔ طرح طرح کے اعتراضات شعروں پر ہونے لگے مگر وہ بزرگوار جو شاعری کے فن سے ماہر تھے زندہ تھے کسی کے بنائے کچھ نہ بنی۔ سید صاحب نے مشق سخن و تحصیل علم کو نہ چھوڑا۔ صبح سے چار بجے شام تک تو درسی کتابیں لئے اساتذہ کی خدمت میں حاضر رہتے۔ چار بجے شام اپنی خاص نشست گاہ میں آکر بیٹھتے۔ شائقین و نوجوان جمع رہتے۔ دو تین گھنٹے تک شعر خوانیاں رہتیں۔ سر شام کھانا کھا کر سو رہتے۔ بارہ بجے شب کو التزاماً اٹھ بیٹھتے۔ اس وقت شاعری شروع ہوتی۔ کبھی اصول فن کی کتابیں دیکھتے، کبھی اساتذہ کے دیوان کا مطالعہ کرتے۔ یہاں تک کہ صبح ہو جاتی۔ صبح سے پھر درسیات میں مشغول ہوتے۔ خدا جانے مشق سخن میں کتنے دفتر سیاہ کر ڈالے۔ آخر اس سخت محنت اور شب بیداری سے ضعف ہضم و اختلاج قلب میں سخت گرفتار ہوئے۔ شب کی غذا کا ہضم ہونا موقوف ہو گیا۔ روزانہ صبح کو غذا اگلوانا پڑتی۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچ گئی کہ غذا بھی ہضم ہونا موقوف ہو گئی ان عوارض نے ان کو محض ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا دیا۔

مرزا دبیر و میر انیس

سنہ [illegible] کے موسم میں مرزا دبیر و میر انیس اس شہر میں وارد ہوئے۔ چونکہ مرزا صاحب سے اور اس خاندان سے بذریعہ مراسلات پہلے سے رسم تھی۔ مرزا صاحب کے روز ورود کے دوسرے ہی دن بہ شوق تمام اپنے عم بزرگوار کے ہمراہ سید صاحب بھی ملاقات کو گئے۔ مرزا صاحب بڑے تپاک اور حسن خلق سے پیش آئے۔ سید صاحب سے ان کے اشغال کو پوچھا جب معلوم ہوا کہ علمی اشغال کے ساتھ شعر گوئی کا بھی شغف ہے تو بطور بزرگانہ نصیحت کے فرمایا کہ آپ مرثیہ کہئے تو بہتر ہے۔ سید صاحب نے بھی گھر آکر بیس پچیس بند مرثیہ کی تمہید کے نظم کر کے اپنے عم بزرگوار کو دکھائے۔ وہ خوش ہو کر مرزا صاحب کے پاس لے گئے

اور کہا کہ اس پر آپ اصلاح دے دیجئے۔ مرزا صاحب نے بند پڑھوا کر سنے، تعریف کی اور کہا کہ میں انشاء اللہ لکھنؤ سے اصلاح دے کر بھیج دوں گا۔ بہ سبب عدیم الفرصتی کے دو سال بعد مرزا صاحب نے اصلاح دے کر وہ بند بھیج دیئے۔

سید قاسم علی خاں مرحوم اور اس خاندان سے قرابت قریبہ تھی اور روزانہ اس گھر میں وہ تشریف لاتے تھے۔ میر انیس اور میر مونس کو قاسم علی خاں صاحب ہی نے لکھنؤ سے بلوایا تھا۔ روز ورود کے دوسرے ہی دن سید قاسم علی خاں کے ہمراہ یہ دونوں بزرگوار بھی سید صاحب کے والد مرحوم بزرگوار کی ملاقات کو آئے۔ میر مونس چونکہ دو سال قبل سے اس شہر میں آتے تھے سید صاحب کو جانتے تھے۔ بڑی محبت سے ملے اور پوچھا ادھر آپ نے کوئی تازہ غزل بھی کہی ہے؟ سید صاحب نے ان کے اصرار سے ایک غزل پڑھ کر سنائی۔ میر انیس بھی بیٹھے تھے۔ میر مونس نے تو بہت تعریف کی۔ مگر میر انیس چپ سنتے رہے۔ یہ بات سید صاحب کو ناگوار ہوئی۔

ایک دفعہ اس شہر میں مشاعرہ کی طرح تھی۔ ؎

ہمارا دل بھی لہو ہو گیا جگر کی طرح

محرم کے زمانہ میں کسی تاریخ مجلس کے وقت سے دو تین گھنٹے قبل سید صاحب اور ان کے بھائی سید جعفر حسین خاں مرحوم سید سلطان مرزا کے کمرہ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ سامنے کے کمرہ میں میر انیس و میر مونس ٹھہرے ہوئے تھے یہ تینوں صاحب بھی وہیں پہنچے۔ میر مونس جاگ رہے تھے اور بیٹھے تھے۔ مگر میر انیس رومال منہ سے لپیٹے پلنگ پر سو رہے تھے۔ میر مونس سے باتیں ہونے لگیں۔ اسی ضمن میں اس طرح کا بھی ذکر آیا۔ بطور تفنن طبع شعر کہے جانے لگے۔ میر مونس نے بھی اور سید صاحب نے بھی چند شعر کہے جو شعر یاد ہیں وہ یہ ہیں ؎

کچھ آج شام سے چہرہ ہے فق سحر کی طرح — ڈھلا ہی جاتا ہوں فرقت میں دوپہر کی طرح
یہ بوسے لب شیریں نے تلخ کی ہے حیات — کہ بند بند کو باندھے ہوں نیشکر کی طرح
بلا تو بھیجئے دوری ہے آپ کے نزدیک — ابھی پہنچتے ہیں ہم ڈاک میں خبر کی طرح (مونس)

سید صاحب کا بھی ایک شعر یہ ہے ؎

شبیہ کھنچ نہیں سکتی خموش ہے مانی — دہن بھی یار کا معدوم ہے کمر کی طرح

اتنے میں میر انیس بھی اٹھ بیٹھے۔ تعارف رسمیہ کے بعد کہنے لگے ایک شعر ہمارا بھی سن لیجئے ؎

خدا جہاں میں سلامت رکھے بجائے قبر
کہ سوئے پاؤں کو پھیلا کے اپنے گھر کی طرح

تصنیف ناول صورۃ الخیال

مولوی حسین علی مرحوم مسلم مشنری بھاگلپور ایک زمانہ میں برسوں تک روزانہ سید صاحب کے پاس آیا کرتے تھے۔ ان کے

ترغیب دینے، اسلوب بتانے اور اندر جرا نام بنگلہ کے ناول سنانے پر سید صاحب نے بھی [illegible]ء میں ایک ناول لکھا۔ ناول پورا نہ ہوا تھا کہ ڈیڑھ جزو کا ہو گیا۔ یہی پہلا ناول اُردو زبان میں ہے جو سید صاحب کے قلم سے نکلا۔ دوستوں کی صلاح سے ناول کو چھپوا دیا۔ اس ناول نے بڑی شہرت پکڑی۔ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم بنگال و پنجاب و ممالک متحدہ نے بہت جلدیں خرید کیں۔ اس شہرت و رشک کے سبب سے بعض حضرات کھڑے کئے گئے جو مدعی ہوئے کہ ناول میرا ہے۔ اصلاح کے لئے میں لے گیا تھا۔ سید صاحب نے اپنے نام سے چھپوا دیا۔ سید صاحب اور ان کے دوستوں نے کہا کہ جزو قصہ ناتمام ہے اگر آپ کا ناول ہے تو دوسرا حصہ چھپوا دیجئے یا فقط آگے کا قصہ ہی بیان کر دیجئے چنانچہ پھر دو برس بعد سید صاحب نے دوسرا حصہ لکھا اور چھپوایا۔ اس کے تین برس بعد تیسرا حصہ لکھ کر چھپوا دیا گیا۔

ملکی و قومی خدمات

علاوہ شاعری و تصنیفات کے اگر سید صاحب کے پولیٹیکل و قومی و مذہبی خدمات پر نظر کی جائے تو وہ بھی کم نہیں۔ ابتدا میں جبکہ میونسپلٹی کی عمر دس بارہ برس سے زیادہ نہ تھی اور میونسپلٹی کے ممبر گورنمنٹ کی طرف سے مقرر ہوا کرتے تھے، سید صاحب مال سلامی کے وارڈ ممبر مقرر ہوئے چونکہ نہایت ہوشیاری سے اس کام کو انجام دیا تھا، کمشنر صاحب کے ایماء سے صاحب کلکٹر نے چھوٹی بیٹھک میں میونسپل کمشنر مقرر کر دیا۔ کمیٹیوں میں برخلاف دوسرے ہندوستانیوں کے نہایت آزادی سے رائے دیتے تھے۔

[illegible]ء میں صبح صادق مطبع سے اخبار نسیم سحر اردو زبان میں ہفتہ وار سات برس نکلتا رہا جس کے آنریری ایڈیٹر سید صاحب تھے۔ اخبار کو فروغ بہت ہوا۔ کسی وجہ سے سید صاحب نے اس میں لکھنا چھوڑ دیا۔ اس لئے بہت جلد وہ اخبار بند ہو گیا۔

[illegible]ء میں سید صاحب نے ایک کمیٹی کی اور شہر کے اندر ایک ابتدائی مدرسہ کے جاری کئے جانے کی تحریک کی اور یہ رائے دی کہ اس مدرسہ میں اہل شہر کے لڑکوں کو اردو فارسی اور انٹرنس تک تعلیم دی جائے۔ روسائے شہر کے چندے سے یہ مدرسہ بنام زبدۃ المدارس کھولا گیا۔ جس کے آنریری سیکرٹری برابر سید صاحب رہے۔ سات برس تک یہ مدرسہ بڑے فروغ پر رہا مگر چندہ کے موقوف ہو جانے کے سبب سے آخر تنگ آ کر اٹھا دینا پڑا۔

[illegible]ء میں آپ آنریری مجسٹریٹ منتخب ہوئے۔ مسٹر کنگ کلکٹر نے آپ کی کارروائی دیکھ کر درجہ دوم کے اختیارات اور تنہا مقدمات تجویز کرنے کا حق گورنمنٹ سے دلوایا۔ آپ نے بہت مقدمات ایسے ایسے پیچیدہ اور قابلیت کے ساتھ کئے کہ باوجود سزا دینے کے مدعی و مدعا علیہ سب خوش رہے۔ بہت کم آپ کے فیصلہ کا اپیل ہوا۔

مذہب

سید صاحب کا دودھیالی خاندان شیعہ مذہب اور ننھیال میں شیعہ و سنی دونوں ہیں۔ پانی پت میں آپ کے عزیز قریب نواب نظیر محمد خاں صاحب وغیرہ سب اہل سنت جماعت ہیں۔ اس خاندان میں گو کہ ہر ایک اپنے اپنے مذہب میں (سنی یا شیعہ) پختہ ہے مگر آپس میں کسی قسم کا ظاہراً و باطناً تعصب و نفاق نہیں۔ سید صاحب شیعہ مذہب رکھتے ہیں مگر ان کے برتاؤ اور حسن معاشرت سے

(چاہے برسوں کوئی خط و خط میں ان کے پاس رہے) بجز طریقہ نماز کے کہ ہاتھ کھول کر پڑھتے ہیں ہرگز پتہ نہیں لگ سکتا۔ حق پسندی و انصاف و راستی ان کی رگ رگ میں بھری ہوئی ہے۔ اسی لئے مذاہب مختلفہ کے سب لوگ جو سید صاحب کی طبیعت سے واقف ہیں سید صاحب کو بہت پسند کرتے اور دل سے ادب کرتے ہیں۔

خدمت زبان اردو

اس بارے میں بمشکل ان کا کوئی نظیر مل سکے گا جس صبر کے ساتھ لگاتار وہ پچاس برس تک لٹریری خدمت کرتے رہے یہاں تک کہ باوجود تلف ہو جانے کے بھی اس وقت ایک لاکھ ہر قسم کے اشعار اور دو سو جزوں سے زیادہ نثر کے تصنیفات ان کے پاس موجود ہیں۔ اصناف نظم کے سب قسم کے کلام ادا ہوئے ہیں۔ مثلاً غزلیں، رباعیاں، مثنویاں، قطعات، افراد، ترجیع بند، مخمسات، مسدسات، تاریخیں وغیرہ مراثی و مولود و سلام۔

بہت سی غزلوں کے ضائع ہو جانے اور ہزاروں شعروں اور بہت سی غزلوں کے نکال دینے پر بھی اب جو دیوان مرتب ہے اس میں بارہ سو غزلیں ہیں جن میں گیارہ ہزار پانچ سو گیارہ شعر داخل ہیں۔

رباعیات سات سو کے قریب ہیں جن میں ہر قسم کے اخلاقی مضامین دل پسند طریقے سے ادا ہوئے ہیں۔ یہ مجموعہ چار جزو کا ہے۔

مثنویوں کے نام یہ ہیں:۔ نازِ خدا، نالۂ دلکش، نغمۂ جانفزا، یادِ حبیب، چشمۂ کوثر، ثمرۂ زندگی، فغانِ دلکش، نویدِ مہند۔

مجموعہ منظومات متفرق بھی آٹھ دس جزو سے کم نہیں۔ جس میں قریب پانچ ہزار شعروں کے ہوں گے۔ قطعات طولانی وغیر طولانی، رقعہ ہا کے تقریبات، فرمائشی احباب، قطعات تاریخ وغیرہ الگ، ترجیع بند، افراد، خمسہ جات مشتمل بر مضامین مختلف سب شامل ہیں۔

مجموعہ مراثی و مولود وغیرہ میں ۴۰ مرثیے، تین مولود، بیس سلام ہیں۔ کوئی مرثیہ دو سو بندوں سے کم نہیں اور بعض تین سو بندوں سے بھی زیادہ ہیں۔ تقریباً تیس ہزار سے زیادہ اشعار ہوں گے۔

نثر میں مختلف مضامین کی کتابیں ہیں اور ضخیم ہیں۔ بعض مرتب اور بعض غیر مرتب۔ ان میں بھی بعض کتابیں چھپ گئی ہیں اور اکثر نہیں چھپی ہیں۔ جو کتابیں بیس پچیس برس قبل چھپ بھی گئی ہیں ان کے مضامین کی اب مناسب ترمیم کر دی ہے۔

کتاب نصائح الصبیان سید صاحب نے اپنے بچوں کی اخلاقی حالت کو درست کرنے کے لئے لکھی تھی۔ تین چار جزو کی کتاب ہے اور اسی زمانہ میں چھپ بھی گئی تھی۔

کتاب تاریخ صوبہ بہار ۲۰۰ برس قبل بیادگار تشریف آوری عالی زمان حضور پرنور شاہنشاہ ایڈورڈ ہفتم (جب کہ حضور بحالت ولی عہد سرزمین ہند میں رونق افروز ہو کر تھوڑی دیر پٹنہ میں بھی قیام پذیر ہوئے تھے) حسب ایمائے جناب کمشنر صاحب بہادر لکھی گئی۔

صورۃ الخیال، ناول ۱۲۹۳ھ میں حسب ایمائے منشی حسن علی مرحوم مسلم مشنری لکھا گیا۔ یہ ناول تین جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد کا نام صورۃ الخیال، دوسری کا جلیۃ الکمال، تیسری کا حلیۃ الکمال ہے۔ پانچ دفعہ چھپ گیا ہے۔

کتاب نوائے وطن صوبہ بہار کے لوگوں کی زبان تحریری و تقریری کا درست کرنے کے خیال سے سید صاحب نے چھپوا کر شائع کی یہ وہی کتاب ہے جس نے مصنف پر مخالفت کا طوفان عظیم برپا کر دیا۔

نصاب تعلیم اردو و فارسی و عربی کی چھ کتابیں ہیں جو سید صاحب نے سہولت تعلیم کے خیال سے تصنیف کی ہیں۔

ذخیرۃ الادب میں فن شاعری و زبان دانی کے متعلق بارہ چودہ ابواب ہیں۔ گویا فن معنی و بیان و فصاحت و بلاغت و عروض و قوافی و دیگر معلومات کا ذخیرہ ہے اور جدت یہ کہ سب کو نہایت سہولت سے اردو کی مثالیں دے کر بیان کیا ہے۔

کشکول میں مختلف علماء، شعراء و مصنفین کی کتابوں سے لطائف و ظرائف علمیہ و شعریہ چن چن کر جمع کئے ہیں۔

کتاب ترجمۃ الاسلاف سلیس فارسی زبان میں سید صاحب نے حسب ایمائے جناب مسٹر اسٹوارٹ بیلی صاحب بہادر اپنے خاندان کے بیان میں لکھی ہے۔

کتاب مردم دیدہ، اسم با مسمیٰ ہے۔ جن جن نامی گرامی و غیر نامی باکمالوں یا عام شرفاء کو مصنف نے دیکھا ہے یا ان سے ملاقاتیں رہی ہیں، سب کے مختصر مختصر حالات بقدر اپنے علم کے اس کتاب میں لکھ دیئے ہیں۔ اب تک قریب سات سو شرفاء کا ذکر اس میں لکھا جا چکا ہے۔ یہ کتاب کئی جلدوں میں ہے۔

مجموعہ لکچر تصحیح تاریخ۔ آنریبل خان بہادر نواب سرفراز حسین خاں صاحب کے دولت خانہ پر دو شنبہ کو ایک صحبت ہوا کرتی تھی جس میں سید صاحب تاریخی مضامین کے لکچر دیا کرتے تھے۔ پندرہ سولہ جلسے ہوئے جن میں ابتدا سے لے کر مہابھارت اور اس کے بعد کے راجاؤں کے حالات بطور لکچر بیان کئے گئے۔

رسالہ نوریہ میں عقائد و اعمال مذہب شیعہ کو نہایت فصیح عربی میں لکھا گیا ہے۔ ممکن ہے ان کے علاوہ اور بھی تصنیفیں ہوں۔"

کاوش سے دیا حق میں جوانی میں نے   تا عمر بہت کہی کہانی میں نے
ناقدری زمانہ تری پروا ہے کسے   افراط سے چھوڑی ہے نشانی میں نے

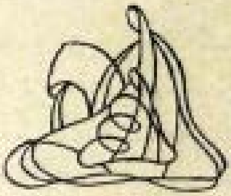

میرزا ابو طالب خاں اصفہانی

سیاح بحر و بر عالم ابو طالب ابن محمد اصفہانی عرض کرتا ہے کہ چونکہ بہ سبب گردشِ روزگار اور گردش لیل و نہار وطن میں قیام قرار دشوار ہوا اور ایک عمر صحرا نوردی اور سفر ہائے دور و دراز میں بسر ہوئی جس کی وجہ سے تجربات گوناگوں و معلومات بوقلموں حاصل اور مشاہدہ عجائب بحر و غرائب بر میسر ہوا لہذا اول شخص نے چاہا کہ واقعات سفر فرنگ کو مرتب کیا جائے اور اس ملک کی تمام اشیائے مفیدہ بعد تحقیق و تدقیق کے اس سفر نامہ میں مندرج ہوں تاکہ وہاں کے عجائبات اور مستورات تمام مخلوق جن سے اہل اسلام کو آگاہی نہیں ہے منکشف ہوں چنانچہ روزنامچہ کے حالات سفر کو تحریر کرنا شروع کیا اور ۱۲۱۸ھ میں کہ اپنی توقع کے خلاف ایسے سفر پرخطر سے سالم رہ کر بعد مدت کے کلکتہ میں وارد ہوا ان مسودات کا خلاصہ مرتب کیا اور اس کا نام "مسیر طالبی فی بلاد افرنجی" رکھا۔

اسباب سفر و ترک وطن

اب پہلے اپنے وہ حالات کہ جو اس سفر عظیم کا باعث ہوئے ظاہر کرنا مناسب ہے کہ اس کے بعد روزنامچہ سفر آغاز ہو۔

والد بزرگوار اس حقیر کے حاجی محمد بیگ خاں قوم ترک رہنے والے عباس آباد اصفہان کے تھے عہد جوانی میں صولت نادری سے اصفہان کو خیرباد کہہ کر ہندوستان میں وارد ہوئے اور رفقائے وزیر جنت مکان ابو المنصور خاں صفدر جنگ کے زمرہ میں داخل کئے گئے راجہ نول رائے کے مارے جانے اور محمد قلی خاں کے نائب صوبہ اودھ مقرر ہونے کے بعد ان کی رفاقت میں مامور ہو کر تقرب اور خصوصیت حاصل کی۔ بعد وفات صفدر جنگ کے نواب شجاع الدولہ مرحوم نے اپنے عم زادے کو دغا سے قتل کیا۔ اور اس مظلوم کے رفقا سے جو سلوک کرکے والد کی گرفتاری کا قصد کیا۔ یہ حفظ ما تقدم پر عامل ہوئے اور کسی قدر جواہر و اشرفی لے کر مع چند غلاموں کے راہی بنگالہ ہوئے اور تمام مال و منال اور عیال و اطفال کو لکھنؤ میں چھوڑا۔ چند مدت بنگالہ میں عزت و اعتبار سے بسر کر کے رہگرائے عالم بقا ہوئے۔ تاریخ وفات قطعہ ذیل سے ظاہر ہے ؎

محمد ابن شفیع آں خجستہ الدین — کہ بود وے شرف از فضل و علم و عقل و ادب
شتافت چوں بہ بہشت بریں ازیں عالم — ز تاب فرقتش افتاد جان ما در تب
وقوع ایں غم عظمیٰ بماہ اول انگراں — چو بود از سنہ ہجرت رسول عرب
ہزار و یک صد و ہشتاد و دو سوم تاریخ — جمال گشت بالہام سال رنج و تعب

نمودہ طوف بہشت بریں دوم تاریخ
ندائے جرم وقضی آمد از علم و طرب

میرے نانا صاحب ابو الحسن بیگ نامی مرد متقی دیندار ہم شہر برہان الملک مرحوم اور ان کے دوستان قدیمی سے تھے چنانچہ بعد

ان کی وفات کے امورِ دنیوی ترک کر کے بقیہ عمر نہایت دل تنگی سے خانہ نشینی میں بسر کر دی۔ ولادت اس بے سعادت کی آخر سنہ ۱۱۶۶ھ شہر لکھنؤ میں ہوئی۔ بعد ہجرت والد کے نواب شجاع الدولہ بہادر نے بمقتضائے اتحادِ قدیمی میرا روزینہ مقرر کیا اور تعلیم و تربیت میں کوشش فرماتے رہے۔

چار برس کے بعد حسب الطلب جناب والد کے سنہ ۱۱۸۰ھ میں مرشد آباد کو رخصت کیا۔ یہ میرا پہلا سفر تھا جو چودہ برس کی عمر میں ہمراہ مادرِ معظمہ عظیم آباد تک براہ خشکی اور پھر بہ سواری کشتی طے ہوا۔ مرشد آباد پہنچ کر صرف ڈیڑھ سال تک خدمت پدری نصیب ہوئی تھی کہ فلک کج رفتار نے یتیمی میں مبتلا اور کفالت خدمات و خرچ و ملک اور کشاکش امور خانہ داری میں گرفتار کر دیا۔

تحصیل علم و دانش خوش بود لیک والہ — عشق جنوں طبیعت فرصت نداد ما را

چونکہ ایک لڑکی اقربا سے نواب خانخاناں بہادر مظفر جنگ سے تقریب کے نامزد ہوئی تھی۔ اس لیے کئی سال نواب معظم الیہ کی خدمت میں بسر ہوئے۔ آخر سنہ ۱۱۹۰ھ ابتدائے جلوس نواب آصف الدولہ مرحوم میں حسب الطلب نواب مختار الدولہ ثابت جنگ دوسری مرتبہ حسن طلبی جا کر عمل داری اٹاوہ وغیرہ محالات میاں دو آب پر مامور ہوا۔ یہ تمام سفر کشتی پر دریائے گنگ کو بکسر تک اور وہاں سے فیض آباد تک دریائے گھاگرہ میں نہایت تکلیف سے ہوا۔ چونکہ طول محالات متعلقہ دو آب کا کانپور سے اوپر شہر تک دو ہفتہ کی راہ ہے، پورے دو سال اس ولایت کے دورہ میں بسر ہوئے۔ بعدہ بسبب اختلاف حیدر بیگ کابلی کے کہ مختار الدولہ کے نائب مقرر ہوا تھا معزول ہو کر ایک سال لکھنؤ میں رہا۔

اس اثنا میں محالات گورکھپور کرنل الگزنڈر سے متعلق ہوئے اور کرنل موصوف نے اپنی مددگاری کے واسطے وزیر سے اجازت لے کر مجھ کو ہمراہ لیا۔ یہ ولایت بھی طول میں پندرہ روز کی راہ ہے لہٰذا تین سال کامل یہاں تک کہ برسات بھی سفر میں بسر ہوتی۔ ہر گاؤں میں میرے واسطے پھونس کے مکان بنائے جاتے تھے اور ہر سال خیموں کی تجدید ہوتی تھی۔ بعد اس ہمراہ کرنل کے معزول ہو کر ایک سال لکھنؤ میں خانہ نشین رہا۔

اس زمانے میں حیدر بیگ اور گماشتگان کمپنی مسٹر مڈلٹن و مسٹر جانسن کے درمیان نزاع پیدا ہوئی اور حیدر بیگ نے ان سے دغابازی شروع کی۔ اس سبب سے عام ملک کا انتظام خراب ہو گیا۔ ہر سال مال گزاری میں کمی ہونے لگی اور زمینداروں نے دورہ کے محالات کو تاراج کرنا شروع کیا۔ منجملہ ان کے راجہ بلبھدر سنگھ جو کہ تمام صوبہ اودھ کی وراثت کا دعویٰ اور ہم چشمی وزیر کا مرتبہ رکھتا تھا اور ایک لاکھ راجپوتوں کی فوج اس کے مطیع تھی، بہت زیادہ بغاوت اور نافرمانی کرنے لگا۔ ہر چند وزیر اور کمپنی بہادر کی فوجیں اس کی سرکوبی کے واسطے متعین ہوئیں لیکن بسبب تزویر عاملان حیدر بیگ کے کوئی نتیجہ مرتب نہ ہوا۔ مسٹر مڈلٹن نے گورنر ہیسٹنگز کے اشارے سے مجھ کو اس انتظام کی تحریص و ترغیب دی۔ چونکہ میں جانتا تھا کہ اس بدعملی کا باعث حیدر بیگ ہے اور اس کام میں میری کوشش اس کے بالکل مخالف اور اس کی عداوت میری خانہ ویرانی کا باعث ہوگی، ہر چند عذر کیا لیکن غرض مند بہرہ ہوتا ہے۔ کمپنی کے کارپردازوں نے میری ایک نہ سنی اور شر اعدا سے میری حفاظت کا وعدہ کر کے یہ شغل خطیر میرے سپرد کیا۔

دو سال اس مہم کے سرانجام میں صوبہ اودھ کے طول و عرض کا دورہ کیا گیا اور راجہ مسطور سے متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ آخرکار اگرچہ اس خاندان کا یہ دشمن صد سالہ مارا گیا اور ملک وزیر بالکل صاف ہو گیا اور تغلب عمال کی راہ بھی بند ہوئی۔ صوبہ کا انتظام بھی درست اور مکمل ہو گیا لیکن ساتھ ہی اس کے میری تباہی اور خانہ بربادی کے سامان بھی مرتب ہو گئے۔ گماشتگان موصوف جنہوں نے میری حمایت کا وعدہ کیا تھا معزول ہو گئے اور گورنر ہیسٹنگز صاحب ولایت کو چل دیے۔ نئے حکام کلکتہ میں تشریف لائے اور تمام عہد و اقرار میری حمایت اور مددگاری کے پرانے ہو گئے۔ اس تغیر میں حیدر بیگ نے باوجود درنگی کے رشوت اور حیلہ سازی سے اپنے آپ کو صلاح اندیش اور خیر خواہ ظاہر کر کے اقتدار حاصل کیا اور چند سال بعد

ساتھ بھی ایسی ظاہر داری کا سلوک کیا کہ سرکار انگریزی سے اس کی شکایت کی ضرورت نہ پڑی۔ اس کے بعد حسب سابق اپنی عادت کے وکیل کے پردے میں روباہ بازی کر کے مجھ کو بہانے سے چاہا اور دام طمع میں پھنسا کر بجز جرح قابو میں لا سکے مگر میری کیفیت جب کہ پیش تر بھی ظاہر ہو چکی ہے، رفتہ رفتہ کر کے مجھ کو اظہار میرے رنج کا کرتے تھے مگر باندی اور دوسرے ذخیرہ میں کو بھی ہزار روپیہ سالانہ اس سرکار سے میرے خرچ کے واسطے مقرر تھا، کمی کی ناشستگی اور بات بات میں جھگڑے اٹھانے لگا۔

لکھنؤ کی سکونت دشوار دیکھ کر میں نے دوبارہ بنگالہ کا سفر اختیار کیا اور ۱۲۰۶ھ میں براہ دریائے گنگ کلکتہ میں پہنچ کر لارڈ کارنوالس سے اپنی مصیبت کی شکایت کی۔ لارڈ موصوف نے اگرچہ تعظیم سے پیش آیا اور امداد کا وعدہ بھی کیا لیکن ان کو اس زمانے میں سفر دکن اور ٹیپو سلطان سے لڑائی در پیش تھی چار برس تک میرے کام میں ڈھیل ہوئی۔ اس سبب سے اس آمدورفت اہل و عیال و تعمیر مکان و باغ وغیرہ کے بہت خرچ تھا اور قرض سے زیر بار ہو گیا القصہ نقصان عظیم جو اس سفر میں مجھ کو پہنچا یہ تھا کہ ایک پسر چار سالہ جو کہ تمام خاندان کا چشم و چراغ تھا بلکہ اس کی پیاری پیاری باتوں سے ہمسائے تک بھی اس سے محبت رکھتے تھے اس کو کلکتہ کی آب و ہوا ناموافق ہوا اور وہاں کے اطبا کی بے وقوفی کے باعث بیمار ہو کر فوت ہو گیا۔ اس داغ نے سب کے دلوں کو کباب کر دیا۔ اس واقعہ جانکاہ کا سوز و گداز رباعیات ذیل سے ظاہر ہے۔

در آتش فرقت تو اے لخت فؤاد — شد خاک وجودم از رہ آب بہ باد
پیوستہ جگر دیدہ ام چو سقف حمام — ہموارہ ز نالہ ام چو چنگ از بیداد

ایضاً

تا از نظرم آں شہسوار برفت — ہر لحظہ سیل از چشم خوں بار برفت
صد روز دراز روشنش تواں کرد — کوتاہ شب عمر کہ زاں یار برفت

القصہ جب لارڈ کارنوالس دکن سے لوٹے تو میرے معاملہ کی نسبت خیال فرمایا چونکہ حیدر بیگ نے ابھی دنوں میں قضا کی تھی لہٰذا میرے تعلقات اس سرکار میں مضبوط کرنے کی غرض سے ۱۲۰۷ھ میں مجھ کو لکھنؤ روانہ کیا اور ایک خط میری سفارش میں جو ان کی لیاقت و بزرگی کے شایان تھا وزیر کو لکھا اس سفارش کا یہ اثر ہوا کہ وزیر اور اس کے اہل کاروں نے میری تعظیم و تکریم اور مدارات خاطر خواہ کی اور کاربرآری کی پوری امید تھی کہ میرے بخت برگشتہ کی تاثیر سے لارڈ کارنوالس ولایت کو چل دیئے۔ لہٰذا ان لوگوں کے بھی قول و قرار سست ہو گئے اور ٹال مٹول کرنے لگے۔

اسی زمانے میں وزیر اور مسٹر چیری کا آپس میں مناقشہ واقع ہوا اور وہ بسبب شکایت وزیر کے معزول کئے گئے۔ اس پر اہل کاران وزیر نے کمال ناواقفی سے اپنے آپ کو حاکم مستقل جان کر مجھ کو پیام دیا کہ تمہیں بھی مسٹر چیری کے ساتھ لکھنؤ سے باہر جانا چاہیے میں نے ان سے ہر چند کہا کہ تم غلطی پر ہو اگر میں تمہارے پاس رہوں گا تو جو کچھ مناسب ہوگا وقت پر تمہاری رہنمائی کروں گا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا لہٰذا بعض متعلقین کو لکھنؤ میں چھوڑا اور بعض کو الٰہ آباد میں پہنچا کر وہاں سے تیسری بار ۱۲۱۲ھ میں براہ دریائے گنگ کلکتہ پہنچا۔

لارڈ ٹینموتھ المعروف بہ سر جان شور نے کہ اس وقت گورنر بنگالہ تھے میری مدد کا وعدہ کیا۔ اسی اثنا میں آصف الدولہ مرحوم فوت ہو گئے اور ان کے جانشین وزیر علی خاں کی سرکشی کے جھگڑے اور چند در چند ایسے قضیے پیش آئے کہ لارڈ موصوف میرے کاروبار پر توجہ کرنے کی فرصت نہ پا کر ولایت روانہ ہو گئے۔ تین برس انتظار میں مجھ پر گزرے۔ اس انتظار و پریشانی میں جو باقی رفقا اس وقت تک میرے ساتھ تھے ادھر ادھر منتشر ہو گئے اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ تین اولاد اور چار نفر کنیز رفاقت دیتے رہے کہ جنہوں نے مجھ کو اور میری اولاد کو پرورش کیا تھا سفر ہائے خیر میں ساتھ تھا اور میری جدائی سے ملول ہو کر گئے

کر کے نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ کا راستہ لیا۔

اس فقر و فاقہ اور طول مدت اور توقف کلکتہ سے نہایت پریشان رہتا تھا کہ ایک دن کپتان رچرڈسن جو باشندے اسکاٹ لینڈ کے زبان داں فارسی و ہندی اور سخن فہمی میرے دوست تھے عازم انگلینڈ ہو کر مجھ سے ملنے آئے اور اثنائے گفتگو میں کہنے لگے کہ اگر تم بھی انگلینڈ کا ارادہ کرو تو اس دل تنگی سے بھی نجات ملے گی اور سیر سے عجائب و غرائب دیکھنے میں آئیں گے اور میں مدت سفر میں تمہاری تعلیم زبان انگریزی کی کوشش کروں گا۔ میں نے اس خیال سے کہ سفر پر خطر و دراز ہے اور تنگ جہاز میں چلنے اور ممالک مختلفہ میں گزرنے اور بہ سبب اختلاف آب و ہوا کے کہیں نہ کہیں مر گئے تو چار و ناچار کشمکش دہر اور جور اخوان زماں سے نجات پاؤں گا سفر کا عزم بالجزم کر کے ان سے اقرار کر لیا اور باتفاق کپتان مذکور جہاز کرسٹینا نام میں جس کا مالک کپتان تمین تھا ایک کمرہ کرایہ کر لیا۔

آغاز سفر فرنگ بتاریخ غرہ شہر رمضان المبارک ۱۲۱۳ھ مطابق فروری ۱۷۹۹ء روز پنجشنبہ ہندوستان کلکتہ سے رخصت ہو کر بجرہ پر کپتان مذکور کے ساتھ سوار ہو کر کجگری جہاز کو روانہ ہوا۔ دو روز راستہ میں گزرے تیسرے روز منزل کو جہاز پر پہنچ کر ہر ایک اپنے اپنے کمرے میں قیام پذیر ہوا۔ یہ جہاز نہایت بے انتظام اور بد ساخت تھا۔ کار پرداز اکثر بنگالی کاہل اور نکمے۔ کمرے بہت تنگ و تاریک اور بدبودار تھے خصوصاً میرا مجھ کو جس کے بیان سے ملال ہوتا ہے۔ بالجملہ جو کچھ مقدر ہو چکا تھا آزار و تکلیف اس جہاز میں جو سب پہنچے ایک تھوڑی سی امید بھی کہ جلد سفر کے طے ہونے کی تھی وہ اس سے بدل گئی اور سفر میں اس قدر توقف ہوا کہ ساڑھے پانچ مہینے صرف کیپ جنوبی تک کہ نصف راہ انگلینڈ کا ہے منقضی ہو گئے۔

ذکر عجیب پردار مچھلیوں کا پنجشنبہ ۲۱ ربیع کو دیکھنے والی مچھلیاں نظر آئیں کہ گروہ گروہ بقدر تین چار گز کے پانی سے بلند ہو کر چار سو پانچ سو قدم ہوا میں کبھی نیچے کبھی اوپر ہو کر مثل پرندوں کے اڑ کر پھر پانی میں چلی جاتی تھیں۔ چنانچہ ان کا پردار ہونا بخوبی دیکھا جاتا تھا۔ اس سے پہلے یہ بات مسافران دریا سے سن کر خیال ہوتا تھا کہ یہ داستان جھوٹ کے ہوگا۔ گو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ صاف پرند ہیں۔ بعض ان میں سے جو اڑان میں جہاز کے مستول یا بادبان سے ٹکرا کر جہاز پر گر پڑی تھیں گوشت ان کا کھایا گیا۔ نہایت لذیذ اور مشابہ مچھلی طیبانگے کے تھا۔ اس مقام سے شدت گرمی ہوا کی کہ مثل ماہ جیٹھ اور بیساکھ کے بنگالہ میں ہوتی ہے کم ہونا شروع ہوئی کیونکہ ہم درجہ ہفتم شمالی استوا سے گزر کر اب درجہ پنجم استوا میں تھے یہ اور درجے ہوئے اور آفتاب نے بھی اس ۲۱ روز میں قریب سات درجے شمالی استوا طے کئے تھے اس لئے قریب ناظر ہونے سے تبدیل موسم محسوس ہوئی۔

زنان ہلنڈیہ زنان ہلنڈیہ جو کیپ کی رہنے والی ہیں اکثر بھدی بے نمک بد خلق اور بے سلیقہ ہیں لیکن جن عورتوں کی پیدائش کیپ میں ہوتی ہے ان میں حسن رنگ اور جسم کی خوبصورتی پائی جاتی ہے۔ اکثر حصول زندگی کی وجہ سے پیشہ کرتی ہیں اور جو پارسا ہیں ان کو بھی حیا نہیں۔

ایک دن کئی لڑکیاں مجھ کو گھیرے ہوئے تھیں۔ ان میں سے ایک نے جو زیادہ حسین اور شوخ تھی میرے ہاتھ سے رومال چھین کر اپنی ہمراہ والیوں کو دے دیا۔ وہ قہقہے لگاتی تھیں اور اس کو تسبیل ذکر کرتی تھیں۔ میں شرم سے اس رومال کو چھوڑتا تھا۔ چونکہ زنان استنبول میں رومال کا لینا اور دینا عورت کے درمیان علامت ایجاب و قبول کی ہے اور میں ایسی جوان حسین کو رومال دینے میں مضائقہ کر رہا تھا۔ اس شوخ و شنگ نے سبب پوچھا۔ میں نے کہا کہ تیری ہمجولیاں مجھ کو اچھی نہیں لگتیں اس لئے میں ان کو رومال نہیں دیتا اور تیرے واسطے مخصوص رکھا ہے اگر تو قبول کرے تو حاضر ہے۔ یہ سن کر سب ہنسنے لگیں اور وہ شرما کر ایک طرف کو بھاگ گئی۔

شروع سفر انگلینڈ دوبارہ چہار شنبہ ۲۶ ربیع الثانی کو ایک جہاز "برطانیہ" نام پر جس کا کرایہ تیس گنی یعنی تین سو روپیہ ادا ہی

روپیہ بابت دیگر اخراجات محسوب ہوا تھا، سوار ہو کر لندن کے قصد سے لنگر اٹھایا اور میرا چار سو روپیہ نصف کرایہ جہاز سابق کا سوخت ہو گیا۔ اس جہاز کا کام وہیل مچھلی کا شکار کرنا اور اس کا تیل کھینچنا اور لندن میں لے جانا ہے۔ اس کا کپتان علم جہاز رانی سے نہایت ماہر کلاک نامی تھا۔ آئرلینڈ تک تین ہفتے راستے میں ملے۔ سہ شنبہ غرہ جمادی الاول وقت نصف النہار جزیرہ سینٹ ہیلینا میں پہنچ کر لنگر کیا۔ دس تاریخ کو گورنر بروک کی مہمانی اور اطراف کے باغات کی سیر وغیرہ میں مشغول رہ کر اور تاریخ شام کو بعد فراغت طعام کے جہاز پر سوار ہو کر آگے کو روانہ ہوئے۔

شنبہ ۵؍ جمادی الثانی کو مقابل دہانہ انگلش چینل کے جو انگلینڈ اور فرانس کے درمیان حد فاصل ہے پہنچ کر داخل ہونے کو تھے کہ باد شرقی مانع ہوئی اور اتفاقاً ملک آئرلینڈ میں پہنچنے کا ہو گیا۔ شہر کارک میں معلوم ہوا کہ لارڈ کارنواس جو کہ بادشاہ انگلینڈ کی جانب سے اس جزیرے کا حاکم ہے دار الملک ڈبلن میں رہتا ہے۔ لارڈ موصوف کی ملاقات کے خیال اور اس سرزمین کی تربیت اور عمدگی آب و ہوا اور سہولت سفر کی وجہ سے اس پر رائے قرار پائی کہ جہاز کو چھوڑ کر یہاں سے براہ خشکی لندن کو جاؤں چونکہ آغاز سفر سے یہ ارادہ تھا کہ بعد سیر انگلینڈ کے لارڈ ممدوح کو دیکھنے کے واسطے اس جزیرے میں آؤں گا، اب کہ حسب الاتفاق اس ملک میں پہنچا ہوں، بہتر ہے کہ پچھلے کام کو پہلے ہی کر لیا جائے۔

لہٰذا شنبہ دوسری ماہ رجب کو زیادہ سامان اور نوکروں کو جہاز پر چھوڑ کر ضروری کپڑے اور چیزیں ساتھ لے کر دوبارہ کارک کو روانہ ہوئے اس مرتبہ ایک کھلی کشتی میں اسی دریائے شیریں سے شہر میں آ کر پہلے سرائے میں مقیم ہوئے اور دو روز کارک میں ٹھہرے۔

ذکر کپتان بیکر

انہی دنوں ایک اور کپتان بیکر کہ جنگ غلام محمد خاں روہیلہ میں موضع بیٹھ پر میرے روشناس ہوئے تھے اور کپتان رچرڈسن کے دوست تھے خبر پا کر ہماری ملاقات کو آئے اور اپنے مکان پر کہ ایک باغ شہر سے چار میل کے فاصلے پر لب دریا ہے لے جا کر ضیافت کی۔ ملاحظہ فضائے باغ اور دلچسپی عمارت اور ہر کام کے واسطے علیحدہ علیحدہ کمروں کا ہونا اور چیزوں کے رکھنے کا انتظام خاص کر باورچی خانہ اور برتن دھونے کا کمرہ اور برتنوں کے رکھنے کے موقع کو دیکھ کر نہایت محظوظ ہوا۔ باورچی خانہ میں بھی کلوں کے ذریعے سے کام لیا جاتا تھا۔ ایک کل کباب کی سیخ کو الٹ پلٹ کرتی تھی اور گوشت اور پیاز کا قیمہ کرتی تھی اور ہاون دستہ کوٹتی تھی۔ کپتان بیکر نے اس باغ کی متعلقہ زمین کو اس طرح منقسم کیا ہے کہ بعض سے سال بھر کا غلہ اور بعض سے میوہ اور ترکاریاں اور بعض سے مرغوں کا دانہ ڈھوروں کی چرائی جن کا دودھ اور مکھن اور گوشت وغیرہ کا خرچ اس کے باورچی خانہ میں ہوتا ہے حاصل ہوتی ہے۔

منجملہ اس کے گھر والوں کے دو لڑکیاں اس کی بہن کی بھی ہیں۔ ایک حاضر جوابی اور بذلہ سنجی اور دوسری حسن قامت اور صورت میں نظیر نہیں رکھتی بہت سے جوانان شہر کارک اس کے طلب گار ہیں مگر وہ غرور حسن اور خود نمائی میں ایسی سرشار ہے کہ ابھی تک کسی سے رضامند نہیں ہوئی۔ القصہ پری رخساریں معہ چند لفرزنان ہمسایہ کے کھانے کی میز پر موجود رہ کر اپنی پوری توجہ سے میری مہمانداری میں مصروف رہتی تھیں اور میں نے چونکہ اس سے پہلے ایسا حسن دلآویز نہ دیکھا تھا اس جور سرشت کے تماشائے جمال میں ہمہ تن چشم ہو کر یہ بیت مرزا بیدل کا پڑھتا تھا۔

چو حسن نیم رنگست این چہ مژگان خدنگ است این
نگہ کار فرنگ است این کہ آتش در فرنگ افتد

بعد کھانے کے اس رنگ پری نے چائے بنا کر مجھ کو دی اور اس کی مٹھاس کی نسبت دریافت کیا اور کہا کہ مجھ کو یہ خیال ہے کہ شیرینی کم ہو۔ میں نے جواب دیا کہ ایسی شیریں شمائل کے ہاتھوں سے جو چائے بنائی گئی ہو اس میں شیرینی کی کمی کا گمان بھی نہیں ہو سکتا بلکہ زیادہ ہو جانے

کا خوف ہے۔ حاضرین اس گرما گرم فقرے سے نہایت محظوظ ہوئے اور ہنسنے لگے۔

ملاقات دین محمد

دوسرا بال خانہ کپتان مذکور کے دین محمد نام ایک شخص باشندہ مرشد آباد ہے کہ برادر کپتان بیکر اس کو بچپن سے خانہ زادوں کی طرح پرورش کر کے کارک میں لایا اور مدرسے میں تحصیل زبان انگریزی کی غرض سے داخل کیا۔ دین محمد بعد تحصیل علم کے شرفائے کارک سے ایک شخص کی بیٹی کو جو کہ حسن و جمال میں مشہور ہے اور اس مدرسے میں تحصیل علم کرتی تھی لے کر بھاگ گیا اور کسی شہر میں نکاح کر کے بعد پھر کارک میں آ گیا۔ اب اس سے کئی اولادیں ہیں اور ایک علیحدہ مکان میں امیری ٹھاٹھ سے بسر کرتا ہے۔ ایک کتاب اپنے حالات اور بعض ہندوستان کی رسموں میں لکھ کر اس ملک میں شائع کی ہے۔

ڈبلن

دوشنبہ چوتھی رجب کو میل کوچ میں بیٹھ کر ڈبلن کو روانہ ہوئے چہار شنبہ ۶ رجب کو تھوڑی رات گزری تھی کہ ڈبلن پہنچے۔ شہر مذکور کنارہ دریائے شور پر واقع ہے اور اس کے محیط کا دور ۲۰ میل ہے۔ مکانات بعضے پتھر کے تراشے ہوئے ہیں اور بے چونے مصالحے کے چن کر درز بندی کر دی گئی ہے۔ اکثر اینٹ چونے کے بنے ہوئے بہت صاف، چار منزلہ اور بعضے اس سے بھی زیادہ۔ ایک محلہ اور ایک کوچے میں منزلوں کا شمار برابر ہے اور ہر مکان میں ایک تہہ خانہ جو بجائے باورچی خانہ اور کوئلہ اور برف وغیرہ کا ذخیرہ کرنے اور چینی کے برتن رکھنے اور مکان والوں کے کپڑے اور باورچی خانہ کے برتن دھونے کے واسطے مخصوص ہے۔ اس سے اوپر کا درجہ حاضری اور کھانا کھانے کے واسطے اور اوپر کا اول بالا خانہ عورتوں کی نشست اور شب خفتن کے لیے دوسرا سونے کے واسطے اور تیسرا جس کی چھت نیچی کھپریل کی ہے نوکروں اور غلہ بھرنے کے واسطے مقرر ہے۔

دوسرے روز ڈبلن پہنچنے کی میں نے لارڈ کارن والس کو اطلاع دی لارڈ ممدوح نے نہایت خوش ہو کر وقت ملاقات معین کیا بعد ملاقات کے نہایت مہربانی اور دلجوئی سے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ مجھ کو جس چیز کی ضرورت ہو فوراً مہیا کریں اور اچھی طرح شہر کا سیر تماشا کرائیں۔ جب تک کہ میں وہاں رہا ہفتہ میں ایک مرتبہ ان سے ملتا تھا اور ہر مرتبہ لطف تازہ اور عنایت بے اندازہ سے محظوظ ہوتا تھا۔ چنانچہ یہ قلیل وقت ایسی فراغت اور خوشی سے گزرا کہ تمام عمر نہ گزرا تھا۔ سب چھوٹے بڑے ہر مقام اور ہر وقت میری مدد میں مشغول رہتے تھے حتیٰ کہ میں گھر سے باہر نکلتا میرے چاروں طرف ہجوم ہو جاتا اور ہر شخص میرے باب میں کچھ نہ کچھ کہتا۔

برف باری

بعد دو ہفتہ کے برف باری شروع ہوئی تمام چھتیں اور دیواریں روئی کی مثل سفید ہو گئیں۔ شہر کے کوچے چاندی کی نہروں کے مانند اور باغ کی روشیں جل پانی کی نہروں کے جن کے دونوں طرف سبزہ زار ہو نہایت خوشنما اور دلپذیر معلوم ہونے لگیں۔ چونکہ اس سے قبل میں نے تمام عمر برف کا سماں نہیں دیکھا تھا، اس تماشے سے اس قدر محظوظ ہوا کہ بیان میں نہیں آ سکتا۔ دو تین روز کے بعد تمام چمن اور صحرا اور پہاڑ جہاں تک کہ نظر جا سکتی تھی سفید ہو کر بقدر ایک گز کے زمین پر برف جم گئی اور خلاق المعانی کے ان اشعار کا مضمون صادق آنے لگا۔

ہر گز کے سواد بر بیل نشان برف   گر گل کہ لقا ایست زمین در دہان برف
مانند پنبہ دانہ کہ در پنبہ شد نہاں   اجرام کوہ ہاست نہاں در میان برف

میرے مزاج میں اس ملک کے جاڑوں کی شدت اور موسم زیادہ موافق تھا اور بدن کو اس قدر تقویت اور طبیعت کو فرحت حاصل ہوتی تھی کہ چلنے پھرنے میں کاہلی یا ماندگی کا نشان تک بھی نہ پایا جاتا تھا ہندوستان میں ڈھاکے کا اکہرا کرتہ بدن پر بوجھ کرتا تھا اور آدھ کوس

بھی پیادہ چلنے سے ہلکان ہو جاتی تھی۔ اب میرا لباس بے شائبہ حسن سازی ایک گدھے کا بوجھ ہے اس پر بھی جسم میں اس قدر چستی و چالاکی ہے کہ چلنے میں مثل دوڑنے کے وقت دم پڑتا ہے۔

ذکر لندن

۲۵ شعبان مطابق ۲۱ جنوری ۱۸۰۰ء منگل کے روز کلکتہ کی روانگی سے اس وقت تک پانچ روز کم ایک سال قمری منقضی ہوا تھا لندن میں داخل ہوا اور مارگرٹ اسٹریٹ میں کپتان رچرڈسن کے مکان پر اترا چونکہ میری منزل اس مکان کے دوسرے درجے میں تھی، ایک ہفتے کے بعد تنگ آکر اسی محلے میں دوسرا مکان لیا پھر کئی مکان اور بدلے۔ سب سے اخیر مکان کا مالک قوم الیمان یعنی جرمن سے مرد عیال دار و عالم حسن عجیب اطوار تھا۔ اس کے گھر نہایت فراغت سے بسر کی یہاں تک کہ فرانس کے راستے مراجعت ہند کا قصد کر کے لندن سے رخصت ہوا۔ مدت قیام لندن دو سال پانچ مہینے پندرہ دن تھے۔

ماندگی راہ سے آسودہ ہو کر میں نے مسٹر ڈنڈاس وزیر ہند کو چٹھی لکھ کر استدعائے ملاقات کی۔ انہوں نے بے تامل تعین وقت فرما کر طلب کیا اور نہایت تعظیم و تکریم سے ملے۔ بعدہٗ قصبہ ومبلڈن میں کہ لندن سے دس میل ہے اپنے باغ میں ضیافت کر کے حق مہمان نوازی ادا کیا۔ دو ایک روز کے بعد وزیر ممدوح نے میرا عرض حال کر کے بادشاہ کی ملازمت کرائی۔ جناب ولی نعمت اور ملکہ آفاق کوئن شارلٹ نے بھی براہ غریب نوازی دیر تک گفتگو فرمائی اور ہمیشہ دربار میں حاضر ہونے کی اجازت مرحمت کر کے کثرت کی حاضری سے اظہار خوشنودی مزاج فرمایا۔ اس کے بعد شہزادوں اور امیروں اور معززین شہر نے مجھ سے ملنے کی رغبت کر کے ہر تقریب سے ملاقات کی اور رنگ رنگ میری دعوتیں اور ضیافتیں کیں۔ لہٰذا میں ہر روز نئی جگہ ہوتا تھا اور وہاں کے طعام و شراب اور نغمہ و سرود سے جو بسبب وسعت سلیقہ انگلش کے ہر جگہ تازہ بتازہ اور نوبنو معلوم ہوتی تھی بے انتہا لذت اٹھاتا تھا۔

عجیب تر یہ ہے کہ اہل محفل بھی میرے سامان لطائف و ظرائف سے جو بسبب اس ملک کی جدت ہوا اور عدم فکر و تشویش اور تماشائے حسینان دلربا اور استماع نغمات ہوش فزا کے ہر وقت طبیعت میں جوش زن رہتے تھے اور وہ اہل علم کی نازک خیالیاں تھیں جو انگریزی لباس میں ان لوگوں کے سامنے نئی صورت سے ظاہر ہو کر ایسا محظوظ کرتی تھیں کہ نہایت اشتیاق سے ان مضامین کو حفظ کر کے ایک دوسرے کے سامنے نقل اور نقل مجلس بناتے تھے۔ آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ کوئی بڑی محفل مجھ سے خالی نہ ہوتی تھی میں ہر جلسے کا جزو خاص شمار کیا جاتا تھا۔

اس شہر میں پہنچنے کے وقت میرا مصمم ارادہ تھا کہ یہ سال دو سال مدت قیام لندن کے بیکار اور فقط تماشے ہی میں نہ گزریں بلکہ خود علوم انگلش کی تحصیل کروں اور ان کو بھی علم فارسی کی تعلیم دوں۔ اس خیال سے ارباب حل و عقد کو مطلع کیا کہ اگر ایک مدرسہ معین کر کے دو تین جوانان انگلش کو جو زبان فارسی بھی جانتے ہوں وہاں جگہ دیں میں ان کو فارسی میں کامل کروں گا اور ایک دوسرے کی مدد سے ایک رسالہ جو فارسی کی نحو میں میں نے جہاز میں لکھا تھا اور وقت کی کتاب صحت معنی اور قانون لغت فارسی کو مدنظر رکھ کر انگریزی میں ترجمہ کروں گا۔ میرے بعد ان دو تین آدمیوں سے بہتوں کو فائدہ پہنچے گا۔ باوجودیکہ یہ رائے خاص و عام کو پسند آئی لیکن عمل میں نہ آسکی کیونکہ ارکان کمپنی بسبب تنگی طبیعت اور کفایت خرچ کے عوام کے نفع کا کچھ خیال نہیں کرتے اور امرائے شاہی کثرت کار اور جنگ فرانس کی وجہ سے اس کام کے اجرا پر متوجہ نہ ہو سکے۔ آخر میں جب ان کو فرصت ہوئی تو دو مدرسے ایک لندن اور دوسرا آکسفورڈ میں معہ چھ ہزار روپیہ سالانہ کے میرے اخراجات کے واسطے مقرر کیے لیکن وقت گزر چکا تھا اور میں عازم وطن تھا۔ اس لیے ان جھگڑوں کو چھوڑ کر سوائے سیر تماشا کے اور کوئی کام اختیار نہ کیا۔ جب تک وہاں رہا دن عید رات شب برات کی طرح نہایت عیش سے گزرا۔

لطیفہ: مسٹر ہوزی جو ایک عرصہ تک لکھنؤ میں انگریزوں کی طرف سے مقتدر رہا مراجعت وطن کے وقت اس کا جہاز ولایت حبش میں ایک پہاڑ سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا اور صد ہا کثیر نفر کے تباہ و ہلاک ہوا کہتے ہیں کہ حبشی اس کا گوشت کباب کر کے کھا گئے۔ اس کی بیٹی مس ہوزی نے لاوارث ہونے کے سبب سے مسٹر شکاٹ کے گھر میں جو ڈائرکٹران کمپنی سے ہے پرورش پائی۔ اس کے حسن و جمال کا شہرہ دور دور ہے۔

ایک روز مسٹر شکاٹ مذکور کے باغ میں جو لندن سے بارہ میل ہے میں مہمان تھا۔ بعد طعام کے سب باغ کی سیر کرنے لگے چونکہ گرمی کا موسم تھا ایک بلند درخت کے سایہ میں جہاں ہمیشہ ان کی نشست ہوتی تھی چائے اور قہوہ کی میز لگا کر اس کے گرد بیٹھ گئے۔ مس شکاٹ نے میری طرف متوجہ ہو کر بغرض امتحان کہا یہ درخت اس قسم کے درختوں سے ہے جو زمین پر پھیلتے ہیں اور کبھی اونچے نہیں ہوتے۔ اس کا بلند ہونا تعجبات سے ہے۔ میں نے کہا کوئی تعجب نہیں اگر میں بھی ان لوگوں کی طرح مس ہوزی کے جلسوں میں ہوتا تو اس درخت سے بھی زیادہ بلند ہو جاتا۔ حاضرین اس فقرے سے خوب ہنسے اور میرے لطف کلام کی داد دی۔

ہندوستان اور ایران کی تصویریں مسٹر ڈوسی جو کہ حکام عدالت سے ہے مسٹر جوزف بنک کے یہاں میرا روشناس ہوا اور پھر ملنے کے واسطے میرے یہاں آیا اور مجھ کو اپنے مکان پر لے گیا۔ یہاں میں نے ہندوستانی اور ایرانی مصوروں کے ہاتھ کی تصویریں جو اواسط ہند کی تباہی میں وقتاً فوقتاً انگریزوں کے ہاتھ آئیں ایسی عمدہ دیکھیں جو فرنگستان کی تصاویر نامی سے بڑھی ہوئی تھیں۔

ایک خمسہ نظامی نہایت خوشخط با تصویر تھا جس کی پشت پر نواب شیر جنگ مرحوم کی مہر لگی ہوئی تھی اور میں نے اس کتاب کو اس مرحوم کے پاس دیکھا تھا کہ جان کی طرح عزیز رکھتا تھا اور کبھی اپنے پاس سے جدا نہ کرتا تھا۔ دوسرا شاہنامہ کہ وہ بھی اسی سرکار کا تھا یہ دونوں کتابیں مصوران ایران کی نازک قلمی کا نمونہ تھیں۔ اور اسی طرح کے اکثر قطعے اور طغرے جو شاذ و نادر ہندوستان میں نظر آتے تھے مسٹر ہسٹنگز اور مسٹر فرگ ایڈن کے مکانوں میں اور بعض دوسرے مکانات میں دیواروں پر آئینہ دار چوکھٹوں میں جڑے ہوئے دیکھ کر گذشتہ کی عبرت حاصل کی گئی۔ خاقانی۔

کسریٰ و ترنج زر پرویز و ترہ زریں برباد شدہ یکسر از یاد شدہ یکساں
پرویز کنوں گم شد زاں گمشدہ کمتر گو زریں ترہ کو برخواں رو کم ترکوا برخواں

علاوہ ازیں خاص کتب خانہ بادشاہی میں بہت سی کتابیں مصوران ایرانی و ہندوستانی کی صناعیوں کی دیکھیں۔ ایک ان میں سے شاہجہان نامہ تھا کہ جس میں مصوران شاہی نے شاہجہان کی تصاویر بزم و رزم نہایت صحیح اور عمدہ کھینچی ہیں۔ یہ کتاب تباہی دہلی میں آصف الدولہ کے ہاتھ آئی تھی اور وہ اس کو بڑی قدر سے اپنے پاس رکھتا تھا۔ سر جان شور گورنر بنگالہ نے اس سے لے کر بادشاہ انگلینڈ کی نذر کی۔

مسٹر ڈانیل مصور جس نے آصف الدولہ کے جلسے کی تصویر مع مسٹر ہسٹنگز اور دیگر حاضرین کے کھینچی تھی مجھ سے ملنے آیا اور اپنے یہاں مدعو کیا۔ اس کے مکان پر تاج محل اور ہندوستان کی اکثر مشہور عمارتوں کی تصویریں دیکھیں اور وہ ساکنان لندن کو جو کبھی اس ملک میں نہیں آئے اور یہاں کے حال سے غافل ہو کر یہ گمان کرتے ہیں کہ ہندوستان میں کوئی چیز نامی اور قابل قدر نہیں ہے جا کر دکھاتا ہے۔ مسٹر ڈانیل نے سیاہ قلم تصویر کا کارخانہ مفصل طور سے مجھ کو دکھایا اور میرے سامنے کام بھی کیا۔

عجیب دعوت نامہ لندن کی ایک معزز خاتون نے محفل رقص کی تقریب میں مجھ کو رقعہ بھیجا جس میں صرف یہ مندرج تھا کہ میں فلاں تاریخ

مکان پر موجود ہوں گی نہیں اس کا کچھ مطلب نہ سمجھا اور ایک دوست کے پاس لے گیا اس نے کہا کہ تم کو بلایا ہے اور شاید مجلس رقص ہوگی۔ میں نے اس عبارت کی وجہ دریافت کی تو اس نے جواب دیا کہ چونکہ بے طلب ملاقات کے لیے جانے والوں کو اکثر یہ جواب دیا جاتا ہے کہ گھر میں نہیں ہیں لہٰذا یہ رسم مقرر ہو گئی ہے کہ جب بلاتے ہیں تو یہ لکھتے ہیں کہ میں فلاں وقت گھر میں ہوں اور جانے والا اگر وقت مقررہ پر جائے گا تو ضرور ملاقات ہوگی۔

ماہ ذیقعد سنہ ۱۲۱۶ھ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی جنگ ختم ہوئی۔ لندن اور پیرس میں تین شب متواتر جشن چراغاں رہا۔ میں کہ مدت سے ارادہ فرانس و واپسی وطن کا قصد کر رہا تھا موقع پا کر لندن میں دو برس پانچ مہینے پندرہ روز قیام کے بعد سہ شنبہ ماہ صفر سنہ ۱۲۱۷ ہجری کو دوستوں سے وداع ہو کر شہر پیرس کو روانہ ہوا۔

نواب سرور الملک آغا مرزا دہلوی

کون سنتا ہے کہانی میری　　اور پھر وہ بھی زبانی میری

ولادت

صبح کا وقت روز سہ شنبہ ماہ ذوالحجہ ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء میری پیدائش کی تاریخ ہے۔ میرے والدین مرحومین میری پھوپی کے ساتھ فراش خانہ (دہلی) کے محلے میں رہتے تھے۔ اُنھوں نے میرا نام آغا مرزا رکھا۔ یہ مکان جس میں میں پیدا ہوا دو منزلہ تھا۔ نیچے دالان در دالان کے دائیں بائیں کوٹھریاں۔ صحن جانب مقابل باورچی خانہ وغیرہ۔ بائیں طرف ڈیوڑھی اور سامنے اُس کے مختصر صحنچیاں تھیں۔ اوپر کی منزل پر مختصر صحن ایک دالان، جانبین کوٹھریاں تھیں۔ اس مکان کی تفصیل اس واسطے لکھتا ہوں کہ میری ولادت سے متعلق ایک عجیب حکایت میں نے والدۂ مرحومہ سے سنی ہے۔ والدہ مغفورہ میری نہایت عابدہ زاہدہ اور ضروری مسائل دین سے واقف تھیں اور قرآن مجید مع ترجمہ و تفسیر شاہ عبدالقادرؒ پڑھی ہوئی تھیں۔ استاد اُن کے سید حسن بہنوئی سرسید احمد خاں مرحوم کے تھے۔ اُن صاحب نے اپنے رشتے کی کل مستورات کو قرآن مجید اور مسائل دین پڑھائے تھے جناب شاہ صاحب کے اصل مسودہ ترجمۂ قرآن مجید کی نقل والدہ مرحومہ کے پاس تھی اور اسی مسودہ میں والدہ ماجدہ نے مجھ کو بھی قرآن مجید پڑھایا تھا۔

ایک جنّی بزرگ

الغرض والدۂ ماجدہ نے جو حکایت بیان فرمائی وہ یہ ہے کہ اس مکان کی اوپر کی منزل پر ایک کوٹھری میں کوئی جنّی بزرگ باخدا عبادت گزار رہتے تھے۔ میری پھوپی صاحبہ اُن کو جانی پکارا کرتی تھیں۔ کوٹھے پر ہر شخص کو نہ جانے دیتی تھیں اور نہایت پاک و صاف رکھتی تھیں۔ وہ بزرگ بھی اکثر بوقتِ ضرورت اُن کے ساتھ سلوک کرتے تھے چنانچہ والدہ صاحبہ نے ایک نقل بیان فرمائی کہ ایک شب کو پھوپی نماز عشا کے واسطے کھڑی ہوئیں۔ اتنے میں گنڈیریوں[1] والے نے آواز دی۔ پھوپی صاحبہ نے کہا کہ افسوس ہے اس وقت میرے پاس پیسے نہیں ہیں ورنہ میں گنڈیریاں لیتی۔ اسی وقت اُن کے پاؤں

---

[1] یہ عام عادت تھی اہلِ دہلی کی کہ امرا و خوش باش گرمیوں میں سموسہ اور قیمہ بھری ٹکیاں ناشتہ کرتے تھے۔ سموسہ والیاں صبح کے تڑکے ہر گھر میں پہنچ جایا کرتی تھیں۔ دوپہر سہ پہر کو برف میں جمی ہوئی ملائی کی قلفیاں اور ہر قسم کے ترمیوہ جات اور رات کو گنڈیری والے گلی کوچوں میں آواز دیتے پھرتے تھے اور سوتے وقت آبخورے گرم گرم دودھ کے پیا کرتے تھے۔ عوام لوگ صبح کو چنے پر مل گرما گرم ضرور کھاتے تھے۔ جاڑوں میں نہاری کلّے پائے تنوری پراٹھے عوام کا اور شیرمال و باقرخانی امرا اور خوش حال لوگوں کا ناشتہ تھا۔ چائے قہوہ کے نام سے بھی کوئی واقف نہ تھا۔

کے پاس کسی چیز کے گرنے کی آواز ہوئی۔ چراغ منگا کر جو دیکھا تو ایک روپیہ کلدار کا پڑا ہوا تھا۔ وہ انھوں نے اٹھا لیا اور کہا کہ بھائی یہ روپیہ کلدار کا میں تبرکاً رکھوں گی۔ والد ماجد میرے نہایت ذی علم تھے۔ فارسی، عربی کے علاوہ روڑکی سے علوم ریاضیات میں سند بھی حاصل کی تھی۔ وہ ان بزرگ کے وجود سے منکر تھے لیکن آخرکار اُنھیں بھی قائل ہونا پڑا۔

الغرض جب میری ولادت قریب پہنچی۔ پھوپی صاحبہ نے مولانا شاہ رفیع الدینؒ کو بلا بھیجا اور کہا کہ آپ کوٹھے پر جائیے فلاں کوٹھری میں ایک بزرگ رہتے ہیں جن کو جن کہتے ہیں۔ میرا سلام اُن سے کہیے اور کہیے کہ میرے ہاں زچگی خانہ ہونے والا ہے لیکن نہیں کہ کسی قسم کی طہارت کا انتظام ہو سکے۔ پس اگر آپ کو ناگوارِ خاطر ہو تو میں دوسرے مکان میں اُٹھ جاؤں۔ ورنہ اسی مکان میں سامان زچگی کا کروں۔ چنانچہ شاہ صاحب کوٹھے پر گئے اور پیام پھوپی صاحبہ کا پہنچایا۔ اُن بزرگ نے جواب دیا کہ ہرگز دوسرے مکان میں نہ جائیے۔ میں خود اس مولود کی حفاظت کروں گا۔ صرف اس قدر احتیاط کریں کہ کوئی عورت مرد یا بچہ کوٹھے پر نہ آنے پائے۔ الغرض والدہ ماجدہ نے فرمایا کہ جب میں پیدا ہوا تو جب کبھی میں رات کو پاؤں مار کر کپڑا اتار ڈالا کرتا تھا تو وہ بزرگ فوراً اُڑھا دیا کرتے تھے یا کبھی انّا خوابِ غفلت میں مبتلا ہوتی اور میں دودھ کے واسطے روتا تو وہ انّا کو جگا دیتے۔ جب چلّے کا دن قریب آیا تو پھر پھوپی صاحبہ نے شاہ رفیع الدین صاحب کو طلب کر کے پیام بھیجا کہ اب میرے یہاں مہمانداری ہے اور کل مستورات اُن کے بچے اور ماما انّا وغیرہ ملازمین جمع ہوں گے۔ اُس وقت کوئی انتظام احتیاط کا مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ لہٰذا میں دوسرے مکان میں مہمانداری کے واسطے اُٹھی جاتی ہوں۔ وہ بزرگ راضی نہ ہوئے اور کہا کہ ہم بھی اسی خوشی میں شریک ہوا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ دن تقریب کا آیا اور مہمان جمع ہوئے۔ پھوپی صاحبہ خود کوٹھے پر گئیں اور پکار کر کہا کہ بھائی صاحب۔ میرے یہ مہمان آپ کے وجود سے ناواقف ہیں۔ مبادا آپ کی کسی حرکت سے ڈر جائیں تو میری مہمانداری ستیاناس ہو جائے گی۔ اُس حجرے میں سے جواب آیا کہ تم خاطر جمع رکھو۔ تمھارے مہمان ہمارے مہمان ہیں۔ اُن کی خاطرداری میرے ذمہ ہے۔ دوسرے روز جب سب مہمان جمع ہوئے تو اُن بزرگ نے نئی طرح سے اُس خوشی میں شرکت کی یعنی بیبیوں کے زیور و لباس وغیرہ چرانے شروع کر دیے۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کوئی بی بی کہتی تھی کہ میرا ہار کوئی چرا لے گیا۔ کسی کا صندوقچہ غائب ہو گیا۔ کوئی اپنا دوشالہ ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ ایک بی بی دوسری بی بی کے ملازمین پر چوری لگاتی تھی۔ پھوپی صاحبہ نہایت غضب اور غصے میں اوپر گئیں اور اُن بزرگ کو خوب بُرا بھلا کہا اور کہا وہ سب چیزیں فوراً واپس کیجیے ورنہ میری خوشی مبدل بہ رنج اور میری مہمانداری برباد ہوئی جاتی ہے۔ آواز آئی کہ آپ نیچے جائیے وہ سب چیزیں پہنچ جاتی ہیں۔ پھوپی صاحبہ نیچے اُتر آئیں۔ اُس وقت دسترخوان بچھا ہوا تھا اور کل مہمان کھانے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ یکایک چھت کی طرف سے چرچر کی آواز آئی۔ سبھوں نے سر اُٹھا کر دیکھا کہ کسی کا دوشالہ لٹکتا ہوا چلا آتا ہے۔ کسی کی پازیب لٹکتی آ رہی ہے۔ یہ تماشا دیکھ کر سب بیبیاں چیخیں مار مار کر اِدھر اُدھر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ ایک قیامت برپا ہو گئی۔ کسی کو بخار ہو گیا۔ کوئی بیہوش ہو کر گر پڑی۔ افتاں و خیزاں کل مہمان بھاگ نکلے۔ جلسہ اور دعوت سب درہم برہم ہو گئی۔ والدہ صاحبہ فرماتی تھیں کہ ہم لوگ اُس مکان سے اُٹھ کر دوسرے مکان میں چلے گئے۔

پھر صرف ایک دفعہ اُن بزرگ سے ملاقات اس طرح ہوئی کہ قلعہ میں کوئی شہزادی بیمار ہو گئی اور حالت جنون کی پہنچی۔ والدہ صاحبہ بھی مزاج پُرسی کو وہاں گئیں تو اُس شہزادی نے والدہ ماجدہ کو دیکھ کر کہا کہ "السلام علیکم تم مجھ کو پہچانتی ہو۔" والدہ ماجدہ ڈر گئیں، اس

شہزادے نے کہا: "ڈرو نہیں، میں وہی ہوں کہ تمھارے بچے کی نگرانی کرتا تھا اور میرے مکان میں وہ بچہ پیدا ہوا تھا۔ میں اس کو بہت عزیز رکھتا ہوں۔" والدہ ماجدہ خوف زدہ اسی وقت وہاں سے واپس چلی آئیں۔

غدر ۱۸۵۷ء

۱۸۶۰ء تک میں اسی مکان میں رہا۔ غدر کے زمانے میں مجھ کو ہوش اچھی طرح ہو گئے تھے۔ بہت سی باتیں اب تک یاد ہیں۔ اس زمانہ میں اگر کسی یورپین سپاہی کی صورت نظر آتی تھی تو بچے تالیاں بجاتے اور تھو تھو کر کے کنکر مارتے تھے۔ جب باغی لوگ شہر میں آتے تو ہمارے مکانوں میں خوب پہرا چوکی کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ مجھ کو خوب یاد ہے کہ جس روز کالے شہر میں گھسے ہیں اس دن رحیم بخش خدمتگار کے ساتھ بلاقی بیگم کے کوچہ میں اپنی خالہ صاحبہ کے پاس جا رہا تھا۔ جب دریبہ میں پہنچا تو دیکھا کہ خلقت پریشان ہو کر ہر طرف بھاگی پھرتی ہے۔ رحیم بخش قوی آدمی تھا۔ مجھ کو جلدی سے اپنی پیٹھ پر اٹھا کر لے بھاگا۔ جس وقت ہم خالہ مرحومہ کے مکان پر پہنچے دروازہ پھاٹک کا بند ہو رہا تھا۔ رحیم بخش دھکا دے کر اس زور سے گھسا کہ ہم دونوں دروازہ کے اندر گر پڑے اور خوب چوٹ آئی۔ ایک دو روز کے بعد یہ خوف دلوں سے جاتا رہا اور پھر اپنے مکان پر باطمینان واپس آ گئے۔

شہر میں باغی اور پہاڑی پر انگریز تخمیناً چھ ماہ تک لڑتے رہے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ ہم ہر شب توپ کے گولوں کو چلتے ہوئے دیکھتے تھے اور آتش بازی سمجھتے تھے۔ ایک دن ایک گولہ کوٹھے پر چھت پھاڑ کر دالان میں اسی وقت گرا جب ہم سب کھانا کھا رہے تھے۔ بڑے ابا نے دوڑ کر بہت سا پانی اس پر انڈیل دیا۔ میں ایک ولایتی مولوی صاحب سے پڑھا کرتا تھا۔ ولایتی؟ لوگوں کو کہتے تھے جو سرحد افغانستان سے بشکل طالب علم یا میوہ فروش آیا کرتے تھے۔ یہ مولوی صاحب قوی ہیکل، ریش دراز، سر کے بال تا بہ شانہ چھٹے، وظیفے اور عبادت گزار تھے۔ ایک روز وہ والد مرحوم کے پاس آئے اور کہا کہ ایک نعمت عظمیٰ ہم کو خداوند تعالیٰ نے اس زمانہ میں عطا فرمائی ہے۔ حیف ہے کہ ہم اس رحمت سے محروم رہیں۔ والد نے پوچھا کہ وہ کیا نعمت ہے۔ جواب دیا کہ جہاد اور شہادت۔ والد مرحوم نے بہت کچھ ان کو سمجھایا مگر ان کے سر پر شوقِ شہادت سوار ہو چکا تھا۔ پگڑی سر پر اور تلوار کمر میں باندھ کر بندوق ہاتھ میں لے کر تیار ہو گئے اور والد مرحوم سے کہا جو کچھ رقم میری تنخواہ کی آپ کی طرف ہو وہ امانتاً اپنے پاس رہنے دیجئے۔ یہ کہہ کر وہ روانہ ہو گئے۔ عرصۂ دراز تک غائب رہے۔ والد مرحوم یہ سمجھے کہ مولوی کو نعمتِ شہادت نصیب ہو گئی۔ اُن کی رقم سے پلاؤ وغیرہ پکوایا۔ جب سہ پہر کو والد صاحب فاتحہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے۔ مولوی صاحب بھی آ پہنچے اور اپنی فاتحہ کا پلاؤ خوب کھایا اور پھر اسی وقت جانے کو مستعد ہو گئے۔ والد نے ان سے کہا کہ یہ فاتحہ حسبۃً للہ ہے۔ آپ اپنی تنخواہ لیتے جائیے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ اوّل تو میں اس رقم کا مستحق نہیں ہوں اور اگر آپ دیتے ہیں تو اپنے پاس رہنے دیجئے۔ شاید میری فاتحہ کے کام آئے۔ والد نے کہا کہ آپ زندہ ہو کر اپنی فاتحہ آپ کھایا کرتے ہیں۔ یہ دل لگی اچھی نہیں ہے۔ یہ رقم آپ لیتے جائیے مگر مولوی صاحب نے رقم نہ لی اور چلے گئے اور پھر واپس نہ آئے۔ والد نے چند روز بعد اُن کی فاتحہ کر دی۔

---

[1] یہ عجیب امر قابلِ تحریر ہے کہ چھ ماہ کی گولہ باری میں اہلِ دہلی کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا۔ صرف ایک سقہ جو چاندنی چوک میں پانی بھری پکھال بیل پر لئے جا رہا تھا۔ وہ اور اُس کا بیل اُڑ گیا۔

اس جنگ مشش ماہہ میں کالے خاں گولنداز نے بڑا نام پیدا کیا اور خوب تاک تاک کر پہاڑی پر گولے برسائے۔ پوربیوں کا یہ حال تھا کہ ہر نفر اپنے تئیں خود مختار بلکہ بادشاہ سمجھتا تھا۔ حتیٰ کہ ابو ظفر محمد بہادر شاہ سے بھی گستاخیاں کرتے تھے اور علانیہ کہتے تھے کہ "بادسا بادسا کوں کا جس کے موڑ پر ہم جنڈا رکھ دیں توں ہو بادسا ہوئے گا" (بادشاہ بادشاہ کاہے کا، جس کے سر پر ہم جوتا رکھ دیں وہی بادشاہ ہو جائے)

مرزا عاشور بیگ کی معرکہ آرائی

مجھ کو خوب یاد ہے کہ بڑے ابا مرحوم ایک روز دستار و کمربستہ بادشاہ کے پاس گئے اور اُن سے کچھ فوج طلب کی تاکہ انگریزوں سے لڑیں۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ "ابا میرے پاس فوج کہاں ہے جو میں کسی کو دوں۔ اسّی برس کی میری عمر ہو گئی۔ اعضا سب بیکار ہو گئے۔ یہ جنگ میری لڑائی نہیں میری خود سر فوج لڑ رہی ہے۔ اگر تم کو شوق جنگ ہے تو اس فوج کے افسروں سے معاملہ کرو۔" چنانچہ یہی ہوا کہ ایک دو پلٹنیں لے کر وہ شہر کے باہر نکلے۔ بالک پٹ پر گوروں سے مقابلہ ہوا اور کئی چھکڑے غنیمت کے لوٹ کر حضرت مرحوم گھر واپس آئے اور باہر کے جلو خانہ کے حجروں میں وہ سب غنیمت مقفل کر دی۔ دوسرے روز افسران فوج ان کے پاس آئے اور کہا کہ میرزا صاحب یہ غنیمت تقسیم کر دیں۔ حضرت نے فرمایا کہ تم لوگ اس کے مستحق نہیں ہو۔ بے لام زبر بل، دال واؤ پیش دو' بل دو۔ ہر چند اُن سب نے اور والد مرحوم نے اُن کو سمجھایا کہ یہ تکرار مناسب نہیں تمام فوج بگڑ جائے گی مگر بڑے ابا نے کسی کی نہ سنی اور وہ لوگ یہ کہہ کر چلے گئے کہ کل سمجھ لیں گے۔ دوسرے دن یہ خبر ملی کہ وہ لوگ مع ایک جمعیت مسلح مستعد فساد آ رہے ہیں۔ یہاں بھی لڑائی کی تیاری کر لی گئی۔ نواب ضیاء الدولہ مع اپنے ملازمین کے اپنے بہنوئی کی مدد کو آ گئے۔ پھاٹک بند کر دیا گیا۔ ملازم جا بجا جستہ جستہ مقامات مناسبہ پر بندوق تلوار دے کر کھڑے کر دیے گئے۔ بڑے ابا اور اُن کے فرزند اکبر ادھر اُدھر انتظام میں مصروف تھے۔ والد مرحوم اور نواب ضیاء الدولہ نے فرصت پا کر یہ مشورہ کیا کہ جس طرح ہو سکے صلح کر لی جائے۔ باہم مشورہ کر کے دونوں نے بڑے ابا سے کہا کہ آپ مع چند ملازمین کے دیوان خانہ کی چھت پر جا بیٹھیں تاکہ آپ کو اچھی طرح موقع بندوق چلانے کا ملے اور ہم یہاں پھاٹک پر اُن کو روک سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ تو کوٹھے پر گئے اور نواب ضیاء الدولہ نے زینہ کا دروازہ بند کر کے قفل لگا دیا اور خود پھاٹک پر مع والد مرحوم جا کر دروازہ کھول دیا۔ اس عرصہ میں افسران فوج مع جمعیت کے قریب آ گئے۔ نواب ضیاء الدولہ بہادر اور والد مرحوم اُن کے پاس گئے اور گفتگو صلح کی شروع کر دی۔ افسروں نے کہا کہ میرزا صاحب ناحق ضد کرتے ہیں۔ اگر ہم خاموش رہ جائیں تو یہ جمعیت کس طرح خاموش رہ سکتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ قرار پایا کہ جمعیت دور کھڑی رہے۔ افسران فوج ہمراہ آ کر مال غنیمت کو دیکھ لیں۔ اس کے بعد تقسیم کر لی جائے۔ چنانچہ حجروں کے قفل کھولے گئے۔ افسروں نے دیکھا کہ حجروں میں پرانی کڑھائیاں، جوتے اور ڈوئیاں بھری ہوئی ہیں۔ افسروں نے تعجب کیا کہ اسی مال پر مرزا صاحب ہم سے لڑتے تھے۔ الغرض افسروں نے سپاہیوں کو بلا کر وہ مال دکھا دیا۔ سبھوں نے یہ کہا کہ یہ مال مرزا صاحب کو مبارک رہے اور باجا بجاتے ہوئے واپس چلے گئے۔ اُدھر بڑے ابا اور اُن کے فرزند اکبر مع ملازمین کے گولے بارود سے تیار منتظر تھے کہ جمعیت زد پر آئے تو حملہ کر دیا جائے۔ نواب ضیاء الدولہ نے حجرہ اسی طرح مقفل کر دیا اور زینہ کا دروازہ کھول کر اپنے بہنوئی کو طلب کیا اور اطلاع کر دی کہ جانبین کی فہمائش کر دی گئی۔ اب

کوئی خدشہ نہیں رہا۔

جس دن انگریز شہر پر حملہ آور ہوئے اور کشمیری دروازہ پر قابض ہوئے۔ اہل شہر متوحش اور سراسیمہ شہر سے نکل کر جانے لگے۔ اس وقت نواب ضیاء الدولہ مع اپنے ملازمین اور جوان فرزندوں کے خانچن کے کوچہ میں چلے آئے کہ سب ایک جگہ جمع ہو جائیں اور تقدیر الٰہی کے منتظر رہیں۔ والد مرحوم اور نواب ضیاء الدولہ بہادر نے ہر چند چاہا کہ سب مستورات، بیگمات، ملازمین، ذکور و اناث اس وقت فرصت ہے کہ ہنوز انگریز شہر میں داخل نہیں ہوئے ہیں۔ مثل دیگر خلائق کے کسی طرف نکل جائیں۔ مگر بڑے ابا راضی نہ ہوئے وجہ اس کی یہ تھی کہ حضرت کو علم نجوم و رمل میں بڑا دخل تھا اور یہ حکم لگا رکھا تھا کہ انگریزوں کو شکست ہوگی۔ میرزا احمد بیگ نے بھی کہ ان فنون میں شاگرد اپنے والد کے تھے۔ باجازت اپنے والد کے قرعہ ڈالا تھا اور یہ حکم لگایا تھا کہ فلاں روز انگریز شہر میں داخل ہوں گے۔ اس حکم پر بڑے ابا نہایت برافروختہ ہوئے اور بیٹے سے کہا کہ افسوس ہے تو ان فنون میں اب تک نالائق رہا۔ القصہ والد مرحوم افسوس کناں دہلی دروازہ واپس آئے تاکہ سب گھر والوں کو اور کچھ ضروری سامان لے کے خانچن کے کوچہ سے واپس جائیں اور شرکت کریں مگر اس میں ناکام رہے یعنی شہر میں یکایک قیامت برپا ہو گئی۔

شہر پر انگریزوں کا قبضہ اور کشت و خون

ہر گلی کوچے میں دست بدست لڑائی شروع ہو گئی۔ راستے سب بند ہو گئے۔ گورے، خاکی اور افغان ہر قسم کے ہتھیار باندھے فتح کے نشہ میں سرشار ٹوٹ پڑے۔ زن و بچہ، ضعیف و جوان میں فرق نہ کرتے تھے۔ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ مکانوں میں گھس گھس کر غارت گری شروع کر دی۔ وہ بیبیاں کہ بقول فردوسی:

برہنہ نہ دیدہ تنم آفتاب

کی مصداق تھیں۔ گھر چھوڑ کر اپنے مردوں کے حالات سے بے خبر جدھر کو منہ اٹھا بھاگ رہی تھیں۔ ہمارے مکان سے شہر کا دروازہ قریب تھا۔ والد مرحوم اور ماموں محمد ابراہیم خاں مع ہم سب اہل و عیال و ملازمین کے افتاں و خیزاں شہر کے باہر نکل گئے اور حضرت سید حسن رسول نما کی درگاہ میں پہنچ کر وہاں کے کھنڈروں میں پناہ گزیں ہوئے۔ یہاں رحیم بخش اور غلام رسول دو قدیم ملازمین بھی ہتھیار بستہ پہنچ گئے۔ اُن کی زبانی معلوم ہوا کہ عین دار و گیر کے دن بڑے ابا اور نواب ضیاء الدولہ مع اعزا و ملازمین مسلح گھر سے نکلے۔ اُن کا چوک میں کالے صاحب کے مکان سے مقابلہ ہو گیا۔ وہیں سب مرد شہید ہو گئے۔ عورتوں بچوں کا حال معلوم نہیں کہ کدھر گئے۔ جو صدمہ سامعین کے دلوں پر گزرا۔ وہ قابل بیان نہیں مگر خود اپنی مصیبت بھی کم نہ تھی۔ دونوں فریقوں سے خوف جان و مال تھا۔ باغی ایک طرف اور خاکی وغیرہ انگریزی فوج دوسری طرف۔ گویا شرط باندھے ہوئے تھے کہ کون خون خرابہ لوٹ مار زیادہ کرے۔ ایک دن کا واقعہ مجھ کو یاد ہے کہ میں اور دوسرے ہم سن بچے درگاہ شریف کے باہر املی کے درخت کے نیچے کھیل رہے تھے اور ایک لڑکا املی پر چڑھ کر کتارے پھینک رہا تھا کہ دور سے خاکی دکھائی دیئے بلکہ ایک خاکی تیغ بکف ہماری طرف متوجہ ہوا۔ ہم سب بچے کھنڈروں کی طرف "خاکی آ گئے، خاکی آ گئے" کہتے ہوئے بھاگے۔ عورت مرد سب یہ آواز سن کر کھنڈروں سے نکل کر ہر طرف بھاگنے لگے۔ بارے وہ خاکی چند قدم چل کر پھر اپنی ٹکڑی میں جا ملا۔ تب سب کی جان میں جان

آئی۔ خود ہمارے دونوں خدمتگار روزانہ اِدھر اُدھر دُور تک نکل جاتے اور لٹیروں کے ساتھ مل کر جنس وغیرہ کھانے کی چیزیں لُوٹ کر لاتے اور ایک گھڑا پانی سے بھرا پتھروں کے چولھے پر دھرا رہتا تھا۔ اُس میں ڈالتے جاتے۔ دال، چاول، گوشت، گڑ، گیہوں، آٹا سب اس میں مل کر پکتا تھا۔ جس کو بھوک لگتی دبے دبے پاؤں گھڑے کے پاس جاتا اور اپنا پیٹ بھر کر پھر کسی دیوار، منڈیر کی آڑ میں چھپ رہتا۔ انہی نوکروں نے خبر دی کہ خالہ صاحبہ اور اُن کے ساتھ دوسرے رشتہ دار مرد اور عورت برف خانہ میں مقیم ہیں۔ ہم سب گرتے پڑتے برف خانہ پہنچے، وہاں دیکھا، ہر طرف پہرا چوکی ہے اور سب لوگ اطمینان سے بے خوف اور بافراغت گزر کر رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ خالو آبا نے الور سے جمعیت اور سواریاں اونٹ چھکڑے، رتھیں، بہلیاں، پالکیاں اور انگریزی پروانے راہداری اور نقد کثیر رقم بھیجی ہے۔ نواب امین اللہ خاں عرف منشی اترجان ریاست الور کے وزیر اعظم تھے اور میری حقیقی خالہ کے شوہر تھے۔ یہاں دوسرے رشتہ دار بھی رفتہ رفتہ جمع ہونے لگے مثلاً بڑے خواجہ صاحب اور چھوٹے خواجہ صاحب (مترجم بوستانِ خیال) کو میرے رشتے کے چچا تھے اور بڑے ابا کا منجھلا فرزند مرزا محمود بیگ اور عورت مرد دیگر اعزا بھی آ گئے۔ اب ہم برف خانے سے الور روانہ ہوئے۔ راستہ میں چند منزل بعد نواب محمد غلام فخر الدین خاں مع اہل و عیال ایک چھکڑے میں لدے ہوئے ملے۔ غلام فخر الدین خاں میری پھوپی مرحومہ موصوفہ امانی خانم کے اکلوتے بیٹے اور نواب دبیر الملک اسد اللہ خاں غالب کے نہایت پیارے بھتیجے داماد تھے جن کی تعلیم کے واسطے غالب نے "ماہ نیم ماہ"[1] و "پنج آہنگ" وغیرہ کتابیں تصنیف کی تھیں۔ یہ لوگ بھی ہمارے ساتھ ہو لئے۔ چند روز یہاں آرام سے گزرے تھے کہ پھر فلک شعبدہ باز نیا رنگ لایا۔ ٹھاکر لکھدیر سنگھ حقیقی چچا مہاراج کا با اثر رئیس تھا یکایک اُس نے بغاوت کر دی اور راتوں رات ہمارے گھروں پر جمعیت کثیر ٹھاکروں اور میوں کی لے کر حملہ آور ہوا کچھ کشت و خون کے بعد میو مکان میں گھس آئے۔ اُن میوں نے پیٹ بھر کر ہم سب کو خوب لوٹا۔ الغرض ہم میوں کے دست بُرد کے مظلوم ایک تباہی کی حالت میں وہاں سے نکالے گئے۔ راستہ میں ایک ندی پڑتی ہے جس کا نام سابی ہے۔ ہمیشہ خشک رہتی ہے شاید برشکال میں بھری رہتی ہوگی۔ لیکن کبھی کبھی غیر موسم میں بھی کسی وجہ سے اس میں یکایک پانی آ جاتا ہے اور اس زور سے آتا ہے کہ ہاتھی بھی اگر سامنے ہو تو بہائے جائے اور جب پانی سب بہہ جاتا ہے تو پھر خشک ہو جاتی ہے۔ ہمارا جو حال ہوا قابل بیان نہیں۔ پانی کے دھکے کا صدمہ، ڈوب جانے کا خوف سر سے پاؤں تک پانی میں ڈوبے ہوئے، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا وہ بھی میدان اور جنگل کی غرض کہ جانیں بچ گئیں۔ اسی کو غنیمت سمجھے۔ کھانا وغیرہ اور کچی جنس جو ساتھ تھی وہ سب ستیاناس ہو گئی۔ رائے یہ قرار پائی کہ اسی حالت میں جس طرح ہو سکے منزل ختم کرنی چاہئے مگر چوکی کے چوکیدار جھگڑا لائے کہ مال اسباب دکھاؤ۔ یہاں تک کہ مار کٹائی پر فریقین تیار ہو گئے والد نے کچھ زر نقد اُن کے حوالے کیا۔ تب ہم سب عجب حالت بیچارگی میں آگے روانہ ہوئے اور منزل بمنزل شیدی پورہ ایک قصبہ شہر دہلی کے باہر پہاڑی پر تھا وہاں پہنچے۔

---

[1] مہر نیم روز غالب نے بہادر شاہ ظفر کی فرمائش پر لکھی تھی اور پنج آہنگ اُن کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ ماہ نیم ماہ اس کا دوسرا حصہ تھا۔ اس کے لکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ یہ بیان قرین صحت نہیں ہے کہ یہ کتابیں غالب نے غلام فخر الدین خاں کے لئے لکھی تھیں۔

شیدی پور میں قیام

یہاں ہمارے جد چچا مرزا جیون بیگ خاں کے پوتے مرزا عبداللہ بیگ عرف مرزا دولھا بیگ مع اہل و عیال و اطفال مقیم تھے۔ ہم سب ان کے پاس اُترے۔ یہاں بڑی اماں مع اپنے دونوں لڑکوں خداداد بیگ و رفیع الدین بیگ اور دختر آبادی بیگم بھی آگئیں اور مفصل حال شہیدوں کا سُنایا۔ یعنی یہ کہ بڑے ابا مرزا عاشور بیگ مع اپنے فرزند اکبر مرزا احمد بیگ و دیگر عیال و ملازمین اور نواب ضیاء الدولہ مع اہل و عیال و ملازمین سب ہتھیار بند ہو کر بستہ چاندنی چوک میں آگے بڑھے تھے کہ سامنے سے گوروں کی جمعیت نظر آئی۔ آگے آگے اُن کے سر تھیافلس مٹکاف چلا آتا تھا۔ اس کو اہل شہر "کانا مٹکاف" اس واسطے کہتے تھے کہ وہ ایک آنکھ پر شیشہ لگاتا تھا اور بادشاہ کے دربار میں ریذیڈنٹ یا ایجنٹ تھا۔ اس ظالم نے فوراً سب کو گھیر لیا۔ مرزا احمد بیگ نے تلوار میان سے نکالی مگر اُن کے والد نے اُن کو روک دیا اور کہا کہ ہیں اب شہادت کے لئے تیار ہو جاؤ اور کلمۂ توحید کا ورد کرو۔ سر تھیافلس نے عورتوں اور بچوں کو الگ کھڑا کر دیا اور مردوں کی رسن بستہ قطار کھڑی کر دی اور حکم فائر کا دیا۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ اسی وقت ایک انگریز نے ضیاء الدولہ کا ہاتھ پکڑ کر اس زور سے گھسیٹا کہ یہ ضخیم جسیم آدمی زمین پر گر پڑے۔ اُدھر رسن بستہ قطار مثل مرغانِ مذبوح لوٹنے لگے۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون۔ نواب ضیاء الدولہ عورتوں اور بچوں کو لے کر چُھپت گئے اور وہاں سے شیدی پور آگئے۔

الغرض شیدی پوری میں ہم لوگ چند روز مقیم رہے۔ شہر کے دروازہ پر گوروں کا پہرہ تھا۔ بلا ٹکٹ آمد و رفت مسدود تھی۔ بھائی علی مرزا بیگ جن کا انتقال حال میں ہوا ہے، اُن کو ضرورت شہر میں جانے کی تھی۔ میں بھی ساتھ ہوا۔ وہ کپتان کے بنگلہ پر ٹکٹ کے واسطے گئے۔ کپتان اتفاقاً باہر کھڑا ہوا تھا۔ میں نے پہلی بار انگریز کی صورت دیکھی۔ میں نہایت گورا چٹا اور فربہ تھا۔ میرے سر پر اُس نے ہاتھ پھیرا اور ٹکٹ دے دیا۔ شیدی پوری میں چچا مرزا عباس بیگ کا خط والد کے نام آیا کہ تم عاشور بیگ شہید کے اہل و عیال سمیت فوراً میرے پاس چلے آؤ۔

مرزا عباس بیگ سیتا پور ملک اودھ میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے اور خیر خواہی سرکار میں لارڈ کیننگ نے اُن کو جاگیر علاقہ بڑا گاؤں عطا کی تھی اور علاوہ اس کے پانچ سو روپیہ ماہوار بھی کر دیئے تھے جو اس زمانہ میں ہندوستانیوں کو بہت کم ملتے تھے۔ علاوہ خط کے چچا صاحب نے خرچ راہ اور پروانہ راہداری بھی بھجوا دیا تھا۔ چچا مرزا دولھا نے اپنے منجھلے فرزند علی مرزا بیگ کا نکاح بڑے ابا شہید کی منجھلی لڑکی آبادی بیگم سے بمشورہ والد ماجد کر دیا اور ہم سب لوگ سیتا پور روانہ ہو گئے۔ شیدی پوری کے قیام میں کوئی بات قابلِ تحریر نہیں بجز اس کے کہ ہر جمعہ کی سہ پہر کو شیدی گوہر کے باغ میں عبداللہ خاں داستان گو امیر حمزہ کی داستان کہا کرتے تھے۔ باوجودیکہ اہلِ دہلی کی ایسی سقیم حالت تھی کہ گھر بار سب لُٹ گیا، خانہ بدوش ہو گئے مگر چندہ کر کے داستان ضرور سُنا کرتے تھے۔

والد مرحوم کو مرض مراق تھا اور شدتِ مرض میں ایسی نوبت جنون کی پہنچتی تھی کہ از خود رفتہ ہو جاتے تھے۔ اس مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ بھی عجیب و غریب تھی۔ دادا صاحب مرحوم (مرزا اکبر بیگ) سیاح آدمی تھے۔ عربی فارسی میں فرد فرید تھے اور علوم ریاضیات ہیئت و ہندسہ وغیرہ کے علاوہ فن نجوم و رمل میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے اور اُن علوم کی تکمیل کی غرض سے دور دراز ممالک میں سیر و سفر کیا۔ حتیٰ کہ اس زمانہ میں حج بیت اللہ کی نعمت حاصل کرتے ہوئے براہِ مصر ملک اطالیہ پہنچے اور وہاں عملی ریاضیات

حاصل کی۔ وہاں سے صوبہ اصلی کی سیر کرتے ہوئے حیدرآباد دکن واپس آئے اور مہاراج چندو لال کے ہاں مہمان رہے۔ اسی زمانہ میں میرزا یوسف برادر حقیقی کلاں مرزا اسد اللہ خاں غالب افواج قاہرہ دولت آصفیہ میں نہایت معتمد عہدہ پر سرفراز تھے۔ کسی دشمن نے ایسا جادو کیا یا ایسی دوا کھلادی کہ وہ مجنون مطلق ہو گئے اور تا وقت انتقال مجنون رہے۔ الغرض دادا صاحب (مرزا اکبر بیگ) مہاراج سے رخصت ہو کر دہلی واپس آئے اور اپنے مکان شیش محل میں گھنٹہ گھر یعنی کلاک ٹاور کھڑا کیا جو تمام ہندوستان میں اس وقت تک کہیں نہیں بنا تھا مگر چند روز بعد پھر سفر کو نکلے اور لکھنؤ آئے۔ اس بار والد مرحوم کو بھی ہمراہ لائے۔ لکھنؤ میں افیون کھانے کا رواج ادنیٰ و اعلیٰ میں بہت تھا۔ والد مرحوم کو بھی افیون کی کثرت عادت پڑ گئی۔ جب دہلی واپس آئے تو بعض احباب نے چھیڑنا شروع کیا اور پھوپی صاحبہ نے جب ان کی نسبت تلاش کی تو کوئی اپنی لڑکی دینے پر راضی نہ ہوا اور مرحوم کو اس قدر غیرت دامن گیر ہوئی کہ ایک مرتبہ قسم کھا بیٹھے کہ آج سے افیون نہ کھاؤں گا۔ ایک دم ترک کے باعث سخت بیمار پڑ گئے۔ اس زمانے میں حکیم محمود خاں کی شہرت شروع ہوئی تھی اور والد مرحوم میں اور حکیم صاحب مغفور میں کمال محبت تھی۔ اُنھوں نے خاص توجہ سے ایسا نادر علاج کیا کہ گویا مُردہ کو زندہ کر دیا۔ بایں ہمہ دماغ پر اس عادتِ بد کا کچھ اثر باقی رہ گیا تھا جس سے کبھی کبھی مراق کا دورہ پڑ جاتا تھا۔

ہردوئی میں قیام

اس زمانہ میں سفر خطرناک تھا۔ اضلاع اودھ بالخصوص سیتاپور اور ہردوئی میں پاسی قوم مسافروں پر ڈاکہ ڈالتی تھی۔ والد مرحوم پالکی میں اور ہم بہلیوں میں سفر کرتے تھے۔ پروانہ راہداری کے باعث تحصیلدار، تھانہ دار ہماری نگرانی کرتے اور پاسیوں کو راہ بتانے کے واسطے متعین کر دیتے تھے۔ ایک دفعہ ہردوئی کے جنگل میں ایک پاسی ہم کو دانستہ راہ غلط کر کے گھنے جنگل میں لے گیا تاکہ وہاں چھپے ہوئے پاسی حملہ آور ہوں مگر ہمارے ملازمین یکایک چونک پڑے اور پاسی کو گرفتار کر کے منہ میں کپڑا ٹھونس کے دست و پابستہ گاڑی پر ڈال دیا اور پھر کر راستہ پر واپس آئے۔[1]

---

[1] اس زمانے کے سفر بھی خاص لطف رکھتے تھے۔ انگریزوں نے اپنے رسل و رسائل کے واسطے میل کاٹ اور مسافروں کے واسطے شکرم اسپ گاڑی دہلی سے کلکتہ تک جاری کر رکھی تھی۔ میل کاٹ پر شاید ایک یا دو مسافر کی جگہ تھی اور کرایہ مہنگا تھا۔ شکرم میں چار آدمی اندر اور دو آدمی باہر چھت پر سستے کرایہ سے بیٹھا کرتے تھے۔ پوری شکرم بھی بلا شرکت غیرے کرایہ پر دستیاب ہو سکتی تھی مگر میل کاٹ یا شکرم پر صرف اہل ثروت سفر کرتے تھے۔ عام طور پر بیلوں کی گاڑیاں جنھیں بہلی کہتے تھے کرایہ پر دستیاب ہوتی تھیں اور منزل بمنزل سفر ہوتا تھا۔ مقامات منزل مقرر تھے۔ ہر مقام پر سرائے بنی ہوئی تھی۔ جس میں بھٹیارے بسے ہوئے تھے۔ ہر روز یہ بھٹیارے اپنی سرائے سے دور تک جا کر مسافروں کو استقبال کر کے لاتے تھے۔ آپس میں خوب لڑائیاں ہوتی تھیں۔ ہر بھٹیارا اپنی صفات بیان کر کے مسافروں کو اپنی طرف راغب کرتا تھا۔ مسافر بے چارہ اُن کی باہم کشمکش میں حیران و پریشان ہو جاتا تھا۔ سرائے کے دروازہ میں داخل ہوتے ہی عجیب سماں نظر آتا تھا۔ جدھر دیکھیے گاڑیاں، بیل، گھوڑے، اونٹ وغیرہ سواریوں کا جمگھٹ ہے۔ درختوں پر جانوروں کا غل شور، تیسرے کا وقت، بھٹیاروں کی مسافروں کے ساتھ چھین جھپٹ، مسافروں کے غول کے غول پکانے ریندھنے کی فکر میں ادھر اُدھر دوڑ دھوپ اور غل غپاڑا، گھوڑوں کا ہنہنانا، بیلوں کا ڈکارنا، اونٹوں کا بلبلانا۔ شام کا رفتہ رفتہ رات ہو جانا ایک خاص سماں (بقیہ صفحہ ۹۳۱)

میری تعلیم

میں نے غدر سے پہلے چند سورتیں پارہ عمّ کی پڑھی تھیں۔ غدر کے زمانے میں الور میں قیام کے زمانے میں کھیل کود میں عمر گزاری۔ جب سیتاپور آئے تو پھر الف بے شروع کی گئی۔ دہلی میں جب قیام رہا تو بڑے خوجم صاحب سے کریما، ماقیما اور آمد نامہ پڑھتے رہے یا سید حامد اور سید محمود پسران ماموں سر سید احمد خاں کے ساتھ کھیلتے رہے اور متواتر سفروں میں سب بھول بھال گئے۔ سیتاپور میں جب مستقل قیام ہوا تو مدرسہ میں بھیجے گئے۔ تینوں عم زاد بھائی میرزا محمود بیگ و خداداد بیگ و رفیع الدین بیگ غدر کے بعد سیتاپور میں مقیم رہے تو وہ اعلیٰ کلاسوں میں پہنچ گئے اور میں سب سے پھسڈی رہا اور چونکہ کھیل کود کا زیادہ اتفاق رہا۔ پڑھنے لکھنے کی طرف رغبت بھی نہ تھی۔ الغرض جب مدرسہ میں داخل ہوا تو الف کے نام بھالا بھی نہ جانتا تھا۔ اس مدرسہ کے ہیڈ ماسٹر بابو رام چندر ایک ذی علم آدمی تھے۔ اس مدرسہ میں علاوہ اردو انگریزی کے بخواہش والد مرحوم ہندی ناگری کے کلاس میں بھی مجھے شریک کیا گیا۔ پنڈت امرناتھ سے پریم ساگر تک ناگری پڑھی۔ ذہن اور حافظہ میرا بہت اچھا تھا مگر کھیل کی طرف رغبت زیادہ تھی۔ سب سے زیادہ گیڑیوں اور گولیوں میں جی لگتا تھا۔

اس زمانے کے کھیل

دوسرے کھیل جو دہلی میں قبل از غدر جاری تھے۔ مثل کبڈی، سرنگ لال گھوڑی، کوڑی، زقند، گیند بلا وغیرہ۔ میدان کی بازیاں لڑکوں کے کھیل مثل چڈی[1] چھکول، چیل جھپٹا، گلی ڈنڈا، اور کاٹ کوٹل، آنکھ مچولی، "بڑھیا ہم نے تیری سوئی پائی"۔ اس میں ہم سن لڑکیاں بھی شریک ہوتی تھیں۔ اندرون دالان کے کھیل مثل چندر چھپول، "کوڑا جمال شاہی"، "چوکے کا تو ماروں گا"۔ اس میں بھی لڑکیاں شریک رہتی تھیں۔ خاص لڑکیوں کے کھیل "تتّی تتّی پوریاں"، "کوئی دیسا کی کوئی ویسا کی"، "کوئی چڑیا کا جھنڈا چھڑا دو جی"۔ اور قدیم سنت ماما حوا یعنی گڑیاں کھیلی جاتی تھیں۔ میں بھاگ دوڑ کے کھیلوں میں دوسرے لڑکوں سے بوجہ فربہی جسم برابری نہ کر سکتا تھا۔ البتہ ڈنڈ مگدر، کشتی، پیراکی میں کسی سے کم نہ تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۳۰) بند ہو جاتا تھا۔ بی بھٹیاری کی پکائی ہوئی موٹی موٹی روٹیاں اور کھڑے چھلکوں کی ماش کی دال، اس میں بڑا ڈونگا گھی کا رکھا ہوا، روٹیاں بھی گھی سے چپڑی ہوئی۔ بھوکے ماندے تھکے مسافروں کو وہ مزا دیتی تھیں کہ بادشاہوں کی اغذیہ لطیفہ بھی ان پر صدقہ کر دی جائیں۔ وہیں پچھلی رات تک ہر طرف چہل پہل، کہیں جھانج والوں کے نعرے، کسی طرف چلتے سارنگی و ستار کے نغمے، کہیں گاڑیوں کی گھنٹیاں رقص کناں اور کسی طرف مسافروں کی لڑائی جھگڑے کا جھنکار۔ عجب ایک تماشا لائق دید ہوتا تھا جس کو ریل کے سونے نے ہمیشہ کے واسطے معدوم کر دیا۔ اب تو خود رو گاڑی یعنی موٹر کار زمین کی چھاتی پر دال دلتی ہے اور اڑن کھٹولا آسمان کی چادر کو پاش پاش کرتا ہے۔

[1] اس کھیل پر ایک ضرب المثل "شیطان کی چڈی" بنی اور زبان زد خاص و عام تھی۔ مشہور یہ تھا کہ اس کھیل میں لڑکوں کے ساتھ شیطان بھی شریک رہتا ہے اور جب اس کی باری چڈی دینے کی آتی، تو غائب ہو جاتا ہے۔ یہ تو شیطان کی چڈی ہے یعنی اپنا کام نکال کر جب ہماری باری آئی تو پہلو تہی کر گئے۔ اسی پہلو تہی کے معنی میں گول ہو جانا بھی ہے۔ یعنی جس طرح بعض جانور اپنے بچاؤ کے لیے اپنے ہاتھ پاؤں منہ خول میں چھپا کر گول ہو جاتے ہیں اسی طرح پہلو بچا گئے۔

برادران عم زاد مذکورۂ بالا ہم سے پہلے لکھنؤ پہنچ گئے تھے اور کیننگ کالج کے اعلیٰ درجوں میں شامل ہو گئے تھے میں جب لکھنؤ آیا تو کچھ اردو لکھ پڑھ لیتا تھا اور والدہ نے قرآن مجید پڑھا دیا تھا۔ بس یہ میرا مبلغ علم تھا۔ میرے عم زاد بھائی انگریزی، فارسی، اُردو میں بدرجہا مجھ سے بڑھے ہوئے تھے۔ الغرض والد کو حالتِ مرض میں دہلی لے گئے اور چچا صاحب مرحوم کے پاس رہا۔

قیام کیننگ کالج

اُسی زمانہ میں جب کہ کیننگ کالج قائم ہوا۔ جنرل بیرو چیف کمشنر اودھ نے مرزا عباس بیگ اور بابو دکھنا رنجن مکرجی کو اپنے ہم رائے کر کے قیصر باغ میں تعلقہ داران و امرائے اودھ کی تعلیم کے واسطے ایک خاص تعلیم خانہ قائم کیا۔ جس کا نام وارڈز انسٹی ٹیوشن رکھا گیا اور تعلیم خانہ کیننگ کالج کی ایک شاخ مقرر کیا گیا۔ جس وقت میرا نام اس تعلیم خانے میں لکھا گیا۔ فقط تعلقہ داران اودھ کے یتیم لڑکے جن کی جائداد زیرِ نگرانی حکام تھی، شریک تھے۔ من جملہ ان کے راؤ پور، راجہ بھینگا، راجہ تیرا، راجہ ہڑہا، راجہ امیر حسن خاں محمود آباد، منشی ہرچرن داس، اندر کرم سنگھ، راجہ گھری گڑھ، چودھری امتیاز الزمان، چودھری مصطفےٰ حسین، شیخ یوسف الزماں، چودھری محمد واجد حسین، چودھری احسان رسول، دیویندر سنگھ وغیرہم مع راقم و محمود بیگ و خداداد بیگ و رفیع الدین بیگ ہم کوئی ۱۷، ۱۸ طلباء تھے۔

چند واقعات

ایک لطیفہ مجھ کو یہاں یاد آیا۔ ایک مردِ معقول کلکتہ سے لکھنؤ میں آئے اور فنِ شعر گوئی میں بڑا دعویٰ رکھتے تھے۔ یہ سُن کر کہ نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب معروف مرزا نوشہ میرے دادا ہوتے تھے۔ مجھ سے بکمال شوق ملنے کو آئے اپنے تئیں شاگرد دادا مرزا نوشہ کا بتایا اور ایک غزل اپنی مجھ کو سُنائی جس پر اُن کو بڑا ناز تھا۔ مطلع اس کا یہ تھا ؎

جو چشم نم اُٹھا کے دیکھا فلک کے اُوپر زمیں کے نیچے
بہایا آنکھوں سے ایک دریا فلک کے اُوپر زمیں کے نیچے

اُنھوں نے الفاظ "اُٹھا کے دیکھا" کے واسطے فلک کے اوپر سفر اختیار کیا۔ الغرض میں اُن کو منشی ظہیر الدین صاحب کے پاس لے گیا۔ وہاں بھی اُنھوں نے شاگردیِ مرزا نوشہ کی ظاہر کی اور یہ مطلع سنایا۔ منشی صاحب کو یکایک غصہ آ گیا اور کہا: "نالائق مرزا کا نام بدنام کرتا ہے۔" یہ بیچارہ شاعر نہایت شرمندہ وہاں سے اُٹھ کر بھاگا۔

میں اور غلام حسنین قدر ایک روز گومتی کے کنارے پر کھڑے ہوئے تھے کہ یکایک اُن کی شاعری کی رگ متحرک ہوئی اور یہ قطعہ اُسی وقت کہہ ڈالا۔ اچھا قطعہ ہے ؎

مصور بھی میرے دشمن ہوئے ہیں   کہ میری شبیہیں جہاں کھینچتے ہیں
گلے پر بناتے ہیں تصویرِ خنجر   کلیجے پہ نوکِ سناں کھینچتے ہیں

ایک روز مسٹر وائٹ (WHITE) نے بر سرِ کلاس یہ بیان کیا کہ زبانِ اُردو بیسٹرڈ (حرام زادی یا دوغلی) ہے۔ عربی، فارسی، بھاشا، سنسکرت سے پیدا ہوئی۔ میں کہ طفولیت سے بزرگوں کے سامنے بھی زبان دراز تھا بول اُٹھا کہ انگریزی

کب حلال زادی ہے۔ مسٹر وہائٹ (WHITE) ہنس پڑے اور کہا۔ مگر انگریزی بڑی وسیع زبان ہے۔ ہر قسم کے مطالب نظم و نثر اس میں ادا ہو سکتے ہیں مثلاً اردو میں بلینک ورس (نظم بے قافیہ) یا ڈراما (ناٹک) ناممکن ہے۔ میں نے پھر گستاخانہ جواب دیا کہ ڈرامے کے بدلے ہمارے ہاں کشمیری نقال اور بھانڈ نقلیں کرتے ہیں۔ ہمارے شعرا نے توجہ نہیں کی مگر بلند پروازی اور مضامین میں انگریزی شعرا سے اگر زیادہ تسلیم نہ کیے جائیں تو کم بھی نہیں ہیں اگر اجازت ہو تو میں ایک دو مثالیں پیش کروں۔ مسٹر وہائٹ نے کہا کہ ہم بھی سنیں۔ میں نے کہا کہ شیکسپیئر نے رومیو کی زبان سے یہ مضمون بطرز دلکش باندھا ہے کہ: ”اگر میں تیرا (جولیٹ کا) دستانہ ہوتا تو تیرے گال کو مس کرتا۔“ ذوق نے یہ مضمون اس طرح باندھا ہے ؎

گر سیہ بخت ہی ہونا تھا نصیبوں میں مرے
زلف ہوتا ترے رخسار پہ یا تل ہوتا

اس کے بعد میں نے کہا کہ اور سنیے۔ ینگ (YOUNG) ایک شاعر چند مصرعوں میں بہت اعلیٰ مضمون نہایت پُر اثر الفاظ میں باندھ گیا ہے۔ وہی مضمون مرزا غالب نے دو مصرعوں میں باندھا ہے ؎

حسنِ مہ گرچہ بہنگام کمال اچھا ہے
اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

مسٹر وھائٹ اس کا ترجمہ سن کر بہت خوش ہوئے مگر ڈراما کی بابت ضد کرتے رہے۔

اسی زمانہ میں سید حسین بلگرامی (نواب عماد الملک) کالج میں اور بابو کیشب چندر و بابو کالی کرشن ذیلی درجوں کے لیے مقرر ہوئے کیونکہ اس وقت تک مسلمانوں میں بی۔ اے بہت کم تھے۔ سید حسین صاحب کی قدر میرے چچا مرزا عباس بیگ بہت کرتے تھے۔ بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ ان کے والد اور ان کے چچا زمانۂ غدر سے قبل نواب ضیاء الدین خان و نواب امین الدین خان و شمس الدین خان پسران نواب احمد بخش خان (والیِ ریاست لوہارو و فیروز پور جھرکا) کی تعلیم کے لیے ایک جگہ ملازم تھے۔

غدر سے پہلے کے حالات

ما قبل غدر میرے بڑے ابا مرزا عاشور بیگ شہید بہت حسین و جمیل آدمی تھے۔ نہایت گورے بلکہ جھبو کا رنگ، آنکھیں سبزی مائل کرنجی۔ ریش و بروت ویسے ہی بھورے اور سنہرے تھے۔ قد نہایت بلند و بالا۔ دوہرا جسم کسرتی، سانچے میں ڈھلا ہوا۔ عربی، فارسی، ہیئت و نجوم و جفر میں مثل اپنے والد کے شہرۂ آفاق تھے۔ غصّہ ان کے مزاج میں کمال درجہ تھا۔ کل اہلِ خاندان سوائے دادا مرزا نوشہ اُن سے مرعوب تھے۔ بوجہ وفورِ علوم کچھ ذرا سی جنون کی لٹک بھی تھی۔ جس چیز کا شوق کرتے تھے اُس میں محو ہو جاتے تھے اور انتہا تک اس کو پہنچاتے تھے۔ ادویہ کا شوق ہوا تو معاجین، جوارشات، حبوب وغیرہ شیشوں میں بھری طاقوں پر دھری رہتی تھیں اور یہ سب بدست خود تیار کرتے تھے۔ کیمیا کا شوق ہوا تو ہجوم کیمیا سازوں کا باہر دیوان خانے میں شب و روز جمع رہتا تھا اور یہ سب قورما پلاؤ کباب، حلوے، مربّے وغیرہ مزے مزے کے کھانے چکھا کرتے تھے۔ ہر قسم کے ست اور کشتے تیار ہوا کرتے تھے۔ ایک صبح

کو بڑے ابا بہت خوش و بشاش محلسرا میں آئے اور بڑی اماں اور والدہ کو ایک چھوٹا سا ٹکڑا چاندی کا دکھایا کہ ہم نے بنایا ہے اُس چاندی سے ایک تختی منقش کندہ بنا کر میرے گلے میں ڈالی۔ یہ تختی میرے گلے میں سن بلوغ تک رہی۔ لکھنؤ میں وہ گم ہو گئی۔ اسی طرح شیشہ گری کا شوق ہوا تو ہر قسم کے ظروف بنا ڈالے۔ شاہ رفیع الدین کے مرید ہوئے تو تمام رات ہو حق کے نعرے لگاتے رہتے۔ مرتبۂ شہادت اُن کو ملا ہے اُن کی مغفرت میں شک نہیں۔

نواب ضیاء الدولہ

نواب ضیاء الدولہ فرزند حکیم نواب رکن الدولہ وزیر وقت تھے۔ وسیم و جسیم، میانہ قد، گندم رنگ، ریش و بروت و موئے سر سیاہ و سفید، کثیر الاولاد۔ نہایت خوش مزاج، وسیع الاخلاق، اور کثیر الاملاک تھے۔ بلکہ یہ بات اُن کے والد مرحوم کی دہلی میں مشہور تھی کہ "میں نے دولت کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں"۔ لیکن غدر میں تمام گھر اُن کا دھڑلے سے لُٹا۔ خاکیوں اور تلنگوں اور گوروں نے تنکا تک نہ چھوڑا۔ املاک اور جائداد کی یہ حالت ہوئی کہ اُن پر شبہ بغاوت کا قائم ہو کر کل جائداد سرکار میں ضبط ہو گئی اور فاقہ کشی کی نوبت پہنچ گئی۔ بالآخر لکھنؤ میں بامید استمداد چچا مرزا عباس بیگ مرحوم اپنی ہمشیرہ یعنی میری بڑی چچی کے پاس چلے آئے اور چند سال یہاں مقیم رہے۔ اُن کی حکایت بھی عبرت خیز و قابل بیان ہے یعنی جب یہاں کار برآری نہ ہوئی تو پھر دہلی واپس چلے گئے۔ اس زمانے میں شاہ عبدالعزیز معروف بہ چھوٹے حافظ جی اور اخوند جی بقید حیات تھے۔ تمام شہر کو اُن کی ذات بابرکات سے فائدۂ عظیم پہنچ رہا تھا۔ ہر مریض جسمی و مبتلائے رنج روحی شاہ صاحب سے استمداد کرتا اور فائدہ اٹھاتا۔ نواب ضیاء الدولہ ایک روز تنگ دستی سے عاجز ہو کر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اب تو یہ نوبت پہنچی ہے کہ آپ کی مسجد میں آ پڑوں۔ اور جان بحق تسلیم کر دوں۔ شاہ صاحب یہ سن کر بہت گھبرائے اور کہا کہ نواب صاحب، آپ کل تشریف لائیے۔ الغرض دوسرے روز نواب صاحب پھر پہنچے اور زہر کھانے اور جان دینے کے الفاظ زبان پر لائے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ نواب صاحب آپ لاہور جائیے۔ یہ سن کر کمال حالت مایوسی میں نواب صاحب نے کہا کہ افسوس آپ بھی مجھ سے ہنسی کرتے ہیں۔ اے صاحب میں نانِ شبینہ تک کا تو محتاج ہوں، یہ دور دراز سفر کس طرح کروں۔ وہاں قیام کس طرح کروں، کوئی وہاں آشنا، ملاقاتی واقف کار نہیں کہاں اتروں کس سے استمداد کروں۔ غربت اور اس پر تنگ دستی۔ اب میں آپ کی مسجد میں آ پڑتا ہوں۔ شاہ صاحب چپ رہے اور بعد مراقبہ یہ کہا کہ آپ سفر کا قصد کیجیے۔ اللہ سب آسان کر دے گا۔ نواب صاحب مایوس و محزون وہاں سے گھر واپس آئے۔ اب اللہ کی قدرت کا تماشا دیکھو کہ ایک ساہوکار قدیم نواب صاحب کے پاس کبھی کبھی آیا کرتا تھا۔ اتفاقاً اُس دن بھی آیا اور نواب صاحب کو مغموم دیکھ کر اُس نے کہا کہ افسوس آپ کی املاک ناحق ضبط ہوئی ہیں۔ آپ کیوں نہیں کوشش و جستجو کرتے۔ نواب صاحب نے بے مزہ ہو کر جواب دیا کہ یہاں کھانے کو نہیں ہے جستجو کس طرح ہو سکتی ہے۔ اُس نے کہا، کہ نواب صاحب میں آپ کے گھر کا نمک پروردہ ہوں اور آپ کے گھر سے ساہوکار بنا ہوں۔ آپ مستعد ہو جائیے جو خرچ ہو گا میں دوں گا۔ خلاصہ یہ کہ روپیہ پیسے سے جب اطمینان ہو گیا تو نواب صاحب مع اپنے فرزند نواب بشیر الدین احمد خاں کے لاہور پہنچے۔ دو پہر دن کے بعد شہر میں داخل ہوئے اور یہ رائے قرار پائی کہ پہلے سیدھے کچہریوں کی طرف چل کر کچھ حالات وکلا وغیرہ

دریافت کرو۔ پھر قیام کا ذکر کریں گے۔ الغرض دریافت کرتے کراتے یہ سیدھے چیف کورٹ میں اس وقت پہنچے کہ کچہری برخاست ہوئی تھی اور صدر حاکم اپنی بگھی پر سوار ہو رہا تھا۔ نواب صاحب بھی اپنی گاڑی سے اتر کر اس خیال سے کھڑے ہو گئے کہ کسی سے کچھ حالات دریافت کریں۔ صدر حاکم کی گاڑی کے پاس جا کر بہت ادب سے جھک کر اس کو سلام کیا۔ اول تو الفربہ خوبرو مرد آدمی۔ علاوہ اس کے آخر نواب تھے، چہرہ سے شان و شوکت، شرافت و نجابت برس رہی تھی۔ صدر حاکم یکایک اُن کی طرف مخاطب ہو گیا اور کہا کہ "ول تم کچھ کہتا ہے؟" نواب صاحب کے مُنہ سے نکلا کہ جی ہاں! دو ایک امور ضروری عرض کرنا چاہتا ہوں۔ صدر حاکم اُلٹا اپنے کمرے میں چلا گیا اور ان کو بُلایا۔ جب اُنھوں نے اپنی رام کہانی سُنائی تو وہ بولا "ول یہ مقدمہ کسی وکیل کے پاس لے جاؤ۔" نواب صاحب نے بچشم پُرنم کہا کہ "میں غریب الوطن ہوں۔ یہاں کسی کو نہیں جانتا۔" صدر حاکم نے چپراسی کو بُلا کر کہا کہ "دیکھو ریٹی گن (RETIGON) صاحب ہے تو ہمارا سلام بولو۔" ریٹی گن صاحب فوراً چلے آئے۔ معلوم نہیں صدر حاکم نے انگریزی میں کیا کہا۔ وہ تو چلا گیا۔ بیرسٹر صاحب ان کا ہاتھ پکڑ کر باہر آئے اور کہا کہ چیف جج صاحب نے آپ کی سفارش کی ہے اور اپنی نشست گاہ میں جا کر ان کا حال سُنا اور کہا "ہم تمھارا مقدمہ لڑے گا۔ تم جب جیت جائے گا، تب ہمارا فیس دے دینا۔" الغرض مقدمہ چلا اور وہ اُس میں جیتے۔ جائداد و املاک سب ان کے ہاتھ لگیں۔ دہلی میں پھر امیر دولت مند بن گئے۔ یہ بھی مر گئے۔ اخوند جی کا وصال ہو گیا۔ حکایت باقی رہ گئی۔

دہلی اس وقت یعنی قبل غدر خوب آباد تھی گو بادشاہت برائے نام رہ گئی تھی اور ڈھنڈوری میں یہ الفاظ پکارے جاتے تھے۔ "خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا۔" تاہم بادشاہ کا دم غنیمت سمجھا جاتا تھا۔ درباری قواعد اکبر کے وقت کے اب تک جاری تھے۔ بہادر شاہ کو قریب ایک لاکھ روپیہ ماہوار من جانب کمپنی ملتے تھے۔ شاہزادگان و سلاطین زادوں کے وظیفے علی الاستحقاق ملتے تھے اور شاہی کارخانجات کے اخراجات ادا ہوتے۔ چوب دار، خواص، باری دار وغیرہ ملازمین کی تنخواہ تقسیم ہوتی تھی۔ حکیم احسن اللہ خاں وزیر تھے۔ منشی خلیل اللہ خاں کے بعد مفتی صدرالدین خاں اُن کے شاگرد مفتی شہر تھے۔ اس لاکھ روپیہ میں سے اہل شہر کو وظیفے اور تنخواہیں ملتی تھیں۔ کچھ ایسی برکت اس لاکھ روپیہ میں تھی کہ دلی والوں کو تلاش معاش کے واسطے باہر جانے کی ضرورت نہ تھی چنانچہ میاں ذوقؔ کہتے ہیں ؎

ہے دکن میں ان دنوں گرچہ بہت قدرِ سخن
کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

اہل حرفت و صنعت سے لے کر شعرا اور علما و مشائخ ایسے جمع ہو گئے تھے کہ دُور دُور ممالک تک اپنا جواب نہ رکھتے تھے مثلاً مشائخ میں شاہ رفیع الدینؒ و شاہ عبدالقادرؒ۔ فقرا میں میاں نقا حسین رسول شاہی۔ شاہ عبدالعزیز اور چھوٹے حافظ جی معروف۔ اخوند جی۔ علما میں مفتی صدرالدین خاں، مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا صہبائی۔ شعرا میں شیخ ابراہیم ذوقؔ، حکیم مومن خاں مومنؔ، نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب معروف بہ مرزا نوشہ۔ مصوروں میں نتھوؤں کے کوچہ کے مصورین۔ مُہرکن بدرالدین خاں۔ روغن و عطر فروش میں دریبہ والا گلاب گندھی۔ رکاب داروں میں چھوٹے مرزا۔ درزیوں میں شجاعت بیگ۔ قدر دانوں میں مرزا

علی بیگ۔ سپاہ پیشہ میں علاج یار خاں و رسالدار سمند خاں۔ الغرض اس وقت دہلی میں ہر فن اور ہر ہنر، ہر پیشہ کے لوگ جابکدست نادر الوجود جمع ہو گئے تھے۔ بازاروں میں ایسی رونق تھی کہ شہر دلہن بنا ہوا تھا۔ تیسرے پہر کو چاندنی چوک میں ہر قسم کے لوگوں کا مجمع ہوتا تھا۔ ہر طرف کٹوروں کی جھنکار سنائی دیتی تھی۔ شام کے وقت جامع مسجد کی سیڑھیوں پر گدڑی بازار لگتا تھا، جہاں امرا بھی آ آ کر گرم کباب کھایا کرتے تھے۔ اخلاق اہلِ شہر کے اُس زمانے میں بُرے نہ سمجھے جاتے ہوں گے۔ رنڈیوں کی بڑی قدر تھی۔ سوائے علما، مشائخ کے باقی اُمرا، شرفا خوش باش کم ایسے تھے جو رنڈیوں سے میل جول نہ رکھتے ہوں۔ ہندو بھائی بھی سنتِ راجہ بیربل اور راجہ ٹوڈرمل پر قائم مسلمان بھائیوں سے بقول شخصے چولی دامن کا ساتھ رکھتے تھے۔ اس زمانے میں ٹوپی کا رواج کم اور پگڑی کا رواج زیادہ تھا۔ باہم پگڑی بدلا کرتے تھے اور اسی کو پگڑی بدل بھائی کہا کرتے تھے اور یہ رسم اکبر کے زمانے سے جاری تھی۔ چنانچہ راجہ بیربل و فیضی و راجہ ٹوڈرمل اور ابوالفضل و مہاراجہ جے پور مخاطب بہ مرزا راجہ اور نواب خانخاناں پگڑی بدل بھائی تھے۔ رفتار، دستار، گفتار میں کوئی فرق نہ تھا۔ اکبر کے زمانے کا جامہ وغیرہ ترک ہو گیا تھا اور چولی دار انگرکھے بھی ترک ہوتے جاتے تھے۔ ان کی جگہ پر نیچے انگرکھے بغیر چولی کے پہنے جاتے تھے۔ مسلمان سیدھی طرف اور ہنود الٹی طرف پردہ رکھتے تھے۔ بس یہی وجہ تمیز دونوں میں رکھا گیا تھا۔ اُردو بولتے تھے مگر خط و کتابت و تصنیف و تالیف فارسی زبان میں جاری تھی اور اس میں ہنود مسلمانوں سے دعویٰ ہمسری رکھتے تھے۔ چنانچہ انشائے مادھو رام اور مینا بازار وغیرہ مسلمانوں کے مکتبوں میں بھی جاری تھیں۔ ہولی، دسہرہ، دیوالی، عید، بقرعید میں باہم محافل و مجالس میں شریک رہتے تھے۔ غدر سے پہلے دسہرہ یا ہولی کے ایام میں فتحپوری کے محلہ میں ایک جلسہ ہوتا تھا جس کا نام کفر کچہری تھا۔ ایک شخص میلی کچیلی پھٹی پرانی پتلون پہن کر ٹوٹی پھوٹی ہیٹ سر پر رکھ کر گویا ریزیڈنٹ بنتا تھا۔ میز پر قلم دوات کاغذ اور خود کرسی پر بیٹھتا تھا۔ باقی حضرات کوئی سرشتہ دار، کوئی محرر اور چپراسی وغیرہ پورا عملہ کچہری کا بنتا تھا۔ مقدمات دل لگی کے دائر ہوتے تھے۔ ٹیسو دھوم دھام سے نکلتے تھے۔ لڑکیاں گنگریاں نکالتی تھیں۔ ان ایام میں غلام رسول خاں ایک سنگ دل جابر آدمی کوتوال شہر تھا۔ ٹیسو نکالنے والوں نے اس کے نام پر تک جوڑی تھی۔ ایک بول اس کا مجھ کو یاد ہے ؎

ہمارے ٹیسو نے کھائی تھی ببول
اس میں سے نکلا غلام رسول

اس تک بندی کو بالی کہتے ہیں۔ اُس وقت کے انگریزی حکام بھی بے تکلف ملتے جلتے تھے۔ ریزیڈنٹ شب کو کابلی بلند نوک دار ٹوپی سر پر، چوڑا آستینوں کا کرتا، غرارہ دار پاجامہ پہن کر مسند پر بیٹھتا تھا۔ پیچوان سامنے لگا رہتا تھا۔ امرائے شہر جمع ہوتے تھے۔ باہم حرف و حکایات، شعر و شاعری اور سب سے زیادہ شطرنج بازی ہوتی تھی۔ سلاطینوں میں مرزا کرامت شاہ، اپنے زمانے میں

---

[1] ایک امر بالخصوص قابلِ بیان یہ ہے کہ کل باشندگانِ شہر سر کے بال کان کی لو تک رکھتے تھے۔ اِلّا فقرا، علما و مشائخ جو بعض منڈا کر رکھتے تھے اور اکثر چہرہ کو منڈوایا کرتے تھے۔ ہمارے زمانے میں بہ پیروی اہلِ یورپ سر کے بال خشخاشی کترے ہوئے رکھے جاتے ہیں۔ اسی طرح داڑھی منڈوانا نہایت بے حیائی اور شرم کی بات سمجھی جاتی تھی۔ عام وضع یہ تھی کہ داڑھی چڑھائی جاتی تھی اور مونچھیں اس طرح رکھتے تھے جیسے دو بچھو ڈنک والے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس زمانے میں داڑھی منڈائی جاتی ہے اور مونچھیں اس طرح بنائی جاتی ہیں کہ گویا دو جوہے دُم دار بیٹھے ہوئے ہیں۔

زود فہم شاعر تھے۔ اہل شہر انگریزی حکام سے بے جھجکی کے ساتھ ملتے تھے۔ مسٹر فٹز پیٹرک FITZ PETRICK جو رفتہ رفتہ سر ڈنس فٹز پیٹرک ہوئے۔ غدر سے پہلے کسی عدالتی عہدہ پر مقرر تھے۔ اکثر اوقات نواب امین الدین خاں و نواب ضیاء الدین خاں والیان ریاست لوہارو کے ہاں اکثر شطرنج کھیلا کرتے تھے۔ یہ صاحب چند روز کے واسطے حیدرآباد دکن میں رزیڈنٹ رہے تھے۔ یہ مجھ پر بہت مہربان تھے۔ پھر ملک پنجاب کے لفٹنٹ گورنر ہوئے اور وہاں نواب لوہارو حال کے ساتھ بڑے بڑے سلوک کیے۔ الغرض ہر فرقہ میں باہم معاشرت بے تکلفانہ قائم تھی۔ ایک انگریزی حاکم نے ایک میواتی (سروں) کے ساتھ نکاح کیا تھا۔ اس کا بھی گیت بہت گایا جاتا تھا۔ سروں کا بھائی دہلی کے بازاروں میں خوب اکڑ کر چلا کرتا تھا۔

پھول والوں کی سیر مقام مہرولی مزار حضرت قطب عالم سید السادات قطب الدین بختیار کاکی بڑی دھوم دھام سے ہوتی تھی۔ پنکھا شان و شوکت سے چڑھتا تھا۔ بادشاہ بھی مع جلوس رونق افروز ہوتے تھے۔ عرس بزرگان دین و اولیاء اللہ قابل دید ہوتے تھے۔ خصوصاً حضرت سلطان الہند غریب نواز عطائے رسول حبیب اللہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی ثم اجمیری جلوس کے ساتھ اجمیر شریف روانہ ہوتی تھی۔ شہر میں روزانہ بعد عصر ایسا مجمع کثیر عوام و خواص کا ہوتا تھا کہ شانہ سے شانہ لڑنے کی نوبت آتی تھی۔ گھوڑے گاڑی بگھی، فٹن وغیرہ کا رواج نہ تھا۔ امرا و خوش حال گھوڑوں، ہاتھیوں، نالکی پر یا پیادہ اور تام جھام، پینس و پالکی پر سوار ہوتے۔ میں نے کسی یورپین سیاح کی تصنیف میں پڑھا ہے کہ چاندنی چوک کا مثل اور دلی کے انگرکھے کی نظیر بڑے بڑے پایۂ تخت ہائے یورپ میں بھی نہ تھی۔ مغرب کے وقت جامع مسجد کی سیڑھیوں پر گدڑی بازار لگا کرتا تھا۔ ٹی کے کباب چٹپٹے مزے دار اور سونٹھ کے پانی کے مزے۔ مغل بچے، آکا لوگ انگرکھے سر پہ باندھے ہوئے دلی کا انگرکھا زیب بدن، بلکہ ذی مرتبت لپٹے ماش بھی بیچا کرتے تھے۔ یہ جوبن والا شہر تھا مگر بقول شخصے ؎

خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی؟

قلعہ والوں کے اخلاق نہایت بد تھے۔ سوائے بادشاہ باقی کل شاہزادے و شاہزادیاں سلاطین حرام و حلال کے احکام سے ناواقف تھے اور بیشتر ان میں سے جاہل مطلق تھے۔ البتہ زبان اُردو قلعہ کی مستند تھی۔ عیدیں شہر میں دھوم دھام سے ہوا کرتی تھیں۔ بادشاہ مولا بخش نام ہاتھی پر عیدگاہ برائے نماز جایا کرتے تھے۔ یہ ہاتھی ہمیشہ مست رہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ حضرت ناصر الدولہ والی ملک دکن نے نذر گزرانا تھا۔ بچے اس سے کی لالا کھیلا کرتے تھے کہ جب بادشاہ کو انگریز دلی سے لے گئے۔ مولا بخش نے کھانا پینا ترک کر دیا تھا اور بالآخر بھوکا پیاسا مر گیا۔ الغرض دہلی ایسی آباد تھی کہ امرا و خوش حال، علماء و فقراء، ملازمت پیشہ و اہل حرفت اپنی اپنی حالت میں نہایت بے فکر و آسودہ زندگی بسر کرتے تھے۔

ایک گروہ اس زمانہ میں عجیب پایا جاتا تھا جس کو "آکا" یا مغل بچے کہا کرتے تھے۔ یہ لوگ مغل بچے قدیم امرا کی اولاد نہ پڑھے نہ لکھے کاہلی کی وجہ سے کسی پیشہ یا نوکری کے قابل نہ تھے مگر بوجہ شرافت خاندان ہر صحبت، ہر محفل و مجلس میں باریاب تھے اور اہل مقدرت کی فیاضی پر زندگی کی گزران تھی۔ خوش رو، خوش جسم، خوش وضع، خوش رفتار، خوش گفتار، لطیفہ گو، بامروت، باوفا، گرم مزاج، زود رنج، یہ ان کے صفات تھے۔ افسوس یہ گروہ مفقود ہو گیا۔ صرف ایک فرد کبیر السن ہم صفات

مذکورہ باقی رہ گیا تھا۔ برادرم محمد اکرام اللہ خاں مرحوم اس کے خبرگیراں تھے۔ یہاں پر ایک حکایت مجھ کو یاد آئی۔ بادشاہ کی انّا کے بیٹے کو شوق حج و زیارت دامن گیر ہوا۔ اس کی والدہ نے رقم کثیر نذر کی۔ آغا چوک میں کھڑے ہوگئے اور ہر آیندہ روندہ سے گلے ملنے لگے۔ لوگوں نے پوچھا کہ آغا یہ کیا بات ہے۔ فرمایا کہ حج بیت اللہ کو جا رہے ہیں۔ بعد چند روز کے آغا پھر شہر میں دکھائی دیئے۔ دریافت حال پر ارشاد فرمایا کہ ابھی ہم تو جاتے تھے مگر واقف کاروں نے ہم سے کہا کہ کعبہ شریف میں حقہ نیچوں کا کوئی مستری ہی نہیں ہے۔ خلاصہ یہ کہ اُن کی والدہ اُن سے ناراض ہوگئیں اور روپیہ روز جو اُن کو دیا کرتی تھیں وہ بند کر دیا۔ آغا نے ایک عرضی بادشاہ کو لکھی کہ "اصیل مُرغی جو روز انڈا دیا کرتی تھی۔ اب کڑک ہوگئی" بادشاہ نے خود روپیہ روز جاری کر دیا۔

ایک آغا بڑے چچا خواجہ جان مرحوم کے ہاں رہتے تھے۔ ایک روز سہ پہر کے وقت اپنے حجرے کے باہر بیٹھے ہوئے سُلفے کا دم لگا رہے تھے۔ بیٹا سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں بھنگ کے نشہ میں چُور تھے اور ہم سب چبوترے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ یکایک آغا نے بیٹے سے کہا کہ جانِ پدر آج جی چاہتا ہے کہ عربی بولیں۔ بیٹے نے کہا کہ جو حکم۔ آغا نے کہا کہ (انا کم وکاہ) بیٹے نے جواب دیا کہ (بیری بچھو کاہی)۔ آغا بہت خفا ہوئے اور کہا کہ او نالائق "انا" اور "کم" تو دو لفظ عربی کے ہیں۔ یہ بیری بچھو کونسا لفظ عربی ہے۔ اُن کا تکیہ کلام "چناں چہ" تھا اور کچھ قدرے قلیل فارسی بھی پڑھے ہوئے تھے۔ فارسی بولنے کا بڑا شوق تھا۔ ماہ رمضان میں ایک روز اُن پر روزہ رکھنے کی فرمائش کی گئی۔ دوسرے دن صبح کو دیکھا کہ آغا اپنے حجرے کے آگے بھنگ[1] گھونٹ رہے ہیں اور سُلفے کا دم لگا رہے ہیں اور حجرہ میں سے قاؤں قاؤں کی آواز آ رہی ہے۔ لوگوں نے کہا کہ آغا آج تو تم روزہ سے ہو۔ یہ بھنگ کیوں گھُٹ رہی ہے۔ فرمایا کہ بھائی چناں چہ میں نے رات کو نیت روزہ کی باندھی مگر میری سحری چناں چہ یہ کتا کھا گیا۔ چناں چہ میں نے اس کو چھت پر ہاتھ پاؤں باندھ کر لٹکا دیا کہ تُو نے چنانچہ سحری کھائی تُو ہی چنانچہ روزہ بھی رکھ۔

الغرض دہلی والے بے فکری سے زندگی بسر کرتے تھے اور حق یہ ہے کہ بعد عالمگیر کے شہر دہلی میں کسی بادشاہ کے وقت میں ایسا مجمع اہل علم و اہل کمال کا نہ ہوا ہوگا۔ جیسے اب اجڑے وقت تھا جس طرح چراغ بجھتے وقت بھڑک اُٹھتا ہے دہلی بھی اپنی آخری روشنی دے کر خاموش ہوگئی۔

زمانہ غدر کے حالات

زمانۂ غدر کے حالات ناقابلِ بیان ہیں۔ جب میرٹھ کی فوج شہر میں گھُسی اور قلعہ دار وغیرہ انگریزوں کو مار کر شہر پر مسلط ہوئے تو فرعون سے زیادہ خود سر اور بے باک تھے۔ حتیٰ کہ بادشاہ کو بھی "بڈھو سلام" کہا کرتے تھے۔ اُمرا اور شرفا نے گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ افسران فوج البتہ زیادہ بااخلاق تھے مگر وہ بھی یہ کہتے تھے کہ یہ پوربیے ہمارے قابو کے نہیں ہیں۔ اس فوج نے مرزا ابوبکر و مرزا مغل وغیرہ جوان جوان، خوب صورت، خوش وضع شاہزادوں کو اپنا افسر بنایا تھا۔ شاید اس خیال پر کہ عام ہمدردی اُن کے ساتھ ہو جائے۔ ان غریبوں

---

[1] شہر میں بھنگ کا بہت رواج تھا افیون و شراب سے عوام تک نفرت رکھتے تھے۔ سوائے فقرا و رسول شاہی مریدان میاں قدا حسین جھنجھوٹا نے یہ نیا فرقہ فقرا کا قائم کیا تھا۔ سر، داڑھی، مونچھ، بھویں سب صفا چٹ نشہ میں چُور رہنا ہو کا دم لگاتے تھے۔

وحشیوں کی گستاخیوں سے بچنے کے خیال سے افسری قبول کر لی تو ایک روز بھی پہاڑی پر لڑنے کو نہیں گئے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ والد مرحوم جو نہایت سُرخ و سفید بھورے بال، کنجی آنکھ، دراز قد، ورزشی جسم کے آدمی تھے، کسی ضروری کام کے واسطے باہر نکلے، پوربیوں نے فوراً گرفتار کر لیا اور قلعہ میں لے گئے۔ اہلِ قرابت بھی کمریں باندھ کر پگڑیاں سر پر رکھ کر ہتھیار بند بادشاہ کے پاس پہنچے۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ میری کون سنتا ہے۔ افسرانِ فوج کے پاس جاؤ۔ افسرانِ فوج نے جواب دیا کہ فوج کو یقین ہو گیا ہے کہ اس فرنگی کو آپ صاحبوں نے اپنے گھر میں چھپا رکھا تھا۔ بہت کچھ گفت و شنید ہوئی اور مرزا ابوبکر وغیرہ شاہزادگان تک نوبت پہنچی اور بالآخر پانسو روپیہ نقد لے لئے تو ان کو چھوڑا۔

مرزا عباس بیگ

مرزا عباس بیگ کے حالاتِ زندگی قابلِ بیان ہیں۔ وہ میرے والد مرحوم سے بڑے اور مرزا عاشور بیگ سے چھوٹے تھے۔ نہایت حسین اور خوب صورت۔ کمال سُرخ و سفید، جسم سانچے میں ڈھلا ہوا، میانہ قد اور طاقت خداداد رکھتے تھے۔ جوانی میں عیاش طبع، رنگین مزاج اور احباب پرست تھے۔ اگرچہ پڑھنے لکھنے کا شوق کم تھا مگر عجیب تر یہ کہ اس زمانہ میں ان کو انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا اور اس قدر پڑھی کہ تحریر و تقریر کر لیتے تھے۔ فارسی میں معمولی لیاقت تھی اور عربی سے ناواقف تھے۔ ماسٹر رام چندر اس زمانے میں عیسائی ہو گئے تھے۔ مرزا بھی ان کے شاگرد ہو گئے۔ مرزا اگرچہ بہت عیاش اور رنگین مزاج تھے مگر شعر گوئی تو ایک طرف شعر صحیح بھی نہ پڑھ سکتے تھے۔ مرزا عباس بیگ نے انگریزی تحریر و تقریر کی لیاقت فی الجملہ حاصل کر لی تھی اور اپنی بلند بختی کے واسطے میدان وسیع کی تلاش میں تھے۔ وہ موقع ان کو خوش قسمتی سے مل گیا یعنی ان کے حقیقی چچا مرزا افضل بیگ المخاطب بہ جواد الدولہ وکیل سلطنت بغرض تصفیہ چند اہم امور وائسرائے کے پاس کلکتہ بھیجے گئے۔ چونکہ کلکتہ میں ان امور کی بابت دشواریاں پیدا ہوئیں، انھوں نے اپنی طرف سے راجہ رام موہن رائے کو بخطاب راجگی انگلینڈ روانہ کئے اور خود وہاں سے اپنے ساتھ ایک بنگالن ماہ رخا کو لے کر واپس آئے مگر زندگی نے وفا نہ کی اور جلد انتقال کیا۔ یہ بیوہ مرزا کے حسن و جمال پر عاشق ہو گئی۔ ادھر ان کے والد ماجد ان کی رفتار سے ناراض ہو گئے۔ یہ اسباب ہوئے کہ یہ اس عورت کو لے کر نکل کھڑے ہوئے اور پنجاب میں ایک راجہ کے ہاں ملازم ہوئے۔ چونکہ قوی ہیکل، وجیہ اور جمیل تھے۔ راجہ نے ان کو اپنی مصاحبت خاص میں رکھا۔ یہ امر دیگر مصاحبین کو شاق گزرا اور راجہ سے موقع پا کر عرض کیا کہ آپ کی محبوبہ رنڈی مرزا کی طرف بہت راغب ہے۔ راجہ نے ایک شب ان کو خوب شراب پلائی اور رنڈی کو حکم دیا کہ ان کے حجرے میں جائے۔ مرزا نشے میں چور تھے مگر چھرا لے کر اس کی ناک کاٹنے کے واسطے کھڑے ہو گئے۔ وہ رنڈی بھاگ نکلی۔ راجہ یہ سب تماشا خود دیکھ رہا تھا۔ اپنے مصاحبین پر بہت خفا ہوا اور مرزا کی شرافت کا معترف ہو گیا مگر مرزا صبح کو راجہ کے پاس گئے اور کہا کہ خانہ آباد و دولت زیادہ۔ آپ نے میرے ساتھ وہ کام کیا جو کوئی رئیس اپنے ملازم کے ساتھ نہ کرتا۔ ہر چند راجہ نے عذر معذرت کی مگر یہ نوکری چھوڑ کر لاہور چلے گئے اور کوتوال شہر مقرر ہو گئے۔

چچا مرحوم بیان کرتے ہیں کہ میں اس زمانہ میں اس قدر رشوت خوار تھا کہ آٹھ آنے بھی نہ چھوڑتا تھا اور بہت زر و سیم و نقد جنس جمع کر لیا تھا مگر باوجود اس دولت کے اہلِ خاندان میں بنیت سے باہر تھا۔ سوائے والد مرحوم اور پھوپی صاحبہ مرحومہ اور

کوئی دوسرا اُن سے نہ ملتا تھا۔ علاوہ اس وجہ کے جو اُوپر بیان کی گئی۔ ایک وجہ بہت بڑی یہ بھی تھی کہ کل خاندانی جاگیرات اُن کی بدولت خاندان سے نکل گئی تھیں اور بوجہ عدم ثبوت و اتلاف اسناد سرکار میں ضبط ہو گئی تھیں۔ پنجاب میں اُنھوں نے اپنا مذہب تبدیل کیا اور وجہ تبدیلی یہ بیان کرتے تھے کہ ایک شب اُنھوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک چھینکے میں ایک سر بریدہ رکھا ہوا ہے اور اُن سے کہتا ہے کہ تم اہل بیت علیہم السلام سے محبت رکھو۔ پنجاب میں ایک فقیر نے ان کو ایک نقش دست غیب کا بخشا اور اُن کا قول تھا کہ کل دُنیاوی کامیابی اُن کو اُس نقش کی بدولت حاصل ہوئی تا زمانۂ وفات یہ نقش وہ بعد نماز ظہر لکھا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ میرے والد مرحوم اور پھوپی صاحبہ اُن سے ملنے کے واسطے فیروزپور گئے ہوئے تھے کہ ایک روز مرزا تو اپنی کچہری میں تھے اور والد مرحوم باہر دیوان خانہ میں مسائل ریاضیات حل کر رہے تھے کہ ایک ہمسایہ ایک چھوکری کو لایا اور کہا کہ آپ اس چھوکری کو رکھ لیجئے۔ میں باہر جاتا ہوں۔ دو تین روز میں واپس آؤں گا اپنی چھوکری کو لے جاؤں گا۔ والد مرحوم یہ سمجھے کہ شاید بھائی کا دوست ہے جو اس طرح بے تکلف آیا۔ چھوکری کو اندر زنانہ میں بھجوا دیا۔ وہ شخص تو چل دیا مگر پولیس کی دوڑ آن پہنچی۔ چھوکری کو پکڑ لے گئے۔ ڈپٹی کمشنر کہ موقع کا منتظر تھا۔ اُس نے مقدمہ بردہ فروشی یا یوں کہو کہ لونڈی خریدنے کا مرزا پر قائم کر کے معطل کر دیا۔ چچا مرحوم کہتے تھے کہ اس مقدمہ کو اس قدر طول ہوا کہ کل جمع پونجی خرچ ہو گئی اور نوبت فاقہ کشی کی پہنچی۔ ڈپٹی کمشنر نے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیا۔

یہ بھیس بدل کر اُونٹ کرایہ کر کے ملتان میں افتاں خیزاں رات کو سفر کرتے ہوئے اور دن کو چھپتے ہوئے جنرل ایبٹ (ABBOT) کے پاس اس وقت شب کو پہنچے کہ وہ رات کا کھانا کھا کر مع اپنی زوجہ کے قہوہ وغیرہ پی رہا تھا۔ مرزا نے اونٹ سے کود کر جس کمرہ میں روشنی دیکھی۔ بے باکانہ دروازہ کو دھکا دیا اور اندر گھس گئے۔ میم بیچاری تو ہائے کر کے بیہوش ہو گئی جنرل فوراً طمنچہ لے کر اُن کی طرف بڑھا۔ خلاصہ یہ کہ بعد جان پہچان شناخت نام و نشان جنرل نے کل حال سُنا اور دونوں ایک ایک طمنچہ لے کر ڈاک گاڑی میں جانب لاہور روانہ ہوئے۔ راستہ خیر و عافیت سے گزرا۔ لاہور پہنچ کر جنرل سیدھا اُن کو سر ہنری کے پاس لے گیا۔ سر ہنری (HENRY) اپنی کچہری میں تھا۔ مرزا نے کہا۔ یہاں مجھ کو پولیس پکڑ لے گی۔ جنرل نے کہا تم فوراً طمنچہ مار دینا یہ کہہ کر وہ خود تو سر ہنری کے پاس گیا۔ مرزا گاڑی میں دروازہ بند بیٹھے رہے۔ تھوڑی دیر بعد جنرل واپس آیا اور مرزا سے کہا پولیس سے مت ڈرو اور میرے ساتھ چلو۔ سر ہنری نے بُلایا ہے۔ الغرض سر ہنری نے شکایت کی کہ "تم ہمارے پاس کیوں نہیں آیا جو ملتان گیا۔" اور تمام حال سُن کر وارنٹ کی منسوخی کا حکم جاری کر دیا اور ٹمپل صاحب کے محکمہ بندوبست میں خدمت عطا کر دی۔ بعدہٗ ملک اودھ میں وہ سر ہنری کے ساتھ چلے آئے۔ ایام غدر میں ملاوں کے تحصیلدار تھے۔ باغیوں نے تحصیل پر حملہ کیا تو اُنھوں نے بکمال جوانمردی خزانہ کو بچا کر جنرل اوٹرام کے پاس روانہ کر دیا اور خود پا پیادہ وہ بھیس بدل کر جنگل جنگل چھپتے ہوئے بلگرام پہنچے۔ اہل بلگرام نے ان کو اپنے ہاں پوشیدہ رکھا۔ یہاں بیٹھ کر اُنھوں نے انگریز حکام سے خط و کتابت شروع کر دی اور باغیوں کی حرکات و سکنات سے اطلاع دیتے رہے۔ پھر یہ فرخ آباد بھیجے گئے۔ یہاں بھی ایک عجیب واقعہ ہوا۔

یعنی نواب فرخ آباد کے اسباب ضبط شدہ میں ایک تلوار گم ہو گئی جس کا قبضہ اور میان کئی لاکھ کا گراں قیمت تھا۔ چند انگریز جو سامان کی پڑتال کرنے کو مقرر تھے۔ اس میں سے ایک انگریز نے جس کا نام بھول گیا۔ مرزا سے کہا کہ "تم اس کا ذمہ دار ہے۔" مرزا نے فوراً طپنچہ اس پر جھونک دیا۔ نذری صاحب نے بکمال تعجیل مرزا کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ گولی زمین پر گری۔ یہ نال پکڑ کر کندی سے اس کا سر پھوڑنے کو چلے۔ انگریزوں نے ان کو پکڑ لیا اور اس انگریز کو دوسرے کمرہ میں کر دیا۔

قائمی مجلس تعلقہ داران اودھ

فرخ آباد سے سیتا پور میں ڈپٹی کلکٹر درجہ اوّل بماہوار ششصد روپیہ مقرر ہوئے اور جاگیر بڑا گاؤں انعام میں ان کو عطا ہوئی۔ لکھنؤ میں جب اُن کا قیام ہوا تو جنرل ایل بیرو چیف کمشنر یعنی امیر ملک اودھ اور مہاراجہ مان سنگھ قائم جنگ صدر الصدور تعلقہ داران اودھ تھے۔ ان تینوں کی رائے سے کیننگ کالج اور دیگر تعلیم گاہ ورثیاں تعلقداران موسوم بہ وارڈ انسٹی ٹیوشن قائم ہوا۔ مگر بڑا کام ان سے یہ ہوا کہ مجلس تعلقداران اودھ قائم کی گئی۔ جس کے صدر و کرسی نشین مہاراجہ مان سنگھ قائم جنگ قرار پائے اور بابو دکھنا رنجن معتمد یعنی سکرٹری نامزد ہوئے۔ جب مرزا نے وظیفہ یعنی پنشن لی تو بعد بابو دکھنا رنجن یہ خود سکرٹری بنائے گئے۔ یہاں پر بھی ایک واقعہ قابلِ تحریر گزرا ہے یعنی کالج قائم ہوتے وقت تعلقداران کا ایک جلسہ شوریٰ منعقد ہوا جس کے صدر جانشین خود کمشنر اودھ اور نائب الصدر مہاراجہ اور معتمد مرزا تھے۔ اس جلسہ میں ابتدائی امور طے ہوئے۔ منجملہ ان کے اس امر پر بھی بحث ہوئی کہ مدرسہ قرار پائے یا کالج اور ابتداً ہیڈ ماسٹر مقرر ہو یا پرنسپل۔ مہاراجہ کی رائے باتفاق راجہ تجمل حسین خاں وغیرہ تعلقہ داران حاضرین یہ تھی کہ ابتدا میں زیادہ خرچ نامناسب ہے لہٰذا ہیڈ ماسٹر مقرر کیا جائے۔ جنرل بیرو اور مرزا نے رائے پرنسپل کی دی۔ مہاراجہ نے برائے طنز کہا کہ "ہاں مرزا صاحب آپ کے بچے اس میں پڑھتے ہیں۔ اس واسطے آپ نے رائے دی ہے۔" مرزا کو ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتے تھے یکایک جامہ سے باہر ہو گئے اور جواب دیا کہ "تو ایک دھوتی بند سور باسکر پوجنے والا تُو معاملاتِ تعلیم و تربیت کو کیا سمجھے۔" مہاراجہ اس مرتبہ کے آدمی تھے کہ تمام تعلقہ داران اودھ کیا ہندو کیا مسلمان' مہاراجہ کی پوجا کرتے تھے۔ یہ الفاظ سن کر دنگ رہ گئے اور جنرل بیرو نے انگریزی میں بہ تشدد کہا کہ "مرزا کیپ یور ٹیمپر (KEEP YOUR TEMPER) یعنی اپنے مزاج کو قابو میں رکھو۔ یہ سن کر حضرت نے کُل کاغذات جنرل کے سامنے پھینک دیے اور یہ کہہ کر کہ آپ دوسرا معتمد بنا لیجیے۔ کرسی پر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جلسہ درہم برہم ہو گیا۔ مرزا اسی حالت غیظ و غضب میں گھر واپس آگئے اور امیر خاں داروغہ پر غصہ اتارتے ہوئے اندر کوٹھی میں چلے گئے۔ یہ کپڑے اتار ہی رہے تھے کہ سامنے سے مہاراجہ کی سواری نمودار ہوئی۔ میں نے دوڑ کر چچا کو اطلاع دی۔ وہ اسی طرح صرف کرتہ پہنے باہر چلے آئے۔ عجب طرح کی ملاقات ہوئی۔ مرزا تو نادم و شرمندہ صورت سر جھکائے ہوئے بیٹھے رہے۔ مہاراجہ ایک دو منٹ کے بعد تبسم کناں گویا ہوئے کہ مرزا صاحب! میں ایک امر خاص کی بابت آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔" مرزا نے کہا "مہاراج اب آپ زیادہ مجھ کو شرمندہ نہ کیجیے۔ میں ایک جاہل مزاج سپاہی پیشہ آدمی ہوں۔ مجھ سے آج نہایت جاہلانہ خطا سرزد ہوئی جس کی میں معافی مانگتا ہوں۔" مہاراجہ نے ارشاد فرمایا "نہیں مرزا صاحب میں بقسم کہتا ہوں کہ میں واقعی آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں اس واسطے

کہ ان تعلق داروں نے حضور اور مہاراج وغیرہ القاب دے کر مجھ کو بلا استحقاق واجب التعظیم بنا دیا تھا۔ آج آپ نے مجھ کو بیدار کیا۔"

سفر حیدر آباد دکن

میں پہلے تحریر کر چکا ہوں کہ مدرسے کی تعلیم و درسی کتابوں پر میرا دل نہیں لگتا تھا۔ مجھ کو خود حیرت ہے کہ میں نے انٹرنس کا امتحان بدرجۂ اول کیونکر پاس کیا۔ بہرحال فرسٹ آرٹ کے امتحان میں ناکامیاب رہا اور کالج سے ایسا برداشتہ خاطر ہو گیا کہ بار دوم امتحان دینے کے واسطے کسی طرح دل نہ چاہا اور فکر دامن گیر ہوئی کہ چچا مرحوم پر اپنا بوجھ نہ ڈالنا چاہیے۔ اتفاقاً مجھ میں اور میری چچی میں بے مزگی بھی پیدا ہو گئی اور میں نے کسی طرف بتلاش روزگار نکل جانے کا قصد مصمم کر لیا۔ سید حسین صاحب بلگرامی نے میرے اس خیال کی تائید کی۔ خلاصہ یہ کہ چچا مرحوم نے بھی مجھ کو اجازت عطا فرما دی اور بالآخر حیدر آباد دکن کا سفر بوجوہ چند قرار پایا۔

حیدر آباد کے قصد سے قبل ایک عجیب واقعہ ہوا یعنی میں جب کالج سے گھر آیا تو ایک برہمن مفلوک الحال دروازہ پر کھڑا ہوا تھا۔ پوتھی بغل میں دبی ہوئی تھی۔ اس کے سوال پر میں نے کہا کہ کیوں جھوٹی باتیں بنا کر حرام کھاتا ہے۔ کہیں نوکری کر لے ابھی تو جوان تندرست ہے۔ اس نے جھلا کر کہا۔ میاں ذرا بیٹھ جاؤ اور اپنا ہاتھ دکھاؤ۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ اس نے اول ہاتھ دیکھا اور بعدہٗ پوتھی خوب بچار کر بولا کہ فلاں دن تم دکن روانہ ہو جاؤ گے۔ میں ہنس پڑا اور کہا کہ تو جاؤ اور اپنا راستہ لو۔ تمہاری پوتھی کا حال معلوم ہو گیا۔ اس نے کہا کہ میاں فلاں دن میں پھر آؤں گا۔ اگر تم یہاں رہے تو تمہارے سامنے میں پوتھی کو پھینک دوں گا۔ ورنہ چلتے وقت کسی کو جو تمہارا جی چاہے میرے واسطے دیتے جانا۔ افسوس ہے کہ چلتے وقت کچھ چھوڑ جانا بھول گیا اور واقعی اسی دن روانہ ہوا۔

بھائی صاحب نے چلتے وقت ایک خط مجھ کو دیا تھا۔ اس کے لفافہ پر لکھا ہوا تھا۔ "بلدۂ حیدر آباد محلہ مستعد پورہ نزد برادرم حکیم علی رضا برسد۔" میں سیدھا دریافت کرتا ہوا مستعد پورے پہنچا اور حکیم صاحب کے دروازے پر آواز دی۔ ایک نوجوان، گندم رنگ، میانہ قد، لنگی باندھے ہوئے کالا سا رومال سر پر لپیٹے ہوئے باہر نکلے۔ بعد سلام علیک کے وہ خط میں نے ان کو دیا۔ انھوں نے خط پڑھ کر کہا کہ بھائی صاحب سید علی رضا گاؤں گئے ہوئے ہیں۔ میں محمد رضا ان کا برادر خورد ہوں۔ ان کا مکان سکونت خالی ہے۔ آپ تشریف لائیے۔ البتہ ان کے آنے کے بعد دوسرے مکان کی فکر کی جائے گی۔ میں تھکا ماندہ اس کو غنیمت سمجھا اور اس مکان میں اتر پڑا۔ لکھنؤ سے چل کر میں حیدر آباد تو دس ماہ بعد پہنچا۔ مئی [illegible] میں لکھنؤ چھوڑا اور [illegible] کے اوائل میں حیدر آباد پہنچا۔

کوشش برائے باریابی دربار وزارت

اس زمانہ میں نور الدین شاہ قادری ساکن پنجاب و شاہ دکن کے پیر مشہور تھے اور شاہ دکن کو بھی اس قدر اعتقاد ان شاہ صاحب سے تھا کہ زر و جواہر توڑے بھر کر شاہ صاحب کو بھیجا کرتے تھے اور مشہور تھا کہ ایک بار اپنا خاص ہاتھی مع زردوز عماری شاہ صاحب کو عطا کیا۔ وزیر مختار الملک نے شاہ صاحب کو اطلاع دی کہ ہم زردوز عماری کے نوکر ہیں آپ کے سلام کو

حاضر ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب نے ہاتھی عماری فوراً واپس کر دی۔ اُس رئیس ذیشان کے عہد میں ہر قسم کے فقراء شہر میں بکثرت موجود ہو گئے تھے۔ ڈھولچی شاہ اور کنگی شاہ اور اسی طرح کے عجیب و غریب مختلف اسماء کے فقرا بے فکری سے عیش کر رہے تھے اور اُن کی طرف سے وکلاء ڈیوڑھی مبارک میں حاضر رہتے تھے اور یہ وکلاء امیر دولت مند بن گئے مگر سب سے زیادہ رسوخ حضرت نورالدین شاہ قادری کو تھا۔ حضرت کا سن شریف اسّی سے زیادہ تجاوز کر گیا تھا۔

میں نے دو تین روز تو سفر کی تکان کے باعث آرام لیا۔ بعدہٗ نفیس کپڑے پہن کر عطر وغیرہ لگا کر طمطراق کے ساتھ کنداسامی کے پاس پہنچا۔ یہ شخص ابتداءً محکمہ تعمیرات کا ٹھیکہ دار تھا اور قوم کا تلنگا، دراز قد، سیاہ رنگ کہ حبشی بھی اسے دیکھ کر شرما جائے۔ موٹے موٹے ہونٹ، لمبے لمبے کان ان میں چھوٹے چھوٹے چھلّے پڑے ہوئے۔ مضحک صورت، کج مج گفتار مگر وزیر با تدبیر مصاحب خاص تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس پر صاحب عالیشان یعنی ریذیڈنٹ کی خاص توجہ مبذول تھی اور رئیس اعظم کو بھی ایسے شخص انگریزی داں کی ضرورت تھی کہ جس میں زیادہ قابلیت اور بلند حوصلگی اور سازش و غلط بیانی کا مادہ نہ ہو اور مابین ریذیڈنٹ اور مدار المہام سیدھی سادی وکالت کرے اور خود غرضی و ذاتی نفع کی تدابیر نہ سوچے۔

کنداسامی انگریزی سے بقدر ضرورت واقف اردو و فارسی و عربی سے بے بہرہ تلنگی وغیرہ السنہ دکن میں مشاق تھا بد صورت ایسا کہ شام کو سامنے آ جائے تو رستم بھی ڈر جائے مگر ریذیڈنٹ کا لاڈلا مختار الملک کا بکار آمد تھا۔ الغرض صبح کے وقت پا پیادہ اُن کے قصر عالی شان کا پتہ پوچھتا ہوا ان کی خدمت میں پہنچا۔ واقعی مکان ان کا قصر عالیشان تھا۔ نہایت سرسبز و شاداب باغ، اُس میں اونچی کرسی کی دو منزلہ کوٹھی فرش فروش میز کرسی سے آراستہ شیشہ آلات سے چمکتی ہوئی بہت بھلے، گھوڑے سیڑھیوں کے پاس جمع جس سے معلوم ہوا کہ یہی وقت اُن کے دربار کا ہے۔ میں بھی بلا پرسش اوپر چڑھ گیا۔ ایک کمرے میں ایک کوچ پر نو دولت راجہ کنداسامی مثل مہادیو جلوہ فرما تھے اور رو برو کرسیوں پر اہل دربار متمکن تھے میں بھی ماتھے پر ہاتھ رکھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ پوچھا آپ کہاں سے آئے ہیں۔ میں نے اُٹھ کر چچا مرحوم کا خط ان کے ہاتھ رکھ دیا اور عرض کیا کہ میں ایک خط نواب صاحب کے نام بھی لایا ہوں۔ فرمایا کہ کسی موقع پر میں آپ کا ذکر کروں گا مگر نواب کو آج کل فرصت بہت کم ہے۔ میں اُن کا سوکھا ساکھا جواب سن کر مایوسانہ واپس چلا آیا مگر ہفتہ عشرہ میں کئی بار اُن کی دربار داری کرتا رہا۔

ایک روز دیوان حافظ میں فال دیکھی۔ یہ شعر برآمد ہوا ؎

گر بدیوانِ غزل صدر نشینم چہ عجب
سالہا بندگیِ صاحبِ دیوان کردم

اس شعر کو پڑھ کر ذرا دل کو تسکین ہوئی۔ میں اکثر بعد نماز عصر مکان کے دروازے کے باہر ایک بنچ پر سر راہ جا بیٹھا کرتا تھا۔ اس وقت قلعہ کی طرف سے ایک بزرگ لنگوٹی بند ایک ڈنڈا ہاتھ میں لئے ہوئے کودتے اُچھلتے دکنی چال شہر کی طرف جایا کرتے تھے اور بہت جلد پُرانے پُل سے سیندھی شراب میں سرشار رال ٹپکتی ہوئی واپس آتے تھے۔ کسی سے بات چیت ذکر

تھے۔ اور نہ کسی سے روپیہ پیسہ قبول کرتے تھے۔ سڑک کے لڑکوں کی فوج اُن کے جلو میں رہتی تھی۔ ایک دن جو وہ پل سے واپس آئے تو سیدھے میری طرف آئے اور میرا حقہ چھین کر ایک لمبا دم لگایا اور آسمان کی طرف دھواں پھینکتے ہوئے کودتے پھاندتے جلوسِ طفلاں میں آگے بڑھ گئے۔ میں نے آدمی کو آواز دے کر حقہ کی نےنال دُھلائی۔ جب اُنھوں نے یہی طریقہ اختیار کیا تو میں نے اندر دروازہ کے نشست اختیار کی۔ وہ دروازہ کے اندر بھی گھس آئے اور حقہ چھین کر معمولی دم لگا کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے کہ "تجھ کو بُلا رہے ہیں، اور تُو نہیں جاتا۔" یہ کہتے ہوئے وہ تو چل دیے۔ میں نے دروازہ کے اندر باہر جھانکا وہاں کوئی نہ تھا۔ دوسرے روز بھی یہی اتفاق ہوا۔ اس شب کو میں ازحد فکرمند تھا۔ آخر میں نے حضرت حافظ سے مشورہ لیا۔ یہ شعر نکلا ؎

در چو حافظ برم رہ ز بیاباں بیروں
ہمرہ کوکبۂ آصفِ دوراں بروم

اس کو پڑھ کر اس قدر ہمت ہوئی کہ میں نے قسمت آزمائی کا مصمم ارادہ کر لیا۔ نکلتے ہوئے جاڑے تھے۔ علی الصباح کوئی چار بجے اُٹھ کر نہایا اور نماز پڑھ کر کپڑے پہنے۔ پگڑی باندھی۔ کمر کسی۔ اوپر سے مغرق چوغا پہنا یابو پر سوار ہوا (گھوڑا بیچ ڈالا تھا) جوں ہی دروازہ سے نکلا مہترانی جھاڑو دیتی ہوئی دکھائی دی۔ دل اور مضبوط ہوا۔ قبل طلوعِ آفتاب دربدولت پر پہنچ گیا اور بے ساختہ اندر گھس گیا۔ پہرہ دار نے مجھ کو نہ روکا۔ سامنے دالان دکھائی دیا۔ میں وہاں پہنچا۔ دالان کے سائبان میں چند لوگ حلقہ باندھے ہوئے حقے کا دم لگا رہے تھے۔ میں بھی اس حلقہ میں اوکڑوں بیٹھ گیا۔ حقہ گردش کرتا ہوا میری طرف بھی آیا۔ میں نے بھی دم لگایا۔ اس وقت میرے نزدیک ہم نشین نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ میں نے اپنا مقصود بیان کیا۔ اس بھلے مانس نے اب مجھ کو غور سے دیکھا اور کہا تعجب ہے کہ آپ کو کسی نے نہیں روکا اور یہ کونسا وقت ملاقات یا سلام کا ہے۔ ہم لوگ کہ پہرے کے سوار ہیں۔ اس وقت ذرا روشنی زیادہ ہو جائے تو وہ دیکھو اوپر پردہ پڑا ہوا ہے، نواب صاحب ہمارا سلام لے لیں گے۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ ہٹ جائیں بلکہ اس وقت آپ چلے جائیں اور کسی وقت آ کر کوشش کیجیے۔ میں وہاں سے اُٹھ آیا اور اب روشنی بھی خاصی ہو گئی۔ اتنے میں ایک شخص دستار و کمر بستہ حجرے میں سے نکلا۔ مجھ کو دیکھ کر بہ ترش روئی کہا کہ تم کون ہو اور اس وقت یہاں کیوں آئے ہو۔ میں نے کہا کہ میں فرسٹ اسسٹنٹ رزیڈنٹ کا فرستادہ ہوں۔ اس نے تعجب سے کہا کہ یہ کس کا نام ہے اور کہہ کر پردہ کے روبرو جا کھڑا ہوا۔ وہ سب سوار بھی صف بستہ کمرہ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ شاید نواب اوپر برآمد ہوئے ہوں گے۔ میں ایک ستون کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ اس عرصہ میں کئی چوبدار بھی آ گئے اور مجھ کو خوب گھورا۔ اس سوار مذکورہ بالا نے میرے پاس آ کر دوستی کی راہ سے کہا کہ آپ یہاں سے چلے جائیں۔ ورنہ یہ چوبدار آپ کو بجبر یہاں سے نکال دیں گے یا کچھ وعدہ کر لیجیے کہ کھڑا رہنے دیں۔ میں نے اس سے کہا کہ تم ایک چوبدار کو میرے پاس لے آؤ۔ الغرض چوبدار نے جو ایک کلدار روپیہ وصول کیا۔ مجھ سے کہا کہ نہ یہ وقت سلام کا ہے نہ یہ وقت باریابی کا ہے۔ آپ یہاں تشریف لا کر بیٹھ جائیں۔ ہمارے خلیفہ محمد آتے ہیں۔ شاید وہ کوئی مشورہ آپ کو دیں۔ باریابی کے واسطے تو زبردست ذریعہ درکار ہے۔ میں اس دالان میں ایک طرف بیٹھ گیا اور لوگوں کی آمد و رفت کا تماشا

دیکھتا رہا۔ بڑی دیر بعد پھر وہی چوبدار میرے سامنے آیا اور کہا کہ فقیر محمد تو آج تشریف نہیں لائے ان کے بیٹے آئے ہیں۔ اُن سے مل لیجیے۔ الغرض میں اُن سے ملا اور شریف صاحب کا خط اُن کو دکھایا۔ وہ ترش رو ہو کر بولے کہ ہم چٹھی رساں نہیں ہیں۔ آپ کی عقل جاتی رہی ہے۔ کسی اہلِ دربار کا ذریعہ ڈھونڈ لیجیے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ یہ خط پہنچا دیں تو میں آپ کی خدمت کرنے کو موجود ہوں۔ یہ سُن کر چونک پڑے اور پوچھا کہ کیا دو گے۔ میں نے پچاس کا نام لیا۔ وہ خوشی سے کھڑے ہو گئے اور کہا۔ بیٹھیے میں ابھی آتا ہوں۔ یہ کہہ کر اوپر چلے گئے۔ میں کوئی دس بجے تک اُن کا منتظر رہا۔ بالآخر میں نے اُسی چوبدار سے کہا بھئی وغیرہ صاحب کہاں چلے گئے۔ مجھے تو خبر لا دو۔ میں دس روپیہ تمھاری بھی نذر کروں گا۔ وہ یہ سُن کر اوپر پہنچا اور وغیرہ صاحب کو پکڑ لایا۔ اُنھوں نے کہا کہ آپ کا خط نواب صاحب نے پڑھ کر آپ کو ایک بجے حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔ لائیے میرے روپے۔" میں نے کہا کہ بہتر گھنٹی تک بیٹھیے یہ موجود ہیں۔ کہا کہ اسی چوبدار کو دے جائیں۔ الغرض میں رحیم بخش کی دوکان پر آیا۔ کہا کہ پچاس روپیہ فوراً جہاں سے بنے فوراً لا دو۔ وہ رقم لے آیا۔ اُس چوبدار نے اپنا تقاضا کیا۔ میں نے کہا کہ ایک بجے پھر آتا ہوں۔ اُس نے کہا کہ وہ خدمت دوسری ہو گی۔ میں نے کہا میں یہ اور وہ دونوں یاد رکھوں گا۔ وہ خوش خوش روانہ ہوا۔ میں نے بازار سے منگا کر کچھ کھایا اور ایک بجے تک اسی دوکان پر بیٹھا درباریوں اور امرا کے آمد و رفت کے جلوس کا تماشا دیکھتا رہا۔ ایک بجے پھر اُسی دالان میں پہنچا۔ وہ چوبدار وغیرہ صاحب کو پکڑ لایا۔ میں ان کے ساتھ اوپر گیا۔ کمرہ صاف فرش و دری چاندنی سے آراستہ تھا۔ اور ایک مسند صدر مقام پر بچھی ہوئی تھی مگر مسند پوش پڑا ہوا تھا۔ اس کمرے سے وہ دوسرے کمرے میں لے گیا۔ وہاں چند لوگ منتظر باریابی بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھ کو بھی وہاں بٹھا دیا اور خود ایک اور اندر کے کمرے میں چلا گیا اور فوراً واپس آ کر کہا کہ چلو! حضور یاد فرمایا ہے۔ جوں ہی میں کمرے کے اندر گیا، سامنے چند قدم کے فاصلہ پر مسند بچھی ہوئی تھی اور نواب صاحب بکمال شان و شوکت مسند آرا تھے۔ نشست حالت میں قد بلند و بالا چوڑا سینہ گورا رنگ جامہ وار کی شیروانی در بر کلاہ زری بر سر۔ بہت سے کاغذ مسند کے پاس اور کچھ کاغذ اور قلم ہاتھ میں لیے بیٹھے تھے کہ چوبدار نے آواز دی۔ "آداب بجا لاؤ۔ ادب سے قاعدے سے"۔ میں فوراً جھک گیا اور ہندوستانی آداب بجا لایا۔ چوبدار میرا ہاتھ پکڑ کر مسند تک لے گیا۔ میں نے پانچ روپیہ رومال پر رکھ کر نذر گزرانی۔ بخندہ پیشانی روپیہ اُٹھا لیے اور حکم بیٹھنے کا دیا۔ ہاتھ کے کاغذ ایک طرف رکھ دیے اور مخاطب ہو کر میرا نام و نشان وغیرہ دریافت فرمایا۔ میں نے اُٹھ کر عمِ محترم مرحوم کا خط پیش کر دیا۔ اُس کو پڑھ کر ایک نظر مہربانی کی مجھ پر ڈالی اور پوچھا کہ کب سے آپ یہاں آئے ہیں۔ میرا بیان سُن کر فرمایا۔ کیوں آپ نے دیر لگائی میرے دربار میں کسی کو ممانعت نہیں ہے۔ خیر آپ بے تکلف آتے رہیے۔ اس کے بعد چچا مرحوم کے حالات اور میری لیاقت کی بابت سوالات کرتے رہے۔ کوئی دس پندرہ منٹ گفتگو رہی۔ عطر بردار نے عطر و پان[1] میرے

---

[1] یہ رسم دیگر امرائے عظام کی ملاقات میں جاری رہتی اور یہ اشارہ برخاست کا تھا۔ شمس الامراء امیر کبیر عمدۃ الملک کی ملاقات میں برخاست کا اشارہ صرف مسند کے پہلو کے نیچے پڑا رہتا تھا۔ امیر کبیر شمس الامراء اور رشید الدین خاں وقار الامراء کے ہاں کوئی اشارہ ختم ملاقات نہ تھا۔ دربار شاہی میں بھی صرف مسند کے نیچے ہو سے جاتے تھے۔ البتہ ریذیڈنٹ کے دربار میں ایک کشتی جس میں پان ہار اور عطر کی شیشی ہوتی تھی۔ ریذیڈنٹ اور اس کے ہمراہ صاحبان انگریز کو دی جاتی تھی۔ یہ علامت برخاست کی تھی۔

سامنے رکھا۔ میں نے کھڑے ہو کر لے لیا اور سلام کر کے اُلٹے پاؤں کمرے کے باہر خوش خوش نکل آیا۔ میاں وغیرہ صاحب نے کہا کہ اب آپ کی باریابی محال ہے۔ میں بہت گھبرایا۔ اُس نے کہا کہ میاں سلام والے کا دن مقرر ہے۔ آپ کے واسطے کچھ ارشاد نہیں ہوا۔ میں نے پچاس کا وعدہ اُن سے اور کیا۔ وہ اندر پہنچے اور واپس آ کر کہا کہ آپ کے واسطے چہار شنبہ کا روز آٹھ بجے صبح کا وقت مقرر ہوا اور مجھ کو مبارکباد دی کہ وہ امراء جو بندگانِ عالی کی ڈیوڑھی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کے ساتھ آپ کا سلام مقرر ہوا۔

مختصر حالات امراء و اہلکارانِ ریاست

اس وقت نواب مختار الملک شجاع الدولہ سالار جنگ میر تراب علی خاں بہادر کی حکومت اپنی بہار پر تھی۔ اوقات شریف ان کے یہ تھے کہ حوائج و غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر صبح کی نماز پڑھتے اور خدمت گار، شاگرد پیشہ اور پہرہ دار اور دیگر اہلِ نشست کا سلام اس طرح لیتے کہ خود اوپر برآمد ہوتے اور نیچے دالان میں حاضر باش صف بستہ کھڑے رہتے۔ پردہ اُٹھتے ہی چوب دار آواز دیتا یہ سب لوگ جھک جاتے اور تین تسلیمات بجا لاتے۔ وہاں سے خانہ باغ میں اُترتے۔ ٹیپو خاں وغیرہ چابک سواران چند گھوڑے خاصہ کے اور چند کوتل لئے ہوئے حاضر رہتے۔ اس وقت صرف مخصوص مصاحبین دستار و کمر بستہ بلے دکھنی چھینٹ کے انگرکھے اور مدراسی اچکن پہنے ہوئے موجود رہتے۔ کبھی کبھی ہر دو صاحبزادگان بھی ہمرکاب ہوتے اور اگر قسمت ور امیدوار کسی مصاحب کے ذریعے سے پہنچ جاتا تو اس کی عرضی بھی لے لیتے اور گاہ گاہ شہر کے باہر سرور نگر وغیرہ کی جانب نکل جاتے۔ بہر حال سورج نکلتے نکلتے گلبہاری میں مسند پر جلوہ افروز ہو جاتے۔ لباس نہایت سادہ، ٹخنوں سے اونچی، گھٹنوں سے نیچی مختلف رنگ کی جامہ وار کی شیروانی دوہری زنجیر دار گھڑی۔ زیبِ صدر کلاہ ترکی۔ جیسی بخارائی یا سمرقندی بر سر۔ پائجامہ بیشتر سفید۔ گوشہ کلاہ آگے جھکا ہوا اور دراز قامت کشیدہ سینہ۔ موئے سر تراشیدہ، ڈاڑھی مونڈی ہوئی، مونچھ بڑھی ہوئی، نہایت صاف گندمی رنگ، چہرہ پر کمال درجہ رونق و رعب حکومت۔ باہر جاتے ہوئے یا ریذیڈنٹ یا دیگر امرائے شہر سے ملتے وقت دستارِ وزارت بر سر۔ ڈیوڑھی مبارک آستانہ شاہی پر حاضر ہوتے وقت جامہ وغیرہ در بر۔ انگریزی پوشاک و انگریزی وضع سے گریزاں۔ اہلِ دربار سب کے سب دکھنی پوشاک یا مدراسی یا ہندوستانی ملازمین شیروانیاں پہنے ہوئے اپنے اوقات و ایام مقررہ پر حاضر۔ سلام کا طریقہ یہ کہ ہر سلام کے واسطے علیحدہ مقامات یعنی کمرہ مقرر اور صبح سے رات کے بارہ بجے تک امراء و جمعدارانِ فوج و اہلکارانِ دیوانی و منصب داران و امیدواران فضل و کرم، و خوش باشانِ بلدہ و ملازمین متعلقہ و اضلاع مقررہ دن اور مقررہ اوقات پر حاضر رہتے تھے۔ خلافِ روز یا خلافِ وقت اگر کوئی آتا تو میاں خیر محمد کسی کو باریاب نہ ہونے دیتے۔ انتظام ریاست میں اس وزیرِ باتدبیر نے چند اصول کی پابندی کو اپنے اُوپر لازم کر لیا تھا۔

اصرار اس امر پر تھا کہ کوئی یوروپین یا نیم یوروپین ملازم ریاست بے ادبانہ وضع بے تکلف باریاب نہ ہونے پائے۔ لہٰذا کل ایسے ملازمین سوائے افسرانِ فوج ننگے سر کلاہ بدست جوتے اُتار کر باریاب ہوتے تھے بلکہ ہر یوروپین روبرو بیٹھ بھی نہ سکتا تھا کھڑے کھڑے عرض معروض کر کے چلا جاتا تھا اور وزارت پناہ اُن سے کبھی انگریزی میں گفتگو نہ کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ انگریزی زبان

میں مزید شوق زبردست رہتا ہے اور اُردو میں میں اس پر حاوی رہتا ہوں۔ جب سے میں نے یہ سنا، میں خود بھی انگریزوں سے اُردو میں گفتگو کیا کرتا ہوں اور صاحبان انگریز بھی میری نیچی داڑھی اور قدیم وضع پوشاک لباس دیکھ کر مجھ کو انگریزی داں نہیں سمجھتے بلکہ حضرت غفران مکان میر محبوب علی خاں کو بھی میں نے یہ نصیحت کی تھی اور یہی مشورہ دیا تھا کہ ہر اہم معاملہ میں صرف یہ ارشاد فرما دیا کریں کہ "ما بدولت و اقبال اس امر پر غور کر کے تم کو تحریراً اطلاع دیں گے۔"

یہ عجیب بات ہے کہ کل حیدر آباد و چہ ہندو و چہ مسلمان فطرتاً اپنے آقائے ولی نعمت پر حاضر و غائب جان نثار کرنے کو تیار تھے۔ گویا بعد خدا اور رسول کے اپنے مالک کی پوجا کرتے تھے اور امراء و ملازمین، ہندو تو اپنا دیوتا اوتار سمجھتے تھے۔ کسی فرنگی، مدراسی، پارسی، انگریز، ہندوستانی کی مجال نہ تھی کہ بے ادبانہ اسم مبارک اعلیٰ حضرت زبان پر لا سکے۔

یہ مختصر حالات تو امرائے وقت کے تھے اب بلدہ اور اہل بلدہ کے حالات بھی ہدیہ ناظرین کرنے خالی از لطف نہیں ہیں — کل شہر شاہراہ و گلیاں بجز چند گلی تا صدر دروازہ ڈیوڑھی مبارک چوڑے چوڑے سنگ خارا سے سنگ بستہ تھا، گلیاں تنگ اور نہایت گندی حالت میں تھیں۔ حتیٰ کہ وہ گلی جو گاڑی خانہ شاہی کو جاتی تھی موسوم بہ "موری گلی" تھی۔ صرف صدر دروازہ ڈیوڑھی سے کرتا ڈیوڑھی دیوانی دروازہ چادر گھاٹ چند سڑک گھوڑا گاڑی کے قابل تھی۔ شہر کی گندگی کی بابت حکایت مشہور تھی کہ وزارت پناہ نے انتظام صفائی شہر کرنا چاہا مگر مخالفین وزارت نے جس میں نامور مولوی محمود اکبر علی کا شریک تھا اور جو نواب وقار الامراء رشید الدین خاں کی زبردست پناہ میں تھے۔ حضرت افضل الدولہ جنت آرام گاہ سے عرض کیا کہ یہ دیوان نمک حرام بلدہ کے راستے اس نیت سے صاف کرتا ہے کہ انگریزوں کی آمد و رفت اندرون بلدہ جاری ہو جائے۔

---

[1] یہ عجیب بات میں نے دیکھی کہ ہندو و مسلمان شیر و شکر ہے ہوئے تھے، رہتے تھے اور جس طرح ہندو بر سر علاقہ جات دیوانی و پائیگاہ و صرف خاص و نظام میں عہدہ ہائے جلیلہ و مناصب و جاگیرات پر سرفراز تھے۔ اسی طرح مسلمان بھی علاقہ پیش کاری و دیگر امرائے ہنود مثل راجہ شیو راج وغیرہ میں ملازم تھے اور ہنود کے تہواروں اور مسلمانوں کی عیدوں وغیرہ میں باہم بلا تکلف شرکت کرتے تھے۔ خود مجھ کو بھی پابندی ان مراسم کی کرنی پڑتی تھی۔ مہاراجہ نریندر جب مسند وزارت پر متمکن ہوئے تو یہ رسم مجھ کو بھی ادا کرنی پڑی اور بعض امرائے ہنود تو خود چندلال جیسے عالی حضور وزیر تو مسلمانوں سے برابری کا دعویٰ رکھتے تھے مثلاً راؤ رمبھا صاحب جب کہ باب سعادت ہوتے تھے تو اپنا ہاتھی اور عماری حضور ہاتھی کے برابر رکھتے تھے اور باہم طریق تعارف یہ تھا کہ وہ ہم ماؤ ہاتھی پر ہاتھ رکھتے تھے اور مہاراجہ چندو لال حضرت پیشانی مبارک پر ہاتھ رکھ کر ان کا سلام قبول فرماتے تھے۔ دیگر امرائے ہنود دیسی مالک کی جاگیرات سے ممتاز مثل امرائے اسلام اپنے اپنے علاقوں کے مختار تھے۔ اگرچہ عہد وزارت آسمان جاہ و بشیر الدولہ میں مولوی مشتاق حسین نے امرائے ہنود کو جہاں چٹکا زبردست دراز دستی کا تھی مگر میرے زمانے میں محفوظ رہے۔ مولوی ممدوح اپنے ہم وطنوں کے ساتھ زیادہ سلوک کرتے رہے اور [illegible] طلبا کو انگلینڈ برائے تعلیم بھیجتے رہے مگر میں نے اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ بھی اس سلوک میں گریز نہیں کیا۔ مثلاً لگیا نائیڈو میرا ملازم خانگی تھا اور مجملہ مریدان دختر چندر [illegible] ڈاکٹر اگھور ناتھ شاید سروجنی (سروجنی نائیڈو مراد ہیں) نام کی آج کل فخر نسواں ہند ہے اور ایک دو ڈاکٹر اور بھی کے صاحبزادی انگلینڈ بھیجے گئے بلکہ خود ڈاکٹر اگھور ناتھ کو عالم متبحر اور نظیر ممتاز گویا آدھے مسلمان تھے۔ مولوی سید حسین صاحب نے ان کو سررشتہ تعلیم سے موقوف کر دیا تھا اور [illegible] ملا صاحب مدراسی ان کے معاون تھے۔ میں نے پھر ان کو بانظام [illegible] مدرسہ پر مقرر کرا دیا۔

پس حکم اقدس برائے ممانعت صفائی شہر و درستی راستہ جاری ہوگیا۔

میں ایک روز کوئی نو دس بجے صبح کو مدرسہ میں طلبا کو درس دے رہا تھا کہ ایک شاگرد پیشہ میرے پاس آیا اور کہا، چلیے وزارت پناہ نے یاد فرمایا ہے۔ میں معمولی لباس پہنے درس میں مشغول تھا۔ شاگرد پیشہ کو جواب دیا کہ میری طرف سے تسلیم عرض کرو اور کہو کہ میں معمولی لباس پہنے ہوئے ہوں۔ اگر مہلت عطا ہو تو بعد ختم درس کمربستہ حاضر ہوں گا۔ وہ شاگرد پیشہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اس سے اس کی خاموشی اور حیرت کا سبب پوچھا۔ وہ بولا۔ آپ کو کیا معلوم کس ضرورت کی وجہ سے یاد ہوئی ہے۔ حکم کی تعمیل ضروری ہے۔ میں درس کو چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مجھ کو بگھی میں بٹھا کر اطلاع کی۔ فوراً بلایا گیا۔ وزارت پناہ ایک کوچ سے تکیہ لگائے ہوئے بہت سے کاغذ چھاتی پر، پنسل ہاتھ میں لئے رونق افروز تھے اور بستے کاغذات کے نیچے کوچ کے رکھے ہوئے تھے۔ ایک کرسی پر مجھ کو بیٹھنے کا اشارہ ہوا اور کاغذات الگ رکھ کر میری طرف مخاطب ہوئے۔ پہلے اپنے صاحبزادوں کی بابت گفتگو شروع کی۔ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ کپتان جان کلارک آپ سے اردو پڑھنا چاہتے ہیں۔ آپ ان سے ملیے اور اپنا وقت نکال کر ان کے پاس جاتے رہیے۔ مسٹر کلارک کو بھی کوئی عذر نہیں ہے۔ میں نے حماقت سے دو عذر پیش کئے۔ ایک یہ کہ صاحبزادگان کے درس میں بہت خلل پڑے گا۔ دوم انگریز بڈھوں کے پڑھانے کی میں لیاقت نہیں رکھتا۔ یہ سن کر نواب صاحب ہنس پڑے اور دوسرے سخن بدل کر فرمایا کہ آپ کا مذہب سنی ہے اور آپ کے چچا شیعہ ہیں۔ یہ کیا بات ہے۔ میں نے جواب دیا۔ تمام خاندان میں صرف وہ ایک خواب کی وجہ سے شیعہ ہوگئے کہ ایک کٹا ہوا سر دیکھا جو یہ کہتا ہے کہ تم کو اہل بیت علیہم السلام سے محبت رکھنی چاہیئے۔ سالہائے دراز کے بعد جب وہ پنجاب سے لکھنؤ آئے تو دیکھا کہ وہ سر ہم شکل مرزا دبیر تھا۔ پھر فرمایا کہ مرزا غالب بھی تو شیعہ تھے۔ میں نے عرض کیا کہ نیم شیعہ تھے۔ محب اہل بیت تھے مگر مذہب اختیار نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد ایک بند لفافہ مجھ کو عطا کیا اور فرمایا کہ آپ سہ پہر کو مدرسہ میں نہ جائیے۔ کپتان صاحب کو یہ خط پہنچا دیجئے۔ میں وہ لفافہ لے کر کھڑا ہوا تو پھر فرمایا کہ ذرا بیٹھ جاؤ۔ کیا آپ کو شاہان دہلی سے بھی تعلق ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میری والدہ ماجدہ شاہ عالم کی نواسی ہیں ورنہ ہم لوگ ملازمت پیشہ ہیں۔ چنانچہ میرے پردادا مرزا جیون بیگ خاں اور ان کے بھائی اشرف الدولہ مرزا اشرف بیگ خاں فوج شاہی کے سردار تھے۔ پھر فرمایا کہ آپ کے چچا مرزا عباس بیگ بھی تو اودھ میں جاگیردار ہیں اور گورنمنٹ کے خیرخواہ ہیں۔ الغرض میں ان باتوں کا اور سوالات بے محل کا کچھ مطلب نہ سمجھا اور نہ میں نے اپنے خیال کو ادھر مصروف کیا۔ وہاں سے پژمردہ خاطر اس سوچ میں اٹھ کر چلا آیا کہ میں بڈھے طوطے کو کیا پڑھاؤں گا۔ بہرحال تعمیل حکم میں کپتان صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ وہ باہر ہوا خوری کو جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ مجھ کو فوراً بلا لیا اور نواب صاحب کا خط پڑھ کر بڑے جوش سے ہاتھ ملایا اور کہا میں اس وقت باہر جاتا ہوں۔ آپ کل صبح کو میرے پاس آئیے اور کوئی کتاب اردو کی ساتھ لیتے آئیے۔ میں نے کہا صبح کو مجھے مدرسے سے فرصت نہیں ہے۔ اسی وقت بیٹھ گئے اور کرون صاحب کے نام خط لکھ کر مجھے دیا۔ میں جانے لگا تو مجھ کو روک لیا چند منٹ اور مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کرکے رخصت کر دیا۔ چلتے وقت میں نے کہا کہ اگر دوپہر کو آپ مجھے بلائیں تو میں آسکتا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ یہ قرار پایا کہ جب مجھ کو فرصت ہو آیا کروں۔ دوسرے روز مدرسے سے کھانا وغیرہ کھا کر پہنچ گیا۔

بڑی خاطرداری سے مجھ سے ملے اور کہا کہ میں حضور میں جانے والا ہوں۔ دو تین جملے مجھ کو رومن میں لکھ دو میں یاد کروں گا اور الف لیلہ اردو میرے واسطے لیتے آنا۔ وہ میں پڑھوں گا۔ اس کے بعد اپنی بی بی سے ملاقات کرائی۔ معلوم ہوا کہ وہ مسٹر براؤننگ BROWNING کی بیوہ ہیں اور ان سے نکاح ثانی ہوا ہے۔ نہایت ذی علم اور شاعرہ ہیں۔ غرض ہر روز وہ مجھ سے اردو کے جملے لکھوا لیتے تھے الف لیلہ کا صرف ترجمہ مجھ سے سنا کرتے تھے۔ ایک سطر اردو پڑھتا تھا اور اُن کو سناتا تھا۔ روز عاشورہ محرم الحرام میں سہ پہر کو ان کے پاس گیا تو مجھ سے محرم کے حالات لکھنے کی فرمایش کی۔ میں نے کہا۔ یہ تاریخی واقعہ ہے۔ کہا کہ کتابیں کون پڑھے تم مختصر حالات لکھ کر لاؤ اور کل علی الصباح میرے پاس آؤ۔ میں گھر میں واپس آیا اور کوئی آدھی رات گئے تک قلم فرسائی کرتے کرتے وہیں سو گیا۔ صبح کو وہ غیر مکمل اوراق گھسیٹم خط لے کر ان کے پاس گیا اور وہ بدخط اوراق دکھا کر نظر ثانی اور خلاصات لکھنے کے عذر سے واپس لینے چاہے۔ انھوں نے وہ اوراق مجھ سے لے لئے اور کہا کچھ مضائقہ نہیں میں پڑھ لوں گا اور کل صبح کو آپ پھر میرے پاس آیئے۔ میں خالی الذہن ہو کر وہاں سے چلا آیا۔ دوسرے روز صبح کو میں گیا تو وہ ہوا خوری کو گئے ہوئے تھے اور وہ کاغذ میز پر رکھے ہوئے تھے۔ میں نے نظر ثانی کے خیال سے وہ کاغذ اٹھا لیے۔ اس کے ایک گوشہ پر کپتان صاحب کی تحریر تھی کہ میں نے تقریراً تحریراً خوب امتحان کر لیا۔ آدمی لائق اور میرے کام کے ہیں۔ اس ہی کے نیچے نواب صاحب کی تحریر تھی کہ میں نے بھی خاص اسی وجہ سے ان کا انتخاب کر کے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ یہ تحریریں پڑھ کر میں نے وہ کاغذات میز پر رکھ دیئے۔ اتنے میں کپتان صاحب ہوا خوری سے واپس آئے اور بڑے تپاک سے ”ہاؤ ڈو یو ڈو“ HOW DO YOU DO ہوئی۔ بیٹھتے ہی مجھ سے یہ کہا کہ آپ نواب صاحب سے ملے تھے یا نہیں اور انھوں نے آپ سے کچھ کہا یا نہیں۔ میں نے جواب دیا کہ میں اب تک ملا اور نہ کوئی گفتگو ہوئی۔ یہ سن کر اُنھوں نے چند سطریں لکھ کر دیں اور کہا آپ ابھی نواب صاحب سے ملیے۔ میں وہ خط لے کر گو خلاف وقت ورود مقرر تھا۔ سیدھا در دولت وزارت پر حاضر ہوا۔ نواب صاحب نے اُسی وقت مجھ کو طلب کر لیا۔ اوّل ادھر اُدھر کی دو تین باتیں کر کے مجھ سے ارشاد کیا کہ کپتان صاحب آپ سے بہت خوش ہیں۔ میں نے دست بستہ عرض کیا کہ مجھ کو سرکار کی خوشی مطلوب ہے۔ ان سے کیا غرض۔ علاوہ اس کے نہ وہ کچھ پڑھتے ہیں۔ باتوں میں وقت خراب ہو جاتا ہے۔ معلوم نہیں اُنھوں نے میرا جواب سنا یا نہیں۔ چند منٹ خاموش رہ کر فرمایا۔ آپ سے کچھ ضروری امور کہنے ہیں۔ اس وقت فرصت نہیں ہے۔ پانچ بجے آپ آیئے۔ میں سلام کر کے گھر چلا آیا۔ یہاں میں نے دیکھا کہ والدہ ماجدہ دو تین تھان کپڑوں کے لئے ہوئے بیٹھی ہوئی ہیں اور شجاعت بیگ آپ کی انّا کا فرزند فن خیاطی میں بے مثل کتر بیونت کر رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا کپڑے ہیں۔ فرمایا کہ تم نے ہی تو کہلا بھیجا تھا تو جلد جامہ تیار کراؤ کل حضور میں جاتا ہوں۔ میں نے حیرت سے انکار کیا تو ساجد بیگ اور واجد بیگ جن کی عمر اس وقت پانچ پانچ چھ چھ برس کی تھی بول اُٹھے واہ بھائی وا ابھی تو ایک شخص ہاتھی پر سوار ادھر سے نکلا اور کہا کہ جاؤ تمھارے بھائی کل حضور میں جاتے ہیں۔ نیمہ سلواؤ۔ الغرض پانچ بجے ڈیوڑھی پر حاضر ہوا۔ گھٹنوں تک اونچی اچکن پہنے ہوئے تھا۔ پگڑی سر پر کمر بندھی ہوئی تھی۔ نواب صاحب مجھ کو دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا کہ کپتان صاحب نے آپ کو اپنی مددگاری کے واسطے پسند کیا ہے۔ آپ ان کے ساتھ ڈیوڑھی مبارک میں جایا کیجئے۔ میں یہ سن کر سناٹے میں رہ گیا اور دست بستہ عرض کیا کہ مجھ سے ایسی خطا کیا ہوئی ہے کہ اس

اصل خدمت سے علیحدہ کر کے ایک انگریزی کی منشی گری اور ترجمہ نگاری پر بھیجا جاتا ہوں۔ بہت انگریزی داں سرکار میں موجود ہیں ان میں سے کوئی کپتان صاحب کے پاس متعین کر دیا جائے۔ میں نے جو صاحبزادگان کے ساتھ محنت کی وہ برباد نہ فرمایئے۔ نواب صاحب نے یہ سن کر حیرت سے فرمایا کہ آپ کی عقل جاتی رہی ہے۔ یہ وہ خدمت ہے کہ کسی وقت آپ خود میری سفارش حضور پُر نور سے کریں گے۔ بہرحال آپ ابھی امیر کبیر بہادر سے ملنے جایئے اور وہاں سے پھر میرے پاس واپس آیئے۔ اس کے بعد ہنس کر فرمایا کہ آپ کے پاس کیا سواری ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میرے پاس صرف ایک یابو سمند سیاہ زانو ہے۔ فرمایا۔ یہ کچھ نہیں اور ایک شاگرد پیشہ کو یاد فرما کر حکم دیا کہ خانساماں سے کہو کہ آپ کے واسطے ایک پالکی ابھی تیار رکھے اور دو ہرکارے بھی ساتھ جائیں اور نرسنگھ راؤ کو طلب فرما کر حکم دیا کہ تم پہلے جا کر نواب صاحب کو اطلاع کر دو۔ ان احکام کے بعد پھر میری طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ کپتان صاحب بھی یہیں کی بار ڈیوڑھی مبارک میں جائیں گے۔ آپ کو بھی وہاں حاضر رہنا چاہیئے مگر اس لباس میں نہیں بلکہ درباری لباس میں۔ ایک دن میں تیار ہو سکتا ہے۔ کل آپ پہن کر میرے پاس آیئے۔ چونکہ میں خالی الذہن آیا تھا۔ لہٰذا خود پانچ روپیہ بھی برائے نذر نواب امیر کبیر عطا فرمائے اور اس کو قرض کے نام سے نامزد فرمایا۔

مُلاقات نواب امیر کبیر

الغرض میں پُر تکلف پینس میں بیٹھا ہوا دو ہرکارے جلو میں دوڑتے ہوئے خدمتگار پینس کا کنارا پکڑے ہوئے اس شان و شوکت سے اُن بازاروں میں سے گزرا جہاں میں تنہا پاؤں پیدل بہ تلاش روزگار پڑا پھرتا تھا۔ عصر کا وقت تنگ تھا کہ میں اُن کی ڈیوڑھی میں پہنچا۔ جلو خانہ میں پہنچ کر جونہی میں نے پالکی سے قدم باہر نکالا۔ ایک مرد آدمی لمبا قد، دوہرا جسم، ریش سفید دراز۔ دستار شاگرد پیشگان بر سر۔ کمر پہ کوئی دس بارہ گز کا کپڑا لپیٹے ہوئے اس میں پیش قبض اُڑسے ہوئے تلوار ہاتھ میں سامنے اکڑے ہوئے اور سخت آواز سے مجھ سے کہا کہ یہ کیا انسانیت ہے کہ نواب صاحب (نواب عمدۃ الملک امیر کبیر شمس الامراء شریک نائب السلطنت) کو تم نے اتنا منتظر رکھا۔ میں نے دل میں کہا کہ ع

سالیکہ نکوست از بہارش پیدا

میں نے بلا وجہ چند الفاظ عذر کے کہہ دیئے۔ وہ مجھ کو ایک سہ دری کی طرف لے گئے۔ دو دروں میں پردے پڑے ہوئے تھے تیسرے در میں جو میں نے قدم رکھا ایک پیر کہنہ سال نہایت ضعیف مشکل مربعی دستار بر سر، جامہ در بر، نہایت نورانی چہرہ جس پر رعب و امارت درخشاں، بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے جھک کر سلام کیا۔ بکشادہ پیشانی ہاتھ ماتھے پر رکھ لیا اور مسکراتے ہوئے نذر قبول فرما کر مسند کے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یہ سہ دری نہایت مختصر تھی۔ صرف دری چاندنی بچھی ہوئی تھی اور ایک چھوٹی سی الماری مسند کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ وہ صاحب جو میرے ساتھ آئے تھے وہ بھی سلام کر کے بیٹھ گئے اور نرسنگھ راؤ بھی حسب الطلب حاضر ہو گئے۔ اس کے بعد میرا نام دریافت فرمایا۔ میں نے کہا احقر کو آغا مرزا کہتے ہیں۔ یہ سن کر نرسنگھ راؤ سے فرمایا کہ آغا اور مرزا دونوں لفظ بڑے خاندان کا پتا دیتے ہیں۔ اس کے بعد میری تعلیم اور تربیت کا حال پوچھ کر فرمایا کہ آپ لاطینی بھی جانتے ہیں۔ میں نے عرض کیا۔ لاطینی کا رواج کسی مدرسہ میں نہیں ہے۔ پھر پوچھا ریاضی بھی جانتے ہو۔ میں نے کہا بقدر ضرورت۔ کہا اس کے کیا معنی، میں نے عرض کیا کہ جس قدر امتحان کے واسطے ضرورت پڑی۔ یہ سن کر تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر میرا مذہب دریافت فرما کر کہا کہ آپ کو تو یہاں لوگ جانتے بھی ہوں گے

میں نے عرض کیا۔ سوائے مولوی امین الدین خاں اور کوئی مجھ سے واقف نہیں۔ وہی میرا مذہب بھی جانتے ہیں۔ فرمایا کہ گواہی شاہدی کی ضرورت نہیں آپ کا بیان کافی ہے۔ یہ کہہ کر نرسنگھ راؤ سے ارشاد فرمایا کہ مختار الملک سے کہہ دو کہ میں ان صاحب کو پسند کرتا ہوں اور میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ اللہ تبارک آپ کو یہ خدمت مبارک فرمائے۔ نرسنگھ راؤ نے میری طرف نذر دینے کا اشارہ کیا میری جیب خالی تھی۔ اس نے اپنا رومال معہ رقم میری طرف کھسکا دیا۔ یہ نذر بھی میری مسکرا کر قبول فرمائی اور کہا کہ ذرا بیٹھ جاؤ۔ اور وہ خود بھی سیدھے بیٹھ گئے۔ پھر خوب غور سے میری طرف دیکھ کر فرمایا کہ تم سمجھے کہ تم کو کس ذمہ داری کی خدمت پر مقرر کیا ہے۔ میں روزِ حشر تم کو پکڑوں گا۔ اگر کچھ بھی بندگانِ عالی کے خیالاتِ مذہبی یا معاشرتی میں فرق آیا۔ میں نے دست بستہ جواب دیا کہ یہ ذمہ داری اس احقر و کمترین کی طرف عائد نہیں ہو سکتی ہے۔ میں ایک ادنیٰ ملازم مجبور و محکوم سرکار اور نواب وزارت پناہ کا ہوں اور صرف تعمیلِ حکم میرا فرض ہے۔ ورنہ اختیار بدست شما ہے۔ میرے اس جواب پر ایک دو آنسو اُن مبارک و محترم آنکھوں سے ٹپک پڑے اور فرمایا کہ "میں ابھی سے دیکھتا ہوں کہ انقلابِ عظیم ہونے والا ہے۔ میں چند روز کا مہمان ہوں۔ میں کہاں اور حضورِ پُرنور کی عہدِ حکومت و مختاری دیکھنی کہاں۔ علاوہ اس کے حاضر باشان در دولت کو جو توقع عرض معروض کا ہے وہ ہم کو نصیب نہیں۔ صرف تم لوگ نگراں حال رہو گے۔ معلوم نہیں کہ انگریز کا تقرر تعلیم پر اور انگریزی تعلیم کیا اثر دکھلائے۔ مختار الملک بہت دانا اور دور اندیش آدمی ہیں اور بقول ناصر الدولہ کے ایک جواہر پارہ اور ہیرے کا ٹکڑا ہمارے ہاتھ لگا ہے مگر انگریزیت کا ریلا مثل سیلاب [illegible] ہے اور نئی امت جو ہمارے بعد آنے والی ہے۔ ہماری وضع ہمارے مراسم سے بے خبر، نہیں معلوم کیا شطرنج بچھائے۔ بہرحال اس قدر تو ضرور ہے کہ مذہبی خیالات قائم رہیں اور آدابِ شاہی میں فرق نہ آنے پائے اور مثل تقویم پارینہ یا اساطیر الاولین چشم زدن میں سے نظر انداز نہ کئے جائیں۔" یہ فرما کر عود کا حکم دیا اور پہلو کے تکیے بدل دیئے۔ یہ اشارہ تھا کہ برخاست۔

میری پہلی باریابی

دوسرے روز سہ پہر کو حسب الطلب میں بلباس خاص یعنی جامہ و نیمہ و دستار و کمر اول وزارت پناہ کی خدمت میں پہنچا۔ مجھ کو اس لباس میں دیکھ کر بہت خندہ زن ہوئے مگر جامے کی قطع و برید اور اس کے بندوں کو ناپسند فرمایا۔ بعدہٗ وہاں سے سیدھا در دولت شاہی پر حاضر ہوا۔ باہر کے جلو خانہ میں میانہ چھوڑا اور پا پیادہ جامے کو سنبھالے ہوئے کئی جلو خانے طے کر کے خلوت میں پہنچا۔ وہاں ہر دو صاحب یعنی تہنیت یار الدولہ و منگل جنگ میرے منتظر تھے۔ اول ہم سب نے نماز عصر پڑھی۔ بعدہٗ تہنیت یار الدولہ ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کا نام روشن بنگلہ تھا وہاں چلے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد جب حضور پُرنور بیدار ہوئے تو انھوں نے مجھ کو طلب کیا۔ چھوٹا سا دالان، چھوٹی سی انگنائی، دالان میں مسند بچھی ہوئی۔ اس پر حضور پُرنور کلاہ ترکی بر سر، انگرکھا دکھنی دربر، لمبی لمبی چوٹیاں تا بہ کمر، عمر شریف کوئی آٹھ برس کی، جلوہ افروز تھے۔ دو تین مامائیں سفید مثل برف دوپٹوں میں لپٹی ہوئیں پس پشت استادہ، بڑے میاں اور ان کے بیٹے دست بستہ روبرو سے مسند کھڑے ہوئے۔ اول لفظ جو حضور پُرنور نے ارشاد فرمایا، یہ تھا کہ "انگریزی بولی کیسی ہوتی ہے۔ سُناؤ۔" میں نے انگریزی میں عرض کیا کہ I PRAY FOR YOUR HIGHNESS' LONG LIFE AND PROSPERITY اس کے بعد فوراً برخاست فرما گئے۔

روزِ اول درسِ مُبارک۔ علی الصبح میں حسبِ قرارداد در دولت فلک رفعتِ شاہی پر حاضر ہوا اور مجلس خانہ سے

اُتر کر جو محلِ مبارک میں پہنچا۔ اسی وقت ہرکارہ نے خبر دی کہ کپتان صاحب چار مینار تک آ پہنچے۔ مستحکم جنگ استقبال کے واسطے دروازہ پر جا کھڑے ہوئے۔ تہنیت یار الدولہ نے چوبدار کو حکم دیا کہ محل میں اطلاع کر دو جلد حضورِ پُرنور برآمد کئے جائیں۔ اس عرصے میں کلارک صاحب بھی آ گئے۔ مجھ سے ہاتھ ملایا۔ سب کو یہ خیال تھا کہ حضورِ پُرنور پہلی بار انگریز سے ملتے ہیں، مبادا مرعوب ہو جائیں مگر میں نے نواب وزارت پناہ کا اطمینان کر دیا تھا اور اب حضورِ پُرنور بھی بسواری ہوادار رونق افروز ہوئے۔ چند مامائیں پیچھے پیچھے تھیں۔ کپتان صاحب نے استقبال کرنا چاہا میں نے اُن کو روک دیا۔ خلاصہ یہ کہ دائیں جانب کے درہ میں گول میز اور کرسیاں پہلے سے رکھ دی گئی تھیں۔ میں اور کلارک صاحب ظفر جنگ اور مستحکم جنگ کرسیوں پر بیٹھے باقی کل حاضرباشان اور مامائیں وغیرہ ملازمین سامنے سے ہٹ گئے۔ حضورِ پُرنور کے چہرۂ مبارک سے خوف تو ظاہر نہ تھا مگر متحیر تھے کہ میں نے جیبوں میں سے دو تین تصاویر خوش رنگ نکالیں اور وہ سامنے رکھ کر اُن کی نسبت باتیں بنانے لگا۔ یہاں تک کہ ظفر جنگ اور حضورِ پُرنور ہنس پڑے۔ اس وقت باجازت کپتان صاحب میں نے کہا کہ اب حضور تشریف لے جائیں۔

ایک میں ہی اُستاد حضورِ پُرنور کا ہوں کہ درس کی ابتدا میرے ہاتھ پر ہوئی اور ختم بھی میرے ہاتھ پر ہوا۔ دوسرے اُستاد بیچ میں شریک ہوئے یا قبل ختم غائب ہو گئے اور ایک میں ہی خوش قسمت ہوں کہ برابر مورد الطاف شاہی رہا۔ اپنا رعب قائم رکھنے کے لیے ایک قدیم انگریزی تحریر میرے ذہن میں آئی جس کو "وہپنگ بوائے" کہتے ہیں۔ یہ تو ناممکن تھا کہ میں ہر وقت ظفر جنگ کو دھمکاتا رہتا۔ اس واسطے کہ بعد ذات بابرکات حضورِ پُرنور جملہ امرا میں اُن کا مرتبہ اعلیٰ تھا اور سزا دینی تو دھمکی سے زیادہ ناممکن تھی۔ پس تجویز یہ قرار پائی کہ چند منصب داران رکاب سعادت کے بچے بھی حاضر رہیں اور اُن کو علیحدہ درس دیا جائے گویا ایک مکتب مختصر میری نگرانی میں قائم کیا جائے اور ان کی درس دہی کے واسطے میں نے مرزا رفیع الدین بیگ کو اپنی پیش دستی میں لے لیا۔ اُن میں سے صرف ممتاز علی کا نام یاد رہ گیا۔ جو اب بخطاب ممتاز یار جنگ افسر الملک بہادر کی دامادی سے ممتاز ہیں۔ ان بچوں کو میں روزانہ دھمکاتا اور اکثر دو تین بید بھی لگا دیا کرتا تھا۔

دعوت عام بطریق قدیم

چہارشنبہ آخر صفر کے مہینے میں سات چھلے چاندی اور سونے کے راجہ گردھاری پرشاد عرف بنسی راجہ نے مجھ کو اور گیارہ چھلے استحکام الدولہ مستقل جنگ جان کلارک خاں بہادر بمنصب ہفت ہزاری پنج ہزار سوار کو ملے۔ یہ دستور قدیم بھی شاہان دہلی کا تھا اور رجب میں کونڈوں کی دعوت بھی [illegible] مذکور میرے پاس آئی۔ بعد مغرب میں خلوت مبارک میں حاضر ہوا۔ تمام خلوت اندر باہر [illegible] تمام وسیع صحن اس کے مہمانوں سے بھرے ہوئے تھے۔ سوائے امرائے عظام باقی شرفاء و خوش باش لوگوں میں سے کوئی ایسا ہی بدقسمت ہوگا جو اس دعوت سے محروم رہ گیا ہو۔ خلوت کے اندر قناتیں گھیری گئی تھیں۔ بالا منزل شہ نشین پر حضورِ پُرنور مع چند مصاحبین مسندِ شاہی پر جلوہ افروز تھے۔ نیچے دالانوں میں دسترخوان بچھے ہوئے اور پاس پاس بڑی بڑی ناندیں رکھی ہوئی اور دسترخوان پر خالی صحنکیں چنی ہوئی تھیں۔ غول کے غول مہمان باہر سے آتے اور بریانی کھا کر پائین زینۂ شاہ نشین کے پاس آ کر آداب بجا کر چلے جاتے۔ جو مراسم و قواعد و ضوابط شاہان دہلی حضرت آصف جاہ کے وقت سے چلے آتے ہیں اُن میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔

جب وزارت پناہ سفرِ یورپ سے واپس آئے تو اپنے ساتھ کپتان کلاڈ کلارک برادر بزرگ کپتان جان کلارک کو اس کی جگہ پر مقرر کر کے لیتے آئے۔ پہلی ہی ملاقات میں کپتان صاحب مجھ سے کشیدگی کے ساتھ ملے اور تا قیام حیدرآباد مجھ سے کشیدہ خاطر رہے۔ خود فوجی آدمی تھے اور کسی وجہ سے ایک ٹانگ اُن کی از کار رفتہ تھی اور مثانے کے مرض میں دائم المرض تھے۔ نہ طریقِ تعلیم سے واقف نہ عدمِ صحت کی وجہ سے کسی کام کے لائق۔ ہر وقت یہ وہم کہ مبادا مجھ سے لوگ زبان درازی کریں۔ سید حسین صاحب کی لیاقت کے سامنے میری کم لیاقتی کا خیال۔ بلا تجربہ ولایت ہی میں بجائے خود قائم کر کے آئے ہی لفظ استادی سے انکار کیا اور اپنے تئیں لفظ سپرنٹنڈنٹ SUPERINTENDENT یعنی منتظمِ تعلیم سے مخاطب کیا اور نواب وزارت پناہ سے باصرار فرمایش کی کوئی انگریز فنِ تعلیم کا تجربہ کار اُن کی مددگاری میں مقرر کیا جائے۔ چنانچہ ایک مسٹر ڈیوڈسن DAVIDSON نامی جوان عمر اس خدمت پر مقرر کر دیئے گئے۔ وہ ایک کھیل کود کا آدمی تھا۔ اس نے بھی تمام کام مجھ پہ چھوڑ دیا اور محض خوش قسمتی سے میرا یار بن گیا مگر اس کی بھی عمر نے وفا نہ کی اور چند ہی ماہ کے بعد راہیِ ملکِ عدم ہوا۔

ڈپٹی نذیر احمد

اس کے بعد مولوی نذیر احمد نے کپتان صاحب سے راہ و رسم پیدا کی۔ یہ صاحب دہلی کے قریب کے قصبہ کے رہنے والے انگریزی سرکار میں سررشتہ تعلیم کے اعلیٰ عہدہ دار صاحبِ تصانیفِ کثیر پنشن لے کر حیدرآباد میں بعہدہ صدر تعلقداری سرفراز تھے۔ سن رسیدہ نہایت چست و چالاک کپتان صاحب کو بہت جلد گوندے پر لگایا اور خوشخط قلمی رسالہ اصطلاحات صیغۂ مال و ضوابطِ مال گزاری صاف سیدھے اُردو زبان میں خود تالیف کر کے کپتان صاحب کو دیئے اور یہ قرار پایا کہ درسِ انگریزی کے ساتھ نظم و انتظام کی بھی تعلیم دی جائے۔ اُدھر رزیڈنٹ کو خود وزارت پناہ پر اعتراضات تھے اور مولوی صاحب علاوہ بریں سرکار انگریزی کے پنشن یافتہ قابلِ اعتماد، وہ ہمراہ کپتان کلاڈ کلارک ہوا خواہ مخواہ امیر کبیر کو ہمراہ رزیڈنٹ ہونا پڑا۔ گو حق بات یہ ہے کہ نانا پوجی نے نہایت کوشش کی کہ رزیڈنٹ کی رائے کو بدلے الغرض اب وزارت پناہ کو مجبوری یہ تقرر منظور کرنا پڑا اور میں جب حسبِ معمول اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو بکمال شفقت میرے آنسو پونچھنے کے واسطے ارشاد فرمایا کہ مولوی کا تقرر تو ہو گیا مگر آپ کا کوئی نقصان نہ ہو گا۔ کلارک صاحب اوقاتِ درس تقسیم کر دیا کریں گے۔ میں نے جواب دیا کہ مجھ کو سرکار کی خدمت گزاری سے غرض ہے جو کام مجھ کو سپرد کیا جائے بسر و چشم حاضر ہوں۔ اُدھر کپتان صاحب نے مجھ سے کہا کہ کل مولوی صاحب اپنا کام شروع کر دیں گے۔ آپ اور وہ مل کر تقسیمِ اوقات کر لیں۔ مولوی صاحب کے ہاں یہ حال تھا کہ تقرر سے ایک روز قبل ہی تمام خدمات ڈیوڑھی مبارک کو نام بنام اپنے رشتہ داروں اور ہوا خواہوں میں بانٹ چکے تھے اور سوائے مولوی امین الدین خاں و عنایت الرحمٰن خاں کوئی ہندوستانی ایسا نہ تھا کہ مولوی صاحب کی خوشامد و مبارکبادی کے واسطے نہ گیا۔ ایک دربارِ عظیم الشان ان کے ہاں قائم ہو گیا۔

اب حکایتِ عجیب یہ سنیئے کہ ایک بزرگ نہایت سن رسیدہ دکھنی طرف سے حیدرآباد میں وارد ہوئے اور میرے مکان میں چند ماہ سے مقیم تھے۔ باوجود کبرِ سن، راست قامت، چست و چالاک، گندم رنگ، اکہرا جسم، میانہ قد، لباس ترکی، گیسو دراز، ریش سفید نہ کوتاہ نہ دراز، اُردو زبان سے ناواقف، فارسی زبان میں کمال درجہ فصیح، مسائلِ صوفیہ جس وقت بیان کرتے

تو گویا منہ سے پھول جھڑتے۔ بعد عصر اکثر اوقات وعظ فرماتے اور سامعین کو اپنا شیدا کر لیتے۔ میں اس دن نواب صاحب کے پاس سے آکر اُن کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور چائے نوشی ہو رہی تھی کہ ایک شخص دہلی کے میر رحمت علی نامی مجھ سے ملنے آئے اور بآوازِ بلند مجھ سے کہا کہ "مرگِ نو مبارک ہو۔ اب تمھارا ڈیوڑھی مبارک میں گھسنا محال ہے۔ وہاں تو کارخانجات تقسیم ہو گئے" شاہ صاحب نے فقط "مرگِ نو" سن کر حیرت سے مجھ سے پوچھا کہ "ایں چہ می گوید" میر رحمت علی نے تمام حال اُن سے بیان کر دیا۔ شاہ صاحب کو کمال صدمہ ہوا اور کچھ دیر خاموش و ساکت رہ کر اپنی ڈاڑھی پکڑی اور مجھ سے کہا کہ "مرزا تم خاطر جمع رکھو۔ وہ ڈیوڑھی میں نہ آنے پائے گا۔" اس پر میر رحمت علی ہنس پڑے۔ شاہ صاحب نے حالتِ غضب میں یہ کہا کہ "واللہ اگر نذیر احمد کل ڈیوڑھی میں آیا تو میں یہ ڈاڑھی منڈوا ڈالوں گا۔" شاہ صاحب کو غصے میں دیکھ کر میر رحمت علی بھی چپ ہو گئے۔ نو دس بجے رات تک شاہ صاحب کے تیور بدلے رہے اور ایک حالتِ سکوت میں رہے۔ خلاصہ یہ کہ علی الصباح میں سب سے پہلے ڈیوڑھی مبارک میں پہنچا اور مستحکم جنگ کو حضورِ پُر نور کے برآمد کرنے کے واسطے بھیجا۔ کپتان کلارک اور مولوی نذیر احمد کا انتظار کرتا رہا۔ اب درس کا وقت بھی آ گیا۔ حضورِ پُر نور بھی برآمد ہوئے۔ مظفر جنگ بہادر بھی آ گئے مگر وہ دونوں صاحب نہ آئے۔ میں نے اس خیال سے کہ درس بیکار نہ جائے درس شروع کر دیا۔ عرصۂ دراز کے بعد کپتان صاحب کا خط آیا کہ آپ درس ختم کر کے جلد میرے پاس آیئے۔ درس کا وقت بھی ختم ہو گیا تھا۔ خانساماں نے دوپہر کے خاصے کے واسطے میز بھی تیار کر لی تھی۔ حضورِ پُر نور اور ظفر جنگ بہادر میز پر تشریف لائے۔ میں اور مستحکم جنگ شریکِ خاصہ ہوئے۔

بعد تناولِ خاصہ مستحکم جنگ نے مجھ سے کہا کہ مولوی سمیع الزماں خاں تو دنیا کی ماں تھے اب دنیا کا باپ آتا ہے مگر تعجب ہے کہ اب تک نہیں آیا۔ میں بھی دریائے حیرت میں غرق کپتان صاحب کے پاس پہنچا۔ وہ غیظ و غضب کی حالت میں پریشاں حال مجھ سے ملتے ہی بولے کہ "امیر کبیر نے مجھ کو بڑا دھوکا دیا اور عالمِ خلائق میں مجھ کو رسوا کیا۔ یہ خط وزیر اعظم کا پڑھو۔" اس میں لکھا تھا کہ "نواب امیر کبیر بہادر نے تقرر مولوی نذیر احمد کا نامنظور فرمایا۔ آپ اُن کو ڈیوڑھی مبارک میں نہ جانے دیجیے۔" اس کے بعد مجھ سے کہا کہ "میں رزیڈنٹ کے پاس بھی گیا تھا۔ کل تک وہ میرے مددومعاون تھے۔ آج مجھ ہی پر پلٹ پڑے اور کہا کہ تم لوگ آپس میں لڑ کر مجھ کو ستاتے ہو کیا۔ ضرورت ہے کہ ایک پردیسی آدمی خلافِ مرضی نواب امیر کبیر ڈیوڑھی مبارک میں مقرر کیا جائے۔ لہٰذا یہ میرا استعفا نواب صاحب کو لے جا کر دے دو اور کہہ دو کہ اگر نذیر احمد ڈیوڑھی میں نہ آئے گا تو میں بھی خدمت سے دست بردار ہوں۔" میں نے کہا کہ "مجھ کو اس جھگڑے میں نہ ڈالیے۔ ناحق بدنام ہو جاؤں گا۔" مگر ان کے اصرار سے مجبوراً نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ نواب صاحب نہایت خندہ پیشانی سے ملے اور فرمایا "رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔" مگر نواب امیر کبیر بہادر کو یہ حرکت زیبا نہ تھی اور کلارک صاحب کی بھی یہ ہٹ اور ضد ناحق ہے۔ کل شب کو عبدالمجید اُن کا وکیل میرے پاس آیا اور کہا کہ نواب صاحب فرماتے ہیں کہ "اگر نذیر احمد صبح کو ڈیوڑھی میں گیا تو میں شہر چھوڑ کر باہر نکل جاؤں گا۔" اس کے بعد سر رچرڈ میڈ کا خط آیا کہ نذیر احمد ڈیوڑھی میں نہ جانے پائے۔ وہاں سے میں مکان پر آیا۔ شاہ صاحب سراسیمہ و پریشان اِدھر سے اُدھر جلدی جلدی ٹہل رہے تھے۔ مجھ کو دیکھتے ہی بولے کہ میری ڈاڑھی بچ گئی

مُنڈی کا۔ میں نے تمام حال اُن سے بیان کیا۔ وہ اُسی وقت سجدۂ شکر بجا لائے اور مجھ سے کہا: "مرزا خوش باش۔ حافظِ حقیقی شما را نگہبان است۔"

عہدِ ناصر الدولہ

اس مقام پر حضرت ناصر الدولہ کے عہد کے معاشرتی حالات جو میں نے متواتر معتبر ذرائع سے سُنے قابلِ بیان ہیں۔ حضرت ناصر الدولہ نے خطاب ہز میجسٹی سے صاف انکار کر دیا۔ اس بادشاہ ذی جاہ کو کمال درجہ نہ فقط انگریزوں اور انگریزیت سے کوفت تھی بلکہ کل بیرونی باشندگان مثل اہلِ بمبئی و پونا و مدراس اور ان کی معاشرت لباس و رفتار سے بھی کلی نفرت تھی۔ البتہ اگر کوئی ہندوستانی بالخصوص اہلِ دہلی میں سے حیدرآباد جاتا تو اس کی قدر فرماتے تھے۔ جب سے کہ سرکار کمپنی بہادر سے خطاب ہز میجسٹی کی غلطی صادر ہوئی۔ اُس وقت سے حکم عام ہو گیا تھا کہ امرائے عظام میں سے کوئی بلا اجازت دروازۂ چادر گھاٹ سے باہر نہ جائے بلکہ ہر دروازہ پر ہرکارے مقرر کیے گئے کہ آیندہ روندہ کی اطلاع ہوتی رہے اور یہ بھی حکم تھا کہ کوئی انگریزی چیز استعمال نہ کی جائے بلکہ اپنے ملک کی ساختہ شے استعمال کی جائے۔ دفاتر و محکمہ جات میں کاغذی گھوڑے کا ساختہ کاغذ استعمال کیا جاتا تھا۔ نانڈیر کے سیلوں کے جامے اور نیمے پہنے جاتے تھے۔ ایک نواب درباری کی جو شامت آئی، کسی بمبئی کے سوداگر سے تن زیب یا ململ وغیرہ انگریزی ساخت کا کپڑا لے کر جامہ بنا کر دربار میں آئے۔ بندگانِ عالی نے وہ کپڑا دیکھ کر پوچھا کہ یہ کپڑا کہاں سے لائے۔ شامت زدہ نے سکندرآباد کا نام لیا۔ فرمایا "تمھارے پاس مفت کا روپیہ جمع ہو گیا ہے۔ لہٰذا اس قدر جرمانہ داخل کرو اور تا حکمِ ثانی خانہ نشین رہو۔" یہ بھی عجیب بات میں نے خود وزارت پناہ سے سُنی کہ حضور پُر نور اکثر اپنے آقا یعنی بادشاہ دہلی کی قدم بوسی کی آرزو ظاہر فرمایا کرتے تھے۔

وزارت پناہ کا انتقال

اب یہاں اللہ تبارک و تعالیٰ جل جلالہٗ و جل شانہٗ کی قدرتِ کاملہ کا تماشا دیکھنے کے قابل ہے کہ ایک شب کو قریب ایک بجے یا دو بجے میرے پاس موہن لال پنڈت آیا۔ اس پنڈت کو سفارش کر کے میں نے ملازم رکھایا تھا۔ نواب وزارت پناہ مثل دیگر مشاہیر عالم خود بھی ستارہ شناس اور نجوم و رمل کے معتقد تھے اور بعض رمال مثل گلاب شاہ وغیرہ پنجابی و اکثر جوتشی پنڈت ملازم سرکار وزارت تھے اور حسبِ دستور ان کے سلام کے واسطے بھی ایام و اوقات مقرر تھے۔ اس شب کو اس کے سلام کی باری تھی۔ پٹاپی راما راؤ محاسب کے کاغذات پر دستخط فرما کر اور مراسلات رزیڈنسی و دیگر احکام ضروری جاری فرما کر گویا اس روز کا کام ختم کر کے پنڈت کو باریابی سے مشرف فرمایا اور حکم کشیدن زائچہ کا دیا۔ پنڈت نے جیسا کہ دستور اس قوم کا ہوتا ہے۔ پہلے چوڑے احکام ترقی اقبال و کامیابی دارین کے لگائے۔ اختتام فرما کر زائچہ اس سے لے کر خود ملاحظہ فرمایا اور دیکھ کر کہا کہ "پنڈت جی خانۂ حیات تو خالی ہے۔" یا کچھ ایسے ہی الفاظ کہے۔ پنڈت نے رفع دخل کی کوشش کی۔ اس عرصہ میں وزارت پناہ نے آواز دی۔ شاگرد پیشہ حاضر ہوا۔ پیچوان رکھنے کا حکم دیا اور پنڈت کو رخصت کر دیا۔ وہ سیدھا دوڑتا ہوا میرے پاس آیا اور یہ واقعہ بیان کیا۔ میں نے غصے میں اُس سے کہا کہ یہ تیری کیا نامعقول حرکت تھی کہ محض اتنی سی بات کہنے کے واسطے تو نے میری نیند خراب کی۔ اُس نے کہا خدا کرے میرا زائچہ جھوٹا ہو۔ الغرض صبح حسبِ معمول پرانی حویلی گیا۔ اسی وقت کپتان کلارک صاحب اور مسٹر کرون بھی آ گئے۔ حضور پُر نور

ہنوز آرام میں تھے اور منصب داران چوکے کی گرد چپک نشست تھی کہ اتنے میں ٹیپو خاں خستہ حال پریشان بال، چشم گریاں بر لب آہ و فغاں دوڑتا ہوا آیا اور کہا کہ حضور کو جلد از جلد بیدار کرو۔ اُن کا نمک حلال، باوفا، جاں نثار وزیر تصدق ہوا۔ کلارک صاحب نے گھبرا کر مجھ کو دیکھا۔ میں نے ٹیپو خاں کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔ سانس درست کرو اور واقعہ بیان کرو۔ وہ پھوٹ کر رو پڑا اور بولا جلد حضور کو اطلاع کرو۔ میں نے دوڑ کر حضور کو بیدار کیا۔ بندگانِ اقدس آنکھیں ملتے ہوئے تشریف لائے۔ ٹیپو خاں نے تمام حالِ شب کا بیان کیا اور کہا کہ ڈاکٹر حکیم سب حاضر تھے کسی کی کچھ نہ چلی۔ حضور پُر نور نے ارشاد فرمایا کہ ”حضرت آپ جائیے اور پوری کیفیت لائیے۔“ کلارک صاحب کی گاڑی موجود تھی۔ میں سوار ہو کر دولتِ وزارت پر پہنچا۔ جونہی میں نے کمرے میں قدم رکھا۔ حکیم باقر علی خاں روتے ہوئے باہر نکلے۔ میرے سوال پر انھوں نے کہا۔ تم خود جا کر دیکھو۔ کم بخت ڈاکٹر نے کام تمام کر دیا۔ ہاتھ پکڑتے پکڑتے منع کرتے کرتے غلام نے یخنی پلا دی۔ میں اندر گیا۔ وزیر باتدبیر پلنگ پر دراز تھے۔ میں اُن کی شکل دیکھتے ہی جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔ ہر دو فرزندان ”ہائے بابا! ہائے بابا“ پکار رہے تھے۔ تمام ڈیوڑھی میں اندر باہر اُوپر نیچے ایک قیامت برپا ہو گئی۔ میں نے صاحبزادگان کی تشفی کرنی چاہی۔ مگر وہ وقت تشفی کا کہاں تھا۔ میں پھر ڈیوڑھی مبارک پر واپس آیا۔ اس وقت کپتان کلارک اور مسٹر کروِن بھی رو پڑے اور چشم مبارک حضور پُر نور سے بھی آنسو ٹپک پڑے۔ کپتان کلارک اور مسٹر کروِن تو روانہ ہوئے۔ مولوی مسیح الزماں خاں اور امرائے عظام سر خورشید جاہ و آسمان۔ وقار الامراء و مہاراجہ پیشکاری بھی حاضر در دولت فلک رفعت ہوئے۔ یہاں تو ایک حالتِ سکوت تھی مگر دوسری طرف میجر گاف و کپتان کلارک و سید حسین صاحب بلگرامی مسٹر جونس کے پاس پہنچے کہ آپ فوراً اعلان کیجیے کہ نواب لائق علی خاں فرزند کلاں مرحوم و مغفور بجائے اپنے والد کے بالاستحقاق جانشین کیے گئے۔ ورنہ بلدہ میں فساد کا بڑا اندیشہ ہے۔ مسٹر جونس یہ سن کر نہایت برہم ہوئے اور کہا: ”یہ تو ہندوستانی پردیسی آدمی ہے اور تم ایک دفتر کے منشی ہو اور تم ایک معلم ہو۔ تم لوگوں کو معاملاتِ ملکی سے کیا تعلق ہے اور مجھ سے ان معاملات میں گفتگو کرنے کا کیا حق ہے۔ جاؤ اپنا راستہ لو۔ اگر میں نے سُنا کہ تم لوگوں نے کوئی سازش قائم کی تو تمھارے حق میں اچھا نہ ہو گا۔“ کپتان کلارک سے کہا کہ ”بحیثیت معلّم تم کو درس و تدریس سے تعلق ہے۔ اگر اس کے خلاف میں نے سُنا تو میں تم کو معطل کر دوں گا۔“ تینوں صاحب شرمندہ وہاں سے چلے آئے۔ مسٹر جونس اوّل تو خاتونان و فرزندان صاحب المہام مرحوم کے پاس پُرسا دینے کو دولتِ وزارت پر گئے اور وہاں سے سیدھے پُرانی حویلی آ کر نہایت دردناک الفاظ میں ہز ہائینس کو اُن کے جاں نثار و وفادار خانہ زاد وزیر باتدبیر کا پُرسا دیا اور بعدہٗ مہاراجہ پیشکار کو سن رسیدہ، کار فہمیدہ، شریکِ خدمت وزیر مرحوم تھے۔ ذمہ دار امن و امانِ بلدہ و انتظامِ ریاست کا کیا۔ یہ معاملہ چل رہا تھا کہ میں حسبِ دستور یوم مقررہ پر مسٹر جونس سے ملنے گیا تو نہایت ترش رُو ہو کر مجھ سے کہا کہ ”استادوں کو کیا حق مداخلت امورِ انتظامی میں ہے۔ کپتان کلارک کو میں نے چپکا دیا تو مولوی مسیح الزماں خاں میرے پاس سر آسمان جاہ وقار الامرا کی طرف سے آئے تھے۔ اب تم کس کی طرف سے آئے ہو؟“ میں نے کہا کہ حسبِ معمول حاضر ہوا ہوں۔“ تو پھر کہا کہ ”اگر میں نے سنا کہ کسی اُستاد نے ان معاملات میں دخل دیا تو میں اس کو نکال دوں[1] گا۔“

(لہ۔ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اُردو کا نفاذ

اوّل جو بڑا تغیر اور انقلابِ عظیم نواب لائق علی خاں نے کیا یہ تھا کہ اس وقت تک زبانِ ریاست فارسی تھی اور وزیرِ حال نے زبانِ ریاست اُردو کر دی۔ اس جگہ مجھے یاد آتا ہے کہ ایک روز میں سہ پہر کے وقت وزارت پناہ مرحوم (سالار جنگ اوّل) کی خدمت میں حاضر تھا۔ اثنائے گفتگو میں مجھ سے ارشاد فرمایا کہ آج مولوی مشتاق حسین نے ایک نئی بات مجھ سے کہی کہ فارسی زبان کے عوض کل دفاتر و محکمہ جات ریاست میں اُردو زبان جاری کر دی جائے۔ میں نے حماقت سے عرض کی کہ مولوی صاحب کی رائے تو معقول ہے۔ یہ سنتے ہی یا تو مسند سے تکیہ لگائے بیٹھے تھے یا سیدھے اُٹھ بیٹھے اور فرمایا "خدا نہ کرے"۔ خدا کے الف کو اتنا بڑھایا کہ میں گھبرا اُٹھا اور سمجھا کہ مجھ سے غلطی ہوئی۔ اس کے بعد فرمایا کہ تم ہندوستانی فارسی تحریر و تقریر میں مشاق نہیں ہو۔ فارسی زبان میں اہلِ اسلام کے فتحِ ہند کی علامت ہے کہ ہم بھی قوم فاتح ہیں اور یہ ملک ہم نے بزورِ شمشیر فتح کیا۔ اپنے ملک میں تو تم لوگ یہ نشانی مٹا چکے۔ اب یہاں بھی یہ اندھیر کیا چاہتے ہو۔ جب تک میں زندہ ہوں فارسی بھی زندہ رہے گی۔"

سازش

اہلکارانِ ریاست نے میری مخالفت پر کمر بہت مضبوط باندھی اور اُن کو عمدہ موقع بھی مل گیا کہ ایک شب میرے کوچوان بخشی نامی نے شراب پی اور اس کے نشہ میں وہ میرے بچوں کے یابو پر سوار ہو کر اُسے سرورنگر دوڑاتا ہوا گیا اور ایسا گرا کہ سر اس کا شق ہو گیا۔ میرا خدمت گار امیر نامی یابو اور کوچوان دونوں کو لے آیا۔ باہر دروازہ پر امیر کی اور کوچوان

(حاشیہ صفحہ نمبر ۶۵۶) جس روز نواب مختار الملک کا انتقال ہوا۔ اسی روز مسٹر بیرنگ فائنس ممبر گورنمنٹ آف انڈیا جو بعد ازاں بخطاب لارڈ کرومر مصر میں کارگزار رہے تھے اور ایک یورپین پرنس حیدر آباد میں نواب وزیر کے مہمان تھے۔ انتقال کے ایک روز قبل جبکہ نواب صاحب اپنے تمام مہمانوں کو تالاب میر عالم اپنے ساتھ لے گئے۔ جہاں نہایت پُر تکلف دعوت کا انتظام ہوا تھا جب سب تالاب سے واپس ہوئے تو نواب صاحب نہایت بشاش اور تندرست چوک محلہ مبارک آئے۔ حضور پُر نور زنانہ میں تھے اور میں تنہا افضل محل کے چبوترے پر کھڑا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو حضور پُر نور کو اطلاع کی جائے۔ فرمایا کہ حضور پُر نور کو تکلیف دینا نہیں چاہتا اور چند نہایت عمدہ میووں کی طرف اشارہ فرما کر ارشاد فرمایا کہ تم ان میووں کو میری طرف سے بطور نذر گزران دینا۔ شب کو نواب صاحب نے اپنے مہمانوں کے ساتھ ڈنر تناول فرمایا۔ ڈنر کے بعد میں نے سُنا کہ زنانہ سے کوئی کھانا پیش ہوا جو ان کو نہایت مرغوب تھا اس کو تناول فرمایا۔ اس کے بعد ہی سوئے ہضم کی شکایت محسوس ہوئی جو بالآخر باعث موت ہوئی۔ اس حادثۂ عظیم کے متعلق جو تفصیل مسٹر بلنٹ نے بحوالہ میڈم گینا (MADEMOISELLE GAINA) نواب صاحب کی فرانسیسی نرس اپنی کتاب "انڈیا انڈر رپن" (INDIA UNDER RIPON) میں صفحہ ۲۰۰ و ۲۰۱ پر تحریر کی ہے۔ اس کا اعادہ اس مقام پر نامناسب نہ ہوگا۔ نرس نے بیان کیا کہ سالار جنگ بہترین انسان اور بڑے اولوالعزم آدمی تھے۔ کبھی کسی نے اُن کی زبان سے سخت لفظ نہیں سُنا۔ نواب امیر کبیر رشید الدین خاں نے مرض الموت کی حالت میں اُن کو بلایا اور اپنے بچوں کو اُن کے سپرد کیا۔ نرس مذکور کا بیان بطور یقینی یہ ہے کہ نواب صاحب کو زہر دیا گیا۔

کی جورو کی لڑائی ہوئی۔ خلاصہ یہ کہ اس کی جورو اس کو ڈاکٹر جانسن ایک دیسی عیسائی کے پاس جو کوتوالی کے شفاخانہ کا ڈاکٹر تھا لے گئی اور وہ وہاں مر گیا۔ میں صبح کی نماز پڑھ رہا تھا کہ ایک حکیم سید علی جن کو میں نے نوکر رکھا دیا تھا۔ میرے پاس آئے اور کہا کہ آپ کس خواب غفلت میں ہیں۔ کوتوال اکبر جنگ آپ پر کوچوان کے خون کا مقدمہ قائم کر رہا ہے۔ میں نے کہا کہ کوتوال کی عقل ماری گئی ہے۔ میں ابھی رقعہ اس کو اصل حالات کا لکھتا ہوں۔ سید علی نے کہا کہ ایسی غلطی نہ کرو۔ اتنے میں ایک تھانے دار آیا اور اس نے میری نشست کے مکان کے نقشہ کی اجازت مانگی میں نے اجازت دے دی۔ سید علی نے کہا کہ جلدی سول سرجن کو بلا کر اس کا پوسٹ مارٹم کراؤ ورنہ گاڑ دیا جائے گا تو صرف کوتوالی کے ڈاکٹر کی شہادت رہ جائے گی۔ میں نے ڈاکٹر لاری کو رقعہ لکھا۔ وہ فوراً چلے آئے اور کل حال مجھ سے سن کر کوتوالی شفاخانہ گئے اور بعد باقاعدہ کارروائی میرے پاس آئے اور کہا کہ مقدمہ بالکل صاف ہے۔ میں نے یادداشت لکھ لی ہے اور نذر میرا پانسو روپیہ ہے۔ وہ بھجوا دو۔ اب مقدمہ مجھ پر زور شور سے بن گیا اور دس بارہ گواہان چشم دید جو گویا دس بجے رات کو میرے گھر میں گھس کر میرے پاس کھڑے تھے جمع کر لیے گئے ڈاکٹر جانسن سے رپورٹ لکھوائی گئی کہ میں نے پانسو روپیہ اس کو بطور رشوت بھیجے تھے۔ نواب وزیر (لائق علی خاں) نے معروضہ داخل کیا کہ سرور جنگ پر جرم خون کا ثابت ہو چکا ہے۔ مسٹر کارڈی کہ واپس آ گئے تھے۔ انھوں نے لکھا کہ سرور جنگ اپنی ذات سے پیروی مقدمہ کریں۔ کسی بیرسٹر وکیل کو ان کو اجازت نہ دی جائے۔ علاوہ خون کے مقدمہ کے سول سرجن کو پانسو روپیہ رشوت دیے ہیں۔ یہ جرم بھی ان پر لگایا جائے۔ الغرض میری گردن زدن کا پورا سامان کر لیا گیا۔ کوچوان کی جورو کو سب سے بڑی گواہ تھی اس پر کوتوال اکبر جنگ نے قبضہ کر کے خوب اس کو سکھایا پڑھایا اور کوشش یہ کی گئی کہ میں پابزنجیر عدالت فوجداری میں بھیجا جاؤں۔ اس میں نواب وزیر اور رزیڈنٹ سے لے کر کل اہلکاران ریاست بلکہ ایک دو صاحب جو محل مبارک کے بھی شریک تھے۔ میں نے بھی عرضی حضور پرنور کو دی کہ برائے خدا حضور میری طرفداری نہ فرمائیں۔ ورنہ تباہ ہو جاؤں گا البتہ مجھ کو عدالت میں نہ بھیجیں اور ایک کمیشن جس کو نواب وزیر اور رزیڈنٹ بھی پسند کریں برائے تحقیقات مقرر کر دیا جائے۔ میری زبان کوئی نہیں لے گئی ہے۔ حضور ملاحظہ فرمائیں گے کہ ان ناخداترس لوگوں کی میں کیا گت بناتا ہوں۔ چنانچہ ایک کمیشن قائم کیا گیا اور اجلاس اس کا پرانی حویلی میں مقرر ہوا۔ کمیشن میں کیمپبل (CAMPBELL) رزیڈنٹ کی طرف سے سردار عبدالحق نواب وزیر کی جانب سے اور قدیر جنگ بہادر دربار شاہی کی طرف سے مقرر ہوئے۔ کوتوال اکبر جنگ انگریزی فوج کا آدمی تھا مسٹر فونیڈی مددگار اوّل رزیڈنٹ مسٹر سانڈرس کا خاص رازدار تھا اور سید حسین صاحب بلگرامی کی توجہ سے نواب لائق علی خاں کی ابتدائی وزارت میں خدمت کوتوالی بلدہ پر سرفراز ہو گیا تھا۔

آمدم بر سرِ مطلب اوّل شہادت الزامی ثابت ہوئی اور ساختہ و مصنوعی گواہوں نے دھوم دھام سے گواہی دی۔ گویا اس وقت یہ مجمع کثیر باوجودیکہ عرب و حلی غول کے پہرے میرے دروازے پر متعین تھے۔ میرے گھر کے اندر دیوان خانہ میں گھس آئے تھے۔ اس کے بعد کوتوال پیروکار جانب سرکار نے خوف زدہ حالت میں ہکلا ہکلا کر اپنا بیان لکھوایا۔ اب نوبت اصل گواہ یعنی کوچوان کی جورو کی آئی۔ یہ فاحشہ عورت تھی اور کوتوال سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے شراب پلا کر پیش کیا

کو خوب بولے مگر نتیجہ برعکس ہوا۔ سردار دیر جنگ نے اُٹھ کر اس کے مُنہ کو سُونگھا اور مسٹر کیمبل نے کہا کہ مقدمہ خراب گیا۔ اب صرف ڈاکٹر لاری کا بیان لے لیا جائے۔ چنانچہ دوسرے روز ڈاکٹر لاری نے آ کر کُل واقعات اور اپنی یادداشت کا نتیجہ بیان کر دیا اور میری شکایت کی کہ میں نے اُن کی فیس نہیں دی۔ یہ فیس عدالت دلوا دے۔ میں نے اُسی وقت پانسو روپے کی تھیلی عدالت کی میز پر رکھ دی۔ ڈاکٹر صاحب تو تھیلی بغل میں مار کر چپت ہوئے اور ارکان کمیشن نے مشورہ دیا۔ مسٹر کیمبل نے کہا کہ مقدمہ ثابت ہے۔ میں فیصلہ لکھتا ہوں۔ اس پر سردار عبدالحق اور قدیر جنگ بہادر نے کہا کہ مقدمہ ریا تھا۔ جتنی کیمبل تھا۔ ہم اپنے فیصلے الگ لکھیں گے۔ چنانچہ مجھ سے کہا گیا کہ کل فیصلہ سُنایا جائے گا۔ میں نے کہا کہ میری طرف کی صفائی ابھی نہیں لی گئی۔ اس کا کسی نے کچھ جواب نہ دیا۔ مسٹر کیمبل وہاں سے اُٹھ کر سیدھے نواب وزیر یار اور مسٹر کارڈی کے پاس گئے۔ خلاصہ یہ کہ تینوں رکنوں نے بالاتفاق فیصلہ سنایا کہ مقدمہ خارج اور سرور جنگ کُل الزامات سے بری ہیں۔ میں دودھ کا دھویا شہد کا نہایا گھر کو واپس آیا اور قطع گرنے کی تیاری بیکار گئی۔ مسٹر کارڈی نے ایک خط حضور پُر نور کو لکھا کہ گو سرور جنگ کُل الزامات سے بری ہیں۔ مگر ایک الزام اُن پر یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اس قدر نادان ہیں کہ اپنے گھر کا انتظام نہ کر سکے اور ایک آدمی کی جان مفت میں ضائع ہوئی۔ لہٰذا وہ اس جُرم میں چھ مہینے تک خانہ نشین کر دیے جائیں اور ان کو فہمائش کی جائے کہ آئندہ وہ اپنے گھر کا انتظام عقلمندی کے ساتھ کریں۔ حضور پُر نور نے مجھ کو یہ خط دکھایا۔ میں نے عرض کیا کہ حضور نے جب فدوی کو ابتدا میں یاد فرمایا تھا۔ فدوی اُسی وقت انجام اپنا سمجھ گیا تھا ؎

بے فنائے خود میسّر نیست دیدارِ شما
می فروشد خویش را اول خریدارِ شما

اب اپنے نمک خواروں اور جان نثاروں پر رحم فرمائیے اور ان جھگڑوں کو ختم فرما دیجئے۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ فدوی لائق علی خاں کو لے آتا ہے۔ اُس کا قصور معاف فرمائیے اور ایسی شرطوں سے اُن کے ہاتھ جکڑ دیجئے کہ پھر وہ سر نہ اُٹھا سکیں اور دوسری شکل یہ ہے کہ اپنے شاہی اقتدار سے اس کو معزول کر دیجئے اور کسی دوسرے خانہ زاد کو یہ عزت عطا فرمائیے ورنہ ہم جان نثاروں کی مٹی تک برباد ہو جائے گی۔ فرمایا دُوسرا شخص کون تجویز کیا جائے۔ میں نے عرض کیا کہ قبل اس کے کہ فدوی اپنی رائے ظاہر کرے۔ فدوی ایک تاریخی واقعہ عرض کرتا ہے کہ "لارڈ ڈلہوزی نے سرجان لارنس سے مشورہ کیا کہ ملک پنجاب کے انتظام کے واسطے لائق ترین شخص کون اُن کے ذہن میں ہے۔ سرجان نے جواب دیا کہ اگر مجھ پر بدگمانی نہ کی جائے تو میں اپنے علم و یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کام کے واسطے میرے بھائی سرہنری لارنس سے لائق تر آپ کو کوئی آدمی نہ ملے گا۔ لارڈ ڈلہوزی نے فوراً انتظام پنجاب ان کے سپرد کر دیا۔ نواب امیر کبیر کی اور میری دوستی مشہور ہے اور وہ مجھ کو مثل اپنے بھائی کے سمجھتے ہیں۔ فدوی کے نزدیک اُن سے بہتر وزیر آپ کو نہ ملے گا۔" یہ سُن کر فرمایا کہ "یہ امر غور طلب ہے اور اب تو وائسرائے آ رہے ہیں۔"

وائسرائے کی آمد اب وائسرائے کی مہمانداری کا انتظام بھی شروع ہو گیا۔ اہلکاران دیوانی نے رزیڈنسی کی طرف

دوڑ شروع کر دی اور بڑے جوڑ سے مشورے مسٹر کاڈری سے ہوتے رہے۔ تا آنکہ لارڈ ڈفرن حیدرآباد میں داخل ہوئے۔ دربار اور ڈنر اور پارٹیز وغیرہ کی تفصیل طول بے جا ہے۔ خلاصہ ایں کہ صدر صوبیدار اقلیم ہند اور شاہ دکن میں تین ملاقاتیں ہوئیں اور لارڈ ڈفرن نے خوب حضور پُرنور کو ٹٹول لیا۔ مسٹر کاڈری نے اب تمام قوت کے ساتھ لارڈ ڈفرن کو مجبور کرنا چاہا کہ باہم شاہ و وزیر میں صلح کرا دیں مگر لارڈ ڈفرن اپنے زمانہ کے مشہور مدبران یورپ میں شمار کیے جاتے تھے۔ اُن پر کسی کا افسوں نہ چل سکا۔ نواب امیر کبیر کے قصر دولت پر شوریٰ قرار پایا۔ ایک کوچ پر حضور پُرنور اور نواب وائسرائے اور دوسری کرسی پر نواب امیر کبیر متمکن ہوئے اور مجھ کو حکم ہوا کہ میں پس پشت حضور پُرنور استادہ ہوں۔ لارڈ ڈفرن نے تازہ زبان فارسی سیکھی شروع کی تھی۔ پس گفتگو بھی اُس میں شروع کی۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اب حضور پُرنور کی فارسی دانی کا پردہ فاش ہوتا ہے جرأت کر کے کہا۔ یور ایکسیلنسی یہاں فارسی سمجھنے والے (غیر لوگ) بہت ہیں۔ بہتر ہے کہ انگریزی میں گفتگو کی جائے۔ اس وقت لارڈ ڈفرن نے مُنہ موڑ کر مجھ کو خوب غور سے دیکھا اور کہا: ویری ویل (VERY WELL) اب وہ انگریزی میں حضور پُرنور سے گفتگو کرنے لگے۔ خلاصہ اس کا یہ تھا کہ آپ بدل سالار جنگ سے ناراض نہیں ہیں اور یہ تو میں اب بھی کہوں گا کہ اس سے کوئی ایسا قصور سرزد نہیں ہوا کہ اس کو اتنی بڑی سزا دی جائے مگر چونکہ اب مجھ کو معلوم ہو گیا کہ کسی خاص وجہ سے آپ اس سے بیزار ہو گئے ہیں تو آپ اُس کو معزول کر دیجیے اور یہ انتخاب بھی مجھ کو پسند ہے۔ سر خورشید جاہ بڑے نوبل اور سن رسیدہ اور ذی لیاقت ہیں مگر میری خواہش یہ ہے کہ میرے کلکتہ پہنچنے تک آپ تامل کریں اور کار ریاست جس طرح چل رہی ہے چلنے دیں اور میرے فیصلہ کا انتظار کریں۔ اس کے بعد وہ نواب امیر کبیر کی طرف مخاطب ہوئے جس میں اُردو میں ترجمہ کرتا گیا کہ آپ سن رسیدہ اور تجربہ کار ہیں یقین ہے کہ ہز ہائینس کو آپ خوش رکھ کر ایڈمنسٹریشن میں ترقی کریں گے اور دونوں سرکاروں کی باہم دوستی کو مضبوط کریں گے

یہ تو سب کچھ ہوا مگر مولوی مہدی علی نے اپنی دانائی اور مشکل کشا عقلمندی سے چشم زدن میں ہماری تمام کارستانی اور طویل محنت کو برباد کر دیا۔ اس شخص کو اللہ تعالیٰ نے ایسا دماغ عطا فرمایا تھا کہ اگر یہ یورپ میں پیدا ہوا ہوتا تو بسمارک اور ڈیزریلی بھی اُس کے آگے کان پکڑتے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب لارڈ ڈفرن روانہ ہونے تھے اور کل صبح کو جانے والے تھے اتفاقاً حضور پُرنور میز ڈیبل کے پاس تخت پر جلوہ افروز تھے اور مصاحبین دست بستہ گرد تخت کے کھڑے ہوئے تھے راقم بھی حاضر تھا اور نواب وزیر ترساں و لرزاں دُور دالان کے کنارے پر کھڑے ہوئے تھے۔ حضور پُرنور نے حسبِ معمول ہم سب حاضرین کو علی قدر مراتب پان عطا فرمائے۔ اس وقت شاید اُن کو حقیر کرنے کے واسطے دو پان دستِ مبارک میں لے کر اُن کی طرف دیکھا۔ اُنھوں نے دوڑ کر آداب بجا لا کر وہ پان لے لیے۔ اس ادنیٰ بات کا بڑا جھگڑا بنا دیا گیا۔ یعنی کوئی دس بجے رات کو لارڈ ڈفرن کا خط آیا کہ یہ سن کر کہ آپ نے سالار جنگ کی خطا معاف فرما دی۔ بہت خوش ہوا اور میں کل صبح کو اطمینان کے ساتھ روانہ ہوتا ہوں۔ یہ خط پڑھ کر حضور پُرنور نہایت پریشان ہو گئے اور میں دریائے حیرت میں غرق ہو گیا کہ الٰہی یہ کیا جادو اہلکاران دیوانی نے کیا اور طلسم کس طرح توڑا جائے کہ یکایک بامداد غیبی میرے ذہن نے انتقال کیا۔ میں نے عرض کیا کہ حضور نے دو پان لائق علی خاں کو عطا فرمائے۔ اس پر مخالفین سامری فن نے یہ جادو کی عمارت کھڑی

کی۔ اس کا ڈھارنا کیا مشکل ہے۔ فوراً جواب رخصت فرما دیا جائے۔ فرمایا کہ لکھیے کیا جواب دیا جائے۔ میں نے قلم برداشتہ لکھا چونکہ میری اور آپ کی متفق ہو چکی تھی میں نے آج مسٹر کو رخصت نامہ پان عطا کر دیئے اور یہ رسم میرے دربار کی کاوڈری صاحب کو معلوم ہے۔ تعجب ہے کہ انھوں نے آپ کو اطلاع نہیں کیا مگر میں جو آپ سے وعدہ کر چکا ہوں اس پر مستقل ہوں یعنی جب تک کلکتہ جا کر مجھ کو آپ دیکھیں گے میں اپنے دل پر جبر کر کے مسٹر سے کام لیتا رہوں گا۔ اس خط کو پڑھ کر حضور پُرنور کا چہرۂ مبارک بشاش ہو گیا اور دستخط کر کے فرمایا کہ حضرت آپ خود اس خط کو لے جائیے۔ میں از حد پریشان ہوا کہ رات کا ایک بج چکا تھا۔ اول تو مسٹر کاوڈری سے ملاقات ناممکن۔ دوم نہ معلوم وہ مجھ سے کس طرح پیش آئیں اور کیا میری گت بنائیں۔ خوف زدہ خط لے کر ریذیڈنسی پہنچا۔ سب خواب خرگوش میں مبتلا تھے۔ میں نے چپراسی کو بلا کر خط دے کر کہا کہ جب کاوڈری صاحب اٹھیں تو یہ خط اُن کو دے دینا کہ لارڈ صاحب کو پہنچا دیں۔ اپنا شاگرد پیشہ کو وہاں چھوڑ دیا تاکہ اپنے سامنے وہ خط پہنچوا دے۔ بعد اس کے میں نے حضور پُرنور سے عرض کیا کہ نقصان تو کچھ نہیں ہوا مگر مسٹر کاوڈری کو معاملہ کو طول دینے کا موقع مل گیا۔

اب یہ سنیئے کہ اہلکاران دیوانی امیر کبیر کے نامزد ہونے کی خبر سُن کر از حد پریشان ہو گئے۔ اُدھر حاضر باشان دربار دولت شاہی میں بھی کمال درجہ کھلبلی پڑ گئی اور ہر جانب سے اُن پر حملے شروع ہو گئے۔ یہاں تک کہ حضور پُرنور بھی اُن سے مشکوک کر دیئے گئے۔ نواب بشیر الدولہ آسمان جاہ امیر کبیر اس زمانہ میں انگلینڈ گئے ہوئے تھے۔ حضور پُرنور نے اُس میموریل میں بجائے نواب امیر کبیر نام آسمان جاہ کا لکھوا دیا۔ جب وہ میموریل تیار ہوا تو اس کو صاف کرانے کی ضرورت پڑی۔ افسر جنگ کا انگریزی خط بہت اچھا تھا اور وہ زود نویس تھے۔ باوجودیکہ میں ان حضرات کی بے وفائی کے مزے چکھ چکا تھا اور ان کی "ہل من مزید" سے واقف تھا مگر "آزمودہ را آزمودن جہل است" کا مصداق بن گیا اور وہ میموریل اُن سے صاف کرایا۔ انھوں نے اپنی عادت کے مطابق فائدہ عظیم اُٹھایا۔ سر آسمان جاہ کو فوراً تار دے کر ایسا ممنون بنایا کہ گویا اُن ہی کی سفارش سے وزیر بنے تھے اِدھر اپنا راستہ گورنمنٹ میں کھلا رکھا اور فوجی مدارج میں بھی ترقی کرتے گئے۔

آسمان جاہ کا عہدِ وزارت

نواب آسمان جاہ دوڑے ہوئے انگلینڈ سے آئے اور خلعت وزارت سے سرفراز ہوئے اور نواب وزیر (لائق علی خاں) پونہ میں جا کر مقیم ہوئے اور وہیں انتقال کیا۔ جس وقت نواب امیر کبیر نے اُن کے انتقال کی خبر سُنی۔ آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور فرمایا:

ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مُرد

عجب قسمت اس بچے کی تھی جن لوگوں نے اُس سے فائدے اُٹھائے۔ انھیں لوگوں نے اس کو برباد کیا۔ نواب امیر کبیر کا قول صرف ایک حد تک صحیح ہے یعنی اہل سازش جو نواب وزیر کے گرد جمع ہوتے تھے۔ ان میں صرف دو صاحبوں نے مستقل اور دوامی فائدہ ایسا اُٹھایا کہ قدیم امرائے ریزہ تو ایک طرف امرائے عظام سے بھی دولت و حکومت و جاہ و جلال میں سبقت لے گئے اور نواب آسمان جاہ کو سیڑھی بنا کر قدم بقدم بالاتر چڑھتے رہے اور جب آسمان جاہ کی معزولی کا وقت آیا تو وہاں سے اُڑ کر نواب وقار الامراء کی چھتری پر جا بیٹھے۔ راقم کا حال یہ ہوا کہ باطمینان تمام اپنی چھوٹی سی حیثیت و عزت لے کر بچ نکلا

اختیار کی اور جناب سیدنا و مرشدنا حضرت سید محمد پاشا صاحب بخاری کے دستِ حق پرست پر جناب پیر دستگیر اور خواجہ غریب نواز کی غلامی میں داخل ہو کر زیادہ اپنے اوقات اپنے پیر و مرشد رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بسر کرنے لگا اور معاملات سے کلیۃً بے تعلق ہو کر خلق سے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہوں گے

قطع تعلق کر دیا۔ ایک روز جو میں نماز صبح سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو دیکھا کہ مولوی مشتاق حسین میرے مکان کی مسجد میں بیٹھ کر تلاوت قرآن مجید کر رہے ہیں۔ مولوی صاحب نے قرآن مجید کو جزدان کر دیا اور مجھ سے بہت تپاک سے ملے۔ مولوی صاحب اضلاع میں صدر تعلقدار نہایت متدین اور سچے خیر خواہ ریاست اور کمال درجہ جفاکش اور کارگزار اور ہر سازش سے پاک و صاف اور عربی فارسی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے اور نواب آسمان جاہ کے مشیر خاص تھے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ تم ناحق گوشہ نشین بنے ہو۔ میرے ساتھ چلو۔ میں نواب صاحب سے تمھاری سفارش و صفائی کرا دوں گا۔ میں نے ہر چند عذر کیا مگر وہ مجھ کو پکڑ لے گئے۔ نواب آسمان جاہ نہایت مستقل مزاج اور کوہ وقار اور ازحد کم سخن تھے۔ مجھ سے بکشادہ پیشانی ملے مگر اثنائے گفتگو میں ذکر نواب خورشید جاہ امیر کبیر کا آ گیا۔ مجھ سے فرمایا کہ آپ اکثر ان کے پاس جایا کرتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ میری ان کی قدیم راہ و رسم ہے اور ان کے فرزند میرے شاگرد ہیں۔ یہ سن کر وہ چپ ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد مولانا مجھ کو باہر لے آئے اور کہا کہ آپ نے غلطی کی جو یہ جواب دیا۔ مگر میں سنبھال لوں گا۔ اب اصل مطلب سنو نواب صاحب کا حال تم خود جانتے ہو۔ پرانے بڈھوں کے اسیر ہیں اور اہل سازش سے بھی تم خوب واقف ہو۔ نواب صاحب نے کئی معروضے حضور پرنور میں داخل کیے کہ اضلاع سے مجھ کو بلا کر اپنے پاس رکھیں مگر اب تک کوئی جواب عطا نہیں ہوا۔ اگر آپ سچے خیر خواہ ریاست کے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ دروازہ سازش کا بند ہو اور کار ریاست میں خلل واقع نہ ہو تو آپ میرے بارے میں ضرور کوشش کیجیے۔ میں نے ان سے کہا کہ قلم دوات کاغذ دیجیے۔ میں آپ کے روبرو معروضہ لکھتا ہوں اور آپ ہی داخل کرا دیجیے۔ چنانچہ میں نے مختصر معروضہ یہ لکھا کہ درحالیکہ حضور نے آسمان جاہ بہادر کو اس خدمت پر سرفراز فرمایا ہے تو ضرور ہے کہ ان کو ان کی پسند کے اہلکار ملیں ورنہ نواب لائق علی خاں کے وقت کی ہنگامہ آرائی قائم رہے گی اور مولوی مشتاق حسین پر ان کو کامل اعتبار بھی ہے۔ فدوی نے جرأت معروضہ کی صرف براہ خیر خواہی کی ہے۔" یہ لکھ کر میں چلا آیا۔ چند روز بعد میں نے سنا کہ مولانا دست راست بلکہ عصائے پیری نواب آسمان جاہ کے ہو گئے اور کل حل و عقد ریاست ان کے قبضہ میں ہو گیا اور انھوں نے فردونجی صاحب کو مراسلات انگریزی کے واسطے اپنا پیش دست اور مہر جی کو مشیر قانونی بنا لیا اور مہدی حسن فتح نواز جنگ کو اپنا شریک خدمت کر کے مولوی مہدی علی کو خانہ نشین کر دیا یہ مہدی حسن فتح نواز جنگ چند روز اپنے بھائی حیدر حسن کے ساتھ ہمارے تعلیم خانہ و تربیت خانہ واقع قیصر باغ لکھنؤ میں میرے ساتھ بھی رہے تھے مگر کچھ حاصل نہ کیا البتہ لکھنؤ ہی میں فتنہ رہے۔ بعدہٗ ملک اودھ میں منصف ہوئے۔ ایک دوغلی میم کو گھر میں ڈال کر پردہ نشین کر لیا تھا اور اسی سے کچھ انگریزی تحریر و تقریر حاصل کر لی تھی۔ ذہن رسا پایا تھا اور بچپن میں کچھ عربی بھی پڑھی تھی۔ سرسید احمد خاں سے بیعت کر کے ان کی سفارش بنام وزارت پناہ لائے تھے۔ مگر ان کا انتقال ہو چکا تھا اور مدارالمہام کا عہد وزارت تھا۔ مولوی مشتاق حسین ان کو اپنے ساتھ میرے پاس لائے۔ میں نے صیغہ عدالت میں ملازم رکھا دیا تھا مگر چند روز بعد خانۂ نواب وزیر میں انھوں نے اور ان کی ہم

نے نواب وزیر کی صحبت میں کمال رسوخ حاصل کیا اور جب وہ معزول ہو گئے تو بامداد مولوی مشتاق حسین صاحب وشیر خاص نواب آسمان جاہ بن گئے مگر چونکہ نواب آسمان جاہ سن رسیدہ اور قدیم تہذیب کے پابند تھے۔ میم صاحب کی دال وہاں نہ گلی۔

حضور پرنور نے کل اختیارات حل و عقد جو عہد وزارت جاہ میں مہاراج و نواب وزیر کو حاصل تھے نواب آسمان جاہ کو عطا فرما کر مختار کل ریاست ابد مدت کا کر دیا۔ صرف اہم معاملات میں ضروری معروضات مع اپنی رائے اور تجویز کے نواب صاحب کی طرف سے اور ان کے نام اور دستخط سے مولوی مشتاق حسین صاحب داخل کر دیا کرتے تھے۔ گویا درحقیقت وزیر اعظم جناب مولانا اور ان کے شریک فتح نواز جنگ بہادر تھے۔ نواب صاحب فقط دستخط کے مالک تھے۔ مولوی مشتاق میں سوائے ضد اور ہٹ کے اور کوئی عیب نہ تھا۔ ریاست کے خیر خواہ وزارت خواہ، متدین متقی و پرہیزگار، محنت و جانکشی میں تیلی کا بیل، شب و روز قلم دوات کاغذ سے سروکار، مگر چونکہ نرے مولوی تھے۔ بلند پروازی میں کبھی ایک منزل کوٹھے سے زیادہ نہ اُڑ سکتے تھے۔ انگریزی معاشرت اور انگریزی خیالات سے ناواقف تھے۔ لہٰذا اُنھوں نے جس طرح پلے ہوئے ہاتھی کو جنگلی ہاتھیوں کے پکڑنے کے واسطے چھوڑ دیتے ہیں۔ مسٹر فردونجی جیسے ادیب اور انگریزی معاشرت کے واقف کار کو انگریزوں کو رام کرنے کے واسطے متعین کر رکھا تھا۔ اُدھر فتح نواز جنگ مہدی حسن کو حسب مرتبہ کذب و صدق میں بے باک تھے۔ اپنی سازش کی سرگرمی کے واسطے اپنا شریک خدمت بنایا تھا۔ خود حضور پرنور کی خوشنودی حاصل اور قائم رکھنے کے واسطے سید حسین صاحب بلگرامی کافی تھے۔ علاوہ اُن کے افسر جنگ پہلے ہی سے از جا چکے تھے رہ گیا میں، سو صحبتوں کی دولت میں کرنل مارشل میرا کام تمام کر چکے تھے۔ اب تین وزیر حیدر آباد میں ہو گئے ایک وزیر اعظم برائے دستخط اور دو وزیر کوچک برائے انتظام ریاست اور انگشت ششم یعنی کرنل مارشل مع افسر جنگ۔ مگر بقول افسر جنگ ایک بیچارے سپاہی کو بڑے معاملات میں مداخلت کی قدرت کہاں ہو سکتی ہے صرف منہ بولے بھائی بن گئے تھے اور جب کرنل صاحب کو اوّل درجہ کا ٹکٹ دیا جا کر میل ٹرین سے روانہ کر دیا۔ تو یہ وزرائے کوچک کی برادری میں شریک ہو گئے۔

مولوی مہدی علی کی بابت کچھ رعایت ہو گئی اور کچھ یہ خیال کر فردونجی کو اُن سے جُدا کر کے اُن کو بے تیغ کر دیا گیا لہٰذا اُن وزراء نے اُن کو یتیم و خانہ نشین کر کے چھوڑ دیا اور یہ سمجھ کر کہ ہر طرف سے سازش کا سدّ باب ہو گیا۔ ریاست کی گاڑی کو ریل گاڑی کی رفتار پر دھوم دھام سے چلانے لگے۔

نواب مہدی علی خاں، منیر نواز جنگ، محسن الملک ایسے آدمی نہ تھے کہ دبی بلی کر چوہوں سے کان کترواتے۔ اب اخبارات میں بھی چبھتے مضامین نکلنے شروع ہوئے۔ وزیروں نے شبہ نواب امیر کبیر پر کیا۔ ایک روز میں پرانی حویلی حاضر تھا اور مجھلے وزیر یعنی مشتاق حسین بھی کچھ ضروری کاغذات دربغل موجود تھے۔ میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ ”اب تو خوب اخبار نویسی کی مشق ہو رہی ہے۔ آج کی باریابی میں حقیقت معلوم ہو جائے گی۔“ میں نے جواب دیا کہ اگر یہ خطاب غیر طرف ہے تو چشم ما روشن دل ما شاد اگر میری طرف ہے تو آپ کے دماغ میں خلل ہو گیا ہے۔ میں وہ نوالہ ہوں کہ آدمی کے حلق میں اٹک جایا کرتا ہوں۔ مولانا تو یہ سن کر چپ رہ گئے مگر نواب وقار الامراء بہادر کو طیش آ گیا اور فرمایا ”بہت اچھا دیکھ لیا جائے گا۔“

ہیرے کا مقدمہ اور لیڈی وقار نواز کا معاملہ۔ اب سنیئے کہ امپریل ڈائمنڈ (ہیرے) کا مقدمہ کھڑا ہو گیا اور

اس قدر طول اس کو ہوا کہ تمام ہندوستان میں غل مچ گیا اور یعقوب بیگ صاحب نے حضور پرنور کی شہادت اس غرض سے طلب کرائی کہ شہادت پیش ہوگی تو مقدمے کو طول ہوگا مگر مولوی مشتاق حسین خاں بہادر وقار الملک اپنی ضد پر قائم رہے اور سرٹرنس کو ہموار کر کے آخر حضور پرنور کو کمیشن میں طلب کرا کے اظہار ان کا قلم بند کرا دیا۔ ادھر وزیر کوچک مہدی حسن خاں فتح نواز جنگ مع اپنی میم صاحبہ انگلینڈ پہنچے اور بحیثیت وزیر ریاست حیدرآباد بی بی وزیرن کو ملکۂ معظمہ کے دربار میں پیش کرا دیا اور خود ولایتی بیرسٹر بن گئے۔ چنانچہ محمد صدیق صاحب انجینئر اور سید علی صاحب بلگرامی اور محسن الملک بہادر ان تینوں نے ایک شخص متھرا نامی بنگالی مفلوک الحال سے ایک رسالہ نواب فتح نواز جنگ اور ان کی میم کی بابت چھپوا دیا جس میں ان کے اوائل عمر کے حالات درج تھے۔ رزیڈنٹ نے اس بنا پر بازپرس کی کہ اس عورت نے دربار ملکۂ معظمہ کی ہتک کی ہے۔ لہٰذا فتح نواز جنگ کو لازم ہے کہ اس رسالہ کی تکذیب میں ثبوت پیش کریں۔ تیسرے چوتھے روز مولوی میر اقبال علی رکن گروہ وزارت میرے پاس تشریف لائے اور مجھ سے کہا کہ وقار الملک اور فتح نواز جنگ کا حکم ہے کہ آپ کو ہم اپنا گواہ برائے تکذیب رسالہ پیش کریں۔ میر اقبال علی کے بعد وزیر اعظم نے مجھ کو طلب کیا اور پوچھا کہ آپ فتح نواز جنگ کی زوجہ سے واقف ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ اگر بہ جبر دریافت فرمایا جاتا ہے تو سنئے "اس کا نام مس ڈانالی تھا۔ میرے ہم درس و ہم مکتب اس کے حالات سے واقف ہیں۔" میرے اس جواب پر مولانا نے آستینیں چڑھائیں اور نواب صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا اور ارشاد فرمایا کہ معلوم ہوا کہ آپ ہی اس رسالہ کے مصنف ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ نہ میں اس کا مصنف نہ مجھ کو اس کی اشاعت کا علم۔ میں نے عرض کیا کہ اگر یہ مقدمہ چلایا گیا اور میں بجبر پیش کیا گیا تو یہ وزارت قائم نہ رہے گی اور سلام علیک کر کے نہایت متردد اور پریشان گھر واپس آیا۔

اس شب کو میں نے خواب میں دیکھا کہ گویا میں ایک زرنگار گاڑی اور نہایت خوب صورت و بلند قد جوڑی پر سوار مع ایک اپنے ملاقاتی کے مولوی مشتاق حسین کے مکان پر گیا ہوں اور مولانا میلے کپڑے پہنے اور میلی کچیلی پگڑی برسر بہت سے کاغذات دربغل میری گاڑی کے پاس آئے اور وہ کاغذات میرے سپرد کر دیے۔ پھر وہ گاڑی اور جوڑی مجھ سے کہ گاڑی اور نہایت بلند ہو گئی اور بلندی پر پہنچ کر ہاتھی ہو گئی اور وہ ہاتھی گویا ہوا پر اڑا مجھ کو سیلون جزیرہ کو لے گیا اور وہاں کے بڑے ہوٹل کی میز پر اُترا۔ پھر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے یہ خواب حضرت پیر و مرشد سے دوسرے روز بیان کیا۔ ارشاد فرمایا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ تم کو یہ خواب مبارک فرمائے اور انجام بخیر ہو۔

دوسرے روز تحریری حکم وزارت مجھ کو پہنچا کہ فوراً میں اپنا بیان لکھ کر داخل کروں۔ اب میں نے خیال کیا کہ تمہاری پوری شامت آگئی۔ مجبوراً کمر بستہ دستار بسر در دولت فلک رفعت شاہی پر پہنچا۔ عجب اتفاق ہوا کہ میری اطلاع ہوتے ہی خود بدولت و اقبال برآمد ہو گئے اور اپنے کمرۂ نشست گاہ میں فوراً مجھ کو یاد فرمایا۔ میں چہرۂ مبارک دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ چہرہ بالکل سفید جس میں ایک بوند بھی خون کی نہ تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میری پرسش مزاج کے جواب میں فرمایا کہ "اپنا حال تم سے کہوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم اس وقت کیوں حاضر ہوئے۔ میں تو تم کو خود بلانے والا تھا۔" میں نے کل حالات مفصل عرض

کر دیجیے۔ فرمایا: "آپ کو تو ڈیوڑھی مبارک اور مجھ سے تعلق ہے۔ آسمان جاہ کا کیا حق ہے کہ بے میری اطلاع و اجازت آپ سے پیام و سلام کرتے۔ میں بہت خوش ہوا کہ آپ نے جواب ترکی بہ ترکی دیا۔" یہ فرما کر عرضداشت وزیر اعظم کی بقلم مولانا مشتاق حسین خاں صاحب میز پر سے اٹھا کر مجھ کو عنایت کی۔ خلاصہ اس کا یہ تھا کہ سرور جنگ پر مقدمہ قائم کرنا چاہیے۔ اس کے بعد فرمایا کہ آپ کچھ اندیشہ نہ کیجیے جو واقعات آپ کو معلوم ہیں بے تکلف لکھ دیجیے۔ پھر ارشاد فرمایا کہ اب آپ میری سنیے۔ مشتاق حسین مہدی حسن اور ریذیڈنٹ نے مجھ کو عامۂ خلائق کے سامنے ناحق حقیر کیا زبردستی ایک ادنیٰ ہیرے کے واسطے میرا بیان لکھوایا اور کوئی فائدہ نہ ہوا۔ معاملہ اب تک چل رہا ہے۔ اس صدمہ نے میرا یہ حال کر دیا۔ میں نے عرض کیا کہ اگر حکم ہو تو فدوی اس معاملہ کو ختم کر دے۔ اس وقت یعقوب بیگ صابونجی یہاں آیا ہوا ہے اس کو بلا کر آپ کے قدموں پر گرا دیتا ہوں۔ آپ اس کی خطا معاف فرما دیجیے۔ ہیرا خزانہ میں داخل کر دیجیے۔ یہ سب منہ دیکھ کر رہ جائیں گے۔ فرمایا جو کچھ کرنا ہو، جلدی کر دیجیے چنانچہ یہی ہوا اور مقدمہ ختم ہو گیا۔

ادھر حضور پُرنور نے مجھ کو شب و روز حاضر باشی کا حکم فرمایا اور کُل عرضداشتیں جو وقتاً فوقتاً وزرائے کونسل بہ دستخط وزیر اعظم بھیجا کرتے تھے۔ مجھ ناچیز کے سپرد فرما کر ان کے مضار و مفاد کی تنقیح کا حکم دیا اور اب احکام شاہی بہ رد و قدح جاری ہونے شروع ہو گئے۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ آنحضرت بدولت و اقبال نے قصد کُل حل و عقد اپنے دستِ مبارک میں لینے کا کر لیا اور نواب امیر کبیر سر خورشید جاہ بھی آنحضرت کو رائے دینے میں مستعد ہو گئے۔ نواب فخر الملک نے بھی مثل نواب امیر کبیر بہادر با خلوص نیت معاملات کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اب وہ زمانہ آ گیا کہ "قانونچۂ مبارک" کے تالیف کرنے کی ضرورت پڑی اور مجھ ناچیز ہیچمدان کو حکم دیا کہ ایک نظام سیاسی ریاست کا بہت جلد مرتب کیا جائے تاکہ آئندہ کوئی اعلیٰ تا ادنیٰ عہدہ دار اپنے فرائض منصبی کو سمجھ کر دائرہ محدود سے قدم باہر نہ نکال سکے۔

چنانچہ حصہ اول قانونچۂ مبارک منظور اقدس ہو کر واسطے طبع کے بھیجا گیا۔ اس وقت اتفاقاً ایک میرے مددگار نے بے میری اطلاع ایک معمولی قانونی فقرہ اس میں شامل کر دیا۔ وہ فقرہ گویا جامدار میں کمبل کا پیوند معلوم ہونے لگا۔ میں نے عرض کیا کہ اب تو کُل نسخے اس کے چھپ چکے۔ میری یہ غفلت معاف فرمائی جائے۔ یہ بنا قانونچہ کی ہے۔ اب صرف ایک مشکل درپیش ہوئی وہ یہ کہ باوجاہت وزارت پناہ ریذیڈنسی کا ڈربہ لڑائی کے مرغوں یعنی اہل سازش کے واسطے کھل گیا تھا اور جس نے پہلے ریذیڈنٹ کے کانوں پر قبضہ کیا وہی بازی لے جاتا تھا۔ اس وقت تک تو سب وزرائے کونسل کی توڑ پھوڑ کی طرف متوجہ تھے مگر قانونچۂ مبارک کے بعد سب کی توجہ میری طرف مبذول ہوئی اور آپس میں سرگوشیاں ہوئیں کہ اگر خلافِ دستور قدیم حضور پُرنور نے عنانِ حکومت اپنے دستِ قدرت میں لی اور وزارت کی خودمختاری کا خاتمہ کر دیا تو پھر ہم لوگ تو محض شطرنج کے پیادے رہ جائیں گے اور یہ وقار اور اعتبار جو ہم نے انگلینڈ تک حاصل کیا ہے۔ یہ ظالم سرور جنگ ع

ما را ازیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نبود

مثل تارِ عنکبوت ایک ہی ہاتھ میں نیست و نابود کر دے گا۔ چنانچہ چند یورپین عہدہ دار مثل ڈنلاپ (DUNLOP) کرنل

(NAVAL) کے بقول سفید برہمن تھے جو انھیں حضرات کی سفارش سے ملازم ریاست ہوئے تھے وہ بھی شریک رائے اپنے محسنین کے ہو گئے۔ اب لمبے لمبے مضامین اخباروں میں نکلنے شروع ہو گئے اور رزیڈنٹ پر قدیم پالیسی کے قائم رکھنے کے واسطے زور ڈالا گیا۔ مجھ کو پھر اپنی حفاظت کی فکر کرنی پڑی۔

فی الحال جبکہ ان حضرات نے دیکھا کہ ان کا افسوں مجھ پر کارگر نہ ہوا تو مولوی مہدی علی خاں محسن الملک کو اپنی رائے اور مشورے میں شریک کیا۔ جناب مولانا نے میرے یہاں معمول سے زیادہ آمد و رفت شروع کی اور میرے مکان کے خستہ حالات دیکھ کر کہ وہ بھاڑ ہے اور نہ فانوس، نہ فرنیچر نہ میز نہ کرسی نہ کوچ۔ بہت افسوس و ہمدردی میری کم استطاعتی اور بے بضاعتی پر ظاہر کی اور ہر ملاقات میں میری معمولی حالت پر اور کثرتِ اولاد کی بابت گفتگو کیا کرتے اور افسر جنگ بہادر کی مثال دیا کرتے کہ کس طرح انھوں نے اپنی دنیا کو سنبھالا ہے۔ الغرض ایک روز جبکہ میں دردِ نقرس میں مبتلا ایسا فرشی تھا کہ کروٹ بھی لینے کی طاقت نہ تھی مرزا غضنفر بیگ جو داماد مولانا کے تھے میرے پاس آئے۔ اس وقت مسٹر پالمر (PALMER) بیرسٹر میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ مرزا صاحب نے مجھ سے کہا کہ تم سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہوں۔ مسٹر پالمر یہ سن کر باہر چلے گئے۔ مرزا صاحب نے اول ہر طرف کے دروازے کمرے کے بند کیے اور میرے پاس بیٹھ کر ایک پوٹلی لال کپڑے میں بندھی ہوئی جیب سے نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ میں نے کہا: بھئی یہ کیا معاملہ ہے کہ دروازے بند کیے گئے اور یہ پوٹلی کیسی ہے۔ فرمایا کھول کر دیکھ لیجیے۔ باوجودیکہ میرا ہاتھ قابو میں نہ تھا میں نے بمشکل پوٹلی کھولی۔ اس میں بہت سے گڈّے نوٹوں کے بندھے ہوئے تھے۔ میں دیکھ کر حیران رہ گیا اور ان کی صورت دیکھنے لگا۔ وہ بولے کہ مولانا نے سلام کہا ہے اور کہا ہے کہ "آپ کی حالت حد سے گزر گئی۔ آپ کی حالت سن کر نواب آسمان جاہ کو بہت افسوس ہوا۔ اس کو رشوت نہ سمجھیے بلکہ دوستانہ تحفہ سمجھیے اور اپنے بچوں کی تعلیم پر صرف کیجیے۔ نواب صاحب کا یہ عطیہ بے موقعہ ہے۔ یہ نہ سمجھیے کہ وہ کوئی کام آپ سے نکالنا چاہتے ہیں۔ وہ اور آپ اور ہم سب خیر خواہ جاں نثار حضور پرنور کے ہیں۔ جو راستہ آپ چل رہے ہیں، اگر یہ ریاست کے واسطے بہتر ہے تو ہم سب آپ کے شریک اور معین اور مددگار رہنے کو مستعد ہیں۔ ہم سب کی غرض ایک ہونی چاہیے اور وہ یہی ریاست کی بہتری و خیر خواہی ہے۔"

وہ تو یہ تقریر اور پند و نصیحت کر رہے تھے۔ میرے دل و دماغ کو وہ صدمہ پہنچا کہ غور و فکر کی بھی حالت باقی نہ رہی۔ ایک حالت بے چارگی اور سراسیمگی میں چت لیٹ گیا کہ یکایک امدادِ غیبی نے میری دستگیری فرمائی اور جناب پیر و مرشد کی توجہ میرے کام آئی یعنی یکایک میرے دل میں القا ہوا کہ یہ نوٹ ہیں۔ وہیں جگہ ان کے نمبر لکھے گئے ہوں گے اور ایک شخص غیر اور اجنبی یہ نوٹ لایا ہے اور اس نے میرے ہاتھ میں رکھ دیے ہیں۔ اگر میں پھیر دوں تو پہنچنے کا ثبوت تو یاروں کے پاس کافی ہی ہے لیکن پھیرنے کا ثبوت میں کیا دے سکوں گا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے مرزا صاحب سے کہا کہ ذرا گنیے تو کتنے نوٹ ہیں۔ فرمایا ہزار ہزار روپیہ کے اسّی نوٹ ہیں اور یہ کہہ کر مجھ کو دکھانے لگے اور گننے لگے اور پوٹلی میں باندھ کر میرے تکیے کے نیچے رکھ دیے۔ اس کے بعد انھوں نے مجھ کو مبارکباد دی اور کہا کہ اب آپ حضور پرنور کے پاس ہیں اور مولانا دیوان کے پاس کار ریاست عمدہ طور پر دونوں کے مشورے سے چلے گا۔ میں نے جواب دیا کہ مولانا کو میرا سلام کہنا اور یہ کہنا کہ روپیہ تو میں نے رکھ لیے مگر میں ہرگز ہرگز آپ کا ممنون نہیں ہوا۔ کیونکہ میری

مدت العمر کی ملازمت میں آپ نے ایسا دھبا لگا دیا کہ اس کا دھونا میری قدرت سے باہر ہے۔ اب بسم اللہ آپ تشریف لے جائیے اور یہ کہتے ہوئے کہ "واقعی مولانا کا قول صحیح ہے کہ آپ کا نام دفتر حقارت میں نمبر اوّل پر درج کیا جائے۔" میں نے پامر صاحب کو اندر بلایا۔ وہ کوئی درخواست لائے تھے۔ میں نے وہ درخواست اسی وقت بھجوا دی اور پھر اُن سے کُل حال بیان کر دیا، اور پرچی بھی ان کو دکھائی۔ اُن کا رنگ زرد پڑ گیا اور کہا کہ "مرگ نو مبارک باد۔" اب تم کسی طرح نہیں بچ سکتے۔ تم کو زبان تک نہ لگانا تھا اور فرستادہ کو گھر سے باہر نکلوا دینا چاہیے تھا۔ میں نے اُن سے اپنا منشا بیان کیا اور کہا کہ میری حالت ذرا سنبھل جائے تو میں یہ رقم حضور پُرنور کو نذر کر دیتا ہوں۔ وہ میرے بہترین گواہ ہو جائیں گے۔ اُنھوں نے کہا کہ "واقعی خوب تمھارا ذہن لڑا مگر خبردار ایک منٹ کی دیر نہ کرو۔" مگر اس روز جانا نہ ہوا۔ دوسرے روز صبح کو میں نے خیال کیا کہ جس طرح بن سکے۔ یہ بلا سر پر سے ٹالو۔ موت اس زندگی سے بہتر ہے۔ الغرض مصری خاں وغیرہ نے مجھ کو اُٹھا کر پالکی میں ڈال دیا۔ ڈیوڑھی مبارک پہنچ کر ملازمین نے مجھ کو کرسی پر بٹھا دیا۔ اس عرصہ میں حضور پُرنور برآمد ہوئے۔ میرا حال زار دیکھ کر افسوس فرمایا۔ اس کے بعد میں نے اپنا صندوقچہ منگوایا اور پوٹلی دست بستہ نذر گزرانی فرمایا۔ یہ کیا ہے؟ میں نے عرض کی۔ میری نذر قبول فرمائی جائے اُس کو کھول کر ملاحظہ فرمائیے۔ حضور پُرنور اس کو کھول کر نوٹ گننے اور مجھ کو دیکھنے لگے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ اسی ہزار کے نوٹ مجھ کو نواب آسمان جاہ بہادر وزیر اعظم نے بطور انعام عطا کیے ہیں چونکہ میں اس کا مستحق نہیں ہوں۔ حضور پُرنور کی نذر گزرانتا ہوں اور تمام و کمال قصہ میں نے عرض کیا۔ سنتے ہی چہرۂ مبارک سُرخ ہو گیا اور عابد کو حکم دیا کہ ٹیلیفون دے کر آسمان جاہ کو ابھی بلاؤ۔ میں نے قدم پکڑ لیے اور عرض کیا کہ میرے حال پر رحم فرمائیے اور میری عرض قبول فرمائیے۔ آسمان جاہ اس وقت فقط وزیر اعظم ہی نہیں بلکہ رکن اعظم ریاست آصفیہ اور رشتہ دار شاہی ہیں۔ اس وقت اپنی عزت بچانے کے واسطے اُن کو دس بیس لاکھ روپیہ خرچ کر دینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ علاوہ اس کے میں تنہا اور اُدھر ایک گروہ ذی علم مستعد بکار چست و چالاک۔ ذرا پھر کیا جائے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ رقم ایک خاص غرض سے دی گئی ہے یعنی فدوی کوشش کر کے حضور میں اور آسمان جاہ میں اتحاد قائم کرا دے تاکہ مثل سابق مامور رہیں اور اجراے تجویز مبارک بیکار ہو جائے۔ اگر حضور پُرنور ایک عنایت نامہ آسمان جاہ کے نام بالفاظ لطف و عنایت تحریر فرما دیں تو یہ کل حضرات خواب غفلت میں پڑ کر جو جال مجھ پر ڈالا ہے اُس میں خود پھنس جائیں گے۔ ان حضرات کی چال یہ ہے کہ اس خیال سے کہ فدوی نے رشوت قبول کر لی ہے۔ چند روز میں اپنے کل کام حسب دل خواہ فدوی کے ذریعہ سے پختہ کر کے پھر فدوی پر جرم رشوت لگا کر فدوی کا خاتمہ کر دیں۔ فدوی مسٹر بلاؤڈن کو بھی اس راز میں شریک کرنا چاہتا ہے۔ وہاں سے رخصت ہو کر اسی حالت میں رزیڈنسی پہنچا اور تمام رام کہانی اُن کو بھی سُنائی۔ وہ سُن کر ایک مرتبہ کرسی پر سے بیتاب ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُنھوں نے کہا کہ مجھ کو لازم ہے کہ میں فوراً فارن آفس کو رپورٹ کر دوں اور ہز ہائینس فوراً آسمان جاہ سے جواب طلب کریں۔ میں نے کہا کہ یہ لوگ خود اپنے پہلو بچا کر خود مجھ پر رشوت ستانی کی تہمت لگائیں گے اور خود جال میں پھنس جائیں گے۔ دوسرے دن بندگان عالی اور رزیڈنٹ کے باہم مشورہ میں یہ رائے قرار پائی کہ فی الحال خاموش رہنا چاہیے۔ میں نے بھی چند معروضات کی منظوریاں حاصل کر کے ان گرگان باراں دیدہ کو پورا اطمینان دلا دیا کہ میں یہ رقم ہضم کر بیٹھا ہوں۔ فتح نواز جنگ نے بغلیں بجائیں کہ اب مجھ کو کون نکال سکتا ہے اور بے صبری کی حالت میں ایک مسٹر بلاؤڈن کو خط لکھ بھیجا کہ سرور جنگ نے رعب داب ڈال کر ایک لاکھ روپیہ سر آسمان جاہ سے وصول کیا ہے۔ مسٹر بلاؤڈن نے

شاہ و وزیر دونوں کو بذریعہ تحریر کہا کہ سرور جنگ سے فوراً جواب طلب کیا جائے اور جو لوگ اس شرمناک معاملہ میں شریک ہوں ان کا بھی بیان قلم بند کر کے میرے پاس بھیجا جائے۔

مولوی مہدی علی پریشان حال میرے پاس آئے اور کہا کہ تم صاف انکار کر دو۔ میں نے کہا کہ میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ نواب صاحب نے مجھ کو یہ رقم میرے بچوں کی تعلیم کے واسطے عنایت فرمائی۔ میں علانیہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں بلکہ لاکھ روپیہ میں سے جو بیس ہزار کم ہیں۔ میں وہ بھی وصول کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بولے۔ ایک سید کا خون ناحق تمہاری گردن پر ہوگا۔ میں کچھ کھا کر سو رہوں گا۔ میں نے کہا کہ سید تو زمانۂ علی مرتضیٰ علیہ السلام کے وقت سے مظلوم اور شہید ہوتے چلے آئے ہیں۔ یہ تو آپ کا ورثہ ہے۔ برہم و پُر آب ہو کر کہا کہ تم کو ہنسی سوجھی ہے اور میرا کام تمام ہو رہا ہے۔ میں نے کہا۔ مولانا میں ہرگز انکار نہ کروں گا اور کل واقعات لکھ بھیجوں گا۔

اس کے بعد مولوی محمد صدیق رکن رکین گروہ مخالف میرے پاس آئے اور کہا کہ تم کو نواب وقار الامراء نے بُلایا ہے میرے ساتھ چلو۔ نواب وزیر اعظم بھی موجود ہیں۔ میں نے بذریعہ ٹیلیفون حضور پُر نور سے اجازت حاصل کی اور ان کے ساتھ ہو لیا وہاں ایک ہنگامہ رقص و سرود برپا تھا۔ نواب وقار الامراء مجھ کو ایک کمرہ میں علیحدہ لے گئے اور پوچھا کہ آپ کو کتنے روپیہ مولوی مہدی علی نے دیئے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ مولوی مہدی علی نے مجھ کو ایک کوڑی بھی نہیں دی۔ البتہ مرزا غضنفر علی بیگ مختار شاہ عبدالرحیم نے مجھ کو نواب آسمان جاہ کی طرف سے اسی ہزار کے نوٹ فی نوٹ ہزار روپیہ دیئے ہیں۔ اس پر مولوی محمد صدیق نے قہقہہ مارا اور کہا کہ بیس ہزار جناب مولانا کھا گئے۔ میں نے کہا کہ مگر میرا حق مجھ کو ملنا چاہیئے۔ جب نواب صاحب کے دفتر میں میرے نام ایک لاکھ درج ہوئے ہیں تو باقی بیس ہزار عنایت فرمائے جائیں۔ نواب وقار الامراء نے فرمایا کہ آپ کے ساتھ ہم تو بہت کچھ سلوک کرنے والے ہیں۔ لاکھ بیس ہزار کی کیا اصل ہے۔ نواب وقار الامراء اور مولوی محمد صدیق میں قرار پایا کہ بیس ہزار روپیہ مولوی مہدی علی سے واپس لے کر مجھ کو دیئے جائیں۔ اس شرط پر کہ میں مسٹر پلاؤڈن کے جواب میں صاف انکار کروں۔ میں نے کہا کہ میں ہرگز انکار نہ کروں گا۔ یہ سب گفتگو میں نے پھر بروقت باریابی حضور پُر نور سے عرض کر دی۔ ارشاد فرمایا کہ آپ کچھ پروا نہ کیجئے اور واقعات لکھ دیجئے۔ پس حکم اقدس بنام وزیر اعظم شرف صدور پایا۔ سوائے علامہ روزگار مولانائے مکرم نواب محسن الملک مہدی علی خاں بہادر کے اور سب کے حواس باختہ ہو گئے۔ لیکن اس پیر جہاندیدہ فطرت دانا نے ایسا جواب لکھا کہ اگر اصل واقعات چند ماہ پیشتر حضور پُر نور اور مسٹر پلاؤڈن کو معلوم نہ ہو جاتے تو مجھ کو کہیں منہ دکھانے کو جگہ بھی نہ رہتی۔ جب سب کے بیانات داخل ہو گئے تو حضور پُر نور نے مسٹر پلاؤڈن کو طلب کیا۔ میں تو بری کر دیا گیا۔ مولانا کو جلد ممالک محروسہ سرکار عالی سے (سنہ ۱۸۹۳ء) نکل جانے کا حکم ہوا۔ مہدی حسن فتح نواز جنگ یہ حال دیکھ کر مع میم صاحب لکھنؤ روانہ ہوئے۔ مولوی مشتاق حسین شہر بدر کئے گئے۔ سر آسمان جاہ بے گناہ خدمت وزارت سے معزول ہو گئے۔ یہ نتیجہ اس وزارت کا ہوا۔ مگر بڑا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم پالیسی برٹش گورنمنٹ کی بدل گئی۔

علیحدگی کی درخواست

اب میں کہاں تک اس قصے کو تفصیل کے ساتھ لکھوں۔ میں نے باریاب ہو کر عرض کیا کہ میری وجہ سے مسٹر پلاؤڈن ان خلاف ادب افعال کے مرتکب ہو رہے ہیں جو فدوی دیکھ نہیں سکتا۔

علاوہ ازیں خود خسر اور اس کے مشیر خود مختار رہنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا اس وقت فدوی کی علیحدگی مناسب ہے۔ فرمایا کہ حضرت اگر آپ الگ ہو گئے تو میں گویا گدی سے اُتر گیا۔" میں نے عرض کیا کہ میں کب ان قدموں سے جُدا ہوتا ہوں۔ لیکن مصلحت یہی ہے کہ یہ وقت شدید ٹال دینا چاہیے۔ نواب امیر کبیر باہر کے کمرے میں حاضر تھے۔ ان کو طلب فرما کر مشورہ فرمایا اور فرمایا کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ چند روز علیحدہ ہو کر بلدہ ہی میں مقیم رہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اس وقت تو میری آبرو اسی میں بچتی ہے۔ چنانچہ دوسرے یا تیسرے روز نواب خورشید جاہ نے مجھ کو اطلاع دی کہ آپ کی رائے منظور اقدس ہوئی۔ برائے شش ماہ آپ جا سکتے ہیں۔ بعد نماز صبح میں اسٹیشن پر پہنچا۔ میری حیدرآباد بلکہ ملازمت سرکاری کی زندگی اسی پر ختم ہو گئی۔ باقی زندگی میں عام دلچسپی کی کوئی بات نظر نہیں آتی

محمد دین فوق

پیدائش۔ فروری ۱۸۷۷ء ۔ وفات۔ ۱۴؍ ستمبر ۱۹۴۵ء

کشمیر میں افغانوں کا دور اپنے آخری سانس لے رہا تھا۔ یوں تو افغان بادشاہوں کی طرف سے کشمیر میں جو افغان گورنر آئے وہ سب "کشمیر کی جان کے خواہاں" آئے لیکن ان میں حاجی کریم داد خاں، اس کا بیٹا آزاد خاں عرف نادر شاہ ثانی اور عہد افاغنہ کے دو آخری گورنر عظیم خاں اور جبار خاں تو واقعی کشمیر کے لیے بلائے عظیم تھے۔ "قحط عظیم" ۱۲۳۲ھ جو عظیم خاں ہی کے زمانے کی یادگار ہے۔ حاکموں کی لوٹ مار، جبر ستانی، ان کا ظلم و ستم۔ یہی کم نہ تھا کہ قحط کی شدت سے سارا ملک چیخ اٹھا۔ بہت سے مسلمان اور ہندو، کوئی قحط کے سبب سے کوئی ان کے ظلم و ستم کا شکار ہو کر ترک وطن پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ بہت سے پنڈت اور مسلمان پٹھانوں کے زمانہ ہی سے پنجاب اور دہلی میں آباد چلے آتے ہیں۔

انہی ستم رسیدوں میں علاقہ کامراج کے ایک بہت بڑے گاؤں ہردو شیوہ کا ایک سرکردہ زمیندار حسن ڈار بھی شامل تھا۔ اس کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ اپنے گاؤں میں "کھاتا پیتا" آدمی تھا۔ حاکم نے موٹی اسامی دیکھ کر خوب ہاتھ رنگے اور اسے بات بات پر یہاں تک تنگ کیا کہ اس نے چند ستم رسیدوں کی ایک جماعت تیار کر کے ترک وطن کا ارادہ کر لیا۔ حسن ڈار کی عمر اس وقت تقریباً ۴۰-۵۰ سال تھی اور وہ ایک بچہ کا باپ بھی تھا جس کا نام رجب ڈار تھا۔ اسی طرح دوسرے لوگ بھی عیال دار تھے۔ یہ سب لوگ ۱۲۳۱ھ مطابق ۱۸۱۶ء میں جبکہ عظیم خاں کشمیر کا حاکم اور محمود شاہ درانی افغانستان اور کشمیر کا بادشاہ تھا۔ رنج و افسوس کے ساتھ اپنی جائدادیں اور وسیع زمینداریاں چھوڑ کر وطن سے باہر نکلے۔

اس قافلہ میں سے کچھ لوگ کوٹلی ضلع جہلم میں رہ گئے۔ کچھ وزیرآباد کچھ گوجرانوالہ اور کچھ لاہور چلے گئے۔ مگر حسن ڈار باقی ماندہ جماعت کے ساتھ گوجرہ تحصیل ڈسکہ میں آکر مقیم ہو گیا۔ مگر جب یہاں کوئی مزدوری دی تو وہ موضع گھڑتل میں، جو اسی تحصیل میں گوجرہ کے متصل ایک مشہور قصبہ ہے، چلا آیا۔

حسن ڈار کے دو فرزندوں میں رجب ڈار بڑا تھا اور چھوٹا الفردوتا۔ رجب ڈار کے ہاں چھ اولادیں ہوئیں۔ تین لڑکے اور تین لڑکیاں۔ فرزند حسب ذیل تھے: میاں بڈھا خاں تخلص مشتاق، میاں لدھا خاں تخلص زار، منشی غلام محمد تخلص خادم۔

میں اواخر فروری ۱۸۷۷ء مطابق ماگھ سمت ۱۹۳۳ بکرمی میں بمقام کوٹلی ہرنرائن (ضلع سیالکوٹ) پیدا ہوا۔ چونکہ والد صاحب (منشی لدھا خاں) بوجہ ملازمت کبھی سیالکوٹ، کبھی پونچھ اور کبھی جموں رہا کرتے تھے۔ اس لیے ہم سب اپنے تایا میاں بڈھا خاں کے پاس ہی رہتے تھے جو کوٹلی ہرنرائن میں پٹواری تھے۔

میرے والد، تایا اور چچا منشی غلام محمد خادم کے زمانہ میں گھڑتل میں ابھی مدرسہ قائم نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے مسجدوں کی درس گاہوں

اسی میں عربی فارسی کی تعلیم پائی۔ لیکن ۱۸۸۳ء یا اس سے کچھ قبل کے ایام میں گھرتل میں پرائمری مدرسہ کھل چکا تھا۔ اس لیے مجھے اس مدرسہ میں داخل کیا گیا۔ اس زمانہ میں استاد اوقات مدرسہ کے علاوہ اپنی خوشی سے گھر پر بھی پڑھایا کرتے تھے۔ وہ صرف اپنی نیک نامی اور اپنے مدرسہ کی شہرت کے خواہاں تھے۔ ٹیوشن یا اس قسم کی اُجرتوں کا اس زمانہ میں رواج نہ تھا۔ حکام تعلیم بھی لڑکوں کو امتحانات میں ہوشیار دیکھتے، کتابیں انعام میں دیا کرتے۔ فیس بالکل معاف ہوتی تھی۔ البتہ چند برسوں کے بعد غالباً ۱۸۸۵ء یا ۱۸۸۶ء میں جماعت وار فیس مقرر ہو گئی۔ یعنی جماعت اوّل کی ایک آنہ، دوم کی دو آنے اسی طرح پانچویں کی پانچ آنہ۔

پرائمری اسکول گھرتل کے مجھے دو تین واقعات یاد ہیں جو میری آئندہ زندگی کا مقدمۃ الجیش ثابت ہوئے۔ میں شاید دوسری یا تیسری جماعت میں تھا۔ دیہاتی لڑکے بانسری کے ساتھ جو پنجابی اشعار پڑھا کرتے تھے وہ میں پنسل سے کاغذ پر لکھ لیا کرتا تھا۔ میں پانچویں جماعت میں تھا ایک مرتبہ گرمائی تعطیلوں میں کثرت سے تمام طلبا کو سوالات ملے۔ میں نے اپنے تمام حل کیے ہوئے سوالات کی کاپی کو خوشخط لکھا اور اس کا نام اپنے نام پر "محمد الحساب" رکھا اور اس کا سرورق بڑا خوبصورت بنایا۔ جب مولوی دسوندھی خاں نے میرے ہم جماعتوں کی کاپیوں کے ساتھ میری کاپی دیکھی جس کے سرورق پر لکھا ہوا تھا "محمد الحساب" مصنفہ محمد دین طالب علم جماعت پنجم مدرسہ گھرتل۔ تو حیرت سے دیر تک میری طرف دیکھتے رہے۔

۱۸۹۱ء میں، میں انگریزی تعلیم کے لیے مڈل اسکول جامکے ضلع سیالکوٹ میں داخل ہوا، جو اب ہائی اسکول ہے۔ جامکے کے بورڈنگ ہاؤس کے دو دلچسپ واقعات قابل ذکر ہیں۔ ایک رات تمام بورڈروں نے ایک تماشہ کیا۔ کوئی استاد بنا، کوئی شاگرد۔ سبق کس طرح غلط سنایا جاتا ہے۔ ایک طالب علم دوسرے طالب علم کو کس طرح چھیڑتا ہے۔ کس انداز سے اس چھیڑ کی شکایت ماسٹر کے پاس کی جاتی ہے۔ گھروں میں جا کر کس طرح جھوٹے بہانے بنا کر مزید خرچ طلب کیا جاتا ہے۔ ماسٹر کا بنچ پر کھڑا کرنا، جرمانہ کی سزا دینا، رجسٹر سے نام خارج کرنے کی دھمکی دینا، ہمارے ہیڈ ماسٹر بابو گنڈا مل بڑے سیدھے سادے درویش صفت استاد تھے۔ ان کی نقلیں کر کے میز پر ٹانگیں دراز کرنا، سپرنٹنڈنٹ بورڈنگ بن کر بورڈنگ کا معائنہ کرنا اور لنگر کی روٹیاں دیکھنا۔ غرض یہ تماشا ہو ہی رہا تھا کہ حافظ اللہ بخش سپرنٹنڈنٹ بورڈنگ اور مولوی غلام محی الدین ہیڈ پرشین ٹیچر آ گئے۔ اب جس طرح ہوا کے آتے ہی بھیڑیا لاحول پڑھتے ہی شیاطین غائب ہو جاتے ہیں، استادوں کی شکلیں دیکھتے ہی لڑکے تتر بتر ہو گئے۔

میں اسکول کی چھت پر جا بیٹھا۔ جو لڑکے قابو آ گئے ان کو پٹتے ہوئے دیکھتا رہا اور میں پٹنے کے بغیر ہی چھت پر بیٹھا کانپتا رہا۔ صبح میری بھی حاضری ہوئی۔ مولوی غلام محی الدین چھڑی لے کر اٹھے میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ گو رات کو مار نہیں پڑی لیکن خدا کی قسم جن کو مار پڑی ان سے زیادہ نادم ہوں اور ان سے زیادہ درد محسوس کر کے روتا رہا ہوں۔ مولوی صاحب نے فرمایا تم کو مار ہی نہیں پڑی تو رونا کس طرح آیا؟ میں نے کہا۔ آپ ہی نے تو گلستان میں پڑھایا ہے ؎

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند — کہ در آفرینش ز یک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار — دگر عضوہا را نماند قرار

مولوی صاحب ہنس پڑے اور مجھے سزا سے نجات مل گئی۔ سچ کہا مولانا حالی نے ؎

بڑھاپے کی دانائی سے کر کوئی
بدل دے وہ بچپن کی نادانیاں

یہ وہ ایام تھے کہ مڈل کا سرٹیفکیٹ بھی ملازمت حاصل کرنے کو کافی ذریعہ سمجھا جاتا تھا بلکہ اس کے متعلق مشہور تھا ؎

مڈل مایۂ شادمانی بود
مڈل حاصل زندگانی بود

لیکن میں اس زمانے کے اس "مایۂ شادمانی" بلکہ "حاصل زندگانی" سے بھی محروم رہا۔ میری تعلیم کے ابتدائی مدارج یہیں آکر ختم ہو گئے۔ میرا ارادہ صرف عربی، فارسی اور انگریزی پڑھنے کا تھا لیکن میرے والد اور بھائی مجھے پٹواری کا کام سکھانا چاہتے تھے جو ایک قسم کا ہمارا آبائی اور پشتینی کام تھا۔ آخر مجھے ۱۸۹۰ء کی گرمیوں میں سیالکوٹ جانا پڑا جہاں میرے چچا مولوی فتح الدین صدر قانونگو تھے۔ ان کے ذریعے میں پٹواری کا کام سیکھتا رہا۔ میرے والد صاحب قبلہ ان ایام میں ریاست پونچھ میں ملازم تھے اور پونچھ کے تین چار مواضعات کے جو تحصیل جموں میں واقع ہیں، ٹھیکہ دار تھے اور جموں ہی میں حویلی راجہ صاحب پونچھ میں ان کا قیام تھا۔ انہی کے ماتحت میرا چھوٹا بھائی چراغ الدین مرحوم بھی ملازم تھا۔ ۱۸۹۱ء میں انہوں نے مجھے بھی جموں میں بلا لیا۔

سیالکوٹ میں جب تک میں رہا، منشی رحیم بخش تجر مرحوم اور منشی محمد اسمٰعیل ذبیح مرحوم کے دم سے شعر و شاعری کا چرچا رہا۔ جموں میں منشی نور الدین عنبر اور منشی نذیر علی عاشق کانگڑوی اس چرچے میں میرے ساتھ شامل تھے۔ عنبر مرحوم بہت اچھا کہتے تھے۔ [illegible] میں نائب قصیدہ [illegible] تک پہنچے تھے کہ عین شباب میں انتقال کر گئے۔ منشی نذیر علی شیعہ عقائد رکھتے تھے۔ ان کی وجہ سے محرم کے ایام میں مجھے بھی دو چار مرتبہ "مومنین" کی مجلس میں جا کر مرثیہ خوانی کرنی پڑی۔

چند دنوں کے بعد ۱۸۹۵ء میں "پیسہ اخبار" لاہور کے دفتر میں، جہاں میرے تایا صاحب میاں بڈھا خاں مشتاق مرحوم ملازم تھے، میرا تعلق ہو گیا۔ اس تعلق کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مولوی محبوب عالم صاحب مالک پیسہ اخبار کے دو چھوٹے بھائی منشی عبد الکریم اور منشی عبد الرحیم میرے ہم جماعت تھے۔ پیسہ اخبار کے مالک مولوی محبوب عالم مرحوم واقعی ایڈیٹر گر تھے۔ ان کے اکثر کارندوں اور ایڈیٹروں نے یہاں کوئی تجربہ حاصل کرنے کے بعد اپنے جدید اخبار جاری کر دیے۔ راقم الحروف نے بھی نومبر ۱۹۰۱ء میں "پنجۂ فولاد" کے نام سے اپنا اخبار جاری کیا۔

اخبار میری توقع سے زیادہ مقبول ہوا، یہاں تک کہ اس کے خریداروں میں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے کم نہ تھی بلکہ ایک دو یا اس سے کچھ زیادہ عیسائی خریدار بھی تھے۔ اخبارات نے اس پر بہت اچھے ریویو لکھے۔ نواب فصیح الملک بہادر مرزا داغ دہلوی نے یہ اشعار کہے ؎

ہوا ہے پنجۂ فولاد جاری — خریدار نیا اخبار دیکھو
جناب فوق کی گل کاریوں سے — بنا اخبار یہ گلزار دیکھو
نئی خبریں بہت سی ملیں گی — جو ہو کر طالب دیدار دیکھو
نظر چڑھ جائے گر اہل نظر کی — پھر اس کی گرمیِ بازار دیکھو
یہ پرچہ تو پرچاتا ہے دل کو — نہ ہو گا اس سے دل بیزار دیکھو
اٹھا کر دیکھ لے سو سو بار اس کو — اگر دیکھو تو سو سو بار دیکھو

سادہ مصرع تاریخ اے داغ
یہ لو اخبار جوہر دار دیکھو

۱۹۰۱ء

لیکن ۱۹۰۵ء میں بعض اور صدمات کے ساتھ اخبار کو ایک ایسا صدمہ پہنچا جس سے یہ جاں بر نہ ہو سکا۔ آخر میں نے جولائی یا اگست ۱۹۰۶ء میں مطبع پنجۂ فولاد اور اخبار پنجۂ فولاد دونوں بند کر دیئے۔ اسی زمانہ کا ایک شعر ہے ؎

اخبار بند ہونے سے کہتے ہیں ناز میں
اے فوقؔ اب وہ پنجۂ فولاد کیا ہوا

ہندوستان میں دیسی زبان کے اخباروں نے رئیسوں اور ریاستوں کی آغوش میں آنکھ کھولی اور سرکار پرستی کے دامن میں پرورش پائی۔ چنانچہ ہندوستان اور بالخصوص پنجابی اخبارات کا ابتدائی دور بتاتا ہے کہ ان اخبارات میں یا تو والیان ریاست کی مدح سرائی اور قصیدہ خوانی ہوتی تھی یا حکومت انگریزی کی برکات کا ذکر ہوا کرتا تھا۔ خبریں معمولی ہوتی تھیں اور ان میں بھی کوئی خاص بات نہ ہوا کرتی تھی۔ پنجاب میں غالباً پیسہ اخبار سب سے پہلا اخبار تھا جس نے عام خبروں کے علاوہ اخبار میں خاص دلچسپی پیدا کی اور سیاسی مضامین اور حکومت کے بعض کاموں پر نکتہ چینی بھی شروع کی۔

جب میں نے ۱۹۰۱ء میں اپنا اخبار جاری کیا تو اس زمانے میں بھی ایسے اخبار موجود تھے جو والیان ریاست کی مدح سرائی کر کے ریاستوں کا دورہ کیا کرتے تھے۔ چند ایڈیٹروں نے جو اپنے اخبار کبھی کبھی حسب ضرورت چھاپ لیا کرتے تھے مجھے بھی ریاستوں کے سبز باغ دکھائے۔ ۱۹۰۲ء کی پہلی سہ ماہی میں مہاراجہ دتیا (بندھیل کھنڈ) کے ولی عہد کی شادی تھی۔ ان اخبارات کے ایڈیٹروں نے کئی دن ریاستی دوروں کے فوائد سنا کر مجھے بھی اس سفر پر آمادہ کر لیا۔ اس سفر میں ہم دتیا، سمتھر، ناگود، میہر اور بندھیل کھنڈ کی سب سے بڑی ریاست ریواں تک پہنچے۔ اس سیاحت میں کچھ مالی فائدہ تو نہ ہوا، البتہ اکثر اہل علم اور شعراء حضرات سے شناسائی ہو گئی جو آئندہ اخبار کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔

بندھیل کھنڈ گیا اور بگھیل کھنڈ گیا بلکہ سنٹرل انڈیا اور سی پی تک میں ہم نے دیکھا کہ ایک تو مسلمانوں کی آبادی کم ہے اور پھر جتنی بھی ہے اس کا کثیر حصہ جہالت اور بے علمی کے علاوہ مفلسی اور فاقہ کشی میں مبتلا ہے۔ ان کی دنیا کا حال یہ ہے کہ شاید ہی کوئی مسلمان کسی اعلیٰ عہدے پر ہو، خصوصاً ان علاقوں کی ریاستوں میں جو بھوپال، باؤنی، جاورہ، باسودہ اور راہ کی ایک دو اور چھوٹی ریاستوں کے علاوہ سب کی سب ہندو ہیں اور جو مسلمان ملازم تھے بھی ان کو ہندی کی ترویج نے دفتروں سے نکلوا دیا۔ ان کے لباس میں اور ہندوؤں کے لباس میں بظاہر کوئی فرق نہیں۔ بلکہ غیر ملکی آدمی مطلق تمیز نہیں کر سکتا کہ ان میں ہندو کون ہے اور مسلمان کون؟ جس طرح ہندو گھٹنوں تک دھوتی پہنتا ہے اسی طرح مسلمان بھی پہنتا ہے۔ جو ہوائی ٹوپی ہندو کے سر پر ہے وہی مسلمان کے سر پر دیکھی گئی۔ مسجدیں اول تو بہت کم ہیں اور جو ہیں اکثر مقامات پر غیر آباد دیکھی گئیں۔

بہت سے مسلمان اچھی اچھی عمر کے ایسے دیکھے گئے جن کو کلمہ تک نہیں آتا تھا۔ ہندوؤں کو تو وہاں چھوت ہی تھی لیکن ان علاقوں کے مسلمان بھی چھوت کے قائل پائے گئے۔ بندھیل کھنڈ میں پنا ایک اچھی خاصی ریاست ہے۔ وہاں ہمیں اپنے گروہ سے ستنا جاتے ہوئے ایک مرتبہ رات کو قیام کرنا پڑا۔ وہاں کوئی سرائے نہ تھی اور نہ کوئی واقف تھا۔ بڑی مشکل سے تلاش کے بعد ایک مسلمان کا گھر ملا۔ وہاں بھی ہندوؤں

کی طرح گرا کر چھوڑ دیا ہوا تھا۔ ہم نے اس گھر کے مالک سے اپنی تکلیف کا ذکر کیا اور کہا کہ ہم سامان بازار سے لا دیتے ہیں۔ آپ ہمیں کھانا تیار کرا دیں۔ ہم مزدوری بھی دے دیں گے۔ آپ کے مسلمان بھائی ہیں اور یہاں ہمارا کوئی واقف نہیں۔ اس مسلمان نما ہندو نے کہا۔ آپ برتن بازار سے لے آئیں ہم آپ کو کھانا تیار کر دیں گے۔

ہمیں اس کے اس جواب سے رنج تو پہنچا لیکن اس رنج کا اظہار چونکہ نقصان رساں تھا اس لیے خاموش ہو رہے۔ آخر کو برتن لائے لیکن ہانڈی نہ مل سکی۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے برتن میں سالن تیار کرایا اور ہمارے مٹی کے پیالوں میں اوپر سے دھار باندھ کر اس طرح گرا دیا جیسے کوئی کسی اچھوت یا چوہڑے چمار کو خدا واسطے دیتا ہے۔

بیگار کا ان ریاستوں میں بہت رواج تھا۔ یہاں تک کہ جوان جوان لڑکیوں کو بھی بیگار میں پکڑ لیا جاتا تھا اور دس دس بارہ بارہ میل تک ان کو پا پیادہ اسباب اٹھا کر لے جانا پڑتا تھا۔ پھر رستے میں اور قیام کی جگہ ان کی جو درگت ہوتی تھی وہ علیحدہ تھی۔ مدارس ان ریاستوں میں بہت کم تھے۔ ناگرو، ابے گڑھ، بھیر، سماول، کوٹھی، زیاں، چنا، ستھر وغیرہ ریاستوں میں صرف ریاں ہی ایک ایسی ریاست تھی جہاں ہائی اسکول تھا۔ ان ریاستوں میں اس زمانہ میں ۹۹½ فی صد ناخواندہ لوگ تھے۔ عورتوں کی تعلیم کا تو وہاں نام و نشان تک بھی نہ تھا۔

ان ریاستوں کے لوگ کھلے بندوں ہم سے ملنا اور پھر ریاست کے کسی سیاسی و اقتصادی مسئلے پر گفتگو کرنا اپنی مصیبت کا پیش خیمہ سمجھتے تھے۔ ان دنوں ریاستوں میں آزادی اور آزاد خیالی کا نام لینا بھی جرم سمجھا جاتا تھا۔ آج (سنہ ۱۹۳۸ء میں) حالات بہت کچھ بدل چکے ہیں اور آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ نحوست جہاں غریبوں کے پس و پیش منڈلا رہی تھی اب وہاں سے اپنا بوریا بستر باندھ رہی ہے۔ جس طرح برطانوی ہندوستان میں بیداری کی لہر پیدا ہو رہی ہے وہی خیال اب ریاستوں میں بھی پھیل رہا ہے اور ہر جگہ آزادی کو اپنا پیدائشی حق اور غلامی کو لعنت تصور کیا جا رہا ہے۔

جب میں نے پنجۂ فولاد سنہ ۱۹۰۱ء میں جاری کیا تو اس میں بھی کشمیر، جموں اور پونچھ کے واقعات درج کیے جاتے تھے لیکن انہی ایام میں کشمیری گزٹ اور اس کے بعد سنہ ۱۹۰۶ء میں کشمیری میگزین اور سنہ ۱۹۱۳ء میں اخبار کشمیری تو بالکل ریاستی حالات کے لیے وقف ہو گئے اور اس اخبار کی تحریک سے دوسرے اخباروں میں کشمیر کے متعلق جو خاص خاص واقعات درج ہوتے تھے ان سے ہندوستان میں اہل کشمیر کے حالات سے اکثر لوگ واقف ہونے لگے اور مظلوم کشمیریوں کے متعلق عام طور پر ہمدردی و اسپرٹ کے جذبات پیدا ہو گئے۔ اخبار کشمیری ہی نے اپنی مسلسل اور زوردار تحریروں سے کشمیری کانفرنس کا وجود قائم کیا جو مسلمانان ریاست بلکہ دیگر اقوام کی بیداری کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ اس اخبار نے اپنے محدود اغراض اور ایک خاص ملک و قوم سے وابستہ ہونے کے باوجود خاصی ترقی کی۔ میرے اخبار میں چودھری رحمت علی بی اے (جو بعد میں انگلستان جا کر پاکستان کا نام اچھالتے رہے) نازش بدایلی۔ ملک مقبول احمد (جو بعد میں ڈپٹی رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز صوبہ کشمیر ہوئے) سید حبیب (مالک اخبار سیاست وغیرہ) میر نیاز کاشمیری بیرسٹر محمد حنیف مختار مرحوم (حنیف ہاشمی جو بعد میں ادبی دنیا۔ نیرنگ خیال اور اخبار ریاست کے عملہ ادارت میں شریک ہوئے) مولانا محمد بخش مسلم۔ بابو محمد الدین بی اے۔ مسٹر رشید صحرائی اور کئی دیگر اصحاب کام کر چکے ہیں۔

سنہ ۱۹۱۳ء میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کی تحریک سے میں نے تصوف کا رسالہ طریقت جاری کیا جو چار پانچ سال تک رہا۔ پھر جب میرے [illegible]

خاں والی حیدر آباد کو محی الملت والدین کا خطاب مسلمانان ہند کی طرف سے ملا تو بعض احباب کی تحریک سے رسالہ نظام جاری کیا جس میں سید غلام یزدانی ناظم محکمہ آثار قدیمہ اور مہاراجہ سرکشن پرشاد بھی قلمی امداد دیتے رہے۔ چونکہ میں ہر سال چند مہینے کشمیر میں رہتا تھا، اس لیے میری غیر حاضری میں میرے کارکن میری پالیسی کو قائم نہ رکھ سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اس غیر حاضری کا اثر اشاعت پر پڑتا تھا۔ آخر اڑھائی سال کے بعد نظام بھی بند ہو گیا۔

سنہ ۱۹۳۳ء و سنہ ۱۹۳۴ء میں خاص سری نگر کشمیر سے میں نے "کشمیر جدید" کے نام سے اخبار جاری کیا۔ لیکن اس کا بھی یہی حال رہا کہ دسمبر کے آتے ہی میں لاہور آ جاتا تھا اور اخبار بھی ساتھ ہی بند ہو جاتا تھا۔

کشمیر ایجی ٹیشن (سنہ ۱۹۳۱ء) کے زمانہ سے میں نے کشمیری اخبار میں بھی دلچسپی لینی کم کر دی۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں اس سے ایڈیٹوریل ادارتی تعلق قطع کر لیا۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں اس کا چارج رشید صحرائی کو دے دیا اور سنہ ۱۹۳۴ء میں یہ اخبار جو ۲۰ سال تک اہل ملک کی خدمات بجا لاتا رہا اور جس کی خدمات کا اعتراف کشمیری کانفرنس کے تمام پریذیڈنٹوں نے یکے بعد دیگرے اپنے اپنے صدارتی خطبوں میں کیا، میری عدم توجہی اور بعض دیگر وجوہ سے بند ہو گیا۔ کشمیر کی تحریک حریت کے آج جو رہنما اور لیڈر ہیں اور کشمیر، جموں بلکہ پونچھ کے اخبارات کے جو ایڈیٹر ہیں وہ کشمیری میگزین کے زمانہ میں سکولوں کی ابتدائی جماعتوں میں پڑھا کرتے تھے۔

ایک ہفتہ وار اخبار کے علاوہ دو ماہوار صوفیانہ اور ادبی رسالوں کی ادارت ایک تن واحد ہی سے وابستہ تھی۔ جس کو اس کے نحیف جسم اور اس کی بیماریوں کی وجہ سے خواجہ حسن نظامی نے ایک مرتبہ صحیح طور پر متحرک ہسپتال کہا تھا۔ لیکن ان اخبارات و رسائل کے علاوہ تصنیف و تالیف کا شغل بھی تھا اور مجھے شکریہ کے ساتھ اعتراف کرنا چاہیے کہ مجھے اخبار نویسی اور تالیفات کا شغل اور اپنا ذاتی کتب خانہ قائم کرنے کا مذاق اپنے استاد مولوی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار سے ملا۔

میں ابھی پیسہ اخبار ہی میں تھا کہ میں نے ایک چھوٹا سا رسالہ تاریخ شالامار باغ کے نام سے لکھا جو بیس یا چوبیس صفحہ کا تھا۔ چونکہ بالکل نئی چیز تھی اور عوام کو اس کی تاریخ اور اس کے تفصیلی حالات سے کوئی علم نہ تھا۔ اس لیے یہ رسالہ جو ۱۱۰۰ کی تعداد میں چھاپا گیا تھا دو مہینے کے اندر ہی فروخت ہو گیا۔ اس رسالہ کے ہر ایڈیشن میں بعد ازاں اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ آخری ایڈیشن جس میں کشمیر کے شالامار باغ کا بھی تفصیلی ذکر ہے سو صفحہ سے زیادہ حجم پر ہے۔

اس کے بعد انار کلی ناول لکھا اور جو کیفیت انگریزی میں انار کلی کے متعلق درج تھی وہ سب نقل کر کے لے آیا۔ یہ ناول بھی کئی مرتبہ چھپ چکا ہے لیکن بعد کی تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ یہ محض افسانہ تراشا گیا ہے۔ عہد اکبری اور عہد جہانگیری کی کسی تاریخ میں اس واقعہ کا ذکر تک نہیں۔ بعد ازاں اخبار عام اور آفتاب پنجاب والوں نے چند ایک کتابیں لکھوائیں۔ جب اخبار اور پریس جاری کیا تو خود کتابیں چھاپنی شروع کیں۔

ناولوں کا شوق اخبار نویسانہ زندگی شروع کرنے سے پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ فن تاریخ میں زیادہ کتابیں لکھیں، کشمیر اور پونچھ کے متعلق تو اس قدر تاریخی لٹریچر کتابی صورت میں مہیا کیا کہ اردو زبان میری تصنیفات سے قبل اس قسم کے لٹریچر سے بالکل خالی تھی۔ میری تصنیفات کی تعداد اسی کے قریب ہے جن میں خاص طور پر حسب ذیل مشہور ہیں:-

تاریخ حریت اسلام۔ تاریخ اقوام کشمیر۔ شباب کشمیر لاہور مطبوعہ ہیں۔ وجدانی نشتر۔ روایات اسلام۔ تاریخ کا روشن پہلو۔ مکمل تاریخ کشمیر، خواتین کشمیر، تاریخ اقوام پونچھ، تاریخ بڈشاہی۔ یہ کتاب دراصل شباب کشمیر کا تکملہ ہے۔ "شباب کشمیر" میں کشمیر کے ہر دلعزیز بادشاہ بڈشاہ کی پچاس سالہ حکومت کا ذکر ہے۔ یہ میں نے ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۳ء تک جمع کر کے چھاپا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۲۳ء سے ۱۹۴۰ء تک اس قدر اور تفصیلی حالات ملے کہ وہ مطبوعہ شباب کشمیر سے بھی بہت زیادہ تھے۔ اس لیے میں نے پھر نئے سرے سے اس کتاب کو مرتب کیا اور اس کا نام "تاریخ بڈشاہی" رکھا۔ گویا یہ کتاب میری چوتھائی صدی کی محنت شاقہ کا نچوڑ ہے۔ ابھی پانچ چھ کتابوں کے مسودے پڑے ہیں۔

میرے دو فرزند حیات ہیں۔ ظفر الحق پیدائش فروری ۱۹۰۲ء اور ظفر احمد۔ تیسرا فرزند ظفر الاحسن گیارہ سال کی عمر میں ۸ر نومبر ۱۹۲۲ء کو فوت ہو چکا ہے۔ پھر سے

جس قدر اشعار ہیں میرے وہ ہیں سب لخت دل
فوق تم کو کون کہتا ہے کہ بے اولاد ہو

(غیر مطبوعہ[1]۔ تلخیص)

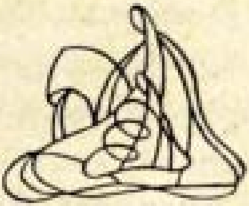

---

[1] سرگذشت فوق کا مکمل قلمی مسودہ محمد عبداللہ قریشی کے پاس ہے۔

شیدا گجراتی

مرحوم حاجی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۲۰ء میں ہوئی۔ اس زمانہ میں وہ بمبئی کی خوجہ مول جی بھائی جیوراج کی لائبریری کے ناظم تھے۔ اور میں پرانی کتابیں فروخت کرتا تھا۔

چنانچہ ان سے میرا تعارف بھی ایک کتب فروش کی حیثیت سے ہوا۔ میں ان کے پاس مرحوم کرسن داس مول جی کی تصنیف "انگلینڈ مال پرواس" (انگلینڈ کی سیر) لے کر حاضر ہوا تھا۔

ان کے گھر پہنچنے پر میں نے دروازہ ہی میں ایک شاندار شخصیت کو دیکھا جسے دیکھ کر میں اس وقت متحیر تو نہ ہوا لیکن متاثر ضرور ہوا بعد میں یہ تاثر تحیر میں تبدیل ہو گیا۔ اور اس وقت بھی حاجی محمد کی بارعب شخصیت کا تصور مجھے متحیر کیے ہوئے ہے۔

مرحوم حاجی محمد نے مجھے اپنے لائبریری روم میں لے جا کر بٹھایا اور پھر نہایت شیریں لب و لہجہ کے ساتھ گفتگو شروع کی۔

"کہیے کیسے آئے ہو؟"

میں نے کتاب دکھاتے ہوئے کہا: "یہ کتاب لایا ہوں" اور کتاب ان کے ہاتھ میں دیدی۔

سرسری نگاہ سے کتاب کو دیکھ کر بولے: "کیا لیجیےگا؟"

میں ان کی لائبریری کی کتابیں رکھی ہوئی الماریوں کو دیکھنے میں مصروف تھا۔ میں نے کہا: "جو آپ کا دل چاہے۔ دیدیجیے" انہوں نے مجھے خزانچی کے نام پندرہ روپیہ کی ادائیگی کے لیے خط دے دیا۔

کتاب کی اصل قیمت بارہ روپیہ تھی۔ اور اب پرانی ہو جانے کی وجہ سے اس کے دو روپیہ بھی ملنا مشکل تھے۔ اتنی بڑی رقم پا کر تو میں سکتے میں آگیا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ پندرہ روپیہ کتاب کی قیمت نہ تھی بلکہ وہ تو اس کے قابل مصنف کی روح کے لیے نذرانہ عقیدت تھا۔ مرحوم حاجی محمد جس طرح ایک عالم کی تعظیم کرنا جانتے تھے اسی طرح اس کی روح کی بھی عزت کرتے تھے۔ کتاب بھی تو مصنف کی روح ہی ہوتی ہے۔

وہ کتاب ۱۸۶۷ء میں شائع ہوئی تھی۔

وہ پندرہ روپے پا کر میری طمع بڑھ گئی۔ اب میں روزانہ ہی حاجی صاحب کے یہاں حاضری دینے لگا۔ میں شاعری بھی کرتا تھا اور گاہے گاہے میری نظمیں "بمبئی سماچار" میں چھپتی بھی رہتی تھیں۔

ایک دن میں نے حاجی صاحب سے بہت جھجکتے ہوئے کہا: "میں بھی شعر کہتا ہوں" ان کی نگاہیں میری طرف اٹھیں۔ ان کی نگاہوں میں ایک قسم کا رعب و جلال تھا اور وہ میرے چہرے سے جیسے میرے جذبات کا اندازہ لگا رہے تھے۔ میرے الفاظ سے انہیں خوشی ہوئی اور انہوں نے مجھ کو اپنی نظمیں لانے کو کہا۔ مجھے اور کیا چاہیے تھا۔ میرا دل خوشی کے مارے دھڑکنے لگا۔ دوسرے روز میں نہایت شوق

کے ساتھ اپنی نظمیں لے کر ان کے پاس گیا ان کی توجہ نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اپنی کم عمری میں احتراماً ان سے دور بیٹھا کرتا تھا۔ ان کے شفقت آمیز اصرار پر ان کے قریب جا بیٹھا۔ انہوں نے غیر معمولی دلچسپی کا ثبوت دیا۔ میری نظمیں دیکھنے کے لیے مانگیں۔ اور جس طرح کوئی اپنا دل چیر کر کسی کے سامنے رکھ دے میں نے اپنی جذبات دیوانگی سے بھری ہوئی نظمیں ان کی خدمت میں پیش کر دیں۔ ۔ ۵ مجھے خیال آتا ہے کہ مرحوم نے میری دیوانگی کی بھی قدر افزائی کی تھی۔

میرے شعر دیکھ کر ان کا ذوقِ شعر بیدار ہو گیا۔ ان کا دل بھی مجھے شعر سنانے کے لیے بے چین ہو گیا۔ دیوانہ نے دیوانہ کو پہچان لیا تھا۔

انہوں نے اپنی نظمیں دکھائیں، اور کچھ خود ترنم کے ساتھ سنائیں۔ سنانے کے انداز میں بناوٹ نہیں تھی جوش البتہ ضرور تھا۔ اسی دن انہوں نے مجھے اپنی کتاب ”ایمان نا موتی“ (ایمان کا موتی) بھی دکھائی جس میں اللہ کے ننانوے نام گنائے گئے تھے۔ یہ کتاب انگریزی کے مشہور مصنف سر ایڈون آرنلڈ کی تصنیف کا ترجمہ تھی۔ سر آرنلڈ سے حاجی صاحب کے دوستانہ تعلقات تھے اور باہم خط و کتابت رہتی تھی۔ اس ترجمہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اللہ کے ہر ایک نام کے ساتھ ساتھ ایک ایک ہندی کا دوہا (شعر) بھی حاجی صاحب نے چھاپ دیا تھا۔ اس میں سے ایک دوہا یہ ہے

الکبیر واتی بہان (خدا بہت بڑا ہے)

تیری کلا کرتار ہے
بھر پھر کبوت باپ
ترو جاری بھید ہے
اننت اور اماپ

(اے کارساز! تیرا راز کوئی نہیں جان سکتا! تیری قدرت لامحدود ہے اور اس کو ناپنے کے لیے کوئی پیمانہ نہیں۔ دنیا کی تمام چیزیں تیری کاریگری اور خلاقی کی مظہر ہیں)

اس کتاب کا سن اشاعت سنہ ۱۹۰۹ء تھا۔ تیس سال پہلے مرحوم حاجی گجراتی کے ساتھ ساتھ ہندی کی خدمت بھی کرتے تھے۔ انہوں نے ہندی کے لیے بھی بہت محنت کی۔ لیکن شاید ان کی خدمات اور ان کی ریاضت کے بارے میں شاید کوئی ہندی والا واقفیت نہ رکھتا ہو گا !

۲

وقت گزر گیا۔ اسی زمانہ میں ماہنامہ ”بیسویں صدی“ نکالنے کا موقع آیا۔ ”بیسویں صدی“ نکالنے کے لیے حاجی صاحب نے گجرات کے لائق ادیبوں سے مشورہ کیا اور مجھ پرانی کتابیں بیچنے والے کے خیالات جاننا بھی وہ نہ بھولے۔ وہ کہتے تھے کہ میں عوام کے رجحانِ طبیعت کو پہچانتا ہوں۔ لیکن میں ان کی اس رائے سے نہ اس وقت متفق تھا اور نہ آج ہوں۔ ”بیسویں صدی“ نکالنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ حاجی صاحب کی لائبریری میں نئے نئے لوگ آنے لگے۔ کبھی میں ان کے یہاں، عصرِ حاضر کے مشہور گجراتی مصور جناب راول کو دیکھتا، کبھی تو

رکشنکر اپنی مراٹھی پوشاک میں نظر آتے اور کبھی کبھی دُھرندھر بھی جلوہ افروز دکھائی دیتے۔ وہ سب کے سب ان سے مل کر مسرت کے جذبات سے بھر جاتے۔ گجرات کے مشہور مصور راول صاحب نے تو یہ بات اس حد تک محسوس کی ہے کہ عقیدت کے طور پر مرحوم حاجی محمد کی یادگار میں انہیں کے نام سے ایک جریدہ گجراتی میں نکالا ہے۔

”بیسویں صدی“ کو شایانِ شان بنانے کے لیے جو جو تیاریاں درکار تھیں سب ہو رہی تھیں۔ ہندی اور گجراتی کے ادیبوں اور داوٹراک فیلڈز آئی۔ سی۔ ایس (اس وقت کے سورت کے کلکٹر) جیسے انگریز دوست، سب کی معاونت حاجی صاحب نے حاصل کی۔ تصویریں تیار ہونے لگیں، سرورق تیار ہوا اور چھپنے کے لیے باہر بھیج دیا گیا۔ بالآخر شب و روز کی سخت محنت اور جھنجھٹوں کے بعد بیسویں مارچ کو ”بیسویں صدی“ کا پہلا شمارہ تیار ہوا۔

یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ”بیسویں صدی“ کے وجود کے بعد ہی گجراتی ادب پیدا ہوا۔ اس سے پہلے ’آرٹ‘ کیا ہے، تصویر کشی کسے کہتے ہیں۔ حسن کس شے کا نام ہے؟ یہ باتیں بہت ہی کم لوگ جانتے تھے۔

گجراتی زبان کی حیثیت میں تو اس وقت بھی موجود تھی لیکن اس کا سامانِ آرائش نہ تھا۔ اس کے حسن میں دلکشی نہ تھی۔ مرحوم حاجی محمد نے اس کی آرائش کے لیے تمام تر کوششیں کیں۔ انہوں نے ”بیسویں صدی“ کے ذریعہ گجری کو اس طرح سنوارا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ اس کے خریداروں میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بہت سے لوگ تو ٹیلیگرام کے ذریعہ خریدار بنے۔ ہندوستان بھر میں کوئی ماہنامہ اس رفتار سے مقبول نہ ہوا ہوگا۔

مارچ ۱۹۱۷ء میں ”بیسویں صدی“ کی عمر ایک سال ہو گئی۔ ایک ہی سال میں اس نے کئی سال کے برابر ترقی کر لی۔ قارئین کو اس ماہنامے نے دیوانہ بنا دیا۔ لیکن وہ دیوانے کیا جانتے تھے کہ ان کے محبوب رسالہ ”بیسویں صدی“ کے قابل مدیر کو کس قدر ریاضت کرنا پڑتی ہے۔ دیوانے قارئین کے ساتھ مدیر بھی دیوانہ ہو گیا اور ”بیسویں صدی“ کا دوسرا سال شروع ہوا۔

اس دوسرے سال میں حاجی صاحب نے ”بیسویں صدی“ کو پہلے سے زیادہ دلکش اور اس میں شائع ہونے والے مواد کو اور بھی معیاری بنانے کی مہم شروع کر دی۔ پہلے انہوں نے اس میں ایک عمدہ قسم کا ناول قسط وار شائع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اور اس کام کے لیے ان کی نظرِ انتخاب کنھیالال مانک لال منشی پر پڑی۔

جناب کنھیالال منشی نے مرحوم حاجی صاحب سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر اس طرح کیا ——— ”مرحوم بھائی حاجی محمد سے میرا تعارف جناب چندر شنکر پنڈیا کے ذریعہ ہوا تھا۔ اس وقت وہ اپنے ”بیسویں صدی“ نکالنے کے برسوں پرانے خواب کو پورا کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے اور میں اس کشمکش میں تھا کہ گجراتی میں کہانیاں لکھنا چھوڑ دوں یا نہیں، کیونکہ گجراتی میں لکھنے کے معنی تھے کچھ مت کماؤ، کچھ نہ کھاؤ۔“

جس وقت حاجی صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا اس وقت جناب کنھیالال منشی کا نام بھی گجراتی میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ ہاں گھنشیام ویاس کچھ ضرور جانے پہچانے تھے۔ حاجی صاحب نے ان کو قطب ستارہ کی طرح چمکا دیا۔ اور آج تک وہ قطب ستارہ اپنی جگہ پر اسی طرح روشن ہے۔ آج جناب کنھیالال منشی کا نام زبان زدِ خاص و عام ہے۔ یہ کس کی مخلصانہ کوششوں کا ثمر ہے؟ صرف اور صرف حاجی محمد کا۔ حاجی صاحب مسلمان تھے اور کنھیالال منشی کا برہمن۔ اس لیے یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ ایک مسلمان نے ایک برہمن کو آدمی سے دیوتا بنا دیا۔

مرحوم حاجی صاحب نے کنھیالال منشی سے "گجرات نو ناتھ" "پرتھوی ولبھ" — جس کا ہندی ترجمہ بھی ہو چکا ہے —— اور کئی دوسرے ناول لکھوائے اور انہیں ایک قابل مصنف بنانے کے لیے کافی تربیت دی۔ "گجرات نو ناتھ" نام کے ناول سے "بیسویں صدی" اور کنھیالال منشی دونوں کو فائدہ پہنچا۔

اسی زمانہ میں حاجی صاحب نے ایک اور افسانہ نویس "دھومکیتو" جس کی کہانی "گوالنی" نے گجرات میں دھوم مچا دی۔ اس افسانہ نویس کا نام ملیالی تھا۔ ملیالی کی زبان میں بڑی شیرینی اور روانی ہے۔ اور اس کی کہانیوں نے گجرات کا سر اونچا کر دیا ہے۔

ابھی گجراتی میں مرحوم سر رمن بھائی نیلکنٹھ کے علاوہ کوئی مزاح نگار نہیں تھا۔ مرحوم حاجی صاحب نے اس طرف بھی توجہ کی نتیجہ میں اور یا جوشی، جہانگیر وار اور مست فقیر جیسے مزاح نگار پیدا ہو گئے۔ حاجی صاحب جس چیز کی طرف متوجہ ہوتے اس کا معیار بلند کر کے ہی دم لیتے۔ مصوروں میں مرحوم تربھون پٹیل، راول، سوملال اور پرشوتم داس متھرا داس کو متعارف کرانے کا سہرا بھی انہیں کے سر ہے۔ مشہور مصور گوکھلکر کو جب پوسٹر بنانے پر پانچ سو روپیہ انعام ملا تھا۔ اس کا تصور دینے والے حاجی محمد ہی تھے۔ اور روی شنکر راول کو بمبئی کی آرٹ گیلری سے جو تمغہ طلائی حاصل ہوا اس میں بھی حاجی صاحب کا بہت ہاتھ تھا۔ وہ تصویر "بوا منگل" کی تھی اور اس کی زیادہ قیمت مرحوم نے سر فضل بھائی کریم بھائی سے دلوائی تھی۔

۳

اب میں اپنی طرف آتا ہوں۔ ۱۹۱۸ء کا مارچ کا مہینہ گزر گیا تھا۔ ان دنوں میں حاجی صاحب سے روٹھا ہوا تھا۔ مجھے یہ بدگمانی ہو گئی تھی کہ حاجی صاحب میری نظم کو مناسب جگہ نہیں دیتے۔ اپنی اس بدگمانی کا ذکر میں نے اپنے اور حاجی صاحب کے قریبی دوست ودی ٹھاکر افتا سے کیا۔ وہ میری بات پر ہنسنے لگے۔ میرے دل کی کمزوری پر انہوں نے ہمدردی ظاہر کی اور مجھے سیدھے حاجی صاحب کے پاس لے گئے۔

میرے پاس تب بھارتی کے عنوان سے ایک نظم تیار تھی۔ ان سے گفتگو کرنے کے بعد میں مطمئن ہو گیا اور میں نے وہ نظم ان کے حوالے کر دی۔ انہوں نے نہایت اطمینان کے ساتھ اسے میز کی دراز میں رکھ دیا۔ میں پھر کچھ بد دل ہوا لیکن کچھ بول نہ سکا۔ انہوں نے ہنستے ہنستے مجھ سے اپنا فوٹو دے آنے کو کہا۔ میں ان کی اس بات کو طنز سمجھا۔ لیکن پھر بھی لالچ میں اپنا فوٹو کھنچوا کر ان کو دے دیا۔ میرا فوٹو دیکھ کر وہ تھوڑا سا مسکرا کر رہ گئے۔ اس وقت مجھے اس سے بہت ہی کوفت ہوئی۔ لیکن ....

لیکن اپریل کے شمارہ میں اپنی اس نظم اور فوٹو کو صدی کے پہلے صفحہ پر دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی۔ میں حاجی صاحب کے گھر گیا۔ خوشی اور شرمندگی کے مارے میں گردن نہ اٹھا سکا۔ اسی دن انہوں نے مجھے میتھلی شرن گپت کی ہندی کی کتاب "بھارت بھارتی" دی۔

میں نے پوچھا — اس کا کیا کروں؟

انہوں نے جواب دیا: "اس میں خزانہ بھرا ہے۔"

میں نے پوری بھارت بھارتی کا مطالعہ کیا۔ مجھے مولانا حالی کے مسدس اور میتھلی شرن گپت کی بھارت بھارتی میں بہت کچھ یکسانیت معلوم ہوئی۔ فرق صرف اسقدر تھا کہ مسدس میں ایک مسلم کی روح تھی اور بھارت بھارتی میں ایک ہندو کی۔ ان دونوں کو دیکھ لینے کے بعد میں نے مسدس لکھنا شروع کیا: "بیسویں صدی" کے جون کے شمارہ میں میرے بیس مسدس: "کیتنی ہتو آدیش نے پاچھو پھیری کنچن تھشے" : وہ اس ملک میں جینے سے سونا اقتدار سونا ہی رہا ہے، کے عنوان سے شائع ہوئے۔ یہ بیس مسدس نہ تھے بلکہ مجھے آسمان ادب پر اڑانے والے پر تھے۔ یہ پر مجھے کس نے لگائے تھے؟ بلی کے پجاری حاجی محمد نے۔ انہیں کی مہربانی سے میں یہ پر حاصل کر کے آسمان ادب میں اڑ رہا ہوں۔ اس دن سے میں صدی کا مستقل شاعر بن گیا اور تبھی بھارتی جیسی حب الوطنی کے جذبات سے پر نظم کی کتاب گجرات کے قدموں میں رکھ سکا۔

۴

جب حاجی محمد کو گجراتی زبان میں کوئی اور اچھا افسانہ نگار نہ مل سکا تو ان کی نگاہ ہندی کی طرف گئی۔ پنڈت وشومبھر ناتھ جیجا مرحوم حاجی صاحب کے بیٹھکے میں آتے تھے۔ وہ خود بھی مست ہوتے اور انہیں بھی مست و بیخود بنایا کرتے تھے۔ ان کی بہت سی کہانیوں کا گجراتی میں ترجمہ ہوا۔ جیجا صاحب ہندی میں بولتے جاتے اور حاجی صاحب ترجمہ کر کے گجراتی میں لکھتے جاتے۔ اسی طرح جیجا صاحب کی کہانیاں گجراتی میں تیار ہو کر بیسویں صدی میں شائع ہوتی رہیں۔ جی۔ پی۔ شریواستو کی تمام مزاحیہ تحریریں بھی حاجی صاحب نے اسی طرح ترجمہ کر کے بیسویں صدی میں شائع کرائیں۔

حاجی صاحب سدرشن کی کہانیوں کے بڑے دلدادہ تھے۔ اور ان کی جو کہانیاں انہیں مسودہ کی شکل میں ملتیں بڑی محبت کے ساتھ مجھے پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ جناب سدرشن کی بہت سی کہانیاں بیسویں صدی میں چھپ چکی ہیں۔ ناتھو رام پریمی نے اس سلسلے میں بہت مدد کی ہے۔ انہیں کی وجہ سے حاجی صاحب کو پریم چند، چترا سین شاستری، سدرشن، جی پی سریواستو، ٹھاکر شیونندن سنگھ اور وشومبھر ناتھ جیجا وغیرہ ہندی کے ادیبوں کی تحریریں دیکھنے کا موقع ملا۔ ان لوگوں کے ادب پاروں سے حاجی صاحب نے گورجری کی تزئین کی اور آج گورجری زبان ہندی کے اسالیب سے آراستہ و پیراستہ ہو کر کندن کی طرح چمک رہی ہے۔

مرحوم حاجی صاحب نے ہندی ادب کے جن مضمونوں کو پسند کیا تھا، ان کی کتابوں کی قدر گجراتی میں سب سے پہلے ہوئی ہے۔ ادھر پریم چند کی کہانیاں ہندی اخبار میں آتی ہیں ادھر ان کا ترجمہ گجراتی میں ہو کر چھپ جاتا ہے۔ ابھی حال ہی میں پریم چند کا ناول "غبن" شائع ہوا ہے۔ میں نے اسے خرید لیا۔ بے گھڑی کی موج کے دفتر میں بھائی نگیس ڈنکل بیٹھے تھے۔ غبن کی کاپی میرے پاس دیکھ کر وہ بھی لے آئے۔ پریم چند جی سے اجازت لی گئی اور گن سندری میں اس کا ترجمہ بھی نکلنے لگا۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ گجراتی کے ادبا پر پریم چند کا اثر معمولی نہیں ہے۔ لیکن سب سے پہلے پریم چند کو گجراتی ادب میں روشناس کرانے کا سہرا حاجی صاحب کے ہی سر ہے۔

خود میں بھی پریم چند سے کافی متاثر ہوا ہوں۔ ایک دن حاجی صاحب نے پریم چند کا ناول "بازار حسن" مجھے دیا اور اپنے لائبریری روم میں ہی پڑھ ڈالنے کو کہا۔ میں نے اسے پڑھا اور اس کی زبان مجھے بہت اچھی لگی۔ اس سے پہلے ہندی کی نظموں سے تو مجھے بے حد دلچسپی تھی لیکن ناولوں سے قطعاً لگاؤ نہ تھا۔ بازار حسن پڑھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میرے اندر بازار حسن کی تقلید میں کچھ لکھنے کی تحریک

پیدا ہوئی اور میں نے ایک ناول "امینہ" لکھنا شروع کیا۔ حاجی صاحب کو اس کے کچھ باب دکھائے۔ انہوں نے اسے صدی میں چھاپنے کی خواہش ظاہر کی لیکن ان کی خواہش پوری ہونے سے پہلے ہی موت نے اپنی خواہش پوری کر لی۔ حاجی صاحب اپنی خواہش دل میں لے کر چلے گئے اور کئی سال بعد "امینہ" بمبئی سماچار میں شائع ہوا۔ اس کے بعد میں نے اور بھی کئی ناول لکھ کر سرزمین گجرات کی نذر کیے اور گجرات نے انہیں اپنایا بھی لیکن میں سمجھتا ہوں میرے اس کام کا کریڈٹ پریم چند کو ہی حاصل ہے۔ اگر میں نے اس کا "بازارِ حسن" نہ پڑھا ہوتا ——— حاجی صاحب اس کے پڑھنے کے لیے مجھ سے اصرار نہ کرتے تو میں نے جو ناول تصنیف کیے ہیں وہ شاید ہی تصنیف ہوتے یعنی ان کا لکھا جانا ناممکن تھا

۵

مرحوم حاجی صاحب کی نگاہ بہت وسیع تھی۔ ان کا حلقۂ احباب نہایت لمبا چوڑا تھا۔ مختلف قسم کے ادیبوں کی آمد و رفت کی وجہ سے ان کا گھر مرکزِ ادب ہی بن کر رہ گیا تھا۔ مراٹھی زبان کے ماہنامے "منورنجن" کے مدیر جناب کاشی ناتھ متر سے لے کر، بیرسٹر لال چکیر، "وشل ستیہ دام گوپچر" "ترنگ" کے مدیر، اردو کے مشہور ڈرامہ نویس منشی آغا حشر کاشمیری، منشی عبداللطیف شاد وغیرہ میں سے کوئی نہ کوئی ہمیشہ ان کے یہاں موجود رہتا۔ حاجی صاحب گجراتی ادب کے لیے ان سب سے کچھ نہ کچھ حاصل کرتے۔ دراصل ان کا مقصد گجراتی ادب کو زیادہ سے زیادہ وسعت دینا تھا۔ اس لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہتے — انہوں نے مقصد کے آگے اپنی صحت و آرام کسی چیز کی پرواہ نہ کی انہوں نے گجراتی ادب کی خدمت میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔

مارچ ۱۹۲۰ء کا "بیسویں صدی" کا شمارہ گجراتی ادیبوں کی غیر فانی یادگار تھا۔ وہ ان کے کثیف جسموں کی غیر فانی آرام گاہ تھا۔ حاجی محمد مرتے مرتے مصنفوں کو زندگی دے گئے تھے۔ اس سے پہلے گجرات کے عوام ان مصنفوں کی صورتوں سے تو کیا ناموں سے بھی واقف نہ تھے۔

حاجی محمد نے گجراتی ادب میں تصاویر کو سب سے زیادہ حسن عطا کیا۔ یہاں تک کہ ہندی ادب پر بھی اس کا اثر پڑا۔ ۱۹۱۰ء میں ہندی میں اچھی تصویریں چھاپنے والا رسالہ "سرسوتی" کے مثل ایک آدھ ہی نکلتا تھا۔ لیکن آج "مادھوری"، "سدھا"، "کلیان"، "وشال بھارت" اور "ہنس" وغیرہ بہت سے ہندی رسالے دلکش تصویروں سے مزین ہوتے ہیں۔ بنگال میں بھی تصاویر کا شوق "بیسویں صدی" کے بعد ہی پیدا ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ ان سب پر "بیسویں صدی" کا اثر ہی پڑا ہو۔

بہرحال وہ غیر فانی دنیا کا پیغمبر چلا گیا۔ "بیسویں صدی" کے نو ہی شمارے نکال کر حاجی محمد ان میں ادب کے اعلیٰ و نادر نمونے اور بے مثال ذرائع بھر گئے ہیں۔ گجراتی زبان کے ہر نئے ایڈیٹر کو سب سے پہلے ان کے پیدا کردہ ذرائع کا استعمال کرنا پڑے گا۔ مرحوم حاجی کی یہ فتح کوئی معمولی فتح نہیں ہے۔

۶

حاجی محمد صاحب جنت مقام ہو گئے لیکن ایک طرح کا ویرانہ پن چھوڑ گئے۔ ان کی موت کے غم نے بے شمار لوگوں

دیوانہ بنادیا۔

جناب چندر سین ساستری اپنے غم کی کیفیت "انتقل" میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"میری یہ تصنیف بیوہ ہے۔ میں نے ایک طرح اس کو حاجی محمد سے بیاہ دیا تھا۔ حاجی محمد گجراتی ادب کے سنہ کا استاد پجاری اور مشہور و معروف ماہنامے "بیسویں صدی" کا مدیر تھا۔ سب سے پہلے اس تصنیف پر اسی کی نظر پڑی۔ اس نے دیوانہ کی طرح اسے پیار کیا۔ میں نے بھی اپنے پرائے کی پرواہ کیے بغیر اس کے ساتھ اس کا بیاہ کر دیا۔ مگر بیاہ ہوچکا ہی تھا کہ وہ مر بھی گیا۔...... اس نے اس کی ایک ایک سطر پر تصویر بنوانے کی تیاریاں کی تھیں۔ ایک مصور روپ پر کچھ تصویریں بنا کے لایا بھی تھا لیکن وہ اس نے پسند نہ کر کے واپس کر دیں۔ اس نے کہا —— مصنف جو بات کہہ نہیں سکتا، اسے مصور تصویر کے ذریعہ بیان کرتا ہے۔ جو اس میں کامیاب ہو، وہی مصور ہے۔

اچانک اس کا انتقال ہو گیا۔ ادب کی قسمت پھوٹ گئی۔ اب اس کتاب کے لیے کون سا زیور مناسب ہو گا۔

اس کتاب میں کچھ کمی رہ گئی۔ کچھ نئے مضامین کا اضافہ کرنا تھا، کچھ ترمیم کرنا تھی مگر حاجی محمد کے سانحۂ اجل سے کچھ دل سا بیٹھ گیا میں نے بہت بار کوشش کی لیکن نہ آگے کو کچھ لکھا جا سکا اور نہ پچھلے میں ترمیم و اصلاح ہو سکی۔ طبیعت ہی نہ لگی۔"

—— چندر سین شاستری

پنڈت بدری ناتھ بھٹ نے "شاردا" (ہندی ماہنامہ) میں اپنے دلی جذبات کا اظہار یوں کیا تھا۔

"حاجی محمد کے انتقال سے صوبہ گجرات کو تو نقصان عظیم پہنچا ہی ہے مگر ہندی والوں کا بھی بہت نقصان ہوا ہے۔ بمبئی سے باہر رہنے والے ان کے ادب کے شوقین دوستوں کو تو ان کے بغیر بمبئی خانۂ بے چراغ معلوم ہوتی ہے۔"

—— بدری ناتھ

ان یادوں کو ختم کرتے ہوئے اس قدر لکھ دینا کافی ہو گا کہ ہندوستان میں کسی بھی زبان میں کوئی ماہنامہ نکالنے والے کو مرحوم حاجی محمد کے "بیسویں صدی" کی فائلوں کو دیکھ لینا بہت ضروری ہے۔ "بیسویں صدی" کی فائلوں کی تعداد تھوڑی ہے، لیکن ان فائلوں میں نایاب مواد موجود ہے۔ ادب میں قدم بڑھانے والے کے لیے "بیسویں صدی" یقیناً رہنما کا کام دے گا۔ اس وقت گجراتی میں نکلنے والے ماہنامے "کمار" "نوچیتن" "شاردا" اور "گجرات" وغیرہ "بیسویں صدی" ہی کی خاک سے پیدا ہوئے ہیں اور "بے گھر کی موج" کی جو ہر ہفتہ بارہ ہزار کاپیاں نکلتی ہیں وہ بھی "بیسویں صدی" ہی کا اثر ہے۔ "بیسویں صدی" نہ ہوتا تو میں بھی نہ ہوتا اور میں نہ ہوتا تو "بے گھر کی موج" بھی کہاں سے آتی؟

دو ایک اہم باتیں رہی جا رہی ہیں، انہیں بھی یہاں لکھنا ضروری ہے۔ مرحوم حاجی صاحب بڑے عجیب طریقے سے مجھ سے نظم لکھواتے تھے ایک بار میں نے انہیں یہ شعر سنایا

دیا اٹھو دستے رنگ کی کیسریاں
بلبیر تے دودھیرے ستے جھریاں

(اے بہادرو زعفرانی رنگ کے کپڑے پہن کر بسنت کے موسم میں نئی نئی امنگوں کے ساتھ تیار ہو جاؤ)

یہ شعر سنتے ہی انہوں نے اس نظم کو مکمل کرنے کے لیے مجھ پر زور ڈالا۔ میں نے انکار کیا کہ مجھ سے اس کی تکمیل نہ ہو سکے گی مگر وہ کب ماننے والے تھے۔ نہ مانے اور مجھے اپنی چھت پر قید کر دیا۔ بالآخر مجھے بحالت قید ہی اپنی یہ نظم پوری کرنا پڑی۔ نظم سن کر حاجی صاحب مست ہو گئے۔ اس کے آخری اشعار یہ تھے۔

گھن گھن گھن گھن جیا رے گنڈیر پڑتی
لے سے ارماں بھری شور تا چڑھتی
دیہ ہاتھ کھڑگ کھنڈ کھنڈ کھنڈ، کھنڈ کھنڈتی
وداری ناکھتا سر ڈوی پتی نژتی !!
چھوا یچ تے بلیہر! ہوتا بلیا !
دیرا عفر، وسنتے رمو کری کیسریاں

(جب نقارے پر چوٹیں پڑتی ہیں تو اس کی گھن گھن سے دل میں اصلی بہادری کے جذبات ابھر آتے ہیں۔ اور جب بہادر کے ہاتھ میں تلوار کھڑکھڑاتی ہے تو ساری مصیبتیں گویا کٹ جاتی ہیں۔ اس لیے اے بہادرو تم اپنے بازوؤں کی طاقت آزماؤ اور زعفرانی کپڑے پہن کر رزم بہار میں اٹھ جاؤ۔)

ایسا اصرار کرنے والا اور اس قدر محبت کرنے والا گجراتی ادب میں کون ہے؟

ایک بار میں نے اپنی کہانی "ساڑی کی قیمت" ان کو دکھائی۔ اس کے اس جملے پر "شدھا نے ساڑی اتار دی، جیسے جسم کا خون اتار رہی ہو" وہ اچھل پڑے تھے۔ لیکن اب؟

مرحوم حاجی محمد ہمیشہ نقصان اٹھا کر ہی "بیسویں صدی" نکالتے رہے۔ اس سلسلے میں وہ مجھ سے ہمیشہ کھل کر بات چیت کیا کرتے تھے لیکن اس کے باوجود میں نے ان سے کہہ ہی ڈالا کہ آپ "بیسویں صدی" کے ذریعہ کافی آمدنی کر لیتے ہیں لیکن پھر بھی اسے بیکار چھپاتے ہیں۔ پھر کیا تھا۔ پاس ہی ایک ٹین کا ڈبہ پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے اٹھا کر میرے سر پر دے مارا۔ خون بہہ نکلا۔ اور فوراً ان کے دل کی محبت جاگ اٹھی۔ وہ بہت بے چین ہو گئے اور ڈریسنگ کرانے کے لیے اپنے بیٹے کے ہمراہ مجھے ڈاکٹر کے یہاں بھیج دیا۔ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ایک ڈبہ مارنے کے عوض انہیں سو ڈبوں کی برابر مار کھانے کا دکھ ہوا ہوگا۔ ایسی پدرانہ شفقت و محبت گجراتی ادب میں اور کس کے پاس ہے؟ وہ تو انہیں کے پاس تھی۔ اف!

مترجمہ:۔ نسیم عباسی

جگر بسوانی

کچھ ہم سے سنو بیٹھ کے کچھ ہم کو سناؤ
حالِ دلِ ناشاد جو سننا ہے تو آؤ

۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۱ء بمقام قصبہ بسواں ضلع سیتاپور پیدا ہوئے۔ آبائی سلسلہ حضرت سیدنا و مولانا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ اول سے ملتا ہے۔

اجدادِ کرام جو ہندوستان تشریف لائے شاہانِ سابقہ فرمانروایانِ ہند کے مقابل میں فاتحانِ عرب کے نام سے مشہور ہوئے جن کے آخری جانشین شاہانِ اسلام تاجدارانِ ہند کا دستِ راست رہے اور خانزادے کا خطاب سلطنت کی جانب سے عطا ہوا۔ شجرہ خاندانی حسبِ ذیل ہے:

جدِ بزرگوار سیدنا و مولانا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ اول۔ شیخ محمد۔ شیخ محمد قاسم۔ شیخ محمد جلیل۔ شیخ محمد تقی۔ شیخ محمد عبدالمجید۔ شیخ محمد حمزہ۔ شیخ محمد عبدالملک۔ شیخ محمد جلال الدین۔ شیخ محمد شمس الدین۔ شیخ محمد اوحد الدین۔ شیخ محمد نظام الدین۔ شیخ محمد نصیر اللہ۔ شیخ محمد امجد۔ شیخ محمد عالم و فاضل قاضی القضاۃ۔ حافظ محمد نصرت اللہ قاضی دربارِ دہلی۔

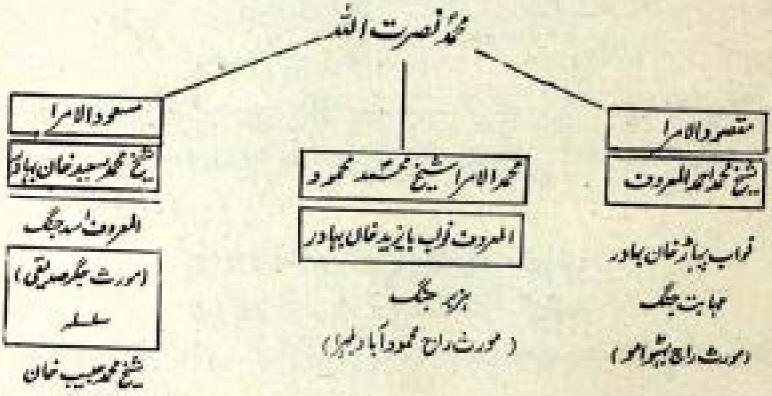
محمد نصرت اللہ
مسعود الامرا
شیخ محمد سعید خان بہادر
المعروف اسد جنگ
(مورث جگر صدیقی)
ـــــ
شیخ محمد حبیب خان
محمد الامرا شیخ محمد محمود
المعروف نواب بایزید خان بہادر
بزبر جنگ
(مورث راج محمود آباد)
مقصود الامرا
شیخ محمد امجد المعروف
نواب پیار خان بہادر
حمایت جنگ
(مورث راج بھیرو)

(باقی اگلے صفحہ پر)

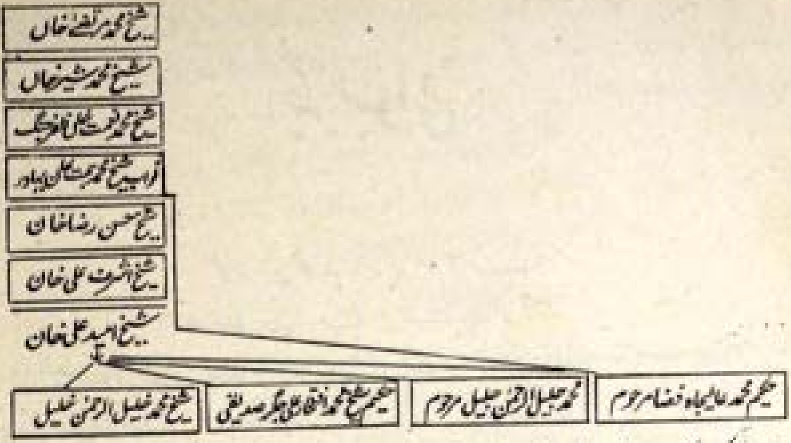
شیخ محمد مرتضیٰ خاں
شیخ محمد بشیر خاں
شیخ محمد نصرت علی خاں جنگ
نواب شیخ محمد حسن علی بہادر
شیخ حسن رضا خان
شیخ اشرف علی خان
شیخ امید علی خان
حکیم محمد عابد اللہ رضا مرحوم
محمد جمیل الرحمن جمیل مرحوم
حکیم شیخ محمد اشفاق علی جگر صدیقی
شیخ محمد خلیل الرحمن خلیل

فارسی کی تکمیل کے بعد ہم اسکول پڑھنے کے لیے بھیجے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندو ماسٹر اسکول میں بیٹھ کر زیادہ تر پڑھتے تھے۔ مڈل کلاس تک بسواں میں انگریزی حاصل کی۔ لکھنؤ میں انٹرنس کلاس کا امتحان دینے کے بعد بعض ولی صاحب کی وجہ سے انگریزی تعلیم سے دل ہٹ گیا اور ہم نے ہمیشہ کے لیے اسکول سے علیحدگی اختیار کر لی۔

اسیروں میں انہیں صیاد پہلے ذبح کرتا ہے
پھڑکتے کو پھڑکتے جن کے بازو ٹوٹ جاتے ہیں

ہمارے والد شیخ امید علی خاں مرحوم کا تخلص رضا تھا۔ آپ خواجہ حیدر علی آتش مرحوم کے شاگرد تھے۔ اس سلسلے سے ہم نے خدائے سخن حضرت امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ کی شاگردی اختیار کی۔ ۱۸۹۵ء میں رامپور جا کر ہم نے شرف تلمذ حاصل کیا اور وقتاً فوقتاً قدم بوسی کا اتفاق ہوتا رہا۔ راجہ نوشاد علی خاں مرحوم تعلقدار جہانگیر آباد پر ہماری شاعری نے جادو کا اثر ڈالا۔ مرحوم نے تمام عمر ہماری اور ہمارے کلام کی بیحد عزت کی۔ تمام ہندوستان کا سفر کیا۔ سب بڑے بڑے شہر دیکھے۔ اس دلکش سفر میں ہم کو بمبئی کی دلکش بہار پسند آئی۔ پلٹتے وقت آگرہ دیکھا۔ آگرہ کا تاج دیکھا۔ تاج کے مینار پر ایک خوبصورت ہم سفر دوست نے اپنے نازنین ہاتھ سے ہمارا یہ فی البدیہہ کہا ہوا مطلع پنسل سے لکھا ہے

تمہارے عاشق تمہارے شیدا تمہارے شوریدہ سر ہمیں ہیں
جگر کو کیا جانتے نہیں تم جگر ہمیں ہیں جگر ہمیں ہیں

واپسی کے بعد ہم نے لکھنؤ میں بدستور قیام کیا اور حضرت نوشاد کی راتوں کے شریک رہے۔ لیکن بمبئی دیکھنے کے بعد لکھنؤ کا حسن آنکھوں کو نہ بھایا۔ ہم پھر بمبئی چلے گئے ۔

ہو گیا یہ کوئے بت سفاک میں   دل جگر دونوں ملیں گے خاک میں

اس مرتبہ ہمارے دو چھوٹے بھائی محمد خلیل الرحمٰن خلیل، محمد جلیل الرحمٰن جلیل نیز ایک شاگرد محمد امیر تمنا بسوانی ہمارے ساتھ تھے اس سال وبائے طاعون کے شروع ہونے سے ہم نے بمبئی سے نکل کر قصبہ باندرہ میں قیام کیا۔ اس زمانے میں ہمارے شاگرد منشی محمد اسماعیل کوکب مرحوم ریاست مروڈ جنجیرہ کے اسکولوں میں پوشین ٹیچر تھے۔ ایک ماہ کی رخصت لے کر ہم سب کو اپنے وطن ناسک لے گئے۔ رخصت کا زمانہ ختم ہونے پر کوکب ہمارے مختصر قافلے کو مروڈ جنجیرہ لے گئے یہاں دو ہفتہ بے حد آرام سے رہے بہت سے معززین سے ملنے کا موقع ملا جن میں بمبئی کے مشہور خاندان "فیضی" کے چند نوجوان لوگ تھے یہاں کے زمانۂ قیام میں ہمارے پُر اثر ناول "دردِ جگر" کا آغاز۔ نئے خیالات کی دماغ میں شورشیں، دل کی دنیا میں ایک انقلابِ عظیم کا طوفان مرتے دم تک نہ بھولے گا۔

راجہ نوشاد علی خاں مرحوم نے پھر زبردستی ہم کو اپنی طرف کھینچا۔ ہم لکھنؤ آئے۔ دیکھا تو راجہ مرحوم کی صحبت میں شاعری کا دور دورہ ہے بیٹھے بھی زیادہ تھے کہ مرحوم نے ذوق کے شعر پر مصرعے لگانے کی فرمائش کی ۔

وہ مول لیتے ہیں جس دن کوئی نئی تلوار
لگاتے پہلے مجھی پر ہیں امتحاں کے لیے

جوانی کا زمانہ، دل میں جوش، مشقِ سخن زوروں پر ایک منٹ کی فکر میں مصرعے سنا دیے جو راجہ صاحب مرحوم کو تمام عمر نہیں بھولے ۔

یہ دشمنی ہے خدا جانے یا ہے اُن کا پیار　　بغیر مجھ کو ستائے انھیں نہیں ہے قرار
بلانے آدمی آتا ہے دوڑ کر سو بار　　وہ مول لیتے ہیں جس دن کوئی نئی تلوار
لگاتے پہلے مجھی پر ہیں امتحاں کے لیے

سنہ ۱۹۰۵ء میں ہم نے تجارت کی لائن اختیار کی۔ سول لائن، حضرت گنج لکھنؤ میں ایف جگر برادرس کمپنی کے نام سے ریشمی اونی کپڑوں اور متفرق سامان کے کاروبار کا بڑا کارخانہ اعلیٰ پیمانہ پر کھولا۔ خدائے برتر کی تائید سے کئی برس تک کثیر نفع کے ساتھ کام چلا بینکوں سے لاکھوں روپے کا لین دین ہو گیا لیکن روز بروز افکار بڑھتے گئے۔ اور کاروبار کو بھاری لاپروائیوں سے نقصان پہنچتا رہا اس لیے ہم نے لکھنؤ کا کاروبار بند کر دیا۔

سنہ ۱۹۰۷ء میں مستقل طور پر بمبئی میں قیام کرنے کی نیت سے ہم گئے۔ کاروبار میں ہر قسم کی کامیابی اور سرسبزی کے خواب نظر آنے لگے۔ لیکن غنی دل، قانع طبیعت، گوشہ نشینی کی خو نے ترقی کی بیل افسردہ کرنا شروع کر دی اور ہم مایوس ہو کر سنہ ۱۹۱۲ء میں ہمیشہ کے لیے وطن چلے آئے۔

ایک مرتبہ قیامِ لکھنؤ کے زمانہ میں دلی افکار نے کچھ اس طرح بے خود کیا کہ مشقِ سخن نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اسی عرصہ میں ایک مشاعرہ تھا، احباب جگر نواز کے اصرار سے غزل کہنے بیٹھے تو نظم کی دنیا آنکھوں میں تاریک تھی۔ چھوٹی ہوئی مشق، ٹوٹا ہوا دل، رُکی ہوئی طبیعت۔ غرضیکہ چاہتے کچھ تھے نظم کچھ ہوتا تھا۔ دو چار گھنٹوں کی محنت میں کچھ شعر کہے لیکن [illegible] نکتہ رس نے کوئی مصرع نہیں پسند کیا۔ جی جل گیا۔ مسودہ کو گریبانِ صبر کی طرح چاک کر ڈالا، مشاعرے کو خیرباد کہہ کر شام ہی سے پڑ کر

سو رہے۔ خواب میں عجیب و غریب واقعہ پیش نظر ہوا ہم نے دیکھا کہ استاد مرحوم بے حد سفید لباس پہنے ایک خوشنما اور دلکش مقام پر رونق افروز ہیں شاگرد جمع ہیں شمع سخن کے گرد پروانوں کا ہجوم ہے خادم بھی باگرداں ہو رہا ہے۔ حضور نے کمال نوازش سے مسکرا کر فرمایا جگر میاں آپ نے شاعری کا شوق بہت کم کر دیا مذاق سخن کے ترقی میں روز شعر کہیئے۔ آنکھ کھلنے کے بعد اس تاریخ سے تادم تحریر خدا کر کوئی دن ایسا نہیں گزرا جس دن شعر نہ کہے ہوں۔

مہاراجہ بلاسپور ضلع شملہ کے ذمے کارخانہ کی ایک بڑی رقم باقی تھی وصول کرنے کے لیے ہم بلاسپور پہنچے۔ دریائے ستلج کے کنارے سرسبز پہاڑوں کے آغوش میں نہایت خوشنما بستی ہے بلند پہاڑوں سے راج دھانی کے مکانوں کو ہمسری کا دعویٰ تو بیجا ہے۔ ایک دن شام کا وقت تھا، آفتاب کوہستانی خوابگاہ کی طرف جا رہا تھا ایک باغ میں جو زنانہ محل سے ملا ہوا تھا چند دوستوں کے ساتھ ٹہل رہے تھے بہت سی خواصیں محل سرا سے نکلیں ہم کو دیکھ کر پہلے تو ان لوگوں کو وحشت ہوئی لیکن آخر کار وہ بھی اس چمن میں ٹہلتی رہیں۔ ان کے گلابی رخسار ان کے رنگین لباس دیکھ کر ہم ان کو گلزار حسن کے بہترین پھول سمجھتے تھے۔ ایک دوست نے فرمائش کی کہ کوئی حسب حال شعر نظم کیا جائے ہم نے یہ مطلع اسی وقت کہہ کر پڑھا۔

چشم جاناں کا میں بیمار ہوں سودائی بھی
پیار کرتے ہیں مجھے آہوئے صحرائی بھی

۱۹۰۳ء میں ہم کلکتہ گئے تین سال تک تجارتی کاروبار میں کوشش کرتے رہے۔ دھرم تلا، دھا بازار اور فوجداری بالاخانے پر کپڑے کی دوکان رہی، لیکن وہ ترقی جو لکھنؤ میں حاصل ہوئی تھی نظر نہ آئی اس لیے یاران لکھنؤ پھر زبردستی لکھنؤ کھینچ لائے۔

آغاز شباب سے شاعری کا شوق ہے۔ جملہ کلام دیوان غزلیات، قصائد، قطعات، مفردات، مثنویات اور متفرق نظمیں تین حصوں میں ہدیۂ ناظرین کرام ہوگا۔ یاران رنگین خیال جو مجھ سے مشورہ سخن لیتے ہیں، اکثر طباع، صاحب عشق اور اس فن کے دلدادہ ہیں۔ جن میں ماسٹر سید باسط علی صاحب باسط زمیندار بسوان سکریٹری بزم جگر، منشی محمد سرفراز خاں صاحب سرور زمیندار بستی غزان جالندھر پنجاب، منشی محمد خلیل الرحمٰن صاحب خلیل زمیندار بسوان برادر خورد احقر، قاضی ظہیر الدین صاحب ظہیر بسوانی تحصیلدار ریاست محمود آباد، مولوی محمد عظیم صاحب واثق بسوانی، لالہ رگھبیر ناتھ پرشاد صاحب شاد مہاجن و زمیندار بسوانی، سیٹھ بدھو لعل صاحب جوہر رئیس کانپور، منشی نبی حسین خاں صاحب اثر بسوانی، مولانا عبدالرحیم خاں صاحب ناز ہیڈ ماسٹر پرائمری اسکول بسوان، ماسٹر بخت بہادر صاحب نشاط متعلم انٹرنس کلاس بسوان، ماسٹر بدری نرائن صاحب حسین محمود آبادی، سیٹھ پیر محمد صاحب وفا تاجر بمبئی، منشی زین الدین صاحب زیبا بمبئی، منشی محمود علی صاحب شرر دہلوی، سید عاشق حسین صاحب قمر بنارسی، شیخ احمد صاحب داؤد خیری بمبئی، منشی سید علی صاحب سید قادری پوربندری بمبئی، شیخ عبدالغنی صاحب غنی بمبئی، منشی تجمل حسین صاحب تبسم فتحپوری، منشی ابوالحسن صاحب شمیم بہاری، ملک محمود رفیق صاحب رسوا سیالکوٹی، سید محمد مصطفےٰ صاحب مصطفےٰ تاجر عطر کانپوری، منشی جگل بہاری لعل صاحب نگیں محمود آبادی، ماسٹر محمد نظیر صاحب پیکان ڈرائنگ ماسٹر سیٹھ جند مل ہائی اسکول، ماسٹر رام سروپ صاحب پیکر کلرک جیو پال ہائی اسکول، زمیندار کتاپور، منشی واحد علی صاحب واحد بلگرامی، منشی عبدالغفار خاں صاحب شہرت بہرائچی۔

منشی غلام رسول صاحب تاجر تباکو بسوانی، مسٹر رام سرن روشن منتظم انٹر فسٹ کلاس، منشی گنگا کرشن صاحب تپش فتح پوری، مرزا محمد خاں صاحب محمد بسوانی، شیخ عبدالحمید خاں صاحب بیان زمیندار بابو پور، منشی شبیر حسین صاحب شبیر فتح پوری، منشی بھوکن لعل صاحب شگفتہ اورنگ آبادی، منشی شیو نرائن لعل صاحب رتن اورنگ آبادی، منشی عبدالحمید خاں صاحب قید ڈاکٹری رائٹر بہرائچ، منشی نظیر احمد صاحب نظیر بسوانی، منشی محمد یار خاں صاحب رافت بہرائچی، جناب پنڈت رام دلارے صاحب رام بسوانی، منشی فرزند علی صاحب راز بسوانی، منشی محمد نذیر صاحب ناظر بسوانی، منشی کدار ناتھ صاحب تجر بسوانی، پنڈت بنسی دھر صاحب شبنم بسوانی، منشی اونکار ناتھ صاحب ماہر شاہ آبادی، نیز اور بہت سے احباب عشق سخن کی منزل طے کر چکے ہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ سب کے دیوان میری زندگی میں شائع ہو کر میری دلی مسرت کا باعث ہوں۔

جگر بسوانی

وفات: ۷ مئی ۱۹۵۱ء کو واقع ہوئی اور بسوان ضلع سیتاپور (یو۔ پی) میں سپرد خاک ہوئے۔

تصانیف:

(۱)	دیوان جگر	حصہ اول
(۲)	دیوان جگر	حصہ دوم
(۳)	درد جگر	ناول
(۴)	مکاتیب جگر	غیر مطبوعہ
(۵)	تذکرۃ الشعرا موسوم بہ دور سخن	یہ تذکرہ بہ اقساط رسالہ فصاحت حیدرآباد دکن میں چھپتا رہا ہے کتابی صورت میں ابھی طبع نہیں ہوا۔

اطہر ہاپوڑی

ولادت : ۳ - اکتوبر ۱۸۷۴ء   وفات : ۲۵ - فروری ۱۹۵۹ء

نام سید معشوق حسین تخلص اطہر والد ماجد کا نام سید امراؤ علی صاحب ابن شاہ اسد اللہ عابد شب زندہ دار ۔ پرہیزگار متقی پابند شریعت با خدا بزرگ تھے ۔ وطن قصبہ ہاپوڑ (ضلع میرٹھ)

میں ۱۰ شعبان المعظم ۱۲۹۱ھ مطابق ۳ اکتوبر ۱۸۷۴ء بروز جمعہ بعد نماز عصر ہاپوڑ میں پیدا ہوا

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْم

۱ ۸ ۷ ۴ ۳

سے میری ولادت کی تاریخ نکلتی ہے ۔ میری عمر بارہ سال کی تھی کہ والد ماجد نے عالم قدس کی طرف رحلت فرمائی ۔ اس کے بعد میں اپنے برادر کلاں منشی سید اشفاق حسین ڈپٹی مجسٹریٹ ، ڈپٹی کلکٹر کے سایۂ داماں عاطفت میں تعلیم و تربیت سے بہرہ یاب ہوا ۔

مذاق سخن سنجی شعور ہی سے طبیعت میں ہے ۔ چودہ پندرہ سال کی عمر سے شعر کہنے لگا تھا ۔ مولوی قمرالدین قمر سوروں ضلع ایٹہ کے باشندے میری فارسی تعلیم کے لیے ملازم تھے ۔ مولوی صاحب شاعر بھی تھے اور نعت میں غزل کہتے تھے ۔ مولوی صاحب نے اس زمانہ میں ایک غزل نعت میں کہی جس کا مطلع تھا ؎

کشش میں کاش کہ تیری دلا اتنا اثر ہوتا
تو مجھ پہ مہرباں ہر دم مرا رشکِ قمر ہوتا

مولوی صاحب کی عادت تھی کہ جو نئی غزل فرماتے ۔ اس کو ہفتوں گنگنایا کرتے ۔ مجھے سنتے سنتے وہ تمام غزل یاد ہو گئی ۔ ایک دن خود بخود طبیعت میں لہر پیدا ہوئی اور یہ مطلع موزوں ہو گیا ؎

اگر عشق محمد دل میں میرے جلوہ گر ہوتا
تو ہرگز خارِ عصیاں سے نہ زخمی باغِ جگر ہوتا

اس کے بعد چار شعر اور کہہ کر غزل کو با مقطع تمام کیا اور مولوی صاحب کو غزل اصلاح کے لیے دکھائی ۔ مولوی صاحب نے اصلاح نہیں دی اور شعر کہنے سے منع فرمایا ۔ اس طرح یہ پہلی غزل نعت میں موزوں ہوئی ۔ تحقیق شعری کا شوق حضرت جلال لکھنوی اور مولوی محمد احسن شوق نیموی کے باہمی مباحثے کی کتابیں دیکھ کر پیدا ہوا ۔

زمانۂ قیام لاہور میں حضرت اصفہانی کا تلمذ اختیار کیا ۔ حضرت اصفہانی بڑے فاضل اور حاضر طبع شاعر تھے ۔ تین سال استفادہ

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

فرمایا۔ اُردو میں کسی سے اصلاح نہیں لی۔

۱۸۹۱ء و ۱۸۹۲ء میں مین پوری میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ وہاں مولوی محمد محسن صاحب کاکوری مرحوم سے اکثر ملاقات ہوئی۔ وہیں منشی طاہر علی طاہر فرخ آبادی اور منشی حیات بخش صاحب رسا تلمیذ حضرت داغ مرحوم سے خاص دوستانہ مراسم تھے۔

۱۸۹۵ء سے ۱۸۹۹ء تک علی گڑھ میں قیام رہا۔ جہاں میرے برادرِ کلاں سید اشفاق حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اس زمانے میں حالی مرحوم حیاتِ جاوید کی تکمیل کے لیے علی گڑھ میں رونق افروز تھے اور علامہ شبلی بھی علی گڑھ میں پروفیسر تھے۔ اس وجہ سے مولانا حالی و مولانا شبلی مرحوم کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ نومبر ۱۸۹۵ء میں رام پور جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ملک الشعرا حضرت امیر مینائی کی خدمت میں شرفِ نیاز حاصل کیا۔ منشی صاحب مرحوم کا کلام خود ان کی زبانِ مبارک سے سُنا اور اپنا کلام بھی ان کی خدمت میں پیش کیا ؎

الحمد یہ وہ غزل ہے مری مجھ کو جس کی داد
ہر شعر پر ملی ہے جنابِ امیر سے

دسمبر ۱۹۰۲ء میں دربارِ دہلی کے موقع پر فصیح الملک حضرت داغ مرحوم سے آغا شاعر دہلوی کے ساتھ ایک مرتبہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

میں ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۹ء تک وکالت کرتا رہا۔ اس زمانے میں جناب جلال لکھنوی مرحوم سے بعض الفاظ اور بعض مسائلِ شعری پر گرما گرم گفتگو ہوئی اور مقامی اخبارات میں مضامین بھی نکلے۔ منشی امیراللہ تسلیم سے اکثر صحبت رہی اور ان سے خصوصیت کے ساتھ مراسم بڑھ گئے۔

۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۰ء تک گوالیار میں وکیل رہا اور اعتبار الملک[2] حضرت مضطر خیرآبادی مرحوم کے مشاعروں میں شریک ہوا اور اکثر ان سے دوستانہ اختلاف رہا۔

۱۹۱۰ء میں جے پور چلا گیا۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۰ء تک جے پور میں منصف رہا۔ فرقہ وارانہ وجوہ کی بنا پر استعفا دے کر ٹونک چلا آیا۔

۱۹۲۳ء میں میں نے اُردو کی حمایت میں "ہندی پرچارنی" سبھا کے مقابلے میں "اُردو ڈیفنس کمیٹی" قائم کی۔ اس کے سیکرٹری کی حیثیت سے اُردو کی خدمات انجام دیں۔

---

[1] اس بحث میں مولوی ظہیر احسن شوق نیموی کا رسالہ اصلاح مع ایضاح شرح اصلاح و ازاحۃ الاغلاط مطبوعہ اردو پریس علی گڑھ ملاحظہ فرمائیے

[2] افتخار الشعرا اعتبار الملک اقتدار جنگ منشی سید افتخار حسین مضطر خیرآبادی حضرت امیر مینائی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے والیِ ٹونک کے استاد تھے۔ ۱۹ رمضان ۱۳۴۵ھ مطابق ۲۰ مارچ ۱۹۲۶ء کو وفات پائی۔ بابا چھنگا شاہ میں مدفون ہوئے۔

میری چند تصانیف مندرجہ ذیل ہیں :۔

(۱) اردو کے تین دیوان (۲) مجموعہ قصائد اردو (۳) مجموعہ قصائد و غزلیات فارسی (۴) رسالہ تحقیقات الفاظ (۵) قطعات تاریخ۔ مراثی و سلام (۶) رسالہ اصلاح عروض زیرِ تصنیف (۷) مکتوباتِ شعری۔ (۸) رسالہ جدید عروض و قوافی (۹) اظہار اللغات۔ اس کے دو حصے ہیں۔ ایک حصے میں وہ فارسی الفاظ ہیں جن کو ہندوستانی فارسی نہیں سمجھتے اور شبہ کرتے ہیں۔ دوسرے حصے میں وہ الفاظ ہیں جن کو ہندوستانی فارسی سمجھتے ہیں اور حقیقت میں وہ فارسی نہیں ہیں۔ ہر لفظ کی سند فرہنگِ ناصری سے دی گئی ہے۔ اور دوسرا حصہ محاکمہ ہے جو برہانِ قاطع اور مرزا غالب کی قاطع برہان کے متعلق ہے۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مرزا غالب کی رائے برہانِ قاطع کی نسبت اکثر غلط ہے اور اس کی تائید فرہنگِ ناصری سے نہیں ہوتی۔ فرہنگِ ناصری کا مؤلف ایرانی ہے۔ اس کی رائے برہانِ قاطع اور قاطع برہان دونوں سے زیادہ مستند ہو سکتی ہے۔

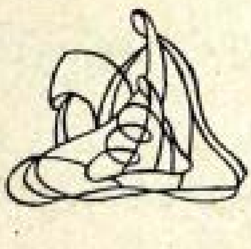

شاہ محمد حسین الہ آبادی

ولادت:- ۱۸۵۳ء
وصال:- ۸/رجب ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء

"میں ناچیز کی نمود و بود ابتدا سے ایسے خاندان میں ہوئی جو مدت دراز سے علوم حقیقت اور فنون تصوف میں مشہور تھا۔ پہلے پہل آنکھیں کھلیں تو جہاں صوفیا و پیر، باتیں سنیں تو وہی توحید و حقائق کی، خود میرے خاندان میں اتنے لوگ تھے کہ اگر کوئی ملنے آتا اور پندرہ پندرہ منٹ بھی ایک شخص کے پاس بیٹھتا تو قریب قریب پورا دن صرف ہو جاتا۔ وہ سب ایک خیال کے لوگ تھے۔ ان کی صحبت میں بجز اس کے کہ حقائق و معارف کی باتیں ہوں، ذوق و شوق کا ذکر ہو، اولیائے کرام کے تذکرے ہوں اور کوئی چرچا ہی نہیں تھا۔ خانقاہ میں مسجد میں اور ہر ایک مکان میں باہر کے فقراء بھی بکثرت آتے جاتے تھے۔ راتوں کو تمام محلہ ذکر کی آواز سے گونجتا رہتا تھا۔ لڑکپن سے جو انہیں کی صحبت رہی تو اسی وقت سے اہل اللہ کے ملنے کا شوق رہا۔ اور ان کی صحبت کے فیضان سے دل آداب صحبت فقرا سے انتہا درجہ با ادب رہا۔ اسی وجہ سے اس ناچیز کو اہل اللہ کی خدمت میں حاضری کے وقت ہمیشہ تتبع عادات کا خیال رہا نہ تفتیش خرق عادات کا۔ ہاں کوئی کرامت یا خرق عادات بلا اختیار پیش آئی تو آمنا و صدقنا کر کے مان لیا۔"[1]

شعر
ہر گہ گفتم ز جہاں جان جہانے کہ مپرس — جان فشاندم بسر آفت جانے کہ مپرس
دے آبے کہ سکندر ز جہاں جست و نیافت — یافتم از دم شمشیر و سنانے کہ مپرس
داغ بر داغم از آں لالہ عذارے کہ مگو — پا بہ گل ہستم از آں سرو روانے کہ مپرس

ماند پیکان خدنگ نگہت بدہان زخمم
یافتم بہر سپاس تو زبانے کہ مپرس

رگ مجنوں کو اگر سودا ہو نوک نشتر ہو تو نجد کے خار صحرا سے بڑھ کر نہیں۔ چشم وامق کو سرمہ کی حاجت ہو تو غبار کوئے عذرا سے بہتر نہیں۔ دردمندان الفت کو دوا کی پروا نہیں۔ خاک راہ محبوب ان کے لئے سرمایۂ شفا ہے۔ جاں دادگان محبوب کو کسی بت اعجاز نما کی حاجت نہیں۔ ہوائے کوئے جاناں ان کے حق میں دم عیسیٰ ہے۔ اس راہ کے صدقے جس کی انتہا کوچہ جاناں تک ہو۔

---

[1] مکتوب بنام صاحبزادہ مولانا محمد ولایت حسین صاحب

[2] مکتوب بنام مولانا اشرف علی تھانویؒ

اس کوچے کے قربان جس کی نسبت سید انس و جاں تک ہو۔ اس شہر کا سودا آنکھوں میں نور اور دل میں سویدا ہو بن کر رہے تو کم ہے۔ جو سایہ پرور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اس سرگشتہ دشت ناکامی نے مدتوں تڑپ کر فکر کی کہ اپنے آقا کے بارگاہ عرش الجاہ کے آستانۂ فیض کاشانہ کی جبہ سائی کرے مگر نارسائی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔

آخر خدا نے وہ دن دکھایا کہ ناچیز آپ لوگوں سے رخصت ہو کر صبح ۸ بجے جبل پور پہنچا۔ جبل پور کے مسلمانوں نے میرے دن بھر کے قیام کے لئے اسٹیشن پر خیمہ وغیرہ کا انتظام کیا تھا مگر آنے کا وقت یقینی طور پر معلوم نہ تھا۔ اس لئے وہ انتظام ناتمام رہا۔ دن بھر اسٹیشن ہی پر قیام رہا۔ وہاں سے روانہ ہو کر دوسرے دن عصر کے وقت بائی کلہ کے اسٹیشن پر میرے مخدوم محمد صدیق سیٹھ ملے اور کہنے لگے کہ بمبئی میں اور لوگ بھی آپ کے منتظر ہوں گے مگر "الفضل للمتقدم" آپ میرے مہمان ہو چکے۔ میں نے خیال کیا کہ میرے قدیم دوست مولوی محمد صدیق ہیں وہ اگر اصرار فرمائیں گے تو میں مجبور ہو جاؤں گا۔ وہ میرے ساتھ بوری بندر اسٹیشن تک آئے۔ یہاں مولوی محمد صدیق احمد صاحب اور ایک جماعت مسلمانوں کی میری منتظر تھی اور سواری کے لئے گاڑیاں بکثرت موجود تھیں۔ غرض کہ مولوی صاحب کی لائی ہوئی گاڑیوں پر سوار ہو کر باتفاق صدیقین آغا بلڈنگ میں ٹھہرے . . . . بمبئی کی سرگزشت اس پرچے کے آخر میں لکھوں گا۔ ابھی کچھ اور ضروری باتیں لکھوں گا۔

میری طبیعت فطرۃً کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ دنیا کے رنج و راحت بخش اسباب سے بہت کم متاثر ہوتی ہے۔ کسی دوست کے قرب و بعد کا اثر میرے قلب پر بہت کم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ مجھے یہ امر متیقن مثل مشہور کے ہے کہ ہر وصل کی انتہا فصل، ہر جمع کا انجام تفرقہ ہے بقول شاعر ؎

ہر جمع کا انجام پریشانی ہے

مگر اس مرتبہ ہم وطنوں کے ظاہری و باطنی تجاذب نے میرے قلب کو اس طرح کشاکش میں ڈالا کہ اگر قبلۂ عالم سرکار والا اقتدار آقائے نامدار جہاں پناہ روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانہ بوسی کا شوق دل پر غالب نہ ہوتا تو یقیناً دل کی ایسی حالت پہنچی تھی کہ دامان شکیبائی ہاتھ سے جاتا رہتا۔ مجھے یہ تو یقین ہے کہ میرے ہم وطن سب نہیں تو اکثر دلی محبت رکھتے ہوں گے۔ اس لئے کہ میں نے جہاں تک محبت اور اس کے اسباب میں غور کیا تو یوں سمجھ میں آیا کہ اصل محبت تو ہر شخص کو اپنی ذات کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس کے بعد جس کو اس کی ذات کے ساتھ جس قدر قرب ہے اسی قدر محبت کم و بیش ہوتی ہے۔ اولاد اور بھائیوں کی محبت کا تفاوت اسی تفاوت مراتب قرب پر مبنی ہے۔ مگر قرب دو ہیں۔ ایک قرب زمانی و مکانی۔ دوسرے قرب باطنی (جس طرح اخلاق اور مزاج آپس میں متقارب ہوتے ہیں) ہاں جس طرح قرب زمانی اور مکانی میں زمان اور مکان کا متحد ہونا ملحوظ ہے، قرب باطنی میں بھی کسی امر کا مشترک ہونا ضروری ہے۔ اسی امر مشترک کو اتحاد باطن یا اتحاد معدن کہتے ہیں۔ بہر حال اپنے ساتھ اول درجہ کی محبت ہوتی ہے۔ دوسرے درجہ کی محبت قریبوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ غرض کہ قرابت کو محبت لازم ہے۔ قرابت نسبی کو غور سے دیکھئے تو وہ بھی اشتراک معدن کی ایک فرع معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اجزائے نطفۂ پدری اس کے اصل کے ساتھ کبھی مخلوط اور ایک معدن میں تھے۔ پیدا ہونے کے بعد اگر قرب کے اور وجوہ پیدا ہو جائیں تو محبت میں اور ترقی ہو جاتی ہے۔ ہاں کہیں باوجود اتحاد معدن نہ

وطن کے بجائے محبت کے عداوت نظر آتی ہے۔ تو اس کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے قسم کی محبت جو اس کے معارض ہے غالب آتی ہے۔

معدن دو طور کے ہوتے ہیں۔ ایک حقیقی دوسرا غیر حقیقی۔ معدن حقیقی سے ہماری مراد کسی وصف انضمامی میں شرکت و اتحاد ہے۔ جس طرح دو فرد انسانیت یا اوصاف ذاتی میں متحد ہیں اور معدن غیر حقیقی سے مراد وصف انتزاعی میں شرکت ہے جیسے نحوی یا صرفی ہونے میں شرکت۔ غرض کہ غور سے دیکھا گیا تو اتحاد معدن موجب محبت ہے۔ ہاں کہیں باوجود اتحاد معدن حقیقی اور غیر حقیقی کے وہ محبت نہیں ہوتی جو دُور کے رہنے والوں میں یا متحد المذہب والاخلاق میں ہوتی ہے تو اس کا منشاء یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرابت نسبی میں اتحاد معدن غیر حقیقی ہے۔ اس لئے کہ نطفے اگر پیدا ہوتا ہے تو جسم پیدا ہوتا ہے نہ روح۔ اور بدن روح کے حق میں ایسا ہے جیسا مکین کے حق میں مکان اور اخلاق اور امور مذہبی کا تعلق بالذات روح کے ساتھ ہے اور اتحاد مکانی میں معدن غیر حقیقی کا اتحاد ہے اور اوصاف روحانی کا اتحاد معدن حقیقی کا اتحاد ہے اور حقیقی غیر حقیقی پر غالب ہے۔ بہرحال مجھے اپنے ہموطنوں سے چونکہ اتحاد معدن کبھی ایک وجہ سے کبھی بوجوہ حاصل تھا اس لئے خیال محبت راجح اور اس کا مخالف خیال میری نظر میں بے وجہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اہل وطن کے ان برتاؤں کو جو خلاف محبت تھے نہایت حیرت کی نگاہ سے دیکھتا۔

میرے وطنی بھائیوں نے ایک زمانے تک مجھے وہابی بنایا اور محض اپنے وہم و گمان کے موافق وہابیہ کے سارے عقائد کا۔ اچھے ہوں یا بُرے، واقع میں وہ میرے عقائد ہوں یا نہ ہوں۔ مجھے معتقد ٹھہرایا۔ اس کا منشا محض اسی قدر تھا کہ مولود شریف کے محافل میں ذکر ولادت کے وقت بالخصوص حسب رواج قیام (جس وقت ولادت کا بیان میلاد شریف میں ہو تو اس وقت کھڑے ہونے کو قیام میلاد کہتے ہیں) نہ کرتا تھا گو میں قیام کو حرام نہ جانتا تھا اور قیام کرنے والوں کو بُرا نہ سمجھتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی قیام مخصوص کو فرض یا واجب یا رکن ایمان نہ جانتا تھا۔ جیسا کہ اب بھی نہیں جانتا۔ جہاں اور لوگ قیام کرتے وہاں میں بھی قیام کر لیتا۔ میرے استاد مکرم جناب مولانا عبدالحئی صاحبؒ کے حیات کا زمانہ تھا۔ ان کی بھی یہی روش تھی کہ جہاں لوگ قیام کرتے خود بھی فرماتے۔ خود ضروری نہ جانتے۔ قیام کو بدعت، قیام کرنے والوں کو مبتدع نہ ٹھہراتے۔ میری بھی وہی روش تھی۔ فقط اتنی ذرا سی بات پر میں وہابی بنا۔ بدعقیدہ کہلایا اور وہابیہ کے سارے عقائد میرے ذمہ لگائے گئے۔ گو خدا کے فضل و کرم سے ان سارے عقائد سے دُور تھا۔ طرفہ یہ ہے کہ جو اصحاب قیام کے قائل تھے یا ہیں، وہ بھی فرضیت یا وجوب کے قائل نہیں۔ مگر ترک پر اس قدر شور و شغب ہوا کہ کبھی کسی فرض یا واجب کے ترک پر نہ دیکھا نہ کسی حرام کے ارتکاب پر سنا۔ غرض ایک زمانہ تک میں ان کے گمان میں وہابی بنا رہا۔

اس دور میں وہابی مجھ سے خوش اور ان کے مقابل ناخوش رہے۔ وہابیوں نے اپنی غلط فہمی سے یہ سمجھا کہ یہ من کل الوجوہ ”ہمنوا“ ہیں اور ان کے مقابل نے خیال کیا کہ یہ ”منہم“ ہیں۔ حالانکہ میں من کل الوجوہ نہ اِن میں تھا نہ اُن میں ؎

ہر کسے از ظن خود شد یار من   وز درون من نہ جست اسرار من

یہ پہلا دَور تھا۔ اب دوسرا دَور شروع ہوا۔ یہ پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ قیام میرے نزدیک معصیت یا قبیح کبھی نہ تھا اور عند التحقیق اس کی حقیقت بھی استحباب اور استحسان علماء سے زائد نہیں۔ اہل محبت اپنے ذوق و شوق میں اس کو مقام شہود میں کچھ سمجھیں

وہ اور بات ہے۔ اب میں نے محفل میلاد شریف میں قیام بہ التزام شروع کیا۔ اس دور کے انقلاب عملی سے یہ انقلاب اوہام ہوا کہ وہابیہ کے زمرہ میں، بجائے متبع، مبتدع میرا نام ہوا اور ان کے مخالفین کے زمرہ میں سنی ٹھہرا۔ پہلے دور میں جو مجھے "منّا" (اپنے میں) سمجھتے تھے "منہم" (غیروں میں) سمجھنے لگے اور منہم والے منّا۔ اب وہابیہ کی طرف سے جتنے عقائد ان کے مخالفین کے تھے وہ میرے سر باندھے گئے اور ان کے مخالفین کی جانب سے وہ ساری تہمتیں جو پہلے دور میں میرے ذمہ لگائی گئی تھیں یک قلم دور کر دی گئیں۔ پہلے دور میں جس فرقہ کے نزدیک قابل تحسین و آفرین تھا اس کے نزدیک قابل نفرین بنا۔ ان دونوں فرقوں کے تبدل و تغیر خیالات کی وجہ سے مجھے یہ علم حاصل ہوا کہ ہمارے اسمائے متعارفہ کے سوا اور نام بھی ہیں۔ وہابی، بدعتی سنی۔ ہم تو طالب علم ہیں ہمارا مطلب کہیں نہیں گیا۔ ہم بہرحال اس میں بھی ان کے شکر گزار ہیں۔

یہ دور بھی ختم ہوا۔ اب تیسرا دور شروع ہوا۔ میری طبیعت میں فطرتاً سوز و گداز رکھا گیا ہے اور کلام موزوں اور صوت حسن کے ساتھ خلقۃً مجھے ایک فطری مناسبت ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ذاتی اور نسبی تعلق خواجگان چشت سے ہے۔ ان حضرات سے دس پشت سے شرف غلامی حاصل ہے۔ اس نسبت نسبی اور ذاتی کے غلبہ نے میری طبیعت کو سماع و نغم اور استماع زیر و بم پر مجبور کیا اور جو فوائد باطنی مجھے سماع و غنا میں ہوئے بیان نہیں کر سکتا۔ جو لعن و طعن دوست و دشمن کے سننے میں آئے اس کو میرا دل ہی جانتا ہے۔ سب و شتم کے خطوط لکھ کر بھیجے۔ پہلے دونوں دور کے اکثر موافق مخالف ہو گئے۔ بقول شخصے "بیل نہ کودا کودی گون" ایسے سفیہ جہلا منہ آئے جنہیں الف بے اور لٹھے شہتیر میں فرق نہیں معلوم ہوتا۔ ہمارے اوپر ان کی طعن آلود یاوہ گوئیوں کا اتنا اثر بھی نہ ہوا جتنا مکھی یا مچھر کی بھنبھناہٹ کی آواز کان میں آنے سے ہوتا ہے۔ . . . الہ آباد اہل علم سے خالی ہے۔ کوئی کچھ کہے ہماری نظر میں یہ مطاعن جمادات کی آواز اور حیوانات کے صوت و صدا سے بھی زیادہ بے معنی ہیں۔ اس لئے ہم نے ایسی ویسی تحریر و تقریر بھی نہ دیکھا نہ سنا۔ ہم کو اپنے کام سے کام ہے۔

خلقے بطعن و گفتگو عاشق بکار خویشتن[1]

مگر سنتے ہیں کہ کچھ ایسے کلمات (ان لوگوں نے) لکھے جن سے ہمارے دوستوں کو دلی رنج پہنچا۔ ہمیں تو کچھ ان باتوں کا خیال ہی نہیں ہوا کیوں کہ مجاذیب کی زبان سے ہم نے اس سے بڑھ بڑھ کر کلمات سنے۔ دوسرے میری ذات خاص کے اوصاف ذمیمہ جس قدر لکھیں اور الٹ پر جتنا جی میں آئے ملامت کریں ان ذمائم سے بدرجہا کم ہیں جن کا ہونا میری ذات میں مجھے عین الیقین کے درجہ پر پہنچا ہوا ہے۔ وہ ساری ملامتیں جن کا اپنے اٹکل سے مجھے مستحق سمجھتے ہیں بہ نسبت ان ملامتوں کے جن کا میں اپنے علم میں فی الواقع مستحق ہوں بہت ہی قلیل ہیں۔ بہرحال اس دورہ میں میرا لقب صوفی و عارف، فاسق و فاجر، ریاکار ہوا۔ معلوم ہوا کہ میرے یہ بھی اسماء ہیں جن کا اب ہمیں علم ہوا۔

اسمائے مختلفہ کی تشخیص اشخاص مختلفہ سے شہود و آثار کے اختلاف پر مبنی ہے۔ جس نے جس اثر کا مشاہدہ میری ذات میں کیا اس کے موافق مجھے خطاب دیا۔ مشاہدہ کا اختلاف مشاہد (مشاہدہ کرنے والا) کے استعداد و مناسبت پر مبنی ہے اور

---

[1] حضرت شاہ صاحب کا وصال ۲۰ رجب سنہ ۱۳۲۲ھ کو اجمیر شریف میں عین حالت سماع میں ہوا۔ اسی وجہ سے "شہید عشق" کہلاتے ہیں۔

آثار کا ظہور علمی یا عینی تجلیات اسمائی، صفاتی اور واقعاتی کی نیرنگیوں کا مقتضا ہے۔ جن اسماء کی تجلیات علمی یا عینی کے جلوہ گاہ ہونے کا پیشتر ہمیں علم نہ تھا۔ اس دور میں معلوم ہوا کہ ان کے بھی ہم کسی نہ کسی طور کے مظہر ہیں۔ واقع میں یا کسی کے علم میں گو وہ غیر واقعی ہی کیوں نہ ہو مگر ایک قسم کی تحقیق ذہنی سے خالی نہیں۔ دلدادہ الفت کے لئے یہ کیا کم ہے کہ محبوب کے کسی علم یا صفت کا مظہر ہو۔ عاشق کے لئے محبوب کی ہر ادا دلفریب ہے۔

؎ نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

ہم بہرحال شکرگزار رہیں کہ ؎

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

ہمارے حضرات کے نزدیک ہر مخلوق کا حضرت حق سے دو طور پر تعلق ہے ایک بواسطہ دوسرے بلاواسطہ۔ تعلق بواسطہ میں تو حکماء ہمارے موافق ہیں مگر تعلق بلاواسطہ میں مخالف۔ لیکن کتاب و سنت اس کے ساتھ ناطق ہے۔ تعلق بلاواسطہ کو صوفیہ عالیہ کی اصطلاح میں "وجہ خاص" کہتے ہیں۔ وجہ خاص ہر شخص کے لئے مبداء فیاض سے فیوض مخصوصہ کے پہنچنے کا واسطہ ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان نام رکھنے والوں کو بواسطہ "وجہ خاص" میری ذات میں ایسے آثار کے علم شہودی کا افاضہ ہوا ہو جن کا مجھے علم نہیں اور وہ ان کے لئے ان اسماء کے ساتھ میرے مسمّیٰ بنانے کا ذریعہ ہو۔ میں گمان بد کیوں کروں۔ میں تو یہی سمجھوں گا کہ ان کا علم میرے لئے اس علم کا ذریعہ ہوا کہ میں ان اسماء کا بھی مظہر ہوں۔ ہاں یہ بھی یاد رہے کہ میں نے جو اوپر جماد و حیوان کی آواز کو تمثیلاً ذکر کیا وہ باعتبار عوام کے ہے جو جماد و حیوان کو بے علم و ادراک اور بے نطق سمجھتے ہیں۔ اہل کشف کے نزدیک سب ذی علم اور ذی نطق ہیں۔ آیہ کریمہ انطقنا اللہ الذی انطق کل شیء۔ ہر چیز کو ناطق بتاتی ہے اور آیہ کریمہ و ان منہا لما یہبط من خشیۃ اللہ احجار کو ذی علم ٹھہراتی ہے۔ اس لئے کہ خشیت بے علم کے ناممکن ہے۔ قال اللہ تعالیٰ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء۔ اسی بنا پر سنگریزوں کی تسبیح میں وجہ اعجاز تسبیح نہیں کیوں کہ وہ عادۃً تسبیح کرتے ہیں وان من شیء الا یسبح بحمدہ۔ وجہ اعجاز ان لوگوں کو تسبیح سنانا تھی جو عادۃً نہ سنتے تھے۔

یہ تین دور جو اپنی عمر کے میں نے ذکر کئے ان میں لوگوں کی بدگمانی پر مجھے سرسری نظر کے اعتبار سے تعجب ہوا مگر بعد غور کے معلوم ہوا کہ تعجب کا محل نہیں۔ میرے ساتھ بدی کا گمان رکھنے والے دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک راستباز جو بہ تقاضائے حب ایمانی ان عقائد کو جو ان کی نظر میں باطل ہیں مبغوض رکھتے تھے اور اس کے لوازم میں سے ہے کہ ان عقائد کا معتقد بھی مبغوض مانا جائے تو گو اتحاد وطنی موجب الفت تھا مگر تباعد اعتقادی باعث نفرت تھا۔ گو محض ان ہی کے علم میں اس کا تعلق روح کے ساتھ تھا اور اس کا جسم کے ساتھ۔ اور حکم روحی حکم جسمی پر غالب ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔ میں ایسے لوگوں کا بھی شکرگزار ہوں کیوں کہ حب ایمانی ان کی دوستی و دشمنی کا سرمایہ ہے۔ ایسے لوگوں کی دوستی و دشمنی بہ تغیر خیال یا بہ تبدیل احوال تغیر پذیر ہے۔ دوسرے وہ لوگ تھے جنہوں نے میرے کسی قدر ارتفاع کو بھی اپنے انخفاض کا ذریعہ سمجھا گو یہ خیال ان کا محض ان کی عقلمندی پر مبنی ہے یا بلا وجہ میرا ارتفاع ان کی نظر میں کھٹکا۔ یہ لوگ ہمیشہ ہر دور میں اپنی کاہش قلبی میں مبتلا رہے۔ اس لئے کہ یہاں خدا کے فضل سے کچھ نہ کچھ ہر دور میں عظمت ظاہری رہی۔ ہم ان کے حق میں بھی دست بدعا ہیں کہ اللہ ان کو ان کے مرض سے رہائی دے۔ ہم ان کو بھی معذور سمجھتے ہیں۔

اس قسم کے برتاؤ نے میرے دل کو اپنے وطنی بھائیوں سے سرد کر دیا تھا۔ میں نے محض اپنے شہر والوں کے نفع کی غرض سے انجمن قائم کی۔ ابتدا اس کی اس زمانے میں ہوئی جب باہم ہندو مسلمانوں میں کسی قدر رنجش تھی۔ اس انجمن کے تقرر کی غرض یہ تھی کہ مذہبی حقوق اور دینی آزادی کا جو گورنمنٹ برطانیہ نے اپنی رعایا کو بہ مقتضائے عدالت و رعایا پروری عطا فرمائی ہے تحفظ کرے اور اگر کچھ نقصان آگیا ہو تو حکام وقت کی خدمت میں استدعا کر کے حاصل کرے اور ان سرکاری احکام میں جس کی اشاعت اور تفہیم کی مسلمانوں میں حکام کو ضرورت پڑے ذریعہ اور واسطہ ہونے کی شرافت حاصل کرے۔ لاوارث مُردوں کی تجہیز و تکفین کا سامان کرے۔ ابتدا سے اب تک سارے مہتمم بالشان کام انجمن کے جلسہ عام میں کثرت رائے سے کئے جاتے ہیں۔ پہلے اشتہار دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد مجمع میں رائے لی جاتی ہے۔ ممبروں کا تقرر وغیرہ سب مجمع میں کیا جاتا ہے۔ انجمن کے ممبر کوئی ایسے نہیں جن کی عزت یا معیشت یا شہرت محض انجمن کی ممبری کے ذریعے ہو۔ انجمن نے کبھی مسلمانوں کو کثیر سرمایہ اکٹھا کرنے کی تکلیف نہیں دی تاکہ مانگنے کی دردسری نہ اٹھانی پڑے۔ دوسرے جس وقت کوئی خاص ضرورت پیش آتی ہے تو اس کے لئے بقدر ضرورت مسلمانوں سے اعانت کی درخواست کی جاتی ہے۔ کوئی سرمایہ کثیر جمع کرنے کی التماس نہیں کی گئی۔ ہاں اس قدر تدبیر کر دی جاتی ہے کہ جس سے ملازمین کی تنخواہوں کا انتظام ہو۔

تفضل حسین منصرم انجمن ایک ہوشیار اور جفاکش آدمی ہے اور قطع نظر جفاکشی کے معاملات فہمی کی قابلیت ان میں ایسی ہے کہ کم کسی میں ہوتی ہے۔ اتنے زمانہ تک انجمن نے اپنے کارِ فرض منصبی کو پورے طور سے ادا کیا۔ میں اگرچہ دو تین سال بیشتر سفر میں رہتا ہوں مگر ہمیشہ انجمن کے حالات سے جہاں رہوں مجھے اطلاع دی جاتی ہے اس انجمن کے قائم ہونے پر بالخصوص مجھ پر اور منصرم پر جس قدر طعن و تشنیع کی بوچھاریں تحریراً و تقریراً ہوئیں ان کو میرا دل ہی جانتا ہے ؎

جراحات السنان لہا التیام   ولا یلتام ما جرح اللسان

کا مقتضا تو یہ تھا کہ ان جگر خراش مضامین سے ایک دیرپا اثر دل میں پیدا ہو جس کا ازالہ مرور دہور کے بغیر دشوار ہو۔ مگر میں نے ان باتوں کو دل میں جگہ نہیں دی اور یہ سمجھا کہ

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

میں نے انجمن کو مسلمانوں کے مذہبی امور کے لئے ایک جارحہ تو بنایا تھا اور حکام والا مقام کے حضور میں مسلمانوں کی حالت عرض کرنے کے واسطے ایک زبانِ گویا قرار دیا تھا۔

مقتضائے انصاف یہ تھا کہ مسلمان اس سے کام لیتے اور اگر کچھ بُرائی نظر آتی تو محض خلوص اور اصلاح کے طریقہ سے اس کی درستگی کی کوشش کرتے۔ ممکن ہے کہ ممبران انجمن سے کسی رائے میں غلطی ہو۔ ان سے کوئی امر فروگذاشت ہو گیا ہو کوئی مسلمان اس غلطی کو بطور نصیحت سمجھائے تو انجمن اس کے ماننے ہی پر قناعت نہ کرے گی بلکہ اس کا شکریہ تہ دل سے ادا کرے گی۔ کسی ہاتھ پیر یا کسی عضو میں نقصان آگیا ہو تو مقتضائے عقل یہ ہے کہ اس کی اصلاح کی فکر کرے نہ کہ تشہیر کرتا پھرے کہ ہمارا ہاتھ پُر عیب ہے۔ بہرحال جب تک ہمارے امکان میں ہے ہم تدبیر سے ہمت سے و دعا سے انجمن کے بقا کی فکر کریں گے۔ آئندہ خدا مالک ہے۔ اب ہم نے انجمن کو مسلمانوں کے سپرد کر دیا ہے۔ انہیں کی انجمن ہے۔ انہیں کے کام کے لئے قائم کی گئی ہے۔ ہماری کوئی خاص ذاتی غرض اس سے متعلق نہیں۔ دیکھیں وہ اس کے ساتھ کیا

برتاؤ کرتے ہیں۔ جناب مولوی محی الدین صاحب اور برادر عزیز مولوی مظہر حسین صاحب اور نور دیدہ حافظ ولایت حسین صاحب بجائے میرے انجمن کا کام انجام دیں گے۔ کوئی مصرف انجمن کا بجز معمولی خرچ کے بلا مشورہ تمام اراکین کے نہ ہوگا اور کوئی مہتم بالشان کام انجمن کا مثل تقرری ممبران وغیرہ کے بغیر انعقاد مجلس عام کے نہ ہونا چاہیے۔ انجمن کا کوئی مصرف کسی ذاتی کام یا کسی ایسے کام میں نہ ہونا چاہیے جو طریق اہل سنت کے خلاف ہو۔ بظاہر تو میں نے انجمن کو مسلمانوں اور ان تینوں کے سپرد کیا مگر فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔

یہ انجمن کچھ میرے ذاتی غرض کے لئے نہیں۔ خدا خوب جانتا ہے کہ انجمن کے سرمایہ سے یا اس کی کسی چیز سے قلیل ہو یا کثیر میں کبھی ہرگز متمتع نہیں ہوا نہ یہ انجمن میرے لئے سرمایہ عزت یا ذریعہ معیشت ہے۔ میں بمصداق واما بنعمۃ ربک فحدث بطور تحدیث نعمائے الٰہی اپنے اللہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ وہ میری غیبی امداد ظاہری و باطنی ابتدائے سن شعور سے آج تک برابر فرماتا ہے کہ مجھے ابنائے روزگار میں کسی کی منت کشی کا نیازمند نہیں کیا۔ اس شہر میں اور ہندوستان کے دیگر بلاد میں بہت سے صاحب دولت میرے دوست ہیں مگر کبھی خدا کی مہربانی سے کسی متنفس سے مجھے اپنے ذاتی غرض میں التجا کرنی یا ان کی دولت یا عزت پر طمع اور آرزو کی نگاہ سے نظر ڈالنے کی نوبت نہیں آئی۔ ہاں کبھی قومی معاملات میں بعض معاملہ فہم لوگوں سے اعانت طلب کرنے کی ضرورت ہوئی۔ اس میں چند ہی لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے مدد دی ورنہ اکثروں نے تو بے توجہی سے کام لیا اور اگر توجہ بھی کی تو بعض آنی (یعنی بالکل تھوڑی دیر کے لئے) کہ ایک مجلس کے بعد پھر اس توجہ کا اثر نہ رہا۔ یہ اعانت طلبی نہ اس وجہ سے تھی کہ ملکہ فہم میں ان کو تفوق تھا بلکہ اس وجہ سے تھی کہ معاملات کے بکثرت برتاؤ کی وجہ سے ان کا تجربہ زیادہ تھا۔ ایک شخص قوی البصر ہے۔ اس کی بینائی کی قوت بہت قوی ہے۔ مگر گھر سے کبھی اس کو باہر جانے کا اتفاق نہیں ہوا اور دوسرا شخص ضعیف البصر ہے مگر اکثر سفر میں رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مبصرات کے صور مرتسمہ اس کے خزانہ علم میں زائد ہوں گے۔ مگر نفس قوت باصرہ میں وہ شخص اول کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر حضورؐ کا ارشاد ہے کہ انتم اعلم بامور دنیاکم (اے دنیادارو! تم اپنے دنیاوی معاملات کو بہتر سمجھتے ہو)۔ میں اپنے خدا کا شکرگزار ہوں کہ اس نے مجھے ایسے علوم عربیہ سے بہرہ یاب فرمایا ہے کہ شاید بیشتر اقران اہل علم اس سے خالی ہوں گے اور وہ علوم محض اس کے کرم کا نتیجہ ہیں نہ میری سعی و کوشش کا۔ صدہا باریک مسائل جن کے حل میں بیشتر عقلاء کے عقول محو حیرت ہیں مبداء فیاض نے بہ تجلی صفت علمی نہایت سہولت سے مجھ پر اس کی حقیقت منکشف کر دی۔ مثلاً حقیقت نفس کیا ہے اور اس کے اثبات پر کیا دلیل ہے اور تجرد و بقا پر کیا برہان ہے۔ ہیکل انسانی کی تدبیر اس سے کیسے ہو سکتی ہے اور کیا ممکن ہے کہ بعض نفوس انسانی ایسے ہوں کہ ترقی کمال علمی و عملی سے ان کو ایسا کمال حاصل ہو جس سے ایک وقت میں چند ہیاکل انسانی اور صور جسمانی کی تدبیر ان سے ہو سکے۔ جس طرح عقل فعال سے باوجود تجرد کے فساد کی تدبیر حکماء کی مانی ہوئی حقیقت ہے اور آیا نفس انسانی کا وجود مزاج کے بعد ہے یا قبل مزاج اور آیا نفس انسانی کو بدن کے ساتھ کسی امر کے ذریعے سے ارتباط حاصل ہے جو جسم اور نفس دونوں میں مشترک ہو اور دونوں کے من وجہ مناسب ہے یا نہیں۔ اس لئے کہ بسیط تام مرکب تام کے مباین ہے اور ہر موثر کی تاثیر دوسرے میں بدون مناسبت اور ارتباط کے ناممکن ہے۔ اگر مناسب ہے تو مزاج مرکب اور نفس بسیط میں کونسی مناسبت ہے اور ان کی حقیقت کیا ہے اور آیا ممکن ہے کہ نفس اس ارتباط سے کلیتہً الگ ہو جائے اور اس کو کسی صورت بسیط یا مرکب سے کسی قسم کا تعلق باقی نہ رہے۔ یا یہ امر ناممکن ہے۔ اگر ممکن ہے تو آیا اس عالم میں ممکن ہے باوجود بقاء علاقہ تدبیر کے۔ یا ناممکن۔ وہ فیض جو مبداء فیاض سے ہوا کیا ہے اور اس کے صدور کی کیفیت اور قوابل تک اس کے وصول کی حقیقت کیوں کر ہے۔ ہیولیٰ قابل قسمت نہ صورت۔

بجز حلول صورت کے بعد کوئی امر جدید پیدا ہوا بجز اجتماع کے اور اجتماع محض ایک نسبت اعتباری ہے جس کے لئے کوئی تحقیق فی حد ذاتہ نہیں ہے۔ الا تبعیت کسی ایسے امر کی جس کے لئے وجود تحقیقی ہو یہ امر تحقیق ہے کہ کوئی جوہر کسی کیفیت کے باطل ہونے سے باطل نہیں ہوتا حالانکہ حرارت اگر نار سے باطل ہو تو صورت ناریہ باطل ہو جاتی ہے۔ بہر حال ایسی اور اس کے امثال ہزاروں مسائل اور صدہا اشکال ہیں جن میں عقلا کو تفتیش کثیر کے بعد کچھ ظنی اور تخمینی علم ہوتا ہے اور وہ بھی شبہات سے خالی نہیں۔ حضرت حق نے اپنے کرم سے مجھ پر بآسانی کھول دیا اور حقیقت یہ ہے کہ ہر اغلاق کے لئے مفتاح ہے۔ کسی کے لئے ایک کسی کے لئے متعدد۔ مفاتیح کا انحصار محض آلات جسدیہ یا مشاعر نفسیہ میں نہیں۔ بعض وہ امور ہیں جو بواسطہ نظر و فکر عقل ادراک کئے جاتے ہیں اور بعض ایسے امور ہیں جو نہ حواس سے معلوم ہوں نہ عقل سے۔ جس طرح ذات و صفات حق یا ان امور کا علم جو امتزاج قوی مزاجیہ طبیعیہ یا اختلاطات قوی فلکیہ یا توجہات ملکیہ یا تلبیسات نفوس بشریہ اور قوی طبیعیہ سفلیہ کے نتائج ہیں یا طبقات عالم کی ترتیب کے اسرار اور ان کے احکام اور خواص کلیہ اور ہر جنس اور نوع اور صفت کا حد و خاص اور اوقات مخصوصہ کے ساتھ مخصوص ہونا اور ہر ایک نوع اور صفت کا باوجود اشتراک کے بعض بعض امور میں ممتاز ہونا۔ علیٰ ہذا القیاس مجموعہ عالم کی ایجاد کی علت غائیہ وغیرہ ایسے امور ہیں کہ عقل و حواس ان کے ادراک سے عاجز ہیں۔ ہاں اگر کسی کو ان امور کا علم ہو تو اس کے علم کا ذریعہ عقل و حواس نہیں بلکہ اس کی مفتاح کچھ اور ہے جس پر وہ امور کھلے نہیں۔ اس کے اعتبار سے غیب ہیں اور جس پر کھل گئے اس کے لئے شہادت ہیں۔ حق کے اعتبار سے سب شہادت ہیں کوئی غیب نہیں۔ غیب اپنے اعتبار سے فی حد ذاتہ دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جس کا علم ہے مگر اس کے لئے وجود نہیں جس طرح محالات۔ مثلاً اجتماع ضدین یا اجتماع نقیضین یا الجسم لایکون بمکانین والاثنان لایکون قبل الواحد اور سبب اپنے مسبب سے پیشتر نہیں ہوتا۔ مثلاً نسبت و اعتبار یہ سب چیزیں معلوم ہیں مگر ان کے لئے وجود نہیں۔ ان کے لئے مفتاح غیبی نہیں مفتاح عقلی ضرور ہے۔ دوسرے وجوہ معلوم بھی ہیں اور موجود بھی مگر بعض وجوہ سے معلوم ہیں اور بعض وجوہ سے غیر معلوم۔ اس کے لئے مفتاح کی ضرورت ہے۔ پھر بعض غیب ایسے ہیں کہ ہمارے ادراک میں نہیں آسکتے۔ اگرچہ فی حد ذاتہ قابل ادراک ہیں۔ دوسرے وہ جو ہرگز ادراک میں آ ہی نہیں سکتے اس کی ایک قسم غیب مطلق ہے جس کی شان میں وارد ہوا ہے کہ وعندہ مفاتیح الغیب لا یعلمہا الا اللہ۔ الف لام شمول جنسی کے لئے ہیں۔

ہر ایک اغلاق کے مفاتیح مخصوص ہیں۔ وہ میرے مذاق میں باعتبار وجہ خاص ہر ایک شخص کے لئے جداگانہ ہیں۔ کل حزب بما لدیہم فرحون اور سب مفاتیح قادر مطلق کے ید قدرت میں ہیں۔

اگر اس ناچیز کو بعض وقائع سربستہ کی مفاتیح خزانہ غیب سے عنایت ہو جائیں تو مستبعد نہیں۔ میں نے کبر و عجب کی راہ سے یہ مضامین نہیں لکھے بلکہ محض تحدیثاً للنعمۃ الالٰہیۃ لکھے ہیں۔ ہاں اس کا اس قدر تاسف ہے کہ بہت سے علوم بہت سے دقائق فنون کا خدا کے فضل سے میرا سینہ گنجینہ ہے۔ نہ کوئی طالب ہوا اور نہ میں نے اس کی اشاعت کی۔ طالب کا حال تو ظاہر ہے کہ اور شہروں میں عموماً اور الٰہ آباد میں خصوصاً علم کے طالب قلیل بلکہ ناپید ہیں۔ دنیا کے طالب تو جاہ کے خواہاں بیشتر دو چار باتیں علم کی صحیح یا غلط کہیں سن لیں یا چند روزہ ورق گردانی سے ذرا غلط صحیح کان ایکون کے معنی اپنے نزدیک سمجھنے لگے۔ فاضل، فاضل گر بن گئے اور خود میں نے اس واسطے اشاعت نہیں کی کہ جوہر علوم کا ہر نا اہل سے کتمان کرنا مناسب ہے۔

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی   تا بے خبر بمیرد در درد خود پرستی

امام زین العابدین کی جانب ایک قول منسوب ہے جس کے معنی ہیں کہ میں اپنے جواہر علوم کو اس لئے نہیں ظاہر کرتا کہ جاہل حق ناشناس اسے نہ سنے۔ منجملہ نعمائے الٰہی کے اللہ کا کرم ہے کہ ان جزئی مسائل میں جو شریعت میں نہایت ادون درجہ کی ہیں اور ابنائے زمانہ اپنے مبلغ استعداد کا ان میں روز و شب صرف کرنا منتہائے علو ہمت اور غایت معرفت کمال سمجھتے ہیں۔ میں نے ان کی طرف توجہ نہیں کی۔ ہاں اگر تحریر کی نوبت آئے تو بیشتر علوم کے دقائق ہیں اور کبھی کبھی ایسے امور میں جو تمام مسلمانوں کے لئے نفع بخش ہیں مثلاً الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد اس کی تحقیق میں ایک تحریر لطیف ہے۔ تلویح کے مقدمات اربعہ کی جرح و تعدیل میں ایک مجتہدانہ تحریر ہے۔ علاء الدولہ سمنانی اور عبدالرزاق کاشی جو نزاع "نفحات الانس" میں لکھی ہے اس میں ایک منصفانہ فیصلہ ہے۔ مقولات عشر کی تحقیق میں ایک نفیس تحریر ہے۔ ایک لطیف رسالہ ہے جس میں وجوہ شرافت انسانی و اخلاق حمیدہ کی تعلیم محض قرآن شریف سے لکھی گئی ہے۔ وجوہ عقلی بیان کر کے استنباط قرآنی مذکور ہے۔ ایک رسالہ برزخ کے مسائل اور اسرار عقلی و کشفی اور ملاحظات کے بیان میں ہے۔ محقق دوانی کے رسالہ زوراء کی ایک شرح ہے جس میں نفس کا حال اور معترضین کے خدشات کا جواب کافی دیا گیا ہے ایک مولود شریف کا رسالہ ہے جس میں مولد کی ضرورت اثبات نبوت عام پر اثبات نبوت خاص۔ نبوت کی نشانیاں۔ معجزات کا امکان اور اس کا وقوع بوجوہ عقلی و نقلی بیان ہوا ہے۔ قیامت کا مسئلہ ایک نہایت حیرت انگیز واقعہ ہے۔ انبیاء کو اس میں تحیر۔ اولیا اس کے علم سے عاجز۔ اشقیاء میں کچھ تو اس کے منکر کچھ اس کے امکان کے مقر مگر محض خیالی ہونے کے قائل۔ غرض مجوزین اور محیلین دونوں کو اس کے حال میں حیرت ہے۔ ہاں اہل ایمان و اہل معرفت و یقین کو اس کے قطعی الوقوع ہونے میں کسی قسم کا شک نہیں۔ زمانہ وقوع معلوم ہو کہ نہ ہو بلکہ ان کو اس کے آنے کا ہر دم انتظار مگر نہ ویسا جیسا غفلت شعاروں کا شعار ہے کہ اس کے وقوع کا تو انکار مگر استفسار وقت وقوع میں اصرار یقولون متی ھذا الوعد ان کنتم صادقین یسئلونک عن الساعۃ ایان مرسٰھا۔ اہل معرفت ہر لحظہ اس کو قریب جانتے اور اس کے لئے سامان مہیا کرنے کی ہر دم فکر رکھتے ہیں یستعجل بھا الذین لا یؤمنون بھا والذین امنوا یعلمون انھا الحق انھم یرونہ بعیدا و نراہ قریبا اور فی الحقیقت کفار کا یہ کہنا کہ متی ھذا الوعد بالکل بیجا نہ تھا۔ اس لئے کہ متی ھذا کے سوال کا تعلق ان امور سے ہے جو زمان یا زمانیات میں سے ہیں اور قیامت تو محض آنی ہے کہ چشم زدن بلکہ اس سے بھی کم وما امر الساعۃ الا کلمح البصر او ھو اقرب۔ جس طرح ایک اندھا مادر زاد جس نے کبھی مبصر اور مرئی نہ دیکھا ہو کبھی رنگ و روپ کا حال سن کر یوں پوچھے کہ رنگ کیوں کر سونگھا جا سکتا ہے۔ اس کا جواب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ رنگ کا جاننا باصرہ کا کام ہے نہ شامہ کا۔ ایسے ہی ان حقیقت ناآشناؤں کو جواب ہے کہ علمھا عند اللہ جو اللہ کے پاس ہو وہ جانے۔ فی الحقیقت ایک امر عظیم ہے کہ انبیاء مرسلین نے بھی اس کے وقت وقوع کو کھول کر نہیں بیان کیا اور بات یہ تھی کہ انبیاء بیان شرائع کے لئے تشریف لاتے تھے اور شرائع کا تعلق اس زمانہ سے ہے جس میں عمل ہے جزا نہیں اور قیامت کا تعلق اس دن سے ہے جس میں جزا ہے عمل نہیں۔ بہر حال میں نے قیامت کے متعلق ایک تحریر نفیس لکھی ہے جس میں آیات قرآنی سے کہیں کہیں احادیث صحیحہ سے قیامت کا حال لکھ کر اس کے اسرار بطور مذاق اہل کشف اور اس کی حقیقت بوجوہ عقلی ایسے عنوان شائستہ سے بیان کی ہے کہ عقول متوسط بھی شاید اس کے ماننے سے عذر نہ کریں اور منکرین قیامت کو بھی شاید دیکھنے کے بعد انکار کرنے میں تامل ہو۔ یہ تحریریں کچھ تو تمام ہیں اور کچھ ناتمام۔ اس قسم کی اور بھی تحریرات ہیں۔ غرض یہ ہے کہ خدا کی عنایت سے طبیعت کی توجہ بیشتر

علوم دقیقہ اور معارف یقینیہ کی طرف رہی نہ محض خطابیات اور شعریات کی جانب۔ وہاں پیمانۂ عمل میرا البتہ متاعِ اخروی سے بالکل خالی ہے اور اس کے سرسبز ہونے کے سامان اپنے حول و قوت سے باہر ہیں۔ سرکار والا اقتدار آقائے نامدار کے آستاں بوسی کا احرام اس غرض سے باندھا ہے کہ ان کی ایک نظر ہم ایسے فاقد الاستعداد لوگوں کے کامل الاستعداد بنا دینے کو کافی ہے۔

میں ان دنوں کچھ ایسا بد حواس و گم کردہ ہوں۔ خدا جانے کیا کہتا تھا کیا کہنے لگا۔ میری یہ تحریر بالکل طرز مجنونانہ رکھتی ہے۔ اب لکھتے لکھتے جی گھبرا گیا۔ باقی حالات انشاء اللہ بمبئی کے قرنطینہ اور جہاز کے کامران سے لکھوں گا اور اگر نہ لکھ سکا یا وہاں سے بھیجنے کا موقع نہ مل سکا تو انشاء اللہ پہنچ کر لکھوں گا۔ اس تحریر میں میں نے اللہ کے احسانات بیان کئے ہیں۔ یہ تحریر ابھی ناتمام ہے۔ اس کے بعد اس کا تکملہ بھیجوں گا۔ اس میں اپنی تقصیرات کی تشریح کروں گا جو ان احسانوں کے ادائے شکر میں مجھ سے ظہور میں آئیں۔

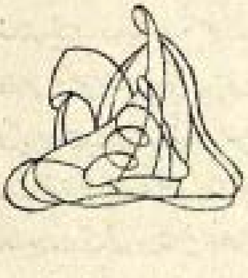

عبدالمجید سالکؒ

ولادت: ۱۳؍ دسمبر ۱۸۹۴ء

وفات: ۲۷؍ ستمبر ۱۹۵۹ء

جب میں نے ہوش کی آنکھ کھولی، تو بزرگوں سے معلوم ہوا کہ میرے پردادا کے والد دھرم کوٹ رندھاوا (ضلع گورداسپور) میں رہتے تھے۔ چھوٹی سی زمینداری تھی۔ کشتم پشتم گذران ہو رہی تھی۔ انہی دنوں خدا جانے کیا جوگ پڑا کہ زمینداری ختم ہوگئی۔ میرے پردادا بٹالہ میں اُٹھ آئے اور ککے زئیوں کی اس گلی میں جو ہاتھی دروازہ میں محلہ پلاں کے نام سے مشہور ہے ایک چھوٹا سا مکان بنا کر مقیم ہوگئے اور صابون سازی کا ایک چھوٹا سا کارخانہ قائم کر لیا۔ گویا ذریعہ معاش زراعت سے صنعت کی طرف منتقل ہوگیا۔ پردادا کے متعلق سنا کہ وہ نہایت متقی و پرہیزگار، تہجد گزار بزرگ تھے۔ اور سارا محلہ ان کا ادب کرتا تھا۔ ان کے متعدد بیٹے ہوئے جن میں سے بعض کا تو بچپن ہی میں انتقال ہوگیا۔ چار بڑے ہوئے۔ دین محمد، میاں محمد، میر محمد، سلطان محمد —— حضرت میاں میر محمد میرے دادا تھے۔ ان کے ہاں چار لڑکے ہوئے۔ ایک بچپن میں مرگیا۔ تین لڑکے عبدالعزیز، غلام قادر، محمد افضل صاحب اولاد ہوئے۔ ان تینوں میں سے غلام قادر میرے والد تھے جو پٹھانکوٹ کی میونسپل کمیٹی کے محرر مقرر ہوئے اور سیکرٹری کے عہدہ پر پہنچ کر سبکدوش ہوئے۔

میرے دادا میاں میر محمد نہایت صالح، متقی، تہجد گزار بزرگ تھے۔ ساری عمر تعلیم و تدریس کے مشغلے میں مصروف رہے غرض ایک دریائے فیض تھا کہ رواں تھا اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ بٹالہ اور اس کے نواحی علاقے میں ان سے فیض یاب ہونے والوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی تھی۔ علم و فضل کے علاوہ خط اتنا پاکیزہ تھا کہ کوئی بڑے سے بڑا پیشہ ور خوش نویس بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ شعر بھی کہتے تھے اور طب میں بھی خاصی دستگاہ رکھتے تھے۔ اگرچہ کبھی مطب نہ کیا مگر معمولی مریضوں کا علاج نہایت کامیابی سے کر لیا کرتے تھے اور ان کے کتب خانے میں طب کی کتابیں خاصی تعداد میں موجود تھیں۔ چونکہ دادی کا انتقال ہوچکا تھا اور دادا کے بیٹے اپنے اپنے مقام پر حصول معاش میں مصروف تھے اس لیے دادا نے آخر میں بٹالہ کا قیام زیادہ تر ترک کر دیا تھا اور اکثر میرے والد کے پاس پٹھانکوٹ ہی میں رہتے تھے۔

والد عالم تو نہ تھے لیکن فارسی ادب میں درخور دانی رکھتے تھے اور تحریکات جدیدہ سے ان کی دلچسپی بہت بڑھی ہوئی تھی میں نے تین قسم کے کتب و جرائد ان کے پاس اکثر دیکھے۔ ایک تو ”ککے زئی سوشل ریفارمر“ ماہوار رسالہ ان کے پاس ہمیشہ آتا تھا اور وہ ککے زئیوں کی تنظیمی و تعلیمی کانفرنس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ دوسرے چچا نے جو احمدی ہوچکے تھے اپنے بڑے بھائی کو مرزا صاحب کی کچھ کتابیں بھیج دی تھیں اور اخبار البدر ان کے نام جاری کرا رکھا تھا۔ تیسرے انہیں انجمن حمایت اسلام سے گہرا تعلق تھا۔ انجمن کا رسالہ اس کے سالانہ جلسوں کی روئدادیں، بعض بڑے شعراء کے دیوان، سرسید، شبلی اور آزاد کی کتابیں ہمارے گھر میں اکثر موجود رہتیں۔ مجھے بچپن سے پڑھنے کا ہوکا تھا۔ اس لیے جو چیز سامنے آجاتی اس کو پڑھے بغیر نہ رہتا۔ میرے ہم عمر بچے

میرے مقابلے میں نہایت بے خبر اور قلیل المعلومات تھے۔ والد میرے شوقِ مطالعہ کی قدر کرتے اور نئی نئی کتابیں پڑھنے کو دیا کرتے تھے۔ انھوں نے چار پانچ سال میں فارسی کی چند ابتدائی کتابیں سکول کی تعلیم کے علاوہ پڑھا دیں اور کریما، گلستان، بوستان اور انوار سہیلی تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد ایک زمانہ ایسا آیا کہ انھوں نے سہ نثر ظہوری شروع کرا دی لیکن میں اس غذائے ثقیل کو ہضم نہ کر سکا۔ اور ایک ہی سطر پڑھنے کے بعد بھاگ گیا۔ اس کے بعد تاریخ فرشتہ کا سبق ملنے لگا جس سے مجھے خاصی دلچسپی رہی۔

اس زمانے میں مولوی محبوب عالم لاہور سے پیسہ اخبار، انتخاب، لاجواب، شریف بی بی اور بچوں کا اخبار شائع کیا کرتے تھے اور مولوی انشاء اللہ خاں کا وطن بھی خاصا مشہور تھا۔ یہ اخبارات ہمارے ہاں تو نہ آتے تھے لیکن والد کے بعض دوستوں کے ہاں جا کر ان میں سے بعض اخبار پڑھ لیا کرتا تھا اور امرتسر کے وکیل سے تو مجھے گہرا اور خاص لگاؤ تھا۔

غالباً میری عمر گیارہ بارہ برس کی ہوگی کہ مجھے والد اپنے ہمراہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں لے گئے۔ مجھے یاد ہے کہ اس سالانہ اجلاس میں مولانا حالی اور مرزا ارشد گورگانی بھی تشریف لائے تھے۔ مولانا حالی کی مقدس اور پاکیزہ صورت اب تک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ مولانا حالی نے اپنا کلام سنایا اور لوگوں نے اس چراغِ سحری کی تنک روشنی کو بھی غنیمت سمجھا۔ خصوصاً میں کہ درسی کتابوں میں حالی کی نظمیں پڑھا کرتا تھا حضرت کی زبان سے ان کا کلام سن کر بالکل ہی مست ہو گیا۔

اس کے بعد جب والد صاحب مجھے دوسری دفعہ انجمن کے جلسے میں لائے تو وہ غالباً اکیسواں سالانہ جلسہ تھا اس کے واقعات مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔

۱۹۰۱ء میں کہ میری عمر مشکل چودہ سال ہوگی، شعر کہنا شروع کیا اور پچا کوٹ اور بنوں کے مشاعروں میں غزلیں پڑھیں۔ میں نے مولانا حالی کی خدمت میں تلمذ کے لیے لکھا۔ آپ نے اپنی ضعیفی کا عذر پیش کر کے ڈاکٹر اقبال کا نام تجویز کیا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو ایک خط لکھا جس میں تلمذ کے لیے درخواست کی اور ایک غزل بطور نمونہ بھیجی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے خط لکھا کہ "آپ کے اشعار اچھے ہیں اگر شوق قائم رہا تو آپ بہت اچھے شاعر ہوں گے۔ یاد رکھیے طبیعت انسان کو آسمان سے ملتی ہے اور زبان زمین سے۔ اگر آپ کی طبیعت شاعرانہ ہے تو آپ خود بخود شعر گوئی پر مجبور ہوں گے۔ باقی رہی زبان تو اس میں میں موزوں استاد نہیں ہو سکتا —— منشی حیات بخش رسا رامپوری یا سید محمد احسن مارہروی میں سے کسی سے رجوع کیجیے۔ اس کے علاوہ مفید الشعراء، رسالہ تذکیر و تانیث (حالی) اور ایک آدھ عروض کی کتاب پڑھیے۔"

اس کے بعد میں نے رسا صاحب کو خط لکھا اور جواب باصواب آنے پر ان کو غزلیں بغرض اصلاح بھیجیں۔ زبان اور فن کے متعلق ضروری باتیں تو کتابوں میں بھی مل سکتی ہیں لیکن اپنے کلام پر کسی کامل الفن کی اصلاح سے جو فائدہ پہنچتا ہے وہ میرے نزدیک کتابوں سے نہیں پہنچ سکتا۔ میں نے صرف ڈیڑھ سال رسا صاحب سے اصلاح لی۔ اس کے بعد انھوں نے لکھ دیا کہ "اب اصلاح کی ضرورت نہیں ہے اور آپ جن اصناف میں فکرِ سخن کر رہے ہیں ان میں اصلاح دینا میرا منصب بھی نہیں۔ میں تو صرف غزل کی حد تک جا سکتا تھا۔" ۱۹۰۳ء کے آغاز میں رسا صاحب کا انتقال ہو گیا۔

پچا کوٹ میں سکول مڈل تک تھا اور میں نے ۱۹۰۱ء میں کہ میری عمر ۱۴ سال کی تھی۔ مڈل پاس کر لیا تھا۔ بعد میں انٹرنس

تعلیم کے لیے بٹالہ بھیج دیا گیا۔ مشن سکول (بیرون نیل دروازہ) میں داخل ہوا اور ہوسٹل میں رہنے لگا۔ سالانہ امتحان کا سنٹر امرتسر میں ہی تھا۔ وہاں پہنچ کر امتحان دیا اور سکول کو خیرباد کہہ کر پٹھانکوٹ چلا گیا۔ دو تین مہینے کے بعد نتیجہ نکلا۔ ۲۲ جون ۱۹۱۱ء کو لندن میں شہنشاہ جارج پنجم کی تاجپوشی ہوئی۔ اس دن ہندوستان میں بھی جلسے ہوئے۔ مجھے یاد ہے کہ ۲۲ جون ہی کو میرے پاس ہونے کا تار آیا۔ اسی دن جلسۂ تاجپوشی تھا اور میں نے تحصیلدار کی فرمائش پر اس جلسے میں ایک نظم بھی پڑھی تھی۔

اس کے بعد چچا نے والد سے کہا کہ سالک کو چند ماہ کے لیے میرے پاس وزیرستان بھیج دیجئے۔ وہاں اس کی عارضی ملازمت کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ چنانچہ میں دسمبر میں پٹھانکوٹ سے چل کر دریا خاں، وہاں کشتیوں کے پل پر سے ڈیرہ اسماعیل خاں اور ڈیرہ اسماعیل خاں سے تانگے پر ٹانک پہنچا۔ جہاں پولیٹیکل سرائے میں چچا اور ان کے دفتر کا عملہ مقیم تھا۔ پولیٹیکل عملہ جنوبی وزیرستان کی سخت سردی سے بچنے کے لیے ٹانک میں مقیم تھا اور چند ہفتے کے اندر وانا جانے والا تھا۔ چند ہفتے کے بعد ہم وزیرستان روانہ ہوئے، اور ٹانک، مرتضیٰ، نیلی کچھ، کھجوری کچھ، انتائی ہوتے ہوئے وانا پہنچے۔ یہ سلسلہ کوہ سلیمان تھا۔ خشک اور ننگے پہاڑ، دشوار گزار درے، چھوٹی سڑک۔ رستے میں ایک جگہ بہت اونچے پہاڑ نظر آئے جو دیوار کی طرح سیدھے کھڑے تھے۔ اور درمیان میں ایک چھوٹا سا درہ تھا۔ چچا نے بتایا کہ یہ درہ گومل ہے جہاں سے محمود غزنوی اور دوسرے حملہ آور ہندوستان میں داخل ہوئے۔

اس کے بعد میرے وطن واپس جانے کا وقت قریب آ گیا۔ والد نے چچا کو لکھا کہ سالک کی شادی کی تاریخ ۱۰ مئی ۱۹۱۲ء مقرر ہوئی ہے۔ آپ اس کو ساتھ لے کر تاریخ مقررہ سے پہلے پہنچ جائیے۔ چنانچہ چچا اور میری روانگی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ وانا سے ٹانک، ٹانک سے ڈیرہ اسماعیل خاں، وہاں سے دریا خاں پہنچے۔ اس دفعہ چونکہ موسم گرما تھا اس لیے اٹک پر کشتیوں کا پل باقی نہ رہا تھا۔ سٹیم بوٹ چلتا تھا، جسے جہاز بھی کہتے ہیں۔ اس جہاز میں سوار ہو کر اٹک کو پار کیا اور ۸ مئی ۱۹۱۲ء کو بٹالہ پہنچ گیا۔ ۱۰ مئی کو شادی ہو گئی۔ اس وقت میری عمر ساڑھے ۱۶ سال تھی۔

چند مہینے ہنی مون اور بے کاری و بے فکری میں بسر کیے اور اس کے بعد نوکری کی تلاش ہوئی۔ چنانچہ ایک دن میں نے سامان باندھا اور توکل بہ تقدیر لاہور روانہ ہو گیا۔ چند روز کی کوشش کے بعد ریلوے اکاؤنٹس آفس میں بیس روپے ماہانہ کی ایک کلرکی ملی اور ہم بفضل خدا نوکر ہو گئے۔

گھر کے لاڈ پیار میں رہنے اور ماں کی پکائیاں کھانے کی عادت تھی۔ یہاں کوٹھڑیوں میں رہنا اور بازار سے کھانا کھانا پڑا تو چند ہی ہفتوں میں طبیعت صاف ہو گئی اور صحت برباد۔ لیکن اخبار زمیندار کی تحریروں اور مولوی ظفر علی خاں کی تقریروں نے دل بہلا رکھا تھا۔ آئے دن موچی دروازے کے باہر باغ میں عظیم الشان جلسے ہوتے۔ طرابلس و بلقان کے حوادث نے مسلمانوں کے قلوب میں سب سے پہلے سیاست اسلامی کے شعلے بھڑکا رکھے تھے۔ ہر طرف زندگی اور حرارت و حمیت کے آثار نظر آ رہے تھے۔ لاہور آخر لاہور ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد تشریف لائے۔ ان کی بے مثال تقریر ہوئی۔ آغا حشر آئے ان کی تقریر ہوئی۔ انجمن حمایت اسلام کا جلسہ ہوا۔ علامہ اقبال کی نظمیں شکوہ، جواب شکوہ، شمع و شاعر مختلف جلسوں میں سنیں۔

میں ریلوے کی نوکری صرف سات مہینے کر پایا تھا کہ صحت بالکل خراب ہو گئی اور آشوب چشم کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا۔ ناچار

نوکری چھوڑ کر پٹھانکوٹ چلا گیا اور چند روز کے بعد وہاں کے ایک سکول میں مدرس ہو گیا۔ پچیس روپے مشاہرہ قرار پایا۔

چند ماہ میں جا کر کہیں طبیعت بحال ہوئی اور شاعری عود کر آئی۔ دفعتاً دل میں یہ ولولہ اٹھا کہ ایک ادبی ماہنامہ جاری کیا جائے۔ گورداسپور میں جا کر فانوس خیال کا ڈیکلریشن داخل کیا۔ سید اصغر حسین نادر کو اپنے ارادے سے مطلع کیا۔ پہلے رسالے کا مضمون مرتب کر کے نادر صاحب کو بھیج دیا اور کہا کہ اس کی کتابت کرا کر پانچ سو پرچہ چھپوا کر بھیج دو۔ انہوں نے محنت کر کے پرچہ چھپوایا اور پٹھانکوٹ بھیج دیا۔ یہاں سے شائع کر دیا گیا۔ لیکن میرے والد محترم کی بات صحیح ثابت ہوئی۔ بھلا وہ رسالہ کیا چلے گا جس کا کاتب قادیان میں رہتا ہو، پریس لاہور میں ہو، مقام اشاعت پٹھانکوٹ ہو اور مالک و مدیر اپنی ملازمت کی پابندیوں کی وجہ سے کہیں آنے جانے سے بھی قاصر ہو۔ خانۂ ملاح در جیحون آشتی کشتی در فرنگ چنانچہ دس مہینے کے بعد "فانوس خیال" بجھ گیا اور صرف آہوں کا دھواں چھوڑ گیا۔

فانوس خیال کے زمانے میں مجھے یہ احساس ضرور ہو گیا کہ میں نظم و نثر دونوں میں اپنے ہم عمر معاصرین سے بہت آگے ہوں اور مجھے کلرکی اور مدرسی وغیرہ کا خیال چھوڑ کر لکھنے پڑھنے کا مشغلہ اختیار کرنا چاہیے۔ فانوس خیال کی ناکامی کے بعد میرا دل پٹھانکوٹ میں نہ لگتا تھا۔ چنانچہ مدرسی سے استعفیٰ دے دیا۔ بستر باندھ کر لاہور روانہ ہو گیا اور چیمبرلین روڈ پر احاطہ عبد الستار میں اپنے دوست چودھری دلاور خاں آدم پوری کے پاس پہنچ گیا اور مولوی سید ممتاز علی صاحب کا لٹریری اسسٹنٹ اور پھول اور تہذیب نسواں کا معاون مدیر مقرر ہو گیا۔

مولوی سید ممتاز علی کے دار الاشاعت میں ملازم ہو جانے کے بعد میری ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ مولوی صاحب کے صاحبزادے سید حمید علی اور سید امتیاز علی تاج مجھ سے بھائیوں کا سا برتاؤ کرتے تھے اور مولوی صاحب بھی بے انتہا شفقت فرماتے تھے۔ میں نے بچوں اور عورتوں کے لیے سادگی اور سلاست کے ساتھ مضامین لکھنا سیکھا۔ میری بہترین دوستیوں نے بھی یہیں نشو و نما پائی۔ احمد شاہ بخاری، جگل کشور راب، احمد سلمانی، راجہ غضنفر علی خاں، پیر رفیع الدین اور بعض دوسرے روشن طبع نوجوانوں سے یہیں رابطۂ صحبت استوار ہوا۔ ان سب کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ قریب قریب سبھی مجھے استاد سمجھتے تھے اور زبان اور انداز بیان کے معاملے میں اکثر مجھ سے مشورہ کرتے تھے۔

انہی دنوں شاہ دلگیر اکبر آبادی نے رسالہ نقاد دوبارہ جاری کیا اور ہمارے امتیاز علی تاج کو اس میں مضامین لکھنے کا بے حد شوق ہوا۔ انہوں نے نقاد میں چند تنقیدی مضامین اور چند افسانے لکھے اور مجھ سے بھی فرمائش کی۔ چنانچہ میں نے نقاد کے لیے ایک دو افسانے لکھے اور دو تین غزلیں بھی بھیجیں۔

اس کے بعد تاج صاحب کو خیال آیا کہ دار الاشاعت سے ایک ادبی ماہنامہ جاری کیا جائے۔ چنانچہ کہکشاں کے نام سے ایک رسالہ جاری کر دیا گیا۔ اس میں مولانا راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی، نیاز فتح پوری، عارف ہسوی وغیرہ مضامین لکھنے لگے، امتیاز، بخاری اور میں اس میں اکثر لکھتے تھے اور میرے افسانے، مقالات اور نظمیں میرے نام سے نہیں بلکہ "گمنام" کے نام سے شائع ہوا کرتی تھیں۔

انہی دنوں ہمارے حلقۂ احباب میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ مولانا سید حامد حسین بیدل شاہ جہان پوری پھرتے پھراتے لاہور آ نکلے اور حکیم فقیر محمد چشتی نظامی کی وساطت سے ہمارے حلقے سے متعارف ہو گئے۔ بیدل صاحب فارسی عربی اور اردو کے ماہر تھے۔ مجھ سے امتیاز سے اور بخاری سے بے حد محبت کرتے تھے۔ پہلے مطبع مفید عام میں تصحیح کا کام کرتے تھے پھر کچھ مدت کے لیے مخزن کے

ایڈیٹر مقرر ہو گئے تھے۔

اب میری شاعری اور انشا پردازی کی شہرت روز افزوں ہو رہی تھی کیونکہ مختلف رسالوں میں مقالات اور افسانے شائع ہو رہے تھے۔ کہکشاں نکل رہا تھا۔ بزم ادب کے مشاعروں میں میری غزلیں خاص طور پر داد تحسین حاصل کر رہی تھیں۔ شیخ عبدالقادر، نواب ذوالفقار علی خاں، میاں شاہ دین، حکیم فقیر محمد چشتی نظامی اور دوسرے معززین شہر کے ہاں اکثر جانا ہوتا تھا اور ڈاکٹر اقبال سے تو روز بروز تعلقات بڑھ رہے تھے۔ انہی کے ہاں مولانا غلام قادر گرامی سے تعارف ہوا جو اس دور آخر میں فارسی کے عدیم المثال شاعر تھے۔ لاہور کے اکابر صحافت یعنی مولوی محبوب عالم (پیسہ اخبار)، مولوی انشاء اللہ خاں (وطن)، اور منشی محمد دین فوق کی خدمت میں مجھے خاص نیاز حاصل تھا۔ ایک دو دفعہ مولوی محرم علی چشتی سے بھی ملاقات ہوئی۔ لیکن ان کی ملاقات کا عموماً اثر کچھ ایسا نہ محسوس ہوا۔ انہی دنوں آغا حشر کاشمیری لاہور میں آ گئے اور حکیم فقیر محمد چشتی کی وساطت سے مجھے حشر کی دوستی کا فخر حاصل ہوا۔

مجھے مقالہ نگاری کے علاوہ انگریزی سے اردو ترجمہ کرنے کا شوق بھی بے حد تھا۔ انہی دنوں شیخ عبدالعزیز نے (جو کبھی ابزرور کے ایڈیٹر تھے اور اب جنگی پبلسٹی کے سلسلے میں سرکاری اخبار "حق" شائع کرتے تھے اور پریس برانچ کے انچارج بھی تھے) مانٹیگو چیمسفورڈ ریفارم رپورٹ اور رولٹ کمیشن رپورٹ اٹھا کر مجھے بھیج دیں اور کہا کہ بڑے بڑے بی اے، ایم اے جمع ہوئے تھے مگر وہ انگریزی جانتے ہیں نہ اردو۔ صرف آپ کا ترجمہ مجھے پسند آیا۔ اس لیے سارا کام آپ ہی کیجیے۔ میری تنخواہ کم تھی اور گزران مشکل سے ہوتی تھی۔ میں نے لگ لپٹ کر یہ ترجمہ ایک مہینے میں ختم کر دیا اور ڈھائی سو روپیہ بطور معاوضہ وصول کیا جو میری آٹھ مہینے کی تنخواہ سے بھی زیادہ تھا۔

ایک دن ٹیگور کا ایک چھوٹا سا ناٹک پڑھا "چترا" اور اس کے ساتھ خود رسالہ تمدن دہلی میں اس کے ترجمے کی ایک قسط بھی نظر پڑی۔ یہ ترجمہ مسٹر آصف علی نے کیا تھا۔ نہایت عربی آمیز، ٹھس اور بے جان۔ مجھے غصہ جو آیا تو دو دن کے اندر اس ناٹک کا نہایت عمدہ، سلیس، سادہ، شیریں اور رواں ترجمہ کر ڈالا۔ جو دوستوں نے بے حد پسند کیا۔ اور خواجہ حسن نظامی تو اس پر ایسے لٹو ہوئے کہ خود خواہش ظاہر کر کے اس پر مزے کا ایک دیباچہ لکھ دیا۔ بعد میں چترا دار الاشاعت سے چھپ کر شائع ہو گیا۔ اس ترجمے کو گاندھی جی اور ٹیگور نے بھی پسند کیا۔

۱۹۱۹ء سے عجیب مصیبتوں کا زمانہ شروع ہوا۔ جنگ عظیم تو ختم ہو گئی لیکن انفلوئنزا کی وبا اس زور شور سے پھیلی کہ ساری دنیا الامان الامان پکار اٹھی۔ حکومت ہند نے ایک بل وائسرائے کی امپیریل کونسل میں پیش کیا جس کی بنیاد رولٹ کمیشن رپورٹ پر رکھی گئی تھی۔ اسی کو رولٹ بل کہتے تھے۔ اس میں پولیس کو انتہائی اختیارات دے دیے گئے تھے۔ جس کی وجہ سے کسی کی آزادی محفوظ نہ رہی تھی۔ ہندوستانی اخباروں اور سیاسی جماعتوں نے اس کے خلاف بہتیرا شور مچایا لیکن حکومت نے سرکاری نامزد ممبروں کی مدد سے اس بل کو پاس کر کے رولٹ ایکٹ بنا دیا۔ تمام ملک میں شدید ناراضگی کی لہر دوڑ گئی۔ مہاتما گاندھی نے دو تین پمفلٹ شائع کیے اور کہا کہ ملک بھر میں ناراضگی کے اظہار کے لیے ہڑتال کی جائے۔ اس ہڑتال کا پہلا دن ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء مقرر کیا گیا۔ دوسرا دن ۶ اپریل تھا۔ پہلے دن تمام ہندوستان کے گوشے گوشے میں مکمل ہڑتال ہوئی۔ ایسی ہڑتال جس کی مثال اس سے قبل ملکی تاریخ میں موجود نہ تھی۔

اپریل کے آغاز کا ذکر ہے۔ میں دفتر تہذیب نسواں میں بیٹھا تھا کہ کسی نے بتایا گاندھی جی گرفتار ہو گئے۔ شہر بھر میں شور مچ گیا

ستیہ گرہ یعنی گاندھی جی کی کمیٹی کے رضاکار سڑکوں کوچوں میں پھرنے لگے اور ہڑتال شروع ہو گئی۔ امرتسر میں جہاں ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال نے عوام کے جذبات کو سخت برانگیختہ کر رکھا تھا حکام کی بے تدبیری کے باعث عوام کے جذبات بھڑک اٹھے۔ سر مائیکل اوڈوائر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ لاہور اور امرتسر دونوں شہروں میں مارشل لا نافذ کر دیا۔ جلیانوالہ باغ امرتسر میں چند ہزار آدمی ایک جلسے کے لیے جمع ہوئے تھے وہاں جنرل ڈائر نے ایک فوجی دستے سے بے پناہ گولیاں چلوائیں جن سے کوئی ایک ہزار مسلمان اور سکھ ہلاک ہو گئے۔ ہزاروں زخمی ہوئے اور مارشل کی وجہ سے رات بھر کوئی مقتولین کی نعشیں اٹھا سکا نہ زخمیوں کی خبرگیری اور تیمارداری کر سکا۔ دونوں شہروں میں معززین کی گرفتاریاں، ٹکٹکیوں پر تازیانہ زنی اور طرح طرح کے مظالم شروع ہوئے۔ چھ ہفتے تک لاہور اور امرتسر میں انتہائی دہشت طاری رہی۔ ہندوستانی لیڈروں نے بہت شور مچایا سر شنکرن نائر نے وائسرائے کی کونسل سے استعفا دے دیا۔ ڈاکٹر ٹیگور نے سر کا خطاب واپس کر دیا۔ پنڈت مالوی نے قانونی کونسل میں پنجاب پر وہ تقریر کی جو ہمیشہ یادگار رہے گی۔ گاندھی جی بھی اپنے طریقے پر احتجاج اور پروپیگنڈا میں مصروف رہے۔ آخر بڑی مشکل سے ہزاروں مصیبتیں اٹھانے کے بعد مارشل لا موقوف کرایا گیا۔ بہت سے معززین کو ”سرسری عدالت“ سے عمر قید کی سزا دے دی گئی تھی۔ ان میں سے بعض سزائیں کم کی گئیں بعض رہا کر دیئے گئے۔

مارشل لا ختم ہو جانے کے بعد گاندھی جی کو بھی پنجاب آنے کی اجازت مل گئی۔ چنانچہ ایک دن وہ آن پہنچے۔ مزنگ میں تانگوں کے اڈے کے پاس پنڈت رام بھجدت وکیل کی کوٹھی تھی۔ یہ بڑے کانگرسی تھے اور ٹیگور کی بھانجی سرلا دیوی ان کی بیوی تھی۔ مہاتما جی بھی اسی کوٹھی میں ٹھہرے۔ لوگوں پر اب تک خوف طاری تھا اس لیے وہ کوئی بڑا مظاہرہ نہ کر سکے۔ لیکن گاندھی جی سے ملنے والوں کا ہر وقت تانتا بندھا رہتا تھا۔ میں اور راجہ غضنفر علی خاں مہاتما گاندھی جی سے مل کر اتنے خوش ہوئے کہ ہمارا قدم زمین پر نہ ٹکتا تھا۔

اپریل ۱۹۲۰ء میں جب میں زمیندار کا ایڈیٹر مقرر ہوا، اس وقت مولانا ظفر علی خاں کے علاوہ دو اور بزرگ مجلس ادارت میں کام کرتے تھے۔ ایک مولانا کے بھائی چودھری غلام حیدر خاں دوسرے سعید بیگ۔ جب مولانا ظفر علی خاں نے چند روز میرا کام دیکھا اور انہیں احساس ہو گیا کہ میں بیٹے کی مدد سے باسانی ادارت کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہوں تو انہوں نے اخبار میرے سپرد کیا اور مطمئن ہو کر اپنے تقریری دورے پر لاہور سے روانہ ہو گئے۔ مولانا دو دو تین تین مہینے باہر رہ کر بیچ میں کبھی دو چار دن کے لیے آتے۔ میرے مضامین بھی بڑے شوق سے پڑھتے اور تحسین سے حوصلہ افزائی فرماتے۔ دس بیس روپے انعام کے طور پر مٹھائی کے لیے دیتے اور پھر لاہور سے روانہ ہو جاتے۔

غالباً مئی ۱۹۲۰ء کا ذکر ہے کہ ایبٹ آباد میں ایک فوجی گورے چلکوٹ نے ایک مہاجر حبیب اللہ خاں کو بندوق سے شہید کر دیا۔ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ اگست میں کلکتہ میں کانگرس کا خاص اجلاس ہوا جس میں پنجاب کے دوسرے لوگوں کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں، آغا محمد صفدر اور ڈاکٹر کچلو بھی گئے ہوئے تھے۔ ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کا ذکر ہے مولانا ظفر علی خاں کا تار آیا کہ میں فلاں گاڑی سے دوپہر کو لاہور اسٹیشن سے گزر رہا ہوں مجھ سے ملنے کے لیے آؤ۔ اختر علی خاں اور میں ریلوے اسٹیشن پر گئے۔ ٹرین آئی۔ مولانا، آغا صاحب اور ڈاکٹر صاحب اترے۔ بغلگیر ہوئے۔ اسی رات عزیزم منصور علی خاں پیدا ہوئے تھے۔ میں نے مولانا کو یہ خبر سنائی اور پوتے کی ولادت پر مبارکباد دی۔ مولانا نے بتایا کہ ہم گاندھی جی کے حکم سے ایبٹ آباد جا رہے ہیں جہاں پر چلکوٹ کا کورٹ مارشل ہو رہا ہے۔ ہم اس کورٹ مارشل کا مشاہدہ کریں گے کہ آیا انصاف کا منشا پورا ہو رہا ہے یا نہیں۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک طرف مسٹر براؤن انسپکٹر پولیس کھڑے ہیں اشارے سے مجھے بلایا اور کہا۔ مجھے بے حد افسوس

سے کہا میں قانون تحفظ ہند کے تحت مولانا ظفر علی خاں کو گرفتار کرنے آیا ہوں، آپ مولوی صاحب کو اطلاع دے دیجئے۔ حکم حاکم مرگ مفاجات۔ براؤن نے مولوی صاحب کو ساتھ لیا۔ ڈیوڑھی میں پہنچے تو ایک موٹر کار کھڑی تھی۔ براؤن اور مولوی صاحب اس میں بیٹھ کر چل دیئے۔ قصہ کوتاہ یہ کہ مولانا ظفر علی خاں کو پانچ سال قید با مشقت کی سزا دی گئی اور منٹگمری جیل ان کا مسکن مقرر کیا گیا جہاں میں اور اختر علی بار بار جا کر ان سے ملاقاتیں کرتے رہے۔

مولانا ظفر علی خاں کے تین چار ماہ بعد اختر علی خاں بھی گرفتار کر لیے گئے اور تین سال کے لیے مرتبۂ اسیری پر فائز ہو کر لاہور سنٹرل جیل میں بھیج دیئے گئے جہاں پانی پت کے صوفی اقبال مرحوم اور مولانا لقاء اللہ عثمانی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری پہلے سے موجود تھے۔

۹ر نومبر ۱۹۲۱ء کا ذکر ہے میں دفتر زمیندار میں بیٹھا ہوا تھا کہ مولانا حامد حسین بیدل شاہ جہانپوری آ گئے اور کہنے لگے اب تو شام ہو گئی گھر نہیں چلتے؟ میں نے کہا آپ دس منٹ بیٹھیے میں ابھی فارغ ہوا جاتا ہوں۔ چنانچہ دس منٹ کے بعد میں بیدل صاحب کے ساتھ گھر چل دیا۔ گھر پہنچا تو مردانہ میں بیدل صاحب کو بٹھا کر خود اوپر گیا اور چائے کے لیے کہہ آیا۔ ابھی چائے تیار نہ ہوئی تھی کہ نیچے سے نذیر احمد سیماب (اسسٹنٹ ایڈیٹر زمیندار) نے مجھے پکارا۔ میں نیچے اترا تو سیماب صاحب نے بتایا کہ مرزا غلام حسین انسپکٹر پولیس چند سپاہیوں کو لے کر مکان پر آئے تھے اور انہوں نے مجھے گرفتار کر لیا ہے اور آپ کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔ میں نے اوپر جا کر اچکن پہنی، گھر والوں کو اپنی گرفتاری کی خبر سنائی اور انہیں ہائے وائے کرتا چھوڑ کر نیچے اتر گیا۔ مرزا غلام حسین نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ مجھے تانگے میں بٹھایا اور تھانہ لے کر چل دیئے۔ بیدل صاحب پریشان ہو کر شجاعت اللہ خاں، احمد شاہ بخاری، امتیاز علی تاج اور دوسرے دوستوں کو خبر دینے کے لیے بھاگے۔ ابھی میں تھانے پہنچا ہی تھا کہ گرفتاری کی خبر سارے شہر میں اڑ گئی۔

مقدمے کی سماعت ہوئی۔ استغاثہ پیش ہوا، استغاثہ کے گواہ پیش ہوئے۔ الزام یہ تھا کہ ملزم نے زمیندار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ایسا مضمون لکھا جس سے ملک معظم کی رعایا کے دو طبقوں (ہندوستانیوں اور انگریزوں) کے درمیان نفرت و حقارت پیدا ہوتی ہے۔ میں نے اپنا تحریری بیان لکھ کر عدالت میں داخل کر دیا۔ دو تین دن بعد ایک دن میں دفعتہً طلب کیا گیا اور مجھے موٹر کار میں بٹھا کر عدالت میں لے گئے جہاں [illegible] صاحب نے مجھے ایک سال قید با مشقت کی سزا کا مژدہ سنایا۔ میں ان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد موٹر کار میں بیٹھا اور سنٹرل جیل پہنچ گیا۔

چند ہی روز گزرے تھے کہ معلوم ہوا حکومت ہم میں سے چند آدمیوں کو میانوالی جیل بھجوانے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ چنانچہ ایک دن رات کے وقت گیارہ آدمیوں کا قافلہ تیار کیا گیا اور ان کے بستر، ٹرنک اور دوسرا سامان باندھ کر رکھ دیا گیا۔ اس قافلے میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولوی لقاء اللہ عثمانی، اقبال احمد، اختر علی خاں، راجہ غلام قادر خاں، میں اور نذیر احمد سیماب، سردار سردول سنگھ کویشر، سردار منگل سنگھ، پنڈت نیکی رام شرما اور ایک ہریانے کے جاٹ ہندو لیڈر یہ گیارہ نفوس تھے۔ چند ہی ہفتوں میں میانوالی جیل سیاسی قیدیوں سے معمور ہو گیا اور رضاکاروں کے داخلوں سے قومی نعروں کی دل آویز صدائیں بلند ہونے لگیں۔

پڑھے لکھے قیدیوں نے مطالعہ وغیرہ کا شغل اختیار کیا۔ چنانچہ ہم لوگوں کا پروگرام یہ ہوتا تھا۔ صبح اٹھ کر ضروریات سے فارغ ہوئے، نماز پڑھی، مشقت ادا کی اور چائے پی۔ اس کے بعد میں اور عبدالعزیز انصاری مولانا احمد سعید سے ادب عربی، صرف و نحو عربی اور منطق

کا سبق لینے لگے۔ اختر علی خاں اور راجہ غلام قادر خاں سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے قرآن صحیح کرنے لگے۔ مولوی لقاء اللہ عثمانی پانی پتی سازشوں اور جوڑ توڑ میں مصروف ہو گئے یعنی فلاں فلاں مطلوبہ چیز کیونکر چوری چوری باہر سے منگائی جائے اور فلاں پیغام فلاں شخص تک کس تدبیر سے پہنچایا جائے۔ مولوی لقاء اللہ نمازوں میں ہم سب کے پیش امام بھی تھے اور یہ چوری چھپے کے کام بھی ان ہی کے سپرد تھے چنانچہ میں نے ان کا لقب امام السارقین مقرر کیا تھا۔

سید حبیب (مدیر سیاست) بعض وجوہ سے ہمارے ساتھ نہ تھے کہ اس لیے دوسرے احاطے میں چلے گئے تھے۔ ایک زمانے میں وہ مولانا داؤد غزنوی کو انگریزی پڑھایا کرتے تھے اور مولانا داؤد سید حبیب کو عربی پڑھاتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کی انگریزی بھی آئی اور عربی بھی۔

خیر، میں دن بھر اپنا کام وغیرہ کرتا رہتا تھا۔ ہم تھوڑی سی "مشقت" بھی کرتے تھے یعنی چرخے پر پانچ تار کا سوت (صرف بقدر دو چھٹانک) دری بافی کے لیے بانٹ دیا کرتے تھے۔ یہ کوئی بیس منٹ کا کام تھا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد تعلیم و تعلم کا سلسلہ ایک بجے تک جاری رہتا۔ اس وقت مولانا عبد اللہ چوڑی والے للکار کر کہتے "ارے بھئی کھانا تیار ہے"۔ سب اکٹھے بیٹھ کر لطف کے ساتھ کھانا کھاتے، اور پھر قیلولہ فرماتے۔ نماز ظہر اور نماز عصر کے بعد چائے کا دور ضرور ہوتا۔ مغرب کے بعد کھانا کھایا جاتا اور عشاء کے بعد بھی دیر تک بحث مباحثے جاری رہتے۔ کبھی کبھی قوالی بھی ہوتی تھی جس میں اختر علی خاں گھڑا بجاتے۔ صوفی اقبال تالی بجا کر تان دیتے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری غزل گاتے، مولانا احمد سعید شیخ مجلس بن کر بیٹھتے اور مولانا داؤد غزنوی اور عبد العزیز انصاری حال کھیلتے۔ غرض ہم لوگوں کے مشاغل صوم و صلوٰۃ تلاوت قرآن، تعلیم و تعلم اور تفریح و تفنن کے تمام پہلوؤں سے مکمل تھے۔

رمضان کا مہینہ آ گیا۔ اگرچہ میانوالی میں قیامت کی گرمی پڑ رہی تھی اور ہم لوگ زندانی تھے لیکن ہم نے جوش و خروش سے ماہ صیام کا خیر مقدم کیا۔ تلاوت قرآن کا خوب دور دورہ رہا۔ نمازیں اور نوافل خوب پڑھے گئے۔ عید آئی۔ طرح طرح کے کھانے پکائے گئے ہم نے بہت سے عام اخلاقی قیدیوں کو چاول اور سویاں کھلائیں اور وہ غیر مترقبہ نعمتوں کو کھا کر بہت مسرور و ممنون ہوئے۔

ایک دفعہ سر جان مینارڈ ہوم ممبر حکومت پنجاب میانوالی جیل کے معائنے کے لیے آئے۔ سر جان ہر ممتاز قیدی سے ایک دو باتیں کرتے جب میرے پاس آئے اور میرا تعارف کرایا گیا تو انہوں نے سوال کیا "سالک صاحب، زمیندار کا اصلی ایڈیٹر کون ہے؟" میں نے کہا "کم از کم میں تو اصلی ہوں۔" ہنس کر کہنے لگے آپ کو تو ہم جانتے ہیں، آپ جرنلسٹ ہیں۔ لیکن زمیندار کا آج کل جس ایڈیٹر کا نام لکھا جاتا ہے وہ تو پان فروش ہے۔ میں نے کہا جب آپ اصلی ایڈیٹروں کو نہایت تیزی سے گرفتار کرتے چلے جائیں گے تو لازماً پان فروش کو آگے کرنا پڑے گا تاکہ اصل لکھنے والے محفوظ رہیں۔

رہا ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ تحریک ختم ہو چکی ہے۔ جب واپس لاہور آیا تو سب سے پہلے دفتر زمیندار میں گیا جہاں ان صاحب سے ملاقات ہوئی جن کو غلام رسول مہر کہتے ہیں۔ اور جن کی رفاقت و محبت نومبر ۱۹۲۲ء سے لے کر الی الآن شامل حال ہے اور جس کو میں ان نعمتوں میں گنتا ہوں جن کی وجہ سے دکھ بھری زندگی قابل برداشت رہی۔ اب میں اور مہر صاحب دونوں زمیندار کے ایڈیٹر تھے۔

میری رہائی کے بعد سید احمد شاہ بخاری نے دہلی مسلم ہوٹل میں دعوت طعام دی جس میں سب احباب جمع ہوئے۔ میں کمرے کے دروازے میں کھڑا سب سے حسب قدر تعلق مصافحہ و معانقہ کر رہا تھا کہ اتنے میں حکیم احمد شجاع اور مولانا [illegible] تشریف لائے

وہ قد و قامت میں صرف ڈھائی فٹ کے بونے واقع ہوئے تھے۔ لیکن عام بونوں کے برعکس ان کے جسم کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں نہایت دل آویز تناسب تھا اور وہ بادی النظر میں بونے نہیں بلکہ نو دس سال کے لڑکے معلوم ہوتے تھے حالانکہ ان کی عمر چالیس سال سے کم نہ تھی) مولانا سہا آگے آگے تھے۔ میں سمجھا حکیم صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ میں نے مولانا کے شانے کو تھپتھپایا اور چمکار کر کہا: "بیٹے! وہاں جا کر انگیٹھی کے پاس بیٹھ جاؤ۔" مولانا نے اپنا چھوٹا سا دلفریب چہرہ اٹھا کر مجھ پر ایک کڑوی نگاہ ڈالی۔ اور حکیم صاحب نے فوراً فرمایا۔ "سالک صاحب! ان سے ملیے۔ مولانا سہا حمید آبادی نہایت بلند پایہ شاعر اور ادیب ہیں اور کچھ مدت سے انہوں نے لاہور کو اور لاہور میں میرے غریب خانہ کو مشرف کر رکھا ہے۔" میں شرم و ندامت سے کٹ گیا۔ مولانا سے معافی مانگ کے معذرت چاہی لیکن مولانا خاموش رہے۔ اور میں بدستور نادم رہا۔ جب کھانے کے بعد مولانا سہا نے اپنی ایک غزل ارشاد فرمائی اس وقت معلوم ہوا کہ آپ ہم لوگوں کی سطح سے کتنے اونچے ہیں۔

کچھ مدت کے بعد سید احمد شاہ بخاری مزید تحصیل علم کے لیے انگلستان جا کر کیمبرج کے عمانوئیل کالج میں داخل ہو گئے۔ سید حامد حسین بیدل بھی لاہور چھوڑ گئے۔ بنگال اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں نوکر ہو گئے اور رہ گئے سالک و تاج۔ سو محفل بہت دبلی ہو گئی۔ لیکن بیدل صاحب کے جانے سے پہلے ہم نے لاہور سے تیرہ میل دور کالا شاہ کاکو کے قریب نادر ڈیک میں مچھلی کے شکار کا پروگرام بنایا اور تین چار دفعہ اس پروگرام پر عمل بھی کیا۔ اتوار کے دن علی الصباح ہم سب شکاری کنڈیوں میں کیچوے لگا، ڈوریاں باندھ چھڑیاں تھام ڈیک کے کنارے بیٹھ جاتے اور وہ لغویات اور خرافات بکتے کہ شیطان بھی پناہ مانگے۔ مچھلی پکڑنے کا تو محض بہانہ تھا مقصود تو فقط یہ تھا کہ ہفتے بھر کی متانت و سنجیدگی سے دماغوں میں جو پھپھوندی سی لگ چکی تھی وہ اتر جائے۔ اور آئندہ ہفتے کی زندگی کو نئی حرارت سے شروع کیا جائے۔

۱۹۲۵ء کا ذکر ہے کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر مسلط ہونے کے بعد وہابیوں نے بہت سے مزارات کے قبے توڑ دیے، اور جنت البقیع اور جنت معلی کی بعض اونچی قبروں کو صاف کر دیا۔ عامۃ المسلمین کے جذبات برانگیختہ ہو گئے اور ہندوستان بھر میں بدعتی مولویوں نے ایک شور محشر برپا کر دیا۔ اتنے میں کسی نے خبر اڑا دی کہ وہابیوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر پر گولہ باری کی ہے پھر کیا تھا سارا ملک ایک سرے سے دوسرے سرے تک جذبات کا شعلہ زار بن گیا۔ آخر مجلس خلافت مرکزیہ نے ایک وفد جو مولانا محمد عرفان، مولانا ظفر علی خاں، مولانا سید سلیمان ندوی اور شعیب قریشی پر مشتمل تھا مرتب کر کے حجاز بھیجا۔ یار ہمدم مہر صاحب بھی اس کے ساتھ گئے۔ اور زمیندار کا سارا کام مجھ اکیلے کے کندھوں پر آن پڑا۔ ان حضرات نے مدینہ منورہ جا کر نہایت احتیاط سے مسجد نبوی اور گنبد خضرا کا معائنہ کیا اور اس نامبارک خبر کی تردید کی جب کہیں جا کر جذبات کا طوفان تھما۔

جب وفد واپس آیا اور مولوی ظفر علی خاں اور مہر لاہور پہنچے تو میرے اعصاب نے بالکل ہی جواب دے دیا۔ میں نے مولوی ظفر علی خاں سے چھ ماہ کی رخصت طلب کی۔ جس پر وہ بہت پریشان ہوئے۔ آخر ناچار مولوی صاحب کو میری رخصت منظور کرنی پڑی۔ میں زمیندار سے جان چھڑا کر گھر جا بیٹھا اور محنت و تشویش کے بعد اس سکون و آرام سے خوب متمتع ہوا۔ کوئی ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ سید امتیاز علی تاج مصر ہو گئے کہ دارالاشاعت کو سکولوں کی لائبریریوں کے لیے کتابوں کی ضرورت ہے آپ آجکل فارغ ہیں چھ سات کتابیں لکھ دیجیے۔ آخر میں نے قبول کیا اور کاریگری، ایجادات، دانایان فرنگ، سیاحوں کی کہانیاں، قدیم تہذیبیں، آئین حکومت ہند وغیرہ کتابیں لکھ ڈالیں۔

میں چپ چاپ گھر میں بیٹھا تھا۔ مہر صاحب بھی دو مہینے کے لیے گھر پر چلے گئے۔ مولوی ظفر علی خاں نے مجھے رقعہ لکھا کہ آپ رخصت کا سلسلہ ختم کیجیے۔ مہر صاحب چلے گئے ہیں۔ آپ کو ساڑھے تین سو روپے مشاہرہ دیا جائے گا اور مرتضیٰ احمد خاں میکش آپ کے مددگار کی حیثیت سے کام کریں گے۔ میں نے صرف یہ جواب لکھ دیا کہ میری رخصت کے چھ مہینے پورے ہو جانے دیجیے اس کے بعد میں آپ کی تجویز کے بارے میں رائے قائم کروں گا۔ اس واقعہ کے پندرہ بیس روز بعد مجھے اور مہر صاحب کو ڈاکٹر اقبال نے بطور خاص بلایا۔ ہم وہاں پہنچے تو مولوی ظفر علی خاں اور مولانا عبد القادر قصوری بھی موجود تھے۔ مولانا نے کہا کہ مولانا محمد علی حجاز سے واپس کراچی پہنچ گئے ہیں اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابن سعود کے خلاف ہنگامہ آرائی کریں گے اور مولانا ظفر علی خاں کو مختلف مقامات پر جلسے منعقد کرنے کے لیے جانا پڑے گا۔ آپ لوگ اب اپنی رخصت کو ختم کیجیے اور زمیندار میں بدستور کام شروع کر دیجیے۔ ہم نے کچھ عذر معذرت کی لیکن ڈاکٹر اقبال نے مولانا عبد القادر قصوری کی تائید کی۔ اس پر ہم نے فیصلہ کیا کہ از سر نو کام شروع کر دیں گے۔ چنانچہ ہم نے سلطان ابن سعود کی حمایت اور مولانا محمد علی کی مخالفانہ مہم کی مزاحمت بڑے زور شور سے کی اور اس میں مولانا محمد علی سے قلمی جنگ و پیکار کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا۔ لیکن ہم نے ادب و لحاظ کو ملحوظ رکھ کر حد سے تجاوز نہ کیا اور مولانا محمد علی نے بھی حملوں کو سخن گسترانہ حد سے آگے نہ بڑھنے دیا۔

زمیندار کی مالی حالت روز بروز خراب ہو رہی تھی۔ ۱۹۲۷ء کے آغاز میں یہ کیفیت تھی کہ مجھے اور مہر صاحب کو دو تین قسطوں میں مہینے کے اندر تنخواہ مل جاتی تھی لیکن باقی عملہ تنخواہوں کے معاملے میں بہت پریشان تھا۔ مارچ کے مہینے میں ماہ رمضان آ گیا۔ ارکان عملہ نے تنخواہیں طلب کیں اور بالآخر تنگ آ کر ہڑتال کا فیصلہ کر لیا۔ ہم نے اس خیال سے ان کا ساتھ دیا کہ شاید ہماری اہمیت اور مسلسل خدمت ان کی تسلیم ہو جائے۔ مالک زمیندار کو نوٹس دیا گیا کہ اگر ۳۰ مارچ کی شام تک عملے کو دو ماہ کی تنخواہیں نہ ملیں تو ۳۱ مارچ سے کام ترک کر دیا جائے گا۔ لیکن چونکہ تاریخ مقررہ تک تنخواہوں کا بندوبست نہ کیا گیا، اس لیے ۳۱ مارچ کو ہڑتال ہو گئی۔ جوانی کے دن تھے، دماغ کا جوش تھا، کچھ کر گزرنے کا حوصلہ تھا۔ چنانچہ دو چار دن کے اندر ہی ڈیکلریشن دیا گیا۔ دفتر کرایہ پر حاصل کیا گیا۔ فرنیچر اور سٹیشنری خریدی گئی۔ مضامین مرتب کیے گئے۔ پریس اور کاغذ کا بندوبست کیا گیا۔ اشتہارات فراہم کیے گئے اور یہ سب کچھ ایسی سرعت کے ساتھ عمل میں آیا کہ ۳۱ مارچ کو زمیندار سے نکلے تھے اور ۲ اپریل کو ظاہری اور باطنی محاسن سے آراستہ ایک عظیم الشان روزنامہ "انقلاب" جاری ہو گیا۔

ابھی انقلاب کو جاری ہوئے صرف دس ماہ گزرے تھے کہ دفعتہً انقلاب و زمیندار میں لڑائی شروع ہو گئی اور مولانا ظفر علی خاں نے حسب عادت نظموں پر نظمیں جھاڑنی شروع کر دیں۔ ادھر بھی چوڑیاں پہنے ہوئے نہ تھے۔ چنانچہ اس زمانے میں خوب افکار و حوادث لکھے گئے اور بڑی شاندار نظمیں دونوں طرف سے سرزد ہوئیں۔ لیکن دو ماہ بعد ہمارا محاصرہ اس قدر سخت ہو گیا کہ مولانا نے از راہ کرم ہمیں معاف کر دیا اور پھر نیاز مندی اور بزرگی کے وہی تعلقات قائم ہو گئے جو اب تک قائم ہیں۔

مہر صاحب ابھی دوسری گول میز کانفرنس کے لیے ڈاکٹر اقبال کے ہمراہ روانہ نہیں ہوئے تھے کہ ہم دونوں نے لاہور میں مکان بنانے کا ارادہ کیا۔ ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ صاحب نے ہمیں ترغیب دی کہ شہر میں چھوٹا سا مکان بنانے کے بجائے مسلم ٹاؤن میں کوٹھی بنا لیجیے۔ شاہ صاحب سے میں نے اور مہر صاحب نے پانچ پانچ کنال زمین خرید لی۔ ۱۹۳۲ء کے اواخر میں دو کوٹھیاں بن کر تیار ہو گئیں اور ہم میکلوڈ اور فلیمنگ روڈ سے اٹھ کر ان میں منتقل ہو گئے۔

اپریل [illegible] میں میری بڑی لڑکی وحیدہ بیگم کی شادی شیخ عبدالوکیل خلف شیخ محمد عبداللہ، سوداگر چینی و نیشنل آرٹ امرتسر کے ساتھ ہوئی۔

۵ر جولائی [illegible] کو اتوار کا دن تھا اور میں بال بچوں میں بیٹھا ہوا چھٹی منا رہا تھا کہ دفعتاً پٹھانکوٹ سے ایک تار بجلی کی طرح آن گرا۔ برادر عزیز عبدالرؤف ساحر مرحوم نے اطلاع دی تھی کہ آج صبح والد محترم دفعتاً حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے ہیں۔

دہلی ریڈیو سید احمد شاہ بخاری اور سید ذوالفقار علی بخاری کی شبانہ روز محنت کی وجہ سے بے حد کامیاب اور ہر دلعزیز ہو رہا تھا۔ ایک دن اس ریڈیو کی طرف سے مجھے دو تقریروں کی دعوت دی گئی اور لکھا گیا کہ اس کے لیے دہلی آنا پڑے گا۔ چنانچہ میں دہلی گیا اور احمد شاہ بخاری کے دولت کدہ پر ٹھہرا۔ دوسرے دن صبح ناشتے سے فارغ ہوا تو بخاری صاحب نے کہا کہ کسی دوست سے ملاقات کو جانا ہو تو موٹر کار حاضر ہے۔ پہلے جانے میں نظام الدین جا کر خواجہ حسن نظامی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بڑے تپاک سے ملے۔ وہاں اس وقت کرنل مقبول حسین قریشی (بہاولپور) بھی موجود تھے۔ تھوڑی دیر بعد خواجہ صاحب مجھے ساتھ لے کر درگاہ دکھانے کے لیے چلے۔ خواجہ صاحب کے گھر سے ایک زینہ پر چڑھ کر جب دوسری طرف اترے تو ایک معمولی سا مکان تھا۔ خواجہ صاحب نے فرمایا "یہ ایمان خانہ ہے۔" میں نے کہا اس پر کیا موقوف ہے۔ اس قماش کے تو سبھی مکان "ایمان خانے" ہیں اور ہم جہاں سے اٹھ کر آئے ہیں کیا وہ "بے ایمان خانہ" تھا۔ بہت ہنسے کہنے لگے۔ آپ "افکار" لکھتے ہی نہیں بولتے بھی ہیں۔

اس کے بعد کمرے میں چند طاق دکھائے جن میں سے کسی پر مقام ابراہیم اور کسی پر مقام آدم لکھا ہوا تھا۔ ایک طاق خالی تھا میں نے کہا یہ کیا ہے؟ کہنے لگے۔ یہ طاق میں نے اپنے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔ میں نے کہا تو پھر اس پر "مقام المنحوس" لکھ دیجئے۔ بے اختیار ہنس پڑے۔ پھر ہم درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ میں داخل ہوئے۔ یہ رسم بھی ختم ہوئی۔ فاتحہ پڑھی۔ وہاں سے نکل کر مرزا غالب کی قبر پر حاضر ہوئے جو کعبۂ اہل سخن اور قبلۂ ارباب ذوق ہے۔ اس پر کافی دیر توقف کیا، فاتحہ پڑھ کر واپس آ گئے۔

شام کو کیا دیکھتا ہوں کہ بخاری صاحب کی کوٹھی کے سبزہ زار پر بڑے بڑے تخت اور ان پر اجلی چاندنیاں بچھائی جا رہی ہیں۔ معلوم ہوا کہ میرے اعزاز میں دعوت طعام دی گئی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دہلی کے ادباء، شعراء اور اخبار نویسوں کا خاصا مجمع ہو گیا۔ مسٹر آصف علی، مرزا محمد سعید، خواجہ حسن نظامی، مولانا مظہر الدین، ملا واحدی، جوش ملیح آبادی، سردار دیوان سنگھ مفتون، شاہد احمد، رازق الخیری، جعفری (مدیر وقت)، بلال احمد زبیری، شوکت علی فہمی اور متعدد دوسرے حضرات موجود تھے۔ لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی اور شعر خوانی کا بازار گرم تھا۔ میں خواجہ حسن نظامی اور مولانا مظہر الدین کے درمیان بیٹھا تھا کہ دفعتاً جوش ملیح آبادی اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آئے۔ مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا آپ بھی کن لوگوں کے پاس آ بیٹھے جن سے کافور و کفن کی بو آتی ہے۔ میں نے کہا مشکل یہ ہے کہ آپ سے بھی بو آتی ہے۔ اس پر کہنے لگے ؎

وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

تین دن کے بعد میں واپس لاہور آ گیا۔

۵ر اور ۶ر اکتوبر [illegible] کو میرے دو لڑکوں عبدالرشید ارشد اور عبدالسلام خورشید کی شادیاں ہوئیں۔ بیاہ تو میں اور دعوت ولیمہ

میں لاہور کے بے شمار معززین شامل ہوئے۔

۵ مارچ ۱۹۴۶ء کو میری والدہ ماجدہ کا انتقال ہوگیا۔ والد محترم کے انتقال کے بعد وہ زیادہ تر بیمار رہنے لگی تھیں اور لاہور میں میرے برادران کوچک عبدالرؤف ساغر (مرحوم) اور عبدالحفیظ عشرت کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان دونوں کی ابھی شادیاں نہ ہوئی تھیں۔ اس لیے ان کے گھر کی دیکھ بھال کے لئے والدہ محترمہ کا وجود بہت غنیمت تھا۔ میں ہمیشہ برکت کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد مجھے پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ ماں دنیا کی کتنی بڑی نعمت ہے اور اولاد کے لیے اس کی ذات کتنی برکت و رحمت کا سرچشمہ ہے۔ اللہ مغفرت فرمائے۔

نومبر ۱۹۴۶ء میں میری منجھلی بیٹی کی شادی آغا سعید (برادر شیخ عبدالحی ہاشمی ایڈووکیٹ منٹگمری) سے ہوئی۔ اس تقریب پر بھی حسب معمول تمام معززین شہر میرے غریب خانے پر تشریف لائے اور متعدد وزراء و اکابر کی طرف سے تحفے وصول ہوئے۔

جون اور جولائی ۱۹۴۷ء کے مہینے "انقلاب" کے لیے بہت سخت تھے۔ اس لیے کہ انقلاب کی پوری زندگی میں کبھی ایسا اتفاق نہ ہوا کہ اس کی کوئی معتدبہ رقم بنک میں موجود ہو۔ ہمیشہ یہی ہوتا کہ پچیس تیس ہزار کی رقم واجب الوصول ہوتی۔ اس میں سے دس ہزار روپیہ مہینے بھر میں وصول ہوگیا۔ اخبار جاری رہا۔ اگلے مہینے پھر وہی پچیس تیس ہزار روپے واجب الوصول رہے۔ لیکن چونکہ مارچ سے لے کر جولائی تک پانچ مہینے فرقہ وار فسادات ہی میں گزرے اس لئے وی پی اور منی آرڈر اور دوسری وصولیوں میں سخت خلل واقع ہوا۔ اس پانچ ماہ کی مدت میں روزنامہ انقلاب اور دوسرے اخبارات بھی محض فرقہ وار فسادات کی وجہ سے ہفتے ہفتے دو دو ہفتے کے لیے اپنی اشاعت ملتوی رکھنے پر مجبور ہوئے۔ بالآخر اس علاقے میں کرفیو نافذ ہوگیا جس میں انقلاب کا دفتر اور مطبع تھا۔ لہٰذا اشاعت اخبار بالکل محال ہوگئی۔ یہ ایام میں نے اور مہر صاحب نے چپ چاپ مسلم ٹاؤن میں بسر کئے اور جب فسادات کی آگ فرو ہوئی اور ہم اپنے دفتر میں گئے تو شہر کی صورت بالکل بدل چکی تھی۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان قائم ہوگیا۔ اس وقت کے بعد کی سرگزشت لکھنا بے حد دشوار ہے۔ میں بھی اپنے دل و دماغ اور اپنے قلم میں اتنی صلاحیت نہیں پاتا کہ جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا اور بساط سیاست پر شاطروں نے جو چالیں چلیں ان کو قلم بند کرسکوں اور شاید اس سرگزشت کو فاش انداز سے لکھنا مصلحت بھی نہیں۔ اگر چند سال حیات مستعار باقی ہے تو ان شاء اللہ اور اگر لکھنے والا ہی نہ رہا تو اللہ اللہ! کار دنیا کسے تمام نکرد۔

(تلخیص۔ محمد عبداللہ قریشی)

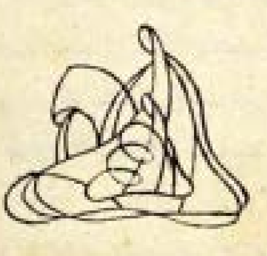

سیّد عطاء اللہ شاہ بُخاری

ولادت : یکم ربیع الاول ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۱ء)
وفات : ۲۱ر اگست ۱۹۶۱ء

میرا شجرۂ نسب

میں ان علمائے حق کا پرچم لیے پھرتا ہوں جو ۱۸۵۷ء میں فرنگیوں کی تیغ بے نیام کا شکار ہوئے تھے۔ ربِ ذوالجلال کی قسم! مجھے اس کی کچھ پروا نہیں کہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں — لوگوں نے پہلے ہی کب کسی سرفروش کے بارے میں راست بازی سے سوچا ہے۔ وہ شروع ہی سے تماشا دیکھنے کے عادی ہیں۔ میں اس سرزمین میں مجدد الف ثانیؒ کا سپاہی ہوں، شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان کا متبع ہوں، سید احمد شہیدؒ کی غیرت کا نام لیوا اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی جرأت کا باغی دیوانہ ہوں۔ میں ان پانچ مقدمہ ہائے سازش کے پابہ زنجیر صلحائے امت کے لشکر کا ایک خدمت گزار ہوں جنھیں حق کی پاداش میں عمر قید اور موت کی سزائیں دی گئیں۔ [(۱) مولانا یحییٰ علی صادق پوری (۲) مولانا عبدالرحیم صادق پوری (۳) قاضی میاں جان۔ (۴) میاں عبدالغفار (۵) مولانا محمد جعفر تھانیسری کو ۱۸۶۴ء میں سزائے موت کا حکم سنا کر صرف اس لیے عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا کہ پھانسی کو عزیز جانتے تھے] ہاں! ہاں! میں انھی کی نشانی ہوں، انھی کی صدائے بازگشت ہوں۔ میری رگوں میں خون نہیں آگ دوڑتی ہے۔ میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ میں قاسم نانوتویؒ کا علم لے کر نکلا ہوں۔ میں نے شیخ الہند کے نقشِ قدم پر چلنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ میں زندگی بھر اسی راہ پر چلتا رہا ہوں اور چلتا رہوں گا — میرا اس کے سوا کوئی موقف نہیں۔ میرا ایک ہی نصب العین ہے اور وہ برطانوی سامراج کی لاش کو کفنانا یا دفنانا ہے۔

ہر شخص اپنا شجرۂ نسب ساتھ رکھتا ہے۔ میرا یہی شجرۂ نسب ہے۔ میں سر اونچا کر کے فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں اس خاندان کا ایک فرد ہوں۔

میرا عقیدہ

میں دُنیا میں ایک چیز سے محبت کرتا ہوں اور وہ ہے قرآن۔ مجھے صرف ایک چیز سے نفرت ہے اور وہ ہے انگریز۔ میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کے تجربوں اور مشاہدوں نے میرے ان دو جذبوں میں بلا کی شدت اور حرارت پیدا کر دی ہے۔

محبت اور نفرت کے یہ دونوں زاویے ایسے ہیں کہ جن دماغوں میں ان کا سودا ہے وہ ان کے لیے پابہ زنجیر ہندوستان میں جیل خانہ زندگی کے سفر کا ایسا موڑ ہے، جہاں کبھی طلب کے خیال سے رُکنا پڑتا ہے، کبھی زمین کی کشاکش لے آتی ہے اور کبھی جستجوئے منزل کا تقاضا پہنچا دیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اب جیل خانے کی "آبرو" پر بوالہوسوں نے پیش دستی شروع کی ہوئی ہے اور ؎

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں

لیکن ۱۹۲۲ء کی تحریک خلافت کے زمانۂ قید طلب پر غور کرتا ہوں تو نگاہوں میں ایک تصویر سی کھنچ جاتی ہے۔ میانوالی ڈسٹرکٹ جیل میں احباب کی ایک یادگار بزم، سب اہل ذوق، اہل دل اور اہل علم جمع تھے۔ مولانا احمد سعید دہلوی حدیث پڑھایا کرتے۔ عبدالمجید سالک دربار اکبری کا سبق دیتے۔ مولوی لقاء اللہ کی بنی تلی باتیں گفتگو میں رس پیدا کرتیں۔ صوفی اقبال پانی پتی کے "اشلوکے" خدا کی پناہ، عبداللہ چوڑی والے کی ٹکسالی گالیاں تبرک کی طرح تقسیم ہوتیں اور آصف علی کھلتے تو پھبتیوں کے تختے بچھ جاتے۔ جی خوش کرنے کے لیے مشاعروں کا بھی اہتمام ہوتا۔ شاعر طرحی و غیر طرحی کلام سناتے۔ کبھی سالک صدر ہوتا، کبھی آصف اور کبھی ؎

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

اختر علی خاں نے ایک دفعہ معرکہ کی غزل سنائی۔ سب لوٹ پوٹ ہو گئے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ کچھ یاد سا آگیا۔ میں نے اختر سے کہا، میاں مقطع کہو۔ وہ کسی قدر جھینپا۔ میں نے کہا، تو مجھ سے سنو۔ مقطع تھا ؎

جو مے کشی سے ہو فرصت تو دو گھڑی کو چلو
امیر مسجد جامع میں آج امام نہیں

سب ششدر رہ گئے۔ ارے امیر مینائی کی غزل اڑا لی۔ سوالات کی ایک بوچھاڑ ہونے لگی۔ اختر علی خاں مقطع کے ساتھ ہی بزم سے غائب ہو گئے۔ دو دن روٹھے رہے۔ تیسرے دن بمشکل راضی کیا گیا۔ امیر مینائی کا دیوان ان کے تکیے تلے رکھا تھا۔ میں نے اُٹھایا تو غزل کا صفحہ ہی پھٹا ہوا تھا۔

جب طبیعت ذرا اور شگفتہ ہوتی تو مولانا ڈھولک بجاتے، صوفی مرحوم تالی پیٹتا، داؤد غزنوی حال کھیلتے، کبھی اختر گاتا، کبھی سالک، کبھی عاجز اور کبھی تیموں۔ وہ رنگ بندھتا کہ در و دیوار جھومتے اور کائنات بھی جھک کر گوش برآواز ہو جاتی ؎

اب کہاں لیکن وہ رنگا رنگ بزم آرائیاں
یعنی سب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

ہم میں سے کوئی رہا ہوتا تو سب بچوں کی طرح روتے بلکتے اور بادل ناخواستہ الوداع کہتے، مولانا احمد سعید رہا ہونے لگے تو ان کی گھگھی بندھ گئی۔ آنسوؤں کے تاروں سے نغمۂ جدائی پھوٹ رہا تھا۔

اس قید کے علاوہ اور بھی کئی دفعہ قید ہوئے لیکن وہ رنگ کبھی پیدا نہ ہوا۔ پنجاب کی تو تقریباً سب جیلیں دیکھی بھالی ہیں لیکن ۱۹۳۰ء میں ڈم ڈم جیل کی بھی زیارت ہو گئی۔ وہاں افسروں سے ایسی ٹھنی کہ رہائی تک اکھاڑہ جما رہا۔ دوست زندانی مصائب سنانے میں لذت محسوس کرتے ہیں اور میں عیب۔ یہ اپنا اپنا زاویۂ نظر ہے۔ میں ان مصیبتوں کو رُسوا کرنے کا عادی نہیں، میرے لیے

جیل خانہ صرف نقل مکانی ہے۔ اپنے گرد و پیش باغ و بہار فراہم کر لیتا ہوں اور قید یوں گزر جاتی ہے جیسے صحراؤں سے بادل۔

ایک شب جیل خانے میں سورۂ یوسف کی تلاوت کر رہا تھا۔ چودھویں رات کا چاند آسمان پر جگمگا رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ قرأت کی تاثیر میں ڈوب کر ٹھٹھر گیا ہے۔ ایک گھنٹہ اسی تلاوت میں گزر گیا۔ اتنے میں پنڈت رام جی لال سپرنٹنڈنٹ جیل نے پیچھے پکارا۔ دیکھا تو وہ کھڑا ہے اور رخسار اس کے آنسوؤں سے تر ہیں۔ کہنے لگا۔ "شاہ جی! خدا کے لیے بس کرو۔ میرا دل قابو سے باہر ہو گیا ہے۔ اب مجھ میں رونے کی سکت نہیں۔" اللہ اللہ! یہ قرآن کی تلاوت کا اعجاز تھا۔

ایک دن گورنمنٹ آف انڈیا کا برطانوی نژاد ہوم ممبر جائزے کے لیے آ پہنچا۔ میں بیٹھا ہوا کتاب دیکھ رہا تھا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا:

"کہیے شاہ جی! آپ اچھے ہیں؟"

میں نے کہا:

"خدا کا شکر ہے۔"

دوبارہ پوچھا۔

"کوئی سوال؟"

"میں اللہ سے سوال کیا کرتا ہوں۔" یہ میرا جواب تھا۔ وہ فوراً بولا:

"نہیں میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں؟"

"جی ہاں۔ آپ میرا ملک چھوڑ کر چلے جائیے۔"

وہ فوراً لوٹ گیا۔ اس واقعے کو پچیس برس گزر چکے ہیں اور ربع صدی کے بعد انگریز خود کہہ رہا ہے کہ وہ جا رہا ہے۔ جب وہ یہاں رہنے پر مصر تھا، تو ہندوستان جیل خانہ تھا۔ اب وہ جانے کا اعلان کر رہا ہے تو ہندوستان آتش کدہ ہے ؎

کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں

میرے عقیدے میں اب دو ہی چیزیں ہیں:

قرآن کی محبت اور انگریز سے نفرت!

ترجمہ و تفسیر

"اللہ الصمد" کے معنی میں مجھے ہمیشہ تردد رہا کہ "اللہ بے نیاز ہے"۔ بس یونہی دل کو تسکین نہ ہوتی۔ جیل ہی کا واقعہ ہے کہ شاہ عبد القادر صاحب دہلوی کا ترجمہ قرآن پاک دیکھ رہا تھا کہ اچانک اسی کا خیال آیا کہ دیکھیں شاہ صاحب کیا لکھتے ہیں۔ جب وہ جگہ نکالی تو حضرت نے ترجمہ فرمایا: "اللہ نرادھار ہے۔" میں کبھی اسے نرادھار پڑھوں کبھی کچھ۔ آخر اپنے جیل ہی کے ایک ساتھی پنڈت نیکی رام شرما کے پاس گیا جو بہت فاضل آدمی تھا۔ اس سے پوچھا کہ یہ لفظ کیا ہے؟ وہ دیکھتے ہی جھومنے لگا اور واہ واہ کے نعرے بلند

کرنے شروع کیجیے۔ میں نے چند لمحے انتظار کرنے کے بعد کہا۔ کیا عجیب آدمی ہیں آپ۔ میں انتظار میں ہوں اور آپ اپنے ہی آپ لطف لے رہے ہیں۔ مجھے بھی تو علم ہو کہ کیا معنی ہیں۔ اس کے بعد اس نے بتایا کہ یہ سنسکرت کا لفظ ہے "نردھار" اور یہ اس ذات کے لیے بولا جاتا ہے جس کا کام کسی بن نہ اٹکے اور جس بن کسی کا کام نہ بنے۔" تب مجھے تسکین ہوئی اور یوں محسوس ہوا جیسے کوئی گم شدہ متاع مل گئی ہو۔ پھر میں نے اس پر کئی گھنٹے بیان کیا۔

ایسے ہی اھدنا الصراط المستقیم ــــ ولا الضالین کے معنی میں بھی مجھے تسکین نہ ملتی تھی کیونکہ عام معنی ہیں "دکھا ہم کو راہ سیدھی۔ راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے انعام کیا۔ نہ ان کی جن پر تیرا غضب ہوا اور وہ گمراہ ہوئے۔" لیکن جب حضرت شاہ صاحب کا ترجمہ پڑھا تو بالکل وضاحت ہو گئی اور وہی عین مطابق معنی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

"چلا ہم کو راہ سیدھی۔ راہ ان کی جن پر تیرا انعام ہوا (اور) نہ ان پر تیرا غضب اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔۔۔"

ظاہر ہے جو بات اس میں ہے وہ اس عام ترجمہ میں نہیں۔ یہ دونوں ترجمے ایک دوسرے کے برعکس ہیں۔ ایک میں تو اھدنا کے معنے دکھانے کے لیے گئے ہیں جو اس کی ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ کے منافی ہے۔ جہاں کانٹے ہی کانٹے ہوں وہاں کیا چھوڑ دینا؟ اور ساتھ چلانا ایسا ہے جیسے باپ بچے کو انگلی پکڑ کر ساتھ چلاتا ہے اور راستہ کی دشواریاں سہل کر دیتا ہے۔ اپنی توفیق حفاظت میں چلانا یہ اس بارگاہ کی عین شان ہے۔

میرے مخاطب

میں نے چوالیس ۴۴ برس لوگوں کو قرآن سنایا۔ پہاڑوں کو سناتا تو عجب نہ تھا کہ ان کی سنگینی کے دل چھوٹ جاتے۔ غاروں سے ہم کلام ہوتا، تو جھوم اٹھتے۔ چٹانوں کو جھنجھوڑتا تو چلنے لگتیں۔ سمندروں سے مخاطب ہوتا تو بھینٹ کے لیے موجیں بلند ہو جاتے۔ درختوں کو پکارتا تو وہ دوڑنے لگتے۔ کنکریوں سے کہتا، تو وہ لبیک کہہ اٹھتیں۔ صرصر سے گویا ہوتا تو وہ صبا ہو جاتی۔ دھرتی کو سناتا تو اس کے سینے میں بڑے بڑے شگاف پڑ جاتے۔ جنگل لہرانے لگتے۔ صحرا سرسبز ہو جاتے مگر میں نے ان لوگوں کو خطاب کیا، جن کی زمینیں بنجر ہو چکی ہیں۔ جن کے ہاں دل و دماغ کا قحط ہے۔ جن کے ضمیر عاجز آ چکے ہیں جو برف کی طرح ٹھنڈے ہیں۔ جن کی پستیاں انتہائی خطرناک ہیں، جن میں ٹھہرنا المناک اور جن سے گزرنا طرب ناک ہے، جن کے سب سے بڑے معبود کا نام طاقت ہے۔ (۱۹۴۵ء)

اذانِ بتکدہ

اللہ کی کتاب کی بلاغت کے قربان جائیے۔ خود بولتی ہے کہ میں محمدؐ پر اتاری گئی ہوں۔ بابو لوگو! اس کی قسمیں نہ کھایا کرو، اس کو پڑھا کرو۔ سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیلؒ کی طرح نہ سہی اقبال کی طرح پڑھا کرو۔ دیکھا اس نے قرآن کو ڈوب کر پڑھا تو مغرب کی دانش پر ہلہ بول دیا۔ پھر اس نے قرآن کے سوا کچھ دیکھا ہی نہیں۔ وہ تمھارے بتکدے میں اللہ اکبر کی صدا ہیں (۱۹۴۶ء)

پاکستان کی حفاظت

میں ان لوگوں میں سے نہیں جو یہ صدا دیتے پھریں کہ میں تو رشتۂ وفاداری لیے پھرتا ہوں۔ میری انگلی پکڑ کر اپنے ساتھ لے چلو۔ جس مقتل میں چاہو۔ مجھے ذبح کر دو ——— ایسا کبھی نہیں ہوگا، ہرگز نہیں ہوگا۔ میں خوش ہوں۔ میری خوش بختی ہے کہ اس ملک سے انگریز نکل گیا۔ میں دنیا کے کسی حصے میں بھی سامراج کو نہیں دیکھ سکتا۔ میں اس کو قرآن اور اسلام کے خلاف سمجھتا ہوں۔

تم میری رائے کو خود فروشی کا نام نہ دو۔ میری رائے ہار گئی اور اس کہانی کو یہیں ختم کر دو ——— اب پاکستان جب بھی پکارا واللہ باللہ میں اس کے ذرے ذرے کی حفاظت کروں گا۔ مجھے یہ اتنا ہی عزیز ہے جتنا کوئی اور دعویٰ کر سکتا ہے ——— میں قول کا نہیں، عمل کا آدمی ہوں۔ اس طرف کسی نے آنکھ اٹھائی تو وہ پھوڑ دی جائے گی۔ کسی نے ہاتھ اٹھایا تو وہ کاٹ دیا جائے گا۔ میں اس وطن اور اس کی عزت کے مقابلے میں اپنی جان عزیز رکھتا ہوں نہ اولاد ——— میرا خون پہلے بھی تمہارا تھا اور اب بھی تمہارا ہے۔ (۱۹۵۲ء)

مراجعت

میں وہاں چلا جاؤں گا جہاں سے لوٹ کر کوئی نہیں آیا۔ پھر تم مجھے پکارو گے مگر تمہاری پکار تمہارے کانوں سے ٹکرا کر تمہیں ہلکان کر دے گی اور تم مجھے نہ پاؤ گے۔ (۱۹۶۰ء)

(مرتب : محمد عبداللہ قریشی)

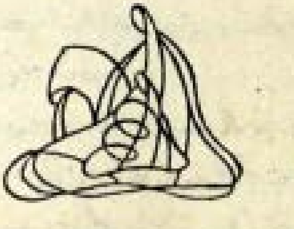

(سر) شیخ عبدالقادر

ولادت : ۱۸۷۴ء

وفات : ۹ر فروری ۱۹۵۰ء

یاد ش بخیر بیٹرس نے ایک دفعہ لاہور کا جغرافیہ لکھا تھا اور طنزاً یہ کہا تھا کہ جغرافیۂ لاہور میں آب و ہوا کا باب نہیں کیونکہ لاہور میں آب و ہوا ہی نہیں۔ اسی طرح میرے بچپن کی تاریخ انوکھی ہے۔ اس میں بچپن کا باب ہی نہیں ملتا یعنی بچپن کا زمانہ آیا اور گزر گیا۔ بچپن کا زمانہ عجیب بے فکری کا زمانہ ہوتا ہے جو لوگ اسے بادشاہی کا زمانہ کہتے ہیں بجا کہتے ہیں۔ ماں باپ اور خویش و قریب سب بچے کی خبر گیری کرتے ہیں اور اسے خوش رکھنے اور بہلائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بچپن کا اصل لطف اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب بچہ چلنے لگتا ہے اور کھیل کود کا وقت شروع ہوتا ہے۔ مجھے خدا نے زندگی کی بہت سی نعمتیں بخشیں مگر بچپن کی نعمت ذرا ادھوری سی رہی۔ میں اپنے ماں باپ کی آخری اولاد تھا اور ان کے بڑھاپے میں پیدا ہوا تھا اس لیے گھر بھر میں سب مجھ سے بڑے تھے اور میں اکیلا بچہ تھا۔ میرے والد مرحوم اس وقت بسلسلۂ ملازمت لودھیانہ میں رہتے تھے اور ہمارا مکان شہر کے بیرونی حصہ میں ایک ایسے محلے میں تھا جس کے قریب ہماری طرز کے لوگ نہیں رہتے تھے۔ اس لیے نہ کسی ہمسائے کے گھر کا ہمارے ہاں سے آنا جانا تھا اور نہ وہ لوگ یا ان کی عورتیں اور بچے ہمارے گھر آتے تھے۔ دن میں جب میرے والد کام پر چلے جاتے تھے اور میری والدہ مرحومہ گھر کے کام کاج میں لگ جاتی تھیں تو میرے ساتھ کھیلنے والا یا مجھ سے بات چیت کرنے والا کوئی نہ ہوتا تھا۔ میری دو بیاہی ہوئی بہنیں گھر میں تھیں مگر ان میں سے ایک مجھ سے کوئی بیس برس بڑی تھی اور دوسری کوئی پندرہ برس۔ اس لیے سوائے اس کے کہ وہ کسی وقت ادھر ادھر آتے جاتے میرے سر پر ہاتھ پھیر جائیں، انھیں اپنے کام رہتے تھے۔ میں گھر کے صحن میں کسی ایک طرف بیٹھا اپنا دل بہلاتا رہتا تھا۔ خیالی طور پر سوچتا تھا کہ میں بڑا ہو گیا ہوں اور میرے بہت سے دوست ہیں اور کبھی ان میں سے کوئی اور کبھی کوئی میرے ہاں بطور مہمان آتے ہیں۔ کوئی گھوڑے پر، کوئی گاڑی پر اور میں ان کے ٹھہرانے اور ان کے گھوڑے گاڑی کو جگہ دلانے میں مصروف ہوں یا کوئی اور اسی طرح کے خیالی پلاؤ پکاتا رہتا تھا۔

جب میں چار برس چار مہینے اور چار دن کا ہوا تو میری بڑی بہن نے مجھے بغدادی قاعدہ پڑھانا شروع کیا۔ میں چند دنوں میں ہی حرف شناس ہو گیا اور مجھے ایک مولوی صاحب کے ہاں قرآن مجید پڑھنے کے لیے بھیجا جانے لگا۔ میرا دن قدرے مصروف ہونا شروع ہوا اور تنہا کھیلنے کی جگہ مولوی صاحب کے گھر میں جانا اور وہاں سے پچھلے پہر واپس آنے کا ایک شغل سا بن گیا۔ میں نے چھ مہینے میں قرآن مجید ناظرہ پڑھ لیا اور اس کے ختم کے بعد شہر کے ابتدائی مدرسے میں داخل ہو گیا۔ ان دنوں مدرسوں میں کھیلوں کا رواج کم تھا۔ سارا وقت پڑھنے لکھنے میں ہی لگتا تھا۔ اس لیے

میرا معمول یہی رہا کہ نوکر کے ہمراہ مدرسے چلا گیا اور اس کے ہمراہ گھر آ گیا۔ اس لیے بچپن میں جو کھیل کود کی مصروفیات اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ ہوتی ہیں، ان سے میری ابتدائی زندگی خالی رہی۔ نہ کسی سے لڑنے جھگڑنے کی نوبت آئی۔ نہ کسی سے مار کھائی نہ کسی کو مارا۔ اس سبب سے جسمانی ترقی اس زمانے میں خاطر خواہ نہ ہو سکی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ بڑوں کو زیادہ دیکھنے اور بڑوں سے ملنے کے مواقع مجھے بچپن میں ہی اتنے ملے جتنے اکثر بچوں کو اس ملک میں نہیں ملتے۔

میرے والد مرحوم اپنے وقتِ فرصت میں مجھے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ شام کو وہ سیر کو نکلتے تو مجھے ساتھ لے جاتے اور مجھ سے باتیں کرتے جاتے تھے۔ واپس آتے تھے تو میں ان کی تکان رفع کرنے کے لیے ذرا ان کے پاؤں دابتا تھا اور اُن سے دُعا لیتا تھا۔ کبھی کبھی وہ صبح کو بھی باہر نکلتے تھے اور اپنی والدہ کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھتے تھے۔ ان کی اس سعادت مندانہ ادا اور ان کے مذہبی جذبات کا گہرا اثر اس زمانہ میں میرے قلب پر ہو گیا اور اس کا کچھ بقایا اب تک موجود ہے۔

عجب اتفاق ہے کہ گھر میں بڑوں کی صحبت ملی تھی تو باہر بھی اسی قسم کا سلسلہ رہا۔ شہر کے مشہور اور ذی مرتبہ لوگوں میں والد صاحب کی ملاقات بہت تھی۔ لودھیانہ کابل سے آئے ہوئے ایک پناہ گزین شاہی خاندان کے قیام کی جگہ تھی۔ افغانستان کے شاہ شجاع کی اولاد وہاں جاگزیں تھی۔ ان میں شاہزادہ شاہ پور بہت وجیہہ اور شاندار تھے۔ ان کا بنگلہ اور اس کے گرد کا باغ بہت خوبصورت اور پھولوں سے آراستہ تھا۔ میں کبھی کبھی اپنے ابا جی کے ساتھ شہزادہ صاحب کی خدمت میں جاتا تھا اور وہ مجھے پاس بٹھاتے اور مہربانی کرتے تھے۔ میرے دل میں اس خیال سے کہ یہ ایک والیِ ملک کی اولاد اور اب بے وطن ہیں اور اس اُمید میں بیٹھے ہیں کہ شاید دورِ زمانہ ایسا بھی آ جائے کہ وہ دوبارہ اپنا کھویا ہوا تخت پا لیں، ان سے بہت ہمدردی پیدا ہوتی تھی۔ ان کی زبان سے فارسی بول سُن کر مجھے فرحت ہوتی تھی۔ کیونکہ میرے کان گھر میں بھی فارسی الفاظ سے آشنا تھے۔ میرے والد کتابی فارسی خوب جانتے تھے اور مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ مدرسہ کے وقت کے بعد مجھ سے فارسی سیکھ لیا کرو، کسی وقت کام آئے گی اور گو فارسی میں نے ان سے بعد میں سیکھی مگر ان کی زبان سے فارسی اشعار بچپن ہی میں سننے کا موقع ملتا رہا۔

افغان شہزادوں کے خاندان کے علاوہ لودھیانہ میں دہلی اور نواحِ دہلی کے کچھ شرفا اور بعض نواب پناہ گزین بھی آباد تھے۔ ان کے گھر ایسے آراستہ تو نہیں تھے جیسے کابل کے شہزادوں میں دو تین بڑے شہزادوں کے تھے مگر پھر بھی ان کی رہائش بہت اچھی تھی۔ گھر کے باہر ایک چھوٹا سا باغیچہ ہر ایک نے لگا رکھا تھا۔ اس میں ایک تخت پوش پر سفید چادر بچھی ہوتی تھی اور گاؤ تکیہ لگا ہوتا تھا۔ صاحبِ خانہ شام کے قریب باہر نکل کر بیٹھتے تھے اور اپنے دوستوں سے خوش گپّی کرتے یا کبھی کبھی اکیلے بیٹھے ستار بجاتے رہتے تھے۔ ان کے گھروں کے قریب ہم جب کبھی گزرتے۔ مجھے یہ منظر بہت ہی دلچسپ معلوم ہوتا تھا۔ یہ محلہ گویا اُردو والوں کا خاص گھر تھا۔

اس کے سوا ایک اور جماعت جس کے بہت سے اراکین اور افراد لودھیانہ میں سکونت رکھتے تھے، خطۂ کشمیر کے رہنے والوں کی تھی۔ ان کے تین طبقے اس شہر میں آباد تھے کچھ حضرات ”خواجہ“ کے لقب سے ممتاز تھے۔ تجارت میں فروغ پا کر اچھے امیر ہو گئے تھے اور بہت آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے ایک گروہ کے ہاں میرے والد اکثر جاتے تھے اور میں ان کے ہمراہ ہوتا تھا اور تجارت میں ان کی اور اُن کے خاندان بھر کی مصروفیت اور ان کی خوش حالی دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی تھی۔ وہ سب اُردو اور پنجابی بھی بولتے تھے مگر آپس میں کشمیری

میں باتیں کرتے تھے۔ دُوسرا طبقہ کشمیر کے لوگوں کا نان پکانے اور باقرخانی بنانے اور بیچنے کا کام کرتا تھا اور اپنے فن میں اچھا کمال رکھتا تھا۔ تیسرا طبقہ محنت مزدوری سے اپنا پیٹ پالتا تھا اور لکڑی چیرنے پھاڑنے کی مہارت رکھتا تھا۔

اس طرح ان مختلف طبقات آبادی کو دیکھنے، ان کی مدد کرنے اور ان کو سمجھنے کی صلاحیت مجھ میں پیدا ہو گئی اور میری طبیعت انواع و اقسام کے لوگوں سے مانوس ہو گئی اور اُن کی بولیوں کو سننا مجھے دلچسپ معلوم ہونے لگا۔ یہ ذوق بعد میں میری لسانی مذاق کی ہمہ گیری میں بہت ممد ثابت ہوئے۔ خاص کر زبانِ اُردو سے مناسبت اور اس کا شوق اسی ابتدائی زندگی کی پیداوار ہے کیونکہ مختلف طرح کی آبادی جو لدھیانہ میں مقیم تھی۔ اُردو کو ہی بطور مشترکہ زبان کے استعمال کرتی تھی۔

میں ابھی پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا اور میری عمر دس سال کے قریب تھی کہ میرے والد پنشن لے کر اپنے بزرگوں کے وطن قصور میں آگئے جو ضلع لاہور میں ایک مشہور اور پُرانا شہر ہے اور میں وہاں کے مدرسے میں پڑھنے لگا۔ اصل بچپن تو دس سال کی عمر تک ختم ہو چکا تھا اور بچپن کا یہ مختصر سا حال یہاں ختم ہو جانا چاہیے مگر قصور کے ایک دو سال اور بچپن میں شامل کرنے بے جا نہ ہوں گے۔

قصور کے مدرسے میں پڑھائی کے سوا ورزش اور کھیلوں کا بھی کچھ رواج شروع تھا لیکن چونکہ میرا ابتدائی زمانہ ورزش اور کھیل سے خالی رہا۔ اس لیے پڑھائی میں تو آتے ہی میرا شمار اچھے لڑکوں میں ہو گیا مگر کھیل میں شرکت برائے نام رہی۔ ہمارے مدرسے میں گیند بلّے کی ایک ٹیم تھی۔ اُستادوں نے اس میں شریک ہونے کو مجھے کہا مگر میں ہی جھجکتا تھا۔ اُستادوں نے مجھے اس ٹیم کا سیکرٹری مقرر کر دیا اور اس سبب سے میرا ٹیم کے ہمراہ روز جانا تو ضروری ہو گیا۔ مگر میں کھیل کود میں ڈرتا ہوا شریک ہوتا تھا۔ اور اس میں کچھ ترقی نہ کر سکا۔ شہر میں ہماری برادری کے گھر جس محلے میں تھے، وہاں میرے ہم عمر بچے بہت سے تھے۔ وہ اکثر شام کے قریب کھیل کود کے لیے اکٹھے ہو جاتے تھے۔ انھیں اور کھیلوں کے علاوہ آنکھ مچولی کھیلنا پسند تھا۔ میں بھی ایک کھلے میدان میں جو ہمارے گھروں کے سامنے تھا، ان سے مل کر کھیلنے جاتا تھا مگر میری دل بستگی کھیلوں سے بہت کم تھی اور یوں بھی مجھے میری والدہ مرحومہ کا حکم تھا کہ سرِ شام گھر واپس آجایا کرو اور میں اس حکم کو پابندی کے ساتھ ماننے کی کوشش کرتا تھا۔

مدرسے کے معلموں میں ایک مولوی صاحب تھے جنھیں شوق تھا کہ لڑکوں کو تقریر کرنا سکھائیں۔ اُنھوں نے پرائمری کے اوپر کی جماعت اور مڈل کی جماعتوں کی ایک مجلس بنائی جس کے جلسے وہ ہفتے میں ایک بار کرتے تھے اور خود صدر جلسہ ہوتے تھے۔ لڑکوں کو کوئی مضمون دیا جاتا تھا جس پر وہ اپنی بساط کے مطابق کچھ لکھ کر لاتے تھے اور پڑھ کر سناتے تھے۔ میں اس مجلس میں شریک ہو گیا اور جب میں نے پہلی دفعہ چھوٹا سا مضمون لکھا اور جھجک کے بغیر پڑھ کر سنایا تو مجھے بہت شاباش ملی اور مجھے تقریر کی مشق کا شوق پیدا ہو گیا جو بعد کو بڑے ہو کر بھی جاری رہا۔ اس کی بدولت تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مجھے قومی مجالس میں تقریر کرنے کے بے شمار موقعے ملے۔

میں کوئی تین سال تک قصور میں رہا اور وہاں سے مڈل پاس کر کے لاہور آگیا۔ میری جوانی لاہور میں ہی بسر ہوئی اور بعد کو لاہور سے اتنے گہرے تعلقات قائم ہو گئے کہ لاہور ہی میرا وطن ہو گیا۔

[۱۸۹۴ء میں بی اے کیا۔

۱۸۹۵ء میں پنجاب آبزرور میں اسسٹنٹ ایڈیٹر اور تین سال بعد چیف ایڈیٹر ہوئے۔

۱۹۰۱ء میں ماہنامہ مخزن نکالا۔

۱۹۰۴ء میں بیرسٹری کے لیے لندن گئے۔ ۱۹۰۷ء میں واپس آ کر دہلی میں پریکٹس شروع کی اور ۱۹۰۹ء میں لاہور چلے آئے۔

۱۹۱۲ء میں لائل پور میں سرکاری وکیل مقرر ہوئے اور آٹھ سال تک یہ کام کرتے رہے۔

۱۹۲۱ء میں لاہور ہائیکورٹ کے جج مقرر ہوئے۔

۱۹۲۴ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے صدر بنے۔

۱۹۲۵ء میں قائم مقام وزیر تعلیم ہوئے۔

۱۹۲۶ء میں لیگ آف نیشنز میں ہندوستان کے نمائندہ ہو کر جنیوا گئے۔

۱۹۲۶ء میں مسلم لیگ کے اجلاس دہلی کی صدارت کی۔

۱۹۲۷ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی مدراس میں صدارت کی۔

۱۹۲۸ء میں پنجاب ایگزیکیٹو کونسل کے قائم مقام رکن بنے اور سر کا خطاب پایا۔

۱۹۲۹ء میں پبلک سروس کمیشن کے رکن ہوئے۔

۱۹۳۰ء میں لاہور ہائی کورٹ کے ایڈیشنل جج ہوئے۔

۱۹۳۴ء میں انڈیا کونسل لندن کے ممبر ہوئے اور پانچ سال تک لندن میں رہے۔ جہاں سے ۱۹۳۹ء میں وطن واپس آئے۔ اسی سال وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل کے قائم مقام ممبر ہوئے۔

۱۹۴۲ء میں بہاولپور ہائی کورٹ کے چیف جج بنے۔ جہاں سے ۱۹۴۵ء میں واپس آ کر لاہور میں مقیم ہوئے۔ یہیں ۹ فروری ۱۹۵۰ء کو سپرد خاک ہوئے]

کشتی اور طوفان

وہ دردناک نظارہ مشکل سے بھولے گا جب میں نے ایک دن کشتی اور اس کی سواریوں کو، ساحل کے قریب ہزارہا لوگوں کے پیش نظر، طوفان کی لہروں کے زبردست تھپیڑوں سے عاجز آ کر ڈوبتے دیکھا۔

فرانس کا شمالی ساحل تھا اور اتوار کا دن۔ ہزاروں تماشائی زن و مرد ساحل کے قریب اونچے بند پر بیٹھے طوفان اور تلاطم دریا کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ سکون کے وقت تو سمندر کے منظر کو دلکش ماننے میں شاید کسی کو بھی کلام نہ ہو۔ لیکن تلاطم کے وقت کا منظر بھی ایک پُر شوکت دلچسپی سے خالی نہیں۔ بشرطیکہ آپ بےکسارِ ان ساحل میں ہوں مگر یہ دلچسپی اسی وقت تک ہے کہ سامنے سمندر ہی سمندر ہو۔ کسی انسان کی جان یا کسی کشتی کی قسمت طوفان کے پنجے میں نہ ہو۔ ورنہ سخت سے سخت دل موم ہونے لگتے ہیں اور دلوں سے دُعا بے اختیار اُٹھتی ہے کہ الٰہی! ان جانوں کی خیر ہو جو اس پُر شوکت حالت میں تو کل بخدا پانی میں ناؤ ڈالے ہوئے ہیں۔

جس دن کا میں ذکر کرتا ہوں، اس دن سمندر زوروں پر تھا۔ موجیں بلیوں اچھلتی تھیں اور کبھی کبھی پانی ساحل کی ساری خشکی طے

کر کے بند سے آ ٹکراتا تھا اور اس طرح اُچھلتا تھا کہ بند کے اُوپر کی زمین تر ہو جاتی تھی اور جو لوگ وہاں بیٹھے ہوئے تھے ان کے کپڑے بھیگ جاتے تھے۔ لیکن تعطیل کا دن، فراغت کا زمانہ، سمندر کی بے اعتدالیاں ہنسی میں ٹال دی جاتی تھیں۔ کسی عورت کے دامن تک اگر سمندر کا دست گستاخ بڑھتا تھا تو کئی اور مشتاق ہاتھ بچانے دوڑتے تھے اور چھتری کی ڈھال سامنے کر دیتے تھے اور عورت ہنسی خوشی شکریہ ادا کرتی تھی۔ اگر کسی مرد کا دامن آبِ شور سے تر ہو جاتا تھا تو عورتیں تالی بجاتی تھیں اور وہ قہقہے پڑتے تھے کہ الاماں۔ لوگ بھیگتے تھے اور پروا نہ کرتے تھے۔ کوئی اپنی جگہ سے نہ ٹلتا تھا۔

ایک طرف باجہ بج رہا تھا اور سینکڑوں لوگ اس کے گرد جمع تھے اور جو دُور تھے، وہ بھی اس کی سُریلی صداؤں کے مزے لے رہے تھے کہ اچانک ایک توپ کی آواز آئی۔ چار بجے کے قریب توپ کیوں چلی؟ سب حیران ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ جاننے والے جان گئے کہ کوئی جہاز یا کشتی خطرے میں ہے اور یہ توپ بندرگاہ کے اس مینار سے چلی ہے جہاں ایک تجربہ کار بحری افسر نگہداشت پر متعین رہتا ہے کہ نواحِ بندر میں اگر کوئی ایسا حادثہ ہو تو فوراً اس کی اطلاع دے۔ نگاہیں سمندر کی طرف دوڑیں اور ایک بادبان پر پڑیں جو اپنے کام سے عاری ہو چکا تھا اور اس سے ایک مستول پر آڑی جو سرنگوں ہوتا جاتا تھا۔ کشتی کا ایک سرا پانی میں تھا، دوسرا پانی کے اوپر تھا اور اس طرف مستول سے مضطربانہ چمٹے ہوئے دو آدمی نظر آتے تھے۔ سینکڑوں زن و مرد بے قراری کے ساتھ بند سے نیچے اُتر کر پانی کے قریب جانے لگے اور بعض تیراک کپڑے اُتار کر پانی میں کود پڑے کہ کشتی تک پہنچ کر اس کی مدد کریں۔

تھوڑی دیر میں دو کشتیاں پانی میں ڈال دی گئیں جن میں وردی پوش ملاح ایک ایسی سوسائٹی کے ملازم تھے جس کا کام ڈوبتوں کی جانیں بچانا ہے اور جو عموماً سمندر کے کنارے پھرتے رہتے ہیں کہ اگر کوئی ناواقف دُور تک نہاتا ہوا چلا جائے اور غوطے کھانے لگے یا اور کوئی واقعہ ہو تو مدد کو پہنچیں۔ مگر موجوں کی یہ حالت تھی کہ دونوں کشتیوں میں سے ایک بھی وہاں تک نہ پہنچ سکی جہاں کشتی ڈوب رہی تھی۔ یہ لوگ ہمت کر کے اس طرف کو بڑھتے تھے مگر ایک ہی موج ایسی آتی تھی کہ مار کر پیچھے ہٹا دیتی تھی۔ اتنے قدم بڑھنے نہیں پاتے تھے جتنے پیچھے دھکیل دیئے جاتے تھے۔ گویا سمندر زبانِ موج سے ان پر عتاب کرتا ہوا کہتا تھا: "او انسانِ ضعیف کے بے ادب ہاتھو! ہٹو اور اپنی بساط سے بڑھنے کی جرأت نہ کرو۔ یہ کشتی اور اس کی سواریاں میرا شکار ہیں اور کس کی مجال ہے کہ میرا شکار مجھ سے چھینے؟ اور میں کیا ہوں؟ میں بھی نہنگِ اجل کا ایک منہ ہوں۔ اس نہنگ کا نوالہ اب تمھارے ہاتھ کیونکر آ سکتا ہے؟"

اسی طرح وہ دلاور اور بہادر تیراک جو اکا دکا کود پڑے تھے تلاطمِ موج سے عاجز آ کر کنارے پر کھڑے بے بسی سے یہ خوفناک تماشا دیکھ رہے تھے۔ کشتی بان کے کئی یار دوست، جان پہچان والے وہیں کنارے پر موجود تھے اور ہاتھ مل رہے تھے۔ مگر کیا ہوتا تھا۔ کشتی دو چار دفعہ ڈوبی اور اُبھری۔ آخر صرف بادبان کا ایک حصہ پانی کے اوپر تھا اور باقی سب پانی کے نیچے۔ ذرا دیر میں وہ بادبان بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور کشتی نذرِ طوفان ہو گئی۔

اس ہیبت ناک سین کے دیکھنے والوں کے چہرے اس وقت دیکھنے کے لائق تھے۔ ایک مایوسی تھی جو سب چہروں پر چھائی ہوئی تھی، ایک رنج تھا جو سب دلوں پر مسلط تھا۔ ایک پریشانی تھی جو سب طرف آشکارا تھی۔ ایسی ہی گھڑیوں میں بنی نوعِ انسان کی وہ باہمی لازوال یگانگت ثابت ہوتی ہے جس سے کیا اشخاص کیا اقوام کامیابی کے نشے اور دولت کمانے کی جدوجہد میں چشم پوشی کر لیتی ہیں۔

وہاں عیسائی بھی تھے اور یہودی بھی۔ انگریز بھی تھے اور فرانسیسی بھی، پروٹسٹنٹ بھی تھے اور کیتھولک بھی۔ چند سیاہ فام حبشی تھے اور چند گندم گوں مصری۔ مراکش اور الجزائر کے کئی تاجر اپنی سرخ ٹوپیاں پہنے کھڑے تھے اور میں ایک ہندی بھی۔ اسی گروہ کا جزو قلیل تھا مگر ہر ایک نبض ایک رفتار پر تھی۔ گویا ایک نبض تھی۔ ایک دوسرے سے پوچھتا تھا کہ مرنے والے کون تھے، کہاں سے آئے تھے؟ پہلے تو جتنے منہ تھے اتنی زبانیں۔ کوئی کچھ کہتا تھا کوئی کچھ۔ آخر ایک شخص سے جس نے اس کشتی کو روانہ ہوتے دیکھا تھا معلوم ہوا کہ کشتی میں چھ آدمی تھے۔ ایک کشتی بان اور دو اس کے بیٹے۔ ایک چودہ سال کا جو کشتی چلانے میں مدد دیتا تھا اور دوسرا آٹھ نو سال کا جس کو وہ اکیلا گھر میں نہیں چھوڑ سکتا تھا کیونکہ اس کی ماں مر چکی تھی۔ یہ شخص کشتی لیے کنارے پر بیٹھا تھا کہ تین مسافر آئے۔ دو مرد اور ایک عورت انھوں نے کہا ہم سمندر کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔ ایک دو اور کشتی والوں نے انکار کیا کہ آج طوفان آ رہا ہے۔ اس حالت میں کشتی دریا میں نہیں ڈالی جا سکتی۔ وہ مایوس ہوئے اور کہنے لگے کہ ہمیں پھر اور موقع نہیں ہے۔ کل واپس جانا ہے۔ یہ کشتی بان دلیر تھا۔ اس نے کہا "آؤ۔ میں لیے چلتا ہوں۔" وہ ہنستے ہوئے سوار ہو گئے اور کشتی چلی۔ آدمی تھا کاریگر۔ خاصی دیر تک باوجود طوفان کے چلاتا رہا۔ مگر اس کی دلیری اور ان کے اس شوق کی آڑ میں موت شکار کھیل رہی تھی۔ ایک تھپیڑا ایسے زور کا آیا کہ کشتی اس کے قابو میں نہ رہی اور الٹ گئی۔ بس پھر کیا تھا، کہیں ٹھکانا لگتا تھا نہ لگا۔

اب ان آفت رسیدوں کی کہانی سنو۔ جو سیر کرنے نکلے تھے۔ وہ تھے ایک میاں ایک بی بی اور ایک میاں کا بھائی۔ میاں بی بی میں کچھ عرصہ سے عشق صادق تھا اور آخر دونوں نکاح پر متفق ہو گئے تھے۔ اتوار کا یہ حادثہ ہے اور ہفتہ کے دن ان کا بیاہ ہوا تھا۔ دونوں کے ماں باپ زندہ تھے اور بیاہ ہوتے ہی یہ ہنسی خوشی رخصت ہوئے تھے کہ اتوار کا دن یوں کاٹ کر پیر کو گھر جائیں گے۔ ہفتے کو جب پادری ان کے ہاتھ ملا کر ان کو دعا دے رہا ہوگا تو اسے کیا معلوم ہوگا کہ وہ نکاح آسمان کے لیے باندھ رہا ہے اور زمین پر اس نکاح کی مدت چوبیس گھنٹے سے زیادہ نہیں۔ مگر وہ چوبیس گھنٹے ایسے تھے کہ ان پر چوبیس سال کی خوشی قربان کر دینی چاہیے کیونکہ ان کا جو انجام ہوا وہ ہر چند پُر درد اور خوفناک ہے مگر ایسا انجام ہے کہ کوئی طالب و مطلوب اس سے بڑھ کر آرزو نہیں کر سکتے۔ دونوں ڈوبے تو اکٹھے ڈوبے۔ شب بھر دونوں کے سانس اکٹھے سینہ سپر رہے اور جب دنیا چھوٹنے یہ سمجھ لیا کہ قعر سمندر میں جہاں لاکھوں بندگانِ خدا کی بے نشان قبریں بنی ہیں ان کا بھی گھر بن چکا، تو اچانک سمندر کے جی میں یہ آئی کہ ان کا عشق صادق کم از کم پختہ اور مشترکہ مزار کا مستحق ہے۔ چلو، ان کی لاشیں اگل دو۔ باقی سب کو تو ہضم کر گیا لیکن ان دونوں کو پیر کے روز ساحل پر پھینک دیا۔

پیر کو دریا کا سکون دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ کل بھی اسی زور کا طوفان تھا اور جہاں کشتی ڈوبی تھی، اسی جگہ کے قریب خشکی ہو گئی تھی۔ وہاں دو موم کی تصویریں پڑی تھیں۔ بیوی اپنے جان نثار شوہر سے لپٹی ہوئی۔ بال چہرے پر پریشان۔ مگر صورت سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سو رہی ہے۔ میاں کے چہرے پر سکون نہ تھا جس سے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ جوانمردانہ موجوں سے لڑتے لڑتے جان دی ہے اور جد و جہد کا نقش چہرے پر یادگار رہ گیا ہے ؎

شناورانِ محبت تو سینکڑوں ہیں مگر
جو ڈوب جائے وہ پکا ہے آشنائی کا

استنبول

مدت سے آرزو تھی کہ استنبول دیکھوں۔ آخر پوری ہوئی۔ اب تین ہفتے سے میں ہوں اور استنبول کی گلیاں۔ نہ وہ ختم ہوتی ہیں نہ میرا شوق۔ یورپ کے اکثر سیاحوں نے لکھا ہے کہ یہ شہر تو لاجواب ہے مگر اس کی گلیاں خراب ہیں۔ گلیوں میں صفائی کا انتظام ٹھیک نہیں۔ ان سے بدبو آتی ہے۔ ان میں قدم قدم پر کتے لیٹے رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ سہی۔ لیکن اگر انھیں اس شہر کی بے انتہا خوبیوں کی شناخت کے لیے آنکھیں دی گئی ہوتیں، تو وہ ان عیوب سے قطع نظر کر کے اس کے محاسن کو دیکھتے اور اب بھی کئی قدر شناس سیاحوں نے بے حد داد دی ہے۔ یہ عیوب عارضی ہیں۔ بہ نسبت سابق بہت کم ہو گئے ہیں اور اُمید ہے کہ دن بدن صفائی میں ترقی اور سڑکوں اور راستوں کی درستی پر زیادہ توجہ ہوتی جائے گی۔

دیکھنے کی جو چیز اس شہر میں ہے وہ یہ ہے کہ اس کے بانیوں نے اس کے لیے ایسا موقع ڈھونڈا ہے جس نے اسے سارے جہان کا انتخاب بنا دیا ہے۔ ایک طرف ایشیا اپنی قدامت کو سنبھالے کھڑا ہے اور دوسری جانب یورپ اپنی جدت طرازی پر اترا رہا ہے اور درمیان میں یہ استنبول ہے۔ گویا ایشیا کا یورپ سے ٹانکا ملا ہوا ہے۔ ایک طرف سے استنبول یورپ کی اقوام مختلفہ کا مرجع ہے اور دوسری طرف سے ایشیائی قومیں اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں خصوصاً ایشیا کی مسلمان اقوام کے لیے اس مقام کی قدرتی خوبیوں اور اس کے تجارتی فوائد کے سوا یہاں مذہبی کشش بھی ہے۔ مزید براں خود ملک کے اندر بھی مختلف مذاہب اور اقوام کی کمی نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ؎

جمگھٹا ہے اس میں ترک و فرس و روم و زنگ کا
یعنی گلدستہ ہے اک گلہائے رنگا رنگ کا

نصائح رفاعیہ

مجھے استنبول کے سفر میں جو صحبتیں نصیب ہوئیں ان میں سب سے گہرا نقش دل پر اس بزم منور نے چھوڑا جو محمد ابوالہدیٰ سردار طریقۂ رفاعی کے ہاں دیکھی گئی۔ یہ بزرگ تیس سال سے مقربین بارگاہ سلطانی میں ہیں اور دنیا کا زر و مال ہر وقت ان کے لیے حاضر ہے۔ اس پر تواضع اور حسن خلق کا نمونہ ہیں اور دن رات سوائے یاد حق اور تلقین شریعت کے کوئی شغل نہیں رکھتے۔ ان کے دیکھتے دیکھتے کئی مجلسیں بنیں اور کئی بگڑیں۔ کئی لوگ بڑھے اور کئی گرے۔ مگر انھیں کسی سے سروکار نہ رہا اور نہ ہے ؎

رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ

ایک دن انھوں نے مجھے ایک چھوٹا سا رسالہ اردو میں لکھا ہوا عنایت فرمایا جس میں طریقہ مبارکہ رفاعیہ کے سب سے بڑے مرشد حضرت سید احمد کبیر رحمۃ اللہ علیہ کے ایک سو اقوال کسی نے عربی سے ترجمہ کیے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اس نعمت سے اکیلا مستفید ہوں۔ اس لیے ارادہ رکھتا ہوں کہ اس رسالے کو شائع کر دوں۔ پیشتر اس کے کہ وہ رسالہ علیحدہ چھپے اور لوگ اس کے فیض سے بہرہ اندوز ہوں ان نصائح میں سے بعض، جو ہر مذہب و ملت کے اصحاب کے لیے یکساں دلچسپ ہیں، یہاں نقل کر دیتا ہوں کہ اہل نظر دیکھیں کہ حکمت

کہ کیسے کیسے دفتر ان مختصر فقروں میں بند کیے گئے ہیں:

۱۔ ہمارا طریق ہے نہ مانگیں، نہ پھیریں اور نہ جمع رکھیں۔

۲۔ دعویٰ تکبر کا نتیجہ ہے۔ دل اس کی برداشت نہیں کر سکتا اور اسے زبان کی طرف پھینک دیتا ہے۔ احمق زبان لے کے بیٹھتی ہے۔

۳۔ تھوڑا ادب اچھا ہے اس علم و عمل سے جس کے ساتھ ادب نہ ہو۔

۴۔ تیرا بھائی وہ ہے کہ تیرا نفس اس پر بھروسا کرے اور تیرے دل کو اس سے آرام ہو اور تجھ کو خدا سے باز نہ رکھے۔

۵۔ اللہ کے ساتھ رہ بہ صورت محافظت، خلق کے ساتھ بہ خیر خواہی لیکن نفس کے ساتھ بر سرِ پرخاش رہ۔

۶۔ اُمید کو تازہ کرنا زہد ہے نہ کہ کملی پہننا اور موٹا کھانا۔

۷۔ جس نے صبر کی زرہ پہنی، اشتاب کاری کے تیروں سے بچ گیا۔

۸۔ حق خاص و عام کے دلوں میں پوشیدہ ہے خواہ وہ حق پر ہوں خواہ باطل پر۔

۹۔ احوال کے محرابوں کی مرمت خیال کے ہاتھوں سے نہیں ہو سکتی۔

۱۰۔ بندۂ زر نہ خدا کا بندہ ہو سکتا ہے نہ خلقِ خُدا کا دوست۔

۱۱۔ مروت کے معنی یہ ہیں کہ اپنے نفس پر اس کی طاقت سے بڑھ کر بوجھ ڈالے۔

۱۲۔ جب علم کسی راہ میں منزل بناتا ہے تو عمل کو وہاں سے کوچ کرنا پڑتا ہے۔

۱۳۔ خوش خلقی فائدہ مند تجارت ہے، قناعت خزانہ ہے۔ دُنیا کی محبت میں گرفتار نہ رہنا آبرو ہے۔ توکل پناہ ہے اور عقل کشتیِ نجات۔

۱۴۔ عذاب کی تلخی گناہ کی شیرینی کو بُھلا دیتی ہے

۱۵۔ دانش مند کا چراغ کبھی گل نہیں ہوتا اور نہ اس کی آبرو کی پردہ دری ہوتی ہے۔

چند گھنٹے لورپول میں

سفرِ ترکی میں بے شمار اصحاب نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ میں نے انگلستان میں شیخ عبداللہ کوئلیم (شیخ الاسلام جزائر برطانیہ) سے بھی ملاقات کی یا نہیں اور اگر کی تو میری رائے ان کی نسبت کیا قائم ہوئی؟ یہی سوال جب سے میں ہندوستان آیا ہوں دہرایا گیا ہے۔ اس لیے اس مختصر سی ملاقات کا حال جو مجھے شیخ ممدوح سے ایک مرتبہ نصیب ہوئی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

میں نے لندن سے بعض معاملات کے متعلق شیخ عبداللہ کوئلیم سے خط و کتابت کی تھی اور اُنھوں نے مجھے دعوت دی تھی کہ لورپول جا کر ان کے ہاں ٹھہروں۔ لیکن اس کا موقع نہ ملا۔ ایک دفعہ میں اتفاق سے مانچسٹر میں مقیم تھا کہ ایک دن فرصت کا نکل آیا اور یہ معلوم ہوا کہ لورپول وہاں سے قریب ہے اور گاڑیاں بکثرت جاتی ہیں۔ اس موقع کو غنیمت جان کر میں روانہ لورپول ہوا۔ اتنا تو ضرور تھا

کہ بے اطلاع جاتا ہوں۔ خدا جانے شیخ ممدوح وہاں ہوں یا نہ ہوں یا انھیں فرصتِ ملاقات ہو یا نہ ہو۔ لیکن چونکہ دوسرے موقع کا ملنا غیر یقینی تھا، جانا ہی مناسب سمجھا۔ خوش قسمتی سے شیخ لورپول ہی میں تھے اور اپنے دفتر میں مل گئے اور جس اخلاق سے باوجود کم فرصتی کے اور باوجود کسی ملاقاتی کی آمد کے لیے تیار نہ ہونے کے وہ پیش آئے، اس کا ایک گہرا نقش میرے دل پر ہے۔

مجھے ان کے کاروباری دفتر کا پتہ معلوم تھا جہاں وہ سالسٹر کا کام کرتے ہیں۔ شہر کے کامیاب سالسٹروں میں ان کا شمار ہے اور ان کے وقت کا بیشتر حصہ اسی کام میں صرف ہوتا ہے۔ میں جب گیا تو وہ ابھی دفتر میں تشریف نہیں لائے تھے۔ ان کے آدمی نے مجھے وہاں بٹھایا اور کہا کہ ابھی آتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں وہ تشریف لے آئے اور میرا کارڈ دیکھتے ہی مجھے بلایا۔ خوش ہو کر تپاک کے ساتھ ملے مگر شکایت کی کہ میں نے انھیں پہلے سے مطلع کیوں نہیں کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ میرا آنا اتفاق ہو گیا اور میں بہت تھوڑے وقت کے لیے آیا ہوں۔ اس لیے اُسے اس آنے میں محسوب نہ کیا جائے جس کا وعدہ تھا۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ "میں اس وقت بھی خیر مقدم کرتا ہوں اور پھر آپ آئیں گے تو پھر کہوں گا۔ اور میری خواہش یہ ہے کہ آپ کم از کم دو تین دن کے لیے آئیں اور کوئی دن تعطیل کا درمیان ہو تو میں آپ کو جزیرہ میں لے چلوں جہاں میرا گھر ہے اور جہاں اب لورپول کا مختصر سا اسلامی مدرسہ یتیم خانہ بھی بغرض سہولت منتقل کر دیا گیا ہے میں خود اکثر وہاں چلا جاتا ہوں۔ وہ جگہ باعتبار صحت بخش آب و ہوا کے اس کارخانوں سے بھرے ہونے اور دھوئیں سے گھرے لورپول پر ترجیح رکھتی ہے۔"

میں نے بھی جزیرہ دیکھنے کا شوق ظاہر کیا اور کہا "میں کوشش کروں گا کہ پھر آؤں اور وہاں کی سیر کروں لیکن آج یہاں دو غرض سے آیا تھا۔ ایک آپ کی ملاقات، سو حاصل ہو گئی۔ دوسرے آپ کے اسلامی مشن کے کام کا جو حصہ یہاں نظر آ سکتا ہے اسے یا آپ کی معیت میں دیکھنا یا آپ کے کسی معتبر کے ساتھ جا کر دیکھنا۔" اُنھوں نے کہا "جو کچھ یہاں موجود ہے وہ میں خود ساتھ چل کر آپ کو دکھلاؤں گا اب یہاں صرف ہمارے مسلم انسٹی ٹیوٹ کی عمارت ہے۔ اس میں ایک بڑا کمرہ ہے جو لکچروں کے لیے ہال کا کام دیتا ہے اور جمعہ کے دن مسجد کا کام۔ اگر آپ جمعہ کے دن تشریف لائیں تو پچاس ساٹھ نمازیوں کی جماعت آپ کو ملے گی۔ ہمارے رجسٹروں پر نو مسلموں کی تعداد کئی سو تک پہنچ چکی ہے مگر ان میں سے بعض فوت ہو گئے۔ بعض کہیں دوسرے ملکوں میں چلے گئے۔ اب بھی کوئی تین سو کے قریب انگریز لورپول اور اس کے گرد و نواح میں ایسے ہیں جو ہماری جماعت میں شامل ہیں۔ ان میں سے جو جمعہ کے دن شہر میں ہوتے ہیں وہ نماز جمعہ میں شریک ہو جاتے ہیں مگر لکچر کا دن اتوار کا ہے۔ اس دن زیادہ مجمع ہوتا ہے اور لکچروں کے سننے کے لیے عیسائی بھی آتے ہیں اور بارہا یہ ہوا ہے کہ وہ لکچروں سے متاثر ہو کر رفتہ رفتہ مائل بہ اسلام ہو گئے ہیں۔"

میں نے سوال کیا "یہ تو فرمائیے کہ آپ جب اشاعت اسلام کرتے ہیں یا فرائض اسلام ادا کرتے ہیں تو اب بھی لوگ آپ پر اینٹ پتھر پھینکتے ہیں یا نہیں جیسے پہلے دنوں میں کیا کرتے تھے؟"

جواب دیا "اب وہ نوبت نہیں لیکن پھر بھی کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ لوگوں کا تعصب ابھی دُور نہیں ہوا۔ گو ابتدا میں جو ہجوم ہوتا تھا اور جو اذیتیں ہمیں دی جاتی تھیں۔ ان سے نسبتاً امن ہے۔ میں بھی حتی الوسع احتیاط سے کام لیتا ہوں اور انھیں خواہ مخواہ چھیڑ کا موقع نہیں دیتا (اپنی انگریزی ٹوپی کی طرف اشارہ کر کے) دیکھئے میں عموماً یہی ٹوپی اوڑھتا ہوں اور روزانہ ان لاکھوں انگریزوں میں مل

جاتا ہوں جو شہر کے کوچہ و بازار میں ہوتے ہیں اور جن سے کوئی غرض نہیں کرتا۔ کون جانتا ہے کہ یہ کوئیلم جا رہا ہے اور بہت سے کوئیلم جاننے والے ایسے بھی ہوں گے جو یہ نہیں جانتے کہ یہ عبداللہ کوئیلم ہے۔ ابتدا میں لوگوں نے میرے کام میں خلل ڈالنے کی کوشش کی تھی یہ کہہ کر کہ اس شخص کے حواس میں خلل آ گیا ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے۔ جب میں نے کوشش اور محنت سے یہ ثابت کر دکھایا کہ سالیسٹری کے کام کے لیے میں وہی کوئیلم ہوں جو اسلام قبول کرنے سے پہلے تھا تو کاروبار کی پہلے کی سی حالت قائم ہو گئی۔ اب میں اپنی اسلامی وردی صرف جمعہ کے دن پہنتا ہوں اور باقی دنوں میں مثل اور لوگوں کے رہتا ہوں۔"

لورپول جانے سے پہلے میں نے شیخ کی ایک تصویر ترکی علما کے لباس میں دیکھی تھی اور یہی ان کی وقت نماز کی وردی ہے۔ شاید اس جبے اور لمبے لباس کی وجہ سے ہوگا کہ وہ خاصے قد آور معلوم ہوتے تھے مگر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ آپ کا قد چھوٹا ہے۔ ان کی صورت زیادہ تیزی کا پتہ نہیں دیتی مگر آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی ہے۔ ان کا روزمرہ کا لباس انگریزی مذاق کے اعتبار سے بہت سادہ ہے اور وہ باوجود خوشحالی کے قریب قریب درویشانہ زندگی بسر کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی گفتار میں بھی وہ بات نہیں جو ان کی تحریروں میں پائی جاتی ہے گو طلاقت زبان معمولی گفتگو میں بھی موجود ہے۔ ان کا تلفظ اور لہجہ اس علاقے کے تلفظ اور لہجے سے مختلف ہے چنانچہ مانچسٹر اور لورپول وغیرہ میں ایسے الفاظ کو جن میں حرف با فتح پڑھا جاتا ہے، با لضم بولتے ہیں۔ مثلاً کپ (پیالہ) کو "کُپ" اور فن (ہنسی۔ تماشا) کو "فُن" کہتے ہیں اور ہمارے شیخ کوئیلم بھی اس تلفظ کے عادی ہیں۔

دفتر میں کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد شیخ مجھے ایک ہوٹل میں کھانا کھلانے لے گئے۔ کھانے پر مختلف اسلامی مضامین کے متعلق باتیں ہوتی رہیں جن سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ شیخ کا دل حقیقت میں نور اسلام سے منور ہے۔ وہ جو خدمت اسلام کی وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں، خلوص سے کرتے ہیں۔ اگر ان کو سلطان ترکی کی طرف سے کچھ امداد ملتی ہے یا وہاں ان کی خدمات کی قدر کی گئی ہے تو یہ ان کی خوش قسمتی اور سلطان کی بیدار مغزی ہے مگر میرے نزدیک یہ امداد یا قدردانی ان کی مساعی کا باعث نہیں ہے بلکہ ان کی مساعی ان کے دلی عقیدے کا نتیجہ ہیں اور یہی وہ رائے تھی جو میں نے ان لوگوں کو دی جنھوں نے جا بجا شیخ کی نسبت مجھ سے استفسار کیا۔ یہ بھی بیان کیا کہ شیخ عبداللہ کوئیلم کے پکے مسلمان ہونے کی ایک اور شہادت بھی مجھے ملی ہے جو قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ مجھے لندن میں ان کے چھوٹے صاحبزادے مسٹر بلال کوئیلم سے ملنے کا اتفاق ہوا جو باپ کے پیشے کی سند حاصل کرنے کے لیے لندن میں پڑھتے ہیں۔ اول تو اس نام سے ہی پیغمبر اسلام کی محبت ٹپکتی ہے۔ دوسرے ان کی تقریر جو اسلام کے متعلق سنی تو جی خوش ہو گیا اور معلوم ہوا کہ باپ نے خاص توجہ سے بیٹے کو اپنے مذہب سے آگاہ کیا ہے اور یہ بات بغیر خلوص کے ممکن نہیں۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم پہلے مسلمانان لورپول کی قبریں دیکھنے گئے۔ کوئی پچیس تیس قبریں ہوں گی جو وہاں کے عیسائی قبرستان کے ایک گوشے میں بنی ہوئی ہیں اور دیگر قبروں سے الگ نظر آ رہی ہیں کیونکہ قبلے کے لحاظ کی وجہ سے ترچھی بنی ہیں اور دوسری قبروں کی سیدھ میں نہیں۔ شیخ نے سنایا کہ وہاں مسلمانوں کو دفن کرنے کے متعلق بہت جدوجہد کا سامنا ہوا تھا اور بہت جھگڑے کے بعد وہ زمین جس میں انگلستان کے ان اولین مسلمانوں کی قبریں بنی ہیں مسلمانوں نے مول لی تھی۔ یاد رفتگان سے شیخ کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں۔ کیونکہ ان سونے والوں میں سے بہت سے ان کے رفیق دوست تھے جنھوں نے ابتدائی تکالیف کے مقابلے میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ آخر ہم نے فاتحہ

کے لیے ہاتھ اٹھائے کہ خدا ان مبارک ارواح پر رحمت فرمائے۔

قبرستان سے ہم انسٹی ٹیوٹ کی طرف آئے۔ مختصر سی عمارت ہے جو موجودہ ضروریات کے لیے کافی ہے۔ اس عمارت کا ایک حصہ مسجد ہے۔ داخل ہوتے ہی دفتر کا کمرہ ہے۔ اس کے آگے ہال کا بڑا کمرہ۔ ہال میں کوئی تصویریں یا دیگر آرائش نہیں۔ صرف ایک چبوترہ تقریر کے لیے بنا ہے اور نیچے کرسیاں رکھی ہیں۔ نماز کے وقت کرسیاں اٹھا دی جاتی ہیں۔ چبوترہ کے ساتھ کی دیوار پر جلی حروف میں امیر عبدالرحمٰن خاں مرحوم کے گراں بہا عطیہ کا ذکر ہے جو پرنس نصراللہ خاں کے ہاتھ لورپول کی اسلامی جماعت کو دیا گیا تھا۔ اوپر کے کمرے اس وقت خالی پڑے ہیں یا ان میں بنچیں کرسیاں وغیرہ رکھی ہیں۔ پہلے وہاں مدرسہ کی جماعتیں تھیں۔ اور ایک کمرہ امام مسجد کو ملا ہوا تھا جو وہیں رہتا تھا۔ کچھ عرصہ تک بعض انگریزی دان ہندوستانی مسلمان اس خدمت پر مامور رہے مگر آج کل کوئی آدمی اس مطلب کے لیے مقرر نہیں۔

انسٹی ٹیوٹ دیکھنے کے بعد میں شیخ سے رخصت ہونے کو تھا مگر ان کی مروت نے اجازت نہ دی۔ انھوں نے کہا کہ چند منٹ اور آپ کی صحبت میں گزار سکتا ہوں۔ یہ کہہ کر میرے ساتھ ریل تک پہنچانے آئے۔ راستہ میں لورپول کا بڑا بازار اور ٹاؤن ہال بھی انھوں نے مجھے دکھایا اور اس کے بعد پھر لورپول آئے اور ان کے ہمراہ ان کے مکان پر چلنے کی تاکید کر کے رخصت ہوئے۔

(مرتب: محمد عبداللہ قریشی)

ظفر علی خاں

ولادت : ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۰ء)
وفات : ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء

خاکِ درِ رسولؐ کے ذرّوں سے جا کے پوچھ لو
گر ہو سراغ ڈھونڈنا تم کو مرے مکان کا
ہے عربی حسب مرا اور عجمی نسب مرا
اس سے زیادہ فخر کیا ہو میرے خاندان کا

طالب علمی کا زمانہ

میں جن دنوں پٹیالہ میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا تو ایک رنگین مزاج اُستاد مکھن لال نامی مجھے پڑھایا کرتے تھے۔ یہ استاد صاحب افیمی تھے اور باری باری لڑکوں سے افیم کی چسکی لیا کرتے تھے۔ ہر لڑکا اپنی باری آنے پر دو آنے کی افیم لا دیتا تھا۔

ایک دن مکھن لال صاحب افیم کی چسکی لے کر عجیب ترنگ میں آئے۔ فرمانے لگے: "دیکھو لڑکو! میں ایک مصرع بولتا ہوں جو لڑکا دوسرا مصرع کہہ کر شعر پورا کر دے گا۔ اسے ایک چسکی معاف ہوگی۔"

مصرع یہ تھا۔ ؏

واہ رے بے نظیر مکھن لال کیا زباں میں تری طلاقت ہے

لڑکے خاموش تھے، اچانک میرے منہ سے نکلا ؎

ایڑیاں بھی ہیں تیری لمبی سی ٹھنگڑیوں میں بھی تیری طاقت ہے
تُو تو ہوتا کہیں کا چپراسی یاں پڑھانا تیری حماقت ہے

کمرہ دبے دبے قہقہوں سے گونج اُٹھا۔ مکھن لال زندہ دل آدمی تھا۔ اس کے مصرع کے جواب میں دو مصرعے حاضر تھے۔ خوش ہوا اور بولا:

"ظفر علی کسی روز بڑا شاعر بنے گا۔ بس دو چسکیاں معاف۔"

میں نے بچپن میں مختلف اسکولوں میں تعلیم پائی۔ پانچویں اور چھٹی جماعت علی گڑھ میں پاس کی، آٹھویں مشن ہائی اسکول وزیرآباد سے میٹرک کا امتحان الٰہ آباد اور پنجاب ہر دو یونیورسٹیوں سے پاس کیا۔

میرے والد سراج الدین خاں کشمیر کے محکمہ ڈاک میں ایک اچھے عہدے پر کام کرتے تھے۔ بعد میں وہ ریاست کے پوسٹ ماسٹر جنرل بھی رہے ہیں۔

گلمرگ کا واقعہ ہے۔ ایک دن میں ڈاک خانہ کے باہر ایک بنچ پر بیٹھا تھا کہ ایک انگریز کیپٹن گھوڑے پر سوار وہاں آیا۔ ڈاک خانہ کے سامنے وہ گھوڑے پر سے اترا اور پکار کر کہنے لگا:

"ہے چھوکرا! اس کا لگام پکڑو، ہم ابھی آتا ہے۔"

میں نے تنک کر جواب دیا:

"میں تمھارا بال گیر نہیں جو لگام پکڑ کر کھڑا رہوں۔"

کیپٹن بہت لال پیلا ہوا اور اس نے ریاست کے انگریز ریذیڈنٹ سے شکایت کی کہ ڈاک خانہ میں ظفر علی نامی لڑکے نے میری توہین کی ہے۔ مختصر یہ کہ والد صاحب نے کہہ سن کر معاملہ رفع دفع کرا دیا۔

ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم میرے ہم جماعت تھے۔ مولانا شوکت علی مجھ سے ایک جماعت آگے تھے اور مولانا محمد علی ایک جماعت پیچھے۔

میری شادی بارہ برس کی عمر میں ہو گئی تھی۔ جب بیوی گھر میں آئی تو میں ایک مدت تک یہی سمجھتا رہا کہ یہ کوئی مہمان لڑکی آئی ہے۔ کم عمری میں والد صاحب کے ساتھ کشمیر کے دورے پر جایا کرتا تھا تو نماز کے وقت برف توڑ کر اس سے وضو کیا کرتا تھا۔

ایک دفعہ حیدرآباد میں ایک ہمسائے کے لڑکے نے ایک مندر کے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی۔ وہ کالا سوٹ سلوانا چاہتا تھا اور اس کے والدین اسے سلوا کر نہیں دیتے تھے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اسے بچانے کے لیے کنوئیں میں کود پڑا۔ لوگ جمع ہو گئے اور ایک رسہ لٹکایا گیا۔ پہلے مجھے اوپر کھینچنے لگے۔ ابھی میں نصف اونچائی پر آیا ہی تھا کہ رسہ ٹوٹ گیا اور میں دھڑام سے نیچے گر گیا اور سخت چوٹیں آئیں۔ پھر نئے سرے سے رسہ ڈال کر ہم دونوں کو نکالا گیا۔

بچپن میں مجھے کبڈی اور کرکٹ کا بہت شوق تھا لیکن یہ شوق بچپن کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔

ایک دفعہ ہم دو چار ہم جماعتی علی گڑھ سے آگرہ جا رہے تھے کہ ہمارے ڈبے میں ایک مارواڑی سیٹھ سوار ہو گیا۔ رات کا وقت تھا۔ اوپر کی سیٹ پر چڑھ کر سو رہا۔ خراٹے لینے لگا تو ہمیں وحشت ہوئی۔ جی میں آیا کہ جگا دیں۔ دیکھا کہ ایک ٹوکری جس میں لڈو ہیں اس کی برتھ کے نیچے کی طرف لٹک رہی ہے۔ نیچے کے برتھ پر میرا بستر تھا۔ شوکت علی اور میں نے ہاتھ بڑھا کر لڈو نکالنے شروع کیے۔ خواجہ غلام الثقلین اور میر محفوظ علی بدایونی ہم چار تھے۔ آن واحد میں ٹوکری چٹ کر دی اور سو گئے۔ دن چڑھے آگرہ آ گیا۔ سیٹھ صاحب ابھی تک برتھ پر دراز تھے۔ ہم نے جلدی جلدی سامان لپیٹا اور لپکے لپکے ڈگ بھرتے ہوئے باہر نکل گئے۔ کئی دفعہ پیچھے مڑ کر دیکھا کہ سیٹھ تعاقب تو نہیں کر رہا۔ لیکن خیریت گذری۔ اب شوکت علی ملتے ہیں تو اس واقعہ کی یاد دلاتے اور کہتے ہیں

کہ ”جاؤ ظفر علی خاں لڈو کھلاؤ گے؟“

مصائب کا ہجوم

آج سال کا پہلا دن ہے اور ہر شخص اپنے اپنے مقدر اور اپنے اپنے نصیب کے لحاظ سے سنہ ۱۹۱۰ء کے نوروز سے بہرہ اندوز ہے۔ پچھلے سال جن کی زندگی کا دور کل شام کو ختم ہوگیا، جو لوگ غم روزگار سے فارغ رہے، آج کا دن ان کے لیے روز عید سے کم نہیں۔ وہ صبح سویرے نئی اُمنگوں اور نئے ولولوں کے ساتھ بستر خواب سے اُٹھے اور اُمیدوں کا ایک لہلہاتا ہوا مرغزار حد نگاہ تک اپنے سامنے پھیلا ہوا پاکر نئے سال کی منزل کو راحت و اطمینان سے طے کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔ لیکن ایک طبقہ ایسے برگشتہ بخت لوگوں کا بھی ہے جن کے لیے کلک ازل نے سنہ ۱۹۰۹ء کی لوح پر بجز مصائب و نوائب کی بوقلمونی اور افکار و آلام کی گوناگونی کے اور کوئی نقش نہ کھینچا تھا۔ جن کے واسطے اگر ایک طرف فکر معاش سوہان روح ہو رہی تھی تو دوسری طرف اعزا و اقربا کی دائمی مفارقت داغ جگر بن رہی تھی۔ غرض جن کے مال، جان، عزت، آبرو سبھی پر پے بہ پے آفتیں آتی رہیں ؎

جام مے و خون دل ہر یک بہ کسے دادند
در دائرۂ قسمت اوضاع چنیں باشد

حیدرآباد سے اخراج

ہمارا شمار طبقہ ثانی الذکر کے لوگوں میں ہے۔ پریشانی و مصیبت اور غم و الم کا کوئی ایسا خطرہ نہ تھا جس سے سنہ ۱۹۰۹ء کے فلک نے ہمیں زخمی نہ کیا ہو۔ ۹ اکتوبر سنہ ۱۹۰۹ء کو ہماری قسمت نے دفعتۃً پلٹا کھایا یعنی مشیت ایزدی عتاب سلطانی کی شکل میں ظاہر ہوئی اور ہم اپنے آقائے ولی نعمت حضور آصف جاہ سادس خلد اللہ ملکہ و افاض علی العالمین برہ و احسانہٗ کے فرمان واجب الاذعان کو نوشتہ تقدیر سمجھ کر دل میں بہت سے ارمان اور حسرتیں لئے ہوئے اس سرزمین سے رخصت ہوئے جسے تیرہ سال سے ہم نے اپنا وطن ثانی سمجھ رکھا تھا جس کے در و دیوار سے ہمیں بوئے مہر و محبت آتی تھی اور جس کی اُلفت کا سودا اس وقت تک سر میں ایسا سمایا ہوا ہے کہ مرتے دم تک نہ نکلے گا۔ حیدرآباد دکن کو خیرباد کہتے وقت جو کیفیت ہمارے قلب پر طاری ہوئی، اس کا اندازہ ناخن اس وقت کرسکتا ہے جب وہ گوشت سے جدا ہو رہا ہو۔ تیرہ سال کا بنا بنایا گھر آن کی آن میں اُجڑ گیا۔ دیرینہ صحبتوں کی وہ شمع جسے ایک عمر کی مہر افروزی نے روشن کیا تھا، باد حوادث کے ایک جھونکے سے بجھ گئی ؎

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدیم و بہار آخر شد

لیکن ہم عسیٰ ان تکرھوا شیئا و ھو خیر لکم کے ارشاد پاک کو اس افتاد کی کلید سمجھ کر جو ہم پر پڑی تھی اور ان بداندیشوں کے معاصی کو جن کی معاندانہ دراندازیوں سے ہم اس حال کو پہنچے تھے، ان کے مقتضائے طبیعت پر محمول کر کے

اس توشہ کے ساتھ، جو ہمارے ضمیر کی پیروی نے ہمارے ہمراہ کر دیا تھا، ہم پھر کر وہیں آ گئے جہاں سے چلے تھے۔ وہ خدا جس نے اپنی مخلوقات کے لیے رزق کا اگر ایک دروازہ بند کر رکھا ہے تو ہزار دروازے کھول رکھے ہیں۔ اگرچہ ہماری روزی کا کفیل تھا لیکن ہمارے آقائے ولی نعمت نے جن کی خلق الٰہی کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے کہ وہ اپنے غلاموں کو، خواہ ان کی خطا کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، فاقہ کشی کی سزا کبھی نہیں دیتے، ہم کو بھی اپنے فیضانِ عام سے محروم نہ رکھا اور عمر بھر کے لیے ہمارا معقول وظیفہ مقرر کر دیا باقی رہی ہماری گنہگاری یا بے گناہی، سو اس کا فیصلہ ایک نہ ایک دن زمانہ خود کرے گا۔ اس لیے کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خان خلد اللہ ملکہم کے ضمیر منیر سے کوئی بات زیادہ مدت تک پوشیدہ نہیں رہ سکتی ؎

داد خواہے را کہ می خواہد ز سلطان داد خود
انتظار با امداد یاری می باید کشید

حیدرآباد دکن کو الوداع کہنے اور ان گوناگوں زیر باریوں کے برداشت کرنے کے بعد جنھوں نے ہمارا دیوالہ نکال دیا ہم یہ سمجھتے تھے کہ ہماری پریشانیوں اور مصیبتوں کا دور ختم ہو گیا اور اگرچہ اب ہمیں اپنی کتاب زندگی کا ایک نیا ورق الٹ کر ایک ایسی سرزمین میں جو باوجود یگانہ ہونے کے پھر بھی ایک طرح بیگانہ تھی دنیا میں عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہنے کے لیے از سرِ نو جدوجہد کرنی پڑے گی۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد ہم اطمینانِ قلب اور جمعیتِ خاطر کے ساتھ ان مشاغل میں مصروف ہو سکیں گے جن سے ہماری طبیعت کو مناسبت تھی۔ بزرگانِ وطن نے ہمارے آنے پر جس حوصلہ افزا طریقے سے اپنی عنایات کا اظہار کیا، وہ ہماری امیدوں سے بہت بڑھ کر تھا اور قومی خدمت گزاری کے جس میدان کو ہم نے اپنے سامنے پھیلا ہوا پایا۔ اس کی وسعت ہماری کوششوں اور قابلیتوں کی حدود سے بہت زیادہ متجاوز تھی۔ اسی لیے ہم نے لاہور میں طرح اقامت ڈالی اور بہت سے علمی و عملی منصوبے ذہن میں قائم کرنے شروع کیے۔ پنجاب کے ایک کالج نے پروفیسری کی خدمت ہمیں دینی چاہی۔ دو سربرآوردہ اور کثیر الاشاعت اخبار کے مالکوں نے اپنے اخبارات کا اہتمام ایک گراں قدر مشاہرہ پر ہمارے نام تفویض کرنا چاہا۔ ریاست اندور میں ایک معزز خدمت ہمارے لیے تجویز ہوئی مگر ہم نے یہ سوچ کر کہ جو شخص ایک دفعہ آصف جاہ سادس کی سلک ملازمت میں منسلک ہو چکا ہو، اُسے صرف خلق خدا ہی کی خدمت گزاری زیب دے سکتی ہے۔ ان تمام عنایت آمیز دعوتوں کو شکریہ کے ساتھ رد کر دیا اور اپنے منصوبوں کو بروئے کار لانے کی ادھیڑ بن میں لگ گئے۔ لیکن ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ ہماری مصیبتوں کا پیالہ ابھی لبریز ہو کر چھلکا نہیں اور ہم نہ جانتے تھے کہ امتحان الٰہی ابھی ختم نہیں ہوا ہے

نومیدی ما گردش ایام ندارد
روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد

والد کا انتقال

۶ر دسمبر ۱۹۰۹ء کی صبح ہمارے لیے صبح قیامت بن کر طلوع ہوئی۔ یعنی قبلہ و کعبہ جناب مولوی سراج الدین احمد خاں صاحب

کا سایہ ہمارے سر سے ہمیشہ کے لیے اُٹھ گیا۔ مال کا نقصان ہماری جیبوں کی طاقت برداشت سے بڑھ کر ہو چکا تھا۔ آبرو پر بھی اس حد تک جو خفتانے وقت تھی، حرف آ چکا تھا۔ اب لے دے کر ایک جان حزیں باقی رہ گئی تھی، اس کے خرمن پر بھی قضا کی بجلی گر گئی اور وہ شخص جس کا وجود قوم کے ایک بہت بڑے طبقہ کے لیے آیۂ لطف و رحمت اور ملک کے ایک بہت بڑے حصہ کے لیے دلیل خیر و برکت ہونے کے علاوہ ہماری آزادیوں اور فارغ البالیوں کا کفیل اعظم تھا، مٹی میں جا ملا ؎

من میہماں و چرخِ سیہ کاسہ میزباں
دُردی خورِ بلا کم و تلخابہ نوشِ یاس

جن خاندانی اور قومی ذمہ داریوں کا بوجھ یک بیک اس جانفرسا سانحہ نے جس کے لیے ہم تیار نہ تھے، ہمارے کندھوں پر لاد دیا ہے، وہ گراں وزنی میں اس بار امانت سے کسی طرح کم نہیں جس کی تاب ارض و سما بھی نہ لا سکے تھے۔ خدا ہی ہے جو ہم اس کے حق برداشت سے پوری طرح عہدہ برآ ہو سکیں۔

زمیندار کی نشاۃ الثانیہ

ہماری خاندانی ذمہ داریوں سے تو خیر بیرونی دُنیا کو چنداں دلچسپی نہ ہو سکتی ہے اور نہ ہونی چاہیے لیکن جو قومی ذمہ داریاں مرحوم نے ترکہ کے طور پر ہمارے لیے چھوڑی ہیں، ان میں اخبار "زمیندار" کا جاری رکھنا اہمیت کے بہت سے پہلو لیے ہوئے ہے۔ اس لیے کہ اس اخبار کی بقا کے ساتھ اس تحریک کی نشوونما وابستہ ہے جو مرحوم کی ہفت سالہ شبانہ روز کوششوں نے قوم کے سب سے زیادہ زبردست مگر ساتھ ہی سب سے زیادہ بے زبان اور کس مپرس طبقہ کے دلوں میں پیدا کر دی تھی۔ جان آفریں کو جاں سونپنے سے پہلے مرحوم نے اپنے چند باقی ماندہ انفاس اگر کسی خواہش کی نذر کیے تو وہ خواہش یہی تھی کہ جس پودے کو انھوں نے اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا وہ مرجھا نہ جائے یعنی زمیندار ان کے بعد بھی اپنے قومی اور ملی فرائض کی بجا آوری میں مشغول رہے۔ اس آخری وقت میں جب کہ ہمیں مرحوم کی غلامی کی وہ سعادت میسر ہوئی جو زور بازو سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتی اور جس کے لیے ہم خدائے بخشندہ کی توفیق و تائید کے رہین احسان ہیں۔ مرحوم نے اگرچہ یہ بھی فرمایا کہ اگر خود زمیندار کی ایڈیٹری نہ کر سکو تو کسی دوسرے شخص کے سپرد اس کام کو کر دینا جس کے دل میں قوم کا درد موجود ہو اور جو زمینداروں کی خدمت گزاری کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہو۔ لیکن ان کی حسرت زدہ نگاہ ان کے دل کی ترجمانی اس طرح کر رہی تھی کہ ؎

باغباں چوں من زیں جا بگذرم حرامت باد
گر بجائے من سروے غیر دوست بنشانی

اسی لیے ہم آج سے "زمیندار" کا اہتمام اپنے ذمے لیتے ہیں اور اگرچہ سنہ ۱۹۰۹ء کے ثلث آخر کی مصیبتوں اور تباہیوں کا کالا بادل اب تک ہمارے سر پر چھایا ہوا ہے لیکن اس گھٹا ٹوپ میں لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ کی دل افروز شعاعیں بھی رہ رہ کر اپنی جھلک دکھا رہی ہیں۔ جناب باری کے اس رحمت آفریں ارشاد کے علاوہ ان بے شمار احباب اور معاونین و بہی خواہانِ زمیندار کی غم گسارانہ

تحریریں بھی ہماری مزید تقویت اور حوصلہ افزائی کا موجب ہوئیں جنہوں نے اس سانحۂ جانکاہ پر ہم سے یکجہتی اور بے لوث ہمدردی کا اظہار فرماتے ہوئے یہ اُمید ظاہر کی کہ زمیندار برابر جاری رکھا جائے گا کہ مرحوم کی اس سے بہتر یادگار اور کوئی نہیں قائم کی جا سکتی۔ ہم ان تمام دوستوں اور بزرگوں کا ان کی عنایت آمیز ہمدردی کے لحاظ سے اگرچہ فرداً فرداً شکریہ بذریعہ خطوط ادا کر چکے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ زبان و قلم ان کے شکر سے عہدہ برآ ہونے کی مقدرت کسی طرح نہیں رکھتی ؎

آنکہ بہ پرسش آمد و فاتحہ خواند و می رود
گو نفسے کہ روح را میکنم از پئش رواں

زمیندار کا نصب العین

زمیندار کے اجراء سے جیسا کہ اس کے گزشتہ ہفت سالہ فائل گواہ ہیں، قبلہ مرحوم کا منشا بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ زمینداروں کے طبقہ کو اس عام تمدنی چل چل میں حصہ لینے کے قابل بنایا جائے جو مغربی ممالک کی تو خیر ایک مدت مدید سے رائج و رواں ہی ہوئی ہے لیکن جس کی ایک زبردست لہر نے مشرق الاقصیٰ سے اُٹھ کر تمام ایشیا کو چھا لیا ہے اور جو دولت علیہ برطانیہ کے ایثار فراواں و حکومت ہند کی تائید سے ہندوستان کے بے شورہ زار خطہ کو بھی اپنے فیوض سے سیراب کرنے لگی ہے۔ مرحوم کی خواہش تھی کہ زمیندار جن کی جہالت ضرب المثل ہے، دُنیا کے حالات سے باخبر ہوں اور قومیت کے ان حقوق کا احساس کرنے لگیں جو انھیں لارڈ کرزن کے قول کے مطابق ہندوستان کی ریڑھ کی ہڈی ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں۔ ایسی خواہش کی تکمیل کچھ ہنسی کا کھیل نہ تھی۔ اس کے لیے ضرورت تھی بہت بڑے سرمایہ کی جو نقصان کی تاب لا سکے۔ اس کے لیے حاجت تھی بہت بڑے دل گردہ کی جو شماتت ہمسایہ کے اثر سے محفوظ رہ سکے۔ اس کے لیے درکار تھا وہ حوصلہ جو سرکار کے بعض غیر مآل اندیش و غیر ذمہ دار عہدہ داروں کی گھُرکیوں سے بالا ہو۔ اس کے لیے مطلوب تھا وہ خوف خدا جو خطابات کی نمائشی عزت کے مقابلہ میں قومی خدمت کی حقیقی آبرو کو زیادہ تر قابلِ وقعت سمجھتا ہو۔ ان سب باتوں میں سے زمیندار کے اجراء کے وقت جسے مرحوم نے اپنی مدعا براری کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھا۔ مرحوم کے پاس ایک سرمایہ تو نہ تھا لیکن باقی تمام اوصاف بوجہ الکمال موجود تھے۔ وہ ہمیشہ فرمایا کرتے ؎

ہمت بلند دار کہ نزد خدا و خلق　　باشد بقدر ہمت تو پایگاہ تو

غرض انھوں نے اخبار نکالا اور دھڑلے سے نکالا۔ ملک اور قوم کی جو خدمت زمیندار نے کی ہے۔ اس پر اس کے گزشتہ کالم گواہ عادل ہیں۔ سرمایہ کی کمی کی وجہ سے جو قرض اخبار کے چلانے میں مرحوم پر ہو گیا تھا، اسے مرحوم نے اپنی جائداد واقع نو آبادی نہر چناب کو اٹھارہ ہزار روپیہ میں بیچ کر چکایا اور جب ان کی آنکھیں بند ہوئیں تو آمد و خرچ مشکل سے برابر پایا گیا۔ دوسرے اخبار نویس مالی اعتبار سے کامیاب ہوتے ہوں تو ہوں، زمیندار اپنے ہم نام طبقہ کے لوگوں کی طرح ہمیشہ فاقہ مست ہی رہا ؎

جز سیم قلب ہیچ نشد حاصلے ہنوز
تو می دریں خیال کہ اکسیر می کنند

لیکن زمیندار جاری کرنے سے جو اصلی مقصد مرحوم کے پیش نظر تھا۔ وہ بڑی حد تک پورا ہو گیا اور وہ یہ حسرت اپنے ساتھ نہیں لے گئے، کہ ان کی کوششیں بار آور نہیں ہوئیں۔ زمینداروں میں، جن کی خدمت گزاری کے لیے مرحوم نے اپنی عمر کا آخری حصہ وقف کر رکھا تھا، اپنے ملک کے دوسرے طبقوں کی طرح بیداری کے آثار پیدا ہو چکے ہیں اور وہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ ملک کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہونے کے اعتبار سے انھیں بھی بعض حقوق حاصل ہیں جو انھیں ملنے چاہئیں اور جن کے مطالبہ کے لیے انھیں ایک شفیق اور عادل گورنمنٹ کے دروازہ پر دستک دینی چاہیے۔ یہ احساس ایک بہت بڑی حد تک مرحوم ہی کا پیدا کیا ہوا ہے ؎

گریہ شام و سحر شکر کہ ضائع نگشت
قطرہ باران او گوہر یکدانہ شد

اگر مرحوم کی قومی خدمات اس قابل ہیں کہ ان کے لحاظ سے مرحوم کی یادگار قائم کی جائے۔ اگر اس یادگار کی بہترین شکل نہ صرف مرحوم کی روح کے لیے سرمایۂ اطمینان جاودانی بہم پہنچانے بلکہ ایک بہت بڑی قومی ضرورت پورا کرنے کے خیال سے یہ ہو سکتی ہے کہ اخبار زمیندار کو قائم اور جاری رکھا جائے تو کیا ہم ان حضرات سے جنھیں اس تجویز سے اتفاق ہو (اور ہم جانتے ہیں کہ ایسے اصحاب کی تعداد بہت بڑی ہے) یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ ہمیں اس پاک یادگار کے قائم کرنے اور اسے برقرار رکھنے میں مدد دیں گے۔ یہ توقع صرف اسی صورت میں پوری ہو سکتی ہے جبکہ معاونین کرام اس اخبار کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھیں اور ہمیں اپنا ایک ادنیٰ خادم تصور فرما کر جس کے سپرد محض اس کا انتظام کیا گیا ہے اس کی بقا اور ترقی کے لیے اسی طرح ساعی ہوں گے کہ گویا وہ خود انھیں کا اخبار ہے۔

ع۔ ا۔ م

ہم اپنی طرف سے کوشش کریں گے کہ ان مقاصد کو پیش نظر رکھ کر جو اس کے اجرا کے محرک اولیں تھے۔ زمیندار کو اس شان کے ساتھ چلائیں کہ وہ ہر مذاق کے ناظرین کے لیے موجب افادہ و تفریح ہونے کے علاوہ اپنے آپ کو گورنمنٹ کا ایک وفادار اور مخلص مشیر اور رعایا کی خواہشوں اور آرزوؤں کا ایک صحیح ترجمان اور ملک و ملت کے حقوق کی حمایت و حفاظت کا ایک مضبوط ذریعہ ثابت کرے۔ ہماری یہ کوشش ہوگی کہ اس اخبار کی حیثیت محض ایک مقامی اخبار کی نہ ہو بلکہ یہ ہندوستان کا ایک ہمہ گیر اخبار ہو جس میں صوبہ پنجاب کے اغراض و مقاصد کی حفاظت کا خصوصیت کے ساتھ لحاظ رکھنے کے علاوہ جو ایک قدرتی بات ہے۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں کی ضروریات سے بھی بحث ہو۔ ہندوستان کی مختلف قوموں اور فرقوں کے مابین اتحاد قائم رکھنے کا اصول ہمیشہ ہمارا نصب العین ہوگا۔ ہمارے کالم ہر قسم کے تمدنی، معاشرتی، روحانی، اخلاقی و علمی مضامین نظم و نثر کے لیے کھلے رہیں گے۔ ہم ملک کے مشاہیر اہل قلم کے رشحات ادب سے اس اخبار کے صفحات کو سیراب کرنے میں ہر وہ کوشش جو ممکن ہوگی، عمل میں لائیں گے اور طول و عرض ملک میں یا تو خود دورہ کر کے یا کسی ایسے شخص کو اس خدمت پر مامور کر کے جس کی قابلیت اور اہلیت پر ہمیں پورا بھروسہ ہو، نہ صرف ہر حصہ کے حالات میں تفحص سے کام لیں گے اور زمیندار کے حلقہ اثر کو وسیع کرنے میں ساعی ہوں گے بلکہ مسلم الثبوت انشا پردازوں اور نکتہ سنجوں کی خدمت میں استعانتاً و استمداداً حاضر ہوں گے۔ اخبار کا زیور پابندی وقت ہے۔ خدا نے چاہا تو زمیندار ٹھیک وقت پر ناظرین کی خدمت میں حاضر ہوا کرے گا اور اگر وہ منصوبے پورے ہو گئے جو ہم نے

اس کی ترقی کے متعلق ذہن میں قائم کر رکھے ہیں تو عجب نہیں کہ بہت جلد یہ اخبار مہینے میں چار دفعہ کی بجائے آٹھ دفعہ بلکہ سولہ دفعہ بلکہ روزانہ شرفِ حضوری حاصل کرنے لگے۔ غرض اگر خدا کا فضل شاملِ حال رہا اور ہماری اور ہمارے ناظرین کی متحدہ کوششیں جاری رہیں تو وہ دن دور نہیں کہ ہم اور وہ مل کر حافظ کے یہ تشکری ترانے گاتے ہوئے سنے جائیں ؎

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ نو در اندازیم
اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش بر اندازیم

(زمیندار جلد ۵ نمبر ۱ یکم جنوری سنہ ۱۹۱۳ء)

سلطان ترکی کی خدمت میں باریابی

معرفی کی رسم ادا کرنے کے لیے عثمانی و ہندوستانی مجلسِ نو آبادی ہائے مہاجرین کے صدر نشین ڈاکٹر اسعد پاشا، جو شاہی طبیب بھی ہیں مقرر تھے۔ ٹھیک تین بجے ہم ڈاکٹر اسعد پاشا کے ساتھ یلدیز کوشک میں پہنچے اور "باش مابین جی" (اول چیمبرلین) خالد ضیا بے کے کمرے میں کچھ دیر انتظار کرتے رہے۔ لطفی بے سابق "باش مابین جی" جو انگریزی زبان بہ روانی بول سکتے ہیں، اسی دن یورپ سے لوٹے تھے اور انہیں ہماری ترجمانی کا ایما ہوا تھا۔ کوئی نصف ساعت کے انتظار کے بعد ہماری طلبی ہوئی اور متعدد شان دار و دل آویز ایوانوں کو طے کرتے ہوئے ہم ڈاکٹر اسعد پاشا اور لطفی بے کے ہمراہ ایک وسیع کمرے کے دروازے پر پہنچے جس کی بہترین آرائش اس کی دل لبھانے والی سادگی تھی۔

کمرہ کے وسط میں تیس کروڑ مسلمانانِ عالم کے خلیفہ، خادم الحرمین الشریفین، امیر المومنین محمد خان خامس جو اسلام کے آخری سیاسی امیر ہیں کھڑے تھے۔ محمد فاتح اور سلیمان قانونی کے اس جلیل القدر جانشین کو دیکھتے ہی جو خیالات ہمارے دماغ میں اور جو کیفیات ہمارے دل میں برق کی طرح دوڑ گئیں۔ ان کی شرح کا یہ وقت نہیں۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے لیے یہ خیالات اور کیفیات شرح سے مستغنی ہیں۔ ہم اور ہمارے دونوں ساتھی دروازہ پر شعارِ اسلامی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آداب بجا لائے اور آگے بڑھے۔ اعلیٰ حضرت نے تین قدم آگے بڑھ کر بخندہ پیشانی ہمارے سلام کا جواب دیا۔ کمرے میں چار کرسیاں رکھی تھیں۔ اعلیٰ حضرت کی کرسی کے قریب ایک تپائی پر وہ نقرئی کشتی ایک چوبدار نے لا کر رکھ دی جس میں ہماری نذر تھی۔

لطفی بے اگرچہ ترجمانی کے لیے موجود تھے لیکن ایسی حالت میں جب کہ اعلیٰ حضرت زبانِ فارسی سمجھ اور بول سکتے تھے ہم نے لطفی بے کی وساطت مناسب نہ سمجھی اور گفتگو برابر فارسی میں ہوتی رہی۔

امیر المومنین کی ذرہ نوازی ملاحظہ ہو کہ ہمارے ساتھ ساتھ کھڑے ہوئے اور کشتی کا ڈھکنا اپنے دستِ خاص سے تھامے رہے تاکہ ہم وہ چیزیں بہ آسانی نکال سکیں۔ اعلیٰ حضرت کی یہ تواضع اور فروتنی دیکھ کر بے اختیار ہمارے منہ سے یہ لفظ نکل گئے کہ "مسلمانوں کا امیر ایسا ہی ہونا

چاہیے۔" اعلیٰ حضرت نے ہماری نذر قبول کرکے فرمایا :

"ہم ان چیزوں کا مطالعہ کریں گے۔"

میں نے عرض کیا کہ "جس زبان (اردو) میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ وہ حضور کے ساڑھے سات کروڑ دعاگوؤں کی زبان ہے اس لیے یقیناً اس زبان کا حضور پر بہت بڑا حق ہے۔"

کتاب کے بعد "زمیندار" کا نسخہ ملاحظہ فرما کر اعلیٰ حضرت نے ہماری درخواست پر ازراہِ عنایت لطف و کرمت اجازت بخشی کہ یہ اخبار باقاعدہ طور پر ملازمانِ اقدس و اعلیٰ کے پاس پہنچا رہے۔ یہ ایک ایسا بڑا اشرف ہے جس کے لحاظ سے ہم اُردو اخبار نویسی کو عموماً اور زمیندار اور اس کے بے شمار ناظرین کو خصوصاً مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

نقرئی کشتی جس میں ہم نے علامہ اقبال کی بانگِ درا اور روزنامہ زمیندار کا خاص نمبر رکھ کر پیش کیا تھا، پیرس (فرانس) کی ساختہ تھی۔ اگرچہ یہ بادشاہوں کے لائق تو نہ تھی۔ اس لیے کہ اس کی قیمت صرف چھ پاؤنڈ جیسی حقیر رقم تھی لیکن اعلیٰ حضرت کے مذاقِ سلیم نے محض ہماری دلدہی کے لیے اسے قبول فرماتے وقت ارشاد کیا کہ ان تکلفات کی کیا ضرورت تھی ___ یہ فرما کر اعلیٰ حضرت کرسی زرنگار پر تشریف فرما ہوئے اور ہم لوگوں کو بیٹھنے کا حکم فرمایا۔ ہم نے اعلیٰ حضرت کی اجازت سے حضورِ انور کے سمعِ مبارک تک مسلمانانِ ہند کا حسبِ ذیل پیغام پہنچایا :

> "جہاں پناہ! ساڑھے سات کروڑ مسلمانانِ ہند کی طرف سے، جنھیں اسلام کی سیزدہ صد روایات نے حضور کے تخت و تاج کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے۔ کمترین حضور کی خدمت بابرکت میں محبت آمیز ارادت و عقیدت کی ناچیز نذر پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہے۔ حضور اس الفت، اس محبت، اس ارادت کا اندازہ نہیں فرما سکتے جو مسلمانانِ عالم کو عموماً اور مسلمانانِ ہند کو خصوصاً حضور کی ذاتِ مبارک کے ساتھ ہے، جو حرمین الشریفین کے خادم اور اسلامیوں کی کشتی کے ناخدا ہیں۔ ہندوستان میں ہمارے دو بادشاہ ہیں۔ ایک جارج خامس اور دوسرے محمد خامس۔ جارج خامس ہماری جان کے مالک ہیں لیکن محمد خامس کا قبضہ ہمارے دلوں پر ہے اور ہماری دلی تمنا ہے کہ دونوں تاجداروں کے تعلقات برادرانہ رہیں تاکہ ہماری جانِ حزیں ہمارے دلِ ناشاد سے اُلجھنے نہ پائے۔"

ہماری ان ناچیز گزارشات کو اعلیٰ حضرت کمالِ توجہ سے سنتے رہے اور جب ہماری گزارش ختم ہو چکی تو فرمایا :

> "ہم مسلمانانِ ہند کا، جنھیں اخوتِ اسلامی کے رشتے نے ہمارا بھائی بنا رکھا ہے، بدل و جان ممنون ہیں۔ انھوں نے آڑے وقت پر ہمارا ہاتھ بٹایا اور مصیبت کے وقت ہمارے کام آئے۔ ہمارا دلی شکریہ ان کی محبت آمیز ہمدردی کے لحاظ سے ان تک پہنچا دو۔ ہم خداوندِ کریم سے دعا کرتے ہیں کہ وہ اپنی رحمتیں اور برکتیں ہندوستانی مسلمانوں پر نازل فرمائے۔ آمین ثم آمین۔"

اعلیٰ حضرت نے یہ الفاظ ایسے رقت آمیز لہجہ میں ارشاد فرمائے کہ ہمارا دل بھر آیا اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو ڈبڈبا آئے۔ ہم نے مؤدبانہ عرض کی کہ جہاں پناہ! اگر اجازت عطا فرمائیں تو کمترین اپنے کروڑوں ہم وطنوں کی طرف سے حضور کے دستِ اقدس کو بوسہ دینے کا شرف حاصل کرے۔

اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ تقبیل کی اجازت نہیں۔ البتہ سنتِ حضور فخر المرسلین کے اتباع کو مدِ نظر رکھ کر مصافحہ کریں گے۔ یہ کہہ کر حضور نے اپنا دستِ مبارک بڑھایا اور مصافحہ سے ہماری اور مسلمانانِ ہند کی عزت کو دوبالا فرمایا۔

آخر میں حضورِ انور نے ارشاد کیا کہ ہمیں آپ سے مل کر نہایت خوشی ہوئی اور آپ کے خیالات سے ہم نہایت محظوظ ہوئے۔ یہ ارشاد فرما کر حضور نے متعلق بیگ کو فرمایا:

"انھیں لے جا کر قہوہ پلاؤ۔"

دراصل یہ رخصت کا اشارہ تھا۔ یہ فرما کر اعلیٰ حضرت محل میں تشریف لے گئے اور ہم بہت ہی دل پذیر و دل آویز یادگاروں کو دلوں میں جگہ دیتے ہوئے شربت اور قہوہ نوشی کے بعد یلدز کوشک سے رخصت ہوئے۔[1]

نظربندی ۱۹۲۰ء

کرم آباد کو سر مائیکل نے بنایا ہے مری علمی حوالات
اگر اس وقت میں آزاد ہوتا دکھا سکتا نہ شاید یہ کمالات
نہ ہوتی ترجمے کی مجھ کو فرصت کتابوں میں نہ کٹتے میرے دن رات
نہ ہوتا ضبط ہی کا سر میں سودا نہ دل ہی سے نکل سکتی مناجات
پرو سکتا نہ موتی روز ایسے چمک سے جن کی ہیں شمس و قمر مات
گنواتا شاید اپنے وقت کو میں دلاتی شرم مجھ کو میری اوقات
عسیٰ ان تکرہوا شیئاً کی تاویل
سمجھاتے یوں نہ قرآں کے اشارات

مہمانِ فرنگ (سرجان میفی کے کشتگانِ ناز[2])

پیتے ہیں جیل میں چکی اسیرانِ فرنگ آسیائے گردشِ دوراں ہے زندانِ فرنگ
جو نہ دے اس کو ضمانت قید کاٹے تین سال کیوں نہ ہو تثلیث ہی ٹھہرا جو ایمانِ فرنگ
پاؤں میں بیڑی گلے میں تختی اور ہاتھوں میں داغ اُمتِ مرحوم پر کیا کیا ہیں احسانِ فرنگ
آسیا کا دستہ حجت حلقۂ جولاں دلیل اپنی منطق پر ہیں نازاں نکتہ سنجانِ فرنگ

---

[1] یادداشت مولانا ظفر علی خاں مرقومہ اسکندریہ، ۲ جولائی ۱۹۱۳ء۔ یہ اور مولانا کی دو گراں مایہ دستاویزوں کی نقل کے لیے ہم شیخ کرامت اللہ صاحب (گجرات) کے ممنون ہیں۔

[2] زمیندار ۵ جون ۱۹۲۱ء

صبح کو گوبھی کے ڈنٹھل شام کو اُبلی مسور — ہم رہے اس شان سے برسوں ہی مہمانِ فرنگ
ہم سیہ بختوں کو روغن بھی ملا ہو کر سیاہ — کیونکہ ہے روغن کی زردی حقِ خوانِ فرنگ
نرخِ گندم نے ہمیں اولادِ آدم کر دیا — ورنہ کھاتے تھے چنے ہم مثلِ گاوانِ فرنگ
پھر چھٹانک آٹے میں بھی بھر تو ہو شلغم کی دال — ورنہ کیا یاد آئے گا اندازۂ نانِ فرنگ

جرنیل نادر خاں کی خدمت میں

پشاور، ۲۷ فروری ۱۹۲۹ء۔ آج ہمارا وفد نو بجے صبح جرنیل نادر خاں کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جرنیل ممدوح پر ذات الجنب کے دیرینہ اثرات نے نقاہت طاری کر رکھی تھی اور خان عبدالغفار خاں کے بھائی کپتان خان نے جو مجلس جلالِ امرائے افغانیہ کے قائد منتخب ہوئے ہیں ان کا طبی معائنہ کرنے کے بعد رائے ظاہر کی تھی کہ وہ جہاں تک ہو کم گفتگو کریں اور کم سے کم دس پندرہ دن تک زحمتِ سفر گوارا کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لائیں لیکن مسئلہ افغانستان کی نزاکت انھیں اس مشورہ پر حرف بحرف کاربند ہونے کی اجازت نہ دے سکتی تھی۔ اس لیے انھوں نے ہمارے وفد کی گزارشات سننے اور اپنا مافی الضمیر سنانے کے لیے بآمادگی تمام وقت نکال لیا۔ وفد کے آزاد افکار کے ترجمان ہونے کی حیثیت سے میں نے سلسلۂ کلام شروع کیا اور مسلمانوں کی خواہشوں اور تمناؤں سے انھیں بالتفصیل آگاہ کیا۔ ان گزارشات کا مفاد حسب ذیل تھا:

"ہم آپ کے بجا طور پر سپاس گزار ہیں کہ آپ نے باوصف ناسازیِ طبع ہمیں ان توقعات کی تشریح کی اجازت دی جس سے ہماری طرح نہ صرف سارا صوبہ سرحد بلکہ ہندوستان کی تمام اسلامی آبادی بلکہ سارے ہندوستان کا دل لبریز ہے۔ آپ افغانستان کے ایک نامور فرزند ہیں۔ اپنے ملک کے مصالح کو ہم سے بہتر جاننے کا دعویٰ کر سکتے ہیں اور آپ کی توجہات پر ہمارا حق اس سے زیادہ نہیں کہ آپ بھی اسی برگزیدہ رسولؐ کا کلمہ پڑھتے ہیں جس کا سرمدی حلقہ ہمارے کانوں میں بھی پڑا ہوا ہے۔ لیکن یہی وہ رشتہ ہے جس نے ہمارے اور آپ کے درمیان حجابِ غیریت اُٹھا رکھا ہے اور اسی لیے ہماری یہ امید بے جا نہ ہوگی کہ آپ اپنے سات کروڑ دینی بھائیوں کی دردمندانہ اور بے غرضانہ التجاؤں سے بے نیاز نہ ہوں گے۔

افغانستان کی اسلامی سلطنت جس کی حریتِ کاملہ کا باسطوت علم آپ نے آج سے دس سال قبل "تل" کی بلندیوں پر نصب کیا تھا اس وقت اندرونی فتنہ پردازوں کی جاہلانہ خیرہ سری اور بیرونی حریفوں کی معاندانہ عیاری کی باہمی آویزش و سازباز سے پارہ پارہ ہو رہی ہے اور اس کے گوشے گوشے میں ہنگامۂ رستخیز بپا ہے۔ اس کا جوان سال شہریار، آپ کا آقائے نامدار امان اللہ خاں غازی کابل چھوڑ کر قندھار چلا گیا ہے۔ آپ لاہور میں ہیں اور اس کے بعد علی الرؤس الاشہاد اعلان کر چکے ہیں کہ جب تک بادشاہ کا زائل شدہ خسروانہ اقتدار بحال نہ کر لیں گے آپ کو چین نہ آئے گا۔ خدائے قدوس اس جذبۂ وفاداری کا آپ کو موزوں صلہ دے۔ لیکن وقت کا سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ آپ کو اپنے مبارک مقاصد کی تکمیل کے لیے کونسی راہِ عمل اختیار کرنی چاہیے۔ کیا انجامِ مرام کی سبیل یہ ہے کہ آپ سمتِ مشرقی میں جا کر اس آتشِ فتنہ و فساد کو فرو کرنے کی سعی فرمائیں اور شہریار غازی کے لیے میدان کو حریفانِ امن کے وجود سے پاک کر دیں یا سیدھے قندھار چلے

جائیں اور حضورِ ممدوح کے دست و بازو ہو کر شاہی ملک و ملت کے خلاف سینہ سپر ہو جائیں۔

مسلمانانِ ہند کی متفقہ رائے میں دوسرا مسلک اقرب الی الصواب ہے۔ آپ سے بہتر اس حقیقت کا شناسا اور کون ہو سکتا ہے کہ کابل سے ڈکہ تک آج سارا علاقہ طاغوت کی گرفت میں ہے۔ بچہ سقہ ہو یا ملائے شور بازار کوئی بھی سطوتِ اسلامیہ کا نمائندہ نہیں ہے بلکہ چند کٹھ پتلیاں ہیں جو مغربی استعمار کے تار پر ناچ رہی ہیں۔ رہے شنواری اور کروہ دامانی یا دوسرے حریص قبائل، تو وہ سب کے سب یا تو اس بدبخت گروہ سے متعلق ہیں جو اپنا ایمان چند چاندی کی ٹکلیوں کے عوض بیچ ڈالنے کے خوگر ہیں یا اس بدبخت زعماء کے افراد ہیں جن کے جاہلانہ اوہام ان ابن الغرض ملاؤں کی تجارت کے گراں مایہ زریں متاع ہیں۔ آپ کا اس بے سرو سامانی میں جبکہ آپ کے پاس نہ روپیہ ہے نہ فوج، سمتِ مشرقی کا رُخ کرنا خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ آپ کی طرف سے غازی امان اللہ خاں کی حمایت کا اعلان ہو چکا ہے خطرہ سے خالی نہیں۔ آپ کا خیال ہے جیسا کہ آپ نے مجھ سے دورانِ سفر ارشاد فرمایا کہ آپ شوریدہ سر جنگجو کو دعوتِ صلح دیں گے اور اس طور بچہ سقہ کو تخت و تاج سے دست برداری پر مجبور کر کے امان اللہ خاں غازی کے مراجعت فرمائی کابل ہونے کے لیے سازگار فضا پیدا کر دیں گے لیکن یہ سب قیاسات محلِ نظر ہیں۔ کیا وہ جماعت جو کفر کا فتویٰ عائد کر کے امان اللہ خاں کو کافر اور خارج از اسلام قرار دے چکی ہے۔ آپ کے پند و موعظت سے راہِ راست پر آجائے گی؟ اور پھر آپ نے ان بولہبی فطرت رکھنے والے اشقیا کا علاج کیا سوچا ہے جن پر پیغمبرِ خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وقت سے لے کر اب تک کوئی نصیحت کارگر نہیں ہو سکی؟

آخری عرض ایک یہ ہے کہ خدائے مقلب القلوب نے سارے ہندوستان کا دل آپ کی طرف پھیر دیا ہے۔ اس نعمت کی قدر فرمایئے۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔ یہ نعمت آپ کو محض اس لیے حاصل ہوئی ہے کہ آپ نے غازی امان اللہ خاں کی حمایت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس نعمت کی قدر فرمایئے اور اسی طرح مقلب القلوب رہیے۔ ہماری دعا ہے کہ ہندوستان کی رائے عامہ بدلنے نہ پائے۔ کیونکہ عالم متغیر ہے اور خلقت کی رائے کو بھی بدلتے دیر نہیں لگتی۔"

جرنیل نادر خاں کا جواب

جب میں نے سلسلۂ گفتگو ختم کیا تو جرنیل نادر خاں نے میری تمام باتوں کو غور سے سُننے کے بعد یوں جواب دیا:

"مسلمانانِ ہند نے مسئلۂ افغانستان میں جس عمیق دلچسپی کا اظہار کیا ہے، میں ان کا تہ دل سے شکر گزار ہوں اور خود میرے ساتھ جس برادرانہ محبت کا سلوک ان کی طرف سے ہوا ہے اس کے لیے میں بجان و دل ان کا منت گزار ہوں اور آپ حضرات کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنے رویہ سے خود کو اس اعتماد کا اہل ثابت کروں جو مجھ پر کیا گیا ہے۔ میری ذاتی رائے میں سمتِ مشرقی جا کر میں غازی امان اللہ خاں کے زیادہ کام آ سکتا ہوں۔ میرا اور آپ کا نصب العین ایک ہے۔ آپ بھی امان اللہ خاں کے خسروانہ اقتدار کی بحالی کے متمنی ہیں اور میں بھی اسی ایک مقصد کے لیے بیماری سے اُٹھ کر فرانس سے سیدھا اپنے وطن جا رہا ہوں۔ فرق صرف طریق کار کا ہے۔ میں مسلمانانِ ہند کی رائے سے سرتابی کرنے کا حوصلہ اپنے میں نہیں پاتا۔ لیکن مجھے اتنی اجازت دیجیے کہ میں اپنے ہم قوم بھائیوں سے مشورت

کروں۔ شام کے پانچ بجے آپ حضرات ازراہِ کرم پھر تشریف لائیں۔ جس نتیجہ پر اس مشورت کے بعد میں پہنچوں گا، اس سے آپ کو آگاہ کروں گا۔"

جرنیل نادر خاں کا جواب سُننے کے بعد دس بجے دن ہم اپنے عالی منزلت مخاطب اور اُن کے گرامی قدر بھائیوں کا شکریہ ادا کر کے مجلسِ خلافت کے دفتر کی جانب روانہ ہوئے کیونکہ سرحد کی ساری آبادی کا نچوڑ اس عظیم الشان جلسہ کی شرکت کے لیے پشاور میں جمع تھا جو شاہی باغ میں تین بجے دن منعقد ہونے والا تھا اور ہمیں اس کا اہتمام کرنا تھا۔

(۲۶ فروری ۱۹۲۹ء کی ڈائری کا ایک ورق)

ہنگامہ آرا زندگی کا حرفِ آخر

ہمارا قافلہ منزلِ مقصود تک پہنچ چکا ہے۔ اس کے بعد تمنائے راہ پیمائی تو ہے مگر قوتِ راہ پیمائی نہیں۔ کبھی ہم تماشائی تھے اور دُنیا تماشا۔ اب ہم تماشا ہیں اور دُنیا تماشائی۔ جہاں چڑھتے ہوئے سُورج کی پُوجا ہوتی ہو، وہاں ڈوبتے ہوئے آفتاب کو کون پوچھتا ہے؟ اور ہم تو ڈوبتے ہوئے ستاروں کی طرح دُنیا پر نظر ڈال رہے ہیں۔[1]

(مرتب: محمد عبداللہ قریشی)

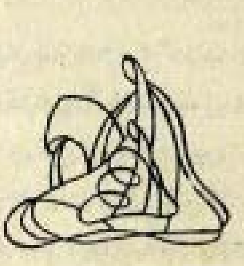

---

[1] تقریر اردو کانفرنس پنجاب یونیورسٹی ۱۹۳۹ء۔

خواجہ غلام الحسنین پانی پتی

راقم اثم خاکسار خواجہ غلام الحسنین ولد خواجہ غلام عباس ابن خواجہ اخفر علی ابن خواجہ اکبر علی انصاری کی ولادت دسمبر [illegible] کے قریب بمقام قصبہ پانی پت ہوئی۔ اس قصبے میں کچھ کم سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ جس سے راقم کا تعلق ہے آباد چلی آتی ہے۔ یہ لوگ ابو ایوب انصاری یعنی حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ صحابی رسول کی اولاد میں ہیں۔ ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی میں بعہد سلطان غیاث الدین بلبن خواجہ شیخ انصاری کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی ہرات سے ہندوستان آئے ان کا سلسلۂ نسب ۲۹ واسطے سے حضرت ابو ایوب انصاری تک اٹھارہ واسطے سے شیخ الاسلام تک اور دس واسطے سے ملک محمد شاہ تاج ملقب بہ آتش خواجہ تک جو غزنوی دور میں فارس، خراسان و عراق عجم کا فرماں روا تھا پہنچتا ہے۔

پانی پت میں جو ایک محلہ انصاریوں کا اب تک موجود ہے وہ خواجہ ملک علی ہی کی اولاد سے منسوب ہے۔ میں والد کی طرف سے اسی شاخ انصار سے تعلق رکھتا ہوں۔ میری والدہ جعفری سادات کے ایک معزز گھرانے کی بیٹی تھیں جو یہاں سادات شہدا پور کے نام سے مشہور ہیں۔

بارہ سال کی عمر تک پانی پت میں رہا۔ اس عرصے میں قرآن حکیم ختم کیا، فارسی کی ابتدائی کتابیں اور گلستان و بوستان سعدی کا انتخاب پڑھا۔ فارسی انشا پردازی کی کسی قدر تعلیم اپنے نانا سید محمد حسین صاحب مرحوم سے حاصل کی جو فارسی کے اچھے ادیب اور فارسی ادبیات میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اور خط شکستہ کے عمدہ خوش نویس تھے۔ عربی صرف و نحو کی درسی کتابیں، ہدایت النحو تک اور فقہ میں فارسی کے چند ابتدائی رسالے مولوی شیخ احمد علی مرحوم ساکن موضع برست ضلع کرنال سے پڑھے جو لکھنؤ کے فارغ التحصیل سند یافتہ اور علم کلام کے ماہر تھے۔ اس کے علاوہ مقامی ورنیکلر مڈل اسکول کی چوتھی جماعت کا امتحان پاس کیا۔

[illegible] کے قریب امرتسر بھیجا گیا جہاں اپنے چچا حاجی خواجہ ابراہیم حسین سے، جو سلطان العلماء میرن صاحب قبلہ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، ادب عربی کی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھیں، منطق میں مقال اقوال اور شرح تہذیب تمام کی اور مولوی سید احمد کبیر صاحب ساکن موضع جیجنہ ضلع [illegible] سے پرائیویٹ طور پر کسی قدر انگریزی پڑھ کر گورنمنٹ ہائی اسکول سے تین چار مہینے میں جماعت چہارم کا امتحان دے کر جماعت پنجم میں ترقی حاصل کر لی۔ مولوی صاحب نے منطق میں قطبی اور نحو میں شرح ملا جامی شروع کرائی تھی مگر چند ہی سبق پڑھنے پایا تھا کہ پانی پت واپس آنا پڑا۔ یہ سب آٹھ مہینے کی تعلیم تھی۔

اس کے بعد مولانا حالی کی خدمت میں دہلی بھیجا گیا۔ اینگلو عربک اسکول دہلی سے جماعت پنجم پاس کرنے کے بعد وظیفہ مل گیا اور مڈل ترقی کے اینگلو ورنیکلر مڈل امتحان تین سال کی بجائے دو سال میں پاس کیا اور ہائی اسکول کا اسکالرشپ حاصل کر کے گورنمنٹ ہائی اسکول دہلی میں داخل ہوا اور دو سال تعلیم پا کر [illegible] میں اٹھارہ سال کی عمر میں انٹرنس پاس کیا۔ فارسی اور عربی کی تعلیم اینگلو عربک اسکول میں مولانا حالی ہی سے حاصل کی۔ جو وہاں السنۂ شرقیہ کے مدرس اول تھے۔

[illegible] میں گورنمنٹ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے امتحان جے اے وی درجہ اوّل میں پاس کیا۔ [illegible] میں فارسی زبان دانی اور علم ادب کا

فارسی امتحان بھی اسی درجہ اول میں اور اردو زبان دانی اور علم ادب کا سب سے بڑا امتحان بھی [illegible] میں درجہ اول میں پاس کیا۔ مجھے مطالعہ کا بہت شوق تھا ادب عربی کی کتابیں، حماسہ، متنبی، معلقات وغیرہ کے بعض حصے لغات و شروح کی مدد سے حاصل کیے۔ فارسی ادبیات کی خاص کتابیں، سہ نثر ظہوری، رقعات نعمت خاں عالی، ابو الفضل، انوار سہیلی وغیرہ کا مطالعہ کیا۔ انگریزی میں عموماً فلسفہ، مذہب اور فلسفہ تعلیم و طریقہ تعلیم کی کتابیں زیر مطالعہ رہیں۔ مذہب اسلام کے ساتھ غیر مذاہب کا مطالعہ بھی جاری رہا۔

میری ملازمت کا تقریباً تمام زمانہ پانی پت میں گزرا اور خوش قسمتی سے مولانا خواجہ ابراہیم حسین اور مولانا حالی بھی اس زمانے میں اپنی اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو کر پانی پت میں مقیم تھے، چنانچہ جب تک دونوں بزرگ زندہ رہے ان سے علمی و دینی فیض برابر حاصل کرتا رہا۔ مولانا ابراہیم حسین کا انتقال [illegible] میں اور مولانا حالی کا [illegible] میں ہوا۔

میرا سب سے دلچسپ مشغلہ قرآن مجید کا مطالعہ ہے، جس کے متعلق میرے والد خواجہ غلام عباس مرحوم پہلی ہی سے میرے اور میرے بھائی بہنوں کے کانوں میں ڈالتے رہتے تھے گھر میں ہر وقت اپنی گفتگو اور قال اللہ و قال الرسول کے تذکرے رہتے تھے۔ ان کی سادہ معاشرت ہمارے لیے بہت اچھا نمونہ تھا۔ وہ محنت کے عادی تھے۔ مسلمانوں کو کام سے لگانے اور مل جل کر تجارت کرنے کا عمل تو پانی پت میں سب سے پہلے انھوں نے پیش کیا اور ایک کپڑے کی دکان چلانے پھلانے پھلوائی۔ میرے منجھلے بھائی خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے اصلاح تمدن و معاشرت کے جو خیالات عصر جدید کے ذریعے سے ملک میں پھیلائے وہ والد مرحوم ہی کے خیالات کا پرتو تھا۔ میرے چھوٹے بھائی خواجہ غلام السبطین نے کاروبار کو محنت اور دیانت سے انجام دینے کا سبق ان ہی مرحوم سے سیکھا ہے۔

اس کے علاوہ [illegible] سے [illegible] تک علامہ [illegible] حضرت مولانا شیخ عبد الحق کے جلسہ ہائے مواعظ قرآنی سے وقتاً فوقتاً فیضیاب ہوا۔ ان کی وجہ سے میرے قرآنی ذوق میں روز بروز ترقی ہوتی رہی۔ علامہ موصوف قرآن مجید اور فلسفہ اسلام کے بے مثل عالم تھے۔ مولانا حالی نے ان کے مواعظ کے متعلق فرمایا تھا کہ میں نے مدت العمر میں بھی ایسے وعظ نہیں سنے تھے۔

میں اپنی تعلیم جاری رکھنے کا بہت خواہشمند تھا مگر اپنے والد کے بار کسی قدر ہلکا کرنے کے خیال سے ملازمت اختیار کی کیوں کہ ان کی سات اولادوں میں سب سے بڑا میں تھا اور چھ بھائی بہن زیر تعلیم تھے۔ زمینی جائداد کی آمدنی ناکافی تھی اور ان کے وسعت کے مطابق تمام مصارف کو پورا نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے میں نے اپنے تعلیمی مصارف کا بار مزید ان پر ڈالنے کے بجائے یہی مناسب سمجھا کہ ان کی کچھ نہ کچھ مالی امداد بجا لاؤں۔ میں آگے تعلیم حاصل نہ کر سکا مگر میرے دونوں بھائی گریجویٹ ہو گئے۔

اکتوبر [illegible] میں کرنال میں امیدوار ہوا۔ دو تین مہینے بعد مسٹر ڈرمنڈ (DRUMMOND) ڈپٹی کمشنر کی پیشی میں پندرہ روپے کی ایک اسامی مل گئی جس پر دس مہینے کام کیا صاحب نے بوقت رخصت بغیر میری درخواست کے حسن کارگزاری کا سرٹیفکیٹ عنایت کیا

دفتری نوکری مجھے پسند نہیں تھی۔ اس لیے کوشش کرکے نومبر [illegible] میں میونسپل بورڈ سکول پانی پت کی سیکنڈ ماسٹری پر تبدیلی کرا لی جس کی تنخواہ اس وقت پچیس روپے تھی۔ میرے وطن میں آ جانے کی وجہ سے بھائی بہنوں کی تعلیم میں بہت آسانی پیدا ہو گئی۔ میں دوران ملازمت ہی میں دس مہینے کے لیے ٹریننگ کالج لاہور میں داخل ہوا اور جولائی [illegible] میں تعلیم سے فارغ ہو کر اپنی ملازمت پر واپس آیا۔ اس کے بعد ہائی سکول کرنال کو تبدیلی ہو گئی۔ جہاں [illegible] سے [illegible] تک دو سال رہنا ہوا۔ پھر خود کوشش کرکے اپنی اسامی پر واپس آ گیا

اس کے بعد رخصت حاصل کر کے ڈھائی سال سے زیادہ عرصہ مجبوراً گھر رہا۔ اپنے بھائی خواجہ غلام الثقلین مرحوم کی جگہ صدر مہتمم تعلیمات اجمیر مدارس رہا اور قائم مقامی کی مدت پوری کر کے دہلی واپس آیا اور ہربرٹ سپنسر (HERBERT SPENCER) کی کتاب ایجوکیشن (EDUCATION) کے ترجمے کو جو علی گڑھ ہی میں شروع کر دیا تھا مکمل کیا اور مارچ ۱۹۱۳ء میں اپنی اسامی کا چارج لے لیا۔ مجھے گھر رہے دو سو پچاس روپے ماہوار کے حال تھے۔

اور مئی ۱۹۱۳ء سے ۹ مئی ۱۹۱۸ء تک میونسپل کمیٹی پانی پت کا سیکرٹری رہا اور نئے اکاؤنٹ کوڈ (قواعد حسابات) کے مطابق کمیٹی کی تنظیم کی۔ اس ملازمت میں مطالعہ کی فرصت کم ملتی تھی اس لیے خود درخواست کر کے مدرسہ پانی پت میں واپس آ گیا اور ساڑھے نو سال کے قریب وہاں رہا یعنی اکتوبر ۱۹۱۸ء سے مارچ ۱۹۲۸ء تک حالی مسلم ہائی سکول میں ساٹھ روپے ماہوار پر کام کیا مگر علالت کی وجہ سے اس خدمت سے مستعفی ہوا۔ اور ملازمت کی پابندیوں سے آزاد ہو کر ساڑھے چار سال صرف علمی خدمت اور مطالعہ میں منہمک رہا۔ مگر قدرت نے تعلیم ہی کو میرا ذریعہ معاش بنا دیا تھا اور آخر کار اسی کی طرف لوٹنا پڑا۔

اس زمانے میں مدرسۃ الواعظین لکھنؤ کا آرگن الواعظ جاری ہوا اور اس کی اعزازی ادارت مجھ کو حاصل ہوئی۔ ستمبر ۱۹۱۹ء سے اگست ۱۹۲۲ء تک اس خدمت کو انجام دیا مگر چونکہ دو تین مہینے بعد ہی بغرض زیارات عتبات عالیات عراق جانے کا اتفاق ہوا، اس لیے وہیں سے الواعظ کے لیے مضامین بھیجتا رہا۔

ایک سال کے بعد عراق سے واپس آیا اور ۱۹۲۴ء میں مدرسۃ الواعظین میں پورے ایک سال کام کیا۔ میرا کام تحقیقات مذاہب اسلام اور دیگر ادیان کے تقابل پر لیکچر دینا اور فاضل طلاب مدرسہ کو طریقۂ تبلیغ کے متعلق ہدایات دینا قرار دیا گیا۔ میں ایک سال تک بلا کسی معاوضے کے اس خدمت کو انجام دینا چاہتا تھا۔ مگر جناب نجم العلماء نے باصرار مبلغ پچاس روپیہ ماہوار مقرر فرما دیا۔ میں نے اس زمانے میں وحدت اور قربانی، تشبیب کی کمائی، جلد دوم عروج پر سات لیکچر وغیرہ وغیرہ چند رسالے اردو میں اور کتاب اسلام اور توحید (ISLAM AND THE DIVINE UNITY) انگریزی میں لکھی جس سے واعظین نے فائدہ اٹھایا۔ ایک سال کے بعد اپنی مجبوریوں سے استعفا دینا پڑا۔ مارچ ۱۹۲۵ء سے آخر دسمبر ۱۹۲۸ء تک ساڑھے تین سال بمبئی میں پرنسپل اردو ٹریننگ کالج معلمات کا پرنسپل رہا۔ مسلم معلمات کے ٹریننگ کا کوئی قابل اطمینان حل کئی سال سے بمبئی کے اہل حل و عقد کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ میرے تقرر نے اس عقدے کو حل کیا اور وہ گتھی (GORDIAN KNOT) ایک ضعیف انسان کے ہاتھوں کھل گئی۔ یعنی ٹرینڈ معلمات کے بہم پہنچنے کی وجہ سے اردو مدارس بنات کی حالت روز بروز بہتر ہوتی چلی گئی۔ میرا تقرر بمبئی میں ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر ہوا اور بعد میں پونے دو سو ہو گئے۔ اپریل ۱۹۲۹ء میں دو سو ہونے والے تھے مگر میرے محترم بزرگ خواجہ سجاد حسین بی اے (ابن حالی) نے مجھے پانی پت طلب کیا اور میں تمام بمبئی سے قطع تعلق کر کے یہاں آیا۔ خواجہ صاحب ممدوح نے یکم جولائی ۱۹۲۹ء سے حالی مسلم ہائی سکول میں بحیثیت ہیڈ ماسٹر مدرسہ و معلم اعلیٰ انسٹرکٹر مقرر کر کے ایک سو روپیہ ماہوار اعزازیہ کے طور پر عنایت کیا۔ ساڑھے سات سال تک دونوں خدمتوں کو انجام دینے کے بعد میں نے سبکدوشی کی درخواست کی مگر یکم جولائی ۱۹۳۶ء کو صرف تعلیمی فرائض سے سبکدوشی ہوئی، منیجری کی خدمت کو ابھی تک انجام دے رہا ہوں۔

اگر ایک سال کی مجبوری اور دو سال کی سیکرٹری شپ کو علیحدہ کر دیا جائے تو میری زندگی کے پورے ستائیس سال علمی تعلیمی کام میں بسر ہوئے جس میں مدرسی سے لے کر مدرسہ کی منیجری، ٹریننگ کالج کی پرنسپلی، ایک تبلیغی مدرسہ کی پروفیسری اور ایک صوبہ کی انسپکٹری ہر قسم کی خدمتیں شامل ہیں۔ میں نے ملازمت کے زمانے میں اپنی لیاقت سے بہت زیادہ کمایا اور چونکہ میرے ذاتی مصارف بہت محدود رہے ہیں۔ اس لیے اگر روپیہ جوڑنے کا شوق ہوتا تو کئی ہزاروں کا مالک ہوتا۔ مگر میری کمائی اہل خاندان کی خدمت، بہن بھائیوں اور ان کی اولاد کی تعلیمی اعانت، مستحقین کی امداد اور اپنے دینی ذوق کے کام میں صرف ہوئی اور ہو رہی ہے۔

تصانیف

میری ہر قسم کی چھوٹی بڑی تحریرات کی تعداد ستر کے قریب ہے۔ بعض کتب و رسائل کے نام یہ ہیں۔

فلسفۂ تعلیم	ترجمہ ایجوکیشن
سیرت النبی	حالات کم
اخلاق حسینی	(حضرت سید الشہداء کا اخلاق)
یادگار حسینی	(مرزا سلطان احمد صاحب رئیس قادیان کی تصنیف جو میری ترمیم و تخلیص سے شائع ہوئی)
ترجمۂ سر الشہادتین	(مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے عربی رسالے سر الشہادتین کا ترجمہ)
تحقیق الجہاد	(مولوی چراغ علی کی انگریزی کتاب کا ترجمہ)
تنقید لطیف بر خیالات عزیز (علی گڑھ کالج کے ایک سابق پروفیسر کے دہریانہ و ملحدانہ خیالات کی مکمل تردید)	
اسلام اور توحید	(زبان انگریزی) ISLAM AND THE DIVINE UNITY
تکبیر حصار	(حصار کی ایک مذہبی کانفرنس میں میری تقریر منعقدہ ۱۹۱۹ء)
تعلیم اور قرآن	(دسمبر ۱۹۲۳ء کے اجلاس مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا لیکچر)
مذہبی تعلیم اور اس کے عمل طریقے (دسمبر ۱۹۲۰ء کے اجلاس مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں لیکچر)	
تقدیس القرآن	(مخالفین کے اعتراضات کا جواب)
حدوث مادہ	(خواجہ غلام الثقلین بی اے کے مضامین جو میری نظرثانی اور ترمیم کے بعد شائع ہوئے)
کشف الحقیقۃ	(الحاقہ کی مکمل تفسیر)
عیسائیت اور اسلام	
دیوتا اور قربانی	(سوامی دیانند کی تحریروں سے گائے، بیل وغیرہ کی قربانی اور گوشت خوری کا ثبوت)
سنہ شیپ کی کہانی	(ویدوں کے زمانے میں انسانی قربانی کا ثبوت اور سوامی جی کے اس قول کی تردید کہ ویدوں میں کوئی قصہ کہانی نہیں ہے)
جنود و صنم پرست لیکچر	(سوامی دیانند کی تحریروں سے اس بات کا ثبوت کہ جنود و صنم کی عبادت صرف ذاتی امتیاز پر قائم ہے)
حقوق الوالدین	
عمدۃ المطالب فی مناقب علی ابن ابی طالب۔	
اسنی المطالب فی امامۃ علی ابن ابی طالب	
احسن البراہین علی افضلیت امیر المومنین	
خدا کی ہستی	
خدا کی توحید	
وجود خدا	(زبان فارسی)
آئینۂ قادیان	(خواجہ غلام الثقلین کے مضامین میرے حواشی اور تشریحات کے ساتھ)

سیاد الاخلاق

سوامی دیانند اور ان کی تعلیم۔ انہوں نے اس کو ضبط کرانے کی انتہائی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ مولانا سید مجتبیٰ حسن کامونپوری نے اس کا خلاصہ بزبان عربی مصر میں شائع کرایا جو علمائے مصر میں بہت مقبول ہوا۔

سفرِ حج

ان کتابوں کے علاوہ میں نے الاصول من ایضاح الکافی کا اردو ترجمہ اور تفسیر بڑی محنت اور خاص اہتمام کے ساتھ لکھنی شروع کی تھی کتاب العقل اور کتاب التوحید ختم کر چکا تھا۔ کتاب الحجۃ کا ترجمہ شروع کیا تھا کہ ایک حادثہ پیش آیا یعنی میرٹھ کے اسٹیشن سے میرے کل مسودات مع تمام کتب و سامان کے گم ہو گئے۔ اس نقصان نے دیا صدمہ پہنچایا بہت ٹوٹ گئی یہ ۱۹۳۱ء کا واقعہ ہے۔ میں نے اپنی کتابوں سے مالی فائدہ کبھی نہیں اٹھایا بلکہ ہزاروں کتابیں مفت تقسیم کیں۔

میرا ارادہ عراق میں رہ کر کچھ مذہبی خدمت کرنے کا تھا۔ چنانچہ علامہ ہبۃ الدین شہرستانی کی سرپرستی میں ایک عربی رسالہ جس کا نام مجلہ نے شمس المشرقین تجویز دیا تھا جاری کرنے کا پورا انتظام ہو چکا تھا اور حضرت آقا سید ابو الحسن اصفہانی کی سرپرستی میں اسناد و فتنہ بہائیاں کے متعلق بھی کام کرنے کا خیال تھا اور ایک ابتدائی مقالہ زبان فارسی لکھ کر مجتہد مرحوم کی خدمت میں پیش کر دیا تھا جو پسند کیا گیا مگر خلاف توقع ایسے اسباب پیش آئے کہ مجھے ہندوستان آنا پڑا۔

(تلخیص)

گویا

نکہتِ گل اور روحِ چمن

نفیس لباس اور خوبصورت زیورات کے بغیر عورت کی زندگی ادھوری ہے ان کا فیشن اور ڈیزائن ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اور نیا روپ دکھاتا ہے۔ لیکن خوشبو تسکین روح کا سامان جس کا کام نسائیت کا جادو جگانا اور دل کو لبھانا ہے وہ کبھی نہیں بدلتی۔

عورتوں کی رنگین طبع اور معیار پسندگی کیلئے گویا کا نام ان کے محبوب کا درجہ رکھتی ہے۔

آپ کے لئے گویا کی چھ محبوب اور اہم خوشبویات

اینٹانس - پاسپورٹ - گارڈینیا -
بلیک روز - نووافیئر - گویا نمبر ۵

گویا لندن - پیرس - نیویارک

- اینٹانس ٹیلکم
- اینٹانس پرفیوم
- پاسپورٹ کولون
- بلیک روز شیمپو
- نووافیئر ٹیلکم
- گارڈینیا کولون

آپکی
آنکھوں
کا
تارا

آپ کے گھر کو روشن کر رہا ہے
اس روشنی کو بیمہ
ہمیشہ ہمیشہ کیلئے باقی رکھے گا

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹیڈ

[illegible]

دِلفریب اور دیدہ زیب پارچہ جات
خوش رنگ
اور
خوش وضع
کالونی
ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ
اسماعیل آباد (ملتان)
کالونی سیلز ڈپو
۳۴، بی ایڈورڈ روڈ صدر راولپنڈی
۴۸، دی مال - لاہور۔
LAA P/15

تازگی اور فرحت کی حامل

اروما سپیریئر چائے

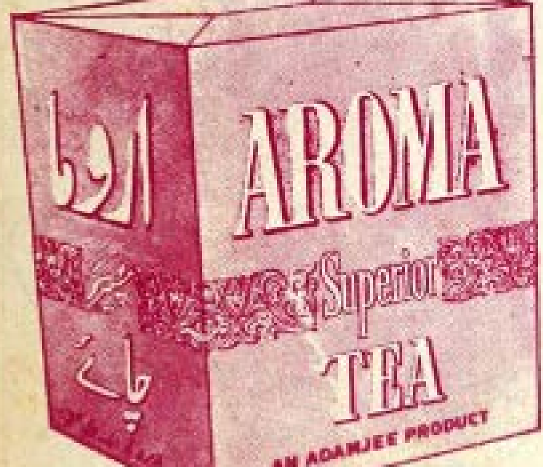
اروما
چائے
AROMA
Superior
TEA
AN ADAMJEE PRODUCT

پاکستان اور سیلون کی
اعلیٰ چائے کی پتیوں کی آمیزش

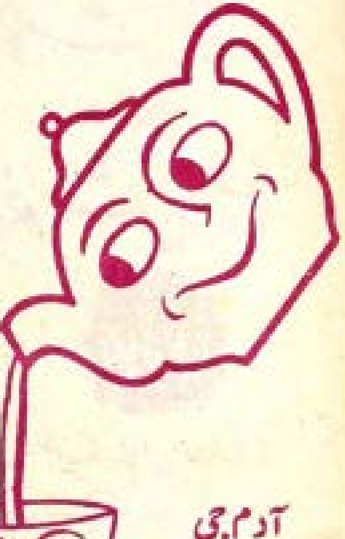

آدم جی
کی پیشکش

CRANFORDS

ناطق لکھنوی

پیدائش ——— ۱۸۷۸ء لکھنؤ
وفات ——— ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۰ء چاٹگام

عربی نصاب میں معانی و بیان اور نظم و نثر کی کتابیں اتنی ہیں کہ ان کا پڑھنے والا شعر و شاعری سے نابلد نہیں رہ سکتا۔ اس کے علاوہ میرے والد ماجد سید محمد عبدالبصیر حضور، آتش کے شاگرد تھے۔ ان سے اصلاح لینے کو اکثر شعراء آتے تھے۔ وہ اصلاحیں میں دیکھا کرتا تھا۔ وہ لغات عربی و فارسی میں اچھا درک رکھتے تھے کئی ہزار اشعار شاعروں کے بیسیوں ان کو یاد تھے۔ وہ خود بھی ان کے تو ایسے الفاظ ان کے معانی کے لیے استعمال کرتے تھے، آج کے لیے اس زبان کے اہل زبان استعمال نہیں کرتے، جیسے شائق بجواہرات، تنقید، فکر، مقرب وغیرہ۔ وہ فرماتے تھے کہ یہ الفاظ اردو میں جامعطف و اضافت، مرتد یا مقبول ہو کر مستعمل ہو سکتے ہیں۔ اس وجہ سے مجھ کو شعر و ادب کے نقائص معلوم ہو جاتے تھے۔ دہلی و لکھنؤ کے بیس پچیس شعرا مستثنیٰ کر کے باقی اکثر شاعروں کے خیالات و مضامین اور الفاظ و معانی میں ابتذال اور بے احتیاطیوں کا رواج روز افزوں تھا۔ کوئی رعایت لفظی کا دلدادہ، کوئی محاورہ نوتی میں ڈوب مرنے کو آمادہ، کسی کو صنائع بدائع پر فخر و ناز، کوئی مضحک مبالغہ کو معیار کمال سمجھتا تھا۔ کسی نے یہ طے کر لیا تھا کہ شعر میں رونے پیٹنے، موت، گور غریباں کے مناظر اور معشوق و فلک کے نازل کیے ہوئے مصائب و مظالم کے بیان ہی میں اثر محدود ہے۔ جب تک یہ مضامین نہ ہوں شعر پُر تاثیر نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ ان سے بلند ہو کر شاعری کی عام سطح پر ممتاز ہونا چاہتے تھے وہ غیر مانوس الفاظ اور لغو خیالات نظم کر کے اپنی علمی قابلیت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ شاعری کے اصل مقصد یعنی کیفیت شعری سے کوئی غرض نہ تھی۔ مثلاً یہ شعر –

جگر خواروں کو مزہ ہے قطرۂ ناپاک کا   کیا دہن ان کا دہن ہے کیڑ ملاک کا

اس قسم کی شاعری میں انقلاب پیدا کرنے کی دُھن میرے دل و دماغ میں پیدا ہو کر مجھے ضبط و خاموشی پر مجبور نہ کر سکی اور پہلے تو میں غالب کی طرح غزلوں پر تنقیدی مضامین لکھنا شروع کیے۔ پھر اخبار زندہ دل اور معیار و خدنگ نظر میں غلط اشعار و شعرا پر اعتراضات کا ایک مستقل سلسلہ قائم کر دیا۔ سا معصوم بزرگوں اور اپنے استادوں کے کسی کی رعایت نہیں کی اور سب کو ایک ہی میدان میں لے آیا۔ میرے تمام اعتراضات کی نوعیت اس اصول پر تھی کہ خود انہی کے مسلّم اصول سے جو غلطیاں ان سے لفظی و معنوی ہوئی تھیں ان پر میں نکتہ چینی کرتا تھا تاکہ اردو ادب میں بے اصولی نہ پیدا ہو۔

اب یہ امر کہ مجموعی حیثیت سے مذاق شاعری قابل اصلاح اور ایک سخت انقلاب کا محتاج تھا۔ اس کے لیے میں نے علیحدہ مضامین لکھے اور جلسوں میں تقریریں کیں اور زبانی لوگوں کو سمجھا کر اپنا ہم خیال بنانا شروع کیا۔ میرے خیالات کا ماحصل یہ تھا کہ شعر کا مجید ایسا ہو کہ باپ بیٹی اور بہن

بھائی کے مدبر جوش کے اشعار پڑھ سکیں۔ اس معاملہ میں لکھنؤ کے علاوہ ہندوستان کے اکثر شاعروں نے مدد دی۔ مثلاً جناب سائل دہلوی، خان بہادر وحشت کلکتوی، دل شاہجہانپوری، شفق عماد پوری، سیماب اکبر آبادی اور بہت سے شعرا نے اس مذاق سلیم کا خیر مقدم کیا اور انھی مہذب اصول پر ان سب اساتذہ کا کلام شائع ہوتے دیکھا۔ دقیانوسی خیالات بے کیف ہو گئے، اعضائے نسوانی کے بجائے گریہ و مرگ کے مضامین کم ہونا شروع ہوئے رعایت لفظی کی بھرمار کم ہوئی۔ بہت ممکن ہے کہ یہی خیالات اوروں کے دل میں بھی آئے ہوں جو تعجب نہیں کہ بعض اساتذہ ہم لوگوں کے اظہار خیال سے پہلے اس پر کاربند ہوں مگر جہاں تک یاد پڑتا ہے اس کی تحریک عملی طور پر دیکھنے میں نہیں آئی۔ مگر ہم لوگ اس سلیم مذاق کا عشر عشیر نہ جانتے تھے جو اس زمانے میں چند مغرب زدہ نوجوانوں کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔

غرضیکہ اردو زبان میں اعتراضات و تبصروں اور مذاق سلیم پر مضامین لکھنے کے علاوہ دو دو جزو کے افسانے ذوق رکھنے والے نظر کی فرمائش سے لکھے مثلاً عروج و زوال، خون عاشق اور ریاض اسرار موجودہ مجموعہ تصنیف و تالیف کیے اور پھر ناولوں تک سلسلہ پہنچا۔ اعتراضوں اور تنقیدوں سے پھر کچھ فائدہ ضرور ہوا۔ مبتدیوں کی مشقوں میں اصلاح اور اساتذہ کے انداز شاعری میں کافی انقلاب ہوا۔ میری نظر میں بھی ادبیات کے حسن و قبح و ترقی کے لحاظ سے زیادہ روشنی ہو گئی۔ کیونکہ علاوہ اس شغل کے فارسی و عربی دواوین کثرت سے میرے مطالعہ میں رہتے تھے اور غالب کا دیوان تو گویا روزمرہ کا وظیفہ ہو گیا۔ مگر میں خود اردو شعر کم کہتا تھا۔ میرا خیال یہ تھا اور اب تک ہے کہ اردو زبان بول چال میں جتنی آسان ہے تکمیل کے لیے اتنی ہی مشکل۔ غالب کے مشکل اشعار حل کرنے سے مجھ کو خاص دلچسپی تھی کیونکہ خیالات اور انداز بیان میں جدت و انفرادیت تھی۔ اساتذہ اردو کے دیوان میں جو اشعار سہل ممتنع اور کم نظر آتے تھے۔ میں خیال کرتا تھا کہ ایسے شعر کہنا میرے امکان سے باہر ہے اور نہ تو مضامین جو میرے بس کے نہ سلیقہ نہ خوش اسلوبی ملتی تھی آفتاب، کاظم حسین محشر اور کئی احباب نے مجبور کیا کہ میں بھی طبع آزمائی کروں اور میرے کانوں میں یہ آواز بھی پڑی کہ عیوب و نقائص پر اعتراض کرنے سے خود صحیح شعر کہنا مشکل ہے آخر مجبور ہو کر میں اپنی طبیعت کو ٹٹولنے لگا۔

اتفاقاً میرے محلہ باغ ناگفتی میں مرزا محمد بیگ عاشق مولف لغت بہار ہند آکر فروکش ہو گئے۔ ان سے اور میرے والد سے اس قدر ربط و ضبط تھا کہ میں انھیں چچا کہتا تھا۔ ان کے یہاں مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اس محلہ میں کبھی مشاعرہ نہیں ہوا تھا پہلے روز کے مشاعرے میں وہ واہ واہ کا شور و غل سن کر پڑوس کی عورتیں سمجھیں کہیں چور آیا ہے اور شاید پکڑ لیا گیا ہے اور مردوں نے آکر مشاعرے کو گھیر لیا اور یہ تماشہ دیکھنے بیٹھنے لگے میں بھی گیا۔ مجھے بڑی محبت سے مرزا صاحب نے اپنے پاس بٹھا لیا۔ لوگوں کا کسی کسی شعر پر ایک دم سے بے قرار ہو کر چلا اٹھنا اور پڑھنے والے کا جھک جھک کے سلام کرنا، میرے لیے ہنسی کا ضبط کرنا اس سے زیادہ مشکل تھا جس قدر عاشقوں سے ضبط گریہ دشوار ہے گویا "من ضحک ضحک" کی ہوا میرے گرد چکر لگا رہی تھی۔ چند روز کے بعد حضرت امیر مینائی قریب خانہ پر میری حقیقی ممانی سے ملنے آئے جو کہ ان کی بہن ہوتی تھیں اور میرے ہی یہاں رہتی تھیں۔ حضرت مرحوم جب تشریف لاتے تھے مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ مجھ سے بہت محبت رکھتے ہیں۔ ان کو معلوم ہوا کہ میں نے کچھ اشعار عربی میں کہے ہیں۔ ان کے اصرار سے میں نے پڑھا۔

لقد جاء ارض الوداد　　فاسکن ھنا یا فواد

حضرت نے یہ شعر سن کر فرمایا کہ نثر و نظم میں اضافہ کرنے کا جہاں تک تعلق ہے ہم لوگوں پر اردو زبان کا حق زیادہ ہے میں سمجھتا ہوں کہ تم اچھے ادیب ہو سکتے ہو بشرطیکہ توجہ اور محنت کرو۔ میں نے کہا کہ اردو شاعری شاید ہی میرے امکان میں ہو۔ حضرت امیر مینائی اپنی بہن یعنی میری ممانی سے

محاورات اور ضرب الامثال کی تحقیق کیا کرتے تھے کیوں کہ یہ اپنی گفتگو میں مثلیں اور محاورے زیادہ استعمال کرتی تھیں اور ان کا خاندان پانچ سو برس سے لکھنؤ میں آباد تھا اور اب بھی ہے۔ اس لیے ان کی زبان سب سے زیادہ مستند اور خالص اردو تھی۔ اسی زمانہ میں امیر اللغات کی تالیف شروع ہوئی تھی۔ ادھر احباب کا اصرار ادھر حضرت کا ارشاد اردو شاعری کے بہت سے سامان و سرمایہ اپنے دماغ میں مہیا اور مجتمع کرنے لگا۔ اور مرزا محمد بیگ صاحب کے مشاعروں میں اب بہ نظر استفادہ جا کر لوگوں کی غزلیں نہایت غور و فکر سے سننے لگا۔ ایک مرتبہ شیخ فضل احمد کیف شاگرد آتش کا یہ مصرع طرح دیا گیا ؎

میں تیری زنجیر کھینچوں تو میری زنجیر کھینچ

اس پیرایہ کا مصرع اور اس مضمون کا اظہار کر لیں سے ملاقات ہو تو میں اس سے کہوں "میں تیری زنجیر کھینچوں تو مری زنجیر کھینچ" میں نے خیال کیا کہ قیس اب کہاں، اس کو گزرے ہوئے صدہا سال گزر گئے۔ پھر میں نے غور بھی کیا کہ شاعری میں تاریخ و جغرافیہ کو کیا دخل ہے مگر ہاں یہ امر حقیقت سے ضرور بعید ہے۔ نہ تو مجنوں سے ملاقات ہوگی نہ یہ نوبت آئے گی۔ وہ مصرع بیکار ہو جائے گا۔ میرے ذہن میں ایک مضمون آیا جس کو میں نے نظم کر لیا۔ اردو میں پہلا مصرع تھا۔

میری وحشت دیکھیے کہتا ہوں اپنے قیس سے
میں تری زنجیر کھینچوں تو مری زنجیر کھینچ

اسی روز مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ شاعر کے دل میں شعر کہنے کے بعد سنانے کا بھی ولولہ ہوتا ہے۔ پھر تو میرے دل میں اظہار خیال کا جذبہ پیدا ہوا۔ مرزا صاحب کا اصرار، مجھے پڑھنا ہی پڑا حالاں کہ زندگی میں شرمیلی اور شرمیلا پن زبان کو روک رہا تھا۔ اس مصرع پر اس قدر شور و غل ہوا کہ وہ صاحب جو مشاعروں میں شرکت ترک کر چکے تھے، مکان سے باہر تشریف لائے۔ جب ان سے مرزا صاحب نے یہ کہا کہ میرے بھتیجے نے طرح پر ایسا مصرع لگایا ہے جو کیف کے مصرع سے بہتر ہے تو وہ حواس باختہ ہو کے واپس گئے۔ کیوں کہ آتش کے بعد انھوں نے لکھنؤ سے بھی مشورہ کیا تھا۔ گھر میں جا کے میری ماں سے جن کے کوئی بیٹا نہ تھا اور مجھے اپنا فرزند بنایا تھا کہا کہ آپ کے بیٹا اقبال تعلیم سے فراغت پا گئے جب طالب علم کو کسی ادبیات کا شوق پیدا ہو جاتا ہے پھر وہ نہیں پڑھتا خصوصاً شاعر جو ہر وقت ایک انجمن کی طرح چہک میں رہتا ہے۔ اور دنیوں تو چھوٹ سکتی ہے۔ مگر دوسرے انجمنی اس کو داد اور تعریفیں کر کے آسمان پر چڑھاتے ہیں کہ پھر نشہ کبھی اترتا ہی نہیں بلکہ روز افزوں ہوتا ہے۔ میں نے چاہا کہ اب انگریزی کی تعلیم ہو مگر نا ممکن ہو گیا۔

غرض کہ میں نے اردو شاعری شروع کر دی اور یہ سوچا کہ والدین شاعری کے خلاف ہیں اور حضرت امیر مینائی رام پور میں رہتے ہیں۔ اصلاح کیوں کر ہوگی۔ ایک رات کو سب شعرائے قدیم پر فاتحہ نام بہ نام پڑھ کر اس زمین میں جس کی ردیف "دل میں" اور قافیہ "آہ گیر" چند شگفتہ قافیے انتخاب کر کے ہر ایک میں دس دس اشعار کہے جن کے مضامین مختلف تھے ان میں سے ایک ایک دو دو شعر لکھ کے باقی تلف کر دیئے۔ وہاں رات سے صبح تک میں اسی میں مصروف رہا۔ صبح کو حسب معمول ماموں آغا ابو تراب آئے، انھوں نے چہرہ دیکھ کر کہا کہ تم نے رات غزل کہی۔ تمہارا چہرہ زرد ہو گیا ہے۔ سناؤ کیا کہا ہے۔ میں نے کہا چند دن کے بعد طول نکال کر اس کو ٹھیک ٹھاک کر لوں گا پھر سناؤں گا مگر اپنی بابت میری یہ رائے ہے کہ میں کبھی اچھا شعر نہیں کہہ سکتا۔ انھوں نے میری رائے کو غلط بتایا۔

چند سال تک میں اسی صحبت اور اسی اشتغال میں رہا۔ چند دہ میں غزلیں کہیں مگر مشاعرے سے پہلے جناب مفتی امیر مینائی کی خدمت میں اصلاح کے لیے بھیج دیتا تھا کیوں کہ مشاعرے کے وقت تک نظر کرتا رہتا تھا اور چاہتا تھا کہ باوجود کم مشقی اپنے ساتھیوں سے زیادہ پیچھے نہ رہوں۔ ۱۸۹۳ء میں ایک مشاعرہ کانپور کے منظر سے کیا۔ جس میں ہم لوگ بھی مدعو ہوئے۔ میں وہاں گیا تو اخبار نور الانوار کے لیے ابو سعید خاں ابن عبد الرحمن خاں مالک مطبع نظامی نے مجھے اخبار مذکور کی ادارت سپرد کی۔ میں اس خدمت کو اچھی طرح انجام دیتا رہا اور مشاعروں میں بھی شرکت کرتا رہا۔ شعرا اور سامعین میرے اشعار

سے کسی قدر محظوظ ہوتے تھے۔ پھر جب افسر قلم سے ملاقات ہوگئی۔ ان کو یہ شوق ہوا کہ مجھ سے ناول اور تواریخ وغیرہ تصنیف و تالیف کرا کے شائع کریں اور فائدہ اٹھائیں۔ اس کے لیے مجھے دو تین سو روپیہ ماہوار دیتے تھے۔ چالیس پچاس کتابیں شائع ہوئیں۔ پھر [illegible] میں ایک جنتری انھی کے نام سے نکالی۔ جس کی مقبولیت اتنی ہوئی کہ چالیس ہزار چھپنے لگی۔ وہیں سے ایک رسالہ "شرر" نام ان کے لیے نکالا جس کے آٹھ ہزار خریدار ہوگئے۔ پھر مجھے کچھ ملال پیدا ہوا۔ اسی زمانے میں حیدر آباد دکن کے سرکاری اخبار ملک و ملت کی ادارت کے لیے کسی ایڈیٹر کی تلاش میں قاضی محمد رفیع سر اقبال الدولہ وزیر اعظم کی طرف سے لکھنؤ آئے۔ وہاں سے میرا نام سن کر لاہور آئے اور مجھ سے دو مضمون یکے بعد دیگرے لکھوا کر سر اقبال الدولہ کو بھیجے۔ دوسرا مضمون بھی انھوں نے پسند کیا اور میں وہاں چلا گیا۔

کانپور میں چار پانچ سال کے اندر اتنی غزلیں کہی تھیں کہ ایک دیوان تیار ہوگیا۔ وہ میں نے بیچ ڈالا۔ کیوں کہ مجھے تو پسند نہ تھا مگر خریدار کو پسند آیا۔

حیدرآباد میں مجھے صرف ایک مضمون ہفتہ وار لکھنا پڑتا تھا۔ باقی اوقات فرصت کے تھے۔ مجھے یہ شوق پیدا ہوا کہ انسان کو کسی علم یا فن میں کمال حاصل کرنے کے لیے عمر کافی نہیں ہوسکتی مگر جو حاصل ہے اور فرصت کے موافق ہر علم و فن کچھ کچھ حاصل کرے اگر ذہانت قدرت سے ملے اور محنت خود کرے۔ کاتب کو اپنی خوشنویسی پر ناز تھا۔ ایک دن میری بحث چھڑی اور شکایت پر اس نے کہا کہ میں نے تین سال کی محنت میں جتنا حاصل کیا ہے کوئی دس برس مشق کرے تو بھی یہ بات حاصل نہیں ہوسکتی۔ یہ سن کے میں نے وصلیاں منگائیں اور الف ب لکھ کر اسی قلم کے پاس اصلاح کے لیے لے گیا۔ تین مہینے مشق کرکے اور اخبار کی کاپی لکھ کر چھپوا دی۔ نستعلیق کے بعد نسخ، خط ثلث، شفیعہ اور طغریٰ کی مشق کرتا رہا۔ پھر علوم نجوم اور جفر پر سخت محنت اور اس کے جاننے والے کی تلاش میں بہت بہت دوڑ دھوپ کی۔ اسی طرح بہت سے علوم و فنون پر ریاضت کرتا رہا۔ اس فرصت میں پانچ سو شعر کا ایک قصیدہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں لکھا اور مصحف ناطق نام رکھ کر شائع کیا۔

اس زمانے میں مولوی حسن الزماں محدث نیشاپوری سرکار نظام سے پانچ سو روپیہ ماہوار تصنیف کے لیے پاتے تھے۔ انھوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ ایک کتاب عقاید حنفیہ کے مطابق شائع کرنے والے ہیں۔ مگر وہ کتاب جس کا نام الفقہ الاکبر من اہل البیت الاطہر تھا جب شائع ہوئی تو دیکھا کہ حنفیوں کے خلاف اور محدثوں کے موافق ہے۔ اور مولوی عبدالعزیز شافعی جو میرے اساتذہ میں سے ایک استاد مولوی غلام محمد محدث کے داماد تھے مولوی حسن الزماں کے شریک و مددگار رہتے۔ ان دونوں عالموں نے مل کر یہ کتاب تصنیف کی تھی۔ حیدرآباد کے ایک رئیس نے وہ کتاب مجھ کو دکھائی اور کہا کہ مصنف نے اعلان کے خلاف کیا ہے اور اپنے مذہب کی خدمت حنفیوں کو مغالطہ دے کر کی ہے۔ مجھ سے ان مولوی صاحب نے کہا کہ تم اپنے اخبار ملک و ملت میں اس پر ریویو کر دو۔

میں نے اس پر بہت غور و فکر کے بعد بیس اعتراضات کیے اور اخبار میں شائع کر دیے۔ ریویو پڑھ کر اہل علم تو بہت خوش ہوئے مگر مولوی عبدالعزیز صاحب کچھ خفا اور کچھ پریشانی کی حالت میں تشریف لائے۔ ان کی عمر ۷۰ سال تھی اور میرا سن تخمیناً ۳۰ برس کا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ تم نے یہ غلط حرکت کی۔ اتنے بڑے فاضل محدث جس کو ۴۰ ہزار حدیثیں مع اسناد و اسماء الرجال یاد ہیں اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی۔ میں نے عرض کی کہ اگر میرے اعتراضات صحیح ہیں تو میں قابل ملامت نہیں ہوں اور اگر غلط ثابت کر دیجئے تو میں اپنی غلطی کا اعلان کر دوں گا۔ کیوں کہ میں کوئی مشہور آدمی نہیں ہوں کہ مجھے اعتراف عجز میں تامل و شرم ہو۔ انھوں نے فرمایا کہ اچھا حکیم مصباح الدین خاں دہلوی کے مطب میں بعد جمعہ آؤ میں بھی آجاؤں گا۔ جمعہ کے بعد حکیم صاحب کے مطب میں وہ بھی تشریف لائے اور میں بھی گیا۔ گفتگو بھی ہوئی مگر کوئی بات ایسی نہ ہوئی جس سے حاضرین میں سے کوئی یا میں اس منزل پر پہنچتا کہ میرے اعتراضات غلط تھے۔ دوسرے جمعہ پر مباحثہ اٹھا رہا۔ یہاں تک کہ چار جمعے گزر گئے اور بات طے نہ ہوئی

تو حیدرآباد کے علما نے مجھ سے کہا کہ تم اصل مصنف یعنی مولوی حسن الزماں سے بات چیت کیوں نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ وہ مجھ سے علم میں اس قدر جید ہیں کہ میں ان سے مناظرہ نہیں کر سکتا۔ لوگوں نے کہا کہ تحریری مباحثہ ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا کتابیں ساتھ نہیں لایا ہوں۔ سب نے کہا کہ کتابیں ہم لوگ بھیج دیں گے۔ میں نے ایک رقعہ مصنف صاحب کو لکھا کہ آپ کی کتاب کے متعلق چند باتیں آپ سے دریافت کرنا ہیں۔ اگر آپ جواب دینے کا قصد کریں تو مجھے مطلع فرمائیں۔ تاکہ میں وہ سوالات قلم بند کر دوں۔ انھوں نے جواب تحریری میں اقرار کیا۔ میں نے بارہ سوال ایسے لکھے کہ اگر غلط جواب دیں تو ان کی غلطی اظہر من الشمس ہو اور اگر صحیح جواب دیں تو ان کی کتاب غلط ثابت ہو۔

مولوی صاحب صرف حدیث و فقہ جانتے تھے، نہ تو منطق و فلسفہ سے مس تھا نہ دماغ معقولات سے مناسبت فطری رکھتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سوال کچھ جواب کچھ۔ شاخیں غیر متعلق پیدا ہو جاتی تھیں یا کسی وجہ سے انھیں یہ یاد ہی نہ رہتا تھا کہ وہ اپنی کتاب یا میرے جواب میں پہلے کیا لکھ گئے ہیں اور اب کیا لکھ رہے ہیں۔ حتیٰ کہ میں نے بارہ سوال کیے اور انھوں نے جواب گیارہ کے دیے۔ میں رات بھر کتابوں کا مطالعہ کرتا اور ان کا جواب الجواب لکھتا تھا۔ تقریباً ایک سال یہ سلسلہ رہا۔ اس کا اختتام بہت افسوسناک ہوا اور وہ اس طرح کہ رات کو مولوی حسن الزماں صاحب میرے اعتراضوں کا جواب لکھنے کے لیے اٹھے اور اٹھ کر لیمپ جلایا۔ سوء اتفاق سے لیمپ بھڑک اٹھا اور اس کے شعلے اس قدر بڑھے کہ دونوں ہونٹ اور دونوں ہاتھ جل گئے۔ مولوی عبدالعزیز صاحب نے آکر مجھ سے یہ اتفاقی حادثہ رو رو کر بیان کیا اور کہا کہ تمھاری تحریروں کا جواب نہ وہ خود لکھ سکتے ہیں ہونٹوں کے جل جانے سے لکھا سکتے ہیں۔ مجھ کو اس واقعے سے سخت صدمہ پہنچا۔ کیوں کہ نہ میں اس مباحثے کو شروع کرتا نہ وہ جواب لکھنے کے لیے لیمپ جلاتے نہ یہ حادثہ رونما ہوتا۔ جن علما نے مجھ کو کتابیں بھیجی تھیں میں نے انھیں واپس کر دیں۔ اور مناظرے کی صورت تمام بیان کر دی۔

دکن میں ذوقِ شاعری عام اور کامیاب نہ تھا مگر حضرت داغ اور ان کے تلامذہ موجود تھے ان کے ساتھ ایک مشاعرے میں شریک ہوا تھا۔ طرح میں جو غزل میں نے پڑھی تھی اس کا مطلع یہ ہے ؎

وقت رخصت چلتے چلتے کہہ گئے ۔۔۔ اب جدا ہاں رہ گئے سو رہ گئے

اس کے علاوہ اور کوئی غزل مکمل میرے پاس نہیں ہے۔ کیوں کہ مختلف علوم و فنون کے شوق میں وہاں کئی سال گزر گئے۔ چنانچہ حکیم مصباح الدین خاں صاحب سے طب شروع کی اور پھر دہلی جا کر حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں صاحب کے یہاں ختم کی جو ذریعۂ معاش ہونے کی وجہ سے اب تک میرے ساتھ ہے۔

کچھ روز لکھنؤ میں رہ کر سہسرام میں حضرت حسن جان صاحب سے ملنے گیا جو ایک درویش کامل اور صاحب علم فضل تھے۔ وہاں وحدۃ الوجود والشہود پر گفتگو شروع ہو گئی۔ اور تقریباً ایک ہفتہ یہ سلسلۂ بحث رہا جس کے سننے کے لیے سہسرام کے بعض علما بھی آتے تھے۔ اس بحث میں مجھ کو شکست ہوئی اور جب سے میں وحدۃ الوجود کو حق سمجھتا ہوں۔ وہاں حسن جان صاحب نے مجھ سے باقاعدہ مطب شروع کرایا اور ان کی توجہ خاص سے یہاں بہت سے مریضوں کو فائدہ پہنچا۔

چار مہینے کے بعد میں کانپور آیا اور مطب کرنے لگا۔ یہاں پھر شعر و شاعری کا سلسلہ شروع ہوا جو حیدرآباد اور سہسرام میں ملتوی رہا تھا۔ کانپور سے لکھنؤ جا کر اکثر مشاعروں میں شرکت کرتا رہا۔ بارہا ایسا ہوا کہ برسوں اور مہینوں ایک غزل بھی لکھنے کی نوبت نہیں آئی خواہ کسی علم و فن میں مصروف ہونے کی وجہ سے یا کسی تصنیف و تالیف سے فرصت نہ ملی۔ اس لیے غزل کہتا تھا تو یہ کیفیت ہوتی تھی کہ جیسے آج ہی شاعری کی ابتدا ہوئی ہے۔ اس وجہ سے کلیات

کر پڑتی تھی اور اصول ادب و صحتِ لغات اور قواعدِ فن کا ہمیشہ لحاظ رہتا تھا۔ اسی کم مشقی کی وجہ سے جب اب تک تکمیل شاعری نہ کر سکا تو اندازہ کر لیجئے کہ آغاز شاعری میں میرے اشعار کس کلام کے ہوئے ہوں گے گو معلوم نہیں کس وجہ سے اب تو آپ اس وقت بھی لوگ پسند کرتے تھے۔ یہ نتیجہ میں نے مشاعروں کی واہ واہ سے نہیں نکالا ہے بلکہ لوگوں نے غزلیں لے کے خریدیں اور ایک شخص نے کافی معاوضہ دے کر پورا ایک دیوان لکھوایا جو خریدار کے نام سے مقبول بھی ہو گیا اور علاوہ اس کے مستند اور بے پایاں نقادوں نے اس قدر تحسین کی ہے کہ شاید کسی شاعر کی زندگی میں اتنے اور ایسے لوگوں نے اس قدر تعریف نہ کی ہوگی۔

۱۸۹۲ء میں کثرتِ شعر و شاعری سے تنگ آ کر لکھنؤ کو خیر باد کہہ کر عزیز الدین (کنگ آف ...) کے علاج کی غرض سے کلکتہ طلب کیا گیا۔ یہاں آتے ہی اس شوق کے مطابق کہ چند روز شغل پر بھی ... خود خوبی اور ... میری ضیافت میں اپنے ہاں ایک مشاعرہ کر دیا میں نے ... میں کہا کہ

ہر زمیں کز نسیم آسماں پیداست

کئی سال کلکتہ میں مطب کرتا رہا۔ اپنی استعداد و حیثیت کے موافق یہاں کے کتب خانوں کی سیر کرتا رہا۔ اسی اثنا میں یہ خیال آیا کہ فنِ نسب مٹا جا رہا ہے۔ اس کو محفوظ کر لیا جائے۔ بغیر سوچے سمجھے صرف ذوق، جس کی بنیاد پر دنیا کے سب سے پہلے انسان سے بسم اللہ کر دی اولاد آدم کی اولاد و ذریت سے ملی۔ پھر عربی کی مستند تواریخ و انساب جمع کرنا شروع کیں۔ جب کلکتہ کے کتب خانوں کو دیکھ چکا تو پٹنہ میں خدا بخش کے کتب خانے میں گیا۔ وہاں دو کتابیں نئی ملیں۔ ایک رسالہ ابن حزم جو نسب میں بہت مستند ہے۔ دوسری کتاب فنِ رجال کی گیارہ جلدوں میں ملی، جس میں ہر راوی کا نام پچھلی سات پشتوں تک درج تھا۔ پھر ٹونک کے کتب خانے میں گیا۔ وہاں سے حیدرآباد پہنچا۔ وہاں کے کتب خانے سے بھی ایک بہت اچھی کتاب ملی۔ اس طرح تقریباً تیس سال کتابوں سے استفادہ کیا اور پچاس مطبوعہ اور غیر مطبوعہ پرائیویٹ شجرے حاصل کیے اور مختلف قوموں اور ملکوں کی تاریخیں پڑھیں۔ رفتہ رفتہ یہ شجرہ اتنا بڑا ہو گیا کہ اس کمرے میں سمائے گا جس میں ایک مشاعرہ ہو سکتا ہے۔ اندازہ کیجیے کہ کتنے سال اس کام میں گزرے ہوں گے اور کتنے برس شاعری حرام رہی ہوگی۔

صرف یہ شجرہ ہی میری شاعری میں مخل نہیں ہوا بلکہ قریب قریب ایسے اور بھی بہت سے کام کیے۔ مثلاً نظم اردو کی تالیف یا کتاب تصوف اسرارِ حقیقت بستانِ معرفت کی تصنیف یا مسلم یونیورسٹی میں طلبا کو ایک لیکچر دیا جس میں پانچ سو کتابوں کے نام ان کے مصنفوں کے نام اور ان میں جو مضامین ہیں ان کا خلاصہ دو دو سطر میں بیان کیا۔ خیال کرنا چاہیے کہ ان پانچ سو عربی زبان کی کتابوں کے مطالعہ میں اور ان کے نوٹ لینے کرنے میں کتنا وقت صرف کیا ہوگا۔

اور قوت کے بیان کرنے سے اظہارِ قابلیت مقصود نہیں اول تو مجھ میں قابلیت ہی نہیں کیونکہ طلبِ اصل قوتِ اصل۔ دوسرے یہ کہ جس چیز سے مجھ کو کسی قدر مناسبت ہے اس کو بھی اس جگہ کہوں یا بلکہ میرا منشا یہ ہے کہ شاعری کے لیے مجھ کو بہت کم وقت ملا اور یہ بھی خیال رکھیے کہ میں کوئی قوی ہیکل آدمی نہیں ہوں۔ شدید محنتوں کی وجہ سے کتنی مرتبہ بیمار ہوا ہوں گا اور کتنے متفرق کاموں میں کتنا وقت صرف ہوا ہوگا۔ مثلاً سیکڑوں سہرے، شادی کے رقعے، ولادت، وفات اور تعزیت کے لیے کتنی تاریخیں کہی ہوں گی اور ایسے شعرا مضامین نثر، نظم اور غزلوں پر اصلاحیں دی ہوں گی بعض دیوان ایسے زیرِ اصلاح رہے ہیں جن کی اصلاح کئی برس میں ختم ہوئی۔ اگر حساب کیا جائے تو مشکل سے پچیس سال مجھے اس فن کے لیے ملے ہوں گے۔ وہ بھی ایک مشت نہیں بلکہ متفرق طور پر دقتوں کے ساتھ اور دقتِ مزاجی فن کی مشق کے لیے سمِ قاتل ہے۔

اپنی شاعری میں میں نے اکثر موقعوں پر چند امور کا لحاظ رکھا ہے۔

(۱) کوئی پیغام ہو یا کسی حقیقت کا اظہار یا کسی راز کا انکشاف یا عشق و محبت کے پیرائے میں کسی مسئلہ کا حل یا حسنِ تعلیل کا ضروری اور اہم منظر ہو۔

(۲) میں نے کسی بے بنیاد بات پر جو محض شاعری اور خیالی ہو کسی شعر کی عمارت نہیں کھڑی کی ہے اور بات کا بتنگڑ نہیں بنایا۔

(۳) میں نے بارعب اور شاندار الفاظ سے شعر کو بھاری بھرکم نہیں بنایا ہے بلکہ معنی کو وسیع اور الفاظ کو سادہ مگر برمحل استعمال کرنے کی کوشش کی ہے

(۴) محض مقامی اور اہلِ زبان کے مخصوص محاورے زیادہ استعمال نہیں کیے ہیں، کیوں کہ ایسی زبان کی عمر کم ہوتی ہے اور اپنے قیاس کے موافق تھا خیال کے لیے ایسی زبان رکھی ہے جو کئی صدیوں کے بعد بھی باوجود قدرتی لسانیاتی تغیرات کے ناقابلِ فہم اور بے لطف نہ ہو۔

(۵) میں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ جن اقسام کے مضامین نظم کرنے میں غالب کو اردو زبان کی طرف سے بے پروائی کرنا پڑتی ہے، یعنی اس قسم کے باریک و دقیق خیالات بہتر سے بہتر پیرایہ اور صاف و سادہ الفاظ و عبارت میں نظم کروں، اور اردو زبان میں ایسے خیالات کا اضافہ کروں جن کی جگہ ہنوز خالی ہے اور جن کی کمی کی وجہ سے اردو ادب فارسی ادب سے پیچھے ہے۔

سادہ مزاج شعرا کی طرح میں زیادہ تحسین طلب اور شہرت پسند نہیں ہوں، اس دعوے کی دلیل ضروری ہو تو یہ واقعہ ہے کہ شعر کہنے کے لیے بھی مجبور یہ عذر نہیں ہوا کہ طبیعت حاضر نہیں ہے۔ مگر پڑھنے کے لیے صدہا مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ طبیعت حاضر نہیں ہوئی اور نہیں پڑھ سکا۔ اگر لوگوں نے بہت مجبور کیا تو مجبوراً نہایت بددلی سے تین چار شعر پڑھ دیئے۔ اب رہی شہرت طلبی تو اس کی بابت صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ ہندوستان بھر کے شعرا میں جن حضرات نے اپنے کلام کو رسالوں میں شائع کرنے سے پرہیز کیا ہے۔ ان میں سے ایک میں بھی ہوں۔

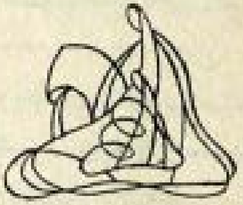

جالبؔ دہلوی

ایڈیٹروں کی ہندوستان میں پبلک و گورنمنٹ کے نزدیک کوئی وقعت ہو یا نہ ہو مجھ پر اپنے مہربان[1] کے حکم کی فرمائش بمنزلہ فرض کے ہے اور گو اصولاً مجھے اس سے اختلاف ہے کہ کوئی شخص خود اس امر کا صحیح اندازہ لگا سکتا ہے کہ کن کن واقعات نے اس کی زندگی پر کوئی مستقل و پائیدار اثر ڈالا ہے اور اسے وہ بنایا ہے جو وہ اس وقت ہے۔ تاہم جہاں تک میری یادداشت کام دے سکتی ہے کیونکہ ۱۸۸۱ء سے قبل کے سالوں کی ڈائریاں یہاں میرے پاس موجود نہیں ہیں اور نہ کوئی ایسا شخص بھی یہاں موجود ہے جس سے میں سن طفولیت کی تصدیق کر سکوں اپنی گزشتہ زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالوں گا اور ان واقعات کو بالاختصار لکھنے کی کوشش کروں گا جن سے میری جرنلسٹک (صحافتی زندگی) کچھ متاثر ہوئی ہے کیونکہ جناب فوق کی فرمائش کی بجا آوری بظاہر اسی میں منحصر ہے اور یقیناً ان کا یہ منشا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اخبار نویس ان کی خاطر "کراماً کاتبین" سے دوستانہ ربط ضبط پیدا کریں اور ان کے روزنامچے کے ضروری اقتباسات کشمیری میگزین میں چھپنے کے لیے بھیج دیں۔

چہ گویم از سر و سامانِ خود عمریست چوں کاکل
سیہ بختم پریشاں روزگارم، خانہ بر دوشم

ابتدائی حالات کے متعلق میں صرف اتنا لکھنا کافی سمجھتا ہوں کہ میری پیدائش ۱۸۶۸ء کی تیسری سہ ماہی میں قدیم دارالسلطنت دہلی کے ایک خاندان میں واقع ہوئی جو اپنے شجرۂ نسب سے "سید نقوی" ظاہر ہوتا ہے اور چند پشت اوپر بعض ایسے نام اس میں نظر آتے ہیں جن کے تذکرے اور حوالے کتب سیر و تاریخ میں ملتے ہیں۔ یہ خاندان چونکہ ہندوستان میں پہنچنے کے بعد فی الفور خلیفہ شاہان دہلی کے دامن دولت سے وابستہ ہو گیا تھا اور اس کے اراکین معزز عہدوں[2] پر سرفراز رہے۔ اس لیے غدر ۱۸۵۷ء کا اس پر بھی سخت تباہی خیز اثر پڑا جو لوگ ہلاکت سے بچ رہے تھے انہوں نے امن چین ہونے کے وقت خود کو نہ صرف وسیلۂ معاش بلکہ مکان اور خانہ داری کے سامان سے بھی محروم پایا اور بمصداق الکاسب حبیب اللہ میرے والد[3] ماجد نے صنعت شال دوزی کو اپنی اور اپنے متعلقین کی شکم پروری کا ذریعہ بنایا جس کے ساتھ بعد میں تجارت کا

---

[1] میر بشارت علی جالبؔ دہلوی نے آپ بیتی کے یہ اوراق منشی محمد الدین فوق مرحوم کی فرمائش پر ۱۹۱۳ء میں لکھے تھے اور انہوں نے کشمیری میگزین لاہور کے ایڈیٹر نمبر بابت اکتوبر ۱۹۱۳ء میں شائع کیے تھے۔ اس کی تمہید بہت طویل تھی جو حذف کر دی گئی ہے۔ (محمد عبداللہ قریشی)

[2] جالب مرحوم کے حقیقی دادا میر احمد علی نقوی نواب شرافت محل کی سرکار میں داروغگی کے عہدے پر ممتاز تھے جو مرزا جہانگیر بہادر کی والدہ اور اکبر ثانی تاجدار دلی کی بیگم تھیں۔

[3] جالب مرحوم کے والد کا نام میر وزیر علی تھا۔

منفعت بخش جزو بھی شامل کر لیا گیا۔

میری پیدائش کے وقت یہ آخری جزو غالب اور کسی قدر فارغ البالی کا موجب تھا۔ لیکن ڈیڑھ دو سال بعد ہی ایک انقلاب ہوا جو فلاکت و عسرت کو اپنے ساتھ لایا مگر خدائے قادر و توانا نے میری تربیت و تعلیم کی ایک یہ صورت پیدا کر دی تھی کہ جناب صاحب عالم میرزا مغل صاحب ولد مرزا اکبر بخش ولد میرزا نجم بخت ابن حضرت اکبر شاہ ثانی کو جو بہ حیثیت ایک رکن خاندان تیموریہ کے سرکاری وظیفہ خوار اور میرے والد کے موتمن و غم گسار تھے، پیدائش کے وقت ہی سے میرے حال پر خاص التفات ہوا اور ان کی زوجہ محترمہ نے جن کو میں استانی جی کہا کرتا تھا، اولاد کی طرح میری پرورش و تربیت کا ذمہ لیا۔ اس طرح گویا دو سوا دو برس کی عمر ہی میں، میں بغرض تعلیم استاد کے ہاں چلا گیا اور میرے پدر روحانی کی شفقت نے حالت شیر خواری سے نکلتے ہی مجھے پڑھانا شروع کر دیا تھا۔

شہزادوں کے ہاں کی اس پرورش و تربیت نے میری زبان و اخلاق پر بہت زبردست اثر ڈالا اور قدامت پرستی کا ایک گہرا رنگ چڑھا دیا۔ صاحب عالم بہادر نے قاعدہ بغدادی و پارۂ عم پڑھانے کے بعد مجھے اردو شروع کرا دی تھی اور جس وقت میں نے پہلی اردو کی پہلی ختم کی اس وقت دوسری کا اور دوسری کے وقت تیسری کا اور نصف چوتھی اور تیسری کے وقت نصف چوتھی اور تہائی پانچویں مجھے قریب قریب حفظ ہو گئی تھی۔ کیونکہ اسی گھر میں ایک اور مجھ سے بڑی عمر کا لڑکا ان کتابوں کو پڑھتا تھا اور میں اس کے سبق کو غور سے سننے کے باعث اپنے ذہن و دماغ میں محفوظ پاتا تھا

پھر صاحب عالم نے قدیم طریقہ پر فارسی شروع کرائی اور دستور الصبیان ختم کرانے کے بعد مجھے عربک سکول کی شاخ اور اس کے اٹھ جانے پر کلاں محل کے سکول میں جہاں نارمل کے ساتھ تین ماڈل کلاسیں تھیں پڑھنے بھیجا اور چونکہ اردو فارسی جانتا اور تحریر کی مشق رکھتا تھا میں ایک دم سے تیسری لوئر کلاس میں داخل کیا گیا اور آٹھ نو مہینے کی پڑھائی کے بعد میں نے جماعت سوم کا امتحان پاس کر لیا جس کے بعد میں اینگلو عربک ہائی سکول میں داخل ہوا اور سال بہ سال ترقی کر کے چودہ سال کی عمر میں میں نے پنجاب یونیورسٹی کا امتحان مڈل جنوری ۱۸۹۶ء اور سولہ سال کی عمر میں انٹرنس مارچ ۱۸۹۸ء میں پاس کر لیا جس کی جماعتیں اسی وقت سے عربک سکول میں کھولی گئی تھیں۔

عربک سکول کی تعلیم کے دوران میں مجھے جماعت اول مڈل سے جماعت پنجم ہائی کلاس تک برابر وظیفہ ملتا رہا اور علاوہ دیگر اساتذہ کے جناب شمس العلماء مولانا حالی[1] ظلہم اور خان بہادر خواجہ تصدق حسین صاحب[2] جج عدالت خفیفہ دہلی سے نہ صرف سکول میں بلکہ پرائیویٹ

---

[1] مولانا حالی اس وقت شمس العلماء نہیں تھے، یہ خطاب انہیں ۱۹۰۴ء میں ملا۔

[2] مولانا حالی نے ۱۸۸۷ء میں عربک سکول دہلی کی ملازمت سے استعفیٰ دیا اور اپنی جگہ اپنے قریبی عزیز خواجہ تصدق حسین کو مقرر کرا دیا جو ترقی کر کے پہلے لاہور میں میر منشی گورنمنٹ پنجاب اور بعد میں خان بہادر اور جج عدالت خفیفہ لاہور ہو گئے۔ انہی کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی آپ بیتی میں تحریر فرمایا ہے کہ میں لاہور میں خان بہادر تصدق حسین کے ہاں جا کر ٹھہرا جو مولانا حالی کے لڑکے تھے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ مولانا حالی کے صرف دو ہی لڑکے مولوی خواجہ اخلاق حسین اور خواجہ سجاد حسین ڈائرکٹر تعلیمات بلوچستان گزرے ہیں۔ تیسرا کوئی لڑکا نہیں تھا۔

(محمد عبداللہ قریشی)

طور پر ان کے دولت محلوں پر جاکر پڑھنے کا بھی فخر حاصل ہوا۔

اس اثناء میں فارسی کی تعلیم پہلے صاحب عالم بہادر کے ہاں اور پھر جناب مولوی اشرف علی صاحب مرحوم خاندانی معلم شاہی کے ہاں جاری رہی جہاں قدیم درس کی میں نے تمام کتابیں ان سے ان کی حسب ہدایت ایک کامستعد استاد سے پڑھیں اور عربی کی تعلیم جناب مولانا محمد اسحاق صاحب مدرس فلسفہ و الٰہیات دار العلوم مولانا نذیر حسین صاحب محدث دہلوی مرحوم اور ایک مولوی سے پائی جس کا یہ اثر تھا کہ سینٹ سٹیفنس مشن کالج دہلی میں داخل ہونے کے بعد مجھے فارسی پڑھنے کی ضرورت نہ رہی اور سابق استعداد کی مدد سے میں نے بآسانی امتحان پاس کر لیا۔ مگر افسوس ہے کہ کالج میں مجھ کو اپنی تعلیم مکمل کرنے اور گریجویٹ بننے کا موقع نہ ملا اور ایف۔ اے تک تعلیم پاکر میں کالج چھوڑنے پر مجبور ہوا۔

تحریری لائن میں آنے کا سلسلہ نظم سے شروع ہوا اور بارہ تیرہ سال ہی کی عمر میں ایک ہم جماعت کی تحریک سے کچھ اشعار موزوں کر کے میں حضرت مجروح مرحوم کی خدمت میں لے گیا، دو سال بعد حضرت مجروح نے اپنی پیرانہ سالی کا عذر اور میری طبیعت کے رنگ پر نظر کر کے مجھے حضرت داغ مغفور سے استفادہ کی صلاح دی اور چونکہ وہ تعلق خاندان شاہی کے باعث ابتداء سے میرے حال پر مہربان تھے اس لیے انہوں نے صلاح میں ایک خاص شفقت مبذول رکھی جو ان کی وفات کے وقت تک قائم رہی۔

فکر سخن اس طرح جاری تھی کہ ایک تقریب خاص سے سید میر حسن صاحب رضوی مالک اخبار خیر خواہ عالم دہلی کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا اور وہاں جناب میر نثار علی صاحب شہرت ابو الاخبار پنجاب نے مجھ کو مضمون نگاری پر مائل کیا اور جناب حاذق الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب دہلوی نے ابتدا ہی میں غیر معمولی حوصلہ افزائی کر کے اپنا مرحوم اکمل الاخبار تحریری طور پر میرے سپرد کر دیا۔

اس کے تھوڑے عرصہ بعد میں نے اودھ اخبار لکھنؤ کے لیے مضمون لکھنے شروع کیے اور جناب منشی نولکشور صاحب سرگباشی بالقابہم لاٹ صاحب کے ساتھ میرٹھ آنے پر مجھے اپنے ہمراہ لکھنؤ لے گئے اور اودھ اخبار سے یہ تعلق منشی صاحب سرگباشی کی وفات کے وقت تک قائم رہا۔

پھر دکن کا شوق مجھے اخبار دکن گزٹ بمبئی کی اسسٹنٹ ایڈیٹری پر لے گیا۔ جس کے سلسلے میں حیدر آباد دکن اور جنوبی ہند کی سیاحت کا موقع ملا۔ وہاں سے شیخ غلام محمد صاحب مرحوم نے اخبار وکیل (امرتسر) کی ایڈیٹری کے لیے جس کو نیا جاری کیا گیا تھا، بلایا اور ۱۸۹۸ء میں چھ سات ماہ تک میں اخبار پنجاب امرتسر کی ایڈیٹری بدیں توقع کرتا رہا کہ اس کے مالک اس کو روزانہ کر دیں گے۔ جب یہ امید پوری نہ ہوئی اور جناب مولوی محبوب عالم صاحب نے اپنے پیسہ اخبار کو روزانہ کر کے مجھے اس میں بلایا تو میں ۱۹۰۱ء میں لاہور چلا آیا اور اس وقت تک (۱۹۱۵ء) بحیثیت (جوائنٹ) ایڈیٹر روزانہ پیسہ اخبار سے متعلق ہوں۔ گو درمیان میں روزانہ کے ملتوی ہو جانے پر میں تین سال برابر دہلی و میرٹھ رہ آیا اور اکتوبر ۱۹۰۸ء سے اکتوبر ۱۹۱۰ء تک پورے دو سال پھر اخبار وکیل امرتسر کی ایڈیٹری کرتا رہا نیز اکتوبر ۱۹۰۳ء سے مارچ ۱۹۰۵ء تک اخبار شریف مرحوم کو ایڈٹ کیا جس کی یاد اب تک میرے اور لوگوں کے دلوں میں باقی ہے۔

آخر میں مجمل طور پر یہ بتا دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنی زندگی میں مجھے سر سید مغفور، مولوی سمیع اللہ خاں صاحب مرحوم، شمس العلماء مولانا حافظ ڈپٹی نذیر صاحب مرحوم دہلوی، شمس العلماء مولانا آزاد دہلوی مرحوم، خان بہادر شمس العلماء منشی ذکاء اللہ صا

دہلوی مغفور سے بھی تعلیم و استفادہ کا موقع ملا ہے۔ اور اس کا میری اخبار نویسی پر کچھ نہ کچھ اثر پڑا ہے۔

جناب جالبؔ نے چھتیس سال اخبار نویسی کی۔ سب سے پہلے روزنامہ صلح کل میں بحیثیت ایڈیٹر کام کیا۔ پھر اکمل الاخبار، اودھ اخبار، وکیل امرتسر، پیسہ اخبار لاہور، ترجمان، ہمدرد، دکن گزٹ، شریف، ہمدم، رسالت وغیرہ میں کام کرتے رہے۔ کلکتہ سے بھی اپنا ایک اخبار نکالا۔ کوئی تیرہ سال ہمدم لکھنؤ کے ایڈیٹر رہے اور نومبر ۱۹۲۹ء میں وہاں سے سبکدوش ہوئے۔ ۴ مارچ ۱۹۳۰ء کو اپنے روزانہ اخبار ہمت کا پہلا نمونہ کا پرچہ نکالا اور پھر ۴ مارچ سے اسے باقاعدہ جاری کر دیا۔ اس اخبار کو ابتدائی سال مشکلات سے نکالنے کی خاطر سید صاحب نے پیرانہ سالی میں بڑی محنت جانفشانی سے کام کیا جس سے آپ کے قویٰ کو سخت صدمہ پہنچا۔ یہاں تک کہ ۸ جولائی ۱۹۳۰ء کی شام کے چھ بجے آپ دنیائے صحافت سے منہ موڑ کر اور اسلامی تہذیب و شائستگی کے ساتھ اردو ادب کو روتا چھوڑ کر منوں مٹی کے نیچے آرام سے سو گئے۔ آپ کو تحریر و تقریر پر یکساں قدرت حاصل تھی یہی وجہ ہے کہ آپ قلمرو صحافت پر حکمرانی کرنے کے ساتھ اقلیم دل پر بھی حکومت کرتے تھے اور ہر خیال کے لوگ آپ کو سر آنکھوں پر جگہ دیتے تھے۔

(محمد عبداللہ قریشی)

مولوی مہیش پرشاد

میرے باپ اور دادا دونوں پولیس میں نوکر تھے۔ ۱۹۱۱ء میں اسکول لیونگ پاس کرنے پر میرے سامنے دو سوال رکھے گئے کہ میں یا تو تھانیدار بن جاؤں یا پولیس میں سب انسپکٹر بھرتی ہو جاؤں۔ یہ دونوں باتیں میرے خیالات کے خلاف تھیں۔ پہلی کے لیے تو میں کسی حالت میں بھی تیار ہی نہ تھا۔ ہاں دوسری صورت کے لیے میں مجبوراً تیار ہوا جس کے لیے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ پولیس میں شناخت نشانی انگوٹھا (THUMB IMPRESSION) کے محکمے میں چلا جاؤں گا۔ یا کورٹ انسپکٹری کروں گا تاکہ جو رات دن کے تھانے والے جھنجھٹ رہتے ہیں ان سے پیچھا چھوٹا رہے گا۔

۱۹۱۱ء کا جولائی یا اگست کا مہینہ تھا۔ میں الہ آباد کے کلکٹر سے ملا، عرضی دی۔ سول سرجن کے یہاں سے پاس ہوا۔ گھر گھرانے کی تصدیق ہوئی۔ آخر ساری ضروری باتیں ٹھیک ہو گئیں اور میرا کاغذ کمشنر کے یہاں بھیجا گیا۔ خدا کے فضل سے وہاں بھی چلا گیا۔ تب تو بہت سے گھر گھرانے والوں کی عجیب عجیب امیدیں بندھیں۔ کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ۔ مگر میں انسپکٹر جنرل کے ہاں رک گیا۔ شاید سبب یہ تھا کہ میری عمر اس وقت کم تھی۔ میں دوسرے سال جا سکتا تھا جبکہ دوسرے زیادہ عمر والوں کے لیے اگلے سال موقع نہ تھا۔ اچھا جو ہوا سو ہوا پولیس میں جانے کا سوال ایک برس کے لیے کھٹائی میں پڑ گیا۔

میں نے شری اروند گھوش کی سوانح عمری میں پڑھا تھا کہ وہ گھوڑے کی سواری میں ٹھیک نہ اترنے کے کارن آئی سی ایس کی جگہ سے محروم رہ گئے تھے۔ مگر خدا کے فضل سے انہیں آج جو عزت حاصل ہے وہ شاید آئی سی ایس ہونے پر نہ ہوتی۔ میرا جی پولیس میں جانے کو چاہتا ہی نہ تھا۔ لہٰذا رک جانے کے بعد میں نے اگلے سال نہ جانے کا تہیہ کر لیا۔ عربی پڑھنے کی طرف جھکا۔ خدا کے فضل سے آج جس حالت میں ہوں وہ قابل اطمینان ہے۔ جو لوگ پہلے کہتے تھے کہ میں پولیس میں نہیں گیا، وہ بھی آج کہتے ہیں کہ پولیس کی نوکری سے آپ بہرحال اچھی حالت میں ہیں۔

۲

الہ آباد سے پنجاب یونیورسٹی کی عمر زیادہ ہے اور اس کا اورینٹل کالج پنجاب میں سب سے پرانا ہے۔ مولوی عالم و فاضل کے امتحانات میں سے کسی ایک یا دونوں کو آج تک کسی نے اس کالج سے پاس نہیں کیا۔ ۱۹۱۳ء میں جب اس کالج میں داخل ہوا تو ۱۹۱۵ء کے امتحان فاضل میں یونیورسٹی بھر میں ۲۰ میں سے صرف ۳ پاس ہوتے تھے۔ کچھ لوگ میرے بارے میں کہتے تھے کہ کیسا ہندو ہے جو عربی پڑھنے آیا ہے۔ جبکہ مسلمان لڑکے بھی بری طرح ناکام ہوتے ہیں۔ خدا کا کرنا کہ ۱۹۱۶ء کے امتحان عالم میں یونیورسٹی بھر میں کوئی کامیاب نہ ہوا

مجھے سنہ [illegible] میں عالم کے امتحان میں بیٹھنا تھا جو بہت مشکل تھا۔ میں گھبرایا نہیں۔ کبھی کبھی وقت یہ خیال ضرور آتا تھا اگر میں فیل ہوگیا تو یہ شخصی طور پر میرے ہی لیے نہ ہوگا بلکہ جاتی کی سبکی بھی ہوگی۔ لیکن میرے یہ آخر کے الفاظ مجھے ڈھارس دیتے تھے کہ ایشور مالک ہے جو کچھ ہوگا اچھا ہی ہوگا۔ آخر میں نے بھی تو محنت کی یہاں تک کہ میرے چال چلن اور محنت سے میرے استاد بھی متاثر ہوئے۔ لاہور کی شاہی مسجد، نیلا گنبد وغیرہ کی مسجدوں میں بھی جانے اور وہاں کے استادوں اور طالب علموں سے فائدہ اٹھانے کا بھی موقع ملا۔ آخر میں نتیجہ یہ ہوا کہ عالم و فاضل کے امتحانوں کے چھ چھ سو نمبروں سے بالترتیب ۳۲۶ اور ۳۲۲ نمبر مجھے ملے اور مجھے جتنی خوشی ان دونوں امتحانوں میں پاس ہونے سے ہوئی اتنی عمر بھر میں کبھی کسی بات سے نہیں ہوئی۔

۳

مولوی عالم فاضل ہونے کے بعد کچھ روزی کمانے کا مسئلہ میرے لیے کئی وجوہ سے بہت اہم تھا۔ اس سلسلے میں میری دلی خواہش تو یہ تھی اور آج بھی یہی ہے کہ اگر اپنی زندگی کے مطابق معمولی طور سے روزی ملتی رہے تو اپنا سارا وقت ہندی میں مسلمانوں کے ادب، تاریخ اور مذہب وغیرہ موضوعات کی کتابیں لکھنے لکھانے ہی میں زندگی بسر کروں۔ مگر میرے کئی دوستوں نے کہا کہ ابھی ہندی میں اتنا میدان نہیں۔ آپ کو قابل اطمینان طور پر اپنی روزی کا بندوبست کرنے کے بعد لکھنے لکھانے کا جھنجھٹ اپنے سر لینا چاہیے ورنہ ناشروں کے بھروسے رہ کر ٹوٹا اٹھانا پڑے گا۔

یہ بات صاف طور سے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں اس کے سلسلے میں پہلے دو چار دوستوں سے مشورہ کرتا ہوں پھر کچھ عرصے تک اس پر غور کر کے اصول متعین کرتا ہوں اور پھر جو کچھ ٹھان لیتا ہوں اسے کر کے چھوڑتا ہوں۔ آخر میں نے یہ طے کیا کہ کتابیں لکھنے لکھانے والی نوکری کروں گا، یا کم سے کم کسی انٹرمیڈیٹ کالج کی نوکری کروں گا۔

میرے محترم پنڈت مہابیر پرشاد دویدی جی نے میرے لیے ایک جگہ تجویز کی وہ کتابوں ہی سے متعلق تھی۔ مگر معاملہ نہ ہو سکا کیونکہ مجھے صرف چالیس یا پینتالیس روپے مہینہ ہی ملتا تھا۔ اور میں نے کم سے کم پچاس مانگے تھے۔ یہاں تک کہ ۴۹ روپے پندرہ آنے ادائی بھی اپنے فیصلے کے خلاف منظور نہیں تھے۔

اس کے سوا کئی اسکولوں کی ملازمت کی طرف میں نے دھیان نہیں دیا۔ یا ان کے لیے انکار کیا اور کچھ اسباب سے مجھے تصنیف و تالیف سے متعلق ایک اور نوکری کا بھی خیال کرنا پڑا۔ آخر لگ بھگ دو مہینے تک مجھے کوئی نوکری میری منشا کے مطابق نہیں ملی اور اس زمانے میں نے جو کچھ کیا وہ میری دو کتابوں سے علاقہ رکھنے والا کام تھا۔ جن کے لیے مجھے تھوڑا بہت معاوضہ ملا، گو کچھ زمانے کے بعد ملا۔

سچ تو یہ ہے کہ میرے ارادے اور اصولوں کا نتیجہ میری امید اور خیال سے کہیں اچھا ہوا۔ کوئی انٹرمیڈیٹ کالج تو دور رہا مجھے براہ راست ہندو یونیورسٹی میں جگہ مل گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور میرے ایک عزیز دوست نے لاہور سے لکھا کہ آپ نے جو ریاضت مولوی عالم و فاضل کے لیے کی تھی اسی کا پھل ہے جو آپ کو اچھی جگہ ملی ہے۔ آخر مجھے ہندوستانی یونیورسٹی کی جگہ ملنی تھی اسی لیے دوسری ملازمتوں میں معاملات طے نہیں ہوئے تھے۔

اس موقع پر ایک لطیفہ بھی لکھنے کے قابل ہے۔ یونیورسٹی میں میرا تقرر ہو جانے پر ایک دن میرے ایک دوست نے پوچھا

کہ آپ ایک تو کائستھ دوسرے آریہ سماجی۔ آپ کو بھلا مالوی جی مہاراج نے کیوں کر رکھا؟ میں نے جواب دیا، بس یہی تو دو خوبیاں ہیں جن کے کارن مجھے رکھا۔" ہاں میں یہ بھی کہوں گا کہ مجھے محترم شری مالوی جی مہاراج سے صرف چند منٹ تک ہی پہلے پہل بات چیت کرنے کا موقع ملا تھا اور انہوں نے اسی وقت مجھے جگہ دینے کا وعدہ کر لیا تھا بعد میں انہوں نے جس شفقت کا سلوک کیا اسے میں تمام عمر نہیں بھولوں گا۔

۴

میرے ایک چچا سورگیہ لالہ رگھوبیر پرشاد جی تھے۔ وہ گھرانے کے خیال سے تو کچھ دور کے تھے۔ مگر وہ مجھ پر جتنے مہربان تھے اس کے لحاظ سے ان کو جتنا قریبی کہوں اتنا ہی کم ہے۔ حقیقت میں وہ ایک نمونے کے انسان تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں اپنے دونوں چچیرے بھائیوں کے ساتھ ریل میں آ رہا تھا۔ ہم میں سے کسی نے ریل کے دروازے کے نیچے کا وہ ربڑ کاٹ دیا جو دروازے کی روک کے لیے نیچے لگا رہتا ہے۔ وہ ربڑ واقعی ہمارے کسی کام کا نہ تھا یہ ہماری سراسر بے وقوفی تھی کہ ہم نے بلا وجہ اسے کاٹ دیا تھا۔ ہمارے اس فعل پر ہمارے چچا نے ہم لوگوں کو بہت برا بھلا کہا۔ یہ ان کی باتوں ہی کا اثر ہے کہ میں اب رفاہ عام کی کسی چیز کو نقصان پہنچانا بہت بڑا پاپ سمجھتا ہوں اور اگر کہیں ذرا بھی ایسا دیکھتا ہوں تو اسے برداشت نہیں کر سکتا۔

۵

میں اپنی زندگی میں ایک بات یہ بھی دیکھتا ہوں کہ اگر میں اپنی خواہش کے خلاف کوئی کام لالچ یا دباؤ میں آکر کر بیٹھتا ہوں تو مجھے مادی نقصان ہوتا ہے۔ ایک بار کی بات ہے کہ میرے یہاں ایک صاحب آئے۔ میری خواہش تھی کہ ان کو کھانا کھلا دوں۔ مگر کچھ ایسے جھنجھٹ تھے کہ میں مناسب نہ سمجھا [illegible]۔ مگر اسی سے مجھے بھاری نقصان پہنچا۔ ایک بار ایک صاحب کا کام تھا انہوں نے مجھے دس روپے دیئے۔ زبردستی ان روپوں کو میرے سر منڈھ دیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے بعد ہی مجھے دس سے کہیں زیادہ روپوں کا خرچ اٹھانا پڑا۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ اگر میں راستے میں پڑی ہوئی کوڑی کو اٹھا لوں، جو میری نہیں ہے تو میرے سر بیکار میں کئی پیسوں کا خرچ ضرور پڑ جائے گا۔

اب ایک بات جس کا لکھنا ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب میں درجہ تین یا چار میں پڑھتا تھا اس وقت میرے گاؤں کے ایک صاحب کوئی ہفتہ وار اخبار منگاتے تھے۔ میری نظر میں یہ بات بہت اہمیت رکھتی تھی۔ میں کبھی کبھی سوچتا تھا کہ کیا کبھی ایسی نوبت بھی آئے گی کہ میرے نام بھی کوئی رسالہ آیا کرے گا۔ یا جس طرح دوسرے لوگوں کے مضامین اور خبریں رسالوں میں شائع ہوتی ہیں اسی طرح کیا کبھی میں بھی اتنا لائق ہو سکوں گا کہ میرا بھی مضمون کسی رسالے میں چھپ جائے۔

میں انگریزی اسکول میں طالب علم تھا، اس زمانے میں پہلے پہل میرا جو مضمون ایک رسالے میں چھپا تھا، اس پر مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی۔ مگر اب خدا کے فضل سے یہ حال ہے کہ کوئی ہفتہ ایسا نہیں جاتا جو کہیں سے کسی مضمون کی فرمائش نہ آتی ہو۔ واقع میں یہ بات اب اپنے سر ایک بڑے جھنجھٹ کی معلوم ہوتی ہے۔

آخر میں اب میں اپنے تھوڑے سے بہت تجربات کے بغیر یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص اپنے ضمیر کی آواز پر دھیان رکھے اور اپنے کام کو سلیقے سے انجام دے پھر تھوڑا کر کے غور کرے تو خدا کے کرم سے ایسے ذرائع پیدا ہو جاتے ہیں کہ اسے کہیں زیادہ کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی استقلال اور جرأت کی بھی ضرورت ہے

سر مرزا اسماعیل

میں نسلاً ایرانی ہوں۔ ۲۳-۱۰-۱۸۸۳ء میں بمقام بنگلور پیدا ہوا۔ میرے والد آغا جان، علی عسکر شیرازی کے بیٹے تھے۔ میرے نانا اور دادا دونوں شیراز سے آئے تھے۔ میرے نانا مشہدی کاظم ایک دولت مند تاجر تھے اور بمبئی میں مقیم ہو گئے تھے۔ ان کے بھائی مشہدی حسین نے بمبئی میں نہایت نفیس شیعہ مسجد بنوائی تھی۔ اس مسجد کی تعمیر کے لیے وہ خاص طور پر ایران سے معماروں کو لائے تھے۔ یہ مسجد ایک زبردست وقف کی حامل ہے آج کل اس کی ماہانہ آمدنی چار ہزار روپے کے لگ بھگ ہے۔ یہ رقم بمبئی کے شیعہ فرقے کے مذہبی کاموں میں صرف کی جاتی ہے۔

میرے دادا علی عسکر اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ۱۸۲۴ء میں شیراز سے بنگلور آئے۔ اس وقت ان کی عمر مشکل سے سولہ سال تھی۔ یہ دونوں بھائی اپنے ساتھ عرب اور خلیج فارس سے بہترین گھوڑے لائے تھے۔ انہوں نے ایک ایسے زمانے میں جب کہ ہندوستان آسٹریلیا کے گھوڑوں سے ناواقف تھا، گھوڑے درآمد کرنے والے تاجروں کی حیثیت سے اپنا کاروبار قائم کر لیا۔ یہ دونوں ریماؤنٹ ڈپو، مہاراجہ کے اصطبل اور بنگلور اور میسور کی فوجوں کے لیے گھوڑے فراہم کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایرانی شالوں کا کاروبار بھی چلاتے تھے۔

بنگلور آنے کے کچھ ہی دنوں بعد میرے دادا علی عسکر کے بڑے بھائی اپنے گھوڑوں کے ساتھ منگلور سے واپس آتے ہوئے دریائے کاویری میں ڈوب کر مر گئے۔ ان دونوں بھائیوں کے مزار بنگلور کے قریب "ٹامس" کے دلکش ایرانی قبرستان میں ایک دوسرے کے پاس پاس موجود ہیں

علی عسکر کو بنگلور اور اس کی آب و ہوا اتنی زیادہ پسند آئی کہ انہوں نے اسے اپنے مستقل قیام کے لیے پسند کر لیا اور پھر لوٹ کر کبھی ایران نہ گئے۔ علی عسکر کے زمانے میں یہ شہر ایک خاموش اور دلکش شہر تھا۔ بنگلور کا وہ حصہ جو "ہائی گراؤنڈ" کہلاتا ہے اور بنگلور کا سب سے اچھا حصہ سمجھا جاتا ہے، اس میں علی عسکر نے بہت سے مکانات بنوائے۔ وہ مکان جس میں میں رہتا ہوں، بہت وسیع ہے اور اس کے ساتھ پانچ ایکڑ زمین کا کمپاؤنڈ ہے۔ یہ مکان میرے دادا کا مکان تھا اور اسی سڑک پر واقع ہے جو اب ان کے نام پر علی عسکر روڈ کہلاتی ہے۔ میں جب دیوان کے عہدے سے سبکدوش ہوا تو اس مکان میں رہنے لگا۔

علی عسکر بالکل ہی ان پڑھ آدمی تھے۔ لیکن قدرت نے انہیں زبردست فہم عامہ اور ایسی خصوصیات سے نوازا تھا وہ زندگی میں بہت کامیاب رہے۔ ۹۲ سال کی عمر پا کر انہوں نے ۹ اگست ۱۹۰۰ء کو انتقال کیا۔ بحیثیت مجموعی ان کی زندگی بڑی خوشگوار گزری۔ قسمت نے انہیں دل کھول کر نوازا۔ زندگی میں سب سے بڑا صدمہ جو انہیں سہنا پڑا، یہ تھا کہ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ انہیں بینکوں پر بالکل اعتماد نہ تھا۔ اس کے برخلاف وہ اینٹ پتھر پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے۔ انہوں نے اپنا تمام سرمایہ مکانات بنانے میں لگا دیا۔ یہ ایک دانش مندانہ فعل تھا۔ ان کے وارث اس کی جتنی بھی قدر کریں کم ہے کیونکہ ہم اب تک اس کے ثمرات سے متمتع ہو رہے ہیں۔ ان کے زمانے سے لے کر اب تک ان کی جائداد کی قیمت بہت بڑھ گئی ہے اور بعض صورتوں میں تو اس میں بیس گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ وہ شہر میں اور سول اور فوجی علاقے میں سب سے بڑے صاحب جائداد تھے۔ اور اسی وجہ سے وہ "ہائی گراؤنڈ" کے جاگیردار مشہور ہو گئے تھے۔

اگرچہ ان کے جوان اور باشعور بیٹے تھے۔ لیکن وہ ان میں سے کسی ایک کو بھی سرکاری ملازمت کی اجازت نہ دیتے تھے۔ عزت اور وقار کے بارے میں ان کے نظریات عجیب تھے۔ ان کے برطانوی دوست انہیں اپنے لڑکوں کو سرکاری ملازم رکھنے کا مشورہ دیتے تھے ان سب کو اچھی اچھی نوکریاں پیش کرتے تھے۔ لیکن یہ بات ان کے دل کو لگتی تھی۔ کسی کی خدمت گزاری سے انہیں یہ بہتر معلوم ہوتا تھا کہ وہ آزاد رہیں چاہے یہ ملازمت سرکاری ہی کیوں نہ ہو۔ وہ اپنے وطن سے سرکاری ملازمت کے تعلق سے ایسا ہی تعصب رکھتے تھے۔ دیوان راما چار و بڑی مشکل سے انہیں اس بات پر آمادہ کر سکے تھے کہ میرے والد نو عمر مہاراجہ چام راج وڈیار کے اعزازی مصاحب کا عہدہ قبول کریں۔ میرے والد کو مہاراجہ سے بڑی محبت تھی اور مہاراجہ بھی انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ مہاراجہ نے صرف ۳۱ سال کی عمر پا کر ۱۸۹۴ء میں وفات پائی۔ ان کی بے وقت موت نے ریاست کو زبردست دھکا پہنچایا۔ عجیب بات ہے ان کے بڑے بھائیوں نے بھی بالکل اتنی ہی عمر پا کر وفات پائی تھی۔

تفویض سے پہلے میسور کے چیف کمشنر سر مارک کبن، علی عسکر پر بہت مہربان تھے۔ انہیں سر مارک کبن کی دوستی اور ان کا غیر معمولی اعتماد حاصل تھا۔ سر مارک اکثر ان کے اصطبل پر آیا ہی کرتے۔ چائے پیتے اور گھوڑے دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ انہیں گھوڑوں سے بڑا شغف تھا اور خود ان کے پاس بھی ایک بڑا اصطبل تھا۔ علی عسکر کو بعد میں آنے والے تمام انگریز عہدہ داروں کی دوستی حاصل رہی اور ریذیڈنسی میں ان کی بے تکلفانہ آمد و رفت رہی۔ ان دنوں ریذیڈنسی میں ایسی بے تکلف آمد و رفت بڑے اعزاز کی بات سمجھی جاتی تھی۔ انہیں گھوڑدوڑ سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ بنگلور اور میسور کے گھوڑدوڑ کے میدانوں کے علاوہ وہ ان کے گھوڑے حیدرآباد اور بمبئی کے گھوڑدوڑ کے میدانوں میں بھی دکھائی دیتے تھے۔ انہیں انگریزی بالکل نہ آتی تھی اور وہ ہندوستانی بھی نہ بول سکتے تھے۔ اس کے باوجود یورپی اور ہندوستانی دوستوں سے ان کی خوب نبھتی تھی۔ وہ بنگلور ٹرف کلب کے اسٹیوارڈ بھی تھے۔ ان دنوں ایک غیر یورپی کے لیے یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔

ہز ہائی نس آغا خان اوّل ہمارے زمانے میں مشہور گھوڑدوڑ کے سردار کے دادا اور علی عسکر گہرے دوست تھے۔ وہ ہر سال بنگلور آیا کرتے تھے اور اپنے گھوڑدوڑ کے گھوڑے لایا کرتے تھے۔ آغا خان کی والدہ لیڈی شاہ علی سے میری نانی کی گہری دوستی تھی۔ میسور کے ایک مورخ ایم شاما راؤ نے اپنی کتاب ماڈرن میسور میں علی عسکر کے بارے میں لکھا ہے۔

> "علی عسکر پیشے کے لحاظ سے تاجر تھے اور میسور کے تمام طبقوں میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے ان کی رسائی مہاراجہ کرشنا راجہ وڈیار تک تھی اور وہ انہیں اپنا دوست سمجھتے تھے۔ مہاراجہ اکثر اپنے اہم خطوط کی پوسٹنگ کا کام ان ہی کے سپرد کرتے تھے۔ رازوں کے خطوط کی نوعیت کو برقرار رکھنے کے لیے علی عسکر خود ہی ان خطوط کو میسور کی سرحد سے باہر ہوسور تک لے جاتے اور وہاں انہیں پوسٹ کرتے تھے۔"

۱۸۳۱ء میں میسور کے حکمران کو راج گدی سے اتارنے کے بعد برطانوی حکومت نے ریاست کا نظم و نسق مہاراجہ کے نام سے ایک چیف کمشنر کے ذریعے ۱۸۸۱ء تک چلایا۔ ۱۸۸۱ء میں آنجہانی مہاراجہ کے لے پالک فرزند سری چامراج وڈیار کو حکمرانی کے پورے اختیارات سونپ دیئے گئے اور ان کے مہاراجہ ہونے کا اعلان کیا گیا۔ کمشنر کا دور حکومت تمام سمتوں میں ریاست کی ترقی کا آغاز ثابت ہوا۔ یہی وہ مضبوط بنیاد تھی جس پر بعد کے ہندوستانی عہدہ داروں نے وہ عمارت تعمیر کی جس کو ہندوستان کی مثالی ریاست کہا جانے لگا۔ جوں جوں دن گزرتے گئے اس امر میں اضافہ ہوتا گیا۔ مہاتما گاندھی نے اسے تقریباً رام راج قرار دیا۔ ہندوستان گول میز کانفرنس کے صدر لارڈ سینکی نے میسور کے بارے میں

کہا کہ یہ دنیا کے لیے ایک نمونہ ہے۔

سر مارک کبن ستائیس سال سے زیادہ عرصے تک میسور کے کمشنر رہے۔ انہوں نے غیر معمولی انہماک اور دلچسپی کے ساتھ ریاست کی خدمت کی۔

میری انگریزی تعلیم بنگلور کے سنٹ پیٹرک اسکول سے شروع ہوئی۔ ایک سال کے بعد میں شہر کے ویزلین مشن ہائی اسکول میں بھیج دیا گیا جہاں میں ۱۸۹۶ء تک رہا۔ اس کے بعد مجھے ہز ہائنس مہاراجہ کی خصوصی جماعت میں داخلے کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ مہاراجہ کے ٹیوٹر اور گورنر مسٹر اسٹورٹ فریزر تھے۔ یہ انڈین سول سروس کے عہدہ دار تھے اور غیر معمولی قابلیت رکھنے والے انسان تھے۔ اس سے پہلے وہ ہندوستانی والیان ریاست یعنی مہاراجہ بھاؤنگر اور مہاراجہ کولھاپور کو بڑی کامیابی کے ساتھ تعلیم دے چکے تھے۔ وہ بالکل نوعمر تھے۔ ۳۰ سال سے زیادہ ان کی عمر نہ تھی۔ اس کے باوجود میسور میں بھی وہ بہت کامیاب رہے۔

ہز ہائی نس اور ان کے ہم جماعت سرمائی محل میں پڑھا کرتے تھے۔ ساڑھے دس بجے سے لے کر ساڑھے چار بجے تک پڑھائی کی جاتی۔ پڑھائی کے علاوہ ہمیں روزانہ ڈرل کرائی جاتی، گھوڑے کی سواری سکھائی جاتی، کرکٹ، فٹ بال اور ٹینس کھلائی جاتی، پولو اور شکار کی بھی مشق ہوتی تھی۔

۱۹۰۱ء میں مہاراجہ کی کلاس سے نکل کر بنگلور کے سنٹرل کالج میں داخل ہو گیا جس سے میں نے بی اے کیا۔ میرا پہلا تقرر میسور پولیس میں بحیثیت اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ہوا۔ پھر میں سول سروس میں منتقل ہوا۔ مہاراجہ نے اصرار کیا کہ مجھے ان کے شخصی اسٹاف میں شامل کیا جائے جس میں بتدریج ترقی کر کے اسسٹنٹ سکریٹری کے عہدے تک پہنچا۔ ۱۹۱۴ء میں ہزور سیکرٹری مقرر ہوا۔ اور ۱۹۲۲ء میں آر. ایچ. کیمبل کے جانشین کی حیثیت سے مہاراجہ کا پرائیوٹ سکریٹری کے عہدے پر مجھے ترقی دی گئی۔ مہاراجہ کے پرائیویٹ سکریٹری کو وزیر کے برابر درجہ حاصل تھا اور یہ ایک کلیدی عہدہ سمجھا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ میں ریاست میں دیوان کے بعد سب سے معتبر عہدہ دار بن گیا اور جب ۱۹۲۶ء میں دیوان کا عہدہ خالی ہوا تو مہاراجہ نے مجھے دیوان مقرر کیا۔ میں اس عہدے پر کوئی پندرہ سال یعنی ۱۹۴۱ء تک فائز رہا۔ اتنے طویل عرصے تک سر کے. شیشادری ایئر کے سوا کوئی اور فائز نہ رہا۔ سر شیشادری ایئر اٹھارہ سال تک دیوان رہے۔

میں مہاراجہ سے بار بار پوچھتا رہتا تھا کہ وہ وقت نہیں آگیا ہے کہ میں کسی اور کے لیے اس جگہ کو خالی کر دوں۔ جو شخص کرسی پر جا بیٹھا ہو وہ شاید نہ اکتائے، لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کرسی اس سے اکتا جاتی ہے اور تبدیلی کی آرزومند ہوتی ہے۔ مہاراجہ کی وفات سے کوئی چھ مہینے پہلے کی بات ہے، وہ اور میں ایک بار موٹر میں بیٹھے محل جا رہے تھے۔ میں نے آخری مرتبہ جب یہ بات ان سے کہی تو وہ اس سے کسی قدر ناراض ہوئے۔ انہوں نے قدرے بے صبری کے لہجے میں شمشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میں انہیں یہاں پہنچا دوں، پھر جو چاہوں کروں۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ جہاں تک میرا تعلق ہے، جب تک میں اور تم زندہ ہیں، میرے لیے دوسرے دیوان کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

اگست ۱۹۲۸ء میں بنگلور میں فسادات پھوٹ پڑے۔ ان فسادات میں اسکول کے طالب علموں نے نمایاں حصہ لیا۔ فسادات کا اصلی سبب ایک مسلمان سیاست دان کا غیر مقبول ہونا تھا۔ یہ صاحب شہر کی بلدیہ کے صدر نشین تھے۔ ہندوؤں کی بڑی اکثریت انہیں ناپسند کرتی تھی۔ ان میں کچھ کمزوریاں بھی تھیں اور ان کے غیر مقبول ہونے کے معقول وجوہات بھی تھیں۔ یہ بات مجھے اپنے عہدے سے الگ ہونے کے بعد معلوم ہوئی۔ لیکن یہ صاحب بڑے کام کے آدمی تھے، اور ہر کام میں بڑے مستعد۔ اسی وجہ سے میں انہیں پسند کرتا تھا۔ اور شہر کے اپنے چند دوسرے ساتھیوں میں انہیں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ یہ صبح میں گھوڑے پر سوار ہوا کرتا تھا اور میرے ساتھ بلدیہ کے کمشنر، صحت عامہ کے عہدہ دار اور بلدیہ کے انجینئر ہوتے

تھے لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ میں ان صاحب کا سرپرست اور حامی ہوں۔ اس کی وجہ سے مجھ پر بھی کافی کیچڑ اچھالا گیا۔ فسادات نے نازک صورت اختیار کرلی اور گرچہ اسے فوراً دبا دیا گیا، لیکن دونوں فرقوں میں ایک دوسرے کے خلاف منافرت کے جذبات اس کے بعد بھی باقی رہے اور انہیں دور کرنے میں کافی وقت لگا۔ لندن کے اخبار ڈیلی میل نے اس معاملے میں کافی دلچسپی کا اظہار کیا اور سنسنی خیز داستانیں شائع کیں جو ہمارے لیے بڑی حیران کن تھیں۔

ان پریشان کن دنوں میں مہاراجہ نے مجھے ایک خط لکھا۔ اس خط سے ان کی خلقی انصاف پسندی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کسی معاملے میں جب وہ ایک رائے قائم کر لیتے ہیں تو پھر کوئی چیز انہیں اس سے ہٹا نہ سکتی تھی۔ جو ان کا وفادار ہوتا وہ بھی اس سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے لکھا تھا:

> "میں یہ چند سطریں لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے اُمید ہے کہ تم یہ خیال نہ کرو گے کہ میں تم سے اور تمہارے ان دنوں سے جب کہ تم ہر طرف سے پریشانیوں میں گھرے ہوئے تھے، غافل رہا۔ میری دعا ہے کہ ان مشکل حالات کے دباؤ سے تمہاری صحت متاثر نہ ہونے پائے۔"

مجھے جب کام میں کامیابی حاصل ہوتی مہاراجہ خوش ہوتے تھے۔ ایک بار غرض مند جماعتوں نے یہ خبر اڑا دی کہ میں بہت جلد اپنے عہدے سے الگ کیا جانے والا ہوں۔ اس کے جواب میں مہاراجہ نے ۱۹۳۵ء میں اپنے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ میرے عہدے کی میعاد میں مزید پانچ سال کی توسیع کر دی گئی ہے۔ اس اعلان کا پرجوش خیر مقدم ہوا۔ ۱۹ فروری ۱۹۳۵ء کو لال باغ میں بنگلور کے شہریوں نے ایک زبردست استقبالی تقریب میرے اعزاز میں منعقد کی۔ اس تقریب میں برطانوی ریذیڈنٹ میرے بازو بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستان کی کسی بھی دیسی ریاست میں کوئی بھی فرماں روا اپنے دیوان کے اعزاز میں ایسے عوامی مظاہرے کی اجازت نہیں دیتا۔

ہندوستان میں گائے کے تحفظ کے مسئلے سے گہری دلچسپی لی جاتی رہی ہے۔ ایک بار مجھے دہلی سے جمیعت العلماء ہند کے معتمد کا تار وصول ہوا۔ اس تار میں گائے کے مسئلے پر میری رائے دریافت کی گئی تھی۔ میں نے جواب دیا کہ گائے کی قربانی کی اجازت دیتے ہوئے اسلام ایسے فعل سے اجتناب کی ہدایت کرتا ہے جس سے دوسروں کا دل دکھے۔ اس کے علاوہ اس مسئلے کو میں خالص یا بڑی حد تک مذہبی مسئلہ نہیں سمجھتا بلکہ اس مسئلہ کی معاشی اہمیت پر زور دیتا ہوں۔ بڑی حد تک یہ معاشی اسباب ہی تھے جن کی بنا پر ریاست میسور کو گائے کے تحفظ کا قانون نافذ کرنے میں تامل تھا۔ حالانکہ ایسا قانون دوسری بہت سی ریاستوں نے نافذ کر رکھا تھا۔ اس ریاست میں بقر عید کے موقع پر کہیں بھی گائے کی قربانی نہیں دی جاتی۔ میں نے جواب میں یہ بھی لکھا کہ مذہبی اختلافات پر زور دے کر انہیں ہوا دینا مجھے پسند نہیں اور خاص طور پر ایسے زمانے میں تو بالکل ہی نہیں۔ حکومت میسور نے اس مسئلہ پر مشورہ دینے کے لیے بالکلیہ ہندوؤں پر مشتمل ایک خصوصی کمیٹی قائم کی تھی۔ کمیٹی نے متفقہ طور پر مویشیوں کے ذبیحہ پر کسی قسم کی تحدید عائد کرنے کی مخالفت کی۔ کمیٹی کی یہ رائے بڑی حد تک معاشی بنیادوں پر قائم ہوئی تھی۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد میسور کی کانگریسی حکومت نے مجلس قانون ساز کے ذریعہ ذبیحہ گاؤ پر امتناع کا قانون نافذ کر دیا، لیکن اس کی ہمسایہ حکومت مدراس نے ایسا نہیں کیا۔ راجپوتانہ میں ذبیحہ گاؤ کی کبھی اجازت نہ تھی۔ ادھر کشمیر میں مہاراجاؤں کی حکومت کے دوران میں گائے کو ذبح کرنے والے کو قتل کی سزا دی جاتی تھی۔ کشمیر میں گائے کے گوشت کی کسی بھی صورت میں درآمد ممنوع تھی

پورے ہندوستان میں انتہا پسند ہندوؤں نے ذبیحہ گاؤ پر مکمل امتناع کی جو زبردست مہم جاری رکھی ہے اس کا اصل محرک سیاسی ہے۔ اس معاملے میں کاش ہمیں زیادہ — سمجھدار اور پُرخلوص ہے جو گائے کی بہتری اور بھلائی چاہتی ہے۔

میرے عہد میں ایک اہم واقعہ برطانوی حکومت کو ریاست کے خزانے سے منتقل کرنے کے لیے ریاست پر عائد کردہ ۳۵ لاکھ روپے سالانہ خراج میں دس لاکھ روپے کی کمی ہے۔ یہ واقعہ ۱۹۲۸ء میں پیش آیا جب لارڈ اردن ہندوستان کے وائسرائے تھے۔ اس موقع پر ہز ہائی نس نے از راہِ عنایت مجھے لکھا تھا:

"آج جب کہ خراج میں کمی کے لیے ہماری چھتیس سالہ کوشش کی کامیابی پر ہمارے قلب مسرت سے لبریز ہیں مجھے یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اس معاملے کی بہتری کے لیے جو کامیاب کوشش کی ہے اور اس طرح سے میسور پر جو احسان کیا ہے اس کا اعتراف کروں۔ ہز ایکسیلنسی وائسرائے نے ہمیں بتایا ہے کہ اس خراج میں کمی کا اصل مقصد حکومت ہند کے پاس اچھی حکومت کا انعام ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ریاست کے مطالبات منوانے میں تمہاری وکالت کو بڑا دخل رہا ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ وہ یقین اس میں شامل ہے کہ تمہارے ہاتھوں میں یہ رقم میسور کی فلاح و بہبود کے لیے بہترین طریقے پر خرچ ہوگی۔ یہ جان کر تمہیں مسرت ہوگی کہ مجھے سب سے مقتدر شخصیت نے بتایا ہے کہ اس سلسلے میں ریاست کسی اور کی نہیں تمہاری سب سے زیادہ ممنونِ احسان ہے۔"

۱۹۳۶ء میں مہاراجہ کے سفرِ یورپ میں میں ان کے ساتھ رہا۔ وہ اس سفر سے بہت خوش رہے۔ انہیں ہر چیز سے دلچسپی تھی۔ تعمیر کاری، موسیقی، سیاسیات، مناظرِ قدرت، موٹر رانی، گھوڑے اور چڑیا گھر۔ خود ان کے پاس ہندوستان میں سب سے اچھا چڑیا گھر تھا۔ ان کے اس سفر میں برلن کی سیر بھی شامل تھی۔ جرمن حکومت نے سرکاری طور پر ان کا استقبال کرنا چاہا، لیکن انہوں نے اس دعوت کو قبول نہ کیا۔

نومبر ۱۹۳۴ء میں لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہند کی حیثیت سے میسور آئے۔ اس ریاست سے وہ بمبئی کے گورنر کی حیثیت سے واقف تھے اور ایک دو بار مدراس کے گورنر کی حیثیت سے اس ریاست میں آ بھی چکے تھے۔ لارڈ اور لیڈی ولنگڈن مہاراجہ مرحوم کے گہرے دوست تھے۔ اور دونوں میسور میں جانے پہچانے اور مقبول تھے۔ جب ہم جلوس میں سب سے بڑے مہمان خانے للت محل جا رہے تھے تو لیڈی ولنگڈن نے مجھ سے بیان کیا، ہز ایکسیلنسی مجھ سے بہت خفا ہیں اور مجھ پر برسنے والے ہیں۔ میں ان کی بات سن کر مسکرایا اور جواب دیا کہ ہز ایکسیلنسی چاہے مجھے کتنا ہی ڈانٹیں میں ان کا برا ماننے کا نہیں کیونکہ میں ان سے بڑی محبت رکھتا ہوں اور دل سے ان کی عزت کرتا ہوں۔

دوسرے دن میری طلبی ہوئی۔ وائسرائے نے اپنی مخصوص خوش طبعی سے کام لیتے ہوئے کہا: "مرزا! یہ تم کیا کر رہے ہو؟" پھر انہوں نے کہا ہر ایک گورنر نے انہیں میسور کے ایوانِ نمائندگان میں میری حالیہ تقریر پر اعتراض لکھ بھیجا ہے۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی اور میں نے کہا کہ میرا مقصد قطعی طور پر اچھا تھا۔ کسی کا اس پر معترض ہونا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے اس کا بھی ذکر کیا کہ کسی اور موقع پر میرا ایک بیان ان کے پیش رو لارڈ اردن سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میرا مقصد صحیح ہے اور یہ ساری بات پیار کی تھی۔ انہوں نے صبر کے ساتھ میری بات سنی اور صرف اتنا کہا: "اے عزیز! یہ کام پھر نہ کرنا۔" میں نے وعدہ کیا کہ میں خیال رکھوں گا کیونکہ میں انہیں ناراض کرنا نہ چاہتا تھا۔

میسور سے روانگی سے پہلے ہی لارڈ ولنگڈن کو بتایا گیا کہ مہاراجہ میسور ابھی ابھی ان کی مہمان داری سے فارغ ہوئے تھے، اب مسٹر گاندھی

کو اپنا مہمان بنانے والے ہیں۔ وائسرائے سے کہا گیا کہ اس سے ناگوار اثرات مرتب ہوں گے اور میسور یا دوسری ریاستوں کو جیسے ٹراونکور وغیرہ کو جہاں مسٹر گاندھی جانے کا خیال کر رہے ہیں، بڑی دشواری پیش آئے گی۔ اس پر لارڈ ولنگڈن کافی پریشان ہو گئے انہوں نے اپنے ہاتھ سے ایک طویل خط مہاراجہ کو لکھا جس میں ان سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ مہاتما گاندھی کو ریاست کا سرکاری مہمان نہ بنائیں۔ مہاراجہ کے پرائیوٹ سکرٹری نے مجھ سے مشورہ کیا میں نے مشورہ دیا کہ مہاراجہ وائسرائے کو ٹھیک ٹھیک بات بتا دیں۔ انہیں یہ لکھیں کہ مسٹر گاندھی ریاست کے سرکاری مہمان نہ ہوں گے۔ ان کے میزبان بنگلور کے عوام ہیں جن کی دعوت پر وہ یہاں آ رہے ہیں۔ حکومت نے بس اتنا ہی کیا کہ اپنا سب سے بڑا مہمان خانہ کمارا پارک بنگلور کے قائدین کو دیا ہے کہ وہ اس میں مہاتما گاندھی کو ٹھہرا سکیں۔ ریاست یہی رعایت ممتاز اصحاب کو دیتی رہی ہے۔ میں نے مشورہ دیا کہ مہاراجہ یہ بھی بتا دیں کہ اگر وائسرائے اس سے اتفاق نہ کریں تو وہ دیوان کو حکم دیں گے کہ یہ دعوت نامہ واپس لے لیا جائے۔

چنانچہ میں نے وائسرائے کے پرائیوٹ سکرٹری کو لکھا کہ کمارا پارک اور میسور میں شیشادری ہال کس طرح مسٹر گاندھی کے میزبانوں کے حوالے کیا گیا ہے۔ اگر وائسرائے چاہیں تو یہ رعایت منسوخ کر دی جائے گی لیکن اس سے مقامی طور پر بے اطمینانی پیدا ہو جائے گی اور ایجی ٹیشن کے لیے لوگوں کو ایک بہانہ ہاتھ آ جائے گا۔ وائسرائے کے پرائیوٹ سکرٹری نے فوراً جواب دیا کہ وائسرائے پوری صورت حال سے واقف ہو گئے ہیں اور جو انتظامات ہو چکے ہیں ان میں کسی طرح کی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔

مئی ۱۹۳۶ء میں مسٹر جناح اپنی بہن مس فاطمہ جناح کے ساتھ اپنی صحت کی بحالی کے لیے بنگلور آئے۔ وہ ایک ہفتے تک نندی درگ میں ریاست کے مہمان کی حیثیت سے مقیم رہے۔ یہ مقام بنگلور سے کوئی ۴۰ میل دور ایک صحت بخش پہاڑی مقام ہے۔ مسٹر گاندھی نے بھی ۱۹۳۶ء میں یہیں قیام کیا تھا۔

نندی سے واپس آنے کے بعد ہم ریاست کے سرکاری مہمان خانہ پارک میں ملے اور پاکستان کے مسئلے پر گفتگو کی۔ میں نے ان سے کہا کہ ان کے نقطۂ نظر اور میرے نقطۂ نظر میں فرق یہ ہے کہ وہ پاکستان صرف مسلمانوں کے لیے چاہتے ہیں اور میں ہندوستان اور پاکستان دونوں مسلمانوں کے لیے چاہتا ہوں۔ اس وقت پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا سوال نہیں اٹھا تھا۔ میری حجت یہ تھی کہ غالباً انہیں ہندوستان کا ایک چوتھا حصہ ملنے والا ہے ہندوستان کے باقی حصے میں مسلمانوں کی کوئی شنوائی نہ ہوگی۔ میری تجویز کردہ اسکیم کے تحت مسلمانوں کو پنجاب، بنگال، آسام، صوبہ سرحد اور بلوچستان میں پورا اقتدار حاصل رہے گا۔ دوسرے صوبوں اور اسی طرح مرکز میں انہیں وزن اور وقار حاصل رہے گا۔ مسٹر جناح کا جواب تھا کہ میں لیگ میں شامل ہو جاؤں اور اس کو اپنا پیغام پہنچاؤں۔ میں نے کہا میں عمر بھر سرکاری ملازم رہا ہوں سیاست داں کے فرائض انجام دینے کا اہل نہیں ہوں۔ اور میرے لیے یہ بالکل ممکن نہیں کہ عوام کو مطمئن کروں اس طرح کی لڑائی میں سرگرم حصہ لوں۔

دوسری کئی ریاستوں کی طرح میسور کو بھی نئی دہلی میں مہاراجہ کے استعمال کے لیے محل بنانے کے لیے جگہ دی گئی تھی۔ میں ایک ایسے محل پر ۱۲ لاکھ روپے کی خطیر رقم صرف کرنے کا حامی نہ تھا جو مہاراجہ کے بہت کام آنے والا نہ تھا کیونکہ وہ شاذ و نادر ہی دہلی جاتے تھے۔ پھر اس کی نگہداشت پر سالانہ زبردست خرچ آتا۔ لوگ اسے استعمال کرنے کی درخواستیں کر کے الگ تنگ کرتے۔ ہم اس رقم کو بہت بہتر طریقے پر خود ریاست میں صرف کر سکتے تھے جہاں پبلک کی بہت سی ضروریات کی تکمیل کی جا سکتی تھی۔ اس طرح نئی دہلی میں محل بنانے کا خیال ترک کر دیا گیا۔ اور زمین حکومت ہند کو واپس کر دی گئی۔

دیوان کی حیثیت سے میرے پندرہ سالہ ریاستی نظم و نسق کے دوران میں میں نے کوئی پچیس مختلف صنعتیں جاری کیں یا ان کے اجرا میں مدد دی۔ ان میں بعض اہم مصنوعات میں فولاد کی تیاری، سیمنٹ، کاغذ، شکر، کیمیائی کھاد، ہوائی جہاز سازی، گلاس، پورسلین، زرعی آلات، مصنوعی ریشم، برقی بلب اور پکے فولاد کے پائپ ہیں۔

پانی کی قوت سے چلنے والے دو نئے برقی قوت گھر بھی میرے دور میں بننے شروع ہوئے۔ ایک شمشا کے آبشار پر اور دوسرا مشہور جوگ آبشار پر۔

ہندوستان بھر میں نظم و نسق نے، وہ کہیں کا ہو، اپنے شہروں کو خوبصورت بنانے کی طرف کم ہی توجہ کی ہے دیہاتوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ انگلستان کا ہندوستان سے مقابلہ کیجیے تو گویا زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ صاف ستھری بہترین سڑکیں، نفیس باغات، عمدہ تراشی ہوئی باڑیں انہیں دیکھ کر کیسی خوشی ہوتی ہے۔ آبادی سے بھرپور لندن اور پیرس کے کھلے وسیع میدانوں کو دیکھیے۔ ہندوستان میں کتنے شہر ایسے پارکوں پر فخر رکھتے ہیں؟ ہمارے یہاں تو چھوٹے چھوٹے پارک بھی نہیں جہاں شہری تھوڑی دیر سستا سکیں۔ اپنی آمدنی کا ایک حصہ اپنے شہر کو اپنے اور شہریوں کے لیے دلکش بنانے پر صرف کرنے میں ذرا بھی نہ ہچکچانا چاہیے۔ گندے گلی کوچوں اور تنگ و تاریک مکانات کے علاقوں کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ غریبوں کے لیے مکانات کی تعمیر کا کام ساتھ ساتھ ہونا چاہیے۔

میسور کے مہاراجہ بھی ایک مشکل سے دوچار تھے۔ انہیں اس مسئلے کے حل پر دشواری پیش آ رہی تھی کہ میسور کے قلعے کے اندر جو بیشتر مکانات ان کے عزیزوں کی ملکیت تھے وہ باقی رکھے جائیں یا انہیں حاصل کر کے زمین کے برابر کر دیا جائے۔ میں چاہتا تھا کہ یہ مکانات خرید کر انہیں توڑ دیا جائے۔ آخر میں مہاراجہ نے بھی مکانوں کو حاصل کر کے زمین کے برابر کر دینے کا فیصلہ کیا۔

ہندوستان میں میسور پہلی دیسی ریاست ہے جس نے دیہی علاقے میں برقی قوت فراہم کی۔ شہریوں کے آرام کے لیے میں نے بس اسٹیشن بنوانے شروع کیے۔ آب رسانی کا مسئلہ بھی پھیلتے ہوئے شہروں کے لیے درد سر بنا ہوا ہے۔ میرے ہی زمانے میں بنگلور کے شہریوں کے لیے پانی کی فراہمی کے لیے چام راج واٹر ورکس بنایا گیا تھا۔

میسور کے مہاراجہ سری کرشنا وڈیار (آنجہانی) پکے ہندو تھے۔ اور اپنی روزمرہ زندگی میں مذہب کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہز ہائی نس کو دوسرے مذاہب کے لوگوں کو اپنی مذہبی عبادات اور رسوم کی ادائگی میں امداد دے کر دلی مسرت ہوتی تھی۔ مجھے قریب آدھی صدی تک ان سے گہرے ربط کا شرف حاصل رہا ہے۔ اس پوری مدت میں کبھی ایسا نہ ہوا کہ انہوں نے مجھ پر بے اعتمادی کا اظہار کیا ہو یا مجھ سے اس طرح سلوک کیا ہو کہ میں دوسرے مذہب کا پیرو تھا۔ ۱۹۴۰ء میں انہوں نے وفات پائی اور پوری ریاست ان کے غم میں ماتم کدہ بن گئی۔ ان کی موت میری زندگی کا سب سے بڑا صدمہ رہا۔

ان طویل مباحثوں میں جس کے نتیجے کے طور پر ۱۹۳۵ء کا انڈیا ایکٹ بنا، میسور ہی نہیں بلکہ دیگر ہندوستانی دیسی ریاستوں کی نمائندگی کی ذمہ داری مجھ پر رہی۔ لندن میں جب پہلی گول میز کانفرنس ہوئی اس میں میں نے جنوبی ہند کی ریاستوں میں ٹراونکور، کوچین اور پدوکوٹا کی بھی نمائندگی کی۔ دوسری کانفرنس میں میں راجستھان کی ریاستوں میں سے جے پور اور جودھ پور کا نمائندہ رہا۔ تیسری کانفرنس میں میں اس ہندوستانی وفد میں شامل تھا اور جائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کی امداد کرتا رہا تھا جس نے شہادتیں قلمبند کیں اور بڑی حد تک اس تجویز کا مسودہ تیار کیا جس نے ۱۹۳۵ء میں

انڈیا ایکٹ کی صورت اختیار کی۔ اس طرح کئی بار مجھ پر بھی یہ ذمہ داری عائد ہوئی کہ میں خود ہی برطانوی ہند کے مقابلہ میں ہندوستانی ریاستوں کی نمائندگی کروں۔

میں نے ۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۹۴۶ء تک چار خوش گوار اور دلچسپ سال جے پور کے وزیر اعظم کی حیثیت سے ایک روشن خیال حکمران کے تحت گزارے جس نے اپنے وعدے کے مطابق میری پوری طرح حمایت کی۔ جے پور میں جو بات مجھے سب سے زیادہ پسند آئی وہ یہ تھی کہ وہاں سازشوں سے فضا پاک تھی۔ ہز ہائی نس کسی بھی قسم کی سازش کو جس کا تعلق ہوتا اپنا مکروہ چہرہ دکھانے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ غرض مندوں کے اثر سے آزاد ہو کر وہ اپنی رائے آپ خود قائم کرتے تھے اور اسی کے مطابق عمل کرتے تھے

مجھے میسور اور دہلی کے پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ میں جانے کا کافی اتفاق ہوا تھا تو عرض کیا جا سکتا ہے کہ اس محکمہ کے عہدہ دار شریف تھے اور شریفوں کا سا سلوک کرتے تھے۔ وہ انتقام پسند نہ تھے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ کسی پر اعتماد کرنے میں عجلت سے کام نہ لیتے تھے لیکن بگاڑ بھی نہ کرتے تھے۔ اور تلخی تک نوبت آ جانے کے بعد بھی انتقام نہ لیتے تھے۔ مجھے یہ بیان کرتے ہوئے حقیقی خوشی محسوس ہوتی ہے کہ میں سرکاری معاملات میں انگریز عہدہ داروں کے بعض صفات حسنہ کو بڑے احترام کی نظر سے دیکھتا تھا۔ تاہم ان کے طرز عمل کے بعض استثنائی مثالیں بھی ہیں ایک بار جے پور کے پولیٹیکل ایجنٹ اسکول آف آرٹس کا معائنہ کر رہے تھے۔ ایک ستائی ہوئی مدرس نے انہیں ناظم تعلیمات سمجھ کر ان پر حملہ کر کے انہیں زخمی کر دیا۔ خوش قسمتی سے زخم گہرے نہ تھے۔ اور جلد ہی مندمل ہو گئے۔ پولیٹیکل ایجنٹ کو شبہ ہوا کہ اس پر حملہ میں میرا بھی ہاتھ ہے۔ مدرس مسلمان تھا۔ لیکن مجھے اس کے وجود کی بالکل ہی خبر نہ تھی۔ میڈیکل ڈپارٹمنٹ کے ناظم نے جو ایک وظیفہ یاب انگریز عہدہ دار تھا۔ مجھے مورد الزام قرار دیا اور کہا کہ یہ حادثہ اس لیے پیش آیا ہے کہ ریاست میں بدمعاشوں کی ہمت افزائی کی جا رہی ہے۔ پولیس کے ناظم کا بھی یہی خیال تھا اور وہ بھی حکومت ہند کا ایک وظیفہ یاب انگریز تھا۔ ملزم کو ہائی کورٹ نے سات سال کی سزائے بامشقت سنائی۔ اس پر بھی پولیٹیکل ایجنٹ کو تشفی نہ ہوئی اور انہیں یہاں تک شبہ ہوا کہ میں نے یہ سزا دینے کے لیے ہائی کورٹ کو ترغیب دی ہے جو ان کے خیال میں بہت کم تھی انہوں نے عدالت کے فیصلے کی ایک نقل تنقیح کے لیے دہلی کے محکمۂ قانون کو بھیجی۔ میں نے جے پور کے چیف جسٹس سر سرت گھوش سے خواہش کی کہ وہ پولیٹیکل ایجنٹ کو سمجھا دیں کہ میں نے اس مقدمہ کے سلسلے میں ان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے۔ پولیٹیکل ایجنٹ کو اس سے بھی اطمینان نہ ہوا میں نے خود ان سے اس مسئلہ پر بات کرنا پسند نہیں کیا۔ لیکن میں نے دہلی کے پولیٹیکل سکریٹری کو میسور کے چیف جسٹس سر ریگی کی اس تقریر کی نقل بھیج دی تھی جو انہوں نے میرے عہد دیوانی ہی کی تھی۔ اس تقریر میں انہوں نے اس بات کو سراہا تھا کہ میسور میں حاکمہ عدلیہ پر کسی طرح بھی اثر انداز نہیں ہوتا۔ حکومت ہند کے پولیٹیکل سکریٹری نے جواب میں مجھے لکھا کہ انہوں نے میرا خط اور تقریر کی نقل پولیٹیکل اڈوائزر کو دکھائی اور ان دونوں نے میرے طرز عمل کو پسند کیا اس کے بعد میں نے پھر اس واقعہ کے بارے میں کچھ نہیں سنا۔

حکومت ہند کا پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ جے پور کے بارے میں کچھ مطمئن نہ تھا اور میں وہاں جو کچھ کر رہا تھا اسے پسند نہ کرتا تھا وہ چاہتا تھا معاملات پہلے کی طرح چلتے رہیں۔ نہ کوئی ترقی ہو اور نہ کسی کو شکایت کا موقع ملے۔ اس کا خیال تھا کہ میں بہت زیادہ روپیہ صرف کر رہا تھا اور بہت سی تبدیلیاں لا رہا تھا۔ میں نے ابتدا ہی میں اپنا نقطۂ نظر مہاراجہ پر واضح کر دیا تھا کہ میں صرف امن و امان برقرار رکھنے کے لیے نہیں آیا ہوں کہ دوسرے کی چیزوں کو بس جوں کا توں بنے رہنے دوں۔ ہز ہائی نس نے بڑی جسارت سے کام لے کر ہر وقت میری حمایت کی۔ مہاراجہ کی ہی بدولت

کے جواب میں کہ انہیں محاذِ جنگ پر خدمت کا موقع دیا جائے، وائسرائے نے انہیں لکھا کہ یہ اسی وقت ممکن ہو سکے گا جب کہ "بعض معاملات کا پوری طرح تصفیہ ہو جائے"۔ یہ میرے انتظامات کی طرف واضح اشارہ تھا۔ مہاراجہ نے ہز ایکسیلینسی کو یقین دلاتے ہوئے لکھا کہ ریاست کے تمام معاملات کی آپ خود نگرانی کرتے ہیں اور غذائی صورت حال کے سوا (اور یہ مسئلہ تو پورے ہندوستان میں موجود ہے) ریاست کو کسی ایسے دشوار مسئلہ کا سامنا نہیں جو کسی حیثیت سے بھی پریشان کن ہو۔

شہر جے پور میں جس تیزی کے ساتھ ترقیاتی کام ہو رہے تھے، نیویارک ٹائمز کا نامہ نگار جو ان دنوں جے پور آیا ہوا تھا، اس سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے اپنے اخبار کو اس کی ایک شاندار رپورٹ بھیجی، لیکن اس سے پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے خیال کیا شہر کی بہتری کے لیے بہت زیادہ روپیہ صرف کیا جا رہا ہے جب کہ ایک ایک پائی بھی حکومت ہند کے تمسکات میں لگانے کی ضرورت تھی۔ خود وائسرائے نے مہاراجہ کو لکھا اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ اس تیز رفتاری سے آگے نہ بڑھیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے ذہن میں میں ہی مجرم تھا۔ میں نے پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ پر یہ بات واضح کر دی کہ میں عوامی روپیہ ضائع نہیں کر رہا تھا، میں بھوکوں کے پیٹ بھرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ شہر کی صفائی بھی جو بہت بری حالت میں تھا۔ میں نے اس سے اتفاق کیا کہ جہاں تک ہو سکے اپنی رفتار کو تیز نہ ہونے دوں گا۔ تاہم میں اپنے منصوبے کے مطابق کام کرتا رہا، لیکن نسبتاً دھیمی رفتار سے اور احتیاط کے ساتھ۔

میں نے جے پور کے دیوان کا عہدہ ابتداء میں ایک سال کے لیے قبول کیا تھا۔ بعد میں میں نے اس میں دو سال کی توسیع قبول کی اور اس کے بعد مزید ایک اور سال کی۔ اس طرح میں نے اس خوبصورت ریاست میں ایک نہایت مہربان اور قدر دان حکمران کے تحت چار سال گزارے۔

جے پور میں بھی دوسری دیسی ریاستوں کی طرح کوئی دستور نہ تھا۔ مہاراجہ ریاست کا نظم و نسق ایک کونسل کی مدد سے چلاتے تھے جو وزیر اعظم اور تین وزیروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ منسٹروں کا تقرر مہاراجہ کرتے تھے اور جب تک مہاراجہ چاہتے اپنے عہدے پر برقرار رہتے۔ کونسل کی صدارت خود مہاراجہ کرتے اور ان کے ؟ میں وزیر اعظم۔ مجھے یہ بات غیر دانشمندانہ معلوم ہوئی کہ مہاراجہ کونسل کی صدارت کریں اور نظم و نسق سے اپنے آپ کو اس درجہ وابستہ رکھیں۔ کیونکہ جب کبھی بھی حکومت کے کسی عمل سے پبلک کو اختلاف ہوتا تو لوگ اپنی تنقید میں ان کا نام بھی لیتے۔ مہاراجہ نے میری رائے سے اتفاق کیا، اور کونسل کے صدر کے اختیارات وزیر اعظم کو سونپ دیئے۔

ریاست جے پور میں عوامی نمائندوں پر مشتمل کوئی دستور ساز جماعت نہ تھی جو حکومت کی پالیسی کو شکلیں دینے میں مدد دیتی۔ میری کوشش سے مہاراجہ نے ۱۹۴۴ء میں سیاسی اصلاحات کا اعلان کیا اور جے پور میں بھی عوامی نمائندوں کے دیوان بنا دیئے گئے

چونکہ ممتاز سیاح جے پور کے بارے میں نہایت خوش گوار تاثرات اپنے ساتھ لے جاتے تھے، اس لیے اس نے ایک خوش گوار فضا پیدا کر دی اور اس فضا نے میرے کاموں کی تکمیل میں بڑی مدد دی۔ تاہم اس کے یہ معنی نہیں کہ غرض مندوں کی طرف سے میری مخالفت بالکل نہیں ہوئی۔ مثال کے طور پر ہندو مہا سبھا کسی نہ کسی طرح مجھے جتنی جلدی ہو سکے جے پور سے نکلوانے پر تلی رہی۔ یہ اس کے عقیدے کے خلاف بات تھی کہ ایک ہندو ریاست میں ایک مسلمان اتنی اونچی جگہ پر فائز رہے۔ ہندو مہا سبھا نے اس وقت بھی ایسی ہی کوشش کی تھی جب میں میسور کا دیوان تھا، لیکن وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکی۔ جے پور میں اس کی کوشش زیادہ منظم رہی۔ اس کا سب سے بڑا الزام میرے خلاف

بہت جاذب توجہ لیکن احمقانہ تھا کیونکہ اس کے بے بنیاد ہونے کو فوراً ثابت کیا جا سکتا تھا۔ مجھ پر الزام لگایا گیا کہ میں ہندوؤں کے مندروں کو پامال/خراب کر رہا ہوں انھیں ڈھا رہا ہوں۔ حالانکہ میں دراصل ان کی مرمت کر رہا تھا اور انھیں اپنی اصلی حالت پر لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان میں سے بہت سے مندر کس مپرسی کے عالم میں تھے اور بعض تو واقعی کارخانوں کی حیثیت سے استعمال کیے جا رہے تھے۔ ہندو مہا سبھا نے واقعات کو غلط رنگ دینے کی مہم اس زور شور کے ساتھ چلائی کہ میں نے ایک بیان جاری کرتے ہوئے ہندو مہا سبھا کو چیلنج دیا کہ وہ الزامات کو ثابت کرے۔ اگر وہ الزامات ثابت کرنے میں ناکام رہے تو پھر یہی مناسب ہوگا کہ وہ الزامات سے دست کش ہو جائے اور معافی نامہ داخل کرے۔ میں نے ڈاکٹر مونجے کو جو مسلمانوں کے خلاف تعصب کے لیے کافی شہرت یافتہ تھے، اور سیلم کے ورداراجلو کو، دونوں ہندو مہا سبھا کے نائب صدر تھے، دعوت دی کہ وہ خود خاص طور پر جے پور آ کر ان معاملات کی تحقیق کریں۔ یہ دونوں حضرات جے پور آئے اور ان تمام مندروں کا معائنہ کیا جن کے بارے میں الزامات تراشے گئے تھے۔ ریاست کے چیف انجینئر سر تیجا سنگھ نے انھیں وہ تمام مقامات دکھائے اور یہ ثابت کرنے میں انھیں ذرا بھی دشواری پیش نہ آئی کہ یہ سارے الزامات بے بنیاد تھے۔ ورداراجلو نے تو ایک بیان جاری کرتے ہوئے صحیح واقعات پیش کر دیے بلکہ مندروں کی مرمت اور ان کی بہتری کے لیے جو کچھ کیا گیا تھا اس پر اپنے اطمینان کا اظہار بھی کیا۔ مونجے نے جو شخصی طور پر مجھ پر مہربان رہے، اس بیان سے اپنے آپ کو وابستہ کرنے سے انکار کیا بلکہ اس کے اجرا میں حائل ہوئے۔ حالانکہ نجی طور پر وہ تسلیم کرتے رہے کہ جو اطلاعیں انھیں ملی تھیں وہ بالکل بے بنیاد تھیں۔

حکومت کے دفاتر میں اردو کے چلن کے خلاف احتجاجی مہم کی ابتدا بھی ہندو مہا سبھا ہی نے کی۔ اردو کے سلسلے میں سر تیج بہادر سپرو نے مجھے ایک نہایت دلچسپ تاریخی خط لکھا تھا۔

جے پور میں مجھے ایک نہایت دردناک حادثے سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ حادثہ اتنا غیر معمولی تھا کہ اس کا یہاں بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایک صبح جب میں اپنے دفتر کی میز پر کام میں مصروف تھا، ایک سکھ نوجوان نے مجھ سے ملنے کی خواہش کی۔ میری عادت تھی کہ میں کسی سے ملنے سے انکار نہ کرتا تھا۔ سکھ نوجوان اندر لایا گیا۔ اس نے بڑے سکون کے ساتھ اپنی آمد کی غرض و غایت بتائی۔ اس نے کہا کہ وہ ایک لڑکی سے محبت کرتا ہے لیکن لڑکی کا باپ ان دونوں کی شادی کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اس نوجوان کی کوئی حیثیت نہ تھی اس لیے اس نے درخواست کی کہ میں اس کی مدد کروں اور اسے جے پور سول سروس میں کوئی جگہ دے دوں۔ گویا میں ہی اس کی امید کا آخری سہارا تھا۔ میں نے اسے بالکل واضح طور پر ہمدردی کے ساتھ سمجھایا کہ اس سلسلے میں میرے لیے کوئی وعدہ کرنا ممکن نہیں خواہ وہ بے روزگار ہی کیوں نہ ہو، درآں حالیکہ وہ جے پوری بھی نہ تھا۔ اس نے کہا اگر میں اس کی مدد نہ کروں تو وہ یہیں جان دے دے گا۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی تصور نہ کر سکا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا اسے سچ مچ بھی کر دکھائے گا۔ میں نے اسے سمجھانا چاہا اور میں نے اس سے کہا کہ وہ بے وقوف نہ بنے۔ ذرا صبر سے کام لے اور کسی اور جگہ جا کر ملازمت ڈھونڈے۔ وہ ایم۔ اے تھا اور کافی ذہین تھا۔ اور کہیں بھی اپنے مقصد میں کامیاب۔ یہ دیکھ کر کہ میں اس کی مدد پر آمادہ نہیں تھا، اس نے ایک ریوالور نکالا اور اپنی کنپٹی پر رکھ لیا۔ قدرتی طور پر میں گھبرا گیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ ایسی احمقانہ حرکت نہ کرے۔ میرے لیے اس کے ہاتھ سے ہتھیار چھیننا ناممکن تھا کیونکہ ایک چوڑا میز ہم دونوں کے درمیان حائل تھا۔ اس نے کہا ڈریے نہیں میں آپ کو کوئی گزند نہ پہنچاؤں گا۔ یہ کہا اور نہایت اطمینان کے ساتھ اس نے اپنے آپ کو گولی مار لی۔ گولی اس کی کھوپڑی کو چیرتی ہوئی پچھلی دیوار میں دھنس گئی۔ وہ اپنے آپ کو گولی مارنے سے پہلے نہایت آسانی کے ساتھ مجھے نشانہ بنا سکتا تھا۔ جس لڑکی سے اسے محبت تھی، اس کی تصویریں اس کی جیب سے نکلیں۔ مجھے خوشی ہے کہ

میں نے بڑے صبر و تحمل سے کام لیکر اسے سمجھانے کی کوشش کی اور اس نے وہی کیا جس کا وہ عزم کر کے آیا تھا۔

مہاراجہ اور عوام دونوں چاہتے تھے کہ میں ابھی یہیں رہوں۔ مگر حیدرآباد کی دعوت مجھے مل چکی تھی۔ ایسے میں میں نے بے پروا ہو کر خدا حافظ کہنا طے کیا۔ بقول سعدی لوگوں کے بس کہنے سے پہلے بس کر دینا چاہیئے۔ میں نے بھی ایسے وقت چلے جانے کا ارادہ کیا جب کہ لوگ میرے ٹھہرنے کے خواہش مند تھے۔

میں اگست ۱۹۴۶ء میں وزیر اعظم کی حیثیت سے حیدرآباد پہنچا۔ کوئی اٹھارہ سال پہلے بھی حیدرآباد کے ریذیڈنٹ سر ولیم بارٹن کے ذریعے مجھے یہ خدمت پیش کی گئی تھی۔ لیکن اس وقت میسور چھوڑ جانے کو میرا جی نہ چاہتا تھا۔

ریاست میں انتظام نظم و نسق اور سیاسی امور میں نظام مختار اعلیٰ تھے۔ لیکن صرف نظری حیثیت سے کیونکہ نظم و نسق کی ذمہ داری ان کی ایگزیکٹو کونسل پر تھی۔ اس کونسل میں وزیر اعظم ہوتا تھا جس کا تقرر وہ وائسرائے کے مشورے سے اور اس کی منظوری سے کرتے تھے۔ کونسل میں چھ تا آٹھ اراکین ہوتے تھے۔ نظام اپنی کونسل کے فیصلے کے خلاف نہیں جا سکتے تھے۔ ایک بار جب میں نے نظام سے یہ کہا کہ جب میں لوگوں سے کہتا ہوں کہ یور اگزالٹڈ ہائینس ہندوستان میں سب سے زیادہ دستوری حکمران ہیں تو لوگ میری بات پر یقین نہیں کرتے۔ یہ سن کر وہ خوب ہنسے۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر نظام ایگزیکٹو کونسل کے فیصلے کے خلاف جاتے تو ریذیڈنٹ اس میں مداخلت کرتا۔

نظام میں بہت سی خوبیاں ہیں اور اس کے ساتھ عجیب عادتیں بھی۔ وہ بڑی سیدھی سادی زندگی بسر کرتے ہیں۔ انہیں نمود و نمائش سے نفرت ہے۔ وہ نہایت سادہ انتہائی سستے کپڑے پہنتے ہیں۔ سادہ ترین غذا کھاتے ہیں اور وہ بھی بہت تھوڑی۔ وہ ایک پرانی موٹر استعمال کیا کرتے تھے۔ جب یہ موٹر بالکل ہی ٹوٹ پھوٹ گئی اور اس کی درستی ناممکن ہو گئی تو انہیں بڑی مشکل سے دوسری نئی موٹر استعمال کرنے پر آمادہ کیا جا سکا۔ انہوں نے اپنی جمع کی ہوئی قریب قریب پوری دولت الگ الگ ٹرسٹ بنا کر اپنے بیٹوں، بیٹیوں اور دوسروں میں بانٹ دی ہے۔ انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کو تین کروڑ روپے دیئے ہیں۔ ان کے کردار کی ایک خوبی ان کا تحمل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ایسے لوگوں کو دور کر دیا ہو جنہیں وہ پسند نہ کرتے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی برہمی کے اظہار کے لیے کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ برانگیختہ کرنے والی بڑی سے بڑی بات پر بھی ان کا ضبط و تحمل قابل ستائش رہا ہے۔ مشیت نے ان سے سخت اور بہت سخت سلوک کیا۔ انہوں نے کیا کچھ نہیں کھویا ہے!

جیسے ہی میں حیدرآباد پہنچا، مہاتما گاندھی نے مجھے خط لکھا اور ان سیاسی اصلاحات کے بارے میں اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا جن کا اعلان اسی زمانے میں ہوا تھا۔

ریاست حیدرآباد نے اپنے صحیح معنی میں ہندو مسلم اتحاد کا خوش گوار منظر پیش کیا تھا۔ حیدرآباد کی سماجی زندگی ہندو مسلم تہذیبوں کا سنگم تھی۔ ریاست میں مہاراجہ سر کشن پرشاد جیسے امیر سے بڑھ کر نظام کا وفادار کوئی نہ تھا۔ خود مہاراجہ برسوں تک نظام کے وزیر رہے۔ میرے لیے حیدرآباد میں یہ معلوم کرنا بڑا دشوار تھا کہ کون ہندو ہے اور کون مسلمان۔ دونوں فرقوں کے لوگ قریب قریب ایک ہی طرح کا لباس پہنتے تھے اور اردو دونوں کی مشترکہ زبان تھی۔ مجھے کسی ملنے والے سے یہ پوچھنا پسند نہ تھا کہ وہ مسلمان ہے یا ہندو۔ بلکہ اس کا نام پوچھ کر میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

جب کبھی میں مستقر پر ہوتا تو ہفتے میں دو روز عوام سے ملنے کے لیے مختص کر دیتا جیسا کہ میں نے میسور اور جے پور میں کیا تھا۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ دن میرے لیے کتنے مشقت طلب ہوتے تھے۔ درجنوں لوگوں سے ملتا جو کوئی نہ کوئی شکایت یا کوئی نہ کوئی درخواست لے کر آتے تھے لیکن یہ مشقت برداشت کرنے کے قابل چیز تھی۔ لوگوں کو یہی چیز سب سے زیادہ مطمئن کرنے والی تھی کیونکہ عہدہ داروں کی بد انتظامی کو روکنے کی اس سے بہتر اور کوئی صورت نہ تھی۔ حیدرآباد میں لوگوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ ایک نئی آزادی انہیں ملی ہے اور عہدہ دار عوام سے پہلے کی نسبت زیادہ اخلاق اور نرمی سے پیش آنے لگے تھے۔ یہ طرزِ عمل راست نتیجہ تھا اس بات کا کہ نظم و نسق کے صدر تک عوام کی رسائی آسان ہو گئی تھی۔ ان دو روزوں میں جب ہر روز دو سے تین سو آدمیوں سے ملتا تھا۔ نظام کے کانوں تک یہ خبر پہنچائی گئی کہ وزیر اعظم اپنے دفتر میں بیٹھے ہیں وہ دو روز "دربار" لگانے میں مصروف ہیں۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں یہ سب کچھ اپنی شان و شوکت بڑھانے کے لیے نہیں کر رہا تھا بلکہ ان کی اور ان کی رعایا کے لیے مشقت اختیار کیا تھا۔

میسور اور جے پور کی طرح شہر کا میرا ہفتہ وار معائنہ نظم و نسق کی ایک اور خوبی تھی۔ اس نے بڑے اچھے نتائج پیش کیے۔ جے پور کی طرح میں حیدرآباد میں اس معائنے کے لیے ایک بڑی کا موٹر استعمال کرتا تھا تاکہ اپنے ساتھ چار یا پانچ عہدہ داروں کو رکھ سکوں۔ یہ دیکھ کر عوام بہت خوش ہوتے اور معاملات کو جس تیزی سے نپٹتا دیکھ کر حیران رہ گئے۔ غریبوں کے گھر جانا، ان کی ضروریات معلوم کرنا اور دیر لگائے بغیر ان کو پورا کرنا، اصلاح کے کام انجام دے کر مجھے بڑی مسرت محسوس ہوتی تھی

حیدرآباد میں کتنا زبردست کام کرنا تھا اور یہ کتنا حیرت انگیز ملک بن سکتا تھا لیکن یہ امید بر نہ آئی تھی۔ یہ گوہرِ مقصود ہاتھ نہ آنا تھا اگرچہ میں حیدرآباد میں صرف دس مہینے رہا لیکن مجھے اس کا افسوس نہیں کہ میں وہاں کیوں گیا۔ اور نہ مجھے اس کا غم ہے کہ میں نے اسے اتنی جلدی کیوں چھوڑ دیا۔ جیسا کہ میں نے پہلے ہی سوچا تھا، برطانوی اقتدار کے ختم ہوتے ہی میرا وہاں ٹھہرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ نظام نے آزاد رہنے کا عزم کر لیا تھا یہی حال بدبخت اور احمق مسلمانوں کی اس جماعت کا تھا جو اتحاد المسلمین کہلاتی تھی۔ یہ لوگ مجھے حیدرآباد سے نکلوانے کے لیے زمین و آسمان سر پر اٹھائے ہوئے تھے۔

میں نے دیکھا کہ ریاست کے سینئر عہدہ داروں کا بھی سر پھر گیا ہے اور ایسے عہدہ داروں کی تعداد کچھ کم نہ تھی۔ میں ایسے تمام لوگوں کے پہلو میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ اس لیے جب میں گرمیوں میں آرام کرنے کے لیے بنگلور جا رہا تو میں نے اس صورتِ حال کا اچھی طرح جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے حیدرآباد واپس نہیں جانا چاہیے۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ میرے جانے سے نظام کو افسوس نہ ہو گا۔ میں نے ۱۵ مئی ۱۹۴۷ء کو اپنا استعفیٰ لکھ کر نظام کو بھیج دیا۔

میں ہندوستان کی تقسیم کا سخت مخالف تھا۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملک کی تقسیم نے دونوں حصوں کو نقصان پہنچایا، ہندوستان کو کم اور پاکستان کو زیادہ کیونکہ وہ خود بھی دو الگ الگ ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہے۔ اس تقسیم نے جمہوریہ ہند میں رہنے والے کوئی چار کروڑ مسلمانوں کی پوزیشن کو حد درجہ مشکل اور نازک بنا دیا ہے۔

تقسیم ملک کی ذمہ داری بالآخر و قطعاً کانگریس کے سر جاتی ہے، مسٹر جناح کے نہیں۔ سر اسٹافورڈ کرپس نے ۱۹۴۲ء میں جو تجویز پیش کی تھی اس کو وہ قبول کرنے کے لیے تیار تھے۔ لیکن کانگریس نے اسے قبول نہیں کیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۶ء میں انہوں نے کیبنٹ مشن کا پلان قبول کیا

لیکن کانگریس نے اس میں مشکلات پیدا کر دیں۔ اس لیے ملک کی تقسیم کی پوری ذمہ داری ان پر ڈالنا درست نہیں اگرچہ اس کی ابتدا کے ذمہ دار بے شبہ وہی ہیں۔ بہر حال اب ملک تقسیم ہو چکا ہے اور پاکستان ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ ہندوستان میں ایسے لوگ جو فکر صحیح رکھتے ہیں اس کی خوش حالی ترقی اور ہندوستان سے اس کے مشترکہ مفاد کے مضبوط رشتوں کی استواری کے آرزو مند ہیں۔

۱۹۴۱ء میں میسور کے عہدۂ دیوانی سے الگ ہونے کے کچھ دنوں بعد مہاراجہ جموں و کشمیر نے ایک خصوصی پیامبر کو ہوائی جہاز سے میرے پاس ایک خط دے کر بھیجا تھا۔ اس خط میں مجھے ان کی ریاست کے دیوان کا عہدہ پیش کیا گیا تھا اور نظم و نسق میں بالکل آزادی کا وعدہ بھی کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں جے پور کا پیغام دعوت نامہ بھی مجھے مل گیا تھا۔ میں جے پور کے مہاراجہ سے اچھی طرح واقف تھا اور کشمیر کے مہاراجہ کے لیے اجنبی تھا میں ایک دوست کو کھونے کے لیے تیار نہ تھا اس لیے میں اس وقت کے پولیٹیکل سیکرٹری اور اپنے دوست سر کینتھ فٹز کے مشورے سے جے پور جانے کا فیصلہ کر لیا۔

۱۹۴۷ء میں حیدر آباد کے وزیر اعظم کے عہدے سے ہٹنے کے بعد مجھ سے پھر کشمیر کے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالنے کی خواہش کی گئی۔ یہ معلوم کرنے کے بعد کہ میں اس کے لیے راضی نہیں ہوں، ان ہی صاحب نے دہلی میں میرے ایک دوست سر گوپال سوامی آئنگر کو پکڑا اور ان سے خواہش کی کہ وہ کسی نہ کسی طرح مجھے یہ عہدہ قبول کرنے پر راضی کریں۔ سر گوپال سوامی آئنگر نے مجھ سے کہا کہ اگر تم اس کے لیے راضی بھی ہو تو میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دو۔ کشمیر کی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے اور وہ چاہتے تھے کہ میں اس کے قضیے میں الجھ جاؤں۔

اسی زمانے میں مجھے بڑودہ سے بھی دعوت آئی تھی کیونکہ ان ہی دنوں بڑودہ کی وزارت عظمیٰ خالی ہوئی تھی لیکن اسے بھی قبول نہ کر سکا لیکن اب مجھے اس حادثے کی وجہ سے جس میں یہ ریاست اور اس کے فرمانروا دونوں پردۂ ہستی سے مٹا دیئے گئے، خیال آتا ہے کہ اسے قبول نہ کر کے میں نے بڑی غلطی کی۔ شاید میں اس مصیبت کو کسی طرح ٹلا دیتا۔ میں ہز ہائی نس سے ان کے بچپن سے واقف تھا اور وہ میری بات کا ضرور لحاظ کرتے۔

آنجہانی سردار ولبھ بھائی پٹیل اور میں ایک دوسرے سے قریب ربع صدی سے واقف تھے۔ اور ہمارے تعلقات دوستانہ تھے۔ لیکن جیسے ہی وہ مرکزی حکومت کے وزیر بنے ہم ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے۔ مجھ سے ان کا طرز عمل بالکل ہی بدل گیا اور ہمارے تعلقات میں خاصا کھچاؤ آ گیا۔ وہ ایک اچھے دوست اور برے دشمن بن جاتے تھے۔ حیدر آباد کے زوال کے بعد نظام مجھ سے ملنے کے از حد مشتاق تھے، لیکن مجھے ان کے قریب بھی پھٹکنے نہ دیا گیا۔ دہلی اور حیدر آباد کے درمیان ایک دوستانہ معاہدہ طے کرانے کے لیے جو کچھ میں نے کیا اس کے بعد اس طرز عمل کی وجہ سمجھنا دشوار تھا۔ مارچ ۱۹۴۹ء میں نظام بہت خواہش مند تھے کہ شہزادہ معظم جاہ کے لیے انہوں نے جو ٹرسٹ بنایا تھا میں اس کا ٹرسٹی بنوں اگر میں شہزادہ کے بعد بھی زندہ رہتا تو میں ان کی جگہ لینے والا تھا۔ جو کچھ ہو چکا تھا اس کے باوجود نظام کو مجھ پر اعتماد کا یہ کھلا ثبوت تھا۔ میں نے نظام کی یہ دعوت قبول کرتے ہوئے انہیں لکھا بہتر ہے کہ میں ساتھ ساتھ سردار پٹیل کو لکھ کر اس کی تصدیق کر لوں کہ انہیں اس بارے میں کوئی اعتراض تو نہیں۔ مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ انہیں میرا حیدر آباد جانا گوارا نہیں آخر کار میرا اندیشہ ہی درست نکلا۔ انہوں نے میرے تار کے جواب میں لکھا۔

"یوپی گورنر نے مجھے اطلاع دی ہے کہ یہ معاملہ ہنوز زیر غور ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آپ کا اس موقع پر وہاں جانا کچھ مفید نہ ہوگا۔ اس کے خلاف یہ بات ناپسندیدہ تنازعات کا باعث ہوگی۔ ان حالات میں میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ حیدرآباد جانے کا خیال ترک کر دیں۔ میں یہ بھی کہوں گا کہ نظام نے اس بات کا ذکر بھی مجھ سے نہیں کیا ہے۔"

آج تک میں بھی یہ بات نہ جان سکا کہ سردار پٹیل یہ کہنے میں کہاں تک حق بجانب تھے کہ نظام نے اس معاملہ میں ان سے مشورہ نہیں کیا ہے کیونکہ نظام اور دوسرے لوگوں نے مجھے واضح طور پر لکھا تھا کہ انہوں نے اس بارے میں وزارت داخلہ کی اجازت حاصل کر لی ہے۔

مئی ۱۹۴۹ء میں میں نے روزنامہ ٹائمز آف انڈیا میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اس میں میں نے ریاستوں کے تعلق سے سردار پٹیل کی پالیسی پر تنقید کی تھی اور اسے بالکل بے رحمانہ بتایا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں یہ بات بہت ناگوار گزری تھی۔ جمہوری خود سروں کو خوش رکھنا دشوار گزار کام ہے۔

۱۹۴۷ء میں حیدرآباد کے وزیر اعظم کی حیثیت سے جب میں دہلی پہنچا تو راج کماری امرت کور نے مجھے تار پر دعوت دی کہ میں مہاتما گاندھی سے ملوں۔ جب میں ان سے ملنے گیا تو انہوں نے خان عبدالغفار خان کو بھی بلایا۔ خان عبدالغفار خان نے مجھ سے سوال کیا کہ شمال مغربی صوبہ سرحد کی آزادی کے ان کے مطالبہ کے بارے میں میرا کیا خیال ہے۔ میں ایسے سوال کے لیے تیار نہ تھا اور فوراً ہی میں نے کہا "چونکہ آپ پاکستان میں شریک ہونا نہیں چاہتے اور ہندوستان میں آپ کی شرکت ممکن نہیں، اس طرح آپ آزاد بھی رہ سکتے ہیں۔" گاندھی جی نے ہنستے ہوئے کہا "یہ کس طرح ممکن ہے؟" میں نے جواب دیا "اگر بنگال آزادی کا مطالبہ کر سکتا ہے تو شمال مغربی صوبہ سرحد کیوں نہیں کر سکتا؟" بلاشبہ میں آزاد بنگال ہی کا قائل نہ تھا اور شمال مغربی صوبہ سرحد کا کس طرح حامی ہو سکتا تھا۔

انڈونیشیا میں اقوام متحدہ کے فنی مددگار نمائندے کی حیثیت سے میرا قیام مختصر رہا۔ اس کا آخری مہینہ جکارتا کے ایک دواخانے میں گزرا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ میں انڈونیشیا میں بہت خوش رہا۔ بہت سی چیزوں نے سازش کر کے میرے وہاں قیام کو ناخوشگوار بنا دیا۔ پہلی بات تو یہ کہ میرے رہنے کے لیے یہاں کوئی مکان نہ ملا۔ حکومت اس مسئلے کی تکمیل سے قاصر رہی۔ جس ہوٹل میں میرا قیام تھا، مشرق کے بہترین ہوٹلوں میں اس کا شمار ہوتا تھا اور اس کے کمرے کافی آرام دہ تھے لیکن مجھے وہاں کی غذا بالکل پسند نہ آئی۔ ممکن ہے یہ میرا اپنا قصور ہو۔ اس عہدے کے قبول کرنے سے پہلے میں نے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ مجھے درجہ اوّل کے سفیر کا درجہ دیا جائے۔ میرے اس خیال کی حکومت ہند اور اقوام متحدہ دونوں نے تائید کی تھی۔ حکومت انڈونیشیا کی طرف سے اتنے واضح تیقنات بھی پورے نہ ہو سکے۔

مجھے اپنے آباؤ اجداد کے وطن جانے کا بھی موقع نہ ملا تھا۔ میں نے اس دیرینہ خواہش کو بھی پورا کر لیا۔ ستمبر ۱۹۵۰ء میں میں بنگلور سے روانہ ہوا اور ایک دن دیر سے کراچی پہنچا۔ میں نے ایک رات کراچی میں بسر کی اور اپنے بہت سے رشتہ داروں اور دوستوں سے ملا۔ یہاں میرے متعدد رشتہ دار اور دوست ہیں۔ ان میں سے بعض اہم عہدوں پر فائز ہیں۔ میرے بھتیجے میجر جنرل اسکندر مرزا وزارت دفاع کے معتمد ہیں۔ ایک اور قریبی عزیز آغا ہلالی

وزارت خارجہ میں شریک معتمد ہیں۔ مرزا احمد اصفہانی جو پاکستان کے غالباً سب سے بڑے صنعت کار ہیں بیوی کی طرف سے رشتہ دار ہیں۔ میری چار شادی شدہ بھتیجیاں اور بھانجیاں بھی کراچی میں بس گئی ہیں۔ پاکستان کے بعض بڑے عہدہ دار میرے پرانے اور عزیز دوست ہیں۔ ان میں گورنر جنرل مسٹر غلام محمد، سابق وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین، وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان، اور وزیر داخلہ مسٹر گرمانی شامل ہیں۔

میں طہران میں تقریباً پندرہ دن رہا۔ اس پوری مدت میں میں اپنے قدیم دوست مرزا خلیل شیرازی کا مہمان رہا۔ ہز مجسٹی شاہ ایران نے بھی مجھے شرف باریابی بخشا اور مجھ سے صاف صاف باتیں کیں۔ انہوں نے ایک زبردست محب وطن کی حیثیت سے مجھے بہت متاثر کیا۔ طہران سے میں اکتوبر ۱۹۵۵ء میں بغداد گیا۔ اس سفر کا اصل مقصد کربلا، نجف اور کاظمین کی زیارت تھی مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ یہ مقامات جو لاکھوں نفوس کے نزدیک مقدس ہیں، حکومت کی نظر توجہ سے کس درجہ محروم ہیں۔ حالانکہ یہاں کی حکومت نہ صرف ان مقدس زیارت گاہوں پر کافی رقم صرف کر سکتی ہے بلکہ ان مقامات کی بہتری پر بھی کافی خرچ کرنے پر قادر ہے۔ یہ مقامات متمدن دنیا کی معمولی ضروریات سے بھی محروم ہیں۔ کربلا سے نجف تک کوئی سڑک نہیں، حالانکہ ان دونوں کے درمیان صرف چالیس میل کا فاصلہ ہے۔

میں نے کربلا کے ایک مجتہد صاحب سے پوچھا یہ کیا بات ہے کہ اسلامی ممالک اتنے زیادہ پسماندہ کیوں ہیں اور ان کا نظم و نسق اس درجہ شکستہ کیوں ہے؟ ان ملکوں کے باشندے ایسی مصیبتیں کیوں اٹھا رہے ہیں جنہیں آسانی کے ساتھ دور کیا جا سکتا ہے۔ کیا اسلام اس کا ذمہ دار ہے؟ اس خیال کی پر زور تردید کی گئی۔ انہوں نے کہا کہ اس کے برخلاف محض اس لیے ان ملکوں کی یہ درگت بنی ہے کہ وہ اسلام کی بنیادی باتوں پر عامل نہیں ہیں۔ جب میں نے یہ بات فاطمہ جناح سے کہی تو انہوں نے تصحیح کی "مسلم ممالک" نہ کہیے بلکہ "ایشیائی ممالک کہیے"۔ خواہ بات کچھ بھی ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر ملکوں کا نظم و نسق غیر ترقی پذیر ہے اور یہی ان کی سب سے بڑی خرابی ہے۔ مثال کے طور پر انڈونیشیا کو لیجیے۔ یہاں کا نظم و نسق بدنظمی کی اپنی آپ مثال ہے اور اس بدنظمی کو دور کرنے اور نظم و نسق کو بہتر بنانے کی کوئی سنجیدہ کوشش بھی یہاں نہیں ہوتی۔ عراق کا نظم و نسق شاید اتنا برا نہ ہو لیکن وہ بھی کافی برا ہے۔ یہی حال مصر، ایران، اردن، اور دوسرے ملکوں کا ہے۔ پاکستان کے نظم و نسق میں کافی ابتری پھیلی ہوئی ہے۔ ہندوستان میں نظم و نسق کا معیار اس سے اونچا ہو سکتا تھا جتنا کہ وہ اب ہے۔ عوامی مصارف بڑی تیزی سے بڑھتے جا رہے ہیں جس کی وجہ سے تجارتی محاصل عائد کرنا ناگزیر ہو رہا ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر لوگ تکلیف اٹھا رہے ہیں اور ہر طرف بددلی پھیل رہی ہے۔ یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں کہ مشرق وسطیٰ کی حکومتیں اس پبلک کے اعتماد اور احترام سے محروم ہیں جن کی وہ خدمت کر رہی ہیں۔ ہمارے ملک نہایت آسانی کے ساتھ چند ریاست دانوں کی جنت بن رہے ہیں۔

(تلخیص و ترجمہ: سید صباح الدین رفعت)

محمد علی جوہر

جس خالق نے مجھے ۱۰ ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ کو پیدا فرمایا تھا اس کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آج بتاریخ ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ کو میں نے اپنی عمر کے پچاس سال پورے کیے۔ اس پوری مدت پر نظر ڈالتا ہوں تو عجیب و غریب خیالات دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ ۱۰ رمضان ۱۲۹۷ھ کو میرے والد نے بعارضہ ہیضہ کوئی ۳۰ - ۳۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس وقت میری والدہ مرحومہ کی عمر ۲۷ - ۲۸ سال کی تھی۔ سوائے قرآن کے کچھ نہ پڑھا تھا۔ اسی کی مدد سے خود اردو کا بین السطور ترجمہ پڑھنے کی استعداد پیدا کر لی تھی۔ والد نے تیس چالیس ہزار کا قرضہ چھوڑا تھا اور پانچ لڑکے اور ایک لڑکی۔ جن میں سب سے بڑے کی عمر ۱۲ سال کی تھی جو تیس برس ہی کی عمر میں مرگی کے موذی مرض میں مبتلا رہے۔ اور سب سے چھوٹا خود میں تھا جس کی عمر اس وقت پورے دو سال تھی۔ مجھے اپنے والد مرحوم بالکل یاد نہیں۔ مگر والدہ مرحومہ کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ علاوہ اس فیض گراں مایہ کے جو شوکت صاحب کی محبت، نگرانی اور ترغیب و تحریص کی بدولت مجھے نصیب ہوا ہے، میں جو کچھ بھی ہوں اور جو کچھ میرے پاس ہے وہ خداوند کریم نے مجھے اسی مرحومہ کے ذریعے سے پہنچایا ہے۔ والد مرحوم کی وفات کے دن سے خود گھر کی بوڑھی ماماؤں کا سا سادہ اور سستا لباس پہنا اور انھیں کی طرح روکھی سوکھی کھا کر گزر کی۔ مگر ہمارا کوئی سوال رد نہیں کیا اور ہمیں اس عیش و آرام میں رکھا، پالا اور بڑا کیا، جو ہمارے ان چچاؤں کی اولاد کے عیش و آرام سے کسی طرح کم نہ تھا، مگر کچھ زائد ہی تھا، جو بفضلہٖ تعالیٰ والد مرحوم کی وفات کے وقت زندہ سلامت تھے۔ جن کی جائدادوں پر قرضے کا وہ بوجھ نہ تھا جو ہمارے ترکے پر تھا جو ریاست رامپور میں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز تھے۔ ان سب سے پہلے ہمیں کو گھر سے نکال کر بریلی اسکول میں تعلیم کے لیے والدہ مرحومہ نے بھیجا اور وہ تو سب اسکول چھوڑ چھوڑ کر گھر چلے گئے مگر ہماری ہی تعلیم جاری رہی اور شوکت صاحب جس طرح ریاست رامپور کے باشندوں میں غالباً سب سے پہلے کسی ہندوستانی یونیورسٹی کے گریجویٹ ہوئے، اسی طرح ان میں سب سے پہلے آکسفورڈ کا گریجویٹ میں ہوا۔ میرے سب سے بڑے چچا، جو ہماری جائداد کا انتظام فرمایا کرتے تھے اور ریاست میں ایک بہت بڑے عہدے پر ممتاز تھے، اس وقت زندہ تھے۔ جب میں ان کے سب سے چھوٹے مرحوم بھائی کا سب سے چھوٹا لڑکا اور ایک بیوہ کا پرورش کردہ اسی ریاست میں ان سے بھی بڑے عہدے پر مقرر کیا گیا تو انھوں نے اس اعزاز پر مجھے گلے لگایا اور پیار کیا۔

ریاست ہائے رامپور اور بڑودہ میں اچھے خاصے عہدوں پر ملازمت کرنے اور جو خدمتیں تفویض ہوتی رہیں، انھیں نیک نامی کے ساتھ بجا لانے اور چند اور ریاستوں میں ان سے بھی اعلیٰ عہدے پیش کیے جانے مگر مجبوری قبول نہ کر سکنے کے بعد میں نے دنیائے صحافت میں قدم رکھا اور ملک و ملت کی خدمت کے لیے اس شعبۂ زندگی میں داخل ہوا۔ آج یہ کہنا مشکل ہے کہ ان خدمات کی انجام دہی میں نیک نامی حاصل کی یا بدنامی۔ لیکن غالباً یہ تو آج بھی نہ کہا جائے گا کہ گمنام رہا۔ مسلمانوں کی سب سے پہلی باقاعدہ سیاسی انجمن یعنی مسلم لیگ کی ۱۹۰۶ء

میں بنیاد ڈالی اور ۱۹۱۸ء میں اس کا صدر منتخب ہوا۔ گو قید فرنگ کی بدولت کرسی صدارت پر میری تصویر ہی "جلوہ افروز" ہوئی۔ اس عزت افزائی کے باعث اپنی قسمت کا آج تک مشکور ہوں۔ مگر میری نظر میں جو اس کی حقیقت تھی وہ اس زمانے کے اس شعر سے واضح ہوتی ہے۔

یہ صدر نشینی ہو مبارک تمہیں جوہر
لیکن صلۂ روزِ جزا اور ہی کچھ ہے

پانچ سال کی نظربندی اور قید سے رہائی پر ۱۹۲۰ء میں جمعیت خلافت کی طرف سے ایک وفد کا سرکردہ ہو کر یورپ جانا اور وزرائے برطانیہ، فرانس و اطالیہ و پاپائے روم سے ملنا پڑا۔ پھر دو سال کی قید سخت کی سزا بھگتنی پڑی۔ اور اس کے بعد ۱۹۲۳ء میں ہندوستان کی سب سے بڑی نمایندہ سیاسی انجمن انڈین نیشنل کانگرس کی صدارت کے لیے باتفاق رائے انتخاب ہوا۔ ۱۹۲۶ء میں سب سے پہلے عالم اسلام کی موتمر کے لیے بھی مسلمانانِ ہندوستان کی نمایندگی کے لیے جمعیت خلافت کی طرف سے منتخب ہوا۔

زہے سعادتِ آں بندہ کہ کرد نزول
گہے بہ بیتِ خدا و گہے بہ بیتِ رسولؐ

گو موتمر کا اجلاس دوم حج کے موقع پر مکہ معظمہ میں منعقد نہیں کیا گیا تھا، لیکن موتمر کی شاخ ہند کی طرف سے اس کے لیے بھی باتفاق منتخب ہوا۔ ان مناصب کے متعلق جو فرائض تھے انھیں نیک نامی سے انجام دیا یا بدنامی نصیب ہوئی۔ یہ نہیں کہہ سکتا۔ مگر یقیناً گمنام نہیں رہا۔ لیکن نہ یہاں کا نام مطلوب ہے اور نہ یہاں کی نیک نامی۔ جو کچھ مطلوب ہے وہ وہی صلۂ روزِ جزا ہے جس کا ۱۹۱۸ء کے انتخاب صدارت کے بعد کے شعر میں ذکر ہے۔ دیکھیے وہاں کیا ملتا ہے۔ خود خدا شاہد ہے کہ جب سے ہوش سنبھالا ہے اس پر اور اس کے رسول پر ایمان ہے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ بدبختی سے: ع

اُن کو مانا ہے، پہ کہنا نہیں مانا اُن کا

ہزاروں گناہ کیے ہیں۔ فرائض مذہبی کی ادائیگی میں لاکھوں کوتاہیاں ہوتی ہیں، تاہم اس رحیم و کریم کا شکر ہے کہ اسلام کے مصائب میں شریک کرکے آنکھیں کھول دیں اور اپنے گمراہ بندے کو راہ راست پر لایا۔ ممکن ہے کہ اب بھی یہ وسوسۂ شیطانی ہی ہو اور میری بھی وہی حالت ہو جس کے متعلق غالب نے لکھا ہے کہ: ع

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

لیکن دل تو کہتا ہے کہ جس کے نام نامی پر میرے والدین نے میرا نام رکھا تھا اس کے طفیل میں مجھ پر بھی کرم ہو اور مجھ سے بھی اس ذاتِ گرامی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا چاہنے والا فرمایا ہے:

أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ

جتنا سوچتا ہوں وہی حقیقت معلوم ہوتی ہے جو بحالتِ نظربندی چھندواڑے میں ان اشعار میں ظاہر کی گئی تھی:

یہ نظربندی تو نکلی ردِّ سحر
دیدہ ہائے شوق اب جا کر کھلے

اب کہیں ٹوٹا ہے باطل کا طلسم
حق کے عقدے اب کہیں جوہر کھلے

فیض سے تیرے ہی اک قید فرنگ
بال و پر نکلے قفس کے در کھلے

کیا یہ جائز نہیں کہ میں اپنے ہم نام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے طفیل میں آج جب کہ مجھے پیدا ہوئے نصف صدی گزر چکی ہے اپنے دل کو ڈھارس بندھاؤں کہ وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ اور اس غزل کا مقطع بھی سچ ہو جائے۔

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر
مر کے جوہرؔ آپ کے جوہر کھلے

جب میں دس بارہ برس کا لڑکا تھا تو خیال کیا کرتا تھا کہ پچاس برس کا آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے اور بڑھاپے میں اُٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے کھانے پینے میں دوسروں کی مدد لینا پڑتی ہے اور دوسروں کا دست نگر ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے میری آرزو تھی کہ خدا کرے پچاس سال کی عمر سے پہلے ہی موت آجائے تاکہ سسک سسک کر اور پلنگ پر پڑے پڑے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا نہ پڑے۔ آج پچاس سال کا ہو گیا مگر اب تک موت نہ آئی۔ حالانکہ جس سال سے میدان صحافت میں قدم رکھا ہے ذیابیطس جیسے موذی اور مہلک مرض میں مبتلا ہوں اور جو راحت یا آرام سکون و بے فکری اس کا مقابلہ کرنے کے لیے درکار ہیں وہ مفقود ہیں۔ اس وقت تک جتنی عمر ہوتی ہے اس کا آخری تہائی حصہ اسی مرض میں گزرا ہے۔ اعضا میں اب قوت باقی نہیں ہے۔ حافظہ بے حد خراب ہو گیا ہے۔ لیکن بحمد اللہ اب تک دوسروں کا دست نگر ہونا نہیں پڑا۔ اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، کھانے پینے میں ابھی دوسروں سے مدد لینے کی ضرورت نہیں پڑی اور گو سال گزشتہ میں چار ماہ تک صاحب فراش رہا تب بھی ملک و وقت کے کاموں میں شرکت کی اور بیٹھے بیٹھے بلکہ لیٹے لیٹے بھی وہ خدمات انجام دیتا رہا جو کانگرس اور خلافت کے سلسلے میں مجھ سے متعلق تھیں۔ اسی حالت میں حج و زیارت کا شرف بھی نصیب ہوا۔ اور گو اسی دن جس دن موتمر عالم اسلامی نے رسمی افتتاح کے بعد اپنا اصلی کام شروع کیا۔ آدھے جسم میں بے حسی پیدا ہو گئی اور وہ بھی قلب والے آدھے حصے میں۔ اور میں سمجھا کہ اللہ میاں نے اپنے گھر بلا کر ہمیشہ ہی کے لیے مہمان نوازی فرمائی۔ مگر موت نصیب ہو کر جنت المعلیٰ میں سونا میسر نہ ہوا۔ دوسرے ہی دن سے موتمر کے ہر جلسے میں شریک ہوا اور جو کچھ ہو سکا کیا۔ اس کے ختم ہوتے ہی زیارت روضۂ رسولؐ کے لیے چلا تو راستے میں دنبل نکل آیا جس سے خیال ہوا کہ شاید اسی سوراخ سے ملک الموت تشریف لانے والے ہیں اور جنت المعلیٰ کی جگہ جنت البقیع میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مہمان نوازی کا سامان کر دیا جائے گا۔ مگر جو موت مکہ معظمہ میں نصیب نہ ہوئی تھی وہ مدینہ منورہ میں بھی میسر نہ آئی۔ البتہ جب مولوی ثناء اللہ صاحب نے یہ بندھا ہوا ہاتھ مدینہ منورہ سے واپسی پر دیکھ کر پوچھا تو غالب کے غیر مطبوعہ کلام میں سے یہ شعر سنا دیا ؎

موت اُن کی ہے جو ہیں مر کے وہیں دفن ہوئے
زندگی اُن کی جو اس کوچے سے کھسک آئے

نہ معلوم ہمارے قبلہ و قبر شکن بھائی اس موت کے قائل ہیں یا نہیں، جو صرف انھیں کا حصہ ہے (جو بس مر کے وہیں دفن ہوتے) لیکن میں تو اس قبلہ و قبر شکنی پر بھی اس کا قائل ہوں، نیز اس زندگی کا جو ان کے حق میں ہے (جو اس کوچے سے گھائل آئے) یعنی کہ بحمداللہ اس سے گھائل ہو کر آیا ہوں، باوجود روز افزوں علمی و قلبی ذاتی مصائب کے آج ۱۵ ذی الحجہ ۹۵ ۱۳ھ تک اس زندگی کا لطف اٹھا رہا ہوں جو "اس کوچے سے گھائل آنے والوں کو عنایت ہوتی ہے"۔ اور اس "کوچے" کی خاکروبی کی خدمت جہاں تک ہو سکتا ہے اس دورِ افتادگی کی حالت میں بھی کرتا ہی رہتا ہوں۔ چاہے کسی اور بھائی کو جو وہاں سے گھائل ہو کر نہیں آیا ہے پسند آئے یا نہ آئے۔ جس کے طفیل میں یہ زندگی نصیب ہوئی، اُسی کے طفیل اس ذاتِ پاک سے، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، التجا ہے کہ اگر اس کوچے ہی میں ایک مشتِ استخواں کے لیے دو مشت خاکِ پاک نصیب ہو جائے تو ترا کرم ہوگا۔ لیکن اگر اس سعادت سے محروم رہوں، تب بھی یہ تو آج حکم ہو جائے کہ جس بندے کا نام محمدؐ اور علیؓ کے اسمائے گرامی پر آج سے پچاس سال پیشتر ہم نے رکھوایا تھا اس کو اب جتنے دن اور جینا ہے، محمدؐ اور علیؓ ہی کے دین کی خدمت کے لیے چلایا جائے تاکہ ہر روز روزِ عید اور ہر شب شبِ برات ہو کیونکہ

وہی دن ہے ہماری عید کا دن
جو تری یاد میں گزرتا ہے

اور جہاں کہیں بھی موت آئے اسی راستے میں آئے جس میں محمدؐ اور علیؓ کو آئی تھی تاکہ ہمارے اس بندے کے لیے سب شعر صحیح نکلیں:

قضا کس کو نہیں آتی ہے، یوں تو سب ہی مرتے ہیں
پر اس مرحوم کی بوئے کفن کچھ اور کہتی ہے

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے — پر غیب سے سامانِ بقا میرے لیے ہے
پیغام ملا تھا جو حسینؓ ابنِ علیؓ کو — خوش ہوں وہی پیغامِ قضا میرے لیے ہے
کیوں ایسے نبیؐ پر نہ فدا ہوں کہ جو فرمائے — اچھے تو سبھی کے ہیں بُرا میرے لیے ہے

جس کو دُنیا نے نامراد کہا — وہی ناکام کام کرتا ہے
میرے رنگِ کفن کی شوخی دیکھ — یوں ہی عاشق ترا سنورتا ہے

جوہر نہ کیوں یہ رسم کہن زندہ کر چلیں
دار و رسن کے گرچہ نہ ہوں بانیوں میں ہم

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

قارئین سے استدعا ہے کہ میرے لیے دعا فرمائیں کہ جو دن زندگی کے اب بھی باقی ہیں، خدمتِ اسلام میں صرف ہوں اور موت آئے تو اللہ ہی کے راستے میں۔ پچاس برس جہاں ایک اللہ کے حق ادا کرنے میں لاکھوں کوتاہیاں ہوئی ہیں، وہاں اس کی کروڑہا کروڑ مخلوق کا حق ادا کرنے میں کیا کچھ کوتاہیاں نہ ہوئی ہوں گی۔ سب بھائیوں اور بہنوں سے التجا ہے کہ جس کسی کو میرے ہاتھ سے، زبان سے، قلم سے تکلیف پہنچائی ہو یا سوئے ظن ہی کے باعث دل ہی دل میں اس کو رنج ہوا، مجھ کو اس کی حق تلفی کی ہو وہ مجھے للہ معاف کر دے۔ خداوند کریم اس کو اس کا اجر دے گا۔ جس کسی نے مجھے نقصان پہنچایا ہے، اسے میں نے للہ معاف کیا۔ میری بحمداللہ آج کسی سے ذاتی عداوت نہیں۔ لیکن جب تک خلق اللہ کی خدمت کرتا رہوں گا، یہ ممکن نہیں کہ کسی کو برا نہ لگوں۔ لیکن خداوند مجھ پر کرم فرما اور میری دوستی اور دشمنی سب تیرے ہی لیے ہو۔ اور الحب فی اللہ والبغض فی اللہ میرا شعار رہے۔ خداوندا اتنا کرم اور فرما کہ مجھے الکاظمین الغیظ والعافین عن الناس میں شامل فرما۔ اگر یہ دعائیں قبول فرماتا ہے تو ابھی اور زندہ رکھ تاکہ کچھ اور تیری مخلوق کی خدمت اور تیری عبادت کر سکوں، ورنہ میں اب زندگی سے بیزار ہوں آج ہی میرا خاتمہ کر دے اور اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین ثم آمین

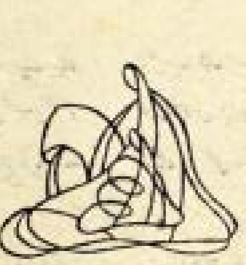

چیخوف

سپرنٹنڈنٹ نے پھر سے کہا "میں نے تمھیں اس لیے رکھ چھوڑا ہے کہ مجھے تمھارے باپ کا لحاظ ہے ورنہ تمھیں کبھی کا اٹھا دیا ہوتا۔"

میں نے جواب دیا "یہ آپ کا حسنِ ظن ہے ورنہ بندہ کہاں اڑ سکتا ہے۔"

اور پھر میں نے اسے کہتے سنا "ارے جاؤ اسے یہ تو میرے سر پر سوار ہو رہا ہے۔"

دو دن کے بعد مجھے نوکری سے جواب مل گیا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی، اس سے پہلے بھی اسی طرح مجھے آٹھ مختلف جگہوں سے جواب مل چکا تھا۔

اس دفعہ جب میں گھر پہنچا تو میرا باپ آنکھیں بند کیے ایک آرام کرسی پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کا سوکھا ہوا بے گوشت چہرہ تسلیم و رضا کا عنوان تھا۔ آنکھیں کھولے یا سلام کا جواب دیے بغیر اس نے کہا "اگر آج تمھاری ماں زندہ ہوتی تو تم اس کی جان کا روگ بنے ہوتے۔ اس کی بے وقت موت میں بھی خدا کی کتنی حکمت نظر آ رہی ہے۔" اور پھر اس نے آنکھیں کھول کر کہا "بدنصیب لڑکے، بتا اب میں کیا کروں؟"

جب میں چھوٹا تھا تو میرے رشتہ دار اور دوست کوئی نہ کوئی راہ دکھایا کرتے تھے۔ بعض فوج میں بھرتی ہو جانے کی صلاح دیا کرتے، بعض کسی دوا خانہ میں ملازمت کر لینے کا مشورہ دیتے اور بعض تار کے محکمہ میں نوکری کی نصیحت کیا کرتے اور اب جب میں ۲۵ سال کا ہو گیا ہوں، کنپٹیوں کے بال سفید ہونا شروع ہو گئے ہیں اور فوج، دوا خانہ اور تار وغیرہ سب محکموں میں کام کر چکا ہوں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دنیا کی تمام ممکن چیزیں ختم ہو گئی ہیں۔ لوگوں نے اب نصیحت کرنا اور مشورہ دینا بند کر دیا ہے۔ اب وہ محض آہ بھرتے ہیں اور خاموشی سے سر ہلا دیتے ہیں۔

"تم نے کبھی اپنے متعلق بھی سوچا ہے" میرے باپ نے بات کو جاری رکھا۔ "تمھاری عمر کے لوگ سماج میں ایک باعزت حیثیت کے مالک ہوتے ہیں۔ لیکن تم کیا ہو؟ ایک ٹٹ پونجی، ایک فقیر، اپنے باپ پر بوجھ۔" اور پھر وہ حسبِ معمول کہتا چلا گیا "آج کل کے نوجوان اپنی بے دینی، مادہ پرستی اور نخوت کی وجہ سے سیدھے جہنم کی راہ پر جا رہے ہیں۔ دیکھو کل میں تمھارے ساتھ چلوں گا۔ تم سپرنٹنڈنٹ سے معافی مانگو اور دل لگا کر کام کرنے کا وعدہ کرو۔" اس نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا "تمھیں ایک دن بھی سماج کے اندر ایک مستقل حیثیت کے بغیر نہیں رہنا چاہیے۔"

"آپ میری بات تو سنیں" میں نے آزردگی سے کہا۔ "آپ جس چیز کو سماج میں ایک حیثیت سمجھتے ہیں، وہ تو محض علم اور پیسے کی رعایت ہے۔ وہ جن کے پاس نہ علم ہے نہ پیسہ وہ تو ہاتھ سے ہی کام کر کے روٹی کماتے ہیں اور میں سمجھ نہیں سکتا کہ میں اس اصول سے کس طرح مستثنیٰ ہو سکتا ہوں۔"

"جب تم محنت مزدوری کی بات کرتے ہو تو کتنے احمق معلوم ہوتے ہو۔" میرے باپ نے جھنجھلا کر کہا۔ "گھوڑ مغز! اچھی طرح سمجھ لو کہ اس کثیف جسمانی کس بل کے علاوہ تمہارے اندر ایک آسمانی قوت ایک مقدس آگ کا شعلہ بھی ہے۔ جو تمہیں گدھے اور کیڑے مکوڑے سے نمایاں طور پر ممتاز کرتا ہے اور خدا کے زیادہ قریب لاتا ہے۔ یہ آگ ہزارہا سال کی بہترین کوششوں کا پھل ہے۔ تمہارا پردادا پازنیف بوروڈنو کے مقام پر جرنیل کی حیثیت سے لڑا۔ تمہارا دادا ایک شاعر، ایک خطیب اور امیرالامرا تھا۔ تمہارا چچا ایک سکول ماسٹر تھا اور پھر مجھے دیکھو میں میر عمارت ہوں۔ کیا پازنیف کے خاندان نے اس مقدس آگ کی اسی لیے حفاظت کی تھی کہ تم اسے بجھا دو؟"

ایک بند کمرے میں بیٹھ کر میں نے کہنا شروع کیا: "نقل کرتے رہنا اور ٹائپ پر انگلیاں چلاتے رہنا میری عمر کے آدمی کے لیے صرف شرمناک ہی نہیں بلکہ سخت ذلت ہے۔ مقدس آگ کا اس سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"لیکن یہ پھر بھی ایک ذہنی کام ہے۔" میرے باپ نے کہا۔ "فضولیات کو مختصر کرو۔ میں تم سے طے کیے دیتا ہوں کہ اگر تم واپس اپنے کام پر نہ گئے اور انھیں بے ہودہ خیالات کے پیچھے پڑے رہے تو یاد رکھو میں اور میری بیٹی تمہیں اپنے دل سے نکال دیں گے۔ قسم ہے اس خدائے زندہ کی میں تمہیں اپنی جائداد سے محروم کر دوں گا۔"

میں نے کہا: "جائداد کا سوال میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ میں اسے آپ کے کہے بغیر بھی چھوڑ سکتا ہوں۔"

"ہاں! اب تمہیں یہ بھی جرأت ہو گئی ہے۔" میں نے ایک تیز اور ایک آواز کو گرجتے سنا۔ "احمق کہیں کا۔"

اور تیزی و چستی سے جو اس کی عادت میں داخل ہو چکی تھی۔ اس نے زناٹے سے مجھے دو تھپڑ رسید کیے۔ "تم بھول رہے ہو کہ تم کون ہو؟"

لیکن میرا ارادہ ٹل نہیں سکتا تھا۔ میں اب دوبارہ اس نوکری پر جانا نہیں چاہتا تھا بلکہ مشقت کی زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ سوچتا صرف یہ تھا کہ کونسا کام کروں۔ ذہنی لذتوں مثلاً ناٹک دیکھنے یا مطالعہ کرنے کا تو مجھے بے حد شوق تھا لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ میں کوئی ذہنی تخلیق بھی کر سکتا تھا یا نہیں۔ سکول میں مجھے یونانی زبان سے انتہا درجے کی نفرت تھی اور ابھی میں چوتھی جماعت ہی میں تھا کہ مجھے اسکول سے اٹھا لیا گیا۔ مدت تک استادوں کی مدد سے پانچویں جماعت کی تیاری کرتا رہا۔ لیکن بے سود۔ پھر میں نے کئی مختلف سرکاری دفتروں میں کام کیا۔ جہاں دن کا بیشتر حصہ یونہی گزر جاتا تھا۔ لوگوں کی نظروں میں یہ ذہنی کام تھا۔

رات ہو گئی۔ ہم دورانسکی بازار میں رہتے تھے۔ شہر کا یہ صدر بازار تھا۔ نفیس مزاج لوگ اپنی شامیں یہیں گزارتے تھے۔ میں باغ کے دروازے پر کھڑا آنے جانے والوں کو دیکھتا رہا۔ ان میں سے اکثر میرے ہمجولی تھے جن کے ساتھ میں کبھی برابر سے کھیلا کرتا تھا۔ اور شاید اب انھیں یہ خیال بھی نہ تھا کہ میں بھی پاس ہی کھڑا ہوں۔ کیونکہ میرا لباس غریبانہ اور پرانی وضع کا تھا۔ اس کے علاوہ شہر میں میری ہوا بھی کوئی اچھی نہ تھی کیونکہ میں سماج میں کسی عمدہ حیثیت کا مالک نہ تھا۔ اکثر عامیانہ ہوٹلوں میں بلیرڈ کھیلا کرتا تھا اور پھر شاید اس لیے بھی کہ مجھے دو دفعہ پولیس کے سامنے مشتبہ حیثیت میں پیش ہونا پڑا تھا۔ اگرچہ میں بالکل بے قصور تھا۔

سامنے کی شاندار عمارت میں دولژیکوف کے یہاں کوئی پیانو بجا رہا تھا۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔ ستارے جھلملانے لگے تھے۔ اتنے میں میرا باپ ایک پرانی بلند مڑے ہوئے کناروں والی ہیٹ پہنے میری بہن کے ہاتھ میں ہاتھ دیے لوگوں کے سلام کا جواب دیتا ہوا آہستہ آہستہ

پاس سے گزرا۔

اس کا ذہن یقینی طور پر کُند تھا۔ جس میں کوئی وسعت اور صفائی نہ تھی۔ میرے باپ نے میری بہن کی زندگی بھی کچھ اسی رنگ میں رنگ دی تھی۔ اوّل تو اس کا نام ہی قلوپطرہ رکھا تھا۔ جس طرح میرا نام مسائیل۔ ابھی وہ بچی ہی تھی کہ وہ اسے ستاروں، پرانے زمانے کے رشیوں اور باپ دادا کی باتیں سُنا سُنا کر پریشان کر دیتا۔ پھر زندگی اور اس کے فرائض پر لمبی چوڑی بحث کیا کرتا۔ اب وہ چھبیس سال کی تھی لیکن ابھی تک اس کی عادتیں نہیں بدلی تھیں۔

مکان میں میرا کمرہ الگ تھا۔ لیکن میں ایک اور ہی کوٹھڑی میں رہا کرتا تھا جو کسی وقت غالباً گھوڑوں کا ساز و سامان رکھنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ یہاں رہنے سے میں اپنے باپ اور اس کے ملاقاتیوں کی نظروں میں آنے سے بچا رہتا۔

میری بہن میرا انتظار کر رہی تھی۔ باپ کی نظر بچا کر وہ میرے لیے کچھ کھانے کو لے آئی۔ روٹی کا ایک ٹکڑا اور ٹھنڈے گوشت کا ایک قتلہ۔ ہمارے گھر میں زیادہ تر کچھ اس قسم کے مقولے رائج تھے "جو بچ گیا سو نفع"۔ "تم پیسوں کا خیال رکھو روپے خود بخود ہو جائیں گے۔" میری بہن ان مقولوں کو بہت مانتی تھی۔ وہ ہمیشہ خرچ گھٹانے کی فکر میں لگی رہتی۔ پلیٹ کو میز پر رکھ کر وہ میرے بستر پر بیٹھ گئی اور رونے لگی۔ "تم نے پھر نوکری چھوڑ دی ہے۔" اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ "آہ کتنی بُری بات ہے۔"

"لیکن بہن تم بات سمجھو تو" میں نے کہا اور مجھ پر مایوسی کا عالم چھا گیا۔ وہ زار زار رو رہی تھی۔

سوئے اتفاق سے میرے چھوٹے لیمپ کا تیل ختم ہو گیا۔ بتی سے دھواں اُٹھنے لگا اور لیمپ بجھ جانے لگا۔ دیواروں کے پرانے اِک آزردگی سے دیکھنے لگے۔

میری بہن کہتی گئی۔ "اچھا اگر تم اس افسر کے ماتحت نہیں رہ سکتے تو نہ سہی۔ کسی اور جگہ کے لیے کوشش کرو۔ مثلاً تم ریلوے میں کیوں نوکر نہیں ہو جاتے۔ میں نے ابھی ابھی انیوتا بلاگووو سے بات کی تھی، اسے یقین ہے کہ تم ضرور لے لیے جاؤ گے۔ اس نے تو تمھارے لیے کوشش کرنے کا وعدہ بھی کر لیا ہے۔ خدا کے لیے مسائیل ذرا سوچو تو۔ ذرا سوچو تو۔ میں تم سے التجا کرتی ہوں۔"

ہم نے تھوڑی دیر تک اور باتیں کیں اور آخرکار میں مان گیا۔ میں نے کہا۔ "اگر تم چاہتی ہو تو میں قسمت آزمانے کے لیے تیار ہوں۔" ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے وہ خوشی سے مسکرائی اور اس نے میرے ہاتھ کو زور سے مروڑا۔ لیکن جب میں باورچی خانے میں تھوڑا سا تیل لینے کے لیے گیا تو وہ پھر رونے لگی۔ یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔

خیراتی کاموں کے لیے چندہ اکٹھا کرنے میں ازہوگن خاندان ہمیشہ پیش پیش رہتا تھا۔ یہ لوگ ناٹک اور ناچ گانے کی محفلیں قائم کرنے میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ مجھے ان ناٹکوں سے بہت دلچسپی تھی۔ ڈراموں کے انتخاب یا پارٹ کی تقسیم میں میرا کوئی حصہ نہ تھا۔ میرا کام صرف پس پردہ ہوتا تھا۔ مثلاً سینریاں بنانا۔ ایکٹروں کے پارٹ نقل کرنا، انھیں لقمہ دینا یا روپ دھارنے میں ان کی مدد کرنا یا بعض اوقات مختلف تاثرات پیدا کرنا۔ مثلاً بادل کی گرج۔ بلبلوں کا گانا وغیرہ میرے سپرد تھا۔

اپنی بہن سے بات چیت کرنے کے ایک دن بعد میں ازہوگن کے یہاں صبح سے شام تک سینریاں بناتا رہا۔ شام سات بجے ریہرسل تھی۔ ریہرسل کے شروع ہونے سے ایک گھنٹہ قبل سب اداکار بڑے کمرے میں جمع ہو گئے۔

میں نے شکر دینے کے لیے ٹوپی ابھی اٹھائی ہی تھی کہ میری بہن آگئی۔ وہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی۔ ذرا میرے ساتھ آؤ۔ میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ ایڈنا بے کا کو ہیٹ اور سیاہ نقاب پہنے دروازہ پر پردوں کے پیچھے کھڑی تھی۔ وہ کورٹ کے معاون صدر کی بیٹی تھی۔ وہ دوسرے ملنے کے موقعوں پر بھی صرف کسی ضروری کام کے لیے ہی آتی تھی۔ ظاہر ہے اب بھی وہ یونہی ایک لمحے کے لیے ہی آئی تھی۔

"میرے باپ نے تمہارے متعلق کہا تھا۔" اس نے رکھائی سے میری طرف دیکھے بغیر شرماتے ہوئے کہا۔ "دل زری کوت نے تمہارے لیے ریلوے لائن پر نوکری کا وعدہ کر لیا ہے۔ کل اس سے ملو۔ وہ گھر پر ہی ہوگا۔"

دوسرے دن بارہ بجے اور ایک بجے کے درمیان میں دل زری کوت کے یہاں گیا۔ نوکر مجھے ایک خوبصورت کمرے میں لے گیا۔ انجینئر کی بیٹی لکھنے کی میز پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ "آپ ابا جان سے ملنے کو آئے ہیں؟" اس نے پوچھا۔ "وہ ذرا نہا رہے ہیں۔ آپ تشریف رکھیں، وہ سیدھے یہیں آئیں گے۔"

میں بیٹھ گیا۔

"آپ اس سامنے والے مکان میں رہتے ہیں نا؟" اس نے تھوڑی سی خاموشی کے بعد پوچھا۔

"جی ہاں"

اتنے میں دل زری کوت آگیا۔ وہ ایک تولیے سے اپنی گردن مل رہا تھا۔

"پاپا یہ ہیں موسیو پلازنیف"

"ہاں ہاں بے کا کو نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔" وہ تیزی سے بغیر ہاتھ بڑھائے میری طرف مڑا۔ "لیکن میں تمہیں کس قسم کا کام دے سکتا ہوں۔ میرے پاس کون سی آسامیاں خالی ہیں۔ تم لوگ بھی عجیب ہو۔ ہر روز تمہارے جیسے بیسیوں میرے پاس آتے ہیں۔ دوست میں ریل کی پٹڑی بنا رہا ہوں۔ میرے پاس تو سخت محنت کا کام ہے۔ تم سب کلرک ہو۔"

"تم کیا کر سکتے ہو؟" وہ بولتا چلا گیا۔ "تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ مجھے دیکھو میں ایک انجینئر ہوں۔ ایک معزز اور بلند رتبہ کا آدمی۔ لیکن ریل کی پٹڑیاں بنوانے سے پہلے میں برسوں ادنیٰ کام کرتا رہا ہوں۔ میرے عزیز تم خود ہی بتاؤ، میں تمہیں کس قسم کا کام دے سکتا ہوں؟ کیا تم کسی طرح تار کا کام کر سکتے ہو؟" اس نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"ہاں میں تار کلرک رہ چکا ہوں"

"ہوں……اچھا……دیکھیں گے……فی الحال تم ڈوبریکانیا چلے جاؤ۔ وہاں ایک آدمی تو ہے لیکن سخت نکما۔"

"وہاں مجھے کیا کچھ کرنا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"دیکھا جائے گا۔ تم وہاں چلے جاؤ۔ میں کوئی نہ کوئی انتظام کروں گا۔"

بغیر سر ہلائے اس نے منہ موڑ لیا۔ میں نے جھک کر اسے اور اس کی بیٹی کو سلام کیا اور چلا آیا۔

دوسری صبح سورج چڑھتے ہی میں ڈوبریکانیا چل دیا۔ ڈوبریکانیا جو پہلا اسٹیشن تھا، شہر سے کوئی بارہ میل دُور تھا۔ میں چلا گیا۔

اناج کے کھیت صبح کی سنہری کرنوں میں نہا کر مسحور ہو رہے تھے۔ میدان ہموار اور ہرا بھرا تھا۔ کھلی فضا کتنی بھلی لگتی تھی اور پھر مجھے آزادی کے احساس کی کتنی زبردست خواہش تھی۔ کاش اس صبح —— صرف اس صبح —— میں یہ نہ سوچتا کہ شہر میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ مجھے کس کس چیز کی ضرورت ہے اور کاش مجھے بھوک نہ لگتی۔

ڈوبچنیا میں اسٹیشن کا اندرونی حصہ پلستر کیا جا رہا تھا۔ ملبے کے ڈھیروں میں میں یونہی بغیر کچھ جانے بوجھے پھرنے لگا۔ جب میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ ٹیلی گراف کی تاریں تو اسٹیشن سے دائیں ہاتھ مڑ کر کوئی میل ڈیڑھ میل دور ایک سفید دیوار کے پاس جا کر ختم ہوتی ہیں۔ اب میں سمجھا کہ مجھے تو وہاں جانا تھا۔

یہ ایک پرانا غیر آباد مکان تھا۔ دروازہ کھلا پڑا تھا، میں اندر چلا گیا۔ میز پر ایک آدمی ٹیلیگراف کی مشین کے سامنے بیٹھا تھا۔ سر سیاہ تھا اور وہ بادبان کے کپڑے کا بنا ہوا کوٹ پہنے تھا۔ اس نے نیچی نظروں سے مجھے جھانک کر دیکھا اور پھر وہ فوراً مسکرا اٹھا اور بولا "اخاہ میاں نکمے، ارے تم کہاں؟"

یہ آدمی چیپراکوف میرا پرانا ہم جماعت تھا۔ ہم باتوں میں مشغول ہو گئے۔ مجھے پتہ چلا کہ وہ زمین جہاں ہم کھڑے تھے کچھ عرصہ پہلے چیپراکوف کی ہی تھی اور صرف پچھلی خزاں میں ڈول ژی کوف کے قبضے میں آئی تھی۔ پھر وہ مجھے کھانے پر لے گیا اور زور دے کر فیصلہ کر دیا کہ میں اس کے ساتھ ہی رہوں اور انھیں کے ہاں کھانا کھایا کروں۔

میرا نیا کام شروع ہو گیا۔ میں تاریں وصول کرتا اور آگے بھیج دیتا۔ دن کا زیادہ حصہ کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے اور تاروں کا انتظار کرنے میں گزار دیتا یا کبھی باہر باغ کی سیر کو نکل جاتا۔ کھانا مادام چیپراکوف کے ہاں کھایا کرتا تھا۔

چونکہ گھر پر کام زیادہ نہیں ہوتا تھا، چیپراکوف کچھ بھی نہ کرتا۔ بس سویا رہتا یا بندوق لے کر تالاب میں بطوں کا شکار کرنے چلا جاتا۔

ایک دن کھانا کھانے کے بعد وہ ہانپتا ہوا اندر آیا اور بولا "چلو تمھاری بہن تم سے ملنے آئی ہے۔"

میری بہن اینوتا بلے گاو اور ایک فوجی جوان کے ساتھ آئی تھی۔ نزدیک جا کر میں نے پہچان لیا۔ یہ اینوتا بلے گاو کا بھائی تھا، جو فوج میں ڈاکٹر تھا۔ ہم باغ میں چلے گئے۔ ڈاکٹر آگے آگے جا رہا تھا اور بڑے جوش سے کہہ رہا تھا "کیا کھلی ہوا ہے۔ مقدس ماں کیا کھلی ہوا ہے۔" وہ کہیں فوج میں نوکر تھا اور چھٹی منانے کے لیے گھر آیا تھا اور کہہ رہا تھا کہ خزاں کے موسم میں ایم۔ ڈی کا امتحان دینے اسے پیٹرس برگ جانا ہے۔ اس کی شادی ہو چکی تھی اور تین بچے بھی تھے۔

جب وہ تمام جا چکے اور تمام آوازیں گم ہو گئیں، مجھے یاد آیا کہ اینوتا بلے گاو نے سارا دن ایک لفظ تک نہیں کہا تھا۔ وہ حیرت انگیز لڑکی ہے، میں نے سوچا، حیرت انگیز۔

ایک دن شام کے وقت جب رادش بھی کمرے میں بیٹھا ہوا تھا، اچانک ڈول ژی کوف کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اسٹیشن سے اتر کر سیدھا ہمارے پاس ہی آ گیا تھا۔ "یہ کیا اوٹ پٹانگ ہے؟" اس نے یادداشت کی کتاب پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ "میں پندرہ دن کے اندر اندر دفتر کو اسٹیشن پر لے جا رہا ہوں اور میرے دوست مجھے پتہ نہیں چلتا کہ میں تمھارا کیا کروں۔"

آخر کار گھوڑے آ گئے اور جب اس نے خدا حافظ کہا تو ہمیں یہ خوشخبری سنا دی کہ وہ ہم دونوں کو پندرہ دن کے اندر اندر

نکال دے گا۔

"وینڈری کی آنی وانچ" میں نے راوش سے کہا۔ "تم مجھے اپنے ساتھ کام میں شریک کر لو۔"

"بہت اچھا۔" اور ہم دونوں شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔

راوش کوئی عام آدمی نہ تھا۔ وہ مختلف کام کرنے کا ٹھیکہ لیا کرتا تھا۔ مثلاً دیواروں کو رنگنے چمکانے، ان پر کاغذ لگانے حتیٰ کہ چھت کے اوپر سلیں لگانے کا۔ اگر اس کے دل میں ہر قیمت مالک یا ٹھیکہ دار کہلوانے کی خواہش نہ ہوتی تو وہ یقیناً بہت مالدار ہوتا۔ وہ اعلیٰ درجہ کا کاریگر تھا اور ایک ایک دن میں دس دس روبل بھی کما لیتا تھا۔ اب میں ان لوگوں میں رہتا تھا جو محنت کرنے پر مجبور رہتے اور جنھیں بگھی کے گھوڑوں کی طرح کام کرنا پڑتا تھا۔ آہستہ آہستہ مجھ میں بھی اس مجبور محنت کا احساس رچتا گیا۔ اس کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا اس لیے میری زندگی کو آسان بنا دیا اور میں رفتہ رفتہ ہر قسم کے شک و شبہ سے آزاد ہو گیا۔

جب میں کام سے فارغ ہو کر گھر جاتا تو دروازوں کے پاس بنچوں پر بیٹھے ہوئے تمام لوگ، تمام دوکاندار، نوکر اور ان کے مالک مجھ پر فقرے کستے اور پھبتیاں اڑاتے۔ پہلے پہل تو میں بہت پریشان ہوتا اور مجھے حد درجہ تکلیف ہوتی تھی۔

"نکما نکما مکان رنگنے والا۔" مجھے ہر طرف سے یہی آوازیں سنائی دیتیں۔ ایک دفعہ بھرے بازار میں جب میں ایک لوہار کی دوکان کے پاس سے گزر رہا تھا تو مجھ پر گندہ پانی پھینکا گیا، جیسے اتفاق سے گر گیا ہو اور پھر ایک دفعہ ایک اور آدمی نے مجھے چھڑی سے مارنے کی کوشش کی تھی۔ ایک بوڑھے مچھلی والے نے ایک دفعہ میرا راستہ روک لیا اور غصے سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "احمق! مجھے تمھارا افسوس نہیں۔ مجھے تو تمھارے باپ کی حالت پر رحم آتا ہے۔"

ایک دن میں وفرانسکی بازار کی ایک گلی میں اینوتا بیٹے کافو سے ملا۔ میں کام پر جا رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں دو لمبے لمبے برش اور رنگ کا ٹین تھا۔ مجھے پہچان کر اینوتا بیٹے کافو کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔

"مہربانی کر کے مجھے بر بازار سلام نہ کیجیے۔" اس نے گھبرا کر کانپتی ہوئی رُوکھی آواز میں کہا اور مصافحے کے لیے ہاتھ تک نہ بڑھایا۔ یک لخت اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ "اگر تمھارے خیال میں یہ واقعی ضروری ہے تو خیر...... یونہی سہی لیکن میری درخواست ہے کہ مجھے نہ ملا کیجیے۔"

"اب میں وفرانسکی بازار میں نہیں رہتا تھا۔ بلکہ شہر کے پاس ہی ایک بستی میں اپنی بوڑھی دایہ کلا پوتا کے ہاں رہتا تھا۔ بیچاری بڑے اچھے مزاج کی لیکن غمزدہ بوڑھی عورت تھی۔ اس کا ایک لے پالک تھا پروکوفی ایک بے تربیت، لانبا، سرخ سر اور داڑھی منڈی ہوئی مونچھیں۔ یہی کوئی تیس کے قریب وہ قصائیوں کا کام کرتا تھا اور اس کے ساتھ ہی رہا کرتا تھا۔

میں اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے گھر کبھی نہیں جاتا تھا۔ جب میں کام سے واپس آتا تو اکثر مختصر لیکن اضطراب آمیز رقعے میز پر پڑے پاتا۔ جو باپ کے متعلق میری بہن لکھ کر بھیجتی تھی۔ مثلاً آج وہ کھانے کے وقت خاص طور پر کھویا کھویا تھا۔ آج اس نے کچھ نہیں کھایا۔ آج سارا دن اس کا سر چکراتا رہا۔ آج اس نے کمرے کو اندر سے تالا لگا لیا اور دیر تک باہر نہ آیا۔ وغیرہ وغیرہ اس قسم کی خبریں مجھے تکلیف دیتیں۔ میں سو نہیں سکتا تھا اور کبھی کبھی رات کے وقت چپکے چپکے پھرتے وفرانسکی بازار میں اپنے مکان تک

پہنچ جاتا۔ تاریک کھڑکیوں کو دیکھتا اور گھر والوں کی خیریت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا۔ اتوار کو میری بہن مجھے ملنے آتی۔ لیکن چپ چپ۔ گویا مجھے نہیں بلکہ بوڑھی دایا کو ملنے آتی ہے۔

ایک دن اچانک ڈاکٹر بلاگوو آ گیا۔ "میں تمہیں ملنے کے لیے آیا ہوں۔" اس نے میرے ہاتھ کو ایک طالب علم کی طرح جھٹکتے ہوئے کہا۔ میں بھی کچھ اداس تھا اور بڑی دیر سے چاہتا تھا کہ کسی سے باتیں کروں۔ لیکن رنگ ساز سے نہیں۔ بلاگوو بڑی سرگرمی سے میرے ساتھ بحث کرتا رہا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ کوئی غیر متعلق سوال اسے ستا رہا تھا۔ "میرا خیال ہے کہ تمہاری بہن اب نہیں آئے گی۔"

میری بہن آ پہنچی۔ وہ ڈاکٹر کو دیکھ کر پریشان سی ہو گئی اور تھوڑی دیر کے بعد ہی کہنے لگی "اب گھر جانے کا وقت ہو گیا ہے۔"

"ٹھہرو ٹھہرو الیکسی نا" بلاگوو نے دونوں ہاتھوں سے دل کو دباتے ہوئے گرمجوشی سے کہا۔ "اگر تم گھڑی دو گھڑی ہمارے پاس بیٹھ جاؤ تو خدا نہ کرے تمہارے باپ کو کچھ ہو تو نہیں جائے گا۔"

کچھ دیر سوچ میں ڈوب کر میری بہن ہنس پڑی اور پھر یک لخت وہ خوش خوش نظر آنے لگی۔ ہم باہر نکل گئے اور گھاس پر لیٹ کر باتیں کرتے اور شہر کو دیکھتے رہے۔

اس دن کے بعد جس دن میری بہن مجھے ملنے آتی۔ ڈاکٹر بھی آ نکلتا اور وہ دونوں ایک دوسرے سے اس طرح علیک سلیک کرتے گویا میرے کمرے میں ان کی ملاقات اتفاقی تھی۔

اگست میں رادش نے ہمیں ریلوے لائن پر جانے کا حکم دے دیا۔ میں ریلوے لائن پر کام کرتا رہا۔ اگست کا سارا مہینہ بارش ہوتی رہی۔ ہم جو کچھ کرنا چاہتے بارش اس کا ستیاناس کر دیتی۔ ہمیں ریلوے کی عمارتوں میں رہنے یا سونے کی اجازت نہ تھی۔ ہم مٹی کی کچی جھونپڑیوں میں پناہ لینے پر مجبور تھے۔ جو بڑی گندی اور نم دار تھیں۔

خزاں کا موسم آ گیا۔ بارشیں، کیچڑ، اندھیرا ہر چیز امنڈ آئی۔ بیکاری کا زمانہ شروع ہو گیا اور میں اکثر تین تین دن تک گھر میں بیکار بیٹھا رہتا۔ بہت ہوتا تو کوئی چھوٹا موٹا کام کر لیتا۔ رنگنے کا کام نہیں۔ بلکہ ٹوکری وغیرہ اٹھانے کا اور دن بھر میں چار پانچ آنے کما لیتا۔

جن دنوں میں کلب میں دارالمطالعہ کے ساتھ والے کمرے میں کاغذ لگا رہا تھا ایک شام جب میں واپس گھر آنے کی تیاری کر رہا تھا۔ دولزی کوف انجینئر کی بیٹی چند کتابیں بغل میں دبائے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے جھک کر سلام کیا۔

"اخاہ تم ہو۔ کہو مزاج تو اچھے ہیں؟" اس نے فوراً مجھے پہچانتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"

"میرے اس طرح دیکھنے کو معاف کرنا۔" اس نے کہا۔ "میں نے تمہارے متعلق بہت کچھ سنا ہے۔ ڈاکٹر بلاگوو کو تم سے خاص طور پر انس ہے۔ تمہاری بہن بھی اب میری واقف ہے۔ کتنی پیاری لڑکی ہے۔ لیکن میں اسے کبھی منا نہیں سکی کہ تمہارے اس طرح کام کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ بلکہ تم تو شہر بھر میں سب سے زیادہ دلچسپ آدمی بن گئے ہو۔ اگر تم کسی وقت گھر آؤ۔

تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ میرا تم سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مجھے تکلف کی عادت نہیں۔" اس نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ میرے پاس آنے میں تمھیں کوئی جھجک نہیں ہوگی۔ پاپا یہاں نہیں ہیں۔ وہ پیٹرس برگ گئے ہوئے ہیں۔" وہ سایہ کو لہراتی ہوئی دارالمطالعہ میں چلی گئی اور میں گھر چلا آیا۔ رات دیر تک مجھے نیند نہ آئی۔

اُس بے کیف خزاں میں کوئی مہربان روح بظاہر میری زندگی کو بلند کرنے کے لیے آئے دن چائے، لیموں، بسکٹ یا بُھنا ہوا شکار بھیجا کرتی اور کارپونا مجھے بتاتی کہ ایک سپاہی یہ چیزیں لایا کرتا ہے۔ لیکن کہاں سے اس کا کوئی پتہ نہیں۔ سپاہی پوچھا کرتا کہ آیا میں تندرست تو ہوں؟ میرے پاس گرم کپڑے تو ہیں وغیرہ وغیرہ۔ جب جاڑا پڑنے لگا تو اسی طرح سپاہی کے ہاتھ میری غیر حاضری میں مجھے ایک عمدہ نرم اُون کا بُنا ہوا گلوبند بھیجا گیا۔ اس سے ایک دلفریب خوشبو آرہی تھی۔ اور میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ میری نیک پری کون ہے؟ گلوبند سے کنول کے عطر کی خوشبو آرہی تھی۔ یہ اینوتا بلے گافو کا دل پسند عطر تھا۔

بڑے دن سے ایک ہفتہ پہلے ڈاکٹر بلے گافو آپہنچا۔ اور پھر ہم رات کو یا تو بلیرڈ کھیلتے یا بحث تمحیص کرتے۔ میری بہن مجھے ملنے کے لیے پھر آنے لگی اور پھر دونوں ہر بار ایک دوسرے کو اچانک ملنے پر حیرت کا اظہار کیا کرتے۔ لیکن اب ان کے مسرور لیکن مجرم چہرے سے صاف ظاہر ہو جاتا کہ یہ ملاقاتیں محض اتفاقی نہ تھیں۔ ایک شام جب ہم بلیرڈ کھیل رہے تھے تو ڈاکٹر نے مجھ سے کہا: "میں نے کہا، ایک تم مس ڈول زی کوف سے ملنے نہیں جاؤ گے؟" میں نے اسے بتایا کہ کس طرح بہار کے موسم میں اس کا باپ مجھ کو ملا تھا۔

"بیوقوف مت بنو" ڈاکٹر ہنس پڑا، "انجنیئر اور ہے۔ اس کی بیٹی اور ہے۔ میرے بھائی بدمزگی پیدا نہ کرو۔ کبھی کبھی اس سے ملنے جایا کرو۔ پھر کل شام چلیں۔ کیا خیال ہے؟"

اس نے مجھے منا لیا۔ دوسرے دن شام کو میں نے سرج کی پتلون پہنی اور کچھ مضطرب سا ہو کر مس ڈول زی کوف کے ہاں چل دیا۔ ماریا وکٹرافنا میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ مجھ سے اس طرح ملی جیسے برسوں سے جان پہچان تھی۔ اس نے ایک خوبصورت درازوں والی میز کھولی اور کہا۔ "یہ میری کھیتی باڑی کی لائبریری ہے۔ یہ میری خواہش ہے کہ جونہی مارچ شروع ہو ڈوبچ نیا جاؤں۔ وہاں کی دنیا نہایت دلفریب ہے نا؟ پہلے سال تو ادھر اُدھر پھر کر چیزوں کو سمجھوں اور اگلے سال خود کام شروع کر دوں۔ پاپا نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ڈوبچ نیا کی جاگیر مجھے دے دیں گے اور میں جو چاہوں گی کروں گی۔" کرسمس کے دن ہم نے ماریا وکٹرافنا کے یہاں کھانا کھایا اور تمام چھٹیاں تقریباً ہر روز اس کے یہاں جایا کرتے۔

اب ہم اکثر ملا کرتے۔ بعض دفعہ دن میں دو دو بار بھی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ ہر روز بلاناغہ قبرستان آجایا کرتی اور میرے انتظار میں صلیبوں کے کتبے پڑھا کرتی۔ بعض دفعہ وہ گرجا کے اندر آجاتی اور میرے پاس کھڑی ہو کر مجھے کام کرتے ہوئے دیکھا کرتی۔ جب میں اس سے ملنے جاتا تو میرے کپڑوں سے رنگوں اور تارپین کے تیل کی بُو آتی۔ میرے ہاتھوں پر دھبے پڑے ہوتے اور وہ انھیں پسند کرتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اسی لباس میں اس کے پاس آؤں لیکن اس کے ڈرائنگ روم میں مجھے اپنے اس قسم کے لباس سے گھن آتی۔ میں پریشان ہو جاتا۔ اس لیے میں ہمیشہ اس کے یہاں جاتے ہوئے سرج کی نئی پتلون پہن لیتا۔ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتی تھی۔

روزے آگئے۔ ڈول زی کوف جسے میں قریب قریب بھول چلا تھا، پیٹرس برگ سے واپس آگیا۔ شام کو حسب معمول جب میں یہاں

گیا تو وہ ڈرائنگ روم میں ٹہلتے ہوئے کوئی دلچسپ واقعہ سنا رہا تھا جب میں نے انجینئر کو دیکھا تو میرے پاؤں خود بخود رُک گئے۔ لیکن اس نے دونوں ہاتھ میری طرف پھیلا دیے اور مسکرا کر کہا: "تو وہ آگیا، تو وہ آگیا۔ میاں رنگساز تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ ماشا نے تمھارے متعلق مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ یہ تو تمھارے گُن گا رہی ہے۔ میں بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں اور پسند کرتا ہوں۔" وہ میرا بازو پکڑ کر کہتا چلا گیا: "ایک اچھا مزدور بننا اس بات سے کئی درجہ بہتر ہے کہ آدمی سرکاری کاغذ زرد کرے اور سر پر پھُندنے دار ٹوپی پہنے۔ میں خود انھیں ہاتھوں سے بیلجیم میں کام کیا کرتا تھا۔"

ایک شام انجینئر کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے ہم جھینگا مچھلی کی ایک سالم ٹوکری کھا گئے۔ گھر واپس آتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ انجینئر نے آج مجھے دو دفعہ "میرے عزیز" کہہ کر پکارا تھا۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی یہ شفقت ایسی ہے جیسے وہ کسی ایسے کتے کی پیٹھ تھپتھپا رہے ہوں جسے مالک نے مار مار کر گھر سے نکال دیا ہو۔ میں سمجھنے لگا کہ وہ مجھ سے کھیل رہے ہیں۔ اور جب ان کا جی بھر جائے گا تو یہ بھی مجھے باہر نکال دیں گے۔ اس خیال سے مجھے بہت شرم آئی اور اتنا دکھ ہوا کہ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ جیسے میری توہین کی گئی ہو۔ میں نے آسمان کی طرف نظریں اُٹھائیں اور عہد کر لیا کہ اس تمام کھیل کا خاتمہ کر دوں گا۔

دوسرے دن میں دل زی کوف کے ہاں نہ گیا۔

(ایک ہفتہ بعد) ایک شام بُری طرح برف پڑنے لگی اور شمال سے سرد ہوا چلنے لگی گویا سردی پھر پلٹ آئی ہے جب میں کام سے فارغ ہو کر گھر لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ماریا وکٹرا فنا میرے کمرے میں بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ فرکوٹ پہنے تھی اور اس کے دونوں ہاتھ اُونی دستانوں میں تھے۔

"تم مجھے ملنے کیوں نہیں آتے؟" اس نے اپنی شوخ اور چمکدار آنکھیں اُٹھا کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ میں خوشی کے مارے بیخود ہو گیا۔

"تم مجھے ملنے کیوں نہیں آتے؟" اس نے اپنا سوال دُہرایا۔ "اگر تم مجھے ملنے نہیں آتے تو نہ سہی۔ دیکھو میں خود تمھیں ملنے آگئی ہوں۔" وہ کھڑی ہو گئی اور میرے پاس آگئی۔ "مجھ سے دُور نہ رہو۔" وہ رونے لگ پڑی۔ "میں تنہا ہوں۔ میری زندگی سخت عذاب میں ہے۔ سخت عذاب میں! اور ساری دنیا میں تمھارے سوا میرا کوئی نہیں۔ مجھے دغا نہ دو۔" آنسو پونچھنے کے لیے رومال تلاش کرتے ہوئے وہ مسکرا پڑی۔ ہم دونوں تھوڑی دیر تک خاموش کھڑے رہے اور پھر میں نے اپنے بازو اس کی گردن میں حمائل کر دیے۔ اسے چوم لیا اور چومتا رہا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے اس طرح باتیں کرنے لگے گویا مدتوں سے ہم نہایت پیار اور محبت سے رہ رہے تھے۔

دو دن بعد اس نے مجھے ڈوبچ نیا بھیج دیا۔ میں اتنا خوش تھا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ ماشا بگھی میں آیا کرتی۔ آزاد اور بے پروا ہو کر یا شام کے غروب ہونے تک ماشا کا انتظار کرنے کے بعد میں جب بے چین اور اداس ہو کر واپس چلا جاتا اور حیران ہوتا کہ ماشا کیوں نہیں آئی تو دروازے پر باغ میں ایک پیارا غیر متوقع لطیف سایہ نظر آجاتا۔ یہ ماشا ہوتی۔

سینٹ ٹامس کے ہفتہ کے فوراً بعد ہی ڈوبچ نیا سے دو میل پرے کری لوتکا کے گاؤں میں ہماری شادی ہو گئی۔ اب

وہ ہر وقت میرے پاس تھی۔ بڑے مکان کے تینوں کمروں میں ہم دونوں اکٹھے رہتے۔ میں پو پھٹتے ہی اٹھ کھڑا ہوتا اور کسی نہ کسی کام میں لگ جاتا۔ مثلاً گاڑیوں کی مرمت کرنے، باغ کی روشیں ٹھیک کرنے، پھولوں کے تختے بنانے، مکان کی چھتوں کو رنگنے وغیرہ وغیرہ میں۔

ڈاکٹر بلاگوو ہمیں ملنے کے لیے سائیکل پر آنے جانے لگا۔ میری بہن نے بھی اکثر آنا شروع کر دیا۔ پھر وہی ہاتھ کی محنت، ترقی اور کسی پُراسرار اچھے زمانے کی باتیں ہونے لگیں۔

ماشا اکثر چکی پر جایا کرتی اور بظاہر سٹیپن (چکی پر کام کرنے والا شخص) کی باتوں میں بڑی دلچسپی لیتی۔ سٹیپن بڑے زور شور سے کسانوں کو گالیاں دیتا اور ماشا اس کی طرف کھنچی جاتی۔

میری بہن بھی دوہری زندگی بسر کر رہی تھی۔ وہ نہایت احتیاط سے ہر چیز مجھ سے چھپا جاتی، اور اکثر ماشا کے ساتھ کھسر پھسر کرتی نظر آتی۔

ایک دن اسکول کی عمارت سے واپس آتے ہوئے میں چُپ چاپ باغ میں سے گزر رہا تھا۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سنے بغیر میری بہن ایک پُرانے پھیلے ہوئے سیب کے درخت کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بالکل چپ چاپ، دم سادھے گویا کوئی بھوت یا سایہ ہو۔ اس کا لباس سیاہ تھا اور وہ زمین پر نظریں گاڑے اسی جگہ آگے پیچھے تیزی سے چل پھر رہی تھی۔ درخت سے ایک سیب گرا۔ وہ چوکنی ہو گئی اور خاموش کھڑی ہو کر ہاتھوں سے کنپٹیوں کو دبانے لگی۔ اسی وقت میں آگے بڑھا۔ یکلخت مجھے اپنی ماں اور اپنا بچپن یاد آ گیا۔ جذبات کا ایک طوفان میرے دل میں اُمنڈ آیا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں نے اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر اسے چوم لیا۔ "کیا بات ہے" میں نے پوچھا۔ "تم خوش نہیں۔ میں بڑی دیر سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے بتاؤ تمھیں کیا تکلیف ہے؟"

"میں بتا دوں گی۔ میں بتا دوں گی۔ میں تمھیں سب کچھ بتا دوں گی۔ تم سے چھپانا سخت مشکل اور تکلیف دہ ہے مسائیل!" وہ دبی دبی بولتی گئی۔ "مجھے اس سے محبت ہے، مجھے اس سے محبت ہے۔ میں خوش ہوں لیکن پتہ نہیں کیوں ڈرتی ہوں۔" قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ درختوں کے سائے میں ڈاکٹر بلاگوو آتا دکھائی دیا۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے سیب کے درخت کے پاس ملنے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ جذبات کی رو میں بہہ گئی اور اس کی طرف دوڑی۔ اس نے ایک دردناک چیخ ماری گویا وہ اس سے چھینا جا رہا ہو۔ ڈاکٹر پریشان ہو گیا۔ لیکن جلدی ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اور پھر اس کے بالوں کو تھپتھپاتے ہوئے وہ کہنے لگا۔ "دیکھو دیکھو اتنی پریشان کیوں ہو؟ دیکھو تو میں آ گیا ہوں۔"

پہلے تو ہم خاموش کھڑے پریشانی میں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر تینوں چل پڑے۔ معلوم نہیں کیوں مجھے اس بات کا یقین نہ آتا تھا کہ میری بہن کو محبت ہو گئی ہے۔ اور وہ ایک اجنبی کے بازوؤں میں بازو ڈالے میرے ساتھ چل رہی ہے۔ میری بہن —— یہ پریشان، خوف زدہ پگلی اور جکڑی ہوئی مخلوق ایک ایسے آدمی سے محبت کر رہی ہے۔ جس کی شادی ہو چکی ہے۔ جس کے بیوی بچے ہیں۔

میں اور ماشا اسکول کھولنے کی رسم ادا کرنے جا رہے تھے۔

"خزاں.... خزاں..... خزاں" ماشا نے دور دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "کوئی پرندہ نہیں۔ کوئی ہری بھری

شے نہیں۔ ہاں بید کے درخت ہیں۔"

"گڑی جا چکی ہے۔" ماشا نے کہا۔ "اب تم اور میں اپنا اپنا جائزہ لے سکتے ہیں۔ ہم نے بہت کام کیا ہے اور بہت سوچا ہے۔ ہم اپنے آپ کو بہتر بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن کیا ہماری کامیابی کا ہمارے ماحول پر کوئی اثر ہوا ہے۔ کیا اس سے کسی کو فائدہ ہوا ہے؟ نہیں۔ جہالت، جسمانی گندگی، شراب نوشی، بچوں کا زیادہ تعداد میں مرنا۔ ہر چیز اسی طرح ہے۔ تمھارے ہل چلانے اور بونے سے اور میرے کتابیں پڑھنے اور روپیہ خرچ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔"

اس کی یہ دلیل بازی مجھے پریشان کر رہی تھی۔ "ہم شروع سے آخر تک مخلص رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور اگر کوئی آدمی مخلص ہے تو وہ سچا ہے۔"

"اس پر کسے اعتراض ہے۔ ہم مخلص تھے۔ لیکن جس چیز میں مخلص تھے۔ ہم اسے ٹھیک ٹھیک حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔"

جب ہم کوری نوفکا پہنچے۔ موسم سہانا اور خوشگوار تھا۔ آس پاس اناج کوٹا جا رہا تھا اور جئی کی پیال کی خوشبو آ رہی تھی۔ ایک کمرے میں عبادت کی رسم ادا ہو رہی تھی۔ عبادت کے بعد کوری نوفکا کے کسان ماشا کے پاس شمع دان لائے اور ڈوبچ نیا کے کسانوں نے اسے ایک بڑا نان اور گلٹ کی ایک تکلانی پیش کی۔ ماشا سسکیاں بھرنے لگی۔

"اگر ہم نے کوئی ایسی بات کہہ ڈالی ہے۔ جو نہیں کہنی چاہیے تھی یا ہم کوئی ایسا کام کر بیٹھے ہیں جو نہیں کرنا چاہیے تھا تو ہمیں معاف کر دو۔"

ایک بوڑھے آدمی نے کہا اور اس نے ہم دونوں کو جھک کر سلام کیا۔

جب ہم واپس لوٹے تو ماشا مڑ مڑ کر اسکول کو دیکھتی رہی۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ماشا کی نظریں اسے ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ رہی ہیں۔

شام کے وقت وہ شہر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ ویسے اس کی عادت ہو گئی تھی کہ وہ اکثر شہر جاتی اور کئی دفعہ رات کو بھی وہیں ٹھہر جاتی۔ دوسرے دن شام کے قریب ماشا شہر سے واپس آ گئی۔ وہ کسی بات سے ناخوش تھی۔ لیکن وہ چھپا گئی اور اس نے صرف اتنا کہا۔ "یہ تمام کھڑکیاں کیوں بند کر دی ہیں؟" میں نے دو کھڑکیاں کھول دیں۔ اگرچہ بھوک نہیں لگی تھی۔ پھر بھی ہم کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ "جاؤ اور ہاتھ دھو کر آؤ۔" میری بیوی نے کہا۔ "ان میں سے پیسے کی بُو آ رہی ہے۔"

وہ بازار سے کچھ نئے مصوّر رسالے خرید لائی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد ہم دیر تک اکٹھے بیٹھے تصویریں دیکھتے رہے۔ اس میں فیشن کے چند نمونے بھی تھے۔ وہ سو گئی اور میں بیٹھا کوئی ایک گھنٹہ تک تصویریں دیکھتا رہا۔

ہمارا ملنا، ہماری شادی' اس عورت کی زندگی جسے قدرت نے بڑی فیاضی سے نوازا تھا ایک حادثہ سے زیادہ نہ تھا۔ دنیا کی ہر بہترین چیز اس کے قدموں میں تھی۔ وقت کی ہر ذہنی تحریک اور ہر نظریہ اس کے لیے تفریح طبع کے سوا اور کچھ نہ تھا اب اسے میری ضرورت نہ تھی۔ اب وہ اُڑ جانے کو تھی اور میں تنہا، بالکل تنہا رہ جانے والا تھا۔

صبح ہوتے ہی وہ چلی گئی۔ میں نے تین دن تک اس کا انتظار کیا اور پھر تمام سامان ایک کمرے میں بند کر کے خود بھی شہر کو چل دیا۔ شام ہو چلی تھی۔ دفراشکی بازار کی شمعیں جل رہی تھیں۔ پاول نے مجھے بتایا کہ گھر پر کوئی بھی نہیں۔ وکٹر آئی ونچ پیٹرس برگ جا چکا ہے اور ماریا وکٹروفنا غالباً ازہوگن کے ہاں ریہرسل پر گئی ہوئی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں کن جذبات کے ساتھ ازہوگن کے ہاں گیا۔

"تم آگئے؟" اس نے اپنا داہنا ہاتھ دیتے ہوئے کہا۔ "بہت اچھا ہوا تم آگئے۔ میں آج رات چند دنوں کے لیے پیٹرس برگ جا رہی ہوں۔ اجازت ہے نا؟"

آدھی رات کے وقت میں اس کے ساتھ اسٹیشن پر گیا۔ وہ مجھے گھٹ گھٹ کر ملی۔ غالباً وہ شکر گزار تھی کہ میں نے غیر ضروری سوالوں سے اسے پریشان نہیں کیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ مجھے خط لکھے گی۔ میں دیر تک اس کا ہاتھ تھامے کھڑا رہا۔ اسے چومتا رہا اور مشکل سے اپنے آنسوؤں کو روک سکا۔ میں نے ایک لفظ تک نہ کہا۔

وہ چلی گئی لیکن میں وہیں کھڑا روشنی کو غائب ہوتے دیکھتا رہا اور تصور ہی میں اسے پیار کرتا رہا۔

میں نے رات کارپوفنا کے ہاں گزاری۔ دوسرے دن میں راوش کے ساتھ مل کر ایک امیر سوداگر کا سامان مرمت کر رہا تھا۔

اتوار کو کھانا کھا چکنے کے بعد میری بہن آئی اس نے میرے ساتھ ہی چائے پی۔

"آج کل میں بہت زیادہ پڑھتی ہوں۔" اس نے مجھے دو کتابیں دکھاتے ہوئے کہا جو آتے ہوئے وہ پبلک لائبریری سے لیتی آئی تھی۔ "تمھاری بیوی اور فلادی میر کا شکریہ۔ انھوں نے مجھے خواب سے جگا دیا ہے۔ مجھے بھی محسوس ہونے لگا ہے کہ میں انسان ہوں۔ پہلے راتوں کو بیٹھی رہتی اور مختلف فکروں میں کھوئی رہتی تھی اور سوچا کرتی تھی کہ اس ہفتے میں کتنی کھانڈ ختم ہوئی ہے۔ یا ڈرتی کہیں کھیرے نمکین نہ ہو جائیں۔ اب میرے فکر مختلف ہیں۔ مجھے اپنے ماضی سے نفرت ہے اور اب تو میں اپنے باپ کو اپنا دشمن سمجھتی ہوں۔"

"یہ تو بہت بری بات ہے کہ تم رات کو سو نہیں سکتیں۔" میں نے کہا۔

"کیا تمھارا خیال ہے میں بیمار ہوں۔۔۔۔۔ بالکل نہیں۔۔۔۔۔ لیکن آخر صحت کوئی اتنی ضروری چیز تو نہیں۔ بتاؤ کیا میں ٹھیک کہہ رہی ہوں؟"

صاف ظاہر ہے اسے اخلاقی امداد کی ضرورت تھی۔ ماشا جا چکی تھی۔ ڈاکٹر بلے گاوو پیٹرس برگ میں تھا اور شہر میں اب میرے سوا کوئی اسے تسلی دینے والا نہ تھا جو کہتا وہ بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے ہر وقت اس کا دھیان رکھنا پڑتا اور وہ جب بھی پوچھتی میں فوراً کہتا۔ "ہاں تم بالکل ٹھیک ہو۔"

"کیا تم جانتے ہو۔ اب کے مجھے ازہوگن کے ہاں ایک پارٹ بھی دیا گیا ہے۔ میں اسے اسٹیج کرنا چاہتی ہوں۔ پارٹ صرف دس سطروں کا ہے لیکن پھر بھی یہ دن میں پانچ مرتبہ چائے بنانے اور یہ دیکھنے سے کہ باورچی زیادہ تو نہیں کھا گئی کئی درجہ اچھا ہے۔"

دو دن کے بعد وہ ازہوگن کے ہاں ریہرسل کے لیے آئی۔ تیسرے ایکٹ تک اس کا کوئی کام نہ تھا۔ آخر کار اس کی باری آگئی

”قلوپطرہ الیکسی نا! اب تمھاری باری ہے۔“ سٹیج منیجر نے کہا۔

وہ سامنے سٹیج پر آگئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ اپنا پارٹ ادا کرنے کے ناقابل تھی۔ میں صاف دیکھ رہا تھا کہ وہ کانپ رہی ہے۔ میں آگے بڑھ کر اس سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ یکلخت دھڑام سے گر پڑی اور زور زور سے سسکیاں بھرنے لگی۔

اتنے میں مادام ازہوگن چھوٹی آستینوں والی صدری پہنے سینے پر سگرٹ کی راکھ بکھیرے، دبلی پتلی جلدی جلدی میرے پاس آگئی۔

”بیٹا! یہ تو غضب ہوگیا۔ تمھاری بہن کی حالت تو بہت خراب ہے ـــ وہ ماں بننے والی ہے ․․․․․ خدا کے لیے اسے جلدی یہاں سے لے جاؤ۔“

تھوڑی دیر کے بعد ہم بہن بھائی ایک گلی میں جا رہے تھے۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اب شہر میں رہنا مشکل ہے۔ اس لیے جونہی میں کچھ پونجی جمع کر لوں۔ کسی اور جگہ چلے جانا چاہیے۔ میں اسے کارپوفنا کے یہاں لے گیا۔ اس طرح ہم نے ایک سادہ زندگی شروع کر دی۔ وہ ہر وقت گاتی رہتی اور کہا کرتی کہ وہ نہایت مسرور ہے۔

(کچھ عرصہ بعد) ”میں تم سے کہنا چاہتا ہوں۔“ پروکونی (کارپوفنا کے پالک) کہنے لگا۔ ”یہ بات اب زیادہ دیر تک نہیں چل سکتی۔ کیونکہ تم سمجھتے ہی ہو کہ اس عمر کی وادی میں دنیا ہمارے اور تمھارے متعلق کیا کہتی ہے۔ ماں تو رحمدل ہے۔ وہ تو نہیں کہے گی کہ تم بھی اپنی بہن کی وجہ سے مکان چھوڑ جاؤ۔ لیکن میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اس کے رویہ کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔“

میں اس کی بات کو سمجھ گیا۔ اسی دن میں اپنی بہن کو لے کر راوش کے ہاں چلا گیا۔

(کافی عرصہ بعد) آخر کار راشا کا خط آگیا۔ لکھا تھا:۔

”میرے اچھے مسائیل۔ بقول بوڑھے رنگساز کے ہمارے اچھے فرشتے خدا حافظ! ـــ میں پاپا کے ساتھ امریکہ نمائش پر جا رہی ہوں ـــ چند دنوں میں میں سمندر پر ہوں گی ـــ دور ڈوبکی نیا سے بہت دور ـــ میں چاہتی ہوں کہ وہاں آزادی سے سانس لوں ـــ میں کامران ہوں ـــ دیوانی ہوں ـــ تم دیکھتے ہو۔ خط کے الفاظ کتنے بے ربط ہیں۔ میرے پیارے مجھے آزادی بخش دو۔ جلدی سے یہ رشتہ توڑ دو۔ جو ابھی تک ہم دونوں کو باندھے ہوئے ہے۔ میرا تمھیں ملنا اور جاننا ایک آسمانی روشنی کی کرن تھا۔ جس نے میری تمام ہستی کو پرنور کر دیا۔ لیکن تمھاری شریک حیات بننا میری غلطی تھی۔ تم سمجھتے ہی ہو۔ غلطی کا یہ احساس مجھے سخت اذیت دے رہا ہے۔ میں تم سے التجا کرتی ہوں۔ تمھارے پاؤں پڑتی ہوں۔ میرے فیاض دوست، جلدی ـــ بہت جلدی۔ میرے جہاز پر سوار ہونے سے پہلے ـــ مجھے تار دو کہ تمھیں اس باہمی غلطی کی اصلاح منظور ہے۔ میرے پر دل سے یہ آخری بوجھ بھی اتار دو ـــ پاپا باقی انتظام خود کر لیں گے۔ وہ وعدہ کرتے ہیں کہ وہ تمھیں رسمی کارروائیوں کے لیے پریشان نہیں ہونے دیں گے۔

اور پھر — پھر میں آزاد ہوں جہاں چاہوں اڑتی پھروں۔ ہاں تو؟ — خوش رہو۔ خدا تمھیں خوش رکھے۔ مجھ گنہگار کو معاف کر دو۔

"میں خوش ہوں۔ وقت گزار رہی ہوں۔ ہر قسم کے لغو کام کر رہی ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ مجھ جیسی بری عورت کی کوئی اولاد نہیں۔ میں گاتی ہوں اور شادکام ہوں۔ لیکن یہ حماقت نہیں یہ میری جنت ہے۔ میری آرام گاہ، داؤد کے پاس ایک انگوٹھی تھی جس کے نگینے پر یہ نقش کندہ تھا — "کل شیٔ فان" (ہر شے فانی ہے) جب آدمی غمگین ہو تو یہ الفاظ انسان کو مسرت بخشتے ہیں اور جب انسان مسرور ہو تو یہ الفاظ اسے غمگین کرتے ہیں۔ میں نے بھی ایک ویسی ہی انگوٹھی بنوائی ہے۔ جس کے نگینے پر عبرانی زبان میں نقش کندہ ہے۔ یہ نقش مجھے میری حماقتوں سے روکتا ہے۔ ہر شے فانی ہے۔ جب زندگی بھی فانی ہے تو کسی شے کی ضرورت نہیں۔ ہاں سوائے آزادی کے احساس کے۔ کیونکہ جب انسان آزاد ہو تو وہ کچھ نہیں چاہتا...... کچھ نہیں..... کچھ نہیں......
یہ رشتہ توڑ دو — تمھیں اور تمھاری بہن کو محبت بھرا پیار...... اپنی ماشا کو معاف کر دو اور بھول جاؤ۔"

میں نے خط کو ایک دفعہ اور پڑھا۔ عین اس وقت باورچی خانہ میں ایک سپاہی داخل ہوا جو ہمارے لیے ہفتہ دو دفعہ نہ معلوم کہاں سے چائے کے ڈبے، فرانسیسی نان اور شکار وغیرہ لایا کرتا تھا۔ میں نے اپنی بہن کو سپاہی سے باتیں کرتے سنا۔ اس نے چیر لیٹ کر تھوڑا سا فرانسیسی نان کھایا اور مجھ سے کہا۔

"جب تم نوکری چھوڑ کر رنگ ساز بن گئے تھے تو انیوتا بلے گافو اور میں شروع سے ہی تمھیں سچا مانتی تھیں۔ لیکن کہتے ہوئے ڈرتی تھیں۔ وہ کون سی طاقت ہے جو ہمیں جو کچھ سوچتے ہیں کہہ ڈالنے سے روکتی ہے۔ انیوتا بلے گافو کی مثال ہی لے لو۔ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ تمھاری پرستش کرتی ہے۔ لیکن کوئی طاقت اسے یہاں آنے سے روکتی ہے۔ وہ ہم سے کتراتی ہے۔ ڈرتی ہے"
میری بہن نے اپنے ہاتھ سینے پر رکھ لیے اور بڑی دلسوزی سے کہا: "وہ تم سے شدید محبت کرتی ہے۔ کاش تم جان سکتے۔ اس نے سوائے میرے اور کسی کے سامنے محبت کا اعتراف نہیں کیا۔ تم دیکھو گے وہ ساری عمر شادی نہیں کرے گی۔ کیونکہ اسے تم سے محبت ہے۔ تمھیں اس بات کا افسوس ہے نا؟"

"ہاں ہے۔"

"یہ نان اسی نے بھیجا ہے۔ وہ سچ مچ بیوقوف ہے۔ بھلا اتنا چھپنے کا کیا فائدہ۔ میں بھی اس کی طرح بیوقوف اور احمق تھی۔ لیکن اب میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ اب میں جو چاہتی ہوں کہہ ڈالتی ہوں۔"

اتنے میں ڈاکٹر بلے گافو آ پہنچا۔ وہ ڈاکٹری کی ڈگری لے چکا تھا اور اپنے باپ کے پاس شہر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ چھٹی منا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ دوبارہ جلدی ہی پیٹرس برگ چلا جائے گا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنی تعلیم کو پورا کرنے کے لیے باہر جائے اور پھر آ کر پروفیسر ہو جائے۔

آہستہ آہستہ اس کی گفتگو کے موضوع بدلتے گئے۔ وہ سائنس اور پھر اپنے مضمون کے متعلق باتیں کرنے لگا۔ جو پیٹرس برگ میں پسند کیا گیا تھا۔ میری بہن، اس کے دکھ یا میرے متعلق اس نے کوئی بات نہ کی۔ اس کے لیے زندگی ارمانوں اور دلچسپیوں سے

بھری تھی۔ میں نے سوچا۔ ماشا کو امریکہ، اپنی انگوٹھی اور اس کے نقش کا خیال ہے۔ ڈاکٹر اپنی ڈگری اور پروفیسروں کے پیچھے پڑا ہے۔ صرف میں اور میری بہن ہی دقیانوسی چیزوں کے لیے رہ گئے ہیں۔

وفوانسکی بازار میں ہمارے گھر میں بالکل اندھیرا تھا۔ میں نے باڑ کو پھلانگا اور جس طرح پہلے کیا کرتا تھا پچھلے دروازے سے باورچی خانے میں گیا۔ میرا باپ کلب سے واپس آگیا تھا۔

”اچھے آبا سلام!“ میں نے کہا۔

”تم کیا چاہتے ہو؟“ اس نے تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد پوچھا۔

”میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ میری بہن سخت بیمار ہے۔ وہ اب زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکے گی۔“ یہ کہتے کہتے میری آواز بھرا گئی۔

”خیر!“ میرے باپ نے عینک اُتار کر میز پر رکھ دی اور ایک لمبا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ آج سے دو سال پہلے اسی جگہ میں نے تم سے التجا کی تھی کہ تم اپنی اصلاح کر لو۔ تم اپنی ضد پر اڑے رہے اور سب سے بری بات یہ کہ تم نے اپنی بہن کو بھی بھٹکا دیا۔ تمھاری وجہ سے اس کے ناموس پر بٹہ لگا۔ اب تم دونوں بگڑ چکے ہو۔ خیر جیسی کرنی ویسی بھرنی

”میں بھی آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اسی جگہ کھڑے ہو کر میں نے التجا کی تھی کہ میری بات سُنی جائے۔ آپ نے باپ دادا کی باتیں چھیڑ دیں۔ میرے دادا کی جو نظمیں لکھا کرتا تھا۔ اور اب جب میں بتا رہا ہوں کہ آپ کی بیٹی موت کے دروازے پر کھڑی دم توڑ رہی ہے تو آپ پھر باپ دادا کے قصے اور اُن کے کارنامے چھیڑ رہے ہیں۔ یہ گھسی باتیں اور اس زمانے میں جب موت کے سائے آپ کے سر پر منڈلا رہے ہیں اور زندگی دس پانچ سال سے زیادہ نہیں۔“

”تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟“ میرے باپ نے سختی سے پوچھا۔

”میں نہیں جانتا مجھے آپ سے محبت ہے۔ مجھے آپ سے دور رہنے کا حد سے زیادہ افسوس ہے اور اسی لیے میں آگیا ہوں۔ مجھے ابھی تک آپ سے محبت ہے لیکن میری بہن آپ کے ساتھ تمام رشتے توڑ چکی ہے۔ وہ آپ کو معاف نہیں کرے گی آپ کا نام لیتے ہی اسے اپنی گزری ہوئی زندگی سے نفرت ہونے لگتی ہے۔“

اور یہ کس کی غلطی ہے؟“ میرا باپ چلّایا۔ ”یہ تمھاری غلطی ہے پاجی!“ میرے باپ نے میز سے اپنا رولر اٹھا لیا۔ ”تم نشے میں ہو۔ تمھیں اس حالت میں یہاں آنے کی جرأت کس طرح ہوئی۔ میں تم سے آخری دفعہ کہے دیتا ہوں اور اپنی آوارہ بہن سے بھی کہہ دینا کہ تم میں سے کسی کو بھی کچھ نہیں ملے گا۔ میں نے اپنی نافرمان اولاد کو اپنے دل سے نکال دیا ہے۔ تم جہاں چاہو . . . . غارت ہو سکتے ہو۔ خدا کی یہی مرضی تھی کہ مجھے تمھارا عذاب دے دے کر ہلاک کیا جائے۔ لیکن میں اس آزمائش میں پورا اُتروں گا اور یعقوب کی طرح دُکھ درد جھیلنے میں تسکین حاصل کروں گا۔“

میں نے مایوس ہو کر اپنا ہاتھ ہلایا اور چلا آیا۔ مجھے یاد نہیں کہ اس کے بعد اگلی رات اور اگلے دن مجھ پر کیا گزری۔ کہا جاتا ہے کہ میں گلیوں میں ننگے پاؤں اور ننگے سر لڑکھڑاتا اور گاتا ہوا پھرتا رہا اور بچوں کا ایک غول میرے پیچھے پیچھے لگا تھا“

کے آوازے کستا رہا۔

اگر میں اپنے لیے ایک انگوٹھی بنواؤں تو اس کے نگینے پر یہ نقش کندہ ہوگا۔ "لا شی فان" (کوئی شے فانی نہیں) میرا ایمان ہے کہ کوئی شے اپنا نشان چھوڑے بغیر نہیں جاتی۔ اور ہر قدم جو ہم اُٹھاتے ہیں۔ خواہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔ ہمارے حال اور مستقبل پر ضرور اثر ڈالتا ہے۔

میں جن جن منزلوں سے گزرا ہوں۔ بیکار نہیں گئیں۔ میرے دُکھ درد اور میرے صبر کا لوگوں پر اثر ہوا ہے۔ اب وہ مجھے 'ملکا' نہیں کہتے۔ اگرچہ میں اعلیٰ خاندان کا ہوں۔ لیکن اب وہ مجھے مزدور دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اور اب انھیں میرے رنگ کا برش اور برتن اُٹھائے پھرنے اور کھڑکیاں لگانے پر تعجب نہیں ہوتا۔ بلکہ اب وہ لوگ مجھے کام دے کر خوش ہوتے ہیں۔ میں اوّل درجہ کا کاریگر سمجھا جاتا ہوں۔ اور اب میں خود ایک ٹھیکہ دار ہوں۔

میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ سنجیدہ اور خاموش رہتا ہوں۔ بہت کم ہنستا ہوں۔ ماریا وکترافنا میری بیوی اب کہیں سمندر پار رہتی ہے۔ ڈاکٹر بیٹے کا فوجی سمندر پار ہے۔ میرا باپ اب بہت بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس کی کمر جھک گئی ہے۔ میں اس سے کبھی ملنے نہیں گیا۔

عام طور پر صبح سے شام تک کام میں لگا رہتا ہوں۔ اچھے موسم میں اپنی ننھی بھانجی کو ساتھ لے کر قبرستان نکل جاتا ہوں اور وہاں دیر تک کھڑا یا بیٹھا اس قبر کو دیکھتا رہتا ہوں جو مجھے بہت پیاری ہے اور بچی کو بتاتا ہوں کہ تمھاری امی یہاں سوئی پڑی ہے۔

بعض دفعہ قبر کے پاس مجھے اینوتا بلیکا مل جاتی ہے۔ ہم ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں اور پھر چپ چاپ کھڑے رہتے ہیں یا تھوڑا بہت، اس کی بچی اور دنیا کے دُکھ درد کی باتیں کرتے ہیں۔ قبرستان سے نکل کر ہم خاموشی سے چل دیتے ہیں۔ اور وہ آہستہ آہستہ جان بوجھ کر اپنی رفتار کم کر دیتی ہے تاکہ تھوڑی دیر تک میرے ساتھ چل سکے۔ جب شہر آ جاتا ہے تو اینوتا بلیکا گھبرا کر خدا حافظ کہتی ہے اور آگے بڑھ جاتی ہے۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ ابھی ابھی میرے ساتھ چل رہی اور بچی کو پیار کر رہی تھی۔

تلخیص: نسیم عباسی

امجد حیدر آبادی

ہم اپنی جنس میں بھی معصوم ہے	ہم رنگ وجود میں بھی معدوم ہے
"ہم" کیا ہے خدا کا ایک علم تکم	لیکن اسے علم ہے کہ معلوم ہے

ہمارا نام جس طرح ہم تحریر ہیں اسی طرح نام بھی نرالا ہی ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اس اپنے روحانی ہم کی تقسیم کریں ہم کو اپنی دونوں عظیمیں یعنی والدین کے مختصر صفات بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے والد	ہماری والدہ
۱۔ جسم طرح دار، قامت اگرچہ چھوٹا مگر بھی کسی قدر بڑے رنگ کا اظہار ہوتا تھا۔	سانولا رنگ، دبلی پتلی، کسی قدر پستہ قامت، پیٹ پیچھے سے لگا ہوا۔
۲۔ قدیم وضع کے مولوی	محض امی
۳۔ نماز کے بھی سخت پابند، بکثرت صیام	گنڈے دار نمازی، صرف رمضان کی روزہ دار
۴۔ بے حد نازک مزاج	حد درجہ سادہ مزاج
۵۔ بے حد سست، اپنے ہاتھ سے کوئی کام نہ کرتے	صبح سے شام تک کام کرنے والی
۶۔ خوش خوراک، خوش پوش	روکھا سوکھا کھا کر، موٹا جھوٹا پہن کر زندگی گزارنے والی
۷۔ بہت بولنے والے	بہت خاموش

اب جنھوں نے ہم کو دیکھا ہے وہ تو سمجھ سکتے ہیں کہ والدین کے ان صفات میں سے قدرت نے ہم کو راستہ کیا کیا چیزیں دی ہیں۔ جنھوں نے ہم کو نہیں دیکھا ہے ان کے لیے ہم کسی قدر تفصیل کرتے ہیں۔

۱۔ صورۃً اور جسماً تو ہم ماں اور باپ دونوں کے درمیان ہیں کچھ ادھر سے ملا ہے کچھ ادھر سے یوں سمجھیے کہ ہم ماں باپ دونوں کے بیچوں بیچ ہیں ہمارا

۲، ۳۔ علم و جہالت کی بھی درمیانی حالت ہے نہ مولوی نہ جاہل، نمازی بھی واجبی واجبی ہے مگر حضرت والد کی کثرت صیام کا اثر ہے کہ ہم کو دن بھر بھوک بہت کم لگتی ہے مگر رات وہ خوب بھی کھانے میں تامل نہیں ہوتا۔

۴۔ نازک مزاجی میں بالکل باپ ہی کے بیٹے ہیں۔ ۵۔ کام چور۔ ۶۔ لباس و خوراک کے تکلفات سے بے حس۔ ۷۔ کم گوئی میں بالکل اپنی ماں کے قدم بقدم ہیں ان تینوں امیروں میں باپ سے کچھ حصہ نہیں لیا۔

اب ہم ان دونوں کی صورت و سیرت کی یادگار رشید احمد حسین امجد کے نام سے اس عدم خیز عالم میں بظاہر موجود ہیں دیکھیے کب تک رہیں

ہم نے اپنی والدہ صوفیہ مرحومہ سے سنا تھا کہ نواب سالار جنگ اول کی وفات ۱۳۰۰ھ کے پانچ یا چھ سال بعد حیدر آباد دکن میں، رجب کے قریب، صبح روز دو شنبہ ہماری نحوست کا ستارہ طلوع ہوا یعنی ہم عالمِ غم میں پیدا ہوا ہوں۔ صحیح تاریخ و سنہ ہم کو بھی معلوم نہیں۔

ہمارے والد حضرت صوفی سید رحیم علی مرحوم کا ہماری والدہ سے عقد کے تین سال بعد عین ہمارے چھلے کے دن مرگ مفاجات سے آناً فاناً انتقال ہو گیا۔ چھلے کی رسم میں پھولوں سے سجا ہوا گھر دم بھر میں ماتم کدہ ہو گیا۔ جو پانی زچہ بچہ کے نہلانے کے لیے گرم کیا گیا تھا غسلِ میت کے کام آیا۔ بلند اقبال کی بلند اقبالی کا یہ پہلا کرشمہ تھا۔ ابھی اور دیکھتے جائیے۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ حضرت مرحوم نے اس واقعے سے دو روز قبل تندرستی ہی میں اپنی قبر تیار کروالی تھی۔

اس وقت بیماری یا موت کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ قبر بننے کے تیسرے ہی دن نماز ظہر سے واپس آتے ہوئے دل پر فالج کا اثر ہوا گھر آتے آتے رنگ گور نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ بچے کے شوق میں کھلی ہوئی آنکھیں قبر کی مٹی سے بند ہو گئیں۔ بندگی بیچارگی۔

ڈھونڈتے کیا ہو موت کے اسباب ۔ مر گئے مرگِ ناگہانی سے
دور جانے کی کیا ضرورت ہے ۔ موت پیدا ہے زندگانی سے

دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے ہماری والدہ سے کہتے گئے۔ ہمارا غم نہ کرنا بچے ہی کو لے لینا تمہارا یہ بچہ جیتا رہا اور کچھ ہو کر رہے گا۔ ہماری والدہ قصبہ حسن آباد مضافات حیدر آباد کی رہنے والی تھیں۔ ہمارے والد کا مولد کسی نے اورنگ آباد بتایا ہے کسی نے میرٹھ بیان کیا ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

اسی طرح نام بھی بعض نے رحیم حسین ابن کریم حسین کہا ہے۔ اور بعض نے رحیم علی۔ لیکن آخر الذکر نام چونکہ ہم نے اپنی ماں سے سنا ہے اس لیے ہمارے پاس یہی زیادہ قابلِ وثوق ہے۔

والد کے کسبِ معاش کے ابتدائی حالات سے ہم تو کیا ہماری والدہ بھی بے خبر ہیں مگر آخری زندگی میں کسی مسجد کی امامت کرتے تھے ان کی اذان میں بھی خاص اثر تھا۔

ہمارے والد کے یکے بعد دیگرے چار بیویوں سے اکیس بچے ہوئے، بیس مر کر اکیسویں ہم پیدا ہوئے۔ ایک کے اکیس ہو کر پھر ایک کا ایک ہی رہ گیا۔ واہ ری واہ۔

کمالاتِ امجد اب دنیا کے اسٹیج پر ننھے ایکٹر کے پرلطف تماشے نئے نئے کمالات بغیر کسی ٹکٹ کے بنفسِ نفیس ملاحظہ کرتے جائیے۔

قول و فعلِ مرداں بلکہ ہم ماں کی گود میں آنے سے پہلے ابھی ماں کے پیٹ ہی میں تھے کہ محرم کا مہینہ آ گیا۔ بیوی (ہماری والدہ) نے اپنے شوہر (ہمارے والد) سے محرم کے تعزیے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ نیکی کے دم میں تھے ہاں کہہ دیا۔ بیوی کا تماشہ دیکھنے کی خوشی میں گھر کا تمام کام کاج جلد جلد ختم کر کے بن ٹھن کر مغرب تک بالکل تیار ہو گئیں۔ شوہر روزانہ کی عادت کے خلاف مغرب کے بعد آنے کی جگہ نماز عشا کے بعد تشریف لائے۔ تماشے کی دیوانی بیوی نے جھٹ پٹ دسترخوان بچھایا ہاتھ دھلا کھانا لا کر سامنے رکھ دیا۔ آپ کھا پی اندر ہو کر باہر تشریف لے چلے۔ بیوی نے کہا کیا تعزیے دیکھنے نہ چلو گے۔ جس زبان سے دن کی روشنی میں ہاں کہا تھا اب رات کی تاریکی میں نہیں کہہ دیا اور باہر تشریف لے چلے باہر جا کر ادھر دروازے کو قفل لگا رہے تھے ادھر بیوی تعزیے نہ دیکھنے کے غم میں اندر ہی اندر سوگواری کر رہی تھیں۔ شوہر کے گھر سے نکلتے ہی بجے لگیں زنانک پڑے، تمام دن تھکا تھکا کر ساقط کر گیا۔"

قلبِ ماہیت

ہمارے پیدا ہونے سے پہلے ہماری والدہ کی ایک لڑکی مر چکی تھی جس کا غم ہماری والدہ کے دل و جگر میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا تھا اس لیے والد صاحب کے انتقال کے بعد اپنی لڑکی کی یادگار میں کچھ دنوں کے لیے ہم بھی لڑکی بنا دیے گئے ہمارے کانوں میں بالیاں گلے میں مالا ڈال دی گئی۔ روزانہ ہمارے بالوں میں کنگھی کر کے چوٹی ڈال دی جاتی آنکھوں میں کاجل ہوتا ہونٹوں پر مسی ہوتی ہم تھی ہی عمر میں سو دکھا کے ہیں مٹکاتے اچھا چہرہ لے کر ادھر سے اُدھر اُدھر سے ادھر اٹھلایا کرتے۔

بالائی چور

ایک دفعہ گھر میں دودھ کی کڑھائی آگ پر چڑھی ہوئی تھی کھول کھول کر دودھ کا بہت سا حصہ بالائی بن چکا تھا دیکھتے ہی رال ٹپک پڑی۔ بے صبرے میں اتنا صبر کہاں کہ ماں آئے اور نکال کر دے اور پھر یقین کہ ضرور دیں گی۔ دیں یا نہ دیں۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ بالائی کے لیے گرم گرم دودھ میں ہاتھ ڈال دیا۔ بالائی نکال تو لی مگر ہاتھ جل اٹھا جلدی سے منہ میں ڈال لی۔ منہ میں آگ پڑ گئی۔ گرم چیز نگلی نہیں جاتی۔ بالائی اگلی نہیں جاتی۔ بلبلا کر چیخ اُٹھے آواز کے ساتھ ہی والدہ دوڑی ہوئی آئیں۔ صاحبزادہ کو دیکھا اور عجب شان میں دیکھا منہ میں بالائی بھرے منہ کھول کھول کر چلا رہے ہیں چوری کی چوری اور خود ہی اطلاع دی۔ پر کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ اضحک اللہ سنہا فی الاخرۃ

راحت زحمت فزا ہے معلوم نہ تھا　　اس قند میں سم ملا ہے معلوم نہ تھا
ہے گنج میں یہ سانپ خبر تھی کس کو　　بالائی میں یہ بلا ہے معلوم نہ تھا

حماقت میں کرامت

ایک دفعہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ گرمی کے موسم میں ہم باؤلی پر پہنچے۔ باؤلی میں ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا، بیسوں آدمی چھوٹے بڑے کود رہے تھے تیر رہے تھے، نہا رہے تھے، غوطے لگا رہے تھے۔ یہ تماشا دیکھتے دیکھتے ہم کو بھی جوش آگیا۔ اپنے سے باہر ہو کر کپڑے اتار ڈالے۔ ہم سے قریب ایک صاحب پیراکی کے استاد بیٹھے ہوئے تھے ہم نے ان سے پوچھا کیا ہم بھی کود جائیں انہوں نے یہ سمجھ کر کہ ہم تیرنا جانتے ہیں اچھا کہہ دیا۔ ہم ماہر فن کی طرح دھم سے پانی میں کود گئے۔ کود کر ڈوب گئے۔ ڈوب کر پھر ابھرے۔ ابھر کر پھر ڈوب گئے۔ پھر ابھرے پھر ڈبکی ہی کو تھے کہ استاد صاحب نے دیکھ لیا۔ اتنا وقت کہاں تھا کہ کپڑے اتار سکتے کپڑوں سمیت پانی میں کود کر ہم کو سنبھال لیا اور کنارے لا کر چھوڑ دیا۔ ہماری اس حماقت پر بہت لعنت ملامت کی اس میں شک نہیں کہ حماقت ضرور ہوئی مگر اس تاریخ سے ہم کو تیرنا آگیا۔

رک نہیں سکتی کبھی چڑھنے سے یہ وہ بیل ہے
کھیل جاتا جان پر بچوں کا ادنے کھیل ہے

علم انسانی

یارب ہو تم معلوم نہیں　　حادث کو قدیم معلوم نہیں
سبحانک لا علم لنا پڑھتا ہوں　　کچھ بھی مجھے اے علیم معلوم نہیں

تعلیم امجد

چالیس دن کے یتیم بچے کو پالنے پوسنے تعلیم دلانے میں ایک بے کس بے یار و مددگار بیوہ نے جو مصیبتیں اٹھائیں ناقابل بیان ہیں۔ بارہا ایسا ہوا کہ بچے کو تمام تمام دن کھانا نہ ملا بھوکا ہی مدرسہ چلا گیا۔

اکثر ایسا ہوا کہ کسی استاد صاحب نے مار مار کر لکڑی کے ساتھ بچے کی ہڈیاں توڑ دیں سر پھٹ گیا چہرے پر خون کی چادر اتر آئی۔ ماں اپنے اکلوتے لال کا یہ حال آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔ اندر ہی اندر خون کے گھونٹ پی رہی ہے۔ مگر کیا مجال اُف تو کرے۔ کہے بھی تو کس سے۔ وہ استاد جنہیں مفت پڑھاتے ہیں ان کو کچھ کہا نہیں اور انہوں نے پڑھانا ترک کر دیا تو نہیں، مجبور، ہر طرح مجبور۔

اونٹنی کا بچہ اپنی تیز رو ماں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے تھک کر پکارتا ہے اے ماں ذرا تو آہستہ چل ماں کہتی ہے بیٹا کیا کروں میں خود بھی مجبور ہوں۔

دل من گرچہ بر تو مہربان است   زمام من بدست ساربان است

ایک دفعہ دونوں پاؤں میں رسّی باندھ کر چھت کی کڑیوں میں اُلٹے لٹکا دیے گئے، موٹی موٹی رسیوں سے مار مار کے ادھموا کر دیا ہمارے منہ سے کف جاری ہو گیا۔ لٹکا ہوا جسم بے حس ہو کر بالکل ہی ڈھلک گیا۔

مارنے والے کو مرنے والے کی کیا خبر۔ لایعصون ما امرالله جلاد اپنے کام میں لگے ہوئے تڑا تڑ مارے جا رہے تھے۔ مزہ تو یہ کہ [illegible] کا یہ پرلطف تماشا ہماری والدہ کے سامنے ہی ہو رہا تھا۔ ہم تو پہلے ہی مٹے ہوئے تھے آنکھیں بند کئے عالم بے خودی میں خدا تک جا پہنچے تھے اب جو کچھ بھی درگت ہماری بن رہی تھی وہ اس کھلی آنکھوں سے دیکھنے والی کا حصہ تھی۔

یک دیدہ بصیر بود و یک دیدہ کور   یک مردہ بگور بود و یک زندہ بگور

اگرچہ ہماری والدہ کے عزیز و اقارب سب مر چکے تھے شوہر کا سایہ بھی سر پر باقی نہ رہا تھا۔ سب بچے جا کر ہم اکیلے رہ گئے تھے مگر معلوم ہماری اس ماں میں تعلیم کا شوق کہاں سے اور کس طرح پیدا ہو گیا تھا کہ ہم سے بار بار فرماتیں بیٹا اگر جینا ہو تو کچھ پڑھ کر جیو، ورنہ بہتر یہی ہے کہ مر جاؤ۔ ماں علم کی دلدادہ، ہم کھیل پر آمادہ۔ ان کو علم سے محبت ہم کو پڑھنے سے وحشت، ہم دو حرف بھی پڑھ لیتے تو یہ ماں یہ سمجھتیں کہ بڑی دولت حاصل ہو گئی۔ ہم جس قدر کھیل لیتے سمجھتے کہ زندگی کا مقصد حاصل ہو گیا۔

کسی پر سایۂ شیطاں کسی پر ظل رحماں تھا   کوئی عاجل کا دلدادہ کوئی آجل کا خواہاں تھا

عالم تماشائی رات جب کبھی ہم پڑھنے کے لیے بٹھائے جاتے دو چار منٹ کچھ منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر کتاب بند کر جھٹ پٹ اُٹھ کھڑے ہوتے۔ والدہ نے روزانہ یہی کیفیت دیکھ کر کہا، یوں نہیں تم میرے سامنے پڑھا کرو۔ کتاب کی ہر سطر پر انگلی رکھ دیتیں ہم سمجھے کہ یہ پڑھنا جانتی ہیں۔ اس خوف سے بغیر کسی تغلب و تصرف کے ایمانداری کے ساتھ برابر پڑھا کرتے بہت دنوں میں جا کر جب یہ راز کھلا کہ ماں پڑھنا لکھنا کچھ بھی نہیں جانتی ہیں محض ماں ہی ہیں تو ہم کو اپنی اوقات ضائع ہونے پر بہت افسوس ہوا۔ لکھنے پڑھنے کی جگہ اتنا وقت بھی کھیل کود میں صرف ہو جاتا تو زندگی کے معنی صحیح ہو جاتے۔ انما الحیوة الدنیا لعب و لہو۔

جو کفر سے شرمائے وہ ایمان ہیں ہم   جو وقت کے بعد ہو وہ عرفان ہیں ہم
پچھتاتے نہیں لوگ برائی کر کے   حیرت ہے کہ نیکی سے پشیماں ہیں ہم

گردش پرکار قیام مدرسہ کے آخری زمانہ میں ہم نے پڑھنا لکھنا بالکل چھوڑ دیا تھا خفتن و خوردن وہی مشاغل اور خوب از بر تھے آخر مہتمم صاحب مدرسہ کو بھی ہماری بے چاری کی خبر ہو گئی اگرچہ مدرسہ کے قاعدہ کے اعتبار سے ہمارا حصہ فوراً بند ہو جانا چاہیے تھا مگر مہتمم صاحب ہمارے راہ راست پر آنے کی امید میں کچھ دنوں ٹالتے رہے۔ آخر ایک دن مدرسہ کے بڑے ہال کے سامنے ہم کو روک کر پوچھ ہی بیٹھے کہ تم نے پڑھنا کیوں چھوڑ دیا

ہم نے کہا کس سے پڑھیں۔

مہتمم صاحب نے کہا کیا تمہارے پڑھانے کے لیے استاد نہیں ہیں؟

ہم نے کہا معمولی استادوں سے تو ہم نہیں پڑھ سکتے۔

مہتمم صاحب نے کہا، پھر کس سے پڑھو گے؟

ہم نے کہا مولوی عبدالوہاب صاحب بہاری سے

مہتمم صاحب نے کہا تمہارے لیے آٹھ روپے ماہوار کا استاد تو نہیں رکھا جا سکتا۔

ہم نے کہا تو پھر ہم نہیں پڑھ سکتے۔

ہمارے اس جواب سے مہتمم صاحب کو سخت غصہ آگیا اور چاہا کہ ہم کو پکڑنے اور مارنے کے لیے لپکے۔ یہ واقعہ جس ہال کے سامنے ہو رہا تھا اس کے متعدد دروازے تھے ہم جھٹ سے ایک دروازے میں گھس گئے مہتمم صاحب نے بھی ہمارا پیچھا کیا ہم دوسرے دروازے سے نکل پڑے۔ اسی طرح تھوڑی دیر تک آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے اپنے ساتھ مہتمم صاحب کو بھی در بدر پھراتے رہے۔

ہمارے دوست طلبہ کھڑے تماشا دیکھتے رہے پھر ہم لگے تیر کی طرح جامعہ سے باہر سڑک پر پہنچ گئے حضرت صاحب نے بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ شارع عام پر ایک طالب علم اور ایک مہتمم مدرسہ دوڑے چلے جا رہے تھے۔ اسی بھاگ دوڑ میں مہتمم صاحب کی ایک جوتی پاؤں سے نکل کر بدرو میں جا پڑی مگر حضرت نے اس کا بھی خیال نہ کیا ایک ہی جوتی پہنے برابر تعاقب میں مصروف رہے ہمارا یہ حال تھا کہ دس قدم بھاگتے ہیں۔ پھر مڑ کر دیکھتے ہیں حضرت کو آتا دیکھ کر ہم دس قدم آگے نکل جاتے ہیں۔ ایک شریف بزرگ اور ایک شریر لڑکے کا کیا جوڑ آخر غریب ہار مان کر تھک گئے اور ہم سے ہاتھ دھو کر براہ راست ایک ہی جوتی پہنے ہوئے قدیم مراسم کے اعتبار سے ہماری والدہ کے پاس جا پہنچے۔ ہمارے کانوں سے دور، ہماری والدہ کے سامنے ہم کو خوب ہی صلواتیں سنائیں۔ والدہ نے کہا آپ نے اس کو پکڑ کر مارا کیوں نہیں۔ مہتمم صاحب نے کہا، چھلاوے کو کون پکڑ سکتا ہے۔ کم بخت جتنا ذہین ہے اتنا ہی شریر ہے۔

اس اثنا میں مولانا کی آمد سے بے خبر، مولانا کو دیکھ کر دم ہی تو نکل گیا۔ نہ معلوم کیا بات تھی کہ پھر بھاگنے کی بھی ہمت نہ رہی۔ بیچ ہی بیچ آنگنے میں کھڑے رہ گئے۔ ادھر شفیق ماں، ادھر مشفق مہربان سر جھکائے آنکھیں نیچی کیے تھے اور بہت کچھ سنتے۔ اس وقت ہماری حالت اس غلام کی سی تھی جو اپنے مالک کے گھر سے بھاگ کر ایک کنوئیں میں کود پڑا تھا اور کنوئیں سے سرنگ لگاتا ہوا پھر جو نکلا ہے تو اسی اپنے مالک کے گھر میں۔ وہ اسی کو تقدیرات کہتے ہیں۔

تجھ سے میں بھاگ کر کہاں جاؤں گا ۔۔۔ تو سامنے آئے گا جہاں جاؤں گا
امید لیے عہد ہراس آیا ہوں ۔۔۔ تجھ سے منہ موڑ کر تیرے پاس آیا
تقدیر ارض و سما کی معلوم نہیں ۔۔۔ قسمت دست قضا کی معلوم نہیں
ہر کام یہاں ہے اپنی مرضی کے خلاف ۔۔۔ کیا مرضی ہے خدا کی معلوم نہیں

شادی اور آزادی

ہم تقریباً ۱۹۰۰ء میں مدرسہ نظامیہ قدیم کے وظیفہ خواروں میں شریک ہوئے۔ وہاں تعلیم ختم کی پھر مدرسہ چھوڑ دیا اس وقت سخت گرانی کا زمانہ تھا اب تک والد مرحوم کے پس انداز اور ان کے چھوڑے ہوئے مکانات بیچ بیچ کر زندگی بسر کرتے رہے۔ قحط کے زمانہ میں سخت مصیبت آ پڑی۔ دو روپے ماہوار پر ایک لڑکی کو پڑھانے کے لیے چار میل جایا کرتے تھے جس ماہوار اور جس آمد و رفت پر ایک مزدور ملنا مشکل تھا ہم نے مدرسی کی صورت میں اس کو آسان کر دکھایا۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں شیخ میراں صاحب کی لڑکی سے پہلی شادی ہوئی جس سے ایک لڑکی اعظم النساء پیدا ہوئی اس کے دو سال بعد کسی خانگی وجہ سے ماں سے بگڑ کر ہم لکھنؤ چلے گئے۔

نے ملک میں ٹھہرنے کو جگہ دی۔ مجبوراً گورنمنٹ کے عیسائی مشن میں اترے۔ مشن اسکول میں تعلیم بھی دیا کرتے تھے۔ نئے کرسچنوں اور پادریوں سے دن رات مذہبی گفتگو رہا کرتی تھی۔ پادری صاحب اتوار کے دن جب مشن ([illegible]) میں وعظ کرنے کے لیے جاتے ہم بھی ان کے ساتھ جایا کرتے تھے بڑا لطف تو یہ تھا کہ ایک طرف پادری صاحب کھڑے ہوئے عیسوی دین بتاتے دوسری طرف ان کے بالمقابل ہم دین محمدی کی تبلیغ کیا کرتے کام ختم کر کے ہم دونوں پھر ایک ساتھ گاڑی میں سوار ہو کر مشن کو واپس آتے۔ ہماری اس طرز روش سے سارے مسلمان منگلور متحیر تھے کوئی ہم کو عیسائی کہتا کوئی محمدی سمجھتا، کچھ مخالف تھے بہت سے موافق تھے۔ اکثر جگہ ہماری دعوتیں ہوتیں۔ ہمارے ویسے چھپے معتقد ہوتے ایک مولوی صاحب تو بالکل ہی ہمارے مخالف ہو گئے تھے۔۔۔۔ اس طرح تین چار مہینے منگلور میں گزار کر ماں کی وجہ سے پھر حیدرآباد واپس ہوئے۔

ہمارا پہلا قدر دان

یہاں آ کر چند مہینوں کے بعد مولوی عزیز مرزا صاحب بی۔ اے کی علمی قدر دانی کی شہرت سن کر ایک دن ان کے مکان پر پہنچ گئے۔ مولوی صاحب اس وقت [illegible] تھے ہم نے سلام کر کے رباعیات امجد کی ایک جلد پیش کر دی۔ مولوی صاحب نے کتاب ہاتھ میں لے کر فرمایا کیا مولوی امجد صاحب نے بھیجی ہے۔

شاید مولوی امجد صاحب ان کے تخیل میں کوئی عجیب ہستی کے انسان تھے اس وقت کتاب دینے والا کم عمر اور مبتذل الحال انسان ان کے خیال میں رباعیات امجد کا مصنف نہیں ہو سکتا تھا۔

ہم نے مسکرا کر عرض کیا جی ہاں! یہ کتاب بھی امجد ہی نے بھیجی ہے اور پیش کرنے والا بھی امجد ہی ہے۔ مولوی صاحب ہماری صورت دیکھ کر بہت متحیر ہوئے پھر پوچھا کیا یہ وہی رباعیاں ہیں جن کے متعلق مولانا حالی نے لکھا ہے کہ تعجب ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں جو منافی شعر و سخن ہے۔ ایسا عمدہ اور اعلیٰ مذاق شاعری کا کیوں کر پیدا ہوا۔

ہم نے کہا۔ ہاں! یہ وہی رباعیاں ہیں۔ اس کے بعد مولوی صاحب ہمارے حال پر بہت مہربان ہو گئے اور ہمیشہ قدر دانی فرماتے رہے۔ آپ ہی کی سفارش سے ابتداءً ہم دارالعلوم میں بیس روپے ماہوار پر مدرس ہو گئے جن کے لیے اب تک دل سے دعا نکلتی ہے۔

اس نوکری کے بعد ایک مکان بھی لے لیا۔ نوکر ہو کر مالک مکان ہو کر ٹھیک گزر رہا ہوگا کہ ۱۳۲۶ھ میں رود موسیٰ کی طغیانی کا واقعہ پیش آیا۔

طغیانی اور موسیٰ

یاں صرصر سے آشیاں گرتا ہے — اب لشکر عیش کا نشاں گرتا ہے
اب جاؤں کدھر کہاں پناہ ڈھونڈوں یارب — پھٹتی ہے زمیں آسماں گرتا ہے

عظیم تباہی

ہمارا مکان ندی سے کوئی ساٹھ گز کے فاصلہ پر واقع تھا سلخ شعبان ۱۳۲۶ھ کی شام ہی سے رود موسیٰ لبریز ہو کر اپنے دونوں ساحلوں کی طرف سیل بلا کی طرح بڑھ رہی تھی۔ رات کے آٹھ بجے تک ہمارے گھر میں گھٹنوں گھٹنوں پانی پہنچ گیا۔ ہم نے اسی وقت والدہ سے چلنے کے لیے کہا بھی، مگر انھوں نے کمال استقامت سے یہی جواب دیا کہ جب موت آ ہی گئی ہے تو یہاں اور وہاں سب برابر ہے۔ اینما تکونوا یدرککم الموت۔ رات کے دس بجے تک زور بڑھتے ہوئے پانی نے غنیم کی فوج کی طرح چاروں طرف سے محاصرہ کر لیا اس وقت ہم سب لوگ گھبرا کر پاس کے مکان میں جو نہایت مرتفع اور مستحکم تھا اور پہلے بھی ایک بار ندی کی زد سے بچ چکا تھا چلے گئے

---

[1] یہ کتاب شمسی پریس آگرہ میں ظفر یاب خاں کے اہتمام سے ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی تھی۔

یہاں ہم سے پہلے ہی محلہ کے اکثر لوگ پناہ لینے کے لیے آ گئے تھے۔ ہم مکان کے دیوان خانہ میں ٹھہر گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد قبلہ رخ کی دیوار شق ہوئی کمرے کے ہال میں پانی دوڑتا ہوا گھسا ہم ادھر سے بھاگ کر دوسری طرف جا پہنچے ادھر بھی ہم دم لینے پائے تھے کہ صحن کا پانی دروازہ کے راستہ چڑھتا ہوا اوپر آ گیا۔ آخر ایک تخت بیچ میں ڈال کر ہم سب اس پر بیٹھ گئے۔

ہم اس وقت آنکھیں بند کیے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے چھت گرنے اور مرنے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس تمام طوفانی حادثہ میں یہ وقت ہمارے لیے کمال کرب کا وقت تھا۔ اس اضطراب میں یکایک ایک ہوک اٹھی جی میں آئی جب مرنا ہی ہے تو چھت کے نیچے دب کر اور چوہا چوہا ہو کر کیوں مریں۔ میدان میں نکل کر کیوں نہ جان دیں۔

خیال نے عزم، عزم نے عملیت کی صورت اختیار کر لی۔ فوراً ماں کا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے ماں کے ساتھ بیوی بیوی کی گود میں بچی چار سر بکف مجاہدین کا قافلہ شق شدہ دیوار کی درز سے قبلہ رخ کی گلی میں اترنے کے لیے تیار ہو گیا۔ میر قافلہ نے پہلے قدم رکھا اور یہ سمجھ کر کہ پانی میں اتر رہے ہیں مگر ایسا نہیں ہوا، بلکہ ہمارا قدم ایک گرے ہوئے مکان کے ملبے پر پڑا۔ ہمارے بعد والدہ اور بیوی بھی مکان سے باہر ملبے پر کھڑی ہو گئیں ادھر ہم باہر ہوئے ادھر چھت بیٹھ گئی گھبرا کر آگے بڑھ گئے۔ خدا کی قدرت، صدہا مکانوں کے گرنے سے ملبے کے بڑے بڑے پشتے قائم ہو گئے تھے جو اونچائی میں ان مکانوں کے برابر تھے جو ابھی گرے نہ تھے اندھیری رات میں پانی کے اندر ہی اندر پاؤں سے راستہ ٹٹولتے ملبوں پر پاؤں رکھتے کودتے جاتے جانب جنوب ایک مثلث وضع چبوترے تک پہنچ گئے۔

اب آگے کوئی ملبہ یا پشتہ نہ تھا وہیں ٹھٹک کر رہ گئے۔ اس وقت ندی بلیوں اچھل رہی تھی۔ پانی لحظہ بلحظہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا گھپ چھایا ہوا تھا مینہ لگاتار برس رہا تھا موجوں کے شور اور گرتے ہوئے مکانوں کے دھماکے سے جو کبھی بجلی کی کڑک، کبھی توپوں کی گرج سے مشابہ تھا، دل سینہ میں دہل دہل کر رہ جاتا تھا۔

جب ہم اس چبوترے پر آئے تھے پانی اس کی منڈیر سے نیچے تھا لیکن جوں جوں ندی چڑھتی گئی چبوترے سے پانی اونچا ہوتا چلا رات کے دو بجے تک تو پانی چبوترے سے چڑھتا ہوا پاؤں سے ٹخنوں، ٹخنوں سے پنڈلیوں، پنڈلیوں سے گھٹنوں، گھٹنوں سے کمر، کمر سے گلے تک آ پہنچا ہم لوگ اس خیال سے کہ جیئیں تو ایک ساتھ جیئیں، ڈوبیں تو ایک ساتھ ڈوبیں۔ ایک دوسرے کے ہاتھ مضبوطی سے تھام کر ڈوبنے سے بچنے کے لیے چبوترے سے آگے بڑھے چبوترے سے آگے بڑھنا ہی تھا کہ سب کے سب غڑاپ سے پانی میں ڈوب گئے ڈگر کھائی سے جا پڑے خندق میں۔

ہم ایک طرف ماں ایک طرف بیوی، ایک طرف بچی ایک طرف جمع عناصر اربعہ منتشر ہو گئے اس جگہ بھی قدرت کا کرشمہ دیکھنے کے قابل ہے۔ ہمارا قدم ڈوبنے کے بعد زمین کی سطح کی جگہ گھاس کے چھپر پر جا پڑا، ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ یہاں تو لاکھوں تنکوں کا ایک پورا چھپر مل گیا۔ ہم چھپر کے ذریعہ خود بخود پھر سطح آب پر برآمد ہو گئے۔ والدہ بیوی بچی ہمارے قریب ہی غوطے کھا رہی تھیں۔ یکے بعد دیگرے ہر ایک کو پانی سے نکال نکال کر چھپر پر چڑھا لیا۔ چھپر چار آدمیوں کے بوجھ پر بھی سطح آب پر برابر قائم رہا۔ ہم بچی کو جو حیرت ناک تحمل سے ہمارے ساتھ مصیبتوں کو برداشت کرنے میں شریک تھی جو ذرا ذرا سی بات پر رونے والی آج بالکل ساکت وصامت تھی، کاندھے پر ڈالے ہوئے آنے والے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ اسی طرح کچھ وقت اس چھپر پر بھی گزر گیا مگر کس طرح گزرا۔

سینہ بشگافم اگر طاقت دیدن داری

یہاں تک کہ صبح کاذب نمودار ہوگئی۔ دور دور کی مسجدوں سے اللہ اکبر کی آواز آنے لگی۔

ہم سمجھے کہ اندھیری رات تو جوں توں کٹ گئی اب صبح ہو چلی ہے دن کے اجالے میں کوئی نہ کوئی بچاؤ کی صورت نکل ہی آئے گی یہ نہ سمجھے کہ دن کی روشنی رات کی ظلمت سے زیادہ ظالم ثابت ہوگی۔

اس پر لطف بیداری سے رات کا خوش خواب ہی غنیمت رہے گا۔ یعنی صبح کے وقت ندی کی زد سے فصیل شہر کا ایک حصہ گر پڑا فصیل گرنے کی وجہ سے اس کا سمٹا ہوا زور دور دور پھیل کر ہماری طرف بھی منتقل ہو گیا اب تک پانی میں صرف چڑھاؤ تھا بہاؤ نہ تھا مگر فصیل گرنے کے بعد پانی اپنی اصلیت (یعنی روانی) پر آ گیا اور وہ چھپر جس پر ہم اب تک جان ہتھیلی پر لیے بیٹھے ہوئے تھے طوفانی کشتی کی طرح ڈگمگانے لگا۔ ابا کچھ کر گرنے سے پیشتر ہی ہم نے اہتمام سے کہ ابھی رونہیں سو جا ہمیشہ کے لیے سو جا ہمارے ہوش و حواس اس وقت بھی قابل تعریف تھے کہ ہم نے بیوی سے مہر معاف کرا لیا اور ماں کے قدموں پر سر جھکا کر اپنی گذشتہ نافرمانیوں وغیرہ کی معافی مانگ لی۔ اب چھپر آہستہ آہستہ دھارے کے ساتھ سطح آب پر بہنے لگا جائیں کھمبوں سے نکلنے کے قریب ہو گئیں۔ ماں نے گھبرا کر پوچھا بیٹا! اب کیا کیا جائے۔ ہم نے کہا اگر کوئی بڑا اور چوڑا تختہ مل جاتا تو اس پر بیٹھ کر بہتے ہوئے چلے جاتے۔ پھر آگے جو پیش آئے۔ اس کہنے کے ساتھ ہی والدہ نے ایک تختے کی طرف اشارہ کیا جو بہتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا جب بالکل ہی قریب آ گیا۔ ہم تختے کے شوق میں بغیر اس خیال کے کہ بچی کاندھے پر بیٹھی ہوئی ہے پانی میں کود پڑے۔ والدہ نے بچی کو فوراً اٹھا لیا۔ ہم تختے کی طرف بڑھے چلے گئے تختہ لانے کو چلے تھے پانی کا دھارا ہم کو بہا لے چلا۔

تقدیر میں جب تک ماں بیوی کا ساتھ دینا لکھا تھا دے چکے۔ اب ماں دیکھ رہی ہے بیٹا بہا چلا جا رہا ہے اور جانا بھی ایسے جیسے کوئی کمان سے تیر نکلتا ہے۔ یہاں تک کہ بہتے بہتے ایک درخت کے قریب پہنچ کر اس کی جھکی ہوئی ڈالی کو پکڑ لیا اور ساتھ ہی پلٹ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ہم اس وقت اپنے ساتھیوں سے تقریباً سو گز دور ہو گئے تھے۔ ہم نے وہیں سے چلا کر آواز دی کہ بچی کو کسی بہتے ہوئے صندوق میں بند کر کے بہا دو۔ ممکن ہو تو میں اس طرف سے نکال لوں گا اور تم بھی کسی تختہ وغیرہ کا سہارا لے کر اپنے آپ کو دریا کی موجوں کے حوالے کر دو۔

قدرت کی نیرنگیوں کے تماشے دیکھتے جائیے۔ اس کہنے کے بعد ہی والدہ کے سامنے مختلف سامانوں کے ساتھ ٹین کا ایک بڑا صندوق بھی بہتا ہوا آ گیا۔ والدہ نے فوراً اس کو پکڑ بھی لیا اور چاہا کہ موتی کی طرح بچی کو صندوق میں بند کر کے بہا دیں مگر قسمت کی بات صندوق مقفل نکلا والدہ نے بچی کے ساتھ پھر مجھے پکار کر کہا بیٹا! صندوق تو قفل لگا ہے۔ پھر صندوق کو چھوڑ کر ایک بڑی شہتیر پکڑ لی اور اپنی بہو کو بھی اس کے تھام لینے کی ہدایت کر کے اپنے آپ کو دریا کے حوالے کر دیا۔ یہ ہوا کہ راستہ چند قدم ہی طے ہوا تھا کہ بیوی کے ہاتھ سے شہتیر نکل گئی پھر پتہ نہ چلا کیا ہوئیں۔

تھوڑی دیر کے بعد والدہ بھی نہ سنبھل سکیں شہتیر سے دور جا پڑیں کبھی ڈوبتی ہیں کبھی اچھلتی ہیں کبھی صرف سر کے بال نظر آتے ہیں کبھی زور کر کے ابھرتی ہیں تو کچھ صورت بھی نظر آ جاتی ہے مگر ایک جھٹکے تک پھر ڈوب جاتی ہیں۔ آہ! آہ!! ان تمام طوفانی مناظر میں یہ منظر جو کچھ تھا اس کا اندازہ ہمارے سوائے شاید ہی کوئی کر سکے۔

ہم درخت سے یہ سب حالات دیکھ رہے ہیں ہر وقت قصد ہوتا ہے کہ پانی میں کود پڑوں۔ ماں تک پہنچ جاؤں۔ مگر دھارے کی مخالف سمت کچھ زور نہیں چل سکتا۔

خدا کی قدرت والدہ خود بخود بہتی ہوئی ایک درخت کے قریب پہنچ گئیں جو ہم سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا ہم نے فوراً آواز دی۔ ماں!

تم درخت تک پہنچ گئی ہو تمہارے سر پر ڈالیاں بھی ہوں گی فوراً کسی ڈال کو پکڑ لو۔ ماں نے بیٹے کی آواز سن لی۔ اسی عالم بدحواسی میں ہاتھ بڑھا کر ایک پتلی سی ڈال پکڑ لی اور ہماری طرف دیکھ کر کہا۔ اے بیٹا! میرے دونوں چاند ڈوب گئے (یعنی بہو اور پوتی) ہم نے کہا خیر جو ہوا ہوا تم کسی طرح بچ جاؤ۔ ماں نے کہا، بچی کمر سے بندھی ہوئی ہے جو پانی میں لٹک گئی ہے جس کی وجہ سے میں اوپر ابھر نہیں سکتی۔ ہماری والدہ کی یہی ایک آخری بات تھی جو ہمارے کانوں تک پہنچی اب معلوم ہوا کہ والدہ نے اپنا دوپٹہ نکال کر نصف اپنی اور نصف بچی کی کمر سے باندھ دیا تھا کہ بچی کہیں ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے انہوں نے بچی کی جان بچانی چاہی، بچی بیچاری ان کو ڈبو رہی ہے۔ اب تک تو وہ بچی کو نہیں چھوڑنا چاہتے تھے اب بچی ان کو نہیں چھوڑنا چاہتی ہماری شان بھی اس وقت تصویر لینے کے قابل تھی۔

جس درخت پر ہم چڑھے ہوئے تھے اس کو ایک لمبی ڈال کے سوائے جو بہت اونچی چلی گئی تھی کوئی اور ٹہنی یا ڈال نہ تھی جس پر ہماری طرح کئی سانپ اور کنکھجورے پہلے ہوئے تھے ہم اس وقت اسی ڈال پر ٹیک لگائے ہوئے اپنی ماں سے گفتگو کر رہے تھے والدہ کی مذکورۃ الصدر آخری بات سننے کے بعد وہ ڈال جو ہماری پشت پناہ تھی تڑ سے ٹوٹ گئی ہم اس کے ساتھ پانی میں گر گئے گر کر پھر جو ابھرے بے ساختہ ہماری زبان سے نکل گیا۔ اماں میں تو چلا، کاش ہماری زبان بند ہو جاتی۔ ہمارا حلق بیٹھ جاتا کیونکہ اس آواز کے ساتھ ہی گھبرا کر انہوں نے ہماری طرف دیکھا اور وہ پتلی سی ڈال بھی ہاتھ سے چھوٹ گئی ماں کے دو چاند کی طرح ہمارا ایک چاند بھی پانی میں ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا۔ انا للہ۔

طاقت نہیں دست و پا میں بے زور ہو رہے ہیں   پامالِ زمانہ صورتِ مور ہو رہے ہیں
اماں ادا سمجھا کر جہاں میں خوش رہوں   تم ہو بے گور زندہ در گور ہو رہے ہیں

ہم ننگ خاندان، خاندان کو ڈبو کر ڈوبتے تیرتے ندی کے زبردست دھارے میں بہے چلے جا رہے تھے دور سے اس قسم کی دو دھاریں نظر آئیں، سیدھے خط کی زبردست دھار بخط مستقیم نئے پل میں کھینچ کر بہنے والے کو ٹھیک موت کے گھاٹ اتار رہی تھی دوسری کمانی شکل کی کمزور دھار زنانہ ہسپتال کے جنوبی جانب سے ہوتی ہوئی نئے پل تک جا رہی تھی۔ ہم بہتے بہتے ان دونوں دھاروں کو دیکھتے اور سوچتے جا رہے تھے اگر سیدھے خط میں جا پڑے تو ٹھیک موت کے منہ میں پہنچ جائیں گے اگر دوسری کمانی دھارے گزرتے ہیں تو کچھ زندگی بچنے کی امید ہو سکتی ہے۔ مگر دونوں صورتیں اپنے اختیار سے باہر اور امکان سے دور تھیں بارہ گھنٹے پانی میں بہتے رہتے غوطے کھاتے کھاتے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے جسم کی تمام طاقت بھی وداع ہو گئی تھی اسی سوچ بچار میں بجلی کی رفتار سے پل نقطۂ تقاطع تک پہنچ گئے اور وہی ہوا جس کا کھٹکا لگا ہوا تھا یعنی سیدھی دھار بہتے چلے، موت کا یقین قطعی ہو گیا تھا انا للہ پڑھ کر آنکھیں بند کر لیں ایسے وقت میں خیال آیا کہ نہ معلوم ہماری لاش کدھر بہے کہاں نکلے، کون نکالے ہمارے ویسٹ کوٹ کی جیب میں پاکٹ ہے۔ پاکٹ میں کچھ روپیہ ہے جو مرنے والے کو روپیہ جیب میں رکھ کر مرنا بڑی شرمناک بات ہے لوگ ہماری جیب ٹٹولیں گے روپیہ نکالیں گے ہماری خساست پر نفرت کے ساتھ لعن طعن کریں گے یہ خیال الفاظوں میں بہت دیر میں ادا کیا گیا مگر ذہن میں ایک بجلی کی چمک سے زیادہ وقفہ نہ ہوا۔ خیال کے ساتھ ہی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا پاکٹ بھی کچھ جیب سے نکلی ہوئی گویا نکلنے کو تیار ہی بیٹھی ہوئی تھی خود بخود ہاتھ آ گئی۔ چھوٹی سی سیاہ چرمی پاکٹ کو ہاتھ میں لے کر اسی زور اور نفرت سے پانی میں پھینکا جس طرح کوئی طاعونی چوہے کو پھینکتا ہو بچانے والا پاکٹ اندازی کی آڑ میں سب کچھ کر گیا۔ بظاہر ہم اپنے اسی زندگی زور سے اس خوفناک دھارے سے نکل کر دوسری کمزور دھار میں جا پڑے اور اسی دھار میں کچھ ڈوبتے اور زنانہ ہسپتال کے محاذ میں آنے کے بعد ہسپتال کی بیماروں نے ڈوبتے کو بچا لیا اور ملنے ہی روپیہ دے کر جان چھڑا دی۔

خدا کرے کہ ملک الموت جان لے کر ایمان چھوڑ دے۔ بہادری طرح صدہا جوان بچے بوڑھے مرد اور عورتیں کچھ ہم سے دور کچھ نزدیک بہے چلے جا رہے تھے کسی کو کسی سے سروکار نہ تھا۔ نہ معلوم ہم میں کیا سرخاب کا پر لگا تھا اور ہماری زندگی کی ابھی کیا ضرورت تھی کہ خواہ مخواہ بچا لیے گئے۔ کاش اس بچنے سے بچ جاتے۔

ہر آن مصیبت اک نئی پڑتی ہے — جو پڑتی ہے جان پر کڑی پڑتی ہے
چوٹیں کھاتا ہے شیشۂ دل دن رات — جیسے گھنٹے پہ موگری پڑتی ہے

بے غیرتی بلا دور، ننگ خاندان اور خاندان کو ڈبو کر، عزیزوں کو کھو کر نکلے وہ حشر نکلے۔ بھیانک صورت، ڈراؤنا چہرہ لیے جل مانس بنے ہوئے ہم کنارے تو لگ گئے۔ بہنے والے بہہ گئے، ڈوبنے والے ڈوب گئے۔ گئے اور ایسے گئے کہ لاشوں تک کا پتہ نہ چلا۔

سیلاب میں جسم زار گویا خس تھا — غرقاب محیط غم کس و ناکس تھا
اتنے دریا میں بھی نہ ڈوبا امجد — غیرت والے کو ایک چلو بس تھا

باپ کا وہ قصہ ہوا، ماں کا یہ حال، ایسے برخوردار کی بلند اقبالی میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔

کس وقت دل غمزدہ مغموم نہیں — رونے دھونے کی کس گھڑی دھوم نہیں
قبر مادر تو خیر بنی ہی نہ سکی — لیکن گور پدر بھی معلوم نہیں

عقدِ ثانی

دو دل اک ہوں تو نخل جاں پھلتا ہے — دل گود میں حسن و عشق کی پلتا ہے
امجد! بجلی کی روشنی کے مانند — دو تار سے زیست کا دیا جلتا ہے

اس عظیم اور ہیبت ناک خانہ بربادی کے بعد برسوں شادی کا خیال تک نہ ہوا۔ مدرسہ کی نوکری کرتے، مولوی سید نادر الدین صاحب سے دو ایک سبق پڑھتے زندگی کے دن بسر کرتے تھے.... اس تباہی کے چھ سال بعد.... ان کی بڑی صاحبزادی جمال النساء سے ۵ ماہ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ بروز جمعہ کو عقد ہو گیا۔ جن کا دوسرا نام ہم نے سلمیٰ رکھا تھا۔ مولوی صاحب کو بھی اس لڑکی سے خاص محبت تھی اسلیے ان کی تعلیم میں خاص طور پر [illegible] تیرہ سال کی عمر میں بیاہی گئیں۔

ہم نے رو دھو کے ڈوب کر نکلنے اور موت کا تلخ مزا چکھنے کے بعد یہ عہد کر لیا تھا کہ اب جب تک زندہ ہیں اس موت کا راز معلوم کرنے میں بسر کریں گے اور موت (جس کی جاں فرسا تکلیف سے ابھی ابھی واقف ہو چکے ہیں) کے آسان ہونے کی فکر میں لگے رہیں گے.... اپنی سی بہت کچھ کوشش کرتے، وظائف پڑھتے، نوافل پڑھتے، ہر بندے سے خدا کی راہ دریافت کرتے۔ جو کہتا یہی کہتا ہے۔

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند — تہی خمخانہا کردند و رفتند

اسی لیل و نہار میں ایک دفعہ ہم اور سلمیٰ چولہے کے پاس بیٹھے ہوئے یونہی اپنی کھچڑی پکا رہے تھے۔ سالن چولہے پر چڑھا تھا، نیچے آگ جل رہی تھی۔ ہم دونوں گفتگو میں محو تھے یکایک ہم پر ایک کیفیت سی طاری ہوئی ہم کہتے کہتے چپ ہو گئے اور اسی خاموشی میں بچوں کی طرح کوئلہ لے کر کچھ دیوار پر لکھنے لگے۔ اس وقت سلمیٰ کسی کام کے لیے اٹھ گئی تھیں اس کیفیت سے فارغ ہو کر ہم بھی وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور کمرے میں چپ چاپ لیٹ رہے۔ سلمیٰ سالن کی خبر لینے پھر چولہے کے پاس گئیں۔

سالن کی جگہ دیوار پر نظر پڑی کوئلہ کی لکیروں کو غور سے دیکھا، لکیروں میں حروف، حروف میں الفاظ، الفاظ میں مصرعے نظر آئے۔ اچھی

طرح پڑھا اور خوب یاد کر کے ہمارے پاس دوڑی ہوئی آئیں اور کہنے لگیں۔ لیجئے ایک معمولی سی بات برسوں کے بعد آج سمجھ میں آئی آج خیرالفال ہو یا خوردند و رفتند کا خاتمہ ہو گیا . . . . مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے ابھی ابھی دیوار پر لکھی ہوئی رباعی نظر آئی شاید آپ ہی نے لکھی ہے جس نے میرے دل سے آپ کے بتائے ہوئے نقش قدیم کو خیرالفال بنا دیا خوردند و رفتند کو دل سے مٹا کر فضل الٰہی کا منتظر بنا دیا، اور مغضوب علیہم کے خار زار سے باہر لاکر انعمت علیہم کی تسکین بخش جنت تک پہنچا دیا۔ سنئے، آپ بھی سنئے، وتعز من تشاء وتذل من تشاء۔

ہر ذرے پہ فضل کبریا ہوتا ہے　　اک چشم زدن میں کیا سے کیا ہوتا ہے
اصنام دلی زبان سے یہ کہتے ہیں　　وہ چاہے تو پتھر بھی خدا ہوتا ہے

ان ربک لذو فضل علی الناس ولکن اکثرھم لا یشکرون ۝

تاریخی رات

یوں تو سلی کی حالت میں کیفیت میں طبیعت میں روزانہ کوئی نہ کوئی ترقی ہوتی ہی جاتی تھی لیکن ۸ صفر [illegible] کی رات ہماری تمام زندگی کی تاریخی رات ہے۔ اس رات بہت دیر تک حسن و عشق پر گفتگو ہوتی رہی تھی۔ حسن ازل کے کرشموں کے ساتھ ساتھ عاشقانِ حقیقی کا بھی تذکرہ ہو رہا تھا۔ سینوں میں حیرت انگیز جذبات کا تلاطم تھا ہر ایک ہوش و حواس رکھتے ہوئے اپنی لذت اور کیفیت میں گم تھا۔

ہم بلا قصد و ارادہ حسن و عشق میں ڈوبی ہوئی رباعیاں کہتے جاتے تھے اور وہ لکھتی جاتی تھیں۔ سنتے سنتے سُن ہو کر سو گئیں تقریباً پونے گھنٹے کے بعد پھر جو بیدار ہوئیں سنبھلنا مشکل ہو گیا۔ اور اوضاع و اطوار میں فرق آ گیا۔ گہری نیند نے جھنجھوڑ کر خواب غفلت سے جگا دیا۔ سوتی تھیں جیتی اٹھیں۔ جلال جمال کا مظہر بنی ہوئی تمتماتا ہوا چہرہ، نیم باز آنکھیں آنکھوں میں آنسو لب پر تبسم چاہتی کچھ تھیں کہتی کچھ تھیں۔ نئے نئے الفاظ عجیب عجیب ترکیبیں، مثلاً ؎

شمس جلال کا وہ ذرہ بے تاب ہوں میں　　کہ کبھی ہاتھ میں ہوں اور کبھی نایاب ہوں میں

کبھی مختصر لفظوں میں حسن و عشق کی تفسیر، مثلاً ؎

کبھی حسن ہے تو کبھی عشق ہے تو　　کبھی کھینچتا ہے کبھی کھنچ رہا ہے

کبھی اضطراب و مایوسی کے ساتھ نظر آنے والی ہستی کو نظر نہ آنے والے طریقے پر پانا، مثلاً ؎

ایک مدت سے پڑی ہے مری نگری سونی　　اپنی بستی مری بستی میں بسانے آ جا

کبھی نظر نہ آنے والی نشانیوں کو شمار حضرت بے نشان کی نشان دہی، مثلاً ؎

نشاں رامبیں، کایں نشاں بے نشان است　　مکاں صد ہزار و مکیں لامکان است

یہ کیفیت دیکھ، یہ اشعار سن کر تھوڑی دیر کے لیے تو ہمارے حواس بھی غائب ہو گئے، سہم سہم گئے، لرز لرز گئے۔ مگر پھر بھی یہ ہوشیاری کی کہ جو کچھ انھوں نے کہا تھوڑا بہت نوٹ کر لیا لیکن حرف حرف انھوں نے کیا کہا ہم نے کیا سنا نہ بیاں میں آ سکتا ہے نہ زباں پر۔ سچ بھی یہ ہے کہ رات گئی گئی، جس کی بات اس کے ساتھ گئی۔ اس تاریخ کے بعد سلی وہ سلی نہیں رہیں جن کو ہم سمجھایا پڑھایا کرتے تھے اب تو وہ ہمیں کو سمجھانے اور پڑھانے کیلئے تیار تھیں۔ ہم ایک ایک کر پوچھا کرتے، وہ جگہ جگہ کر جواب دیا کرتیں۔ مادیت، روحانیت سے، روحانیت حیرت سے، [illegible] متبدل ہو گیا

روز افزوں رہی تھی شان جمال　　حسن [illegible] بیروں شدم از خیال

الکمال مقدمۃ الزوال

جلال سلمہٗ نے ۱۳۳۲ھ میں ہمارے ساتھ حج و زیارت کے لیے روانہ ہوئیں۔ تمام سفر حمل اور صعوبات سفر کی وجہ سے مسلسل چھ مہینے تک بیمار رہیں۔ اسی حالت میں حج و زیارت کی سعادت حاصل کرکے ۱۰ محرم ۱۳۳۳ھ کو وطن واپس ہوئیں۔ واپسی کے دو مہینے بعد وضع حمل ہو کر جلال سلمہٗ کی مثال ایک حسین و شکیل بچہ پیدا ہوا...... لیکن وہ چار ہی دن میں بچے نے ماں سے منہ پھیر لیا اور ماں نے اس کو گود سے الگ کرکے قبر کے آغوش میں دے دیا۔ پھر بچے کی مفارقت کے دو چار دن بعد ۱۹ ربیع الاول ۱۳۳۳ھ وقت نماز جمعہ سفر زندگی کے تیئیس ۲۳ منازل طے کرکے کسی چپ چاپ آنے والے کے خیر مقدم اور خاموش بلانے والے کی صدا پر لبیک اللھم لبیک کہتی ہوئی ارجعی الی ربک کی طرف چل دیں۔

جلال یہ لکھتے وقت بعض احباب پوچھتے تھے کہ اس میں غالباً آپ کے تفصیلی حالات ہوں گے، تصویر ضرور ہوگی، اساتذہ کے اسماء ہوں گے، احوال کا نقشہ ہوگا، شاعری اور رباعیات پر تبصرہ ہوگا، یہ ہوگا وہ ہوگا۔ اس لیے ان سوالات کے جواب میں ہم سید محمد حسین متخلص بہ تجمل ساکن حیدرآباد دکن عمر تقریباً ۴۰ سال ابن سید رحیم علی مرحوم ابن سید کریم حسین پیشہ ملازمت لکھ دیتے ہیں اس بات پر کہ....

حلیہ ہمارا رنگ گندمی ہے، وہ گندم جس کی بدولت بابا آدم جنت سے دنیا میں اور ہمارے بابا دنیا سے جنت میں بھیجے گئے۔ قد دو گز سے دو انچ کم۔ سر شانہ اسٹری کا آدھا عالم برست، سادہ پیشانی، بھویں، آنکھ، کان، متوسط، نیچے کچھ چھوٹے۔ رخسار کسی قدر دبے ہوئے، مختصر سی ڈاڑھی اور رنگ گندمی، سینہ چوڑا اگر بیچ سے دو انچ کم ہو تو نہ رہا۔ مذہب یہی ہے کہ ابتدائی جوانی سے اب تک ایک حال پر بال برابر فرق نہیں۔ اس کا ثبوت یہ کہ جو جسم ہے اس وقت بھی الحمدللہ انقلاب بھی اسی طرح نہیں اٹھ سکی۔

تعلیم اور اساتذہ۔ الف۔ ب سے قرآن مجید گھر ہی میں ختم کیا۔ پھر تعلیم مدرسہ نظامیہ میں ہوئی۔ پانچ برس تک روزانہ دال چاول کھاتے اور ہفتہ واری گوشت کی ایک ایک بوٹی پر لڑتے ہوئے مولوی سعید الدین صاحب سہارنپوری اور مولوی عبدالوہاب صاحب بہاری سے جامع تک تعلیم پائی۔ چند روز ہم ادعات ہی حق مولوی عبداللہ صاحب روزانہ مدرسے سے مولا کے پہاڑ (جو شہر سے دس میل ہے) الگ جاکر آغا شوستری صاحب سے شافیہ، دستور المبتدی وغیرہ بھی پڑھتے رہے۔ مرزا محبوب علی بیگ صاحب سے کچھ فارسی بھی پڑھی۔ انہی دنوں میں پنجاب کے امتحانوں میں بھی شریک ہوئے۔ اسی زمانہ میں ہم الاخلاق کے نام سے اخلاق جلالی کے لامعہ سوم کا ترجمہ کیا۔ منشی فاضل کے جواب مضمون کا پرچہ جواب لکھا گیا۔ کئی عنوانوں میں ایک عنوان دوات قلم کا مناظرہ بھی تھا۔ ہم نے اسی مضمون پر قلم اٹھایا۔ تین گھنٹے میں علاوہ نثر کے پچیس پچاس شعر لکھ ڈالے جن میں تین شعر جو زبان قلم سے ادا ہوئے تھے اب تک یاد ہیں ـــ

منم کہ با قلمم گفت حضرت باری — منم چو طرۂ زلف بتان تاتاری
منم شبیہ کہ پیدا شدہ ز نیلی و ارم — منم ربیع کہ برگوش کاتبان سخن
منم کہ چوں الف اللہ ہست قامت من — منم چو سرو کشیدہ بہ بوستان سخن

آخری زمانہ میں مولوی سید نادر الدین صاحب سے حمداللہ تک کتابیں پڑھیں۔

شاعری

شاعری کا شعور پندرہ سولہ سال کی عمر میں پیدا ہوا۔ واقعہ یہ ہوا کہ مدرسہ نظامیہ میں کہیں سے شیخ ناسخ کا دیوان ہاتھ لگ گیا۔ کئی دن اسی دیوان کو غالباً بغیر سمجھے ہی پڑھتے رہے۔ پڑھتے پڑھتے کچھ موزونی آ گئی۔ سمجھتے سمجھتے آخر ایک شعر ہم نے بھی کہہ ڈالا جو یہ ہے۔

نہیں کم گر یہ دشمن ہو گیا ہے آسماں اپنا — مگر یارب نہ ہو نامہرباں وہ مہرباں اپنا

پھر اردو سے فارسی پر جا پہنچے کہ فارسی میں سوائے گلستان کے اور کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی۔ اسی کو پڑھتے رہے۔ پڑھتے پڑھتے آخر ایک فارسی شعر زبان پر آ ہی گیا جو یہ ہے۔

بسان سایہ لطف آفتابم پیش پا افتد
اگر خورشید محشر را نظر بر داغ ما افتد

ہماری پہلی نظم جو تقریباً بیس بائیس سال کی عمر میں لکھی گئی "معیار انسان" ہے اور پہلی غزلیں ان سلسلت بیاد ربیع الصبا پر ہوئیں۔ فارسی کی چند غزلیں علامہ ترکی صاحب کو اور اردو کی چند غزلیں حبیب صاحب کنتوری کو دکھائیں۔ . . . . بیعت۔ بیعت میں ہمارا سلسلہ حضرت شمس الدین فیض دہلوی علیہ الرحمتہ سے ملتا ہے اور یہ بھی بچپن کی بات ہے جوانی میں نہ تو مرید ہوئے۔ اب نہ وہ جوانی ہے نہ وہ پیر ہے۔ نہ عبادت ہے نہ ذکر ہے۔ اب تو صرف جلد اور ایمان پر مرنے کی فکر ہے۔

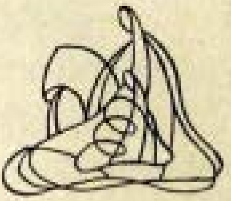

گورکی

ایک تنگ و تاریک کمرے میں کھڑکی کے پاس میرا باپ زمین پر پڑا ہوا تھا۔ وہ ایک بہت لمبی سفید چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ اس کے ننگے پاؤں کی انگلیاں عجیب طریقے سے پھیل گئی تھیں۔ ہاتھ سینے پر بے حرکت پڑے تھے اور ان کی انگلیاں ٹیڑھی ہو گئی تھیں۔ اس کی مسکراتی ہوئی آنکھیں تانبے کے دو ٹکڑوں کے بار سے بند تھیں۔ چہرے کا نور اڑ چکا تھا اور وہ جس بھیانک ڈھنگ سے اپنے دانت دکھا رہا تھا اس سے مجھے وحشت ہونے لگی۔

ایک سرخ سائے سے اپنا نیم جسم ڈھانکے ہوئے میری ماں دو زانو بیٹھی تھی اور بابا کے نرم دراز بالوں کو اسی کالی کنگھی سے سلجھانے لگی جس سے میں تربوز کے چھلکے اتارنے کا کام لیا تھا۔ وہ اپنی بھرائی ہوئی رسیلی آواز میں لگاتار بڑبڑاتی جاتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ آنسوؤں کی موسلا دھار جھڑی اس کی سرمئی سوجی ہوئی آنکھوں کو بہا لے جائے گی۔

رگِ جاں سے قریب

میری نانی میرا ہاتھ تھامے ہوئے تھی۔ اس کا سر بڑا اور گول تھا۔ آنکھیں چھپی چھپی اور ناک پھولی پھولی سی۔ اس بڑھیا کی شخصیت بہت دلچسپ تھی۔ وہ رو بھی رہی تھی اور اس کا دکھ میری ماں کے غم سے کسی طرح کم نہ تھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک بار اس نے مجھے بابا کی طرف دھکیل دیا۔ لیکن خوف و ہراس کے مارے میں اس کے پیچھے چھپ گیا۔ اس سے پہلے میں نے عمر رسیدہ لوگوں کو کبھی روتے نہ دیکھا تھا۔ نہ وہ الفاظ میری سمجھ میں آئے جنہیں میری نانی بار بار دہراتی جاتی تھی۔

"بابا کو خدا حافظ کہہ دے! اب تو اسے کبھی نہ دیکھے گا.......... وہ مر گیا۔ ہائے کیسا مرد چلا گیا!"

نانی نے پوچھا: "تو روتا کیوں نہیں؟ تجھے رونا چاہیے۔"

میں نے جواب دیا: "میں رونا نہیں چاہتا۔"

اس پر نانی نے نرمی سے جواب دیا: "تیری مرضی نہیں تو نہ رو۔"

مجھے تعجب ہوا کیونکہ میں بہت کم روتا تھا اور روتا بھی تھا تو غصے میں، دکھ درد میں نہیں۔

اس سے ملنے سے پہلے میں گویا سویا ہوا سا اور تاریکی کے لحاف میں چھپا ہوا سا تھا لیکن جب وہ آئی تو اس نے مجھے جگایا اور دن کے اجالے میں لا کھڑا کیا۔ میرے تاثرات کو اس نے ایک ہار میں پرویا اور انہیں رنگارنگ کی لڑیوں میں گوندھا۔ اس طرح وہ ہمیشہ کے لیے میری غمخوار بن گئی۔ وہ میری رگِ جاں سے قریب ہے اور اس کی یاد مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ کائنات کے لیے اس کی بے لوث محبت نے میری شخصیت کو مالا مال کیا اور مجھے وہ قوت بخشی جو ایک پرخار زندگی کے لیے از بس ضروری ہے۔

مجھے نانی کی وہ طفلانہ مسرت ہنوز یاد ہے جو نجنی کو دیکھ کر اسے ہوئی تھی۔ ہاتھ پکڑ کر اس نے مجھے آغوش میں کھینچ لیا اور چیخ کر کہا: "دیکھ وہ کس قدر خوبصورت ہے [illegible]" ایک پستہ قد سیاہ پوش بڑھیا جس کی ناک خربوزے کی سی، آنکھیں سیاہی بھری اور وہ بھی کچھ گلابی کچھ سنہری سی تھی،

دوسروں کو دھکیلتے ہوئے ہماری طرف بڑھا: "ابا جان!" زخمی آواز میں یہ کہتی ہوئی میری ماں اس کے گلے سے چمٹ گئی۔

اب حیرت ناک سرعت سے ایک ہنگامہ خیز رنگا رنگ زندگی کا دھارا رواں ہوتا ہے۔ مدت دراز کے بعد آج جو میں ماضی کی ورق گردانی کرتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ حقیقت یہی ہے اور بار بار جی چاہتا ہے کہ میں اس کی تردید یا تاویل کروں۔ ایک بے چارے رشتہ دار کی زندگی وہ سوہان روح ہے جس کا خیال اک الجھن رہ ہے لیکن حقیقت رحم سے زیادہ قوی ہے اور پھر میں آپ بیتی نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ اس تنگ و تاریک ماحول کا مرقع پیش کر رہا ہوں جس میں اس طبقے کا ایک عام روسی رہتا تھا اور اب بھی رہتا ہے۔

میرے نانا کے گھر میں باہمی رقابت اور کدورت کا بازار گرم رہتا تھا۔ بڑے ہی نہیں بلکہ بچے بھی اس مرض میں مبتلا رہتے تھے۔ اتفاق سے نانی کی زبانی یہ بھنک میرے کان تک پہنچی کہ میری ماں جس دن آئی اسی روز سے اس کے بھائیوں نے نانا سے جائداد کے بٹوارے کا مطالبہ کیا۔ ماں کی اچانک آمد سے انہیں ایک نیا بہانہ ہاتھ آ گیا کیونکہ وہ ڈرتے تھے کہیں ماں اپنا جہیز نہ مانگے جو نانا نے اس لیے نہیں دیا تھا کہ اس نے ان کی مرضی کے خلاف خفیہ شادی کر لی تھی۔ میرے ماموں مصر تھے کہ یہ جہیز ان سب میں بانٹ دیا جائے۔ علاوہ بریں وہ آپس میں اس بات پر عرصے سے لڑ رہے تھے کہ شہر یا ملحقہ گاؤں میں ان میں سے کون نیا کارخانہ قائم کرے گا۔

آسمانی باپ

شرمیلی ممانی نتالیا دھیمی آواز سے مجھے پڑھایا کرتی تھی۔ وہ بڑی نرمی سے کہتی تھی: "بہت بہتر........... اب کہو آسمانی باپ تیرے نام کی تقدیس باقی رہے۔" اگر میں پوچھتا تھا کہ نام کی تقدیس کیا چیز ہے؟ تو وہ سہم کر ادھر ادھر دیکھتی اور مجھے ڈانٹتی کہ بحث نہیں کیا کرتے، یہ گناہ ہے۔

اس بات سے مجھے حیرت ہوتی تھی۔ سوال پوچھنا گناہ کیوں ہے؟ نام کی تقدیس...... یہ الفاظ میرے ذہن میں کسی پُراسرار منتر کی طرح جم گئے اور میں موقع بے موقع ان کا غلط سلط استعمال کرنے لگا۔

ایک روز نانا نے پوچھا: "اولیشا آج تو کیا کرتا رہا ہے؟ کھیل؟ تیرے ماتھے کی چوٹ تو یہی ظاہر کرتی ہے۔ چوٹ لگانا مشکل نہیں اور آسمانی باپ کا کیا ہوا؟ تو نے اسے یاد کیا؟"

ممانی نے آہستہ سے کہا: "اس کی یادداشت بہت خراب ہے۔"

یہ سن کر نانا کی باچھیں کھل گئیں اور ناک بھوں چڑھا کر بولے: "اس سے کیا۔ اس کا واحد علاج بید ہے۔"

پھر مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا: "کبھی تیرے باپ نے تجھے ٹھونکا تھا؟"

میری سمجھ میں بھی نہ آیا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ اس لیے میں خاموش رہا۔ لیکن میری ماں نے جواب دیا: "نہیں میکسم نے اسے کبھی ہاتھ نہیں لگایا اور نہ مجھے اس کی اجازت دی۔"

نانا نے مجھے اتنا پیٹا کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ میں کئی روز بیمار رہا اور ایک چوڑے پلنگ پر اوندھا پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ اس غم آگیں زمانے نے میری زندگی کی کایا پلٹ دی۔ میری طبیعت میں ایک عجیب انقلاب ہو گیا اور میں اپنے میں خود ایک حیرت انگیز تغیر محسوس کرنے لگا۔ میرے دل میں دوسروں کی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا اور میں اپنے اور ان کے دکھ درد کا احساس کرنے لگا گویا میرے دل کو چیر کر کسی نے اس میں سوز و غم کا جہاں بسا دیا ہے۔

مجھے نانی کا غم بہت ستاتا تھا کیونکہ وہ اس سے اتنا قریب تھا۔ ایک روز وہ دونوں بیٹھی دونوں اس سے باز دینے کی باتیں کر رہی تھیں کہ نانا دروازہ کھول کر چلا آیا۔ مجھے ڈرتی ہی ندرنے پھر ایک نیا ستم توڑا گھر میں آگ لگ گئی ہے:

ادھر میں آگ بالکل بجھ گئی اور حرارت بھی معدوم ہو گئی۔ نانا نے پوچھا:

"تم ڈر گئے تھے؟"

"نہیں تو۔"

"شاباش! ڈرنے کی کیا بات تھی۔"

اندھیار کے ساتھ دونوں عورتوں نے اپنی اپنی راہ لی۔ جاکوف شہر میں رہا اور مائیکل نے ندی کنارے ڈیرا ڈالا۔ ادھر نانا نے ایک کٹا ہوا اور ادھام وہ مکان خرید لیا۔ اس زمانے میں کسی نامعلوم مقام سے میری ماں میں چند گھڑیوں کے لئے دیکھنے آجاتی وہ ویسی ہی تند گیر اور دامن کش تھی۔ اپنی بھوری اور بے حس آنکھوں سے زمستان کے سورج کی طرح وہ بس دم بھر دیکھ کر پھر غائب ہو جاتی۔ اس کی یاد دلانے کی کوئی چیز باقی نہ بچی تھی۔

اس گھر میں ہنستے کھیلتے دن کٹ رہے تھے لیکن گاہے گاہے میں آپ ہی آپ مغموم ہو جاتا تھا۔ غم مجھے نڈھال کر دیتا تھا اور میں دیر تک کسی اندھیری کھائی میں ہر قسم کے احساس سے محروم اندھوں اور لاوارث مردوں کی طرح پڑا رہتا۔

شہد کا چھتا

میرا بچپن گویا شہد کا چھتا تھا جس طرح مدھ مکھیاں وہاں شہد لے کر آتی تھیں، سیدھے سادے اور گمنام انسان اپنے تجربے اور مشاہدے لے لے کر میرے پاس آئے اور اپنے تحفوں سے میری روح کو مالا مال کر گئے۔ یہ شہد عموماً ترش اور کسیلا ہوتا تھا، تاہم وہ بھی علم تھا ـــــ اور ہر قسم کا علم شہد ہے۔

یہ سنتے سنتے میں تھک گیا تھا کہ انسانوں پر مظالم ہوتے ہیں، ان کی ہتک کی جاتی ہے اور وہ مصیبتیں سہتے رہتے ہیں۔

ایک سنیچر کو نور کے تڑکے میں رابن چڑیا پکڑنے کے لیے پترونا کی باڑی میں گھس گیا۔ میں پکا شکاری نہ تھا۔ شکار سے زیادہ مجھے اس کا تماشا لطف دیتا تھا اور سب سے زیادہ دلچسپی پرندوں کے طور طریقوں سے ہوتی تھی۔ برف میں بیٹھے بیٹھے اکڑ گیا تھا اور میرے کان گویا جھڑ گئے تھے۔ اچانک جال اور پنجرے سمیٹ کر گھر کی راہ لی۔ وہاں نانا سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس نے میرا کاندھا پکڑ کر ڈھیٹی ہوئی آنکھوں سے مجھے گھور کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "تیری ماں آئی ہے۔" میں اس سے چھوٹ گیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے دیکھنے لگا مگر رقت کے مارے میرا گلا رندھ گیا تھا۔

نانی نے مجھے باہر جانے کا حکم دیا۔ میں باورچی خانے میں جا کر بیٹھ گیا جہاں سے میں ان کی بات چیت بخوبی سن سکتا تھا۔ اس مباحثے کا موضوع ایک بچے کی ذات تھی جو حال ہی میں میری ماں کے پیدا ہوا تھا اور فی الحال کہیں اور پل رہا تھا۔

ماں نے فوراً مجھے باقاعدگی سے درسی پڑھائی شروع کر دی۔ ماں نظم پر جتنا زور دیتی تھی میرا حافظہ اتنا ہی بغاوت کی طرف مائل ہو جاتا تھا اور ان لطیف و ہموار بحروں کو یاد کرنے سے انکار کر دیتا تھا۔ خدا جانے کہاں سے تنتے اور بے تکے بول میرے دماغ میں آ جاتے اور نظم کی صحیح ترکیبوں کو نکال باہر کرتے تھے۔

ماں اب سامنے کے دونوں کمروں میں رہتی تھی اور اس سے ملنے کو بہتیرے مہمانوں کا جمگھٹ رہتا تھا۔ جب کبھی ان رنگیلے مہمانوں کے ساتھ چلی جاتی تو گھر میں برت کا سا سناٹا چھا جاتا۔ بڑے دن کے بعد ماں نے مجھے اور ساشا، مائیکل کے بیٹے کو ساتھ کر اسکول بھیج دیا۔ ان دنوں

میں بہت مصروف تھا۔ میں نے افسر بننے کا فیصلہ کر لیا۔ گھنی داڑھی والا افسر اور اس کے لیے تعلیم از بس ضروری تھی۔ جب میں نے سانتا کو یہ بات بتائی تو وہ بھی سوچ بچار کے بعد میرا ہم خیال ہو گیا۔

اس واقعہ کے دوسرے دن میں نیند سے جاگا تو میرے جسم بھر میں لال پھنسیاں ابھر آئی تھیں۔ یہ چیچک کا آغاز تھا۔ میں پچھواڑے کی کوٹھڑی میں ڈال دیا گیا۔ نانی کے سوا کوئی میرے پاس نہ آتا تھا۔

دوسری نانی

رفتہ رفتہ میں بحال ہونے لگا۔ ایک شام کو میں نانی کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ اچانک اس پر میری نظر پڑی۔ وہ دروازے کے باہر زمین پر منہ کے بل پڑی ہوئی تھی۔ میں لپک کر باہر آنگن میں برف کی نالی میں کود کر میرے ہاتھ پاؤں شیشے سے کٹ گئے۔ اس روز اماں کے یہاں بہت سے مہمان آئے ہوئے تھے۔ کسی نے طرح طرح کی ٹوٹنے کی آواز سنی۔ جسم بھر میں کانچ کی کرچیں اتر گئی تھیں۔ ٹانگیں بھی بیکار ہو گئی تھیں۔ چارپائی پر بیٹھے بیٹھے میں دیا بچاتا۔ صاحب حرکت میں محسوس کرتا تھا کہ مکان میں بے حد شور رہتا ہے۔ معلوم ہوتا کہ آنے جانے والوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا اور دروازے جیسے کھلتے بند ہوتے رہتے تھے۔ اماں شاذ و نادر مجھے دیکھنے کو آتی تھی اور وہ بھی چند ساعت کے لیے۔ وہ اماں بھی بڑی ہوشیاری سے ہوتی تھی گویا جلدی میں ہو۔

ایک مرتبہ دن کے تیسرے پہر میری آنکھ لگ گئی۔ جب میں جاگا تو یکایک محسوس ہوا کہ میری دونوں ٹانگیں بھی جاگ گئی ہیں۔ یاد نہیں پڑتا گھسٹتے ہوئے کیوں کر میں اپنی اماں کے کمرے میں جا پہنچا۔ وہاں کئی اجنبی موجود تھے اور ان میں ایک سوکھی ساکھی سفید پوش بڑھیا نے کرخت آواز میں کہا "بچّے کا عرق پلا کر اس کا سر ڈھک دو۔"

سہم کر میں نے پوچھا "یہ کون ہے؟"

نانا نے مختلف آواز میں کہا "یہ تیری دوسری نانی ہے۔"

اماں ہنستی ہوئی بولیں "یہ بیکسوف کو میرے پاس لائی؟ اور یہ تمہارے ابا ہیں۔"

گائے کہیں کی!

کئی سال ازدواجی زندگی کے پہیے پھرنے کے مانند گزر گئے۔ شادی کے بعد اماں کہیں چلی گئی تھیں اور گھر میں ہو کا عالم تھا۔ نانا کی بات چیت اب میرے لیے بالکل غیر دلچسپ ہو گئی تھی۔ ایام برسات میں اس نے مکان بیچ دیا۔ اب نانا نے ایک ٹیلے کے نیچے کسی دقیانوسی مکان کے تہ خانے میں دو دو ٹھیرے کرائے پر لیے۔ یہاں سے سمرو ماہ کے ایک نئے مکان میں کیوں منتقل ہوئے اس سلسلے کے واقعات اب میں بھول گیا ہوں۔ مجھے باہر جانے کی اجازت اکثر نہ تھی اور میں باہر سے جیسے زخم خوردہ واپس آتا تھا ہر کیا؟ مجھے سختی ہوتا تھا۔ اماں سے اس کے جھگڑے بڑھنے لگے۔ ایک دن وہ میرے پاس کر چلا تھا: "چونکہ تم اپنی حماقت کی وجہ سے گائے بن ہو گئی ہو بس میں کسی دوست کو گھر نہیں بلا سکتا، گائے کہیں کی!"

بعد ضبط میں ہی اماں نے مجھے اسکول روانہ کیا۔ لڑکوں سے جلد میری دوستی ہو گئی مگر ماسٹر اور پادری کے متعلق ایک آن نہ بھایا۔ اس کے باوجود کہ میں ذہین اور محنتی تھا، مجھے کچھ عرصے بعد پتہ لگا کہ جو وہ دودی کے جرم میں میں اسکول سے نکال دیا جاؤں گا۔ دیکھا کریے چھٹکے چھوٹے تھے لڑکی کا انجام میرے سامنے تھا۔ اماں کی بیماری روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اور وہ مجھے بری طرح پکار رہی تھی۔

شام کی چائے کے وقت میں آنگن سے ہو کر باورچی خانے میں داخل ہو رہا تھا کہ اماں کی پُرحسرت آواز سنی: "یوجین! میں تمہارے

پاؤں پڑتی ہوں۔"

سوتیلے باپ نے گھڑک کر کہا: "بک بک نہ کرو۔"

"لیکن میں جانتی ہوں کہ تم اس عورت سے ملنے جا رہے ہو۔"

"ہاں تو کیا ہوا؟"

میں نے صاف سنا کہ اس نے ماں پر وار کیا۔ میں نے میز سے وہ چھری اٹھا لی جو میرے مرحوم باپ کی تنہا یادگار تھی اور جس سے روٹی کاٹنے کا کام لیا جاتا تھا ——— اور پوری طاقت سے سوتیلے باپ کی پسلی میں گھسیڑ دی۔ خوبیٔ قسمت کہ اماں نے اسے گھسیٹ لیا اور چھری اس کی کھال سے اچٹ کر اوور کوٹ کو پھاڑ کر رہ گئی۔

ایک مرتبہ پھر میں نے اپنے کو نانا کے گھر میں پایا۔ گھر کے خرچ کا پیسہ آدھوں آدھ بٹا ہوا تھا۔ ایک روز نانی اپنے پیسوں سے سودا لا کر کھانا پکاتی اور دوسرے دن نانا کی باری آتی ——— میں بھی چند پیسے کمانے لگا۔ چھٹی کے دن صبح سویرے میں ٹوکرا لیے ہوئے نکل جاتا اور سڑکوں اور گلیوں میں کترن اور ہڈیاں، کیلیں وغیرہ چنا کرتا۔ آدھ من لوہے کاغذ یا کترن کے لیے کباڑیا مجھے چونی اور آدھ من ہڈی کے لیے دونی دیتا۔ کوڑا کرکٹ جوڑنے سے زیادہ مفید مشغلہ ندی کنارے ساگوان کے تختوں اور شہتیروں کی چوری تھی۔ ہمارے گاؤں میں چوری کا شمار کسی جرم میں نہ ہوتا۔ یہ ایک رسم عام تھی اور غریب دیہاتیوں کے لیے اس کے سوا روٹی کمانے کا ذریعہ تھا بھی نہیں۔

میرا سوتیلا باپ قرض لینے کے جرم میں نوکری سے برطرف کر دیا گیا اور دوبارہ غائب ہو گیا۔ اماں اپنے چھوٹے بیٹے نکولائی کو لیے ہوئے نانا کے گھر آئی۔ دوپہر کو کھڑکی سے سر نکال کر نانا آواز لگاتا: "کھانا تیار ہے"۔ چند نوالے کھلا کر نانا اس بچے کے چھوٹے سے پیٹ کو انگلی سے ٹٹولتا اور اپنے آپ سے پوچھنے لگتا:

"بس کروں یا چند نوالے اور کھلاؤں؟"

اتنے میں اماں اپنے اندھیرے کونے سے پکار کر کہتی: "دیکھئے وہ روٹی کے لیے ہاتھ پھیلا رہا ہے۔"

"الو کا پٹھا! اسے اپنے پیٹ کا حال کیسے معلوم ہو جاتا ہے؟" پھر وہ نکولائی کے منہ میں کچھ اور بھر دیتا۔

اپنی راہ

ایک دن ہانڈی میں کوئی چیز ابل رہی تھی۔ جلدی میں اس نے کریدنی اس زور سے کھینچی کہ کھڑکی چوکھٹ سے اتر گئی۔ اس پر بڈھا غصے سے چلا اٹھا۔ اس کے باہر جاتے ہی میں نے چھرے سے کریدنی کی مونٹھ کاٹ دی۔ اماں نے مجھے نصیحت کی: "تمہیں ان کے معاملوں میں دخل دینے کی ضرورت کیا ہے؟" اگست کے مہینے میں کسی اتوار کی دوپہر اس کا دم نکلا۔ اماں کی تجہیز و تکفین کے چند روز بعد نانا نے کہا: "میاں الکسی! اب میں تمہارا بار نہیں اٹھا سکتا۔ میرے گھر میں تمہارے لیے جگہ نہیں۔ دنیا میں جاؤ اور اپنی راہ تلاش کرو۔"

اسی دن میں دنیا میں اپنی راہ ڈھونڈنے نکل گیا۔ شہر کے صدر بازار میں جوتوں کی ایک طرح دار دکان پر مجھے شاگرد پیشہ کی جگہ مل گئی۔ چولہے پر کھانا گرم کرتے وقت بے خیالی میں ہنڈیا میرے ہاتھوں پر الٹ پڑی۔ ڈاکٹر نے آ کر میرے پھپھولوں کی مرہم پٹی کی اور سات دن بعد میں نے اپنے کو نانی کے ساتھ گھوڑا گاڑی پر سوار شہر کے گلی کوچوں میں چوکڑیاں بھرتے ہوئے دیکھا۔

جب میں گھر سے نکلا تو کئی بری خبریں سننے میں آئیں۔ یہ اطلاع دیتے ہوئے سیاہ چشم کوستم نے غصے سے کہا: "ڈاکوں ہی کو جلدی

آتی ہے۔"

"یہ دیکھو ایک دیا خریدی تو مرا ہے۔"

"اب تو تمہارے احاطے میں نئے کرایہ دار آ گئے ہیں۔ محرر کا لونڈا آوارہ اشخاص پچھڑوں ہی سا ہے۔ اس کی دو بیٹیاں ہیں ایک تو ابھی بچہ ہے دوسری لنگڑی ہے۔ بیساکھی لے کر چلتی ہے مگر بڑی خوبصورت ہے۔"

لڈملا کی ماں کو پوستینوں کی ایک دکان میں کام مل گیا اور صبح سویرے وہ گھر سے چلی جانے لگی۔ اس کی بہن اسکول کی راہ پکڑتی اور بھائی کارخانے کا رخ کرتا۔ بارش کے دنوں میں لڈملا کے یہاں جاتا۔ چولہے چکی میں اس کا ہاتھ بٹاتا اور کمروں کی جھاڑ پونچھ کر دیتا۔ وہ ہنسی ہنسی میں کہتی: "ہم دونوں تو میاں بیوی کی طرح ساتھ رہتے ہیں بلکہ ان سے بھی بہتر زندگی گزارتے ہیں کیونکہ شوہر اپنی بیوی کی مدد کب کرتا ہے۔"

میرا بھائی گویا ستارۂ صبح کی طرح دیکھتے ہی دیکھتے آنکھ سے اوجھل ہو گیا۔ شام کو سر راہ میں نے لڈملا کو یہ دکھ بھری سنائی لیکن اس پر کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ دنیادار عورتوں کی طرح وہ بھی بڑی سیانی نکلی اور بس اس شام سے میرا دل اس سے اچاٹ ہو گیا۔

از سر نو مجھے گھر بار اختیار کرنا پڑا۔ جس گھر میں مجھے رہنا نصیب ہوا وہ دو منزلہ اور سفید تھا اور اس پر کسی ایسے تابوت کا گمان ہوتا جس میں سارا کنبہ دفن ہونے والا ہو۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ چھٹی کے اوقات کس طرح گزاروں۔ اس محلے میں دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ دل کہتا کسی ایسی جگہ چلیے جہاں لوگ کم سوتے ہوں، کم جھگڑے ہوتے ہوں، اور دن رات اللہ میاں سے شکوے شکایت نہ کرتے ہوں اور دوسرے کے عیب پر نکتہ چینی نہ کرتے ہوں۔

ایسٹر کے بعد والے سنیچر کو ایک مشہور خانقاہ سے مریم کا بت ہمارے شہر میں مہمان آیا۔ مریم مجھے جی جان سے پسند تھی۔ جب بت کو سلام کرنے کا وقت آیا تو یہ دیکھے بغیر کہ بڑے کیا کر رہے ہیں میں نے بت کے ہونٹوں اور گالوں کو چوم لیا۔

بہار کا جادو چل ہی گیا اور میں گھر سے بھاگ نکلا۔ دن میں تو میں ندی کنارے چہل قدمی کرتا رہا۔ نیک دل ملاح مجھے روٹی اور سائبان میں سونے کے لیے جگہ دے دیتے۔ آخر کار ان میں سے ایک نے مجھ سے کہا: "لڑکے یوں ٹامک ٹوئیاں مارنے سے کیا حاصل۔ نیکی نامی اگن بوٹ میں جا۔ وہاں ایک مشعلچی کی ضرورت ہے۔"

جینے کا انداز

ہر گھاٹ پر آٹھ آٹھ دس دس کے غول سامان سے لدے پھندے نیچے اتر جاتے اور ان کی جگہ لینے کے لیے انہیں کی قماش کے آدمی بوٹ پر سوار ہو جاتے۔ لیکن اس آوا جائی کا ہماری زندگی پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ آنے والوں کی گفتگو کے موضوع بھی وہی ہوتے جو جانے والوں کے تھے ——— زمین، مزدوری، خدا، عورت اور اسی قسم کی چیزیں اور ان کے بیان کا انداز بندھا بندھایا ہوتا: "مشیت ایزدی یہی ہے کہ ہم مصائب برداشت کریں۔ صبر و شکر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ یہی اپنی قسمت ہے۔"

ایسی باتیں سن کر مجھے برا بھی لگتا اور غصہ بھی آتا۔ مجھے ہر قسم کی گندگی سے نفرت تھی اور اسی طرح اپنی ذلت یا توہین کو میں ہرگز برداشت نہ کر سکتا تھا۔ کئی موقعے آئے جب میرے جذبات بے حد مشتعل ہوئے اور سمجھ میں نہ آیا کہ لوگ اچھے ہیں یا برے، شریف ہیں یا شریر۔ میں یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ کس وجہ سے اتنے بے مہر ہیں اور کسی پر مہربانی کرتے انہیں شرم کیوں آتی ہے۔

جی چاہتا کہ جہاز ہمیشہ حرکت میں رہے اور ہر روز نئے شہروں اور نئے لوگوں کا تماشا ہو۔ لیکن یہ زندگی زیادہ عرصے نہ چل سکتی تھی۔

اس کا سلسلہ ایک دن اچانک ٹوٹ گیا۔ ہم کزان سے نجنی کی طرف جا رہے تھے۔ نجنی میں داروغہ نے مجھے برخاست کر دیا۔ مجھے آٹھ روبل ملے۔ اتنی بڑی رقم میں نے نہ کمائی تھی۔

میں نے نانی کو اگن بوٹ کے سب حالات سنائے۔ یہ کہتے مجھے بڑی شرم آئی کہ بوٹ سے نکالا گیا لیکن ہچکچا کر میں نے یہ بھی سنا دیا۔ نانی نے اس کا کوئی اثر قبول نہ کیا۔ بس اتنا کہا: "تم ابھی کم عمر ہو۔ تمہیں جینے کا انداز نہیں آیا۔"

"لیکن جینے کا ڈھب کیوں کر آتا ہے؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔"

ننھے غزل خواں

میں نے فیصلہ کیا کہ گانے والی چڑیوں کو پکڑنے کا پیشہ اختیار کروں۔ ان ننھے غزل خوانوں کو پکڑتے مجھے دکھ ہوتا تھا اور انہیں پنجروں میں بند کرتے وقت تو واقعتاً میرا کلیجہ پھٹتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ انہیں دور ہی سے دیکھا جائے۔ لیکن ایک تو شکار کا خبط اور دوسرے پیسوں کی چاہت نے میری نازکی کو دھو ڈالا۔

جب برف باری شروع ہوئی تو نانا دوبارہ مجھے اپنی سالی کے گھر لے گیا۔ یہیں کہیں ایک پردیسی رہتا تھا جو شہر کے بہترین درزی کی دکان پر ملازم تھا۔ اس کی بیوی جو بانجھ تھی صبح و شام تک کتابیں پڑھنے کے سوا کوئی کام نہ کرتی تھی۔

پڑھنے لکھنے کے شوق نے میری جو درگت بنائی وہ مجھے خوب یاد ہے۔ درزی کی بیوی کی کتابیں میرے خیال میں بیش قیمت اور نایاب تھیں اور چونکہ یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ بڑھیا نہ جانے کب انہیں آگ میں جھونک دے۔ میں چپکے پرانی سستی کتابیں لانے لگا جو اس دکان میں مل جاتی تھیں۔ جہاں میں ہر روز صبح سویرے روٹی خریدنے جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ حال ہوا کہ جیسے کسی متوالے کے لیے شراب ویسے میرے لیے کتاب۔ کتابوں نے مجھ میں ایک نئی روح پھونکی جو عمل و شرافت کے جذبات سے مالا مال تھی اور مجھے ترغیب دیتی تھی کہ جرم ہو یا بہادری کوئی کارنامہ دکھاؤں کیوں کہ جن لوگوں میں رہتا تھا ان میں نہ یہ جرأت تھی کہ جرم کریں نہ یہ کہ بہادر ہوں۔ کتابوں میں جو کچھ پڑھتا تھا اس سے ان کی زندگی بالکل الگ تھی اور میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ زندہ کیوں ہیں۔ کم از کم مجھے تو کسی قیمت پر یہ زندگی گوارا نہ تھی یہ طے شدہ امر تھا۔

بھونرے کی مانند

اسی زمانے میں میرے آقا کے فلیٹ کے نیچے کی منزل میں کچھ کرایہ دار آئے۔ ان میں ایک جوان عورت اپنی بیٹی اور بوڑھی ماں کے ساتھ تھی۔ وہ عورت نہایت حسین مگر مغرور اور تند مزاج تھی جب دریچے کھول دیے جاتے اور پردے اٹھا دیئے جاتے تو کمرے کے لوگوں کو میں صاف دیکھ سکتا تھا۔ میں دل میں اسے ہمیشہ ملکۂ حسن کے نام سے یاد کرتا تھا۔ حقارت و رشک مجھے یاد دلاتا کہ ملکۂ حسن چیزوں کی صحبت میں ہے اور یہ لوگ بھونرے کے مانند اس گل رعنا پر ہجوم کر رہے ہیں۔ اس عورت کی صحبت نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا۔

ایک بار پھر میں ایک اگن بوٹ پر شیفی کی خدمت پر مامور ہو گیا۔ داروغہ کی بیوی اس قدر لطف و عنایات کے ساتھ پیش آتی کہ مجھے کچھ شبہ ہونے لگا۔ میں نے سوچنے کی کوشش تو بہت کی مگر اس کی باتوں کا مطلب کبھی نہ سمجھ سکا۔ وہ اس قدر گری ہوئی اور شرمناک ہوتی تھیں کہ بیان نہیں کی جا سکتیں۔

موسم خزاں کا چل چلاؤ تھا۔ بحری سفروں کے دن ختم ہو گئے۔ میں نے ایک بت ساز کے کارخانے میں کام سیکھنے کی غرض سے شاگردی اختیار کرلی۔ کارخانے کی مالک ایک نیک دل بوڑھی عورت تھی۔ وہ ایک دن بعد ہی مجھ سے کہنے لگی: "آج کل دن چھوٹے ہوتے ہیں اور راتیں بڑی۔ بہتر یہ

ہے کہ صبح کے وقت تم دکان کے کام کاج میں ہاتھ بٹایا کرو، پینٹ سکھانے کا کام شام کے بعد بھی ہو سکتا ہے۔"

اس نے مجھے ایک نوجوان پستہ قد دکان دار کے سپرد کر دیا جو مصنوعی رنگ و روغن سے اپنے چہرے کو خوبصورت بنائے رکھتا تھا۔ مورتوں کی قیمتیں مختلف قد و قامت، وضع قطع اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کے اعتبار سے مقرر تھیں اور وہ بہت جلد میرے ذہن میں بیٹھ گئیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا کہ فلاں بزرگ کی کیا خصوصیت ہے ایک امر محال تھا میرے لیے اس سے بھی زیادہ سخت کام گاہکوں کو بیچنا تھا۔ وہ مکروہ شکل کی رنگ برنگی مورتیں خود مجھے بھی جعلی معلوم ہوتی تھیں اور اس لیے میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ ان کو فروخت کروں۔

شام کو جب چھٹی ہوتی تو میں کاریگروں کو اپنے اور پیا کے قصے سنایا کرتا۔ میں چھپی کتابوں کی تلاش میں سرگرداں رہتا اور تقریباً ہر شام کو جاری مجلس لگتی۔ میری زندگی میں یہ وقت یادگار ہے۔

مستقل قہقہہ

میں جانتا تھا کہ دکاندار مجھ سے کھنچا کھنچا رہتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کو مجھ سے نفرت ہو گئی تھی۔ دکان تو دکان گھر کی چار دیواری میں بھی اگر کسی کو مجھ سے دشمنی تھی تو یہ ذات شریف دکاندار کی منظور نظر تھی۔ مجھے اپنی زندگی میں اس قسم کی لڑکی سے پہلی بار سابقہ پڑا تھا اس کی ضرورت سے زیادہ مجھے بے شرمی سے نفرت تھی اور ڈر بھی معلوم ہوتا تھا جب اس نے محسوس کیا کہ مجھے اس کے عشوے اور غمزے ایک آنکھ بھی نہیں بھاتے تو مجھے چڑانے کے لئے اس نے تریا چلتروں سے کام لینا شروع کیا۔

روز بروز یہ ننھی سی خواہش میرے دل و دماغ پر زیادہ حاوی ہوتی چلی گئی کہ میں جی بھر کر مسخرہ پن کروں۔ لوگوں سے اس طرح دل لگی کی جائے کہ وہ خوشی سے ناچ اٹھیں، یہاں تک کہ ان کی زندگی ایک مستقل قہقہہ بن جائے۔ میں اس خواہش کی تکمیل میں کامیاب رہا۔

عورت ذات کا خیال میرے دل میں ضرورت سے زیادہ جاگزیں رہنے لگا۔ بارہا میں نے اپنے من سے پوچھا کیا تو بھی اگلی چھٹی کے دن اس جگہ جانا چاہتا ہے جہاں جا کر سب اپنا دل بہلاتے ہیں؟ یہ کسی نفسانی خواہش کے ماتحت نہ تھا۔ میں بالکل تندرست اور طاقتور تھا۔ لیکن کبھی کبھی یہ آرزو مجھے دیوانہ بنا دیتی کہ میں کسی ایسی ہستی کے سینے سے لپٹ جاؤں جو ماں کی طرح نرم و نازک، رحم دل، دکھ سکھ کو سمجھنے والی اور پر خلوص ہو تاکہ میں اس سے کہہ سکوں کہ میری روح ہر وقت بہت مضطرب اور بے چین رہتی ہے۔ میں تمباکو نوشی کا بری طرح عادی تھا۔ اس کے نشے سے میرے پریشان خیالات اور مضطرب جذبات میں سکون پیدا ہو جاتا تھا۔ رہی شراب سو اسے پی کر مجھے بڑی کوفت ہوتی تھی کیونکہ اس کی بدبو سے میرے ذوق لطیف کو صدمہ پہنچتا تھا۔

موسم بہار نے شروع ہو کر رہا سہا سکون بالکل ختم کر دیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ دوبارہ جہاز پر ملازمت کروں اور استرخان پہنچتے ہی ایران کی طرف بھاگ نکلوں۔ اتفاقاً نانا کے نقشہ نویس بھانجے سے ملاقات ہو گئی جس کے یہاں پہلے میں ملازم رہ چکا تھا۔

"ارے پیشکوف! ادھر کہاں؟" اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "اب بہتر یہی ہے کہ جیسے ہو تم دوبارہ میرے پاس چلے آؤ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے اس سال نئی مارکیٹ کے چند ٹھیکے لے لیے ہیں۔ تم ایک نگران کے فرائض اچھی طرح انجام دے سکتے ہو۔"

میں اپنے مالک کے ساتھ کشتی میں بیٹھا تھا۔ کشتی بازار کے بیچوں بیچ ان مکانوں کے قریب سے گزر رہی تھی جن میں دوسری منزل تک تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ اس نے چلتے چلتے وہ جگہ دکھائی جہاں پانی اتر جانے کے بعد تعمیر کا کام شروع کرنا تھا۔

ترکاری سے تشبیہ

اس مکان میں جو کبھی میری ملکہ کا عشرت کدہ تھا ایک بڑے خاندان نے رہائش اختیار کر لی تھی۔ پانچ نوجوان لڑکیاں تھیں حسین و جمیل اور رعنائی میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اور دو لڑکے جو مدرسے میں تعلیم پا رہے تھے۔ میں عام طور پر انہی لوگوں سے کتابیں لے لیتا تھا۔ شام کے وقت سب سے اوپر کی چھت پر بہت سے لوگوں کا جمگھٹا لگتا۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں سبھی جمع ہو جاتے۔ مجھ اکیلے نے اتنی کتابیں پڑھی تھیں کہ ان سب نے مل کر بھی نہ پڑھی ہوں گی۔ صورت شکل بہتر کر لینا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں میری نظروں میں ہمیشہ مزاحیہ رنگ غالب آ جاتا۔ ان میں سے ہر ایک کی تصویر کو کسی نہ کسی پھل یا ترکاری سے تشبیہ دے کر خوش رہتا۔

متواتر تین سال میں اس بروا شہر کی سنسان عمارتوں میں زندہ درگور مردوں کی کارگزاری کا جائزہ لیتا رہا۔ مجھے شراب پسند تھی نہ عورت ان دونوں کا نشہ مجھے کتاب میں ملتا تھا۔ ابھی میری عمر صرف پندرہ سال تھی لیکن کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ غور و فکر اور علم و مشاہدہ نے میرے دل و دماغ پر ایک بھاری وزن لاد دیا تھا۔ میری طبیعت کو کبھی قرار نصیب نہ ہوتا تھا۔ بیماری، ناخوشی اور چغل خوری وغیرہ کے نام سے بھی مجھے چڑ تھی۔ جبر و ظلم یا بدمزگی سے مجھے طبعاً نفرت تھی اور اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔

شام کو بازار سے لوٹتے وقت میں ایک ٹیلے پر چڑھ کر ڈوبتے ہوئے سورج کا نظارہ کیا کرتا تھا۔ اب میں ہمیشہ باہر کے ملکوں اور ان بڑے بڑے شہروں کے تصور میں گم رہنے لگا جہاں لوگوں کی زندگی کا ڈھانچہ بالکل مختلف تھا۔ اس تصور سے میری بے چینی کچھ رام ہوتی اور یہ سوچتا کہ دنیا اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

پت جھڑ کے بے رنگ دنوں میں کبھی کبھی میں دشت نوردی کے لیے نکل پڑتا۔ اسی پت جھڑ کے زمانے میں میں نے قازان شہر کی راہ لی دل میں یہ خفیہ امید لیے ہوئے کہ شاید وہاں تعلیم کا کوئی سامان ہو سکے۔

غرض کہ میں نے سچ مچ حصول تعلیم کے ارادے سے قازان یونیورسٹی کی راہ لی۔ یہ بات مجھے ایوری نوف نامی خوش مزاج لڑکے نے سجھائی تھی۔ فاقے سے بچنے کے لیے میں دریائے وولگا کی کشتیوں کے ارد گرد چکر لگانے لگا کیوں کہ اس جگہ چار چھ آنے آسانی سے کمائے جا سکتے تھے۔

نان بائی

کسی نے میرا تعارف ویری نکوف سے کرا دیا۔ شہر میں کسی کے پاس ضبط شدہ کتابوں کا اتنا اچھا مجموعہ نہ تھا اور قازان بھر کے طلباء اور انقلاب پسند انہیں پڑھنے کے لیے جمع ہوا کرتے تھے۔ سچ پوچھا جائے تو ویری نکوف کے گھر کے مالک شہر کے طالب علم تھے۔ انہیں روس اور روس کے عوام کے مستقبل کی طرف سے ہمیشہ اندیشہ لگا رہتا تھا۔ اس نئی زندگی نے مجھے اتنا مسحور کیا تھا کہ میں کام چھوڑ کر دوسروں کی روٹی کا محتاج بن گیا اور سب جانتے ہیں کہ دوسروں کی دی ہوئی روٹی زہر سے بھی زیادہ کڑوی ہوتی ہے۔ چنانچہ میں سیمونوف نامی نان بائی کی دکان میں ملازم ہو گیا۔ زندگی کے اس دور سے متاثر ہو کر میں نے کئی افسانے لکھے۔

ایک بار ویری نکوف کو سوجھی کہ نان بائی کی دکان کھول لی جائے۔ نان بائی کے نائب کے علاوہ ویری نکوف کے خیمے کی خدمت بھی میرے سپرد ہونے والی تھی۔

اس دوران میری نانی کا انتقال ہو گیا۔ بھیک مانگ کر بوڑھی میرے سوتیلے بھائیوں اور ان کی بہن کے بچوں کا پیٹ پالتی تھی گو سب جہاں منتشر تھے۔

اب تنور خانے میں طلبہ کا آنا جانا بہت کم ہو گیا۔ اس سے مجھے یہ دقت ہو گئی کہ دوران مطالعہ میں جو مشکل آ جاتی اسے سمجھانے والا کوئی نہ تھا۔ لہٰذا اس قسم کے مشکل سوالات میں ایک کاپی میں نوٹ کرنے لگا۔ ایک مرتبہ لکھتے لکھتے میں تھک کر سو گیا اور [illegible] بابا کو اسے کھول کر پڑھنے کا موقع مل گیا۔ غصے کے مارے اس نے میری کاپی کوڑے کی ٹوکری میں پھینک دی۔

"بہت خوب! چیخ کر بولا، تم کو کاروبار تجارت کے خاتمے کا خبط سوار ہوا ہے۔ عجیب بات ہے۔ ان خرافات کو چھوڑو۔ سیاسی پولیس ایسی ہی تحریروں میں بڑی دلچسپی لیتی ہے جو کاروبار تجارت کی مخالفت کا سودا سر میں سمایا ہے۔"

ادھر تنور جتنی تیزی سے ترقی کر رہا تھا میرے حالات بد سے بدتر ہو رہے تھے۔ تنور کے کام دھندے کے علاوہ مجھے چار جگہ روٹیاں بانٹنی ہوتی تھیں۔ ان میں رئیس زادیوں کا بورڈنگ ہاؤس بھی تھا۔ ٹوکری سے روٹیاں نکالتے ہوئے وہ میرے ہاتھوں میں پرچیاں تھما دیتی تھیں۔ میں یہ تاڑنے کی کوشش کرتا کہ ان میں وہ کون ہے جو بغیر سمجھے بوجھے ایسی شرمناک پرچیاں لکھ لکھ کر مجھے دیا کرتی ہے۔ خود بخود پہلے گھر کا خیال آتا اور میں اپنے آپ سے پوچھتا کہ کیا کوئی غیرت مند دہقان اپنے گھروں کو اس قسم کے بورڈنگ ہاؤس سے وابستہ کرتا ہے۔

دوستی ہی سہی

میری ساری محنت کا کچھ حاصل نہ تھا۔ بے چارہ دیرنکوف افسوس سے کہتا: "ہمارا دیوالہ نکل جائے گا۔" ادھر اس کا خاندان تباہی کے منہ میں جا رہا تھا۔ اس کے باپ پر مذہب بھوت کی طرح سوار ہو گیا۔ چھوٹا بھائی شراب نوشی اور عشق بازی میں گم تھا۔ بہن اپنی محبت میں ناکام ہو کر کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں اس پر مرتا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ اپنی دکان کی مالکہ پر بھی فدا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ساری جنس لطیف کا عاشق زار بن بیٹھا۔ مجھ پر شہوت کا غلبہ رہنے لگا لیکن زوروں پر ہوا۔ عمر اقتضائے طبع اور ماحول کا تقاضا تھا کہ عورتوں سے چپک جاؤں۔ ہم بستری کا شرف حاصل ہو سکے تو دوستی ہی سہی۔

میں سماج کا جتنا مشاہدہ کرتا اسی قدر یہ حقیقت واضح ہوتی جاتی کہ اس میں انسانی ہمدردی کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ بے معنی چیزوں کی ملکیت کے لیے مسلسل کشمکش کا نام زندگی تھا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق تھا کتابوں کے علاوہ اور سب چیزیں میرے لیے بیکار اور غیر ضروری تھیں۔ مجھے روحانی درماندگی کا احساس ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ہر فرد کے قول و فعل میں ہی نہیں جذبات میں بھی تضاد ہے۔ میں نے اپنے آپ کو اسی تضاد کا شکار پایا۔ [illegible] رہا تقاضائے جنس۔

لیکن تھوڑے ہی عرصے میں حالات کی کایا پلٹ ہوئی۔ آغاز بہار کی کسی شام کا ذکر ہے۔ میں دکان میں داخل ہوا ہی تھا کہ خوخول پر نظر پڑی۔ نہایت سنجیدہ دھیمے لہجے میں وہ کہنے لگا:

"تم میرے پاس کیوں نہ آ جاؤ؟ میں وولگا کے کنارے یہاں سے پینتالیس میل دور ایک گاؤں میں رہتا ہوں۔" گاؤں کا نام بتا کر اس نے ہدایت کی کہ جمعہ کی شام کو گھاٹ پر جا کر لوہے کی کشتی پر بیٹھ جانا۔

خودکشی کی ناکام کوشش کے بعد میں اپنی نظروں میں ذلیل ہو گیا تھا اور زندگی میرے لیے عذاب ہو گئی تھی۔ خوخول نے یقیناً میری روحانی الجھن کو محسوس کیا اور اپنی زندگی میں مجھے داخل کر کے از سرِ نو تازہ دم کیا۔

دیہات کی زندگی میری نظر میں بے رنگ اور بے معنی تھی۔ پہلے میں اکثر سنا کرتا تھا کہ دیہاتیوں کی زندگی فطرت اور صحت کے قریب ہوتی ہے۔ لیکن کسانوں کو میں نے جہالت، ان تھک محنت اور غلاظت کے بار سے دبا ہوا پایا۔ ان میں سے کسی کو مسرت کی ہوا بھی نہ لگی تھی

وقت کے آغاز میں خوگل دکان کے لیے مال کا انبار دے کا اور اس سے کسی پر گیا۔ جیسے کا وزر ہے وہ جا دھو کر کپڑے بدل چکا تھا اسی وقت اُس نے زور سے چلائی: "گھر میں آگ لگ گئی ہے۔"

جس جگہ ہماری جھونپڑی تھی اب سلگتے ہوئے انگاروں کے ڈھیر کے سوا کچھ نہ تھا۔ خوگل کے منہ سے ایک آہ نکلی: "کتابوں کے جلنے کا بڑا رنج ہے۔" اس نے اداسی سے کہا:

"نیاز گونت کی رائے ہے کہ تم اس کے ساتھ ہی رہو۔ وہ نئی دکان کھولنا چاہتا ہے۔ میں نے سارا مال اس کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔"

"میں سوچ کر کوئی فیصلہ کروں گا۔"

خوگل نے خوابیدہ آواز میں پوچھا: "کیا تم کسانوں سے خفا ہو؟ یہ رویہ مناسب نہیں۔ یہ لوگ محض احمق ہیں۔ ان کی بدقسمتی کی وجہ بھی حماقت ہے۔"

خوگل سے جدا ہونے کے بعد میں مایوسی و بیزاری کے گرداب میں پھنس گیا۔ گاؤں میں میری حالت اس کتے کی سی تھی جو اپنے مالک سے جدا ہو گیا ہو۔ میں بارینوف کے غسل خانے میں رہنے لگا اور اس کے ساتھ امیر کسانوں کے باغوں یا کھیتوں میں مزدوری کر کے پیٹ پالنے لگا۔ برسات کی ایک رات کو وہ پوچھنے لگا: "چلو کل ہی سمندر کی راہ پکڑیں۔ مذاق نہیں، یہاں ہم جیسے غریبوں کی قدر نہیں۔"

چنانچہ دوسرے دن ہم روانہ ہو گئے۔

رنگیلی جورو

میں ایک ریلوے اسٹیشن پر چوکیدار کی خدمت انجام دینے لگا۔ شام ڈھلے سے لے کر صبح کے دھندلکے تک ہاتھ میں ڈنڈا لیے مال گودام کا گشت کیا کرتا تھا۔ آخری گودام کے پاس برف کے گالوں میں دور دور ہی چلتے پھرتے ہوئے نظر آتے۔ یہ قزاق تھے جو مال چرانے کی گھات میں رہتے۔ کبھی کبھی ایک سپاہی کی رنگیلی جورو گودام پر آتی تھی اس کی بے حیائی دیکھ کر مجھے ابکائی آ جاتی تھی لیکن اس کے حسین و جمیل جسم کے ناجائز استعمال سے مجھے نفرت بھی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ مجھ سے چھیڑ چھاڑ کرتی تھی لیکن میں اسے اپنے گودام کے قریب بھٹکنے بھی نہ دیتا۔ میں نے بہت نرم الفاظ میں اس کی بے حیائی پر نکتہ چینی کی۔ یہ سن کر اس نے متانت سے جواب دیا: "زندگی کی کوفت نے مجھ سے حیا کا احساس چھین لیا ہے .... میرا کیا گناہ۔ سیانوں کا کہنا ہے کہ خالق نے عورت کی قدر و قیمت ...... پنہاں کر دی! اس میں میرا کیا قصور؟"

قریبی ریلوے اسٹیشن ماسٹر چیزوفسکی کی تصویر میری آنکھوں کے آگے پھرا کرتی تھی۔ وہ پرلے درجے کا چور بھی تھا اور قلیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر پارسلوں میں سے کپڑے یا میوے نکال لیتا اور اس مال کو بیچ کر گھر پر راتوں کو محفل نشاط جمایا کرتا تھا۔ اسٹیشن ماسٹر مجھے بھی اپنی بزم میں شرکت کی دعوت دیتا تھا۔

ان دونوں شہوت کے پرشرم ناک نظارے مجھ میں نفرت و حقارت کے جذبات پیدا کرتے تھے۔ ویسے مجھے ان مردوں اور خصوصاً عورتوں کے حال پر بھی ترس آتا تھا۔ اس کے باوجود ان محفلوں میں شرکت سے میں اپنے آپ کو روک نہ سکتا تھا کیونکہ زندگی کے ہر رنگ کے دیکھنے کا خبط مجھ پر بری طرح سوار تھا۔ میں تاریک ترین گوشوں کی چھان بین سے بھی نہ چوکتا تھا اور اس طرح میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔

ریلوے اسٹیشن پر تین ماہ گزارنے کے بعد دل بالکل اچاٹ ہوگیا اور یہاں کی زندگی وبال ہوگئی کیونکہ میں اسٹیشن ماسٹری اور سبھا سے بالکل بیزار ہو چکا تھا۔ علاوہ بریں اس کی باورچن نے میرا جینا اجیرن کر دیا تھا۔ جب کوئی بس نہ چلا تو میں نے ریلوے کے محکمے کو عجلت میں درخواست لکھی جس میں مرمینا کے ظلم کی داستان لکھی تھی۔ بارے یہ درخواست منظور ہوئی اور میرا تبادلہ ایک بڑے ریلوے اسٹیشن کے مال دفتر میں ہوگیا۔

وہاں کئی پڑھے لکھوں کی ایک ایسی جماعت سے میری ملاقات ہوگئی جو سب جیل کی ہوا کھا چکے تھے۔ شام کی صحبتوں میں ادب اور عام اشاروں میں بعض رنگیلی چھبیلی عورتوں کو پرچانے کی کوشش کرتے تھے ان صحبتوں میں اسٹیشن ماسٹر کی محفلیں یاد آتیں۔

چند ماہ بعد میرا تبادلہ کہیں اور ہوگیا۔

کتابوں میں زندگی کے جس حسن کا ذکر ہوتا ہے اس سے محظوظ ہونے کو میں ترستا تھا۔ میں کسی ایسی شے کی تمنا کرتا تھا جو مجھ میں طاقت اور مسرت پیدا کر دے۔ مجھے اس خیال سے بڑا دکھ ہوتا تھا کہ زندگی کے ایسے گھاٹے اور بھیانک پہلوؤں سے دوچار ہونے کے لیے میں کیوں مجبور ہوتا ہوں۔

اب قسمت نے تعلیم کی تکمیل کے لیے مجھے پہلی محبت کا راستہ دکھایا۔ چند احباب نے دریائے اوکا میں کشتی رانی کا تہیہ کیا اور مجھ سے کہا کہ صاحب اور ان کی بیگم کو جلسے میں شرکت کی دعوت دے آؤ۔ یہ دونوں حال ہی میں فرانس سے لوٹے تھے اور ابھی تک مجھے ان سے ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوا تھا چنانچہ ایک روز شام کو میں ان سے ملنے گیا۔

دلچسپ جانور

دوسرے دن ہم دریائے اوکا کی سیر کر رہے تھے۔ میاں بیوی کی سب لوگ اتنی تعریف کرنے لگے کہ میرا دل ان کی محبت سے لبریز ہوگیا۔ ہمارا لگاؤ چند روز میں بہت گہرا ہوگیا اس عورت کے لیے یہ عین فطری امر تھا جیسے پہلی مرتبہ ایک دلچسپ جانور سے واسطہ پڑا ہو اور اس نوجوان کے لیے جسے آغوش یار کے سوا اور کہیں آرام نہ ملتا ہو۔

چند روز بعد ہم دونوں ایک کھیت کی منڈیر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے صاف صاف الفاظ میں سمجھایا کہ ہماری عمر میں بڑا فرق ہے تمہیں بہت کچھ سیکھنا ہے اور ابھی اس قابل نہیں کہ ایک عورت اور جیون میں اس کی رفاقت کا ذمہ لے سکو۔ پیار و محبت کی کچھ باتیں کر کے وہ رخصت ہوئی۔ اور میں حد نظر تک اس کے خرام ناز کو دیکھتا رہا۔ جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہوگئی تو یک بیک دل میں وسوسہ تھا کہ میری پہلی محبت ناکام رہے گی

یہ وسوسہ صحیح ثابت ہوا۔

اس ناکامی نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ وحشت کے مارے میں نے اس شہر کو خیرباد کہا اور دو سال تک سارے روس کی خاک چھانتا رہا۔ دو سال بعد خزاں کے موسم میں ٹانگ ٹکریاں مارتے ہوئے میں طفلس جا پہنچا۔ وہاں معلوم ہوا کہ وہ یورپ کی سیر کر کے اس شہر میں آئی ہوئی ہے۔ سوچ ہی رہا تھا کہ اس سے ملنے جاؤں نہ جاؤں کہ اس نے خود بعض دوستوں کے توسط سے مجھے یاد فرمایا۔

جاڑوں کے موسم میں وہ دونوں ماں بیٹیاں میرے پاس اٹھ چلی آئیں۔ کسی پادری کے باغ میں ایک غسل خانہ تھا جسے ہم نے تین روپے ماہانہ کرایہ پر لے لیا۔ اس عورت کو ایسے سڑے ہوئے گھر میں رہتے ہوئے میرا دل دکھتا تھا۔ میرے افلاس کی یہ انتہا تھی کہ اکثر تو کھانے کے لیے

گوشت پک سکتا تھا۔ اس کا مقدور تھا کہ میں بچے کے لیے کوئی کھلونا لاؤں۔

دو پیسے فی لائن

اس زمانے میں میں ایک وکیل کی محرری کرتا تھا۔ فرصت کے اوقات میں دو پیسے فی لائن کے حساب سے ایک مقامی اخبار کے لیے افسانے گھسیٹ دیا کرتا تھا۔ جب ہمارے چند روپے جمع ہوتے تو دوستوں کو دعوت دیتے۔

مجھے امید تھی کہ یہ عورت جو بیک وقت میرے لیے ماں اور محبوبہ تھی مجھے کسی ایسے امرت سے سرشار کرے گی جو میری تخلیقی قوتوں کو سیراب کر دیگا۔

میری خانگی زندگی کے متعلق احباب پریشان کن روایتیں بیان کرنے لگے۔ میری بیوی نے کہا:

"تم رشک و حسد تو نہیں کرنے لگے؟"

مجھ میں جوانی کی خود اعتمادی اتنی زیادہ تھی کہ رشک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

یہ وسوسہ بھی اٹھنے لگا کہ اس قسم کی زندگی کہیں مجھے اپنے سے دور نہ لے جائے۔ ادب کے سوا دنیا میں میرے لیے کوئی جگہ تھی مگر موجودہ حالات میں میرے لیے کام کرنا ناممکن تھا۔ آخر کار میں نے اپنی بیوی سے کہا۔

"اگر میں یہاں سے چلا جاؤں تو مناسب ہوگا۔"

کچھ سوچ کر وہ بولی: "ہاں مجھے خود بھی احساس ہے کہ یہ ماحول تمہارے لیے موزوں نہیں۔"

کچھ دیر بعد ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہم اداس اور خاموش بیٹھے رہے۔ چند روز بعد میں نے اس شہر کو خیر باد کہا۔ وہ کسی ناٹک منڈلی میں شامل ہو گئی۔

پہلی محبت نے میری زندگی کے ایک رخ کو روشن کیا لیکن ہم دونوں کے ذوق میں اتنا اختلاف تھا کہ میں دل ہی دل میں کڑھنے لگا۔ اسے مصائب کے ذکر تک سے نفرت تھی۔ رحم و کرم کے تصور سے بھی وہ ناآشنا تھی اور اسے صرف وہ لوگ پسند تھے جو ہنسنا جانتے تھے۔ زندگی کے مسائل کو وہ تماشائی کے نقطۂ نظر سے دیکھتی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ مرتے دم بھی اسے امید ہوگی کہ موت کی حیثیت کسی شعبدے سے زیادہ نہیں اور اس میں بھی دلچسپی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور مضمر ہوگا۔

(ترجمہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری)

(تلخیص: نعیم احمد)

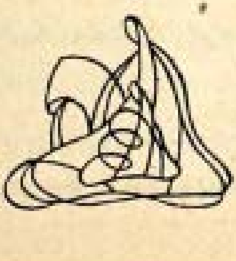

ہمدرد کی آپ بیتی

میرا نام ہمدرد ہے اور کام ہمدردی۔ خلقِ خدا کی خدمت میرا فرض اور طبِ مشرق کی ترقی میرا مشن۔ میں ۱۹۰۶ء میں دہلی میں عالمِ وجود میں آیا۔ میرے بانی تھے شہیدِ فن حکیم حافظ عبدالمجید مرحوم۔ انھوں نے مجھے بنایا تو ان کے سامنے یہ مقاصد تھے:۔

۱۔ عوام کی طبی خدمت اور اچھی و سستی دواؤں کی فراہمی۔
۲۔ طبِ مشرق کی حفاظت اور ترقی۔
۳۔ دیسی دواؤں کا معیار بڑھانا۔
۴۔ صحت کے اصولوں کی اشاعت۔

انھوں نے ان مقاصد کے لئے رات دن انتھک محنت شروع کر دی اور پورے خلوص کے ساتھ میری ترقی کے لئے کام کرتے رہے۔ لیکن افسوس کہ اُن کی عمر نے وفا نہ کی۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادوں حکیم عبدالحمید دہلوی اور حکیم حافظ محمد سعید دہلوی نے میری باگ ڈور سنبھالی اور اپنے والد محترم کے منشا کے مطابق میری ترقی کے لئے کام کرنے میں مصروف ہو گئے۔ دونوں دانش مند اور محنت پسند بھائیوں کے اتحادِ فکر و عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد میری شہرت عام ہو گئی۔ میرا بنایا ہوا شربت روح افزا ہزاروں لاکھوں آدمی پینے لگے۔ میرے کارکنوں کی تعداد بڑھنے لگی اور لاکھوں مریض میری دواسے شفا پانے لگے۔ میری طرف سے شائع ہونے والا رسالہ ہمدرد صحت لوگوں کو صحت و تندرستی کے اصول سکھانے لگا اور روز بروز اس کی مقبولیت بڑھتی گئی۔

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہو گیا اور ۱۹۴۸ء میں حکیم حافظ محمد سعید دہلوی پاکستان آ گئے۔ یہاں افراتفری کا عالم تھا۔ کوئی ساز و سامان تھا نہ مال و دولت، صرف حکیم صاحب کا خلوص تھا اور خدمت کی لگن۔

پچاس روپے مہینہ کرایہ کا کمرہ لے کر اور بارہ روپے ماہانہ کرایہ کا فرنیچر لے کر میرا دفتر قائم کر دیا اور حکیم صاحب اور ان کے ساتھی شب و روز کام کرنے لگے۔ یہ محنت کا پھل ہی ہے کہ کچھ ہی عرصہ میں میرا نام روشن ہو گیا اور میرا کام پھیلنے لگا۔ کراچی کے بعد لاہور میں، لاہور کے بعد ڈھاکہ اور چاٹگام میں میری شاخیں قائم ہو گئیں۔ اس کے علاوہ ملک کے ہر شہر اور قصبہ میں میری ایجنسیاں اور اسٹاکسٹ مقرر ہو گئے جو میری دوائیں عوام کو پہنچا کر نفع پہنچاتے ہیں۔ میری جانب سے بڑے بڑے شہروں میں مطب قائم ہیں جہاں عوام کو بلا معاوضہ طبی مشورے دیے جاتے ہیں۔

میرے کارکنوں کی تعداد کم و بیش سات سو ہے، جن کو ہر مہینہ میرے ذریعہ ایک لاکھ سے اوپر تنخواہ ملتی ہے۔

میری جانب سے ہر ماہ پانچ رسالے شائع ہوتے ہیں۔

ہمدرد صحت (تعلیم و صحت کا نقیب)۔ ہمدرد نونہال (بچوں کا محبوب ساتھی)، اخبار الطب (طب و اطباء کا ترجمان)۔ ہمدرد میڈیکل ڈائجسٹ (بیرونی ممالک میں طبِ مشرق کا علمبردار)، میڈیکل ٹائمز (طبِ مشرق کا انگریزی ترجمان)۔

ہم نے ۱۹۵۸ء میں جامعہ طبیہ شرقیہ کے نام سے ایک اعلیٰ طبی کالج قائم کیا جو کامیابی کے ساتھ خدمات انجام دے رہا ہے۔

یکم جنوری ۱۹۶۴ء سے حکیم محمد سعید دہلوی نے ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن قائم کر دیا ہے جس کے تحت رفاہی، تعلیمی اور علمی کام انجام پائیں گے۔ فاؤنڈیشن کے تحت ادارۂ صحت و تحقیق طب قائم ہو رہا ہے۔ یہ ادارہ تعلیم صحت، طبی تحقیق اور دیسی ادویہ پر ریسرچ کے کاموں کے لئے قائم کیا گیا ہے اور اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہو گا۔

مجلس ترقی ادب لاہور کی کلاسیکی مطبوعات

۱۔ سروشِ سخن ۔ از فخرالدین حسین سخن ۵/۰۰
۲۔ بہارِ دانش ۔ از مرزا جان طپش ۳/۰۰
۳ خرد افروز ۔ (ترجمہ عیارِ دانش)
از شیخ حفیظ الدین احمد ۴/۵۰
۴۔ امراؤ جان ادا ۔ از مرزا رسوا ۵/۰۰

مقالاتِ سرسید (احمد خاں)

۵۔ حصہ اوّل ۴/۵۰ ۶۔ حصہ دوم ۴/۵۰
۷۔ حصہ سوم ۳/۰۰ ۸۔ حصہ چہارم ۵/۲۵
۹۔ حصہ پنجم ۴/۵۰ ۱۰۔ حصہ ششم ۴/۵۰
۱۱۔ حصہ ہفتم ۳/۵۰ ۱۲۔ حصہ ہشتم ۱/۷۵
۱۳۔ حصہ نہم ۴/۵۰ ۱۴۔ حصہ دہم ۴/۷۵
۱۵۔ حصہ یازدہم ۸/۰۰ ۱۶۔ حصہ دوازدہم ۳/۰۰
۱۷۔ حصہ سیزدہم ۸/۰۰ ۱۸۔ حصہ پانزدہم ۵/۰۰
۱۹۔ موعظۂ حسنہ ۔ از ڈپٹی نذیر احمد دہلوی ۴/۰۰
۲۰۔ مسافرانِ لندن ۔ از سرسید احمد خاں ۳/۰۰
۲۱۔ سوانحِ مولانا روم ۔ از شبلی نعمانی ۴/۵۰
۲۲۔ حیاتِ سعدی ۔ از مولانا الطاف حسین حالی ۴/۵۰
۲۳۔ قصصِ ہند ۔ از مولانا محمد حسین آزاد ۴/۰۰
۲۴۔ آرائشِ محفل ۔ از میر شیر علی افسوس ۸/۰۰
۲۵۔ ابن الوقت ۔ از ڈپٹی نذیر احمد دہلوی ۳/۵۰

۲۶۔ رسومِ ہند ۔ از رائے بہادر ماسٹر پیارے لال
آشوب دہلوی و کپتان ڈبلیو جے ہالرائڈ ۳/۵۰
۲۷۔ فسانۂ مبتلا ۔ از ڈپٹی نذیر احمد دہلوی ۴/۵۰
۲۸۔ فردوسِ بریں ۔ از مولانا عبدالحلیم شرر ۳/۰۰
۲۹۔ وکرم اروسی ۔ از مہا کوی کالی داس ۱/۷۵
۳۰۔ مرقعِ لیلیٰ مجنوں ۔ از مرزا رسوا مرتبہ عشرت رحمانی ۲/۵۰
۳۱۔ مذہبِ عشق (گل بکاؤلی) ۔ از نہال چند لاہوری ۴/۰۰
۳۲۔ نورتن ۔ از محمد بخش مہجور ۶/۰۰
۳۳۔ جوہرِ اخلاق ۔ از جیمز کارکرن ۱/۵۰
۳۴۔ جامع الحکایاتِ ہندی ۔ از شیخ صالح محمد عثمانی ۳/-
۳۵۔ مہتابِ داغ ۔ از نواب مرزا خاں داغ دہلوی ۴/۵۰
۳۶۔ دیوانِ درد ۔ از خواجہ میر درد ۳/۵۰
۳۷۔ قواعدِ زبانِ اردو ۔ از گلکرسٹ ۲/۰۰
۳۸۔ یادگارِ غالب ۔ از شمس العلماء الطاف حسین حالی ۹/۰۰
۳۹۔ اخلاقِ ہندی ۔ از میر بہادر علی حسینی ۳/۰۰
۴۰۔ موازنۂ انیس و دبیر ۔ از شبلی نعمانی ۹/۰۰
۴۱۔ باغِ اردو ۔ از شیر علی افسوس ۵/۰۰
۴۲۔ شگفتہ (کہانی) ۔ از کاظم علی جوان ۲/۲۵
۴۳۔ نشتر (ناول) ۔ از سجاد حسین انجم ۴/۰۰
۴۴۔ توتا کہانی ۔ از حیدر بخش حیدری ۳/۵۰

دفتر مجلس ترقی ادب ۔ ۲ ۔ کلب روڈ ۔ لاہور

نوائے وقت

پاکستان میں

اخبارات تو کئی ہیں، کئی اور نکلیں گے۔ لیکن وہ

"میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

کی

منفرد اور دلپذیر کیفیت آپ کو صرف

پاکستان میں اُردو کے بہترین اخبار

نوائے وقت

میں

ہی نظر آئے گی۔ اگر آپ یہ اخبار پڑھتے ہیں تو آپ اس بیان کی تصدیق کریں گے۔ اگر کسی وجہ سے آپ یہ اخبار نہیں پڑھتے رہے تو آپ ہفتہ عشرہ تک پڑھ کر دیکھیں کہ یہ بات مبالغہ سے کس قدر بعید اور حقیقت سے کس قدر قریب ہے!

لاہور، راولپنڈی، ملتان سے بیک وقت شائع ہوتا ہے

مطبوعاتِ بزمِ اقبال لاہور

۱۔ اقبال اور مُلّا
از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم۔ مطبوعہ متعدد بار، آخری بار ۱۹۶۱ء صفحات ۸۰۔ سائز ۲۰×۲۶/۸ قیمت ۱۲ آنے۔ اس پمفلٹ میں مسلمانانِ پاکستان کو اس طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ علامہ مرحوم کو بجا طور پر پاکستان کا بانی تو قرار دیا جاتا ہے مگر ان کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔

۲۔ فلسفۂ اقبال
مرتبہ بزم اقبال۔ مطبوعہ بار اوّل ۱۹۵۷ء۔ بار دوم ۱۹۶۲ء۔ صفحات ۴۴۰۔ سائز ۱۸×۲۲/۸۔ قیمت ۶/- روپے۔ اس کتاب میں ان مضامین کا اردو ترجمہ درج ہے جو بزم کے سہ ماہی مجلہ اقبال کے انگریزی شماروں میں وقتاً فوقتاً علامہ کے نظریات جمالیات و فن اور تصورِ ارتقاء، اجتہاد وغیرہ کے متعلق شائع ہوتے رہتے ہیں۔

۳۔ فکرِ اقبال
از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم۔ مطبوعہ بار اوّل ۱۹۵۰ء۔ بار دوم ۱۹۶۲ء۔ صفحات ۶۶۰۔ سائز ۱۸×۲۲/۸۔ قیمت ۱۰/- روپے۔ یہ کتاب علامہ مرحوم کے فلسفے کے متعلق جامع کتاب ہے۔

۴۔ اقبال اور تصوّف
از پروفیسر محمد عرفان۔ مطبوعہ ۱۹۵۰ء۔ صفحات ۱۱۹۔ سائز ۱۸×۲۲/۸۔ قیمت ۲/۸ روپے۔ اس کتاب میں تصوف کی حقیقت پر کتاب و سنت کی روشنی ڈالتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ علامہ مرحوم کو صوفیائے کرام اور خاص طور پر مولانا رومی سے کس قدر عقیدت تھی۔ علامہ کے مسلکِ تصوف پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

۵۔ تشکیلِ جدید الٰہیات
ترجمہ سید نذیر نیازی۔ مطبوعہ ۱۹۵۸ء۔ صفحات ۳۶۰۔ سائز ۱۸×۲۲/۸۔ قیمت ۸/- روپے۔ ان خطبات کا ترجمہ جو مولانا نے سائنس، مذہبی مشاہدات، حقیقتِ دعا، حیات بعد الموت وغیرہ کے متعلق مدراس، حیدرآباد اور علی گڑھ میں دئے۔

۶۔ ذکرِ اقبال
از مولانا عبدالمجید سالک۔ مطبوعہ ۱۹۵۵ء۔ صفحات ۲۹۶۔ سائز ۱۸×۲۲/۸۔ قیمت ۵/- روپے۔ اس کتاب میں اقبال کے سوانح حیات کو مستند ماخذ کی بنا پر قلمبند کیا گیا ہے۔

۷۔ مکاتیبِ اقبال
بنام خان نیاز الدین خاں۔ مطبوعہ ۱۹۵۴ء۔ صفحات ۴۴۔ سائز ۲۰×۲۶/۸۔ قیمت ۱/۱۲ روپے۔ ان خطوط میں علامہ نے اہم علمی و ادبی موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور مفید نکات بیان کئے ہیں۔

۸۔ تلمیحاتِ اقبال
از سید عابد علی عابد۔ مطبوعہ ۱۹۵۹ء۔ صفحات ۵۰۰۔ سائز ۲۰×۲۶/۸۔ قیمت ۹/- روپے۔ اس کتاب میں علامہ کی کتب کے مطالعے کے لئے بہترین حوالہ جات درج ہیں۔

کریم احمد خاں، سیکرٹری بزم اقبال، ۲۔ نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ۔ لاہور

زمانہ کسی کا انتظار
نہیں کرتا!

[illegible] سے حل ہو سکتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ برما شیل نے [illegible] کی خدمت کر سکیں۔

[illegible] برما شیل [illegible] آپ [illegible] سب اعلیٰ قسم کی ہوتی ہیں۔

خدمت اپنا افتخار : برما شیل پر اعتبار

[illegible]

Habiboon

معیاری مصنوعات
ملک کی تعمیر و ترقی کا زینہ ہیں

ایمونیا کمپریسر

گیر ہیڈ و سپل ہیڈ - خراد مشین چار فٹ تا بارہ فٹ سائز

علاوہ ازیں برف خانہ و کولڈ سٹوریج کے لیے ہر سائز کی مشینری
و متعلقہ سامان ہماری نمایاں مصنوعات ہیں۔

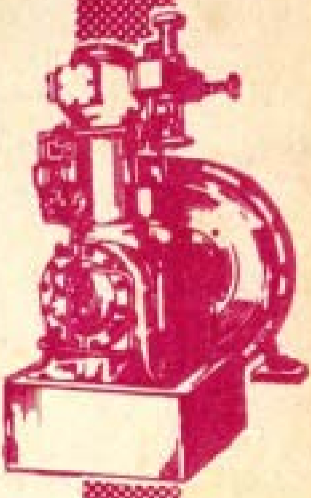

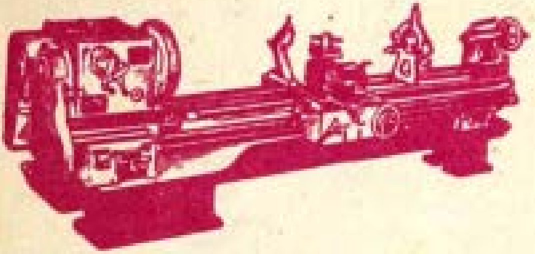

تار:
SHABROLL
فون: ۲۰۵۱ - ۶۵۶۹۳

Habiboon

تیار کنندگان: ایم شبیر احمد اینڈ برادرز، راوی باغ، لاہور

S.J.

آسٹر ملک کا زمانہ
مسرتوں سے بھرپور ہوتا ہے!

وہ زمانہ جب بچے کی پرورش آسٹر ملک پر ہوتی ہے ماں اور بچہ دونوں کے لئے مسرتوں کا زمانہ ہوتا ہے۔ آسٹر ملک بچے کو تندرست و مطمئن رکھتا ہے جس کی بدولت ماں کو بھی آرام نصیب ہوتا ہے۔ دوسری عورتوں کی طرح آپ بھی اپنی صحت کا خیال رکھیں گی اور اپنی اولاد کو ہر طرح خوش و خرم دیکھیں گی۔

جی ہاں! آسٹر ملک بچے کی صحت اور مناسب نشو و نما کے لئے مضبوط بنیاد قائم کر دیتا ہے۔

آسٹر ملک اعلیٰ اور خاص قسم کے دودھ سے تیار کیا جاتا ہے۔ اس میں زود ہضم بنایا گیا ہے تاکہ بچے کا معدہ اس کو آسانی سے ہضم کر سکے۔ ہڈیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے وٹامن ڈی بھی شامل کیا گیا ہے۔ اسی لئے اپنا دودھ چھوٹ جانے پر یا اس کی کمی پوری کرنے کے لئے لاکھوں مائیں پورے اعتماد کے ساتھ بچوں کو آسٹر ملک دیتی ہیں۔

آسٹر ملک
ماں کے دودھ کا بہترین نعم البدل

بچوں کی پرورش پر ایک مفید کتاب
آسٹر ملک کی کتاب اردو میں دستیاب ہو سکتی ہے۔ یہ کتاب حاصل کرنے کے لئے
۵۰ پیسے کے ٹکٹ بھیجئے اور ایک کتاب مفت حاصل کیجئے۔
پی۔ او بکس نمبر ۳۶۴۳۔ کراچی۔

OM-12-193-UD

NOORS

SOHAGAN
AND
MOHINI
SAREES

TISSUE BROCADE
BROSSO GLASSO
TISSUE SATIN

NOOR & COMPANY
21, Gordhandas Market
Karachi Phone: 33033

NOOR SILK MILLS
S.I.T.E. Karachi-Phone: 79151

ایک دوا
اور
دو تاثیریں

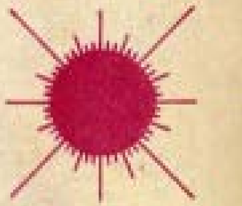

ڈائمنڈ پلز

قیمت ۵۰/۷

دوہری تاثیر رکھنے والی "ڈائمنڈ پلز" ایک طرف معدے کی اصلاح کر کے قلتِ خون۔ اعصابی کمزوری اور دماغی ضعف کی بیخ کنی کرتی ہے تو دوسری طرف اپنے خصوصی اجزا، قوتِ رجولیت (مردانہ طاقت) میں نمایاں اضافہ کر کے جسم اور دماغ کو شباب کی تازگی اور جولانی سے لبریز کر دیتی ہیں۔ صرف چند روزہ استعمال آپ میں حیرت انگیز تغیر پیدا کر دیگا

ہر دوا فروش سے طلب کیجئے یا براہ راست ہم سے رجوع فرمائیے

تیار کردہ:۔
سن ٹریڈنگ کارپوریشن۔

سول ایجنٹ میسرز چھابڑا کارپوریشن ۲۹ حسن علی آفندی روڈ کراچی فون:۔ ۳۶۶۸۳ ۹۰۸۳۸

معمار

چلچلاتی ہوئی دھوپ ہو یا جنوری کی سردی
منزل کی نشان دہی کیلئے ہمیشہ مصروف کار ہے

MECO

رجسٹرڈ ٹریڈ مارک

وطن عزیز میں سیم و تھور کا خاتمہ
اور زرعی پیداوار کی ترقی میں

میکو

ڈیزل انجن

پیش پیش ہے

محمود انجنیئرنگ کارپوریشن

انڈسٹریل ایریا بیرون سرائے سلطان لاہور ۱/۳ - فیروز پور روڈ، لاہور

GRAMS **MAHENG** ٹیلیگرام ٹیلیفون ۸۰۰۱۰ فون آفس ۱۵۹۹۸ S.S.

M.E.C 3/64

آپ کے موافق
برتھ اسٹون

جنوری	گارنٹ	مئی	نیلم	ستمبر	اوپل
فروری	کٹیلا	جون	موتی	اکتوبر	سنیلا
مارچ	زمرد	جولائی	یاقوت	نومبر	فیروزہ
اپریل	عقیق	اگست	ہیرا	دسمبر	مون سٹون

فرحت علی جیولرز

۲۹ ر کمرشل بلڈنگ - دی مال
لاہور

آپ سفر میں ہوں یا حضر میں
کیاری کیاری سے چنے ہوئے پھولوں کا گلدستہ

سیارہ ڈائجسٹ

کا مطالعہ
آپ کے لمحات کو خوش گوار اور رنگین بنا دے گا

ہر شمارے میں ادبیات، فلکیات، نفسیات، عجائبات، حیوانیات، شکاریات، طنز و مزاح، شخصیات، طب و صحت، تاریخ انسانی، نئی نئی ایجادات، شہر و ممالک اور اقوام عالم پر معلوماتی مضامین ہوتے ہیں۔

سالانہ خریداروں کے لیے خاص رعایت

۱۲ شماروں کی قیمت ۱۸ روپیہ ہے۔ مگر آپ صرف ۱۵ روپیہ میں حاصل کر سکتے ہیں۔ آج ہی ذیل کا کوپن پُر کر کے حوالۂ ڈاک کیجیے۔ اگلے شمارہ سے آپ کو پرچہ باقاعدہ ملنا شروع ہو جائے گا۔

پیرا ڈائز سبسکرپشن ایجنسی ۳۔ برنس روڈ، کراچی ۴

براہ کرم آپ میرا نام سیارہ ڈائجسٹ کے مستقل خریداروں میں شامل کیجیے۔ میں اس کوپن کے ہمراہ ۱۵ روپیہ بذریعہ منی آرڈر / چیک / ڈرافٹ / پوسٹل آرڈر روانہ کر رہا ہوں۔

نام ____________________

پتہ ____________________